منتخبات نظام الفتاوی

حضرت مفتی محمد نظام الدین اعظمیؒ

(جلد اول)

ایفا پبلیکیشنز، نئی دھلی

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ

نام کتاب : منتخبات نظام الفتاوی (جلد اول)
صفحات : ۵۵۸
قیمت : ۵۲۰/روپے
طبع اول : مارچ ۲۰۱۳ء

ناشر

ایفا پبلیکیشنز، نئی دهلی

۱۶۱-ایف بیسمنٹ، جوگابائی، پوسٹ باکس نمبر: ۹۷۰۸
جامعہ نگر، نئی دہلی - ۱۱۰۰۲۵
ای میل: ifapublication@gmail.com
فون: 011 - 26981327

اجمالی فہرست

۱	**كتاب العقائد والشرک**	۳۱
۲	**كتاب الطهارة**	۱۰۹
۳	باب الأنجاس وتطهيرها	۱۱۱
۴	باب الوضوء	۱۳۹
۵	باب التيمم	۱۵۱
۶	باب الغسل	۱۵۳
۷	**كتاب الصلوٰة**	۱۵۷
۸	باب مواقيت الصلوٰة	۱۵۹
۹	باب الأذان والإقامة	۲۱۵
۱۰	باب أركان الصلوٰة وواجباتها وسننها ومكروهاتها ومفسداتها	۲۲۷
۱۱	باب الإمامة	۲۷۷
۱۲	باب الوتر والتراويح والنوافل	۳۱۷
۱۳	باب الجمعة	۳۳۵
۱۴	باب العيدين	۳۴۳
۱۵	باب الجنائز	۳۴۹
۱۶	**كتاب الزكاة**	۳۶۵
۱۷	باب المصارف	۴۰۱

۱۸	باب العشر	۴۲۹
۱۹	باب صدقۃ الفطر	۴۳۷
۲۰	**کتاب الصوم**	۴۴۷

فہرست

	پیش لفظ	۲۳
	کتاب العقائد والشرک	۳۳
۱	کلمۂ طیبہ اور شہادت کی حقیقت	۳۳
۲	اولیاء اور شہداء کے زندہ ہونے کا صحیح مفہوم	۳۴
۳	کیا اولیاء اور شہداء سے ہماری رہبری کا کام لیا جاتا ہے؟	۳۴
۴	دعاء میں اولیاء کو سفارشی بنانا	۳۴
۵	تقلید شخص کی پابندی کس طرح ہوئی؟	۳۷
۶	(قادیانیوں کے بارے میں) وفاقی شرعی عدالت پاکستان کا حکم شرعی	۳۹
۷	شرعی حجت کیا کیا ہیں؟	۴۰
۸	تقلید کے بارے میں حضرت مولانا ظفر احمد صاحب کا بیان	۴۱
۹	فقہ ائمہ اربعہ کی تقلید کے سلسلہ میں مفصل بحث	۴۵
۱۰	انبیاء و اولیاء کے وسیلہ سے دعا مانگنا	۴۶
۱۱	حضور ﷺ کی ولادت کے موقع پر سیرت کا بیان	۴۶
۱۲	حضور ﷺ غیب جانتے تھے؟	۴۶
۱۳	اللہ تعالیٰ ہر امر کا فیصلہ ہر سال شب برأت میں کرتے ہیں یا شب قدر میں؟	۵۶
۱۴	کیا عورت کی تخلیق مرد کی پسلی سے ہوئی ہے؟	۶۲
۱۵	مجتہد کے لئے کیا شرائط ہیں؟	۶۳
۱۶	حضور ﷺ کا سایہ پڑتا تھا	۶۴
۱۷	اللہ تعالیٰ کا جسم ہے یا نہیں؟ اور آیات صفات کا کیا مطلب ہے؟	۶۵
۱۸	تقدیر کیا ہے؟	۶۷
۱۹	تقدیر میں گناہ کرنا لکھا ہے تو پھر عذاب کیوں؟	۶۷

۲۰	شانِ رسول ﷺ میں گستاخی کرنا کیسا ہے؟	۷۶
۲۱	کمیونسٹ پارٹی میں شامل شخص کا حکم	۷۷
۲۲	کیا توریت، انجیل و بائبل پڑھنے والا مرتد ہو گیا؟	۷۹
۲۳	کیا رسول اللہ ﷺ اپنی قبر میں زندہ ہیں اور سلام پڑھنے والے کے سلام کو سنتے ہیں؟	۸۱
۲۴	عقیدۂ رضاخانیت (عربی)	۸۴
۲۵	خاتم النبیین کے صحیح معنی	۸۶
۲۶	رسول اللہ ﷺ کا خاتم النبیین ہونا	۸۷
۲۷	خواجہ اجمیری کے مزار کے پھول اور عود کی خصوصیت	۸۷
۲۸	کافر کو کافر نہ کہنا کفر ہے کا مطلب	۸۸
۲۹	بہائی مذہب اختیار کرنے کے بعد تجدید ایمان و نکاح لازم ہے	۸۹
۳۰	مزار پر پھول چڑھانے کے کشف کا حکم	۹۰
۳۱	تحذیر الناس، حفظ الایمان و براہین قاطعہ کی عبارتوں پر اشکال	۹۱
۳۲	وہ ہندو جس کو کبھی دعوتِ اسلام نہیں دی گئی کیا وہ بھی مستحق جہنم ہے؟	۹۲
۳۳	کیا کافر جنت میں جائے گا؟	۹۳
۳۴	کیا صرف نیت کر لینے سے نیکی مل جائے گی؟	۹۳
۳۵	قرآن و حدیث کو کچھ نہیں مانیں گے کہنا	۹۵
۳۶	کسی بھی مخلوق کو دافع البلیات کہنا	۹۶
۳۷	خنزیر کا گوشت کھانے کی وجہ سے مسلمان رہا یا نہیں؟	۹۶
۳۸	بارہویں شریف کی مجلسوں کا حکم	۹۷
۳۹	ہنیا کا قول اٹھا لیا گیا کہنے سے مسلمان رہا یا نہیں؟	۹۸
۴۰	حضور ﷺ کا اللہ کے نور سے پیدا ہونے کا مطلب	۹۹
۴۱	حضرت تھانویؒ کا مقام	۱۰۰
۴۲	ایک علمی اشکال کا جواب	۱۰۰
۴۳	غیر مسلم کی شادی میں شرکت کا حکم	۱۰۶
۴۴	غیر مسلم کی میت میں جانا	۱۰۶
۴۵	سورج گرہن اور چاند گرہن کے وقت کھانا وغیرہ کیسا ہے؟	۱۰۷

	كتاب الطهارت (باب الأنجاس وتطهيرها)	۱۱۱
۱	مخصوص کاغذ سے استنجاء کا حکم	۱۱۱
۲	دہ دردہ کی تعریف	۱۱۲
۳	حوض وٹنکی کی تطہیر کا حکم شرعی	۱۱۳
۴	ناپاک اشیاء ڈالے ہوئے صابن کا حکم شرعی	۱۱۳
۵	پیشاب سے بنائے ہوئے نمک کا حکم	۱۱۴
۶	کیا پیشاب فلٹر کرنے کے بعد بھی ناپاک رہے گا؟	۱۱۵
۷	قرآن کریم کی کیسٹ بے وضو چھونا، ٹیپ کرنا نیز کتابت کرنا شرعاً کیسا ہے؟	۱۱۵
۸	نجاست میں گرے بسکٹ کا حکم	۱۱۶
۹	خنزیر کے چمڑے کا استعمال جائز ہے یا نہیں؟	۱۱۷
۱۰	کپڑے وغیرہ پر جب تک نجاست کا داغ اور دھبہ نظر نہ آئے اس کو ناپاک نہیں کہیں گے	۱۱۸
۱۱	ڈرائی کلین کیے ہوئے کپڑوں کا حکم	۱۱۹
۱۲	غیر ملکی پنیر کا حکم	۱۲۱
۱۳	ذبیحہ کے کشید مادہ سے بنایا ہوا پنیر	۱۲۳
۱۴	گھی پاک کرنے کا شرعی طریقہ	۱۲۵
۱۵	انسانی بالوں کی ٹوپی کا حکم	۱۲۸
۱۶	خنزیر کے بالوں سے بنے ہوئے برش کی شرعی حیثیت	۱۲۹
۱۷	جن مواقع میں ڈھیلا استعمال کرنا متعذر ہو وہاں کیا کرے؟	۱۳۲
۱۸	حضور ﷺ کا فضلہ پاک ہے؟	۱۳۳
۱۹	رنگا ہوا کپڑا پاک ہے یا ناپاک؟	۱۳۴
۲۰	جنبی کا قرآن کو چھونا اور دوسری جگہ لے جانا	۱۳۴
۲۱	استرہ کے ذریعہ ڈاڑھی بنوانے سے کیا چہرہ ناپاک ہو جاتا ہے؟	۱۳۵
۲۲	بڑے کمرے میں بیت الخلاء بنوانا	۱۳۵
۲۳	جس برتن میں کتے نے منہ ڈالدیا ہو اس کا استعمال	۱۳۶
۲۴	حالت حیض میں بیوی سے مجامعت	۱۳۶
۲۵	فرج میں مانع حمل بعض دواؤں کے استعمال کا حکم	۱۳۷
	باب الوضوء	۱۳۹
۱	ٹوتھ پیسٹ یا برش کا استعمال مسواک کے قائم مقام ہوسکتا ہے؟	۱۳۹

۲	مصنوعی اعضاء یا پلاسٹر اور زخم پر پٹی ہونے کی صورت میں وضو اور غسل کے احکام	۱۳۹
۳	وضو کی دعا	۱۴۰
۴	ہاتھ پاؤں سے معذور طہارت میں کس سے مدد لے؟	۱۴۲
۵	اذان کے وقت وضو کرتے ہوئے وضو کی دعا پڑھنے کا حکم	۱۴۲
۶	جنازہ کے لئے کئے گئے وضو سے نماز فرض کی ادائیگی	۱۴۳
۷	غسل کے وضو سے نماز فرض وواجب کی ادائیگی	۱۴۳
۸	نماز جنازہ کے بعد تازہ وضو ضروری ہے یا نہیں؟	۱۴۴
۹	وضو کا مسئلہ	۱۴۴
۱۰	نائیلون یا سوتی موزوں پر مسح درست ہے یا نہیں؟	۱۴۵
۱۱	انجکشن لگوانا ناقض وضو ہے یا نہیں؟	۱۴۶
۱۲	ریح خارج ہونے پر وضو کرنے کا حکم کیوں ہے؟	۱۴۶
۱۳	خروج ریاح کے مریض کے لئے وضو و نماز کا حکم	۱۴۷
۱۴	آنسو نکلنے سے وضو کا حکم	۱۴۸
۱۵	حافظ قرآن ریاح کا مریض ہو تو وہ کیا کرے؟	۱۴۹
۱۶	بغیر وضو قرآن پڑھنا	۱۵۰
	باب التیمم	۱۵۱
۱	جنبی کا تیمم کرکے تلاوت اور نماز پڑھنا	۱۵۱
۲	ٹھنڈک کی وجہ سے تیمم	۱۵۲
۳	گرم پانی بھی نقصان دہ ہو تو تیمم کرنا کیسا ہے؟	۱۵۲
	باب الغسل	۱۵۳
۱	نیرودھ استعمال کرنے کی صورت میں غسل واجب ہوگا یا نہیں؟	۱۵۳
۲	بحالت غسل جنابت چھینٹ ٹب میں پڑنے سے پانی ناپاک ہوگا یا نہیں؟	۱۵۳
۳	بغیر پانی وکلوخ استعمال کرنے سے غسل	۱۵۴
۴	حجامت کے بعد غسل ضروری نہیں ہے	۱۵۴
۵	غسل کی نیت پڑھ پر پھونکے ہوئے پانی سے غسل	۱۵۵
۶	غسل کی حاجت میں قرآن شریف کو ہاتھ میں لے کر مسجد میں جانا	۱۵۵

	كتاب الصلوة(باب مواقيت الصلوة)	۱۵۹
۱	برطانیہ وغیرہ میں موسم سرما میں رات مختصر ہوتی ہے وہاں نماز، روزہ وتراویح کا حکم	۱۵۹
۲	جہاں چھ ماہ دن، چھ ماہ رات مسلسل رہتی ہے وہاں کے لوگ روزہ اور نماز کس طرح ادا کریں؟	۱۶۱
۳	ظہر پڑھنے کے بعد ایسی جگہ پہنچنا جہاں اس کے بعد ظہر کا وقت ہوا تو کیا دوبارہ ظہر پڑھنی ہوگی؟	۱۶۱
۴	وہ مصلی یا چادر جس پر خانہ کعبہ یا مسجد نبوی کا نقش ہو، اس پر بیٹھنا اور نماز پڑھنا کیسا ہے؟	۱۶۲
۵	ہوائی جہازوں میں نماز کس نظام الاوقات کے مطابق ادا کی جائے؟	۱۶۴
۶	جن ملکوں میں بعض نمازوں کا وقت ہی نہیں ملتا وہاں ادائیگی کی کیا صورت ہوگی؟	۱۷۱
۷	جن مقامات میں عشاء کا وقت نہیں ملتا وہاں نماز پڑھنے کا طریقہ؟	۱۷۸
۸	وہ مقامات جہاں شفق ابیض اسی طرح شفق احمر غائب نہیں ہوتی وہاں نماز وروزہ کا حکم	۱۷۹
۹	انگلینڈ کے بعض مقامات میں اوقات نماز کے تعین کا طریقہ	۱۸۵
۱۰	برطانیہ کے قدیم اوقات صلوٰۃ پر عمل کرنا	۱۸۸
۱۱	برطانیہ میں صبح صادق کی تحقیق	۱۹۲
۱۲	تیز رفتار ہوائی جہازوں میں اوقات نماز وروزہ کا حکم	۱۹۶
۱۳	ہوائی جہاز، ٹرین اور پانی کے جہاز میں نماز ادا کرنے کا حکم	۱۹۷
۱۴	ہوائی جہاز میں نماز کے جواز کی تفصیلی بحث (سمندری جہاز میں نماز ادا ہونے کی تفصیل)	۱۹۹
۱۵	مغرب کے وقت کی ابتداء وانتہاء	۲۰۱
۱۶	چاند پر نماز اور استقبال قبلہ کا حکم	۲۰۲
۱۷	تعیین قبلہ کی صحیح شکل	۲۰۲
۱۸	سمت قبلہ کی بحث	۲۰۴
۱۹	مغرب کے رخ پر بنائی گئی قدیم مساجد کا حکم	۲۱۲
	باب الأذان والإقامة	۲۱۵
۱	ٹیپ ریکارڈ سے یا جوتے پہن کر اذان دینا	۲۱۵
۲	مرتکب کبائر کا اذان دینا	۲۱۵
۳	اذان کے بعد ہاتھ اٹھا کر دعا مانگنا	۲۱۵
۴	منفرد کی اذان واقامت	۲۱۶
۵	عورت پر اقامت نہ ہونے کی وجہ؟	۲۱۶
۶	بوقت اذان قضاء حاجت کا حکم	۲۱۷

۷	مؤذن کا اذان کہنے کے بعد خود جماعت میں شریک نہ ہونا	۲۱۷
۸	اقامت کون کہے؟	۲۱۸
۹	مائک سے اذان دینا	۲۲۰
۱۰	جدید آلات کا استعمال	۲۲۰
۱۱	اذان دینے کے لئے وضو ضروری نہیں ہے	۲۲۱
۱۲	اندرون مسجد اذان دینا	۲۲۱
۱۳	جمعہ کی اذان ثانی کا صحیح محل	۲۲۱
۱۴	زوال سے قبل جمعہ کی اذان اور سنت کی ادائیگی	۲۲۳
۱۵	مسجد کے مائک سے دنیاوی کاموں کا اعلان کرنا درست ہے یا نہیں؟	۲۲۳
۱۶	اذان سن کر مسجد نہ جانے والا کیا کافر ہے؟	۲۲۵
۱۷	بچہ کے کان میں اذان کا حکم	۲۲۵
	باب أركان الصلوٰة وواجباتها وسننها ومكروهاتها ومفسداتها	۲۲۷
۱	ہر رکعت میں دو سجدے فرض ہیں	۲۲۷
۲	پوری زندگی کی عافیت کی دعا مانگنا کیسا ہے؟	۲۲۸
۳	موضع قدمین سے سجدہ گاہ کی بلندی کس قدر درست ہے؟	۲۳۰
۴	نماز، زکوٰۃ اور روزہ چھوڑنے والوں کے لئے شریعت میں کون سی سزا ہے؟	۲۳۲
۵	نماز میں رفع یدین کا شرعی حکم	۲۳۴
۶	نماز میں رفع یدین کا حکم	۲۳۵
۷	سر اور جہر کی حد	۲۳۹
۸	بلند آواز سے آمین کہنا	۲۳۹
۹	نماز میں آمین آہستہ یا بلند آواز سے کہنا	۲۴۱
۱۰	قنوت نازلہ فجر کی نماز میں پڑھنے کا حکم	۲۴۲
۱۱	فجر کی نماز میں قنوت نازلہ پڑھنا	۲۴۳
۱۲	بارش یا تاریکی کی وجہ سے دو نمازوں کو ایک ساتھ پڑھنا	۲۴۴
۱۳	فسادات کے موقع پر قنوت نازلہ اور آیت کریمہ پڑھنا	۲۴۵
۱۴	مختلف قسم کے مصلوں کا شرعی حکم	۲۴۵
۱۵	فاتحہ اور سورت کے درمیان وقفہ کی حد	۲۵۰

۱۶	حنفی امام کے لئے دوسرے ائمہ کے مسائل کی اتباع کرنا	۲۵۰
۱۷	بچوں کا گھٹنا کھول کر نماز پڑھنا	۲۵۱
۱۸	نماز فجر میں مقتدی کا لحاظ کرتے ہوئے چھوٹی سورت پڑھنا	۲۵۲
۱۹	نماز میں ناف کے نیچے ہاتھ باندھنا	۲۵۲
۲۰	دوران نماز دنیاوی ضرورتوں کا خیال آجانا	۲۵۳
۲۱	نماز میں لاؤڈ اسپیکر کا استعمال	۲۵۴
۲۲	جلسۂ استراحت کا حکم	۲۵۶
۲۳	صلوٰۃ با جماعت کے بعد ہاتھ اٹھا کر اجتماعی دعا کا حکم	۲۵۷
۲۴	سورۂ یٰسین ختم کرنے کا معمول بنانا	۲۵۷
۲۵	بعد نماز فجر جہری دعا	۲۵۸
۲۶	بعد نماز اجتماعی طور پر یا ہاتھ اٹھا کر دعا کرنا	۲۵۹
۲۷	بعد نماز دعا آہستہ یا بلند آواز سے مانگی جائے؟	۲۶۲
۲۸	قبول دعا کا افضل طریقہ کیا ہے؟	۲۶۳
۲۹	سجدۂ توبہ کا کیا طریقہ ہے؟	۲۶۳
۳۰	نماز با جماعت کے بعد اجتماعی فاتحہ پڑھنے کا حکم	۲۶۴
۳۱	اسلام میں جو چیزیں ممنوع نہیں وہ جائز ہیں کیا یہ اصول صحیح ہے؟	۲۶۴
۳۲	عبادت میں جہاں آپ ﷺ نے سکوت فرمایا اس کو دین سمجھنا کیسا ہے؟	۲۶۴
۳۳	حنفی مقتدی کا فجر کی دوسری رکعت میں دعا پڑھنا	۲۶۵
۳۴	نماز کے بعد دعا کیا جزء نماز ہے؟	۲۶۶
۳۵	کن نمازوں میں گھوم کر دعا مانگی ہے اور کن نمازوں میں نہیں؟	۲۶۷
۳۶	چشمہ لگا کر نماز ادا کی جاسکتی ہے یا نہیں؟	۲۶۸
۳۷	نمازی کے آگے سے ہٹنے کا حکم	۲۶۸
۳۸	نمازی کے آگے سے گذرنے کی حد	۲۶۹
۳۹	پلنگ پر نماز ادا کرنا	۲۶۹
۴۰	دوسرے کی زمین پر بنائی گئی مسجد میں نماز	۲۶۹
۴۱	نماز فجر پڑھنے کے بعد وقت کے ختم ہوجانے کا علم ہو تو کیا کیا جائے؟	۲۷۱
۴۲	نماز فجر پڑھنے کے دوران سورج کا طلوع ہوجانا	۲۷۱
۴۳	نماز عصر کے بعد قضاء یا نفل نماز پڑھنا	۲۷۱

۴۴	فوت شدہ نماز کی ادائیگی سے قبل وقتیہ نماز پڑھنا	۲۷۱
۴۵	جماعت ہوجانے کے بعد آنے والے افراد کس طرح نماز پڑھیں؟	۲۷۱
۴۶	فجر کی جماعت کھڑی ہوجانے کے بعد سنت پڑھنا	۲۷۲
۴۷	دستیاب شدہ کپڑے میں نماز	۲۷۳
۴۸	چوری والے کپڑے میں نماز	۲۷۳
۴۹	عشاء کی فرض نماز تنہا پڑھنے والے کے لئے وتر با جماعت پڑھنا	۲۷۳
۵۰	نماز سے فارغ ہوکر مصافحہ کرنا کیسا ہے	۲۷۴
۵۱	نماز میں سورہ فاتحہ دوبار پڑھنے سے سجدہ سہو	۲۷۴
۵۲	حالت سفر میں قصر	۲۷۵
	باب الامامة	۲۷۷
۱	ریڈیو، ٹیپ ریکارڈ اور ٹیلی ویژن کے ذریعہ اقتداء اور ان سے سنی گئی آیت سجدہ سے سجدہ کے وجوب کا حکم شرعی	۲۷۷
۲	امام کس کو بنایا جائے؟	۲۷۸
۳	مسجد میں امامت کا حق کس کو ہے؟	۲۷۸
۴	امام شافعی ہو اور مقتدی حنفی ہو یا اس کے برعکس ہو تو نماز کس طرح پڑھیں؟	۲۷۹
۵	اگر شافعی و حنفی میں مسائل سے زیادہ واقف حنفی ہے تو اس کی امامت اولیٰ و افضل ہے	۲۸۲
۶	حنفی کا شافعی کی امامت کرنا	۲۸۳
۷	حنفی، شافعی کی امامت کرسکتا ہے یا نہیں؟	۲۸۴
۸	غیر متشرع حافظ کی اقتداء	۲۸۵
۹	جس کی بیوی پردہ نہ کرتی ہو اس کی امامت	۲۸۵
۱۰	امام کے ذمہ ایسا کام سپرد کرنا جس سے اس کی تحقیر ہو	۲۸۵
۱۱	نسبندی کرانے والے کی امامت	۲۸۶
۱۲	آیت سجدہ نہ کرنے والے امام کی اقتداء	۲۸۷
۱۳	رسول اللہ ﷺ کی توہین کرنے والے کی امامت	۲۸۷
۱۴	قرآن صاف نہ پڑھنے والے حافظ کے پیچھے تراویح وشبینہ	۲۸۸
۱۵	بغیر ڈاڑھی والے کی امامت	۲۸۸
۱۶	کیا غیر روزہ دار، روزے دار کی امامت کرسکتا ہے؟	۲۹۲
۱۷	شادی شدہ عورت کا نکاح پڑھانے والے کی امامت	۲۹۲

۱۸	امرد صبیح کی تراویح میں امامت کا حکم	۲۹۳
۱۹	ڈاڑھی کتروانے والے کی امامت	۲۹۴
۲۰	ڈاڑھی منڈانے کا حکم	۲۹۴
۲۱	ڈاڑھی کی شرعی حیثیت اور اس سے متعلق چند مسائل	۲۹۵
۲۲	ڈاڑھی کی شرعی حیثیت	۳۰۳
۲۳	ڈاڑھی منڈانے کو جائز سمجھنا	۳۰۴
۲۴	صفوں میں کجی ہو تو امام کا مصلّٰی کہاں ہو؟	۳۰۵
۲۵	امام کو مصلی پر امامت کے لئے کب کھڑا ہونا چاہئے	۳۰۵
۲۶	محراب کی تعیین اور در مسجد کا حکم	۳۰۸
۲۷	امام کا تنہا محراب میں کھڑا ہونا	۳۰۹
۲۸	امام کا محراب کے اندر کھڑا ہونا	۳۱۲
۲۹	مقتدی کا فرض یا واجب چھوٹ جانا	۳۱۲
۳۰	امام کا دوبارہ نماز پڑھنا اور مقتدی کو منع کرنا	۳۱۲
۳۱	مسبوق کے تکبیر تحریمہ کہہ کر بیٹھنے سے قبل امام نے سلام پھیر دیا	۳۱۳
	باب الوتر والتراویح والسنن	۳۱۷
۱	وتر میں شافعی امام کی اقتداء	۳۱۷
۲	وتر کی ایک رکعت نہ ہونے کی وجہ	۳۱۸
۳	بیس رکعت تراویح کا ثبوت	۳۱۸
۴	رکعات تراویح کا صحیح عدد ایک قدیم حدیثی مسئلہ کی تنقیح وتشریح	۳۲۲
۵	حضور ﷺ نے تراویح کی نماز کس طرح پڑھی؟	۳۲۲
۶	تراویح چار چار رکعت ایک سلام سے پڑھنا	۳۲۴
۷	بوجہ مجبوری آٹھ رکعت تراویح پڑھنا	۳۲۴
۸	تراویح کے ہر ترویحہ میں دعا اور حضور ﷺ اور خلفاء راشدین کا نام القاب کے ساتھ لینا کیسا ہے	۳۲۵
۹	تراویح میں ترویحہ کے بعد دعاء	۳۲۶
۱۰	بالتداعی تہجد کی جماعت کا حکم	۳۲۶
۱۱	نماز تہجد کی شرعی حیثیت	۳۲۷
۱۲	اذان مغرب اور اس کے فرض کے مابین سنت کا حکم	۳۲۸

۱۳ وتر کے بعد نفل پڑھنا ۳۳۲

۱۴ لیلۃ القدر کی نیت سے نماز پڑھنا ۳۳۳

باب الجمعة ۳۳۵

۱ غیر مسلم ممالک میں نماز جمعہ وعیدین کا حکم ۳۳۵

۲ جمعہ فی القریٰ کا حکم ۳۳۶

۳ خطبہ میں آیت قرآنی سے قبل تعوذ وتسمیہ پڑھنا ۳۳۷

۴ اعلان یا خطبہ سے قبل سلام ۳۳۷

۵ خطبۂ جمعہ اردو میں پڑھنے کا حکم ۳۳۸

۶ خطبۂ جمعہ کے بعد امام کا مصلّٰی پر بیٹھنا ۳۴۰

۷ جمعہ کی سنتوں کا حکم ۳۴۱

باب العیدین ۳۴۳

۱ نماز عیدین میں حنفی کا شافعی کی اقتداء کرنا ۳۴۳

۲ عورتوں کا نماز عیدین کی جماعت میں شریک ہونا ۳۴۴

۳ خطبہ عید کے بعد دعا ۳۴۴

۴ نماز عید کے بعد مصافحہ ومعانقہ ۳۴۵

۵ عید کے دن غیر شرعی کاموں کو انجام دینا ۳۴۶

باب الجنائز ۳۴۹

۱ موت پر ختم تہلیل ۳۴۹

۲ غائبانہ نماز جنازہ کا بیان ۳۴۹

۳ کیا میت کو غسل دینے والے پر غسل واجب ہے؟ ۳۵۲

۴ دوبارہ نماز جنازہ پڑھنا، نیز نماز جنازہ کب تک ادا کی جاسکتی ہے؟ ۳۵۲

۵ جنازہ پر آیات کریمہ یا اسمائے حسنیٰ والی چادر ڈالنا کیسا ہے؟ ۳۵۴

۶ قبر میں رکھنے کے بعد چہرہ دیکھنا ۳۵۵

۷ تدفین کے بعد ہاتھ اٹھا کر دعا کرنا ۳۵۶

۸ قبرستان میں ہاتھ اٹھا کر دعا کرنا ۳۵۶

۹	جمعہ کی شب میں وفات پانے والے شخص کو جمعہ کی نماز سے قبل دفن کرنا ضروری ہے؟	۳۵۷
۱۰	عذاب قبر کا تعلق جسم اور روح دونوں سے ہے یا ایک سے، نیز قبر سے کیا مراد ہے؟	۳۵۷
۱۱	کافر کی موت کی خبر سن کر کیا کہنا چاہیے؟	۳۵۸
۱۲	ایصال ثواب کا روپیہ مدرس کی تنخواہ میں دینا	۳۵۹
۱۳	غیر مسلموں کے ایصال ثواب کا حکم	۳۵۹
۱۴	ایصال ثواب کے لئے قرآن خوانی کا حکم شرعی	۳۶۰
۱۵	کیا فرقہ وارانہ فساد میں مرنے والا مسلمان شہید ہے؟	۳۶۲
۱۶	مسلمان اگر مسلمان کو مار ڈالے تو وہ شہید ہے یا نہیں؟	۳۶۲
	کتاب الزکوٰۃ	۳۶۷
۱	زکوٰۃ کس پر فرض ہے؟ اور زمین پر زکوٰۃ ہے یا نہیں؟	۳۶۷
۲	کسی خاص مقصد کے لئے رکھی گئی رقم پر سال گزرنے کے بعد زکوٰۃ کا حکم	۳۶۷
۳	فروخت شدہ پیداوار سے جو رقم آئی اس پر زکوٰۃ	۳۶۸
۴	زکوٰۃ و فطرہ کا مقصد	۳۶۹
۵	حکومت کی کسٹڈی میں رکی ہوئی رقم پر زکوٰۃ	۳۶۹
۶	زر ضمانت پر زکوٰۃ	۳۷۰
۷	قرض دی ہوئی رقم پر زکوٰۃ	۳۷۱
۸	مشین کی مالیت پر زکوٰۃ	۳۷۱
۹	بیوی کے مستعمل زیورات پر زکوٰۃ	۳۷۱
۱۰	زیورات کی زکوٰۃ میں سرکاری نرخ کا اعتبار ہوگا یا بازار کا؟	۳۷۲
۱۱	زیورات کی زکوٰۃ کی ادائیگی میں کس نرخ کا اعتبار ہوگا؟	۳۷۳
۱۲	قرض پر زکوٰۃ کا حکم	۳۷۴
۱۳	دوران سال حاصل ہونے والی رقم پر بھی زکوٰۃ واجب ہے؟	۳۷۴
۱۴	مشترک کاروبار میں زکوٰۃ	۳۷۵
۱۵	کپڑے کے تھان کے ذریعہ زکوٰۃ کی ادائیگی	۳۷۶
۱۶	سواری کے گھوڑے اور کھیتی کے بیل پر زکوٰۃ	۳۷۶
۱۷	کھانے کی غرض سے خریدے گئے غلہ پر زکوٰۃ	۳۷۶
۱۸	جانوروں کی زکوٰۃ	۳۷۶

۱۹	نوٹ پر زکوٰۃ	۳۷۸
۲۰	روپے پر زکوٰۃ	۳۷۹
۲۱	فیکٹری کے تیارشدہ اورخام مال پر زکوٰۃ	۳۷۹
۲۲	مشینری اوراوزار پر زکوٰۃ	۳۷۹
۲۳	سونے اور چاندی میں زکوٰۃ کا طریقہ	۳۷۹
۲۴	دوسرے کے قرض کی ادائیگی میں جو رقم دی اس کی زکوٰۃ کس پر ہے؟	۳۸۰
۲۵	جس رقم کے ملنے کی امید نہ ہو اس پر زکوٰۃ	۳۸۱
۲۶	پاورلوم پر زکوٰۃ	۳۸۲
۲۷	زکوٰۃ یا فطرہ کی رقم سال بھر رکھنا یا تجارت کے لئے دینا	۳۸۲
۲۸	کیا بینک میں جمع شدہ رقم کی زکوٰۃ اسی سے دینا ضروری ہے؟	۳۸۳
۲۹	بینک میں جمع شدہ رقم پر زکوٰۃ	۳۸۴
۳۰	مختلف کرنسیوں کے ذریعہ زکوٰۃ کی ادائیگی	۳۸۴
۳۱	شیئرز پر زکوٰۃ	۳۸۶
۳۲	زکوٰۃ میں نکالی ہوئی زائد رقم آئندہ سال کی زکوٰۃ میں وضع کرنا	۳۸۸
۳۳	کمپنیوں یا ملوں کے شیئرز پر زکوٰۃ واجب ہے یا نہیں؟	۳۸۸
۳۴	یونٹ ٹرسٹ میں لگے ہوئے روپے اور زکوٰۃ کا حکم	۳۹۰
۳۵	جس ملک میں حکومتی سطح پر جو قیمت مقرر ہو اسی اعتبار سے زکوٰۃ نکالی جائے	۳۹۱
۳۶	کمپنیوں کے حصص کی خرید وفروخت اور اس پر زکوٰۃ وغیرہ کا مسئلہ	۳۹۲
۳۷	جس رقم کے مالک کا پتہ نہ ہو اس کو کیا کیا جائے؟	۳۹۳
۳۸	بغیر مدکی صراحت کے دی گئی رقم کا مصرف	۳۹۳
۳۹	غیر منقسم میراث میں وجوب زکوٰۃ	۳۹۳
۴۰	زکوٰۃ اصل سرمایہ میں ہے یا منافع پر بھی؟	۳۹۵
۴۱	استعمال شدہ اشیاء کی مالیت اور حصص پر زکوٰۃ	۳۹۶
۴۲	ڈاکخانہ میں ماہانہ آمدنی اسکیم اور اس پر زکوٰۃ کا حکم	۳۹۸
۴۳	زکوٰۃ کی رقم تجارت میں لگانے کا حکم	۳۹۹
	باب المصارف	۴۰۱
۱	ہندوستان میں بیت المال کا شرعی حکم	۴۰۱

۲	علوم دینیہ پر زکوۃ صرف کرنا	۴۰۳
۳	اہل مدرسہ کو زکوۃ دینا	۴۰۳
۴	مدارس کے سفراء عامل، عاشر میں داخل ہیں یا نہیں؟	۴۰۳
۵	ابن سبیل کا مصداق طالب علم ہے یا نہیں؟	۴۰۴
۶	زکوۃ کی رقم سے مدرسہ کی تعمیر	۴۰۴
۷	کیا مدرسہ کے کارکنوں کے لئے زکوۃ لینے میں بھی فقر کی شرط ہے	۴۰۴
۸	سادات طلبہ کو زکوۃ دینا	۴۰۴
۹	زکوۃ کی رقم سے مدرسہ کے طلبہ کے لئے دینی کتب کی خریداری	۴۰۴
۱۰	سید بھائی کو زکوۃ دینا	۴۰۶
۱۱	مدرسہ میں زکوۃ کا مصرف	۴۰۷
۱۲	کیا ادائیگی زکوۃ کے لئے کوئی مہینہ مخصوص ہے؟	۴۰۸
۱۳	مصارف زکوۃ	۴۰۸
۱۴	فقراء و مساکین کسے کہتے ہیں؟	۴۰۸
۱۵	مصارف زکوۃ کے علاوہ دوسری مد میں زکوۃ صرف کرنا	۴۰۸
۱۶	زکوۃ کی رقم جمع کر کے رفتہ رفتہ خرچ کرنا	۴۰۸
۱۷	غیر مصرف پر زکوۃ صرف کرنا	۴۰۸
۱۸	مکتب میں جو مقربا فی وزکوۃ دینا	۴۱۰
۱۹	امام کے لئے صدقہ و زکوۃ لینا	۴۱۱
۲۰	ملازمین کو زکوۃ کی رقم سے تنخواہ دینا	۴۱۲
۲۱	مستحق زکوۃ کی رقم سے اپنے لئے کتابیں خریدنا	۴۱۳
۲۲	زکوۃ کی رقم کو دینی کتابوں اور معلمین کی تنخواہ پر خرچ کرنے کی صورت	۴۱۳
۲۳	مقروض کو زکوۃ کی رقم دے کر اس سے اپنا قرض وصول کرنا	۴۱۴
۲۴	صدقات واجبہ کی رقم سے غریب طلبہ کو کتابیں دینا	۴۱۵
۲۵	اپنی زکوۃ یا فطرہ کی رقم بہو کو دینا	۴۱۶
۲۶	قرض کا روپیہ زکوۃ یا سود سے منہا کرنا	۴۱۶
۲۷	جس ادارہ میں باپ نے زکوۃ کی رقم دی ہو اس میں بیٹے کا کھانا اور راشن لینا	۴۱۷
۲۸	گورنمنٹ سے ملحق مدارس میں زکوۃ دینے کا حکم	۴۱۷
۲۹	مدارس عربیہ میں آمدہ رقوم اوران پر زکوۃ کا شرعی حکم	۴۱۸

۳۰	زکوۃ کا مصرف	۴۲۳
۳۱	ادائیگی زکوۃ کے لئے تملیک شرط ہے	۴۲۴
۳۲	انجمن یا سوسائٹی پر زکوۃ کی رقم خرچ کرنا	۴۲۴
۳۳	زکوۃ کی رقم نسواں اسکول پر خرچ کرنا	۴۲۷
	باب العشر	۴۲۹
۱	ہندوستان کی زمین اس وقت عشری ہیں یا خراجی؟	۴۲۹
۲	زمین کی زکوۃ کا شرعی حکم	۴۳۰
۳	ہندوستان کی زمینیں عشری ہیں یا خراجی؟	۴۳۱
۴	کیا زمین کی تمام پیداوار میں عشر ہے؟	۴۳۱
۵	کن فصلوں میں عشر واجب ہے اور کتنا؟	۴۳۲
۶	مالگذاری دینے کی وجہ سے عشر ساقط نہیں ہوگا، غلہ کی رقم پر زکوۃ	۴۳۳
۷	ہندوستانی اراضی عشری ہیں یا نہیں؟	۴۳۴
	باب صدقة الفطر	۴۳۷
۱	اسکول کالج میں صدقہ دینا کیسا ہے	۴۳۷
۲	صدقۂ فطر کا وجوب اور اس کے مصارف	۴۳۸
۳	صاع کی صحیح مقدار	۴۳۸
۴	کیا جوار، مکا، باجرہ صدقۂ فطر میں دیا جا سکتا ہے اور اس کا وزن کیا ہوگا؟	۴۴۲
۵	صدقۂ فطر کا مصرف	۴۴۳
۶	صدقۂ فطر کسی تنظیم میں دینا اور حسب موقع خرچ کرنا	۴۴۴
۷	قیمت کے ذریعہ صدقۂ فطر ادا کرنے میں گیہوں کے کس نرخ کا اعتبار ہوگا؟	۴۴۴
	کتاب الصوم	۴۴۹
۱	مسئلۂ توحید اہلہ	۴۴۹
۲	رویت ہلال کمیٹی کے فیصلہ کی شرعی حیثیت اور اس کے حدود	۴۶۰

۳	رویت ہلال کی شہادت میں شاہد کا عادل ہونا	۴۷۲
۴	رویت ہلال کمیٹی کے فیصلہ کی خبر، جم غفیر مستفیض ہوگی یا نہیں؟	۴۷۲
۵	شرعی فیصلہ کے اعلان کے لئے کیا معتمد مسلمان کا ہونا ضروری ہے؟	۴۷۳
۶	پاکستان رویت ہلال کمیٹی کا فیصلہ ہندوستان کے لئے بھی معتبر ہوگا؟	۴۷۴
۷	رویت ہلال کمیٹی ممبئی کی رویت ہلال سے متعلق مفصل بحث	۴۷۵
۸	ڈاڑھی مونڈنے کی خبر یا شہادت	۴۷۵
۹	اختلاف مطالع کی جغرافیائی حقیقت	۴۷۵
۱۰	ایک علاقہ کی رویت دوسرے علاقہ کے لئے	۴۷۵
۱۱	کیا ہندوستان کے ایک علاقہ کی رویت پورے ملک کے لئے معتبر ہوگی	۴۷۵
۱۲	رویت ہلال سے متعلق	۴۸۳
۱۳	برطانیہ میں رویت ہلال سے متعلق چند اہم سوالات	۴۸۳
۱۴	پاکستان کا اعلان ہندوستان کے لئے معتبر ہے یا نہیں؟	۴۸۷
۱۵	کیا بذریعہ ٹیلی فون مطلقا رویت ہلال کی اطلاع معتبر ہوگی؟	۴۸۸
۱۶	ریڈیو، ٹیلی فون وغیرہ کے ذریعہ اطلاع ہلال کا شرعی حکم	۴۹۰
۱۷	دوربین یا ہوائی جہاز سے چاند دیکھنا	۵۰۳
۱۸	ریڈیو، ٹیلی ویژن، تار، فون اور خط کے ذریعہ رویت کی خبر	۵۰۴
۱۹	رویت ہلال کے لئے کمیٹی کی تشکیل	۵۰۴
۲۰	محض سائنسی یا حسابی تخمینہ کی بنیاد پر رویت ہلال کا حکم لگانا درست ہے؟	۵۰۷
۲۱	بحالت صوم آنکھوں، کانوں اور فرج میں دوا پہنچانا مفسد صوم ہے یا نہیں؟	۵۱۲
۲۲	ریڈیو کی خبر پر روزہ توڑوانا	۵۱۲
۲۳	ریڈیو کی خبر معتبر ہے یا نہیں؟	۵۱۳
۲۴	دوسری جگہ کی شہادت پر افطار کرنا	۵۱۴
۲۵	مغربی ممالک میں رمضان اور اوقات نماز کا مسئلہ	۵۱۴
۲۶	برطانیہ جہاں آسمان غبار آلود رہتا ہو وہاں رمضان اور عید کا تعین	۵۱۷
۲۷	وہ مقامات جہاں افق ہمیشہ غبار آلود رہتا ہے وہاں رمضان کی ابتداء وانتہا	۵۳۹
۲۸	لندن وغیرہ جہاں کا افق ہمیشہ صاف رہتا ہے، وہاں ثبوت رمضان کا شرعی حکم	۵۴۰
۲۹	بحرین میں سعودی عرب کے اعلان پر روزہ وعید	۵۴۳
۳۰	مونٹریال میں رمضان وعید کی ثبوت رویت کا طریقہ	۵۴۴

۳۱	چاند کی خبر قبول کرنے کی حد	۵۴۶
۳۲	کان اور ناک میں دوا ڈالنے سے روزہ ٹوٹتا ہے یا نہیں؟	۵۴۷
۳۳	روزہ کا قصر حالت سفر میں	۵۴۷
۳۴	بحالت روزہ انجکشن لگوانا	۵۴۸
۳۵	روزہ میں انجکشن اور سلائین لگوانا	۵۴۸
۳۶	بحالت روزہ انجکشن لینا اور خون وگلوکوز چڑھانا	۵۴۹
۳۷	بحالت روزہ جانوروں سے وطی کی صورت میں قضا لازم ہے، نیز ایسے جانوروں کے دودھ اور گوشت کا حکم	۵۵۰
۳۸	ڈنمارک اور نائجیریا وغیرہ میں روزہ وافطار کا حکم (عربی)	۵۵۰
۳۹	روزہ میں چیچک کے ٹیکے لگوانا	۵۵۳
۴۰	بحالت روزہ ۱۲/بجے تک جنبی رہنا	۵۵۳
۴۱	بحالت روزہ منجن کا استعمال	۵۵۵
۴۲	نفل روزہ کب افطار کیا جائے؟	۵۵۵
۴۳	لمبے دنوں میں روزہ وعید کا حکم	۵۵۶

☆☆☆

بسم اللہ الرحمن الرحیم

پیش لفظ

اللہ تعالیٰ نے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر یعنی بھلائی کی طرف بلانے اور برائی سے روکنے کو اس امت کا مقصد وجود قرار دیا ہے: ﴿كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ﴾ (آل عمران: ۱۱۰) اس حکم کی مخاطب پوری امت ہے؛ لیکن امت کے مختلف طبقات اپنی اپنی صلاحیت اور قدرت کے لحاظ سے اس کام کے مکلف ہیں، دین کی طرف عمومی دعوت ہر مسلمان کا فریضہ ہے، طاقت کے ذریعہ معروف کو نافذ کرنا اور منکر سے روکنا اسلامی حکومت کی ذمہ داری ہے، اور کچھ ذمہ داریاں وہ ہیں جو علماءِ شریعت سے متعلق ہیں، اگر اسلامی حکومت ہو تو بعض اوقات اس کو حکومت کی مدد سے بھی انجام دیا جاتا ہے، اگر اسلامی حکومت نہ ہو تو انہیں اپنے طور پر انجام دینا واجب ہے، —— قضا اور افتاء 'امر بالمعروف' کی ایسی ہی صورتیں ہیں، قاضی کا تقرر حکومت کی طرف سے ہوتا ہے اور جہاں حکومت نہ ہو اور امارت شرعی کا نظام بھی نہ ہو، وہاں عام مسلمانوں کے انتخاب سے قاضی مقرر ہوتا ہے: " **ویصیر القاضي قاضیا بتراضي المسلمین** " (الفتاوی الہندیہ ۱/۴۶۱، ردالمحتار، باب الجمعہ) افتاء کے لئے اسلامی حکومت کی طرف سے نہ تقرری ضروری ہے اور نہ مسلمانوں کی طرف سے انتخاب؛ بلکہ کسی بھی صاحب علم سے جب حکم شرعی دریافت کیا جائے اور وہ اس مسئلہ کے حکم سے واقف ہو تو ضروری ہے کہ وہ دریافت کرنے والے کی رہنمائی کرے، جیسے نہ جاننے والوں کا فریضہ ہے کہ وہ جاننے والوں سے پوچھیں: ﴿فَاسْأَلُوْا أَهْلَ الذِّكْرِ إِنْ كُنْتُمْ لاَ تَعْلَمُوْنَ﴾ (النحل: ۴۳، الانبیاء: ۷) اسی طرح جاننے والے کا فریضہ ہے کہ وہ سوال کا جواب دے؛ ورنہ رسول اللہ کے ارشاد کے مطابق اسے آگ کی لگام پہنائی جائے گی:

" **من كتم علما مما ينفع الله به في أمر الناس أو أمر الدين ألجمه الله يوم القيامة بلجام من النار** " (سنن ابن ماجہ، باب من سئل عن علم فکتمہ، حدیث نمبر: ۲۶۱)۔

غرض کہ افتاء اور قضاء امر بالمعروف کی ایسی صورتیں ہیں، جو علماء ہی کے ذریعہ انجام پاسکتی ہیں، افتاء اخبارِ حکم

شرعی' کا نام ہے، یعنی مفتی حکم شرعی کے بارے میں آگاہ کرتا ہے، قضا، الزامِ حکم سے عبارت ہے، یعنی قاضی اس کے سامنے پیش ہونے والے واقعہ کی تحقیق کر کے فریقین پر حکم کو لازم کرتا ہے، افتاء کا دائرہ وسیع ہے، اعتقادات اور عبادات کے بشمول دین کے تمام شعبوں کے بارے میں مفتی رہنمائی کرتا ہے، قضا کا دائرہ اس لحاظ سے محدود ہے، قاضی صرف معاملات اور دو افراد کے درمیان پیش آنے والے مخاصمات کو حل کرتا ہے، مفتی کی ذمہ داری تحقیق مسئلہ ہے یعنی کسی بات کے بارے میں حکم شرعی بیان کرنا اور قاضی کا کام ہے تحقیقِ واقعہ؛ اسی لئے مفتی کے لئے ضروری ہے کہ وہ احکام شریعت کا علم رکھتا ہو اور قاضی کے لئے اس بات کی گنجائش رکھی گئی ہے کہ اگر وہ خود احکام شریعت سے پوری طرح واقف نہ ہو تو مفتی کی مدد سے فیصلہ کرے۔

اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ مفتی کی ذمہ داری کتنی اہم اور کتنی نازک ہے؛ اسی لئے علماء نے لکھا ہے کہ مفتی احکام شریعت کو بیان کرنے میں اللہ کا نائب ہوتا ہے اور وہ جو فتوی دیتا ہے، اللہ کی طرف اس کی نسبت کرتا ہے؛ اسی لئے سلف صالحین فتوی دینے میں بے حد احتیاط سے کام لیتے تھے؛ چنانچہ امام نوویؒ فرماتے ہیں: " **المفتي موقع عن الله تعالیٰ** " (شرح المہذب:۱/۴۰) اور علامہ ابن قیم لکھتے ہیں کہ مفتی کو اس بات کو ملحوظ رکھنا چاہئے کہ وہ فتوی دینے میں کس کی نیابت کر رہا ہے: "**وليعلم المفتي عمن ينوب في فتواه** " (إعلام الموقعین:۱/۱۱) خود ائمہ مجتہدین کی احتیاط کا حال یہ تھا کہ امام ابوحنیفہؒ فرماتے تھے کہ اگر علم کے ضائع ہوجانے کا خطرہ نہ ہوتا تو فتوی نہیں دیتا، امام مالکؒ کا حال یہ تھا کہ مسجد نبوی میں ان سے ۴۸/ مسائل پوچھے گئے اور ۳۲/ سوالات پر انہوں نے فرمایا: مجھے نہیں معلوم، امام احمدؒ بھی بہت سے مسائل میں اپنی لا علمی کا اظہار فرماتے تھے (شرح المہذب:۱/۴۱)۔

اللہ تعالی نے محمد رسول اللہ ﷺ کے ذریعہ جو شریعت بھیجی ہے، وہ قیامت تک کے لئے ہے؛ اس لئے ضروری ہے کہ ہر دور میں جو نئے مسائل پیدا ہوں، فقہاء اور ارباب افتاء ان کا حل پیش کریں، یہ رسول اللہ ﷺ پر سلسلۂ نبوت کے ختم ہوجانے کے لوازم میں سے ہے، زمانہ کے آگے بڑھنے کے ساتھ ساتھ بہت سی تبدیلیاں رونما ہوتی رہتی ہیں، سماجی اور اخلاقی قدروں میں انحطاط، نئے معاشی نظام کی تشکیل، سیاسی حالات میں اتار چڑھاؤ، جدید آلات و وسائل کی پیدائش اور صنعتی ترقی، یہ وہ اسباب ہیں، جن کی وجہ سے ہر دور میں نئے مسائل پیدا ہوتے رہتے ہیں قرآن وحدیث میں اس کا صریح اور واضح حکم نہیں مل سکتا؛ کیوں کہ اگر اللہ تعالی نے آج سے چودہ سو سال پہلے ہوائی جہاز اور انٹرنیٹ کے مسائل کا ذکر فرمایا ہوتا تو وہ لوگوں کی سمجھ سے باہر ہوتا اور یہ بات " **كلموا الناس على قدر عقولهم** " کے مغائر ہوتی؛ اسی لئے فقہاء نے لکھا ہے کہ نصوص تو چند ہیں اور پیش آنے والے مسائل بے شمار: " **النصوص معدودة والحوادث ممدودة** " (المحصول لابن العربی:۱/۱۲۵، المحیط البرہانی:۸/۲۰۱، ط: دار إحیاء التراث العربی)؛ البتہ قرآن وحدیث میں اصول ومبادی واضح کردئے گئے ہیں

اور شریعت کے مقاصد و مصالح کو بیان کر دیا گیا ہے، ان بنیادی تعلیمات اور اصولی ہدایات سے روشنی حاصل کرتے ہوئے قیامت تک پیدا ہونے والے مسائل کو حل کیا جاسکتا ہے، اس کے لئے ضروری ہے کہ ایک طرف شریعت کے مآخذ یعنی کتاب وسنت میں بصیرت حاصل ہو، دوسری طرف سلف صالحین کے اجتہادات اور آراء وافکار سے بھی آگاہ ہو؛ تاکہ وہ مسائل شرعیہ میں غور وفکر کے منہج کو سمجھ سکے، تیسرے: وہ اپنے عہد کے تقاضوں، ضرورتوں، مصلحتوں اور لوگوں کے عرف وعادت سے اچھی طرح باخبر ہو؛ اسی لئے فقہاء نے لکھا ہے: " من لم يعرف أهل زمانه فهو جاهل "نیز علم کی ان جہتوں سے آراستہ ہونے کے ساتھ ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ اس کا سینہ خشیت الٰہی سے معمور ہو اور جب وہ افتاء کی ذمہ داری انجام دیتا ہو تو محسوس کرتا ہو:

گفتہ او گفتہ اللہ بود

گرچہ از حلقوم عبداللہ بود

ایسے ارباب افتاء ہر دور میں پیدا ہوتے رہے ہیں؛ لیکن ایسے لوگوں کی تعداد بعد کے ادوار میں بہت زیادہ نہیں رہی ہے، ایسی ہی مغتنم شخصیات میں ایک استاذ گرامی حضرت مولانا مفتی نظام الدین اعظمی صاحبؒ (سابق صدر مفتی دارالعلوم دیوبند) تھے، مفتی صاحب نے لاکھ سے زیادہ ہی فتاوی لکھے ہوں گے؛ لیکن جو چیز ان کو معاصر علماء سے ممتاز کرتی ہے، وہ ہے جدید مسائل پر توجہ اور حکم لگانے میں اعتدال، اس حقیر کے تتبع کے مطابق حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ اور حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ دہلویؒ کے بعد فتاویٰ میں احوال کی رعایت اور شریعت کی حدود اربعہ میں رہتے ہوئے امت کے مسائل میں تیسیر وسہولت کا پہلو سب سے زیادہ آپ کے یہاں پایا جاتا ہے؛ بلکہ تقاضۂ احوال کے تحت پہلے دونوں بزرگوں سے بھی بڑھ کر، اسی طرح جدید مسائل پر توجہ حضرت تھانویؒ اور حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ کے بعد آپ کے یہاں ملتی ہے؛ بلکہ آپ کے یہاں ان حضرات سے زیادہ نوازل سے متعلق فتاوی ہیں؛ کیوں کہ موجودہ دور میں نئے مسائل کے پیدا ہونے کی رفتار بہت تیز ہے، باخبر حضرات اس بات سے واقف ہیں کہ استاذ گرامی حضرت مولانا مفتی محمود حسن گنگوہیؒ کے پاس بھی جب نئے مسائل سے متعلق سوالات آتے تو اکثر وبیشتر آپ کے پاس بھیج دیتے تھے، اس طرح کہا جاسکتا ہے کہ آپ کے فتاوی میں جدید مسائل کا ذخیرہ غالباً علماء ہند کی تمام کتب فتاوی سے بڑھ کر ہے، خود (منتخبات نظام الفتاوی) سے قارئین اس کا اندازہ کر سکتے ہیں۔

مفتی صاحب کے اعتدال کا اندازہ ان فتاوی سے کیا جاسکتا ہے، جو مسلمانوں کے مختلف فرقوں سے متعلق ہیں، جیسے شیعوں کے متعلق ایک سوال کے جواب میں فرماتے ہیں:

”سنیوں پر خود ضروری ہے کہ وہ اہل سنت والجماعت کی اذان کا انتظام کر کے ان کو اس کا موقع ہی نہ دیں؛ البتہ کافر کہنے میں چوں کہ انتہائی احتیاط کا حکم ہے؛ اس لئے جب تک دلیل شرع سے ثابت نہ ہو جائے کہ اس شیعہ کا عقیدہ یہ بھی ہے کہ نعوذ باللہ حضرت جبرئیل سے غلطی ہوئی کہ وحی لے کر حضور کے پاس چلے گئے اور اسی قسم کا اور کوئی کفریہ عقیدہ ثابت نہ ہو جائے، کافر نہ کہا جائے گا، مثلا اگر قرآن پاک میں کسی تحریف کا عقیدہ ان کا ثابت ہو جائے، جیسے یہ عقیدہ ہو کہ قرآن چالیس پارے تھا، دس پارہ سنیوں نے چھپا دیا وغیرہ، تو یہ بھی کفریہ عقیدہ ہے، ایسے عقیدہ والوں کے بھی کفر میں شبہ نہ ہوگا“

اسی طرح کمیونسٹ پارٹی سے تعلق رکھنے والے مسلمانوں کے بارے میں رقمطراز ہیں:

”جو لوگ مذہبی اعتبار سے بھی کمیونسٹ ہو چکے ہیں، دین اسلام سے منحرف ہو چکے ہیں، ان کا یہ حکم ہے، اور جو لوگ مذہبا کمیونسٹ نہیں ہوئے؛ بلکہ خدا اور رسول کے قائل ہیں، نماز، روزہ کو حق سمجھتے ہیں اور کرتے ہیں، محض سیاسی پارٹی کے طور پر ہندوستان کی کمیونسٹ پارٹی سے سیاسی اتفاق رکھتے ہیں، ان کا یہ حکم نہیں ہے، نہ وہ اسلام سے خارج ہیں اور نہ ان کی بیوی نکاح سے خارج ہے“

غیر مقلد حضرات کے بارے میں ایک سوال کے جواب میں لکھتے ہیں:

”عام غیر مقلدین جو ظاہر احادیث پر عمل کرتے ہیں، ان کا حکم اصحاب ظواہر جیسا ہے، ان کو گمراہ نہیں کہا جائے گا؛ البتہ اگر ان میں سے کوئی شخص تعصب برتا ہے، تقلید کو شرک جانتا ہے یا ائمہ اربعہ کی تنقیص کرتا ہے تو وہ یقیناً گمراہ ہے“

بریلوی حضرات اور منکرین حدیث سے متعلق ایک سوال کے جواب میں فرماتے ہیں:

”احادیث کا منکر فرقہ گمراہ ہے، اہل بدعت اور تمام گمراہ فرقے جیسے معتزلہ، خوارج، روافض، نیچری یہ سب فرقے اسی قسم کے ہیں، یہ لوگ فاسق اور اہل معاصی کہلاتے ہیں اور جب دلیل شرعی سے اس میں سے کسی کا کفر متیقن ہو جاوے تو اس کو کافر بھی کہہ سکتے ہیں؛ لیکن عام طور پر سب کو کافر نہیں کہہ سکتے اور

نہ ایسا کہنا جائز ہے، احتیاط کے بھی خلاف ہے''۔

مفتی صاحب کی یہ آراء فرقوں اور جماعتوں سے متعلق ہیں ؛ لیکن یہی رنگ معاملات سے متعلق فتاوی میں بھی موجود ہے، چوں کہ خود اِس کتاب میں بہت سے فتاوی میں قارئین اس کو دیکھ سکیں گے؛ اس لئے ان کو خاص طور پر ذکر کرنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔

نئے مسائل کے بارے میں کوئی رائے قائم کرتے ہوئے صرف کتب فقہ کی عبارتیں سامنے ہوں تو امت کی مشکلات کو حل کرنا دشوار ہوگا، یہ ضروری ہے کہ شریعت کے بنیادی اصول اور اس کے مقاصد و مصالح مفتی کے سامنے رہیں، مفتی صاحب کے یہاں اس کا بڑا اہتمام تھا، دارالاسلام اور دارالکفر سے متعلق آپ کی گفتگو، پراویڈنٹ فنڈ کے متعلق آپ کی رائے، سود کے مصارف، قبرستان میں مسجد کی توسیع، سودی قرض لینے کی جائز اور نا جائز صورتیں، لائف انشورنس سے حاصل ہونے والی رقم سے غیر شرعی ٹیکس کی ادائیگی، اعانت علی المعصیت کی بعض صورتیں، بعض مغربی ملکوں میں نماز کے اوقات، بیرونی ممالک سے امپورٹ کیے جانے والے گوشت، مشینی ذبیحہ اور کتنے ہی مسائل ہیں، جن میں مفتی صاحب کا یہ مزاج واضح طور پر کارفرما ہے۔

مفتی صاحبؒ''اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا'' کے سرپرستوں میں تھے، اگرچہ اپنی پیرانہ سالی اور ضعف و بیماری کی وجہ سے کبھی سیمینار میں شریک نہ ہو سکے؛ لیکن آپ کی زندگی میں جتنے سیمینار ہوئے، تقریباً ہر سیمینار کے لئے آپ مفصل یا مختصر جواب ضرور لکھا یا کرتے تھے اور آپ کے مختصر جوابات بھی شرکاء سیمینار کے لئے مشعل راہ کا کام دیتے تھے، نیز اکثر اوقات بانی اکیڈمی حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ آپ کا جواب خود پڑھ کر سناتے تھے، اس کی تشریح فرماتے تھے اور اس میں جو تعمق ہے اس کی طرف اشارہ بھی کرتے جاتے تھے، قاضی صاحب آپ کے شاگردوں میں تھے اور استاذ و شاگرد دونوں ایک دوسرے سے بے حد محبت رکھتے تھے، اس حقیر کے لئے بھی سرمایہ سعادت ہے کہ اسے حضرت مفتی صاحبؒ سے تلمذ کا شرف حاصل ہے، طالب علمی کے زمانہ میں زیادہ تعلق نہیں رہا؛ لیکن بعد میں جب بھی دیوبند جاتا، ضرور ملاقات کے لئے حاضر ہوتا، مفتی صاحب بے حد خورد نوازی کا معاملہ فرماتے، دعائیہ کلمات کہتے اور حالیہ عرصہ میں جو مفصل فتوی یا نئے مسائل سے متعلق کوئی فتوی ان کے قلم سے جاری ہوتا، طلبہ سے منگا منگا کر ان سے استفادہ کا موقع دیتے، آخری ملاقات وفات سے دو تین ماہ پہلے ہوئی، جس میں ضیافت کا بھی خصوصی اہتمام فرمایا اور خواتین کی نماز سے متعلق ایک تفصیلی فتوی منگوا کر دکھایا اور میری خواہش پر اسے نقل کرا کر عنایت فرمایا، یہ فتوی بھی تفقہ و اعتدال کا شاہکار ہے، میں نے اسے حیدرآباد کے بعض رسائل میں بھی شائع کرایا۔

حضرت مفتی صاحبؒ ہندوستان کے مردم خیز خطہ مئو کے قریبی قصبہ 'اوندرا' میں ذوقعدہ ۱۳۲۸ھ مطابق نومبر ۱۹۱۰ء میں پیدا ہوئے، آپ کے خاندان کے لوگ عام طور پر انگریزی تعلیم یافتہ تھے؛ لیکن آپ نے اپنی خواہش سے دینی تعلیم حاصل کی، یہاں مولانا نعمت اللہ اور مولانا شکر اللہ صاحبان کے علاوہ حضرت مولانا شاہ وصی اللہ الٰہ آبادیؒ سے کسب فیض فرمایا، پھر متوسطات کی تعلیم مدرسہ عزیزیہ بہار شریف اور مدرسہ عالیہ فتح پوری دہلی میں حاصل کی اور ۱۳۵۲ھ میں دارالعلوم دیوبند سے فارغ ہوئے، پھر مختلف مدارس کے علاوہ تقریباً ۲۵ سال دارالعلوم مئو میں تدریس و افتاء کے فرائض انجام دیے، ۱۳۸۵ھ میں دارالعلوم دیوبند کی طلب پر دیوبند تشریف لائے اور تادم آخریں دارالعلوم میں درس حدیث، تربیت افتاء اور فتاوی نویسی کے فرائض انجام دیتے رہے، یہاں تک کہ ۲۱؍ذوقعدہ ۱۴۲۰ھ کو آپ کی وفات ہوئی، مئو کے زمانہ تدریس ہی میں حضرت شاہ وصی اللہ صاحبؒ سے آپ کو راہِ سلوک میں خلافت بھی حاصل ہوئی۔

فتاوی میں چوں کہ سوال کے لحاظ سے بکثرت تکرار بھی ہوا کرتی ہے؛ اس لئے آپ کی خواہش تھی کہ آپ کے منتخب فتاوی شائع کیے جائیں؛ چنانچہ مفتی صاحب نے منتخب فتاوی کا یہ مجموعہ حضرت مولانا قاضی مجاہدالاسلام قاسمیؒ کی خواہش پر ان کے سپرد فرمایا، اس کی پہلی دو جلدیں ان کی زندگی میں اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا اور قاضی پبلیشرز دہلی سے شائع ہوئیں، اگر قدیم طریقہ پر کتابت کرائی جاتی تو مزید دو جلدیں ہو جاتیں؛ لیکن اب اس کا نیا ایڈیشن عمدہ کمپوزنگ کے ذریعہ منظر عام پر آرہا ہے، اس طرح چار جلدوں کا مسودہ تین جلدوں میں مکمل ہو گیا۔

تاہم 'منتخبات نظام الفتاوی' کے اس نئے ایڈیشن کو زیادہ مفید، استفادہ میں آسان اور ترتیب میں بہتر بنانے کی کوشش کی گئی ہے، اولاً تو مسودہ کی ہر جلد میں طہارت سے فرائض تک کے احکام شامل تھے، اب ایک باب کے تمام مسائل ایک جگہ کر دیئے گئے ہیں، نیز تیسری اور چوتھی جلد میں فتاوی پر عنوانات نہیں تھے، یہ لگا دیئے گئے ہیں، یہ دونوں کام بڑی محنت اور خوش اسلوبی کے ساتھ محبّ عزیز مفتی سعیدالرحمٰن قاسمی (دارالافتاء امارت شرعیہ، پھلواری شریف، پٹنہ) نے انجام دیئے ہیں، دوسرا کام حوالہ جات سے مراجعت، جہاں حوالہ جات مذکور نہیں تھے، وہ تلاش کر کے ان کو ذکر کرنے کا تھا، اس کام کو مسودہ کے تیسری اور چوتھی جلد میں محترمان مولانا ڈاکٹر ظفر الاسلام صدیقی (شیخ الحدیث دارالعلوم مئو) اور مولانا خورشید احمد اعظمی (مئو) نے بڑی محنت سے انجام دیا ہے، پہلی جلد میں حوالہ جات کی مراجعت اور کہیں کہیں حسب ضرورت حواشی کا اضافہ مولانا محمد سراج الدین قاسمی (رفیق شعبۂ علمی اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا) نے اور دوسری جلد میں تصحیح و مراجعت کا کام عزیزی مولانا احمد نادر القاسمی (رفیق شعبۂ علمی) کے ہاتھوں پورا ہوا ہے، اس طرح مختلف مخلصین اور اکیڈمی کے محبین کی محنت نے اس نئے ایڈیشن کو زیادہ سہل الاستفادہ بنا دیا ہے، دعاء ہے کہ اللہ تعالیٰ ان سبھی حضرات کو ان خدمات کا بہتر

سے بہتر اجر عطا فرمائے۔

اکیڈمی کے لئے نہایت مسرت کا مقام ہے کہ آج اکیڈمی کے اولین سرپرستوں میں سے ایک یعنی صاحب فتاوی کی ایک خواہش کی تکمیل ہو رہی ہے اور بانی اکیڈمی کا منشأ بھی پورا ہو رہا ہے، امید ہے کہ اس منتخب مجموعہ کی طباعت ان دونوں بزرگوں کی روح کے لئے سکون و قرار کا باعث بنے گی اور تمام مسلمان خاص کر علماء و ارباب افتاء تک ایک عظیم علمی و فقہی امانت پہنچے گی، دعا ہے کہ اللہ تعالی اکیڈمی کی اس سعی کو قبول فرمائے اور حضرت الاستاذؒ کے لئے اس کو صدقہ جاریہ بنا دے۔

۱۶/ ربیع الآخر ۱۴۳۴ھ	خالد سیف اللہ رحمانی
۲۸ فروری ۲۰۱۳ء	(جنرل سکریٹری اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حرف چند

حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ☆

اسلام ایک مکمل نظام حیات اور ضابطۂ زندگی ہے، زندگی کے ہر ہر گوشہ پر محیط اور روزمرہ پیش آنے والے واقعات وحوادث اور مسائل سے متعلق رہنمائی فراہم کرنا ہی نظام اسلامی کا طرہ امتیاز ہے، یہی وجہ ہے کہ تاریخ کے مختلف ادوار، مختلف فکری رویوں، فلسفیانہ رجحانات اور حیرت انگیز اور ذہن انسانی کو دنگ کردینے والی تبدیلیاں بھی مسلم معاشرہ کو اس کی اسلامی راہ سے نہ مٹا سکیں، اور صدہا نئے تجربات کے مقابلہ میں مسلم معاشرہ اپنے اسلام اور اس کی پیش کردہ شریعت پر قائم رہا، لیکن کیا اسلامی شریعت میں ساری تفصیلات موجود تھیں؟ نہیں، ایسا ہو بھی نہیں سکتا تھا، نصوص قرآن واحادیث محدود ہیں جبکہ زمانہ کی تبدیلیاں، انسانی معاشرہ کے سوابق اور لواحق اور مسائل وحوادث لامحدود ہیں، اور اس تیز رفتار دنیا میں ہر آن ایسے نئے مسائل پیش آتے ہیں جن کا تصور بھی ماضی میں نہیں کیا جاسکتا تھا۔

ایسی صورت میں نصوص واردہ میں آئے ہوئے اشارات اور اس کی حکمتوں کو ہی بنیاد بنا کر فیصلہ کیا جاسکتا ہے، اس کام کے لئے کس قدر دقت نظر اور فقیہانہ بصیرت کی ضرورت ہے، اس کا اندازہ مشکل نہیں ہے، فقہاء نے اپنی پوری پوری زندگی اسی کام کی نذر کردی ہے، تب جا کر انہوں نے امت کی رہنمائی کی ہے، آج کے دور میں بھی ایسی کوششیں جاری ہیں اور خدا کے فضل وکرم سے مفتیان دین نے اس میدان میں گرانقدر کام کیا ہے اور فقہ وفتاوی کے دفاتر ظہور پذیر ہوئے ہیں، لیکن موجودہ زمانہ اور صورتحال میں جن مسائل سے ہم دوچار ہیں ان میں فتاوی کا وہ مجموعہ جو اپنی مختلف النوع خصوصیات اور امتیازات کی وجہ سے نمایاں ہے، اس کا انتخاب ہم نے کیا ہے۔

اسی سلسلہ میں ''منتخبات نظام الفتاوی'' کی تین جلد کی اشاعت کا ہم نے فیصلہ کیا ہے اور اس وقت جلد اول پیش

☆ بانی وسابق سکریٹری جنرل، اسلامک فقہ اکیڈمی (انڈیا)۔

کرتے ہوئے اکیڈمی کو بڑی مسرت ہورہی ہے۔

ویسے تو اس کتاب کی قدر و قیمت کا اندازہ اہل علم لگائیں گے، البتہ اتنا عرض کر دینا مناسب سمجھتا ہوں کہ مصنف کی علمی زندگی کا نچوڑ اور کشید ہے جو مسائل شرعیہ کے عقدہ کشا کی حیثیت سے ہمارے سامنے آئی ہے، اس میں قرآن شریف اور احادیث شریفہ، اجماع سلف، صحابہ و تابعین اور مجتہدین امت کے اقوال اور ان کے فیصلوں کی روشنی میں نئے مسائل کا حل پیش کیا گیا ہے اور زندگی کے تمام پہلوؤں میں پیش آنے والے تقریباً اکثر و بیشتر مسائل پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے اور ان کا جواب دیا گیا ہے، موجودہ حالات میں جہاں دین سے عدم واقفیت کی بنا پر مسلم معاشرہ میں برائیوں، غلطیوں اور کوتاہیوں کا طوفان سا آ گیا ہے، وہیں ایسے علماء بھی بہت کم ہی ملتے ہیں جو مسائل کو ان کے صحیح تناظر میں رکھ کر علم و بصیرت کو بنیاد بنا کر ان کا حق ادا کر سکیں اور مسلم معاشرہ کو صحیح راہ پر لے جانے میں مطلوبہ کردار ادا کر سکیں، مسائل کے حل میں جہاں علم و واقفیت کی کمی سبب ہے وہیں دوسرے اور بھی ایسے بہت سے اسباب ہیں جن کا ذکر بھی ناخوشگوار ہے۔ ایسی صورت میں ایک ایسی کتاب کی ضرورت کس قدر بڑھ جاتی ہے اس کا احساس ہر باشعور اور دین پسند شخص کو بہت زیادہ ہے، کتاب اپنی سلاستِ زبان، دقتِ بیان اور معرفتِ زمان و مکان میں ایک منفرد مقام کی حامل ہے، اس کتاب کے ذریعہ مسائل کے جاننے میں اتنی آسانی ہوگی جس کی نظیر فتاوی کی عام کتابوں میں جو ابھی تک منظر عام پر آ چکی ہیں، ملنی مشکل ہے، انہی افادی پہلوؤں کو دیکھتے ہوئے اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا نے جو کہ روح دین اور روح عصر دونوں کی حامل ہے، نظام الفتاوی کا انتخاب کیا اور مصنف سے درخواست کی کہ اسے اس کی اشاعت کی اجازت مرحمت فرمائیں، مصنف کی کرم فرمائی اور اکیڈمی پر ان کی بیش بہا عنایات کے نتیجہ میں آج یہ کتاب اکیڈمی کی نگرانی میں اپنی شکلی و معنوی خوبیوں کے ساتھ زیور طبع سے آراستہ ہو کر منظر عام پر آ رہی ہے۔

مولانا مفتی صاحب کی شخصیت محتاج تعارف نہیں ہے۔ آپ ایک طویل مدت سے دارالعلوم جیسے عظیم دینی ادارہ جس کی شہرت ساری دنیا میں پھیلی ہوئی ہے اور اسے فقہ و فتاوی کے میدان میں بلاشبہ قیادت کا مرتبہ حاصل ہے، مزید برآں اس ادارہ سے نکلنے والے علماء اور علمی تحقیقات کو سند اعتبار حاصل ہے، سے وابستگی رکھتے ہیں اور آپ نے مسلم معاشرہ کے نشیب و فراز سے واقفیت حاصل کرنے کا بڑا اچھا موقع پایا ہے، مسائل کے حل میں ان چیزوں کا پرتو واضح طور پر محسوس ہوتا ہے اور کتاب کا ہر ہر لفظ مصنف کی وسعت علمی، طویل فقیہانہ تجربہ اور علمی و فقہی بصیرت کا عکس معلوم ہوتا ہے۔

پہلی جلد کے بعد عنقریب دوسری اور تیسری جلد بھی انشاء اللہ منظر عام پر آئے گی، جس سے فقہ و فتاوی کی دنیا میں واقع ایک خلا پر ہوگا، ہم رب العالمین سے دعا گو ہیں کہ وہ اس کتاب کی افادیت زیادہ سے زیادہ عام فرمائے اور روزمرہ کی زندگی کو شرعی ہدایات کی روشنی میں گذارنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین!

تقریظ

از سند العلماء فقیہ العصر و مجاز حضرت شیخ الحدیث سہارنپوری نور اللہ مرقدہ

حضرت مولانا الحاج الشاہ مفتی محمود صاحب گنگوہی مدظلہ العالی ☆

مفتی دار العلوم دیوبند

حامداً و مصلیاً و مسلماً

نئے واقعات دنیا میں آئے دن پیش آتے ہی رہتے ہیں، جن کا شرعی حکم معلوم کرنے کے لئے قوم پریشان رہتی ہے۔

اللہ تبارک و تعالیٰ جزائے خیر دے حضرت الشاہ مفتی نظام الدین صاحب ناظم شعبہ افتاء دار العلوم دیوبند کو کہ انہوں نے ایسے مسائل کے مجموعہ کو شرعی دلائل کے ساتھ حل کیا، عبارات نقل کیں، جس کی وجہ سے عوام اور اہل علم دونوں کے لئے یہ مجموعہ بہت کارآمد اور بصیرت افروز ہو گیا۔

دعا ہے کہ اللہ پاک ان کی اس خدمت کو قبول فرمائے اور دارین کی ترقی سے نوازے۔ آمین

☆☆☆

☆ حضرت مفتی محمود صاحب گنگوہی علیہ الرحمہ کا وصال ۱۹/ربیع الثانی ۱۴۱۷ھ مطابق ۳/ستمبر ۱۹۹۶ء کو ساؤتھ افریقہ میں ہوا، اور حضرت کی تدفین ہیزل ڈین سے ۳/کلومیٹر کے فاصلہ پر ایلسبرگ ساؤتھ افریقہ کے قبرستان میں ہوئی، خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را۔

پیش لفظ

حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالنپوری
شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند

الحمد لله وكفى وسلام على عباده الذين اصطفى، اما بعد

اسلام ایک ابدی اور آفاقی مذہب ہے، وہ انسانی ذہن کی تسکین اور انسانی ضروریات کی تکمیل کی ضمانت رکھتا ہے، اس کے اصولوں میں ہمہ گیری کی صفت پائی جاتی ہے، اسی وجہ سے جب بھی انسانی ضرورتیں نئی شکلیں اختیار کرتی ہیں اور نئی ایجادات جلوہ گر ہوتی ہیں، تو علماءاسلام آگے بڑھتے ہیں اور اصول اسلام کی تطبیق کا فریضہ انجام دیتے ہیں، امام اعظم ابوحنیفہؒ نے جس کام کا بیڑا اٹھایا تھا وہ کام کسی منزل پر جا کر رکا نہیں ہے، بلکہ حالات زمانہ کے ساتھ ساتھ پھیلتا اور بڑھتا رہا ہے، اور انشاءاللہ یہ سلسلہ قیامت تک یوں ہی چلتا رہے گا۔

یوں تو کبھی علماءاسلام نے اس سلسلہ میں قابل قدر خدمات انجام دی ہیں، زمانے کی ضروریات سے کسی نے بھی صرف نظر نہیں کی، اور بقدر ہمت ہر مکتب فکر نے سعی بلیغ کی ہے، مگر یہ بھی واقعہ ہے کہ اس سلسلہ میں امام اعظم ابوحنیفہ قدس سرہ، ان کے تلامذہ اور ان کے متبعین کو خاص امتیاز حاصل رہا ہے، اور اسی وجہ سے امت نے آپ کو اور آپ کے اصحاب کو ''اصحاب الرائے'' کے معزز لقب سے نوازا ہے، اس لقب کا مطلب یہ ہے کہ جدید مسائل اور الجھے ہوئے معاملات میں مختلف آراء میں سے قابل اعتنا رائے امام اعظم ہی کی ہے، یہی حضرات صائب الرائے ہیں، اگرچہ بعض بر خود غلط قسم کے لوگوں نے اس معزز لقب کو بدنما کرنے کی نہ صرف سعی کی ہے، بلکہ اس قدر پروپگنڈہ کیا ہے کہ اس کا صحیح مطلب عام طور پر لوگوں کے ذہنوں سے اوجھل ہو کر رہ گیا ہے، لیکن اللہ پاک جزائے خیر عطا فرمائے ابن حجر شافعی رحمۃ اللہ علیہ کو کہ انہوں نے ''الخیرات الحسان'' میں اس غلط پروپگنڈہ کا پردہ چاک کر دیا، اصابت رائے کا یہ خصوصی وصف مختلف زمانوں میں علماء احناف کے مختلف طبقات میں خصوصیت کے ساتھ پایا جاتا رہا ہے، چنانچہ کبھی اہل عراق کو اس میں تفوق حاصل رہا تو کبھی علماء

ماوراءالنہر کو، ہمارے اس دور میں یہ خصوصی فضل علماء ہند کو عطا ہوا ہے، جس کا اعتراف متعدد علماء عرب نے بھی کیا ہے، پھر علماء ہند میں بھی اس کا حظ وافر علماء دیوبند کو حاصل رہا ہے، فقیہ النفس قطب الارشاد حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی قدس سرہ، حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہ، فقیہ بے مثال مفتی عزیز الرحمٰن صاحب عثمانی قدس سرہ، رہنمائے قوم وملت حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب دہلوی قدس سرہ، مفتی اعظم مملکت پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب دیوبندی قدس سرہ، اور فقیہ نکتہ رس حضرت علامہ مفتی مہدی حسن صاحب شاہجہانپوری قدس سرہ وغیرہم کی مساعی جمیلہ سے کون ناواقف ہے، ان حضرات نے نہ صرف پچھلے مسائل کو نکھارا اور ان کی نوک پلک درست کی، بلکہ نئے مسائل اور معضلات عصر کی زلفوں کو بھی سنوارا، اللہ تعالی کے اس خصوصی فضل وکرم کا جس قدر شکر بجالا یا جائے کم ہے۔

علماء دیوبند میں سب سے پہلے حضرت تھانوی قدس سرہ نے حوادث الفتاوی کو علاحدہ مرتب فرمایا، آپ کے بعد آپ کے مسترشد حضرت مفتی محمد شفیع صاحب قدس سرہ نے اس سلسلے میں قابل قدر کارنامہ انجام دیا، اب اسی مبارک سلسلے کے ہمارے بزرگ دارالعلوم دیوبند کے مفتی حضرت مولانا مفتی محمد نظام الدین صاحب اعظمی دامت برکاتہم نے ایک نہایت مفید کام انجام دیا ہے، آپ کے تحریر فرمودہ ہزاروں فتاوی میں سے منتخب کر کے نئے زمانے کی نئی ضرورتوں سے متعلق اہم فتاوی کا یہ مجموعہ امت مسلمہ کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے، اللہ تعالی حضرت مفتی صاحب کو جزائے خیر دے اور امت مسلمہ کو اس مجموعہ سے زیادہ سے زیادہ منتفع فرمائے (آمین یارب العالمین)۔

حوادث الفتاوی کے سلسلے میں ایک خاص بات قابل لحاظ یہ ہے کہ چونکہ ان کا حل کتب فقہیہ میں صراحۃً نہیں پایا جاتا، بلکہ مفتی زمانہ اخذ واستنباط سے کام لے کر حل پیش کرتا ہے، اس لئے اس میں خطا (چوک) کا احتمال بہ نسبت دیگر جوابات کے زیادہ پایا جاتا ہے، ائمہ مجتہدین کو بھی ایسے حالات سے دوچار ہونا پڑتا ہے، لیکن جب بھی ان کے سامنے اپنی خطاء واضح ہوئی ہے تو ہمیشہ انہوں نے اپنی رائے سے رجوع فرمالیا ہے، کبھی اپنی بات کی پچ نہیں کی، حضرت تھانوی قدس سرہ کے یہاں تو ماہنامہ "النور" میں ترجیح الراجح، کا ایک مستقل عنوان تھا، ہمارے حضرت مفتی صاحب بھی اسی سلسلے سے وابستہ ہیں اس وجہ سے آپ کے دل میں بھی اتباع حق کا جذبہ موجزن ہے، جب بھی آپ کے سامنے اپنی کوئی خطا واضح ہوتی ہے آپ فوراً اس کا تدارک فرماتے ہیں۔

"منتخبات نظام الفتاوی" کی شکل میں جن مسائل کو پیش کیا جا رہا ہے اس کی ایک غرض یہ بھی ہے کہ بالغ نظر علماء کرام انہیں ملاحظہ فرمائیں، اور کوئی قابل اصلاح بات پیش فرمائیں، تاکہ اس کی روشنی میں حوادث الفتاوی کے جوابات مزید نکھر کر امت کے سامنے آئیں، غرض علماء کرام سے امید ہے کہ وہ ضرور اس کتاب کو قابل اعتناء سمجھیں گے اور کوئی بات قابل

اصلاح محسوس فرمائیں تو اطلاع فرمائیں گے۔"فقد ورد فی الخبر عن النبی الصادق الابر صاحب القبر الاطهر صلی الله علیه وسلم أنه قال: الدين النصيحة قيل: لمن يا رسول الله؟قال لله ولرسوله"

☆☆☆

تاثرات

جناب مولانا سید محمد ازہر شاہ قیصر صاحب
سابق ایڈیٹر رسالہ دارالعلوم دیوبند

حضرت مولانا مفتی محمد نظام الدین اعظمی صاحب مدظلہ دارالعلوم دیوبند کے فاضل قدیم اور صدر المدرسین دارالعلوم دیوبند حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے تلمیذ خاص ہیں، ان کی یہ خصوصیت ہے کہ حضرت علامۃ العصر مولانا محمد انور شاہ کشمیری نوراللہ مرقدہ کی اس آخری تقریر میں بھی شریک تھے جوانہوں نے وسط ۱۹۳۳ء میں جامع مسجد دیوبند میں فرمائی تھی، اور اسی مہینہ میں وہ حضرت مرحوم کی نماز جنازہ اور تدفین میں بھی شریک تھے، مفتی صاحب گذشتہ بیس سال سے دارالافتاء دارالعلوم دیوبند میں ذمہ دارانہ حیثیت سے افتاء کی خدمت انجام دے رہے ہیں، نہ صرف جزئیات فقہ پر غائر نظر اور قرآن وحدیث سے مسائل کے استخراج پر کامل دسترس رکھتے ہیں، بلکہ وہ دقت نظر، وسعت مطالعہ اور شارع علیہ الصلوۃ والسلام کے کلام واحکام کے مزاج اور روح تک پہنچنے کا بھی انہیں ذوق میسر ہے جو کسی مکتب ومدرسہ سے زیادہ قدرت کے ایک عطیہ، اولیاء کامل کے فیضان نظر اور اپنی ذہنی پرواز اور قلبی استعداد کے طور پر حاصل ہوتا ہے، مولانا تقوی وطہارت کی ایک قابل رشک زندگی کے مالک ہیں، عارف عصر حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے دامن علم وفضل سے وابستہ رہے ہیں، ان کی زندگی اور ان کے اوقات ایسی خوبصورتی اور دل کشی لئے ہوئے ہیں کہ ان کے قریب ہوکر دل ودماغ پر ان کی عظمت بڑھتی ہے گھٹتی نہیں۔

مولانا نے افتاء کی خدمت عظیم کے سلسلہ میں خاص طور پر جدید مسائل ومعاملات پر نظر رکھی ہے، مولانا ان پر پوری نظر رکھتے ہیں، رویت ہلال کا مسئلہ، بجلی کی مشینوں سے ذبیحہ کا مسئلہ، ایک جسم میں دوسرے جسم کی پیوندکاری، جس حصہ زمین پر سال کے نصف حصہ میں رات اور نصف حصہ میں دن رہتا ہے اس میں نماز کے اوقات کا تعین، بینکوں کی طرف سے مختلف النوع مالیاتی اسکیم سے حاصل ہونے والے انٹرسٹ کا مسئلہ، میڈیکل تعلیم کے سلسلہ میں انسانی لاشوں کی چیر پھاڑ کا

مسئلہ، اوراس طرح کے بیسیوں جدید مسائل جوعصر حاضر میں الجھی ہوئی حیثیت میں سامنے آئے اورانہوں نے دیندار طبقہ کے ذہن میں بڑی الجھن پیدا کردی ہے، مولانا نے نص قرآن وحدیث کے ساتھ ضروری اور مناسب اجتہادو اختراع کی روشنی میں ان پر کلام فرمایا ہے، اورانہیں ایسے صاف، شستہ اور دل نشیں دلائل کے ساتھ واضح کیا کہ الجھے ہوئے ذہن سلجھ گئے اور خلفشار میں گھرے ہوئے دماغوں نے سکون پایا۔

تفقہ دراصل دین کی سمجھ کا نام ہے اور سمجھ ہی ایک ایسی چیز ہے جس سے دینی اوامر ونواہی کو انسان پہچان سکتا ہے اوران کے دلائل کا احاطہ کرسکتا ہے، حضرت امام ابوحنیفہؒ کو دوسرے فقہاء کرام پر اسی سمجھ، تعمق نظر ودوراندیشی اور غیر معمولی ذہانت وذکاوت کی بنا پر امتیاز حاصل ہے، کہنے والوں نے توان کے سرمایہ علم وفضل کو قیاس کہہ کر بے وزن کرنا چاہا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ مسائل ومعاملات میں ان کی یہی دقت نظر ان کا سب سے بڑا امتیاز ہے، خود حدیث پاک سے بھی اسی مفہوم کا پتہ چلتا ہے: "قال عليه السلام: خيركم في الجاهلية خيركم في الاسلام اذا فقهوا، او كما قال"، "ومن يرد الله به خيرا يفقهه في الدين" اورامام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں اس تفقہ کی شہادت حضرت عبداللہ ابن مبارک اور حضرت امام شافعی رحمہم اللہ کے اقوال دیتے ہیں، مثلاً: "قال ابن المبارك: ابو حنيفة أفقه الناس، قال الإمام الشافعيؒ :الناس في الفقه عيال على أبي حنيفة"۔

مولانا کے ایسے فتاوی اور تحریریں میری نظر سے اس طرح گذریں کہ ادارہ رسالہ دارالعلوم دیوبند نے عوامی ضرورتوں کا لحاظ کرکے اکثر ان کی تحریریں ان سے لے کر رسالہ دارالعلوم میں شائع کیں، مجھے ان کے مطالعہ سے اس کا احساس ہوا کہ مولانا کا تفقہ، اور بصیرت علمی ایک محدود دائرہ کی چیز نہیں، بلکہ وہ اس بات کو سمجھتے ہیں کہ فلاں حکم شرعی کا مفہوم اور دائرہ کار کیا ہے؟ اس مفہوم میں کیا چیزیں آسکتی ہیں اور کیا ان میں نہیں آسکتیں، اس قوت فیصلہ کے بعد مولانا کی جس موضوع پر گفتگو ہے، اس میں منشاء شریعت کی پوری پاسداری کے ساتھ زمانہ کا بھی لحاظ رکھا گیا ہے۔

مجھے پوری امید ہے کہ مولانا کی یہ تحریریں دیندار طبقہ میں مقبول ہوں گی اور الجھے ہوئے مسائل کا یہ حل دور تک اور دیر تک مسلمانوں کے لئے شمع ہدایت کا کام دے گا، واللہ الموفق وہو المعین۔

☆☆☆

چند باتیں

کتاب اور صاحب کتاب کے بارے میں

حضرت مولانا مفتی عبدالقیوم القاسمی☆

سائنس اور ٹکنالوجی کے اس جدید صنعتی اور فکری انقلاب نے جو بہت سے مسائل پیدا کر دیئے ہیں، ان میں ایک جدید دور میں پیدا ہونے والے مسائل کا فقہی اور شرعی حل بھی ہے جو جدید ایجادات اور نئے معاملاتی نظام کی وجہ سے پیدا ہوتے جا رہے ہیں، مثلاً میڈیکل سائنس کے میدان میں ترقی سے پیدا ہونے والے مسائل جیسے اعضاء کی پیوند کاری، مصنوعی طریقہ پر حمل وتولید، پوسٹ مارٹم، انیمیشن، انجکشن سے وضو اور روزہ کا مسئلہ، اسی طرح ٹرین اور ہوائی جہاز میں نماز ادا کرنا، ریڈیو، ٹیلی ویزن سے نماز کا مسئلہ، ریڈیو، ٹیلی فون، ٹی وی، کی اطلاع پر رویت ہلال کا حکم، نیز پراویڈنٹ فنڈ، بینک اور انشورنس کا انٹرسٹ، اور بینک میں جمع شدہ مال پر زکوۃ کا مسئلہ، دکانوں اور مکانوں کی پگڑی، سودی قرض لینا، بینک کے سود کے مصارف اور بینک سے متعلق کاروبار کی مختلف صورتوں کا حکم وغیرہ وغیرہ۔

الغرض ان جیسے مسائل کی فہرست بڑھتی ہی جا رہی ہے، ان مسائل کا حل فقہی نقطۂ نظر سے امت کے سامنے پیش کرنا ایک انتہائی مشکل اور دشوار کام ہے، اس لئے کہ قرآن وحدیث اور فقہ کے قدیم ذخیرہ میں ان مسائل کے نظائر اور ان سے قدیم ترین صورتیں تلاش کرنی ہوتی ہیں، احکام کی علتوں اور اسباب پر غور کرنا ہوتا ہے، اور اپنے زمانہ کے عرف اور رواج کو بھی سامنے رکھنا پڑتا ہے۔

امام ابو یوسف علیہ الرحمہ کے ارشاد: "من لم يعرف أحوال زمانه لم يجز الفتيا" کی اہمیت ان مسائل کو دیکھ کر ہی سمجھ میں آتی ہے۔

احقر الوری کے ماوی وملجا سیدی ومرشدی شیخ طریقت عارف باللہ حضرت مولانا مفتی محمد نظام الدین اعظمی صاحب

☆ خادم ادارہ خادم القرآن متصل مسجد جنت الفردوس، بچہ راہا کریم نگر انصار بلاک ذاکر کالونی شہر میرٹھ۔

ادام اللہ اقبالہم وعمت فیوضہم العلمیہ والعملیہ کو جدید مسائل اوران کے حل کے سلسلے میں باری تعالی نے جو غیر معمولی مہارت عطا فرمائی ہے اس کا اندازہ آئندہ صفحات سے ہوگا، موصوف چونکہ خاموش طبیعت، کم گو اور سادہ لوح مزاج کے حامل ہیں، اس لئے حالات بابرکات سے متعلق اختصاراً روشنی ڈالنا اور قارئین کو متعارف کرانا اولاً ضروری سمجھ رہا ہوں۔

ولادت باسعادت:

ماہ ذیقعدہ ۱۳۲۸ھ مطابق ماہ نومبر ۱۹۱۰ء بمقام اندرا ضلع اعظم گڑھ (مئو) عمل میں آئی، حضرت والا نے دس سال کی عمر میں پرائمری درجہ چار پاس کیا، اس سے قبل چند ماہ سخت علیل رہے، فرماتے ہیں کہ بیماری میں اکثر حضرت خواجہ معین الدین اجمیریؒ کو دیکھتا کہ حضرتؒ مجھے بلا کر اپنے سامنے بٹھاتے اور کچھ دعائیں دیتے، دعائیں تو یاد نہیں کہ کیا دیتے اور کیا فرماتے صرف اتنا احساس ہے کہ ان کی طرف کشش بہت ہوتی اور جی چاہتا کہ ایسا ہی ہوجانا چاہئے، اسی طرح اکثر و بیشتر خواجہ نظام الدین اولیاء علیہ الرحمہ کو بھی دیکھتا وہ بھی اسی طرح شفقت فرماتے، اور حضرت اجمیری رحمۃ اللہ علیہ کو تو کبھی کبھی سبز رنگ کے تخت طاؤس پر جلوہ افروز دیکھتا وہ بھی سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرتے۔

اسی زمانہ میں حضرت والا کے سب سے چھوٹے ماموں حاجی عبدالقیوم صاحبؒ جو اس وقت انجمن اسلامیہ گورکھپور میں پڑھتے تھے، وہاں انجمن کے سالانہ جلسہ میں علماء دیوبند تشریف لاتے ان کے بیانات و واقعات ماموں صاحبؒ بیان کرتے اس سے بھی کشش ہوتی کہ ایسا ہی ہوجانا چاہئے۔

غالباً یہی سب باتیں باعث کشش بن گئیں کہ درجہ چار (پرائمری) پاس کرنے کے بعد حضرت والا نے طے کرلیا کہ اب عربی فارسی پڑھ کر عالم بننا چاہئے، والد مرحوم جناب مولانا محمد رفیع صاحبؒ نے بہت ترغیب دی کہ ایک مسلم موضع یوسف پور میں اپنی زمین داری اور چھاؤنی ہے تم وہیں جاکر اس کے قریب موضع فتح پور کے مڈل اسکول میں پڑھو، اور اپنی چھاؤنی میں رہو، اور فرمایا کہ اس موضع کی پوری آمدنی سے جتنا پڑھنا چاہو پڑھاؤں گا، ادھر حضرت والا کا پورا خاندان انگریزی داں تھا اور کم و بیش چھ پشت سے کوئی عربی داں نہیں تھا، البتہ شاہی دور میں خاندان کے لوگ مفتی، قاضی، قاضی القضاۃ، صدر الصدور وغیرہ ملتے ہیں، مگر انگریزی دور میں سب انگلش تعلیم میں منہمک ہوچکے تھے اور یہ بھی نہیں جانتے تھے کہ عربی تعلیم کہاں ہوتی ہے۔

مگر حضرت والا کے اس اصرار پر کہ عربی تعلیم ہی حاصل کروں گا والد مرحوم نے بنارس میں جہاں پر خاندانی ماموں کوتوال شہر تھے ان کے پاس لے جاکر اپنے فرزند ارجمند کی دلی خواہش اور نیک تمنا ظاہر کی، چنانچہ کوتوال محمد فاروق صاحب والد مرحوم اور موصوف کو لے کر وہاں کے تمام مدارس اسلامیہ میں گئے، ان مدرسوں میں سے کسی میں داخل کرنا سمجھ میں نہیں

آیا اور واپس لاکر انگریزی تعلیم کے حصول کے لئے اصرار کیا، مگر حضرت والا برابر انکار فرماتے رہے، اسی حالت میں ایک سال ضائع ہوگیا۔

حسن اتفاق سے حضرت والا کے بڑے ماموں محمد متین صاحبؒ آگئے وہ گورکھپور میں رہتے تھے، کہنے لگے کہ وہاں انجمن اسلامیہ ہے ان کو وہاں اپنے پاس رکھوں گا، وہاں چھ ماہ قیام کے دوران ناظرہ کلام پاک پڑھ لیا، مگر ماموں صاحب کے دو بچے تھے وہ آپس میں گالی گلوچ کرتے تھے جس سے بے حد ضیق ہوتی، آخر تنگ آکر والد مرحوم کو لکھا کہ یہ صورت حال ہے، والد مرحوم نے ایک ملازم کو بھیجا اور یہ لکھا کہ یہ انہیں چند یوم کے لئے بھیج دیجئے، ماموں صاحب نے بھیج دیا، دو چار دن گذرنے کے بعد جب گورکھپور جانے کے لئے کہا تو والد مرحوم نے وہی خط دکھا کر جانے سے روک دیا اور اسی طرح کئی ماہ گذر گئے، اتفاق سے حضرت والا کی منجھلی خالہ جن کے کوئی اولاد نہیں تھی تشریف لے آئیں اور عربی پڑھنے کی خواہش دیکھ کر اپنے ہمراہ قصبہ مبارکپور اعظم گڑھ لے گئیں، بحمد اللہ و بفضلہ وہاں مدرسہ احیاء العلوم میں دارالعلوم دیوبند کے تعلیم یافتہ بہت علماء حضرات تھے، اب احیاء العلوم میں تعلیم کا آغاز ہوا، اردو بقدر ضرورت پڑھ کر فارسی پڑھی، حضرت مولانا نعمت اللہ صاحب قدس سرہ، العزیز ولی صفت اور واقعی اللہ کی نعمت تھے بڑی شفقت سے ایک دو ہی سال میں فارسی کا نصاب مکمل کرا کر عربی شروع کرادی، مبارکپور تشریف لے جانا ۱۳۴۲ھ کا واقعہ ہے، حضرت مولانا نعمت اللہ صاحبؒ اور مولانا شکر اللہ صاحبؒ ناظم مدرسہ احیاء العلوم اور دیگر اساتذہ بڑی شفقت و محبت رکھتے تھے اور بہت جلد ہی علم الصیغہ وغیرہ کتابیں شروع کرادیں۔

اسی دوران حضرت والا کے شیخ و مرشد عارف باللہ حضرت مولانا الشاہ محمد وصی اللہ علیہ الرحمہ خلیفہ ارشد حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ مدرسہ احیاء العلوم میں مدرس ہو کر تشریف لائے، حضرت والا اپنے شیخ و ملجاء کی خدمت کو لازم پکڑ کر موصوف ہی کے پاس رہے اور ابتدائی تعلیم کے بعد تین سال بہار شریف کے مدرسہ عزیزیہ میں تعلیم حاصل کر کے دہلی مدرسہ عالیہ فتحپوری تشریف لے گئے، پھر وہاں سے ازہر ہند دارالعلوم دیوبند میں تشریف لاکر ۱۳۵۲ھ میں فراغت حاصل کی۔

دارالعلوم دیوبند سے فراغت کے بعد اولاً مدرسہ جامع العلوم جین پور اعظم گڑھ میں تقریباً پانچ سال تدریسی خدمات انجام دیں، بعدہ مدرسہ جامع العلوم محلہ دھمال ضلع گورکھپور میں ۳ سال تک اپنے علوم بیکراں و بے پایاں سے طلبہ علوم نبوت کو مستفیض کیا، اس کے بعد پھر بحکم شیخ دارالعلوم مئو ناتھ بھنجن میں تشریف آوری ہوئی اور تقریباً پچیس سال کے عرصہ دراز تک درس و تدریس اور فتاویٰ نویسی کی خدمات جلیلہ انجام دیں۔

دارالعلوم مئو کے قیام کے دوران ہی حضرت مولانا الشاہ محمد وصی اللہ صاحبؒ نے اجازت بیعت و تلقین سے بھی نوازا۔

حضرت والا اور شاہ صاحب کا جانبین سے جو والہانہ اور عاشقانہ تعلق تھا اس کا اندازہ نہیں لگایا جاسکتا، حضرت والا کا شمار شاہ صاحب کے اخص الخواص خدام میں ہوتا تھا، حتیٰ کہ گھریلو اور خانگی معاملات میں بھی شاہ صاحبؒ کے مشورہ اور حکم کے مطابق قدم اٹھاتے تھے، شاہ صاحب کی کرامت اور تعلق کا اندازہ ان واقعات سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ فرمایا کہ ایک مرتبہ سیدی وشیدائی حضرت شاہ صاحبؒ احقر کے غریب خانہ پر تشریف لائے، گھر کے پائیں باغ میں ایک آم کا درخت تھا وہ کبھی پھلتا نہیں تھا، میں نے حضرت شاہ صاحبؒ سے اس کا تذکرہ کیا، موصوف نے اس درخت کے قریب تشریف لے جا کر اس کو پکڑ کر فرمایا: ''یہ گھر والے تمہارے نہ پھلنے کے متعلق مجھ سے شکایت کررہے ہیں، تم پھلا کرو'' یہ بات اگرچہ تعجب خیز ہے، مگر اس کے بعد سے وہ درخت خوب پھلنے لگا۔

اسی طرح فرمایا کہ حضرت شاہ صاحبؒ کی خانقاہ کے قریب ایک مرتبہ سیلاب آنے کی بنا پر پانی پہنچ گیا، شاہ صاحب سے اس کا تذکرہ کیا گیا موصوف نے اس پانی کے قریب تشریف لا کر اس کو دھکیلتے ہوئے فرمایا کہ ''جاؤ جاؤ یہاں سے تم یہاں کیوں آگئے'' اسی وقت سے سیلاب اترنا شروع ہوگیا۔

اتباع سنت کے سلسلے میں مجاہدات وعبرت آمیز واقعات:

یوں تو آپؒ (شاہ محمد وصی اللہ) بچپن ہی سے عجیب حالات خرق عادات وغیرہ کے رکھتے تھے، جیسا کہ آپ کی والدہ محترمہ سے معلوم ہوگا اور دیوبند کے قیام کے زمانہ کے اتباع سنت وخرق عادات کے سلسلے کے حالات میں حضرت علامہ محمد ابراہیم صاحب بلیاویؒ اور کچھ سید حکیم محفوظ علی محلہ خانقاہ دیوبند سے معلوم ہوئے۔

پھر ۱۳۵۰ھ میں جب آپؒ مکان پر بیٹھ گئے تو آپ نے زمینداری کی کل آمدنی لینا بند کردیا، حتیٰ کہ کاشتکاری کا غلہ، اور تالاب کی مچھلی کی آمدنی بھی استعمال نہیں کرتے تھے اور شادی ایک متمول شخص کی لڑکی سے ہوئی، آپ تصور کیجئے کہ اس صورت میں عسرت میں مرکب زندگی کس طرح گذری، یہ حال تقریباً دس سال رہا۔

پھر آپؒ اسی موضع میں ایک زمین خرید کر اپنا مکان بنا کر منتقل ہوگئے، اس سے اشارہ ملتا ہے کہ آپ نے اس زمانہ عسرت ومجاہدہ میں کیا کیا مشقتیں برداشت فرمائیں، پھر اللہ تعالیٰ نے فراغت عطا فرمائی تو کہاں تک پہنچایا اس کو ساری دنیا جانتی ہے۔

آپ پر فنا اتنا طاری تھا کہ وصال سے چند ماہ پیشتر قیام ممبئی کے دور میں اپنی مجلسوں میں عام طور سے پڑھا کرتے تھے:

آنے والی کس سے ٹالی جائے گی　　　　جان ٹھہری جانے والی جائے گی

پھول کیا ڈالو گے تربت پر مری　　　　خاک بھی تم سے نہ ڈالی جائے گی

لوگ ان اشعار کا مطلب یہ سمجھتے تھے کہ ممبئی کے اہل بدعت پر نکیر فرما رہے ہیں، ان کی اصلاح کے لئے فرما رہے ہیں، لیکن حالات وفات جاننے کے بعد یہ ظاہر ہوا کہ اپنے انتقال کے حالات و واقعات بیان فرما رہے تھے، سفر حج میں بحر عرب میں پہنچ کر غریق فی الماء ہو گئے "**برد الله مضجعه و انار بفيضه اهل هذا العالم الناسوتي**" (بحکم حضرت الاستاذ جناب مفتی محمد نظام الدین اعظمی صاحب دامت برکاتہم) (مرتب)۔

دار العلوم مئو کے قیام کے بعد حضرت والا کی تشریف آوری ماہ رجب ۱۳۸۵ھ میں بحکم شیخ جامعہ اسلامیہ دار العلوم دیوبند میں ہوئی اور فتاویٰ نویسی کے عہدہ پر فائز کئے گئے، اور اب تک اسی خدمت عظمیٰ کی انجام دہی میں مصروف ہیں۔

تصانیف:

یوں تو حضرت والا کے تحریر کردہ فتاویٰ ہزاروں سے زائد رجسٹروں میں محفوظ ہیں، اسی کے ساتھ "**انوار السنة لروادالجنة المعروف به فتح الرحمن فی اثبات مذهب النعمان**" کی تبییض کا اہم کارنامہ انجام دیا۔ یہ کتاب علم حدیث میں ایک عجیب انداز کی کتاب ہے، مشکوۃ شریف پڑھنے والوں کو عموماً یہ خلجان پیدا ہوتا ہے کہ احناف کے پاس سرمایہ حدیث نہیں ہے، اگر ہے تو بہت کمزور اور بہت کم ہے، اس کتاب سے یہ خلجان بالکلیہ رفع ہو جاتا ہے اور واضح ہو جاتا ہے کہ احناف کی تائید و اثبات میں جس قدر احادیث صحیحہ ہیں کسی دوسرے کے پاس نہیں ہیں۔

یہ کتاب شیخ عبد الحق محدث دہلوی قدس سرہ العزیز کی آخری تصنیف ہے، کما لا یخفی علی من طالعہ۔

شیخ عبد الحق محدث دہلویؒ اس کی وجہ تصنیف میں خود تحریر فرماتے ہیں کہ جب میں "ہدایہ" پڑھتا تھا تو معلوم ہوتا تھا کہ احناف کے پاس سرمایہ حدیث نہیں ہے، اگر ہے تو بہت کمزور ہے، پھر جب مشکوۃ پڑھنے لگا تو معلوم ہونے لگا کہ واقعی مسلک احناف میں احادیث کا سرمایہ نہیں ہے، یہاں تک کہ میں نے طے کر لیا کہ شافعی بن جاؤں، یہ خیال اپنے استاذ شیخ عبد الوہاب متقیؒ سے بیان کر دیا تو شیخ نے فرمایا کہ احناف کی تائید میں جتنا مضبوط اور کثیر سرمایہ حدیث ہے اتنا کسی کے پاس نہیں ہے، تم فلاں فلاں کتابیں دیکھ لو پھر مجھ سے کہنا۔

چنانچہ ان کتابوں کا مطالعہ کر لینے کے بعد میری یہ غلط فہمی رفع ہو گئی، پھر میں نے احناف کی شروح مشکوۃ دیکھنا شروع کیں تو مجھے کہیں یکجا سرمایہ ایسا نہیں ملا جس سے مشکوۃ پڑھنے سے پیدا شدہ خلجان رفع ہو جائے تو اسی وقت سے یہ خیال

تھا کہ ایک کتاب مشکوۃ ہی کے طرز پر ایسی ہونی چاہئے جس سے خود یہ خلجان ختم ہوجائے، چنانچہ مشکوۃ ہی کے طرز پر یہ کتاب حضرت دہلویؒ نے تالیف کی۔

واقعی یہ کتاب عجیب ہے، بالکل مشکوۃ کے طرز پر اور شرح حدیث بالحدیث ہے، اس کتاب کا ایک کمال یہ بھی ہے کہ بالکل مشکوۃ کے طرز پر ایک باب قائم کرتے ہیں پھر اس باب میں جتنے مذاہب معتبرہ وارد ہیں سب کو بیان کرتے ہیں، سب سے قوی مذہب پہلے بیان کرتے ہیں پھر اس کے بعد اس سے کمزور مذہب، پھر اسی طرح اس سے کمزور مذہب، پھر اسی طرح سب سے کمزور مسلک سب سے اخیر میں نقل کرتے ہیں۔

نیز اولاً سب سے کمزور مسلک کی احادیث و روایات نقل کرتے ہیں پھر اس کے بعد اس سے قوی مذہب کی احادیث اور سب سے اخیر میں سب سے قوی مذہب کی احادیث و روایات اس طرح جمع کرتے ہیں کہ بعد کی احادیث و روایات اپنے ماقبل کا خود جواب بنتی ہیں، اور شرح حدیث بالحدیث کا لطف بھی حاصل ہوتا رہتا ہے۔

اس لئے بھی شیخ کی یہ تالیف نوادرات روزگار میں سے ہے۔ اور اس درجہ میں ہے کہ ہدایہ و مشکوۃ پڑھنے کے ساتھ ساتھ اس کو سبقاً سبقاً پڑھا جائے۔

یہ کتاب ''فتح الرحمٰن فی اثبات مذہب النعمان'' حضرت حکیم محمود صاحبؒ معروفی کے جو ایک علمی خاندان کے فرد تھے کتب خانہ کے مخطوطات سے جو نہایت بوسیدہ کرم خوردہ تھی، ابوالمآثر حضرت مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی متوی محدث کبیر کے ذریعہ سے حاصل ہوئی اور حضرت موصوف ہی کے ایماء و امر سے حضرت والا نے مسلسل ڈھائی سال کی محنت و کاوش کے بعد اس کی تبییض کی اس طرح یہ قابل اشاعت ہوئی، اس کا کوئی نسخہ مخطوطہ بھی نہیں ملتا تھا بڑی کاوش اور تلاش سے جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی کے مخطوطات کے گھر سے برآمد ہوئی اس کے ٹائٹل پر ''فتح الرحمٰن فی تائید مذہب النعمان'' لکھا ہوا ہے، بقیہ عبارتیں حرف بحرف یکساں ہیں اور اس نسخہ کا سراغ بھی خلیق نظامی کی کتاب سے جو کہ شیخ عبدالحقؒ کے حالات میں لکھی ہے اس سے ملا، حضرت والا نے مختصر تعلیقات کے ساتھ طبع کرا کر اس کو زندہ کر دیا ہے، دعا ہے کہ متن کتاب تو زندہ ہوگیا اب کوئی اللہ کا مخیرؒ بندہ ان احادیث کی سند لا کر اس کتاب کو مستند بنادے، تاکہ ان احادیث متداولہ کی سندیں بھی واضح ہوجائیں اور اس کی افادیت مکمل ہوجائے۔

بقیہ تصانیف مندرجہ ذیل ہیں:

۱-اقسام الحدیث فی اصول التحدیث، عربی فوٹو آفسیٹ

۲-اصول حدیث، مترجم بترجمہ اردو

۳-آسان علم صرف جزء اول معروف بہ اردو میزان

۴-آسان علم صرف جز دوم معروف بہ اردو منشعب

۵-آسان علم نحو معروف بہ اردو نحومیر

۶-آسان علم نحو معروف بہ معلم سواد خوانی عربی

۷-رویت ہلال کی شرعی حیثیت

اس وقت فتاوی کا جو مجموعہ آپ کے ہاتھوں میں ہے حضرت والا ہی کے علوم بیکراں و بے پایاں کے بحر عمیق کا ایک حصہ ہے۔

جدید منتخبات نظام الفتاوی کی ترتیب کے سلسلے میں طریقہ کار یہ رہا کہ قدیم نظام الفتاوی میں جو فتاوی جدید مسائل سے متعلق تھے ان کو اخذ کیا، اور بقیہ فتاوی رجسٹر اور رکھے ہوئے مسودات سے نقل کئے، اور اس کا اہتمام کیا گیا کہ جدید مسائل سے متعلق فتاوی ہی کو اس جلد میں پیش کیا جائے، کیونکہ جدید مسائل کے حل کے لئے امت ہر وقت پریشان رہتی ہے اور نئی ایجادات نے ان کی اہمیت میں مزید اضافہ کر دیا ہے۔

اسی طرح حوالہ جات کا بھی اہتمام کیا، اور جملہ مسائل کو باب در باب اور فصل در فصل پیش کرنے کی سعی کی گئی بعض استفتا اور جوابات فارسی یا عربی میں تھے ان کا ترجمہ بھی کر دیا گیا ہے، یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ جہاں علماء دیوبند نے نحو، صرف، تاریخ اور تفسیر وغیرہ علوم وفنون پر بیشمار کتابیں تصنیف کی ہیں جن سے ملک و بیرون ملک کی لائبریریاں مزین ہیں اسی طرح علم فقہ پر ایک نا قابل فراموش خدمت عظمی انجام دی ہے، خصوصا جدید فقہی مسائل پر۔

جدید مسائل کے حل اور ان پر بحث کی ابتداء علماء دیوبند میں حضرت مولانا اشرف علی تھانوی نور اللہ مرقدہ سے ہوئی، یہی نہیں، بلکہ موصوف نے حوادث الفتاوی کے نام سے ان جیسے مسائل کو علاحدہ مرتب فرمایا۔

اور اسی پر اکتفاء نہیں کیا، بلکہ جس طرح امام اعظم ابوحنیفہؒ نے اپنی حیات مبارکہ میں قرآن وحدیث سے استنباط کردہ مسائل کی ترتیب کے لئے ایک جماعت اپنے تلامذہ ومسترشدین کی تیار کی اسی طرح آپ نے ایک ایسی جماعت ورثہ میں چھوڑی جس نے آپ کے بعد ان جیسے مسائل کو مزید بسط وتفصیل کے ساتھ امت مسلمہ کے سامنے پیش کر کے قابل قدر کارنامہ انجام دیا جن میں خصوصا مایہ ناز مفسر قرآن حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ مفتی اعظم پاکستان کی ذات گرامی قابل ذکر ہے، حضرت مفتی صاحبؒ نے جن مسائل پر بحث کی ہے ان میں سے بعض مسائل بنام جواہر الفقہ طبع ہو کر منظر عام پر آچکے ہیں۔

جدید مسائل کے سلسلہ میں ایک خاص بات قابل ذکر یہ ہے کہ چونکہ ان کا مدار نئی ایجادات پر ہے اور حالات کے تغیر سے مسائل میں بھی تبدیلی آتی رہتی ہے، مثلاً جب پہلے پہل چشمہ رائج ہوا تو جملہ مفتیان کرام نے فتوی دیا کہ اس کو لگا کر نماز پڑھنا جائز نہیں ہے، اس لئے کہ اس سے خشوع وخضوع میں خلل واقع ہوتا ہے، اور ہر ایسی چیز مکروہ ہے کہ جس سے نماز میں خلل واقع ہو"**كما قال ويكره للمصلي ما يشغل البال ويخل بالخشوع**"(نورالایضاح ص ۸۸) لیکن کچھ دنوں بعد یہ فتوی دیا کہ نظر کے چشمہ کو لگا کر نماز پڑھنی چاہئے، اس لئے کہ جس کی بینائی کمزور ہے اس کو بغیر چشمہ لگائے سکون و طمانیت حاصل ہی نہیں ہوگا، آج بھی "امدادالفتاوی" (جلد اول ۴۳۹) میں یہ مسئلہ موجود ہے۔

اسی طرح جب ہاتھ کی گھڑی کا رواج ہوا تو یہ مسئلہ اٹھ کھڑا ہوا کہ اس کو باندھ کر مردوں کے لئے نماز پڑھنا جائز نہیں ہے، اور یہ دلیل دی گئی کہ عورتوں کی چوڑیوں کے مشابہ ہے، لہذا اس سے مشابہت بالنساء لازم آئے گی، اور فرمان نبوی علیہ السلام "**من تشبه بقوم فهو منهم**" کے خلاف ہوگا، مگر آج صورت حال یہ ہے کہ ہر مفتی کے پاس گھڑی ملتی ہے، اس کے بعد جب لاؤڈ اسپیکر کی ایجاد ہوئی اور اس کے ذریعہ نماز کا مسئلہ چھڑا تو تمام مفتیان کرام نے مل کر یہ فتوی دیا کہ اس سے نماز جائز نہیں ہوگی اور دلیل اس کی فتاوی شافعی سے لائے کہ بازگشت آواز کی اقتداء کرنا صحیح نہیں ہے، فتاوی دارالعلوم دیوبند قدیم (۱۷۵/۵) پر آج بھی یہ مسئلہ موجود ہے۔

اس کے بعد جب ریل گاڑی چلی تو فتوی یہ دیا گیا کہ ریل گاڑی بھی چونکہ دابہ کے حکم میں ہے اور چوپائے پر صرف نفلی نماز ادا کی جاسکتی ہے، لہذا ریل گاڑی پر نفل نماز کے علاوہ کوئی نماز ادا کرنا جائز نہ ہوگا، لیکن آج جملہ مفتیان کرام فتوی دیتے ہیں کہ تمام نمازیں ریل گاڑی میں ادا کرنا جائز ہے۔

اس کے بعد جب ہوائی جہاز کی ایجاد ہوئی تو فتوی دیا گیا کہ اس میں نماز ادا کرنے میں چونکہ سجدہ کا تحقق نہیں ہوتا، اس لئے کہ سجدہ کی تعریف ہے: "**وضع الجبهة على الارض**" اور وہ فضا میں اڑتا ہے، لیکن اب مسئلہ یہ ہے کہ اس میں بھی نماز ادا کی جاسکتی ہے۔

لہذا ان جیسے مسائل میں اہل نظر کے درمیان اختلاف کا پایا جانا بعید بات نہیں بلکہ عین تقاضا فطرت ہے، اور ایسے مسائل کے جوابات کتب فقہیہ میں صراحۃ نہیں ملتے بلکہ مفتی عصر اجتہاد واستنباط سے کام لے کر جوابات دیتا ہے۔

رب ذوالجلال فتاوی کے اس مجموعہ کو نفع عوام وخواص کا ذریعہ بنائے اور حضرت والا کے فیوض و برکات سے سب کو مستفید فرمائے، اللھم آمین۔

☆☆☆

{}

كتاب العقائد والشرك

کتاب العقائدوالشرک

کلمہ طیبہ اورشہادت کی حقیقت:

اس سوال کے جواب میں جوخانقاہ حضرت شاہ ارزان قدس سرہ کی جامع مسجد میں ہوا۔

۱۔ لا إله إلا الله محمد رسول الله

۲۔ أشهد أن لا إله إلا الله وحده لاشريك له وأشهد أن محمداً عبده ورسوله۔

معزز حاضرین! السلام علیکم

ابھی ابھی میں نے دوکلمہ طیبہ کی تلاوت آپ حضرات کے سامنے کی ہے۔دریافت طلب بات بھی دو میں ہے۔ اول کلمہ طیبہ میں نے کیوں تلاوت کیااور کیوں تلاوت کرایا۔

معزز حاضرین کل شب خانقاہ شاہ ارزان میں مجلس میلادالنبی ہوئی تھی۔جس کے مقرر جناب مولانا فضل کریم شاہ اورشاہ عزیز تھے دونوں حضرات نے خوب خوب نکات کی باتیں قرآن کے ماتحت اور گواہ اور گواہی پر بڑی صراحت کی گئی یعنی گواہ کیسا مستند ہوگااور گواہی کیسی مستند ہوگی۔

اب آپ حضرات سے دریافت طلب بات دوسری یہ ہے کہ جس نے جو گواہی اللہ اور رسول پر دی وہ مستند ہے یا غیر مستند، جبکہ گواہی کے لئے شرط عینی ہے؟

الجواب وبالله التوفيق:

پہلی بات کہ کلمہ طیبہ کی تلاوت کیوں کی اور کیوں کرائی ظاہر ہے، اس لئے کہ کلمہ طیبہ کے مفہوم کی تصدیق نصیب ہو اور ایمان میسر ہو اسی کلمہ طیبہ کی تصدیق اور اسی کے حق جاننے اور سمجھنے اور اسی پر اعتقاد رکھنے کا نام ایمان کی حقیقت ہے۔کلمہ طیبہ کا اجمالی مفہوم یہ ہے کہ اللہ وحدہ لاشریک لہ معبود برحق اور یکتا و بے مثل ہے۔اور جناب محمد ﷺ اللہ کے برحق رسول و

نبی آخر الزماں ہیں۔

دوسری بات گواہی جو دی کیسی ہے۔ جب دل سے حق جان کر دی تو وہ مستند اور صحیح ہے شرط عینی ان چیزوں کے لئے ہے جن کا وجود بھی عینی ہو، جیسے انسان کے موجود ہونے یا اس کے مرد ہونے یا عورت ہونے کی شہادت کہ ان چیزوں کا وجود بھی عینی ہے تو ان چیزوں کی شہادت کے لئے شرط عینی نہیں ہے، بلکہ اس کے وجود کا تحقق و یقین آ ثار و علامات سے ہو جانا شہادت دینے کے لئے کافی ہے جیسے خود انسان ہی کی عقل کا وجود کوئی دکھا نہیں سکتا ہے عینی مشاہدہ نہیں کرا سکتا ہے، مگر شہادتیں دیتا ہے کہ فلاں عقلمند اور بڑا عقل والا ہے اور محض اس بنا پر کہ عقل آنکھوں سے دیکھنے کی چیز نہیں، بلکہ عقل اپنے آ ثار و علامات سے ہی جانی پہچانی جاتی ہے۔

پس اس طرح اللہ وحدہ لاشریک کا وجود اس دنیا میں ان آنکھوں سے دیکھا نہیں جا سکتا ہے، بلکہ آ ثار و علامات اور اس کی قدرت ظاہرہ و باہرہ سے اس کے وجود پاک کا تحقق و یقین ہے شہادت دی جائے گی اسی طرح جناب نبی کریم ﷺ کا وجود گرامی اگر چہ اس وقت ہماری آنکھوں کے سامنے نہیں ہے، لیکن آپ کی تعلیمات، نیز اور آ ثار و علامات و تواتر سے آپ کے وجود مبارک کا تحقق اور یقین موجود ہے شہادت ہے دی جائے گی۔

ایک عقل مند و سلیم الطبع کے سمجھنے کے واسطے اتنا کافی ہے۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۸/ ۹/ ۸۵ ۱۳ ھ

الجواب صحیح سید احمد علی سعید نائب مفتی دارالعلوم دیوبند محمود عفی عنہ

۱- اولیاء و شہداء کے زندہ ہونے کا صحیح مفہوم:

اللہ کے ولی، شہید قبروں میں زندہ ہیں اور ان کو اللہ کے ہاں سے کھانا ملتا ہے، ایسا ہی ایمان اللہ کے رسولوں کے ساتھ رکھنا درست نہیں ہے تو اس کے ثبوت میں دلیل دیجئے؟

۲- کیا اولیاء اور شہداء سے ہماری رہبری کا کام لیا جاتا ہے؟

کیا اللہ تعالیٰ مذکورہ ہستیوں سے ہماری رہبری و رہنمائی کا کام لیتا ہے؟

۳- دعاء میں اولیاء کو سفارشی بنانا:

کیا مذکورہ ہستیوں کو ہماری دعاء خدا تک پہنچانے کے لیے سفارشی بنانا جائز ہے، جبکہ دنیا میں اللہ کے زندہ ولی

موجود ہیں اوران سے یہ کام لیا جاتا رہا ہے۔

الجواب وباللہ التوفیق:

شہیدوں کے بارے میں قرآن پاک میں اس آیت کریمہ: "ولا تقولوا لمن یقتل فی سبیل اللہ أموات بل أحیاء ولکن لا تشعرون" (۱) کا ترجمہ حضرت شاہ عبدالقادر صاحب محدث دہلوی جو ہم سب کے بڑے اور ہم سب کے معتمد ہیں اس طرح فرماتے ہیں:

(اور مت کہو اس کو جو مارا گیا ہو خدا تعالیٰ کی راہ میں کافروں سے لڑکر، جو اس لڑائی میں دنیا کی، یا اپنی کچھ غرض نہ تھی، ان کو نہ کہو مرے ہیں، یعنی ان کو مردہ نہ کہو کہ مرے نہیں، بلکہ جیتے ہیں اسی جہاں میں، پر تم کو خبر نہیں، اور نہیں جانتے تم کہ ان کی زندگی کس طرح کی ہے تمہاری سمجھ میں نہیں آتی)۔

اسی طرح کی ایک اور آیت چوتھے پارہ میں آل عمران میں ہے: "ولا تحسبن الذین قتلوا فی سبیل اللہ أمواتاً، بل أحیاء عند ربهم یرزقون فرحین بما اٰتاهم اللہ من فضله" (۲)۔

اس کا ترجمہ شاہ صاحب فرماتے ہیں:

(اور نہ بوجھو اور نہ سمجھو ان لوگوں کو جو مارے گئے ہیں خدا تعالیٰ کی راہ میں مردے، یعنی مردے نہیں بلکہ جیتے ہیں اور خدا تعالیٰ کے پاس روزی پاتے ہیں خوشی کرتے ہیں اس چیز سے جو دیا ہے ان کو خدا تعالیٰ نے اپنے فضل سے)۔

اور آیت کریمہ: "ولا تحسبن الذین قتلوا فی سبیل اللہ أمواتاً" (۳) کی تفسیر میں حضرت ابن عباسؓ سے احادیث صحیحہ میں اس طرح منقول ہے کہ حضور ﷺ نے شہداء غزوۂ احد کے سلسلے میں فرمایا ہے:

"(جعل اللہ أرواحهم فی جوف طیر خضر) ترد أنهار الجنة، تشرب من مائها ولبنها وعسلها وشرابها الطهور (تأکل من ثمارها وتاویٰ) إلی قنادیل من ذهب معلقة فی ظل العرش، فلما وجدوا طیب ماکلهم ومشربهم ومقیلهم قالوا: من یبلغ إخواننا عنا أی عن قبلنا إنا أحیاء فی الجنة نرزق لئلا یزهدوا فی الجهاد ولاینکلوا عند الحرب، فقال اللہ تعالیٰ: أنا أبلغهم عنکم، قال: وأنزل اللہ

۱- سورۂ بقرہ: ۱۵۴۔
۲- سورۂ آل عمران: ۱۶۹-۱۷۰۔
۳- سورۂ آل عمران: ۱۶۹۔

عزوجل: "ولا تحسبن الذين قتلوا في سبيل الله أمواتاً" (۱)۔

اس روایت کا حاصل یہ ہے کہ جب شہید کی روح شہید کے جسد ناسوتی اور عنصری سے نکل جاتی ہے تو اس کو عرش کے نیچے سبز چڑیوں کے قالب میں کردیا جاتا ہے، جہاں وہ جنت کی سیر کرتی رہتی ہیں اور جنت کی نہروں سے اور جنت کے پھلوں اور نعمتوں سے کھاتی پیتی رہتی ہیں اور عرش کے نیچے جو سونے کی قندیلیں لٹکی ہوتی ہیں ان میں سیر کرتی ہیں اور خوش و مست رہتی ہیں اور چاہتی ہیں کہ جو دنیا میں موجود ہیں ان کو کسی طرح خبر پہنچ جائے کہ دیکھو شہید ہونے کی برکت سے ہم اس نعمت اور خوشی میں ہیں، لہذا تم لوگ کبھی جہاد کرنے میں سستی نہ کرنا اور نہ لڑتے ہوئے منہ موڑنا تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میں تم لوگوں کی جانب سے دنیا والوں کو یہ خبر پہنچا دیتا ہوں، تو اللہ تبارک وتعالیٰ نے یہ آیت کریمہ نازل فرمائی: **"ولا تحسبن الذين الخ"** (۲)، پس اس آیت کریمہ میں بھی یہ اشارہ ہوگیا کہ شہید دنیا میں نہیں آتے۔ اور پہلی آیت کریمہ سے معلوم ہوا کہ ان کی زندگی ناسوتی وعنصری نہیں ہے، بلکہ اس کے برعکس ایسے رنگ کی ہے جس کی کیفیت تامہ ہم نہیں سمجھ سکتے، البتہ ان کے روحانی فیضان سے متمتع ہونا جائز نہیں ہوتا، اسی طرح ان آیات سے یہ بھی معلوم ہوا کہ قبروں میں ان کا جسد عنصری کس طرح رہتا ہے اس کا علم ہونا ضروری نہیں، البتہ انبیاء ورسل علیہم السلام کے بارے میں روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ زمین ان کے جسد عنصری کو نہیں کھاتی، نیز اس آیت کریمہ: **"أولئک الذين أنعم الله عليهم من النبيين والصديقين والشهداء والصالحين وحسن أولئک رفيقا"** (۳)۔ اس سے یہ معلوم ہوا کہ جو انسان کفر وشرک وبدعت سے محفوظ اور سنت رسول اللہ ﷺ کا سچا تابع اور دین دار ہوگا اس کے چار درجے ہیں، ان میں سب سے اونچا درجہ انبیاء علیہم السلام کا ہے، اس کے بعد صدیقین کا درجہ ہے، اس کے بعد شہیدوں کا درجہ ہے اور اس کے بعد صالحین کا درجہ ہے، اور صالحین کا مفہوم یہی ہے کہ وہ مومن صالح ہو، یعنی شرک وکفر وبدعت سے مبرا اور سنتِ رسول علیہ السلام کا سچا تابع ہو، اور یہ بھی معلوم ہوا کہ شہیدوں سے دو درجہ بلند انبیاء علیہم السلام کا درجہ ہے اور ان میں بھی سب سے اونچا وبلند پایہ درجہ جناب نبی کریم ﷺ کا ہے۔ جو خاتم رسل اور خاتم انبیاء ہیں، لہذا ان کے درجہ بلندی وخصوصیات کا احاطہ امتی کے بس میں نہیں اور اسی وجہ سے یہ عقیدہ ماثورہ ہے کہ جس حصۂ زمین سے جسد اطہر ملا ہوا ہے وہ حصہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک عرش سے بھی زیادہ محبوب ہے، لہذا

۱- ابوداؤد شریف مع بذل المجہود، کتاب الجہاد باب فی فضل الشہادۃ ۱۲/۴ ط دار الکتب العلمیہ بیروت، مسلم کتاب الامارۃ باب بیان أن أرواح الشہداء فی الجنۃ ۳۷/۷، رقم الحدیث: ۱۲۱ (۱۸۸۷)۔

۲- سورۂ آل عمران: ۱۶۹۔

۳- سورۂ نساء: ۶۹۔

انبیاء علیہم السلام کو شہیدوں وغیرہ پر قیاس کرنا قطعاً غلط ہے، بلکہ ان کا مرتبہ بے انتہا بلند ہے باقی ۲ و ۳ میں جو باتیں لکھی ہیں وہ شرعاً صحیح نہیں ہیں۔

اور زندہ ولیوں پر قیاس کرنا بھی درست نہیں ہے اور کلام پاک میں جو وسیلہ کا کلمہ وارد ہے اس کا بھی یہ مفہوم نہیں ہے جس کا ذکر ان دونمبروں میں ہے، ہاں روحانی فیض حدود شرع کے مطابق ثابت ہے، اسی طرح اتنی اور بھی گنجائش ہے کہ کسی مردہ بزرگ کے بارے میں اللہ تعالیٰ سے اس طرح سے خود دعاء کر سکتے ہیں کہ اے اللہ تعالیٰ ہمارے علم میں یہ آپ کے ولی ہیں، اپنے اولیاء سے آپ نے ہمیں محبت کرنے کا حکم دیا ہے، کیونکہ محبت نیک کام ہے، پس اس نیک کام کو وسیلہ بنا کر ہم آپ سے دعاء کرتے ہیں کہ ہماری دعا قبول فرمالیں اور بس۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۴/ ۳/ ۱۴۱۱ھ

تقلید شخصی کی پابندی کس طرح ہوئی؟

۱- اجتہاد کی بندش کا فیصلہ کس سال اور کس مقام پر ہوا؟

۲- علماء یا فقہاء جنہوں نے اجماعِ امت کی رہنمائی اور اجتہاد کی بندش جاری کی ان بزرگوں کے اسمائے گرامی اور تعریف کیا ہیں؟

الجواب وبالله التوفيق:

سرخیل جماعت اہلِ حق حضرت مولانا شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ جو مقلدین و غیر مقلدین دونوں ہی کے نزدیک معتمد او معتبر ہیں، وہ اپنی معرکۃ الآراء کتاب "الانصاف" میں تحریر فرماتے ہیں: **"فالتمذهب للمجتهدين سر ألهمه الله تعالى العلماء وجمعهم عليه من حيث يشعرون أو لا يشعرون"۔**

حاصل ترجمہ یہ ہے کہ مذہب مجتہدین کی پابندی ایک راز ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے علماء کے دل میں ڈالا اور ان کو اس پر مجتمع کر دیا خواہ وہ اس کو جانیں یا نہ جانیں (۱)۔

یعنی یہ اجماع عملی ہے اجماع قولی نہیں ہے کہ آپ کے دونوں سوالوں میں سے کوئی سوال اس پر متوجہ ہو، اور اجماع

۱- الانصاف مع الترجمہ/ ۶۲۔

عملی بڑھا ہوا ہوتا ہے اجماع قولی سے، اس لیے کہ اجماعِ قولی کا مآل بھی وہی اتحاد فی العمل ہوتا ہے، جو اجماع عملی میں بدرجۂ اتم ہوتا ہے۔

نیز یہ اجماع اللہ تبارک وتعالیٰ کے رازوں میں سے ایک راز ہے۔ امت کی حفاظت اور گمراہی سے اس کو بچانے کے لیے اللہ تبارک وتعالیٰ نے دوسری صدی ہجری کے بعد ہی جبکہ قرون ثلاثہ مشہود لہا بالخیر کا زمانہ ختم ہونے والا تھا۔ علمائے حق کے قلب پر یہ الہام فرما دیا۔ اور سب علمائے اہلِ حق اس الہام پر مجتمع ومتحد ہو گئے۔

اور اہل ہویٰ اور اہل ضلال جو ابھرنے والے ہی تھے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس اتحاد واجماع سے امت کو افتراق وابتلاء فی الضلال سے بھی بچالیا۔ اور امتِ محمدیہ کی اسی حکمت (حفاظت وامن عن الضلالہ) کے ماتحت تقلید شخصی بھی از خود وجود میں آگئی اور وہ بھی اسی الہام برحق سے ہم جنس ہے، اس کی جانب بھی حضرت شاہ صاحب نے اسی کتاب کے (صفحہ ۷۰) میں اشارہ فرمایا ہے۔ اور امت کے امن عن الضلال اور اس کی حفاظت وانتظام کی جانب اشارہ متعدد احادیث میں ہے، مثلاً یہ روایت: "عن أبي هريرةؓ قال: قال رسول الله ﷺ: **يتعاقبون فيكم ملائكة بالليل وملٰئكة بالنهار" (الیٰ آخر الحدیث)**(۱)۔

اس حدیث کی شرح میں صاحب ''فتح القدیر'' فرماتے ہیں: **"فيه الأخبار بما نحن فيه من ضبط أحوالنا الخ"**۔ اور شارح مشکوٰۃ صاحب ''اشعۃ اللمعات'' اس حدیث پاک کے تحت اس طرح فرماتے ہیں کہ ملائکہ کا آنا جانا برائے ضبط احوال و در برداشتن احوال ایشاں ہے۔ اور ہمارے احوال واعمال کے ضبط وانتظام کا اعلیٰ فرد یہ ہے کہ اس امت کے دین حنیف کی پوری حفاظت کا انتظام ہے کہ بے راہ روؤں کی بے راہ روی اور اہل ہویٰ وضلال اور ان کے فاسد حالات واعتقاد سے حفاظت رہے، اور اس کا پورا انتظام امت میں پیدا ہو جائے اور انہیں باتوں کا الہام اللہ تبارک وتعالیٰ نے دوسری صدی کے بعد ہی میں جب زمانہ خیر القرون ختم ہونے کے قریب تھا علمائے حق کے قلب میں ڈال کر سب کو اس پر مجتمع فرما دیا کہ اب یہی چار ائمہ ہدیٰ جن کی فقہ واستنباط سب برحق ہیں اور ان کے اصول استنباط وفروع شائع ومکمل ہو چکی ہیں۔ انہی کی اتباع میں انحصار کر دیا جائے اور اسی کا دوسرا نام تقلید ہے۔

نیز اسی الہام کی ایک کڑی اسی مذکورہ بالا بے راہ روی وغیرہ سے تحفظ کے لئے تقلید شخصی کا ورود فی القلب ہے اور اسی کا نام اجماع عملی ہے۔ اور ہم پہلے کہہ آئے ہیں کہ اجماع عملی بڑھا ہوتا ہے اجماع قولی سے۔

۱- رواہ البخاری ومسلم، مشکوٰۃ: ۶۲ باب فضائل الصلوٰۃ۔

خلاصہ یہ ہے کہ تقلید شخصی پر من جانب اللہ اجماع عملی منعقد ہو گیا ہے۔" **فوضح الحق و طار الاشکال**"۔

(نوٹ) البتہ تتمیماً للفائدہ یہ لکھ دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہ گفتگو اجتہاد مطلق کے بارے میں تھی ـــــــ باقی ضمنی اجتہاد جیسے اہل تخریج وغیرہ کرتے ہیں ممنوع نہیں، بلکہ اس کا حکم یہ ہے کہ ائمہ اربعہ میں سے جس امام کا مقلد ہو اس کے اصول استنباط کی موافقت واتباع کرتے ہوئے تخریج مسائل کر سکتا ہے، یہ ضمنی اجتہاد قیامت تک جاری رہے گا، اس ضمنی اجتہاد کی تفصیل وتشریح ائمہ اربعہ کے اصول وقواعد میں دیکھی جا سکتی ہے، فقط واللہ علم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند ۲/۴/۱۴۱۱ھ

(قادیانیوں کے بارے میں) وفاقی شرعی عدالت پاکستان کا حکم شرعی:

رسول اللہ ﷺ نے کبھی ذاتی انتقام نہیں لیا۔ رسول اللہ (ﷺ) نے صرف اور صرف اسلام کی بقاء کے لیے قتال کا حکم دیا، خلفائے راشدین بھی اسی سنتِ رسول ﷺ پر عمل کرتے رہے، قتل کی سزا اس شخص کو دی جاتی ہے جو رسول اللہ ﷺ کو آخری پیغمبر تسلیم نہ کرے، اور اپنی طرف سے کوئی متبادل پیغمبر تجویز کر دے، لیکن وفاقی شرعی عدالت نے قادیانیوں کے لیے موت کی سزا تجویز نہیں کی ہے۔

مندرجہ بالا ٹھوس حقیقت کے پیش نظر وفاقی شرعی عدالت کا قادیانیوں کی تردید رسالت کے نا قابل معافی جرم کو نظر انداز کر دینا، توہین سنت اور توہین خلفائے راشدین ہے، اگر ہم وفاقی شرعی عدالت کی اس توہین سنت اور توہین خلفائے راشدین کے فیصلہ کو چیلنج نہیں کرتے تو ہمیں یاد رکھنا چاہئے کہ ہم کولوٹ کر رسول اللہ ﷺ کی طرف جانا ہے۔

الجواب وباللہ التوفیق :

قادیانیوں کا تردید رسالت کا جرم نا قابل معافی جرم ہے، اس کو نظر انداز کرنا شرعاً ہرگز جائز نہیں ہے، اور ایسے مجرم کو شرعاً ثبوت جرم ہو جانے کے بعد سزائے موت دے دینا توہینِ خلفائے راشدین نہیں ہے۔ بلکہ سنت صدیق کے عین مطابق ہوگا، "**كما يظهر من هذه العبارة: "فقاتلهم أبوبكرؓ، حتى قتل الله المسيلمة باليمامة و العنسي بصنعاء**" (۱)۔

۱- نووی شرح مسلم ۳۸/۱۔

اوراس سنتِ صدیق کی اوران دونوں مجرموں کے کیفر کردار تک پہنچنے اور پہنچانے کی مزید کیفیت وتفصیل ''البدایۃ والنہایۃ'' کی جلد ششم کے (ص ۳۰۵،اور ۳۰ ۴) پر دیکھی جاسکتی ہے۔

لہذا شرعی ضابطہ سے قابو پانے کے بعد کوتاہی کرنا عند اللہ ناقابل معافی جرم ہوگا۔اور آخرت میں جواب دہی بھاری ہوجائے گی۔اور حضرت رسول اللہ ﷺ کو منہ دکھانا بھی مشکل ہوجائے گا۔فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۴/ ۳/ ۱۴۱۱ھ

شرعی حجت کیا کیا ہیں؟

فقہ حنفی کا مسئلہ ہے کہ اگر ایسے دیہات میں جہاں عید کی نماز نہ ہوتی ہو قربانی طلوع آفتاب کے بعد بغیر نماز عید پڑھے ہوئے کرلی جائے تو درست ہے، کیا حدیث شریف سے اس کا ثبوت ہے، یا آپ ﷺ کے زمانہ میں ایسا ہوا ہے، اگر ہوا ہے تو مع حوالۂ کتب جواب سے نوازیں؟

الجواب وباللہ التوفیق:

عبارت سوال اور اس کی پرواز سے معلوم ہوتا ہے کہ جناب کے نزدیک حجۃ شرعیہ صرف صراحۃً حدیث پاک یا آپ ﷺ کے زمانہ میں کسی واقعہ کا ہونا ہی ہے، ورنہ انہیں دو صورتوں میں حصر نہ فرماتے، بہر حال بعض چیزیں پیش خدمت ہیں ان کا حکم شرعی صرف انہیں دو اصولوں سے ارشا فرمائیں، تا کہ انہیں کی روشنی میں رہ کر مسئلہ مجوث عنہا کا حکمِ شرعی ارسال کیا جاسکے، بعض چیزیں باعثِ خلجان بنی ہوئی ہیں جو درج ذیل ہیں، ان کا حکم شرعی مدلل ومکمل طور پر مع حوالہ کتب عنایت فرمائیں تا کہ باعث رفع خلجان ہوسکے:

۱-ایک شخص کسی کا گھر غصب کر کے سالہا سال اس میں رہا پھر کسی طرح سے واگذار کرالیا تو اتنے دنوں تک غاصب جو اس میں رہا اس کا عوض دلایا جائے گا یا نہیں اگر نہ دلایا جائے تو اس پر کیا صریح حدیث ہے اور اگر عوض دلایا جائے تو کیا دلایا جائے اور اس پر کیا صریح حدیث ہے؟

۲-کوئی آفاقی مواقیت سے باہر باہر آفاق ہی آفاق میں گذرتا ہوا جدہ پہنچ جائے تو احرام کہاں سے باندھے اگر جدہ سے احرام باندھے تو اس پر کیا صریح حدیث ہے اور اگر جدہ پہنچ جائے تو احرام کہاں سے باندھے اور اس پر کیا حدیث

ہے اور اگر بلا احرام باندھے مکہ مکرمہ چلا جائے تو اس پر کیا حدیث کا حکم ہے اور کس حدیث سے ہے؟

کم از کم ان سب صورتوں میں کوئی حدیث شریف جناب کے پاس ہو تو بیان فرمائیں۔ پھر آنجناب کے اس مطلوبہ سوال کا جواب دیا جائے گا۔

اور اگر آنجناب کے نزدیک حجت شرعیہ اور بینۂ شرعیہ صرف احادیث صحیحہ ہی نہیں ہیں تو بیان فرمائیں کہ آپ کے نزدیک کیا کیا چیزیں حجت شرعیہ اور بینۂ شرعیہ ہیں اور کن دلائل سے ہیں؟

۳- یہ سب کے نزدیک مسلم ہے کہ کسی آفاقی کو بغیر احرام میقات کے اندر چلا جانا جائز نہیں ہے، اب اگر کوئی شخص مشرقی ممالک سے بغیر احرام باندھے ہوئے بذریعہ ہوائی جہاز سیدھا چل کر مواقیت کے اندر سے گزرتا ہوا جدہ پہنچ جائے تو یہ جائز ہوگا یا نہیں؟ اگر جائز ہوگا تو کس حدیث پاک سے؟ یا زمانہ رسالت کے کس عمل سے جائز ہوگا؟ اور اگر نا جائز ہوگا تو کس حدیث پاک سے یا زمانہ رسالت کے کس عمل سے؟ جبکہ اس زمانہ میں نہ ہوائی جہاز تھا اور نہ اس سے سفر ہوتا تھا، ذہن میں رکھ کر اس پر کوئی حدیث پیش فرمائیں، امید کہ اپنے ان دونوں مذکورہ اصولوں سے ان مستفسرہ چیزوں کا حکم شرعی بتلا کر ممنون فرمائیں گے۔ اور جب تک جناب کا ان ہی دونوں اصولوں کے تحت ان مستفسرہ چیزوں کا جواب نہ آئے گا احقر بھی کوئی جواب نہ دے گا، کیونکہ اس وقت جواب دینا وقت ضائع کرنے سے زائد کچھ نہیں۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی مفتی دارالعلوم دیوبند ۲۶/۱/۱۴۱۱ھ

تقلید کے بارے میں حضرت مولانا ظفر احمد صاحب کا بیان:

ہمارے حضرت مولانا خلیل احمد صاحب قدس سرہٗ کا بھانجہ مظاہر علوم سہارنپور سے فارغ ہو کر علیگڑھ میں ایک ڈاکٹر کا کمپاؤنڈر بن گیا۔ یہ ڈاکٹر صاحب جماعت اہل حدیث سے منسلک تھے اس نے اپنے کمپاؤنڈر کو بھی جماعت اہل حدیث میں شامل کرنے کی کوشش کی اور اپنے مسلک کی کتابیں مطالعہ کرنے کی ترغیب دی، تین سال تک وہ اس مسلک کی کتابیں دیکھتا رہا، بالآخر غیر مقلد بن گیا، تین سال کے بعد حضرت مولاناؒ سے ملنے سہارن پور آیا۔ اور آتے ہی صاف کہہ دیا کہ اب میں حنفی نہیں ہوں بلکہ اہل حدیث میں شامل ہو گیا ہوں، حضرت مولاناؒ کو بہت افسوس ہوا اور مدرسہ مظاہر علوم کے علماء سے فرمایا کہ اپنے اس شاگرد کو سمجھاؤ اور اس کے شبہات کا ازالہ کرو! تین دن وہ اساتذہ مظاہر علوم سے گفتگو کرتا رہا اور اپنے مسلک جدید پر جما رہا اتفاق سے اسی زمانے میں احقر بھی حضرتؒ سے ملنے کو تھانہ بھون سے سہارنپور پہنچ گیا، مجھے دیکھ کر

حضرتؒ بڑے خوش ہوئے اور فرمایا کہ تم بڑے اچھے موقع پر آئے۔ یہ تمہارا شاگرد حقیقت سے بیزار ہو کر جماعت اہل حدیث میں شامل ہو گیا ہے، تین دن سے علمائے مظاہر علوم اس کو سمجھا رہے ہیں مگر وہ اپنی بات پر جما ہوا ہے، تم بھی اس کو سمجھاؤ یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ وہ مجھ سے ملنے آ گیا، میں نے کہا انشاء اللہ تعالیٰ اس کا لحاظ رکھوں گا آپ بھی دعا اور توجہ سے مدد فرمائیں، چنانچہ حسب قرارداد بعد عشاء کے وہ میرے پاس آیا، جبکہ میں بستر پر لیٹ گیا تھا وہ پاؤں دبانے لگا میں نے انکار نہ کیا آخر تو شاگرد تھا اب حسب ذیل گفتگو ہوئی۔

ظفر: ہاں صاحبزادے! بتلاؤ اب تمہارا مسلک کیا ہے؟

شاگرد: جناب والا عمل بالقرآن تو سب سے پہلے ہے، اس کے بعد عمل بالحدیث الصحیح ہے۔

ظفر: اگر تمہارا یہ مسلک ہوتا تو پہلے عمل بالقرآن کو بیان کر کے پھر عمل بالحدیث کا نام لیتے۔

شاگرد: وہ تو ظاہر ہے، اس لیے بیان کرنے کی ضرورت نہ سمجھی۔

ظفر: یہ تم نے بات بنائی ہے، ورنہ واقعہ یہ ہے کہ اہل حدیث قرآن پر عمل نہیں کرتے، لیکن حنفیہ کا اصول یہ ہے کہ وہ اول قرآن کو دیکھتے ہیں پھر احادیث کو اور جس حدیث کو نص قرآن کے موافق پاتے ہیں اس کو ترجیح دیتے ہیں اور بعینہٖ احادیث کو اور جس حدیث کا اختلاف ہے ان کے لیے ہم نے اول قرآن کو دیکھا اور جن احادیث کو نصوص قرآنیہ کے موافق پایا ان کو ترجیح دی "قرأۃ فاتحہ خلف الامام" ہی کا مسئلہ لے لو! ہم نے اس کے لیے قرآن کو دیکھا سورۂ اعراف میں حق تعالیٰ کا ارشاد ہے: **"وإذا قرئ القرآن فاستمعوا له وأنصتوا لعلكم ترحمون"** (۱)۔

ترجمہ: (جب قرآن پڑھا جائے تو اس کو کان لگا کر سنو اور خاموش رہو امید ہے کہ تم پر رحم کیا جائے گا)۔

اس سے صاف معلوم ہوا کہ امام کے ساتھ قرأۃ نہ کرنا چاہئے، بلکہ قرآن کو سننا اور خاموش رہنا چاہئے، امام احمد ابن حنبلؒ کا قول ہے کہ یہ آیت بالاتفاق قرأت خلف الامام کے بارے میں نازل ہوئی ہے، اس کے بعد ہم نے حدیث کو دیکھا۔ تو یہ کسی بھی حدیث میں نہیں آیا: **"إذا قرأ الإمام فاقرؤا"** (جب امام قرأت کرے، تم بھی قرأت کرو) **"إذا كبر فكبروا، وإذا ركع فاركعوا، وإذا قال: سمع الله لمن حمده، فقولوا: ربنا لك الحمد، وإذا سجد فاسجدوا"** (۲)، تو حدیث میں موجود ہے (کہ جب امام تکبیر کہے تو تم بھی تکبیر کہو، جب رکوع کرے تو رکوع کرو! اور جب وہ

۱- سورۂ اعراف: ۲۰۴۔

۲- مسلم مع النووی رقم الحدیث: ۶۲ (۴۰۴)، ۴/ ۳۵۳۔

"سمع الله لمن حمده" کہے تو تم "ربنا لک الحمد" کہو، جب سجدہ کرے تو تم بھی سجدہ کرو! مگر یہ کہیں نہیں کہ جب امام قرأت کرے تو تم بھی قرأت کرو، بلکہ اگر ہے تو "إذا قرأ فانصتوا"(۱) ہے کہ جب امام قرأت کرے تو تم خاموش رہو، امام مسلم اور امام احمد نے اور بہت سے محدثین نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔ حنفیہ نے اس کو ترجیح دی اور بقیہ کو اپنے محامل حسنہ پر محمول کیا، آمین کے مسئلہ میں بھی حنفیہ نے اول کو دیکھا، چونکہ آمین دعا ہے، جیسا کہ امام بخاری نے اپنی صحیح میں بیان کیا ہے، اس لئے دعاء کے بارے میں قرآن کو دیکھا تو اس میں اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ملا: "ادعوا ربکم تضرعاً وخفیة" (۲) (اپنے رب سے تضرع کے ساتھ آہستہ دعا کرو) تو ہم نے اس مسئلہ میں شعبہؓ کی روایت کو ترجیح دی۔ جس میں وارد ہے: "فقال آمین وخفض بها صوتهٗ" (آپ ﷺ نے سورہ فاتحہ کے ختم پر آمین کہی اور آواز کو پست کیا، پس آہستہ سے آمین کہی) یہ حدیث ترمذی میں ہے، اس کے بعد رفع یدین کے بارے میں بھی ہم نے اول قرآن کو دیکھا تو حق تعالیٰ کا ارشاد: "قوموا لله قانتین" (۳) اور "الذین هم فی صلوتهم خاشعون" (۴)، پہلی آیت میں یہ ارشاد ہے کہ اللہ کے سامنے سکوت اور سکون کے ساتھ کھڑے ہوں، دوسری آیت میں فرمایا گیا ہے کہ جو لوگ نماز میں خشوع کرنے والے ہیں وہ کامیاب ہیں اور خشوع کے معنی بھی سکون ہی کے ہیں، اس کے بعد احادیث کو دیکھا تو صحیح مسلم میں روایت موجود ہے کہ صحابہ نماز میں سلام کے وقت ہاتھ اٹھا کر السلام علیٰ فلاں السلام علیٰ فلاں کہتے تھے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "ما لی أری لکم رافعی أیدیکم کأنها أذناب خیل شمس اسکنوا فی الصلوٰة" (۵) (یہ کیا حرکت ہے کہ تم اس طرح ہاتھ اٹھاتے ہو، جیسے گھوڑے دم اٹھاتے ہیں نماز میں سکون سے رہو)، اس حدیث سے معلوم ہوا کہ نماز میں سلام کے وقت بھی ہاتھ اٹھانا کیسے مناسب ہوگا کہ رکوع تو بالکل داخل صلوٰۃ ہے ہاں تکبیر تحریمہ میں ہاتھ اٹھانا درست ہے کہ وہ داخلِ صلوٰۃ یعنی رکن نہیں ہے، بلکہ شرط صلوٰۃ ہے، اس لیے حنفیہ نے ان روایات کو ترجیح دی جن میں رکوع کے وقت ترکِ رفع یدین ہے، اسی پر اور مسائل کو قیاس کرو! کہ حنفیہ اول قرآن میں دیکھتے ہیں پھر احادیث میں سے جو نصِ قرآن کے موافق یا قریب ہوں ان کو ترجیح دیتے ہیں۔

۱- مشکوٰۃ مع شرح الطیبی عن ابی ہریرہ وقتادہ رقم الحدیث: ۸۲۷ باب القراءۃ فی الصلاۃ ۲/ ۳۱۱۔

۲- سورہ اعراف: ۵۵۔

۳- سورۂ بقرہ: ۲۳۸۔

۴- سورہ مومنون: ۲۔

۵- عن جابر بن سمرہ، صحیح مسلم مع شرح النووی، رقم الحدیث: (۱۱۹)-(۴۳۰) کتاب الصلاۃ باب الامر بالسکون فی الصلاۃ (۲/ ۳۸۸) ط: دار ابی حیان ۱۹۹۵ء۔

شاگرد: واقعی میں نے ابتک اس نکتہ پر غور نہیں کیا تھا، مگر یہ شبہ اب بھی باقی ہے کہ حنفیہ بعض مسائل میں صحیح احادیث کے خلاف کرتے ہیں۔

ظفر: عزیز من پہلے تم صحیح حدیث کی تعریف تو بیان کرو! مگر دیکھو حدیث صحیح کی تعریف میں کسی کی تقلید نہ کرنا۔

شاگرد: (تقلید مت کرنا یہ سن کر کچھ دیر خاموش رہا اور پسینہ پسینہ ہوگیا پھر کہنے لگا) میں سمجھ گیا واقعی بغیر تقلید کے کسی حدیث کو صحیح کہنا مشکل ہے، پھر بخاری و مسلم و ترمذی وغیرہ کی تقلید تو جائز ہو۔ اور امام ابوحنیفہ و امام مالک و امام شافعی کی تقلید ناجائز ہو یہ کیونکر ہوسکتا ہے؟ اب میں مسلکِ اہلِ حدیث کو چھوڑتا ہوں اور مسلکِ حنفی اختیار کرتا ہوں۔

ظفر: تم بہت جلد سمجھ گئے اس سے دل خوش ہوا۔ مگر میں اس کی اچھی طرح وضاحت کردینا چاہتا ہوں کہ جو لوگ تقلید کا انکار کرتے ہیں اور تقلید کی مذمت کرتے ہیں وہ بھی کسی حدیث کو بغیر تقلید کے صحیح یا ضعیف یا حسن نہیں کہہ سکتے، رہا یہ عذر کہ حق تعالیٰ نے خبر صادق یا شہادتِ عادل کو حجت قرار دیا ہے تو یہ تقلید نہیں، بلکہ اتباعِ حجت ہے میں کہتا ہوں کہ حدیث کو صحیح یا ضعیف کہنا محض خبر نہیں، بلکہ اس کا مدار محدث کے ظن و اجتہاد پر ہے، بعض دفعہ سند کے راوی سب ثقہ ہوتے ہیں، مگر حدیث معلل ہوتی ہے اور علت کی معرفت حاذقین ہی کو ہوتی ہے، ہر محدث کو نہیں ہوتی، ابن ابی حاتمؒ نے "کتاب العلل" میں عبدالرحمٰن ابن مہدی کا قول نقل کیا ہے کہ حدیث کی معرفت بھی الہام ہے، ابن نمیر نے کہا کہ واقعی سچ ہے اگر محدث سے پوچھو کہ تم نے کیسے کہا کہ یہ حدیث صحیح ہے یا معلل ہے تو اس کے پاس کچھ جواب نہ ہوگا۔ احمد ابن صالح فرماتے ہیں کہ حدیث کی معرفت ایسی ہی ہے جیسے سونے اور پیتل کا پہچاننا کیونکہ جوہر کو جوہری ہی پہچانتا ہے پرکھنے والے سے اگر یہ پوچھا جائے کہ تم نے اس کو کھرا اور اس کو کھوٹا کیسے کہا تو وہ کوئی دلیل بیان نہیں کرسکے گا۔

اس حدیث سے ثابت ہوگیا کہ ائمہ حدیث کا کسی حدیث کو صحیح یا معلل کہنا محض خبر نہیں، بلکہ ان کا یہ قول ان کے ظن اور اجتہاد پر مبنی ہوتا ہے تو اس باب میں ان کی بات پر اعتماد کرنا عین تقلید ہے، علامہ ابن قیم کا یہ فرمانا کہ احکام میں تقلید نہیں، اس لئے صحیح نہیں کہ حدیثِ صحیح پر عمل کرنا شرعاً واجب اور ضعیف پر عمل کرنا غیر واجب اور موضوع پر عمل کرنا حرام ہے، تو یہ تقلید احکام ہی میں تو ہے غیر احکام میں تو نہیں، اس لیے فقہاء نے بحث سنت کو اور اس کے قبول و رد کے قواعد کو اصولِ فقہ میں بھی بیان کیا، علامہ ابن القیم کا اس کو اتباع کہنا تقلید نہ کہنا لفظوں کا ہیر پھیر ہے، حقیقت ایک ہی ہے:

عبارا تنا شتیٰ و حسنک واحد ۔۔۔ و کل الیٰ ذلک الجمال یشیر

عزیز من! قرآن شریف کا پڑھنا واجب ہے یا نہیں؟ یقیناً واجب ہے اور غلط پڑھنا حرام ہے، اب تم بتلاؤ کیا بغیر

ائمہ قرأت کی تقلید کے تم قرآن صحیح پڑھ سکتے ہو؟ ہرگز نہیں اور یہ بھی تقلید فی الاحکام ہی ہے، اسی طرح حدیث کو پہچاننا اور صحیح کو ضعیف سے الگ کرنا بھی واجب ہے اور اس میں تقلید ائمہ کے بغیر چارہ نہیں۔

پھر جماعت اہل حدیث کس منہ سے تقلید کا انکار کرتی ہے، پھر تم کو معلوم ہونا چاہئے کہ محدثین نے جو اصول حدیث کی صحت وضعف کے لیے مقرر کئے ہیں، ایسے ہی ہمارے فقہاء نے بھی صحت وضعف حدیث کے لیے کچھ اصول مقرر کیے ہیں جو اصولِ فقہ کی بحث السنہ میں مذکور ہیں، تو ہوسکتا ہے کہ ایک حدیث محدثین کے اصول پر صحیح اور ہمارے اصول پر ضعیف ہو تو اس میں نزاع کرنا غلط ہے۔ دلائل میں غور کرنا چاہئے کہ دلیل سے کس کے اصول قوی ہیں، آخر میں اتنا اور بتلادوں کہ حنفیہ سے زیادہ حدیث کا اتباع کوئی نہیں کرتا، حنفیہ تو قرونِ ثلاثہ میں مرسل اور منقطع کو بھی حجت مانتے ہیں۔ جس کو اہل حدیث رد کردیتے ہیں اور مراسیل ومقاطیع کا ذخیرہ احادیث مرفوعہ سے کم نہیں کچھ زیادہ ہی ہے، تو یہ لوگ حدیث کے آدھے ذخیرہ کو چھوڑتے ہیں، پھر مرفوعات میں سے بھی یہ لوگ صحیح یا حسن ہی کو لیتے ہیں ضعیف کو رد کردیتے ہیں اور حنفیہ کے نزدیک حدیث ضعیف بھی قیاس سے مقدم ہے، بلکہ قول صحابی وقول تابعی کبیر بھی قیاس سے مقدم ہے، اب تم ہی بتلاؤ کہ عامل بالحدیث کون ہے اور تارکِ حدیث کون؟

رہا یہ کہ بعض مسائل میں حنفیہ حدیث صحیح کو چھوڑ دیتے ہیں۔ اس کا جواب میں پہلے دے چکا ہوں کہ اس صورت میں جس حدیث پر حنفیہ نے عمل کیا ہے وہ ان کے اصول پر صحیح تھی، گو محدثین کے نزدیک ضعیف ہو، حنفیہ کے نزدیک صحت حدیث کا مدار صرف سند پر نہیں اس کے لیے کچھ اور بھی شرائط ہیں۔ جو اصولِ فقہ میں مذکور ہیں، اور ہم نے مقدمہ ''اعلاء السنن'' میں بھی ان کو بیان کردیا ہے اور مقدمہ ''اعلاء السنن'' کے دوسرے حصہ میں تقلید واجتہاد پر مفصل کلام کیا گیا ہے۔ جو زیر طبع ہے۔

شاگرد: الحمدللہ اب میری آنکھیں کھل گئی ہیں اور میں اہلِ حدیث کے مغالطہ سے نکل گیا ہوں۔

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

۱- فقہ ائمہ اربعہ کی تقلید کے سلسلے میں مفصل بحث:

۱- ہمارے بھائی صاحب کا کہنا ہے کہ فقہ اور دوسرے علوم صحیح نہیں ہیں۔ اور اگر صحیح وسچا علم ہے تو قرآن وحدیث ہے، باقی سب دین میں نئی چیز ہے جو بدعت ہے، اور جو چیز قرآن وحدیث میں نہ ہو وہ باطل ہے۔

۲–چار ائمہ امام ابوحنیفہؒ، امام شافعیؒ، امام احمد ابن حنبلؒ، امام مالکؒ ان میں کسی کی تقلید نہیں کرنا، کیا حضور ﷺ کے زمانہ میں کوئی کسی کی تقلید کرتے تھے، یا حضور ﷺ اس کا حکم دیتے تھے۔

۲–انبیاء واولیاء کے وسیلہ سے دعاء مانگنا:

حضور ﷺ اور انبیائے کرام واولیاء اللہ کے وسیلہ سے اللہ تعالیٰ سے دعا مانگنا کہاں تک درست ہے، یہ بندہ وسیلہ کا قائل نہیں ہے، وسیلہ جائز ہے تو حدیث کا حوالہ دیجئے۔

۳–حضور ﷺ کی ولادت کے موقع پر سیرت کا بیان:

حضور ﷺ کی ولادت مبارکہ پر سیرۃ النبی بیان کرنا درست ہے یا نہیں۔

۴–حضور ﷺ غیب جانتے تھے؟

حضور ﷺ غیب کی بات جاننے والے تھے یا نہیں۔ بعض واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور ﷺ غیب کی بات جانتے تھے۔

الجواب وباللہ التوفیق:

(۱) قرآن کریم اور احادیث رسول اللہ ﷺ کے سچا اور اصح ہونے سے کسے انکار ہے یہ تو عین دین اور عین ایمان ہے۔ باقی ہر فقہ یا ہر اس چیز کو جو قرآن میں نہ ملے اس کو مطلقاً باطل کہہ دینا یا بدعت قرار دے دینا غلط ہے، بدعت تو نام ہے اس چیز کا جو کسی اعتبار سے دین نہ ہو، اس کو دین قرار دے دینا، یعنی **"من أحدث في الإسلام رأيا لم يكن له من الكتاب والسنة سند ظاهر وخفي ملفوظ أو مستنبط فهو مردود"** (۱)، "وهو" مصداق ہے: **"من أحدث في أمرنا ما ليس منه فهو رد"** (۲) کا............... اور اگر کوئی لغوی اعتبار سے کہے تو بدعت کی دو قسمیں ہیں ایک بدعت سیئہ، دوم بدعت حسنہ، سوایسے علوم کا ایجاد کرنا اور ان کو رائج کرنا اور سیکھنا اور سکھانا، حدیث: **"من سن سنة حسنة فعمل بها كان له أجرها ومثل أجر من عمل بها لا ينقص من أجورهم شيئاً، ومن سن سنة سيئة فعمل بها كان عليه وزرها ووزر من عمل بها من بعده لا ينقص من أوزارهم شيئاً"** (۳) (جو شخص دین میں کوئی اچھا طریقہ

۱– مرقاۃ شرح مشکوۃ ۱/ ۱۷۷۔

۲– سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: ۱۲، ۱/ ۶، مسلم کتاب الاقضیہ۔

۳– ابن ماجہ رقم الحدیث: (۱۹۱) عن المنذر بن جریر عن ابیہ ۱/ ۳۹–۴۰۔

ایجاد کرے اور اس کے چلائے ہوئے طریقہ پر کوئی عمل کرے تو ایجاد کرنے والے کو اس ایجاد کرنے کا بدلہ ہے اور جو شخص اس طریقہ پر عمل کر رہا ہے اس کا بدلہ اس ایجاد کرنے والے کو ملتا ہے اور اس عمل کرنے والے کے ثواب سے کچھ کم نہیں کیا جاتا، اور جو شخص دین میں ایسا طریقہ ایجاد کرے جو شرعاً مذموم اور مقتضائے شرع کے خلاف ہو تو اس ایجاد کرنے والے پر اس کا بدلہ (وزر) ہے، اور جو شخص اس ایجاد کردہ طریقہ کو اپنا رہا ہے اس کا بھی بدلہ (وزر) ہے اور اس عمل کرنے والے کے وزر میں سے کچھ کم نہ کیا جائے گا) کے تحت داخل ہوگا، اس لئے کہ اس حدیث سے دین میں اچھا طریقہ ایجاد کرنا مراد ہے جس کا ثبوت آپ ﷺ اور آپ ﷺ کے اصحاب سے نہ ملے اور وہ طریقہ مقتضائے شرع کے خلاف نہ ہو(۱)۔

لیکن مشاہدات نے ثابت کر دیا کہ ان علوم کا ایجاد ہونا دین کے لیے خیر اور برکت کا موجب رہا، مثلاً پہلی صدی کے اواخر میں اسلام جب ترقی کر کے عرب سے عجم تک پہنچا، لوگوں کے سامنے قرآن کریم اور آنحضور ﷺ کی احادیث پہنچیں اور ایک ہی شخص نے کئی کئی راویوں سے روایت کو سنا اور روایتیں راویوں کے اختلاف سے کہیں ان کی سمجھ کے مطابق متعارض معلوم ہوئیں تو ان کے ذہنوں میں ایک قسم کا الجھاؤ پیدا ہوا کہ کیا دین ہے کہ اس کے مسائل میں خود تعارض ہے، حالانکہ دونوں راویوں کی روایتیں صحیح ہوتیں۔ ایک راوی نے کسی موقع پر آپ سے کچھ اور عمل اور قول کا مشاہدہ کیا دوسرے نے کچھ اور، فرق اتنا تھا کہ ایک راوی کو ناسخ ومنسوخ کا علم نہ ہوسکا، اور انہوں نے منسوخ حکم کو روایت کر دیا، دوسرے راوی اس فرق کو سمجھ گئے۔ چنانچہ عوام کا جب یہ ذہنی الجھاؤ ان کے دلوں میں جگہ کر گیا تو اس نے بہت سے نئے فرق باطلہ کو جنم دیا، مثلاً قدریہ، مرجیہ، معتزلہ، جہمیہ وغیرہ جن سے اس وقت کے علماء مثلاً امام ابوحنیفہ نے مناظرہ بھی کیا جس سے علم کلام وجود میں آ گیا، ادھر دوسری جانب جب زمانہ گذرتا گیا نئی نئی ضرورتیں بڑھتی گئیں۔ پھر اسلامی حکومتوں کی وسعت سے نئے نئے مسائل پھیلتے گئے۔ اور مزاجوں میں بڑی تیزی سے انقلاب آ رہا تھا۔ سادہ دلی اور سادہ زندگی جو صحابۂ کرام کا شیوۂ خاص تھا ختم ہوتا جا رہا تھا۔ طبیعتوں میں سہل پسندی بڑھتی جا رہی تھی۔ اس لیے حالات کا تقاضا ہوا کہ کتاب وسنت کی تعلیمات اس انداز سے مرتب ہوں کہ صحابۂ کرامؓ کے تمام احوال تلاش کیے جائیں۔ اور دین کا سارا ذخیرہ سامنے رکھ کر ایسے جاذب اور سہل انداز میں بیان ہو کہ جسے عالم وجاہل، ذہین وغبی، عربی وعجمی ہر ایک بآسانی سمجھ لے، اور جو مسائل صراحۃً کتاب وسنت اور اقوال صحابہ کرامؓ میں موجود نہیں وہ علماء کے باہمی فکر ونظر وبحث وتمحیص سے کتاب وسنت سے اس طرح مستنبط ہوں کہ آنے والی نسلیں پریشانی سے دو چار نہ ہونے پائیں، اور ساتھ ہی ان کی عجلت پسند اور سہل طلب طبیعتیں غلطی سے محفوظ رہیں، غرض

۱- قواعد الفقہ / ۲۰۴۔

اس طرح اس فن کو مرتب کر کے ان ائمہ مجتہدین نے امت کو ایک عظیم فتنہ سے بچالیا۔ پھر اس کو غلط یا بدعت کہنا کیوں کر صحیح ہوگا، بلکہ بعض باتیں یا بعض علوم جو نوایجاد معلوم ہوں، لیکن وہ کتاب وسنت کے مخالف نہ ہوں، بلکہ ان سے کتاب وسنت کی تسہیل وتشریح ہوتی ہو، یا کسی فتنہ کی روک تھام اس کے بغیر ممکن نہ ہو تو ایسی صورت میں نہ صرف یہ کہ اس کا ایجاد کرنا مباح یا مستحب ہوگا، بلکہ فرض بھی ہو سکے گا۔ صورت مسئولہ عنہا میں جب کہ علم فقہ سراسر علوم قرآن واحادیث صحیح کی تشریح اور آسان تفسیر ہے اور یہ علوم ان کے خلاف نہیں، بلکہ موافق ہیں، چنانچہ امام ابوحنیفہؒ جن کو تدوین فقہ میں خاص اہمیت حاصل ہے ان کے بہت سے اقوال ایسے ملیں گے جن میں تصریح ہے کہ اگر میرے قول کے خلاف کتاب وسنت سے کوئی دلیل مل جائے تو اسی کو اختیار کرو، اور میری بات کو ترک کردو، چنانچہ ''عقود رسم المفتی'' میں ہے: **"فاعلم أن أباحنيفةؒ من شدة احتياطه وعلمه بأن الاختلاف من آثار الرحمة، قال لأصحابه: إن توجه لكم دليل فقولوا به"** (۱)۔

اسی طرح ''کتاب المیزان'' میں مندرجہ ذیل عبارت مرقوم ہے: **"وقد روى الشيخ محي الدين في الفتوحات المكية عن الإمام أبي حنيفة رضي الله تعالىٰ أنه كان يقول: إياكم والقول في دين الله تعالى بالرأي وعليكم باتباع السنة فمن خرج عنها ضل"** (۲) (شیخ محی الدین ابن عربی نے ''فتوحات مکیہ'' میں امام صاحب کی طرف منسوب کر کے ایک قول نقل کیا ہے کہ آپؒ فرمایا کرتے تھے کہ اللہ کے دین میں محض رائے کی بنیاد پر حکم کرنے سے بچو، اور اپنے اوپر سنت کی پیروی ضروری کرلو، اس لیے کہ جو اس سے خارج ہوگیا، گمراہ ہوگیا)۔

اسی طرح ''عقد الجید'' میں مندرجہ ذیل عبارت مرقوم ہے: **"سئل أبو حنيفة إذا قلت قولا وكتاب الله يخالفه قال: اتركوا قولي بكتاب الله، فقيل: إذا كان خبر الرسول ﷺ يخالفه؟ قال: اتركوا قولي بخبر رسول الله ﷺ، فقيل: إذا كان قول الصحابةؓ يخالفه؟ قال: اتركوا قولي بقول الصحابة"** (۳)۔

(امام صاحبؒ سے پوچھا گیا کہ آپؒ کے قول کی کتاب اللہ سے مخالفت ہوتی ہو تو ایسی حالت میں کیا کیا جائے؟ آپؒ نے فرمایا کتاب اللہ کے مقابلہ میں میرا قول ترک کردو۔ کہا گیا اگر حدیث رسول اللہ ﷺ سے اس کی مخالفت ہوتی ہو تو؟ فرمایا آنحضرت ﷺ کے قول کے مقابلہ میں میرا قول چھوڑ دو۔ کہا گیا کہ ایسا ہی قول صحابہؓ اس کے خلاف ہو تو؟ فرمایا قول صحابہؓ کے مقابلہ میرا قول ترک کردو)۔ یعنی میرے قول کی وقعت اس صورت میں قطعاً نہیں، جب وہ ان میں سے کسی

۱- عقود رسم المفتی ۶۵-۶۶ مطبوعہ سہارنپور۔

۲- ۱۲/۱۱/۵۱۔

۳- عقد الجید للشاہ ولی اللہ/۲۶۔

کے بھی خلاف ثابت ہو۔ غرض ان اقوال سے معلوم ہوتا ہے کہ استنباط مسائل میں کتاب اللہ وسنت رسول اللہ ﷺ کی مخالفت کا ادنیٰ شائبہ بھی ان کی نظر میں کس قدر کانٹے کی طرح چبھتا تھا۔ پھر استنباط مسائل میں اول کتاب اللہ کو ترجیح ہوتی اگر اس میں نہ مل پاتا تو سنت رسول اللہ ﷺ پر عمل کرتے، اگر اس میں نہ ملتا، اقوال صحابہؓ اختیار کرتے۔ اگر صحابہ کرامؓ کا بھی کوئی خاص قول مرجح نہ ہوتو اقرب الی القرآن والسنۃ کو لیتے، جیسا کہ ''الخیرات الحسان'' کی مندرجہ ذیل عبارت سے معلوم ہوتا ہے: **"فقد جاء عن أبي حنيفة من طرق كثيرة ما ملخصه أنه أولا يأخذ بما في القرآن، فإن لم يجد فبالسنة، فإن لم يجد فبقول الصحابة، فإن اختلفوا أخذ بما كان أقرب إلى القرآن أو السنة من أقوالهم ولم يخرج عنهم، فإن لم يجد لأحد منهم قولا لم يأخذ بقول أحد من التابعين، بل يجتهد كما اجتهدوا"** (۱)، ان سب اقوال وعبارات سے پتہ چلتا ہے کہ علم فقہ کوئی ذہنی یا خود سنت کے معارض نہیں۔ پھر بھی اس کا انکار کرتے ہوئے اس کو بدعات میں شمار کرنا خود کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ﷺ سے ہی انحراف ہے، حضرت عبد اللہ بن عباسؓ کا بیان ہے: **"فقيه واحد أشد على الشيطان من ألف عابد"** (۲)، (ایک فقیہ شیطان پر ہزار عابدوں سے زیادہ بھاری ہے)۔ ایک دوسری حدیث میں فرمایا گیا ہے: **"من يرد الله به خيرا يفقهه في الدين"** (۳)۔ نیز فرمایا: **خيار كم في الجاهلية خيار كم في الإسلام إذا فقهوا"** (۴)۔ یہ سب روایات وعبارات بتلاتی ہیں کہ علم فقہ کا انکار کرنا الشمس فی نصف النہار کا انکار کرنا ہے۔

(۲) مطلق تقلید کو تمام محققین اہل حدیث بھی تسلیم کرتے ہیں اور اہل حدیث مطلق تقلید کی فرضیت کے قائل ہیں، مطلق تقلید کی فرضیت کے لئے چند دلائل ذکر کئے جاتے ہیں قرآن کریم میں ارشاد ربانی ہے: **''فاسئلوا أهل الذكر إن كنتم لا تعلمون"** (۵) (اگر تم نہیں جانتے تو اہل علم سے دریافت کرلو)، **"أطيعوا الله وأطيعوا الرسول وأولي الأمر منكم''** (۶) (اللہ کی اطاعت کرو، اور رسول کی اطاعت کرو، اور اولی الامر کی) کی تفسیر حضرت جابرؓ اور حضرت ابن عباسؓ اور حضرت عطاء اور مجاہد اور ضحاک اور ابو العالیہ اور حسن بصری وغیرہم نے خلفاء، علماء اور فقہاء سے کی ہے، اس تفسیر کو

۱- الخیرات الحسان ۲۹۔
۲- مشکوٰۃ شریف کتاب العلم ۱/۷۷۳ مع شرح الطیبی۔
۳- بخاری مع الفتح ۱/۱۶۴ رقم الحدیث: (۷۱)، مسلم (۱۰۳۷)۔
۴- فیض القدیر للمناوی ۳/۶۲۰ رقم الحدیث (۳۹۸۷) بخاری عن ابی ہریرۃ، کنز العمال حدیث نمبر: (۲۸۷۸۰)۔
۵- سورۂ انبیاء: ۷۔　　۶- سورۂ نساء: ۵۹۔

مولانا صدیق حسن صاحب رئیس اہل حدیث بھی اپنی تفسیر میں قبول کرتے ہیں، نیز حدیث میں ہے فرمایا گیا:"إنما شفاء العيّ السؤال"(۱)(نہ جاننے والوں کی شفاء سوال کر لینے میں ہے)۔غرض یہ تو واضح ہے کہ نہ جاننے والوں کے لئے تقلید ضروری ہے، اب کلام اس میں ہے کہ ہر وہ شخص جس کو لغت عرف میں عالم کہا جاتا ہے اس تقلید کے کام کو انجام دے سکتا ہے یا کوئی خاص عالم وفقیہ مراد ہے، علماء سلف نے ایسے عالم کا جس کی تقلید کرنی چاہئے، ایک معیار مقرر کیا ہے، حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ اپنی "عقد الجید فی احکام الاجتہاد والتقلید" میں تحریر فرماتے ہیں:

"الاجتهاد على ما يفهم من كلام العلماء استفراغ الجهد في إدراك الأحكام الشرعية الفرعية عن أدلتها التفصيلية الراجعة كلها إلى أربعة أقسام الكتاب والسنة والإجماع والقياس (إلى أن قال): وشرطه أن لا بد أن يعرف من الكتاب والسنة ما يتعلق بالأحكام ومواقع الإجماع، وشرائط القياس وكيفية النظر وعلم العربية والناسخ والمنسوخ وحال الرواة، ثم قال: ولا بأس أن يورد الكلام البغوي في هذا الموضع، قال البغوي: والمجتهد من جمع خمسة أنواع من العلم: علم كتاب الله عزوجل، علم سنة رسول الله ﷺ، أقاويل العلماء السلف من إجماعهم واختلافهم، وعلم اللغة، وعلم القياس إلى أن قال، انتهى كلام البغوي"(۲)۔

(اجتہاد کی تعریف جو کلام علماء سے سمجھی جاتی ہے یہ ہے کہ خوب محنت کرتا ہو دریافت کرنے میں شریعت کے احکام فرعی کو ان کی تفصیلی دلیلوں سے جن کی کلیات کا مآل چار قسم، کتاب اللہ، سنت اور اجماع اور قیاس ہے، اور اجتہاد کی یہ شرط ہے کہ اجتہاد والے کو ضروری ہے کہ قرآن وحدیث اس قدر جانتا ہو کہ جو احکام سے متعلق ہو، اور اجماع کے موقعوں اور قیاس صحیح کی شرطوں اور نظر کی کیفیت اور علم عربیت اور ناسخ ومنسوخ اور راویوں کے حال سے واقف ہو (ترجمہ اسی طرح آخر تک)۔

اب خلاف تقلید شخصی میں رہا (یعنی کسی امام معین کی تقلید ہر مسئلہ اور حکم میں کرنا) یہ علماء اہل سنت والجماعت کے نزدیک واجب ہے، کیونکہ مطلق جس کے دو فرد ہیں شخصی اور غیر شخصی، یعنی ایک معین شخص کی تقلید، اور غیر معین شخص کی تقلید، غیر معین شخص تو اس لئے جائز ہوا کہ اس مطلق فرض کو اس کے جس فرد میں چاہیں ادا کریں، تقلید غیر معین شخص کی بھی کر کے اس فریضہ سے ایسے ہی بری ہو سکتے ہیں، جیسے تقلید شخص معین کی کر کے بری ہو سکتے ہیں، کیونکہ مامور بہ جب مطلق بولا جاتا ہے تو

۱- مشکوۃ المصابیح باب التیمم/۵۵۔

۲- عقد الجید فی أحکام الاجتہاد والتقلید/۔

لاعلی التعیین اس کے کسی بھی فرد کوادا کردینے سے بری الذمہ ہوجاتا ہے، صحابہ کرامؓ اور تابعینؒ کے زمانہ میں دونوں پر عمل ہوتا رہا، لیکن دوسری صدی کے اخیر میں جب دیکھا گیا کہ مذاہب مجتہدین بکثرت پیدا ہوگئے ہیں، بہت کم احکام ایسے باقی رہے جن کی حرمت وجواز یا کراہت واستحباب میں خلاف نہ ہوا، پھر ابنائے زمانہ میں ہوا وہوس کا غلبہ بھی ہوا، وہ رخصتوں کو تلاش کرنے لگے، جس امام مجتہد کا جو مسئلہ اپنی خواہش کے مطابق دیکھا اسی کو اختیار کرلیا، یہاں تک کہ اندیشہ ہوگیا کہ یہ دین متین خواہشات کا مجموعہ نہ بن جائے، اس زمانہ کے دوراندیش علماء نے اس ضرورت کو محسوس کیا کہ اب تقلید غیر معین شخص میں اتنے بڑے مفاسد پیدا ہوگئے، اور آئندہ ان سے بھی بڑے مفاسد کا اندیشہ ہے، اس لئے مصلحت وقت اور شرعی تقاضا یہ ہے کہ سب لوگوں کو تقلید شخصی پر جمع کردیا جائے، چنانچہ ''الانصاف'' مصنفہ حضرت شاہ ولی اللہ قدس سرہ میں ہے: **"وبعد المائتين ظهر فيهم التمذهب بالمجتهدين بأعيانهم وكان هذا هو الواجب في ذلك الزمان"** (۱) (دوسری صدی کے لوگوں میں خاص ائمہ کے مذہب کی پابندی شروع ہوگئی)، تقلید شخصی کی مثالیں دور صحابہ میں بکثرت ملیں گی۔ مثلاً ابوداؤد مجتبائی میں روایت ہے: **"عن عمر بن ميمونؓ قال: قدم علينا معاذ باليمن رسول رسول اللهﷺ - إلى قوله -: فألقيت محبتي عليه فما فارقت حتى دفنته بالشام ميتاً ثم نظرت إلى أفقه الناس بعده فأتيت ابن مسعودؓ فلزمته حتى مات"** (۲) (عمر بن میمون کہتے ہیں کہ جب معاذ بن جبلؓ یمن میں رسول اللہ ﷺ کے قاصد ہوکر تشریف لائے تو میں نے ان سے محبت کی، اور ان سے اس وقت تک جدا نہیں ہوا یہاں تک کہ میں نے ان کو شام میں دفن کردیا، اس کے بعد میں نے دیکھا کہ اب افقہ الناس کون ہے تو حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ کے پاس آیا، اور ان کی خدمت میں رہا، یہاں تک کہ ان کا انتقال ہوگیا)۔ نیز حضرت محدث الہند شاہ ولی اللہ تحریر فرماتے ہیں: **"اختلف في كثير من الأحكام واتبعه في ذلك أصحابه من أهل مكة"** (۳) (حضرت ابن عباسؓ نے جب مکہ میں اقامت فرمائی تو بہت سے مسائل میں دوسرے صحابہؓ کے خلاف کیا، اور بہت سے اہل مکہ نے حضرت ابن عباسؓ کو مرجع بنا کر انہیں کے فتوی پر عمل کیا، نیز ''حجۃ اللہ البالغہ'' ہی میں تحریر فرماتے ہیں: **"وكان إبراهيم وأصحابه يرون ابن مسعود وأصحابه أثبت الناس في الفقه"** (۴) (ابراہیم نخعی اور ان کے تلامذہ حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ اور ان کے تلامذہ کو فقہ میں اثبت الناس سمجھتے

۱- الانصاف ۴۴۔
۲- حوالہ سابق۔
۳- حوالہ مذکور۔
۴- حوالہ سابق۔

تھے بحل خلاف میں انہیں کے قول کو ترجیح دیتے تھے، اور تقلید شخصی کا اس سے زیادہ کوئی مفہوم نہیں ہے، الحاصل تقلید زمانہ آنحضرت علیہ میں خود آپ علیہ کے حکم سے ہوئی، اور پھر صحابہؓ میں ہمیشہ رہی، بعض حضرات نے مطلق تقلید سے کام لیا اور بعض نے تقلید شخصی سے۔

اب رہا یہ سوال کہ ان چار ائمہ ہی کی تقلید کیوں کی جاتی ہے سو اس کا جواب یہ ہے کہ ان ائمہ پر تقلید کا ختم ہونا کوئی امر عقلی یا شرعی نہیں ہے، بلکہ اتفاقی ہے، مشیت خداوندی سے ان چار مذاہب کے سوا اور جتنے مذاہب تھے مندرس ہو گئے، اور مٹ کر کالعدم ہو گئے، کیونکہ دس بیس پچاس یا سو مسائل اگر کچھ مجتہدین سے منقول ہیں تو وہ مستقل مذہب نہیں بن سکتے، کہ لوگ اس کی تقلید کیا کریں، اگر ان سو پچاس احکام میں ان کی تقلید کر بھی لی تو دیگر مسائل میں کیا کریں گے۔ اب جب دیکھا کہ ان چار مذہبوں کے علاوہ کل مذاہب کالعدم قرار پائے تو مسئلہ تقلید ان ہی چاروں ائمہ کے مذاہب پر منحصر ہو گیا۔

حضرت شاہ ولی اللہؒ نے اس تقلید للمجتہدین اور اس تقلید پر اجماع کے بارے میں فرمایا: "**فالتمذهب للمجتهدين سر ألهمه الله تعالى وجمعهم عليهم من حيث يشعرون أو لا يشعرون**" (۱) (عوام الناس کا ان مجتہدین کے مذاہب کو اختیار کرنا اور اس پر اجماع ہونا خواہ وہ جانتے ہوں یا نہ جانتے ہوں یہ من جانب اللہ الہام ہے)۔

جب مذکورہ دلائل سے یہ بات واضح طور پر ثابت ہو گئی کہ مسئلہ تقلید اتفاقی طور پر ان چاروں مذاہب میں منحصر ہو گیا تو اب تقلید ان کے خلاف کی کرنا جائز نہ رہا، چنانچہ طحطاویؒ حاشیہ درمختار میں تحریر فرماتے ہیں: "**من كان خارجاً عن هذه الأربعة، فهو من أهل البدعة والنار**" (علامہ طحطاویؒ ان چاروں ائمہ کے مذہب کی تقلید سے خارج ہونے والے کو اہل بدعت ونار میں شمار کرتے ہیں)، اسی طرح فقہ کی دوسری کتابوں میں علماء فقہ نے اس بات کی تصریح کر دی ہے کہ تقلید شخص غیر معین پر عمل کرنا ضلال وگمراہی اور آخرت میں خسارہ کا موجب ہے۔

۳- تحت السرہ ہاتھ باندھ کر نماز پڑھنے کی حدیث ابوداؤد نسخہ ابن عربی میں موجود ہے، بہتر ہے کہ "بذل المجہود شرح ابوداؤد مطبوعہ کتب خانہ یحیوی سہارنپور میں دیکھ لیا جائے، نیز مصنف ابوبکر بن ابی شیبہ میں بھی موجود ہے، ابوداؤد کی روایت کا متن حسب ذیل ہے: "**عن أبي وائل عن أبي هريرة أخذ الكف عن الكف في الصلاة تحت السرة**" (۲)، اسی طرح ابوبکر ابن ابی شیبہ کی عبارت حسب ذیل ہے: "**ليضع يمينه على شماله في الصلاة تحت**

۱- الانصاف فی سبب الاختلاف ۴۷۔
۲- بذل المجہود ۲/ ۲۳۔

السرة"۔اسی طرح ابوداؤد میں اس مسئلہ سے متعلق مندرجہ ذیل روایت بھی موجود ہے:"عن جریر الظبی عن أبیه قال: رأیت علیا یمسک شماله بیمینه علی الرسغ فوق السرة"(۱)۔حضرت علیؓ کی اس روایت میں فوق سے مراد اتصالاً علی فوق السرہ ہے، نہ کہ فوق منفصلا، جیسا کہ قرآن کریم کی آیت:"إنی أرانی أحمل فوق رأسی خبزا"(۲)۔وایضاً:"وجعل فیها رواسی من فوقها" میں ہے۔

۴-اللہ تعالی سے دعا کرنے اور اپنی حاجت طلب کرنے میں کسی نبی یا ولی کو بطور وسیلہ کے ذکر کرنا اور یوں کہنا: اے اللہ! بوسیلہ فلاں نبی یا فلاں ولی میرے حال پر رحم فرما، اور میری فلاں حاجت پوری فرما، یہ جائز ہی نہیں، بلکہ مسنون بھی ہے اور اجابت دعا میں نہایت موثر ہے۔آنحضرت ﷺ نے ایک صحابیؓ کو دعا کرنے کا اس طرح طریقہ تعلیم فرمایا تھا:"اللهم إنی أسئلک وأتوجه إلیک بنبیک محمد نبی الرحمة"(۳)۔ایسے ہی عمر فاروقؓ کا معمول تھا کہ جب قحط پڑتا تو حضرت ابن عباسؓ کے توسل سے بارش کی دعا مانگتے اور کہتے:"اللهم إنا کنا نتوسل إلیک بنبینا فتسقیا وانا نتوسل إلیک بعم نبینا فاسقنا فیسقون"(۴)۔اسی وجہ سے ہمارے علماء دیوبند توسل کے قائل ہیں، کیونکہ توسل دراصل اللہ کی وہ رحمت ہے جس سے خدا کا مقبول بندہ نوازا گیا ہے، کسی نبی یا ولی کو وسیلہ بنانے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کی خاص رحمت کو جو اس بندے پر ہے وسیلہ بنایا گیا ہے، ناجائز توسل وہ ہے کہ جس میں غیر اللہ کو مطلب برآری کے لئے معین اور فریادرس سمجھا جائے، اور دل میں عقیدہ رکھا جائے کہ میری اس حاجت کو یہی پورا کرنے والے ہیں، یہ توسل ناجائز اور حرام ہے قرآن کریم میں ہے:"إن الله لا یغفر أن یشرک به ویغفر ما دون ذلک لمن یشاء"(۵)۔

۵-کسی بزرگ یا ولی بلکہ ہر مسلمان کی قبر پر فاتحہ پڑھنا جائز ہے، لیکن اس میں بدعات چادر چڑھانا، دیگر اشیاء خوردنی چڑھانا یا کھانے کے سامنے فاتحہ پڑھنا ایسا ثابت نہیں، بلکہ ایصال ثواب کا جو طریقہ کتاب وسنت سے ثابت ہے وہ یہ ہے کہ مثلاً کسی نے خدا کی راہ میں روپیہ پیسہ دے کر یا کپڑا، طعام وغیرہ دے کر خدا سے دعا کی کہ اے اللہ! اس کا ثواب جو کچھ مجھے ملا ہے وہ فلاں کو پہنچا دیجئے یا اسی طرح قرآن کریم یا ایک آدھ سورت تلاوت کر کے یا اور کوئی نیک عمل کر کے

۱- حوالہ مذکورہ ۲/ ۲۴۔

۲- سورۂ یوسف: ۳۶۔

۳- ترمذی شریف ۲/ ۱۹۷، مشکوۃ شریف/ ۱۱۹، حصن حصین منزل خامس/ ۱۵۱، ابن ماجہ/ ۱۰۰۔

۴- الصحیح للبخاری ۱/ ۱۳۷۔

۵- سورۂ نساء: ۴۸۔

خدائے تعالی سے ایصال ثواب کی دعا کی جائے تو یہ طریقہ احسن وعمدہ ہوگا اور اتنا ہی قرآن وحدیث سے ثابت ہے، اس کے علاوہ اس میں ہونے والی سب خرافات ایجاد کردہ ہیں، جن کو ساتھ ملانا بجائے ثواب کے عذاب کا موجب ہوگا۔

٦- آنحضور ﷺ کے یوم ولادت میں آپ کی پیدائش کے وقت کے صحیح حالات یا پوری زندگی کے حالات بیان کرنا یا سننا سنانا ایک ایسا عمل ہے جس کے مستحسن ہونے کا ادنی سی تعلیم رکھنے والا مسلمان بھی انکار نہیں کرسکتا، کیونکہ بلاشبہ نبی ﷺ کی سیرت پاک اور آپ ﷺ کے حالات ومقالات کا مسلمانوں تک خصوصاً اور تمام عالم میں عموماً صحیح صورت میں شائع کردینا اسلام اور مسلمانوں کا اہم ترین فریضہ ہے۔

لیکن اس دور میں مشاہدہ سے ثابت ہے کہ اس مروجہ طریقہ پر مذکورہ فعل، اسلام اور مسلمانوں کے لئے مضر ہی نہیں، بلکہ ایک شیطانی تلبیس بھی ہے کہ جس سے بعض سادہ دل مسلمان دھوکہ میں پڑجاتے ہیں۔ اس لئے کہ برے کام کو نیک سمجھ کر کرنا یہ دوہرا گناہ ہے، چنانچہ فرمایا: "**من ابتدع في الإسلام بدعة يراها حسنة فقد زعم أن محمداً ﷺ خا ن الرسالة ؛لأن الله تعالي يقول: "اليوم أكملت لكم دينكم الخ، فما لم يكن يومئذ ديناً لا يكون اليوم ديناً**"(١) (جو شخص اسلام میں کوئی بدعت ایجاد کرے جس کو وہ نیکی سمجھتا ہو گویا کہ وہ اس کا مدعی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے اللہ تعالی کے احکام امت کو پہنچانے میں خیانت کی (کہ یہ نیکی ان کو نہیں بتلائی)، کیونکہ حق تعالی کا ارشاد ہے کہ آج میں نے تمہارا دین کامل کردیا جو چیز اس دین میں داخل نہیں تھی وہ آج بھی دین نہیں بن سکتی)۔

اس عبارت سے معلوم ہوا کہ مذکورہ عمل کے ساتھ جو رسوم کا اہتمام کیا جاتا ہے وہ نہ صرف یہ کہ گناہ کا ارتکاب کرنا ہے، بلکہ حضور ﷺ کو خائن ٹھہرانا ہے کہ آپ ﷺ نے کچھ چیزیں امت سے چھپائیں، حالانکہ وہ جزو دین تھیں، آج کل مثلاً یوم ولادت کے موقع پر اس کی مقررہ تاریخ ١٢/ ربیع الاول کے دن ہی کو ضروری سمجھا جاتا ہے، حالانکہ شرع سے کوئی مقررہ تاریخ نہیں، نیز اس میں سجاوٹ روشنی وغیرہ کرنا، مٹھائی تقسیم کرنا یہ سب اسراف میں داخل ہونے کی وجہ سے ممنوع اعمال ہیں، نیز اسی طرح اس میں جو سب سے بڑی خرابی ہے وہ یہ ہے کہ عوام الناس شریک ہونے والے اس اعتقاد سے شریک ہوتے ہیں کہ یہاں مجلس میں نبی کریم ﷺ تشریف لاتے ہیں، یا ہمارے اس پروگرام کو دیکھ رہے ہیں اور سن رہے ہیں جیسا کہ ان کے اس جملہ "**یا نبی سلام علیک یا رسول سلام علیک**" سے ظاہر ہوتا ہے تو یہ عقیدہ کھلا ہوا شرک ہے، اور آپ پر بہتان ہے، تیسرا گناہ اس میں یہ ہے کہ اس کو فرض اور واجب کی طرح ضروری سمجھا جاتا ہے، چوتھا گناہ اس

١- الاعتصام للشاطبی ١/ ٧٠-٤٧۔

میں یہ ہے کہ اس میں شریک نہ ہونے والے بے گناہ مسلمانوں کو برا بھلا کہا جاتا ہے، اور پانچواں گناہ مسجد میں بلند آواز سے پڑھنا کہ لوگوں کی نماز میں اور دیگر عبادات میں خلل واقع ہوتا ہے، لہذا کسی تاریخ کے تعین کو ضروری سمجھے بغیر مذکورہ رسومات سے بچتے ہوئے مذکورہ عمل جائز ہے۔

۷- نصوص شرعیہ سے یہی ثابت ہے کہ آپ ﷺ کو غیب کا علم نہیں تھا، بلکہ دور نبوت کے جن واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ کو غیب کا علم حاصل تھا سو وہی واقعات ہیں جن میں بذریعۂ وحی آپ کو اطلاع دی گئی تھی، ورنہ پھر ان واقعات کا کیا جواب ہوگا کہ جن سے ثابت ہوتا ہے کہ آپ ﷺ غیب کی بات نہیں جانتے تھے، مثلاً عامر بن ابو براعامی ایک شخص آیا اور کہا کہ ہماری قوم کی تبلیغ کے لئے مبلغین روانہ کردیجئے، آپ ﷺ نے عہد وپیمان کے بعد ستر صحابہ کرامؓ کو روانہ کیا، راستہ میں اس نے بغاوت کی اور ان اصحابؓ کو شہید کردیا سوائے دو تین اصحابؓ کے کہ وہ میدان معرکہ میں زخمی پڑے تھے، دشمنان دین نے ان کو مردہ سمجھ کر چھوڑ دیا، حالانکہ زندہ تھے، اور بعد تک زندہ رہے، ان کا نام کعب بن انصاریؓ تھا وغیرہ، اسی طرح ایک صحابیؓ بچ نکلے، جو اونٹوں کو چرانے نکل گئے تھے، صحابہ کرامؓ کی یہ جماعت نہایت ہی مقدس اور پاکباز جماعت تھی، دن کو لکڑیاں چنتی اور شام کو فروخت کرکے اصحاب صفہؓ کے لئے کھانا لاتی، اور شب کا کچھ حصہ درس قرآن، قیام لیل اور تہجد میں گزارتی، اگر آنحضور ﷺ عالم الغیب ہوتے تو جانتے ہوئے اپنے جاں نثار اصحاب کے لئے اتنا گھناؤنا ظلم کیسے برداشت کرلیتے (۱)۔

اسی طرح رجیع کا واقعہ جس میں آپ ﷺ نے صحابہؓ کی ایک جماعت کو جن کی تعداد احادیث میں دس بتلائی جاتی ہے رجیع کی طرف روانہ کیا، لیکن جو شخص بلانے آیا تھا اس نے غدر کیا اور ان اصحابؓ کو شہید کردیا (۲)۔

اب ہم اور آپ مل کر غور کریں کہ وہ ذات گرامی جو ادنی سی تکلیف دشمن کے لئے گوارہ نہیں کرسکتی تھی اور جس کی امانت وصداقت کا اعتراف غیروں نے بھی کیا ہے کہ وہ اپنے جاں نثار اصحابؓ کے لئے جانتے ہوئے اتنا گھناؤنا ظلم برداشت کرسکتی ہے، نیز اس کے علاوہ اس بحث پر قرآن کریم میں بہت سی آیات ناطق ہیں کہ غیب کا علم سوائے اللہ تعالی کے کسی کو نہیں، مثلاً "قل لا یعلم من فی السموات والأرض الغیب إلا اللہ" (۳) اور خود سرکار دو عالم ﷺ کو حکم ہے کہ آپ فرمادیجئے: "ولو کنت أعلم الغیب لاستکثرت من الخیر وما مسنی السوء إن أنا إلا نذیر وبشیر لقوم

۱- شرح الزرقانی ۲/۷۴-۷۵۔
۲- شرح الزرقانی ۲/ ۶۴۔
۳- سورۂ نمل: ۶۵۔

یؤمنون''(۱)، لہذا اس مسئلہ میں علماء اہل سنت والجماعت کا مسلک یہ ہے کہ آپ ﷺ عالم الغیب نہیں بلکہ جن خفیہ باتوں کو آپ ﷺ بلا کسی مشاہدہ کے بتلادیا کرتے تھے وہ وہی باتیں تھیں جن کی بذریعہ وحی اطلاع دی جاچکی ہوتی۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند ۱۲/۴/۱۴۰۲ھ

اللہ تعالیٰ ہر امر کا فیصلہ ہر سال شب براءت میں کرتے ہیں یا شب قدر میں؟

متعدد احادیث معتبرہ سے یہ ثابت ہے کہ شعبان کی پندرہویں شب یعنی شب براءت کو ہی اللہ تعالیٰ ہر امر کا فیصلہ فرماتے ہیں شب قدر یعنی رمضان المبارک کے آخری ہفتہ کی طاق راتوں میں نہیں کرتے لیکن ایسی تمام احادیث کے خلاف قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے یوں ارشاد فرمایا ہے: "حم والکتاب المبین إنا أنزلناه فی لیلة مبارکة إنا کنا منذرین فیها یفرق کل أمر حکیم أمراً من عندنا إنا کنا مرسلین''(۲) (کتاب مبین کی قسم ہم نے قرآن کو ایک مبارک رات میں نازل فرمایا ہے بے شک ہم ڈرانے والے ہیں اس رات میں ہر امر محکم کا فیصلہ کیا جاتا ہے، بے شک ہم نے ہی آپ کو رسول بنا کر بھیجا ہے)۔

اس آیت سے ظاہر ہو رہا ہے کہ قرآن کریم اس رات میں نازل ہوا جس میں کہ اللہ تعالیٰ ہر امر محکم کا فیصلہ فرماتے ہیں اور قرآن کریم نازل ہوا ہے، رمضان المبارک کی طاق راتوں میں سے کسی ایک رات میں جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "إنا أنزلناه فی لیلة القدر''(۳) (پس یہ کیسا عجیب معاملہ ہے کہ ایک طرف تو قرآن کریم میں ارشاد ہوتا ہے کہ وہ شب قدر میں نازل ہوا، اور دوسری طرف ارشاد ہے کہ ایک مبارک رات کہ جس میں ہر امر محکم کا فیصلہ کیا جاتا ہے، اس میں قرآن کریم نازل کیا گیا، اس صورت میں مندرجہ بالا آیت میں "لیلة مبارکة''(۴) کو اگر شب براءت تسلیم کیا جائے تو قرآن کریم کی دو آیتوں کے درمیان تضاد واقع ہوتا ہے، جبکہ کلام ربانی ہر قسم کے اختلاف سے پاک ہے، اور اگر لیلۃ مبارکہ کو شب قدر تسلیم کیا جائے تو شب براءت کی بابت وارد ہونے والی تمام احادیث معتبرہ کو موضوع قرار دینا پڑے گا، جبکہ ایسا کئی

۱- سورۂ اعراف: ۱۸۸۔

۲- سورہ دخان: ۱تا ۵۔

۳- سورۂ قدر: ۱۔

۴- سورۂ دخان: ۱۔

وجوہات سے ناممکن ہے۔

اول تو یہ کہ اگر قرآن کریم کی اس آیت میں لیلۃ مبارکہ سے فی الحقیقت شب قدر ہی مراد ہے، تو کیا اللہ تعالی نے ایک بھی سورت ایسی نازل نہیں فرمائی جس سے یہ فیصلہ ہوسکتا کہ شب قدر ہی ہر امر محکم کے فیصلہ کے لئے متعین ہے۔

دوم یہ کہ شب براءت کی بابت جتنی احادیث واقع ہوئی ہیں وہ سب کی سب معتبر ہیں، پھر اس کثرت کے ساتھ واقع ہوئی ہیں، کہ گمان غالب ہوتا ہے کہ بالفرض کچھ احادیث موضوع بھی ہوں تو بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ آنحضور ﷺ نے ضرور شب براءت کے بارے ہی میں فرمایا ہے، کیونکہ شب قدر کے بارے میں ایک روایت بھی ایسی نہیں جو یہ ثابت کرتی ہو کہ دراصل شب قدر ہی میں ہر امر محکم کا فیصلہ کیا جاتا ہے، اگر شب قدر ہی ہر امر محکم کے فیصلہ کی رات ہوتی تو آنحضور ﷺ ضرور اس بارے میں ارشاد فرماتے اور وہ ارشادات تمام نہ سہی کچھ تو ہمارے سامنے موجود ہوتے ہی، پس یہاں ثابت ہوتا ہے کہ آنحضور ﷺ نے شب قدر کی بابت سرے سے یہ فرمایا ہی نہیں کہ اس رات ہر امر محکم کا فیصلہ کیا جاتا ہے، علماء کرام اس آیت میں قیاس آرائی کرتے ہیں کہ ۲۵ ویں پارے کی اس آیت میں قرآن کریم کے نزول سے مراد وہ نزول نہیں جو آنحضور ﷺ پر ہوا، بلکہ لوح محفوظ سے آسمان اول پر قرآن کریم کا نازل کرنا مراد ہے۔ یہ قیاس دل کو نہیں بھاتا، کیونکہ لوح محفوظ سے آسمان اول پر قرآن کریم کا نزول ایک بیکار سی بات ہے، پھر یہ کہ یہ بات محض قیاس آرائی ہے اس کے صحیح ہونے کی واضح دلیل کوئی بھی نہیں، اور قرآن کریم میں قرآن کے لئے لفظ نزول اسی جگہ مراد ہے جہاں پر آنحضور ﷺ پر نازل ہونا فرمایا گیا ہے، ایسی کوئی آیت نہیں ہے جس سے یہ ثابت ہوتا ہو کہ قرآن کریم کسی اور جگہ بھی نازل فرمایا گیا اور یہ بھی کہ آسمان اول پر لوح محفوظ سے قرآن کریم کا نازل ہونا ایک واقعہ خاص اور واقعہ عجیب ہے، پس اللہ تعالی اگر ایسا کرتے تو ضرور اس کو مندرجہ بالا آیت میں بتاتے، جبکہ آیت میں اس بات کا کوئی ذکر نہیں اور کسی حدیث میں بھی کوئی ایسی بات نہیں جو یہ ظاہر کرے کہ قرآن کریم آسمان اول پر بھی نازل کیا گیا تھا، پس اس صورت میں یہ قیاس کرلینا کہ اس آیت میں نزول سے مراد آسمان اول پر نزول ہے، کیا یہ ایک بے بنیاد اور ٹھیک نہ ہونے والا قیاس نہیں ہے۔

اب جناب والا سے التماس ہے کہ احقر کی اس بارے میں تمام ذہنی الجھنوں کو دور کردیجئے گا، میں سمجھتا ہوں کہ جناب والا مدلل طریقے سے ان باتوں کا جواب دینے کی زحمت گوارا فرمائیں گے۔

محمد شہباز السادات (محلہ ابوالمعالی دیوبند)

الجواب وباللہ التوفیق:

آیت کریمہ: "**حم ،والکتاب المبین إنا أنزلناه في ليلة مباركة**" (۱) میں لیلۃ مبارکہ سے مراد جمہور مفسرین و محققین مفسرین کے نزدیک لیلۃ القدر ہی ہے، ۱۵ ویں شعبان کی شب نہیں اور اس لیلۃ القدر ہی کے بارے میں "**فيها يفرق كل أمر حكيم الخ**" (۲) فرمایا گیا، ۱۵ ویں شعبان کی رات کا اصل نام لیلۃ البراءۃ ہے، براءت سے مراد جہنم سے براءت یا عذاب سے براءت مراد ہے اور اس کا حاصل مغفرت و معافی ہے، چونکہ اس شب میں بے شمار گنہگاروں کی معافی و مغفرت ہوتی ہے اس لئے یہ بھی نام پڑ گیا۔

اور چونکہ ۱۵ ویں شعبان کی شب بھی نہایت برکت والی شب ہے اور اس میں بھی باری تعالی عزاسمہ کی خصوصی تجلی دنیا اور آسمان دنیا پر آفتاب غروب ہوتے ہی شروع ہو جاتی ہے اور ساری رات رہتی ہے، اس لئے اس شب کو بھی برکت والی اور مبارک شب فرمایا گیا ہے اور: "**فيها يفرق كل أمر حكيم**" (۳) کے سلسلہ میں جن جن چیزوں کا ذکر وارد ہے ان میں سے جن بعض چیزوں کا ذکر جو بعض روایات میں "لیلۃ البراءۃ" کے سلسلہ میں مروی ہو گیا ہے، اول تو وہ روایات اس درجہ کی نہیں ہیں کہ ان کی وجہ سے نص قرآنی کو چھوڑ دیا جائے، یا پھر یہ مراد ہے کہ فیصلہ تو ہوتا ہے شعبان کی پندرہویں شب میں اور اس کا نفاذ وفرق یعنی کارکن ملائکہ کو سپردگی یہ شب قدر میں ہوتی ہے اور اس میں کوئی اشکال نہیں، کیونکہ فیصلہ ایک مستقل اور الگ چیز ہے، اور پھر اس کا نفاذ الگ اور مستقل چیز ہے، غرض دونوں دو الگ الگ چیزیں ہیں، جیسا کہ دنیوی عدالتوں میں بھی ہوتا ہے کہ فیصلہ وڈگری ہو چکنے کے بعد بھی اجراء ڈگری اور نفاذ فیصلہ ایک مستقل مرحلہ اور کام ہوتا ہے اور دونوں الگ الگ چیزیں شمار ہوتی ہیں، پس اگر یہاں بھی ایسا ہی ہو تو کیا استبعاد ہے؟

اس توجیہ سے بھی سب روایات ایک دوسرے سے منطبق ہو جاتی ہیں اور تضاد کا شبہ ختم ہو جاتا ہے، پھر لیلۃ القدر حقیقت میں تو سارے سال میں دائر ہوتی ہے اور اس کو مخفی رکھا گیا ہے اور تلاش کرنے کی ترغیب دی گئی ہے، باقی عموماً رمضان المبارک کی طاق راتوں میں اور بالخصوص عشرۂ اخیرہ کی طاق راتوں میں اکثر واقع ہونے کی صحیح روایات ملتی ہیں اور مخفی رکھنے میں یہ حکمت بھی ہے کہ اس کو تلاش کرنے میں مومن جب سارے سال لگا رہے گا تو مولیٰ تعالی سے تعلق بڑھتا اور پائیدار ہوتا رہے گا اور نسبت احسان وحضوری جو مطلوب ہے وہ بآسانی حاصل ہو جائے گی اور اس کی تلاش کا ایک سہل اور آسان طریقہ

۱- سورۂ دخان: ۱ تا ۳۔
۲- سورۂ دخان: ۴۔
۳- سورۂ دخان: ۴۔

بھی بعض روایات میں فرمادیا گیا ہے، چنانچہ وارد ہے کہ جو شخص روزانہ شب میں دو رکعت نفل سارے سال لیلۃ القدر کی تلاش کی نیت سے پڑھے گا تو وہ شب قدر پا اس کی فضیلت پانے والا یقیناً شمار ہوجائے گا۔

غرض اس تقریر سے "إنا أنزلناه في ليلة القدر" (۱) اور "إنا أنزلناه في ليلة مباركة" (۲) کے درمیان تضاد کا شبہ جس طرح ختم ہوا اسی طرح یہ شبہ بھی ختم ہوگیا کہ جب لیلۃ مبارکہ سے شعبان کی ۱۵ ویں شب مراد ہوگی، تو قرآن پاک کا نزول اول کو شعبان میں ہونا لازم آئے گا، حالانکہ نص قرآنی "شهر رمضان الذي أنزل فيه القرآن" (۳)، یہ اس کے خلاف اور اس کے متضاد ہے، نیز اس لئے کہ صحیح احادیث میں مروی ہے کہ حضور ﷺ پر پہلی بار جو نزول قرآن ہوا ہے وہ رمضان المبارک کی چوبیس تاریخ تھی اس طرح ۲۵ شب پڑی اور عشرہ اخیرہ کی طاق رات ہوئی اور بالخصوص عشرہ اخیرہ کی طاق رات میں شب قدر کا ہونا صحیح روایات میں مروی ہے ہی۔

یہاں ایک بار اور سمجھ لینا ضروری ہے، اور وہ یہ کہ قرآن مجید نام ہے اور علم ہے اس حصہ کلام الٰہی کا جو ہمارے سامنے تیس پاروں میں موجود ہے اور کلام الٰہی ازلی وابدی اور باری تعالیٰ عز اسمہ کے صفات ذاتیہ میں سے ہے اور اس کا اصلی مقام لوح محفوظ ام الکتاب اور کتاب مکنون ہے، جیسا کہ ارشاد باری ہے: "بل هو قرآن مجيد في لوح محفوظ" (۴)، اور ایک جگہ فرمایا: "إنه لقرآن كريم في كتاب مكنون لا يمسه إلا المطهرون" (۵)، اور "إنه في أم الكتاب" اور یہ قرآن کریم تھوڑا تھوڑا ایک ایک دو دو چار چار آیت کرکے (نجماً نجماً) حضور ﷺ پر بطور نصیحت و ذکر کے ہدایت بنا کر ۲۳ برس میں اتارا گیا یہ امر واقعہ ہے محتاج دلیل نہیں اس کو سب ہی جانتے ہیں۔

اسی طرح یہ بھی ظاہر ہے کہ یہ نزول ۲۳ برس میں صرف رمضان ہی رمضان میں نہیں ہوا ہے، بلکہ رمضان غیر رمضان دونوں ہی میں حسب مصلحت ومشیت باری تعالیٰ ہوا ہے، بلکہ ماہ رمضان میں صرف دو ہی چار آیتیں اتری ہیں باقی سب تو غیر ماہ رمضان میں اترا ہے، اس لئے اس اترنے کو پورے قرآن کریم کا رمضان میں اترنا نہیں کہہ سکتے، پس یہ

۱- سورۂ قدر: ۱۔
۲- سورۂ دخان: ۳۔
۳- سورۂ بقرہ: ۱۸۵۔
۴- سورۂ بروج: ۲۱، ۲۲۔
۵- سورۂ واقعہ: ۷۷ تا ۷۹۔

تھوڑا تھوڑا اترنا آیت کریمہ: "إنا أنزلناه في ليلة القدر" (۱)، اور "إنا أنزلناه في ليلة مباركة" (۲) اور "شهر رمضان الذي أنزل فيه القرآن" (۳) کا مصداق نہیں بن سکتا، کیونکہ قرآن مجید علم ہے۔

اور یہ مصداق نہیں بن سکتا ایسا ہے، جیسے آپ کا علم اور نام شہباز السادات ہے تو آپ کے بارے میں اگر کہا جائے کہ شہباز صاحب آگئے یا شہباز صاحب کوٹھے پر سے اترے تو کوئی یہ نہیں سمجھے گا کہ آدھا جسم اترا اور آدھا جسم نہیں اترا، یا آدھا جسم گیا اور آدھا جسم نہیں گیا وغیرہ، اس لئے کہ شہباز علم ہے اور ایسے مواقع میں علم کا تجزیہ اور ٹکڑا نہیں ہوتا، اس لئے آدھا جسم اترنا اور آدھا جسم نہ اترنا یا آدھا جسم آنا یا آدھا جسم نہ آنا مراد نہیں لیا جاسکتا پھر جب بھی مراد لیا جائے گا تو پورا جسم اترنا یا آنا یا جانا مراد ہوگا اسی طرح یہاں ان آیات کریمہ میں بھی پورے قرآن پاک کا بیک وقت اترنا مراد ہوگا۔

غرض ان تینوں آیتوں میں قرآن کریم پورا بیک وقت اور بیک دفعہ اترنے کا ذکر ہے اور اللہ تعالیٰ نے "انزل" اور "أنزلناه" بول کر اس کی طرف اشارہ بھی فرمادیا کہ پورا قرآن پاک ماہ رمضان میں بھی ہم نے اتارا ہے، کیونکہ عربی میں "انزال" کے اصل معنی ہیں کسی چیز کو پوری کی پوری بیک دم اور بیک وقت اتار دینا۔

اور ۲۳ برس میں اتارنا چونکہ اس طرح کا اتارنا نہیں ہے کہ بیک وقت اور دفعۃً اتار دیا ہو، اس لئے جب ۲۳ برس میں متفرق کرکے اتارنے کا تذکرہ فرمایا ہے تو قرآن پاک کو اس کی خاص صفت ذکر و نصیحت کے ساتھ موسوم کرکے فرمایا ہے، مثلاً: "إنا نحن نزلنا الذكر وإنا له لحافظون" (۴) فرمایا کیونکہ ذکر و نصیحت تو حسب موقع و محل تھوڑی تھوڑی کرکے اور تدریجاً ہی بہتر ہوتی ہے تو تنزیل بول کر اشارہ فرمادیا کہ یہ نصیحت و ذکر تھوڑا تھوڑا کرکے یہاں سے اتارا ہے کیونکہ تنزیل کے اصل معنی ہیں کسی چیز کو تدریجاً اور تھوڑا تھوڑا کرکے اتارنا۔

پس معلوم ہوا کہ خود قرآن کریم میں دو طرح پر نزول قرآن کا ذکر ہے ایک طرح کے نزول کا ذکر "إنا أنزلناه" اور "شهر رمضان الذي أنزل فيه القرآن هدى للناس وبينات من الهدى" (۵) میں ہے کہ ایک نزول ماہ رمضان المبارک میں پورے قرآن پاک کا ہے اور دوسرا نزول پورے ۲۳ برس میں نجماً نجماً اور تھوڑا تھوڑا کرکے ہے۔

۱- سورۂ قدر: ۱۔
۲- سورۂ دخان: ۳۔
۳- سورۂ بقرہ: ۱۸۵۔
۴- سورۂ حجر: ۹۔
۵- سورۂ بقرہ: ۱۸۵۔

یہاں خود بخود سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ کس طرح ہوا تو اس کا جواب بھی حدیث شریف میں فرما دیا گیا اور اس کا حاصل یہ ہے کہ لوح محفوظ اور ام الکتاب سے سماء دنیا ''بیت العزۃ'' تک بیک دم ودفعۃً ماہ رمضان میں اتار دیا گیا، پھر وہاں سے حسب مصلحت ومشیت خداوندی تھوڑا تھوڑا کر کے بذریعہ حضرت جبرئیل علیہ السلام دنیا میں اتارا گیا۔

رہ گیا یہ سوال کہ پھر اس دوبارا تارنے میں کیا حکمت ہے تو ایک حکمت تو وہی ہے جس کی طرف سورہ مزمل کی ابتدائی آیات **"یأیها المزمل قم اللیل (الی قوله تعالی) انا سنلقی علیک قولاً ثقیلاً"**(۱) میں ارشاد فرمایا گیا ہے کہ ہم نے ساری ساری رات قرآن پاک پڑھنے اور بار بار پڑھنے کا حکم اس لئے دیا ہے، تا کہ قرآن کریم جو کہ کلام الٰہی ہے اور اللہ کی صفت خاصہ ہے جس کا وزن پہاڑ بھی برداشت نہ کر سکا اس کے بار بار پڑھنے سے کچھ مناسبت اس سے ہو جائے اور پھر اس کے برداشت کرنے کی اور اس کے تحمل وادا کی استعداد پیدا ہو جائے۔

بالکل اسی طرح سمجھئے کہ ''ام الکتاب'' اور لوح محفوظ سے اولاً سماء دنیا پر اور ''بیت العزہ'' میں اتارنے میں پھر وہاں سے نجماً نجماً (تھوڑا تھوڑا) حضور علیہ السلام پر اتارنے میں یہ حکمت بھی ہو سکتی ہے کہ یہ کلام الٰہی جو ذات بحث کی صفت خاصہ ہے جب تک ام الکتاب وکتاب مکنون اور لوح محفوظ میں محفوظ تھا اس وقت تک حضرت جبرئیل علیہ السلام کو بھی اس کا پورا پتہ ہونا ضروری نہیں تھا اور نہ ان میں بھی اس کے تحمل ادا کی پوری استعداد وطاقت کا ہونا لازم تھا، لیکن جب ام الکتاب ولوح محفوظ سے سماء دنیا اور بیت العزہ پر اتارا گیا جو حضرت جبرئیل علیہ السلام کا مقام تھا اور حضرت جبرئیل علیہ السلام نے اس کو دیکھا اور بار بار پڑھا تو ان میں اس سے مناسبت وتحمل ادا کی طاقت اور پوری استعداد پیدا ہو گئی۔

پھر سرکار دوعالم علیہ السلام کی بعثت کے چند ہی سال بعد کہ ابھی پورا قرآن پاک آپ پر نازل بھی نہیں ہوا تھا کہ حضرت جبرئیل ہر سال ماہ رمضان المبارک میں تشریف لا کر حضور علیہ السلام کو پورا قرآن سناتے تا کہ حضور علیہ السلام کو بھی کلام ربانی سے انس ہو جائے، اور اس کے سمجھنے اور تحمل ادا کی پوری استعداد وطاقت پیدا ہو جائے، چنانچہ جس سال آپ کا وصال ہونے والا تھا، احادیث صحاح میں وارد ہے کہ اس سال کے ماہ رمضان میں دو کلام پاک کا دور فرمایا، اور دو بار پورا قرآن پاک آپ کو پڑھ کر سنایا اور اس سے آپ نے سمجھ لیا کہ اب میرے سفر آخرت اور رفیق اعلیٰ سے ملنے کا وقت آ گیا۔

یہ ایک حکمت دوبار نزول کی اور اس طرح نزول کی برجستہ اس عاصی کے ذہن میں بھی آ گئی اور نہ معلوم کتنی کتنی حکمتیں اس میں مرکوز ہوں گی جن کو صاحب مشکوۃ نبوت علیہ السلام اور صاحب اسرار ہی سمجھ سکتے ہیں۔

۱- 　سورۂ مزمل: ۱ تا ۵۔

اعتقاد صحیح کرنے اور ایمان لانے کے لئے اتنا بھی کافی ہے کہ اللہ تعالی کی مرضی ومشیت یہی تھی اور اس میں ہزاروں حکمتیں ہوں گی جو ہماری عقول سے بالاتر بھی ہوسکتی ہیں، کتنا بہترین یہ مقولہ ہوگا ؎

رموز مملکت خویش خسرواں دانند
احمد تو عاشقی بدلائل ترا چہ کار

پھر آپ خود خیال فرمائیے کہ آپ کے یہ جملے (یہ قیاس دل کو نہیں بھاتا) جس پر خط کھینچ دیا گیا ہے، کیسے ہیں؟

اول تو اس کو محض قیاسی کہنا، حالانکہ اس پر صحیح صحیح روایات موجود ہیں پھر دل کو نہ بھانا، یا اس کو بے کاری بات بتانا وغیرہ وغیرہ کتنے خطرناک جملے ہیں؟ (العیاذ باللہ)۔

اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ خدانہ خواستہ اللہ اور اس کے رسول کے حکم یا کلام کو ہماری خواہش ومرضی یا ہمارے دل یا قیاس کے تابع ہونا چاہئے کہ جس کو ہم اچھا اور صحیح سمجھ لیں بس وہ اچھا اور صحیح ہو اور صرف اس کا حکم یا صرف وہی بات اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے ہو یا یہ مطلب ہو کہ جو بات ہماری سمجھ میں نہ آئے اور نہ ہونی چاہئے یا پھر وہ غلط ہوگی۔

ذرا سوچئے تو صحیح! یہ کس قدر غلط اور خطرناک خیال یا تخیل ہے، یہی تو گمراہی وضلالت کا پہلا اور سب سے بڑا پھاٹک ہے، جتنے مدعیان نبوت اور گمراہ فرقے (فرق باطلہ اور اہل الہوی والضلال) پیدا ہوئے سب کے سب پہلے اسی پھاٹک میں داخل ہوئے اور پھر اس کے محل تک اپنے اپنے کردار کے اعتبار سے پہنچے، امید کہ اتنی مختصری بات بھی سمجھنے کے لئے کافی ہوگی، اور الجھن میں پڑنے سے حفاظت کا سامان ہوگی۔ فقط واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی مفتی دار العلوم دیوبند

کیا عورت کی تخلیق مرد کی پسلی سے ہوئی ہے؟

حضرت حوا علیہا السلام کی پیدائش حضرت آدم علیہ السلام کی بائیں پسلی سے ہوئی یا نہیں؟ اگر ہوئی تو برائے کرم حدیث کا وہ ٹکڑا مع عربی عبارت وحوالہ کتب نقل کریں۔

الجواب وبالله التوفيق:

"عن أبي هريرةؓ أنه قال، قال رسول اللهﷺ: استوصوا بالنساء خيراً فإن المرأة خلقت من

ضلع، وإن أعوج شيئ في الضلع أعلاه الخ"، وعلى هامش البخاري (۱/۴۶۸) تحت قوله: النساء، قيل أراد أن أول نساء هي حواء خلقت من ضلع من أضلاع آدم الخ وتحت قوله: من ضلع، قيل: فيه إشارة إلى أن حواء خلقت من ضلع آدم الأيسر وإلى أنها لا تقبل التقويم الخ" (۱)، مذکورہ بالا حدیث اور اس کے تحت کی جانے والی تشریح سے یہ بات بخوبی معلوم ہوگئی کہ حضرت حواء علیہا السلام کی پیدائش حضرت آدم علیہ السلام کی بائیں پسلی سے ہوئی تھی۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

مجتہد کے لئے کیا شرائط ہیں؟

سوال: مجتہد ہونے کے لئے کیا کیا شرائط ہیں؟

الجواب وباللہ التوفیق:

"وشرطه أنه لا بد له أن يعرف من الكتاب والسنة ما يتعلق بالأحكام ومواقع الإجماع وشرائط القياس وكيفية النظر وعلم العربية والناسخ والمنسوخ وحال الرواة" (۲)۔

مذکورہ بالا عبارت سے معلوم ہوا کہ مجتہد کے لئے چند شرائط ہیں:

۱- پہلی شرط یہ ہے کہ اسے کتاب وسنت کے ان تمام حصوں سے جن سے احکام متعلق ہیں کما حقہ واقفیت ہو۔

۲- مواقع اجماع سے واقف ہو کہ کہاں اور کن مواقع پر اجماع ہوا ہے تا کہ وہ اجماع کی موجودگی میں قیاس سے کوئی حکم مستنبط نہ کرے۔

۳- شرائط قیاس سے اچھی طرح واقف ہو تا کہ قیاس مع الفارق نہ کرے۔

۴- کیفیت نظر سے واقفیت رکھتا ہو تا کہ مسائل کے استنباط میں غلطی نہ کرے۔

۵- لغت عربی پر کافی عبور رکھتا ہو تا کہ قرآن کے صحیح مفہوم کو سمجھ کر اس سے مسائل مستنبط کر سکے۔

۱- بخاری ۱/ ۴۶۹۔

۲- عقد الجید فی أحکام الاجتہاد والتقلید/ ۴۔

۶-ناسخ اور منسوخ کو جانتا ہو، اور رواۃ کی حالت سے واقف ہو جن کے اندر مذکورہ بالا شرائط پائی جائیں گی وہ مجتہد ہوگا۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

حضور علیہ السلام کا سایہ پڑتا تھا:

سوال: نبی علیہ السلام کے جسد مبارک کا سایہ تھا یا نہیں؟

الجواب وباللہ التوفیق:

حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی علیہ السلام کے جسد مبارک کا سایہ تھا جس حدیث سے سایہ کے نہ ہونے کا پتہ چلتا ہے محدثین نے اس کی تضعیف کی ہے، سایہ رسول سے متعلق احادیث اس طرح ہیں:

۱-"عن أنس بن مالکؓ صلی بنا رسول اللہ ﷺ ذات یوم صلاۃ الصبح ثم مد یدہ ثم أخرها فلما سلم قیل له: یا رسول اللہ قد صنعت فی صلاتک شیئاً لم تصنعه فی غیرها، قال: إنی رأیت الجنة فرأیت فیها دالیة قطوفها دانیة حبها کالدباء فأردت أن أتناول منها، فأوحی إلیّ أن استأخر فاستأخرت، ثم رأیت النار فیما بینی وبینکم حتی لقد رأیت ظلي وظلکم فأومأت إلیکم أن استأخروا فأوحی إلیّ أقرهم فإنک أسلمت وأسلموا وهاجرت وهاجروا وجاهدت وجاهدوا، فلم أدلی علیکم فضلاً إلا بالنبوة" (۱)۔

۲-"عن عائشةؓ أن رسول اللہ ﷺ کان في سفر له فاعتل بعیر لصفیةؓ وفي أید زینب فضل، فقال لها رسول اللہ ﷺ: إن بعیر الصفیة اعتل فلو أعطیتها بعیراً من إبلک، فقالت: أنا أعطی تلک الیهودیة قال: فترکها رسول اللہ ﷺ ذا الحجة والمحرم شهرین أو ثلاثة لا یأتیها، قالت: حتی یئست منه وحولت سریری، قالت: فبینما أنا یوماً بنصف النهار إذا أنا بظل رسول اللہ ﷺ مقبل قال عفان حدثنیه حماد عن شمسیة عن النبي ﷺ ثم سمعته بعد یحدثه عن شمسیة عن عائشة، ولا أظنه، إلا

۱- حادی الأفراح إلی بلاد الأرواح لابن قیم الجوزی جلد اول باب اول / ۴۲-۴۳۔

قال فی حجة الوداع"(۱)۔فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

اللہ تعالیٰ کا جسم ہے یا نہیں؟ اور آیات صفات کا کیا مطلب ہے؟

(۱) اللہ تعالیٰ مجسم ہے یا غیر مجسم؟

(۲) اگر غیر مجسم ہے تو سورۃ القلم: **"یوم یکشف عن ساق ویدعون إلی السجود فلا یستطیعون"** (سورۂ قلم:۴۲) (جس دن کھولی جائے گی پنڈلی اور پکارے جائیں گے سجدہ کرنے کو پھر نہ کرسکیں گے) ساق کے معنی پنڈلی صاف لکھے گئے جس سے ایک تخیل پیدا ہو جاتا ہے ایسا کیوں؟

(۳) اگر خدا مجسم ہے تو یہ کہنا کہ اللہ تعالیٰ دیکھتا ہے، مگر آنکھ نہیں، اللہ سنتا ہے، مگر کان نہیں ہے، وغیرہ غلط ظاہر ہوتا ہے (نعوذ باللہ)۔

(۴) اللہ تعالیٰ کو مجسم کہنے والا کافر ہے یا غیر مجسم کہنے والا؟

(۵) اللہ تعالیٰ کا جہنم میں قدم رکھنے سے کیا مراد ہے، جیسا کہ (یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اس میں اپنا قدم رکھ دیں گے) حدیث میں ہے۔

الجواب وباللہ التوفیق:

(۱) اللہ تعالیٰ جسم وجسمانیات سے پاک ہیں تمام نقائص وعیوب سے منزہ ہیں غیر مجسم ہیں۔ آیت کریمہ ہے: **"اللہ نور السموات والأرض"** (۲) اور نور کے معنی آتے ہیں ظاہر لنفسہ ومظہر لغیرہ۔

(۲-۳) **"یوم یکشف عن ساق"** (۳) میں یوم سے مراد قیامت ہے اور ساق کے معنی لغت میں مافوق القدم (پنڈلی) کے آتے ہیں اور کشف ساق اور تشمیر ساق (کپڑے اوپر کھینچ کر پنڈلی کھول لینا) یہ عرب کے محاورہ میں ایک

۱- مسند احمد ۲۳۱/۱-۲۳۲ فی مسند عائشہ۔

۲- سورۂ نور:۳۵۔

۳- سورۂ قلم:۴۲۔

مثل ہے، اس وقت بولتے ہیں، جبکہ کام کی انتہائی شدت اور حالات کی انتہائی سختی وصعوبت ظاہر کرنی ہوتی ہے، چنانچہ جاہلیت عرب کے امثال میں یہ کلام دائر وسائر ہے کہ "وقامت الحرب بنا علی ساق "(۱) اور یہ اشعار بھی اس معنی میں ہیں۔شعر:

أخو الحرب إن عضت به الحرب عضها　　　وإن شمرت عن ساقها الحرب شمراء

في سنة قد كشفت عن ساقها　　　حمراء تبری اللحم عن عراقها

اسی محاورہ کے اعتبار سے بیان فرمایا گیا ہے۔ اور مراد یہ ہے کہ جس دن تمام حالات ومعاملات کی حقیقت منکشف ہوجائے گی، اس وقت تمہارا کیا حال ہوگا (تمہیں اس دن سے ڈرنا چاہئے) پھر وہ حال بعد میں مذکور ہے، اور غرض اس آیت سے یوم قیامت کے احوال سے ڈرانا ہے، نہ کہ کوئی عضو مثل اعضاء انسانی کے ثابت کرنا ہے، بلکہ انسانی فہم سے قریب کرنے کے لئے اس طرح بیان فرمایا گیا ہے، چنانچہ "روح المعانی" میں بھی ہے: "**ساق الشيئ أصله الذی به قوامه كساق الشجر وساق الإنسان، والمراد به يوم يكشف عن أصل الأمر فتظهر حقائق الأمور وأصولها بحيث تصير عياناً**" (۲) اور سب کا حاصل یہ ہے کہ قیامت کے دن باری عزاسمہ کی تجلیات ذاتیہ ظاہر ہوں گی اور سب کے حالات وواقعات اور سب کی حقیقتیں اور سب کے کردار واعمال اس طرح ظاہر ہوجائیں گے جس کا مشاہدہ تمام لوگ اس طرح کریں گے جس طرح آنکھوں سے دیکھ رہے ہوں، اور پھر کسی کو بات بنانے اور کسی قسم کی تلبیس وتغیر وغیرہ کرنے کی جرأت وہمت نہ ہوگی۔

اور ساق کے معنی پنڈلی ہی کے لیں تو یہ کہنا پڑے گا کہ اللہ کے لیے ساق ہے، لیکن ایسی جو اللہ تعالیٰ کی شان کے مناسب ہے، اور اسی طرح آنکھ، پیر وغیرہ والی تمام آیات میں ان اعضاء اور ان اعضاء کے اثرات اور احوال کے مناسب حال تجلیات ربانی مراد ہیں۔ اور اگر کوئی ان اعضاء کو ذاتِ باری عزاسمہٗ کے لئے مراد لے تو کہے گا وہ اعضاء ایسے نہیں، جیسے ہمارے لئے ہیں، بلکہ جو جناب باری سبحانہٗ کے مناسب ہوں، ورنہ کفر ہوگا۔ اور اس صورت میں یہ سب آیات کریمہ آیاتِ متشابہات میں شمار ہوں گی۔

(۴)　اللہ تعالیٰ کو مجسم کہنا کفر ہے۔ غیر مجسم کہنے والا کافر نہیں۔

۱-　روح المعانی ۱۶/۵۹۔

۲-　روح المعانی لعلامہ آلوسی ۱۶/۵۹ مطبع زکریا بکڈ پو دیوبند۔

(۵)　　اس سے بھی مراد وہی ہے جو ۲ و ۳ میں گذری، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند ۹/۵/۹۳ ۱۳ھ

تقدیر کیا ہے؟

انسان اپنی پیدائش سے لے کر موت کے واقع ہونے تک جو بھی اچھے اور برے اعمال کرتا ہے۔ کیا وہ سب اس کی تقدیر میں پہلے سے لکھے ہوتے ہیں؟

تقدیر میں گناہ کرنا لکھا ہے تو پھر عذاب کیوں؟

اگر پہلے سے ہی تقدیر میں نیکیوں اور گناہوں کی تعداد مقررہ اوقات میں متعین کردی جائے اور پھر یہ کہا جائے کہ تقدیر کا لکھا اٹل ہے اگر تقدیر میں پہلے سے ہی گناہ لکھا ہو تو پھر اس پر سزا یا عذاب کیا معنی رکھتے ہیں؟ جبکہ وہ اپنی تقدیر میں لکھے ہوئے گناہ کا ہی مرتکب ہوا، انسان کی تقدیر میں پہلے سے کیا کیا لکھا ہوتا ہے؟ اگر اچھے اور برے تمام اعمال ہی تقدیر میں لکھے ہوئے ہوں تو کس بنیاد پر قبل از وقت تقدیر مرتب ہوئی ہے براہ کرم تفصیل کے ساتھ صراحت فرمائیں، کیونکہ یہاں پر بہت سے اصحاب اس تعلق سے شدید الجھن میں ہیں۔

عبدالمقتدر (ابوظہبی متحدہ عرب امارات)

الجواب وباللہ التوفیق:

جزا اور سزا کے ترتب کا مدار اختیار و شعور و عقل پر ہے اگر کسی کو عقل و شعور نہ ہو، مثلاً پاگل ہو تو وہ کوئی بھی کام کرے اس پر کوئی مواخذہ نہیں، لقولہ علیہ السلام: **"جف القلم عن الثلاثة النائم والصبي والمجنون أو كما قال"**(۱)، اسی طرح اگر عقل و شعور تو ہو، مگر فعل کا صادر ہونا اختیار میں نہ ہو تو اس میں بھی کوئی مواخذہ نہیں، جیسے کوئی شخص ہے اور آنکھیں کھولے بیٹھا ہے یا کہیں جا رہا ہے، اور کوئی نامحرم عورت سامنے آ گئی یا اس پر نگاہ پڑ گئی تو اس پر مواخذہ نہیں، کیونکہ آنکھ کھلی رہے اور نظر نہ آئے یہ بندہ کے اختیار میں نہیں: **"كما قال عليه السلام لعليؓ: يا علي لا تتبع النظرة النظرة فإن**

۱-　　وفي أبي داؤد: رفع القلم عن ثلاثة: عن النائم حتى يستيقظ، وعن المبتلى حتى يبرأ، وعن الصبي حتى يكبر"وفي رواية: عن المجنون المغلوب على عقله حتى يفيق، وعن النائم حتى يستيقظ، وعن الصبي حتى يحتلم" (ابوداؤد کتاب الحدود ۴/۱۴۰)۔

لک الأولی ولیست لک الاٰخرۃ"(۱)۔ البتہ فوراً نگاہ ہٹالینا ضروری ہے اور دوبارہ اس پر نگاہ ڈالنا جائز نہیں -**کما دل علیہ أیضا ھذا الحدیث**- اس لئے اگر فوراً نگاہ نہ ہٹائی یا ہٹا کر دوبارہ پھر دیکھا تو چونکہ جمائے نہ رکھنا اور پھر دوبارہ نہ دیکھنا اختیار میں تھا، اس لئے اس پر مواخذہ ہے۔

خلاصہ یہ کہ جب کوئی انسان اپنی عقل وشعور باقی رہتے ہوئے اپنی قدرت واختیار سے کوئی برا کام کرے گا تو اس کو اس پر عذاب ہوگا، اور سزا کا مستحق ہوگا اور اگر کوئی اچھا کام کرے گا۔ تو اس کو اس پر انعام ملے گا۔ اور جزا کا مستحق ہوگا۔ اور یہ سب کیوں ہے؟ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے جب بندہ کو عقل وہوش ودانش سے نوازا اور قدرت واختیار بھی عطافرمایا اور سب اچھے کام اور برے کام بواسطۂ انبیاء علیہم السلام بتلا کر قوت ممیّزہ (تمیز) بھی دے دی اور تمام کاموں کا نفع ونقصان بھی اور تمام نتائج بھی بتلادئے اور اچھے کاموں کے انعامات کا بھی واضح طور پر یقین دلادیا۔ اب اس کے بعد بھی اگر کوئی احکامِ خداوندی کی خلاف ورزی کرتا ہے تو وہ انعاماتِ خداوندی کی ناقدری کرتا ہے اور یہ احکامِ خداوندی کی تکذیب اور اس سے بغاوت کے مترادف ہوگا، اس لئے سزا کا مستحق ہوگا، جیسا کہ ارشاد ہے: "**إنھم کانوا لا یرجون حسابا، وکذبوا باٰیاتنا کذابا، وکل شيءٍ أحصینٰہ کتابا، فذوقوا فلن نزیدکم إلا عذابا**" (۲) (بیشک یہ لوگ حساب (قیامت) کا اندیشہ ہی نہ رکھتے تھے اور ہماری آیتوں کو خوب جھٹلاتے تھے اور ہم نے (ان کے اعمال میں سے) ہر چیز کو ان کے اعمال نامے میں لکھ کر ضبط کر رکھا ہے، سو اب اس کا مزہ چکھو کہ ہم اب تمہارا عذاب ہی بڑھاتے رہیں گے)۔

اور اسی طرح اگر عقل وشعور سے اور اپنے اختیار سے کام لے کر اچھا کام کرے گا۔ اور دوسرے کام سے اپنے کو روکے گا۔ تو اگر چہ اپنی عقل وشعور اور اختیار کے اعتبار سے خود اپنا فرض ادا کرنے والا ہوگا، مگر ذاتِ خداوندی نے اس کو اپنا منقاد اور اپنے انعامات واحسانات کی قدر دانی کرنے والا شمار فرما کر اپنے فضل وکرم سے اس پر اپنا انعام مقرر فرمادیا، اس کو جزا کا لقب دے کر مستحق ثواب وجزا قرار دے دیا جیسا کہ فرمایا گیا:

"**لئن شکرتم لأزیدنکم ولئن کفرتم إن عذابي لشدید**" (۳) اور فرمایا گیا: "**إن للمتقین مفازا حدائق وأعنابا وکواعب أترابا وکأسا دھاقا، لا یسمعون فیھا لغوا ولا کذابا جزاء من ربک عطاء حسابا رب السموات والأرض وما بینھما الرحمن لا یملکون منہ خطابا**" (۴)۔ (اگر تم لوگ شکر ادا کرتے

۱- رواہ الترمذی والدارمی وابوداود، ترمذی مع عارضۃ الاحوذی کتاب الادب، (باب نمبر: ۲۸) ۱۰/۲۲۹ دار احیاء التراث بیروت۔

۲- سورہ نبأ: ۲۸-۳۰۔

۳- سورہ ابراہیم: ۷۔ ۴- سورہ نبأ: ۳۱-۳۷۔

رہو گے تو میں تمہارے لئے انعامات میں زیادتی ہی کرتا رہوں گا، اور اگر ناشکری کرو گے تو (سمجھ لو) بلاشبہ میرا عذاب بہت ہی سخت ہے، بے شک ڈرنے والوں کو مراد ملتی ہے باغ ہیں اور انگور اور نوجوان عورتیں ایک عمر کی سب اور پیالہ چھلکتا، نہ سنیں گے وہاں بکنا اور نہ بدلا ہے تیرے رب کا دیا حساب سے جو رب ہے آسمانوں کا اور زمین کا، اور جوان کے بیچ ہے مہربانی والا قدرت نہیں کہ کوئی اس سے بات کرے)۔

اور یہ سوال کہ انسان اپنے پیدا ہونے سے لے کر موت تک جو اچھے برے کام کرتا ہے تو کیا وہ سب اس کی تقدیر میں پہلے سے ہی تفصیل کے ساتھ لکھا ہوتا ہے؟ تو جی ہاں یہ صحیح ہے وہ سب کام پہلے ہی سے لکھے ہوتے ہیں، رہا یہ اشکال کہ اگر تقدیر میں پہلے ہی سے گناہ لکھا ہوا لخ۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس مسئلہ کا تعلق ربط حادث بالقدیم کے مسئلہ سے ہے، یعنی ذات وحدہٗ لاشریک لہٗ کے سواء جتنی چیزیں ہیں، خواہ آسمان سے اوپر کی ہوں یا آسمان سے نیچے کی اور عالمِ سفلیات کی ہوں، جیسے جمادات، نباتات، حیوانات اور انسان وجنات سب کا ایک خاص رابطہ وحدہٗ لاشریک لہٗ کی ذات سے ہے اور ان سب چیزوں کے پیدا ہونے سے بہت قبل، ازل سے ہی یہ تمام رابطے اور ان کی تمام تفاصیل سب کی سب ذات وحدہٗ لاشریک لہٗ کے علم میں موجود ہیں، جیسا کہ ارشاد ہے: **"هو الأول والاٰخر والظاهر والباطن وهو بكل شيءٍ عليم"** (۱) (وہی (ذات باری تعالیٰ) اول بھی ہے وہی آخر بھی ہے وہی ظاہر بھی ہے وہی باطن بھی ہے وہی ہر چیز کا علم بھی رکھتا ہے)۔

بلکہ ہر جزئی سے جزئی چیز کی تمام مقدار ایک خاص ترتیب کے ساتھ پورے عالم کے تکوین وانتظام واستحکام کی حکمت کے تقاضے کے مطابق ازل ہی سے لکھی ہوئی محفوظ موجود ہیں جن میں ذرہ برابر بھی کوئی فرق کبھی نہیں آسکتا کما قال اللہ تعالیٰ: **"إن الله خالق كل شيءٍ"** (۲) (بیشک اللہ تعالیٰ ہی ہر چیز کے خالق ہیں)۔

اور ارشاد ہے: **"إن الله بالغ أمره قد جعل الله لكل شيءٍ قدرا"** (۳) (بے شک اللہ تعالیٰ اپنے ہر کام کو اس کے کمال تک پہنچانے والے ہیں)۔

بیشک اللہ رب العزت نے ہر چیز کے لئے اندازہ مقرر کر رکھا ہے اور ارشاد ہے: **"لا الشمس ينبغي لها أن**

۱- سورۂ حدید: ۳۔
۲- سورۂ زمر: ۶۲۔
۳- سورہ طلاق: ۳۔

تدرک القمر ولا اللیل سابق النہار وکل فی فلک یسبحون "(۱) (آفتاب کو اختیار نہیں ہے کہ وہ ماہتاب کو پا جائے اور نہ رات دن پر سبقت کرسکتی ہے، بلکہ ہر ایک اپنے اپنے محور پر تیرتے رہتے ہیں)۔

اور ارشاد ہے: "**مرج البحرین یلتقیان، بینہما برزخ لا یبغیان فبای آلاء ربکما تکذبٰن**" (۲)۔

اس قسم کی بے شمار آیات ونصوص میں جو قاطع دلیل ہیں کہ اللہ جل جلالہٗ نے یہ تمام چیزیں اپنی خاص حکمت وقدرت کے تحت پیدا فرمائی ہیں اور ازل ہی سے مکتوب بھی فرمالیا ہے اور وہ سب اٹل ہیں اور اس کے خلاف ذرہ برابر بھی کبھی نہیں ہوسکتا اور یہ سب اللہ کے علم وقدرت کے تحت ہے اور اگر ایسا نہ مانا جائے تو نعوذ باللہ من ذلک۔ ذات وحدہٗ لاشریک لہٗ کی ذات کو علم سے عاری، قدرت وحکمت سے خالی اور عاجز وغیرہ ماننا پڑے گا۔

"**وتعالیٰ عما یقولون علواً کبیراً**" (۳) (اللہ تعالیٰ کی ذات ان باتوں سے بہت زیادہ بلند وبالا ہے)۔

اور اسی مسئلہ کو مسئلہ تقدیر کہتے ہیں۔ اور چونکہ علم وعقل انسانی کسی ایک مخلوق کے اس رابطہ کی حقیقت اور اس کی کیفیات وحالات کو بھی سمجھنے سے قاصر وعاجز ہے، کیونکہ انسان کی عقل ودانش اور علم ادھورا اور نامکمل ہے، ہر طرف سے جہل وعجز سے اور عدم علم سے گھرا ہوا ہے، بڑے بڑے عقلاء وحکماء بھی عاجز ودرماندہ ہیں، مثلاً عقلاء کی وہ جماعت جو آسمان کے وجود کی قائل نہیں ہے۔ وہ بھی نہ بتا سکی کہ یہ فضا کہاں تک ہے اور اس میں کیا کیا چیزیں ہیں، بلکہ محض اس زمین سے اوپر کی اس خالی فضا میں کیا کیا چیزیں ہیں اور کس انداز و ڈھنگ کی ہیں ان سب کو بھی ابھی تک عقل انسانی نہ معلوم کرسکی یہ تو بڑی بات ہے۔ زمین پر جتنی چیزیں ہیں ان کا احاطہ بھی عقل انسانی ابھی تک نہیں کرسکی آئے دن برابر نئے نئے انکشافات ہوتے رہتے ہیں۔ اور نئی نئی چیزوں کا علم حاصل ہوتا رہتا ہے، کرۂ زمین مع کرۂ مارمحدود ہے اور اس کے اردگرد انسان بارہا چکر لگا چکا ہے، مگر اب تک معلوم نہ کرسکا کہ زمین کے اندر اس کی تہوں میں کیا کیا چیزیں مخفی ہیں یا سمندروں کی گہرائی کتنی ہے اور اس میں کیا کیا چیزیں پوشیدہ ہیں، حالانکہ ان چیزوں کا مشاہدہ وانکشاف اپنی قدرت واختیار میں سمجھتے ہیں، جیسا کہ ان کی شب وروز کی مساعی سے اندازہ ہوتا ہے، تو پھر جن چیزوں کا انکشاف ومشاہدہ حواس خمسہ ظاہرہ وحواس خمسہ باطنہ میں سے کسی کے ذریعہ نہ ہوسکتا ہو اور اس کا انکشاف ومشاہدہ اپنی قدرت واختیار میں نہ ہو، اس کو یہ ہماری عقل انسانی محض اپنے بل بوتے پر کیسے معلوم کرسکتی ہے؟

۱- سورۂ یٰسین: ۴۰۔

۲- سورۂ رحمٰن: ۱۹ تا ۲۱۔

۳- سورۂ اسراء: ۴۳۔

اسی دنیا میں بہت سی چیزیں ہیں جن کے اثرات ہم دن رات دیکھتے ہیں۔اور ان کے وجود کا یقین رکھتے ہیں، مگر ان کی حقیقت معلوم کرنے سے ہماری عقل عاجز و درماندہ ہے۔مثلاً یہی روح ہے جو ہر جاندار کے اندر رہوتی ہے اور اس کے اثرات (چلنا پھرنا کھانا پینا وغیرہ سب) ہم دیکھتے اور سمجھتے ہیں اور جب وہ روح جسم سے الگ ہو جاتی ہے تو وہی جسم خاک کا ایک ڈھیر، بلکہ اس سے بھی بدتر ہو جاتا ہے۔

بڑے بڑے فلاسفہ و عقلاء نے روح کی حقیقت کو معلوم کرنا چاہا، مگر متضاد کلام بول کر اپنے عجز و درماندگی کا اظہار کر کے چلے گئے، نہ ان کے تجربات نے ہمنوائی کی اور نہ ان کے حسیات و وجدانیات ہی نے رہنمائی کی۔کلام الٰہی بھی اس کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

”ویسئلونک عن الروح قل الروح من أمر ربي وما أوتیتم من العلم إلا قلیلا“(۱)(یہ لوگ آپ سے روح کے بارے میں سوال کرتے ہیں آپ کہہ دیجئے کہ روح میرے رب کا حکم ہے (تم لوگ اس کی حقیقت نہیں سمجھ سکتے، اس لئے کہ) تم لوگ علم کا بہت تھوڑا حصہ دیئے گئے ہو)۔

اسی طرح کیفیات نفسانیہ ہیں کہ ان کو بھی محض ان کے اثر و علامات کے ذریعہ جانتے ہیں اور ان کے موجود ہونے کا یقین رکھتے ہیں، مگر اس کی حقیقت کا مشاہدہ نہ کر سکتے ہیں، نہ کرا سکتے ہیں، بلکہ بہت سی کیفیات نفسانیہ ایسی ہیں کہ جب تک انسان ان سے خود متصف نہ ہو جائے اس وقت تک اس کی حقیقت کو نہ وہ خود سمجھ سکتا ہے اور نہ کوئی دوسرا اس کو وہ حقیقت سمجھا سکتا ہے، خبر دینے والے اور بتلانے والے پر ہی اعتماد کر کے ماننا اور یقین کرنا پڑتا ہے اور یہ طریقہ رائج، بلکہ شائع وذائع ہے، اس کا کوئی انکار نہیں کر سکتا۔

جیسے نابالغ لڑکا اگر چہ ذی شعور ہو چکا ہے، مگر وہ بلوغت کی حقیقت ولذت نہیں سمجھ سکتا، اگر کوئی دوسرا سمجھانا اور بتلانا بھی چاہے تو بلوغت کی حقیقت ولذت نہیں سمجھا سکتا، بلکہ محض استاد کے بتلانے اور مخبر کے خبر دینے پر قناعت کرتا ہے اور یقین کر لیتا ہے اور اس کے مسائل کو معلوم کر لیتا ہے۔اور جب بالغ ہو جاتا ہے تو خود بلوغت کی حقیقت ولذت وغیرہ سب کا مشاہدہ ہی نہیں، بلکہ حق الیقین کے درجہ میں یقین کر لیتا ہے۔

اور جیسے عنین آدمی جو جماع پر قادر نہ ہو۔اس کو جماع کی لذت وکیفیت معلوم نہیں اگر کوئی اس کو جماع کی لذت وکیفیت سمجھانا چاہے تو سمجھا نہیں سکتا، حالانکہ جماع کی لذت وکیفیت کا وجود یقینی ہے، اور اس عنین کی عقل و دانش بھی کامل

۱- سورۂ اسراء:۸۵۔

ومکمل ہے، بلکہ وہ علامہ دوراں بھی ہوسکتا ہے، مگراس کے معلوم کرنے اور سمجھنے سے عاجز وقاصر ہے، اور محض لوگوں کے بتانے پر تسلیم کرتا اور یقین کرتا ہے، جب عقل انسانی کا اس دنیا فانی کی چیزوں میں یہ حال ہے تو پھر آخرت کے معاملہ میں اور آخرت کی چیزوں میں جو اس عقل سے وراء الوراء ہے محض اپنی اس عقل وعلم کے ذریعہ کیسے معلوم کرسکتا ہے؟ اور محض اپنی اس عقل وعلم سے سمجھ لینے پر تسلیم کرنے کا مدار رکھنا کہاں تک قرین شعور ودانش ہے۔ اس کی مثال تو اس نابالغ بچے اور عنین شخص جیسی ہوگی جو نابالغ وعنین ہونے کے باوجود بلوغت ولذت جماع کی حقیقت معلوم کرنے کا خواہشمند ہو، غرض علم وعقل انسانی کا اس تمام کائنات اور مخلوقات کے اس رابطۂ حادث بالقدیم کی حقیقت وکیفیت کو سمجھانا تو درکنار وہ تو اس کی ایک ایک مخلوق کے بھی اس کے ساتھ رابطہ کی حقیقت وکیفیت کو معلوم کرنے اور سمجھنے سے قاصر وعاجز ہے، اور اس کے لئے نابالغ وعنین کی طرح بجز اس کے چارہ نہیں کہ وہ مخبر صادق جناب محمد رسول اللہ ﷺ کی خبروں پر اور وحی الٰہی کی خبروں پر اعتماد کرکے صحیح تسلیم کرلے اور ہلاکت سے اپنے آپ کو بچالے اور صرف یہی ایک ذریعہ اس کو اپنے کو ہلاکت سے بچانے اور نجات دلانے کا ہے، ورنہ اس کی مثال بالکل اس شخص جیسی ہوگی جو جہاز میں سوار ہوکر کہیں جارہا ہو اور جہاز بھنور میں پڑ گیا ہو، اور جہاز ران کہہ رہا ہو کہ جلدی اپنے گلے میں یہ ہوا کا حلقہ ڈال لو، کمر میں یہ ہوا کی پٹی باندھ لو، اور سینہ سے یہ ہوا کی مشک لگالو اور بوقت ضرورت اس سے کام لو، ورنہ ڈوب کر ہلاک ہوجاؤ گے۔ اور وہ شخص جہاز ران کی ان ہدایتوں کو نہ مانے اور یہ کہے کہ ہم تو جب تمہاری بات تسلیم کریں گے اور مانیں گے جب جہاز کو بھنور میں غوطہ کھانے کی سب حقیقت اور کیفیت دکھلا دو یا بتلا دو یا سمجھا دو اس کے بعد ہی تمہاری بات مانیں گے۔ اور تمہاری ہدایت پر عمل کریں گے۔ ایسے شخص کو کون صحیح الفہم، صائب الرائے اور صاحب عقل ودانش کہے گا۔ بالکل یہی حال وحکم ہوگا اس شخص کا جو ربط حادث بالقدیم کی حقیقت اور اس کی تمام کیفیات وتفصیلات کو وحی الٰہی اور مخبر صادق کی خبر کی مدد کے بغیر محض اپنے علم وعقل سے معلوم کرنے کے درپے ہوگا اور مطالبہ کرے گا۔ اور تقدیر کا مسئلہ بھی چونکہ اسی قبیل سے ہے، اس لئے اس کے بارے میں بھی یہی حکم وحال ہوگا۔ انہیں وجوہ سے رحمتِ عالم نبی اکرم ﷺ نے اس مسئلہ میں بحث کرنے سے روک دیا ہے مثلاً فرمایا کہ:

الف : "یأتي الشیطان إلیٰ أحدکم، فیقول من خلق کذا ،من خلق کذا، حتی یقول: من خلق ربک، فإذا بلغه فلیستعذ بالله ولینته" (۱)۔

ب : قال علیه السلام: "لا یزال الناس یتساء لون حتی یقال: هذا خلق الله الخلق، فمن خلق الله

۱- رواہ البخاری، مشکوۃ، کتاب الایمان ۱/ ۲۰۳۔

فقولوا: الله الصمد لم يلد ولم يولد ولم يكن لهٗ كفواً أحد، ثم يتفل عن يساره ثلاثا وليستعذ بالله من الشيطان الرجيم"(۱)۔

(الف-شیطان تم میں سے ایک کے پاس آتا ہے اور کہتا ہے کہ کس نے یہ پیدا کیا؟ کس نے وہ پیدا کیا پوچھ پڑتا ہے، پھر تمہارے رب کو کس نے پیدا کیا، پس جب شیطان اس حد پر پہنچے تو تم اللہ سے پناہ مانگ لیا کرو اور تھکار سے اس کو دفع کردیا کرو)۔

ب- حضور علیہ السلام نے ارشاد فرمایا کہ لوگ آپس میں سوال وجواب کرتے کرتے یہ پوچھ پڑتے ہیں کہ تمام مخلوق کو تو اللہ نے پیدا کیا تو پھر اللہ کو کس نے پیدا کیا؟ پس جب لوگ اس قسم کا سوال کر بیٹھیں تو تم لوگ فوراً یہ کہو کہ اللہ کی ذات تو بے نیاز ہے ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گی، اس ذات نے نہ تو کسی کو جنا اور نہ کسی نے اس کو جنا ہے اور نہ کوئی اس کے مثل و مماثل ہے، پھر اپنے بائیں مونڈھے پر تھکار دے اور شیطان رجیم سے پناہ مانگے۔

ان روایتوں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اگر انسان اس مسئلہ میں ردوکرید یا بحث مباحثہ کرے گا، تو عجب نہیں کہ شیطانی نرغہ میں پھنس کر اور مخبوط الحواس ہو کر یہ پوچھنا شروع کردے کہ جب یہ ساری کائنات مخلوقات اللہ نے پیدا کی ہے تو (نعوذ باللہ) خود اللہ کو کس نے پیدا کیا ہے، چنانچہ بہت سی احادیث میں اس کو بیان فرمادیا گیا ہے، اور اس میں گفتگو کرنے سے بچنے کی تاکید فرمائی گئی ہے، بلکہ ایک موقعہ پر چند صحابہ کو اس مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے دیکھ کر بہت سخت تاکید فرمائی ہے، "ترمذی شریف" میں حدیث ہے ایک صحابی فرماتے ہیں:

"خرج علينا رسول الله ﷺ ونحن نتنازع في القدر فغضب حتى أحمر وجهه حتى كأنما فقئي في وجنتيه حب الرمان فقال: أبهذا أمرتم؟ أم بهذا أرسلت إليكم إنما هلك من كان قبلكم حين تنازعوا في هذا الأمر، عزمت عليكم عزمت عليكم أن لا تنازعوا فيه، رواه الترمذي" (۲)۔

(ہم لوگ تقدیر کے مسئلہ میں گفتگو کررہے تھے کہ اچانک حضور علیہ السلام تشریف لائے (اور ہم لوگوں کی یہ گفتگو دیکھ کر) سخت غضبناک ہوگئے، یہاں تک کہ آپ کا چہرہ اس طرح سرخ ہوگیا جیسے آپ کے مبارک رخساروں میں انار نچوڑ دیئے گئے ہوں، پھر آپ علیہ السلام نے ارشاد فرمایا کہ کیا تم لوگ اسی کا حکم دیئے گئے ہو، یا کیا میں تمہارے درمیان اسی لئے بھیجا گیا ہوں کہ تم ان باتوں میں بحث وتمحیص کرو، تم سے قبل بہت سے لوگ اس تقدیر کے مسئلہ میں بحث ومباحثہ کرنے کی وجہ سے

۱- مشکوۃ عن سنن ابی داؤد کتاب الایمان باب الوسوسہ مع شرح الطیبی ۱/ ۲۱۲۔

۲- مشکوۃ مع شرح الطیبی کتاب الایمان ۱/ ۲۵۱۔

ہلاک کئے جا چکے ہیں۔خبردار! خبردار! میں تم لوگوں پر لازم کرتا ہوں کہ کبھی اس میں بحث ومباحثہ مت کرو)۔

اس حدیث پاک میں اس طرف اشارہ ہے کہ تقدیر کو تسلیم کرتے ہوئے اوراس پرایمان رکھتے ہوئے خاموشی سے ان مقاصد کی تکمیل کرنی چاہئے، جن کے لئے آپ مبعوث فرمائے گئے ہیں اوراس کا طریقہ صرف یہ ہے کہ آپ کے بتلائے ہوئے احکام پر عمل محض اللہ کو راضی کرنے کے لیے کیا جائے اور احیائے سنت کیا جائے۔اگر غور کیا جائے تو اسی طریقہ کار میں عقلاً بھی سلامت روی اور ہوشمندی ہے،ایک موقعہ پر صحابہ کرام نے سرکار دو عالم ﷺ کے سامنے اسی مسئلہ تقدیر کو پیش فرما کر عرض کیا کہ یارسول اللہ ﷺ أفلا نتكل على كتابنا وندع العمل" تو پھر کیا ہم اپنی تقدیر پر بھروسہ کرکے عمل کرنا ترک نہ کردیں تو آپ نے جواب میں ارشا فرمایا:

"قال: اعملو فكل ميسر لما خلق أما من كان من أهل السعادة فسيسر لعمل السعادة، واما من كان من أهل الشقاوة فسيسر لعمل الشقاوة، ثم قرا: فأما من أعطى واتقى وصدق بالحسنى الآية" (۱)۔

"وبقيه الاٰية هذا وأما من بخل واستغنى وكذب بالحسنىٰ فسنيسرهٗ للعسرىٰ وما يغنى عنه ماله إذا تردى"(۲)۔

(عمل کرو ہر شخص کے لئے وہی عمل آسان کیا جاتا ہے جس کے لئے وہ پیدا کیا گیا ہے، پس جو شخص اہل سعادت سے ہوتا ہے اس کے لئے سعادت کے کام آسان ہوتے ہیں اور جو شخص اہل شقاوت میں سے ہوتا ہے اس کے لئے شقاوت کے کام آسان معلوم ہوتے ہیں، پھر آپ نے یہ آیت کریمہ:"فأما من أعطى واتقى وصدق بالحسنىٰ فسنيسره لليسرىٰ" (۳)تلاوت فرمائی (پوری آیت کریمہ کا ترجمہ یہ ہے)بہر حال جو شخص صدقہ وزکوۃ نکالتا رہتا ہے اور تقوی اختیار کرتا ہے اور ایمان کی باتوں کی تصدیق کرتا ہے اس کو ہم نیک کام اور فراغت دتی آسان کردیتے ہیں۔اور پھر اس کا مال اس کو ہلاک ہونے سے نہیں بچاتا)۔

خلاصہ یہ ہے کہ صحابہ کرام نے تقدیر میں لکھے ہوئے پر بھروسہ کر کے عمل چھوڑ بیٹھنے کی درخواست کی تھی تو آپ ﷺ نے عمل چھوڑ بیٹھنے سے منع فرماتے ہوئے یہ فرمایا کہ عمل کرتے رہو اور ہمیشہ نیک عمل کی کوشش کرتے رہو، یہ سب

۱- مشکوۃ عن البخاری ومسلم، سورہ لیل:۵ تا ۷، بخاری کتاب تفسیر القرآن، باب ۷، ۸۶/۶ و ابوداؤد کتاب السنہ حدیث نمبر ۴۶۹۴، ۲۲۳/۴ (مرتب)۔

۲- سورۂ لیل:۸ تا ۱۱۔

۳- سورۂ لیل:۵ تا ۷۔

اعمال (نیک وبد) انسان کے انجام پر اور مابعد الموت کے حالات پر قرینہ بنتے ہیں جو نیک بخت ہوتا ہے، اس کے لیے دنیا میں نیک اعمال آسان کردئے جاتے ہیں اور جو بد بخت ہوتا ہے، اس کے لئے اعمال بد آسان کردئے جاتے ہیں، لہذا اگر اعمال خیر صادر ہوں توشکر کرو اور مزید عمل نیک کی توفیق مانگو اور اس کے لئے سعی کرو اور اس میں رضائے باری حاصل ہونے کی دعاء کرو اور رضاء باری حاصل کرنے کی توفیق مانگو۔

پوری انسانی زندگی کا اصلی سرمایۂ حیات رضاء باری تعالیٰ کا حاصل ہوجانا ہے، **كما أشار إليه قوله تعالىٰ:** **"وما لأحد عنده من نعمة تجزىٰ إلا ابتغاء وجه ربه الأعلى ولسوف يرضى"** (۱) نیکوں کے نزدیک اس سے بڑی کوئی اور نعمت نہیں ہے کہ ان کو ان کے اعمال کے بدلہ میں دیدار خداوندی نصیب ہو اور باری تعالیٰ جلد ان کو اس نعمت سے خوش کردے گا۔

اور اس سرمایۂ حیات (رضاء باری) کا حصول اعمال نیک کے پردہ میں ہوتا ہے جو تقویٰ اور اخلاص کے ساتھ حکم شرعی کے مطابق ہو، جیسا کہ فرمایا گیا:

"وما أمروا إلا ليعبدوا الله مخلصين له الدين حنفاء" (۲) اور فرمایا گیا: **"فأما من أعطىٰ واتقىٰ وصدق بالحسنىٰ فسنيسره لليسرىٰ وأما من بخل واستغنىٰ وكذب بالحسنىٰ فسنيسره للعسرىٰ وما يغني عنه ماله إذا تردى"** (۳)۔

(لوگ حکم نہیں دئے گئے ہیں، مگر اس بات کا کہ کامل اخلاص کے ساتھ اللہ کی عبادت کریں اور دین کو خالص اللہ کے لئے بنائیں اور حنیف بنے رہیں، — سو جس نے دیا اور ڈرتا رہا۔ اور سچ جانا بھلی بات کو سو اس کو ہم سہج سہج پہنچادیں گے آسانی میں اور جس نے نہ دیا اور بے پروا رہا۔ اور جھوٹ جانا بھلی بات کو تو اس کو ہم سہج سہج پہنچادیں گے سختی میں اور کام نہ آئے گا اس کا مال جب گڑھے میں گرے گا)۔

لہذا اسی سرمایۂ حیات ومقصد زندگی کی حفاظت کو ہمیشہ مطمح نظر بنائے اور اسی پر قناعت کرے کہ اسی میں سلامتی ہے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

۱- سورۂ لیل: ۱۹-۲۱۔

۲- سورۂ بینہ: ۵۔

۳- سورۂ لیل: ۵ تا ۱۱۔

شانِ رسول ﷺ میں گستاخی کرنا کیسا ہے؟

عالی جناب مفتی صاحب مدظلہ مندرجہ ذیل سوال کا جواب عنایت فرمائیں (۱):

”یہی نہیں، بلکہ آج سے چودہ سو سال قبل جب پیغمبر خدا (ﷺ) کو اہل مکہ نے اپنی ظالمانہ حرکتوں سے مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ منورہ میں پناہ لینے پر مجبور کر دیا، تو اسی واحد قوم انصار نے آپ کو پناہ دی، یہ ہی واحد قوم ہے جس سے رب العزت نے اپنے پیارے رسول کا تحفظ کر دیا، اور یہ ہی قوم انصار اپنی اس روایت کو قائم رکھتے ہوئے ہر دور ہر خطہ زمین سے گذرتی رہی۔ یہاں تک کہ اپنی تہذیب کے ساتھ میرے عزیز ملک میں بھی آئی۔“

اوپر لکھے ہوئے یہ الفاظ جو شانِ رسول اللہ میں استعمال ہوئے ہیں۔ استعمال کرنے والے پر کیا جرم عائد ہوتا ہے؟ اور پناہ کا لفظ شانِ رسول ﷺ کے لئے استعمال کرنا کیسا ہے؟ اور اس لفظ کا استعمال کہاں ہوتا ہے؟

عمر حسین کول ڈپو، نیاز گنج، المورہ، یوپی

الجواب وباللہ التوفیق:

شانِ رسول اللہ ﷺ میں گستاخی کرنے والا ایمان سے خارج ہوجاتا ہے، باقی گفتگو اس مذکورہ عبارت پر ہے کہ اس کا کیا حکم ہے۔

”فیروز اللغات“ میں لفظ پناہ کے مختلف معانی لکھے ہوئے ہیں، مثلاً حفاظت، حمایت وغیرہ (۲)۔

نیز (بخاری شریف ۲/۶۲۰) میں غزوۂ حنین کے ایک واقعہ کا ذکر ہے۔ کہ آپ نے جنگ حنین کے مال غنیمت کو بعض قریش کو تالیف قلب کے لئے دیا اور انصارؓ کو نہیں دیا جس کی وجہ سے ان کے اندر خلجان پیدا ہوا تو آپ ﷺ نے (لمبی حدیث ہے، اخیر میں) یہ فرمایا: ”لو شئتم قلتم جئتنا كذا وكذا“ اور ”فتح الباری“ (ص ۸/۴۱) میں ان جملوں کی تشریح میں حضرت ابو سعید خدری کی روایت سے یہ الفاظ منقول ہیں، حضور ﷺ نے فرمایا: ”أما والله لو شئتم لقلتم فصدقتم وصدقتم أتيتنا هكذا مكذبا فصدقناك ومخذولاً فنصرناك وطريداً فآويناك وعائلاً

۱- اصل مسودے میں سوال یہیں سے شروع ہوا ہے، ایسا لگتا ہے کہ جس شخص کے بارے میں یہ سوال کیا گیا ہے، اس کی بہت سی باتیں نقل کرنے کے بعد اپنے سوال کو مزید مدلل کرنے کے لئے سائل نے ”یہی نہیں“ بلکہ آج سے ...... سے بات شروع کی ہے، اور سائل کا منشاء چونکہ اتنا ہی سے واضح ہو جا رہا ہے، اس لئے اصل مسودے میں ” “ کے درمیان کی عبارت نقل کرنے کو کافی سمجھا گیا ہے (مرتب)۔

۲- فیروز اللغات رص ۳۰۳۔

فواسیناک"(۱)۔

ان تمام باتوں کے باوجود حضور ﷺ نے ان کو خارج ایمان نہیں قرار دیا یہ سب اس بات کے قرائن ہیں کہ تکفیر نہ کرنی چاہئے، نیز فقہ کا قاعدہ ہے کہ اگر کسی کے کلام میں سو پہلو میں سے ننانوے پہلو کفر کے نکلتے ہوں اور صرف ایک پہلو ایمان کا نکل آتا ہو تو کافر نہ کہنا چاہئے، "**إذا کان في المسئلة وجوه توجب الکفر ووجه واحد یمنع فعلی المفتي أن یمیل إلی ذلک الوجه کذا في الخلاصة**"(۲) اور یہاں تعدد معانی کی وجہ سے احتمال عدم تکفیر پیدا ہوگیا، اس لئے بھی تکفیر نہ کریں گے، البتہ ایسے الفاظ جو موہوم ہوں ان کا استعمال جناب رسالت مآب ﷺ کی شانِ اطہر میں ہرگز نہ کرنا چاہئے۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

کمیونسٹ پارٹی میں شامل شخص کا حکم:

"نسأل الله تعالیٰ لنا ولکم العفو والعافیة ولغرض لدی الاستاذ الکریم ان افجع ما نزل الیوم بعامة المسلمین ولا سیما مسلمي جبال الافغانستان وسکان القری والبلاد فیه فاجعة سلطة الکمیونستین العارضین من نور محمد الترکي إلی من یحذو حذوة وبعدها سلطة الکمیونستین الأصلین من برزنیف إلی من یتلو تلوه، والفرقة الاوی قد تصلي وتتلو آیة من القرآن الکریم عند الناس وانها لتصدق وتؤمن باحکام کمیونست وتبطل قانون الملک والإرث و تقول بدل التبادل فی الحقوق علی قدر الاستحقاق بالتساوی فی العمل فکما یصوغ للرجل خروج التبرج، کذلک یجوزونه للمرأة بل یجبرونها به، والرجل یطیع شمول الفوج الحربي ویقهرون النسوان بذلک و یبطلون الملک ولو ملک المتعة یحقون الطلاق من الجانبین الزوج، والزوجة، بل یقولون: إن التدین بأی دینٍ کافیون منّوم، وکتب العقائد الاسلامیة والفقه الاسلامی مشحونة بکفر من أنکر نصّا قطعیاً أو إجماعاً کذلک، وذلک الصدیق أکبرؓ قد قاتل ما نعي الزکوة وهم یصلون ویصومون،

۱- فتح الباری ۲/ ۴۱۔

۲- الفتاوی الہندیہ احکام المرتدین ۲/ ۲۸۳۔

وهولاء المرتدين يقابلون معاملات الشرع باسرها ويبطلونها بفرامينهم المشؤمة، فنرجو أن تزيحوا شبهتنا من فتيا معنونة بعنوانكم الف ۲۰۳ باستفتاء۔"
مسلم لندنی فيها نص آتی (جو شخص نماز روزہ کرتا ہو اس کو محض کمیونسٹ ہونے کی وجہ سے قتل کر دینا جائز نہیں)۔ بینوا توجروا۔

شیخ صاحب قندہاری مہاجر کوئٹہ پاکستان

الجواب وبالله التوفيق:

جواب ہمیشہ سوال کے تابع اور اس کے مطابق ہوتا ہے، لہذا یہ جواب بھی اپنے سوال کے تابع اور اس کے مطابق ہوگا اگر اس جواب کے ساتھ پورا سوال و پورا جواب بھی یہاں نقل ہوتا ہے تو خود بخود آسانی سے پوری بات سمجھ میں آجاتی ہے۔ اگر سوال نقل کرنے کا موقع نہیں تھا تو صرف نمبر سوال بھی اگر مذکور ہوتا جب بھی ہم اپنے فائل سے نکال کر دیکھ لیتے بہر حال چونکہ یہ جواب احقر کا ہی لکھا ہوا ہے، اس لئے اس کا پورا مفہوم بھی احقر کے ذہن میں ہے اور وہ یہ ہے کہ کوئی مسلمان صحیح العقیدہ وصحیح الاعمال ہو اور وہ ہندوستان کی سیاسی جماعت جو کمیونسٹ کے نام سے موسوم ہے محض سیاسی اشتراک کر لینے کی وجہ سے چاہے اس سیاسی کمیونسٹ جماعت کا ایک فرد کہا جائے، مگر اس کو محض اس وجہ سے قتل کر دینا جائز نہ ہوگا، بلکہ بالکل ایسا ہی ہوگا، جیسا کہ کانگریس وغیرہ دوسری جماعتوں میں صحیح العقیدہ اور صحیح الاعمال مسلمان کے شریک سیاست ہو جانے سے ان کا قتل کر دینا جائز نہیں۔

بصیرت کے لئے ذرا اور تفصیل سمجھ لیجئے ہندوستان میں بہت سی سیاسی جماعتیں (کانگریس، شوسلسٹ، کمیونسٹ وغیرہ) ہیں اور ہر ایک میں غیر مسلموں (کافروں مشرکوں، دہریوں) وغیرہ کی اکثریت ہے، مگر ہر جماعت میں لوگ اپنے عقیدے ومذہب پر قائم رہتے ہوئے شریک جماعت ہوتے ہیں اور محض اس وجہ سے کسی کو مرتد یا کافر یا واجب القتل نہیں کہا جاتا اور نہ کہہ سکتے اسی طرح اس کو بھی واجب القتل نہیں کہہ سکتے (۱)، اور جو مسلمان اسلامی عقائد واعمال کو چھوڑ کر کافرانہ عقیدہ

۱- عن أنس بن مالک ؓ قال، قال رسول اللہ ﷺ: ثلاثة من أصل الإيمان، الكف عمن قال لا إله إلا الله، ولا تكفره بذنب ولا تخرجه من الإسلام بعمل، والجهاد ماض منذ بعثني الله إلى أن يقاتل آخر أمتي الدجال لا يبطله جور جائر ولا عدل عادل والإيمان بالأقدار (سنن ابوداؤد کتاب الجہاد باب فی الغزو مع ائمۃ الجور ۳/۸ احدیث ۲۵۳۲) روى الطحاوي عن أصحابنا لا يخرج الرجل من الإيمان إلا جحود ما أدخله فيه، ثم ما تيقن أنه ردة يحكم بها به، وما يشك أنه ردة لا يحكم بها، إذ الإسلام الثابت

واعمال اختیار کرلے تو اگرچہ وہ کسی بد دین جماعت میں داخل نہ بھی ہو جب بھی شرعی حکومت کو یہ حق ہو جاتا ہے کہ وہ اسلام پیش کرے، اور پیش کرنے کے بعد ارتداد پر قائم رہے تو اس کو قتل کر دے(۱)۔

اور جو اعمال وعقائد سوال میں درج ہیں اس کا قائل ومعتقد بلاشبہ اسلام سے خارج ہو گا اور شرعی حکومت کو حق ہو گا کہ وہ اسلام پیش کرے، اگر اس کے باوجود باز نہ آئے تو سزائے مرتدین جاری کر دے، لہٰذا اس فتوی سے مغالطہ نہ کھانا چاہئے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

کیا توریت، انجیل وبائبل پڑھنے والا مرتد ہو گیا؟

اگر کوئی شخص توریت انجیل یا بائبل محض معلومات کے لئے مطالعہ کرے حالانکہ وہ مسلمان ہے اور اپنے آپ کو مسلمان کہتا ہے اور نماز بھی پڑھتا ہے اور جمیع امور مسلمانوں کی طرح بجالاتا ہے کیا یہ شخص مرتد ہو گیا۔

مذکورہ شخص کو مرتد کہنے والے کے لئے کیا حکم ہے مفصل تحریر فرمائیں۔

اسرار احمد ضلع سہارنپور، یوپی

الجواب وباللہ التوفیق:

محض معلوماتی مطالعہ کی ہر شخص کو اجازت نہیں ہاں جو شخص اپنے مذہبیات پر پورا عبور رکھتا ہو ہر قسم کے تشیب وفراز کو سمجھتا ہو حق وباطل کو خوب پہچانتا ہو اور اس کے رد کرنے کی بھی پوری قدرت رکھتا ہو اور رد کرنے کے ہی نیت سے دیکھے اور پھر جہاں کچھ اشکال ہو وہاں اس فن کے ماہر علماء سے رجوع کرتا رہے، تو اس کو اس کی اجازت ہو گی باقی اسکولوں کالجوں وغیرہ اور مدارس میں جو ایسی کتابیں پڑھائی جاتی ہیں اسکا حکم ایسا ہے جیسا کہ عربی دینی مدارس میں فلسفہ کی کتابیں جن میں عقائد

لا یزول بشک مع أن الإسلام یعلو، وینبغی للعالم إذا رفع إلیه هذا أن لا یبادر بتکفیر أهل الإسلام مع أنه یقضی بصحة إسلام المکره (البحر الرائق ۵/۲۰۹) (مرتب)۔

۱- وفی المسایرة: ولاعتبار التعظیم المنافی للاستخفاف کفر الحنفیة بألفاظ کثیرة وأفعال تصدر من المتهتکین لدلالتها علی الاستخفاف بالدین (البحر الرائق ۵/۲۰۲)، ویعرض الإسلام علی المرتد وتکشف شبهته ویحبس ثلاثة أیام، فإن أسلم وإلا قتل (کنز الدقائق مع شرحہ البحر الرائق ۵/۲۰۱) (مرتب)۔

اسلام کے خلاف باتیں بھی ہوتی ہیں، جیسے اثبات "جزء الذی لاتجزی، ہیولی بصورت جسمیہ وقدم عالم وصفات باری تعالی، کے مسائل وغیرہ اور جیسا کہ دفع سحر کے لئے مسائل کا پڑھنا پڑھانا کہ ان مسائل وعقائد کورد کرنے اور ان کے ضرر سے بچنے اور انکا صحیح شرعی حکم معلوم کرنے کے لئے پڑھتے پڑھاتے ہیں اور جیسا کہ اسکولوں کالجوں میں حساب سود کا اور دیگر ناجائز قوانین کا اور داخل نصاب گیتا اور رامائن وغیرہ پڑھنے پڑھانے کا حکم کہ اس کو وقت آنے پر رد کرنے کی نیت سے یا محض نصاب کے جزو لازم ہونے کی وجہ سے اور امتحان میں پاس ہونے کے لئے پڑھتے پڑھاتے ہیں اور ان مضامین کو حق نہیں مانتے اور نہ ان کو حق وصحیح کہتے ہیں، بلکہ موقع آنے پر اس کورد کرنے کی نیت رکھتے ہیں اور ایسی صورتوں میں بوجہ ضرورت او ربقدر ضرورت ان کے پڑھنے پڑھانے کی گنجائش ہوگی (۱) اور سوال کا پرچہ محض مطابق سوال لکھنے سے یا اس کو صحیح جواب کہنے سے مرتد نہیں کہیں گے، جبکہ وہ ان چیزوں اور مضامین کو حق وصواب نہیں جانتا، ارتداد نام ہے دین سے پھر جانے کا اور وہ شخص ایسا نہیں ہے، کیونکہ وہ اپنے کو مسلمان کہتا ہے اور اسلامی عقیدے رکھتا ہے، اسلامی قاعدہ وقانون کے مطابق اسلامی عبادت بھی کرتا ہے، پس ایسی حالت میں جو لوگ اس کو مرتد اور خارج از اسلام کہیں گے وہ گنہگار ہوں گے انکو ایسا کہنے اور سمجھنے سے باز آنا لازم ہے اور کہہ ڈالنے کے بعد توبہ استغفار بدرگاہ رب غفار کرنا لازم ہے (۲)۔

ہاں اگر کسی کو خطرہ ہو کہ اس پڑھنے یا پڑھانے سے اس کا عقیدہ بگڑ جائے گا کفر کا عقیدہ رکھنے لگے گا تو اس کو ان چیزوں کے پڑھانے اور پڑھنے کی قطعاً اجازت نہ ہوگی، بلکہ ناجائز وحرام اور قطعاً ممنوع تک ہوسکتا ہے، اور ممنوع رہے گا، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند ۳۰/۳/۱۴۰۱ھ

نوٹ: احقر کے نزدیک استفتاء مذکورہ کا یہی جواب ہے۔

الجواب صحیح: سیداحمد علی سعید مفتی دارالعلوم دیوبند، محمود غفرلہ

۱- ما أبيح للضرورة يتقدر بقدرها (الاشباہ والنظائر ص/۱۹ الطبعۃ کراچی)۔

۲- عن أنس قال قال رسول اللهﷺ: ثلث من أصل الإيمان، الكف عمن قال لا إله إلا الله لا تكفره بذنب ولا تخرجه من الإسلام بعمل، والجهاد ماض مذ بعثني الله إلى أن يقاتل آخر هذه الأمة الدجال لا يبطله جور جائر ولا عدل عادل، والإيمان بالأقدار (مشکوۃ المصابیح باب الکبائر وعلامات النفاق ص/۱۷) (مرتب)۔

کیا رسول اللہ ﷺ اپنی قبر میں زندہ ہیں؟ اور سلام پڑھنے والے کے سلام کو سنتے ہیں؟

علماء دیوبند سارے کے سارے اس بات پر متفق ہیں کہ رسول اللہ ﷺ اپنی قبر انور میں زندہ ہیں اور اگر روضۂ اقدس پر سلام پڑھا جائے تو آپ ﷺ خود سنتے ہیں۔ لیکن علماء دیوبند میں چند عالم ایسے بھی ہیں جو کہ اس بات کو نہیں مانتے جیسے حضرت مولانا عنایت اللہ شاہ بخاری گجرات، حضرت مولانا احمد سعید ملتانی، احمد سعید صاحب تو گالی بھی دیتے ہیں ان کو جن کا عقیدہ یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ سنتے ہیں پاکستان میں علماء دیوبند صرف اس لئے بدنام ہوئے کہ ایسے دو ایک عالموں نے اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد علیحدہ بنالی اس مسئلے کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے تفصیل سے جواب دیں اور ان لوگوں کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے، یہ لوگ کہتے ہیں کہ جو ایسا عقیدہ رکھے کہ رسول اللہ ﷺ اپنی قبر انور میں زندہ ہیں وہ مشرک ہیں۔

محمد امجد سہارنپور، یوپی

الجواب وبالله التوفيق:

نبی کریم ﷺ روضۂ اطہر میں زندہ ہیں، اس لئے کہ نبی کریم ﷺ کا درجہ شہداء کے درجے سے کم نہیں ہے جن کے بارے میں نص صریح ہے۔

"ولا تقولوا لمن يقتل في سبيل الله اموات بل أحياء ولكن لا تشعرون " (۱) حضرت انسؓ سے مروی ہے: **"قال النبي ﷺ الانبياء أحياء في قبورهم .....** الحديث (۲)، صحیحین کی حدیث ہے انسؓ سے: **"عن أنسؓ عن النبي ﷺ قال: العبد إذا وضع في قبره وتولى وذهب أصحابه – حتى إنه يسمع قرع نعالهم – أتاه ملكان فاقعداه.....** الحدیث" (۳) (جب بندے کو اسکی قبر میں رکھدیا جاتا ہے اور اسکے ساتھی چلے جاتے ہیں تو وہ

۱- سورۂ بقرہ: ۱۵۴۔

۲- الأنبياء احياء في قبورهم يصلون (المطالب العاليہ ۲۶۹/۳ حدیث: ۳۴۵۲ نشر وزارۃ الاوقاف والشؤون الاسلامیہ کویت، تحقیق الشیخ حبیب الرحمٰن الاعظمی بحوالہ مسند ابو یعلی ۱۴۷/۶ حدیث ۳۴۲۵ دار الثقافۃ العربیہ دمشق و مسند بزار، وعن شداد بن أوسؓ قال: قال رسول الله ﷺ: إن من أفضل أيامكم يوم الجمعة فيه خلق آدم، وفيه النفخة، وفيه الصعقة، فأكثروا علي من الصلاة فيه، فإن صلوتكم معروضة عليّ، فقال رجل: يا رسول الله كيف تعرض صلاتنا عليك وقد أرمت يعني بليت، فقال: إن الله قد حرم على الأرض أن تأكل أجساد الأنبياء (سنن ابن ماجہ ۳۴۵/۱ کتاب اقامۃ الصلاۃ باب فی فضل الجمعہ حدیث ۱۰۸۵)) (مرتب)۔

۳- صحیح بخاری مع فتح الباری ۲۰۵/۳ کتاب الجنائز باب المیت یسمع خفق النعال حدیث ۱۳۳۸، و ص ۲۳۲ حدیث ۱۳۷۴ (مرتب)۔

ان کے جوتوں کی آواز سنتا ہے دوسری حدیث ہے جس کو امام بیہقی نے شعب الایمان میں روایت کیا ہے۔

عن أبي هريرةؓ قال قال رسول الله ﷺ من صلى علي عند قبري سمعته ومن صلى علي نائيا أبلغته(۱)۔

(جس نے میرے اوپر درود بھیجا میری قبر کے پاس میں اس کو سنتا ہوں اور جس نے دور سے پڑھا وہ میرے پاس پہنچایا جاتا ہے) اس سے بھی معلوم ہوا کہ نبی کریم ﷺ پر جو درود وغیرہ بھیجا جاتا ہے اور روضۂ اقدس پر پڑھا جاتا ہے اس کو سنتے ہیں ان دلائل اور شواہد کے ہوتے ہوئے جو لوگ منکر ہیں وہ غلطی پر ہیں، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند ۱۴۰۲/۱/۳۰ھ

عقیدہ رضاخانیت:

لقد كلفت من قبيل رئيس القضاء الشرعي المكرم بان اكتب تقريراً عن الطائفة البريلوية أي أسسها أحمد رضا خان البريلوى وقد اطلعت علي جملة من عقائدها الفاسده الخارجة عن عقيدة أهل السنة والجماعة مباشرة وبواسطة من لم فيهم من إخواننا الذين قرؤا مولفات رئيس الطائفة وأعوانه بلغته الأصلية وفيها أنه لا يفرق بين الله ورسوله، وأن الرسول ﷺ يعلم جميع الغيب بدون استثناء وانه عليه الصلوة والسلام حاضر في كل مكان وانّ السّيد عبدالقادر الجيلاني هو المستغاث به الكبير كما اطلعنا علي بعض التحريفات في الآيات القرآنيه لفظاً ومعنىً إلى أن ارتكبها

موئسس الطائفة واطلعنا كذالک علي كتبه من فضيلة الشيخ العلامة المرحوم عبدالحئى بن فخر الدين الحسني في كتابه نزهة الخواطر (المجلد الثامن ۳۸۔ و ۴۱)

ولكن لم نجد له حكماً فصلاً يتعلق بخروجه عن الملة لما فسّر لنا بأنه من الخرافات واضحُ عن الاسلام كما ذكر نقلا عن مؤسسي الطائفه أن النبي ﷺ يعلم الغيب علماً حكيماً منذ بدء الخلقية إلى قيام الساعة، بل إلى دخول الجنة والنار وأنه ليحمل لو اء الكفر كفر من يخالف عقيدة ولا سيما علماء اهل الندوة وأهل ديوبند وغير المقلدين واتباع الشيخ محمد بن عبدالوهاب الشيخ مما

۱- رواہ البیہقی فی شعب الایمان کما ذکر فی المشکوۃ ۸۷، مشکوۃ ۷۹۔

يعرفون عنه أكثر مما يعرف لذا نطلبُ من فضيلتكم التفضل بمكاتبة إلينا برائكم فى هذا المذهب البريلوى وطائفته حتى نسيئه المسلمين على خطور ة هذه الطائفة ، وانها بهذه الأداء خرجت عن مذهب الاسلام ومذهب السنة والجماعة أم هو فاسقة فقط، حتىّ يتضح لنا الأمر والله الموفق والهادى إلى سواء السبيل وموفق مع هذا اسماء بعض الكتب اتى فيها ما يخالف عقيدة السنة والجماعة ملفوظات احمد رضاء حدائق بخشش، جاء الحق، مقياس الحنفية، فوائد بديعة الامن والعلاء، احكام شرعية، الفتاوىٰ البريلوية، خالص الاعتقاد، كنز الايمان فى تفسير القرآن، وصايا شريف، هذا اللغو"۔

سیدمحمود مصطفےٰ المیس، عالم الاحادیث دائرۃ القضاء الشرعی، ابوظہی متحدہ عرب امارات

الجواب وبالله التوفيق:

الحمدلله رب العالمين والعاقبة للمقتين والصلاة والسلامعلى سيدنا محمد النبى الأمى الذى بعثه بالحق إلى كافة الناس بشيرا ونذيرا وداعيا إلى الله بإذنه وسراجا منيرا، وجعله أشرف خلقه وختم به النبوة فلا بنى بعده

وعلى العلماء الربانين الراسخين في العلم وعلىٰ آله وصحبه واتباعه الذين فازوا ببركة اتباع شريعته الدرجة العليا فى المارين۔

سماحة الفضيلة السيد الحمود مصطفىٰ عيسىٰ

عالم الأحاديث دائرة القضاء الشرعية من دولة الإمارا ة العربية المتحدة۔

السلام عليكم ورحمة الله وبركاته

وبعد! لقد تشرفت بمسئلتكم الكريمة من قبل رئيس القضاء الشرعى المكرم المؤقر، فان عقائد المولوى أحمد رضا خان البريلوى أكثرها فاسدة خارجة عن عقيدة اهل السنة والجماعةً فإنه يدعى أن الوسول عليه السلام يعلم كل المغيبات علما تفصيليا من الأزل إلى الأبد، ولايخفى منه مثقال ذرة وإنه حاضر وناظر فى كل مكان؛ فى الحياة وبعد االتحاق بالرفيق الاعلىٰ۔

وإنه يدعى أن الرسول عليه الصلوٰة والسلام هو الأول والآخر والظاهر والباطن وهو علىٰ كل شئ قدير، اى يرجع ضمير هو (فى الآية الكريمة) إلى الرسول عليه الصلوٰة والسلام، وهو تحريف معنوى فى كلام الله تعالى، لأن مرجع هو في الآية الكريمة إلى الله تعالىٰ إجماعا، والتحريف المعنوي ايضا كفر كالتحريف اللفظي وهذه الاعتقادات منه مذكورة فى رسالته "خالص الاعتقاد" فى صفحات (۴۰ إلى ۵۵) وفي رسالته الدولة المكيةً (ص ۴۰)، وحاشية، ومن ضلالته أنه مع ادعائه علم الغيب للرسول عليه السلام يقول: ويمكن نسيان بعض الآيات منه عليه السلام، كما في الملفوظ فى الجزء الثالث ٨ و ٩ بلفظه فى الهندية انتهىٰ بلفظه

والحال إنه من ضلالات الروافض وإنه مخالفه صريحة لقوله تعالىٰ؛ "إنا نحن نزلنا الذكر وإنا له لحافظون" الآية وانه يزيل سالمية كلامه تعالىٰ فالحذر الحذر ومن خداعاته: إنه يكفر كل من يخالف اعتقاداته الفاسدة ويشمل تكفيره كلا من العلماء الفحول الربانيين في الهند وخارجه من العرب والعجم حتى صرح في تكفيرهم بأسمائهم مثلا الشيخ محمد بن عبد الوهاب وأتباعهم وعلماء غير المقلدين واتباعهم وعلماء أهل ديوبند وعلماء سهارنفورى والندوه والامارة الشرعية (بهار)، وعلماء جمعية العلماء في الهند وأيه جماعة المسلمين فى الهند سواء كانت مذهبية أوسياسية وقال: من شک في كفرهم فهو ايضاً كافر. وهذه التكفيرات كلها مصرحة فى كتابه تجانب أهل السنة في صفحات شتى ٢٣، ٨٦، ٩٠، حتى قد ابتلىٰ بتكفير نفسه أيضاً في هذه التكفير لأن والده لايكفر هذه العلماء الفحول فكفر والده من هذا الفتوى فهو ايضاً كفر بنفسه، لأنه لايكفر والده، وكذلک يكفر السيد إسماعيل الشهيد الدهلوى في مقام فى كتابه "خالص الاعتقاد" ثم فيه في مقام آخر قال لانكفر إسماعيل (الشهيد، لأن الشرع منعنى بتكفير رجل فى كلامه مائة جهة كلها مكفرة إلا جهة واحدة يقتضي عدم التكفير وحال هذا الرجل هكذا.

ومن خداعاته، انه لما لم يفز في مرامة من هذه التكفيرات فاخترع اختراعاً تشنيعا جدا۔ اى ألتقط ثلاثة جمل من كتاب "عالم ربانى" (تحذير الناس) من ثلاث مقامات صيرها عبارة واحدة كفرية وترجمها بالترجمة الكفرية بنفسه وجاء بها إلى علماء الحرمين وأظهرها عليهم وأخذ منهم

فتوى الكفر على هذا الرجل واتباعهم وجيلهم الهندية ثم اشا ع هذا الفتوى باسم "حسام الحرمين" فلما اطلع على هذا الكيد وخداعه العلماء الربانيون فاظهروا عند علماء ألحرمين أصل الكتاب وأوقفوهم على الحقيقة فردوا عليه رداً كاملا وأخذوه معاتبين عليه فخاف منهم وتقياً وقال معتذرا عند حضرتهم إنا لانعتقد ان علم الرسول عليه السلام مسا ولعلم البارى بل من اعتقد المساواة بينهما فهو خارج عندى عن الاسلام ثم لما رجع إلى الهند وأشاع ثانيا رسالته الدولة المكية فكتب في حاشيته من سوى علم الرسول مع علم البارى لانقول له إنه كافر، ومن خرافات أنه يعتقد ان الشيخ عبد القادر الجيلاني مستغاث كبير في العالم مع أنه شرک صريح ويدخل به تحت وعيد الآية الكريمة:" إن الله لايغفر أن يشرک به ويغفر مادون ذلک الآية" ولكنه من قوم لايفقهون وهكذا له خرافات أخرى أتركها لخوف التطويل.

ومن سلسلة كتب الترديد لخرافاته كتاب (غاية المامول في تتمة منهج الوصول في تحقيق علم الرسول) ألفه مولانا السيد احمد آفندى البرزنجي المفتي بالمدينة المنوره في اللسان العربي طبع الآن في انجمن ارشاد المسلمین ۱۶/بی، شاداب کالونی حمید بلڈنگ نئی روڈ لاہور۔

فمن شاء مزيد الواقفية فليراجع إليه ويطالعه وعليه تقريظات وتائيدات من خمسة عشر عالما من علماء الحرمين الشريفين.

ومن غواية فهمه ومن دنائة ماجه وبذاذة لسانه إنه قال في قصيدته المدحيه في شان عائشة أم المومنين رضي الله عنها اشعارا لايقدر أحد من المومنين ان يظهره بلسانه أو بقلمه فمن شاء فلينظر في رسالت "حدائق بخشش" في ۳۷۔

وهذه أنموذجة من أكثر خرافاته التي هي باعثة في الرصاد الشقاق والنفاق والتفريق بين المؤمنين ليقع الوهن في أخلاء الإنجليز من الهند ومع هذا ما افتى أحد من أكابرنا عليه الكفر حزما واحتياطا من اكفار اهل القبلة.

وخشية من النصوص المهددة الواردة فيه حتى وجدوا صراحة إنكار النصوص القطعية أوانكار الدلائل الشرعية القطعية من غير تأويل صحيح، بل أشغلوا أنفسهم باتباع سنة سيد المرسلين

ظاهرا وباطنا بالقلب واللسان والجوارح والحالات وفوضوا أمورهم إلى الله لتحصيل الرضاء عنه والقول واخيراً نقول إن في البدعة ظلمة وفي السنة نورا فإذا عمل رجل بالسنة ودوام عليها ظاهراً وباطنا حتى تكون راسخة في قلبه صغيرها وكبيرها ويصير دينه وطبيعته الثانية ويضوح نور السنة من قوله وفعله وجوارحه ويتلا لأ من جوانبه، فترتفع الظلمة وتسخر قناديلها من غير كلمو بحث ومناظرة وغيرها، ويدخل نورها في قلوب العوام ويجري مجرى الدم من حيث لايشعرون حتى جعلت تصلح أعمالهم وتصح عقائدهم، وهذا النفع أكبر وأرسخ من نفع المناظرة والبحث والكد كما هو مشاهد من التجربة۔

ولعل هذا سر في اشتغال أكابرنا في أنفسهم باتباع السنة فليحزم علينا أن نسلک على هذا الوطيره سرا وعلنا لنكون فائزين من غير مشقة هائلة وعناء فقط والسلام

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

خاتم النبیین کے صحیح معنی:

کتاب خاتم النبیین کے بہترین معنی ص ۴۰ مرتبہ مولانا ابوالعطاء صاحب فاضل جالندھری سابق پرنسپل جماعت احمدیہ۔ دعوت وتبلیغ سلسلہ احمدیہ قادیان (مشرقی پنجاب) عوام کے خیال میں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خاتم ہونا بایں معنی ہے کہ آپ کا زمانہ انبیاء سابق کے زمانہ کے بعد ہے اور آپ سب میں آخری نبی ہیں، مگر اہل فہم پر روشن ہوگا کہ تقدم وتأخر زمان میں بالذات کچھ فضیلت نہیں پھر مقام مدح میں ''ولكن رسول الله وخاتم النبيين'' (سورۂ احزاب: ۴۰) فرمانا اس صورت میں کیونکر صحیح ہوسکتا ہے۔ کتاب خاتم النبیین کے بہترین معنی کیا ہیں؟ یہ عقیدہ رکھنا درست ہے یا نہیں؟

الجواب وبالله التوفيق:

یہ عقیدہ رکھنا درست نہیں ہے اس میں قرآن پاک کی تنقیص ہے، آپ اگر تحریری بحث دیکھنا چاہتے ہیں تو مفتی محمد شفیع صاحب کی کتاب ختم نبوت دیکھئے۔ اس کتاب کے تین حصے ہیں ختم النبوۃ فی القرآن، ختم النبوۃ فی الحدیث، ختم النبوۃ فی

الآثار، اس سے آپ کو پوری بصیرت ہوگی، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۸/۸/۸۵ ۱۳ھ

الجواب صحیح سید احمد علی سعید نائب مفتی دارالعلوم دیوبند

رسول اللہ ﷺ کا خاتم النبیین ہونا:

مندرجہ ذیل عبارت کے اس عقیدہ پر شرعی فتویٰ دیجئے (کتاب تحذیر الناس ص ۳) از افاضات مبارکہ حجۃ الاسلام حضرت قاسم العلوم والخیرات مولانا محمد قاسم صاحب قدس اللہ سرہ العزیز۔

عوام کے خیال میں تو رسول اللہؐ کا خاتم ہونا بایں معنی ہے کہ آپ کا زمانہ انبیاء سابق کے زمانہ کے بعد ہے اور آپ سب میں آخری نبی ہیں، مگر اہل فہم پر روشن ہوگا کہ تقدم وتاخر زمان میں بالذات کچھ فضیلت نہیں ہے پھر مقام، مدح میں ولکن رسول اللہؐ وخاتم النبیینؐ فرمانا اس صورت میں کیوں کر صحیح ہوسکتا ہے کتاب تحذیر الناس ص ۳ کیا یہ عقیدہ رکھنا درست ہے۔

الجواب وبا اللہ التوفیق

عبارت منقولہ پوری عبارت نہیں ہے پوری عبارت کا جو مفہوم ہے وہ بالکل صحیح و برحق ہے اور وہی عقیدہ تمام اہل سنت والجماعت کا ہے اور حاصل اس کا یہ ہے کہ جناب نبی کریم ﷺ محض زمانہ ہی کے اعتبار سے خاتم النبیین نہیں تھے بلکہ ذات ومرتبہ کے اعتبار سے بھی آپ خاتم النبیین ہیں، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی مفتی دارالعلوم دیوبند ۲۱/۱۰/۸۵ ۱۳ھ

الجواب صحیح محمود عفی عنہ

خواجہ اجمیری کے مزار کے پھول اور عود کی خصوصیت:

۱-لوگ اجمیر والے خواجہ معین الدین صاحبؒ کے مزار پر جاتے ہیں اور وہاں سے پھول اور عود لاتے ہیں اور خواجہ صاحبؒ یہ کرامت ظاہر کرتے ہیں کہ اس پھول اور عودی کو کھلانے سے جسم کی بہت بیماری دور ہوجاتی ہیں، خصوصاً چھوٹے بچوں کے گلے میں باندھنے سے اور عموماً بڑوں کو کھلانے سے آرام ہوجاتا ہے، ایسی کرامت پر اعتقاد کرے یا کہ نہیں اور کرنے والوں کو منع کرے یا کہ نہیں؟

۲-مندرجہ بالا عبارت پر اعتقاد کرنا شرک ہوگا یا کہ نہیں؟

الجواب وباللہ التوفیق

۱-کرامات الاولیاء حق ثابت (۱) یہ تو عقیدے کی چیز ہے۔کرامت کی حقیقت یہ ہے کہ وہ جس اولیاء سے صادر ہوتی ہے وہ ان کے اختیار میں نہیں ہوتی، بلکہ جب خدا چاہتا ہے ان کے ہاتھ پر صادر کرتا ہے،اجمیر شریف کے بزرگ مسلم ہیں (ان کے ہاتھ پر بیشمار کرامتیں صادر ہوئیں اور ہوسکتی ہیں) لیکن یہ بدعتی لوگ جس طرح پیش کرتے ہیں اس میں خواجہ صاحب رحمہ اللہ علیہ کو موثر و دخیل سمجھتے ہیں، اس لئے ان کی باتوں کو نہ سننا، نہ ماننا چاہئے ان میں ہی سے یہ چیزیں بھی ہیں جو سوال میں لکھی ہیں،لہٰذا اسپر اعتقاد یا اس کو صحیح نہ کہنا چاہئے،فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی،مفتی دارالعلوم دیوبند ۱۷/۸/۸۵ ۱۳ھ

الجواب صحیح سید احمد علی سعید نائب مفتی دارالعلوم دیوبند

کافر کو کافر نہ کہنا کفر ہے کا مطلب؟

جناب مولانا محمد مرتضی حسن صاحب دربھنگی نے کتاب ''اشد العذاب'' کے (ص ۱۳) پر یہ عبارت تحریر کی ہے۔ اگر خان صاحب کے نزدیک بعض علماء دیوبند واقعی ایسے ہی تھے جیسا کہ انہوں نے سمجھا تو خان صاحب کو ان علماء دیوبند کی تکفیر فرض تھا۔اگر وہ ان کو کافر نہ کہتے تو وہ خود کافر ہوجاتے جیسے علماء دیوبند نے جب مرزا صاحب کے عقائد کفریہ معلوم کر لئے اور وہ قطعاً ثابت ہوگئے تو اب علماء اسلام پر مرزا صاحب اور مرزائیوں کو کافر و مرتد کہنا فرض ہوگیا ہے اگر وہ مرزا صاحب اور مرزائیوں کو کافر نہ کہے تو وہ خود کافر ہوجائیں گے جو کافر کو کافر نہ کہے وہ خود کافر ہے۔یہ عبارت اس کتاب کی آپ کی نظر سے گزری ہے کیا اور عبارت کا خط کشیدہ جو جملہ ہے کہ جو کافر کو کافر نہ کہے وہ خود کافر ہے حق ہے یا کہ نہیں؟

۱- عبارة النسفي في عقائد وكرامات الاولياء حق فتظهر كرامة على طريق نقض العادة للولي من قطع المسافة البعيدة في المدة القليلة وظهور الطعام والشراب واللباس عند الحاجة والمشي على الماء والهواء وكلام الجمار والعجماء واندفاع المتوجه من البلاء وكفاية المهم من الأعداء وغير ذالك من الاشياء (الرد المحتار على الدر ۲۴۶/۵، مکتبہ زکریا)(مرتب)۔

الجواب وباللہ التوفیق:

کفر کوایمان کہنا یہ بھی کفر ہےاور کافر کومؤمن کہنا یہ بھی کفر ہے باقی محض کافر کو کافر نہ کہنا یہ بھی کفر ہو یہ خلاف احتیاط ہے ایسا نہ کہنا چاہئے کہ جو کافر کو کافر نہ کہے وہ خود کافر ہے، اس لئے کہ کافر کو کافر نہ کہنے پر یہ لازم نہیں ہے کہ پھر کافر کومؤمن کہہ دیا جو واقعی کفر ہے، بلکہ اس میں یہ بھی احتمال ہے کہ کافر کو کافر نہ کہا تو مومن بھی نہ کہا ہو بلکہ سکوت کیا ہو، اس لئے مطلقا بلالحاظ قیود ایساعام جملہ نہیں بولنا یا لکھنا چاہئے احتیاط کرنا چاہئے۔

یہ کتاب ''اشد العذاب'' میری نظر سے نہیں گزری ہے، مگر جتنا آپ نے نقل کیا اس کے اعتبار سے جواب ہے، البتہ کتاب کے سیاق وسباق کے اعتبار سے عبارت محولہ (جو کافر کو کافر نہ کہے وہ کافر ہے) کا مفہوم ہے کہ کافر نہ کہے، بلکہ مؤمن کہےاور یہ مفہوم بالکل ظاہر ہےاور بیشک یہ کفر ہے، اس لئے کتاب کا مضمون صحیح ہےاور صاحب کتاب حق پر ہے، کیونکہ مرزائیوں کا کفر ثابت ہے۔ہذا ماعندی فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

الجواب صحیح سید احمد علی سعید نائب مفتی دارالعلوم دیوبند

بہائی مذہب اختیار کرنے کے بعد تجدید ایمان ونکاح لازم ہے:

زید ایک مرد مسلمان پابند صوم وصلوۃ وعلم دین سے بخوبی واقف تھا۔اس نے مذہب بہائیہ کا فارم بھر کر اسے قبول کرلیا نمازیں ترک کردیں اور اپنی زبان سے اقرار کیا کہ قیامت تک رسول آتے رہیں گے۔رسالت ختم نہیں ہوئی نبوت ختم ہوچکی ہے، اب وہ زید مسلمانوں سے کہتا ہے کہ میں نے صرف مذہب بہائیہ کی معلومات کرنے کے لئے ایسا کیا تھا۔اور اب وہ پھر مسلمانوں کی نمازوں میں شریک ہوتا ہےاور امامت بھی کرتا ہے۔دریافت طلب امر یہ ہے کہ زید کو دوبارہ داخل اسلام ہونے کے لئے تجدید اسلام اور تجدید نکاح کی ضرورت ہے یا کہ نہیں۔زید کے گھر میں بیوی مومنہ ہے۔

الجواب وباللہ التوفیق:

اگر واقعی صحیح ہے تو تجدید ایمان اور تجدید نکاح ضروری ہے جب تک تجدید ایمان اور تجدید نکاح نہ کرے اس وقت

تک بیوی کے پاس ہرگز نہ جائے۔اور نہ امامت کرے،فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی،مفتی دارالعلوم دیوبند ۹/۵/ ۸۵ ۱۳ھ

الجواب سید احمد علی سعید نائب مفتی دارالعلوم دیوبند،محمود عفی عنہ

مزار پر پھول چڑھانے کے کشف کا حکم:

ایک بدعتی مولانا نے وعظ کے دوران میں یہ فرمایا کہ میرے پیارے بھائی جو صاحب کشف ہے انکے اپنے سلسلہ کے کسی شہید صاحب کے مزار پر گئے تو صاحب مزار نے صاحب کشف سے یہ فرمایا کہ ہمیشہ تازہ گلاب کے پھول لا کر ڈالا کرو پھر یہ واقعہ ہم سے بیان کیا اس دن سے میں بھی ہمیشہ مزار پر تازہ گلاب کے پھول چڑھاتا ہوں دریافت ہے کہ کیا یہ صاحب مزار قبر میں سے کچھ کہہ سکتے ہیں یا کہ نہیں ور ان کا کہنا صاحب کشف سن سکتے ہیں یا نہیں اور اس پر عقیدہ رکھنا درست ہے یا کہ نہیں؟

الجواب وباللہ التوفیق:

جو کشف شریعت کے خلاف ہوتا ہے وہ غلط ہوتا ہے اس پر عمل کرنا جائز نہیں ہوتا ہے،قبروں پر پھول چڑھانا بدعت اور ناجائز ہے،اس لئے یہ کشف صحیح نہیں ہے اور اس پر عمل کرنا ناجائز ہے۔ بلکہ اس کا ترک کرنا واجب ہے (۱)،فقط واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی،مفتی دارالعلوم دیوبند ۲۴/۹/ ۸۵ ۱۳ھ
الجواب صحیح سید احمد علی سعید نائب مفتی دارالعلوم دیوبند

۱- واعلم أن النذر الذی يقع للأموات من أكثر العوام ومايؤخذ من الدراهم والشمع والزيت ونحوها إلى ضرائح الأولياء الإكرام تقرباً إليهم فهو بالإجماع باطل وحرام،الدرالمختار علی الرد ۲/۵ ۱۷، مطبوعہ عثمانیہ،قال ابو الحسن الشاذلی: قد تضمنت لنا العصمة فيما جاء به الكتاب والسنة ولم تضمن لنا العصمة فی الكشوف والإلهام،فتاوی لابن تیمیہ ۲/ ۲۲۶، مکتبہ المعارف الرباط (مرتب)۔

تحذیر الناس، حفظ الایمان وبراہین قاطعہ کی عبارتوں پر اشکال:

۱۔ بالفرض آپ کے زمانہ میں بھی کہیں اور کوئی نبی ہو تب بھی آپ کا خاتم ہونا بدستور باقی رہتا ہے، بلکہ اگر بالفرض بعد زمانہ نبوی بھی کوئی نبی پیدا ہو تو خاتمیت میں کچھ فرق نہ آئے گا، چہ جائے کہ آپ کے معاصر کسی اور زمین میں یا فرض کیجئے اس زمین میں کوئی اور نبی تجویز کیا جائے تحذیر الناس کی ان عبارتوں میں انکار ختم نبوت ہے یا نہیں انکار ختم نبوت ثبوت کفر ہے یا کہ نہیں اور یہ کتاب قادیانیت کی معلوم ہوتی ہے۔

۲۔آپ کی ذات پر عالم غیب کا حکم کیا جانا اگر بعض غیب ہے یا کل غیب اگر بعض علوم غیب مراد ہیں تو حضور ﷺ کی کیا تخصیص ہے ایسا علم غیب تو زید عمرو، بلکہ ہر صبی ومجنون، بلکہ جمیع حیوانات وبہائم کے لئے بھی حاصل ہے۔(حفظ الایمان) مذکورہ بالا حفظ الایمان کی عبارتوں میں حضور ﷺ کی توہین ہے یا نہیں؟ اور یہ کفر ہے یا کہ نہیں؟

۳۔الحاصل غور کرنا چاہئے کہ شیطان و ملک الموت کا حال دیکھ کر علم محیط زمین کا فخر عالم کو خلاف نصوص قطعیہ کے بلا دلیل محض قیاس فاسد سے ثابت کرنا شرک نہیں تو کون سا ایمان کا حصہ ہے شیطان و ملک الموت کو یہ وسعت تو نص سے ثابت ہے فخر عالم کی وسعت علم کی کونسی نص قطعی ہے کہ جس سے تمام نصوص کو رد کر کے ایک شرک ثابت کرتا ہے (براہین قاطعہ) یہ عبارتیں کفریہ ہیں کہ نہیں اسلئے کہ شیطان کے علم کو حضور ﷺ کے علم اقدس سے زائد بتایا ہے اور شیطان کو خدا شریک مانا ہے۔ پھر اس شرک کو نص سے ثابت کیا ہے۔

الجواب وبا اللہ التوفیق:

۱۔ہر موقع پر اگر بالفرض یا فرض کیجئے کا عنوان ہے اور عنوان (بالفرض) بولا ہی جاتا ہے محالات اور ان ہونی چیز کے لئے لہٰذا یہ مضمون کفری نہیں ہے، بلکہ اس عنوان سے ختم نبوت کا اور بھی ثبوت کرنا ہوا یہ مصنف معلوم ہوتا ہے، نیز یہ کتاب تحذیر الناس قادیانیوں کی نہیں اور نہ ان عبارتوں میں انکار ختم نبوت ہے۔

۲۔یہ عبارت کفریہ نہیں اور نہ اس میں توہین رسول ﷺ کی متلزم ہے ان عبارتوں میں علوم تکوینی کی گفتگو ہے نہ کہ علوم تشریعی کی علوم تکوینی خضر علیہ السلام کو موسیٰ علیہ السلام کے علوم تکوینی سے زیادہ ہونا خود قرآن پاک میں منصوص ہے (۱۵۔۱۶ پارہ دیکھئے) حالانکہ موسیٰ علیہ السلام بڑے جلیل القدر نبی اور یقیناً خضر علیہ السلام سے اعلیٰ وافضل ہیں۔

۳۔اسی طرح براہین قاطعہ کی مذکورہ عبارتیں بھی کفریہ نہیں ہیں، ان میں ان ہی علوم تکوینیہ کی گفتگو ہے جن کا

انبیاء علیہ السلام کو نہ ہونا کوئی نقص نہیں یہ تو فرسودہ اور پرانا مسئلہ ہے کوئی نیا مسئلہ نہیں اس پر تو مستقل کتابیں اور تصنیفیں موجود ہیں ان کتابوں کو منگا کر دیکھئے اور ''بسط البنان'' کو منگا کر خود دیکھ لیجئے بصیرت ہوجائے گی کتابیں تو اس موضوع پر بہت ہیں ہم چند کی نشاں دہی کر دیتے ہیں۔

تصانیف:

۱۔ تصانیف مولانا مرتضی حسنؒ　　۲۔ مولانا منظور احمد نعمانی رحمۃ اللہ علیہ

۳۔ جہد المقل مصنفہ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی مفتی دارالعلوم دیوبند ۲۳/ ۹/ ۸۵ ۱۳ھ

الجواب صحیح: سید احمد علی سعید نائب مفتی دارالعلوم دیوبند ۲۴/ ۹/ ۸۵ ۱۳ھ

وہ ہندو جس کو کبھی دعوت اسلام نہ دی گئی کیا وہ بھی مستحق جہنم ہے؟

ایک ہندو جس کو نہ کبھی اسلامی تعلیم سے آگاہ کیا گیا ہے اور نہ ہی اس کو اسلام کی دعوت دی گئی کیا وہ بھی ہمیشہ ہمیشہ کی جہنم کا مستحق ہے؟

الجواب وبا اللہ التوفیق:

اسباب علم عام وتام ہو چکے ہیں اور مسئلہ توحید عقلی ہے، لہذا ایسے مقامات میں جہاں یہ اسباب عام ہو چکے ہوں یہ عذر کافی نہ ہوگا، ہاں پہاڑ کی کھائیوں میں یا دنیا کے کسی ایسے علاقے میں جہاں دعوت ورسالت واقعی نہ پہنچی ہو جہل معتبر ہوسکتا ہے (۱)، یہ اصل مسئلہ ہوا اب اس ہندو کا حال متعین ہو کر اس کا متعین حکم معلوم ہوسکتا ہے۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند ۱۰/ ۲/ ۸۵ ۱۳ھ

الجواب صحیح محمود غفی عنہ

۱- لیکن اصول الشاشی میں اس طرح ہے: ''وجب الإيمان على من لم تبلغه الدعوة ...... قال أبو حنيفة لو لم يبعث الله تعالى رسلا لوجب على العقلاء معرفته بعقولهم''، (اصول الشاشی ۳۴، مکتبہ یاسر ندیم دیوبند) (مرتب)۔

۱- کیا کافر جنت میں جائے گا؟

کویت ریڈیو سے (دینی مسائل کے عنوان سے) سوال وجواب جاری ہوتے ہیں وہاں انکی مملکت نے ایک جماعت رجسٹرڈ کردیا ہے اس کی طرف سے ایک سوال کے جواب میں ریڈیو پر یہ مسئلہ نشر ہوا ہے کہ مسلمان کو ہمیشہ کے لئے راحت وچین کی زندگی کے لئے جنت اللہ تعالی عنایت فرمائیں گے لیکن کفار کے واسطے ہمیشہ کے لئے دوزخ نہیں ہے، بلکہ ان کی سزائیں انہیں ملنے کے بعد اللہ تعالی انہیں بھی جنت نصیب فرمائیں گے تو یہ بات درست ہے یا غلط؟

۲- کیا صرف نیت کر لینے سے نیکی مل جائے گی؟

کیا صرف نیک ارادہ کرنا اور نیک عقیدہ رکھنا کافی ہے اور کیا اللہ تعالی صرف نیت کو دیکھتے ہیں اور عمل کی ضرورت نہیں یا عمل بھی ہونا ضروری ہے، کیا صرف نیت کر لینے سے نیکیاں حاصل ہوجائیں گی۔

الجواب وبا للہ التوفیق:

۱۔کویت ریڈیو سے یہ جو خبر نشر ہوئی ہے کہ کافر بھی اپنی سزا بھگتنے کے بعد جنت میں آجائیں گے غلط ہے، قرآن وحدیث کے صریح نصوص کے خلاف ہے یہ حکم گنہگار مسلمانوں (عُصاۃ مومنین کا ہے جنہوں نے کبھی کفر وشرک نہیں کیا تھا یا کیا تھا، مگر دل سے توبہ کر چکے ہیں اس کے بعد مرے تھے "کما قال تعالیٰ: الا الذین تابو وأصلحوا و۔۔فاتوب علیهم وانا التواب الرحیم"(۱)۔

البتہ جن لوگوں نے کفر یا شرک کیا اور اس پر قائم رہے اور بغیر توبہ کے مرگئے ان کے لئے ہمیشہ ہمیشہ کی جہنم ہے کبھی بھی انکی مغفرت نہ ہوگی، "کما قال تعالی :إن الله لا یغفر أن یشرک به ویغفر ما دون ذالک الخ " (۲)۔

ایک جگہ ارشاد باری تعالی ہے:"قال تعالی: ان الذین کفروا وما تو وهم کفار فأولئک علیهم لعنة الله والملائکة والناس أجمعین لا یخفف عنهم العذاب ولاهم ینظرون" (۳)۔

بلکہ ان کے جہنم میں رہنے اور کبھی جہنم سے نہ نکلنے کی تصریح بھی ان نصوص قرآنیہ میں ہے:"کما قال تعالیٰ: إن

۱- سورۂ بقرہ:۱۶۰۔
۲- سورۂ نساء:۴۸۔
۳- سورۃ البقرۃ:۱۶۱۔

اللہ لعن الکافرین وأعدّ لھم سعیرا خالدین فیھا ابداً لا یجدون ولیاً ولا نصیراً" (۱)۔

(بے شک اللہ نے دور کردیا کافروں کو اپنی رحمت سے اور نکال دیا اپنی رحمت سے اور ان کے واسطے بڑھتی آگ کا عذاب مسلط کردیا، ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے بڑھتی آگ میں کبھی نہ نکل سکیں گے اس سے اور نہ پائیں گے کوئی دوست یا مددگار جو انکو وہاں سے نکال سکے)۔

اور دوسری اور آیت: "قال تعالیٰ: ومن یعص اللہ ورسولہ فإن لہ نار جھنم خالدین فیھا ابداً" (۲)۔

ان دونوں آیتوں میں حکم ابد مذکور ہے اور ابد کے معنی یہ آتے ہیں ایسی مدت جس میں کبھی انقطاع نہ ہو اور وہ کبھی ختم نہ ہو ان دونوں آیتوں میں کلمۂ ابد مذکور ہے اس کے علاوہ اور بھی بہت سی آیات ہیں جو کافروں کے حق میں اسی مضمون کو ادا کرتی ہیں محض اختصار کے خیال سے نقل نہیں کرتا ہوں۔

مثلاً سورۂ معارج (پ۲۹): "لقولہ تعالیٰ: لیس لہ دافع من اللہ ذی المعارج" (۳)، اور مثلاً سورہ عم یتسائلون (پ۳۰) میں: "لقولہ تعالیٰ: فذوقوا فلن نزیدکم الاعذابا" (۴) اور مثلاً: "بقولہ تعالیٰ :لم یکن اللہ لیغفر لھم ولا لیھدیھم سبیلا" (۵) وغیرہا۔

اسی طرح اس مضمون کے سلسلے میں کافروں کے تا ابد نار جہنم میں رہنے کی صحیح حدیثیں بھی میں بہت زیادہ مروی ہیں۔

خلاصہ یہ کہ گنہگار مومن (عصاۃ مومنین) تو ضابطہ عدل کے تحت ایک مدت تک خواہ طویل ہو یا قصیر ہو سزا بھگتنے کے بعد انکی مغفرت ہو سکے گی اور بعد مغفرت جنت میں لے لئے جائیں گے، جیسا کہ شروع جواب کی آیات سے معلوم ہوتا ہے نیز شفاعت کی بہت ساری صحیح احادیث سے معلوم ہوتا ہے، مگر جو لوگ کفر و شرک سے بغیر توبہ کے مریں گے ان کے لئے جہنم سے نجات کی کوئی شکل نہیں ہے یہ سب مذکورہ آیات اللہ تعالیٰ کے ارشاد کے مطابق ہیں اور اللہ تعالیٰ سے زیادہ سچا کون ہوسکتا ہے، "قال تعالیٰ :ومن اصدق من اللہ قیلا" (۶)، اس لئے وہاں کے لوگوں پر شرعا ضروری ہے کہ وہ لوگ

۱- سورۂ احزاب ۶۵۔
۲- سورۂ جن: ۲۳۔
۳- سورۂ معارج: ۳۔
۴- سورۂ نبا: ۳۰۔
۵- سورۂ نساء: ۱۳۷۔
۶- سورۃ النساء: ۱۲۲۔

حکومت کو آگاہ کر کے اس غلط معنوں میں تردید کرائیں اور ایسے غلط مضامین کی اشاعت سے روک دیں۔

(۲) عمل خیر کے ساتھ نیک ارادہ مفید ہوتا ہے عمل نہ ہو اور نیک ارادہ ہو یہ نجات کے لئے کافی نہیں ہے: "إن الله لا ينظر إلىٰ صوركم وأموالكم ولكن إنما ينظر إلى أعمالكم وقلوبكم أو كما قالؐ" (۱) کا یہی مطلب ہے جو احقر نے بیان کیا ہے کہ وہ مطلب ہے جو سوال میں مذکور ہے یہ مطلب تو زندقہ اور لادینی کا دروازہ کھول دے گا عمل کے ساتھ ساتھ صحیح نیت ہو تو وہی کامیابی ہے جیسا کہ اس حدیث میں بیان فرمایا گیا ہے: "إنما الأعمال بالنيات وإنما لإمرئٍ ما نوى فمن كان هجرته إلى الله ورسوله فهجرته إلى الله ورسوله ومن كانت هجرته إلى دنيا يصيبها إلى الآخر الحديث" (۲)۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

قرآن وحدیث کو کچھ نہیں مانیں گے کہنا:

۱۔ ایک شخص نے کہا کہ کتاب وقرآن اور حدیث ہم کچھ نہیں مانیں گے فقط ہمارے پرانے عالم نے جو کہا ہے وہی کروں گا۔

۲۔ چند آدمی نے ایک قانون بنالیا کہ جو عالم یا جاہل ہمارے یہاں قیام اور رضاد کے مسئلہ پر گفتگو کرے گا اس کو دس جوتا مارا جائے گا۔

الجواب وبالله التوفيق:

۱- جب وہ کہتا ہے کہ ہمارے بڑے عالم نے جو کہا ہے وہی کروں گا تو اس کا مقصد قرآن وحدیث کو جھٹلانا یا انکار کرنا نہیں ہے، بلکہ وہ اس مخاطب کو جھٹلاتا ہے کہ جو قرآن وحدیث کی ترجمانی کررہے ہو وہ صحیح نہیں ہے وہ اس سے کافر نہیں ہوا ہے، لیکن ایسے جملے بولنے سے احتیاط کرنا واجب ہے، آئندہ اس طرح نہ کہے۔

۲- یہ جملہ بہت سخت اور گناہ ہے اس سے علماء کی توہین نکلتی ہے ہرگز نہ کہنا چاہئے، ورنہ سخت گنہگار ہوگا اور بعض

۱- رواہ ابن ماجۃ عن أبي ہریرۃ ورفعہ إلى النبي ﷺ (ابواب الزہد، رقم الحدیث ۴۱۹۵) ۲/ ۴۱۶)(مرتب)۔

۲- رواہ البخاري والمشکوۃ في ابتداء کتابیہما۔

صورتوں میں کفر کا موجب ہوجائے گا بہت ڈرنے کی چیز ہے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۱/ ۸/ ۸۵ ۱۳ ھ

الجواب صحیح سید احمد علی سعید، محمود غفی عنہ نائب مفتی دارالعلوم دیوبند

کسی بھی مخلوق کو دافع البلیات کہنا:

غیر خدا کو دافع البلیات کہنا کیسا ہے آیا کفر ہے یا شرک یا حرام اور حضور ﷺ کی ذات پاک غیر خدا میں شامل ہے یا نہیں جو شخص درود شریف وغیرہ میں حضور ﷺ کی صفت دافع البلیات کہہ کر آپ پر درود وسلام بھیجتا ہے ہیں تو اس کا نکاح درست ہے یا کہ نہیں؟

الجواب وباللہ التوفیق:

اس درود میں دافع البلیات کے لفظ سے مراد آپکی برکات بھی لی گئی ہیں، یعنی آپ کی برکات سے بلائیں دفع ہوجاتی ہیں، اس لئے اس کے بولنے کو کافر نہ کہیں گے، لیکن ایسے موہم لفظ کا بولنا مناسب نہیں خاص کر جہلاء کو، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند ۱۹/ ۹/ ۸۵ ۱۳ ھ

خنزیر کا گوشت کھانے کی وجہ سے مسلمان رہا یا نہیں؟

ایک مسلمان مرد کسی کافر کسان کی ملازمت کرتا تھا اس کافر نے خنزیر کا گوشت پکا کر کھلا دیا اس مسلمان مرد کو بعد میں یہ کہتا ہے کہ یہ تو بکرے کا گوشت تھا یا مرغ کا تھا گویا کہ اس نے جھوٹ بولا ہے حالانکہ وہ گوشت خنزیر کا تھا باوجود یکھے جانکر کھلایا ہو یا بھول کر کھلایا پھر اس مسلمان کو بتلایا گیا تھا کہ یہ گوشت تمہارے کھانے کے قابل نہیں ہے تم مت کھاؤ لیکن اس نے کھالیا۔ دریافت ہے کہ وہ مسلمان رہا یا کہ نہیں اس کے ساتھ مسلمان کو کیا برتاؤ کرنا چاہئے؟

الجواب وبا للہ التوفیق

اگر خنزیر یا مردار کا گوشت جانتے بوجھتے ہوئے اور حلال ہونے کے اقرار کے ساتھ کھایا ہے تو ایمان بھی ختم اور

نکاح بھی ٹوٹ گیا پھر سے تجدید ایمان او رتجدید نکاح بعد توبہ ضروری ہے (لأن استحلال الحرام كفر، عالمگیری ۲/۵۵، مطبع رشیدیہ پاکستان)اور اگر دیدہ ودانستہ کھایا ہے مگر اس کو حلال نہیں قرار دیا تھا بلکہ حرام ہی سمجھتا تھا تو ایمان ونکاح نہیں ختم ہوا لیکن سخت گناہ گار وفاسق اور عند اللہ مجرم ومعذب ہوگا۔ فوراً بدرگاہ رب العزت دل سے نہایت ندامت کے ساتھ توبہ واستغفار کرنا اور آئندہ ہمیشہ کے لئے اس سے باز رہنا لازم ہے۔

اور اگر مردار یا خنزیر کا گوشت نہیں جانتا تھا، بلکہ دھوکہ دے کر اس کو کھلا دیا گیا ہے، مگر چونکہ اس کو بتلا دیا گیا تھا کہ یہ تمہارے کھانے کے قابل نہیں ہے مت کھاؤ اس کے باوجود اس نے کھالیا ہے اس لئے خلاف احتیاط کیا اور عاصی ہوا گو دوسرے درجہ کا ایسی حالت میں بھی اس کو بلا تحقیق کھانا درست نہ تھا توبہ کرے اور آئندہ باز رہے۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی مفتی دارالعلوم دیوبند ۲۲/۱۰/۱۹۸۵ھ

الجواب صحیح سید احمد علی احمد نائب مفتی دارالعلوم دیوبند

بارہویں شریف کی مجلسوں کا حکم:

حضور اکرم ﷺ کا ذکر مبارک موجب ثواب ہے یا نہیں اگر موجب ثواب ہے تو بارہویں شریف کی مجلسوں کا کیا حکم ہے یہاں یہ دیکھا جاتا ہے کہ بارہویں کی مجلسوں میں اس کو خاص کر دیتے ہیں اور ذکر مبارک کے وقت کھڑے ہو جاتے ہیں تو کیا یہ درست ہے اکثریت اس کو درست قرار دیتے ہیں۔ اور کہاں یہ بات بتلائی ہے۔ اور عندالشرع کیا حکم ہے؟

الجواب وباللہ التوفیق:

حضور اکرم ﷺ کا ذکر مبارک بغیر کسی التزام مالایلزم کے خواہ ولادت شریفہ کا ذکر ہو بلاشبہ باعث خیر اور موجب اجر وثواب ہے لیکن آجکل کی مروجہ مجلس میلاد قرآن پاک، حدیث شریف اور اجماع امت وقیاس ائمہ سے ثابت نہیں، بلکہ بے اصل اور بدعت ہے، لہذا اس خاص نام سے کوئی مجلس نہ کی جاوے وعظ یا بیان سیرت کے نام سے کی جاوے اور اس میں حضور انور ﷺ کے حالات مقدسہ بیان کئے جائیں اور ذکر ولادت کے وقت قیام نہ کیا جاوے شیرینی وغیرہ تقسیم نہ ہو تو وہ جائز ہے اللہ رب العزت اور حضور ﷺ نے کسی کو مولود کرنے کا حکم نہیں دیا ہے نہ خلفائے راشدین نے کبھی مولود کے نام سے مجلس منعقد فرمائیں ہیں، بلکہ چھ ۶ صدی پوری اس مجلس سے خالی گذری ہیں۔ ۶۰۷ھ کے بعد سلطان اربل نے اس کی

ابتداء کی اور بہت شان وشوکت سے بادشاہی انتظام کے ساتھ مجلس منعقد کی پھر انکی حرص میں دوسرے لوگوں نے اسکو اپنے بادشاہ کے اتباع میں شروع کیا، اس وقت سے ہی علماء حق نے اس کی تردید میں فتویٰ دیئے اور کتابیں لکھیں۔ چنانچہ المدخل میں تقریباً ۲۳ صفحات میں بہت مدلل اس کی تردید میں فتوی دیے اور کتابیں لکھیں۔

قال في المدخل :و قد منع علماء نا رحمة الله عليهم الجلوس إلى القصاص من الرجال أعني الوعاظ الذين يعملون في المساجد وغيرها قال الإمام أبو طالب المكي رحمة الله عليه في كتابه كانوا يرون القصص بدعة، ويقولون: لم يقص في زمن الرسول ﷺ، وفي زمان أبي بكر، ولا في زمن عمر رضي الله عنهما حتى ظهرت الفتنه، فلما وقعت الفتنة ظهر القصاص (۱) وهذه المفاسد مركبة علي فعل المولود إذا عمل بالسماع، فإن خلا منه وعمل طعاما فقط و نوى به المولود دعا إليه الاخوان ومسلم من كل ما تقدم ذكره، فهو بدعة بنفس نيته، فقط اذن ذلك زيادة في الدين وليس من عمل السلف الماضين واتباع السلف أولى بل أو جب من أن يزيد نيته مخالفة بما كانو عليه، لأنهم أشد الناس إتباعاً لسنة رسول الله ﷺ و تعظيما له (المدخل ۱ / ۲٦۸)(۲)۔

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند ۱۸/ ۷/ ۸۵ ۱۳ ھ

الجواب صحیح محمود عفی عنہ

ہتیا کا قول اٹھالیا گیا کہنے سے مسلمار ہایا نہیں؟

۱-یہاں موضع کھوڑ کے علیا خان ولد رسول خانصاحب حال مقیم کھوڑے ہندوؤں کے مذہب میں مل کر سوو چن لے کر ہتیا کا قول اٹھالیا ہندوؤں نے اس کے کھنڈ مارے نہ جانے کیا کہلایا کچھ کہا نہیں جاسکتا ہے ایسی صورت میں کیا یہ مسلمان ہے یا کہ نہیں؟

۲-کیا اس سے پھر سے مذہب اسلام میں شامل کیا جاسکتا ہے اور اگر کیا جاسکتا ہے تو کن شرائط میں؟

۳-یہ اس بات کا عادی ہو چکا ہے معلوم ہونے پر برادری سے خارج کر دیا گیا ہے عند الشرع اسکا کیا جواب ہے؟

۱- المدخل لابن الحاج لمالکی ۲/ ۱۳، مکتبہ دارالتراث القاہرۃ۔

۲- المدخل لابن الحاج لمالکی ۲/ ۱۰، مکتبہ دارالتراث القاہرۃ۔

الجواب وبا اللہ التوفیق:

(او ۲ و ۳) عبارت سے سوال واضح نہیں ہوتا ہے کہ بتیا کا قول اٹھالیا ہندوں نے اس کے کنڈے مارنے کا کیا مطلب ہے، لیکن زیادہ سے زیادہ یہ نکل سکتا ہے کہ اس کو ہندو بنالیا ہے یا مرتد کرلیا ہر حال میں توبہ کر کے اسلام میں داخل کرنے کی کوشش کرنا واجب ہے، اسی طرح جب وہ خود توبہ کر کے اسلام میں داخل ہونا چاہے تو داخل کرلینا واجب ہے، صحیح حدیث میں ہے: "التائب من الذنب كمن لا ذنب له" (۱)، البتہ اگر وہ اس جرم کا عادی ہو چکا ہے اور بار بار کر چکا ہے تو اس کو اسلام میں داخل کرنے کے بعد برابر سمجھتے سمجھاتے رہیں اور جب تک اس کے حالات سے اس کی توبہ پر اطمینان نہ ہو جاوے اور اس کے اسلام کا پختہ اور راسخ ہونا معلوم نہ ہو جاوے اس کے ساتھ کسی مسلمان عورت کا نکاح کرنے میں احتیاط کی جائے۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند ۴/۸/ ۸۵ ۱۳ھ

حضور علیہ السلام کا اللہ کے نور سے پیدا ہونے کا مطلب؟

یہ شخص کہتا ہے کہ حضور علیہ السلام کا نور اللہ کے نور سے بنا ہے کیا یہ صحیح ہے میری طبیعت پر یہ بات نہیں آتی ہے، کیونکہ حضور علیہ السلام اللہ کے بندے ہیں اور اس کے رسول ہیں۔

الجواب وبا اللہ التوفیق:

حضور اکرم علیہ السلام کا اللہ تعالیٰ کے نور سے پیدا ہونے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ دونوں نور ایک ہی ہیں، بلکہ مطلب یہ ہے کہ اسی نور خداوندی سے نور محمدی براہ راست مستفاد ہے اور اس پر کوئی اشکال نہیں ہے۔

آپ کی کھٹک غایت احتیاط کی بناء پر تھی اب امید ہے کہ دور ہوگئی ہوگی، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند، سہارنپور

۱- رواہ ابن ماجہ، مشکوۃ المصابیح باب الاستغفار والتوبہ/۲۰۶۔

حضرت تھانویؒ کا مقام:

عبارت برہان دہلی فروری ۱۹۵۶ء ص ۱۱۲۔۱۱۳۔۱۱۴ مرتبہ مولانا سعید احمد اکبرآبادی فاضل دیوبند۔

حضرت تھانوی علیہ الرحمۃ کا سب سے نمایاں اور بڑا کمال بقلم احقر (مولوی عبدالباری ندوی) کی نظر میں یہ تھا کہ علم وعمل میں حدود کی رعایت اس درجہ تھی کہ حضرات انبیاء کا توذکر ہی نہیں، ورنہ لوازم بشریت کیساتھ اس سے زائد کا تصور ہے اس عبارت کا مطلب بجز اس کے اور کیا ہوسکتا ہے کہ تابعین اور تبع تابعین اور ائمہ عظام صدیقین وشہدا تو کیا حضرت تھانوی کا مقام صحابہ سے بھی اونچا تھا اور لوازم بشریت کے ساتھ اس سے زائد کا تصور ہی نہ ہوتا یہ سب سے اونچا مرتبہ ہے اس بنا پر مولانا تھانوی فرداً فرداً ہر ایک صحابہ سے جو دوسرے صحابہ کے مقابلہ میں مفضول تھے ان سے لامحالہ تھانویؒ اونچے ہو ہی گئے۔ماہنامہ برہان دہلی سعید احمد اکبرالہ آبادی یہ عقیدہ رکھنا درست ہے یا کہ نہیں؟

الجواب وبا لله التوفيق:

مولانا عبدالباری ندوی نے ایک بات اپنے جذبات کے ماتحت لکھی اور اکبرآبادی صاحب نے اس کی اصلاح کردی کہ اس طرح نہیں لکھنا چاہئے اور بس یہ کوئی عقیدہ تو ہوا نہیں کہ کچھ تصویب یا تردید کی جائے۔فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۸/ ۱۰/ ۸۵ ۱۳ھ

الجواب صحیح محمود عفی عنہ

ایک علمی اشکال کا جواب:

چار پانچ مسائل آپ کی خدمت میں لکھ کر بھیج رہا ہوں اگر آپ اس کا جواب ارسال فرمادیں تو یہ آپ کی نوازش ہوگی اور جاہل مطلق کا ذہن صاف ہوجائے گا، کیونکہ میرا زیادہ تر بیٹھنا اٹھنا ہندوؤں میں ہے، کچھ ہندو ایسے بھی ہیں جو نہایت متعصب قسم کے ہیں، میرا دل چاہتا ہے کہ اپنے آقا (علیہ السلام) کی ہر بات کو صحیح اور صاف ستھرا ثابت کردوں، اور آپ تو بہتر جانتے ہیں کہ واحد اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے کہ دنیا کے ہر شخص کو مدلل اور معقول جواب دیتا ہے، ہم چاہتے ہیں کہ کوئی خلش باقی نہ رہے۔ایک ہندو کو میں نے عقلی دلیل سے راون کے پوجنے پر سمجھایا کہ یہ بالکل غلط ہے۔الحمدللہ اس نے قسم گیتا کی کھائی کہ آج سے ہم راون کو نہیں پوجیں گے، اور اس نے پوجا چھوڑ دی، جیسا کہ شق القمر کا ہمارے آقا ﷺ کا معجزہ جس پر راجہ بھوج نے تحفہ تحائف بھیجے تھے، راجہ بھوج کے نزدیک معجزہ ثابت ہوا، اسی صورت سے میرے رہبر آپ قرآن اور

حدیثوں کے علاوہ دلیلوں سے تمام مسئلہ ثابت کیجئے گا، یہ اس نا کارہ کی درخواست ہے، کہ غیر مسلموں کو جواب دینا ہے۔ میرے غم گسار یہ نہ کہئے گا کہ تم کیوں ان چیزوں سے الجھ رہے ہو۔ان میں ہمارے مذہبی وقار کا سوال ہے۔اگر جواب طویل ہوں تو اگر آپ مناسب سمجھیں تو ایک ایک کر کے یا عامر عثمانی سے کہہ کر تجلی میں عنایت فرمادیجئے اگر آپ مناسب سمجھئے تو اور یہ ضرور لکھ کر بھیجئے گا کہ کس مہینہ کی تجلی میں جواب آرہے ہیں، باقی ہماری تو دلی خواہش یہی ہے کہ یہ زحمت آپ گوارا فرمائیں۔

☆ کیا ثبوت ہے کہ بچہ اسلام کی فطرت پر پیدا ہوتا ہے، پیدا ہونے والا ہر بچہ مسلمان ہوتا ہے؟

☆ اگر مسلمان شراب کی حالت میں مرجائے تو حدیث کے مطابق کافر مرا، اب اس کو ایصال ثواب پہنچا سکتے ہیں یا نہیں؟

☆ کیا ثبوت ہے مذہب اسلام ہی سچا مذہب ہے؟

☆ لوگ مردے سے کیوں ڈرتے ہیں، اکیلے رات کو اس کے پاس نہیں بیٹھتے، چاہے جتنی محبت کرتے ہوں؟

☆ اگر کوئی عورت جنگل میں یا کسی بھی ویران جگہ میں مرجائے، کوئی وارث نہ ہو تو پتہ کیسے چلے گا کہ ہندو ہے یا مسلمان؟

☆ جب آدم ہی کی سب اولاد ہیں تو پھر ہندو کیا، مسلمان کیا، سکھ کیا، عیسائی اور پارسی کیا؟

☆ اگر بچہ کو ننگا نہ دیکھیں تو کیسے پتہ چلے گا کہ بچہ لڑکا ہے یا لڑکی؟

چاہے دو تین دفعہ میں جواب دیجئے، مگر میرے اللہ کے ولی ہم کو جواب ضرور دیجئے گا۔

الجواب وباللہ التوفیق:

جناب نے جس مقصد کے حصول کا تذکرہ گرامی نامہ میں کیا ہے اس کا اصل طریقہ تو یہ ہے کہ اہل دل ومشائخ کی صحبت میں اسی مقصد کی تحصیل کی غرض سے رہا جائے، اور اخذ مقصد ان کی ہدایت کے مطابق کیا جائے۔ان کی صحبت وگفتگو کی برکت سے قلب وذہن اس طرح تیار ہوجاتا ہے کہ ہر مرحلہ میں خود رہبری کرتا ہے اور دوسروں پر بھی اپنا اثر ہی نہیں ڈالتا، بلکہ ان کو بھی اپنا ہم رنگ بنا دیتا ہے جیسا کہ آیت کریمہ: ”صبغة الله ومن أحسن من الله صبغة“ (١)۔

١- سورۂ بقرہ: ١٣٨۔

وہ ملکہ جس کے حصول کی آنجناب کو فکر ہے، یقیناً بہت نیک مقصد ہے اور فی زمانہ تو اس کی تحصیل بہت ہی ضروری ہے، مگر اس کا طریقہ وہی ہے جو اوپر مذکور ہوا، محض خط وکتابت ولٹریچر ومضامین وغیرہ دیکھ کر کچھ معلومات میں اضافہ یا بولنے کا ڈھنگ تو آجاتا ہے، مگر وہ ملکہ راسخہ پیدا نہیں ہوتا جو مقصود ہے یا جو دوسروں پر اپنا رنگ چڑھادے نہیں ہوتا الا ماشاء اللہ۔

اس لئے اگر اس کا شوق ہے تو کسی اہل دل محقق شیخ سے ربط وتعلق قائم فرمائیے، البتہ آپ کی بصیرت کے لئے اور ازدیادِ شوق کے لئے ایک اور ضابطہ عرض کئے دیتا ہوں، اگر چہ یہ ضابطہ اس اصلی ضابطہ وطریقہ کا جو اوپر مذکور ہوا ہے بدل تو نہیں ہوسکتا، لیکن کارآمد ضرور ہوگا اور بہت ہوگا، نیز اس اصل طریقہ کی تحصیل میں معین ومددگار ہوگا، جس سے اس کی تحصیل کا شوق بھی بڑھے گا۔

روزمرہ نئے نئے حالات، پھر نئے نئے مسائل وسوالات نئے نئے انداز سے پیدا ہوتے رہتے ہیں جن کے نئے نئے انداز سے تحقیقات وجوابات بھی درکار ہوتے ہیں، اور یہ سب چیزیں غیر متناہی سلسلہ رکھتی ہیں، ہر ایک کے لئے محض رٹے ہوئے جوابات کافی نہیں ہوتے، پس اگر وہ ملکہ راسخہ جو مشائخ کی صحبت وبرکت وتوجہ سے حاصل ہوتا ہے موجود نہ ہو جب بھی اگر کم از کم علمی عقلی درجہ کا ہی ضابطہ محفوظ رہے تو ان پیدا شدہ جزئیات وسوالات کا جواب معتدبہ درجہ میں دیا جاسکتا ہے اور وہ ضابطہ یہ ہے:

توحید باری تعالیٰ عقلی ہے اور اس کا ثبوت عقلی وواقعاتی ہے۔ اگر کوئی بھی نبی مبعوث نہ ہوتا اور نہ کوئی کتاب نازل ہوئی ہوتی جب بھی محض عقل کی رہبری سے اور واقعات کے تجزیہ اور تجربہ سے توحید کا قائل ہونا ضروری ہوتا، بلکہ ضروری تھا اور ہے، اور اسی بناء پر متقدمین حکماء یونان بھی محض عقلی دلائل کی رہبری سے اپنے اپنے انداز پر مدعی توحید ہوئے ہیں، پس اس کو تو عقل اور عقلی دلائل سے ثابت کیا جائے اور اس مدعا کو ثابت کرنے کے لئے فن علم کلام سیکھا جائے، اور علم کلام وعلم عقائد کی کتابوں کا مطالعہ کیا جائے اور اس کی معلومات فراہم کی جائیں۔

توحید باری تعالیٰ کے اثبات کے بعد باری تعالیٰ عز اسمہٗ کی ذات وصفات کا تفصیلی علم اور اس کے حقوق وآداب کا علم، نیز اس چیز کا علم کہ کیا کیا چیزیں باری تعالیٰ عز اسمہ کی مرضی کے مطابق اور پسندیدہ ہیں، تاکہ ان کا امتثال کیا جائے اور کیا کیا چیزیں ان کی مرضی کے خلاف وناپسندیدہ ہیں، تاکہ ان سے پرہیز واجتناب کیا جائے اور اپنی دنیوی واخروی صلاح وفلاح کا سامان پیدا کیا جائے اور نجات حاصل کی جائے، ان سب علوم کا احاطہ محض عقل نہیں کرسکتی، عقلاء کے متضاد نتائج بھی اس کی کھلی دلیل ہیں، ایک صاحب عقل، ایک چیز کو مرضی قرار دے کر اس کے کرنے کا حکم دیتا ہے، اور دوسرا صاحب عقل اسی

چیز کو نامرضی قرار دے کر اس سے باز رہنے کا حکم دیتا ہے، اگر کوئی ذی عقل بطور محاکمہ کے کچھ فیصلہ بھی کر دے جب بھی اس فیصلہ کا یقینی ہونا ضروری نہیں ہوگا، غیر یقینی بلکہ مشکوک ہوگا، ہاں اگر باری تعالی عزاسمہ خود ہی اپنی ذات وصفات سے متعلق اپنے حقوق وآداب سے متعلق، اپنی مرضی ونامرضی سے متعلق کچھ معلومات عطا فرمادیں تو بے شک وہ معلومات یقینی اور غیر مشکوک ہوں گی۔

چنانچہ باری تعالیٰ عزاسمہٗ نے اپنے فضل وکرم سے اور اپنی شفقت ورحمت کے طفیل جو مخلوق پر متوجہ ہے، تخلیق کائنات انسانی کے روز اول سے ہی انبیاء ورسل مبعوث فرمانے کا سلسلہ شروع فرمادیا، ان میں سے بہتوں کو ان کی قوم کی ضرورت کے مطابق مستقل کتابیں بھی دیں، نیز بقدر ضرورت اور بطور اتمام حجت بہتوں کو معجزے بھی ساتھ کر دیئے، تا کہ اگر کوئی معاند عناد برتے تو اس کو مقہور ومغلوب بھی کیا جا سکے۔

چنانچہ نبی آخر الزماں نبی امی خاتم المرسلین حضرت مصطفی ﷺ (روحی فداہ وقلبی) کو سب سے اخیر میں قیامت تک کے لئے اپنا رسول بنا کر بھیجا جو تمام ادیان کے لئے ناسخ ہو، مبعوث فرمایا اور آپ پر اپنا کلام ازلی وسرمدی قرآن پاک نازل فرمایا اور اس کو قیامت تک کے لئے زندہ رہنے والا معجزہ بنایا اور اس کی حفاظت کی ضمانت خود اپنے ذمہ لی، چنانچہ ارشاد ربانی ہے کہ بلاشبہ ہم ہی نے یہ ذکر (قرآن پاک) نازل کیا ہے۔ ہم ہی اس کے محافظ ہیں کہ اس کو مٹنے اور ہر تغیر سے محفوظ رکھیں گے: "**إنا نحن نزلنا الذكر وإنا له لحافظون**" (۱)۔

نیز مزید اظہار اعجاز کے لئے اور تحدی ومقابلہ کرنے والوں کی عاجزی ظاہر کرنے کے لئے اور مومنین کی تقویت وطمانیت کے لئے یہ بھی ارشاد فرمایا گیا:

"**وإن كنتم في ريب مما نزلنا على عبدنا فأتوا بسورة من مثله وادعوا شهداء كم من دون الله إن كنتم صادقين، فإن لم تفعلوا ولن تفعلوا فاتقوا النار التي وقودها الناس والحجارة أعدت للكافرين**" (۲)۔

(اے انسانو!) اگر تم اس کتاب (قرآن مجید) کے نازل کرنے میں جس کو میں نے اپنے بندے (محمد ﷺ) پر نازل کیا ہے شک میں ہو تو اس کتاب کی کسی (چھوٹی سے چھوٹی) سورت کے مثل ہی (بنا کر) لاؤ، اور اس (معاملہ) میں اپنے

۱- سورۂ حجر: ۹۔

۲- سورۂ بقرہ: ۲۳، ۲۴۔

تمام معبودین کو شریک کرلو، اللہ کے سوا، اگر تم (اپنے اس شک و دعویٰ میں) سچے ہو تو ضرور ایسا کرو) اور (سن لو) اگر تم اس کے مثل نہ لاسکے اور (یقین کرلو کہ) ہرگز کبھی مثل نہیں لاسکتے، لہٰذا اس آگ سے ڈرو جس کے ایندھن پتھر اور انسان ہوں گے ان منکرین کے لئے وہ آگ (جہنم) تیار کرلی گئی ہے)۔

غرض کہ جب ان چیزوں (توحید، رسالت و کتب سماوی کا نزول) مدلل کردیا جائے گا اور مخاطب کو اس پر مطمئن کردیا جائے گا تو پھر اگلی منزل (افہام و تفہیم مسائل و معاملات) آسان تر ہو جائے گی اور محض کتاب و سنت کے دلائل سے ہی دل میں اترتی اور پیوست ہوتی چلی جائیگی۔

ان چیزوں (توحید و رسالت و کتب سماوی کا نزول) کا عقلی انداز کا محققانہ ثبوت جس کے انکار کی کسی معاند کو بھی مجال نہ ہو، قاسم العلوم والخیرات حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمہ اللہ کے مضامین و رسائل و تصانیف میں ملے گا، مثلا حجۃ الاسلام، تقریر دل پذیر، میلۂ خدا شناسی وغیرہ ان کا مطالعہ کرنا چاہئے، بلکہ کسی محقق ذی مناسب و استعداد عالم سے سبقا سبقا سمجھ کر محفوظ کرنا چاہئے۔

اور قوت فکریہ و ذہنیہ کی تصحیح و تکمیل و تزکیہ و صفائی کے لئے اہل دل شیخ محقق کی صحبت کی تلاش کرنا چاہئے، اور جب تک یہ صحبت میسر نہ ہو اس وقت تک حضرت قاسم العلوم والخیرات نور اللہ مرقدہٗ کی تصانیف و مضامین کے مطالعہ کے ساتھ حضرت مولانا اشرف علی تھانوی نور اللہ مرقدہٗ کے مواعظ و ملفوظات و تصانیف کا بالخصوص اشرف الجواب ہر سہ حصہ اور "المصالح العقلیہ فی الاحکام الشرعیہ" کے مستقل مطالعہ کا معمول رکھنا چاہئے، پھر انشاء اللہ تعالیٰ ان مذکورہ سوالات ہی کا نہیں بلکہ ہر پیش آنے والے سوال کا شافی جواب خود دے سکیں گے۔

کثرت مشاغل کی وجہ سے جناب کے تمام سوالات کا تفصیلی جواب کا موقع نہیں ملا، نیز وہ اتنا مفید بھی نہ ہوگا جتنا ان اصول کو اپنانا اور اس پر کاربند ہونا مفید ہوگا۔

آپ کی تسکین خاطر کے لئے اجمالی طور پر مختصر جواب کتاب و سنت کی روشنی میں بھی عرض کردیا جاتا ہے:

۱۔ حدیث شریف میں وارد ہے:

"کل مولود یولد علی فطرة الإسلام فأبواه یهودانه أو ینصرانه أو یمجسانه" (۱)۔

(ہر بچہ فطرۃ اسلام پر پیدا ہوتا ہے پھر اس کے ماں باپ (مربی) اسکو یہودی بنادیں یا نصرانی بنادیں یا مجوسی

۱۔ کتاب اللؤلؤ والمرجان ۲۰/۷، حدیث نمبر: ۱۷۰۲۔

بنادیں (غرض جیسے خود ہوتے ہیں ویسا بنا دیتے ہیں))۔

اور تجربہ بھی شاہد ہے کہ بچہ بالکل خالی الذہن اور صحیح الفطرت ہوتا ہے۔ جیسی تعلیم و تربیت وصحبت ہوتی ہے ویسا ہی بن جاتا ہے۔ یہیں سے علماء نے لکھا ہے کہ اگر کوئی بچہ شعور پیدا ہونے سے پہلے بالکل تنہا واکیلا چھوڑ دیا جائے تو جب وہ بڑھے گا اور عقل حاصل ہوگی تو موحد ضرور ہوگا۔ شرک وکفر سے محفوظ رہے گا اور یہی حقیقت تو اسلام کی بھی ہے۔

۲- کافر نہیں مرتا، مومن مرتا ہے مومن ہی رہتا ہے، اس معصیت کی وجہ سے گنہگار و فاسق، البتہ ہو جاتا ہے اور ہر فاسق کا کافر ہونا ضروری نہیں، بلکہ عاصی و فاسق الگ چیز ہے اور کافر الگ چیز ہے۔ جس نے اس کے خلاف کہا ہے اس نے غلط کہا ہے۔

۳- قرآن مجید میں ایک جگہ ارشاد ہے: "إن الدين عند الله الإسلام" (۱)۔

اور ارشاد ہے: "ومن يبتغ غير الإسلام دينا فلن يقبل منه وهو في الآخرة من الخاسرين" (۲)۔

اس سے معلوم ہوا کہ دین اسلام ہی برحق اور سچا دین ہے۔

۴- وہم کے غلبہ اور ایمان کے ضعف کی وجہ سے ڈرتے ہیں، قوی الایمان اور صحیح العقل نہیں ڈرتے۔

۵- جس طرح مرد کو اسلامی لباس و پوشاک، شکل وصورت اختیار کرنے کا اور رکھنے کا اور شعائر اسلامی اپنانے کا حکم ہے اور ضروری ہے، اسی طرح عورتوں کو بھی حکم ہے اور اس کو اپنانا ضروری ہے، پس جس طرح ان چیزوں کے ذریعہ سے مرد پہچانا جائے گا اسی طرح وہ بھی پہچانی جائے گی، پھر اگر وہ نمازی ہوگی تو نور نماز بھی اس کو متمیز کردے گا اور اگر اس نے یہ سب چیزیں اختیار نہیں کیں، اور بزی مسلم (مسلم وضع قطع) اختیار نہیں کی، نماز روزہ کو نہیں اپنایا اور پھر نہ پہچانی گئی تو وہ خود اس کی ذمہ دار ہوگی، دوسروں پر اس کا وبال نہ ہوگا۔ حدیث شریف میں فرمادیا گیا ہے: "ومن تزيا بزي قوم فهو منهم"، بر تقدیر تسلیم اگر دنیا میں اس کے ساتھ کچھ خلاف ایمان اور غلط معاملات ہو جائیں تو ہو جائیں، مگر نفس ایمان کی برکت سے آخرت میں حقیقت واضح ہو کر اپنے اعمال نیک و بد کے اعتبار سے بدیر یا جلد مومنین کے زمرہ میں آجائے گی۔

۶- اسی توحید اور اس کے تفصیلی حقوق، آداب واحکام کے اختیار کرنے اور ترک کرنے سے یہ فرق پیدا ہو گیا، کوئی مومن، کوئی کافر، کوئی ناجی، کوئی ناری، کوئی جنتی، کوئی دوزخی ہو گیا۔

۷- بچوں کے غیر ذی شعوری کے زمانہ تک ان کا ننگا بھی دیکھنا درست ہے اور بلکہ پیدا ہوتے ہی جب کہ وہ قدرتا

۱- سورہ آل عمران: ۱۹۔

۲- سورہ آل عمران: ۸۵۔

ننگا ہوتا ہے، لڑکا یا لڑکی ہونا معلوم ہوجاتا ہے۔ پھر اسی کے مطابق اس کے لباس و پوشاک بھی عادۃً ہوجاتے ہیں، پھر یہ کونسی پوچھنے کی بات یا استعجاب کی چیز ہے، بلکہ خود یہ سوال بھی قابل استعجاب ہے۔

البتہ شریعت مطہرہ نے ان ایہامات کے دفع کرنے کے لئے بھی یہ حکم دیا ہے کہ لڑکوں کو بچپن ہی سے مردانہ لباس اور لڑکیوں کو زنانہ لباس پہنایا جائے، اس کے خلاف کرنا حکم شریعت کے خلاف ہے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

غیر مسلم کی شادی میں شرکت کا حکم:

کیا غیر مسلم کی شادی میں شرکت کی جاسکتی ہے؟

الجواب وباللہ التوفیق:

مذکورہ سابق سے رجوع کرکے یہ جواب بھیجا کہ: دعوت ولیمہ جس کا قبول کرنا واجب ہوتا ہے جب اس میں امور معصیت وگانا، باجا وغیرہ منضم ہوجانے پر شرکت ناجائز ہوجاتی ہے۔ اور اسی طرح جب مسلمان کی شادی میں جب امور ممنوعہ کا انضمام ہوجاتا ہے تو شرکت ناجائز ہوجاتی ہے۔ تو پھر کافر کی شادی میں جس میں بہت سے امور ممنوعہ پوجا پاٹ وشرکانہ امور وگانا بجانا منضم ہوں پھر اس میں شرکت کیونکر جائز رہے گی؟ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند ۲۷/۱/۱۴۱۱ھ

غیر مسلم کی میت میں جانا:

ایک غیر مسلم کی میت میں جانا کیسا ہے؟ جواب قرآن وحدیث کی روشنی میں دیجئے حضور پاک ﷺ کی کبھی غیر مسلم کی شادی میں یا میت میں شرکت ہوئی ایسا ہمیں علم نہیں۔

الجواب وباللہ التوفیق:

کافر کی میت محل غضب خداوندی ہوتی ہے جس سے نفور عن المحل ہونا اور غضب خداوندی سے پناہ مانگنا چاہئے، نیز

ارتھی (جنازہ) لیجاتے ہوئے کفریہ شرکیہ نعرے وغیرہ امور ممنوعہ ہوتے ہیں کس طرح شرکت جائز رہے گی؟ اس لئے احقر اپنے دونوں سابق جوابوں سے رجوع کر کے عدم شرکت کا حکم شرعی قرار دیتا ہے،فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی،مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۷/۲/۱۴۱۱ھ

سورج گرہن اور چاند گرہن کے وقت کھانا وغیرہ کیسا ہے؟

سورج گرھن پڑتے وقت بڑے لوگ کہتے ہیں کہ اس وقت کوئی کام نہ کرو کھانا نہ کھاؤ بلکہ خوب خیرات کرو حمل والی عورت کو کچھ چیز کاٹنے یا کوئی کام کرنے کو منع کر دیتے ہیں اس کے ہاتھ سے مہتر وغیرہ کو نمک دلاتے ہیں اور باہر نکلنے کو منع کر تے ہیں ۔عند الشرع یہ عمل کیسا ہے؟

الجواب وبا لله التوفيق:

سورج گرہن یا چاند گرہن پڑنے کے وقت دو رکعت نماز اتنی لمبی پڑھیں کہ گرہن ختم ہو جائے اگر کچھ بچ جائے تو تسبیح واستغفار میں مشغول رہنا مستحب ہے گرہن کے وقت میں کھانا پینا بہتر نہیں ہے اور خیرات کرنا بہتر ہے اور اس کے علاوہ جو باتیں سوال میں لکھی ہیں بے اصل ہیں ان پر عقیدہ رکھنا گناہ اور جاہلیت کی باتیں ہیں، البتہ سورج گرہن اور چاند گرہن کی نماز میں اتنا فرق ہے کہ سورج گرہن کی نماز امام مسجد میں جماعت سے آہستہ پڑھائے اور چاند گرہن میں الگ الگ ہر آدمی نماز پڑھے،فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی،مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

کتاب الطہارت

کتاب الطہارت (باب الأنجاس وتطہیرہا)

مخصوص کاغذ سے استنجاء کا حکم:

آج کل عام طور پر سرکاری دفاتر، ہوائی اڈوں اور اسٹیشنوں وغیرہ کے استنجاء خانوں میں پیشاب سکھانے کے لیے مخصوص کاغذ رکھے ہوئے ہوتے ہیں جن کو عام طور پر استعمال بھی کیا جاتا ہے۔ شرعی نقطۂ نظر سے ان مخصوص کاغذوں سے استنجاء کرنا کیسا ہے؟　　　حافظ اکبر علی (میرٹھ شہر)

الجواب وبالله التوفيق:

اگر یہ کاغذ کلوخ (مٹی کے ڈھیلوں) کی طرح جاذب ہوتے ہیں تو ان کا حکم بھی وہی ہے جو کلوخ کا ہے کہ اگر مبرز سے اِدھر اُدھر پیشاب نہیں پھیلا ہے، یا پھیلا ہے مگر اتھنی کی مقدار کے اندر ہی پھیلا ہے تو اس کے استعمال کے بعد محض وضوء کر کے بھی نماز پڑھ سکتے ہیں، ورنہ پانی سے بھی طہارت حاصل کرنا ضروری رہے گا(۱)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند، سہارنپور ۱۷/۱۰/۱۴۰۹ھ

الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن خیرآبادی، مفتی دارالعلوم دیوبند

۱- یہ حکم انہی مخصوص کاغذوں کے متعلق ہے جو برائے استنجاء بنائے جاتے ہیں، ان مخصوص کاغذوں کے علاوہ سے استنجا کرنا، مکروہ ہے: وکره الاستجاء بعظم، إلى قوله وشئي محترم، قال الشامي: ويدخل أيضاً الورق۔ اور علامہ شامیؒ اس کی کراہیت کے اسباب پر روشنی ڈالتے ہوئے فرماتے ہیں: لصقالته وتقومه وله احترام أيضا لكونه آلة لكتابة العلم ولذا علله في التاتر خانية: بأن تعظيمه من أدب الدين (شامی ۱/۲۲۷ فصل الاستنجاء) (مرتب)۔

دہ دردہ کی تعریف:

دہ دردہ کی تعریف کیا ہے، سوہاتھ کی تحدید کیا ہے کس طرح ہونا چاہئے؟

الجواب وبا الله التوفيق:

شریعت میں دہ دردہ حوض کو حوض کبیر شمار کیا جائے گا، صورت اس کی یہ ہے کہ حوض کی طولاً وعرضاً چاروں جانب دس دس ذراع مربع ہوں، اس طرح کہ پانی کا گرد چاروں طرف سے چالیس ذراع مربع ہو اور اس کی سطح سوذراع مربع ہو، ذراع شرعی، ۹ گرہ کا ہوتا ہے، جب طول بھی دس ذراع اور عرض بھی دس ذراع ہو اور دس کو دس میں ضرب دینے سے سو حاصل آتا ہے، تو سطح سوذراع مربع کی ہوگی۔

”وفي الفتاوى :الحوض الكبير مقدر بعشرة أذرع في عشرة أذرع وصورته أن يكون من كل جانب من جوانب الحوض عشرة أذرع وحول الماء أربعون ذراعاً ووجه الماء مأة أذرع هذا مقدار الطول والعرض“ (۱)۔

فلذا أفتي به المتأخرون الإعلام أى في المربع بأربعين وفي المدور بستة وثلاثين وفي المثلث من كل جانب خمسة عشرو ربعاً وخمسا بذراع الكرباس ، ولوله طول لا عرض لكنه يبلغ عشر في عشر جاز تيسراً “(۲)۔

عام اس سے کہ موجودہ شکل اس کی لمبی ہو سہ گوشہ ہو یا جیسی بھی ہو، مگر مربع نکالیں تو دس دس ذراع نکل آوے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند، سہارنپور

۱- وفي الخلاصة وصورة الحوض الكبير المقدر بعشرة في عشرة أن يكون من كل جانب من جوانب الحوض عشرة وحول الماء أربعون ذراعا ووجه الماء مأة أذرع هذا مقدار الطول والعرض (البحر الرائق ۱/۱۴۰، مکتبہ زکریا، دیوبند وخلاصۃ الفتاوی ۱/۳)۔

۲- الدر المختار علی الرد ۱/۱۷۷-۱۷۸، مطبع عثمانیہ۔

حوض وٹنکی کی تطہیر کا حکم شرعی؟

چھوٹے حوض یا پانی کی ٹنکیوں میں اگر نجاست گر جائے تو اس کا کیا حکم ہوگا، ایا اس صورت میں پانی پاک رہے گا یا ناپاک؟ اگر پانی ناپاک ہو جائے گا تو اس کے پاک کرنے کی کیا صورت ہوگی؟

الجواب وبالله التوفيق:

چھوٹے حوض یا پانی کی ٹنکیاں جو چھوٹی ہوں، یعنی وہ دردہ (عشر فی عشر) نہ ہوں ان میں نجاست گرنے سے وہ ناپاک ہو جائیں گی ورنہ ناپاک نہیں ہوں گی، اور پاک کرنے کی صورت یہ ہے کہ ناپاکی نکال کر اس کا کل پانی نکال دیں اور پھر پانی سے اس کی دیواریں وغیرہ دھو کر اس پانی کو بھی گرا دیں یا نکال دیں پھر پاک پانی بھر دیں، اور اگر یہ حوض وٹنکی اس قسم کی ہوں کہ جن میں پانی اوپر سے آتا ہے اور نیچے سے گرتا ہے تو اس کے اندر پانی آنے اور نکلنے کے دونوں راستے کھول دیں اور مرئی نجاست نکال دیں۔ پھر دیکھیں اگر اتنا پانی نکل گیا ہو جتنا اس میں تھا تو اب یہ سب پانی پاک شمار ہوگا۔ (اور اگر ٹنکی یا چھوٹا حوض اس طرح پر ہو کہ اس میں دو پائپ لگے ہوئے ہوں ایک سے پانی برابر آتا ہو، اور دوسرے سے نکلتا رہتا ہو تو یہ جاری پانی کے حکم میں ہے)، پانی ناپاک نہ ہوگا" **كمافي العالمگيرية، واذا كان الحوض صغيراً يد خل فيه الماء من جانب ويخرج من جانب يجوز الوضوء به من جميع جوانبه وعليه الفتوىٰ**" (۱)، فقط واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند، سہارنپور
الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن خیرآبادی مفتی دارالعلوم دیوبند

ناپاک اشیاء ڈالے ہوئے صابن کا حکم شرعی:

مغربی ممالک سے جو صابن آتے ہیں ان کے متعلق سننے میں آتا ہے کہ ان میں ناپاک اجزاء اور خنزیر کی چربی وغیرہ کا استعمال کیا جاتا ہے، اس طرح کے صابن سے کپڑے صاف کرنا کیسا ہے، اور کپڑے پاک رہیں گے یا ناپاک؟

۱- عالمگیری ۱؍۱۷۔

الجواب وبالله التوفيق:

مغربی ممالک سے آئے ہوئے صابنوں میں جب تک حرام چربی یا سور کی چربی کا ملا ہوا ہونا دلائل شرعیہ سے ثابت ویقینی نہ ہوجائے اس وقت تک ان کے استعمال کو ناجائز نہیں کہہ سکتے ہیں، کیونکہ اشیاء میں اصل حلت واباحت ہے: "الأصل في الأشياء الإباحة" (۱)، البتہ اس کے استعمال کرنے سے ان حالات میں اجتناب کرنا تقویٰ واحتیاط کہا جا سکتا ہے (۲)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند، سہارنپور

الجواب صحیح حبیب الرحمٰن خیرآبادی مفتی دارالعلوم دیوبند

پیشاب سے بنائے گئے نمک کا حکم:

بعض مقامات پر پیشاب کو پکا کر اس کی شوریت کو نکال کر نمک بنا دیا جاتا ہے، شرعی نقطۂ نظر سے اس نمک کا استعمال درست ہے یا نہیں؟

الجواب وبالله التوفيق:

پیشاب شوریت وغیر شوریت بجمیع اجزاء نجس بعینہ اور غیر مباح الشرب والاکل ہوتا ہے، اس لیے شوریت نکال دینے کے بعد بھی بقیہ اجزاء ناپاک ونجس ہی باقی رہیں گے اور ان کا استعمال ناجائز ہی رہے گا (۳)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند، سہارنپور

الجواب صحیح حبیب الرحمٰن خیرآبادی

۱- الاشباہ والنظائر ۸۷ باب الیقین لا یزول بالشک۔

۲- علامہ ابن عابدین شامی نے اس کی صراحت کی ہے: "جعل الدهن النجس في صابون يفتى بطهارته، لأنه تغير و التغير يطهر عند محمد رحمه الله، ويفتى به للبلوى" (شامی ۱/ ۲۱۰ باب الانجاس)، اس کے علاوہ دیگر اکابر کے فتاویٰ میں بھی اس کا حکم مذکور ہے، تفصیل کے لئے دیکھئے: کفایت المفتی ۱/ ۱۳۰) (مرتب)۔

۳- (ویرفع أي الحدث بماء ينعقد به ملح لابماء... ملح لبقاء الأول على طبيعته الأصلية والقلاب الثاني إلى طبيعة الملحية (الدر المختار على هامش الشامي ۱/ ۱۲۱، باب المياه) ہاں اگر پیشاب نمک کی کان میں پڑ کر نمک بن جائے اور غیر متمیز ہوجائے تو "الخلط استهلاک" کے مطابق اس پر پیشاب کا حکم باقی نہ رہے گا (مرتب)۔

کیا پیشاب فلٹر کرنے کے بعد بھی ناپاک رہے گا؟

ابھی کچھ ایام قبل روسی سائنسدانوں نے ایک شخص کو ایک ہوا بند کوٹھری میں تجربہ کے طور پر بند کردیا اور اس کے لیے سامانِ خورد ونوش کا کچھ انتظام کردیا، لیکن کچھ ایام کے لیے پانی سپلائی نہ کیا، تاکہ پانی کے بغیر زندگی کا تجربہ کرسکیں، چنانچہ ان لوگوں نے ایک برتن میں پیشاب کیا اور اس کے تمام اجزاء متعفنہ اور ضاریہ کو ایک مشین سے کشید کرکے ختم کرنے کے بعد مثل پانی کردیا، جس طرح سمندری پانی کو کھارے سے تبدیل کرکے میٹھا بنالیتے ہیں۔

غور طلب امر یہ ہے کہ یہ انقلاب ماہیت کے تحت آتا ہے یا نہیں؟ مع دلائلِ شرعیہ ونقلیہ ثابت فرمائیں۔

الجواب وبالله التوفيق:

اس کشید کا حاصل تو صرف یہ ہے کہ پیشاب کے اندر سے اس کے متعفن اور مضرت رساں اجزاء کو نکال دیا گیا، اور باقی جو اجزاء بچے وہ اسی پیشاب کے اجزاء ہیں۔ اور پیشاب بجمیع اجزاء نجس العین اور نجس بنجاست غلیظہ ہے، اس لیے یہ باقی ماندہ اجزاء بھی نجس العین اور نجس بنجاستِ غلیظہ ہی رہیں گے(۱)۔ اس میں تقلیب ماہیت کی کوئی صورت نہیں پائی گئی اس کو قلبِ ماہیت نہیں کہہ سکتے، بلکہ یہ تجزیہ تخر جہ ہوا نہ کہ قلب ماہیت، قلب ماہیت تو یہ ہے کہ سابق حقیقت معدوم ہوکر نئی حقیقت ونئی ماہیت بن جائے، نہ پہلی حقیقت وماہیت باقی رہے نہ اس کا نام باقی رہے، نہ اس کی صورت وکیفیت باقی رہے، نہ اس کے خواص وآثار وامتیازات باقی رہیں، بلکہ سب چیزیں نئی ہوجائیں، نام بھی دوسرا، صورت بھی دوسری، آثار وخواص بھی دوسرے، اثرات وعلامات اور امتیازات بھی دوسرے پیدا ہوجائیں، جیسے شراب سے سرکہ بنالیا جائے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند، سہارنپور

قرآن کریم کی کیسٹ بے وضو چھونا، ٹیپ کرنا، نیز کتابت کرنا شرعاً کیسا ہے؟

آج کل قرآن کریم کو بذریعہ ٹیپ ریکارڈ کیسٹ میں ٹیپ کیا جاتا ہے، اس طرح بغیر وضو کے ٹیپ کرنا جائز ہے یا

۱- ویرفع أی الحدث بماء ينعقد به ملح لابماء ملح لبقاء الأول على طبيعته الأصلية وانقلاب الثاني إلى طبيعة الملحية (الدر المختار على هامش الشامي ۱/ ۱۲۱، باب المياه)۔

نہیں۔نیز قرآن کریم کی کیسٹ بغیر وضو کے ہاتھ میں لیجاسکتی ہیں یا نہیں؟ اور بغیر وضو کے قرآن کریم کی کتابت کرنا شرعی نقطۂ نظر سے کیسا ہے؟

الجواب وبالله التوفيق:

اس طرح بغیر وضو کے کیسٹ میں بھرنا اور اس کا ہاتھ میں لینا سب جائز ہے، کیونکہ کیسٹ میں صرف ہوا محبوس ہوتی ہے، کلمات جیسی کوئی چیز محبوس ہو کر مقید نہیں ہوتی، بخلاف کتابت کے کہ اس میں کلمات جیسی چیز محبوس ہو کر مقید ہوتی ہے، اس لیے کتابت بے وضو کرنا اور اس کو بے وضو چھونا کچھ بھی جائز نہیں ہوگا(۱)۔

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند، سہارنپور

الجواب صحیح حبیب الرحمٰن خیرآبادی

نجاست میں گرے بسکٹ کا حکم:

ہمارے بسکٹ جو کہ کاغذ میں ملفوف تھے، ایک دم اچانک غلیظ پانی میں گر پڑے، فوراً ایک شخص نے نیچے پہنچ کر اٹھا لیا، کھول کر دیکھا تو بعض پر چار، چھ دھبے یا ہلکی چھینٹیں تھیں اور بعض پر صرف کاغذ کی تری ہی پہنچی تھی، اب سوال یہ ہے کہ ان کے پاک کرنے کا طریقہ کیا ہے، کیا بسکٹوں کے تنور میں اس کو سینک کر پاک کر سکتے ہیں؟

۱- (مسئلہ مذکورہ میں فقہاء حنفیہ کے درمیان اختلاف ہے، امام ابو یوسف کے نزدیک محدث کے لئے قرآن کی آیت کی کتابت جائز ہے جبکہ امام محمد کے نزدیک مکروہ ہے، علامہ حلبی نے دونوں قولوں کے درمیان تطبیق اس طرح دی ہے: امام ابو یوسف کے قول کا محمل یہ ہے کہ کاتب اور اس کی کتاب کے درمیان قلم وغیرہ کا واسطہ ہو اور کاتب کا ہاتھ قرآن کی آیت کو مس نہ کر رہا ہو اور امام محمد کے قول کا محمل یہ ہے اور ان کا قول اس صورت سے متعلق ہے کہ جب کاتب اور قرآن کی کتابت شدہ آیت کے درمیان کوئی واسطہ اور فصل نہ ہو۔ بعض حضرات نے امام ابو یوسف کے قول کو کراہت تحریمی کی نفی پر محمول کیا ہے اور امام محمد کے قول کو کراہت تنزیہی پر محمول کیا ہے۔ الدر المختار میں ہے: "ولاتكره كتابة قرآن والصحيفة أو اللوح على الأرض عند الثاني خلافا لمحمد، وينبغي أن يقال: إن وضع على الصحيفة مايحول بينها وبين يده يؤخذ بقول الثاني، وإلا فبقول الثالث قاله الحلبي" علامہ شامی اس کے تحت لکھتے ہیں:۔ قوله (خلافا لمحمد) حيث قال أحب إلي أن لايكتب، لأنه في حكم الماس للقرآن، قال في الفتح: والأول أقيس، لأنه في هذه الحالة ماس بالقلم وهو واسطة منفصلة فكان كثوب منفصل إلا أن يمسه بيده قوله: (وينبغي) ووفق بين القولين بما يرفع الخلاف من أصله بحمل قول الثاني على الكراهة التحريمية، وقول الثالث على التنزيهية بدليل قوله أحب إلي" (الدر المختار على رد المحتار ۱/ ۱۷۵ طبع کراچی) نیز دیکھئے: (امداد الفتاوی ۱/ ۱۴۷ طبع زکریا بکڈپو، دیوبند) چونکہ قرآن کریم کی ایک دو آیتوں کو لکھنے میں اس احتیاط پر عمل کرنا ممکن ہے، لیکن پورے قرآن کو بے وضو تحریر کرنے میں اس کا قوی امکان ہے کہ کاتب کے ہاتھ سے قرآن کریم کی دیگر آیتیں مس ہوجائیں جو کہ بالاتفاق حرام ہے، اس لئے احتیاطاً حضرت مفتی صاحب نے مطلقاً کتابت کو ناجائز قرار دیا ہے (مرتب)۔

الجواب وبالله التوفيق:

محض سینکنے سے یہ بسکٹ پاک نہ ہوں گے، سینکنے سے نجاست کے اجزاء لطیفہ تو نکل سکتے ہیں، مگر اجزاء ثقیلہ وکثیفہ کا اخراج نہ ہوگا، اس لیے یہ سوال بیکار ہے، البتہ یہ طریقہ بہتر ہے کہ جس حصہ پر نجس پانی یا نجاست کا اثر (دھبہ وغیرہ) ہو اس کو کھرچ کر نکال دیا جائے اور بقیہ کو استعمال کرلیا جائے (۱،۲)۔ فقط واللہ علم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دار العلوم دیوبند، سہارنپور

خنزیر کے چمڑے کا استعمال جائز ہے یا نہیں؟

خنزیر کا چمڑا بعض اچھی موٹر کاروں میں استعمال ہوتا ہے، تو جس گاڑی میں اس چمڑے کا استعمال ہو اس گاڑی میں سوار ہونا جائز ہے یا نہیں؟ ۔نیز یہ بھی دریافت طلب ہے کہ جہاں وہ چمڑا لگا ہوا ہے وہاں پر ہمارا کوئی بھی عضو یا کپڑا مس ہوتا ہو تو کیا وہ عضو یا کپڑا ناپاک ہوجائے گا، یا اس کی کچھ تفصیل تری اور غیر تری میں ہے، اگر ہے تو وہ بھی تحریر فرمائیں۔

الجواب وبالله التوفيق:

چمڑا جو بالکل خشک ہو اس پر اپنا خشک جسم یا خشک کپڑا مس کرنے یا لگنے سے کپڑے یا جسم پر نجاست نہیں آئے گی (۳)، البتہ اگر وہ چمڑا پانی سے یا کسی بھی طرح سے تر ہو اور اس پر اپنا خشک جسم یا کپڑا لگے گا تو اس چمڑے کی تری آجائے گی جس کی بنا پر ناپاک ہوجائے گا۔ یا وہ چمڑا خشک ہی ہو لیکن پسینہ وغیرہ سے اپنا جسم یا کپڑا تر ہو کر اس چمڑے سے لگے اور پھر اس

۱– (ويزيده: ويطهر المني الجاف ولو مني امرأة على الصحيح بفركه عن الثوب ولو جديدا مبطنا، وعن البدن بفركه في ظاهر الرواية طحطاوي على مراقي الفلاح / ۸۹، باب الأنجاس وتطهيرها، وهكذا في الفتح ۱/ ۱۳۶)۔

۲– (ومنها الحث والدلك الخف إذا أصابته النجاسة إن كانت متجسدة كالعذرة والروث والمني يطهر بالحث إذا يبست وإن كانت رطبة في ظاهرا لرواية لايطهر إلا بالغسل وعند أبي يوسف إذا مسحه على وجه المبالغة بحيث لايبقى لها أثر يطهر وعليه الفتوى لعموم البلوى) (الفتاوی الہندیہ ۱/ ۴۴، دار الفکر) (مرتب)۔

۳– (وإذا أصاب الثوب المبلول النجس في ثوب طاهر يابس فظهرت نداوته ولكن لايصير رطبا يسيل منه شئى بالعصر، بل كان بحيث لو عصر لا يسيل منه شئى ولا يتقاطر، اختلف المشائخ فيه، والأصح أنه لايصير نجساً كذا في الخلاصة كبيرى/ ۱۷۱، فصل في الآسار (مرتب)

چمڑے کا کوئی اثر (رنگ یا بو وغیرہ) اپنے جسم یا کپڑے پر آجائے تو بھی ناپاک ہوجائے گا(۱)، ایسے اشتباہ کے موقع پر جب اس پر بیٹھنا ہو یا ٹیک لگانا ہو تو کوئی موٹا کپڑا، رومال یا تولیہ وغیرہ ڈال کر بیٹھے کہ احتیاط اسی میں ہے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند، سہارنپور

کپڑے وغیرہ پر جب تک نجاست کا دھبہ و داغ نظر نہ آئے اس کو ناپاک نہیں کہیں گے:

جملہ سرکاری دفاتر و کوٹھیوں میں بڑے عمدہ قسم کے قالین بچھے ہوئے ہوتے ہیں۔ اور جو لوگ ان دفاتر و کوٹھیوں ہی میں کام کرتے ہیں وہ اپنے جوتوں سمیت آتے ہیں جو کچھ پانی یا تھوڑی بہت تری جوتوں کو لگتی ہے تو وہ قالین اتنے موٹے ہوتے ہیں کہ اس تری کو فوراً جذب کر لیتے ہیں، اور ان پر بھنگی دن میں کئی مرتبہ جھاڑو دیتے ہیں، اور بڑے صاف، شفاف نظر آتے ہیں، ظاہر ہے کہ کوئی نجاست نظر نہیں آتی، ایسے قالینوں پر نماز ہوجائے گی یا نہیں؟

حافظ محمد طاہر (پنجاب)

الجواب وبالله التوفيق:

اگر استنجا خانہ و بیت الخلا اس قالین یا فرش سے اتنی دوری پر ہو کہ آنے میں درمیان میں کچھ زمین پڑتی ہو، یا پختہ فرش اتنا وسیع پڑتا ہو کہ اس پر گذرنے میں جوتوں کی تری راستہ ہی میں جذب ہوجاتی ہو، جب تو اس فعل سے قالینوں کو اس وقت تک ناپاک نہیں کہیں گے جب تک نجاست کا داغ، دھبہ یا اثر (رنگ و بو وغیرہ) ان قالینوں پر نظر نہ آئے اور محض شبہ کی بنا پر کوئی حکم نہیں لگے گا۔

ہاں اگر استنجاء خانہ و بیت الخلاء اتنے قریب ہیں کہ درمیان میں کچھ ایسی زمین نہیں پڑتی کہ جوتوں کے تلوے اس پر گذرنے سے خشک ہوجاتے ہوں اور نہ پختہ فرش ہی ایسا حائل ہو تو ظنِ غالب اسی کا ہوگا کہ ناپاکی و نجاست کا اثر قالین پر

۱- (ولو بسط المصلي أي السجادة على شئ نجس رطب أو جلس على أرض نجسة رطبة أو لف الثوب اليابس الطاهر في ثوب نجس رطب فأثر الرطوبة النجسة في ثوبه في الصورتين الأخريين أو أثرت في مصلاه في الصورة الأولى ينظر إن كان ثانية الرطوبة بحال لو عصر الثوب أو المصلي يقاطر منه شئ يتنجس الثوب والمصلي والا أي، وان لم يكن الثانية بذلك الحال فلا يتنجس ..... وأيضا يشترط أن لايوجد أثر النجاسة من لون أو ريح) (غنیۃ المستملی ص:۱۷۸، دارالکتاب دیوبند) (مرتب)۔

آ گیا۔ایسی صورت میں اس پر کوئی پاک کپڑا بچھائے بغیر نماز پڑھنا درست نہ ہوگا۔فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی،مفتی دارالعلوم دیوبند،سہارنپور

ڈرائی کلین کیے ہوئے کپڑوں کا حکم؟

ڈرائی کلین کیے کوٹ،پتلون یا شیروانی وغیرہ کی تطہیر کیے بغیر نماز پڑھنی یا پڑھانی درست ہے یا نہیں؟ ڈرائی کلین ایک فلٹر میں چند گیلن پٹرول ڈال کر گرم کپڑے چار،پانچ عدد ڈال دیے جاتے ہیں اور مشین چالو کر دی جاتی ہے۔جس سے کپڑے پٹرول میں زوروں سے گردش کرنے لگتے ہیں اور میل کچیل پٹرول میں آجاتا ہے۔پھر پٹرول کو نتھار کر کپڑے خشک کر کے پریس کر دیے جاتے ہیں۔فلٹر میں جو کپڑے ڈالے جاتے ہیں ان میں نوے فیصد یقینی طور پر نجس ہوتے ہیں،لہٰذا ان کی وجہ سے ٹنکی یا پٹرول اور اس کے سارے کپڑے یقیناً نجس ہو جاتے ہیں جو محض خشک کرنے سے پاک نہیں ہوتے،اس لیے ان کی تطہیر کے بغیر ان کپڑوں میں نماز کس طرح درست ہو سکتی ہے؟

الجواب وباللہ التوفیق:

یہ تو ظاہر ہے کہ کوئی بھی کپڑا(سوتی ہو یا اونی یا ریشمی)ابتداءً جب بنا جاتا ہے اور تیار کیا جاتا ہے اس وقت بھی اس کے دھاگے(تانے بانے وغیرہ)میں مسالہ(ماڑی وغیرہ)لگایا جاتا ہے اور وہ بھی اکثر غیر مسلم لگاتے ہیں اور نہایت گندے پیروں سے اور گندی جگہوں میں خوب مسلتے ہیں جس میں ناپاکیوں کی آمیزش کبھی دیکھی بھی جاتی ہے اور کبھی مظنون ہوتی ہے اور تطہیر شرعی کے اصول تو قطعاً ملحوظ نہیں ہوتے،جیسا کہ ان کے کارخانوں اور فیکٹریوں کا مشاہدہ کرنے والوں پر ظاہر ہے اور اس کا تقاضا یہ ہے کہ نئے کپڑے بھی خواہ سوتی ہوں یا اونی یا ریشمی۔بغیر شرعی ضابطہ سے پاک کیے ہوئے استعمال کرنا درست نہ ہو،لیکن فتویٰ یہ نہیں ہے،کیونکہ اصل اشیاء میں طہارت ہے(کمافی الاشباہ)(۱)،جب تک ناپاکی لگی ہوئی یا لگتے ہوئے نہ دیکھ لیا جائے،یا شرعی ثبوت یا شہادت سے ناپاک ہونا متیقن نہ ہو جائے ناپاکی کا حکم نہیں لگا سکتے۔

اسی طرح دیہاتوں میں عام طور پر سوتی کپڑے جو دھوئے جاتے ہیں وہ گدھوں کی لیدوں میں ملوث کرنے اور خوب ملنے کے بعد دھوئے جاتے ہیں اور بسا اوقات پانی کی کمیابی کی وجہ سے وہ ایک چھوٹے سے گڑھے میں اور کبھی محض

۱- (الاصل فی الاشیاء الاباحۃ/۸۷،باب الیقین لایزول بالشک،الفن الاول،الاشباہ النظائر مع شرح الحموی)۔

ٹبوں میں دھوئے اور صاف کئے جاتے ہیں، اور خشک بھی بسا اوقات ناپاک زمینوں پر (جیسے تالاب وغیرہ کے گندے حواشی یا گندی جھاڑیوں میں) پھیلا کر کئے جاتے ہیں جس کا مشاہدہ بھی عام ہے، اور جہاں کہیں دھوبی غیر مسلم ہوں اور آبادی بھی عموماً غیر مسلموں کی ہو، وہاں تو اس کا مشاہدہ اور بھی عام ہے، مگر اس کے باوجود ان دھلے ہوئے کپڑوں پر ناپاک ہونے کا حکم نہیں لگایا جاتا اور نہ بغیر شرعی ضابطہ کے پاک کئے ہوئے ان کپڑوں میں نماز پڑھنے سے نماز جائز نہ ہونے ہی کا حکم دیا جاتا ہے(۱)۔

یہ صرف اسی قاعدہ مسلمہ کی بنا پر ہے کہ اصل اشیاء میں طہارت ہے، پس جب تک اس کے خلاف دلیل شرعی سے نجاست کے ملوث وبقاء کا یقین نہ ہو جائے حکم بنجاست حکم شرعی نہ ہوگا، بالخصوص جب ابتلاء عام بھی اس میں شریک ہو جائے۔

بالکل اسی طرح یہاں پٹرول سے دھلے ہوئے کپڑوں کا بھی حکم ہوگا، بلکہ پٹرول کے اندر جذب نہ ہونے اور اڑ جانے کی قوت پانی سے کہیں زیادہ اور قوی ہوتی ہے، اور پھر اونی کپڑوں میں سوتی کپڑوں کے مقابلہ میں جذب کرنے کی صلاحیت بھی تقریباً نفی کے برابر ہوتی ہے، اور اسی بنا پر اونی کپڑوں کو بھگو کر نا تک دو تو محض نچرنے کے ساتھ ہی ساتھ بالکل خشک ہو جاتے ہیں، بخلاف سوتی کپڑوں کے کہ نچرنے کے بعد کافی تر رہتے ہیں۔

اس کا تقاضا بھی یہ ہونا چاہئے کہ اونی کپڑوں میں نجاست کی سرایت بھی بہت کمزور و ناپائیدار رہو، اور ان کی تطہیر کا طریقہ بھی سہل و آسان ہو، انہیں وجوہ کی بنا پر پٹرول سے دھلے ہوئے ان کپڑوں پر ناپاک ہونے کا حکم نہیں ہوتا اور نہ ان کے دوبارہ دھونے کا حکم ہوتا ہے اور نہ پاک کرنے کا حکم ہوتا ہے۔

یہیں سے یہ بات بھی نکل آئی کہ جب پٹرول میں کپڑوں کی گردش کرانے اور جھنجھوڑنے سے کپڑوں کے داغ دھبے (خواہ وہ ناپاکی ہی کے داغ دھبے ہوں) زائل ہو جاتے ہیں اور کپڑا صاف ستھرا ہو جاتا ہے تو جب کپڑے میں پٹرول جذب نہ ہو کر اڑ جاتا ہے اور اس کے اڑ جانے کے بعد بھی اثر نجاست (رنگ و بو مزہ وغیرہ) باقی نہیں رہتا ہے بلکہ زائل ہو جاتا ہے تو کہنا پڑے گا کہ پٹرول ہی سے ازالہ ہوا ہے، اور تطہیر نام ہے اسی ازالۂ نجاست کا خواہ قلب ماہیت کی وجہ سے ہو جیسے شراب کا سرکہ بن جانا اور سرکہ کا پاک شمار کیا جانا، یا محض اڑ جانے سے ہو، جیسے ناپاک روئی کے دھننے سے روئی کا پاک ہو

۱- (واختلف في أنه هل يطهر بالغسل في الأواني، بأن غسل الثوب النجس أو البدن النجس في ثلث إجانات، قال أبوحنيفة ومحمد رحمهما الله: يطهر حتى يخرج من الإجانة الثالثة طاهراً (بدائع الصنائع، ۸۷/۱ كتاب الطهارت) (مرتب)۔

جانا، یا غسل بالماء کے ذریعہ سے یا کسی بھی سیال طاہر شئی سے غسل کے ذریعہ سے، اور یہ صورت یہاں بھی حاصل ہے (۱)، لہٰذا اس بنا پر بھی دوبارہ تطہیر کا حکم دینے کی ضرورت نہ ہوگی (۲)۔

البتہ جن لوگوں کو اپنے کپڑے کی ناپاکی کا یقین ہو، مثلاً نجاست لگتے ہوئے یا لگی ہوئی خود دیکھی ہے تو ان کو پٹرول میں دھونے کے لیے دینے سے قبل خود پاک کر لینا چاہئے یا پھر دھل کر آنے کے بعد احتیاطاً خود پاک کر لینا افضل ہوگا (۳)۔ اسی طرح مشین سے نکلنے کے بعد ذی جرم نجاست کا جرم باقی رہے تو اس کا دھونا ضروری رہے گا اس کے بغیر پاک نہیں کہا جائے گا (۴)۔

اسی طرح یہ بات بھی الگ ہوگی کہ از روئے تقویٰ ایسے دھلے ہوئے کپڑوں کی تطہیر بقاعدۂ شرع خود کر لی جائے، مگر اس کو فتویٰ نہیں قرار دیا جاسکتا، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند، سہارنپور

الجواب صحیح محمود غفرلہٗ

غیر ملکی پنیر کا حکم:

جس طرح اس ملک میں اکثر کھانے پینے کی چیزیں غیر مسلم عیسائی اور یہودیوں کی فیکٹریوں میں بنتی ہیں اور مسلمان ان کو خرید کر کھاتے ہیں، اسی طرح پنیر جس کو انگریزی زبان میں چیز (CHEESE) کہتے ہیں، اپنے تمام تر اقسام کے ساتھ غیر مسلموں کی فیکٹریوں میں بنتا ہے اور مسلمان انہیں خرید کر کھاتے ہیں۔

۱- (روئی میں نجاست لگ جائے تو اگر نجاست کی مقدار اتنی ہو کر دھنائی سے اس کا اثر زائل ہو جائے تو دھننے سے روئی پاک ہو جائے گی، لیکن اگر نجاست کی مقدار زیادہ ہو تو اس کو دھونا ضروری ہے، قال الشامي قوله: وندف قطن تنجس أقله ومن عده شرط كون النجس مقدارا قليلا يذهب بالندف وإلا فلا يطهر، ردالمحتار ۱/ ۳۱۴) (مرتب)۔

۲- (وإن كان لها جرم كثيف، فإن كان منيا فإنه يطهر بالحت بالإجماع، وإن كان غيره كالعذرة والدم الغليظ والروث يطهر بالحت عند أبي حنيفة وأبي يوسف رحمهما الله وعند محمد لايطهر إلابالغسل، (بدائع الصنائع ۱/ ۸۴ كتاب الطهارة)۔

۳- (لأن اليقين لايزول بالشك - الاشباه والنظائر مع شرح حموی، ص، ۷۵، الفن الاول) (مرتب)۔

۴- (مايطهر به النجس عشرة: منها الغسل، يجوز تطهير النجاسة بالماء وبكل مائع طاهر يمكن إزالتها به كالخل ومنها المسح ومنها الفرك في المني ومنها الحت والدلك ومنها الجفاف وزوال الأثر، ولافرق بين الجفاف بالشمس والنار والريح والظل ومنها الإحراق ومنها الاستحالة ومنها الدباغ والزكاة والنزح) (الفتاوی الہندیہ ۱/ ۴۱-۴۵) (مرتب)۔

اب کچھ دنوں سے یہ سوال پیدا ہوا ہے کہ پنیر کے بنانے میں انفحہ استعمال کیا جاتا ہے جو نوزائدہ گائے کے بچہ کے شکم سے جمے ہوئے دودھ کی شکل میں نکالا جاتا ہے، اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ بچھڑے کو دودھ پلا کر اس کو ذبح کیا جاتا ہے، اس کے بعد پیٹ چاک کر کے وہ دودھ جو دہی کی شکل میں جم جاتا ہے اس کو نکال لیا جاتا ہے۔

توسوال یہ ہے کہ غیر مسلم کے ذبیحہ سے کشیدہ انفحہ سے بنا ہوا پنیر مسلمان کے لیے حلال ہے یا نہیں؟

الجواب وبالله التوفيق:

غنیۃ المستملی الکبیر، (ص، ۱۴۸) پر ہے:"**البيضة إذا وقعت من الدجاجة في الماء أو في المرقة لاتفسدهٖ وكذا سخلةٌ وكذا الإنفخة بكسر الهمزة وفتح الفاء وقد تكسر وهي مايكون في معدة الرضيع من أجزاء اللبن طاهرة عند أبي حنيفة رحمه الله لاتفسد الماء ولاغيره وإذا خرجت من شاة ميتة سواء كانت جامدة أو مائعة وعندهما المائعة نجسة والجامدة متنجسة تطهر بالغسلِ فيفسد ان الماء وغيره، إلا إذا اغتسلت الجامدة، أما لو خرجت من مذكاة فلا خلاف في طهارتها**" (۱)۔

اس عبارت سے معلوم ہوا کہ انفحہ جو گائے کے بچہ کے شکم سے یا بکری وغیرہ کسی بھی ایسے جانور سے نکالا جاتا ہے جس کا گوشت کھانا حلال ہے، وہ انفحہ اس جانور کے شکم سے شرعی طریقہ سے ذبح کرنے کے بعد نکالا جائے تو وہ بالاتفاق حلال و پاک ہوتا ہے اور اس کا کھانا اور استعمال کرنا درست رہتا ہے، اور جو انفحہ ماکول اللحم ہی جانور کے پیٹ سے نکال دیا جائے مگر بغیر شرعی ذبح کئے ہوئے (مردار) جانور سے نکال دیا جائے تو صاحبین رحمہما اللہ کے نزدیک حلال تو ہوتا ہے، مگر معدہ کی خارجی ناپاک رطوبت کی آمیزش کی وجہ سے ناپاک رہتا ہے۔ اگر خشک اور منجمد ہو تو دھو کر پاک وطاہر بھی کیا جاسکتا ہے اور بعد تطہیر استعمال بھی کیا جاسکتا ہے اور اگر رقیق وسیال ہے تو ناپاکی کے سرایت کر جانے کی وجہ سے اس کی تطہیر کی کوئی شکل مفید نہیں رہتی، اور اس کا استعمال درست نہیں ہوگا۔ اور امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک ہر حال میں اس کا استعمال درست رہتا ہے اور رہے گا کیونکہ وہ رطوبت امام صاحب کے نزدیک ناپاک نہیں ہوتی۔

اور اس اختلاف کا ثمرہ یہ نکلے گا کہ از روئے فتویٰ اس کا استعمال جائز اور درست رہے گا۔ از روئے تقویٰ احتیاط افضل ہوگا۔

۱- (وهكذا في الطحطاوي على مراقي الفلاح على صفحة، ص، ۹۱، قبيل كتاب الصلوٰة) (مرتب)۔

پس یہ رینٹ جوگائے کے بچہ سے بعد ذبح نکالا جاتا ہے یہ حلال وپاک ہے،اس کا استعمال بلا اختلاف جائز اور درست ہے اور اس کے ذریعہ سے جو پنیر بنایا جائے گا اس کا استعمال بھی جائز اور درست رہے گا۔فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی،مفتی دارالعلوم دیوبند،سہارنپور

الجواب صحیح محمود غفرلہٗ

ذبیحہ سے کشید مادہ سے بنایا ہوا پنیر:

مسلمان کے ذبیحہ سے کشید مادہ سے بنایا ہوا پنیر حلال ہے یا نہیں؟

سوال(۳):

(الف) ایک مسلمان کے سوال پر محکمہ زراعت واقتصادیات کے ایک ذمہ دار شخص نے ایک اخبار میں یہ بیان دیا ہے کہ پنیر بناتے وقت دودھ کو منجمد کرنے کے لیے رینٹ،یعنی انفحہ استعمال ہوتا ہے،مگر چونکہ بچھڑے بڑی تعداد میں ذبح نہیں کئے جاتے،اس لیے سور(خنزیر)کے پیٹ سے بھی کوئی مادہ اس غرض کے لیے کشید کیا جاتا ہے اور بڑی تحقیقات کے بعد سائنس داں سبزہ جات سے ایک مادہ کشید کرنے میں کامیاب ہوگئے ہیں جو دودھ کو جمانے میں استعمال کیا جاتا ہے اور حیوانی رینٹ کا قائم مقام ہوگیا ہے۔

(ب) ڈیری انڈسٹری کنٹرول بورڈ کے منیجر نے جمعیۃ العلماء ٹرانسوال کے سوال کے جواب کے ضمن میں فرمایا:یہ معلوم ہے کہ بیرونی ممالک میں بعض رینٹ میں خنزیر کے پیٹ سے کشید کوئی سیال مادہ شامل ہوتا ہے،مگر جہاں تک اس آفس کا ذکر ہے اور علم ہے،اس میں آخرالذکر رینٹ مستعمل نہیں ہے۔

(ج) جمعیۃ العلماء نٹال کے سوال پر اور بندہ کی اس ذاتی گفت وشنید اور تحقیق پر نیشنل کوآپر ٹیوڈیریز لمیٹڈ کے پروڈکٹ کنٹرولر اور معاون منیجر نے زبانی اور تحریری بیان دیا کہ اب ان کی جملہ برانچوں میں جو ساری پبلک میں پھیلی ہوئی ہیں،صرف سبزی کے مصنوعی رینٹ کا استعمال ہوتا ہے۔

(د) کیپ ٹاون کی جمعیت العلماء کے شیخ ابوبکر نجار کی تحقیق وسوال کی بنا پر کیپ ٹائمس نامی اخبار میں ڈاکٹر جے۔ایف۔لاگیر نے جو بایو کیمیکل مینوفیکچرنگ فرم کے جوائنٹ منیجنگ ڈائرکٹر ہیں،یہ بیان دیا کہ ہماری کمپنی تمام ساؤتھ افریقہ کی واحد رینٹ ساز کمپنی ہے،جو صرف گائے کے بچہ کے پیٹ سے کشید مادہ سے رینٹ بناتی ہے جس میں خنزیر کے

پیٹ کا کوئی جزء نہیں ہوتا ہے۔

تو اب کلام کا ملخص اور سوال یہ ہے کہ محکمہ زراعت واقتصادیات کے ذمہ دار شخص نے بتلایا کہ پنیر بناتے وقت دودھ کو منجمد کرنے کے لیے خنزیر کے پیٹ سے کوئی سیال مادہ بھی مستعمل ہوتا ہے۔ مگر یہ نہیں بتایا کہ اس ملک میں بھی اس کا استعمال ہے یا نہیں اور دیگر تمام بیان دینے والوں نے یہ بتایا کہ اس ملک میں بچھڑے کے پیٹ سے کشیدہ رینٹ یا مصنوعی نباتی رینٹ مستعمل ہے اور نیشنل کوآپر ٹیوڈیریز کے ذمہ دار اشخاص نے صراحت سے یہ بتلا دیا کہ وہ اب حیوانی رینٹ یعنی بچھڑے کا رینٹ استعمال نہیں کرتے ہیں، وہ اپنی تمام ترفیکٹریوں میں صرف نباتی رینٹ استعمال کرتے ہیں۔

تو کیا ایسی صورتِ حال میں پنیر کو مشکوک ٹھہرا کر اس کو حرام سمجھا جائے، یا ان ذمہ دار اشخاص کے انکار کرنے کی بنا پر اس کو حلال ٹھہرایا جائے؟

قاسم محمد عفی عنہ (ناظم جمعیۃ العلما نٹال ساؤتھ افریقہ)

الجواب وباللہ التوفیق:

سوال نمبر ۲ کا جواب نمبر ۱ کے ضمن میں آچکا ہے کہ اس کا استعمال جائز ہے۔

جواب نمبر ۳ (الف) خنزیر مثل غلاظت کے ناپاک، یعنی نجس العین وحرام ہے، ذبح کے بعد بھی یہ پاک نہیں ہوتا، اس کے پیٹ سے کشید کیا ہوا کوئی مادہ سیال ہو یا منجمد پاک وحلال نہ ہوگا۔ ناپاک وحرام ہی رہے گا۔ اور اس کا استعمال جس کھانے وغیرہ میں ہو جائے گا وہ بھی ناپاک وحرام ہو جائے گا اور اس کا کھانا اور اس کا استعمال کرنا بھی درست وجائز نہ رہے گا۔ ”لأنه نجس العين بمعنى أن ذاته بجميع أجزائه نجسة حياً وميتاً“ (۱)۔

البتہ جب تک ناپاک وحرام کی آمیزش کا ثبوت ویقین نہ ہو جائے، اس وقت تک قطعی حرمت کا حکم نہیں دیا جائیگا۔ ”إن اليقين لاَ يزول بالشك“ (۲) لیکن احتیاط اولی اور بہتر رہے گی مکروہ یا حرام نہ کہہ سکیں گے۔

(ب، ج، د) ان کے اندر درج شدہ بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی مادہ وغیرہ خنزیر کے پیٹ سے کشید کیا جاتا ہے، وہ ٹرنسوال ونٹال اور ساؤتھ افریقہ میں عام طور سے استعمال نہیں ہوتا، بلکہ یا تو گائے کے بچہ کے شکم سے نکالا ہوا رینٹ

۱- شامی ۱/۱۳۶۔

۲- الاشباہ والنظائر مع شرح الحموی، ص، ۵۷، الفن الاول۔

استعمال ہوتا ہے، اس مصنوعی رینٹ کے بنانے میں یا اور کسی طرح پر اگر کسی ناپاک یا حرام چیز کی آمیزش نہیں ہوتی ہے تو یہ نباتی رینٹ بھی بلاشبہ پاک وحلال ہے۔ غرض جب پنیر بنانے میں دونوں قسم کے (حرام وناپاک اور پاک وحلال) رینٹ استعمال ہوتے ہیں اور اصل اشیاء میں حلت اور اباحت ہے(۱)، تو جب تک کسی پنیر کے بارے میں یہ بات دلیل سے متحقق نہ ہوجائے کہ اس میں حرام یا ناپاک رینٹ استعمال ہوا ہے اس وقت تک اس پر حرام یا ناپاک ہونے کا حکم نہیں لگائیں گے۔ ہاں جب یہ دلیل سے یقین ہوجائے اور ثبوت مل جائے کہ اس میں کوئی حرام یا ناپاک چیز ملی ہے جیسے یہ کہ پیکٹ وڈبہ پر ہی لکھا ہو کہ یہ پنیر کسی حرام یا ناپاک چیز سے تیار شدہ ہے تو اس کو ہرگز استعمال نہ کیا جائے یا مثلاً معتبر شہادت مل جائے کہ اس میں حرام یا ناپاک چیز ملی ہوئی ہے۔

نیز اس سلسلے میں تجارتی اصول کے ماتحت ذمہ دار اشخاص کے بیان پر اعتماد کیا جائے گا، کیونکہ دنیوی اصول کے مطابق بھی تجارت کو سچائی اور دیانت ہی سے فروغ ہوتا ہے۔ اس لیے بھی بغیر وجہ شرعی کے کسی کو جھوٹا ودغاباز سمجھنا یا کہنا صحیح نہیں ہوگا۔ امید کہ اس تفصیل سے اطمینان ہوجائے گا۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند، سہارنپور

الجواب صحیح محمود غفرلہٗ

گھی پاک کرنے کا طریقۂ شرعی:

مولانا احمد رضا خاں مرحوم نے اپنے فتاویٰ رضویہ مطبوعہ رضوی پریس بریلی ص،۷۰۶ پر تحریر کیا ہے۔ ایک سوال کے جواب میں سوال وجواب بعینہٖ مندرجہ ذیل ہیں:

سوال: گھی گرم تھا، اس میں مرغی کا بچہ گرا اور فوراً مرگیا۔ یہ گھی کھانا جائز ہے یا نہیں؟

جواب: گھی ناپاک ہوگیا، بے پاک کیے اس کا کھانا حرام ہے، پاک کرنے کے تین طریقے ہیں: ایک یہ کہ اتنا ہی پانی اس میں ملا کر جنبش دیتے رہیں، یہاں تک کہ سب گھی اوپر آجائے، پھر اسے اتار لیں، دوسرا پانی اسی قدر ملا کر یوں ہی کریں پھر اتار کر تیسرے پانی سے اسی طرح دھوئیں، اور اگر گھی سرد ہوکر جم گیا ہو تو تینوں بار اس کے برابر پانی ملا کر جوش دیں یہاں تک کہ گھی اوپر آجائے پھر اسے اتار لیں۔

۱- الاصل فی الأشیاء الإباحۃ، الأشباہ والنظائر مع شرح حموی ۱/۸۷، باب الیقین لایزول بالشک، الفن الاول (مرتب)۔

اقول: بلکہ جوش دینے کی پہلی ہی بار حاجت ہے، پھر تو گھی رقیق ہوجائے گا اور پانی ملا کر جوش دینا کفایت کریگا۔

"قال في الدر: المهن يصب عليه الماء فيغلي فيعلو الدهن الماء، فيرفع بشئ هكذا ثلاث مرات، وهذا عند أبي يوسف خلافا لمحمد، وهو أوسع، وعليه الفتویٰ، كما في شرح الشيخ إسماعيل عن جامع الفتاویٰ، وقال في الفتاویٰ الخيرية: إن لفظة فيغلي، ذكرت في بعض الكتب، والظاهر أنها من زيادة الناسخ، فإنا لم نرمن شرط لتطهير الدهن الغليان مع كثرة النقل في المسئلة والتتبع لها إلا أن يراد به التحريک مجازاً، فقد صرح في مجمع الرواية وشرح القدوری أنه يصب عليه مثله ماء ويحرک، فتأمل (ه)۔ أويحمل على ما إذا جمد الدهن بعد تنجسه، ثم رأيت الشارح صرح بذالک في الخزائن فقال: والدهن السائل يلقى فيه الماء، والجامد يغلي به حتى يعلو الخ" (۱)۔

دوم:

ناپاک گھی جس برتن میں ہے، اگر جمنے کی طرف مائل ہوگیا ہو تو آگ پر پگھلالیں اور ویسا ہی پگھلا ہوا پاک گھی اس برتن میں ڈالتے جائیں، یہاں تک کہ گھی سے بھر کر ابل جائے، سب گھی پاک ہوجائے گا۔ "جامع الرموز" میں ہے: "الماء كالماء والدبس وغيرهما فطهارته بإجرائه مع جنسه مختلطاً به"۔

سوم:

دوسرا پاک گھی لیں اور مثلاً تخت پر بیٹھ کر نیچے ایک خالی برتن رکھیں اور پرنالے کے مثل کی چیز میں وہ پاک گھی ڈالیں، اس کے بعد یہ ناپاک گھی اس پرنالے میں ڈالیں یوں کہ دونوں کی دھاریں ایک ہوکر پرنالے سے برتن میں گریں، اسی طرح پاک وناپاک دونوں گھی ملا کر ڈالیں، یہاں تک کہ سب ناپاک گھی پاک گھی سے ایک دھار ہوکر برتن میں پہنچ جائے کو سب پاک ہوگیا۔ "خزائن" میں ہے: "إن كان أحدهما طاهراً والآخر نجساً فصبا من مكان عال فاختلطافي الهواء ثم نزلا طهر كله"۔

پہلے طریقہ میں پانی سے گھی کے کوتین بار دھونے میں گھی خراب ہونے کا اندیشہ ہے۔ دوسرے طریقہ میں ابل کر تھوڑا گھی ضائع ہوجائے گا، تیسرا طریقہ بالکل صاف ہے مگر اس میں احتیاط بہت درکار ہے کہ برتن میں ناپاک گھی کی کوئی بوند نہ پاک سے پہلے پہنچے نہ بعد کو گرے، نہ پرنالے میں بہاتے وقت اس کی چھینٹ اڑ کر پاک گھی سے جدا برتن میں گرے ورنہ

۱– ردالمحتار باب الانجاس ۱/ ۵۴۳، ۵۴۴، طبع دار الکتب العلمیہ) (مرتب)۔

برتن میں جتنا پہنچا، یا اب پہنچے گا سب ناپاک ہوجائے گا۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

اب سوال یہ ہے کہ مولانا نے جواب فتوے میں ایک طریقہ میں ''در''، دوسرے طریقہ میں ''جامع الرموز'' اور تیسرے طریقہ میں خزائن کا حوالہ دیا ہے تو کیا وہ واقعہ کے عین مطابق ہے، اور یہ کہ کیا یہ مذکورہ طریقے معتمد علیہا ہیں؟

التبصرة على الجواب:

پہلے جواب کی تقدیر پر گھی تو پاک ہوجائے گا مگر اس کے مضر ہونے کا اندیشہ ہے، جیسا کہ خود مجیب نے لکھا ہے کہ اس طریقہ سے تین بار دھونے میں گھی خراب ہونے کا اندیشہ ہے، اور اسی وجہ سے فقہاء کرام نے عامۃً جوش دینے کو لکھا ہے اور بتلایا ہے کہ گھی کی مقدار پاک پانی میں گھی ڈال کر جوش دیں بعد جوش کے جب گھی، پانی مختلط ہوجائیں، گھی اوپر سے اتار لیں اور تین بار ایسا ہی کریں، لہٰذا اس جواب نمبر ا کی تعبیر میں سقم ہے اور بالخصوص جب کہ اس طریقہ پر کوئی معتبر وصریح حوالہ نہیں، جو حوالہ ہے وہ نہیں بتلاتا کہ یہ تحریک ٹھنڈے ہی پانی میں ہو۔

دوسرے جواب کی تعبیر میں بھی غلطی ہے، اس لیے کہ جس عبارت (عبارت جامع الرموز) سے استدلال کیا ہے اس میں لفظ ''**يا جرائه مع جنسه مختلطاً به**'' ہے۔ اجراء کے معنی ابلنے کے نہیں آتے، بلکہ بہادینے کے آتے ہیں، اور اس بہادینے (اجراء) کا یہ طریقہ نہیں ہوسکتا جو اس جواب میں مذکور ہے، تیسرا جواب کوئی الگ اور مستقل شکل نہیں ہے، بلکہ وہی ہے جو نمبر ۲ میں ''جامع الرموز'' سے نقل کیا ہے، پھر تیسرے جواب میں جو دو شقیں بیان کی ہیں ان میں پہلی شق میں تعبیر کی غلطی کے ساتھ آپس میں عبارت کے اندر تدافع وتزاحم بھی ہے، اس لیے وہ شق بے معنی ہوکر رہ جاتی ہے اور دوسری شق بعینہٖ وہی ہے جو جواب ۲ میں ''جامع الرموز'' کی عربی عبارت میں ہے، لہٰذا اس کی دوسری تشریح بھی نافہمی یا غلط فہمی کی بنیاد پر ہے۔

صحیح اور آسان اور بے ضرر طریقہ گھی پاک کرنے کا وہی ہے جو ردالمحتار(۱) وغیرہ فقہاء احناف کی معتبر کتابوں میں مذکور ہے جس کو بہشتی زیور میں بھی نقل کیا ہے، **فلينظر هناك**، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند، سہارنپور

الجواب صحیح سید احمد علی سعید

۱- ''(والدهن يصب عليه الماء فيغلى فيعلو الدهن الماء فيرفع بشئى هكذا ثلاث مرات الخ (شامى ۱/ ۲۲۲، فصل في

انسانی بالوں کی ٹوپی کا حکم:

یہاں بہت سے لوگوں کے سروں پر بال نہیں ہوتے ہیں، اس لیے انسانی بالوں کی طرح ٹوپی بنا کر سر پر رکھتے ہیں، یا سر کے ساتھ منسلک سلائی کر دیتے ہیں جس کی بنا پر یہ معلوم نہیں ہوتا، کہ اصلی بال ہیں یا نقلی، بعض مسلمان یوں کہتے ہیں کہ ہم یہاں کی سردی کی وجہ سے اس طرح کرتے ہیں، جو بندہ کے نزدیک ضروری نہیں، تو ایسا کرنا کیسا ہے، اگر انسانی بالوں کے علاوہ نائلون یا مصنوعی یا حیوانی گھوڑے وغیرہ کے بال سر پر لگائے تو کیسا ہے؟

الجواب وبالله التوفيق:

انسانی بال بھی اجزاء انسانی میں سے ہے اور اجزاء انسانی اگرچہ کافر اور غیر مسلم کے ہی ہوں وہ بھی مکرم ومحترم ہوتے ہیں اور ان کا استعمال ان کی توہین ہے اور ناجائز بھی ہے، کما اشار الیہ قولہ تعالیٰ: "**ولقد کرمنا بنی آدم**"(۱)، اور "مراقی الفلاح" میں ہے: "**وجلد الآدمي لحرمته صونا له لكرامته، وإن حكم بطهارته لا يجوز استعماله كسائر أجزاء الآدمي**/ ۹۰، (باب الانجاس وتطہیرها) **وتحته في الطحطاوی: وجلد الآدمي ولوكافراً كما في القهستاني، فيطهر ولايستعمل لكرامته**"، اور درمختار (۱/ ۳۸ **باب المياه**) میں ہے: "**فلا يدبغ أي جلد الإنسان لكرامته (الى قوله) حتى لو طحن عظمه في دقيق لم يؤكل في الأصح احتراما، أي لا لنجاسة**"۔

لہٰذا انسانوں کے بالوں کی ٹوپی بنانا یا ان سے ٹوپی کا کام لینا یا سر کے ساتھ منسلک کر کے سلائی کرنا اور اصلی بالوں کی طرح بنا کر استعمال کرنا خواہ اصلی ونقلی ہونے کا امتیاز ہو یا نہ ہو، غرض کسی طرح بھی ہو، اس کا استعمال کرنا ناجائز ہوگا اور مذکورہ عذر معتبر نہ ہوگا۔ ہاں خنزیر کے علاوہ اور جانوروں کے بالوں کو یا نائیلون واون یا مصنوعی بالوں کو سردی سے تحفظ کی خاطر ٹوپی ولباس کے طور پر جیسے کنٹوپ، پوستین، کمبل وغیرہ استعمال کر سکتے ہیں، یہ جائز رہے گا، البتہ ان چیزوں کو اس طرح استعمال کرنا کہ وہ سر یا داڑھی وغیرہ کے قدرتی بالوں کی طرح غیر متمیز ہو کر نمایاں ہوں منع ہے۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند، سہارنپور

تطهير الدهن والعسل) والدهن المتنجس يطهر بصب الماء عليه ورفعه عنه ثلاثاً، أو يوضع في إناء مثقوب ثم يصب عليه الماء فيعلو الدهن ويحركه ثم يفتح الثقب إلى أن يذهب الماء وهذا إذا كان مائعاً وأما إذا كان جامداً فيقور"طحطاوی علی مراقی الفلاح، ص، ۱۲۷، باب الأنجاس والطهارة عنها ۔ مرتب)۔

۱- سورۂ بنی اسرائیل: ۷۰۔

خنزیر کے بالوں سے بنے ہوئے برش کی شرعی حیثیت:

۱-یہاں برش کا کام تقریباً پچاس سال سے ہوتا چلا آرہا ہے جس میں برش کارخانہ دار مسلم اور غیر مسلم بھی ہیں اور آبادی کے تناسب سے پچاس فیصد مزدور اس کام سے وابستہ ہیں۔

۲-برش پینٹنگ خنزیر کے بال اور بھینس وگائے کی دم اور گھوڑے کی دم کے بال سے ملاوٹ کے ساتھ یا خالص خنزیر کے بال سے تیار کیا جاتا ہے، بال کے علاوہ اس میں لکڑی کے ہینڈل وٹین کے خول، برش سیٹنگ چیرا ورلا کھ باہر سپلائی کرنے کے لیے گتے کے ڈبے استعمال ہوتے ہیں۔ باہر جن کو سپلائی ہوتا ہے ان میں دکاندار مسلم بھی ہیں اور غیر مسلم بھی۔

ہم نے خنزیر کے بال کو برش سے ہٹانے کی ہر چند کوشش کی اور اس کی جگہ نیولوں اور گائے بھینس وگھوڑوں کے بالوں سے تیار کیا گیا، لیکن پینٹس کرنے میں ناکام رہے، آخر مجبور ہو کر پوری طرح خالص خنزیر کے بال یا ملاوٹ سے تیار کرنے پڑے، یہاں کا برش ہندوستان میں پینٹنگ کے لئے خواہ متبرک جگہ ہو یا غیر متبرک، حتی کہ شیر کوٹ کو چھوڑ کر پورے ہندوستان میں ہیر کٹنگ سیلون (نائی صاحبان) اسی خنزیر کے بال کے برش کو داڑھی میں استعمال کرتے ہیں، حتی کہ بسکٹ فیکٹریاں بسکٹوں وڈبل روٹیوں میں گھی، تیل اور چربی وغیرہ بھی اسی خنزیر کے برش سے پینٹ کرتے ہیں۔

۳-خنزیر کے بال جو ہم تک پہنچے ہیں ان کو صاف دھلائی کے ساتھ پاوڈر و کیمیکل کے ذریعہ گرم پانی سے پکا کر پہنچتے ہیں، پھر کاریگروں سے برش تیار کرا کر باہر سپلائی کئے جاتے ہیں۔ کام ختم ہونے پر کاریگر مزدور اپنے ہاتھوں کو صابن وغیرہ سے صاف کر لیتے ہیں۔

۴-ہم خدا اور رسول کی عظمت اور خوف خدا دل میں رکھتے ہیں۔ اس کاروبار سے دل سے نفرت کرتے ہیں اور اس کو چھوڑ کر بہت سے کام کئے لیکن کسی کام نے ساتھ نہیں دیا اور نقصان ہوا پھر مجبوراً اسی کام کو کرنا پڑا اور کچھ لوگوں نے دوبارہ اسی کام کو کر کے حج بھی کیا، رہن سہن کے مکانات بھی بنائے، ہم سب اس کی کمائی سے بڑھ چڑھ کر زکوۃ نکال کر ضرورت مندوں، بیواؤں، یتیموں ومسکینوں کو کافی دیتے ہیں۔ نیز مدرسوں کے چندوں میں بھی دیتے ہیں۔ اور کوئی غرض نہیں رکھتے۔

ایک برش آرٹسٹ جادرہ سے تیار ہوتا ہے جس میں نیولے کا بال بھی لگتا ہے، اس کو سائین بورڈ لکھنے کے لیے سپلائی کیا جاتا ہے، کاریگر مدت سے یہی کام کرتے آرہے ہیں، اور برش خنزیر کافی تعداد میں بنارہے ہیں، دریافت طلب امر یہ ہے کہ اس طرح برش کا بنانا اور استعمال کرنا شرعاً کیسا ہے؟

الجواب وبالله التوفیق:

اس برش کے معاملہ میں تین درجے ہیں: ایک درجہ اس کے استعمال کا ہے، دوسرا درجہ اس کے بنانے کا ہے اور تیسرا درجہ اس کے بنوانے کا ہے، اور تینوں درجوں کے احکام الگ الگ ہیں، تقریب فہم کے لیے پہلے چند فقہی عبارتیں پیش کی جاتی ہیں:

"وأما الخنزیر: فقد روي عن أبي حنیفة رحمه الله أنه نجس العین، لأن الله تعالیٰ وصفه بکونه رجسا فیحرم استعمال شعره وسائر أجزائه، إلا أنه رخص في شعره للخرازین للضرورة، وروي عن أبي یوسف رحمه الله في غیر روایة الأصول أنه کره ذالک أیضاً (إلی قوله) وعن محمد رحمه الله أنه لاینجس مالم یغلب علی الماء کشعر غیره"(۱)۔

اور ردالمحتار (۱/۱۳۸) میں ہے: **"قوله (وشعر المیتة الخ، وعند محمد لاینجسه أفاده في البحر، وذکر في الدرر أنه عندمحمد طاهر، لضرورة استعماله أي للسخرازین، قال العلامة المقدسي: وفي زماننا استغنوا عنه، أی فلا یجوز استعماله لزوال الضرورة الباعثة للحکم بالطهارة الخ"۔**

"بدائع الصنائع" کی عبارت سے معلوم ہوا کہ حضرت امام صاحب علیہ الرحمۃ کے نزدیک خنزیر کے بال وسائر اجزاء نجس ہیں، لیکن امام صاحب علیہ الرحمہ نے بھی خرازین (جوتی سینے والوں) کو جوتا گانٹھنے میں خنزیر کے بال کے استعمال کی اجازت دی ہے اور یہی قول امام ابو یوسفؒ کا بھی ہے، لیکن غیر روایۃ الاصول میں امام ابو یوسفؒ سے مکروہ ہونا بھی نصاً منقول ہے، اور امام محمدؒ سے یہ منقول ہے کہ خنزیر کا بال غیر خنزیر کے بال کی طرح پانی کو ناپاک نہیں کرتا جب تک کہ پانی پر غالب نہ آجائے اور ردالمحتار (شامی) سے معلوم ہوتا ہے کہ خنزیر کا بال پانی وغیرہ میں پڑ جائے تو بغیر وجہ شرعی کے پانی کو ناپاک نہ کہیں گے، اس کی ضرورت استعمال داعی ہونے کی وجہ سے خرازین کے لیے اس کے طاہر ہونے کا حکم ہے اور فی زمانہ جو اس کے استعمال سے بغیر ضرورت استغناء کا حکم ہے وہ حکم اس کی علت کے غلط ہونے کی بنا پر نہیں بلکہ تحقق علت نہ ہونے کی بنا پر ہے، پس جب کہیں وہ علت متحقق ہو جائے گی تو اس کے استعمال وغیرہ کا حکم بھی متحقق ہو جائے گا:

اس تمہید کے بعد معاملہ برش کا حکم لکھا جاتا ہے۔

۱- یہ کہ بر تقدیر صحتِ سوال جب یہ برش خنزیر کے بال کے بغیر بھی بنتے ہیں، خواہ ایسے برش کم بنتے ہوں جب بھی

۱- بدائع الصنائع ۱/۶۳۔

چونکہ اشیاء میں اصل حلت واباحت ہے،اس لیے جب تک کسی برش میں خنزیر کے بال ہونے کا یقین نہ ہوجائے اس وقت تک اس کا استعمال جائز رہے گا،اورجس برش میں خنزیر کے بال کا استعمال یقینی طور پر معلوم ہوجائے تو پھر دیکھا جائے گا کہ پوتائی کرتے وقت وہ بال ٹوٹ کر اگر روغن وغیرہ میں نہیں آتے،اور وہ ایسے بال ہیں کہ سائنٹیفک طریقہ سے اس طرح صاف وخشک کر لئے گئے ہیں کہ دسومت ورطوبت بھی قطعاً روغن ومسالوں میں نہیں آتی تو اس کا استعمال بھی بلاشبہ درست رہے گا، اوراگر وہ بال پوتائی کرتے وقت ٹوٹ کر روغن وغیرہ میں گر کر پوتائی کی جگہ آکر چپک جاتے ہیں یا سائنٹفک طریقہ پر ایسے صاف وخشک نہیں کہ دسومت ورطوبت بالکل خشک ہو کر ختم ہوگئی ہو تو ایسے برش سے مسجد کی دیواروں وغیرہ کی پوتائی کرنا درست نہ رہے گا۔اور نہ کسی ایسی چیز کی پوتائی کرنا جائز رہے گا جس کو پاک وطاہر رکھنا مقصود ہوتا ہے۔

اس تفصیل سے ان بالوں کے برش کے استعمال کا عدمِ جواز واضح ہوگیا جو اس طرح خشک یا صاف نہ کئے گئے ہوں، یہ تفصیل تو ان برشوں سے متعلق تھی،اب برش بنانے یا بنوانے کا حکم شرعی مذکور ہے:

اگر غیر مسلم مزدور رکھ کر ان سے یہ برش بنوائے جائیں اور وہ مزدور ایسے برش بنا کر دیدیں تو ان کی سپلائی کرنا درست رہے گا،البتہ جس قسم کے برش ہوں ان کو واضح کرنا ضروری ہوگا،یعنی یہ کہہ دینا ضروری رہے گا کہ اس میں خنزیر کے بال کا استعمال نہیں ہوا ہے،یا سائنٹفک طریقہ سے خشک وصاف کیے ہوئے بال لگے ہوئے ہیں۔یا اس طرح صاف وخشک کیے ہوئے نہیں ہیں تا کہ بوقتِ استعمال دھوکہ نہ ہو،اگر سپلائی کرتے وقت یہ تفصیل نہیں کی گئی تو یہ فعل باعثِ گناہ وخداع شمار ہو کر باعث بربادی کاروبار ہوسکتا ہے۔

اور یہ برش خود بنانے کا حکمِ شرعی یہ ہے کہ اگر خنزیر کے بال نہ لگاتے ہوں جب تو بلاشبہ ایسے برش بنانا جائز رہے گا، اورخنزیر کے بال کا لگانا بغیر ضرورتِ شدیدہ کے جائز نہ رہے گا۔خاص کر ایسے بال لگانا جو سائنٹیفک طریقہ سے اس طرح صاف وخشک نہ کئے گئے ہوں جس کی وجہ سے دسومت ورطوبت پوتائی کرنے میں روغن وغیرہ تک نہیں آتی۔ایسے بالوں کا استعمال اگر ضروری ہی ہوجائے تو اس کا ہر سامان الگ رکھنا ہوگا۔اور کام کر چکنے کے بعد ہاتھ مانجھنا ضروری رہے گا اور کپڑوں وغیرہ پر جہاں اس کی چھینٹیں پڑ گئی ہوں ان سب کو بغیر پاک کیے ہوئے کسی کام کے لیے استعمال کرنا درست نہ رہے گا،بلکہ احتیاط اسی میں رہے گی کہ ایسے برش غیر مسلم مزدوروں سے حسبِ ہدایت بالا بنوائے اور سپلائی کئے جائیں۔اور یہی حکم ہر مسلم شخص ومزدور کے لیے ہے جو بنوائے یا استعمال کرے۔

پس جن صورتوں میں برشوں کا بنانا یا بنوانا،بیچنا خریدنا جائز ہے ان صورتوں میں اس کا پیشہ حلال وجائز رہے گا اور

اس کا خود کھانا دوسروں کو کھلانا، خیر و خیرات کرنا اور ہر نیک کام میں صرف کرنا درست رہے گا، اور جن صورتوں میں اس کا بنانا یا بنوانا یا خرید وفروخت کرنا ناجائز رہے گا ان صورتوں میں اس کا روپیہ حرام وناجائز رہے گا۔ اور اس کا حکم شرع صرف یہ ہوگا کہ اس کے وبال سے بچنے کی نیت سے جہاں تک جلد ہو سکے فقراء ومساکین کو دے کر اپنی ملک سے نکال دے كما في البذل (۱)، اور ثواب کی نیت اس دینے پر نہ کرے بلکہ ایسا کرنا کفر ہے۔

پس ایسی صورت میں صرف ان مدرسوں میں دینا درست رہے گا جن میں نادار طلباء کو کھانا، کپڑا دیا جاتا ہے اور یہ کہہ کر دینا ضروری رہے گا کہ یہ رقم اس قسم کی ہے تاکہ اہل مدرسہ اسی میں اس کو خرچ کریں اور جن مدرسوں میں اس قسم کے مصرف نہ ہوں ان میں دینا یا ان مدرسہ والوں کا جانتے بوجھتے لینا کچھ بھی درست نہ رہے گا۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند، سہارنپور

جن مواقع میں ڈھیلا استعمال کرنا متعذر ہو وہاں کیا کرے؟

مدارس دینیہ میں جو سینٹری پاخانے ہوتے ہیں اگر ان میں مٹی کے ڈھیلے استعمال کئے جائیں تو خطرہ واندیشہ ہے کہ بعضوں کی بے احتیاطی سے وہ اندر گھس جائیں اور ٹنکی بھر کے پاخانے خراب ہو جائیں ایسے خطرہ واندیشہ کی بناء پر اگر ان کو ممنوع الاستعمال قرار دیتے ہوئے ٹوائلیٹ پیپر کی اجازت دی جائے تو کیا رفع سنت کے وبال کا مورد بنے گا یا ٹوائیلٹ پیپر کے استعمال سے استنجاء بالحجر کی سنت ادا ہو جائے گی؟ بینوا توجروا۔

عبدالحق عفرلہ (خادم مدرسہ نصیر الاسلام ناظر ہاٹ چاٹگام)

الجواب وبالله التوفيق:

جن مواقع میں کلوخ استعمال کرنا متعذر ہو ان مواقع میں ٹوائیلٹ پیپر سے کلوخ کی فضیلت حاصل ہو سکتی ہے، جیسے ہوائی جہاز کے سفر میں، باقی اپنے مکانات میں انسان ٹوائیلٹ پیپر استعمال کرنے کے لئے مجبور نہیں ہوتا، عموماً کلوخ میسر ہوتا ہے اور اگر اس کو استعمال کرنے کے بعد رکھنے کے لئے کوئی ٹن (برتن) متعین کر کے رکھا لیا جائے کہ استعمال شدہ

۱- (وأما إذا كان عنده جل مال خبيث فإما إن ملكه بعقد فاسد أوحصل له بغير عقد ولايمكنه أن يرده إلى مالكه (إلى قوله)، فيلزم عليه أن يدفعه إلى الفقراء ولكن لايريد بذالك الأجر والثواب، ولكن يريد دفع المعصية عن نفسه (بذل المجهود/ ۱ ۳۷ كتاب الطهارة، باب فروض الوضوء)(مرتب).

کلوخ اس میں رکھے جائیں جس کو بھنگی پھینک دیا کرے گا تو ایسی صورت میں ٹوائیلٹ پیپر، کلوخ کی قائم مقامی نہیں کر سکتا۔

ہاں جہاں کلوخ میسر نہ آئیں جیسے بحالت سیلاب یا ایسے ممالک میں جہاں کلوخ نہیں ملتے وہاں ہوائی جہاز والے استعمال کی طرح گنجائش نکل سکتی ہے۔

باقی رہی یہ بات کہ ڈھیلے (کلوخ) ٹنکی خراب کردیں گے اور ٹوائیلٹ پیپر سے ٹنکی خراب نہیں ہوگی صحیح نہیں ہے، اس لئے کہ مٹی کے ڈھیلے جلد گل کر تہ نشین ہو جائیں گے، بخلاف ٹوائیلٹ پیپر کے کہ وہ نہ جلدی گلیں گے، نہ سڑیں گے، نہ تہ نشیں ہوں گے، نہ مٹی بنیں گے، بلکہ پانی پر دیر تک تیرتے رہ کر ٹنکی کو جلد خراب کریں گے (۱)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند، سہارنپور

حضور اکرم ﷺ کا فضلہ پاک ہے:

کیا حضور ﷺ کا فضلہ (پیشاب و پاخانہ) مذہب حنفی میں پاک اور قابل استعمال (خورد ونوش) ہے؟

الجواب وباللہ التوفیق:

جی ہاں آنحضرت ﷺ کا فضلہ پاک تھا شامی ج ا میں تصریح ہے، (۲) باقی یہ کیا سوال ہوا کہ قابل استعمال (خورد ونوش) کے قابل ہے یا کہ نہیں؟ یہ سوال تو اس وقت پیدا ہو جب آج بھی کہیں موجود ہو۔

لغو سوالات نہیں اٹھانے چاہئے بالخصوص جبکہ موقوف علیہ نجات مسئلہ نہ ہو اس قسم کے سوالات سے فتنے پیدا ہوتے ہیں، بچنا چاہئے۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند، سہارنپور ۲/ ۹/ ۸۵ ۱۳ھ

الجواب صحیح محمود عفی عنہ

۱- حضرت مفتی صاحب علیہ الرحمہ نے ٹوائلیٹ جلدی نہ گلنے کی جو بات لکھی ہے، وہ پرانی بات ہے، ورنہ اب تو ٹوائلیٹ اور ٹی سو پیپر پانی کے ساتھ ہی گل کر پانی بن جاتے ہیں اور پانی کے ساتھ بہہ جاتے ہیں، اس کے برخلاف مٹی تہہ میں جم جاتی ہے، نیز یہ کہ شہروں میں مٹی کے ڈھیلے تو درکنار پتھر بھی میسر نہیں ہوتے، مرتب کے خیال میں ٹوائلیٹ پیپر سے کلوخ والی سنت ادا ہو جانی چاہئے (مرتب)۔

۲- ''(صحح بعض أئمة الشافعية طهارة بوله صلى الله عليه وسلم وسائر فضلاته، وبه قال أبو حنيفة كما نقله في المواهب اللدنية عن شرح البخارى للعيني وصرح به البيرى في شرح الاشباه، وقال الحافظ ابن حجر تضافرت الادلة على

رنگا ہوا کپڑا پاک ہے یا ناپاک؟

کپڑا رنگ کر پاک کرنا چاہئے یا نہیں؟ زید کہتا ہے کہ سب رنگ ناپاک ہوتے ہیں ان میں شراب ملائی جاتی ہے کیا زید کا کہنا ٹھیک ہے؟

الجواب وباللہ التوفیق:

سب رنگ ناپاک نہیں ہوتے ہیں (۱)، اور جب تک کسی رنگ کے ناپاک ہونے کا یقین نہ ہوئے اس کا پاک کرنا ضروری نہیں ہے۔ واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند، سہارنپور ۱۶/ ۱۰/ ۸۵ ۱۳ ھ
الجواب صحیح سید احمد علی سعید نائب مفتی دارالعلوم دیوبند

جنبی کا قرآن کو چھونا اور دوسری جگہ لے جانا:

قرآن شریف غسل کی حاجت میں چھو سکتا ہے اور ہاتھ میں لیکر کہیں لے جاسکتا ہے یا کہ نہیں؟

الجواب وباللہ التوفیق:

جنابت اور حاجت غسل کی حالت میں قرآن پاک پر کپڑا لپٹا ہوا ہو تو اس کے اوپر سے چھو سکتے ہیں (۲)، اور ساتھ میں لے جا بھی سکتے ہیں بغیر کسی حائل کے جنابت کی حالت میں اسی طرح بے وضو کی حالت میں بلا کسی حائل کے نہیں چھو سکتے فرق یہ ہے کہ بے وضو کے زبان سے بلا قرآن پاک چھوئے ہوئے پڑھ سکتا ہے اور حاجت غسل کی حالت میں بلا غسل کئے زبان سے بھی نہیں پڑھ سکتا۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند، سہارنپور ۲۱/ ۱۰/ ۸۵ ۱۳ ھ

الجواب صحیح محمود عفی عنہ

ذلک وعد الائمة ذالک من خصائصه صلى الله عليه وسلم (شامی ۱/ ۲۳۳، فیض القرآن) (مرتب)۔

۱- الاصل ان ماثبت باليقين لايزول بالشک (قواعد الفقہ لسید عمیم الاحسان ص ۱۱، مکتبہ دارالکتاب دیوبند)۔

۲- الحرمة مس المصحف لايجوز لهما وللجنب والمحدث مس المصحف الا بغلاف متجاف عنه كالخريطة (فتاوی

استرہ کے ذریعہ ڈاڑھی بنوانے سے کیا چہرہ ناپاک ہوجاتا ہے؟

استرے سے ڈاڑھی منڈوانے کے بعد کیا چہرہ ناپاک ہوجاتا ہے کیا اس چہرہ کو دومرتبہ دھونا ضروری ہوتا ہے یا صرف چہرہ پر لگایا ہوا صابن چھڑانا ضروری ہے۔

الجواب وبالله التوفيق:

اگر ناپاک پانی یا ناپاک کوئی چیز چہرہ پر لگائی ہے تو ناپاک ہوگا اور دھونا بھی ضروری ہوگا ورنہ نہیں، لیکن ڈاڑھی منڈانا حرام ہے(۱)۔

"قوله (وأما الأخذ منها الخ) بهذا وفق في الفتح بين ما مروبين مافي الصحيحين عن ابن عمر عنه صلى الله عليه وسلم احفوا الشوارب واعفوا اللحى قال: لأنه صح عن ابن عمر راوى هذا الحديث ...... وعن النبي صلى الله عليه وسلم يحمل الاعفاء على اعفاء ها عن أن يأخذ غالبها أو كلها كما هو فعل مجوس الأعاجم من حلق لحاهم" (۱)۔

"والأخذ من اللحية وهو دون ذالک كما يفعله بعض المغاربة ومخنثة الرجال لم يبحه أحد وأخذ كلها فعل يهود الهند ومجوس الأعاجم" (۳) فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند، سہارنپور ۲۹/۱۰/۸۵ ۱۳ ھ

الجواب صحیح محمود عفی عنہ

بڑے کمرے میں بیت الخلاء بنوانا:

دیہات میں (گاؤں میں) اگر گھر بڑا ہو، پھر اس گھر کے ایک کمرے میں بیت الخلاء وغیرہ بنائیں تو کوئی حرج ہے یا نہیں؟ جبکہ اور کہیں جانے سے تکلیف ہوگی اور پردہ وغیرہ کا انتظام بھی نہیں، اس بارے میں بیان فرمائیں۔

ہندیہ ۱/۸ ۳۰، رشیدیہ، پاکستان)۔

۱- عن ابن عمر عن النبي صلى الله عليه وسلم احفوا الشوارب واعفوا اللحى (مسلم شریف ۱/۱۲۹ کتب خانہ رحیمیہ دیوبند)۔

۲- رد المحتار علی الدر ۳/۹۸ ۳، مکتبہ زکریا۔

۳- الطحطاوی علی المراقی رص ۲۷ ۳ مطبعہ سلیمان مصطفی ماموددمشق۔

الجواب وباللہ التوفیق:

گھر کے اندر ایک کمرہ میں عورتوں کے لئے بیت الخلاء بنالینا ضروری ہے، بلکہ امریکی پاخانہ یا اس قسم کی کوئی اور باتھ روم وغیرہ بنالینا زیادہ بہتر ہے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند، سہارنپور ۱۴/ ۲/ ۱۴۰۳ھ

جس برتن میں کتے نے منہ ڈال دیا ہو اس کا استعمال:

عام طور سے کلھو میں کتے برتن میں منھ ڈال کر خراب کر دیتے ہیں لیکن لوگ اس کو استعمال کر لیتے ہیں یہ جائز ہے یا نہیں۔

الجواب وباللہ التوفیق:

بغیر پاک کئے اس کو استعمال کرنا درست نہیں (۱)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند، سہارنپور ۶/ ۱۲/ ۱۴۰۴ھ

حالت حیض میں بیوی سے مجامعت:

اگر کوئی شخص حالت حیض میں اپنی بیوی سے مجامعت کرے اور اس کو شیوہ بنائے تو اس پر حکم شرع کیا ہے؟

الجواب وباللہ التوفیق:

شیوہ بنالینا استحلال کو مستلزم نہیں، بلکہ اصرار کو مستلزم ہے جو گناہ کبیرہ ضرور ہے، مگر کفر نہیں ہے اور گناہ کبیرہ کے ارتکاب سے تفریق بین الزوجین کا حکم نہیں ہے، محض توبہ اور استغفار کافی ہے، اور اگر استحلال کو مستلزم کر بھی لیں جب بھی

۱- "وسور الکلب والخنزیر وسائر سباع البھائم نجس باتفاق علمائنا" (حلبی کبیر فصل فی الآسار ۱۶۷، مکتبہ سہیل اکیڈمی لاہور، وقال فی البحر الرائق: ولنا قولہ صلی اللہ علیہ وسلم "یغسل الاناء من ولوغ الکلب ثلاثا" روی عن أبی ہریرۃؓ فعلا وقولا، مرفوعا وموقوفاً الخ (البحر الرائق کتاب الطہارۃ ۱/ ۲۲۵، مکتبہ زکریا، وقال الطحطاوی فی حاشیتہ علی مراقی الفلاح، یندب عندنا التسبیع وکون إحداھن بالتراب، طحطاوی علی مراقی الفلاح ۱۸، فصل فی بیان احکام السور) (مرتب)۔

تفریق بین الزوجین کا حکم نہیں ہے، مستحل الوطی فی حالتہ الحیض مفتی بہ قول میں کافر نہیں ہوتا ہے، کما صرح بہ فی "الطحطاوی علی مراقی الفلاح"(۱)۔

(ص ۷۴ فی باب الحيض والنفاس):" وصحح صاحب الخلاصة عدم كفره، وقال في الفصل الثاني من ألفاظ الكفر: أن من اعتقد الحلال حراماً أو على القلب يكفر إذا كان حراماً لعينه وثبتت حرمته بدليل قطعي، أما إذا كان حراماً لغيره بدليل قطعي أو حراماً لعينه بخبر الأحاد لايكفر، إذا اعتقده حلالاً ،فعلى هذا لايفتى بكفر مستحله، لأن حرمته لغيره وهو الأذى"۔

لہٰذا تکفیر یا تفریق کا فتویٰ غلط ہے۔ بلکہ صورت مسئولہ میں نکاح علیٰ حالہ باقی ہے، البتہ شخص مذکور کو لازم ہے کہ وہ اس شنیع حرکت سے توبہ کرے اور باز آجائے اور اس جرم کے صدور کی وجہ سے کچھ مال تصدق کر دے تو بہتر ہے۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند، سہارنپور ۲۶/ ۹/ ۸۵ ۱۳ھ

فرج میں مانع حمل بعض دواؤں کے استعمال کا حکم:

مسئلہ یہ ہے کہ ایک دوائی ہے اور وہ دوائی ایسی ہے کہ اگر اس کو اپنی فرج کے اندر استعمال کرے تو اس کو تین سال تک حمل قرار نہیں پاتا، اب آیا ایسی دوائی کا استعمال کرنا جائز ہے یا نہیں، اگر اس دوائی کا استعمال کرنا جائز نہیں تو اس کو لگا کر نماز پڑھنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب وباللہ التوفیق:

ضرورت شرعیہ جس کا اعتبار محقق اطباء نے کرلیا ہو اس ضرورت شرعیہ واقعیہ کے تحت اس دوا کا استعمال کرنا جائز ہو جائے گا، ورنہ اس کا استعمال کرنا جائز نہ ہوگا، اس کے استعمال کے جواز وعدم جواز ہر دو صورت میں اس کو لگا کر نماز کے جائز ہونے اور نہ ہونے میں یہ تفصیل ہے کہ اگر محض وہ دوا یا رطوبت فرج میں ملی ہوئی باہر خارج ہوتی ہو تو مثل پیشاب وغیرہ ناپاکی کی طہارت کے جب تک استنقاء واستنجاء کے ذریعہ طہارت حاصل نہ کرلی جائے وضوء ونماز کچھ صحیح نہ ہوگا، پورے محقیہ

۱- طحطاوی علی المراقی ص ۷۴ مطبع سلیمان مصطفیٰ (دمشق)۔

واستنقاء واستنجاء کے بعد وضو کر کے نماز پڑھنا جائز رہے گا۔ بغیر اس کے نماز پڑھنا جائز نہ رہے گا، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند ۲۳/ ۱۲/ ۱۴۱۰ھ

باب الوضوء

ٹوتھ پیسٹ یا برش کا استعمال مسواک کے قائم مقام ہوسکتا ہے؟

مسواک کی جگہ اگر ٹوتھ پیسٹ اور برش استعمال کیا جائے تو کیا یہ مسواک کے قائم مقام ہوگا، اور مسواک کا ثواب بھی ملے گا؟

الجواب وباللہ التوفیق:

کچھ دانت وغیرہ گر جانے کی وجہ سے اگر مسواک کا استعمال نہ ہو سکے تو کسی بھی منجن یا پیسٹ وغیرہ سے بوجہ مجبوری مسواک کا ثواب ملے گا، ورنہ مسواک کا ثواب نہ ملے گا، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور
الجواب صحیح حبیب الرحمٰن خیرآبادی مفتی دارالعلوم دیوبند

مصنوعی اعضاء یا پلاسٹر اور زخم پر پٹی ہونے کی صورت میں غسل اور وضو کے احکام:

۱-مصنوعی دانتوں اور دانتوں کے علاوہ دیگر مصنوعی اعضاء کی صورت میں وضو اور غسل کے کیا احکام ہوں گے؟

۲-اسی طرح اگر کوئی شخص پلاسٹر کرائے ہوئے ہے یا زخم پر پٹی بندھی ہوئی ہے، ایسا شخص وضو اور غسل کس طرح کرے گا؟

الجواب وباللہ التوفیق:

۱-ظاہری اعضاء جسم میں جو مصنوعی اعضاء لگے ہوئے ہوں تو غسل جنابت کرنے میں ان سب کا نکالنا ضروری

رہے گا جن کے نکالنے سے نہ نقصان ہو اور نہ کسی قسم کی مجبوری ہو، ورنہ بغیر نکالے غسل کرلینا درست رہے گا، اور یہی حکم ان اعضائے ظاہری کا جو کسی عضو وضو پر لگے ہوئے ہوں نکالنے اور لگانے میں ہے، اسی قاعدۂ کلیہ پر تمام جزئیات کے احکام نکل آئیں گے(۱)۔

۲-اسی مذکورہ بالا ضابطۂ شرعیہ سے پلاسٹر کئے ہوئے حصہ کا، نیز زخم پر پٹی بندھی ہوئی ہو تو اس کا حکم بھی نکل آئے گا کہ جس وقت پلاسٹر کھولنے میں یا پٹی کے کھولنے میں ضرر کا ظنِ غالب ہو تو بغیر کھولے ہوئے غسل و وضو کرلے ورنہ کھول کر کرلے(۲)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور
الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن خیرآبادی، محمد ظفیر الدین مفتاحی، مفتی دارالعلوم دیوبند

وضو کی دعا:

وضو کے اندر کونسی دعا حدیث سے ثابت ہے ہم نے پڑھا ہے کہ وضو کے بعد سورہ انا انزلنا پڑھنے پر چالیس ۴۰ سال کے گناہ معاف ہوتے ہیں کیا یہ صحیح ہے یا غلط؟

الجواب وبالله التوفيق:

وضو میں ابتداء "**بسم الله العلي العظيم، والحمد لله على دين الاسلام**" پڑھنا(۳) اور اعضاء وضوء کو دھوتے وقت"**أشهد أن لا إله إلا الله وحده لا شريک له وأشهد أن محمداً عبده ورسوله**" اور وضو سے فارغ ہونے کے بعد"**اللهم اجعلني من التوابين واجعلني من المتطهرين** "پڑھنا(۴) مسنون ہے، جس کی

۱- اس کی واضح مثال علامہ شامی کا وہ جزئیہ ہے جس میں موصوف فرماتے ہیں کہ فقہاء کرام رحمہم اللہ نے اس طرح کے مصنوعی دانت لگوانے یا دانتوں کو سونے، چاندی کے تاروں سے باندھنے کی اجازت دی ہے، کما قال تحت قوله: (و كذا الإناء المضبب أي الحكم فيه كالحكم في المفضض، يقال باب مضبب: أي مشدود بالضباب وهي الحديدة العريضة التي يضبب بها وضبب أسنانه بالفضة إذا شدها بها" (فتاویٰ شامی ۵/۳۱۹، کتاب الحظر والاباحۃ)(مرتب)۔

۲- (ويجوز المسح على الجبائر إذاكان يضره المسح على الجراحة ويمسح على العصابة كلها سواء كان تحته جراحة أولا، لأن العصابة لاتعصب على وجه يأتي على موضع الجراحة الخ (فتح القدیر ۱/۱۴۰، باب المسح علی الخفین)(مرتب)۔

۳- الدر المختار علی الرد ۱/۱۰۱، مطبع عثمانیہ۔

۴- شامی ۱/۱۱۸، مطبع عثمانیہ۔

حدیث میں بہت زیادہ فضیلت ہے۔

حدیث میں لکھا ہے کہ اس شخص کے لئے جنت کے آٹھوں دروازے کھول دئے جاتے ہیں جس میں چاہے داخل ہوجاوے اور اگر دھیان سے دو رکعت تحیۃ الوضوء پڑھ لے جو کہ مستحب ہے بشرطیکہ مکروہ وقت نہ ہو تو گناہوں سے اس طرح پاک ہوجاتا ہے جیسے ابھی ماں کے پیٹ سے پیدا ہوا ہو:

" قال في الحلية عن البراء بن عازب رضي الله تعالىٰ ـعن النبي ﷺ قال: ما من عبد يقول: حين يتوضأ "بسم الله، ثم يقول بكل عضو: أشهد أن لا إله إلا الله وحده لا شريك له، وأشهد أن محمداً عبده و رسوله، ثم يقول حين يفرغ: اللهم أجعلني من التوابين وأجعلني من المتطهرين إلا فتحت له ثمانية أبواب الجنة يدخل من أيها شاء، فان قام من وقته ذلك فصلي ركعتين يقرأ فيهما ويعلم ما يقول إنفتل من صلاته كيوم ولدته أمه، ثم يقال له إستأنف العمل (رواه الحافظ المستغفري، وقال: حديث حسن "(۱)۔

اس کے علاوہ ہر عضو کے دھونے کے وقت کی دعائیں بھی منقول ہیں انکا پڑھنا مستحب ہے وضوء کے بعد انا انزلنا کا پڑھنا آداب وضوء میں سے لکھا ہے:"ومن الآداب إلى أن قال وقراة سورة القدر"(۲)۔

انا انزلنا کے پڑھنے پر چالیس سال کے گناہ معاف ہونے کی حدیث ہماری نظر سے نہیں گذری ہے، البتہ حدیث میں بعد وضو کے انا انزلنا پڑھنے کی یہ فضیلت لکھی ہے کہ جس نے ایک مرتبہ انا انزلنا پڑھی اس کا شمار صدیقین میں ہوگا اور جس نے دو مرتبہ پڑھی اس کا نام شہداء کے رجسٹر میں لکھ دیا جاتا ہے اور جس نے تین مرتبہ پڑھی اللہ تبارک وتعالیٰ اس کا حشر انبیاء علیہم السلام کے ساتھ فرمائیں گے(۳)۔

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

الجواب صحیح محمود عفی عنہ

۱- شامی ۱/۸/۱۱، مطبع عثمانیہ۔

۲- الدر المختار علی ہامش رد المحتار ۱/۹۷۔

۳- وقرائة سورة في ليلة القدر مرة واحدة كان من الصديقين ومن قرأها مرتين كتب في ليلة ديوان الشهداء ومن قرأتها ثلاثاً حشره الله محشر الأنبياء (مراقی الفلاح علی ہامش الطحاوی ۳۲)(مرتب)۔

ہاتھ پاؤں سے معذور طہارت میں کس سے مدد لے؟

ہاتھ پاؤں سے معذور شخص ایک عورت سے یا مرد سے آب دست وموئے زیر ناف کٹوانے اور پاکی وطہارت کے سلسلہ میں دوسروں سے تعاون لے سکتا ہے یا نہیں؟ اگر تعاون لے سکتا ہے یا لے سکتی ہے تو کس سے؟

الجواب وباللہ التوفیق:

موئے زیر ناف اگر بال صفا صابن وغیرہ کوئی چیز لگا کر بلا تعاون صاف کرا سکتا ہو تو صاف کرے، ورنہ استنجاء وطہارت کے طریقہ سے بیوی سے یہ کام لے لے۔ اور عورت ہو تو اپنے شوہر سے یہ کام لے لے۔ اگر یہ دونوں نہ ہوں تو مرد کسی عورت سے نکاح کر کے اس کے ذریعہ سے یہ کام لے اور عورت کسی مرد سے نکاح کر کے کام لے لے اگر یہ بھی نہ ہو سکے تو کوئی مرد مرد کے لئے ہاتھ میں دستانہ باندھ کر کلوخ سے پہلے مبرز صاف کرے پھر پانی سے طاہر کر لے اور بیٹا پوتا نواسہ کو تقدیم ہوگی اور عورت کے لئے بیٹی پوتی نواسی ہوں تو ان سے یا بہو سے، ورنہ پھر محرم عورت سے اور پھر کسی بھی عورت سے یہ کام لے لے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

اذان کے وقت وضو کرتے ہوئے وضو کی دعاء پڑھنے کا حکم:

۱-وضو کرتے وقت اگر اذان ہو رہی ہو تو کیا جو دعائیں وضو کے عضو دھونے کے وقت حضور علیہ السلام سے منقول ہیں وہ پڑھنی چاہئیں؟ یا اذان کا جواب دینا چاہئے؟

۲-کیا تصویر (جاندار) کی طرف دیکھنا بھی گناہ ہے، اگر جاندار کی تصویر نکلی ہوئی نہ ہو، یعنی سامنے نظر نہ آتی ہو، لیکن کسی طرح چھپی ہوئی ہو تو ایسی تصویر دیکھنا بھی گناہ ہے (مثلاً کسی کتاب کے اندر تصویر کا ہونا اخبار کے اندر کے ورقوں پر جاندار تصویر کا ہونا وغیرہ)۔

۳-انگریز لوگ جب ان کی کرسمس ہوتی ہے تو مسلمان کے گھر میں بھی اکثر کرسمس کارڈ بھیجتے ہیں تو کیا مسلمان کو بھی (اخلاقاً) جن انگریز نے اس کے گھر کارڈ بھیجا ہے کرسمس کارڈ بھیجنا جائز ہے؟

۴-جب اذان میں مؤذن حی علی الصلوٰۃ کہے تو منہ کب پھیرے اور کہاں تک تفصیل سے لکھیں؟

الجواب وباللہ التوفیق :

۱- بہتر ہے کہ کلمات اذان کا جواب دیا جائے۔

۲- عزت وعظمت ومحبت یا رغبت وشہوت یا بدنگاہی کے جذبہ سے دیکھنا منع ہے۔

۳- ہاں اپنے عید وغیرہ خوشی کے موقع میں اخلاقاً مسلمان بھی بھیج سکتے ہیں۔

۴- جب حی علی الصلوٰۃ اور حی علی الفلاح کہنا شروع کرے تو منہ پھیرے اور پورا چہرہ کندھے تک پھیرے۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۵/۱/۹۶ ۱۳ھ

۱- جنازہ کے لئے کئے گئے وضو سے نماز فرض کی ادائیگی :

زید نے جنازہ کی نماز کے لئے وضو کیا پھر اسی وضو سے مغرب کی نماز پڑھی آیا اس وضو سے نماز ادا ہو جائے گی یا دوبارہ وضو کرنا ہوگا۔

۲- غسل کے وضو سے فرض وواجب کی ادائیگی :

غسل کے وضو سے فرض نماز بلا کراہت جائز ہے یا کہ نہیں اس طرح عیدین کی نماز کے وضو سے فرض نماز ادا ہو جائے گی یا کہ نہیں۔

الجواب وباللہ التوفیق

۱- دوبارہ وضو کرنا ضروری نہیں اس وضو سے ہر نماز پڑھ سکے گا۔

۲- بلا شبہ جائز ہے اور یقیناً ادا ہو جائے گی (۱) فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۲/۷/۸۵ ۱۳ھ

الجواب صحیح سید احمد علی سعید، محمد جمیل الرحمان نائب مفتی دارالعلوم دیوبند

۱- "لایستحب وضوء ان للغسل اتفاقا، قال العلامة نوح آفندی: بل ورد مایدل علی کراهية، اخرج الطبرانی فی الأوسط عن ابن عباسؓ قال: قال رسول الله ﷺ من توضأ بعد الغسل فليس منا" (شامی ۱/ ۱۱۷، مکتبہ فیض القرآن دیوبند) (مرتب)۔

نماز جنازہ کے بعد تازہ وضو ضروری ہے یا نہیں؟

مورخہ ۴/رمضان کو ایک میت کے وارث نے آکر مسجد میں بیان کیا کہ ہم فلاں شخص کی میت لائے ہیں، اس لئے میت کی نماز پڑھا دی جائے ہم میت کو دفن کرنے بھی لے جائیں گے، ورنہ لوگ پھر دفن میں نہ جائیں گے اور یہ میت کو رات بھر گھر میں نہیں رکھ سکتے ہیں جس وقت وہ شخص مسجد میں آیا اس وقت تراویح شروع ہو کر صرف دو رکعت ہوئی تھی، چنانچہ اس وقت مسجد کے باہر جا کر امام اور دیگر نمازیوں اور شرکاء نے نماز جنازہ پڑھی اور بعد نماز جنازہ شرکاء جنازہ اور کچھ مقتدی میت لیکر قبرستان چلے گئے امام مسجد میں آکر تراویح شروع کر دی اور بعد تراویح وتر اور نفل پڑھ لیئے۔

مطلع فرمایئے کہ امام اور مقتدیوں کو بعد نماز جنازہ تازہ وضو کر کے نماز پڑھانا اور پڑھنا تھا یا کہ نہیں؟

الجواب وبالله التوفيق:

امام نے صحیح عمل کیا اس کو یہی کرنا چاہئے تھا، بعد نماز جنازہ تازہ وضو کرنے کی ضرورت نہیں، نماز جنازہ سے وضو نہیں ٹوٹتا ہے، یہ غلط اور جاہلانہ باتیں مشہور ہوگئی ہیں، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۲/ ۹/ ۸۵ ۱۳ ھ
الجواب صحیح محمود عفی عنہ

وضو کا مسئلہ:

اگر وضو کرتے وقت ایک عضو باقی رہ جائے اور پانی قریب میں بھی نہ ملے تو اس وقت کیا کیا جائے؟

الجواب وبالله التوفيق:

جب پانی کم ہونے کا اندیشہ ہو تو شروع وضوء سے ہی کفایت کر کے وضو کفایت یا وضو فرض پر قناعت کرے، بہر حال اگر ایک عضو دھونے سے قبل پانی بالکل ختم ہو جائے اور حسب قاعدہ شرع پانی ملنے کی توقع نہ ہو تو تیمم کر لیں (۱)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۶/ ۱۲/ ۱۴۰۴ھ

۱- لوكان مع المحدث مايكفي بغسل بعض اعضاء الوضوء فإنه تيمم من غير غسله، هكذا في شرح الوقاي (ہندیہ باب التیمم، الفصل الثالث فی المتفرقات ۱/ ۳۰، دارالکتاب) (مرتب)۔

نائیلون یا سوتی موزوں پر مسح درست ہے یا نہیں؟

نائیلون، کپڑے کے موزوں پر مسح درست ہے یا نہیں؟

الجواب وبالله التوفيق:

جوازِ مسح علی الخفین میں اصل خفین ہیں، اور خفین چمڑے کے موزوں کا نام ہے اور یہ حکم غیر مدرک بالقیاس ہے، اس لیے قیاس کا تقاضا تو یہ ہے کہ غیر چمڑے کے موزوں پر بھی مسح جائز ہی نہ ہو، لیکن قیاس خفی اور استحسان کی مدد سے غیر چمڑے کے موزوں پر بھی (خواہ نائیلون ہو یا سوتی وغیرہ ہو) جن میں خفین کے خصوصی اوصاف واحوال پائے جاتے ہوں، ان پر بھی جوازِ مسح کی گنجائش نکلتی ہے، اور وہ خصوصی احوال واوصاف یہ ہیں کہ:

''خفین ساتر للقدمین مع الکعبین'' ہوتا ہے اور عضو مستور کا کوئی حصہ اوپر سے نظر نہیں آتا، اور مسح کی تری اندر حصہ تک نہیں پہنچتی، اور بغیر جوتا پہنے اور بغیر باندھے ہوئے چلا جائے تو میل دو میل اس طرح چل سکتے ہیں کہ نہ تو وہ کٹے گا اور نہ ساق سے نیچے اترے گا۔

پس جو موزہ غیر چمڑے کا خواہ نائیلون کا ہو خواہ سوتی یا اونی ہو۔ ان اوصاف کا حامل ہو یعنی اگر اتنا موٹا ہو کہ مسح کی تری جسم تک نہ پہنچے، اور اتنا مضبوط ہو کہ بغیر جوتا پہنے اور بغیر باندھے ہوئے میل دو میل چلے تو نہ کٹے، اور نہ پیر سے نکلے تو اس پر مثل خفین کے مسح جائز رہے گا(۱)۔

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

۱– ''(ولا يجوز المسح على الجوربين عند أبي حنيفة رحمه الله إلا أن يكونا مجلدين أو منعلين، وقالا: يجوز إذا كانا ثخينين لايشفان لماروي أن النبي عليه السلام مسح على جوربيه، ولأنه يمكنه المشي فيه إذا كان ثخينا وهو أن يستمسك على الساق من غير أن يربط بشئي فأشبه الخف، (إلى قوله)وعنه أنه رجع إلى قولهما وعليه الفتوى(ہدایہ اولین/۶۱، باب المسح علی الخفین)،لاَ شك أن المسح على الخف على خلاف القياس، فلا يصح إلحاق غيره به إلاّ إذا كان بطريق الدلالة وهو أن يكون في معناه، ومعناه الساتر لمحل الفرض الذى هو بصدد متابعة المشي فيه في السفر وغيره للقطع بأن تعليق المسح بالخف ليس لصورته الخاصة بل لمعناه للزوم الحرج في النزع المتكرر الخ'' (فتح القدیر مع العنایہ ۱/۱۰۹، کتاب الطہارۃ، مرتب)۔

انجکشن لگوانا ناقض وضو ہے یا نہیں؟

انجکشن لگوانا یا بدن میں دوا، خون، گلوکوز چڑھوانا ناقضِ وضو ہے یا نہیں؟

الجواب وبالله التوفيق:

اگر ان چیزوں کے استعمال سے خون یا پیپ وغیرہ کچھ بدن سے نہ نکلے تو وضو نہیں ٹوٹے گا، اس لیے کہ ناقض وضو خروجِ نجاست ہے(۱)، اور وہ یہاں نہیں پایا گیا، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

ریح خارج ہونے پر وضو کرنے کا حکم کیوں ہے؟

ہمیں اس سے اتفاق ہے کہ ریح خارج ہونے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے، لیکن ایک بہت ہی تعلیم یافتہ غیر مسلم کا سوال ہے کہ ریح خارج ہونے پر آپ وضو ہی کیوں کرتے ہیں، آبدست کیوں نہیں کرتے؟

الجواب وبالله التوفيق :

خروج ریح میں وضو کا حکم اس وجہ سے نہیں ہے کہ اس سے ریح نکل کر بدن کو ناپاک کر دیتی ہے اور اس نجاست کو دور کرنے کا یہ طریقہ ہے کہ سوال پیدا ہو کہ پاخانہ کے مقام پر تو ضرور ہی لگی ہوگی، پھر اس کو دھونے کا حکم کیوں نہیں ہے؟ بلکہ یہ امر تعبدی ہے اور اس کی وجہ دوسری ہے اور حکم خداوندی ہے، اور یہ بات تو ظاہر ہے کہ ہر انسان کے جسم میں کچھ نہ کچھ پاخانہ پیشاب وغیرہ (غلاظت) ہر وقت ہی رہتی ہے، اور جب تک وہ غلاظت اپنے محل ومستقر میں رہتی ہے اس وقت تک اس آدمی کو نہ تو کوئی ناپاک کہتا ہے اور نہ کسی عضو کے دھونے وغیرہ کا حکم دیتا ہے، اور جب وہ غلاظت اپنی جگہ ومحل وظرف سے نکل کر

۱- ”وينقضه خروج كل خارج نجس منه أى من المتوضي الحي معتاد. أولا، من السبيلين أولا إلى مايطهر“ (الدرالمختار علی ہامش الشامی ۱/ ۹۰، نواقض الوضوء) لیکن اگر انجکشن کے ذریعہ خون بدن سے نکالنا مقصد ہو تو یہ ناقض وضو ہے، اس کی نظیر یہ جزیہ ہے: ”القراد إذا مص عضو انسان فامتلاء دما إن كان صغيراً لاينقض وضوه كما لو مصت الذباب أوالبعوض، وإن كان كبيرا ينقض، وكذا العلقة إذا مصت عضو إنسان حتى امتلأت من دمه انتقض وضوءه“ (فتاویٰ عالمگیری ۱/ ۶، کتاب الطہارت)۔

جسم سے باہر آجاتی ہے تو فوراً دھونے اور پاک کرنے کا تقاضا ہوجاتا ہے اور طبیعت سلیمہ دھوتی بھی ہے، ورنہ سب کو نجس وناپاک قرار دیتی ہے اور ناپاک وگندہ تصور کرتی ہے اور اس سے طبیعت منقبض رہتی ہے، پس ریح خارج ہونے میں اگرچہ کوئی غلاظت وغیرہ مثلاً پیشاب پاخانہ خارج نہ ہو، مگر وہ ریح پاخانہ کے محل ومستقر وظرف سے نکل کر باہر آتی ہے اور کچھ نہ کچھ اثر غلاظت کا لیکر آتی ہے، جیسا کہ اس کی بدبو وغیرہ سے اندازہ ہوجاتا ہے اور اس سے طبیعت سلیمہ کچھ اثر انداز بھی ہوجاتی ہے، اور کچھ انقباض وتکدر بھی بسا اوقات طبائع سلیمہ میں پیدا ہوجاتا ہے، اس لئے عقل سلیم کا تقاضہ تو یہ تھا کہ جب ریح خارج ہو تو اسی وقت فوراً آب دست بھی لے اور ہاتھ منہ دھوکر تکدر طبعی وانقباض بھی دور کرلیا جائے، اور اپنی بشریت کو اعلیٰ ومرتفع کرلیا کرے، مگر چونکہ اس میں عام طبائع پر تنگی واقع ہوتی، اور ناپاکی کسی جگہ لگی نہیں ہوتی، اس لئے اللہ تعالیٰ نے بشری کمزوری پر نظر فرماکر اور شفقت کرتے ہوئے یہ حکم تطہیر وتنظیف کا نہیں دیا۔ بلکہ یہ حکم دیا کہ کم از کم جب میرے دربار میں حاضری دینا ہو اور نماز کے لئے آنا ہو، تو وہ بھی چونکہ میرے دربار کی حاضری ہے اس وقت کم از کم وضو، یعنی ایک خاص طریقہ سے ہاتھ منہ، پیر وغیرہ دھوکر آیا کرو، اس سے ہم وہی انشراح دیں گے جو فوراً پوری تطہیر سے تم حاصل کرتے، بلکہ بنظر شفقت مزید یہ بھی آسانی فرمادی کہ اگر تم پہلے سے وضو کرچکے ہو تو اگرچہ اس سے نماز بھی پڑھ چکے ہو، وہ بھی کافی قرار دے لیں گے، اس کے علاوہ اور بہت سی حکمتیں ہیں جو صرف اللہ کے علم میں ہیں، اور بہت سی حکمتیں علماء نے بیان بھی کی ہیں، مثلاً اس عمل سے صفت ملکوتیت بھی پیدا ہوگی اور ملائکہ سے قربت ومناسبت بھی پیدا ہوگی، جو باعث قرب خداوندی ہوگا، وغیرہ وغیرہ، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۳/۷/۹۵ ۱۳ھ

خروج ریاح کے مریض کے لئے وضو ونماز کا حکم:

ایک شخص عرصہ ۱۷۔۱۸ سال سے ریاحی مریض ہے جس کی وجہ سے وضو ایک بار کرنے کے بعد فوراً یا کچھ دیر بعد یا عین نماز میں رکوع وسجود کے وقت ساقط ہوجاتا ہے اگر ریاح کو روکا جاتا ہے تو مزید حبس ریاح سے اور دیگر امراض کا اندیشہ ہے۔ ایسی صورت میں بار بار وضو کرنا بھی بے سود ہے کیونکہ پھر ساقط ہونے کا اندیشہ رہتا ہے، عموماً مغرب اور عشاء میں صرف ایک وضوء سے پوری نماز مشکل ہے، نیز دوبارہ وضو کرنے سے جماعت کے آداب اور تسلسل میں فرق پڑتا ہے، ایسی مجبوری کی حالت میں صرف ایک بار کرکے پوری نماز ادا کی جاسکتی ہے اور درمیان میں کسی بھی وقت وضو کا ساقط ہونا مرض سے قابل

معاف ہوسکتا ہے؟

الجواب وبالله التوفيق:

اگر آپ کے خروج ریح کا مرض ایسا ہے کہ کوئی وقت نماز کا پورا اس طرح نہیں گذرتا ہے جس میں آپ وضو کر کے نماز پڑھ سکیں اور یہ مرض پایا جاتا ہے تو آپ شرعاً معذور ہیں اور بقائے عذر کے لئے ہر وقت میں ایک آدھ مرتبہ بھی یہ مرض (خروج ریح) پایا جانا کافی ہے، تو آپ معذور رہیں گے اور پورے وقت کے لئے آپکو ایک ہی وضو کافی رہے گا وقت بھر یہ وضو خروج ریح سے نہیں ٹوٹے گا جتنی نمازیں فرض سنت نفل تراویح آپ چاہیں پڑھیں، البتہ اگر خروج ریح کے علاوہ اور کوئی دوسرا ناقض پایا جائے گا تو اس سے آپ کا وضو ٹوٹے گا، خروج ریح سے نہیں ٹوٹے گا، جب ایک وقت نماز کا ختم ہو جائے اور دوسرا شروع ہو تو پھر سے نیا وضو آپ کرلیں۔ چاہے خروج ریح بعد وضو کے نہ ہوا ہو، کیونکہ معذور کے حق میں وقت کا نکلنا اور داخل ہونا ہی ناقض وضو کے حکم میں ہے، مثلاً آفتاب غروب ہونے سے پہلے آپ نے وضو کیا تو یہ وضو عصر کے وقت میں ہوا اور عصر کے ہی وقت بھر رہے گا، جب آفتاب غروب ہوا وقت عصر ختم ہوا ساتھ ساتھ یہ وضو بھی ختم ہوا اب مغرب کا وقت شروع ہو گیا اب اس وقت کے لئے ایک جدید وضو کر لیجئے اور عشاء کا وقت ہونے تک جتنی نمازیں چاہیں اسی وضو سے جس طرح وقت بھر جتنی نمازیں چاہیں پڑھ سکتے ہیں مس مصحف وغیرہ سب کر سکتے ہیں (۱)۔فقط واللہ اعلم بالصواب

آنسو نکلنے سے وضو کا حکم:

وضو کے بعد کسی جذبہ کے تحت آنکھوں سے آنسوں رواں ہو گئے تو ایسی حالت میں وضو باقی رہے گا یا کہ ٹوٹ جائے گا؟

۱- ’’ومن به عذر كسلسل بول أو استطلاق بطن) وانفلات ريح ورعاف دائم وجرح لايرقأ ولايمكن حبسه بحشو من غير مشقة ولابجلوس ولا بالايماء في الصلوة فبهذا يوضؤن (لوقت كل فرض) لا لكل فرض ولا نفل ...... (ويصلون به) اى بوضوء هم في الوقت (ماشاء وامن الفرائض) اداء للوقتية وقضاءء لغيرها‘‘ (مراقی الفلاح ۷۲ دار الکتب العربیۃ الکبری بمصر)(مرتب)۔

الجواب وباللہ التوفیق:

باقی رہے گا۔فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۲/۷/۸۵ ۱۳ھ

الجواب صحیح سید احمد علی سعید، محمد جمیل الرحمان مفتی دارالعلوم دیوبند

حافظ قرآن ریاح کا مریض ہو تو وہ کیا کرے؟

سوال: گذارش ہے کہ مجھے ریاح بہت آتی ہے اور میں قرآن کا حافظ ہوں رمضان میں تراویح پڑھانے میں پانچ چھ ٦ دفع روزانہ ریح خارج ہوجاتی ہے بار بار نیت توڑنے پر لوگوں میں بدنامی ہوجائے گی اور کوئی سنانے والا بھی نہیں ہے، اسی طرح میں ایک وضو پر پوری تراویح پڑھا دیتا ہوں جبکہ دس پانچ منٹ سے زیادہ ریح نہیں رکتی ہے اگر اس طرح نہ پڑھایں تو قرآن پاک رہ جائے گا میں بہت پریشان ہوں کیا کروں؟

دریافت ہے کہ قرآن پڑھانا بند کر دوں یا اسی طرح پڑھاتا رہوں؟

الجواب وبا للہ التوفیق:

حسب تحریر سوال آپ شرعاً ایسے معذور نہیں ہیں کہ محض ایک وضو سے وقت بھر نماز پڑھتے رہیں، خواہ ریح خارج ہوا کرے۔

اور آپکے پیچھے تمام مقتدیوں کی جنھوں نے ریح خارج ہونے پر نمازیں پڑھی ہیں کوئی نماز نہیں ہوگی اور جو پڑھی ہیں وہ نہیں ہوئیں۔

آپ قطعاً نماز پڑھانا ترک کردیں اور جتنی نمازیں اس طرح ریح خارج ہونے کے بعد پڑھائی ہوں اعلان کردیں کہ وہ نمازیں دھرالیں، ورنہ سب کا گناہ آپ پر ہوگا(۱)۔فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

الجواب صحیح سید احمد علی سعید

۱- مراقی الفلاح ۷۲، دار الکتب العربیۃ الکبری مصر۔

بغیر وضو قرآن پڑھنا:

بغیر وضو قرآن مجید کھول کر پڑھ بھی سکتا ہے یا کہ نہیں۔

الجواب وباللہ التوفیق:

جنابت اور حاجت غسل کی حالت میں قرآن پاک پر کپڑا لپٹا ہوا ہو تو اس کے اوپر سے چھو سکتے ہیں (۱) اور ساتھ میں لے جا بھی سکتے ہیں بغیر کسی حائل کے جنابت کی حالت میں اسی طرح بے وضو کی حالت میں بلا کسی حائل کے نہیں چھو سکتے فرق یہ ہے کہ بے وضو کے زبان سے بلا قرآن پاک چھوئے ہوئے پڑھ سکتا ہے اور حاجت غسل کی حالت میں بلا غسل کئے زبان سے بھی نہیں پڑھ سکتا، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲/۱۰/۸۵ ۱۳ھ

الجواب صحیح محمود عفی عنہ

۱- ”الحرمة مس المصحف لایجوز لهما وللجنب والمحدث مس المصحف إلا بغلاف متجاف عنه كالخريطة“ (فتاویٰ ہندیہ ۱/۳۸، رشیدیہ، پاکستان) (مرتب)۔

باب التیمّم

جنبی کا تیمّم کرکے تلاوت اور نماز پڑھنا:

ایک شخص ماسٹری کرتا ہے اور دینی تعلیم وغیرہ بھی اس کے ساتھ ساتھ رکھتا ہے تو وہ بحالت جنابت کلام پاک تعلیم دے سکتا ہے یا کہ نہیں؟ اور احتیاطاً صبح کو غسل نہیں کرتا ہے دوپہر کو غسل کرتا ہے فجر کی قضا ظہر کے وقت میں پڑھتا ہے۔ غسل جنابت کے بجائے تیمم کرکے قرآن چھونا اور پڑھنا جائز ہے یا کہ نہیں۔ اگر غسل کرکے صبح کی نماز یا تلاوت قرآن کرتا ہے تو بیمار ہونے کا غالب گمان ہے، جبکہ کلام پاک میں موجود ہے "لایمسه الا المطهرون" دوسری جگہ "فتیمموا صعیدا طیبا" بھی موجود ہے۔

سائل کی مراد ہے کہ جنابت کے دفع کے لئے تیمم کرکے نماز اور قرآن پاک پڑھے۔ بینوا توجروا۔

الجواب وباللہ التوفیق:

اگر آپ نے بار بار کے تجربہ سے یا مسلمان دیندار حاذق طبیب کی تشخیص وقول کے مطابق غسل کے نقصان کرنے کا ظن غالب ہو تو غسل کے لئے تیمم کرکے تمام نمازیں اور تلاوت سب پڑھیں اور کریں، اگر وضو میں نقصان کرتا ہو تو اس کے لئے بھی تیمم کرلیا کریں، مگر نماز قضاء ہرگز، ہونے نہ دیں۔ اور جس تیمم سے نماز پڑھ سکتے ہیں اس سے تلاوت بھی کرسکتے ہیں۔ تلاوت کے لئے علیحدہ تیمم کی ضرورت نہیں ہے(۱)، البتہ محض تلاوت کے لئے یا ذکر اذکار کے لئے تیمم کرے تو اس تیمم

۱- "لو کان یجد الماء إلا انه مریض یخاف إن استعمل الماء اشتد مرضه .... ویعرف ذلک الخوف، إما بغلبة الظن عن امارة والتجربة أو اخبار طبیب حاذق مسلم" (ہندیہ ص ۲۸/۱، رشیدیہ پاکستان)——لو تیمم الجنب یرید به الوضوء جاز. لو تیمم لقراة القرآن عن ظهر القلب أو عن المصحف أو لزیارة القبور أو لدفن المیت أو للاذان أو للاقامة او لدخول المسجد أو لخروجه، الخ (ہندیہ ۲۶/۱، رشیدیہ پاکستان) (مرتب)۔

سے نماز نہ ہوگی نہیں پڑھ سکتے ہیں ۔یہ مسئلہ تو فقہ کی کتابوں میں عام طور سے لکھا ہے ،فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۴/ ۹/ ۸۵ ۱۳ ھ

الجواب صحیح محمود عفی عنہ

ٹھنڈک کی وجہ سے تیمم:

زید پر غسل واجب ہے لیکن سردی میں کاہلی کی وجہ سے صرف تیمم پر اکتفاء کرلیتا ہے اور نماز پڑھ لیتا ہے آیا اس کا یہ فعل درست ہے کیا نماز ہو جائے گی یا کہ نہیں۔

الجواب وباللہ التوفیق:

محض کاہلی کی وجہ سے تیمم پر اکتفاء کرنا جائز نہیں ہے، ہاں اگر بار بار کا اپنا تجربہ ہو کہ اس حالت میں غسل نقصان کرتا ہے یا مسلمان حاذق طبیب تشخیص کردے کہ پانی مضر ہوگا تو تیمم کرنا صحیح ہوگا ،فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۹/ ۱۰/ ۸۵ ۱۳ ھ

الجواب صحیح محمود عفی عنہ

گرم پانی بھی نقصاندہ ہو تو تیمم کرنا کیسا ہے؟

گرم پانی سے وضو کرنے سے سر میں درد ہوتا ہے کیا ایسی حالت میں میرے لئے تیمم کرنا جائز ہے؟

الجواب وباللہ التوفیق:

کسی مسلمان دیندار حاذق طبیب کی اجازت سے جائز ہوگا ،فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۳/ ۱۰/ ۸۵ ۱۳ ھ

الجواب صحیح محمود عفی عنہ

باب الغسل

نرودھ استعمال کرنے کی صورت میں غسل واجب ہوگا یا نہیں؟

آج کل عورت سے جماع کے وقت بعض لوگ نرودھ کا استعمال کرتے ہیں، کیا اس صورت میں غسل واجب ہوگا؟

الجواب وباللہ التوفیق:

غسل واجب ہوجائے گا(۱)، اور اگر بغیر ضرورت شرعی ایسا کیا گیا تو گناہ بھی سخت ہوگا، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند، سہارنپور

الجواب صحیح حبیب الرحمٰن خیرآبادی

بحالت غسل جنابت چھینٹ ٹب میں پڑنے سے پانی ناپاک ہوگا یا نہیں؟

حالت جنابت میں غسل کرتے وقت بالٹی یا ٹب میں چھینٹ پڑتی رہتی ہے اب اس کا پانی پاک رہتا ہے یا کہ ناپاک ہوجاتا ہے ٹب یا بالٹی سے پانی نکالنے کے لئے ہاتھ بھی ڈالتے ہیں اب سوال یہ ہے کہ اس پانی سے وضو یا غسل جائز یا کہ نہیں؟

الجواب وباللہ التوفیق:

جس جگہ بدن پر ناپاکی لگی ہو اگر وہاں سے اچھل کر چھینٹ پانی میں گرے گی تو بالٹی کے پانی کو ناپاک

۱- ”ولو لف ذکرہ بخرقة وأولجه ولم ينزل، فالأصح أنه إذا وجد حرارة الفرج واللذة وجب الغسل وإلا فلا، والأحوط وجوب الغسل في الوجهين، لقوله صلى الله عليه وسلم: إذا التقى الختانان وغابت الحشفة وجب الغسل أنزل أو لم ينزل“ (طحطاوی علی مراقی الفلاح ۱/۵۴، کتاب الطهارت) (مرتب)۔

کردے گی (۱) جس سے غسل جائز نہیں ہوگا، اور اگر دوسری جگہ سے اچھل کر بالٹی میں چھینٹ گرے گی تو بالٹی کا پانی ناپاک نہ ہوگا جس سے وضو غسل درست ہوجائے گا، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند،سہارنپور ۱۲/ ۷/ ۸۵ ۱۳ ھ

الجواب صحیح سید احمد علی سعید، محمد جمیل الرحمان نائب مفتی دارالعلوم دیوبند

بغیر پانی وکلوخ استنجاء کرنے سے غسل:

زید سواری سے سفر کر رہا ہے چلتی گاڑی میں اس کو پیشاب معلوم ہوتا ہے روکنا نا قابل برداشت ہے نہ وہاں پانی ہے نہ دوسری چیز جس سے استنجاء ممکن ہو مجبوراً پیشاب سے فارغ ہوجاتا ہے پھر جب گاڑی ٹھہرتی ہے تو وہاں پانی یا ڈھیلہ سے استنجا کرے آیا وہ پاک ہوا یا کہ ناپاک ہی ہے وہ بغیر غسل کے نماز ادا کرسکتا ہے یا کہ نہیں۔

الجواب وبالله التوفيق:

ڈھیلے یا پانی سے استنجاء کر کے وضو کر کے نماز پڑھ سکتا ہے غسل کی ضرورت نہیں (۲) فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند،سہارنپور ۱۲/ ۷/ ۸۵ ۱۳ ھ

الجواب صحیح سید احمد علی سعید، محمد جمیل الرحمان نائب مفتی دارالعلوم دیوبند

حجامت کے بعد غسل ضرور نہیں ہے:

حجامت یا بال کٹوا کر صرف وضوء کر کے نماز پڑھ سکتے ہیں یا نہانا ضروری ہے اگر بغیر غسل کے نماز پڑھ لے تو نماز ہوجائے گی یا نہیں؟

۱- "وكل ماء وقعت فيه نجاسة لم يجز الوضوء به قليلا كان او كثيرا" (قدوری علی اللباب ۱/ ۲۴، دارالایمان سہارنپور) (مرتب)۔

۲- "اعلم ان الجمع بين الماء والحجر أفضل" (شامی ۱/ ۲۴۸، مکتبہ فیض القرآن دیوبند) (مرتب)۔

الجواب وباللہ التوفیق:

محض حجامت بنوانے یا بال کٹوانے سے غسل واجب نہیں ہوتا محض وضوء کر کے نماز پڑھ سکتے ہیں بلکہ اگر پہلے سے باوضوء ہوں تو اس سے وضوء نہیں ٹوٹے گا اور بغیر نیا وضو کیے نماز پڑھ سکتے ہیں اور نماز ہو جائیگی ،فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی ،مفتی دارالعلوم دیوبند،سہارنپور

غسل کی نیت پڑھ کر پھونکے ہوئے پانی سے غسل:

غسل کرتے وقت جو نیت پڑھی جاتی ہے وہ پڑھ کر پانی پر پھونک کر پانی سے غسل کرنا چاہئے یا پانی پر نہیں پھونکنا چاہئے ۔

کے،کے مبئی

الجواب وباللہ التوفیق:

غسل کرتے وقت جو نیت کی جاتی ہے اس کا دل میں کر لینا بھی کافی ہوتا ہے،اس کو پڑھ کر دم کرنے کا حکم نہیں ہے(۱)۔

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی ،مفتی دارالعلوم دیوبند،سہارنپور ۷/۱/۱۴۰۲ھ

غسل کی حاجت میں قرآن شریف کو ہاتھ میں لے کر مسجد میں جانا:

غسل کی حاجت میں قرآن شریف کو ہاتھ میں لے کر مسجد میں جاسکتا ہے اس ارادہ سے کہ میں وہاں جا کر اور پہلے غسل اتار کر نماز پڑھنے کے بعد میں قرآن مجید پڑھوں گا۔

۱- ''وھی لغة عزم القلب علی الشئ واصطلاحاً کما فی التلویح: قصد الطاعة والتقرب إلی اللہ تعالی فی إیجاد الفعل'' (البحرالرائق ۱/۴۹)(مرتب)۔

الجواب وباللہ التوفیق:

پاک کپڑے میں لپیٹ کر لے جا سکتا ہے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دار العلوم دیوبند، سہارنپور ۲۱/۱۰/۸۵ ۱۳ھ

الجواب صحیح محمود عفی عنہ

كتاب الصلوة

کتاب الصلوۃ (باب مواقیت الصلوۃ)

برطانیہ وغیرہ میں موسم سرما میں رات مختصر ہوتی ہے، وہاں نماز، روزہ وتراویح کا حکم ؟

برطانیہ میں عموماً اوراس کے شمال مغربی صوبہ اسکاٹ لینڈ میں بطور خاص سردیوں میں دن بالکل مختصر اور موسم گرما میں ازحد طویل ہوتا ہے، امسال توقع ہے کہ پہلا روزہ ۱۴؍جولائی کو ہوجائے گا، اگر ۱۴؍جولائی کا روزہ ہوا تو مقامی تقویم کے اعتبار سے اس دن اوقاتِ سحر وافطار وصلوات خمسہ مندرجہ ذیل تفصیل سے ہوں گے۔

صبح صادق	طلوع شمس	زوال	وقت عصر	وقت مغرب	وقت عشاء
منٹ-گھنٹہ	منٹ-گھنٹہ	منٹ-گھنٹہ	منٹ-گھنٹہ	منٹ-گھنٹہ	منٹ گھنٹے
۱-۴۶	۴-۴۸	۱-۴۰	۶-۴۳	۱۰-۲	۱۱-۳

اس تفصیل کے مطابق صبح صادق سے لےکر طلوع آفتاب تک تین گھنٹے دو منٹ کا فاصلہ ہوگا۔ اور طلوع فجر سے غروب آفتاب تک کا درمیانی وقفہ (روزہ کی طوالت) ۲۰ گھنٹے ۱۶ منٹ کا ہوگا، عشاء کی نماز اگر غروب سے ایک گھنٹہ بعد شروع کریں اور ۲۰ رکعات تراویح بشمول سوا پارہ قرآن کریم ایک گھنٹہ پندرہ منٹ میں بعجلت اور ڈیڑھ گھنٹہ میں بسہولت ختم کرلیں۔ اور اذان عشاء و جماعت کے درمیان ۱۲ منٹ کا فاصلہ رکھ کر سوا گیارہ بجے عشاء کی جماعت شروع کریں تو تراویح وغیرہ سے پورے پونے ایک بجے فراغت ہوگی۔ اور طلوع فجر سے پانچ منٹ قبل سحری کی بندش رکھیں تو اس طرح یہاں کے مسلمانوں کو صرف ایک گھنٹہ کی رات میسر ہوتی ہے جس میں ضروریات اور تناول سحری وغیرہ سب کچھ سرانجام دینا ہوتا ہے (مثلاً گھروں سے مسجد آنا جانا اور کھانا پکانا)۔

نوٹ: یہاں اسکاٹ لینڈ میں مئی، جون اور وسط جولائی تک پوری رات شفق ابیض مغرب کے بعد افق پر

بصراحت نمودار رہتی ہے جوکہ صبح صادق کے بعد پھیل کر مکمل روشنی مہیا کر دیتی ہے۔باہر آبادی سے دور جا کر مختلف تاریخوں میں اس کا تجربہ کیا گیا ہے۔دریں صورتِ حال بیان فرمائیں کہ ہم یہاں عشاء اور منتہائے سحر کا تعین کس طرح کریں، کیا مقامی تقویم کا التزام ضروری ہوگا یا اس کا کوئی متبادل حل موجود ہے؟ آئندہ امسال روزہ تقریباً ساڑھے بیس گھنٹہ اور اس سے بھی کچھ زائد طویل ہو جائے گا۔

مقبول احمد خادم (جامع مسجد گلاسکو)

الجواب وبالله التوفيق:

الف: حاصل سوال یہ ہے کہ برطانیہ میں عموماً شمالی حصہ میں اکثر گرمی کے موسم میں عشاء کا وقت گیارہ بج کر تین منٹ پر شروع ہوتا ہے اور صبح صادق ایک بج کر چھیالیس ۴۶ منٹ پر ہو جاتی ہے۔گویا رات کی کل مقدار دو گھنٹہ تینتالیس ۴۳ منٹ تک ہو جاتی ہے، امسال رمضان میں ایسا ہی ہوگا اب اگر وقت شروع ہوتے ہی اذان دے کر بارہ، چودہ منٹ پر بھی نماز شروع کر دی جائے تو فرض وتر اوتراویح سے فراغت تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ میں ہوگی، اس طرح اب رات کا حصہ کم وبیش صرف ایک گھنٹہ بچے گا، اس مختصر وقت میں سحری کھانا پینا اور دوسری ضروریات پوری کرنا اور مسجد تک جانا وغیرہ سب کچھ کرنا بہت دشوار ہوگا تو عمل کی کیا صورت اختیار کی جائے؟

تو اس کا جواب یہ ہے کہ عزیمت تو یہی ہے کہ سنت کے مطابق پورے ایک ختم قرآن پاک کے ساتھ پوری تراویح پڑھ کر پورا ماہِ مبارک مجاہدہ میں گذار دیں، ورنہ اگر معذوری ہو، مثلاً کمزوری ہو یا مریض ہو یا ملازمت کی مجبوری ہو تو الم ترکیف، سے بیس رکعات تراویح کی پوری کرلیں (۱)، اور اگر اس کی بھی طاقت یا موقع نہ ہو تو فرض اور وتر کے درمیان محض آٹھ رکعت بنیت تراویح پڑھ لیا کریں (۲)۔

ب- اسکاٹ لینڈ یا جہاں بھی ایسا ہو کہ کسی مہینہ میں مثلاً مئی، جون اور وسط جولائی تک پوری رات شفقِ ابیض بعد مغرب قائم رہتی ہے اور صبح صادق ہونے پر بیاض پھیلا کر مکمل روشنی مہیا کر دیتی ہے تو ایسے مقام میں وقتِ عشاء اور منتہائے سحر کا تعین کس طرح کیا جائے۔اور نماز عشاء کس طرح اور کس وقت پڑھی جائے؟

۱- "واختاربعضهم سورة الإخلاص في كل ركعة، وبعضهم سورة الفيل أي البداية منها ثم يعيدها وهذا أحسن لئلا يشتغل قلبه بعدد الركعات" (شامی ۱/۴۷۵، باب الوتر والنوافل) (مرتب)۔

۲- "وذكر في الفتح أن مقتضىٰ الدليل كون المسنون منها ثمانية والباقي مستحبا (شامی ۱/۴۷۴، باب الوتر والنوافل)۔

تواس کا حکم یہ ہے کہ اگر چہ فقہاء احناف ؒ نے شفقِ ابیض کے بعد ہی شروعِ وقتِ عشاء بیان کیا ہے، لیکن بعض محققین فقہاءؒ شفقِ احمر کے غروب کے بعد سے ہی وقتِ عشاء کی ابتداء بیان کرتے ہیں (۱)۔

اس لیے مذکورہ حالت میں شفقِ احمر کے غروب ہوتے ہی وقتِ عشاء تسلیم کر کے نمازِ عشاء صبح صادق کا بیاض شروع ہونے سے قبل، ادا کر لی جائے، اور ماہِ رمضان المبارک میں بھی عشاء کے فرض و وتر کے درمیان صبح صادق کی سفیدی ظاہر ہونے سے پہلے تراویح بھی پڑھ لینے کی کوشش کی جائے، اگر بیس رکعات کا موقع "الم تر کیف" پڑھ کر بھی نہ ملے تو آٹھ رکعت ہی پڑھ لیا کریں، ہاں جہاں اس کا بھی موقع نہ ہو تو صرف عشاء کے فرض و وتر ہی پڑھ لیا کریں۔ اور بہیت ادا پڑھیں جیسا کہ مقیمین بلغاریہ کے لیے نمازِ عشاء کی ادائیگی کی بحث میں فقہاءؒ نے بیان فرمایا ہے کہ اگر شفق ختم ہونے سے قبل ہی صبح صادق شروع ہو جائے اور عشاء کا وقت نہ ملے جب بھی صلوٰۃِ مغرب و فجر کے درمیان بعد مغرب کچھ وقفہ دیکر فرض عشاء اور وتر بنیت ادا پڑھ لینا راجح ہے (۲)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

جہاں چھ ماہ دن، چھ ماہ رات مسلسل رہتی ہے وہاں کے لوگ روزہ و نماز کس طرح ادا کریں؟

سوال: جہاں چھ ماہ کا دن اور چھ ماہ کی رات ہوتی ہے، وہاں نماز، روزہ اور وظائف یا وہ نمازیں جو سورج کے حساب سے پڑھی جاتی ہیں کس طرح ادا کی جائیں، کیا دن کے چھ مہینے میں صرف پانچ نمازیں ہی پڑھی جائیں گی اور چھ مہینے کے دن کا روزہ کس طرح رکھا جائے گا؟

ظہر پڑھنے کے بعد ایسی جگہ پہنچنا جہاں اس کے بعد ظہر کا وقت ہوا تو کیا دوبارہ ظہر پڑھنی ہوگی؟

ایک شخص برق رفتار جہاز سے ظہر کی نماز پڑھ کر مشرق سے مغرب کی طرف سفر کرتا ہے، منزل پر پہنچنے کے بعد یہاں نماز ظہر کا وقت ہوتا ہے، اب اس کو نماز ظہر پھر پڑھنی چاہیے، یا جو پڑھ کر آیا ہے وہ کافی ہے۔

سید محمد میاں نظامی (بستی حضرت نظام الدین، نئی دہلی)

۱- کما بینہ وفصلہ فی الدر والرد۔ (وقت العشاء والوتر منہ إلی الصبح، قال الشامی قولہ: منہ أی من غروب الشفق علی الخلاف فیہ" (شامی ۱/ ۲۴۱، کتاب الصلوۃ) (مرتب)۔

۲- "وفاقد وقتهما کبلغار فإن فیها یطلع الفجر قبل غروب الشفق فی اربعینیة الشتاء مکلف بهما فیقدر لهما" (الدر المختار ۲/ ۱۸) (مرتب)۔

الجواب وباللہ التوفیق:

۱-جس مقام پر آفتاب چھ مہینے مسلسل غروب رہتا ہے اور چھ مہینے مسلسل طلوع رہتا ہے اس مقام پر انسانی آبادی مشکل ہے، بہر حال وہاں جو لوگ آباد ہیں ان کے لیے یہ حکم ہے کہ جس وقت آفتاب غروب ہوا اس وقت سے ہر چوبیس گھنٹہ کو گھڑی دیکھ کر ان کو دن و رات کا مجموعہ قرار دے کر پانچوں نمازیں جس فصل و انداز سے پڑھتے ہیں پڑھتے رہیں، حدیث دجال (۱) سے بھی اس طرف روشنی ملتی ہے اور حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلویؒ کا رجحان بھی یہی معلوم ہوتا ہے، پھر اسی طرح جب چھ ماہ مسلسل طلوع رہے اس وقت بھی وہی سابق حساب کے اعتبار سے ہر چوبیس گھنٹہ میں شب و روز کی نمازیں اندازہ کے لحاظ سے پڑھتے رہیں اور اسی طرح حساب سے جب رمضان کا مہینہ آئے تو اس میں روزہ بھی رکھیں (اسی اعتبار سے) اور جس طرح دنیا کا اپنا ہر کام (سونا، جاگنا، کام کرنا، ڈیوٹی دینا وغیرہ) وقت کے حساب سے کریں گے، اسی طرح نماز روزہ بھی حساب کر کے ادا کریں گے (۲)۔

۲-جب ایک مرتبہ کوئی نماز پڑھ لی گئی تو پھر اگر اسی نماز کا دوبارہ وقت آئے گا تو دوبارہ نہیں پڑھی جائے گی وہی ایک بار کی ایک دن میں پڑھی ہوئی نماز کافی ہوگی (۳)، فقط واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

وہ مصلیٰ یا چادر جس پر خانہ کعبہ یا مسجد نبوی کا نقشہ ہو، اس پر بیٹھنا اور نماز پڑھنا کیسا ہے؟

مسلمان حرمین شریفین سے ایسے مصلے لاتے ہیں جو رنگ برنگ اور پھول پھال والے ہوتے ہیں اور ان پر بیت

۱- اور حدیث دجال سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے، جب آپ ﷺ سے دریافت کیا گیا کہ جب ایک دن ایک سال کے برابر ہوگا تو کیا ایک دن کی نمازیں کافی ہوں گی؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: نہیں، بلکہ اندازہ سے نمازیں ادا کرتی ہوں گی، حدیث کے الفاظ یہ ہیں:" قلنا: یارسول اللہ! الیوم الذی کسنة أتکفینا فیه صلوٰة یوم؟ قال: لا، أقدروا له قدره .. الخ" (مسلم شریف ۲/ ۴۰۱، باب ذکر الدجال) (مرتب)۔

۲- "قال الرملی فی شرح المنهاج: ویجری ذالک فیما لو مکثت الشمس عند قوم مدة الخ، قال فی امداد الفتاح قلت: وکذالک یقدر لجمیع الآجال کالصوم والزکوٰة والحج والعدة وأجال البیع والسلم والإجارة؛ وینظر ابتداء الیوم فیقدر کل فصل من الفصول الأربعة بحسب ما یکون کل یوم من الزیادة والنقص کذا فی کتب الأئمة الشافعیة ونحن نقول بمثله إذ أصل التقدیر مقول به إجماعا فی الصلوٰة (شامی ۱/ ۲۴۴، فصل فی فاقد وقت العشاء کأهل بلغار کتاب الصلوٰۃ) (مرتب)۔

۳- "وإذا أتمها أی الظهر یدخل مع القوم، والذی یصلی معهم نافلة، لأن الفرض لا یتکرر فی وقت واحد" (هدایہ ۱/ ۱۵۲، باب ادراک الفریضۃ) (مرتب)۔

اللہ شریف اور مسجد نبوی علیہ السلام کے گنبد کا نقشہ بھی رہتا ہے اور اپنی نمازوں میں مسجد میں امامت کی جگہ پر اور اب اسی طرح کی چادریں بنی ہوئی لاکر پوری صف میں بچھاتے ہیں جن پر لامحالہ لوگوں کے پیر پڑتے ہیں، ایسے مصلے اور ایسی چادروں کے بارے میں شرعی حکم کیا ہے؟ ہمارے اسلاف رحمہم اللہ کا معمول کیا رہا؟ اکابرین کیا فرماتے ہیں؟

محمد یوسف باوا (لندن)

الجواب وبالله التوفيق:

حرمین شریفین سے مصلے جولائے جاتے ہیں جن پر پھول، بوٹے بنے ہوئے ہوتے ہیں۔ اگر بیت اللہ شریف یا گنبد خضراء کا نقشہ اس پر صحیح اور صاف طور سے نمایاں ہو کہ اس کے دیکھتے ہی ان کی اصل صورت سامنے آجاتی ہو تو اس پر پیر رکھنا یا سجدہ کرنا دونوں ناجائز ہوگا، اس لیے کہ کعبۃ اللہ اور گنبد خضراء دونوں کا شعائر دینی سے ہونا مسلم اور ظاہر ہے اور تمام دینی شعائر کا احترام وتعظیم واجب ہے: "**كما أشار إليه قوله تعالىٰ: ومن يعظم شعائر الله فإنها من تقوى القلوب**" (۱) "**وأيضا من المسئلة مسلمة، أى تحريم الحرمات واجب كما فى المرقات شرح المشكوٰة**"۔ اور معظم ومحترم چیز کو پیروں سے روندنا اس کی اہانت کو متلزم ہونا اور ناجائز ہونا ظاہر ہے اور یہ دونوں نقشے اگرچہ عین کعبہ اور عین گنبد خضراء نہیں ہیں، لیکن ان کے عکاس وترجمان اور ان پر دال ہیں، اس لیے ان کی اہانت اور توہین بھی ان دونوں کی اہانت اور توہین کو متلزم ہوگی اور ناجائز ہوگی اور یہیں سے یہ بات بھی واضح ہوگئی کہ جب عین کعبۃ اللہ پر سجدہ کرنا درست نہیں، کما صرح بہ العلماء کہ کعبۃ اللہ مسجود لہ نہیں، بلکہ صرف مسجود الیہ ہے اور وہ بھی بطور امر تعبدی اور غیر مدرک بالقیاس ہونے کے درجہ میں محض اللہ کے حکم سے کہ کعبہ کی جانب سجدہ کرو، کعبہ کی جانب سجدہ کیا جاتا ہے کعبہ کو سجدہ نہیں کیا جاتا ہے، بلکہ اللہ کو سجدہ کیا جاتا ہے، اس لیے کعبہ کو سجدہ کرنا شرک کہا گیا ہے (۲)، تو گنبد خضراء کو یا گنبد خضراء پر سجدہ کرنا بدرجہ اولی شرک اور ناجائز ہوگا۔

پس یہ نقشے جب ان دونوں کے ترجمان وعکاس ہیں، تو ان دونوں نقشوں پر بھی سجدہ کرنا ناجائز وحرام ہوگا۔ اگر یہ چیز شرک نہ ہو تو ایہام شرک اس سے ضرور ہوگا اور یہ ایہام شرک بھی ممنوع ہوجائے گا اور اگر وہ نقشے صاف اور نمایاں نہ ہوں یا غلط

۱- سورۂ حج: ۳۲۔

۲- حتى لو سجد للكعبة نفسها كفر، قال الشامى: فإن المسجودله هو الله تعالىٰ والتوجه إلى الكعبة مأمور به كما تقدم كان السجود لنفس الكعبة كفرا (الدر المختار مع الشامی ص، ۲۸۶، ج،۱، کتاب الصلوۃ) (مرتب)۔

ہوں اور کسی ذی روح کی تصویر یا صلیب وغیرہ کسی کفر کے شعار کے نقوش نہ ہوں تو اس پر نماز پڑھنا بے تکلف جائز رہے گا، بشرطیکہ شاغل مصلی نہ بنے ورنہ مکروہ ہوگا، یہی حکم بعینہ اور اسی تفصیل کے ساتھ ان منقش چادروں کا بھی ہوگا کہ جن پر نماز پڑھی جائے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

ہوائی جہازوں میں نماز کس نظام الاوقات کے مطابق ادا کی جائے؟

استفتاء کی بنا اس پر ہے:

۱- اسلام میں پانچ نمازیں فرض ہیں: قال النبی ﷺ: "**خمس صلوات افترضهن الله تعالىٰ**"(۱)۔

۲- ان نمازوں کی ادائیگی کے لیے مخصوص اوقات فرض کیے گئے ہیں: "**لها أوقات مخصوصة لاتجزی قبلها بالإجماع**" (۲)۔

ان اوقات کی فقہی نوعیت خواہ کچھ ہو لیکن اس میں شک نہیں کہ عملاً ان کو صحتِ ادا کے لیے شرط سمجھا جاتا ہے جس سے شبہ ہوتا ہے کہ فرضیتِ نماز کی علت شاید یہی اوقات ہیں، چنانچہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ایک واقعہ سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ حدیث میں آتا ہے:

"**نام رسول الله ﷺ في حجر علي رضي الله عنه حتى غربت الشمس فلما استيقظ ذكر له أنه فاتته العصر، فقال: اللهم إنه كان في طاعتک وطاعة رسولک فرددها عليه، فرددت حتى صلى العصر وكان ذلک بخيبر" والحديث صححه الطحاوی و عياض، وأخرجه جماعة منهم الطبرانی بسند وأخطا من جعله موضوعا كابن الجوزی، وقواعدنا لاتأباه**" (۳)۔

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ نماز میں وقت کو خاص اہمیت حاصل ہے، جب ہی تو ان کے لیے سورج کا اعادہ کرایا گیا ہے، کیا وقت کی اسی اہمیت کی بناء پر فقہاء نے اس کو سبب وجوب قرار دیا ہے، جیسا کہ مشہور ہے: "**وسببها أوقاتها عند الفقهاء**"(۴)۔

۱- ابوداؤد، کتاب الصلاۃ حدیث نمبر: ۴۲۵، عن عبادۃ بن الصامت ۱/ ۱۱۵۔

۲- نیل الاوطار ۱/ ۳۲۶۔

۳- شامی کتاب الصلاۃ ۱/ ۲۶۵۔

۴- البحر الرائق کتاب الصلوۃ ۱/ ۴۲۳۔

لیکن اگر ایسا ہے تو واقعۂ دجال کے متعلق کیا کہا جائے گا، جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اگر وقت ایک سال تک بھی نہ آئے تو نمازیں برابر تقدیر و اندازہ کے ساتھ ادا کی جاتی رہیں گی:

"أنه ذكر الدجال رسول الله ﷺ قلنا: ما لبثهُ في الأرض؟ قال: أربعون يوماً يوم كسنة ويوم كشهر ويوم كجمعة وسائر أيامه كأيامكم فقلنا: يا رسول الله! فذلك اليوم الذي كسنة أتكفينا فيه صلوٰة يوم؟ قال: لا، اقدروا له قدره" (۱)۔

اس واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وقت سببِ وجوب نہیں ہے، علماء کا ایک طبقہ اسی طرف گیا ہے کہ وقت سببِ وجوب نہیں ہے صرف علامت ہے، محقق ابن ہمام علیہ الرحمہ فرماتے ہیں: **"جعل علامة على الوجوب الخفي الثابت في نفس الأمر" (۲)۔**

بہر حال وقت کی حقیقت سبب وجوب کی ہو یا علامت کی، دریافت طلب امر یہ ہے کہ ہوائی جہازوں کے سفر میں اکثر امتداد وقت کی حالت سے سابقہ پڑتا ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ زمین اپنے طول پر ہے، مشرق کی طرف سے ایک ہزار میل فی گھنٹہ کے حساب سے چوبیس گھنٹہ میں ایک چکر پورا کرتی ہے اور ہوائی جہاز عموماً زمین سے چالیس ہزار فٹ کی بلندی پر پرواز کرتے ہیں تو اگر زمین کی مخالف سمت میں یعنی سورج کی طرف پشت کر کے پرواز کرتے ہیں تو ان پر رات کے اوقات بڑھتے رہتے ہیں اور اگر ان کی پرواز زمین کے موافق سمت ہوتی ہے تو اس صورت میں چونکہ سورج سامنے ہوتا ہے اس لیے ان پر مسلسل دن کا وقت بڑھتا رہتا ہے، یہ ابتداء وقت کی صورت ہے، لیکن اس سے زیادہ حیرت ناک وہ شکل ہے جس میں وقت کم ہوتا ہے، کہتے ہیں کہ راکٹ چوبیس گھنٹہ میں زمین کے سترہ چکر لگاتا ہے، یعنی ڈیڑھ گھنٹہ میں ایک چکر، جس کا مطلب یہ ہے کہ ڈیڑھ گھنٹہ میں نمازوں کے تمام اوقات راکٹ پر گذر جاتے ہیں اور اس طرح چوبیس گھنٹہ میں سترہ دن کی نمازیں فرض ہو جاتی ہیں، ان مذکورہ بالا دونوں صورتوں میں جب کہ وقت معدوم بھی نہیں ہے لیکن معمول کے مطابق موجود بھی نہیں ہے، نمازوں کے متعلق کیا فیصلہ کیا جائے گا؟

۱- کیا جو وقت گذر رہا ہے اس کے حساب سے نمازیں ادا کی جائیں گی؟ لیکن یہ صورت حدیث دجال کے خلاف ہے۔

۱- اخرجہ مسلم من حدیث طویل ۴/ ۵۵-۲۲۵۰، فی کتاب الفتن ۱۱۰،۱۱۱، ۲۹۳۷۔

۲- فتح القدیر ۱/ ۲۲۳۔

۲-یہ جو وقت معمول کے مطابق موجود نہیں ہے، تقدیر و اندازکر کے اس کے حساب سے نمازیں ادا کی جائیں گی، لیکن اس صورت میں یہ اشکال ہے کہ تقدیر و اندازہ کے لیے کون سے اوقات کو معیار بنایا جائے گا؟

۳-یہ جو وقت معمول کے مطابق موجود نہیں ہے اس کو بنیا قرار دے کر نماز کی عدمِ فرضیت کا فیصلہ کیا جائے گا، یہ وہ بنیادیں ہیں جن پر استفتاء مرتب کیا گیا ہے، اس سلسلہ میں احقر بھی چند معروضات بغرض اصلاح پیش کر رہا ہے، ملاحظہ فرمائیں اور اپنی تحقیقات علمیہ وفقہیہ سے سرفراز فرمائیں۔

اس میں شک نہیں کہ شریعت نے نماز کا مدار شمس کے اوقات پر رکھا ہے، قال الله تعالى: "أقم الصلوٰة لدلوک الشمس إلى غسق الليل وقرآن الفجر" (۱)، اور اس میں بھی شک نہیں کہ شمسی اوقات کرۂ ارض کے ہر حصہ میں یکساں نہیں پائے جاتے، جیسا کہ مشاہدہ ہے، بلکہ ان میں تفاوت کثیر نظر آتا ہے۔

۱-اصولاً جن مقامات میں یہ اوقات نہ پائے جاتے ہوں، نماز فرض نہیں ہونی چاہئے، کیونکہ جب سبب وجوب ہی نہیں ہے تو نماز کی فرضیت کا حکم کس طرح دیا جا سکتا ہے، چنانچہ علماء کا ایک طبقہ ایسے موقعہ پر نماز کی عدمِ فرضیت ہی کا قائل ہے:" وبه جزم في الكنز والدرر والملتقىٰ وبه أفتى البقال ووافقه الحلواني والمرغيناني ورجحه الشرنبلالي والحلبي" (۲)۔

یہ تمام حضرات عدمِ سبب ہی کی بنا پر نماز کی عدمِ فرضیت کے قائل ہیں، اور ان کی اصل بقالیؒ کا فتویٰ ہے۔ "ومن لم يوجد عندهم وقت العشاء كما قيل يطلع الفجر قبل غيبوبة الشفق عندهم، أفتى البقاليؒ بعدم الوجوب عليهم لعدم السبب، وهو مختار صاحب الكنز كما يسقط غسل اليدين من الوضوء عن مقطوعهما من المرفقين، وأنكره الحلواني ثم وافقه" (۳)۔

میرے نزدیک بقالیؒ کی اس عبارت پر کہ وقت سببِ وجوب ہے، کچھ اور بھی اشکالات ہیں:

۱-وقت جس کا سبب یا علامت ہونا محض دلیل ظنی سے ثابت ہے اس کو نماز کی متواتر الثبوت خمسیت کو ختم کرنے کے لیے حجت بنایا جاتا ہے جو کہ صحیح نہیں ہے۔

۲-لیلۃ الاسراء میں جو خمسین صلوٰۃ فرض ہوئیں اور آخر میں معاف ہو کر خمس صلوٰۃ رہ گئیں، بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ

۱- سورۂ بنی اسرائیل: ۷۸۔
۲- الدر مختار ۱/ ۲۶۷۔
۳- فتح القدیر ۱/ ۱۹۷۔

ان سے مراد خمس اوقات ہیں، کیونکہ ہم اوقات میں تو خمسیت پاتے ہیں صلوٰۃ میں نہیں پاتے، معراج میں صلوٰۃ کا عدد گیارہ کا فرض ہوا پانچ کا نہیں، "فرضت الصلوة ليلة الإسراء ركعتين ركعتين إلا المغرب" (۱) نیز بعد کو حضر میں دو، دو کا مزید اضافہ کیا گیا ہے، "ثم زيدت بعد الهجرة إلا الصبح" (۲) یہ اضافہ اوقات میں نہیں نماز میں کیا گیا ہے۔

تو کیا ایک مرتبہ معاف کرا کے دوبارہ بالکل وجوب کا حکم نہ ہونا اس کا کوئی قائل نہیں ہے؟ لہذا خمس اوقات کی بات ہی صحیح معلوم ہوتی ہے تو اگر اس کو صحیح تسلیم کر لیا جاتا ہے تو اس صورت میں اوقات کا خود اپنے لیے سبب وجوب ہونا لازم آتا ہے جو صحیح نہیں ہے بلکہ غلط ہے۔

۳- یہ حقیقت ہے کہ ہر رکعت ایک مستقل نماز ہے۔"إن كل ركعة صلوٰة"(۳) اور یہ بھی حقیقت ہے کہ اس کی ادائیگی رکعۃً، رکعۃً ممنوع ہے۔"نهیٰ رسول الله ﷺ عن الصلوٰة ركعة ركعة"۔ بلکہ شفعۃً شفعۃً ادا کرنا ضروری ہے، کیونکہ اس کی فرضیت ہی دو دو رکعت ہوئی ہے۔ "الصلوٰة فرضت ليلة الإسراء ركعتين ركعتين إلا المغرب، ثم زيدت بعد الهجرة إلا الصبح" (۴) اور فقہاء کا یہ اصول ہے کہ وجوبِ نماز کا تکرار وجوبِ اوقات کی وجہ سے ہوتا ہے، مثلاً ظہر اصولاً اپنے وقت پر فرض ہوتی ہے اور اصلاً دو رکعت ہوتی ہے، لیکن اس میں بعد کو جو دو رکعتوں کا اضافہ کیا گیا ہے تو کیا اس کا موجب بھی یہی ظہر کا وقت ہے۔ اصولاً تو اس کے لیے کوئی اور مستقل وقت ہونا چاہئے تھا، کیونکہ یہ دو رکعتیں خود ہی ایک مستقلِ نماز ہیں، لیکن ایسا کوئی نہیں کہتا، سب ان کو ظہر ہی کہتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ وقت کو دو اور چار سے بحث نہیں شریعت نے جتنی نمازیں اس میں فرض کر دیں وہ ان کی ادائےگی کا محل بن جائے گا، اس وجہ سے صحیح بات یہی معلوم ہوتی ہے کہ وقت سببِ وجوب نہیں ہے۔

۴- وقت اس لیے بھی سبب وجوب نہیں ہے کہ اگر یہ سبب وجوب ہی ہوتا تو اس کو نمازوں سے مقدم ہونا چاہئے تھا حالاں کہ تمام احادیث اس پر متفق ہیں کہ اوقات کا تعین فرضیتِ نماز کے اگلے دن ہوا ہے۔

۵- اور اس لیے بھی اس کو سبب وجوب نہیں کہا جاسکتا، کیونکہ کلام اللہ میں اس کے علاوہ ایک اور سبب کا تذکرہ بھی

۱- نیل الاوطار۔
۲- نیل الاوطار ۱/ ۳۰۹۔
۳- ہدایہ ص ۱۰۷۔
۴- نیل الاوطار ۱/ ۳۰۹۔

موجود، یعنی ذکر کا، ''قال الله تعالیٰ: أقم الصلوٰة لذکري''(۱)، کیا ایک نماز کے لیے ایک وقت میں دو سبب موجب ہو سکتے ہیں؟

ان وجوہات کی بنا پر وقت کو سببِ وجوب قرار دینا خدشہ سے خالی نہیں ہے۔ اگر وقت سبب وجوب نہیں ہے تو کیا اس کو علامت سمجھا جائے، جیسا کہ محقق ابن ہمامؒ کی رائے ہے وہ فرماتے ہیں: ''جعل الوقت علامة علی الوجوب الخفي الثابت في نفس الأمر'' پھر کچھ آگے چل کر الخفی الثابت کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ''هو ما تواطئت أخبار الإسراء من فرض الله تعالیٰ الصلوٰة خمساً بعد ما أمروا أولاً بخمسين ثم استقر الأمر علی الخمس شرعاً عاماً لأهل الاٰفاق، لا تفصيل فيه بين أهل العلم'' (۲)۔

گو اس تشریح پر بظاہر یہ اشکال ہوتا ہے کہ احکام ومسائل کی بہت سی ایسی صورتیں ہیں جن میں نماز کی فرضیت ساقط ہو جاتی ہے، اس لیے حضرت محقق ابن ہمامؒ کا شرعاً عاماً فرمانا صحیح نہیں ہے کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ عورتوں کے بعض ایام میں فرضیت نماز ساقط ہو جاتی ہے۔ نیز قصر کی بنا پر دو رکعتیں ساقط ہو جاتی ہیں۔ نیز حالتِ محاربہ میں دو رکعتوں میں ہیئت کذائی ساقط ہو جاتی ہے۔ وغیرہ ذالک، لیکن بغور دیکھنے سے یہ اشکال صحیح نہیں معلوم ہوتا، کیونکہ ان تمام صورتوں میں فرضیتِ نماز حکماً ساقط کی جاتی ہے حقیقۃً ساقط نہیں ہوتی۔

البتہ وقت کو علامت تسلیم کرنے سے ایک اور مسئلہ اٹھ کھڑا ہوتا ہے کہ ہوائی جہازوں کے مذکورہ بالا حالات میں وجوبِ نماز کا علم کس طرح حاصل ہو۔ علامہ شامیؒ نے اس کا حل تجویز فرمایا ہے: ''إنا لا نسلم لزوم وجوب السبب حقيقة بل يکفي تقديره کمافي أيام الدجال'' (۳)۔

لیکن سوال یہ ہے کہ اس تقدیر و انداز کا معیار کیا ہونا چاہئے، کیونکہ فضا میں جو وقت گذر رہا ہے وہ امتداد کی وجہ سے قابلِ اعتماد نہیں ہے، کیونکہ اس کا ایک وقت نمازوں کے متعدد اوقات پر چھایا ہوا ہے اس سلسلے میں گو فقہاء کی کوئی تشریح نظر سے نہیں گذری لیکن ان کا میلان بظاہر اس طرف معلوم ہوتا ہے کہ مقاماتِ قریبہ کے اوقات کو معیار بنایا جائے، علامہ شامیؒ ایک حوالہ سے لکھتے ہیں: ''أن يکون وقت العشاء في حقهم بقدر ما يغيب فيه الشفق في أقرب البلاد

۱- سورۂ طٰہٰ: ۱۴۔
۲- فتح القدیر ۱/ ۱۹۷۔
۳- شامی ۱/ ۲۶۶۔

إلیھم"(۱)،مگر دشواری یہ ہے کہ ہوائی جہاز چونکہ فضاء میں اڑتا ہے اس لیے وہاں مقاماتِ قریبہ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، البتہ زمین کو فضا کا مقام سمجھا جاسکتا ہے۔

لیکن اس صورت میں یہ اشکال واقع ہوتا ہے کہ زمین بھی اختلاف اوقات سے خالی نہیں ہے مثلاً لینن گراڈ میں چھ مہینہ کا دن اور چھ مہینہ کی رات ہوتی ہے۔ یا ماسکو میں ۲۳/جون کو ۲۳/گھنٹہ کا دن اور ایک گھنٹہ کی رات ہوتی ہے اور ۲۳/دسمبر کو اس کے برعکس ہوتا ہے،اس لیے ان مقامات میں خود ہی تقدیر و انداز کی ضرورت درپیش رہتی ہے یہ معیار کس طرح بن سکتے ہیں۔

آخری صورت یہ ہے کہ زمین کی مخصوص سطح کے اوقات کو تقدیر و اندازہ کا معیار قرار دیا جائے جو عموماً ۱۲ گھنٹہ کا دن اور ۱۲ گھنٹہ کی رات پر مشتمل ہوتے ہیں یہ آخری صورت ہی بچند وجوہ صحیح معلوم ہوتی ہے:

۱–اوقاتِ عالم میں یہ اوقات سب سے زیادہ معتدل ہیں۔

۲–قیاس یہ ہے کہ "لیلۃ الاسراء" میں انہیں اوقات کو بنیاد قرار دے کر نمازیں فرض کی گئی تھیں، کیونکہ آں حضرت علیہ ارشاد فرماتے ہیں:"فرضت بخمسین صلوٰۃ في کل یوم"(۲)،یہ ارشاد "لیلۃ الإسراء" کے موقع کا ہے،اسی موقع کا حضرت موسیٰ علیہ السلام کا یہ ارشاد ہے:"إن أمتک لا تستطیع خمسین صلوات کل یوم واني واللہ قد جربت الناس قبلک"(۳)،ان دو عظیم پیغمبروں (علیہما السلام) نے کل یوم کے لفظ سے جو مراد لیا ہے یقیناً اسی کو فرضیت نماز کا کل یوم ہونا چاہئے اور معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام مصر و فلسطین کا یوم اور جناب رسول اللہ علیہ حجاز کا یوم ارشاد فرما رہے ہیں،اس لیے اوقاتِ نماز کے واسطے سرزمین انبیاء علیہم السلام کے اوقات کو تقدیر و اندازہ کا معیار بنانا نہ صرف یہ کہ بہتر ہے بلکہ اقرب إلی اللہ ہے،ہم فضاء کے اوقات کو اس لئے بھی اپنے واسطے معیار نہیں بنا سکتے، کیونکہ یہ ہماری فطرت کے خلاف ہے، ہماری فطرت یہ ہے کہ "ولکم في الأرض مستقر ومتاع إلی حین"(۴)،زمین چونکہ ہمارا مستقر ہے،اس لیے زمین ہی کے اوقات ہمارے لیے معیار کا کام دے سکتے ہیں۔بنا بریں احقر کی رائے یہ ہے کہ ہم خواہ چاند پر ہوں یا راکٹ اور ہوائی جہاز میں یا لینن گراڈ اور ماسکو میں ہر جگہ ہم کو ۱۲ گھنٹے کا دن اور ۱۲/گھنٹے کی رات کے

۱– رد المحتار ۱/۲۴۳۔
۲– مشکوۃ باب المعراج/۵۲۸۔
۳– مشکوۃ باب المعراج/۵۲۸۔
۴– سورۂ بقرہ:۳۶۔

معتدل نظام الاوقات کے مطابق نمازیں ادا کرنی چاہئیں۔فقط واللہ اعلم وعلمہ اتم واحکم۔

محمد مقبول الرحمٰن سیوہاروی (خادم ادارہ المباحث الفقہیہ دہلی)

الجواب وباللہ التوفیق:

محترم المقام زادت مکارمکم ومعالیکم　　　　السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

جناب کا تحریر کردہ جواب بغور پڑھا، جناب نے خلاصہ جواب جو اخیر میں بایں الفاظ (ہم خواہ چاند پر ہوں یا راکٹ میں ہوں یا ہوائی جہاز میں یا لینن گراڈ اور ماسکو میں ہر جگہ ہم کو ۱۲ گھنٹے کے دن اور ۱۲ گھنٹے کی رات کے معتدل نظام الاوقات کے مطابق نمازیں ادا کرنی چاہئیں) تحریر فرمایا ہے، اس سے ہمیں پورا اتفاق ہے اور وہ بالکل صحیح ہے۔

سوال میں مذکورہ حالات کے اندر انہی ایام معتدلہ کے اوقات کا لحاظ کر کے جس وقت سے سفر کریں گے اس وقت سے ہر چوبیس گھنٹہ میں پانچ نمازوں کے فصل کا اندازہ کر کے نماز پنجگانہ ادا کرتے رہیں گے، اور باقی اس خلاصہ سے اوپر جو اشکال و جواب اور طویل بحث وتمحیص پیدا ہوگئی ہے، اس کا بڑا سبب علت اور سبب کے اصطلاحی معنٰی کا ذہن سے ذہول کر جانا معلوم ہوتا ہے۔غالباً دونوں کو ایک اور متحد المعنٰی سمجھ لیا گیا ہے۔حالانکہ علت اور سبب دونوں دو مختلف اور الگ الگ چیزیں ہیں، علت کے انتفاء سے معلول کا منتفی ہوجانا ضروری ہوجاتا ہے، اسی طرح علت سے معلول کا تخلف بیشک ممکن نہیں ہوتا اور نہ علت میں تعدد وتوارد ہوسکتا ہے۔بخلاف سبب کے کہ اسباب میں تعدد وتوارد بھی ہوسکتا ہے اور سبب کے انتفاء سے مسبب کا انتفاء لازم نہیں آتا ہے۔نیز مسبب کا تخلف بھی سبب سے ممکن ہے جہاں کہیں اس کے خلاف نظر آتا ہے وہاں سیاق وسباق کے قرائن سے سبب سے مراد علت ہوتی ہے۔اور یہ اطلاق بھی شائع وذائع ہے اور اس عرفی اطلاق کو بھی ممکن ہے کہ اس خلط میں دخل ہو۔یہی حکم اور حال علامت کا بھی ہے کہ اس میں بھی تعدد وتوارد اور تخلف سب ہوسکتا ہے، نماز پنجگانہ میں اصل علت وجوب کی حکم باری تعالیٰ عزوجل ہے اور وہ حکم ان اوقات پنجگانہ میں متوجہ ہوتا ہے، لیکن چونکہ انتہائی خفی ہوتا ہے اس لیے اس پر شریعتِ غراء اور دربار رسالت علی صاحبھا الصلوٰۃ والسلام نے کچھ اسباب وعلامات مقرر فرما کر ہماری رہبری فرمادی ہے جن سے حکمِ خداوندی (جو اصل علتِ وجوب ہے) کا پتہ چل جاتا ہے اور امتثالِ امر سہل ہوجاتا ہے۔

پھر بعض کتب مذہب میں جو اوقات کو سبب اور بعض میں علامت ذکر کیا گیا ہے، ان میں نزاع حقیقی نہیں ہے محض تعبیر وعنوان کا فرق ہے جو اختلافِ لفظی سے آگے نہیں ہے اور مآل ان دونوں کا قریب قریب ایک ہی ہے۔

اسی طرح شمسی حرکات کے اندر جو انحصار کیا گیا ہے وہ انحصار بھی صحیح نہیں ہے، اس لیے کہ جس طرح دلوک شمس کا ذکر ہے اسی طرح غسق لیل اور قرآن الفجر بھی مذکور ہے: "أقم الصلوة لدلوک الشمس إلى غسق الليل وقرآن الفجر" (۱) نیز روایات صحیحہ میں عشاء کے وقت کے بارے میں آتا ہے کہ تیسری رات کا چاند جس وقت غروب ہوتا ہے اسی وقت آپ ﷺ عشاء کی نماز ادا فرماتے: "عن النعمان بن بشیرؓ قال: أنا أعلم الناس بوقت هذه الصلوة كان رسول الله ﷺ يصليها لسقوط القمر الثالثة" (۲)، اسی طرح یہ بھی آتا ہے کہ شفق کی غیبوبت سے وقت عشاء شروع ہوتا ہے۔ "وأول وقت العشاء إذا غاب الشفق" (۳)، اسی طرح نماز فجر کے وقت کے بارے میں وارد ہے کہ جس رات کی تاریکی میں افق کے اندر سفیدی نمایاں ہونے لگے اس وقت سے فجر کا وقت شروع ہوجاتا ہے۔ "وقت الفجر من الصبح الصادق وهو البياض المنتشر في الأفق إلى طلوع الشمس" (۴)، یہ سب بھی اوقات کی نشاندہی میں وارد ہے۔

غرض جناب کی مساعی اور کاوشیں ایک علمی سعی وکوشش ہے جو بلا ریب قابل ستائش وتحسین ہے۔ اور خلاصہ جواب جو اخیر جواب میں مذکور ہے وہ بلا ریب صحیح و درست ہے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

الجواب صحیح العبد محمود غفرلہٗ

جن ملکوں میں بعض نمازوں کا وقت ہی نہیں ملتا وہاں ادائیگی کی کیا صورت ہوگی؟

۱- یورپ کے بعض ملکوں میں ایام سرما کی مخصوص تاریخوں کے اندر نماز عصر کا وقت داخل ہی نہیں ہوتا، نہ سیدنا امام اعظمؒ کے نزدیک نہ صاحبین وائمہ ثلاثہ کے نزدیک، یعنی کسی چیز کا سایہ سایہ اصلی کے علاوہ ایک مثل نہیں ہو پاتا ہے کہ سورج غروب ہوجاتا ہے دریں صورت غروب آفتاب کے بعد نماز عصر پڑھی جائے گی یا پہلے؟ اور اس کی ادائے گی بنیت ادا ہوگی یا قضا یا پھر وہ نماز فرض ہی نہ ہوگی؟

۱- سورۂ بنی اسرائیل: ۷۸۔
۲- ترمذی شریف ۱/ ۲۳، باب ماجاء فی وقت صلوٰۃ العشاء الآخرۃ۔
۳- ھدایہ اولین ۱/ ۸۲، کتاب الصلوٰۃ۔
۴- فتاویٰ عالمگیری ۱/ ۵۱، کتاب الصلوٰۃ۔

اگراس میں ائمہ اسلام کا اختلاف ہوتواس کی وضاحت بھی ضروری ہے۔

۲-ہر سال یہاں کم وبیش ۶۵ راتیں ایسی آتی ہیں کہ سیدنا امام اعظم کے مسلک میں نمازِ عشاء کا وقت ہی داخل نہیں ہوتا ہے، کیونکہ افق غربی سے نہ شفق ابیض زائل ہوتی ہے نہ ساری رات سورج ۱۸ درجے سے نیچے ہوتا ہے (۱۲، اور ۱۸ کے درمیان گردش کرتا ہے)، ایسی صورت میں احناف کے لیے نماز عشاء کی ادائیگی کی کیا صورت ہوگی؟ اس خاص مسئلہ میں قولِ صاحبین کی طرف امام ابوحنیفہؒ کی رجعت صحیح ہے؟ جیسا کہ ''فتح القدیر'' اور ''شامی'' وغیرہما میں ہے، اگر صحیح ہے تو کیا مذکورہ راتوں کے علاوہ بھی ضرورت صحیحہ (بہت کم وقت ہونا) ومصلحتِ شرعیہ ارتفاع نزاع بین المسلمین وغیرہما کے پیش نظر قول صاحبین رحمہما اللہ پر حنفیوں کو عمل کرنا جائز ہے؟

۳-مذکورہ راتوں میں جب ساری رات سورج ۱۸ درجے سے نیچے نہیں ہوتا صبح کاذب ہوتی ہی نہیں تو ''إمساک عن الأکل والشرب للصوم'' کا کیا حکم ہوگا؟

فیروز احمد (سکریٹری نیوزی لینڈ اسلامک سوسائٹی)

الجواب وباللہ التوفیق:

۱، ۲-جن ملکوں میں ایام سرما کی چند مخصوص تاریخوں میں آفتاب کے نصف دائرہ سے آگے بڑھنے کے بعد سایہ اصلی کے علاوہ ایک مثل بھی پورا نہیں ہوتا کہ آفتاب غروب ہوجاتا ہے، یعنی عصر کا وقت بروایاتِ حنفیہ نہیں ملتا وہاں بھی نماز ادا کرنا فرض رہے گا اور عمل کی صورت یہ ہوگی کہ جب آفتاب ڈھل جائے یعنی اس کا سایہ مغرب سے مشرق کی جانب منتقل ہونے لگے اسی وقت ظہر کی نماز ادا کرلی جائے پھر بغیر لحاظ سایہ اصلی اور بغیر لحاظ سایہ کے مثلین ومثلِ واحد غروب ہونے سے پہلے نمازِ عصر پڑھ لی جائے بقضا نہ کی جائے، بلکہ ادا کی نیت سے پڑھی جائے پھر آفتاب غروب ہوتے ہی مغرب کی نماز پڑھ لی جایا کرے۔

اسی طرح غروب آفتاب کے بعد جب شفق احمر غائب ہوجائے تو نماز عشاء پڑھ لی جایا کرے اور اگر ایسا ہو کہ شفقِ احمر بھی غروب نہیں ہوتی یہاں تک کہ مشرقی جانب میں صبح کی روشنی نظر آجاتی ہو تو شفقِ احمر کے باقی رہتے ہوئے بھی نمازِ عشاء بنیت ادا پڑھ لی جائے۔

اس مسئلہ کی بہت اچھی بحث صاحب ردالمحتار نے فاقد وقت عشاء کے تحت کی ہے اور بنیت ادا کو ترجیح دی ہے اور

یہ قول اشبہ بالفقہ ہے اور اس کی مزید تائید احقر کی اگلی گفتگو سے بھی ہو جائے گی، پھر آفتاب طلوع ہونے سے کچھ قبل نماز فجر پڑھ لی جایا کرے۔

اس طرح ۲۴ رگھنٹہ کی پانچوں نمازیں بنیت ادا پڑھ لی جایا کریں، یہ طریقہ عمل حضرت امام ابوحنیفہؒ کے خلاف نہ ہوگا، اس کی وضاحت اگلی تقریر سے بخوبی ہو جائے گی۔

اسی طرح جب عصر کا وقت نہ ملنے کی وجہ سے اور عشاء کا وقت نہ ملنے کی وجہ سے اوپر لکھے ہوئے قاعدہ کے مطابق عصر وعشاء پڑھیں گے تو قضاء کی نیت نہ کریں گے بلکہ ادا ہی کی نیت سے پڑھیں گے۔

اس لیے کہ فرض نمازوں کے اوقات کی ابتداء وانتہاء اور یہ تعیینِ اوقات نمازوں کے فرض ہونے کی علت نہیں کہ ان کے منتفی ہونے سے نماز (کا حکم) ہی منتفی ہو جائے بلکہ اوقات کی یہ ابتداء وانتہاء اور یہ تعیین صرف علامات واسباب کے درجے کی چیزیں ہیں اور اسباب وعلامات کے منتفی ہونے سے اصل حکم مسبب منتفی نہیں ہوتا، جیسا کہ "فتح القدیر" وغیرہ میں مکمل بحث موجود ہے البتہ علت کے منتفی ہونے سے معلول حکم منتفی ہوتا ہے۔

نماز پنج گانہ کے فرض ہونے کی اصل علت نصوص قرآنیہ مطلقہ ہیں مثلاً: "اقیموا الصلاۃ" (۱) وغیرہا اور اس کی شرح اس حدیث پاک میں ہے: "إن اللہ تعالیٰ فرض علی کل مسلم ومسلمۃ فی کل یوم ولیلۃ خمس صلوٰت" (۲) اور اس حدیث جیسی اور احادیث میں بھی ہے اور یہ سب مشاہیر احادیث رواۃ الصحاح میں سے ہیں۔

اگر اس مسئلہ کی پوری بحث تفصیل کے ساتھ دیکھنا ہو تو ۱۹۸۳ء کے لندن کے سمینار کے موقع میں جو جناب عبداللہ مغرم مامور فی المملکۃ السعودیہ کی نگرانی میں ہوا تھا، اس کے تفصیلی جواب میں اس کی تفصیل بصیرت کے ساتھ ملے گی یہ تفصیلی جواب عربی اور اردو دونوں زبان میں ہے، عربی جواب دارالعلوم کے رسالہ الدراسۃ میں بھی شائع ہو چکا ہے اور اردو جواب احقر کے پاس سے غیر مطبوعہ مل سکتا ہے۔

ان احکام کی تائید حدیث دجال سے بھی ہوتی ہے، حدیث دجال صحاح میں مروی ہے، خاص کر مسلم شریف میں بہت تفصیل سے مذکور ہے، حدیث بہت طویل ہے صرف بقدر ضرورت یہاں نقل کی جاتی ہے، دجال چالیس یوم تک رہے گا، اس کا پہلا دن چھ ماہ کا ہوگا پھر کم ہوتے ہوتے مثل شررہ کے ہو جائے گا۔

۱- سورۂ بقرہ: ۴۳۔

۲- "وفی أبی داؤد: جاء رجل إلی رسول اللہ ﷺ وھو...... فإذا ھو سئل عن الاسلام فقال رسول اللہ ﷺ: خمس صلوات فی الیوم واللیلۃ" (ابوداؤد ۱/۶۰ احدیث نمبر ۳۹۱، کتاب الصلاۃ)۔

"عن أبي أمامة الباهليؓ قال رسول اللہ ﷺ: وان إيامه (أى أيام دجال) أربعون يوماً إلى قوله وآخر أيامه كالشررة يصبح أحدكم على باب المدينة، فلا يبلغ بابها الآخر حتى يمسي، فقيل له كيف نصلي يارسول الله في تلك الأيام القصار! قال: تقدرون الصلوة، كما تقدرون في هذه الأيام الطوال، ثم صلوا، أو كما قال"

آپ کے فرمان "تقدرون الصلوۃ الخ" کا مفہوم یہ ہے کہ جس طرح چھ ماہ اور دوسرے بڑے دنوں میں اندازہ سے فرق کر کے پانچوں نمازیں پڑھو گے، اسی طرح چھوٹے چھوٹے دنوں میں بھی اندازہ سے فرق کر کے تمام نماز پنج گانہ پڑھتے رہنا۔

حاصل یہ نکلا کہ جس طرح چھوٹے سے چھوٹے دن میں دن کی سب نمازیں اندازہ کر کے پڑھنا خواہ تھوڑا ہی تھوڑا فصل ووقفہ کر کے ہو بلکہ اگر متصلا دن کی نمازیں اندازہ کر کے پڑھنی پڑیں تب بھی پڑھتے رہنا (اسی طرح سے چھوٹی سے چھوٹی راتوں میں بھی رات کی سب نمازیں اندازہ کر کے، خواہ متصلا تینوں نمازیں رات کی پڑھنی پڑیں یا کچھ وقفہ کے ساتھ پڑیں پڑھتے رہنا)۔

اس میں نکتہ یہ ہے کہ ۲۴ رگھنٹہ میں اللہ تعالیٰ نے جو پانچ نمازیں فرض فرمائی ہیں ان کی تعمیل ہوتی رہے اور رشتہ عبودیت الی المعبود صحیح و مستحکم رہے۔

نوٹ: ابتداء وقت عصر میں اور ابتداء وقت عشاء میں ایک قول امام اعظمؒ سے بھی صاحبین کے قول کے مطابق ملتا ہے اور اس پر عمل کر لینے کی گنجائش بھی ہے، لیکن جہاں امام کا قول صراحۃً ملتا ہے اور اس پر عمل کرنے میں تعذر وغیرہ بھی نہیں ہوتا ہو وہاں اختلاف سے محفوظ رہنے کی خاطر امام کے ہی قول پر فتویٰ ہوتا ہے باوجود اس کے اگر کوئی عذر شرعی کی وجہ سے صاحبین کے قول پر عمل کرے تو مسلکِ حنفیت سے خارج شمار نہیں کیا جائے گا، باقی صورتِ مسئولہ میں مذکورہ حالات کے تحت اس مسئلہ میں بحث کی ضرورت ہی نہیں ہے کما لا یخفی۔

کیونکہ یہاں پر تو امام کے قول کے مطابق ابتداء عصر اور ابتداء عشاء کا وقت ظاہر و محسوس ہی نہیں ہوتا کہ مفتیٰ بہ اور غیر مفتیٰ بہ قول کی بحث پیدا ہو سکے۔

ایک شبہ اور اس کا ازالہ:

شبہ یہ ہے کہ بعض علماء متاخرین نے فرمایا ہے کہ جس جگہ عشاء کا وقت داخل ہی نہیں ہوتا ہو یا مفقود رہتا ہو ملتا نہ ہو

وہاں عشاء کی نماز فرض نہ ہوگی، جیسا کہ اہل بلغاریہ پر اگر کوئی کہے جیسا کہ بعض علماء نے کہا ہے اسی پر قیاس کرکے کہ یہی حکم اس جگہ کا بھی ہوگا جہاں عصر کا وقت داخل نہ ہوتا ہو کہ وہاں عصر فرض ہی نہ ہوگی اور وجوب ادا کا حکم متوجہ نہ ہوگا، اس طرح کا حکم سمجھنا اور اس طرح کہنا صحیح نہیں ہے، بلکہ تعبیر اس طرح ہونی چاہئے کہ ان مقامات میں عصر وعشاء کے وقت کا ادراک اور احساس نہیں ہوتا ہے اور یہ اوقات محسوس وظاہر نہیں ہوتے ہیں اور یہ کہنا کہ وہاں عصر وعشاء کی نماز فرض ہی نہ ہوگی تو اس قول کا مبنی وہی غلطی ہے کہ ان اسباب وعلامات کو علت فرضیت سمجھ لیا گیا ہے، حالانکہ یہ اسباب علت فرضیت نہیں ہیں جیسا کہ بعض محققین متقدمین کے قضا وادا کے کلام میں گذر چکا ہے کہ علت فرضیت تو مخصوص آیات قرآنیہ ہیں اور قرآن پاک کلام الٰہی ہے اور کلام تربیت ہے اور تدریجی طریقہ اصلاح کا کلام ہے، اسی نماز کے حکم میں غور فرمایئے ایک جگہ بہت مختصر جامع کلمہ فقط "أقیموا الصلوٰۃ" فرمادیا گیا ہے پھر ایک جگہ ذرا وضاحت فرمائی گئی کہ "أقم الصلوٰۃ لدلوک الشمس إلی غسق اللیل وقرآن الفجر إن قرآن الفجر کان مشھوداً" (۱) فرمایا گیا اور اس میں پانچوں نمازوں کو مجمل طور پر بیان فرمایا گیا اسی کی ترجمانی حضور پاک ﷺ نے "إن اللہ فرض علی کل مسلم ومسلمۃ خمس صلوٰۃ فی کل یوم ولیلۃ" والی حدیث میں فرمائی، یہی آیت وحدیث حکم فرضیت صلوٰۃ کی اصل علت ہیں اور اس آیت وحدیث سے معلوم ہوگیا کہ جب تک ۲۴ گھنٹہ میں یوم ولیل بنتا رہے، اس وقت تک یوم ولیل کی مقدار کم ہو یا زیادہ ان میں یہ پانچ نمازیں پڑھی جائیں گی۔

لہٰذا اب یہ کسی کا کہنا کہ عصر کا وقت یا عشاء کا وقت نظر نہ آیا تو وہ نماز فرض ہی نہ رہی بداہۃً غلط ہو جائے گا جمہور متقدمین ائمہ مجتہدین کے نزدیک یہی راجح ہے اور ایام معتدلہ میں جہاں سورج کا طلوع وغروب معتدل رہتا ہو وہاں پانچوں نمازوں کے وقت کی ابتداء اور انتہاء امامت جبرئیل والی حدیث میں بتلادی گئی اور جہاں طلوع وغروب ۲۴ گھنٹہ میں یومیہ نہ ہوتا ہو بلکہ زائد مقدار تک طلوع یا غروب رہ جاتا ہو وہاں کے لیے حدیث دجال میں حکم بتلا دیا گیا۔

پھر تمام نماز کے اوقات کو تھوڑا تھوڑا کرکے حسب مصلحت وحکمت تربیت قرآن پاک کے مختلف مقامات میں بیان فرمادیا گیا، چنانچہ دو ڈھائی سو آیات سے زیادہ آیات میں نماز سے متعلق اوقات واحکام بیان فرمائے گئے اور نمازوں کی غرض وغایت "وأقم الصلوٰۃ لذکری" (۲) میں بیان فرمادی گئی کہ میری یاد کرنے اور یاد رکھنے کے لیے اور مجھ سے رشتہ

۱- سورۂ بنی اسرائیل: ۷۸۔

۲- سورۂ طٰہٰ: ۱۴۔

عبودیت محکم واستوار رکھنے کے لیے نماز پڑھا کرو۔

اس آیت کریمہ کے اشارہ سے بھی نیز حدیث دجال والی روایت سے یہ حکم مستنبط ہوتا ہے کہ ایام معتدلہ میں دو نمازوں کے درمیان جس انداز کا فرق وبعد ہوتا ہے اسی انداز کا فرق وبعد طویل ایام میں قائم کر کے ۲۴ رگھنٹہ کی ایک مقدار غروب اول سے شمار کر کے نصف اول کو شب قرار دے کر اس میں رات کی تینوں نمازوں مغرب، عشاء اور فجر کو جہر سے پڑھ لیا کریں اور نصف ثانی کو یوم قرار دے کر اس میں دن کی نمازیں ظہر اور عصر کو سراً پڑھ لیا کریں تا کہ خالق کائنات کے ساتھ رشتہ عبودیت برابر قائم رہے۔

غرض ابتداء عصر وعشاء یا ابتداء فجر کا وقت الگ الگ اور جدا جدا ظاہر نہ ہونے کے باوجود مذکورہ بالا دلائل کے مطابق دونوں نمازیں عشاء مع الوتر اور فجر بنیت ادا پڑھنا فرض رہے گا، یہیں سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ آفتاب کا ۱۸ ردرجہ وغیرہ زیر افق ہونا اداء نماز کے صحیح یا غیر صحیح ہونے کے لیے مدار نہیں ہے، بلکہ ان ہی دلائل سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ تمام عبادات محضہ کی ادائیگی صحت کا مدار علوم اہل فلکیات اور علوم اہل ہندسہ کی تحقیقات اور تدقیقات پر نہیں ہے اور نہ ان کو اصل نصوص اور شرعی علامات واسباب پر فوقیت دی جاسکتی ہے، بلکہ اصل مدار اور فوقیت صرف اور صرف نصوص قرآنیہ اور حدیث پر ہے، بلکہ شرعی علامات واسباب بھی ثانوی درجہ کی چیزیں ہیں اور ماہرین فلکیات اور ماہرین ہندسیات کا صرف تابعیت وفرعیت کے درجہ میں اطمینان قلب اور تسکین قلبی کے لیے لحاظ کریں تو مضائقہ نہیں اور یہ بھی صرف میدانی علاقوں کے ان خطوں میں جہاں طلوع وغروب وغیرہ متعادل ومنتظم اور تدریجی ہوتے ہیں بشرطیکہ ان کا حساب وغیرہ نصوص وعلامات واسباب شرعیہ کے مطابق ہو اور مروجہ نقشہ بھی ان اسباب وعلامات کے موافق ہو نیز گھڑیاں بھی ان نقشوں کے مطابق ہوں ورنہ ان چیزوں کی کوئی شرعی حیثیت نہ ہوگی اور ان کا شرعاً کوئی اعتبار نہ ہوگا جیسا کہ آیت کریمہ:

"یسئلونک عن الأهلة قل هي مواقيت للناس والحج"(۱) **"ويسئلونک عن الروح قل الروح من أمر ربي وما أوتيتم من العلم إلا قليلاً"** (۲) کے اشارہ سے، نیز حدیث پاک: **"نحن أمة أمية لا نكتب ولا نحسب" أوكما قال عليه السلام"** (۳)۔

اور اس جیسی دوسری احادیث صحاح سے معلوم ہوتا ہے، پس عرض البلدتین سے، بلکہ اس کے کچھ قبل ہی سے جہاں

۱- سورۂ بقرہ:۱۸۹۔
۲- سورۂ بنی اسرائیل:۸۵۔
۳- اس حدیث کی تخریج وتحقیق رویت ہلال او راختلاف مطالع کے جواب کے ضمن میں گذر چکی ہے)(مرتب)۔

سے طلوع وغروب کے اوقات اعتدال او رتدریج کے ساتھ نہ ہوں بلکہ غیر معتدل یا غیر تدریجی ہوجائیں وہاں اس حساب کو "لیطمئن قلبی" کے درجہ میں بھی علی الاطلاق اعتبار کرنا صحیح نہ ہوگا، جیسا کہ برطانیہ اوراس سے شمال کی سمت کے اکثر ممالک ومقامات جن میں طلوع وغروب کے اوقات تدریجی تفاوت اوراعتدال کے ساتھ نہ ہوں ایسے ممالک اورخطوں میں صرف نصوص اورشرعی علامات واسباب منصوصہ پر صحت عباداتِ محضہ کامدار رکھا جائے گا، بلکہ اگر شرعی علامات واسباب بھی ظاہر ومحسوس نہ ہوں تو محض نصوصِ قرآنیہ وحدیثیہ پر مدار رکھ کراندازہ وتحری سے عمل کرلینا کافی اور صحیح ہوجائے گا۔

۳-مذکورہ بالا دلائل سے یہ بات بھی واضح ہوگئی کہ "إمساک عن الأکل والشرب للصوم" میں بھی ۱۸ / ۱۲ / درجہ افق سے نیچے آفتاب کا ہونا شرط نہیں ہوگا۔

اورادائیگی صوم کی صحت کے لیے ان درجات سے نیچے آفتاب کے ہونے پر مدار نہ ہوگا، بلکہ شرعی علامات واسباب کاظہور جب تک سادہ فطری اصول مشاہدہ وغیرہ سے ہوتا رہے کہ غروب کے بعد افطار اور کھانے پینے اور مغرب وعشاء وتر کی نماز ادا کرلینے کے ساتھ اگر سحری کھانے اور فجر کی نماز پڑھنے کا وقت ملتا رہے تو گھڑیاں رکھ کراس کے مطابق انتظام کرکے عمل کرتے رہنا درست وصحیح ہوگا اور جب ان شرعی علامات واسباب کا ظہور سادہ فطری اصول سے بھی دشوار ومتعذر ہوجائے تو نصوص قرآنیہ واحادیثیہ پر مدار رکھ کرکہ وہ اصل ومتبوع اور علتِ احکام ہیں جیسا کہ ہم پہلے بھی کہہ آئے ہیں ان پر صحیح عمل کرلینا کہ وہ سارے عالم کے لیے مدارِ صحتِ اعمال اور مدارِ نجات ہیں کافی اوردرست رہے گا۔

پس ان نصوص واحادیث کا جو مفہوم قرون ثلثہ مشہود لہا بالخیر میں لیا گیا ہے اور جس کی تفصیل وتشریح جس طرح ائمہ اربعہ متقدمین ائمہ ہدیٰ نے کی ہے جن کے اہل حق ہونے پر اجماع سلف ہوچکا ہے، اسی تفصیل وتشریح کے مطابق عمل کرلینا کافی اوردرست ہوگا، اورعنداللہ مقبول ہوگا، جیسا کہ عرض البلدتین کے بعد جوں جوں شمال کی جانب بڑھیں گے یہی اصول معمول بہا اور صحیح ہوگا، پس جب شرعی علامات واسباب بالکل ظاہر نہ ہوں تو محض نصوص واحادیث کے حکم کے مطابق محض اندازہ اورتحری کرکے طلوع آفتاب سے پہلے ہر عمل کا انتظام کرکے اس پر عمل کرلیں۔

آپ کی تحریر کے مطابق تو آپ کے علاقہ اورخطے میں افطار وطعام نماز ہر چیز سے فارغ ہوکر طلوع آفتاب سے سوا گھنٹہ قبل سے تکمیل صوم کا موقع نظر آتا ہے، پس اسی کے مطابق عمل رکھنا عنداللہ مقبول ہوگا اور مدار نجات کے لئے کافی ہوگا۔

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

جن مقامات میں عشاء کا وقت نہیں ملتا وہاں نماز پڑھنے کا طریقہ؟

(الف) دنیا میں بعض مقامات ایسے ہیں کہ وہاں پر بعض موسموں میں بائیس، تیئیس گھنٹہ کا دن ہوتا ہے، ایک طرف سورج غروب ہوا کہ دوسری طرف سے ایک ڈیڑھ گھنٹہ کے بعد دن ہوجاتا ہے، وہاں پر مغرب تو پڑھ سکتے ہیں عشاء کا وقت نہیں ہوتا، اور فجر پڑھیں گے یا نہیں؟ نیز وہاں پر ظہر وعصر دن کے کون سے حصہ میں پڑھیں گے؟

نارتھ شال میں سیوون ناروے اور دوسرے جزیرے ہیں، وہاں پر ایک مسلمان بھائی خود رہا تھا اور اس نے خود وہاں پر دیکھا ہے، نیز وہاں پر ترک مسلمانوں کی مسجد ہے اور وہ لوگ نماز پڑھتے ہیں، مگر نہیں معلوم کہ کونسے وقت میں پڑھتے ہیں۔

(ب) نیز سردیوں میں رات لمبی ہوتی ہے، ایک دو گھنٹہ کے لیے سورج طلوع ہوجاتا ہے اور غروب ہوجاتا ہے، وہاں پر پانچوں نمازیں کس وقت پڑھیں گے؟

الجواب وبالله التوفيق:

(الف) اگر چہ دن ۲۲/ ۲۳ گھنٹہ کا ہوتا ہے مگر جب آفتاب کا طلوع وغروب روز ہوتا ہے تو غروب ہوتے ہی مغرب کی نماز پڑھ لیں اور طلوع ہونے سے کچھ پہلے فجر کی نماز پڑھ لیں۔ درمیان میں اگر چہ عشاء کا وقت نظر نہیں آتا، لیکن مغرب وفجر کے درمیان جب موقع ہو عشاء کی نماز بھی بلالحاظ جمع بین الصلوتین پڑھ لینا ضروری ہے، اگر چہ وقت کی تنگی وقلت سے سنن ونوافل کا موقع دو وقت نہ ملے مگر فرض، وتر پڑھ لینا چاہئے، مفتٰی بہ قول میں ایسا نہیں ہے کہ عشاء کی نماز ساقط ہوجائے۔

(ب) اسی طرح سردیوں میں بھی جب تک آفتاب روزانہ طلوع وغروب ہوتا رہے اگر چہ گھنٹہ دو گھنٹہ ہی کے لیے تو طلوع وغروب کی پوری مقدار کے نصفِ ثانی کے شروع ہوتے ہی ظہر پڑھ لیں اور غروب ہونے سے کچھ قبل عصر پڑھ لیں سنن ظہر کا وقت نہ ملے جب بھی فرض ضرور پڑھ لیا کریں، اتنی ہی مقدار کے یہ لوگ مکلّف ہیں، اس سے پورے عابد شمار ہوں گے۔

(ت) جہاں مسلسل کئی دن یا کئی ہفتہ یا ماہ آفتاب غروب نہیں ہوتا یا طلوع نہیں ہوتا وہاں بھی ۲۴ گھنٹہ کا ایک دورہ یومی ولیل (دن رات کا ایک چکر) متعین کر کے اس کے اجزاء میں پانچوں نمازیں ادا کریں گے اور نمازوں کے درمیان فصل و

فاصلہ کا وہی تناسب رکھیں گے جو یہاں معتدل ایام کے ملکوں میں ہوتا ہے (۱)۔

اور چوبیس گھنٹہ کا ایک دورہ یومی ولیلی معلوم کرنے کے لئے کہ اس کی ابتداء کب سے اور کس طرح کریں تو اس کا آسان اور سہل طریقہ یہی ہے کہ جس دن آفتاب غروب ہو کر طلوع نہ ہونا شروع ہو جائے بلکہ مسلسل غروب ہی رہے اس دن کے غروب سے ۲۴ رگھنٹہ تک کی مقدار کو پورے ایک دن ایک رات کی مقدار شمار کر کے اس میں حسب تصریح بالا پانچوں نمازیں ادا کریں، اور پھر اس ۲۴ گھنٹہ کے ختم ہونے پر دوسرا ۲۴ رگھنٹہ، پھر تیسرا ۲۴ رگھنٹہ مقرر کرتے جائیں اور ان سب میں مثل اول ۲۴ رگھنٹہ کے نصف اول رات قرار دے کر اس میں رات کی نمازیں اور نصف ثانی کو دن قرار دے کر دن کی نمازیں پڑھتے چلے جائیں، اور دن بڑا ہوتے ہی جس دن آفتاب طلوع ہو کر مسلسل طلوع رہے غروب نہ ہو تو اس میں پہلا دورہ مکمل کرنے کے لئے صرف ۱۲ رگھنٹہ کی مقدار پر ایک دورہ یومی ولیلی مکمل قرار دیں اور اس بارہ گھنٹہ میں دن کی نمازیں ادا کریں، اس بارہ گھنٹہ کا دورہ ختم ہونے کے بعد پھر ۲۴ر ۲۴ گھنٹہ کی مقدار کا دورہ یومی ولیلی (دن رات کا مجموعہ) مقرر کرتے جائیں اور اس کے نصف اول میں رات کی نمازیں (مغرب، عشا، فجر) پڑھتے جائیں اور نصف ثانی میں دن کی نمازیں (ظہر وعصر) پڑھتے جائیں۔فقط واللہ اعلم بالصواب

كتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

الجواب صحیح العبد محمود غفرلہ، سید احمد علی سعید مفتی دارالعلوم دیوبند

وہ مقامات جہاں شفق ابیض اسی طرح شفق احمر غائب نہیں ہوتی وہاں نماز وروزہ کا حکم:

وہ علاقہ جہاں پر شفق ابیض غائب نہ ہوئی اسی طرح جہاں پر شفق احمر بھی غائب نہیں ہوئی وہاں کے لئے فقہاء نے لکھا ہے کہ عشاء کی نماز کے لئے تقدیر کرے جیسا کہ درمختار میں ہے **فیقدر لهما** اور فجر کے متعلق لکھتے ہیں کہ فجر طلوع ہوئی ہے، **کبلغار فان فيها يطلع الفجر قبل غروب الشفق الخ** اس سے معلوم ہوا کہ جہاں پر عشاء کا وقت نہیں ہوتا وہاں پر طلوع فجر ہوتی ہے اس میں حسب ذیل سوالات وارد ہوتے ہیں امید ہے کہ ان کو حل فرمائیں گے۔

۱- قال الرملی فی شرح المنهاج ويجرى ذلک فيما لو مكثت الشمس عند قوم مدة الخ قال فی امداد الفتاوی قلت وكذلک يقدر لجميع الآجال كالصوم والزكوة والحج والعدة واجال البيع والسلم والاجارة وينظر ابتداء اليوم فيقدر كل فصل من الفصول الاربعة بحسب ما يكره كل يوم من الزيادة والنقص كذا فی كتب الائمة الشافعية، ونحن نقول بمثله اذا صل التقدير مقول به اجماعا فی الصلوة (شامی ۱/ ۲۴۴ کتاب الصلوۃ) (مرتب)۔

(الف) درمختار کی عبارت ہے "فیقدر لهما" علامہ شامیؒ بحث کرتے ہیں جس سے بظاہر یوں مفہوم ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک اقرب البلاد پر قیاس کر کے عمل کرنا غیر صحیح ہے، چنانچہ لکھتے ہیں: **بقي الكلام في معنى التقدير والذي يظهر من عبارة الفيض أن المراد أنه يجب قضاء العشاء، بأن يقدر أنّ الوقت أعني الوجوب، قد وجد كما يقدر وجوده في أيام الدجال على ماياتي، لانه لايجب بدون السبب، فيكون قوله: ويقدر الوقت جوابا عن قوله في الأول لعدم السبب، وحاصله إنا لا نسلم لزوم وجوب السبب حقيقة، بل يكفي تقديره كما في أيام الدجال، ويحتمل أن المراد بالتقدير المذكور هو ما قاله الشافعية من أنه يكون في حقهم يقدرما يغيب فيه الشفق في أقرب البلاد إليهم والمعنى الأول أظهر الخ** (۱)۔

لہٰذا عرض ہے کہ "درمختار" کی عبارت میں تقدیر سے کیا مراد ہے؟

"ب" فقہاء نے لکھا ہے کہ جہاں عشاء کا وقت مفقود ہے وہاں فجر طلوع ہوئی ہے اس میں ایک علمی سوال وارد ہوتا ہے کہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: **"كلوا واشربوا حتى يتبين لكم الخيط الابيض من الخيط الاسود من الفجر"** (۲)۔ اس میں بالاتفاق اسود سے رات کی سیاہی اور ابیض سے صبح صادق کی سفیدی مراد ہے اب سوال یہ ہے کہ ملک بلغاریا اس کے مانند بلاد میں واقع علاقہ جہاں تمام لیل شفق ابیض باقی رہتی ہے یعنی غائب نہیں ہوتی اسلئے عشاء کا وقت نہیں ہوتا ہے اور آیت قرآنی سے معلوم ہوتا ہے کہ طلوع فجر کے لئے اسود ہونا لازم ہے اور ان علاقوں میں پوری رات بیاض موجود ہونے کی وجہ سے طلوع فجر کس طرح ہوگی، لہٰذا عرض یہ ہے کہ فقہاء کی عبارت میں طلوع فجر سے کیا مراد ہے کیوں کہ تمام فقہاء جنہوں نے اس مسئلہ کو بیان کیا ہے تمام یک زبان ہیں کہ طلوع فجر ہوئی ہے اور کسی نے تردید نہیں کی نیز آیت مذکورہ میں اسود سے کیا مطلب ہے رات کی مکمل تاریکی یا نفس تاریکی اسی طرح وجود شفق بیاض کی وجہ سے طلوع فجر کی جو تعریف فقہاء نے کی ہے وہ کس طرح صادق آئے گی۔

۲۔ طلوع فجر صادق سے قبل کاذب کا ہونا لازم ہے؟

۳۔ طلوع فجر جہاں سے کھانا پینا روزہ رکھنے والوں کے لئے حرام ہے اور فجر کی نماز پڑھنا جائز ہے وہ طلوع فجر صادق کے حصہ اوّل سے یا انتشار سے علامہ شامی لکھتے ہیں: **"نعم في كون العبرة بأول طلوعه أو استطارته إلى**

۱۔ مطلب في فاقد وقت العشاء کتاب الصلاۃ ۱/۲۴۲ دار احیاء التراث بیروت۔

۲۔ سورۂ بقرہ: ۱۸۷۔

قوله إن الأول أحوط والثاني أوسع'' اس عبارت میں بظاہر گنجائش معلوم ہوتی ہے کہ طلوع فجر کے بعد بھی سحری وغیرہ کھائی جاسکتی ہے، لہٰذا اوالثانی اوسع اور عبارت مذکورہ کی مالہ وماعلیہ مراد کیا ہے، نیز اگر اوسع صحیح ومفتی بہ ہے تو استطار وانتشار کا معیار کیا ہوگا۔

امید ہے کہ مذکورہ سوالات کو حل فرما کر ممنون فرمائیں گے یہ احقر برائے تشفی اور ازدیاد علم کے لئے عرض خدمت کررہا ہے لہٰذا مدلل جواب مرحمت فرمائیں گے اگر جرم نہ ہو ورنہ ان دلائل کی طرف اشارہ کردیا جائے۔

یوسف (باٹلی یوکے انگلینڈ)

الجواب وباللہ التوفیق:

۱-وہ علاقہ جہاں پر شفق ابیض غائب نہیں ہوتی یا وہ علاقہ جہاں پر شفق احمر بھی غائب نہیں ہوتی یا وہ علاقہ جہاں آفتاب اس سے بھی کم یا محض تھوڑی دیر کے لئے غائب رہتا ہے، ان سب مقامات کے لئے متن ''درمختار'' میں ہے: ''**وفاقد وقتها مكلف بهما فيقدر لهما، وقيل: لا مطلب في فاقد وقت العشاء**'' (۱) اس عبارت کا کھلا ہوا مفہوم یہ ہے کہ ان تمام مقامات میں یعنی عشاء اور فجر دونوں کے لئے لوگ مکلف رہیں اور ان دونوں نمازوں کے لئے یعنی (عشاء وفجر کے لئے)، ایک وقت مقدر مانا جائے گا یہ عام فقہاء کا قول ہے اور ظاہر الروایہ یہی ہے باقی بعض فقہاء کے نزدیک ایسا نہیں ہے اور'' درمختار'' میں بطور مثال کے ''**کبلغار**'' ''**فان فيها يطلع الفجر قبل غروب الشفق**'' کہا ہے اور بعض فقہاء نے جو ''**لهما**'' کا مرجع عشاء کا فرض ووتر لیا ہے، اس میں بھی یہی مندرجہ گفتگو جاری ہوگی۔ ان عبارتوں سے معلوم ہوا کہ جہاں پر عشاء کا وقت نہیں ملتا، یعنی اس کے غایت درجہ خفی ہونے کی وجہ سے نہ نظر آتا ہے اور نہ اس کا ادراک ہی ہوتا ہے وہاں بھی فجر کا طلوع ہوتا ہے اور'' **فاقد وقتها** ''کا ترجمہ عشاء کا وقت نہیں ہوتا صحیح نہیں ہے، بلکہ نہ پانا صحیح ترجمہ ہوگا، اس لئے کہ فاقد کے معنی نہ پانے والا ہے نہ کہ نہ ہونے والا، کیونکہ فقدان کے معنی نہ پانے کے ہیں نہ ہونے کے نہیں ہیں **كما لا يخفى** اور دونوں کے مفہوم میں بہت فرق ہے۔

ان عبارات پر جو اشکالات جناب نے ظاہر فرمائے ہیں بجا ہیں ان سب کا حل احقر اپنی بضاعت کے مطابق عرض کرتا ہے خدا کرے صحیح ہو، مذکورہ بالا متن اور اس کی شرح (درمختار) پر علامہ شامی نے جو دو تین صفحہ تک بے نظیر بحث

۱- کتاب الصلاۃ ۱/ ۲۴۲، دار احیاء التراث، بیروت۔

فرمائی (۱) ہے، اس میں فقہاء کرام کے متضاد نظریات وتحقیقات منقول ہیں اور ظاہر ہے کہ ان سب سے اتفاق ممکن نہیں، بلکہ محض کسی ایک کی مطلقاً موافقت کا کوئی مرجح نہیں ہے۔

اس لئے کہ ذہین انسان کے ذہن میں لامحالہ بہت سے اشکالات وارد ہوں گے، جیسا کہ جناب نے بھی متعدد اشکالات فرما کر ان کا حل طلب فرمایا ہے، احقر اپنے بے بضاعت وبے استعداد وکم فہم ہونے کے باوجود انہیں فقہائے کرام "صواباً فمن الله وان كان خطأً فمن تلقاء نفسي بل على الله التكلان واليه المرجع والمآب ومنه اسئل التوفيق والسداد "ہر ایک کا حل حسب نمبر سوال مذکور ہے۔

"الف" یہ صحیح ہے کہ اقرب بلاد پر قیاس کرنا غیر صحیح ہے اور فیض کی عبارت کا یہ مفہوم (۲) توضیح اور تسلیم ہے، مگر ایام دجال پر قیاس کرنا یہ ہمہ وجوہ صحیح نہیں، بلکہ یہ قیاس قیاس مع الفارق ہے، اس لئے کہ حدیث دجال میں آتا ہے کہ وہ چالیس دن رہے گا (۳)، اور اس کا ایک دن چھ ۶ مہینہ کا ہوگا اور ایک دن چالیس دن کے برابر ہوگا اور سات ۷ دن ایک ہفتہ کا ہوگا باقی اور ایام ایسے ہی ہوں گے۔ آجکل تو ظاہر ہے کہ ان دنوں میں جو آجکل کے مثل ہوتے ہیں ان سے تو اس تقدیر کا تعلق نہیں ہے جو وہ انہیں دنوں سے ہے جن میں روزانہ کی طرح، یعنی چوبیس گھنٹہ میں آفتاب غروب ہوکر طلوع نہ ہوگا وہاں کا کیا حکم ہوگا (اندازہ کر کے نماز پڑھتے رہنا)۔

اور صورت مجوزہ عنہا میں آفتاب چوبیس ۲۴ گھنٹہ میں غروب ہوکر طلوع ہوتا ہے، پس "يقدر لهما "کا مفہوم یہ ہرگز نہیں ہوسکتا کہ مثل حدیث دجال کے وقت کا اندازہ کرے اس کے اندر نماز ادا کی جائے، بلکہ یہ مفہوم ہوگا کہ غروب وفجر کے درمیان میں ایک وقت عشاء کا ضرور گذرتا ہے اور اگر چہ وہ وقت نہایت دقیق وخفی ہونے کی وجہ سے نظر نہ آئے یا اس کا ادراک نہ ہو سکے اور اس کے اندر نماز نہ پڑھی جا سکے تو بھی اس وقت کو مقدر اور موجود مانکر اس کے ختم ہوجانے اور گذر جانے کی وجہ سے عشاء وتر کی دوسرے وقت میں قضاء کی جائے جس طرح اوقات ظاہر کے ختم ہوجانے اور گذر جانے پر قضا کی

۱- شامی ۱/ ۲۶۶ تا ۲۶۸، مکتبہ فیض القرآن دیوبند۔

۲- "ان المراد انه يجب قضاء العشاء بأن يقدر الوقت أعني سبب الوجود قد وجد" (شامی ۱/۲۶۶، مکتبہ فیض القرآن دیوبند) (مرتب)۔

۳- روى انه ﷺ ذكر الدجال قلنا: مالبسه في الأرض قال: أربعون يوما يوم كسنته ويوم كشهر ويوم كجمعة وسائر أيامه كأيامكم قلنا: يا رسول الله فذالك اليوم الذى كسنته اتكفينا فيه صلوة يوم قال لا اقدر واله" (رواہ مسلم، شامی ۱/ ۲۶۷، مکتبہ فیض القرآن) (مرتب)۔

جاتی ہے۔وھذا ظاہر اور اس گفتگو سے جناب کا یہ اشکال حل ہو گیا کہ تقدیر سے کیا مراد ہے، یعنی اس سے وقت کا اندازہ کر کے اس میں پڑھنا مراد نہیں ہے، بلکہ نفس وقت کے وجود کو مقدر اور تسلیم کرنا مراد ہے اور یہ الگ بات ہے کہ عشاء کا سارا وقت یا اس کا بعض حصہ غیر محسوس اور غیر مدرک ہوتا ہے یا فجر کے وقت کی ابتداء و شروع غیر محسوس اور غیر مدرک ہے اور باقی حصے میں اتنا وقت مل جائے کہ نماز فجر ادا کی جا سکے خواہ مختصر ہی سہی اور طلوع آفتاب کے کچھ ہی پہلے سہی تو بجائے قضاء کے ادا کر لی جائے ہاں اگر اس میں بھی اتنا وقت نہ ملے کہ نماز ادا کی جا سکے تو مثل عشاء کے اس کی بھی قضاء کی جائے۔زیلعی کے کلام سے اس طرح اشارہ ملتا ہے (۱)، اور درمختار کا یہ قول: "**ولا ینوی القضاء الخ**" (۲)، متن کے بالکل متضاد ہے اور تسلیم نہیں اسی طرح مقطوع الیدین رجلین پر قیاس تسلیم نہیں کیوں کہ یہاں محل حکم ہی مفقود ہے اور فاقد وقت میں ایسا نہیں نیز اس شخص کے اصول پر قیاس کرنا بھی تسلیم نہیں جو طلوع آفتاب کے بعد اسلام قبول کرتا ہے اور اس پر اس سے قبل کی نمازوں کا وجوب نہیں ہوتا اس لئے کہ یہاں قبل اسلام کا وہ شخص خطاب و نصاب کا اہل نہیں رہتا کہ یہ حکم متوجہ ہو اور یہاں اہل رہتا ہے اسی طرح یہاں حائضہ وغیرہ کے حکم پر بھی قیاس کرنا تسلیم نہیں اس لئے کہ یہاں وجوب کے معانی احادیث صحیح وصریح سے ثابت ہیں اور یہاں نہیں اس لئے یہ سب قیاسات مع الفارق ہوں گے، اور کلام الٰہی "**حتی یتبین لکم الخیط الأبیض من الخیط الأسود من الفجر**" (۳) میں اسود سے رات کی سیاہی مراد لینے پر جو اشکالات فرمایا ہے وہ بھی غایت ذہانت سے ہے، اور اس کا حل یہ ہے کہ منطوق کلام الٰہی میں خیط اسود رات کی سیاہی سے مقصد یہ نہیں ہے بلکہ یہ ایک تعبیر ہے اور عام حالات و اماکن کے اعتبار سے ہے اور غلط نہیں ہے اور اگر کوئی قید اس منطوق "**حتی یتبین لکم الخیط الابیض من الخیط الاسود من الفجر**" (۴) میں "**ھیتو من الفجر**" کی ہو سکتی ہے اور اس سے مراد یہ ہے کہ فجر طلوع ہوتے وقت جو ایک سیاہی ہوتی ہے، رات کے حصہ میں ہو یا شفق احمر یا ابیض کے حصہ میں ہو اور خواہ گہری سیاہی ہو یا مفصل سیاہی ہو وہ سیاہی جب فجر کے بیاض سے (جو چمکدار ہوتی ہے) تبین ہو جائے تو وہ مبیّن صائم کے لئے منتہائے اکل و شرب ہو گا اور وہیں سے ابتداء فجر و سحر شروع ہوتی ہے، جیسا کہ فقہاء کی اس عبارت سے بھی معلوم ہوتا ہے: "**وقت الصبح**

۱- "ما اورده الزيلعي عليه من أنه يلزم من عدم نيته القضاء ان يكون اداء ضرورة" (شامی ۱/ ۲۶۷، مکتبہ فیض القرآن) (مرتب)۔

۲- شامی ۱/ ۲۶۷، مکتبہ فیض القرآن۔

۳- سورۂ بقرہ: ۱۸۷۔

۴- سورۂ بقرہ: ۱۸۷۔

من ابتداء طلوع الفجر الصادق وهو الذی يطلع عرضا منتشراً "(۱)۔

وهکذا فی عامة کتب الفقه اور یہ متبین وتمیز ایک لمعہ (چمک) سے ہوتا ہے کہ فجر صادق طلوع ہونے کے وقت جہاں سے آفتاب طلوع ہونے والا ہے وہاں ایک خاص قسم کی چمک پیدا ہوتی ہے جو سابق کے رنگ وحالات سے جدا اور متمیز ہوتی ہے پھر وہی چمک افق میں دائیں بائیں پھیلنے لگتی ہے اور ابتداء فجر ہی اس چمک وانتشار کی تعین میں فقہاء کا اختلاف ہوا ہے، جیسا کہ طحطاوی علی المراقی (ص ۱۳۹) سے جو (جواب ۳) میں آئے گی معلوم ہوتا ہے اور اصحاب متون نے احکام میں لمعہ کی ابتداء معتبر ماننے کے بجائے اس کے استطارہ وانتشار کو حدیث "مسلم وترمذی" کی مدد سے اختیار فرمایا ہے اور یہ لمعہ (چمک) اس خاص وقت میں ہر جگہ اور ہر ملک میں جہاں آفتاب طلوع ہونے والا ہوتا ہے ہوتی ہے، خواہ رات کی سیاہی میں ہو یا شفق احمر یا شفق ابیض میں ہو ہر جگہ ہوتی ہے اور اپنے ماقبل کی حالت سے متمیز ہوتی ہے۔ خواہ اول وہلہ میں دقیق مخفی رہے اور بعد چند سیکنڈ کے نمایاں اور واضح ہو۔ غرض اس تمیز کی حالت سے قبل کی حالت جو مضمحل وکمزور ہوگی اس کا مفہوم ہی ہے کہ اس میں سیاہی مشوب ومختلط ہوتی ہے، خواہ وہ سیاہی شفق ہی ہو یا غیر شفق ہو یہی سیاہی آیت کریمہ میں مذکور ہے، جس کا حاصل محض رات کی سیاہی نہیں ہے، بلکہ نفس سیاہی ہے اور یہی سیاہی منطوق نص میں مراد ہے اور اس سے طلوع فجر کی تعریف جو فقہاء نے کی ہے پھر وہ بھی واضح ہوگئی۔

(۲) طلوع فجر صادق سے قبل فجر کاذب کا ہونا ہر جگہ لازم نہیں ہے، بلکہ انہیں مقامات میں ہوتا ہے جہاں شفق ابیض کے غروب کے بعد رات کا معتد بہ حصہ گذرتا ہے، جیسا رض سے قبل کے بعض حصے۔

(۳) ابتداء طلوع فجر صادق میں فقہاء کے دو قول ہیں، جیسا کہ اس عبارت سے معلوم ہوتا ہے: "**في مجمع الروايات ذكر الحلواني في شرحه للصوم أن العبرة لأول الطلوع، وبه قال بعضهم: فإذا بدت لمعة له أمسک عن المفطرات، وقال بعضهم: العبرة لاستطارته في الأفق، وهذا القول أبين وأوسع والأول أحوط وروى عن محمدؒ أنه قال: اللمعة غير معتبر فى الافق فى حق الصوم و حق الصلوة، وانما يعتبر الانتشار في الأفق قاله في الشرح**" (۲)۔

مگر اصحاب متون نے عموماً قول ثانی کو لیا ہے اس لئے کہ اس کی تائید وتقویت مسلم شریف وترمذی شریف کی

۱- المراقی مع الطحطاوی ص ۱۷۵، دار الکتب العلمیہ، بیروت لبنان۔

۲- طحطاوی علی المراقی: ۱۷۴، دار الکتب العلمیہ بیروت لبنان، فی اول کتاب الصلوۃ۔

روایت "لا يمنعكم من سحوركم أذان بلال ولا الفجر المستطيل، ولكن الفجر المستطير في الأفق" (۱)۔

معلوم ہوتی ہے، لیکن اس فرق سے یہ بات نہیں نکلتی کہ لمعہ نمودار ہونے کے بعد بھی سحری کھانے کی باقاعدہ اجازت دی جائے، اس لئے لمعہ نمودار ہونے کے محض دو تین منٹ میں لمعہ کے دائیں اور بائیں ہر دو طرف چمکدار لہریں پیدا ہونی شروع ہوجاتی ہیں جیسا کہ اما روانہ یا فوارہ میں دائیں بائیں چھوٹی چھوٹی لہریں اور انہیں چھوٹی لہروں کا دائیں بائیں نمودار ہونا استطار وانتشار کا معیار ہے، بس بہت سے بہت اس فرق سے یہ فائدہ حاصل ہوسکتا ہے کہ اگر کوئی شخص اس وقت محض ایک دو گھونٹ پانی پی لے یا پہلے سے سحری کھاپی رہا ہو اور لمعہ نمودار ہونے پر جلدی ختم کر کے منھ صاف کر لے تو اس کے صوم کو غیر صحیح نہیں کہیں گے اور بس۔

اور حدیث پاک میں جو اجازت دی گئی ہے وہ صبح کاذب کے بعد کھانے کی دی گئی ہے نہ کہ ظہور لمعہ کے بعد اور طلوع صبح کاذب اور طلوع صبح صادق کے مابین کافی فصل ہوتا ہے، کم از کم اتنا فصل ضرور ہوتا ہے کہ ایک شخص اطمینان سے کھاپی لے اور حدیث پاک میں اس کو بیان کیا گیا ہے اور اس کی اجازت دی گئی ہے۔ فافترقا۔

اور فقہاء کے اختلاف سے یہ فائدہ حاصل ہوتا ہے کہ سحری کھانا نمودار ہونے سے قبل احتیاطاً بند کر دیا جائے اور انتشار واستطار نمایاں ہونے سے قبل نماز فجر نہ پڑھی جائے اور بس اب امید کہ اس گفتگو سے انتشار واستطار اور فجر مستطیر (صبح صادق) فجر مستطیل (صبح کاذب) سب کا معیار واضح ہوجائے گا۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۸/۱/۱۴۰۴ھ

انگلینڈ کے بعض مقامات میں اوقاتِ نماز کے تعین کا طریقہ:

۱- برطانیہ اور انگلینڈ دونوں چھوٹے سے جزیرے ہیں، یہاں پر سردیوں میں ۱۶ر گھنٹے ۱۵ منٹ (سوا سولہ گھنٹہ) کی راتیں ہوتی ہیں اور گرمیوں میں دن ۱۶ر گھنٹہ ۴۳ر منٹ کا ہوتا ہے، اور سورج کی رفتار جنوب کی طرف سے ہوتی ہے، نمازوں کے اوقات کی تعیین میں دقت ہوتی ہے، (ابتداء اوقات کیا ہیں اور آخری اوقات کیا ہیں) عموماً موسموں کی خرابی کی

۱- ہذا حدیث متفق علی صحتہ اخرجہ مسلم (شرح السنۃ ۲/۳۰۰ حدیث ۴۳۵، مطبوعہ المکتب الاسلامی، ترمذی کتاب الصوم باب ماجاء فی بیان الفجر حدیث ۷۰۶) (مرتب)۔

وجہ سے بادلوں کی وجہ سے سورج نظر نہیں آتا خصوصاً سردیوں میں سورج کہیں کہیں نظر آتا ہے اور کہیں نظر نہیں آتا، اس سلسلے میں حکم شرعی کیا ہے، ظہر کی نماز کا وقت دن کے گھنٹوں کے حساب سے شمار کیا جائے، یا سایہ کو دیکھ کر؟

۲- سری نمازیں دن کے کتنے گھنٹے حصہ میں پڑھنی چاہئے اور سورج غروب ہونے سے کتنے گھنٹے پہلے پڑھنی چاہئے، سردیوں میں دن ۸ گھنٹہ اور گرمیوں میں ساڑھے سولہ گھنٹہ کا ہوتا ہے، مستحب اوقات کیا ہیں اور اوقات مکروہہ جماعت کے لئے کون سے ہیں؟

۳- (الف) گرمیوں میں دن ساڑھے سولہ گھنٹے کا ہوتا ہے اور رات چھوٹی ہوتی ہے، مغرب کی نماز ۹ بجکر ۲۳ منٹ پر ہوتی ہے، جون، جولائی، اگست، ان دنوں میں مغرب کی نماز کے کتنی دیر بعد عشاء کی نماز پڑھنی چاہئے، یہاں کے ماہر اوقات وموسمیات نے شفقِ احمر غائب ہونے کا وقت مغرب کے بعد ۲ گھنٹہ ۸ منٹ پر بتایا ہے، اس حساب سے ۹/ ۲۳ میں ۲/ ۱۰ شامل کرلیں تو عشاء کا وقت ۱۱ بجکر ۴۰ منٹ پر ہوتا ہے، کسی امام کے نزدیک جلدی سے ان راتوں میں عشاء کا وقت کب شروع ہوتا ہے، ہندوستان کے لیے مفتی کفایت اللہ صاحبؒ نے بعد غروب عشاء کے لیے ایک گھنٹہ/ ۲۰ منٹ کم سے کم اور زیادہ سے زیادہ ایک گھنٹہ ۳۷ منٹ رکھا ہے، میرے خیال سے یہ جزیرہ چھوٹا ہے اور سورج کے طلوع وغروب میں ساڑھے سات گھنٹے لگتے ہیں اور اطراف میں ہر طرف دریا ہی دریا ہیں، اور سرخی کبھی تو پوری رات نظر آتی ہے غائب نہیں ہوتی، تو عشاء کا وقت کتنے گھنٹہ میں ہوتا ہے؟ اور یہ جگہ ۵۲ عرض البلد پر واقع ہے (۵۲ ڈگری) عشاء کے وقت کے لیے شفقِ احمر کا غائب ہونا ضروری ہے، بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہاں پر عشاء کا وقت نہیں ہوتا، حالانکہ ساڑھے سات گھنٹہ کی رات ہوتی ہے۔

(ب) ماہِ رمضان میں یہ راتیں بہت چھوٹی ہوں گی، نماز وغیرہ سے فارغ ہونے سے پہلے ہی صبح صادق ہوجائے گی، لہٰذا ان سب حالات کو مدِنظر رکھ کر جواب عنایت فرمائیں، ورنہ رمضان المبارک میں وقت تنگ ہوجائے گا۔

حافظ محمد موسیٰ ابراہیم (انگلینڈ)

الجواب وبالله التوفيق:

تمام سوالات پڑھنے کے بعد جوابات نمبروار درج ہیں، امید کہ باعثِ تشفی ہوں گے۔

۱- ہاں ظہر کی نماز کا وقت گھنٹوں سے شمار کیا جائے ظہر کا وقت زوالِ شمس یعنی آفتاب ڈھلنے سے شروع ہوتا ہے (۱)۔

۱- "أول وقت الظهر إذا زالت الشمس" (ہدایہ اولین/ ۸۱ کتاب الصلوۃ) (مرتب)۔

اور زوالِ شمس اس وقت سے ہوتا ہے جب پورے دن (طلوع شمس سے غروب تک) کی مقدار کا نصف اول ختم ہو کر نصف ثانی شروع ہوتا ہے، پس جب پورے دن کا نصفِ اول ختم ہو کر نصف ثانی شروع ہو جائے تو زوال ہو گیا، وقت ظہر شروع ہو گیا، نماز ظہر پڑھ سکتے ہیں، سایہ اصلی ظاہر ہو یا نہ ہو، سایۂ اصلی کا اعتبار شروع وقت ظہر میں نہیں ہوتا، اگر ہو سکتا ہے تو ختم ظہر میں ہو سکتا ہے (۱)۔

غرض زوال وقت ظہر میں سایۂ اصلی کا پتہ نہ چلنا تعین وقت ظہر میں مضر نہیں، آفتاب کے طلوع اور غروب ہونے کی درمیانی مقدار کے گھنٹوں کے اعتبار سے دو برابر حصے کر لیے جائیں اور جب پہلا حصہ ختم ہو کر دوسرا حصہ شروع ہو جائے تو زوال کا وقت شروع ہو جائے گا، اس میں ظہر پڑھنا بلا شبہ جائز رہے گا، خواہ آفتاب کی حرکت کسی رخ پر اور کسی سمت اور کسی انداز سے بھی ہو کوئی اثر نہیں پڑے گا۔

لہٰذا آپ نے جس حساب سے ظہر کا وقت نکال کر نماز ظہر پڑھنا متعین فرمایا ہے وہ صحیح ہے، سایہ اصلی کا اس وقت سوال ہی نہیں بلکہ ۸ رگھنٹہ ۲۳ رمنٹ پر ہو جائے گا۔

۲۔طلوع شمس سے غروب شمس تک کی پوری مقدار کا تقریباً اخیر حصہ حنفیہ کے معمول میں عصر کا وقت شمار ہوتا ہے، لیکن اصفرار شمس اس مقدار کے آتے آتے ہو جاتا ہے اس سے قبل (ربع آخر یوم میں) بھی پڑھ سکتے ہیں، بلکہ اصفرار شمس کی کراہت سے بچنے کے لیے اسی وقت پڑھ لینا چاہیے، تفصیل کے لیے ماہنامہ دار العلوم نومبر ۱۹۶۹ء ملاحظہ فرمایئے۔

۳-(الف) شفق احمر ختم ہونے سے قبل کسی امام کے نزدیک عشاء کا وقت نہیں ہوتا (۲)، البتہ جب رات صرف ڈیڑھ گھنٹہ کی ہوتی ہے اور ہر طرف دریا کے پانی کی وجہ سے پوری رات یا بہت دیر تک سرخی نظر آتی ہے تو وہ سب سرخی شفق "احمر" نہ ہوگی، شفق احمر اس سرخی کا نام ہے جو آفتاب کے افق مغرب میں ہونے کی وجہ سے ہو اور آفتاب افق میں رات کے آٹھویں حصہ $\frac{1}{8}$ سے زیادہ عموماً نہیں رہتا، جہاں افق سے باہر نکلا مغرب کا وقت ختم ہو کر عشاء کا وقت شروع ہو جاتا ہے اور اس وجہ سے رات کا صرف آٹھواں حصہ مغرب کا وقت شمار ہوتا ہے۔

جس موسم میں جتنی بڑی رات ہو اس کا آٹھواں حصہ اس دن کا مغرب کا وقت ڈیڑھ گھنٹہ کے قریب رہتا ہے، اس

۱- "وآخر وقتها عند أبي حنيفةؒ إذا صار ظل كل شئي مثليه سوى فئي الزوال" (ھدایہ اولین ر ۸۱ کتاب الصلوۃ) (مرتب)۔

۲- "(وأول وقت المغرب منه أي غروب الشمس إلى قبيل غروب الشفق الأحمر على المفتي به، وهو رواية عن الإمام وعليها الفتوىٰ، وبها قالا لقول ابن عمرؓ: الشفق الحمرة وهو مروي عن أكابر الصحابةؓ وعليه اطباق أهل اللسان" (طحاوی علی مراقی الفلاح ص ۹۵ کتاب الصلوۃ) (مرتب)۔

لیے غروب آفتاب سے ڈیڑھ گھنٹہ بعد عشاء کا وقت شروع ہو جاتا ہے، جیسا کہ حضرت مفتی کفایت اللہ صاحبؒ کا قول آپنے بھی اسی قسم کا تحریر فرمایا ہے، آپ کے علاقہ میں افق کی مقدار اس سے بھی کم ہوتی ہے بلکہ جوں جوں قطب کے قریب والے تو درجہ بدرجہ اس سے بھی پہلے پڑھ سکتے ہیں۔

غرض ہر جگہ کی رات کا تقریباً آٹھواں حصہ $\frac{1}{8}$ مغرب کا وقت شمار ہو کر اس کے بعد کا وقت عشاء کا وقت شمار ہو سکتا ہے، ماہر موسمیات کی تحدید کی رعایت کی ضرورت نہیں، بلکہ یہ چیزیں علامت کے درجہ میں ہیں اصل علت نہیں ہیں: اس طرح پر وہاں غروب شمس ۹ ربجکر ۳۲ رمنٹ ہونے پر بھی عشاء کا وقت شروع ہو سکتا ہے اور عشاء اس کے بعد پڑھ سکتے ہیں، اور اگر رات چھوٹی ہونے کی وجہ سے شب بیداری عامۃً وعادۃً دشوار ہو تو نماز میں قرأت کے اندر کچھ اختصار کر لیا جائے اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔

(ب) تراویح میں اگر پورا قرآن پڑھنے سے تنگی وقت ہو تو کم پڑھا جائے، حتی کہ "الم تر کیف" سے پڑھ لینا کافی ہوگا(۱)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

برطانیہ کے قدیم اوقات صلوۃ پر عمل کرنا:

برطانیہ میں قدیم تقویم بگر اٹھارہ یا بارہ ۱۲ ڈگری وغیرہ حساب وکتاب سے جو جنتری تیار ہوتی ہے اس پر اجماع عملی ہے جو بجملہ حجت شرعیہ سے احقر نے ابتداء وقت عصر کے متعلق گذشتہ سال مشاہدہ کیا اور اس کا غلط ہونا مشاہدہ سے ثابت ہوا اور تقریباً تمام مواضع میں اس کی اصلاح کر لی گئی ہے۔

تاریخ	وقت عصر پرانی تقویم میں	صحیح وقت عصر	فرق
یکم جنوری	۲-۵۰	۲-۹	۴۱
یکم اپریل	۵-۵۳	۵-۳۵	۱۸
یکم جولائی	۷-۱۸	۶-۵۲	۲۶ منٹ
یکم اکتوبر	۵-۹	۴-۴۷	۲۲ منٹ

۱- "واختار بعضهم سورة الإخلاص في كل ركعة، وبعضهم سورة الفيل أي البداءة منها ثم يعيدها، والسنة الختم فيها مرة" (شامی، ۱/۴۷۵، کتاب الصلوۃ)۔

اسی طرح ابتداء فجر و انتھائے شفق کے متعلق بھی بعض علماء دین نے تحقیق کی تو ثابت ہوا کہ مروجہ وقت قدیم تقویم میں غلط ہیں بلکہ یہ تو داخل فجر کا وقت ابتداء فجر نہیں اور تقریباً تمام علماء اس کے قائل ہیں اب سوال یہ قائم ہوتا ہے کہ جب قدیم اوقات صلوۃ کا غلط ہونا ثابت ہوگیا مشاہدہ سے، تو کیا اس تعامل پر عمل درست ہے؟

اجماع عمل کے حجت شرعیہ ہونے میں کس کو انکار ہوسکتا ہے لیکن تعامل اگر غلط بنیاد پر ہو اور اس کا واقعی طور پر غلط ہونا ثابت ہوجائے تو اس پر کس طرح عمل جائز ہے جیسا کہ مواجہ قبلہ میں تو اختلاف قابل برداشت ہے باعتبار اجماع عملی کے مگر صریح انحراف ہو تو اس کی اصلاح واجب ہے مفتی محمد شفیعؒ فرماتے ہیں۔

البتہ اگر کسی بلد کی عام مساجد کے متعلق قوی شبہ ہوجاتا ہے کہ وہ سمت قبلہ سے اس درجہ منحرف ہیں کہ نمازیں درست نہ ہوں گی تو ایسی صورت میں اس کا اتباع نہ کیا جائے (۱)۔

اسی طرح یہاں بھی اب جب قطعی طور پر معلوم ہوگیا ہے کہ پرانے وقت میں اور تحقیق کے بعد کے وقت میں کافی فرق ہے تو عمل کس طرح اس تعامل پر درست ہے؟

دوسری بات قطع نظر ورجات کہ یہ ایک حقیقت ہے کہ برطانیہ میں بعض ایام ایسے ہیں جن میں شفق ابیض غائب نہیں ہوتی ہے یہ ایک مسلم حقیقت ہے کہ تمام فقہاء احناف ایک زبان ہیں جہاں شفق غائب نہیں ہوتی وہاں طلوع فجر ہوتی ہے تو کس طرح یہ باور کیا جائے کہ برطانیہ میں طلوع نہیں ہوئی اور ۱۶ رشعبان ۱۴۰۲ھ کے فیصلہ کی بنیاد اس پر ہے کہ طلوع فجر نہیں ہوتی اس کو تسلیم کرنے کی صورت میں تمام فقہاء کی تغلیط لازم آتی ہے جو کہ محل غور ہے۔

نیز جب بیاض غروب نہیں ہوتی، البتہ اندھیرا ہوجاتا ہے گویا طلوع شمس تک بیاض رہتی ہے، البتہ غروب وقبل طلوع کے بیاض زیادہ ہوتی ہے اور درمیان شب میں اغلب سیاہی ہوتی ہے مگر جہت بدلتی ہے احقر نے ۲۵ رمضان کو مشاہدہ کیا جس سے یقین ہوگیا کہ بیاض نہار ہے۔ اس طرح رمضان کی مختلف تاریخوں میں مشاہدہ کیا۔

اور یہ بات مسلم ہے کہ تعامل اگر نص کے خلاف ہو تو حجت نہیں اور قدیم تقویم جو مبنی ہے اصول ہیت پر کس طرح قابل عمل رہے گی۔

اور جب وقت موجود ہے پھر ۱۶ ررمضان کے فیصلہ کے مطابق تقدیر کس طرح جائز ہوگی۔

بہر حال عرض ہے ۱۶ رشعبان کے فیصلہ کی بنیاد جس کے آگے عرض ہے کہ جب شفق ابیض غائب نہیں ہوئی تو ابتداء

۱- 　جواہر الفقہ ۱/ ۲۵۳۔

فجر نہیں اور جب ابتداء نہیں تو تقویم جائز ہے، حالانکہ یہ کسی کا قول نہیں، بلکہ کتب احناف وشوافع کی عبارات اس بات پر دال ہیں کہ باوجود عدم غیوبت شفق طلوع فجر ہوتی ہیں اور تقدیر کل وقت کے فقدان کی صورت میں جائز ہے نہ کہ جزاول کے اشتباہ کی صورت میں یہ تمام مناقشات اس لئے عرض ہیں کہ صحیح تک پہنچ سکوں۔

مفتی یوسف (۱۸ مرس ڈل روڈ سوٹ پل، باکلی ۲۵ کے ج)

الجواب وباللہ التوفیق:

پوری تحریر بار بار اور بغور پڑھی ماشاءاللہ بہت توجہ ومحنت سے لکھی گئی ہے، بہت علمی حقائق ونکات پر مشتمل ہے، اللہ تعالیٰ آپ کے علم واخلاص میں برکت دے وقبولیت عطافرمائے، اور فلاح دارین سے نوازے۔

پہلی بات یہ عرض ہے کہ ۱۶ رشعبان کے کل فیصلہ کی اور من وعن احقر نے تصدیق نہیں کی ہے، بلکہ اخیر مضمون کی جس میں نماز کے اوقات کا اندازہ کرکے نماز پڑھنے کا حکم دیا ہے، بشرطیکہ وہاں کا تعارف اس کے خلاف اور اس کے مزاحم نہ ہو اور بس۔

اس مسئلہ مجوثہ کی بابت کیا عرض کروں اپنا علم ہی کیا ہے محض امتثالاً للامر جو کچھ ذہن میں دیانۃً آرہا ہے عرض ہے مسئلہ مواجہت قبلہ فی الصلوۃ کی بنیاد بھی مشاہدہ ہی پر ہے، مثلاً جب تک عین کعبہ آنکھوں کے سامنے اور مشاہد ہو اس وقت تک عین کعبہ کی مواجہت فی الصلوۃ شرط ہے (۱)، اسی وجہ سے اگر کوئی شخص محض حطیم کی مواجہت اس طرح کرے کہ کعبۃ اللہ کی جانب مواجہت بالکل نہ ہو تو نماز نہ ہوگی (۲)، اور جب عین کعبہ مشاہد نہ ہو اور مسجد حرام مشاہد ہو تو اس وقت عین مسجد حرام کی مواجہت فی الصلوۃ شرط ہوتی ہے اور جب عین مسجد حرام بھی مشاہد نہ ہو تو جہت مسجد حرام کی مواجہت شرط ہوتی ہے، اس سے یہ بات واضح ہوگئی کہ مواجہت قبلہ کی بنیاد بھی مشاہدہ ہی پر ہے اور جب مشاہدہ بالکل نہ ہو سکے تو اس وقت مواجہت فی الجملہ کا

۱- "فإن كان قادراً يجب عليه التوجه إلى القبلة إن كان في حال مشاهدة اللكعبة فإلى عينها أى أى جهة كانت من جهات الكعبة حتى لوكان منحرفاً عنها غير متوجه الى شئ منها لم يجزبقوله تعالىٰ (فول وجهک شطر المسجد الحرام وحيث ماكنتم فولوا وجوهكم شطره) سورة البقره الآية ۱۴۴، وفى وسعه تولية الوجه إلى عينها فيجب ذلک" (بدائع الصنائع ۱/ ۳۰۸، مکتبہ زکریا دیوبند) (مرتب)۔

۲- "ولو صلى مستقبلا لوجهه الى الحطيم لايجوز كذا فى المحيط" (الفتاوی الہندیہ ۱/ ۶۳، باب الشروط الصلاۃ۔ الفصل الثالث فی استقبال القبلۃ، مکتبہ دار الکتاب دیوبند) (مرتب)۔

حکم (۱) عائد ہوتا ہے اور اس پر اجماع عملی منعقد ہے اور اس اجماع پر عمل واجب ہے۔

باقی اس میں یہ شرط بھی ضروری التسلیم ہے کہ اگر کسی خطہ کی عام مساجد بھی جہت قبلہ سے اس طرح منحرف ہو جائیں کہ مواجہت فی الجملہ بھی حاصل نہ ہو اور حجت شرعیہ سے یہ انحراف ثابت و متحقق ہو جائے تو اس وقت وہاں کے رائج اجماع کا حکم ختم ہو کر تحقیق واقعہ کے مطابق حکم شرعی ہو جاتا ہے، پس یہی حال و حکم مسئلہ زیر نظر و مجوزہ کا بھی ہوگا کہ جس شخص کے نزدیک مشاہدہ صحیحہ شرعیہ سے اجماع متعارف کا عمل غلط ہونا حجت شرعیہ سے ثابت ہو جائے اس شخص پر اس اجماع کا حکم متوجہ نہ ہوگا، بلکہ اپنے مشاہدہ صحیحہ شرعیہ کے مطابق عمل کرنا ضروری رہے گا، اور یہی حکم ان لوگوں کو بھی ہوتا ہے جن کے طلوع غروب اور طلوع فجر صادق وغیرہ کے اوقات اس مشاہدہ صحیحہ شرعیہ کے مطابق ہوں اور یہ مطابقت حجت شرعیہ سے ثابت ہو باقی تمام برطانیہ والوں کے لئے صرف اس خطہ کے ایک مشاہدہ صحیحہ شرعیہ کو معیار قرار دیکر تمام برطانیہ کے لئے معمول بہا بنالینا شرعاً صحیح نہ ہوگا، اس لئے تھوڑی تھوڑی مسافت پر طلوع وغروب اور طلوع فجر صادق کے اوقات میں تفاوت فاحش غیر معتدل وغیر منتظم ہوتا ہے، جیسا کہ وہاں کے طلوع فجر صادق کے نقشوں کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے، ہاں اگر ہر خطہ و بلد کے طلوع وغروب و طلوع فجر صادق کے اوقات کا مشاہدہ صحیحہ شرعیہ کر کے ان اوقات کو صرف اس خطہ کے لئے معیار قرار دیا جائے گا تو یہ ہو سکتا ہے اور پھر اگر وہ معیار اجماع متعارف کے خلاف ہوں تو وہاں والوں پر اس اجماع متعارف کا حکم متوجہ نہ ہوگا، بلکہ اپنے مشاہدہ کے مطابق عمل کرنا شرعاً ضروری ہو جائے گا، اس لئے یہ مشاہدہ صحیحہ شرعیہ حجیت اجماع متعارف کے حجیت سے شرعاً قوی تر واقوی ہوگی، البتہ چونکہ برطانیہ میں بہت سے مقامات و خطے ایسے مشاہدہ میں آتے ہیں کہ وہاں سالہا سال فضا متغیم و ناصاف رہتی ہے، بسا اوقات آفتاب کیا آسمان بھی نظر نہیں آتا، ایسے مقامات و خطہ میں طلوع وغروب وغیرہ کے اوقات کا صحیح مشاہدہ ہونا بے حد دشوار و متعذر رہتا ہے اس لئے وہاں کے لوگوں پر اجماع متعارف کا حکم متوجہ رہے گا، اور اسکے مطابق عمل کرنا شرعاً لازم رہے گا، جب تک کہ مشاہدہ شرعیہ صحیحہ سے یا ان دلائل شرعیہ جو کہ اجماع سے اقوی ہیں اجماع متعارف کے خلاف شرعاً ثابت نہ ہو جائے اور وہی حکم حال اقرب البلاد اقرب الایام اعدل الایام وغیرہ کے ذریعہ سے طلوع وغروب وغیرہ کے اوقات کی تعیین کا بھی ہوگا کسی ایک خطہ یا بلاد کے اوقات کے اعتبار سے ثابت شدہ اوقات کو پورے برطانیہ کے

۱- ”والفرض بغير المشاهد إصابة وجهها أي الكعبة هو الصحيح، قال الطحطاويؒ تحت قوله (اصابة جهتها): فالمغرب قبلة لأهل المشرق وبالعكس والجنوب قبلة“ لاهل الشمال وبالعكس فالجهة قبلة كالعين توسعة على الناس كما في القهستاني، حتى لوازيل المانع لايشترط أن يقع استقباله على عين القبلة كما في الحلبي وهو قول العامة وهو الصحيح؛ لأن التكليف بحسب الوسع“ (طحطاوی علی مراقی الفلاح ۱/ ۱۱۵، باب شروط الصلاۃ، مکتبہ اشرفیہ دیوبند) (مرتب)۔

لئے معیار و معمول بہا نہیں بنا سکتے ہیں اگر بنا سکتے ہیں تو صرف اسی خطہ و مقام کے لئے کہ جہاں پر اسکا مشاہدہ صحیحہ شرعیہ ہو جائے -**هذا ماعندی من الشرع الشريف، فإن كان صحيحاً فمن عند الله وان كان خطأ فمن نفسی وما أبرئ نفس** - فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۷/۲/۳/۱۴۰۴ھ

برطانیہ میں صبح صادق کی تحقیق:

تمہید:

محکمہ موسمیات نے شفق کی تین قسمیں قرار دی ہیں:

۱-سیول شفق ۶/درجہ والی شفق، اس کو شفق احمر سے تعبیر کرتے ہیں، اس وقت رات کے آثار کم ہوتے ہیں، چند بڑے تارے نظر آتے ہیں۔

۲-بحری شفق:۱۲ درجہ والی شفق، یعنی شفق ابیض کا ابتدائی اور متوسط درجہ۔

۳-سبت شفق:۱۸ درجہ والی شفق ابیض کا آخری درجہ جس کے بعد تاریکی چھا جاتی ہے۔

جو ممالک ۵۰ سے ۵۸ عرض البلد سے اوپر واقع ہیں وہاں شفق دیر سے غائب ہوتی ہے اور صبح صادق جلدی ہوتی ہے، موسم گرما کے بعض مہینوں میں غروب شفق اور صبح میں بہت کم فاصلہ رہتا ہے، بطور مثال ۵۴ عرض البلد کے طلوع و غروب کا نقشہ یہ ہے: طلوع آفتاب:۳۵-۵:۴۰ غروب آفتاب ۴۱-: دن کی مقدار-۶-۱۷-اور صبح صادق ۳۵-۱-۱-۲۱ مئی سے ۳۱ جولائی تک بحری شفق غائب ہوتے ہی پوری رات شفق پر اجالا رہتا ہے۔

سوال نمبر (۱)

جو ممالک ۵۵ سے ۵۸ عرض البلد پر ہیں وہاں شفقِ ابیض اور صبح صادق میں بہت کم فاصلہ رہتا ہے جب ان اوقات میں رمضان آتے ہیں تو تراویح و سحری وغیرہ کے مسائل بھی بہت غور طلب ہو جاتے ہیں، یعنی جہاں شفق ابیض اور صبح صادق میں فاصلہ ہی نہیں ہوتا وہاں سحری کب ختم کی جائے؟

سوال نمبر (۲)

"درمختار" میں ایک حساب لکھا ہے: صبح صادق کے وقت کے بارے میں کہ جتنے گھنٹہ کی رات ہو اس کا ساتواں

حصہ صبح صادق ہوگا، کیا یہ حساب صحیح ہے؟ نیز مولانا تھانویؒ نے ''امداد الفتاویٰ'' میں لکھا ہے کہ ہیئت کے قاعدہ سے طلوع آفتاب سے ڈیڑھ گھنٹہ قبل تک سحری کھا سکتے ہیں، تو کیا ان اقوال کو مدنظر رکھتے ہوئے جن دنوں شفق ابیض غائب نہیں ہوتی ہے تو صبح صادق میں آفتاب طلوع ہونے کا جو وقت ہے اس سے سوا گھنٹہ پہلے صبح صادق کا تصور کرنا صحیح ہے یا نہیں؟ نیز جن ایام میں سورج افق سے ۱۸ درجے نیچے ہوتا ہے تو صبح صادق بہت آگے بڑھتی ہے مثلاً اگست کی پہلی تاریخ میں ۳۶-۱ ہے تو دوسری کی ۴۹-۱ ہے اور تیسری کی ۵۹-۱ ہے چوتھی کو ۷-۲، اتنی جلدی صبح صادق آگے بڑھتی ہے، اور یہاں علم ہیئت والے کمپیوٹر وقت یہی بتلاتے ہیں، تو کیا اس پر عمل کرنا ضروری ہے؟ تفصیل سے جواب عنایت فرمائیں۔

سوال نمبر (۳)

مثلین کے بعد غروب تک سردیوں میں صرف پون گھنٹہ کا فرق رہتا ہے، تو کیا حنفی المسلک مثل ثانی میں نماز عصر ادا کرسکتا ہے؟

الجواب وباللہ التوفیق:

تمہید:

پہلی بات تو یہ سمجھنی چاہئے کہ دین اسلام دین فطرت ہے، کما ورد: ''الدین الفطرۃ'' اس کے احکام سادہ اور فطری اصول پر ہوتے ہیں، تا کہ ہر انسان خواہ دیہاتی ہو یا شہری عالم ہو یا جاہل، خواہ سمندری علاقہ کا ہو خواہ پہاڑی علاقہ کا ہو، جو بھی ہو اگر وہ احکام پر عمل کرنا چاہے اور اپنے معبود حقیقی سے رابطہ قائم کرنا چاہے تو فطری اصول اور سادہ انداز سے کرسکے، بقاعدہ: ''الدین یسر'' (۱) اور باشارۂ نصوص ''وللعالمین نذیرا'' (۲)، ''وما أرسلناک إلا رحمة للعالمین'' (۳)، اور ایک حدیث پاک میں ہے: ''نحن أمة أمية لا نكتب ولا نحسب'' (۴)، ان سب آیات وروایات واحادیث سے احکام اسلام فلسفیانہ موشگافیوں اور علوم ہیئت کے دقائق پر دائر نہ ہوں گے اور ان کا مدار یہ چیزیں نہ ہوں گی، بلکہ ادلۂ اربعہ شرعیہ سے جو حکم نکلے گا وہی شرعاً معتبر ہوگا۔

۱- عن أبی ہریرۃؓ عن النبی ﷺ قال: ''الدین یسر'' بخاری مع الفتح ۱/۹۳۔
۲- سورۂ فرقان: ۱۔
۳- سورۂ انبیاء: ۱۰۷۔
۴- صحیح البخاری ۱/۲۵۶۔

انہی وجوہ کی بنا پر ثبوت رویت ہلال میں ہوائی جہاز پر اڑ کر دیکھنے کا یا دوربین سے دیکھنے کا اعتبار نہیں ہے، اور نہ اس پر مدار ثبوت ہے خاص کر صیام رمضان کے مسئلہ میں، اس کو احقر اپنے رسالہ ''ریڈیو اور ٹیلیفون وغیرہ کے ذریعہ ثبوتِ رویت ہلال کا شرعی حکم'' میں بہت واضح طور سے مدلل ومفصل بیان کر چکا ہے، اس کا مطالعہ فرمالیا جائے، اس مختصر تمہید کے بعد عرض ہے کہ مسئلہ مجوث عنہا کا مدار اشیاء مذکورہ فی السوال پر نہیں بلکہ نص قرآنی: **"وکلوا واشربوا حتی یتبین لکم الخیط الأبیض من الخیط الأسود من الفجر ثم أتموا الصیام إلی اللیل"** الخ(۱) پر، اس آیت کریمہ میں یہ بتلایا گیا ہے کہ کھاتے پیتے رہو یہاں تک کہ خیط ابیض، خیط اسود سے متبین ہوجائے پھر اس کے بعد رک جاؤ، اور روزہ رات آنے تک پورا کرو محض خیط ابیض کے وجود کو مدار نہیں رکھا گیا، بلکہ خیط ابیض کے تبین کو مدار رکھا گیا ہے، ظاہر ہے کہ نفس خیط ابیض کا وجود اول وہلہ روشنی میں بھی ہوسکتا ہے، مگر اس کو مدار نہ رکھ کر اس کے تبین کو رکھا گیا، دونوں، یعنی نفسِ خیط ابیض اور اس کے تبین کا فرق احادیث پاک اور ائمہ ہدیٰ کے کلام سے بھی معلوم ہوتا ہے، جیسا کہ مسلم شریف اور ترمذی شریف کی حدیث ہے: **"عن سمرة بن جندب قال: قال رسول الله ﷺ: لایمنعکم من سحور کم أذان بلال ولا الفجر المستطیل ولکن الفجر المستطیل فی الأفق"** (۲) حدیث بالا میں صرف فجر نہیں فرمایا گیا، بلکہ مستطیل کی قید بڑھادی گئی ہے جس کا ظاہری مطلب یہی ہے کہ اولیت حقیقیہ بیاض کی مراد نہیں بلکہ اس کا استطارو انتشار مراد ہے، فقہاء کرام نے اسی کو بیاض مستطیر اور منتشر سے تعبیر کیا ہے اور اسی کا اعتبار کیا ہے، چنانچہ ''طحطاوی علی المراقی'' میں حضرت امام محمدؒ سے اس کی تصریح موجود ہے کہ محض لمعہ بیاض کی اولیت حقیقیہ مراد نہیں ہے، بلکہ اس کے انتشار کا اعتبار ہے جب بیاض میں انتشار پیدا ہوجائے تو اس وقت سحری بند کرنا چاہئے۔ اب معلوم نہیں ماہر فلکیات ۱۸ر ڈگری پر جس بیاض کا ذکر کرتے ہیں اس سے کیا مراد لیتے ہیں، ظاہر یہی ہے کہ اپنے فن کے قاعدہ کے مطابق بیاض کی اولیت حقیقیہ (لمعہ) مراد لیتے ہوں گے اور ایسی مبہم بات بھی مدار حکم نہیں بن سکتی، اس لیے بھی مدار ان چیزوں پر نہیں، بلکہ مدار خیط ابیض کے تبین پر ہوگا اور یہ تبین تمہید میں ضابطے اور اصول کے مطابق کسی آلۂ رصد گاہی وغیرہ سے نہ ہوگا، بلکہ عیاناً دیکھنے سے ہوگا۔

۱-خلاصہ یہ نکلا کہ جن دنوں میں آسمان صاف رہے ان دنوں میں بجلی وغیرہ کے قمقموں کی حد سے باہر جا کر خود مشاہدہ کیا جائے اور جس وقت بیاض (خیط ابیض) کا تبین وانتشار مشاہدہ ہوجائے اس وقت کو منتہاء کہنا چاہئے اور اسی وقت

۱- سورۂ بقرہ: ۱۸۷۔

۲- ترمذی شریف ۱/۸۸ کتاب الصوم۔

سے روزہ کی ابتداء کی جائے۔

اگر اپنے یہاں اس مشاہدہ کا موقع نہ آئے تو اطراف کے کسی قریبی مقام سے اس کا مشاہدہ کیا جائے اور اس کے مطابق عمل کیا جائے۔

۲-اگر یہ بھی نہ ہو سکے کہ وہاں کا بھی مطلع صاف نہیں رہتا تو پھر میدانی علاقہ کے منتہائے سحر کا اعتبار کیا جائے۔ میدانی علاقوں کے منتہائے سحر کا اندازہ اس سے بھی ہوتا ہے کہ احادیث صحیحہ میں آتا ہے کہ سحری کھانے میں تاخیر کرنا افضل ہے، "كما في الصحاح عن زيد بن ثابت رضي الله عنه قال: "تسحرنا مع رسول الله ﷺ، ثم قمنا إلى الصلوٰة، قال قلت: كم كان قدر ذلك قال: قدر خمسين اٰية" (۱)، اور انہی احادیثی بنیادوں کی بنا پر فقہ کی معتبر کتابوں مثلاً شامی وغیرہ میں لکھا ہے کہ سدس آخر لیل میں (رات کے آخری چھٹے حصہ میں) سحری کھانا افضل ہے، اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ رات کے آخری چھٹے حصہ تک صبح صادق جو منتہائے سحر ہے، نہیں ہوتی اس کے بعد ہوتی ہے اور حضرت تھانوی نوراللہ مرقدہٗ نے بھی اس کے قریب قریب لکھا ہے کہ کل رات کا ساتواں حصہ فجر کا ہوتا ہے، ظاہر ہے کہ اس کے قبل کا حصہ رات اور سحری کھانے کا وقت شمار ہوگا، ممکن ہے کہ حضرت تھانویؒ نے اس مذکورہ بنیاد (سدس لیل آخر) سے استدلال کیا ہو یا اس کے علاوہ کچھ اور بھی متدل حضرت کا ہو۔ بہر حال میدانی علاقوں کے لیے حضرتؒ نے جو فرمایا ہے وہ بالکل صحیح ہے اور استفتاء ہذا میں اس کا حوالہ بھی صحیح دیا ہے۔ باقی ''درمختار، شامی'' میں یہ چیز نہیں ملی، البتہ روایت و درایت سے ایسی بات نکلتی ہے۔

الحاصل انہی اصولِ ثلاثہ مذکورہ کے مطابق عمل کیا جائے کہ جب اپنے علاقہ میں اور اس کے اطراف کے علاقوں میں اس خیط ابیض کا تبین مشاہدہ اور تحقق نہ ہو تو میدانی علاقہ کے منتہائے سحر کا اعتبار کیا جائے اور اسی کے اعتبار سے سحری کھانا بند کیا جائے، ''هذا ما عندي من الشرع الشريف فإن كان حقا وصحيحا فمن الله، وإلا فمن نفسي وما أبرئ نفسي من الخطاء''۔

۳-اگر صورتِ مذکورہ میں آفتاب کی ٹکیہ اتنی کمزور اور متغیر ہو جاتی ہے کہ اس پر نگاہ پڑنے سے نگاہ گھبراتی نہیں، بلکہ ٹکی رہتی ہے تو ایسی صورت میں مثلِ اول میں بھی عصر کی نماز ادا کر لینے میں بھی کوئی مضائقہ نہیں ہے۔

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

۱- ترمذی شریف ۱/۸۸، کتاب الصوم۔

تیز رفتار ہوائی جہازوں میں اوقات نماز وروزہ کا حکم:

تیز رفتار ہوائی جہازوں میں اوقات نماز اور سحر وافطار کے متعلق کس طرح وقت معلوم کر کے ادا کریں؟

الجواب وباللہ التوفیق:

اس استفتاء کے متعلق کچھ عرض کرنے سے پہلے یہ عرض کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ احقر کا ایک مضمون مغربی ممالک میں نماز روزہ کے خصوصی احکام پر مشتمل ماہنامہ دارالعلوم کے ۱۹۶۹ء کے شمارہ میں شائع ہو چکا ہے، غالباً جناب کے وہاں موجود ہوگا اس کو اگر نہ دیکھا ہو تو تنقیدی نگاہ سے دیکھ لیں، اگر صحیح ہو تو فمن اللہ اور غلط ہو تو فمن نفسی مطلع فرمائیں شکر گزار ہوں گا، کیونکہ اس سے مجھے اپنے لیے بھی صحیح علم کا فائدہ ہوگا۔

پھر اس کے بعد عرض یہ ہے کہ آفتاب کی رفتار کی برابر تیز رفتار سواری سے مغرب کی جانب سفر کیا جائے تو جو وقت روانہ ہونے کا ہے وہی وقت راستہ میں برابر قائم رہے گا، مثلاً ظہر پڑھ کر روانہ ہوا تو جہاں بھی پہنچیں گے یہی وقت ملے گا، اس صورت میں تو کوئی اشکال ہی نہیں ہوگا وہیں ٹھہر کر پھر جو اوقات نماز کے جس طرح یہاں ابتداءً آتے وہاں آئیں گے، نمازیں پڑھتے رہیں گے، اگر اسی رفتار کی سواری پر بجائے مغرب کے مشرق کی طرف چلیں تو پورے لیل ونہار کی گردشِ آفتاب جو چوبیس گھنٹہ میں پوری ہوتی تھی، صرف بارہ گھنٹہ میں طے ہو جائے گی اور جو فاصلہ نمازوں میں سفر سے پہلے تھا وہ نصف ہو جائے گا، مثلاً عصر ومغرب میں اگر دو گھنٹہ کا فاصلہ تھا تو وہ اب صرف ایک گھنٹہ کا اور پورے چوبیس گھنٹہ (لیل ونہار) میں جو پانچ نمازیں پڑھی جاتی تھیں اب وہ دس ہو جائیں گی اس میں بھی شرعاً کوئی قباحت نہ ہوگی، اسی طرح اگر یہ سفر بجانب مشرق اسی سواری سے ہو جس کی رفتار آفتاب کی رفتار سے زیادہ مثلاً دوگنی ہو تو یہ مجموعہ (لیل ونہار) صرف چھ گھنٹہ میں ہوگا اور نمازوں کا فصل بھی اسی مقدار سے کم ہو جائے گا، مثلاً عصر کی نماز کا فصل اس صورت میں بجائے دو گھنٹہ کے صرف نصف گھنٹہ رہ جائے گا اس میں بھی کوئی مضائقہ نہیں، نمازیں اسی مقدار والے فصل سے پڑھتے رہیں گے یہاں تک کہ سواری کی تیز رفتاری کے باعث یہ فصل بین الصلوٰتین کم ہوتے ہوتے اس درجہ پر پہنچ جائے کہ طہارت وغیرہ مقدماتِ صلوٰۃ کی تکمیل کے بعد فرض نمازیں بھی ادا کرنے کا وقت نہ ملے تو وہ نمازیں ساقط ہو کر اس کے بعد والی نماز کی ادائیگی متوجہ ہو جائے گی اور ان کی قضا واجب ہوگی جیسا کہ فاقد اوقات کے مقامات میں فقہاء کرام تحریر فرما چکے ہیں۔

البتہ زیادہ اشکال اس صورت میں ہوگا کہ اس تیز رفتار سواری پر جس کی تیز رفتاری آفتاب کی رفتار سے مثلاً دوگنی ہو

مثلاً عصر پڑھ کر جانب مغرب سفر شروع کریں تو کچھ درجہ جا کر ظہر کا وقت ملے گا پھر آگے بڑھتے ہی جائیں تو آفتاب ظہر میں آجائے گا پھر بڑھتے جائیں تو آفتاب پورب کی جانب ڈھلتا ہوا محسوس ہوگا پھر سفر ختم نہ کریں، بلکہ سفر جاری ہی رکھیں تو پورب سمت میں آفتاب عصر کے وقت میں جیسا ہوتا ہے ویسا محسوس ہوگا اور محسوس ہوگا کہ آفتاب پورب کی جانب غروب ہو رہا ہے پھر پورب کی جانب غروب ہو کر وقت مغرب ہو کر وقت مغرب محسوس ہوگا پھر کچھ دیر بعد وقت عشاء محسوس ہوگا پھر کچھ دیر بعد صبح صادق پچھم سے طلوع ہوتی نظر آئے گی، یہاں تک کہ وقت فجر نمایاں ہو جائے گا، پھر کچھ دیر بعد پچھم کی جانب سے آفتاب طلوع ہوتا نظر آئے گا یہاں تک کہ سارا نظام شمسی ہی درہم برہم نظر آئے گا اور اشراط ساعت میں آفتاب کے مغرب سے طلوع ہونے کی جو روایت ہے سامنے آجائے گی، اس وقت کے لیے اصل میں نماز و روزہ کے احکام کیا ہوں گے جو شخص گھڑی دیکھ کر چلے گا وہ زیادہ الجھن اور اشکال میں مبتلا ہوگا۔

البتہ جو لوگ بغیر گھڑی وغیرہ دیکھے اور بغیر اوقات کے چلتے وقت لحاظ کئے ہوئے سفر کریں گے وہ شاید فضا میں پہنچ کر سمتوں کا پتہ نہ چلا سکیں گے اور ان کے نزدیک پورب پچھم اتر دکھن کچھ نمایاں و تمیز نہ ہوگا شاید ان کو الجھن پیش نہ آئے، یہ الگ بات ہوگی۔ بہر حال اس وقت کے مسائل صوم و صلوۃ زیادہ پیچیدہ ہو کر نمایاں ہوں گے، احقر کی اس تحریر سے اجمالاً ہر شق و مثال کا جواب بھی نکل سکتا ہے، کام کی کثرت اور فرصت میں نہ ہونے کے سبب اس موضوع پر کچھ زیادہ نہ عرض کر سکا جس کے لئے معذرت خواہ ہوں اور حاضری سے بھی معذور رہوں۔

خلاصہ یہ ہے کہ ان حالات میں بھی احقر کے نزدیک نصوصِ قرآنی اور احادیث نبویہ کی رو سے کوئی الجھن یا خلجان نہیں ہے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

ہوائی جہاز، ٹرین اور پانی کے جہاز میں نماز ادا کرنے کا حکم؟

ٹرین میں نماز پڑھنا درست ہے یا نہیں؟ اگر درست ہے تو کیا استقبالِ قبلہ کا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔ نیز ہوائی جہاز اور پانی کے جہاز میں بھی نماز ادا کرنا درست ہے یا نہیں اور قبلہ رخ ہونا ضروری ہے؟

الجواب وبالله التوفيق:

ہاں ریل میں بھی نماز پڑھنے کا حکم ہے(۱)، البتہ اگر یقین ہو کہ وقتِ نماز باقی رہتے ہوئے فلاں جگہ اتنی دیر ٹھہرے گی کہ اتنی دیر میں نماز پڑھ سکوں گا تو اس وقت تک مؤخر کردے، اور اگر مسافر شرعی ہے تو کم از کم فرض و وتر پڑھ لیا کرے۔

ریل کے اندر ہی اگر پڑھنا پڑے تو تحریمہ باندھتے وقت قبلہ رخ کا پتہ لگالے، خواہ قطب نما کے ذریعہ یا کسی

۱- (ریل میں نماز ادا کرنا جائز ہے، اس لیے کہ ریل مثل سریر موضوع علی الارض کے ہے۔"وإن لم يكن طرف العجلة على الدابة جاز لو واقفة لتعليلهم بأنها كالسرير (الدر المختار علی هامش رد المحتار ۱/۴۷۱ کتاب الصلوٰۃ)قال الشامي تحت قوله: (لو واقفة) كذا قيده في شرح المنية، ولم أره لغيره، يعني إذا كانت العجلة على الأرض، ولم يكن شئ منها على الدابة، وإنما لها حبل مثلاً تجرها الدابة به تصح الصلوٰة عليها، لأنها حينئذٍ كالسرير الموضوع على الأرض، ومقتضى هذا التعليل أنها لو كانت سائرة في هذه الحالة لا تصح الصلوٰة عليها بلا عذر، وفيه تأمل، لأن جرها بالحبل وهي على الأرض لا تخرج به عن كونها على الأرض، ويفيده عبارة التا تارخانية عن المحيط، وهي: لو صلى على العجلة، إن كان طرفها على الدابة جازت وهي تسير تجوز في حالة العذر لافي غيرها وإن لم يكن طرفها علي بمنزلة الصلوٰة على السرير اهـ فقوله: وإن يكن الخ يفيد ما قلنا؛ لأنه راجع إلى أصل المسئلة، وقد قيدها بقوله: "وهي تسير" ولو كان الجواز مقيدا بعدم السير تقيده به، فتأمل" (فتاویٰ شامی ۱/۴۷۱، مطلب في الصلوٰة على الدابة) اگر چہ ٹرین میں نماز پڑھنے والے کو یہ امید ہو کہ وقت کے باقی رہتے ہوئے نیچے اتر کر نماز پڑھ سکتا ہے، تب بھی ریل میں پڑھنا جائز ہوگا، کیونکہ عذر نماز کے ابتدائے وقت میں معتبر ہے، اگر چہ اخیر وقت میں عذر کے زائل ہوجانے کی امید ہو:" بقي شئي لم أر من ذكره، وهو أن المسافر إن عجز عن النزول عن الدابة لعذر من الأعذار المارة وكان على رجاء زوال العذر قبل خروج الوقت كالمسافر مع ركب الحاج الشريف، هل له أن يصلي العشاء مثلاً على الدابة أو المحمل في أول الوقت إذا خاف من النزول، أم يؤخر إلى وقت نزول الحجاج في نصف الليل لأجل الصلوٰة؟ والذي يظهر لي الأول، لأن المصلي إنما يكلف بالأركان والشروط عند إرادة الصلوٰة والشروع فيها، وليس لذلك وقت خاص، ولذا جاز له الصلاة بالتيمم أول الوقت وإن كان يرجو وجود الماء قبل خروجه، وعللوه، بأنه قد أداها بحسب قدرته الموجودة عند انعقاد سببها، وهو ما اتصل به الأداء اهـ ومسئلتنا كذلك" (فتاویٰ شامی ۱/۴۷۱ مطلب في الصلوٰة على الدابة) لیکن ایسی حالت میں انتظار کرنا آخر وقت استحباب تک مستحب ہوگا؛ وندب لراجيه رجاءً قويا آخر الوقت المستحب ولو لم يؤخر وتيمم وصلى جاز إن كان بينه وبين الماء ميل وإلا لا" (الدر المختار علی هامش الشامی ۱/۱۶۶، باب التیمم)۔ نیز اگر کھڑے ہوکر پڑھنا بھی کسی عذر کی بنا پر ناممکن ہو تو بیٹھ کر پڑھنا درست ہے:" أو وجد لقيامه الما شديداً صلى قاعداً كيف شاء على المذهب، (الدر مختار باب صلاة المريض) صلى الفرض في فلك جار قاعدا بلا عذر صح لغلبة العجز وأساء، وقالا: لايصح إلا بعذر وهو الأظهر برهان" (الدرالمختار مع الشامي ۱/۵۱۱ باب صلوٰۃ المریض)، اور اگر کسی مجبوری مثلا کثرت اژدہام کی بنا پر بیٹھ کر رکوع، سجود بھی ناممکن ہو تو پھر اشارہ سر سے نماز پڑھے:" وإن تعذر أداها قاعداً ويجعل سجوده أخفض من ركوعه" (الدر المختار مع الشامی ۱/۵۰۹ باب صلوٰۃ المریض)(مرتب)۔

مسلمان سے پوچھ لے۔پھر نماز شروع کردے اور پڑھ لے، کیونکہ ٹرین جلدی جلدی اتنا رخ نہیں بدلتی کہ مواجہت فی الجملہ بھی فوت ہوجائے، ہاں جہاں ایسا ہو وہاں ذرا ٹھہر کر شروع کرے۔اسی طرح ہوائی جہاز میں اور ریائی کے جہاز میں بھی مذکورہ بالا طریقوں سے جہت قبلہ وغیرہ معلوم کرکے نماز ادا کریں۔

ہوائی جہاز پر بھی نماز جائز ہوتی ہے جس طرح ریل وغیرہ کی سواری میں جائز ہوتی ہے، اس لیے کہ وضع الجبھۃ علی الارض میں ارض کے حقیقی معنی مراد نہیں ہیں، بلکہ بطور عموم مجاز کے وہ چیز مراد ہے جس پر پیشانی ٹک سکے۔اس عموم مجاز کا ایک فرد سطح ارض بھی ہے اور ایک فرد ریل سجدہ وغیرہ کی جگہ بھی ہے پس جس طرح چلتی ہوئی کشتی پانی پر ہونے کے باوجود سجدہ کی جگہ ایسی ہوتی ہے کہ اس پر سجدہ کیا جاسکتا ہے، اسی طرح ریل پر اور ہوائی جہاز پر ہر جگہ ایسی جگہ ہوتی ہے جس پر پیشانی رک جاتی ہے خواہ بلا واسطہ یہ جگہ ہو جیسا زمین پر نماز پڑھنے میں یا کشتی میں یا پانی کے جہاز میں اور ہوا میں پرواز کی حالت میں جب کہ سجدہ قبلہ متعین معلوم ہوسکے خواہ قوی سے یا کسی معتمد کے بتانے سے، نیز جہاز بھی بالواسطہ زمین قرار دیا جائے گا جس طرح سمندری جہاز کا زمین پر ہونا بالواسطہ شمار کرکے علماء نے اس پر جواز صلوٰۃ کا حکم دیا ہے۔اسی طرح یہاں بھی صرف ہوائی جہاز سے ایک واسطہ زمین اور جہاز کے درمیان ہوا کا بڑھ جائے گا، پس جو دلائل اس جہاز پر جواز صلوٰۃ کے ہیں وہی دلائل یہاں بھی رہیں گے، کیونکہ ہوا بھی مثل پانی کے ایک جسم قوی ہے صرف پانی کی طرح دکھائی نہیں دیتی۔

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

الجواب صحیح حبیب الرحمٰن خیرآبادی

ہوائی جہاز میں نماز کے جواز کی تفصیلی بحث(۱):

سمندری جہاز میں نماز ادا ہونے کی تفصیل:

سمندری جہاز کشتی کے حکم میں ہے، اور کشتی مثل دابہ کے ہے یا نہیں؟ اس میں اختلاف ہے، صاحب ہدایہ وغیرہ کے

۱- ہوائی جہاز میں اڑتے ہوئے نماز یں، یعنی فرائض وواجبات ادا کرنا جائز ہے یا نہیں؟ اس مسئلہ میں اختلاف ہے، بعض حضرات عدم جواز کی طرف گئے ہیں، اور ان کا مستدل یہ ہے کہ سجدہ کے معنی ہیں: "وضع الجبهة على الأرض" یعنی سجدہ کے تحقق کے لیے چہرے کا زمین پر رکھنا شرط ہے، اور یہ قید ہوائی جہاز میں نماز پڑھنے کی بنا پر فوت ہوجاتی ہے، لہٰذا اگر کسی نے ہوائی جہاز میں نماز ادا کی تو واجب الاعادہ ہوگی، ان کے بالمقابل دیگر حضرات فرماتے ہیں کہ ہوائی جہاز میں نماز پڑھنا درست ہے، اور علی الأرض کی قید کوئی منصوص نہیں ہے کہ مسئلہ کی بنیاد ہی اس پر رکھ دی جائے، بلکہ چونکہ سجدہ کی یہی عام کیفیت ہوتی ہے، اس لیے یہ معنی سجدہ کے اہل لغت نے بیان کردیے اور یہ کہنا ہوگا کہ جیسے رکوع ایک خاص رکن ہے، اسی طرح سجدہ بھی ایک خاص رکن

بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اس کو مثل دابہ کے نہیں سمجھتے، اور اس میں نماز بلا عذر جائز ہے(۱)۔

ہے اور ان کی ادائیگی کی صورتیں ہر مکان کے اعتبار سے علیحدہ علیحدہ ہوں گی، چونکہ سجدہ عام طور پر زمین پر ہی پیشانی ٹیک کر کیا جاتا ہے، اس لیے "الارض" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔

شریعت کا اصل منشاء یہ ہے کہ سجدہ کرنے کے لیے کوئی ایسی چیز ہو جس پر پیشانی ٹک سکے، جس طرح کشتی میں نماز ادا کرنا جائز ہے، حالانکہ کشتی اور زمین کے درمیان بے پناہ پانی کا فاصلہ ہوتا ہے، حاصل کلام یہ ہے کہ زمین کی طرح ہوائی جہاز پر بھی نماز ادا کرنا درست رہے گا اور اعادہ کی ضرورت نہ ہو گی، چنانچہ شیخ عبدالرحمن جزیری نے ہوائی جہاز کو پانی کے جہاز کا حکم دیا ہے، موصوف فرماتے ہیں: "**ومثل السفينة القطر البخارية والطائرات الجوية ونحوها**" (الفقہ علی المذاہب الاربعہ ۱/۲۰۶)۔

مزید فقہی عبارات ملاحظہ ہوں:

"**قال العلامة القهستاني في شرح مختصر الوقاية: والسجود لغة الخضوع وشرعاً وضع الجبهة على الأرض وغيرها. انتهى. وفي البحر شرح الكنز تحت قوله: وكره بأحدهما أوبكور عمامة، والأصل أنه كما يجوز السجود على الأرض يجوز على ماهو بمعنى الأرض مماتجد جبهته حجمه وتستقر عليه، وتفسير وجدان الحجم أن الساجد لو بالغ لايتسفل رأسه أبلغ من ذالك، انتهى وفي الوقاية في اخر باب صفة، فإن سجد على كور عمامته أوفاضل ثوبه أو شئي يجد حجمه وتستقر عليه الجبهة جاز، وإن لم تستقر لا يجوز، انتهىٰ فالمركب الهوائي وإن كان مركبامن اشياء صلبة بحيث تستقر عليه الجبهة ولا تنتقل بالتسفيل تجوز السجدة عليه والظاهر أنه ملحق بالدابة كالسفينة السائرة والموقوفة بالشط الغير المستقرة على الأرض، فإنها ملحق بالدابة كما يستفاد من "رد المحتار" قبيل سجدة التلاوة فالصلوٰة المكتوبة على المركب الهوائي لاتجوز بدون العذر كما هو حكم الصلوٰة على الدابة والسفينة السائرة، وهل يلزم التوجه إلى القبلة ههنا كما في السفينة أولا كما في الدابة؟ والظاهر أنه يلزم؛ لأن المركب الهوائي بمنزلة البيت كالسفينة، فإن لم يمكنه يمكث عن الصلوٰة إلاإذا خاف فوت الوقت لماتقرر من أن قبلة العاجز جهة قدرته**"۔

ہوائی جہاز میں نماز ادا کرنے میں تفصیل یہ ہے کہ جب تک ہوائی جہاز زمین پر کھڑا ہے یا زمین پر چل رہا ہے اس وقت تک وہ ریل کے حکم میں ہے، اس پر بالاتفاق نماز جائز ہے، لیکن جب وہ پرواز کر رہا ہو تو اس حالت میں بھی عذر کی وجہ سے نماز جائز ہے، اگر کھڑے ہو کر ہوائی جہاز میں نماز پڑھ سکتا ہے تو کھڑے ہو کر، ورنہ بیٹھ کر ادا کرے، ہوائی جہاز میں بھی استقبال قبلہ ضروری ہے، اگر قبلہ کے رخ کا علم نہ ہو اور کوئی بتلانے والا بھی نہ ہو تو تحری کر کے نماز ادا کرے، اگر بالفرض بعد میں اندازہ غلط بھی معلوم ہو تو نماز صحیح ہو گئی، اعادہ کی ضرورت نہیں، اگر درمیانِ صلوٰۃ رخ پھر جائے تو اپنا رخ بھی بدل لے (از طرف)(مرتب)۔

۱- دیگر علماء نے تصریح کی ہے کہ وہ مثل دابہ کے ہے اور اس میں نماز بلا عذر جائز نہیں، راجح یہی ہے کہ وہ مثل دابہ کے ہے۔ دوسرا اختلاف یہ ہے کہ امام ابوحنیفہؒ کشتی میں بلا عذر بیٹھ کر نماز ادا کرنے کو درست قرار دیتے ہیں اور صاحبین رحمہما اللہ بغیر عذر کے بیٹھ کر نماز ادا کرنے کو صحیح نہیں کہتے، اس اختلاف میں صاحبینؒ کا مسلک راجح ہے۔

یہ حکم جب ہے جب کشتی چل رہی ہو اور اگر کنارے پر بندھی کھڑی ہو تو اس وقت مثل ارض کے حکم ہوگا، نیز اس میں استقبال قبلہ بھی ضروری ہے، اگر علم نہ ہو تو تحری کر کے نماز پڑھ لے، غلطی واقع ہونے کی صورت میں اعادہ واجب نہیں ہے۔

"**ومن صلى في السفينة قاعداً من غير علة أجزأه عند أبي حنيفةؒ، والقيام أفضل وقالا: لايجزئه إلامن عذر، لأن القيام مقدور عليه، فلا يترك إلا لعلة، وله أن الغالب دوران الرأس وهو كا لمتحقق إلا أن القيام أفضل، لأنه أبعد عن شبهة الخلاف،**

مغرب کے وقت کی ابتداء وانتہاء:

غروب آفتاب سے کتنی دیر بعد عشاء کی اذان ہونی چاہئے اور مغرب کی نماز کتنی دیر بعد تک اور رہتی ہے اور کتنی دیر بعد قضاء ہوجاتی ہے۔

مقصود حسن (امام نئی مسجد موضع بھجری ضلع مظفرنگر)

الجواب وبالله التوفيق:

عشاء کی اذان دینے میں احتیاط یہ ہے کہ غروب سے سوا گھنٹہ کے بعد ہی ہو، اگر کسی معذوری سے نماز مغرب شفق احمر کے غروب ہونے سے پہلے نہ پڑھ سکا تھا تو شفق ابیض کے غروب ہونے تک پڑھ لے تو قضاء نہ کہیں گے اور شفق ابیض کی مقدار عموماً سوا گھنٹہ تک بعد غروب رہتی ہے، اس کے بعد پڑھنا قضاء شمار ہوجائے گا، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱/۸/۱۴۰۴ھ

والخروج أفضل ما أمكنه؛ لأنه أسكن لقلبه، والخلاف في غير المربوطة، والمربوطة كالشط هو الصحيح" (الہدایہ مع فتح القدیر ۱/۶۱۳، باب صلوٰۃ المریض) (مرتب)۔

"صلى الفرض في فلك جارقاعداً بلا عذر صح لغلبة العجز وأساء، وقالا: لايصح إلابعذر وهو الأظهر برهان. والمربوطة في الشط كالشط في الأصح والمربوطة بلجة البحر إن كان الريح يحركها شديدا فكالسائرة وإلا فكالوا قفة، ويلزم استقبال القبلة عند الافتتاح وكلما دارت. قال الشامي تحت قوله: (وأساء) أشار إلى أن القيام أفضل، لأنه أبعد عن شبهة الخلاف، والخروج أفضل إن أمكنه؛ لأنه أسكن لقلبه، بحروشرح المنية، (قوله وهو الأظهر) وفي الحلية بعد سوق الأدلة: والأظهر أن قولهما أشبه، فلاجرم أن مافي الحاوي القدسي: وبه نأخذ (قوله: والمربوطة في الشط كالشط) فلا تجوز الصلوٰة فيها قاعداً اتفاقاً. وظاهر مافي الهداية وغيرها الجواز قائما مطلقا: أي استقرت على الأرض أو لا، وصرح في الإيضاح بمنعه في الثاني حيث أمكنه الخروج إلحاقالها بالدابة نهر. (إلى قوله) وعلى هذا ينبغي أن لا تجوز الصلوٰة فيها سائرة مع إمكان الخروج إلى البر" (فتاویٰ شامی ۱/۵۱۲، مطلب في الصلوٰة في السفينة)۔

مذکورہ بالا عبارت سے چند مسائل اور معلوم ہوئے، کشتی اگر کنارے پر بندھی کھڑی ہو اور پرسکون حالت میں ہو اور کھڑے ہوکر نماز ادا کی جاسکتی ہو، یا یہ ہو کہ باہر نکل کر نماز ادا کرسکتا ہے تو کشتی میں نماز درست نہ ہوگی الا یہ کہ ساحل پر نکلنا ممکن نہ ہو، کشتی اگر چل رہی ہو اور کھڑے ہوکر نماز ادا نہیں کی جاسکتی تو بالاتفاق بیٹھ کر نماز ادا کی جاسکتی ہے، نیز کھڑے ہوکر نماز ادا کرنے کی بنا پر سر چکراتا ہو تو بالاتفاق بیٹھ کر نماز ادا کی جاسکتی ہے۔ استقبال قبلہ از اول تا آخر ضروری ہے، اگر درمیان میں رخ بدل جائے تو اپنا رخ بھی بدل لے (مرتب)۔

چاند پر نماز اور استقبال قبلہ کا حکم؟

حالات حاضرہ کو دیکھتے ہوئے بعض لوگ سوال کرتے ہیں کہ آج کل لوگ چاند پر اتر کر رہنے کی باتیں کرتے ہیں، تو کیا یہ ممکن ہے؟

بفرض محال اگر آدمی چاند پر سکونت اختیار کرلے تو کیا وہاں پر نماز پڑھنا صحیح ہوگا اور کس طرف رخ کرکے نماز پڑھیں گے؟

الجواب وباللہ التوفیق:

اگر جگہ مل جائے تو جماعت بھی کرسکتے ہیں ورنہ تنہا تنہا پڑھ لیں قضاء نہ کریں۔قبلہ نما رکھ کر قبلہ معلوم کرسکتے ہیں ورنہ تحری کرکے سمت قبلہ متعین کرلیں۔اگر تحری میں غلطی بھی واقع ہوجائے اور تحری کرکے سمت قبلہ متعین کرلیں تو نماز ادا ہوجائے گی،"وأینما تولوا فثم وجه الله"(۱) پر عمل ہوجائے گا۔

سیٹ سے علیحدہ ہوکر کسی خالی جگہ میں قیام ورکوع وسجدہ کے ساتھ نہ پڑھی جائے تو سیٹ ہی پر بیٹھے اشارہ سے رکوع وسجدہ کرکے پڑھ لیں، پھر زمین پر اتر کر فرض کا اعادہ کرلیں چاند کیا زہرہ ومریخ وغیرہ پر جانا رہنا ممکن ہے،اس میں شرعاً کوئی مانع نہیں ہے اور وہاں نماز پڑھنا بھی صحیح ہوگا، بلکہ وہاں بھی نماز پڑھنے کا حکم اور وجوب اسی طرح باقی رہے گا اور نماز قبلہ رخ ہی پڑھنی ہوگی،قبلہ نما رکھ کر یا کسی اور ذریعہ سے، ورنہ تحری کرکے قبلہ متعین کریں گے اور جس طرح یہاں نماز فرض ہے اسی طرح وہاں بھی فرض رہے گی،فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی،مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

الجواب صحیح محمود غفرلہٗ،مفتی دارالعلوم دیوبند،سید احمد علی سعید،دارالعلوم دیوبند

تعیین قبلہ کی صحیح شکل:

۱-ہمارے موضع میں ایک قدیم مسجد ہے جس کی توسیع اور تعمیر کا کام شروع کیا گیا تھا، دوران کام قبلہ رخ کی جانچ کرنے کے لیے قبلہ نما آلہ سے جانچ کی گئی تھی جس کے لحاظ سے حالیہ مسجد ۹/ڈگری پر مسجد رہے، یہاں کے مقامی علماء کہتے

۱- سورۂ بقرہ:۱۱۵۔

ہیں کہ بیدر کے لئے دس ڈگری پر قبلہ ہونا چاہئے بعض فرماتے ہیں کہ سات تا دس ڈگری پر مسجد رہے تو نماز درست ہوسکتی ہے، لہذا آپ جواب قطعی تحریر فرمائیں۔

۲-نیز یہ بھی معلوم کرنا ہے کہ حالیہ مسجد کا رخ اگر غلط ہے تو آج تک اس میں پڑھی گئی نمازوں کا کیا حشر ہوگا آیا صحیح ہوئی یا نہیں؟ مسجد کس ڈگری پر ہونی چاہئے مطلع فرمائیں۔بینوا توجروا۔

الجواب وباللہ التوفیق:

سوال کا یہ جملہ (۱) حالیہ مسجد ۹ر ڈگری پر ہے۔

(۲) ضلع بیدر کے لیے ۱۰ر ڈگری پر قبلہ نما ہے۔

اولاً تو بالکل مبہم اور غیر واضح ہے، جب تک مسجد کی اتر دکھن کی لمبائی کی مقدار معلوم نہ ہو اس فرق سے کسی مقدار کا تعین نہیں ہوسکتا۔

ثانیاً چونکہ حکم شرعی کا مدار ان جدید آلات وحسابی دقائق میں نہیں ہوتا، اس لیے اس پر کوئی کلام بے سود اور بے نتیجہ ہوگا، اس لیے (۲) کے متعلق اس حیثیت سے گفتگو بھی نظر انداز کر کے اس کے حکم شرعی کے متعلق کی گئی ہے۔

جواب استفتاء سے قبل یہ چند باتیں سمجھ لینی چاہئیں:

دین اسلام دین فطرت ہے: ''نحن أمة أمية لانكتب ولا نحسب'' أو كما قال عليه السلام (۱) اسلام کے احکام اس فطرت کے مطابق بالکل سیدھے سادے ہوتے ہیں، علم ریاضی وہندسہ کے حسابی دقائق پر موقوف نہیں ہوتے اور نہ ان آلاتِ جدیدہ قطب نما، قبلہ نما پر احکام شرعیہ کا مدار ہوتا ہے، مگر یہ سب چیزیں محض تخمین وتسکین ومددگار کے درجہ میں ہوتی ہیں اور یہ بداہۃً بھی ظاہر ہے، ان آلات کے علم ہونے سے قبل اسلام جزیرہ عرب سے نکل کر افریقہ وروم وفارس وغیرہ تمام ممالک میں اس طرح پہنچ گیا تھا، تمام مساجد بھی بن چکی تھیں اور بغیر ان آلات کے بنیں اور آج تک اسی طرح معتبر وقائم ہیں۔

اب اس کے بعد جواب بحکم شرعی لکھا جاتا ہے:

۱-مسئلہ یہ ہے کہ بیت اللہ شریف جب آنکھوں کے سامنے اور معائن ہو تو عین کعبہ کی مواجہت شرط ہوتی ہے اور

۱- الصحیح للبخاری ۱/۲۵۶۔

جب بیت اللہ شریف آنکھوں سے اوجھل نظروں سے غائب ہو تو محض سمتِ قبلہ اور جہت قبلہ کی مواجہت فی الجملہ کافی ہوتی ہے(۱)، اور بیت اللہ سے جتنی دوری ہوجاتی ہے مواجہت فی الجملہ میں توسیع ہوتی جاتی ہے اور مواجہت فی الجملہ کا مفہوم یہ ہے کہ چہرہ سے خواہ ناک کے سیدھے یا چہرہ کے کسی حصہ سے اگر سیدھا خط نکال دیا جائے تو سیدھا بیت اللہ شریف تک پہنچ جائے تو مواجہت فی الجملہ حاصل ہوجائے گی اور جدید حساب کی رو سے ایک دو ڈگری کا فرق صحتِ صلوٰۃ میں مخل اور مضر نہ ہوگا، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

سمت قبلہ کی بحث:

۱- کیا ایک مسافر مہمان یا سیاح کے لئے جائز ہے کہ بلا دعوت کسی تعمیر شدہ مسجد یا کسی مسلمان کے گھر میں قطب نما (قبلہ نما) کو حجت بنا کر قبلہ کی سمت کی تصحیح کرے۔

۲- کسی مقام اور کعبے کے درمیان جس رخ سے فاصلہ قریب ترین ہو اسی سمت قبلہ ہوگا عام طور سے یہ تسلیم کیا جاتا ہے مگر آج جو آدمی ایک مقام پر مسجد تعمیر کر رہے ہیں اور اصول پر یعنی قریب ترین فاصلے کی طرف قبلہ مقرر کر کے محراب بنادیں اگر آج سے بیس سال بعد کچھ نئے آلات سے یہ دریافت کیا جائے کہ ایک اور سمت سے جو کہ پہلے سے برعکس تو نہیں، لیکن اگر پہلی مغرب تھی تو یہ مشرق نہیں، بلکہ مغربی جنوب ہے مسجد کا کعبہ سے فاصلہ قریب ترین ہے کیا اس صورت میں سابقہ محراب اور رخ قائم رکھا جائے یا تبدیل کردیا جائے۔

ابراہیم ہمدانی (کیلی فورنیا، یو ایس اے)

الجواب وبالله التوفيق:

۱- ایسی صورت میں اس کو خود وہاں کے ذمہ داروں سے مشورہ کئے بغیر کوئی تغیر وتبدیلی کر ڈالنا درست نہیں، بلکہ اس شخص پر لازم ہے کہ پہلے یہ دیکھ لے کہ مسجد کا انحراف کتنا ہے صرف اتنا انحراف ہو جس سے مواجہۃ فی الجملہ بھی حاصل ہوجاتی

۱- "فللمكي إصابة عينها ولغيره أي غير معاينها إصابة جهتها بأن يبقى شئي من سطح الوجه مسامتاً للكعبة أو لهوائها، بأن يفرض من تلقاء وجه مستقبلها حقيقة في بعض البلاد، خط على زاوية قائمة إلى الأفق ماراً على الكعبة، وخط آخر يقطعهٔ على زاويتين قائمتين يمنة ويسرة" منح" (الدرالمختار علی ھامش الشامی ۱/ ۲۸۷ کتاب الصلوٰۃ) (مرتب)۔

ہے جب تو سکوت کرے۔ ہاں اگر اتنا زیادہ انحراف ہے جس سے مواجہت مسجد حرام فی الجملہ بھی حاصل نہیں ہے تو اس مسجد کے ذمہ داروں اور سمجھ دار مصلیوں سے ذکر کرے پھر ان کے مشورے سے وہاں کے معتمد علماء سے فتوی لیکر اس کے مطابق جس تبدل وتغیر کی ضرورت ہو اتفاق واتحاد سے کرے خودرائی ہرگز نہ کرے اسی طرح اگر کسی مسلمان نے اپنے گھر میں نماز پڑھنے کے لئے کوئی جگہ متعین کررکھی ہے اور اسکا قبلہ منحرف پائے تو اس میں بھی یہی مذکورہ بالا تفصیل ہے، صرف فرق اتنا ہے کہ اس صورت میں عام نمازیوں سے یا عام مسلمانوں سے مشورہ کی حاجت نہیں، بلکہ اس گھر کے ذمہ داروں سے مشورہ لے کر استفتاء کرے پھر اس فتوی کے مطابق اتحاد واتفاق کے ساتھ جو کرنا ہو کرے، ہاں مسجد کے علاوہ کسی اور جگہ خود اپنی نماز پڑھنی ہو اور وہاں کوئی صحیح قبلہ رخ بتانے والا نظر نہ آئے تو فقط اپنی تحری اور راس تحری کی قطب نما وغیرہ کے مطابقت کے بعد نماز پڑھ لینا کافی اور جائز ہوگا(۱)۔ مواجہت فی الجملہ کا مفہوم۔ جواب ۲ کا ضمنی نمبر ''ب'' کے اندر آگے آرہا ہے۔

۲-جناب نے جو کچھ لکھا اور سمجھا ہے تقریباً صحیح سمجھا اور لکھا ہے جواب نمبر ا کے اندر درج کی ہوئی تفصیل وقیود وشرائط کے مطابق اتحاد واتفاق کے ساتھ تبدل وتغیر کر دیا جائے گا اس کی نظیر مسجد ذو قبلتین موجود ہے، البتہ خودرائی وغیرہ کرنا کسی کے لئے بھی جائز نہ ہوگا(۲)۔

تمام حوالجات کے ساتھ مدلل ومکمل جواب تفصیل سے لکھنے کے لئے ایک رسالہ درکار ہے اور اس کی گنجائش ان اوراق استفتاء میں نہیں ہے اس لئے مختصر مگر اس انداز سے لکھدیا جاتا ہے کہ آسانی سے پوری بات سمجھ میں آجائے۔ اس کے لئے پہلے چند باتوں کا بطور تمہید ذکر کردینا ضروری ہے۔

الف- مسئلہ شرعی یہ ہے کہ جب تک کعبۃ اللہ شاہد او رنگاہوں کے سامنے ہو تو عین کعبہ کا استقبال ضروری ہوتا ہے اور جب عین کعبہ شاہد نہ ہو، لیکن مسجد حرام شاہد ہو تو مسجد حرام کا استقبال ضروری ہوتا ہے(۳)، اور جب مسجد الحرام بھی شاہد اور نگاہوں کے سامنے نہ ہو تو مسجد حرام کی سمت کا رخ کرنا اور مواجہت کرلینا اور وہ بھی مواجہت فی الجملہ کرلینا کافی ہوجاتا ہے،

۱- ''وان اشتبهت عليه القبلة وليس بحضرته من يسأله عنها اجتهد وصلى كذا في الهداية'' (فتاوی عالمگیریہ ۱/۶۴)۔

۲- (اس لئے کہ جہت کعبہ کی طرف رخ کرنا نماز کے لئے شرط ہے، لقوله تعالى: فول وجهک شطر المسجد الحرام وحيث ما كنتم فولوا وجوهكم شطره (بقرۃ:۱۴۴) نیز تحویل قبلہ سے متعلق حدیث کے اخیر میں ہے: فصلى رجل معه العصر ثم مر على قوم من الأنصار وهم ركوع في صلاة العصر نحو بيت المقدس، فقال: هو يشهد أنه صلى مع رسول الله ﷺ وانه قد وجه إلى الكعبة قال فانحرفوا وهم ركوع (سنن الترمذی ابواب الصلاة باب ما جاء في ابتداء القبلة حدیث ۳۴۰) (مرتب)۔

۳- ''وفي التجنيس: من كان بمعاينة الكعبة فالشرط إصابة عينها، ومن لم يكن بمعاينتها فالشرط إصابة جهتها وهو المختار'' (البحر الرائق ۱/۴۹۵) (مرتب)۔

حتی کہ اگر صحیح سمت کا پتہ کسی وجہ سے نہ چلے اور نہ کوئی صحیح بتانے والا ملے تو ستاروں وغیرہ سے اندازہ لگا کر اور تحری کر کے یا آلات وغیرہ سے مدد لیکر اور تحری کر کے جس رخ و سمت پر دل قرار پائے اس رخ پر تحریمہ باندھ کر نماز پڑھ لے، کیونکہ ان سب صورتوں پر مواجہت فی الجملہ حاصل ہوجاتی ہے "**وللہ المشرق والمغرب فأينما تولوا فثم وجه الله**"(۱) جو اصلی حکم ہے اس پر عمل ہوجاتا ہے اور یہ سب احکام تقریباً مذہب کی تمام ہی کتابوں میں درج ہے جو معتبر ہیں (۲)۔

ب- کعبہ شریف کی لمبائی چوڑائی صرف ۲۲x۲۸ کے لگ بھگ ہے اور مسجد قباء و مسجد نبوی کی لمبائی چوڑائی یقیناً اس سے (۲۲x۲۸) سے زیادہ ہے۔ نیز مسجد نبوی کے دائیں بائیں مدینہ طیبہ کی دیگر مساجد جو دور رسالت میں تعمیر ہوئیں۔ ان سب میں بھی تمام مقتدی ایک ہی خط پر صف بستہ کھڑے ہوتے تھے ظاہر ہے کہ ان میں صرف بعض ہی مقتدی سے اس خط پر عین کعبہ کی مواجہت کا امکان ہے اور باقی تمام مقتدیوں میں عین کعبہ کی مواجہت متصور نہیں ہوسکتی، اس کے باوجود سب کے حق میں مواجہت کعبہ تسلیم کی گئی یہ عمل مواجہت قبلہ فی الجملہ کافی ہونے پر کھلی دلیل ہے۔

ج- پھر دور صحابہ و تابعین میں بہت دور دراز مقامات تک صحابہ و تابعین پہنچے، مثلاً فارس و روم، بلکہ افریقہ کے بڑے بڑے جنگلات کے آگے پہنچ گئے اور تقریباً ہر جگہ مسجدیں بنائیں اور بربر کے علاقہ کی صرف ایک مسجد کے سوا جس کی جہت کعبہ غیبی آواز پر عین کعبہ کے رخ پر بنائی باقی سب مسجدیں یا تو اپنے سامنے والی آبادی کی مسجدیں جس رخ و سمت پر بنی تھیں اسی رخ و سمت پر بنائیں یا پھر جہاں بڑے بڑے ریگستان یا غیر آباد جنگلات یا سمندر و پہاڑ حائل ہوئے وہاں محض ستاروں کے انداز پر تخمینہ و تحری کر کے یا اس دور کے آلات و حسابات کے اصول پر سمت قبلہ متعین کر کے بنائیں، بلکہ ایک مسجد جس خط پر بنایا اس کے دائیں بائیں سو سو پچاس پچاس میل کے فاصلے پر بھی اسی خط پر سمت قبلہ تسلیم کر کے اور مسجدیں بھی بنائیں یہ بھی کھلی دلیل ہے کہ صرف مواجہت قبلہ فی الجملہ شرعاً مطلوب ہے۔

د- مواجہۃ فی الجملہ کا مفہوم۔ لفظ مواجہ وجہ (چہرہ) سے ماخوذ ہے پیشانی کے اوپر اگے بال کی جڑ سے تھوڑی کے نیچے تک کا اور دونوں کانوں کے قریب تک کا حصہ ہے یہ حصہ دائرہ نما ہوتا ہے جس میں بیچ میں ابھار اور ہر طرف ڈھلاؤ اور

۱- سورۂ بقرہ: ۱۱۵۔

۲- "ومن كان خارجاً عن مكة فقبلته جهة الكعبة، وهو قول عامة المشائخ هو الصحيح، هكذا في التبيين، وجهة الكعبة تعرف بالدليل، والدليل في الأمصار والقرى المحاريب التي نصبها الصحابة والتابعون فعلينا اتباعهم فإن لم تكن فالسؤال من أهل ذلك الموضع، وأما في البحار والمفاوز فدليل القبلة النجوم، هكذا في فتاوى قاضي خان" (فتاوی عالمگیریہ ۱/ ۶۳) (مرتب)۔

نیچا ہوتا ہے اور اسکی صورت مثلاً یہ ہوگی اگر اس طرح کھڑا ہوا جائے کہ اس دائرۂ وجہ کے کسی بھی حصہ سے اگر کوئی خط مستقیم آگے کو نکلے اور وہ سیدھا مسجد حرام کے کسی بھی حصہ تک یا بیت اللہ کے اوپر جو عرش معلیٰ تک ہے اس کے کسی حصہ تک پہنچ جائے تو مواجہت فی الجملہ حاصل ہوجائے گی اور "من حيث خرجت فول وجهک شطر المسجد الحرام" (۱)، کا مفہوم صادق آکر نماز کی ادائیگی صحیح ہوجائے گی اور یہی مواجہۃ فی الجملہ شرعاً مطلوب ہے اور یہی مواجہۃ فی الجملۃ جس مسجد میں حاصل ہوجائے گی اس مسجد کا قبلہ صحیح متصور ہوگا اور اس کا بدلنا اور متغیر کرنا ضروری نہیں ہوگا (۲)۔

ھ- زمین مع پانی کے کروی ہے اور اس میں ایک جگہ کعبہ ہے جس کو اللہ تعالی نے تمام عالم کا قبلہ و مرکز قرار دیا ہے اور قبلہ سے مراد کعبہ کی یہ عمارت نہیں ہے بلکہ وہ حصہ ہے جس پر یہ عمارت ہے وہ حصہ اور اس کے مقابل جتنا حصہ تحت الثری تک ہے وہ اور پھر اس کے مقابل جتنی فضا و عرشِ معلیٰ تک ہے وہ سب قبلہ گاہ عالم اور تجلی باری تعالی کا خصوصی مورد ہے، اسی کی طرف سارے عالم کا رخ پھیر دیا ہے اور یہ عمارت اس پر نشانی و علامت ہے اور اس کے ساتھ ملصق ہے اس لئے یہ بھی محترم او رواجب الاحترام ہے اور کعبہ کو کعبہ اس لئے کہتے ہیں کہ سب سے پہلے اسی حصہ زمین کو پانی کے اوپر ظاہر کیا اور ابھارا پھر اس کے بعد اللہ نے اپنی قدرت و حکمت سے جتنا چاہا پھیلایا اور بڑھایا پھر اسی طرح جہاں جہاں اور جتنا حصہ زمین کا چاہا پانی کے اوپر ابھارا اور پھیلایا" كما اشار اليه قوله: إن أول بيت وضع للناس للذى ببكة مباركا" (۳)، غرض اللہ نے اسی حصہ کو تمام عالم کا قبلہ قرار دیکر تمام جنات و انسان کو اسی کی جانب رخ کرکے نماز پڑھنے کا حکم دیا آیت کریمہ "ومن حيث خرجت فول وجهک شطر المسجد الحرام وحيث ما كنتم فولوا وجوهكم شطره" (۴) میں دیا ہے اور "فول وجهک" اور "فولوا وجوهكم" میں مواجہت فی الجملہ مراد لیا ہے (۵)، جیسا کہ احادیث صحاح سے

۱- سورۂ بقرہ: ۱۴۹۔

۲- "لأن وجه الإنسان مقوس فمهما تأخر يميناً أو يساراً عن عين الكعبة يبقى شيء من جوانب وجهه مقابلا لها" (تفصیل کے لئے دیکھئے: ردالمحتار علی الدر المختار ۲/ ۱۰۹، ۱۱۰)۔

۳- سورۂ آل عمران، "وبكة لغة في مكة عند الأكثرين،... وقيل: بكة موضع المسجد ومكة البلد بأسرها وأصلها من البک بمعنى الزحم .... وذهب أكثر أهل الأخبار أن الأرض دحيت من تحته" (تفسیر روح المعانی ۳/ ۸، ۹) (مرتب)۔

۴- (سورہ بقرہ: ۱۵۰)، نیز "ولکل وجہۃ" کی تفسیر میں مذکور ہے: أو لكل قوم من المسلمين جهة وجانب من الكعبة يصلي إليها جنوبية أو شمالية أو شرقية أو غربية (تفسیر روح المعانی تفسیر جزء ثانی ص ۲۱) (مرتب)۔

۵- أي ليس المراد بالقبلة الكعبة التي هي البناء المرتفع على الأرض ولذا لو نقل البناء إلى موضع آخر وصلى إليه لم يجز بل تجب الصلاة إلى أرضها كما في الفتاوى الصوفية عن الجامع الصغير (ردالمحتار علی الدر المختار ۲/ ۱۱۴)۔

بھی معلوم ہوتا ہے اور تعامل صحابہ سے اس کی وضاحت ہوتی ہے۔ اور مزید وضاحت ذیل کے نقشے سے ہوگی۔

و- زمین کے کروی ہونے کی وجہ سے کعبہ شریف سے خط مستقیم پورب جانب کو سطح ارض وسمندر پر چلے گا وہ جتنا پورب بڑھتا جائے گا کروی ہوتا جائیگا، اسی طرح کعبہ شریف سے جو خط مستقیم سطح ارض وسمندر پر پچھم جانب کو چلے گا وہ بھی کروی ہوتا جائے گا، یہاں تک کہ یہ دونوں خط (خط غربی وشرقی) نصف دائرہ کے ایک نقطہ پر آپس میں ملکر ایک مکمل دائرہ بنا دیں گے۔

اسی طرح کعبہ شریف سے جو خط مستقیم اتر کی جانب سطح ارض وسمندر پر چلے گا وہ بھی کروی ہوتا جائے گا اور جو خط مستقیم کعبہ شریف سے دکھن کی جانب سطح ارض وسمندر پر چلے گا وہ بھی کروی ہوتا جائے گا یہاں تک کہ یہ دونوں (جنوبی و شمالی) بھی نصف دائرہ کے ایک نقطہ پر آپس میں ملکر دائرہ بنا دیں گے اور یہ نقطہ بعینہ وہی نقطہ ہوگا جو خط غربی وشرقی کو آپس میں ملا کر ایک مکمل دائرہ بنا چکا ہے پس اس نقطہ پر چاروں سمت (پچھم، پورب، اتر، دکھن) سے کعبہ شریف کا فاصلہ برابر ہوگا اور اس نقطہ پر جو شخص اس پر نماز پڑھ سکتا ہو تو وہ جس طرف چاہے رخ کر کے نماز پڑھ لے مواجہۃ فی الجملہ حاصل ہو کر اس کی نماز صحیح ادا ہو جائے گی۔

البتہ اس جگہ سے ذرا ہٹ جانے پر یہ حکم نہ رہے گا۔ مثلاً اس جگہ سے اگر خط غربی کی طرف ہٹے گا تو اس کو پورب رخ نماز پڑھنا لازم ہو جائے گا اب اگر وہاں کوئی مسجد کسی وجہ سے پچھم رخ پر بنی ہوگی تو اس کا قبلہ بدل کر پورب رخ بنالینا لازم ہو جائے گا، کیونکہ پچھم رخ میں مواجہت فی الجملہ بھی حاصل نہ ہوگی اور دیدہ و دانستہ پچھم ہی رخ نماز پڑھے گا تو نماز نہ ہوگی اسی طرح اس جگہ سے اگر خط شرقی کی طرف ہٹے گا تو اس کو پچھم رخ پر نماز پڑھنا لازم ہوگا اب اگر وہاں کوئی مسجد کسی وجہ سے پورب رخ بنی ہوئی ہو تو اس کا قبلہ بدلکر پچھم رخ کر لینا ضروری ہوگا کیونکہ پورب رخ میں مواجہۃ فی الجملہ بھی حاصل نہ ہوگی اور نماز نہ ہوگی۔

اسی طرح اس نصف دائرہ کے مرکزی نقطہ سے اگر اتر ہٹے گا تو اس کو دکھن رخ قبلہ بنانا واجب ہوگا اور اگر دکھن سے ہٹے گا تو اتر رخ قبلہ بنانا ضروری ہو جائے گا۔ اور خلاف ورزی کرنے میں نماز نہ ہوگی اسی طرح جو مسجدیں یا جو لوگ ان دونوں دائروں کے درمیان واقع ہوں گے انکو بھی مواجہۃ قبلہ فی الجملہ حاصل کرنے میں انہی ضمنی نمبروں میں ذکر کیے ہوئے احکام کے مطابق عمل کرنا لازم ہوگا، یعنی اس طرح نماز پڑھنا ہوگا یا مسجد بنانا ہوگا کہ جتنے خط مستقیم وجہ مصلی سے نکل کر سمت قبلہ کی طرف چلیں ان میں سے کم از کم ایک خط مستقیم سیدھا مسجد حرام کے کسی حصہ تک یا بیت اللہ کے اوپر عرش معلیٰ تک بیت

اللہ کے محاذی جو فضا ہے اس کے کسی حصے تک پہنچ جائے اور یہی مفہوم ہے سوال کے اس جملہ کا (کہ کسی مقام اور کعبہ کے درمیان جس رخ سے فاصلہ قریب ترین ہو اسی سمت قبلہ ہوگا)، کیونکہ اس خط مستقیم پر اس مقام اور کعبہ کے درمیان کا فاصلہ کمتر ہوگا اور بیت اللہ قریب تر ہوگا۔

ز-: کعبہ کی عمارت جس بقعہ پر واقع ہے اس بقعہ کو جب اللہ تعالیٰ نے پانی کے اوپر تمام زمین ابھارنے سے پہلے ابھارا اور نمودار کیا اور اس کو مرکز عالم بنایا پھر حصۂ بقعہ کو اور اس کے محاذی حصے کو تحت الثری تک اور اس بقعہ سے اوپر اس بقعہ کے محاذی فضا کا حصہ عرش معلیٰ تک اپنی خصوصی توجہ کا مورد بنا کر اس کو معظم و محترم بنایا اور تمام عالم کا قبلہ قرار دے دیا اور "ولله المشرق والمغرب فأينما تولوا فثم وجه الله" (۱) کا اصل حکم موجود ہوتے ہوئے (جسکا ثمرہ اب بھی تحری قبلہ وغیرہ کے موقع پر ظاہر ہوتا ہے) اسکے بجائے صرف اسی قبلہ عالم کی جانب تمام انسانوں اور جناتوں کو نماز پڑھنے کا حکم دے دیا تاکہ اس تجلی گاہ عالم کی عظمت اور احترام ہمیشہ باقی اور محفوظ رہے، نیز اس لئے کہ مصلی کی یہ ایک رنگی اور وحدت اشارہ کرے گی وحدت عقیدہ پر اور وحدت عقیدہ دلیل ہوگی وحدتِ ذات پر اور اس کی توحید پر اور یہ عین محمود و مطلوب ہے ان سب باتوں کا تقاضہ تو یہ تھا کہ ہر نماز میں اور ہر جگہ عین کعبہ کی مواجہۃ فرض ہوتی، مگر ہر جگہ سے عین کعبہ کی مواجہۃ متعذر اور دشوار ہی نہیں بلکہ بسا اوقات انسانی قابو سے باہر تھی، اس لئے اللہ نے اپنے قانون: "لا يكلف الله نفساً الا وسعها" (۲) اور "الدين يسر" (۳) کے مطابق ہر جگہ و ہر مقام سے عین کعبہ کی مواجہت فرض نہیں رکھا، بلکہ محض کعبہ کے مشاہد ہونے تک محدود رکھا اور کعبہ کے غیر مشاہد ہونے کی صورت میں صرف مواجہۃ فی الجملہ کی فرضیت قائم فرمادی تاکہ یک رنگیٔ عمل بھی باقی رہے اور احترام و اعزاز بقعہ مبارکہ بھی محفوظ و حاصل رہے۔

اتنا سمجھ لینے کے بعد اصل سوال کا جواب خود بخود نکل آیا جس کا خلاصہ یہ ہے۔

خلاصۂ جواب: کسی خطہ و مقام پر جب کوئی نئی مسجد تعمیر کرنا ہو تو پہلے یہ دیکھیں کہ اس خطہ کے قدیم مساجد کا رخ کیا

۱- (سورہ بقرہ:۱۱۵)، نیز درمختار میں ہے: "والمعتبر في القبلة العرصة لا البناء فهي من الأرض السابعة إلى العرش"، اس کے تحت علامہ شامی لکھتے ہیں: "ليس المراد بالقبلة الكعبة التي هي البناء المرتفع على الأرض ولذا لو نقل البناء إلى موضع آخر وصلى إليه لم يجز بل تجب الصلاة إلى أرضها" (رد المحتار علی الدر المختار ۲/ ۱۱۴) (مرتب)۔

۲- سورۂ بقرہ:۲۸۶۔

۳- "عن أبي هريرة عن النبي ﷺ قال: إن الدين يسر ولن يشاد الدين أحد إلا غلبه، فسددوا وقاربوا وبشروا واستعينوا بالغدوة والروحة وشيء من الدلجة" (صحیح بخاری مع فتح الباری ۱/ ۹۳، حدیث ۳۹) (مرتب)۔

ہے،اگران کے رخ سے مواجہۃ فی الجملہ حاصل ہوتی ہے اس سے اختلاف مذموم اور مخالفت نا درست ہوگی، بلکہ انہی مساجد کے رخ پر اس نئی مسجد کا قبلہ ومحراب رکھیں،یہیں سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ کسی قدیم مسجد کا قبلہ نئے آلات سے دریافت کے بعد بالکل برعکس ومتضاد تو نہیں ہے، بلکہ محض دائیں بائیں (شمالا یا جنوبا) کچھ منحرف ہے تو یہ دیکھ لیں کہ اگر اس انحراف کے باوجود مواجہۃ القبلہ فی الجملہ حاصل ہے جب تو کوئی تبدل وتغیر اس کے محراب وقبلہ میں نہ کریں، کیونکہ اس صورت میں عمل کی یک رنگی محفوظ نہ رہے گی اور یک رنگی حد شرع میں رہتے ہوئے قائم رکھنا عند اللہ مطلوب ومحمود ہے،اور مقصود ہے(۱)، ہاں اگر انحراف اتنا زیادہ ہو کہ مواجہۃ فی الجملہ بھی باقی نہ رہے تو اس کی اصلاح کرنا اور محراب وقبلہ بدل کر مذکورہ طریقہ پر صحیح رخ پر قائم کر دینا ضروری ہو جائیگا دور دراز مقامات پر مواجہۃ قبلہ فی الجملہ معلوم کرنے کا ایک طریقہ کتابوں میں یہ بھی لکھا ہے کہ کمپاس وغیرہ کسی آلہ کے ذریعہ سے عین کعبہ کی مواجہت معلوم کرنے کے بعد یہ دیکھا جائے کہ جس خطہ میں جس خط پر نماز پڑھی جارہی ہے اس خط کے کسی حصہ پر عین کعبہ سے اگر ایک خط مستقیم آ کر زاویتین قائمتین بنا دیتا ہے تو اس پورے خطہ کا مواجہۃ قبلہ فی الجملہ حاصل ہونا تسلیم کرلیا جائے گا اور اس کی صورت، مثلاً یہ ہوگی

عین کعبہ

زاویتین قائمتین

(خط مستقیم جس پر لوگ نماز پڑھتے ہیں یہ ہے اور اس پر سب مصلی کو مواجہۃ قبلہ فی الجملہ حاصل ہوگی)

اور یہ ضابطہ کعبہ شریف کے ہر چہار سمت میں یکساں و بےخطر جاری ہوگا وہ خط مستقیم جس کے کسی حصہ پر عین کعبہ سے خط مستقیم آ کر زاویتین قائمتین پیدا کرتا ہے کعبہ مکرمہ سے جتنا دور رہوگا اتنا ہی زیادہ طویل ہوگا اور جتنا قریب ہوگا اسی قدر چھوٹا ہوگا،اسی طرح جو ممالک وجزائر کعبہ شریف سے بہت ہی دور واقع ہیں ان ممالک میں مواجہۃ قبلہ فی الجملہ معلوم کرنے کے لئے فقہائے کرام نے کچھ اور ضابطے بھی لکھے ہیں، مثلاً جو ممالک کعبہ شریف سے پورب بہت دور واقع ہیں، جیسے ہندوستان اور اسکے پورب منتہائے نصف دائرہ تک تمام ممالک خواہ وہ نصف دائرہ امریکہ میں واقع ہو ان کے لئے یہ دو ضابطے بھی مواجہۃ قبلہ معلوم کرنے کے ہو سکتے ہیں۔

۱- ''أي شرطه الله تعالى لاختبار المكلفين، لأن فطرة المكلف المعتقد استحالة الجهة عليه تعالى تقتضي عدم التوجه في الصلاة إلى جهة مخصوصة، فأمرهم على خلاف ما تقتضيه فطرتهم اختبارا لهم هل يطيعون أولا كما في البحر" (رد المحتار علی الدر المختار ۲/۱۰۸)(مرتب)۔

ضابطہ(۱) یہ کہ مسجد پچھم رخ ہواور قبلہ کی دیوار اس خط مستقیم پر واقع ہو جو قطب شمالی سے نکل کر قطب جنوبی پر جاتا ہے یا قطب جنوبی سے نکل کر سیدھا قطب شمالی پر جاتا ہو، بعینہ یہی ضابطہ دور دراز کے اور مما لک کے لئے بھی ہوسکتا ہے جو کعبہ شریف سے پچھم جانب واقع ہوں، جیسے الجیریا وغیرہ اوراسکے پچھم منتہائے نصف دائرہ تک تمام مما لک، خواہ وہ نصف دائرہ امریکہ میں کیوں نہ واقع ہواور مسجد پورب رخ واقع ہوتو جس مسجد کی قبلہ کی دیوار اس خط مستقیم پر واقع ہوگی جو قطب شمالی سے نکل کر سیدھا قطب جنوب پر پہنچتا ہے یا بالعکس قطب جنوبی سے نکل کر سیدھا قطب شمالی پر پہنچتا ہے۔

ضابطہ(۲) جو مما لک کعبہ شریف سے پورب بہت زیادہ دوری پر واقع ہیں ان کی مسجد پچھم رخ ہواور قبلہ کی دیوار بین المغربین واقع ہو، یعنی سب سے بڑے دن میں جس نقطے پر آفتاب غروب ہوتا ہو، اس نقطے کے اور سب سے چھوٹے دن میں جس نقطہ پر آفتاب غروب ہواس نقطہ کے درمیان بغیر کسی انحراف کے قبلہ کی دیوار واقع ہوتو مواجہۃ قبلہ فی الجملہ حاصل تسلیم ہوگی۔

آفتاب غروب ہونے کے انہیں دونوں نقطوں کو فقہاء مغربین کہتے ہیں بعینہ یہی ضابطہ دور دراز کے ان مما لک و جزائر کے لئے بھی ہوسکتا ہے جو کعبہ شریف سے پچھم واقع ہوں، جیسے الجیریا وغیرہ اوراس کے پچھم منتہائے نصف دائرے تک کہ تمام مما لک، خواہ نصف دائرہ امریکہ پر کیوں نہ واقع ہواور مسجد پورب رخ ہو صرف فرق یہ ہوگا کہ مسجد کی قبلہ کی دیوار بین المغربین واقع ہونے کے بجائے بین المشرقین واقع ہو، یعنی سب سے بڑے دن میں جس نقطہ پر آفتاب طلوع ہوتا ہے اس نقطے کے اور سب سے چھوٹے دن میں آفتاب جس نقطہ پر طلوع ہوتا ہے اس نقطہ کے درمیان واقع ہوتو مواجہۃ قبلہ فی الجملہ حاصل ہوجائے گی۔

فقہائے کرام آفتاب طلوع ہونے کے ان دونوں نقطوں کو مشرقین سے تعبیر کرتے ہیں۔ جو لوگ کعبہ شریف سے دکھن جانب واقع ہیں وہ لوگ قطب شمالی سے یا اور ستاروں سے اندازہ لگا کر مواجہۃ قبلہ فی الجملہ کا پتہ لگا سکتے ہیں اور جب کعبہ سے اتنے دور دراز فاصلہ پر واقع ہوں جہاں سے قطب شمالی نیچے پڑ جانے کی وجہ سے نظر نہیں آئے تو وہاں قطب جنوبی سے اندازہ لگا سکتے ہیں یا کمپاس وغیرہ آلہ کے ذریعے سے عین کعبہ کی مواجہہ معلوم کرنے کے بعد دیکھیں کہ اگر عین کعبہ سے اگر کوئی خط مستقیم نکل کر اس خط کے کسی حصہ پر آکر زاویتین قائمتین بنادیتا ہے تو مواجہت فی الجملہ بلاشبہ حاصل ہوجائے گا۔

جو لوگ کعبہ سے اتر جانب واقع ہیں وہ لوگ قطب شمالی یا دوسرے تاروں سے اندازہ لگا کر مواجہہ قبلہ فی الجملہ

معلوم کر سکتے ہیں یا کمپاس وغیرہ آلات سے عین کعبہ کی مواجہۃ معلوم کرنے کے بعد دیکھیں کہ اگر عین کعبہ سے کوئی خط مستقیم نکل کر اس خط کے کسی حصہ پر آ کر زاویتین قائمتین بنا دیتا ہے تو مواجہۃ فی الجملہ بلا شبہ حاصل ہو جائے گی۔

یہی طریقہ ان لوگوں کے لئے مواجہۃ قبلہ فی الجملہ معلوم ومتعین کرنے کا ہے جو لوگ شمال مغرب یا شمال مشرق کے گوشوں میں یا جنوب مغرب یا جنوب مشرق کے گوشوں میں آباد ہیں، خواہ کتنے بھی دور ہوں (۱)۔ وهذا آخر ما أردنا بيانه ههنا، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۰/۱۰/۱۴۰۰ھ

مغرب کے رخ پر بنائی گئی قدیم مساجد کا حکم:

کیا اکثر دینی صحیفوں میں ہم نے پڑھا اور دیکھا ہے کہ قبلہ یعنی کعبۃ اللہ ہمارے ملک ہندوستان کے مغرب میں واقع ہے رخ کی صریحاً تشریح مذکورہ کتب میں نہیں بتائی گئی ہاں جغرافیائی اور سائنس سے ٹھیک ثابت ہوتا ہے کہ ہمارے جنوبی ہند کے ٹھیک ''شمال مغرب'' میں کعبہ واقع ہے اور آج کل کعبہ شریف کا رخ پہچاننے کا مصنوعی آلہ آ چکا ہے جس سے ٹھیک رخ پہچانا جاتا ہے۔

غرض جنوبی ہند کے اکثر قدیم مساجد جو تقریباً سو سال قبل کبھی تعمیر کی گئی ہیں ٹھیک مغرب کے رخ پر ہی بنائی گئی ہیں اور آج بھی اسی رخ پر نمازیں پڑھی جا رہی ہیں اسلاف کے بزرگوں اور دینداروں کو رخ کعبہ کا ٹھیک پتہ نہ تھا اور انھوں نے اپنی کتب میں ''کعبہ ہند سے مغرب جانب میں واقع ہوتا ہے کے الفاظ پر عمل کیا ہے۔ اس لحاظ سے ساری مسجدیں طرف مغرب پر تعمیر کی گئی ہیں۔ مگر اب کے علماء مسجدوں میں ٹیڑھی صفیں بنانے پر ترجیح دے کر صفیں بالکل ٹیڑھی ہی بنا دی گئی ہیں۔ لہذا ہمارے اسلاف جنھوں نے تعمیر مسجدیں کرائی ہیں اب ان کی بے حرمتی اور بدنامی کے علاوہ بڑا عیب اور دھبہ لگا رہے ہیں۔ اس سلسلہ میں سوال یہ ہے کہ سابق اور اسلاف کے نیک بزرگوں اور ہماری نمازیں اب تک کی کیا ہوئیں آخر اس کا حل کیا ہے؟ اور قدیم مسجدیں کیا کی جائیں؟ آج کل یہ نیا انقلاب فساد کے نمونہ پر پہنچا ہے کیا کریں؟

احمد سعید عفی عنہ

۱- تفصیل کے لئے دیکھئے: ردالمحتار علی الدرالمختار ۲/ ۱۰۸-۱۱۳ مبحث فی استقبال القبلۃ۔

الجواب وباللہ التوفیق:

جو مسجدیں قدیم ٹھیک مغرب رخ پر بنائی گئی ہیں ان میں تمام نمازیں بلاشبہ ان سب مسجدوں میں درست ہے۔نہ صف ٹیڑھی کرنے کی ضرورت ہے اور نہ مسجد کی عمارت گرانے یا بگاڑنے کی ضرورت ہے۔قبلہ کا رخ مغرب واقع ہونے کا شرعی مفہوم یہ ہے کہ ہندوستان کا قبلہ بین المغربین ہے اور وہ ان تمام قدیم مساجد میں حاصل ہے۔ہاں جس مسجد کا رخ بین المغربین نہ ہو اس کا قبلہ درست کرلینا چاہیے اور بین المغربین واقع ہونے کا یہ مفہوم ہے کہ سب سے بڑے دن میں مسجد کے جس رخ پر آفتاب غروب ہوتا ہو اس صحن میں آفتاب اور مسجد کے اوتری کنارہ کے بیچ میں ایک نقطہ پر نشان لگادیں پھر اسی طرح سب سے چھوٹے دن میں آفتاب مسجد کے جس رخ پر غروب ہوتا ہے مسجد کے دکھنی کنارہ اور آفتاب کے بیچ میں اتنے ہی فاصلہ پر ایک نشان لگادیں جتنے فاصلہ پر اوتری نشان لگایا تھا پھر دونوں نشانوں کے درمیان ایک مستقیم کھینچ دیں۔پس اگر یہ خط اور مسجد کے مغربی دیوار کا خط متوازی ہو تو قبلہ بین المغربین حاصل ہے اور نماز بلاشبہ درست ہے(۱)۔

اتنے دور دراز ملکوں میں عین قبلہ کی مواجہہ شرط نہیں ہوتی بلکہ جہت قبلہ کی مواجہت فی الجملہ بھی کافی ہوجاتی ہے۔

لقولہ تعالیٰ "وحیث ما کنتم فولوا وجوھکم شطر المسجد الحرام"(۲)،فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی،مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۶/۱۲/۱۴۰۱ھ

۱- "عن أبي هريرةؓ قال: قال رسول اللهﷺ: ما بين المشرق والمغرب قبلة (سنن الترمذی ۲/۱۷۱،ابواب الصلاۃ حدیث ۳۴۲،۳۴۴)آپ ﷺ نے یہ اہل مدینہ کے لئے ارشاد فرمایا ہے،کیونکہ مکہ مکرمہ،مدینہ منورہ سے جہت جنوب میں ہے،اس حدیث سے واضح ہوجاتا ہے کہ دور والوں کے لئے جہت کعبہ کا استقبال ہی کافی ہے)۔

۲- سورۃ بقرۃ:۱۵۰۔

باب الاذان والاقامۃ

۱-ٹیپ ریکارڈر سے یا جوتے پہن کر اذان دینا:

ٹیپ رکارڈر سے اذان دینا، یعنی اذان ٹیپ کرلی جائے اور ہر نماز کے وقت اس کو بجادیا جائے، تو یہ اذان معتبر ہے یا نہیں، نیز جوتے پہن کر اذان دینا کیسا ہے؟۔

۲-مرتکب کبائر کا اذان دینا:

نسبندی کرانے والے، ویڈیو، سنیما دیکھنے والے اور داڑھی منڈانے والے یا ایک مشت سے کم کرنے والے کا اذان دینا کیسا ہے؟

۳-اذان کے بعد ہاتھ اٹھا کر دعا مانگنا:

اذان کے بعد دعا کے لیے ہاتھ اٹھانے کا ثبوت ہے یا نہیں۔

الجواب وباللہ التوفیق:

۱-ٹیپ ریکارڈر سے اذان دینا جائز نہیں، اور ناپاک جوتا پہنے ہوئے اذان دینا مکروہ ہے۔

۲-اپنی رضا وخوشی سے نسبندی کرانے والے، نیز اس کے بعد جن کا ذکر ہے ان کا مؤذن مقرر کرنا ٹھیک نہیں، اس لیے کہ یہ منصب عالی ہے اور ان کے مؤذن مقرر کرنے کو فقہاء نے مکروہ فرمایا ہے، البتہ جب ان کی اذان بکراہت ادا ہو جائے گی تو ان کی اذان پر بنا کر کے جماعت کرلینا صحیح ہو جائے گا۔

۳-اذان کے بعد ہاتھ اٹھا کر دعا کرنا مستحب یا سنت نہیں اور نفس اباحت میں کلام نہیں، جبکہ ضروری سمجھنے والوں

سے خلط نہ ہو(۱)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲/۸/۱۴۱۱ھ
الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن خیرآبادی، محمد ظفیر الدین مفتاحی، کفیل الرحمٰن

منفرد کے لئے اذان واقامت:

اگر اکیلے کسی جگہ ہو جنگل میدان یا سمندر میں ہو نماز کے وقت پر اذان دیکر نماز پڑھنا ضروری ہے یا بغیر اذان دیئے صرف اقامت کہہ کر نماز پڑھ لینا کافی ہے، بعض لوگ صرف مغرب کی نماز اذان دیکر پڑھتے ہیں باقی نمازیں اذان دیئے بغیر صرف اقامت کہہ کر نماز پڑھ لیتے ہیں کیا مسئلہ ہے؟

عبدالستار اسماعیل (شری کونکر ایس، پی، ٹی جبیل الجبیر سعودی عرب)

الجواب وباللہ التوفیق:

اگر جنگل ومیدان وغیرہ کسی جگہ میں اکیلے ہوں تو اذان دینا سنت ہے، اس لئے اذان دیکر نماز پڑھنا افضل ہے، باقی اگر بغیر اذان دئے محض اقامت پڑھکر نماز پڑھ لیں جب بھی نماز بلا کراہت ادا ہو جائے گی اس حکم میں نماز مغرب وغیر مغرب سب برابر ہے۔فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

عورت پر اقامت نہ ہونے کی وجہ:

عورت پر تکبیر اقامت نہ ہونے کی کیا وجہ ہے؟

فتح محمد کشمیری (بمقام شاہ پورہ ضلع بارہ مولہ کشمیر)

۱- "المسنون في هذا الدعاء أن لا ترفع الأيدي؛ لأنه لم يثبت عن النبي ﷺ رفعها" (فیض الباری علی شرح البخاری ۲/۱۶۳)(مرتب)۔

الجواب وباللہ التوفیق:

اس لئے کہ عورت کے ذمہ نماز با جماعت نہیں، بلکہ تنہائی میں نمازیں پڑھنا بہتر ہوتا ہے اور اقامت جماعت کے لئے ہوتی ہے (۱)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۵/۱۰/۱۴۰۱ھ

بوقت اذان قضاء حاجت کا حکم:

اذان ہوتے وقت بعض لوگ پیشاب و پاخانہ کی فراغت کے لئے منع کرتے ہیں اس کا کیا شرعی حکم ہے؟

خادم مشتاق احمد (محمد پور صدر اعظم گڑھ)

الجواب وباللہ التوفیق:

جب اذان شروع ہو جائے تو پیشاب پاخانہ میں مشغول ہونا منع ہے، بلکہ باہر ہی رک کر اذان کا جواب دینا چاہئے (۲)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۵/۳/۱۴۰۱ھ

۱- مؤذن کا اذان کہنے کے بعد خود جماعت میں شریک نہ ہونا:

مؤذن اذان کے بعد وضو یا سنتوں یا اور کسی کام میں مشغول ہو جاتے ہیں حتی کہ نماز کھڑی ہو جاتی ہے اور جب امام تکبیر تحریمہ باندھ چکا ہوتا ہے، یا ایک رکعت ہو جاتی ہے تو اب یہ مؤذن اس مسجد میں نماز نہیں پڑھتے، بلکہ دوسری مسجد میں جا کر تکبیر اولی کے ساتھ نماز ادا کرتے ہیں ان کا یہ روزانہ کا معمول ہے، کبھی ظہر کی نماز میں دو منٹ باقی ہوتے ہیں، جبکہ ان کو ٹائم کا بھی علم ہوتا ہے، اس کے باوجود سنتوں کی نیت باندھ لیتے ہیں، جب تک وہ سنتوں سے فارغ ہوتے ہیں اتنے میں نماز

۱- "ویکرہ تحریماً جماعۃ النساء ولو فی التراویح" (الدر المختار مع رد المحتار ۲/۳۰۵) (مرتب)۔

۱- "ولا ینبغی أن یتکلم السامع فی خلال الأذان والإقامۃ ولا یشتغل بقراءۃ القرآن ولا بشیئ من الأعمال سوی الإجابۃ" (فتاوی عالمگیریہ ۱/۵۷) اور اگر آدمی بیت الخلاء میں ہے تو وہ اذان کا جواب نہیں دے گا، "وأجمعوا أن المتغوط لا یلزمہ الرد فی الحال ولا بعدہ" (البحر الرائق ۱/۴۴۹) (مرتب)۔

کی دو تین رکعتیں نکل جاتی ہیں، اب اس صورت میں بھی یہ نماز چھوڑ کر دوسری مسجد میں جا کر باجماعت نماز ادا کرتے ہیں، نیز ظہر کی اور فجر کی سنتوں کو نماز سے پہلے پڑھنا ضروری سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس کے بعد ہوں گی ہی نہیں، لہذا ان کا یہ علم کہاں تک درست ہے اور ان کے لئے کون سی صورت بہتر ہے بیان فرمائیں۔

۲- اقامت کون کہے؟

مؤذن صاحب مغرب کی اذان دے کر لوٹتے ہیں تو تکبیر کوئی دوسرا مقتدی پڑھ دیتا ہے، یہ روزانہ کا معمول ہے۔ موذن صاحب بعد میں خفاء ہوتے ہیں اور کہتے تکبیر مؤذن کا حق ہے آپ حضرات ایک دو منٹ انتظار کرلیا کریں، لہذا شریعت کی روشنی میں بیان فرمائیں کہ کیا واقعی یہ مؤذن کا حق ہے اور اس کے لئے انتظار کی گنجائش بھی ہے یا نہیں؟

الجواب وبالله التوفيق:

۱۔ صورت مسئولہ کا شرعی حکم یہ ہے کہ اگر جماعت کا وقت مقرر ہے اور جماعت اسی وقت مقررہ پر ہوتی ہے تو مؤذن صاحب کا سنتوں میں مشغول رہ کر جماعت چھوڑ دینا جائز نہیں، بلکہ مسئلہ اس طرح ہے کہ اگر ظہر کی سنت ہے تو اگر دوسری رکعت پوری ہونے کے قریب ہے تو دو رکعت پر سلام پھیر کر جماعت میں شریک ہو جائے، اور اگر تین رکعت پڑھ چکا ہے تو چاروں رکعت بعجلت پوری کر کے جماعت میں شریک ہو جائے، ورنہ سنتوں کی نیت توڑ کر جماعت میں شریک ہو جائے اور جماعت نہ چھوڑے، ورنہ گنہگار ہوگا، "(قوله خلافا لما رجحه الكمال) حيث قال: وقيل: يقطع على رأس الركعتين وهو الراجح......ثم اعلم أن هذا كله حيث لم يقم إلى الثالثة، أما إذا قام إليها وقيدها بسجدة ففي رواية النوادر يضيف إليها رابعة ويسلم، وان لم يقيدها بسجدة قال في الخانية: لم يذكر في النوادر واختلف المشائخ فيه، قيل: يتمها أربعا ويخفف القرأة" (۱)۔

اسی طرح اگر فجر کی سنتوں میں غالب گمان ہو کہ سنت پڑھ کر جماعت مل جائے گی جب تو سنت کہیں کنارے پر پڑھ کر فرض میں شریک ہو جائے، ورنہ سنت چھوڑ دے اور فرض میں شریک ہو جائے۔ پھر سنتِ ظہر فرض کے بعد اور سنتِ فجر آفتاب طلوع ہونے کے بعد راجح قول میں پڑھے تو ترک کا گناہ نہ ہوگا، "وإذا خاف فوت ركعتي الفجر الاشتغالة بسنتها تركها لكون الجماعة أكمل، وإلا بأن رجا ادرك ركعة في ظاهر المذهب، وقيل:

۱- ردالمحتار ۱/۴۹۷۔

التشهد......ولا يتركها، بل يصليها عندباب المسجد" (۱)**"وقال محمد: أحب إلى أن يقضيها إلى الزوال كما في الدرر،قيل: هذا قريب من الاتفاق......وقال: لا يقضي، وإن قضى فلا بأس به"** (۲)۔

پس مؤذن کا سنت میں مشغول رہ کر جماعت چھوڑ دینااور دوسری مسجد میں چلاجانا مکروہ تحریمی ہےاور سخت گناہ ہے،اور جس مسجد میں اذان دے اس کو چھوڑ کر دوسری مسجد میں جا کر نماز پڑھنا فقہاء نے مکروہ تحریمی لکھا ہےاور اس پر سخت نکیر وارد ہوئی ہے،اور نکیر کی صورت یہ بیان فرمائی گئی ہے کہ ایسی قبیح حرکت ہے کہ جیسے کوئی لوگوں کو کھانے کی دعوت دیکر بلائے اور جب لوگ کھانا کھانے کے لئے آویں تو یہ دعوت دینے والا غائب ہو جائے یہ عنداللہ سخت مبغوض اور ممنوع ہے،پس اگر یہ صورت اذان دیر میں دینے سے پیش آگئی ہے تو اس پر لازم ہے کہ مقررہ وقت سے اتنا قبل دے کہ مستقل نمازی آکر طہارت وضو، سننِ رواتب پڑھ کر اطمینان سے تکبیر اولی پالیں، جب دوسرے نمازی اتنا وقت پا جائیں گے تو مؤذن کیوں نہ پائے گا،پس اگر اتفاقیہ تاخیر اذان میں ہوگئی ہے جب تو قابلِ رعایت ہوگا۔ورنہ اس تاخیر کی عادت کرے گا تو واجب العزل ہوگا اور اس کو ہٹا کر دوسرا مستعد مؤذن مقرر کر لینا چاہئے، کیونکہ اذان کی گڑبڑی اور عدم پابندی وقت سے جماعت کا نظم بھی گڑبڑ ہوسکتا ہے،اسی طرح اگر جماعت کا وقت مقرر نہ ہو، یا اس کا انتظام نہ ہو تو جماعت منظم نہ ہوگی اور سارے ہی اہل محلّہ عنداللہ ماخوذ و مجرم ہوں گے اور جماعت کا نظم برقرار و قائم رکھنا ضروری ہوگا،ورنہ سارے اہل محلّہ گنہگار ہوں گے۔

اور اگر جماعت کا وقت مقرر ہے،مگر امام سے وقت کی صحیح پابندی نہ ہوتی ہو اور اسی عدم پابندی سے مذکورہ بالا خرابیاں آسکتی ہیں تو امام سے بھی کہہ دیا جائے کہ پابندی اوقات کریں وہ بھی اگر نہ مانیں تو ان کو بھی بدلا جا سکتا ہے۔

۲-مغرب کی نماز میں مؤذن کے اذان خانہ سے جماعت گاہ تک آنے میں اتنی دیر نہیں ہوتی کہ وقت مکروہ آجائے یا اس سے نماز میں کراہت آجائے ،اس لئے مؤذن کے پہنچنے اور تکبیر شروع کرنے کا انتظار کرنا چاہئے اور جب مؤذن کو کسی دوسرے کی تکبیر پڑھنے سے رنج ہوتا ہے تو پھر کسی کو موذن پر سبقت کرنا درست نہ ہوگا۔**"من أذن فهو يقيم"** (۳) کے قاعدے سے تکبیر میں سبقت نہ کرنا چاہئے۔مؤذن کو ناگواری نہ ہو تو مضائقہ نہیں،**"أقام غير من أذن**

۱- الدر المختار ص ۸۸،۴باب ادراک الفریضۃ۔

۲- رد المحتار ۱/ ۴۸۲۔

۳- أخرجه احمد ۴/ ۱۶۹،فی مسند زیاد الصدائی ہو ابو داؤد ۱/ ۱۴۲،حدیث نمبر (۵۱۴)،ترمذی ۱/ ۳۸۳ (حدیث نمبر:۱۹۹)،ابن ماجہ ۱/ ۲۳۷، حدیث نمبر ۷۱۷)(مرتب)۔

بغيبته أى المؤذن لا يكره مطلقا، وإن بحضوره كره أن لحقه وحشة" (۱)،"(قوله: كره إن لحقه وحشة)أى لم يرض به......الأفضل أن يكون المؤذن هو المقيم أى لحديث من أذن فهو يقم" (۲)،فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

۱- مائک سے اذان دینا:

کیا مائک سے اذان پڑھنا بدعت ہے، نیز اس سے اذان کا فریضہ ادا نہیں ہوگا تشفی بخش جواب سے نوازیں۔

۲- جدید آلات کا استعمال:

بعض مولوی حضرات کا (جو زمانہ آدم سے تعلق رکھنے والے ہیں) فتویٰ ہے کہ تمام جدید آلات کا استعمال، مثلاً گھڑی ٹیلیفون وغیرہ بدعت ہے؟

الجواب وبالله التوفيق:

۱- اہل سائنس کی تحقیق کے مطابق لاؤڈ سپیکر کی آواز متکلم ہی کی آواز ہوتی ہے، البتہ اس میں آواز بلند ہو جاتی ہے اور اذان میں رفع صوت مطلوب بھی ہے، کما فی البحر: "يرفع للترغيب الوارد في الحديث في رفع صوت المؤذن لا يسمع مدى صوت المؤذن إنس ولا جن ولا مدر إلا شهد له يوم القيامة" (۳)، اس لئے کہ اس میں اذان بلا کراہیت جائز ہے۔

۲- ہر جدید آلہ کا استعمال ناجائز اور بدعت نہیں ہے، بلکہ اس میں تفصیل ہے، وہ یہ کہ جو آلات لہو لعب کے لئے موضوع ہیں ان کا استعمال ناجائز ہے اور جو نہ لہو لعب کے لئے موضوع ہوں اور نہ ہی ان کا استعمال لہو لعب میں متعارف ہو گیا ہو، ان کا استعمال جائز ہے، مزید تفصیل (امداد الفتاویٰ ۱/ ۸۴۰) پر ملاحظہ ہو، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲/ ۱/ ۱۴۱۱ھ

۱- الدر المختار۔
۲- رد المحتار ۱/ ۲۶۵۔
۳- البحر ۱/ ۳۶۶۔

اذان دینے کے لئے وضو ضروری نہیں:

اذان دینے کے لئے وضو کرنا ضروری ہے یا نہیں؟

الجواب وباللہ التوفیق:

اذان دینے کیلئے وضوء کرنا ضروری نہیں البتہ ہمیشہ بلاوضو اذان دینا اچھا نہیں ہے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۴/ ۲/ ۱۴۰۳ھ

۱- اندرون مسجد اذان دینا:

"فتاویٰ قاضیخاں، تبیین الحقائق" اور "فتاویٰ عالمگیری" وغیرہ کتب فقہ میں یہ عبارت ہے: "وینبغی أن یوذن علی المئذنۃ وخارج المسجد ولا یؤذن فی المسجد" (۱)۔ تو کیا آج کل مسجد کے برآمدہ کی یا مسجد کے بغل کی کوٹھری میں اسپیکر سے جو اذان دیتے ہیں وہ مناسب نہیں ہے، جبکہ اذان کا مقصد پوری طرح حاصل ہورہا ہے کیا اسپیکر سے عین مسجد میں اذان دیجائے تو مکروہ ہے؟ تمام جوابات مفصل مدلل کتابوں کے حوالے سے ارقام کیا جائے ان مسائل میں یہاں ایک شخص نے آج کل ایک فتنہ کھڑا کردیا ہے۔ یہ صاحب اپنے آپ کو شیخ الحدیث اور مفتی بھی بتاتے ہیں۔

۲- جمعہ کی اذان ثانی کا صحیح محل:

۱- جمعہ کے روز اذان ثانی رسول اللہ ﷺ کے عہد مبارک میں مسجد کے اندر منبر کے نزدیک ہوتی تھی یا مسجد کے باہر دروازے پر ہوتی تھی۔

۲- حضرت عثمانؓ کے زمانہ میں کہاں ہوتی تھی کیا یہ صحیح ہے کہ ہشام بن عبدالملک سے پہلے تک اذان ثانی مسجد کے باہر دروازے پر ہوتی تھی اور ہشام بن عبدالملک نے اذان ثانی کو مسجد کے اندر منبر کے نزدیک منتقل کیا، جیسا کہ ابن الحاج مالکی نے المدخل (ج ۲ ص ۲۱۲) میں لکھا ہے اور مولانا عبدالحئی لکھنوی نے حاشیہ وقایہ (ج ۱ ص ۲۰۲) میں اس کو صحیح تسلیم کیا ہے، کیا ابن الحاج کا بیان صحیح ہے؟

۳- ہندوستان میں مولانا احمد رضا وغیرہ کے اختلافات اٹھانے سے قبل تک اذان ثانی کے سلسلہ میں تمام بلاد

۱- فتاوی قاضیخان علی ہامش العالمگیریہ ۱/ ۷۸۔

عرب وعجم میں مسلمانوں کا ایک تعامل رہا ہے۔

محمد ادریس (راجستھان)

الجواب وباللہ التوفیق:

۱-"وينبغي أن يوذن على المئذنة أو خارج المسجد ولا يؤذن في المسجد" کا ترجمہ عربی میں یہ ہے کہ "يندب أن يوذن على المئذنة أو خارج المسجد ولا يؤذن ندباً في المسجد"۔

اردو ترجمہ یہ ہے کہ بہتر یہ ہے کہ اذان میذنہ پر یا خارج مسجد دی جائے مسجد کے اندر اذان دینا مندوب وبہتر نہیں ہے، یعنی ینبغی کا معنی "مستحب" نہیں ہے اور نہ "لا یوذن" کے معنی "لا یجوز" کے ہیں، ورنہ دور صحابہ وتابعین میں کبھی کوئی اذان اندرون مسجد نہ دیجاتی، حالانکہ اذان خطبہ ہشام بن عبدالملک کے دور سے جو دورتابعی یقیناً اور دور صحابہ بھی فی معنی کہا جاسکتا ہے۔ برابر مسجد میں متوارث طور پر بلانکیر چلی آئی ہے(۱)۔

اور مسجد سے باہر میذنہ وغیرہ پر دینے کا اور مسجد کے اندر نہ دینے کا استحباب اس وجہ سے ہے کہ اذان میں جہاں تک ہوسکے آواز بلند کرنا اور دور تک پہنچانے کی سعی کرنا اور زیادہ سے زیادہ غائبین کو اعلام کرنا مطلوب شرعی ہے، جیسا کہ ابوداؤد شریف وغیرہ صحاح ستہ وغیرہ کی احادیث صحیحہ سے معلوم ہوتا ہے کہ کلمات اذان خواب میں عبداللہ بن زید کو فرشتہ نے بتلایا، مگر سرکار دو جہاں علیہ السلام نے اذان حضرت بلالؓ سے "إنه أندى صوتا منک"(۲) کہہ کر دلوائی اور اس ارشاد نبوت کی وجہ سے موذن کا جہرالصوت ہونا افضل کہا گیا اور کیوں اس لئے تا کہ دور تک آواز پہنچے اور اعلام کامل ہو اور اسی وجہ سے جب حضرت عثمان غنیؓ کے دور میں مسلمان کثیر ہوگئے تو حضرت عثمان غنیؓ نے جو اذان زائد کہلوائی تو اس کو مقام زوراء جو ایک بلند مقام تھا کہلوائی اور تمام صحابہ کرام نے اس کے جواز پر اجماع کرلیا، پس معلوم ہوا کہ میذنہ وغیرہ مقصود بالذات نہیں ہے اور نہ اندرون مسجد اذان کہنا ممنوع وناجائز ہے، بلکہ یہ محض اسوجہ سے ہے کہ میذنہ وغیرہ سے اعلام غائبین کامل ہوگا اور اندرون مسجد سے اعلام غائبین ناقص ہوگا، پس اب اس آلہ (لاؤڈاسپیکر) کیوجہ سے یہ اکمال واہتمام بغیر میذنہ کے بھی ہوتا

۱- "ويوذن ثانياً بين يديه أي على سبيل السنية" (ردالمحتار علی الدرالمختار ۳/۳۸، وفي البحر: بذلك جرى التوارث (البحر الرائق ۲/۲۷۴)(مرتب)۔

۲- سنن ابوداؤد ۱/۱۳۵، کتاب الصلاۃ باب کیف الأذان حدیث ۴۹۹، حدیث طویل ہے متعلقہ حصہ یہ ہے: "فلما أصبحت أتيت رسول الله ﷺ فأخبرته بما رأيت، فقال إنها لرؤيا حق إن شاء الله فقم مع بلال فالق عليه ما رأيت فليؤذن فإنه أندى صوتاً منك..." الحدیث (مرتب)۔

ہے اور اندرونِ مسجد سے بھی ہوتا ہے، جبکہ مائک اوپر منارہ وغیرہ پر رکھدیا جائے، لہٰذا اب یہ اعتراض کہ مائک باہر رہتے ہوئے بھی اندرونِ مسجد ممنوع ہے یا مکروہ ہے صحیح نہ ہوگا، بلکہ جس شکل میں اعلام غائبین اچھی طرح ہوگا اور آواز دور دور تک پہنچے گی وہ اولیٰ وافضل عندالشرع شمار ہوگی (۱)۔

۱۔ منبر کے سامنے مسجد کے دروازہ پر ہوتی تھی (۲)۔

۲و۳۔ حضرت عثمان غنیؓ کے شروع دورِ خلافت تک یہی طریقہ رہا پھر جب لوگ زیادہ ہوگئے تو حضرت عثمانؓ نے ایک اور اذان کا (اعلام غائب کے لئے) مقام زوراء پر شروع فرمایا (۳) اور یہ طریقہ ہشام بن عبدالملک تک چلتا رہا کہ یہ اذان مقام زوراء پر ہوتی رہی پھر ہشام بن عبدالملک نے اس اذان کو جو عندالخطبہ باب مسجد پر دیجاتی تھی منبر کے قریب شروع کرادی چونکہ ہشام بن عبدالملک کا دور خیر القرون ہے (۴)، اس لئے اس کو بدعت یا گمراہی یا خلاف شرع نہیں کہہ سکتے، کیونکہ اس دور خیر القرون سے اب تک بلااختلاف یہ اذان اندرون مسجد بین یدی المنبر یا بین یدی الامام ہوتی چلی آرہی ہے اور یہ تواتر عملی ہے، مولوی احمد رضا خانصاحب کے اختلاف سے اس تواتر میں کچھ قباحت وخرابی نہ آئے گی، بلکہ اس تواتر عملی جو اجماعی درجہ میں قریب تر پہنچ چکا تھا اس کی مخالفت کی قباحت خود مولوی احمد رضا خانصاحب پر عائد ہوگی (۵)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

۱۔ حالات کے اعتبار سے تبدیلی ہوتی رہی ہے" وقال ابن سعد بالسند إلى أم زيد بن ثابت: كان بيتي أطول بيت حول المسجد، فكان بلال يؤذن فوقه من أول ما أذن إلى أن بنى رسول الله ﷺ مسجده فكان يؤذن بعد على ظهر المسجد، وقد رفع له شيئ فوق ظهره" (ردالمحتار علی الدر المختار ۲/ ۵۴) (مرتب)۔

۲۔ ابوداؤد باب النداء یوم الجمعہ (حدیث ۱۰۸۸، عن السائب بن يزيد قال: "كان يؤذن بين يدي رسول الله ﷺ إذا جلس على المنبر يوم الجمعة على باب المسجد، وأبي بكر وعمرؓ، ثم ساق نحو حديث يونس"، اور وہ حدیث ۱۰۸۷ ہے) (مرتب)۔

۳۔ "فلما كان خلافة عثمان وكثر الناس أمر عثمان يوم الجمعة بالأذان الثالث، فأذن به على الزوراء، فثبت الأمر على ذلك" (ابوداؤد حدیث ۱۰۸۷، نیز صحیح بخاری مع فتح الباری ۲/ ۳۹۳ حدیث ۹۱۲، ۹۱۳) (مرتب)۔

۴۔ ہشام بن عبدالملک کی وفات ۱۲۵ھ میں ہے، اور وہ ۱۰۵ھ میں خلیفہ مقرر ہوا تھا (البدایہ والنہایہ ۸/ ۳۹۹) (مرتب)۔

۵۔ "وإذا صعد الإمام المنبر جلس وأذن المؤذن بين يدي المنبر بذلك جرى التوارث" (ہدایہ ۱/ ۱۵۱) (مرتب)۔

زوال سے قبل جمعہ کی اذان وسنت کی ادائیگی:

یہاں سعودی میں جمعہ کے روز زوال سے ایک ڈیڑھ گھنٹہ پہلے جمعہ کی اذان جامع مسجد میں دے دی جاتی ہے، اب اگر کوئی شخص زوال سے پہلے جمعہ کی چار رکعت سنت پڑھے تو جائز ہے یا نہیں جبکہ زوال ہونے کے بعد فوراً ہی خطیب خطبہ پڑھنا شروع کر دیتا ہے سنت پڑھنے کے لئے پہلے وقت ہی نہیں ملتا، جبکہ خطبہ جاری رہتا ہے اسکے بارے میں اگر زوال سے پہلے پڑھے تو جائز ہے یا نہیں؟ واضح فرمائیں۔

الجواب وباللہ التوفیق:

جمعہ کے دن بھی زوال سے پہلے کی اذان معتبر نہیں اس طرح زوال سے پہلے جمعہ کی سنت پڑھنا بھی صحیح نہیں، جمعہ کی سنت بھی زوال کے بعد پڑھے زوال سے پہلے جو سنت پڑھی جائے گی وہ کافی نہ ہوگی، زوال کے بعد پھر پڑھنی پڑے گی، پس اگر کوئی شخص جمعہ کے دن زوال سے پہلے آجائے اور نماز پڑھنا چاہے تو نفل کی نیت سے پڑھے، پھر جب زوال ہو جائے سنت جمعہ کی پڑھے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۴/ ۲/ ۱۴۰۳ھ

مسجد کے مائک سے دنیاوی کاموں کا اعلان کرنا درست ہے یا نہیں:

مسجد کے مائک سے دنیاوی امور کے اعلانات وغیرہ کرنا درست ہے یا نہیں؟

الجواب وباللہ التوفیق:

جولاؤڈاسپیکر یا مائک ان دنیاوی کاموں کے اعلان کے لئے استعمال کیا جاتا ہے اگر وہ اسپیکر یا مائک مسجد پر وقف شدہ سے خریدا گیا ہے جب تو اس اسپیکر و مائک سے صرف مسجد کے کام کا اعلان کرنا درست رہے گا، جیسے اذان اور وعظ و نصیحت کا کام باقی دنیاوی کسی کام میں اس کا استعمال کرا کرایہ لیکر بھی جائز نہ ہوگا، اور اگر یہ اسپیکر اور مائک وغیرہ مسجد کے پیسے سے نہیں خریدا گیا ہے اور اس کے استعمال میں مسجد میں وقف شدہ بیڑی بھی استعمال نہیں کی جاتی، بلکہ ان سب کاموں میں خرچ کرنے کی نیت سے خریدے گئے ہیں کہ اس سے اذان بھی ہوگی اور یہ سب اعلانات بھی ہوں گے تو اس صورت میں

اسپیکرو مائک سب عین مسجد سے الگ امام کے کمرہ میں یا کسی اور جگہ جو مسجد سے متصل ہو۔فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱/۸/۱۴۰۴ھ

اذان سن کر مسجد نہ جانے والا کیا کافر ہے؟

زید نے نماز کی اذان سنی نماز کے لئے جانے میں دو چار منٹ کی دیر ہوگئی زید نے بکر سے کہا کہ میں تو کافر ہوگیا ہوں بکر نے کہا کہ کیوں زید نے جواب دیا، اس لئے کہ میں اذان سنکر فوراً نماز پڑھنے نہیں گیا دریافت یہ ہے کہ زید کافر ہوا یا کہ نہیں؟

الجواب وباللہ التوفیق:

لغو جملہ بول گیا جو ہرگز نہ بولنا چاہئے لیکن کافر نہیں ہوا ہے آئندہ ایسے جملہ بولنے سے احتیاط واجب ہے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۹/۹/۸۵ ۱۳ھ

بچے کے کان میں اذان کا حکم:

یہاں دبئی میں اسپتال کے قانون کے مطابق بچہ پیدا ہونے کے فوراً بعد اذان دینے کی ممانعت ہے اور تین چار روز کے بعد جب چھٹی ہوتی ہے تب اذان دی جاتی ہے، کیا اس میں کوئی حرج ہے؟ بینوا توجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

بچہ پیدا ہونے کے بعد نماز پنجگانہ کی اذان کی طرح بلند آواز سے اذان دینا ضروری نہیں ہے، بلکہ سنت یہ ہے کہ بچہ جب آلائش وگندگی سے پاک کرلیا جائے تو اس کو قریب کرکے پہلے دایاں کان سامنے کرکے کلماتِ اذان صرف ایسی آواز سے کہدیں کہ آواز بچہ کے کان تک پہنچ جائے، پھر اسی طرح بایاں کان سامنے کرکے اقامت کے کلمات ایسی آواز سے کہہ دیں کہ آواز بچہ کے کان تک پہنچ جائے اور بس۔"عن أبي رافع قال: رأيت رسول الله ﷺ أذن في أذن الحسن بن علي رضي الله عنه حين ولدته فاطمة بالصلوٰة ،رواه الترمذی وأبوداؤد، وقال الترمذی: هذا

حدیث حسن صحیح"(۱)۔

اور یہ صورت قانون ہسپتال کے خلاف بھی نہ ہوگی اور سنت بھی ادا ہو جائے گی، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

۱- وفی شرح السنة عن عمر بن عبد العزیز كان یؤذن فی الیمنی ویقیم فی الیسری إذا ولد الصبی، قلت: وقد جاء فی مسند أبی یعلی الموصلی عن الحسین مرفوعاً: من ولد له ولد فأذن فی اذنه الیمنی وأقام فی اذنه الیسری لم تضره أم الصبیان. كذا فی الجامع الصغیر للسیوطی (مرقاۃ شرح مشکوۃ ۴/ ۲۶۰) (مرتب)۔

باب ارکان الصلوۃ وواجباتہا وسننہا ومکروہاتہا ومفسداتہا

ہر رکعت میں دو سجدے فرض ہیں:

عید گاہ مبارک شاہ شہید گورکھپور میں عید کی نماز میں سب سے آخری صف والے بہت سے مقتدیوں نے دوسری رکعت میں مکبرین کی آواز نہ سننے کی وجہ سے صرف ایک سجدہ کیا بعد نماز امام صاحب سے دریافت کیا گیا تو موصوف نے فرمایا کہ جن مقتدیوں نے دوسری رکعت میں صرف ایک سجدہ کیا ان کی بھی نماز تبعاً للامام ہوگئی ہر رکعت میں دونوں سجدے فرض نہیں، کیا امام صاحب کا فرمانا صحیح ہے؟

الجواب وباللہ التوفیق:

تبعاً للامام مقتدی کی نماز اسی حد تک صحیح ہوتی ہے۔جس حد تک مقتدی سے شرائط وفرائض وارکان اصلیہ میں سے کوئی چیز فوت نہ ہوئی ہو۔اور غلطی محض ایسی ہو جس کی تلافی کا انجبار فقط سجدۂ سہو سے ہوسکتا ہے اور یہاں ایسا نہیں ہے۔اس لئے کہ یہاں سجدہ ثانیہ فوت ہوگیا ہے اور سجدہ ثانیہ بھی مثل سجدہ اول کے فرض ہے، کما فی البحر "**والمراد من السجود والسجدتان فأصله ثابت بالكتاب والسنة والإجماع**" (۵۱۱/۱)۔الطحطاوی "**ويفترض السجود المراد منه الجنس أي السجدتان**"(۱)۔

اسی طرح نماز عیدین سے ایجاب سجدہ سہو کے سقوط پر بھی قیاس نہیں کرسکتے، اس لئے کہ یہ سقوط ازدحام کی وجہ سے عام مصلیوں کی نماز کو فساد سے بچانے کے لئے ہے، "**والسهو في صلاة العيد والجمعة والمكتوبة والتطوع سواء والمختار عند المتأخرين عدمه في الوليين لدفع الفتنة**"(۲) اور وہ بھی اسی حد تک جب تک محض ایسی غلطی

۱- البحر الرائق ص ۱۲۵ او ص ۱۲۷۔

۲- درمختار علی ہامش ردالمحتار ۵۰۵/۱۔

ہو جس کا انجبار سجدہ سہو سے ہوسکتا ہے، ورنہ اگر فرض فوت ہوجائے یا فساد صلوٰۃ کا خطرہ ہو تو حکم سقوط متوجہ نہیں ہوتا ہے، جیسا کہ ''درمختار، ردالمحتار، بحر'' وغیر ہائے نے بحث کر کے واضح کر دیا ہے، اس لئے امام موصوف کا یہ فرمانا کہ نماز ان کی بھی صحیح ہوگئی، صحیح نہیں، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند، سہارنپور ۱۰/ ۲/ ۹۲ ۱۳ ھ

پوری زندگی کی عافیت کی دعاء مانگنا کیسا ہے؟

ایک شخص اپنی پوری زندگی کی عافیت کی دعاء مانگتا ہے تو آیا یہ جائز ہے یا حرام ہے، ایک عالم صاحب نے ''درمختار'' میں ''کتاب الصلوٰۃ'' کے حوالہ سے حرام قرار دیا ہے جو اردو میں طبع شدہ ہے، اگر حرام ہے تو کیوں حرام ہے؟ مع دلائل وضاحت مطلوب ہے؟ اللهم إني أسئلک العفو و العافية'' کے تحت تو جائز ہے؟

حکیم وصی احمد (مالک علیگڑھ دواخانہ گورکھپور، یوپی)

الجواب وبالله التوفيق:

اصل مسئلہ اس طرح ہے کہ جو چیزیں عادۃً مستحیل نہ ہوں ان کی دعا صرف اولیا کو ضرورت شرعی کے ماتحت مانگنا جائز ہے، جیسے ایسی بہت سی دعائیں انبیاء علیہم السلام اور بعض اولیاء کرام سے مانگنا منقول وثابت ہے، باقی عوام کو ایسی دعاء مانگنا درست نہیں۔

اور جو چیزیں عقلاً یا شرعاً محال ہوں یا ممنوع بنص صریح ہوں ان کی دعاء مانگنا جائز نہیں، اسی طرح جن چیزوں کا تحقق یقینی اور منصوص بنص صریح ہے، ان کے تحقق نہ ہونے کی دعاء مانگنا جائز نہیں ہے، جیسے موت کا وقوع، پل صراط سے گذرنے کا وقوع اور میدان محشر کی تختی اور حساب وکتاب وغیرہ کا وقوع ضروری ہے، کوئی ایسی دعاء مانگے کہ یا اللہ مجھ کو موت ہی نہ آئے یا ہمیشہ ہمیشہ میری یہ زندگی باقی رہے۔ اس قسم کی دعائیں مانگنا ناجائز وحرام ہے، اور بڑی گستاخی ہے۔

یہ سب تفصیلات فقہ کی اکثر کتابوں اور احادیث میں مروی اور منقول ہیں، قبیل المطلب فی الدعاء المحرم (درمختار علی ہامش الشامی ۱/ ۳۵۰) میں ''ويحرم سوال العافية مدى الدهر'' بھی ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ ابداً آلابا دتک عافیت کا اور خیر مستمر کی دعاء مانگنا حرام ہے، اس لئے کہ اس میں موت ومابعد الموت کے واقعات کے وقوع کا عدم تحقق مانگنا ہے جو

ناجائز وحرام ہے۔

مدی الدھر کے معنی ابد آلاباد کے ہوں گے تاکہ تمام روایات میں انطباق حاصل ہوجائے نیز دھر کے معنی بہت سے آتے ہیں، ''قاموس'' میں: "الامد الممدود، أبد، الوسه" کے مذکور ہیں اور مفرادات امام راغب میں ہے: (دھر) "الدھر فی الأصل اسم لمدۃ العالم من مبتدأ وجودہ إلی انقضائه" (۱)۔

امام راغب فن لغت کے امام ہیں، ان کی تشریح سے معلوم ہوا کہ "دھر" کے اصلی معنی پورے عالم کائنات کے وجود سے لیکر انقضاء وجود تک اور بقیہ معنی عرفی یا مرادی حسب مقام ہوتے ہیں اور اسی بناء پر نہایہ ابن کثیر (۱/۳۸) میں دھر کے معنی "الدھر اسم للزمان الطویل ومدۃ الحیاۃ الدنیا" (۲) کے بھی لئے ہیں اور "بیضاوی شریف" میں آیت کریمہ: "ھل أتی علی الإنسان حین من الدھر" (۳) میں "حین من الدھر" کی تفسیر "طائفة محدودۃ من الزمان الممتد فی غیر النھایة" کے ساتھ فرمائی ہے، یعنی دھر کے اسی اصلی معنی (مدت غیر نہایت) کو لیا ہے، یہی "إلی أبد الآباد" کے معنی مراد لئے جائیں گے، اس لئے "درمختار" کی عبارت: "ویحرم سوال العافیة مدی الدھر الخ" (۴) کا مطلب یہ ہوگا کہ ابد الآباد تک کے لئے یا پورے قیام عالم تک کے لئے عافیت کی دعاء مانگنا حرام ہے، اس لئے کہ یہ دعاء نصوص صریحہ کے خلاف ہے اس دعا کا حاصل یہ ہے کہ موت بھی واقع نہ ہو، احوال برزخ اور قیام محشر اور پل صراط سے گذرنا وغیرہ سب سے بچاؤ ہوجائے یا یہ سب کچھ پیش نہ آوے، حالانکہ ان سب کا پیش آنا یقینی ہے۔

اور سوال میں ذکر کردہ دعاء (پوری زندگی کی عافیت کی دعاء) میں موت و مابعد الموت کے حالات کے پیش نہ آنے کی دعاء نہیں ہے، کیونکہ موت پر زندگی ختم ہوجاتی ہے، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ موت سے پہلے پہلے جتنی زندگی ہو وہ عافیت سے گذرے اور یہ دعاء جائز ہے اور اس میں اسی قسم کی تاویلیں ہوں گی جو مندرجہ ذیل احادیث اور روایات میں ہیں:

۱-"اللھم إنی أسئلک من الخیر کله ماعلمت منه وما لم أعلم" (۵)۔

۲-"اللھم إنی أسئلک العفو والعافیة فی دینی ودنیای وأھلی ومالی" (۶)۔

۱- مفردات للراغب۔

۲- نہایہ لابن کثیر ۱/۳۸۔

۳- سورۂ دہر: ۱۔

۴- شامی ۱/۳۵۰۔

۵- حصن حصین بحوالہ مسند احمد ابن حنبل۔

۶- حصن حصین بحوالہ ابوداؤد۔

۳-''یا حي یا قیوم بر حمتک أستغیث أصلح لي شان کله'' (۱)۔

۴-''اللھم أسئلک العافیة من کل بلیة واسئلک دوام العافیة''(۲)۔

۵-''اللھم إني أسئلک العافیة من جمیع البلاء وأسئلک تمام العافیة دوام العافیة''(۳)۔

۶-''اللھم إني أسئلک العفو والعافیة والمعافاة الدائمة فی الدنیا والآخرة ''(۴)۔

لہذا''ویحرم سوال العافیة مدی الدھر'' کی عبارت کے تحت یا اسی قسم کی مخالفت کے تحت دعاء کی اور عبارتوں کے تحت داخل کر کے اس دعاء کو حرام یا نا جائز کہنا صحیح نہ ہوگا۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیو بند، سہارنپور ۱۷/ ۲/ ۹۷ ۱۳ھ

موضع قدمین سے سجدہ گاہ کی بلندی کس قدر درست ہے؟

قدمین سے کسی قدر بلندی پر سجدہ بلاعذر درست ہے یا نہیں؟ اگر سجدہ گاہ ایک بالشت یا اس سے اونچائی میں کم ہو تو اس پر سجدہ بحالت عذر درست ہے یا نہیں، اگر سجدہ گاہ ایک بالشت یا اس سے زیادہ بلندی پر ہے تو مطلقاً جائز ہے یا نہیں؟

فقہ کی عبارتوں میں''الا بزحمة'' کے تحت ایک ہی نماز میں ایک مصلی کا دوسرے مصلی کی پشت پر سجدہ کرنا درست قرار دیا گیا ہے، اس پر قیاس کرتے ہوئے مساجد میں خطیب کے وہ ممبر جو ایک بالشت سے زیادہ اونچائی پر واقع اور اینٹ اور سمنٹ سے پختہ بنے ہوئے ہیں جن کا ہٹانا زحمت سے خالی نہیں تو کیا اس پر سجدہ کرنا جائز ہے؟ جب کہ بعض فتاوی ایسے موجود ہیں کہ ایسی جگہ پر قطع صف کے طور پر وہ جگہ خالی چھوڑ دی جائے اس پر سجدہ نہ کرنا چاہئے، تو پھر''الا بزحمة'' کے تحت پشت مسجود بھی تو ایک بالشت سے زیادہ اونچائی پر ہے، اس کی تخصیص کیوں ہے؟ اور''الا بزحمة'' میں وہ منبر وغیرہ کیوں نہیں داخل ہیں؟

صفات اللہ اعظمی (بلاقی پورہ، مئو)

۱- مناجات مقبول بحوالہ حزب الاعظم۔

۲- قربات عند اللہ بحوالہ حزب اعظم۔

۳- بحوالہ حزب اعظم۔

۴- ماثبت بالسنة وغیرہ وغیرہ۔

الجواب وبالله التوفيق:

اعلیٰ بات تو یہ ہے کہ موضع سجود موضع قدمین ہی کے سطح پر ہو وضع قدمین سے کچھ اونچا ہو جائے تو ایک بالشت تک کی اونچائی مع الکراہت جائز رہتی ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ اس سے بھی جہاں تک ہو احتراز کیا جائے اور اگر موضع سجود ایک بالشت سے بھی زیادہ اونچا ہو جائے تو جائز نہیں (۱)۔

البتہ ''إلا بزحمة'' سے ایک بالشت کی اونچائی سے کچھ زائد اونچائی کا استثناء کیا گیا ہے۔ کمافی الدر: ''**وان سجد للزحام على ظهر ......مصل صلوته التي هو فيها جاز للضرورة، وان لم يصلها...... لا**'' (۲)، اس استثناء میں دو قید ہیں، ایک تو زحمت اور زحمت کا مطلب یہ ہے کہ مصلی اتنے زیادہ ہوں کہ صفیں اتنی قریب قریب کرنی پڑیں کہ پچھلے مصلی کو اگلے مصلی کی پشت پر سجدہ کئے بغیر چارہ نہ ہو اور صورت مسئولہ میں ایسا نہیں اور زحمت و بھیڑ نہیں کہ پچھلے مصلیوں کو اگلے مصلیوں کی پشت پر سجدہ کرنا لازم ہو رہا ہو، یہاں صرف دو مصلی جو منبر کے محاذات میں ہوں گے صرف ان کو سجدہ علی الارض کرنے کا موقع نہیں ملے گا، لہذا صورتِ مسئولہ کو زحمت پر قیاس کر کے ''إلا بزحمة'' کے تحت داخل کرنا درست نہ ہوگا، بلکہ جس طرح اسطوانہ وغیرہ حائل ہونے سے جگہ چھوڑ دی جاتی ہے، جگہ چھوڑنا ہوگا اور جس طرح حیلولۃ اسطوانہ سے انقطاع صف مضر نہیں ہوتا، اسی طرح یہ انقطاع بھی قادح فی الصلوٰۃ نہ ہوگا۔

دوسری چیز اس استثنائی حکم میں علیٰ ظہر مصلی صلوۃ ہو ''فیها'' کی قید ہے۔ اس قید کا احترازی ہونا اغلب ہے، جیسا کہ شامی کی تحقیق سے مترشح ہوتا ہے، کیونکہ تمام متون اس قید کو ذکر کرتے ہیں۔ صرف قہستانی نے اس قید کو ذکر نہیں کیا، یا اطلاق کو اختیار کیا، مگر ''عقود رسم المفتی'' میں قہستانی کو یہ مرتبہ فقہاء محققین نے نہیں دیا ہے کہ ان کو اہل ترجیح کا منصب دیا جائے، اسی طرح ظہر مصل صلوتہٗ کے علاوہ صورتوں میں ایک بالشت سے زیادہ اونچائی پر جواز سجدہ کا حکم مشکل ہوگا، پس صورتِ مسئولہ میں اس ممبر کے حصہ پر سجدہ کرنے کی اجازت نہ ہوگی۔

علاوہ ازیں اس صورت میں اور اتنی اونچائی میں سجدہ کا تحقق فی الجملہ اور حکمی سجدہ کا تحقق بھی مشتبہ ہو جائے گا، اور سجدۂ حقیقی یا حکمی یا فی الجملہ بہر حال رکن اصلیہ میں داخل ہوتا ہے اس لئے بھی اس کی گنجائش نہ دی جانی چاہئے فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند، سہارنپور

۱- کمافی الدر علی هامش الشامی ۱/۳۳۸۔

۲- الدر المختار ۱/۳۳۸۔

نماز، زکوٰۃ اور روزہ چھوڑنے والوں کے لئے شریعت میں کون سی سزا ہے؟

شریعت اسلامیہ تارک نماز تارک زکوٰۃ اور تارک صوم کے لئے بالترتیب کون کون سی حد مقرر کرتی ہے یعنی اگر اسلامی حکومت بروئے کار ہو توفسق کے مذکورہ بالا معاملات میں کیا تعزیری کارروائی کرے گی۔ فتوی مع استشہاد کتاب وسنت عنایت فرمایا جائے۔

احمد کمال معرفت حضرت مولانا انعام الحق صاحب (جعفرآباد کورکھپور)

الجواب وبالله التوفيق:

"في الدر المختار على هامش الشامي(۱/۲۳۵) قبيل مطلب فيمايصير الكافر مسلما من الأفعال۔ وتاركها عمداً مجانة...... يحبس حتى يصلي...... وقيل يضرب حتى يسيل منه الدم وعند الشافعي يقتل بصلاة واحدة حدًا وقيل كفراً وقبل ذلک باسطروالصوم كالصلوة على الصحيح، وتحته في الرد: قال أصحابنا: لا يقتل بل يعزر أو يحبس حتى يموت أويتوب (قوله وعند الشافعي يقتل) وكذا عند مالک واحمد، وفي رواية عن احمد: وهي المختارة عند جمهور أصحابه أنه يقتل كفراً"(۱)۔

ان عبارتوں سے معلوم ہوا کہ نماز اور روزہ دونوں کے تارک عمداً کا حکم ایک ہی ہے اور وہ حضرت امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک تو یہ ہے کہ قید کردیا جائے۔ یہاں تک کہ تائب ہوکر نمازی ہوجائے یا مرجائے اور بعض فقہاء نے تعزیر جسمانی کا حکم دیا ہے کہ مارا جائے یہاں تک کہ جسم سے خون بہہ جائے اور حضرت امام مالک وشافعی واحمد رحمہم اللہ کے نزدیک قتل تک کیا جاسکتا ہے بلکہ حضرت امام احمد بن حنبل کا مسلک مختار تو یہ لکھا ہے کہ فقط ایک نماز کے تکاسلاً ترک پر قتل کیا جاسکتا ہے تارک زکوٰۃ کے معاملہ میں تفصیل ہے اور وہ یہ ہے کہ اموال دوطرح کے ہوتے ہیں۔(۱) اموال ظاہرہ (۲) اموال باطنہ، اموال باطنہ سے مراد ہے سونا چاندی یا ان کا زیور یا نقد یا سامان تجارت جو گھر میں رہتا ہو ہاں جب کہیں باہر بھیجا جائے تو وہ اموال ظاہرہ میں شمار ہوجاتا ہے۔

"كما في ردالمحتار (۲/۳۴) هي النقود وعروض التجارة إذا لم يمر بها على العاشر؛ لأنها

۱- شامی ۱/۲۳۵۔

بالإخراج تلتحق بالأموال الظاهرہ"۔ اموال ظاہرہ میں حکم یہ ہے کہ اس کی زکوۃ سلطان یا نائب سلطان کے جبراً لے لینے سے بھی ادا ہو جاتی ہے(۱)۔

"والمفتی به التفصیل إن کان فی الأموال الظاهرة یسقط الفرض؛ لأن للسلطان أو نائبه ولایة أخذها (إلی قوله)، وإن کان فی الباطنة لا(۲)(رد المحتار ص ۲۵) وفی الدر علی هامش الرد ص ۲۵ ج ۲ وفی التجنیس المفتی به سقوطها فی الأموال الظاهرة لا الباطنة (۳) (وفی ص ۲۴) أخذ البغاة والسلاطین الجائر زکوة الأموال الظاهرة کالسوائم والعشر والخراج لا إعادة علی أربابها إن صرف المأخوذ فی محله الآتی ذکره، وإلا یصرف فیه فعلیهم فیما بینهم وبین الله إعادة غیر الخراج (۴) (والمراد من فیما بینهم وبین الله الدیانة أی یصرف دیانة لا قضاء)"۔

فی الهدایة(۱/۱۶۶)لأن له مطالبا وهو الإمام فی السوائم ونائبه فی أموال التجارة وفیه فی (ص ۱۷۳) إذا أخذ الخوارج صدقة سوائم لا یثنی علیهم ..... إذا نوی بالدفع التصدق علیهم سقط عنه، وکذا ما دفع إلی کل جائر وتحته فی العنایة: وکذلک السلطان إذا صادر رجلا وأخذ منه أموالا فنوی صاحب المال الزکوة عند الدفع سقطت عنه الزکوة (۵)،ان عبارتوں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اموال ظاہرہ ہر وہ مال ہے جو گھر سے باہر ریل میں ڈاکخانہ میں بینک وغیرہ میں رہتا ہو، چاہے بشکل نقد ہو یا بشکل عروض وسامان ہو اور چاہے مویشی و پیداوار غلہ وغیرہ ہو، سب اموال ظاہرہ ہیں،اور اس کی زکوۃ حکومت شرعیہ جبراً لے سکتی ہے،لیکن یہ بھی معلوم ہو گیا کہ اگر کوئی امیر ظلماً بھی لے لے اور دینے والا دینے کے وقت تصدق کی نیت کر لے تو دینے والا بری الذمہ ہو جائے گا اور یہ حکم اموال ظاہرہ میں مطلقاً ہے اور اموال باطنہ میں یہ قضاء ہے،فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی،مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

۱- رد المحتار علی الدر المختار ۳/۲۱۵۔
۲- رد المحتار علی الدر المختار ۳/۲۱۷۔
۳- الدر المختار مع رد المحتار ۳/۲۱۷۔
۴- الدر المختار مع رد المحتار ۳/۲۱۵۔
۱- عنایہ علی ہامش فتح القدیر ۲/۱۵۰۔

نماز میں رفع یدین کا شرعی حکم:

حضور مقبول ﷺ نے اپنے وصال کے وقت آخری نماز اور حضرات خلفاء راشدین اور جمیع صحابہ کرام اور دوسویں صدی کے ائمہ کرام کی سنت رفعِ یدین اہل حدیث ثابت کررہے ہیں اور سنتِ موکدہ، بلکہ واجب کے امام مکیؒ کے نزدیک بتا کر بلا رفع یدین نماز کو باطل کہتے ہیں۔

الجواب وباللہ التوفیق:

واقعی جو حضرات اہل حدیث ہیں اور جن کو علم حدیث پر عبور ہے اور مزاج میں عدل وانصاف رکھتے ہیں وہ ایسی باتیں ہرگز نہیں کہہ سکتے، جو اس میں مذکور ہیں۔

بعض لوگوں کو اس روایت سے دھوکہ لگ گیا ہے جس میں یہ زیادتیاں درج کردی تھیں، حالانکہ یہ زیادتیاں غلط عند المحدثین ہیں، پھر اس مغالطہ کو یہاں پیش کر کے اتنا بڑا دعوی کردیا ہے اور یہ حقیقت اس کے خلاف ہے، جیسا کہ خود بخاری ومسلم اور تمام کتب صحاح کی روایت سے معلوم ہوتا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ اوائل زمانہ میں قریب قریب ہر خفض ورفع کے وقت لوگوں نے رفع یدین فرمایا ہے، پھر آہستہ آہستہ حسب ہدایت نبوی ﷺ افتتاحِ صلوٰۃ کے وقت تکبیر تحریمہ کے وقت کے سوا میں متروک ہوگیا اور اسی بات پر تمام خلفاء راشدین اور تمام عشرۂ مبشرہ اور جمہور صحابہ تکبیر افتتاح کے وقت کے علاوہ تمام انتقالات میں رفعِ یدین نہیں کرتے تھے، اسی مضمون کی روایات عام طور سے صحاح میں ملیں گی۔

اگر اس مدعی کو اپنے دعوے میں اصرار ہے تو صحیح سند کے ساتھ صحاح کی کتابوں میں سے کسی کتاب میں اس کے متضاد کوئی روایت ایسی پیش کردے جو مذکورہ بالا مفہوم کے لئے ناسخ بن سکے۔

اگر نہیں پیش کرسکتے ہیں تو ایسی غافلانہ جرأت کا کیا انجام ہوسکتا ہے، اس کو ذرا سوچ لیں اور اگر مزید بصیرت کے لیے تفصیل دیکھنی ہو تو "آثار سنن" کی تعلیقات کا جو شوق نیموی مرحوم کی ہے، نیز "اعلاء السنن" کا مطالعہ فرمالیں، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

نماز میں رفع یدین کا حکم:

میں کوئی عالم یا حافظ نہیں ہوں ایک غریب گھرانے کا چشم و چراغ ہوں دسویں جماعت تک تعلیم حاصل کر چکا ہوں لیکن کچھ مجبوریوں کی وجہ سے باپ کا ہاتھ بٹانا چاہتا تھا اور آج سعودی عرب میں مقام جدہ میں ایک معمولی سے روزگار پر ہوں، حدیث میں آیا ہے کہ جو آدمی نماز کے صحیح ارکان کی ادائیگی نہیں کرتا۔ اس کی نماز اس کے منھ پر طمانچہ ہے اور وہ شخص اتنا گنہگار ہے جتنا کہ ایک بے نمازی بھی نہیں ہوگا اور یہی ڈر دل میں بیٹھ گیا ہے کہ جو نماز میں ادا کرتا ہوں وہ صحیح ہے یا غلط، میں آج تک امام ابوحنیفہؒ کی تقلید کرتا رہا ہوں۔ لیکن ہم اس میں رفع یدین نہیں کرتے ہیں آمین زور سے نہیں کہتے، لیکن یہاں پر میں بہت سے عربی باشندوں کو دیکھتا ہوں کہ وہ رفع یدین کرتے ہیں، آمین سے عربوں کی مسجدیں گونج اٹھتی ہیں، اس لئے میں نے بخاری شریف کا سہارا لیا، تاکہ صحیح حدیث صحیح نماز کا طریقہ معلوم ہو سکے، کیونکہ بخاری رحمۃ اللہ علیہ ایک بہت بڑے محدث تھے، علامہ زہری کہتے ہیں کہ میں نے محمد بن اسماعیل بخاری کو خواب میں دیکھا کہ آپ رسول اللہ ﷺ کے پیچھے جاتے ہیں یعنی امام بخاری سنت نبویہ کے پورے عامل تھے، ایک قدم بھی سنت رسول اللہ ﷺ کے خلاف رکھنا نہ چاہتے تھے، لیکن جب میں نے رفع یدین کا بیان (صفحہ ۱۶۴ بخاری شریف پارے جلد اوّل) پر دیکھا وہاں حدیث نمبر (۷۸۳ اور ۷۸۴) سے پتہ چلا کہ رسول اللہ ﷺ رفع یدین کرتے تھے، پھر ہم لوگ رسول اللہ ﷺ کی سنت کو کیوں چھوڑ رہے ہیں ان کی نماز اور ہماری نماز میں فرق محسوس ہوتا ہے۔

الجواب وباللہ التوفیق:

اصل مسئلہ سمجھنے سے قبل چند باتیں سمجھ لینا ضروری ہے:

پہلی بات یہ کہ جتنی صحیح حدیثیں ہیں وہ سب کی سب صرف بخاری شریف میں منحصر نہیں ہیں، اس کو خود حضرت امام بخاریؒ نے فرمایا ہے، بلکہ اور بہت سی حدیثیں صحیح ہیں اور وہ بخاری شریف میں نہیں ہیں اور وہ سب مدار مذہب ہیں۔ چنانچہ حضرت امام بخاریؒ کو خود تین لاکھ صحیح حدیثیں مع سند و متن کے زبانی یاد تھیں ان میں اپنی شرط کے تحت پہلے ایک لاکھ کو چھانٹا اور اپنی شرط کے مطابق صرف چھ ہزار بخاری شریف میں جمع فرمایا، اس میں بھی مکررات نکال دیں تو صرف ساڑھے چار ہزار ہی حدیثیں بچتی ہیں، اس لئے تمام صحیح حدیثوں کا انحصار محض بخاری شریف میں سمجھنا فن حدیث سے ناواقفیت سے ناشناسی ہے، البتہ چونکہ امام موصوف نے اپنے علم کے مطابق بہت محتاط طریقہ اختیار فرمایا ہے، اس لئے اصح الکتب بعد کتاب اللہ

البخاری کہا جاتا ہے اور انہیں احتیاطوں کے ثمرہ میں سے وہ ثمرہ بھی ہے جو آپ نے خواب کے سلسلہ میں بیان کیا ہے، حالانکہ خواب کسی کے نزدیک حجت شرعی نہیں۔

دوسری بات: صحیح حدیث جہاں بھی ہے وہ خواہ بخاری شریف کے علاوہ میں ہو اس سے حکم شرعی ثابت ہو جاتا ہے اور یہ چیز تمام امت مسلمہ کے نزدیک مسلمہ ہے اس لئے بھی اس انحصار کا تخیل غلط ہے۔

تیسری بات یہ ہے کہ حضرت امام ابوحنیفہؒ حضرت امام بخاری کے استاد کے استاد کے استاد میں سے ہیں، یعنی امام بخاریؒ کے استاذ حضرت امام احمد ابن حنبلؒ اور ان کے استاذ حضرت امام شافعیؒ اور ان کے استاذ حضرت امام محمدؒ اور ان کے استاذ حضرت امام ابوحنیفہؒ ہیں اور حضرت امام بخاریؒ سے تقریباً سو ۱۰۰ برس قبل زمانہ خیر القرون کے ائمہ ھدی میں سے ہیں، حضرت امام ابوحنیفہؒ کے جتنے اساتذہ ہیں ان میں سے ایک کے بارے میں بھی طعن و جرح کا شبہ کرنا درست نہیں، بخلاف حضرت امام بخاریؒ کے اساتذہ میں بعض کے بارے میں ائمہ جرح وتعدیل نے طعن بھی کیا ہے، اس لئے جو حدیث حضرت امام ابوحنیفہؒ سے ثابت ہو جائے وہ با تفاق محققین محدثین احادیث بخاری سے افضل و اعلیٰ ہوتی ہے۔

چوتھی بات:۔ حضرت امام بخاری رحمہ اللہ بہت ثقہ اور بہت محتاط اور ممتاز ہیں، مگر ائمہ اربعہ امام مالکؒ امام ابوحنیفہؒ امام شافعی امام احمد بن حنبلؒ سے فائق انکو محققین نے نہیں قرار دیا، بلکہ ائمہ مجتہدین (ائمہ اربعہ) کو فائق و برتر قرار دیا، اس لئے حضرت امام بخاریؒ کو ائمہ اربعہ سے افضل و فائق قرار دینے کی بنیاد پر کوئی فیصلہ کرنا جمہور امت کے نظریہ کے خلاف ہوگا۔

پانچویں بات یہ ہے کہ ائمہ اربعہ امام مالک، امام ابوحنیفہؒ، امام شافعیؒ، امام احمد بن حنبلؒ رحمہم اللہ نے کتاب وسنت کا جو مطلب بیان فرمایا ہے اس کو تمام امت نے حق اور صحیح قرار دیا ہے اور ان کے مجتہدات کو بھی برحق کہا ہے اور سبکو اہل حق میں شمار کیا ہے اور اس لئے جو شخص خود مجتہد نہ ہو، اس پر ان حضرات کے بتلائے ہوئے معنی کی اتباع کو لازم قرار دیا ہے اور اس خودرائی کو ناجائز وحرام کہا ہے، اگر ایسا نہ کرے گا تو بہت سی معصیت میں اور بہت سی حرام باتوں میں مبتلا ہو جائے گا اور دین تماشا بنکر رہ جائے گا۔

چھٹی بات: یہ ہے جو شخص خود مجتہد نہ ہو اور ان ائمہ میں سے کسی امام کی اتباع کر رہا ہے اس کے لئے لازم وضروری ہے کہ تمام مسائل (اصولی وفروعی) میں صرف اس ایک امام سے رجوع کرے اور صرف اس کے بتائے ہوئے معنی پر عمل کرے، ورنہ خبط عشواء کرے گا اور بہت سے معاملات میں حرام کے ارتکاب کا مجرم ہو جائے گا اور تلفیق بالمحرم میں مبتلا ہو کر

اپنے بہت سے عبادات تک کو برباد کرڈالے گا، اور دین اسطرح کھلونا اور تماشہ بن جائے گا، جس طرح پانچویں بات میں کہا گیا ہے۔"ھکذا یؤخذ من البخاری کتاب المناسک تحت باب اذا حاضت المرأۃ بعد ما افاضت (۱) وایضاً یؤ خذ من شرحہ" فتح الباری "تحت ھذا الحدیث،وایضاً من رسالۃ ثمرات الأوراق أو غیرھا"۔

ساتویں بات:۔یہ ہے کہ مذکورہ تینوں باتوں میں ائمہ کے اندر اختلافات صرف اولویت وافضلیت کا ہے، کوئی امام دوسرے کے قول وفعل کو نا جائز یا مکروہ نہیں کہتا، بلکہ صرف یہ کہتا ہے کہ ہمارے نزدیک احادیث صحیحہ سے اس کا افضل ہونا ثابت ہے، لہذا کسی کا ان مسائل مذکورہ میں سے کسی مسئلہ کو ضروری سمجھنا اور نہ کرنے والوں پر نکیر کرنا یا طعن وتشنیع کرنا ناجائز وغلط ہوگا، ان ضروری گذارشات کے بعد آپ کے تینوں اشکالات کا الگ الگ ازالہ کیا جاتا ہے:

۱۔پہلا مسئلہ تکبیر اولی کے علاوہ رکوع میں جاتے ہوئے اور رکوع سے اٹھتے ہوئے رفع یدین کا ہے، اس سلسلہ میں "بخاری شریف" (ج ۱ص ۱۰۲) میں صرف دو ۲ روایتیں منقول ہیں۔

ایک روایت حضرت ابن عمرؓ کی ہے اور دوسری ابو قلابہؒ کی ہے، دونوں کا حاصل ایک ہی ہے کہ ان روایات سے زیادہ سے زیادہ رفع یدین کا وجود ملتا ہے، مگر اس پر دوام ہمیشگی نہیں ملتی، اس لئے کہ امام بخاریؒ نے خود جزء رفع یدین میں تعلیقاً روایت نقل فرمائی ہے کہ تکبیر اولی کے بعد رفع یدین نہیں ہے، نیز ابن زبیر رضی اللہ عنہ سے صحیح سند کے ساتھ روایت موجود ہے کہ ایک شخص کو تکبیر اولی کے علاوہ رکوع میں جاتے آتے رفع یدین کرتے دیکھا تو منع فرمایا اور کہا کہ یہ عمل پہلے تھا بعد میں ترک ہوگیا اور خود ابن عمرؓ سے بھی اس کے برخلاف صحیح سند کے ساتھ اور دوسری صحیح حدیث موجود ہے کہ حضرت ابن عمرؓ رفع یدین نہیں کرتے تھے، چونکہ ترک شئی فعل شئی سے بعد میں ہوتا ہے اس لئے ترک والی روایات بعد کی ہوگی اور راجح ہو جائے گی، اور اس کو حضرت ابن زبیرؓ منع کرتے وقت یہی پیش نظر رکھ کر رفع یدین کرنے سے منع فرمایا تھا اور اسی وجہ سے احناف تکبیر اولی کے علاوہ اور موقعوں میں رفع یدین کے ترک کو اولی وافضل کہتے ہیں اور اس کی تائید میں دوسری بہت سی صحیح حدیثیں موجود ہیں اور مثلاً حضرت ابن مسعودؓ کی روایت جو بالکل صحیح سند سے "ابوداؤد شریف، ترمذی شریف، نسائی شریف" سب میں موجود ہے، الفاظ یہ ہیں: "قال عبداللہ بن مسعود ألا أصلّی بکم صلاۃ رسول اللہ ﷺ فصّلیٰ فلم

۱– "عن عکرمۃ أن أھل المدینۃ سألوا ابن عباس عن امرئۃ طافت ثم حاضت قال لھم تنفر قالوا: لا نأخذ بقولک وندع قول زید قال: اذا قدمتم المدینۃ، فاسئلوا فقدموا المدینۃ فسئلوا " (بخاری ۱/ ۲۳۷)(مرتب)۔

یرفع یدیه إلا فی أول مرة" (۱)۔

ترجمہ: (یہ ہے کہ فرمایا ابن مسعودؓ نے کہ کیا میں تم لوگوں کو حضور ﷺ کی نماز پڑھ کر نہ دکھلا دوں اس کہنے کے بعد نماز پڑھی اور رفع یدین صرف تکبیر اولی میں کیا بعد میں نہیں کیا) اس حدیث سے بھی معلوم ہوا کہ رفع یدین صرف تکبیر اولی کے وقت ہوگا بعد کے انتقالی حالت میں نہ ہوگا اور مثلاً حضرت براء بن عازبؓ کی صحیح سند سے روایت ہے جس کے الفاظ مبارکہ یہ ہیں:

"أن رسول الله ﷺ کان إذا افتتح الصلوة رفع یدیه قریب من أذنیه ثم لایعود" (۲)۔

ترجمہ: (حضور ﷺ جب نماز شروع کرتے ہوئے تکبیر کہتے تو ہاتھ اٹھاتے تھے پھر کسی وقت نہ اٹھاتے) اور مثلاً مسلم شریف حضرت جابر بن سمرہؓ سے مروی ہے جس کے الفاظ یہ ہیں۔

"خرج علینا رسول الله ﷺ، فقال: مالی أراکم رافعی أیدیکم، کأنها أذناب خیل شُمسٌ اسکنوا فی الصلوة" (۳)۔

ترجمہ:۔ (حضرت جابر بن سمرہؓ فرماتے ہیں (ہم لوگ نماز پڑھ رہے تھے کہ اچانک) ہم پر حضور ﷺ تشریف لائے اور فرمایا کہ ہمیں کیا ہوا ہے کہ میں تم لوگوں کو مجل گھوڑوں کی دم کی طرح (نماز میں) ہاتھ اٹھاتے دیکھتا ہوں، نماز میں سکون سے رہو) اس روایت میں: "**خرج علینا**" اور" **اسکنوا فی الصلوة**" کا لفظ قرینہ ہے کہ اس سے وہ روایت مراد نہیں جو جماعت کی نماز کا سلام پھیرتے وقت مقتدیوں کو سلام پھیرتے ہوئے ہاتھ اٹھاتے حضور ﷺ نے دیکھا اور فرمایا کہ "**مالی أراکم الخ**" اسلئے کہ اس روایت میں نہ تو" **خرج علینا**" ہے اور نہ تو "**اسکنوفی الصلوة**" ہے، پھر اسی طرح حضرت ابن عباسؓ اور حضرت عبداللہ ابن الزبیرؓ وغیرہ سے بھی تکبیر اولی کے علاوہ رفع یدین نہ ہونا مروی ہے، غرض جب تمام مرویاتِ باب پر نظر کی جاتی ہے تو افضل اور بہتر یہی نکلتا ہے کہ تکبیر اولی کے علاوہ اور کسی وقت رفع یدین نہ کرنا ہی افضل ہے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۵/ ۹/ ۱۴۰۳ھ

۱- رواہ ابوداؤد فی سننہ کتاب الصلاۃ باب من لم یذکر الرفع عند الرکوع ۱/ ۱۰۹ قدیمی، والترمذی فی جامعہ ابواب الصلاۃ، باب رفع الیدین عند الرکوع ۱/ ۳۵ (مرتب)۔

۲- ابوداؤد کتاب الصلوۃ، حدیث نمبر (۷۴۹) (۱/ ۲۰۰)۔

۳- (باب الأمر بالسکون فی الصلاۃ، کتاب الصلاۃ ۱/ ۱۸۱ قدیمی، رواہ الطحاوی فی شرح معانی الآثار باب التکبیر للرکوع والتکبیر للسجود ۱/ ۱۶۲،

سر اور جہر کی حد:

سری نماز میں امام کو کتنی آواز سے قرأت کرنی چاہئے اور جہری میں کتنی؟ بعض کتابوں میں لکھا ہے کہ سری میں اتنے زور سے پڑھے کہ خود کان میں آواز پہنچے، کیا صرف زبان ہلانے سے اور مخرج نکالنے سے نماز نہیں ہوگی؟

الجواب وباللہ التوفیق:

امام کرخیؒ کی تخریج کے مطابق محض تصحیح حروف کے ساتھ ادائیگی بھی کافی ہے، خواہ اس کی آواز کانوں تک نہ پہنچے اور امام ہندوانی کی تخریج کے مطابق اس طرح پڑھے کہ اگر کوئی مانع نہ ہو تو خود قاری کے کانوں تک آواز پہنچ سکے اور دونوں تخریجیں درست ہیں، البتہ زیادہ علماء ومشائخ ہندوانی کے ساتھ ہیں، اس لیے احتیاط اس میں ہے کہ اس طرح پڑھیں کہ اگر کوئی امر مانع نہ ہو تو خود قاری کے کانوں تک آواز پہنچ سکے (۱)۔فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

بلند آواز سے آمین کہنا:

دوسرا آمین کے بارے میں دیکھا وہ بھی بخاری شریف جلداول کے صفحہ (۱۷۲) اور (۱۷۳) پر حدیثیں موجود ہیں، حدیث نمبر ۸۳۷ ،اور ۸۳۸۔

امام کا بلند آواز سے آمین کہنا اس پر بھی آمین بلند آواز سے کہنے کی حدیثیں موجود ہیں، پھر ہم امام ابوحنیفہؒ والوں کو زور سے آمین کہنے پر کیوں روکا جاتا ہے؟۔

عامر تاج الدین دبیر (جدہ سعودی عربیہ)

اشرفی دیوبند، ابوداؤد فی کتاب الصلوۃ باب من لم یذکر الرفع عند الرکوع نحوہ، الترمذی فی أبواب الصلاۃ ۲۵۷ عن ابن مسعود نحوہ) (مرتب)۔

۱- ’’اعلم أنهم اختلفوا في حد وجود القرأة على ثلثة أقوال: فشرط الهندواني والفضلي لوجودها: خروج صوت يصل إلى أذانه، وبه قال الشافعي، وشرط بشر المريسي وأحمد: خروج الصوت من الفم، وإن لم يصل إلى أذنه، لكن بشرط كونه مسموعاً في الجملة، حتى لو أدنى أحد صماخه إلى فيه يسمع، ولم يشترط الكرخي وأبوبكر البلخي السماع، واكتفيا بتصحيح الحروف۔ واختار شيخ الإسلام وقاضي خان وصاحب المحيط والحلواني قول الهندواني، كذا في معراج الدراية إلى قوله وأن ماقاله الهندواني أصح وأرجح لاعتماد أكثر علمائنا عليه‘‘ (فتاویٰ شامی ۵۹/۱ ۳ کتاب الصلوۃ باب القرأۃ) (مرتب)۔

الجواب وباللہ التوفیق:

آمین بالجهر کا جومسئلہ ہے اس سلسلہ میں صرف ابو ہریرہؓ اور ابن الزبیرؓ کی روایت ہے حضرت ابو ہریرہؓ سے دو روایت ہے، ایک یہ کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ جب امام "غیر المغضوب علیهم ولا الضالین" کہے تو تم لوگ آمین کہو اس روایت سے امام یا ماموم کا یا خود حضور ﷺ کا یا کسی کا آمین جہرا کہنا معلوم نہیں ہوتا، بلکہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ "ولا الضالین" کے بعد آمین کہنے کا وقت ہے۔

اس وقت امام آمین کہتا ہے اس وقت تم لوگ بھی آمین کہو، اس لئے کہ اس وقت ملائکہ بھی آمین کہتے ہیں، پس جسکی آمین ملائکہ کی آمین کے مطابق ہو جائے گی اسکی خطائیں معاف ہو جائیں گی۔

اور یہی روایت اصل ہے، اسی کی تعبیر حضرت ابو ہریرہؓ اپنی دوسری روایات: "إذا أمن الإمام فأمنوا" میں فرما رہے ہیں اور اگر دونوں روایتوں کو اصل مستقل ارشاد نبوی ﷺ تسلیم کرلیا جائے۔ جب بھی ان دونوں سے آمین کہنے کا محض ثبوت ملتا ہے، اس کے جہراً یا سراً کہنے کا پتہ نہیں چلتا۔ البتہ تیسری روایت جس میں ہے "امن ابن الزبیرؓ ومن وراہ حتی ان للمسجد لوجّة" اس سے آمین کے جہراً کا ثبوت ملتا ہے، لیکن یہ حضور ﷺ کا قول یا فعل نہیں ہے، بلکہ حضرت ابن الزبیر اور دوسرے صحابہؓ کا ہے، لہذا دوسری مرفوع قولی حدیث پر اس کو ترجیح نہ ہوگی۔ اور دوسری حدیث کی کتابوں سے جو حضور ﷺ کا عمل "مدبها صوته" نقل کیا جاتا ہے تو "مدبها صوته" جس طرح جہراً ہوتا ہے، اسی طرح سراً بھی ہوتا ہے، اس لئے یہ روایت بھی آمین بالجہر پر نص نہ ہوگی بخلاف اس کے وہ صحیح روایت جس میں حضور صلی اللہ کا عمل "و خفض بها صو ته" منقول ہے وہ البتہ آمین بالسر پر نص ہے، اس لئے حنفیہ سراً آمین کہنے کو افضل قرار دیتے ہیں، دوسرے حنفیہ سراً آمین کہنے کو افضل قرار دیتے ہیں، دوسرے یہ کہ آمین دعا ہے، جیسا کہ حضرت عطاء نے خود بھی اسکی تصریح کی ہے کہ آمین دعا ء ہے اور دعاء کے بارے میں قرآن پاک میں ارشاد ہے: "ادعوا ربکم تضرعاً و خفیة" (۱)، یعنی دعا سراً کہنے کا حکم ہے اور قرآن کا حکم سب پر بالا ہے، اس لئے بھی حنفیہ آمین بالسر کے قائل ہیں اور سراً آمین کہنے کو افضل کہتے ہیں۔

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۵/۹/ ۱۴۰۳ھ

۱- سورۂ اعراف: ۵۵۔

نماز میں آمین آہستہ یا بلند آواز سے کہنا:

یہاں بعض لوگ نماز میں الحمد کی سورت کے آخر نماز میں آمین زور سے بلند آواز سے کہتے ہیں، ان سے جب کہا جاتا ہے کہ آمین آہستہ سے کہو تا کہ کسی کو تکلیف نہ ہو تو حدیث کی کتاب "ابوداؤد شریف" کا حوالہ دے کر کہتے ہیں کہ آنحضرت علیہ آمین بلند آواز سے کہتے تھے اور مسجد نبوی گونج اٹھتی تھی۔ اور یہی حکم ہے، آمین آہستہ کہنے کی کوئی حدیث ہے ہی نہیں، اگر ہو تو دکھلاؤ۔ تو برائے مہربانی صحاحِ ستہ کی کتابوں میں سے آمین آہستہ کہنے کے جواز میں چند حدیثیں لکھوا کر بھیجئے!

الجواب وبالله التوفیق:

جس طرح صحاح ستہ میں جس درجہ کی حدیث آمین زور سے کہنے کی مروی ہے، اسی طرح اسی درجہ کی حدیث آہستہ کہنے کی مروی ہے۔

ایک کے راوی شعبہ ہیں تو دوسرے کے راوی سفیان ہیں، دونوں ایک درجہ کے مستند ہیں، اسی طرح جس درجہ کی حدیث مسجد گونج جانے کی مروی ہے، اسی درجہ کی حدیث اتنی بلند آواز سے آمین کہنے کی مروی ہے کہ عورتوں کی صف تک آواز پہونچتی تھی، بالکل اسی درجہ کی دوسری حدیث صحیح بھی موجود ہے کہ ایسے آہستہ کہتے تھے کہ صرف قریب کی صف کا، بلکہ بعض مرتبہ صرف قریب کا آدمی محسوس کرتا تھا کہ آپ نے آمین فرمایا، صحاح کی ان احادیث میں سے کسی ایک کو دوسری پر ترجیح دینا اور محض ایک کو لازم پکڑ لینا سخت دشوار ہے اور ادھر قرآنِ پاک میں وارد ہے: "**ادعوا ربكم تضرعاً وخفية**" (۱) سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ سے تضرع کے ساتھ اور خفیہ طور پر دعا کرو، آمین بھی دعاء ہے، اس لیے کہنا پڑے گا کہ اصل تو آمین آہستہ سے ہی کہنا ہے۔

اور حضور علیہ تعلیماً للامۃ ان مختلف طریقوں سے کبھی کبھی کرلیا کرتے تھے، نہ کہ ان مذکورہ طریقوں میں سے محض ایک طریقہ سے ہمیشہ بلند آواز سے یا مدِ صوت کے ساتھ ہمیشہ ہی کہا کرتے تھے۔

یہی وجہ ہے کہ حضرت عمر فاروقؓ اور حضرت علیؓ نے کبھی بلند آواز سے آمین نہیں کہی، اسی طرح تمام بڑے صحابہ میں سے کسی نے حضور علیہ کے بعد ہمیشہ بلند آواز سے آمین نہیں کہی۔

ان بڑے صحابہ کے ہمیشہ آمین آہستہ کہنے سے معلوم ہو گیا کہ سرکارِ دو عالم علیہ کا ان مذکورہ اور مختلف انداز سے

۱- سورۂ اعراف: ۵۶۔

کہنا محض تعلیماً للامۃ تھا اور اصل طریقہ قرآن پاک میں بیان کردہ حکم کے مطابق آہستہ ہی ہے، اس لیے حنفیہ اسی آہستہ طریقے سے کہنے کو ترجیح دیتے ہیں، ورنہ احادیث شریفہ میں تضاد ٹکراؤ ماننا پڑے گا، حالانکہ احادیث سب صحیح ہیں اور من اللہ وحی غیر متلو ہیں، ان میں تضاد و تخالف ماننا جائز نہیں، کیونکہ قرآنِ پاک میں صاف طور سے اس تضاد و اختلاف کی تردید کی اطلاع موجود ہے، فرمایا گیا ہے: "ولو كان من عند غير الله لوجد و افيه اختلافاً كثيراً" (۱)، اس لیے اختلاف کو جو بظاہر احادیث میں نظر آتا ہے اپنی کوتاہی فہم سے مان کر اسی میں جمع کرنے کی صورت کو لازم پکڑا جائے گا اور حنفیہ کا مسلک اس کے مطابق ہے۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

قنوت نازلہ فجر کی نماز میں پڑھنے کا حکم:

ما حكم القنوت في صلوٰة الصبح عند المذاهب الأربعة، وهل يجوز للحنفي المذهب إذا صلى إماماً أن يقنت وما حكم إذا صلى الحنفي مأموماً وقنت الإمام"۔

محمد شفیق الرحمٰن خاں (مسجد زید بن ثابتؓ شارع کیدا داری الشرخ الصناعیۃ دولۃ الکویت)

الجواب وبالله التوفيق:

حضرت امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک دعائے قنوت دوامًا صرف نمازِ وتر میں ہے، نمازِ فجر میں نہیں ہے، اگر فجر میں ہے تو وہ قنوتِ نازلہ کی دعا ہے جو صرف نازلہ کے وقت پڑھی جاتی ہیں نہ کہ ہمیشہ (۲)۔

۱- سورۂ نساء: ۸۲۔

۲- "ولا يقنت لغيره إلا لنازلة فيقنت الإمام في الجهر، وقيل: في الكل، قال الشامي: يوافقه مافي البحر والشرنبلالية عن شرح النقاية عن الغاية: وإن نزل بالمسلمين نازلة قنت الإمام في صلاة الجهر، وهو قول الثوري وأحمد رحمهما الله إلى قوله: شرعية االقنوت في النوازل مستمرة، وهو مجمل قنوت من قنت من الصحابة بعد وفاته عليه السلام، وهو مذهبنا وعليه الجمهور، قال الحافظ أبو جعفر الطحاوي: إنما لايقنت عندنافي صلوة الفجر من غير بلية، فإن وقعت فتنة أو بلية، فلابأس به، فعله رسول الله صلي الله عليه وسلم، وأما القنوت في الصلوات كلها للنوازل فلم يقل به إلا الشافعي. (فتاوى شامي باب الوتر والنوافل، ۲/ ۲۵۱)۔

"أن النبي ﷺ كان لايقنت إلا إذا دعي علي قوم أو دعي لقوم" (نصب الراية باب صلوة الوتر والنوافل ۲/ ۱۳)،

حنفیہ کی ایک اور دلیل حضرت ابومالک اشجعی کی روایت ہے، وہ فرماتے ہیں:

اسی وجہ سے حنفیہ کے نزدیک نمازِ فجر میں ہمیشہ دعاءِ قنوت پڑھنا ثابت نہیں ہے، اس لیے حنفی امام کو نمازِ فجر میں دعاءِ قنوت نہ پڑھنا چاہئے، ہاں اگر مقتدیوں میں حضرات شوافع یا ایسے لوگ ہوں جو دعاءِ قنوت پڑھتے ہوں تو ایسے وقت میں اس امام کو درست ہے کہ قومہ میں قومہ کی دعائیں جن کا عام طور سے قومہ میں پڑھنا ماثور ہے، اس طرح سست رفتاری سے پڑھے کہ توقف اور تفکر کی خرابی بھی نماز میں نہ آئے اور اس درمیان میں یہ حضرات اپنی دعاءِ قنوت بھی پڑھ لیں اور جب حنفی ایسے امام کے پیچھے نماز پڑھے جو اس میں دعاءِ قنوت پڑھنے کا قائل ہو تو خاموش کھڑا رہے اور رکوع وغیرہ سارے ارکان امام کے ساتھ ادا کرتا رہے (۱)۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

فجر کی نماز میں قنوت نازلہ پڑھنا:

صبح کو فجر کی نماز جو دعاءِ قنوت نازلہ پڑھی جاتی ہے اس کا پڑھنا کیسا ہے۔

الجواب وباللہ التوفیق:

فجر کی نماز میں دوسری رکعت میں رکوع کے بعد کھڑے ہو کر جو دعاء پڑھی جاتی ہے وہ عام بلیات ومصائب کو اپنے رب العزت کی مدد سے دفع کرنے کی نیت سے پڑھنا جائز ہے (۲)۔

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۶/ ۷/ ۸۵ ۱۳ ھ

الجواب صحیح: سید احمد علی سعید، محمود عفی عنہ مفتی دارالعلوم دیوبند

"قلت: لأبي يا أبت إنک قد صليت خلف رسول الله صلي الله عليه وسلم وأبي بکر وعثمان: وعلي بن أبي طالب ههنا بالکوفة نحواً من خمسين سنة أکانوا يقنتون؟ قال: أي بني! أعجبني "محدث" (نصب الرایہ ۲/ ۹ ۷ باب فی ترک القنوت) (مرتب)۔

۱- "ويأتي الإمام بقنوت الوتر لا الفجر، لأنه منسوخ، قال الشامي: فصار کما لو کبر خمساً في الجنازة حيث لايتابعه في الخامسة بل يقف ساکتاً مرسلا يديه قال الشامي وقيل: يقعده وقيل: يطيل الرکوع وقيل يسجد إلى أن يدرکه في شرنبلاليه (فتاویٰ شامی ۱/ ۴۴۹، باب الوتر والنوافل) هکذا في کتب المعتبرة للفتاویٰ عند الأحناف کالرد، والدرر والبحر وغيرهما" (مرتب)۔

۲- "وقال الحافظ أبوجعفر الطحاويؒ: إنما لا يقنت عندنا في صلاة الفجر من غير بلية، فإن وقعت فتنة أو بلية، فلا

بارش یا تاریکی کی وجہ سے دونمازوں کوایک ساتھ پڑھنا:

وهل يجوز للحنفي ان يجمع بين الصلوٰتين جماعة للمطر أو الغيم أو الظلم أرجو الإفادة التامة للسوال المذكور ولكم جزيل الشكر منا والسلام۔

محمد شفیق الرحمٰن خاں (مسجد زید بن ثابتؓ شارع کیداداری الشرخ الصناعیۃ دولۃ الکویت)

الجواب وبالله التوفيق:

جمع حقیقی بین الصلوتین حنفیہ کے نزدیک صرف دوموقعوں پر جائز ہے: ایک موقع عرفات کا ہے کہ نویں ذی الحجہ کو عرفات میں امام الحج کی معیت میں جماعت سے پڑھے تو عصر کی نماز کو مقدم کر کے ظہر کے ساتھ ہی پڑھ لے اور امام الحج یا امیر الحج کے ساتھ نہ پڑھے تو، خواہ جماعت سے پڑھے یا تنہا پڑھے، جمع نہ کرے، بلکہ دونوں نمازوں کی وضاحت ظہر اور عصر کو اپنے اپنے وقت ہی میں پڑھے، دوسرا موقع مزدلفہ کا ہے، مزدلفہ میں مغرب کو مؤخر کر کے عشاء کے وقت میں پڑھے، خواہ جماعت سے پڑھے یا تنہا، ہر حال میں جمع کرے۔

ان دوموقعوں کے علاوہ اور کسی بھی موقعہ میں جمع حقیقی نہ کرے، اس لیے کہ جمع کرنا آیتِ کریمہ: ''إن الصلوٰة كانت على المؤمنين كتاباً موقوتا''(۱) کے خلاف ہے اور جتنی حدیثیں ان دونوں موقعوں کے علاوہ مطر وغیم وغیرہ میں جمع کی ہیں سب اخبارِ آحاد یا غیر متواترہ ہیں اور اخبار غیر متواترہ سے تغیر وتبدل کتاب اللہ پر جائز نہیں اور اس وجہ سے ان دونوں موقعوں کے علاوہ تمام موقعوں میں جمع سے محض جمع صوری مراد لے کر جمع بین الروایات کرتے ہیں، اس لئے صرف ان دونوں موقعوں میں احناف جمع حقیقی کے قائل ہو گئے (۲)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

بأس به فعله رسول اللهﷺ'' (ردالمحتار علی الدر المختار ۲/ ۴۴۹)۔

۱- سورۂ نساء: ۱۰۳۔

۲- اس مسئلہ سے متعلق روایات درج ذیل ہیں: عن ابن عباسؓ قال: قال رسول اللهﷺ: من جمع بين الصلاتين من غير عذر فقد أتى بابا من أبواب الكبائر ''(ترمذی شریف ۱/ ۳۹۳ کتاب الصلوٰۃ باب الجمع بين الصلوتين)۔

فسادات کے موقع پر قنوت نازلہ اور آیت کریمہ پڑھنا:

☆ نماز فجر میں جو قنوت نازلہ آج کل پڑھا جارہا ہے اور عشاء کی نماز کے بعد آیت کریمہ پڑھ کر سب لوگ ایک جگہ جمع ہوجاتے ہیں۔ایک شخص دعاء کراتا ہے اور دوسرے اس پر "آمین" پکارتے ہیں،اس طریقہ کے بارے میں مسائل سے نوازیں کہ کس طرح صحیح ہے؟"لا إله إلا أنت سبحانک إني کنت من الظلمین" ● تک پڑھی جائے یا: "فاستجبنا له ونجینه من الغم، وکذلک ننجي المئومنین" ● (۱) تک پڑھی جائے۔

دہلی وغیرہ بطور اشتہار کے بہت سی دعائیں چھپ کر شائع ہورہی ہیں کہ موجودہ دور میں ان کو پڑھیں۔لہذا آپ بھی تحریر فرمادیں کہ کس دعاء کا ورد کیا جائے؟

الجواب وبالله التوفیق:

یہ سب طریقے بھی صحیح ہیں۔صرف کمی یہ ہے کہ ان باتوں کے ساتھ اپنے گناہوں سے توبہ شریعت کے مطابق نہیں کرتے ،آیت کریمہ محض:"إني کنت من الظلمین" تک بھی صحیح توبہ کے ساتھ پڑھنا کافی ہے۔

نیز آج کل کثرت سے درود شریف کا ورد اور اس دعاء "اللّٰهم إنا نجعلک في نحورهم، ونعوذبک من شرورهم" کا ورد کثرت سے چلتے پھرتے رکھیں۔اتنا بھی بہت کافی ہے۔فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی،مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۷/۵/۱۴۱۱ھ

مختلف قسم کے مصلوں کا شرعی حکم:

(۱) آپ کی خدمت میں کاغذ کا مصلی پیش کیا جارہا ہے،اس طرح کے مصلے کاغذ پر چھپتے ہیں اور معلوم ہوا کہ کسی مقام پر مسلمان اس کو دسترخوان کی جگہ استعمال کرکے کوڑا کرکٹ کے ڈبے وغیرہ میں پھینک دیتے ہیں۔

(۲) کپڑے کی چادروں کی صورت میں چھپتے ہیں اور کئی مقام پر مسجد کے منتظمین مسجد کی صفوں میں بچھاتے ہیں

"قال محمد: بلغنا عن عمر بن الخطاب أنه کتب في الأمان فیها هم أن یجمعوا بین الصلوتین ویخبرهم أن الجمع بین الصلوتین في وقت واحد کبیرة من الکبائر" (موطا امام محمد/ ۱۲۹–۱۳۰ باب الجمع بین الصلاتین فی السفر والمطر ما صلی رسول الله بغیر میقاتها)(مرتب)۔

۱- سورہ انبیاء:۸۷-۸۸۔

جن پر لوگوں کے پاؤں لامحالہ پڑتے رہتے ہیں اور لوگ ان پر بیٹھ بھی جاتے ہیں اور جوتے بھی رکھتے ہیں۔

(۳) مخمل کے کپڑے کی صورت میں بنے ہوئے ہوتے ہیں جو عام طور پر مسلمان اپنی اپنی انفرادی نمازوں کے وقت گھروں میں اور مساجد میں امام کی امامت کی جگہ استعمال کرتے ہیں اور یہ کہ اس پر بہ نسبت کاغذ اور چادروں کے بیت اللہ شریف کی تصویر زیادہ نمایاں ہے۔

(۴) یعنی مصلی کی چادریں تیار کرنے والے صاحب نے بتایا ہے کہ ان کو سعودی تجار سے جو آرڈر ملتے ہیں تو وہ تاکید کرتے ہیں کہ بیت اللہ کی تصویر والا عکس داہنی جانب ہو اور یہ کہ وہ خود بھی سمجھتے ہیں کہ وہ بیت اللہ کی تصویر والی چادریں بنارہے ہیں اور کہتے ہیں کہ بائیں جانب والی تصویر گنبد خضراء کی نہیں ہے۔ اس سلسلے میں ایک جماعت کہتی ہے کہ ایسے مصلے جائز و درست ہیں بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ ایسے مصلے باپ دادا یعنی عرصہ دراز سے استعمال ہوتے آئے ہیں اور کئی بزرگان دین کو بھی استعمال کرتے دیکھا گیا ہے، جبکہ دوسری جماعت دلائل کی بناء پر اس کے استعمال کو مکروہ ناجائز بتاتی ہے اور بعض تو شرک وحرام تک بتادیتے ہیں، براہ کرم تفصیل سے اس کا جواب مع حوالہ جات کے تحریر فرمائیں۔

(۵) اگر کسی مسجد کے منتظمین اپنے امام کو استعمال کرنے پر مجبور کریں اور ضد کریں تو اس امام کو کیا کرنا چاہئے اور یہ کہ ایسی صورت میں ایسے مصلوں کی کیا حقیقت کیا حیثیت کیا مقام رہے گا اور یہ کہ ایسے ضدی منتظمین کے بارے میں شرعی کیا حکم ہوگا، براہ کرم یہ بھی بتائیں کہ اسلام میں ایسے مصلوں کی کیا حقیقت ہے کیا حیثیت ہے اور کیا مقام ہے۔

بندہ ابراہیم باوا

الجواب وباللہ التوفیق:

اس مصلی کو بغور دیکھا آجکل جو کعبۃ اللہ شریف کی یا گنبد خضرا کی جو صورت ہے وہ اس مصلی میں نہیں، لہذا اس اعتبار سے اس پر نماز کا عدم جواز یا کراہت کی گفتگو ہی ختم ہوگئی (۱)، رہ گیا نماز میں شاغل ہو یہ امر اضافی ہے، بعض کے اعتبار سے ایک چیز شاغل بنتی ہے اور بعض کے اعتبار سے نہیں بنتی مثلاً ایک دیہاتی غریب جس نے کبھی منقش کپڑے نہ دیکھے ہوں اس کے لئے معمولی خوبصورت کپڑا چک وغیرہ بھی شاغل بن جائے گا اور ایک شخص جو برابر منقش کپڑوں میں رہتا ہے یا اس کے سامنے نقش ونگار رہتے ہیں اس کے لئے شاغل نہ بنے گا اور ایسی صورت کا حکم یہ ہوگا کہ جس کے لئے شاغل بنے وہ

۱- "أو لغير ذی روح لا یکرہ" (الدر المختار مع رد المحتار ۲/۴۱۸) (مرتب)۔

استعمال نہ کرے اور جس کے لئے شاغل نہ بنے اس کو استعمال کی اجازت ہوگی، اس لئے سب کے لئے یکساں اور کلی حکم اس صورت میں نہ ہوگا اور نہ افراد کے مجموعہ پر یہ حکم آنا ضروری ہوگا، بلکہ یہ حکم ہر ہر فرد کے لئے الگ الگ اس کے خصوصی مصلی اور احوال کے اعتبار سے ہوگا (۱)۔

جناب نبی کریم ﷺ کی نگاہ مبارک ایسے موقعہ میں شفقۃ علی الامۃ مسائل واحکام کی تبلیغ کی مصلحت سے غریبوں محتاجوں کمزوروں بیماروں کی جانب منجانب اللہ پہنچتی تھی ورنہ آپ کی ذات مقدس اس سے کہیں زیادہ اعلی وارفع ہے کہ آپ اللہ کے سامنے کھڑے ہوں اور آپ کی نگاہ غیر اللہ میں مشغول ہو باقی چونکہ احکام ومسائل کی تبلیغ وتحریض مطلوب شرعی اور آپکا منصب تھا، اس لئے بھی ہر وقت یہ حکمت پیش نظر رہتی تھی، چنانچہ اس کی مثالیں بہت ہیں، مثلاً مسئلہ یہ ہے کہ۔

(مثال۔۱) جب ایک شخص تنہا نماز پڑھے تو اس کو اپنے نشاط وانبساط کے مطابق ارکان صلاۃ جتنا طویل کر سکے طویل کرنا ہی بہتر واولی ہے اور جب وہی شخص امامت کرے تو حکم یہ ہے کہ کمزوروں بیماروں ضرورتمندوں کی رعایت مقدم کرے اور ہلکی نماز پڑھے چنانچہ بخاری ومسلم میں بھی حضرت ابو ہریرہ سے صحیح روایت مروی ہے: "**إذا صلى أحدكم للناس فليخفف، فان فيهم السقيم والضعيف والكبير وإذا صلى لنفسه فليطول ما شاء**" (۲) حالانکہ اس میں نگاہ سقیم وضعیف وکبیر کی طرف پہنچتی ہے اور سقیم ضعیف وکبیر یہ سب غیر اللہ ہیں، مگر چونکہ یہ چیز شرعاً مطلوب ہے، اس لئے محمود ہے اس کا امتثال کمال عبدیت کا اظہار ہے آپ کا عمل مبارک بھی اس حکم کے مطابق تھا آپ تہجد کی نماز پڑھتے تھے تو بہت طویل اور بہت حسین پڑھتے تھے اور "ابو داؤد شریف" میں حضرت عائشہؓ کی طویل حدیث میں "**لا تسأل عن حسنهن وطولهن**" (۳) سے اسی کی طرف اشارہ ہے اور جب آپ امامت فرماتے تھے تو اس کے بارے میں حضرت انسؓ

۱- "**عن عائشة رضي الله عنها أن النبي ﷺ صلى في خميصة لها أعلام، وقال: شغلتني أعلام هذه، فاذهبوا بها إلى أبي جهم وأتوني بانبجانيه**" (صحیح مسلم کتاب المساجد حدیث ۶۱)، حافظ ابن حجرؒ اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں: "**وأما بعثه بالخميصة إلى أبي جهم فلا يلزم منه أن يستعملها في الصلوة .... ويحتمل أن يكون ذلك من جنس قوله: "كل فإني أناجي من لا تناجي"**" (فتح الباری شرح صحیح بخاری ۱/۴۸۳)، نیز امام نوویؒ اس کی شرح میں لکھتے ہیں: "**ففيه الحث على حضور القلب في الصلوة وتدبر ما ذكرناه ومنع النظر من الامتداد إلى ما يشغل وإزالة ما يخاف اشتغال القلب به وكراهية تزويق محراب المسجد وحائطه ونقشه وغير ذلك من الشاغلات**" (شرح نووی ۵/۴۴) (مرتب)۔

۲- صحیح بخاری مع فتح الباری ۲/۱۹۹ کتاب الأذان باب إذا صلی لنفسہ فلیطول ماشاء حدیث ۷۰۳ بعض نسخوں میں فان فیہم کے بجائے فان منہم ہے، نیز روایت میں لفظ ضعیف، سقیم پر مقدم ہے، نیز صحیح مسلم میں کچھ الفاظ کے فرق سے مروی ہے (دیکھئے: حدیث ۱۸۴، ۱۸۵، ۱۸۶) (مرتب)۔

۳- سنن ابو داؤد ۲/۴۰ ابواب قیام اللیل باب فی صلاۃ اللیل حدیث ۱۳۴۱، **عن أبي سلمة بن عبد الرحمن أنه أخبره أنه سأل عائشة**

سے (خادم خاص) "بخاری ومسلم" میں روایت ہے فرماتے ہیں: **"ما صليت وراء إمام قط أخف صلاة ولا أتم صلاة من النبي ﷺ، وإنه كان يسمع بكاء الصبي، فيخفف مخافة أن تفتن أمه"** (۱)، اس روایت میں بھی کمزوروں اور ضعیفوں کی طرف ذہن گیا اور ان کی رعایت کو مقدم فرمایا اور مثلاً:

(مثال نمبر ۲) مساجد کو مزخرف کرنا نقش ونگار سے مزین کرنا قرب قیامت کی علامت ہے (۲)، اور فقہاء نے مسئلہ لکھا ہے کہ وقف کے پیسے سے نقش نگار بنانا ناجائز ہے اور اپنے ذاتی پیسے سے بنانا غیر مستحسن اور ناپسندیدہ فی الشرع ہے اور قبلہ کی دیوار میں تو اپنے پیسے سے بھی ایسا نقش ونگار بنانا ممنوع ومکروہ ہے (۳)۔

اس علت مطردہ کے تحت یہ حکم خود بخود بھی نکل آیا کہ جو صفیں مساجد میں بچھائی جاتی ہیں ان کا سادہ اور غیر منقش ہونا کم از کم مطلوب شرعی ضرور ہوگا اور خلاف کرنا مکروہ ہوگا۔ پھر اس حکم میں بھی اوپر کی ذکر کردہ مصالح پیش نظر ہو سکتی ہیں کہ مساجد میں ہر مسلمان شریک جماعت ہو سکتا ہے اور عام مسلمانوں میں اکثر وبیشتر غریب ومسکین ہوتے ہیں اور ان مزخرفات کا ان کے لئے شاغل بنا قرین قیاس بھی ہے اس لئے ذہن نبوی علی صاحبہا الصلاۃ کی متابعت میں یہ حکم عام بھی ہو سکتا ہے کہ ایسی صفیں مکروہ وممنوع ہوں جس طرح دیوار قبلہ کا نقش ونگار مکروہ ہے (۴)، اور غرباء ومساکین کی رعایت مقدم ہو، پس منتظمین وذمہ دار مساجد پر اس حکم کا لحاظ رکھنا بھی ضروری ہوگا۔

اگر کسی مسجد کے منتظمین اس کا لحاظ نہ کریں تو ان کو نرمی وہمدردی کے ساتھ مسائل سے واقف کرنا اور سمجھانا چاہئے اگر سمجھ جائیں اور اصلاح فرمالیں اور لحاظ رکھنے لگیں تو فہو المراد ورنہ ضد وزبردستی نہیں کرنی چاہئے نزاع وجدال اختیار نہیں کرنا

زوج النبي ﷺ: كيف كانت صلاة رسول الله ﷺ في رمضان؟ فقالت: ما كان رسول الله ﷺ يزيد في رمضان ولا في غيره على إحدى عشرة ركعة يصلي أربعاً فلا تسأل عن حسنهن وطولهن، ثم يصلي أربعاً فلا تسأل عن حسنهن وطولهن، ثم يصلي ثلاثاً قالت عائشة رضي الله عنها فقلت: يا رسول الله أتنام قبل أن توتر؟ قال يا عائشة! إن عينيّ تنامان ولا ينام قلبي (مرتب)۔

۱- صحیح بخاری مع فتح الباری ۲/۲۰۰ کتاب الأذان باب من أخف الصلاۃ عند بکاء الصبی حدیث ۷۰۸، ولفظه: ما صليت وراء إمام قط أخف صلاة ولا أتم من النبي ﷺ وإن كان يسمع بكاء الصبي، فيخفف مخافة أن تفتن أمه، نیز صحیح مسلم حدیث ۱۹۲ (۴۶۹) (مرتب)۔

۲- عن أنس أن النبي ﷺ قال: لا تقوم الساعة حتى يتباهى الناس في المساجد (سنن ابوداؤد ۱/۱۲۳ کتاب الصلاۃ باب فی بناء المساجد حدیث ۴۴۹) (مرتب)۔

۳- "ومحمل الكراهة التكلف بدقائق النقوش ونحوه خصوصاً في المحراب أو التزيين مع ترك الصلوات (فتح القدير ۱/۳۶۸)، قال المصنف في الكافي: وهذا إذا فعل من مال نفسه، أما المتولي فإنما يفعل من مال الوقف ما يحكم البناء دون النقش فلو فعل ضمن حينئذ لما فيه من تضييع المال" (البحر الرائق ۲/۶۵) (مرتب)۔

۴- "ويكره التكلف بدقائق النقوش ونحوها خصوصاً في جدار القبلة" (الدر المختار مع رد المحتار ۲/۴۳۱) (مرتب)۔

چاہئے، بلکہ ہمدردی کے لہجہ میں مسئلہ بتا کر خاموش ہوجانا چاہئے مسئلہ صاف صاف اور اخلاص سے بتا کر اختلاف وشقاق و نزاع وجدال سے بچنے اور بچانے کے لئے خموش ہوجائے انشاء اللہ عند اللہ براءت ذمہ ہوجائے گی پھر جو مواخذہ مطالبہ وغیرہ منجانب اللہ ہوگا وہ صرف منتظمین و ذمہ داروں تک محدود رہے گا (۱)۔

رہ گیا ائمہ کا ایسے موقعہ پر کیا رویہ ہونا چاہئے انکا رویہ بھی یہی ہونا چاہئے جو ابھی ذکر ہورہا ہے، رہ گئی ان کی نماز اگر وہ اپنے مصلی کو شاغل دیکھتے ہوں تو اس کو اس طرح بھی حل کرسکتے ہیں کہ اپنا سادہ رومال اپنے مصلی پر ڈال کر اپنے کو بچالیں۔فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۶/۱۲/۱۴۰۰ھ

نوٹ:۔ جو روایات جناب نے نقل فرمائی ہیں وہ اولا تو از قبیل فضائل ہیں فضائل پر احکام ومسائل کی بنا نہیں ہوتی، بلکہ اس سے مقصد اولی ترغیب وتحریض ہوتی ہے تاکہ عمل کرنے کا شوق پیدا ہو کر عمل کرنا سہل اور آسان ہوجائے اور نسبتِ احسان پیدا کرنے کی استعداد وصلاحیت حاصل ہوجائے۔

ثانیاً: ایسی روایات اکثر باب تربیت اور اصلاح سے متعلق ہوتی ہیں، اسی کی وجہ سے مشائخ ومصلحین ایسی روایت لاکر رذائل باطنہ ومکائد خفیہ کی اصلاح فرماتے ہیں جس سے سالک باطن کی تربیت باحسن وجوہ ہوتی ہے، نیز یہ حالات تقوی کے اعلی مراتب پر فائز ہونے کے بعد اکثر ظہور پذیر ہوتے ہیں۔

اس لئے بھی ان چیزوں کو عام وکلی حکم نہیں قرار دیا جائے گا۔

امید ہے کہ ان مختصر جملوں سے ان روایات کے مفاہیم ومحامل اور مصادیق بھی واضح ہوجائیں گے جو باعث طمانیت قلب بھی بنیں گے۔فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

۱- "ادع إلى سبيل ربک بالحکمة والموعظة الحسنة وجادلهم بالتي هي أحسن إن ربک هو أعلم بمن ضل عن سبيله وهو أعلم بالمهتدين" (سورۂ نحل: ۱۲۵)۔

۱- فاتحہ اور سورت کے درمیان وقفہ کی حد:

امام صاحب کے ختم سورہ فاتحہ اور ضم سورہ کے درمیان کتنی دیر تک وقفہ اور سکوت رہنے سے نماز فاسد ہوجاتی ہے۔

۲- حنفی امام کے لئے دوسرے ائمہ کے مسائل کا اتباع کرنا:

کوئی حنفی عالم دیگر ائمہ ثلثہ کے مسائل کے تابع بن کر امامت کرے تو بہتیرے اختلافِ مسائل حنفیہ کے کتنے مواقع اور مسائل میں نماز فاسد ہوجاتی ہے، اس مسئلے میں دلیل ضرور چاہیے، ورنہ یہاں نا قابل مسموع ہوگا خاص کر حنفی امام شافعی مسائل کے تابع بن کر نماز ادا کرسکتا ہے یا نہیں۔

مولوی شبیر احمد میرٹھی

الجواب وبالله التوفيق:

۱- بعد فاتحہ آمین کہنے اور ضم سورہ کے پہلے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کہنے اور اطمینان سے سانس لینے اور اطمینان کرنے کے بقدر وقفہ وسکوت کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں اور اس سے زائد بغیر ضرورت طبعی وشرعی کے سکوت ووقفہ کرنا مذموم ہے کبھی مکروہ کبھی موجب سجدۂ سہو ہوگا۔ ان سب مسائل کی تفصیل اردو کتب فقہ مثلاً "علم الفقہ، بہشتی ثمر و بہشتی زیور و تعلیم الاسلام مصنفہ حضرت مفتی کفات اللہ" میں موجود ہے، ان کتابوں کا مطالعہ کریں (۱)۔

۲- حنفی امام کو دوسرے ائمہ کے مقلدین کے مسائل کا اتباع کرنا تو درست نہیں البتہ امامت وطہارت وغیرہ کے مسائل میں حنفی رہتے ہوئے اس طرح عمل کرے کہ دیگر ائمہ کے مسلک ومسئلہ کے مطابق بھی عمل ہوجائے اور اختلافات ائمہ سے بھی محفوظ رہیں اور نماز میں ہر مسلک کے لوگوں کی رعایت ہوجائے مثلاً سورہ فاتحہ سے قبل آہستہ سے ہر نماز میں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کا پڑھنا اور سورہ فاتحہ کے بعد آہستہ سے آمین اور ضم سورہ سے پہلے آہستہ سے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم، اسی طرح سانس کھینچ کر اور ٹھہر ٹھہر کر پڑھ لینا جس سے وہ لوگ جو خلف الامام سورہ فاتحہ پڑھنا چاہتے ہوں سورہ فاتحہ جلدی جلدی پڑھ لیں۔ یا مثلاً نماز فجر کی دوسری رکعت کے رکوع کے بعد قومہ میں تسمیع اور تحمید کے علاوہ قومہ کی اور جو دعائیں احادیث میں وارد ہیں ان کو بھی پڑھ لیں، تا کہ وہ مقتدی جو اس میں قنوت نازلہ پڑھنا چاہتے ہوں پڑھ لیں تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں، بلکہ

۱- "وانه يجب أن لا يؤخر السورة عن قرائة الفاتحة.... وقيده في فتح القدير، بأن يكون مقدار ما يتأدى به ركن عن قرائة الفاتحة" (البحر الرائق ۲/۲۶۶، نیز دیکھئے: بہشتی زیور سجدہ سہو کا بیان مسئلہ ۹، و بہشتی ثمر/۸۷) (مرتب)۔

ایسے حنفی امام کو جن کے پیچھے دیگر ائمہ کرام کے مقلدین بھی شریک ہوں رعایت کرنا چاہئے (۱)، باقی تمام ایسے مسائل کی تفصیل فتویٰ سے حل و معلوم نہیں ہوسکتی ان مسائل کی تفصیل دیکھنا ہو تو اردو زبان کی غایۃ الاوطار ترجمہ درمختار یا ردالمحتار، البحرالرائق کا باب الامامہ مطالعہ کریں، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۳/ ۰۸/ ۱۴۱۰ھ

بچوں کا گھٹنا کھول کر نماز پڑھنا:

ہمارے بڑے لڑکے کی عمر ساڑھے آٹھ برس اس سے چھوٹے کا سات برس ہوا میں ان لوگوں کو مسجد میں ہر روز لے جاتا ہوں۔ وہ لوگ گھٹنوں کے اوپر پائجامہ پہن کر جاتے ہیں، نمازی لوگ ان کا ران دیکھنے سے گنہگار ہوں گے؟ کئی مولوی صاحب مجھے کہا بچہ ہے ان کے لئے کوئی حکم نہیں ہے، نابالغ ہے۔

محمد اسحاق، تھائی لینڈ

الجواب وبالله التوفيق:

جب بچے سات برس کے ہوجائیں تو ان کو نماز پڑھنے کا حکم ہے، اس لئے اچھا کرتے ہیں کہ ان کو مسجد میں لے جاتے ہیں، البتہ ایسا تہبند یا پائجامہ یا کپڑا پہن کر مسجد میں جانا چاہیے جس میں گھٹنا چھپا رہے، قرآن پاک میں ہے: "یا بنی آدم خذوا زینتکم عند کل مسجد وکلوا واشربوا ولا تسرفوا إنه لا یحب المسرفین" (۲)، اور جو لباس خود پہننا منع ہو، اس کو بچوں کو پہنانا منع ہے جس نے اس کے خلاف کہا غلط کہا (۳)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۱/ ۸/ ۱۴۰۲ھ

۱- "فی التاتارخانیة عن الحجة: ینبغی للإمام أن یحترز عن ملامسة النساء ومواضع الاختلاف ما استطاع" (ردالمحتار علی الدرالمختار ۲/ ۳۴۰) (مرتب)۔

۲- سورۂ اعراف: ۳۱۔

۳- "فإن ماحرم لبسه وشربه حرم إلباسه وإشرابه" (الدرالمختار مع ردالمحتار ۹/ ۵۲۲) (مرتب)۔

نماز فجر میں مقتدی کا لحاظ کرتے ہوئے چھوٹی سورت پڑھنا:

صبح کی نماز میں آج کل کے مقتدیوں کے لحاظ سے چھوٹی سورتیں پڑھنا کیسا ہے؟

الجواب وبالله التوفيق:

فجر کی نماز میں طوال مفصل جس کی مقدار تخمیناً چالیس آیت سے لے کر ساٹھ آیت تک ہے اور اس کی مقدار رات کے چھوٹے بڑے ہونے، نیز مصلیوں کے نشاط و رغبت و کثرت اشتغال کے اعتبار سے کم وبیش ہوتی ہے اور یہ مقدار طوال مفصل کی مسنون ہے، کسی مقتدی کے لحاظ سے اتنا کم نہ کردے کہ سنت ترک ہوجاوے کم سے کم مقدار سنت کی یہ ہے کہ دونوں رکعتوں کی قرأت ملا کر چالیس آیت ہوجائیں، بلاضرورت صحیحہ اس سے کم نہ کرے کہ خلاف سنت ہوگا (۱)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۶/ ۷/ ۸۵ ۳ھ

الجواب صحیح: سید احمد علی سعید، محمود غفی عنہ مفتی دارالعلوم دیوبند

نماز میں ناف کے نیچے ہاتھ باندھنا:

ناف کے نیچے ہاتھ باندھ کر نماز پڑھنے کا حکم کونسی حدیث میں ہے، حضور ﷺ نے کبھی ناف کے نیچے ہاتھ نہیں باندھے۔ اور ہے تو کون سی حدیث ہے صراحت کیجئے؟

الجواب وبالله التوفيق:

تحت السرہ ہاتھ باندھ کر نماز پڑھنے کی حدیث ابوداؤد نسخہ ابن عربی میں موجود ہے، بہتر ہے کہ "بذل المجہود شرح ابوداؤد مطبوعہ کتب خانہ یحیوی سہارنپور" میں دیکھ لیا جائے، نیز مصنف ابوبکر بن ابی شیبہ میں بھی موجود ہے، ابوداؤد کی روایت

۱- "وسنتها في الحضر أن يقرأ في الفجر في الركعتين بأربعين أو خمسين آية سوى فاتحة الكتاب" (فتاوی عالمگیریہ ۱/ ۷۷) "ولا يزيد على القراءة المستحبة ولا يثقل على القوم ولكن يخفف بعد أن يكون على التمام والاستحباب كذا في المضمرات ناقلاً عن الطحاوی" (ایضاً ۱/ ۷۸) (مرتب)۔

کامتن حسب ذیل ہے:"عن أبي وائل عن أبي هريرة أخذ الكف عن الكف في الصلوة تحت السرة"(۱)، اسی طرح ابوبکر ابن ابی شیبہ کی عبارت حسب ذیل ہے:"ليضع يمينه على شماله في الصلوة تحت السرة"، اسی طرح ابو داؤد میں اس مسئلہ سے متعلق مندرجہ ذیل روایت بھی موجود ہے:"عن جرير الظبي عن أبيه قال رأيت علياً يمسك شماله بيمينه على الرسغ فوق السرة"(۲)، اس حضرت علی کی روایت میں فوق سے مراد اتصالاً علی فوق السرۃ ہے نہ کہ فوق منفصلا جیسا کہ قرآن کریم کی آیت:"إني أراني أحمل فوق رأسي خبزاً" (۳)"وجعل فيها رواسي من فوقها"(۴) میں ہے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۲/۰۴/۱۴۰۲ھ

دوران نماز دنیوی ضرورتوں کا خیال آجانا:

ایک آدمی اگر نماز پڑھ رہا ہو اور اسی اثنا میں اس کو دنیوی کاموں اور ضرورتوں میں سے کوئی اس کے ذہن نشین ہوجاوے مثلاً بیوی بچے اور اس کے علاوہ دیگر امور خارجہ کام تو اس کا کیا حکم ہے آیا اس کی نماز مکمل طور سے ہوگی یا کہ نہیں؟

الجواب وبالله التوفيق:

حالت نماز میں دنیاوی کام اور ضرورتوں کے ذہن نشین ہوجانے سے نماز تو ہوجاتی ہے، لیکن نمازیوں کو چاہئے کہ ایسے خیالات بذات خود ذہن میں نہ لائے ہاں اگر خود بخود آجائیں تو صحت صلاۃ کے منافی نہیں ہے (۵)، فقط واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

الجواب صحیح سید احمد علی سعید نائب مفتی دارالعلوم دیوبند ۸ شعبان ۸۵ ۱۳ھ

۱- بذل المجهود ۲/۲۲۔
۲- بذل ۲/۲۴۔
۳- سورۂ یوسف: ۳۶۔
۴- سورہ حم السجدہ: ۱۰
۵- "في الفتاوى: ولو تفكر في صلاته فتذكر حديثاً أو شعراً أو خطبة أو مسئلة يكره ولا تفسد صلاته هكذا في السراج الوهاج" (فتاوی عالمگیریہ ۱/۱۰۰) (مرتب)۔

نماز میں لاؤڈاسپیکر کا استعمال:

ایک مسجد میں یہاں امامت کراتا ہوں اور نماز میں لاؤڈاسپیکر استعمال نہیں کر رہا ہوں اور حضرت والا نے بھی برطانیہ کے سفر میں دیکھا ہوگا کہ ائمہ مساجد اس کو نمازوں میں استعمال کر رہے ہیں، اور دلیل میں اس بات کو پیش کر رہے ہیں کہ اس کے استعمال کے اندر جو عقائد مفتی محمد شفیعؒ نے اپنی کتاب "آلات جدیدہ" میں لکھے ہیں وہ یہاں مفقود ہیں، مثلاً بجلی کا چلا جانا قریب قریب مساجد کا ہونا وغیرہ صرف خشوع وخضوع اور سلف صالح کی سنت کے خلاف ہے، اس کے باوجود آپ نے بھی جمعہ وعیدین میں مساجد میں اس کا استعمال دیکھا ہوگا نیز ایک عالم صاحب کہہ رہے ہیں کہ آلۂ مکبر الصوت سے آواز کا بلند ہونا اور دور تک پہنچانا بناء محراب وبناء گنبد سے زیادہ آسان ہے اور بناء محراب وبناء گنبد بلا نکیر مدت مدیدہ سے رائج ہے اور اس سے بھی رفع صوت امام مقصود ہے تو حضرت والا سے گذارش ہے کہ ان باتوں کا دلائل سے جواب دیں۔

ایس اے بوڑیات (۴۔ سارتھ کنگ اسٹریٹ باٹلے F17 یورک شائر، انگلینڈ)

الجواب وبالله التوفيق:

اعلیٰ بات تو یہی ہے نماز فرض بلا لاؤڈاسپیکر کے بالکل سادہ طریقہ پر ادا کی جائے، اس لئے کہ امام کی قرأت کا سننا ہر مقتدی کے حق میں واجبات صلوۃ میں سے نہیں ہے، بلکہ استماع وانصات واجب ہے اور وہ بغیر اس آلہ کے بھی حاصل ہے، نیز اس لئے کہ خشوع وخضوع جو نماز کی روح ہے وہ بھی اس صورت میں بدرجہ اتم حاصل ہوتی ہے اور اس کے تحصیل کی ترغیب بلکہ فی الجملہ تاکید بھی ہے اور آلہ مکبر الصوت میں بجلی نہ بھاگنے کی صورت میں عموماً فوں شوں گھڑ گھڑ گھڑ گھڑ وغیرہ کی آوازیں نکل آتی ہیں جو خشوع خضوع میں یا کم از کم یکسوئی اور توجہ الی الصلوۃ میں مخل ضرور ہو جاتی ہیں جن سے بچنا یا بچنے کی تدبیر کرنا بلاشبہ مقاصد تکمیل صلوۃ میں سے ہے رہ گئی یہ بات کہ آلۂ مکبر الصوت نماز میں استعمال کرلیا جائے تو نماز ہو جائے گی یا نہیں؟۔

تو ابتداء میں اپنے اکابر نے نماز نہ ہونے کا فتوی دیا، جیسا کہ حضرت تھانویؒ کے ابتدائی فتاویٰ اور حضرت مفتی محمد شفیع صاحب کے رسالہ "التحقيق الفريد في تقريب الصوت البعيد" اور اس کے قبل کے فتاویٰ سے معلوم ہوتا ہے پھر اس کے بعد جب اپنے اکابر میں بھی دو رائیں نظر آنے لگیں اور نماز جائز کہنے والے حضرات کے اس فرمانے سے کہ لاؤڈاسپیکر کے

انبوبوں سے نکلنے والی آواز بعینہ متکلم کی ہی آواز ہوتی ہے جو بڑھ کر نکلتی ہے۔صدائے بازگشت وغیرہ نہیں ہے اور ایسی صورت میں نماز جائز ہو جانا چاہئے تو مانعین جواز کے نزدیک بھی اپنی رائے میں تردد پیدا ہو گیا اور حضرت تھانویؒ ہی کے آخر زمانہ میں عدم جواز کے قائلین کے نزدیک یہ رائے ٹھہری کہ اس آلہ کے ماہرین سے تحقیق کرلی جائے جو آوازیں اس سے نکلتی ہیں بعینہ متکلم ہی کی آواز ہوتی ہے جو بلند ہو کر نکلتی ہے تو جواز صلوۃ کا فتوی دے دیا جائے، جیسا کہ "رسالہ التحقیق الفرید" کے بعد فتاوی وغیرہ سے معلوم ہوتا ہے اور حضرت تھانویؒ کی بھی یہی رائے ہے، چنانچہ اس تحقیق میں تین ماہرین میں سے دو کی تحقیق یہ ہوئی کہ بعینہ متکلم کی آواز ہوتی ہے جو بلند ہو کر نکلتی ہے صدائے بازگشت وغیرہ نہیں ہے اور ایک ماہر کی رائے اس کے خلاف ہوئی مگر ان دو ماہرین میں سے ایک غیر مسلم تھا، اس لئے متفق علیہ فیصلہ جواز کا نہ ہو سکا پھر حضرت تھانویؒ کا وصال ہو گیا بعد میں یہ چیز محقق ہو گئی کہ اس میں جو آواز نکلتی ہے وہ صدائے بازگشت وغیرہ نہیں ہوتی، بلکہ متکلم ہی کی آواز ہوتی ہے جو بلند ہو کر نکلتی ہے۔

تو حضرت مولانا ظفر احمد صاحب تھانویؒ اور حضرت مولانا سیّد حسین احمد صاحب مدنیؒ اور حضرت مولانا مفتی محمد شفیعؒ وغیرہم تمام اکابرین کے نزدیک متفقہ طور پر بلا کراہت اس سے جواز نماز کا فتوی ہو گیا شیخ الاسلام نمبر میں بھی حضرت مدنیؒ کا فتوی جواز کا شائع ہو چکا ہے اور یہ الگ بات ہے کہ بلا ضرورت اس کا استعمال مستحسن نہیں ہے باقی اگر کوئی استعمال کرے تو نماز بلا کراہت ادا ہو گی البتہ اس کا لحاظ ضروری رہے گا کہ لاؤڈ اسپیکر بہت عمدہ قسم کا ہو تا کہ اس میں سے بے موقعہ فون شون کر یہہ آواز نہ نکلے تا کہ خشوع خضوع وغیرہ فوت نہ ہو ورنہ اس کا استعمال مکروہ ہو گا اس طرح اگر بجلی بھاگ جانے کا یا آلہ کے خراب ہو جانے کا اندیشہ ہو اور مجمع بڑا ہو کہ امام کی آواز پیچھے تک پہنچنے میں شبہ ہو تو مکبرین کا انتظام رکھنا بھی ضروری رہے گا، تا کہ ایسے وقت میں نماز خراب نہ ہو اور چونکہ زمانہ سلف میں اس آلہ کا وجود ہی نہ تھا اس لئے انکی سنت کی مخالفت وموافقت کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا اور محراب ومنبر بنانے سے رفع صوت امام مقصود نہیں، بلکہ محراب سے امام کے جائے قیام کو واضح کرنا مقصود ہوتا ہے اور منارہ سے مسجد کی عمارت کا اعزاز واکرام مقصود ہوتا ہے اور اس کا نمایاں کرنا مقصود ہوتا ہے اور یہ مطلوب شرعی ہے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۸/ ۲/ ۱۴۰۴ھ

جلسۂ استراحت کا حکم:

نماز پڑھتے وقت طاق رکعت یعنی پہلی رکعت ہونے پر اور تیسری رکعت کے دونوں سجدہ کرکے باقاعدہ طور پر بیٹھ کر اٹھنا چاہئے یا نہیں؟ اس بارے میں بھی بخاری شریف کی جلد اول میں صفحہ (۱۸۲ پر حدیث ۸۲۸ اور ۸۲۹) یہ دونوں (حدیثیں) ملیں۔ جن میں طاق رکعت میں بیٹھنے کا حکم ملا ہے، لیکن یہ سیدھے کھڑے ہو جاتے ہیں اور ایسے ہی دوسرے بہت سے مسئلے ہیں جنکا تفصیل سے لکھنا مجھ جیسے ناواقف کے لئے مشکل ہے، لیکن میں چاہتا ہوں کہ میری نماز مکمل طور پر صحیح ہو، اس میں کوئی بات کی ادائیگی میں کمی نہ ہو اور رسول اللہ ﷺ کی ہر سنت پر عمل کرنا چاہتا ہوں، اس لئے آپ سے مشورہ لینا چاہتا ہوں کہ میں ان میں سے کونسا طریقہ اپناؤں بخاری شریف والا یا آج تک جس امام کی تقلید کرتے آیا ہوں۔

عامر تاج الدین دبیر (جدہ سعودی عربیہ)

الجواب وبالله التوفيق:

پہلی اور تیسری رکعت میں سجدہ ثانیہ کے بعد پہلے بیٹھ جائے پھر اٹھے، یعنی جلسۂ استراحت کرنے کا ہے، اس سلسلہ میں بخاری شریف میں صرف ایک روایت حضرت مالک بن الحویرثؓ کی ہے کہ حضور ﷺ نماز کی طاق رکعتوں میں دوسرے سجدہ کے بعد سیدھے بیٹھ جاتے پھر کھڑے ہوتے یہ روایت پوری نہیں ہے پوری روایت میں "**لا تبادروني فاني قد بدنت**" بھی موجود ہے، جیسا کہ امام ابن القیم نے "زاد المعاد" میں اس زیادتی کو نقل کرکے فرمایا ہے کہ جلسہ اصلی حکم نہیں، بلکہ بوجہ ضعف پیری آپ نے ایسا کیا ہے چنانچہ امام ابن قیمؒ فرماتے ہیں:

"**يدل على أن تلك كانت لعلة، لأن ذلك الجلسة للاستراحة، والصلوة غير موضوعة لتلك**" (۱)۔

اور یہی مذہب امام مالک واحمد کا بھی ہے کہ یہ حضرات جلسۂ استراحت نہیں کرتے تھے، اس کے علاوہ امام ترمذی نے "ترمذی شریف" میں حضرت ابو ہریرہؓ سے صحیح سند کے ساتھ حضور ﷺ کا ہمیشہ کا معمول "**كان النبي ﷺ ينهض على صدور قدميه**" نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ اس پر اکثر اہل علم کا عمل ہے، لہذا حنفیہ بھی یہی فرماتے ہیں کہ جلسۂ استراحت حضور ﷺ کا ہمیشہ کا معمول یا مقصود فی الصلوۃ نہیں تھا، بلکہ بوڑھاپے وغیرہ عارض کی وجہ سے اتفاقی تھا اور

۱- رواہ الترمذی فی جامعہ ابواب الصلوۃ، باب کیف النہوض من السجود ۱/۸ سعدیہ۔

اگر کوئی آج بھی کسی علت یا ضعف کی وجہ سے کرے تو مکروہ نہ ہوگا، باقی عادۃ افضل یہی رہے گا کہ بلا عذر جلسۂ استراحت نہ کیا جائے امید کہ اتنی گفتگو سے آپ کی تسلی ہوجائے گی، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۵/۹/ ۱۴۰۳ھ

۱-صلوٰۃ باجماعت کے بعد ہاتھ اٹھا کر اجتماعی دعاء کا حکم:

صلوٰۃ مکتوبہ کے بعد ہاتھ اٹھا کر دعاء مانگنے کی شرعی حیثیت کیا ہے، بعض لوگ اس کو بدعت کہتے ہیں، کیا اس کو بدعت کہنا صحیح ہے؟ دلائل واضحہ کی روشنی میں حل فرمادیجئے؟

۲-سورہ یٰسین ختم کرنے کا معمول بنانا:

اگر کسی دینی ادارہ میں علم وعمل اور امور مدرسہ کی ترقی کے پیش نظر اوقات مدرسہ کے علاوہ سورہ یٰسین شریف ختم کرانے کا معمول رہے تو کیا یہ عمل بدعت میں شامل ہوگا یا کار حسنہ میں، واضح فرمادیجئے؟

الجواب وبالله التوفيق:

۱-"عن أنس رضي الله عنه أن النبي ﷺ قال: ما من عبد يبسط كفيه في دبر كل صلوٰة يقول: اللهم إلهي وإله إبراهيم وإسحق ويعقوب وإله جبرئيل وميكائيل وإسرافيل أسئلك أن تستجيب دعوتي فإني مضطر وتعصمني في ديني، فإني مبتلي وتنالني برحمتك، فإني مذنب وتنفي عن الفقر، فإني متمسكين إلا كان حقا على الله أن لا يرد يديه خائبتين (عمل اليوم والليلة)" (۱)،

روایت مذکورہ سے معلوم ہوا کہ فرض نماز کے بعد ہاتھ اٹھا کر دعاء مانگنا مشروع ومسنون ہے، بدعت کہنا صحیح نہیں ہے۔

۲-سورۂ یٰسین شریف قلب قرآن ہے، **"عن أنس قال: قال رسول الله ﷺ: إن لكل شئ قلبا وقلب القرآن يسن"** (۲) اس کا پڑھنا بطور معمول اور وظیفہ حصولِ مقصد کے لئے معین ہے، لہٰذا یہ عمل بدعت نہیں، بلکہ بہتر

۱- عمل الیوم واللیلۃ لابن السنی مکتبہ دارالبیان/ ۴۷، حدیث نمبر ۱۳۸، عن أنس بن مالك عن النبي ﷺ أنه قال: مامن عبد......الخ (مرتب)۔

۲- مشکوٰۃ المصابیح مع شرح الطیبی ۴/ ۲۵۴، کتاب فضائل القرآن، رواہ الترمذی، والدارمی حدیث نمبر (۲۱۴۷) (مرتب)۔

ہے۔فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۴۱۱/۱/۲ھ

بعد نماز فرض جہری دعا:

یہاں مختلف قسم کی غیر مشروع رسموں میں سے چند چیزیں ایسی ہیں جن کی میں نے لوگوں کو یہاں نہ صرف پابندی کے ساتھ پیروی کرتے دیکھا ہے، بلکہ دوسروں کو بھی اس کی تلقین کرتے ہیں اور مختلف قسم کے جواز اس کے عذر میں پیش کرتے ہیں جو خود ہی قابل مذمت ہیں، مگر یہاں چونکہ صاحب علم لوگ یا تو نہیں یا ہیں تو پھر لائق اعتماد نہیں (مختلف وجوہات کی بنا پر علم اور عمل میں ایک دوسرے کے متضاد اور سنت رسولؐ سے بیزاری کا عملاً اظہار) انہیں وجوہات کی بنا پر میں آج آپ سے رجوع ہو رہا ہوں اور امید ہے کہ آپ ان سوالوں کا جواب قرآن حدیث رسول وفقہ وغیرہ کی معتبر روایتوں سے بیان فرمائیں گے اللہ تعالیٰ آپ کو اس کا اجر عظیم عطا فرمائے (آمین)۔

سوال:۔ یہاں ہر فرض نماز اور نماز جمعہ کے فوراً بعد اور سنتوں سے قبل امام اور مقتدی بہت ہی بلند آواز کے ساتھ ذکر میں مجموعی طور پر مشغول ہو جاتے ہیں جس کی وجہ سے جو حضرات سنتوں کے لئے کھڑے ہو جاتے ہیں ان کی نمازوں میں بہت خلل پیدا ہو جاتا ہے۔ان کا کہنا ہے کہ فرض نمازوں کے بعد آیۃ الکرسی سبحان اللہ الحمد للہ اور اللہ اکبر پڑھنے کی بہت فضیلت آئی ہے۔مجھے اس سے ذرہ برابر بھی انکار نہیں، لیکن میں نے جہاں تک سمجھا ہے وہ یہ ہے کہ ان فرض نمازوں میں جن کے بعد سنتیں نہ ہوں ان اذکار میں مشغول ہوں اور سنتیں پڑھ کر غالباً میں نے درمختار میں نماز کے بیان میں یہ اشارہ پڑھا تھا اور جہاں تک بلند آواز اور لاؤڈ اسپیکر پر مجموعی طور پر ان کا اذکار کا پڑھنا کسی بھی صورت سے صحیح نہیں معلوم ہوتا۔

(۲) نماز عید سے قبل عیدگاہ (اگرچہ یہاں کوئی مستقل عیدگاہ نہیں ہے کسی بڑے ہال میں انتظام کیا جاتا ہے) میں لاؤڈ اسپیکر پر مجموعی طور پر تکبیرات پڑھی جاتی ہیں دونوں عیدوں کے موقع پر براہ کرم اس کے متعلق حدیث وفقہ سے مع اختلاف مذاہب حنفی، شافعی وغیرہ مطلع فرمائیے۔

الجواب وباللہ التوفیق:

(۱) آپ کا خیال صحیح ہے ان فرض نمازوں کے بعد جن کے بعد سنتیں نہیں ہیں سبحان اللہ، الحمد للہ واللہ اکبر کا پڑھنا

ثابت ہے اور وہ بھی جہراً نہیں، بلکہ سراً۔ ہر فرض نماز کے اور نماز جمعہ کے بعد جہراً اس کا التزام بدعت اور "من أحدث في أمرنا هذا ما ليس منه فهو رد أو كماقال" (۱) میں داخل ہے اور حسن تدبیر سے اس کی اصلاح ضروری ہے۔

(۲) مذکورہ فی السوال طریقہ سے جہراً نماز عیدین سے قبل تکبیرات پڑھنا ثابت نہیں اس کا بھی حکم وہی ہے جو نمبرا کا ہے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۴۰۳ھ

بعد نماز اجتماعی طور پر ہاتھ اٹھا کر دعا کرنا:

ملک بنگال کے مفتی فیض اللہ نے فتویٰ مناجات بعد صلوٰۃ نام کی ایک کتاب چھپوائی ہے از اول تا آخر انہوں نے بعد نماز مناجات میں ہاتھ اٹھانے کو بدعت سیئہ ثابت کیا ہے کہتے ہیں فرائض نماز کے بعد یا تنہا فرض یا نفل وتر ہو یا تراویح ختم نماز کے بعد امام دعا کے لئے ہاتھ اٹھاتا ہے اور مقتدی تبعاً للامام ہاتھ اٹھاتے ہیں اور آمین کہتے ہیں یہ بدعت سیئہ ہے کسی بھی حدیث سے مرفوع ہو یا موقوف حتی کہ حدیث ضعیف، بلکہ موضوع حدیث بھی اس بارے میں کہیں بھی نہیں ہے نہ نبی ﷺ نے ہاتھ اٹھایا، نہ صحابہ نے، نہ تابعین نے، نہ زمانہ سلف صالحین ائمہ مجتہدین میں اس کی کوئی مثال ملتی ہے، نہ فقہی کتابوں میں اس کا کوئی ثبوت ملتا ہے، ہاں ادعیہ ماثورہ مثلاً اللھم أنت اللہ وغیرہ کا پڑھنا ثابت ہے، مگر انفرادی حیثیت سے ہے، لہذا دعاء کے لئے ہاتھ اٹھانا غلو فی الدین اور شرعی حد سے تجاوز ہے، لہذا سب کو چاہئے کہ فرداً فرداً بغیر ہاتھ اٹھائے ہوئے ان دعاؤں کے پڑھنے پر اکتفاء کریں، ہاتھ اٹھانا عبث اصل ہے، بعض فقہاء نے بغیر کسی دلیل نقلی محض قیاس اور استنباط سے ایسی دعاء کو مستحب بتایا ہے، کوئی حدیث قولی یا فعلی اپنے استدلال پر نہیں دیا ہے، حدیث میں جو دبر الصلوۃ کا لفظ آیا ہے اس کا مطلب آخر الصلوٰۃ ہے، جیسے دبر اللیل کے معنی آخر اللیل کے آتے ہیں، صحابہ کرام نے نبی علیہ السلام کے جزو حالات نقل فرمائے ہیں مگر کسی صحابی سے ایک روایت بھی ایسی نہیں ملتی کہ نبی علیہ السلام نے بعد فرائض صلوٰۃ کبھی بھی ہاتھ اٹھایا ہو، لہذا مناجات

۱- بخاری ۱/ ۳۷۱، کتاب الصلح مطبع اصح المطابع، مسلم ۲/ ۷۷، کتب خانہ رحیمیہ۔ "حاصل الكلام في هذا المقام أنه قال في الخلاصة ولايكبر يوم الفطر اه فافادأن الخلاف في اصل التكبير لا في صفة وأن الإتفاق على عدم الجهربه، ورده في فتح القدير، بأنه ليس بشيئ إذلا يمنع من ذكر الله في وقت من الأوقات، بل من إيقاعه على وجه البدعة وهو الجهر لمخالفة قوله تعالىٰ واذكر ربك في نفسک فيقتصر على مورد الشرع وهو الأضحى لقوله تعالىٰ واذكروالله في أيام معدودات" (شامی ۱/ ۷۷۷، مطبوعہ عثمانیہ) (مرتب)۔

مروجہ قرون متاخرہ کا تعامل تو ہوسکتا ہے، مگر قرون ثلثہ کا تعامل ہرگز نہیں ہوسکتا، لہذا اس دور کے علماء اگر دعا میں ہاتھ اٹھاتے ہیں تو یہ انکا اپنا ذاتی فعل ہے جو کہ سند نہیں ہے۔ تعامل سلف حجت تعامل خلف حجت نہیں ہے۔

نور الایضاح اور مراقی الفلاح میں جو اس کو مسنون کہا ہے اس کی نہ کوئی سند ہے نہ دلیل نہ کسی مجتہد سے منقول محض ایک رائے ہے جو قابل عمل سند نہیں ہے امام تیمیہ اس بارے میں فرماتے ہیں: "**دعاء الامام والمامومين جميعا عقيب الصلوة فهو بدعة لم يكن على عهد النبي** ﷺ" (۱)، نیز مولانا خلیل احمد صاحب بذل المجہود (ص ۱۴۸) میں کہتے ہیں:

"**وأما ما يفعله بعض الإمام من رفع اليدين في الدعاء عند دعاء جماعة من أئمة الشافعية والحنفية بعد الصلاة فلا وجه له**"، نیز مولانا انور شاہ کشمیری (فیض الباری ۲/۱۶۷) میں لکھتے ہیں: "**واعلم أن الأدعية بهذه الهيئة الكذائية لم يثبت عن النبي** ﷺ **ولم يثبت عنه رفع الأيدي دبر الصلاة في الدعوات**" (۲)، نیز مولانا محمد یوسف بنوری نے جامع ترمذی کی شرح (جامع السنن ۳/۴۰۹) میں فرماتے ہیں:

شہروں میں یہ بات رائج ہے کہ فرض نمازوں کے بعد ہاتھ اٹھا کر اجتماعی طور سے دعاء مانگتے ہیں حالانکہ آنحضرت ﷺ کے زمانے میں کبھی کبھار کے لئے بھی ایسی دعا کا ثبوت نہیں ہے چہ جائیکہ ہمیشہ ایسا کرلیا، ہاں البتہ فرائض کے بعد تواتر کے ساتھ بہت سی دعائیں ثابت ہیں مگر وہاں نہ ہاتھ اٹھانا ہے نہ ہیئت اجتماعیہ لاہور کے مشہور عالم علامہ ابوالقاسم رفیق دلوری اپنی کتاب عماد الدین ص ۲۹۷ پر لکھتے ہیں الغرض فرض نماز کے سلام کے بعد امام اور اس کے مقتدیوں کا مل کر دعا مانگنا بدعت سیئہ ہے، مولانا عبدالحی فرنگی اپنے مجموعہ فتاوی (۱/۱۶) (۳) پر لکھتے ہیں یہ طریقہ جو فی زماننا مروج ہے کہ بعد سلام رفع یدین کے ساتھ دعا مانگنا اور مقتدی آمین کہتے ہیں یہ نبی علیہ السلام کے زمانہ میں نہ تھا یہ سب دلیل اور علماء

۱- فتاوی ابن تیمیہ ۱/۱۸۴۔

۲- "**إلا أقل قليل ومع ذلك ورد فيه ترغيبات قولية والأمر في مثله أن لا يحكم عليه بالبدعة فهذه الأدعية في زماننا ليست بسنة بمعنى ثبوتها عن النبي** ﷺ **وليست ببدعة بمعنى عدم أصلها في الدين**" (فیض الباری علی صحیح البخاری ۲/۱۶۷)۔ یہ فیض الباری کی پوری عبارت ہے، جس کے ذکر سے مولانا فیض اللہ صاحب کا یہ ایہام کہ مولانا انور شاہ کشمیریؒ بھی اس کی بدعت کے قائل ہیں دور ہوجاتا ہے، چنانچہ فیض الباری میں آگے مذکور ہے: **فإن التزم أحد منا الدعاء بعد الصلاة برفع اليد فقد عمل بما رغب فيه** (ﷺ) **وإن لم يكثره بنفسه فاعلم ذلك.** اھ (فیض الباری علی صحیح البخاری ۲/۱۶۷)۔

۳- (۱/۲۳۸) بہ سلسلہ تحقیق محمل حدیث ثوبانؓ: ولا یؤم قوما فیخص نفسہ بدعوة دونہم... الحدیث (سنن ترمذی حدیث: ۳۵۷)۔

امت کے اقوال کو نقل کر کے مولانا فیض اللہ نے ملک میں انتشار کی صورت پیدا کر دی ہے امت مسلمہ گروہ در گروہ ہو گئے اختلاف کی خلیج وسیع سے وسیع تر ہوتی جارہی ہے، لہذا سوال یہ کہ اکابر امت عامۃ المسلمین نیز علماء حرمین شریفین اجتماعی حیثیت سے بعد فرائض نماز ہاتھ اٹھا کر دعا کرتے ہیں اور عام طریقہ سے مساجد کے ائمہ بھی کر رہے ہیں گویا اجماع امت کی سی کیفیت اور حالت پائی جاتی ہے تو نا درست مکروہ اور بدعت سیئہ ہے؟ جیسا کہ مولانا فیض اللہ کا قول ہے یا درست ہے جیسا کہ علماء امت کا عمل ہے، مولانا تھانوی نے اس خاص مسئلہ پر ایک رسالہ استحباب الدعوات کی تالیف فرمائی ہے امید کہ بغور سوال ملاحظہ فرما کر تفصیل سے آگاہ فرمائیں گے، تا کہ رفع شر ہو سکے، نیز ہم لوگ "**اتبعوا السواد الأعظم**" اور "**لا تجتمع أمتي على الضلالة**" (۱) اور تعامل حرمین شریفین، نیز اجماع امت ہونے کی وجہ سے ہم سب عمل کرتے رہیں یا مولانا موصوف کے مطابق دعاء میں ہاتھ اٹھانے کو ترک کر دیں؟

الجواب وبالله التوفيق:

بعد نماز مناجات میں ہاتھ اٹھانے کو بدعت کہنا یا یہ کہنا کہ کسی حدیث سے ہاتھ اٹھانا ثابت نہیں غلط ہے، صحیح نہیں ہے، اس لئے کہ ابن ماجہ کے استاذ ابن السنی نے جو بہت بڑے محدث ہیں انھوں نے اپنی کتاب "عمل الیوم واللیلہ" (ص ۷ ۳ ۴ تا ۱ ۴) مختلف حدیثیں روایت کی ہیں، مثلاً ایک حدیث یہ ہے جو حضرت انس سے مروی ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ نہیں ہے کوئی بندہ کہ جس نے ہر نماز کے بعد اپنے دونوں ہاتھ خدا کے سامنے پھیلا کر یہ کہا: "**اللهم إلهي وإله ابراهيم واسحق ويعقوب وإله جبرائيل وميكائيل واسرافيل عليهم السلام أسئلك أن تستجيب دعوتي، فاني مضطر وتعصمنى في ديني، فإني مبتلى وتنالني برحمتك، فاني مذنب وتنفى عن الفقر، فاني متمسكن**" (جو شخص ہاتھ اٹھا کر ہر نماز کے بعد یہ دعا پڑھے لے تو حضور ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اپنے اوپر ضروری فرما لیتے ہیں کہ اس کے دونوں ہاتھوں کو خائب وخاسر و نامراد واپس نہ کریں (۲)، پس جب روایت سے یہ بات ثابت ہو گئی تو اب یہ

۱- رواہ الترمذی، ابن ماجہ، مشکوۃ مع شرح الطیبی ۸/۱ ۳۳، کتاب الإیمان حدیث نمبر ۱۷۳ ام ۴ ۱۷ (مرتب)۔

۲- عمل الیوم واللیلہ لابن السنی مکتبۃ دار البیان ۲/ ۷ حدیث ۸ ۱۳، ابتدائے حدیث اس طرح ہے: "عن أنس بن مالك عن النبي ﷺ أنه قال: ما من عبد بسط كفيه في دبر كل صلاة ثم يقول: اللهم .....فإني متمسكن إلا كان حقا على الله عزوجل أن لا يرد يديه خائبين"۔

کہنا کہ ثابت نہیں ہے یا یہ کہنا کہ بدعت ہے یا اس کے مقابلہ پر "بذل المجہود یا فیض الباری" وغیرہ سے کوئی عبارت نقل کرنا غیر مفید و بے محل ہوگا، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

بعد نماز دعا آہستہ یا بلند آواز سے مانگی جائے؟

جماعت کی فرض نماز کے بعد دعا مانگی جاتی ہے وہ دعا بآواز مانگنا چاہئے یا آہستہ مانگنا چاہئے کیونکہ قرآن کی آیت ہے۔

"ادعوا ربکم تضرعاً و خفیة الخ" (۱) (لوگو! اپنے پروردگار سے عاجزی اور چپکے چپکے دعا مانگا کرو) اس آیت کریمہ کی تحت دعا مانگی جائے یا آواز سے مانگی جائے؟

الجواب وبا اللہ التوفیق:

دوسری آیت کریمہ میں خفیہ دون الجہر بھی وارد ہے اور بعض آیت کا بیان ہوتی ہے اس لئے آیت کریمہ محولہ میں دعا محض سراہی کے اندر محصور نہ ہوگی بلکہ دعاء کی اصل بین الجہر والمخافتہ وارد ہوگی اور اختیار دونوں کا ہوگا جیسا کہ "درمختار علی ھامش الشامی" میں تصریح ہے: "الدعا یکون بین الجھر والمخافة کذا اعتمده الباجي في کنز العفاة"، باقی یہ بات الگ ہے کہ نفس دعا میں افضل کیا ہے اس میں تفصیل ہے اور اس کے بیان کی نہ یہاں ضرورت ہے نہ گنجائش ہے ہاں فرض یا جماعت کے بعد دعاء کا افضل طریقہ لکھ دیا جاتا ہے کہ امام کو افضل تو یہی ہے کہ آہستہ دعا مانگے اور مقتدی بھی آہستہ آہستہ آمین کہیں، "ادعوا ربکم تضرعا وخفیة" (۲)، لیکن اگر سامعین کو متوجہ رکھنے یا دعاء کے کسی بعض جزء کی اہمیت ظاہر کرنے کے لئے کچھ جہر کے ساتھ بھی کل دعا یا بعض دعا جہر سے مانگ لی جائے تو خلاف سنت اور قابل اعتراض بات نہ ہوگی۔ "إذا دعا بالدعاء المأثور جھراً ومعه القوم أیضا لیتعلموا الدعاء لابأس به" (۳)۔

۱- سورۂ اعراف: ۵۶۔

۲- سورۂ اعراف: ۵۵۔

۳- الفتاوی الہندیہ ۳۱۸/۵۔

(تنبیہ) اگر پوری تحقیق دیکھنی مطلوب ہو تو "رسالہ استحباب الدعوات عقیب الصلوٰت" اردو مطالعہ کریں، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱/۸/ ۸۵ ۱۳ھ
الجواب صحیح سید احمد علی سعید، محمود عفی عنہ

۱- قبول دعاء کا افضل طریقہ کیا ہے؟

اللہ تعالیٰ سے جو دعاء مانگی جائے تو حضور سیدنا و مولانا احمد مجتبیٰ محمد مصطفیٰ ﷺ کے طفیل سے مانگی جائے، کیونکہ ہم حنفی الاعتقاد لوگوں کا یہ یقین کامل ہے کہ بطفیل حضور ﷺ دعاء کی مقبولیت یا ایصال ثواب سے جو بلا طفیل حضور ﷺ دعاء مانگی جائے یا ایصال ثواب پہنچایا جائے فرق ہے جو طریقہ افضل و بہتر ہے اس کی ہدایت کی جائے۔

۲- سجدہ توبہ کا کیا طریقہ ہے؟

سربسجود ہو کر درگاہ خداوندی بے نیاز میں گناہوں سے توبہ کرنا اور معافی مانگنا اور دعاء مانگنا از روئے قرآن وحدیث کوئی نقص تو نہیں ہے، ان دونوں باتوں سے مطمئن فرمادیں۔

الجواب وباللہ التوفیق:

۱- جی ہاں صحیح ہے سرورعالم ﷺ کے وسیلہ اور طفیل سے دعاء زیادہ قبول ہوتی ہے اور دعاء کا یہی طریقہ افضل اور بہتر ہے (۱)۔

۲- جائز تو یہ بھی ہے، لیکن بہتر طریقہ یہ ہے کہ پہلے دو رکعت نفل بہ نیت صلوۃ توبہ نہایت حضور دل سے پڑھے، پھر بعد سلام بیٹھے بیٹھے عجز و نیاز کے ساتھ اپنے گناہوں کی معافی مانگے فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور
الجواب صحیح محمود عفی عنہ دارالعلوم دیوبند

۱- "ویحسن التوسل بالنبی الی ربه" (ردالمحتار ۹/۵۶۹، مکتبہ زکریا دیوبند) (مرتب)۔

۱-نماز با جماعت کے بعد اجتماعی فاتحہ پڑھنے کا حکم:

ساؤتھ افریقہ میں عام طریقہ رائج ہے کہ نماز با جماعت کی تکمیل کے بعد امام جماعت سے فاتحہ پڑھایا کرتا ہے، اس سوال پر فقہاء، چاروں اماموں اور علماء کا کیا فیصلہ ہے؟ کیا یہ ہونا چاہئے کہ فقہاء اس طرح با جماعت فاتحہ پڑھنے کی اجازت نہیں دیتے ہیں اور اگر جماعت کی اکثریت اس طرح کے پڑھنے کی خواہش رکھتی ہے تو کیا فقہی قانون پڑھنے کو روا رکھے گا، اکثریت کی رائے کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس طرح فاتحہ پڑھنے کو روا رکھے گا؟

۲-اسلام میں جو چیزیں ممنوع نہیں وہ جائز ہیں، کیا یہ اصول صحیح ہے؟

مسلمانوں کا ایک طبقہ اس اصول میں یقین رکھتا ہے کہ جو چیز بھی اسلام میں ممنوع نہیں ہے وہ جائز ہے، دوسرے طبقہ کا عقیدہ ہے کہ جو چیز بھی قرآن پاک اور سنت کے احکام سے ثابت نہیں ہے وہ بدعت ہے، یہ طبقہ یہ عقیدہ رکھتا ہے کہ ہم لوگوں کو عبادت کے صرف ان طریقوں اور ذریعوں پر بھروسہ کرنا چاہئے، جو کہ اللہ اور اس کے رسول (ﷺ) نے سکھائے ہیں، ہم کو ان کے اندر قطع و برید کی اجازت نہیں ہے اور نہ ہم ان میں کوئی اضافہ کر سکتے ہیں، کیونکہ ہم اللہ کی کتاب اور رسول اللہ ﷺ کی سنت کے علاوہ کوئی اور ذریعہ نہیں رکھتے، جس سے ہم اللہ کی معرفت حاصل کریں، اور اللہ سے تعلق حاصل کریں، اس معاملہ میں جو بھی تبدیلی کی جائے گی وہ بدعت ہے اور ہر ایک بدعت ضلالت ہوگی۔ اس طبقہ کا یہ بھی عقیدہ ہے کہ یہ بات بنیادی طور پر غلط ہے کہ جو بھی بات ممنوع نہیں ہے اس کو لے لیا جائے اور اللہ تعالیٰ سے تعلق قائم کرنے کے نئے طریقہ اختیار یا ایجاد کئے جائیں۔

۳-عبادت میں جہاں آپ ﷺ نے سکوت فرمایا اس کو دین سمجھنا کیسا ہے؟

کیا قرآن پاک ایسی شہادتوں سے بھرا پڑا ہے کہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے کچھ اہم معاملات میں سکوت فرمایا ہے، خصوصاً عبادات کے میدان میں؟

آخری عرض آنکہ اگر ہمیں اجازت حاصل ہو کہ وہاں ہم اپنے طور پر بڑھاتے جائیں جہاں ہمارے نبی ﷺ نے سکوت فرمایا ہے تو کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ ہم بڑھاتے ہی چلے جائیں یہاں تک ہم اس طرح پر اسلام کی روح کو برباد کر بیٹھیں، کیونکہ ہم بہر حال انسان ہی ہیں اور غلطی کر سکتے ہیں، اور یہ تمیز کرنے کی طاقت نہیں رکھتے کہ ہمارے لئے اچھا کیا ہے؟ اور گناہ آلود کیا ہے؟ کیونکہ رسول اکرم ﷺ کو وحی آتی تھی اور ہمیں نہیں آتی؟

الجواب وباللہ التوفیق:

۱-اگر جماعت فاتحہ سے فاتحہ مروجہ مراد ہے تو بدعت ہے اور اگر نفس اجتماعی دعاء ثانی مراد ہے تو اس میں مضا ئقہ نہیں، لیکن اس کو لازم وضروری قرار دینا، اس کا رواج دینا، اہتمام کرنا کہ جو شریک نہ ہو اس پر نکیر کرنا، طعن وتشنیع کرنا ناجائز ہے، اگر ایسا ہے تو یہ طریقہ والتزام واجب الترک ہوگا، اور بدعت شمار ہوگا۔

۲-دین میں اور بالخصوص عبادات میں یہ اصول کہ (جو چیز بھی اسلام میں ممنوع نہیں وہ جائز ہے) صحیح نہیں، یہ ایک مغالطہ ہے، صریح اور صحیح حدیث: "من أحدث في أمرنا ماليس منه فهو رد، وفي رواية، فهو مردود" (۱) کے تحت بدعت ہے اور خود یہ اصول بھی مستحدث ہے اور دوسرے طبقہ کا عقیدہ صحیح اور مطابق فرمان رسول ﷺ ہے۔

۳-ہاں قرآن پاک ایسی شہادتوں سے بھرا پڑا ہے، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہوسکتا کہ دین میں اور عبادات کے میدان میں محض اپنی سمجھ سے کوئی ایسی چیز بڑھادی جائے جس کے بارے میں ہمارے نبی ﷺ نے سکوت فرمایا ہو، یہ طریقہ دین میں زیادتی اور ناپسندیدۂ باری تعالیٰ ہوگا اور بارگاہ شریعت اور بارگاہ عزاسمہ میں خطرناک قسم کی گستاخی ہوگی، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۲/ ۱۲/ ۹۰ ۱۳ھ

حنفی مقتدی کا فجر کی دوسری رکعت میں دعا پڑھنا:

امام فجر کی فرض نماز کی دوسری رکعت میں بھی رکوع کے بعد کھڑے ہوکر دعا مانگتے ہیں حنفی مسلک کے مقتدی کو دعا مانگنا کیسا ہے؟

شفیع احمد الاعظمی

الجواب وباللہ التوفیق:

فجر کی نماز میں جب امام رکوع کے بعد (قومہ میں) کھڑے ہوکر دعا مانگیں تو حنفی مقتدی بھی ان کی اقتداء میں خموش

۱- مشکوۃ المصابیح/ ۲۷۔

کھڑے رہیں اور اگر جی پڑھنے کا بہت چاہتا ہے تو آہستہ آہستہ دل میں آمین کہتے رہیں باقی زبان سے کچھ نہ کہیں (۱)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

نماز کے بعد کی دعا کیا جزء نماز ہے؟

نماز کے بعد کی متصل دعا کیا نماز ہی کا ایک جز ہے اور امام کے ساتھ دعا مانگے بغیر نماز مکمل نہیں ہوتی ہے۔

بعض امام عصر اور صبح میں سلام پھیرنے کے بعد مصلی پر کافی دیر تک بیٹھے وظیفہ پڑھتے رہتے ہیں کبھی کبھی آدھ گھنٹے سے زیادہ بیٹھنے کے بعد دعا شروع کرتے ہیں ایسی حالت میں کچھ مقتدی تنگ آکر تنہا دعا مانگ کر چلے جاتے ہیں جسے امام موصوف قطعی ناجائز اور نماز کی خرابی کا باعث بتاتے ہیں آپ کے نزدیک کیسا ہے؟

الجواب وباللہ التوفیق

نماز فجر اور عصر کے بعد انصراف الی المصلین یا داہنے یا بائیں کر کے امام بیٹھ جائے اور سبحان اللہ اور الحمد للہ کی تسبیحات تینتیس ۳۳ تینتیس ۳۳ مرتبہ پڑھ کر زراطویل دعا مانگے ایسا کرنا سنت ہے، لیکن یہ سب امور نماز کا جز نہیں کہ ان کے چھوڑ دینے سے نماز ہی نہ ہو یا نفس نماز میں کوئی خلل واقع ہو جائے امام موصوف کا اس نماز کو قطعی ناجائز وغیرہ کہنا صحیح نہیں ہے (۲) اور امام کا اس مقدار مسنون مذکور سے اتنی تطویل کرنا کہ مقتدی اکتا جائیں مکروہ ہے، اس طریقہ کو ترک کرنا چاہئے (۳)۔

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

۱- ”ویأتي المأموم بقنوت الوتر ولو بشافعي یقنت بعد الرکوع، لأنه مجتهد فیه لا الفجر؛ لأنه منسوخ بل یقف ساکتاً علی الأظهر مرسلاً یدیه“ (الدر المختار مع رد المحتار ۲/۴۴۶) (مرتب)۔

۲- ”عن أبي سعید قال قال رسول اللہ ﷺ: مفتاح الصلاۃ الطهور وتحریمها التکبیر وتحلیلها التسلیم ولا صلاۃ لمن لم یقرأ بالحمد وسورۃ في فریضة أو غیرها“ (سنن الترمذی ۲/۳، کتاب الصلاۃ باب ما جاء فی تحریم الصلاۃ وتحلیلها حدیث: ۲۳۸) (مرتب)۔

۳- ”تنبیه لو زاد علی العدد: قیل یکره، لأنه سوء أدب“ (رد المحتار علی الدر المختار ۲/۲۴۷) (مرتب)۔

کن نمازوں میں گھوم کر دعا مانگنی ہے اور کن نمازوں میں نہیں:

۱۔ فجر اور عصر کی نماز کے بعد جو گھوم کر دعا مانگی جاتی ہے اس کی وضاحت فرماویں۔

۲۔ ظہر و مغرب اور عشاء و جمعہ کے بعد کیوں گھوم کر دعاء مانگی نہیں جاتی ہے اس کی بھی وضاحت کریں۔

۳۔ ظہر و مغرب اور عشاء اور جمعہ کی نماز کے بعد گھوم کر دعاء مانگنا جائز ہے یا کہ نہیں؟

۴۔ زید نے جمعہ کی نماز پڑھائی اور گھوم کر دعاء مانگی بکر نے اعتراض کیا کہ سوائے دو وقت کے اور وقت میں گھوم کر دعا نہیں مانگی جاتی ہے زید نے جواب دیا کہ ہر نماز کے بعد دعاء مانگی جاسکتی ہے ہمارے پاس ثبوت ہے کسی کتاب کا نام بتلایا مگر ہم کو کتاب کا نام یاد نہیں ہے اس کے بعد عمرو نے ایک فتوی کی شکل میں پیش کیا جس میں یہ اوپر سوال لکھا ہے کہ فقہ کی کتابوں میں بھی یہ ہے کہ جس نماز کے بعد سنت مؤکدہ ہوں نہ پھرے اور جواب شروع ہی میں یہ لکھا ہے کہ امام کا بعد سلام قبلہ سے انحراف تو قطعاً سنت نہیں ہے اور اس کا ترک یعنی بعد سلام بقبلہ رو بیٹھا رہنا امام کے لئے بالا جماع مکروہ ہے جمعہ وغیرہ سب نمازیں اس حکم میں برابر ہیں اور بعد سلام دعاء و مناجات بھی بالا جماع جائز ہے نیچے یہ بھی تحریر ہے کہ فقہ کی کتاب میں یہ نہیں کہ جس نماز کے بعد سنت ہے اس کے بعد امام کو قبلہ سے پھرنا ہی منع ہے، ہاں فصل طویل کو ناپسند فرماتے ہیں۔

الجواب وبالله التوفیق:

(۱) فجر اور عصر کی جماعت کے سلام کے بعد امام کا دائیں یا بائیں طرف سے مصلیوں کی طرف گھوم جانا اور پھر کچھ دیر تسبیحات وغیرہ پڑھکر دعاء مانگنا سنت ہے (۲ و ۳ و ۴) فجر و عصر کے علاوہ اور نمازوں میں حضور علیہ السلام سے ثابت نہیں بلکہ سلام کے بعد فوراً قبلہ رخ ہی بیٹھے بیٹھے ہلکی دعاء مانگ کر سنتوں میں مشغول ہو جانا حضور علیہ السلام کا اکثر معمول شریف تھا(۱)۔

اور یہی ان نمازوں میں سنت ہے اس کے خلاف سنت نبوی کا خلاف ہوگا، ہاں چونکہ سنت مؤکدہ نہیں ہے، اس لئے اگر کبھی اتفاق سے کوئی گھوم جائے تو ناجائز کا مرتکب نہیں کہا جائے گا، مگر اس کی عادت نہیں ڈالنا چاہئے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۰/۹/۸۵ ۱۳ھ

الجواب صحیح محمود عفی عنہ

۱- دیکھئے: ردالمحتار ۲/۲۴۷، باب صفۃ الصلاۃ مکتبہ زکریا۔

چشمہ لگا کر نماز ادا کی جاسکتی ہے یا نہیں؟

چشمہ لگا کر نماز ادا کرنا درست ہے یا نہیں؟ جب کہ بہت سے لوگوں اور علماء کرام تک کو چشمہ لگائے ہوئے نماز ادا کرتے دیکھا ہے۔

الجواب وباللہ التوفیق:

درست ہے، بشرطیکہ سجدہ وغیرہ کرتے وقت ڈھیلا ہونے سے نہ الجھے، ورنہ اتار دینا چاہئے (۱)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور
الجواب صحیح حبیب الرحمن خیرآبادی مفتی دارالعلوم دیوبند

نمازی کے آگے سے ہٹنے کا حکم؟

اگر میں کسی نمازی کے بالکل آگے بیٹھا ہوا ہوں اور وہ نمازی نماز میں مشغول ہے، تو اگر میں اپنی جگہ سے ہٹ کر کسی اور جگہ جانا چاہوں تو کیا ہٹ سکتا ہوں؟ کیا بیٹھے رہنا اور نمازی کے نماز ختم کرنے کا انتظار کرنا اولی ہے؟

الجواب وباللہ التوفیق:

ہاں بیٹھے رہنا اور ختم نماز کا انتظار کرنا اولی ہے، اور ہٹ جانا بھی درست ہے، البتہ اگر نمازی دائیں جانب کچھ ہٹا ہوا ہے تو اس کے بائیں جانب سے ہٹے اور اگر بائیں جانب کچھ ہٹا ہوا ہے تو اس کے دائیں جانب سے ہٹے اور اگر بالکل ہی محاذات میں ہو تو ہر طرف سے ہٹ سکتے ہیں، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

۱- فی نفسہ عینک لگانا جائز ہے، لیکن فعل عبث ہونے کی بنا پر نماز میں مکروہ ہے، البتہ جو لوگ بینائی کے کمزور ہونے یا کسی عارض کی بنا پر عینک (نمبری) لگانے کے عادی ہیں، ایسے لوگوں کے حق میں نہ یہ فعل عبث ہوگا اور نہ مکروہ ہوگا، اس لیے کہ ایسے عادی لوگوں کو بغیر عینک سکون واطمینان حاصل نہیں ہوتا، اور فقہ کا یہ ضابطہ بھی مسلم ہے: "الضرورات تبیح المحضورات" (الاشباہ والنظائر/۱۰۸) (مرتب)۔

۱-نمازی کے آگے سے گذرنے کی حد:

نمازی کے آگے کتنا فاصلہ رکھ کر گذرا جاسکتا ہے؟

۲-پلنگ پر نماز ادا کرنا:

۲-پلنگ پر فریضۂ نماز کی ادائیگی نہ ہونے کی وجہ کیا ہے؟ اگر کوئی ایسا فولڈنگ پلنگ ہو جس پر پلاسٹک یا سوت کی نواڑ ہے تو کیا اس پر فریضہ کی ادائیگی ہوسکتی ہے؟

الجواب وبالله التوفيق:

۱-میدان میں اور بڑی مسجد میں جو تقریباً ۶۰ ہاتھ چوڑی اور ۶۰ ہاتھ لمبی ہو تو تین صف کے بعد سے مصلی کے آگے سے گذر سکتے ہیں، ورنہ آگے سے نہ گذرنا چاہئے، "**ومرورمارفي الصحراء أوفي مسجد كبير بموضع سجوده في الأصح**"(۱)، "**وحجه في النهاية والفتح أنه قدر مايقع بصره على المار لوصلي بخشوع أي راميا ببصره إلى موضع سجوده......(قوله في مسجد صغير)هو أقل من مستين ذراعا وقيل أربعين وهو المختار**"(۲)۔

۲-پلنگ اتنا ڈھیلا نہ ہو کہ رکوع سجدہ وغیرہ انتقالات صلوتیہ میں پریشانی ہو تو اس پر نماز پڑھ سکتے ہیں، بشرطیکہ چارپائی پاک ہو یا اس پر پاک کپڑا ہو۔

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

دوسرے کی زمین پر بنائی گئی مسجد میں نماز:

ایک مسجد باہمی جھگڑے اور خاص طور پر امام کے ساتھ ذاتی اختلافات کی بنا پر بنائی گئی جب کہ پہلے سے یہاں مسجد موجود تھی اور سارے گاؤں کے لوگ اس میں نماز پڑھتے چلے آرہے تھے۔ جہاں دوسری مسجد بنائی گئی ہے وہ آدھی زمین

۱- الدرالمختار۔

۲- ردالمحتار ۱/۴۲۶۔

ایک دوسرے شخص کی ہے جو مسجد بنانے کے صرف اس لئے حق میں نہیں تھا کہ یہ تفریق بین المؤمنین کا سبب بنے گی مگر بنانے والوں نے کوئی پرواہ نہیں کی اور یہ کہا کہ ہمیں مسئلہ کی کوئی ضرورت نہیں ہے ہم مسجد بنا کر چھوڑیں گے چنانچہ مسجد بن گئی اور جسکی زمین دبائی گئی تھی وہ اب بھی ناراض ہی ہے، ایسی صورت میں اس نوتعمیر مسجد میں نماز پڑھنا کیسا ہے، جبکہ اس کے بننے سے گروہ بندی ہوئی ہے اگر کبھی پورا گاؤں آپس میں میل جول کر لے باہمی جھگڑے ختم ہو جائیں تب اس مسجد میں نماز پڑھنا درست ہوگا یا نہیں یا پھر بھی زمین والے کی رضامندی ضروری ہوگی، براہ کرم اس مسئلے کا شافی جواب مرحمت فرمائیں، عنداللہ ماجور ہوں گے۔

عبدالسلام (تندیرا، راجستھان)

الجواب وباللہ التوفیق:

مسجد جھگڑے اور ذاتی اختلاف کی بنا پر بنانا ناجائز فعل ہوگا اور سخت گناہ کا کام ہوگا، اسی طرح دوسرے کی زمین پر اس کی اجازت ومرضی سے بنالینا بھی ناجائز اور حرام فعل کا ارتکاب ہوگا۔

البتہ جب مسجد بن گئی اور اپنے اور غیروں نے سب نے اس کو مسجد سمجھ لیا اور مسجد کہہ دیا تو اس میں شعائر اللہ ہونے کی شان پیدا ہوگئی اس کو اب گرانا اور مسمار و منہدم کرنا جائز نہ ہوگا، بلکہ اب ضروری ہے کہ جھگڑا ختم کر کے، دونوں مسجدوں کو آباد کرنے کی کوشش کی جائے (۱)، اور جس کی زمین پر بغیر اس کی اجازت ومرضی کے مسجد بنالیا ہے اس سے اجازت حاصل کیا جائے اور اجازت چاہے مفت دے یا قیمت لے کر دے جس طرح دے اجازت لے لینا ضروری ہے اور اس شخص پر بھی ضروری ہے کہ اجازت دیدے، خواہ معاوضہ لے کر ہو یا بلا معاوضہ لئے ہو (۲)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۴۰۲/۹/۴ھ

۱- "وفی شرح المنیة للحلبی: بنی مسجدا فی أرض غصب لا بأس بالصلاة فیه" (ردالمحتار علی الدرالمختار ۲/۴۴)۔

۲- "ولو ضاق المسجد علی الناس وبجنبه أرض لرجل تؤخذ أرضه بالقیمة کرها، کذا فی فتاوی قاضی خان" (فتاوی عالمگیریہ ۲/۴۵۶)۔

۱-نماز فجر پڑھنے کے بعد وقت کے ختم ہوجانے کا علم ہو تو کیا کیا جائے؟

صبح کی جماعت کے بعد علم ہوا کہ نماز کا وقت نہیں تھا، اب آیا نماز کا اعادہ کیا جاوے یا اسی نماز پر اکتفاء کرلیا جائے۔

۲-نماز فجر پڑھنے کے دوران سورج کا طلوع ہوجانا:

ابر یا وقت کی لاعلمی سے صبح کی نماز پڑھنے کے دوران سورج طلوع ہوگیا ہے، ایسی حالت میں کیا کیا جائے۔

۳-نماز عصر کے بعد قضا یا نفل نماز پڑھنا:

عصر کی نماز کے بعد مغرب سے پہلے قضاء نماز یا نفل نماز ادا کرسکتے ہیں یا کہ نہیں۔ بہشتی زیور میں عصر کے بعد قضاء نماز پڑھنے کی اجازت ہے۔

۴-فوت شدہ نماز کی ادائیگی سے قبل وقتیہ نماز پڑھنا:

زید پانچوں وقت نماز پڑھتا ہے ایک روز کسی وجہ سے اس کی دو وقت کی نماز قضا ہوگئی، مثلاً ظہر کی یا عصر کی اب وہ ان دو قضاء نماز کو ادا کرنے سے پہلے مغرب پڑھ سکتا ہے، جب کہ اس کے سامنے مغرب کی جماعت کھڑی ہو رہی ہے یا اس کو پہلے قضاء نماز ادا کرنی ہوگی۔

۵-جماعت ہوجانے کے بعد آنے والے افراد کس طرح نماز پڑھیں:

مسجد میں عشاء کی نماز ہوچکی ہے جماعت کے بعد سات آدمی ایک گھنٹہ بعد جمع ہوتے ہیں اب یہ چند افراد الگ الگ نماز پڑھیں، یا جماعت بنا کر بہتر کیا ہوگا۔

الجواب وباللہ التوفیق:

(۱) اس صورت میں اعادہ نماز کا واجب ہے، کیونکہ وہ نماز نہیں ہوئی ہے (۱)۔

۱- "عن عقبة بن عامر الجهني قال: ثلاث ساعات كان رسول اللهﷺ ينهانا أن نصلي فيهن أو نقبر فيهن موتانا، حين تطلع الشمس بازغة حتى ترتفع وحين يقوم قائم الظهيرة حتى تميل وحين تضيف الشمس للغروب حتى تغرب" (سنن الترمذی ۳/۳۴۰ کتاب الجنائز، باب ماجاء فی کراہیۃ الصلوۃ علی الجنائز عند طلوع الشمس حدیث: ۱۰۳۰)، "فإن كانت الصلاة فرضاً أو واجبة فهي غير صحيحة" (البحر الرائق ۱/۴۳۳)۔

(۲) اعادہ ضروری ہے (۱)۔

(۳) بہشتی زیور میں صحیح لکھا ہے قضاء نماز پڑھ سکتے ہیں نفل نہیں پڑھ سکتے ہیں (۲)۔

(۴) اگر وہ صاحب ترتیب ہے تو پہلے اس کو قضاء نمازیں پڑھنی ضروری ہے (۳)، اگر صاحب ترتیب نہیں ہے تو مغرب کی نماز میں شریک ہوجائے، پھر قضاء نمازیں پڑھے (۴)۔

(۵) مسجد میں جماعت ثانیہ کی اجازت نہیں (بشرطیکہ وہ مسجد شارع نہ ہو) ایسی صورت میں مسجد سے متصل سہ دری یا کوئی جگہ ہو تو وہاں جماعت کرلیں، ورنہ تنہا تنہا پڑھیں (۵)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

فجر کی جماعت کھڑی ہوجانے کے بعد سنت پڑھنا:

صبح کی نماز فرض کی جماعت شروع ہوگئی اس کے بعد پیچھے ہوئے نمازی وضو سے فارغ ہوکر دو رکعت سنتیں ضرور پڑھتے ہیں چاہے ان کو پچھلی رکعت ملے نہ ملے قعدہ آخرہ بھی ملنا کافی سمجھتے ہیں اس بارے میں شریعت کا کیا حکم ہے ایک عالم کہتا ہے کہ جماعت کی نماز کی تکبیر شروع ہونے کے بعد سنتوں کو پڑھنا ناجائز ہے وقت نہیں رہتا ہے جماعت میں شامل ہونا ضروری ہے۔

۱- ''لأن وقت الفجر كله كامل فوجبت كاملة فيبطل بطرو الطلوع الذي هو وقت فساد'' (رد المحتار علی الدر المختار ۲/ ۳۳)۔

۲- ''واعلم أن الأوقات المكروهة نوعان: الأول الشروق والاستواء والغروب، والثاني: ما بين الفجر والشمس، وما بين صلاة العصر إلى الاصفرار .... والنوع الثاني ينعقد فيه جميع الصلوات التي ذكرناها من غير كراهة'' (رد المحتار علی الدر المختار ۲/ ۳۴)۔

۳- ''الترتيب بين الفائتة والوقتية وبين الفوائت مستحق، كذا في الكافي، حتى لا يجوز أداء الوقتية قبل قضاء الفائتة كذا في محيط السرخسي'' (فتاوی عالمگیریہ ۱/ ۱۲۱)۔

۴- ''ويسقط الترتيب عند كثرة الفوائت، وهو الصحيح هكذا في محيط السرخسي، وحد الكثرة أن تصير الفوائت ستاً بخروج وقت الصلاة السادسة'' (فتاوی عالمگیریہ ۱/ ۱۲۳، نیز رد المحتار ۲/ ۵۲۶)۔

۵- ''ويكره تكرار الجماعة بأذان وإقامة في مسجد محلة، لا في مسجد طريق أو مسجد لا إمام له ولا مؤذن'' (الدر المختار مع رد المحتار ۲/ ۲۸۸)، ''عن أبي يوسف أنه إذا لم تكن الجماعة على الهيئة الأولى لا تكره وإلا تكره، وهو الصحيح، وبالعدول عن المحراب تختلف الهيئة، كذا في البزازية'' (رد المحتار ۲/ ۲۸۹) (مرتب)۔

الجواب وباللہ التوفیق:

مفتی بہ قول یہی ہے کہ جب تک نماز فجر کے تشہد ملنے کا ظن غالب ہو سنتیں پڑھ کر شریک جماعت ہو البتہ جس جگہ جماعت ہو رہی ہے وہاں نہ پڑھے بلکہ کہیں کنارے پیچھے الگ ہٹ کر پڑھ لے مثلاً کوئی سہ دری ہو یا حوض کے پیچھے یا باب مسجد کے کسی گوشہ میں یا باہر مسجد سے کوئی جگہ ہو وہاں پڑھ کر شریک جماعت ہو(۱) فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۲/ ۷/ ۸۵ ۱۳ھ

الجواب صحیح محمود غفی عنہ مفتی دارالعلوم دیوبند

۱-دستیاب شدہ کپڑے میں نماز:

دستیاب شدہ کپڑے میں نماز ہو سکتی ہے یا نہیں؟

۲-چوری والے کپڑے میں نماز:

چوری کئے ہوئے لباس میں نماز پڑھنا جائز ہے یا نہیں۔

۳-عشاء کی فرض نماز تنہا پڑھنے والے کے لئے وتر با جماعت پڑھنا:

جس شخص نے عشاء فرض جماعت کے ساتھ ادا نہیں کی اب وہ وتر با جماعت پڑھ سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب وباللہ التوفیق:

۱-دستیاب شدہ کپڑے سے کیا مراد ہے، اگر مراد جائز طریقہ سے ہوتا ہے تو جائز ہے، ورنہ جیسا ویسا حکم مال (۲)۔

۲-نا جائز ہے اور اگر پڑھ لی جائے گی تو بکراہت ادا ہوگی (۳)۔

۱- "وإذا خاف فوت ركعتي الفجر لاشتغاله بسنتها تركها لكون الجماعة أكمل، وإلا بأن رجا إدراك ركعة في ظاهر المذهب وقيل: التشهد... لا يتركها بل يصليها عند باب المسجد إن وجد مكانا وإلا تركها" (الدرالمختار مع ردالمحتار ۲/ ۵۱۰)۔

۲- "المتيمم في السفر اذا وجد من الماء قدر مايكفي بغسل اعضاء الفريضة مرة مرة ولوغسل على وجه السنة لايكفيه انتقض تيممه هو المختار كذا في الخلاصة" (ہندیہ ۱/ ۳۰، باب التیمم، مکتبۃ دارالکتاب) (مرتب)۔

۳- لوتركها الكل هل يصلون الوتر بجماعة فليراجع کے ذیل میں طحطاوی میں یوں ہے: قضيته التعليل في المسئلة السابقة

۳-اپنے فرض پڑھ لینے کے بعد مقتدی بھی شریک ہوسکتا ہے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۴۰۴/۱۲/۶ھ

نماز سے فارغ ہوکر مصافحہ کرنا کیسا ہے؟

عام طور پر یہ دیکھا جارہا ہے کہ لوگ نمازوں سے فارغ ہوکر خصوصاً صلوٰۃ عیدین سے مسجد میں امام صاحب سے اور خود مقتدیان آپس میں مصافحہ کرتے ہیں یہ کس حد تک درست ہے؟

محمد مظہر پاشا (حیدرآباد دکن)

الجواب وبالله التوفيق:

مطلقاً نماز کے بعد بالالتزام مصافحہ یا معانقہ کرنا شرعاً درست نہیں ہے (۱)، اس لئے حتی الامکان اس عمل سے بچنا ضروری ہے، لیکن ابتدائی ملاقات کسی نماز کے بعد فوراً ہو رہی ہو تو اس صورت میں گنجائش ہے کہ مصافحہ یا معانقہ کیا جاسکتا ہے۔ ''کما قال علیه السلام: ما من مسلمین یلتقیان فتصافحا إلا غفر لهما قبل أن یتفرقا'' (۲)، واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

نماز میں سورہ فاتحہ دوبار پڑھنے سے سجدہ سہو:

بھول کر نماز کی پہلی دو رکعتوں میں سورۂ فاتحہ کوئی شخص دو بار پڑھ دے یا تشابہ لگنے کی وجہ سے سورۃ فاتحہ کی دو تین

بقولهم لانها تبع ان یصلي الوتر بجماعة في هذه الصورة لانه لیس تبع للتراویح ولا العشاء عند الامام انتهی حلبي (الطحطاوی علی الدر ۱/ ۲۹۷، المکتبہ العربیہ کانسی روڈ کوئٹہ) (مرتب)۔

۱- ''ونقل في تبیین المحارم عن الملتقط: أنه تكره المصافحة بعد أداء الصلوٰة ولأنها من سنن الروافض'' (شامی ۱/ ۳۳۶، مرتب)۔

۲- (ابوداؤد نے ان الفاظ میں اس حدیث کو روایت کی ہے: ''مامن مسلمین یلتقیان فیتصافحان إلا غفرلهما قبل أن یفترقا'' (بحوالہ جمع الفوائد ۳/ ۲۹۶، کتاب الأدب) (مرتب)۔

آیتوں کو چند بار پڑھ دے تو کیا اس سے نماز میں کوئی خرابی لازم آئے گی اور کیا سجدہ سہو کرنا ہوگا۔

محمد ادریس (راجستھان)

الجواب وبالله التوفيق:

ہاں سجدۂ سہو کرنا لازم ہو جائے گا (۱) فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

حالت سفر میں قصر:

زید ایک دیندار شخص ہے جو عالم نہیں مگر کثرت مطالعہ کے باعث وسیع تر دینی معلومات رکھتا ہے وہ اس بات کا قائل ہے کہ مسافر بحالت سفر نماز میں قصر کا پابند نہیں ہے بلکہ یہ اسکی مرضی واختیار پر موقوف ہے اور دلیل میں آیت کریمہ۔

"فليس عليكم جناح أن تقصروا من الصلوة إن خفتم أن يفتنكم الذين كفروا "(۲) کو پیش کرتا ہے۔اولا "لا جناح عليكم " کا صیغہ وجوب کے لئے نہیں ہے دوسرے ان خفتم کی قید بھی اس کی تائید کرتی ہے کہ قصر صلوۃ موقوف بالشرط ہے، کیا زید کا یہ عقیدہ وعمل درست ہے، اہل سنۃ والجماعت میں ایسا بھی کوئی مذہب ہے؟

محمد فروز عالم

الجواب وبالله التوفيق:

پہلی بات تو یہ ہے کہ آیت کریمہ "لا جناح عليكم "نہیں ہے بلکہ "ليس عليكم جناح الخ" ہے، سورۂ نساء کی آیت ہے ملاحظہ فرمالیجئے۔ دوسری بات یہ ہے کہ آیت کریمہ مطلق نہیں ہے جب کہ زید نے مطلق سمجھ کر مفہوم بیان کیا، بلکہ یہ آیت مقید ہے بغیر سفر کے بھی بوقت خوف قصر کرنا درست ہونا چاہیے، بلکہ بغیر سفر شرعی بھی ایک محلّہ سے دوسرے محلّہ میں جانے سے قصر ہونا چاہیے اسی طرح دو رکعت والی نماز بھی قصر کرکے صرف ایک رکعت پڑھنے کا جواز نکلنا چاہیے، حالانکہ ان

۱- "فلو قرأها في ركعة من الأوليين مرتين وجب سجود السهو لتأخير الواجب وهو السورة ،كما في الذخيرة وغيرها، وكذا لو قرأ أكثرها ثم أعادها كما في الظهيرية"(ردالمحتار علی الدرالمختار ۲/ ۵۲،فتاوی عالمگیریہ ۱/ ۷۱)(مرتب)۔

۲- سورۂ نساء:۱۰۱۔

باتوں کا کوئی قائل نہیں۔پس جب آیت کریمہ مقید ہے تو قید کو من قبل الشارع معلوم کرنا ضروری ہے،اس طرح یہ آیت کریمہ تفسیر قصر میں مجمل بھی ہے،ورنہ جس طرح جو چاہتا قصر کر لیتا حالانکہ اس کا بھی کوئی قائل نہیں،نہ صحابہ میں،نہ ائمہ میں الغرض اس قید کی تشریح اور اس اجمال کی تفسیر دونوں مشکوۃ نبوت سے معلوم کرنا ہوگا اور روایات میں بخاری و مسلم اور دیگر کتب صحاح وغیر صحاح سب میں تفصیل وتفسیر وتقیید کی صورتیں مذکور ہیں اس کا پابند ہونا پڑے گا۔چنانچہ مسلم شریف (۱) میں یعلی بن امیہ کی حدیث میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ سوال کہ یا رسول اللہ اب تو فتنہ کا خوف نہیں ہے اب تو قصر نہ کرنا چاہیے حضور علیہ السلام نے جواب دیا کہ یہ قصر بحالت سفر اللہ تعالیٰ کی جانب سے بندہ پر تحفہ ہے اس کی قدر کی جائیگی۔اور سفر شرعی میں قصر ہی کیا جائیگا، چنانچہ حضور علیہ السلام نے سفر شرعی میں ہمیشہ قصر ہی فرمایا ہے کبھی اتمام نہیں فرمایا ہے اسی طرح حضرت صدیق اور حضرت عمرو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے بھی ہمیشہ سفر شرعی میں قصر ہی فرمایا ہے اور حضرت عثمانؓ نے جو کبھی اتمام کیا ہے اور لوگوں نے اعتراض کیا ہے تو جواب میں فرمایا کہ میں نے یہاں "تا ھل" کرلیا ہے،اس لئے مجھے گنجائش ہے وغیر ذالک۔اس لئے جمہور ائمہ قصر کو ضروری قرار دیتے ہیں صرف حضرت امام شافعی رحمہ اللہ اتمام کی بھی اجازت دیتے ہیں اور وہ اس میں منفرد ہیں،مزید تفصیل اگر مطلوب ہو تو ہدایہ کی شرح فتح القدیر (۲) اور رد المحتار شامی۔وغیرہ "باب صلوۃ المسافر" میں مطالعہ فرمالیجئے یہاں مزید تفصیل وبسط کی گنجائش نہیں ہے،امید کہ اتنی تقریر سے تشفی ہوجائے گی۔

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی،مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

۱- مسلم شریف ۱/ ۲۴۱،کتاب صلوۃ المسافرین وقصرہا،مطبع رحیمیہ دیوبند۔

۲- فتح القدیر ۱/ ۳۹۵ دار عالم الکتب السعودیہ-الرد المحتار مع الدر ۲/ ۶۰۳،مکتبہ زکریا دیوبند۔

باب الامامۃ

ریڈیو، ٹیپ ریکارڈ، ٹیلیویژن اور ٹیلیفون کے ذریعہ اقتداء اور ان سے سنی گئی آیت سجدہ سے سجدہ کے وجوب کا حکم شرعی:

بذریعہ ٹیلیفون، ٹیلیویژن، ٹیپ ریکارڈ اور ریڈیو کے ذریعہ اقتداء کرنا صحیح ہوگا؟

عبدالقیوم میرٹھی (متعلم دارالافتاء دارالعلوم دیوبند)

الجواب وباللہ التوفیق:

ٹیپ ریکارڈ، گراموفون وغیرہ جن میں متکلم کی آواز بعینہ نہیں آتی، بلکہ متکلم کی آواز کی نقل آتی ہے، صدائے باز گشت کی طرح تو ان سے آیت سجدہ سننے کی بنا پر نہ سجدہ تلاوت واجب ہوگا اور نہ ہی ان کی اقتدا میں نماز پڑھنا صحیح ہوگا (۱)۔

البتہ ٹیلیفون میں متکلم کی آواز بعینہ آسکتی ہے، مثلاً ایسا ٹیلیفون ہو کہ جس میں بولنے والے کی صورت بھی نظر آتی ہو اور وہ بولتا ہوا نظر آتا ہو تو اس کی آیت سجدہ کی تلاوت پر سجدۂ تلاوت کرنا ضروری ہوجائے گا۔

اسی طرح اس آلہ کے توسط سے بھی یقین ہو کہ یہ آواز بولنے والے کی آواز ہی ہے، جب بھی سجدۂ تلاوت کرنا واجب ہوجائے گا، ورنہ واجب نہ رہے گا۔

رہ گیا ریڈیو، اس میں اکثر بیان کرنے والے کی تقریر و آواز ٹیپ کر لی جاتی ہے اور پھر اسی کو نشر کرایا جاتا ہے، پس اگر ایسا ہونے کا ظن غالب ہو تو اس کی آواز پر سجدۂ تلاوت کرنا لازم نہ رہے گا۔

۱- "ویؤیده قوله: ولا تجب إذا سمعها من طير هو المختار، وإن سمعها من الصدى لاتجب عليه، كذا في الخلاصة" (فتاویٰ عالمگیری ۱/۶۸) "لا تجب بسماعه من الصدى والطير" (الدر المختار علی الشامی ۱/۵۱۷، باب سجود التلاوة) اور جب سجدۂ تلاوت بھی واجب نہیں ہوگا تو اس کی اقتدا میں نماز پڑھنا بدرجۂ اولیٰ درست نہیں ہوگا (مرتب)۔

ہاں جب بولنے والا بغیر ان وسائل کے خود بول رہا ہے اور آیت سجدہ کی تلاوت کرے تو اس کی آیت سجدہ کی تلاوت کرنے پر سجدۂ تلاوت واجب ہو جائے گا۔ **"يجب بسبب تلاوة آية (إلىٰ قوله) بشرط سماعها فالسبب التلاوة وإن لم يوجد السماع، كتلاوة الأصم، والسماع شرط في حق غير التالي أوبشرط الائتمام أي الاقتداء بمن تلاها، فإنه سبب لوجوبها أيضاً"** (۱)، اور ریڈیو میں متکلم کی بعینہٖ آواز اور ٹیپ کی آواز میں موقع استعمال کا فرق مدلل طور پر ہو جاتا ہے، اسی کے اعتبار سے عمل کرے، اور یہی تفصیل و تدقیق ٹیلی ویژن سے آواز سنائی دینے میں ہے اور اسی تفصیل کے مطابق تحقیق کر کے عمل کرے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دار العلوم دیوبند سہارنپور

۱-امام کس کو بنایا جائے؟

ہمارے یہاں دو مولوی صاحب ہیں ایک نے تو کسی لڑکی کو بھگا کر شادی کی ہے پھر طلاق دے دی اور ثانی نکاح بھی کر لیا ایسی لڑکی سے جس کو حد جاری ہو سکتی ہے۔ اور دوسرے مولوی صاحب ہیں جنکے حق میں کسی قسم کی بدنامی نہیں ہے، لہذا ان دونوں میں کس کی امامت افضل ہے، یعنی نماز پڑھنا پیچھے اول کو ثانی کے سلف پر اور ثانی کو اول کے سلف پر جائز ہے، دونوں مولوی صاحب کی موجودگی میں مطلقاً لڑکی بھگا کر شادی کرنے والی سلف پر نماز پڑھنا جائز ہے یا نہیں اور اکثر فقہاء کس طرف گئے ہیں جواب قرآن واحادیث وفقہ سے دیں اور خدا بزرگ سے نعمت دارین حاصل کریں۔

۲-مسجد میں امامت کا حق کس کو ہے؟

ہمارے یہاں ایک مسجد وقف کی ہوئی ہے۔ وقف کرنے والے کے اولاد میں سے ایک مولوی صاحب ہیں جو امام کے قائل بھی نہیں ہیں، برابر ایک اور مولوی صاحب کا اعتبار ہے، لیکن وقف کرنے والے کے لڑکے مولوی صاحب یوں کہتے ہیں کہ چونکہ مسجد میرے باپ دادا کی وقف کی ہوئی ہے، اس لئے امامت کا حق مجھے ہے کسی کی ملکیت میں مسجد بنایا تو اس مسجد میں نماز پڑھنا کیسا ہے؟ جائز یا ناجائز۔

بشیر احمد

۱- الدر المختار مع الشامی ار ۵۱۴، باب سجود التلاوۃ۔

الجواب وباللہ التوفیق:

۱–دوسرا مولوی جس کے بارے میں کوئی بدنامی نہیں اس کے پیچھے نماز پڑھنا بہتر ہے(۱)۔

۲–وقف کرنے کے بعد چیز وقف کرنے والے کی ملک سے نکل جاتی ہے اور خاص اللہ کی ملک شمار ہوتی ہے پھر اللہ کے حکم کے مطابق جو شخص امامت کا زیادہ مستحق ہوگا اور اس کو امامت کا حق زیادہ ہوگا۔ واقف کی اولاد اگر ایسی نہ ہو تو اس کے بجائے دوسرا شخص جو امامت کا اہل ہو اس کو ترجیح ہوگی، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲/ ۱۲/ ۱۴۰۳ھ

امام شافعی ہو اور مقتدی حنفی ہو یا اس کے برعکس ہو تو نماز کس طرح پڑھیں؟

۱–ہم یہاں دبئی میں ہندوپاک کے مسلمان حنفی ہیں اور یہاں عرب ممالک میں اکثریت شافعی لوگوں کی ہے، اس لیے نماز وغیرہ میں زیادہ تر شافعی مسلک کے طریقہ پر عمل کیا جاتا ہے، اس وقت یہاں غروب چھ بجے ہوتا ہے اور حنفی وقتِ نمازِ عصر ساڑھے چار بجے ہوتا ہے، لیکن شوافع کی اکثریت کی وجہ سے عصر کا وقت پونے چار بجے ہوتا ہے، یعنی غروب سے سوا دو گھنٹے قبل ہوتا ہے۔

اس صورت میں حنفی کی اقتداء شافعی امام کے پیچھے وقت پر ہوسکتی ہے یا نہیں؟

۲–اکثر مساجد میں امام حنفی ہیں وہ بھی شافعی وقت پر نمازِ عصر کی امامت کراتے ہیں، ان کے پیچھے شافعی اور حنفی مقتدیوں کی نماز صحیح ہوسکتی ہے؟

۳–حنفی شخص شافعی وقت پر اذان سن کر فوراً منفرد نماز ادا کرسکتا ہے؟ اذان غروب سے ڈھائی گھنٹہ قبل ہوتی ہے۔

۴–اگر اس طریقہ پر نماز نہیں ہوتی تو حنفی لوگ کیا کریں، کیونکہ اگر حنفی وقت پر نماز باجماعت ہونے لگے اور تمام حنفی لوگ جو تعداد میں وطنی شافعی لوگوں سے زیادہ ہیں، اپنی الگ جماعت کریں تو فتنہ کا اندیشہ ہے، ایسے ماحول میں کیا کیا جائے؟

۵–اگر شافعی وقت پر حنفی کی عصر ہوسکتی ہے تو اگر کسی حنفی کی ظہر باقی ہے تو کیا اس سے پہلے ادا کرسکتا ہے؟ ہم نے معتبر حنفی علماء سے دریافت کیا۔ گجرات کے ایک معتبر حنفی نے ہم سے زبانی صاف انکار کیا تھا کہ اس طرح نماز صحیح نہ ہوگی۔

۱– "قلت وسيذكر الشارح عند المؤيد بالجواز لو غيره أصلح" (ردالمحتار علی الدر ۱/ ۲۸۴، مکتبہ زکریا) (مرتب)۔

ہاں اگر نفل کی نیت سے عصر کے فرض میں شامل ہوں گے تو نفل ہو جائے گی اور حنفی وقت پر نمازِ عصر ادا کرنا لازمی ہے۔دوسرے مولانا صاحب نے بتلایا کہ میں خود شافعی وقت پر ادا کرتا ہوں اس کی گنجائش نکلتی ہے آپ فیصلہ فرمائیں۔

٦-نمازِ فجر میں رکعت میں عرب حضرات قنوتِ نازلہ پڑھتے ہیں، بعض امام بعدِ قراءت اور بعض قومہ میں، اس کے بارے میں حنفی امام و مقتدی کیا کریں؟

۷-جہری نمازوں میں سورۂ فاتحہ کے بعد شافعی امام تھوڑی دیر خاموش رہتے ہیں، اس وقفہ میں مقتدی الحمد شریف پڑھتے ہیں اس وقت حنفی مقتدی کیا کرے؟ کیا حنفی امام شافعی مقتدیوں کی رعایت کرسکتا ہے اور اتنا خاموش رہ سکتا ہے، کیونکہ اگر امام چھوٹی سورت پڑھتا ہے تو مقتدی الحمد پوری نہیں پڑھ سکتے۔

۸-تراویح میں نہایت مختصر قعدہ اخیرہ کیا جاتا ہے، جس میں مقتدی درود شریف و دعا نہیں پڑھ سکتے اور امام کے سلام پھیرنے کے بعد فوراً دوسری رکعت شروع ہو جاتی ہے، کیا مقتدی اپنے طور سے درود شریف و دعا کے بعد سلام پھیر کر امام کی نماز میں تھوڑی تاخیر سے مثلاً الحمد کے ختم تک شامل ہوسکتا ہے؟

۹-رمضان المبارک میں شافعی حضرات وتر باجماعت ادا کرتے ہیں اور دو رکعت ایک سلام سے اور ایک رکعت دوسرے سلام سے، تو کیا ان کی اقتدا حنفی کرسکتے ہیں؟

۱۰-عیدین کی نماز کی نیت سے پتہ چلتا ہے کہ شافعی حضرات سنت کی نیت کرتے ہیں اور ہم حنفی واجب کی، اس طرح ہماری نماز صحیح ہوگی یا نہیں؟

۱۱-جمعہ کے خطبہ ثانی اور عیدین میں اہتمام سے مقتدی ہاتھ اٹھا کر آمین کہتے ہیں، کیا یہ ہمارے لیے جائز ہے؟

الجواب وبالله التوفيق:

نوٹ: پہلے فقہی عبارتیں پیش کی جاتی ہیں پھر اصل جواب نقل ہوگا:

۱-"وقت الظهر من زواله أي ميل ذكاء عن كبد السماء: إلى بلوغ الظل مثليه وعن مثله وهو قولهما وزفر والأئمة الثلاثة رحمهم الله، قال الإمام الطحاوي: وبه نأخذ. وفي غرر الأفكار وهو المأخوذ به، وفي البرهان: وهو الأظهر، لبيان جبرئيل، وهو نص في الباب وفي الفيض: وعليه عمل الناس اليوم، وبه يفتى" (۱)۔

۱- الدر المختار علی هامش الشامی ۱/۲۴۰ کتاب الصلوٰۃ۔

۲-"قال الشامي تحت قوله: وعليه عمل الناس اليوم: أى في كثير من البلاد، والأحسن مافي السراج عن شيخ الإسلام أن الاحتياط أن لايؤخر الظهر إلى المثل، وأن لايصلي العصر حتى يبلغ المثلين إلى قوله وانظر هل إذا ألزم من تأخيره العصر إلى المثلين فوت الجماعة يكون الأولى التأخير أم لا. والظاهر هو الأول، بل يلزم لمن اعتقد رجحان قول الإمام تأمل، ثم إلى قوله: لوكان إمام محلته يصلي العشاء قبل غياب الشفق الأبيض فالأفضل أن يصليها وحده بعد البياض" (۱)۔

جواب سوال:

۱-احناف کے مفتی بہ قول وقت سے پہلے حنفی کا اقتدا کرنا مفتی بہ قول کے خلاف ہوگا، بحوالہ عبارت (۲)۔

۲-عبارت (۱-۲) سے معلوم ہوتا ہے کہ جو حنفی اس میں حضرت امام طحاویؒ کی اتباع کرتا ہو اور ان کے قول کے مطابق صاحبین کے قول کو کہ وہ بھی امام ابوحنیفہ ہی کا ایک قول ہے، راجح سمجھتا ہو، جیسا کہ صاحب "غرر الافکار و برہان وفیض" نے سمجھا ہے، وہ اگر امامت کرے یا اقتدا کرے تو نکیر نہیں کی جاسکتی۔

اور باقی احناف جو امام کے ظاہر قول کو اور جمہور احناف کے مفتیٰ بہ قول کو لیتے ہیں اس کا حکم آگے آتا ہے۔

۳-نہیں ادا کرسکتا (۲)۔

۴-اگر فتنہ کا اندیشہ ہو تو نفل کی نیت سے ان کے ساتھ شریک ہوجائیں پھر بعد میں اگر جماعت کرسکیں تو جماعت سے پڑھ لیں، ورنہ منفرداً پڑھ لیں۔

۵-پہلے ظہر پڑھے پھر عصر پڑھے جس جگہ جماعت عصر ہو رہی ہو وہاں سے ہٹ کر دوسری جگہ گھر میں یا جہاں مناسب ہو پڑھیں۔ اور رفع فتنہ کے لیے ان کی جماعت میں شریک ہوسکتے ہیں۔

۶-اگر امام حنفی ہے تو قرأت کے بعد نہ پڑھیں، بلکہ قومہ میں پڑھیں (۳)۔ اور حنفی مقتدی آہستہ آہستہ آمین کہتے

۱- الشامی ۱/ ۲۴۰ کتاب الصلوۃ۔

۲- "فحصل أن الإقتداء بالمخالف المراعي في الفرائض أفضل من الانفراد إذا لم يجد غيره، وإلا فالاقتداء بالموافق أفضل" (فتاویٰ شامی ۱/ ۳۷۹ کتاب الصلوۃ)۔

۳- (وهل القنوت هنا قبل الركوع أم بعده لم أره، والذى يظهرلي أن المقتدى يتابع امامه، إلا إذا جهر، فيؤمن وأنه يقنت بعد الركوع لاقبله، بدليل ما استدل به الشافعي على قنوت الفجر، وفيه التصريح بالقنوت بعد الركوع حمله علمائنا على القنوت للنازلة ثم رأيت الشرنبلالي في مراقي الفلاح صرح بأنه بعده، واستظهر الحموى أنه قبله والأظهر ماقلناه، (شامی ۱/ ۴۵۱ باب الوتر والنوافل (مرتب)۔

رہیں اور اگر امام شافعی ہوتو جوقومہ میں پڑھے تو حنفی مقتدی بھی آہستہ آہستہ آمین کہتے رہیں اور اگر بعد قرأت پڑھے تو حنفی مقتدی خاموش کھڑے رہیں۔

۷-''الف''حنفی مقتدی خاموش کھڑے رہیں۔

''ب''حنفی امام اس صورت میں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم اطمینان سے پڑھ کر ختم سورت کرے اور شوافع حضرات سورۂ فاتحہ پڑھیں، اگر کچھ سورۂ فاتحہ باقی رہ جائے تو ختم سورت سے قبل قبل پوری کرلیں۔

۸-حنفی امام کو بھی تراویح کے قعدہ اخیرہ میں التحیات کے ساتھ درود شریف پڑھ لینا چاہئے، درود شریف پڑھنا بھی اہم ہے، اگر کوئی امام جلدی سلام پھیر دے، لیکن مقتدی کو درود شریف پڑھ کر رکعت مل جانے کا ظنِ غالب ہوتو درود شریف پوری کر کے سلام پھیرنا چاہئے۔

۹-حنفی حضرات اپنی جماعتِ وتر بعد میں جہاں مناسب ہو علیحدہ کریں اگر ان کے ساتھ جماعت میں شریک ہونا ہی پڑے تو دو رکعت نفل کی نیت کر کے شریک ہوں اور دوسری رکعت کے سلام پر اپنی یہ نماز ختم کردیں اور پھر مستقل دو رکعت نفل کی نیت کر کے شریکِ جماعت ہوجائیں اور جب امام سلام پھیرے تو اپنی ایک رکعت مثلِ مسبوق کے پوری کرلیں۔

۱۰-ایسی صورت میں بھی حنفیہ کی اقتدا کرلینا صحیح ہے(۱)۔

۱۱-اس طرح دعا کرنا اس موقع پر ثابت نہیں ہے، لہٰذا نہ کریں۔فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

اگر شافعی وحنفی میں مسائل سے زیادہ واقف حنفی ہے، تو اس کی امامت اولیٰ وافضل ہے:

ایک مسجد ہے جس میں مصلی تمام کے تمام شافعی المسلک ہیں جن میں نہ کوئی عالم ہے اور نہ سنتوں کے پابند ہیں اور نہ کوئی داڑھی رکھتا ہے اور نہ ہی قرآن کریم پڑھتا ہے، نہ مخارج کا پتہ نہ وقف کا بالکل غلط قرآن پڑھتے ہیں، ایک حرف بھی صحیح

۱- ''لكن في وتر البحر إن يقن المراعاة لم يكره أوعلمها لم يصح، وإن شك كره، قال الشامي: أى المراعاة في الفرائض من شروط وأركان في تلك الصلوٰة وإن لم يراع في الوجبات والسنن كما هو ظاهر سياق كلام البحر، وظاهر كلام شرح المنية أيضاً حيث قال: وأما الاقتداء بالمخالف في الفروع كالشافعي، فيجوز مالم يعلم منه مايفسد الصلوٰة على اعتقاد المقتدي عليه الإجماع إنما اختلف في الكراهة فقيد بالمفسد دون غيره كما ترى، وفي رسالة الاهتداء في الاقتداء لملا علي قاري ذهب عامة مشائخنا إلى الجواز إذا كان يحتاط في موضع الخلاف، وإلا فلا'' (شامی ۱/۸۔۳۷۷ کتاب الصلوٰۃ۱۲)(مرتب)۔

ادا نہیں ہوتا۔

ایسے لوگوں میں ایک آدمی ہے جو کہ حنفی المسلک ہے، مسائل تجوید وغیرہ سے تھوڑا بہت واقف ہے اور تمام کے تمام شافعی مصلی اس حنفی کے پیچھے نماز پڑھنا چاہتے ہیں تو کیا حنفی شخص امامت کرسکتا ہے؟ اگر ان شافعیوں میں سے کوئی شخص نماز پڑھائے تو نماز فاسد و باطل ہوسکتی ہے قرآن وغیرہ کے غلط ہونے کی وجہ سے، مثال کے طور پر ضاد، ظ، میں کوئی فرق نہیں، الف، ء، ع، میں کوئی فرق نہیں، ق، ک، خ، میں کوئی فرق نہیں، س، ث، ص، میں کوئی فرق نہیں، ہ، ح، میں کوئی فرق نہیں، ت، ط، میں، ذ، ز، میں ان تمام میں کوئی فرق نہیں ہے، مدلل تحریر فرمائیں۔

پی، ایس موسیٰ بمعرفت، مولوی شفیق الرحمٰن (متعلم دارالافتاء دارالعلوم دیوبند)

الجواب وباللہ التوفیق:

صورت مسئولہ میں شافعی المسلک حضرات اس حنفی شخص کی اقتدا کرسکتے ہیں، بلکہ موجودہ حالت میں یہی بہتر ہے، لیکن اس حنفی شخص کو طہارت اور نماز کے مسائل میں خلافیات کی حدود میں رہتے ہوئے رعایت کرنی چاہئے (۱)۔

"ولو شک شافعي: في اتيان المخالف بالواجبات عند المأموم لم يؤثر في صحة الاقتداء به تحسيناً للظن به توقي الخلاف" (۲) فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

حنفی کا شافعی کی امامت کرنا:

ایک حنفی مسلک کا عالم شافعی مسجد کا امام ہے جو کہ مسلک شافعی کی رو سے ارکان صلوۃ ادا کرنے کے بعد دوبارہ حنفی مسلک کی روشنی میں تنہا نماز پڑھتا ہے ایسا کرنا جائز ہے یا نہیں؟ پھر ایسے امام کے بارے میں شریعت مطہرہ کا کیا حکم ہے؟

۱- **"فتحصل أن الاقتداء بالمخالف المراعیٰ في الفرائض أفضل من الإنفراد إذا لم يجد غيره، وإلا فالاقتداء بالموافق أولیٰ. وإذا لم يجد غير المخالف فلا كراهة في الاقتداء به أو الاقتداء به اولیٰ من الإنفراد"** (حاشیۃ الطحطاوی علی مراقی الفلاح کتاب الصلوۃ ۱/۲۲۱) (مرتب)۔

۲- تحفۃ المحتاج شرح المنہاج لابن حجر ۱/۲۲۱ (مرتب)۔

الجواب وباللہ التوفیق:

اگر سب مقتدی شافعی ہوں اور صرف امام حنفی ہوں تو ایسے اعمال میں جو حنفی مذہب میں نماز کے اندر نا جائز ہیں ان میں رعایت جائز نہیں اور جو اعمال نماز میں حنفی مذہب نا جائز نہیں ہیں اور شافعی مذہب میں ان کے بغیر ان کی نماز خراب ہو جاتی ہے تو رعایت ضروری ہے اور جن اعمال کے بغیر شوافع حضرات کی نماز خراب نہیں ہوتی اور حنفی مذہب میں وہ نا جائز نہیں ہے ان اعمال میں ان کی رعایت نہ کرنا افضل واولی ہے اور رعایت کر لینے کی ہی گنجائش ہے ان اصول کے مطابق عمل کرے تو امام پر کوئی وزر نہیں ہے، ورنہ جیسا عمل ہوگا ویسا حکم ہوگا باقی فرض ایک بار پڑھ لینے کے بعد دوبارہ تنہا بھی پڑھنا جائز نہیں، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

حنفی، شافعی کی امامت کرسکتا ہے یا نہیں:

ایک مسجد جس میں مصلی تمام کے تمام شافعی المسلک ہیں جس میں نہ کوئی عالم ہے اور نہ کوئی مولوی، نہ سنت کا پابند ہے اور نہ کوئی داڑھی رکھتا ہے اور نہ ہی قرآن صحیح پڑھتا ہے، نہ مخارج کا پتہ نہ وقف کا بالکل غلط قرآن پڑھتے ہیں ایک حرف صحیح ادا نہیں ہوتا ایسے لوگوں میں ایک آدمی ہے جو کہ حنفی مسلک پر ہے مسئلہ مسائل وتجوید وغیرہ سے تھوڑا بہت واقف ہے اور تمام کے تمام شافعی مصلی اس حنفی کے پیچھے نماز پڑھنا چاہتے ہیں کیا حنفی شافعی کی امامت کر سکتے ہیں باوجود کہ شافعی المسلک میں سے کوئی شخص نماز پڑھا تا ہے تو نماز فاسد و باطل ہو سکتی ہے قرآءۃ وغیرہ کی غلطی ہونے کیوجہ سے مثال کے طور پر ض، ظ میں کوئی فرق نہیں، خ، ق، ک میں کوئی فرق نہیں س ش میں کوئی فرق نہیں ہے، الف، ع میں کوئی فرق نہیں ہے ہ ح میں کوئی فرق نہیں ہے ت ط میں ذ ز میں ان تمام میں کوئی فرق نہیں مع الدلائل تحریر فرمائیں۔

معرفت مولوی شفیق الرحمٰن (دارالعلوم دیوبند)

الجواب وباللہ التوفیق:

صورت مسئولہ میں شافعی المسلک حضرات اس حنفی شخص کی اقتداء کر سکتے ہیں بلکہ موجودہ حالات میں یہی بہتر ہے لیکن ان حنفی صاحب کو طہارت ونماز کے مسائل میں خلافیات کی حدود شرع میں رہتے ہوئے امامت کرنی چاہئے، "فتحصل

أن الاقتداء بالمخالف المراعي في الفرائض أفضل من الانفراد إذا لم يجد غيره، والا فالاقتداء بالموافق أولى" (۱)"وإذا لم يجد غير المخالف، فلا كراهة في الاقتداء به والاقتداء به، أولى من الإنفراد (۲)،ولو شک شافعي في إتيان المخالف بالواجبات عند المأموم لم يؤثر في صحة الاقتداء به تحسينا للظن في توقي الخلاف" (۳)،فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۳/۲/۱۴۰۱ھ

۱-غیر متشرع حافظ کی اقتداء:

ایک حافظ غیر متشرع کی اقتداء نماز تراویح میں کرنا افضل ہے؟ یا ایک پابند شرع غیر حافظ کی اقتداء میں نماز تراویح افضل ہے؟۔

۲-جس کی بیوی پردہ نہ کرتی ہو اس کی امامت:

اگر امام کی بیوی شوہر کی تنبیہ کے باوجود غیر مرد سے بے پردہ ہو کر گفتگو کرتی ہے، نیز عوام الناس سے پردہ کا کوئی خاص اہتمام نہیں ہے تو ایسے امام کی اقتداء میں ازروئے شرع محمدی علیہ السلام کسی قسم کی کراہیت وغیرہ تو نہیں اگر ہے تو آپ کراہیت کو بالبسط تحریر فرمائیں۔

۳-امام کے ذمہ ایسا کام سپرد کرنا جس سے اس کی تحقیر ہو:

آج کل کے اس دور پرخطر میں مقتدیان حضرات امام مساجد کو اس شرط پر رکھتے ہیں کہ اس سے مسجد کی نگرانی مسجد میں جھاڑو دینا اور پانی گرم کرنا، نیز مسافروں کی دیکھ بھال کرنا وغیرہ وغیر لازم کردیتے ہیں اور اگر کبھی ان امور میں سہو اور تسہیل امام نے برتا تو اہل محلہ ان امام پر حاکمانہ حکم کرتے ہیں تو ایسے امام کی اقتداء میں نماز کے اندر کوئی کراہیت تو نہیں؟ اگر ہے تو بالتفصیل جواب سے نوازیں۔

شفیق احمد (مسجد انصاریان قصبہ اسوڑہ غازی آباد یوپی)

۱- ردالمحتار علی الدرالمختار ۲/۳۰۳ وفیہ فالاقتداء بالموافق أفضل" بدل "أولى"۔

۲- حاشیۃ الطحطاوی علی مراقی الفلاح، الطبعۃ الثالثۃ بالمطبعۃ الکبری الامیریہ بولاق/ ۲۰۴۔

۳- تحفۃ المحتاج شرح المنہاج لابن حجر ۱/۲۲۱۔

الجواب وباللہ التوفیق:

۱-غیر متشرع کی تشریح کے بعد اس نمبر کا جواب منقح ہو سکے گا۔

۲-شوہر کی تنبیہ اور ممانعت کے باوجود اگر بیوی بے پردہ رہتی ہے تو اس سے اس امام کی امامت میں فتور وخلل یا کراہت واقع نہ ہوگی (۱)۔

۳-امام مقتدا ہوتا ہے اس میں مقتدائیت کی شان ہوتی ہے اس کے سپرد ایسا کام کرنا (جس میں اس کی شان مقتدائیت ختم ہو یا اس کام کی وجہ سے عوام کے نزدیک تحقیر وغیرہ ہو) ٹھیک نہیں۔اگر بوجہ غربت وناداری کے یہ سب کام کرنا منظور بھی کرلے تو اس کی ذمہ داری یا اس کا جو کچھ بھی اثر ہوگا اس کی ذمہ دار قوم اور مقتدیان مسجد ہوں گے،اس لئے ایسے کام سے امام کو بری کر کے دوسرا شخص ایسے کام کے لئے ملازم رکھ لینا چاہیے (۲)،فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی،مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۲/۶/ ۱۴۰۱ھ

نسبندی کرنے والے کی امامت:

جو شخص جان بوجھ کر نسبندی کرائے اس کی امامت کیا ہے حرام یا مکروہ؟

الجواب وباللہ التوفیق:

جان بوجھ کر ایسا کرانا ممنوع وحرام ہے۔ایسے شخص کی امامت مکروہ تحریمی ہوتی ہے،فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی،مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

۱- ’’عن أبی هریرةؓ قال: قال رسول اللهﷺ: الصلاة المكتوبة واجبة خلف كل مسلم براً كان أو فاجراً وإن عمل الكبائر ‘‘(سنن ابوداؤد ۱/ ۱۶۲ کتاب الصلاۃ باب امامۃ البر والفاجر حدیث ۵۹۴) نیز تنبیہ اور حتی الوسع بیوی کی حرکت پر نکیر سے وہ اپنے فریضہ سے سبکدوش ہو گیا، اس کی وجہ سے اس کو فاسق نہیں کہا جائے گا، ”له امرأة فاسقة لا تنزجر بالزجر لا يجب تطليقها كذا فى القنية“ (فتاوی عالمگیریہ ۵/ ۳۷۲)(مرتب)۔

۲- ’’إن الأصل أن بناء الإمامة على الفضيلة والكمال ‘‘(البحرالرائق ۱/ ۶۰۲)۔

آیت سجدہ نہ کرنے والے امام کی اقتداء:

غالباًان حضرات کے نزدیک (یعنی عمانی) سجدہ تلاوت سنت ہے، اور ائمہ مساجد نماز کی تلاوت میں آیت سجدہ بھی پڑھتے ہیں تو ہم حنفی ان کی اقتداء کرتے ہیں، ایسی حالت میں کیا ان کی اقتداء درست ہے اور ہم گنہگار نہیں ہوں گے؟

الجواب وباللہ التوفیق:

جب وہ لوگ آیت سجدہ نماز میں تلاوت کر کے سجدہ نہ کرتے ہوں تو حنفی مقتدی کو چاہئے کہ فوراً اسی وقت سجدہ نہ کریں، بلکہ جب وہ نماز ختم کر کے سلام پھیریں تو حنفی اپنا سجدۂ تلاوت کر کے سلام پھیریں، اور جتنی آیات سجدہ انہوں نے اس نماز میں تلاوت کی ہیں اتنے سجدے کر کے سلام پھیریں اور ان کے ساتھ ہی سلام نہ پھیریں، ورنہ نماز تو ہو جائے گی باقی سجدۂ تلاوت نہ کرنے کا گناہ بھی ہوگا۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۹/۴/۱۴۰۲ھ

رسول اللہ ﷺ کی توہین کرنے والے کی امامت:

توہینِ رسول اللہ ﷺ کرنے والے کے پیچھے نماز درست ہے یا نہیں، خواہ وہ اہانت کسی قسم کی ہو؟

الجواب وباللہ التوفیق:

توہینِ رسول ﷺ تو نعوذ باللہ کفر ہے مسلمان باقی نہیں رہے گا، اس کے پیچھے نماز پڑھنے کا کیا سوال ہے اور کون مسلمان اس کی جرأت کر سکتا ہے؟

اور یہ بھی سمجھ لیجئے کہ بغیر وجہ شرعی کے کسی مسلمان کی طرف یہ نسبت معمولی گناہ نہیں ہے، اگر یہ صحیح تہمت نہ ہوئی تو وہ توہین لوٹ کر اسی متہم کرنے والے پر آئے گی اور وہی اس جرم کا مورد بن جائے گا جس کو وہ دوسروں پر تھوپنا چاہتا تھا۔

ایسی باتیں کہنا بڑے خطرے کا مقام ہے، متہم کرنے والے کو بھی اپنی خیر منانی چاہئے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

قرآن صاف نہ پڑھنے والے حافظ کے پیچھے تراویح وشبینہ:

۱۔زید تراویح میں قرآن کریم سناتا ہے،لیکن اس طرح پڑھتا ہے کہ حروف کٹ جاتے ہیں مقتدیوں کی سمجھ میں نہیں آتا ہے اور زید کے مقابلہ میں دوسرا حافظ ایسا پڑھتا ہے کہ سمجھ میں آتا ہے اور حروف نہیں کٹتے ہیں۔

صورت مسئولہ میں زید کا قرآن شریف سنانا مقتدیوں کے لئے تراویح میں جائز ہے یا کہ نہیں سوال یہ ہے کہ مقتدی اب زید کا قرآن شریف سنیں یا اس کے مقابلہ میں دوسرے حافظ صاحب کا سنیں جس کے حروف نہیں کٹتے ہیں۔

۲۔ایسا شبینہ سننا جس میں قرآن کریم کے حروف کٹتے ہوں اور سمجھ میں بھی نہ آتا ہو تو کیا جائز ہے کیا ایسا شبینہ پڑھنا باعث ثواب ہے اور جائز ہے یا نا جائز ہے؟

الجواب وباللہ التوفیق:

۱۔زید کے مقابلہ میں دوسرا حافظ جو صحیح وصاف پڑھتا ہے اس کا سنیں۔

۲۔ایسا شبینہ جس میں قرآن پاک صاف وصحیح نہ پڑھا جاوے، جائز نہیں، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۸/۸/۸۵ ۱۳ھ

بغیر ڈاڑھی والے کی امامت:

۱۳/رمضان ایک صاحب نے اعلان کیا کہ جو حافظ صاحب تراویح پڑھا رہے ہیں ان کے پیچھے تراویح پڑھنا حرام ہے، کیونکہ ان کو داڑھی مونچھ نہیں ہے اس کے بعد انہوں نے اپنی تراویح کا علیحدہ انتظام کیا، الم ترکیف سے پڑھنا شروع کیا نتیجہ یہ کہ کچھ لوگ قرآن چھوڑ کر ان کے پیچھے پڑھنا شروع کر دیا۔یہاں زیادہ تعداد بغیر داڑھی والوں کی ہے، بعض دفعہ فرض جماعت پڑھانے کے لئے بغیر داڑھی والا فرض پڑھا دیتا ہے، اس لئے آپ قرآن وحدیث کی روشنی میں فقہ حنفی، شافعی، حنبلی کے تحت ارسال فرمادیں، کیونکہ میرے ساتھیوں میں تینوں مسلک کے لوگ ہیں۔

سوال یہ ہے کیا بغیر داڑھی والے کی امامت میں فرض نماز یا تراویح پڑھنا جائز ہے؟

محمد ارتقاع خان شروانی (پوسٹ بکس ۴۲ ادہران سعودی عربیہ)

الجواب وباللہ التوفیق:

بے شمار احادیث صحیحہ میں ڈاڑھی رکھنے اور مونچھ کٹانے بلکہ چھوٹی سے چھوٹی رکھنے کی بہت سخت تاکیدیں وارد ہیں اور اس کے خلاف پر مذمتیں وارد ہیں یہاں پر بطور نمونہ محض چند حدیثیں نقل کی جاتی ہیں، مثلاً بعض روایات صحاح ستہ میں ہے: ''أوفروا اللحی واحفوا الشوارب'' بعض میں ہے: ''أنهكوا الشوارب واعفوا اللحی'' اور بعض میں ہے: ''قصّوا الشوارب واعفوا اللحی''، اور بعض میں ان کلمات کے ساتھ: ''وخالفوا المشرکین'' اور بعض میں: ''وخالفوا الأعاجم'' بھی ہے(۱)۔

چنانچہ عجمیوں اور مشرکوں میں عموماً ان کا مذہبی شعار دیکھا جاتا ہے۔ڈاڑھی منڈانے کا اور مونچھ بڑھانے کا اور اسی اعتبار سے مونچھ کٹانے اور منڈانے کو اور ڈاڑھی بڑھانے کو اسلامی شعار قرار دیا گیا ہے، بعض روایات میں ''عشر من الفطرۃ'' اور بعض میں ''خمس من الفطرۃ''(۲) فرمایا گیا، اور ان سب میں ڈاڑھی بڑھانے کو ضرور شمار کیا گیا ہے، اور فطرہ کے معنی جبلّہ سلیمہ کے ہیں یعنی صحیح فطرت انسانی کا بھی تقاضا یہی ہے، کہ مونچھیں ختم کی جائیں یا کٹائی جائیں اور ڈاڑھی بڑھائی جائے، نیز بعض روایات صحاح میں اسی خصلت (مونچھ چھوٹی سے چھوٹی رکھنا یا بالکل کٹا دینا اور ڈاڑھی بڑھانا) کو فطرۃ انبیاء بتایا گیا(۳)۔جس کے معنی یہ ہیں کہ یہ خصلت تمام انبیاء علیہم السلام کی سنت اور طریقہ مسلوکہ ہے، جو یقیناً محبوب عندرب العالمین کی شکل ہے۔

انہی روایات کی بناء پر تمام فرق اسلامیہ کا سوائے بعض روافض وبعض خوارج کے یہ اجماعی مسئلہ ہے کہ یہ صورت

۱- ڈاڑھی اور مونچھ سے متعلق احادیث صحاح ستہ میں ان الفاظ میں وارد ہیں: ۱-''خالفوا المشرکین، ووفروا اللحی وأحفوا الشوارب، ۲-انهكوا الشوارب واعفوا اللحی'' (صحیح بخاری مع فتح الباری ج ۱۰ حدیث ۵۸۹۲، ۵۸۹۳)، ۳-''خالفوا المشرکین، احفوا الشوارب وأوفوا اللحی، ۴- جزوا الشوارب وارخوا اللحی، خالفوا المجوس'' (صحیح مسلم حدیث ۵۴،۵۵/ ۲۵۹)، ۵-''احفوا الشوارب واعفوا اللحی'' (صحیح مسلم حدیث ۵۲/ ۲۵۹، سنن ترمذی کتاب الادب باب ماجاء فی اعفاء اللحیہ حدیث ۲۷۶۳، سنن نسائی ۱/ ۱۲، احفاء الشارب واعفاء اللحی ۸/ ۱۲۹، احفاء الشارب، ومسند احمد بن حنبل ۲/ ۱۶، ''خالفوا زی الأعاجم'' کے الفاظ میں کوئی حدیث نہیں مل سکی)۔

۲- صحیح بخاری مع فتح الباری ۱۰/ ۳۴۳، صحیح مسلم کتاب الطہارۃ حدیث ۴۹، ۵۰/ ۲۵۷، بلفظ خمس من الفطرۃ اور اس میں ڈاڑھی کا ذکر نہیں ہے، نیز صحیح مسلم کتاب الطہارۃ حدیث ۵۶/ ۲۶۱، ابوداؤد کتاب الطہارۃ باب السواک من الفطرۃ حدیث ۵۳ بلفظ عشر من الفطرۃ اور اس میں اعفاء اللحیہ کا بھی ذکر ہے (مرتب)۔

۳- اس کی صراحت صحاح ستہ میں مجھے نہ مل سکی، البتہ حافظ ابن حجرؒ نے فتح الباری میں لکھا ہے: ''نعم وقع التعبير بالسنة موضع الفطرة في حديث عائشة عند أبي عوانة في رواية....'' اور بیضاویؒ کا قول نقل کیا ہے: ''هي السنة القديمة التي اختارها الأنبياء واتفقت عليها الشرائع'' (فتح الباری ۱۰/ ۳۳۹) (مرتب)۔

(مونچھ کٹی یا اس طرح صاف ہو کہ جلد (چمڑا) نمایاں ہو اور ڈاڑھی بڑھی ہوئی ہو اسلامی و مذہبی شعار شمار ہے اور یہ الگ بات ہے کہ ڈاڑھی کم سے کم کتنی لمبی اور بڑی ہو اس میں آپس میں کچھ ضمنی اختلاف ہے، مگر ڈاڑھی رکھنا واجب سب کے نزدیک بالاجماع ہے بعض اصحاب ظواہر ظاہر نص کے اعتبار سے کٹوانے کی قطعاً اجازت نہیں دیتے ہیں بالکل چھوڑے رکھنے کو ضروری قرار دیتے ہیں ایک قول حضرت امام احمد ابن حنبل کا بھی یہی ہے دوسرا قول دیگر ائمہ کی طرح کچھ توسع کا ہے اور اس میں توسع کی بنا ان روایات پر ہے، صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے مروی ہے کہ وہ اطراف لحیہ سے کچھ کٹوا کر لحیہ کو مرصّع و جمیل بنا لیتے تھے۔ اور حضور اکرم ﷺ کی لحیہ مبارکہ کے بارے میں صحاح میں ہے کہ آپ کی ڈاڑھی کثہ (گھنی) (۱) اور مسترسلہ (لٹکی ہوئی) اس طرح پر تھی کہ پیچھے سے بھی نظر آتی تھی اس کے معنی یہ ہیں کہ آپ کی ڈاڑھی کے بال کٹکر بالکل چھوٹے جلد سے لگے ہوئے یا محض کھونٹی کی طرح ہوں ایسے نہیں تھے، بلکہ مسترسل (لٹکے ہوئے) تھے اس طرح پر کہ پیچھے سے بھی نظر آتے تھے (۲)، اور اس کے معنی یہ ہیں کہ کان کے نیچے بھی ڈاڑھی کے بال اتنے بڑے اور لٹکے ہوئے تھے، کہ شانہ مبارک کے اوپر سے بھی لٹکے ہوئے معلوم ہوتے تھے چاہے دو انگل ہو یا تین انگل ہو یا چار انگل مگر لٹکے ہوئے ضرور ہوتے تھے کم و بیش اسی کے اندر تمام ائمہ کا قول دائر ہے، جڑ سے کٹا دینے کا کسی کا مذہب نہیں ہے۔ اور پورے ڈاڑھ (یعنی نیچے کا جبڑا جس کی ہڈی پر نچلے دانت لگے ہوتے ہیں) پر جو بال ہوں وہ سب ڈاڑھی میں شمار ہے۔ اور اس پورے بالوں کا یہی حکم ہے کیونکہ حدیث پاک واعفوا اللحی وغیرہ میں مراد ہی وہ بال ہیں جو لحیین پر اُگے ہوئے ہوں ان ہی روایات کی بناء حضرت امام ابوحنیفہ کا مذہب یہ ہے کہ پورے لحیین میں کہیں چار انگل سے کم مقدار بالوں کی نہ ہو اور اس کی تائید حضرت ابن عمرؓ کے اس اثر اور روایت سے ہوتی ہے جس کو فقہاء کرام ان لفظوں میں نقل کرتے ہیں: "**صح عن ابن عمر راوی هذا الحديث أنه كان يأخذ الفاضل عن القبضة (الي قوله) وأما الأخذ منها وهي دون ذلک أی القبضه كما يفعله المغاربة ومخنثة الرجال فلم يبحه أحد**" (۳)، اور مونڈانا ذی اعاجم و مشرکین میں داخل ہو کر حرام ہے۔ اور ڈاڑھی مونچھ دونوں کے صفایا سے مخنثین کے مشابہ ہو کر مزید حرمت کا سبب اور باعث مذمت و باعث غضب خداوندی

۱- چنانچہ "کث اللحیہ" کے تحت ملا علی قاری جمع الوسائل فی شرح الشمائل میں لکھتے ہیں: "كث اللحية" بتشديد المثلثة أی غليظها وفی رواية كان كثيف اللحية وفی أخرى عظيم اللحية ذكره ميرک" (ص: ۴۵) (مرتب)۔

۲- "عن أبي معمر قال: قلنا لخبابؓ: أكان رسول اللہ ﷺ يقرأ في الظهر والعصر؟ قال: نعم قلنا بم كنتم تعرفون ذاک؟ قال باضطراب لحيته" (صحیح البخاری مع فتح الباری ۲/ ۲۳۲، کتاب الأذان، باب رفع البصر إلی الإمام فی الصلاۃ حدیث ۷۴۶) (مرتب)

۳- رد المحتار ۲/ ۱۱۳ مطبوعہ مکتبہ زکریا۔

اور بغاوت عن قول الرسول علیہ السلام کے مشابہ ہے، اور در مختار میں فتح القدیر سے نقل کیا ہے: "وأخذ كلها أي حلق كلها فعل يهود الهند ومجوس الأعاجم" (۱) غرض بارہویں صدی ہجری تک ساری امت محمدیہ ڈاڑھی کو اسلام کا شعار اور سنت انبیاء وسنت رسول اللہ ﷺ اور ضروری قرار دیتی تھی، مگر مغربی تہذیب سے متاثر ہو کر بعض خطہ کے لوگوں نے ڈاڑھی مونڈانا شروع کر دیا اور اس میں پہل اہل مصر نے کیا پھر علماء مستشرقین نے تہذیب مغرب زدگی سے متاثر ہو کر ڈاڑھی کی شرعی حیثیت متبدل ومتغیر کرنا شروع کر دیا حتی کہ ڈاڑھی کو بالکل طبعی وغیر شرعی چیز قرار دینے لگے، اور اس معاملہ میں مکمل چھوٹ دینے لگے یہاں تک کہ علماء اور خطباء اور ائمہ مساجد بھی متاثر ہونے لگے۔ اِلّا من حفظہ اللہ۔ پھر یہ بلا اس قدر عام ہوگئی کہ عرب کے دیگر ممالک میں بھی عام طور سے پھیل گئی، اور ایک سنت رسول علیہ السلام جو شعار کا درجہ رکھتی تھی، مردہ ہونے لگی، العياذ بالله اللهم احفظنا من شرور أنفسنا ومن سيئات أعمالنا، حالانکہ مسئلہ یہ ہے کہ مقتدیوں میں اگر کوئی ایک شخص بھی ایسا ہو، جو مسائل طہارت وصلوۃ سے بخوبی واقف ہو، اور قرآن پاک صحیح پڑھتا ہو اور ڈاڑھی بھی شرعی رکھتا ہو اس کے ہوتے ڈاڑھی مونڈانے والے کو امام بنانا درست نہیں اگر وہ امامت کرے گا تو سب مقتدیوں کی نماز مکروہ تحریمی ہوگی، ہاں اگر کوئی مقتدی ایسا نہ ہو سب ڈاڑھی مونڈانے والے ہی ہوں، تو یہ حکم نہ ہوگا، بلکہ ان میں کا جو افضل ہو اس کو امام بنا دینا درست ہوگا، یہی حکم تراویح میں بھی امامت کا ہے باقی اقتداء کو بھی مطلقاً حرام کہہ دینا صحیح نہیں ہے (۲)، بلکہ یوں کہیں گے کہ ایسے امام کے پیچھے پڑھنے سے الم ترکیف سے پڑھ لینا بہتر ہوگا، اس وقت جو شخص ڈاڑھی کی سنت کا احیاء کرے گا وہ ان پاک حدیثوں:

"من أحىٰ سنتي عند فساد أمتيّ فله أجر مائة شهيد أو كما قال" (۳) اور "من أحيا سنة من سنتي قد أميتت بعدي، فإن له من الأجر مثل أجور من عمل بها من غير أن ينقص من أجورهم شيأً، ومن ابتدع بدعة ضلالة لا يرضاها الله ورسوله كان عليه من الإثم مثل آثام من عمل بها ولا ينقص من

۱- در مختار مع رد المحتار ۳/۳۹۸۔

۲- "ويكره تقديم العبد ..... والفاسق، لأنه لا يهتم لأمر دينه..... وإن تقدموا جاز لقوله عليه السلام: صلوا خلف كل بر وفاجر" (ہدایہ ۱/۱۰۱، نصب الرایہ ۲/۲۶)، میں اس کی روایت کو دارقطنی کی طرف منسوب کیا ہے اور اس پر کلام بھی نقل کیا ہے، نیز ابوداؤد کی ایک روایت کا حوالہ دیا ہے جو سنن میں ان الفاظ میں مذکور ہے: "والصلاة واجبة عليكم خلف كل مسلم براً كان أو فاجراً وإن عمل الكبائر... "الحدیث (ابوداؤد کتاب الجہاد باب فی الغزو مع ائمۃ الجور حدیث نمبر ۲۵۳۳، نیز دیکھئے: البحر الرائق ۱/۲۱۰) (مرتب)۔

۳- "عن أبي هريرة قال: قال رسول الله ﷺ: "من تمسک بسنتي عند فساد أمتي فله أجر مائة شهيد" (مشکوۃ مع شرح الطیبی ۱/۳۴۰، کتاب الایمان باب الاعتصام بالکتاب السنۃ)۔

أوزارهم شيئاً رواه الترمذي وابن ماجة'' (۱) (مشکوۃ ص ۳۰) کا مصداق بنے گا، اور ان حدیثوں کی فضیلت سے کامران و بامراد ہوگا۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۴/۱۰/۱۴۰۰ھ

کیا غیر روزہ دار، روزہ دار کی امامت کرسکتا ہے؟

۱- ایک شخص جو مسجد میں پنجگانہ نماز کی امامت کرتا ہے وہ بوجہ بیماری رمضان کے روزے نہیں رکھتا ہے کیا وہ روزے دار نمازیوں کی امامت کرسکتا ہے یا کہ نہیں۔

الجواب وبالله التوفيق:

اگر امام ایسے مرض کا مریض ہے کہ شرعاً بھی اس کو روزہ نہ رکھنا جائز ہے اور اس مرض کی وجہ سے نماز میں کوئی فتور نہیں واقع ہوتا تو اس کی امامت جائز ہے (۲)۔

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۲/۷/۸۵ ۱۳ھ

شادی شدہ عورت کا نکاح پڑھانے والے کی امامت:

کوئی شخص جو کہ پیش امام بھی ہو اور ایسا نکاح پڑھا دے جس کی طلاق نہ ہوئی ہو اور مدت عدت بھی پوری نہ ہوئی ہو اور ایسا نکاح دانستہ طور پر امام صاحب پڑھا دیں تو کیا ایسے امام کے پیچھے نماز پڑھنا درست ہے اور اس کی امامت شرعاً جائز ہے؟

۱- سنن ابن ماجہ ۷۶/۱ مقدمہ باب من أحیا سنۃ قد أمیتت حدیث ۲۱۰، اور سنن ترمذی ۴۵/۵ کتاب العلم باب ما جاء فی الأخذ بالسنۃ حدیث ۲۶۷۷، دونوں کتابوں میں مروی احادیث کے الفاظ میں فرق ہے معنی ایک ہے، یہاں مذکور حدیث میں دونوں کے الفاظ خلط ملط ہیں، البتہ مشکوۃ میں دوسری والی روایت من وعن ہے (مرتب)۔

۲- ''فمن شهد منكم الشهر فليصمه ومن كان مريضاً أو على سفر فعدة من أيام أخر يريد الله بكم اليسر ولا يريد بكم العسر ...'' (سورہ بقرہ: ۱۸۵)، اس عذر کی وجہ سے اس پر فسق کا اطلاق نہیں ہوگا۔

الجواب وباللہ التوفیق:

اگر امام نے دیدہ دانستہ بالقصد ایسا نکاح پڑھایا ہے تو کبیرہ گناہ کا ارتکاب کیا، امام کو فوراً توبہ کرنا چاہیے اور جب تک تائب نہ ہوجائے اور اس کے حالات سے لوگوں کو اطمینان نہ ہوجاوے اس کو امام بنانا مکروہ تحریمی ہوگا۔ اور اگر امام واقعہ نہیں جانتا تھا اس کو دھوکہ دیا گیا تھا تو اس کا کوئی قصور نہیں ہے اور نہ اس کے پیچھے نماز مکروہ ہے (۱)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

الجواب صحیح: سید احمد علی سعید

امرد صبیح کی تراویح میں امامت کا حکم:

میرے فرزند حافظ محمد آصف خان سلمہ کی عمر پندرہ سال ہے کیا وہ نماز تراویح کی جماعت پڑھا سکتا ہے۔

کم از کم کتنے سال کی عمر میں نماز تراویح کی جماعت پڑھا سکتا ہے۔

الجواب وباللہ التوفیق:

لڑکے کی عمر جب پندرہ سال پوری ہوجائے تو خواہ اور کوئی علامت بلوغت کی ظاہر نہ ہو جب بھی شریعت کے نزدیک بالغ تسلیم کیا جاتا ہے (۲) اور امامت کرسکتا ہے، ہاں اگر لڑکا امرد صبیح اور زیادہ حسین ہے یا دیکھنے میں کم سن معلوم ہوتا ہو (۳) اور مصلیوں میں کوئی دوسرا آدمی امامت کا زیادہ اہل موجود ہو تو اس کی امامت افضل ہے (۴)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

۱- ''لا یجوز للرجل أن یتزوج زوجۃ غیرہ وکذلک المعتدۃ'' کذا فی السراج الوھاج (فتاوی عالمگیریہ ۱/ ۲۸۰) ''وتجوز إمامۃ الأعرابی والأعمی والعبد وولد الزنا والفاسق''، کذا فی الخلاصۃ، إلا أنھا تکرہ ھکذا فی المعون (فتاوی عالمگیریہ ۱/ ۸۵) (مرتب)۔

۲- ''فإن لم یوجد فیھما شیئ فحتی یتم لکل منھما خمس عشرۃ سنۃ بہ یفتی'' (الدرالمختار مع ردالمحتار ۹/ ۲۲۵)۔

۳- ''وکذا تکرہ خلف أمرد الظاھر أنھا تنزیھیۃ أیضا، والظاھر أیضاً کما قال الرحمتی أن المراد بہ الصبیح الوجہ لأنہ محل الفتنۃ'' (ردالمحتار علی الدرالمختار ۲/ ۳۰۱) (مرتب)۔

۴- ''ھذا إن وجد غیرھم وإلا فلا کراھۃ'' (الدرالمختار مع ردالمحتار ۲/ ۳۰۱)۔

ڈاڑھی کتروانے والے کی امامت:

ڈاڑھی کتروانے والے امام کے پیچھے کیا نماز مکروہ ہوتی ہے کیا وہ فاسق کہلاتا ہے۔شرعاً اس کی کیا حیثیت ہے؟ بحوالہ کتب جواب سے نوازیں۔

الجواب وبالله التوفيق:

جوشخص ڈاڑھی منڈاتا ہے یا کترواکرایک مشت سے کم رکھتا ہے اس کے پیچھے نماز بکراہیت ادا ہو جاتی ہے "**لانه في الدر ويكره امامة عبد وفاسق**" (۱)،اور ڈاڑھی کا مسئلہ بہت اہم ہے،ڈاڑھی رکھنا سنت انبیاء ہے اور شعار اسلام میں داخل ہے حدیث شریف میں جو صحیحین میں ہے۔

"**احفوا الشوارب واعفوا اللحیٰ**" نیز مسلم شریف میں ہے:"**جزو الشواب واعفوا اللحی وخالفوا المجوس**" (شامی ۱۵۵/۲) (۲)۔

اور یہ سب حکم صیغہ امر کے ساتھ ہے جو وجوب کے لئے ہوتا ہے اور درمختار علی الشامی (ص ۱۵۵) میں ہے:"**وأما الأخذ منها وهي دون ذلک (ای القبضة) كما يفعله بعض المغاربة ومخنثة الرجال، فلم يبحه أحد وأخذ كلها فعل يهود الهند ومجوس الأعاجم**" (۳)،ان سب عبارتوں کا مفاد کم از کم اتنا ضرور نکلے گا کہ اس کے مرتکب کے پیچھے نماز بکراہت ادا ہو۔فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی،مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۵/۵/۱۴۰۳ھ

ڈاڑھی منڈانے کا حکم:

داڑھی کا منڈھانا کتنا گناہ ہے؟

مفتی حسن انصاری مقام گڈھی سیلم پور،مرادآباد

۱- البدعة خمسة أقسام باب الامامة ۳۷۶/۱ دار احیاء التراث،بیروت وکذا فی الہدایہ کتاب الصلاۃ باب الامامۃ ۱۲۲/۱،رشیدیہ،دیوبند۔

۲- مطلب فی الاخذ من اللحیۃ،باب ما یفسد الصوم ۱۱۳/۲،نیز روایات کی تخریج چند صفحات قبل گذر چکی ہے (مرتب)۔

۳- مطلب فی الأخذ من اللحیۃ،باب ما یفسد الصوم ۱۱۳/۲،دار احیاء التراث،بیروت وکذا فی المرقاۃ ۹۱/۲،باب السواک کتاب الطہارۃ۔

ڈاڑھی کی شرعی حیثیت اوراس سے متعلق چند مسائل:

۱-غیر شرعی داڑھی والے حافظ قرآن جو نماز کے باہر ٹخنہ سے نیچے پتلون بھی اکثر لٹکائے رہتا ہے، سینما بھی دیکھتا ہے، فوٹو بھی مستورات کی مجلسوں تک میں جا کر اتارتا ہو، نماز جماعت بھی اکثر چھوڑتا رہتا ہو، کا امام بن کر نماز فرض اور نماز سنت تراویح پڑھانا کیسا ہے برائے کرم قرآن وحدیث کی روشنی میں مع حوالہ جات کے تفصیلی جواب تحریر فرمادیں جو اشاعت بھی کیا جانے والا ہو۔

۲-ڈاڑھی کی شرعی حیثیت کیا ہے؟　　۳-ڈاڑھی کی شرعی مقدار کیا ہے؟

۴-ڈاڑھی شرعی مقدار سے کم وبیش رکھنا کیسا ہے؟　　۵-اور ایسے لوگوں کے بارے میں شرعی حکم کیا ہے؟

۶-غیر شرعی ڈاڑھی رکھنے والے کے پیچھے نماز فرض، نماز سنت تراویح ادا کرنا کیسا ہے، جبکہ شرعی ڈاڑھی والا شخص موجود ہو؟

۷-غیر شرعی ڈاڑھی والے کی اذان وتکبیر کہنا، نکاح پڑھوانا گواہی دینا کیسا ہے، جبکہ شرعی ڈاڑھی والے (خصوصاً اذان وتکبیر کہنے والے) موجود ہوں؟

ابراہیم یوسف باوا رنگون

الجواب وبالله التوفيق:

نوٹ: ہر نمبر کا جواب دینے سے پہلے بطور تمہید کے چند باتیں معروض ہیں اس سے مذکورہ نمبروں کا جواب آسانی سے ذہن میں آسکے گا۔

تمہید: بے شمار احادیث صحیحہ میں ڈاڑھی رکھنے کی اور مونچھ کٹانے کی بلکہ چھوٹی سے چھوٹی کر لینے کی بہت زیادہ تاکیدیں وارد ہیں اوراس کے خلاف کرنے پر سخت سخت مذمتیں وارد ہیں یہاں بطور نمونہ محض چند حدیثیں پیش کی جاتی ہیں، مثلاً بعض روایات صحاح میں ہیں: "اوفروا اللحي واحفوا الشوارب"(۱) بعض میں ہے: "أنهكوا الشوارب

۱-　عن ابن عمر قال: "قال رسول الله ﷺ: خالفوا المشركين، أو فروا اللحي، وأحفوا الشوارب، وفي رواية: انهكوا الشوارب، و أعفوا اللحي" باب الترجل، كتاب اللباس حدیث نمبر: ۴۴۲۱، مشكاة مع شرح الطیبی ۸/ ۲۴۷ والنسائی کتاب الطہارۃ ۱/ ۱۳-۱۵۔

واعفوا اللحى"(۱)،ان دونوں حدیثوں کا مفہوم یہ ہے کہ ڈاڑھی بڑھاؤ اور مونچھوں کو اس طرح چھوٹی کراؤ کہ جلد کھل کر صاف ہو جائے بعض روایات میں "**قصوا الشوارب واعفوا اللحى**"(۲) اور بعض روایات میں ان کلمات کے ساتھ: "**وخالفوا المشركين**" (۳) اور بعض میں: "**خالفوا زی الاعاجم**" (۴) اور بعض میں "**خالفوا زی المجوس**" ہے ،ان روایتوں کا مفہوم یہ ہے کہ مشرکوں اور غیر مسلم عجمیوں کی مشابہت نہ اختیار کرو، بلکہ اس کی مخالفت کرو۔

چنانچہ عجمیوں اور مشرکوں میں عموماً ان کا مذہبی شعار دیکھا جاتا ہے، ڈاڑھی مونڈانے اور مونچھ بڑھانے کا اور اسی اعتبار سے مونچھ کٹانے اور مٹانے کو اور ڈاڑھی بڑھانے کو اسلامی شعار قرار دیا گیا ہے (۵)۔ بعض روایات میں "**عشرة من الفطرة**"(۶) اور بعض میں "**خمس من الفطرة**"(۷) اور بعض میں "**من خصال الأنبياء**" اور تقریباً سب میں ڈاڑھی بڑھانے کو ضرور شمار کیا ہے، اور "فطرہ کے معنی جبلۃ سلیمہ (۸) کے ہیں، یعنی صحیح فطرت انسانی کا تقاضا بھی یہی ہے کہ مونچھیں ختم کی جائیں، یا کٹائی جائیں اور ڈاڑھی بڑھائی جائے، نیز بعض روایات صحاح میں اسی خصلت (مونچھ چھوٹی سے چھوٹی رکھنا یا بالکل کٹا دینا اور ڈاڑھی بڑھانا) کو فطرت انبیاء بتایا گیا ہے، جس کے معنی یہ ہیں کہ یہ خصلت تمام انبیاء علیہم السلام کی

۱- حوالہ مذکور۔

۲- مذکورہ حوالہ جات۔

۳- مشکاۃ کتاب اللباس باب الترجل ۸/ ۲۴۷۔

۴- ڈاڑھی اور مونچھ سے متعلق احادیث صحاح ستہ میں ان الفاظ میں وارد ہیں: "**خالفوا المشركين ووفروا اللحى واحفوا الشوارب**" (مشکوۃ حوالہ مذکور (مرتب)۔

۵- "**وقص اللحية من صنع الأعاجم وهو اليوم شعار كثير من المشركين كالافرنج والهنود ومن لا خلاق له في الدين من الطائفة القلندرية**" (مرقاۃ المفاتیح شرح مشکاۃ المصابیح ۲/ ۴)۔

۶- **عن عائشة قال: قال رسول الله ﷺ: "عشرة من الطفرة: قص الشارب، واعضاء اللحية، والسواک، والاستنشاق بالماء، وقص الاظفار وغسل البراجم و نتف الإبط وخلق العانة وانتقاص الماء"** (دیکھئے: سنن دارقطنی کتاب الطہارۃ ۱/ ۹۵، موسوعہ اطراف الحدیث ۵/ ۴۴۹)۔

۷- **عن أبي هريرة قال: "خمس من الفطرة"** الخ (دیکھئے: أوجز المسالک باب ماجاء في السنة في الفطرة، ۱۴/ ۲۲۳، مشکاۃ مع شرح الطیبی کتاب اللباس ۸/ ۲۴۶، ابوداؤد حدیث نمبر ۴۱۹۸، کتاب الترجل ۴/ ۸۴)۔

۸- "**كل مولود يولد على الفطرة ... والمعنى أنه يولد على نوع من الجبلة والطبع المتهئ بقبول الدين، عشر من الفطرة أي من السنة، يعني سنن الأنبياء عليهم السلام التي أمرنا أن نقتدي بهم**" (النہایۃ فی غریب الحدیث والأثر ۳/ ۴۵۷ باب الفاء مع الطاء، نیز دیکھئے: مرقاۃ المفاتیح شرح مشکاۃ المصابیح ۲/ ۴) (مرتب)۔

سنت اور طریقہ مسلوکہ ہے جو یقیناً محبوب عند رب العالمین شکل بھی ہے۔ انہی روایات کی بنا پر تمام فرق اسلامیہ کا سوائے بعض روافض وبعض خوارج کے سب کا یہ اجماعی مسئلہ ہے کہ یہ صورت (مونچھ) کٹی یا اس طرح صاف ہو کہ جلد (چمڑا) نمایاں ہو اور ڈاڑھی بڑھی ہوئی ہو اور یہ صورت اسلامی اور مذہبی شعار میں شمار ہے۔

یہ الگ بات ہے کہ ڈاڑھی کم سے کم کتنی لمبی اور بڑی ہو اور اس میں آپس میں کچھ ضمنی اختلاف ہے، مگر ڈاڑھی رکھنا واجب سب کے نزدیک بالاجماع ہے، بعض اصحاب ظواہر ظاہر نص کے اعتبار سے کٹوانے کی قطعاً اجازت نہیں دیتے بالکل چھوڑے رکھنے کو ضروری قرار دیتے ہیں، ایک قول حضرت امام احمد بن حنبل کا بھی یہی ہے، دوسرا قول دوسرے ائمہ کی طرح کچھ توسع کا ہے اور اس توسع کی بنا ان روایات پر ہے جن میں صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے مروی ہے کہ وہ اطراف لحیہ سے کچھ کٹوا کر لحیہ کو مرصع اور جمیل بنا لیتے تھے، اور حضور اکرم ﷺ کی لحیہ مبارکہ کے بارے میں صحاح میں حوالہ جات ہے کہ آپ ﷺ کی ڈاڑھی کثہ (گھنی) اور مسترسلہ (لٹکی ہوئی) اس طرح پر تھی کہ وہ پیچھے سے بھی نظر آتی تھی، اور اس کے معنی یہ ہیں کہ آپ ﷺ کی ڈاڑھی مبارک کے بال کٹ کر بالکل چھوٹے جلد سے لگے ہوئے، یا محض کھونٹی کی طرح ہوں، ایسے نہیں تھے، بلکہ مسترسل (لٹکے ہوئے) تھے، مگر ساتھ ہی حضرت ابن عمرؓ سے یہ بھی مروی ہے کہ کٹا کر ایک قبضہ (چار انگل کی مقدار) سے کم کرا لینے کو کسی صحابی نے بھی جائز نہیں قرار دیا ہے۔ کما فی رد المحتار ج ۲ ص ۱۱۴، (۱) یعنی ایک قبضہ (مشت) سے جو لوگ کم کرا لیتے ہیں اس کو کسی نے بھی جائز نہیں کہا ہے۔

اور حضور ﷺ کی لحیہ مبارکہ کے بارے میں صحاح میں ہے کہ آپ کی لحیہ مبارکہ (ڈاڑھی مبارک) کثہ (گھنی) اور مسترسلہ (دراز لٹکی ہوئی) (۲) اس طرح پر تھی کہ پیچھے سے بھی نظر آتی تھی، اس کے معنی یہ ہیں کہ آپ کی ڈاڑھی کے بال کٹ کر بالکل چھوٹے جلد سے لگے ہوئے یا محض کھونٹی کی طرح نہیں ہوتے تھے، بلکہ مسترسل لٹکے ہوئے تھے اور پیچھے سے بھی نظر آتے تھے اور اس کے معنی یہ ہوئے کہ کان کے نیچے بھی ڈاڑھی کے بال اتنے بڑے اور لمبے ہوتے تھے کہ شانہ مبارک کے اوپر سے بھی لٹکے ہوئے معلوم ہوتے تھے چاہے دو انگل ہو یا تین انگل ہو یا چار انگل ہو، مگر لٹکے ہوئے اور دراز ضرور ہوتے

۱- "وأما الاخذ منها و هي دون ذلک (ای القبضة) کما يفعله المغاربة و مخنثة الرجال فلم يبحه أحد" (الدر المختار مع رد المحتار ۳/۳۹۸) (مرتب)۔

۲- یہ لفظ کسی حدیث میں نہیں ملا، البتہ بخاری کی اس حدیث سے اس پر دلالت ہوتی ہے: "عن أبي معمر قال: قلنا لخباب أکان رسول اللہ ﷺ يقرأ في الظهر والعصر قال نعم، قلنا بما کنتم تعرفون ذاک قال: باضطراب لحيته" (صحیح بخاری مع فتح الباری ۲/۲۳۳، کتاب الأذان باب رفع البصر إلی الإمام فی الصلاۃ حدیث ۷۴۶) (مرتب)۔

تھے۔ اور اسی کے اندر اندر تمام ائمہ کا قول دائر ہے، جڑ سے ڈاڑھی کٹا دینے کا یا مونڈا دینے کا کسی کا مذہب نہیں ہے، اور پورے ڈاڑھ پر (یعنی نیچے کا جبڑا جس کی ہڈی پر نچلے دانت لگے ہوتے ہیں) اس پر جو بال ہوں وہ سب ڈاڑھی میں شمار ہیں اور اس پورے بالوں کا یہی حکم ہے، جو ابھی مذکورہ ہوا، کیونکہ حدیث پاک میں صیغہ امر کے ساتھ: "واعفوا اللحی، ارخوا اللحی" وغیرہ حدیثیں وارد ہیں اور صیغہ امر وجوب کے لئے ہونا مسلم ہے اور اس سے مراد وہی بال ہیں جو لحیین پر اُگے ہوتے ہیں (۱)۔

انہی روایات کی بناء پر حضرت امام ابوحنیفہ کا مذہب یہ ہے کہ پورے لحیین میں کہیں چار انگل سے کم مقدار بالوں کی کٹا کر نہ ہو، اور اس کی تائید مزید حضرت ابن عمرؓ کے اس اثر سے بھی ہوتی ہے جس کو فقہاء کرام ان لفظوں میں نقل کرتے ہیں، "وصح عن ابن عمر راوی هذا الحديث أنه كان يأخذ الفاضل عن القبضة (فقط إلى قوله، وأما الأخذ منها وهي دون ذلك (أي القبضة) كما يفعله المغاربة ومخنثة الرجال فلم يبحه أحد" (۲)۔

غرض ڈاڑھی مونڈانا زی اعاجم ومشرکین میں داخل ہو کر حرام ہے ہی، جیسا کہ اوپر مذکور ہوا اور ڈاڑھی اور مونچھ دونوں کے صفایا سے مخنثین کے مشابہ ہو کر مزید حرمت کا سبب اور باعث مذمت و باعث غضب خداوندی اور بغاوت عن قول الرسول علیہ السلام کے مشابہ ہوگا، جیسا کہ شیخ احمد نفراوی مالکی کی عبارت سے بھی معلوم ہوتا ہے جسکو وہ فقہ مالکی سے نقل کرتے ہوئے فرماتے ہیں: "فما عليه الجند في زماننا من أمر الخدم بحلق لحاهم دون شواربهم لا شك في حرمته عند جميع الأئمة لمخالفة لسنة المصطفى ﷺ ولموافقته لفعل الأعاجم والمجوس" (۳)۔

غرض زمانہ رسالت علی صاحبہا الصلاۃ والسلام سے لے کر برابر ڈاڑھی کے معاملہ میں اسی پر وجوباً عمل ہوتا چلا آ رہا تھا اور کتاب و سنت سے بھی یہی صورت متعین ہو کر اسلامی شعار متعارف ہے، مگر مسلمانوں کے اسباب زوال میں ایک سبب کہئے جو اپنے نحوست اعمال سے پیدا ہوئے کہ مغربی تہذیب سے متاثر ہو کر بعض خطہ کے لوگوں نے ڈاڑھی مونڈانا شروع کر دیا، پھر بعض علماء مستشرقین نے تہذیب مغرب زدگی سے متاثر ہو کر ڈاڑھی کی شرعی حیثیت ہی کو متبدل و متغیر کرنا شروع کر دیا، اور ڈاڑھی بالکل غیر شرعی چیز، بلکہ محض طبعی شئی قرار دینے لگے، اور اس معاملہ میں مکمل چھوٹ دینے لگے، یہاں تک کہ بہت

۱- "اللحية اسم لجميع من الشعر ما نبت على الخدين والذقن" (مجمع بحار الانوار ۴/۴۸۸) (مرتب)۔

۲- الدر المختار مع رد المحتار ۳/۳۹۸۔

۳- ڈاڑھی اور انبیاء کی سنتیں مصنفہ مولانا مفتی سعید احمد پالنپوری/۲۶۔

سے پڑھے لکھے ذی ہوش وذی علم حضرات اور بہت سے خطباء اور ائمہ مساجد بھی متاثر ہونے لگے-الامان والحفیظ-پھر یہ وبا ایشیاء میں غالباً سب سے پہلے مصر میں آئی پھر یہ وبا بلا بن کر اس قدر عام ہوگئی کہ عرب کے دیگر ممالک میں بھی عام طور سے پھیل گئی اور ایک سنت رسول علیہ السلام جو شعار کا درجہ رکھتی تھی وہ مردہ ہونے لگی اور حدیث پاک "**من ترک سنتي لم ينل شفاعتي**" (۱) اوکما قال علیہ السلام کے وبال میں مسلمانوں کو اس وبا نے مبتلا کر دیا اور ترک سنت رسول علیہ السلام کا وبال دنیا اور آخرت دونوں جگہ ذلت ورسوائی ونامرادی وناکامیابی ہے، جیسا کہ اس حدیث پاک سے معلوم ہوتا ہے: "**أبغض الناس إلى الله ثلاثة ملحد في الحرم ومبتغ في الإسلام سنة الجاهلية ومطلب دم امرئ مسلم بغير حق**"، رواہ البخاری (۲)، بلکہ ترک سنت گمراہی کے شہر کا دروازہ ہے، حدیث شریف میں ہے، موطا امام مالک میں مروی ہے، "**قال رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم تركت فيكم أمرين لن تضلوا ما تمسكتم بهما كتاب الله وسنة رسوله**" (۳)۔

ترجمہ:- یعنی نبی کریم علیہ السلام نے فرمایا ہے کہ میں تمہارے درمیان دو چیزیں چھوڑ کر جا رہا ہوں جب تک تم لوگ ان دونوں کے مطابق عمل کرتے رہوگے گمراہ نہ ہوسکوگے، ایک کتاب اللہ دوسرے سنت رسول اللہ، ظاہر ہے کہ جب سنت رسول علیہ السلام چھوڑ کر انسان گمراہی کے شہر میں داخل ہوجائے گا تو پھر جتنی بھی گمراہی وذلت ونکبت آوے کم ہے، **اللهم احفظنا من شرور أنفسنا ومن سيئات أعمالنا آمين**۔

اس تمہید کے بعد اب استفتاء کے اندر مندرجہ سوالوں کا جواب نمبروار مذکور ہے:

(۱) ڈاڑھی شرعی ومذہبی شعار ہے اس کی حفاظت کرنا اور اسکو نمایاں رکھنا شرعاً واجب ہے۔

(۲و۳) ڈاڑھی کی شرعی مقدار کم سے کم ایک قبضہ (مشت) ہے جو کم وبیش چار انگل ہوتی ہے اور اس کو برقرار رکھنا واجب ہے۔

(۴) ایسے لوگ واجب کے تارک اور اسلامی ومذہبی شعار کو پامال کرنے والے اور مٹانے والوں کے مشابہ ہوتے ہیں جو عند اللہ نہایت مبغوض ہیں اور انہی وجوہ سے ایسے لوگ عند اللہ فاسق شمار ہوتے ہیں، اور اسی وجہ سے ان کے پیچھے ایسے

۱- رد المحتار علی الدر المختار ۱/ ۲۲۰، کتب حدیث میں ان الفاظ میں کوئی حدیث نہ مل سکی، البتہ حضرت ابن عباسؓ سے منقول ایک حدیث میں یہ الفاظ مذکور ہیں: "**ومن نكث ذمتي لم ينل شفاعتي ولم يرد علي الحوض**" (مجمع الزوائد ۱/ ۱۷۲) (مرتب)۔

۲- صحیح بخاری مع فتح الباری ۱۲/ ۲۱۰، حدیث ۶۸۸۲، ...بغیر حق لیہریق دمہ (مشکوۃ ص ۲۷) (مرتب)۔

۳- موطا امام مالکؒ مع شرحہ تنویر الحوالک للسیوطی ۳/ ۹۳ (مرتب)۔

لوگوں کی نماز مکروہ ہوتی ہے جو شرعی شکل وصورت رکھنے کے ساتھ ساتھ امامت کے بھی اہل ہوں۔

(۵) جب شرعی ڈاڑھی رکھنے والے امامت کے اہل موجود ہوں یعنی قرآن پاک صحیح پڑھتے ہوں اور طہارت ونماز کے مسائل سے اچھی طرح واقف ہوں اور محتاط بھی ہوں تو ایسے شخص کے موجود ہوتے ہوئے غیر شرعی ڈاڑھی رکھنے والے کو امام نہیں بنانا چاہئے۔ ورنہ سب کی نماز بکراہت ادا ہوگی، اور کراہت کے اندر غلظت وشدت میں تفاوت ہو تو یہ الگ بات ہوگی، مثلاً ایک شخص ڈاڑھی مونڈانے کا عادی ہے اور قصداً مونڈا تا رہتا ہے اس کے پیچھے نماز پڑھنے سے کراہت تحریمی ہوگی اور اس کراہت میں غلظت وشدت باعتبار اس شخص کے پیچھے نماز پڑھنے سے زیادہ ہوگی جو مونڈا تا نہیں، بلکہ وہ کتا کر چھوٹی اور غیر شرعی رکھنے کا عادی ہے اور قصداً ایسا کرتا رہتا ہے پھر اس شخص کی اقتداء کرنے میں کراہت کے اندر غلظت وشدت زیادہ ہوگی باعتبار اس شخص کی اقتداء کے جو ایسا کرنے کا عادی نہیں، بلکہ کبھی کبھی بعض اتفاق سے اس سے ایسا ہو جاتا ہے، البتہ ایسے شخصوں کو بھی مستقل عہدۂ امامت دینا اور مستقل امام مقرر کرنا درست نہیں۔

اور اگر شرعی ڈاڑھی رکھنے والا اور امامت کا اہل موجود ہی نہ ہو تو اس وقت انہی میں سے جو زیادہ دیندار اور متبع سنت ہو اسی کو امام بنا کر نماز باجماعت پڑھ لیں جماعت ہرگز ترک نہ کریں، یہی حکم فرض وتر اور تراویح سب کے بارے میں ہے۔

اگر کسی مسجد کا مقرر شدہ امام غیر شرعی ہو، مگر ایسا فاسد العقیدہ ہونا معلوم نہ ہو جس کے پیچھے نماز نہ ہوتی ہو اور اس کا نصب وعزل بھی اپنے اختیار واستطاعت میں نہ ہو، یا کسی اجنبی جگہ پہنچ جائیں جہاں کا امام اسی قسم کا ہو اور نصب وعزل اپنے اختیار میں نہ ہو تو صبر کریں اور حدیث پاک: ''**صلوا خلف کل بر وفاجر** اوکما قال علیہ السلام'' (۱) کے حکم کے مطابق اس کے پیچھے پڑھ لیں جماعت ترک نہ کریں۔

اور اگر اصلاح کرنا چاہیں اور اصلاح کی توقع ہو جب بھی: ''**اذهبا إلى فرعون إنه طغى فقولا له قولاً لينا لعله يتذكر أو يخشى**'' (۲) کے اصول کو اور: ''**ادع إلى سبيل ربك بالحكمة والموعظة الحسنة وجادلهم بالتي هي أحسن**'' (۳) کے ضابطے کو ہمیشہ سامنے رکھیں اور کبھی اس کو نہ چھوڑیں اور کبھی ایسا طریقہ اختیار نہ کریں جو آپس کے نفاق وشقاق یا اختلاف ونزاع کا باعث بنے ہمیشہ ''**لست عليهم بمصيطر**'' (۴) کو بھی پیش نظر

۱- سنن الدارقطنی باب صفۃ من تجوز الصلوۃ معہ والصلوۃ علیہ ۲/۵۷ (مرتب)۔

۲- سورۂ طہٰ: ۴۴۔

۳- سورۂ نحل: ۱۲۵۔

۴- سورۂ غاشیہ: ۲۲۔

رکھیں۔

(۶) ایسے شخص کو موذن مکبر اور قاضی نکاح مقرر کرنا مذموم ومکروہ ہے باقی متشرع آدمی کے موجود رہتے ہوئے بھی ان کی دی ہوئی اذان وتکبیر سے جو نماز پڑھی جائے گی وہ بلا کراہت ادا ہو جائے گی (۱)، اسی طرح ایسے قاضی نکاح کا پڑھایا ہوا نکاح بھی بلا کراہت صحیح ونافذ ہو جائے گا۔

البتہ گواہی کے مسئلے میں یہ تفصیل ہے کہ جس گواہی میں محض تحمل شہادت کافی ہوتا ہے اس میں ان کا گواہ بنانا معتبر ومفید ہوگا، جیسے عقد نکاح کہ اس میں ان کا شاہد بنانا معتبر اور کافی ہے۔ کیونکہ یہ گواہی محض عقد نکاح منعقد ہونے کے لئے ہوتی ہے اور محض تحمل شہادت کے درجہ کی چیز ہوتی ہے اور انعقاد نکاح کے بعد صحت نکاح کے نفاذ یا بقاء کے لئے پھر ان شاہدوں کی ضرورت نہیں باقی رہتی، بلکہ شہرت عامہ وتسامع وغیرہ کافی ہو جاتی ہے، باقی یہ الگ بات ہے کہ اس میں بھی دیندار لوگوں کا گواہ بنانا اعلیٰ وافضل بات ہے (۲)، باقی جن معاملات میں تحمل شہادت کے ساتھ ساتھ ادائے شہادت بھی ضروری ہوتی ہے، جیسے رؤیت ہلال کے ثبوت کے لئے شہادت کہ اس میں تحمل شہادت اور ادائے شہادت دونوں چیزیں لازم ہوتی ہیں تو اس میں عادل ہونا یا کم از کم مستور الحال ہونا ضروری ہوتا ہے۔

عادل شریعت کی اصطلاح میں اس شخص کو کہتے ہیں جس کی صلاح زیادہ ہو اس کے فساد سے اور صواب غالب ہو خطا سے اور سلیم القلب ہو کما فی قاضیخان علی هامش الہندیہ (۲/ ۴۶۰) "**إن کان صلاحه أکثر من فساده وصوابه أغلب من الخطأ ویکون سلیم القلب یکون عدلاً تقبل شهادته**" (۳) قاضیخاں محض صاحب ترجیح ہی نہیں ہیں بلکہ صاحب تخریج بھی ہیں انہوں نے فساد زمانہ کے پیش نظر امام ابو یوسفؒ کی تحقیق کو قول مفتی بہ میں ترجیح دی ہے۔

چنانچہ فرماتے ہیں: "**وعن أبي یوسف إن کان الفاسق وجیهاً ذا مروة جازت شهادته؛ لأن مثله لا یکذب**" (۴)۔

۱- "ویکره أذان الفاسق ولا یعاد هکذا في الذخیرة" (فتاوی عالمگیریہ ۱/ ۵۴) (مرتب)۔

۲- "وشرط في الشاهد أربعة أمور الحریة والعقل والبلوغ والإسلام... ویصح (أي النکاح) بشهادة الفاسقین والأعمیین" (فتاوی عالمگیریہ ۱/ ۲۶۷ کتاب النکاح)، "الفسق لا یمنع أهلیة الشهادة عندنا فینعقد النکاح بحضرته، وإنما یمنع أداء الشهادة لتهمة الکذب" (فتاوی قاضیخان علی ہامش فتاوی عالمگیریہ ۲/ ۴۶۰) (مرتب)۔

۳- فتاوی قاضیخان علی ہامش فتاوی عالمگیریہ ۲/ ۴۶۰، "لأن غیر المعصوم لا یخلو عن قلیل ذنب فیعتبر فیه الغالب وعن أبي یوسف رحمه الله تعالی ..... لأن مثله لا یکذب" (مرتب)۔

۴- فتاوی قاضی خان بحوالہ بالا۔

اس کا حاصل یہ ہے کہ اگر کوئی شخص شرعی ضابطہ کے مطابق عادل ومستورالحال نہ ہو، لیکن ایسا باوجاہت اور ذی منصب وذی مروۃ ہو کہ جھوٹ بولنے کو اپنے منصب کے خلاف اور اپنی توہین سمجھتا ہو اور واقعۃ ایسا ہی ہو کہ اس سے کذب صادر نہ ہوتا تو اس کی بھی شہادت مقبول ومعتبر ہوگی، اسی طرح اگر مالی معاملات میں اتنا دیانت دار وصاف مشہور رہو کہ اپنے مالی نقصان کے باوجود بھی جھوٹ نہ بولتا ہو تو لایکذب کی علت کے اطراد سے اسکی بھی شہادت مقبول ومعتبر ہوگی۔

تصویر کشی کی شرعی حیثیت اور ترک جماعت پر وعید:

(۷) اس نمبر کا حکم شرعی بھی بعینہٖ نمبر ۵ کا حکم ہے، اور شرعی ڈاڑھی رکھنا اسلامی ومذھبی شعار ہونے کے ساتھ ساتھ واجب ہے، اس کو ہمیشہ مونڈانے یا کتا کر غیر شرعی بنانے یا بنوانے والا ترک واجب پر اصرار کرنے والا اور سنت انبیاء اور سنت جناب مصطفیٰ ﷺ کا مخالف ہوگا جو نہایت خطرناک معصیت ہوگی، پاجامہ یا پتلون یا تہبند قصداً ٹخنہ سے نیچے رکھنا احادیث پاک میں عجمی متکبروں کی خصلت فرمایا گیا ہے(۱) اور حدیث پاک میں فرمایا گیا ہے کہ جس کے قلب میں رائی کے دانہ کی دال کے برابر بھی کبر ہوگا وہ جنت میں داخلہ تو درکنار جنت کی خوشبو بھی نہیں پائے گا اور جنت کی خوشبو ایک ماہ کی مسافت تک پہنچتی ہے اس کا مطلب یہ ہوا کہ جس کے قلب میں ذرا بھی کبر کا شائبہ ہوگا وہ بھی جنت سے ایک ماہ کی مسافت کے فاصلہ سے بھی دور رکھا جائے گا(۲)۔

فوٹو خواہ دستی بنا ہوا ہو یا مشین یا کسی آلہ یا نگیٹیو وغیرہ کسی بھی ذریعہ سے بنا ہو سب کے اعتبار سے مطلقاً فرمایا گیا ہے: "أشد الناس عذابا یوم القیمة ألمصورون" او کما قال علیہ السلام (۳) اور ایک حدیث میں ہے کہ تصویر بنانے والے سے آخرت میں کہا جائے گا کہ تصویر تو بنائی اب اس میں روح بھی ڈال دو وہ روح نہیں ڈال سکے گا گرز گرز مارا جائے گا اور اس پر ہمیشہ ہمیشہ یہی عذاب ہوتا رہے گا (۴)، فالأمان والحفیظ ان وعیدوں سے فوٹو اتارنے کے گناہ و

۱- "عن ابن عمرؓ أن رسول اللہ ﷺ قال: لا ینظر اللہ إلی من جر ثوبه خیلاء" (صحیح مسلم کتاب اللباس حدیث ۲۰۸۵/۴۲) (مرتب)۔

۲- "عن عبد اللہ عن النبی ﷺ قال: لا یدخل الجنة من کان فی قلبه مثقال حبة من خردل من کبر، ولا یدخل النار من کان فی قلبه مثقال خردلة من إیمان" (سنن ابوداود ۵۹/۴ کتاب اللباس، باب ماجاء فی الکبر، حدیث ۴۰۹۱) (مرتب)۔

۳- صحیح مسلم کتاب اللباس حدیث ۲۱۰۹/۹۸۔

۴- "عن ابن عمرؓ أن رسول اللہ ﷺ قال: الذین یصنعون الصور یعذبون یوم القیامة یقال لهم: أحیوا ما خلقتم" (صحیح مسلم کتاب اللباس ۲۱۰۸/۹۷) "وفی روایة: من صور صورة فی الدنیا کلف أن ینفخ فیها الروح یوم القیامة ولیس بنافخ" (صحیح مسلم حدیث ۲۱۱۰/۱۰۰)۔

معصیت کا اندازہ ہوتا ہے اوراس کے مرتکب کی حیثیت شنیعہ بھی مفہوم ہوتی ہے اورترک جماعت بلاعذر شرعی کرنے والوں پر جووعید وعذاب ہے وہ بھی بے انتہا شدید ہے، اس میں سے ایک یہ بھی ہے کہ صحیح احادیث میں وارد ہے کہ سرکاردو عالم ﷺ نے فرمایا کہ جی میں آتا ہے کہ نوجوانوں کوحکم کروں کہ وہ جنگل سے لکڑیاں کاٹ کرلائیں اورترک جماعت کرنے والوں کے گھروں کوان لکڑیوں سے گھیر کرآگ لگادوں کہ وہ سب اسی میں جل کرخاک ہوجائیں، مگرعورتوں بچوں پر رحم آجانے سے چھوڑ دیتا ہوں (۱) یہ معمولی اظہارغصہ جناب نبی کریم ﷺ کا نہیں ہے، اس لئے ان قبیح عادات پر مشتمل انسان کی امامت کاادنی حکم وہ ہوگا جونمبر ۵ میں بتلایا گیا ہے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمدنظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبندسہارنپور ۵/۱۱/۱۴۰۰ھ

ڈاڑھی کی شرعی حیثیت:

۱۔ڈاڑھی رکھناواجب ہے یامستحب ہے ڈاڑھی منڈانے والااور کترانے والااوراس پراصرار کرنے والاشرعاً کیا حکم رکھتاہے ڈاڑھی کتروانے والے کی شہادت شرعاً جائز ہے یا کہ نہیں؟

۲۔رسول ﷺ اورصحابہ اورتابعین کا کیاعمل رہاہے، کیاان کاعمل ہمارے واسطے موجب عمل ہے یا کیاہے؟

۳۔کیارسول اللہ ﷺ کا اورصحابہ کاعمل ہمارے واسطے موجب اتباع ہے، جبکہ ڈاڑھی رکھنے کے متعلق آپ نے فرمایاہےایک مٹھی کی مقدارپرڈاڑھی رکھناواجب ہے یا کہ نہیں اس سے کم ڈاڑھی رکھنےوالے کی شہادت مقبول ہے یا کہ نہیں فقہاء کامقدارقبضہ کومتعین کرنااوراس سے کم ڈاڑھی والے کومردودالشہادت کہنایہ فقہاء کاقول امرمنکرنا قابل ہے یا کیا، اور ڈاڑھی والے کے متعلق یہ کہنا کہ یہ بے ایمان ہیں جائز ہے یا کہ نہیں یا کہناحرام ہے۔

الجواب وباللہ التوفیق:

ڈاڑھی اسلامی شعارمیں سے ایک شعار ہے، حضوراکرم ﷺ اورصحابہ وتابعینؒ اورتمام اصحاب خیرالقرون میں

۱- ''عن أبي هريرةؓ أن رسول اللہ ﷺ قال: والذي نفسي بيده لقد هممت أن آمر بحطب فيحطب ثم آمر بالصلوة فيؤذن لها ثم آمر رجلاً فيؤم الناس ثم أخالف إلى رجال فأحرق عليهم بيوتهم والذي نفسي بيده لو يعلم أحدهم أنه يجد عرقاً سميناً أو مرماتين حسنتين لشهد العشاء'' (صحیح بخاری مع فتح الباری ۲/۱۲۵ حدیث ۶۴۴)، حافظ ابن حجرؒ نے لکھا ہے: ''فقوله في رواية المقبري: لو لا ما في البيوت من النساء والذرية، يدل على أنهم لم يكونوا كفاراً'' (فتح الباری ۲/۱۲۷)۔

سے کسی کا بھی ڈاڑھی رکھنا محض عادت کے طور پر یا محض طبعی نہیں تھا، بلکہ شرعی حکم ہونے کی حیثیت سے تھا اس پر ہنسنا یا اسکا مذاق اڑانا بڑی ہی خطرناک بات ہے، یہ سب یورپ کی پیداوار ہے، احادیث صحیحہ کثیرہ سے اس کا وجوب ثابت ہے اور محض امت مسلمہ ہی کا شعار نہیں ہے، بلکہ تمام انبیاء سابقین علی نبینا علیہم الصلوۃ والسلام کا شعار اور ان سب کی سنت ہے یہ علماء کی من گڑھت بات یا اختراع نہیں ہے۔

ڈاڑھی منڈانا یا چار انگلی کی مقدار سے کم رکھنا اور اس پر اصرار کرنا فسق ہے، اس سے آدمی اللہ اور رسول کے نزدیک فاسق مردود الشہادۃ ہو جاتا ہے حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنھما کا قول ہے کہ ڈاڑھی ایک قبضہ سے کم نہ رکھنا چاہئے، تمام صحابہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کا اس مقدار کی سنت پر اجماع ہے اور اجماع صحابہ خود بھی ایک حجت شرعی ہے، ڈاڑھی مذہبی شعار کے ساتھ ساتھ ایک صحیح فطرۃ انسانی بھی ہے (۱)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

الجواب صحیح محمود غفی عنہ

ڈاڑھی منڈانے کو جائز سمجھنا:

یہاں مسلمان ڈاڑھی منڈانا جائز سمجھتے ہیں یہاں تک کہ بڑی بڑی مساجد کے امام وخطیب بھی داڑھی منڈاتے ہیں جب ان سے سوال کیا جاتا ہے تو کہتے ہیں کہ یہ ضروری نہیں ہے ایک سنت ہے اور پہلے فرائض کی پابندی ضروری ہے اور اللہ تعالیٰ صورتوں کو نہیں نیتوں کو دیکھتا ہے اگر دل میں رسولؐ اور اللہ کی محبت ہے اور فرائض کی پابندی کرتے ہیں تو بس ہے براہ کرم اس پر بھی تفصیلی روشنی ڈالئے۔

الجواب وباللہ التوفیق:

قطعا ڈاڑھی منڈانا قطعا ناجائز ہے، بہت سی صحیح احادیث میں اس کے رکھنے کا حکم وجوب کے صیغہ کے ساتھ ہے، مثلاً فرمایا گیا ہے: "جزوالشوارب واعفوا اللحی" (۲) یعنی مونچھوں کو جڑ سے کاٹو اور ڈاڑھی کو بڑھاؤ یہ حکم رسول اللہ

۱- ڈاڑھی کے وجوب سے متعلق روایات وآثار چند صفحات قبل تخریج وتحقیق کے ساتھ گذر چکے ہیں، وہاں ملاحظہ کرلیا جائے (مرتب)۔

۲- اس حدیث کی تخریج گذر چکی ہے (مرتب)۔

ﷺ ہے اوراس کا امتثال واجب اورضروری ہے، باطن کے ساتھ ظاہر کی بھی اصلاح اوراس کا مطابق شرع کے ہونا ضروری ہے، پھر جب یہ لوگ بھی سنت سمجھتے ہیں تو ترک سنت پر جو وعید ہے اس کو بھی انہیں سامنے رکھنا چاہئے حدیث پاک میں ہے: "من ترک سنتی لم ینل شفاعتی" أو کما قال (۱) یعنی سنت ترک کرنے والا شفاعت سے محروم رہے گا اور یہ محرومی معمولی محرومی نہ ہوگی۔ اللہ تعالیٰ سب کو اتباع سنت کی توفیق مرحمت فرمائیں، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

صفوں میں کجی ہو تو امام کا مصلی کہاں ہو:

مسجد کے صحن میں کجی اکثر آجاتی ہے بائیں طرف بڑھ جاتا ہے اس صورت میں صحن میں جماعت ہو تو مصلی محراب کے سامنے بچھایا جائے یا کہ جہاں جماعت کا بیچ ہو۔

الجواب وباللہ التوفیق:

مسجد کے صحن میں کجی آجانے کے سبب سے باہر جماعت کرنے کے وقت مسجد کا اندرونی محراب وسط صف میں نہیں آتا ہے تو امام صحن میں اسی جگہ کھڑا ہو جہاں پہلی باہری صف کا وسط واقع ہو (۲)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۱/۸/۱۴۰۴ھ

امام کو مصلی پر امامت کے لیے کب کھڑا ہونا چاہئے؟

۱- ہمارے یہاں ایک جماعت اقامت میں حی علی الصلوۃ پر کھڑی ہوتی ہے اور کچھ لوگ اس کو ناجائز سمجھ کر سختی سے مخالفت کرتے ہیں حتی کہ مخالفین نے اشتہار چھپوا کر تقسیم بھی کیے ہیں۔

۱- ان الفاظ کے ساتھ حدیث نہیں مل سکی، البتہ حضرت ابن عباسؓ سے منقول ایک حدیث میں یہ الفاظ مذکور ہیں: "ومن نکث ذمتی لم ینل شفاعتی ولم یرد علی الحوض" (مجمع الزوائد ۱/۱۷۲) (مرتب)۔

۲- "وینبغی للإمام ان یقف بازاء الوسط فان وقف فی میمنة الوسط او فی میسرته فقد اساء لمخالفته السنة" (عالمگیری ۱/۸۹، مکتبہ رشیدیہ پاکستان) (مرتب)۔

اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ اس مسئلہ کا ثبوت احادیثِ کریمہ یا شرح احادیث یا کتبِ فقہ سے بھی ہے یا نہیں؟

مسئلہ حی علی الصلوۃ کے عاملین مشکوۃ شریف وشرح مرقات واشعۃ اللمعات اور فتاوئ عالمگیری وشرح وقایہ کی عبارت حتی کہ امام ابوحنیفہؒ کا مذہب حوالہ میں پیش کرتے ہیں، آیا ان کتب معتبرہ کے حوالہ جات صحیح ہیں یا نہیں؟ اگر صحیح ہیں تو اس کو نا جائز سمجھنے والے اور امام ابوحنیفہؒ کا مذہب نہ ماننے والے ازروئے شرع وہ حضرات کیا حکم رکھتے ہیں؟

۲-مخالفین فرماتے ہیں کہ علما فرنگی محل کے نزدیک اقامت میں حی علی الصلوۃ پر کھڑا ہونا جائز نہیں ہے، کیا واقعی ان کا قول صحیح ہے؟ اگر صحیح ہے تو حضرت مولانا عبدالحیؒ فرنگی محلی کا شرح وقایہ جلد اول میں حاشیہ پر اس کے جواز پر دلیل لکھنا اور عدمِ جواز کو مکروہ جاننا کیا معنی رکھتا ہے؟

الجواب وبالله التوفيق:

جب امام اور سب مقتدی مصلے پر پہلے سے اس طرح موجود ہوں کہ یا تو صف بھی سیدھی کر چکے ہوں یا صف سیدھی کرنے میں دیر نہ لگے گی اور تکبیر تحریمہ کی فضیلت فوت نہ ہوگی تو ادب یہ ہے کہ لوگ حی علی الصلوۃ پر کھڑے ہوں، قد قامت الصلوۃ پر یا اس کے بعد معاً نماز کا تحریمہ بندھ جائے۔

ادب کا مطلب یہ ہے کہ اس کے پہلے اگر کھڑے ہو جائیں تو مکروہ یا برا نہ ہو، مستحق عتاب ونکیر نہ ہوگا۔

فقہاء نے اس مسئلہ کو اسی ادب کے موقع میں لکھا ہے۔

چنانچہ صاحب ''تنویرالابصار'' اور اس کی شرح ''درمختار'' میں اس طرح ہے: **"والآداب تركه لايوجب إساءة ولا عتاباً كترك سنة الزوائد، لكن فعله أفضل، نظره إلى موضع سجوده حال قيامه، إلى قوله والقيام لإمام وموتم حين قيل: حي على الفلاح إن كان الإمام بقرب المحراب وإلا فيقوم كل صفٍ ينتهي إليه الإمام على الأظهر، وإن دخل من قدام قاموا حين وقع بصرهم عليه"** (۱)۔

اسی عبارت کا یہ جملہ: ''**إن كان الإمام بقرب المحراب**" مفہوم بالا کا پورا پتہ دیتا ہے، اس کا حاصل یہ ہوا کہ

۱- الدرالمختار ۱/ ۴۴۶، و ۴۴۷ کتاب الصلوۃ۔

صرف جواز میں کلام نہیں، لیکن اس کو واجب اور ضروری قرار دینا کہ جو پہلے کھڑا ہو جائے اس پر نکیر یا طعن وتشنیع کی جائے جیسا کہ اس پر اصرار کرنے والے کرتے ہیں، بیجا جائز ہے۔

اور اگر امام قرب محراب موجود نہ ہو اور نماز پڑھانے کے لیے پیچھے سے آئے تو جس صف میں آئے اس صف کے لوگ کھڑے ہوتے جائیں اور اگر سامنے سے آئے تو جس وقت لوگوں کی نظر امام پر پڑے اور سمجھ لیں کہ جماعت کرانے آرہے ہیں تو امام پر نظر پڑتے ہی سب لوگ کھڑے ہو جائیں، جیسا کہ عبارتِ بالا کے اس جملہ ''**والافیقوم کل صف الخ**'' سے معلوم ہوتا ہے۔

اور اس میں حکمت یہ ہے کہ فوراً کھڑے ہو جانے میں امام کے مصلے پر پہنچنے تک صفیں سیدھی ہو کر تکبیر اولی میں امام کی معیت بھی مل جائے گی، اور یہی طریقہ جو فقہ کی مذکورہ بالا عبارت میں مذکور ہے جناب سرکار دو جہاں ﷺ کی تعلیمات اور صحابہ کرامؓ کے عمل میں ملتا ہے، کتب صحاح حدیث اور غیر صحاح جیسے مسلم شریف، ابو داؤد شریف، اور مصنف عبد الرزاق وغیرہا میں ایسا ہی معمول ملتا ہے، جیسا کہ بذل المجہود (جلد ۱، ص ۳۰۷) میں دفعِ تعارض بین الروایات کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"ویجمع بأن بلالا کان یراقب خروج النبي ﷺ فأول ما یراه یشرع فی الإقامة قبل أن یراه غالب الناس، ثم إذا رأوه قاموا فلا یقوم فی مکانه حتی تعتدل صفوفهم۔

قلت: ویشهد له ماروا ه عبد الرزاق عن ابن جریج عن ابن شهاب: إن الناس کانوا ساعة یقول المؤذن: الله أکبر، یقومون للصلوٰة، فلا یأتي النبي ﷺ مقامه حتیٰ تعتدل صفوفهم الخ"۔

ان ہی احادیث وروایات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت بلال حضور ﷺ کے نکلنے کے منتظر ومراقب رہتے تھے جیسے ہی حجرۂ مبارک سے پردہ اٹھا اور اندازہ ہوا کہ جماعت کرانے تشریف لا رہے ہیں فوراً تکبیر شروع فرما دیتے تھے اور لوگ بھی کھڑے ہو کر صف سیدھی کرنے میں مصروف ہو جاتے یہ نہیں ہوتا تھا کہ آپ ﷺ حجرۂ مبارک سے نکل کر آکر مصلے پر بیٹھ جائیں، اس کے بعد مکبر تکبیر شروع کرے اور پھر اس کے بعد آپ ﷺ اور دوسرے لوگ کھڑے ہوں جیسا کہ آج کل کے بدعتی لوگ کرتے ہیں یہ ان کا من گھڑت طریقہ اور خلاف سنت ہے۔

ہاں یہ ضرور ہے کہ جب تک سرکار دو جہاں ﷺ جماعت کرانے کے لئے نہ نکلتے اس وقت تک لوگ بیٹھے رہا کرتے اور انتظار فرماتے۔

شروع زمانہ میں بعض مرتبہ لوگ پہلے ہی سے کھڑے ہو کر انتظار کرنے لگے تو اس سے روکا گیا، جیسا کہ ابو داؤد شریف کی روایت: "إذا أقيمت الصلوٰة فلا تقوموا حتىٰ تروني" (۱) سے معلوم ہوتا ہے، یعنی "فلا تقوموا منتظرين للصلوٰة" (۲)۔

اور یہیں سے یہ مسئلہ بھی نکلتا ہے کہ اگر کوئی شخص مسجد میں آئے اور ابھی جماعت میں کچھ دیر ہے یا امام ابھی نہیں آیا ہے یا مکبر نے بغیر امام کی موجودگی کے تکبیر شروع کردی ہے تو کھڑے کھڑے انتظار نہ کرے کہ یہ فعل مکروہ ہے بیٹھ جائے اور بیٹھ کر منتظرِ صلوٰۃ ہو اور اسی کو مولانا عبدالحی صاحب فرنگی محلی علیہ الرحمۃ نے یا عالمگیری وغیرہ نے لکھا ہے۔

اس تفہیم وتشریح کے بعد تمام روایات فقہیہ وحدیثیہ آپس میں منطبق اور احناف کا صحیح مسلک واضح ہوجاتا ہے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

محراب کی تعیین اور در مسجد کا حکم:

محراب سے مراد کیا ہے؟ کیا مسجد کی ہر در میں جو محراب کنار رہتا ہے جس میں لوگ آتے جاتے ہیں محراب کی تعریف میں آتا ہے؟ یا صرف پچھلی دیوار کے درمیان منبر کے قریب جو محراب بنی رہتی ہے صرف وہی محراب ہے وضاحت فرمائیں اور یہ بھی واضح کریں کہ منبر کے قریب کی محراب کے علاوہ مسجد کی دوسری در میں اگر امام کھڑا ہو کر نماز پڑھا رہا ہو اس کے صحن میں مقتدی کھڑے ہوں تو اس میں شرعاً کوئی ممانعت تو نہیں ہے۔

خادم مشتاق احمد (محمد پور صدر اعظم گڑھ)

الجواب وبالله التوفيق:

قبلہ کی دیوار میں بالکل بیچو بیچ میں جو محراب نما بنایا جاتا ہے وہ مراد ہے تاکہ امام کے دونوں طرف صفوں کی مقدار برابر رہے، پس اس محراب کو چھوڑ کر اور جگہ یا کسی اور در میں کھڑے ہونے سے اگر امام کے دونوں جانب کی صفیں برابر نہ رہیں

۱- ابو داؤد ۱/۸۰۔

۲- شرح ابو داؤد شریف۔

کم وبیش ہوجائیں تو کراہت تحریمی کا ارتکاب لازم آئے گا(۱) اسی طرح اگر کسی در (محراب نما) کے اندر امام کھڑا ہو اور سب مقتدی باہر یا صحن میں کھڑے ہوں تو اگرچہ تعادل طرفین حاصل ہو مگر اساءت ہوگی اور کراہت کو منجر ہوگی، ورنہ کوئی حرج نہ ہوگا(۲)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۵/۳/۱۴۰۱ھ

امام کا تنہا محراب میں کھڑا ہونا:

بہت سی مساجد کی تعمیر اس طرح ہوتی ہے کہ پہلی صف کے اندر ہی دیوار قبلہ سے متصل ممبر ہوتا ہے اور دیوار قبلہ سے محراب کا مدور حصہ دیوار قبلہ سے تین چار بالشت آگے باہر کو نکلا ہوا ہوتا ہے عام طور پر مصلی مذکورہ پہلی صف میں بچھایا جاتا ہے اور جماعت کے وقت مقتدیوں کی صفِ اول اس کے بعد ہوتی ہے جو درحقیقت دیوار قبلہ سے صفِ ثانی ہوتی ہے، مگر عموماً جمعہ، عیدین بارش وغیرہ کے وقت نمازیوں کے ازدہام و کثرت اور جماعت خانہ میں جگہ کی قلت کی بنا پر امام کا مصلی ذرا آگے کو محراب کے اندر کردیا جاتا ہے بایں طور کہ امام تو جماعت کے وقت خارج محراب کھڑا رہتا ہے، لیکن اس کا سجدہ محراب کے اندر واقع رہتا ہے اور مقتدی دیوار قبلہ سے متصل ممبر والی صفِ اول میں امام سے ڈھائی تین بالشت پیچھے کھڑے ہوجاتے ہیں جس کی بنا پر زیادہ تعداد میں لوگ جماعت میں شریک ہوسکتے ہیں۔

ایک صاحب جو دینی جماعت کے ذمہ دار سمجھے جاتے ہیں، انہوں نے یہ مسئلہ بتایا کہ دیوار قبلہ سے متصل ممبر والی صفِ اول مذکور میں جماعت کے ساتھ نیز بغیر جماعت کے انفرادی طور پر دونوں صورتوں میں فرض، واجب، سنت نفل کوئی بھی نماز پڑھنا قطعاً ناجائز اور حرام ہے جس سے اجتناب کلی بھی ضروری ہے ان کی یہ بات موجب نزاع بنی ہوئی ہے۔

الجواب وباللہ التوفیق:

حرمتِ قطعیہ کے ثبوت کے لیے دلیلِ قطعی اور صریح ہونا ضروری ہے، اس لیے قطعاً حرام کہنے والے شخص سے دلیل

۱- ''السنة أن يقوم في المحراب ليعتدل الطرفان ولو قام في أحد جانبي الصف يكره'' (ردالمحتار علی الدر المختار ۲/۳۱۰، ۳۱۴) (مرتب)۔

۲- ''وقيام الإمام في المحراب لا سجوده فيه'' (الدرالمختار مع ردالمحتار ۲/۳۱۴) نیز اس مسئلہ میں فتح القدیر ۱/۳۵۹ کی بحث بھی دیکھی جاسکتی ہے (مرتب)۔

قطعی وصریح کا مطالبہ ہوگا اگر وہ پیش نہ کر سکے تو اس کی بات قابل اعتناو التفات بھی نہ ہوگی، اس لیے کہ مسئلہ اس طرح نہیں ہے جس طرح حرام قطعی کہنے والا شخص کہتا ہے، بلکہ مسئلہ اس طرح ہے کہ امام تنہا بالکل محراب کے اندر کھڑا ہو اور مقتدیوں میں سے کوئی اس امام کے ساتھ محراب کے اندر نہ ہو تو بلا ضرورت اس طرح کھڑا ہونا مکروہ ہے اور اگر امام کا نصف قدم بھی محراب کے باہر ہو تو اگر چہ سجدہ وغیرہ سب محراب کے اندر ہو تو قطعاً مکروہ نہیں ہے، بلکہ بلا کراہت جائز ہے اور یہ مسئلہ فقہ کی کتب معتبرہ میں عام طور سے مذکور ہے (۱)۔

اور یہاں یہی صورت ہے کہ امام محراب سے باہر کھڑا ہو جاتا ہے، لہٰذا یہ کھڑا ہونا بلا کراہت درست رہے گا۔

یہ شبہ نہ کیا جائے کہ محراب کا مدور حصہ قبلہ کی اور دیواروں کے اعتبار سے تین چار بالشت آگے باہر کو نکلا ہوا ہے، لہٰذا وہ تمام حصہ مسجد سے خارج ہو گیا اور امام و مقتدی کا مکان الگ الگ اور مختلف ہونے کی وجہ سے اقتدا درست نہیں ہوگی، اس لیے کہ یہ شبہ وارد نہیں ہوتا، کیونکہ فقہاء محققین نے تصریح کی ہے کہ محراب کا یہ حصہ بھی حیز مسجد اور داخل مسجد ہی شمار ہوتا ہے، مسجد سے خارج شمار نہیں ہوتا، لہٰذا اختلاف مکان امام و ماموم کا وہم بھی غلط ہو گیا۔

اب رہا مقتدیوں کا صف اول میں امام سے صرف ڈھائی تین بالشت پیچھے کھڑا ہونا، یہ عمل چونکہ محض نمازیوں کے ازدحام و کثرت اور جماعت خانہ میں جگہ کی قلت کی وجہ سے ہوتا ہے، اس لئے یہ صورت بھی بلا کراہت جائز رہے گی، مثلاً محولہ عبارت میں بھی آگے جا کر تصریح ہے: **"وإضافة المكان فلا كراهة، وفي الدر المختار على الطحطاوي"** (ص ۴۳): **"وهذا كله عند عدم العذر كجمعة، وعيد، فلو قاموا على الوقوف والإمام على الأرض أو في المحراب لضيق المكان لم يكره، لو كان معه بعض القوم في الأصح، وبه جرت العادة في جوامع المسلمين"** (۲)۔

علاوہ ازیں فقہاء کرام نے تصریح کی ہے کہ ازدحام وغیرہ کے وقت میں سجدہ بجائے راہوں پر کرنے کے اگلی صف کے مصلیوں کی پشت پر کرنا بلا کراہت جائز ہے، بلکہ خود اپنی ران پر بھی اپنا سجدہ کر لینا ایسی بھیڑ میں بلا کراہت جائز ہے،

۱- "وكره قيام الإمام في المحراب لاسجوده فيه وقدماه خارجه، لأن العبرة للقدم مطلقاً، "قال الشامي": وكذا سواء كان المحراب من المسجد كما هو العادة المستمرة أولا كما في البحر" (فتاویٰ شامی کتاب الصلوٰۃ ۱/ ۴۳۴) "ويكره قيام الإمام في المحراب لاقيامه خارجه وسجوده فيه" (حاشیۃ الطحطاوی علی مراقی الفلاح کتاب الصلوٰۃ/ ۳۹۴) (مرتب)۔

۲- درمختار کتاب الصلاۃ باب مایفسد الصلاۃ وما یکرہ فیہا ۲/ ۴۱۵، طبع دار الکتب العلمیہ بیروت (مرتب)۔

جیسا کہ درمختار (۱) وشامی وغیرہ میں ہے، حالانکہ ان صورتوں میں سجدہ کی بعض سنتیں بھی چھوٹ جاتی ہیں، مگر چونکہ جماعت کی فضیلت اتنی زیادہ ہے اور جماعت اتنی اہم چیز ہے کہ شریعتِ مطہرہ نے اس کی تحصیل کے لیے اتنی چھوٹ دیدی پھر سوال میں ذکر کردہ صورت میں تو ان سنتوں کا ترک بھی لازم نہیں آتا ہے، اس لیے یہ صورت بدرجہ اولی اور بلا کراہت جائز رہے گی۔

رہ گیا یہ شبہ کہ مذکورہ صورت میں امام کے بائیں جانب اگر چہ پہلی صف میں بھی کہیں انقطاع تو واقع نہ ہو، لیکن امام کے دائیں جانب کم از کم پہلی صف میں ممبر کے حائل ہونے کی وجہ سے انقطاع صف لازم ہے اور یہ انقطاع بھی باعثِ کراہت ہوسکتا ہے یہ شبہ نہ کیا جائے، اس لیے کہ (شامی ۱/ ۳۸۳) میں تصریح موجود ہے کہ ممبر کی حیلولت انقطاع صف شمار نہیں کیا جاتا ہے، ''کما قال: ویعلم منه بالاولیٰ أن مثل مقصورة دمشق إلی قوله، فلا ینقطع الصف''۔

عربی کی پوری عبارت بوجہ طوالت درج نہیں کی قارئین حضرات خود دیکھ لیں (۲)۔

(۱) اس عبارت کے دیکھنے سے یہ بات بھی واضح ہوجاتی ہے کہ پہلی صف وہی شمار ہوگی جو امام کے پیچھے قدم کی دیوار کے قریب تر صورت مسئلہ میں ہوگی۔

(۲) صف اول کی جگہ میں بھی جماعت کے وقت کے علاوہ فرض، واجب، سنن ونوافل وغیرہ سب نمازیں بلا کراہت جائز ہیں، اس لیے کہ مسجد بنائی ہی اس لیے جاتی ہے کہ اس میں نماز وغیرہ عباداتِ مقصودہ کی جائیں، جیسا کہ احادیثِ صحیحہ میں موجود ہے، پس مسلمان جس جگہ چاہے مسجد کے اندر نماز ادا کرسکتا ہے اس کو روکنا جائز نہیں ہوگا، ''الا العارض''، مثلاً جماعت کا وقتِ مقررہ ہوچکا ہے اور کوئی محراب میں یا کسی ایسی جگہ پڑھنا چاہے جہاں پڑھنے سے جماعت قائم نہ ہوسکے تو کہا جائے گا کہ بھائی یہاں مت پڑھو وہاں جا کر پڑھ لو، مسجد کے اندر نماز پڑھنے سے روکنا خطرناک وعید کی زد میں آتا ہے، قال

۱- ''وإن سجد للزحام علی ظهر مصل صلاته التي هو فیها جاز للضرورة إلی قوله بل علی غیر الظهر کالفخذ ین للعذر'' (الدرالمختار علی الشامی کتاب الصلوۃ ۱/ ۳۳۸) (مرتب)۔

۲- پوری عبارت اس طرح ہے: ''فعلی هذا اختلف في الصف الأول، هل هو ما یلي الإمام من داخلها، أم مایلي المقصورة من خارجها؟ فأخذالفقیه بالثاني توسعة علی العامة کیلا تفوتهم الفضیلة، ویعلم منه بالأولیٰ أن مثل مقصورة دمشق التي هي في وسط المسجد خارج الحائط القبلي یکون الصف الأول مایلي الإمام في داخلها وما اتصل به من طرفیها خارجا عنها من أول الجدار إلی آخره، فلا ینقطع الصف بینائها، کما لاینقطع بالمنبر الذی هو داخلها فیما یظهر'' (کتاب الصلوۃ، شامی ۱/ ۳۸۳) (مرتب)۔

تعالیٰ: "ومن أظلم ممن منع مساجد الله أن يذكر فيها اسمه"(۱)،غرض صفِ اول میں بھی اگر جماعت کاوقت ابھی نہ ہوا ہو یا ہو چکا ہو، مگر اس طرح پڑھ رہا ہے کہ اس کی وجہ سے جماعت میں تنگی وغیرہ کوئی خلل واقع نہ ہوگا تو بھی پڑھ سکتا ہے اور اس کو پڑھنے کو حرام قطعی کہنا، بلکہ مسجد کے کسی حصہ میں نماز پڑھنے کو حرام قطعی کہنا سخت اور خطرناک قسم کی جرأت ہے۔فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

امام کا محراب کے اندر کھڑا ہونا:

امام صاحب عصر اور مغرب کی نماز مسجد کے برآمدہ میں ادا کرتے ہیں اور امام محراب کے اس قدر اندر ہوتے ہیں کہ بالکل نظر نہیں آتے بعض مقتدی کہتے ہیں، اس صورت میں امام صاحب کا اندر کھڑا ہونا، جبکہ باہر جگہ بھی ہے مکروہ ہے، امام صاحب کہتے ہیں کہ اس میں کوئی کراہت نہیں۔

الجواب وبالله التوفيق:

برآمدہ میں جماعت ہونے کی صورت میں کم از کم امام کا آدھا قدم برآمدہ کے حصہ میں ہونا چاہئے، تاکہ اختلاف فقہاء سے بچا رہے، ورنہ اسائت وکراہت سے خالی نہ ہوگا، اور اصلاح لازم رہے گی۔فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

۱-مقتدی کا فرض یا واجب چھوٹ جانا:

اگر مقتدی کا کوئی واجب یا فرض جماعت میں غلبۂ نوم سے یا ضعفِ بصارت سے ترک ہو جاوے تو کیا اس مقتدی کو نماز کا اعادہ کرنا ہوگا۔

۲-امام کا دوبارہ نماز پڑھنا اور مقتدی کو منع کرنا:

اگر عصر کی نماز کسی وجہ سے امام صاحب دوبارہ پڑھیں تو اس جماعت کے کسی بھی مقتدی کو اعادہ کی ضرورت نہیں

۱- سورۂ بقرہ: ۱۱۴۔

ہے، بلکہ اور لوگ شامل ہوں یہ مسئلہ کچھ سمجھ میں نہیں آتا ہے، ایک امام نے جب دوبارہ نماز پڑھی تو ان نمازیوں میں سے کسی کو بھی شامل نہ کیا گیا، البتہ اور آنے والے لوگوں کو مقتدی بنا کر جماعت ہوئی۔ آخر یہ مسئلہ کس طرح ہے؟

الجواب وبالله التوفيق:

ا-ہاں مقتدی کو اعادہ کرنا ہوگا (۱)۔

۲-بعض صورتیں ایسی ہوتی ہیں کہ مقتدی کی نماز ہو جاتی ہے اور امام کی نہیں ہوتی ممکن ہے یہی صورت رہی ہو اگر امام عالم بالمسائل اور متدین ہو تو اعتماد کیا جاوے ورنہ پھر خود اس سے معلوم کرلیا جاوے، پریشان ہونے کی کیا بات ہے (۲)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

مسبوق کے تکبیر تحریمہ کہہ کر بیٹھنے سے قبل امام نے سلام پھیر دیا:

اگر کوئی شخص مسجد میں آ کر وضو کر کے امام کے ساتھ شریک ہونا چاہتا تھا اور امام صاحب قعدۂ اخیرہ میں تھے جب وہ شخص آیا اور نیت ابھی باندھ ہی چکا تھا کہ امام نے سلام پھیر دیا، تو آیا اب یہ نیت توڑ کر دوبارہ تکبیر تحریمہ کہہ کر نماز پڑھے گا یا اسی پہلی تکبیر تحریمہ ہی پر نماز کی بناء کرے گا اور یہ شخص قعدہ میں امام کے ساتھ شریک نہ ہو سکا تھا۔

الجواب وبالله التوفيق:

حرم صلوٰۃ میں داخلہ تکبیر تحریمہ سے ہوتا ہے، لقوله عليه السلام: **"تحريمها التكبير وتحليلها التسليم أو كما قال عليه السلام"(٣)، وكما قال في شرح التنوير:"قال في الحلية عند قول المنية: ولا دخول**

ا- "إن المؤتم لو قام ساهياً في القعدة الأولى يعود ويقعد، لأن القعود فرض عليه بحكم المتابعة حتى قال في البحر ظاهره أنه لو لم يعد تبطل صلاته لترك الفرض "(ردالمحتار علی الدرالمختار ۲/ ۱۶۶) (مرتب)۔

۲- تفصیل کے لئے دیکھئے: ردالمحتار علی الدرالمختار ۲/ ۳۴۰۔

۳- السنن للترمذی ۱/ ۳۲۔

فی الصلوٰۃ إلا بتکبیرۃ الافتتاح" (۱) جب اس نے تحریمہ نماز اللہ اکبر کہہ کر باندھ لیا تو حرم صلوٰۃ میں داخل ہوگیا اور اس کا تحریمہ منعقد ہوگیا، اور اس کو بحکم، "لا تبطلوا أعمالکم" باطل نہ کرے اور نہ توڑے اور اسی پر اپنی نماز پوری کرے۔

گفتگو جو کچھ ہے صحت اقتداء میں ہے، صحت اقتداء کے لیے منجملہ اور شرائط کے مشارکۃ فی الرکن بھی ہے، درمختار باب الامامۃ میں شرائطِ اقتداء گناتے ہوئے کہتے ہیں: "ومشارکته فی الأرکان" (۲)، اور یہ مسلم ہے کہ تحریمہ یا تکبیر تحریمہ رکن صلوٰۃ نہیں ہے، بلکہ صرف شرط ہے، محض اتصال بالارکان کی وجہ سے تمام شرائط وارکان ملحوظ ہوتے ہیں۔ پس محض تحریمہ باندھنے سے ابھی مشارکۃ رکن متحقق نہیں ہوئی تھی کہ امام نے سلام پھیر دیا، تو صحتِ اقتداء کی شرائط کہاں پائی گئیں کہ صحت اقتداء کا حکم بھی ہو جائے اور رکن سے مراد رکن اصلی ہے، چنانچہ اسی متن کے تحت علامہ شامیؒ فرماتے ہیں: "أی فی أصل فعلها أعم من أن یأتی بها معه أو بعده لا قبله إلا إذا أدرکه إمامه فیها (الی قوله) فیصح لوجود المتابعة التی هی حقیقة الاقتداء" (۳)۔

پھر دوسری جگہ مطلب "مهم فی تحقیق متابعة الامام" کے تحت فرماتے ہیں: "قال فی شرح المنیة: لاخلاف فی لزوم المتابعة فی الأرکان الفعلیة إذهي موضوع الاقتداء" الخ (۴)۔ پھر طویل ونفیس بحث کے بعد فرماتے ہیں: "والحاصل أن المتابعة فی ذاتها ثلاثة أنواع: مقارنة لفعل الإمام مثل أن یقارن إحرامه لإحرام إمامه لرکوعه وسلامه لسلامه، ......ومعاقبة لإبتداء فعل إمامه مع المشارکة فی باقیة، ومتراخیة عنه، فمطلق المتابعة الشامل لهذه الأنواع الثلاثة یکون فرضاً فی الفرض وواجباً فی الواجب، وسنة فی السنة عند عدم المعارض أو عدم لزوم المخالفة" (۵)۔ اور جہاں جہاں مشارکۃ فی الارکان کی مثال دیتے ہیں قیام کو چھوڑ کر رکوع کی مثال دیتے ہیں، اس لیے کہ رکوع رکنِ اصلی اور لازم ہے اور قیام ویسا نہیں ہے۔ چنانچہ نوافل بعذر میں قیام ساقط ہو جاتا ہے اور بغیر عذر بھی بیٹھ کر پڑھ لینے کی اجازت ہے، بخلاف اور ارکان (رکوع، سجود، قعود) کے، اس لیے محض قیام کی مشارکۃ کو شرائط انعقادِ اقتداء میں کافی نہیں سمجھا گیا ہے، اور اس وجہ سے جمہور علماء کے

۱- ردالمحتار ۱/ ۴۴۷۔
۲- الدرمختار مع الشامی ۱/ ۳۷۰ باب الامامہ۔
۳- فتاویٰ شامی ۱/ ۲۷۰، باب الامامۃ۔
۴- شامی ۱/ ۲۱۶۔
۵- شامی ۱/ ۳۱۷۔

نزدیک (جو محض سلام اول سے خروج مانتے ہیں)، اگر کوئی شخص السلام کے بعد ''علیکم'' سے قبل بھی امام کو پائے تو اقتدا صحیح نہیں ہوتی، اور صلوٰۃ امام کو پانے والا نہیں مانتے۔

بعض علماء کے نزدیک (جو دونوں سلام سے خروج عن الصلوٰۃ مانتے ہیں) اگر کوئی سلام اول کے بعد سلام ثانی سے قبل امام کو پائے، یعنی قعدہ میں بیٹھ جانے سے امام کو پانے والا مان لیتے ہیں، ''**کما اشار إلیه لفظ أدرکه فی عبادته**'' (۱)۔

''**قوله مرتین الخ هو الأصح وقیل: الثانیة سنة کما فی الفتح، ثم الخروج عن الصلوٰة بسلام واحد عند العامة، وقیل: لهما کما فی مجمع الأنهر، فلو اقتدیٰ به بعد لفظ السلام الأول قبل علیکم لایصح عند العامة، وقیل: إن أدرکه بعد التسلیمة الأولیٰ قبل الثانیة فقد أدرکه مع الصلوٰة الخ**''۔ اور یہیں یعنی ''قبل الثانیۃ'' کی قید سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جب سلام ثانی بھی پھیر دے اور کوئی امام کو پائے تو کسی کے نزدیک اقتدا صحیح نہیں ہوگی، اور یہاں یہی صورت ہے، جیسا کہ سوال کی خط کشیدہ عبارت سے معلوم ہوتا ہے۔

لہٰذا صورت مسئولہ میں کسی کے نزدیک اقتدا صحیح نہیں ہوگی، بخلاف اس کے کہ اگر کوئی شخص امام کے سلام اول کے علیکم کے میم کہنے سے قبل امام کو پا گیا، خواہ قعدہ میں نفس قعود ہی کرلیا تو بھی امام کو پا گیا، اور اقتدا بالاتفاق سب علماء کے نزدیک صحیح ہوگئی۔

اور ثمرۂ اختلاف یہ نکلے گا کہ اختلافی صورتوں میں اگر کوئی شخص بناء کرے اور اقتداء کے طور پر نماز پڑھ لے تو وجوب اعادہ کا حکم نہ ہوگا، مگر عبادتِ مفروضہ کا یہ معاملہ ہے، اس لیے احتیاط اولیٰ ہے، تاکہ ادائیگی فرض بالقطع والیقین ہوجائے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور
الجواب صحیح سید احمد علی سعید مفتی دارالعلوم دیوبند

۱- وکمافی الطحطاوی ۱۳۷/۱، ۱۳۸۔

باب الوتر والتراویح والسنن

وتر میں شافعی امام کی اقتداء:

۱-میرے کیمپ کی مسجد میں شافعی مسلک کے امام نماز پڑھاتے ہیں کچھ مقتدی حنفی مسلک کے بھی ہیں رمضان کے مہینہ میں امام کے پیچھے نماز وتر پڑھنا کیسا ہے، جبکہ نماز وتر میں دو بار امام نیت باندھتے ہیں دو رکعات پڑھنے کے بعد سلام پھیرتے ہیں۔ پھر ایک رکعت کی نیت باندھتے ہیں، تیسری رکعت کے رکوع کے بعد کھڑے ہو کر دعا بھی مانگتے ہیں۔ اگر امام کے پیچھے نماز وتر پڑھنا جائز ہے تو حنفی مقتدمین دو رکعات پوری کرنے پر سلام پھیریں گے کہ نہیں اور تیسری رکعت میں رکوع کے بعد کھڑا ہو کر دعا مانگے کہ نہیں؟

شفیع احمد اعظمی

الجواب وباللہ التوفیق:

۱-شافعی مسلک کے امام صاحب ظاہر و متبادر یہی ہے کہ باب طہارت میں حنفی مسلک کی رعایت فرماتے ہوں گے، کیونکہ ائمہ اربعہ کے نزدیک مجمع علیہ ترجیح یہی ہے، اس لئے ایسے امام شافعی مسلک کے ہوں جب بھی ان کی اقتداء میں نماز تراویح و نماز فرض دونوں بلا کراہیت درست ہوگی۔ البتہ وتر میں یہ تفصیل ہے کہ اگر دو رکعت پر سلام قطع پھیر کر پھر صرف ایک رکعت کی نیت کرتے ہوں تو وتر کی نماز ان کے پیچھے نہیں پڑھ سکتے، بلکہ اپنی وتر الگ، خواہ اکیلے ہی پڑھنی پڑے الگ ہی پڑھیں، اس لئے کہ حنفیہ کے نزدیک کوئی نماز محض ایک رکعت نہیں اور حدیث شریف میں محض ایک رکعت پڑھنے سے منع فرمایا ہے۔

اور اگر وہ امام صاحب بھی تین رکعت وتر کی بہ یک سلام پڑھیں تو وتر بھی ان کے پیچھے پڑھ لینا بہتر ہوگا۔ اور تین رکعت وتر بیک سلام پڑھنا بھی ان کے نزدیک جائز ہے، اس لئے مطلقا مخالفت نہیں ہے، بلکہ ممانعت ان کے اس عمل کے

تابع ہے جب وہ وتر مذکورہ فی السوال صورت سے پڑھیں (۱)۔فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

وتر کی ایک رکعت نہ ہونے کی وجہ:

وتر کی تنہا ایک رکعت نہ ہونے کیا وجہ ہے؟

فتح محمد کشمیری (بمقام شاہ پورہ ضلع بارہ مولہ کشمیر)

الجواب وباللہ التوفیق:

احادیث میں اسی طرح وارد ہے اور تین رکعت والی روایت زیادہ قابل ترجیح ووثوق ہے (۲)۔فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۵/۱۰/۱۴۰۱ھ

بیس رکعات تراویح کا ثبوت:

دو مسئلوں میں بعض حنفی مسلک رکھنے والے شکوک و پریشانی میں مبتلا ہیں، جواب احادیث کے ساتھ مرحمت فرمائیے!

حضور سرور کائنات ﷺ نے نماز تراویح کی کتنی رکعتیں پڑھی اور پڑھائی ہیں؟ حضرت عائشہ صدیقہؓ کی حدیث کہ حضور رمضان وغیر رمضان میں ۱۱ر رکعت مع وتر کے پڑھتے تھے۔

اس حدیث کے تحت اہل حدیث حضرات آٹھ رکعت تراویح کو حضور ﷺ کی سنت تسلیم کر کے ۲۰ر رکعات

۱- ”وصح الإقتداء فيه (الوتر) ففي غيره أولى إن لم يتحقق منه ما يفسدها في اعتقاده في الأصح كما بسطه في البحر بشافعي مثلاً لم يفصله بسلام لا إن فصله على الأصح فيهما (الدر المختار) على الأصح فيهما أى في جواز أصل الإقتداء فيه بشافعي وفي إشتراط عدم فصله“ (رد المحتار علی الدر المختار ۲/ ۴۴۴ نیز دیکھئے: البحر الرائق ۲/ ۶۸، ۶۹) (مرتب)۔

۲- تفصیل کے لئے دیکھئے: (مرقاۃ المفاتیح شرح مشکاۃ المصابیح ۳/ ۲۰ اوما بعدہا باب الوتر) (مرتب)۔

پڑھنے والوں کو تارکِ سنت اور بدعتی کہتے ہیں، اور دلیل یہ ہے کہ حضرت امیر المومنین عمر فاروقؓ نے جب تراویح کی جماعت قائم فرمائی اور حضرت ابی ابن کعبؓ کو امام مقرر فرمایا تھا تو انہوں نے ۱۱ر رکعت پڑھائی ہے۔

حنفی مسلک والے حضرات امام ابوحنیفہؒ کی روایت پر جو ۲۰ر رکعت پڑھتے ہیں، وہ خود حنفی اکابر علماء دیوبند کے نزدیک ضعیف ہے، حوالہ میں بحر العلوم استاذ علامہ انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ کا ارشاد نقل کیا ہے، عبارت یہ ہے:

”وأما النبي صلى الله عليه وسلم ،فصح عنه ثمان ركعاتٍ، وأما عشرون ركعة، فهو عنه بسندٍ ضعيفٍ وعلىٰ ضعفه اتفاق“ (العرف الشذی)۔

اور شیخ الحدیث مولانا زکریا صاحب کاندھلویؒ نے اپنی کتاب ”اوجز المسالک“ (۱ر۲۹۷) میں لکھا ہے کہ بیس رکعات تراویح جو حضرت ابن عباس سے مروی ہیں وہ عندالمحدثین مجروح اور ضعیف ہے۔

براہ کرم واضح مدلل جوابات مرحمت فرما کر تشنگی کو دور فرمادیں، تاکہ انتشار ختم ہوجائے؟

الجواب وباللہ التوفیق:

نماز تراویح اس خاص نماز کا نام ہے جس کو سرورِ کائنات ﷺ نے ایک سال رمضان المبارک میں صرف ۳ر راتوں میں ناغہ دے دے کر پڑھا ہے۔

پہلی بار رات کے ابتدائی حصہ میں صرف تہائی رات تک پڑھا، پھر ناغہ دے کر ایک رات میں آدھی رات پڑھا، پھر ناغہ دے کر ایک رات میں قریب قریب ساری رات پڑھا۔

پھر جب صحابہ کرامؓ کو عام طور سے علم ہوا تو بہت سے صحابہ جمع ہوگئے اور ساری رات مسجد میں حضور ﷺ کا انتظار فرمایا۔ مگر حضور ﷺ تشریف نہیں لائے اور بعد میں فرمایا کہ تم لوگوں کے جمع ہونے کا مجھے علم تھا، مگر مجھے خطرہ ہوگیا کہ کہیں یہ نماز فرض نہ ہوجائے اور آنے والی امت پر بار نہ بنے، اس لیے تمہارے مجتمع ہونے کے باوجود میں نہیں آیا۔

یہاں تک یہ واقعہ متفق علیہ عندالکل ہے، اس کا کوئی منکر نہیں ہے، لہٰذا اس خاص نماز کا تعلق حضرت عائشہ صدیقہؓ کی روایت سے بالکل نہیں ہے۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ تو سرکار دو جہاں ﷺ کے رمضان وغیر رمضان میں رات کے اندر نفل وسنت کا جو روزمرہ کا اور عام معمول تھا اس کو بیان فرماتی ہیں، اور وہ بھی اپنا دیکھا ہوا بیان فرمارہی ہیں، نہ کہ آپ ﷺ کے تمام معمولات کا استقصاء فرمارہی ہیں۔

اس لئے عائشہ صدیقہؓ کی مراد نہ تو آٹھ رکعات میں تحدید کرنے کی ہوسکتی ہے اور نہ اس سے کم اور زیادہ کی نفی کرنی ہوسکتی ہے۔

اس روایت سے ۲۰ رکعات تراویح کی نفی پر استدلال کرنا بے محل اور ناواقفیت کی علامت ہوگی۔ غرض جب فرض ہوجانے کا خطرہ ختم ہوگیا تو صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین اپنے اپنے طور پر اور اپنی ذاتی معلومات کے مطابق پورے رمضان میں مختلف رکعات پڑھتے تھے۔

لہٰذا ان حضرات کے مختلف رکعات پڑھنے سے بھی ۲۰ رکعات تراویح کے مدعا میں کوئی خلل واقع نہ ہوگا، کیونکہ اس اختلاف کا مدار ان کی اپنی اپنی ذاتی رائے پر ہے، نہ کہ کسی بنیادی و حتمی حکم پر ہے۔

پھر جب آپ کے وصال کے بعد فرض غیر فرض سے اور واجب غیر واجب سے خوب متمیز ہوگیا اور خلط و اختلاط کا اندیشہ جاتا رہا تو حضرت عمر فاروقؓ نے اس خواہش رسول ﷺ کو جو خاص ان ۳ راتوں میں پڑھنے کا باعث بنی تھی رائج فرما کر الگ پڑھنے والوں کو بیس رکعات میں جو اصل تعداد تھی منضبط کر کے سب کو ایک نماز با جماعت میں منسلک کردیا اور حضرت ابی بن کعبؓ کو ان کی امامت کے لیے مقرر کردیا اور حضرت ابی ابن کعب ۲۰ رکعات تراویح پڑھانے لگے، پھر اسی پر تمام حضرات صحابہ کا اجماع ہوگیا۔

یہی نہیں، بلکہ جمہور علماء کا یہی معمول و مسلک ہوگیا، چنانچہ ائمہ اربعہ بھی اسی ۲۰ رکعات پر مجتمع ہیں، ان میں سے کسی امام کے نزدیک رکعات تراویح ۲۰ سے کم نہیں ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ ۲۰ رکعات تراویح کا ثبوت اجماع صحابہؓ سے ہے، جمہور علماء امت کا ۲۰ پر اتفاق کرنے سے ہے اور ائمہ اربعہ کے بیس رکعات پر مجتمع ہونے سے ہے اور یہ تینوں چیزیں ان معترضین کے نزدیک حجت ہیں اور حق ہونے کی دلیل ہیں۔

یہیں سے یہ بات معلوم ہوگئی کہ مصنف ابن ابی شیبہ کی روایت کی سند کا ضعف یا حضرت ابن عباس کی روایت کی سند کا ضعف بیس رکعات تراویح کے مدعا میں مضر یا مخل نہیں ہوسکتا، کیونکہ مدار ان روایات پر ہے ہی نہیں، بلکہ مدار ان اجماعات پر ہے۔

اسی طرح یہیں سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ ان خاص تین راتوں میں جناب نبی کریم ﷺ نے بیس رکعات ضرور پڑھائی تھی، کیونکہ اگر ایسا نہیں ہے تو ان اجماعات کا خلاف واقعہ اور کذب پر ہونا لازم آئے گا، اور یہ نہیں ہوسکتا، کیونکہ یہ

صریح اور صحیح حدیث: "**لا یجتمع أمتي علی ضلالة**" (۱) کے خلاف ہوگا اور یہ باطل ہے۔

اسی طرح یہ کہنا کہ الگ الگ پڑھنے والوں کو جب حضرت عمر فاروقؓ نے ایک جماعت میں منسلک کردیا اور ان پر حضرت ابی ابن کعبؓ کو امام مقرر کیا تو انہوں نے امام ہوکر مع وتر کے صرف گیارہ ہی رکعات پڑھائیں یہ بالکل غلط ہے اور دعویٰ بلا دلیل ہے۔

اگر ایسا کہنے والوں کو اصرار ہو تو صحیح سند کے ساتھ اس کے ثبوت پر دلیل لانا ہوگا اور یہ لا نہیں سکتے: "**هاتوا برهانكم إن كنتم صادقين في دعواكم، ولن تأتوا به أبداً**"۔

اور ۲۰ رکعات تراویح پڑھنے والوں کو تارکِ سنت اور بدعتی کہنا بڑا ہی خطرناک جملہ ہے، ایسا کہنے والوں کو اپنا انجام سوچنا چاہئے، اس لیے کہ ۲۰ رکعت تراویح کے اس اجماع میں خلفاء راشدین اور عشرہ مبشرہ اور اجل فقہاء سب ہی ہیں۔ اور ان حضرات کی تو بڑی شان ہے، تمام صحابہؓ کی توثیق وفضیلت اور ان کے محبت وحق ہونے کی دلیل پر خود قرآنِ پاک ناطق ہے، بلکہ ان کے اس وصف سے متصف ہونے پر اور ان کے بابصیرت ہونے پر امت کو متنبہ اور آگاہ کرنے کا حکم ہے مثلاً: "**قل هذه سبيلي ادعوا إلى الله على بصيرة أنا ومن اتبعني**" (۲) **وغير ذلک من الآيات**"۔

پھر احادیث صحیحہ بھی بہت سی اس پر دال ہیں مثلاً:

"**عليكم بسنتي وسنة خلفاء الراشدين المهديين، تمكسوا بها وعضوا عليها بالنواجذ**" (۳)۔

اور مثلاً "**أصحابي كالنجوم بأيهم اقتديتم اهتديتم وغير ذلک**" (۴)۔

اور علماء حق کا متفقہ مقولہ ہے: **أصحابي كلهم عدول**، پس ایسی خطرناک بات کہنے والا سوچے کہ بات کہاں تک پہنچتی ہے۔

اس معترض کے جملہ سے کس کس کلام کا جھوٹا وکاذب ہونا لازم آتا ہے، العیاذ باللہ پھر جب یہ اساطین امت تارک سنت وبدعتی اور اہل ضلال ہوں گے تو پھر دنیا میں کون متبع سنت اور اہل حق میں سے ہوگا؟

"**أللهم احفظنا من شرور أنفسنا ومن سيئات أعمالنا واهدنا سبل السلام آمين**"۔

۱- مشکوۃ باب الاعتصام بالکتاب والسنۃ ۱/ ۳۳۸ مع شرح الطیبی طبع ادارۃ القرآن والعلوم الاسلامیہ، کراچی پاکستان۔

۲- سورۂ یوسف: ۱۰۸۔

۳- مشکوۃ کتاب الایمان باب الاعتصام الکتاب والسنۃ حدیث نمبر ۱۶۵ مع شرح الطیبی، رواہ احمد ابوداؤد الترمذی وابن ماجہ ۱/ ۳۳۰۔

۴- مشکوۃ مع شرح الطیبی کتاب المناقب باب مناقب الصحابۃ رواہ رزین عن عمر بن الخطابؓ ۱۱/ ۲۱۸۔

غرض ایسے جملے بڑے خطرناک ہیں، اس سے باز رہنا اور توبہ کرنا لازم ہے، اور اگر مزید تفصیل دیکھنی ہو تو مصابیح التراویح اور رالرای انجح اور بیس رکعات تراویح مؤلفہ ابوالمآثر حضرت مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی دیکھیں اور اس کا رد کسی رسالہ میں نظر آئے تو مؤلف موصوف کا جواب الجواب دیکھیں، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

رکعات تراویح کا صحیح عدد ایک قدیم حدیثی مسئلہ کی تنقیح وتشریح:

۱-بعض مسلمانوں کا خیال ہے کہ حضور اکرم ﷺ رمضان المبارک میں صرف آٹھ رکعات تراویح پڑھتے تھے، جبکہ دوسروں کا کہنا ہے کہ حضرت عمرؓ نے لوگوں سے بیس رکعات تراویح پڑھنے کو فرمایا صحیح واقعات کون سے ہیں؟

۲-جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ ہمارے نبی ﷺ نے آٹھ رکعات تراویح پڑھیں اور باجماعت تراویح ادا کرنے سے روکا، ان کا یہ نظریہ ہے کہ نبی کریم ﷺ کے عمل کا ہماری رہنمائی کو موجود ہونے کی وجہ سے حضرت عمرؓ کا حکم منسوخ ہو جانا چاہئے، مہربانی فرما کر مندرجہ بالا بیانات پر اپنی رائے اور اپنا نظریہ اور حکم بتائیں۔

حضور ﷺ نے تراویح کی نماز کس طرح پڑھی؟

۳-سمجھا جاتا ہے کہ ہمارے نبی ﷺ نے پہلی تین راتوں میں تراویح مسجد میں پڑھی یہ تراویح کی نمازیں علیحدہ علیحدہ پڑھی گئیں یا جماعت کے ساتھ؟

۴-یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ہمارے نبی ﷺ نے بعد کو اپنے گھر میں تراویح پڑھی، انہوں نے رکعات کس تعداد میں پڑھیں، اس بارے میں رائیں مختلف ہیں، براہ کرم اس پوزیشن کی توضیح کیجئے اور ماخذ کا حوالہ بھی دیں۔

الجواب وباللہ التوفیق:

(۱،و۲) یہ خیال صحیح نہیں، متفق علیہ بات صرف اتنی ہے کہ ایک سال جناب نبی کریم ﷺ نے رمضان المبارک میں صرف تین شب میں ناغہ کے ساتھ ایک نئی نماز جماعت کے ساتھ ادا فرمائی، جس کو قیام رمضان سے تعبیر فرمایا گیا ہے، پہلی شب میں ثلث رات تک، دوسری شب میں نصف رات تک، تیسری رات میں صبح صادق کے قریب تک، چوتھی شب میں بھی تمام صحابہؓ مسجد میں ساری ساری رات انتظار میں جمع رہے اور آپ تشریف نہیں لائے، صبح کو ارشاد فرمایا کہ مجھے تم لوگوں کا

انتظار میں جمع رہنا معلوم ہے، مگر ڈرا کہ مبادا یہ نماز امت پر فرض ہوجائے اور امت اس پر قابو نہ پائے، بلکہ بار گذرے، اس لئے میں نہیں آیا، پھر اس کے بعد علماء میں اختلاف ہوا کہ وہ نماز کتنی رکعتیں تھیں، بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ نئی نماز بیس رکعت تھی، چنانچہ جمہور علماء کا یہی خیال ہے اور اسی بناء پر آپ کے بعد جب فرضیت کا خطرہ ختم ہوگیا تو صحابۂ کرامؓ اپنے اپنے طور پر پورے رمضان میں بیس رکعت، بلکہ بعض صحابہؓ اس سے زائد بھی پڑھتے رہے، اور بعض علماء کا یہ خیال ہے کہ وہ نماز صرف آٹھ رکعت تھی، اگرچہ یہ روایت صحاح کی ہے، مگر یہ خیال کمزور ہے کہ اس کا منشاء حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی وہ روایت ہے جس میں فرماتی ہیں کہ حضور علیہ السلام نے رمضان وغیر رمضان میں کبھی آٹھ رکعت سے زیادہ نہیں پڑھیں، مگر اس روایت میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا حضور علیہ السلام کا پورے سال بھر کا تہجد کی نماز کا معمول بتلا رہی ہیں، نہ کہ وہ نئی نماز جس کو سرکار دو عالم علیہ السلام نے صرف تین شب پڑھ کر بند فرمادیا اور جس کو قیام رمضان سے تعبیر فرمایا گیا۔

اور اگر آٹھ رکعت والی روایت کو اسی کے لئے تسلیم کرلیا جائے، حالانکہ جمہور صحابہؓ کا معمول حضور علیہ السلام کے بعد ہمیشہ آٹھ رکعت سے زائد پڑھنے کا تھا تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ وہ روایت منسوخ ہے، جن صحابہؓ کو اس کے نسخ کا علم نہ ہوا وہ آٹھ رکعت پڑھتے رہے، اگر وہ منسوخ نہ ہوتی تو جمہور صحابہ کا یہ معمول نہ بنتا، چنانچہ ائمہ اربعہ میں سے کسی کے نزدیک تراویح بیس رکعت سے کم نہیں ہے، بلکہ حضرت عمر فاروقؓ نے تو صرف جماعت میں منسلک فرمادیا ہے۔ یہ نئی نماز کی تعداد ایجاداً نہی کی ہے، **"ھکذا فی مؤطا امام مالک والشامی والفتح والبحر وغیر ذلک"**۔

یہیں سے یہ بات بھی واضح ہوگئی کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے حکم کو منسوخ کہنا صحیح نہیں ہے، منسوخ ناسخ سے مقدم ہوتا ہے نہ کہ موخر، حضرت عمرؓ کا یہ طریق عمل یقیناً حضور علیہ السلام کے عمل سے مؤخر ہے، بلکہ اس پر منسوخ کا لفظ بولنا علماء کی اصطلاح سے ناواقفیت کی دلیل ہے، اسی طرح ایسا نظریہ رکھنے والوں کی یہ بھی کم علمی اور ناواقفیت کی دلیل ہے کہ حضور علیہ السلام نے تراویح باجماعت پڑھنے سے روکا ہے، بلکہ حقیقت وہ ہے جو شروع جواب میں مذکور ہوئی اور وہ عنوان تو پڑھنے کی ترغیب کا اور خود نہ پڑھنے کی دلیل کے بیان کرنے کا ہے۔

(نوٹ) اگر مزید تحقیق اور سیر حاصل بحث دیکھنی مقصود ہو تو اردو رسالہ (رکعات تراویح) مصنفہ حضرت مولانا ابو المآثر محمد حبیب الرحمٰن اعظمی کا مطالعہ فرمائیں۔ اور اگر کوئی اس کا ردیا جواب پیش کردہ از جانب مولانا سلیمان اعظمی پیش کرے تو پھر مولانا کا جواب الجواب بھی ضرور دیکھئے۔ انشاء اللہ قاطع نزاع اور کافی ووافی ہوگا۔

۳- باجماعت پڑھی گئی۔

۴-ہوسکتا ہے آپ نے اپنے دولت خانہ پر تراویح کی نماز تنہا پڑھی ہو جو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی باری کے علاوہ ہو، مگر اس کی یا اس کی رکعت کی تعداد متعین ہوکر منقول نہیں، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۲/ ۱۲/ ۹۰

تراویح چار چار رکعت ایک سلام سے پڑھنا:

ہمارے یہاں بعض جگہ تراویح کی نماز دو ۲ دو ۲ رکعت کے بجائے چار چار رکعت پانچ سلام کے ساتھ پڑھتے ہیں چار چار رکعت پڑھنا جائز ہے یا نہیں؟

بشیر احمد

الجواب وباللہ التوفیق:

تراویح کی نماز دو رکعت کی نیت باندھ کر پڑھنا سنت ہے بیس رکعت دس سلام سے پڑھ لے دو ۲ دو ۲ رکعت سے زیادہ ایک سلام سے پڑھنے سے تراویح ادا ہو جائے گی لیکن طریق سنت کے خلاف ہوگا اور طریق سنت کے ثواب سے محرومی رہے گی، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲/ ۱۲/ ۱۴۰۳ھ

بوجہ مجبوری آٹھ رکعت تراویح پڑھنا:

ایک شخص بوجہ کمزوری و بیماری اپنے گھر پر ہی نماز عشاء کے بعد صرف آٹھ رکعت نماز تراویح پڑھنا ہی جائز سمجھتا ہے۔

الجواب وباللہ التوفیق:

تراویح کی نماز سنت مؤکدہ بیس رکعتیں ہیں، آٹھ رکعت نہیں اس کو بیس رکعت پڑھنا چاہیے (۱)، بوجہ بیماری یا

۱- ”وهي عشرون ركعة، هو قول الجمهور وعليه عمل الناس شرقاً وغرباً“ (ردالمحتار علی الدرالمختار ۲/ ۴۹۵)، نعم ثبت العشرون من زمن عمر في الموطا عن يزيد بن رومان قال كان الناس يقومون في زمن عمر بن الخطاب بثلاث وعشرين ركعة“ (فتح القدیر ۱/ ۴۰۷)، نیز مزید تفصیل کے لئے دیکھئے: البحر الرائق ۲/ ۱۱۷، نیز تعلیق شامی علی البحر ۱۱۸/ (مرتب)۔

کمزوری مسجد میں نہیں جاسکتا ہے، گھرہی پڑھ لے، کھڑے ہوکر نہیں پڑھ سکتا، بیٹھ کر ہی پڑھ لے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

الجواب صحیح: محمود عفی عنہ، مفتی دارالعلوم دیوبند

تراویح کے ہر ترویحہ میں دعا اور حضور ﷺ وخلفاء راشدین کا نام القاب کے ساتھ لینا کیسا ہے؟

یہاں پر نماز تراویح کی بیس رکعت اس طرح پڑھی جاتی تھی کہ ہر چار رکعت کے بعد تسبیح سبحان ذی الملک والملوک پڑھی جاتی ہے اور اس کے بعد دعا مانگی جاتی ہے، پھر ایک مختصر تسبیح فتقبل من اللہ الرحمۃ والمغفرۃ پڑھنے کے بعد دوسرے دوگانے کے لئے کھڑے ہو جاتے ہیں، اس طرح پر ہر چار رکعت کے بعد دعا مانگنے کے بعد القابات کے ساتھ حضور ﷺ کا نام لیا جاتا ہے آٹھویں رکعت کے بعد القابات کے ساتھ ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کا نام لیا جاتا ہے بارہویں رکعت کے بعد حضرت عمرؓ کا نام اور سولہویں رکعت کے بعد حضرت عثمانؓ کا نام اور بیسویں رکعت کے بعد حضرت علیؓ کا نام القابات کے ساتھ ساتھ لئے جاتے ہیں پھر بعد وتر دعا چند لوگ صحن مسجد کے ایک کونے میں کھڑے ہو کر پیغمبروں کے نام سے چاہتے ہیں، البتہ حضرت آدم علیہ السلام کا نام پہلے لیا جاتا ہے پھر جلیل القدر نبیوں کے نام کے بعد آنحضرت ﷺ کا نام پر صلوۃ ختم کر دیا جاتا ہے کیا اس طرح تراویح پڑھنے میں کوئی بدعت ہے؟

الجواب وباللہ التوفیق:

مذکورہ طریقہ سے بہت سی غیر ضروری چیزوں کو ضروری سمجھ لیا گیا ہے جو شریعت مطہرہ کے قاعدہ میں درست نہیں ہے اور حد شرع کے خروج کی وجہ سے بدعت ہے، تراویح مسنون طریقہ کے مطابق پڑھنا چاہئے اور مسنون طریقہ وہ ہے جس طریقہ سے صحابہ کرام اور ائمہ کرام ھدیٰ نے پڑھی ہیں، اس کے لئے "بہشتی ثمر" اور "تعلیم الاسلام" کے رسالے دیکھ لیجئے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۴/ ۲/ ۹/ ۸۵ ۱۳ ھ

الجواب صحیح سید احمد علی سعید نائب مفتی دارالعلوم دیوبند

تراویح میں ترویحہ کے بعد دعاء:

تراویح میں ترویحہ کی دعاعام طور پر لوگ سبحان ذی الملک الخ پڑھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ دعا'' جامع رموز'' اور '' ردالمحتار'' میں درج ہے، دوسری طرف علماءحق کہتے ہیں کہ کوئی دعا ثابت نہیں درود شریف کلمہ سوم وغیرہ پڑھ لیا جاوے تو صحیح ہے، ''ھدیۃ المصلیین'' نامی کتاب میں اسی طرح درج ہے اور'' جامع الرموز، ردالمحتار'' کا حوالہ دیا ہے۔

یوسف باوالندنی

الجواب وباللہ التوفیق:

'' درمختار'' میں ہے: ''ویخیرون بین تسبیح وقراءۃ وسکوت وصلوۃ فرادیٰ'' (۱) اور ردالمحتار (ص ۴۷۴) میں ناقلاً عن منہج العباد مذکور ہے: ''قال القهستاني: فيقال ثلث مرات سبحان ذی الملک والملکوت الخ'' (۲) ان عبارتوں سے معلوم ہوا کہ نفس دعا تو ثابت ہوسکتی ہے باقی متعین طور پر کوئی اور خاص دعا ثابت نہیں ''کما یدل علیہ لفظہ ویخیرون ایضاً''، نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ ''سبحان ذی الملک الخ'' والی دعا جو عام طور سے رائج ہے ، وہ بدعت نہیں، ثابت ہے ہاں اسی کو ضروری سمجھنا یا اس میں حصر کر دینا یہ درست نہیں ہے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۲/۹/۱۴۰۰ھ

بالتداعی تہجد کی جماعت کا حکم:

تہجد کی نماز جماعت کے ساتھ پڑھنا درآں حالیکہ اس میں تداعی ہو بدعت ہے اور ہمارے بعض اکابر کا اس پر عمل ثابت ہے، جیسے حضرت مدنیؒ، جواب دیجئے۔

الجواب وباللہ التوفیق:

تہجد کی نماز با جماعت جب کہ علی سبیل التداعی نہ ہو بدعت نہیں ہے، ''یکرہ ذلک لو علی سبیل التداعی

۱- درمختار مع ردالمحتار ۲/ ۴۹۶ کتاب الصلاۃ باب الوتر والنوافل۔

۲- ردالمحتار مع درمختار ۲/ ۴۹۷ تحت قولہ (بین تسبیح)۔

بأن يقتدي أربعة بواحد"(۱)، حاصل کلام یہ کہ اگر امام کے علاوہ چار آدمی ہوں تو مکروہ ہے، ورنہ نہیں، رہا حضرت مدنی رحمہ اللہ کا معمول تو اگر ان کے ساتھ چار آدمی سے کم رہتے تھے تو کوئی اشکال ہی نہیں اور اگر زیادہ ہوتے تھے تو کہا جائے گا کہ حضرت مدنی تنہا یا صرف دو تین آدمیوں کو لے کر پڑھتے رہے ہوں گے اور لوگ بعد میں شریک ہوتے رہے ہوں گے جن کی امامت کی حضرت مدنی نیت نہ کرتے ہوں گے، اس صورت میں کراہت صرف متاخرین پر ہوگی۔ امام پر نہیں، "وفي التتارخانية :لو لم ينو الإمامة لا كراهة على الإمام" (۲)، "وفي رد المحتار: لو اقتدىٰ به واحد أو اثنان ثم جاءت جماعة اقتدوا به قال الرحمتي: ينبغي أن تكون الكراهة على المتأخرين" (۳)۔

حضرت شیخ الاسلام رحمۃ اللہ علیہ کی تہجد با جماعت پڑھنے میں قوی توجیہ یہ ہے کہ حضرت موصوفؒ بالخصوص اس مسئلہ میں بلاشبہ درجۂ اجتہاد پر فائز تھے اور مجتہد کے بارے میں حکم شرعی یہ ہے:"إن المجتهد إذا اجتهد في واقعات بحكم يمتنع عليه تقليد غيره فيها اتفاقا" (۴)،اس عبارت کا مطلب یہ ہے کہ حضرت موصوف پر اپنے اجتہاد و تحقیق کے مطابق عمل کرنا ضروری تھا، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۱/۱/۱۴۱۱ھ

نماز تہجد کی شرعی حیثیت:

ریڈیو کویت نے بتلایا کہ نماز تہجد سرکار دو عالم ﷺ پر فرض تھی مگر امت پر نہیں!

حافظ مہدی حسن (پوسٹ بکس ۲۲۴/ریاض، سعودی عرب)

الجواب وبالله التوفيق:

ریڈیو نے پوری بات نہیں بتلائی، یا پوری بات سمجھی نہیں گئی!

پوری بات یہ ہے کہ نماز تہجد حضور ﷺ پر شروع میں فرض تھی اور بعد میں فرضیت منسوخ ہوگئی، جیسا کہ حضرت

۱- الدر مختار ۱/۵۲۴۔
۲- الدر مختار ۱/۵۲۴۔
۳- شامی ۱/۵۲۴۔
۴- شامی نعمانیہ علی الدرر ۱/۵۱۔

عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت سے جو "مسلم شریف" وغیرہ میں مروی ہے، ثابت ہے، البتہ آنحضرت ﷺ نماز تہجد ہمیشہ بلا ناغہ و بلا ترک پڑھتے تھے، اس پڑھنے کو آپ نے اپنی خصوصیت قرار نہیں دی اور نہ کوئی دلیل خصوصیت پر قائم ہے اور جس عمل و عبادت پر آپ ﷺ مواظبت بلا ترک فرمائیں وہ کم از کم سنت ضرور رہوتا ہے۔

اس لیے نماز تہجد امت کے لیے بھی سنت کے درجہ میں باقی رہی اور غیر فرض پر نفل، مستحب کا اطلاق کر دیتے ہیں، بعض مواقع میں مستحب کے لفظ سے تعبیر فرما دیا ہے۔

نیز مسلم شریف کی ایک اور حدیث سے تہجد کی سنت کی طرف اشارہ ملتا ہے، (۱) علاوہ ان ترغیبی روایات کے جو خاص تہجد کی فضیلت کے بارے میں مروی ہیں۔

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲/ ۲/ ۹۹ ۱۳ھ

اذانِ مغرب اور اس کے فرض کے مابین سنت کا حکم؟

۱ - "ما حكم السنة بعد أذان المغرب وقبل الفرض عند المذاهب الأربعة بأنني حنفي المذهب"۔

الجواب وبالله التوفيق:

اذانِ مغرب کے بعد اور فرض سے پہلے ائمہ اربعہ میں سے کسی کے نزدیک سنت نہیں ہے، بلکہ ائمہ ثلاثہ امام ابوحنیفہ، امام شافعی، امام مالک رحمہم اللہ کے نزدیک تو مستحب بھی نہیں! حضرت امام احمد بن حنبلؒ اور حضرت اسحاق و بعض اہل ظواہر کے نزدیک دو رکعت تو مستحب ہے اور وہ بھی اس قدر کے ساتھ کہ ان دو رکعت میں مشغول ہونے سے فرض مغرب کی ادائیگی میں تاخیر لازم نہ آئے، ورنہ ادائیگی مکروہ ہو جائے گی اور دلیل میں عبداللہ بن مغفل کی روایت پیش فرماتے ہیں:

۱- "وقوله وصلوٰة الليل أقول: هي أفضل من صلوٰة النهار كما في الجوهرة ونور الإيضاح، وقد صرحت الأيات والأحاديث بفضلها والحث عليها، قال في البحر: فمنها ما في صحيح مسلم مرفوعا: "أفضل الصلوة بعد الفريضة صلوة الليل.

ثم اعلم أن ذكره صلوٰة الليل من المندوبات مشىٰ عليه في الحاوی القدسي، وقد تردد المحقق في فتح القدير في كونه سنة أو مندوباً، لأن الأدلة القولية تفيد الندب، والمواظبة الفعلية تفيد السنية، لأنه صلى الله عليه وسلم إذا واظب على تطوع يصير سنة، إلى قوله، ولذا قال في الحلية: والأشبه أنه سنة" (فتاویٰ شامی ۲۰/۲، باب الوتر والنوافل) (مرتب)۔

"عن عبد الله بن مغفل رضي الله عنه عن النبي ﷺ قال: بين كل أذانين صلوٰة أن يتخذها الناس سنة (ثلث مرات) وقال في الثالثة: لمن شاء كراهيتهٔ أن يتحذها الناس سنة" (۱)۔

اس کے جواب میں کہا جاتا ہے کہ اس سلسلہ میں بعض روایات میں سندِ معتبر کے ساتھ "ماخلا صلوٰۃ المغرب" بھی مروی ہے، جیسا کہ اس روایت سے بھی معلوم ہوتا ہے:

"إن رسول الله ﷺ قال: إن بين كل أذانين ركعتين ما خلا صلوٰة المغرب أو كما قال عليه السلام" (۲)۔

اگر کوئی متن کی سند پر جرح کرے، مگر مجموعہ حسن لغیرہ ہوکر قابلِ استناد، قابلِ استدلال بلاشبہ مسلم ہے، اس لیے یہ حکم نمازِ مغرب کے علاوہ کا ہے۔

علاوہ ازیں اگر حضرت عبداللہ بن مغفل کی روایت کے عموم میں نمازِ مغرب کو شامل بھی مان لیا جائے تب بھی "لمن شاء" کی تخییر کی رو سے اس روایت سے بہت سے بہت محض اباحت واجازت یا عدمِ کراہت نکل سکتی ہے، نہ کہ ترغیب وتحریص یا ندب واستحباب وغیرہ۔

لہٰذا دعوائے استحباب یا سنت پھر بھی صحیح نہ ہوگا اور یہ اباحت یا اجازت اور عدمِ کراہت اس وقت نکل سکتی ہے جب ان دو رکعت میں مشغولیت کی وجہ سے صلوٰۃِ مغرب کی ادائیگی میں وقتِ اولیٰ سے تاخیر لازم نہ آئے اور اشتباکِ نجوم کی قباحت کا خطرہ نہ پیش آئے، ورنہ کراہت لازم آجائے گی اور اباحتِ مطلقہ ختم ہو جائے گی۔ فافہم وتدبر۔

اشتباکِ نجوم کے تاخیر کر دینے کی کراہت کا بہت سی روایات سے پتہ چلتا ہے: مثلاً حضرت ابوایوبؓ کی روایت ہے: **"قال رسول الله ﷺ: لايزال أمتي بخير أوقال: على الفطرة مالم يؤخروا المغرب إلى أن تشبک النجوم" (۳)۔**

اور مثلاً حضرت رافع بن خدیجؓ کی روایت ہے: **"كنا نصلي المغرب مع رسول الله ﷺ فينصرف أحدنا وأنه ليبصر مواقع نبله" (۴)۔**

۱- بخاری شریف ۱/ ۱۵۷ کتاب التہجد باب الصلوٰۃ قبل المغرب وأخرجہ أبو داؤد فی سننہ ۱/ ۱۸۶ تحت باب الصلوٰۃ قبل المغرب) (وھکذا فی الترمذی ۱/ ۲۶ أیضا کتاب الصلوٰۃ) (مرتب)۔

۲- بیہقی، دار قطنی ۲/ ۲۶۴ کتاب الصلوٰۃ (مرتب)۔

۳- ابوداؤد، باب وقت المغرب ۱/ ۶۰۔

۴- متفق علیہ الصحیح للبخاری ۱/ ۷۹۔

اور مثلاً سلمہ بن اکوعؓ کی روایت ہے: "**کان النبی ﷺ یصلی المغرب ساعة تغرب الشمس إذا غاب حاجبها**" (۱)۔

ان روایات سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ غروب آفتاب کا یقین ہوجانے کے بعد جہاں تک جلد ہو سکے نمازِ مغرب اس طرح اور جلدی ادا کرلی جائے کہ اشتباکِ نجوم کی قباحت سے محفوظ رہے، اشتباکِ نجوم غروب آفتاب کے ۱۰/ ۱۲ منٹ کے بعد سے ہی شروع ہوجاتا ہے "**کما هو شاهد رأی العین**" پس جب آفتاب غروب ہوتا ہوا نظر آئے جب تو غروب ہوتے ہی اذان دیدینا بحدیث نمبر (۳) درست ہوجائے گا اور اگر ڈوبتا ہوا نظر نہ آئے تو غروب کا ظن غالب ہونے کے بعد ازالۂ شک اور حصولِ یقین کے لیے دو ایک منٹ کا توقف کرنا احتیاطاً لازم ہوگا، پھر موذن کی رفتارِ صوت کے اعتبار سے اذان میں تین منٹ سے پانچ تک خرچ ہوتے ہیں، اس لیے اوسطاً چار منٹ کی مقدار اذان کے لیے رکھئے، پھر مختصراً ادائیگی کے لیے بھی کم وبیش دس منٹ رکھئے تو بھی غروب سے فراغتِ نماز تک ۱۶ منٹ ہوجاتے ہیں۔

جس کا حاصل یہ ہے کہ اس وقت اشتباکِ نجوم اگرچہ مکمل نہ ہو، مگر شروع ہوجانا اغلب ہوجائے گا، اب اگر اذان کے بعد اور فرض سے قبل دو رکعت اور پڑھی جائیں تو اشتباکِ نجوم کی قباحت کا منظم ہوجانا اغلب، بلکہ قریب بیقین ہوجائے گا۔

اسی خدشہ کی بنا پر بعض حضرات مجتہدین نے یہ فرمایا کہ اذان شروع ہوتے ہی دو رکعت والی نماز شروع کردے تاکہ اذان ختم ہوتے ہی یہ بھی نماز سے فارغ ہوجائے، مگر یہ توجیہ صحیح نہیں ہے، اس لیے کہ اگر یہ شخص بوقت اذان مسجد میں موجود ہے جب تو اذان کی اجابت فعلی اگرچہ حاصل ہے، مگر اجابتِ قولی جو علی اختلافِ الاقوال واجب یا مستحب ہوگی اس کا ترک لازم آئے گا۔

اور اگر مسجد میں موجود نہیں تھا تو اجابتِ فعلی نہ ہوگی اور اس کا ترک ایک امرِ مباح یا مستحب کا ترک لازم آئے گا اور یہ دونوں صورتیں شرعاً مذموم ہوں گی۔

ان روایتوں سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ جناب نبی کریم ﷺ کا اور صحابہ کرامؓ بھی حضرات کا ہمیشہ دائمی طور پر کنارۂ آفتاب کا غروب یقینی ہوجانے کے بعد فوراً بلا تاخیر نمازِ مغرب پڑھ لینے کا معمول تھا اور اس معمول کے خلاف کا ذکر جو بعض روایات میں آیا ہے وہ سفر وغیرہ کے عارض سے یا بیان جواز کی مصلحت سے معلوم ہوتا ہے۔

۱- ابوداؤد، باب وقت المغرب ۱/ ۶۰۔

پس بلا تاخیر ہمیشہ پڑھ لینے کے معمول سے اس معمول کا سنت رسول علیہ وسنتِ صحابہؓ بھی نکل آیا اور سنتِ رسول علیہ کے خلاف بلاعذر شرعی کرنا معصیت وکراہیت سے خالی نہیں ہوتا ہے۔

ان وجوہ سے بھی اشتباک نجوم تک تاخیر کو علماء نے خلاف سنت ومکروہ فرمایا ہے، نیز حضور اکرم علیہ اور صحابہ کرام کے اس دائمی معمول سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ حضرات بھی ان دو رکعتوں کو نہیں پڑھتے تھے (۱)۔

چنانچہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما جو اتباع سنت رسول علیہ کے عاشق تھے وہ تصریح فرماتے ہیں: "مارأيت أحداً على عهد النبي علیہ يصليهما" (۲) پھر مسجد میں اور علی الاطلاق نہ پڑھنا تو ظاہر ہی ہے کیونکہ کوئی ایک بھی روایت قابلِ استنادنہیں ہے، اس کے خلاف پر موجود ہیں، گھر میں بھی آپ علیہ نے کبھی نہیں پڑھا، جیسا کہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی روایت ہے جس کو طبرانی نے سند شامیین میں سندِ صحیح کے ساتھ نقل کیا ہے: "سالنا أزواج رسول الله علیہ هل رائتن رسول الله يصلي الركعتين قبل المغرب قلن: لا، غير أم سلمة رضي الله عنها قالت: صلاها عندى مرة، فسألته ما هذه الصلوة، قال: نسيت الركعتين قبل العصر فصيلتهما (التعليق الصبيح) ناقلا عن فتح البارى (وغيره)" (۳)۔

اسی طرح بہت سی روایات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ خلفاء راشدین نے اور اکابر صحابہ کی بڑی جماعت نے حضور علیہ کے بعد بھی یہ دو رکعتیں نہیں پڑھیں، ان روایات میں محفوظ السند اور صحیح السند بھی ہیں، یا کم از کم مجموعہ ایسا ضرور ہے جو درجۂ حسن تک پہنچ کر قابل استناد واحتجاج ہو جاتا ہے۔

چنانچہ حضرت نخعی جو اصحاب حدیث کے نزدیک بھی مسلم بزرگ ہیں وہ بھی فرماتے ہیں: "وانها بدعة وروي عن الخلفاء الأربعة وجماعة من الصحابةؓ إنهم كانو لايصلونها"، ان ہی روایات کی بنا پر ائمہ ثلاثہ اور امام ابوحنیفہؒ، امام شافعی اور امام مالک رحمہم اللہ ان دو رکعتوں کے سنت واستحباب کے قائل نہیں ہیں (۴)۔

بلکہ حضرت امام مالک کا ایک قول یہ بھی منقول ہے کہ یہ حکم ابتداء اسلام میں تھا پھر منسوخ ہو گیا اور حضرت امام

۱- "لم يصل أبو بكرؓ ولا عمرؓ ولا عثمانؓ قبل المغرب ركعتين" (بیہقی ۲/۴۷۶ باب من جعل صلوٰة المغرب ركعتين) (مرتب)۔

۲- ابوداؤد شریف، باب الصلوۃ قبل المغرب ۱/ ۱۸۲۔

۳- طبرانی۔

۴- عمدۃ القاری ۲/ ۲۶۱۔

شافعی،حضرت امام ابوحنیفہ کے ساتھ ہیں،حضرت امام ابوحنیفہ منسوخ ہونے کے قائل نہیں ہیں، بلکہ یہ فرماتے ہیں کہ چونکہ نمازِعصر کے بعد کسی نفل کا نہ ہونا ظاہر ہے اور بعد غروب متصلا نمازِ مغرب پڑھنے کے دائمی معمول سے یہ شبہ ہوسکتا تھا کہ شاید ممانعت نفل بعد غروب بھی فرض مغرب ادا کرلینے تک ممتد ہو۔

تو یہ ارشاد فرما کر اس شبہ کو دور فرما دیا اور ''لمن شاء'' سے نفسِ اباحت کا اظہار فرمایا، چنانچہ حضرت امام ابوحنیفہؒ کا محقق قول یہ ہے کہ اگر کبھی امام کے آنے میں اتفاقاً دیر ہوجائے اور لوگ اس کے انتظار میں بیٹھے ہوئے ہوں تو اس حالت میں اگر کوئی شخص ہلکی پھلکی دو رکعت کنارے ہٹ کر ادا کرے تو گنجائش ہے، ورنہ کراہت ہے۔

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

وتر کے بعد نفل پڑھنا:

۱-عشاء کی نماز کتنی رکعت ہے دوسری بات وتر کی نماز کے بعد کیا نفلیں پڑھنا ٹھیک ہے یا نہیں رمضان میں وتر کی نماز کے بعد دو رکعت نفل پڑھتے ہیں اکثر کیا یہ ٹھیک ہے یہ سنتیں نہیں کیا رسول ﷺ کی ایک حدیث ہے کہ وتر کی نماز آخری نماز ہے تو نفلیں پڑھنے کا سوال ہی نہیں ہوتا۔

۲-عرب میں تراویح کی نماز قرآن دیکھ کر پڑھتے ہیں (۱۰ رکعت بعد صرف ایک رکعت وتر پڑھتے ہیں تو ہم حنفی والے کو ایک وتر پڑھنا ہے یا نہیں) ہم اس طرح سے پڑھ رہے ہیں ایک رکعت وتر امام کے پیچھے پڑھتے ہیں بعد میں تین رکعت وتر الگ پڑھتے ہیں، کیا یہ ٹھیک ہے یا نہیں؟

محمد شفیع (الجزب سعودی عرب)

الجواب وبالله التوفيق:

۱-عشاء کی نماز کا فرض مقیم کے لئے چار رکعت ہے اور فرض سے پہلے چار رکعت سنت غیر موکدہ ہے اور فرض کے بعد دو رکعت سنت موکدہ ہے اس کے چھوڑنے کی عادت کرلینا معصیت ہے اور اس کے چھوڑنے والے کے لئے ''من ترک سنتي لم ينل شفاعتي'' (۱) کی وعید ماثور ہے یعنی جو میری سنت کو چھوڑے گا وہ میری شفاعت سے محروم رہے گا

۱- وفي رواية: "عن عبد الله: ولو تركتم سنة نبيكم لضللتم" (ابن ماجہ ابواب المساجد، رقم الحدیث ۷۷۱،۱/ ۱۴۱) وفی رواية:

اس کو ہمیشہ ملحوظ رکھے ورنہ بڑے حرمان میں مبتلا ہوگا وتر کے بعد بلا شبہ نوافل وغیرہ کا پڑھنا جائز ہے صحاح ستہ بخاری مسلم و غیرہ میں اس مضمون کی متعدد روایات موجود ہیں اور آخری نماز ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اس کی مشروعیت آخر میں ہوئی ہے جیسا کہ مسلم بخاری ابو داؤد و ترمذی کی روایت "ان الله زادكم صلوة الخ" سے بھی معلوم ہوتا ہے اور حضور ﷺ کے خود عمل سے اور خلفاء راشدین کے عمل سے بھی ہوتا ہے اور آخری نماز ہونے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ آخری شب میں یا آخری وقت میں پڑھی جائے، خوب سمجھ لیجئے۔

البتہ جس کو اخیر شب میں اٹھنے کا یقین ہو اس کو اخیر شب میں وتر پڑھنا بہتر ہے اور جس کو اخیر شب میں اٹھنے کا یقین نہ ہو اسکو اول شب میں ہی پڑھ لینا بہتر ہے یہ سب صحاح ستہ میں مصرح ہیں۔

۲-وتر کی دوسری رکعت میں سلام قطعاً نہ پھیرنا چاہئے صحاح میں اس کی روایت بھی موجود ہے، نیز حضور ﷺ نے صحیح حدیث میں نماز بتیراء (فقط ایک رکعت کی نماز سے) منع فرمایا ہے چنانچہ روایت میں صراحۃ ہے کہ "نهى رسولُ الله ﷺ عن صلوة البتيراء" (۱)، اس لئے جب وہ لوگ وتر کی دوسری رکعت میں سلام پھیر کر محض ایک رکعت پڑھیں تو اس میں انکی اقتداء نہ کرے، بلکہ اپنی وتر علیحدہ تین رکعت ایک سلام سے پڑھے۔

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

لیلۃ القدر کی نیت سے نماز پڑھنا:

رمضان مہینہ کی ۲۷ ویں تاریخ کو ہم لیلۃ القدر کی نیت سے نماز پڑھتے ہیں یہ لیلۃ القدر کی نیت سے نماز پڑھنا صحیح ہے یا نہیں کیا نفل کی نیت سے پڑھے جواب دیں مجموعہ نیت نامہ میں لیلۃ القدر لکھا ہے۔

احقر العاصی بشیر احمد

الجواب وبالله التوفيق:

لیلۃ القدر کے لئے کوئی خاص نماز احادیث صحیحہ سے ثابت نہیں ہے، بلکہ اپنی نفلی عبادتوں میں سے کچھ رکعت نفل

عن عائشة: ستة لعنتهم ولعنهم الله.....والتارك لسنتي" رواه البيهقي ورزين (مشكوة مع شرح الطيبي كتاب الايمان حديث نمبر ۱۰۹، ۲۶۰/۱)۔

۱- اخرجه ابن عبدالبر في كتاب التمهيد نصب الراية ۱۲۰/۲، المجلس العلمي۔

نماز کی اور رونوں کے اعتبار سے زیادہ پڑھ لینا اور لیلۃ القدر کی فضیلت حاصل کر لینا بھی احادیث سے کافی ہونا ثابت ہے، اور کسی خاص نماز کو ضروری سمجھنا ناجائز اور بدعت ہے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲/۱۲/۱۴۰۳ھ

باب الجمعہ

غیر مسلم ممالک میں نماز جمعہ وعیدین کا حکم:

۱-یورپ کے اندر بیشتر ممالک ایسے ہیں جہاں کبھی حکومت اسلامی ہوئی ہی نہیں وہاں جمعہ واعیاد نیز سکونت مسلمین کا شرعی حکم کیا ہے؟

۲-یہاں کی مجلس علماء نے مقامی موسمی تبدیلیوں کو مدنظر رکھتے ہوئے ستمبر کے آخری ہفتہ سے مارچ کے آخری ہفتہ تک شفقِ ابیض کے غائب ہونے پر بالاتفاق ابتداء عشاء کا وقت تسلیم کیا ہے، ابتدا اپریل سے ستمبر کے تیسرے ہفتہ تک شفق احمر کے غائب ہونے پر بالاتفاق ابتداء عشاء کا وقت تسلیم کیا ہے ابتداء اپریل سے ستمبر کے تیسرے ہفتہ تک شفق احمر کے غائب ہونے کے بعد وقت عشاء کی ابتداء تسلیم کی ہے ایسا نہ کرنے میں نزاع شدید، حرج مدید ہے۔کیا مجلس علماء کا یہ فیصلہ قابل عمل ہے؟

فیروز احمد (سکریٹری نیوزی لینڈ اسلامک سوسائٹی)

الجواب وباللہ التوفیق:

۱-ایسے ممالک میں جہاں کبھی اسلامی حکومت ہوئی نہ ہو لیکن وہاں حکومتِ وقت کی جانب سے امن وامان قائم رہتا ہو، بدامنی اور شر وفساد کو حکومت روک دیتی ہو تو ایسے ممالک میں بھی جمعہ وعیدین کا قائم کرنا اور رکھنا مسلمانوں پر بشرائطہا واجب ہوجاتا ہے اور مسلمانوں پر لازم ہوجاتا ہے کہ اپنی آپس کی رضامندی سے کسی کو خطیب امام مقرر کرکے اس فریضہ کو انجام دیں، **"وأما بلا عليها ولاة كفار فيجوز للمسلمين إقامة الجمع والأعياد ويصير القاضي قاضيا بتراضي المسلمين، فيجب عليهم أن يلتمسوا واليا مسلما منهم"**(۱)۔

۱- ردالمحتار ۸/۴۳۔

اسی طرح وہاں سکونت مسلمین بھی جائز ہے، اور صحیح ہے خواہ مستامن ہو کر ہو خواہ مستقل شہری باشندہ کی حیثیت سے ہو، البتہ مسلمانوں پر یہ بھی ضروری رہے گا کہ اپنے معاشرتی معاملات کو شرعی احکام کے مطابق درست رکھنے کے لیے معتبر علماء سے رجوع کیا کریں، نیز آپس کے نزاعی معاملات کے حل کے لیے جماعت مسلمین بنا کر اس سے رجوع کر کے اپنے معاملات میں شرعی احکام کے مطابق فیصلہ لے کر عمل کیا کریں، "فإن تنازعتم في شئ فردوه إلى الله والرسول إن كنتم تؤمنون بالله واليوم الآخر ذلك خير و أحسن تاويلا"(۱)۔

۲-آپ کے یہاں کے حالاتِ مذکورہ کے پیش نظر آپ کا مندرجہ طریقہ شرعاً بالکل صحیح درست اور قابل عمل ہے۔

هذا ما عندي من الشرع، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

جمعہ فی القریٰ کا حکم:

ایک بستی جس کی مردم شماری بائیس سو ہے جس میں ۹۵ فیصدی مسلم ہیں اور ۵ فیصدی ہندو ہیں اور لوگوں کی عام طور پر ضرورتوں کے پورے ہونے کے لئے تقریباً بیس دوکان ہیں اور اس بستی میں نماز جمعہ اور عیدین پہلے سے پڑھتے چلے آئے ہیں اگر ترک کیا جائے تو اختلاف کا اندیشہ ہے اس بستی میں نماز جمعہ اور عیدین کا کیا حکم ہے؟

الجواب وباللہ التوفیق:

حنفیہ کے نزدیک جمعہ جائز ہونے کے لئے شہر یا قصبہ یا بڑا گاؤں ہونا ضروری ہے چھوٹے گاؤں میں جمعہ درست نہیں ہے، بلکہ ظہر کی نماز فرض ہے، بڑا گاؤں وہ ہے جس میں گلی کوچے ہوں بازار ہو روزمرہ کی ضروریات مثلاً غلہ کپڑا جوتا، آٹا دال ترکاری گوشت وغیرہ ہمیشہ ملتی ہوں ایسا نہ ہو کہ ہفتہ میں ایک دن یا دو دن بازار لگتا ہو اس سے ضروریات پوری کی جاتی ہوں یا کسی دوسری جگہ سے پوری کی جاتی ہوں ضروری پیشہ ور بڑھئی دھوبی لوہار موچی نائی وغیرہ سب وہاں رہتے ہیں ڈاکخانہ ہو ڈاکٹر یا طبیب ہو دوائیں ملتی ہوں غرض ضروریات اور آبادی کے لحاظ سے وہ قصبہ کے مثل ہو جس گاؤں کے متعلق شبہ ہو،

۱-　سورۂ نساء:۵۹۔

بہتر یہ ہے کہ تجربہ کار مسائل فقہیہ کے کسی ماہر عالم کو بلا کر معائنہ ومشاہدہ کرادیا جائے پھر اس کی رائے پر عمل کیا جائے (۱)۔

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

خطبہ میں آیات قرآنی سے قبل تعوذ وتسمیہ پڑھنا:

ہم شافعی ہیں ہمارے امام شافعی کے قول کے مطابق مسئلہ بتلایا جائے ہم جمعہ کے خطبہ میں چوتھے فرض، یعنی ایک آیت قرآن کی پڑھنا ضروری ہے اس آیت سے پہلے "أعوذ باالله من الشيطان الرجيم بسم الله الرحمن الرحيم" پڑھنا شافعی قول سے درست ہے یا کہ نہیں؟

الجواب وبا الله التوفيق:

"اعوذ باالله من الشيطان الرجيم" اور" بسم الله الرحمن الرحيم" کو قرآن کی پڑھنے سے قبل پڑھنا درست ہے، کیونکہ یہ دونوں ادب قرأت میں داخل ہیں۔

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

اعلان یا خطبہ سے قبل سلام:

تبلیغی اجتماع ہو یا اور کوئی جلسہ وغیرہ میں جب اعلان کیا جائے تو اعلان سے قبل سلام کرے پھر اعلان کرے، یا امام جمعہ خطبہ سے قبل لوگوں کو سلام کر کے خطبہ شروع کرے تو یہ قبل الاعلان سلام کرنا کیسا ہے؟

الجواب وباالله التوفيق:

اعلان کرنے کے لئے یا خطبہ جمعہ وغیرہ شروع کرنے کے لئے سلام مشروع نہیں ہوا ہے، سلام تو شروع ملاقات

۱- "المصر وهو ما لا يسع أكبر مساجده أهله المكلفين بها؛ وعليه فتوى أكثر الفقهاء" (الدرالمختار ۵/۳) نیز درمختار میں ہے: "إنه بلدة كبيرة فيها سكك وأسواق ولها رساتيق وفيها وال يقدر على إنصاف المظلوم من الظالم..." الخ (الردالمختار علی الدرالمختار ۵/۳، نیز دیکھئے: فتاوی عالمگیریہ ۱/۱۴۵)۔

کے لئے مشروع ہوا ہے، پس جب اعلان کرنے کے لئے اٹھے یا خطبہ وغیرہ دینے کے لئے اٹھے اور کوئی سا آدمی اکیلا یا ایسے ہی چند سامنے پڑ جائیں تو ان کو سلام کر دینا پھر اعلان یا خطبہ وغیرہ شروع کرنا جائز رہے گا، باقی اعلان کرنے یا خطبہ دینے کے واسطے سلام کا حکم شرعی سمجھ کر سلام کرنا ثابت نہیں، بلکہ منع ہے (۱)۔

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۳/۸/۱۴۰۱ھ

خطبہ جمعہ اردو میں پڑھنے کا حکم؟

کسی شہر میں اکثر مساجد میں جمعہ کا خطبۂ اولیٰ اردو میں ہوتا ہے، ایسے شہر میں کوئی قدیم مسجد آباد کرنے والے خطبۂ اولیٰ اردو میں جاری کئے ہوں، مگر اس شہر کے اکثر مسلمان خطبہ اردو میں سننے کے عادی نہ ہوں تو افضل اور اولیٰ حالات کے اعتبار سے کیا ہے؟ دیگر مساجد کے منتظمین اور مسلم آبادی میں حد درجہ حالات بد اور شدت آچکی ہے۔ منتظمین کے رویہ نے بھی آبادی میں ایک عجیب ہیجان پیدا کر دیا ہے، ڈر ہے کہ کوئی نزاع نہ پیدا ہو جائے اور ہاتھا پائی کی نوبت آجائے، لہٰذا ایسی صورت میں کیا کیا جائے؟

الجواب وباللہ التوفیق:

نمازِ جمعہ کے لیے دونوں خطبے شرط ہیں، جیسا کہ عام کتابوں میں فقہ کی لکھا ہوا ہے (۲)، اسی وجہ سے اس میں عبادت کی بھی شان ہے، اس کی طرف اشارہ: "إذا خرج الامام فلا صلوۃ ولا کلام" (۳) سے بھی ملتا ہے۔

نیز خطبہ بھی مثل صلوٰۃ کے امرِ تعبدی ہے، اس کو عالمگیری نے اس طرح ظاہر فرمایا ہے: "الخطبۃ کالصلوٰۃ"، اسی وجہ سے اس میں بھی قیاس کو دخل نہ ہوگا، بلکہ جس طرح نماز امرِ تعبدی ہے اور جس طرح جس کیفیت و قیود و شرائط کے ساتھ دربارِ رسالت سے منقول ہے، اسی طرح ادا کرنا اور پڑھنا ضروری ہے، قیاس کر کے کہ خطبہ کے معنی مضامین وعظ اور

۱- "وترک السلام من خروجه إلى دخوله في الصلاة، وقال الشافعيؒ إذا استوى على المنبر سلم" (درمختار مع رد المحتار ۳/۲۳) (مرتب)۔

۲- "ويسن خطبتان خفيفتان" (الدر المختار علی الشامی باب صلوٰۃ الجمعۃ ۱/۵۴۴)۔

۳- "وكل ما حرم في الصلوة حرم فيها أى في الخطبة، خلاصة وغيرها، فيحرم أكل وشرب، وكلام ولو تسبيحاً أو ردالسلام أو أمر بالمعروف بل يجب عليه أن يستمع ويسكت" (الدر المختار علی هامش الشامی باب صلوٰۃ الجمعۃ ۱/۵۵۱) (مرتب)۔

احکام کے ہیں اور مخاطب کو نفع پورا جب ہی پہنچے گا، جب اس کو مخاطب کی زبان میں پڑھا جائے، غلط ہوگا۔

جس طرح نماز کی قرأت ودعاؤں میں یہ ساری مصلحتیں ہوتی ہیں، مگر غیر عربی میں نماز پڑھنا درست نہیں، اسی طرح خطبہ کا بھی حکم ہوگا۔

اوران ہی وجوہ واسباب کے تحت صحابہ کرامؓ بھی جب بسلسلۂ تبلیغ وجہاد عرب سے باہر نکلے اور فارس وروم میں پہنچے توانہوں نے کبھی خطبہ جمعہ غیر عربی میں نہیں دیا (مخاطب کی زبان میں) بلکہ قرون ثلثہ مشہو دلہا بالخیر میں کوئی جزئیہ نہیں ملتا کہ ان حضرات نے خطبہ جمعہ غیر عربی میں پڑھا ہو، حالانکہ ان میں اوران کی جماعت میں بہت سے لوگ ایسے تھے جو غیر عربی اور مخاطب کی زبان جانتے تھے، نیز ان کا مقصدِ اولین تبلیغ اوراشاعتِ دین تھا اوراس لیے عرب سے باہر نکلے تھے اور اس وقت اشاعتِ مذہب اوراحکامِ مذہب کا طریقہ بھی اس وعظ ونصیحت میں قریب قریب محدود تھا اورآج کل کی طرح اس کے ذرائع ووسائل کثیر نہیں تھے اوروہ ہم سے زیادہ مستعد وشوقین اس معاملہ میں تھے ان سب باتوں کے باوجود خطبۂ جمعہ کو مثل نماز کے بالکل اسی طریقہ میں محدود رکھا جس کو دربار رسالت سے حاصل کیا تھا۔

تومعلوم ہوا کہ خطبۂ جمعہ کواسی طرح عربی میں محفوظ رکھنا شرعی مطلوب ومقصود ہے، اس سے خروج کرنا منشاء رسالت ﷺ کے خلاف اور: "**من أحدث في أمرنا هذا ما ليس منه فهو رد**"(۱) کا ایک فرد ہوا۔

اوران ہی وجوہ سے حضرت امام ابوحنیفہؒ نے جن کا پہلا قول غیر عربی میں جواز کا تھا اپنے اس قول سے رجوع فرمالیا۔

اوران ہی وجوہ سے مفتی بہ قول خطبۂ جمعہ کے غیر عربی میں ہونے کے کراہتِ تحریمی کا ہے، جیسا کہ شرح مؤطا میں حضرت شاہ ولی اللہ محدث قدس سرہ العزیز نے بھی فرمایا ہے (۲)۔

۱- مشکوۃ المصابیح/ ۲۷۔

۲- "ولما لاحظنا خطب النبي ﷺ وخلفائه رضي الله عنهم وهلم جراً فوجدنا وجود أشياء منها الحمد والشهادتان والصلوٰة على النبي ﷺ (إلى قوله) وأما كونها عربية فلاستمرار أهل المسلمين في المشارق والمغارب به مع أن في كثير من الأقاليم كان المخاطبون أعجميين. وقال النووي في كتاب الأذكار: حمد الله تعالىٰ ويشترط كونها أي خطبة الجمعة وغيرها بالعربية . وهل يشترط كون الخطبة كلها بالعربية وجها أن الصحيح اشتراطه، فإن لم يكن منهم من يحسن العربية خطب بغيرها ويجب عليهم التعلم والاعصراً ولا حجة لهم، (شرح احیاء العلوم للزبیدی ۳/ ۲۲۶) روى مسلم عن جابر في قصة يوم الفطر ثم خطب النبي ﷺ، فلما فرغ نزل فأتى النساء، وروى البخاري عن ابن عباسؓ بعد وعظ النساء ثم انطلق هو وبلالؓ إلى بيته. فقوله: فرغ فذكرهن ونزل وانطلق إلى بيته إلى قوله: ولاشك أن التذكير بالهندية ليس من الخطبة المسنونة في شيء؛ لان من

اب جن لوگوں کو اس پر اصرار ہو ان کو نرمی و محبت سے اصل مسئلہ احناف کا اور اصل منشاء حضرت رسالت مآب ﷺ وصحابہ کرامؓ وتابعین عظام کا سمجھایا جائے اور اگر ضرورت داعی ہو تو اس طرح جمع کرلیا جائے کہ ہر خطبہ جمعہ شروع ہونے کے متعینہ وقت کے قبل اذانِ اول کے بعد کوئی صاحب (امام یا غیر امام) خطبہ کا مضمون اور ضروری وعظ بیان کر دے اور خطبہ کے متعینہ وقت سے دس آٹھ منٹ قبل اپنا بیان قطعاً بند کر دے، تا کہ لوگ اطمینان سے سنت مؤکدہ وقت کی پڑھ لیں اور خطبہ ونماز وقت سے ادا ہو اور گڑبڑی نہ ہو یا پھر تمام نماز (فرض وسنت) سے فراغت کے بعد وعظ کا سلسلہ قائم کرلیا جائے، مگر خطبہ جمعہ کو بعینہٖ ویسا ہی رکھا جائے جس طرح صحابہ کرام سے منقول ہے، اس میں کوئی تبدیلی نہ کی جائے۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

خطبہ جمعہ کے بعد امام کا مصلی پر بیٹھنا:

اس قصبہ کی جامع مسجد میں جمعہ کی نماز تخمیناً ۸۰-۹۰ سالوں سے ادا کی جارہی ہے جمعہ کی نماز میں بعد ختم خطبہ پیش امام صاحبان منبر سے اتر کر نماز پڑھانے کے لئے جائے نماز پر کھڑے ہو جاتے ہیں اور پھر تکبیر شروع ہوتی تھی اب چند مہینوں سے ایک نوعمر پیش امام مقرر کئے گئے ہیں یہ امام صاحب جمعہ کی نماز میں بعد ختم خطبہ منبر سے اتر کر جائے نماز پر بجائے کھڑے ہونے کے بیٹھ جاتے ہیں پھر تکبیر شروع ہوتی ہے، جب تکبیر میں حی علی الصلوۃ کہا جاتا ہے تو امام صاحب نماز کے لئے کھڑے ہوتے ہیں اس پر مقتدیوں کا اعتراض ہے، بلکہ اندیشہ فساد اور فریق بندی کا ہے، دریافت ہے کہ قدیم امام کا طریقہ صحیح اور صواب ہے یا کہ جدید امام صاحب کا، یعنی جمعہ کی نماز میں بعد ختم خطبہ منبر سے اتر کر جائے نماز پر کھڑا ہو جانا یا بیٹھ جانا اور پھر کھڑا ہونا نمازیوں کی اکثریت تکبیر سنتے ہی کھڑی ہو جاتی ہے، جبکہ امام صاحب بیٹھے ہی رہتے ہیں جب تک حی علی الصلوۃ نہ کہی جائے اٹھتے نہیں ہیں عند الشرع کیا حکم ہے؟

خواصها المقصورة كونها بالعربية لعدم نقل خلافها عن صاحب الوحي أو السلفؒ منقول من جواهر الفقه اول" اور درمختار میں شروع فی الصلوۃ کے بیان میں ہے:"علیٰ هذا الخلاف الخطبة وجميع أذ كار الصلوٰة" (الدر المختار علی ھامش الشامی کتاب الصلوۃ ۱/ ۳۲۵) (مرتب)۔

الجواب وباللہ التوفیق:

پہلے امام صاحبان کا طریقہ صحیح اور متوارث ہے نئے امام صاحب جو چند مہینوں سے امامت کرتے ہیں اگر جمعہ کے علاوہ اور نمازوں میں پہلے سے اگر بیٹھ چکے ہوں اور بوقت اقامت حی علی الصلوۃ تک بیٹھے رہیں تو گنجائش ہے کہ بعض فقہاء نے حی علی الصلوۃ اور حی علی الفلاح پر جو کھڑے ہونے کو لکھا ہے اس کی یہی صورت ہے، لیکن بالقصد ایسا طریقہ بنانا اور اختیار کرنا جو موجب فتنہ ہو ہرگز جائز نہیں ہے، جبکہ ابتداء سے کھڑے ہونے کی تصریح بھی ہے اور متوارث بھی ہے اور خطبہ جمع کے بعد منبر سے اتر کر مصلی پر جا کر پہلے بیٹھ لینے کا طریقہ تو فقہ حنفی میں کہیں ثابت نہیں اور اس کو ضروری سمجھنا یا ایسا (نہ) کرنے والوں پر نکیر کرنا یا ان کو برا سمجھنا قطعاً نا جائز ہے (۱) فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۶/۷/ ۸۵ ۱۳ ھ

جمعہ کی سنتوں کا حکم:

جمعہ کی نماز میں جمعہ کے دو فرضوں کے قبل کی سنتیں اور فرضوں کے بعد کی سنتوں اور نوافل میں قبل جمعہ یا بعد جمعہ کس طرح نیت باندھی جائے گی یا صرف لفظ وقت جمعہ کہہ دینا کافی ہوتا ہے دیگر یہ کہ قبل کی سنت فوت ہو جائے تو بعد فرض ادا کس طرح کریں اگر کرے تو کیا سب سنتوں کے بعد۔

الجواب وباللہ التوفیق:

دونوں طرح صحیح ہے، نیت بندھ جائے گی کوئی شق ضروری نہیں (۲)، اگر جمعہ کے قبل والی سنتیں رہ جاویں تو بہتر یہ ہے کہ بعد جمعہ کی سنت پڑھ کر پڑھیں (۳) فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

۱- فإذا اتم أی الإمام الخطبة قوله: أقيمت بحيث يتصل أول الإقامة بآخر الخطبة وتنتهي الإقامة بقيام الخطيب مقام الصلاة.... ويكره الفصل بأمر الدنيا (ردالمحتار علی الدرالمختار ۳/ ۳۹) (مرتب)۔

۲- "والنية: إرادة الصلاة لله تعالى على الخلوص" (البحرالرائق ۱/ ۲۸۰)۔

۳- "بخلاف سنة الظهر وكذا الجمعة، فإنه إن خاف فوت ركعة يتركها ويقتدی ثم يأتی بها على أنها سنة في وقته أی الظهر قبل شفعه عند محمد وبه يفتى" (الدرالمختار مع ردالمحتار ۲/ ۵۱۳، نیز تفصیل کے لئے دیکھئے: ردالمحتار نفس صفحہ وبعدہ)، "عن عائشةؓ أن النبیﷺ كان إذا لم يصل أربعاً قبل الظهر صلاهن بعده" (سنن الترمذی ۲/ ۲۹۱، ابواب الصلاۃ حدیث: ۴۲۶) (مرتب)۔

باب العیدین

نماز عیدین میں حنفی کا شافعی کی اقتداء کرنا:

شافعی امام کے پیچھے حنفیوں کی نماز صحیح ہوتی ہے یا نہیں خصوصاً عید کی نماز کے متعلق ایک استفتاء کے جواب میں ایک مفتی صاحب نے ہمارے ملک برما میں عدم جواز کا فتویٰ صادر فرمایا ہے، اب تک شافعی مذہب والے اور حنفی مذہب والے ایک دوسرے کی اقتدا کرتے ہوئے نماز پڑھتے چلے آرہے ہیں اب اس عدم جواز کے فتوی سے عوام الناس میں بڑی سراسیمگی ہے۔

الجواب وبالله التوفيق:

''درمختار''(۱/۳۷۸) میں ہے: **''ان تيقن المراعاة لم يكره أوعدمها لم يصح وإن شك كره وتحته في قوله: إن تيقن المراعاة أى المراعاة في الفرائض من شروط وأركان في الصلوة (الى قوله) ذهب عامة مشائخنا إلى الجواز إذا كان يحتاط في موضع الخلاف وإلا فلا والمعنى أنه يجوز في المراعي بلا كراهية وفي غيره معها، ثم المواضع المهمة للمراعاة أن يتوضأمن الفصد والحجامة والقئى والرعاف ونحو ذلك لا فيما هو سنة عنده مكروه عندنا''(۱)۔**

ان عبارتوں سے معلوم ہوا کہ شافعی مذہب امام اگر حنفی مقتدی کی رعایت نماز کے شرائط وطہارت کے مسائل میں کرتا ہے تو بلا کراہت حنفی کی نماز صحیح ہوجائے گی۔ اور اگر نماز کے شرائط وطہارت کے مسائل میں بالخصوص نواقض وضو وغیرہ کے مسائل میں رعایت نہ کرتا ہو تو حنفی کی نماز صحیح نہ ہوگی۔

۱- مطلب فی الاقتداء بشافعی ونحوہ باب الامامۃ وکذا فی البحر الرائق باب الامامۃ ۱/۳۵۱۶ھ رشیدیہ وکذا فی تبیین الحقائق باب الوتر والنوافل (مرتب)۔

حاصل کلام یہ نکلا کہ شافعی محتاط ہو اور ان مذکورہ مسائل میں احتیاط رکھتا ہو تو اس کے پیچھے نماز بلا کراہت درست ہوگی، ورنہ اقتدا کرنے میں احتیاط کی جائے۔

یہی حکم عیدین کے بارے میں بھی ہے، پھر اگر امام عیدین جو شافعی ہو اور محتاط ہو اور چار زائد تکبیروں سے زائد تکبیر کہے تو حنفی اس میں خموش رہے اور نماز حنفی کی اس صورت میں بلاشبہ صحیح ادا ہو جائے گی اور اگر امام حنفی ہو تو چار زائد تکبیریں اس طرح کہے کہ شافعی مقتدی اپنی زائد تکبیریں پوری کرلیں۔ فقط واللہ علم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۵/۵/۱۴۰۳ھ

عورتوں کا نماز عیدین کی جماعت میں شریک ہونا:

عورتیں نماز عیدین کی ادائیگی کے لئے عیدگاہ جاتی ہیں اور مسئلہ کے مطابق مردوں اور بچوں کی صفوں کے بعد اپنی صفیں بنا کر امام کے پیچھے نماز عیدین ادا کرتی ہیں عندالشرع موجودہ زمانہ میں کیا حیثیت ہے؟

الجواب وباللہ التوفیق:

عورتوں کے لئے نماز عیدین اور جمعہ کسی میں شرکت کی اجازت نہیں ہے، کیونکہ عورتوں کا بناؤ سنگار اور زینت کا لباس پہن کر مردوں میں آنا ممنوع ہے اور جبکہ پردہ کا بھی اہتمام نہ ہو تو اس صورت میں غیر محرم کے سامنے آنا حرام ہے، اس لئے بجائے خدا کی رحمتوں کے حصول کے غضب کے نزول کا سبب بن جائے گا۔

"قال في الخلاصة :ولا يخرج الشابُّ من النساء في جميع الصلوات إلى قوله. وقد ذكرنا الجواب المختار في زماننا أنهن لا يخرجن "(۱)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۶/۷/۸۵ ۱۳ھ

الجواب صحیح: محمود غفی عنہ

خطبہ عید کے بعد دعا:

ہمارے یہاں بعض جگہ عید کی نماز کے بعد دعا کرنے کے بجائے خطبہ کے بعد دعا کرتے ہیں خطبہ نماز کے بعد ادا

۱- دیکھئے: فتاوی قاضیخان علی ہامش الفتاوی العالمگیریہ ۱/ ۱۸۳۔

کرنا جائز ہے یا نہیں؟

بشیر احمد

الجواب وباللہ التوفیق:

نماز عیدین میں خطبہ کے بعد اجتماعی دعا کرنا ثابت نہیں ہے، ہاں نماز کے بعد فوراً دعا کر سکتے ہیں (۱)، اور دعا کے بعد خطبہ پڑھ سکتے ہیں حدیث شریف میں ہر نماز کے بعد دعا کرنا ثابت ہے، اس لئے یہ بدعت نہ ہوگا اور خطبہ کے بعد ثابت نہیں، پس اگر خطبہ کے بعد دعا کرنے کو ضروری یا حکم شرعی سمجھ کر بالالتزام دعا کریں تو نا جائز اور بدعت ہوگا، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲/ ۱۲/ ۱۴۰۳ھ

نماز عید کے بعد مصافحہ و معانقہ:

عام طور پر یہ دیکھا جاتا ہے کہ مسلمان عیدین میں نماز عید کے بعد ملاقات اور معانقہ کرتے ہیں اور ایک دوسرے کو عید مبارک کے ساتھ مبارکباد دیتے ہیں اس میں حضور علیہ السلام اور صحابہ کا کیا معمول رہا۔

یوسف باوا ندوی

الجواب وباللہ التوفیق:

عید کے دن بعد نماز جو معانقہ و مصافحہ وغیرہ کا مروجہ طریقہ ہے کہ نماز کے پہلے سے بالکل ساتھ ساتھ تھے اور ساتھ ہی نماز بھی پڑھی، مگر نماز سے فارغ ہو کر مصافحہ و معانقہ کرنے لگے گویا کہ یہ معانقہ و مصافحہ عید کا معانقہ و مصافحہ ہے، یہ چیز سرکار دو عالم علیہ السلام کے دور میں، بلکہ قرون ثلاثہ مشہود لہا بالخیر کے اندر کہیں نہیں ملتی، اس لئے اس کو شرعی و ضروری سمجھ کر کرنا قطعاً ناجائز اور: "من أحدث في أمرنا هذا ما ليس منه فهو رد" (۲) (وفي رواية): "فهو مردود" کا مصداق

۱- "ويدعو ويختم بسبحان ربك" (الدر المختار علی الرد ۱/ ۴۹۵، مطبوعہ عثمانیہ) (مرتب)۔

۲- صحیح بخاری مع فتح الباری ۵/ ۳۰۱ کتاب الصلح حدیث ۲۶۹۷، صحیح مسلم کتاب الاقضیہ حدیث ۱۷/ ۱۸/ ۱۷ عن عائشہ (مرتب)۔

ہے اور اس طور پر ایسا کرنا بدعت ہوگا ہاں اگر کوئی شخص وہاں نہیں تھا اور ملاقات ہوگئی یا کوئی شخص کہیں باہر سے آ گیا اور ملاقات ہوگئی تو اس سے مصافحہ اور معانقہ ممنوع و بدعت نہ ہوگا، لیکن جہاں اس معانقہ وغیرہ کی بدعت کا ایسا عام رواج ہو کہ لوگ اس کو ضروری سمجھ کر کرتے ہوں تو وہاں ان لوگوں سے بھی احتیاطاً معانقہ وغیرا ایسا کام کرنا جس سے اہل بدعت کو سند پکڑنے کا موقعہ ملے درست نہ ہوگا، کیونکہ یہ امر محض مباح یا بیش از بیش مستحسن ہوگا اور عقیدۂ عوام کی حفاظت اور عوام کو غلط عقیدہ میں ابتلاء سے بچانا واجب ہوگا اور مستحسن کے لئے واجب کا ترک کرنا جائز نہیں ہوگا، باقی عیدین کے روز نفس خوشی منانا اظہار مسرت کرنا اور دوست و احباب سے ملنا اور بوقت ملاقات کلمات ترحیب پیش کرنا بھی اس طرح سے کہ اہل بدعت سے مشابہت نہ ہو درست اور جائز ہے(۱)، اس لئے کہ حدیث شریف میں ان ہی ایام کے بارے میں آیا ہے: ''**هذه الأيام أيام أكل وشرب أو كما قال عليه الصلاة والسلام**(۲) یعنی یہ دن کھانے پینے اور ازدواجی زندگی کو سنوارنے کے ہیں ہمارے اکابر بھی اہل ہوئی و بدعت کی مشابہت سے بچتے ہوئے اظہار مسرت اور دوست احباب، اعزہ و اقرباء سے ملنا جلنا رکھتے تھے اور رکھتے ہیں، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۲/۹/۱۴۰۰ھ

عید کے دن غیر شرعی کاموں کو انجام دینا:

یہاں عید کے دن میں لوگ کیا کیا بناتے (میدان بنانے کنواں کھودنے یا اسکول کا جھنڈا (بوٹا) کا کھمبا خریدنے) کے لئے ایسا ہی روپیہ اٹھاتا ہے (چندہ کرتے ہیں) شریعت میں یہ بات ہے (یہ شریعت کی بات ہے)؟ کیا ایسا کرنا اچھا ہے؟

۱- ''وندب كونه من طريق آخر واظهار البشاشة واكثار الصدقة والتختم والتهنئة بتقبل الله منا ومنكم لا تنكر'' (درمختار مع ردالمحتار ۳/۴۹ تفصیل کے لئے شامی دیکھئے)۔

۲- ''عن عقبة بن عامرؓ قال، قال رسول اللهﷺ يوم عرفة ويوم النحر وأيام التشريق عيدنا أهل الإسلام وهي أيام أكل وشرب''(سنن الترمذی ۳/۴۱۳ کتاب الصوم باب ما جاء فی کراہیۃ الصوم فی أیام التشریق حدیث ۷۷۳، سنن ابوداؤد ۲/۳۲۰ کتاب الصوم باب صیام أیام التشریق حدیث ۲۴۱۹) (مرتب)۔

الجواب وباللہ التوفیق:

عید کے دن ان چیزوں کا کرنا شریعت میں ثابت نہیں، بلکہ بعد کے لوگوں کی من گھڑت ایجاد ہے اس کو شرعی چیز سمجھ کر کرنا یا شرعاً اچھا سمجھنا سب ممنوع اور: "**من أحدث في أمرنا هذا ما ليس منه فهو رد**" (۱) میں داخل ہو کر ناجائز اور بدعت ہوگا۔

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۱/۸/۱۴۰۲ھ

۱- "عن عائشة رضی اللہ عنہا قالت قال رسول اللہ ﷺ: من أحدث في أمرنا هذا ما ليس فيه فهو رد" (صحیح البخاری مع فتح الباری ۵/۳۰۱ کتاب الصلح باب إذا اصطلحوا علی صلح جور فالصلح مردود حدیث ۲۶۹۷) (مرتب)۔

باب الجنائز

موت پر ختم تہلیل:

کیا کسی کی موت پر ختم تہلیل کرنا بدعت ہے؟ اگر ہے تو کس صورت میں اور جواز کی کوئی صورت ہے یا نہیں؟ واضح جواب سے نوازیں۔

الجواب وبالله التوفيق:

میت کو ایصال ثواب کے لئے ختم تہلیل یا تلاوت قرآن اور صدقہ وغیرہ کرنا، جبکہ مشروع طریقہ پر بلا قیود رسومات ہو جائز ہے، "**صرح علمائنا في باب الحج عن الغير، بأن للإنسان أن يجعل ثواب عمله لغيره صلاة أو صوماً أو صدقة أو غيرها كذا في الهداية**" (۱) فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۱/۱/۱۴۱۱ھ

غائبانہ نماز جنازہ کا بیان:

قرآن وحدیث اور مسلک کے اعتبار سے غائبانہ نماز جنازہ کا چاروں اماموں کے نزدیک کیا حکم ہے؟ مفصل تحریر فرمائیں کہ کس کی نماز جنازہ غائبانہ میں پڑھنی چاہئے اور کس کی نہیں؟

محمد اکرام مظفر نگری

۱- شامی ۱/ ۶۲۷۔

الجواب وباللہ التوفیق:

نماز جنازہ غائبانہ حضرت امام شافعیؒ کے نزدیک اور ایک روایت میں حضرت امام احمد بن حنبلؒ کے نزدیک جائز ہے اور حضرت امام مالکؒ اور امام ابوحنیفہؒ اور جمہور امت کے نزدیک ناجائز ہے، "**ومنها أن يكون الميت حاضرا فلا تجوز الصلاة على الغائب...... باتفاق الحنفية والمالكية وخالف الشافعية والحنابلة**"(۱)۔

جو حضرات جائز فرماتے ہیں ان کی دلیل صحاحِ ستہ کی صرف ایک روایت ہے جس میں حضور ﷺ کا حبشہ کے بادشاہ حضرت نجاشیؓ کی نمازِ جنازہ کا پڑھانا مروی ہے(۲)۔

وفي حديث أنه عليه السلام: "قال: مات اليوم عبد لله صالح أصمعة النجاشي فأمنا وصلى عليه" (رواہ مسلم) حالانکہ صحاحِ ستہ کی دوسری صحیح روایت میں یہ بھی مروی ہے کہ حضرت نجاشی کا جنازہ بوقت نماز حضور ﷺ کے سامنے رای العین کردیا گیا تھا(۳)، حجاباتِ ارضی مرتفع فرما کر یا جس طرح بھی اللہ نے چاہا ان روایات کی بنا پر نمازِ غائبانہ ہی کہنا صحیح نہیں ہوگا۔

رہ گیا ان صحابہ کا جو اس میں شریک تھے ان کے اعتبار سے بھی نمازِ غائبانہ کہنا مشکل ہے، اس لیے کہ حضرت عمران بن حصینؓ کی روایت صحاح ہی میں ہے کہ ہم لوگوں کو ایسا ہی معلوم ہوتا تھا کہ جنازہ آنکھوں کے سامنے ہے۔

اگر غائبانہ ہی تسلیم کرلیا جائے تو ان حضرات کی خصوصیت قرار دی جائے گی بچند وجوہ: اول یہ کہ جب یہ اسلام لاچکے تھے تو اس کا تقاضا یہ تھا کہ ایک آدھ دفعہ تو خدمتِ اقدس میں حاضر ہوگئے ہوتے بالخصوص جب کہ حاضری میں کوئی خاص مانع نہیں تھا، پس ان کے اسلام کی اشاعت کے لیے آپ ﷺ نے ان کی نماز پڑھ کر اس کو ظاہر فرمایا۔

دوم یہ کہ ایک خلقِ کثیر نے آپ ﷺ کے سامنے انتقال فرمایا اور بعضوں کی موت بڑی دردناک حالت میں غزوات وغیرہ میں ہوئی مگر آپ ﷺ نے کسی کی بھی نمازِ جنازہ غائبانہ نہیں پڑھی، یہ کھلی دلیل ہے کہ نمازِ جنازہ غائبانہ جائز

۱- کتاب الفقہ علی المذاہب الأربعۃ ۱/ ۵۲۲۔

۲- "عن أبي هريرة أن النبي ﷺ نعى للناس النجاشي اليوم الذي مات فيه وخرج بهم إلى المصلى فصف بهم وكبر أربع تكبيرات" (الصحیح لمسلم ۱/ ۳۰۹، الصحیح للبخاری ۱/ ۱۶۷ واللفظ للمسلم) (مرتب)۔

۳- "كما قاله العياض في الشفاء: ورفع النبي ﷺ النجاشي حتى صلى عليه فتكون صلوته عليه كصلوٰة الإمام على ميت رآه ولم يره المأموم، ولا خلاف في جوازها كما ذكر الواقدي في كتابه عن ابن عباس قال كشف للنبي ﷺ عن سرير النجاشي حتى راه وصلى عليه" (مرتب)۔

ہوتی تو اس پر ضرور عمل کر کے دکھایا جاتا۔

رہ گئیں معاویہ بن معاویہ حبشی کے جنازہ کی نماز غائبانہ پڑھنے کی روایات تو یہ اس قدر ضعیف اور مجروح ہیں کہ ان میں کسی میں بھی حجتِ جواز بننے کی صلاحیت نہیں ہے اور اگر کوئی ان سب روایات کے مجموعہ سے استدلال کرے تو ان میں یہ تصریح بھی ہے کہ حجابات مرتفع کر کے جنازہ سامنے کر دیا گیا تھا(۱)۔

اقوال:

حضرت نجاشی پر آپ ﷺ کے نمازِ جنازہ ادا کرنے کا یہ بھی جواب دیا جاتا کہ حضور ﷺ نے جو صحابہ کو لے کر اصمعہ نجاشی پر نمازِ جنازہ پڑھی ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ نجاشی خفیہ طور پر ایسی جگہ مسلمان ہوا تھا کہ وہاں ان پر نمازِ جنازہ پڑھنے والا کوئی نہ تھا، اس لیے آپ ﷺ نے نمازِ جنازہ ادا فرمائی۔

"ومن ثم قال الخطابي لايصلىٰ على الغائب إلا إذا وقع موته بأرض ليس بها من يصلى عليه"۔

تیسرا جواب یہ دیا جاتا ہے کہ نجاشی کا بدن تو سامنے نہیں لایا گیا تھا، مگر ان کی روح آپ ﷺ کے سامنے لائی گئی، اس لیے اس پر نمازِ جنازہ پڑھی، لیکن رفعِ حجاب کرنا یا روح کو حاضر کرنا آپ ﷺ کے ساتھ مخصوص ہے .... چوتھا جواب یہ دیا جاتا ہے کہ دوسرے بادشاہوں کو اسلام کی طرف مائل کرنے کے لیے اور جو دوسرے بادشاہ آپ ﷺ کے زمانہ میں مسلمان ہوئے ان کے استیلافِ قلوب کے لیے نجاشی پر نمازِ جنازہ پڑھی، نیز صلوٰۃ جنازہ کے متعلق یہ بھی شرط ہے کہ میت امام کے سامنے موجود ہو اور صلوٰۃ علی الغائب کے جواز کی صورت میں یہ شرط فوت ہوجاتی ہے، بہرحال صلوٰۃ علی الغائب کوئی قاعدہ کلیہ نہیں۔

اس لیے غائبانہ جواز پر استدلال درست نہ ہوگا، اسی طرح زید بن خلف اور جعفر طیارؓ کے جنازوں کی زیارت کی روایت کا بھی یہی حال ہے کہ آپ ﷺ نے ان دونوں کے لیے دعاء مغفرت وغیرہ کی ہے، نہ کہ صلوٰۃ جنازہ ادا فرمائی۔

اور اگر تسلیم بھی کرلیں جب بھی خلقِ کثیر پر غائبانہ نمازِ جنازہ نہ پڑھنے کا ثبوت محض ہوتے ہوئے ان جزوی واقعات سے شیوع وعموم کے ساتھ نمازِ جنازہ غائبانہ کا اثبات کسی طرح بھی درست نہ ہوگا، اسی لیے تابعین حضرات صلوٰۃ

۱- "كما قال: كنا مع النبي صلى الله عليه وسلم لتبوک فنزل جبرئیل علیه السلام، فقال يا رسول الله! ان معاوية بن معاوية المزني مات بالمدينة، أتحب أن تطوى لک الأرض فتصلي عليه؟ قال عليه السلام: نعم، فضرب بجناحه على الأرض ورفع له سريره فصلىٰ عليه" (مرتب)۔

جنازہ غائبانہ کے قائل نہیں ہیں (۱)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

کیا میت کو غسل دلانے والے پر غسل واجب ہے؟

اگر نابالغ بچہ کا انتقال ہو جائے اور جو شخص اس نابالغ بچہ کو غسل دے اس پر غسل کرنا واجب ہے یا نہیں، اور اگر بچہ چند ہی دن کا ہے تو اس کو غسل دینے والے پر غسل واجب ہے یا نہیں؟

الجواب وباللہ التوفیق:

صورت مسئولہ میں غسل دلانے والے پر غسل واجب نہیں ہے: چاہے میت بالغ ہو چاہے چند دنوں کا بچہ صغیر ہو (۲)، منیۃ المصلی میں غسل کی گیارہ قسمیں مذکور ہیں اور یہ کسی بھی قسم میں شمار نہیں ہے (۳)، اور تصانیف کا مفہوم مخالف حجت ہوتا ہے، اس لیے معلوم ہوا کہ یہ مواقع غسل میں سے نہیں ہے۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور
الجواب صحیح حبیب الرحمن خیرآبادی

دوبارہ نماز جنازہ پڑھنا، نیز نماز جنازہ کب تک ادا کی جاسکتی ہے؟

(۱) زید برضائے الٰہی فوت ہو گیا۔

وفات کے بعد اسے غسل دینے اور کفنانے کے بعد ایک مرتبہ نماز جنازہ ادا کی گئی، لیکن اس میں اولیاء جنازہ میں کوئی بھی اتفاق سے شرکت نہ کرسکا۔ تو کیا کوئی ولی (علی الترتیب) دوبارہ نماز جنازہ پڑھ سکتا ہے کہ نہیں، نیز ولی کی صلاۃ

۱– "لأنه لو جازت الصلوٰة على الغائب مطلقا لصلى النبي ﷺ على من مات من الصحابة ويصلي المسلمون شرقا وغربا على الخلفاء الأربعة وغيرهم ولم ينقل ذلك" (عینی ۴/ ۳۳ اوالفتح، والبذل والتعلیق ۲/ ۲۳۷ والأعجاز ۱/ ۲۲۷) (مرتب)۔

۲– البتہ غسل دلانے والوں کو غسل کرنا مستحب ہے، کما في رد المحتار: "وندب أي الغسل لجنون أفاق وكذا المغمى عليه (إلى قوله) أو غسل ميتاً الخ" (فتاوی شامی ۱/ ۱۷۶) (مرتب)۔

۳– کبیری ص، ۵۲، ۵۴، کتاب الطہارۃ۔

الجنازۃ الاولی میں قصداً عدم شرکت کا کیا حکم ہے، (۲) زید بیرون ملک میں فوت ہوگیا وہاں پر اس کا پوسٹ مارٹم کیا گیا اس کے بعد غسل دے کر کفن پہنا کر لکڑی کے تابوت میں بند کر کے بغیر جنازہ پڑھے اس نعش کو اپنے سابقہ ملک بھیج دیا گیا وفات کے بعد تین روز کے اندر وہ نعش ورثۂ اولیاء کو مل گئی اب تین دن کے اندر ورثا اس کا جنازہ پڑھ سکتے ہیں کہ نہیں، (۳) زید کی نعش بیرون ملک سے وفات کے تین روز بعد ورثہ کو ملی اور بظاہر کوئی بدبو اور جسم کا تفسخ نہیں محسوس ہوتا تو اس کا اب جنازہ پڑھانا جائز ہے کہ نہیں، جبکہ اس سے قبل اس کا کوئی جنازہ نہ پڑھا گیا ہو، (۴) اس زمانے میں خصوصاً جو نعشیں بیرون ملک سے لائی جاتی ہیں پوسٹ مارٹم کر کے کوئی خاص مسالہ لگایا جاتا ہے یا نعش کو تابوتی مختصر سردخانہ میں رکھ کر باہر سے بند کر دیا جاتا ہے اس طرح کہ جس کی وجہ سے بدبو محسوس نہیں ہوتی سوال ہے کہ اگر یہ مسالہ نہ لگایا جاتا یا اس سردخانہ میں رکھنے کا انتظام نہ کیا جاتا تو تین روز کے بعد بالفرض یہ نعش متورم ہو کر پھٹ جاتی، لیکن پھٹنے اور بدبو پھیلنے سے بظاہر اس عارضی انتظام کی وجہ سے بچ گئی۔ کیا اس نعش پر بھی کئی کئی دنوں اور مہینوں کے بعد نماز جنازہ پڑھنی جائز ہے یا نہیں، (۵) وفات کے بعد میت پر نماز جنازہ پڑھنے کے لئے وقت کی کوئی حد از روئے شرع مثلاً تین روز وغیرہ کی مقرر ہے یا کہ جب تک میت کے جسم کا تفسخ خون وغیرہ کا خروج بدبو نہ محسوس ہوتی ہو، دیگر شرائط کے ساتھ نماز جنازہ پڑھنے کو جائز قرار دیا جائے۔

غلام مصطفیٰ عفی عنہ (دارالعلوم عثمانیہ، ۸۵، رسول پارک، اچھرہ ۱۶، پاکستان)

الجواب وباللہ التوفیق:

۱-جب اولیاء میں سے کسی نے شرکت نہیں کی تھی تو اولیاء بعد میں پڑھ سکتے ہیں کسی مجبوری سے شرکت نہ کر سکے ہوں یا بالقصد شریک نہ ہوئے ہوں دونوں صورتوں کا یہی حکم ہے کہ ولی بعد میں پڑھ سکتا ہے (۱)۔

۲و۳و۴ جنازہ تین دن کے اندر ملے یا تین دن کے بعد ملے اگر پھٹا نہیں ہے اور نعش مجسم موجود ہے تو اس پر نماز جنازہ اگر اب تک نہیں پڑھی گئی تو نماز جنازہ پڑھنا اس پر فرض ہے اور نعش کا یہ تحفظ، خواہ مسالہ لگا کر ہو یا سردخانہ میں رکھکر ہو یا کسی اور وجہ سے جب جسم صحیح ہے اور نماز جنازہ ادا نہیں ہوئی ہے تو ادا کرنا فرض ہے (۲)۔

۱- ''فإن صلي غيره أي الولي ممن ليس له حق التقدم علي الولي ولم يتابعه الولي أعاد الولي ولو علي قبره'' (الدرالمختار مع ردالمحتار ۳/ ۱۲۳، نیز تفصیل کے لئے دیکھئے: ردالمحتار) (مرتب)۔

۲- ''وإن دفن وأهيل عليه التراب بغير صلاة أو بها بلا غسل أو ممن لا ولاية له صلي علي قبره إستحساناً ما لم يغلب علي الظن تفسخه من غير تقدير هو الأصح'' (الدرالمختار مع ردالمحتار ۳/ ۱۲۵) (مرتب)۔

۵-قبر میں دفن کے بعد فقہاء کرام جو تین دن کے بعد پڑھنے سے منع فرماتے ہیں وہ اس بنا پر فرماتے ہیں کہ جسم پر مسالہ وغیرہ نہ چڑھایا جائے اور گرم میں رکھا جائے تو عموماً تین دن میں نعش خراب ہوجاتی ہے اور جب خراب ہوجائے تو وہ نعش باقی نہ رہی تو نماز جنازہ کا حکم ختم ہوجاتا ہے، ورنہ تین دن کی تحدید کوئی اصلی وذاتی نہیں ہے (۱)، پس جب تین دن کے بعد بھی وہ نعش صحیح سالم محفوظ ہے تو نماز جنازہ کا حکم متوجہ رہے گا اور جب تک نماز جنازہ ادا نہ ہوئی ہو ادا کرائیں گے "**كما يوخذ من هذه العبارة وشرحه (أي الصلوة للجنازة) إسلام الميت وطهارته ووضعه أمام المصلى (متن الدر) وفي شرحها وشرطها ايضا حضوره ......وكونه هو او اكثره**" (۲)، فقط واللہ اعلم بالصواب

كتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۱/۷/۱۴۰۱ھ
الجواب صحیح سید احمد علی مفتی دارالعلوم دیوبند

جنازہ پر آیات کریمہ یا اسمائے حسنیٰ والی چادر ڈالنا کیسا ہے؟

پہلے زمانہ کے لوگ مردوں کو چارپائی پر لے جاتے تھے تو اوپر سے کوئی سفید چادر ڈال لیتے تھے۔ اب تکلف زیادہ ہوگیا ہے۔ قیمتی تابوت بنوایا جاتا ہے، اوپر پردہ کے لئے مخمل کا پردہ آیا ہے اس پر کلام اللہ کی آیات لکھی ہیں۔ کچھ دیندار لوگ اس کے خلاف ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اس میں آیات قرآنی کی توہین ہے۔ بجائے اس کے سادی چادر ڈالنا چاہئے۔

سوال ہے:

☆اس مخملی قیمتی چادر کو استعمال کرنا جائز ہے یا ناجائز یا مکروہ تنزیہی؟

☆اگر ناجائز ہے تو اس چادر کو کیا کیا جائے۔

الجواب وبالله التوفيق:

☆ دیندار حضرات کا کہنا صحیح ہے۔ کلام اللہ شریف کی آیات واجب التعظیم ہیں، اور واجب التعظیم شئے کو مظنۂ

۱- "ما لم يغلب على الظن تفسخه من غير تقدير هو الأصح، لأنه يختلف باختلاف الأوقات حراً وبرداً والميت سمناً وهزالاً والأمكنة" (رد المحتار على الدر المختار ۳/۱۲۵) (مرتب)۔

۲- درمختار کی عبارت اس طرح ہے: "وشرطها أيضاً حضوره و"وضعه" وكونه هو أو أكثر "أمام المصلى" (الدر المختار مع رد المحتار ۳/۱۰۴) (مرتب)۔

ذلت واہانت میں رکھنا ناجائز ہےاور جس چادر پر آیات قرآنی لکھی ہوئی ہوں اس چادر کو جنازہ پر ڈالنا مظنۂ اہانت ہونے سے خالی نہیں،اس لئے کہ اگر وہ آیات کمر سے نیچے پیر وغیرہ کی جانب ہوں یا جسد میت سے نیچی لٹکی ہوئی ہوں تو ان آیات کی اہانت ظاہر ہے۔اسی طرح کمر سے اوپر سینہ یا سر کی جانب ہوں جب بھی جسد میت سے اکثر کچھ ناپاک رقیق رطوبت وغیرہ خارج ہونا ظاہر ہے،پس اگر کفن کے اوپری حصہ کی جانب یہ نجاست کفن میں لگ جائے تو چادر کے اس سے مس ہونے سے خود آیات کریمہ کا نجاست پر ڈالنا لازم آئے گا جس سے بچنا واجب ہونا ظاہر ہے اور اس چادر کے عام استعمال کی اجازت دینا کسی طرح جائز نہ ہوگا۔پس اگر کوئی شخص بہت اہتمام سے حفاظت کرے اور جسد کے اوپر کمانی وغیرہ لگا کر اس چادر کو اتنے اوپر رکھے کہ ان مذکورہ خرابیوں میں سے کوئی خرابی پیدا نہ ہو، بلکہ محض برکت کیلئے سر یا سینہ کی محاذات میں رکھ دیا جائے تو اس میں مضائقہ نہ ہوگا۔مگر جب بھی اس چادر کے عام طور پر استعمال کو جائز کہہ دیا جائے تو مظنۂ نجاست واہانت پر پیش کرنے میں شبہ نہ ہوگا،اس لئے ایسی چادر کی جنازہ پر عام اجازت ہرگز نہیں ہوسکتی ،اس لئے بہر حال تحرز چاہئے۔

☆اور جب ناجائز رہا تو اس چادر کو تبرک کی طرح رکھ دیا جائے یا محترم موقع پر رکھا جائے،فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی ،مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۸/۵/۱۴۱۱ھ

قبر میں رکھنے کے بعد چہرہ دیکھنا:

ہمارے یہاں آجکل یہ رواج عام ہوتا جارہا ہے کہ مردہ کو کفنانے کے بعد قبرستان کی مسجد میں بعد نماز جنازہ یا قبر میں رکھنے کے بعد میت کے چہرہ کو کھول کر دیکھایا جاتا ہے شریعت اس بارے میں کیا کہتی ہے اور ہم کو کیا کرنا چاہئے؟

الجواب وباللہ التوفیق:

یہ التزام درست نہیں ہے، کیونکہ کسی بھی امر مباح کو اگر لازم اور ضروری سمجھ لیا جاوے تو اس کا ترک ضروری ہے، اگر کوئی منہ دیکھنا چاہے تو کفنانے کے بعد دیکھلایا جائے نماز جنازہ کے بعد یا قبر میں رکھنے کے بعد منہ دیکھلانا مناسب نہیں، کیونکہ اس حالت میں اس پر آثار برزخ شروع ہوجاتے ہیں۔

" فيه أن من أصر على أمر مندوب و جعله عزماً ولم يعمل بالرخصة أصاب منه الشيطان من

الإضلال، فكيف من اصّر على بدعة ومنكرا نتهى والله تعالىٰ اعلم (مأة مسائل)"

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۸/۷/۸۵ ۱۳ھ

الجواب صحیح محمود عفی عنہ

تدفین کے بعد ہاتھ اٹھا کر دعا کرنا:

مردہ کو دفن کر کے جب واپس آتے ہیں تو اس وقت ہاتھ اٹھا کر فاتحہ پڑھنا جائز ہے یا کہ نہیں؟

الجواب وبالله التوفيق:

اگر ہاتھ اٹھا کر دعاء کرنے کو جی چاہے تو قبر کی طرف سے منھ پھیر کر قبلہ رو ہو جائیں (۱)۔

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۴/۹/۸۵ ۱۳ھ

قبرستان میں ہاتھ اٹھا کر دعا کرنا:

ہمارے یہاں قبرستان پر زیارت کرتے وقت یا زیارت کرنے کے بعد قبلہ کی طرف منھ کر کے ہاتھ اٹھا کر دعا مانگا جاتا ہے مطلقاً قبرستان پر ہاتھ اٹھا کر دعاء کرنا جائز ہے یا نہیں؟۔

بشیر احمد

الجواب وبالله التوفيق:

قبرستان میں بوقت زیارت دعا کرنے میں ہاتھ نہ اٹھانا بہتر ہے، اگر دعا کرتے وقت ہاتھ اٹھانے کا دل چاہے قبلہ رخ ہو جائے اور قبر سے رخ پھیرے (۲)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲/۱۲/۱۴۰۳ھ

۱- واذا اراد الدعاء يقوم مستقبل القبلة كذا في خزانة الفتاوى، ہندیہ ۵/۵۰ ۳، رشیدیہ پاکستان (مرتب)۔

۲- "وإذا أراد الدعاء يقوم مستقبل القبلة كذا في خزانة الفتاوى" عالمگیری ۵/۵۰ ۳، رشیدیہ، پاکستان (مرتب)۔

جمعہ کی شب میں وفات پانے والے شخص کو جمعہ کی نماز سے قبل دفن کرنا ضروری ہے؟

اگر کسی شخص کا جمعہ کے روز یا جمعہ کی شب میں انتقال ہوا، تو کیا اس کو جمعہ کی نماز سے قبل دفن کرنا ضروری ہے؟ بعض لوگ کہتے ہیں کہ اگر اس کو جمعہ سے قبل دفن کر دیا گیا تو تمام جمعوں کا ثواب ملتا رہے گا ورنہ نہیں۔ یہ بات کہاں تک درست ہے؟

الجواب وباللہ التوفیق:

ایسی صورت میں نماز جمعہ سے قبل دفن کرنا واجب نہیں ہے اور واجب سمجھنا غلط ہے، بلکہ افضل یہ ہے کہ نماز جنازہ میں شریک ہونے والے جس صورت میں زیادہ ہوں اس کا لحاظ افضل رہے گا، ہاں اگر نعش خراب ہونے کا اندیشہ ہو تو پہلے دفن کر دینا چاہیے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲/۸/۱۴۱۱ھ

الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن خیرآبادی، محمد ظہیر الدین مفتاحی، کفیل الرحمٰن

عذاب قبر کا تعلق روح اور جسم دونوں سے ہے یا ایک سے؟ نیز قبر سے کیا مراد ہے؟

کیا عذاب صرف جسم کو ہوتا ہے یا روح کو یا دونوں کو قبر سے مراد کون سی قبر ہے یہ قبرستان والی یا جو علیین میں جہاں روح ہوتی ہے کیا روح کا تعلق جسم سے ہوتا ہے یا نہیں کچھ لوگ کہتے ہیں قبر سے مراد علیین والی قبر ہے قبرستان والی قبر مراد نہیں ہے شریعت کی رو سے جواب دیں۔

الجواب وباللہ التوفیق:

ایک ہے دارالعمل (دار تکلیف جو دنیا ہے اس کے بعد جزاء اور سزا کا معاملہ ہوگا جس کا نام دار آخرت (دار جزاء) ہے، ان کے علاوہ تیسرا دار ہے کہ انسان دنیا سے رخصت ہوا اور قیامت سے پہلے درمیان میں پڑتا ہے اس کا نام دار قبر ہے جو (برزخ) کہلاتا ہے آدمی جو عمل کرتا ہے قیامت سے پہلے اس عمل کا بدلہ شروع ہوتا ہے اور آئندہ ملنے والی چیزوں کا نمونہ

دیکھایا جاتا ہے،نعمت کی شکل میں ہو یا عذاب کی شکل میں ہو (۱)،قبر سے مراد وہ گڑھا نہیں ہے جس میں دفنا دیا جاتا ہے، بلکہ مرنے کے بعد کی حالت مراد ہے وہ کسی طرح سے بھی ہو چاہے وہ پانی میں ڈوب کر مرجائے یا اور کسی طرح سے (۲)،دنیا کے اندر اصل جسم ہے اور روح اس کے تابع ہے جسم کے واسطے سے روح کو بھی تکلیف ہوتی ہے اور آخرت میں جسم تابع ہے اور روح اصل ہے،اس لئے اگر جسم ریزہ ریزہ ہوگیا ہو اور مٹی بن گیا ہو تب بھی مقصد حاصل ہوتا ہے،لیکن جسم کو بھی تابع بنا کر عذاب دیا جاتا ہے آخرت کی حیات اور دنیا کی حیات میں فرق ہے۔دنیا میں جسم اور روح کا تعلق قوی ہے وہاں ایسا نہیں ہے (۳)،فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی،مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۰/۱/۱۴۰۲ھ

کافر کی موت کی خبر سن کر کیا کہنا چاہئے؟

کافر کے مرنے کی خبر سنکر کیا کہنا چاہئے؟

الجواب وبالله التوفيق:

ایسی بات کہے جس میں اس کا معاملہ خدا کے حوالہ ہو جاوے مثلاً یوں کہے خدا اس کے مناسب حال معاملہ اس کے ساتھ کرے (۴)،فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی،مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۶/۱۰/۱۳۸۵ھ
الجواب صحیح سید احمد علی سعید نائب مفتی دارالعلوم دیوبند

۱- ''إن رسول اللهﷺ قال: إن أحدكم إذا مات عرض عليه مقعده بالغداة والعشي إن كان من أهل الجنة فمن أهل الجنة وإن كان من أهل النار فمن أهل النار، فيقال: هذا مقعدک حتى يبعثک الله يوم القيامة'' (صحیح بخاری مع فتح الباری ۳/ ۲۴۳ کتاب الجنائز حدیث:۱۳۷۹)۔

۲- ''وانما أضيف العذاب إلى القبر لكون معظمه يقع فيه ولكون الغالب على الموتى أن يقبروا وإلا فالكافر ومن شاء الله تعذيبه من العصاة يعذب بعد موته ولو لم يدفن'' (فتح الباری شرح صحیح بخاری ۳/ ۲۳۳)۔

۳- ''وخالفهم الجمهور فقالوا تعاد الروح إلى الجسد أو بعضه كما ثبت في الحديث ولو كان على الروح فقط لم يكن للبدن بذلک إختصاص، ولا يمنع من ذلک كون الميت قد تفرق أجزاؤه، لأن الله قادر أن يعيد الحياة إلى جزء من الجسد ويقع عليه السوال كما هو قادر على أن يجمع أجزاءه'' (فتح الباری شرح صحیح بخاری ۳/ ۲۳۵) (مرتب)۔

۴- دیکھئے: کتاب الخراج لابی یوسف/ ۲۱۶ و رد المحتار ۹/ ۵۵۷، مکتبۂ زکریا۔

ایصال ثواب کا روپیہ مدرس کی تنخواہ میں دینا:

ایصال ثواب کا روپیہ مدرس کی تنخواہ میں بھی دیا جاسکتا ہے کہ نہیں۔

الجواب وباللہ التوفیق:

اگر ایصال ثواب کا روپیہ منت کا ہے یعنی اس کے ایصال کی منت مان چکا ہے تو اسکا صدقہ کرنا واجب ہے اس کے مستحق صرف غریب اور نادار طلبا ہیں، مدرس کی تنخواہ میں دینا جائز نہیں ہے اور منت کا نہیں ہے تو تنخواہ مدرس میں بھی دے سکتے ہیں، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۶/ ۱۰/ ۸۵ ۱۳ھ
الجواب صحیح سید احمد علی سعید نائب مفتی دارالعلوم دیوبند

غیر مسلموں کے ایصال ثواب کا حکم:

بعض غیر مسلموں کو خواجہ صاحب یا اور بعض بزرگوں سے بڑی عقیدت ہے، چنانچہ وہ ان کے ایصالِ ثواب کے لیے غریبوں کو کھانا کھلاتے ہیں، یا صدقہ خیرات کرتے ہیں یا مسجد مدرسہ بنواتے ہیں، تو کیا ان غیر مسلموں کا ایصالِ ثواب ان اکابر کو پہنچتا ہے یا نہیں؟

ولی اللہ خان (نشان پاڑا روڈ بمبئی)

الجواب وباللہ التوفیق:

یہ ہوسکتا ہے کہ خواجہ صاحب یا ان بزرگوں کو کچھ ثواب منجانب اللہ مل جائے، اللہ کی مشیت ومرضی پر موقوف ہے ضابطہ نہیں ہے۔

باقی مسلمانوں کے ایصالِ ثواب کی طرح ایصالِ ثواب کرنے والے کو جو ثواب آخرت کا ملتا ہے، وہ غیر مسلم کو نہیں ملے گا، البتہ دنیا میں کچھ وسعت وراحت پہنچ جائے تو یہ ہوسکتا ہے۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۴/ ۱۱/ ۱۴۰۱ھ

ایصال ثواب کے لئے قرآن خوانی کا حکم شرعی:

انگلستان کی اکثر مساجد میں عام رواج ہے کہ جب کوئی شخص فوت ہو جاتا ہے تو اس کا رشتہ دار مساجد کمیٹی کے سکریٹری / صدر کے ذریعہ یہ اعلان کرانے کی خواہش کرتا ہے کہ فلاں دن فلاں وقت برائے ایصال ثواب ختم قرآن شریف ہوگا۔ آپ سب حضرات مسجد میں تشریف لائیں۔

ابھی دو ماہ ہوئے اس مسجد میں جب کسی نے ایسی درخواست کی تو اپنے امام صاحب نے (جو مفتی ہیں) کہا یہ جائز نہیں، ایک بزرگ اور تھے انہوں نے بھی کہا کہ نہیں۔ اپنے گھروں میں قرآن خوانی کرالیں اور مسجد میں دعائے مغفرت ہو جائے گی۔

کافی بھائیوں کو تعجب ہوا کہ یہ رواج ہم اپنے بچپن سے ہندوستان اور پاکستان میں دیکھتے آئے ہیں، اور اب یہ ممنوع قرار دے دیا گیا ہے۔ چنانچہ مسجد میں پھر قرآن خوانی نہیں ہوئی۔

ابھی دس دن کا واقعہ ہے کہ ایک بھائی کی لڑکی فوت ہوگئی اس نے قرآن خوانی کی خواہش کی آخر اس کے کہنے پر یہ فیصلہ ہوا کہ سورہ یسین پڑھ کر دعائے مغفرت کر دی جائے۔

مفتی صاحب نے (زادالمعاد ص ۱۵۰، ج ۱ مصری) کا حوالہ دیا جس میں یہ ہے کہ حضور ﷺ کا یہ طریقہ نہ تھا کہ تعزیت کے لئے لوگ جمع ہوں اور قرآن خوانی ہو، نہ قبر کے پاس نہ کسی اور جگہ یہ سب باتیں بدعت ہیں، ایجاد کردہ ہیں، مکروہ ہیں۔

اب جو بھائی قرآن خوانی کے حق میں ہیں ان کا جواب یہ ہے کہ حدیث ضعیف ہے، اس لئے کہ ایک تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت میں قرآن شریف ابھی مکمل کتاب کی صورت میں تیار نہیں ہوا تھا (وہ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے عہد خلافت میں مکتوب ہوا)، اس لئے آپ ﷺ کے وقت میں قرآن شریف ختم کرانے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ دوسرے یہ کہ ''نہ کسی اور جگہ'' میں صرف مسجد ہی نہیں آتی، بلکہ گھر وغیرہ بھی شامل ہیں۔ تو پھر قرآن خوانی کیسے ہو اور مرحوم کو ایصال ثواب کی صورت کیا ہو۔ یہ ہو سکتا ہے کہ مرحوم کے دوست احباب کو کہہ دیا جائے کہ تم منفرداً ختم کرالو، یعنی اکٹھے ہو کر نہیں اور پھر یہاں مسجد میں آکر سب مل کر دعاء مغفرت کرلیں گے۔

میں اور میری یہاں کی کمیٹی آپ کی بے حد مشکور ہوگی اگر آپ اس اہم مسئلہ پر روشنی ڈال کر ہماری اصلاح فرمائیں گے۔

محمد عبدالحمید (چیرمین ومیاڈن مسجد کمیٹی۔لندن)

الجواب وبالله التوفيق:

تعزیت کے لئے لوگوں کا آنا یا جمع ہوجانا دوسری چیز ہے اور اھداء ثواب للمیت اور ایصال ثواب کے لئے قرآن پاک پڑھ کر میت کو ایصال ثواب کرنا دوسری چیز ہے۔ دونوں کے الگ الگ حکم ہیں، دونوں میں خلط ملط کرنا صحیح نہیں ہے۔ جمہور اہل السنۃ والجماعۃ کا یہی مذہب ہے کہ اہداء ثواب للمیت جائز ہے، صرف معتزلہ اس کے منکر ہیں (۱)۔

تعزیت کا مفہوم تو یہ ہے کہ صاحب میت، یعنی جس کے یہاں میت ہوگئی ہو اس کے یہاں جا کر صبر و تحمل کی تلقین کی جائے تسلی و تشفی کے کلمات کہے جائیں۔ اور اس سلسلہ میں اگر وہ کلمات کہہ دیے جائیں جو ماثور و منقول ہیں۔ جیسے: "لله ما أعطى ولله ما أخذواليه النشور" وغیرہ۔ تو یہ درست ہوگا باقی اس وقت تلاوت قرآن پاک قرون مشہود لہا بالخیر سے ثابت و منقول نہیں ہے۔

یہی مذہب مختار حضرات شوافع کا بھی ہے کما فی رد المحتار: "**والذى حرره المتأخرون من الشافعية وصول القراء ة للميت إذا كانت بحضرته أودعى له عقبها ولو غائبا، لأن محل القراء ة تنزل الرحمة والبركة. والدعاعقبها ارجىٰ للقبول الخ**" (۲) اور ابن قیم حنبلی نے جن کی "زاد المعاد" ہے، انہوں نے بھی اپنی مشہور و مسلم کتاب (کتاب الروح) میں لکھا ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ: "**اختلف في إهداء الثواب إلى الحي، فقيل: يصح لإطلاق قول أحمد يفصل الخير ويجعل نصفه لأبيه أو أمه**" (۳)۔

جب زندہ کے لئے ایصال ثواب کے جواز کو نقل فرمایا ہے تو میت کے لئے بدرجہ اولی جائز و درست ہوگا۔ پس "زاد المعاد" کا وہ مفہوم لینا درست نہ ہوگا اور اگر تسلیم کر لیا جائے تو وہ ان کی اپنی تحقیق و ذاتی رائے ہوگی۔ جو دوسروں کے لئے حجت نہ ہوگی۔ بالخصوص جب کہ حضرت امام احمد بن حنبل سے وہ خود ایسی بات نقل کرتے ہیں جو ان سے موافقت نہیں کرتی۔ البتہ اجتماعی قرآن خوانی اگر کرنی ہو تو سب کو آہستہ وسرا پڑھنا ضروری ہوگا۔ جہراً پڑھنا مکروہ ہے، جیسا کہ فتاویٰ عالمگیری، میں ہے: "**ويكره للقوم أن يقرأ القرآن جملة جهرا لترك الاستماع والإنصات المامور بهما، كذا في القنية**" (۴)۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۹/ ۴/ ۱۴۰۳ھ

۱- کمافی الشامی ص ا۔
۲- رد المحتار کتاب الصلاۃ باب صلاۃ الجنازۃ ۲/ ۱۵۲ طبع دار الکتب العلمیہ بیروت۔
۳- شامی ص ا/ ۲۰۵ باب صلاۃ الجنازۃ، مطلب فی القرأۃ للمیت واہداء ثوابہا لہ ۲/ ۱۵۲ طبع دار الکتب العلمیہ۔
۴- فتاوی عالم گیری/ ۳۱۷۔

کیافرقہ وارانہ فسادات میں مرنے والا مسلمان شہید ہے؟

موجودہ حالات کے پیش نظر جو ملک میں فرقہ وارانہ کشیدگی ترقی پر ہے اور غیر مسلم مسلمانوں پر حملہ کر کے موت کے گھاٹ اتار رہے ہیں۔جیسا کہ فی الحال بجنور۔مظفرنگر وشاملی وغیرہ میں حادثے ہوئے ہیں۔شرعی ضابطہ سے نوازیں کہ ان مسلم مرنیوالوں کو شہید کا درجہ ملتاہے یا اور درجہ ان کے لئے شرعی ضابطہ سے نافذ ہے۔مرنے والوں میں تبلیغی جماعت بھی ہوسکتی ہے اور مسافر بھی۔شہر میں اکثر دیہاتی بھی ہوتے ہیں۔اس کے علاوہ کچھ ایسے بھی اشخاص ہوتے ہیں جو پرانی عداوت کا بدلہ لیتے ہیں ان تمام وجوہات کے پیش نظر شرعی ضابطہ سے مسائل سے نوازیں کہ کس پر کیا حکم ہے؟

الجواب وباللہ التوفیق:

اس فرقہ وارانہ کشیدگی میں جو مسلمان کسی بھی غیر مسلم کے ہاتھ سے مارا جائے وہ بلاشبہ شہید ہوتا ہے، البتہ سب پر لازم ہے کہ حسب استطاعت اپنی پوری حفاظت اور پوری مدافعت کرتے ہوئے مریں یا بچیں۔بزدلی کے ساتھ یا اپاہجوں کی طرح جان نہ دیں، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۷/۵/۱۴۱۱ھ

مسلمان اگر مسلمان کو مارڈالے تو وہ شہید ہے یا نہیں؟

یہاں دو مسلمان بھائی آپس میں تکرار کر رہے ہیں وہ یہ کہ ایک صاحب کا کہنا ہے کہ مسلمان اگر مسلمان کو مارڈالے وہ شہید نہیں ہے، دوسرے صاحب کہتے ہیں کہ وہ شہید ہے اس کو غسل اور کفن نہ دیا جائے پہلے صاحب کا کہنا صحیح ہے یا دوسرے صاحب کا کہنا صحیح ہے؟

الجواب وباللہ التوفیق:

دونوں فریق میں سے کسی کا کلیہ صحیح نہیں ہے، نہ ہر حال میں شہید ہوگا نہ ہر حال میں غیر شہید ہوگا، بلکہ بعض صورتوں میں شہید ہوگا اور بعض میں نہیں، جیسے مسلمان ڈاکو مسلمان پر ڈاکہ ڈالیں تو جن مسلمانوں پر ڈاکہ پڑا ہے اگر ان میں سے کوئی قتل ہوجاوے تو وہ شہید ہوگا اور اگر خود ڈاکوں میں سے اس ڈاکہ میں کوئی قتل ہوگا تو وہ شہید نہ ہوگا، اس لئے کہ شہادت ایک

فضیلت کا درجہ ہے اور یہ تو ایسی خراب موت ہے کہ اس پر نماز جنازہ بھی نہیں، ''کما تدل علیه هذه العبارات۔ هو (أی الشهید) فی الشرع من قتله أهل الحرب والبغی وقطاع الطریق'' (وایضاً)(۱)، ''ویصلی علی کل مسلم (الی قوله) إلا البغاة وقطاع الطریق ومن بمثل حالهم ''(ہندیہ باب الشہید)(۲)۔

اسی طرح یہ حکم بھی صحیح نہیں کہ جو بھی شہید ہو اس کو غسل اور کفن نہ دیا جائے، بلکہ بعض شہید کو غسل وکفن دیا جائے گا اور بعض کو نہیں دیا جائے گا، جیسے جس شہید نے ارتثاث کرلیا یا جنابت کی حالت میں شہید ہوا اور اس کے جنبی ہونے کا علم ہو ''کما تدل علیه هذه العبارات ویغسل إن قتل جنباً'' الخ(۳)، ''ویغسل من ارتث وهو صار خلقاً فی حکم الشهادة لنیل مرافق الحیاة۔۔۔الخ ''هندیه باب الشهید(۴)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور
الجواب صحیح محمود غفی عنہ مفتی دارالعلوم دیوبند

۱- فتاوی عالمگیریہ ۱/ ۱۶۷۔
۲- فتاوی عالمگیریہ ۱/ ۱۶۳۔
۳- فتاوی عالمگیریہ ۱/ ۱۶۸۔
۴- فتاوی عالمگیریہ ۱/ ۱۶۸۔

كتاب الزكوة

کتاب الزکوۃ

زکوۃ کس پر فرض اور زمین پر زکوۃ ہے یا نہیں:

زکوۃ کن لوگوں پر فرض ہے فرض کرو کہ زید کے پاس سات بیگہ زمین ہے اور ایک سو(۱۰۰) من غلہ ہے غلہ کی قیمت پانچ ہزار روپیہ ہے جو روپیان دنوں رائج ہے اور زید کے پاس دوسرے کا قرض آٹھ ہزار روپیہ ہے کچھ زمین دوسرے کے ذمہ سود بھرنا ہے کیا ایسی حالت میں زید کو زکوۃ ادا کرنا ہوگا۔

الجواب وبالله التوفيق:

زکوۃ ادا کرنا ایسے لوگوں پر فرض ہوتی ہے جن کے پاس اپنی حوائج اصلیہ (تمام ضروریات زندگی) سے اور ادائیگی قرض سے فاضل اور زائد ساڑھے باون تولہ چاندی یا اس وزن کا چاندی کا زیور یا ساڑھے سات تولہ سونا یا اس وزن کا سونے کا زیور وغیرہ یا تجارت کا سامان موجود ہو اور اگر ایسا نہ ہو تو کچھ زکوۃ واجب نہیں ہوتی ہے (۱)۔

آپ نے اپنے جو حالات لکھے ہیں اس کے مطابق آپ پر ادائیگی زکوۃ واجب نہیں ہے، فقط واللہ علم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۷/۱۰/۱۳۸۵

الجواب صحیح محمود غفی عنہ مفتی دارالعلوم دیوبند

کسی خاص مقصد کے لئے رکھی گئی رقم پر سال گزرنے کے بعد زکوۃ کا حکم:

لڑکی کی شادی یا مکان بنوانے کے لئے یا سواری خریدنے وغیرہ کے لیے جمع کی گئی رقم ایک سال سے زائد رکھنے پر

۱- "وسببه أي سبب افتراضها ملک نصاب حولي ... تام.... فارغ عن دين له مطالب من جهة العباد..... وفارغ عن حاجته الأصلية، لأن المشغول بها كالمعدوم" (الدرالمختار مع ردالمحتار ۳/۱۷۴-۱۷۸) (مرتب)۔

جبکہ صاحب نصاب بھی ہوگیا اس جمع کی گئی رقم پر زکوۃ واجب ہوگی جو کسی خاص مقصد کے لئے رکھی گئی ہے۔

الجواب وباللہ التوفیق:

جس شخص کے پاس یہ رقم سال بھر رکھی رہی جب وہ شخص صاحب نصاب ہے تو اس کی بھی زکوۃ ادا کرنی فرض ہوگئی، خواہ کسی بھی مقصد کے لئے رکھی رہی ہو، "**الزکوۃ واجبة علی الحر العاقل البالغ المسلم إذا ملک نصابا ملکا تاما وحال علیه الحول**" (۱)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۹/ ۱۱/ ۱۴۱۰ھ

فروخت شدہ پیداوار سے جو رقم آئی اس پر زکوۃ:

ناچیز فصل انبہ فروخت کرتا ہے اس طور سے جو رقم وصول ہوتی ہے کیا رقم وصول ہوتے ہی اس پر ڈھائی فیصد (2½) کے حساب سے زکوۃ واجب ہوجاتی ہے یا جب اس رقم پر ماہانہ رقم پر پورا ایک سال قمری گزر جائے گا تب واجب الاداء ہوتی ہے، برائے مہربانی وضاحت سے احکامات شرعیہ سے روشناس فرمائیں۔

ایس ایس حیدر، لکھنؤ

الجواب وباللہ التوفیق:

فصل انبہ کے فروخت پر جو رقم وصول ہوتی ہے اس کا حکم اموال تجارت کی زکواۃ کی طرح نہیں ہے کہ سال پورا ہونے کے بعد دی جانے کا حکم ہو، بلکہ اس زکوۃ کا نام عشر (دسواں حصہ) یا نصف عشر (بیسواں حصہ) ہے (۲)۔

چونکہ بعض علاقہ میں آم کی فصل بھی جو بار بار پانی وکھاد وغیرہ دیئے ہوئے اور زمین کھود کر نرم کئے ہوئے ہیں آتی ہے جیسے کشمیر وغیرہ کے بعض علاقے تو اس جگہ کے پھل آنے پر کل پھل کا بیسواں حصہ جہاں تک جلد ہو سکے بطور صدقہ نکال دے یا اس کی قیمت ادا کرے۔ سال گذرنے کا انتظار نہ کرے اور جہاں کہیں آم کی فصل ایسی نہیں ہوتی کہ بار بار پانی وکھاد وغیرہ دیئے بغیر ہو یا پانی وکھاد وغیرہ دینا ہو تو کم تو ایسی جگہ کی پیداوار کا دسواں حصہ نکال دے جیسے دس من پھل میں سے ایک

۱- ہدایہ ۱/ ۱۸۵۔

۱- "ولو باع الزرع إن قبل إدراکه فالعشر علی المشتري ولو بعده فعلی البائع" (الدر المختار مع رد المحتار ۳/ ۲۷۶)۔

من پھل یا اس کی قیمت نکال دے(۱) مگر یہ حکم اور تفصیل اس صورت میں ہے جب باغ عشری زمین میں ہو(۲) اور اگر ایسا نہ ہوتو بیسواں یا دسواں حصہ متعین نہیں بلکہ اسی مقدار پر یا چالیسواں حصہ یا جتنا ہو سکے زیادہ سے زیادہ نکال دے کہ یہ نکالنا باعث خیر و برکت ہوگا، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۵/ ۲/ ۱۴۰۲ھ

زکوۃ وفطرہ کا مقصد:

زکوۃ وفطرہ کے ادا کرنے کا مقصد عید کے دن معذور اقرباء یتیم اور بیوہ مساکین کو دیگر عید کے دن خوشی میں شریک ہونا اور رفاقہ زدی سے بچ کر صاحب نصاب کو ثواب پہنچانا مقصد ہے یا کوئی دوسرا مقصد ہے۔

الجواب وباللہ التوفیق:

جی ہاں یہ بھی ایک مقصد ہے اور اس کے علاوہ اور بھی بہت سے مقاصد ہیں، لیکن اصل حکم شرع اور اس کی اتباع ہے(۳)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۹/ ۷/ ۸۵ ۱۳ھ
الجواب صحیح: سید احمد علی سعید، محمود احمد غفی عنہ مفتی دارالعلوم دیوبند

حکومت کی کسٹڈی میں رکی ہوئی رقم پر زکوۃ:

میرے پاس کاروبار میں کافی کثیر روپیہ تھا ہر سال جس کی زکوۃ ادا کر دیا کرتا تھا سال ہذا ایک پاکستانی کمپنی جو

۱- ''عن سالم بن عبد الله عن أبيه قال، قال رسول اللهﷺ: فيما سقت السماء والأنهار والعيون أو كان بعلا العشر، وفيما سقي بالسواني أو النضح نصف العشر'' (سنن ابوداود ۲/ ۱۰۸، کتاب الزکوۃ باب صدقۃ الزرع حدیث ۱۵۹۶) (مرتب)۔

۲- ''وأما شرائط المحلية، فأنواع: منها أن تكون الأرض عشرية'' (بدائع الصنائع ۲/ ۱۷۵)۔

۳- ''إنما كان قول المؤمنين إذا دعوا إلى الله ورسوله ليحكم بينهم أن يقولوا سمعنا وأطعنا وأولئك هم المفلحون، ومن يطع الله ورسوله ويخش الله ويتقه فأولئك هم الفائزون'' (سورہ النور: ۵۱-۵۲)، ''عن ابن عباسؓ قال: فرض رسول اللهﷺ زكاة الفطر طهرة للصائم من اللغو والرفث وطعمة للمساكين من أداها قبل الصلاة فهي زكاة مقبولة، ومن أداها بعد الصلاة فهي صدقة من الصدقات'' (سنن ابوداود ۲/ ۱۱۱، کتاب الزکوۃ باب زکوۃ الفطر حدیث: ۱۶۰۹)۔

مدراس میں واقع ہے اس کمپنی سے کاروبار زیادہ کیا گیا مذکورہ کمپنی کو حکومت نے محکمہ کسٹوڈین میں لے لیا ہے جس کی وجہ سے میری اور میرے آسامیوں کی کثیر رقم رک گئی ہے جس کو تقریباً چھ ماہ کا عرصہ ہوتا ہے، یہ رقم حکومت ہم کو ادا کرنے کا امکان بھی ہے، لیکن کس قدر عرصہ میں یہ رقم حاصل ہو سکیں گی جس کا صحیح اندازہ نہیں ہو رہا ہے فی الوقت بہت ہی مختصر روپیہ کاروبار میں ہے جس سے میری گذر بسر بمشکل ہو سکتی ہے مخفی مباد کہ آسامیوں کی واجب الادا رقم و سرمایہ دونوں کسٹوڈین میں رکے ہوئے ہیں عرض خدمت یہ ہے کہ شرعی نظریہ سے مختصر سرمایہ جو اسوقت کاروبار میں مشغول ہے اس کی زکوۃ ادا کرنی ہوگی یا خطیر، یعنی کثیر روپیہ جو کسٹوڈین میں رکا ہوا ہے اس کی بھی زکوۃ ادا کرنی ہوگی۔

عبدالستار

الجواب وباللہ التوفیق:

جو رقم کسٹوڈین میں رکی ہوئی ہے اس کی زکوۃ ادا کرنا ابھی آپ کے ذمہ واجب نہیں ہے جب جب ملے گی اور جس طرح ملے گی اس طرح کرنا واجب ہوگا پہلے نہیں (۱)، البتہ جو مختصری رقم آپ کے قبضہ میں اس وقت ہے اور جو سرمایہ اس وقت آپ کے قبضہ میں ہے اس پر جو اور قرضے وبقائے ہوں ان کو وضع کرنے کے بعد جس قدر بچے اگر وہ مقدار نصاب زکوۃ ہو تو فقط اس پر فی الحال زکوۃ واجب ہوگی (۲)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

الجواب صحیح: سید احمد علی سعید مفتی دارالعلوم دیوبند

زر ضمانت پر زکوۃ:

زید کے پاس مکمل حساب نہیں ہے اور نہ پہلے کبھی تھا وہ ہر سال اپنے کو صاحب نصاب سمجھتے ہوئے احتیاط کے طور پر کچھ زیادہ رقم کا ہی زکوۃ نکالتا رہا ہے، مگر قلب کو تسکین نہیں ہے، اس لئے دریافت ہے۔

۱- زید ایک کاروبار دوسرے کنٹرکٹ پر لیا ہے جس کی ضمانت کے طور پر نقد روپیہ ڈھائی ہزار جمع مالک کے پاس کیا

۱- "وعندهما الديون كلها سواء تجب زكوتها ويؤدى متى قبض شيئاً قليلاً أو كثيراً" (ردالمحتار باب زکاۃ المال ۳۳۶/۲)۔

۲- "وسببه أي سبب افتراضها ملك نصاب حولي .... تام .... فارغ عن دين له مطالب من جهة العباد .... وفارغ عن حاجته الأصلية لأن المشغول بها كالمعدوم" (الدرالمختار مع ردالمحتار ۱۷۴/۳-۱۷۸)(مرتب)۔

ہے اس سال تمام میں بھی زید اس روپیہ کا زائد مالک ہے، مگر روپیہ مالک کے پاس جمع ہے۔

قرض دی ہوئی رقم پر زکوۃ:

۲-زید اپنے خاص کاروبار میں بچت کا روپیہ اندازہ کے موافق زیادہ سے زیادہ دو ہزار فرض کرتا ہے جو کچھ دوسروں کو بطور قرض دے چکا ہے اور کچھ کاروبار میں پھنسا ہوا ہے۔

مشین کی مالیت پر زکوۃ:

۳-زید کے پاس دو عدد مشین کپڑا بننے والی ایجی ہیں جو پانچ ہزار مالیت کی ہیں جس سے آمدنی دو سو روپیہ سے لے کر ڈھائی سو روپیہ تک ہے۔

بیوی کے مستعمل زیورات کی زکوۃ:

۴- زید کی بیوی کے پاس پانچ سو روپیہ کے زیورات ہیں جو استعمال کرتی ہے۔

۵-زید کے ذمہ کاروبار کے طور پر کچھ دوسروں کا باقی اور کچھ پر اس کا باقی ہے جو اپنے حساب سے برابر تصور کر چکا ہے اب ایسی حالت میں زید کو کس کس رقم پر زکوۃ نکالنی ہوگی۔

الجواب وبالله التوفيق:

۱-ضمانت کے طور پر جو ڈھائی ہزار جمع ہے اس پر ابھی زکوۃ نہیں، ملنے کے بعد دیجئے (۱)۔

۲-بچت کے دو ہزار روپیہ میں سے جو دوسروں کو بطور قرض دیا ہے اگر دست گردان کے طور پر ہے کہ جلدی ہی مل جائے گا تو اس کی زکوۃ دی جائے گی، ورنہ ملنے کے بعد بہر حال پچیس روپیہ فی ہزار کے حساب سے زکوۃ دینی ہوگی (۲)۔

۳-مشینوں کی مالیت پر زکوۃ نہیں (۳)۔

۱- ’’ویؤدی متی قبض شیئاً قلیلاً أو کثیراً إلا دین الکتابة والسعایة والدیة فی روایة‘‘ (ردالمحتار علی الدر المختار ۳/۲۳۶)۔

۲- ’’ففی القوی (أی الدین القوی وهو بدل القرض ومال التجارة) تجب الزکوة إذا حال الحول، ویتراخی القضاء إلی أن یقبض أربعین درهماً ففیها درهم ....الخ‘‘ (البحرالرائق ۲/۳۶۳)(مرتب)۔

۳- ’’ولا (زکاة) فی ثیاب البدن .... وأثاث المنزل ودور السکنی ونحوها .... وکذلک آلات المحترفین‘‘ (الدرالمختار مع ردالمحتار ۳/۱۸۳)(مرتب)۔

۴-بیوی کے پاس جو چاندی سونے کے زیور ہیں اگر چہ استعمال کرتی ہیں،مگراس میں زکوۃ دیناواجب ہے اور پانچ سوروپیہ کے زیورات پر ساڑھے بارہ روپیہ زکوۃ دینی ہوگی(۱)۔

۵-جب برابر ہوگیا تواس پر کچھ زکوۃ نہیں (۲)،فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی،مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

الجواب صحیح:سید احمد سعید،مفتی دارالعلوم دیوبند

زیورات کی زکوۃ میں سرکاری نرخ کا اعتبار ہوگا یا بازار کا:

ہندوستان کی حکومت وقت نے سونے کی بین الاقوامی قیمت رائج کردی ہے اندرون ہند اور بیرون ہند ہر جگہ حکومت کا سونے کا سارا کاروبار اور لین دین بین الاقوامی شرح سے ہوتا ہے سونا بانڈ اور جنگی ضرورت سے سونے کے چندہ میں اور سونے کے قرض لینے اور دینے کے وعدہ میں بھی حکومت ہند اور ہندوستانی باشندوں کا سارا لین دین او رفراہم شدہ اور قرض ملے ہوئے سونے کی قیمت کا حکومت کی طرف سے اعلان بین الاقوامی قیمت سے ہوتا ہے،مگراس بین الاقوامی قیمت پر سونا کھلے بازار میں کسی عام خریدار کو میسر نہیں ہوتا ہے،البتہ سونے کی بین الاقوامی قیمت سے تقریباً ۹۷ روپیہ فی بھری زائد دینے پر بلیک مارکیٹ اور چوربازاری میں حسب ضرورت چوری سے سونا ملتا ہے،لیکن چوربازاری سے خرید کردہ اس سونے کو کچھ دنوں کے بعد اگر اسی سنار یا کسی دوسرے سنار کے پاس فروخت کیا جاوے تو قیمت کا کوئی نرخ متعین نہیں رہتا ہے ہر خریدار سنار من مانی قیمت دیتا ہے۔

مستورات کے پرانے زیورات کے سونے کی قیمت کی کوئی شرح متعین نہیں رہے گی زیورات کی اصل شکل میں تبدیل کے بغیر اصلی سونے اور میل اور ٹانکہ کا فرق بہت دشوار ہے،اس لئے میل اور ٹانکے کے نام پر ہر سنار کم از کم لگاتا ہے اور ضرورت اور مجبوری کے موافق زیور فروخت ہوجاتا ہے اصل سونے کی قیمت تشخیص نہیں ہو پاتی ہے۔

ان حالات میں سوال یہ ہے کہ جن خواتین کے کچھ پرانا زیور بقدر نصاب باقی ہے تو وہ زکوۃ دینے کے لئے سونے

۱- ’’تجب في كل مائتي درهم خمسة دراهم وفي كل عشرين مثقال ذهب نصف مثقال مضروباً كان أو لم يكن مصوغاً أو غير مصوغ حلياً كان للرجال أو للنساء تبراً كان أو سبكية، كذا في الخلاصة‘‘(فتاوی عالمگیریہ ۱/۱۷۸)۔

۲- ’’وسببه أي سبب افتراضها (الزكاة) ملك نصاب حولي .... تام .... فارغ عن دين له مطالب من جهة العباد... الخ‘‘(الدرالمختار مع ردالمحتار ۳/۱۷۴)(مرتب)۔

کی قیمت کی تشخیص سرکاری اور بین الاقوامی نرخ سے کریں یا چور بازاری کی شرح سے قیمت لگائیں؟

الجواب وباللہ التوفیق:

مذکورہ صورت میں آپ یہ کرلیا کریں کہ سونے کے تمام زیورات کو وزن کرلیا کریں، مثلاً چالیس تولے ہوں تو ایک تولہ وزن کا کوئی زیور زکوۃ میں نکال دیں، اگر زیور نہ دینا چاہتے ہوں تو اس زیور کو بازار میں دکھلا کر جو عام قیمت لگے اتنے قیمت کے روپیہ زکوۃ میں نکال دیں خالص ایک تولہ سونے کی قیمت نکالنی آپ پر فرض نہیں ہے، بلکہ محض ایک تولہ سونے کے زیور یا اس کی قیمت دینی فرض ہے اور وہ اس طرح ادا ہوجائے گی اگر بالفرض ایک تولہ سونے کا کوئی زیور نہیں، بلکہ ڈیڑھ تولہ کا ہے اس کی قیمت لگوا کر اس قیمت کا دو تہائی برابر ایک تولہ زیور کی قیمت کے ہوجائے گا اسی طرح ایک تولہ سے کمی بیشی کے زیور میں حساب لگا کر نکال سکتے ہیں (۱)۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۳/۹/۸۵ ۱۳ھ
الجواب صحیح: محمود غفی عنہ مفتی دارالعلوم دیوبند

زیورات کی زکوۃ کی ادائیگی میں کس نرخ کا اعتبار ہوگا؟

سونے اور چاندی کے زیورات پر زکوۃ نکالنے کے لئے ان کے وزن کی قیمت کا چالیسواں حصہ مقرر ہے چاندی کا نرخ تو معلوم ہوجاتا ہے، مگر سونے کا نرخ کا کوئی قیام نہیں ہے یہ سب بلیک مارکیٹ کا بھاؤ ہے کچھ حضرات کا کہنا ہے کہ گورنمنٹ نے جو نرخ سونے کا مقرر کیا ہے اس حساب سے زکوۃ دینی ہوگی انگریزی اخبار دیکھنے پر بھی اس کے نرخ کا پتہ نہیں چلا ہے بلیک مارکیٹ کا بھاؤ ایکسو پینسٹھ ۱۶۵ روپیہ تولہ ہے جواب سے مطلع فرمائیں۔

الجواب وباللہ التوفیق:

سونے چاندی کے جتنے زیورات ہوں ان سب کی قیمت بازار میں معتبر جگہوں میں لگوا کر پھر اس کی قیمت کا

۱- ''والمعتبر وزنهما أداءً ووجوباً ولا قيمتهما (الدر المختار) شامی میں ہے: أي من حيث الأداء يعني يعتبر أن يكون المؤدى قدر الواجب وزناً عند الإمام والثاني، وقال زفر: تعتبر القيمة واعتبر محمدٌ الأنفع للفقراء'' (الرد المحتار علی الدر المختار ۳/ ۲۲۷) (مرتب)۔

چالیسواں حصہ اس لگی ہوئی قیمت کا زکوۃ میں نکال دیں، بے شبہ زکوۃ ادا ہو جاویگی، زیادہ کاوش کی ضرورت نہیں (۱)۔فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۸/ ۲/ ۹/ ۸۵ ۱۳ھ
الجواب صحیح: سید احمد علی سعید، مفتی دارالعلوم دیوبند

قرض پر زکوۃ کا حکم:

میں کپڑے کی تجارت کرتا ہوں اس میں ادھار بکری ہوتی ہے اس میں کچھ دھارا ایسا بھی ہے کہ مارا بھی جاوے اور کچھ ادھار ایسا ہے کہ اس کا کچھ پتہ نہیں ہے کہ کب ملے اس کو زکوۃ کے حساب میں شامل کیا جاوے یا کہ نہیں۔

الجواب وباللہ التوفیق:

جس ادھار کے ملنے کی امید نہیں اس کی زکوۃ بھی نکالنا آپ کے ذمہ نہیں، بلکہ جب ملے اور جس طرح ملے اس وقت اسی طرح اس کی زکوۃ نکالنی واجب ہوگی (۲)۔فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور
الجواب صحیح: محمد جمیل الرحمٰن، محمود عفی عنہ مفتی دارالعلوم دیوبند

دوران سال حاصل ہونے والی رقم پر بھی زکوۃ واجب ہے؟

زید کے پاس ایک ہزار روپیہ ہے کہ جس پر رمضان میں زکوۃ واجب ہوگئی ہے، مگر کچھ روپیہ رمضان کے ۴ مہینہ قبل اور آ گیا ہے ایسی صورت میں زید ایک ہزار روپیہ پر زکوۃ نکالے یا پورے روپیہ پر عند الشرع کیا حکم ہے؟

۱- "وجاز دفع القيمة في زكاة ... وتعتبر القيمة يوم الوجوب وقالا: يوم الأداء..... ويقوم في البلد الذي المال فيه" (الدر المختار مع رد المحتار ۳/ ۲۱۰-۲۱۱)(مرتب)۔

۲- "فتجب زكوتها إذا تم نصاباً وحال الحول، لكن لا فوراً ،بل عند قبض أربعين درهماً من الدين القوي "(الدر المختار مع رد المحتار ۳/ ۲۳۶)(مرتب)۔

الجواب وباللہ التوفیق:

زید کے ذمہ پورے روپیہ کی زکوۃ واجب ہے یعنی اصل سرمایہ کی بھی اوراس رقم کی بھی جو بعد میں حاصل ہوئی ہے (۱)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۲/ ۹/ ۸۵ ۱۳ھ

مشترک کاروبار میں زکوۃ:

ہم دو آدمی روپیہ قرض لاکر تجارت کرتے ہیں، کل مال تخمیناً ساڑھے چار ہزار روپیہ ہے گذشتہ سال ہم دو آدمی بطور تنخواہ ایک ہزار روپیہ لیکر اپنے خرچ میں لائے اس کے سال آئندہ مارچ کو سال پورا ہوگا حساب کرنے میں جتنا روپیہ نکلے گا ہم دونوں کی تنخواہ ملا کر اس پر زکوۃ کس طرح دی جائے گی از روئے شرع ہمیں بتلایئے؟

الجواب وباللہ التوفیق:

جب سال پورا ہو مثلاً مارچ کے ماہ میں پورا ہوگا تو اس وقت دوکان کے تمام اخراجات قرض وغیرہ چاہے آپ لوگوں کی ذات پر یا گھر پر خرچ ہوا ہو یا قرضہ میں دیا ہو، سب مجرا کرکے جو بچے وہی اصل سرمایہ ہوگا۔ اوراسی پر زکوۃ واجب ہوگی (۲)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۴/ ۹/ ۸۵ ۱۳ھ

جواب صحیح ہے، اتنی بات اور قابل لحاظ ہے کہ شریک کو اپنے کام کی تنخواہ مال شرکت سے لینا درست نہیں ہے (۳)۔

۱- "والمستفاد ولو بهبة أو إرث وسط الحول إلى نصاب من جنسه فيزكيه بحول الأصل" (الدر المختار مع رد المحتار ۳/ ۲۱۴) (مرتب)۔

۲- "وسببه أي سبب افتراضها ملك نصابي حولي .... تام .... فارغ عن دين له مطالب من جهة العباد، ..... وفارغ عن حاجته الأصلية لأن المشغول بها كالمعدوم" (الدر المختار مع رد المحتار ۳/ ۱۷۴) (مرتب)۔

۳- "يعني لو استاجر أحد الشريكين صاحبه لحمل طعام بينهما لا يستحق المسمى ولا أجر المثل، لأن العقد ورد على ما لا يمكن تسليمه، لأن المعقود عليه حمل النصف شائعاً وذلك غير متصور" (البحر الرائق ۸/ ۴۴) (مرتب)۔

کپڑے کے تھان کے ذریعہ زکوۃ کی ادائیگی:

ایک شخص نے ایک تھان کپڑے کا تیار کیا اور اس میں سوت وغیرہ کی دس روپیہ لاگت آئی ہے، یعنی خرچہ اس تھان پر دس روپیہ کا ہوا اور وہ تھان بازار میں پندرہ روپیہ کا بکتا ہے تو پانچ روپیہ اس میں بننے کی مزدوری کے ملتے ہیں تو اگر کوئی شخص اس تھان کو اپنے ہاتھ سے بنکر کسی غریب کو اپنی طرف سے زکوۃ میں دیدے تو زکوۃ میں دس روپیہ ادا ہوں گے یا پندرہ روپیہ ادا ہوں گے۔

الجواب وبالله التوفيق:

جب کپڑا بنکر تیار ہو گیا اور اس کی مالیت پندرہ روپیہ کی ہوگئی اور زکوۃ مالیت پر ہی ہوتی ہے اور موجودہ مالیت لاگت پر لگتی ہے، تو اب پندرہ روپئے زکوۃ ادا ہونے میں کیا اشکال ہے بلا تردد پندرہ ہی روپیہ زکوۃ ادا ہوتی خواہ فروخت کر کے نقد بنا کر ادا کیا یا کپڑا دیکر (۱)۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

۱-سواری کے گھوڑے اور کھیتی کے بیل پر زکوۃ:

زکوۃ کے نصاب کے علاوہ سواری کا ایک گھوڑا اور کھیتی کے کام کے دو بیل ہیں ان جانوروں پر زکوۃ واجب ہے کہ نہیں۔

۲-کھانے کی غرض سے خریدے گئے غلہ پر زکوۃ:

ایک شخص کے پاس کھیتی میں غلہ کے بجائے روئی پیدا ہوئی، اور اس نے روئی فروخت کر کے غلہ خریدا، اگر اپنے کھانے کی غرض سے خریدا تو اس پر خریدے ہوئے غلہ پر زکوۃ واجب ہوگی یا کہ نہیں۔

۳-جانوروں کی زکوۃ:

ایک شخص کے پاس چند ہاتھی ہیں بھینس ہیں اور بیل ہیں بکریاں ہیں مندرجہ بالا جانوروں میں کونسی قسم کے کتنے

۱- ''وجاز دفع القيمة في زكوة وعشر'' (الدر المختار) ''قال في الشامية: أي ولومع وجود المنصوص عليه'' (الرد المحتار علی الدر المختار ۳/ ۲۱۰)، ''ويقوم في البلد الذي المال فيه'' (الدر المختار ۳/ ۲۱۱) (مرتب)۔

جانور پر زکوۃ واجب ہے۔

الجواب وباللہ التوفیق:

۱، ۲۔ سواری کے گھوڑے اور کھیتی کے بیلوں پر زکوۃ واجب نہیں اور جو غلہ گھر پر کھانے کے لئے خرید ا اس پر زکوۃ واجب نہیں (۱)۔

۳۔ ہاتھی اگر تجارت کے لئے یعنی ہاتھیوں کی خرید فروخت کی تجارت کرتا ہے تو اس کی قیمت پر زکوۃ واجب ہوگی (۲) اور اگر سواری کے لئے ہیں مثل سامان تجارت کے ان کی خرید وفروخت نہیں کرتا تو اس پر زکوۃ واجب نہیں ہے، اسی طرح جو بھینس بیل ہل جوتتے یا بوجھ لادنے یا گاڑی میں چلانے کے لئے یا اور کسی کار معیشت کے لئے ہیں تو ان پر زکوۃ واجب نہیں (۳) اور کسی کار معیشت کے لئے نہیں ہیں بلکہ یوں ہی پڑے رہتے ہیں اور سال بھر میں اکثر حصہ یعنی چھ ماہ سے زائد محض چر کران کا گذر ہوجاتا ہے کھلانا پلانا نہیں پڑتا ہے تو ان پر زکوۃ اس وقت واجب ہوگی (۴) جب بھینس یا بیل تیس عدد یا زیادہ ہوجائیں (۵) تیس سے کم ہو یا ٦ ماہ یا اکثر حصہ سال کا ان کو کھلانا پڑتا ہے تو پھر زکوۃ واجب نہیں، یہی حکم بکریوں کا بھی ہے، فقط فرق یہ ہے کہ بجائے تیس کے جب چالیس بکریاں ہوجائیں اور اکثر حصہ سال کا محض چر کر گذارتی ہوں تو زکوۃ واجب ہوگی اور زکوۃ یہ ہوگی کہ تیس بھینس یا بیل سے لے کر ۳۹ تک میں (تبیعہ) ایک سالہ بچہ اور پھر چالیس میں دو سالہ بچہ (مسنہ) اور پھر چالیس سے زائد میں ایک مسنہ (دو سالہ بچہ) اور جتنا زیادہ ہوا تنا ہی چالیسواں ایک مسنہ کا دیں گے اونسٹھ (۵۹) تک اور ساٹھ میں دو تبیعہ یعنی ایک سالہ بچہ خواہ مذکر ہو یا مونث، پھر ستر میں ایک مسن مذکر یا مسنہ مونث اور ایک تبیع مذکر یا مونث پھر اسی طرح ہر تیس پر تبیعہ یا تبیع اور ہر چالیس پر مسن یا مسنہ دیتے جائیں اور بکریوں میں جب تک بکریاں چالیس سے کم ہوں تو کوئی زکوۃ نہیں۔ جب چالیس ہوجائیں تو ایکسو بیس تک محض ایک بکری اور ایک سو بیس سے زائد میں دو سو

۱- ”ومنها فراغ المال عن حاجته الأصلية فليس في دور السكنى وثياب البدن وأثاث المنازل ودواب الركوب وعبيد الخدمة وسلاح الاستعمال زكوة، وكذا طعام أهله وما يتجمل به من الأواني إذا لم يكن من الذهب والفضة، وكذا الجوهر واللؤلؤ والبلخش والزمرد ونحوها إذا لم يكن للتجارة“ (فتاوی عالمگیری ۱/ ۱۷۲) (مرتب)۔

۲- ”ولو للتجارة ففيها زكوة التجارة“ (الدر المختار مع رد المحتار ۳/ ۱۹۸)۔

۳- دیکھئے حاشیہ نمبر ۱، نیز ”وكذا كتب العلم إن كان من أهله وآلات المحترفين (يعني لا زكاة فيها)“ (فتاوی عالمگیریہ ۱/ ۱۷۲)۔

۴- ”فلو علفها نصفه لا تكون سائمة فلا زكوة فيها للشك في الموجب“ (الدر المختار مع رد المحتار ۳/ ۱۹۸)۔

۵- ”نصاب البقر والجاموس ثلاثون سائمة وفيها تبيع“ (تنویر الابصار مع الدر ورد ۳/ ۲۰۳)۔

تک دو بکری پھر ہر سیکڑہ میں ایک بکری (۱)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۴/ ۹/ ۸۵ ۱۳ھ
الجواب صحیح: محمود عفی عنہ، مفتی دارالعلوم دیوبند

نوٹ پر زکوۃ:

زکوۃ کا اخراج نصاب کے اوپر مقرر ہے مثلاً سونا ۷ تولہ چاندی ساڑھے باون تولہ یا چاندی کا روپیہ ہو تو پچاس روپیہ پر ۴/۱ اب چونکہ چاندی کا نرخ ۸/ ہے تولہ کا ہے اس کے حساب سے ساڑھے باون تولہ چاندی کے دام ۱۸۲ روپیہ ہوتے ہیں علی ہذا القیاس۔

اب نہ تو پچاس روپیہ والا اور نہ ڈیڑھ سو روپیہ والا اور نہ سو روپیہ والا صاحب نصاب ہوتا ہے۔ دریافت ہے کہ اب زکوۃ کس حساب سے نکالیں۔

الجواب وباللہ التوفیق:

نصاب زکوۃ ساڑھے باون تولہ چاندی یا اس وزن کا چاندی کا زیور یا اتنی چاندی کی قیمت کا روپیہ ہے جتنے روپیہ میں ساڑھے باون تولہ چاندی مل سکے گی اتنا ہی مقدار نصاب ہوگا اور اس حساب سے چالیسواں حصہ زکوۃ دینا ہوگا، مثلاً آجکل ساڑھے باون تولہ چاندی ۱۸۲ روپیہ میں آتی ہے تو اتنی رقم نوٹوں سے جب ضرورت اصلیہ سے (فارغ) فاضل ہوگی تو مقدار نصاب کا مالک کہا جائے گا کاغذ کے نوٹ رکھنے والے بھی اسی طرح قیمت لگا کر زکوۃ نکالیں گے (۲)۔

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور
الجواب صحیح: محمود عفی عنہ، مفتی دارالعلوم دیوبند

۱- بھینس بیل کے نصاب اور زکوۃ کے لئے دیکھئے: الدر المختار مع رد المحتار ۳/ ۲۰۳ اور بکری کی زکاۃ کے لئے ص ۲۰۴/ (مرتب)۔

۲- "والمعتبر وزنهما أداء ووجوباً ولا قيمتها نفى لقول زفر باعتبار القيمة فى الأداء، وهذا إن لم يؤد من خلاف الجنس وإلا اعتبرت القيمة إجماعا" (الرد المحتار على الدر المختار ۳/ ۲۲۷)۔

۱-روپے پر زکوۃ:

روپیہ نقد پر کتنا فی صدی زکوۃ واجب ہے؟

۲-فیکٹری کے تیار شدہ اور خام مال پر زکوۃ:

کارخانہ کے تیار مال پر جو بکا نہیں ہے اور جو کچا مال پڑا ہے اس پر کس حساب سے زکوۃ دینی ہے؟

۳-مشینری اور اوزار پر زکوۃ:

مشینری اور اوزاروں پر زکوۃ ہے یا کہ نہیں اگر ہے تو کیا صورت ہے؟

۴-سونے چاندی میں زکوۃ کا طریقہ:

سونے چاندی پر زکوۃ کا کیا طریقہ ہے جس پر عورت اور مرد کا حق ہو؟

الجواب وباللہ التوفیق:

(۱) ڈھائی روپیہ فی سیکڑہ کے حساب سے زکوۃ ادا کی جاوے (۱)۔

۲-تیار مال کی تیار مال کے اعتبار سے قیمت لگا کر اور کچا مال پر کچا مال کی قیمت لگا کر زکوۃ دی جائے (۲)۔

۳-مشینری اور اوزاروں کی قیمت پر زکوۃ نہیں واجب ہوتی ہے (۳)۔

خرید کر بیچا کرتا ہے اور اس کی خرید وفروخت کا کاروبار کرتا ہے تو اس صورت میں ان مشینری اور اوزاروں کی قیمت

۱- ''تجب في كل مائتي درهم خمسة دراهم وفي كل عشرين مثقال ذهب نصف مثقال'' (فتاوی عالمگیریہ ۱/۱۷۸)، ''عن علي قال :قال رسول الله ﷺ: قد عفوت عن صدقة الخيل والرقيق، فهاتوا صدقة الرقة، من كل أربعين درهما، درهماً وليس في تسعين ومائة شيئ فإذا بلغت مائتين ففيها خمسة دراهم'' (سنن الترمذی ۳/۷ کتاب الزکوۃ باب ما جاء فی زکوۃ الذہب والورق حدیث ۶۲۰)۔

۲- ''وأما أموال التجارة فتقدير النصاب فيها بقيمتها من الدنانير والدراهم'' (بدائع الصنائع ۲/۱۰۹)، ''إذا كان له مائتا قفيز حنطة للتجارة تساوي مائتي درهم فتم الحول، ثم زاد السعر أو انتقص فإن أدى من عينها أدى خمسة أقفزة وإن أدى القيمة تعتبر قيمتها يوم الوجوب'' (فتاوی عالمگیریہ ۱/۱۷۹)۔

۳- ''وليس في دور السكنى وثياب البدن وأثاث المنزل ودواب الركوب وعبيد الخدمة وسلاح الاستعمال زكوة لأنها مشغولة بالحاجة الأصلية وليست بنامية أيضاً، وعلى هذا كتب العلم لأهلها وآلات المحترفين'' (ہدایہ ۱/۱۶۶) (مرتب)۔

پر زکوۃ واجب ہوگی اور جو لوگ مشینری یا اس کا اوزار اپنے یہاں کارخانوں میں استعمال کے لئے خود رکھتے ہیں اس کا وہ حکم ہے کہ اس کی قیمت پر زکوۃ واجب نہیں ہے۔

بلکہ اس سے کاروبار کرکے جو آمدنی ہوگی اگر وہ آمدنی نصاب کی مقدار کو پہنچ جائے تو اس آمدنی پر زکوۃ دینی واجب ہوگی زکوۃ کی مقدار نصاب یہ ہے کہ تمام ضروریات زندگی اور حاجت اصلیہ پوری کرنے کے بعد ساڑھے باون تولہ چاندی یا اس کی قیمت کے برابر روپیہ جو فاضل بچے وہ مقدار نصاب ہے۔

(۴) ۳۔ میں جو مقدار نصاب کا بتلایا گیا ہے اتنا زیور جب ہو تو اس زیور کا ایک چالیسواں حصہ زکوۃ دینا واجب ہے خواہ زیور کا چالیسواں حصہ نکال دیں یا اس کی قیمت لگا کر چالیسواں حصہ نکال دیں دونوں جائز ہے (۱)۔فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۴/ ۹/ ۸۵ ۱۳ھ
الجواب صحیح: سید احمد علی سعید، مفتی دارالعلوم دیوبند

دوسرے کے قرض کی ادائیگی میں جو رقم دی اس کی زکوۃ کس پر ہے؟

زید کافی عرصہ سے مقروض چلا آتا تھا بکر نے زید کو سود سے بچانے کے لئے اب سے ایک ماہ پیشتر اس کا قرض ادا کر دیا اور طے پایا کہ زید ہر ماہ بکر کو دو سو روپیہ قسط وار ادا کرتا رہے گا، بکر ہمیشہ زکوۃ رمضان کے اخیر میں ادا کرتا ہے، لہذا موجودہ شکل میں، جبکہ تین ہزار پانچ سو روپیہ زید کا قرض ادا کرنے میں لگا دیتے ہیں تو امسال اور اگلے سال زکوۃ کس پر واجب ہوتی ہے آیا زید ادا کرے یا بکر۔

الجواب وباللہ التوفیق:

بکر ہی کو ادا کرنی ہوگی قرضدار کو نہیں (۲)، قرضدار کا قرضہ سودی ادا کر دینا بہت بڑا ثواب ہے جتنی رقم زکوۃ میں

۱- دیکھئے: حاشیہ نمبر۱، "وجاز دفع القیمة أی ولو مع وجود المنصوص علیه" (رد المحتار علی الدر المختار ۳/ ۲۱۰) (مرتب)۔

۲- "واعلم أن الدیون عند الإمام ثلاثة قوی ومتوسط وضعیف، فتجب زکاتها إذا تم نصاباً وحال الحول، لکن لا فوراً"، (الدر المختار) "وعندهما الدیون کلها سواء تجب زکاتها ویؤدی متی قبض شیئاً قلیلاً أو کثیراً" (رد المحتار علی الدر المختار ۳/ ۲۳۶)۔

دے گا اس سے کہیں زیادہ اس کا ثواب پائے گا جس کا نفع ابدی ہوگا(۱)۔فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۰/ ۲/ ۹/ ۸۵ ۱۳ھ

الجواب صحیح: سید احمد علی سعید، مفتی دارالعلوم دیوبند

جس رقم کے ملنے کی امید نہ ہو اس پر زکوۃ:

جو رقم بطور قرض دی گئی ہے اور اس کے وصول ہونے میں کافی دیر ہے اور بعض صورتوں میں رقم واپس ہونے کی بالکل امید نہیں ہے تو ان حالتوں میں اس رقم پر زکوۃ دینی ہوگی یا کہ نہیں چونکہ ادائیگی زکوۃ کے لئے تملیک ضروری ہے اور قرض دی ہوئی رقم اپنے قبضہ سے باہر ہے اور اس رقم پر تصرف بھی حاصل نہیں ہے، اس لئے زکوۃ نکالنی واجب ہے یا کہ نہیں۔

الجواب وباللہ التوفیق:

جس رقم کے ملنے کی امید نہیں ہے اس کی زکوۃ نکالنی ابھی واجب نہیں ہے جب ملے اور جس طرح ملے اسی طرح زکوۃ نکالنی واجب ہوگی اور جس رقم کے ملنے کی امید ہے اس کی زکوۃ نکالنی واجب ہے اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ جتنی حیثیت اور سرمایہ آپ کے قبضہ میں ہے اس میں اس رقم قرض کو بھی شمار کیجئے جس کے ملنے کی امید ہے اور پھر مجموعہ کا چالیسواں حصہ نکال دیجئے اس رقم کا بھی چالیسواں ادا ہوگیا، اور جس فقیر کو آپ دیں گے اس کی تملیک بھی ہوگئی ہے تملیک کا یہی مطلب ہے، یعنی فقیر کو دی ہوئی رقم کا مالک بنانا، ورنہ آپ تو مالک ہیں ہی اس رقم کا بھی جو متوقع الحصول ہے اور اس رقم کے بھی جو غیر متوقع الحصول ہے تملیک کا وہ معنی نہیں جو آپ سمجھ رہے ہیں (۲)۔فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۸/ ۲/ ۹/ ۸۵ ۱۳ھ

الجواب صحیح: سید احمد علی سعید، مفتی دارالعلوم دیوبند

۱- "عن أبي هريرةؓ عن النبي ﷺ قال: من نفس عن مسلم كربة من كرب الدنيا نفس الله عنه كربة من كرب يوم القيامة، ومن يسر على معسر في الدنيا يسر الله عليه في الدنيا والآخرة، ومن ستر على مسلم في الدنيا ستر الله عليه في الدنيا والآخرة، والله في عون العبد ما كان العبد في عون أخيه" (سنن الترمذی ۴/ ۲۶۳، کتاب البر والصلۃ باب ما جاء فی السعر علی مسلم حدیث: ۱۹۳۰)(مرتب)۔

۲- دیکھئے حاشیہ نمبر۱، (الرد المحتار علی الدر المختار ۳/ ۲۳۶)، أما تفسيرها فهي تمليك المال من فقير مسلم .... الخ (فتاوی عالمگیریہ ۱/ ۱۷۰)(مرتب)۔

پاورلوم پر زکوۃ:

اگر کوئی شخص کپڑے کی سلائی کی مشین خریدے یا پاورلوم (کپڑے کی مشین جو بجلی کے ذریعہ چلتی ہے) خریدے اور خود کام کرے یا خرید کر دوسرے کو دے اور آمدنی کے منافع میں شرکت ہو تو اس مشین یا پاورلوم پر زکوۃ ہوگی یا کہ نہیں جبکہ یہ مال نامی نہیں ہے۔

الجواب وباللہ التوفیق:

اگر سلائی کی مشین یا پاورلوم خرید کر خود اس پر کام کرتا یا کراتا ہے بغرض تجارت نہیں خریدا ہے تو اس مشین یا پاورلوم کی مالیت پر زکوۃ واجب نہیں (۱) اور اگر اس پر خود کا کام نہیں کرتا کراتا ہے بلکہ فروخت کر دیتا ہے تو یہ مال تجارت شمار ہوگا اور اس کی مالیت پر اگر حوائج اصلیہ سے اور قرضہ وغیرہ سے زائد مقدار نصاب کو پہنچ جائے تو زکوۃ واجب ہوگی فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۸/ ۱۰/ ۸۹ ۱۳ ھ
الجواب صحیح: سید احمد علی سعید، مفتی دارالعلوم دیوبند

زکوۃ وفطرہ کی رقم سال بھر رکھنا یا تجارت کے لئے دینا:

کیا زکوۃ وفطرہ کی رقم جمع کر کے سال بھر رکھنا جائز ہے یا کسی آدمی کو تجارت کے واسطے دینا اسے نفع لے کر غریبوں بیواؤں یتیموں کی امداد کی غرض سے جائز ہوگا یا کہ نہیں۔

الجواب وباللہ التوفیق:

زکوۃ وفطرہ سال پورا ہونے پر جہاں تک جلدی ہو سکے ادا کر دینا چاہئے زکوۃ وفطرہ غریب ومسکین کا حق ہے۔ اس کے مصرف میں جب تک ان کو نہیں دے گا ادائیگی نہ ہوگی، اب ظاہر ہے کہ تجارت میں لگانا ادائیگی نہیں ہے، لہذا اگر تجارت

۱- ''وکذلک آلات المحترفین أی سواء کانت مما لا تستھلک عینه فی الانتفاع کالقدوم والمبرد أو تستھلک (رد المحتار علی الدر المختار ۳/ ۱۸۳) یعنی لا زکاۃ علیھا'' (مرتب)۔

میں لگا دیا اور مر گیا تو زکوۃ وفطرہ ادا نہ ہوگا اور گنہگار ہوگا(۱)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور
الجواب صحیح: محمود عفی عنہ، مفتی دارالعلوم دیوبند

کیا بینک میں جمع شدہ رقم کی زکوۃ اسی سے دینا ضروری ہے؟

ہمارا کچھ روپیہ بینک میں جمع ہے جس کی زکوۃ نکالنا ہے ہم رمضان کے مہینے میں جمع شدہ رقم کا حساب لگا کر جتنی رقم زکوۃ کی ہوتی ہے وہ بنک سے تو نہیں نکالتے اس کے علاوہ آمد سے زکوۃ ادا کرتے ہیں کیا ایسا کرنے سے زکوۃ ادا ہوجاتی ہے یا وہی روپیہ بنک سے نکالنا ضروری ہے؟

الجواب وباللہ التوفیق:

بنک میں جمع شدہ روپیہ کی زکوۃ دینے کے لئے بنک سے ہی روپیہ نکالنا ضروری نہیں ہے اپنے جس روپیہ سے زکوۃ ادا کریں گے زکوۃ ادا ہوجائے گی (۲) سود کی رقم جو بنک سے ملنے والی ہوا کرے اس کو نکال کر بعینہ وہی روپیہ (رقم) صدقہ کردیا کیجئے اس میں ادلا بدلہ نہ کیجئے (۳)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۴/۱۰/۸۵ ۱۳ھ
الجواب صحیح: محمود عفی عنہ، مفتی دارالعلوم دیوبند

۱- ''وقيل فوري أي واجب على الفور وعليه الفتوى كما في شرح الوهبانية فيأثم بتأخيرها بلا عذر وترد شهادته، لأن الأمر بالصرف إلى الفقير معه قرينة الفور'' (الدر المختار مع رد المحتار ۳/۱۹۱، ۱۹۲، نیز فتاوی عالمگیریہ ۱/۱۷۰)، کسی کو تجارت کے لئے دینے سے زکوۃ ادا نہیں ہوگی، کیونکہ زکوۃ کا تمام ہے، ''تمليك المال من فقير مسلم.'' الخ کا دیکھئے: فتاوی عالمگیریہ ۱/۱۷۰) (مرتب)۔

۲- قال إسماعيل المتكلم عليه ديون لأناس شتى لزيادة في الأخذ ونقصان في الدفع ، فلو تحرى ذلك وتصدق على الفقراء بثوب قوم بذلك يخرج عن العهدة، قال ؒ فعرف بهذا أن في مثل هذا لايشترط التصدق بجنس ما عليه كذا في القنية (فتاوی عالمگیریہ ۵/۳۶۷)، وجاز دفع القيمة في زكاة وعشر... الخ (الدر المختار) قال في الرد: وجاز دفع القيمة أي ولو مع وجود المنصوص عليه (الرد المحتار علی الدر المختار ۳/۲۱۰) (مرتب)۔

۳- ''ويجب رد عين المغصوب (الدرالمختار) وظاهره أن رد العين هو الواجب الأصلي، وهو الصحيح'' (رد المحتار علی الدر المختار ۹/۲۶۶) (مرتب)۔

بینک میں جمع شدہ رقم پر زکوۃ:

عمومی بینک یا اسلامی بینک جس میں سودی معاملہ نہیں ہوتا ہے لوگوں کے جمع شدہ رقوم میں زکوٰۃ آئے گی کہ نہیں ادلۂ فقہیہ سے بیان فرمائیں۔

الجواب وباللہ التوفیق:

اپنا روپیہ جس کو آدمی خود کسی بینک میں محفوظ کرے، خواہ عمومی یا اسلامی ہر ایک میں اس کی زکوٰۃ ادا کرنا واجب رہے گا، البتہ اپنے جمع کئے ہوئے روپئے سے زائد جو پیسہ سود کے نام سے لے اس کا حکم دوسرا ہے سود کے نام سے ملے ہوئے روپیہ کا حکم یہ ہے کہ اس کو بینک میں نہ چھوڑے، بلکہ وہاں سے نکال کر بغیر نیت ثواب کے، بلکہ اس کے وبال سے بچنے کی نیت سے غریبوں مسکینوں حاجتمندوں قرضداروں وغیرہ کو دے کر جلد از جلد اپنی ملکیت سے خارج کر دے اور استغفار کرے اور دعا کرتا رہے کہ اے اللہ ہمارا حال ایسا کر دیجئے کہ اس قسم کے پیسوں سے حفاظت رہے (۱)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۳/۸/۱۴۰۱ھ

مختلف کرنسیوں کے ذریعہ زکوۃ کی ادائیگی:

دیگر ممالک کی کرنسی سکے پاونڈ یا ڈالر کی قیمت حکومت کے اعتبار سے ۱۸ روپئے اور ڈالر کے اعتبار سے ۸ روپئے مقرر ہیں اور زکوۃ ادا کرنیوالے ان ممالک سے اپنے وطن ہند میں غرباء یتامی کے لئے پاؤنڈ ڈالر کے بھیجنے کا انتظام کرتے ہیں بعض لوگ ۲۲ روپیہ فرانس کا سکہ فرانک کے بجائے ۳ کے بجائے ۵ روپئے اور ڈالر کے ۔ ۸ روپئے کے بجائے ۔ ۱۰ دیتے ہیں اور ملتے ہیں اور ایسی شکل میں زکوۃ کی ادائیگی کے لئے جو ربع عشر نکالا جاتا ہے تو ۔ ۱۰۰ پاؤنڈ ۔ ۱۰۰ ڈالر ۔ ۱۰۰ فرانک ۔ ۔ ۱۰۰ کوچا (زامبیا کا سکہ) کی قیمت میں ۔ ۸۰ پاؤنڈ ۔ ۸۰ ڈالر ۔ ۸۰ فرانک ۔ ۸۰ کوچا کے برابر ہوجاتی ہے تو اب زکوۃ میں ۔ ۸۰ پاؤنڈ ۔ ۸۰ ڈالر ۔ ۸۰ فرانک ۔ ۸۰ کوچا کی قیمت دینے سے زکوۃ ادا ہوجائیگی یا نہیں مذکورہ کام سرکاری گناہ ہے یہ افریقہ کے باشندوں کو معلوم ہے۔

۱- ''من ملک أموالا غیر طیبة أو غصب أموالاً وخلطها ملکها بالخلط ویصیر ضامناً، وإن لم یکن له سواها نصاب فلا زکاة علیه فیها وإن بلغت نصاباً لأنه مدیون'' (ردالمحتار علی الدر المختار ۳/۲۱۸) (مرتب)۔

بعض دفعہ ان سکوں کی قیمت جو حکومت نے مقرر کی ہے اس میں کم قیمت ملتی ہے مثلاً ایک سکہ کی قیمت جو حکومت کے اعتبار سے ۱۱-۱۲ ہے مگر وہ رقم سرکار سے اخفاء کرکے اور حکومت کو چوری سے ہند میں بھیجتے ہیں تو ایسی رقم (سکوں) کی قیمت کم ملتی ہے مثلاً ۱۱-۱۲ کے بجائے ۷-۸ ملتی ہے تو اس شکل میں بھیجنے والے کی زکوۃ ادا ہوجائے گی یا نہیں ایک سو ڈالر کے ۱۰۰۰ کے بجائے آٹھ سو ملتے ہیں۔

اگر ۲ کے اندر زکوۃ ادا نہ ہوئی تو سوال یہ ہوگا کہ ایک ملک کا سکہ دیگر ممالک کے مقابلہ میں کیا حیثیت وحقیقت رکھتا ہے دیگر ممالک میں اس کی سکہ کی حیثیت ہے یا نہیں؟ اگر سکہ صحیح ہو تو پھر اس کی جو بھی قیمت حاصل ہو زکوۃ ادا ہونی چاہئے ان سوالات کا جواب نظائر اور دلائل سے مفصلاً تحریر فرماکر ممنون فرمائیں اہل علم کا اس بارے میں اختلاف ہے، اس لئے جواب مدلل مع النظیر تحریر فرماکر ممنون فرمائیں۔

کتبہ العبد محمد بن اسماعیل العمرواری (بحکم خادم دار الافتاء مفتی احمد بیات صاحب ۱۶ محرم الحرام ۱۴۰۱ھ یوم الثلاثاء)

الجواب وباللہ التوفیق:

ایک ملک کا سکہ دوسرے ملک میں جو قیمت بین الاقوامی اور حکومتی سطح پر مقرر ہو وہی بنیاد اور معیار بنے گی ادائیگی کے صحت اور ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونیکی اور جو قیمت اس حکومت کی مقررہ قیمت سے زائد دوسرے لوگ دیدیتے ہیں یا کم دیتے ہیں یہ قیمت کوئی قیمت رائجہ وناقفہ فی السوق عامۃً نہیں ہوئی کہ کنٹرول نرخ اور بازار کے عام رائج بھاؤ (بلیک) پر قیاس کیا جاسکے اور اس کو بنیاد وحکم بنایا جاسکے، لہذا جس سکہ کی جس ملک میں حکومتی سطح کے مطابق قانوناً جو قیمت مقرر ہو اسی کے اعتبار سے زکوۃ نکالنی چاہئے، دوسرے ملک میں مقامی اور وقتی اور وقتی طور پر لوگ جو زائد یا کم پیسے دیتے ہوں ان کا اعتبار نہ کرنا چاہئے۔

بلکہ احتیاط اس میں ہے کہ جس ملک میں جتنے سرمایہ پر ہمیں زکوۃ نکالنی ہے اتنے سرمایہ کا چالیسواں حصہ اسی ملک کے اعتبار سے ادائیگی زکوۃ کی نیت سے سال پورا ہوتے ہی الگ نکال دے اور پھر اس کی ادائیگی خود حسب موقعہ اسی ملک میں یا کسی دوسرے ملک بھیجتا رہے (۱) بلکہ زیادہ احتیاط اس میں ہے کہ یہ رقم مذکورہ الگ کردینے کے بعد اپنے کسی معتمد کے حوالہ کرکے کہہ دے کہ یہ رقم مذکورہ زکوۃ کی صحیح مصرف میں آپ خرچ کردیجئے یہ زیادہ احتیاطی صورت ہے (۲) مثلاً کسی کے

۱- "وأما شرط أدائها فنية مقارنة للأداء أو لعزل ما وجب هكذا في الكنز" (فتاوی عالمگیریہ ۱/۱۷۰) (مرتب)۔

۲- إذا وكل في أداء الزكاة أجزأته النية عند الدفع إلى الوكيل (فتاوی عالمگیریہ ۱/۱۷۱)۔

پاس ایک ہزار پونڈ کی زکوۃ نکالنی ہے تو ۲۵ پونڈ بمد زکوۃ نکالکر اپنے بقیہ سرمایہ سے الگ کردیا پھر اسی طرح فی ہزار ۲۵ پونڈ کے حساب سے باقی ہزار ڈالر سے ۲۵ ڈالر کے حساب سے نکالکر الگ کرویں اور یہ الگ کرنا محض بہی کھاتہ میں اور محض کاغذی اندراج میں نہ رہے بلکہ عین سرمایہ میں سے اتنی رقم جو فی ہزار ۲۵ کے حساب سے آتی ہو اس کو اپنے سرمایہ کی تھیلی سے نکال کر دوسری مستقل تھیلی میں یا مستقل دوسرے خانہ یا بکس میں الگ رکھ لیں یہ علیحدگی بہ نیت ادائیگی صحیح و معتبر ہوتی ہے اور یہی عزل کرنے سے اس جگہ مراد ہوتی ہے۔فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۴۰۱/۱/۳ھ

شیئرز پر زکوۃ:

مکانات اور جائیداد وغیرہ کی ملکیت پر زکوۃ عائد نہیں ہوتی ہے، بلکہ ان کی آمدنی پر اگر وہ بقدر نصاب ہو، اس اصول پر کمپنیوں کے حصص کا معاملہ ہوگا، مثلاً کسی نے ٹاٹا کے دس ہزار حصے خریدے تو کیا جائیداد اور مکانات کی طرح سال بھر کے ان حصص کی جو آمدنی ہوئی ان پر زکوۃ واجب ہوگی یا حصوں کی کل مالیت پر، جسے جائیداد کی طرح خریدے اور بیچے جاتے ہیں، اور بغیر خرید وفروخت کے بینکوں کی طرح رقم حسب دل خواہ نکالی نہیں جاسکتی ہے، ان حصوں کے دام بازار میں گھٹتے بڑھتے رہتے ہیں، یونٹ ٹرسٹ کا بھی یہی حال ہے، سالانہ نفع کو حصہ داروں پر ان کے حصوں کے حساب سے تقسیم کیا جاتا ہے، یہی صورت تاج کمپنی اور دہلی کلاتھ مل وغیرہ کے حصول کی ہے براہ کرم ان امور کے بارے میں اپنی رائے سے مطلع فرمائیں۔

عبدالسلام

الجواب وباللہ التوفیق:

یہ توصحیح ہے کہ کمپنیوں، فیکٹریوں، کارخانوں وغیرہ کے حصوں کی کل مالیت پر زکوۃ عائد نہیں ہوتی اور محض اس کی آمدنی کی بچت ونفع ہی میں وجوب زکوۃ محصور ودائر نہیں ہوگا، بلکہ اس میں تفصیل ہے اور وہ یہ ہے کہ جو کارخانہ یا فیکٹری یا کمپنی ایسی ہے کہ اس میں کسی چیز کی خرید وفروخت نہیں ہوتی، نہ اپنی بنائی ہوئی وتیار کردہ چیز کی نہ دوسرے سے کچھ خریدی ہوئی چیز کی، بلکہ محض دوسروں کا کام مثلاً اجرت لے کر کر دیا جاتا ہے، جیسے آٹا پیس کر دیدیا یا دھان کوٹ کر یا تیل نکال کر

دیدیا مثلاً نئے کپڑوں کے تھان پر پریس کر کے دیدیا وغیرہ تو ایسی صورت میں تو صرف بچت پر جو جملہ اخراجات نکالنے کے بعد بچے اور نصاب کی مقدار ہو جائے تو زکوۃ نکالنا عائد ہوگا، فرنیچر و اثاثہ و دیگر سامان پر وجوب زکوۃ کا حکم عائد نہ ہوگا، اور اگر وہ فیکٹری، کمپنی، یا کارخانہ ایسا ہے کہ اس میں چیزیں تیار کر کے فروخت کی جاتی ہیں چاہے دوسروں کے یہاں کی چیز خرید وفرخت کی جاتی ہوں، یا نہ کی جاتی ہوں، جیسے کلاتھ میل کہ اس میں اونی کپڑا خرید کر دھاگہ دار کپڑا تیار کر کے فروخت کیا جاتا ہے، یا مثلاً پریس وغیرہ کہ اس میں کاغذ خرید کر اپنی مطبوعہ کتابیں فروخت ہوتی ہیں، اب چاہے دوسری جگہ کی مطبوعات بھی فروخت ہوتی ہوں یا نہ ہوتی ہوں، جیسے تاج کمپنی وغیرہ تو ان میں زکوۃ کا وجوب محض بچت پر نہ ہوگا، بلکہ سال بھر کے پورے اخراجات وضع کر کے اس کی آمدنی کی بچت پر، نیز جتنا سامان تجارت کا تیار شدہ مال ہوگا یا برائے تیاری سامانِ تجارت، جتنا کچا مال ہوگا جیسے کلاتھ میل میں کپڑے کے علاوہ ریشم، سوت، روئی وغیرہ کی مالیت اور شوگر میل چینی کے علاوہ گڑ، گنا وغیرہ کی مالیت، ان سب کی مالیت کا حساب لگا کر زکوۃ نکالنے کا حکم ہوگا، البتہ تیار شدہ عمارت، مشینری و دیگر اثاثہ فرنیچر و آلات کی مالیت پر زکوۃ عائد نہ ہوگی، اسی اصول پر کمپنیوں کے حصص کا معاملہ بھی ہوگا، اس لیے کہ کمپنیوں کے ملازمین محض وکیل واجیر کے درجہ میں ہوتے ہیں، اور اصل مالک یہی حصہ داران (شیر دار) حسب شیر و حصہ ہوتے ہیں، پس ہر حصہ دار عمارت و مشین وغیرہ ہر ہر چیز کا حسب حصہ مالک شمار و متصور ہوگا، اور یہی وجہ ہے کہ چیزوں کی قیمت گھٹنے بڑھنے کے اعتبار سے حصوں کی خرید وفرخت ہوتی ہے، پس عمارت، مشین اور اس کے اوزار وا ثاثہ فرنیچر وغیرہ کی جو قیمت اس کے حصہ میں آئے گی اس پر وجوب زکوۃ نہ ہوگا، بلکہ اس کو وضع کرنے کے بعد جو سامان تجارت کا ہوگا، خواہ کچے مال کی صورت میں ہو اس کی قیمت و مالیت اور بچت پر وجوب زکوۃ عائد ہوگا، پس سال بھر کمپنی ہر حصہ دار کو جو رپورٹ و حساب دیتی ہے اگر اس میں ان سب چیزوں کی تفصیل مذکور ہو تو اس کے حساب سے حسب تفصیل مذکورہ بالا زکوۃ نکال دیں اور اگر اس رپورٹ میں یہ تفصیلات مذکور نہ ہوں تو کمپنی سے دریافت کر کے کہ میرے حصے میں تجارت کا تیار شدہ مال اور کچا مال کی کتنی مالیت ہے اور بچت کتنی ہے، صرف اس کا چالیسواں حصہ زکوۃ میں نکال دیں، یہی تفصیلی حکم ٹاٹا مل اور دیگر ملوں اور کمپنیوں اور یونٹ ٹرسٹ و تاج کمپنی و کلاتھ مل دہلی وغیرہ کا ہوگا۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیو بند سہارنپور ۴/ ۱۲/ ۹۸ ۱۳ھ

زکوۃ میں نکالی ہوئی زائد رقم آئندہ سال کی زکوۃ میں وضع کرنا:

اگر کسی شخص نے موجودہ سال کی زکوۃ بلا حساب اندازاً نکالدی اور زکوۃ ادا کرنے کے بعد جب حساب کیا گیا تو معلوم ہوا کہ زکوۃ میں زیادہ رقم چلی گئی ہے تو اس زیادہ دی ہوئی رقم کو آئندہ سال کی زکوۃ میں شمار کر سکتے ہیں یا نہیں۔

مولوی عبدالرحیم گجراتی مدرس مدرسہ جامعہ نذیریہ کاکوی ضلع مہسانہ گجرات

الجواب وباللہ التوفیق:

شمار کر سکتے ہیں بشرطیکہ دونوں نصابوں کی جنس متحد ہو دراہم ودنانیر اور عروض تجارت متحد الجنس ہیں، "رجل له اربعمأة درهم فظن أن عنده خمسمأة فأدى زكوة خمسمائة، ثم علم فله أن يحسب الزيادة للسنة الثانية كذا في محيط السرخسي"(۱)۔

"وفي الولوالجية: لو كان عنده أربعمأة درهم فأدى زكوة خمسمأة ظانا أنها كذلك كان له أن يحسب الزيادة للسنة الثانية؛ لأنه أمكن أن تجعل الزيادة تعجيلاً ۱۰ھ وقيد في البحر بكون الجنس متحدا، قال: لأنه لو كان له خمس من الابل وأربعون من الغنم فعجل شاة عن أحد الصنفين ثم هلك لا يكون عن الآخر ـــــ والدراهم والدنانير وعروض التجارة جنس واحد" (۲)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۴۰۱/۴/۸ھ

الجواب صحیح محمود غفرلہ، مفتی دارالعلوم دیوبند

کمپنیوں اور ملوں کے شیئرز پر زکوۃ واجب ہے یا نہیں؟

کمپنیوں اور ملوں کے شیرز پر زکوۃ واجب ہے یا نہیں؟ بعض کمپنیاں صرف گھروں کے اثاثہ کے لیے ہوتی ہیں آیا ان پر بھی زکوۃ واجب ہے؟ نیز سمینٹ فیکٹری اور اس جیسے دوسرے ملوں کے شیرز پر زکوۃ واجب ہوتی ہے یا نہیں، اگر واجب

۱- فتاوی عالمگیریہ ۱۷۶/۱۔

۲- ردالمحتار علی الدر المختار ۲۲۱/۳۔

ہے تو کیوں؟ اس لیے کہ شیرز کے پیسوں کا استعمال مجہول ہے کہ مشین پر صرف ہوا ہے یا تجارتی مال پر، کس قسم کی کمپنیوں اور ملوں کے شیرز پر زکوٰۃ واجب ہے اور کس قسم پر نہیں، مثال کے ساتھ مدلل اور بحوالہ تحریر فرمائیں، اگر واجب ہے تو چونکہ شیرز کی قیمت غیر معین ہے، اس لیے خریدتے وقت کی قیمت واجب ہوگی یا موجودہ قیمت پر مفصل جواب عنایت فرمائیں۔

محمد یعقوب، رنگون (برما)

الجواب وبالله التوفيق:

کمپنیوں اور ملوں کے پورے شیرز یا اس کی قیمت پر ہر حال میں علی الاطلاق زکوٰۃ واجب نہ ہوگی، بلکہ اس میں تفصیل ہے اور وہ یہ ہے کہ کمپنی اور مل جب سالانہ حساب دے اس وقت دیکھا جائے شیرز کے جتنے جتنے حصے، مشینیں، عمارتیں اور اس کے فرنیچر وغیرہ پر خرچ ہو چکے یا اور ضروریات انتظام پر جو حصے خرچ ہو چکے ہیں ان پر زکوٰۃ واجب نہ ہوگی، جتنے نقد کی شکل میں یا تجارت کے سامان کے اور اخراجات وغیرہ وضع کر کے جتنا حصہ نفع پر آتا ہو صرف اس میں زکوٰۃ واجب ہوگی (۱)۔

کمپنی یا مل جس قسم کی ہو سب میں اسی قاعدے کے مطابق زکوۃ واجب ہوگی، مثلاً شوگر فیکٹری ہے اس میں ہمارے دس ہزار شیرز کے داخل ہیں ان دس ہزار میں سے تین ہزار مشینوں پر اور دو ہزار عمارت اور اس کے فرنیچر پر خرچ ہو چکے ہیں اور ایک ہزار کا کوئلہ اور ایندھن وغیرہ موجود ہے تو اس مجموعہ (چھ ہزار) پر زکوٰۃ واجب نہ ہوگی، البتہ اگر ایک ہزار نقد بچا ہے اور تین ہزار چینی وبکری کا شیرہ اور ایکھ وغیرہ موجود ہے، اس میں چار ہزار پر، اسی طرح مثلاً تنخواہ ملازمین وغیرہ جملہ اخراجات وضع کر کے اپنے کل شیرہ پر چار ہزار نفع وبچت کا موجود ہے، اس پر یعنی مجموعہ آٹھ ہزار پر زکوٰۃ واجب ہوگی، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

۱- "وسببه ملك نصاب حولي تام فارغ عن دين له مطالب من جهة العباد وفارغ عن حاجته الأصلية، لأن المشغول بها كالمعدوم" (الدر المختار مع الشامی) "وقال في الهداية: وليس في دور السكنىٰ وثياب البدن وأثاث المنازل، ودواب الركوب، وعبيد الخدمة، وسلاح الاستعمال زكوٰة، لأنها مشغولة بالحاجة الأصلية وليست بنامية أيضاً" (ہدایہ اولین ۱۸۶) (مرتب)۔

یونٹ ٹرسٹ میں لگے ہوئے روپے پر زکوٰۃ کا حکم؟

میں نے یونٹ ٹرسٹ آف انڈیا میں کچھ روپیہ لگایا ہے جس کا منافع ادارہ کے اعلان کے مطابق رہتا ہے، یونٹ کا پمفلٹ اس کے ساتھ بھیج رہا ہوں، اس سلسلے میں عرض ہے کہ:

۱-اس ادارہ میں لگائی ہوئی رقم پر زکوۃ ادا کرنی چاہیے یا نہیں؟

۲-اگر زکوٰۃ نکالنا ضروری ہو تو لگائی ہوئی رقم پر ادا کی جائے یا جو حصص خریدے گئے ہیں اس کی موجودہ قیمت پر ادا کی جائے، امید ہے کہ جواب عنایت فرما کر ممنون ومشکور فرمائیں گے۔

الجواب باللہ التوفیق:

اس ادارہ میں لگائی گئی تمام رقم پر زکوۃ ادا نہ کی جائے گی، بلکہ اس ادارہ میں اثاثہ مثلاً فرنیچر، و مشینیں وعمارت وغیرہ پر جو رقم خرچ ہوگئی ہے اس کو حسب حصہ وضع کرکے جو رقم ڈیپازٹ ہو اور جو سامان تجارت کا ہو اور نفع کی رقم ہو اس میں حسب حصص جس کے حصہ میں جتنی رقم آئے فقط اس پر زکوٰۃ کی ادائے گی واجب ہوگی۔

مثلاً شروع میں دس لاکھ کی لاگت سے کام اسٹارٹ کیا، دس لاکھ میں سے ۴ لاکھ اثاثہ (عمارت، فرنیچر، مشین وغیرہ) میں صرف ہوگئے، اور بچے چھ لاکھ، اس سے سامانِ تجارت خریدا گیا، اور تجارت کرنا شروع کیا جیسے گنا خرید کر اس سے شکر بنا کر شکر و گڑ کی تجارت شروع کی اور جیسے کوئی خام سامان لے کر اس سے عمدہ وقیمتی چیزیں بنا کر تجارت کرنا شروع کیا، اب اس ادارہ کی حیثیت بیس لاکھ ہوگئی تو ظاہر ہے کہ شروع میں جو حصے دس روپے میں خریدے تھے اور اسی پر یہ شرکت تھی اب وہ حصے یقیناً بیس روپے کے ہوگئے، اور اگر فروخت کیے جائیں تو اس وقت تیس روپے تک فروخت ہوسکتے ہیں تو زکوٰۃ ان بیس یا تیس روپوں پر واجب الادا نہ ہوگی بلکہ موجودہ حالت میں اس ادارہ میں جو اثاثہ (مشین وآلات وغیرہ) ہوں ان کی قیمت مناسب لگا کر وضع ہو جائیں گے پھر ادارہ میں جو رقم مجموعی طور پر ڈیپازٹ مع نفع کے ہو صرف اس میں جتنا حصہ جس حصہ دار کا ہوگا۔

اسی طرح اس ادارہ میں جو سامان تجارت ہوگا مثلاً گنا، گڑ، شکر وغیرہ ان سب کی موجودہ قیمت پر جو حصہ اس شیر والے کا ہوگا صرف اس پر زکوۃ واجب الادا ہوگی۔

منیجر پر ان تمام باتوں کی تفصیل اپنے ہر شیر دار کو بتلانا لازم ہوگا، اسی پر زکوٰۃ کا حساب لگایا جائے، اس جواب سے

امید ہے کہ سوال کے دونوں نمبروں کا جواب معلوم ہوجائے گا، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

جس ملک میں حکومتی سطح پر جو قیمت مقرر ہو اسی اعتبار سے زکوٰۃ نکالی جائے؟

دیگر ممالک کی کرنسی، سکے، پاؤنڈ، ڈالر کی قیمت حکومت کے اعتبار سے اٹھارہ روپے اور ڈالر کے اعتبار سے آٹھ روپے مقرر ہیں، اور زکوٰۃ ادا کرنے والے ان ممالک سے اپنے وطن (ہند) میں غربا و یتامیٰ کے لئے پاؤنڈ، ڈالر بھیجنے کا انتظام کرتے ہیں، بعض ۲۲ روپیہ فرانس کا سکہ بجائے تین کے پانچ روپے اور ڈالر کے آٹھ روپے کے بجائے دس روپے دیتے اور لیتے ہیں) ایسی شکل میں زکوٰۃ کی ادائے گی کے لئے جو ربع عشر نکالا جاتا ہے تو سو پاؤنڈ سو ڈالر، سو فراں سو کو چا (زامبیا کا سکہ) کی قیمت اسی پانڈ، اسی ڈالر، اسی فراں، اسی کوچا کے برابر ہوجاتی ہے، تو اب زکوٰۃ میں اسی اسی پانڈ، اسی ڈالر اسی فراں، اسی کوچا کی قیمت دینے سے زکوٰۃ ادا ہوجائے گی یا نہیں؟ مذکورہ کام سرکاری گناہ ہے، یہ افریقہ کے باشندوں کو معلوم ہے۔

بعض مرتبہ ان سکوں کی قیمت جو حکومت نے مقرر کی ہے اس میں کم قیمت ملتی ہے، مثلاً ایک سکہ کی قیمت حکومت کے اعتبار سے گیارہ بارہ روپے ہے، مگر وہ رقم سرکار سے اخفاء کرکے اور حکومت کی چوری سے ہند میں بھیجتے ہیں تو ایسی رقموں (سکوں) کی قیمت کم ملتی ہے، مثلاً گیارہ روپے کے بجائے سات آٹھ ملتی ہے، تو اس شکل میں بھیجنے والے کی زکوٰۃ ادا ہوجائے گی یا نہیں، ایک سو ڈالر کے گیارہ سو کے بجائے آٹھ سو ڈالر ملتے ہیں۔

اگر (۲) کے اندر زکوٰۃ ادا نہ ہوئی تو سوال یہ ہوگا کہ ایک ملک کا سکہ دیگر ممالک کے مقابلہ میں کیا حیثیت وحقیقت رکھتا ہے، دیگر ممالک میں اس سکہ کی حیثیت ہے یا نہیں، اگر سکہ صحیح ہو تو پھر اس کی جو بھی قیمت حاصل ہو زکوٰۃ ادا ہونی چاہیے، ان سوالات کے جوابات نظائر اور دلائل سے مفصل طور پر تحریر فرما کر ممنون فرمائیے۔

محمد ابن اسماعیل (گجرات)

الجواب وباللہ التوفیق:

۱، ۲، ۳- ایک ملک کا سکہ دوسرے ملک میں جو قیمت بین الاقوامی اور حکومتی سطح پر مقرر ہو وہی بنیاد اور معیار

بنے گی، ادائیگی صحت اور ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کی، اور جو قیمت اس حکومت کی مقررہ قیمت سے زائد دوسرے لوگ دیتے ہیں یا کم دیتے ہیں، یہ قیمت کوئی قیمت رائجہ ونافعہ فی السوق عامۃً نہیں ہوتی کہ کنٹرول نرخ اور بازار کے عام رائج بھاؤ (بلیک) پر قیاس کیا جاسکے اور اس کو بنیاد حکم بنایا جاسکے۔

لہٰذا جس سکہ کی جس ملک میں حکومتی سطح کے مطابق قانوناً جو قیمت مقرر ہو اسی کے اعتبار سے زکوۃ نکالنی چاہیے، چاہے دوسرے ملک میں مقامی اور وقتی طور پر لوگوں کو کچھ زائد یا کم پیسے دیتے ہوں ان کا اعتبار نہ کرنا چاہیے، بلکہ احتیاط اس میں ہے کہ جس ملک میں جتنے سرمایہ پر ہمیں زکوۃ نکالنی ہے اپنے سرمایہ کا چالیسواں حصہ اسی ملک کے اعتبار سے ادائیگی زکوۃ کی نیت سے سال پورا ہوتے ہی الگ نکال دے اور پھر اس کی ادائیگی خود حسب موقع اس ملک میں یا کسی دوسرے ملک میں بھیجتا رہے، بلکہ زیادہ احتیاط اس میں ہے کہ یہ رقم مذکورہ الگ کر دینے کے بعد اپنے کسی معتمد کے حوالہ کر کے کہدے کہ یہ رقم مذکورہ زکوۃ کے صحیح مصرف میں آپ خرچ کر دیجئے، یہ زیادہ احتیاطی صورت ہے، مثلاً کسی کو ایک ہزار پاؤنڈ کی زکوۃ نکالنی ہے، تو پچیس پاؤنڈ بمد زکوٰۃ نکال کر اپنے بقیہ سرمایہ سے الگ کر دیا، پھر اسی طرح فی ہزار پچیس کے حساب سے باقی ہزار ڈالر سے پچیس ڈالر کے حساب سے نکال کر الگ کر دیں، اور یہ الگ کرنا بھی بہی کھاتہ میں اور محض کاغذی اندراج میں نہ رہے، بلکہ عین سرمایہ میں سے اتنی رقم جو فی ہزار پچیس کے حساب سے آتی ہو اس کو اپنے سرمایہ کی تھیلی سے نکال کر دوسری مستقل تھیلی میں یا کسی مستقل دوسرے خانہ یا بکس میں الگ رکھ لیں، یہ علیحدگی بنیت ادائیگی صحیح ومعتبر ہوتی ہے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

کمپنیوں کے حصص کی خرید وفروخت اور اس پر زکوٰۃ وغیرہ کا مسئلہ؟

تمہید: جو اشیاء ملک گیر پیمانہ پر تیار کی جاتی ہیں، ان کے بنانے والے کارخانوں، فیکٹریوں، نیز ان مشینوں کی ملکیت جو ان کارخانوں میں نصب ہوتی ہیں چند افراد کی نہیں کثیر افراد کی ہوتی ہیں، ان کمپنیوں کو لمیٹیڈ کمپنیاں کہا جاتا ہے، ان کمپنیوں کے حصص عوام میں فروخت کیے جاتے ہیں، لوگ تھوڑے یا بہت حصے خرید کر مالک ہو جاتے ہیں، حصے خریدنے والے کارخانوں میں دخیل نہیں ہوتے ہیں، انتظام ان کا ہوتا ہے جو کارخانوں کے مؤسس اور بانی ہوتے ہیں، وہ لوگ ہمہ وقت کارکن ہونے کی بنیاد پر اپنا معاوضہ بطور تنخواہ کے کارخانوں سے وصول کرتے ہیں فروخت شدہ حصص ناقابل انتفاع ہوتے ہیں، عوام آپس میں اس کی خرید وفروخت کر سکتے ہیں، حصص کی قیمت کمپنیوں کی پوزیشن اور نفع آوری پر کم وبیش ہوتی

رہتی ہے، کمپنی حصص رکھنے والوں کو سالانہ منافع کا ایک محدود حصہ تقسیم بھی کرتی ہے، اس تمہید کے بعد جواب طلب امور یہ ہیں کہ:

۱- کیا یہ حصص جائیداد منقولہ کی حیثیت رکھتے ہیں؟

۲- زکوٰۃ حصص کی آمدنی اور منافع پر جو کمپنی دے اس پر عائد ہوگی؟

۳- حصص کی فروخت سے جو آمدنی ہو اس پر عائد ہوگی یا حصص پر بھی، اگر حصص پر بھی عائد ہوگی تو اس قیمت پر جس پر خریدے، یا اس قیمت پر جو سال پورا ہونے کے بعد بازار میں اس کی قیمت ہو؟

۴- بعض کمپنیاں قلیل نفع کمانے کی وجہ سے یا نقصان کی وجہ سے منافع تقسیم نہیں کر پاتیں، نتیجۃً ان پر حصص کی قیمت اصل قیمت سے گر جاتی ہے، کبھی تو ان حصص کا خریدار ہی نہیں ملتا، ایسی صورت میں حصص کی زکوٰۃ دینی ہوگی اگر دینی ہو تو کس قیمت پر؟

۵- کسی ادارۂ تعلیمی کو زکوٰۃ کی شکل میں حصص منتقل کیے جاسکتے ہیں یا نہیں؟

۶- ایک غور طلب بات یہ بھی ہے کہ کمپنیاں اکثر و بیشتر بینکوں اور افراد سے بھی ایک سالہ یا دو سالہ کی مدت پر سود کی رقم لیتی ہیں اور اس سود پر لیے ہوئے روپیہ سے مال تیار کر کے فروخت کرتی ہیں، حصص رکھنے والوں کو جو منافع دیا جاتا ہے اس میں سود کی رقم سے کمایا ہوا منافع بھی ہوتا ہے، یہ ایک خلش ہے جس میں راقم الحروف جو کہ حصص ہی کا کاروبار کرتا ہے، مبتلا ہے اس لیے استفتاء ارسال ہے۔

عبدالمنان (دہلی)

الجواب وباللہ التوفیق:

۱- یہ حصص جو کمپنیوں سے خریدے جاتے ہیں جائیداد منقولہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔

۲، ۳، ۴- کمپنیوں کے حصص کی جو خریداری ہوتی ہے تو اس میں اگر حصہ دار آلات و مشینوں میں بھی شریک ہوتا ہے تو اس رقم کو الگ کر کے جتنے میں آلات وغیرہ کی خریداری ہوتی ہے، بقیہ تمام اصل و منافع کی رقم پر زکوٰۃ واجب ہے، خواہ بعد میں ان حصص کی قیمت قلت منافع کی بنا پر کم ہی کیوں نہ ہو جائے۔

۵- کسی ادارۂ تعلیمی کو (جو زکوٰۃ کا مصرف ہو) حصص زکوٰۃ کی شکل میں منتقل کیے جاسکتے ہیں۔

٦-عالمگیر پیانے پر جو کمپنیاں قائم ہوتی ہیں اور ان کے حصص فروخت ہوتے ہیں، ان میں کارخانے کو چلانے والے ان خریداروں کے وکیل ہوتے ہیں، لہٰذا ایسی صورت میں مالِ مستفاد میں حرمت نہ آوے گی جب کہ کمپنی قائم کرنے والے غیر مسلم ہوں" **فإن الوكيل بالبيع كالعاقد لنفسه وفساد البيع في حق الذمي لايستلزم حرمة الربح علي المسلم، فان تبدل الملك يدفع خبث الفساد**"(۱)۔

البتہ مبسوط میں ہے کہ کفار کی کمپنیوں میں شرکت خود مکروہ ہے، اور اگر مسلمانوں کی کمپنیاں بھی سودی لین دین کرتی ہوں، جیسا کہ آج کل غالب یہی ہے تو ان کمپنیوں میں شرکت کرنا جائز نہیں ہے، فقط واللہ اعلم بالصواب

ناقلا عن امداد الفتاویٰ القصص السنی في أحكام حصص كمپنی

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور
الجواب صحیح: محمد ظفیر الدین مفتاحی، مفتی دارالعلوم دیوبند

۱-جس رقم کے مالک کا پتہ نہ ہو اس کو کیا کیا جائے؟

جاوید کے والد صاحب کے پاس ایک شخص نے بڑی رقم کسی کام کے سلسلہ میں ارسال کی تھی، اس سے خرچ ہونے کے بعد کچھ رقم بچ گئی، والد صاحب کا بھی انتقال ہو گیا اور مرسل کا بھی پتہ نہیں اس رقم کو کس مد میں صرف کیا جائے؟

۲-بغیر مد کی صراحت کے دی گئی رقم کا مصرف:

اسی طرح ایک اور صاحب نے رقم ارسال کی تھی لیکن کس مصرف میں صرف کرنا ہے اس کی تفصیل نہیں بتائی، ایک دو مرتبہ خط لکھا، لیکن کوئی جواب موصول نہیں ہوا اور کافی عرصہ گذر گیا، اس رقم کو بھی کس مصرف میں صرف کریں، کیا طلبہ اور اہل علم حضرات کو دی جاسکتی ہے؟ اسی طرح کیا طلباء کی کتابوں پر صرف کی جاسکتی ہے؟ مطلع فرمائیں۔

۳-غیر منقسم میراث میں وجوب زکوۃ:

غیر تقسیم شدہ میراث پر زکوۃ سال گذرنے پر ہوگی اور ادائیگی زکوۃ کے وقت تمام ورثاء کی اجازت ضروری ہے یا نہیں؟

محمد محمود احمد (جامعہ حسینیہ راندیر سورت گجرات)

۱- نقلاً عن امداد الفتاوی، کتاب الشرکۃ ۳ر ۴۹۷۔

الجواب وباللہ التوفیق:

۱-اگر مرسل کا پتہ چل سکےتو پتہ چلا کر دریافت کرلیا جائے ،ورنہ پھر اگر مرسل الیہ کے کسی ذاتی کام کے لیے بھیجا تھا تو یہ باقی رقم بھی مرسل الیہ کی ذاتی اور مملوکہ شار ہوگی، انتقال کے بعد ترکہ شار ہوگی اور حسب تخریج شرعی تقسیم ہوگی اور اگر مرسل الیہ کے کسی ذاتی کام کے سلسلے میں نہیں بھیجی تھی، بلکہ کسی قومی رفاہِ عام کے لیے یا کسی کار خیر کے اندر صرف کرنے کے سلسلے میں بھیجی تھی تو اس نوع کے کسی کام میں صرف کی جائے جس کام کے سلسلہ میں بھیجی تھی۔

۲-اگر یہ یقین ہے کہ خط پہنچا ہے پھر بھی کوئی جواب قصداً نہیں دیا ہے تو قرینہ یہ ہے کہ ہدیتہً یہ رقم بھیجی ہے جس مصرف میں چاہیں صرف کر سکتے ہیں اور اگر یہ یقین ہے کہ انہوں نے قصداً کوئی جواب نہیں دیا ہے تو ان مذکورہ مصارف میں صرف کرنے کی اجازت کی تصریح سے پھر ایک جوابی رجسٹری خط بھیج کر جواب کا انتظار کیا جائے ،اگر جواب آجائے تو فبہا ورنہ وہی سابق ذکر کردہ حکم ہوگا۔

۳-ہاں سال گذرنے پر ایسی چیزوں پر جن پر زکوٰۃ واجب ہوتی ہے، ادائیگی زکوۃ فرض ہو جائے گی، اگر ان سب کا حصہ مقدار زکوٰۃ کو پہونچتا ہو اور وہ سب بالغ بھی ہوں، ورنہ جس کا حصہ مقدار نصاب کو پہونچتا ہے اور وہ بالغ ہیں صرف ان کے حصہ میں ادائیگی زکوۃ متوجہ ہوگی اور ادائیگی زکوۃ کے لیے ان سے اجازت بھی لینی ہوگی، ہاں اگر ان سب نے حالاً یا مقالاً اجازت دے رکھی ہے تو وہ اجازت بھی کافی ہوگی۔

اجازت حالاً یا مقالاً کا مفہوم یہ ہے کہ مورث کے انتقال کے بعد اس رقم کے کاموں کی انجام دہی ان لوگوں نے سپرد کر دی ہو اور سب بالغ ہوں یا مشترک کاروبار رہو اور اس شخص کو اپنا منتظم کار بنا رکھا ہو، یا از خود یہ ذمہ داری آگئی ہو اور اگر ایسا نہیں ہے تو جلد از جلد تقسیم ورثاء کر کے سبکدوش ہونا چاہیے،فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

زکوۃ اصل سرمایہ پر ہے یا منافع پر بھی؟

جہاں تک مجھے معلوم ہے کہ زکوۃ اصل زر پر فرض ہے، لیکن سعودی عرب میں تاجروں سے حکومت صرف منافع کا 2½% زکوۃ کے طور پر سالانہ وصول کرتی ہے براہ کرم تصدیق فرمائیے کہ زکوۃ اصل زر پر فرض ہے یا صرف منافع پر، (نوٹ) اگر آپ کے پاس سے کوئی ایسا رسالہ نکلتا ہے جس میں فقہ شریعت اسلامی کے مسائل سوال و جواب کی صورت میں شائع

ہوتے ہوں تو میں ایسا رسالہ اپنے نام جاری کرانا پسند کرتا ہوں۔ان کی تفصیلات لکھئے کہ قیمت اشتراک کس قدر اور کس پتہ پر اور کس رسالے کے لئے روانہ کی جائے،اپنے مذکورہ بالا چار سوالوں کے جواب کا منتظر رہونگا؟

سید عبداللہ (معرفت الفوشیئر یڈنگ کمپنی پوسٹ بکس ۳۲۶ الخبر۔سعودیہ عربیہ)

الجواب وبالله التوفيق:

زکوۃ نکالنے کا شرعی طریقہ یہ ہے کہ ایک دفعہ جب صاحب نصاب ہونے کے بعد سال پورا ہوا اور اپنی ضروریات سے زائد جتنا مال سال پورا ہونے کے وقت موجود ہو ان سب کا مع اصل ونفع شمار کر کے چالیسواں حصہ زکوۃ میں نکالدے، پھر اگلے سال جب سال پورا ہونے کے دن کا حساب کریں اور تمام اخراجات اور ضروریات سے فاضل جتنی رقم وسامان مع اصل ونفع باقی رہے سب کا چالیسواں حصہ نکالدیا کریں۔غرض وہ نفع یا بچت کا چالیسواں حصہ نکالنا کافی نہ ہوگا، "**هكذا في الدر المختار و رد المحتار والبحر و غيرها من الكتب الفقهية المعتبرة للفتوى عند الأحناف (والمستفاد ولو بهبة أو ارث وسط الحول يضم إلى نصاب من جنسه، فيزكيه بحول الأصل**" (۱)، "**تجب في مائتي درهم وعشرين ديناراً ربع العشر وهو خمسة دراهم في المائتين**" (۲) فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۳۰/ ۷/ ۱۴۰۰ھ

استعمال شدہ اشیاء کی مالیت اور حصص پر زکوۃ:

اس کے بعد کا سوال زکوۃ کی ادائیگی کے متعلق ہے اس مسئلہ کی وضاحت کے لئے مختصراً یہ عرض کروں گا کہ میری ملکیت میں ایک قطعہ آراضی ہے جن پر مکان بنا ہوا ہے زمین اور مکان کی قیمت دس ہزار رینڈ ہے۔

نوٹ: رینڈ ساؤتھ افریقہ میں مروجہ سکہ ہے جس کی قیمت آج کل ۸ روپیہ پچاس پیسے کے برابر ہے۔

خرچ وضع کرنے کے بعد میری خالص آمدنی ایک ہزار رینڈ ہے جو ایک سال سے زائد سے میرے قبضہ میں رہتی ہے میں سمجھتا ہوں کہ مجھ کو زکوۃ ایک ہزار رینڈ آمدنی پر ادا کرنی ہے کیا مجھے اپنی آراضی اور مکان کا نہ مالیتی مبلغ دس ہزار روپیہ رینڈ

۱- الدرالمختار مع ردالمحتار ۳/ ۲۱۴۔

۲- البحرالرائق ۲/ ۳۹۳۔

پر بھی ادا کرنی ہوگی۔

اسی طرح سے ایک بڑی کمپنی کے ایک ہزار رینڈ کے حصص خریدتا ہوں جس کے اور بھی حصص دار ہیں مطالبہ کے تغیرات کے ساتھ حصص کی قیمتیں بھی کم وبیش ہوتی رہتی ہیں سال کے اختتام پر کمپنی حصہ رسد (منافع) اعلان کرتی ہے یہ رقم میرے قبضہ میں ہے، مثال کے طور میرا حصہ رسد کو مبلغ سو رینڈ ہے میں سمجھتا ہوں کہ اگر یہ رقم ایک سال سے زائد میرے قبضہ میں رہتی ہے تو زکوۃ سو رینڈ پر قابل ادائیگی ہے میرا سوال یہی ہے کہ اس رقم کے لئے بھی ہے جو جائیداد کے حصول میں لگائی جاتی ہے کیا مجھے زکوۃ اس رقم پر بھی ادا کرنی ہے جو میں نے حصص کے خریدنے میں لگائی حصص کی قیمتیں بازاروں رجحانات کے ساتھ تغیر پذیر ہوتی رہتی ہیں حصص کی قیمت اس قیمت سے کم یا زائد ہوسکتی ہے جو ابتداءً ان کے خریدنے میں ادا کی گئی ہے۔

الجواب وباللہ التوفیق:

مکان یا زمین یا اور کسی مشینری پر جیسے موٹر انجن وغیرہ کی قیمت و مالیت پر زکوۃ واجب نہیں ہوتی زکوۃ اس کی آمدنی پر نقد روپیہ اشرفی یا ان کے زیور پر اور تجارت کے سامان پر واجب ہوتی ہے جبکہ اس کی قیمت نصاب زکوۃ (۵۲½ تولہ چاندی یا اسکی قیمت کو) پہونچ جائے اور ضروریات سے فاضل ہوکر پورے ایک سال تک باقی رہے۔

پس اس قطعہ آراضی اور اس پر بنے ہوئے مکان کی قیمت دس ہزار یا اس سے بھی زیادہ رینڈ نہ ہوجائے اس پر زکوۃ نہ ہوگی، البتہ خرچ وضع کرنے کے بعد جو آمدنی ایک ہزار رینڈ ہے جب اس پر پورا سال گزر جائے تو انکا چالیسواں حصہ یعنی ($\frac{1}{40}$) ۲-½ رینڈ فی سیکڑہ حساب سے زکوۃ نکالنی فرض ہوگی۔

اسی طرح جو حصص آپ کمپنی سے خریدیں گے اور ان حصص کے آپ مالک ہوں گے اور ان حصص کی آمدنی ونقد کا جو حساب کمپنی سال کے اختتام پر دیگی صرف اس آمدنی ونقد کا چالیسواں حصہ زکوۃ میں نکالنا ضروری ہوجائے گا۔

ہاں جس وقت ان حصص کو فروخت کریں گے اور ان حصص کے آپ مالک ہوں گے اور حصص کی آمدنی ونقد کا جو حساب کمپنی سال کے اختتام پر دیگی صرف اس آمدنی پر نقد کا چالیسواں حصہ زکوۃ میں نکالنا ضروری وفرض ہوگا ان حصص کی قیمت میں سے جس قدر مشینری وعمارت وفرنیچر وغیرہ میں صرف ہوجائے گا اس کا چالیسواں حصہ زکوۃ میں نکالنے کا حکم نہ ہوگا۔

ہاں جس وقت ان حصص کو فروخت کریں گے اور وہ حصص نقد کی شکل میں منتقل ہوجائیں گے اس وقت چونکہ آپ

دوسرے اموال سے نصاب زکوۃ کے مالک رہیں گے ان حصص کے نقد پر بھی زکوۃ واجب ہو جائے گی اور اس کا چالیسواں حصہ نکالنا ضروری ہو جائے گا۔

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۴۰۴/۶/۸ھ

ڈاکخانہ میں ماہانہ آمدنی اسکیم اور اس پر زکوۃ کا حکم:

۱-زید نے ۵۰ ہزار روپے گورنمنٹ کے ڈاک خانہ میں "ماہانا آمدنی اسکیم" فنڈ میں جمع کرار کھے ہیں، ماہانہ آمدنی کے نام سے وہ چھ سال تک ہر ماہ پانسو روپے بونس کے نام سے واپس مل جائیں گے۔اگر زید چھ سال پورا ہونے سے پہلے اپنی جمع کرائی ہوئی رقم واپس لینا چاہے گا تو کچھ معمولی گھاٹے کے ساتھ اس کو وہ رقم واپس مل جائے گی۔

زید اپنی مندرجہ بالا جمع کرائی ہوئی رقم پر زکوۃ ادا کرنا چاہتا ہے، اگر اس کے پاس ایک رہائشی مکان اور صرف 2½ تولہ سونا ہیں تو وہ کس حساب سے زکوۃ ادا کرے؟

۲-عمر نے ۵۰ ہزار روپے گورنمنٹ کے فنڈ میں ساڑھے پانچ سال کے لئے جمع کرار کھے ہیں 5½ سال کے بعد اس کو ۵۰ ہزار کی جگہ ایک لاکھ روپے ملیں گے اگر وہ اس رقم کو 2½ سال پورا ہونے سے پہلے لینا چاہے گا تو اس کو کچھ گھاٹے کے ساتھ وہ رقم واپس مل جائے گی۔

عمر مندرجہ بالا جمع کرائی رقم پر زکوۃ ادا کرنا چاہتا ہے اگر اس کے پاس ایک رہائشی مکان اور 2½ تولہ سونا ہیں تو وہ کس حساب سے زکوۃ ادا کرے؟

الجواب وباللہ التوفیق:

۱-رہائشی مکان کی قیمت پر کوئی زکوۃ نکالنی واجب نہیں، البتہ 2½ تولہ سونے کی زکوۃ سال میں چالیسواں حصہ نکالنا ہوگا اور ہر سال میں جتنی تعداد تک روپیہ جمع ہو چکا ہوگا، ان سب کی زکوۃ ان مجموعہ پر چالیسواں حصہ نکالتے رہنا ہوگا، اور اپنی جمع کردہ رقم سے زائد جو رقم ہوگی اس پر وجوب زکوۃ کے بجائے یہ حکم ہوگا کہ اس زائد کے وبال سے بچنے کے لئے اس کو مسلم غربا ءمساکین کو دے دیا جائے ،اور یہ حکم اس صورت میں ہے جب چھ سال تک حسب معاہدہ پوری قسط جمع کرتا رہے اور اس کو اپنی جمع رقم سے زائد ملے اور اس وقت میں یہ معاملہ محض شرعی ربوا کا ہوگا اور جب چھ سال سے پہلے جمع کرائی ہوئی رقم

واپس لے گا تو کچھ گھاٹے کے ساتھ رقم واپس ملے گی، پس اگر اس گھاٹے سے مراد یہ ہے کہ ان جمع کردہ اصل میں سے بھی کچھ کم واپس ملے گی تو یہ شرعاً سودی ہونے کے ساتھ قمار (جوئے) کا بھی شمار ہو جائے گا، اور نا جائز ہر حال میں رہے گا۔

۲-اور سوال نمبر ۲ کا بھی یہی حکم ہے۔

ہاں اگر اس ماہانہ آمدنی اسکیم کی صورت یہ ہو کہ جس طرح پراویڈنٹ فنڈ میں تنخواہ ملازم کے قبضہ میں آنے سے قبل ہی محکمہ خود کاٹ لیتا ہے تو اس کا حکم بھی وہی پراویڈنٹ فنڈ کا بعینہ ہوگا اور سب ملی ہوئی زائد رقم بھی اپنی جمع کی ہوئی رقم کے مانند حلال و جائز رہے گی، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۵/۹/۱۴۱۰ھ

زکوۃ کی رقم تجارت میں لگانے کا حکم:

بکر کے پاس مدرسہ کی رقم بھی رہتی ہے وہ اس رقم کو اپنی رقم میں ملا کر تجارت کرتا ہے تو سوال طلب یہ ہے کہ مدرسہ کی رقم جو خیرات اور زکوۃ کا مال ہے اس کو تجارت میں لگانا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب وباللہ التوفیق:

اگر اراکین مدرسہ اور روپے دینے والے اصل مالکوں کی اجازت و مشورہ سے مدرسہ کے نفع کے لئے ایسا کرتا ہے اور زکوۃ کی رقم کے علاوہ سے کرتا ہے تو جائز ہے (۱)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۸/۱۱/ ۸۵ ۱۳ھ
الجواب صحیح محمود عفی عنہ مفتی دارالعلوم دیوبند

۱- مصالح مسجد کے لئے مسجد کی رقم کا استعمال درست ہے، "واذا جعل تحته سرابا لمصالحة أی المسجد جاز" (درمختار ۶/ ۵۴۷) جبکہ مسجد کے احکام بہ نسبت اس کے تحت ہیں، لہذا یہاں بدرجہ اولی درست ہوگا) ورنہ نہیں (زکوۃ کی ادائیگی بغیر تملیک مصارف نہیں ہوتی، اس لئے بغیر حیلہ اس کا تجارت وغیرہ میں استعمال درست نہیں، "ویشترط أن یکون الصرف تملیکا" (الدر المختار مع رد المحتار ۳/ ۲۹۱)۔

باب المصارف

ہندوستان میں بیت المال کا شرعی حکم:

بھٹکل کے مسلمانوں کی جو کہ سب کے سب شافعی المذہب ہیں، ایک جماعت بیت المال قائم کرنا چاہتی ہے جس کا کام یہ ہوگا کہ مسلمانوں سے زکوۃ جمع کرے اور شہر کے مستحقین پر تقسیم کرے، اس سلسلہ میں علماء سے استصواب کیا گیا، علماء نے جواب دیا کہ قیام بیت المال کے لئے اہم شرط اسلامی قوت قاہرہ کا وجود ہے جو احکام شرع کا بزور قوت نفاذ و اجراء کرسکے۔ اور چونکہ فی زمانہ یہ امر مفقود ہے اس کے علاوہ دوسرے مفاسد کے پیدا ہونے کا امکان ہے جن کے انسداد و استیصال کا کوئی ذریعہ نہیں، لہذا موجودہ صورت میں شرعا قیام بیت المال کی اجازت نہیں دی جاسکتی ہے، علماء کرام کا ادعاء یہ ہے کہ تبدیل احوال وظروف سے احکام بھی تبدیل ہوجاتے ہیں، اب جناب کی خدمت میں حسب ذیل امور پیش کیے جاتے ہیں۔

☆ بیت المال کی شرعی حیثیت کیا ہے، آیا یہ فرض ہے؟ یا سنت؟ یا مستحب ہے؟

☆ کیا شروط بشرط نصب امام و دیگر شرائط ہیں؟

☆ وہ دیگر شرائط کیا ہیں؟

☆ درصورت اثبات کیا ہمارے زمانہ میں یہ شرط پائی جاتی ہے، یا پائی جاسکتی ہے؟

☆ بیت المال میں کس قسم کا مال جمع کیا جاسکتا ہے؟

☆ کیا علماء کا مذکورہ بالا ادعاء صحیح ہے؟

☆ درصورت صحت ادعاء مسائل میں اس کی نظیریں کیا ہیں؟

☆ کیا کسی بستی کا کوئی ادارہ یا جماعت المسلمین امام یا مسلمان حاکم کی جگہ لے سکتا ہے؟

☆ کیا موجودہ زمانے کے قضاۃ جو صرف انعقاد نکاح وطلاق وغیرہ کا کام کرتے ہیں، امام یا حاکم کی جگہ لے سکتے ہیں؟

☆ کیا کچھ لوگ جمع ہو کر بیت المال کا نام لیے بغیر لوگوں سے جمع زکوۃ و تقسیم کا کام اجتماعی طور پر کر سکتے ہیں یا نہیں؟

☆درصورت امتناع بیت المال ایسی ممانعت کو کس قسم میں رکھا جائے گا؟

نوٹ: ہماری بستی شافعی المذہب پر مشتمل ہے۔ازراہ کرم جواب میں مذہب شافعی کے نقطۂ نظر کو بھی واضح فرمائیں۔

الجواب وباللہ التوفیق:

بیت المال اصطلاحی شرع میں اس شرعی خزانے کا نام ہے جس کو امام المسلمین قائم کرتا ہے جس میں مال غنیمت خمس وعشر وخراج واموال ظاہر یہ کی زکوٰۃ وغیرہ اکٹھا کی جاتی ہے، اس کے انعقاد واقامت کے لئے بیشک وہی شرائط ہیں جن کی طرف مقامی علماء کرام نے توجہ فرمائی ہے اہم شرط قوت قاہرہ کا موجود ہونا ہے، اوراس کے فقدان کی صورت میں ان مفاسد کا ظن غالب ہے جن کی طرف مقامی علماء نے توجہ دلائی ہے، البتہ اگرچہ شرعی بیت المال مفقود ہے اوراس کے انعقاد واقامت کے شرائط بھی موجود نہیں ہیں، لیکن چونکہ بعض مصارف بیت المال موجود ہیں، جیسے غرباء ومساکین اور مبلغین ودعاۃ وعلم دین کے معلمین وغیرہ وغیرہ، اس لئے ان مصارف کا وجود جہاں موجود ہو یا مدات بیت المال کے محل جہاں میسر ہوجائیں، جیسے دارالیتامی یا وہ مدارس علوم دینیہ جن میں مستحقین زکوۃ وصدقات وزکوٰۃ کی کفالت کی جاتی ہو وغیرہ وغیرہ، ان پر وہ اموال جو بیت المال میں جمع کئے جاتے ہیں خرچ کئے جائیں تو درست ہوگا، اوراس بناء پر اس قسم کے اداروں کو جن میں مستحقین زکوٰۃ وصدقات رہتے ہیں بیت المال کا مصرف قرار دے کر وہ رقم وہاں دینا اوراس کی نوعیت مدات کی توضیح کرتے ہوئے خرچ کرنے کی تشریح کرنا درست ہے اوراس بناء پر بعض علماء کے ذہن میں آ گیا کہ یہ بیت المال بھی کہے جاسکتے ہیں اور جب یہ ادارے بیت المال کہے جاسکتے ہیں تو پھر بیت المال کے نام پر ادارہ بھی قائم کیا جاسکتا ہے، خواہ بوقت عطا اس ادارہ میں مصرف بیت المال، یعنی ایسے اشخاص موجود نہ ہوں جو مصرف بیت المال کہے جاسکیں، حالانکہ یہ ظاہر ہے کہ جب اس ادارہ میں مستحقین بیت المال موجود نہیں، بیت المال کے اموال کے مصارف بھی موجود نہیں تو پھر اس کو بیت المال شرعی کا مصرف کیسے کہا جائے؟ بخلاف دارالیتامی ومدارس دینیہ کے جن میں طلباء غیر مستطیع کے کھانے کپڑے کی کفالت کی جاتی ہے اور جس میں یہ طلباء تعلیم وتعلم کا مشغلہ رکھتے ہیں ان پر مصرف بیت المال کا اطلاق ہوسکتا ہے اور مصرف بیت المال کا محل قرار دے کر وہ جو اموال بیت المال جانا چاہئے۔فقدان بیت المال کی صورت میں مصارف بیت المال کے محل میں صرف کردینا عین منشاء شارع کی تکمیل ہے اوران مفاسد کا بھی ظن غالب نہیں ہے جن کی طرف علماء مذکورہ نے اشارہ فرمایا ہے، اس لئے اگر اس قسم کا

کوئی نظم قائم کرلیا جائے جس سے جلد سے جلد اور محتاط طریقہ سے لوگوں کی زکوٰۃ ادا ہوجائے تو جائز کہا جائے گا، لیکن اصحاب وارا کین ادارہ کو یا اسکے ذمہ دار لوگوں کو کسی سے زبردستی وبجبر خواہ وہ اموال ظاہر یہ ہی کیوں نہ ہوں وصول کرنے کا حق نہ ہوگا اور اگر ارباب اموال اس میں اپنی زکوۃ نہ دیں تو گنہگار نہ ہوں گے، بلکہ ان کو اپنے اموال کی زکوۃ خدا سے ڈر کر خود اس کے مصرف میں اور اس کے مستحقین تک پہنچانا ضروری رہے گا، البتہ اگر کسی ادارے میں جس کے بارے میں ظن غالب ہو۔ اور یہ بات محقق دیکھیں کہ اس میں یہ رقوم زکوٰۃ وغیرہ اس کے مستحقین کی ملک میں نہایت صحیح طور پر پہنچ جاتے ہیں اور ادائیگی حسب قاعدہ شرع ہوجاتی ہے دیدیں تو ان کی ادائیگی صحیح ہوجائے گی۔

اسی طرح اصحاب وارا کین ادارہ نے اگر محتاط اور صحیح طریقہ سے شریعت مطہرہ کے بتائے اصول کے مطابق ان رقوم کو ان کے مستحقین کی ملک میں پہنچانے سے پہلے پہلے خرچ کرڈالا تو ارباب اموال کی صدقات وزکوٰۃ واجبہ (نذ رو کفارۂ روزہ) وغیرہ ادا نہ ہوگی، اور ایسا کرنے والے عند اللہ سخت مجرم و ماخوذ ہوں گے۔ بلکہ دنیا کے وبال میں بھی ابتلاء کا شدید اندیشہ رہے گا، اور ارباب اموال کو اس کا علم صحیح اور یقین ہوجانے کے بعد ایسے ادارہ میں اپنی رقم دینا جائز بھی نہ ہوگا۔

ہماری ان گزارشات سے امتناع کا درجہ بھی معلوم ہوگیا کہ امتناع لعینہ نہیں ہے، بلکہ امتناع لغیرہ ہے، لفقدان شرائط اور اس امتناع لغیرہ کا حاصل وہی ہے جو اوپر ابھی مذکور ہوا۔ اس میں ضرورت کے تمام اجزاء کا جواب آ گیا، اور ہر ہر نمبر کے تفصیلی جواب الگ الگ لکھنا مقصد سے زائد اور بلاضرورت ہے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۲/۸/ ۹۳ ۱۳ھ

علوم دینیہ پر زکوۃ صرف کرنا:

۱ - ”هل يجوز صرف مال الزكوة في تعليم العلوم الدينية والاسلامية“

اہل مدرسہ کو زکوۃ دینا:

۲۔ ”هل يجوز صرف الزكوة على أهل المدرسة والجامعة“

مدارس کے سفراء وعامل اور عاشر میں داخل ہیں یا نہیں؟

۳۔ ”هل يجوز اطلاق العامل والعاشر على سفير المدرسة والجامعة في أخذ الزكوة من الناس“

ابن سبیل کا مصداق طالب ہے یا نہیں؟

۴۔ ’’هل يصح مصداق ابن سبيل على المتعلم‘‘

زکوۃ کی رقم سے مدرسہ کی تعمیر:

۵۔ ’’هل يصح التعمير للدار العلوم من مال الزكوة‘‘۔

۶۔ ’’هل يشترط المدرسة التعليم عربية الشرعية‘‘

کیا مدرسہ کے کارکنوں کے لئے زکوۃ لینے میں بھی فقر کی شرط ہے؟

۷۔ ’’هل يشترط الغناء والفقر في قبول الزكوة معلم ومتعلم والخادم المدرسه‘‘

سادات طلبہ کو زکوۃ دینا:

۸۔ ’’وان كان في المدرسة سادات اعني أولاد رسول اللهﷺ يجوز لهم الزكاة أم لا‘‘۔

زکوۃ کی رقم سے مدرسہ کے لئے دینی کتب کی خریداری:

۹۔ ’’واذا اشترىٰ بالمال الزكوة كتب المدينيه وأن يضع في المدرسه على طريق الوقف يصح الزكوة وخرج الزكوة‘‘۔

۱۰۔ ’’بينوا بالبيان الكافي توجروا من الله بالاجر الوافي ونرجو منكم العفو في الأغلاط‘‘۔

عبدالمنان حقانی (خادم الدارالعلوم گلستان قاطع شیں بلوچستان پاکستان)

الجواب وبالله التوفيق:

۱، ۲۔ ’’لايجوز إلا بعد تمليك المستحق (أما تفسيره (الزكوة فهي تمليك المال من فقير مسلم غير هاشمي ولا مولاه بشرط قطع المنفعة عن الملك من كل وجه لله تعالى)‘‘(۱)۔

۳۔ لا يجرى كل أحكام العامل والعاشر على سفراء المدارس والجامعات في أخذ الزكوة ’’درمختار باب المصارف‘‘میں ہے: وعامل يعم الساعي والعاشر اس کے تحت علامہ شامی لکھتے ہیں: ’’الساعي هو من يسعى في القبائل لجمع صدقة السوائم، والعاشر من نصبه الإمام على الطرق ليأخذ العشر ونحوه في

۱- 　فتاوی عالمگیریہ ۱/۱۷۰۔

المارة''(۱)۔

۴۔ نعم يصح(قلت: ورأيته في جامع الفتاوى ونصه: وفي المبسوط: لا يجوز دفع الزكوة إلى من يملك نصاباً إلا إلى طالب العلم والغازى ومنقطع الحج'' (۲)۔

۵۔ ''بدون تمليك المستحق لا يجوز التعمير من مال الزكوة (ويشترط أن يكون الصرف تمليكاً لا إباحة كما مر، لا يصرف إلى بناء نحو مسجد ''(۳)''وقدمناه أن الحيلة أن يتصدق على الفقير ثم يأمره بفعل هذه الأشياء''(۴)۔

۶۔ ''نعم يشترط(ان طالب العلم يجوز له أخذ الزكوة ''(۵)اس کے تحت علامہ شامی لکھتے ہیں:(من أن طالب العلم) أي الشرعي(۶)۔

۷۔ نعم يشترط (جس کو زکوۃ دی جائے اس کا فقیر ہونا ادائیگی زکوۃ کے صحیح ہونے کے لئے شرط ہے، ''ولأن الفقر شرط في جميع الأصناف إلا العامل والمكاتب وابن السبيل'' (۷)،نیز معلم اگر فقیر بھی ہو تو مد تنخواہ میں زکوۃ کی رقم دینا درست نہیں جب تک اس کی تملیک نہ ہوجائے)۔

۸۔ '' لا يجوز لهم أخذ الزكوة (ولا (أى لا يصرف) إلى بني هاشم إلا من أبطل النص قرابته وهم بنو لهب'' (۸)۔

۹۔ بدون تمليك المستحق لا يوضع في المدرسة بطريق الوقف، وإلا لا يصح الأداء ولا يبرا الذمة فقط(الحيلة أن يتصدق على الفقير ثم يأمره بفعل هذه الأشياء)''(۹)۔

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

۱- ردالمحتار علی الدرالمختار ۳/ ۲۸۴۔
۲- ردالمحتار علی الدرالمختار ۳/ ۲۸۵۔
۳- ردالمحتار علی الدر ۳/ ۲۹۱۔
۴- ردالمحتار علی الدرالمختار ۳/ ۲۹۳۔
۵- الدرالمختار۔
۶- ردالمحتار علی الدرالمختار ۳/ ۲۸۵۔
۷- ردالمحتار علی الدرالمختار ۳/ ۲۸۳
۸- الدرالمختار مع ردالمحتار ۳/ ۲۹۹۔
۹- الدرالمختار مع ردالمحتار ۳/ ۲۹۳۔

سید بھائی کو زکوۃ دینا:

میرا ایک حقیقی بھائی ہے۔ گاؤں میں معمولی سی کرانہ کی دکان ہے جس میں فروخت کے لئے سامان تک کافی نہیں ایک دو ایکٹر زراعتی زمین بھی ہے مذکورہ دونوں کی مجموعی آمدنی اتنی ہوتی ہے کہ کثیر العیال (دس افراد خاندان) جس میں لڑکیاں بھی شادی کی عمر سے تجاوز کر رہی ہیں کہ ہمیشہ تنگدستی سے گذر رہوتی ہے، کیا میں انہیں زکوۃ کی رقم دے سکتا ہوں، تا کہ وہ دکان کے لئے سامان خریدیں، تو انہیں مناسب آمدنی کا کچھ ذریعہ ہو جائے اور وہ اپنے لڑکوں کی تعلیم لڑکیوں کی شادی وغیرہ امور پہ توجہ دے سکیں؟ جواب لکھتے وقت خیال رکھئے کہ وہ میرا حقیقی بھائی ہے اور وہ سید خاندان ہی کا ہے۔

سید عبداللہ صاحب معرفت الغوشیہ (ٹریڈنگ کمپنی پوسٹ بکس ۳۲۶ الخبر۔ سعودیہ عربیہ)

الجواب وباللہ التوفیق:

سادات کو متقدمین فقہاء نے زکوۃ کی رقم دینے سے منع فرمایا ہے (۱)، اور چونکہ بیت المال شرعی سے سادات کے وظائف مقرر ہو جاتے تھے اور اب بیت المال شرعی نہیں رہے، اس لئے بعض متاخرین فقہاء نے سادات کو بھی زکوۃ کی رقم دینے کی اجازت دے دی ہے (۲)، اس لئے احتیاط اسی میں ہے کہ حقیقی بھائی جب سید ہے تو اس کی مدد ضرور کی جائے گی، مگر زکوۃ کی رقم سے نہ کی جائے، بلکہ صدقات نافلہ سے کی جائے اور اگر بھابھی، یعنی بھائی کی بیوی اگر غیر سید ہو تو اس کو زکوۃ کی رقم بے تکلف دینا جائز ہے۔ اور اتنی زیادہ مقدار بھی اس کو دے سکتے ہیں جس سے وہ اپنے بچوں کی پوری کفالت و تعلیم وتربیت وغیرہ کا خرچ فراغت سے کر سکے۔ ورنہ اگر حقیقی بھائی و بہن سید نہ ہوں تو ان کو اور ان کی اولاد کو جب غریب ومحتاج ہوں تو زکوۃ کی رقم دینا جائز ہے بلکہ دوسرے کے اعتبار سے زیادہ بہتر ان کو دینا ہے (۳)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۳۰/ ۷/ ۱۴۰۰ھ

۱- "ولا تدفع إلی بنی ھاشم ہدایہ ۱/ ۱۸۶ یعنی سواء فی ذلک کل الأزمان، وسواء فی ذلک دفع بعضھم لبعض ودفع غیرھم لھم" (ردالمحتار علی الدرالمختار ۳/ ۲۹۹)۔

۲- "وروی أبوعصمة عن الإمام أنه یجوز الدفع إلی بنی ھاشم فی زمانه، لأن عوضھا وھی خمس الخمس لم یصل إلیھم لإھمال الناس أمر الغنائم وإیصالھا إلی مستحقیھا، وإذا لم یصل إلیھم العوض عادوا إلی المعوض، کذا فی البحر وقال فی النھر: وجوز أبویوسف دفع بعضھم إلی بعض" (تفصیل کے لئے دیکھئے: ردالمحتار علی الدرالمختار ۳/ ۲۹۹)۔

۳- بل ھم أولی لأنه صلة وصدقة) (ردالمحتار علی الدرالمختار ۳/ ۲۹۳) (مرتب)۔

مدرسہ میں زکوۃ کا مصرف:

ان مدارس کے بارے میں جن میں بیرونی طلباء زیر تعلیم ہیں اور قیام و طعام بذمہ مدرسہ ہے معطی کی نیت رقم زکوۃ بوقت ادا یہ ہوتی ہے کہ جو اس کے ذمہ زکوۃ واجب ہے وہ ذمے سے ادا ہو جائے، یہ تو ہوئی نہیں پایہ تو کہتے نہیں کہ فلاں مقام پر خرچ کرو، بلکہ سفیر یا مدرسہ کے مہتمم کے کہنے پر کہ مدرسہ زکوۃ لیتا ہے تو زکوۃ دیتے ہیں سوال یہ ہے کہ مصارف زکوۃ مدرسہ میں کیا کیا مقام ہے تنخواہ معلم، طلباء کے طعام قیام لباس مدرسہ کی توسیع مدرسہ کے دیگر اخراجات، مہتمم رقم زکوۃ کی اگر حیلہ تملیک نہ کرتا ہو تو اور مدرسہ میں رقم زکوۃ کو مہتمم کہاں کہاں پر صرف کرسکتا ہے۔

یہ سوال ہماری تسلی کے لئے ہے تا کہ معلوم ہو جائے اور زکوۃ کی ادائیگی سے مطمئن ہو جائیں اور صحیح مصرف کا بھی علم ہو جائے۔

احمد علی صدیقی (احمد علی محمد علی پر فیوم سسینمار وڈپوسٹ کھوکون، ایم-پی)

الجواب وباللہ التوفیق:

زکوۃ صدقۃ فطر اور دوسری واجب التملیک رقوم کو صرف نادار اور غیر مستطیع طلبہ کے کھانے کپڑے پر خرچ کرنا لازم ہے، اگر تنخواہ مدرسین یا تعمیر وغیرہ یا کسی کام کی اجرت میں خرچ کرنا ہو یا کسی بھی ایسے کام میں خرچ کرنا ہو جس میں تملیک مستحق نہیں ہوتی بغیر تملیک مستحق کے خرچ کرنا جائز نہیں ہے (۱)، لہذا جس طرح زکوۃ کے مال سے کوئی سامان خرید کر اس سے نفع اٹھانا جائز نہیں، ویسے ہی اس کا اجرت میں دینا بھی جائز نہیں)۔

اس لئے احتیاطی پہلو یہی ہے کہ ان رقوم واجب التملیک پر وصول ہونے کے ساتھ ہی مستحقین زکوۃ سے تملیک کرا کے پھر خرچ کے لئے استعمال کریں اور تملیک کا بہتر طریقہ یہ ہے کہ جتنے روپے کی تملیک کرنا ہو اتنے روپئے کے بارے میں کسی غریب مستحق زکوۃ سے کہیں کہ تم اتنے روپئے کہیں سے قرض لا کر مدرسہ میں بطور چندہ وعطیہ دیدو، تمہارا قرض ادا کر دیا جائے گا پھر جب وہ غریب اتنا روپیہ کہیں سے قرض لا کر بطور چندہ مدرسہ میں دے دے تو اس کے بعد زکوۃ وغیرہ واجب التملیک والی رقم اس غریب کو دیدیں اور وہ غریب اس رقم سے اپنا قرض ادا کر دے۔

اس کو قرض دینے میں ایسا بھی کر سکتے ہیں کہ خود اپنے پاس سے اس کو قرض دیدیں پھر جب وہ قرض لی ہوئی رقم

۱- ''ویشترط أن یکون الصرف تملیکاً'' (الدر المختار مع رد المحتار ۳/۲۹۱)، ''وکل ما صلح ثمناً أی بدلاً فی البیع صلح أجرۃ؛ لأنہا ثمن المنفعۃ'' (الدر المختار مع رد المحتار ۹/۵)۔

چندہ میں دیدے تو اس کے بعد اپنی زکوۃ والی رقم اس کو دیدے پھر جب وہ اس رقم پر مالک ہو جائے تو اس سے اپنا قرض وصول کر لے۔

یہی طریقہ دوسرے کسی مالدار سے دلا کر اختیار کر سکتے ہیں (۱) فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۵/۱/۱۴۰۱ھ

کیا ادائیگی زکوۃ کے لئے کوئی مہینہ مخصوص ہے؟

۱-صاحب زکوۃ کو کس ماہ میں اور کس مدت میں ادا کر دینی چاہئے؟

مصارف زکوۃ:

۲-زکوۃ کے مستحق کون کون حضرات ہیں جن کو اللہ اور اس کے رسول نے حکم دیا ہے نمبروار اور ترتیب کے ساتھ بتلائیے کہ کس کے بعد کس کو دیجائے؟

فقراء و مساکین کس کو کہتے ہیں؟

۳-زکوۃ لینے والے کی مفلسی کس حد تک ہو جن کو زکوۃ دی جائے مجبوری کی نوعیت بھی تحریر فرمادیں۔

مصارف زکوۃ کے علاوہ دوسرے مد میں زکوۃ صرف کرنا:

۴-زکوۃ کی رقم مستحقین کے علاوہ دوسرے آدمی یا مصارف میں دی جائے تو زکوۃ ادا ہوگی یا کہ نہیں۔

زکوۃ کی رقم جمع کر کے رفتہ رفتہ خرچ کرنا:

۵۔ زکوۃ کی رقم اگر زید تمام مسلمانوں سے لیکر جمع کرے اور ایک سال تک رفتہ رفتہ مختلف نوعیت سے قومی یا نفلی مصارف میں صرف کرتا رہے تو شرع کا کیا حکم ہے۔

غیر مصرف پر زکوۃ صرف کرنا:

۶۔ اللہ اور رسول کے مقرر کردہ مستحقین کے حق کو ادا نہ کر کے اور خدا کے معذور اور مجبور بندوں کی حق تلفی کر کے جو شخص روپیہ جمع کرے اور غیر مصرف میں صرف کرے اور صاحب زکوۃ اس کو پیسہ دے کر زکاۃ ادا کرنا چاہے آیا ان دینے

۱- ''وحيلة الجواز أن يعطى مديونه الفقير زكاته، ثم يأخذها عن دينه، ولو امتنع المديون مديده وأخذها لكونه ظفر بجنس حقه، وحيلة التكفين بها التصدق على الفقير ثم هو يكفن، فيكون الثواب لهما، وكذا في تعمير المسجد" (درمختار مع رد المحتار ۳/۱۹۰)(مرتب)۔

والوں کی زکوۃ بھی ادا ہوگی یا کہ نہیں اور جمع کرنے والا آہستہ آہستہ جمع کرتا ہے تو اس کے لئے شریعت کا کیا حکم ہے۔

الجواب وباللہ التوفیق:

(الف) جب مالک نصاب ہونے کے بعد حولان حول (ایک سال) پورا ہوجائے زکوۃ دینی چاہئے، خواہ کوئی سا بھی مہینہ ہو(۱)۔

(ب) مستحق زکوۃ یہ لوگ ہیں:

(۱) فقیر یعنی وہ شخص جس کے پاس کچھ مال ہو مگر مقدار نصاب سے کم ہو۔

(۲) مسکین، یعنی وہ شخص جس کے پاس کچھ مال نہ ہو دانہ دانہ کو محتاج ہو۔

(۳) عامل جو شخص امام المسلمین کی جانب سے زکوۃ سوائم وعشر وصول کرنے کے لئے مقرر ہو ان کا آج وجود نہیں ہے۔

(۴) مکاتب، اس کا بھی آج وجود نہیں۔

(۵) وہ قرضدار جس کے پاس قرض ادا کرنے کے بعد نصاب کی مقدار سے کچھ کم بچے۔

(۶) وہ لوگ جو فریضہ جہاد یا فریضہ حج ادا کرنے کے لئے نکلیں۔ اور اچانک ان کا مال ہلاک ہوجائے اور ادائیگی فریضہ سے مجبور ہونے لگے ہوں اور جو طلب علم دین میں مشغول ہو اور محتاج اخراجات ہو۔

(۷) مسافر جو اچانک زادراہ ہلاک ہوجانے سے محتاج ہوگیا ہو۔

اور فوری کوئی صورت حصول زادراہ کی نہ ہو(۲)۔

(ت) اگر کسی کو اتنا مل جاتا ہو کہ کسی طرح صبح شام ہوتی جاتی ہو لیکن اس کے پاس حوائج اصلیہ سے اتنا فاضل نہیں رہتا ہو جو نصاب زکوۃ کی مقدار ہے یعنی قول مختار کے مطابق ساڑھے باون تولہ چاندی یا اتنا ہی زیور یا اس مقدار کا کوئی سامان تجارت ہو تو ایسے آدمی کو زکوۃ مانگنا تو جائز نہیں، لیکن اگر کوئی اس کو از خود دیدے تو لے لینا جائز ہے، اگرچہ بہتر یہ بھی نہیں ہے

۱- "وافتراضها عمری أی علی التراخی وصححه الباقانی وغیره، وقیل: فوری أی واجب علی الفور، وعلیه الفتوی، کما فی شرح الوهبانیة، فیأثم بتأخیرها بلا عذر" (الدر المختار مع رد المحتار ۳/۱۹۱، تفصیل کے لئے دیکھئے: رد المحتار) (مرتب)۔

۲- الدر المختار مع رد المحتار ۳/۲۸۳-۲۹۔

اور جس کے پاس کچھ بھی نہ ہو، بلکہ تنگی سے گذر کرتا ہو اس کو مانگنا بھی جائز ہے گو بہتر نہیں (۱)۔

(ث) زکوۃ ادا نہ ہوگی دوبارہ دینا واجب رہے گا (۲)۔

(ج) یہ قطعاً جائز نہیں ادائیگی زکوۃ صحیح ہونے کے لئے غرباء و مساکین کو اس زکوۃ کی رقم کا مالک بنا دینا شرط ہے اور ظاہر ہے کہ صورت مسئولہ میں ایسا نہیں (۳)، ہاں اگر زید کے پاس زکوۃ کا روپیہ جمع کرنے والے زید کو ادا کرنے کا وکیل بنا دے اور پھر زید وکالتہً زکوۃ کے مصرف میں صرف کرے تو جائز ہو سکتا ہے، جیسا کہ مدارس اسلامیہ کے نظماء و مہتمم حضرات کرتے ہیں (۴)۔

(خ) ایسی صورت میں ان دینے والوں کی زکوۃ ادا نہ ہوگی اور اس طرح جمع کرنے والے اور غیر مصرف میں جمع کرنے والے عند اللہ سخت مجرم اور گناہ گار رہوں گے (۵)۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی مفتی دار العلوم دیو بند سہارنپور ۱۹/ ۷/ ۱۳۸۵ھ

الجواب صحیح سید احمد علی سعید، محمود احمد عفی عنہ دار العلوم دیو بند

مکتب میں چرم قربانی وزکوۃ دینا:

ایک مدرسہ اس قسم کا ہے کہ مدرسہ میں ٹین بورڈ لگا ہوا ہے اور اس پر لکھا ہوا کہ اسلامیہ پرائمری اسکول اور رسید بہی پر لکھا ہے عربیہ اسلامیہ مدرسہ حفظ القرآن اس رسید بہی کو لے کر گاؤں در گاؤں چندہ مانگتے ہیں فطرہ اور زکوۃ اور چرم قربانی

۱- ''ویجوز دفعها إلى من يملك أقل من النصاب وإن كان صحيحاً مكتسباً كذا في الزاهدی'' (فتاوی عالمگیریہ ۱/ ۱۸۹)، ''ولا إلى غنى يملك قدر نصاب فارغ عن حاجته الأصلية من أي مال كان'' (الدر المختار مع رد المحتار ۳/ ۲۹۵)، ''ولا يحل أن يسأل شيئاً من القوت من له قوت يومه بالفعل أو بالقوة كالصحيح المكتسب'' (الدر المختار مع رد المحتار ۳/ ۳۰۵)۔

۲- زکاۃ کی تعریف ہے: ''هي تمليك المال من فقير مسلم غير هاشمي ولو مولاه بشرط قطع المنفعة عن الملك من كل وجه لله تعالى هذا في الشرع'' كذا في التبيين (فتاوی عالمگیریہ ۱/ ۱۷۰)۔

۳- کیونکہ زکاۃ نام ہے: ''تمليك المال من فقير مسلم ....'' الخ کا، اور مصارف زکاۃ متعین ہیں، ''إنما الصدقات للفقراء والمساكين والعاملين عليها والمؤلفة قلوبهم وفي الرقاب والغارمين وفي سبيل الله وابن السبيل فريضة من الله والله عليم حكيم'' (سورہ توبہ: ۶۰) (مرتب)۔

۴- ''الوكيل إنما يستفيد التصرف من الموكل'' (رد المحتار ۳/ ۱۸۹)۔

۵- دیکھئے: حاشیہ ث، ج ويشترط أن يكون الصرف تمليكاً (الدر المختار مع رد المحتار ۳/ ۲۹۱) (مرتب)۔

سب مدرسہ کو دیتے ہیں اور دو مدرس ہیں ایک ہندی پڑھانے کے لئے اور ایک قرآن شریف پڑھانے کے لئے جو کہ حافظ صاحب ہیں اور مہتمم مدرسہ ہندی پر زیادہ توجہ رکھتے ہیں۔

اور مہتمم صاحب کہتے ہیں کہ جب ڈپٹی صاحب آئیں گے تو وہ قرآن کی تعلیم کی جانچ نہیں کریں گے، بلکہ ہندی کی کریں گے، اس لئے ہندی پر زیادہ توجہ دو قرآن پر کم کوئی بچہ امدادی بھی نہیں ہے اور نہ کوئی باہر کا رہنے والا ہے سب مقامی بچے ہیں ایسے مکتب میں صدقہ چرم قربانی زکوۃ کی رقم صرف ہوسکتی ہے یا کہ نہیں۔

الجواب وباللہ التوفیق:

صدقۂ فطر، چرم قربانی زکوۃ وغیرہ کی رقم کسی کی اجرت میں مدرس کی تنخواہ میں دینا جائز نہیں ہے اس کے مصرف صرف غرباء اور مساکین ہیں ان پر صدقہ کردینا واجب ہے کما ہو مصرح فی عامة کتب الفقه اور سوال کی عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ اس مدرسہ میں طلباء مستحقین جو مصرف زکوۃ ہیں نہیں ہیں یا ہیں تو ان کو کھانا وغیرہ کچھ نہیں دیا جاتا ہے، لہذا اس مدرسہ میں یہ رقمیں دینا جائز نہیں ہے جو دے گا اس کی زکوۃ یا صدقۂ فطر وغیرہ ادا نہیں ہوگا (۱) فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۲/ ۷/ ۸۵ ۱۳ھ

الجواب صحیح: سید احمد علی سعید، محمود عفی عنہ دارالعلوم دیوبند

امام کے لئے صدقہ وزکوۃ لینا:

بندہ ایک مسجد میں امامت کرتا ہے اس کی ہر ماہ داری تنخواہ ستر روپیہ ہے جو کہ مقرر ہے اس ماہ داری تنخواہ سے خرچ ماہ داری نہیں چلتا ہے اس لئے بندہ ہر ماہ کے اور سال کے آخر میں مقروض ہوجاتا ہے، لہذا بندہ کے لئے صدقۂ فطر لینا یا زکوۃ کا روپیہ لینا اس ستر روپیہ کے علاوہ جائز ہے یا کہ نہیں، بینوا توجروا۔

الجواب وباللہ التوفیق:

جن کو خورد ونوش کے لئے ان کی کمائی کافی نہ ہو ان کے لئے صدقۂ فطر اور زکوۃ کا لینا جائز ہے خورد ونوش کو فقیہ لوگ

۱- زکوۃ میں مال کی تملیک بشرط قطع المنفعة عن المالک من کل وجہ للہ تعالی ہوا کرتی ہے، لہذا کسی نفع کے عوض میں یا اجرت کے طور پر دینا زکوۃ کا مصداق نہیں ہوگا دیکھئے فتاوی (عالمگیری ۱/ ۱۷۰)۔

حوائج اصلیہ سے تعبیر کرتے ہیں: "كذا لو كان له حوانيت أو دار غلة تساوى ثلاثة آلاف درهم وغلتها لا تكفي لقوته وقوت عياله يجوز صرف الزكوة إليه في قول محمد رحمه الله، ولو كان له ضيعة تساوى ثلاثة آلاف و لا يخرج منها ما يكفي له ولعياله اختلفوا فيه قال محمد بن مقاتل يجوز له أخذ الزكوة"(۱)۔

ان عبارتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ حوائج اصلیہ کے لئے اگر کمائی کافی نہ ہوتو ایسے شخص کے لئے صدقۃ فطر اور زکوۃ واجبہ ہو یا نافلہ ہو لینا جائز ہے(۲)، اگر اس شخص کے پاس زیور یا چاندی یا سونا نصاب زکوۃ کی مقدار یا اس قیمت کا سامان حوائج اصیلہ سے زائد نہ ہوتو اس کو زکوۃ لینا درست ہوگا(۳)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

جواب صحیح ہے بشرطیکہ یہ امام صدقۃ فطر اور زکوۃ کو اپنا حق نہ سمجھتا ہو اور وہاں یہ رواج نہ ہو کہ امام ہی کو دیا جائے اور نہ ملنے پر امام نمازیوں سے ناراض نہ ہو اور امامت چھوڑ کر دوسری جگہ جانے کے لئے آمادہ نہ ہو۔

الجواب صحیح محمود غفی عنہ، سید احمد علی سعید، نائب مفتی دارالعلوم دیوبند ۵/۸/ ۸۵ ۱۳ھ

ملازمین کو زکوۃ کی رقم سے تنخواہ دینا:

زکوۃ کا روپیہ طلباء کے خرچ کے علاوہ ملازمین وغیرہ کی تنخواہوں میں خرچ کرنا ہوسکتا ہے یا نہیں؟

الجواب وبالله التوفيق:

زکوۃ کا مصرف غرباء و مساکین ہیں جن کو بلا عوض کسی عمل کے دینا اور ان کی تملیک کرنا ضروری ہے اور مدرسین تنخواہ اپنے عمل کے عوض میں لیتے ہیں ان کو زکوۃ کا روپیہ تنخواہ میں دینا جائز نہیں ہے(۴)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۷/۸/ ۸۵ ۱۳ھ

۱- فتاوی قاضیخان علی ہامش فتاوی عالمگیریہ ۱/ ۲۶۶۔

۲- کذا فی فتاوی قاضیخان ۱/ ۱۲۴۔

۳- "ويجوز دفعها إلى من يملك أقل من النصاب" (فتاوی عالمگیریہ ۱/ ۱۸۹)(مرتب)۔

۴- "بشرط قطع المنفعة عن الملك من كل وجه لله تعالى"، اس کے تحت بحر میں ایک جزئیہ منقول ہے: "رجل يعول أخته أو أخاه أو عمه فأراد أن يعطيه الزكوة، فإن لم يفرض القاضي عليه النفقة جاز؛ لأن التمليك بصفة القربة يتحقق من كل وجه،

مستحق زکوۃ کی رقم سے اپنے لئے کتابیں خریدنا:

عشر زکوۃ فطرہ چرم قربانی کی رقم سے دینی لائبریریوں یا اسلامی کتب خانوں میں کتابیں نہیں خرید سکتے ہیں اور نہ اخبار ورسائل کا اجراء کرسکتے ہیں، مگر یہ رقوم ایک ایسے مفلس یا نادار کو دی جاتی ہے جو اس کا صحیح معنوں میں مستحق او راہل ہے لیکن یہ شخص فطری طور پر کتب بینی رسالہ نویسی کا دلدادہ اور شوقین واقع ہوا ہے، اس لئے وہ اپنی زیرکی سے ایسا کرتا ہے کہ ان پیسوں سے بقدر کفاف خورونوش کا انتظام کرلیتا ہے اور باقیماندہ پیسوں سے اپنے ذوق کے مطابق کتابیں خریدتا ہے، واضح رہے کہ اس میں مزکی کا ایماواشارہ بالکل نہیں رہتا ہے۔

الجواب وبالله التوفيق:

جب وہ مفلس ان رقوم کا صحیح مصرف ہے تو اس کو دینے کے بعد وہ ان کا صحیح مالک ہوگیا ہے اب اس کو پورا اختیار ہے جس مصرف میں چاہے خرچ کرے اگر مستحسن مصرف میں صرف کرے گا او رثواب کے کاموں میں صرف کرے گا تو ثواب ہوگا اور اگر ناجائز مصرف میں صرف کرے گا تو گنہگار ہوگا باقی تصرف احکام قضاء میں نافذ ہوجائے گا اور زکوۃ دینے والوں کی زکوۃ ادا ہوجائے گی، البتہ دیدہ دانستہ ایسے مفلس کو دینا جو حرام اور ناجائز میں خرچ کرتا ہے، نہ چاہئے اور اس مفلس مذکور کا مصرف تو کوئی ناجائز نہیں پھر اشتباہ کی کیا وجہ ہے (۱)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

زکوۃ کی رقم کو دینی کتابوں اور معلمین کی تنخواہ پر خرچ کرنے کی صورت:

ایک شخص اپنی زکوۃ کی رقم دینی تعلیم، معلم کی تنخواہ، دینی کتابوں پر خرچ کرنا چاہتا ہے، زکوۃ کی رقم کہاں خرچ کرسکتے ہیں اور کہاں نہیں خرچ کرسکتے کس کو دے سکتے ہیں اور کس کو نہیں دے سکتے؟

وإن فرض عليه النفقة لزمانته إن لم يحتسب من نفقتهم جاز، وإن كان يحتسب لايجوز؛ لأن هذا أداء الواجب عن واجب آخر "(البحرالرائق ۲/ ۳۵۳)(مرتب)۔

۱- "وفي المعراج: التصدق على العالم الفقير أفضل" (الدرالمختار مع ردالمحتار ۳/ ۳۰۴)(مرتب)۔

الجواب وباللہ التوفیق:

زکوۃ کی رقم کسی معلم کو اس کی تنخواہ کے عوض میں دینا جائز نہیں (۱)۔

دینی کتابوں پر خرچ کرنے کی صورت یہ ہے کہ دینی کتابیں خرید کر کسی غریب مسلمان کو جو زکوۃ کا مصرف ہے ان کتابوں کا اس کو مالک بنا دیں "ویشترط أن یکون الصرف تملیکاً لا إباحة" (۲)، دینی تعلیم پر دینے کی یہ صورت ہے کہ جس مدرسہ میں دینی تعلیم ہوتی ہو اور وہاں غریب مسلمان طالب علم پڑھتے ہوں وہاں کے مہتمم کو زکوۃ کے پیسہ کا وکیل بنا دے کہ یہ زکوۃ کا روپیہ ہے آپ اس کو اس کے مصرف میں خرچ کریں اور زکوۃ ادا ہو جانے کی بہتر اور بے خطرہ یہی صورت ہے بشرط یہ کہ مہتمم مدرسہ مسائل سے واقف ہو اور دیندار و محتاط ہوں (۳)۔

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۵/۹/۹۵ ۱۳ھ
الجواب صحیح: سید احمد علی سعید مفتی دارالعلوم دیوبند

مقروض کو زکوۃ کی رقم دے کر اس سے اپنا قرض وصول کرنا

زید کا قرض ایک غریب پر باقی تھا زید نے زکوۃ نکالی اور اس غریب کو دی پھر اس سے کہا کہ تیرے پاس رقم آ گئی ہے، اب میرا قرض ادا کر دے اس نے اس رقم سے ۱۸ سو ادا کر دیا تو زید اپنی دی ہوئی رقم کو اس طرح وصول کر سکتا ہے یا کہ نہیں، نیز اگر رقم پر قبضہ کرنے کے بعد اس مقروض نے ادائیگی قرض سے انکار کیا تو زید اپنے قرض اس رقم کو چھین کر لے سکتا ہے یا کہ نہیں؟

الجواب وباللہ التوفیق:

اس طرح زکوۃ بھی ادا ہو جائے گی اور قرض بھی وصول ہو جائے گا اگر مقروض قرضہ واپس کرنے سے انکار کر دے تو

۱– کیونکہ: هي تمليك المال من فقير مسلم غيرهاشمي ولو مولاه بشرط قطع المنفعة عن الملك من كل وجه لله تعالى) (فتاوی عالمگیریہ ۱/ ۱۷۰)، نیز بدائع الصنائع میں: "العاملون عليها" کی بحث میں ہے: "دل أنه إنما يستحقه بعمله لكن على سبيل الكفاية له ولا عوانه لا على سبيل الأجرة؛ لأن الأجرة مجهولة) (بدائع الصنائع ۲/ ۱۵۱) (مرتب)۔

۲– الدر المختار مع رد المحتار ۳/ ۲۹۱۔

۳– "أو نوى عندالدفع للوكيل ثم دفع الوكيل بلانية" (الدر المختار مع رد المحتار ۳/ ۱۸۷)، "إذا وكله الفقراء، لأنه كلما قبض شيئاً ملكوه" (رد المحتار علی الدر المختار ۳/ ۱۸۸) (مرتب)۔

اس سے دی ہوئی رقم جبراً بھی لینا درست ہے، "وحیلة الجواز أن یعطی مدیونه الفقیر زکوته ثم یأخذها عن دینه ولو امتنع المدیون مدیده وأخذها لکونه ظفر بجنس حقه فإن مانعه رفعه للقاضی" (۱)۔

جی ہاں اس طرح وصول کرسکتا ہے، اس طرح زکوۃ بھی ادا ہوجائے گی۔ اور قرض بھی وصول ہوجائے گا اور اگر دی ہوئی رقم پانے کے بعد بھی مقروض ادائیگی قرضہ سے بلاوجہ شرعی انکار کرے تو زبردستی بھی چھین کر لے سکتا ہے۔ مگر اپنی دی ہوئی رقم ہونے کے اعتبار سے نہیں، بلکہ اپنا بقیہ قرض ہونے کے اعتبار سے بلاوجہ شرعی ومجبوری کا مطلب ہے کہ مثلاً وہ اور اس کے ننھے بچے فاقہ اور بھوک سے مر رہے تھے اور یہ رقم صرف فاقہ روک سکتی ہے زائد کچھ نہیں بچتا ہے ایسی صورت میں اگر ادائیگی قرض میں کچھ تاخیر کردے فوراً نہ دے تو گنہگار نہ ہوگا اور آپ کو زبردستی چھین لینے کی اجازت نہ ہوگی۔

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۸/۲/۹/۸۵ ۱۳ھ

الجواب صحیح محمود عفی عنہ مفتی دارالعلوم دیوبند

صدقات واجبہ کی رقم سے غریب طلبہ کو کتابیں دینا:

میرے گاؤں میں مکتب اسلامیہ جس میں تعلیم الاسلام کے چار حصے پڑھائے جاتے ہیں اور چاروں حصے انجمن حمایت الاسلام لاہور پاکستان کتاب قرآن شریف پڑھائی جاتی ہے ایک مدرس تنخواہ والا مقرر ہے بچوں سے کسی قسم کی فیس نہیں لی جاتی ہے ایک دو بچہ ایسا غریب ہے جس کو کتابیں دی جاتی ہیں جس کا صرف صدقہ فطر اور چرم قربانی اور زکوۃ کی رقم سے پورا کیا جاتا ہے اگر ایسا نہ کیا جاوے تو چلنا مدرسہ کا مشکل ہے عندالشرع اسمیں یہ فنڈ لگائے جاسکتے ہیں یا کہ نہیں۔

الجواب وبالله التوفيق:

صدقہ فطر، زکوۃ، چرم قربانی کی قیمت سے کسی مدرس کی تنخواہ دینا جائز نہیں ہے، غریب مسلمان بچوں کو کھانا کپڑا ان رقموں سے دے سکتے ہیں جو بچے پڑھتے ہیں ان کے والدین سے کچھ ماہانہ یا ہفتہ وار لے کر بھی تنخواہ دے سکتے ہیں (۲)۔

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۶/۲/۹/۸۵ ۱۳ھ

الجواب صحیح: سید احمد علی سعید مفتی دارالعلوم دیوبند

۱- الدر المختار مع رد المحتار ۳/۱۹۰۔

۲- زکوۃ کی رقم مستحق زکوۃ کو بلاعوض ومنفعت دی جاتی ہے، اجرت میں دینا جائز نہیں، البتہ تعلیم قرآن پر اجرت لینا جائز ہے۔ "قال في الهداية:

اپنی زکوۃ یا فطرہ کی رقم بہو کو دینا:

اپنی زکوۃ یا فطرہ وغیرہ اپنے لڑکے کی بیوی کو بھی دے سکتے ہیں یا کہ نہیں؟

الجواب وباللہ التوفیق:

اگر لڑکے کی بیوی مصرف زکوۃ ہے تو دے سکتے ہیں (۱)،فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور
الجواب صحیح سید احمد علی سعید، مفتی دارالعلوم دیوبند

قرض کا روپیہ زکوۃ یا سود سے منہا کرنا:

ایک شخص نے اپنے پانچ سو روپیہ میں سے کسی دوسرے شخص کو ایک سو روپیہ پندرہ روز کے وعدہ پر دیا، لیکن اس نے دو سال گذر جانے پر بھی واپس نہیں کیا، نہ اس سے کبھی بھی ملنے کی امید ہے۔ اس چار سو روپیہ پر بنک سے ملنے والا سود (۲) چار سو روپیہ میں واجب ہونے والی زکوۃ اس ایک سو روپیہ میں جو دیا گیا ہے کیا محسوب کیا جاسکتا ہے، یعنی سود اور زکوۃ سے یہ ایک سو روپیہ لیا جاسکتا ہے یا نہیں۔

الجواب وباللہ التوفیق:

اگر وہ آدمی غریب زکوۃ لینے کا شرعاً مستحق ہے تو بنک کا سود یا زکوۃ کا روپیہ اس کو دیکر اپنا قرض اس سے وصول کیا جاسکتا ہے، ورنہ نہیں۔ "وحيلة الجواز أن يعطى مديونه الفقير زكاته ثم يأخذها عن دينه" (۲)،فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۲/۱۰/۸۵ ۱۳ھ

وبعض مشايخنا رحمهم الله استحسنوا الاستئجار على تعليم القرآن اليوم لظهور التواني في الأمور الدينية،ففي الإقناع تضييع حفظ القرآن، وعليه الفتوى " اھ (ردالمحتار علی الدرالمختار ۳/ ۷۶) (مرتب)۔

۱- کیونکہ لڑکے کی بیوی اس کے اصول یا فروع میں سے نہیں ہے، ولا يدفع إلى أصله وإن علا وفرعه وإن سفل، كذا في الكافي (فتاوی عالمگیریہ ۱/ ۱۸۸) "ويجوز دفعها لزوجة ابيه وابنه وزوج ابنته" (ردالمحتار علی الدرالمختار ۳/ ۲۹۳) (مرتب)۔

۲- الدرالمختار مع ردالمحتار ۳/ ۱۹۰۔

جواب صحیح ہے، مطلب یہ ہے کہ ایکسو روپیہ جواس کے ذمہ واجب الاداء ہے اس کو زکوۃ یا سود میں محسوب نہیں کیا جاسکتا ہے بلکہ زکوۃ یا سود کا روپیہ اس مستحق کو دیکر اس سے اپنا قرضہ وصول کیا جاسکتا ہے۔

الجواب صحیح: محمود عفی عنہ، سید احمد علی سعید نائب مفتی دارالعلوم دیو بند

جس ادارہ میں باپ نے زکوۃ کی رقم دی ہو اس میں بیٹے کا کھانا اور امداد لینا:

صدقۂ فطر اور زکوۃ کا مال گاؤں کے سب لوگ ایک جگہ ملا کر پھر اسے فقیر اور مساکین کے درمیان تقسیم کر دیتے ہیں اس زکوۃ دینے والوں میں باپ ہوتے ہیں اور اس زکوۃ سے حصہ لینے والوں میں بیٹے ہوتے ہیں تو اس صورت میں باپ کی زکوۃ ادا ہوگی یا نہیں؟ نیز دارالعلوم میں زکوۃ کے روپیہ پیسہ غلہ وغیرہ بھیجنے والا باپ اور دارالعلوم سے جو کھانا اور امداد دی جاتی ہے لینے والا بیٹا بھی ہوتا ہے تو مذکورہ بالا مسئلہ کا کیا حکم ہوگا؟

الجواب وبالله التوفيق:

جب سب گاؤں کے لوگوں کا صدقہ فطر و زکوۃ ایک میں ملا دیتے ہیں پھر "لا علی التمیز" دیتے ہیں تو "الخلط استهلاک" (۱) کے ضابطہ کے ماتحت زکوۃ وصدقہ فطر سب ادا شمار ہوگا، البتہ جب یہ معلوم ہو جائے کہ فلاں کی یہ زکوۃ کی یا صدقہ فطر کی رقم ہے اور یہ رقم اس کے باپ یا بیٹے کو دی جارہی ہے تو یہ زکوۃ وصدقہ فطر ادا نہ ہوگا۔ کیونکہ صدقات واجبہ کا اصول وفروع کو دینا درست نہیں (۲)، اور مدارس میں یہ رقوم جو آتی ہیں اسی اختلاط کے ضابطہ کے مطابق غیر متمیز طریقہ سے جملہ طلباء پر خرچ کی جاتی ہیں، اس لئے یہاں وہ شبہ نہیں ہوگا۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی مفتی دارالعلوم دیو بند سہارنپور

گورنمنٹ سے ملحق مدارس میں زکوۃ دینے کا حکم:

۱- جو مدرسہ گورنمنٹ سے ملحق ہو، خواہ ہمارا مدرسہ دارالعلوم ہو یا مفتاح العلوم ہو، ان مدارس میں صدقہ، فطرہ،

۱- الدر المختار، باب الزکاۃ، مطلب فیما لو صادر السلطان جائز ۲/۲۹۰ (مرتب)۔

۲- "ولا يدفع إلى أصله وإن علا وفرعه وإن سفل كذا في الكافي" (الفتاوی الہندیہ ۱/۱۸۸) (مرتب)۔

زکوٰۃ، چرم قربانی وغیرہ دینا کیسا ہے، جب کہ ہمیں خوف اس بات کا ہے کہ آج نہیں تو کل یہ مدارس ہمارے ہاتھوں سے نکل سکتے ہیں اور گورنمنٹ ان پر قبضہ کرسکتی ہے، بہر حال اس بارے میں مفصل جواب عنایت فرما کر ممنون فرمائیں۔

۲-گورنمنٹ سے جو ایڈ ملتی ہے مدرسین، ملازمین کو اس سے تنخواہ دینا کیسا ہے؟

سوال کرنے کی نوبت یوں آئی کہ میرے استاذ نے ایک واقعہ بیان کیا کہ ایک مفتی صاحب خلیفہ ہارون رشید کے زمانہ میں افتاء کا کام کرتے تھے اور ہارون رشید ان کو کچھ بطور وظیفہ کے دیتے تھے، لہذا اس پر عوام نے فضیل ابن عیاضؒ سے شکایت کی، آپ نے عوام کو تو بہلا کر واپس کر دیا، اس کے بعد فضیل ابن عیاض مفتی صاحب کے پاس گئے، ان سے آپ نے کہا کہ آپ کو معلوم ہے کہ ہارون رشید یہ رقم کہاں سے آپ کو دیتے ہیں؟ تو پھر مفتی صاحب نے توبہ کی اور کہا، آج سے نہیں لوں گا۔ جب یہ معاملہ ہے تو کیسے اس حکومت سے ایڈ لیں، سمجھ میں نہیں آتا، لہذا اس مسئلہ پر غور فرما کر جلد از جلد جواب تحریر فرمائیں تاکہ اس پر عمل کرنے میں کسی قسم کا شک باقی نہ رہے۔

الجواب وباللہ التوفیق:

۱-اگر ان مدارس میں ان رقوم کے مستحقین ومصارف موجود ہوں تو یہ رقوم بلاکراہت ان کو دینا جائز رہے گا، البتہ اگر خوفِ مذکور کا ظن غالب ہو جائے تو الحاق ختم کر دینے کا حکم عائد ہو جائے گا۔

۲-مدرسین کو اس کا لینا جائز ہے اور فضیل ابن عیاض کا جو واقعہ آپ نے نقل کیا ہے تو وہ محتاج سند ہے، اگر تسلیم بھی کر لیا جائے تو بہت سے بہت تقوی ہو سکتا ہے، فتوی نہیں ہو سکتا کہ اس سے استدلال کیا جا سکے اور حکومت جیسی بھی ہو، مگر ہے عوام کی، عوام کا ہر فرد یکساں مستحق ہے اور اس میں مسلمان بھی شامل ہے، حسب حیثیت وہ بھی مستحق ہے اور اسی سے استحقاق ملتا ہے اور لیتا ہے، البتہ عوام میں جو لوگ با اثر وبا اقتدار ہیں، سمجھدار وسلیقہ مند ہیں ان پر ان کی حیثیت کے اعتبار سے اس بات کی سعی لازم ہے کہ دیکھتے رہیں کہ حالات کیسے بن رہے ہیں جس کا ذکر سوال میں ہے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور
الجواب صحیح سید احمد علی سعید مفتی دارالعلوم دیوبند

مدارس عربیہ میں آمدہ رقوم اور ان پر زکوۃ کا شرعی حکم؟

۱-مدارس عربیہ میں صدقاتِ واجبہ اور عطیات کی رقم جو جمع ہوتی ہے، اس پر سال گذرنے کے بعد زکوۃ واجب

ہوگی یا نہیں؟ نیز یہ رقم معطی کی ملک سے خارج ہوتی ہے یا معطی کی ملک شمار ہوتی ہے؟ اس میں تین صورتیں متصور ہوسکتی ہیں:

(الف) معطی کی ملک باقی ہو، جیسا کہ امداد الفتاویٰ میں بھی لکھا ہے، لیکن اس پر مندرجہ ذیل اشکالات ہیں:

۱-حولانِ حول کے بعد عطیات کی رقوم پر زکوٰۃ فرض ہونی چاہیے مگر اس کی ادائے گی کی کیا صورت ہوگی جب کے ان کے مالکوں کا کچھ علم نہیں؟ اس لیے کہ اولاً تو چندہ دینے والوں کی فہرست بہت طویل ہوتی ہے، جن میں سے بیشتر کا پتہ لگانا مشکل ہے، پھر چندہ کی رقم ایک جگہ جمع ہوتی ہے اور حسب موقع خرچ ہوتی رہتی ہے، اس صورت میں یہ معلوم کرنا ناممکن ہے کہ اس میں کس شخص کی کتنی رقم ہے، کسی نے کتنے پچاس برس پہلے رقم دی تو اب تک اس کی بھی شرکت چلی آتی ہے اور آئندہ بھی یہ شرکت جاری رہے گی۔

(ب) چندہ دینے والوں میں سے کسی کا انتقال ہوجائے تو اس کے چندہ کی رقم اس کے ترکہ میں داخل ہوگی، اس لیے اداء وصیت وقرض اور وارثوں کے حقوق اس سے متعلق ہوں گے۔ وارثوں میں مجنون اور نابالغ بھی ہوسکتے ہیں جو اہر وتبرع کے اہل نہیں ہیں، پس اس رقم کو واپس کرنا ضروری ہوگا اور یہ نمبر الف کی وجوہ سے ناممکن ہے۔

۲-مہتمم طلبہ کی طرف سے وکیل ہو، اس میں مندرجہ ذیل قباحتیں ہیں:

۳-طلبہ ان رقوم کے مالک ہوں گے، اس لیے جب وہ چاہیں مہتمم (وکیل) کو برطرف کردیں اور اپنی رقوم کا مطالبہ کردیں۔

۲-اگر کسی طالب علم کا انتقال ہوجائے تو اس کے ورثاء اپنے حق کا مطالبہ کرسکتے ہیں۔

۳-جب مدرسہ میں اتنی رقم جمع ہوجائے کہ ہر طالب علم کا حصہ بقدر نصاب پہنچ جائے تو مہتمم کے لیے اس سے مزید رقم وصول کرنا جائز نہ ہوگا، بلکہ خود طالب علم پر زکوٰۃ فرض ہوجائیگی۔

۴-رقوم چندہ کو بیت المال پر قیاس کرکے یوں کہا جائے کہ یہ معطی کی ملک سے خارج ہوگئی مگر کسی کی ملک میں داخل نہیں ہوگی، لیکن بیت المال میں حاکم کی ولایت جبریہ عامہ ہوتی ہے اور مہتمم کو وکالت اختیاریہ حاصل ہے، اس لیے یہ قیاس مع الفارق معلوم ہوتا ہے، اگر یہ تسلیم کرلیا جائے تو مدِ زکوٰۃ میں تملیک ضروری نہیں رہے گی؟

احتشام الحق سیلاوی (مدرسہ اشرف المدارس ناظم آباد کراچی)

الجواب وباللہ التوفیق:

پیش آمدہ مسئلہ کو احقر اس طرح سمجھے ہوئے ہے کہ مہتممین مدارس نہ تو محض معطیین کے من کل الوجوہ نائب اور وکیل ہوتے ہیں کہ نمبر ایک کی شق پر عائد شدہ اشکالات وارد ہیں، اور نہ یہ مہتممین مدارس محض فی الحال داخل شدہ مستحق طلباء کے وکیل ونائب ہوتے ہیں کہ نمبر ۲ میں درج شدہ اشکالات وارد ہوں اور نہ یہ مہتممین مدارس من کل الوجوہ عمال بیت المال کے مثل ہوتے ہیں، اور نہ مدارس میں داخل شدہ کل رقوم من کل الوجوہ رقوم بیت المال کے حکم میں ہوتی ہے کہ ان پر نمبر ۳ میں درج شدہ اشکالات وارد ہوں، بلکہ صورت کچھ اور ہوتی ہے اور اس کے سمجھنے کے لیے پہلے ان داخل شدہ رقوم کی حیثیت ونوعیت معلوم ومتعین کرلینا ضروری ہے، سو عرض ہے کہ مدارس میں عموماً تین قسم کی رقوم داخل ہوتی ہیں:

۱-رقوم عطیات، ہدایا، وصدقات نافلہ وغیرہ یعنی وہ رقوم واجب التملیک نہیں ہوتیں۔

۲-رقوم زکوۃ ونذر وکفارہ وغیرہ یعنی وہ رقوم جو واجب التملیک ہوتی ہیں۔

۳-وہ رقم جس کو دینے والا کسی خاص کام کے لیے متعین کر کے دیتا ہے، مثلاً کہتا ہے کہ اس رقم سے فلاں کمرہ بنوادینا، یا ٹائل لگوادینا، یا فرش بنوادینا وغیرہ۔

تفصیل حکم رقوم:

۳-یعنی وہ رقم جس کو دینے والا کسی خاص کام کے لیے نامزد کر کے دیتا ہے، مثلاً کوئی خاص کمرہ بنوانے کے لیے وغیرہ وغیرہ تو اس کا حکم یہ ہے کہ اس میں مہتمم مدارس محض معطی کے وکیل ونائب ہوتے ہیں، اور یہ رقم ملک معطی سے خارج نہیں ہوتی بلکہ جب تک یہ رقم موجود رہتی ہے بحکم امانت رہتی ہے اور معطی کو اختیار رہتا ہے کہ جب چاہے اس توکیل کو ختم کردے اور اپنی رقم واپس لے لے اور جب حسب ہدایتِ معطی خرچ ہو جاتی ہے تو ملک معطی پر خرچ ہوتی ہے، غرض اس صورت میں محض معطی مالک رہتا ہے، پس مملوکیت کے تمام احکام (مثلاً حق تصرف للمعطی اور بعد ممات معطی ترکہ ووراثت وغیرہ سب احکام اس پر نافذ ولاگو ہوں گے اور اسی وجہ سے اس قسم کی رقوم کو خلط واستہلاک سے بچانے کے لیے مدارس میں بالکل الگ الگ رکھنا اور ہدایت ومنشاء معطی کے موافق خرچ کرنا لازم رہتا ہے، اور اگر الگ الگ رکھنے میں دشواری ہو تو قرض کی صورت میں منتقل کرالینا ضروری ہوتا ہے، اور خلط واستہلاک کی صورت میں ضمان عائد ہوتا ہے۔

(وهذه الاحكام كلها ظاهرة في الفقه)

تفصیل حکم رقوم:

۲- رقوم نمبر ۲: یعنی رقوم زکوٰۃ وغیرہ جو واجب التملیک ہوتی ہیں ان رقوم میں مہتممین مدارس اور حسب ضابطہ مدرسہ ان کے نواب بھی معطی کے من وجہ وکیل ہوتے ہیں، اس لیے قبضہ مہتمم من کل الوجوہ قبضہ مستحق نہیں ہوگا، اور اسی وجہ سے تملیک طلبہ یا تملیک مستحق زکوٰۃ ضروری رہتی ہے، بغیر اس تملیک کے کسی دوسرے مصرف میں صرف کرنا جائز نہیں رہتا، اور خلط واستہلاک سے بچنے کے لیے ان رقوم کو غیر واجبۃ التملیک رقوم سے مستقل طور پر الگ رکھنا چاہیے، نیز ان رقوم میں یہ لوگ ان طلبہ کے جو فی الحال مدرسہ میں موجود ہیں اور ان طلبہ کے جو آئندہ داخل ہونے والے ہیں، یا ان مستحقین زکوٰۃ کے جو مدرسہ میں فی الحال موجود ہیں اور ان مستحقین زکوٰۃ کے جو آئندہ مدرسہ میں رہنے والے ہوں اگر چہ یہ لوگ مجہول الذات والکمیۃ ہوں، ان سب کے بھی وکیل ونائب ہوتے ہیں اور اس جہت کے اعتبار سے چونکہ حق مستحق بھی متعلق ہو جاتا ہے، اس لیے ان رقوم کو دیدینے کے بعد معطین واپس بھی نہیں لے سکتے اور نہ ان رقوم پر حولانِ حول کے بعد پھر کبھی زکوٰۃ واجب ہوگی، اور نہ مقدار کثیر ہونے پر مزید حاصل کرنے کو ناجائز کہہ سکیں گے، اور نہ کوئی مستحق غنی کہلائے گا اور نہ وہ اشکالات عائد ہوں گے جو سوال میں مذکور ہیں۔

اس جواب کی فی الجملہ تائید حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوری نور اللہ مرقدہٗ کی اس تحریر سے بھی ہوتی ہے، جو (فتاویٰ اشرفیہ موسوم بہ فتاویٰ امدادیہ، ج ۴ ص ۲۱۸) قدیم میں مذکور ہے:

اور وہ یہ ہے کہ عاجز کے نزدیک مدارس کا روپیہ وقف نہیں، مگر اہل مدرسہ مثل عمال بیت المال کے معطین اور آخذین ہر دو کی طرف سے وکلاء ہیں، لہذا نہ اس میں زکوٰۃ واجب ہوگی اور نہ معطین واپس لے سکتے ہیں، انتہی بلفظہٖ

ایک شبہ کا ازالہ:

مستحقین طلبہ میں یہ توسیع وتعمیم اس لیے ہوگی کہ مدارسِ دینیہ عربیہ محض چھ سال یا چھ ماہ کے لیے قائم نہیں کیے جاتے، بلکہ رہتی دنیا تک کے لیے بغرض احیاء دین وعلم دین قائم ہوتے ہیں، **کما هو مقتضاء جميع الاوقاف** (کالمساجد والرباطات وغیرہ اور مدارس میں) ان رقوم کو دینے والے بھی اسی نیت وتصور سے دیتے ہیں، لہذا رہتی دنیا تک کے مستحقین زکوٰۃ فی الجملہ ضمناً وتبعاً متصور ومراد ہو جائیں گے، اور یہ استحقاق ان کے مجہول الذوات والکمیۃ ہونے کے باوجود ان سے متعلق ہو جائے گا، پھر معطین بھی مختلف طرح کے ہوتے ہیں، بعض تو طلبہ پر خرچ کی تشریح کے ساتھ دیتے ہیں اور بعض بغیر اس کے دیتے ہیں، بلکہ بعض تو یہ کہہ کر دیتے ہیں کہ مثلاً یہ زکوٰۃ کا روپیہ ہم مدرسہ کے کام کے لیے دیتے ہیں، اور یہ

جانتے ہوئے دیتے ہیں کہ اس مدرسہ میں فی الحال نادار طلبہ کو کھانا کپڑا نہیں ملتا، پس اس جملہ کی تصریح اور شرعی توجیہ بجز اس کے اور کچھ نہیں ہوسکتی کہ تملیک شرعی کے ذریعہ اس رقم سے مدرسہ کا کام کیا جائے، اور جب مدرسہ میں طلبہ نادار نہ ہوں تو لامحالہ کسی بھی مستحق زکوٰۃ سے تملیک کرا کر کسی مصرف مدرسہ میں رقم صرف ہوسکے گی اور عاقل بالغ کے کلام کا محمل حسن پر مہما امکن حمل کرنا بھی ضروری ہوتا ہے، پس اگر معطی نے یہ کہہ کر دیا کہ یہ رقم ضروریات طلباء پر خرچ کے لیے ہے تو جب تو اس پر تملیک طلباء ملحوظ رہنا ضروری ہوگا، اور اگر مطلقا بلالحاظ تعیین طلبہ دیا ہے تو مدرسہ کے کسی بھی مستحق زکوٰۃ سے بلا تکلف تملیک کرالینا کافی ہوگا، بلکہ ایسی صورت میں اور اگر کسی ملازم مدرسہ کو جو مستحق زکوٰۃ و نادار بھی ہے اور مصلحت شرعی ہو تو اراکین مدرسہ کے مشورہ سے اجرت و تنخواہ قرار دیئے بغیر محض بطور صدقہ کے اس رقم سے اس کی کچھ مدد کردینا بھی جائز رہے گا، اسی لیے مصرف کی ان دونوں شکلوں کا لحاظ رکھتے ہوئے ان کی رقوم کو بھی الگ الگ رکھنا بہتر ہوگا، تاکہ وہ رقوم بوجہ اتم معطی کی ہدایت و منشاء کے مطابق صرف ہوسکیں۔

تفصیل حکم رقوم:

(۱) یعنی رقوم عطیات وغیرہ جو غیر واجب التملیک ہوتی ہیں، ان رقوم کے بارے میں بھی مہتممین مدارس اور ان کے نواب وکیل و نائب ہوتے ہیں، البتہ اس کی نوعیت و احکام میں کچھ فرق ہوتا ہے:

مثلاً رقوم نمبر ۲ (واجب التملیک رقوم) میں تملیک فقراء شرط ہوتی ہے، اور ان رقوم (غیر واجب التملیک رقوم) میں تملیک فقراء شرط نہیں ہوتی ہے، لیکن ارباب حل وعقد کے مشورہ سے خرچ کا جو ضابطہ حدود شرع میں رہتے ہوئے مقرر و متعین ہوتا ہے، صرف اس ضابطہ کے ماتحت خرچ کرنا ضروری رہتا ہے، اور اگر ارباب حل وعقد نہ ہوں یا ہوں، مگر کسی خرچ کے بارہ میں کوئی واضح ضابطہ نہ ملے تو ادارہ کے سابق اہل علم و دیانت و ذمہ داروں کا معمول واجب الاتباع رہتا ہے، اور اگر یہ صورت بھی نہ ہو تو دیگر ایسے ہی مدارس اور اداروں کا معمول دیکھا جائے گا اور اس کی اتباع کی جائے گی، مہتمم یا عملہ مدارس خود رائی نہیں کر سکتے ہیں، **كما هو ظاهر وباهر من فتوى الأكابر۔**

اور مثلاً رقوم ۲ میں مہتممین مدارس اولاً صرف معطیین و آخذین کے وکیل و نائب ہوتے ہیں، پھر بعد تملیک شرعی کے تمام مسلمانوں کے یا ارباب حل وعقد کے وکیل و نائب ہوجاتے ہیں اور رقوم ۱ میں شروع ہی سے تمام مسلمانوں کے یا ارباب حل وعقد کے وکیل و نائب ہوتے ہیں، اس لیے کہ مہتممین ارباب حل وعقد کے انتخاب سے امیر و نائب ہوتا ہے، یا ارباب حل وعقد نہ ہوں تو جس خطہ کا یہ مدرسہ ہے، اس خطہ کے بااثر سمجھ دار ذمہ دار مسلمانوں کا امیر نائب یا نمائندہ ہوتا ہے

اور سلطان کے ایک خاص وصف (انتظام حقوق عامہ) میں سلطان کے قائم مقام ہو جاتا ہے، اس لیے کہ جب ارباب حل وعقد کے اتفاق سے یا تراضی مسلمین سے اس منصب سے سلطان وابستہ ہے کما ھو مبرھن فی مقامہ تو پھر اس کے قائم مقام کا نصب کیوں نہ ان سے وابستہ ہوگا، ضرور ہوگا۔

ایک شبہ کا ازالہ:

اور قوت قہریہ کے فقدان سے اس نیابت کے اقامت وتحقیق میں شبہ نہ کیا جائے، اس لیے کہ سلطان میں دو وصف ہوتے ہیں: ایک وصف (حکومت وسلطنت) جس کا ثمرہ سدثغور وتنفیذ حدود وقصاص وغیرہ اعمال ہیں اور اس میں قوت قہریہ شرط ہے، اس میں تو کوئی بغیر اس قوت کے قائم مقام نہیں ہو سکتا ہے۔

دوسرا وصف وہ محض انتظام حقوق عامہ ہے جس کے لیے قوت قہریہ شرط نہیں ہوتی، اس وصف میں بغیر قوت قہریہ کے بھی نیابت ہو سکتی ہے، (ھکذا فی امداد الفتاویٰ (ص ۱۲۲ ج ۴ قدیم)) اور یہ مالی انتظام مدارس اسی قبیل سے ہے، جو بغیر قوت قہریہ کے بھی محض آپس کی مصالحت ورضامندی سے بھی قائم ودرست ہو سکتا ہے، لہذا قوت قہریہ کے فقدان سے اس نیابت (مالی انتظام مدارس) کے اقامت وتحقق میں فتور واقع نہ ہوگا، چنانچہ اقامتِ جمعہ واعیاد کے انتظام میں یہ نیابت امیر تسلیم ورائج ہے اور اسی پر وجوب جمعہ واعیاد وغیرہ ہمارے مسلک میں دائر ہے اور ان کے تحقق واقامت میں کوئی فتور واقع نہیں ہوگا، پھر جب یہ انتظام حقوق عامہ دنیوی امور سے بھی متعلق ہو سکتا ہے اور اس کے درست ومنتظم رکھنے میں یہ نیابت سلطان جائز ہو سکتی ہے، تو مالی امداد وانتظام مدارس کے لیے جو خالص امر دینی ہے درست ومنتظم رکھنے کے لیے (یعنی احیاء دین واحیاء علم دین اور اس کے ابقاء وتحفظ کے لیے) ہے، اور جو سب سے مقدم فریضہ ہے اور اہم الواجبات میں سے ہے اس میں یہ نیابت کیوں جائز ودرست نہ ہوگی، بدرجہ اولیٰ جائز ودرست ہوگی، بالخصوص جب کہ یہ مالی انتظام مدارس ملاک اور مستحقین کی رضا ورغبت سے بھی ہوگا اور جب مہتمم مدرسہ سلطان کے وصف ثانی (انتظام حقوق عامہ) میں سلطان کا قائم مقام ہوگا تو عملہ مدرسہ، عمال بیت المال کے مثل ہوں گے، اور یہ رقوم قسم ثانی کی (رقوم غیر واجب التملیک) جب برضاء ورغبت من جانب ملاک داخل ہو جائیں گی تو یہ رقوم اموال بیت المال کے مثل ہو جائیں گی، اور اگر چہ یہ رقوم وقف شمار نہیں ہوں گی، مگر بحق مدرسہ محبوس ضرور ہو جائیں گی، اس لیے کہ بغیر اس جنس کے یہ انتظام امر دینی فی زمانہ قائم ومنظم نہیں ہو سکتا، حالانکہ اس کا قائم ومنتظم رکھنا سب پر حسب استطاعت واجب ہے، اور واجب کا ذریعہ بھی واجب ہوتا ہے، اس لیے یہ جنس بھی واجب ہوگا، اور چونکہ رہتی دنیا تک کے لیے یہ نظم قائم ومنتظم ہوتا ہے جیسا کہ ہم پہلے (نمبر ۲ کے جواب میں) کہہ آئے ہیں، اس لیے

ان کوواپس لینے کا بھی حق کسی کو حاصل نہ ہوگا، خود معطیین کو بھی حق نہ ہوگا، اس لیے کہ اس سے جس واجب میں جو مقصود اولی ہے فتور واقع ہوجانے کا ظن غالب متصور ہے۔

اسی طرح ان رقوم کی فی الحال مقدار کثیر جمع ہوجانے کے بعد مزید رقوم کا استحصال بھی ممنوع نہ ہوگا۔

اس لیے کہ جب یہ نظم رہتی دنیا تک کے لیے واجب ہے تو آئندہ ان رقوم کثیر کے مصرف کا وجود بھی بظن غالب مظنون ہے، اسی طرح حولان حول پر ان رقوم میں زکوٰۃ بھی واجب نہ ہوگی، اس لیے کہ بیت المال کی رقوم کا یہی حکم ہے، نیز اس لیے کہ اس حبس دائمی کی وجہ سے ملاک کا تصرف مالکانہ منقطع ہوجاتا ہے اور ادائے گی زکوٰۃ کا حکم اسی تصرف مالکانہ کے قبیل سے ہے، لہٰذا وہ بھی منقطع ہوجائے گا، اسی طرح ولایت عامہ جبریہ سے بھی اشکال نہ ہوگا، کیونکہ ولایت عامہ جبریہ سلطان کے وصف اول یعنی حکومت وسلطنت (جس کا ثمرہ سدثغو روقوۃ تنفیذ وغیرہ ہوتا ہے) سے متعلق ہے اور یہ نیابت (مالی انتظام مدارس) محض وصف ثانی انتظام حقوق عامہ سے متعلق ہے، اور یہ دو الگ الگ چیزیں ہیں، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

زکوٰۃ کا مصرف:

۱-زکوٰۃ کا صحیح مصرف کیا ہے؟

ادائیگی زکوۃ کے لئے تملیک شرط ہے:

۲-زکوۃ کے مستحقین کو زکوٰۃ کی رقم یا دیگر اشیاء کا مالک بنادینا زکوٰۃ کی شرطوں میں سے ہے یا نہیں؟

انجمن یا سوسائٹی پر زکوۃ کی رقم خرچ کرنا:

۳-زکوٰۃ کی رقم کسی انجمن یا سوسائٹی پر خرچ کی جاسکتی ہے یا نہیں؟ جب کہ وہ انجمن یا سوسائٹی ہر مسلمان کی فلاح وبہبود کے لیے بنائی گئی ہے۔

اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ شاہ قطب مصریؒ کے بھائی سید محمد قطب کی تصنیف ''شبہات حول الاسلام'' کا جو اردو ترجمہ کیا گیا ہے، اس کی عبارت نقل کی جارہی ہے:

اسلام نے اپنے ابتدائی دور میں اس وقت کے مخصوص حالات کے پیش نظر مستحق لوگوں کو خود جاکر نقد یا جنس کی صورت میں زکوۃ وصول کرنے کو روا رکھا تھا۔

مگر یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ اسلام کے نزدیک زکوٰۃ کی تقسیم کا یہی واحد طریقہ ہے کہ مستحقین خود جا کر زکوٰۃ وصول کرتے پھریں اور کوئی دوسرا طریقہ نہیں اختیار کیا جاسکتا، اسلامی قانون میں کوئی ایسی چیز موجود نہیں ہے جس سے ایسا نتیجہ نکالا جاسکے، اسلام زکوٰۃ کے روپیہ سے عوامی بہبود کے ادارے مثلاً اسکول، اسپتال قائم کرنے سے نہیں روکتا اور نہ اس کو اس کے روپیہ سے امداد باہمی، انجمنوں اور کارخانوں کی تعمیر پر ہی کوئی اعتراض ہوسکتا ہے، بالفاظ دیگر زکوٰۃ کی رقم سماجی بہبود کے سارے مفید کاموں پر صرف کی جاسکتی ہے۔

زکوٰۃ کے مال سے نقد امداد صرف بیماروں، بوڑھوں اور بچوں کو دی جاتی ہے، لیکن دوسرے تمام لوگوں کی امداد ان کے لئے روزگار فراہم کرنے یا ان کی بھلائی کے کسی منصوبے کی تکمیل کی صورت میں ہوسکتی ہے، کیونکہ اسلامی معاشرہ ایک ایسا معاشرہ ہے جس میں محض زکوٰۃ پر گزارا کرنے والے کسی غریب طبقہ کا کوئی مستقل وجود نہیں پایا جاتا، اسی طرح زکوٰۃ اسلامی ریاست کو بھی مختلف اجتماعی منصوبوں اور اسکیموں کی تکمیل کے لئے دی جاسکتی ہے۔

اسپتال اور اسکول پر زکوٰۃ کی رقم صرف کی جاسکتی ہے یا نہیں؟

مولوی لال محمد قاسمی (سلطنت عمان)

الجواب وبالله التوفيق؟

۱،۲-نماز، روزہ اور حج کی طرح زکوٰۃ بھی عبادت ہے، صاحب نصاب پر زکوٰۃ کی ادائیگی فرض ہے، "الزكاة واجبة على الحر العاقل البالغ المسلم إذا ملك نصابا تاما وحال عليه الحول" (۱)۔

اللہ تعالیٰ نے اس کے مستحقین کو خود بنص صریح منصوص فرمایا ہے اور صیغۂ حصر کے ساتھ بتلادیا ہے ارشاد ہے:

"إنما الصدقات للفقراء والمساكين والعاملين عليها والمؤلفة قلوبهم وفي الرقاب والغارمين وفي سبيل الله وابن السبيل فريضة من الله ان الله عليم حكيم" (۲) صیغۂ حصر: "إنما الصدقات للفقراء" کا مفہوم یہی ہے کہ "ليست الصدقات إلا للفقراء والمساكين" الخ اور لام تملیک کا ہے، یعنی ادائے گی زکوۃ وصدقات نہیں درست ہوگی مگر ان ہی مذکورین کو دے کر مالک بنانے سے ادا ہوگی کسی اور کے دینے سے

۱- ہدایہ ۱/۱۸۵۔

۲- سورۂ توبہ: ۶۰۔

ادا نہ ہوگی اور اگر لام استحقاق کے لیے لیا جائے تو مطلب یہ ہوگا کہ زکوٰۃ وصدقاتِ واجبہ کے مستحق صرف یہی مذکورین ہیں ان کے علاوہ کوئی دوسرا مستحق نہیں ہے، کسی اور کو دے دینا یا کسی اور جگہ خرچ کر دینا، غیر مستحق کو دے دینا اور غیر مستحق پر خرچ کر دینا ہوگا، جو حکم خداوندی کی خلاف ورزی ہوگی، ذمہ سے بری نہ ہوگا، معتبر کتب تفسیر میں اس آیت کا یہی مفہوم بیان کیا گیا ہے۔

اور اگر لام کو انتفاع کے لئے جائے جب بھی یہی مفہوم ہوگا کہ زکوٰۃ وصدقات واجبہ صرف ان ہی مذکورین کی نفع رسانی کے لئے ہیں اور اگر ان کی نفع رسانی کے بجائے اور ان کی نفع رسانی کر دی گئی یا کسی اور جگہ خرچ کر دیئے گئے تو حکم خداوندی کی تعمیل نہ ہوگی بلکہ حکم خداوندی کی نافرمانی اور مخالفت ہوگی کسی اور کی نفع رسانی مقصود ہو یا کسی اور کام میں خرچ کی ضرورت ہو تو زکوٰۃ وصدقات واجبہ کے علاوہ اپنے دوسرے اموال سے نفع پہونچاؤ اور دوسرے اموال جو اللہ تعالیٰ نے تمہیں دے رکھے ہیں ان سے خرچ کرو چنانچہ علامہ شوکانی رحمۃ اللہ علیہ اپنی مشہور تفسیر "فتح القدیر" میں فرماتے ہیں: "إنما من صيغ القصر وتعريف الصدقات للجنس أي جنس هذه الصدقات مقصور على هذه الأصناف المذكورة لايتجاوزها، بل هي لهم لالغيرهم" (۱)۔

کلمہ انما حصر کے صیغوں میں سے ہے اور لفظ الصدقات کا معرف بلام لانا جنس کے لئے یعنی ان تمام صدقات واجبہ کی پوری جنس مقصود ومحصور ہے صرف ان مذکورہ صیغوں پر ان سے متجاوز نہیں ہوسکتی۔

بلکہ یہ صدقات واجبہ صرف ان مذکورین کے لئے ہیں ان کے علاوہ کسی اور کے لئے نہیں ہیں اور جب لام تملیک کا ہے تو ان مذکورین کو مالک بنا دینا لازم ہوگا یہ مالک ہو کر پھر جہاں چاہیں اور جس مصرف میں چاہیں صرف کر سکتے ہیں۔

ان ہی وجوہ کی بنا پر علماء احناف تملیک مستحق صحت ادا کے لئے شرط قرار دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ بغیر تملیک مستحق کے ادائیگی صحیح نہ ہوگی اور ذمہ بری نہ ہوگا (۲)۔

مذکورہ بالا تحقیق سے معلوم ہوگیا کہ انجمن یا سوسائٹی پر خود ارباب اموال ان صدقاتِ واجبہ کو خرچ نہیں کر سکتے کیونکہ تملیک مستحق نہ ہوگی ہاں یہ مستحقین مالک ہو جانے کے بعد پھر خود اپنی ہی مرضی سے ان انجمنوں، سوسائٹیوں کے لئے دیدیں تو خرچ کر سکتے ہیں ذخیرۂ حدیث سے بھی ان مذکورہ بالا مفہوم ومقصود کی تائید وتصویب ملتی ہے اور آیت کریمہ میں کوئی ایسا اشارہ نہیں ملتا کہ اسلام نے اپنے ابتدائی دور میں اس وقت کے مخصوص حالات کے پیش نظر یہ وقتی حکم دیا ہو۔

۱- تفسیر فتح القدیر للشوکانی ۲/۵۲۱، طبع دار الحدیث القاہرہ) (مرتب)۔

۲- "هي تمليك جزء مال فلو أطعم يتيماً ناويا الزكوة لايجزيه" (جزء مال عینہ الشارع من مسلم فقیر) (الدر المختار مع الشامی ص ۲ کتاب الزکوۃ)۔

پس شاہ قطب رحمۃ اللہ علیہ کے بھائی محمد قطب کے مضمون کا بھی حال معلوم ہوگیا کہ وہ ان کی ذاتی رائے ہے جو جمہور مفسرین ومحدثین وفقہاء کی رائے کے خلاف ہے جمہور محدثین وفقہاء بھی عوامی بہبود کے اداروں وقائم کرنے سے نہیں روکتے بلکہ وہ قائم کرنے کا حکم دیتے ہیں، بلکہ حسب موقع ضروری قرار دیتے ہیں، البتہ طریق کار کی تصحیح کردینا چاہتے ہیں تاکہ حدود شرع سے تجاوز نہ ہو پس اگر حکومت ان کاموں کو جو عوامی فلاح وبہبود کے لئے ہوں کرے تو وہ بھی باقاعدہ شرع کے مطابق کرے اور اگر عوام کرنا چاہیں تو وہ بھی حدود شرع کے مطابق کریں پس اگر عوام خود کرنا چاہیں تو صدقاتِ نافلہ سے ان کاموں کو کریں اور اگر حالات ناگزیر ہو جائیں اور صدقاتِ واجبہ کے استعمال کے بغیر چارہ نہ رہے تو اس طرح کریں کہ رقوم پر تملیک مستحق آجائے یا تملیک مستحق کے بعد کریں مثلاً مستحق اس کا مالک ہو کر پھر ان ہی کام کرنے والوں کو بطور عطیہ ان کاموں کے لئے دے دے یا ان کا وکیل بنادے وغیرہ (۱)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

زکوۃ کی رقم نسواں اسکول پر خرچ کرنا:

زکوۃ کا پیسہ نسواں اسکول پر خرچ کرنا درست ہے یا نہیں۔

الجواب وباللہ التوفیق:

۱-جو لڑکیاں غریب و نادار مستحق زکوۃ ہوں ان کے کھانے کپڑے پر خرچ کرنا درست ہے اور اس کے علاوہ تنخواہ ملازمین پر تملیک مستحق سے قبل خرچ کرنا درست نہیں، **"انما الصدقات للفقراء والمساكين والعاملين عليها والمؤلفة قلوبهم الخ"**(۲)، **"أن الحيلة أن يتصدق على الفقير، ثم يأمر بفعل هذه الأشياء"** (۳)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۴/ ۴/ ۱۴۰۴ھ

۱- "وقلنا أن الحلية أن يتصدق على الفقير ثم يأمره بفعل هذه الأشياء" (شامی ۲/ ۶۳ کتاب الزکوۃ) (مرتب)۔

۲- سورۂ توبہ:۶۰۔

۳- شامی ۲/ ۸۶، عثمانیہ۔

باب العشر

ہندوستان کی زمین اس وقت عشری ہیں یا خراجی؟

ہندوستان کی زمینیں عشری ہیں یا خراجی؟ بعض حضرات اس کے قائل ہیں کہ ہندوستان کی زمینیں موجودہ دور میں نہ عشری ہیں اور نہ خراجی، آیا کہ یہ قول صحیح ہے یا نہیں بصورت صحت تحریر فرمائیں کہ وہ کونسی بنیادیں ہیں جن کے سبب آج ہندوستان کی زمینوں کو عشری اور خراجی ہونے سے خارج کر دیا گیا ہے، جبکہ بڑے بڑے سے پہلے فتاویٰ میں ہندوستان کی زمینوں کے عشری ہونے کا حکم متعدد علماء ومفتیان کرام سے موجود ہے، مثلاً مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی، مفتی کفایت اللہ صاحب ومفتیان دارالعلوم دیوبند، مزید برآں عشر وزکوٰۃ کی فرضیت مطلقاً قرآن وحدیث وفقہاء حنفیہ سے ثابت ہے جس میں دارالحرب ودارالاسلام کا کوئی فرق نہیں ہے۔

ہندوستان کی وہ زمینیں جنہیں سیر دھری یا کاشتکاری کہا جاتا ہے، جن میں ہندوستانی قانون کے مطابق خرید وفروخت، تعمیر، گڈھا کنواں وغیرہ کھدوانا ممنوع ہے، بیس گنا جمع کرنے کے بعد مکمل تصرفات کے اختیارات حاصل ہوجاتے ہیں، ان کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ کیا وہ میراث میں داخل ہو کر شرعی طور پر تقسیم ہوں گی یا کیا حکم ہوگا؟ کیا صاحب زمین کے انتقال کے بعد وہ ترکہ ہو کر وارثوں کا حق بن جائیں گی، جبکہ حکومت ہند ان میں وراثت جاری کرتی ہے، لیکن بھومیدھر زمین وسیر دھر زمین کے وارثوں میں فرق کیا گیا ہے، مثلاً سیر دھری لڑکی نہیں پاسکتی، بلکہ صرف لڑکے اس کے مستحق ہوتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔

الجواب وباللہ التوفیق:

خاتمہ زمینداری میں جن زمینوں کو حکومت نے اپنے قبضہ تصرف میں لے لیا اور ملکیت مالکان کو ختم کر دیا وہ مالکوں کی ملک سے نکل کر حکومت کی ملک میں داخل ہوگئیں، اور وہ زمین چاہے پہلے عشری رہی ہوں، لیکن اب عشری باقی نہیں ہیں،

اس لئے کہ عشریت باقی رہنے کے لئے شرط ہے کہ زمین کبھی ملکیت غیر مسلم میں نہ جائیں، پھران زمینوں میں جس زمین کو حکومت نے بیس گناوغیر لیکراپنے قاعدہ وضابطہ کے تحت قابضین کی ملک میں دے دیا اوراس پران کوحق مالکان دے دیا اس زمین کے وہ قابضین مالک ہوگئے، ان میں وراثت حسب تخریج شرعی جاری ہوگی اور یہ زمینیں خراجی ہوں گی، جبکہ خراجی زمین میں عشرواجب نہیں ہے، اور جن زمینوں پرحق مالکانہ نہیں دیا وہ ملک حکومت میں باقی رہیں ان کوحکومت جس کوجس طرح چاہے دے اس کے اختیار میں ہے، اس میں وراثت شرعی جاری نہ ہوگی ،اس کی مثال سیر دھری کی زمینیں ہیں اور یہ زمینیں نہ خراجی ہیں اور نہ عشری، بلکہ اراضی محوزہ سلطانیہ کے درجہ میں ہیں، اور ان زمینوں کی پیداوار میں سے عشر نکالنا ضروری نہ رہے گا اور جن زمینوں کا زمیندار نہیں ٹوٹا اور حکومت نے ان کو اپنے قبضۂ تصرف میں نہیں لیا، جیسے باغ مالکان اور مکان کی زمینیں اگر یہ عشری ہیں اور خاتمۂ زمیندار کے قانون سے مستثنٰی ہیں تو یہ عشری شمار ہوں گی اور ان کی پیداوار پر عشر واجب ہوگا، نیز جن زمینوں کی عشریت خاتمہ زمیندارہ قانون سے ختم ہوگئی ان سے محض وجوب ساقط ہوا ہے، لیکن احتیاط اس میں ہے کہ بغرض حصول خیر وبرکت جہاں تک ہوسکے عشرو نصف عشر نکالتے رہا جائے۔اس قسم کے مباحث ''باب الرکاز'' (۱) اور ''باب العشر والخراج'' (۲) میں بھی کافی مل جائیں گے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

زمین کی زکوۃ کا شرعی حکم:

اگر کوئی شخص ہندوستان میں کاشت کی زمین کی ہی خرید وفروخت کا کاروبار کرنے لگے تو اس پر زکوۃ واجب ہوگی یا نہیں؟ اگر زکوۃ واجب ہوگی تو اس کی کیا صورت ہوگی؟ نیز اس صورت میں اس کی پیداوار پر زکوۃ واجب ہونے نہ ہونے کا کیا حکم رہے گا؟

الجواب وباللہ التوفیق:

جب زمین ہی کے خرید وفروخت کا کاروبار کرے گا تو یہ زمین سامانِ تجارت میں شمار ہوگی حکماً مالِ نامی قرار پائے گی اور مال نامی کا حکم اس پر جاری ہوجائے گا اور وہ حکم یہ ہے کہ اس زمین کی قیمت جب مقدارِ نصاب کے برابر ہوجائے

۱- شامی ۲/۲۔
۲- شامی ۳/۲۔

اور سال بھر مقدار نصاب باقی رہے تو اس کی کل قیمت کا چالیسواں حصہ زکوٰۃ اموال کے ضابطوں کے مطابق زکوٰۃ نکالنا ہوگا اور جب خود زمین کی تجارت نہ کرے گا تو اس کی پیداوار پر حکم جاری ہوگا کہ وہ زمین عشری ہو اور بارش کے پانی سے پیداوار ہو تو کل پیداوار کا دسواں حصہ، ورنہ بیسواں حصہ نکالا جائے، "**عن سالم بن عبدالله بن أبيه عن النبي ﷺ قال فيما سقت السماء والعيون أوعشريا العشر وماسقي بالنضح نصف العشر**"(۱)، اور اس کے مستحق صرف غرباء اور مساکین ہوں گے اور ان کے علاوہ کسی اور کام میں جیسے مساجد وغیرہ میں بھی دینا درست نہ ہوگا، "**ويشترط أن يكون الصرف تمليكا لا اباحة لا يصرف إلى بناء نحو مسجد ولا إلى كفن ميت وقضاء دينه**" (۲)، اور اگر وہ زمین نہ عشری ہو نہ خراجی، جیسا کہ آج کل خاتمۂ زمیندارہ کے بعد ہندوستان کی زمین کہ یہ سب اراضی محوزہ سلطانیہ کے قبیل کی ہوگی ان میں عشر کچھ بھی نکالنا واجب نہیں، البتہ زیادہ سے زیادہ جتنا ہو سکے بطور صدقہ نافلہ نکالتا رہے کہ یہ باعث خیر وبرکت رہے گا اور اس کی رقم کو مسجد میں وغرباء، تجہیز وتکفین اور ہر نیک مصرف میں صرف کرنا جائز ودرست رہے گا، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۷/۶/۱۴۱۱ھ

ہندوستان کی زمینیں عشری ہیں یا خراجی:

آراضی ہندوستان نہ عشری ہیں نہ خراجی معلوم یہ کرنا ہے۔

الف: کون سی زمین کل یا بعض، آزادی سے قبل جو اسلامی دور رہا ہے اور موروثی زمینیں بھی جو ترکہ میں ملتی آرہی ہیں وہ یا (ب) غیر مسلم سے خریدی ہوئی یا مسلمان سے بھی خریدی ہوئی۔

کیا زمین کی تمام پیداوار میں عشر ہے؟

(ج) عشر دسواں نصف عشر بیسواں بارانی غیر بارانی مختلف پیداوار پر جو کہ سال میں تین فصلوں میں چار یا پانچ قسم کی پیداوار ہے ایک بار یا ہر فصل میں، جب عشر ہے تو کیا تمام پیداوار پر خواہ گھر کے کھانے کے لئے کی گئی ہے یا جو برائے فروخت ہو اس میں دی جائے گی پھر عشر کی کیا رہی یا زکوۃ کی عشر اور زکوۃ ایک معلوم کریں (اصل میں اسی طرح ہے جملے غیر

۱- صحیح بخاری ۱/۲۰۰۔

۲- الدرالمختار ۳/۲۹۱۔

واضح ہیں) یا عشر الگ نوع ہے اور زکوۃ الگ نوع۔

کن فصلوں میں عشر واجب ہے اور کتنا؟

(۲) اگر عشر یا زکوۃ پیداوار پر ہے تو مصرف کا طریقہ اور صاحب مصرف کی تفصیل معلوم کریں عشر یا زکوۃ کی مقدار کتنی ہے معلوم کریں اور کن کن فصلوں میں کتنی ہے۔ کپاس، مونگ پھلی، گیہوں، جوار، مکا، مرچی، تلی، رائی۔

عشر یا زکوۃ تمام پیداوار پر ہے یا تمام مصارف کو علیحدہ کر کے مثلاً تخم ملنا بونا صفائی پانی دینا (یا غیر پانی) اور دیگر اخراجات کے جو خرچ ہوئے وہ فصل سے خرچ نکال کر تفصیل سے معلوم کریں، تا کہ ہم کو پریشانی نہ ہو۔

احمد علی و محمد علی (پر فیومری سٹیمار و ڈپوسٹ کھر گون - ایم، پی)

الجواب وبالله التوفيق:

(الف، ب، ج) جن مقامات کی زمینداری توڑ کر حکومت نے اراضیات کا شت کو اپنی ملک قرار دے کر پھر اپنے قانون کے مطابق لوگوں میں زمین تقسیم کی کسی کو بھومیدار کسی کو بنا دیا وہ زمین نہ تو عشری باقی رہی نہ خراجی، بلکہ وہ اراضی اراضیات محوزی سلطانیہ میں داخل ہو گئیں، باقی چونکہ یہ حالات اپنے ہی بداعمالیوں کی نحوست سے پیش آتے ہیں، اس لئے جہاں تک ہو سکے دسواں یا بیسواں حصہ بطور صدقہ نکالتا رہے کہ یہ موجب خیر و برکت رہے گا۔

عشری زمین وہ کہلاتی ہے جس کے باشندے خود مسلمان ہو گئے یا مسلمان بادشاہ نے جہاد کر کے فتح کیا، اور مسلمانوں پر تقسیم کیا اور عرب کی ساری زمین عشری کہلاتی ہے بشرطیکہ وہ ہمیشہ مسلمانوں کے ملک میں رہے اور جو زمین ایسی نہ ہو اور نہ حکومت نے اپنی یا اپنے بیت المال کی زمین اس کو قرار دیا ہو وہ خراجی کہلاتی ہے اور جس زمین کو حکومت نے اپنی ملک یا اپنے بیت المال کی ملک قرار دے لیا ہے اراضی محوزی سلطانیہ کہلاتی ہے (۱)۔

۱- (درمختار مع رد المحتار ج۲) (أرض العرب وهي من حد الشام والكوفة إلى أقصى اليمن، وما أسلم أهله طوعاً أو فتح عنوة وقسم بين جيشنا والبصرة أيضاً بإجماع الصحابة عشرية ...... وما فتح عنوة ولم يقسم بين جيشنا إلا مكة سواء أقر أهله عليه أو نقل إليه كفار آخر أو فتح صلحاً خراجية ...... وفي الفتح: المأخوذ الآن من أراضي مصر أجرة لا خراج (درمختار ۶/۲۸۹ تا ۲۹۴) اس کے تحت علامہ شامی لکھتے ہیں: قلت: وهذا نوع ثالث: يعني لا عشرية ولا خراجية من الأراضي التي تسمى أرض المملكة وأراضي الحوز، وهو من مات أربابه بلا وارث وآل لبيت المال، أو فتح عنوة وأبقي للمسلمين إلى يوم القيامة (رد المحتار مع درالمختار ۶/ ۲۹۴)۔

(۲)عشر تو تمام پیداوار پر عائد ہوتا ہے خرچ وغیرہ نکالے بغیر عائد ہوتا ہے،"**وآتوا حقه يوم حصاده**"(۱) کے حکم سے اور زکوۃ کا وجوب صرف اموال تجارت میں اور زیوارت اور نقدین میں اسوقت ہوتا ہے جب اپنی روزمرہ کی ضروریات سے فاضل ہو اور ساڑھے باون تولہ چاندی یا اس کی قیمت کے نوٹوں سے فاضل رہ کر سال بھر فاضل رہے ورنہ زکوۃ واجب نہیں ہوتی (۲)، اور عشر ہر قسم کی پیداوار پر اور جملہ پیداوار پر واجب ہوتا ہے (۳)۔

برساتی پانی سے ہونے والی پیداوار پر کل پیداوار کا دسواں حصہ دینا ہوتا ہے ورنہ بیسواں حصہ دینا ہوتا ہے اور جن مالوں میں زکوۃ واجب ہوتی ہے اور اس میں خرچ اخراجات نکالکر سال بھر فاضل رہنے والے مال کا صرف چالیسواں حصہ دینا ہوتا ہے (۴)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۴۰۱/۱/۱۹ھ

مالگذاری دینے کی وجہ سے عشر ساقط نہیں ہوگا، غلہ کی رقم پر زکوۃ:

جس زمین کا خراج مالگذاری دینا پڑتا ہے اس زمین پر عشر ہے یا کہ نہیں ہے اور اگر ہے تو عشر جمیع پیداوار سے نکالا جائے گا یا یہ کہ پہلے مالگذاری پیداوار سے وضع کر لی جائے اس کے بعد باقی ماندہ غلہ میں عشر نکالا جائے جو صورت بھی ہو اچھی طرح واضح فرمایں اکثر علماء کی مختلف بات سن کر مضطرب ہیں ساتھ ہی اس کا انکشاف فرماویں عشر نکالا غلہ فروخت کیا گیا اس کی قیمت مقدار نصاب کو پہنچ جاتی ہے اس پر حولان حول بھی اس قیمت پر جو عشر کے غلہ کو بیچ کر حاصل ہوئی ہے زکوۃ ہوگی یا کہ نہیں جبکہ شرائط وجوب زکوۃ بھی موجود ہیں یا یہ کہ عشر نکالنے کی وجہ سے وہ غلہ کی زکوۃ ساقط ہو جائے گی۔

۱- سورہ انعام: ۱۴۱۔

۲- "وشرط كمال النصاب ولو سائمة في طرفي الحول في الابتداء للانعقاد وفي الانتهاء للوجوب، فلا يضر نقصانه بينهما، فلو هلک كله بطل الحول" (درمختار مع ردالمحتار ۳/ ۲۳۳)۔

۳- "قال أبوحنيفةؒ في قليل ما أخرجه الأرض، وكثيره العشر سواء سقي سيحاً أو سقته السماء إلا القصب والحطب والحشيش..." الخ (ہدایہ ۱/ ۱۸۱) (مرتب)۔

۴- "ونصفه في مسقى غرب ودالية أي يجب نصف العشر في سقي بآلة" (البحرالرائق ۲/ ۴۱۶)۔

الجواب وباللہ التوفیق:

اس کا جواب نمبر ۱ میں گذر چکا ہے اب محض نفس مسئلہ کی تحقیق کے طور پر تبرعاً لکھ دیا جاتا ہے کہ جس زمین کا عشری ہونا یقین کے ساتھ معلوم ہے اس کا عشر پوری پیداوار سے نکال دیا جائے گا۔

سرکاری مالگزاری وضع نہ ہوگی مالگزاری دینے سے نہ تو عشر ساقط ہوتا ہے اور نہ کم اور عشر کے غلہ سے حاصل کردہ رقم پر زکوۃ واجب نہیں ہوتی ہے، خواہ وہ کتنی بھی ہو بلکہ جو مصرف خود عشر کے غلہ وآمدنی کا تھا وہی اس کے حاصل شدہ قیمت ورقم کا بھی ہوگا (۱)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

ہندوستانی اراضی عشری ہیں یا نہیں؟

جب علماء کا متفقہ فیصلہ یا اجماع آراضی ہند کے عشر پر نہیں ہوسکا علماء کا اختلاف ہنوز باقی ہے، علماء کی ایک جماعت آراضی ہند کے عشری اور دوسری غیر عشری کے قائل ہوئی اب اس حالت میں کوئی شخص علماء کی پہلی جماعت کو مقتدا بنا کر اپنے غلوں کا عشر نکالتا ہے تو ایک واجب کی ادائیگی سے سبکدوش ہوتا ہے اور آخرت کے مواخذہ سے چھٹکارا پاتا ہے اور اگر جماعت ثانی کے علماء کو مقتدا بناتا ہے تو اس وقت عشر کا نکالنا از قبیل من واحسان ہوا اس پر ضروری نہیں تھا اب سوال یہ ہے کہ یہاں اگر کوئی شخص اپنی پیداوار کا عشر نہ نکالے تو کیا وہ گنہگار ہوگا یا اس سے تارک واجب کہا جائے گا یا اگر کوئی عشر نکالنے سے انکار کر جائے حیلہ بہانہ کرے تو اس پر نکیر کرنا اس کو مورد طعن وتشنیع بنانا روا ہوگا یا امر تعبدی کے جو دو پر شریعت نے جو سزا مقرر کی ہے اس کا وہ سزاوار ہوگا اس مسئلہ کی ایک کڑی اور ہے اور اس پر بھی روشنی ڈالیں جب عشری زمین کا پیدا شدہ غلہ بدون اخراج عشر پاک وحلال نہیں ہوتا ہے چنانچہ حضرت مولانا عبدالشکور صاحب لکھنوی نے اپنی کتاب ''علم الفقہ'' میں اس کی تصریح کی ہے کہ عشری زمین کا غلہ بدون عشر پاک نہیں ہوتا ہے اس کا کھانا درست نہیں ہے کیا یہی حکم اراضی ہند کی پیداوار میں ہوگا اور جو لوگ یہاں عشر نہیں نکالتے ہیں، ان کے یہاں کھانے پینے سے کلی اجتناب کیا جائے گا یا کچھ اور اپنی بساط بھر مسئلہ کی وضاحت فرماویں۔

۱- ''ویجب فی مسقی سماء أی مطر وسیح کنهر بلا شرط نصاب راجع للکل وبلا شرط بقاء وحولان حول'' (الدر المختار مع رد المحتار ۳/۲۶۵)، ''ولا یأکل من طعام العشر حتی یودی العشر وان أکل ضمن عشره'' (مجمع الفتاوی ، الدر المختار ۳/۲۷۴) (مرتب)۔

الجواب وبالله التوفيق:

ہندوستان کے زمین کے عشری وغیر عشری ہونے میں سابق علماء کا اختلاف تھا اور بجا تھا بعد ختم زمینداری سب ختم ہوگیا ہے اب کوئی زمین عشری نہیں رہی ہاں اگر کسی مقام کی زمینداری اب بھی باقی ہو تو وہاں وہ اختلاف سابق علماء کا متوجہ رہے گا اور شامی کی ترجیح جو باب الرکاز (۱) میں ہے قابل توجہ رہے گی، اور اس کا حاصل یہ ہوگا کہ عشر ادا کرنا واجب نہ ہوگا اور ادا نہ کرنے میں گنہگار و مجرم بھی کوئی قرار نہ دیا جائے گا، البتہ احتیاطاً خروج عن الاختلاف کی نیت سے نکال دینے میں استحباب ہوگا اسی طرح بعد ختم زمینداری بھی مستحب ہے کہ احتیاطاً نکال دیا کرے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

۱- شاید اشارہ اس عبارت کی طرف ہے: "ومن أصاب ركازاً وسعه أن يتصدق بخمسه على المساكين، فإذا اطلع الإمام على ذلك أمضى له ما صنع، وإن كان محتاجاً إلى جميع ذلك وسعه أن يمسكه لنفسه وإن تصدق بالخمس على أهل الحاجة من آبائه وأولاده جاز ذلك، وليس هذا بمنزلة عشر الخارج من الأرض" (ردالمحتار علی الدرالمختار ۳/ ۲۶۴) (مرتب)۔

باب صدقۃ الفطر

اسکول کالج میں صدقۂ فطر دینا کیسا ہے؟

ایک کالج ہے جس میں صرف انگریزی اور بنگلہ اور ہندی کی تعلیم ہو رہی ہے تو ایسے اسکولوں اور کالج میں صدقۂ فطر دینا کیسا ہے جب کہ وہ ادھار صدقۂ فطر لینے کے لئے تیار ہو اور ساتھ ساتھ یہ بھی بتائیے گا کہ زکوۃ کا مال دینا کیسا ہے، تفصیل کے ساتھ بیان فرمائیں گے، دوسری بات یہ ہے کہ ہر مدرسہ میں صدقۂ فطر دینا کیسا ہے اگر مدرسہ میں دینا جائز ہے تو اسکول وکالج میں بھی دینا جائز ہونا چاہئے اور اگر اسکولوں میں دینا نا جائز اور مدرسہ میں جائز ہے تو کیسے تفصیل کیساتھ لکھیں گے؟

الجواب وباللہ التوفیق:

اپنے کالج میں جہاں دینی تعلیم نہیں ہوتی ہے اور نہ کالج سے غریب طلباء کو کھانا ملتا ہے تو اس کالج میں صدقۂ فطر اور مال زکوۃ دینا جائز نہیں ہے کیونکہ یہ جگہ اس مال کے مصرف کی نہیں ہے، البتہ اگر غریب طلباء کو وظائف کالج کی طرف سے دئے جاتے ہوں تو دینا جائز ہے، لیکن اس رقم کو وظائف میں بھی صرف کرنا ضروری ہوگا، ہاں جن مدرسوں میں دینی تعلیم ہوتی ہے اور غریب طلباء کو کھانا کپڑا بھی ان مدرسوں کی جانب سے ملتا ہے تو ان میں صدقۂ فطر و مال زکوۃ دینا جائز ہے، کیونکہ یہ مدارس غرباء کے کفیل بنے ہوتے ہیں، فرق یہ ہے کہ کالج میں صدقات واجبہ مثل صدقۂ فطر و زکوۃ کا مصرف نہیں ہوتا ہے اس لئے وہاں نہیں دینا چاہئے دینی مدارس میں غریب طلباء بھی پڑھتے ہیں جن پر زکوۃ صدقۂ فطر خرچ کیا جاسکتا ہے، اس لئے وہاں دینا جائز ہے (۱)۔

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

۱- "وفي المبسوط: لايجوز دفع الزكاة الى من يملك نصابا الا الى طالب العلم والغازى ومنقطع الحج" (الرد المحتار على الدر ۳/۲۸۵، مکتبہ زکریا) (مرتب)۔

صدقۂ فطر کا وجوب اور اس کے مصارف:

صدقۂ فطر کس پر واجب ہے اور کس کو دینا چاہئے، کیا زکوٰۃ اور صدقۂ فطر مسجد میں دے سکتے ہیں؟

الجواب وبالله التوفيق:

جس کے پاس ضرورت سے زائد بالکل فاضل چیزیں نصاب کی مقدار موجود ہوں، اس پر صدقۂ فطر ادا کرنا واجب ہوتا ہے(۱)، اور جو شخص زکوٰۃ لینے کا مستحق ومصرف ہو وہی اس کا بھی مستحق ومصرف ہے(۲)، مسجد کے کسی کام میں زکوٰۃ اور فطرہ دینا جائز نہیں ہے(۳)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

صاع کی صحیح مقدار:

فقہاء کرام رحمہم اللہ تعالیٰ نے صاع کا وزن ۴۰۰ درہم لکھا ہے، عبارات فقہیہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ وزن جو کے صاع کا ہے۔ علامہ شامیؒ نے بھی یہی لکھا ہے کہ اتنے وزن کے جو سے برتن بھر جائے وہ صاع ہوگا۔ احتیاط بھی اسی میں ہے۔

پس اگر اس برتن میں گیہوں بھر کر وزن کریں تو جو کے مذکورہ وزن سے یقیناً زیادہ ہوگا، پھر گیہوں بھی مختلف وزن کے ہوتے ہیں، اس لئے اس کے نصف صاع کا صحیح اور یقینی وزن معلوم کرنے کا طریقہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ ۴۰۰ درہم جو وزن کر کے ایک برتن میں بھر لیں پھر اس برتن کو ماش سے بھریں، پھر ان ماش کا وزن کر لیں تو جو وزن آئے گا، گندم میں وہی وزن معتبر سمجھا جائے، کیونکہ گیہوں کی کسی بھی نوع کا وزن ماش سے زیادہ نہیں ہو سکتا (کذا فی الشامیہ)۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ ۴۰۰ درہم کا حساب سیر او رتولہ سے لگا کر اس وزن کے مطابق گیہوں کا صاع قرار دینے کا جو معمول چلا آرہا ہے وہ صحیح نہیں ہے۔

۱- "وهو من له أدنى شئ أى دون نصاب أو قدر نصاب غير نام مستغرق في الحاجة، ومسكين من له لاشئ له على المذهب، لقوله تعالىٰ أومسكينا ذا متربة" (کتاب الزکاۃ الدر المختار علی ہامش الشامی ۲/۵۸) (مرتب)۔

۲- "مصرف هذه الصدقة ما هو مصرف الزكوة" (الفتاوی الہندیہ ۱/۱۹۸) (مرتب)۔

۳- "لايصرف أى مال الزكوٰة إلى بناء نحو مسجد، قال الشامي: كبناء القناطير والسقايات وإصلاح الطرقات وكري الأنهار والحج والجهاد، وكل ما لاتمليك فيه" (شامی ۲/۶۲) (مرتب)۔

یہاں ۷۰ جو کا وزن برقی مشینوں سے کرایا گیا تو ۵۸۱ء۷ ۲ رتی ہوا، اس حساب سے نصف صاع ایک سیر ۱/۲ ۶۹ تولہ ہوا، لہذا اتنے جو سے جو برتن بھر گیا اسے گیہوں سے بھر کر وزن کیا تو ۲ سیر ۳۰ تولہ ہوا، اور ماش سے بھرا گیا تو ۲ سیر ۳۶ تولہ ہوا۔

پس تحقیق مذکور کی بناء پر گیہوں سے صدقۃ الفطر ادا کرنے کے لئے ۲ سیر ۳۶ تولہ گیہوں ہونے چاہئیں، تحقیق کرنے سے اس طرح سمجھ میں آیا ہے۔

الجواب وباللہ التوفیق:

حضرت مفتی محمود صاحب علیل ہیں بسلسلۂ علاج باہر تشریف لے گئے، اور یہ گرامی نامہ مع سوال کے احقر کے سپرد فرما گئے کہ تو ہی اس سلسلے میں جواب لکھ دے، اس لئے جرأت سمع خراشی ہے۔ اگر کوئی بات صحیح ادا ہوگئی تو اللہ کا شکر ہے۔ ورنہ معذرت خواہی کے ساتھ حصول فہم سلیم وحصول طبع مستقیم کے لئے دعاء کی درخواست ہے۔

سوال کے متعلق جو بات چند نصوص کی طرف ذہن میں ہے، عرض ہے:

سب سے پہلے ان حسابی تحقیقات وتدقیقات کا شرعی درجہ متعین ومعلوم کر لیا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ شرع شریف میں ان کا کیا مرتبہ ہے؟ آیا صحت ادا کے لئے اس حساب یا کسی حسابی تحقیقات وتدقیات کا اختیار کرنا لازم ہے؟ کیا اس کے بغیر ادائیگی صحیح نہ ہوگی۔ اور فرض ذمہ میں باقی رہ جائے گا یا کچھ اور صورت ہے؟

اس سلسلہ میں چند نصوص کی طرف ذہن رہنمائی کرتا ہے۔

مثلاً: (الف) "نحن أمة أمية لا نكتب ولا نحسب" (۱)۔

(ب) "الدين الفطرة" (۲)۔

(ج) "الدين يسر" (۳) وغیر ذلک۔

اس سب کا حاصل یہ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی شخص حساب، کتاب جانتا ہو یا نہ جانتا ہو، بدوی ہو یا شہری ہو، عالم ہو یا جاہل، مرد ہو یا عورت، ہر ایک جب عاقل بالغ غیر معذور مکلّف ہو، تو احکام شرع پر بآسانی عمل کر کے اپنے معبود حقیقی سے اپنا

۱- اس روایت کی تخریج اور حوالہ جات پہلے گذر چکے، دیکھئے: بخاری ومسلم مع النووی باب وجوب صوم رمضان لرؤیۃ الہلال ۴/ ۲۰۵۔

۲- عن أبي هريرة "الفطرة خمس أو خمس من الفطرة، وفي رواية عشر من الفطرة (رواہ ابن ماجہ ۱/ ۵۹ ابواب الطہارۃ، رقم الحدیث: ۲۹۰، ۲۹۱۔

۳- اس کا حوالہ پہلے گذر چکا۔

رشتہ جوڑ سکتے ۔اور خطاب تکلیف میں کامیاب ہو سکے۔

اور ظاہر ہے کہ یہ حسابی تحقیقات وتدقیقات مدار نجات یا مدار صحت عمل، یا مدار صحت ادا نہیں ہو سکتے، بیش از بیش ان کا مرتبہ تحسین یا استحباب کے درجہ میں ہوگا، یا یہ چیزیں طمانیت قلب کے قبیل سے ہوں گی، مکلّف کی برأت ذمہ کے لئے موقوف علیہ ہرگز نہ ہوں گی۔

پس فقہاء کرام کی یہ ابحاث اسی درجہ وقبیل کی ہوں گی عمل کی صحت وجواز کے لئے معیار یا مدار نہ ہوں گی۔

اور ساتھ ہی یہ بات بھی پیش نظر رہنی چاہئے کہ صدقۂ فطر کی مقدار نصف صاع حنطہ (گیہوں) یا ایک صاع شعیر (جو) واجب ہونے کے بعد صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اس واجب کی ادائیگی بلا تکلیف صاع مدینہ سے یا جو صاع میسر ہو اس سے یا جس نوع کے صاع کی ہدایت تھی اس سے نصف صاع یا ایک صاع ادا فرما دیتے تھے، اور سبکدوش وبری الذمہ قرار دیدیئے جاتے تھے۔

ایسا ہرگز نہیں تھا کہ جس صاع کا اعتبار تھا اور جس صاع سے ادا فرماتے تھے وہ سارے کے سارے ایک تاریخ کے بنے ہوئے تھے یا ایک ہی نوع کے تھے، بلکہ نئے پرانے جو میسر آ گئے ان سے ادائیگی کر لی، خواہ پتھر سے بنے ہوئے ہوں یا لکڑی سے بنے ہوئے ہوں اور مشاہدہ ہے کہ بالکل پرانا صاع جو مدتوں سے بار بار استعمال ہوتا ہے اس کا ظرف واندرونی خول کافی بڑھ چکا ہوتا ہے، بالخصوص جب لکڑی کا ہو، اور جو صاع بالکل تازہ اور نیا ہوتا ہے، اس کا اندرونی خول ظرف کم اور چھوٹا ہوتا ہے۔

اور بڑے خول وظرف میں زیادہ مقدار غلہ کی سمائے گی اور چھوٹے میں کم مقدار سمائے گی اور وزن کرنے میں دونوں کی مقداروں میں بڑا فرق بھی ہوگا، مگر ادائیگی سب کی تسلیم کی گئی۔

اسی طرح ادائیگی میں کوئی قید نہیں کہ اتنے وزن وحجم اور اتنی دبازت کے گیہوں یا جو ادا کئے جائیں۔

بلکہ جو گیہوں یا جو میسر ہوا، ادا کر دیا، یا بیش از بیش اوسط درجہ کا لحاظ کر لیا، اس میں گیہوں کے ہلکے اور بھاری ہونے کے اعتبار سے بڑا فرق آنا ظاہر ہے۔بھاری اور روزنی گیہوں جو ایک صاع میں یا نصف صاع میں سمائے گا اس کا وزن بہت زیادہ ہو جائے گا، اور ہلکے گیہوں کا وزن کم ہو جائے گا، اور اس کی مقدار بھی وزن کے اعتبار سے بہت کم ہو جائے گی۔

باوجود ان باتوں کے ادائیگی سب کی صحیح ومعتبر مانی گئی، اگر یہ حسابی تحقیقات وتدقیقات مدار یا شرط ہوں تو ان سب کی ادائیگی کیسے صحیح ومعتبر ہوگی؟ بلکہ بہت سارے صحابۂ کرامؓ (**نعوذ باللہ من ذلک**) قاصرۃ الاداء قاصر العمل، قابل

مواخذہ قرار پائے جائیں گے (ثم العیاذباللہ)۔

قرن اول کا یہ عام حال بھی اس بات کا قرینہ ہے کہ یہ حسابی تحقیقات وتدقیقات مطلوب شرعی نہیں، اور اس کو لازم وضروری قرار دینا یا اس پر صحت ادا کو یا برأت عن الذمہ کو موقوف یا معلق کرنا منشاء ومزاج شرع کے خلاف ہوگا۔

اور بہت ممکن ہے، بقبیلۂ ما یاں حضرت گنگوہیؒ کی اس اصولی تحریر سے تقریری جواب معلوم ہوگیا، وہ تحریر یہ ہے:

"چونکہ ہر جگہ کا حساب مختلف اور وزن مختلف ہے، پس ستر جو م بریدہ غیر مقشر کا ایک درم، پس اس حساب سے رطل بنالیں۔ اور آٹھ رطل کا ایک صاع بنالیں اور کسی کی تحریر کا اعتبار نہ کریں"(۱) حضرت کے اس جملہ میں (کہ اور کسی کا اعتبار نہ کریں) اس جانب بھی اشارہ ہوا کہ اس میں غلو کرنا درست نہیں اور ان کو شرط لازم قرار دینا یا مدار صحت برأت عن الذمہ قرار دینا منشاء ومزاج شرع کے خلاف ہوگا۔

نیز یہ بات بھی پیش نظر رہنی چاہئے کہ ایک ملک کے تول یا ناپ یا سکہ کو جب دوسرے ملک کے تول یا ناپ یا سکہ میں ڈھالا جاتا ہے اور مطابقت حاصل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے تو دونوں کی بنیا مختلف ہونے کی وجہ سے انطباق مکمل اور صحیح نہیں ہوتا۔ مثلاً درہم کے وزن کو جب ہم تولہ، ماشہ کے وزن سے منطبق کرنا چاہیں گے تو کبھی پورا انطباق نہ ہوگا، اس لئے کہ ہندی وزن تولہ، ماشہ کی بنیا دخشخاش پر ہے کہ آٹھ خشخاش کا ایک چاول پھر آٹھ چاول کی ایک رتی پھر آٹھ رتی کا ایک ماشہ پھر بارہ کا ایک تولہ۔

اور درہم (عربی وزن) کی بنیا دشعیر (جو) پر ہے کہ پانچ شعیر کا ایک قیراط چودہ قیراط کا ایک درہم، لہذا جب تک شعیر (جو) کا چاول یا خشخاش یا رتی کے ساتھ کلی انطباق نہ ہوگا، بلکہ جتنا فرق چھوٹے اور بنیادی اجزاء میں ہوگا اس سے کئی گنا زیادہ بڑے وزن میں ہوگا، اگر تولہ کے درجہ میں دو خشخاش کا بھی فرق ہوگیا تو من اور کوئنٹل تک پہنچتے پہنچتے ایک من کا سوا من اور سوا من کا ایک من ہوسکتا ہے، پھر اسی طرح شعیر بھی مختلف جسامت اور حجم و وزن کے ساتھ انطباق معلوم کرے گا اور ایسی صورت میں عدم انطباق ناگزیر ہوگا، اور صاحب درمختار نے جو ماش وعدس کے ذریعہ سے وزن کرنے کا ذکر کیا ہے وہ صرف اس بنیاد پر ہے کہ ماش وعدس مختلف وزن و حجم کے ساتھ انطباق معلوم کرے گا اور ایسی صورت میں عدم انطباق ناگزیر ہوگا۔ اور صاحب درمختار وزن و حجم کے نہ ہوں، لیکن اس زمانہ میں بالخصوص ہمارے اطراف میں تو ماش وعدس دونوں مثل گیہوں وجو کے مختلف حجم و وزن کے ہوتے ہیں، لہذا یہ دردسری محض بے کار ہوگی اور غیر مفید ہوگی، جیسا کہ خود علامہ شامیؒ نے بھی اس کی

۱- فتاویٰ رشیدیہ ص ۳۶۱ کامل ہر سہ حصہ۔

طرف اشارہ کیا ہے، لہذا صاحب ''درمختار'' کی تحقیق پر بناء کر کے کوئی فیصلہ کرنا صحیح نہ ہوگا۔

اسی طرح برقی مشینوں کے ذریعہ سے وزن کی جو مقدار معلوم ہو، فقط اسی کو لازم قرار دینا اور اسی پر صحت ادا کو معلق کرنا بھی صحیح نہ ہوگا، اور نہ اس کی بنیاد پر خلفاً عن سلف عند الجمہور جو معتبر و معمول بہ چلا آرہا ہے۔ اس کی تغلیط درست ہوگی، جیسا کہ نصاب زکوۃ میں اپنے اکابر کا ذوق معلوم و مشہور ہے کہ مقدار نصاب (۵۲ ½ تولہ) چاندی کو جو جمہور سلف سے بطور توارث چلا آتا ہے۔ اس کے خلاف مؤقر علماء کی تحقیق کے بعد بھی اس کو ترک نہ کیا گیا کما صرح بہ صاحب ''الاوزان الشرعیہ''(۱)۔

ہاں یہ الگ بات ہوگی کہ اگر احتیاط برتے اور مشینی وزن کی مقدار کے مطابق ادا کرے تو یہ احتیاط ہوگی، اس کو ممنوع یا ناجائز نہ کہیں گے، لیکن ایسے شخص کو اس کا بھی حق دیں گے کہ وہ دوسروں کو اسی کے ذریعہ حاصل شدہ مقدار پر ادائیگی کے لئے مجبور کرے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

کیا جوار، مکا و باجرہ صدقۂ فطر میں دیا جاسکتا ہے، اور اس کا وزن کیا ہوگا؟

صدقۂ فطر کے لئے گیہوں کنٹرول میں ۵۶ نئے پیسے اور باجرہ ۹۰ نئے پیسے اور مکائی یا مکا ۸۰ نئے پیسے اور جواری ۵۷ نئے پیسے اور کھلا بازار میں جو ایک روپیہ بیس نئے پیسے فی کلو کے حساب سے مل رہا ہے اور دیہاتوں میں جواری ایک روپیہ فی کلو کے حساب سے بغیر کنٹرول کے مل رہی ہے سب اناجوں میں قیمتوں کا یہ فرق ہے بتلایئے کہ جوار مکا باجرہ بھی صدقۂ فطر میں دیا جاسکتا ہے اور ہر ایک کی مقدار وزن کتنی ہے اور ساتھ ہی مشین سے صاف کیا ہوا جو اور بغیر چھلکا صاف کیا ہوا جو اس کی کیا مقدار ہے ایک نفس کے لئے اور اگر کنٹرول بھاؤ گیہوں کی قیمت سوا دو کلو کی ایک صدقۂ فطر کے لئے دینا بہتر ہے، یا کہ نہیں؟

الجواب وباللہ التوفیق:

گیہوں اور جو اور چھوہارے اور منقی کے علاوہ بھی ہر چیز صدقۂ فطر میں دی جاسکتی ہے اور بازاری قیمت ان چیزوں

۱- جواہر الفقہ / ۴۱۴ و ۴۱۵ لمفتی محمد شفیع۔

کی معتبر ہوگی، البتہ گیہوں اور جو وغیرہ میں وزن معین ہے گیہوں کا وزن ہر فطرہ میں پونے دو سیر اور جو کا دوگنا ہے کنٹرول کے بھاؤ کا اعتبار نہیں ہے(۱)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

اگر جوار مکا وغیرہ دیں تو جس قدر وزن گیہوں دیا جاتا ہے وہ ان میں معتبر نہیں ہے، بلکہ جتنا گیہوں واجب ہوتا ہے اس کی قیمت میں جس قدر جوار مکا وغیرہ ملے وہ دیدیں (۲)۔

محمود احمد عفی عنہ ۱۲/ ۹/ ۸۵ ۱۳ھ

صدقۂ فطر کا مصرف:

جب فطرہ سب پر واجب ہے تو دینے والا کس کو دے اور جس کو دیا ہے اس پر فطرہ واجب ہے یا نہیں ایک مولوی صاحب فرماتے ہیں کہ سب پر واجب ہے۔

الجواب وباللہ التوفیق:

فطرہ سب پر نہیں واجب ہوتا ہے بلکہ صرف اس آدمی پر واجب ہوتا ہے جس کے پاس اپنی ضروریات اور حاجت اصلیہ سے فاضل اور زائد نصاب کی مقدار ساڑھے باون تولہ چاندی یا چاندی کا زیور یا اس کی قیمت کا روپیہ یا سامان موجود ہو اور صدقۂ فطر صرف ان لوگوں کو دینا چاہئے جن کو زکوۃ دینا جائز ہو، ورنہ فطرہ ادا نہ ہوگا (۳)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

الجواب صحیح: محمود عفی عنہ مفتی دارالعلوم دیوبند ۱۶/ ۹/ ۸۵ ۱۳ھ

۱- ”نصف صاع فاعل يجب من بر أو دقيقه أو سويقه أو زبيب وجعلاه كالتمر .... أو صاع تمر أو شعير ولو رديئاً“ (الدر المختار مع رد المحتار ۳/ ۳۱۸) (مرتب)۔

۲- ”وما لم ينص عليه كذرة وخبز يعتبر فيه القيمة“ (الدر المختار مع رد المحتار ۳/ ۲۱۹) (مرتب)۔

۳- وهي واجبة على الحر المسلم المالک لمقدار النصاب فاضلاً عن حوائجه الأصلية، كذا في الاختيار شرح المختار (فتاوی عالمگیریہ ۱/ ۱۹۱، نیز الدر المختار مع رد المحتار ۳/ ۳۱۰، وصدقة الفطر كالزكاة في المصارف أي المذكورة في آية الصدقات إلا العامل الغني فيما يظهر (الرد المحتار علی الدر المختار ۳/ ۳۲۵) (مرتب)۔

صدقۂ فطر کسی تنظیم میں دینا اور حسب موقع خرچ کرنا:

صدقۂ فطر کسی فنڈ میں لے کر استعمال کر سکتے ہیں یا کہ نہیں۔

جیسے دہرہ دون دو جماعت فنڈ ہیں وہ لوگ فطرہ بیت المال میں لیکر لوگوں کو دیتے ہیں اور اس کے حساب کتاب کا مسجد میں اعلان کرتے ہیں حکم یہ ہے کہ نماز سے پہلے ادا کردیں اور بیت المال والے نہ معلوم کب کا کب خرچ کرتے ہیں اس کا پورا پورا جواب دیں۔

الجواب وباللہ التوفیق:

صدقۂ فطر غریب مسلمانوں کو دینے سے ادا ہو جاتا ہے اور نماز عید سے پہلے غریب تک پہنچا کر ان کو مالک بنا دینا افضل ہے اور بعد میں بھی دینے سے ادا ہو جاتا ہے مگر افضلیت کے خلاف ہے، لہٰذا صورت مسئولہ میں اگر فقیر مسکین تک پہنچ جاتا ہے تو ادا ہو جاتا ہے(۱)، لیکن یہ طریقہ اس طرح بہتر نہیں ہے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۶/ ۹/ ۸۵ ۱۳ ھ

الجواب صحیح: سید احمد علی سعید مفتی دارالعلوم دیوبند

قیمت کے ذریعہ صدقۂ فطر ادا کرنے میں گیہوں کے کس نرخ کا اعتبار ہوگا؟

فطرہ کے بارے میں ایک حافظ صاحب نے بتایا ہے کہ چونکہ گیہوں بازار میں بلیک سے فروخت ہوتا ہے اور اس کا کوئی قیام نہیں ہے اور گورنمنٹ نرخ پر گیہوں ملتا جاتا ہے، لہٰذا ۶۰ پیسہ فی کلو گیہوں کی قیمت ادا کی جائے گی کیا یہ حساب ٹھیک ہے؟

الجواب وباللہ التوفیق:

اگر آپ بعینہ گیہوں ہی دیں تو سب سے بہتر ہے جائز طریقہ سے جہاں سے اور جس قیمت پر ملتی ہوں کوئی اشکال

۱- ’’وصدقة الفطر كالزكاة في المصارف وفي كل حال....‘‘الخ (الدر المختار مع رد المحتار ۳/ ۳۲۵)، لہٰذا تملیک مستحقین شرط ہے ادائیگی کے لئے)، نیز ’’ويستحب إخراجها قبل الخروج إلى المصلى بعد طلوع الفجر عملاً بأمره وفعله عليه الصلاة والسلام وصح أداؤها إذا قدمه على يوم الفطر أو أخره اعتباراً بالزكاة‘‘ (الدر المختار مع رد المحتار ۳/ ۳۲۲) (مرتب)۔

اور تر ددنہیں ہے، خواہ گورنمنٹ نرخ سے ملا ہو یا بازار کے نرخ سے ملا ہو فطرہ ادا ہو جائے گا، البتہ اگر گیہوں نہ دینا ہو، بلکہ قیمت دینی ہو تو بازاری بھاؤ ہی کا اعتبار ہوگا ہر بلیک مارکیٹ شرعاً واجب الاحتراز نہیں ہے اس میں تفصیل ہے گورنمنٹ نرخ عام بازار میں نہیں ہے اور نہ ہی ہر جگہ ہی ہے اور اصول وقواعد کلی ہوتے ہیں (۱) فقط واللہ اعلم بالصواب

كتبہ محمد نظام الدین اعظمی مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۸/۹/۸۵ ۱۳ھ

الجواب صحیح: سید احمد علی سعید مفتی دارالعلوم دیوبند

۱- "ثم قيل يجوز أداؤه باعتبار العين والأحوط أن يراعي فيه القيمة، هكذا في محيط السرخسي" (فتاوی عالمگیریہ ۱/۱۹۱، نیز دیکھئے: ردالمحتار علی الدرالمختار ۳/۳۲۱) (مرتب)۔

کتاب الصوم

مسئلہ توحید اہلہ:

سوال: الفرقان محرم ۱۳۹۱ھ اسلامی منعقدہ مکہ مکرمہ شعبان ۹۰ھ کے اجلاس کی تجویز توحید اہلہ کے سلسلہ میں ایک سوال کا جواب۔

خلاصہ سوال یہ ہے کہ متعدد ممالک اسلامیہ کے بہت سے علماء اور ذمہ دار حضرات کی یہ رائے اور تجویز ہے کہ عالم اسلامی میں رمضان وعید وغیرہ کا یہ فرق واختلاف عملاً باقی نہ رہے، بلکہ کبھی بھی ایک جگہ کی رویت ہلال کی بناء پر پورے عالم اسلام میں رمضان کا آغاز اور عید الفطر اور عید الاضحیٰ ایک ہی دن ہوا کرے۔

ان کے نزدیک وحدتِ امت کا بھی تقاضا ہے۔ اور اس تجویز کا عنوان توحید اہلہ ہے۔ حضرات علماء اہل تحقیق مسئلہ کی اہمیت محسوس فرماتے ہوئے، نیز اس کے اطراف وجوانب اور مالہ وماعلیہ پر غور فرما کر دلائل کے ساتھ اپنی آراء سے مطلع فرمائیں، بنیادی طور پر اس میں یہ تین سوال پیدا ہوتے ہیں۔

۱-اس مسئلہ میں براہِ راست کتاب وسنت سے ہمیں کیا رہنمائی ملتی ہے؟

۲-جن ائمہ نے اختلاف مطالع کے اعتبار کا انکار کیا ہے۔ ان کا مقصد اس انکار سے کیا ہے؟ اور اس مسئلہ میں اختلاف حقیقی ہے یا صرف لفظی اور تعبیری، جیسا کہ بعض محققین نے رائے ظاہر کی ہے، اگر اختلاف ونزاع حقیقی ہے تو دلائل سے میری طرف سے کس مسئلہ کو ترجیح ہے؟

۳-حنفیہ کے مشہور مذہب عدمِ اعتبار اختلاف کی بنا پر ہندوستان وپاکستان کے احناف کے لئے کیا اس کی گنجائش ہے کہ وہ توحید اہلہ کی تجویز کو قبول کرلیں۔

الجواب وباللہ التوفیق :

الفرقان کا تراشہ اہتمام کی معرفت موصول ہوا۔اس میں قائم کردہ سوالات کے جوابات لکھنے سے قبل ایک اہم چیز قابل غور ہے جو پیش خدمت ہے۔اس پر توجہ دینا زیادہ اہم ومقدم ہے۔وہ یہ ہے کہ توحید اہلہ مقصد شرعی ہے یا نہیں؟ یا ہوسکتا ہے یا نہیں؟اس کا جواب بھی قائم کردہ نمبرات وسوالات کے ذیل میں انشاء اللہ آجائے گا، یہاں اس سے قطع نظر یہ دیکھنا ہے کہ اس تحریک (توحید اہلہ) کا مقصد یہ بیان کیا گیا ہے کہ پورے عالِم اسلام میں رمضان وعید وغیرہ کا فرق واختلاف عملاً باقی نہ رہے، بلکہ کسی بھی ایک جگہ رویت ہلال کی بناء پر پورے عالِم اسلام میں اس مقصد کی تکمیل یا اس میں کامیابی جب ہی ہوسکتی ہے کہ ہر مملکتِ اسلامی پورے قلم رو میں قانوناً لازم قرار دے دے کہ کسی مقام کا کوئی فرد یا کوئی قبیلہ یا باشندہ عملاً اس کے خلاف نہ کرسکے۔اور کرے تو اس سے باز پرس ہو،اس کے خلاف کارروائی ہو،غرض سب کو اس پر مجبور کیا جائے۔

اگر ایسا نہ کیا گیا تو جو مقصد متعین کیا گیا ہے(وحدت فی العمل)وہ حاصل نہ ہوگا،اور اگر سرے سے اس کو لازم ہی نہ کیا جائے، بلکہ ہر شخص کو عمل میں اختیار دے دیا جائے کہ جس کا جی چاہے اتفاق کرے تو یہ تحریک ہی بالکل بے سود ہوگی۔اور اگر واقعی لازم قرار دے دیا جائے۔اور اس کے مطابق عمل کرنا قانوناً ضروری قرار دے دیا جائے تو شرعاً یہ جائز نہ ہوگا۔

اولاً :　اس لئے کہ غیر لازم کو لازم قرار دیا جائے گا اور اس کے مطابق عمل کرنا قانوناً ضروری ہوگا۔

غیر لازم کو لازم قرار دے دینا۔جس چیز میں شریعت مطہرہ نے اختیار دیا ہو اس سے اختیار کو سلب کرلینا شریعت مطہرہ نے ناجائز قرار دیا ہے،اس کے نظائر بے شمار ہیں۔

ثانیاً :　اس لئے کہ نفس رویتِ ہلال رمضان کا مسئلہ امور دینیہ میں سے من کل الوجوہ تحت القضاء داخل ہی نہیں کہ علی الاطلاق تحت القضاء داخل ہوکر اس طرح کا لزوم بطریق قضائے قاضی (حکومت)نافذ ہوجائے۔

ثالثاً :　اس لئے کہ جو لوگ اختلاف مطالع کو معتبر جانتے ہیں ان کے لئے بُعد مسافت کی صورت میں بعض وقت اس حکم حکومت پر عمل کرنا جائز بھی نہ ہوگا۔اس لئے کہ انکا متدل براہِ راست مستند الی الروایات ہوگا۔جیسا کہ حضرت کریبؓ کی روایت میں ہے جس کو صحاح میں سے اکثر نے بہ سند صحیح روایت کیا ہے۔اور الفاظ روایت یہ ہیں:

"أخبرني كريب أن أم الفضل ابنة الحارث بعثته إلى معاوية بالشام، قال: فقدمت الشام فقضيت حاجتها واستهل عليّ هلال رمضان وأنا بالشام فرأينا الهلال ليلة الجمعة ثم قدمت المدينة في آخر الشهر فسألني ابن عباس ثم ذكر الهلال، فقال

رأيتم الهلال؟ فقلت: رأيناه ليلة الجمعة، فقال: رأيتهٗ ليلة الجمعة، فقلت: رآه الناس (في رواية مسلم) ورأيت وراٰه الناس وصاموا وصام معاوية، فقال: لكن رأيناه ليلة السبت فلا نزول نصوم حتى يكمل ثلاثون يوماً أو نراه، فقلت: ألا تكتفي برؤية معاوية وصيامه؟ قال: لا هكذا أمرنا رسول الله ﷺ" (١)۔

اور جیسے کہ وہ روایت جس کو امام مسلم نے "**باب لكل أهل بلد رؤيتهم**" سے ذرا قبل روایت کیا ہے اس کے الفاظ یہ ہیں: "**عن ابن عمر عن النبي ﷺ أنه ذكر رمضان فقال: لا تصوموا حتى تروا الهلال ولا تفطروا حتى تروه فإن أغمي عليكم فاقدروا له (وفي رواية) فاقدروا إلى ثلثين (وفي رواية) فعدوا ثلثين**" (٢)۔

غرض ان کا استناد واستدلال براہِ راست روایات سے ہے۔ان کے خلاف کا فیصلہ قاضی وحاکم کے اختیار میں نہ ہوسکے گا۔**هو مبرهن في مقامه**،نیز اس میں وسعت دین کو تنگ کرنا لازم آتا ہے۔اور جو تسہیل ووسعت اللہ رب العزت نے اس امت کو دی ہے اور ارشاد نبوت علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام: "**اختلاف أصحابي رحمة لأمتي**" (٣)(محبت) سے اس کو موثق ومؤید فرمایا ہے۔مسلوب ہو کر رہ جائے گی جو منشا شرع اور شارع کے خلاف ہوگا۔اور ایک قسم کی دین حنیف میں مداخلت بیجا کے مترادف ہوجائے گی اور انہیں وجوہ کی بناء پر امام مدینۃ الرسول علیہ السلام حضرت مالک رحمۃ اللہ علیہ نے خود اپنی کتاب "موطا" کو دستور وقانون کی حیثیت دے کر سب پر اس کی پابندی لازم قرار دینے سے روکا ہے۔جس کو نقل کرنے والوں نے خود امام کے ان الفاظ میں نقل فرمایا ہے: "**وقد روى أبو نعيم في حيلة الأولياء عن مالك أنه أن أعلق المؤطا على الكعبة ويحمل الناس على ما فيه فقلت لا تفعل، فإن أصحاب رسول الله ﷺ اختلفوا في هذه الفروع تفرقوا في البلدان وكل مصاب، فقال: وفقك الله يا أبا عبد الله**" (٤)۔

١- ترمذی باب لکل أهل بلد رؤيتهم إلى قوله: والعمل عند أهل العلم على هذا الحديث إن لكل أهل بلدة رويتهم (رقم الحديث: ٦٩٢، باب ما جاء لکل أهل بلد رؤيتهم ٣/ ٢١٣ ط: احیاء تراث العربی بیروت)، وهكذا في أبي داؤد ومسلم/ ٣٢٦)۔

٢- وهكذا في أبي داؤد ومسلم/ ٣٢٦۔

٣- في رواية: اختلاف أصحابي لكم رحمة، کشف الخفا للعجلونی ١/ ٦٨، المغنی عن حمل الاسفار للعراقی ١/ ٢٨، تذکرۃ الموضوعات للفتنی/ ٩٠، ابن عساکر: تہذیب تاریخ دمشق ٦/ ٢٨٥، وفي رواية: اختلاف امتي رحمة "المغنی عن حمل الاسفار للعراقی/ ٢٨، اتحاف السادۃ للزبیدی ١/ ٢٠٤، ٣، ٢٠٥، تذکرۃ الموضوعات/ ٩٠، کنز العمال للمتقی الہندی/ ٢٨٦٨٦ موسوعۃ اطراف الحدیث ١/ ١٧٣، (مرتب)۔

٤- مقدمۃ التعلیق المجد علی الموطا للامام محمد۔

امام صاحب کا یہ منع کرنا پہلی بار نہیں تھا، بلکہ اس سے تقریباً ۳۰،۴۰،۵۰ سال قبل اس کے دادا منصور کو بھی نہایت سختی سے منع فرمایا تھا۔ جس کے الفاظ یہ ہیں:

"روی ابن سعد في الطبقات عن مالک أنه لماحج المنصور قال لي: عزمت علی أن آمر بکتابک هذه التي وضعتها فتنسخ ثم أبعث إلی کل واحد من أمصار المسلمین منها نسخة وآمرهم أن یعملوا بما فیه ولا یتوجهوا إلیٰ غیرها فقلت: لا تفعل هذا، فإن الناس قد سبقت إلیهم الأقاویل وسمعوا الأحادیث ورددوا روایات وأخذکل قوم بما سبق روایته فدع الناس، وما اختار أهل کل بلد منهم لأنفسهم کذا في عقود الجمان" (۱)۔

اس بار بار منع کرنے سے یہ معلوم ہوا کہ امام نے محض تواضعاً نہیں منع فرمایا یا روکا ہے، بلکہ ایسی تنگی شرعاً قبیح ومذموم تھی جس کو وہ ناجائز سمجھتے تھے اور شرعی حیثیت سے روکا ہے۔ پھر اسی رویت ہلال کے خاص موضوع پر نکیر نہیں فرمائی اور نہ اس کو خلاف مقصد شرع یا شارع قرار دیا اور نہ وحدت ملت کے منافی سمجھا، بلکہ اگر غور کیا جائے تو یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہے کہ اس وقت اس کا انتظام بہت سہل تھا۔ خلافت راشدہ اور مشکوٰۃ نبوت کا زمانہ بہت قریب تھا، عام طور سے صحابہ موجود تھے، بلکہ صحابہؓ کا دور تھا، دین کے ہر حکم کی تعمیل پر من تن دھن کی بازی لگا دینا آسان تھا اور وحدت ملت کا مسئلہ بھی ان کے ذہن میں اس درجہ اہم تھا کہ جنازہ رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام تین دن تک رکھا رہا، جب تک خلافت کا مسئلہ طے ہو کر وحدتِ ملت حاصل نہ کر لی گئی تدفین مؤخر رکھی گئی، اگر توحید اہلہ میں وحدت ملت کی کوئی حیثیت ہوتی اور یہ (توحید اہلہ) خود یا اس کے ضمن میں کوئی اہم مقصد شرعی یا فضیلت مضمر ہوتی تو صحابہ کرامؓ کی بصیرت اور عقل وہوش ودانش پر قرآن پاک ناطق ہی نہیں، بلکہ قیامت تک کے انسانوں کو آگاہ کرنے کے لئے تشہیر واعلان کا حکم ہے، ارشاد ربانی ہے: **"قل هذہٖ سبیلي أدعو إلی اللہ علی بصیرة أنا ومن اتبعني"** (۲)۔

اور اللہ کے رسول ﷺ نے اس کی وضاحت اس طرح فرمائی: **"أصحابي کالنجوم فبأیهم اقتدیتم اهتدیتم"** (۳)۔

۱- مقدمۃ التعلیق ص ۱۵۔

۲- سورۂ یوسف: ۱۰۸۔

۳- تلخیص الحبیر لابن حجر ۴/۱۹۰، عبد بن حمید فی مسندہ من طریق حمزۃ النصیبی عن نافع عن ابن عمر، وحمزۃ ضعیف جداً، میزان الاعتدال ۱/۶۱۳، ۶۰۷ رقم الحدیث: ۱۵۱۱، ۲۲۹۹ عن ابن عمر وعن الاعمش، عن ابی صالح، عن ابی ہریرۃ عن النبی ﷺ (مرتب)

اس ارشاد میں صحابہ کرامؓ کے مقتدا ہونے کو بھی واضح کیا گیا ہے، ان کی اقتداء کی ترغیب بھی دی گئی ہے، اسی کے ساتھ وہ روایت بھی ملا لیجئے جس میں امت کا بہت سے فرقوں میں منقسم ہو جانا اور اس میں سے محض ایک کا حق پر ہونا اور باقی سب کا ضلالت پر ہونا بیان کیا گیا۔ اس سوال پر کہ برحق فرقہ کون ہوگا؟ جواب میں صحابہ کرامؓ کو مشعلِ راہ قرار دینا اور اپنے معیارِ حق ہونے کے ساتھ ساتھ صحابہ کرامؓ کو بھی تبعاً یہ برکت اتباع صادق معیارِ حق بتلا کر یہ جتلانا کہ ان کے نقش قدم کے تابع رہنے والا حق پر رہے گا۔ اس روایت کے الفاظ یہ ہیں:

"عن عبد الله بن عمرو قال: قال رسول الله ﷺ: ليأتين على أمتي كما أتى على بني إسرائيل حذو النعل بالنعل (إلى قوله) وتفترق أمتي على ثلث وسبعين ملة كلهم في النار إلا ملة واحدة، قالوا: ومن هي يا رسول الله! قال: ما أنا عليه وأصحابي" (۱)، وفي رواية أحمدؒ وأنه سيخرج في أمتي أقوام تتجارى بهم تلك الأهواء كما يتجارىٰ الكلب بصاحبه لا يبقىٰ منه عرق ولا مفصل إلا دخله"۔

ان باتوں کا تقاضا یہ تھا کہ اگر اس میں کوئی خاص فضیلت یا اہمیت ہوتی یا اس پر کوئی خاص شرعی مقصد مرتب ہوتا تو صحابہ کرامؓ کی توجہ اس طرف بھی ہوتی، پھر صحابہؓ ہی کے دور میں اسلام عرب سے نکل کر فارس و روم و افریقہ جیسے دور دراز مقامات تک پہنچ گیا تھا اور اختلاف اہلہ کے واقعات بے شمار واقع ہو رہے تھے اور اس وقت سے زیادہ ضرورت اس وقت توحید اہلہ کی جانب توجہ دینے کی تھی، مگر صحابہؓ نے پھر بھی توجہ نہیں فرمائی، کوئی اشارہ تک اس طرف نہیں ملتا، اس کا بھی تقاضا یہ ہے کہ یہ اختلاف وسعت امت و رحمت علی الامۃ کے دائرہ سے خارج نہیں، اس لئے اس کے خلاف کرنا اور اس میں تنگی ڈالنا مزاج شرع و شارع کے خلاف ہے۔

رابعاً: اس لئے کہ جو لوگ اختلاف مطالع کو مفید نہیں مانتے وہ اختلاف مطالع کے وجود کے منکر نہیں ہیں، بلکہ پنجگانہ وغیرہ تمام ہی معاملات و امور میں معتبر مانتے ہیں اور اس کے مقتضا پر عمل کرتے ہیں اور استناد روایات سے کرتے ہیں اور صحیح کرتے ہیں، صرف وجوب صوم کے اثبات میں بوجہ روایات صحیحہ اعتبار نہیں کرتے اور اس پر بنا نہیں رکھتے، بلکہ یہ فرماتے ہیں کہ اگر طریق موجب (شہادۃ علی الرؤیۃ) (شہادۃ علی قضاء القاضی استفاضہ) کے ذریعہ اہل مشرق کی رویت اہل مغرب پر ثابت ہو جائے تو ان پر لزوم صوم ہو جائے گا۔

۱- رواہ الترمذی، کتاب الایمان باب ماجاء فی افتراق ہذہ الامۃ حدیث نمبر: ۲۶۴۰۔

اورظاہر ہے کہ ریڈیووغیرہ کی خبرطریق موجب نہیں بن سکتی ،اگر بن سکتی ہے توکبھی کبھار استقاضہ بن سکتی ہے یا پیش ازپیش طبل قاضی۔یاصورت مدافع یا قنادیل منارہ وغیرہ کے درجہ میں ہوکرحصول غلبہ ظن کے لئے مفید ہوسکتی ہے اور بعض موقعوں میں اپنے شرائط وقیود کے ساتھ معتبر بھی ہوسکتی ہے جومحض ایک امرمجتہد فیہ ہوگا۔اگرکسی قید یا شرط ضروری یا کسی نص کے خلاف ہوگی توقابل عمل نہ رہے گی،ان شرائط وقیود کی قدرے تفصیل احقر کے مضمون (ریڈیووغیرہ کے ذریعہ رویت ہلال کی اطلاع کا شرعی حکم)میں مذکور ہے،وہ بھی پیش خدمت ہے اس کوبھی ملاحظہ فرمالیا جائے،مثلاً ریڈیووغیرہ کی اطلاع اگرچہ اعلان معتبرمفید کے الفاظ میں بھی ہو،لیکن جس مقام وخطہ میں اطلاع پہنچ رہی ہے وہاں ۲۷،۲۸ تاریخ ہے کہ وہاں اس اعلان پرعمل کرنے کی وجہ سے مہینہ صرف ۲۷،۲۸ دن کا ہوکررہ جائے گا۔اوروہ صرف صریح نصوص کے خلاف ہوگا جو جائز نہ ہوگا۔مثلاً:

حدیث:۵" عن ابن عمر قال: قال رسول الله ﷺ: إنا أمة أمية لا نكتب ولا نحسب، الشهر هكذا وهكذا وهكذا، وعقد الإبهام في الثالثة، ثم قال: الشهر هكذا وهكذا وهكذا، ويعني تمام الثلثين، يعني مرة تسعاً وعشرين ومرة ثلثين"(۱)۔

اورجب ۲۷/۲۸ تاریخ سے روزہ شروع کردیا جائے گا توحدیث ذیل کے منافی ہوگا۔

حدیث۶: "عن أبي هريرة قال: قال رسول الله ﷺ: لايتقدمن أحدكم رمضان بصوم يوم أو يومين إلا أن يكون رجل كان يصوم صوماً فليصم ذلك اليوم" (۲)۔

اوراس مجتہد فیہ حکم کی وجہ سے خلاف نصوص کرنا کسی طرح جائز نہ ہوگا،البتہ صرف ان مقامات وممالک میں قابل عمل رہ سکے گا۔جہاں ۲۹ویں تاریخ گذرکر ۳۰ویں شب آچکی ہو یا آرہی ہو۔حاصل یہ نکلا کہ جوحضرات اختلاف مطالع کا اعتبار نہیں فرماتے ان کے نزدیک بھی اس کے طریق کار میں تمام ممالک اسلام میں عمل کی یکسانی وحدت حاصل نہ ہوسکے گی اوریہ مقصد حاصل نہ ہوسکے گا۔

خلاصہ یہ ہے کہ ان پہلوؤں پرغورکرلیناضروری ہے،تاکہ نتائج زیادہ صحیح وپائیدار نکل سکیں ان مفروضات کے بعد جناب کے قائم کردہ سوالات کے جوابات کی چنداں ضرورت باقی نہیں رہ جاتی،لیکن اشکالاً ہرایک کاجواب نمبروار درج ہے۔

۱- رواہ البخاری والمسلم،مسلم مع النووی باب وجوب صوم رمضان لرؤیۃ الہلال ۲۰۵/۴۔

۲- صحیح البخاری مع الفتح ۱۲۸/۴،اورواہ أیضاً عن ابن عمر مسلم وفیہ:"لا تقدموا رمضان الخ،مسلم مع النووی ۲۰۸/۴۔

۱- اگر اس سوال کا منشاء فقط اتمام حجت یا حصول بصیرت وطمانیت قلب ہو یا یہ ہو کہ چونکہ یہ مسئلہ بین الاقوامی وعالمی سطح پر ہے اور اس میں تمام اسلامی فرقوں سے خطاب ہے، اس لئے کلام بھی ایسی ہی سطح پر ہونا چاہئے جو سب کے لئے حجت بن سکے تو یہ صحیح ہے، اسی کے پیش نظر کچھ مختصراً عرض ہے کہ صوم رمضان اسلام کی ایک بنیادی عبادت ہے۔ اسلام کے ارکانِ خمسہ میں سے ایک اہم رکن ہے: "عن ابن عمر قال: قال رسول الله ﷺ: بني الإسلام على خمس شهادة أن لا إله إلا الله وأن محمداً رسول الله واقام الصلوٰة وايتاء الزكوٰة والحج وصوم رمضان"(۱)۔

قرآن عزیز نے اس کو ایک خاص انداز میں بیان فرمایا۔ ارشاد ہے:

"يا أيها الذين اٰمنوا كتب عليكم الصيام كما كتب على الذين من قبلكم لعلكم تتقون أياماً معدودات"(۲)۔

اس آیت کریمہ میں اس طرف بھی اشارہ ہوسکتا ہے کہ جس طرح بعض امم سابقہ نے حکم کے اندر تقدیم وتاخیر وغیرہ کی خرابیاں پیدا کردیں تو تم ویسا ہی مت کرنا۔ پھر اس کی فرضیت کو قمری مہینہ رمضان مبارک کے اندر منحصر فرما کر کس انداز سے تعبیر فرمایا گیا ہے: "شهر رمضان الذى أنزل فيه القراٰن هدى للناس وبينٰت من الهدىٰ والفرقان فمن شهد منكم الشهر فليصمه"(۳)۔

ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ ماہ مبارک اور اس کے روزے اور قرآن عزیز میں آپس میں ایک خاص ربط وتعلق ہے۔ اور اس کا ملحوظ رکھنا مطلوب شرعی ہے۔ اور اس لحاظ رکھنے پر کچھ خاص برکتیں اور ہدایتیں مضمر ہیں، پھر مطلوب کی تحصیل اور اس کے امتثال کی ترغیب بھی ہے۔

بلکہ ان تمام چیزوں کے حاصل کرنے کا طریقہ بھی خود بطور دلالت النص اور ماسیق الکلام لاجلہ کے فائے تفریعیہ یا تعقیبیہ لاکر "فمن شهد منكم الشهر فليصمه"(۴) سے عبارت النص منصوص فرمادیا گیا۔ کہ جو شخص تم میں سے اس مہینہ کا مشاہدہ کرے (چاند دیکھ لے) اور موجود ہے تو اس کے لئے لازم ہے کہ اس مہینہ کا روزہ رکھا کرے۔ جس کا خلاصہ یہ

۱- بخاری مع الفتح ۱/۴۹، مسلم مع النووی ۱/۱۷۸، کتاب الایمان، الفاظ بخاری کے ہیں (مرتب)۔

۲- سورۂ بقرہ: ۱۸۳۔

۳- سورۂ بقرہ: ۱۸۵

۴- سورۂ بقرہ: ۱۸۵

ہے کہ اس ماہ مبارک (رمضان) کا چاند دیکھ کر ہی روزے رکھنے شروع کئے جائیں۔ پھر اگلا چاند دیکھ کر رکھنا موقوف کیا جائے۔ ظن وتخمین یا محکمۂ موسمیات کی تحقیقات وغیرہ پر مدار نہ رکھا جائے، جیسا کہ اس سے اگلی آیت کریمہ اس کی صاف صاف وضاحت کرتی ہے۔ ارشاد ہے:

"یرید الله بکم الیسر ولا یرید بکم العسر ولتکملوا العدۃ ولتکبروا الله علی ما ھداکم" (۱)۔

لہذا اگر رویتِ ہلال کے طریقے کو چھوڑ کر کوئی اور طریقہ ثبوت رؤیۃ کا اختیار کیا جائے گا تو اس نص کے صریح خلاف ہو جائے گا۔ جو کسی طرح جائز نہ ہوگا۔ اور صحیح حدیث: **"إنا أمۃ أمیۃ لا نکتب ولا نحسب الشھر ھکذا وھکذا"** (۲)، اور حدیث: **"لا یتقدمن أحدکم رمضان بصوم یوم أو یومین"** جو شروع جواب میں گذر چکا ہے ان میں اس کی تصریح موجود ہے۔

اور ہوسکتا ہے کہ امام بخاریؒ وغیرہ محدثین نے صحاح میں ان حدیثوں کو بالخصوص انا امۃ امیۃ کی حدیث کو انہیں نکتوں کی جانب اشارہ کرنے کے لئے "بابُ الصوم" میں خاص طور سے ذکر فرمایا ہے، جیسا کہ شارح بخاری حافظ حدیث ابن حجر عسقلانی کی اس تصریح سے اشارہ ملتا ہے فرماتے ہیں: **"بل ظاھر السیاق یشعر بنفی التعلیق بالحساب أصلاً ویوضحہ قولہ علیہ السلام فی الحدیث الماضی: فإن غم علیکم فأکملوا العدۃ ثلثین ولم یقل: فاسئلوا أھل الحساب"** (۳)۔

اور حضرت ملا علی قاری "**ولا تصوموا حتی تروا الھلال**" کے تحت فرماتے ہیں: **"قال: قال رسول الله ﷺ: لا تصوموا إی یوم ثلاثی شعبان عن رحضان" کما یدل علیہ السیاق"** (۴)۔

اور حضرت حذیفہؓ کی روایت میں جس کو ابو داؤدؒ نے روایت کیا ہے صراحۃً اس کی نہی موجود ہے: **"عن حذیفۃ رفعہ: لا تقدموا الشھر حتی تروا الھلال أو تکملوا العدۃ"** (۵)۔

بلکہ بالقصد تقدیم وتاخیر یوم او یومین تو بڑی چیز ہے ماہ رمضان نہ ہونے کا شبہ (یوم الشک) ہو جب بھی صوم رمضان

۱- سورۂ بقرہ: ۱۸۵۔
۲- بخاری مع الفتح ۴/ ۱۲۶، مسلم مع النووی ۴/ ۲۰۴-۲۰۵۔
۳- فتح الباری ۴/ ۱۲۷ باب الصوم۔
۴- مرقاۃ المفاتیح ۲/ ۵۰۱۔
۵- ابو داؤد کتاب الصوم رقم الحدیث: ۲۳۲۶۔

کی شب سے روزہ رکھنے کو ممنوع اور معصیت قرار دیا ہے: **"عن عمار بن یاسرؓ قال: من صام الذی یشک فیه فقد عصی أبا القاسم ﷺ"** (۱)۔

یہ روایت اگر چہ سنداً موقوف ہے مگر سند صحیح ہے اور حکماً مرفوع ہے اس لئے ممانعت ومعصیت کا حکم، حکم رسول اللہ ﷺ ہونے میں شبہ نہیں، البتہ ہر فرد کا خود اپنا دیکھنا ضروری نہیں ہے۔ بلکہ پوری آبادی یا قوم یا علاقہ میں صرف بعض کی روایت بھی علیٰ حسب شرائط وقیود اور اس پر اعلان ہو جانا بھی کافی ہو جاتا ہے، جیسا کہ حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے معلوم ہوتا ہے۔

حاصل یہ ہے کہ پوری قوم میں محض بعض نے چاند دیکھا اور شہادت دی اور شہادت ضابطۂ شرعی کے مطابق ہے تو معتبر ہوگی اور حجت شرعی ہوگی، اولاً: اس لئے کہ شہادت کا درجہ محض تخمین وحساب کا نہیں۔

ثانیاً: اس لئے کہ آیات وروایات میں شہادت صحیحہ کو ایسا محکم اور قوی درجہ دیا گیا ہے کہ اس کے ذریعہ سے تمام حقوق کا اثبات واجراء کیا جاتا ہے، شہادت ہی پر مدار رکھ کر بڑے بڑے احوال متنازعہ میں قطعی فیصلہ ہوتا ہے۔ حدود وقصاص ورجم کا حکم نافذ ہوتا ہے۔ جان لے لی جاتی ہے۔ ہاتھ کاٹ دیئے جاتے ہیں اور یہ سب احکام قرآن عزیز واحادیث میں مصرح ومفصل موجود ہیں، البتہ قرآن مجید نے شہادت کے باب میں بھی ہم کو ایک ضابطہ کی تعلیم دی ہے اور وہی ضابطہ شہادت صحیحہ وغیر صحیحہ کا معیار ہے۔

مثلاً: جب مشہود علیہ امور دنیویہ میں سے ہو اور حقوق ناس سے متعلق ہو تو اس کے لئے ضابطۂ قرآنی یہ ہے:

"فاستشهدوا شهيدين من رجالكم فإن لم يكونا رجلين فرجل وامرأتان ممن ترضون من الشهداء" (۲)۔

اور مثلاً جب مشہود علیہ خالص امور دینیہ میں سے ہو تو اس کے لئے ضابطہ مقرر کر دیا کہ مخبر کا معتبر وثقہ ہونا بھی کافی ہے اور اس پر ذیل کی آیت کریمہ بھی دلالت کرتی ہے:

"إذا جاء كم فاسق بنباء فتبينوا" (۳)، غرض قرآن عزیز کی آیات اور اس قسم کی نصوص، نیز روایات سے اخذ شدہ ضابطے "باب الشہادۃ" میں مفصل مذکور ہیں اور ان ہی پر احکام کی بناء ہوگی، یہاں اس بحث کا نہ تو مقام ہے اور نہ

۱- رواہ الجماعۃ، مشکوٰۃ ص ۱۷۴۔

۲- سورۂ بقرہ: ۲۸۲ (مرتب)۔

۳- سورہ حجرات: ۶۔

گنجائش، فقہ کے باب الشہادۃ کا مطالعہ کافی ہے۔

صوم رمضان مبارک چونکہ خالص امور دینی میں سے ہے، اس لئے مطلع صاف ہونے میں ایک کی خبر معتبر وکافی ہوگی، جیسا کہ حدیث بالا سے ظاہر ہے، ہلال شوال کا تعلق چونکہ امور دنیا جیسے معاملات سے بھی ہوجاتا ہے، اس لئے مطلع صاف نہ ہونے کی صورت میں کم از کم حسب آیت: "واستشهدوا شهيدين الخ" (۱)، دو عادل شاہد کی شہادت کا ہونا ضروری ہے، محض حساب وکتاب یا تخمین کافی وصحیح نہ ہوگا۔

اور اس تمام گفتگو کا حاصل یہ نکلتا ہے کہ بذریعہ شہادت صحیحہ ثبوت رویت ہونے کے بعد اگر بذریعہ ریڈیو مخصوص شرعی الفاظ میں اعلان کیا جائے تو یہ اعلان بھی اپنے شرائط وقیود کے ساتھ معتبر ومفید ہوسکتا ہے، اختلاف مطالع ہو یا نہ ہو، اس لئے کہ اختلاف مطالع پر شریعت مطہرہ نے صوم رمضان کی بناء نہیں فرمائی ہے، بلکہ اگر بناء رکھی ہے تو ثبوت رویت کے اعلان پر، جیسا کہ ابھی حدیث ابن عباسؓ سے معلوم ہوجائے گا، اور وہ یہ کہ ایک اعرابی نے ہلال رمضان دیکھ کر اپنا چاند دیکھنا جناب نبی کریم ﷺ کے سامنے بیان کیا، تو جناب نبی کریم ﷺ نے اس کے مسلمان ہونے کا اعتبار کر لینے کے بعد حضرت بلالؓ سے فرمایا کہ لوگوں میں اعلان کردو کہ کل سے روزہ ہے (۲)۔

۲- جب یہ بات معلوم ہوگئی کہ مدار ثبوت وجوب صوم رمضان محض آیات وروایات اور رویت وثبوت رویت پر ہے اختلاف مطالع پر نہیں ہے تو مقصد صرف یہ ہے کہ صوم رمضان کے ثبوت ووجوب کا مدار اختلاف مطالع پر نہ ہوگا، نہ یہ کہ اختلاف مطالع کے نفس وجود وتحقیق سے انکار ہے، بلکہ اس کا وجود وتحقق تسلیم ہے، بلکہ صوم رمضان کے علاوہ اور امور دینیہ ودنیویہ میں ملحوظ بھی ہے، جیسا کہ ہم پیشتر عرض کر چکے ہیں حتیٰ کہ اوقات نماز اور حج وقربانی وغیرہ تک میں ملحوظ ومعتبر ہے، چونکہ نصوص نے ہم کو اس میں پابند نہیں کیا ہے اور یہاں پابند فرمایا ہے۔ اسی گفتگو سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ اختلاف حقیقی ہے، صرف لفظی وتعبیری نہیں ہے اور نہ یہ علماء کی شان کے لائق ہے ہر فریق کے مستدلات روایات کی جانب مستند ہیں۔ اور ہر ایک کے نتائج وثمرات اور ہر ایک کا دائرہ عمل سب الگ الگ وجداگانہ ہیں۔

دلائل کے لحاظ سے ترجیح عدم اعتبار اختلاف مطالع کے قائلین کے حق میں ہے اور وہی ظاہر الروایۃ ہے، اس لئے کہ ان کے مسلک کے مطابق نصوص صحیحہ وصریحہ پر عمل کرنا دوسروں کے اعتبار سے زیادہ حاصل ہوتا ہے، گویا ان کا قول نصوص کی ترجمانی ہے۔

۱- سورہ بقرہ: ۲۸۲۔

۲- مشکوۃ شریف۔

۳-سابق معروضات سے ہی یہ معلوم ہوگیا کہ توحید اہلہ کی یہ تجویز کوئی شرعی مقصد نہیں ہوسکتا اور نہ وحدت ملت اس پر موقوف ہے اور نہ اس کے ضمن میں کسی خدمت دینی کی تکمیل یا تحصیل ہی مضمر ہے، اگر ایسا ہوتا تو بمقتضائے آیت کریمہ: "اليوم أكملت لكم دينكم وأتممت عليكم الخ"(۱)، دربار رسالت سے براہِ راست یا پھر قرون مشہود لہا بالخیر سے کوئی نہ کوئی اشارہ وغیرہ ضرور ملتا جب ایسا نہیں ہے تو اس کو ضروری و لازم قرار دینا درست و مشروع نہ ہوگا۔ اور مذہبی حیثیت دے کر وجود میں لانا احداث فی الدین کے مترادف ہوگا۔ اور حسب تصریح امام دینی امور میں حرج اور تنگی ڈالنے کے بھی مترادف ہوگا۔

اور ان سب چیزوں سے قطع نظر اور بر تقدیر تسلیم اگر ثبوت ہلال کا مدار شرعی شہادت سے ہٹ کر کسی حساب یا محکمۂ موسمیات کی تحقیقات وغیرہ پر رکھا گیا تو نصوص و روایات مقدمہ کے صریح خلاف ہونے کی وجہ سے نا قابل قبول، بلکہ واجب الرد ہوجائے گا، فقہائے محققین کی مندرجہ ذیل تصریحات سے اس کی تائید ہوتی ہے:

"ولا عبرة بقول المؤقتين ولو عد ولاً على المذهب" (۲) "وتحته في الشامي:"بل في المعراج: لا يعتبر قولهم بالإجماع ولا يجوز للمنجم أن يعمل بحساب نفسه وفي النهر فلا يلزم بقول المؤقتين إنه أي الهلال يكون في السماء ليلة كذا، وإن كانوا عدولاً في الصحيح كما في الإيضاح"(۳)۔ پھر ایک سطر کے بعد فرماتے ہیں:"ما قاله السبكي رده متأخرو أهل مذهبه" پھر چند سطر کے بعد فتاویٰ شہاب رملی الکبیر شافعی سے ایک طویل بحث نقل کرتے ہوئے فرماتے ہیں:"لأن الشهادة نزلها الشارع منزلة اليقين وماقاله السبكي مردود ردّه عليه جماعة من المتأخرين"(۴)۔

اور اگر مدار ثبوت شرعی شہادت ہی پر رکھا جائے جب بھی نشریہ مشتہرہ دوسرے مقامات میں پہنچے گا تو وہاں کے لئے وہ نشریہ شہادت نہیں بن سکے گا۔ کیونکہ غائبانہ شہادت متحقق ہی نہیں ہوتی۔ ''كما هو ظاهر ومبرهن في مقامه ''بیش از اخبار کے درجہ میں ہوگا جیسے طبل قاضی و صورت مدافع یا قنادیل منارہ کی حیثیت میں قرار دے کر اعلان کے درجہ میں ہوگا۔ قاضی کا نقارہ یا توپ کی آواز یا منارہ کی روشنی اس صورت میں بھی ان دونوں کے صحت و اعتبار کے لئے کچھ شرائط و قیود ہیں

۱- سورۂ مائدہ:۳۔
۲- درمختار۔
۳- ردالمحتار (الشامی) ۲/ ۹۲۔
۴- حوالہ سابق۔

جس کی کچھ تفصیل مضمون منسلکہ میں مذکور ہے اگر ان شرائط وقیود کا پورا پورا لحاظ بھی کرلیا جائے تب بھی کسی مقام پر عمل کرنے والوں کے حق میں مہینہ ۲۹/۳۰ دن کا ہونے کے بجائے ۲۸/یا ۳۱ دن کا ہو رہا ہو تو صریح نصوص وروایات کے خلاف ہونے کی وجہ سے اس پر عمل کرنا درست نہ ہوگا ہاں جن کے یہاں عمل کرنے سے مہینہ ۲۸ دن یا ۳۱ دن کا نہ ہو رہا ہو بلکہ ۲۹ یا ۳۰ دن کا محفوظ و باقی رہتا ہو صرف ان کے وہاں درست رہے گا۔اور حجاز مقدس و دوراز مقامات کی بنیاد پر نشریہ مشتہر کرنے میں ہندو پاکستان میں مہینے کا تحفظ ۲۹ یا ۳۰ دن میں غیر ممکن نہیں تو مشتبہ ضرور ہے۔بلکہ اس کا عدمِ تحفظ ظاہر ہے۔جیسا کہ سوال میں خود بھی مذکور ہے۔اس لئے اس تقدیر پر احناف کے لئے ایک ایک دن اور بسا اوقات دو دو دن کا فرق ہونے کی وجہ سے توحیدِ اہلہ پر عمل کی گنجائش نہ ہو سکے گی۔بلکہ ان تمام ملکوں میں عمل کرنا جائز نہ ہوگا۔جہاں مہینہ ۲۹/یا ۳۰ دن کا محفوظ نہ رہتا ہو،فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی،مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

رویت ہلال کمیٹی کے فیصلہ کی شرعی حیثیت اور اس کے حدود:

رویت ہلال کے متعلق مفصل فتویٰ باعثِ شرف اندوزی ہوا احقر مطالعہ سے مستفیض ہوا،آپ حضرات کی جدوجہد مستحق صد تحسین ہے۔جزاکم اللہ عنا وعن سائر المسلمین،خیال ہے کہ اس کو طبع کرا کر حضرات علماء کی خدمت میں تصدیق کے لئے بھیجا جائے،ان کی تصدیق حاصل ہو جائے گی تو ایک متفق علیہ فتویٰ ہو جائے گا،مگر معاف فرمائیے اس کے ایک حصے میں وضاحت کی ضرورت تھی،وہاں ابہام رہ گیا مہربانی فرما کر اس ابہام کو رفع فرمائیں،اس فتویٰ کا سب سے آخری فقرہ یہ ہے۔

”یا مثلاً اس طرح انتظام کر دیا جائے کہ ہلال کمیٹی جس کے سب ارکان باشرع ہوں اور اس میں ایک مستند او رتجربہ کار مفتی شریک ہو اور وہ کمیٹی اپنے انتظام میں رویتِ ہلال کا شرعی ثبوت حاصل کر کے حکومت سے اجازت لے کر،بایں الفاظ اعلان نشر کردے کہ ہم فلاں ہلال کمیٹی کے تمام افراد رویت ہلال کا شرعی ثبوت ملنے کے بعد باتفاق آراء اعلان کرتے ہیں کہ رویت ہلال کا شرعی ثبوت ہو چکا ہے اور کل یکم رمضان ہے اور روزے رکھے جائیں گے یا کل یکم شوال ہے نماز عید ادا کی جائے گی، پھر اسی طرح ہلال شعبان،ذی الحجہ وغیرہ کے لیے اعلان کر دیا جائے،اگر ضرورت پڑے تو جہاں جہاں اس قسم کے ریڈیو وغیرہ کے مراکز ہوں اس قاعدۂ مذکور کے مطابق انتظام کرلیا جائے۔“ آخری لفظ ”اور پھر سب کو ایک میں منسلک کر دیا جائے۔“ وضاحت طلب ہیں۔جو بھی وضاحت ہو اس میں اس کا خیال رکھا جائے کہ دہلی۔کلکتہ۔بمبئی۔مدراس وغیرہ کو ایک

سلک میں منسلک کرایا جائے اور کیا اس مختصر وقت میں اس انسلاک پر عمل کرنے کی بھی کوئی صورت ہوسکتی ہے؟ اس فقرہ کے پیش نظر چند سوال درج ذیل ہیں:

سوال ۱۔ دلی میں رویت ہلال کمیٹی ہے اس میں زیادہ تر علماء کرام ہیں کہ ان کو تجربہ کار مفتی کہا جاسکتا ہے۔ یہ کمیٹی اگر انتظام کردے کہ اس کے فیصلے کی اطلاع آپ کے پیش کردہ شرائط کے بموجب دہلی ریڈیو سے ہوجائے تو ہندوستان میں جہاں جہاں یہ خبر پہنچے گی تو کیا وہاں کے مسلمانوں کے لئے جائز ہوجائے گا، کہ اسی خبر پر عمل کرکے عید منالیں یا اس کا کوئی حلقہ نہیں ہے اور پورے ہندوستان کے لئے کافی ہے تو آپ کے "اس قسم کے مرکز ہوں تو ہر جگہ اس قاعدہ کے مطابق انتظام کیا جائے" الخ" اور اگر حلقہ ہے" تو کیا ہے اس کی حدود کیا ہیں؟

۲-اس وقت یہ کمیٹی صرف اہل دلی کی ہے، اس لئے احقر کے خیال میں اس کا فیصلہ اہل دلی کے لئے واجب العمل ہوگا، اہل دلی کے علاوہ اور جگہ جہاں اس فیصلے کی خبر پہنچے گی اس کی حیثیت ایک خبر کی ہوگی اس پر عمل کرنا ضروری نہیں ہوگا، لیکن اگر ایسی شکل بن جائے کہ کمیٹی پورے ہندوستان کی نمائندہ کمیٹی مان لی جائے تو اس کی طرف سے جو اعلان ہوگا وہ پورے ہندوستان کے لئے قابل قبول ہوگا یا نہیں؟

۳-اگر حکومتِ ہندوستان یا کوئی اس کا مسلمان وزیر جس کا تعلق اوقاف وغیرہ امور مذہبی سے ہو وہ چند مستند تجربہ کار مفتی صاحبان کی کمیٹی بنائے اور اعلان کردے کہ یہ کمیٹی پورے ہندوستان کے لئے ہے تو اگر اس صورت میں یہ کمیٹی فیصلہ کردے اور آپ کی تحریر کردہ شرائط کے بموجب اعلان کردے کہ اس کمیٹی کے جملہ افراد نے رویتِ ہلال کا ثبوت شرعی ملنے کے بعد باتفاق آراء فیصلہ کیا ہے کہ رویت ہلال کا شرعی ثبوت ہوچکا ہے تو کیا اس صورت میں اس کمیٹی کا اعلان ہندوستان کے ہر ایک مسلمان کے لئے قابل تسلیم ہوگا؟ اور ہندوستان کے مسلمان جہاں بھی ہوں ان کے لئے جائز ہوگا کہ اس اعلان کے بموجب اپنے یہاں یکم شوال یا یکم رمضان تسلیم کرلیں؟

۴-کیا کمیٹی کے تمام ارکان کو ریڈیو اسٹیشن پہنچ کر اعلان کرنا ہوگا، ریڈیو والے تو اس کی اجازت نہیں دیں گے، اور غالباً یہ ممکن بھی نہیں ہوگا کہ سب ارکان بولیں۔ تو کیا یہ جائز نہ ہوگا کہ کمیٹی کا ایک ذمہ دار فرد، مثلاً صدر خود اعلان کرے یا کمیٹی کی طرف سے تحریر جائے اور وہ سنا دی جائے، اس کے الفاظ یہ ہوں گے کہ فلاں مقام کی رویت ہلال کمیٹی نے شرعی ثبوت ملنے کے بعد باتفاق آراء فیصلہ کیا ہے کہ کل فلاں دن یکم رمضان ہے اور روزے رکھے جائیں گے۔ یا الخ

مولانا محمد میاں

الجواب وباللہ التوفیق:

گرامی نامہ نے شرف صدور بخشا، عزت افزائی کا شکریہ، شائع کرانے کے سلسلہ میں جیسا جناب کا خیال ہے ہمیں اس سے اختلاف نہیں ہم نے تو خود عرصہ ہوا ''ماہنامہ دارالعلوم'' میں شائع کرنے کے لئے دیا ہے، مگر اب تک شائع نہیں ہوسکا، انسلاک سے یہ مقصد نہیں ہے کہ ریڈیو کے تمام مراکز کی ایک کمیٹی بنادی جائے، بلکہ مقصد صرف اتنا ہے کہ جس طرح مثلا دہلی میں شرعی قیود وشرائط کے مطابق ہلال کمیٹی قائم ہے، اسی طرح اور جگہ بھی جہاں جہاں ریڈیو اسٹیشن ہوں، شرعی ہلال کمیٹی بنادی جائے اور اس کے ذریعہ آپس میں ایسا ارتباط قائم کرلیا جائے جس سے ایک دوسرے کو اعتماد حاصل ہوجائے، اور کبھی کبھی حسب ضرورت وموقعہ شرعی ہلال کمیٹی کا ایک ایک دو دو نمائندہ لے کر اجتماع کرلیا جائے اور کوئی نئی پیش آمدہ بات ہوتو اس میں تبادلہ خیالات کر کے حتی المقدور یک جہتی حاصل کرلی جایا کرے، اس کے علاوہ بھی اس میں چند فوائد پیش نظر ہیں:

۱-مثلاً جب ہر مرکز ریڈیو سے شرعی اصول وضابطے کے مطابق اعلان یا خبر نشر ہونے لگے گی تو ہر طرح کی افواہوں اور غیر مصدقہ خبروں کی اشاعت کا سلسلہ خود بخود بند یا کم ہوجائے گا، یا کم از کم بے اثر ضرور ہوجائے گا اور عوام الناس اکثر ان الجھنوں سے محفوظ ہوجائیں گے جن میں آج کل عموماً مبتلا ہوجاتے ہیں اور آئندہ مزید ابتلاء کا اندیشہ ہے۔

۲-پورے ملک کے ہر گوشے میں رویت ہلال ممکن ہے اور ہر گوشے سے صرف ایک مقام کی شرعی ہلال کمیٹی تک شرعی اصول وضابطہ کے مطابق اطلاعیں پہنچانا دشوار ہوگا، اور جب ہر مرکز پر معتبر شرعی ہلال کمیٹی ہوگی تو اپنے قریب تر مقام کی شرعی ضابطہ واصول کے تحت اطلاعات پہنچانے اور تحقیق کرنے میں آسانی ہوجائے گی اور آپس میں رابطۂ اعتماد ہونے کی بنا پر اس کی تائید وتوثیق حدود مذکورہ میں، نیز جس مقام تک ان شرعی قیود وشرائط کے مطابق اطلاعات پہنچیں، جن کی تفصیل پورے مضمون میں جابجا کی گئی ہے، بآسانی وہ اطلاعات قابل قبول ہوسکیں گی، اس سے بھی بہت حد تک عوام تشویش وافتراق سے محفوظ رہ سکیں گے۔

اس گزارش کے بعد اب پیش کردہ سوالات کے جواب کی چنداں ضرورت باقی نہیں رہتی، لیکن امتثال امر اور مزید سد طمانیت قلب کی خاطر ہر سوال کے جواب نمبر وار مذکور ہیں۔

۱-ریڈیو کی بعض اطلاعات اعلان کے درجہ میں ہوں گی جن کی طرف ہم مسئلہ ۱-۲ میں اشارہ کرچکے ہیں، اور بعض اطلاع محض خبر کے درجہ میں ہوں گی، جن کی طرف ہم مسئلہ ۳-۴ میں اشارہ کرچکے ہیں۔

بہر حال جب کوئی اعلان یا کوئی خبر شرائط و قیود شرعیہ مذکورہ کے مطابق ہوگی تو پورے ہندوستان کے لئے عمل کے واسطے کافی ہو سکے گی، جس فاصلہ تک اختلاف مطالع کی بحث نہیں آتی، جس کی مقدار بعض روایات فقہیہ کی بناء پر پیدل کی مسافت سے ایک ماہ کی مسافت ہے جو چار سو اسی میل (انگریزی میل سے) دور نہ ہوگی، بلا اختلاف رائے قابل قبول عمل ہو سکے گی، اور اس کے بعد والوں کے لئے بھی ان علماء کے قول کے مطابق جن کے نزدیک ظاہر روایات اور مفتی بہ قول کے تحت اختلاف مطالع معتبر نہیں قابلِ قبول و قابلِ عمل ہو سکے گی، بشرطیکہ اس اعلان یا خبر پر عمل کرنے کی وجہ سے ان کا مہینہ ۲۹ر دن یا ۳۰ر دن ہونے کے بجائے ۲۸ دن یا ۳۱ دن کا نہ ہو رہا ہو، جیسا کہ ہم اپنے جواب ا، ۲ میں وتنبیہہ ۲ میں ذکر کر چکے ہیں، اس لئے کوئی حد یا حلقہ متعین کرنے کی ضرورت نہیں، ورنہ ہر مرکز ریڈیو پر شرعی ہلال کمیٹی بنانا ہی بے سود ہوگا۔

۲- اگر ایسی شکل نہ بھی بنے کہ یہ شرعی کمیٹی پورے ہندوستان کے لئے نمائندہ کمیٹی تسلیم کر لی جائے، جب بھی اس کا اعلان یا خبر جو شرعی ثبوت کے ساتھ ہوگی وہ دہلی والوں کے لئے اور مضافات والوں کے لئے اس فاصلے تک جہاں تک اختلاف مطالع کی بحث نہیں پیدا ہوتی یکساں قابلِ عمل و قابل قبول رہے گی، اور اس کے بعد والوں کے لئے ان علماء کے قول کے مطابق جن کے نزدیک اختلاف مطالع معتبر نہیں اس مذکورہ شرط کے ساتھ قابل عمل و قابل قبول رہے گی جس کا ابھی اوپر ذکر ہوا علی سبیل التسلیم اور اگر ایسی شکل بن جائے کہ یہ شرعی کمیٹی پورے ہندوستان کے لئے نمائندہ کمیٹی تسلیم ہو جائے جب بھی اس کے اعلان یا خبر کا حجت صحیح ہونا ظاہر ہے۔

۳- چند مستند و تجربہ کار مفتی صاحبان کی شرعی ہلال کمیٹی بنانے اور اعلان کرنے کے لئے تو کسی مسلمان وزیر یا حکومت کی قید یا شرط نہیں ہے، بلکہ بعض ذی رائے مسلمانوں کی رائے سے بھی ہو سکتی ہے، پس اگر حکومت یا وزراء کا تعاون حاصل ہو جائے تو حدود شرعی کے اندر اس میں بھی کوئی مضائقہ نہیں، اور اگر ایسی صورت ہو جائے کہ حکومت کی جانب سے شرعی قاعدے کے مطابق رویت ہلال کمیٹی کا ثبوت حاصل کر کے اعلان کرنے کا قانون و انتظام ہو جائے یا کسی مسلمان حاکم، یا مسلمان وزیر کو، خواہ وہ وزیر امور مذہب سے متعلق ہو یا نہ ہو، حکومت کی جانب سے شرعی قاعدے کے مطابق ثبوت رویت ہلال حاصل کر کے اعلان کرنے کا اختیار ہو جائے تو یہ اور عمدہ بات ہوگی بشرطیکہ حدود شرعی کے اندر ہو، جیسا کہ ہم جواب ۱، ۲ میں وضاحت کر آئے ہیں۔

۴- کمیٹی کے تمام ارکان کا ریڈیو اسٹیشن پر پہنچ کر اعلان کرنا ضروری نہیں ہے، بلکہ کمیٹی کا محض ایک ذمہ دار فرد بحیثیت معلن اعلان کر دے یا کمیٹی اپنی طرف سے ایک متفقہ تحریر لکھ کر دیدے جس کے الفاظ وہی ہوں جس کو جناب نے لکھا

ہےاور وہ تحریر سنادی جائے تو یہ بھی کافی ہے،واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی،مفتی دارالعلوم دیوبندسہارنپور ۱۴/۷/۱۴۰۹ھ
الجواب صحیح:مفتی سیداحمد علی سعید،مفتی محمودغفرلہ

تذئیل:ادارہ مباحث فقہیہ دہلی کے شائع کردہ استفتاء کاجواب

الجواب وباللہ التوفیق:

تعارفی کلمات کے اخیر میں مذکور ہے کہ تجویز کے زیر عنوان جولکھاہے اس کی طرف خاص توجہ کی ضرورت ہے،اس استفتاء ثانی کے جواب میں مطمح نظر یہی جزئیات ہیں پھر صفحہ(ل) کے نوٹ میں درج ہے کہ اس کی تصدیق یا تردید فرمائیں۔ پھر استفتاء ثانی کے ابدائی اجزاء کے متعلق ہم اس کے جواب میں کچھ لکھ چکے ہیں،اس لئے بغیر اختصار اس وقت صرف انہیں مشارالیہ امور سے متعلق کچھ معروضات ہیں:

تجویز<u>۱</u> کے سلسلے میں یہ عرض ہے کہ نفس اختلاف مطالع کے وقوع سے تو بیشک کسی کو انکارنہیں ہے اور نہ ہی ہوسکتا ہے اور یہ بالکل کھلی چیز ہے،البتہ جو کچھ اختلاف ہے وہ صرف اس میں ہے کہ رویت ہلال کا شرعی حکم ثابت ہونے میں اختلاف مطالع کو دخل ہے یا نہیں؟

ظاہر الروایۃ میں اور جمہور امت کے علماء محققین کے نزدیک،خواہ کسی مجتہد کے مکتب خیال سے متعلق ہوں!اس ثبوت کامدار اختلاف مطالع پر نہیں ہے، بلکہ حسب قاعدہ شرع براہ راست رویت پر یا رویت کی شہادت پر حسب ضابطہ اس کے اعلان واخبار پر ہے،جیسا کہ ہم اپنی سابق دو مفصل تحریروں(توحیدابلہ)اور(ریڈیو ٹیلیفون وغیرہ کے ذریعہ اطلاعات کا شرعی حکم)میں تفصیل کے ساتھ اس پر مدلل کلام کر چکے ہیں،لہذا اس وقت گفتگو اسی نہج (مبنی برظاہر الروایۃ)پر ہونی چاہئے ،اور اگر ثبوت رویت ہلال کا مدار ظاہر الروایۃ سے ہٹ کر اختلاف مطالع پر رکھ دیا جائے تو مسئلہ کی پیچیدگیاں ختم نہ ہوں گی، بلکہ اور بڑھ جائیں گی اور عمل میں سہل کاری کے بجائے اور طرح طرح کی افراتفری اور دشواریاں پیدا ہوجائیں گی اور جس الجھن وپریشانی میں آج قوم مبتلا ہے اور جس کے تدارک کی تدبیر سوچنے کے لئے ہم اکٹھا ہورہے ہیں،اس سے بھی کہیں زیادہ الجھاوے اور خرابیاں سامنے آجائیں گی۔

پہلی خرابی: اختلاف مطالع کی حد مثلا پانچ سو(۵۰۰)میل مقرر کر دی گئی ہے اور اس کے مطابق ڈھاکہ سے

رویتِ ہلال کا اعلان ہوا۔ ڈھاکہ سے کلکتہ، پانچ سومیل کے اندر ہے، وہاں وہ حکم جواس اعلان میں تھا نافذ ہوا، لیکن الہ آباد، بنارس مثلاً ڈھاکہ سے پانچ سو(۵۰۰) میل کے بعد اور زیادہ دور ہے۔ وہاں یہ حکم شرعی نافذ نہ ہوگا تو اب فرض کیجئے ادھر دہلی سے بھی رویت شرعی کا اعلان ہوا اور قاعدہ مسلمہ کے تحت اس کا حکم بھی صرف پانچ سومیل تک نافذ ہوگا۔ اور الہ آباد (بنارس کی دوری دہلی سے پانچ سومیل سے زائد ہے، اس لیے پانچ سومیل کے اندر اندر اس اعلان کا بھی حکم وہاں نافذ نہ ہوگا، تو اب یہ نتیجہ ہوگا کہ دہلی و اطراف دہلی میں تمام عید یا رمضان (۵۰۰) میل کے اندر اندر رہوگا، اسی طرح کلکتہ و ڈھاکہ و پٹنہ اور صرف درمیان میں کچھ دور عید نہ ہوگی نہ رمضان تو ذرا خود خیال فرمائیے کہ اس علاقہ میں عوام کے اندر اس سلسلہ میں کیا کیا اور کتنا کچھ خلفشار و ہنگامہ ہونے کا خطرہ یا ظن غالب ہے۔

دوسری خرابی: اختلاف مطالع کی یہ تحدید ظاہر ہے کہ منصوص تو نہیں ہے، بلکہ مبنی بر حساب وقیاس ہے۔ تو پھر اس پر عبادات جیسے فریضہ کے وجوب وسقوط کا مدار کیسے رکھا جاسکتا ہے۔ مثلاً فرض کیجئے کلکتہ سے ہلال رمضان کے ثبوت کا شرعی اعلان ہوا اس کے مطابق پانچ سو(۵۰۰) میل تک کے لوگوں کو روزہ رکھنا فرض ہوگیا اور اس کے بعد والوں کو ناجائز ہوگا، یا مثلاً ہلال عید کے ثبوت کا یہی شرعی اعلان کلکتہ سے ہوا تو پانچ سومیل تک (مثلاً لکھنؤ تک) کے لوگوں پر روزہ رکھنا حرام اور عید منانا فرض ہوجائے گا اور اس کے مطابق جیسے (شاہجہاں پور وغیرہ) کے لوگوں پر روزہ رکھنا فرض اور عید منانا حرام کیا جائے گا۔

یہ فرض وحرام کا حکم کس نص کے ذریعہ سے ہوگا، اس حکم کا استناد کس نص کی جانب ہوگا، جبکہ یہ تحدید محض قیاسی وحسابی ہے۔

اگر کہا جائے کہ "لکل بلد رؤیتھم" اس کا مستند ہوگا تو اول تو یہ نص شارع نہیں ہے، نہ حقیقۃً نہ حکماً، بلکہ فہم راوی ہے، حتی کہ فہم ابن عباسؓ بھی ہونا اس کا ضروری نہیں ہے، پھر ایسے حکم کی بنیاد اسی چیز پر کس دلیل شرعی سے ہوسکے گی، اور اس قول (لکل أھل بلد رؤیتھم) نص کو بھی تسلیم کرلیں جب بھی اہل کلکتہ اور اس کے توابعات تو اس کا مصداق ہوسکیں گے، لیکن لکھنؤ تک کے تمام شہر جو کلکتہ سے سیکڑوں میل دور دراز ہوں گے اور قطعاً کسی نوع سے توابعات کلکتہ نہ ہوں گے وہ اس کے مصداق کس طرح ہوں گے؟ اگر کہا جائے کہ اعلان کی وجہ سے یہ سیکڑوں بلاد اس نص کے مصداق ہوگئے کہ یہ اعلان ان تک پہنچ رہا ہے تو بعینہ یہی سوال اور یہی جواب اعلان اور سننے کی بات لکھنؤ والوں سے بعد والوں کے لئے بھی ہے، تو اب ذرا ہونے والے خلفشار کا اندازہ کیجئے بالخصوص جب کلکتہ اور دہلی دونوں جانب سے یہ اعلانات یکساں ہو رہے ہیں۔

تیسری خرابی: اس سے مثلاً پانچ سومیل کی تحدید کا کیا مفہوم ہے؟ آیا مقام رویت سے ہر طرف پانچ پانچ سومیل یا ہر طرف سے صرف ڈھائی سومیل یا محض ۵۰۰ میل مربع ان ہر سہ تقدیرات پر تفریعات علیحدہ علیحدہ اور آپس میں متضاد ہوں گی، مثلاً اگر پانچ سو مربع لیا جائے تو قطر ڈیڑھ سو پونے دوسومیل سے زائد نہ ہوگا، جس کا حاصل یہ ہوگا کہ صرف ۱۵۰ یا ۱۷۵ میل ہی پر مطلع بدل جائے، حالانکہ کوئی اس کا قائل نہیں اور اگر ڈھائی سومیل ہر طرف لیا جائے تو بھی لازم آئے گا کہ دو سو پچاس میل کے بعد ہی مطلع بدل جائے، حالانکہ کوئی اس کا بھی قائل نہیں، اور اگر ہر طرف ۵۰۰ میل لیا جائے، جیسا کہ ظاہر اور متبادر ہے تو اس صورت میں مثلاً لکھنو سے رویت ہلال کے شرعی ثبوت کا اعلان ہوا، تو یہ اعلان لکھنو سے ۵۰۰ میل پچھم دہلی تک اور ۵۰۰ میل پورب کلکتہ تک تمام مقامات کو یکساں شامل اور تمام مقامات کے لئے ثبوت رویت کا یکساں موجب ہوگا، اور اس تقدیر پر کلکتہ سے دہلی تک کا ایک مطلع ہونا لازم آجائے گا جو اپنے مفروض کے خلاف ہوگا۔

چوتھی خرابی: نیز یہ خرابی بھی لازم آئے گی کہ مثلاً جب دہلی سے رویت ہلال کا شرعی ثبوت تسلیم ہو جائے گا تو اس سے پورب سمت میں ۵۰۰ میل کے بعد بھی جتنے مقامات ہوں گے ان سب کے مطلع میں چاند کا ہونا لازمی ولابدی ہوگا۔ اور پورب سمت کے کسی مقام میں اختلاف مطالع کا سوال ہی نہ ہوگا کہ ان میں رویت کا حکم نہ دیا جائے، پھر کس دلیل شرعی سے اس پورب سمت میں بھی ۵۰۰ میل کے بعد عدم رویت اور عدم صوم یا فطر کا حکم دیا جائے گا۔

اس لئے کسی مقدار (۵۰۰ میل یا ۸۰۰ میل وغیرہ) کی تحدید سے پہلے ان احتمالات ثلاثہ کی تعیین وتشریح اس طرح ضروری ہے کہ یہ عائد شدہ اشکالات مرتفع رہیں، ورنہ پھر جو تشتت وافتراق وخلفشار امت میں رونما ہوگا۔ اس کی خرابی احاطہ بیان سے باہر ہے۔

پانچویں خرابی: ظاہر ہے کہ مطلع کا اختلاف آفتاب کی حرکت سے پیدا ہوتا ہے اور اسی کے تابع ہوتا ہے جس نوع کی حرکت آفتاب کی ہوگی اسی نوع کا اختلاف مطلع ہوگا، پس جب حرکت آفتاب مسلسل او رتدریجی اور ہر آن میں متجدد ہوتی رہتی ہے تو اختلاف مطالع بھی مسلسل اور تدریجی ہوتا رہے گا، بلکہ حقیقت میں ہر آن میں متجدد ہوتا رہے گا، اور پانچ سومیل مقدار کی تحدید محض انتظامی اور تخمینی ہوگی، جو محض میدانی علاقوں میں تو کچھ کام دے سکے گی، مگر پہاڑی مقامات میں یا ان مقامات میں تلال ووہاد (ٹیلے اور گڑھے) بکثرت ہوں، جیسے حواشی سمندر کے اکثر علاقے ہوتے ہیں کام نہ دے سکے گی اور قاعدہ کلی اور عام قرار دینے کی اس میں قطعی صلاحیت نہ ہوگی۔

چھٹی خرابی: اختلاف مطالع کی بنیاد پر ۵۰۰ سومیل کی تحدید یا کسی مقدار کی بھی تحدید پیچیدگیوں کو ختم کرنے والی

نہ ہوگی، مثلاً ۵۰۰ میل کی تحدید پر کلکتہ کا مطلع ۵۰۰ سومیل پر ختم ہوجائے گا، اور جو مقام کلکتہ سے مثلاً سومیل جانب مغرب میں واقع ہے، اس کا مطلع کلکتہ کے انتہا سے سومیل بعد ختم ہوگا، اسی طرح دوسومیل بعد یا تین سومیل بعد کے مقام کا مطلع دوسومیل یا تین سومیل بعد ختم ہوگا۔ وہلم جرا۔

اس مقدمہ کو ذہن میں رکھنے کے بعد اب غور فرمایئے کہ اگر کلکتہ سے سومیل پچھم کسی مقام پر رویت ہلال ہوا، اور وہاں ریڈیو اسٹیشن نہیں ہے، اس لئے اس کا اعلان کلکتہ ریڈیو اسٹیشن سے وہ تو سننے والا اس اعلان کا حکم کلکتہ سے ٹھیک ۵۰۰ سو میل پر سمجھے گا۔

حالانکہ اس رویت کا حقیقت کے اعتبار سے یہ حکم شرعی مزید سومیل بعد تک جانا چاہئے، اسی طرح اگر کلکتہ سے سو میل یا دو سومیل یا تین سومیل قبل ہی مطلع کی انتہا ہونی چاہئے، حالانکہ اس اعلان سے لوگ پورے ۵۰۰ سومیل تک سمجھیں گے اور عمل کریں گے، اور یہ غلط ہوگا، اب اگر اس اعلان میں یہ سب تفصیلات ظاہر نہ ہوں تو یہ اعلان کسی طرح قابل عمل نہیں رہے گا، چہ جائے کہ واجب العمل قرار پانے کا تصور کیا جائے اور اگر یہ سب تفصیلات اعلان میں ظاہر کی جائیں تو خیال فرمایئے عوام کی الجھنوں کا کیا حال ہوگا، اور کس طرح یہ اعلان قابل عمل بنایا جاسکے گا۔

ساتویں خرابی: اختلاف مطالع کی یہ تحدید مقام اعلان سے ہر چہار جانب پانچ پانچ سومیل ہو یا اس کا نصف نصف ہو یا صرف پانچ سومیل مربع ہو ہر تقدیر پر یہ ضابطہ اور تحدید طول البلد کے اعتبار سے اگر نافذ ہو تو عرض البلد کے اعتبار سے نافذ ہونا ضروری نہیں اور اگر دونوں کا لحاظ کیا جائے تو سمت کے اعتبار سے پانچ سومیل یا ۸۰۰ سومیل یا ۲۵۰ میل وغیرہ ہونا صحیح نہ ہوگا، بلکہ ہر جگہ اور ہر علاقہ کے اعتبار سے مختلف مقدار ہوگا، پھر یہ تحدید محض ایک کھلونا ہی نہیں، بلکہ دین میں تماشہ بنانے کے مترادف فعل ہوجائے گا۔

غرض ثبوت رویتِ ہلال کی مقدار محض اختلاف مطالع پر رکھتے ہیں تو اسی طرح کی اور بھی بہت سی خرابیاں پیدا ہوں گی اور بہت سی الجھنیں پیدا ہوں گی جن کا دفعیہ یا ان کی اصلاح قابو سے باہر ہوگی۔ اور غالباً ایسی ہی وجوہ ہوں گی جن کی بناء پر ہر طبقہ خیال کے جمہور علماء نے اختلاف مطالع پر ثبوت رویت کی بنا رکھنے کو منع فرمایا ہے، بخلاف اس کے اگر مدار ثبوت رویت بجائے اختلاف مطالع کے ظاہر روایت پر ہی رکھا جائے اور یہ کہا جائے کہ کوئی شرعی ہلال کمیٹی جس کے سب ارکان باشرع ہوں، اس میں کم از کم ایک معتمد وتجربہ کار مفتی شریک کار ہو اور رویت ہلال کا شرعی ثبوت حاصل کر کے، بایں الفاظ ریڈیو پر خود اعلان کرے، یا اپنے کسی نائب یا وکیل کے ذریعہ سے کرائے (کہ ہم رویت ہلال کا شرعی ثبوت حاصل کر کے

اعلان کررہے ہیں کہ کل صبح یوم فلاں یکم رمضان ہے روزے رکھے جائیں یا یکم شوال ہے نماز عیدالفطر پڑھی جائے) توچونکہ یہ اعلان طبل قاضی یا قندیل منارہ یا توپ وغیرہ کی طرح محض علامت ہی نہیں ہے، بلکہ اس سے قوی تر اور واضح شئی (اعلان) ہے یہ بدرجہ اولی غلبہ ظن حاصل ہونے کا سبب اور موجب ہوگا، اس لئے یہ اعلان ان تمام لوگوں کے لئے شرعاً حجت اور موجب عمل ہوگا، جن کو یہ اعلان ۲۹ شعبان یا ۲۹ رمضان کو سنائی دے اور اس عمل کرنے کی وجہ سے ان کا مہینہ ۲۸ / دن کا نہ ہورہا ہو۔

اگر وہ لوگ اس اعلان کو صحیح اور قاعدہ شرع کے مطابق جانتے اور سمجھتے ہیں تو ان پر اس کے مطابق عمل کرنا دیانۃً واجب اور ضروری ہوجائے گا، البتہ اس اعلان مذکورہ پر عمل کرنے کی وجہ سے جن لوگوں کا مہینہ ۲۸ دن کا یا ۳۱ دن کا ہونا لازم آئے تو ان کو اس اعلان پر عمل کرنا درست و نا جائز رہے گا۔

پس اگر عوام وخواص سب کے سامنے معیار عمل ثبوت صرف یہی اعلان (انہی مخصوص لفظوں میں کہ ہم رویت ہلال کا شرعی ثبوت حاصل کرکے اور انہی شرائط وقیود کے ساتھ جو بھی مذکور ہوئیں رکھ دیا جائے تو امید ہے کہ کوئی الجھن سمجھنے میں اور عمل کرنے میں نہ ہوگی، اور نہ ۵۰۰ سو میل یا ۸۰۰ سو میل یا کسی بھی مسافت کی تحدید وغیرہ کی بحث پیدا ہوگی، اور اندرون مملکت و بیرون مملکت کی تحدید کی بحث بھی پیدا نہ ہوگی، بلکہ ظاہر مذہب کے مطابق اس عبارت: "**واختلاف المطالع غير معتبر علىٰ ظاهر المذهب أي قوله) فيلزم أهل المشرق برؤية أهل المغرب إذا ثبت عندهم بطريق موجب**"(۱) کے تحت دنیا کے کسی گوشہ وحصہ سے یہ اعلان ۲۹ تاریخ کو مذکورہ بالا شرائط وقیود کے مطابق آئے اور مہینہ ۲۸ دن کا نہ ہورہا ہو تو شرعاً حجت ہوجائے گا، البتہ اس پر عمل کے نفاذ کا اختیار انتظاماً عوام کو نہ ہوگا، کما حققہ العلامۃ التھانوی فی رسالتہ "زوال السنة عن أعمال السنة" بلکہ مقامی شرعی ہلال کمیٹی کو ہوگا یا مقامی یا قریبی معتمد مفتی یا عالم کو ہوگا جو مسائل متعلقہ ضروریہ سے اچھی طرح واقف ہو جیسا کہ ہم تفصیلی جواب (ریڈیو ٹیلیفون وغیرہ کی اطلاع کا شرعی حکم) میں تفصیل سے بیان کرچکے ہیں۔

تجویز ۲ اس سلسلہ میں کچھ تو ہم تجویز ۱ میں کہہ آئے ہیں اور بعض یہ امور مزید عرض کرتے ہیں، جن کو نمبروار عرض کرتے ہیں:

● زیر عنوان "رویت ہلال کمیٹی کی تشکیل" دفعہ (ب) یہ عرض ہے کہ تشکیل اور یہ تحدید اگر اختلاف مطالع کی بنیاد پر

۱- درمختار علی ھامش الشامی ۲/۹۶۔

قائم کی گئی تو یہ سب غیر معتبر اور غیر صحیح شمار ہوگی، چہ جائیکہ واجب التسلیم ہو، اور دفعہ (د) کے تحت قولہ "صاحب بصیرت امام" اس میں امام کا مطلقا اور محض صاحب بصیرت ہونا کافی نہیں، بلکہ امام کا ان ضروری مسائل سے بھی اچھی طرح واقف ہونا ضروری ہے جو اس قسم کے معاملات سے متعلق ہوں، اور اس امام کا تنہا فیصلہ بھی محض اسی صورت میں قابلِ تسلیم ہوگا، جبکہ وہاں مستند شرعی ہلال کمیٹی موجود نہ ہو، لہذا اس میں یہ قید بھی لگانی ضروری ہے۔

● ربط ہم کے تحت (دفعہ الف تا و) جو کچھ بھی لکھا گیا ہے اس سے تقویت و تائید کا فائدہ تو بیشک حاصل ہوگا، لیکن ان میں سے کسی سے بھی یہ قوت پیدا نہ ہوگی کہ اس پر مدار ثبوت اور حکم رکھ دیا جائے تو محض اس کی بنیاد پر رویت کا فیصلہ کردیا جائے، اس لئے کہ ان میں کوئی شق بھی طرق موجبہ (**شهادة علی الرؤیة، یا شهادة علی الشهادة علی القضاء، یا استفاضة**) میں سے نہیں ہو رہی ہے، اور نہ ہی کتاب القاضی کے ضابطہ پر پوری اتر رہی ہے اور نہ ہی "**لو کان ببلدة لا حاکم فیها صاموا بقول ثقة وأفطروا بأخبار عدلین للضرورة**"(۱) کے قاعدہ میں داخل ہو رہی ہے کہ مفید مطلب ہو سکے۔

ہاں اگر اس کمیٹی میں سے کوئی شخص اس ٹیلی ویژن یا ٹیلیفون سے، بایں الفاظ خبر دے کہ میں نے خود چاند دیکھا ہے یا مجھ سے فلاں شخص (اور وہ معلوم و معتبر ہو) نے مجھ سے اپنا چاند دیکھنا بیان کیا ہے اور واقعہ بھی یہی ہو کہ اس نے واقعی خود چاند دیکھا ہو، یا اس سے فلاں شخص نے خود اپنا چاند دیکھنا بیان کیا ہو، تو یہ خبر معتبر ہوگی، اسی طرح اگر کوئی ایسی شرعی کمیٹی ہو جس میں مزید تین افراد ارکان ہوں اور خبر دینے والے کے سامنے ان افراد کمیٹی نے چاند دیکھنے کی شہادت لیکر ثبوت رویت کا فیصلہ کیا ہو، اور یہ خبر دینے والا شخص خبر دے کہ میرے سامنے یہاں کی ہلال کمیٹی نے چاند کی شہادت شرعی لیکر رویت ہلال کے ثبوت کا فیصلہ دیا ہے، اور معاملہ رمضان المبارک کے چاند کا ہے، اور مطلع غبار آلود ہے تو یہ ایک خبر (ٹیلیویژن یا ٹیلیفون کی) بھی ثبوت کے لئے کافی ہو جائے گی، اور اگر مطلع غبار آلود ہو صاف نہ ہو اور چاند عید کا ہو یا کسی اور مہینہ کا ہو یا چاند رمضان ہی کا ہو مطلع صاف ہو اور غبار آلود نہ ہو تو کم سے کم ایسی ایسی دو خبروں کا دو ٹیلیفونوں کے ذریعہ آنا ضروری ہوگا، جو اپنی مقرر کردہ یا تسلیم کردہ شرعی رویت ہلال سب کمیٹیوں میں سے دو مختلف کمیٹیوں سے آرہے ہوں۔

اگر یہ خبریں انہی مقرر کردہ و متعینہ الفاظ میں آرہی ہیں جو متعینہ الفاظ بھی اوپر مذکور ہوئے ہیں، مگر اپنی مقرر کردہ یا تسلیم کردہ رویت ہلال کمیٹی سے نہیں آرہی ہیں، بلکہ آزاد جگہوں اور آزاد لوگوں کی جانب سے آرہی ہیں اور مطلع صاف ہے، تو

۱- درمختار کتاب الصوم ۳/ ۳۵۴ طبع دار الکتب العلمیہ بیروت لبنان (مرتب)۔

خواہ رمضان کا چاند ہو یا غیر رمضان کا مختلف مقامات سے اتنی تعداد میں آجانا ضروری ہے کہ صداقت کا ظن غالب حاصل ہو جائے اور صداقت کے غلبہ ظن حاصل ہونے کے لئے کسی تعداد کی تعیین وتحدید نہیں ہے، بلکہ شرعی رویت ہلال کمیٹی سب ارکان کی متفقہ صوابدید پر موقوف ہے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

نقل مطابق اصل طریقہ کار کی تفصیل:

۱- اس مرکزی ہلال کمیٹی کے تحت آل انڈیا ریڈیو اسٹیشن سے متعلق اور اسی طرح بھارت کے تمام ریڈیو اسٹیشنوں سے متعلق شرعی رویت ہلال کی الگ الگ سب کمیٹیاں بنادی جائیں جن کے سب افراد باشرع ہوں اور ان میں ایک مستند مفتی یا معتمد عالم بھی شریک رہے اور کل افراد کی تعداد پانچ نفر سے زیادہ نہ رہے۔

اور ان کمیٹیوں کے ذمہ یہ کردیا جائے کہ اپنے اپنے علاقہ سے رویت ہلال کا شرعی ثبوت حاصل کرنے کے بعد اپنے اپنے ریڈیو اسٹیشنوں سے، بایں الفاظ اعلان کریں کہ رویت ہلال شرعی ثبوت حاصل کر کے بہ اجازت مرکزی ہلال کمیٹی یہ اعلان کیا جاتا ہے کہ کل صبح یکم رمضان ہے، روزے رکھے جائیں، یا کل صبح یکم شوال ہے، نماز عید ادا کی جائے۔

۲- چونکہ صوبائی ریڈیو اسٹیشنوں سے جو اعلانات نشر ہوں گے ان کا پورے ملک میں پہنچنا ضروری نہیں ہے، اس لئے آل انڈیا ریڈیو اسٹیشن سے متعلق جو شرعی ہلال کمیٹی ہو وہ تمام اسٹیشنوں سے نشر ہونے والے اپنی سب کمیٹی کے اعلان کو سننے کا خود ہی انتظام والتزام اس تاریخ (۲۹) میں کریں اور جن اسٹیشنوں سے وہاں کی ہلال کمیٹی شرعی قیود وشرائط کے تحت رویت ہلال کا اعلان نشر کرے یہ کمیٹی بھی بغرض تصدیق وتکمیل یہ اعلان آل انڈیا ریڈیو سے کردے، تاکہ پورے ملک میں یکساں طور پر اعلان پہنچ جائے۔

۳- حکومت سے یہ مطالبہ کرلیا جائے کہ اس شرعی کمیٹی کے اعلان کے علاوہ اور کوئی رویت ہلال کے بارے میں حکومت نہ کرے یا اگر اپنی کسی مصلحت کی وجہ سے یہ اعلان نشر کرے تو کم از کم اس شرعی ہلال کمیٹی کے اعلان کو فوراً نشر کرادینے کا انتظام کردے، اور شرعی ہلال کمیٹی کے افراد خود یا کسی اپنے نائب سے یہ شرعی اعلان نشر کرائیں، اس نائب کا اس شرعی ہلال کمیٹی کے افراد میں سے ہونا ضروری نہیں ہے، البتہ اس کا مسلمان ہونا ضروری ہے، اس طریقہ سے یہ اعلان دیانۃً مستند ہو جائے گا۔

۴-ریڈیواسٹیشنوں کے علاوہ بھی جہاں تک ممکن ہو ہر ہر شہر وقصبہ و بڑی آبادی میں سے یہ مرکزی ہلال کمیٹی اپنی ہلال کمیٹی اس مقام کے مذہبی لوگوں کے تعاون سے قائم کراوے، اوراس کے ذمہ یہ کام کردے کہ اپنے اپنے علاقہ رویت ہلال کا شرعی ثبوت حاصل کر کے جس طرح اپنے یہاں مقامی طور پر اعلان ثبوت رویت کرے، اسی طرح اپنے قریب تر ریڈیو اسٹیشن سے متعلق شرعی ہلال کمیٹیوں کو بھی شرعی اصول وضوابط کے مطابق آگاہ کردیا جائے۔

۵-جن جن مقامات میں شرعی اعلان پہنچے گا اگر وہاں ۲۹ رتاریخ ہو اور اس اعلان پر عمل کرنے کی وجہ سے مہینہ ۲۸ دن کا یا ۳۱ دن کا نہ ہو رہا ہو تو وہاں کے لوگوں پر اس اعلان کے مطابق عمل کرنا دیانۃً ضروری ہو جائے گا، اس لئے اگر اس جگہ کوئی شرعی ہلال کمیٹی موجود ہو تو وہ کمیٹی ورنہ وہاں کا مستند مفتی یا معتمد عالم اس اعلان کی وضاحت کرادے۔

۶-جن جن مقامات میں اس شرعی ہلال کمیٹی کا اعلان نہ پہنچے وہاں کے لوگ اپنی مقامی شرعی رویت ہلال کمیٹی کی اگر یہ نہ ہو تو اپنے یہاں کے مستند مفتی یا معتمد عالم کی ہدایت کے تحت رویت کا شرعی ثبوت حاصل کر کے روزہ رکھیں۔

۷-جن جن مقامات میں شرعی ہلال کمیٹی یا مستند مفتی یا معتمد عالم وغیرہ کوئی نہ ہو تو وہاں کے لوگ اپنے کسی قریبی آبادی سے جس میں اس کا شرعی نظم ہو اس سے اپنے کو منسلک کر کے اس کی ہدایت کے مطابق عمل کیا کریں۔

۸- چونکہ یہ ضروری نہیں کہ ریڈیو اسٹیشن سے متعلق جو ہلال کمیٹیاں ہوں گی ان کے سامنے رویت ہلال کا شرعی ثبوت ہو جائے، بلکہ یہ بھی ممکن ہے کہ جہاں جہاں ریڈیو اسٹیشن اور ہلال کمیٹیاں ہوں، ان میں سے کسی مقام میں رویت نہ ہو اور ایسے مقامات میں شرعاً ثابت ہو جائے، جہاں ریڈیو اسٹیشن اور ہلال کمیٹیاں بالکل نہ ہوں، اس لئے کسی اسٹیشن سے یہ اعلان تو ہرگز نہ کیا جائے کہ رویت ہلال شرعاً ثابت نہیں۔ اول تو سکوت کیا جائے کہ کوئی اعلان ہی نہ کیا جائے اور مصلحت سے اعلان ضروری ہو تو یہ اعلان کیا جائے کہ ہمارے پاس رویت کا ثبوت نہیں پہنچ سکا ہے، لہٰذا جن لوگوں کے یہاں رویت ہلال کا شرعی ثبوت ہو چکا ہو وہ لوگ اپنے طور پر اس کے مطابق روزے رکھیں یا عید منائیں۔

۹-رویت ہلال کمیٹی کے انعقاد اور اس کے لئے انتظام یا اہتمام کا مقصد ہرگز توحید اہلہ نہیں ہے کہ سارے ملک میں شرعاً ایک ہی دن روزے رکھے جائیں، اور ایک ہی متعین دن میں سارا ملک عید و بقرعید یا شب برأت وغیرہ منایا کرے، کیونکہ یہ چیز شرعاً تو مطلوب ہی نہیں ہے اور نہ اس کا التزام ہی درست یا محمود ہوگا، بلکہ یہ چیزیں منشاء شرع اور شارع علیہ السلام کے خلاف ہیں، جیسا کہ ہم اپنے رسالہ توحید اہلہ میں تفصیل سے کہہ چکے ہیں۔ اس انتظام اور اہتمام کا مقصد صرف یہ ہے کہ ریڈیو، ٹیلیفون وغیرہ سے آواز اور غیر شرعی خبروں اور طرح طرح کی اطلاعات اور نشریات کی وجہ سے غلط

طریقے پر جو روزے رکھے جاتے ہیں یا عید منائی جاتی ہے، نہ ہونے پائے، کیونکہ یہ چیز جائز نہیں ہے اور اس سے روزہ اور نماز عید و بقر عید جیسی اہم عبادتیں خراب اور تباہ ہو جاتی ہیں، اور مزید گوناگوں پریشانیاں اور تباہیوں کا مورث ہوتی ہیں، اس طرح عوام ان عام اطلاعات و نشریات کی وجہ سے جو تشویشات اور الجھنیں پیدا کر کے نزاع و فساد کا سبب بن جاتے ہیں، ان کا بھی فی الجملہ انسداد ہو سکے کہ یہ چیزیں شرعاً ناجائز ہونے کے ساتھ ساتھ نہایت معیوب اور شرمناک الیہ بھی ہوتا ہے۔

۱۰-ان مسائل اور طریقہ کار او ر دستور العمل کی پوری ملک میں ہر جگہ ہر وقت خوب اشاعت و تشہیر کی جائے اور پمفلٹ چھپوا کر ان ایام میں مفت تقسیم کرائے جائیں، مختلف اخبار و رسائل میں بھی ان مسائل اور طریقہ کار کی متعدد بار اشاعت کی جائے اور عوام کو آگاہ کیا جائے کہ وہ ان مسائل کو خوب سمجھ لیں اور ہر ریڈیو و ٹیلیفون کے ہر اعلان یا خبر پر توجہ نہ دیں، بلکہ شرعی اصول و ضوابط کے مطابق جو اطلاعات ملیں صرف ان کے مطابق عمل کریں، مثلاً اس شرعی ہلال کمیٹی کی جانب سے شرعی ثبوت کے بعد ان مخصوص شرعی الفاظ میں (کہ رویت ہلال کا شرعی ثبوت حاصل کرنے کے بعد اعلان کیا جاتا ہے) جو اعلان نشر ہو فقط اس کی اتباع کریں یا اپنے یہاں کی مقامی شرعی ہلال کمیٹی یا اپنے مفتی یا معتمد عالم کی ہدایت کے مطابق عمل کریں اور خوب سمجھ لیں کہ یہ احکامات و انتظامات شرعی ہیں، لہذا اپنے طور پر خود رائی سے کوئی عمل نہ کر بیٹھیں ایسا کر بیٹھنا شرعاً درست نہ ہوگا، بلکہ نیکی اور نیک کام و عبادت برباد کرنے کے ہم معنی ہوگا۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۴/۹/۹۱ ۱۳ھ

مرکزی رویت ہلال کمیٹی کے لائحہ عمل کے سلسلہ میں گزارش ہے کہ جناب اس کو مرتب کرنے کے لئے اپنا قیمتی وقت اس میں لگائیں! اور حسب ذیل نکات کی طرف خاص توجہ فرمائیں!

۱-رویت ہلال کی شہادت میں شاہد کا عادل ہونا:

رؤیت کی شہادت میں شاہد کی عدالت پر روشنی ڈالیں، کیا فاسق ذی مروت و ذی وجاہت کی اس سلسلہ میں شہادت معتبر ہو سکتی ہے یا نہیں؟

۲-رویت ہلال کمیٹی کے فیصلہ کی خبر جہر مستفیض ہوگی یا نہیں؟

اگر رویت عامہ اس مقصد کے لئے بنانا ہو تو شرعی کمیٹی کے فیصلہ کی خبر بذریعہ خطوط یا ٹیلیفون ملے تو اس کو خبر مستفیض کہا جا سکے گا یا نہیں؟

۳-شرعی فیصلہ کے اعلان کے لئے کیا معتمد مسلمان کا ہونا ضروری ہے؟

جبکہ ریڈیو پر رویت ہلال کے شرعی فیصلے کا اعلان علامت کے درجہ میں معتبر ہو، اعلان کنندہ کے لئے مسلم معتمد کی شرط ضروری ہے یا نہیں؟

امید کہ بہت جلد لائحۂ عمل مرتب فرما کر ارسال فرمانے کی زحمت گوارہ کریں گے، تا کہ مرکزی کمیٹی بلا کر اس کا فیصلہ لیا جا سکے۔

قاضی سجاد حسین (کنوینر، کل ہند رویت ہلال کمیٹی جمعیۃ بلڈنگ، قاسم جان، دہلی-۲)

الجواب وباللہ التوفیق:

۱-مسلمان اگر چہ فاسق ہو لیکن اگر ذی مروت و ذی وجاہت و باوقار ہو کہ جھوٹ بولنے میں اپنی توہین سمجھتا ہو، سبکی محسوس کرتا ہو، جھوٹ نہ بولتا ہو تو اس کی شہادت قابلِ قبول و معتبر ہو سکتی ہے (**کما فی کتاب الشهادة من الدر والبحر وغيرها**)۔

۲-ظاہر ہے کہ یہ فیصلہ شام کو بعد غروب ہوگا اور کبھی کافی دیر بعد بھی ہو سکتا ہے اور محض چند گھنٹہ بعد صبح سے ہی روزہ رکھنا یا عید منانا ہوگا اور اتنے قلیل عرصہ میں کوئی خط بذریعہ ڈاک نہیں آسکتا، البتہ دستی خطوط یا ٹیلیفون یا ریڈیو کے ذریعہ ہو سکتا ہے۔

اگر ریڈیو کے ذریعہ ہو تو اس میں وہی متعین لفظوں میں اعلان (کہ ہم شرعی ثبوت حاصل کرنے کے بعد الخ) مفید ہوگا، اور اگر دستی خطوط کے ذریعہ سے ہو تو اگر شرعی کمیٹی کا فیصلہ دوسری شرعی کمیٹی کو پہنچانا مقصود ہے اور وہ فیصلہ ہلال رمضان سے متعلق ہے تو با قاعدہ کتاب القاضی کی ایک تصدیقی تحریر ایک معتبر مسلمان کو بھی شاہد بنا کر اور اپنی مہر وغیرہ لگا کر اس شاہد کے ذریعہ دوسری شرعی کمیٹی تک بھیج دی جائے تو معتبر ہو جائے گا، اور اگر ہلال رمضان کے علاوہ کسی اور مہینہ سے متعلق ہلال کا فیصلہ ہے تو اسی تصدیقی تحریر پر دو معتبر شخصوں کو شاہد بنا کر انہی دونوں کی معرفت بھیج دی جائے، باقی ٹیلیفون میں چونکہ عام طور سے کتاب القاضی الی القاضی کی صورت نہیں بنتی، اس لئے اس سے عام طور سے صرف تقویت و تائید کا فائدہ حاصل ہو سکے گا اس پر حکم کا مدار نہ رکھ سکیں گے۔ ہاں بعض صورتیں اس میں بھی مفید ہو سکتی ہیں جس کو ہم اسی منسلک تحریر کے اخیر میں اپنے اس قول (ہاں اگر اس کمیٹی الخ) سے اخیر تک تفصیل سے پیش کر رہے ہیں۔ اسی میں دیکھ لیا جائے اعادہ میں طول کے سواء کچھ

نہیں!

۳-ریڈیو کا یہ شرعی اعلان قاضی یا قندیل منارہ یا صورتِ مدافع کی طرح محض علامت ہی نہیں ہے کہ اس پر قیاس کیا جائے، بلکہ اس سے بہت اونچی چیز ہے اور باقاعدہ اعلان ہے اور اعلان کرنے والا اس کمیٹی کا نائب یا وکیل ہوگا، پس جس طرح اس کمیٹی کے لئے کچھ شرائط وقیود ہیں اسی طرح اعلان کرنے والے کے لیے بھی کچھ شرائط ہوں گی، کم از کم اس کا مسلمان ہونا ضروری ہوگا۔ اور اس حکم کا ماٴخذ وہ احادیث ہوں گی جن میں حضور ﷺ نے کسی امر کا اعلان کرنے کے لئے یا کسی دینی کام کی تکمیل کے لئے اپنے نواب یا قائم مقام بھیجے ہیں اور بالخصوص یہ حدیث: "عن ابن عباس قال: جاء أعرابي إلى النبي ﷺ فقال: إني رأيت الهلال يعني هلال رمضان فقال: أتشهد أن لا إله إلا الله! قال: نعم، قال أتشهد أن محمدا رسول الله! قال: نعم، قال: يا بلال أذن في الناس أن يصوموا غدا" (۱)۔ اس کا ماخذ ہو سکے گی اور آیت کریمہ: "لن يجعل الله للكافرين على المؤمنين سبيلا" (۲) کا اشارہ بھی اس طرف ہے اور حضرت عمر ﷺ کا واقعہ جس کو صاحب تفسیر مظہری نے فرمایا: "لا تتخذوا اليهود والنصارىٰ أولياء" (۳) کے تحت نقل کیا ہے، بہت واضح رہنمائی کرتا ہے۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

پاکستان رویت ہلال کمیٹی کا فیصلہ کیا ہندوستان کے لئے بھی معتبر ہوگا؟

ہندوستان اور پاکستان کا مطلع تقریباً ایک ہی ہے اور پاکستان میں پورے ملک کے لئے رویت ہلال کمیٹی حضرت مولانا احتشام الحق تھانوی کے زیر قیادت شرعی اصول وضوابط کے ماتحت بنی ہوئی ہے، اس کا فیصلہ جس طرح پورے پاکستان کے لئے معتبر اور قابل عمل ہے اسی طرح اختلاف حکومت کے باوجود پاکستان رویت ہلال کمیٹی کے فیصلہ کو شرعی نقطۂ نظر سے ہندوستان کے لئے بھی معتبر اور مقبول قرار دینے کی اجازت وگنجائش فقہی اصول کے پیش نظر ہے یا نہیں؟

مصلح الدین (مولوی شمس الدین روڈ مغلواڑہ، بڑودہ، گجرات)

۱- رواہ الجماعۃ والدارمی مشکوۃ شریف ۱/۱۷۴۔

۲- سورہ نساء: ۱۴۱۔

۳- سورۂ مائدہ: ۵۱۔

الجواب وباللہ التوفیق:

جی ہاں ہندوستان اور پاکستان کا مطلع ایک ہی سا ہے، جیسا کہ مرادآباد کے اجلاس میں اکابر تصریح فرما چکے ہیں، جب شرعی رویت ہلال کمیٹی کا فیصلہ شرعی ضابطہ کے مطابق ۲۹ رتاریخ کو ہم تک پہنچے گا تو شرعاً معتبر ہوگا، ورنہ شرعاً معتبر نہ ہوگا، اس کے معتبر ہونے کے اصول وضوابط و قیود وغیرہ بھی سب تفصیل سے اس رسالہ میں مذکور ہیں مطالعہ فرمائیں، ہاں اگر کسی چیز میں اختلاف ہو تو مع وجہ اختلاف عرض کرے گا، یا رجوع کرے گا فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۹/۶/ ۱۳۹۸ھ

رویت ہلال عیدگاہ کمیٹی ممبئی کی رویت ہلال سے متعلق مفصل بحث

سوال ۱: (الف) رویت ہلال کا مسئلہ رویت وخبر سے تعلق رکھتا ہے یا شہادت سے؟

(ب) اگر خبر سے تعلق رکھتا ہے تو اس کو قبول کرنے کے کیا شرائط ہونے چاہئیں۔

(ج) اگر شہادت سے تعلق رکھتا ہے تو اس کو قبول کرنے کے کیا شرائط ہونے چاہئیں؟

ڈاڑھی مونڈنے کی خبر یا شہادت:

(د) داڑھی مونڈنے والے شخص کی خبر یا شہادت قبول کرلی جائے گی یا نہیں؟

اختلاف مطالع کی جغرافیائی حقیقت:

سوال ۲: (الف) کیا اختلاف مطالع کی کوئی جغرافیائی حقیقت ہے؟

ایک علاقہ کی رویت دوسرے علاقہ کے لئے:

(ب) کسی مقام یا علاقہ کی رویت دوسرے مقام یا علاقہ کے لئے شرعاً معتبر ہے یا نہیں؟

(ج) کیا مشرقی علاقہ کی رویت جہاں آفتاب پہلے غروب ہوتا ہے مغربی علاقہ کے لئے جہاں آفتاب بعد میں غروب ہوتا ہے معتبر سمجھی جانی چاہئے یا نہیں؟

کیا ہندوستان کے ایک مقام کی رویت پورے ملک کے لئے معتبر ہوگی؟

(د) کیا ہندستان کے کسی مقام کی رویت کو پورے ملک کے لئے قابل قبول ہونا چاہئے؟

الجواب وبالله التوفيق:

۱-ہلال رمضان تومطلقا خبر سے متعلق ہے باقی اور ہلال (عیدوغیرہ)،اگر حاکم یاوالی مسلم یا قاضی شرع یااس کا قائم مقام، جیسے رویت ہلال کمیٹی وغیرہ موجود ہوتوشہادت سے متعلق ہوتا ہے،ورنہ وہ بھی خبر شرعی سے متعلق ہوتا ہے جیسا کہ مندرجہ ذیل عبارتوں سے معلوم ہوتا ہے۔

الف: "وقيل: بلا دعویٰ وبلا لفظ أشهد وبلا حكم ومجلس قضاء، لأنه خبر لا شهادة للصوم مع علة كغيم وغبار وخبر عدل أو مستور۔

ب: "وشرط للفطر مع العلة والعدالة نصاب الشهادت ولفظ أشهد وعدم الحد في قذف لتعلق نفع العبد"۔

ج: "ولو كانوا ببلدة لاحاكم فيها صاموا بقول ثقة وأفطروا بأخبار عدلين مع العلة للضرورة إلى الآخر"

اوراس کے تحت "شامی کتاب الصوم" (۲/۱۲۵) میں ہے:

"قوله للضرورة الخ أى ضرورة عدم حاكم يشهد عندہ"(۱)۔

اس لفظ "للضرورة" سے معلوم ہوا کہ اگر حاکم شرع یااس کا قائم مقام موجود ہوگا تواس کوتقدم ہوگااور فیصلہ کرنے کااستحقاق اسی کورہے گا۔

(ب،و،ج) شہادت کے متعلق ہونے کا مفہوم یہ نہیں ہے کہ خصومات یاحقوق العباد میں واقع شدہ نزاعات کی طرح ہراعتبار سے تحت القضاداخل ہو، بلکہ مفہوم یہ ہے کہ یہ چیز اگر چہ دیانات کے قبیل سے ہے،مگر چونکہ اس کاتعلق عامۃ المومنین سے ہوتا ہے،اوربعض صورتوں میں جیسے رویت ہلال فطر میں کہ اس میں نفع عباد کابھی تعلق ہوجاتا ہے،اس لئے درستگی نظم اورعمدگی امتثال کے لئے قضاوامارات سے تعلق ہوجاتا ہےاورقضاوامارات سے متعلق ہونے کے معنی بھی یہ نہیں ہیں کہ امیرالمؤمنین وصاحب قوت قہریہ کاموجود ہوناضروری ہو، بلکہ اگر یہ موجود ہوتوفہوالمراد ورنہ ایسامعتمد وثقہ شخص جوتراضی مسلمین سے اس قسم کے معاملات میں حدودشرع میں رہ کر فیصلہ کرنے کے لئے اوراس میں جواختلافات رونماہوں،ان کودورکرنے کے لئے منتخب ونامزدکردیاگیاہوتوکافی ہے۔

۱- شامی ۲/۱۲۵۔

اور اگر ایسا عند الکل معتمد شخص موجود نہ ہو تو جماعت مسلمین (جیسے رویت ہلال کمیٹی جس کے سب ارکان باشرع ہوں) یا خطیب جامع مسجد وعید گاہ یا وہاں کا معتمد مفتی یا عالم جس کے سامنے اس قسم کے معاملات میں رجوع کیا جاتا ہو قاضی شرع کے قائم مقام قرار دے کر اس کے سامنے اس قسم کے شہادتیں گزار کر ثبوت رویت حاصل کرلیا جائے، کیونکہ وجوب صوم وافطار کا مدار محض ثبوت رویت پر ہے جو شرعی ضابطہ کے مطابق ہو، جیسا کہ آیت کریمہ: "**فمن شهد منكم الشهر فليصمه**" (۱) کے منطوق اور احادیث صحیحہ کے مدلول اور مفہوم سے واضح ہوتا ہے، مثلاً:

الف: "**صوموا لرويته وأفطروا لرؤيته**" (۲)۔

(چاند دیکھ کر روزہ رکھا کرو اور چاند ہی دیکھ کر افطار کیا کرو)۔

ب: "**ولا تصوموا حتى تروا الهلال ولا تفطروا حتى تروه فإن أغمي عليكم فاقدروا له ثلاثين (وفي رواية) فعدوا ثلاثين**" (۳)۔

(روزہ مت رکھا کرو اور اسی طرح افطار مت کیا کرو جب تک چاند نہ دیکھ لو اور اگر بوجہ ناصافی مطلع چاند مخفی رہ جائے تو (مہینہ کی) مقدار پوری کرلیا کرو اور ایک روایت میں ہے کہ اس کے لئے تیس دن پورے کرلیا کرو اور ایک روایت میں ہے کہ تیس کا شمار کیا کرو)۔

ج: "**لا تقدموا الشهر حتى تروا الهلال أو تكملوا العدة، ثم صوموا حتى تروا الهلال أو تكملوا العدة**" (۴)۔

(کسی مہینہ کی ابتداء) چاند دیکھنے پر مقدم نہ کیا کرو (اگر چاند نظر نہ آوے تو) شمار (تیس دن کا) پورا کرلیا کرو پھر (اسی طرح چاند دیکھ کر) روزہ رکھا کرو، یا تیس دن کا شمار پورا کرلیا کرو)۔

اور جن شرائط وقیود کا قبول شہادت وخبر میں پیش نظر رکھنا ضروری ہے، ان کی تفصیل فقہائے کرام رحمہم اللہ نے اس طرح تحریر فرمائی ہے۔

(۱) اگر موقع ہلال رمضان کا ہو اور مطلع ناصاف ہو، یعنی کسی غبار وغیرہ کی وجہ سے رویت عامہ سے مانع ہو تو محض ایک

۱- سورہ بقرہ: ۱۸۵۔
۲- مسلم ۱/۳۴۷۔
۳- مسلم ۱/۳۴۷ وابوداؤد۔
۴- ابوداؤد ۱/۳۲۵ (مرتب)۔

عادل یا مستورالحال مسلمان کی شہادت سے روزہ رکھنے کا حکم دیدیں گے، خواہ وہ گواہ گواہی دینے کا لفظ (میں گواہی دیتاہوں الخ) کہے، یا نہ کہے دونوں صورتیں معتبر ہوں گی (درمختار)۔

(۲) اگر موقع ہلال عیدین یا کسی اور مہینہ کا ہواور مطلع نا صاف ہوتو دو عادل یا مستورالحال ثقہ مسلمانوں کی شہادت سے جو گواہی کے الفاظ (مثلاً گواہی دیتاہوں الخ) کے ساتھ ہو (درمختار)

(۳) اگر موقع ہلال رمضان یا غیر رمضان (عیدین وشعبان وغیرہ) کا ہو۔ مگر مطلع صاف ہوتو عادل یا مستورالحال ثقہ مسلمانوں کی شہادت (گواہی کے الفاظ) کے ساتھ اتنی تعداد میں ہو کہ رویت ہلال کے ثبوت کا ظن غالب ہوجائے۔

نوٹ: یہ تعداد متعدد ہونے کے بعد کسی خاص عدد کے ساتھ مخصوص نہیں ہے، بلکہ قاضی شرع یا اس کے قائم مقام (ہلال کمیٹی وغیرہ) کی صواب دید پر محمول ہے۔

(۴) اگر ایسے مقام میں رویت ہلال کے ثبوت کا مسئلہ پیش کیا جائے جہاں قاضی شرع یا اس کے قائم مقام (رویت ہلال کمیٹی یا خطیب جامع مسجد وغیرہ) کوئی موجود نہ ہوتو وہاں کے لوگوں پر لازم ہوگا کہ وہ لوگ انہی تفصیلات مذکورہ کے ساتھ جو ابھی تین نمبروں میں مذکور ہوئی ہیں، عادل یا مستورالحال مسلمان کے قول وخبر کے مطابق عمل کریں، عوام خودرائی ہرگز نہ کریں۔

(د) داڑھی رکھنا تمام انبیا علیہم السلام کی سنت اور تمام انبیاء کا طریقہ بتایا گیا ہے اور اس کو اپنانے کی بڑی تاکید فرمائی گئی ہے اور مونچھ کٹانے اور داڑھی رکھنے کو مسلمانوں کی پہچان اور اسلامی شعار بتایا گیا ہے اور اس کا بھی بہت تاکیدی حکم دیا گیا ہے: "**قصوا الشوارب واعفوا اللحیٰ (وفی روایة) حلقوا الشوارب واعفوا اللحیٰ وخالفوا زی الأعاجم**"(۱)۔

(مونچھوں کو کٹایا کرو اور داڑھی کو بڑھایا کرو اور ایک روایت میں ہے مونچھوں کو صاف کروایا کرو۔ یعنی جلد سے بال نکال دیا کرو، مونڈ کر یا کاٹ کر، اور داڑھی کو بڑھا کے رکھا کرو، اور اعاجم (غیر مسلمین) کے طور طریقے کی مخالفت کیا کرو)۔

۱- مسلم/۱/۱۲۹، باب خصال الفطرہ، اس باب کی تمام احادیث سے متعلق تفصیلات کتاب الصلاۃ میں گذر چکی ہیں، حسب ضرورت رجوع کیا جاسکتا ہے۔

اس مضمون کی بہت سی تاکیدی روایات واحادیث اور بھی ہیں، اس کو شعار اسلامی قرار دینے سے اہمیت اور عظمت اور بھی بڑھ گئی ہے، قرآن کریم میں ہے: "ومن يعظم شعائر الله فإنها من تقوى القلوب" (۱) اور شعائر کے تحفظ کرنے وزندہ رکھنے میں قوم کی بقاء وزندگی مضمر رکھی گئی ہے، انہی وجوہ سے داڑھی نہ منڈانا واجب قرار پایا ہے اور یہ ایسا کبیرہ ہے کہ اس کو چھپانا بھی چاہے تو چھپا بھی نہیں سکتا۔ اور پھر اس کے منڈانے کی عادت کر لینے میں تو کبیرہ ہے کہ اس کو چھپانا بھی چاہے تو چھپا بھی نہیں سکتا، اور پھر اس کے منڈانے کی عادت کر لینے میں تو کبیرہ گناہ کے ارتکاب علی الاعلان پر اصرار ہو جاتا ہے جس سے معصیت کبیرہ کی شدت میں مزید اضافہ ہو جاتا ہے اور ایسا علانیہ وظاہر ارتکاب ہوتا ہے کہ اس کے ثابت کرنے میں کسی دلیل شرعی کے قائم کرنے کی احتیاج بھی نہیں رہتی ہے، اس لئے ایسا شخص اصطلاح شرع میں خود بخود فاسق معلن کی فہرست میں آجاتا ہے جس طرح تارک صلوٰۃ تارک صوم جو علی الاعلان وبرملا صوم وصلوٰۃ کو ترک کرتا ہو، اگر چہ داڑھی رکھتا ہو، مگر وہ بھی فاسق معلن کی فہرست میں آجاتا ہے اور رداڑھی رکھنا اس کو فسق سے نہیں بچاتا، لیکن اس کے باوجود اس کی شہادت ہر موقع میں نامقبول ورد نہ ہوگی، بلکہ بہت سے مواقع میں مقبول ومعتبر ہوگی، جیسا کہ اگلی تفصیلات سے عنقریب واضح ہو جائے گا، اس لئے کہ فاسق معلن کے بارے میں حکم خداوندی ہے کہ جب کوئی فاسق کوئی خبر لائے تو اس کی تحقیق کرو تبیین کرو، اور بغیر تحقیق وتبیین کے کوئی حکم اس کی خبر پر نہ لگاؤ۔

اور اس کا حاصل یہی ہے کہ اگر تحقیق وتبیین کے بعد خبر کی صداقت کا ظن غالب ہو جائے تو وہ مقبول ہو سکتی ہے، لہذا جب شرعی اصطلاح کے مطابق کوئی شخص فسق میں ابتلاء کے ساتھ شہادت یا خبر دے گا تو بحکم آیت قرآنی اس کی تبیین وتحقیق کریں گے اور قاضی خان کی ذکر کردہ تفصیل کے مطابق قبول یا عدم قبول کی تعیین کریں گے۔ قاضی خاں اس طرح فرماتے ہیں:

"الفسق لا يمنع أهلية الشهادة عندنا...... وانما يمنع أداء الشهادة لتهمة الكذب، وتكلموا في الفسق الذى يمنع الشهادة اتفقوا على أن الإعلان بكبيرة يمنع الشهادة في الصغائر إن كان معلنا نوع فسق مستشنع يسميه الناس بذلك فاسقا مطلقا لا تقبل شهادته، وان لم يكن كذلك ينظر إن كان صلاحه أكثر من فساده وصوابه أغلب من الخطاء ويكون سليم القلب يكون عدلا تقبل شهادته......

۱- سورہ حج: ۳۲۔

وعن أبي يوسفؒ إن كان الفاسق وجيها ذا مروءة جازت شهادته؛ لأن مثله لا يكذب" (۱)۔

(فسق کسی کو اس کے شاہد بننے کی صلاحیت سے نہیں روکتا، بلکہ کذب کی تہمت کی وجہ سے شہادت ادا کرنے (اور قبول کرنے سے) روکتا ہے (اور علماء نے اس فسق کے بارے میں جو ادائے شہادت سے روکتا ہے) پوری گفتگو فرمائی ہے، علماء نے اتفاق کیا ہے کہ کبیرہ گناہ کو علی الاعلان کرنا قبول شہادت سے روک دیتا ہے اور صغائر کو بالاعلان کرنے میں تفصیل ہے کہ اگر اس قسم کا ہو جس سے شنیع وقبیح درجہ کا فسق نمایاں ہو کر اس کی وجہ سے عوام الناس اس کو فاسق سمجھنے لگتے ہوں تو اس کی شہادت بھی مقبول نہ ہوگی اور اگر وہ شخص ایسا نہ ہو تو غور کریں گے اگر اس کی صلاح واچھائیاں اس کی خطاء وبرائیوں پر غالب ہوں اور وہ شخص سلیم القلب ہو تو وہ عادل ہی شمار ہوگا اور اس کی شہادت بھی مقبول ہوگی اور حضرت امام ابو یوسفؒ سے یہ بھی مروی ہے کہ اگر فاسق ذی وجاہت اور بامروت ہو تو اس کی شہادت بھی مقبول ہو جاتی ہے، اس لئے کہ ایسا آدمی جھوٹ نہیں بولتا جھوٹ کو اپنی حیثیت عرفی کے منافی سمجھتا ہے)۔

اور اسی مضمون کو متعدد فقہاء نے اپنے اپنے انداز میں مختلف عبارتوں میں ذکر فرمایا ہے، جیسے (رد المحتار، درمختار، بحر الرائق، بدائع الصنائع)، چنانچہ صاحب بدائع (۱/۲۷۱) کے الفاظ یہ ہیں: **"لكن الصدق لا يقف على العدالة لا محالة"** (۲)، یعنی لیکن صدق ہمیشہ سچائی اور لامحالہ عدالت ہی پر موقوف نہیں رہا کرتی، بلکہ **"فإن من الفسقة من لايبالي بارتكابه أنواعا من الفسق ولكن لا يستنكف عن الكذب"**، بلکہ بہت سے فاسق ایسے ہوتے ہیں جو طرح طرح کے فسق میں مبتلا رہنے کے باوجود جھوٹ نہیں بولتے، جھوٹ بولنے کو برا جانتے اور مانتے ہیں اور اس سے بچتے ہیں۔

ان عبارتوں سے معلوم ہوا کہ داڑھی منڈانے والا شخص مثلاً اگر صوم وصلوٰۃ کا پابند ہے، معاملات کا سچا ہے، جھوٹ نہیں بولتا، یا ذی وجاہت وذی مروت ہے، باوقار ہے، جھوٹ بولنے کو، بالخصوص ایسے معاملات میں اپنی تحقیر وتوہین سمجھتا ہے تو اس کی شہادت قبول کی جائے گی۔

اسی طرح ایسا شخص جس کی شکل وصورت وضع قطع شریعت کے مطابق نہ ہو، لیکن وہ سنجیدہ اور باوقار ہو جھوٹ بولنے کو خود اپنی شان کے خلاف سمجھتا ہو، اس کی شہادت بھی تسلیم کی جاسکتی ہے، "درمختار کتاب الشهادت" میں ہے: **"فإن عدالة الشاهد شرط لوجوبه لا للصحة، فلو قضى بشاهد فاسق نفذ"** (۳)۔

۱- فتاوی قاضی خاں، کتاب الشهادة، ۲/ ۴۶۰۔

۲- بدائع الصنائع ۱/ ۲۷۱۔

۳- درمختار کتاب الشهادة، ۲/ ۳۷۲۔

اوراسی بناء پر ایسے لوگوں کے لئے بھی لازم ہے کہ وہ اپنے فسق کا علم رکھتے ہوئے بھی آکر شہادت دیں، اس لئے کہ بسا اوقات قاضی اس کی شہادت قبول کرلے گا، چنانچہ اسی "درمختار" میں ایک سوال قائم فرماتے ہوئے فرماتے ہیں: **"وهل له أن يشهد مع علمه لفسقه قال البزازي: نعم، لأن القاضي ربما يقبله"**(۱) (کیا کسی فاسق کو اپنے فسق کا علم ہونے کے باوجود گنجائش وجواز ہے کہ وہ شہادت دیدے تو (جواب میں) صاحب فتاویٰ بزازیہ نے کہا ہے کہ ہاں، اس لئے کہ قاضی بسا اوقات اس کی شہادت قبول کرلے گا اور حق واضح ہوگا اور داڑھی منڈانے والے یا اپنی شکل وصورت یا وضع قطع مطابق شریعت نہ رکھنے والے بسا اوقات ایسے سنجیدہ ذی وجاہت اور باوقار ہوتے ہیں جو جھوٹ بولنے کو خود اپنی شان کے خلاف قرار دیتے ہیں، بخلاف اس شخص کے جو داڑھی حد شرع میں رکھتا ہو، لیکن شراب کے نشہ میں برملا چور رہتا ہو، اور بلا حجاب وشرم باہر نکلتا اور اسی نشہ میں گھومتا پھرتا ہو، اور بخلاف اس شخص کے جو داڑھی بھی رکھتا ہو، حج بھی کرچکا ہو، نماز بھی پڑھتا ہو مگر برملا شراب سازی کا کاروبار بھی کرتا ہو یا طوائف کے ساتھ بھی خلوت وجلوت، ربط وضبط رکھتا ہو، یہ لوگ اپنی ظاہری شکل وصورت اگرچہ صحیح رکھتے ہوں، مگر اپنے اس شنیع فعل اور دنی وذلیل حرکات کی وجہ سے عوام کے نزدیک بھی باوقار وذی وجاہت ومعتبر شمار نہ ہوں گے اور ایسے لوگوں کی شہادت قبول نہ کی جائے گی، اسی طرح وہ شخص جو برملا سٹہ بازی کرتا اور جوا کھیلتا ہو، اور عام طور پر متہم بالکذب والدنائۃ ہو اس کی شہادت بھی باوجود ظاہری شکل وصورت وضع قطع خلاف شرع نہ ہونے کے قبول نہ کی جائے گی، بخلاف اس شرابی یا زانی یا چور یا سودخور کے جو یہ حرکتیں مخفی طور پر کرتا ہے اور مخفی رکھتا ہے عنداللہ اگرچہ وہ بھی فاسق وفاجر اور عاصی ہے اور تائب ہونا قبول یا مردود الشہادت ہونا ضروری نہ ہوگا، اس لئے کہ شریعت مطہرہ نے: **"ولقد كرمنا بني آدم"** (۲) کے تحت اور عرض مومن کے تحفظ کی خاطر بلا وجہ تجسس سے روکا ہے حتی کہ فقہاء کرام نے فرمایا ہے: **"إن الشاهد إذا كان فاسقاً سرا لا ينبغي أن يخبر بفسقه (إلى قوله) والمعدل إذا قال للشاهد: هو متهم بالفسق لا تبطل عدالته"** (۳)۔

(شاہد جب مخفی طور پر فسق میں مبتلا ہو تو جائز نہیں ہے کہ کوئی اس کے فسق کی خبر دے اور اس کی صحیح شہادت کو مجروح کرے، بلکہ اگر معدل بھی کسی شاہد کے بارے میں اطلاع دے کہ یہ شخص فسق کے ساتھ متہم ہے تو بھی ایسی حالت میں اس کی عدالت ظاہری باطل نہ ہوگی)۔

۱- حوالہ سابق۔

۲- سورہ اسراء:۷۰۔

۳- شامی ۴/۳۷۷۔

خلاصۂ بحث یہ ہے کہ فاسق، خواہ چوری، شراب نوشی، زنا وغیرہ کے فسق میں مبتلا ہو یا داڑھی منڈانے کے فسق میں گرفتار ہو، لیکن ہر دور میں ایسے لوگ بھی پائے جاتے ہیں جو ان سارے وجوہ کے باوجود ذی وجاہت با مروت ہوتے ہیں، اور اپنی حیثیت عرفی کو قائم رکھنے کے لئے جھوٹ کو اپنی شان سے گرا ہوا دیکھ کر کبھی اس کا ارتکاب نہیں کرتے، نیز ایسے لوگ بھی دیکھے جاتے ہیں جو عام معاملات عبادات کے لحاظ سے دیندار معلوم ہوتے ہیں، فرائض وواجبات، بلکہ سنن ونوافل ومعمولات کے بھی پابند ہوتے ہیں، لیکن سوسائٹی کی خرابی کی وجہ سے داڑھی نہیں رکھتے، اس لئے ایسے افراد کے لئے شریعت مطہرہ نے علی الاطلاق شہادت رد کردینے کے بجائے تبیین وتحقیق کا اصول مقرر کیا ہے ان کی شہادت کو ان اصولوں کے معیار پر رکھ کر دیکھ لیا جائے اگر تبیین وتحقیق کے بعد ان کی خبر یا شہادت قابل قبول ہو تو قبول کر لی جائے، ورنہ رد کردی جائے۔

(۲)۔(الف) اختلاف مطالع کے موجود ہونے اور اس کے ثابت وتحقق ہونے اور پائے جانے سے قطعاً انکار نہیں ہے اس کا وجود تسلیم ہے، بلکہ مشاہد ہے کہ ایک جگہ طلوع آفتاب کا وقت ہے تو ایک جگہ دوپہر کا وقت ہے اور ایک جگہ غروب کا وقت ہے، فی زمانہ اس کے وجود کا انکار معمولی عقل کا انسان بھی نہیں کرسکتا، کلام اس کے وجوب صوم وافطار میں معتبر ہونے میں ہے۔ شریعت مطہرہ نے وجوب وثبوت صوم وافطار کو اختلاف مطالع پر محمول یا دائر نہیں فرمایا، بلکہ حد شرع کے مطابق چاند کے دیکھنے اور دیکھنے کی شہادت وخبر پر دائر فرمایا ہے، جیسا کہ اوپر ہم "صوموا لرویته" وغیرہ احادیث اور آیت کریمہ: "فمن شهد منكم الشهر فليصمه" (۱) پیش کر کے ذکر کر چکے ہیں، پس اختلاف مطالع کی جغرافیائی حیثیت تو تسلیم ہے، بلکہ نماز وغیرہ کے اوقات اور دیگر بہت سے معاملات میں جن میں شریعت نے اس کے اعتبار کرنے کی آزادی دی ہے اعتبار بھی ہے، مگر صوم وافطار میں شریعت مطہرہ نے ہم کو پابند بنا دیا ہے، اس لئے اس کا اعتبار اور اس پر مدار رکھنا درست نہ ہوگا۔

(ب) اپنے قیود وشرائط کے ساتھ معتبر ہوگی۔

(ج) ہاں! جب شرعی ضابطہ کے مطابق آجائے تو معتبر ہوگی۔

(د) ہاں! اس کا بھی یہی حکم ہے کہ جب شرعی ضابطہ کے مطابق ثابت ہو کر اور شرعی ضابطہ کے مطابق اس کی اطلاع آجائے گی تو معتبر ہوگی، ان تینوں نمبروں (ب، ج، د) میں محولہ شرعی قیود وشرائط کی تفصیل عنقریب خود بخود سوال نمبر چار میں آجائے گی۔

۱- سورۂ بقرہ ۱۸۵۔

رویت ہلال سے متعلق:

جناب مفتی اعظم صاحب ہمارے یہاں نہ کوئی ہلال کمیٹی ہے اور نہ کوئی اس بارے میں خاص انتظام ہے توامسال ہلال عید کے متعلق قصبہ میں اختلاف ہوگیا کہ چند اشخاص نے محض ریڈیو کی اطلاع سے روزہ افطار کرلیا اور بعض حضرات نے لوگوں کے کہنے سے کہ فلاں مقام پر چاند ہوگیا ہے، اس اطلاع پر روزہ افطار کرلیا، اور ایک جماعت نے نہ روزہ افطار کیا، اور نہ اس خبر کی تصدیق کی، بلکہ اس روز اپنا روزہ پورا کیا تو اس صورت میں معلوم کرنا ہے کہ آیا اس جماعت نے جس نے روزہ افطار کیا اس پر روزہ کی قضاء واجب ہے یا کہ نہیں یا دوسری جماعت نے کہ جس نے روزہ افطار نہیں کیا ہے وہ فعل حرام کے مرتکب ہوئے۔

الجواب وبالله التوفيق:

جبکہ رویۃ عامہ ثابت ہوچکی ہے اس لئے جن لوگوں نے اتوار کو روزہ توڑ دیا ہے ان پر قضاء واجب نہیں ہے تحریر سوال سے معلوم ہوتا ہے کہ اس دن رویت کا ثبوت شرعی نہیں ہوسکا تھا اس لئے جن لوگوں نے افطار نہیں کیا وہ بھی فعل حرام کے مرتکب نہیں ہوئے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۱/۱۰/۸۵ ۱۳ھ
الجواب صحیح محمود عفی عنہ

برطانیہ میں رویت ہلال سے متعلق چند اہم سوالات:

برطانیہ کے بعض علاقوں میں موسم گرمی میں رویت حلال کا امکان ہے یعنی گرمی کے موسم میں اگر بادل وغیرہ کوئی علت آسمان پر نہ ہو اور مطلع صاف ہو تو چاند دیکھ سکتے ہیں، جیسا کہ امسال جمعیۃ علماء برطانیہ کا اعلان رجب المرجب کی پہلی کا یہیں کی رؤیت پر ہوا ہے اس صورت میں حسب ذیل سوالات حل طلب ہیں:

(۱) موسم گرمی میں جب رؤیت ممکن ہے تو کیا شرعاً ساکنان برطانیہ کو دوسرے ممالک سے خبر رؤیت ہلال منگوانا ضروری، یعنی واجب ہے اگر واجب نہیں ہے اور نہ ہی بیرون ملک سے خبر منگوائی یا موصول ہوئی اور رؤیت نہ ہوسکی تو کیا مکمل تیس دن شمار کرکے پہلی شعبان یا رمضان شمار کرنا درست ہے یا نہیں۔

(۲) بیرون ملک سے خبر منگوانا واجب نہ ہواور یہاں کے متدین علماء رویت ہلال کمیٹی نے پہلی رمضان یا عید کے نفی کا فیصلہ کر دیا (یعنی شعبان کو تیس دن کا شمار کر کے)بعدہ کسی نے دوسرے ملک سے خبر منگوائی اور وہ خبر اثبات میں آئی یا متعدد ممالک سے مختلف خبر کسی نے منگوائی تو کیا ہمیں اس بیرونی خبر پر اعتبار کرنا ہوگا یا نہیں اپنی مقامی خبر پر مدار رکھا جائے یا جو خبر منگوائی گئی ہے اس کی تحقیق کرنا لازم ہے۔

(۳) نوٹ رؤیت ہلال کمیٹی نے چونکہ باہر سے خبر منگوانا واجب نہیں ہے دوسرے ملک سے خبر نہیں منگوائی کسی نے انفرادی طور پر منگوائی۔

(۴) سردی کے موسم میں رؤیت ہلال کا امکان نہیں ہے یعنی بادل وغیرہ اکثر بلکہ ہر وقت ہوتے ہیں جس سے چاند کا نظر آنا ممکن نہیں ہے تو ایسے علاقوں کے رہنے والوں کو بیرون ملک سے خبر منگوانا ضروری ہے یا نہیں اگر خبر منگوانا واجب ہی ہے تو فیصلہ کی کیا صورت ہوگی کذفی العکس۔

(۵) مختلف ممالک سے مثلاً مراکش، افریقہ، الجزائر، ٹیونس وغیرہ۔ سے فون پر کسی جان پہچان والے سے ان کے یہاں رمضان وعید کے رؤیت کے متعلق پوچھ لیا کہ آپ کے یہاں کیا فیصلہ ہوا ہے اگر سب جگہ سے یوں خبر دی گئی کہ رؤیت ہلال ہوگئی تو کیا ان مختلف ممالک سے جو خبر فون پر لی گئی ہے اس کو خبر مستفیض بنا سکتے ہیں یا نہیں؟۔

مفتی احمد (ترکیسر، سورت)

الجواب وباللہ التوفیق:

(۱) اگر شعبان کی ۲۹ر تاریخ کو مطلع نا صاف تھا لیکن ایک معتمد ومتدین مسلمان نے چاند دیکھ کر چاند دیکھنے کی شہادت دیدی تو روزہ رکھنا سب پر شرعاً واجب ہوگیا، اب نہ کسی خبر کا منگوانا جائز رہے گا اور نہ اس شہادت شرعی کے خلاف کرنا جائز رہے گا۔ اسی طرح ۲۹ر رمضان کو مطلع نا صاف تھا، لیکن دو معتمد ومتدین مسلمانوں نے چاند دیکھکر چاند دیکھنے کی شہادت دیدی تو عید منانا سب پر واجب ہوگیا اب نہ کسی خبر وغیرہ کا منگوانا جائز رہے گا اور نہ اس شہادت شرعی کے خلاف کرنا جائز رہے گا۔ اسی طرح اگر مطلع صاف ہو اور چاند دیکھنے کی اتنے لوگوں نے شہادت دیدی کہ ان سب کا جھوٹ بولنے پر اتفاق کر لینا سمجھ میں نہ آتا ہو یا دشوار معلوم ہوتا ہے تو ان کی شہادتوں پر عمل کر لینا واجب ہوجاتا ہے اب کہیں سے خبر منگوانا یا اس شرعی شہادت کے خلاف کرنا جائز ہی رہے گا۔ ۲۹ شعبان کا معاملہ ہو یا ۲۹ رمضان کا دونوں میں یہی حکم ہے کہ ۲۹

شعبان کے بعد روزہ رکھنااور ۲۹؍رمضان کے بعد عید منانا واجب ہوجائے گا۔ برطانیہ کے لئے بھی یہی حکم ہے(۱)۔

(۲) اوراگر ۲۹؍شعبان کو یا ۲۹ رمضان کو مذکورہ بالا حکم (جو۱ میں درج ہے) کے مطابق چاند دیکھنا ثابت نہ ہوا تو ۳۰؍شعبان کو دن میں روزہ رکھنے کی نیت کر لینے کے بعد وقت کے اندر اندر (یعنی نصف نہار شرعی تک اطلاع کا انتظار کرنا (تلوّم) اور عام عادت کے مطابق چاند کا پتہ لگانا (التماس ہلال) شرعاً واجب رہتا ہے (۲)، قولہ عام عادت کے مطابق مثلاً آج کل کے ریڈیو۔ٹی۔وی کو عام ہوجانے کی وجہ سے ۲۹؍شعبان کی شام کو دنیا کے کسی خطہ کے شرعی رؤیت ہلال کمیٹی کی جانب سے جس کے سب افراد باشرع ومعتبر ہوں اور بایں الفاظ اعلان آجائے کہ ہم فلاں شرعی رؤیت ہلال کمیٹی چاند ہو جانے کی شرعی ثبوت حاصل ہونے کے بعد اعلان کرتے ہیں کہ صبح روزہ رکھا جائے تو اب سب پر روزہ رکھنا واجب ہوجائے گا ۲۹؍رمضان کو اسی قسم کی شرعی رؤیت ہلال کمیٹی جس کے سب افراد باشرع اور معتبر ہوں ان الفاظ میں اعلان کریں کہ شرعی ضابطہ کے مطابق ہلال عید کی رؤیت ثابت ہونے کی وجہ سے ہم اعلان کرتے ہیں کہ صبح عید منائی جائے تو عید منانا واجب ہو جائے گا۔

اسی طرح منجانب پوری کمیٹی کے فقط اس کا صدر اپنے عہدہ کو بتلاتا ہو، یہی اعلان کرے جو ابھی مذکور ہوا تو بھی اس پر عمل کر لینا واجب ہوجائے گا اس لئے کہ مفتی بہ قول میں رؤیت ہلال کے ثبوت کے بارے میں اختلاف مطالع معتبر نہیں ہے بلکہ صرف طرق موجبہ سے نفی ثبوت کے شرعی طریقہ سے ثابت ہوجانا کافی ہے (۳) اور یہ اعلان مذکور نہ شہادت ہے نہ خبر، بلکہ

۱- ”إن كان بالسماء علة فشهادة الواحد على هلال رمضان مقبولة إذا كان عدلاً مسلماً عاقلاً بالغاً حراً كان أو عبداً ذكراً كان أو أنثى“ (فتاوی عالمگیریہ ۱/۱۹۷) ”وإذا كان بالسماء علة لم تقبل في هلال الفطر إلا شهادة رجلين أو رجل وامرأتين، لأنه تعلق به نفع العبد وهو الفطر فأشبه سائر حقوقه...... وإن لم يكن بالسماء علة لم تقبل إلا شهادة جماعة يقع العلم بخبرهم“ (الہدایہ کتاب الصوم/ ۱۹۶)۔

۲- ”والمختار أن يصوم المفتي بنفسه أخذا بالاحتياط ويفتي العامة بالتلوم إلى وقت الزوال ثم بالإفطار نفياً للتهمة“ (ہدایہ/ ۱۹۴)، ”والتلوم الانتظار كما في المغرب“ (ردالمحتار ۳/ ۳۴۹)، رؤیت ہلال سے متعلق تفصیل کے لئے دیکھئے: ردالمحتار ۳، کتاب الصوم، البحرالرائق ۲/ ۴۵۹، عالمگیریہ ۱/ ۱۹۶) (مرتب)۔

۳- واختلاف المطالع ورؤيته نهاراً قبل الزوال وبعده غير معتبر على ظاهر المذهب وعليه أكثر المشائخ وعليه الفتوى، بحر عن الخلاصة، فيلزم أهل المشرق برؤية أهل المغرب، إذا ثبت عندهم رؤية أولئك بطريق موجب (درمختار مع رد المحتار ۳/ ۳۶۳) بطریق موجب کے تحت علامہ شامی لکھتے ہیں: كأن يتحمل اثنان الشهادة أو يشهد على حكم القاضي، أو يستفيض الخبر، بخلاف ما إذا أخبر أن أهل بلدة كذا رأوه، لأنه حكاية (۳/ ۳۶۴)، نیز اختلاف مطالع کے سلسلہ میں تفصیل کے لئے مذکورہ متن کے تحت علامہ شامی کی تفصیل ۳/ ۳۶۳، ۳/ ۳۶۴ کی طرف رجوع کیا جائے۔

مدافع قاضی و حاکم شرعی کے مدافع و نقارہ کی آواز یا اس کا اعلان اعلان عام کے حکم میں ہے اور اس پر عمل کرنا اس شخص پر دیانۃً واجب ہو جاتا ہے جو اس قاضی یا حاکم شرعی کو جانتا مانتا ہو **کما هو مبرهن في مقامه كالشامي والبحر وغيرهما**(۱)۔

پس اگر ۳۰ر شعبان کو نصف یوم شرعی تک تلوم والتماس کے باوجود رؤیت ہلال کا شرعی ثبوت نہیں ملا تو بجز خواص کے سب کو کھا پی لینا اور روزہ نہ رکھنا لازم ہو جاتا ہے اب اگر اس وقت کے گذر جانے کے بعد، یعنی نصف نہار شرعی کے بعد شرعی ضابطہ کے مطابق اطلاع رؤیت آجائے گی جب بھی کوئی گناہ نہ ہوگا، بلکہ صرف ایک روزہ کے قضاء کا حکم ہوگا جس طرح ٹیلی ویژن اور ریڈیو عام ہوگیا ہے اسی طرح، بلکہ اس سے بھی زیادہ ٹیلیفون بھی عام ہو چکا ہے تو اس ٹیلیفون کا حکم یہ ہے کہ اس اطلاع پر چونکہ اعلان کی شرعی تعریف صادق نہیں آتی، اس لئے اس کی اطلاع اعلان شرعی نہیں کہا جاسکتا ہے، البتہ اگر شرعی ضابطہ کے مطابق اطلاع آئے تو خبر شرعی کا درجہ ہو کر اور "**ولو کانو ببلدة لا حاكم فيها**" (۲) "درمختار" کی عبارت کے تحت خبر کے درجہ میں معتمد اور غیر معتمد ہو سکتی ہے اور اس کے معتبر و مفید ہونے میں بہت سی شرطیں ہیں جو محض استفتاء کی شکل میں حل نہیں ہو سکتیں اگر رؤیت ہلال کے ثبوت کا شرعی حکم (احقر کا رسالہ) جس کو مختلف کتب خانوں نے شائع بھی کر دیا ہے دیکھ لیا جائے تو اس میں بھی کافی تفصیل و مواد مل سکتا ہے۔

باقی غیر منظم ہو کر اور اس افراتفری کے ساتھ مختلف لوگوں کا اپنی اپنی طور پر ٹیلیفون یا ریڈیو وغیرہ کی خبروں پر عمل کر لینا یا مختلف طور سے افراتفری کے ساتھ خبریں منگوانا قطعاً درست نہیں ہے، بلکہ معتمد علماء کی ایک رؤیت ہلال کمیٹی ہر شہر و قصبہ و آبادی میں ہو سکے تو ہر آبادی میں قائم کر کے شرعی ہدایت و ضابطہ کے مطابق عمل کرنا لازم ہے۔ ۳ و ۴ ان دونوں کا حکم بھی اوپر مذکورہ تفصیل سے نکل آیا ہے۔

(۵) اس کا حکم بھی ۱ کے اندر مذکور مفتی بہ قول کے ضابطے کے مطابق نکل آیا کہ مراکش، افریقہ، یا کسی بھی دور یا نزدیک ملک کی قید ضابطہ شرعی پر نہیں ہے، بلکہ شرعی ضابطہ کے مطابق آنے کی قید ہے اور یہ قید ہے کہ وہ شرعی الفاظ و ضابطہ

۱- "قلت والظاهر أنه يلزم أهل القرى الصوم بسماع المدافع أو رؤية القناديل من المصر، لأنه علامة ظاهرة تفيد غلبة الظن" (رد المحتار علی الدر ۳/۳۵۴)۔

۲- "ولو كانوا ببلدة لا حاكم فيها صاموا بقول ثقة وأفطروا بإخبار عدلين مع العلة للضرورة" (درمختار مع رد المحتار ۳/۳۵۴)۔

میں ہواوراس پر عمل کرنے سے عمل کرنے والوں کے نزدیک مہینہ ۲۸ دن کا یا ۳۱ دن کا ہونا لازم نہ آتا ہو(۱)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۵/۸/۱۴۰۰ھ

پاکستان کا اعلان ہندوستان کے لئے معتبر ہے یا نہیں؟

آج ہندوستان میں، بلکہ پاکستان کے آٹھ کروڑ مسلمان عید منا رہے ہیں، مگر ہمارے کوئٹہ (راجستھان) میں عید نہیں منائی جارہی ہے وجہ یہ کہ یہاں کے قاضی صاحب نے آج کے لئے عید کا اعلان نہیں کرایا۔ کوئٹہ میں ہمیشہ سے یہی قاعدہ ہے کہ رات کو اعلان کرایا جاتا ہے کہ کل عید ہے اور نماز فلاں وقت ہوگی۔ گذشتہ رات کو ۹ ربجے آل انڈیا ریڈیو سے یہ خبر نشر ہوگئی ہے کہ دلی، کلکتہ، بنگال (بھارت) میں آج ۲/۸/۸۱ء کو عید منائی جائیگی۔ پاکستان آج منا رہا ہے۔ رات سے ہم لوگوں کو بھی امید تھی کہ آج عید ہوگی مگر صبح جب اٹھے تو پتہ چلا کہ قاضی صاحب ان سب اطلاعات کو نہیں مانتے اور جو ہوا وہ عرض کر چکا ہوں اس مصیبت سے چھٹکارا پانے کے لئے پاکستان نے ہلال کمیٹی بنا کر یہ مسئلہ حل کیا ہے اور جو کمیٹی فیصلہ کرتی ہے سارا ملک مانتا ہے۔ کیا ہندوستان کے علماء کرام اعلان نہیں کر سکتے دلی کے پیش امام صاحب سارے ہندوستان کے مسلمانوں کیلئے اعلان نہیں کرا سکتے، جبکہ بھارت کی حکومت مسلمانوں کے لئے تمام سہولتیں فراہم کرتی ہے آل انڈیا ریڈیو آپ کی خدمت کرنے کو تیار ہے۔ مہربانی فرما کر بذریعہ ڈاک جواب دینے کی تکلیف فرمائیں۔ کہ کیا اس ترقی یافتہ دور میں کن اصولوں پر عید منانا چاہیے۔ یہاں ۳۰ میل دور بندق میں بازار و قصبہ ہے وہاں آج مسلمان عید منا رہے ہیں جب کہ آسمان پورا ابر آلود ہے۔

احقر سید حامد علی کوئٹہ پاکستان

الجواب وباللہ التوفیق:

آل انڈیا ریڈیو کی یہ مذکورہ خبریں کہ دلی، کلکتہ، بنگال میں آج عید منائی جائیگی شرعی خبر نہیں ہے شرعاً یہ معتبر نہیں ہے، البتہ رویۃ ہلال کمیٹی دہلی کے صدر امام جامع مسجد دہلی جب کمیٹی کی طرف سے یہ اعلان کریں یا کرائیں شرعی ثبوت کے

۱- ''ابن عمرؓ یحدث عن النبی ﷺ: إنا أمة أمية لا نكتب ولا نحسب، الشهر هكذا وهكذا وهكذا وعقد الإبهام في الثالثة، والشهر هكذا وهكذا وهكذا يعني تمام ثلاثين'' (صحیح مسلم کتاب الصیام حدیث ۱۵/۱۰۸۰)۔

ذریعہ رویۃ ہلال تسلیم کر کے اعلان کیا جاتا ہے کہ صبح عید کی نماز پڑھی جائے۔

یا یہی اعلان پاکستان کی شرعی رویۃ ہلال کمیٹی کرے تو یہ اعلان بیشک شرعی اعلان ہوگا اس پر عمل کرنا درست ہوگا۔

اور یہ دونوں ہلال کمیٹیاں (دہلی اور پاکستان) کی کئی سال سے شرعی الفاظ میں اعلان کرتی ہیں۔پس ان کو خوب غور سے سنا جائے، بلکہ ان دونوں اعلانوں کے الفاظ ٹیپ کر کے مقامی علماء جو اس قسم کے مسائل سے اچھی طرح واقف ہوں ان کے سامنے رکھا جائے پھر وہ حضرت جو حکم شرعی دیں اس پر عمل کیا جائے۔خود رائی وغیرہ ہرگز نہ کی جائے (۱)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

کیا بذریعہ ٹیلیفون مطلقاً رویت ہلال کی اطلاع معتبر ہوگی:

رمضان وعیدین بذریعہ فون رویت ہلال کی خبر دینے والا شخص سامع کے نزدیک معلوم ومتعارف ہو اور اس کی آواز بھی جانی پہچانی ہو اور عادل بھی ہو اس صورت میں کیا قیود وشرائط کے ساتھ بذریعہ فون دی ہوئی خبر اور شہادت شرعاً مقبول ومعتبر سمجھی جائے گی یا فون سے دی ہوئی خبر اور شہادت بہر صورت علی الاطلاق غیر مقبول وغیر معتبر ہوگی، اس بارہ میں آپ کی اور دیگر موجودہ اکابر دیوبند کی کیا رائے ہے؟

مصلح الدین (مولوی شمس الدین روڈ مغلواڑہ، بڑودہ، گجرات)

الجواب وباللہ التوفیق:

رمضان المبارک وعیدین وغیرہ کی رویت کی جو اطلاع بذریعہ فون آئے گی، وہ غائبانہ اطلاع ہوگی وہ اطلاع خواہ کتنے ہی مضبوط وموثق طریقہ سے آئے شہادت نہیں کہلائی جا سکتی، شہادت میں مجلس قضا میں آکر بیان کرنا شرط ہوتا ہے، شہادت غائبانہ نہیں ہوتی، البتہ اس اطلاع کو خبر کہہ سکتے ہیں اور جب حدود شرعی کے مطابق ہوگی تو معتبر ومقبول بھی ہو سکتی ہے، مطلقاً اور ہر حال میں مقبول ومعتبر نہیں ہوتی، اس سلسلہ میں احقر کا ایک طویل وبسیط استفتاء (ریڈیو ٹیلیفون کے ذریعہ رویت

۱- "شهدوا أنه شهد عند قاضي مصر كذا شاهدان برؤية الهلال في ليلة كذا وقضى القاضي به ووجد استجماع شرائط الدعوى قضى أي جاز لهذا القاضي أن يحكم بشهادتهما؛ لأن قضاء القاضي حجة وقد شهدوا به، لا لو شهدوا برؤية غيرهم؛ لأنه حكاية نعم لو استفاض الخبر في البلدة الأخرى لزمهم على الصحيح من المذهب" (الدرالمختار مع ردالمحتار ۳/۳۵۸) (مرتب)۔

ہلال کا شرعی حکم) شائع ہو چکا ہے احقر اس کو بھیج رہا ہے اس میں تفصیلی بحث ہے، بصیرت کے ساتھ حکم معلوم ہو سکے گا، اور دارالافتاء کی رائے بھی واضح ہو سکے گی، نیز اس کا ایک ضمیمہ بھی یہاں ذیل میں درج کر دیا ہے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۶/۹/۹۸ ۱۳ھ

ضمیمہ ضابطہ فقہیہ:

"ولو كانوا ببلدة لاحاكم فيها صاموا بقول ثقة وأفطروا بأخبار عدلين مع العلة للضرورة"

الخ (۱) کی بنیاد پر اپنے مطبوعہ جواب کے ضمیمہ کے طور پر کچھ مسائل جو کہ خاص ٹیلیفون سے متعلق ہیں احقر مزید عرض کر رہا ہے، تاکہ ٹیلیفون سے متعلق مسائل کی مزید وضاحت ہو جائے اور عمل آسان ہو سکے۔

مسئلہ ۱: پورے علاقہ میں جتنی معتبر شرعی رویت ہلال کمیٹیاں ہوں ان سب کو حتی المقدور ایک نظم میں منسلک کرنے کی کوشش کی جائے اور باہم رابطہ قائم رکھا جائے، تاکہ عمل میں ہم آہنگی اور ثبوت میں آسانی ہو۔

مسئلہ ۲: جب کسی ایک معتبر شرعی رویت ہلال کمیٹی کے نزدیک شرعی اصول سے رویت ہلال ثابت ہو جائے تو وہ کمیٹی دوسری رویت ہلال کمیٹی کو شرعی کے مطابق اس ثبوت رؤیت کی اطلاع کردے ضابطہ شرعی کی بعض صورتیں ذیل میں درج کی جاتی ہیں۔

(الف) اس کا ایک خاص ضابطہ تو وہی ہے جو عام طور سے کتب فقہ میں مذکور ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ یہ شرعی کمیٹی دو آدمیوں کے سامنے شرعا رویت کے ہو جانے کو لکھے اور ان دونوں کو اس تحریر کی تصدیق وتصویب کے بعد اپنے یہاں بھی ثبوت رویت کا اعلان کردے، پس ٹیلیفون کے ذریعہ حسب قاعدہ شرع ثابت شدہ رویت کی اطلاع بھی اسی ضابطہ کے مطابق دوسری شرعی رویت ہلال کمیٹی کے پاس بھیجے۔

(ب) اگر یہ طریقہ اطلاع دینے کا میسر نہ ہو یا دشوار ہو تو یہ بھی کیا جا سکتا ہے کہ شرعی رویت ہلال کمیٹیاں رویت ہلال کی خبر واطلاع دوسری شرعی رویت ہلال کمیٹی کو دینے کے بارے میں کچھ خاص اصطلاحی الفاظ بنالیں جن کو عام لوگ نہ سمجھیں، جیسے فوجوں کے خاص اصطلاحی الفاظ (کوڈ) میں بذریعہ فون دوسری معتبر شرعی کمیٹی کو اطلاع دے دے، پھر جب اس دوسری شرعی رویت کمیٹی کو اس اطلاع وخبر کے صحیح ہونے کا ظن غالب ویقین ہو جائے تو وہ اپنے یہاں بھی ثبوت شرعی

۱- شامی ۲/۱۲۵۔

رویت کا اعلان کردے۔

(ج) اگر مخصوص اصطلاحی الفاظ متعین نہ ہوں یا متعین ہوں، لیکن ان کے ظاہر ہوجانے اور مخفی نہ رہنے کا اندیشہ ہو تو ایسی صورت میں جس مقام کی شرعی رویت ہلال کمیٹی کی جانب سے یہ فون آیا ہے اس کمیٹی سے دوبارہ دریافت کرکے یا وہاں کے چند معتمد مسلمانوں سے فون کرکے مزید تصدیق واطمینان کرلیا جائے اور جب سچ ہونے کا ظن غالب حاصل ہوجائے تو اس کے بعد اپنے یہاں بھی اعلان کردیا جائے اور جب تک ان خارجی شواہد وقرائن کے ذریعہ سے صداقت کا ظن غالب پیدا نہ ہوجائے اس وقت تک اپنے یہاں اعلان نہ کیا جائے، احتیاط کی جائے۔

اس لیے کہ فون کی اطلاع عام طور سے تحریر کے اعتبار سے زیادہ خفاء اور التباس ہوتا ہے، اور ایک شخص کی آواز دوسرے شخص کی آواز سے بعض اوقات خطوط کی مشابہت سے زیادہ مشابہ اور مختلط ہوتی ہے، پس جب تحریر کی تصدیق کرنے میں "**الخط یشبه الخط**" کی وجہ سے خارجی دلائل وشواہد اور قیود وغیرہ کا ملحوظ رکھنا ضروری ہوتا ہے تو اس میں بدرجہ اولی لازم وضروری رہے گا۔

نوٹ: جب کمیٹیوں میں باہم تعاون کا رابطہ نہ ہو یا کیف ما اتفق کوئی ٹیلیفون کہیں سے ثبوت رویت کا آجائے تو اس صورت میں جو صورتیں فون کی شرعاً معتبر ہونے کی ہیں وہ مطبوعہ جواب میں مسئلہ ا تا ۳ تفصیل سے آچکی ہیں، وہاں ملاحظہ فرمالیا جائے۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

ریڈیو ٹیلیفون وغیرہ کے ذریعہ اطلاع ہلال کا شرعی حکم:

آج کل آمد ورفت اور خبر رسانی کے ذرائع اس قدر عام اور آسان ہوگئے ہیں کہ عید اور بقرعید ورمضان کے چاند کی خبریں بھی ہر وقت گاؤں گاؤں، شہر شہر ہر جگہ پہنچ جاتی ہیں، کبھی تار وٹیلیفون سے کبھی ریڈیو سے اور مسلمانوں کا عام طبقہ عموماً مسائل سے ناواقف ہونے کی وجہ سے ایک الجھن اور کش مکش میں مبتلا ہوجاتا ہے کہ ایسے موقع پر حکم شرع شریف کیا ہے؟ ہمیں عید منالینی یا روزہ رکھ لینا چاہئے یا نہیں؟ بالخصوص ریڈیو کی خبریں بعض مرتبہ حجاز اور بعض ایسے دور دراز ممالک سے آجاتی ہیں جس سے کبھی ۲۸ر شعبان ہی کو پہلی رمضان معلوم ہوتی ہے اور کبھی ۲۸ر رمضان ہی کو عید کا دن معلوم ہوتا ہے اور کبھی آٹھویں ذی الحجہ کو بقرعید اور قربانی کا دن معلوم ہوتا ہے۔ ہر جگہ معتبر عالم موجود نہ ہونے کی وجہ سے یہ الجھن اور بڑھ جاتی ہے، بعض لوگ اختلاف مطالع کی آڑ لے کر ٹال دیتے ہیں بعض لوگ جنتری کو بنیاد بنا کر حجت کرتے ہیں اور بعض لوگ علم

ہیئت کے اصول سے بحث و معارضہ کرتے ہیں، اور بعض لوگ ان خبروں کو شہادت کا درجہ دے کر صحیح تسلیم کر لیتے ہیں اور اس کے مطابق عمل کر ڈالتے ہیں، اور بعض لوگ مقامات مقدسہ یا اسلامی ممالک کا نشریہ ہونے کی بنا پر بلا کسی قید و شرط کے لحاظ کئے ہوئے واجب العمل قرار دے کر دوسروں کو بھی ماننے پر مجبور کرتے ہیں، غرض اس سے عوام میں بڑے بڑے فسادات رونما ہو جاتے ہیں، ایک ہی آبادی کے کچھ حصہ میں عید منائی جاتی ہے اور کچھ حصہ میں روزہ ہوتا ہے، بعض جگہ عید گاہوں میں جھگڑا فساد کی نوبت آجاتی ہے۔

بعض مفسدین دین کو بازیچہ شیاطین بنانے اور کھلونے کی شکل دینے کی کوشش میں لگ جاتے ہیں، اس لئے گزارش ہے کہ ان خبروں سے متعلق کچھ مسائل اور اصول وقواعد مفصل اور مدلل اس طرح بیان کر دیئے جائیں جس سے بصیرت کے ساتھ مسئلہ کی صحیح حیثیت ذہن میں اتر سکے اور عمل کرنے میں روشنی مل سکے اور کش مکش ختم ہو سکے۔

الجواب وبالله التوفيق :

یہ تو صحیح ہے کہ ریڈیو کی خبر یا اعلان شہادت شرعیہ نہیں، لیکن مطلقاً ہر حال میں بالکل نا قابل عمل اور نا قابل التفات قرار دے دینا بھی صحیح نہیں، اسی طرح یہ بھی صحیح نہیں کہ ریڈیو پر آنے والی ہر خبر اور اعلان بالکلیہ صحیح اور درست ہو کہ اس پر تحقیق و تفتیش کی بھی ضرورت نہ رہے اور اس پر عمل واجب ہو جائے، بلکہ اس میں کچھ تفصیل ہے، کچھ قیود و شرائط ہیں، ان کے ساتھ ریڈیو کا نشریہ و اعلان معتبر قابلِ عمل ہو سکتا ہے، اور ان شرائط اور قیود کے بغیر معتبر اور نا قابل توجہ و عمل رہے گا، ان تفصیلات و قیودات کی اجمالی نشان دہی ذیل میں نمبر وار کی جائے گی، اور امید ہے کہ اس سے مذکورہ جملہ شقوں کا جواب اور جملہ شکوک کا ازالہ بھی ہو جائے گا، ان تفصیلات و قیودات کی نشاندہی کرنے سے پہلے کچھ ضمنی گفتگو بطور تمہید و مقدمہ پیش کی جاتی ہے جو مفہوم مسئلہ کے حل کرنے میں معین و نافع ہو سکتی ہے۔

تمہید و مقدمہ:

اولاً چند عبارات فقہیہ نقل کی جاتی ہیں:

- "ولا عبرة بقول الموقتين ولو عدولا على المذهب، قال في الوهبانية: وقول أولي التوقيت ليس بموجب" (۱)۔

۱- درمختار۔

● "وتحته في الشامية (۲/ ۱۲۵) أي في وجوب الصوم على الناس بالإجماع، وفي النهر: فلا يلزم بقول الموقتين أنه أي الهلال يكون في السماء ليلة كذا، وإن كانوا عدولا في الصحيح (إلى قوله) قلت ما قاله السبكي رده متاخروا أهل مذهبه (أي الشافعي) ومنهم ابن حجر والرملي (ثم إلى قوله) وما قاله السبكي الشافعي مردود ردهٗ عليه جماعة من المتأخرين منه (أي الشافعية) وليس في العمل بالبينة مخالفة لصلوته ﷺ ووجهه ما قلنا: إن الشارع لم يعتمد الحساب بل ألغاه بالكلية لقوله نحن أمة أمية (ثم إلى قوله) وقال ابن دقيق العيد: الحساب لا يجوز عليه الاعتماد في الصلوٰة، انتهىٰ ما قاله الرملي الشافعي"(۱)۔

● "واختلاف المطالع غير معتبر على ظاهر المذهب، وعليه أكثر المشائخ وعليه الفتوىٰ، بحر عن الخلاصة"۔

● "قوله: ورويته نهارا الخ (تحته في الشامي (۳/ ۹۲)، إنما الخلاف في اعتبار اختلاف المطالع بمعنى أنه هل يجب على كل قوم اعتبار مطلعهم ولا يلزم أحد العمل بمطلع غيره أم لا يعتبر اختلافها، بل يجب العمل بالأسبق رؤيته (إلى قوله) وظاهر الرواية الثاني وهو المعتمد عندنا وعند المالكية والحنابلة لتعلق الخطاب عاما بمطلق الروية في حديث صوموا لرؤيته (إلى قوله) بخلاف أوقات الصلوٰة"(۲)۔

(مذہب مختار کے مطابق موقتین کے قول کا کچھ اعتبار نہیں و ہبانیہ میں کہا ہے کہ موقتین (حساب داں) کے قول سے کوئی حکم ثابت نہیں ہوتا، شامی میں اسی کی شرح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ مثبت حکم نہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ان کے قول سے لوگوں پر روزہ کا وجوب بالاتفاق نہ ہوگا، اور نہر میں ہے کہ موقتین کے کہنے سے لازم نہیں آتا کہ چاند اس رات آسمان میں موجود ہی ہو، گو یہ لوگ ازروئے شرع عادل ہی کیوں نہ ہوں، صحیح قول یہی ہے، پھر چند سطروں کے بعد لکھتے ہیں کہ علامہ سبکی شافعی کا قول غیر مقبول ہے۔ متاخرین شافعیہ نے اس کو رد کر دیا ہے۔ اور گواہوں کی بات پر عمل کرنے میں نبی کریم ﷺ کی نماز کی مخالفت نہیں ہوتی اور موقتین کی بات کے غیر معتمد ہونے کی دلیل وہی ہے جو اوپر بیان کر چکے ہیں کہ شارع علیہ السلام نے حساب پر اعتماد نہیں کیا، بلکہ حساب کو سرے سے لغو قرار دیا ہے اور فرمایا ہے: "نحن أمة أمية" ہم تو ان پڑھ لوگ ہیں۔

۱- شامی ۲/ ۱۲۵۔
۲- شامی ۲/ ۹۲۔

ابن دقیق العید (صاحب احکام الاحکام) فرماتے ہیں کہ نماز کے سلسلے میں حساب پر اعتماد کرنا جائز نہیں، انتہی ما قالہ الرملی الشافعی، شامی (۲/۱۲۵)، اور در مختار میں بحوالہ بحر لکھا ہے کہ ظاہر مذہب کے مطابق اختلاف مطالع کا اعتبار نہیں، اسی پہ مشائخ کا عمل ہے اور یہی مفتی بہ ہے: اور اختلاف مطالع کے معتبر و غیر معتبر ہونے میں جو اختلاف ہے، اس معنی کر کے ہے کہ کیا ہر بستی پر لازم ہے کہ وہ صرف اپنے مطلع کا اعتبار کرے اور کسی کے لئے دوسرے کے مطلع پر عمل کرنا ضروری نہیں ہے، یا یہ کہ اختلاف مطالع کا کچھ بھی اعتبار نہیں، بلکہ جو شخص بھی پہلے چاند دیکھ لے سب کے ذمہ اس کی پیروی ضروری و لازم ہے، کچھ آگے چل کر فرماتے ہیں کہ دوسری ظاہر الروایۃ ہے اور حنفیہ کے نزدیک یہی معتبر ہے اور مالکیہ اور حنابلہ کا بھی اسی پر اعتماد ہے، اس لئے کہ حدیث "صوموا لرؤیته" میں مطلقاً رویت کا خطاب ہر فرد کے لئے عام ہے، لیکن اوقات صلوٰۃ کا حکم اس سے مختلف ہے۔

ان عبارات سے معلوم ہوا کہ اختلاف مطالع کا اعتبار اور حساب منجمین کا اعتبار محققین احناف کے نزدیک اور محققین ائمہ اربعہ کے نزدیک صحیح نہیں، بلکہ طرق موجبہ سے جو ثبوت رویت کا ہوگا فقط وہ معتبر ہوگا، خواہ وہ ثبوت دنیا کے کسی حصہ و گوشہ سے آئے کسی بھی طرح سے آئے صرف شرط اتنی ہے کہ نصوص صریحہ صحیح یا متون صحیحہ شرعیہ کے خلاف نہ ہو، اور مقصد شرع سے بھی متجاوز نہ ہو، اس لئے کہ طرق موجبہ خود نصوص نہیں کہ نص کا یا حقیقت واقعہ کا معارضہ یا مقابلہ کر سکیں، بلکہ نصوص سے متاخر و ثانوی درجہ میں ہے، مثلاً نصوص میں وارد ہے: "صوموا لرویته"۔

● "صوموا لرویته وأفطروا لرویته، فإن غم علیکم فأکملوا عدة شعبان ثلاثین"(۱)، أنا أمة أمیة لا نکتب ولا نحسب الشهر هکذا وهکذا وعقد الإبهام فی الثالثة، ثم قال: الشهر هکذا وهکذا، یعنی تمام الثلاثین یعنی مرة تسعا وعشرین ومرة ثلاثین"(۲)۔

● "وعن ابن عباسؓ قال جاء أعرابی إلی النبی ﷺ فقال: إنی رأیت الهلال یعنی هلال رمضان فقال أتشهد أن لا إله إلا الله! فقال نعم، قال: أتشهد أن محمدا رسول الله! قال: نعم، قال: یا بلال أذن فی الناس أن یصوموا غدا"(۳)۔

(چاند دیکھ کر روزہ رکھو اور چاند دیکھ کر افطار کرو (عید مناؤ) اگر گرد و غبار وغیرہ کی وجہ سے چاند ڈھک جائے تو تیس

۱- بخاری کتاب الصوم، ۱/۲۵۶ و أیضاً مسلم۔
۲- مشکوٰۃ المصابیح/۱۷۴۔
۳- رواہ ابو داؤد و ترمذی، نسائی، ابن ماجہ، دارمی، مشکوٰۃ وغیر ذلک من النصوص الواردۃ فی ہذا الباب۔

دن شعبان کے پورے کرلو' بخاری، مسلم، ہم لوگ امت امیہ ہیں حساب وکتاب پر مدار ان چیزوں کا نہیں رکھتے، بلکہ مہینہ اتنا ہوتا ہے اور اتنا ہوتا ہے، ایک مرتبہ دونوں ہاتھ کی انگلیاں اٹھا کر تین بار اشارہ فرمایا اور تیسری بار اشارہ کرتے ہوئے انگوٹھے کو موڑ کر چھپا لیا، پھر دوسری مرتبہ پھر مثل سابق دونوں ہاتھ کی انگلیاں اٹھا کر تین بار اشارہ فرمایا، اور اس مرتبہ تیسری بار کے اشارہ میں انگوٹھا بھی اٹھائے رکھا اور اس سے آپ تیس دن پورے مراد لے رہے تھے، اور بتلانا یہ تھا کہ مہینہ ۲۹ دن کا بھی ہوتا ہے اور کبھی پورے تیس دن کا)۔

حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ ایک دیہاتی حضور پاک ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا، اور کہا کہ میں نے ابھی رمضان کا چاند دیکھا ہے، جناب نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ تم وحدانیت رب ذوالجلال کی شہادت دیتے ہو، اس نے کہا: ہاں، پھر آپ ﷺ نے فرمایا کہ تم مجھے اللہ کا رسول برحق سمجھتے ہو! اس نے کہا: ہاں، آپ ﷺ نے فرمایا کہ اے بلال! لوگوں میں اعلان کردو کہ صبح روزہ رکھیں)۔

ان نصوص سے چند امور ظاہر ہوتے ہیں، مثلاً یہ کہ مہینے ۲۹ دن یا ۳۰ دن میں دائر ہوں گے اس سے کم یا بیش نہیں ہوں گے، یا مثلاً یہ کہ دین اسلام عالم گیر مذہب ہے، یہ عالم، جاہل، یا متمدن بدوی، بادشاہ، رعایا، حکماء، فلاسفہ غرض سب کو ایک ساتھ مخاطب کرتا ہے، اور اصول فطری وسادہ وضع کرتا ہے، اور اسی سادگی پر بنیاد رکھتا ہے، تاکہ سب یکساں عمل کرسکیں، بلکہ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ دین کی بنیاد وہی سادگی اور فطرت پر ہے، جو علوم ہندسہ وریاضیہ کی کشاکش سے معریٰ ہے، اسی طرح تکلفات وتدقیقات سائنسیہ سے مبرا ومنزہ ہے، لہذا نہ خوردبین سے تلاش ہلال کی ضرورت ہے نہ فضا میں پرواز کی حاجت ہے، بلکہ اگر نصوص صحیحہ ومتون شرعیہ صحیحہ میں غور کیا جائے تو یہ امر بالکل واضح طور پر نمایاں ہوجاتا ہے کہ تکلفات وتدقیقات ریاضیہ غیر مطلوب ہیں، یہی نہیں، بلکہ غیر مستحسن بھی ہیں، بلکہ بعض اوقات مضر وغیر معتبر بھی ہوں گے، جس طرح اگر بغیر تدقیق وتحقیق اور بغیر اہتمام والتزام کے کوئی حکم ان سے مل جائے تو معتبر اور مقبول ہوگا۔

"کما حققه الشیخ المفتی محمد شفیع الدیوبندی مدظله فی رسالة" "آلات جدیدہ" کے شرعی احکام (ص ر ۱۸۳)۔

خلاصہ یہ ہے کہ ثبوت رویت ہلال کا مدار یا تو خود رویت پر ہے، شہادت میں قاضی شرعی ومجلس قضاء وغیرہ شرط ہے، اور بسا اوقات اس کا فقدان ہوتا ہے، ایسے مواقع میں عادل مسلمان کی خبر بھی بمفاصیلہ وشرائطہ جب اس طرح ہو کہ اس سے ثبوت کا ظن غالب حاصل ہوجائے تو کافی ہوجاتی ہے۔ کما فی التنویر:

(۷) "لو كانوا ببلدة لا حاكم فيها صاموا بقول ثقة وافطروا باخبار عدلين للضرورة۔ تحت قوله ببلدة في الشامي (۱۲۵)، أو قرية قال في السراج: ولو تفرد واحد برويته في قرية ليس فيها دال ولم يأت مصرا يشهد وهو ثقة يصومون بقوله، والظاهر أنه يلزم لأهل القرىٰ الصوم بسماع المدافع أو برؤية القناديل من المصر، لأنه علامة ظاهرة تفيد غلبة الظن حجة موجبة للعمل"(۱)۔

(تنویر الابصار میں ہے کہ اگر لوگ ایسے شہر میں ہوں جس میں کوئی حاکم شرع نہ ہو تو لوگ اس میں ایک ثقہ معتبر آدمی کے قول پر روزہ رکھیں اور دو ثقہ عادل شخصوں کی خبر پر افطار کریں یہ حکم ضرورت کی وجہ سے ہے، (اسی کے تحت) شامی (۱۲۵/۲) میں یہی حکم دیہات کا بھی ہے، کسی ایسے دیہات میں چاند دیکھے اور شہر تک قاضی کے پاس شہادت دینے کے لئے نہ آئے اور وہ ثقہ معتبر شخص ہو تو لوگ اس کے قول کے مطابق روزہ رکھیں اور یہ حکم ظاہر مسلم ہے کہ دیہات والوں پر شہر کی توپ کی آواز سن کر یا شہر کے میناروں اور قندیلوں کی روشنی دیکھ کر روزہ رکھنا لازم ہو جاتا ہے، اس لئے کہ یہ ایسی ظاہری علامت ہے جس سے رویت کا ظن غالب، حاصل ہو جاتا ہے اور یہ عمل کرنے کے لئے حجت موجبہ ہے۔

اور یہ اعتبار کا ادنیٰ درجہ ہے اور مخبر کا مسلمان عادل ہونا، اس بات پر موقوف ہے کہ اس کی پوری پوری شناخت اور تعین ہو، نیز اس کے دینی حالات و عادات کا بھی صحیح علم ہو کہ آیا یہ ثقہ و عادل ہے یا نہیں ٹیلی گرام و وائرلیس میں یہ سب امور غیر ممکن نہیں تو دشوار ضرور ہیں، کچھ خبر نہیں ہوتی کہ خبر دینے والا کون ہے اور کیسا ہے، اس لئے ان کی خبریں اس باب میں مفید و معتبر نہ ہوں گی، یہ ہو سکتا ہے کہ کسی خاص موقع پر ان خبروں سے قوت و تائید کا فائدہ حاصل ہو جائے، مگر مدار ثبوت ان پر نہیں ہو سکتا، ان خبروں میں اگر چہ اتنی جہالت اور اتنا ابہام نہیں ہوتا جتنا وائرلیس وٹیلیگرام کی خبروں میں ہوتا ہے، لیکن اس میں بھی اتنی بات ضرور ہوتی ہے کہ آواز کی پوری شناخت ہوتی بھی ہے تو بہت کم اور دشواری سے حتیٰ کہ محققین نے اس کا درجہ خط سے بھی کم شمار فرمایا ہے:

"كما حققه الشيخ الموصوف بالتفصيل في رسالة :كشف الظنون عن حكم الخط والتيليفون"۔

(جیسا کہ شیخ موصوف (مفتی محمد شفیع صاحب) نے نہایت بسط و تفصیل سے اس کو اپنے رسالہ "کشف الظنون عن حکم الخط والتلیفون" میں واضح طور پر بیان فرمایا ہے)۔

۱- شامی ۱۲۵/۲۔

اس لئے اس پر بھی عام طور سے مدار نہیں رکھ سکتے، البتہ بعض خاص صورتوں میں اس کا اعتبار کر سکتے ہیں، جس کی تعین وتشریح بعد میں اپنے موقعہ پر عرض ہوگی، رہ گیا ریڈیو تو جن میں چند قیود وشرائط کا اگر لحاظ کرلیا جائے تو صحت کا غلبہ ظن بھی بسہولت حاصل ہوسکتا ہے، مگر چونکہ ریڈیو دنیا کے ہر خطہ سے آسکتا ہے اور آتا ہے، ایسے مقام سے بھی آتا ہے جہاں کا مطلع مختلف ہونا بالکل ظاہر اور مسلمات میں سے ہے، جیسے کہ لندن، امریکہ، قسطنطنیہ، بلغاریہ، ان مقامات سے بھی کوئی اعلان ضابطہ شرعی کے مطابق آسکتا ہے، اور اختلاف مطالع کے نفس وقوع سے اختلاف یا انکار بھی نہیں ہے، اگر انکار یا اختلاف ہے تو محض رویت ہلال کے ثبوت میں اس کے اعتبار کرنے یا اس پر مدار رکھنے میں ہے، اس لئے ریڈیو کے اس نشریہ کے اعتبار کرنے میں جو قیود وشرائط ہیں اور جن کا لحاظ رکھنا بہر حال ضروری ہے، ان کو ہم ذرا تفصیل سے بیان کریں گے، تا کہ منشاء شارع علیہ السلام اور مقصد شرع سے تخالف یا تجاوز لازم نہ آئے، جو کسی طرح درست نہ ہوگا۔

غرض اس مختصر تمہید کے بعد خاص طور سے ریڈیو سے متعلق تفصیلات وقیودات موعودہ نمبروار بیان کی جاتی ہیں جن کو احکام ومسائل کے لئے اصول موضوعہ اور قواعد کلیہ کے درجہ میں بھی کہا جاسکتا ہے اور اسی لئے ہم ہر صورت کو الگ الگ بعنوان مسئلہ نمبروار بیان کرتے ہیں، تا کہ سمجھنا اور بھی آسان ہو جائے۔

مسئلہ ۱: جہاں حکومت کی جانب سے قاعدہ شرعی کے مطابق رویت کا ثبوت حاصل کر کے اعلان کرنے کا قانون وانتظام ہو اور اس پر عمل رائج ومشہور، ہو تو وہاں پر مقامی طور سے پورے حدود مملکت کے اندر عمل کرنے کے لئے یہ مطلق اعلان بھی مثل اعلان قاضی ومثل طبل قاضی وصوت مدافع وغیرہ معتبر ہوگا، خواہ حکومت مسلمہ ہو یا کافرہ، ان اعلانات اور نشریوں پر عمل کرنا لازم ہوگا۔

"لحصول غلبة الظن بهذاالطريق في هذه الصورة"۔

(حکم اس لئے ہے کہ) اس صورت میں اس طریقہ سے غلبہ ظن حاصل ہو جاتا ہے)۔

اور اس صورت میں حدود مملکت سے باہر بھی اس اعلان ونشریہ پر عمل کرنا ضروری ہوگا، بشرطیکہ مہینہ ۲۹ و ۳۰ دن کا ہونے کے بجائے ۲۸ دن یا ۳۱ دن کا نہ ہو رہا ہو (بحوالہ عبارت ۵)۔

اس لئے کہ یہ اعلان من کل الوجوہ محض طبل قاضی یا صوت مدافع وغیرہ کے مانند نہیں ہے کہ محض انہیں کے حکم کے تابع اس کا بھی حکم ہو، اور وہی چیزیں اس کا مقیس علیہ ہو جائیں اور نہ ہی قضاۃ کے امور قیاسیہ مجتہدہ میں سے ہے کہ محض ان کے حدود واختیار و دائرہ حکومت کے اندر اندر محصور ہے اور نہ ہی معاملات محضہ یا امور سیاسیہ ملکیہ میں سے ہے کہ "لنا دارنا

ولكم داركم" کے قاعدے سے حدود حکومت ومملکت کے اندر اندر محدود رہے، بلکہ اعلان ان تمام مذکورہ چیزوں سے بہت قوی وبلند ہے اور یہ اعلان ان صحابیؓ کے اعلان کے مانند ہے جن کورویت ہلال کا شرعی ثبوت ہو جانے کے بعد خود سرکار دوعالم ﷺ نے اعلان کرنے کا حکم فرمایا تھا: "كما رواه الجماعة والدارمي عن ابن عباسؓ قال: جاء اعرابي إلى النبيﷺ، فقال إني رأيت الهلال، يعني هلال رمضان، فقال: أتشهد أن لا إله إلا الله! قال: نعم، قال أتشهد أن محمدا رسول الله! قال: نعم، قال: يا بلال أذن في الناس أن يصوموا غدا"(۱)۔

یہ اعلان نبوی اس اعلان کا مقیس علیہ ہوسکتا ہے اور جس طرح یہ اعلان نبوی کسی دار یا حکومت کے حدود سے محدود نہیں تھا، اسی طرح یہ اعلان بھی کسی دار یا حکومت کے حدود سے محدود نہ ہوگا، جیسا کہ ذی قعدہ ۱۳۵۷ھ کے مرادآباد کے اجلاس "جمعیۃ العلماء" کے اندر اپنے اکابر حضرات شیخ الاسلام اور حضرت مفتی کفایت اللہ صاحب رحمہم اللہ کے فیصلہ سے بھی معلوم ہوتا ہے، نیز یہ اعلان خالص امور دینیہ سے متعلق ہے اور باب دیانات سے ہے، بلکہ از قبیل عبادات اور خالص عبادات سے متعلق ہے، بعض مہینوں میں کچھ آمیزش معاملات کی (جیسے ماہ عید الفطر وغیرہ) جو نظر بھی آتی ہے تو وہ محض تبعا وضمنا ہے، اس میں صلاحیت نہیں کہ اس کو مقیس علیہ بنایا جائے اور اس پر مستقل احکام متفرع کیے جائیں، بلکہ جس طرح اور امور دینیہ اور عبادات کے مخاطب سارے عالم کے مسلمان ہوتے ہیں، اسی طرح اس کے مخاطب بھی سارے عالم کے مسلمان ہوسکتے ہیں اور جس طرح وہ سب "فليبلغ الشاهد الغائب" (۲) کے قاعدہ سے سب پر متوجہ رہتے ہیں، اسی طرح یہ بھی اسی قاعدہ سے سب پر متوجہ رہ سکتا ہے، بشرطیکہ مخصوص شرعی الفاظ میں ہو، اور تمام شرائط وقیود کو حاوی ہو جن کی تشریح وتفصیل اپنے اپنے موقعہ پر آجائے گی۔

مسئلہ ۲: جہاں پر حکومت کی جانب سے ایسا انتظام نہ ہو وہاں ایسا مسلمان حاکم جس کو حکومت کی جانب سے شرعی ثبوت حاصل کر کے اعلان کرنے کا اختیار رہو اور وہ اعلان کرے یا ہلال کمیٹی جس کے تمام افراد مسلمان باشرع ہوں اور اس کی پوری کارروائی میں کوئی مستند ومفتی تجربہ کار شریک ہو یا مستند مفتی شہر یا عالم مقتداء ومتدین یہ لوگ اعلان کریں کہ شرعی ثبوت حاصل کرنے کے بعد یہ اعلان کیا جاتا ہے اور قرائن شرعیہ سے صحت کا ظن غالب ہو تو مقامی طور پر یہ اعلان بھی معتبر ہوگا، اور اس پر عمل کرنا درست ہوگا۔

۱- مشکوٰۃ/۱۷۴۔

۲- بخاری مع الفتح باب الخطبۃ أیام منی ۳/۵۷۳۔

مسئلہ ۳: جہاں پر حکومت کی جانب سے کوئی شرعی انتظام نہ ہو اور نہ کوئی مسلمان حاکم منجانب حکومت حسب قاعدہ شرع ثبوت لے کر اعلان کا اختیار رکھتا ہو اور نہ کوئی شرعی ہلال کمیٹی وغیرہ ہو، جیسا کہ ہمارے ملک کی اکثر آبادیوں کا بالخصوص دیہاتوں کا یہی حال ہے، جیسا کہ وہاں بھی مسلمان آباد ہیں اور بکثرت ہیں اور ان کو بھی روزے رکھنا شوال کی پہلی تاریخ متعین ومعلوم کرنا ضروری ہے، کیونکہ یکم شوال کو روزہ رکھنا حرام ہے، اور چاند ہر جگہ یا ہمیشہ نظر آنا ضروری نہیں اور ریڈیو بوجہ کثرت قریب قریب ہر گاؤں میں رائج ہو چکا ہے، اگر ریڈیو سے خبر آجائے اور آہی جاتی ہے، ایسے موقع پر کس طرح عمل کیا جائے اس کا حکم یہ ہے کہ یہ خبر اگرچہ اپنے ملک کے کسی حصہ سے آئے، لیکن بایں الفاظ آئے کہ یہاں چاند ہوا ہے، یا فلاں شخص نے دیکھا ہے یا بہت سے لوگوں نے دیکھا ہے، تو یہ بالکل معتبر نہیں، خواہ کتنی ہی تعداد میں ایسی خبریں کیوں نہ آئیں۔

"لأنها حكاية محض لا خبر معتبر كما هو ظاهر"۔

(اس لئے کہ خبر وحکایت محض ہے شریعت میں غیر معتبر ہے)۔

اور ہمارے ملک میں آجکل ریڈیو کی خبریں اکثر ایسی ہی ہوتی ہیں، اور عوام بھی اکثر بلا لحاظ شرائط وقیود اس کو معتبر اور قابل عمل قرار دے کر عمل کر بیٹھتے ہیں اور ان ہی وجوہ کی بناء پر بعض حضرات علماء نے ریڈیو وغیرہ کی خبروں کو مطلقاً غیر معتبر ونا قابل عمل قرار دیا ہے، ورنہ راجح ومحقق یہ ہے کہ اگر بایں الفاظ اعلان یا خبر نشر ہو کہ میرے سامنے فلاں حاکم شرعی نے یا فلاں ہلال کمیٹی نے جس کے تمام افراد باشرع ہیں یا فلاں مفتی شہر نے یا فلاں عالم مقتدیٰ ومتدین نے یا فلاں مسلمان حاکم یا مسلمان وزیر نے (جس کو حکومت وقت کی جانب سے با اختیار بنایا گیا ہو) ثبوت شرعی حاصل کر کے ثبوت رویت کا حکم یا فیصلہ دے دیا ہے، اور ان الفاظ کا نشر کرنے والا شخص بھی معلوم ومعتبر ہو تو اس نشریہ پر بھی عمل کرنا درست اور صحیح ہوگا۔

"لأن البلدة لا تخلو عن حاكم شرعي عادة" ينفذ أحكامه فيستند هذا الخبر إلى موجب شرعي صحيح وأقله أن يحصل به غلبة الظن الموجب للعمل كما يحصل بسماع أصوات المدافع وبرؤية القناديل من المصر"(۱)۔

(اس لئے کہ کوئی شہر ایسے حاکم شرعی سے عادۃً خالی نہیں رہتا جس کے احکام اس شہر میں نافذ ہوتے ہیں، پس یہ

۱- وفی رد المحتار الشامی: "لأن البلدة لا تخلو عن حاكم شرعي عادة، فلا بد من أن يكون صومهم مبنيا على حكم حاكمهم الشرعي، فكانت تلك الاستفاضة بمعنى نقل الحاكم المذكور، وهي أقوى من الشهادة......فإنها تفيد اليقين فلا ينافي ماقبله، هذا ما ظهرلي، تأمل" رد المحتار کتاب الصوم ۳/ ۵۹ ۳، مطلب ما قالہ السبکی)۔

خبر (اس حالت میں) صحیح شرعی سبب کی جانب سے منسوب ومستند ہوگی اور اس کا کم سے کم درجہ یہ ہے کہ اس سے ایسا غلبۂ ظن حاصل ہوجائے گا جو عمل کرنے کی وجہ ہو سکے گا)۔

اسی طرح بایں الفاظ خبر یا اعلان نشر ہو کہ میں نے خود چاند دیکھا ہے یا مجھ سے فلاں فلاں (کم سے کم دو معتبر عادل) شخصوں نے خود اپنا چاند دیکھنا بیان کیا ہے اور ان الفاظ کا نشر کرنے والا شخص معلوم اور معتبر ہے اور قرائن شرعیہ سے صحت کا ظن غالب ہے تو مقامی طور پر یہ خبریں بھی طرق موجبہ کے مطابق ہونے کی وجہ سے معتبر ہوں گی اور قابل عمل ہوں گی۔

"كما حققه العلامة التهانوی رحمه الله فی رسالة زوال السنة من أعمال السنة وفی إمداد الفتاوی"(۱)۔

(جیسا کہ علامہ تھانویؒ نے اپنے "رسالہ زوال السنۃ عن أعمال السنۃ" میں اور "امداد الفتاویٰ" (۲/ ۷۲) میں اس کی تحقیق کی ہے)۔

مگر اس کے معتبر ہونے میں یہ تفصیل ہوگی کہ اس خاص آبادی کے آس پاس آبادی میں جہاں جانا آنا زیادہ دشوار نہ ہو، اگر کوئی عالم متدین موجود ہو جو اس قسم کے مسائل سے واقف ہو، اس کے سامنے ریڈیو سے خبر سننے والوں کو پیش کر کے بیان دلائیں پھر حکم شرعی معلوم کر کے اس کے مطابق عمل کریں۔ عوام خود رائی و عجلت نہ کریں۔

مسئلہ ۴: جو دیہات یا آبادی ایسی ہو کہ اس کے آس پاس کی آبادی میں ویسا متدین اور ذی علم شخص موجود نہ ہو جو اس قسم کے مسائل سے بخوبی واقف ہو، اور اس کے مقتضی پر عمل کرتا ہو یا موجود ہو، مگر وہاں تک ریڈیو سے خبر سننے والوں کا جانا آنا دشوار ہو اور ان عالم کا آنا بھی دشوار ہو، مندرجہ ذیل طریقہ سے عمل کیا جائے تو درست ہوگا اور نجات آخرت کے لئے ان شاء اللہ کافی ہوگا، البتہ دوسروں سے الجھنا یا زبردستی کرنا یا دوسروں کو ماننے پر مجبور کرنا ہرگز درست نہ ہوگا۔ اور وہ طریقے یہ ہیں:

(الف) اگر مطلع صاف ہونے کی حالت میں اس معتبر مضمون کا نشر یہ آجائے جو مسئلہ ۳ میں راجح اور محقق کر کے لکھا گیا ہے، یعنی یہ کہ میں نے خود چاند دیکھا ہے (اور یہ شخص معلوم (معتبر ہو) یا یہ مضمون ہو کہ مجھ سے فلاں (معلوم ومعتبر) شخص نے خود اپنا چاند دیکھنا بیان کیا ہے یا فلاں شرعی ہلال کمیٹی یا فلاں با اختیار مسلمان حاکم نے یا فلاں قاضی شرع نے یا فلاں مفتی شہر نے (اور یہ سب لوگ معتبر ومعلوم ہوں) شرعی ثبوت لے کر رویت ہلال کا حکم دیا ہے، اور یہ اعلان یا خبر اتنی

۱- امداد الفتاوی للتھانوی ۲/ ۷۲۔

تعداد میں آجائے کہ عادۃً ان سب کا جھوٹ پر اتفاق کر لینا متصور نہ ہو یا معتذر رہو تو عمل کرنا جائز ہوگا، صرف دو ایک نشریہ کبھی اس صورت میں عمل کرنے کے لئے کافی نہ ہوگا، خواہ ہلال عید کے موقع پر ہو یا ہلال رمضان کے۔

(ب) اگر مطلع صاف نہ ہو اور ہلال رمضان کے ثبوت کا ہو، اور مضمون وہی ہے جو ابھی (الف) میں راجح اور محقق کہہ کے لکھا گیا ہے، یعنی یہ ہے کہ میں نے خود چاند دیکھا ہے، الخ تو ایک نشریہ بھی عمل کے لئے کافی ہو جائے گا۔

(ج) اگر مطلع صاف نہ ہو، اور موقع ہلال عید کے ثبوت کا ہو یا رمضان کے علاوہ کسی اور مہینہ کا ہو، مثلاً شعبان یا بقرعید وغیرہ کا ہو تو ایسے معتبر مضمون کا نشریہ جس کو راجح اور محقق کہہ کے ابھی لکھا گیا ہے کہ کم از کم دو کی تعداد میں آنا ضروری ہے جو مختلف مقامات سے کیف ما اتفق آرہے ہوں، اور اس نشریہ کے صادق ہونے کا اور نشر کرنے والوں کے عادل ہونے کا ظن غالب ہو۔

مسئلہ ۵: اگر منجانب حکومت ثبوت رویت کا کوئی شرعی انتظام نہ ہو، اور نہ کوئی مسلمان حاکم منجانب حکومت شرعی قاعدہ کے مطابق بذریعہ ریڈیو وغیرہ اعلان نشر کرتا ہو اور نہ کوئی شرعی ہلال کمیٹی حسب ضابطہ شرع اس خدمت کو انجام دیتی ہو، اور نہ وہ آبادی ایسی ہو کہ اس میں یا اس کے آس پاس کی آبادی میں کوئی ایسا متدین اور ذی علم موجود ہو جو اس قسم کے مسائل سے بخوبی واقف ہو، اور اس کے مقتضی پر عمل کرتا کراتا ہو یا موجود ہو، مگر وہاں تک ریڈیو سے خبر یا اعلان سننے والوں کا جانا آنا دشوار ہو، اور ان عالم کا آنا بھی دشوار رہو تو ان حالات میں ہلال رمضان کے ثبوت کے لئے ٹیلیفون کا اختیار کر لینے کی بھی گنجائش ہو سکتی ہے۔

ٹیلیفون سے آنے والی اطلاع اگر چہ شرعی شہادت نہیں ہوگی، کیونکہ باب شہادت میں شاہد کا مجلس شہادت میں حاضر ہونا ضروری ہے اور وہ یہاں مفقود ہے، اور پس پردہ کی شہادت شرعاً معتبر نہیں، لیکن چونکہ اس پر دین کے ایک بہت بڑے مسئلہ کی بنیاد واقع ہو رہی ہے، اس لئے اس کو مؤثق کرنے کے لئے حتی الامکان ان قیود کا اعتبار کرنا ضروری ہے، جو شہادت میں ملحوظ ہوتی ہیں۔

اس لئے ٹیلیفون کا مضمون وہی ہو، جو مسئلہ ۳ میں محقق و راجح کہہ کر لکھا گیا ہے، یعنی یہ کہ ٹیلیفون سے بولنے والا یہ اطلاع ان الفاظ میں دے رہا ہو کہ میں نے خود چاند دیکھا ہے یا مجھ سے فلاں معتبر شخص نے جس کو میں خوب جانتا ہوں، اپنا چاند دیکھنا بیان کیا ہے، یا میرے سامنے فلاں شرعی ہلال کمیٹی نے جس کو میں خوب جانتا ہوں، اور اس کے تمام ارکان ذی علم اور متدین ہیں، شرعی ثبوت لے کر رویت ہلال کا حکم و فیصلہ دیا ہے یا ٹیلیفون پر کہنے والا یہ کہہ رہا ہو کہ میرے سامنے فلاں

مسلمان حاکم جو اس قسم کے معاملات میں اعلان کرنے کا اختیار رکھتا ہے، اس نے یا فلاں قاضی شرعی نے یا فلاں مفتی شہر نے شرعی ثبوت لے کر رویت کا حکم و فیصلہ دیا ہے اور مسلمان حاکم اور قاضی شہر کو میں خوب جانتا ہوں اور یہ لوگ معتبر و متدین ہیں اور پھر یہ شخص جو ٹیلیفون پر بول رہا ہے، یہ بھی خوب جانا پہچانا اور معتبر و متدین شخص ہو اور اس کی آواز بھی خوب پہچانی جارہی ہو، اور پھر ان الفاظ میں ان قیود کے ساتھ آنے والے ٹیلیفون کے بعد اس پر عمل کرنے کی محض مندرجہ ذیل صورتیں ہیں:

(الف)—— مطلع صاف ہو تو محض دو ایک ٹیلیفون کافی نہیں، خواہ کمیٹی ہی ثقہ اور معتبر لوگوں کی ہو، بلکہ ملک کے مختلف گوشوں سے ان ہی مذکورہ بالا الفاظ میں اتنی تعداد میں آجانا ضروری ہے کہ عادۃً ان سب کا جھوٹ پر اتفاق کر لینا متصور نہ ہو یا متعذر رہو۔

(ب)—— مطلع صاف نہ ہو اور موقع ہلال رمضان کے ثبوت کا ہو تو صرف ایک ٹیلیفون بھی اپنے عمل کے لئے کافی ہوگا۔

(ج)—— مطلع صاف نہ ہو اور موقع ہلال عید کے ثبوت کا ہو یا رمضان کے علاوہ کسی اور مہینے کا ہو، مثلاً شعبان یا بقرعید کا ہو تو کم از کم مذکورہ معتبر الفاظ میں دو ٹیلیفون کا آنا ضروری ہے جو مختلف مقامات سے کیف ما اتفق آرہے ہوں اور ان کے صادق اور معتبر ہونے کا ظن غالب حاصل ہو رہا ہو۔ اسی طرح اگر چہ کوئی شرعی انتظام ہو اور خبر کو ثبوت شرعی کے ساتھ نشر کرنے کے مراکز بھی موجود ہوں، لیکن ٹیلیفون کی اطلاع ایسے مقام سے آرہی ہو کہ وہاں سے شرعی اصول و ضابطہ کے مطابق ان مراکز تک اطلاع پہنچنا سخت دشوار و متعذر رہو، اس حالت میں اگر یہ اطلاع ان ہی معتبر الفاظ میں آرہی ہو تو یہ بھی ان ہی مذکورہ بالا تفاصیل و قیود کے مطابق معتبر ہو سکے گی۔

تنبیہ: یہی وہ حالتیں اور صورتیں ہیں جن میں ٹیلیفون کے اعتبار کی گنجائش ان مذکورہ تفصیل و شرائط کے ساتھ ہو سکتی ہے، جن کے بیان کا شروع میں وعدہ کیا گیا تھا:

"هذا أيضا مستفاد من رسالة زوال السنة عن أعمال السنة (١٩-١٨)، ومن إمداد الفتاویٰ (٧٢/٢)، لمجدد الوقت المحقق العلامة أشرف علي التهانوي رحمه الله.

(یہ احکام بھی رسالہ زوال السنۃ عن اعمال السنۃ سے اور "امداد الفتاویٰ ۷۲/۲) سے مستفاد ہے)۔

مسئلہ ۶: جب یہ اعلانات او رنشر یئے بیرون ملک سے آئیں اور اپنے یہاں مثل مسئلہ ا کے انتظام موجود ہو تو اس انتظام کے تحت جو اعلان ہو فقط اس پر عمل کریں خود عجلت نہ کریں اور اگر مثل مسئلہ ا میں جو راجح و محقق کہہ کر بایں الفاظ لکھا گیا ہے "میں نے خود چاند دیکھا ہے یا میرے سامنے فلاں حاکم شرعی نے ثبوت کا فیصلہ دیا ہے۔ الخ" اس کے مطابق عمل کریں اور اگر یہ

صورت بھی نہ ہو تو مسئلہ ۴ کے مطابق عمل کریں۔ اور اگر یہ صورت بھی نہ ہو مگر ٹیلیفون آ رہے ہوں تو مسئلہ ۵ کے مطابق عمل کریں۔

تنبیہ ۲: ان تمام صورتوں میں عمل جائز ہونے کے لئے ایک ضروری شرط یہ بھی ہے کہ ان کے اعلانات یا خبروں پر عمل کرنے سے مہینہ ۳۰/ یا ۲۹/ دن کے بجائے ۲۸/ دن یا ۳۱ دن کا نہ ہو رہا ہو، ورنہ کسی صورت میں بھی عمل کرنا قطعاً جائز نہ ہوگا، مثلاً رمضان کی ۲۸ ہی تاریخ کی شام کو اعلان یا خبر آ جائے، خواہ ان الفاظ میں کیوں نہ آجائے جس کو راجح و محقق کہہ کر لکھا گیا ہے، یعنی میں نے چاند دیکھا ہے یا فلاں فلاں نے چاند دیکھا ہے الخ، تو یہ اعلان یا خبر کسی طرح شرع میں معتبر نہ ہوگی چاہے مسئلہ ۱ کی حالت ہو یا مسئلہ ۲ یا مسئلہ ۳ کی یا مسئلہ ۴ کی۔ یا مثلاً شعبان کی ۳۰ کو بدلی تھی چاند نظر نہ آنے کے باوجود اس کے بعد اس کے بعد والے دن کو فقہی قاعدہ کے مطابق رمضان قرار دے کر روزہ رکھ لیا اور بعد دوپہر بذریعہ ریڈیو یہ اعلان آ گیا کہ میں نے چاند دیکھا ہے اور کل آئندہ رمضان کی پہلی تاریخ ہے، تو اس اعلان یا خبر پر عمل نہ کریں گے، اور روزہ نہ توڑیں گے، بلکہ اسی دن کو جس میں روزہ رکھا ہے رمضان کی پہلی تاریخ ماننا ضروری رہے گا، ورنہ شعبان کا مہینہ ۳۱ دن کا ہونا لازم آجائے گا، اور یہ جائز نہیں، نص صریح کے خلاف ہے، کما مر فی التمہید۔

تنبیہ ۳: خوب یاد رہے کہ اس قسم کے اعلانات و خبروں پر عمل کرنے میں بڑی ہی احتیاط لازم ہے، حتی کہ اگر بعد میں دلیل شرعی سے بالیقین معلوم ہو جائے کہ اس اعلان یا خبر کی وجہ سے جس دن روزہ افطار کر لیا یا روزہ نہیں رکھا، حالانکہ اس دن روزہ رکھنا چاہئے تھا یا وہ دن رمضان ہی کا تھا تو اس دن کی قضا رکھنی ضروری اور لازمی ہوگی، مثلاً دلیل شرعی سے یہ معلوم ہو جائے ۲۹ رمضان کی بذریعہ ریڈیو رویت کی خبر غلط تھی، اس کے بعد والے دن یکم شوال نہ تھی، بلکہ ۳۰ رمضان تھی، جیسے خود ریڈیو ہی نے تردید کر دی کہ وہ خبر غلط ثابت ہو گئی ہے تو اس کی قضا رکھنی ضروری اور لازمی ہوگی۔

تنبیہ ۴: شہر کے لوگوں کی طرح دیہات کے لوگوں کو بھی چاہئے کہ دو دو چار گاؤں کا حلقہ بنا کر اس میں ہلال کمیٹی بنالیں اور اس میں ایک متدین شخص کو بھی جو مسائل متعلقہ سے واقف ہو شریک کر لیں، پھر حسب قاعدہ شرعی مذکورہ بالا اس کے تحت عمل کر لیا کریں۔ اور ان ہلال کمیٹیوں کے بنانے میں حتی المقدور سعی و کوشش کریں کچھ ایثار کریں، بہر حال جہاں یہ بھی ممکن نہ ہو وہاں جو شہر یا قصبہ قریب ہو، اور وہاں اس کا نظم ہوا ہے کو اس سے وابستہ کر لیں اور اس کی ہدایات کے مطابق عمل کر لیا کریں۔

تنبیہ ۵: سب سے عمدہ اور بہتر صورت تو یہ ہے کہ حکومت وقت کی جانب سے رویت ہلال کا انتظام با قاعدہ

قانونی شکل میں کرالیا جائے، کم از کم ہلال عید و بقر عید و شعبان و رمضان ہی کا نظم کرالیا جائے، اس لئے کہ خبر رسانی کے ذرائع و وسائل کثیر و آسان و عام ہوتے جارہے ہیں ٹیلیگرام و ٹیلیفون ریڈیو لاسلکی وغیرہ جن میں بعض تو گھر گھر نہیں تقریبا گاؤں گاؤں عام ہوتے نظر آرہے اگر اس طرف توجہ نہ کی گئی تو بعد چندے عامۃ المسلمین بڑی الجھنوں میں مبتلا ہونے لگیں گے، اس انتظام کی ایک صورت یہ بھی ہوسکتی ہے کہ حکومت ایک متدین ذی علم مسائل و احکام رویت سے بخوبی واقف اور مستند مسلمان کو متعین کرکے اس کو قانونا اختیار دے دے کہ وہ اپنے طور پر شرعی قاعدہ سے رویت ہلال کا ثبوت حاصل کرکے وقت پر قیود و تفصیلات شرعیہ مذکورہ کے تحت اعلان کردیا کرے اور سارا ملک اس کے مطابق عمل درآمد کرلیا کرے، یا مثلاً اس طرح انتظام کرلیا جائے کہ ہلال کمیٹی جس کے سب ارکان باشرع ہوں، اور اس میں ایک مستند اور تجربہ کار مفتی شریک کار ہو وہ کمیٹی ایسے انتظام میں رویت ہلال کا شرعی ثبوت حاصل کرکے حکومت سے اجازت لے کر، بایں الفاظ اعلانیہ نشر کردے یا کرادے کہ ہم فلاں ہلال کمیٹی کے تمام افراد رویت کا شرعی ثبوت ملنے کے بعد باتفاق آراء اعلان کرتے ہیں، یا کراتے ہیں کہ رویت ہلال کا شرعی ثبوت ہو چکا ہے اور کل یکم رمضان ہے روزے رکھے جائیں، یا یکم شوال ہے نماز عید ادا کی جائے، پھر اسی طرح ہلال شعبان و ذی الحجہ وغیرہ کے لئے اعلان کردیا جائے یا کرا دیا جائے، نیز اگر ضرورت پڑے (ضرورت واقعی ہے) تو جہاں جہاں اسی قسم کے لہر (یعنی ریڈیو وغیرہ) کے مراکز ہوں، اسی قاعدہ مذکورہ تنبیہ ؎ کے مطابق انتظام کرلیا جائے اور پھر سب کو ایک میں منسلک کرالیا جائے۔

امید ہے کہ اس تفصیل سے صورت مسئولہ کی تمام شقوں کا جواب بقدر ضرورت نکل آئے گا اور انشاء اللہ کوئی پہلو تشنہ نہ رہے گا، اس لئے اب کسی مزید تفصیل کی حاجت نہ رہی فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور
الجواب صحیح: سید علی سعید، محمود غفی عنہ، مفتی دارالعلوم دیوبند

دوربین یا ہوائی جہاز سے چاند دیکھنا:

دوربین کے ذریعہ یا ہوائی جہاز میں بیٹھ کر بلندی سے چاند دیکھنے کا اعتبار کیا جائے گا یا نہیں؟

(الف) کسی مقام کی رویت کا اعلان اگر مقامی قاضی ٹیلی ویژن یا ریڈیو پر کرتا ہے یا بذریعہ ٹیلی فون اطلاع دیتا ہے تو مقامی لوگوں کے لئے ایسا اعلان اور ایسی اطلاع قابل قبول ہے یا نہیں؟

ریڈیو، ٹیلی ویژن، تار، فون اور خط کے ذریعہ رویت کی خبر:

(ب) ریڈیو اور ٹیلی ویژن کی خبر دوسرے مقامات کے لئے قابل قبول ہے یا نہیں، اگر ہے تو کن کن شرائط کے ساتھ؟

(ج) ٹیلی فون کی اطلاع جب کہ آج کل بڑے بڑے شہروں کے درمیان ڈائریکٹ ڈائلنگ کا سسٹم رائج ہے، دوسرے مقامات کے لوگوں کے لئے قابل قبول ہے یا نہیں، اگر ہے تو کن کن شرائط کے ساتھ؟

(د) تار کی اطلاع دوسرے مقامات کے لوگوں کے لئے قابل قبول ہے یا نہیں، اگر ہے تو کن کن شرائط کے ساتھ؟

(ھ) خط کے ذریعہ دوسرے مقامات کے لوگوں کو اطلاع مل جائے تو اسے قبول کیا جائے گا یا نہیں، اگر قبول کیا جائے گا تو کن صورتوں میں؟

رویت ہلال کے لئے کمیٹی کی تشکیل:

کیا رویت ہلال کے اعلان کے لئے کسی مرکزی کمیٹی کی تشکیل سے آپ متفق ہیں؟ اور کیا بڑے بڑے شہروں میں ذیلی کمیٹیوں کی تشکیل سے بھی آپ کو اتفاق ہے؟

رویت ہلال کے مسئلہ پر کوئی اور مشورہ جو آپ دینا چاہیں۔

الجواب وباللہ التوفیق:

دین اسلام سادہ اور دین فطرت ہے، اس کے احکام بھی سادہ اور فطری اصول کے مطابق ہوتے ہیں، تا کہ عاقل بالغ انسان، خواہ پڑھا لکھا ہو یا ان پڑھ، خواہ امیر ہو یا غریب اور خواہ کسی خطہ کا باشندہ ہو آسانی سے عمل کر سکے اور اپنے خالق و مالک و مربی سے اپنا رشتۂ عبودیت صحیح طریقہ سے جوڑ سکے۔

سرکار دو عالم ﷺ کے زمانہ میں رصد گاہیں ہند و بیرون ہند میں موجود تھیں۔ اصطرلاب وغیرہ آلات بھی موجود تھے اور ان آلات و رصد گاہوں کے ذریعہ سے صحیح طریقہ سے معلوم بھی کیا جاتا تھا کہ اس وقت چاند کس مقام کے مطلع میں موجود رہتا ہے نظر آئے یا نہ آئے، یہ دوسری بات ہے، اگر ان آلات اور رصد گاہوں کے ذریعہ تلاش ہلال کا حکم دیدیا جاتا تو کچھ مستبعد بات نہ ہوتی، مگر سرکار دو عالم ﷺ نے ایسا حکم نہیں دیا، بلکہ صاف صاف فرما دیا گیا کہ جب تک تم لوگ چاند نہ دیکھ لو روزہ نہ رکھو، اسی طرح روزہ شروع کرنے کے بعد جب تک چاند نہ دیکھ لو روزہ ختم نہ کرو، بلکہ اگر تم پر مطلع صاف نہ

ہونے کی وجہ سے چاند نظر نہ آئے مخفی رہ جائے تو تیس دن کی تعداد مہینہ کی ابتدائے صوم میں بھی اور انتہائے صوم میں بھی، بلکہ ہر مہینہ کی تعداد ایسے حالات میں تیس دن کی پوری کرلو، نیز مدینہ واطراف مدینہ میں پہاڑیاں بھی موجود تھیں ان پر لوگ چڑھتے بھی تھے اور یہ بھی یقین تھا کہ اوپر کی فضا صاف ہوتی ہے اگر اس پر چڑھ کر چاند تلاش کرنے کا حکم دیدیا جائے، لوگ عمل بھی کرلیں گے اور یہ بھی اطمینان تھا کہ اگر پہاڑ پر چڑھ کر چاند دیکھنے کا حکم دیدیا جائے تو لوگ پہاڑ سے اوپر اڑ کر نہ جاسکیں گے کہ غلو کرنے یا افراط وتفریط کرنے کا اندیشہ یا خطرہ ہو، پھر بھی پہاڑ پر چاند دیکھنے کا حکم دینے پر قناعت فرمائی گئی، یہی نہیں، بلکہ علمی وسائنسی موشگافیوں اور حسابی دقیقہ سنجیوں کے احتمال سے بھی اعراض فرمایا گیا اور "نحن أمة لا نكتب ولانحسب" () (صحیح بخاری ۱/۲۵۶) کا فرمان ناطق فرمادیا گیا، یہ سب چیزیں اسی بات کا پتہ دیتی ہیں کہ نہ دوربین استعمال کرنے کی ضرورت ہے اور نہ ہوائی جہاز میں اڑ کر تلاش کرنے کی حاجت ہے، بلکہ ان سب طریقوں کو لازم کرنا یا اہمیت دینا شرع وشارع علیہ السلام کا مطلوب نہیں ہے اور حکم شرع بننے کی صلاحیت نہیں رکھتے اور جب یہ بات ثابت ہوگئی کہ یہ شکل حکم شرع بننے کی صلاحیت نہیں رکھتی تو اس پر شرعی حکم محول ودائر نہ کیا جائے گا اور نہ ہی اس کا اہتمام ہی کیا جائے گا، البتہ اگر خبر دینے والے یا شاہدین ہوائی جہاز سے دیکھ کر طریقہ موجب کے ساتھ جس کی تفصیل اوپر گزر چکی ہے خبر یا شہادت دیدیں گے تو حسب ضابطہ شرعی اعتبار کرلیا جائے گا اور اس طرح وہ خبر یا شہادت بھی معتبر ومقبول ہوسکتی ہے۔

(الف) اگر اعلان بایں الفاظ ہو کہ فلاں رویت ہلال کمیٹی چاند کے شرعی ثبوت مل جانے کے بعد یہ اعلان کررہی ہے یا اپنے انتظام سے کرارہی ہے کہ رویت شرعاً ثابت ہوچکی ہے، صبح سے (مثلاً) روزے رکھے جائیں یا صبح نماز عید ادا کی جائے اور یہ کمیٹی جانی پہچانی اور معتبر ہو، اور اس کے سب ارکان باشرع ہوں تو یہ اعلان مقبول ہوگا اور اس پر عمل کرنا واجب ہوجائے گا۔

اسی طرح معتمد ومعتبر ہلال کمیٹی کے موجود نہ ہونے کی صورت میں یہی اعلان اگر قاضی شہر یا اس کے قائم مقام کی جانب سے ہو تو وہ بھی مقبول اور واجب العمل ہوگا۔

(ب) انہیں شرائط مذکورہ (الف) کے ساتھ دوسرے مقامات سے آنے والا اعلان بھی واجب العمل ہوگا، صرف ایک قید ملحوظ ہوگی کہ اس اعلان پر عمل کرنے کی وجہ سے مہینہ ۲۸ دن کا نہ ہورہا ہو۔ اگر ۲۸ دن کا ہورہا ہوگا تو عمل کرنا جائز نہ رہے گا۔

(ج) ٹیلیفون کی اطلاع کو چونکہ بہت سے آدمی بیک وقت نہیں سن سکتے، اس لئے اس کے ذریعہ اطلاع میں

اعلان کی شان نہ ہوگی، بلکہ یہ اطلاع محض خبر کے درجہ کی چیز ہو سکے گی، خواہ ڈائلنگ کے ذریعہ سے ہو یا کسی اور طریقہ سے ہو، کیونکہ اعلان کے مفہوم و ماہیئت میں یہ داخل ہے کہ اس کو بیک وقت بہت سے لوگ سنیں، اور اس اطلاع کے مقبول ہونے کی شرط یہ بھی ہوگی کہ ٹیلیفون میں بولنے والا شخص جانا پہچانا اور معتبر وثقہ شخص ہو، اور اس کی آواز بھی خوب اچھی طرح پہچانی جا رہی ہو، اس میں کسی قسم کا اشتباہ یا خلط نہ ہو، اور وہ یہ کہے کہ میں نے خود چاند دیکھا ہے یا مجھ سے فلاں شخص نے (اور وہ بھی خوب جانا پہچانا اور معتبر وثقہ شخص ہو) اپنا چاند دیکھنا بیان کیا ہے اور مجھے خبر کرنے کے لئے کہا ہے جب یہ اطلاع ان لفظوں میں ہوگی اور وہاں قاضی شرع یا اس کا قائم مقام (رویت ہلال کمیٹی وغیرہ) نہ ہوگا تو رمضان وعید کے چاند کے اعتبار سے اور مطلع صاف ہونے کے اعتبار سے جو شرائط وقیود سوال ا کے جواب میں گزر چکی ہیں انہیں شرائط وقیود کے ساتھ مقبول و نامقبول ہوگی۔

(د) ظاہر ہے کہ تار میں تار دینے والے کے الفاظ یا اس کی بعینہ نقل نہیں آتی، بلکہ ٹیلیگراف مشین (ایک آلہ) کی آواز (کھٹکھناہٹ) کے اصطلاحی اشاروں کی مخفی ترجمانی آتی ہے اور وہ بھی بالواسطہ یا بلاواسطہ، اس لئے تار کی اطلاع کو نہ تو اعلان کہہ سکتے ہیں اور نہ خبر شرعی کا درجہ دے سکتے ہیں اور یہ سب امور ظاہر ہیں، اس لئے محض تار کے ذریعہ ثبوت رویت کا حکم نہیں دیا جا سکتا، البتہ تقویت وتائید یا تصویب وتصدیق کا درجہ دیا جا سکتا ہے۔

خط کا حکم یہ ہے کہ اگر خط لکھنے والے نے دو معتبر وثقہ مسلمانوں کے سامنے خط لکھ کر ان دونوں کو اس پر شاہد بنا کر خط کے ہمراہ بھیجا ہے اور یہ دونوں خط لانے والے خط لاکر شہادت دیں کہ کاتب نے ہمارے سامنے یہ خط لکھا ہے تو یہ خط معتبر وحجت بنے گا۔ پس اگر یہ خط لکھنے والا قاضی شرع یا اس کا قائم مقام (جیسے رویت ہلال کمیٹی) وغیرہ ہے اور اس خط میں ثبوت رویت کی اطلاع لکھی ہے تو اس خط پر عمل کرنا واجب ہو جائے گا۔

اور اگر قاضی شرع یا اس کے قائم مقام نے نہیں لکھا ہے، بلکہ کسی تیسرے شخص نے لکھا ہے اور اس میں اپنے چاند دیکھنے کی خبر دی ہے تو یہ خبر کے درجہ میں ہوگا اور رمضان وعیدین کے چاند کے اعتبار سے اور مطلع صاف وناصاف ہونے کے اعتبار سے جو شرائط وقیود تفصیل سے سوال ا کے جواب میں درج ہیں اس کے مطابق عمل ہو سکے گا اور اگر شاہد بنا کر نہیں بھیجا ہے تو "الخط يشبه الخط" کی وجہ سے مفید ومعتبر نہ ہوگا، ہاں اگر مختلف مقامات سے مختلف آدمیوں کے خط رویت ہلال کے ثبوت کے اتنی تعداد میں آجائیں کہ انکار کی گنجائش نہ رہے تو اس صورت میں اس کا بھی اعتبار ہو جائے گا اور وہ مفید رویت بن جائے گا۔

ہاں اتفاق ہے، البتہ رویت ہلال کی ہر شرعی کمیٹی میں سب ارکان کا باشرع ہونا ضروری ہے اور جہاں تک ہو سکے

ہر کمیٹی میں دو ایک ایسے رکن کا انتخاب کرنا مناسب ہوگا جو کتاب و سنت اور فقہ سے اچھی واقفیت رکھتے ہوں۔

چونکہ ہلال رمضان وعیدین کا مسئلہ دین و دیانت اور عبادات سے تعلق رکھتا ہے، اس لئے اس معاملہ میں مسائل پر غور و بحث اور اجتماعی فیصلہ کے لئے یہ ضروری ہے کہ اہل سنت والجماعت کے علماء خاص طور پر ایسے علماء جو مذاہب اربعہ کے فقہ پر عبور رکھتے ہوں، ان کی رہنمائی حاصل کی جائے۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۵/ ۲/ ۱۲/ ۹۳ ۱۳ھ

محض سائنسی یا حسابی تخمینے کی بنیاد پر رویت ہلال کا حکم لگانا درست ہے:

ہمارے یہاں مختلف ممالک و مکاتب فقہ کے پیرو مسلمان طلبہ تعلیم پا رہے ہیں، گذشتہ عیدالاضحیٰ اور اس سے پہلے عیدالفطر پر تعیین یومِ عید پر اختلاف رائے ہوا، مسلمان طلبہ انجمن کی طرف سے طے پایا کہ دنیا کے مختلف ممالک سے مختلف اسلامی مکاتبِ فکر علماء سے معلوم کیا جائے، تا کہ آئندہ اختلاف نہ ہو، اس لیے یہ عریضہ ارسال ہے، حسبِ ذیل سوالات کے جوابات مرحمت فرمائیں:

الف: کیا ماہِ شوال کا چاند نہ دیکھنے کی صورت میں کسی بھی سائنسی یا حسابی تخمینہ کے ذریعہ جس مقررہ تاریخ کو ماہِ شوال کے چاند کے نظر آنے یا افق پر اس زاویے پر واقع ہونے کی پیش گوئی ہو جس میں موسمی حالات کے سازگار ہونے کی صورت میں چاند دکھائی دیتا ہو اور یہ پیش گوئی قطعیت یا غالب امکان کے درجوں کے ساتھ پیش کی گئی ہو، اس مقررہ تاریخ سے اگلے روز کو ارشوال مان کر عیدالفطر کی نماز ادا کرنا قرآن و حدیث کی رو سے جائز ہے؟

ب: کیا ذی الحجہ یا کسی بھی دوسرے مہینے کے لئے اس طریقہ کار کو اپنانا جائز ہوگا؟

ج: یوم عیدالاضحیٰ کا تعین قرآن و سنت کے مطابق کیسے ہوتا ہے کیا یوم وقوف یعنی وقوف العرفات کے ایک روز کے بعد خواہ آپ دنیا کے کسی خطہ میں ہوں جب کہ اس صورت میں تعین مکۃ المکرمہ میں ذی الحجہ کا چاند نظر آنے کی تاریخ کے لحاظ سے ہوگا اور عین ممکن ہے کہ دوسرے خطوں میں اس تاریخ کو چاند نظر نہ آیا ہو، یا کسی بھی خطہ میں وہاں کے لحاظ سے ۱۵ ذی الحجہ کو جب اس صورت میں عین ممکن ہے کہ وقوف العرفات کے روز ایک یا ایک سے زیادہ کے ایام کے فرق سے دنیا کے کسی علاقہ میں عیدالاضحیٰ ہو۔

الجواب وبالله التوفيق:

مندرجہ ذیل استفتاء کے مسائل کو علی وجہ البصیرت سمجھنے کے لیے چند اصول ذہن میں حاضر رکھنا ضروری ہے اور اس میں سب کی اصل یہ آیت کریمہ ہے: " **شهر رمضان الذی انزل فيه القرآن هدى للناس وبينات من الهدىٰ والفرقان فمن شهد منكم الشهر فليصمه**"(۱) اور اس آیت کریمہ کی تفسیر وتوضیح احادیث رسول پاک علیہ السلام و آثار صحابہؓ میں مذکور ہے، ان سب کا حاصل یہ ہے کہ دین اسلام سیدھی سادی فطرتِ سلیمہ پر دائر ہے، تاکہ ہر طبقہ کا انسان خواہ کسی خطہ کا ہو، کسی طبقہ کا ہو، جاہل وان پڑھ ہو، یا پڑھا لکھا، متمدن ہو یا غیر متمدن غرض کوئی ہو، صرف ایک قید ہے کہ عاقل ہو ہر ایک اپنے رب سے رابطہ عبودیت قائم کر کے آسانی سے کامیاب وفائز المرام ہو سکے۔

اسلامی احکام کا مدار فلسفیانہ موشگافیوں پر یا علم اخلاق وریاضی وہندسہ کے حساب کے دقائق اور نکتوں پر دائر نہیں ہے، لہٰذا ہلال کی رویت وعدم رویت کا حکم بھی ان حسابی یا نجومی حساب پر نہیں ہوگا بلکہ صاف ارشاد فرمایا گیا: "**دقائق و نحن امة أمية لانكتب ولانحسب، الشهر هكذا وهكذا وعقد الابهام في الثانية، ثم قال: الشهر هكذا وهكذا يعني تمام الثلثين يعني مرة تسعا وعشرين ومرة ثلثين**"(۲)۔

اس کا خلاصہ یہ ہے کہ امت اسلام کے احکام کا مدار حساب وکتاب پر نہیں: کیونکہ صوم رمضان کبھی کبھی ۲۹ دن کا ہوتا ہے اور کبھی ۳۰ دن کا ہوتا ہے، پس ۲۹ شعبان کو چاند نظر آجائے تو روزہ رکھنا شروع کردو اور اگر ۲۹ شعبان کو چاند نظر نہ آئے تو شعبان کے ۳۰ دن پورے کر کے روزہ رکھنا شروع کردے، چاند نظر آئے یا نہیں، کیونکہ کوئی مہینہ ۳۰ دن سے زیادہ کا نہیں ہوتا ہے، اسی طرح ہلال عید کا حکم بھی بتایا گیا کہ ۲۹ رمضان کو چاند نظر آجائے تو عید منالو، ۲۹ رمضان کو چاند نظر نہ آئے تو تیس روزے پورے کر کے عید منالو چاند نظر آئے یا نہ آئے، اسی طرح بخاری مسلم شریف میں فرمانِ رسالت علیہ السلام یہ بھی ہے:

"قال عليه السلام: "لايتقدمن أحدكم رمضان بصوم يوم اويومين"(۳)،" وقال عليه السلام: لاتقدموا الشهر حتى ترووا الهلال أوتكملوا العدة، ثم صوموا حتى تروا الهلال أوتكملوا العدة "(۴)۔

۱- سورۂ بقرہ:۱۸۵۔
۲- مشکوٰۃ المصابیح ۱/۱۷۴۔
۳- بخاری ۱/۲۵۶۔
۴- السنن لأبی داؤد باب کراہیۃ صوم یوم الشک ۱/۳۱۹۔

اسی طرح حضرت عمار بن یاسر سے ابوداؤد وغیرہ نے روایت کی ہے:

"من صام یوم الشک فقد عصیٰ أباالقاسم ﷺ" (۱)۔

ان روایات سے صحیح طور پر یہ بھی معلوم ہوگیا کہ صوم رمضان کو ماہ رمضان سے دو ایک دن بھی مقدم کر کے ہرگز نہ رکھو اور اس تحدید کے راز و حکمت کی جانب مذکورہ بالا آیت کریمہ نے ارشاد فرمایا کہ قرآن پاک کو جو احکام خداوندی کی اساس ہے اور ساری دنیا کے تمام انسانوں کی ہدایت کے لیے نازل فرمایا گیا ہے، اس ماہ رمضان المبارک سے خصوصی رابطہ و تعلق ہے اور اسی رابطہ و تعلق کی وجہ سے حکم خداوندی ہے کہ جو شخص اس مہینہ کو پا جائے اس میں پورے مہینے کے روزے رکھے "فمن شهد منكم الشهر فليصمه" (۲) اور بہت ممکن ہے کہ یہ خصوصی ربط و تعلق بھی راز ہو اس بات کا کہ ہلال رمضان کے ثبوت میں اختلاف مطالع کا اعتبار نہیں کیا گیا۔

غرض دو ایک دن کی تاخیر میں بھی یہ نکتہ ہاتھ سے نکل جائے گا اور اس کی جانب حضرت عمار بن یاسرؓ کی روایت میں بھی اشارہ ہے کہ جو شخص بلا ثبوت شرعی کے یوم شک میں رمضان کا روزہ رکھے گا عند اللہ و عند الرسول عاصی و گنہگار ہوگا (۳)۔

اور حسابی تخمینے کا مدار محض وہم و گمان پر ہوتا ہے یقین پر ہرگز نہیں ہوتا، اگر کوئی حساب یقینی ہو بھی جائے تو اس پر انسان قادر نہیں، البتہ شہادت کو شریعت مطہرہ نے یقین کا مرتبہ دیا ہے، اس لیے خصوصی طور پر اس مہینہ کے ثبوت کا مدار رویت پر یا رویت کی شہادت پر رکھا ہے، جس طرح سے کہ اور بہت سے یقینیات کے ثبوت پر ہوتا ہے، رہ گیا یہ سوال کہ دیکھنا ہر ہر شخص کا الگ الگ ضروری ہے یا پوری قوم سے صرف دو ایک کا بھی دیکھنا کافی ہوگا (۴)۔

اس چیز کا ضابطہ بھی ارشاد نبوی ﷺ میں فرمایا گیا، چنانچہ احادیث صحاح میں حضرت ابن عباس سے مروی ہے جس کے الفاظ یہ ہیں:

"جاء أعرابي إلى النبي ﷺ، فقال: إني رأيت الهلال، يعني هلال رمضان، فقال عليه السلام: أتشهد أن لا إله إلا الله، قال: نعم، قال: تشهد أن محمدارسول الله، قال: نعم، قال: "يا بلال!

۱- السنن لأبي داؤد باب کراہیۃ صوم یوم الشک ۱/ ۳۱۹۔

۲- سورۂ بقرہ: ۱۸۵۔

۳- "ولا يصام يوم الشك الخ" (الدرالمختار علی هامش الشامی ص ۹۳، ج ۲ کتاب الصوم)۔

۴- "وصحح فى الأقضية الاكتفاء بواحد إن جاء من خارج البلد، أو كان على مكان مرتفع، واختار ه ظهير الدين، (الدرالمختار علی هامش الشامی ص ۹۳ ج ۲ کتاب الصوم) (مرتب)۔

أذن في الناس أن يصوموا غداً''(۱)۔

اس ضابطہ کا حل یہ ہے کہ ۲۹ شعبان کو اگر ایک معتبر مسلمان بھی رمضان کا چاند دیکھ لے اور پوری قومِ مسلم میں رویت کا شرعی ضابطہ کے مطابق اور شرعی الفاظ میں رویت ہلال کا اعلان کر دیا جائے تو پوری قوم پر روزہ رکھنا ضروری ہو جائے گا اور ماہِ رمضان کے علاوہ اور مہینوں میں مثلاً عید و بقرعید وغیرہ میں چوں کہ دنیوی منافع بھی شامل ہو جاتے ہیں، اس لیے ان مہینوں میں یقین کا درجہ حاصل کرنے کے لیے شہادت کا اصول بھی اختیار کرنا پڑے گا اور شہادت کے باب میں قرآنی ضابطہ یہ ہے:''واستشهدوا شهيدين من رجالكم، فإن لم يكونا رجلين فرجل وامرأتان ممن ترضون من الشهداء''(۲)، اس ضابطہ کا حاصل یہ ہے کہ غیر ماہِ رمضان کے ثبوت کے لیے ۲۹ تاریخ کو کم از کم ۲ معتبر ہی مسلمانوں کا چاند دیکھنے کی شہادت دینا ضروری ہوگا(۳)، اور ان معتبر دو مسلمانوں کی شہادت رویت کے بعد اگر پوری قومِ مسلم میں رویت کا اعلان شرعی ضابطہ و الفاظِ شرعی میں ہو گیا تو پوری قوم پر روزہ رکھنا ضروری ہو جائے گا اور ان سب کا خلاصہ یہ ہے کہ اپنے یہاں کی ۲۹ تاریخ کو کسی شرعی رویت ہلال کمیٹی کی جانب سے جس کے سب ارکان باشرع مسلمان ہوں اور ان الفاظ میں ریڈیو میں اعلان فرمائیں کہ رویت ہلال کمیٹی رمضان کا شرعی ثبوت حاصل کر کے اعلان کرتی ہے کہ کل صبح یکم رمضان ہے، روزہ رکھا جائے، تو روزہ رکھنا ضروری ہوگا، یہ اعلان خواہ کسی خطہ سے آرہا ہو، اسی طرح ۲۹ رمضان کو انہی مذکورہ الفاظ و شرائط کے ساتھ ریڈیو پر اعلان آجائے کہ عید کا چاند شرعی ثبوت سے ہو گیا ہے، صبح نماز ادا کی جائے تو عید منا لینا ضروری ہو جائے گا۔

اس عید کے ثبوت کے لیے جس طرح کے الفاظ میں اعلان آنا بتلایا گیا ہے، اگر اسی طرح کے الفاظ میں عید الاضحیٰ کی رویت ہلال کے ثبوت کا اعلان آجائے اور دنیا کے کسی خطہ سے آجائے اور اس اعلان پر عمل کرنے سے مہینہ ۲۹ دن یا ۳۰ دن ہونے کے بجائے ۲۸ دن یا اس سے بھی کم کا یا ۳۱ دن کا یا اس سے بھی زیادہ دن کا نہ ہو رہا ہو تو اعلان کے مطابق عید الاضحیٰ کی نماز ادا کرنا ضروری ہو جائے گا اور وہ دن مكة المكرمہ کے یوم عرفات کے مطابق ہو یا اس سے آگے یا اس سے پیچھے ہو تو اس میں بھی حرج یا خرابی نہ ہوگی، کیونکہ مکہ کے یوم عرفات کا ساری دنیا میں یوم عرفات ہونے پر کوئی نص شرعی نہیں ہے اور ہر مسلمان کے لیے مہینہ محض ۲۹ دن یا ۳۰ دن کا ہونے کے لیے صریح و صحیح نصوص موجود ہیں جن کے خلاف کرنے کا حق و اختیار کسی کو نہیں ہے، پس بطریق مذکورہ بالا اس شرعی ضابطہ کے مطابق اعلان پر عمل کرنے سے احادیثِ صحیحہ و نصوصِ

۱- السنن لابی داؤد باب فی شہادۃ الواحد علی رویۃ ہلال رمضان ۱/۳۲۰۔

۲- سورۂ بقرہ:۲۸۲۔

۳- ''وبعد صوم ثلاثين بقول عدلين حل الفطر'' (الدرالمختار ص ۹۴ ج۲ کتاب الصوم)(مرتب)۔

شرعیہ کی اتباع بھی نصیب رہے گی اور مزاج شرعی کے مطابق عمل ہوگا اور مکہ مکرمہ کے یوم عرفات کے مطابق یوم عرفہ ماننے سے نصوص شرعیہ صحیحہ کے خلاف ہوگا، اسی طرح محض حساب ریاضی پر عمل کا مدار رکھنے سے مزاج شرع اور تلک حدود اللہ کے خلاف ارتکاب ہوگا جس کی اجازت شرعاً نہیں ہوسکتی۔

خلاصہ یہ ہے کہ آپ کے ملک میں بھی دنیا کے ہر گوشہ سے ریڈیو کے اعلانات برابر آتے ہوں گے، بس آپ کے وہاں کی ۲۹ تاریخ کو ان مذکورہ بالا ضابطوں کے مطابق مذکورہ بالا الفاظ میں دنیا کے جس خطہ سے ریڈیو پر یہ اعلان آجائے کہ شرعی ثبوت سے رویت ہلال ثابت ہونے کی بنیاد پر اعلان کیا جاتا ہے، تو ان اعلانوں کے مطابق بلاتردد عمل کرلیا جائے۔

البتہ یہ شق رہ گئی کہ دنیا کے کسی ایک خطہ میں ۲۹ تاریخ کو کبھی چاند نظر ہی نہ آتا ہو، وہاں کا مطلع ہمیشہ ناصاف ہی رہتا ہو تو وہاں ۲۹ تاریخ کا تعین کس طرح کریں گے، پھر اس اعلان شرعی پر عمل کس طرح ممکن ہوگا؟

اس کا حل یہ ہے کہ ۲۹ شعبان یا ۲۹ رمضان کو جس ملک کے ریڈیو سے مذکورہ بالا شرعی اصول وضوابط کے مطابق اعلان ہوتا ہو اس ملک کے ریڈیو سے اعلان کی تلاش ہر ماہ میں جاری رکھیں اور جس تاریخ کا وہ اعلان کریں وہی تاریخ اپنے یہاں متعین رکھیں تو ۲۹ تاریخ خود بخود متعین ہوتی رہے گی اور عمل کرنا آسانی سے ہوتا رہے گا، ۲۹ شعبان کو شرعی ضابطہ کے مطابق چاند ہوجانے کا اعلان ہوجائے تو روزہ رکھنا شروع کردیں، ورنہ ۳۰ دن پورے کرکے روزہ رکھنا شروع کریں، پھر ۲۹ رمضان کو اگر چاند ہونے کا اعلان شرعی مذکورہ ضابطہ کے مطابق آجائے تو عید منالیں۔ امید کہ اس تقریر سے جناب کے سوالات کی ہر شق کا جواب ذہن میں آگیا ہوگا۔

سوال (۱) کا جواب شرعی یہ نکلا کہ سائنسی یا حسابی وغیرہ تخمینے کی بنیاد پر یکم شوال یا ایک رمضان مقرر کرکے نماز عید ادا کرلینا یا روزہ رکھ لینا درست نہ ہوگا۔

سوال (۱) ب: کا حکم شرعی وجواب شرعی یہ نکلا کہ ماہ ذی الحجہ یا کسی دوسرے مہینے کے لیے بھی سائنسی یا حسابی تخمینے کی بنیاد پر تاریخ مقرر کرنا شرعی عمل نہ ہوگا۔

سوال (۲) کا بھی حکم شرعی یہ نکل آیا کہ یوم عید الاضحیٰ کا تعین بھی اسی شرعی ضابطہ واصول کے مطابق ہوگا جو اوپر مذکور ہے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند، سہارنپور
الجواب صحیح سید احمد علی سعید عفی عنہ مفتی دارالعلوم دیوبند

بحالت صوم آنکھوں، کانوں اور فرج میں دوا پہنچانا مفسدِ صوم ہے یا نہیں؟

بحالت صوم آنکھوں اور کانوں میں دوا ڈالنا یا عورت کی شرمگاہ میں دوا پہونچانا مفسد صوم ہے یا نہیں؟ نیز بحالت صوم گلوکوز اور خون چڑھانا کیسا ہے؟ آیا مفسد صوم ہے یا نہیں؟

الجواب وباللہ التوفیق:

آنکھوں میں دوا ڈالنے سے روزہ فاسد نہیں ہوتا (۱)، اور کان میں ڈالنے سے فاسد ہو جاتا ہے (۲)، اور قاعدہ کلیہ یہ ہے کہ دوا یا غذا کی کوئی چیز جب بعینہ جوفِ معدہ میں پہنچ جائے گی، خواہ کسی راستہ معتاد یا غیر معتاد سے ہو تو روزہ فاسد ہو جائے گا ورنہ نہیں (۳)۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند، سہارنپور
الجواب صحیح حبیب الرحمٰن خیرآبادی، محمد ظفیر الدین مفتاحی، مفتی دارالعلوم دیوبند

ریڈیو کی خبر پر روزہ تڑوانا:

اگر کوئی عالم ریڈیو کی خبر پر لوگوں کو روزہ توڑنے کا حکم کر دے تو اس کے حکم سے روزہ توڑنا جائز ہے یا کہ نہیں اور ایسے عالم روزے توڑنے والے پر از روئے شریعت کیا حکم عائد ہوتا ہے؟

الجواب وباللہ التوفیق:

چاند کی مطلق خبر ریڈیو سے ہو یا تار و خط سے ہو یا کوئی آدمی آکر خبر دے کہ فلاں جگہ چاند ہو گیا ہے یا یہ کہ عید ہو گئی

۱- فتاویٰ عالمگیری ۱۰۴ کتاب الصوم۔

۲- "ولو أقطر في أذنه الماء أو دخله لايفسد صومه لانعدام المعنى والصورة، بخلاف ما إذا أدخله الدهن" (الھدایہ مع فتح القدیر، ص ۲۶۶ ج ۲ کتاب الصوم) "أو دخل الماء في أذنه وإن كان بفعله قال الشامي والحاصل الاتفاق على الفطر بصب الدهن وعلى عدمه بدخول الماء" (فتاویٰ شامی، ۹۸ ج ۲ کتاب الصوم)۔

۳- "ولو داوى جائفة أو آمة بدواء فوصل إلى جوفه أو دماغه أفطر عند أبي حنيفة والذي يصل هو الرطب" (حوالہ مذکورہ بالا) عورت کی شرمگاہ میں دواء ڈالنا بھی مفسد صوم ہے، وفي الاقطار في اقبال النساء يفسد بلا خلاف، وهو الصحيح (فتاویٰ عالمگیری، ۱۰۴، ج ۱، کتاب الصوم) (مرتب)۔

شریعت مطہرہ میں اس قسم کی کوئی خبر معتبر نہیں ہے اور نہ اس پر حکم دیا جاسکتا ہے شریعت نے ایک ضابطہ مقرر کیا ہے اس ضابطہ پر جو خبر پوری اتر آئے گی اس پر حکم لگایا جاوے گا اس ضابطہ کے ماتحت اگر اس ریڈیو میں اعلان کیا جائے کہ فلاں مقام کی ہلال کمیٹی نے شرعی ثبوت کے بعد چاند ثابت ہوجانے کا حکم دیا ہے، یا اس طرح اعلان کرے کہ فلاں حاکم نے بعد ثبوت شرعی کے رویت کا حکم دیا ہے اور اس ہلال کمیٹی کے تمام افراد مسلمان بھی ہوں اور اس میں علماء بھی شریک ہوں اسی طرح حاکم بھی مسلمان ہو جو اعلان کررہا ہے وہ بھی مسلمان ہو تو یہ اعلان معتبر ہوگا دوسرے شہروں میں جہاں یہ خبر انہیں قیود کے ساتھ اگر چہ آوے لیکن جب اس شہر کا قاضی (مفتی عالم) یا ہلال کمیٹی اس اعلان کو معتبر مان کر اس پر رویۃ کا حکم دیں یا روزہ رکھنے یا افطار کرنے کا حکم دیں تو اسی شہر کے عوام کو اتباع کرنی چاہئے از خود کوئی عمل نہ کرلینا چاہئے کہ یہ مطلق العنانی شریعت میں بے رواہ روی ہے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند، سہارنپور

ریڈیو کی خبر معتبر ہے یا نہیں؟

ریڈیو کی خبر معتبر ہے یا نہیں عیدالفطر کے چاند کے بارے میں کسی شخص نے بھی خبر نہیں دی کہ میں نے چاند دیکھا ہے لیکن ریڈیو سے خبر آئی کہ چاند دیکھا گیا تو اس صورت میں ہم لوگ نماز عیدالفطر پڑھیں یا کہ نہیں دوسری بات یہ ہے کہ ایک بستی کے آدھے آدمی آج نماز پڑھتے ہیں اور آدھے کل نماز پڑھتے ہیں تو جن لوگوں نے روزہ توڑ کر نماز پڑھی ان لوگوں کا کیا حکم ہے اور جن لوگوں نے روزہ رکھا ان کا کیا حکم ہے؟

الجواب وباللہ التوفیق

رویت ہلال کے بارے میں خبر موجب کا اعتبار ہے (۱) مطلق خبر کا نہیں ریڈیو سے اگر یہ خبر نشر ہو کہ چاند ہوگیا تو یہ مطلق خبر ہے جس کا شرعاً اعتبار نہیں ہے کیونکہ مخبر کا حال معلوم نہیں اور نہ ہی قوی طریقہ سے اس کو پہچانا جاتا ہے اور نہ ہی وہ نظر آتا ہے اس لئے اس خبر کا شرعاً اعتبار نہیں ہے اور اگر مسلم ہلال کمیٹی کی جانب سے شرعی طریقہ پر رویت ہونے کے بعد یہ اعلان کیا جائے اعلان کے الفاظ شرعی ہوں تو شرعی حدود کے اندر اندر اس کا اعتبار کرلیا جائے گا، جن لوگوں نے ریڈیو کی خبر پر

۱- ”(قوله وهو غلبة الظن) لأنه العلم الموجب للعمل“ (ردالمحتار علی الدر ۳/ ۵۶ ۳، مکتبہ زکریا)، ”نعم لو استفاض الخبر في البلدة الاخرى لزمهم على الصحيح من المذهب مجتبى وغيره“ (الدرالمختار علی الرد ۳/ ۵۹ ۳، مکتبہ زکریا)(مرتب)۔

روزہ توڑ دیا تھا لیکن بعد میں شرعی طریقہ پر معلوم ہوا کہ وہ عید کا دن نہیں تھا تو توڑ دینے والوں پر قضاء ضروری ہوگی۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند، سہارنپور

دوسری جگہ کی شہادت پر افطار کرنا:

۳۰ رمضان کو بر بناء شہادت کسی مفتی صاحب نے اپنے شہر میں فتویٰ دیا کہ روزے افطار کرلو چاند کی شہادت ہوگئی ہے اور اب اس شہر کے ایک یا ایک سے زیادہ معتبر آدمی کسی ایسی دوسری بستی میں جاتے ہیں ارادہ یا بے ارادہ جہاں جمعہ اور عیدین کی نماز بھی ہوتی ہے اور شہر کے حکم میں ہے وہ معتبر آدمی یہ کہتے ہیں کہ فلاں جگہ چاند کی شہادت آئی تھی اور عید ہوگئی ہے آپ سب مسلمان روزے افطار کریں تو اس بستی والے اس معتبر آدمی کی زبانی کہنے سے روزے افطار کریں یا جب مفتی صاحب کی یہ تحریر جائے کہ شہادت ہوگئی ہے جس کو میں نے مان لی ہے آپ لوگ بھی روزے افطار کریں جبکہ وہ لوگ پاکستان جیسی مسلم حکومت کا بذریعہ ریڈیو اعلان اس سے پہلے سن چکے ہوں اگر غلط افطار ہوا تو کیا قضاء آئے گی۔

الجواب وباللہ التوفیق:

ان لوگوں کا محض یہ کہنا کہ فلاں جگہ چاند کی شہادت آئی تھی اور عید ہوگئی کافی نہیں ہاں اگر مفتی صاحب نے ان لوگوں کے سامنے شہادت لیکر افطار کا حکم دیا ہو اور ان لوگوں نے خود سنا ہو اور پھر اس سننے یا حکم دینے کی شہادت دیتے تو یہ معتبر ہوتی یا مفتی صاحب ان دونوں کے سامنے اپنے فتویٰ دینے کی تحریر لکھ کر اور اس تحریر پر ان دونوں کو شاہد بنا کر بھیجتے تو اعتبار ہوتا اور چونکہ ۲۹ رکو ہلال عید کی رویۃ عامۃ شرعاً ثابت ہو چکی ہے، اس لئے ان افطار کرنے والوں پر قضا نہیں ہے۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند، سہارنپور
الجواب صحیح محمود عفی عنہ

مغربی ممالک میں رمضان و اوقات نماز کا مسئلہ:

مغربی ممالک خصوصاً برطانیہ میں بڑھتی ہوئی مسلم آبادی کی بدولت اوقات نماز کا مسئلہ علماء کرام اور مفتیان عظام کی

خصوصی توجہ کا مستحق ہے۔ ہم امید کرتے ہیں کہ مفتیان عظام اس مسئلہ پر غور وخوض کے بعد یہاں بسنے والے مسلمانوں کے لئے دین فطرت کے صحیح وآسان حل کے ذریعہ موقعہ عمل فراہم فرما کر عند اللہ ماجور ہوں گے۔

محکمہ موسمیات اور ہیئت دانوں نے اپنی تحقیق کے مطابق شفق کو تین درجوں میں تقسیم کیا ہے:

سول شفق (۱)―――――――― (۶) درجہ والی شفق

بحری شفق (۲)――――――――(۱۲) درجہ والی شفق

شفق سیت (۳)――――――――(۱۸) درجہ والی شفق

تفصیل: سول شفق کو شفق احمر سے تعبیر کر سکتے ہیں، اس وقت آسمان صاف ہوتا ہے، رات کے آثار کم ہوتے ہیں۔ چند موٹے موٹے تارے دکھائی دیتے ہیں۔

شفق بحری: اس شفق کو شفق ابیض سے تعبیر کر سکتے ہیں۔

شفق سیت: یہ وہ شفق ہے جس کے بعد آسمان پر مکمل تاریکی چھا جاتی ہے۔ اور چھوٹے چھوٹے تارے بھی دکھائی دیتے ہیں۔ ماہرین فلکیات اس شفق کے بعد اپنے فنی تجربوں میں لگ جاتے ہیں۔

شفق کی تفصیل کے بعد اسلامی ممالک، نیز ہند و پاک کرۂ ارض پر "اندروں" ۴۰ عرض البلد پر واقع ہونے کی بنا پر وہاں شفق کے غروب میں زیادہ سے زیادہ ڈیڑھ گھنٹہ ہوتا ہے، اس لئے ان ممالک میں عموماً نماز عشاء بعد غروب ڈیڑھ گھنٹہ کے سال بھر ہوتی ہے، مگر برطانیہ اور وہ ممالک جو ۴۵ عرض البلد سے اوپر واقع ہیں، وہاں جوں جوں اوپر جانا ہوگا غروب شفق دیر سے ہوگی اور صبح صادق جلدی، اسی طرح موسم گرما کے بعض مہینوں اور دنوں میں تو غروب شفق اور ابتداء صبح صادق میں بالکل فصل نہیں ہوتا، اور بعض دنوں میں بہت ہی کم فاصلہ رہتا ہے جو امید ہے کہ حسب ذیل مثال سے واضح ہو جائے گا۔

۵۴ عرض البلد (انگلستان کے جس علاقہ) میں ہم رہتے ہیں ۲۰ جون کو طلوع آفتاب اور غروب حسب ذیل ہے:

	منٹ	گھنٹہ		منٹ	گھنٹہ
طلوع آفتاب	۳۵	۴	غروب شفق بحری	۱۹	۱۲
غروب آفتاب	۴۱	۹	صبح صادق	۵۸	۱
دن کی مقدار	۶	۱۷	درمیانی فاصلہ	۳۸	۱

۵۶ عرض البلد (گلاسکو اور اطراف) پر ۲۰ / جون سے ۱۲ / جولائی تک شفق بحری غائب ہی نہیں ہوتی، ''۵۸-۶۰'' عرض البلد (بالائی اسکاٹ لینڈ اوراسٹورنا و لے) ۱۲ / مئی سے ۲۵ جولائی تک شفق مذکور غائب نہیں ہوتی۔ان دنوں ساری رات افق پراجالا رہتا ہے۔

مذکورہ حساب کی بناء پر جن مقامات پر، یعنی ۵۴ عرض البلد پر جہاں ۱۲ / بجکر ۱۹ منٹ پر شفق غائب ہوتی ہے اور ۴ بجکر ۳۵ منٹ پر طلوع ہوتا ہے، ہم بارہ بجکر ۳۰ منٹ سے قبل نماز عشا نہیں پڑھ سکتے اور دوسری طرف فجر کی نماز ۴ بجے، درمیانی فاصلہ صرف ساڑھے تین گھنٹہ رہتا ہے، نماز عشاء کا یوں مؤخر کر کے ادا کرنا ناممکن نہ سہی، مگر مشکل ضرور ہے، نیز بعض ائمہ کے نزدیک جمع بین الصلوٰتین سفر اور اعذار کی بناء پر جائز ہے اور اس پر عرب ممالک کے باشندوں کا انگلستان میں عمل بھی ہے۔

الف- تو کیا حنفی المسلک کے لئے اس میں آسانی کی کوئی صورت نہیں ہوسکتی جو سارے عوام کے لئے قابل عمل ہو؟ تحقیق اوقات کا یہ مسئلہ صرف نمازوں کی حد تک نہیں، آئندہ چند سالوں کے بعد رمضان المبارک بھی انہی مہینوں میں آئے گا تو اس وقت اس مسئلہ کی اور بھی زیادہ نازک اور سنگین صورت ہوگی، مذکورہ حساب کی بناء پر روزہ تو لمبا ہو ہی جائے گا، بعض جگہوں پر تو ۱۸ بجکر ۱۱ منٹ پر طلوع وغروب آفتاب کا حساب ہوگا، اور جن جگہوں پر ا گھنٹہ ۳۸ منٹ کا فاصلہ نماز عشاء اور فجر صادق کے درمیان رہتا ہے، ان کے لئے اس مختصر سے وقت میں نماز عشاء، تراویح سحری وغیرہ کی ادائے گی ناممکن نہ سہی، لیکن مشکل ترین ضرور ہوتی ہے جس کا ادنیٰ احساس ہر ایک کرسکتا ہے۔

نیز جو علاقے ''۶۵'' عرض البلد پر واقع ہیں وہاں ۲۲ دن اور جو علاقہ ۵۸ اور ۶۰ عرض البلد پر واقع ہیں، وہاں ۶۵ دن (دو ماہ تک) شفق اور صبح صادق کے درمیان فاصلہ نہیں رہتا۔

ب- روزہ کی ابتداء کب سے ہو، نیز نماز عشاء اور تراویح کا اختتام کب ہو یہ سمجھ میں نہیں آتا۔ یاد رہے مذکورہ ساری گزارشات عمل کے لئے پوچھی جارہی ہیں۔ یہ وہ علاقہ ہے جہاں مسلمان کافی تعداد میں آباد ہیں اور ان کی اچھی خاصی تعداد اس مسئلہ سے دوچار ہے، اس لئے ہم امید کرتے ہیں مفتیان عظام اس اہم مسئلہ پر سنجیدگی سے غور فرما کر اس کے قابل عمل حل سے دور افتادہ کو نوازیں گے۔

سوال ۲ برطانیہ میں مختلف مسلک کے لوگ آباد ہیں، کوئی شافعی ہے تو کوئی حنفی تو کوئی اور مسلک کا، حنفی حضرات نماز عصر مثلین کے بعد پڑھتے ہیں، مثلین اور غروب آفتاب میں سردیوں کے موسم میں صرف گھنٹہ بھر کا فاصلہ رہتا ہے،

اورگرمیوں میں ظہر اورعصر کے درمیان کافی فاصلہ رہتاہے، جن شہروں میں غیر حنفی عوام ہوتے ہیں اورامام حنفی ہوتا ہےتو وہاں یہ مسئلہ اوربھی زیادہ قابل بحث بن جاتا ہے،امام کااصرار مثلین پر ہوتاہےاورعوام کا مثل اول پر،ان کےاصرار کی ایک وجہ یہ بھی ہوتی ہے کہ یہاں کی اکثریت کارخانوں میں کام کرتی ہےاورموسم گرما میں مثل اول پرنمازادا کرکے کارخانہ کوجا سکتے ہیں،اورمثلین کے انتظار تک ان کا کارخانہ کاوقت شروع ہوجاتا ہے،اوربعض کارخانوں میں نماز کی ادائیگی بہت مشکل ہوتی ہے۔

نیز کتب فقہ میں اصفرار شمس کے بعد نمازعصر کومکروہ لکھا ہے۔اب یہاں کے موسم میں مثلین کے بعدتو کیااس سے پہلے سورج میں زردی آجاتی ہےاورتمازت تو سارے دن نہیں ہوتی۔

الف- توکیاان صورتوں میں نمازعصر کوحنفی المسلک بھی مثل اول میں ادا کرےتو نماز صحیح ہوگی یا نہیں؟

برطانیہ جہاں آسمان غبار آلودرہتاہووہاں رمضان وعید کاتعین:

سوال ؁ برطانیہ کاموسم اتنا غبار آلودہے کہ یہاں سارے سال میں شاذونادر ہی چاند کی رویت ہوتی ہوجس ملک میں کئی کئی دنوں تک آفتاب غبار کی وجہ سےنظر نہ آتا ہو،وہاں چاند کی رویت کا سوال کم ہی پیدا ہوتا ہے،جب رویت ہلال کامسئلہ یوں ہےتو رمضان وعیدین کےتعین کامسئلہ بھی ایک پیچیدہ مسئلہ بن گیا ہےاوراس سلسلہ میں حضرت مولانا شفیع صاحب مدظلہ سےکئی مراسلات کےبعد جناب والا کے آخری استفتاء کےمطابق آج تقریباً تین سال سےعمل ہورہاہے۔ جس کاماحصل یہ ہے کہ رمضان المبارک کےتعین کے بارے میں توقریبی ممالک مراکش سےبذریعہ فون بات چیت ہونے پر ان کی خبر کےمطابق کیا جاتا ہے اورعیدورمضان کے لئے ملک میں ۲۹ رمضان کو چاند ثابت نہ ہوتو ۳۰ روزے مکمل کرکے عیدمنائی جاتی ہےاورعیدالاضحیٰ کے لئے عموماً یہاں کے علماء یوں کرتے ہیں کہ ہندوپاک کےخطوط پر یکم ذی الحجہ متعین کرکے اسی حساب سےعیدالاضحیٰ کاتعین بھی ہوتا ہے،مگربادی النظر میں یہ کوئی مستقل حل نہیں معلوم ہوتا،اس لئے کہ جوصاحب فون کرتے ہیں اگروہ ملک میں موجود نہ ہوں یا جن کےساتھ مراکش فون سے بات کی جاتی ہے وہ نہ ہوں،ان دونوں صورتوں میں یہ بات پھروہی پریشانی کاباعث ہوگی،نیزخطوط والامسئلہ بھی کسی حدتک صحیح ہوتب بھی مستقل حل نہیں۔

یہی وجہ ہے کہ یہاں کاتعلیم یافتہ طبقہ خاص کرعرب ممالک کےطلباءاس کوقبول نہ کرتے ہوئے محکمۂ موسمیات کے اعتبار سےتعین رمضان وعیدین کرتے ہیں۔

ا-توکیاان مجبوریوں کی صورت میں علامہ سبکیؒ کی تحقیق کےتحت محکمۂ موسمیات والوں کےحساب کےمطابق زمین

سے قائل رویت نہ ہونے پر عیدین و رمضان کا تعین کیا جائے تو کیا اس کی گنجائش نہیں ہو سکتی؟

خدا کے فضل سے برطانیہ میں مسلمان ایک ڈیڑھ لاکھ آباد ہیں اور بڑی تعداد میں ان کے بچے بھی ہیں، ملک بھر میں تقریباً ۶۰ سے ۷۰ تک مساجد قائم ہو گئی ہیں جن میں باقاعدہ نماز پنجگانہ، تراویح وغیرہ ہوتی ہے، اس لئے اس قسم کے مسائل لائق توجہ اور قابل غور ہیں۔

الجواب وبالله التوفيق:

یہ صحیح ہے کہ دین اسلام دین فطرت ہے، اور ایک کامل و مکمل عالمگیر و بین الاقوامی مذہب ہے جو ہر انسان کو اپنے خالق و مالک سے صحیح طور پر رشتہ عبودیت جوڑنے اور اس کو جاننے کے صحیح و سادہ فطری اصول و ضوابط تعلیم کرتا ہے، تا کہ ہر انسان خواہ کسی خطہ و ملک کا باشندہ ہو، خواہ دشت و صحرا کا ہو یا پہاڑ یا جنگل کا، یا سمندری علاقہ یا جزائر کا، خواہ قطبین پر بسنے والا ہو یا خط استواء پر ان پڑھ ہو یا پڑھا لکھا، غریب ہو یا امیر آقا و بادشاہ ہو یا غلام و مملوک مرد ہو یا عورت، خواہ کوئی بھی ہو، قید صرف یہ ہے کہ عاقل و بالغ ہو، عقل و ہوش رکھتا ہو، دیوانہ و پاگل نہ ہو، بچہ و ناسمجھ نہ ہو اور ساتھ ساتھ با دیانت و منصف مزاج ہو، معاند و کینہ پرور نہ ہو۔ جو بھی اپنے معبود حقیقی کو پہچاننا چاہے اس سے اپنا صحیح رشتہ قائم کرنا چاہے تو نہایت آسانی سے ان سادہ اور فطری اصول کے ذریعہ قائم کر کے اس کے فیض قریب سے اپنے ظرف و ہمت کے مطابق مستفیض و متمتع ہو سکے اور یہی مقصد تخلیق آدم ہے اور اسی مقصد کی تحصیل و تکمیل کے لئے سلسلۂ بعثت انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام بھی۔ چنانچہ معبود حقیقی نے اپنے برحق کلام (قرآن پاک) میں مختلف عنوان و انداز سے متعدد جگہ اس طرف اشارہ بھی فرمایا ہے۔ مثلاً:

(۱) "اليوم أكملت لكم دينكم وأتممت عليكم نعمتي ورضيت لكم الإسلام دينا" (۱)۔

(آج کے دن تمہارے لیے تمہارے دین کو میں نے (ہر طرح) کامل کر دیا اور اس سے میں نے تم پر اپنا انعام تام کر دیا اور میں نے اسلام کو تمہارا دین بننے کے لئے پسند کر لیا)۔

(۲) "إن الدين عند الله الإسلام" (۲)۔

(بلا شبہ دین حق اور مقبول، اللہ کے نزدیک صرف اسلام ہی ہے)۔

۱- سورہ مائدہ: ۳۔

۲- سورہ آل عمران: ۱۹۔

(۳) "ومن یبتغ غیر الإسلام دیناً فلن یقبل منه"(۱)۔
(جو شخص اسلام کے سوا کسی دوسرے دین کو طلب کرے گا وہ اس سے قبول نہ ہوگا)۔

(۴) "قل هٰذه سبیلی أدعو إلی الله علیٰ بصیرة أنا ومن اتبعنی وسبحن الله وما أنا من المشرکین"(۲)۔

(۵) "وما أرسلناک إلا کافة للناس بشیرا ونذیرا" (۳)۔
(اورہم نے تو آپ کو تمام لوگوں کے واسطے پیغمبر بنا کر بھیجا ہے خوشخبری سنانے والا اور ڈرانے والا)۔

(۶) "یرید الله بکم الیسر ولا یرید بکم العسر" (۴)۔
(اللہ کو تمہارے ساتھ آسانی کرنا منظور ہے اور تمہارے ساتھ دشواری منظور نہیں)۔

(۷) "لایکلف الله نفسا إلا وسعها" (۵)۔
(اللہ تعالیٰ کسی شخص کو مکلف نہیں بناتا مگر اسی کا کہ اس کی طاقت میں ہو)۔

(۸) "فاستقم کما أمرت ومن تاب معک ولا تطغوا إنه بما تعملون بصیر" (۶)۔
(تو آپ جس طرح کہ حکم ہوا ہے مستقیم رہئے اور وہ لوگ بھی جو کفر سے توبہ کر کے آپ کی ہمراہی میں ہیں اور دائرہ (دین) سے ذرا مت نکلو، وہ ہم سب کے اعمال کو خوب دیکھتا ہے)۔

(۹) "ولقد یسرنا القرآن للذکر فهل من مدکر"(۷)۔
(اور ہم نے قرآن کو نصیحت حاصل کرنے کے لئے آسان کردیا ہے، سوکیا کوئی نصیحت حاصل کرنے والا ہے)۔

(۱۰) "یسئلونک عن الأهلة قل هی مواقیت للناس والحج"(۸)۔
(آپ سے چاندوں کی حالت کی تحقیقات کرتے ہیں، آپ فرمادیجئے کہ وہ چاند آلۂ شناخت اوقات ہیں لوگوں

۱- سورہ آل عمران:۸۵۔
۲- سورہ یوسف:۱۰۸۔
۳- سورہ سبا:۲۸۔
۴- سورہ بقرہ:۱۸۵۔
۵- سورہ بقرہ:۲۸۶۔
۶- سورہ ہود:۱۱۲۔
۷- سورہ قمر:۱۷، ۲۲، ۳۲۔
۸- سورہ بقرہ:۱۸۹۔

کے لئے اور حج کے لئے)۔

حالانکہ سائلین کا مقصد اس کے چھوٹے بڑے ہونے کی وجہ معلوم کرنا تھا جس کا تعلق علم ہیئت سے تھا، اور علم ہیئت جاننے والے عرب میں موجود تھے جواب تحقیقی سمجھ بھی سکتے تھے، مگر اس کے باوجود ان کا رخ اس سادگی کی طرف پھیر کر جواب دیا گیا، اسی طرح اگلے نمبر کی آیت کریمہ کا بھی حال ہے۔

(۱۱) یسئلونک عن الروح قل الروح من أمر ربی وما أوتیتم من العلم إلا قلیلاً" (۱)۔

(یہ لوگ آپ سے روح کو پوچھتے ہیں، آپ فرما دیجئے کہ روح میرے رب کے حکم سے بنی ہے اور تم کو بہت تھوڑا علم دیا گیا ہے)۔

احادیث شریف میں بھی اس طرف جا بجا کہیں اشارہ تصریح موجود ہے، کسی موقع پر ارشاد ہے: "الدین الفطرة"، یعنی دین فطرت سلیمہ ہے یا مثلاً:

"کل مولود یولد علی فطرة الإسلام، فأبواه یهوّدانه أو ینصرانه أو یمجّسانه أو کما قال" (۲)۔

(ہر بچہ فطرت اسلام پر پیدا ہوتا ہے پھر اس کے ماں باپ (مربی) اس کو یہودی بنا دیتے ہیں یا نصرانی بنا دیتے ہیں، یا مجوسی بنا دیتے ہیں)۔

کسی موقعہ پر فرمایا گیا:

"نحن أمة أمیة لا نکتب ولا نحسب أو کما قال ﷺ" (۳)۔

(ہم امت امیہ ہیں، حساب کتاب پر مدار نہیں رکھتے)۔

حالانکہ اس وقت بھی اور خود عرب میں بھی حساب و کتاب جاننے والے، بلکہ علم نجوم و ہیئت جاننے والے موجود تھے، جیسا کہ تاریخ شاہد ہے، پھر ایک موقعہ پر ارشاد ہے:

"صوموا لرویته أو کما قال ﷺ وغیر ذلک" (۴)۔

چاند دیکھ کر روزے رکھ لو، چاند دیکھ کر روزے ختم کر دو، یعنی کسی قواعد ہندسیہ و ریاضیہ وغیرہ کی احتیاج نہیں)۔

۱- سورہ اسراء: ۸۵۔
۲- بخاری مع الفتح ۸/ ۵۱۲ کتاب التفسیر۔
۳- مشکوۃ المصابیح/ ۱۷۴۔
۴- مشکوۃ المصابیح/ ۱۷۴۔

آیات کریمہ واحادیث نبویہ سے اس طرف اشارہ کرنا مقصود ہے کہ یہ دین سادہ وفطری ہے، فطرت سلیمہ کے عین مطابق ہے اس کا لقب ہی دین فطرت ہے، اس کے احکام واصول بھی سادہ وفطری ہوں گے، اس دین کی تحصیل یا اس کے احکام کی تعمیل فلسفیانہ موشگافیوں پر یا علم ہیئت یا اصول ریاضی کے جاننے و ماننے پر موقوف نہ ہوگی۔

جناب نے بھی شروع استفتاء میں تھوڑا سا اشارہ فرمایا ہے، احقر بھی ان ہی سادے اور فطری اصول کے مطابق فقہ حنفی کی مدد سے کچھ عرض کرے گا، امید کہ باعث تسکین خاطر، نیز برائے عمل قابل قبول ہوگا۔

اب نمبر وار سوال کے جوابات مختصراً مگر اس طرح پر عرض ہیں کہ ہر سمجھ دار و منصف مزاج جو حق کا طالب ہو، اور اپنا عمل محض اللہ کی خوشنودی کے لئے مذہب کے مطابق رکھنا چاہتا ہو رکھ سکے۔

سوال ایک جزواول (الف) کا جواب:

مذکورہ بالا گزارشات سے معلوم ہو چکا ہے کہ اس دین فطرت میں کسی حکم کا مدار ماہر موسمیات یا ماہر فلکیات کی تحقیقات وتدقیقات وغیرہ پر نہ ہوگا، بلکہ سیدھے سادے اصول فطرت پر ہوگا، پس شفق کی اپنی طرف سے تین قسمیں کرنا، یا سمندر کی تلاش وجستجو میں پہاڑ کی چوٹیوں پر چڑھنا یا ہوائی جہاز سے پرواز کرنا، یا سمندر کی سطح پر جا کر حقیقت معلوم کرنا مطلوب شرعی نہ ہوگا اور نہ اس پر مدار حکم ہوگا، بلکہ اپنی سطح آبادی پر (جہاں کا بھی باشندہ ہو) رہتے ہوئے سادہ طور پر آلات رصدیہ وغیرہ کا استعمال کئے بغیر صرف قرآن وحدیث وفقہ کی روشنی میں امتیاز شفق وتعیین اوقات کرلینا کافی ہوگا۔

قرآن پاک میں وقت عشاء کے لئے غسق اللیل (رات کی تاریکی) یا "زلفاً من اللیل "(۱)(کچھ حصہ رات کا گزار کر) وارد ہے مثلاً:

(۱) "أقم الصلوٰة لدلوک الشمس إلی غسق اللیل"(۲)۔

(آفتاب ڈھلنے کے بعد سے رات کا اندھیرا ہونے تک نماز ادا کیا کیجئے)۔

اور مثلاً:

(۲) "وأقم الصلوٰة طرفی النہار وزلفا من اللیل"(۳)۔

(اور آپ نماز کی پابندی رکھئے دن کے دونوں سروں پر اور رات کے کچھ حصوں میں)۔

۱- سورۂ ہود: ۱۱۴۔

۲- سورۂ اسراء: ۷۸۔

۳- سورۂ ہود: ۱۱۴۔

اسی طرح احادیث پاک میں بھی حدیث اوقات صلوٰۃ وارد ہے، مثلاً:

"ثم أمره فأقام المغرب حين غابت الشمس ثم أمره، فأقام العشاء حين غاب الشفق"(۱)۔

(جس وقت آفتاب غروب ہوا آپ نے حکم دیا اور نماز مغرب ادا کی گئی پھر جس وقت شفق غائب ہوئی تو حکم فرمایا اور نماز عشاء ادا کی گئی)۔

اسی طرح اور بہت سی روایات میں بھی شفق احمر وابیض کی تفصیل کے بغیر مطلقاً صرف لفظ شفق کا ذکر ہے، پھر شفق کی یہ دو قسمیں (احمر وابیض) اس کا یہ اختلاف کوئی اصولی وبنیادی اختلاف نہیں ہے، بلکہ عرف اور زمانہ کے اعتبار سے محض محاورہ کی ترجمانی کا اختلاف ہے جو محض فروعی اور ضمنی ہے، نیز شفق احمر بھی مثل ابیض کے حضرت امام ابوحنیفہؒ ہی کا (فی روایۃ) قول ہے، مگر شفق احمر صاحبین کی جانب منسوب ہو کر مشہور ہو گیا اور ابیض صرف امام ابوحنیفہؒ کی طرف منسوب رہا، صاحبین کی جانب منسوب ہو کر مشہور نہ ہوا، بلکہ بعض روایات فقہیہ میں احمریت کی جانب امام صاحبؒ کا رجوع بھی منقول ہے:

"وقت المغرب منه إلىٰ غروب الشفق وهو الحمرة عندهما...... وإليه رجع الإمام كما في شروح المجمع وغيرها فكان هو المذهب"(۲)۔

(مغرب کا وقت صاحبین کے نزدیک غروب شمس سے غروب شفق تک رہتا ہے اور یہی قول ائمہ ثلاثہ (امام مالک، شافعی، احمد بن حنبل رحمہم اللہ) کا بھی ہے اور اسی جانب امام ابوحنیفہؒ نے بھی رجوع فرمالیا ہے، جیسا کہ مجمع کی شروح وغیرہ سے معلوم ہوتا ہے، پس یہی متفق علیہ مذہب ہو گیا)۔

عند المحققین اگر چہ یہ رجوع ثابت ومحقق نہیں، لیکن اتنا تو سب کو تسلیم ہے کہ تعامل تمام بلاد میں صاحبین کے ہی قول پر ہے، نیز یہ کہ صاحبین کا قول اوسع اور امام کا قول احوط ہے(۳)۔

چونکہ امام کا قول احوط ہے، نیز آیت کریمہ:

"إن الصلوٰة كانت على المؤمنين كتاباً موقوتاً"(۴)۔

(یقیناً نماز مسلمانوں پر فرض ہے اور وقت کے ساتھ محدود ہے)۔

۱- مسلم ۳/۱۱۹-۱۲۰ مع النووی باب اوقات الصلوات الخمس۔

۲- درمختار ۱/۲۴۱۔

۳- کمافی الشامی ۱/۳۳۵۔

۴- سورۃ نساء:۱۰۳۔

میں موقوتاً کی تفسیر موقتاً بھی ہے، اس کا بھی تقاضا یہ ہے کہ احتیاط کی جائے اور احتیاط یہی ہے کہ نماز عشاء شفق ابیض غائب ہونے کے بعد ادا کی جائے، تا کہ بہر طور اور بلا اختلاف نماز اپنے وقت متعین کے اندر ادا ہو، لیکن اس کے باوجود فقہاء نے تصریح فرمائی ہے کہ اگر کسی مسجد کا امام عشاء کی نماز شفق ابیض غائب ہونے سے قبل ہی پڑھے تو جماعت کو چھوڑ کر غروب شفق ابیض کے بعد پڑھنا واجب نہیں ہے، بلکہ صرف افضل ہے، "**كما في الشامي وفي شرح المنية أنه لو كان إمام محله يصلي وحده بعد الغياب**"(۱)۔

شرح منیہ میں منقول ہے کہ اگر اپنی مسجد کا امام عشاء کی نماز شفق ابیض کے غائب ہونے سے قبل ہی پڑھ لے تو ایسی صورت میں بہتر یہ ہے کہ اپنی نماز تنہا شفق ابیض کے غائب ہونے کے بعد پڑھے)۔

اس کا کھلا ہوا مفہوم یہ ہے کہ اگر کوئی شخص ابیض کے غروب سے قبل ہی اس جماعت میں شریک ہو کر پڑھ لے تو بلا کراہیت نماز ادا ہو جائے گی اور محل طعن وتشنیع نہ بنے گا۔

پس جب بغیر کسی مجبوری وعارض کے اس کی گنجائش ہے اور محل طعن وتشنیع نہیں ہے تو مذکورہ عوارض ومجبوری کی صورت میں بدرجہ اولیٰ مورد طعن یا مستوجب کراہت نہ ہوگا، بلکہ ائمہ مساجد کو خود اس کا لحاظ کرنا انسب ہوگا، تا کہ امت تنگی میں واقع نہ ہو، بخلاف حضر کے اندر جمع بین الصلوٰتین کے کہ حقیقتاً جمع بین الصلوٰتین عرفات ومزدلفہ کے سوا کسی اور جگہ وموقع میں نہیں ہے، حضر کے اندر جمہور امت کے نزدیک صحیح نہیں ہے، **كما بحثه وحققه صاحب بذل المجهود (۲۳۳/۲)، وصاحب أوجز المسالک حتى قال في الأوجز (۵۶/۲)۔ قال الترمذي في كتابه: أجمعت الأمة على ترک العمل به**"(۲)۔

امام ترمذی نے اپنی کتاب میں فیصلہ فرما دیا ہے کہ تمام امت نے جمع بین الصلوٰتین فی الحضر والی روایت کو عملاً متروک قرار دیا ہے(۳)۔

اس لئے جمع بین الصلوٰتین کے پیش نظر کوئی عمل نہ کریں گے، بلکہ اگر غروب شفق وطلوع فجر کے درمیان کچھ وقت نہ ملے جب بھی تینوں نمازیں (مغرب عشاء فجر) بلا لحاظ جمع بین الصلوٰتین کے مستقلاً الگ الگ پڑھیں گے کو مسلسل ہی پڑھنا

۱- شامی ۱/ ۳۳۳۔

۲- سنن الترمذی: قال عیسی: "والعمل على هذا عند أهل العلم أنه لا يجمع بين الصلاتين إلا في السفر أو بعرفة ورخص بعض أهل العلم من التابعين في الجمع بين الصلاتين للمريض" ترمذی باب ماجاء فی الجمع بین الصلاتین کتاب الصلاۃ حدیث نمبر: ۱۸۷۔

۳- اوجز المسالک ۲/ ۵۶۔

پڑے جیسا کہ ہم خود بھی ذرا تفصیل سے اس کو بیان کر رہے ہیں، تا کہ ہر صورت مسئلہ اچھی طرح واضح اور ذہن نشیں ہو جائے اور اسی خیال سے ہر صورت بعنوان مستقل الگ الگ بیان کریں گے۔

مسئلہ ۱: جب تک شفق ابیض غروب ہونے کے بعد کھانے پینے سونے وغیرہ حوائج بشریہ ضروریہ پوری کرنے کے ساتھ ساتھ آسانی سے فرض عشاء ووتر اور رمضان میں تراویح بھی بیس رکعت ''خواہ الم ترکیف'' سے پڑھ سکیں یا فقط بارہ رکعت یا فقط آٹھ رکعات ہی پڑھ سکیں تو شفق ابیض کے غروب کے بعد ہی پڑھیں گے۔

''إن الصلوٰة كانت على المؤمنين كتابا موقوتا''(۱)، اور ''حافظوا على الصلوٰت والصلوٰة الوسطىٰ''(۲) أي أدوا الصلوٰة في أوقاتها''۔

یعنی تمام نمازیں مسلمانوں پر موقت طریقہ سے فرض کی گئی ہیں۔ اور تمام نمازوں کی اور خاص کر وسطیٰ (عصر) کی محافظت کیا کرو، یعنی ان کو ان کے اوقات میں (جب تک وقت مل سکے) ادا کیا کرو، کے پیش نظر شفق ابیض کے غروب ہونے کے بعد ہی ادا کی جائے۔

مسئلہ ۲: جن مقامات میں اتنا وقت نہ ملتا ہو جو ابھی مذکور ہوا ہے، خواہ ابیض باقی رہتے ہوئے ہی طلوع فجر ہو جاتی ہو، جیسا کہ گلاسکو، بالائی اسکاٹ لینڈ وغیرہ اور اس کے اطراف میں بعض دنوں میں ہوتا ہے یا اتنا وقت تو ملتا ہو، لیکن رات چھوٹی ہوتی ہو اور ابیض دیر میں ختم ہونے کی وجہ سے ہمیشہ ساری رات شب بیداری کرنی پڑتی ہو جو عادتاً وعموماً تحمل بشری سے خارج ہے، جیسا کہ ان ہی مقامات کے اندر دوسرے دنوں میں ہوتا ہے۔ ان دونوں صورتوں میں شفق احمر ہی کے بعد نماز عشاء کی ادائیگی کر لینی عملاً علی رویۃ صحیح و درست ہوگی۔ اور صبح صادق کے طلوع ہونے سے قبل عشاء و وتر سب ختم کر لینا ضروری ہوگا۔

مسئلہ ۳: جن مقامات میں اتنا بھی وقت نہ ملتا ہو، بلکہ شفق احمر غروب ہوتے ہی یا اس سے بھی قبل فجر کی سفیدی شروع ہو جاتی ہو، جیسے ۶۰ عرض البلد کے بعد کے بعض مقامات میں ہوتا ہے، تو وہاں بھی اگر چہ وقت عشاء کسی قول پر نہ ملتا ہو، لیکن تینوں نمازیں (مغرب، عشاء، فجر) یکے بعد دیگرے بغیر لحاظ جمع بین الصلوتین ادا کرتے رہیں گے اور جہاں تک

۱- سورۂ نساء: ۱۰۲۔

۲- سورۂ بقرۃ: ۲۳۸۔

ہوسکے گا صبح صادق کے طلوع سے قبل قبل فرض عشاء ووتر سے فراغت کی کوشش کرتے رہیں گے: کماحققہ الامام ابن الھمام (۱)۔

"(في باب مواقيت الصلوٰة بقوله) ومن لا يوجد عندهم وقت العشاء، كما قيل: يطلع الفجر قبل غيبوبة الشفق عندهم (إلى قوله) وأفتى الإمام البرهاني الكبير بوجوبها، ولا يرتاب متأمل في ثبوت الفرق بين عدم محل الفرض وبين سببه الجعلي الذى جعل علامة على الوجوب الخفي الثابت في نفس الأمر وجواز تعدد المعرفات للشئي، فانتفاء الوقت انتفاء المعرف وانتفاء المعرف على شئي لا يستلزم انتفاء ذلک الشئي لجواز دليل أخر وقد وجد، وهو ماتوا طائت أخبار الإسراء، من فرض الله تعالىٰ الصلوٰة خمسا، بعد ما أمروا أولا بخمسين، ثم استقر الأمر على الخمس على الخمسين شرعاً عاماً لأهل الآفاق لا تفصيل فيه بين أهل قطر وقطر (ثم إلىٰ قوله) فاستفدنا أن الواجب في نفس الأمر خمس على العموم غير أن توزيعها على تلک الأوقات عند وجودها، ولا يسقط بعدمها الوجوب، وكذا قال ﷺ: "خمس صلوات كتبهن الله على العباد"۔ ثم هل ينوى القضاء الصحيح أنه لا ينوى القضاء لفقد وقت الأداء، ومن أفتى بوجوب العشاء يجب على قوله الوتر أيضاً" (۲)۔

((باب مواقیت الصلوٰۃ) جن لوگوں کے یہاں شفق غائب ہونے سے قبل ہی فجر طلوع ہوجاتی ہے (سلسلۂ تحقیق جاری رکھتے ہوئے فرمایا کہ) اور کوئی حقیقت بیں شخص عدم محلیت فرض (جیسا کہ مقطوع الیدین میں ہوتا ہے) اور سببیت جعلیہ (جیسا کہ فاقد وقت عشاء میں ہوتا ہے) کے درمیان فرق سمجھنے میں شبہ نہ کرے گا۔ اور وجوب خفی جو نفس الامر میں ثابت شدہ ہوتا ہے اس پر یہ سبب جعلی (وقت صلوٰۃ) محض ظرف وعلامت ہوتا ہے (جس کا درجہ ذریعہ شناخت وقت سے زیادہ نہیں ہوسکتا) اور ذرائع شناخت ومعرفات وعلامات کے تعدد (تغیر وتبدل) کے امکان وجواز میں بھی کوئی شخص شبہ نہیں کرسکتا، پس (ظاہر ہوگیا کہ) وقت ظاہری جو محض معرف شئی کا انتفاء بعینہٖ اسی شئی کے انتفاء کو مستلزم نہیں، کسی دوسری دلیل یا معرف کے وجود کے ممکن ہونے کی وجہ سے اور (بالخصوص جب حال یہ ہو کہ) دوسری دلیل ومعرف کا وجود موجود ملتا بھی ہو اور وہ حدیث معراج واسراء کا تواتر وتواطأ ہے کہ اللہ جل شانہ نے اولا پچاس نمازیں فرض فرمائی تھیں، پھر امت پر آسانی کے لئے صرف

۱- فتح القدیر ۱/۱۵۶۔

۲- فتح القدیر لابن الہمام ۱/۲۲۶ طبع دار الکتب العلمیہ بیروت۔

پانچ نمازیں برقرار رکھیں اور پھران پانچ نمازوں کا استقرار زمین کے ہر خطہ والوں کے لئے یکساں شروع ہوا۔اس مشروعیت عامہ میں کوئی تفصیل نہیں کہ یہ فرضیت صرف فلاں خطہ والوں کے لئے ہے اور فلاں خطہ والوں کے لئے نہیں ہے (پھر سلسلۂ تحقیق جاری رکھتے ہوئے فرمایا کہ)اس مشروعیت عامہ سے یہ بھی مستفاد ہوا کہ نفس الامر اور حقیقت میں پانچ نمازیں عمومی طور پر ہیں ان کی یہ تقسیم ان پانچ ظاہری اوقات پر محض ان کے موجود ہونے کی حالت میں ہوگی (پس ظاہر ہے کہ)ان ظاہری اوقات کے معدوم ہونے کی صورت میں نفس وجوب ساقطہ نہ ہوگا، بلکہ علیٰ حالہ باقی رہے گا۔اور حضور علیہ کے کلام (خمس صلوٰت کتبھن اللہ۔الخ)میں اس کا اشارہ بھی ملتا ہے(پھر یہ بحث کہ)وقت مقررہ معدوم ہونے کے وقت قضاء کی نیت کریں یا اداء کی توضیح یہ ہے کہ وقت ادا معلوم نہ ہونے کی وجہ سے قضاء کی نیت نہ کریں گے(بلکہ اداء ہی کی نیت کریں گے)اور جو شخص وجوب عشاء کا فتویٰ دے گا وہ وجوب وتر کا بھی فتویٰ دے گا)۔

اور زمانہ رمضان المبارک میں اگر تراویح پڑھنے کا موقعہ نہ ملے، نہ بیس رکعات نہ بارہ رکعات نہ آٹھ رکعات تو تراویح نہ پڑھیں، اسی طرح اگر سنن رواتب کا موقعہ نہ ملے، نہ پڑھیں، مگر فرض عشاء و وتر ضرور پڑھیں اور دن کی نمازیں (ظہر وعصر)اپنے اوقات منصوصہ میں پڑھیں۔

مسئلہ ۲: جن مقامات میں اتنا بھی وقت نہ ملتا ہو جس میں ان تینوں نمازوں (مغرب، عشاء، فجر) کے محض فرض فرض بھی مختصر طریقہ پر خواہ مسلسل ہی کیوں نہ ہو نہ ادا کیے جا سکتے ہوں، لیکن وہاں آفتاب کا روزانہ طلوع وغروب ہونا صادق آتا ہو، جیسا کہ عرض تسعین کے قریب بعض مہینوں میں ایسا ہو سکتا ہے تو ان مقامات میں غروب شمس تک کا وقت لیل ونہار کا ایک مجموعہ شمار کر کے نصف اول (غروب شمس سے بارہ گھنٹہ تک)رات کا حصہ شمار کیا جائے اور رات کا حصہ شروع ہوتے ہی نماز مغرب پڑھ لی جایا کرے، پھر تقریباً ۱-۱/۲ گھنٹہ کے بعد سے عشاء کا وقت شمار کیا جائے اور جہاں تک ہو سکے نماز عشاء کی ادائیگی کر لی جائے۔

پھر نصف اول (جو رات کا حصہ شمار ہے)ختم ہونے سے ۱-۱/۲ گھنٹہ قبل سے نماز فجر کا وقت شمار کیا جائے اور نصف اول کے ختم ہونے سے آدھ گھنٹہ بیس منٹ قبل نماز فجر سے فراغت کر لی جائے۔

پھر نصف ثانی (جو دن کا حصہ شمار ہے) کا نصف اول گزارتے ہی، یعنی لیل ونہار کے پورے مجموعے (۲۴ گھنٹہ) کا ربع ثالث شروع ہونے کے بعد سے نماز ظہر کا وقت قرار دیا جائے، اور جہاں تک جلد ہو سکے نماز ظہر سے فراغت کر لی جائے، پھر اس مجموعہ لیل ونہار مکمل ہونے سے آدھ گھنٹہ پون گھنٹہ قبل سے نماز عصر کا وقت شمار کر لیا جائے اور اصفر

ارشمس سے قبل قبل نماز عصر ادا کر لی جائے، کما سیأتی تفصیلہ فی جواب نمبر ۲۔

پھر غروب شمس سے دوسرا مجموعہ لیل ونہار شمار کر کے دوسرے دن کی مغرب شمس کے غروب ہوتے ہی پڑھ لی جائے اور پھر عشاء وفجر وغیرہ ساری نمازیں اول یوم، یعنی لیل ونہار کے اول مجموعہ کے حساب سے ادا کر لی جائیں۔ پھر اسی طرح ہر روز کی نمازوں کا معمول رکھا جائے۔ "هذه كلها مستنبطة من الفتح" (۱/ ۱۵۶) "ومن الدر المختار ومن رد المحتار" (۱/ ۳۳۹ وص ۱/ ۳۷۱)۔

مسئلہ نمبر ۵: جن مقامات میں شمس کا غروب وطلوع روزانہ نہ ہوتا ہو، بلکہ کئی کئی دن یا کئی کئی ماہ مسلسل آفتاب طلوع یا غروب رہتا ہو، جیسے ارض تسعین اور اس کے قرب وجوار کے مقامات تو وہاں پر بھی چونکہ آفتاب ہر چوبیس گھنٹے میں اپنا ایک چکر پورا کر لیتا ہے، یعنی جس وقت جس نقطہ سے چلتا ہے پورے ۲۴ گھنٹہ پر اسی نقطہ پر تقریباً پہنچ جاتا ہے، اور یہ پورا چکر ایک (دورہ) شمار ہو سکتا ہے جو لیل ونہار کا مجموعہ اور ایک دن رات کے برابر کہا جا سکتا ہے، پس اس ہر ایک دن رات میں جو (۲۴ گھنٹہ کی مقدار کے برابر ہوگا) پانچوں نمازوں کے وقت کا تعین اندازے کر کے برابر ان کو ادا کریں گے۔ اور اس لیل ونہار کے مجموعہ کی ابتداء اس قریبی مقام کے غروب شمس کے وقت سے کر لیا کریں، جہاں پر آفتاب غروب ہوتے ہی طلوع ہو جاتا ہے، تاکہ اس قسم کے مقامات میں اوقات نماز پر یگانگت ویک جہتی اور وحدت دین کی ایک شان نمایاں رہے اور "حافظوا على الصلوٰت" (۱) کا بھی حتی المقدور امتثال وظہور ہوتا رہے۔

اور اگر یہ سب صورتیں دشوار ہوں تو ایسا کرنا تو بہر حال آسان ہے کہ جس دن آفتاب غروب ہو کر طلوع نہ ہونا شروع ہو جائے اور مسلسل غروب رہے اس دن کے غروب سے ۲۴ گھنٹہ کی مقدار پورے ایک دن ورات کی مقدار شمار کر کے اس میں حسب تصریح وتفصیل مذکور پانچ نمازیں ادا کریں اور ان گھنٹوں کے ہونے پر دوسرے ۲۴ گھنٹے پھر تیسرے گھنٹے بناتے اور اس میں دن ورات کی نمازیں پڑھتے چلے جائیں، اور دن بڑا ہونے میں جس دن آفتاب طلوع ہو کر مسلسل طلوع رہے غروب نہ ہو تو پہلے دورہ کے لئے طلوع سے صرف بارہ گھنٹہ کی مقدار پر ایک دورۂ شمس ۲۴ گھنٹہ کا ختم کر کے اس میں ظہر وعصر کی نماز پڑھ لیں، اور پھر اس کے بعد ۲۴ گھنٹہ کا ایک دورۂ شمس شمار کر کے نصف اول کو دن قرار دے کر اس میں دن کی نماز پڑھا کریں اور نصف ثانی کو رات قرار دے کر اس میں رات کی نماز پڑھا کریں اور یہ طریقہ احقر کے نزدیک سب سے اشبہ بالفقہ ہے۔

۱- سورۂ بقرہ: ۲۳۸۔

اس مسئلہ میں حدیث نبوی سے کافی روشنی ملتی ہے جس میں واقعہ دجال کا ذکر فرماتے ہوئے ،اس ایک دن کے اندر جوایک سال کا ہوگا، ہر چوبیس گھنٹہ کی پانچوں نمازوں کو اندازہ کر کے پڑھنے کی ہدایت فرمائی گئی ہے، کما رواہ مسلم فی صحیحہ اور ابن ہمام نے اس طرح فرمایا ہے:

”وما روی عنه علیه الصلوٰة والسلام أنه ذكر الدجال فقلنا ما لبثه فی الأرض؟ قال: أربعون یوماً یوم كسنة ویوم كشهر ویوم كجمعة وسائر أیامه كأیامكم، فقیل: یا رسول الله! فذلك الیوم الذی كسنة أتكفینا صلوٰة یوم؟ (۱) قال: لا اقدروا له (رواه مسلم) فقد أوجب أكثر من ثلاث مائة عصر قبل صیرورة الظل مثلاً أو مثلین وقس علیه، فاستفدنا أن الواجب فی نفس الأمر خمس علی العموم غیر أن توزیعها علی تلك الأوقات عند وجودها ولا یسقط بعدمها الوجوب انتهیٰ بلفظه“ (۲)۔

(اور وہ حدیث جو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے مروی ہے کہ آپ نے دجال کا ذکر فرمایا تو ہم نے (صحابہ نے) عرض کیا یا رسول اللہ! وہ دنیا میں کتنے دن ٹھہرے گا، جواب دیا کہ صرف چالیس (۴۰) دن، لیکن اس کا ایک دن ایک سال کے برابر ہوگا اور ایک دن ایک ماہ کے برابر ہوگا اور ایک دن ایک ہفتہ کے برابر ہوگا اور باقی دن تمہارے ان عام دنوں کے برابر ہوں گے، پھر عرض کیا گیا کہ وہ دن جو ایک سال کے برابر ہوگا کیا اس میں صرف ایک دن کی نمازیں پڑھ لینی کافی ہوں گی، فرمایا نہیں، بلکہ اس میں اپنے دنوں کے اعتبار سے اندازہ کر کے نمازیں پڑھنی ہوں گی (مسلم شریف)، خلاصہ یہ کہ حضور علیہ السلام نے (اس دن میں) تین سو سے زیادہ عصر کی نمازیں ہر شئی کا سایہ اصلی ایک مثل اور دو مثل ہونے سے قبل قبل واجب فرمادیں اور اسی پر بقیہ نمازوں کو بھی قیاس کرلو، اسی حدیث سے ہم کو یہ بات بھی معلوم ہوگئی کہ اصل اور نفس الامر میں پانچ نمازیں علی العموم واجب ہیں، ہاں اتنی بات ہے کہ ان پانچ نمازوں کی تقسیم ان پانچ وقتوں میں ان پانچ وقتوں کے پائے جانے کی صورت میں واجب ہے (اور یہ بھی معلوم ہوا کہ) ان نمازوں کا وجوب ان کے اوقات کے موجود نہ ملنے سے ساقط نہ ہوگا)۔

اور شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ اور مولانا عبدالحی فرنگی محلی لکھنویؒ نے بھی اسی حدیث کو معمول بہ قرار دے کر اسی کے مطابق اندازہ سے نمازیں پڑھنے کا حکم دیا ہے، والیہ مال فی امداد الفتاویٰ أیضاً وصرح بہ فی فتاویٰ دارالعلوم (۲/ ۱۳)۔

۱- الصحیح المسلم ۲/ ۴۰۱۔

۲- شرح فتح القدیر ۱/ ۲۲۶۔

مسئلہ ۶: اگر قریبی مقام کے غروب سے مجموعہ لیل ونہار کی ابتداء کا انطباق مشکل ہو، اور ڈاکٹر حمید اللہ صاحب کی تحقیق (کہ ۲۰ مارچ اور ۲۲ ستمبر کا دن تمام روئے زمین پر برابر، یعنی ۱۲ گھنٹہ کا ہوتا ہے) اگر صحیح ہو اور ان تاریخوں میں سے کسی ایک میں بھی وقت غروب آسانی سے متعین ہوسکتا ہو تو تمام سال کے مجموعہ لیل ونہار کی ابتداء اس سے متعین کرلیا کریں، غرض جس میں سہولت ہو اختیار کریں۔

مسئلہ ۷: جب تک رات چھوٹی ہو اور دن بڑا ہو، اور آفتاب روزانہ طلوع وغروب ہوتا ہو، اس وقت تک زوال شمس اور وقت ظہر وعصر الگ الگ متحقق ومتمیز ہوں گے اور ہر وقت کی نماز اس کے اصل وقت میں پڑھنی ضروری ہوگی، البتہ عصر کی نماز اصفرار شمس سے قبل ادا کرنا ضروری ہوگا، ورنہ نماز مکروہ ہوگی۔

مسئلہ ۸: جب رات بڑی ہو اور دن چھوٹا ہو تو جب تک زوال شمس اور مثل ومثلین متمیز ومعلوم ہوسکے اس وقت تک ظہر کی نماز ایک مثل کے اندر اور عصر کی نماز مثلین کے بعد ضروری ہوگی۔ ہاں اگر مثلین آتے آتے اصفرار شمس ہوجائے تو نماز عصر مثلین سے قبل اور ایک مثل کے بعد ہی پڑھ لینا چاہئے۔ کما یاتی تحقیقہ فی جواب ۲۔

مسئلہ ۹: جب دن اتنا چھوٹا ہونے لگے کہ مثل ومثلین کا تعین وتمیز نہ ہوسکے تو زوال شمس کے بعد جہاں تک جلد ہوسکے نماز ظہر پڑھ لی جائے اور اصفرار شمس سے کچھ پہلے نماز عصر سے فراغت کرلی جایا کرے۔

مسئلہ ۱۰: جب دن اتنا چھوٹا ہونے لگے کہ زوال شمس بھی متمیز ومتحقق نہ ہوسکے تو اندازہ سے دن کی نصف مقدار گزارنے کے بعد نماز ظہر پڑھ لی جائے اور اصفرار شمس سے قبل نماز عصر پڑھ لی جائے گو دونوں نمازوں کے درمیان فصل بہت تھوڑا ہے یا بالکل نہ رہے اس میں کوئی مضائقہ نہیں، **کما مر فی التحقیق الذی نقلته فی المسألة الثالثة**۔

مسئلہ ۱۱: جب دن اتنا چھوٹا ہوجائے کہ دن کی نصف مقدار گزرنے کے بعد فرض ظہر وعصر بغیر سنن رواتب کے بھی ادا نہ کرسکیں تو طلوع سے غروب تک کی پوری مقدار میں پہلے صرف ظہر کا فرض پھر عصر کا فرض پڑھ لیا جایا کرے۔

مسئلہ ۱۲: جب طلوع شمس کے بعد سے غروب شمس کے قبل قبل ظہر وعصر کا محض فرض بھی ادا کرنے کا وقت نہ ملے، لیکن آفتاب کا طلوع ہونا روزانہ صادق آتا ہو تو طلوع آفتاب سے طلوع آفتاب تک کا ۲۴ گھنٹہ کا مجموعہ ایک لیل ونہار کا مجموعہ شمار کرکے نصف اول دن کا حصہ شمار کیا جائے اور نصف اول کے نصف اخیر، یعنی پورے مجموعہ کا ربع ثانی شروع ہونے سے وقت ظہر شمار کیا جائے اور جہاں تک جلد ہوسکے نماز ظہر ادا کرلی جائے اور اس ربع ثانی کے ختم ہونے سے دو گھنٹہ قبل سے نماز عصر کا وقت شمار کیا جائے اور جہاں تک جلد ہوسکے نماز عصر ادا کرلی جائے۔

پھر ربع ثانی کے ختم ہونے سے یعنی پورے مجموعہ نہار ولیل کے نصف اول کے ختم ہونے کے بعد سے وقت مغرب شمار کر کے جہاں تک جلد ہوسکے نماز مغرب پڑھ لی جائے پھر دو ڈھائی گھنٹے گزارنے کے بعد نماز عشاء و وتر وغیرہ پڑھ لی جائے، پھر طلوع آفتاب سے ۱- ۲/۱ گھنٹہ قبل سے نماز فجر کا وقت شمار کیا جائے اور طلوع آفتاب سے آدھ گھنٹہ ۲۰ منٹ قبل نماز فجر پڑھ لی جائے۔

مسئلہ ۱۳: جب روزانہ طلوع آفتاب نہ ہو، بلکہ کئی کئی دن یا کئی کئی ماہ مسلسل آفتاب طلوع نہ ہوتا ہو، غروب ہی رہتا ہو، جیسا کہ اسی ارض تسعین اور اس کے مضافات میں ہوسکتا ہے تو اس زمانہ کا ہر ۲۴ گھنٹہ نہار ولیل کا مجموعہ ایک دن ورات کے برابر قرار دیا جائے اور نصف اول کو دن کا حصہ شمار کیا جائے اور نصف آخر کو رات کا حصہ شمار کیا جائے اور دونوں حصوں میں مسئلہ ۱۲ کی طرح عمل کیا جائے، یہاں تک کہ غروب مسلسل کا یہ دور ختم ہوکر روزانہ آفتاب طلوع ہونا شروع ہوجائے، پھر ان مسائل مذکورہ نمبروار میں سے جس مسئلہ کا مصداق صادق آئے اس کے مطابق عمل کیا جائے۔

تنبیہ: سال کا ایک پورا دور مکمل ہوگیا اور اس کے ہر موڑ کے مطابق نماز کا حکم منقح کردیا گیا، تا کہ عمل میں سہولت رہے اور آسانی سے فریضہ صلوۃ ہر دور کے مناسب ادا کیا جاسکے۔فالحمد لله علی ذلک۔اب آگے سوال ۱ کے جزء ثانی کا جواب جو روزہ سے متعلق ہے عرض کیا جائے گا۔

سوال ۱ کے جزوثانی (ب) کا جواب:

وجوب نماز کی طرح روزوں کا وجوب بھی ساقط نہ ہوگا، بلکہ علیٰ حالہ باقی رہے گا۔

"بورود النص حكما مطلقا شاملا لجميع الناس في جميع الأزمنة والأمكنة من غير فرق بين أهل قطر كما قال الله تعالىٰ: "يا يها الذين آمنوا كتب عليكم الصيام كما كتب على الذين من قبلكم لعلكم تتقون أياما معدودات" (۱)۔

(اے ایمان والو! تم پر روزہ فرض کیا گیا جس طرح تم سے پہلے لوگوں پر فرض کیا گیا تھا اس توقع پر کہ تم متقی بن جاؤ تھوڑے دنوں روزے رکھا کرو) (بیان القرآن)۔

"وكما قال الله تعالىٰ: شهر رمضان الذى أنزل فيه القرآن هدى للناس وبينات من الهدىٰ

۱- سورۂ بقرہ: ۱۸۳۔

والفرقان فمن شهد منكم الشهر فليصمه"(۱)۔

(ماہ رمضان ہے جس میں قرآن بھیجا گیا ہے جس کا وصف یہ ہے کہ لوگوں کے لئے ہدایت ہے اور واضح الدلالۃ ہے، منجملہ ان کتب کے جو ہدایت ہیں اور فیصلہ کرنے والی ہیں سو جو شخص اس ماہ میں موجود ہو اس کو ضرور اس میں روزہ رکھنا چاہئے)۔

اس مضمون کی تائید علامہ ابن عابدینؒ کی تحقیق سے بھی ہوتی ہے جس کو موصوف نے رد المحتار (۱/۳۳۹) میں زیر عنوان "تتمہ" تفصیل سے بیان کیا ہے، البتہ صورت ادا میں کچھ تفصیل ہوگی جو ذیل میں درج کی جاتی ہے، اور بغرض تسہیل فہم ہر صورت الگ الگ بعنوان مسئلہ بیان کی جاتی ہے:

مسئلہ نمبر ۱- جن مقامات میں شمس کی عام گردش یومیہ کے اعتبار سے روزانہ طلوع وغروب نہ پایا جاتا ہو، بلکہ کئی کئی دن یا کئی کئی ماہ تک مسلسل آفتاب طلوع ہی رہتا ہو یا غروب ہو کر زمین کے اوٹ میں غائب ہی رہتا ہو، جیسا کہ ارض تسعین اور اس کے اطراف میں ایسا ہو سکتا ہے تو ان مقامات میں جواب نمبر ۱ کے جز واول کے مسئلہ نمبر ۵ کے مطابق آفتاب کا ایک پورا دورہ (۲۴ گھنٹہ کا) جو ایک لیل ونہار کا مجموعہ شمار ہوتا ہے اور اس کے نصف آخر کو دن کا حصہ شمار کیا جاتا ہے اس میں روزہ رکھیں اور اس نصف کے شروع ہونے سے ۱-۲/۱ گھنٹہ پہلے ہی سحری کھانا بند کر کے روزہ کی نیت کر کے روزہ رکھ لیا کریں اور نصف اول جو رات کا حصہ شمار ہوتا ہے اس میں مغرب، عشاء، وتر، تراویح فجر سب نمازیں پڑھ لیا کریں۔ اور پھر جب یہ مجموعہ لیل ونہار پورا ہو کر دوسرے دور کا آغاز ہو فوراً نماز مغرب پڑھنے کی طرح افطار بھی کر لیا کریں۔ اور پھر اس دوسرے دور کے نصف اول میں جو رات کا حصہ شمار ہوتا ہے اس میں کھانا پینا وغیرہ اور رات کی سب نمازوں (عشاء، وتر، تراویح وفجر وغیرہ) سے فراغت کر لیا کریں۔ اور نصف ثانی میں جو دن کا حصہ شمار ہوتا ہے اس کے شروع ہونے سے ۱-۲/۱ گھنٹہ قبل سحری کھا لیا کریں اور روزہ کی نیت کر لیا کریں، پھر اسی طرح ہمیشہ کیا کریں تا آنکہ یہ طلوع وغروب روزانہ ہونے لگے۔

ذلک الدليل الذی بينه فی رد المختار (۱/۳۳۹) تحت التتمة۔

مسئلہ نمبر ۲- جن مقامات میں طلوع وغروب شمس تو روزانہ پورے سال پایا جاتا ہو لیکن ہر موسم میں غروب شمس کے بعد سے فجر صادق طلوع ہونے کے قبل تک اتنا موقعہ ملتا ہو کہ بایمائے آیت کریمہ:

"كلوا واشربوا حتى يتبين لكم الخيط الأبيض من الخيط الأسود من الفجر، ثم اتموا الصيام

۱- سورہ بقرہ: ۱۸۵۔

إلی اللیل"(۱)۔

(کھاؤ اور پیو اس وقت تک کہ تم کو سفید خط صبح کا متمیز ہو جائے سیاہ خط سے پھر رات تک روزہ کو پورا کرلیا کرو) (بیان القرآن)۔

کھایا پیا جا سکے اور پھر اس کے بعد غروب تک روزہ پورا کیا جا سکے تو ان مقامات میں روزہ کی مقدار ساعات سے (یعنی گھنٹوں سے یا نصف گردش شمس وغیرہ سے) متعین نہ کریں گے، بلکہ اس ماہ (رمضان) کے بعینہ یہی دن روزوں کے لئے متعین رہیں گے، لیکن چونکہ اس طرح بغیر آسودگی سے کھائے پئے پورے ماہ میں صوم پر عادۃً وعموماً قدرت نہیں ہو سکتی، اس لئے ناغہ دے کر حسب قدرت واستطاعت روزہ رکھا کریں گے اور جن دنوں میں افطار کریں گے ان دنوں کے صوم کے عوض میں دوسرے مہینوں کے دنوں میں حسب قدرت ناغہ دے دے کر ادا کرتے رہیں گے، لیکن اگر جسمانی کمزوری کی وجہ سے اس پر قدرت نہ ہو تو ان روزوں کا فدیہ فی صوم ایک صدقۂ فطر کے برابر ہمیشہ ادا کرتے رہیں گے۔

اگر بوجہ غربت فدیہ نہ دے سکتے ہوں تو استغفار کرتے رہیں گے اور وہاں سے جلد سے جلد ترک سکونت کر لینے کی کوشش کرتے رہیں گے۔

"کما یؤخذ من هذه العبارة: وکذا لو نذر صوم الأبد فضعف عن الصوم لاشتغاله بالمعیشة له أن یفطر ویطعم لأنه استیقن أن لا یقدر علی قضائه، فإن لم یقدر علی الإطعام لعسرته یستغفر الله وینتقل منه، وإن لم یقدر لشدة الحر کان له أن یفطر ویقضیه فی الشتاء إن لم یکن نذر الأبد"(۲)۔

(اگر کسی نے ہمیشہ روزہ رکھنے کی منت مان لی پھر اپنے روزگار ومعاش میں مشغولی کی وجہ سے ایفاء نذر پر قادر نہیں رہا تو اس کے لئے درست ہے کہ وہ افطار کرلیا کرے اور روزوں کا فدیہ دیدیا کرے، (یہ حکم اس وقت ہے جب وہ شخص غریب ہو اور اس کے لئے معاش میں مشغولی شرعاً واجب ہو) اس لئے کہ اس کو یقین حاصل ہو چکا ہے کہ وہ اس نذر کے ادا کرنے پر قادر نہیں ہے، پس اگر بوجہ غربت کے فدیہ کی ادائیگی پر پھر بھی قادر نہ ہو تو افطار کرتا رہے اور ساتھ ساتھ استغفار بھی کرتا رہے اور جلد سے جلد اس جگہ سے (جہاں پر روزے نہیں رکھ سکتا اور ایفائے نذر نہیں کرسکتا)، دوسری جگہ منتقل ہو جائے، اسی طرح اگر کسی کو شدت حر سے روزہ پر قدرت نہ رہے تو افطار کرلے اور جاڑے میں قضا کرلیا کرے، جبکہ نذر ابد نہ ہو)۔

مسئلہ ۳: جن مقامات میں غروب وطلوع شمس تو روزانہ پایا جاتا ہے، لیکن سال کے صرف بعض مہینوں میں غروب

۱- سورۂ بقرۃ: ۱۸۷۔
۲- فتح القدیر ۲/ ۸۳۔

شمس سے صبح صادق کے درمیان میں نماز ہائے مفروضہ واجبہ ادا کرنے کے بعد اطمینان سے کھانی کر حسب ہدایت آیت کریمہ: "**کلوا واشربوا حتی یتبین لکم الخیط الأبیض الخ**" (۱) (روزہ رکھنے کا وقت ملتا ہو اور بعض مہینوں میں نہ ملتا ہو، تو جس وقت ماہ رمضان ان مہینوں میں واقع ہو جائے جس میں یہ موقع نہ ملتا ہو تو ناغہ دے دے کر حسب استطاعت روزہ رکھیں اور جن دنوں میں روزہ نہ رکھ سکیں ان دنوں کی قضاء اسی سال کے دوسرے دنوں میں رکھ لیا کریں، اور استغفار کرتے رہا کریں اور جلد سے جلد وہاں سے ترک سکونت کی کوشش کرتے رہا کریں۔ **کما مر فی المسألة التی قبل هذه المسئلة۔**

مسئلہ ۴: جن مقامات میں طلوع وغروب شمس روزانہ پایا جاتا ہو، اور غروب کے بعد سے فجر صادق کے غروب ہونے کے پیشتر تک پورے سال اتنا کافی وقت ملتا ہو جس میں صلوٰتہائے مفروضہ واجبہ ادا کرنے کے ساتھ ساتھ اطمینان سے کھانے پینے اور کچھ آرام وسکون لینے کا وقت بھی مل جاتا ہو تو ان مقامات کے لوگوں پر ماہ رمضان میں ہی ہمیشہ ادائیگی صوم واجب وضروری ہوگی اور فجر صادق طلوع ہونے سے ہی روزہ شروع کر دینا لازم ہوگا اور وقت فجر کی مقدار طویل ہونے کی وجہ سے صوم کی مقدار اگرچہ طویل ہو جائے، لیکن سرد ملک ہونے کی وجہ سے قدرت علی الصوم رہے گی اور وجوب صوم متوجہ رہے گا، ساقط نہ ہوگا۔

ہاں اگر کسی کو کوئی وقتی وعارضی مجبوری یا کوئی عذر شرعی پیش آجائے جیسے حاملہ، حائضہ، مرضعہ یا مریض ومسافر وغیرہ تو ایام معتدلہ والوں کی طرح ان کو رخصتیں ملیں گی۔

"**کما دلت علیه هذه العبارة: والحامل والمرضع إذا خافتا علی أنفسهما أو ولدیهما أفطرتا وقضتا دفعا للحرج ولا کفارة علیهما، لأنه إفطار بعذر ولافدیة علیهما**" (۲)۔

(حاملہ ومرضعہ جب اپنے اوپر یا اپنے بچہ پر (روزہ رکھنے سے) جان جانے کا خوف کرنے لگیں تو اس حرج کو دفع کرنے کے لئے افطار کرلیں اور بعد میں قضا رکھ لیں اور اس عمل کی وجہ سے ان پر کوئی کفارہ واجب نہیں ہے، اور نہ ان پر کوئی فدیہ ہے، اس لئے کہ یہ افطار عذر شرعی کی وجہ سے ہے)۔

اسی طرح اگر کوئی شیخ فانی ہو یا ایسا دائم المرض ہو چکا ہو کہ بظاہر حال قدرت علی الصوم مستبعد ہو چکی ہو تو افطار

۱- سورۂ بقرہ: ۱۸۷۔

۲- ہدایہ مع الفتح ۲/ ۳۶۱ کتاب الصوم۔

کرتا رہے اور فدیہ صوم کا ادا کرتا رہے۔

"وعلى الذين يطيقونه فدية طعام مسكين"(۱)۔

(اور جو لوگ روزے کی طاقت نہ رکھتے ہوں ان کے ذمہ فدیہ ہے کہ وہ ایک غریب کا کھانا ہے) (بیان القرآن)۔

(وهكذا ايضا في الشامي (۲/۱۷۶)، وهكذا في ۲/۱۷۷) أيضا ناقلا عن الرملي)۔

مسئلہ۵: ان مسائل سے یہ بات بخوبی واضح ہوگئی کہ گلاسکو اور اس کے مضافات میں ۲۰ جون سے اور بالائی اسکاٹ لینڈ و ناروے اور اس کے مضافات میں ۲۴ مئی سے شفق ابیض غروب ہونے سے قبل ہی صبح صادق طلوع ہو جاتی ہے، تو جب تک غروب شمس کے بعد سے صبح صادق طلوع ہونے کے قبل قبل فرض مغرب و فرض عشاء و وتر ادا کرنے کے ساتھ ساتھ افطار کرنے اور کھانے پینے اور سحری کھانے کا موقع ملتا رہے گا، روزہ رکھنا فرض رہے گا، کیونکہ صوم کی مقدار اگرچہ ۲۰ گھنٹہ کے لگ بھگ ہو جائے گی، مگر سرد ملک ہونے کی وجہ سے قدرت علی الصوم رہے گی۔ جیسا کہ مورخ مغربی ابن بطوط کے سیاحت نامہ سے جو ایسے ہی ممالک کے سفر سے متعلق ہے معلوم ہوتا ہے۔

مسئلہ۶: جن مقامات میں چاند ایام معتدلہ کی طرح ہر ماہ دو دن کے علاوہ بقیہ تمام ماہ روزانہ طلوع و غروب ہو کر اپنا ماہانہ دورہ پورا کر لیتا ہو (خواہ تھوڑی ہی دیر کے لئے طلوع ہو کر پھر غروب ہو جاتا ہو۔ ان مقامات میں ماہ رمضان المبارک اور اس کی پہلی تاریخ کا تعین اسی جگہ کے مطابق کر کے مسائل مذکورہ بالا کے مطابق روزے رکھا کریں۔

مسئلہ۷: جن مقامات میں چاند روزانہ طلوع و غروب نہ ہوتا ہو، بلکہ کئی کئی دن یا کئی کئی ماہ مسلسل چاند طلوع رہتا ہو یا غروب ہی رہتا ہو، جیسے ارض تسعین اور اس کے مضافات کے بعض مقامات ہیں، تو ان مقامات میں کسی قریبی مقام کو (جہاں چاند دو دن کے علاوہ پورے ماہ میں روزانہ طلوع و غروب ہو کر اپنا ماہانہ دورہ پورا کر لیتا ہو، اور آسانی سے اس کا علم و مشاہدہ ہو سکتا ہو) بنیا دبنا کر ماہ رمضان المبارک کا اور اس کی پہلی تاریخ کا تعین کر کے گردش لیل و نہار کے مجموعہ کے ساتھ منطبق کرلیں، پھر ایک مجموعہ کو پوری ایک رات اور دن (۲۴ گھنٹہ) قرار دیں، اور اس کے نصف اول کو رات کا حصہ قرار دے کر اس کے ختم ہونے سے تقریباً دو گھنٹہ قبل سحری کھا کر روزہ کی نیت کر لیا کریں، اور مغرب وغیرہ کی نمازیں ادا کر لیا کریں، جیسا کہ ہم سوال اول کے جزو (الف) کے جواب میں بضمن مسائل تفصیل سے بیان کر چکے ہیں۔

۱- سورۂ بقرہ: ۱۸۴۔

تنبیہ: شروع جواب میں لکھا گیا ہے کہ اسلام دین الٰہی اور دین فطرت ہے اور ایک بین الاقوامی مذہب ہے۔ اس کے احکام ومدار احکام فطری اور فطری اصول کے مطابق ہوتے ہیں، فلسفیانہ موشگافیوں سے مبرا ومحفوظ ہوتے ہیں اور مسائل کی یہ تحقیقات وتفصیلات تو بالکل فلسفیانہ موشگافی یا اس کے ہم پلہ ہیں۔

کوئی یہ شبہ نہ کرے، اس لئے کہ ان غیر معتدل ایام کے رہنے والے نفسیاتی اور فطری طور پر کئی کئی دن تک آفتاب طلوع رہنے کے زمانہ میں مسلسل نہ کام کر سکتے ہیں، اور نہ مسلسل بیدار ہی رہ سکتے ہیں، اور اس طرح مسلسل کئی کئی راتوں میں مسلسل سو ہی سکتے ہیں۔ بلکہ وہ بمقتضائے فطرت مجبور ہیں کہ اپنے سونے جاگنے کھانے پینے، کام کرنے آرام کرنے وغیرہ وغیرہ، تمام کاروبار و معاملات میں گھنٹوں ہی سے کوئی نظم کریں، گویا یہ وہاں کے لوگوں کی ایک فطری ونفسیاتی چیز ہوجائے گی۔ **كما أشار إليه الشاه عبد العزيز المحدث الدهلوي في فتاواه (۱/۱۴۳)۔**

پس شرعی احکام بھی انہی اصول کے ماتحت بمد آیات کریمہ واحادیث شریفہ فقہ کی روشنی میں مرتب ہوں گے اور یہ احکام معروضہ اسی انداز پر مرتب ہیں، لہذا یہ بھی عین فطرت کے مطابق ہی کہلائیں گے، مزید تفصیل کا یہ موقع نہیں ہے، تطویل کے علاوہ خروج عن البحث بھی ہوجائے گا، اس لئے اسی پر اکتفاء ہے اور امید ہے کہ اتنی گزارشات سے اس طراف کے ہر خطہ میں اور ہر موسم میں نماز روزہ کے عمل وامتثال میں شرعی رہنمائی حاصل ہوجائے گی اور اس کی روشنی میں جو شخص عمل کرنا چاہیگا اس کو عمل کرنے میں کوئی دقت یا الجھن نہ ہوگی، بلکہ نہایت آسانی سے عمل کر کے اپنے مربی حقیقی سے اپنا صحیح رشتۂ عبودیت جو اصل مقصد زندگی ہے قائم واستوار رکھ سکے گا۔

سوال ۲ کا جواب

"وفي الدر: وقت الظهر من زواله إلى بلوغ الظل مثليه وعنه مثله وهو قولهما وقول زفر والأئمة الثلاثة (إلى قوله) وفي الفيض وعليه (أي على قول صاحبين) عمل الناس اليوم وبه يفتىٰ (وتحته في الشامية ۱/۳۷۱) والأحسن ما في السراج عن شيخ الإسلام أن الاحتياط أن لا يؤخر الظهر عن المثل وأن لا يصلي العصر حتى يبلغ المثلين ليكون مؤديا للصلوتين في وقتهما بالإجماع أو أيضا فيه (۱/۳۷۰)، قد قال في البحر: لا يعدل عن قول الإمام إلى قولهما إلا ضرورة من ضعف دليل أو تعامل"(۱)۔

۱- شامی ۱/۳۷۰۔

(درمختار میں ہے کہ ظہر کا وقت امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک ہر شئی کا سایہ دو مثل ہونے تک ہے اور امام صاحب سے ایک مثل کی بھی ایک روایت منقول ہے اور یہ ایک مثل کا قول صاحبین کا، نیز امام زفرؒ وائمہ ثلاثہؒ کا بھی ہے (الی قولہ) اور فیض میں منقول ہے کہ آج کل تمام لوگوں کا عمل صاحبین ہی کے قول پر ہے اور اسی کے ساتھ فتویٰ بھی دیا جاسکتا ہے اور اسی تین کے نیچے شامی (۱/۳۷۷) میں ہے کہ ان تمام اقوال میں بہتر وہ قول ہے جو سراج وہاج میں شیخ الاسلام سے مروی ہے کہ احتیاط یہ ہے کہ نماز ظہر کو ایک مثل سے مؤخر نہ کیا جائے اور نماز عصر مثلین سے قبل نہ پڑھی جائے، تا کہ دونوں نمازیں (ظہر وعصر) بالاجماع اپنے اپنے وقتوں میں ادا ہوں، نیز اسی شامی (۱/۳۷۰) میں بحوالہ بحر منقول ہے کہ امام کے قول سے صاحبین کی جانب بھی ضعف دلیل یا تعامل ناس وغیرہ وجوہ شرعی کے بغیر عدول نہ کیا جائے)۔

ان عبارتوں سے معلوم ہوا کہ شفق احمر وابیض کی طرح مثل اور مثلین میں بھی امام صاحبؒ کا ایک قول مثل کا ہے۔

نیز تعامل ناس بھی صاحبین کے ہی قول پر ہے عدول عن قول الامام وجہ بن سکتا ہے، لیکن اس کے باوجود حتی الوسع نماز عصر بعد مثلین اس لئے پڑھتے ہیں، تا کہ بالاجماع اور بلا اختلاف نماز عصر اپنے وقت میں ادا ہو۔

انہی عبارتوں سے نماز عصر کے اندر مثلین سے اس کی تقدیم کی گنجائش عند الضرورۃ نکل آئی، اس کے علاوہ اصفرار شمس کے بعد نماز عصر ادا کرنا عند الاحناف بالاتفاق مکروہ ہے جس سے اجتناب واجب ہے۔

پس اگر حسب تحریر سوال اگر وہاں (گلاسکو وغیرہ میں) مثلین سے ہی اصفرار شمس شروع ہو جاتا ہے تو اس سے اجتناب حتی الوسع ضروری ہوگا، اور مثلین سے قبل ہی نماز عصر ادا کر لینے کی اصول احناف کے مطابق جیسا کہ ابھی مذکور ہوا، بدرجہ اولیٰ گنجائش ہوگی اور ادا کر لینا بلاشبہ وبلانکیر درست ہوگا اور نماز ادا ہو جائے گی۔ اور ایسی صورت میں کہ جب بعد مثلین پڑھنے میں اصفرار شمس قطعی طور پر ہو جاتا ہے تو ائمہ مساجد کا اصرار بیجا نہ ہوگا۔

سوال ۳ کا جواب

ہم پہلے ہی عرض کر چکے ہیں کہ اسلام دین الٰہی اور دین فطرت ہے۔ اس کے اصول فطری اور سادے ہیں، اس کے احکام اور مدار احکام بھی فطری وسادے ہوں گے، محکمۂ موسمیات یا ماہرین فلکیات کی تحقیقات پر اس کے احکام کی بناء نہ ہوگی۔ اور اسی وجہ سے اختلاف مطالع کا اعتبار جمہور محققین کے نزدیک نہیں ہے۔ خواہ شافعی ہوں یا حنفی یا مالکی ہوں یا حنبلی۔ غرض جمہور امت کے نزدیک غیر معتبر ہے۔ کمافی الشامی (۲/۱۴۷)۔

”قد صرحت أئمة المذاهب الأربعة، بأن الصحيح أنه لا عبرة برؤية الهلال نهاراً (إلى قوله

وأنه لا عبرة بقول المنجمين" (۱)۔

(تمام ائمہ مذاہب نے تصریح فرمائی ہے کہ دن میں رویت ہلال کا اعتبار نہیں۔(الی قولہ) اسی طرح منجمین کے قول کا بھی اعتبار نہیں)۔

اور چونکہ امام تاج الدین سبکی شافعی کے قول کی بنا ءانہی حسابات پر ہے اور وہ مزاج اسلام کے خلاف ہے اور اس وجہ سے خود تمام محققین شوافع نے اس کورد کردیا ہے۔

"ماقاله السبكي رده متاخروا أهل مذهبه"(۲)۔

غرض جمہور امت محمدیہ کے نزدیک امام تاج الدین سبکیؒ کے قول پر مذاہب نہیں رکھ سکتے، بالخصوص اس زمانے میں جب کہ ریڈیو کی اس قدر کثرت ہوگئی ہے کہ ہندوستان جیسے پسماندہ ملک میں بھی گھر گھر نہیں تو گاؤں، یا قصبہ قصبہ تو ضرور ہی اس کی بہتات ہوچکی ہے جس کے ذریعہ سے دور ونزدیک ہر جگہ کی اطلاعات بے تکلف وبغیر کسی کاوش ووقت کے پہنچتی رہتی ہیں تو پھر اقوام متمدنہ کے ملکوں میں اس کی کس قدر کثرت وبہتات وفراوانی ہوگی اور اس کے ذریعہ آمدہ اطلاعات واعلانات کا شرعی حکم یہ ہے کہ اگر یہ اعلانات واطلاعات شرعی اصول کے مطابق آجائیں، خواہ کسی خطۂ وملک سے آجائیں ثبوت کے لئے شرعاً کافی ہوں گی، جس کو حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب نے بھی اپنے رسالہ" آلات جدیدہ کے شرعی احکام"میں خوب واضح طور سے بیان فرمایا ہے اور شرعی اصول وضوابط کے مطابق اس قسم کے اعلان واطلاع حاصل کرنے کا نظم بالخصوص متمدن ممالک میں کچھ زیادہ مشکل بھی نہیں، مثلاً کسی مرکزی شہر میں جہاں کا مطلع صاف رہتا ہو، غبار آلود نہ رہتا ہو اور وہاں ریڈیو اسٹیشن بھی ہو، منجانب حکومت یہ انتظام کرالیا جائے کہ کوئی مسلمان حاکم شہادت شرعیہ کے ذریعہ رویت کا ثبوت حاصل کرکے بایں الفاظ یہ اعلان کرادیا کرے کہ رویت کا ثبوت شرعی حاصل کرکے یہ اعلان کیا جاتا ہے کہ کل یوم فلاں سے، مثلاً یکم رمضان ہے یا یکم شوال ہے تو یہ اعلان معتبر ہوگا اور اس پر عمل کرنا اصول مذہب کے مطابق صحیح ودرست ہوگا، صرف ایک بات ملحوظ رکھنی ہوگی کہ اس اعلان پر عمل کرنے سے مہینہ بجائے ۲۹ و ۳۰ دن کا ہونے کے ۲۸ دن یا ۳۱ دن کا نہ ہو رہا ہو۔

اور اگر منجانب حکومت ایسا باقاعدہ نظم نہ ہوسکے تو آپسی انتظام سے ایک شرعی ہلال کمیٹی بنائی جائے جس کے سب افراد باشرع مسلمان ہوں اور اس میں ایک سمجھدار عالم کو بھی جو مسائل متعلقہ سے بخوبی واقف ہو شریک کرلیا جائے، تاکہ

۱- شامی ۲/ ۱۴۷ تحت" مطلب فی رویۃ الہلال نہاراً"۔

۲- شامی ۲/ ۱۴۱۔

تمام شرعی کارروائی باوثوق طریقہ سے مکمل ہوسکے، وہ شرعی ہلال کمیٹی رویت ہلال کا شرعی ثبوت فراہم کرکے ریڈیو اسٹیشن سے اپنی نگرانی میں اعلان نشر کرادے کہ رویت ہلال کا شرعی ثبوت فراہم کرکے یہ اعلان کیا جاتا ہے کہ کل صبح عید ہے، مثلاً، یا اس وقت سے ماہ رمضان کی شب ہوگی، صبح سے روزے رکھے جائیں۔

اس ثانی صورت میں حکومت سے صرف اتنا کام لینا ہے کہ حکومت اور پروگراموں کے ساتھ اس پروگرام کے نشر کرنے کو منظور کرلے اور ہلال کمیٹی کا کوئی مسلم وکیل یا مسلم نمائندہ وہاں پہنچ کر اعلان کردیا کرے، ریڈیو اسٹیشن عموماً اس قسم کی خبریں اور اعلانات خود نشر کرتے رہتے ہیں ان کو اس کے منظور کرنے میں کچھ دقت نہ ہوگی، صرف اتنا لحاظ کرنا ہوگا کہ اس نشریہ کے الفاظ شرعی ہوں گے جس کو ہلال کمیٹی خود مرتب کردے گی۔

پہلی صورت کے انتظام میں بھی حکومت کو کوئی خاص دقت یا پریشانی نہ ہوگی، بلکہ ممکن ہے کہ اس سلسلۂ انتظام میں حکومت کا کچھ مالی یا اقتصادی فائدہ ہی ہوجائے، اس لئے اگر حکومت تنگ دل یا متعصب نہ ہوگی تو آپ کا نظم بآسانی وبسہولت ہوجائے گا، نیز اگر حکومت غیر مسلم سے بھی یہ انتظام کرالیا جائے جب بھی شرعاً نافذ وصحیح ہوگا، یہ انتظام مملکت برطانیہ یا اس کے گردونواح کے نزدیک کی کسی بھی مملکت مسلمہ یا غیر مسلمہ سے کرالیا جائے تو بھی صحیح ونافذ ہوجائے گا اور سارے مسلمان اس کے مطابق آسانی سے عمل کرسکیں گے، اگر یہ انتظام کرلیا گیا تو یہ ایک مستقل حل نکل آئے گا اور خط وٹیلیفون سب سے زیادہ قوی اور اطمینان بخش ہوگا اور ہر طرح شرعی اصول وضابطہ کے مطابق ہوگا۔

الحاصل جب ان سہولتوں کے موجود نہ ہونے کی حالت میں بھی تاج الدین سبکی کا قول معمول بہ دا رمذہب نہ بن سکا، بلکہ فقہاء نے صاف تصریح فرمادی کہ اس حساب کے جاننے والے اور بتلانے والے اگر چہ عادل وثقہ مسلمان ہوں گے جب بھی اس کا اعتبار نہ ہوگا، کما فی الشامی (۱۴۱/۲)۔

"ولا عبرة بقول المؤقتين ولو عد ولا على المذهب" (۱)۔

(اہل ہند سہ وقول منجمین کا اعتبار نہ کریں گے اگرچہ وہ عادل ہی کیوں نہ ہوں)۔

تو ان سہولتوں کے باوجود اگر کسی جگہ کے لوگ تاج الدین سبکیؒ شافعی کی تحقیق کے مطابق عمل کرلیں گے تو ان کا یہ عمل صحیح نہ ہوگا اور ان کا یہ طریقہ نکالنا احکام مذہب کے مطابق صحیح تعمیل وصحیح ترجمانی نہ ہوگی، بلکہ اگر وہ لوگ حکومت میں بااثر وبارسوخ ہوں، اور اسی طرح اور لوگ جو بااثر وبارسوخ ہوں اور حکومت کی جانب سے یا شرعی کمیٹی کے ذریعہ سے اعلان کا انتظام بسہولت متوقع ہو تو ان سب پر خطاب باری عزاسمہ خصوصی طور سے متوجہ ہوگا کہ وہ لوگ اس کے انتظام میں اپنی

۱- شامی ۱۴۱/۲۔

پوری قوت صرف کر کے امت مسلمہ کے انتشار و پریشانی کو رفع کریں، نہ کہ اصول مذہب کو چھوڑ دیں اور اجماع سلف کا توڑ کریں، اور اگر وہ اس کوشش میں بظاہر کامیاب نہ ہوں گے جب بھی حقیقت میں کامیاب ہوں گے ثمرات آخرت سے ضرور بہرہ ور ہوں گے۔ **ھذا ما عندی من الشرع الشریف**، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند، سہارنپور

آیات، احادیث، روایات، فقہ کی روشنی میں استنباط کر کے جو حکم تحریر کیا گیا ہے وہ اقرب واشبہ ہے، اس پر عمل کرنے سے انشاء اللہ تعالیٰ ذمہ بری ہو جائے گا۔

الجواب صحیح: احقر محمود عفی عنہ دارالعلوم دیوبند، سید احمد علی سعید دارالعلوم دیوبند

وہ مقامات جہاں افق ہمیشہ غبار آلود رہتا ہے وہاں رمضان کی ابتداء وانتہا:

چونکہ برطانیہ کا افق ہمیشہ غبار آلود رہتا ہے جس کی وجہ سے چاند دیکھنا ممکن ہے تو رمضان کی ابتداء وانتہا کے لیے کیا صورت اختیار کی جائے؟

الجواب وباللہ التوفیق:

شعبان کی ۲۹ رتاریخ کی شام کو یا اسی رات میں کوئی شرعی رویت ہلال کمیٹی (جس کے سب افراد کا باشرع ہونا معلوم ہو) کا اعلان بایں الفاظ آجائے کہ میں فلاں شرعی رویت ہلال کمیٹی کا صدر یا ممبر ہوں، رویت ہلال کا شرعی ثبوت حاصل کرنے کے بعد اعلان کرتا ہوں کہ کل یکم رمضان ہے یا کل سے روزہ رکھا جائے تو اس اعلان کے تقاضہ اور حکم پر عمل کرنا صحیح ہو جائے گا یہ اعلان انہی الفاظ میں دنیا کے کسی خطہ سے آجائے عمل کرنا درست رہے گا، اسی طرح رمضان کی ۲۹ رتاریخ کی شام کو یا اسی رات میں مذکورہ اوصاف کی کمیٹی کا اعلان آجائے کہ شرعی ثبوت لیکر اعلان کیا جاتا ہے کہ کل یکم شوال ہے یا کل نماز عید ادا کی جائے تو اس پر بھی عمل کرنا درست رہے گا، اور اگر یہی اعلان انہیں مذکورہ الفاظ میں ۲۸ رتاریخ کو آئے تو معتبر نہ ہوگا، کیوں کہ اس صورت میں مہینہ کا ۲۸ ردن کا ہونا لازم آئے گا یہ نص صریح "**الشھر ھکذا و ھکذا**" الخ کے خلاف ہوگا جس کا خلاف کرنا کسی صورت میں جائز نہیں، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند، سہارنپور

لندن وغیرہ جہاں کا افق ہمیشہ ناصاف رہتا ہے، وہاں ثبوتِ رمضان کا شرعی حکم؟

برطانیہ میں فضا بالدوام ابر آلود رہتی ہے، اس لیے کبھی بھی رویت یا شہادت ہلال کا امکان ہی نہیں رہتا ہے، اس وجہ سے ابتداء رمضان یا عیدین کے تعین میں ہمیشہ اختلاف رہتا ہے، بعض حضرات کا کہنا ہے کہ جب رویت وشہادت ممکن ہی نہیں تو ریڈیو کی اطلاع کا اعتبار ناگزیر ہے، اس وجہ سے ایسے لوگ اطلاع ریڈیو پر رمضان وعیدین کا تعین کرتے ہیں۔

شریعت مطہرہ نے رویت وشہادت کے جو قوانین وضع کیے ہیں، اس کے معیار پر ریڈیو کی اطلاع رویت ہلال یقیناً غیر معتبر ہے، لیکن یہاں مشکل یہ ہے کہ اگر ریڈیو کی اطلاع کا اعتبار نہیں کرتے تو سال کے تمام مہینوں میں پورے ۳۰/۳۰ دن ہوں گے اور اس طرح برطانیہ میں مقیم مسلمانوں کا اسلامی سال ۳۶۰ دن کا ہوگا جو ہندو پاک کے اسلامی سال سے جو عموماً ۳۵۴ دن کا ہوتا ہے، چھ دن زیادہ ہوگا، جس کا مطلب یہ ہے کہ جب ہندو پاک میں رمضان کے ٦ دن گذر جائیں گے تب ہی یہاں رمضان شروع ہوگا، اسی طرح عیدین میں ٦ دنوں کا فرق پڑے گا اور وہ فرق بڑھ کر پانچ سال میں ایک مہینہ کا ہو جائے گا، یعنی ہندو پاک میں جب شوال کا مہینہ شروع ہو تو یہاں برطانیہ میں رمضان کی آمد ہو، اسی طرح یہ فرق ہر سال میں بڑھتا ہی چلا جائے گا، پھر اطلاع ریڈیو کو بالضرورت جائز سمجھنے والے قصر صلوٰۃ وافطار فی السفر، احکام معذور، امامت ودرسِ قرآن پر اجرت لینا وغیرہ کا ذکر کر کے فرماتے ہیں کہ عند الضرورت احکام میں تخفیف شریعتِ مطہرہ کا مزاج ہے۔

اور یہاں ریڈیو کی اطلاع پر جواز بھی عند الضرورت ہے ورنہ اختلاف کا ڈر ہے، جیسا کہ اوپر مذکور ہوا، پھر ایک ان کی دلیل یہ بھی ہے کہ ریڈیو کی خبر کو نامعتبر سمجھنے کا قیاس اس امر پر مبنی ہے کہ زمانہ سلف میں رویت وشہادت کے علاوہ تمام ذرائع میں کذب کا امکان تھا، لیکن فی زماننا یہ بات نہایت واضح ہے کہ ریڈیو کی اطلاع میں کذب کا امکان اس معنی میں نہیں کہ بولنے والے کی آواز یقیناً اس ملک سے ہے، جہاں سے وہ بول رہا ہے اور وہ بات یقینی ہے کہ جہاں سے اطلاع مل رہی ہے وہاں ہلال کی چھان بین کمیٹی یا شہر قاضی نے بمطابق احکامِ شرع کر لی ہے اور اس بات کو نشر کرتا ہے نہ کہ اپنی طرف سے خبر دیتا ہے، پس ریڈیو کی اطلاع رویت پر اعتماد نہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں، پس اس تمہید کے پیش نظر حسب ذیل سوالات کے جوابات دے کر ممنون فرمائیں:

۱- جس ملک میں فضا ہمیشہ ابر وآلود رہتی ہو اور رویت شہادت کا امکان ہی نہ ہو وہاں اثباتِ ہلال کی کیا صورت ہوگی؟

الف: کیا اس صورت میں سال کے تمام مہینے ۳۰ دن کے شمار ہوں گے، یا صرف شعبان ورمضان، ذی قعدہ کو

۳۰ دنوں کا قرار دے کر بقیہ مہینوں کو اپنی حالت پر چھوڑ دیں گے؟

۲-ریڈیو کی اطلاع پر رویت ہلال پر اعتماد نہ کرنے کی صورت میں شرقی ممالک و برطانیہ کے درمیان پانچ سال میں ایک مہینہ کا فرق ہو جاتا ہے، تو کیا اس کو شرعی ضرورت سمجھ کر صرف برطانیہ کے مسلمانوں کے لیے ریڈیو کی اطلاع پر رویت ہلال کو معتبر سمجھنا درست ہے یا نہیں؟

الف: شریعت مطہرہ نے سفر میں قصر صلوٰۃ وافطار صوم اور معذور کے لیے طہارت کے احکام میں تخفیف کی اجازت دی ہے اور اس زمانہ میں ضرورت کے پیش نظر امامت و درس قرآن پر اجرت لینے کو درست لکھا ہے، تو کیا رویت ہلال کے مسئلہ میں بھی ضرورت کے پیش نظر برطانیہ میں مقیم مسلمانوں کو تخفیف دے کر ریڈیو کی اطلاع کو معتبر سمجھنے کی اجازت ہو سکتی ہے یا نہیں؟

۳-بعض حضرات کا کہنا ہے کہ جب متعدد ممالک ریڈیو پر رویت ہلال کی خبر نشر کریں، تو یہ خبر مستفیض کے حکم میں ہے، کیا ان کا یہ کہنا شرعاً درست ہے؟ اگر ریڈیو کی اطلاع خبر مستفیض کے حکم میں ہے، تو کم از کم اور زیادہ سے زیادہ کتنے ممالک کے ریڈیو کی اطلاع درکار ہے؟

امید ہے کہ مندرجہ بالا سوالات کے جوابات بہت جلد دے کر یہاں کے مسلمانوں کو شدید اختلاف سے بچالیں گے، یہاں تک کہ اخبار میں علماء پر بھی کیچڑ اچھالا جاتا ہے۔

الجواب وباللہ التوفیق:

مذکورہ حالات بے شک پریشان کن ہیں اور بمقتضائے "**المشقة تجلب التيسير**"(۱) مقتضی تیسیر ہے، اس لیے اس کا حکم مندرجہ ذیل ہوگا:

۱-جب کسی ریڈیو کے بارے میں یہ علم یقینی حاصل ہو جائے کہ وہ ثبوت شرعی کے بعد ہی رویت کا اعلان کرتا ہے، تو اسی اعلان پر عمل کر لینا درست رہے گا، بشرطیکہ اس پر عمل کرنے سے مہینہ ۲۸ دن یا ۳۱ دن کا نہ ہوتا ہو، جیسا کہ دہلی میں کل ہند رویت ہلال کمیٹی قائم ہے اور کمیٹی جو فیصلہ شرعی اصول کے مطابق کرتی ہے اس فیصلہ کو اسی کمیٹی کے الفاظ میں آل انڈیا ریڈیو اپنی خاص خبروں میں نشر کرتا ہے، اس کی مزید توضیح و تصدیق جناب مولانا قاضی سجاد حسین صاحب شیخ الحدیث وصدر

۱- الاشباہ والنظائر/۱۲۵۔

المدرسین مدرسہ عالیہ فتحپوری سے حاصل ہوسکتی ہے، جناب مولانا موصوف اس کل ہند رویت ہلال کمیٹی کے کنویز ہیں، پس اگر اس ریڈیو کا اعلان پہنچ جاتا ہو یا اسی قسم کا کوئی اعلان ملک کے کسی خطہ سے آجاتا ہو اور اس پر عمل کرنے سے مہینہ ۲۸ یا ۳۱ دن کا نہ ہوتا ہو تو بے تکلف اس کے مطابق عمل کرلیا جائے۔

۲-اگر ایسا علم و یقین حاصل نہ ہو، لیکن ظنِ غالب حاصل ہو جائے کہ رویت ہلال کا شرعی ثبوت حاصل کرنے کے بعد ہی یہ اعلان ہوا ہے تو اس پر بھی عمل کرلینا چاہیے یہ درست ہوگا، خواہ دنیا کے کسی خطہ سے آئے بشرطیکہ اس پر عمل کرنے سے مہینہ ۲۸ یا ۳۱ دن کا نہ ہو رہا ہو۔

۳-اور اگر صحت کا یہ ظن غالب بھی حاصل نہ ہو، لیکن مختلف اطراف و ممالک سے ثبوتِ رویت ہلال کی اطلاع اتنی تعداد میں آجائے کہ اتنی تعداد میں عادتاً کذب پر اتفاق نہیں ہوتا، تو استفاضہ کی صورت بن کر اس کے مطابق بھی عمل کرلینا درست ہے۔

نوٹ: ان سب صورتوں میں عوام کے علم و یقین یا ظنِ غالب کا یا استفاضہ قرار دینے کا اعتبار نہ ہوگا، مقامی رویت ہلال کی شرعی کمیٹی کے فیصلہ و ظن غالب کا اعتبار ہوگا اور اگر مقامی شرعی رویت ہلال کمیٹی نہ ہوگی تو وہاں کے خطیب جامع مسجد و عید گاہ کا اور وہاں کے معتمد علماء کا فیصلہ جب ظنِ غالب کے حصول کا یا استفاضہ کے حصول کا ہوگا تو وہ معتبر ہوگا۔

۴-اگر ان مذکورہ صورتوں میں کوئی صورت میسر نہ ہو یا فقہ حنفی کے اصول پر یہ پوری نہ اترتی ہو اور پریشانیاں وہی ہوں جو سوال میں مذکور بھی ہیں، تو اس صورت میں یہ کرنا چاہیے کہ اگر اس خطہ میں شافعی یا حنبلی یا مالکی لوگ بستے ہوں تو جو ان کے معتمد مفتی کا فتویٰ ہو اس پر خود بھی عمل کریں بشرطیکہ اس پر عمل کرنے سے مہینہ ۲۸ دن کا یا ۳۱ دن کا نہ ہوتا ہو۔

اس صورت میں بھی عوام خود رائی نہ کریں، بلکہ علمائے احناف سے اس کے بارے میں فتویٰ حاصل کرلیں۔

۵-اور اگر یہ صورت بھی میسر نہ ہو، یعنی شافعی، حنبلی اور مالکی یہ لوگ بھی نہ بستے ہوں یا بستے ہوں، مگر مذکورہ معتمد فتویٰ موجود نہ ہو یا ان کے فتاویٰ آپس میں متضاد ہوں، تو پھر علمائے احناف ہی سے ان کے معتمد فتاویٰ حاصل کریں، یا ان کے فقہ کی معتمد کتابوں سے رجوع کرکے اس مجبوری کی صورت میں ان کا معتمد مسلک تلاش کرکے اس کے مطابق عمل کریں۔

اتنی گفتگو سے آپ کے سوال کی ہر شق کا جواب ہوگیا اور ۲ کے ضمن (ج) کے بارے میں عرض ہے کہ یہ کہنا کہ اب ریڈیو کی اطلاع میں کذب کا امکان نہیں رہا صحیح نہیں۔

امکان کیا وقوع بھی ہو جاتا ہے، البتہ یہ بات ضرور ہے کہ حکومت کی خالص اطلاعات جس کو حکومت اپنے خاص

اہتمام سے نشر کرتی ہے اس میں اس کا احتمال کم ہوجاتا ہے۔

اور جو اطلاعات عام خبر رساں ایجنسیوں کے ذریعے ہوتی ہیں ان میں اس کا احتمال زیادہ ہوجاتا ہے، پھر ریڈیو کے ذریعہ جو اعلان کرتے ہیں اور اس کے ذریعہ جو خبر دیتے ہیں ان دونوں میں بھی فرق ہے، اعلان تو یہ ہے کہ مثلاً فلاں قاضی یا فلاں شرعی ہلال کمیٹی اعلان کرتی ہے کہ شرعی ثبوت سے رویت ہلال ثابت ہوگیا کل سے روزے رکھے جائیں گے یا کل نماز عید ادا کی جائے گی اور اس جواب میں اعلان سے اسی قسم کا اعلان مراد ہے اور خبر مثلاً یہ ہے کہ فلاں نے چاند دیکھا یا فلاں سے فلاں شخص نے اپنا چاند دیکھنا بیان فرمایا۔

اور جو اطلاعات اس درجہ کی بھی نہ ہوں، مثلاً اس طرح ہو کہ فلاں جگہ عید ہے، یا فلاں جگہ چاند دیکھا گیا تو یہ اطلاعات شرعاً نہ معتبر اعلان ہیں نہ معتبر خبر ہیں، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند، سہارنپور

بحرین میں سعودی عرب کے اعلان پر روزہ وعید:

بحرین میں روزہ رکھنے اور عید الفطر منانے کا اعلان سعودی عرب کے اعلان پر کرتے ہیں گذشتہ رمضان بغیر چاند دیکھے روزہ رکھا گیا عید الفطر بھی سعودی عرب کے اعلان پر منایا گیا بحرین میں چاند دکھائی نہیں دیا تھا جب کہ مطلع بالکل صاف تھا۔ سعودی عرب کے اعلان پر رمضان کے روزے اور عید الفطر منانا کیسا ہے؟

شفیع احمد اعظمی

الجواب وباللہ التوفیق:

جائز ہے، اس طرح سے بھی روزے وعید الفطر سب ادا کرنا درست ہے (۱)۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند، سہارنپور

۱- ''فیلزم أهل المشرق برؤیة أهل المغرب إذا ثبت عندهم رؤیة أولئک بطریق موجب'' (الدر المختار مع رد المحتار ۳/ ۳۶۴) (مرتب)۔

مونٹریال میں رمضان وعید کی ثبوت رویت کا طریقہ:

الف-رمضان یا شوال کے چاند کی رؤیت کے لئے مطالع کے فاصلہ کا تعین مندرجہ ذیل حالات کے تحت کیسے کیا جاسکتا ہے؟

ہم مونٹریال کے مسلمان اب تک یہ طریقہ اختیار کرتے رہے ہیں کہ تقریباً سات سو (۷۰۰) میل شمال، جنوب، اور مغرب میں سے رؤیت ہلال کی مستند اطلاع ملنے پر رمضان یا شوال کا آغاز کرتے ہیں۔ حالانکہ ہمارے پاس اس بات کی بھی سہولت موجود ہے کہ ہم کینڈا اور امریکہ ہی کے ممالک میں تین ہزار میل (۳۰۰۰) دور کے فاصلہ تک بھی رؤیت ہلال کی شہادت حاصل کرسکتے ہیں، لیکن اس میں قباحت ہیکہ اتنے فاصلہ کیوجہ سے غروب آفتاب کے اوقات میں تقریباً تین گھنٹہ کا فرق ہوجاتا ہے جس کی وجہ سے رؤیت کی شہادت کی اطلاع ملنے میں تقریباً رات کے ایک یا دو بج جاتے ہیں اور باشندگاں مونٹریال اور اطراف کے ساکنان کو اتنی رات گئے اطلاع دینا تقریباً ناممکن ہوجاتا ہے، چنانچہ اس وجہ سے لوگوں کا یا تو روزہ چھوٹ جاتا ہے یا عید کے دن کا روزہ ہوجاتا ہے مزید براں تراویح اور اعتکاف کی عبادات میں بھی خلل واقع ہوجاتا ہے۔

اطلاعاً عرض یہ ہے کہ مونٹریال کے مسلمانوں کی آبادی چاروں ائمہ کے مسلک پر مشتمل ہے، لیکن اکثریت احناف کی ہے۔

سید منظور خاں (سنٹر اسلامک ڈی کیوبیک، کناڈا)

الجواب وبالله التوفيق:

متاخرین علماء میں بعض محققین نے رؤیت ہلال کے ثبوت کے لئے بلاد نائیہ (دور دراز) علاقوں میں اختلاف مطالع کا اعتبار کرلیا ہے اور اس کی تحدید بھی بعض نے انگریزی میل سے ۵۰۰ سو میل اور آج کل کیلومیٹر سے تقریباً ۸۰۰ کیلو میٹر سے کردی ہے (۱)، اسلئے ان مذکورہ ممالک میں آپ حضرات کا یہ طریقہ معمول صحیح ہے اور ہوسکتا ہے بشرطیکہ مستند او رشرعی ضابطہ کے مطابق اطلاع ملے بلکہ مستند و شرعی ضابطہ اطلاع کے مطابق (یعنی طرق موجبہ شرعیہ کے مطابق) اگر ۸۰۰ کیلومیٹر سے بھی زیادہ فاصلہ سے اطلاع ملے تو افطار وصوم کا حکم ظاہر روایات اور عندالجمہور مفتی بہ قول کے مطابق دے سکتے ہیں (۲)۔

۱- کمافی ردالمحتار کتاب الصوم (۳/ ۳۶۳) درمختار کی عبارت: "واختلاف المطالع غير معتبر على ظاهر المذهب" کے تحت۔

۲- جیسا کہ درمختار کی عبارت میں صراحت ہے: "غير معتبر على ظاهر المذهب وعليه أكثر المشائخ، وعليه الفتوى، بحر عن الخلاصة، فيلزم أهل المشرق برؤية أهل المغرب إذا ثبت عندهم رؤية أولئك بطريق موجب" (درمختار مع شرحہ ردالمحتار ۳/ ۳۶۳، ۳۶۴)۔

مثلاً اپنے یہاں کی ۲۹؍شعبان کو کسی خطۂ عالم سے شرعی رؤیت ہلال کمیٹی جس کے سب افراد باشرع ومعتبر ہوں ریڈیو پر یا ٹیلی ویژن پر اعلان کرے ہم فلاں شرعی رویۃ ہلال کمیٹی یا میں اس کا صدر رہوں خود اعلان کرتے ہیں یا اپنے خاص آدمی کے ذریعے سے اعلان کراتے ہیں کہ شرعی ضابطہ کے مطابق آج رؤیت ہلال ثابت ہوچکی ہے صبح روزہ رکھا جائے یا ۲۹؍رمضان کو انہی الفاظ میں اعلان کرے کہ شرعی ضابطہ سے ثبوت رؤیت حاصل کر کے اعلان کرتے ہیں صبح یکم شوال وعید منائی جائے تو اس پر بھی عمل کرلینا درست ہوگا، کیونکہ یہ اعلان شرعی ضابطہ کے مطابق اعلان ہوگا، محض خبر یا شہادت کا درجہ نہوگا، یہ اعلان اول صحابی کے اعلان کے مانند ہوگا جسکو رؤیت ہلال کا شرعی ثبوت ہو جانے کے بعد خود سرکار دو عالم ﷺ نے اعلان کرنے کا حکم فرمایا تھا کما رواہ الجماعۃ والدارمی عن ابن عباسؓ (۱) اور یہ حکم مطلق تھا کسی مسافت یا ملک کی قید سے مقید نہیں تھا۔

ریڈیو ٹیلی ویژن کا یہ اعلان مذکورہ بالا شرائط والفاظ میں اپنے یہاں کہ ۲۹؍شعبان یا ۲۹؍رمضان کو مل جائے تو مطلع صاف ہو یا نا صاف یکساں حجت بنے گا اور اس پر عمل کرنا درست ہوگا، البتہ اس کا ثبوت شرعی ضابطہ کے مطابق ہونا ضروری ہوگا مثلاً ۲۹؍شعبان کو مطلع ناصاف ہوتو ایک معتبر شخص کا ریڈیو پر ان مذکورہ بالا شرعی الفاظ خود سن کر بیان کرنا ضروری ہوگا او ۲۹؍رمضان کو جب مطلع صاف نہ ہوتو کم ازکم دو معتبر اشخاص کا ان مذکورہ بالا شرعی الفاظ کا ریڈیو پر خود سنکر بیان کرنا ضروری ہوگا اور جب مطلع صاف ہوتو کم ازکم مختلف ومتعدد معتبر اشخاص کا ان الفاظ کو خود سنکر بیان کرنا ضروری ہوگا۔

اور ریڈیو ٹیلیویژن کے علاوہ محض ٹیلیفون سے اطلاع ملے تو یہ اطلاع چونکہ اعلان کے حکم میں نہ آسکے گی بلکہ صرف خبر کے حکم میں ہوگی پس اگر شرعی خبر بنے تو معتبر ہوسکے گی ورنہ معتبر نہ ہوگی شرعی خبر کا مفہوم یہ ہے کہ جانا پہچانا معتبر آدمی ٹیلیفون پر ان الفاظ میں خبر دے کہ میں نے خود چاند دیکھا ہے اور اسکی آواز بھی خوب پہچانی جاتی ہو یا وہ شخص یہ کہے کہ مجھ سے فلاں آدمی نے اپنا چاند دیکھنا بیان کیا ہے یا کہے کہ میرے سامنے فلاں شرعی رؤیت ہلال کمیٹی نے یا فلاں قاضی نے چاند ثابت ہونے کا فیصلہ کیا ہے اور وہ شخص بھی معتبر ومعتمد ہو اور اسکی آواز بھی خوب پہچانی جاتی ہو تو ۲۹؍شعبان کو ایسے ایک ٹیلیفون کی خبر بھی معتبر ہوگی اور ۲۹؍رمضان کو کم ازکم دو مختلف جگہ کے ٹیلیفون پر ایسے معتبر اشخاص مذکورہ الفاظ میں خبر دیں اور مطلع ناصاف

۱- مشکوٰۃ المصابیح کتاب الصوم باب رؤیۃ الہلال ۴/۱۷۴ "عن ابن عباسؓ قال: جاء أعرابي إلى النبي ﷺ فقال: إني رأيت الهلال يعني هلال رمضان، فقال أتشهد أن لا إله إلا الله، قال: نعم، قال: أتشهد أن محمداً رسول الله؟ قال: نعم، قال: يا بلال أذن في الناس أن يصوموا غدا" رواہ ابوداؤد حدیث: ۲۳۴۰، ترمذی حدیث: ۶۹۱، نسائی ۴/۱۳۳، کتاب الصوم باب قبول شہادۃ الرجل الواحد علی ہلال شہر رمضان ہو ابن ماجہ؛ حدیث: ۱۶۵۲، دارمی (مرتب)۔

ہوتو قابل عمل ہوسکے گا ورنہ قابل عمل نہ ہوگا۔

اور جب مطلع صاف ہوتو چاہے ۲۹؍شعبان ہو یا ۲۹؍رمضان جب تک مختلف سمت کا مختلف ٹیلیفون ان ہی مذکورہ الفاظ وقیود میں خبر نہ دیں معتبر نہ ہوگا(۱)۔

پھر ان ٹیلفون یا ریڈیو وغیرہ کی انفرادی خبر پر عمل درآمد کرلینا چاہئے، بلکہ ہر قصبہ وآبادی میں ایک شرعی رؤیت ہلال کمیٹی یا کوئی شرعی تنظیم ہوتو اس کے فیصلہ کے مطابق عوام کو عمل کرنا لازم ہے خود رائی کرنا ہرگز جائز نہ ہوگا، اور جب شرعی رؤیت ہلال کمیٹی یا وہاں کی شرعی تنظیم مذکورہ بالا شرائط وقیود کے ساتھ فیصلہ کردے خواہ ثبوت رؤیت کا یا عدم ثبوت رؤیت کا تو اس کے خلاف کرنا درست نہ ہوگا۔

خلاصہ جواب یہ ہے کہ آپ حضرات کا عمل بھی غلط یا غیر محتاط نہیں ہے صحیح ہے محض مزید وضاحت وبصیرت کے لئے یہ تفصیلات ذکر کی گئی ہیں، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند، سہارنپور ۲۲/۸/۱۴۰۰ھ

چاند کی خبر قبول کرنے کی حد:

چاند کی خبر کتنے فاصلے سے ماننا چاہئے اور کیوں؟ تفصیل سے لکھیں تاکہ سمجھ میں آسکے۔

الجواب وباللہ التوفیق:

چاند کی خبر جب کہیں باہر سے آوے تو مقامی رویت ہلال کمیٹی یا وہاں کے عالم ومفتی کے فیصلہ واجازت کے بعد عمل کرنا چاہئے اپنی طبیعت سے اور خود رائی کرکے عمل کرلینا درست نہیں ہے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند، سہارنپور ۴/۲/۱۴۰۳ھ

۱- ہدایہ ۱/۱۹۵ کتاب الصوم میں ہے: ”وإذا كان بالسماء علة قبل الإمام شهادة الواحد العدل في رؤية الهلال رجلاً كان أو امرأة حراً كان أو عبداً لأنه أمر ديني فأشبه رواية الإخبار وهذا لا يختص بلفظ الشهادة...... وإذا لم تكن بالسماء علة لم تقبل الشهادة حتى يراه كثير يقع العلم بخبرهم...... وإذا كان بالسماء علة لم تقبل في هلال الفطر إلا شهادة رجلين أو رجل وامرأتين“ (ہدایہ ۱/۱۹۵-۱۹۶) (مرتب)۔

کان اور ناک میں دوا ڈالنے سے روزہ ٹوٹتا ہے یا نہیں؟

جدید ڈاکٹروں کی یہ تحقیق ہے کہ دماغ جو ہے بالکل بند ہے اس میں کسی قسم کا منفذ نہیں نیز یہ کہ جو دوائیں کان یا ناک کے ذریعہ پہنچائی جاتی ہیں وہ نہ بطن میں داخل ہوتی ہیں نہ دماغ میں تو کیا پھر بھی یہ ناقض صوم ہے یا نہیں؟

الجواب وبا اللہ التوفیق:

ڈاکٹروں کی یہ تحقیق عموماً انسان کے مرنے کے بعد مردہ دماغ پر ہوتی ہیں اور مرنے کے بعد حالات کا یکساں وصحیح ونمایاں باقی رہنا کچھ ضروری نہیں رہتا علاوہ ازیں ڈاکٹروں کی تحقیق کی حجت مشتبہ ہے اور فقہاء کرام کی جو تحقیق ہے وہ ملہم من اللہ ہے نیز کتاب وسنت واجماع سے مستنبط ہے جس کی حجیت یقیناً اقوی ہے اسلئے جب تک نصوص ہی سے اسکا غلط ہونا ثابت نہ ہوجائے غلط یا مرجوح نہیں کہہ سکتے فافہم، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند، سہارنپور

روزہ کا قصر حالت سفر میں:

روزہ ماہ رمضان فصل شرعی میں اپنے کسی دنیاوی یا مقدمات کے سفر میں قصر کر سکتے ہیں یا کہ نہیں اور کیا روزہ قصر شدہ بعد کو رکھنا ضروری ہے۔

الجواب وباللہ التوفیق:

سفر میں نماز قصر کرنے کا تو مطلب یہ ہے کہ چار رکعت والی نماز دو رکعت پڑھے اور روزے کے قصر کا یہ مطلب ہے کہ سفر میں اگر تکلیف ہو تو سفر میں نہ رکھے بعد میں قضاء کرلے لیکن اگر سفر میں رکھتا ہے تو افضل اور اچھا ہے دنیاوی کاروبار و مقدمہ وغیرہ کے سفر میں بھی قصر کرنے کا وہی حکم ہے کہ جائز تو ہے باقی روزہ رکھتے رہنا افضل ہے، "**لمسافر...... أوحامل...... الفطر...... ویندب لمسافر الصوم**" (۱)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند، سہارنپور
الجواب صحیح محمود عفی عنہ دارالعلوم دیوبند ۲/ ۹/ ۸۵ ۱۳ھ

۱- الدرالمختار ۳/ ۴۰۳، ۴۰۵۔

بحالت روزہ انجکشن لگوانا:

انجکشن لگوانے سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے یا نہیں تشریح فرمادیں، میرا خیال ہے کہ نس میں انجکشن لگوانے سے تو براہ راست دل ودماغ پر اثر پڑتا ہے، لیکن گوشت پر لگوانے سے بھی براہ راست اثر ہوتا ہے، اسکی مثال میرے سامنے یہ ہے کہ افیون کا انجکشن جس کو گارخیا بھی کہا جاتا ہے گوشت میں ہی لگایا جاتا ہے، لیکن اس سے دل ودماغ بالکل سن ہوجاتے ہیں اور نیند کی کیفیت طاری ہوجاتی ہے گوشت میں انجکشن لگوانے سے طاقت بھی آتی ہے۔

الجواب وبالله التوفيق:

یہ عام مروجہ انجکشن ان سے روزہ نہیں ٹوٹتا ہے اور نہ مکروہ ہوتا ہے ہاں کوئی ایسا انجکشن ایجاد ہوجائے کہ جس کے ذریعہ دوا یا غذا جوف معدہ یا جوف دماغ میں پہونچائی جانے لگے، تو اس وقت اس قسم کے سوالات پیدا ہوں گے دل ودماغ تک اثر پہونچنے سے روزہ پر کوئی اثر نہیں پڑتا ہے(۱)، جس طرح غسل کی تراوٹ عطر کی خوشبو تیل وسرمہ کے اثر سے روزہ پر کوئی اثر نہیں پڑتا ہے روزہ ٹوٹتا ہے غذا یا دوا کے جوف دماغ یا جوف معدہ میں براہ راست پہونچنے سے اور ان انجکشنوں سے دوائیں براہ راست ان اجواف میں نہیں پہنچتیں، بلکہ انکا محض اثر اور نفع پہونچے تو پہونچتا رہے یہ دوائیں صرف شریانوں اور وریدوں میں ہضم ہوکر جذب ہوجاتی ہیں ان بحثوں میں آپ نہ پڑیں اور اگر علمی تحقیق مقصود ہے تو مفتی محمد شفیع صاحب کا ایک مفصل رسالہ ہے اس کا مطالعہ فرمائیں، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند، سہارنپور
الجواب صحیح سید احمد علی سعید

روزہ میں انجکشن اور سلائین لگوانا:

اگر کوئی شخص حالت روزہ میں انجکشن لگوالے تو کیا اس کا روزہ باقی رہے گا، ایسا انجکشن جو غذا کا فائدہ دیتا ہے، نیز کیا حالتِ روزہ میں یہ استعمال کیا جاسکتا ہے؟ نیز سلائین استعمال کرنا کیسا ہے؟

۱- "ولو داوىٰ جائفة أو آمة بدواء فوصل إلى جوفه أو دماغه افطر" (ہدایہ ۱/ ۲۰۲، مطبع یوسفی لکھنو) (مرتب)۔

الجواب وبالله التوفيق:

مفسد صوم صرف وہ چیز ہوتی ہے کہ جوف معدہ میں دوا یا غذا العینہ پہنچ جائے، چاہے منفذ معتاد سے پہنچے یا منفذ غیر معتاد سے پہنچے، اور اگر دوا یا غذا العینہ جوف معدہ میں نہ پہنچے، بلکہ دوا یا غذا العینہ صرف رگوں پٹھوں تک رہ جائے اور صرف اس کا اثر ونفع جوف معدہ تک پہنچے تو بھی روزہ فاسد نہیں ہوگا، پس ان تمام انجکشنوں میں جو شرائینی ہوں، یا وریدی یا استعمال سلائینی ہو دوا یا غذا العینہ جوف معدہ میں نہیں پہنچتی، لہذا ان میں سے کوئی بھی مفسد صوم نہ ہوگا، ہاں اگر کسی تدبیر سے بعینہ دوا یا غذا جوف معدہ میں پہنچا دی جائے جیسے حقنہ یا نلکی وغیرہ کے ذریعہ سے بعینہ دوا یا غذا جوف معدہ میں پہنچا دی جائے یا پہنچا دی جاتی ہے تو ان صورتوں میں روزہ بلاشبہ ٹوٹ جاتا ہے، اور ٹوٹ جائے گا۔

اور جیسے دماغ کے زخم میں جس زخم کو آمہ یا جائفہ کہتے ہیں اس میں رقیق مرہم یا دوا لگانے سے بعینہ وہ دوا جوف معدہ میں پہنچ جاتی ہے اور روزہ ٹوٹنے کا حکم ہو جاتا ہے، **وهذا حاصل مافي كتب الفقه المعتبرة للفتاوى للأحناف عندي**، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند، سہارنپور ۲۲/۹/۱۴۰۱ھ

بحالت روزہ انجکشن لینا اور خون وگلوکوز چڑھوانا:

روزہ کی حالت میں انجکشن لگوانا کیسا ہے، میری سمجھ میں یہ بہتر ہے کہ قضا نہ کرے، بلکہ انجکشن بھی وہ لیتا رہے اور روزہ بھی رکھے، اس لیے کہ انجکشن نہ لگوانے میں مرض بڑھنے کا اندیشہ ہے، نیز گلوکوز اور خون چڑھوانے کا کیا حکم ہے؟

شفیع احمد اعظمی

الجواب وبالله التوفيق:

عام انجکشن جو رگوں یا گوشت میں لگائے جاتے ہیں ان سے روزہ فاسد نہیں ہوتا، روزہ فاسد صرف اس انجکشن سے ہوتا ہے جس کے ذریعہ غذا یا دوا بعینہ قعر معدہ میں پہونچائی جائے، جیسے پاگل کتے کے کاٹے کا انجکشن، اس لیے اگر روزہ کی حالت میں انجکشن نہ لگوانے سے مرض بڑھتا ہے تو بلا کراہت یعنی جو انجکشن محض رگوں اور گوشت میں لگائے جاتے ہیں لگوا سکتے ہیں، یہی حکم خون اور گلوکوز چڑھوانے کا ہے (۱)۔

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند، سہارنپور

۱- وہ زخم ایسے ہیں کہ جن میں دوا ڈالنے کو فقہاء نے فساد صوم کا سبب قرار دیا ہے۔

بحالت روزہ جانوروں سے وطی کی صورت میں قضا لازم ہے، نیز ایسے جانور کے دودھ وگوشت کا حکم؟

اگر کوئی شخص رمضان المبارک کے روزوں میں (العیاذ باللہ) بہیمہ سے اپنی شہوت پوری کرتا ہے تو اس جانور کے گوشت و دودھ کے استعمال میں کوئی کراہت شرعی تو نہیں ہے اور اس شخص پر روزے کی قضا و کفارہ دونوں واجب ہیں یا ایک اس کے علاوہ اور کوئی شرعی تعزیر ہو تو تحریر فرمائیں۔

احقر محمد امین کشمیری

الجواب وباللہ التوفیق:

یہ جرم شدید معصیت اور گناہ ہے اس پر توبہ واستغفار کے ساتھ ان روزوں کی قضا واجب ہے جن میں یہ قبیح وشنیع فعل سرزد ہوا (۱)، اور اس جانور کا دودھ وگوشت سب حرام ہو چکا اس جانور کو ذبح کرنا اگر قانون وقت کے خلاف نہ ہو اس کو ذبح کر کے دفن کر دیا جائے اور اگر قانون وقت کے خلاف ہو تو بلا نیت ثواب اس کو کسی کو اس طرح صدقہ کر دیا جائے کہ اس کے سامنے نہ آسکے (۲)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دار العلوم دیوبند، سہارنپور ۲۵/۱۰/۱۴۰۱ھ

ڈنمارک ونائیجیریا میں روزہ وافطار کا حکم:

الاستفتاء ما قولكم رحمكم الله في المسائل الثانية أولاً: إن الأيام في البلاد التي سكنا فيه وهي المانمارك السويد والنارويج والبلاد القريبة من القطبين تكون طويلة جدا في فصل الصيف ما

بقیہ: ۱- آمہ: سر کے اس زخم کو کہتے ہیں جو دماغ تک پہونچا ہوا ہو اور اس میں دوا ڈالنے کی وجہ سے اصل دماغ تک پہنچ جاتی ہو۔

۲- جائفہ: پیٹ کے اس زخم کو کہتے ہیں جو کہ جوف بطن تک پہونچ گیا ہو اور اس میں دوا ڈالنے کی بنا پر پیٹ میں پہونچ جاتی ہو لہٰذا ان دونوں زخموں میں دوا ڈالنے کی وجہ سے روزہ فاسد ہو جائے گا، ان کے علاوہ کسی بھی طرح کا زخم ہو اس میں دوا ڈالنا مفسد صوم نہیں ہے، ملاحظہ ہو: الهدایہ مع الدرایہ، ص ۲۲۰ کتاب الصوم آمہ: اسم لجراحة وصلت الی الدماغ۔ والجائفة: اسم لجراحة وصلت إلی الجوف (شرح العنایہ علی هامش فتح القدیر، ص ۲۶۶ ج ۲ کتاب الصوم) (مرتب)۔

۱- "وإذا جامع بهيمة أو ميتة أو جامع فيما دون الفرج ولم ينزل لايفسد صومه وإن أنزل في هذه الوجوه كان عليه القضاء دون الكفارة هكذا في فتاوى قاضي خان" (فتاوی عالمگیریہ ۱/ ۲۰۵ نیز دیکھئے فتاوی قاضیخان علی ہامش العالمگیریہ ۱/ ۲۱۷)۔

۲- "ولا يحد بوطء بهيمة بل يعزر وتذبح ثم تحرق ويكره الانتفاع بها حية وميتة" (الدر المختار مع رد المحتار ۶/ ۳۶) (مرتب)۔

حکم الصیام فی هذه البلاد۔

أرسل إلی حضرتکم نسخة من مواعید السحور والإفطار لرمضان فی الدنمراک بعض المنظمات أفتوا بجواز الإفطار بعد صوم ستة عشر ساعة علی الأکثر، وان لم تغرب الشمس وبعضهم أفتوا بامتداد الصوم حسب التوقیت فی الحجاز المقدس و بعضهم یصومون حسب توقیتهم فی بلاد هم أو فی البلاد المجاورة یمکن لهم معتذرین بأنهم لا یمکن لهم أن یصوموا هذه المدة الطویلة مع شغلهم فی المصانع لثمانی ساعات علی الأقل، وأشعرکم بأن الجو یکون بارداً جداً فی الصیف والصائم لا یحس العطش کثیراً ولذا لا یجوز قیاسها علی المناطق الحارة فإنه قیاس مع الفارق ما هو حکم الشریعة الإسلامیة فی مثل هذا الوضع؟ بینوا بالأدلة حکم الله تعالیٰ۔

ثانیا: لا یمکن رؤیة الهلال فی هذه البلاد والقمر یبقی غائباً لمدة طویلة تستمر إلی شهر أحیاناً بعض العلماء أفتوا بأن رمضان والعیدین تکون حسب التوقیت والحساب المرصادی المرتب من الحکومة وبعضهم یتبعون ویصومون حسب رؤیة المملکة العربیة السعودیة ودول الخلیج وبعضهم یتبعون رؤیة أقرب بلد إسلامی حسب الخطوط وما إلی ذلک ما هو الأصلح عندکم؟ شرحوا إرشادکم حسب الشریعة الإسلامیة الغراء۔

ثالثاً: ما هو حکم التأمین (Insurance) فی الإسلام؟ هل یجوز تأمین النفوس والبیوت والسیارات وغیرها أم لا، خصوصاً فی دیار الکفر إذ لا یجد واحد مخلصاً منها۔

رابعاً: هل یجوز استلام الربوا من البنوک فی دیار الکفر وصرفها الی الفقراء أم لا؟ بینوا بالأدلة الشرعیة، توجروا والله الموفق۔

والسلام علیکم رحمة الله و برکاته

محمد ادریس (امام المرکز الثقافی، ڈنمارک)

الجواب وبالله التوفیق:

(۱) الأول البلاد التی تقع حوالی القطبین مثل دانمراک وغیرها یکون فیها مقدار الیوم

كبيرا جدا في زمن الصيف لكن مع هذا لا يلحقهم الضرر بالعطش وغيره كما يلحقهم في المناطق الحارة لأن بلاده تكون باردة جداً كما كتبتم، فالحكم فيها للصوم أن الناس إن وجدوا وقتاً يكفي للإفطار والصلوة المغرب والعشاء مع الوتر و لا كل الطعام وأداء سنة السحور بعد غروب الشمس إلى طلوع الفجر الصادق بالطمانينة، فيجب عليهم أن يصوموا من الفجر الصادق إلى غروب الشمس يوماً كاملاً لأن النهار لا يكون ظرفاً للصوم مثل أوقات الصلوة فإنها تتادى في أي جزء من أوقاتها والصوم ليس كذلك بل النهار معيار له يعني أن الصوم يكون مستوعبا لجميع ساعات النهار فلذا لا يصح أن يكون جزء النهار خالياً عن الصوم هذا هو مطلب المعيار (۱) وأما إن كان أحد منكم مريضاً لا يستطيع الصوم أو شيخاً فانياً فيكون له أداء الفدية وإباحة الإفطار والقضاء بحسب تصريح الفقهاء كما دل عليه قوله تعالى: كلوا واشربوا حتى يتبين لكم الخيط الأبيض من الخيط الأسود من الفجر ثم أتموا الصيام إلى الليل الآية(۲)، وكما دل عليه قوله عليه الصلوة والسلام: إذا جاء الليل من ههنا وذهب النهار من ههنا زاد مسدّد وغابت الشمس فقد أفطر الصائم(ابو داؤد ۱/ ۳۲۸) (۳)۔

إذا غابت الشمس فقد أفطر الصائم يوجب أن يكون مفطرا بغروب الشمس أكل أو لم يأكل (احکام القرآن ۲/ ۲۴۲)(۴)۔ وتفسير روح البيان فلأن الله تعالى جعل الليل غاية الصوم وغاية الشئي مقطعه فيكون بعدها الإفطار ص ۲۰۹(۵) ومن لم يجد الوقت للأعمال المذكورة بعد غروب الشمس فلهم يكون الحكم الآخر فإذا تغرب الشمس هناک ۲ یولیو ۱۹۸۲ء في الساعة الثانية والعشرين ويطلع الصبح الصادق في الساعة الثالثة إلا خمس دقائق هكذا وجدت في جدولتكم المرسلة فحصل لهم حوالي خمس ساعات أو أربع ساعات إلى اختتام السحور فيما بين الغروب وطلوع الفجر الصادق ويمكن لهم أن يفطروا ويأكلوا الطعام والسحور ويؤدوا صلوة المغرب

۱- "والصوم يقوم به ويطول بطوله ويقصر بقصره لأنه معياره" (البحر الرائق ۱/ ۵۳۳)۔
۲- سورۂ بقرہ: ۱۸۷۔
۳- سنن ابو داؤد ۲/ ۳۰۴، کتاب الصوم باب وقت فطر الصائم حدیث ۲۳۵۱ عن عاصم بن عمر عن ابیہ۔
۴- احکام القرآن للجصاص تحقیق محمد صادق قمحاوی ۱/ ۳۰۱۔
۵- تفسیر روح البیان مطبعہ عثمانیہ استنبول ۱۹۲۸ء/ ۳۰۰ (تفسیر سورہ بقرہ: ۱۸۷)۔

والعشاء مع الوتر وغيرها في أثناء ذلک الوقت بالطمانينة فلذا لا يجوز أن يكون جزء النهار خاليا عن الصوم فالفتاوى الأربعة التي تشتمل على إذن الإفطار في أيّ جزء من النهار لا يصح واحد منها۔

وإذا تغرب الشمس بعد أربع وعشرين ساعة أو قبلها والناس لا يجدون وقتا يكفي لأداء الصلوة المذكورة وغيرها ففيها تفصيل۔

(۲) الثاني – بعد ثبوت الرؤية شرعياً أصلح لهم عندي اتباع قول الثالث أي اتباع أقرب بلد إسلامي حسب الخطوط۔

۳۔ الثالث – التامين في الاسلام حرام لاجتماع المنهيات خاصة الربوا والقمار كما قال الله تعالى"احل الله البيع وحرم الربوا "(۱) وقوله تعالىٰ: يا أيها الذين آمنوا إنما الخمر والميسر والأنصاب والأزلام رجس من عمل الشيطان فاجتنبوه لعلكم تفلحون "(۲)۔

وغيرهما كثير من الآيات التي تدل على حرمتها فالواجب الاحتراز عنها على كل مسلم مهما أمكن وإذا لم يجدوا مخلصا منها لديار الكفر (يجوز)(۳) للمضطر شرعيا بالشرائط۔

الرابع إن حكم مال الغير إذا أخذ بغير إجازة شرعية غصبا كان أو ربأ أو نهبة أو غيرها يجب على الآخذ الرد على صاحبه كما قال النبي ﷺ: لا يحل لأحد أن يأخذ متاع أحد لاعبا ولا جاداً، فإن أخذه فليرده (۴) في تحت قوله: على الغاصب رد العين المغصوبة (۳۵/۳ وفي الشامي ۸۰/۴-۸۱)(۵)۔

الحاصل أنه إن علم أرباب الأموال وجب رده عليهم وإلا فإن علم عين الحرام لا يحل له ويتصدق به بنية صاحبه ومفاد الحرمة وإن لم يعلم أربابه لا يحل له فيه ما لم يود بدله، فاذا أخذ الزائد

۱- سورۂ بقرہ:۲۷۵۔

۲- سورۂ مائدہ:۹۰۔

۳- مابین القوسین بتقاضائے سیاق کی طرف سے اضافہ ہے۔

۴- سنن الترمذی ۴/ ۴۶۲ کتاب الفتن باب ما جاء لا یحل لمسلم أن یروع مسلم حدیث ۲۱۶۰ میں حدیث ان الفاظ میں وارد ہے: "لا يأخذ أحدكم عصا أخيه لاعباً أو جاداً فمن أخذ عصا أخيه فليردها إليه")۔

۵- دیکھئے: ردالمحتار علی الدر المختار ۹/ ۲۶۶۔

من التامین او الربوا یجب رده علی اصحابه وان کان علی الآخذ من الضریبة ما لا یجوز فی دیار الکفر رخص له دفع الضریبة إلی الدولة والا صرفها الی الفقراء بنیة دفع الوبال من الحرام ان اردتم المزید أن تطلعو علیه فعلیکم أن تراجعوا إلی الکتب الآتیة مثلاً نظام الفتاوی الجلد الأول للعبد وامداد الفتاوی لسماحة الشیخ التهانوی وجواهر الفقه لسماحة الشیخ مفتی محمد شفیع وفتاوی عزیزیة للشیخ عبدالعزیز المحدث الدهلوی رحمهم الله أجمعین کاملة"۔فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند،سہارنپور ۱۴۰۲/۹/۲۲ھ

روزہ میں چیچک کے ٹیکے لگوانا:

پاکستان سے آئی ہوئی ایک محترمہ کو واپسی کے وقت حکم ہوا کہ چیچک کے ٹیکے اور ہیضہ کے انجکشن لگوا کر سارٹیفکٹ درخواست کے ساتھ داخل کرو۔اب سوال یہ ہے کہ موصوفہ اگر روزہ کی حالت میں ٹیکے لگوائے تو روزہ تو نہیں جائے گا۔

الجواب وباللہ التوفیق:

ان انجکشنوں اور ٹیکوں سے روزہ میں کوئی خرابی نہیں آتی ہے،فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند،سہارنپور

الجواب صحیح سید احمد علی سعید نائب مفتی دارالعلوم دیوبند ۱۳۸۵/۹/۲۳ھ

بحالت روزہ بارہ بجے تک جنبی رہنا:

زید نے دوران ایام رمضان اپنی شرعی اہلیہ سے ہمبستری کی اور سحر بغیر غسل پاکی کے کھائی اور روزہ کی نیت کرکے سو گیا،پھر صبح نو ۹ بجے کے بعد بارہ بجے سے قبل غسل پاکی کرلیا کیا اس صورت میں اسکا روزہ ہوگیا یا کہ نہیں۔

الجواب وباللہ التوفیق:

صورت مذکورہ میں روزہ ہوگیا (۱) ضرورت کے بعد جہاں تک جلد ہو سکے غسل پاکی کرلینا چاہئے بلا عذر شرعی تاخیر

۱- "احل لکم لیلة الصیام الرفث الی نسائکم" سورة البقرة ۱۸۷، وکذا لایفطر لو جامع عامدا قبل الفجر ونزع فی الحال عند طلوعه" (الرد المحتار علی الدر ۳/ ۳۶۹، مکتبۂ زکریا)(مرتب)۔

وسستی کرنا مکروہ ہے اور نماز کسی حال قضاء نہ کرنی چاہئے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند، سہارنپور

الجواب صحیح محمود غفی عنہ مفتی دارالعلوم دیوبند ۲/۱۱/ ۸۵ ۱۳ ھ

بحالت روزہ منجن کا استعمال:

رمضان المبارک میں منجن کا استعمال کرنا کیسا ہے۔

الجواب وباللہ التوفیق:

دن میں منجن استعمال کرنا مکروہ ہے (۱)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند، سہارنپور ۲۳/۸/۱۴۰۱ھ

نفل روزہ میں کب افطار کیا جائے:

ہمارے یہاں پرانے جاننے والے حضرات بتاتے ہیں کہ نفل روزہ مغرب کی فرض نماز کے بعد کھولیں اب اختلاف یہاں پیدا ہو گیا ہے کہ رمضان کا فرض روزہ تو مغرب کی اذان کے وقت کھولتے ہیں اور نفل روزہ مغرب کی فرض نماز کے بعد اس کھولنے کا ثبوت ان کے پاس نہیں ہے۔

الجواب وباللہ التوفیق:

آفتاب غروب ہونے کا یقین ہونے کے بعد فوراً روزہ کھولنا مستحب ہے (۲)، البتہ روزہ کھولنے کی وجہ سے فرض کو حد سے زیادہ مؤخر کرنا صحیح نہیں ہے۔ بلکہ افطار کر کے فرض مغرب اپنے وقت سے ادا کرے پھر آ کر پیٹ بھر کھانا کھائے یہ بہتر طریقہ ہے اور پھر افطار کرے تو ایک گھونٹ پانی سے بھی ہوسکتا ہے پہلے افطار پھر نماز مغرب ادا کرے اس کے بعد کھائے پیئے

۱- "وكره له ذوق شئ وكذا مضغه بلا عذر..... وكره مضغ علك" (درمختار ۳/ ۳۹۵)، علامہ شامی اس کے تحت لکھتے ہیں: "قلت ولأن العادة مضغه خصوصاً للنساء؛ لأنه سواكهن كما يأتي فكان مظنة عدم الكراهة في الصيام لتوهم أن ذلك عذر" (ردالمحتار علی الدرالمختار ۳/۳۹۶)۔

۲- "قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: لايزال الناس بخير ماعجلوا الفطر" (متفق علیہ ریاض الصالحین ص۴۲۲)۔ "وقال عليه السلام اذا أقبل الليل من ههنا وأدبر النهار وغربت الشمس فقد أفطر الصائم" (متفق علیہ حوالہ مذکورہ) (مرتب)۔

غرض جس نے کہا کہ نفل روزہ مغرب پڑھنے کے بعد کھولنا چاہئے غلط کہا ہے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند، سہارنپور

الجواب صحیح سید احمد علی سعید نائب مفتی دارالعلوم دیوبند

لمبے دنوں میں روزہ وعید کا حکم:

الاستفتاء ما قولكم رحمكم الله في المسائل الثانية أولاً: إن الأيام في البلاد التي سكنا فيه وهي الدانمارك السويد والنارويج والبلاد القريبة من القطبين تكون طويلة جدا في فصل الصيف ما حكم الصيام في هذه البلاد۔

أرسل إلى حضرتكم نسخة من مواعيد السحور والإفطار لرمضان في الدنمراك بعض المنظمات أفتوا بجواز الإفطار بعد صوم ستة عشر ساعة على الأكثر وإن لم تغرب الشمس وبعضهم أفتوا بامتداد الصوم حسب التوقيت في الحجاز المقدس و بعضهم يصومون حسب توقيتهم في بلاد هم أو في البلاد المجاورة يمكن لهم معتذرين بأنهم لا يمكن لهم أن يصوموا هذه المدة الطويلة مع شغلهم في المصانع لثماني ساعات على الأقل، وأشعركم بأن الجو يكون بارداً جداً في الصيف والصائم لا يحس العطش كثيراً ولهذا لا يجوز قياسها على المناطق الحارة فإنه قياس مع الفارق ما هو حكم الشريعة الإسلامية في مثل هذا الوضع؟ بينوا بالأدلة حكم الله تعالىٰ۔

ثانيا: لا يمكن رؤية الهلال في هذه البلاد والقمر يبقى غائباً لمدة طويلة تستمر إلى شهر أحياناً بعض العلماء أفتوا بأن رمضان والعيدين تكون حسب التوقيت والحساب المرصادي المرتب من الحكومة وبعضهم يتبعون ويصومون حسب رؤية المملكة العربية السعودية ودول الخليج وبعضهم يتبعون رؤية أقرب بلد إسلامي حسب الخطوط وما إلى ذلك ما هو الأصلح عندكم؟ شرحوا إرشادكم حسب الشريعة الإسلامية الغراء۔

اخوکم محمد ادریس (امام المرکز الثقافی، ڈنمارک)

الجواب وبالله التوفيق:

(۱) الأول البلاد التي تقع حوالي القطبين مثل دانمراک وغيرها يكون فيها مقدار اليوم كبيرا جدا في زمن الصيف لكن مع هذا لا يلحقهم الضرر بالعطش وغيره كما يلحقهم في المناطق الحارة لأن بلاده تكون باردة جداً كما كتبتم فالحكم فيها للصوم أن الناس إن وجدوا وقتاً يكفي للإفطار والصلوة المغرب والعشاء مع الوتر و لا كل الطعام وأداء سنة السحور بعد غروب الشمس إلى طلوع الفجر الصادق بالطمانينة فيجب عليهم أن يصوموا من الفجر الصادق إلى غروب الشمس يوماً كاملاً لأن النهار لا يكون ظرفاً للصوم مثل أوقات الصلوة فإنها تتأدى في أي جزء من أوقاتها والصوم ليس كذلک بل النهار معيار له يعني أن الصوم يكون مستوعبا لجميع ساعات النهار فلذا لا يصح أن يكون جزء النهار خالياً عن الصوم هذا هو مطلب المعيار (۱) وأما إن كان أحد منكم مريضاً لا يستطيع الصوم أو شيخاً فانياً فيكون له أداء الفدية وإباحة الإفطار والقضاء بحسب تصريح الفقهاء كما دل عليه قوله تعالى: كلوا واشربوا حتى يتبين لكم الخيط الأبيض من الخيط الأسود من الفجر ثم أتموا الصيام إلى الليل الآية (۲)، وكما دل عليه قوله عليه الصلوة والسلام: إذا جاء الليل من ههنا وذهب النهار من ههنا زاد مسدّد وغابت الشمس فقد أفطر الصائم (ابوداؤد ۱/۳۲۸)(۳)۔

إذا غابت الشمس فقد أفطر الصائم يوجب أن يكون مفطرا بغروب الشمس أكل أو لم يأكل (احکام القرآن ۲/۲۴۲) (۴)۔ وتفسير روح البيان فلأن الله تعالى جعل الليل غاية الصوم وغاية الشئي مقطعه فيكون بعدها الإفطار ص ۲۰۹ (۵) ومن لم يجد الوقت للأعمال المذكورة بعد غروب الشمس فلهم يكون الحكم الآخر فإذا تغرب الشمس هناک ۲ يوليو ۱۹۸۲ء في الساعة الثانية والعشرين ويطلع الصبح الصادق في الساعة الثالثة إلا خمس دقائق هكذا وجدت في جدولتكم

۱- ”والصوم يقوم به ويطول بطوله ويقصر بقصره لأنه معياره“ (البحرالرائق ۱/ ۵۳۳) (مرتب)۔

۲- سورۂ بقرہ: ۱۸۷۔

۳- سنن ابوداؤد ۲/ ۳۰۴، کتاب الصوم باب وقت فطر الصائم حدیث ۲۳۵۱ عن عاصم بن عمر عن ابیہ۔

۴- احکام القرآن للجصاص تحقیق محمد صادق قمحاوی ۱/ ۳۰۱۔

۵- تفسیر روح البیان مطبعہ عثمانیہ استنبول ۱۹۲۸ء/ ۳۰۰ (تفسیر سورہ بقرہ: ۱۸۷)۔

المرسلة فحصل لهم حوالى خمس ساعات أو أربع ساعات إلى اختتام السحور فيما بين الغروب وطلوع الفجر الصادق ويمكن لهم أن يفطروا ويأكلوا الطعام والسحور ويؤدوا صلوة المغرب والعشاء مع الوتر وغيرها في أثناء ذلک الوقت بالطمانينة فلذا لا يجوز أن يكون جزء النهار خاليا عن الصوم فالفتاوى الأربعة التي تشتمل على إذن الإفطار في أيّ جزء من النهار لا يصح واحد منها۔

وإذا تغرب الشمس بعد أربع وعشرين ساعة أو قبلها والناس لا يجدون وقتا يكفي لأداء الصلوة المذكورة وغيرها ففيها تفصيل، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۴۰۲/۹/۲۲ھ

منتخبات نظام الفتاوی

حضرت مفتی محمد نظام الدین اعظمیؒ

(جلد دوم)

ایفا پبلیکیشنز، نئی دھلی

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ

نام کتاب : منتخبات نظام الفتاوی (جلد دوم)

صفحات : ۴۹۶

قیمت : ۴۷۰/روپے

طبع اول : مارچ ۲۰۱۳ء

ناشر

ایفا پبلیکیشنز، نئی دہلی

۱۶۱ - ایف بیسمنٹ، جوگابائی، پوسٹ باکس نمبر: ۹۷۰۸

جامعہ نگر، نئی دہلی-۱۱۰۰۲۵

ای میل:ifapublication@gmail.com

فون:011 - 26981327

بسم الله الرحمن الرحيم

اجمالی فہرست

۱	**کتاب الحج**	۲۳
۲	باب الحج عن الغیر	۵۷
۳	**کتاب النکاح**	۶۵
۴	باب المحرمات	۱۱۵
۵	باب حرمۃ المصاہرۃ	۱۲۳
۶	باب الرضاعۃ	۱۲۷
۷	باب المہر والجہاز	۱۳۵
۸	باب الاولیاء	۱۳۳
۹	باب المعاشرۃ بالمعروف	۱۵۹
۱۰	**کتاب الطلاق**	۱۶۱
۱۱	باب تعلیق الطلاق	۲۳۷
۱۲	باب الخلع	۲۴۵
۱۳	باب اللعان	۲۴۹
۱۴	باب ثبوت النسب والنفقۃ	۲۵۱
۱۵	**کتاب الوقف**	۲۶۱
۱۶	باب ما یتعلق باحکام المساجد	۲۸۷
۱۷	باب ما یتعلق باحکام المدارس	۳۴۹

۱۸	باب ما يتعلق بأحكام المقابر	۳۷۵
۱۹	**كتاب الأيمان والنذور**	۳۹۵
۲۰	باب الحدود	۴۰۱
۲۱	**كتاب المعاملات**	۴۰۵

فہرست

نمبر	عنوان	صفحہ
	کتاب الحج	۲۵
۱	ہوائی جہاز میں سفر کرنے والا احرام کہاں سے باندھے؟	۲۵
۲	سمندری جہاز سے حج کے لئے جانے پر احرام کہاں سے باندھے؟	۲۵
۳	اگر کوئی شخص آفاق میں چلتا ہوا جدہ پہنچ جائے تو احرام کہاں سے باندھے؟	۲۷
۴	عورت بغیر محرم حج کرے گی تو حج بکراہت تحریمی ہوگا	۳۴
۵	حقیقی خالہ کو حج میں ساتھ لے جانا	۳۵
۶	سردی کی وجہ سے سر میں کپڑا لپیٹنا	۳۵
۷	حجر اسود اور اس کی اہمیت	۳۶
۸	حجر اسود کے استیلام کے وقت پیر نہ موڑنا	۳۷
۹	عمرہ کرنے سے حج فرض نہیں ہوگا	۳۷
۱۰	اگر ہوائی جہاز کے ذریعہ بغیر احرام باندھے جدہ پہنچے تو دم دینا ہوگا	۳۸
۱۱	بحالت احرام اگر خود بخود بال ٹوٹ جائے تو کیا حکم ہے؟	۳۹
۱۲	بیماری کی وجہ سے رمی میں نیابت	۳۹
۱۳	کفارہ یا دم کہاں دینا ضروری ہے؟	۴۰
۱۴	دم جنایت کی ادائیگی حدود حرم میں ضروری ہے	۴۱
۱۵	حج کی قربانی کہاں کی جائے؟	۴۲
۱۶	منیٰ کی قربانیوں کا گوشت اور چمڑہ قابل استعمال بنانے کی اسکیم	۴۳
۱۷	بدرجۂ مجبوری خواتین کے لئے بحالت حیض طواف زیارت کا حکم	۴۵
۱۸	کیا بحالت مجبوری رمی قربانی اور حلق کے درمیان کی ترتیب ساقط ہو جائے گی؟	۴۶
۱۹	عمرہ میں بال قصر کرانے کی مقدار (سر کے ایک طرف کا بال کاٹنا درست نہیں)	۵۰
۲۰	اگر کوئی شخص ارکان حج کی ادائیگی کے بعد حلق وقصر نہ کراتا ہو؟	۵۳

۴۱	بحالت احرام بنیان یا سلی ہوئی چادر پہننے کا حکم	۵۴
۴۲	ارکان چھوٹنے یا ترتیب میں تقدیم وتاخیر کا حکم	۵۴
۴۳	بحالت احرام خون نکلنے سے کیا دم واجب ہوگا؟	۵۵
۴۴	قران کے حج کا احرام باندھنے کے لئے عمرہ کرنا	۵۵
۴۵	عمرہ کے احرام کی چادر کا کفن میں استعمال	۵۵
	باب الحج عن الغیر	۵۷
۱	حج بدل کے لئے آمر کے نفقہ اور اس کے وطن سے جانا ضروری ہے؟	۵۵
۲	حج بدل کرنے والا آمر کی اجازت کے بغیر تمتع کرسکتا ہے یا نہیں؟	۵۹
۳	حج بدل میں کس کی طرف سے حج کی نیت کرے؟	۶۱
۴	حج بدل کرنے والا قارن جنایت کس طرح ادا کرے؟	۶۱
۵	حج بدل کرنے والا کس حج کا احرام باندھے؟	۶۲
۶	حج بدل کرنے والا احرام کہاں سے باندھے؟	۶۲
۷	جس نے حج نہیں کیا اس کا حج بدل کرنا	۶۴
۸	سعودی سے حج بدل کرنا	۶۴
	کتاب النکاح	۶۵
۱	آپ ﷺ سے پہلے نکاح کا طریقہ	۶۷
۲	ایجاب وقبول کی ایک خاص صورت	۶۷
۳	صرف بیوی کے بیان پر تفریق کا حکم	۶۷
۴	دوسری شادی سے قانونا روکنے کا کیا مقصد ہے؟	۶۸
۵	شوہر کے ظلم سے بچنے کی کیا صورت ہے؟	۷۲
۶	نکاح سے قبل لڑکا لڑکی کے لئے ایک دوسرے کو دیکھنا	۷۵
۷	نصرانی اور یہودی لڑکیوں سے نکاح کرنا اور اس کا نکاح پڑھانا	۷۶
۸	اہل کتاب عورتوں سے نکاح	۷۷
۹	دینی معاملات میں بیوی کی تنبیہ کا حکم	۷۷
۱۰	ماباللہ ولاد کو مارنے کا حکم	۷۷
۱۱	متعہ کا حکم شرعی	۷۷

۱۲	پہلی بیوی کی اجازت کے بغیر دوسری شادی کرنے سے دوسری بیوی مستحق وراثت ہوگی یا نہیں؟	۷۷
۱۳	شادی کے موقع پر عورت کا گیت گانا یا نظم پڑھنا	۸۰
۱۴	قرآن کریم کی تلاوت سے روکنے والے اور اس کی بے حرمتی کرنے والے شوہر کے ساتھ بیوی کا سلوک	۸۲
۱۵	مباشرت سے قبل ولیمہ	۸۳
۱۶	شادی وبارات میں شرکت کا شرعی حکم	۸۴
۱۷	لازمی رجسٹریشن نکاح کا شرعی حکم	۸۵
۱۸	نا قابل مجامعت لڑکی سے نکاح کا حکم	۸۷
۱۹	بلا اجازت نکاح ہوا اور لڑکی رخصت ہوکر سسرال چلی گئی تو کیا نکاح ہوگیا؟	۸۸
۲۰	لڑکا اور لڑکی کے بالغ ہونے کی عمر کیا ہے؟	۹۰
۲۱	بالغہ ہونے کے بعد نکاح کے لئے ولی کی اجازت ضروری نہیں ہے	۹۰
۲۲	لڑکے نے کہا میں نے تم سے نکاح کرلیا لڑکی نے کہا مجھے منظور ہے تو کیا نکاح ہوگیا؟	۹۱
۲۳	نکاح صحیح ہونے کے لئے سرکاری کاغذات میں اندراج ضروری نہیں ہے	۹۱
۲۴	بیوی کا یہ کہنا کہ مسئلہ ملاؤں کا ڈھونگ ہے سے نکاح پر کوئی اثر نہیں پڑے گا	۹۲
۲۵	بالغہ کی اجازت کے بغیر نکاح	۹۲
۲۶	زانیہ کو نکاح میں رکھ سکتا ہے یا نہیں؟	۹۳
۲۷	عمر دراز عورت سے نکاح	۹۳
۲۸	خلوت صحیحہ سے پہلے طلاق دے کر پھر آٹھ روز کے اندر نکاح کرلیا صحیح ہوا یا نہیں؟	۹۴
۲۹	کسی کو محض بیٹی کہنے سے حقیقۃً وہ بیٹی نہ ہوگی اور نکاح اس سے درست ہوگا	۹۵
۳۰	حاملہ بالزنا سے نکاح اور اس کے پڑھانے والے کا حکم	۹۶
۳۱	حاملہ بالزنا سے نکاح اور بچہ کے نسب سے متعلق	۹۶
۳۲	جس لڑکی نے کسی غیر مسلم لڑکے سے شادی کرلی ہو اس سے تعلق رکھنا	۹۹
۳۳	بیوہ ممانی سے نکاح کرنا	۱۰۰
۳۴	مسلم لڑکی نے غیر مسلم لڑکے سے نکاح کیا تو نکاح اور اولاد کا حکم	۱۰۰
۳۵	بیوی کے لڑکے کا نکاح اپنی لڑکی سے	۱۰۱
۳۶	مطلقہ بائنہ سے نکاح	۱۰۱
۳۷	مرحوم بھائی کی بیوہ سے نکاح	۱۰۲
۳۸	دو سگے بھائی کا دو سگی بہنوں سے نکاح	۱۰۲
۳۹	مزنیہ کی بہن سے نکاح	۱۰۲

۴۰	عیسائی مجسٹریٹ کے کرائے ہوئے نکاح کی شرعی حیثیت	۱۰۳
۴۱	بیوی کے مرنے کے فوراً بعد دوسرا نکاح کرنا	۱۰۵
۴۲	معتدۃ الطہر مطلقہ کے نکاح ثانی کے لئے جواز کی ایک صورت	۱۰۶
۴۳	شوہر کے مرتد ہونے سے نکاح فسخ ہوگیا	۱۰۷
۴۴	مطلقہ عورت سے نکاح	۱۰۸
۴۵	منکوحۃ الغیر سے نکاح	۱۱۰
۴۶	دوسرے کی بیوی سے نکاح	۱۱۱
۴۷	زوجہ غائب کی عورت کا نکاح دوسری جگہ کب صحیح ہوگا؟	۱۱۱
۴۸	بالغہ کا اپنی مرضی سے کئے ہوئے نکاح نیز طلاق نامہ پر جبراً نشان انگوٹھا لینے کا حکم	۱۱۲
	باب المحرمات	۱۱۵
۱	بیوی کے کم عقل ہونے کی وجہ سے سالی سے نکاح جائز ہے یا نہیں	۱۱۵
۲	بیوی اور اس کی ماں کو رکھنا	۱۱۶
۳	بیوی کو طلاق دینے یا اس کے انتقال کر جانے کے بعد اس کی بہن سے نکاح	۱۱۶
۴	دوسرے کی مطلقہ سے بغیر عدت گذارے نکاح	۱۱۷
۵	شوہر کے انتقال کے بعد بیوہ کا تین ماہ کے بعد نکاح کردینا	۱۱۸
۶	سوتیلی خالہ سے نکاح	۱۱۸
۷	شوہر کو مردہ بتلا کر نکاح کرلینا	۱۱۹
۸	مفقود الخبر کی بیوی سے نکاح	۱۲۰
۹	ساس سے نکاح	۱۲۱
	باب حرمة الصاهرة	۱۲۳
۱	حرمت مصاہرت کی ایک صورت	۱۲۳
۲	شہوت کے ساتھ دو چار سال کی بچی کو چھونے سے حرمت مصاہرت ثابت نہیں ہوتی	۱۲۴
۳	بہو کا خسر پر زنا کی تہمت لگانے سے حرمت مصاہرت ثابت ہوتی ہے یا نہیں؟	۱۲۵
۴	مزنیہ کی لڑکی سے نکاح	۱۲۶
	باب الرضاعة	۱۲۷

۱	رضاعی بہن سے نکاح کرنے سے متعلق حکم شرعی	۱۲۷
۲	ثبوت رضاعت کے لئے تنہا عورتوں کی شہادت	۱۲۸
۳	عورت کی شہادت پر حرمت رضاعت کا شرعی حکم	۱۲۹
۴	بیوی کا دودھ پیا	۱۳۰
۵	بیوی کا دودھ پینے سے حرمت رضاعت ثابت نہیں ہوتی ہے	۱۳۰
۶	دودھ میں دوا ملا کر پلانے سے رضاعت کا حکم	۱۳۱
۷	رضاعت سے متعلق	۱۳۲

	باب الأولیاء والأکفاء	۱۳۳
۱	والد کے ماموں کے لئے نابالغہ کا نکاح کرنا	۱۳۳
۲	والد نے نابالغہ کا نکاح کردیا تو بعد بلوغ اس کو خیار بلوغ نہیں ملے گا	۱۳۴
۳	والد کے لئے نابالغہ لڑکی کا جبراً نکاح کرنا	۱۳۴
۴	نابالغہ لڑکی کا نکاح اس کے والد کی اجازت کے بغیر کرنا	۱۳۵
۵	(عدم کفو کی بنیاد پر فسخ نکاح) کفو کی تعریف	۱۳۷
۶	عربی النسل وغیر عربی النسل میں کفو کا مسئلہ	۱۳۷
۷	لڑکی نے غیر کفو میں نکاح کرلیا تو کیا حکم ہے؟	۱۳۹
۸	لڑکی کا ولی کی اجازت کے بغیر غیر کفو میں نکاح کرنا	۱۴۳
۹	راجپوت، شیخ صدیقی کا کفو نہیں	۱۴۴

	باب المہر والجہاز	۱۴۵
۱	ادائگی مہر میں کس وقت کے سکہ کا اعتبار ہوگا؟	۱۴۵
۲	مہر کی ادائگی میں کس سکہ کا اعتبار ہوگا؟	۱۴۷
۳	مہر میں اشرفی طے کرنا	۱۴۹
۴	زوجین کے درمیان مہر میں اختلاف ہو تو مہر کتنا واجب ہوگا، نیز مہر شرعی کی تحقیق	۱۵۰
۵	جنابت کا غسل نہ کرنے کی وجہ سے کیا عورت مرد پر حرام ہوجاتی ہے اور اس کا مہر مرد پر واجب ہوتا ہے	۱۵۱
۶	ناشزہ عورت اور اس کے مہر وغیرہ کا حکم	۱۵۲
۷	وسعت سے زائد مہر مقرر کردینا	۱۵۳
۸	شوہر کے مرنے کے بعد بیوی کے مہر کا حکم	۱۵۳

۹	مہر سے متعلق مختلف قسم کے سوالات	۱۵۴
۱۰	جہیز کا شرعی حکم	۱۵۶
۱۱	شریعت یا جہالت میں بیان کردہ احادیث سے استدلال	۱۵۶
۱۲	لڑکی والوں سے شادی میں کچھ لینا جائز نہیں	۱۵۶
۱۳	سامان جہیز کے ضیاع کے بعد مطالبہ	۱۵۷
	باب المعاشرہ بالمعروف	۱۵۹
۱	پاکی و ناپاکی کا خیال نہ رکھنے والی بیوی کے ساتھ برتاؤ	۱۵۹
۲	نافرمان بیوی کی اصلاح کا طریقہ	۱۶۰
	کتاب الطلاق	۱۶۱
۳	طلاق دینے کا حق صرف مرد کو ہے عورت کو نہیں	۱۶۳
۴	محض دل میں طلاق دینے سے طلاق واقع نہیں ہوتی	۱۶۴
۵	بیوی کے سامنے طلاق لکھ کر دینے سے طلاق نہیں پڑتی	۱۶۴
۶	طلاق دے دوں کہنے سے طلاق نہیں پڑتی	۱۶۶
۷	ایک مجلس کی تین طلاق کے سلسلہ میں احمد آباد اسلامک ریسرچ سنٹر کی جانب سے منعقد سیمینار کے فیصلہ پر محاکمہ	۱۶۷
۸	ایک مجلس کی تین طلاق	۱۸۴
۹	گواہوں کے سامنے تین طلاق دی تو کیا حکم ہے؟	۱۸۵
۱۰	تین طلاق دینے والے پر مالی جرمانہ اور اس کی تعزیر کا حکم	۱۸۶
۱۱	طلاق دینے پر مالی جرمانہ لینا	۱۹۱
۱۲	طلاق کے بعد دوسری شادی	۱۹۲
۱۳	طلاق مکرہ کا حکم	۱۹۳
۱۴	بیوی سے صرف ایک، دو، تین کہنا	۱۹۴
۱۵	میری طرف سے طلاق ہے اور نا زندگی حرام ہے سے کتنی طلاق پڑی	۱۹۵
۱۶	شوہر طلاق کا منکر ہو اور گواہ طلاق کی گواہی دیں	۱۹۶
۱۷	شادی نامنظور ہے طلاق دے دیا کہنے سے طلاق	۱۹۷
۱۸	مطالبہ طلاق پر دے دی، دے دی، دے دی کہنا	۱۹۹
۱۹	پنچایت کا فسخ نکاح معتبر ہے یا نہیں؟	۱۹۹

۲۰	عدالت کی تفریق کا حکم	۲۰۰
۲۱	طلاق نامہ پر صرف دستخط کرنے سے طلاق پڑی یا نہیں؟	۲۰۱
۲۲	نان ونفقہ اور حق زوجیت ادا نہ کرنے کی وجہ سے نکاح فسخ کرنا	۲۰۲
۲۳	والد کے اصرار پر طلاق نامہ پر دستخط کرنے سے طلاق کا حکم	۲۰۳
۲۴	بیوی کا میکہ میں رہنا طلاق کی دلیل نہیں	۲۰۴
۲۵	بحالت حمل تین طلاق کا حکم	۲۰۵
۲۶	طلاق کے بعد عدت واجب ہے	۲۰۶
۲۷	والدین کا طلاق دینے پر اصرار	۲۰۷
۲۸	بیوی کے لئے شوہر سے طلاق کا مطالبہ کرنا	۲۰۸
۲۹	زبردستی طلاق نامہ پر دستخط کرانے سے طلاق پڑتی ہے یا نہیں؟	۲۰۹
۳۰	کیا حالت حیض میں وطی کرنے سے عورت پر طلاق واقع ہو جاتی ہے؟	۲۱۰
۳۱	نابالغ کی طلاق کا حکم	۲۱۲
۳۲	تم کو طلاق دیے، چھوڑ دیے، چھوڑ دیے کہنے سے کتنی طلاق پڑی؟	۲۱۳
۳۳	بذریعہ تحریر وقوع طلاق کے لئے کیا گواہ کا ہونا ضروری ہے؟	۲۱۴
۳۴	ناجائز تعلق کے شبہ کی وجہ سے طلاق دینے اور بچہ کے نسب و پرورش سے متعلق	۲۱۴
۳۵	بحالت غصہ طلاق چند بار کہنے کا حکم	۲۱۶
۳۶	شوہر کا ''تجھ کو طلاق دیا'' تین بار کہنا	۲۱۷
۳۷	دو مرتبہ طلاق دینے کے بعد منہ بند کر دینے سے کتنی طلاق پڑی؟	۲۱۸
۳۸	بیوی نے طلاق نامہ نہیں لیا جب بھی طلاق پڑ گئی	۲۱۹
۳۹	طلاق نامہ وصول نہ کرنے یا واپس آ جانے کے باوجود طلاق پڑ جاتی ہے	۲۲۰
۴۰	شوہر کا طلاق دے چکا ہوں لکھنا	۲۲۱
۴۱	دوسرے سے طلاق لکھوانے سے بھی طلاق پڑ جاتی ہے	۲۲۱
۴۲	طلاق نامہ پر جبراً انگوٹھا نشان لینے سے طلاق نہیں پڑتی	۲۲۲
۴۳	ختم کیا چند بار کہنے سے طلاق پڑی یا نہیں؟	۲۲۳
۴۴	تو آزاد ہے آزاد ہے تجھے طلاق ہے تجھے طلاق کہنے کا حکم	۲۲۴
۴۵	شوہر کا کہنا ''فارغ خطی لے جاؤ'' اس سے طلاق کا حکم	۲۲۵
۴۶	میں تم کو رکھوں تو ماں کو رکھوں یا بیٹی کو رکھوں کہنے سے طلاق نہیں پڑی	۲۲۶
۴۷	صحت حلالہ کے لئے شوہر ثانی کا وطی کرنا ضروری ہے	۲۲۷

۴۸	شوہر کا جہاں تمہاری مرضی ہو اپنی لڑکی کا نکاح کردو کہنا	۴۲۸
۴۹	حلالہ کا طریقہ	۴۲۹
۵۰	ایک دو تین کہتے ہیں، جواب دے دیا سے کون سی طلاق پڑی؟	۴۲۹
۵۱	شوہر کا کہنا ہے آزاد کردوں گا، کہا، گواہان آزاد کردیا بیان کرتے ہیں، تو کیا حکم ہے؟	۴۳۰
۵۲	شوہر کا زن وشوئی کے تعلقات نہ رکھنا کہنا	۴۳۱
۵۳	زوجین میں نا اتفاقی کیوجہ سے طلاق نہیں پڑی	۴۳۲
۵۴	عدالت سے خودمختاری حاصل کرنا	۴۳۳
۵۵	میرا تم سے کوئی واسطہ نہیں ہے کہنے سے طلاق	۴۳۳
۵۶	بیوی کو میں نے تم کو چھوڑ دی تو میرے کام کی نہیں کہنا	۴۳۴
۵۷	کیا جذام کی وجہ سے حق حضانت ساقط ہونا چاہئے	۴۳۵
	باب تعلیق الطلاق	۴۳۷
۱	شوہر کا ایک نہیں تین طلاق، طلاق، طلاق لکھنا	۴۳۷
۲	شوہر کا ایک دو تین طلاق ہو مجھ پر اگر بیوی میرے گھر آئے، کہنا	۴۳۸
۳	تعلیق طلاق سے رجوع صحیح نہیں ہے	۴۳۹
۴	مارنے پر طلاق کو معلق کرنا	۴۴۰
۵	قرارنامہ کی خلاف ورزی سے کون سی طلاق پڑے گی؟	۴۴۱
۶	زمانہ حال میں لگائی ہوئی شرط کو ماضی پر محمول کرنے کا حکم	۴۴۲
۷	شوہر کا ''اگر تو میرے اور اللہ کے درمیان حجاب بنی ہے تو تجھ کو طلاق'' کہنا	۴۴۲
۸	اگر عیدین میں مصافحہ ومعانقہ بدعت ہو تو بیوی کو تین طلاق	۴۴۳
	باب الخلع	۴۴۵
۱	خلع میں زوجین کی رضامندی ضروری ہے	۴۴۶
۲	بیوی کا خلع نامہ تحریر کرنا	۴۴۶
۳	خون میں عارضہ کی وجہ سے خلع لینا	۴۴۶
	باب اللعان	۴۴۹
۱	لعان کے لئے دارالاسلام شرط ہے	۴۴۹

	باب ثبوت النسب والنفقہ	۲۵۱
۱	زنا سے پیدا شدہ بچی کا نسب	۲۵۱
۲	نفقہ مطلقہ کے بارے میں حکم شرعی	۲۵۱
۳	مطلقہ کو نفقہ کب تک ملیگا؟	۲۵۵
۴	منکوحہ کا بچہ اس کے شوہر کا ہوگا	۲۵۸
۵	جنات کا سلسلہ نسب	۲۵۹
	کتاب الوقف	۲۶۱
۱	موقوفہ جائداد علی الاولاد کے وقف کو ختم کر کے تقسیم کرنا درست نہیں ہے	۲۶۳
۲	واقف کے شرط کی رعایت ضروری ہے	۲۶۳
۳	وقف علی الاولاد کی کیا نوعیت ہے؟	۲۶۳
۴	بھوپال کے بعض اوقاف کا شرعی حکم	۲۶۶
۵	ٹونک کے ایک وقف کا شرعی حکم	۲۶۸
۶	مال حرام سے خریدی ہوئی اشیاء کا وقف کرنا	۲۷۰
۷	وقف کے لئے تحریر ضروری نہیں، وقف زبانی بھی ہوجاتا ہے	۲۷۲
۸	مشترک جائداد کا وقف	۲۷۲
۹	زبانی وقف کے بعد خرچ سے بچنے کے لئے وصیت نامہ لکھنا	۲۷۲
۱۰	موقوفہ زمین کی خرید وفروخت جائز نہیں	۲۷۳
۱۱	مرض الموت کا وقف وصیت کے حکم میں ہے	۲۷۶
۱۲	موقوفہ زمین بیچ کر اس کی قیمت سے دوسری زمین خریدنا	۲۷۸
۱۳	مشترکہ زمین سے بلا اجازت شریک زمین وقف کرنا	۲۷۸
۱۴	موقوفہ اراضی کو ہبہ کرنا جائز نہیں ہے	۲۷۹
۱۵	شرائط واقف کے خلاف عمل	۲۸۲
۱۶	خائن کی تعریف اور اس کا حکم	۲۸۳
۱۷	شب قدر میں شیرینی کی تقسیم اور اس پر اوقاف کی آمدنی صرف کرنا	۲۸۳
۱۸	مسلم اوقاف بورڈ کی آمدنی عیدگاہ پر خرچ کرنا	۲۸۴
۱۹	معذور کا متولی رہنا	۲۸۵

	باب ما یتعلق باحکام المساجد	۲۸۷
۱	مسجد کے لاؤڈ اسپیکر سے گمشدہ چیزوں کا اعلان کیسا ہے؟	۲۸۷
۲	امام کو مسجد کی آمدنی سے ایام رخصت کی تنخواہ دینا کیسا ہے؟	۲۸۸
۳	صدقہ، زکوۃ، چرم قربانی کے علاوہ چراغاں وغیرہ کی رقم مسجد میں لگانا اور لگ جائے تو کیا حکم ہے؟	۲۸۸
۴	جگہ کی قلت کی بناپر خارج از مسجد اقتدا کرنے کا حکم شرعی	۲۸۹
۵	سود لینے، جاندار کی تصویر بنانے اور بلیک مارکیٹنگ کرنے والے کا روپیہ مسجد کی تعمیر میں لگانا کیسا ہے؟	۲۹۱
۶	مسجد کا مکان ایسے قصاب کو کرایہ پر دینا جو خنزیر وغیرہ کاٹے	۲۹۲
۷	اگر مسجد کی زمین پر کسی نے غلطی سے گھر تعمیر کرلیا تو کیا حکم ہے؟	۲۹۳
۸	مسجد میں داخل ہوتے وقت سلام کرنا کیسا ہے؟	۲۹۳
۹	کسی کا مکان وغیرہ توڑ کر جبراً مسجد تعمیر کرنا	۲۹۵
۱۰	غیر مسلم کی رقم مسجد میں لگانا	۲۹۶
۱۱	کافر کا روپیہ مسجد میں لگانا اور اس کو ایصال ثواب کرنا	۲۹۶
۱۲	مسجد کی چھت پر امام کے لئے کمرہ ہونا جائز نہیں	۲۹۷
۱۳	مسجد یا مدرسہ کی رقم شیئرز میں لگانا از روئے شرع درست ہے یا نہیں؟	۲۹۸
۱۴	مساجد میں قمقمے وغیرہ لگانا شرعی نقطہ نظر سے درست ہے یا نہیں؟	۲۹۹
۱۵	زیادہ مستحکم مسجد بنانے کے لئے مسجد کو شہید کرنا	۲۹۹
۱۶	مسجد کو دوسری جگہ منتقل کرنا	۲۹۹
۱۷	شہید شدہ مسجد کے ملبوں کو فروخت کرنا	۳۰۰
۱۸	احکام المساجد سے متعلق اہم مفصل فتویٰ	۳۰۱
۱۹	مسجد میں پینٹ کا استعمال کرنا شرعاً کیسا ہے؟	۳۰۵
۲۰	محراب سے کیا مراد ہے؟	۳۰۵
۲۱	غیر مسلم کا چندہ مسجد میں لگانے کا حکم	۳۰۶
۲۲	بحالت کفر کمایا ہوا پیسہ اور اس کا مسجد و مدرسہ میں صرف کرنا کیسا ہے؟	۳۰۶
۲۳	غیر مسلم کا روپیہ مسجد میں لگانا	۳۰۸
۲۴	خادم مسجد کے لئے موقوفہ زمین کی آمدنی امام و معلم پر صرف کرنا	۳۰۸
۲۵	مسجد کی زمین غیر مسلم کے ہاتھ فروخت کرنا	۳۰۸
۲۶	مسجد کی موقوفہ زمین کا تبادلہ	۳۱۰
۲۷	مسجد کے لئے زمین وقف کرنے کی وصیت کی تو کیا اس سے رجوع صحیح ہے	۳۱۰

۲۸	مسجد موقوف ہوتی ہے یا مملوک؟	۳۱۱
۲۹	احاطہ مسجد میں امام کے لئے حجرہ بنانا جائز نہیں ہے	۳۱۱
۳۰	مسجد کی پرانی لکڑی کو فروخت کرنا	۳۱۲
۳۱	مسجد کا متولی کون ہوگا؟	۳۱۲
۳۲	مسجد کی آمدنی مدرسہ یا دوسرے گاؤں کی مسجد پر صرف کرنا	۳۱۴
۳۳	متولی کا مسجد میں چندہ کرنے سے روکنا	۳۱۵
۳۴	محلہ کی اجازت کے بغیر مسجد میں بجلی کا استعمال	۳۱۵
۳۵	اختلاف کی بناء پر جدید مسجد کی تعمیر	۳۱۷
۳۶	بچے اور پاگلوں کا مسجد میں داخل ہونا	۳۱۸
۳۷	شرابی کو مسجد سے نکالنا جائز ہے یا نہیں؟	۳۱۹
۳۸	مسجد کے لئے وقف شدہ ڈول اور رسی کا حکم	۳۱۹
۳۹	امام کے ساتھ سخت کلامی	۳۲۰
۴۰	ایسی جگہ جہاں سو سال کے بعد مکانات منہدم کردیے جاتے ہوں وہاں مسجد کا حکم	۳۲۰
۴۱	مسجد کی آمدنی سے امام کی آمد و رفت کا کرایہ دینا	۳۲۳
۴۲	امام کے ناشتہ وغیرہ کا نظم مسجد کی آمدنی سے	۳۲۳
۴۳	مسجد کی آمدنی سے انعام دینا	۳۲۳
۴۴	مساجد میں اناج کا دسواں حصہ لگانا	۳۲۴
۴۵	عیدگاہ کے لئے وقف شدہ زمین کا مصرف	۳۲۵
۴۶	مسجد بنانے کے لئے بینک سے سودی قرض لینا	۳۲۵
۴۷	مسجد کی تعمیر کے لئے سودی قرض لینا کیسا ہے؟	۳۲۶
۴۸	مسجد سے متصل صحن کا حکم	۳۲۷
۴۹	مسجد کی آمدنی سے مسجد کے حمام کی لکڑی جلانا کیسا ہے؟	۳۲۷
۵۰	مسجد کی آمدنی دوسرے کاموں پر خرچ کرنا کیسا ہے؟	۳۲۸
۵۱	توسیع کی غرض سے مسجد سے متصل قبرستان اور حجرہ کو مسجد میں شامل کیا جاسکتا ہے یا نہیں؟	۳۳۰
۵۲	مال حرام سے بنی ہوئی مسجد کا حکم	۳۳۱
۵۳	مسجد کی آمدنی کو دوسرے کار خیر میں خرچ کرنا درست ہے یا نہیں؟	۳۳۲
۵۴	غصب شدہ زمین میں مسجد بنانے اور نماز پڑھنے کا حکم	۳۳۳
۵۵	مسجد میں نکاح کا سہرا پڑھنا	۳۳۴

۵۶	چھوٹے محلہ میں دو مسجد کی بنیا ڈالی تو کیا حکم ہے؟	۳۳۴
۵۷	صحن مسجد میں وضو خانہ کا حکم	۳۳۶
۵۸	مسجد کا سامان منتقل کرنا کیسا ہے؟	۳۳۶
۵۹	مسجد میں استنجا خانہ بنانا	۳۳۷
۶۰	جہاں استنجا خانہ بنانے سے مسجد کی بے حرمتی ہو وہیں استنجا خانہ بنانے کا حکم	۳۳۸
۶۱	مسجد کی اینٹ مدرسہ میں یا مدرسہ کی مسجد میں لگی تو کیا حکم ہے؟	۳۳۸
۶۲	مسجد میں دی ہوئی چیزیں واپس لینا	۳۳۹
۶۳	دوسری مسجد کی تعمیر کے بعد پرانی مسجد کا حکم	۳۴۰
۶۴	مسجد کے صحن کے کچھ حصہ پر مسجد کی آمدنی کی خاطر دوکان کی تعمیر	۳۴۰
۶۵	مسجد کے چندہ سے دوکان و استنجا خانہ کی تعمیر	۳۴۱
۶۶	ایک سنوی موقوفہ زمین سے متعلق استفتاء	۳۴۱
۶۷	مسجد کی سابق عمارت گرا کر دوسری جدید تعمیر کا حکم	۳۴۴
۶۸	نابینا کو مسجد کا سفیر بنانا	۳۴۶
۶۹	مسجد میں تدفین درست نہیں ہے	۳۴۶
	باب مایتعلق باحکام المدارس	۳۴۹
۱	زکوٰۃ و صدقۂ فطر کی رقم بغیر حیلہ تملیک مدرسہ کی تنخواہ یا تعمیر وغیرہ میں صرف کرنا جائز نہیں	۳۴۹
۲	فراہمی مالیات کے لئے اجرت کی ایک جدید شکل اور اس کا حکم شرعی	۳۵۰
۳	مدرسہ کے نام موقوفہ زمین پر عیدگاہ، مسجد اور مطبخ بنانا	۳۵۱
۴	سفیر کے لئے مہتمم کی اجازت کے بغیر وصول شدہ رقم میں تصرف کرنے کا حکم	۳۵۳
۵	فرمائشی سامان لانے پر نفع لینا	۳۵۴
۶	مکاتب اسلامیہ میں زکوٰۃ، صدقۃ الفطر اور چرم قربانی کی رقم صرف کرنا، نیز حیلہ تملیک کی بہتر شکل	۳۵۵
۷	حیلہ تملیک کا بہتر طریقہ	۳۵۶
۸	الاؤنس مدرسین کے بارے میں حکم شرعی	۳۵۶
۹	احکام المدارس سے متعلق ایک فتویٰ	۳۵۸
۱۰	مدرسہ یا مسجد کا مکان بینک یا کسی سودی ادارہ کو کرایہ پر دینا	۳۵۹
۱۱	مدرسہ کے مفاد کے پیش نظر مدرسہ کے خزانے سے خواص و عوام پر اوسط درجہ کا خرچ کرنا درست ہے	۳۶۰
۱۲	سینما ہال وغیرہ کی کمائی مدرسہ یا مسجد میں لگانے کا حیلہ شرعی	۳۶۱

۱۳	موقوفہ مدرسہ کا کچھ حصہ یتیم خانہ کو دینے کا حکم	۳۶۲
۱۴	مدرسہ کے لئے وقف زمین پر مسجد و عیدگاہ کی تعمیر	۳۶۳
۱۵	سفراء مدارس کا حکم	۳۶۵
۱۶	بلا تعدی مدرسہ کی رقم سفراء سے گم ہو جائے تو کیا حکم ہے؟	۳۶۶
۱۷	سفیر سے مدرسہ کی رقم گم ہو جانے کا کیا حکم ہے؟	۳۶۸
۱۸	مدارس و مکاتب میں چرم قربانی خرچ کرنے کا حکم	۳۷۰
۱۹	جس مدرسہ میں اسلامی کام نہ ہو اس میں چندہ دینا	۳۷۱
۲۰	جماعت اسلامی کے مدرسہ میں چندہ دینا	۳۷۲
۲۱	مدرسہ کی موقوفہ زمین پر اسکول بنانا	۳۷۳
	باب مایتعلق بأحکام المقابر	۳۷۵
۱	متروکہ قبرستان میں مسجد کی توسیع کرنا	۳۷۵
۲	قدیم متروکہ قبرستان کے نشانات ختم کرکے مسجد بنانا	۳۷۶
۳	قبرستان کے پیڑ یا اس کی قیمت کو مسجد میں لگانا	۳۷۸
۴	قبرستان کی زمین پر دوکان کی تعمیر اور اس کی آمدنی کا حکم	۳۷۸
۵	قبرستان یا مسجد کے روپیہ کو تجارت میں لگانا	۳۷۹
۶	قبرستان کو آمدنی کے لئے استعمال کرنا	۳۷۹
۷	میت کی تدفین کے لئے قدیم قبروں کو منہدم کرنا	۳۸۰
۸	پرانی قبروں کے نشانات مٹ جانے پر کیا حکم ہے؟	۳۸۱
۹	متولی کی اجازت کے بغیر موقوفہ قبرستان میں تدفین	۳۸۲
۱۰	قبرستان کے اردگرد کی زمین مدرسہ میں دینا	۳۸۲
۱۱	قبرستان کے درخت کی آمدنی مسجد و مدرسہ میں صرف کرنا	۳۸۳
۱۲	مزار وغیرہ کے نام موقوف شدہ زمین اور اس کی آمدنی کو مسجد میں لگانا جائز ہے یا نہیں؟	۳۸۴
۱۳	متروکہ قبرستان کی زمین میں غرباء کے لئے مکان بنانا	۳۸۵
۱۴	قبرستان کی موقوفہ زمین پر مدرسہ یا امداد یتامی کے لئے مکان کی تعمیر	۳۸۶
۱۵	عورتوں کے قبرستان جانے کا حکم	۳۸۷
۱۶	چرم قربانی کی رقم سے قبرستان کی چہار دیواری بنانا کیسا ہے؟	۳۸۸
۱۷	قبرستان میں آبادی بسانا	۳۸۸

۱۸	پرانی قبروں پر دوکان لگانا	۳۸۹
۱۹	قبرستان میں فقیروں کو چاول دال دینا	۳۸۹
۲۰	امیر جماعت کے لئے درگاہ کمیٹی کی ممبری قبول کرنا	۳۸۹
۲۱	قبرستان کی زمین فروخت کرنا	۳۹۰
۲۲	مزار کی آمدنی	۳۹۱
	کتاب الأیمان والنذور	۳۹۵
۱	شراب نہ پینے کی قسم کھانے کے بعد شراب پی لینے کا حکم	۳۹۷
۲	منت کے روزوں کا حکم شرعی	۳۹۷
۳	نذر کے روزہ کو پورا کرنے کی صورت	۳۹۸
۴	عہد توڑنے کا کفارہ	۳۹۹
	باب الحدود	۴۰۱
۱	ڈمسی کی کیا سزا ہے؟	۴۰۱
۲	زنا کی سزا محض مزنیہ کے والد سے معافی مانگنے سے معاف نہیں ہوگی	۴۰۲
۳	غیر شرعی طریقہ پر اپنی خواہش کی تکمیل	۴۰۲
	کتاب المعاملات	۴۰۵
۱	پرچوں کے معمے حل کرکے انعام لینا کیسا ہے؟	۴۰۷
۲	شیئرز سے متعلق چند اشکالات	۴۰۸
۳	ہندوستان میں عقود فاسدہ کا حکم، نیز ہندوستان دارالحرب ہے یا دارالامن؟	۴۱۵
۴	دارالاسلام و دارالکفر کی تحقیق	۴۲۴
۵	ترقیاتی منصوبوں میں شرکت کا حکم	۴۳۱
۶	محکمۂ اقتصادیات سے مدد لینے کی بعض صورتوں کا شرعی حکم	۴۳۳
۷	محکمۂ اقتصادیات سے مدد لینا	۴۴۱
۸	ملکی ترقی کی سرکاری اسکیموں میں مسلمانوں کی شرکت	۴۴۵
۹	انعام کا غلط طریقہ	۴۵۷
۱۰	حق تصنیف سے متعلق سوال و جواب	۴۵۸

۱۱	شرکت کی مختلف صورتیں اور ان کے احکام	۴۶۰
۱۲	شرکت عنان کے فساد کی وجوہات	۴۶۶
۱۳	بعض شرکا کا ایک شریک کو نکال دینا	۴۶۶
۱۴	مال شرکت میں شرکاء کی اجازت کے بغیر تصرف	۴۶۷
۱۵	ایک شریک کو اس کی محنت کے صلہ میں طے شدہ حصہ سے زیادہ دینا	۴۶۹
۱۶	شریک کا مال مشترک سے چندہ دینا اور دیگر تصرفات کا حکم	۴۷۰
۱۷	شریک کے انتقال کے بعد اس کے حصہ کا مالک کون ہوگا؟	۴۷۱
۱۸	غیر شریک کا شرکاء کے لئے تنخواہ پر کام کرنا	۴۷۱
۱۹	ہوٹل کی ذمہ داری ایسے شریک کو دینا جو نفع زیادہ دے	۴۷۱
۲۰	مال اور عمل کے بغیر نفع میں شرکت	۴۷۱
۲۱	کھیت کو پیداوار کے ایک تہائی حصہ کی شرط پر سیراب کرنا	۴۷۲
۲۲	مضاربت کے بعد ارباب مال مضاربین اور راس المال میں اضافہ کا حکم	۴۷۲
۲۳	شرکاء میں سے کسی شریک کا مال شرکت میں سے کچھ اپنے مصرف میں لانا	۴۷۸
۲۴	کمیشن کی شرط پر کمپنی میں شرکت	۴۸۰
۲۵	شرکت کی ایک خاص اسکیم	۴۸۱
۲۶	چوری کے مال سے قرض کی ادائگی	۴۸۲
۲۷	غیر مسلم کمپنی سے شیئرز لینا	۴۸۳
۲۸	مضاربت کی مختلف صورتیں اوران کے احکام	۴۸۴
۲۹	مقروض کا ادائگی قرض کے وقت اپنی خوشی سے کچھ رقم زائد دینا	۴۸۷
۳۰	مشترکہ کاروبار سے متعلق ایک اہم فتویٰ	۴۸۸
۳۱	تقسیم شیٔ مشترک کا ایک خاص فیصلہ	۴۸۹
۳۲	بیٹے کی ملازمت کی رقم کا مالک بیٹا ہے یا باپ؟	۴۹۰
۳۳	سودی کاروبار والی فیکٹری کا شیئر ہولڈر بننا	۴۹۱
۳۴	فیکٹری ملازم کی بیوہ کو فیکٹری سے ملنے والی رقم کا حکم	۴۹۲
۳۵	سدا بہولی اسکیم میں شرکت	۴۹۳
۳۶	کمپنی کا شیئر ہولڈر بن کر نفع حاصل کرنا	۴۹۳
۳۷	موجودہ ہندوستان کی شرعی حیثیت	۴۹۴
۳۸	امداد باہمی کی ایک صورت کا شرعی حکم	۴۹۴

كتاب الحج

کتاب الحج

ہوائی جہاز سے سفر کرنے والا احرام کہاں سے باندھے؟

ایک شخص حج کی غرض سے حرمین شریفین کا ارادہ کرتا ہے ہوائی جہاز سے جانا چاہتا ہے تو احرام کہاں سے باندھے خلاصہ تحریر فرماویں۔

الجواب وباللہ التوفیق:

ہندستان کی اصل میقات یلملم ہے محاذات سے آگے بڑھنا بلا احرام کے ناجائز ہے اور اس کے قبل احرام باندھ لینا جائز ہے (۱)، اس لئے بہتر یہ ہے کہ بمبئی ہی سے احرام باندھ لیں ورنہ پھر یلملم یا جو بھی میقات آئے اور اس کے محاذات پر پہنچے تو احرام ضرور باندھ لے اس سے آگے بلا احرام نہ بڑھیں۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دار العلوم دیوبند سہارنپور ۱۸/ ۱۰/ ۱۳۸۵ھ

الجواب صحیح محمود غنی عنہ

سمندری جہاز سے حج کے لئے جانے پر احرام کہاں سے باندھا جائے؟

اب تک حجاج کرام جو سمندری جہاز سے جاتے ہیں وہ یلملم کے محاذات (جو سمندر کے اندر ہیں اب تک ذی النور کے موافق پڑتا ہے) احرام باندھ لیتے ہیں، لیکن اب چند سال سے اچھے لوگ یعنی علماء کا طبقہ جو سمجھدار ہے وہ جدہ سے احرام ہر دو صورت میں جائز بتلاتے ہیں اور خود بھی اس پر عمل کرتے ہیں جیسا کہ مشاہدہ ہوا ہے، تو کیا جدہ سے احرام باندھ سکتے

۱- ''وحرم تاخیر الاحرام عنها کلها لمن ای لآفاقی وقصد دخول مکة یعنی الحرم ...... ولایحرم التقدیم للاحرام علیهابل هو الأفضل إن في أشهر الحج وأمن علی نفسه'' (الدرمع الرد ۳/ ۴۸۳)۔

ہیں، جدہ سے احرام ہر دو صورت یعنی بذریعہ طیارہ اور بذریعہ سمندری جہاز جائز ہے یا نہیں؟

ولی اللہ خان (نشان پاڑا روڈ، بمبئی)

الجواب وباللہ التوفیق:

ابتدائی دور میں جب تک یہ بڑے بڑے جہاز جاری نہ ہوئے تھے اس وقت ہندوستان سے جانے والے عموماً حجاج سورت کی بندرگاہ سے چھوٹے جہازوں یا بادبانی کشتیوں کے ذریعہ سمندر پار کر کے عدن کے آس پاس پہونچ جاتے تھے، پھر وہاں سے سمندر کے کنارے کنارے آگے بڑھتے ہوئے پہنچ جاتے تھے۔

اس درمیان میں بعض جگہ اس خطِ میقاتی کو عبور کرنا پڑتا تھا یلملم اور قرنِ منازل کے درمیان واقع اسی خطہ سے جب تجاوز کرنے کا وقت آجاتا تھا تو جہاز والا اعلان کر دیتا تھا اور لوگ احرام باندھ لیتے تھے اور اب ایسا نہیں ہے، اب یہ بڑے بڑے جہاز میقات سے باہر ہی آفاق میں گذرتے ہوئے جدہ پہنچ جاتے ہیں اور جحفہ اور جدہ کے درمیان جو خطِ میقاتی ہے وہ جدہ سے آدھ میل آگے مقامِ شمشیہ پر سے گذرتا ہے وہاں چونکہ کوئی نشان یا علامت نہیں ہے کہ وہاں پہنچ کر ٹھہرے اور بغیر احرام باندھے آگے نہ بڑھے۔

اور مسئلہ یہ ہے کہ جب کوئی آفاقی آفاق میں گذرتا ہوا بغیر کسی میقات سے آگے گذرتے ہوئے مکہ مکرمہ کے قریب پہنچنے لگے تو جب مکہ مکرمہ صرف دو منزل باقی رہ جائے تو احرام باندھ کر آگے بڑھے، بغیر احرام باندھے آگے نہ بڑھے، یہ مسئلہ عالمگیری اور البحر الرائق وغیرہ میں مصرح ہے(۱)۔

البتہ عوام میں ایک پرانا ڈھرا پڑا ہوا ہے کہ اب بھی سمندر کے اندر آفاق ہی میں بغیر شرعی محاذات کے پیدا ہوئے احرام باندھ لیتے ہیں اور چونکہ میقات سے قبل بلکہ اپنے گھر سے احرام باندھ کر جانا منع یا مکروہ نہیں ہے، اس لیے علماء اس پر نکیر نہیں فرماتے۔

پانی کے جہازوں کے ذریعہ آج کل جانے والوں کے لیے یہی حکم ہے اس کو احقر نے ایک طویل جواب میں جو کہ رسالہ جیسا ہو گیا ہے اور وہ مواقیت خمسہ کے نام سے ہے، رسالہ دار العلوم میں شائع ہو چکا ہے اگر وہ مل جائے تو وہ رسالہ

۱- "ثم الآفاقي إذ انتهى على قصد دخول مكة عليه أن يحرم قصد الحج أو العمرة عندنا، أولم يقصد لقوله صلى الله عليه وسلم: لايجاوز أحد الميقات إلا محرماً ولو لتجارة، ولأن وجوب الإحرام لتعظيم هذه البقعة الشريفة، فيستوي فيه التاجر والمعتمر وغيرهما" (فتاوی شامی، ص۱۳۹، ج۲ کتاب الحج) (مرتب)۔

دارالعلوم سے طلب فرما کر ملاحظہ فرمالیجئے!

باقی ہوائی جہاز سے جانے والوں کو یہ شبہ ہو کہ یہ جہاز کسی خطِ میقاتی سے تجاوز کر کے اور خطِ میقاتی کے اوپر سے گذرے گا تو انہیں چاہیے کہ بمبئی ہی سے احرام باندھ کر احتیاطاً سوار ہوں، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۴/۱۱/۱۴۰۱ھ

اگر کوئی شخص آفاق میں چلتا ہوا جدہ پہنچ جائے تو احرام کہاں سے باندھے:

مکہ مکرمہ کے مشہور و معروف روزنامہ "الندوۃ" (۲۰ ذی قعدہ ۱۳۹۹ مطابق ۱۱ اکتوبر ۱۹۷۹ء) کے آخری صفحہ پر مملکت سعودیہ عربیہ کے بڑے بڑے علماء کرام کی مجلس نے میقات احرام اور رمی جمرات پر ایک فتویٰ صادر کیا ہے اور یہ بات واضح کی ہے کہ "جواً، بحراً و براً" میں داخلہ کے لئے حدود میقات کو تجاوز کر کے جدہ وغیرہ میں احرام باندھنا جائز نہیں ہے اور مجلس نے دوسرا فتویٰ یہ صادر کیا ہے کہ گیارہویں بارہویں، تیرہویں تاریخ کو ایام تشریق میں قبل الزوال رمی جمرات جائز نہیں ہے، صرف دسویں ذی الحجہ، یعنی یوم النحر کو قبل الزوال رمی جمرہ عقبہ (بڑا شیطان) کی درست ہے، عورتیں اور بوڑھے ضعیف اور عاجزین کے لئے رمی جمرہ عقبہ کی دسویں تاریخ کی آدھی رات کے بعد درست ہے۔

علماء کرام سے استدعاء ہے کہ وہ اس سلسلہ میں اپنی رائے دے کر حجاج کرام کی رہبری فرمائیں۔

ممتاز احمد جاوید شافعی (بھٹکل، کرناٹک)

الجواب وباللہ التوفیق:

۲ نومبر ۱۹۷۹ء کے صدق جدید میں علماء سعودیہ کا دو مسئلوں پر ایک فتویٰ شائع کر کے علماء کرام سے یہ استدعاء کی ہے کہ وہ اس سلسلہ میں اپنی رائے دے کر حجاج کی رہبری فرمائیں۔

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ بعض لوگوں کو اس فتویٰ سے کچھ خلجان یا اشتباہ پیدا ہو گیا ہے، اس لئے ان کے اشتباہ و خلجان کو رفع کرنے کی غرض سے بطور وضاحت و تشریح کچھ عرض کیا جاتا ہے۔

مسئلہ ا: یہ جواً، بحراً، براً حرم میں داخلہ کے لئے حدود میقات کو تجاوز کر کے جدہ وغیرہ میں احرام باندھنا جائز نہیں ہے۔

اس سلسلہ میں عرض یہ ہے کہ یہ تو صحیح ہے کہ حرم میں جانے کے لئے حدود میقات سے کسی کو بغیر احرام باندھے ہوئے تجاوز کرنا اور آگے بڑھ جانا جائز نہیں، اس لئے جو لوگ حدود میقات تجاوز کر کے جدہ وغیرہ میں احرام باندھیں گے تو یہ فعل ان کے لئے جائز نہ ہوگا۔

باقی آج کل ہندوستان و پاکستان سے بحری جہاز سے جدہ جانے والے حجاج، بلکہ مشرق کے کسی خطہ سے بحر ہند میں ہوتے ہوئے بحری جہاز سے جدہ جانے والے حجاج، خواہ ملیشیا و انڈونیشیا کے ہوں یا کسی اور خطہ کے ہوں وہ حدود میقات کو تجاوز کر کے جدہ نہیں پہنچتے، بلکہ حدود میقات وخطوط میقات سے بالکل باہر باہر حل کبیر و آفاق ہی میں گذرتے ہوئے جدہ پہنچ جاتے ہیں، اور خود جدہ بھی مکہ مکرمہ سے دو منزل سے کچھ زائد فاصلہ (تقریبا ۳۶ میل انگریزی میل سے) پر حل کبیر اور آفاق میں واقع ہے اور حدود میقات وخط میقاتی جدہ سے تقریبا ایک منزل مکہ مکرمہ کی جانب آگے بڑھ کر اس خط مستقیم پر واقع ہے جو یلملم سے چل کر سیدھا رابغ وجحفہ کو پہنچتا ہے اور وہی خط مستقیم خط میقاتی ہے اور محاذاۃ میقات اسی خط پر واقع ہوتی ہے۔

کیونکہ اس خط کا مقام اور جگہ معلوم ومتعین نہیں ہے اور مسئلہ یہ ہے کہ اگر کوئی شخص حدود میقات سے تجاوز کئے بغیر مکہ مکرمہ کے قریب پہنچ جائے اور میقات ومحاذات میقات کا علم ویقین نہ ہو تو کعبۃ اللہ کی تشریف وتکریم کے پیش نظر مکہ مکرمہ سے دو منزل کی دوری پر ہی احرام باندھ لے اور بغیر احرام باندھے ہوئے آگے نہ بڑھے۔ کما فی الدر المختار علی حامش الشامی:

"وإن لم يكن بحيث يحاذي فعلي مرحلتين وحرم تأخير الإحرام عنها"، وهكذا في الهندية والبحر وغيرهما من الكتب المعتبرة للفتاوىٰ عند الاحناف"(۱)۔

اور اسی وجہ سے حجاج کرام کو جو مشرق سے بحری جہاز سے بحر ہند میں سفر کرتے ہوئے آج کل جدہ پہنچتے ہیں تو ان پر جدہ سے احرام باندھنا واجب وضروری ہو جاتا ہے اور بغیر احرام باندھے ہوئے آگے بڑھنا جائز نہیں رہتا، اور جدہ سے قبل چونکہ کسی میقات سے یا کسی میقات کی محاذات سے تجاوز نہیں ہوتا اور نہ دو منزل سے کم کا فاصلہ مکہ مکرمہ سے کہیں ہوتا ہے، اس لئے جدہ پہنچنے سے قبل احرام باندھنا واجب ولازم نہیں ہوتا، جدہ سے قبل کی جگہ کا فاصلہ مکہ مکرمہ سے دو منزل سے کم نہ ہونا تو ظاہر ہے، اس لئے کہ جدہ سے قبل تقریبا تمام جگہوں کا سمندری کنارہ مکہ مکرمہ سے دو منزل سے بہت زیادہ ہوتا ہے، اس لئے کم کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا اور حدود میقات سے کسی جگہ تجاوز نہ ہونا اس لئے صحیح ہے کہ تجاوز کرنے کا مفہوم یہ ہے کہ

۱- درمختار کتاب الحج ۳؍ ۴۸۲۔

جانے والاکسی میقات سے یا کسی میقات کےمحاذاۃ سے،یعنی دومیقاتوں کےدرمیان خط میقاتی سے آگے بڑھ کرحل صغیر میں داخل ہوجائے، **کما دلت علیه هذه العبارة من الهندية: ''وإن سلک بين الميقاتين في البحر والبر، اجتهد وأحرم إذاحاذیٰ ميقاتا منها (إلى قوله) فإن لم يكن بحيث يحاذي فعلي مرحلتين إلى مكة الخ''**(١) جہاز کے اس پورے سفر میں آجکل ایسا کہیں نہیں ہوتا۔ حل صغیر کے معنی تو ظاہر ہے کہ حدودحرم سے باہر اورمیقات آفاقی کے اندرکا علاقہ حل صغیر کہلاتا ہے اورمحاذات میقات کامفہوم مزید وضاحت کے ساتھ سمجھنے کے لئے پہلے یہ سمجھنا ضروری ہے کہ عین میقات کل پانچ ہیں: یلملم، جحفہ، رابغ، ذوالحلیفہ، ذات عرق،قرن المنازل۔انہیں کومواقیت خمسہ کہتے ہیں اوران میقاتوں میں سے ہرایک میقات سے جوخط مستقیم چل کرسیدھادوسری میقات تک پہنچتا ہے وہ خط میقاتی کہاجاتا ہے اورانہیں خطوط میقاتی کا مجموعہ حرم شریف کوہرطرف سے محیط ہے اورگھیرے ہوئے ہے۔باہر سے کوئی آنے والا جب حدودحرم میں جانا چاہےتواس کوعین میقات پر سے یا کسی خط میقاتی پر سے گذرنا ضروری ہوتا ہے،بغیراس کے حدودحرم میں داخل ہوناممکن نہیں، پس جب اس خط میقاتی پرکوئی جانے والاپہنچ جائے تو کہا جاتا ہے کہ محاذاۃ میقات پر پہنچ گیا اوراسی وجہ سے اس خط میقاتی کوخط محاذاتی بھی کہا جاتا ہےاوراب اگر اس جانے والےکاارادہ مکہ مکرمہ جانے کاہےتوبغیراحرام باندھے اس خط میقاتی سے آگے بڑھ گیا اوراس پر جنایت لازم آگئی،پس یلملم سے دائیں جانب یلملم سے جوخط مستقیم چل کرسیدھا دوسری میقات (جحفہ ورابغ) تک پہنچتا ہے وہ خط سمندر کے کچھ حصہ سےنہیں گزرتا،تاکہ شبہ بھی کیا جاسکے کہ جدہ جانے والا جہاز اس خط سے متجاوزہوگیا،بخلاف یلملم کے بائیں جانب جوخط مستقیم یلملم سے چل کرسیدھاقرن منازل تک پہنچتا ہے وہ خط سمندر کے کچھ حصہ پرگذرتا ہے اوراسی وجہ سےقدیم زمانہ میں جب کہ مشرقی ممالک وہندوستان وغیرہ سے کشتی یا چھوٹے جہاز کےذریعہ سمندرکوپارکر کےمسقط وغیرہ پرآجاتے تھےپھرسمندر کے کنارے آگے بڑھتے تھےتوخط میقاتی کاوہ حصہ سمندر ہی میں آجاتا تھا اوربغیر احرام باندھےکوئی حاجی آگےنہیں بڑھتا تھا، اسی مسئلہ ہندیہ(۲۲۱/۱، وبحر) وغیرہ میں، بایں عبارت: **''ومن حج في البحر فوقته إذا حاذي موضعا من البر لا يتجاوز إلا محرما''**(٢) بیان کیا ہےاوراسی مرحلہ پرپہنچ کرجہازراں محاذاۃ میقات پرپہنچ جانے کا اور احرام بندھوادینے کا اعلان کردیتا تھا،مگراب مشرقی ممالک (ہندوستان وغیرہ) سے آنے والا حاجیوں کا جہازمسقط وعمان وغیرہ کہیں نہیں جاتا اورنہ سمندر کے اس حصہ سے گزرتا ہے جو

١- فتاوی ہندیہ ۲۲۱/۱۔

٢- حوالہ سابق۔

خط میقاتی کے اندر واقع ہے، بلکہ اس خط سے باہر باہر حل کبیر میں چلتا رہتا ہے۔

قولہ حل کبیر: حل کبیر و آفاق ایک ہی چیز ہے، مواقیت خمسہ سے باہر کا کل علاقہ اقصائے عالم تک سب آفاق اور حل کبیر ہے۔

حل کبیر اور آفاق میں ہی گذرتا ہوا سیدھا جدہ پہنچ جاتا ہے جس کی وجہ سے محاذاۃ میقات کا اور اس کے اعلان وغیرہ کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا ہے، مگر اب بھی وہی قدیم ڈھرہ چلا آرہا ہے اور اسی قدیم ڈھرہ و طریقہ پر اب بھی ایک مقام پر پہنچ کر اگرچہ وہ مقام حل کبیر اور آفاق ہی میں ہو محاذات میقات پر آجانے کا اعلان ہو جاتا ہے، حالانکہ محاذات میقات پر آجانے کا احتمال بھی نہیں رہتا اور چونکہ عوام میں بھی وہی سابقہ حالات ومعاملات معروف ومشہور ہیں، اس لئے عوام اس اعلان پر عمل بھی کر لیتے ہیں، اگر بات یہیں تک رہتی تو چونکہ میقات سے قبل بھی احرام باندھ لینا درست ہے، اس لئے انگیز کرلیا جاتا ہے، مگر اس اعلان پر عمل نہ کرنے والے پر لعن طعن بھی کرنے لگتے ہیں، یہ غلط ہے اور اس کے اصلاح کی ضرورت ہے، اصلاح کی جو بہتر تدبیر ہو اختیار کرنا چاہئے۔

مندرجہ ذیل نظری نقشہ سے میقات وحدود میقات وحل صغیر وحل کبیر وآفاق وغیرہ سب باوضاحت طریقے سے انشاء اللہ ذہن میں آجائیں گے اور حدود میقات سے تجاوز نہ کرنے کا مفہوم بھی واضح ہو جائے گا۔ نیچے دیئے ہوئے نقشے میں دو میقاتوں کے درمیان میں جو خطوط ہیں انہیں خطوط میں سے کسی خط پر پہنچنے سے میقات کی محاذاۃ صادق آتی ہے اور دائیں یا بائیں جو میقات قریب ہوتی ہے اسی میقات کا وہ شخص میقاتی کہا جاتا ہے اور اسی خط سے بغیر احرام کے آگے جانا ممنوع ہے، بلکہ اگر جانا ہے تو احرام باندھ کر آگے جانا جائز ہوتا ہے، بعض حضرات یہ فرماتے ہیں کہ کوئی جہاز یا قافلہ کسی میقات کے سامنے خواہ حل کبیر ہی میں ہو اس طرح پہنچ جائے کہ اگر بیت اللہ شریف سے کوئی خط مستقیم چل کر اس میقات سے گزرتا ہوا اس جہاز یا قافلہ تک پہونچ جائے تو وہ محاذات میقات پر آجائیں گے اور ان کو وہیں سے بغیر احرام باندھے آگے بڑھنا جائز نہ ہوگا، یہ شبہ غلط ہوگا اس پر تفصیلی گفتگو اگلے صفحات پر ہے۔

ایک شبہ اور اس کا ازالہ:

حدود میقات یا محاذات میقات کا اگر کوئی شخص یہ مفہوم لے کہ بیت اللہ شریف سے کوئی خط مستقیم چل کر کسی میقات پر سے گذرتا ہوا سیدھا آگے بڑھتا ہوا حل کبیر وآفاق میں سمندری علاقہ میں گزرتا ہوا چلا جائے تو وہ سب خط میقاتی ہے اور اس خط پر بغیر احرام باندھے ہوئے آگے بڑھنا اور تجاوز کرنا حدود میقات سے تجاوز کرنا شمار ہوگا تو یہ مفہوم چند وجوہ غلط ہے۔

جوابات شبہ:

اول: اینکہ اس تقدیر پر یہ خط اقصائے عالم تک جاسکتا ہے، اور درمیان میں کسی متعین حد پر ختم کردینا یا ختم مان لینا نہ منصوص ہے نہ معقول ہے، پس اس مفہوم کی بنیاد پر اقصائے عالم تک حل کبیر و آفاق میں لاکھوں مقامات ومکانات ایسے آجائیں گے جو خط میقاتی پر واقع ہوں گے اور محاذات میقات پر آجائیں گے، اور اس خط کے آگے بغیر احرام باندھے ہوئے آگے جانا جائز نہ ہوگا، ورنہ تجاوز عن حدود المیقات لازم آجائے گا، جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ بہت سے لوگوں کا جب ارادہ مکہ مکرمہ جانے کا ہو تو اپنی آبادی بلکہ اپنے گھر سے ہی اور آفاق میں ہی احرام باندھ کر نکلنا واجب ہوجائے گا اور بغیر احرام باندھے ہوئے آفاق کے اندر بھی اپنے گھر یا آبادی سے باہر نکلنا جائز نہ ہوگا، حالانکہ اس کا کوئی قائل نہیں ہے۔

ثانیاً: اسی طرح اس خط کے اطراف منزل دومنزل کے فاصلے سے مکہ مکرمہ کی سمت سے چل کر جب کوئی اس خط پر آجائے تو اس کو بغیر احرام باندھے آگے بڑھنا جائز نہ رہے گا، حالانکہ وہ بھی آفاق ہی میں ہے اور شریعت کا مسئلہ ہے کہ مکہ مکرمہ آنے کے باوجود بغیر احرام کے جہاں تک چاہے جاسکتا ہے اور یہ اس کے خلاف ہے۔ کمافی الہندیۃ (۱/۲۲۱)۔

ثالثاً: اس لئے کہ اس تقدیر پر میقاتی اور آفاقی کا فرق ہی ختم ہوجائے گا، جو منشاء شرع سے متضاد اور خلاف ہی نہیں، بلکہ ایسے احکام شرعیہ کو منہدم کردینے والا بھی ہے۔

رابعاً: اس لئے کہ شریعت مقدسہ نے حدود حرم کے ہر چہار طرف کچھ فاصلہ پر پانچ سمتوں میں ایک ایک مقام نامزد کر کے میقات حرم قرار دیا ہے، اس لئے کہ بتقاضائے: ''ومن دخلہ کان اٰمناً'' (۱) پورا خطہ وحرم دربار محبوب حقیقی کا محل سرائے شاہی ہے اور اس کے ہر طرف ان میقاتوں تک اس محل سرائے شاہی کا جلو ہے جو بمنزلہ پائیں باغ اور پورا حجاز بلدۂ امین کے لئے بمنزلہ فنائے مصر ہے، اس لئے منشاء شرع یہ معلوم ہوتا ہے کہ جب تم فنائے بلد میں آجاؤ اور محل سرا میں داخلہ کی نیت کرو تو دربار کے آداب شاہی بجالا کر داخل ہوا کرو، اپنے محبوب حقیقی کے عشق ومحبت کی کیفیت طاری کرو، بلکہ محبت میں فنا کی کیفیت طاری کر کے کفن کے کپڑے (احرام) پہن کر آؤ اور جب دربار شاہی میں داخل ہوجاؤ آداب سلامی بجالاؤ اور وفور عشق ومحبت میں سرشار ہو کر محبوب حقیقی کے گھر کا چکر (طواف قدوم) لگاؤ۔

مناسک حج کے تمام ہی احکام دیکھ جائیے تقریباً سب ہی اسی عشق ومحبت کی سرشاری کے ترجمان ومظہر نظر آتے ہیں، ان سب باتوں کا بھی تقاضا یہ ہے کہ کم از کم محل سرائے شاہی کا پائیں باغ (حدود میقات) ہر طرف سے مثل بستان کے

۱- سورہ آل عمران: ۹۷۔

احاطہ بند اور گھرا ہوا ہو، تا کہ کوئی داخل ہونے والا دربار شاہی کے آداب کے ادا کئے بغیر محل سرا میں داخل ہی نہ ہوسکے۔

مگر محبوب حقیقی کی شان کریمی ورحیمی ہے کہ دیواروں سے احاطہ بندی کے بجائے محض خطوط بین المواقیت سے احاطہ بندی قرار دے کر حدود میقات کی تعیین وتحدید کردی اور آداب شاہی کے بجالانے کے طریقے بھی خود ہی بتلادیئے حدود میقات کی اور محاذ میقات کی اس ترجمانی اور مفہوم میں جو ایک شبہ اور اس کا ازالہ کے تحت بیان کیا گیا ہے اس میں ان فوائد اور حکم کا کہیں دور دور تک بھی پتہ ونشان نہیں ہے، بلکہ ان مذکورہ خرابیوں کے علاوہ اور بھی وجوہ ہیں جو اس ترجمانی کی تردید کرتی ہیں، بغرض اختصار ذکر نہیں کیا جاتا۔

غرض حدود میقات ومحاذات میقات کی مذکورہ بالا ترجمانی جن کو صاحب اشکال وشبہ نے بیان ہے وہ اصول شرع، اصول فقہ اور ضوابط عقل ونقل سب کے ہی خلاف ہے اور غلط ہے۔

خشکی وبحر کے راستے سے جانے والے حجاج کے لئے یہ سب تفصیل ہے اگر کوئی ہوائی جہاز سے جانا چاہے تو اس کے لئے مزید تفصیل بھی ہوگی کہ اگر کوئی ہوائی جہاز محض اتنی بلندی پر پرواز کرتا ہے کہ زمین سے بغیر کسی دوربین وغیرہ آلہ کے مدد کے وہ نظر آتا ہے تو وہ زمین کے تابع قرار دیا جائے گا اور اس کے حجاج کو کسی میقات اور خط میقاتی سے بغیر احرام کے آگے بڑھنا اور تجاوز کرنا جائز نہ رہے گا اور اس پر جانے والے حجاج کو اگر یہ ظن غالب ہو کہ صرف تھوڑے ہی وقفہ میں کسی میقات یا کسی خط میقات سے آگے بڑھ جائیں گے تو ان کے لئے ضروری ہے کہ سوار ہونے سے قبل ہی احرام باندھ کر سوار ہوں یا سوار ہوتے ہی فوراً احرام باندھ کر تیار ہو جائیں، مثلاً ہندوپاک سے جانے والا ہوائی جہاز اگر قرن منازل ویلملم کے درمیان سے گزرتا ہوا جدہ یا حدود عرب میں کسی جگہ جاتا ہے تو وہ قرن منازل یلملم کے درمیان خط میقاتی سے یقیناً گزرے گا، اور اس حال میں اس خط (خط میقاتی بین قرن ویلملم) سے بغیر احرام باندھے ہوئے اس کے کسی مسافر کو آگے بڑھنا جائز نہ ہوگا، اور جو ہوائی جہاز اتنی بلندی سے پرواز کرتا ہے کہ زمین سے بغیر دوربین وغیرہ آلہ کی مدد کے نظر نہیں آتا ہو، جیسا کہ اکثر دور دراز مقامات (لندن، امریکہ، کنیڈا، افریقہ وغیرہ) سے آنے والے ہوائی جہازوں کا عموماً یہ حال ہوتا ہے، تو وہ زمین کے تابع نہیں قرار دیئے جائیں گے، بلکہ جس وقت وہ زمین سے قریب آکر نظر آئے گا تو اس وقت زمین کے تابع قرار دیئے جائیں گے، اور صرف اسی وقت سے احرام وغیرہ کے مذکورہ بالا احکامات اس میں آنے والے مسافروں پر لاگو ہوں گے، یا یہ کہ اس مسافر کو اس جہاز کا روٹ (راستہ) معلوم ہو، راستہ کے اور مقامات کا نقشہ بھی معلوم ہو اور جانتا ہو کہ فلاں میقات سے یا اس کی محاذات سے فلاں وقت گزرے گا تو اس وقت کے آنے سے کچھ قبل احرام باندھ لینا ضروری ہو جائے گا۔

لہذا ان کو ان امور کا مزید لحاظ رکھ کر اپنے احرام وغیرہ کا نظم رکھنا ضروری ہوگا، مثلا چھ گھنٹہ مسلسل پرواز میں رہے گا اور جب اترے گا تو میقات کے اندر اترے گا تو اترنے سے محض گھنٹہ دو گھنٹہ پہلے احرام باندھ لینا کافی ہوگا، اور اگر یہ معلوم ہے کہ وہ میقات سے باہر ہو جائے گا اور میقات کے باہر اترے گا، جب تو کوئی اس کا اشکال ہی نہیں، اتر کر پھر خشکی کے مسافروں کی طرح احرام باندھنے کا اہتمام وانتظام کرے گا۔

(نوٹ) حضرت مولانا شیر محمد صاحب نے جو ان مسائل میں امام مانے جاتے تھے ان کی بھی اپنی مشہور تصنیف عمدة المناسک فی شرح زبدة المناسک میں بھی اس انداز کی تحقیق کی ہے جو احقر نے پیش کی ہے۔

مسئلہ ۲: حنفیہ کے نزدیک بھی ۱۱-۱۲-۱۳ کو رمی جمرات قبل الزوال جائز نہیں اور دس ذی الحجہ کو قبل الزوال رمی کرنا محض درست اور مباح ہی نہیں ہے، بلکہ افضل اور بہتر ہے اور بعد الزوال غروب تک مباح ہے، اور غروب آفتاب سے صبح صادق کے طلوع ہونے تک مکروہ ہے اور اس تفصیل کا ثمرہ محض یہ نکلے گا کہ ۱۱ر کی صبح صادق سے پہلے اگر کوئی رمی جمرہ کرے گا تو تارک نہ قرار پائے گا، باقی افضل یہی ہے کہ دسویں تاریخ کو زوال سے قبل قبل کر لے۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۵/۱۲/۹۹ ۱۳ھ

نقشہ نظری میقات خمسہ

جحفہ ورابغ　　　　　　　　خط میقاتی حل کبیر وآفاق

خط میقاتی حل کبیر وآفاق　　　　تنعیم　　　　یلملم

ذوالحلیفہ　　حدود حرم　　کعبہ　　مسجد حرام　　خط میقاتی حل کبیر وآفاق

خط میقاتی حل کبیر وآفاق　　حل صغیر　　حل صغیر　　قرن منازل

کراچی بمبئی......... سمندر راستہ جہاز...

(خط میقاتی حل کبیر وآفاق ہندوستان وپاکستان)　　سمندر راستہ جہاز............

سمندر راستہ جہاز............

جدہ

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

عورت بغیر محرم کے حج کرے گی تو حج بکراہت تحریمی ہوگا:

میں یہاں طائف کے سرکاری دواخانہ میں کام کرتا ہوں، میری بیوی یہاں آئی ہوئی ہے، مکہ کی قربت کی وجہ سے ان پر حج فرض ہوجاتا ہے، لیکن اس مسئلہ میں مشکل یہ ہے کہ حج کے دوران جب کہ تمام ملک میں چھٹی ہے، ڈاکٹروں کو حج کی خصوصی ڈیوٹی پر لگایا جاتا ہے، مجھے یا تو مکہ مکرمہ میں حج کی بولنگ ہوگی یا کسی اور جگہ پر ہوگی۔

اس لیے مسئلہ یہ ہے کہ بیوی کے محرم کے لیے کیا کیا جائے، کیا میری موجودگی حدودِ حرم کے اندر ہونے کی وجہ سے اور بیوی کے ساتھ محرم شرعی کے نہ ہونے کے باوجود حج فرض ادا ہوجائے گا، یا پھر مجھے احرام باندھ کر ان کے ساتھ حج کے درمیان مستقل رہنا ضروری ہے یا نہیں؟ بغیر محرم شرعی کے میری بیوی کا حج ادا ہوجائے گا یا نہیں؟

ڈاکٹر سید انور حسین (ہوسپٹل طائف، سعودی عربیہ)

الجواب وباللہ التوفیق:

بخاری شریف ومسلم شریف میں روایت ہے: "لاتسافر المراة ثلاثا إلا ومعها ذومحرم أو كما قال عليه السلام" (۱)۔

اس حدیث شریف سے معلوم ہوا کہ مسافتِ قصر یا اس سے زائد کا سفر عورت کو بغیر محرم کے یا شوہر کے کرنا جائز نہیں ہے، یہ عام اور مطلق ہے، سفرِ حج میں جانے والی عورت کے لیے بھی ہے، اس لیے آپ طائف سے تو حج کرنے کے لیے بغیر اپنے ساتھ لیے ہوئے یا کسی محرم کے ساتھ گئے ہوئے تنہا نہ بھیجیں، البتہ آپ یہ کرسکتے ہیں کہ جب آپ کی ڈیوٹی مکہ مکرمہ یا منیٰ میں یا حدودِ حرم کسی جگہ میں ہونے والی ہے، آپ مکہ مکرمہ یا منیٰ میں یا حدودِ حرم میں کہیں بھی اپنی ایک قیام گاہ کرایہ پر یا عاریۃً لے لیجئے اور وہاں ساتھ لاکر اہلیہ کا قیام کرادیجئے، پھر ۸/ ذی الحجہ کو جو مناسک حج ادا کرنے کے لیے جانا وغیرہ پڑے گا وہ مسافت قصر سے بہت کم ہوگا اور مخالفت والا حکم جو اوپر حدیث پاک سے منقول ہے لاگو نہ ہوگا، کیونکہ منیٰ کا سفر ہوگا تو وہ صرف چار میل کا ہوگا، پھر منیٰ، عرفات، مزدلفہ کا سفر ہوگا وہ ۸/ ۹ میل سے زیادہ کا نہ ہوگا، اسی طرح حدودِ حرم کے ہر مقام سے کہیں سے بھی مسافت قصر نہ ہوگی، البتہ چونکہ اس سفر میں راتیں بھی گذریں گی، اس لیے اگر ممکن ہو تو آپ رات کو ان کے پاس خود رہ لیا کریں، یا ایسی معتبر اور حج کو جانے والی عورتوں کے ساتھ ان کو کردیں جن کے محرم یا شوہر ساتھ ہوں اور وقتاً فوقتاً

۱- صحیح مسلم ۱/ ۴۳۳۔

آپ بھی نگرانی کرتے رہیں، تو اس طریقہ سے اہلیہ کا حج بھی ادا ہو جائے گا اور کوئی شرعی قباحت یا خرابی بھی لاحق نہ ہوگی، ورنہ اگر عورت مسافتِ قصر کا سفر یا اس سے بھی زیادہ کا سفر طے کر کے تنہا حج ادا کرے تو حج کا فریضہ ادا تو ہو جائے گا مگر اس طرح سفر کا گناہ بھی ہوگا اور حج بکراہت ادا ہوگا، باقی مقبولیت کا مدار اخلاص پر ہے اور اس کا علم اللہ تعالیٰ کو ہے (۱)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

۱- حقیقی خالہ کو حج میں ساتھ لے جانا:

حاجی اپنی سگی وحقیقی خالہ کو ساتھ لیجا سکتا ہے یا نہیں؟

۲- سردی کی وجہ سے سر میں کپڑا لپیٹنا:

آجکل موسم حج میں سخت جاڑا ہوتا ہے تو کیا سر میں کوئی کپڑا لپیٹ سکتا ہے کیونکہ سردی کی وجہ سے بیماری ہونے کا اندیشہ ہوتا ہے، مثلاً اگر بیماری پڑ جائے تو پھر کیا سر میں کپڑا باندھ سکتا ہے اور اگر باندھے تو کیا قربانی واجب ہوگی اور اگر قران کا احرام ہو تو کیا دو قربانیاں جرمانہ کی واجب ہوں گی، یا ایک پھر یہ حکم ایک دن باندھنے کا ہے یا پورے ایام بھر باندھنے کا ہے؟

الجواب وباللہ التوفیق:

۱- لے جا سکتا ہے (۲)۔

۲- اگر ممنوع احرام عذر سے بھی کرے گا تو جزا دینی واجب ہوگی، لیکن قانون یہ ہے کہ سر ڈھانکنے میں دم تب ہے جبکہ سارا دن ڈھانکے (۳)، اور اس سے کم ڈھانکنا اگر چہ گھنٹہ بھر ہو تو صدقہ دے نصف صاع اور گھنٹہ سے کم میں ایک مشت

۱- ''ولو حجت بلا محرم جاز مع الکراھۃ، قال الشامي قوله مع الکراھۃ أي التحريمية للنھي في حديث الصحيحين: لاتسافر امرأۃ ثلاثا إلا ومعھا محرم'' (فتاویٰ شامی ۲/۴۰۰ کتاب الحج)۔

۲- اس لئے کہ حقیقی خالہ محرم ہے "حرمت علیکم امھاتکم وبناتکم واخواتکم وعماتکم وخالاتکم" (سورۂ نساء ۲۳)۔

۳- ''أو ستر رأسه بمعتاد اما بحمل اجانة أو عدل شئ فلا شئ عليه يوما كاملا أو ليلة كاملة وفي الأقل صدقة'' (الدر المختار ۳/۵۷۷)۔

گندم دے اوردن سے زیادہ میں بھی ایک ہی دم ہے اگر چہ کئی دن پہنے رہے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۶/ ۸/ ۱۳۸۵ھ

الجواب صحیح محمد جمیل الرحمٰن، سید احمد علی سعید

حجر اسود اور اس کی اہمیت:

کہتے ہیں کہ حجر اسود کو حضرت آدم علیہ السلام اپنے ساتھ جنت سے لائے تھے، اگر یہ سب درست ہے تو پھر کیا جنت میں مادی اشیا موجود ہیں، اگر یہ دنیاوی سنگ ہے تو پھر ہمارے رسول اللہ ﷺ نے اتنی اہمیت کیوں دی؟

کوئی مسلمان اگر اس کو ایک معمولی سا پتھر سمجھ کر اس کا بوسہ نہ لے تو اس کا حج درست ہوگا یا نہیں؟

الجواب وباللہ التوفیق:

ممکن ہے کہ جوہر مجردہ میں سے رہا ہو اور جب دنیا میں اتارا گیا تو متصف بالمادہ کردیا ہو، کیونکہ دنیا عالم مادیات سے ہے اور جواہر مجردہ کا اتصاف بالمادہ ممکن ہے، جیسا کہ روح جواہر مجردہ سے ہے لیکن اس کا اتصاف با جسام الحیوان ہوتا ہے حالانکہ اجسام کا مادی ہونا ظاہر ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ حجر اسود دنیاوی سنگ نہیں ہے کہ اس کو اس پر قیاس کیا جاوے، بلکہ یہ جنت کی ایک محبوب و معظم شے ہے، اسی لیے سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو ایسی اہمیت دی ہے، پھر آپ کو حکم خداوندی اسی طرح کا تھا اور یہ ایک امر تعبدی ہے اور اس میں کوئی اشکال نہیں اور جب اس کا شئے محترم ہونا عقلاً ممکن ہے اور حضور ﷺ نے معاملہ احترام کا حکم دیا ہے تو اس کی تحقیر کرنا رسول اللہ ﷺ کی اور اصل احکم الحاکمین کے حکم کی نافرمانی ہوگی، جو اپنے اندر شانِ بغاوت رکھے گی، اس لیے یہ حرکت جائز نہ ہوگی، اور اس کا تقاضا بے شک یہ ہے کہ ایسا کرنے سے حج ہی ادا نہ ہوگا۔

لیکن حضور ﷺ کی شانِ رحیمی کا ظہور ہے کہ اس کا بوسہ نہ لینے سے کفارہ جنایت بھی لازم نہ آئے گا(۱)، اور فریضہ

۱- "قال: واستلمه إن استطاع من غير أن يوذي مسلماً، لماروي أن النبي ﷺ قبل الحجر الأسود ووضع شفتيه عليه، وقال لعمر رضي الله تعالىٰ عنه إنک رجل أيد تؤذي الضعيف فلا تزاحم الناس على الحجر، ولكن إن وجدت فرجة فاستلمه وإلا فاستقبله وهلل، وكبر. ولأن الاستلام سنة والتحرز عن أذى المسلم واجب" (الہدایہ مع فتح القدیر، ص ۳۵۳، کتاب الحج) (مرتب)۔

حج ادا ہو جائے گا۔فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

حجر اسود کے استیلام کے وقت پیر نہ موڑنا:

حجر اسود کے استیلام کے وقت حضرت مفتی سعید احمد صاحبؒ نے معلم الحجاج میں لکھا ہے کہ ہاتھ سے استیلام کے وقت صرف چہرہ اور دونوں ہاتھوں کو حجر اسود کی طرف کرنے پر پیر نہ موڑے کہ یہ بہت برا ہے۔

بعض اچھے علماء کا خیال یہ ہے کہ شاید یہ سہو ہے، اس لیے کہ پیر اس طرف نہ کرنے میں ذرا لاپرواہی معلوم ہوتی ہے تو صحیح کیا ہے؟

حضرت مفتی صاحب نے جو لکھا ہے وہ صحیح ہے، یا بعض علماء کا خیال جو ہے کہ پیر بھی حجر اسود کی طرف کرے یہ صحیح ہے، ذرا اس پر روشنی ڈالیں مہربانی ہوگی!

ولی اللہ خان (نشان پاڑا روڈ ممبئی)

الجواب وباللہ التوفیق:

ضابطہ کی اور اصل بات وہی ہے جس کو حضرت مفتی سعید احمد صاحب نے معلم الحجاج میں لکھا ہے، اس لیے کہ یہ استیلام طواف کرتے ہوئے ضمناً کرنا ہوتا ہے۔

لہٰذا طواف کرتے ہوئے جو قدم جس طرح رہتا ہے اسی طرح رہنے دیں، اس رخ سے قدم پھیرنے میں انقطاع فی الشوط کا ایہام ہوتا ہے۔فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۴/۱۱/ ۱۴۰۱ھ

عمرہ کرنے سے حج فرض نہیں ہوگا:

کیا عمرہ کرنے سے حج فرض ہو جاتا ہے؟ میں عمرہ کرکے جب واپس ہوا تو ہر شخص کی زبان پر یہ کلمہ تھا کہ تم پر حج فرض ہو گیا، اب تم نے حج نہیں کیا تو دوزخ میں جاؤ گے، پھر میں اس پر پریشان ہوا اس کا کیا حکم ہے؟

الجواب وباللہ التوفیق :

محض عمرہ کرنے سے حج فرض نہیں ہوتا، بلکہ حج کی فرضیت لقولہ تعالیٰ: "من استطاع إلیه سبیلا" (۱) سے ہوتی ہے کہ جو بیت اللہ تک جانے کی استطاعت ہونے سے متحقق ہوتا ہے، لقولہ تعالیٰ: "الحج أشهر معلومات فمن فرض فیهن الحج فلا رفث الخ" (۲) جیسے نماز پنجگانہ کی نفس فرضیت عقل وبلوغ کے تحقق سے ہوجاتی ہے اور سبب وجوب صلوٰۃ اوقات صلوٰۃ سے متحقق ہوتا ہے کہ جب وقت صلوٰۃ آگیا، سبب وجوب متحقق ہوگیا کہ اگر بسبب وجوب (اوقات صلوٰۃ) پاکر نماز ادا نہ کرے گا تو گنہگار ہوگا، پس اس طرح چونکہ عمرہ میں طواف وسعی ہوتا ہے، پس جب کوئی شخص اشہر حج میں سعی وطواف بیت اللہ کرے گا تو وجوب کا سبب اشہر حج پائے جانے کی وجہ سے اب حج نہ کرے گا تو گنہگار ہوگا، نہ کہ محض عمرہ کرنے سے، پس اشہر حج سے قبل کوئی عمرہ کرے تو سبب وجوب حج متحقق نہ ہونے سے وجوب حج نہیں ہوگا، کیونکہ سبب وجوب کے پائے جانے سے پہلے وجوب نہیں ہوتا، جیسا کہ نماز کے بیان کردہ مسائل سے واضح ہوچکا۔

پس اگر اشہر حج میں عمرہ کرے گا تو حج بھی ادا کرنا اسی سال فرض ہوجائے گا اور اگر اشہر حج سے قبل عمرہ کرے گا تو وجوب کا سبب (اشہر حج) نہ پائے جانے کی وجہ سے اسی سال حج فرض نہ ہوگا، بلکہ اصل فرضیت "فمن حج البیت من استطاع إلیه سبیلا" (۳) کے حکم کے مطابق جس سال بھی ادا کرے گا حج ادا ہوجائے گا، کیونکہ اگرچہ بعض ائمہ کے نزدیک استطاعت ہوتے ہی پہلے ہی سال ادائے گی بھی فرض ہوجاتی ہے، مگر مفتیٰ بہ قول میں پہلے ہی سال ادائے گی لازم نہیں رہتی، بلکہ بعد میں بھی جس سال ادا کرے گا حج ہوجائے گا، قضا کرنا نہ کہا جائے گا، خلاصہ یہ کہ اشہر حج سے قبل محض عمرہ کرلینے سے اسی سال حج کا ادا کرنا فرض نہ ہوگا، پورا مسئلہ ذہن میں نہ آنے سے اس قسم کا خلط پیدا ہوجاتا ہے۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۳۰/۱/۱۴۰۱ھ

۱- اگر ہوائی جہاز کے ذریعہ بغیر احرام باندھے جدہ پہنچے تو دم دینا ہوگا:

ہم لوگ سعودی عرب میں شہر جہاں میں کام کرتے ہیں، ہمارا ارادہ ہوا کہ عمرہ کرکے آئیں، ہمارا ایک عزیز جدہ

۱- سورۂ آل عمران: ۹۷۔

۲- سورۂ بقرہ: ۱۹۷۔

۳- سورۂ آل عمران: ۹۷۔

میں کام کرتا تھا، ہم ظہران سے بذریعہ ہوائی جہاز جدہ بغیر احرام باندھے پہونچے اور جدہ میں ہم اپنے عزیز کے یہاں پہنچے، وہاں قریب ۴/۵ گھنٹہ ٹھہرے اور وہاں سے پھر ہم احرام وغیرہ باندھ کر مکہ معظمہ گئے اور وہاں جا کر ہم لوگوں نے عمرہ کیا، عمرہ کرنے کے بعد جب ہم لوگ جبیل آئے تو ہم نے سنا کہ چونکہ ہوائی جہاز ظہران سے جدہ میقات پر سے گذرتے ہوئے پہونچتا ہے، اس لیے ہم پر دم واجب ہوتا ہے، جب کہ ہمارا ارادہ پہلے اپنے عزیز سے ملنے کا تھا، اس کے بعد ہم لوگوں کا عمرہ کرنے کا ارادہ تھا، اس لیے پہلے تو ہمیں چند لوگوں نے بتایا کہ چونکہ تمہارا ارادہ اپنے عزیز سے ملنے کے بعد عمرہ کرنے کا ہے، اس لیے تم احرام جدہ سے پہلے بھی باندھ سکتے ہو۔

یہ لوگ جنہوں نے ہمیں پہلے اور بعد میں یعنی عمرہ سے پہلے احرام جدہ میں باندھنے کو اور عمرہ کے بعد دم واجب ہونے کو کہا یہ کوئی اچھے یعنی مولوی یا مفتی وغیرہ نہیں تھے، اس لیے اب ذہن نے یہ طے کرلیا کہ اس کا صحیح جواب معتبر علماء سے معلوم کیا جائے، برائے کرم بذریعۂ ڈاک جواب دینے کی زحمت گوارہ فرمائیں۔

۲- بحالت احرام اگر خود بخود بال ٹوٹ جائے تو کیا حکم ہے؟

میں نے حج قران کیا، جب میں عرفات کے میدان میں پہنچا تو شام کے قریب ۳ بجے تھے، چونکہ تکان پوری تھی اور میرے ساتھ ایک چھتری بھی تھی عرفات سے واپسی میں، یعنی نماز ظہر کے وقت امام صاحب کے ساتھ ظہر اور عصر ادا کر کے ہم لوگ جبل رحمت کے قریب گئے تھے۔

(اور وہاں سے فارغ ہو کر ہم لوگ واپس چلتے ہوئے میدان عرفات میں ٹھہر گئے تا کہ وقت غروب میں مزدلفہ کے لیے روانہ ہوں، وہاں تو شام کے قریب ۳ بجے تھے اور میں سر کو چھتری سے لگائے ہوئے یعنی چھتری کے سہارے اس طرح بیٹھا تھا کہ سر میرا چھتری کی اس جگہ تھا جہاں ہاتھ لگا کر چھتری کھولتے ہیں، ہوا یہ کہ اچانک ایک آدمی میرے پیچھے سے گذرا اور میں چونک گیا، اس اچانک چونکنے پر مجھے محسوس ہوا کہ میرے سر کے بال کچھ ٹوٹ گئے، اب جو چھتری کا وہ حصہ دیکھا تو اس میں ایک حصہ بال کا لگا ہوا تھا، یہ بال میں نے جان کر توڑا نہیں، آپ اس بارے میں بھی لکھیں کہ اس کے لیے مجھے کچھ کرنا ہوگا یا نہیں؟ یعنی دم یا کفارہ وغیرہ۔

۳- بیماری کی وجہ سے رمی میں نیابت :

میں نے حج کیا میں جب طواف زیارت یعنی ۱۰ تاریخ کو شیطان کو کنکریاں مارنے اور قربانی کرنے کے بعد شام کو طواف زیارت کر کے آیا تو مجھے بخار ہوگیا اور میں ۱۱ر تاریخ کو تینوں شیطانوں کو کنکری مار کر آیا اور پھر جب ۱۲ تاریخ آئی تو

چونکہ بخار کی وجہ سے میری حالت بہت خراب تھی، مجھ سے چلنا دشوار ہورہا تھا، میرے ساتھ میرا بھائی بھی تھا، جب میں کچھ دور چلا اور ساتھیوں نے دیکھا کہ اس سے چلنا دشوار ہے اور رش یعنی پبلک بھی تو پوری طرح ہے، انہوں نے کہا کہ اپنی کنکریاں بڑے بھائی کو دے دو یہ اپنی کنکریوں کے بعد تمہاری کنکریاں بھی ماردیں گے، انہوں نے ایسا ہی کیا، پہلے انہوں نے اپنی کنکریاں ماریں اور پھر بعد میں میرا نام لے کر میری طرف سے شیطانوں کو کنکریاں ماریں، اب لکھیں کہ اس بارے میں کفارہ وغیرہ دینا چاہیے یا نہیں؟

۴- کفارہ یا دم کہاں دینا ضروری ہے؟

ہم بمبئی جارہے تھے، اتفاق سے جدہ ایک رات کے لئے رکے، ہمارا ارادہ ہوا کہ مکہ مکرمہ جا کر کم ازکم طواف کرآئیں، چنانچہ ہم نے جا کر طواف کرلیا، کیا ہم نے صحیح کیا یا نہیں اگر نہیں تو کیا ہم کو اس صورت میں کفارہ ادا کرنا ہوگا؟

نوٹ: میں حنفی ہوں اگر آپ یہ لکھیں کہ ہم پر کچھ کفارہ یا دم واجب ہوتا ہے تو ہم وہ کفارہ یا دم انڈیا جا کر ادا کرسکتے ہیں یا نہیں؟ یا مکہ وغیرہ میں کرنا ضروری ہے۔ جزاکم اللہ خیراً انشاء اللہ اللہ تعالیٰ آپ کو اس کا آخرت میں اچھا بدلہ دے گا۔

شکیل احمد (سعودی عربیہ)

الجواب وباللہ التوفیق:

۱-اگر آپ کا جہاز اتنی بلندی سے پرواز کرتا ہوا حدِ میقاتی پر سے گذرا ہے کہ وہ زمین سے نظر نہیں آسکتا تو آپ پر کوئی دم دینا واجب نہیں ہے اور اگر آپ کا ہوائی جہاز اتنا نیچے نیچے پرواز کرکے گیا ہے کہ زمین پر سے نظر آسکتا ہے تو ایک دم دینا واجب ہوگا، دم دینے کا مطلب یہ ہے کہ ایک بھیڑ، یا دنبہ یا بکری خرید کر حرم شریف کی حد میں ذبح کرکے یا ذبح کراکے فقراء حرم پر صدقہ کردے اور اس میں خود یا غنی کو نہ دے، ہوائی جہاز کے محکمہ سے اس کی تصدیق ہوسکتی ہے کہ ہوائی جہاز کتنی بلندی سے پرواز کرتا ہے (۱)۔

۲-اس صورت میں آپ پر کوئی دم دینا واجب نہیں ہوا اور نہ ہی کچھ صدقہ دینا واجب ہے، البتہ آپ اگر احتیاطاً سیر آدھ پاؤ گیہوں وغیرہ صدقہ کردیں تو بہتر ہے۔

۱- ”فإن عليهما أي مكي ومتمتع دما لمجاوزة ميقات المكي بلا إحرام“(الدرمع الشامی ۲۲۶، ج۲)۔

۳-اس صورت میں بھی کوئی کفارہ یا دم وغیرہ دینا لازم نہیں ہے (۱)۔

۴-سوال سے معلوم ہوتا ہے کہ جبیل میقات سے باہر آفاق میں ہے اور وہیں سے جدہ آئے اور بغیر احرام باندھے طواف کر آئے یہ غلط ہوگیا، احرام باندھ کر جانا ضروری تھا، پھر عمرہ وطواف وغیرہ کرنا چاہیے تھا، ایک دم جنایت دینا واجب ہوگیا، یعنی ایک بھیڑ یا بکری یا دنبہ خرید کر حرم میں ذبح کرانا اور اس کا صدقہ کرنا ضروری ہے، نیز ایک عمرہ بھی احرام باندھ کر کرنا ضروری ہوگیا (۲)۔

نوٹ: ہم لوگ بھی سنی حنفی ہیں اور سب جوابات فقہ حنفی سے دیے گیے ہیں۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

دم جنایت کی ادائیگی حدود حرم میں ضروری ہے؟

(الف) سائل نے سابقہ فتوی (۹ ۱۳۳ الف) جواب ۹۶۰ الف کا حوالہ دیا ہے نیز تحریر کیا ہے کہ ہم لوگوں کو قربانی انڈیا میں بھی کرنا درست ہے یا یہاں پر ہی کرنا ضروری ہے جہاں پر ہم قیام پذیر ہیں مطلب صرف یہ ہے کہ ہم یہاں حصول معاش کے لئے آئے ہوئے ہیں اگر کوئی گنجائش ہو اور کوئی راستہ ہو تو تحریر کریں۔

کیوں کہ یہاں پر قربانی کرنے سے کافی خرچ آتا ہے اور انڈیا میں کم آئے گا، عمرہ کی قضاء ہم لوگوں نے کر لی ہے، مگر قربانی ابھی تک نہیں کی ہے، صرف آپ کی جانب سے جواب آنے کی دیر ہے، براہ کرم اگر کوئی گنجائش نکل سکتی ہو تو قرآن وحدیث کی روشنی میں مطلع فرمائیں۔

(نوٹ) اور اب سے تقریباً دو ماہ دس دن کے بعد حج آرہا ہے، لہذا اس وقت تو قربانی کرنا ہے، لہذا اگر کوئی گنجائش نہیں نکل سکتی ہو تو کیا ایک ساتھ اونٹ، گائے، وغیرہ وغیرہ میں جس جانور میں سات حصے ہوتے ہوں تو ایک ساتھ دو

۱- "ومن كان مريضا لايستطيع الرمي يوضع في يده ويرمي بها أو يرمي عنه غيره وكذا المغمى عليه، ولو رمى بحصاتين إحداهما لنفسه والأخرى للآخر جاز" (البحر الرائق، ص ۳۱۵، ج ۲ باب الاحرام) (مرتب)۔

۲- "وكل شيء فعله القارن فعليه دمان: دم لحجته، ودم لعمرته، إلا أن يتجاوز الميقات غير محرم بالعمرة أو الحج فيلزمه دم واحد، لما ان المستحق عليه عند الميقات إحرام واحد وبتاخير واجب واحد لايجب إلا جزاء واحد" (ہدایہ اولین، ص ۲۴۷، کتاب الحج) "ويجب أي الدم على من دخل مكة بلا إحرام لكل مرة" (الدرالمختار علی حاشیہ الشامی، ص ۳۲۴ ج ۲ کتاب الحج (مرتب)۔

حصے کر سکتے ہیں، یعنی ایک قربانی تو حج کی اور ایک قربانی عمرہ کی قضاء کی، آیا ان سب کی مجبوری میں گنجائش ہوگی؟ اگر کوئی گنجائش ہوتو تحریر کریں۔

الجواب وباللہ التوفیق:

عمرہ میں غلطی کی وجہ سے یہ قربانی جولازم آئی ہے اس قربانی کو دم جنایت کہتے ہیں اور دم جنایت والی قربانی کا حدود حرم میں ذبح کرنا واجب ہے، حدود سے باہر کرنا جائز نہیں ہے۔ ہاں ایسا کر سکتے ہیں کہ حج میں جو قربانی کی جاتی ہے اس میں بجائے بکرا دنبہ کے گائے یا اونٹ (ایسا جانور جس میں سات حصے ہوتے ہیں) خریدیں اور اس میں جتنے حصے چاہیں اس دم جنایت والی قربانی کے بھی رکھ لیں تو یہ جائز رہے گا(۱)، بلکہ یہ بھی کر سکتے ہیں ساتوں حصہ دم جنایت کا سات آدمیوں کے عمرہ کا ہو اور سب مل کر ایک گائے یا ایک اونٹ خرید کر ساتوں حصہ دم جنایت کی نیت سے ذبح کردیں۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

حج کی قربانی کہاں کی جائے؟

ریڈیو کویت اور پاکستانی رسالہ ''اخبار جہاں'' سے معلوم ہوا کہ دوران حج قربانی منیٰ میں نہ کرکے اپنے ملک یا گھروں میں کر سکتے ہیں۔

حافظ مہدی حسن (پوسٹ بکس ۲۴۴۳/ ریاض، سعودی عرب)

الجواب وباللہ التوفیق:

یہ مسئلہ بھی غلط بتایا اور وجہ بھی غلط بتائی یا پھر ادھوری بات بتائی، مسئلہ اس طرح ہے کہ قربانی دو طرح کی ہوتی ہے: ایک قربانی تو وہ ہے جو صاحب نصاب مقیم پر واجب ہوتی ہے، خواہ حج کرنے جائے یا نہ جائے۔

۱- "لو ذبح سبعة عن أضحية متعة، وقران واحصار وجزاء الصيد والحلق والعقيقة والتطوع فإنه يصح في ظاهر الأصول" (شامی ۳/ ۴۷۲، ۵، مطبع زکریا)۔

اگر حاجی صاحب نصاب ہے اور مکہ مکرمہ یا مدینہ طیبہ کا مکین بھی پندرہ دن سے زیادہ قیام کی نیت کرے تو اس پر قربانی واجب ہوجائے گی، اس کے بارے میں اختیار ہے کہ چاہے تو مکہ مکرمہ میں یا مدینہ طیبہ میں یا گھر پر ہی کرنے کا انتظام کرے، یا اپنے وطن میں قربانی کے لیے رقم بھیج دے کہ وطن کے لوگ وطن میں اس کی طرف سے کردیں اور اس قربانی کے بارے میں مذکورہ مصلحت سوچی جاسکتی ہے۔

اور دوسری قربانی حاجی پر بوجہ حج واجب ہوتی ہے، اس قربانی کا منیٰ میں کرنا واجب ہے اس میں گوشت کے اضاعت وعدم اضاعت پر نظر نہ ہوگی، بلکہ اس میں صرف اراقۂ دم شرعاً مطلوب ہے، اس میں مذکورہ مصلحت بیان کرنا غیر شرعی بات ہوگی، اسی طرح دم احصار اور دم جنایت کا بھی حکم ہے، کہ اس کا بھی حدودِ حرم میں کرنا واجب ہوتا ہے، اس کے بارے میں بھی مذکورہ مصلحت صحیح نہیں، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲/ ۴/ ۹۹ ۱۳ھ

منیٰ کی قربانیوں کا گوشت اور چمڑا قابل استعمال بنانے کی اسکیم:

ادارہ ہٰذا نے منیٰ کی قربانیوں کے جانوروں کے چمڑے، گوشت وغیرہ کو سائنٹفک طریقہ پر کارآمد بنا کر اس کی آمدنی سے مسلمانوں کی تعلیمی ومعاشرتی پستی کی امداد کے لیے سفارت خانہ حکومت سعودی عربیہ دہلی سے درخواست کی، معزز سفیر نے رابطہ عالم اسلامی کانفرنس سے رجوع کرنے کی ہدایت کی۔

نیز حکومتِ ہند نے مذہبی موانعات کا جواز ظاہر کر کے اس میں حصہ لینے سے مجبوری کا اظہار فرمایا۔

ان حالات میں ہمارے اس منصوبہ کی تکمیل وکامیابی کے لیے آپ کی اصابت رائے اور فتویٰ کافی اہمیت کا حامل ہے، براہ کرم اس تعلق سے فتویٰ صادر فرما کر ممنون فرمائیں!

الجواب وباللہ التوفیق:

یہ تو ظاہر ہے کہ قربانی کا گوشت وچمڑا قربانی کرنے والا خود استعمال کر ڈالے یا کسی غریب کو صدقہ کردے یا کسی غنی کو تحفہ یا ہدیہ کردے یہ سب جائز ہے (۱)، بشرطیکہ وہ واجب التصدق نہ ہو (جیسا کہ نذر کی قربانی یا میت کی طرف سے اس کی

۱- ''ویتصدق بجلدها لأنه جزء منها أو یعمل منه آلة تستعمل في البیت کالنطع والجراب والغربال ونحوها'' (ھدایۃ

وصیت کے مطابق کی ہوئی قربانی یا دم جنایت) ورنہ اس کا حکم دوسرا ہوگا۔پھر وہ غنی وغریب اس کا مالک ہونے کے بعد خود استعمال کرے یا کسی کو دیدے حتیٰ کہ چمڑے کو اگر فروخت کر کے اس کی قیمت اپنے مصرف میں صرف کردے اس کا بھی اختیار اس کو حاصل ہے۔

ہاں قربانی کرنے والا اگر خود تحفہ، ہدیہ یا صدقہ کرنے کے بجائے فروخت کردے تو اس پر اس کی قیمت کا تصدق کرنا لازم ہوگا، یہی حکم منیٰ کی قربانی اور مناسکِ حج کے اضحیہ کا بھی ہے، البتہ فرق یہ ہے کہ مناسکِ حج کا اضحیہ خالص اور اعلیٰ شعائرِ اسلامیہ میں سے ہے اور اس میں محض اظہارِ تعبد بشکل ارقہ دم ہے، جیسا کہ حضور ﷺ کے کسی موقعہ پر ستر اونٹ اور کسی موقعہ پر سواونٹ کی قربانی کرنے سے ظاہر ہے، کیونکہ نفسِ وجوبِ اضحیہ تو ایک بکری یا اونٹ کے ساتویں حصہ سے بھی ادا ہوسکتا ہے۔

اور یہ اسکیمیں اگر چہ بظاہر خوشنما ہی نہیں قدرے مفید بھی معلوم ہوتی ہیں مگر اظہارِ تعبد کے منافی ہیں اور اس مقصد کو فوت کرتی ہیں جو مشکوۃ نبوت علی صاحبہا الصلوۃ والسلام کے طرزِ عمل سے ظاہر ہورہا ہے، کیونکہ اس طرح کاربند ہونے پر بعد چندے یہ عمل (ارقہ دم) محض ایک سیاسی، تجارتی، معاشی مقصد ہوکر رہ جائے گا اور اظہارِ تعبد فنا ہوکر قلبِ موضوع، قلب ماہیت اور مسخ مذہب کا ذریعہ وسبب بن جائے گا، اس لیے اس اسکیم کو اختیار کرنا شریعت مطہرہ کے ایک اہم مقصد کو فوت کرنا ہے!

دوسرے یہ کہ مسلمانوں کی تعلیمی ومعاشی پستی کے ازالہ کی اس سے آسان اور بے کھٹکے دوسری بہت سی صورتیں موجود ہیں اور ان میں سے یہ صورت بہت ہی آسان ہے کہ ایسا نیک جذبہ رکھنے والے اگر خود صاحب نصاب نہ ہوں جب بھی اپنے گردوپیش بسنے والے اغنیاء سے پوری پوری رقم زکوٰۃ ادا کرنے اور اس قسم کے پریشان حالوں کی پریشانی رفع کرنے میں کرائیں اور اگر خود بھی صاحب نصاب ہیں تو ان پر اور بھی حکم متوجہ ہے کہ اپنی رقم کی پوری پوری زکوٰۃ صحیح طریقہ اور ان مصارف میں صرف کر کے ایسے لوگوں کی پریشان حالی دور کریں اور دور کروائیں اور ان کا باقاعدہ نظم فرمائیں۔

اسی طرح حکومتوں کو بھی اس طرف متوجہ فرمائیں کہ اموالِ باطنہ وظاہرہ دونوں کی زکوٰۃ کا صحیح نظم اور صحیح استعمال ہونے لگے۔فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲/ ۴/ ۹۹ ۱۳ھ

اخرین، ص ۴۳۴ کتاب الاضحیۃ) (مرتب)۔

بدرجہ مجبوری خواتین کے لئے بحالت حیض طواف زیارت کاحکم:

ا-حیض کی وجہ سےعورت طوافِ زیارت نہیں کرسکی یہاں تک کہ جہاز کے چلنے کا وقت آ گیا اور وہ ابھی تک پاک نہیں ہوئی دور دراز مسافت اور قلتِ نفقہ وغیرہ کے سبب مکہ مکرمہ میں لوٹ کر آنا ممکن نہیں یا بہت متعذر ہے، اور ظاہر ہے کہ اس رکن کے ترک سے حج نامکمل رہتا ہے، یہاں تک کہ فقہاء حضرات نے لکھا ہے کہ واپس آکر طواف کرنا ہی پڑے گا۔

یہ مسئلہ کثیر الوقوع ہے اور آج کے حالات سفر میں ملکی قوانین کی رو سے اور زیادہ مشکل ہوگیا ہے، چونکہ متعین تاریخ پر جہاز کی روانگی ہے اور اس کے بعد کوئی دوسرا جہاز نہیں مل سکتا۔

نیز ویزا بھی نہیں مل سکتا تاکہ قیام میں ذرا تاخیر ہو اور پھر واپس آنا بھی مشکل ہے، بہت سے لوگوں کو دوبارہ سفر نصیب نہیں ہوتا اور اگر ہوتا بھی ہے تو چند مہینہ یا چند سال کے بعد اتنی دراز مدت کے لیے الگ رہنا طوافِ رکن ادا نہ کرنے کی وجہ سے دشوار ہے، مسئلہ ہذا کے متعلق چند فقہی عبارات پیش کی جاتی ہیں:

(۱)"في الشامي نقل بعض المحشين عن مسلک ابن امير حاج: لوهم الركب على القفول ولم تطهر فاستفتت هل تطوف أم لا؟ قالوا: يقال لها: لايحل لک دخول المسجد، وإن دخلت وطفت أثممت وصح طوافک، فعليک ذبح بدنة وهذه المسئلة كثير الوقوع يتحير فيها النساء"(۱)۔

(۲)"في المبسوط السرخسي وإن كان طاف للزيارة جنباً حتىٰ رجع إلى أهله فإنه يعود إلى مكة ليطوف طواف الزيارة وإن لم يرجع إلى مكة فعليه بدنة لطواف الزيارة وعلي الحائض مثل ذالک، وليس عليها لترک الصدر شئی الخ"(۲)۔

(۳)"في البحر الرائق: بعد قول الكنز: طاف للركن محدثابدنة لوجنبا ويعيد والإعادة هي الأصل مادام بمكة وأما إذا رجع إلى أهله ففى الحدث الأصغر اتفقوا إن بعث الشاة أفضل من الرجوع، واختلفوا في الحدث الأكبر فاختار في الهداية أن العود إلى الإعادة أفضل واختار في المحيط إن بعث الدم أفضل"(۳)۔

۱-　شامی ۲/۱۸۴۔
۲-　مبسوط السرخسی ۴/۴۱۔
۳-　البحر الرائق ۳/۲۰۔

(۴)"في الهداية: وإن لم يعد وبعث بدنة أجزأه لمابينا أنه جابر له (أي بعد أن طاف للزيارة جنباً "(۱)۔

(۵)"وفي فتح القدير: لو طاف المرأة للزيارة حائضاً فهو كطواف الجنب الخ" (۲)۔

عبارت مرقومہ سے ظاہر ہے کہ جنبی یا حائضہ کا طواف صحیح ہوسکتا ہے، لیکن عدمِ اعادہ کی صورت میں منجبر بالبدنہ ہو جاتا ہے اورعدم اعادہ کی صورت یہی ہے کہ وہ وطن لوٹ آئے۔

البتہ شامی کی عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ اثم کا ہونا بھی محقق ہے کو بدنہ سے اس کا انجبار ہوجاتا ہے تو ہمارے مسئلہ میں جب ایسے قوی اعذار موجود ومحقق ہیں، کیا پھر بھی وہ عورت گنہگار ہوگی؟ حاصل یہ ہے کہ ان عبارات کے پیش نظر جو عورت حائضہ ہے اور بوقتِ روانگی جہاز اب تک پاک نہیں ہوئی وہ طوافِ رکن کرکے بدنہ ادا کرسکتی ہے یا نہیں؟ اور اعذار مذکورہ کی بنا پر اثم کا تحقق ہوگا یا نہیں؟

کیا بحالت مجبوری رمی قربانی اور حلق کے درمیان کی ترتیب ساقط ہوجائے گی؟

عند الحنفیہ متمتع اور قارن کے لیے یومِ نحر میں ترتیب بین الرمی والذبح والحلق ہے، یعنی پہلے رمی جمرہ عقبہ پھر ذبح پھر حلق کرائے ترتیب میں تقدیم وتاخیر یا تبدیل ہوتو دم واجب ہوجاتا ہے، یہ مسئلہ مسلم ہے کہ آج کے احوال کے پیش نظر ترتیب کا باقی رکھنا ایامِ حج میں مشکل ہے بلکہ نہایت ہی متعذر رہے الا ماشاء اللہ، متعذر رہونے کی یہ وجوہات ہیں:

(۱) بے حد ازدحام وہجوم۔

(۲) مذبح کا قیام گاہ سے بہت دور ہونا یعنی منیٰ میں۔

(۳) گرمی کی شدت، ان تینوں باتوں کے سبب قیام گاہ سے مذبح تک جانا کو ممکن ہے مگر بہت دشوار ہے۔

(۴) وکلاء یعنی جولوگ وکالۃً دوسروں کی طرف سے قربانی کرتے ہیں، اس میں بہت ہی کوتاہیاں کرتے ہیں، کبھی رمی سے پہلے ہی قربانی کردی یا حلق کے بعد ہی کردی اور بعض غیر مقلد تو یومِ نحر سے پہلے ہی قربانی کر بیٹھتے ہیں۔

(۵) جہالت عامہ کی بنا پر اکثر لوگ ان وکلاء پر اعتماد کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ ترتیب رمی، حلق وذبح کے درمیان کوئی چیز ہی نہیں یا ان کو خبر ہی نہیں کہ ترتیب ٹوٹ گئی۔

۱- ہدایہ ۱/ ۲۷۳۔

۲- فتح القدیر ۲/ ۶۴ ۴ کتاب الحج۔

(٦) ضعیف وبوڑھے کے حق میں تو یہ اعذار نا قابلِ تردید ہیں۔

(٧) آج کل کوپن سے جو جانور خریدے جاتے ہیں ان میں بھی زیادہ وثوق نہیں، اس لیے کہ یہ حکومتِ سعودیہ کی طرف سے فروخت کیے جاتے ہیں اور غیر مقلدین کی بنا پر وہ بھی اس ترتیب کا لحاظ نہیں رکھتے بعض لوگ یقین سے یہ نہیں کہہ سکتے کہ ہماری قربانی ہوئی، یا نہیں ہوئی اب وہ حلق کب کرے، اگر کرلیا تو خلجان اور شبہ ضرور رہے گا۔

(٨) خود مذبح میں یہ مشاہدہ ہوا ہے کہ لوگوں کے ہجوم اور جانوروں کی کثرت کی بنا پر طبیعت گھبرا جاتی ہے، اور چوٹ لگنے کا بھی اندیشہ ہے، اور اوپر سے تین میل گرمی میں پیدل چلنا پڑتا ہے، اس موقع پر گاڑی ملنا بھی مشکل اور غریب لوگوں کے پاس کرایہ بھی نہیں ہوتا۔

لہٰذا ان وجوہات کے ماتحت ضرورت سمجھ کر کیا کسی حنفی کو حق ہے کہ اس خاص مسئلہ میں شوافع کے مسلک پر عمل کرے کہ ان کی کتابوں سے عدم وجوب ترتیب ظاہر ہے، تو مذہب شوافع پر عمل کرنے سے یہ سہولت ہوگی کہ اب کسی حاجی کو اس ترتیب کا لحاظ رکھنا ضروری نہ ہوگا اور کسی قسم کا خلجان یا پریشانی نہیں ہوگی، اگر ضرورت سے قربانی پہلے کی گئی یا حلق پہلے اور قربانی بعد میں کی تو کچھ واجب نہیں ہوگا۔

اس ضروری امر میں حضرات علماء کرام سے رہنمائی مطلوب ہے۔

سراج احمد غفرلہٗ (جنوبی افریقہ، ١٠/شعبان/ ٩٨ھ)

الجواب وباللہ التوفیق:

یہ صحیح ہے کہ اگر کوئی طواف زیارت بالکل نہ کرے نہ بحالت طہارت نہ بحالت غیر طہارت بلکہ بالکل ترک کردے اور وطن کو رجوع کر جائے اور میقات سے باہر تک پہونچ جائے تو جب تک جدید احرام کے ساتھ واپس آکر طواف زیارت کا ارادہ نہ کرے، احرام حج سے باہر نہ ہوگا، اور مدت العمر تک عورت اس پر حلال نہ ہوگی، لیکن اگر طواف زیارت کر کے خروج عن المیقات کیا ہے خواہ حالت جنابت میں احرام جدید کے ساتھ واپس آکر اعادہ تو افضل ضرور ہے لیکن اگر واپس نہ آئے بلکہ دم جنایت (بدنہ) بھیج دے تو بھی کافی ہوجاتا ہے، اور انجبار ہوجاتا ہے یعنی واپس آکر طواف کرنا واجب نہیں رہتا ہے۔

اپنی پیش کردہ عبارت ۲ سے ذرا پہلے پڑھ لیجئے تو اس سے یہ مسئلہ واضح ہوجائے گا اور یہ بھی صحیح ہے کہ یہ مسئلہ کثیر الوقوع ہے اور آج کے حالاتِ سفر وغیرہ سے واپسی بسا اوقات دشوار ہوجاتی ہے۔

پھر شامی کی عبارت سے عورت کے گنہ گار ہونے کا جو اشکال پیش کیا ہے، اس پر یہ عرض ہے کہ اس عورت کے فتویٰ لے لینے اور اس کا جواب لاتحل دخول المسجد مل جانے کے باوجود مکہ میں رہتے ہوئے فتویٰ کے خلاف کر کے مسجد حرام میں داخل ہوگئی تو یہ معصیت لازم آئے گی کما اشار الیہ قول المفتی، وان دخلت و طافت أثمت۔

بہر حال خلافِ فتویٰ داخل ہوکر اگر چہ گنہگار ہوگئی تو اس پر اس کا توبہ کرنا لازم ہوگا لیکن اس کا یہ طواف صحیح ہوجائے گا اور انجبار نقصان کے لیے ذبح بدنہ لازم ہوجائے گا اور جب توبہ و ذبح بدنہ کرے گی تو انجبار مکمل ہوکر معصیت بھی ختم ہو جائے گی۔ "لأن التائب من الذنب كمن لاذنب له او كما قال عليه الصلوٰة و السلام" (۱)۔

یہ حکم ایسا ہے جیسا کہ نماز میں کسی واجب کے سہواً ترک ہوجانے پر ارتکاب معصیت ہوجاتی ہے اور جب سجدۂ سہو کر لے تو اس سے انجبار ہوکر معصیت مرتفع ہوجاتی ہے، اسی طرح یہاں بھی حکم ہوگا، کیونکہ جس طرح ترک واجب سہواً میں سجدہ سہو منجبر ہوتا ہے ایسا ہی یہ ذبح بدنہ بھی منجبر ہوتا ہے۔

اور فرق یہ ہوگا کہ نماز میں ترک واجب سہواً میں کوئی مذکر نہیں تھا، اس لیے معصیت نہ ہوگی اور یہاں فتویٰ مفتی مذکر موجود تھا، اس لیے معصیت اور اس پر توبہ کا حکم ہوگا۔

نیز آپ کی پیش کردہ عبارت سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ اگر حائضہ نے بحالت حیض طواف زیارت کرلیا مکہ میں رہتے ہوئے تو اس پر یہ حکم تھا کہ توبہ اور اعادہ کرے، یعنی دوبارہ بحالت پاکی طواف کرے، لیکن اگر اعادہ نہ کرے، اور وطن لوٹ آئے تو اعادہ کے لیے لوٹ کر آنا واجب نہیں رہتا، بلکہ صاحب ہدایہ کے نزدیک اگر چہ عود إلی الإعادہ افضل ہے، لیکن صاحب محیط کے نزدیک صرف بدنہ (برائے دم جنایت) بھیج دینا افضل ہے، لہٰذا اگر عود إلی الإعادہ کرے گی تو فضیلت ہوگی۔

نیز البحر الرائق کی عبارت اور شامی کے سیاق وسباق سے یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ بحالت حیض طواف کرنے کے بعد اگر مکہ میں رہتے ہوئے پاک ہوکر طواف کرنے کا موقع نہ ملے اور پاکی کے انتظار میں مکہ میں رہنا اختیار میں نہ رہے، مثلاً قافلہ اس کا چل دے گا یا اس کا جہاز چھوٹ جائے گا اس مجبوری سے بغیر اعادہ وطن چلی گئی تو حسبِ نصِ شرعی "لايكلف الله نفساً إلا وسعها" (۲) اس کے چلے جانے پر مواخذہ نہ ہوگا۔

۱- مشکوٰۃ المصابیح/۲۰۶۔

۲- سورۃ البقرۃ ۲۸۶۔

تقریب فہم کے لیے چند فقہی عبارات پیش کی جاتی ہیں:

(۱)"وأما ترک الواجبات بعذر فلا شئي عليه ، ثم مراد هم بالعذر مايكون من الله تعالىٰ، فلو كان من العباد فليس بعذر (إلى قوله) بخلاف ما إذا منعه خوف الازدحام فإنه من الله تعالىٰ فلا شئي عليه" (۱)۔

(۲)"وفي الشامية: إن ترک الواجب بعذر مسقط للدم" (۲)۔

(۳)"وتجوز أي النيابة في الرمي عند العذر" (۳)۔

(۴)"ولو طاف المفرد وغيره قبل الرمي والحلق لاشئي عليه ويكره لترک السنة" (۴)۔

(۵)"وليس أن يبيت بمنى ليالي أيام الرمي، فلو بات بغير ها متعمدا کره ولاشئي عليه" (۵)۔

(۶) جو شخص کھڑے ہوکر نماز پڑھ سکتا ہو یا جمرات تک پیدل یا سوار ہوکر آنے میں سخت تکلیف ہو یا مرض بڑھ جانے کا یا مرض پیدا ہوجانے کا قوی اندیشہ ہو تو وہ معذور ہے (۶)۔

(۷) اگر معذور کا عذر دوسرے سے رمی کرانے کے بعد ایام رمی کے رہتے ہوئے زائل ہوجائے تو بھی دوبارہ خود رمی کرنا ضروری نہیں رہتا (۷)۔

(۸) ذبح میں نیابت کا ثبوت عام اور شائع ہے، جیسا کہ آپ کی پیش کردہ عبارت ۲ سے بھی اخذ ہوتا ہے۔

ان عبارتوں سے معلوم ہوا کہ ترتیب بین الرمی والذبح والحلق اگرچہ واجب فی نفسہ ہے لیکن عذر شرعی کی وجہ سے اگر چھوٹ جائے یا ٹوٹ جائے اور اس پر عمل نہ ہو سکے تو اس پر دم جنایت وغیرہ یا کوئی وزر یا کفارہ وغیرہ نہ آئے گا بلکہ ادائیگی حج بلا کراہت مکمل ہوجائے گی۔

اور جناب کے ذکر کردہ اعذار مذکورہ میں ۱ کے عذر کا مبیح للترک ہونا تو ظاہر ہی ہے اور باقی غیروں میں بھی ایسا

۱- غنیۃ الناسک فی بغیۃ المناسک ۱۳۸۔
۲- ۲/۲۰۶۔
۳- غنیۃ ۱۰۰۔
۴- شرح مسلک ۱۵۵۔
۵- غنیۃ ۹۵۔
۶- زبدۃ المناسک ناقلاً عن اللباب ۱۶۵۔
۷- زبدۃ المناسک ۱۶۶۔

شخص جوضعیف وبوڑھا ہو یا اتنی لمبی مسافت تک چلنے کا عادی نہ ہو اور شدید گرمی ودھوپ میں چلنے میں ظن غالب ہو کہ بیمار ہو جائے گا یا مرض بڑھ جائے گا یا چوٹ وغیرہ نا قابل تحمل پیدا ہو جائے گی اور سواری نہ ملے گی تو اس کے حق میں یہ ترتیب واجب نہ رہے گی بلکہ محض حسب استطاعت امتثال کا حکم رہے گا، اور وہ اعذار کی وجہ سے اپنے نائب کے ذریعہ رمی وذبح دونوں کرا سکے گا، اور نائب کے ذریعہ کرانے کے بعد خود عذر مبیح زائل ہو جائے جب بھی دوبارہ خود عمل کرنا اس پر لازم نہ رہے گا۔

اور ۳، ۵، ۶ میں احتیاط سے کام لینے کا حکم متوجہ ہو جائے گا، مثلاً اپنی جماعت وگروہ سے جو متدین اور محتاط ہو اور اس امر پر قادر ہو اور اس سے یہ ظن غالب ہو کہ صحیح وکالت ونیابت انجام دے دے گا تو اس سے یہ کام کرالیا جائے اور اس کو ہدایت کردی جائے کہ قربانی سے فارغ ہو کر جلد سے جلد اطلاع کرے، پھر جب تک اچھی طرح مقررہ وقت کے ساتھ قربانی ہو جانے کا ظن غالب نہ ہو جائے حلق نہ کرائیں، البتہ طواف وحلق میں نیابت درست نہ ہوگی۔ نیز طواف زیارت کا ان سب چیزوں کے بعد ہونا واجب نہیں ہے، بلکہ صرف سنت ہے **كما في العبارة الرابعة**۔

اس لیے طواف زیارت کا ان چیزوں سے پہلے کرلینا علماء نے صرف مکروہ لکھا ہے اور کوئی دم یا صدقہ وغیرہ لازم ہونا نہیں لکھا ہے، خاص کر ایسی مجبوری کی حالت میں کراہت بھی نہ ہوگی، لہذا ایسی معذوری کی حالت میں اگر بآسانی ہو سکے تو خود طواف کے لیے چلا جائے اور طواف کرے، اور پھر قربانی ہو جانے کی اطلاع مل جائے تو حلق کرائے، حلق کرالینے کے بعد عورت بھی حلال ہو جائے گی۔

اور جب ان تمام مسائل میں بوقت معذوری فقہ حنفی سے بھی مذکورہ گنجائش نکل آتی ہے تو اب تقلید حضرت امام شافعیؒ کرنے کا سوال ہی ختم ہو جاتا ہے۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۱/۹/۱۴۰۸ھ

عمرہ میں بال قصر کرانے کی مقدار (سر کے ایک طرف کا بال کٹانا درست نہیں):

۱- جدہ سعودی عرب میں مقیم اکثر حضرات فرصت اور چھٹی کے دنوں میں بیت اللہ شریف جا کر ایصال ثواب کے لئے اپنے خاندان کے مرحومین کی طرف سے عمرہ ادا کرتے ہیں، عمرہ میں طواف اور سعی کے بعد بالوں کو ترشوانے یا قصر کروانے کا شرعی حکم کیا ہے؟ کتنی مقدار میں بال نکلوانے چاہئیں جبکہ حسب ذیل صورتیں واقع ہوں:

۱- ایک شخص کے کافی لمبے بال ہوں۔

۲-ایک شخص کے مختصر سے بال ہوں۔

۳-ایک شخص کے مکمل صاف ہوں۔

مندرجہ بالاصورتوں میں ایک ہی حکم کا اطلاق ہوگا یا علیحدہ صورتیں ہیں۔

۲-کیا ایک شخص مسلسل عمرہ کر کے ¼ کے حساب سے چار عمروں میں اپنا سر صاف کرواسکتا ہے؟ جبکہ بعض فقہ کی کتب میں یہ بات درج ہے کہ حضور ﷺ نے اس طرح کے عمل کو سخت ناپسند فرمایا ہے اور بجائے مسلسل عمرہ کے طواف کی فضیلت بتلائی ہے، براہ کرم اس سلسلہ میں شرعی حکم سے مطلع فرمائیں۔

۳-سعودی، مصری، سوڈانی، اور یمنی حضرات بعد سعی کے چاروں طرف سے مختصر سے بال قینچی سے نکال لیتے ہیں، ان میں اکثر شافعی مسلک کے ہیں، اگر ایسی سہولت دوسرے مسلک میں ہو تو کیا اسے حنفی مسلک والے اپنا سکتے ہیں یا نہیں؟ براہ کرم اس سلسلہ میں رہنمائی فرمائیں۔

محمد نوراللہ شریف (پوسٹ بکس ۹۰۲۰ جدہ سعودی عرب)

الجواب وبالله التوفيق:

قرآن پاک میں ہے: ” محلقين رؤسكم و مقصرين لا تخافون “ (۱)، محلقین روس پورے سر کے بال کٹانے والے کو کہتے ہیں، نیز حدیث پاک میں مثلاً مسلم شریف میں سر کا کچھ حصہ مونڈانا اور کچھ چھوڑ دینا اس طرح کچھ حصہ کا بال کٹانا اور کچھ حصہ کا بال چھوڑ دینا منع ہے (۲)، اس لئے آیت کریمہ اور احادیث کی روشنی کے بعد یہی حکم دیتے ہیں کہ یا تو پورے سر کا حلق کرائے یا پورے سر کا قصر کرائے اور اگر سر پر بال ہی نہ ہوں خواہ مونڈا لینے سے یا بال پیدا نہ ہونے یا جھڑ جانے سے تو سر پر ہلکے ہاتھ سے محض استرا پھیر والیں اس طرح پر کہ جلد کو نقصان نہ پہنچے (۳)، غرض آیت کریمہ اور

۱- ”لقد صدق الله رسوله الرؤيا بالحق، لتدخلن المسجد الحرام إن شآء الله امنين محلقين رء وسكم ومقصرين لاتخافون ط فعلم مالم تعلموا فجعل من دون ذلك فتحا قريبا“ (سورۃ الفتح: ۲۷)۔

۲- ”نافع عن ابن عمرؓ ان رسول الله صلى الله عليه وسلم نهى عن القزع قال: قلت لنافع وما القزع؟ قال: يحلق بعض رأس الصبي ويترك بعض“ (مطبع اصح المطابع مسلم کتاب اللباس باب کراہیۃ القزع ۲/ ۲۰۳، ابن ماجۃ ۲۵۹، مکتبہ تھانوی)۔

۳- ”فأما إذا كان لم يكن (أي الشعر) أجرى الموسىٰ على رأسه لأنه إذا عجز عن تحقيق الحلق فلم يعجز عن التشبه بالحالقين وقد قال النبي صلى الله عليه وسلم من تشبه بقوم فهو منهم“ (بدائع کتاب الحج بیان الحلق والتقصیر: ۲)۔

احادیث مرفوعہ کی متابعت میں تینوں صورتوں کا یہی حکم ہے البتہ عورت کو مردوں کی مشابہت جائز نہیں ہے (۱)، اس لئے عورتوں کا بال مونڈ دینا یا سارے بال منڈا دینا جائز نہیں بلکہ چوٹی کی انتہاء سے صرف دو تین انگل بال کٹوا لینا کافی ہے (۲)۔

۲-حنفیہ کے نزدیک یہ صورت جائز نہیں ہے۔آیت کریمہ اور احادیث صحیحہ کے خلاف ہے بلکہ وہ طریقہ ہے جو اوپر مذکور ہوا،طواف وعمرہ میں کون زیادہ افضل ہے اس میں تفصیل ہے عمرہ تو عمر میں صرف ایک مرتبہ بشرط استطاعت و قدرت واجب ہے (۳)، اور طواف زیارت فرض عین ہے اس لئے یہ طواف تو یقیناً عمرہ سے افضل ہے، باقی نفلی طواف اور نفلی عمرہ میں بعض علماء نے کہا ہے کہ طواف افضل ہے مگر قول محقق آفاقی کے لئے یہ ہے کہ عمرہ میں جتنا وقت لگتا ہے اگر اس تمام وقت کو طواف نفلی میں مشغول رکھے تو یہ طواف بے شک عمرہ سے افضل ہے ورنہ عمرہ افضل ہے اور پانچ دنوں (۹/ذی الحجہ ۱۳/ذی الحجہ) میں عمرہ کرنا ممنوع اور مکروہ ہے (۴)، باقی اور تمام سال ان میں حنفیہ کے نزدیک عمرہ کرنا آفاقی کے لئے مستحب ہے جب موقع ملے اور جتنا موقع ملے عمرہ کرسکتا ہے اور افضل ہے، البتہ حضرت امام مالکؒ کے نزدیک سال میں صرف ایک مرتبہ عمرہ کرسکتا ہے (۵)، اور حنفیہ کے علاوہ دیگر ائمہ کے نزدیک کچھ بحث ہے كما اشار إليه ابن عابدين بقوله:

۱- "عن ابن عباسؓ قال: لعن رسول الله صلى الله عليه وسلم المتشبهات بالرجال من النسآء والمتشبهين بالنساء من الرجال" (ترمذی ابواب الاستیذان والادب باب ماجاء فی کراہیۃ المتشبہات بالرجال من النساء ۱۰۶/۲، مکتبہ اشرفی بکڈپو)۔

۲- "عن عائشةؓ ان النبي صلى الله عليه وسلم نهى ان تحلق المرأة رأسها" (ترمذی ابواب الحج باب ماجاء فی کراہیۃ الحلق للنساء ۱۸۴/۱)، "وعن ابن عباس قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: ليس على النساء حلق إنما على النساء التقصير، وقال في البذل وقدر التقصير فإنه بقدر الأنملة. قال الشوكاني فيه دليل على ان المشروع في حقهن التقصير وقد حكى الحافظ الاجماع على ذالك" (بذل المجہود فی حل ابوداؤد کتاب الحج باب الحلق والتقصیر ۱۸۴/۳، مکتبہ اشرفیہ)، "قال في البدائع لأن الحلق في النساء مثلة ولهذا لم تفعله واحدة من نساء رسول الله صلى الله عليه وسلم ولكنها تقصر فتاخذ من اطراف شعرها قدر الأنملة. لكن اصحابنا قالوا: يجب أن يزيد في التقصير على قدر الانملة لأن الواجب هذا القدر من اطراف جميع الشعر واطراف جميع الشعر لايتساوى طولها عادة بل تتفاوت، فلو قصر قدر الانملة لايصير مستوفيا قدر الانملة من جميع الشعر بل من بعضه، فوجب ان يزيد عليه حتى يستيقن باستيفاء قدر الواجب فيخرج عن العهدة بيقين" (بدائع کتاب الحج باب حکم الحلق ۳۲۹/۲-۳۳۰، مکتبہ زکریا)۔

۳- "قال أصحابنا: إنها واجبة كصدقة الفطر والأضحية والوتر ومنهم من أطلق اسم السنة، وهذا الإطلاق لاينافي الواجب وشرائط وجوبها فهي شرائط وجوب الحج لأن الواجب ملحق بالفرض في حق الاحكام" (بدائع کتاب الحج والعمرۃ ۴۷۸/۲-۴۷۹، مکتبہ زکریا)۔

۴- "وعند أبي حنيفة يكره العمرة في خمسة أيام، يوم عرفة، والنحر، وأيام التشريق" (عمدۃ القاری شرح بخاری، کتاب العمرۃ جلد۷/۱۰۴، مکتبہ زکریا)۔

۵- "وقال مالك واصحابهٗ: يكره أن يعتمر في السنة الواحدة أكثر من عمرة واحدة" (عمدۃ القاری شرح بخاری کتاب العمرۃ

ونظیره ما أجاب العلامة القاضی ابراهیم بن ظهیره المکی حیث سئل هل الأفضل الطواف او العمرة، من ان الارجح تفضیل الطواف علی العمرة إذا شغل به مقدار زمن العمرة (شامی ۲ تحت مطلب العمرة أفضل من الطواف وهو أفضل من العمرة)۔ باقی امام ابوحنیفہ کا مسلک اوپر لکھ دیا گیا کہ پانچ مذکورہ دنوں کے علاوہ ہمیشہ عمرہ کرنا مستحب ہے۔

۳-سعودی، مصری، سوڈانی وغیرہ جو کرتے ہیں کہ مختصر بال چاروں طرف سے کٹوا لیتے ہیں، پورے سر کا نہ تو حلق کراتے ہیں نہ قصر کراتے ہیں آیت کریمہ اور احادیث کے مطابق نہیں ہے، بلکہ حنفیہ کے نزدیک وہی طریقہ ہے کہ اگر منڈانے کے بعد سر پر بال نہ رہیں تو بار بار زمی سے استرہ پھیر والیں اور بس۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

اگر کوئی شخص ارکان حج کی ادائیگی کے بعد حلق وقصر نہ کراتا ہو؟

۱۔ایک صاحب چھ ۶ سال سے ریاض میں مقیم ہیں ہر سال حج بھی کرتے ہیں اور ممکن ہے دوران سال کبھی عمرہ بھی کرتے ہوں بدقسمتی سے حلق یا قصر نہیں کرتے زیادہ سے زیادہ چار پانچ جگہ سے چٹکی چٹکی بال قینچی سے کاٹ لئے وہ کہتے ہیں کہ یہاں کے علماء کا فتوی ہے کہ پہلے حج کے بعد حلق یا قصر ضروری نہیں حج کے دو تین ماہ بعد یا جب ضرورت ہو جہاں بھی ہو تو بال کٹواتے ہیں اب اگر وہ تلافی مکافات پر آمادہ ہو تو کیا کوئی ایسی صورت ہے کہ ان کے سابقہ حجوں کی تکمیل صحیح طریقہ پر ہوجائے اور گناہ بھی معاف ہوجائیں، اس سال بھی حج کے لئے ایسا ہی کیا، لیکن ۱۵ پندرہ ذی الحجہ کو اس بات پر آمادہ ہو گئے کہ حدود حرم میں جا کر حلق یا قصر کے بعد بکری یا بھیڑ ذبح کرتا ہوں اگر وہ ایسا کرلے تو کیا اس سال حج صحیح ہو جائے گا، ایسا شخص حلق یا قصر کر کے حلال نہیں ہوا جب احرام کی پابندیوں سے باہر نہیں۔

الف -تو کیا سلے ہوئے کپڑے پہنیں، داڑھی منڈانے، ناخن کٹوانے اور خوشبو لگانے، میل صاف کرنے، بیوی کے پاس جانے کی وجہ سے جنایات کے ارتکاب کی بنا پر اس کی جزا ادا کرنے کا پابند ہے؟

ب:۔جزاء کی مقدار (دم یا صدقہ) کیا ہوگی؟

ج:۔اگر صدقہ واجب ہو تو اپنے وطن میں مساکین کو دے سکتا ہے یا حرم شریف کے اندر دینا ضروری ہے؟

۷/۱۰۴، مکتبہ زکریا)۔

الجواب وباللہ التوفیق:

اگر سر پر بال باقی نہ رہیں تو صرف استرہ پھیر لینا یا پھیرالینا بھی کافی ہو جائے گا (۱)، اور قصر جڑ سے کاٹنا ضروری نہیں رہتا بلکہ ایک انگلی یا اس سے زیادہ لمبا کاٹنا کافی ہو جاتا ہے (۲)، سالہائے گذشتہ کی ان غلطیوں سے چھٹکارے کے لئے یہ کرے کہ میقات سے احرام باندھ کر آئے اور طواف بیت اللہ کر کے دم دیدے یعنی قربانی کر دے اور اصل تو یہ ہے کہ جتنی مرتبہ ایسی غلطی کی ہے سب کے لئے الگ الگ دم دیدے اگر اتنی قدرت نہ ہو تو جتنے دم کی قدرت ہو ان کے دم دیدے یا کم از کم ایک دم دیکر بقیہ کی تلافی کے لئے توبہ واستغفار کرے اور سال کے اندر کی غلطیوں کے لئے ہر ایک کے عوض میں ایک دم دینا واجب ہے پس اس سال جو غلطی کی ہے اس میں میقات سے احرام باندھ کر طواف کر کے دم دینا واجب ہے پھر ہر دم میں ایک بھیڑ یا بکری کا حرم کے حدود میں ذبح کرنا لازم ہے (۳)، اس طریقہ سے حج صحیح ہو جائے گا اور اگر خود جا کر ایسا نہ کر سکے تو دم کی قیمت بھیج کر حرم میں قربانی کرادے حرم کے باہر قربانی کا اعتبار نہ ہوگا۔

الف: ہاں ان صورتوں میں جزا ادا کرنے کا پابند ہے۔

ب: جزاء کی مقدار دم ہے۔

ج: ۔صدقہ حرم شریف میں خود دینا یا کسی کے ذریعہ بھیج کر وہاں ہی دینا واجب ہے جنایت کا دم یا صدقہ جو بھی ہو اس کو حرم میں دینا واجب ہے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

۱-بحالت احرام بنیان یا سلی ہوئی چادر پہننے کا حکم:

کیا بنیان پہن سکتا ہے، تہ بند یا احرام کی چادر کہیں پھٹی ہو تو کیا سل کر باندھ سکتا ہے یا نہیں؟

۲-ارکان چھوٹنے یا ترتیب میں تقدیم وتاخیر کا حکم:

کوئی نسک چھوٹ گیا یا ترتیب میں تقدیم وتاخیر ہوگئی تو کیا قران کی حالت میں دو قربانی کرے یا ایک کرے؟

۱- "من لم یکن علی رأسه شعر فعلیه ان یمر الموسی علی رأسه" (ہدایہ ۱/ ۲۵۰، مکتبہ تھانویہ دیوبند)۔

۲- "والتقصیر ان یأخذ من رؤس شعره مقدار الانملة" (ہدایہ ۱/ ۲۵۰، مکتبہ تھانوی دیوبند)۔

۳- ہدیا بالغ الکعبة، سورۃ المائدہ ۹۵۔

۳- بحالت احرام خون نکلنے سے کیا دم واجب ہوگا؟

احرام کی حالت میں مرض کی وجہ سے ڈاکٹر نے سوئی لگائی جس سے قدرے خون نکلا تو کیا دم واجب ہوگا، ایسے ہی اگر مسواک کیا جس سے دانتوں سے خون نکلا تو کیا واجب ہوگا؟

۴- قران کے حج کا احرام باندھنے والے کے لئے عمرہ کرنا:

قران کے حج کا احرام باندھنے والا مکہ میں جا کر عمرہ کرے گا، پھر احرام کے ساتھ مکہ میں مقیم رہے گا پھر نفلی طواف کرتا رہے اسکے بعد آٹھ ذی الحجہ کو منیٰ جائے پھر وہاں سے عرفات جائے پھر مزدلفہ آکر رات گذارے پھر ذی الحجہ کو آکر کنکری مارے اور قربانی کرے اور حجامت بنوا کر زیارت کرے اور سعی صفا ومروہ کرے پھر منیٰ جائے اور ۱۱- ۱۲ ذی الحجہ کو قیام کرکے کنکریاں مار کر واپس آئے اور طواف الوداع کرکے مکان ہندوستان آوے تو کیا اس صورت میں حج مکمل ہوگیا؟

الجواب وباللہ التوفیق:

۱- بنیان پہننا جائز نہیں ہے، کیونکہ اس میں آستین ہوتی ہیں اور آستین میں ہاتھ ڈالکر پہننا منع ہے جس پر جزا لازم ہوگی، احرام کی سلی ہوئی چادر پہننا جائز ہے لیکن ترک اولیٰ ہے۔

۲- قران کی حالت میں بھی ایک جنایت پر ایک ہی دم واجب ہوگا۔

۳- دونوں صورتوں میں کوئی جزا لازم نہیں، خون کا نکالنا محظور احرام نہیں، جیسے فصد لینا، مسواک کرنا ہر حالت میں سنت ہے۔

۴- یہ ترتیب صحیح ہے، اس سے حج مکمل ہوگیا، کوئی نسک نہیں چھوٹا۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

الجواب صحیح محمد جمیل الرحمٰن سیوہاروی، احمد علی سعید نائب مفتی دارالعلوم دیوبند ۲۶/ ۸/ ۸۵ ۱۳ھ

عمرہ کے احرام کی چادر کا کفن میں استعمال:

عمرہ کے لئے جو دو کپڑے استعمال کرتے ہیں وہ کیا مرنے کے بعد کفن میں استعمال کرسکتے ہیں یا نہیں؟

محمد شفیع (الجزب سعودی عربیہ)

الجواب وباللہ التوفیق:

عمرہ میں جو دو ۲/ کپڑے استعمال ہوتے ہیں ان کو کفن میں بلا شبہ استعمال کرنا جائز ہے، بلکہ ان کا کفن میں استعمال کرنا افضل ہوگا۔

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دار العلوم دیوبند سہارنپور

باب الحج عن الغیر

حج بدل کے لئے آمر کے نفقہ اور اس کے وطن سے جانا ضروری ہے؟

ایک صاحب استطاعت اور صاحب نصاب میاں بیوی نے ۱۹۷۶ء میں حج کے لیے درخواست دی تھی، مقدر کی بات اس سال قرعہ اندازی میں نام نہیں آیا، بینک ڈرافٹ جو حج کمیٹی بمبئی نے واپس کردیا تھا وہ بینک میں محفوظ کردیا۔

پھر ہوا یہ کہ ان ہی کے ایک بیٹے نے والدین کے بغیر علم و اطلاع کے ایک درخواست حج کے لیے دی تھی تاکہ حج کے بعد ملازمت مل جائے تو اختیار کرلیں، بیٹے کا نام قرعہ میں آنے اور اپنا نام نہ آنے پر بڑے رنج و غم کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ جن لوگوں پر حج فرض ہے ان کا نام قرعہ میں نہیں آیا، لیکن جو حج کے عنوان پر ملازمت کرنا چاہتے ہیں ان کا نام آگیا، دوسرے سال صاحب موصوف کو موتیا بند کا آپریشن ہونے والا تھا، اس لیے آپریشن بعد آئندہ سال یعنی تیسرے سال حج کرنے کا ارادہ کرلیا تھا، اسی عرصہ میں صاحب موصوف کی اہلیہ محترمہ کا انتقال ہوگیا۔

چوتھے سال وہ خود علیل رہنے لگے جس کی وجہ سے دوبارہ حج کے لے درخواست نہیں دی جاسکی۔

صاحب موصوف نے دوران علالت ان دو بیٹوں میں سے جو مدینہ منورہ میں ملازمت کے سلسلہ میں مقیم ہیں، ان میں سے ایک کو خط لکھا کہ میری صحت دن بدن علالت کی وجہ سے گرتی جارہی ہے، تم اپنے بھائی سے کہہ دو کہ وہ میری طرف سے حج بدل کرلیں اور اس کے اخراجات تم خود اپنے پاس سے ادا کردو۔

چنانچہ ایک بیٹے نے والد کی اجازت سے حج کرلیا، صاحب موصوف کا انتقال ہوگیا ہے، اب ان کے بیٹوں کا کہنا ہے کہ مدینہ منورہ میں رہنے والے بیٹے نے حج بدل کرلیا ہے اب پھر حج بدل کرانے اور کرنے کی ضرورت نہیں۔

لیکن دیگر عزیز و اقارب کا کہنا ہے کہ جس کا حج بدل ہو اس کی طرف سے دوسرا حج بدل کرنے والا شخص اس کے وطن سے حج بدل کو جائے۔ اب سوال یہ درپیش ہے کہ صورتِ مذکورہ میں حج بدل ہوا کہ نہیں، اگر نہیں ہوا ہے تو پھر حج بدل کرنے والا شخص صاحب موصوف کے وطن سے ہی حج کے لیے سفر کرے، اور کیا یہ بھی ضروری ہے کہ صاحبِ موصوف کے چھوڑے

ہوئے مال ہی سے حج بدل پرخرچ کیا جائے۔

سید امیر حسن (مکان ۵۶ ۳ کلاس جدید، جدید حیدرآباد)

الجواب وبالله التوفيق:

زندگی میں حج بدل کرانے کے لئے ضروری ہے کہ جس کی طرف سے حج بدل کرنا ہو اس کے نفقہ سے اور اسی کے وطن سے کیا جائے: ''ومن شرائط النفقة من مال الآمر كلها أو أكثرها ، قال الشامي: قال في البحر: وبهذا علم أن اشتراطهم أن تكون النفقة من مال الأمر احترازاً عن التبرع، لامطلقا الخ'' (۱)۔

صورت مسئولہ میں ایسا نہیں ہوا ہے، اس لیے از روئے قیاسِ جلی تو یہ حج بدل جس کو لڑکوں نے اپنے پیسے سے باپ کے حکم کی بنا پر اور صرف مدینہ طیبہ سے کردیا کافی نہ ہوگا، البتہ از روئے استحسان وقیاس خفی اور مطابق حدیث خثعمیہ رضی اللہ عنہا امید قوی ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو قبول فرمالیں (۲)۔

بہر حال لڑکے کا یہ حج کردینا لغو وبے کار نہیں ہوگا، بلکہ تقرب الی الاجابة والقبولية ہوگا، مرنے کے بعد مورث کے تہائی مال سے اور اس کے وطن سے حج بدل کرانا اس وقت واجب ہوتا ہے جب مرنے والے پہ حج فرض رہا ہو اور وہ وصیت بھی حج بدل کروانے کی کرجائے اور یہاں یہ بھی نہیں ہے، یعنی موصی نے اپنے مرنے کے بعد حج بدل کرانے کی وصیت نہیں کی ہے، اس لیے وارثین پر حج بدل کرانا واجب نہیں ہے۔

البتہ اگر وارثین اپنے طور پر خود والدین کی جانب سے حج کردیں یا کرادیں تو بڑی فضیلت اور ثواب کا کام ہوگا اور والدین پر سے سقوطِ فرض بھی ہوجائے گا (۳)۔

۱- فتاویٰ شامی ۲/۲۴۰ کتاب الحج۔

۲- ''ثم ظاهر المذهب أن الحج يقع عن المحجوج عنه يعني امر وبذالك تشهد الآخبار الوارد ة في هذا الباب، فإنه صلى الله عليه وسلم قال للخثعمية: رضي الله عنها حين قالت: إن أبي شيخ كبير لا يستطيع أن يستمسك على الراحلة أفيجزيني أن أحج عنه؟ قال: نعم حجي عن أبيك واعتمري'' (فتح القدیر، ص ۶۶ ج ۳ باب الحج عن الغیر فان کان علی أحدهما حج الفرض وأوصی به لایسقط عنہ تبرع الوارث عنہ بمال نفسہ)۔

۳- ''وإن لم يوص به تبرع الوارث عنه بالاحجاج أو الحج بنفسه، قال أبو حنيفة رحمه الله: يجزيه إن شاء الله تعالى، لقوله عليه السلام للخثعمية: أرأيت لو كان على أبيك دين؟ الخ'' (شامی، ص ۲۴۵، ج ۲ کتاب الحج)۔

حاصل کلام یہ نکلا کہ لڑکے اگر اب حج بدل نہ کرائیں تو ان پر کوئی گرفت نہیں، البتہ جب اللہ نے موقع میسر فرمایا ہے تو والدین میں سے ہر ایک کی جانب سے حج پھر کرڈالیں مزید فضیلت اور اجر وثواب کے مستحق ہوں گے (۱)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

حج بدل کرنے والا آمر کی اجازت کے بغیر تمتع کرسکتا ہے یا نہیں؟

۱- حج بدل کرنے والا تمتع کرسکتا ہے یا نہیں؟ اور اس مسئلہ میں باذن لامر اور بغیر اذنہ دونوں کا حکم یکساں ہے یا اذن کے بعد کرسکتا ہے، اگر اذن کے بغیر کرسکتا ہو تو جس صورت میں حج عن المیت کیا جارہا ہو، ورثہ کی اجازت کیا اس حج کے لیے جانے والے شخص کے لئے کافی ہو جائے گی یا نہیں؟

۲- اور یہ حج بوصیت حج یا تبرع وارث ہو اس مسئلہ میں دونوں کا ایک حکم ہوگا یا مختلف؟ براہ کرم سب صورتوں کا واضح جواب مرحمت فرمایا جائے تا کہ سمجھنے میں خلجان نہ ہو۔

الجواب وباللہ التوفیق:

۱- محجوج عنہ آمر پر اگر حج فرض تھا اور بوجہ معذوری خود نہیں جا سکتا ہے بلکہ اپنی نیابت میں کسی کو حج بدل میں بھیجنا چاہتا ہے تو اس صورت میں حج بدل کے صحیح ہونے کے لیے بیس سے زائد شرطیں ہیں، جو باب المناسک وغیرہ میں تفصیل سے مذکور ہیں:

منجملہ ان کے جو شرطیں مامور حج بدل کے لیے جانے والے شخص سے متعلق ہیں وہ یہ ہیں:

الف: جب تک محجوج عنہ (آمر) مامور کو حج قران یا تمتع کی اجازت نہ دیدے، مامور کو حج قران یا تمتع کرنا جائز نہ ہوگا، اگر کرے گا تو حج بھی آمر کا نہ ہوگا بلکہ مامور کا ادا ہوگا اور اس صورت میں مامور پر ضمان لازم آئے گا، جو حج بدل کے لیے گیا ہے (۲)۔

ب: اور اگر آمر محجوج عنہ نے قران اور تمتع کی اجازت دے دی ہے خواہ مجملاً ہی دی ہو، مثلاً بایں طور کہ تم کو اختیار

۱- "من حج عن أبيه فقد قضى عنه حجته له ولو كان له فضل عشر حجج" (فتح القدیر ۳/۱۶۸، باب الحج عن الغیر) (مرتب)۔

۲- "الرابع: الأمر أي بالحج فلا يجوز حج غيره بغير إذنه" (شامی ۲/۲۳۹، باب الحج عن الغیر)۔

ہے کہ میری طرف سے جس طرح چاہو حج بدل کرا ؤ تو اس صورت میں مامور کو حج تمتع اور قران دونوں کرنا جائز رہے گا، لیکن دم قران، تمتع، جنایت یہ بذمہ مامور رہے گا، مامور کو اپنے ذاتی مال سے ادا کرنا ہوگا، "کما في الدرالمختار: ودم القران والتمتع والجناية على الحاج إن أذن له الآمر...... وإلا فيصير مخالفا فيضمن" (۱)، معلوم ہوا کہ باذن آمر اور بغیر اذن دونوں کا حکم یکساں نہیں بلکہ دونوں کے حکم میں فرق ہے۔

الف (۲ و ۳) اگر محجوج عنہ (آمر) پر حج فرض تھا اور اس نے حج بدل کی وصیت کر کے انتقال کیا ہے اور تہائی ترکہ بعد ادائیگی قرض وغیرہ حقوقِ متقدمہ مکان آمر (محجوج عنہ) سے حج بدل کے لیے کافی ہے تو اگر کسی متعین شخص کو بھیجنے کی وصیت فرمائی ہے تو جب تک وہ متعین کردہ شخص اظہار معذوری یا انکار نہ کردے یا ایسا مہمل ہو کہ اس سے حج بدل ادا ہی نہ ہوگا، اس وقت تک اس متعین کردہ شخص کو بھیجنا ورثا پر ضروری رہے گا، اگر کسی شخص کو آمر نے متعین نہ کیا ہو تو ورثا جس کو مناسب سمجھیں بھیج سکتے ہیں، بھیجنا ضروری رہے گا۔

ب: اگر وصیت تو کی ہے مگر تہائی ترکہ بعد ادائے گی حقوق متقدمہ (قرض وغیرہ) محجوج عنہ (آمر) کے مکان سے حج بدل کے لیے کافی نہ ہوگا مگر خارجِ میقات سے بھیجنے کے لیے کافی ہو تو خارج میقات سے بھیجنا اگر ورثاء کی قدرت میں ہے تو خارج میقات سے ہی جہاں سے کافی ہو بھیجنا واجب رہے گا، ہاں اگر ورثا اپنے ذاتی مال سے تبرع کر کے اور پہلے سے بلکہ مکان آمر سے ہی کسی کو بھیج دیں تو درست ہوگا، بلکہ بہتر و افضل رہے گا وصیت کی ان تمام صورتوں میں مامور کو حج قران و تمتع کرنا درست نہ ہوگا اور نہ ورثا کی اجازت منجانب موصی کافی ہوگی، بلکہ حج افراد کرنا ہر حال میں ضروری رہے گا۔

ج: وصیت تو فرمائی ہے مگر اتنا ہی چھوڑا کہ اس کا تہائی حصہ خارجِ میقات سے حج کے لیے کافی ہو تو وہ رقم مکہ مکرمہ بھیج کر مکی سے حج کروانا ضروری ہوگا۔

د: اور اگر وصیت تو کی ہے لیکن بالکل کوئی ترکہ نہیں چھوڑا کہ مکی ہی سے حج کرایا جا سکے یا ترکہ کافی چھوڑا مگر وصیت نہیں کی تو اگر چہ اس پر (آمر و محجوج عنہ) پر حج فرض باقی رہا ہو مگر اس صورت میں ورثا پر کسی قسم کا حج مکی یا میقاتی کرانا ضروری نہ رہے گا، البتہ اگر ورثا اپنی طرف سے تبرع کردیں تو بہتر و احسن ہوگا اور اللہ نے وسعت دی ہو تو کرانا چاہیے۔

ھ: اگر محجوج عنہ (آمر) پر حج فرض نہیں تھا لیکن حج کرانے کی وصیت فرمادی اور حقوق متقدمہ کی ادائیگی کے بعد تہائی ترکہ کی مقدار اتنی ہے کہ آمر (محجوج عنہ اور موصی) کے مکان سے نہ سہی راستہ ہی کے کسی حصہ سے حج بدل میقاتی کرایا

۱- الدرالمختار ۳/۲/۳۔

جاسکتا ہے اور وہاں سے حج کرانا ورثا کی قدرت میں ہوتو ورثا پر وہیں سے حج کرانا ضروری ہوگا اور اس حجِ بدل کرنے والے (مامور) کے لیے قران وتمتع کرنے کی اجازت نہ رہے گی اور موصی کے ورثا کی اجازت منجانب موصی کافی وصحیح نہ ہوگی۔

و: اگر محجوج عنہ (آمر) پر حج فرض نہ رہا ہو اور نہ اس نے حج کی وصیت فرمائی ہو یا وصیت کی ہو مگر تہائی بعد ادائیگی حقوقِ متقدمہ علی الوصیت جیسے قرض مہر وغیرہ اتنی مقدار کا بھی نہ چھوڑا ہو کہ جس سے حج مکی ہی سہی (وہ حج جو خارج میقات سے آکر کیا جائے) کیا جاسکے تو اس صورت میں کسی وارث پر حج بدل کرانا ضروری نہ رہے گا، حج بدل کرادے تو کراسکتا ہے بلکہ مستحسن ہے اور ایسے حج بدل میں قران وتمتع کراسکتا ہے (۱)۔

ز: اگر صورت نمبر ہ میں تہائی ترکہ کی اتنی مقدار ہو کہ مکی حج (جو اندرونِ میقات والوں پر ہوتا ہے) کرایا جاسکتا ہے اور ورثہ کی قدرت میں ایسا حج کرانا ہے تو اس کا بھی ادا کرادینا ضروری رہے گا اور اس صورت میں حج بدل کرنے والا (مامور) قران، تمتع، افراد سب کرسکتا ہے، البتہ دمِ قران ودمِ جنایت خود بذمہ مامور رہے گا مامور کو یہ دم اپنے ذاتی مال سے ادا کرنا ہوگا ہکذا یستفاد من جمیع مباحث الحج عن الغیر۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

۱-حج بدل میں کس کی طرف سے حج کی نیت کرے؟

زید حج بدل کرنا چاہتا ہے تو حج بدل کے احرام میں نیت اس شخص کی طرف سے کرے جس کی طرف سے حج کرنے جارہا ہے یا اپنی طرف سے کرے اور اس کا ثواب بخشے۔

۲-حج بدل کرنے والا قارن جنایت کس طرح ادا کرے؟

حج بدل کرنے والا جب قران کا احرام باندھے گا تو اگر اسے جنایت ہوجائے تو یہ ایک قربانی کرے گا یا ہر جنایت پر دو قربانی کرے گا۔

الجواب وباللہ التوفیق:

۱-جس کی طرف سے حج کرنے جارہا ہے اس کی طرف سے حج کی نیت کرنا ضروری ہے کما فی الشامی (۲)۔

۱- ''قال: وإن لم یوص أي بالاحجاج فتبرع عنه الوارث وكذا من هم أهل التبرع فحج أي الوارث ونحوه بنفسه أي عنه أو غيره جاز، والمعنى جاز عن حجة الإسلام ان شاء الله تعالى''، کما قال فی الکبیر (فتاویٰ شامی، ص ۲۳۹ ج ۴ باب الحج عن الغیر)۔

۲- ''ویشترط نیة الحج عنه ای عن الآمر'' (الدرالمختار مع الرد ۴/ ۱۵، مکتبہ زکریا)۔

۲-اگر محجوج عنہ نے حج افراد کے لئے مامور کیا ہےتو حج قران کا احرام غیر آمر کی جانب سے باندھنے میں ضامن ہوجائے گا اس لئے کہ ''كما في الغنية إذا أمره غيره بإفراد بحجة أو عمرة فقرن فهو مخالف ضامن في قول أبي حنيفة وقال أبو يوسف و محمد: يجزي عن الآمر استحساناً وهذا الخلاف فيما إذا قرن عن الآمر أما لو نوى بأحدهما عن شخص آخر أو عن نفسه فهو مخالف ضامن بلا خلاف'' (۱)۔

مشورہ: آپ نے چند جزئیات دریافت کئے ہیں حج بدل کرنے میں ان سے یا اسی طرح اور استفتاء کے محض مسائل معلوم کرنے سے آپ کا کام نہیں چلے گا، حج بدل کرنے والا تمام امور میں اپنے آمر کی ہدایت کا پابند ہوگا حتی کہ اگر حج قران کیلئے نہیں کہا ہے اور قران کرلیا ہے جب بھی ضامن ہوگا کمامر مفصلاً، اسی طرح حج افراد میں اس نے میقات سے فقط عمرہ کا احرام باندھلیا ہے کہ بعد عمرہ حلال ہوکر کچھ دن مثلاً رمضان میں مکہ مکرمہ رہ کر پھر مکہ مکرمہ سے حج کا احرام باندھلیگا تو بھی غلط کیا ہے کمامر غرض حج بدل کے بہت سارے مسائل ہیں آپ چند جزئیات کا استفتاء کرکے کہاں تک کام چلا سکتے ہیں، اس طرح آپ کا کام نہیں چل سکتا ہے، اگر آپ صحیح طور پر ارکان حج بدل ادا کرنا چاہتے ہیں تو معلم الحجاج مصنفہ مفتی سعید احمد صاحب سہارنپوریؒ یا اس کے متبادل کوئی معتبر کتاب جس میں مسائل حج معتد بہ درجہ میں درج ہوں خرید کر بار بار مطالعہ کر لیجئے اور مستحضر کر لیجئے جب کام چلے گا، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۶/ ۷/ ۱۳۸۵ھ
الجواب صحیح محمود عفی عنہ، سید احمد علی سعید عفی عنہ

۱-حج بدل کرنے والا کس حج کا احرام باندھے؟

حج مفرد کا احرام باندھے یا قران کا اور کس طرح نیت کرے، یعنی مرنے والے کی طرف سے احرام باندھنے کی نیت کرے یا اپنی طرف سے نفل حج کی نیت کرکے ثواب بخشے۔

۲-حج بدل کرنے والا احرام کہاں سے باندھے؟

کیا رمضان شریف میں یلملم کے میقات سے حج بدل کا احرام باندھ سکتا ہے یا ایام حج مثلاً شوال، ذی قعدہ وغیرہ میں احرام حج باندھنا شرط ہے اور اگر رمضان میں مکہ پہنچنے کا قصد کرے تو پھر حج بدل کا احرام مکہ شریف سے باندھے یا کسی دوسرے میقات سے باندھے۔

۱- ہدایہ ہندی ۱/ ۲۶۴۔

الجواب وباللہ التوفیق:

۱- جس قسم کے احرام کا آمر نے حکم دیا قران یا افراد میں سے اسی کا احرام باندھے، البتہ تمتع کرنا کسی حال میں درست نہیں اگر چہ آمر نے اذن دیا ہو بہتر یہ ہے کہ آمر (حج کرانے والا) مامور (حج بدل کرنے والا) کو عام طرح اجازت دے دے کہ میری طرف سے یا میرے فلاں عزیز کی طرف سے جا کر حج کرو جس طریقہ سے بھی تیری مرضی ہو اور تجھے سہولت ہو، افراد یا قران یا تمتع جو بھی کرو تو اس سے آمر کا حج جائز ہوجائے گا اگر چہ تمتع ہی کرے، کیونکہ آمر کے امر کی مامور نے مخالفت نہیں کی، لیکن اس اجازت عام کے باوجود احتیاط اس میں ہے کہ حج بدل میں تمتع نہ کیا جاوے، احرام باندھنے کے وقت نیت آمر کے حج کی کرے، اگر زبان سے کہے لبیک عن فلان مثلاً تو بہتر ہے ورنہ نیت دل سے بھی کافی ہے بلکہ نائب کو چاہئے کہ اپنے میت کیطرف سے حج کی نیت اس طرح کرے تو افضل ہے: "اللهم انی ارید الحج عن فلان واحرمت به لله تعالیٰ عنه لبيک لحجتی عنه وبشرط نية الحج عنه أی الآمر فيقول احرمت عن فلان ولبيت عن فلان ولو نسي اسمه فنوی عن الآمر صح وتكفی نية القلب" (۱)۔

۲- جس کے امر سے یا جس کے لئے حج کر رہا ہے احرام اس کے میقات سے باندھے(۲)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۶/ ۴/ ۸/ ۸۵/ ۱۳ھ
الجواب صحیح محمد جمیل الرحمن، سید احمد علی سعید

جس نے حج نہیں کیا اس کا حج بدل کرنا:

کوئی غریب آدمی جس کے اوپر حج فرض نہیں اور نہ اس سے قبل کوئی حج کیا، ایسا شخص اور کی طرف سے حج بدل کرسکتا ہے یا نہیں؟

الجواب وباللہ التوفیق:

حنفیہ کے نزدیک ایسا شخص بھی حج بدل کرسکتا ہے جو خود اپنا حج نہ کئے ہو، لیکن یہ افضل نہیں ہے حج بدل ایسے شخص

۱- درمختار ۲/ ۲۹ سـ

۲- "الثاني عشر ان يحرم من الميقات" (شامی ۲/ ص۳۲۹)۔

سے کرانا بہتر ہے جو اپنا حج کرچکا ہے (۱)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۴/ ۱۰/ ۱۳۸۵ھ

الجواب صحیح محمود عفی عنہ

سعودی سے حج بدل کرنا:

اگر کسی کے ماں باپ زندہ ہوں اور حج کے لئے آنے کی انہیں استطاعت ہو، تندرست بھی ہیں پھر بھی نہیں آتے تو ان دونوں کی طرف سے ان کا کوئی بڑا لڑکا یا کوئی رشتہ دار وغیرہ، جو غیر ممالک (سعودی، قطر، بحرین، دوبئی، وغیرہ) میں ہو اور وہ اپنے ماں باپ کی طرف سے حج کرنا چاہے، اور اگر والدین اجازت دے دیں تو وہ حج بدل کرسکتا ہے یا نہیں؟

الجواب وباللہ التوفیق:

جس شخص میں خود حج میں آنے کی استطاعت وطاقت ہو اور تندرست بھی ہو اس کی طرف سے حج بدل کرنے سے اس کا حج فرض ادا نہ ہوگا (۲)، چاہے اس کی طرف سے حج بدل اس کا لڑکا کرے یا کوئی رشتہ دار، چاہے اس کی اجازت سے کرے یا بلا کسی اجازت کے ہر صورت میں یہی حکم ہے، البتہ یہ ہوسکتا ہے کہ کوئی بھی اپنا حج کرکے اس کا ثواب ان کو پہنچادے تو ثواب اس کو پہنچ سکتا ہے باقی حج فرض کرنے سے ادا ہوگا، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۴/ ۴/ ۱۴۰۳ھ

۱- ''فجاز حج الصرورة بمهملة من لم يحج وغيرهم أولى لعدم الخلاف'' (الدر مع الرد ۱/ ۲۱)۔

۲- ''وجود العذر قبل الإحجاج فلو أحج صحيح ثم عجز لايجزيه'' (شامی ۲/ ۲۴۹ ثانیہ)، "فقبل النيابة عند العجز فقط لكن بشرط دوام العجز إلى الموت، لأنه فرض العمر حتى تلزم الإعادة بزوال العذر'' (الدر المختار علی الرد ۴/ ۱۴-۱۵، مکتبہ زکریا، دیوبند)۔

كتاب النكاح

کتاب النکاح

آپ ﷺ سے پہلے نکاح کا طریقہ

آپ ﷺ کے دور سے پہلے نکاح کا کیا طریقہ تھا؟

الجواب وباللہ التوفیق:

جاہلیت کے نکاح کئی طرح رائج تھے (۱)، شریعت نے صرف ایک طریقہ جو آج کل رائج ہے باقی رکھا اور بقیہ سب کو ختم کردیا تو اب اس سے کیا کام۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۶/ ۱۲/ ۱۴۰۴ھ

۱-ایجاب وقبول کی ایک خاص صورت:

میں نے یہاں لندن میں ایک مسلمان لڑکی کے ساتھ یہاں کے قانون کے مطابق سول میرج کی، جسکا خلاصہ یہ ہے: میں نے یہاں کی کورٹ میں تین مسلمانوں کے سامنے یہ قرار کیا کہ میں اس لڑکی کو اپنی بیوی بناتا ہوں اور اسے بیوی کی طرح قبول کرتا ہوں، اسی طرح میری بیوی نے بھی اسی مجلس میں یہ قرار کیا کہ وہ مجھے بحیثیت شوہر قبول کرتی ہے، مگر ابتک ہم لوگوں کا اسلامی نکاح نہیں ہوا ہے تو آیا یہ ہمارا نکاح ہوگیا ہے یا نہیں؟

۲-صرف بیوی کے بیان پر تفریق کا حکم:

اگر یہ نکاح ہوگیا ہے تو اگر کسی وجہ سے یہاں کا قانون صرف بیوی کی بات سن کر علیحدگی کرادے (بیوی اپنی خوشی

۱- "عن عروة ابن الزبير ان عائشة زوج النبی صلی اللہ علیہ وسلم اخبرته ان النكاح فی الجاهلية كان علی أربعة انحاء فنكاح منها نكاح الناس اليوم الخ" (بخاری ۲/ ۷۶۹، مطبع یاسر ندیم دیوبند)۔

سے علیحدگی چاہے) تو یہ طلاق واقع ہوتی ہے یا نہیں؟ (جبکہ یہاں کے کورٹ میں تمام وکیل وجج غیر مسلم ہیں)۔

محمد شعیب (فلیٹ ۵۴۱-۱۹۰، واٹ کنسٹن روڈ، لندن)

الجواب وباللہ التوفیق:

۱- اگر تین مسلمانوں کے سامنے مرد نے یہ کہا کہ میں اس لڑکی کو اپنی بیوی بناتا ہوں اور اسے بیوی کی طرح قبول کرتا ہوں اور پھر اس لڑکی نے بھی اسی مجلس میں ان لوگوں کے سامنے یہ اقرار کرلیا کہ میں اس مرد کو بہ حیثیت شوہر قبول کرتی ہوں تو شرعاً نکاح منعقد ہوگیا اور دونوں شرعاً بھی میاں بیوی ہوگئے(۱)۔

۲-جب شرعاً بھی دونوں میاں بیوی ہوگئے تو جب تک شوہر خود طلاق نہ دیدے یا شوہر سے طلاق دینے کے الفاظ نہ کہلوائے جائیں یا ضابطۂ شرع کے مطابق خلع یا تفریق شرعی واقع نہ ہوجائے محض عورت کا بیان یک طرفہ سنکر تفریق وعلیحدگی کرادینے سے شرعاً طلاق واقع نہ ہوگی بلکہ شرعاً دونوں حسب سابق میاں بیوی باقی رہیں گے(۲)۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲/۲/۱۴۰۱ھ

دوسری شادی سے قانوناً روکنے کا کیا مقصد ہے(۳)؟

الجواب وباللہ التوفیق:

اور اگر یہ تسلیم بھی کرلیا جائے کہ دوسری شادی کرنے سے فی زمانہ عموماً پہلی بیوی کے ساتھ ناانصافی یا ظلم ہونے لگتا

۱- ''النکاح ینعقد بالإیجاب والقبول (ہدایہ ۲/۲۸۵)، وأما رکنہ فالإیجاب والقبول کذا فی الکافی والایجاب ما یتلفظ بہ أولا من أی جانب کان والقبول جوابہ ھکذا فی العنایہ'' (فتاوی عالمگیریہ ۱/۲۶۷)، ''ولا ینعقد نکاح المسلمین إلا بحضور شاھدین حرین عاقلین بالغین مسلمین رجلین أو رجل وامرأتین عدولا کانوا أو غیر عدول أو محدودین فی القذف'' (ہدایہ ۲/۲۸۶)۔

۲- ''عن عصمۃ قال: جاء مملوک إلی النبی ﷺ فقال: یا رسول اللہ إن مولای زوجنی وھو یرید أن یفرق بینی وبین امرأتی قال فصعد رسول اللہ ﷺ المنبر فقال: یا أیھا الناس إنما الطلاق بید من أخذ بالساق، وفیہ الفضل بن المختار وھو ضعیف'' (مجمع الزوائد ۴/۳۳۴)، نیز زوجین کے درمیان حاکم یا قاضی کے ذریعہ تفریق کے لئے شرط ہے کہ وہ مسلمان ہوں، کیونکہ ''لا ولایۃ لکافر علی مسلم لقولہ تعالی: لن یجعل اللہ للکافرین علی المؤمنین سبیلا'' (فتح القدیر ۵/۲۱۲)۔

۳- حضرت مفتی صاحب سے تعدد ازدواج کے نقصانات کو سامنے رکھتے ہوئے ایک سوال کیا گیا تھا، سوال کے مندرجات محفوظ نہیں رہ سکے، اس لئے صرف جواب کو بغرض افادہ شائع کیا جارہا ہے۔

ہے یا ان میں سے کسی ایک کے حقوق کی ادائے گی میں کوتاہی اور حق تلفی ہونے لگتی ہے، اس لئے قانوناً روک تھام کی ضرورت ہے تو پہلے یہ دیکھنا ہوگا کہ اس روک تھام سے کیا مقصد ہے؟ اگر اس سے مقصد یہ ہے کہ ایک سے زائد نکاح کر لینا قانوناً ممنوع قرار دیا جائے کسی شخص کی ایک بیوی رہتے ہوئے دوسرا نکاح کرنے کی قانوناً اجازت ہی نہ ہو اگر کوئی کرے، تو قانون کی خلاف ورزی کرنے والا مجرم قرار دیا جائے۔ تو یہ چیز سماجی مقصد و مصالح کے خلاف ہونے کے ساتھ ساتھ عقلاً بھی غلط اور نا قابل عمل نا قابل قبول ہوگا اور نا قابل نفاذ۔

اس لئے کہ نکاح کے اہم مقاصد میں سے یہ بھی ہے کہ اس کے ذریعہ سے عورت اور مرد دونوں کو عفت و پاک دامنی اور پاکیزہ زندگی نصیب ہو، اور ایک صالح وخوشگوار معاشرہ جنم لے اور پاکیزہ توالد و تناسل کا سلسلہ جاری ہوکر آپس میں مودت و محبت کا خوش آئند ماحول وجود پذیر ہو۔ ان مقاصد کی تکمیل کے لئے بسا اوقات تعدد ازواج لازمی اور ضروری ہوگا۔ تعدد ازواج کی اباحت و اجازت کے بغیر ان مقاصد کی تکمیل بچند وجوہ نہیں ہوسکتی:

● تعدد ازواج ضروری ہے، اس لئے کہ عورتیں اپنی خلقت کے اعتبار سے عموماً مردوں کے بہ نسبت کمزور اور بارد المزاج واقع ہوئی ہیں، ان میں جنسی خواہشات کا ہیجان بھی مردوں کے اعتبار سے کم ہوتا ہے، بالخصوص پاک نگاہ عورتوں میں، بخلاف مردوں کے کہ یہ باعتبار خلقت کے عورتوں کی بہ نسبت قوی اور حار المزاج ہوتے ہیں اور ہر قسم کے مجامع میں آمد ورفت کی وجہ سے، نیز بعض دیگر وجوہ کی وجہ سے ان میں جنسی خواہشات کا ہیجان بھی زیادہ ہوتا ہے، تجربہ اس پر شاہد ہے، ان باتوں کا تقاضا یہ ہے کہ محض ایک ہی عورت پر ہر مرد کو محبوس نہ کیا جائے، ورنہ اس کا قدم حد اعتدال سے متجاوز ہوکر بدکاری کی طرف بڑھ جانے کا قوی خطرہ ہے، بالخصوص طاقت ور لوگوں کے لئے، اور یہ چیز انسانیت سوز ہونے کے ساتھ ساتھ مقاصد نکاح میں بھی مخل و مضر ہوگی۔

● اس لئے کہ عورت بسا اوقات تیس چالیس سال کی عمر میں دس پانچ بچے جن کر بوڑھیا یا مثل بوڑھیا ہو چکی ہوتی ہے، اور مرد کے لئے یہ عین جوش قوت کا وقت ہوتا ہے، اس کے ساتھ یہ بھی ملحوظ رکھئے کہ عورت ہر وقت اس قابل نہیں ہوتی کہ خاوند اس سے ہمبستر ہو سکے، مثلاً لازمی طور پر ہر عورت کو ہر مہینہ کچھ دن حیض (ماہواری) آتا ہے، اسی طرح ولادت کے بعد کچھ دن وہ نفاس میں رہتی ہے جن میں صحبت کرنا ممنوع ہے۔ اور طبعاً بھی عورت کے لئے اس حالت میں صحبت ضرر رساں ہے۔

اسی طرح ایام حمل وایام رضاعت (بچہ کو دودھ پلانے والے دن) میں صحبت کرنا بھی کبھی مضر ہوتا ہے جن میں حمل

کی حفاظت کے لئے صحبت ؤ ہمبستری سے پرہیز کرنا ضروری ہوتا ہے۔

ان حالات کے پیش نظر مردوں کو ایک پر مجبور کرنا بالخصوص قوی مردوں کو اور گرم ملک اور گرم مزاج والوں کو جن کے لئے ایک روز بھی بغیر جماع کے اپنی عفت مآبی کو محفوظ رکھنا دشوار ہوتا ہے اور چین نہیں آتا، ان پر ظلم کرنے کے مترادف ہوگا، بلکہ حرام کاری کے اسباب مہیا کرنے کے مترادف ہوگا، یہاں مرطوب اور بلغمی لوگوں کا ذکر نہیں ہے۔ پھر ان سب باتوں کے ساتھ عقل وشرع کے ان احکام کو بھی پیش نظر رکھئے کہ حرام کاری ایسی گھناؤنی بیماری ہے کہ اس سے بچنے کے لئے کسی دوسری عورت کو بری نظر سے بھی نہ دیکھو اور نہ کسی غیر محرم کو ہاتھ لگاؤ، اس سے تخلیہ میں بات چیت بھی نہ کرو اگر باز نہ آؤگے اور ملوث ہوجاؤگے تو بدترین سزا کے مستحق ہوگے۔ ستم بالائے ستم نہ ہوگا، تو اور کیا ہوگا؟

● اس لئے کہ بعض مرتبہ عورت ٹی بی یا کسی دوسرے مہلک مرض میں مبتلا ہوجاتی ہے اور ایسی کمزور ہوجاتی ہے کہ خدمت کرنے کے بجائے خود خدمت لینے کی محتاج ہوجاتی ہے اور اس کی سابقہ خدمتیں اور بھلا برتاؤ ایسا ہوتا ہے کہ طلاق دے کر علیحدہ کردینا شوہر کی نگاہ میں انتہائی نا انصافی ہوتی ہے، اس کی غیرت ومحبت کسی طرح طلاق دینے کو قبول نہیں کرتی، کبھی عورت بے سہارا کسم پرسی کی حالت میں ہوتی ہے کہ طلاق دے کر علیحدہ کردینا اس کو زندہ درگور کردینے کے مترادف ہوتا ہے، کبھی وہ عورت (مریضہ) دوچار بچوں کی ماں بھی ہوچکی ہوتی ہے اور وہ بچے بھی کسی ایسی عورت کے محتاج ہوتے ہیں جو ان کی دیکھ بھال کرے۔ ایسی حالتوں میں عقل وانصاف کا تقاضا ہوتا ہے کہ مرد ایک ایسی شادی کرے جس سے خود اس کی عفت مآبی بھی محفوظ رہے اور ساتھ ہی اس بے بسی اور مجبور عورت کی بھی بطور حسن مکافات کے خدمت ہوسکے اور بچوں کی بھی نگہداشت وپرداخت ہوسکے۔

اور کبھی ایسی عورت شوہر سے خود اصرار کرتی ہے کہ کسی عورت سے شادی کرلو جو تمہاری اور میری دونوں کی خدمت بھی کرے اور گھر بھی آباد رکھے، اور ان بچوں کی پرورش بھی کرے، خاص کر جب عورت سمجھدار ہوتی ہے تو اکثر ایسا اصرار کرتی ہے اور بسا اوقات ان حالات میں لازم ہوجاتا ہے کہ اس قابل رحم پر رحم کھا کر اس کی درخواست پوری کی جائے اور اس کے ہوتے ہوئے دوسری عورت سے شادی کرلی جائے، تاکہ پرسکون زندگی کا راستہ کھلے اور صالح معاشرہ بھی نصیب ہو۔

● اسی طرح کبھی عورت بانجھ ہوتی ہے اور مرد کو گھر کے ناچراغ ہوجانے کا خطرہ ہوتا ہے اور یہ بانجھ بھی ایسی سلیقہ مند اور مناسب مزاج ہوتی ہے کہ اس کو علیحدہ بھی کرنا نہیں چاہتا یا کسم پرسی کی حالت میں ہوتی ہے (مثلاً اس کے میکہ وغیرہ میں کوئی نہیں ہوتا) کہ اس کو علیحدہ کردینا اس کو ہلاک کردینے کے مترادف ہوتا ہے یا وہ عورت خواہش کرکے شوہر کو اپنے علاوہ

ایک اورعورت سے نکاح کرنے پر مجبور کرتی ہے۔

ان حالات میں تعدد ازواج کو یکسر روک دینے کا قانون کس قدر تنگی کا باعث ہوگا؟ اور کس قدر عقل ودانش سے دور ہوگا؟ اس کا اندازہ کرنے کے لئے ان ملکوں کے حالات کا اور ان لوگوں کا مشاہدہ کیجئے اور جائزہ لیجئے جن ملکوں میں، جن لوگوں میں عورت کے ہوتے ہوئے کسی دوسری عورت سے شادی کرنے کا دستور نہیں ہے، بلکہ ایسی بوڑھیا بدشکل، کج خلق یا بیمار بدوضع کوتاہ اندیش مخالف مزاج ہی کو گلے باندھے رکھنے کی تاکید ہے، ان کو کیا کیا مصائب پیش آتے ہیں، بلکہ مطابق بیان صاحب ''تفسیر حقانی'' کہیں عورت کو زہر دے کر مارا جاتا ہے، کہیں اسے ہلاک کرنے کی سعی کی جاتی ہے وغیرہ وغیرہ۔

● اس لئے کہ بسا اوقات ملکی اور حکومتی سطح پر کوئی بڑی جنگ چھڑ جاتی ہے اور اس ترقی آلات کے دور میں ایک معمولی جنگ کے اندر بھی محض چندونوں میں لاکھوں نوجوان کام آتے ہیں اور ان کے بے شمار بچے یتیم و بے سہارا ہوجاتے ہیں اور لاکھوں عورتیں اچانک بیوہ اور بغیر شوہر کے رہ جاتی ہیں جس کا اندازہ آج کی دنیا میں مشکل نہیں ہے، ۱۹۱۴ء کی جنگ عظیم سے لے کر ۱۹۷۱ء کی متعدد جنگوں کے اندر کام آنے والے اور مرنے والے جوانوں کی تعداد سے اس کا بآسانی اندازہ ہوسکتا ہے ہم نے مانا کہ حکومتِ وقت ان بے سہاروں کے کھانے پینے رہنے سہنے، بلکہ روزگار کا انتظام کرتی ہے، لیکن کوئی بتائے کہ ان بے شمار نوجوانوں اور اچانک بیوہ ہوجانے والی عورتوں کی عفت وعصمت کا کیا علاج ہے؟ تعدد ازدواج کے علاوہ کیا اس کا کوئی اور انتظام ہوسکتا ہے؟

غرض تعدد ازدواج کو قانوناً بند کردینا اور اس کو جرم قرار دے دینا عقل سلیم کے تو خلاف ہے ہی سماج کے لئے بھی بے حد مضر اور تباہ کن ثابت ہوگا۔ تعدد ازدواج کو روکنا صریح مداخلت فی الدین ہے، رہ گئی اس مسئلہ کی شرعی حیثیت تو یہ قانوناً خلاف شرع ہے، بلکہ ایسا قانون مداخلت فی الدین ہے۔ اس لئے کہ جب اللہ رب العزت نے حسب ضرورت ومصلحت چار تک نکاح کر لینے کی سہولت اور صریح اجازت واباحت مرحمت فرمادی تو اب اس کے خلاف قانون بنانا مداخلت فی الدین نہیں تو اور کیا ہے؟ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

''وإن خفتم ان لاتقسطوا فی الیتامیٰ فانکحوا ماطاب لکم من النساء مثنیٰ وثلاث ورباع، فان خفتم ان لاتعدلوا فواحدۃ أو ماملکت أیمانکم ذالک أدنیٰ الاتعولوا''(۱)۔

اگر غور کیا جائے تو علی الاطلاق اس سے روک دینے کا قانون بنانا مداخلت فی الدین کے ساتھ ساتھ اس میثاق اور

۱- سورۂ نساء: ۳۔

قانون کے بھی خلاف ہوگا جس میں حکومت نے ہر مذہب کو آزاد رہنے کی ضمانت دی ہے، بلکہ غور کرو تو سیکولر اسٹیٹ کے لئے بھی یہ ایک بدنما داغ ہوا۔

شوہر کے ظلم سے بچنے کی کیا صورت ہے؟

اور اگر عدم تعدد ازدواج کے اس قانون سے مقصد یہ ہو کہ بالکلیہ ختم نہ کیا جائے، بلکہ کچھ ایسے قیود وشرائط کے ساتھ اجازت دی جائے جس سے ان لوگوں کو جو متعدد نکاح کر کے پہلی بیویوں کو پریشان کرتے ہیں، پریشان کرنے کا موقع نہ ملے، انسداد ہوجائے تو اس کا لحاظ تو خود نص میں موجود ہے، یہی نہیں، بلکہ یہ قید مذکورہ فی النص اس ذات کی لگائی ہوئی ہے جو تمام جذبات انسانی کو محض جاننے والی ہی نہیں، بلکہ ان کی خالق ومالک بھی ہے اور سب اس کے قبضہ قدرت میں ہے، اس ذات سے اچھی وجامع مانع قید کون لا سکتا ہے؟! اس مذکورہ فی النص قید کے ذریعہ سے ان تمام مذکورہ مظالم کا انسداد علی وجہ الکمال ہوجائے گا، البتہ اس کو صحیح طریقہ سے استعمال کرنا اور برتنا شرط ہے، پھر اس بحث کے اٹھانے کے کیا معنی؟

اگر یہ کہا جائے کہ نص میں مذکورہ قید کا فائدہ تو صرف یہ ہے کہ متعدد نکاح کر لینے کے بعد جب کچھ دن گزر جائیں اور تجربہ ہوجائے جب جا کر معلوم ہوسکتا ہے کہ ان دونوں میں عدل ہورہا ہے یا نہیں اور اگر عدل نہ ہوتا ہو تو اب روکا جائے، جیسا کہ بعض مضمون نگاروں نے یہ لکھا بھی ہے، تو یہ ایک کھلی ہوئی غلطی ہے، نص میں (وإن خفتم ان لا تعدلوا) ہے "ان لم تعدلوا" نہیں ہے کہ اس کے معنی یہ لئے جائیں کہ بعد نکاح اگر عدل نہ کرے تو فقط ایک پر قناعت کرے، بلکہ نص کا مطلب یہ ہے کہ نکاح ثانی سے قبل ہی اگر تم کو خوف غالب ہو کہ بعد نکاح عدل نہ کرسکو گے تو صرف ایک ہی عورت پر قناعت کرو، یا "ماملکت أیمانکم" (۱) سے کام لو الخ جس کا کھلا ہوا مفہوم صرف یہ ہے کہ نکاح سے قبل اپنے حالات اور اس عورت کے حالات اور اپنی پہلی بیوی کے حالات پر خوب غور کرے اور پھر ان میں عدل نہ کرنے کی صورت میں دنیا میں جو نتائج بد عموماً پیش آتے ہیں ان پر بھی نظر کرے اور ساتھ ہی ساتھ اپنی دیانت سے آخرت کی باز پرس کو بھی مستحضر کرے کہ عدل نہ کرنے کی صورت میں خدا کے حضور میں جب سوال ہوگا تو کیا جواب ہوگا اور پھر اس کی سزا سے بچاؤ کی کیا صورت ہوگی، غرض آخرت کو بھی پیش نظر رکھ کر خوب سوچ لے کہ ان سب کے نان ونفقہ ولباس وپوشاک وغیرہ میں عدل وانصاف اور ان سب کے حقوق کی ادائے گی اور ان سب کے نفسیاتی تقاضوں کی سرانجام دہی ہو سکے گی یا نہیں، اگر نہ ہونے کا اندیشہ غالب ہو تو نکاح ثانی پر اقدام نہ کرے۔

۱- سورۂ نساء: ۳۔

اگر یہ کہا جائے کہ جب فی زمانہ باندیوں کا وجود نہیں ہے اور طاقتیں بھی کمزور ہو چکی ہیں، ان مذکورہ امور میں غور وخوض کرنے میں کوتاہی متوقع اور قریب الوقوع ہے جس کا لازمی نتیجہ بے اعتدالی اور بے انصافی کا صدور ہوگا، اس لئے یکسر روک دینے کے قانون کی ضرورت ہے کہ ایسے احتمالات تو پہلے نکاح کو بھی بند کر دینے کا حکم یا اس کو قانونا جرم قرار دے دینے کا مشورہ دیا جائے گا۔

اگر اس کا جواب نفی میں ہے اور یقیناً نفی میں ہے تو پھر یہاں کیوں مشورہ دیا جاتا ہے اور ایسا عمل کیوں تجویز کیا جاتا ہے جس سے نص میں تغیر وتبدیلی اور مداخلت فی الدین کا ارتکاب کرنا پڑتا ہے۔ بالخصوص ایسا عمل کیوں نہیں تجویز کیا جاتا ہے جس میں نص کے اندر بغیر کسی تبدیلی وتغیر یا ترمیم وغیرہ کے ان کے بے اعتدالیوں اور بے انصافیوں کا انسداد ہوسکتا ہے؟ مثلاً یہ کہ نکاح ثانی کرنے والے سے ایک اقرار نامہ (کابین نامہ) نکاح ثانی سے قبل ہی لکھوالیا جائے جس کا مضمون وعنوان یہ ہو:

بسم اللہ الرحمن الرحیم

کابین نامہ

امابعد　میں.................. کہ.................. پسر.................. قوم.................. ساکن.................. ضلع.................. کا ہوں میرا نکاح مسماۃ.................. دختر.................. قوم ساکن ضلع.................. کے ساتھ شرائط ذیل پر بعوض مہر.................. روپیہ سکہ رائج الوقت کے قرار پایا ہے۔

لہٰذا میں بدرستی ہوش وحواس بلا کسی جبر واکراہ کے مندرجہ ذیل اقرار نامہ لکھتا ہوں، تاکہ میں اس کا پابند رہوں اور درصورت عدم پابندی مسماۃ سے نکاح کروں تو نکاح کرنے کے بعد جب کبھی اس کو نکاح میں رکھتے ہوئے شرائط ذیل (جس کو دیندار اور سمجھدار لوگوں کے مشورہ سے مرتب کیا جائے) میں سے کسی شرط کے خلاف کروں اور اس خلاف ہونے کو اور ہم دونوں میں علیحدگی کو مندرجہ ذیل اشخاص میں سے کم سے کم دو شخص تسلیم کرلیں تو اس کے بعد مسماۃ مذکورہ کو اختیار رہوگا کہ خلاف شرط ہونے سے ایک ماہ کے اندر اندر جب چاہے اپنے اوپر ایک طلاق بائن واقع کر کے اس نکاح سے الگ ہوجائے اور جب کبھی کسی شرط کے خلاف واقع ہو ہر بار ایک ایک ماہ کے لئے یہ اختیار رہے گا۔ مگر یہ اختیار ایک ہی نکاح تک محدود رہے

گا۔ اگر کسی وقت فرقت اور علیحدگی کے بعد نکاح کا اعادہ ہوتو اس کے بعد یہ اختیار اور یہ شرائط نہیں رہیں گی، بلکہ اس وقت جو کچھ دوبارہ طے ہوجائے گا اس کے مطابق عمل درآمد ہوگا۔

شرائط یہ ہیں ـــــــــــ نیچے یہ لکھا ہو:

اس کا بین نامہ کو میں نے منظور کیا اور لکھوا کر سننے دیکھنے اور تسلیم کرنے کے بعد آج بتاریخ ماہ ــــــــ سنہ میں دستخط کرتا ہوں ــــــــــــ نشان انگوٹھا ــــــــــ گواہ شدہ ــــــــ گواہ شدہ ــــــــــ گواہ شدہ

فائدہ: اسی کابین نامہ سے (شرطوں میں تھوڑی مناسب ترمیم کے بعد) پہلے نکاح کے بعد جو مظالم بعض شوہروں کی جانب سے یا جونشوز سرکشی بعض عورتوں کی جانب سے رونما ہوتی ہے اس کا انسداد بھی ہوسکتا ہے۔

نیز کابین نامہ میں مندرجہ ذیل شرط بڑھا کر اس تلوار سے بھی حفاظت کی جاسکتی ہے جس کا تذکرہ کیا گیا ہے اور اس کے لئے نصوص قطعیہ میں تغیر وتبدیلی تک کرڈالنے کا منصوبہ گانٹھ رکھا ہے، بلکہ اگر غور کیا جائے تو اس موقع کی تعبیر شریعت مطہرہ کے ساتھ نہایت گستاخانہ اور خطرناک قسم کی جرأت ہے، اگر قہار مطلق کی شمشیر قہری کا تصور بھی صحیح معنی میں ہوجائے تو اس کے احکام کی تعبیر اس طرح کرنے پر کبھی جرأت نہ ہو، بہر حال اضافہ کی ہوئی شرط بہ الفاظ ذیل ہوگی:

''اگر میں فلاں عورت سے نکاح کروں گا تو اس کو تین طلاق نہ دوں گا۔ اور اگر میں نے بلا وجہ شرعی اس کو تین طلاق دے دیں تو جب تک وہ عورت اپنا نکاح کسی سے نہ کرے گی اس کا نان ونفقہ اس مقدار سے برابر دیتا رہوں گا جس مقدار پر مندرجہ بالا دونوں فریق کے کم ازکم تین اشخاص متفق ہوجائیں گے اور دینے کا حکم کردیں گے''۔

اگر میں کسی ماہ نان ونفقہ نہ دوں تو ایک ماہ گزرجانے کے بعد عدالت مجاز کے ذریعہ وصول کرسکتی ہے۔

دوشبہات اوران کاحل:

(۱) پہلا شبہ یہ ہے کہ شریعت جب خود نکاح میں بطورعوض کے مہر کو لازم قرار دے چکی ہے اور طلاق میں عدت کا نفقہ واجب قرار دے چکی ہے تو اب مزید نفقہ کا بار شرط لگانا اور لازم کرنا یہ ظلم بھی ہوگا اور حکم شرعی پر زیادتی بھی ہوگی۔ جس کا کسی کو حق نہیں پہنچتا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ شبہ اس وقت ہوسکتا ہے جب حکومت کی جانب سے قانونا یہ شرط لگادی جائے یا کسی بھی دوسرے شخص کی جانب سے شوہر کی مرضی کے خلاف یہ شرط اس پر لازم قرار دے دی جائے، یا عقد نکاح کی صلب حقیقت میں یہ شرط داخل کرلی جائے کہ بغیر اس شرط وقید کے شرعا بھی اس نکاح کو

منعقد تصور نہ کیا جائے اور جب ایسا نہیں ہے، بلکہ شوہر خود اپنی صواب دید سے اپنی مصالح کے پیش نظر نکاح سے الگ اور مستقل طور پر از خود اس قید کو اپنے اوپر لازم کر رہا ہو تو مثل دیگر اقرار، تعلیق، عہود اور عقود معلقہ کے یہ شرط بھی صحیح و معتبر ہوگی۔

(۲)　دوسرا شبہ یہ ہے کہ طلاق کے بعد زمانہ عدت کے علاوہ پھر کوئی نفقہ لازم کرنا یہ از قبیل جرمانہ مالی ہوگا جو جائز نہیں۔

اس کا جواب بھی وہی ہے جو شبہ اول کا جواب ہے، اس لئے کہ جرمانہ مالی یا تعزیر مالی لازم کرنے کا حق کسی دوسرے شخص کو تو بے شک نہیں ہوسکتا صریح نص کے خلاف ہے، جیسا کہ حدیث میں ہے:

"لایحل مال امرئ مسلم إلا بطیب نفسه"(۱)۔

لیکن اسی نص کے استثناء کے مطابق ہر شخص کو خود اپنے اوپر جرمانہ مالی اور تعزیر مالی اس حد تک کہ اس سے دوسرے کے حق کا تلف نہ ہو جائز ہے، جیسا کہ حالتِ حیض میں بیوی سے مباشرت کر لینے کی صورت میں صدقہ کی ایک مقدار ادا کر دینا روایات میں ملتا ہے اور مثلاً اگر کوئی شخص نماز قضاء ہو جانے کے جرم میں بطور جرمانہ اپنے اوپر ایک روپیہ کا صدقہ کر دینا یا ایک دن کا روزہ رکھ لینا لازم کرے تو یہ بلا شبہ جائز ہے۔

آخر میں یہ عرض ہے کہ اس طویل گفتگو سے صرف یہ بتلانا مقصود ہے کہ جس ترمیم یا نام نہاد اصلاح سے کسی حکم شرعی میں تغیر یا تبدیلی یا کسی اطلاق میں تقیید لازم آتی ہو اس کا پیش کرنا، یا قبول کرنا بلکہ اس کا سوچنا بھی کسی مسلمان کے لئے جائز نہیں ہے، بلکہ قطعاً حرام و ناجائز ہے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۵/۱/ ۹۲ ۱۳ھ

نکاح سے قبل لڑکا لڑکی کے لئے ایک دوسرے کو دیکھنا:

کیا نکاح کرنے کے قبل مرد عورت کو اور عورت مرد کو دیکھ سکتی ہے اور کس قدر اگر یہ جائز ہے تو سند میں حدیث حضور ﷺ اور امام اعظمؒ کا قول تحریر کریں۔

۱-　دار قطنی ۳/ ۲۶، کتاب البیوع حدیث: ۹۱ عن انس بن مالکؓ۔

الجواب وبالله التوفيق:

تنہائی میں بالکل ایک دوسرے کو نہیں دیکھ سکتے ہیں، البتہ دوسرے لوگ بھی وہاں موجود ہوں تو صرف چہرہ دیکھ سکتے ہیں (۱)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۴/۱۰/ ۱۳۸۵ھ

نصرانی اور یہودی لڑکیوں سے نکاح کرنا اور ان کا نکاح پڑھانا:

کنیڈا اور امریکہ میں اکثر مسلمان لڑکے نصرانی اور یہودی لڑکیوں سے شادی کر رہے ہیں، یہ لڑکیاں اکثر اپنے دین پر عمل نہیں کرتی ہیں بعض دفعہ اللہ ہی کے وجود سے انکار کرتی ہیں، تو کیا ایسی صورت میں ہم ان کی شادی کرا سکتے ہیں؟

اسلامک سینٹر آف عربک، کناڈا

الجواب وبالله التوفيق:

اگر یہ لڑکیاں اللہ کی وجود سے انکار کرتی ہیں یا اپنے دین (نصرانیت ویہودیت) سے منکر ہیں تو پھر یہ اہل کتاب ہی نہیں ہیں بلکہ دہری ہیں اور ان سے نکاح قطعاً جائز نہیں ہے (۲) اور اگر ایسا نہیں ہے بلکہ وہ انجیل یا توریت کو آسمانی کتاب مانتی ہیں اور خدا کی قائل ہیں تو وہ اہل کتاب میں سے شمار ہونگی اور فی نفسہ ان کے ساتھ اباحت نکاح میں کلام نہیں ہوگا، البتہ ان کے بطن سے پیدا ہونے والے بچوں اور نسل کی حفاظت اور ان کی صحیح تعلیم وتربیت کی خاطر نکاح نہ کرنا چاہئے، اس عمل کی

۱- ”قال رسول الله ﷺ إذا خطب أحدكم المرأة فإن استطاع أن ينظر منها إلى مايدعوه إلى نكاحها فليفعل“ (رواه احمد ورجاله ثقات وصححه الحاكم بلوغ المرام مع السبل ۳/۹۷۹، ولو أراد أن يتزوج المرأة فلا بأس أن ينظر إليها (رد المحتار ۲/۵۳۲ مکتبہ زکریا)۔

۲- درمختار میں ہے: ”وحرم نكاح الوثنية بالإجماع وصح نكاح كتابية وإن كره تنزيها“، اس کے تحت علامہ شامی لکھتے ہیں: ”نسبة إلى عبادة الوثن..... وفي الفتح: ويدخل في عبدة الأوثان عبدة الشمس والنجوم والصور التي استحسنوها والمعطلة والزنادقة والباطنية والإباحية وفي شرح الوجيز: وكل مذهب يكفر به معتقده“ (ردالمحتار علی الدرالمختار ۴/۱۲۵)، ”ولا تنكحوا المشركات حتى يؤمن ولأمة مؤمنة خير من مشركة ولو أعجبتكم ولا تنكحوا المشركين حتى يؤمنوا، ولعبد مؤمن خير من مشرك ولو أعجبكم...“ (سورہ بقرہ ۲۲۱)۔

تائید حضرت عمر فاروقؓ کے رجحانات سے بھی ہوتی ہے (۱)۔فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۹/۱۲/۱۴۰۰ھ

اہل کتاب عورتوں سے نکاح:

اہل کتاب کی عورتوں سے نکاح جائز ہے یا نہیں، اور کیا آج کل کے عیسائی یہودی اہل کتاب میں داخل ہیں یا نہیں؟

دینی معاملات میں بیوی کی تنبیہ کا حکم:

اپنی بیوی کو دینی یا دنیوی معاملات میں مارا جا سکتا ہے یا نہیں، اور کس حد تک مارنے کی اجازت ہے؟

نابالغہ اولاد کو مارنے کی حد:

اپنی اولاد کو نابالغہ ہو یا بالغہ مارنے میں شریعت نے کتنی حد مقرر فرمائی ہے؟

متعہ کا حکم شرعی:

متعہ کے بارے میں اگر قرآنی آیات ہوں تو تحریر فرما کر مشکور فرمائیں!

پہلی بیوی کی اجازت کے بغیر دوسری شادی کرنے سے دوسری بیوی مستحق وراثت ہوگی یا نہیں؟

ایک شخص نے پہلی بیوی کی اجازت کے بغیر دوسری شادی کرلی کچھ عرصہ کے بعد شوہر کا انتقال ہوگیا، پہلی بیوی کا دعویٰ ہے کہ مرحوم نے میری اجازت کے بغیر دوسری شادی کی تھی، اس لئے دوسری بیوی حق وراثت سے محروم ہوگی۔سوال یہ ہے کہ دونوں بیویوں کو پوری پوری وراثت ملے گی یا صرف پہلی کو؟

حافظ محمد صفدر خاں

الجواب وباللہ التوفیق:

کتابیہ عورت سے خواہ نصرانیہ ہو یا یہودیہ مسلمان مرد سے نکاح کی اجازت نص قرآنی سے معلوم ہوتی ہے اور کتابی

۱- ''ویجوز تزوج الکتابیات والأولی أن لا یفعل'' (ردالمحتار علی الدرالمختار ۴/۱۳۴)، ''والمحصنات من الذین أوتوا الکتاب من قبلکم إذا آتیتموھن أجورھن...'' (سورہ مائدہ ۵)۔

سے مراد یہ ہے کہ اپنے نبی مرسل اور کتاب منزل من السماء (تورات وانجیل) پر ان کا اعتقاد ہوتو ان سے نکاح درست ہے، لیکن فقہائے کرام نے دوسرے دلائل سے حربی کتابیہ سے نکاح کرنے کو مکروہ (تحریمی) فرمایا ہے، اس لئے کہ اس سے فتنہ کے دروازے کھلنے کا خوف ہے، اس لئے اگر ہو سکے تو مسلمہ بنا کر نکاح کرے، ورنہ احتیاط کرنا اولیٰ ہے۔

قرآن کریم سے معلوم ہوتا ہے کہ بیوی اگر سرکشی کرے یا نافرمانی کرے تو سب سے اول طریقہ وعظ ونصیحت کا ہے، اگر وہ محض وعظ ونصیحت سے باز نہ آئے تو بستر سے الگ کردے، شاید اس علیحدگی سے شوہر کی ناراضگی کا احساس کر کے اپنے فعل پر نادم ہو اور عبرت پکڑے، اس کے باوجود بھی راہ راست پر نہ آئے تو پھر مارنے کی اجازت دی ہے، لیکن حدیث شریف میں اس کا بیان ہے کہ چہرہ ومذاکیر پر جائز نہیں ہے، نہ اس طرح مارے کہ بدن کہیں سے الگ ہو جائے یا کہیں کی ہڈی ٹوٹ جائے یا سیاہ دھبے پڑ جائیں یا ایسی مار جس کا اثر قلب پر پڑتا ہو یہ بھی ناجائز ہوگا۔

بس ضرورت کے وقت اعتدال کے ساتھ مارے، نیز ہاتھ سے مارے حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ مسواک وغیرہ جیسی چیز سے مارے، "**عن ابن عباس أنه الضرب بالسواک ونحوه**" (۱) اگر حد مذکور سے تجاوز کر کے مارا، یا چہرہ یا مذاکیر پر مارا خواہ ایک ہی ہاتھ سے کیوں نہ مارا ہو گنہگار ہوگا۔

اگر شوہر نے بیوی کو مارا (خواہ ترک نماز کے سبب ہو یا گھر سے بلا اجازت باہر نکلنے پر اور کسی وجہ سے مارا) اور وہ اس سے مرگئی تو شوہر اس کا ضامن ہوگا۔ "عالمگیریہ" میں ہے:

"اگر شوہر نے اپنی بیوی کو بسبب ترک نماز کے، یا بسبب بے مرضی شوہر کے گھر سے باہر نکلنے کے تعزیر دی۔ پس وہ عورت اس تعزیر سے مرگئی تو شوہر اس کا ضامن ہوگا" (۲)۔

بعض علماء کے نزدیک عورت کو ترک نماز پر بھی مارنا جائز نہیں۔ شامی میں ہے: "**وذكر الحاكم لايضرب امرأته على ترك الصلوة**" (۳)۔

سو ابتدائی دو سزائیں وعظ ونصیحت اور بستر کا الگ کرنا ملحوظ رہے کہ جدائی صرف بستر میں ہو مکان کی جدائی نہ کرے، یعنی اس کو گھر سے باہر نکالے، بلکہ خود عورت کو تنہا مکان میں چھوڑ کر چلا جائے یہ شریفانہ سزائیں ہیں، مگر تیسری سزا مار پیٹ کو (اجازت کے باوجود) حضور ﷺ نے ناپسند فرمایا ہے۔

۱- روح المعانی ۴/ ۳۷۔
۲- فتاویٰ عالمگیریہ ۳/ ۳۸۱۔
۳- شامی ۳/ ۲۶۲۔

آپ ﷺ کا ارشاد ہے:"ولن یضرب خیارکم"(یعنی اچھے مرد یہ مار پیٹ کی سزا عورتوں کو نہ دیں گے)۔

ضرب الصبیان کا بھی وہی حکم ہے جو نمبر ۳ پر گذرا کہ چہرہ و مذاکیر کے سوا بدن پر مارے، زیادہ نہ مارے، نہ لکڑی سے مارے، اور یہ بھی نماز کے ترک پر آیا ہے اور عمر دس سال یا اس کے قریب ہو، شامی میں ہے:

"والمراد ضرب به بيده لا بخشبه" حدیث میں جو آیا ہے کہ بچے کو نماز پر مارے تو اس سے مراد ہاتھ سے مارنا ہے، لکڑی یا ڈنڈے سے نہیں، باقی امور دینیہ اور دنیویہ کے لئے مارنا درست نہیں، زبانی کلام پر اکتفاء کیا جائے اور اگر لڑکی بالغہ ہو تو باپ کا اس کو مارنا درست نہیں۔

حرمت متعہ پر قرآن کریم کی یہ آیت کریمہ صریح ہے: "والذين هم لفروجهم حافظون الاعلى أزواجهم أو ماملكت أيمانهم فانهم غير ملومين فمن ابتغىٰ وراء ذالك فأولٰئك هم العدون" (۱)۔

(اور جو اپنی شہوت کی جگہ کو تھامے ہیں، مگر اپنی ازواج پر یا اپنے ہاتھ کے مال باندیوں پر سو ان پر کچھ الزام نہیں، پھر جو کوئی اس کے سوا ڈھونڈے سو وہی ہے حد سے تجاوز کرنے والا)۔

حضرت عبد اللہ بن عباسؓ سے متعہ کا مسئلہ پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا حرام ہے اور میں تو اس کی حرمت کو صریح قرآن کریم سے پاتا ہوں، پھر مذکورہ بالا آیت تلاوت کی "تفسير مواهب الرحمن" (۲)۔

اس کے علاوہ حضرت امام مالکؒ موطا میں حضرت علی سے روایت کرتے ہیں کہ: "أن رسول الله صلى الله عليه وسلم نهى عن متعة النساء يوم خيبر (انتهىٰ)" (۳)۔ اسی طرح فرقہ امامیہ کی ایک معتبر کتاب "الاستبصار" میں حضرت علی سے روایت کرتے ہیں کہ: "قال حرم رسول الله ﷺ: لحوم الحمر الأهلية ونكاح المتعة"، نیز شیعوں کے امام علامہ احقاق الحق لکھتے ہیں کہ متعہ کے حرام ہونے پر ائمہ اربعہ کا کوئی اختلاف نہیں۔

اس سے پتہ چلا کہ متعہ کے حرام ہونے پر اہل سنت کے علاوہ شیعہ کی کتابوں میں بھی اس کے شواہد موجود ہیں، اس کے باوجود اگر اس میں کوئی کلام کرے تو اس کی بدبختی اور بدنصیبی کی انتہا ہے۔

۱-شوہر کے نکاح ثانی کے لئے پہلی بیوی کی اجازت لازمی اور فرض نہیں۔ کما أشار إليه قوله تعالىٰ:

۱- سورہ مومنون: ۵-۷۔

۲- ص ۶ پ ۱۸۔

۳- موطا باب نکاح المتعۃ حدیث: ۶۹۲ عن علی بن طالب ۶۔

"فانکحوا ماطاب لکم من النساء مثنیٰ وثلاث ورباع"(۱)دوسری بیوی شرعاً اس کی بیوی ہے، اس کے انتقال کے بعد دوسری بیوی کوبھی پہلی کی طرح پوراپوراحق وراثت ملے گا۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

شادی کے موقع پر عورتوں کا گیت گانا یا نظم پڑھنا:

۱۔بعض جگہ شادی بیاہ میں یہ رواج ہے کہ عورتیں جمع ہوکر گیت گاتی ہیں اور ایسے لوگ جمع ہوتے ہیں کہ جن میں اکثر غیرمحرم مرد ہوتے ہیں۔

۲۔بعض جگہ ایسا ہے کہ گیت وغیرہ تو نہیں گاتے، لیکن غیرمحرم مردوں کے مجمع میں خصوصاً جبکہ بارات آتی ہے تو بارات کے سامنے مکان کے اوپر عورتیں کھڑی ہوجاتی ہیں اورنعت اورنظمیں وغیرہ خوش الحانی سے اورخوب سریلی آواز سے پڑھتی ہیں، ہر مصرع کے بعد لاالہ الا اللہ وغیرہ الفاظ کہتی ہیں اس کو جائز بلکہ باعث ثواب سمجھ کر پڑھا جاتا ہے۔

۳۔ایسے ہی مجالس میں اکثر ایسے الفاظ پڑھتی ہیں، حسنؓ کے لئے میں نے مہندی منگائی مہندی لگالو، جناب رسول اللہ ﷺ یا حسنؓ کے لئے میں نے گانا بنایا گانا گانا پہن لو جناب رسول اللہ ﷺ، اس قسم کے اشعار وغیرہ پڑھتی ہیں اورتمام مجمع کو سناتی ہیں اورگرماتی ہیں۔

دریافت ہے کہ ایسے امور جائز ہیں یا کہ نہیں اورحضور ﷺ کی طرف مہندی گانا اورگانا وغیرہ کا اس طرح انتساب اورشادی وغیرہ کے مجمع میں پڑھنا آیا یہ توہین نبوت ہے کہ نہیں؟

الجواب وبالله التوفيق:

۱۔ہر گانا بجانا جومحض کھیل وتماشہ کے لئے کیا جاتا ہےشرعاً جائز نہیں ہے، ان الملاھی کلھا حرام اورپھر جوطریقہ آپنے عورتوں کے گانے کابیان کیا ہے یہ توبالکل حد سے گذرا ہوا ہے یہ گیت گانا اوراکو شوق سے سننا اوراس سے لذت حاصل کرنا سب حرام ہے۔

"قال ابن مسعودؓ وصوت اللهو والغناء ينبت النفاق كما ينبت الماء النبات، قلت وفی

۱- سورہ نساء:۳۔

البزازية استماع صوت الملاهي كضرب قصب ونحوه حرام لقوله عليه الصلوة والسلام: استماع الملاهي معصية والجلوس عليها فسق والتلذذ بها كفر بالنعمة" (۱)۔

۲- مذکورہ طریقہ پر غیر محرم مردوں کے مجمع کے سامنے چاہے وہ برات ہو یا غیر برات بلند مقام پر مع زیب و زینت کے جوان عورتوں کا بلا پردہ کامل کے کھڑا ہونا یا گانا اور نعتیں وغیرہ یا لا الہ الا اللہ مذکورہ طریقہ پر خوش الحانی کیساتھ پڑھنا، غیر محرم مردوں کو سنانا اور ان کا سننا تمام قطعاً حرام ہے، کیونکہ یہ خلاف شرع طریقہ ہے اور شادی میں اختیار کرنا داعی الی الفتنہ بھی ہے جو شرعاً جائز نہیں ہے اور آزاد مسلمان عورتوں کو بلا ضرورت شرعیہ کے بلند آواز کرنا بھی جائز نہیں ہے، کیونکہ عورت کی آواز میں بھی فتنہ ہے: "صوت المرأة عورة بلا ضرورة شرعية تمنع المرأة الشابة عن كشف الوجه بين الرجال، لا لأنه عورة بل لخوف الفتنة"(۲)، لقوله تعالىٰ:" ولا تبرجن تبرج الجاهلية الاولىٰ" ولقوله تعالىٰ :"غير متبرجات بزينة" (۳) "ولا يبدين زينتهن" (۴)۔

مذکورہ عبارت سے معلوم ہوا کہ جوان عورتوں کو بلا پردہ کامل غیر محرم کے سامنے آنا یا غیر محرم کے مجمع میں مذکورہ طریقہ پر گانے وغیرہ کا اختیار کرنا قطعاً حرام ہے، غیر محرم عورتوں سے تو قرآن بھی غیر محرم مردوں کو سننا جائز نہیں ہے، تو سریلی آواز سے نظم میں لا الہ الا اللہ غیر محرموں کو سنانا کیسے جائز ہوسکتا ہے، جو یہ کہتے ہیں کہ ہم ثواب سمجھ کر سنتے ہیں یا سناتے ہیں یہ غلط کہتے ہیں یہ محض اپنے نفس کو تباہی کے گڑھے میں ڈالنا ہے، مسلمان عورتوں کے لئے تو اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا ہے کہ وہ اپنی زینت کو ظاہر نہ کریں، انکو زمین پر زور سے چلنے کی بھی ممانعت ہے۔

"كما قال الله تعالىٰ :"ولا يضربن بارجلهن ليعلم ما يخفين من زينتهن" (۵)، قال تعالىٰ :"يدنين عليهن من جلابيبهن "(۶)، وقال ابن عباس وابو عبيدة:" امرت النساء المومنات ان يغطين رؤسهن ووجوهن بالجلابيب الا عيناً ليعلم انها حرائر"۔

۱- درمختار ۲/۲۳۸۔

۲- درمختار۔

۳- سورة النور ۱۸/۶۰۔

۴- سورة النور ۱۸/۳۱۔

۵- سورة النور ۱۸/۳۱۔

۶- سورة الاحزاب ۲۲/۵۹۔

مندرجہ بالا عبارات سے معلوم ہوتا ہے کہ عورتوں کو مذکورہ طریقہ اختیار کرنا اور مردوں کو یہ طریقہ اختیار کرنا جائز نہیں ہے عورتوں کو پردہ میں رہنا چاہئے حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: ''**المرأة عورة فاذا خرجت استشرفها الشيطان**'' (۱)۔

۳۔ حضور ﷺ کی طرف سہرا گنگنا وغیرہ کی نسبت کر کے گانا گناہ ہے مسلمانوں کی شان یہ نہیں ہے، کیونکہ یہ شعار کفار کا ہے، جو مسلمان یہ رسم ادا کرے گا یا اسکو اچھا جانے گا وہ رسم کفار کی تائید کرتا ہے اور پھر ان رسموں کو حضور ﷺ کی طرف نسبت کرنا سراسر توہین نبوت ہے، مسلمانوں کو ایسی حرکتوں سے قطعاً باز رہنا چاہئے، نیز اور لوگوں کو بھی باز رکھنا چاہئے، **قال عليه الصلوة والسلام:'' من رأى منكم منكراً فليغيره بيده، فإن لم يستطع فبلسانه، فإن لم يستطع فبقلبه وذلك أضعف الإيمان ''** (۲)۔

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۶/ ۱۰/ ۱۳۸۵ھ

قرآن کریم کی تلاوت سے روکنے اور اس کی بے حرمتی کرنے والے شوہر کے ساتھ بیوی کا سلوک:

ایک لڑکی ہمیشہ پنج وقتی نماز ادا کرتی ہے اور قرآن شریف فجر کی نماز کے بعد تلاوت کیا کرتی ہے، ایک دو مرتبہ اپنے شوہر کے مکان گئی بھی اور آئی بھی ہے، اس کے شوہر کا اخلاق اچھا نہیں ہے، امسال رمضان شریف میں اپنے شوہر کے گھر تھی، ایک روز لڑکی بعد نماز قرآن شریف کی تلاوت کر رہی تھی اس کا شوہر آیا اور اس نے کہا جو پوتھی تم پڑھ رہی ہو تمہارا پاؤں اور ہاتھ میں مار کر توڑ دوں گا اور اس پوتھی کو پھاڑ ڈالوں گا، لڑکی نے قرآن شریف کا پڑھنا بند نہیں کیا، پھر دوبارہ بولا بند کر دو اگر پڑھنا بند نہیں کرتی تو میں آگ لگا کر جلا دوں گا اور کلام پاک کی بڑی بے حرمتی کی اور کلام پاک کو گالی دیکر کہا کہ میں اس کو جلا دوں گا تو ایسے خاوند کے ساتھ لڑکی کا کیسے گذر بسر ہو سکتا ہے کیسے رہن سہن ہو سکتا ہے؟

شہاب الدین خاں (اسلامیہ اسکول چھوا پوسٹ برتھی گنج ضلع پرتاپ گڑھ یوپی)

الجواب وبالله التوفيق:

سوال کے سیاق وسباق سے معلوم ہوتا ہے کہ اس خرابی میں لڑکی کے بھی سخت رویہ کو دخل ہے، جیسا کہ سوال کے اس

۱- رواہ الترمذی ۱/ ۲۲۲، فیصل پبلیکشنز دیوبند۔
۲- مسلم ۱/ ۵۱، مکتبہ رشیدیہ دہلی۔

خط کشیدہ جملہ (پھر دوبارہ بولا بند کرو اگر پڑھنا بند نہیں کرتی تو الخ) سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلے بھی شوہر نے تلاوت بند کرنے کا حکم دیا ہوگا اور نہ ماننے پر اس تشدد پر اتر آیا ہے، حالانکہ بعینہ اسی وقت تلاوت کرنا واجب شرعی نہیں تھا، بہت سے بہت مباح یا مستحب تھا اور شوہر کے حکم کی تعمیل واجب تھی (۱)، اس لئے لڑکی پر واجب تھا کہ شوہر کے حکم کی تعمیل کر لیتی اور پھر بعد میں شوہر کا غصہ جب اتر جاتا تو اسکو سمجھا لیتی، غرض دونوں کی غلطی کو اس جرم میں دخل ہوگیا، اور دونوں ہی (میاں بیوی) اس گناہ کے کم وبیش سبب بن گئے، اس لئے دونوں ہی کو مل جل کر نباہ کرنے کی تلقین کرنی اور مسائل سیکھنے کی اہمیت اور قرآن پاک کی عظمت وعزت کے بتلانے کی ضرورت ہے، اگر دونوں تائب ہوکر اپنے حالات سدھار لیں تو التائب من الذنب كمن لا ذنب له أو كما قال عليه السلام (۲) کی فضیلت وثواب کے عند اللہ مستحق ہوجائیں گے۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۹/۱۱/۱۴۰۰ھ

مباشرت سے قبل ولیمہ:

بعض لوگوں کا یہ دعویٰ ہے کہ ولیمہ کا کھانا تب تک درست نہیں ہوتا جب تک کے پچھلی رات دلہا دلہن آپس میں مباشرت نہ کرلیں، یہ دعویٰ شرع سے کس حد تک قریب ہے۔

الجواب وبالله التوفيق:

بعض لوگوں کا یہ کہنا کہ جب تک زوجین مباشرت نہ کرلیں دعوت ولیمہ کا کھانا درست نہیں ہوتا ہے، یہ بالکل غلط اور لغو ہے، بلکہ دعوت ولیمہ کا مطلب یہ ہے کہ زوجین کی پہلی شب کی ملاقات کے بعد جو دعوت کی جاتی ہے اس کو ولیمہ کہا جاتا ہے، جیسا کہ ایک روایت میں ہے:

"قال أولم رسول الله ﷺ حين بني زينب بنت جحش فأشبع الناس خبزاً ولحما" رواه

۱- حدیث میں ہے: "لو كنت آمراً أحداً أن يسجد لأحد لأمرت النساء أن يسجدن لأزواجهن لما جعل الله لهم عليهن من الحق" (سنن ابوداود ۲/ ۲۴۴، کتاب النکاح باب فی حق الزوج علی المرأۃ حدیث ۲۱۴۰)، "وعن النبي ﷺ إذا دعا الرجل امرأته إلى فراشه فأبت فلم تأته فبات غضبان عليها لعنتها الملائكة حتى تصبح" (حوالہ سابق حدیث ۲۱۴۱)۔

۲- سنن ابن ماجہ ۲/ ۱۴۲۰، کتاب الزہد باب ذکر التوبہ حدیث: ۴۲۵۰۔

البخاری(۱)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲/۷/۱۴۰۱ھ

شادی و بارات میں شرکت کا شرعی حکم:

۱- آج کل جو ہمارے یہاں شادیاں ہوتی ہیں اس میں شرکت کرنا کیسا ہے؟

۲- زید کہتا ہے بارات میں شرکت حرام ہے، کیونکہ بارات ہنود کی رسم ہے۔ بارات نکلا ہے بری سے اور بری کہتے ہیں ہندوانی رسم کو، دلیل میں بہشتی زیور پیش کرتا ہے۔ کیا زید کا مذکورہ بیان صحیح ہے، اگر نہیں تو پھر حکم کیا ہے؟

۳- بارات میں جانا کیسا ہے اگر لڑکی والا بارات لانے کی اجازت دے تو کیا حکم ہے اور اس کے اندر رہا جاوغیرہ نہیں ہے؟

۴- زید کہتا ہے کہ لڑکیوں کی شادی میں اعزہ وتقارب کو کھلانا درست نہیں ہے اور دلیل میں حضور اکرم ﷺ کی صاحبزادی حضرت فاطمہ زہرہؓ رضی اللہ عنہا کی شادی کو پیش کرتا ہے تو کیا زید کا مذکورہ بیان اور استدلال صحیح ہے؟

الجواب وباللہ التوفیق:

۱- اگر وہ شادی منکرات ورسومات سے پاک ہو اور طریق مسنون پر ہو رہی ہو تو اس میں شرکت کرنے میں کوئی حرج نہیں بلکہ نکاح میں شرکت باعث ثواب ہے۔

۲- بارات بری سے نکلا ہے یہ تحقیق اگر زید کی ہے تو اس کی دلیل مطلوب ہے۔ اور اگر مولانا تھانویؒ کی نقل کی ہے تو حوالہ درکار ہے، کیونکہ مولانا تھانویؒ نے بہشتی زیور یا اصلاح الرسوم میں شادی کے رسوم کا تذکرہ کیا ہے وہاں یہ بات کہیں نہیں ہے کہ بارات بری سے نکلا ہے اور یہ اہل ہنود کی رسم ہے، صرف اتنی بات ہے کہ ''بری'' بارات کا اصل مقصد اور اہم رکن ہے، جس کو اہل زمانہ نے خواہ مخواہ اپنے ذمہ لازم کرلیا اور اس سے پہلے یہ بات کہی ہے کہ کسی زمانے میں چور ڈاکو کے خطرے سے حفاظت کے لئے اس بات کی ضرورت محسوس کی گئی ہوگی کہ دولہا کے ساتھ اور لوگ بھی رہیں، لہذا اس زمانے میں بھی باراتیوں کی تعداد ضرورت واستطاعت کی حد تک میں تو کوئی حرج نہیں ہے جس سے لڑکی والوں پر بار نہ پڑے اور جب

۱- صحیح بخاری مع فتح الباری ۸/ ۵۲۸ کتاب التفسیر، باب لاتدخلوا بیوت النبی...الخ حدیث: ۴۷۹۴۔

ضرورت سے بڑھ کرریا ءیانمو کے لئے ہویاغیر مشروع چیزوں کی شمولیت ہوتو ایسی بارات میں شرکت کرنا جائز نہیں ہے۔

۳-چونکہ اس زمانہ میں شادیوں میں عام طور سے تکلفات کا التزام کیا جاتا ہے اور اس کو ایک ضروری چیز سمجھا جاتا ہے، اگرلڑکی والے نہیں پوچھتے تو شکایت کی جاتی ہے، بعض جگہ اس سے بڑھ کر نیوتہ وغیرہ دینے کا رواج ہے جس میں بدلہ اور ریاء وافتخار کا پورا التزام کیا جاتا ہے یہ سب چیزیں ناجائز ہیں، اس لئے روکا جاتا ہے، ورنہ اعزہ واحباب کو حد شرع میں رہتے ہوئے کھانا کھلانے میں کوئی مضائقہ نہیں اور حضرت فاطمہ زہرہؓ کے نکاح کے وقت حضرت بلالؓ کو حکم دیا گیا کہ وہ دعوت کا انتظام کریں، اور اس دعوت کو دعوت مسنون ہونے کی خواہش ظاہر کی، لہٰذا زید کا اطعام طعام عند النکاح کے عدم جواز پر حضرت فاطمہ زہرہؓ کے نکاح کو پیش کرنا قطعاً صحیح نہیں ہے۔آپ ﷺ کے اس اطعام طعام سے دعوت ولیمہ ہرگز مراد نہیں لی جاسکتی، اس واسطے کہ دعوت ولیمہ کی مدت شب زفاف کے بعد ہے، اور یہاں زفاف کے پہلے عند النکاح فوراً دعوت کا تذکرہ مل رہا ہے جیسا کہ اس روایت میں ہے:''(قال علي)یا رسول الله ﷺ متی تبتني، قال: الثالثة إن شاء الله ثم دعا بلالا فقال: یا بلال إني زوجت ابنتي ابن عمي و أنا أحب أن یکون من سنة أمتي إطعام الطعام عند النکاح فأت الغنم فخذ شاة و اربعة امداد أو خمسة فاجعل في قصعة لعلي أجمع علیها المهاجرین والأنصار، فإذا فرغت فاذني بها فانطلق ففعل ما أمره ثم أتا ه بقصعة فوضعها بین یدیه فطعن رسول الله ﷺ في رأسها ثم قال: ادخل علی الناس زفة زفة (الی قولہٗ)و إني دافعها إلیه (ای إلی علي)الاٰن إن شاء الله'' (روی الحدیث بطوله عبد الرزاق في مسنده بسنده)''،فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

لازمی رجسٹریشن نکاح کا شرعی حکم:

حکومت یوپی نے مرکزی حکومت سے درخواست کی ہے کہ ایک مرکزی نکاح رجسٹریشن ایکٹ بنادیا جائے تا کہ اس قانون کے مطابق پورے ملک میں ہونے والے نکاحوں کا اندراج وغیرہ مکمل ہو سکے، حکومت یوپی نے خیال ظاہر کیا ہے کہ نکاح کے رجسٹریشن کو ابھی تک حکومت نے لازمی قرار نہیں دیا ہے، جس کی وجہ سے حکومت عدلیہ اور عوام کے پاس کسی بھی نکاح کا موثق ریکارڈ کا موجود رہنا ضروری نہیں ہے، جس کا نقصان یہ ہوتا ہے کہ بعض دفعہ جب زن وشوہر میں تعلقات خراب ہوتے ہیں اور معاملات کی تحقیق کی نوبت آتی ہے تو اطمینان بخش گواہی نہیں مل پاتی، اکثر وبیشتر دین مہر کا مسئلہ بہت اختلافی

بن جاتا ہے اور صحیح طور پر دین مہر نہ گواہوں کو یاد رہتا ہے یا دوسرے حاضرین مجلس نکاح کو، یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ گواہ اکثر بوڑھے لوگ بنائے جاتے ہیں جن کے دنیا سے گزر جانے کے بعد گواہی اور مہر کے ثبوت کا مسئلہ قانونی لحاظ سے زیادہ پیچیدہ ہوجاتا ہے۔حکومت یوپی کا خیال ہے کہ ان دشواریوں کو دور کرنے اور نکاح کے مکمل ریکارڈ کو محفوظ رکھنے کے لئے نکاح کے اندراج کو لازمی قرار دیا جانا چاہیے ،تاکہ ہر ایک نکاح کی تفصیلات کا معتمد علیہ وثیقہ موجود رہے یہ بھی معلوم ہوا کہ مرکزی حکومت کو یہ مشورہ دیا گیا ہے کہ نکاح رجسٹریشن ایکٹ ایسا بنایا جائے کہ رجسٹریشن کی حیثیت نکاح کے لئے شرط کی سی ہو جائے اور اس قانون سازی کے بعد ہونے والا وہی نکاح حکومت اور عدلیہ کی نگاہ میں معتبر ہو جس کے اندراجات حکومت کے قانون کے مطابق کرائے جاچکے ہوں اور نفاذ قانون کے بعد وہ سارے نکاح جو رجسٹریشن کے بغیر ہوں حکومت اور عدلیہ کی نگاہ میں غیر معتبر سمجھے جائیں، یہ بھی معلوم ہوا کہ حکومت کو ایک دوسرا مشورہ بھی دیا گیا ہے کہ نکاح رجسٹریشن قانون اس طور پر بنایا جائے اگر اس قانون کے نفاذ کے بعد کوئی شخص رجسٹریشن کے بغیر نکاح کر لے تو وہ نکاح تو صحیح اور حکومت اور عدلیہ کے نزدیک قابل قبول ہوگا،لیکن رجسٹریشن نہ کرانے کو ایک جرم قرار دیا جائے اور جو بھی اس جرم کا مرتکب ہو اس کے لئے جرمانہ یا جیل کی سزا تجویز کردی جائے، گویا اس طور پر رجسٹریشن نہیں کرانے سے نکاح تو متاثر نہیں ہوگا،لیکن نکاح کی تفصیلات کے اندراج اور کسی بھی اٹھنے والے اختلاف کے لئے شہادت وثبوت کی خاطر رجسٹریشن کا نہ کرانا ایک مستقل جرم قرار دیا جائے گا جس کی سزا کی جاسکے گی، ان تفصیلات سے اندازہ ہوگا کہ نکاح کے رجسٹریشن کے سلسلہ میں حکومت یوپی کس انداز پر غور وفکر کررہی ہے اور حکومت میں موجودہ کچھ اور لوگوں کا نقطۂ نظر کیا ہے، ایسی حالت میں ضروری ہے کہ معاملہ کا سنجیدگی کے ساتھ جائزہ لیا جائے اور فیصلہ کیا جائے کہ رجسٹریشن کو اگر نکاح کے لئے شرط قرار دیا جائے اور رجسٹریشن کے بغیر نکاح کالعدم سمجھا جائے تو فقہی لحاظ سے یہ رجسٹریشن قابل قبول ہوگا ،رجسٹریشن کو اگر نکاح کیلئے شرط قرار نہیں بنایا جائے ،لیکن شہادت اور ثبوت کی خاطر رجسٹریشن نہیں کرانے کو تعزیری جرم قرار دیا جائے اور اس کے لئے کوئی سزا تجویز کی جائے تو فقہی لحاظ سے ایسے رجسٹریشن کی اجازت دی جاسکتی ہے۔مسئلہ کی نزاکت واہمیت کے پیش نظر آپ سے جلد سے جلد جواب دینے کی درخواست ہے ۶؍دسمبر ۱۹۸۱ء کو نئی دہلی میں آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے اجلاس میں مسئلہ کی قانونی اور فقہی جہتوں پر غور ہوگا اس لئے براہ کرم ماہ ۲۵؍نومبر تک اپنی رائے ضرور ارسال فرمائیں تاکہ فکر وبحث میں آپ کی گرانقدر رائے سے استفادہ کیا جاسکے۔

منت اللہ (جنرل سکریٹری، آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ خانقاہ مونگیر، ۶؍محرم ۱۴۰۲ھ ۴؍نومبر ۱۹۸۱ء)

الجواب وباللہ التوفیق:

امور مستفسرہ کے متعلق عرض ہے کہ رجسٹریشن کو اگر نکاح کے لئے شرط قرار دیا جائے اور رجسٹریشن کے بغیر نکاح کالعدم سمجھا جائے تو شرعا یہ صحیح نہیں اور نہ ایسی شرط شرعا قابل قبول ہوسکتی ہے(۱)، اسی طرح رجسٹریشن نہ کرانے کو تعزیری جرم قرار دیا جائے اور رجسٹریشن نہ کرانے پر کوئی سزا یا جرمانہ تجویز کیا جائے تو شرعا یہ بھی درست نہ ہوگا، بلکہ ہندوستان کی مسلم پسماندہ اقوام پر بے پناہ ظلم کا دروازہ بھی کھل جائے گا اور امن برباد ہوگا۔ فقط والسلام مع الاحترام

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۵/۱/۱۴۰۲ھ

نا قابل مجامعت لڑکی سے نکاح کا حکم:

ہندہ کو لیڈی ڈاکٹر نے جواب دیا تھا کہ یہ لڑکی شادی کے قابل نہیں ہے، پھر بھی اس کے ماں باپ نے اس کی شادی زید کے ساتھ کردی، جب ہندہ سسرال آئی تو راز کھلا کہ یہ صحبت کے لائق نہیں ہے وہ دوبارہ اپنے میکہ چلی گئی ہندہ کے باپ زید سے طلاق مانگتے ہیں اور زیورات وغیرہ زید کا لے لیا ہے، زید کے کسی سامان کو واپس نہیں کرنا چاہتے ہیں، ایسی صورت میں کیا حکم ہے کہ ان کا نکاح ہوا ہے یا کہ نہیں اگر نکاح کرنا صحیح ہے تو زید طلاق دینے میں گنہگار تو نہیں ہوگا، اگر نکاح درست نہیں ہے تو ایسی صورت میں ایسا نکاح پڑھنا پڑھانا اور مجلس کی شرکت کا کیا حکم ہے؟۔ بینوا توجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

صورت مسئولہ میں نکاح منعقد ہوگیا ہے، اگر مقصد زوجیت کے قابل نہیں ہے تو طلاق دیدینے میں زید گنہگار نہ ہوگا، ہندہ کے والد کو چاہئے کہ زید کے زیورات وغیرہ سب واپس کردے، اس لئے کہ قصور ہندہ کی طرف سے ہے، بلکہ ہندہ کے والد کو مناسب ہے کہ مہر بھی معاف کرادے بالخصوص جب خود ہی طلاق چاہتا ہے یہ جواب اس تقدیر پر ہے کہ لیڈی ڈاکٹر نے لڑکی عورت (مؤنث ہی) سمجھ کر کہا ہے اور اگر لڑکی کی حقیقت میں مونث عورت نہ ہو بلکہ خنثی مشکل ہو تو اس کا حکم دوسرا ہوگا(۲)، لہذا لیڈی ڈاکٹر سے تحقیق کی جائے اگر وہ خنثی مشکل بتائے تو پھر لکھ کر حکم معلوم کیجئے۔

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۶/۸/۱۳۸۵ھ
الجواب صحیح سید احمد علی سعید، محمود غفی عنہ

۱- ''النکاح ینعقد بالإیجاب والقبول بلفظین یعبر بهما عن الماضی''(ہدایہ ۲/ ۲۸۵)۔

۲- ''وفی العنایة محله المرأة لم یمنع من نکاحها مانع شرعی فخرج الذکر والخنثی مطلقا'' (ردالمحتار ۴/ ۶۰، مکتبہ زکریا)۔

بلااجازت نکاح ہوااور لڑکی رخصت ہوکر سسرال چلی گئی تو کیا نکاح ہوگیا؟

ایک لڑکی جس کی عمر ۲۴ سال ہے، شادی ہوئے آٹھ سال ہوا، لیکن اب تک شوہر بیوی کا تعلق قائم نہیں ہوا اور نہ کبھی وہ اپنی مرضی سے سسرال گئی ہے، ایک آدھ بار خلوت بھی ہوئی مگر وہ اس طرح کہ لڑکی اپنے میکے گھر کے اندر سوئی ہوئی تھی، لڑکا جھٹکے سے اندر داخل ہوگیا، جب لڑکی بیدار ہوئی تو جھپکا چھوری کر کے باہر بھاگ گئی لڑکا ناکامیاب رہ گیا، کبھی کبھار ماں باپ اور دیگر رشتہ دار کے دباؤ سے ایک دو دن کے لئے سسرال بھی گئی، صرف دن بھر کے لئے رات کو اپنی ماں کے یہاں سوتی تھی، لیکن اب تک وہ جانے سے انکار کرتی ہے اور کہتی ہے کہ عقد کے وقت مجھ سے اجازت لئے بغیر نکاح پڑھا دیا گیا ہے، لہذا میری شادی ہی نہیں ہوئی، میں جاؤں ہی کیوں، لڑکا جس سے شادی ہوئی ہے وہ لڑکی کا ممیرا بھائی ہے اور ایک ہی آنگن میں رہتا ہے، صرف کمرہ الگ الگ ہے، لڑکی شادی کے قبل ہی سے یعنی جب سے شادی کی بات چلی اشارے کنائے سے اپنی نارضامندی ظاہر کرتی رہی ہے کہ میں اس لڑکے سے شادی نہیں کروں گی، اس کے ولی اور تمام رشتہ دار بھی اس بات کو دیکھ رہے تھے، لیکن اس کے ماں باپ نے زبردستی شادی کردی ہے، اب لڑکی جانے سے برابر انکار کرتی ہے اور لڑکی پڑھی لکھی ہے اور لڑکا پڑھا ہوا تو ہے لیکن سادہ سودا ہے اور لڑکی شادی کے دن بھی سسرال نہیں گئی، یعنی خلوت اس وقت بھی نہیں ہوئی، اب لڑکا رخصتی کے لئے کہتا ہے، لیکن وہ نہیں جاتی اور انکار کرتی ہے وہ کہتی ہے کہ وہ دوسری شادی کرلے میں نہیں جاؤنگی، اس نے شوہر کے یہاں کی کوئی چیز استعمال نہیں کی ہے، والدین کے دھمکانے سے بھی ایک آدھ مرتبہ استعمال کرلیا، لڑکا طلاق دینے سے انکار کرتا ہے، ایسی صورت میں آپ کیا کہتے ہیں لڑکی اگر دوسری جگہ شادی کرنا چاہے تو اس کے لئے کیا حکم ہے؟

الجواب وبالله التوفيق :

حسب تحریر سوال اس وقت لڑکی کی عمر ۲۴ برس ہے، ۸ سال قبل شادی ہوئی تو بوقت نکاح ۱۶ سال کی بالغہ غیر شادی شدہ باکرہ تھی۔ اور نکاح باپ نے کیا۔

لہذا صورت مسئولہ میں بوقت عقد نکاح اجازت لیتے ہوئے لڑکی نے سکوت کیا تھا اس وقت انکار نہیں کیا تھا یا انکار کیا تھا مگر باپ نے زور زبردستی نکاح پڑھا دیا تھا، اس وقت انکار نہیں کیا اور رخصت کردی گئی اور وہ خاموشی کے ساتھ رخصت ہوگئی ان دونوں صورتوں میں نکاح ہوگیا ہے، لڑکی کا شادی سے پہلے بوقت تذکرہ اپنی نارضامندی کا ظاہر کرنا اس پر اثر انداز نہ ہوگا۔

"لوجود علة صحة النكاح وهي الرضاء أو الإكراه كما صرح به الشامي حيث قال: إذ حقيقة الرضاء غير مشروطة في النكاح لصحته في الاكراه ثم قال: عباراتهم مطلقة في ان نكاح المكره صحيح كطلاقه، ولفظ المكره شامل للرجل والمرأة" اوراگر بوقت عقد نکاح لڑکی سے اجازت ہی نہیں لی اور نہ لڑکی کواسوقت علم ہی ہوا تو اس صورت میں یہ نکاح لڑکی کی اجازت پر موقوف تھا، اگر علم ہونے پر رد کردیتی تو رد ہوجاتا ،لیکن لڑکی نے ایسا نہیں کیا ہے جیسا کہ سوال سے معلوم ہوتا ہے کہ لڑکی کبھی کبھار (متعدد بار) ایک دو دن کے لئے سسرال بھی گئی گویا دل نخواستہ ہی گئی اور خواہ شب میں میکے آکر سوتی مگر دن میں پھر چلی گئی جیسا کہ متعدد دن کے لئے رخصتی میں جانے کی صورت میں ظاہر ہے اور گو ایک ہی مکان رہائش میں یہ صورت پیش آئی پس اس صورت میں تسلیم و اجازت ثابت ہوگئی اور نکاح نافذ ہوگیا ہے اور خاص کر جب لڑکی اتنی جری ہے کہ شوہر نے اس کے ہوتے ہوئے کئی بار خلوت کیا اور چھپکا چھوری کر کے کمرہ سے باہر بھاگ گئی اگر چاہتی تو صاف انکار کردیتی اور سسرال بھی ہرگز نہ جاتی اور اگر باپ کے ڈر سے ایک دفعہ جاتی بھی تو پھر شب میکہ میں گذارنے کے بعد دوبارہ سسرال نہ جاتی اور میکہ کا کپڑا وغیرہ استعمال نہ کرتی وغیرہ وغیرہ یہ سب بہت سے بہت اس امر پر قرینہ ہیں کہ وہ اس نکاح سے خوش نہیں اور اس کے ساتھ رہنا نہیں چاہتی ہے، صحت نکاح پر اس کا کوئی اثر نہیں ہے۔

لڑکی اگر اس شوہر کے ساتھ رہنا نہیں چاہتی ہے، اپنا دوسرا نکاح کرنا چاہتی ہے تو بلا وجہ شرعی ایسا کرنا سخت گناہ اور باعث عذاب خداوندی ہے، ایسی عورت پر بڑی سخت وعیدیں وارد ہیں اور سوال سے معلوم ہوتا ہے کہ عورت پڑھی لکھی ہے، ایک عزت دار گھرانے کی ہے، چال چلن بھی اچھا ہے تو شاید مسئلہ مسائل بھی جانتی ہو پھر اس کو ایسا نہیں کرنا چاہئے، بلکہ اسی شوہر کے ساتھ رہکر اسلامی زندگی گذارنی چاہئے اور اگر وہ شرعی وجہ کے ساتھ تفریق کرانا چاہتی ہے تو شوہر سے طلاق حاصل کر لے یا مہر معاف کر کے یا کچھ اور بھی مال دینا پڑے دیکر خلع کرالے اور عدت (تین حیض) گذار کر اپنا دوسرا نکاح کرے بغیر اس کے نہیں، اور جب صورت حال ایسی ہے تو شوہر کے لئے خود ہی مناسب ہے کہ وہ اس کو طلاق دیکر اپنی دوسری شادی حسب منشاء کرے وہ اس میں گنہگار نہ ہوگا، ورنہ موجودہ صورت میں مقصد ازدواج (خوشگوار زندگی) نصیب ہونا دشوار ہے، علاوہ ازیں دیگر طرح طرح کے مفاسد میں ابتلاء کا سخت اندیشہ ہے جس سے بچنا واجب ہے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۸/ ۸/ ۱۳۸۵ھ
الجواب صحیح محمود عفی عنہ

لڑکا اور لڑکی کے بالغ ہونے کی عمر کیا ہے؟

ایک پندرہ سالہ لڑکی بالغ ہے یا نابالغ ہے شرعاً قانوناً لڑکی کس عمر میں اور لڑکا کس عمر میں بالغ ہوتا ہے۔

بالغہ ہونے کے بعد نکاح کے لئے ولی کی اجازت ضروری نہیں ہے:

ا۔ ایک یتیم لڑکی جسکا حقیقی باپ نہیں سوتیلا ہے اب لڑکی کا جائز وارث لڑکی کا حقیقی بھائی ہے یا چچا یا حقیقی ماں کیا بالغہ ہونے کی صورت میں کون لڑکی مذکور کے عقد کی اجازت دے گا اور اس کے بغیر اذن کے نکاح نہ ہوگا یعنی وارث کی اجازت کی کیا بالغہ ہونے پر بھی ضرورت پڑے گی؟

الجواب وباللہ التوفیق:

ا۔ اگر پندرہ سال کی ہوچکی ہے تو بالغ ہے معیار بلوغت شریعت مطہرہ میں یہ ہے کہ لڑکی کو اگر پندرہ سال سے پہلے حیض آجائے یا حمل ٹھہر جائے تو پندرہ سال کی عمر سے پہلے بھی بالغ قرار دی جائے گی ورنہ پندرہ سال پورے ہونے پر حکم بلوغت ہوجائے گا، اور لڑکے (مذکر) کو اگر پندرہ سال کی عمر سے قبل احتلام ہوجائے یا عورت کو حاملہ بنادے تو پندرہ سال کی عمر سے قبل بھی بالغ قرار دیں گے ورنہ پندرہ سال ہوچکنے پر بالغ شمار ہوگا۔ ''وبلوغ الغلام بالاحتلام والإحبال والإنزال والجارية بالاحتلام والحيض والحبل......فإن لم يوجد فيهما شئ فحتى يتم لكل منهما خمس عشرة سنة به يفتى'' (۱)۔

۲۔ اس یتیم لڑکی کا ولی عقد نکاح کے لئے اسکا حقیقی بھائی ہوگا، بھائی کے ہوتے ہوئے چچا یا ماں نہ ہوگی، لڑکی کے بالغ ہوجانے کے بعد غیر کفو میں یا کفوء میں مہر مثل سے کم پر نکاح تو منعقد وصحیح ہوجائے گا مگر اولیاء کو حق ہوگا کہ وہ فسخ نکاح کرالیں اور کفوء میں اور مہر مثل کے مطابق نکاح کر لینے میں ولی سے نکاح کی اجازت لینا ضروری نہیں ہے خود کرسکتی ہے، ''فنفذ نكاح حرة مكلفة بلا رضا ولي'' (۲)، لیکن اجازت لے لینا بہتر ہے۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور
الجواب صحیح محمود عفی عنہ ۱۲/ ۸/ ۱۳۸۵ھ

۱- الدر المختار کتاب الحجر ۹/ ۲۲۵-۲۲۶۔
۲- الدر المختار ۴/ ۱۵۵۔

لڑکے نے کہا: میں نے تم سے نکاح کرلیا لڑکی نے کہا: منظور ہے تو کیا نکاح ہوگیا؟

زید نے ہندہ کو دو بالغ شخص صحیح العقل صورۃ متشرع مسلم کے سامنے کہا کہ میں نے تم سے نکاح کیا تمکو منظور ہے، ہندہ جو ایک بیوہ عورت تھی اس نے زبانی اقرار کرلیا کہ مجھے منظور ہے، اسی طرح تین بار زبان سے اقرار کرلیا ہے، یہ واقعہ ان دونوں نے ارادۃً اور حقیقۃً کیا ہے تو کیا اس فعل سے از روئے شرع ان دونوں کا نکاح صحیح ہوجائے گا۔ بینوا توجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

صورت مسئولہ میں بشرط صحت سوال اگر اس بیوہ کی عدت وفات ۴ماہ دس دن گذر چکی تھی تو نکاح شرعاً منعقد اور لازم ہوگیا اور دونوں عند اللہ اور عند الشرع میاں بیوی ہوگئے (۱)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دار العلوم دیوبند سہارنپور ۱۰/۹/۱۳۸۵ھ

الجواب صحیح سید احمد علی سعید نائب مفتی دار العلوم دیوبند، محمود غفی عنہ

نکاح صحیح ہونے کے لئے سرکاری کاغذات میں اندراج ضروری نہیں ہے:

زید اور ہندہ زن وشوہر شرعی ہیں زید کا بیان ہے کہ ہندہ بدچلن ہے، چنانچہ ایک رشتہ کے بھائی سے پکڑی گئی، بدنام ہوگئی تھی جس سے زید لاعلم تھا ہندہ اس عمل کو نباہ کے لئے متعلقین ہندہ پدر وغیرہ نے زید کو ورغلا کر اور اکھترا ے۔ روپیہ کا لالچ جوڑے کا دیکر ہندہ کی شادی زید سے کردی اور کسی قسم کا جہیز وغیرہ نہیں دیا گیا ہے، زید درس وتدریس کا کام کرتا ہے، پدر ہندہ اپنی سابقہ بیوی کے فوت ہونے پر یہ دوسرا عقد کرلیا، پدر ہندہ ہندہ کے ساتھ اپنی سابقہ بیوی کے بچے خالدہ اور فرزند نابالغ کو بھی بھیجوا دیا ہے، اب زید اس ہندہ کو طلاق دیکر خالدہ سے نکاح کرنا چاہتا ہے تو عند الشرع کرسکتا ہے یا کہ نہیں اور چند گواہوں کی موجودگی میں زید نے ہندہ کو طلاق دیدی ہے اور اس طرح چند گواہوں کی موجودگی میں عقد بھی خالدہ سے کرلیا ہے، لیکن یہ عقد سرکاری کاغذات میں درج نہیں ہے تو کیا یہ عقد عند الشرع درست ہے؟

۱- "وینعقد بایجاب من أحدهما وقبول من الآخر وشرط سماع کل من العاقدین لفظ الآخر لیتحقق رضاهما وشرط حضور شاهدین حرین او حر وحرتین مکلفین سامعین قولهما معاً" (الدر مع الرد ۹/۶۹، ۹۱)۔

الجواب وباللہ التوفیق:

صورت مسئولہ میں زید نے کم ازکم دوگواہوں کے سامنے ہندہ کوواقعی طلاق دینے کے بعد اس کی عدت گذرنے کے بعد خالدہ سے نکاح کیا ہےتو خواہ سرکاری کاغذات میں درج نہیں کرایا ہے، یہ نکاح خالدہ کا شرعاً درست اور جائز ہے اور خالدہ اورزید دونوں زن وشوہر کی طرح رہ سکتے ہیں۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

بیوی کا یہ کہنا کہ مسئلہ ملاؤں کی ڈھونگ ہے، سے نکاح پر کوئی اثر نہیں پڑے گا:

مریم نے شوہر زید سے معلوم کیا کہ چچازاد بھائی کا نکاح چچازاد بہن کیساتھ درست ہے؟ زید نے جواب دیا کہ درست ہے، مریم نے کہا کہ آج دنیا میں نئے نئے مسئلہ چل گئے ہیں جو سب ملاؤں کی ڈھونگ ہیں، مریم کا یہ عقیدہ اس کے شعور کے بعد ہی سے ہےتو مریم اورزید کا نکاح درست ہوایا کہ نہیں؟

الجواب وبا اللہ التوفیق:

نکاح قائم اوردرست ہے یہ جملہ شریعت سے انکار نہیں ہے بلکہ اپنی جہالت کیوجہ سے اس مسئلہ کو غلط مولویوں کا ڈھکوسلہ بازی سمجھتی ہے۔فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۹/ ۵/ ۱۳۸۵ھ
الجواب صحیح سید احمد علی سعید نائب مفتی دارالعلوم دیوبند

بالغہ کی اجازت کے بغیر نکاح:

بالغ لڑکی کا نکاح بلا اس کے دریافت کئے اوراجازت لئے بغیر گواہ کے جائز ہوایا کہ نہیں؟

الجواب وباللہ التوفیق:

بغیر دوگواہوں کے کوئی نکاح صحیح نہیں ہوتا ہے (۱)، اور گواہوں کے ساتھ بالغ لڑکی کا نکاح اس سے بغیر پوچھے

۱- ’’وشرط حضور شاهدين‘‘ (الدرمع الرد ۳/ ۸۷)۔

پڑھائے تو اس کی اجازت پر موقوف ہوگا (۱)، اگر چاہے تو قبول کرے بشرطیکہ کفو میں ہواور اگر غیر کفو میں ہوا ہو تو دو گواہوں کے سامنے بغیر اجازت ولی اقرب صحیح نہیں ہوتا ہے خواہ لڑکی بغیر اجازت ولی خود اجازت کیوں نہ دیدے (۲)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۸/ ۱۰/ ۱۳۸۵ھ
الجواب صحیح محمود غفی عنہ

زانیہ کو نکاح میں رکھ سکتا ہے یا نہیں؟

ایک عورت جو شادی شدہ ہے جس کا دماغی توازن کافی عرصہ سے ٹھیک نہیں ہے، جس کے تین بچے بھی ہیں اس کے ساتھ ایک غیر مرد نے زنا کرلیا ہے جس کی شاہد ایک اور عورت ہے اور وہ شادی شدہ عورت خود بھی اقرار کرتی ہے، اب سوال یہ ہے کہ اسے اپنے نکاح میں رکھ لیا جاوے یا آزاد کردیا جاوے، اگر میں نے اپنے نکاح میں اس کو رکھ لیا تو میں گنہگار نہ ہوں گا؟

الجواب وباللہ التوفیق:

شوہر اپنے نکاح میں رکھ سکتا ہے (۳)، البتہ ایک حیض آنے تک اس کے پاس نہ جائے اس کو نکاح میں رکھ لینے سے شوہر پر کوئی گناہ نہیں ہے۔فقط واللہ اعلم بالصواب

عمر دراز عورت سے نکاح:

کسی بڑی عمر کی عورت سے نکاح کر سکتے ہیں یا نہیں؟ واضح فرمائیں۔

الجواب وباللہ التوفیق:

ہاں! کر سکتے ہیں۔ بلاشبہ جائز ہے۔فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۴/ ۴/ ۱۴۰۳ھ

۱- ”ولا تجبر البالغة البكر على النكاح لانقطاع الولاية بالبلوغ“ (الدرمع الرد ۴/ ۱۵۹)۔
۲- دیکھئے ردالمحتار ۴/ ۲۰۹۔
۳- ”لا يجب على الزوج تطليق الفاجرة“ (الدرالمختار ۴/ ۱۴۴باب المحرمات)۔

خلوت صحیحہ سے پہلے طلاق دیکر پھر آٹھ روز کے اندر نکاح کرلیا صحیح ہوا یا نہیں؟

۱۔ ایک شخص نے رخصتی سے پہلے اپنی بیوی کو تین طلاق دی اور آٹھ روز کے اندر پھر نکاح ہوگیا ہے، تو نکاح ہوا یا کہ نہیں؟ (اسی مرد سے)۔

۲۔ اس کے بعد مرد نے پھر ساس کے سامنے طلاق دی اور پانچ آدمیوں کے سامنے مرد نے خود بیان کیا کہ میں نے اپنی بیوی کو طلاق دیدی جب لڑکی کے نکاح کے متعلق دوسری جگہ بات ہونے لگی تو مرد کہتا ہے کہ میں نے طلاق نہیں دی ہے۔

۳۔ وہ شخص اپنی سسرال میں آتا جاتا تھا اور کئی کئی گھنٹے رہتا تھا لیکن خلوت صحیحہ کی بھی نوبت نہیں آئی ہے۔

الجواب وباللہ التوفیق:

(او ۲ و ۳) اگر میاں بیوی میں خلوت صحیحہ نہیں ہوئی تھی اور تین طلاق تین لفظ سے دی تھی تو ایک طلاق بائن سے عورت مطلقہ ہوئی اور دوسرا نکاح جو محض آٹھ روز بعد ہوا وہ صحیح ہوا اور پھر جب مرد نے اپنی ساس کے سامنے خلوۃ صحیحہ کرنے سے پہلے پہلے طلاق دیدی تو عورت طلاق بائن سے ہی مطلقہ ہوگئی اور چونکہ ابھی خلوت صحیحہ نہیں ہوئی تھی، اس لئے اس پر عدت بھی نہیں ہے، بلکہ جب چاہے کسی دوسرے مرد سے اپنا نکاح کرسکتی ہے اور مرد کا یہ کہنا ہے کہ میں نے طلاق نہیں دی ہے صحیح نہیں ہے، اگر یہ دونوں آپس میں تعلق زن وشوئی قائم کرنا چاہتے ہیں تو پھر سے جدید نکاح کرسکتے ہیں حلالہ کی ضرورت نہیں اور اگر تینوں طلاق بیک لفظ مثلا بایں لفظ دی تھیں کہ میں نے تجھ کو تین طلاق دی تو تینوں طلاقیں واقع ہوکر حرمت مغلظہ ہوگئی اور دوسرا نکاح صحیح نہیں ہوا ہے اور اس صورت میں بھی عورت اپنا دوسرا نکاح جس مرد سے چاہے کرسکتی ہے، شوہر اول کا خلل ڈالنا جائز نہ ہوگا اور اس صورت میں (تین طلاق والی) عورت بغیر حلالہ کے شوہر اول کے لئے کسی طرح اور جائز نہ ہوگی (۱)۔

فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۳۸۵/۸/۴ھ

الجواب صحیح سید احمد علی سعید نائب مفتی دارالعلوم دیوبند

۱۔ "إذا طلق الرجل امرأته ثلاثا قبل الدخول بها وقعن عليها فإن فرق الطلاق بانت بالأولىٰ ولم تقع الثانية والثالثة" (ہندیہ ۱/۳۷۳)۔

کسی کو محض بیٹی کہنے سے حقیقتاً وہ بیٹی نہ ہوگی اور نکاح اس سے درست ہوگا:

زید کی ممانی کی بھتیجی کوثر کی لڑکی بانو کو زید نے اپنے چھوٹے بھائی سلیم کی شادی کے لئے منتخب کر کے سلیم اور بانو کے رشتہ کا پیغام دے ڈالا اور یہ بھی کہا کہ اگر لڑکا ولڑکی ایک دوسرے کو پسند کرلیں تو رشتہ کرلیا جائے۔ زید اپنے ماموں کے یہاں پہلے سے دس سال سے آتا جاتا ہے، جب کہ زید کی والدہ و ماموں ایک دوسرے سے کبھی ملنے جلنے نہیں جاتے۔

کیونکہ زید کی بیوی کی بیماری اور بچہ زندہ نہ رہنے کی وجہ سے اور سلیم کے چھوٹا بھائی ہونے کے ناطہ زید سلیم سے محبت کرتا ہے، لہذا زید نے سلیم اور بانو کے رشتہ کا ذکر کرتے وقت بات چیت کے درمیان یہ کہا کہ اگر بانو کا سلیم سے رشتہ ہوا تو بانو ایک رشتہ سے بھانجی ہونے کے ناطہ بیٹی کے برابر ہے اور پھر اگر چھوٹے بھائی کی دلہن بن گئی تو اس ناطے بھی بیٹی کے برابر ہوگی، اور کیونکہ میری اولاد نہیں ہے، اس لئے اس کی بیٹی کی طرح شادی کروں گا اور بانو کو بیٹی کہہ کر پکارنا اور بات چیت کرنا شروع کردیا، بانو کو سلیم نے دیکھنے کے بعد ناپسند کردیا اور اس پیغام کے چلنے کے دوران صرف عرصہ ۱۱/۲ ماہ میں بانو وزید ایک دوسرے کو اتنا پسند کرنے لگے کہ ایک دوسرے کی علیحدگی برداشت نہیں کرتے ہیں۔ زید کی بیوی صفیہ پچھلے دو سال سے زید کو دوسری شادی کی اجازت دے چکی ہے اور کیونکہ صفیہ لگاتار بیمار رہتی ہے اور اولاد بھی زندہ نہیں رہتی، لہذا زید نے اولاد کی خواہش کے ساتھ اپنی جسمانی ضروریات کے لئے اپنی دوسری شادی کے لئے تیاری کر رکھی ہے، بانو کو جب کہ سلیم نے ناپسند کردیا ہے اور بانو کی زید کے ساتھ بے تکلفی اور محبت کو دیکھ کر زید کی بیوی صفیہ نے زید کو مشورہ دیا کہ جب دوسری شادی ضروری ہے اور آپ ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں تو بانو سے ہی نکاح کرلیں، بانو کا جھکاؤ بھی زید کی طرف ہے۔ مگر زید کی ممانی فاطمہ کا کہنا ہے کہ جب زید نے بانو کو بیٹی کہا ہے تو بیٹی سے نکاح حرام ہے۔

ان سب حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے زید کا بانو سے نکاح جائز ہے یا نہیں؟ وہ بھی اس صورت میں کہ زید نے اس بانو کو بارہا بھائی، بہن اور بارہا بیٹی کہہ کر مخاطب کیا ہے اور خطوں میں بیٹی لکھا ہے اور بانو کا اپنے چھوٹے بھائی سلیم سے رشتہ کرنا چاہا ہے، سلیم کے انکار کا سبب بھی یہی لگتا ہے کہ زید کی بانو سے بے حد بے تکلفی ہے۔ اس صورت میں شریعت کا کیا حکم ہے؟ اور احکام خداوندی کا کیا فیصلہ ہے؟

الجواب وباللہ التوفیق:

صورت مسئولہ میں زید کا نکاح بلا کراہت اور بلاشبہ جائز ہے، بلکہ دونوں کی محبت کا یہ حال ہے تو یہ نکاح کر دینا بہتر

ہے۔فاطمہ کا یہ کہنا کہ زید کا نکاح بانو سے حرام ہے، اس لئے کہ اس کو بیٹی کہہ چکا ہے بالکل غلط ہے اور شریعت کے حکم ومنشاء کے خلاف ہے، کسی کو منہ بولا بیٹا کہہ دینے سے یا کسی کو بیٹی یا بھانجی یا بہن وغیرہ کہہ دینے سے حقیقۃ وہ بیٹا، یا بیٹی یا بہن نہیں ہو جاتا ہے۔اس سے نہ تو ترکہ کا استحقاق ہوتا ہے اور نہ نکاح ومصاہرت کے احکام جاری ہوتے ہیں۔چنانچہ اکیسویں پارہ سورۂ احزاب کے پہلے ہی رکوع میں یہ آیتیں نازل فرمائی ہیں: قال اللہ تعالیٰ: ''وماجعل أزواجکم اللئی تظھرون منھن أمھتکم وماجعل أدعیاء کم أبنا ئکم ذالکم قولکم بأفواھکم واللہ یقول الحق وھو یھدی السبیل أدعوھم لآبائھم ھو أقسط عند اللہ فان لم تعلموا آبائھم فإخوانکم فی الدین'' (۱)۔

پس فاطمہ کو بہن، زید کو بھائی، بانو کو بیٹی وغیرہ کہنے سے ہرگز اس نکاح کے جواز میں اور حلال ہونے میں کوئی شبہ نہ کیا جائے، اسی طرح کسی قسم کا اور کوئی شبہ ان دنیاوی معاملات ورسوم کے تعلق سے ہرگز نہ کیا جائے۔

نوٹ: صفیہ کا مشورہ بالکل درست ہے، زید کو بانو سے نکاح کرلینا انسب وبہتر ہے۔بانو کو بھانجی، بیٹی وغیرہ کہنے سے یا لکھنے سے یہ نکاح ہرگز مکروہ بھی نہ ہوگا۔تفصیلی جواب اوپر صفحہ پر گزر چکا ہے وہ دیکھئے۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۹/ ۸/ ۹۸ ۱۳ ھ

حاملہ بالزنا سے نکاح اور اس کے پڑھانے والے کا حکم:

ہندہ زنا سے حاملہ ہوگئی اور اپنے حمل کا الزام تین آدمیوں پر لگائی، انکو چھوڑ کر ہندہ کا نکاح اور آدمیوں سے پڑھوادیا ہے اور یہ بھی سنا ہے کہ نکاح پڑھاتے وقت امام نے دولہا سے دریافت کیا کہ یہ حمل تمہارا ہے دولہا نے علیحدگی میں امام صاحب سے کہا ہاں میرا ہے، امام نے ایک زانی اور زانیہ کا نکاح پڑھوادیا ہے۔

ان کو کوئی شرعی سزا وغیرہ نہیں دی گئی ہے، کیا امام صاحب کا یہ فعل گناہ ہے کہ نہیں اگر امام کا یہ فعل گناہ ہے تو امام کے لئے شرعی کیا حکم ہے، کیا یہ نکاح صحیح ہے یا کہ نہیں اور امام کی امامت درست ہے یا کہ نہیں؟

الجواب وباللہ التوفیق:

صورت مسئولہ میں ہندہ کا جو نکاح پڑھادیا گیا ہے وہ بالکل صحیح ہے، اگر یہ حمل زنا کا اس شخص کا ہے جس سے نکاح ہوا تو وضع حمل سے پہلے بھی ہندہ کے پاس وہ جاسکتا ہے اور اگر حمل اس کا نہیں ہے تو وضع حمل سے قبل ہندہ کے پاس اس نکاح

۱- سورۂ احزاب: ۴-۵۔

پڑھادینے سے نکاح پڑھانے والے یا اس کے گواہان پر کوئی شرعی گرفت نہیں ہے، بلکہ اس نکاح پڑھادینے سے ایک باب زنا کا انسداد ہوگیا ہے (۱)، کوئی گرفت نہیں جب تک کہ چار عینی شہادت یا خود انکو اقرار نہ ہو اور یہاں دونوں باتیں نہیں اور اب اگر وہ سب اقرار بھی کریں تو نکاح میں فرق نہیں آئے گا، زانی اور زانیہ پر لازم ہے کہ اللہ رب العزت کے سامنے نہایت ندامت اور عجز ونیاز کے ساتھ توبہ واستغفار اور آئندہ اس گناہ کے مرتکب نہ ہونے کا عہد کرتے ہوئے اپنے گناہوں کی معافی چاہیں اور آئندہ اپنا رویہ طور طریقہ صحیح رکھیں، حکومت اسلامی ہوتو ایسے مجرم کی سزا شادی شدہ ہوتو سنگسار کرڈالنا ہے ورنہ سو کوڑے لگانا، مگر یہ حق محض حکومت کو ہے دوسروں کو نہیں، لہذا ایسی صورت میں توبہ واستغفار بدرگاہ رب العزت ضروری ہے مجمع عام توبہ واستغفار کے لئے ضروری نہیں ہے، عوام کیلئے ضروری ہے کہ وہ بھی خواہانہ اور ناصحانہ انداز سے دونوں کی اصلاح کی اس طرح کوشش کریں کہ وہ دونوں اپنے گذشتہ گناہ سے واقعی نادم وتائب ہوکر سیدھے راستہ پر جم جائیں اور بس۔

عوام الناس کو حد شرع کے اندر رہنا چاہئے جذبات سے مشتعل ہوکر حد سے تجاوز نہیں کرنا چاہئے، ہاں اگر یہ نکاح نہ ہوگیا ہوتا بلکہ وہ سب اس زنا کے مرتکب رہتے تو عوام کو حق ہوتا کہ جہاں تک ممکن ہو بلا کسی فساد اور فتنہ کے دباؤ ڈالکر باز رکھنے کی کوشش کرتے۔ اب سب مرحلے ختم ہوگئے اب کسی پر کوئی حکم نہیں۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۳/۹/۸۵ ۱۳ھ

الجواب صحیح محمود غفی

حاملہ بالزنا سے نکاح اور بچہ کے نسب سے متعلق:

ایک شخص مرتکب زنا ہے اور اس سے علوق ہوگیا ہے، اہل خاندان نے مذکورہ شخص کو مجبور کر کے نکاح کردیا ہے، نکاح رضامندی سے ہوا ہے، طرفین رضامند ہیں اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ بحالت حمل نکاح صحیح ہوا ہے کہ نہیں یہ بات ثابت ہے کہ اسی آدمی کا حمل ہے، عزت کے واسطے اہل خاندان نے جلدی سے نکاح کردیا ہے، یہ نکاح صحیح ہوا ہے کہ نہیں اور لڑکا اس کے زانی باپ سے ثابت ہوگا کہ نہیں اور لڑکے کو حرامی کہنا کیسا ہے؟

شفیق احمد (پوسٹ بکس ۲۰۲، الخبر سعودیہ عربیہ)

۱- "وقال أبو حنيفة ومحمد رحمهما الله تعالى: يجوز ان يتزوج امرأة حاملا من الزنا ولايطأها حتى تضع ...... وفي مجموع النوازل: اذا تزوج امرأة قد زنا هو بها وظهر بها حمل فالنكاح جائز عند الكل وله ان يطأها عند الكل" (الہندیہ ۱/۲۸۰ دارالکتاب دیوبند)۔

الجواب وبالله التوفيق:

(۱) في الدر المختار على رد المحتار :" صح نكاح حبلى من زنا)۔

(۲) "وتحته في الرد أي عندهما وقال أبويوسف لا يصح والفتوى على قولهما"(۲)۔

(۳) "و في صفحة (۲۹۲) تحته في الدر : لو نكحها الزاني حل له وطؤها اتفاقا" (۳)۔

ان عبارتوں سے معلوم ہوا کہ جب کنواری غیر شادی شدہ کوحمل ٹھہر جائے تو چونکہ وہ یقیناً زنا کا حمل ہوگا اور ایسی حالت میں انکا نکاح کردینا بلاشبہ جائز ودرست ہوگا اور وہ نکاح صحیح ہوگا مفتی بقول یہی ہے۔

اور یہ بھی معلوم ہوا کہ جس کا حمل ہے اگر اسی کے ساتھ نکاح ہو جائے تو وہ اس کے ساتھ صحبت قربت بھی کرسکتا ہے اور میاں بیوی کی طرح رہ بھی سکتا ہے، پھر اس نکاح سے فقط چھ ماہ پورے ہونے پر بھی بچہ پیدا ہوگا تو وہ بھی حلال اور ثابت النسب ہوجائے گا اور اس کو حرامی کہنا جائز نہ ہوگا اور باپ دادا وغیرہ کے ترکہ سے وراثت بھی پائے گا۔

اگر نکاح کے بعد چھ ماہ گذرنے سے پہلے ہی وہ حمل پیدا ہوجائے اور شوہر کہے کہ یہ میرے نطفہ سے نہیں ہے تو اس کو ثابت النسب نہیں قرار دیں گے بلکہ اس کو منسوب الی امہ کہیں گے اور باپ دادا سے وراثت بھی نہ پائے گا بلکہ صرف ماں نانی کی جانب سے وراثت پائے گا۔

اور اگر چھ ماہ کے اندر ہی پیدا ہوا مگر باپ نے اپنا لڑکا ہونے سے انکار نہیں کیا بلکہ اپنا ہی لڑکا بتایا تو اس کو اس صورت میں بھی ثابت النسب ہی کہا جائے گا اور منسوب الی امہ نہیں کہیں گے، البتہ باپ دادا سے وراثت نہیں پائے گا باقی حرامی وغیرہ اس انداز سے کہنا جس میں طنز یا توہین کا یا ایذ ارسانی کا پہلو نکلے جائز نہ ہوگا، بلکہ منع رہے گا (۴)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۳/۲/۱۴۰۱ھ

۱- الدر المختار مع رد المحتار ۱۴۱/۴۔

۲- رد المحتار على الدر المختار ۱۴۱/۴۔

۳- الدر المختار مع رد المحتار ۱۴۲/۴۔

۴- "ولو زنى بامرأة فحملت ثم تزوجها فولدت، إن جاءت به لستة أشهر فصاعداً ثبت نسبه، وإن جاءت به لأقل من ستة أشهر لم يثبت نسبه إلا أن يدعيه ولم يقل إنه من الزنا، أما إن قال إنه مني من الزنا فلا يثبت نسبه ولا يرث منه كذا في الينابيع" (فتاویٰ عالمگیریہ ۵۴۰/۱)۔

جس لڑکی نے غیر مسلم لڑکے سے شادی کر لی ہو اس سے تعلق رکھنا:

آج سے لگ بھگ دس ۱۰/بارہ سال قبل میری ایک لڑکی تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد ہماری سخت مخالفت اور اظہار ناراضامندی کے باوجود ایک غیر مسلم لڑکے سے شادی سول میرج کر کے مجھ کو اور پورے خاندان کو بڑی پریشانی اور بدنامی میں ڈال دی ہے، اگر چہ لڑکی اپنے مذہب پر قائم ہے اس کا خاوند اس کو یہ اجازت دیتا ہے کہ اپنے مذہب پر قائم رہ کر زندگی بسر کر سکتی ہے، لڑکی کی یہ حرکت اپنے مذہب میں ناجائز اور زنا ہے، اس وجہ سے ہم نے لڑکی کے ساتھ چند سال سے قطع تعلق کر لیا ہے، تا کہ لڑکی راہ راست پر آجائے اور لڑکے کے ساتھ ازدواجی رشتہ توڑ دے، اب ان دونوں کے درمیان تین چار بچے ہیں، اس لئے بظاہر اب ان دونوں کا یہ ناجائز رشتہ ٹوٹنا کچھ ناممکن سا ہے۔

اس دوران لڑکی ہمارے پاس چلی آئی اور یہ خواہش ظاہر کرتی رہی کہ ہم اس کے ساتھ کچھ تعلقات رکھیں، اب ہمارے سامنے خدشہ ہے کہ ہم نے اس کے ساتھ قطع تعلق کر رکھا ہے اور اس کو کسی صورت میں اپنے گھر آنے کی اجازت نہ دی تو تنگ آکر یا مجبور ہو کر تبدیل مذہب کر کے پوری طرح مرتد نہ ہو جائے، اس صورت میں ہمارے لئے زیادہ پریشانی کا باعث ہو سکتا ہے ہمارے چند رشتہ دار یہ مشورہ دیتے ہیں کہ لڑکی کے ساتھ قطع تعلق کرو اس کے ساتھ تعلق رکھنا اور اس کو اپنے گھر آنے کی اجازت دینا شرعاً ناجائز ہے، میں اور میرے گھر کے دوسرے افراد ذہنی پریشانی میں مبتلا ہیں، اس وقت ہمارا لڑکی کے ساتھ تعلق رکھنا صرف مجبوری سے تالیف قلب کے پیش نظر ہے ورنہ لڑکی کی موجودہ زندگی کو ہم ناجائز سمجھتے ہیں۔

حاجی عبد الحق

الجواب وبالله التوفيق:

ہندوستان چونکہ دار غیر اسلامی ہے، اس لئے مجبوری و معذوری کے درجہ میں یہ حکم شرعاً دیا جائے گا کہ لڑکی اور لڑکی والے انتہائی کوشش وسعی بذریعہ ترغیب وتحریض کریں کہ لڑکا مسلمان ہو کر شرعی ضابطہ کے مطابق نکاح کر لے جب تو اس کی اصلاح وتبلیغ کے درجہ میں تعلق ضروری رکھنے کی اجازت ہوگی اور اعلی بات پھر بھی یہی ہے کہ لڑکی اپنے پیدائش شدہ بچوں کو بھی قربان کر کے اگر وہ شخص مسلمان نہ ہو تو اس سے علیحدہ ہو جائے اور بالآخر جب اس کے مسلمان ہونے سے مایوسی ہو جائے تو لڑکی کے لئے یہی حکم متعین رہے گا۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دار العلوم دیوبند سہارنپور

الجواب صحیح: محمد ظفیر الدین مفتی دار العلوم دیوبند ۲۲/۱۱/۲ ۱۴۰ھ

بیوہ ممانی سے نکاح:

زید کا سگا بھانجا محمود بعد وفات زید محمود کا نکاح سارہ سے ہوسکتا ہے یا کہ نہیں؟

الجواب وباللہ التوفیق:

سوال میں مراد سارہ سے اگر زید کی بیوی ہے تو سارہ محمود کی ممانی ہوئی اور اس سے زید کے انتقال کے بعد محمود کا نکاح ہوسکتا ہے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۹/۷/۱۳۸۵ھ

الجواب صحیح محمد جمیل الرحمٰن نائب مفتی دارالعلوم دیوبند

مسلم لڑکی نے غیر مسلم لڑکے سے نکاح کیا تو نکاح اور اولاد کا حکم:

ہندہ نے ایک ہندو مرد کے ساتھ شادی کی ہے اور اس سے اس کو اولاد بھی ہوئی ہے، اب ان اولاد سے کوئی مرجاوے تو اس کی تجہیز وتکفین مسلمانوں جیسی ہو یا کہ نہیں اور مسلمانوں کے قبرستان میں دفن کرسکتے ہیں یا نہیں اور ان بچوں کی شادی مسلمان کے یہاں کرسکتے ہیں یا کہ نہیں وہ عورت اب تک اسلام پر ہی قائم ہے۔

حسن شہاب الدین

الجواب وباللہ التوفیق:

مسلمان عورت کے مسلمان رہتے ہوئے اور ہندو مرد کے ہندو رہتے ہوئے شادی کیسی یہ کہئے کہ ناجائز تعلق ہوا، شادی کے عنوان سے زنا ہوتا رہا ہے اور زنا سے اولادیں پیدا ہوئیں، بہر حال یہ سب اولادیں ماں کے تابع ہوکر مسلمان شمار ہوں گی اور مسلمانوں کی طرح مرنے جینے، شادی بیاہ تمام امور میں ان کے ساتھ معاملہ کیا جاوے گا (۱)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

الجواب صحیح محمود غفی عنہ ۲۹/۱۰/۱۳۸۵ھ

۱- ”ذمی تزوج مسلمة یفرق“ (الہندیہ ۱/۳۳۷)”والولد یتبع خیر الابوین دینا“ (الدرمع الرد ۴/۳۷۰ مکتبہ زکریا) وقال الشامی: یشعر التعبیر بالابوین ولد الزنا (ردالمحتار ۴/۳۷۰)۔

۱-بیوی کے لڑکے کا نکاح اپنی لڑکی سے:

اپنی زوجہ کے بیٹے سے اپنی لڑکی کا عقد نکاح کر سکتے ہیں یا نہیں؟

۲-مطلقہ بائنہ سے نکاح:

جس عورت کو طلاق بائنہ دی گئی ہو ان کو اپنے نکاح میں واپس لانے کے لئے نکاح کی ضرورت ہے کیا؟ اب دوسری مرتبہ مہر دینا پڑے گا یا نہیں۔

ابراہیم بن محمد صالح جی افریقی

الجواب وباللہ التوفیق:

۱- اپنی زوجہ کا لڑکا جو دوسرے شوہر سے ہو اور اس کو ساتھ لیکر آئے اس کا نکاح اپنی اس لڑکی سے جو دوسری بیوی سے ہو جائز ہے۔

قرآن پاک پ ۴ کے اخیر میں مذکور ہے کہ صرف ۱۴ رشتے ایسے ہیں جن سے نکاح حرام ہے اور اس کے علاوہ جو رشتے ہیں ان سے نکاح حلال ہے چنانچہ اخیر آیت میں ارشاد ہے: "**واحل لکم ما وراء ذلکم**"، چونکہ یہ رشتہ ان (۱۴) رشتوں کے علاوہ ہے، اس لئے بلاشبہ جائز ہے(۱)۔

۲- اپنی جس عورت کو صرف طلاق بائنہ دیا ہو تین طلاق نہ دیا ہو، اس کو پھر اپنے نکاح میں لانا ہو تو محض عورت کی اجازت ومرضی سے خواہ عدت کے اندر رہو یا عدت کے بعد بغیر حلالہ کے صرف دو گواہوں کے سامنے جدید نکاح پڑھا کر لا سکتا ہے، البتہ اس جدید نکاح کا مہر جو آپس کے مشورے سے بوقت نکاح طے ہو جائے دینا ہوگا،" **هكذا في الرد والبحر**

۱- "حرمت عليكم أمهاتكم وبناتكم وأخواتكم وعماتكم وخالاتكم وبنات الأخ وبنات الأخت وأمهاتكم اللاتي أرضعنكم وأخواتكم من الرضاعة وأمهات نسائكم وربائبكم اللاتي في حجوركم من نسائكم اللاتي دخلتم بهن فإن لم تكونوا دخلتم بهن فلا جناح عليكم وحلائل أبنائكم الذين من أصلابكم وأن تجمعوا بين الأختين إلا ما قد سلف إن الله كان غفوراً رحيما، والمحصنات من النساء إلا ما ملكت أيمانكم كتاب الله عليكم وأحل لكم ما وراء ذلكم أن تبتغوا بأموالكم محصنين غير مسافحين، فما استمتعتم به منهن فآتوهن أجورهن فريضة ولا جناح عليكم فيما تراضيتم به من بعد الفريضة إن الله كان عليماً حكيماً" (سورۂ نساء: ۲۳، ۲۴) "واما بنت زوجة ابيه أو ابنه فحلال" (الدر المختار مع رد المحتار ۴/۱۰۵)۔

وغیرهما فی باب ایقاع الطلاق"(۱)۔

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۴۰۱/۶/۲۸ھ

مرحوم بھائی کی بیوہ سے نکاح:

مسلمان کا کوئی بڑا بھائی یا چھوٹا بھائی فوت ہوجائے تو ان کی بیوہ بیوی سے نکاح کرسکتے ہیں یانہیں؟ واضح فرمائیں۔

الجواب وباللہ التوفیق:

بڑا بھائی ہویا چھوٹا بھائی اس کے انتقال کے بعد اس کی بیوہ سے نکاح کرسکتے ہیں جائز ہے، بشرطیکہ رضاعت وغیرہ کا کوئی ایسا رشتہ نہ ہوجس سے نکاح حرام ہوتا ہے۔

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۴۰۳/۲/۴ھ

دو سگے بھائیوں کا دوسگی بہنوں سے نکاح:

دو بھائی، دوسگی بہنوں سے نکاح کرسکتے ہیں یانہیں؟ واضح فرمادیں۔

الجواب وباللہ التوفیق:

ہاں! دو سگے بھائیوں کا نکاح دوسگی بہنوں سے جائز ہے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۴۰۳/۲/۴ھ

مزنیہ کی بہن سے نکاح:

ایک شخص کسی عورت کے ساتھ زنا کا مرتکب رہاہے، اب اس عورت کی سگی بہن کی شادی زانی کے ساتھ ہورہی ہے

۱- (وينكح مبانته في العدة وبعدها أي المبانة بما دون الثلاث لأن المحلية باقية(البحر الرائق ۴/ ۹۴، الدر المختار والرد عليه ۵/ ۴۰)۔

یہ شادی جائز ہے یا کہ نا جائز ہے؟

الجواب وباللہ التوفیق:

ہاں یہ شادی جائز ہے، "قال في البحر: أراد بحرمة المصاهرة الحرمات الأربع حرمة المرأة علی اصول الزاني وفروعه نسبا ورضاعا وحرمة أصولها وفروعها علی الزاني نسبا ورضاعا كما في الوطء الحلال ويحل لأصول الزاني وفروعه أصول المزني بها وفروعها.....وتقييده بالحرمات الأربع مخرج بما عداها" (۱)۔

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۸/۶/ ۱۳۸۵ھ

عیسائی مجسٹریٹ کے کرائے ہوئے نکاح کی شرعی حیثیت:

عدالتی کورٹ میں عیسائی مجسٹریٹ کے سامنے نکاح ہو، اور مجسٹریٹ ایجاب وقبول کرائے اور دو گواہ مسلمان موجود ہوں، ایک مرد کی طرف سے اور دوسرا عورت کی طرف سے تو یہ نکاح شرعاً منعقد سمجھا جائے گا یا نہیں؟ مع دلائل جواب سے مشرف فرمائیں۔

نوٹ: ایجاب وقبول کے الفاظ انگریزی میں ہوتے ہیں جس کا ترجمہ حسب ذیل ہے:

تم زید ابن عمر کہہ سکتے ہو کہ تمہاری دانست میں کسی طرح سے باقاعدہ تمہارا نکاح مسمی ہندہ بنت بکر کے ساتھ ہوا جو یہاں حاضر ہے تو اس میں کسی قسم کی رکاوٹ نہیں ہے اور تم ان گواہوں کے اور حاضرین کے روبرو جو یہاں موجود ہیں، باقاعدہ ہندہ بنت بکر کو اپنی بیوی کے طور پر قبول کرتے ہو۔ پھر مجسٹریٹ نکاح کرنے کے لئے جو عورت وہاں حاضر ہے اس سے سوال کرتا ہے کہ "تو ہندہ بنت بکر کہہ سکتی ہے کہ تیری دانست میں کسی طرح سے باقاعدہ تیرا نکاح مسمی زید بن عمر کے ساتھ ہو جو یہاں موجود ہے تو اس میں کسی قسم کی رکاوٹ نہیں، تو ان گواہوں اور حاضرین کے روبرو جو یہاں موجود ہیں باقاعدہ زید بن عمر کو اپنے شوہر کے طور پر قبول کرتی ہے۔ مجسٹریٹ کے اس سوال کے جواب میں عورت کہتی ہے کہ "ہاں" میں زید بن عمر کو اپنے شوہر کے طور پر قبول کرتی ہوں۔ پھر فوراً اس ایجاب وقبول کے بعد مجسٹریٹ دونوں مرد اور عورت کے داہنے ہاتھ طلب کرتا ہے اور دونوں کی ملاقات کرا دیتا ہے اور ان الفاظ میں نکاح کرا دیتا ہے:" میں ظاہر کرتا ہوں کہ زید ابن عمر اور ہندہ بنت بکر جو

۱- رد المحتار ۳/ ۱۰۷۔

یہاں حاضر ہیں دونوں نے با قاعدہ نکاح کر لئے''۔مزید وضاحت کے لئے کورٹ کا جو یہاں پر طریقہ رائج ہے، اس کی انگریزی نقل ارسال ہے۔

الجواب وبالله التوفيق:

حسب تحریر سوال جب عقد نکاح کی مجلس میں زوجین (مردوعورت) دونوں خودموجود تھے، تو اگر چہ عیسائی مجسٹریٹ کے کہنے سے یا پوچھنے سے مرد نے کہا: ''میں قبول کرتا ہوں'' اور عورت نے کہا: ''میں قبول کرتی ہوں'' تو چونکہ ''میں قبول کرتا ہوں'' اور ''میں قبول کرتی ہوں'' یہ دونوں قول وفعل حال کے صیغے ہیں جو عقود میں مثل صیغہ ماضی کے یکساں مفید اور باعث انعقاد عقد ہوتے ہیں، خواہ کسی زبان میں ہوں، جیسا کہ اس عبارت سے معلوم ہوتا ہے: "وهما (أي الايجاب والقبول) عبارة عن كل لفظين ينبئان عن معنى التمليك ماضيين أو حالين" (۱)۔

لہذا پہلا قول ایجاب اور دوسرا قول قبول بن گیا اور عقد نکاح کا ایجاب وقبول دونوں جو رکن نکاح ہیں پائے گئے اور یہ دونوں (میاں بیوی) خود عاقد نکاح اور مباشر نکاح (خود اپنے نکاح کا عقد کرنے والے) ہو گئے اور جب یہ ایجاب وقبول دونوں دو مسلمان گواہوں کے روبرو ہوا تو نکاح بلاشبہ منعقد ہو کر لازم بھی ہو گیا۔ اور مجسٹریٹ محض واسطہ مگر اس کے درجہ میں رہ گیا تا کہ بوقت انکار ثبوت ہو سکے جیسا کہ مندرجہ ذیل فقہی عبارتوں سے واضح ہوتا ہے:

الف: "ويصح (النكاح) بلفظ تزويج ونكاح .... وبكل ما يملك به الرقاب" (۲)۔

ب: "إذا كان الموكل حاضراً كان مباشراً الخ، لأن العبارة منتقل إليه وهو في المجلس(۳)"۔

ج: "قوله: إنها تجعل عاقده الخ لانتقال عبارة الوكيل إليها وهي في المجلس فكانت مباشرة ضرورة" (۴)۔

د: "قوله: وينعقد متلبسا بإيجاب احدهما الخ أشار إلىٰ أن المتقدم من كلام العاقدين إيجاب، سواء كان المتقدم من كلام الزوج أو من كلام الزوجة والمتاخر قبول" (۵)۔

۱- تنویر الأبصار۔
۲- شامی ۱۶/۳ کتاب النکاح۔
۳- شامی ۲۵/۳ کتاب النکاح۔
۴- حوالہ سابق۔　　　۵- مصدر سابق۔

ھ: "وتقبل شهادة المامور عند التجاحد وإرادة الإظهار، وأما من حيث الانعقاد الذى الكلام فيه فهي مقبولة مطلقا كما لا يخفي" (۱)۔

اور جب مرد وعورت (زوجین) دونوں نے مجلس عقد نکاح میں خود موجود رہتے ہوئے ایجاب وقبول کے الفاظ کہہ دیئے تو اب مجسٹریٹ کو مندرجہ بالا عبارت کی بناء پر شرعا قاضی نکاح اور عاقد نکاح نہیں قرار دیا جائے گا، اسی طرح خطبۂ نکاح ،نکاح کے شرائط وواجبات میں سے نہیں ہے، بلکہ سنن نکاح میں سے ہے اور سنن کے ترک ہوجانے سے اصل شئی ختم یا باطل نہیں ہوتی، بیش از بیش اگر خود کسی جبر واکراہ کے اور بغیر کسی قانونی مجبوری کے محض اپنی مرضی سے ایسا عقد (یعنی بغیر خطبہ وبغیر تذکرۂ مہر کے) کیا جائے تو خلاف سنت کے ارتکاب کا گناہ ہوگا، اور اگر قانونی مجبوری سے یا کسی جبر واکراہ ودباؤ سے ایسا کر لیں تو ارتکاب کا گناہ بھی نہ ہوگا، جیسا کہ عبارات ذیل سے معلوم ہوتا ہے:

(۲) "أمر السلطان إكراه وإن لم يتوعده" (۲)۔

(۳) "في الحديث: إن الله تجاوز عن أمتي الخطاء والنسيان وما استكرهوا عليه، وفي شرحه أى وما طلب منهم من المعاصي على وجه الإكراه" (۳)۔

اسی طرح تذکرۂ مہر نہ ہونے سے بھی اس عقد میں کوئی خرابی یا فساد نہیں آیا (۴) "ويصح النكاح وإن لم يسم فيه مهرا" وهكذا في الدر والرد وغيرهما۔

خلاصہ یہ کہ صورت مسئولہ میں حسب تحریر سوال اس عقد نکاح کے صحیح ولازم ہوجانے میں کوئی شبہ نہیں، بلاشبہ بالکل صحیح ہوکر لازم ونافذ ہوجاتا ہے۔فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۸/ ۸/ ۹۶ ۱۳ھ

بیوی کے مرنے کے فورا بعد دوسرا نکاح کرنا:

کیا مرد اپنی عورت کے مرتے ہی سالی کے علاوہ دوسری عورت سے نکاح کرسکتا ہے، اس میں عورت کی عدت پوری

۱- مصدر نفسہ۔
۲- شامی ۹/ ۱۸۲ کتاب الاکراہ، دارالکتب العلمیہ بیروت۔
۳- مشکوۃ، ص ۵۸۴، کتاب المناقب حدیث: ۶۲۹۳۔
۴- ہدایہ ۲/ ۶۲ باب المہر ۲۔

ہونے کا انتظار کیا جاوے یا کہ نہیں؟

الجواب وباللہ التوفیق:

جی ہاں بیوی کے مرنے کے بعد یا زندگی میں بھی کر سکتا تھا مرنے کے بعد بھی فوراً کر سکتا ہے، بشرطیکہ وہ بیوی کی بہن یا بیوی کی اور محرمات میں جیسے خالہ پھوپھی وغیرہ نہ ہو بلکہ اجنبی ہو، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دار العلوم دیوبند سہارنپور ۲۱/۱۰/۱۳۸۵ھ

الجواب صحیح محمود علی عنہ

ممتدۃ الطہر مطلقہ کے نکاح ثانی کے لئے جواز کی ایک صورت:

بندہ کے ساتھ بکر کی شادی ہوئی، شادی ہونے کے بعد بچی پیدا ہوئی، بکر نے اپنی منکوحہ کو طلاق بائن دیدی، بکر کی بچی تقریباً پونے دو سال کی ہے، اب تک بندہ کو پیدائش کے بعد سے حیض نہیں آیا ہے، بندہ اب ایک دوسرے شخص سے شادی کرنا چاہتی ہے، مگر حیض نہ آنے کی وجہ سے عدت پوری نہیں ہو رہی ہے، اس کو لوگوں نے حیض جاری کرنے کے لئے علاج کا مشورہ دیا ہے، ایک ماہ تک علاج ہوا، مگر حیض جاری نہیں ہو رہا ہے، اگر کوئی صورت شادی کرنے کی ہو تو تحریر فرمائی جائے، یا اس سلسلہ میں کوئی مشورہ تحریر فرمایا جائے۔ شادی کی سخت ضرورت ہے۔

الجواب وباللہ التوفیق:

ایسی عورت کو دوسرے شخص سے نکاح کے لئے، حنفیہ کا مسلک مختار تو یہی ہے کہ مدت ایاس تک جس کی کم سے کم مدت تیس برس کی عمر ہو جانے تک ہے، انتظار کرے، اگر تیس سال کی عمر تک حیض نہ آئے تو آئسہ سمجھ کر تین ماہ عدت گزار کر دوسرا نکاح کرے، اس لئے اگر اس کو نکاح کی ضرورت ہے تو بہتر یہی ہے کہ اسی سابق شوہر سے نکاح کرے کہ اس کے ساتھ نکاح کرنے میں کوئی عدت گزارنے کی ضرورت نہیں ہے۔

لیکن اگر سابق شوہر پھر نکاح کرنے پر تیار نہ ہو، اور یہ عورت بے سہارا ہو، نان ونفقہ کا کوئی نظم نہ ہو یا حالات ایسے ہوں کہ بغیر دوسرا نکاح کئے باعصمت زندگی گزارنا دشوار ہو تو اس کو اختیار ہے کہ جماعت مسلمین (شرعی پنچایت) بنا کر جس

میں کم از کم تین دیندار باا ثر معاملہ فہم معزز مسلمان ہوں، اس شرعی پنچایت کے سامنے درخواست دے کر بغیر دوسرا نکاح کئے ہوئے اپنی عصمت زندگی دشوار ہونے کو، نیز نان ونفقہ وغیرہ کی اگر مجبوری ہو بے سہارا ہو، ان باتوں کو ثابت کر کے دوسرا نکاح کر لینے کی اجازت کا مطالبہ کرے۔

پس جماعت مسلمین (شرعی پنچایت) اگر اس کے مطالبہ کو مبنی برحقیقت وصحت سمجھتے ہوئے حیلہ ناجزہ میں لکھے ہوئے ان وجوہ وعلل کے مطابق جوموجب ہوتے ہیں حضرت امام مالکؒ کے مسلک کے مطابق زوجہ مفقود ومتعنت وغیرہ میں فسخ نکاح کے فیصلہ کے لئے، اگر اس عورت کو بھی حضرت امام مالکؒ کے مسلک کے مطابق ۹/ ماہ یا ایک سال مزید حیض کے انتظار کے بعد ختم عدت کا حکم دے کر دوسرا نکاح کر لینے کی اجازت دے دے، تو اس عورت کو جماعت مسلمین کے اس فیصلہ کے مطابق عمل کر لینا اور دوسرا نکاح کر لینا درست رہے گا۔

اس فیصلہ کے جواز ونفاذ کے دلائل شامی (۲/ ۸۲۹)، اور حیلہ ناجزہ (ص ۵۰، و ۶۳) سے بھی مستنبط ہوتے ہیں اور یہ مسئلہ زوجہ مفقود یا متعنت کی نظیر بن سکے گا، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۵/ ۳/ ۹۳ ۱۳ھ

شوہر کے مرتد ہونے سے نکاح فسخ ہوگیا:

زید نے جو اہل سنت مسلمان تھا یا اپنے آپ کو سنی مسلمان ظاہر کرتا تھا، کئی سال پہلے ایک سنی لڑکی سے شادی کی، نکاح حنفی المذہب عالم نے پڑھایا، کچھ عرصہ کے بعد مختلف اثرات کے ماتحت زید پکا مرزائی قادیانی ہوگیا۔ اس عرصہ میں اس کی اولاد بھی ہوئی جس میں دولڑکے اور لڑکیاں بقید حیات ہیں۔ اس کی بیوی بدستور سنی رہی اور ہے، کئی دفعہ اسے ربوہ جا کر مرزائی خلیفہ سے بیعت کرانے پر مجبور کیا، مگر اس نے انکار کردیا۔ اب ملک کی نمائندہ جماعت اور جمہور اہل اسلام کے فیصلہ کے بعد جب مرزائیوں کو غیر مسلم قرار دیا جا چکا ہے زید کو توبہ کرنے کا مشورہ دیا گیا، مگر وہ اپنے مرتد رہنے پر مصر ہے۔ کیا اس کے بعد زید کا نکاح مسلمان خاتون سے قائم رہے گا اور کیا یہ ضروری ہے کہ زید اسے طلاق دے یا طلاق خود بخود واقع ہوجائے گی۔

الجواب وباللہ التوفیق:

حاصل سوال یہ ہے کہ بوقت نکاح زوجین مسلمان تھے بعد میں شوہر قادیانی ہو کر مرتد ہو گیا، اس کا حکم شرعی اسلام میں یہ ہے کہ شوہر کے مرتد ہوتے ہی اس کا نکاح ٹوٹ گیا اور منکوحہ مسلمہ اس کے نکاح سے خود بخود بالکل خارج ہو گئی، طلاق وغیرہ کے دینے کی حاجت یا شرط نہیں رہی، بلکہ منکوحہ اس کے نکاح سے نکل کر آزاد ہو گئی اور نفقہ عدت اور کامل مہر کی بھی مستحق رہی " ارتداد أحدهما فسخ عاجل بلا قضاء فلموطوئة كل مهرها ولغيرها نصفه لو ارتد وعليه نفقة العدة" (۱)، بالخصوص جب کہ سمجھانے اور توبہ کا مشورہ دینے کے بعد بھی وہ مرتد (قادیانی) رہنے پر مصر رہا تو یہ حکم اور بھی واضح ہو گیا۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دار العلوم دیوبند سہارنپور

مطلقہ عورت سے نکاح:

رہنما علی اپنے قریب کے ایک گاؤں میں ایک لڑکی جس کا نام انوری بیگم ہے، سے شادی کی کچھ دن بعد ان دونوں میں نا اتفاقی پیدا ہو گئی جس سے وہ دونوں لڑ جھگڑ کر کے ایک دوسرے سے جدا ہو گئے اور دونوں اپنے گھر جدا ہو کر رہنے لگے، اس کے بعد گاؤں والوں نے دونوں کے معاملے کا فیصلہ کرنے کی غرض سے ایک میٹنگ بلائی اس میں دونوں فریق نے گاؤں کی پنچائت کو حکم بنایا کہ وہ جو فیصلہ کریں گے ہم دونوں قبول کریں گے، اس پر پنچائت نے دونوں کی زبان بندی لی، اس میں انوری بیگم نے کہا کہ میرا شوہر میرے دل کے مطابق نہیں ہے، میں اس سے خوش نہیں ہوں اس لئے میں اس سے الگ ہو جانا چاہتی ہوں، پنچائت سے التجا ہے کہ میرا سامان دلوا کر اس سے طلاق دلوا دے۔ اس کے بعد پنچائت نے رہنما علی کی زبان بندی لی تو اس نے کہا کہ میری عزت پر دھبہ لگانے والی عورت کی مجھے ضرورت نہیں ہے میں اس کے جہیز کے تمام سامان واپس کر دینا چاہتا ہوں، تب پنچائت نے ایک فیصلہ نامہ لکھ کر دونوں کی چاہت کے مطابق سامان کا فیصلہ کرنے کے بعد دونوں کو الگ کر دیا اور انوری بیگم کو عدت گذارنے کے لئے حکم دے دیا گیا، اس کے بعد رہنما علی نے دوسری لڑکی سے شادی کر لی، مگر اس سے بھی کچھ بہتر تعلق نہ رہے کچھ دن بعد یعنی تقریباً دو سال بعد اس نے طلاق دیکر آزاد کر دیئے اس دوسری لڑکی کے مہر اور خوراکی بابت فیصلہ ہونے کے زمانے میں رہنما علی نے کہا کہ میں اپنی پہلی بیوی جو مطلقہ ہے جس کا نام انوری بیگم

۱- الدر المختار علی هامش رد المحتار ۲/ ۳۹۲۔

ہے سے پھر دوبارہ نکاح کروں گا، یہ بات انہوں نے گاؤں کے پنچائت سے کہی، پنچائت نے کہا کہ ایک مرتبہ وہ تمہیں ٹھکرا چکی ہے اور تم اسے طلاق دے چکے ہو، پھر کیسے اسے لاؤ گے؟ اسے نہ لاؤ، پھر تم دوسری بیوی کا حق اب تک نہ دے سکے ہو، اسے پورا کرو تب گاؤں والوں کے دستور کے مطابق ہم دونوں گاؤں کے پنچائت کے آدمی بیٹھ کر اس کا نکاح کردیں گے، مگر رہنما علی نے بہت ہی بے چینی کا اظہار کیا اور پنچائت سے الگ ہوکر گاؤں کے طور طریقے کو چھوڑ کر الگ ایک جگہ کو جا کر وہاں اپنی پہلی بیوی انوری بیگم سے دوبارہ نکاح کرلیا، لہٰذا اب آپ سے ہم تمام لوگوں کی التجا ہے کہ آپ اس معاملہ پر پوری توجہ سے غور فرمائیں اور ہر ایک کا جواب تشفی بخش عنایت فرمائیں۔

۱۔مطلقہ عورت سے کیا دوبارہ شادی کی جاسکتی ہے، رہنما علی کی انوری بیگم سے یہ دوسری شادی صحیح ہے یا نہیں؟ اگر صحیح ہے تو طلاق کے کون قسم سے ہے جو اس کے لئے صحیح طریقہ ہو، اور اگر صحیح نہیں ہے تو بھی وجوہات کی وضاحت فرمائیں۔

۲۔گاؤں والوں کے مشورے کو نہ مان کر ان کو اور گاؤں والوں کے دستور کو چھوڑ کر الگ جگہ شادی کرلینا کیا درست ہے؟ اگر نہیں تو اس کے اپنے لئے کیا سزا ہے اگر ہے تو جواز کے وجوہات بیان فرمائیں۔

روشن علی

الجواب وبالله التوفيق:

۱۔صورت مسئولہ میں حسب تحریر سوال، پہلی بیوی کو فقط ایک طلاق بائن واقع ہوئی، اس لئے کہ سوال کا خط شدہ جملہ طلاق کنائی کا ہے، اور بہ نیت طلاق کہا ہے اور بہ نیت طلاق کہنے سے ایسے جملہ سے صرف ایک طلاق بائن واقع ہوتی ہے اور طلاق بائن میں عدت کے اندر رہو یا بعد عدت دونوں کی آپسی رضامندی سے بغیر حلالہ نکاح درست ہے کما صرحت به الفقہاء عامة (۱)، پس یہ نکاح جو رہنما علی نے کیا ہے، شرعاً صحیح ہے، اگرچہ برادری کے خلاف کیا ہے اس خلاف مرضی کر لینے سے نکاح میں شرعاً کوئی خرابی نہیں آئی، البتہ گاؤں والوں کے مشورے کے مطابق عمل کرنا اس کے لئے بہتر تھا۔

پھر دوسری بیوی کا اگر مہر یا جہیز کا سامان واپس نہیں کیا تو گنہگار بھی ہورہا ہے، اس پر لازم ہے کہ جہاں تک جلد ہوسکے دوسری بیوی کا مہر جو باقی ہو اور جہیز کا سب سامان واپس کردے، واپس نہ کرنے کی صورت میں برادری اس پر اخلاقی

۱- ’’فإذا طلق زوجته طلقة بائنة واحدة أو اثنين جاز له العود اليها في العدة وبعدها ولكن ليس بالرجعة وإنما بعقد جديد‘‘ (الموسوعة الفقهية ۲۹/۲۹)، ’’وينكح مبانة بما دون الثلاث في العدة وبعدها ‘‘(بالإجماع)(الدر المختار على الرد ۵/۴۰، مکتبہ زکریا دیوبند)۔

دباؤ ڈال سکتی ہے، باقی ان باتوں سے پہلی مطلقہ بیوی سے جونکاح کرلیا ہے اس میں خرابی نہ آئے گی، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی،مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۸/۱۲/۱۴۰۳ھ

منکوحۃ الغیر سے نکاح:

۱-گذارش ہے کہ سائل سن ۱۹۴۷ء سے پہلے انگریزی حکومت میں فوج میں تھا، نیازمند کی بیوی گھر پر موجود تھی جس سے ایک بچی تھی، نیازمند ۱۹۴۷ء کے دوران پاکستان چلا گیا، نیازمند کی نوکری کی پنشن جو تھی نیازمند نے اپنی بیوی کے نام کی تھی جو نیازمند کی بیوی کو ملتی رہی۔

۲-نیازمند نے پاکستان سے خط وکتابت بھی جاری رکھی، اس کے بعد نیازمند حج کے لئے مکہ مدینہ چلا گیا اور وہاں ایک سال رہا، اس کے بعد نیازمند سیدھا اپنے ملک یعنی اپنے گھر چلا آیا نیازمند عرصہ تیس سال کے بعد گھر آیا۔

۳-یہ کہ میرے پاکستان جانے کے ۲ سال کے بعد میری بیوی نے ایک اور شخص کے ساتھ عقد کرلیا، جس کا نام چودھری خان ہے جو کہ حلقہ پلیانگر کا رہنے والا ہے، چودھری خان کے عقد سے میری بیوی کے چھ بچے بچیاں ہوئی ہیں، جنکی شادی ہوچکی ہے۔

۴-مسئلہ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک یہ ہے کہ ۹۰ سال تک بیوی خاوند کا انتظار کر کے دوسری شادی کرسکتی ہے لیکن عرصہ تیس ۳۰ سال میں میری بیوی نے دوسرا خاوند اختیار کیا ہے جبکہ نیازمند گم بھی نہیں تھا، بلکہ ایک دوسرے کے خطوط بھی جاری رہے یعنی خطوط میرے بھائی کی طرف سے مجھے آتے جاتے رہے اب جناب حضرات سے گذارش ہے کہ شرع محمدی کے مطابق کیا میری بیوی کو دوسرا خاوند کرنے کا حق تھا یا کہ نہیں؟ اگر جناب کے مسئلہ میں حق بنتا ہو تو نیازمند کو خلع مل سکتا ہے یا نہیں؟ مطابق مسائل نیازمند کو فتوی بھیج کر بتائیں کہ وہ میری بیوی منق ہے یا نہیں؟ کیونکہ نیازمند کی زندگی میں اس نے دوسرے آدمی سے عقد کیا جائز ہے یا ناجائز؟

حاجی دل مند چودھری (سکنہ بڈیاں ڈاکخانہ ریکساں ضلع راجوری)

الجواب باللہ التوفیق:

حسب تحریر سوال جب آپ کے بھائی کی آپ سے خط وکتابت تھی اور پھر عورت نے آپ کے پاکستان جانے کے بعد دوسرے شخص سے عقد کیا اور آپ کے بھائی نے نہ خود اعتراض کیا اور نہ آپ کو مطلع کیا قرینہ ہے کہ طلاق ہوچکی تھی۔غرض یہ

تحریر مدعی کومشکوک اور کمزور بناتی ہے اور ایسی صورت میں بالخصوص اتنی مدت کے بعد جبکہ دوسرے شوہر سے چھ بچے بچیاں ہو کر بالغ ہو گئے اور شادی شدہ بھی ہو گئے اور کنبہ وخاندان میں بھی کسی نے کوئی اعتراض نہ کیا یہ بھی قرینہ ہے کہ نکاح فسخ ہو چکا تھا وہ عورت مطلقہ ہو چکی تھی، اور بعد طلاق عدت گذار کر دوسرے شخص سے عقد کیا ہے اور اس کے خلاف ہونے کی صورت میں سارے کنبہ وخاندان والے بھی متہم ہوں گے۔

ایسی صورت میں اب اتنے زمانے کے بعد اس دوسرے شخص سے نکاح کر لینے کوغلط و باطل قرار نہیں دیا جا سکتا، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور
الجواب صحیح کفیل احمد نائب مفتی دارالعلوم دیوبند، مفتی محمد ظفیر الدین مفتاحی

دوسرے کی بیوی سے نکاح:

بلا طلاق حاصل کیے ہوئے سارہ عورت کے ساتھ زید کا نکاح ہوا ہے بعد نکاح (بیت اللہ) اول شوہر نے طلاق دیا طلاق دینے کے قبل کا نکاح صحیح ہوا یا کہ نکاح لوٹایا جاوے؟

الجواب وباللہ التوفیق:

طلاق دینے کے قبل کا نکاح صحیح نہیں ہوا ہے طلاق کے بعد نکاح لوٹایا جاوے نکاح لوٹانا واجب ہے جب تک پھر سے نیا نکاح دونوں میں نہ ہوئے دونوں بالکل الگ الگ رہیں تعلقات زن وشوئی ہرگز نہ رکھیں (۱)، فقط واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۹/۷/۸۵ ۱۳ھ
الجواب صحیح محمد جمیل الرحمن نائب مفتی دارالعلوم دیوبند

زوجہ غائب کی عورت کا نکاح دوسری جگہ کب صحیح ہوگا؟

زینب کا شوہر اسلم برضا وخوشی اپنے گھر سے ۱۹۶۲ء کی بارہ مئی میں ملازمت پر راوڑ کیلا کے اطراف میں چلا گیا ۱۶

۱- "ولایجوز لرجل أن یتزوج زوجة غیرہ وکذا المعتدة" (الہندیہ ۱/۲۸۰)۔

ستمبر ۶۲ء تک مراسلہ کا سلسلہ جاری رہا، اس کے بعد سے اب تک کوئی خبر نہیں ملی ہے خبر گیری کے لئے کوئی آدمی تو نہیں گیا لیکن خط وکتابت وغیرہ کے ذریعہ پتہ لگایا جارہا تھا کہ ۶۴ء کے مارچ میں وہاں فرقہ وارانہ فساد ہوگیا اس کے بعد ہفتہ تک اخباروں میں شائع بھی کرایا گیا، لیکن کہیں سے کوئی خبر نہیں ملی ہے ۶۵ء کے ماہ فروری میں اسلم کی تلاش میں خود اس کی والدہ اور ماموں راورکیلا گئے اور اس کے گردونواح کے علاوہ دیگر مقامات بھی گئے مگر کوئی سراغ نہیں ملا وہ واپس آکر انہوں نے یہ بیان دیا کہ دریافت کرنے پر اکثر لوگوں نے اس کے ہلاک ہوجانے کا خیال ظاہر کیا ہے، اس لئے ہم کو اسلم کے شہید ہونے کا یقین ہوگیا ہے، چنانچہ اس کی والدہ نے اکثر قرآن خوانی کے رسومات انجام دیئے جس میں رشتہ دار بستی کے لوگ اس کے سسرال والے شریک ہوئے اور اسلم کی بیوی زینب کو یہ کہدیا گیا ہے کہ لڑکا شہید ہوگیا ہے تم اپنا دوسرا انتظام کرسکتی ہو نوجوان زینب شوہر کے نان نفقہ سے محروم اپنے میکہ میں بیوہ ماں کیساتھ نہایت مصیبت کی زندگی گذار رہی تھی نا چار رشتہ داروں قرب وجوار اور بستی والوں کے مشورہ سے چار مہینے دس روز موت کی عدت پوری کر کے ۶۵ء کے ماہ نومبر میں دوسرے سے عقد کرلیا ہے، صورت مذکورہ میں زینب کا دوسرے سے عقد کرلینا جائز اور درست ہے یا کہ نہیں جہاں حاکم شرعی یا قاضی موجود نہیں ہے وہاں کیا طریقہ اختیار کیا جاوے؟

الجواب وباللہ التوفیق:

جب شوہر (اسلم) کی والدہ اور ماموں نے خود بھی تلاش کرلیا اور واپس آکر یہ بیان کیا کہ اسلم کے شہید ہوجانے کا ہم کو یقین ہوگیا ہے اور زینب کے اعزہ وقربا ء اور پاس پڑوس والوں کو بھی اسلم کے شہید ہوجانے کا یقین ہوگیا تو زینب کا یہ عقد کرلینا درست وجائز ہوگیا ہے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

بالغہ کا اپنی مرضی سے کئے ہوئے نکاح نیز طلاق نامہ پر جبراً نشان انگوٹھا لینے کا حکم:

لڑکی اور لڑکا دونوں جوان ہیں، لڑکی لڑکے سے ملکر کہیں چلی جاوے اور پھر اس سے نکاح کرے تو کیا نکاح ہوگیا کچھ دن بعد اس لڑکے کے والدین لڑکی کو اپنے گھر لے آئیں اور پنچائت کر کے اس لڑکی کے شوہر سے زبردستی طلاق کے خواہاں ہیں اور لڑکی کی بھی یہی مرضی ہے کہ مجھے طلاق ملجائے اور لڑکا طلاق دیتا نہیں، زبردستی لڑکے سے نشان انگشت فارغ

خطی پر پنچایت والے لگوائیں تو کیا یہ نکاح ٹوٹ گیا اور طلاق ہوئی یا کہ نہیں، بینوا وتوجروا

الجواب وبالله التوفيق:

اگر دونوں ہم کفو ہیں اور مہر مثل پر شرعی گواہوں کے سامنے نکاح ہوا ہے تو یہ نکاح صحیح ہوگا ایسی صورت میں بلا وجہ شرعی زبردستی طلاق لینا یا لڑکی کا طلاق چاہنا دونوں بہت برا ہے، اور زبردستی محض نشان انگوٹھا فارغ خطی پر لگوا لینے سے نکاح نہ ٹوٹے گا اور نہ طلاق ہی واقع ہوگی جب تک لڑکا زبان سے بھی طلاق نہ دیدے، ''وفي البحر أن المراد الإكراه على التلفظ بالطلاق فلو أكره على أن يكتب طلاق امرأته فكتب لا تطلق، لأن الكتابة أقيمت مقام العبارة باعتبار الحاجة ولا حاجة هنا''(۱)۔فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی مفتی دار العلوم دیوبند سہارنپور ۵/ ۸/ ۸۵ ۱۳ھ

الجواب صحیح سید احمد علی سعید محمود عفی عنہ نائب مفتی دار العلوم دیوبند

۱- 　　ردالمحتار کتاب الطلاق ۴/ ۴۴۰۔

باب المحرمات

بیوی کے کم عقل ہونے کی وجہ سے سالی سے نکاح جائز ہے یا نہیں؟

زید کی بیوی بہت کم عقل ہے، عقل سے کوئی کام یا کوئی بات بھی کرنا دشوار ہے اور اس کے تین چھوٹے بچے ہیں، زید کی بڑی سالی کے بھی چھوٹے چھوٹے بچے ہیں سسرال میں کوئی نہیں ہے، سالی کے بچوں کی پرورش کا کوئی ذریعہ نہیں ہے، ایسی صورت میں سالی بہنوئی سے نکاح کرنے کی آرزومند ہے، کیا زید اپنی سالی سے نکاح کرسکتا ہے یا کہ نہیں؟

الجواب وباللہ التوفیق:

بیوی کے نکاح میں رہتے ہوئے اس کی بہن سے کسی طرح آپ کا نکاح نہیں ہوسکتا ہے، کلام اللہ شریف میں اسکی صریح ممانعت وارد ہے، "و أن تجمعوا بين الاختين إلا ما قد سلف"(۱)، سالی سے نکاح کرنے کی خواہش میں بیوی کو طلاق دیدینا یہ بھی اچھی چیز نہیں ہے قوی خطرہ ہے کہ عندالشرع باعث غضب وہلاکت نہ ہوجاوے، صبر کیجئے جیسے نباہا آئندہ بھی نباہ دیجئے، اس میں آپکے درجات بلند ہوں گے اور اللہ خوش ہوگا، سالی کا نکاح کسی دوسرے سے کرادیجئے کہ اس کی زندگی باعصمت وعزت گذرے اور اپنی موجودہ بیوی جب بے عقل وکم سمجھ ہے اور آپ اس کو طلاق دیدیں تو دوسرا اس سے نکاح بھی نہ کرے گا دربدر ٹھوکریں کھائے گی اور اس کا دل دکھے گا اور آپ پر اس کی آہ پڑے گی جو بہت ڈرنے کی بات ہے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

الجواب صحیح محمد جمیل الرحمٰن نائب مفتی دارالعلوم دیوبند

۱- سورۂ نساء: ۲۳۔

بیوی اور اس کی ماں کو رکھنا:

زید نے اپنی بیوی کو رکھتے ہوئے بیوی کی ماں کو بھی رکھ لیا ہے اور دونوں کو حمل بھی رہ گیا ہے، آیا بیوی کا نکاح باقی رہا یا کہ نہیں، اور اگر باقی نہیں تو پھر کس طرح سے اس سے نکاح کیا جاوے اور کچھ برادری اس کے ساتھ کھاپی رہی ہے اور کچھ برادری اس سے جدا ہے، تو اس کے ساتھ کھانا کیسا ہے اور جو برادری اس کے ساتھ ہے اس کے لئے مسئلہ کیا کہتا ہے؟

الجواب وبالله التوفيق:

صورت مسؤلہ میں زید کی بی بی ہمیشہ کے لئے زید پر حرام ہوگئی زید پر واجب ہیکہ وہ اپنی بیوی کو فوراً طلاق دیکر اپنے نکاح سے الگ کردے اور ہرگز اس کے قریب بھی نہ جائے، اب ان دونوں میں نکاح کی کوئی صورت نہیں ہے جس طرح زید کی ساس زید پر ہمیشہ کے لئے حرام ہے اسی طرح اس کی بیوی بھی ہمیشہ کے لئے حرام ہوگئی (۱)، جب تک زید اپنی بیوی سے متارکت نہ کرے اور طلاق نہ دے برادری کو چاہئے کہ اس کے ساتھ متارکت کرے۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۳/ ۹/ ۸۵ ۱۳ھ

الجواب صحیح: جب تک زید اپنی بیوی اور ساس کو علیحدہ نہ کرے برادری اس سے ترک تعاون کرے جو اس کے ساتھ تعاون کرے گا گنہگار ہوگا، قال الله تعالیٰ: " ولا تعاونوا على الاثم والعدوان "(۲)، فقط واللہ اعلم بالصواب

سید احمد علی سعید ۲۴/ ۹/ ۸۵ ۱۳ھ

بیوی کو طلاق دینے یا اس کے انتقال کر جانے کے بعد اس کی بہن سے نکاح:

ایک مرد نے اپنی عورت کو طلاق دیدی یا اس مرد کی عورت کا انتقال ہوگیا تو اب ہر دو صورت میں یہ مرد اپنی سالی سے نکاح کر سکتا ہے یا کہ نہیں اگر کر سکتا ہے تو کب کر سکتا ہے اور اس مرد کو ایام عدت کے پوری ہونے کا انتظار کرنا پڑیگا یا زوجہ کے مرتے ہی اس کی دوسری بہن سے شادی کرلے۔

۱- ''وحرم ايضا بالصهورية اصل مزنية'' (الدرمع الرد ۳/ ۱۰۷)۔

۲- سورۂ مائدہ: ۲۔

الجواب وبالله التوفيق:

بیوی کوطلاق دیا پھر تو بیوی کی عدت گذرنے کے بعد بیوی کی بہن سے نکاح جائز ہوگا، اس کی عدت کے اندر اسکی بہن سے نکاح جائز نہیں ہے، ہاں اگر بیوی مرگئی ہے تو عدت گذارنی کوئی شئی نہیں ہے، مرد پر عدت نہیں ہوتی جب چاہے اس کی بہن سے نکاح کرسکتا ہے کمافی الشامی (۱)۔فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیو بند سہارنپور ۲/ ۱۰/ ۱۳۸۵ھ

الجواب صحیح محمود عفی عنہ

دوسرے کی مطلقہ سے بغیر عدت گذارے نکاح:

ہمارا ایک عزیز ایک لڑکی سے شادی کرنا چاہتا ہے، لیکن لڑکی شادی شدہ تھی اب اس کی طلاق ہوگئی ہے، لڑکی بے سہارہ ہے اسکا نہ کہیں رہنے کا اور نہ کہیں پیٹ پالنے کا ٹھکانہ ہے، نہ تو اس کے والدین ہیں اور نہ گھر ہے لڑکے کے گھر والے کہہ رہے ہیں کہ جب تک تین مہینہ ۱۳ دن گذر نہ جائیں گے ہم اپنے گھر میں نہیں رکھیں گے اور رشتہ دار بھی کہہ رہے ہیں کہ جب تک نکاح نہیں ہوجائے گا تب تک ہم بھی اپنے گھر میں نہیں رکھیں گے آخر اس کا کوئی فتوی ہے کہ بغیر عدت پورا کئے ہوئے نکاح ہوجائے، اس بے سہارے لڑکی کا گھر بس جائے نہیں تو یہ لڑکی بے موت مرجائے گی، شرعی حکم کا فتوی لکھ کر روانہ کردیجئے۔

الجواب وبالله التوفيق:

اس لڑکی کو جب سے طلاق ہوئی ہے اس وقت سے جب تین حیض آجائیں اسکا دوسرا نکاح کیا جاسکتا ہے جائز ہے، خواہ یہ تین حیض تین مہینے پر آجائیں یا کم میں، جس عورت کو حیض (ماہواری) آتی ہے اسکی عدت تین مہینے نہیں ہے بلکہ محض تین حیض ہے (۲)، لہذا اگر اس لڑکی کو طلاق کے بعد سے تین حیض آچکے ہیں تو فوراً اب اپنے عزیز سے اس کا نکاح کردیجئے ورنہ

۱- دیکھئے ردالمحتار ۵/ ۱۷۸۔

۲- ’’وإذا طلق الرجل امرأته طلاقا بائنا أو رجعيا أو ثلاثا أو وقعت الفرقة بغير طلاق وهي حرة ممن تحيض فعدتها ثلاثة أقراء‘‘ (الہندیہ ۱/ ۵۲۶)۔

جب تک تین حیض نہ آ جائیں کسی محفوظ جگہ جہاں اس کی عزت وآبرو محفوظ رہے رکھیں، خواہ اپنے گھر میں خواہ کسی معتبر آدمی کے گھر میں یہ سب جائز ہے، بلکہ ایسی لاوارث لڑکی کی عزت وآبرو بچانے کی نیت سے ایسا کرنا ثواب کا باعث ہے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۷/ ۱۰/ ۱۳۸۵ھ
الجواب صحیح محمود غفی عنہ

شوہر کے انتقال کے بعد بیوہ کا تین ماہ کے بعد نکاح کردینا:

زید کے انتقال کے تین ماہ بعد زید کی بیوی ہندہ کے ولی نے عدم علم کی بناء پر ایام عدت طلاق پر قیاس کرتے ہوئے نکاح تین ماہ کے بعد بکر سے کردیا ہے، یہ نکاح باعتبار شریعت کے کیا ہوا اگر نکاح فاسد ہوا تو کس طرح ہوا اور یہ بتائیں کہ اگر ہندہ کو پھر دوبارہ بکر کے نکاح میں دیا جائے تو اسکی کیا صورت ہوگی؟

الجواب وبا للہ التوفیق:

وفات کی عدت چار ماہ دس دن ہے(۱) اور عدت کے اندر نکاح کرنا درست نہیں جو نکاح عدت کے اندر ہوتا ہے وہ فاسد ہوتا ہے، اس لئے یہ نکاح فاسد ہوا (۲)، لہذا دونوں فوراً علیحدہ علیحدہ ہو جاویں اور اگر آپس میں تعلق زن وشوئی رکھنا چاہتے ہیں تو چار ماہ دس دن گزارنے کے بعد پھر سے نکاح پڑھالیں، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۵/ ۱۱/ ۱۳۸۵ھ
الجواب صحیح محمود غفی عنہ

سوتیلی خالہ سے نکاح:

اپنی سوتیلی خالہ سے نکاح کرنا جائز ہے یا نہیں؟ واضح فرمائیں۔

۱- ''والعدة للموت باربعة اشهر بالاهلة لو فی الغرة وعشرة من الایام'' (الدر مع الرد ۵/ ۱۸۸)۔

۲- ''لایجوز للرجل ان یتزوج زوجة غیره ولا المعتدة سواء کانت العدة من طلاق او وفاة'' (الہندیہ ۱/ ۲۲۸)۔

الجواب وباللہ التوفیق:

اپنی سوتیلی خالہ سے مثل سگی خالہ (حقیقی خالہ) کے نکاح جائز نہیں قطعی حرام (۱) ہے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۴۰۳/۲/۲۴ھ

شوہر کو مردہ بتلا کر نکاح کر لینا:

۱- خدیجہ بی نامی ایک عورت نے جو منکوحہ تھی قاضی صاحب کے پاس یہ ظاہر کر کے کہ میرا شوہر فوت ہو گیا، عبدالرحمٰن نامی ایک شخص سے جو ملازم سرکار تھا عقد کر لیا، حالانکہ اس کا شوہر عبدالمجیب زندہ تھا وہ پاکستان چلا گیا تھا لیکن عبدالرحمٰن کو اسکا علم نہ تھا۔

۲- عبدالرحمٰن شوہر ثانی بعد عقد تین سال تک زندہ رہا اس کے بعد فوت ہو گیا ہے۔

۳- اس کا شوہر اول عبدالمجیب بعد وفات شوہر ثانی عبدالرحمٰن نا ندیڑ آیا اور اس نے اس نکاح ثانی پر اپنے احباب اور رشتہ داروں سے شکایت کی، مگر اس کے متعلق کوئی کاروائی سرکاری نہیں کی، عبدالرحمٰن شوہر ثانی کی وفات پر چونکہ عبدالرحمٰن ملازم سرکار تھا منجانب اس کی زوجہ اولی سے ایک لڑکا اور دو لڑکیاں نابالغ تھیں خدیجہ بی نے اس وظیفہ اور انعام کے روپیہ سے عبدالرحمٰن کی اولاد کو کچھ نہیں دیا ہے، اس لئے انہوں نے اس کے مقابلہ میں ایک نالش عدالت دیوانی میں کر دی کہ وہ عبدالرحمٰن کی زوجہ شرعی نہیں ہے ناجائز ہے، اس لئے وظیفہ وانعام کی مستحق نہیں ہے، دریافت طلب امر یہ ہے کہ عبدالمجیب شوہر اول جو بعد وفات شوہر ثانی آیا تھا، اس نے کوئی اعتراض اس نکاح پر نہیں کیا ہے، تو کیا ایسا نکاح جائز متصور ہو گا یا نہیں؟ ورنہ عبدالرحمٰن کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اس نکاح پر اعتراض کریں اور اس کو ناجائز قرار دلائیں جس سے خدیجہ کو نقصان پہنچتا ہے؟

الجواب وباللہ التوفیق:

حسب تحریر سوال خدیجہ بی کا شوہر اول زندہ تھا، عام اس سے کہیں چلا گیا تھا یا مفقود الخبر تھا اور خدیجہ بی نے تفریق

۱- "حرمت علیکم امهاتکم واخواتکم وعماتکم وخالاتکم الخ" (سورۂ نساء ۲۳)، "للنص الصریح ودخل فیه الاخوات المتفرقات وبناتهن.....والعمات والخالات المتفرقات" (البحر الرائق ۳/ ۹۳، مکتبہ رشیدیہ پاکستان)۔

شرعی حاصل کئے بغیر دھوکہ دیکر اپنے شوہر کو فوت شدہ بتلا کر عبدالرحمٰن سے اپنا عقد کرلیا تھا مگر چونکہ عبدالرحمٰن کو شوہر اول (عبدالمجیب) کی زندگی کا علم نہیں تھا بلکہ اس نے اس کو فوت شدہ سمجھ کر اور نکاح جائز سمجھ کر عقد کیا تھا، اس لئے اس کی یہ وطی بالشبہ ہوئی اور یہ نکاح حقیقت واقعہ پر نظر کر کے فاسد ہوا اور ایسی صورت میں عبدالرحمٰن کے نطفہ سے جو اولادیں خدیجہ بی کے ہوں گی وہ ثابت النسب ہوں گی، "وتجب العدة بعد الوطء......ويثبت النسب" (۱)، اور مستحق وراثت ہوں گی اور خدیجہ بی کا چونکہ نکاح فاسد ہے وراثت نہیں ملے گی، البتہ مہر مسمی اگر مہر مثل کے برابر یا کم ہے تو ملے گا اور مہر مسمی مہر مثل سے زیادہ ہے تو محض مہر مثل ملے گا اور شوہر اول کا بعد انتقال عبدالرحمٰن نا مذ یر کا اپنے احباب واعزہ سے شکایت کرنا اثر انداز نہ ہوگا۔

لہذا صورت مسئولہ میں خدیجہ بی کے بطن سے اگر کچھ اولادیں عبدالرحمٰن کی ہوئی ہوں گی تو وہ بھی زوجہ اولی کی اولادوں کی طرح جو عبدالرحمٰن سے ہیں وارث ہوں گی اور حسب قاعدہ تخریج شرعی سب کو حصہ ملے گا، تنہا عبدالرحمٰن سے نہیں وارث ہوں گی اور حسب قاعدہ تخریج شرعی سب کو حصہ ملے گا تنہا عبدالرحمٰن کی زوجہ اولی کی اولاد کو نہیں البتہ رقم پنشن یا انعام جو خدیجہ بی زوجہ عبدالرحمٰن کو حکومت نے دیا ہے وہ تنہا خدیجہ بی کا ہے بقیہ اس کے سوا جو متروکہ عبدالرحمٰن کا ہوگا اس میں تمام ورثہ کو حسب تخریج شرعی ملے گا۔ تمام ورثہ کی تفصیل لکھ کر سب کے حصے معلوم کریں، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۵/ ۸/ ۱۳۸۵ھ

الجواب صحیح سید احمد علی سعید، محمود غفی عنہ نائب مفتی دارالعلوم دیوبند

مفقود الخبر کی بیوی سے نکاح:

مریم کا شوہر اب سے ۱۸ر سال قبل ٹریونگ کے زمانہ میں ہندوستان سے پاکستان جانے کے ارادہ سے مکان سے گیا، اس کے بعد سے اس کی کوئی خبر نہیں ملی کہ وہ راستہ میں ہی مرگیا یا پاکستان چلا گیا وہ تنہا تھا کوئی اسکے ساتھ نہیں تھا، اس وقت سے اب تک مریم کو پہلے شوہر کی کوئی خبر نہیں ہے، اس کی ماں نے کلکٹر کی اجازت لیکر دوسرا نکاح کردیا اتفاق سے اس کے بچے ہوئے اور دوسرا شوہر بھی مرگیا ہے، آج تک پہلے شوہر کی کوئی خبر نہیں ہے، مریم نے دوسرا شوہر مرنے کے بعد اور اس کی عدت گذارنے کے بعد خالد سے نکاح کرلیا، اب یہ تیسرا نکاح مریم کا صحیح ہے یا کہ نہیں، خالد کے لئے مریم حلال ہے یا کہ نہیں؟

۱- الدر المختار ۳/ ۲۷۷۔

الجواب وباالله التوفیق:

مریم کا یہ نکاح خالد کے ساتھ صحیح نہیں ہے، اگر خالد سے صحیح نکاح کرنا چاہتی ہے تو جماعت مسلمین یعنی کم از کم تین دیندار باوقار معاملہ شناس مسلمانوں کی جماعت کے سامنے اپنے سارے واقعات کو بیان کرکے اصل شوہر کے نکاح کو فسخ کرنے کی درخواست کرے اور وہ جماعت مسلمین قاعدہ شرع کے مطابق واقعات کی تحقیق بین شہادت اور ثبوت کے ذریعہ اس نکاح کو فسخ کرکے مریم کو دوسرا نکاح کرنے کی اجازت دیدے تو مریم فسخ نکاح کے وقت سے عدت تین حیض گذار کر اپنا نکاح خالد سے پھر سے پڑھوائے اور جب تک جماعت مسلمین کے ذریعہ تفریق شرعی حاصل ہوکر دوسرا نکاح خالد سے نہ ہو جاوے، خالد سے بالکل علیحدہ رہے ہرگز اس کے قریب نہ جائے۔فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۵/ ۹/ ۱۳۸۵ھ

الجواب صحیح محمود علی عنہ

ساس سے نکاح:

اسحٰق نامی ایک شخص نے اپنی بیوی کو ۸ سال پہلے طلاق دی تھی جسکا اسحٰق کو خود اقرار ہے،لیکن بیوی کو بلا نکاح ثانی اپنے پاس رکھے رہا ہے اس درمیان میں بچے بھی ہوئے اور میں نے اس اسحٰق کی بیوی کی لڑکی نجمہ سے اب سے ایک سال پہلے شادی کرلی تھی اور ابھی تک رخصتی نہیں ہوئی تھی اس سال چار یا پانچ ماہ ہوئے اس شخص نے پھر کئی طلاقیں دیدی ہے۔

۳۔۴ دن کے درمیان میں نے اسحٰق کی بیوی کی لڑکی نجمہ کو تین طلاق دیدی ہے۔

اب دریافت کرنا یہ ہے کہ اسحٰق کی بیوی سے جو میری ساس تھی اور میں نے نجمہ کو طلاق دیدی ہے ابھی نہ تو نجمہ کی طلاق مغلظہ کی عدت گذری ہے اور نہ تو اس اسحٰق کی بیوی کی دوبارہ طلاق کی عدت گذری ہے نکاح کرسکتا ہوں یا کہ نہیں؟

الجواب وباالله التوفیق:

صورت مسئولہ میں نجمہ کا نکاح صحیح اور منعقد ہوا تھا اور مجرد نکاح صحیح منعقد ہونے سے ہی نجمہ کی ماں نجمہ کے شوہر پر ہمیشہ کیلئے حرام ہوگئی تھی جیسا کہ درمختار علی ہامش الشامی ج ۲ ص ۲۷۸ کی عبارت:"وحرم بالمصاهرة بنت زوجته الموطوئة وأم زوجته وجداتها مطلقا بمجرد العقدالصحيح وإن لم توطاء الزوجة الخ " سے معلوم ہوتا

ہے کہ نجمہ کے شوہر کا نکاح نجمہ کی ماں سے کسی طرح اور کسی حال میں جائز نہیں ہوسکتا ہے، خواہ نجمہ کی رخصتی ہوئی ہو یا نہ ہوئی ہو، خواہ نجمہ یا نجمہ کی ماں عدت میں ہو یا عدت سے باہر، ہر حال میں نا جائز اور حرام ہے، نجمہ کی ماں نجمہ کے شوہر پر بمنزلہ اپنی ماں کے حرام ہوچکی ہے۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۰/ ۸/ ۱۳۸۵ھ

الجواب صحیح سید احمد علی سعید

عدت میں کسی کا بھی نکاح صحیح نہیں۔

الجواب صحیح احقر محمود غفی عنہ نائب مفتی دارالعلوم دیوبند ۱۰/ ۸/ ۱۳۸۵ھ

باب حرمة المصاهرة

حرمت مصاہرت کی ایک صورت:

زید نے اپنی ساس، یعنی بیوی کی ماں کی شرمگاہ پر انگلی لگائی جس سے اس کا مقصد اس سے زنا کرنا یا کوئی اور کچھ نہیں تھا اور نہ اور کوئی بات تھی، زید بچپن سے ہی گندے خیالات کا تھا اور گندے خیالات کی بناء پر اس نے یہ کیا، ہوا یہ کہ ایک رات زید اور اس کی بیوی اور زید کی ساس ایک ہی کمرے میں لیٹی ہوئی تھیں، ساس اور بیوی دونوں سورہی تھیں، زید نے جان بوجھ کر کہ یہ میری ساس ہے اس کی شرمگاہ پر انگلی لگائی، تو اب شریعت کے قانون کے مطابق اس کو کیا کرنا چاہئے جس سے اس کی تلافی ہوجائے؟

الجواب وبالله التوفيق:

سوال واضح نہیں ہے، آیا شرمگاہ پر اتنا موٹا کپڑا تھا کہ انگلی رکھنے سے ایک کے جسم کی حرارت دوسرے کے جسم تک نہیں پہنچ سکتی تھی تو اپنی بیوی کے حرام ہونے کا حکم نہ ہوگا، بلکہ دونوں بدستور زن وشوہر باقی ہیں، اور اگر باریک کپڑا جس سے ایک کی حرارت جسم دوسرے تک پہنچتی ہے یا ننگے جسم پر ایسا کیا تو اس کا حکم یہ ہے کہ ساس کا شوہر اگر زندہ ہے اور اس واقعہ کی تصدیق کرتا ہے کہ واقعی میرے داماد نے ایسا کیا ہے (۱)، جب تو اس شخص کی بیوی کے حرام ہونے کا حکم ہوجائے گا، (۲)، اس لئے کہ ننگی شرمگاہ پر یا باریک کپڑے پر انگلی لگانا عموماً شہوت سے ہی ہوتا ہے۔

۱- "في المس والنظر إلى الفرج لا يفتى بالحرمة إلا إذا تبين أنه فعل بشهوة، لأن الأصل في التقبيل الشهوة بخلاف المس والنظر كذا في المحيط هذا إذا كان المس على غير الفرج وأما إذا كان على الفرج فلا يصدق" (الفتاوی الہندیہ ۱/۲۷۶)۔

۲- "رجل قبل امرأة أبيه بشهوة أو قبل الأب امرأة ابنه بشهوة وهي مكرهة وأنكر الزوج أن يكون بشهوة فالقول قول الزوج وإن صدقه الزوج وقعت الفرقة" (الفتاوی الہندیہ ۱/۲۷۶)۔

اسی طرح ساس کے شوہر کے تصدیق کرنے سے جس طرح ساس اپنے شوہر پر حرام ہوجائے گی، اسی طرح اگر داماد بھی اس کا اقرار کرے کہ ایسی حرکت ہوگئی ہے تو ساس کی بیٹی اس پہ حرام ہوجائیگی، یعنی اگر داماد کو اقرار ہو کہ اس نے ایسا کیا ہے تو داماد پر اس کی بیوی بھی حرام ہوجائے گی، اور اگر ساس کا شوہر مر چکا ہے اور ساس کو اس قبیح فعل کی تصدیق ہے، پھر بھی جب تک داماد اس قبیح فعل کا اقرار نہ کرے گا، اس کی بیوی کے اس پر حرام ہونے کا حکم نہ کریں گے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۶/ ۵/ ۱۴۱۱ھ

شہوت کے ساتھ دو چار سال کی بچی کو چھونے سے حرمت مصاہرت ثابت نہیں ہوتی:

شہوت کی حالت میں اگر بیٹی یا ساس پر بھول کر بھی ہاتھ پڑ جائے تو بیوی نکاح سے باہر یعنی طلاق پڑ جائے گی، لہٰذا گذارش یہ ہے کہ بعض لوگوں کو خواہش نفسانی کو پورا کرنے کی خاطر بیوی کو سوتے ہوئے جگانا پڑتا ہے اور بیوی کے پاس چھوٹی بچی دودھ پینے والی یا دو چار سال کی سوئی ہوئی ہوتی ہے تو بچی کے اوپر ہاتھ پڑنے سے تو نکاح نہیں ٹوٹتا؟

الجواب وبالله التوفيق:

صورت مسئولہ میں نکاح نہیں ٹوٹتا ہے، مسئلہ آپکو ادھورا معلوم ہوا ہے پورا مسئلہ یہ ہے کہ بھول سے اور بلا شہوت کے ہاتھ لگانے سے نکاح نہیں ٹوٹتا ہے اور یہ کہ جس بیٹی یا ساس کو ہاتھ لگایا ہو تو پہلے تو بلا کسی حائل کے بدن پر لگایا ہو یا اگر بدن پر کپڑا ہو تو اتنا موٹا یا ایسا نہ ہو کہ اپنے ہاتھ کی گرمی اس کے بدن تک نہ پہونچ سکے دوسرے یہ کہ جس کو ہاتھ لگائے وہ مشتہاۃ یعنی کم از کم ۹ برس کی ہو، تیسرے یہ کہ اس پر ہاتھ لگانے سے شہوت ہو اور پھر ہاتھ لگانے میں از دیاد شہوت بھی ہو جب جا کر حرمت مصاہرت ثابت ہوتی ہے ورنہ نہیں (۱)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۸/ ۷/ ۱۳۸۵ھ

الجواب صحیح محمود غنی عنہ

۱- ’’وأصل ممسوسة بشهوة بحائل لايمنع الحرارة ...... هذا اذا كانت حية مشتهاة‘‘ (الدرمع الرد ۴/ ۱۱۰)۔

بہو کا خسر پر زنا کی تہمت لگانے سے حرمت مصاہرت ثابت ہوتی ہے یا نہیں؟

ایک ۵۰ سال والے بوڑھے موذن کو اس کے بیٹے کی بہو زنا کی تہمت لگارہی ہے کہ میرے خسر نے زبردستی زنا کیا مجھ سے اور بڈھا اس بات کو نہیں مانتا ہے اور گواہ کوئی نہیں ہے، بلا گواہ بہو کا قول معتبر اور صحیح ماننا جائز ہے کہ بہو کا قول معتبر مانکر اسکو اذان دینے سے روکا جائے گا، نیز یہ بھی بتلایا جائے کہ جب وہ عورت اس فعل کا اقرار کرتی ہے تو کیا وہ اب اپنے شوہر کے پاس رہ سکتی ہے یا اس پر حرام ہوگئی ہے، عندالشرع کیا فتوی ہے؟

الجواب وبا لله التوفيق:

جب بوڑھا آدمی زنا کا اقرار نہیں کرتا ہے اور کوئی گواہ موجود نہیں ہے تو محض اس عورت کے کہنے سے اذان دینے سے نہ روکا جائے گا، اب رہ گیا یہ مسئلہ کہ وہ عورت اپنے اس اقرار سے شوہر پر حرام ہوئی یا نہیں؟ تو اس کا حکم یہ ہے کہ اگر شوہر کو عورت کے اس کہنے کا یقین ہے کہ وہ سچ کہہ رہی ہے تو وہ عورت اس پر حرام ہوگئی فوراً اس سے الگ ہو جاوے اور اس کو طلاق دیدے۔

اور اگر عوت کے کہنے کا یقین نہیں ہے، اس کو سچا نہیں سمجھتا ہے تو عورت حرام نہیں ہوئی ہے، "رجل تزوج امرأة على أنها عذراء فلما آرادو قاعها وجدها قدافتضت فقال لها: من افتضک فقالت أبوک، إن صدقها الزوج بانت منه ولامهرلها وإن كذبها فهي امرأته"(۱)، اور نہ اس کے لئے کوئی اور حکم ہے البتہ عورت اپنے اس کہنے سے فاسقہ ہوگئی اسکو توبہ کرنا واجب ہے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲/ ۸/ ۱۳۸۵ ھ

الجواب صحیح سید احمد علی سعید نائب مفتی دارالعلوم دیوبند محمود غنی عنہ

۱- الفتاوی الہندیہ ۱/ ۲۷۶۔

مزنیہ کی لڑکی سے نکاح:

ایک آدمی نے ایک عورت سے زنا کیا جس سے لڑکی بھی ہوئی پھر وہی زانی اس عورت کی بڑی لڑکی سے جو اس عورت کے شوہر سے ہوئی تھی شادی کرنا چاہتا ہے کیا یہ درست ہے؟

شیخ محی الدین (میٹریل ڈیپارٹمنٹ شیڈکم ۔سعودی عربیہ)

الجواب وبالله التوفيق:

وفي رد المحتار: يحرم كل من الزاني والمزنية على أصل الأخر وفرعه لورضاعا، قال في البحر: وبحرمة المصاهرة الحرمات الأربع حرمة المرأة على أصول الزاني وفروعه نسبا ورضاعا وحرمة أصولها (اى المزنية) وفروعها (أي المزنية) على الزاني نسبا ورضاعا كما في وطء الحلال، (١)، وفي الهداية: ومن زنى بامرأة حرمت عليه أمها وبنتها" (٢) وتحته في فتح القدير: " روى في حرمته أحاديث كثيرة منها، قال رجل: يا رسول الله إني زنيت بامرأة في الجاهلية أفأ نكح ابنتها؟ قال: لا أرى ذالک" (٣)۔

ان عبارتوں سے معلوم ہوا کہ یہ شخص اپنی مزنیہ کی بڑی لڑکی سے نکاح نہیں کرسکتا، یہ نکاح بھی حرام وناجائز ہوگا، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۷/ ۲/ ۹۹ ۱۳ھ

١- شامی ۳/ ۳۱-۳۲ ۳ کتاب النکاح فصل فی المحرمات، ایچ ایم سعید کمپنی کراچی۔

٢- ہدایہ ۲/ ۱۵۱، کتاب النکاح، فصل فی بیان المحرمات، (ادارہ القرآن والعلوم الاسلامیہ کراچی)۔

٣- فتح القدیر ۳/ ۲۱۲ فصل فی بیان المحرمات، دار الکتب العلمیہ بیروت۔

باب الرضاعۃ

رضاعی بہن سے نکاح کرنے کے متعلق حکم شرعی:

زید نے ایک عورت سے شادی کی جس پر تین معتبر عورتوں نے اس کے دودھ بہن ہونے کی شہادت دی، لیکن زید نے اپنی غرض کے ماتحت ان کی تصدیق نہ کر کے شادی کرلی، حالانکہ شاہدین میں ایک اپنی ماں، دوسری رضاعی ماں، تیسری ایک اور معتبر عورت ہے، مگر کسی عالم سے فتویٰ منگوا کر شادی کرلی، لیکن خدا کی مرضی اس عورت کے کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ یہ عورت چونکہ مالدار ہے، اس غرض سے سب سے ٹکرا اور رہتا ہے، لیکن ہمسایہ کے لوگ جانتے ہیں کہ یہ زید کی دودھ بہن ہے، ایسی حالت میں اس شادی کو توڑنا واجب ہے یا نہیں؟

عبداللطیف چودھری تیل باڑی

الجواب وباللہ التوفیق:

اس کا جواب گذر چکا ہے، صرف واقعہ میں اتنا فرق ہے کہ وہاں شادی ابھی تک نہیں ہوئی تھی، بلکہ کرنا چاہتا تھا اور یہاں خودرائی کر کے کرلی ہے، لہٰذا اس کے حکم میں سابق حکم کے ساتھ اتنا اضافہ ہے کہ جب رضاعت کی شہرت ہے تو طلاق دے کر علیحدگی اختیار کرلینا ہی بہتر ہے، بلکہ ایک درجہ میں واجب ہے اور احتیاطاً تنزہ کا حکم ہے۔ ”فتاویٰ خانیہ“ میں بھی اسی طرح کا جزئیہ منقول ہے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور
الجواب صحیح: محمود غفرلہ، سید احمد علی سعید مفتی دارالعلوم دیوبند

ثبوت رضاعت کے لئے تنہاعورتوں کی شہادت:

ہمارے پڑوس میں دو بہنوں کی شادی کئی سال قبل ایک گاؤں میں انجام پائی، بڑی بہن کے بیٹے ہوئے اور لڑکیاں بھی، جبکہ چھوٹی بہن کی لڑکیاں ہی ہوئیں، دونوں بہنیں اقرار کرتی ہیں کہ وہ اپنے ہم عمر بیٹے بیٹیوں کو ایک دوسرے کا دودھ پلاچکی ہیں اور اس میں شک وشبہ کی کوئی گنجائش نہیں ہے، تاہم خاندان کے کسی مرد کے ذہن میں یہ بات نہیں ہے، آیا وہ رضاعی بہن بھائی ہیں یانہیں ہیں؟ چھوٹی بہن جس کا حال ہی میں انتقال ہوا ہے، چاہتی تھی کہ اس کی بیٹی کی شادی اس کی بڑی بہن کے بیٹے کے ساتھ عمل میں آئے لیکن دونوں بہن اس حقیقت کا بار بار اعتراف کرتی رہی ہیں کہ وہ دونوں بچوں کو ایک دوسرے کا دودھ پلاچکی ہیں، چنانچہ خاندان کے بزرگوں نے متوفیہ کی چاہت کے پیش نظر مفتیان دین سے رجوع کیا اور اس سلسلہ میں ایک بات پیش آئی کہ رضاعت ثابت ہے، اس لئے رشتہ نہیں ہوسکتا جبکہ ایک اور مفتی کا دعویٰ ہے کہ جب تک کوئی مرد رضاعت کے بارے میں شہادت نہ دے رضاعت قرار نہیں پاسکتی اور یوں رشتہ ازدواج ہوسکتا ہے، آپ سے استدعا ہے کہ قرآن وحدیث کی روشنی میں جواب عطافرمائیں۔

پروفیسر عبدالغنی (ساکن بٹینگو، شولا پورہ بارہمولہ کشمیر)

الجواب وبالله التوفيق:

ثبوت رضاعت کے لئے دومرد یا ایک مرد دوعورتوں کی شہادت ہے، صرف تنہا عورتوں کی شہادت معتبر نہیں، لیکن صورت مذکورہ میں چونکہ نکاح سے پہلے نکاح کے جواز وعدم جواز میں شک واقع ہوگیا ہے، اس لئے جانب حرمت کو ترجیح ہوگی، ان کا باہم نکاح کرنا جائز نہ ہوگا۔

"أفاد أنه لا يثبت بخبر الواحد إمرأة كان أو رجلا قبل العقد أو بعده وبه صرح في الكافي والنهاية تبعا لما في رضاع الخانية :لو شهدت به إمرأة قبل النكاح فهو في سعة من تكذيبها لكن في محرمات الخانية: إن كان قبله والمخبر عدل ثقة لا يجوز النكاح وإن بعده وهما كبيران فالأحوط التنزه وبه جزم البزازي معلاً بان الشک في الأول وقع في الجواز وفي الثاني البطلان والدفع أسهل من الرفع" (۱) فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

۱- شامی جلد ۴/ ۵۶۸، مکتبہ عثمانیہ، باب الرضاع۔

عورت کی شہادت پر حرمت رضاعت کا شرعی حکم:

محمد سراج الحق چودھری نے ایک ایسی عورت سے شادی کرنے کا ارادہ کیا جس پر تین معتبر عورتوں نے شہادت دی کہ سراج الحق نے اس عورت کی ماں کا دودھ پیا ہے، شاہد میں ایک سراج الحق کی ماں ہے جس کو تمام ہمسایہ والوں نے معتبر وثقہ ہونے کی شہادت دی، لیکن سراج الحق اس بارے میں اپنی ماں کی تصدیق نہیں کرتا، بلکہ ناثقہ بھی کہتا ہے۔ دوسری عورت، عورتِ مذکورہ کی ماں، یعنی دودھ ماں وہ بھی معتبر اور ثقہ ہے، سوم ہمسایہ کی ایک عورت حاجی، بہر حال تینوں معتبر لوگ جانتے ہیں خصوصا ہمسایہ کے لوگ جانتے ہیں، ایسی حالت میں سراج الحق کو اس عورت سے جو اپنی دودھ بہن ہے (شاہدات کی شہادت کی وجہ سے) اس سے شادی کرنا جائز ہے یا ناجائز؟

الجواب وباللہ التوفیق:

مانا کہ حرمت رضاعت ثابت ہونے کے لئے دومرد یا ایک مرد اور دوعورتوں کی شہادت کی ضرورت ہے، محض عورتوں کی شہادت سے حرمت ثابت نہ ہوگی، لیکن حرمت ثابت نہ ہونے پر نکاح کر لینا واجب بھی تو نہ ہوگا، بہت سے بہت مباح وجائز ہو سکے گا، اور حقیقی ماں کی اطاعت مباح امور میں واجب ہوتی ہے، اسی طرح رضاعی ماں احترام وعظمت اور اس کی اطاعت بھی امور مباح میں ضروری ہوتی ہے، پس جب یہ دونوں کہتی ہیں کہ یہ دونوں رضاعی بہن بھائی ہیں، نیز اس کی شہرت بھی ہوچکی ہے، تو ہرگز اس کو دونوں حقیقی ماں ورضاعی ماں کی مخالفت جائز نہ ہوگی اور نکاح کی اجازت نہ ہوگی۔ علاوہ ازیں ماں کو فاسق کہنا سخت گناہ ہے، اگر بغیر وجہ شرعی کہا ہے تو خود فاسق شمار ہوگا، کیونکہ حکم قرآنی: "ولا تقل لهما اف" (۱) کے خلاف ہے اور حدیث میں عقبہ بن حارث کا واقعہ بالکل اسی قسم کا منقول ہے کہ حضور ﷺ نے ان کو اس نکاح سے منع فرمادیا۔ پھر انہوں نے دوسری عورت سے نکاح کیا (۲)، اس لئے سراج الحق صاحب کو ہرگز ایسی عورت سے شادی کرنے کی اجازت نہ ہوگی۔

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۴؍ ۷؍ ۹۱ ۱۳ھ
الجواب صحیح: محمود غفرلہ دارالعلوم دیوبند، سید احمد علی سعید

۱- سورۂ اسراء آیۃ ۲۳۔
۲- مشکوۃ شریف، ص ۲۷۴۔

بیوی کا دودھ پینا:

ایک شخص نے اپنی بیوی کا دودھ پی لیا ہے؟ کیا اس کی بیوی اس کے نکاح سے نکل گئی؟ دوبارہ نکاح پڑھانا پڑے گا۔

شفیع احمد الاعظمی

الجواب وبالله التوفيق:

بیوی کا دودھ پی لینے سے نکاح نہیں ٹوٹتا بلکہ نکاح بحالہ باقی رہتا ہے بلکہ مسئلہ یہ ہے کہ بالغ ہوجانے کے بعد کسی عورت کا بھی دودھ ہو بلا اضطراری ضرورتوں (علاج وغیرہ کے) کے پینا حرام ہے درست نہیں ہے اور یہی حکم اپنی بیوی کے دودھ کا بھی ہے اور اسی وجہ سے مسئلہ یہ ہے کہ اگر بیوی کا پستان منہ میں لے لیا اور دودھ نکل آیا تو اس کو نہ پئے اور نہ نگلے بلکہ کلی کردے اور تھوک دے۔ اس کے علاوہ جو مسئلہ یہ مشہور ہوگیا کہ نکاح ٹوٹ جاتا ہے غلط ہے اور مسئلہ یہ لکھا ہوا ہے کہ اگر فرط محبت یا جوش شہوت وغیرہ میں بیوی کا پستان منہ میں لے تو یا تو دودھ نکلنے کی جگہ بچا کر منہ میں لے یا پھر اگر دودھ منہ میں آجائے تو فوراً تھوک دے(۱)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

بیوی کا دودھ پینے سے حرمت رضاعت ثابت نہیں ہوتی ہے:

حمیدہ اپنے بچہ کو اپنا دودھ پلا رہی تھی قریب ہی اس کا شوہر کھانا کھا رہا تھا، کسی طرح بچے کے منہ سے دودھ کے قطرے کھانے میں گر گئے، جسے زید اور حمیدہ دونوں نے دیکھا، دیکھنے کے باوجود زید نے دیدہ و دانستہ اس کھانے کو کھالیا ہے، اب عمداً ایسی حرکت کرنے پر اس کی منکوحہ اس کے عقد میں باقی رہے گی یا کہ نہیں یا حرام قرار پائے گی؟

۱- ''مص رجل ثدی امرأته لم تحرم'' (الدرالمختار مع ردالمحتار ۴/۴۲۱)، ''لأنه جزء آدمی والانتفاع به بغير ضرورة حرام على الصحيح'' (ایضاً ۴/۳۹۷) ''وعلى هذا لا يجوز الانتفاع به للتداوی'' (البحرالرائق ۳/۳۸۹)۔

الجواب وبالله التوفيق:

اس کی منکوحہ ہرگز اس پر حرام نہ ہوگی بلاشبہ حلال رہے گی (۱)، البتہ جس جگہ قطرے گرے تھے وہ حصہ اس کو علیحدہ کردینا چاہئے تھا اور اس کو کھانا اس کو جائز نہیں تھا، ''ولم يبح الارضاع بعد مدته لأنه جزء آدمي والانتفاع به لغير ضرورة حرام على الصحيح'' (۲)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

دودھ دوا میں ملا کر پلانے سے رضاعت کا حکم:

ایک لڑکی مسماۃ زینب اپنی بچپن کی حالت میں ایک بار بہت سخت بیمار ہوئی، اسی حالت میں زید کی والدہ کا دودھ صرف ایک قطرہ دوا میں ملا کر زینب کو پلایا گیا تھا بغیر دواء کے اس صورت میں رضاعت ثابت ہوجاتی ہے یا کہ نہیں اور اس لڑکی یعنی زینب سے زید کی شادی ہوسکتی ہے یا کہ نہیں؟

الجواب وبالله التوفيق

زید کی والدہ کا دودھ اگر ڈھائی سال کی مدت کے اندر ہی پلایا گیا ہے اور حلق کے اندر اتر بھی گیا تو رضاعت ثابت ہوگئی اور نکاح بھی حرام ہوگیا ہے، یہ جب کہ خالص دودھ پلایا گیا ہو اور اگر دودھ دواء میں ملا کر پلایا گیا ہے تو دودھ کے غالب ہونے کی صورت میں حرمت نکاح اور رضاعت ثابت ہیں اور دواء غالب ہونے کی صورت میں نہ حرمت ثابت ہوئی اور نہ رضاعت، ''ومخلوط بماء و دواء (الی قوله) اذا غلب لبن المرأة'' (۳)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

الجواب صحیح محمود عفی عنہ ۱۶/۷/۸۵ ۱۳ھ

۱- ''واذا مضت مدة الرضاع لم يتعلق بالرضاع تحريم'' (الہندیہ ۱/ ۳۴۳)۔

۲- الدر المختار ۴/ ۳۹۷۔

۳- درمختار۔

رضاعت سے متعلق:

مسمّٰی رسول ڈار کی پہلی عورت فوت ہوچکی ہے، اس کے بطن سے دولڑکیاں جانہ بی بی وخدیجہ بی بی موجود تھیں پھر رسول ڈار مذکور نے دوسری شادی مسماۃ خورشی کے ساتھ کی ہے خورشی مذکور کے دو بیٹے اور دو بیٹیاں شوہر مذکور سے موجود ہیں، لیکن خورشی مذکورہ اپنی دونوں سوتیلی لڑکیوں کے لڑکوں یعنی جانہ بی کے لڑکے رشید کو خدیجہ کے لڑکے نذیر کو دودھ پلائی ہے، لہٰذا خورشی مذکورہ رشید ونذیر مذکورین کی ایک طرف سوتیلی نانی بھی ہے دوسری طرف دودھ پلانے والی ماں بھی ہے اور ان دونوں یعنی رشید کی بھی بہن ہے، اور نذیر کی بھی بہن ہے دریافت یہ ہے کہ رشید کو نذیر کی بہن کے ساتھ اور نذیر کو رشید کی بہن کے ساتھ عقد نکاح کریں شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

نذیر احمد متصل زیارت، حضرت شاہ ہمدان، مقام ترالی ضلع پلہ والہ، کشمیر

الجواب وباللہ التوفیق:

۱-خورشی کے بطن سے اور رسول ڈار کے نطفہ سے جو لڑکا ہے وہ مصرہ اور جمیلہ کے نسب کے اعتبار سے سوتیلا ماموں ہے اور اس کا نکاح مصرہ اور جمیلہ سے حرام ہے اور رشید اور نذیر رضاعت کے اعتبار سے سوتیلے ماموں ہیں (سوالنامہ میں مصرہ اور جمیلہ کے متعلق صراحت نہیں ہے کہ وہ کس کی لڑکیاں ہیں) اور نسب کے اعتبار سے جو رشتہ حرمت کا ہوتا ہے وہ رشتہ رضاعت کے اعتبار سے بھی حرمت کا ہوتا ہے، ''یحرم من الرضاع ما یحرم من النسب''(۱)۔

پس مصرہ کا نکاح نذیر سے اور جمیلہ کا نکاح رشید سے قطعاً حرام ہوگا اگرچہ ایک رشتہ سے دونوں خالہ زاد بھائی بہن ہونے کی وجہ سے نکاح جائز معلوم ہوتا ہے مگر یہ رشتہ اب مفید حلت نہ ہوگا، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند ۱۴۰۰/۶/۲۶ھ

۱- صحیح مسلم کتاب الرضاع حدیث نمبر (۱۴۴۵) میں ایک حدیث ان الفاظ میں مروی ہے "فإنه یحرم من الرضاعة ما یحرم من النسب" نیز یہ حدیث "ما یحرم من الولاء" اور "ما یحرم من الرحم" کے الفاظ میں بھی منقول ہے

باب الاولیاءوالاکفاء

والد کے ماموں کے لئے نابالغہ کا نکاح کرنا:

تقریباً ڈیڑھ سال کی عمر میں اس کے والد کے ماموں نے والد کے سامنے ہی اپنے اختیار سے زید کیساتھ نکاح کرادیا۔

والد نے اپنے ماموں صاحب کے خوف کی وجہ سے انکارنہیں کیا ہے لیکن اجازت بھی نہیں ہے اور نہ مبارکبادی دی اور اسی وقت گھر پہنچے تو بندہ کی والدہ نے یہ کہا کہ تم نے ایسا کیوں کردیا ہے اس پر بندہ کے والد نے یہ جواب دیا کہ نکاح کردینے کی میری بالکل مرضی نہیں تھی اور نہ ہی میں نے اجازت دی ہے اس پر بندہ کے والد کو غصہ آیا ہے مگر ماموں کے خوف کی وجہ سے پہلے رہنے دیا اور تقریبا بندہ کی چارسال عمر تک حیات رہ کر وفات پا گئے اور اب بندہ بالغ ہے اور بالکل اس نکاح سے متفق نہیں ہے اسی طرح موجودہ ولی برادرکلاں اور والدہ کی بھی مرضی نہیں ہے، لہذا گذارش ہے کہ شریعت کے مطابق جو حکم ہو تحریرفرماکرممنون ومشکورفرماویں۔

الجواب وباللہ التوفیق:

حسب تحریرسوال بوقت نکاح باپ ولی تھا اور اس نے اجازت نہیں دی پھر اس کے بعد اسکالڑکا یعنی بندہ کا بھائی ولی ہوا اس نے بھی ابھی تک اجازت نہیں دی ہے اور نہ لڑکی ہی نے بالغ ہوکر نافذ کیا تو اس صورت مسئولہ میں بندہ کا بھائی جو ولی ہے اور خود لڑکی بھی اس نکاح کو فسخ کرسکتے ہیں(۱) فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲/ ۸/ ۱۳۸۵ھ

۱- ’’وإن كان المزوج غيرهما اى غير الاب والجد ..لايصح النكاح من غير كفوء او بغبن فاحش ... دون كان من كفوء وبمهر المثل صح ولكن لهما اى الصغير وصغيرة خيار الفسخ ولو بعد الدخول بالبلوغ إذالعلم بالنكاح بعده‘‘(الدرمع الرد ۴/ ۱۷۵، مکتبہ زکریا)۔

والد نے نابالغہ کا نکاح کردیا تو بعد بلوغ اس کو خیار بلوغ نہیں ملے گا:

گذارش ہے کہ کسی نابالغ لڑکی کا نکاح اس کے والدین نے کردیا ہو اور اس لڑکی کو یہ نہ معلوم ہو کہ میرا نکاح ہوگیا ہے اب وہ لڑکی سن بلوغ کو پہنچ گئی ہو اور اپنے شوہر کے یہاں جانا پسند نہیں کرتی ہے اور یہ کہتی ہے کہ میں خود اپنی مرضی سے نکاح کرتی ہوں اور شوہر اس کا اختیار نہیں دیتا ہے اور نہ طلاق دیتا تو اس کا پہلا نکاح ٹوٹ گیا ہے؟

الجواب وباللہ التوفیق:

والدین کے کئے ہوئے نکاح میں لڑکی کو خیار بلوغ نہیں حاصل ہوتا ہے، لہذا صورت مسئولہ میں لڑکی کو اپنے اسی شوہر کے پاس جانا چاہئے لڑکی کا جانے سے انکار کرنا یا جانے کو ناپسند کرنا صحیح نہیں ہے (۱)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند، سہارنپور

والد کے لئے نابالغہ لڑکی کا جبراً نکاح کرنا:

ایک لڑکی جو کہ ابھی نابالغ تھی اس کے باپ نے اس کا رشتہ ایک جگہ کردیا، جب لڑکی بالغ ہوئی تو اس نے رشتہ کرنے سے انکار کردیا، باپ کے سامنے وہ بول نہ سکی، اس نے قریب کے ہر ایک مرد وزن کے سامنے انکار کیا، والد نے مطابق اپنے وعدہ کے شادی کرنی چاہی، اس وقت اس لڑکی کے سب قرابت والے بھی اس شادی میں آنے سے انکار کر گئے حتی کہ اس کے بھائی بہن اور سب رشتہ دار اس جگہ کو چھوڑ کر چلے گئے اور بوقت نکاح وہاں موجود نہ رہے تب منکوحہ لڑکی نے کہا کہ اچھا آپ اپنی بات پوری کرلو، میں بھی اپنی بات پوری کروں گی جس سے اجازت نہ دینا مقصد تھا بوقت نکاح کپڑے زیور بالکل نہیں لئے، نکاح ہوئے سات سال ہوگئے ہیں، لڑکی آج تک اپنے والد کے گھر پر ہے اور اس نے آج تک کوئی حق زوجیت ادا نہیں کیا ہے اور نہ خاوند کے ساتھ اور پاس رہی ہے، خانہ داماد سے شرط لی گئی تھی کہ اگر وہ کوئی برا کام کرے، چوری کرے، زنا کرے تو اس پر لڑکی کو طلاق واقع ہوجائے گی، اس کے بعد اس خاوند سے کئی غلطیاں بارہا سرزد ہوئیں ہیں، اس سے یہ بھی وعدہ کیا گیا تھا کہ وہ اس کے گھر سے نہ بھاگے گا، لیکن وہ بار بار بھاگا ہے، اب وہ لڑکا پاکستان چلا گیا ہے، بلا مشورہ کے دریافت ہے کہ نکاح میں کوئی خلل واقع ہوا ہے یا کہ نہیں؟

۱- ''للولی انکاح الصغیر والصغیرۃ ... ولزم النکاح ... إن کان الولی أبا أوجدا ... لم یعرف منهما سوء الاختیار مجانة وفسقا وإن عرف لا یصح'' (الدر مع الرد ۴/۱۷۲)۔

الجواب وبالله التوفيق:

حسب تحریر سوال صورت مسئولہ میں بوقت نکاح لڑکی جب بالغ تھی اور باپ نے لڑکی کی بلا رضامندی کے زبردستی نکاح کیا ہے تو یہ نکاح لڑکی کی اجازت پر موقوف ہوا، اگر لڑکی نے ایک دفعہ بھی اپنے شوہر کو اپنے اوپر قابو دے دیا ہو یا ایک دفعہ بھی شوہر سے ہم صحبت یا خلوت صحیحہ ہو چکی ہو تو رضامندی ثابت ہوگئی اور اس کا نکاح لازم ہوگیا ہے (۱)۔

اور نکاح ہوئے سات (۷) سال ہو چکے ہیں اور شوہر خانہ داماد ہے، اس لئے اغلب یہ ہے کہ ایک آدھ دفعہ تو ضرور ان باتوں میں سے کسی بات کا موقع آ گیا ہوگا۔ دیکھو خدا سے معاملہ ہے اور حلال وحرام کا معاملہ ہے دنیا سازی سے ہرگز اس قسم کے معاملات میں کام نہ لینا چاہئے۔

بہر حال اگر ایک دفعہ بھی عورت نے رضا دیدی ہو یا اپنے اوپر شوہر کو قابو دیدیا ہو تو نکاح لازم ہوگیا اور اب اس شرط نامہ کے خلاف شوہر سے کوئی بات واقع ہوگئی ہو تو عورت پر پہلی خلاف ورزی میں طلاق واقع ہوگئی ورنہ شوہر سے طلاق ہی لینا پڑے گا، شرط نامہ کے خلاف شوہر سے کیا واقع ہوا یہ دیکھ لیا جائے اور حکم لگایا جائے۔

ہاں اگر واقعی ایک دفعہ بھی لڑکی نے اپنی رضا نہیں دی اور نہ ایک دفعہ بھی تنہائی ویکجائی شوہر سے اس نے (۷) سات برس کی مدت میں کی ہے تو لڑکی کو اب بھی اختیار باقی ہے کہ اپنے اس نکاح کو کم از کم تین دیندار باوقار معاملہ شناس اور قوم کے ذمہ دار کے سامنے یہ کہہ دے کہ میں اس نکاح کو رد کرتی ہوں اور توڑتی ہوں اور وہ لوگ تینوں آدمی (جو بمنزلہ جماعت مسلمین کے ہیں) واقعات کی تحقیق شریعت کے مطابق کر کے عورت کے اس رد کو تسلیم کرلیں اور فسخ نکاح کا فیصلہ دیدیں جب بھی یہ نکاح رد اور فسخ ہو جائے گا، عورت کو دوسرا نکاح کرنے کا حق شرعاً حاصل ہو جائے گا۔

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۶/۹/ ۱۳۸۵ھ

الجواب صحیح محمود علی عنہ، محمد جمیل الرحمان

نابالغہ لڑکی کا نکاح اس کے والد کی اجازت کے بغیر کرنا:

ایک لڑکی صغیر السن کی شادی عرصہ ۱۰ دس سال ہوئے ہوئی تھی ، نابالغ لڑکی کا والد شادی کا پیغام بھیجنے کے وقت بھی

۱- ''قال الزوج للبكر البالغة بلغك النكاح فسكت وقالت رددت النكاح ولا بينة لهما على ذلك ولم يكن دخل بها في الأصح فالقول قولها (الدر المختار) وقال الشامي: واحترز به عما اذا دخل بها طوعا حيث لاتصدق في دعوى الرد في الأصح'' (ردالمحتار ۴/ ۱۶۷ مکتبہ زکریا)۔

ناراض تھا،لڑکی کے والد کاحقیقی چچالاولد ہے، اس کی ملکیت زمین وغیرہ کے دباؤ سے لڑکی کا والد اپنے حقیقی چچا سے دبا رہا، لیکن طبیعت اس نکاح کے خلاف رہی، نکاح ہونے کے وقت بھی لڑکی کا والد نکاح میں شریک نہیں ہوااپنے گھر میں بھی نہیں رہا، اسوقت لڑکی بالغ ہوچکی ہے،معزز حضرات کے کہنے اور سمجھانے کے باوجود بھی لڑکی کا والد آج بھی ناراض ہے،لڑکی بھیجنے پر کسی حالت میں آمادہ نہیں، کچھ معزز حضرات حافظ ظہور احمد وبابو انوار احمد وحافظ اقبال احمد نے لڑکی کوتنہائی میں الگ بلاکر سمجھایا اور کافی دباؤ دیا کہ جہاں پر تیرا نکاح تیرے دادا نے کیا ہے اپنی مرضی سے کیا ہے تم وہیں چلی جاؤ،لڑکی نے سمجھانے کے باوجود بھی جانے سے صاف انکار کردیا، ان حضرات کے سامنے کہا کہ میں وہاں کسی بھی حالت نہیں جاؤں گی ایسی حالت میں کیا یہ نکاح درست ہے یا نہیں؟

مسلم الدین (۷ افریقی منزل دارالعلوم دیوبند)

الجواب وبالله التوفيق:

اس نابالغہ کا نکاح اس نابالغہ کے والد کی اجازت پر موقوف تھا،پس اس کے والد نے علم نکاح ہونے کے بعد اس نکاح کورد کردیا تو یہ نکاح اس رد کرنے کے وقت ختم ہوگیا (۱)، اب لڑکی کو وہاں بھیجنا بھی جائز نہیں اب وہیں اس نکاح کی بنیاد پر بھیجنا حرام کاری کرانے کے مترادف ہوگا، ہاں اگر لڑکی وہاں جانے کو تیار ہوجائے تو پھر سے چند گواہوں کے سامنے نکاح پڑھا کر بھیجا جائے ویسے ہرگز نہ بھیجا جائے (۲)،فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی،مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

۱- "في شرح التنوير: فلو زوج الأبعد حال قيام الأقرب توقف على إجازته وفي الشامي تحت (قوله توقف على اجازته) فلايكون سكوته اجازةً لنكاح الأ بعد وإن كان حاضراً في مجلس العقد مالم يرض صريحا أو دلالة تأمل" (ردالمحتار ۱۹۹/۴، کتاب النکاح باب الولی)۔

۲- "نفذ نكاح حرة مكلفة بلا ولي عند ابي حنيفة وأبي يوسف رحمهما الله تعالىٰ في ظاهر الرواية كذا في التبيين" (ہندیہ ۲۸۷/۱، کتاب النکاح، الباب الرابع فی الاولیاء مکتبہ دارالکتاب)۔

عدم کفو کی بنیاد پر فسخ نکاح

حمید اور رضیہ میں بے حد محبت ہے رضیہ نے اپنے باپ کو اطلاع کئے بغیر حمید سے نکاح کی تیاری کی، دن اور وقت مقرر کیا، دو گواہ بنائے دونوں بالغ تھے ان کے سامنے ایجاب وقبول ہوا، نکاح نامہ مرتب ہوا فریقین اور گواہ نے دستخط کئے، عرصہ تک بغیر اعلان نکاح کئے زن وشوئی کی طرح زندگی گذاری ہے، جب رضیہ کے باپ زید کو علم ہوا تو اول تو نکاح تسلیم نہیں کیا اور کہتا ہے کہ اگر نکاح واقع ہو گیا ہے تو لڑکے کے ہم کفو نہ ہونے کی وجہ سے مجھے فسخ کرانے کا حق ہے حمید دیندار اور ایم اے تک تعلیم یافتہ ہے، اور رضیہ کا باپ دیندار اور سید خاندان سے ہے۔

مندرجہ ذیل سوالات کا جواب مطلوب ہے:

کفوء کی تعریف:

کفوء کی کیا تعریف ہے؟

عربی النسل وغیر عربی النسل میں کفوء کا مسئلہ:

☆ کیا ہندوستان میں عربی النسل وغیر عربی النسل کفوء اور غیر کفوء کا مسئلہ معتبر ہے یا کہ نہیں؟

☆ کیا رضیہ اور حمید ہم کفوء ہیں؟

☆ کیا یہ نکاح واقع ہو گیا ہے یا کہ نہیں واقع ہوا ہے؟

☆ کیا زن وشوئی کے تعلقات قائم ہو جانے کے بعد اور ہم کفوء نہ ہونے کی بناء پر زید کو اپنی لڑکی کا نکاح فسخ کرانے کا حق ہے؟

☆ اس دور میں جب عہدہ قضاء کا وجود نہیں ہے فسخ کا کیا طریقہ ہوگا؟

الجواب وباللہ التوفیق:

☆ (درمختار علی الشامی) باب الکفائۃ میں ہے: (الکفائۃ) من کا فاہ إذا ساواہ والمراد هنا مساواة مخصوصة أو كون المرأة أدنى اور اس کی تشریح (شامی ۲/۴۳۸) میں ہے:

شعر: ان الكفائة في النكاح تكون في ست لها بيت بلبيع قد ضبط

نسب واسلام كذالک حرفة حرية وديانه ومال فقط۔

اس عبارت سے معلوم ہوا کہ کفائۃ نسب، اسلام، پیشہ، حریت، دیانت اور مال میں یعنی ان باتوں میں مخصوص قسم کی مساوات کا نام ہے جس کی تفصیل فقہ کی کتابوں میں موجود ہے۔

☆ عربی النسل قومیں خواہ ہندوستان میں ہوں یا غیر ہندوستان میں ان میں باعتبار نسل کے کفائت معتبر ہے جیسا کہ عبارت ذیل سے معلوم ہوتا ہے: "تعتبر (الکفائۃ) نسباً فقریش أکفاء والعرب أکفاء" (۱)۔

☆ حمید کے بارے میں کچھ تحریر نہیں کہ وہ کس خاندان ونسب اور کس پیشہ کا ہے اس کا جواب بغیر اسکے نہیں ہوسکتا ہے جو ۳ کا ہے۔

☆ اس کا بھی وہی جواب ہے۔

☆ "وله اذا کان عصبة الا عتراض فی غیر الکفوء فیفسخه القاضی (۲) زاد لفظ یسکت للاشارة الی ان سکوته قبل الولادة لایکون رضا (الی قوله) ویفهم منه انه لولم یسکت بل خاصم حین علم فکذالک بالاولی"

ان عبارتوں سے معلوم ہوا کہ زن وشوئی کے تعلقات قائم ہونے کے بعد بھی ہم کفوء نہ ہونے کی بناء پر فسخ نکاح کا حق باقی رہتا ہے، لیکن فتوی اس پر ہے کہ بالغہ عورت جو اپنا نکاح بلااذن ولی غیر کفوء میں کرے اس کا نکاح منعقد نہیں ہوتا ہے جیسا کہ عبارت ذیل سے معلوم ہوتا ہے: "ویفتی فی غیر الکفوء بعدم جوازہ أصلاً وهو المختار للفتوی (۳) وفی الشامی تحته وقال شمس الائمة وهذا اقرب الی الاحتیاط کذا فی تصحیح العلامة قاسم"۔

۶۔ مسلمان حکام جو منجانب حکومت وقت اس قسم کے معاملات فیصل کرنے کے مجاز ہوں اور قاعدہ شرعیہ فقہیہ کے مطابق سماعت وتحقیق واقعہ دارومدار مقدمہ سب مرتب کرکے فیصلہ دیں تو معتبر ہوگا۔ یا پھر جماعت مسلمین جو کہ کم سے کم تین دیندار باوقار معاملہ شناس مسلمانوں کی جماعت جو قائم مقام قاضی شرعی کے ہوسکے بقاعدہ شرعیہ فقہیہ سماعت وتحقیق واقعہ دارو مدار مقدمہ وغیرہ مرتب کرکے فیصلہ دے، یہ ایسی جگہوں کا طریق کار ہے جہاں عہدہ قضاء شرعی کا وجود نہ ہو (الحیلة الناجزہ للحلیة العاجزة) فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۲/ ۷/ ۱۳۸۵ھ

الجواب صحیح محمود دعفی عنہ، سید احمد علی سعید

۱۔ تنویر علی هامش الشامی ج ۲ ص ۳۷۳ باب الکفاءۃ۔

۲۔ درمختار علی هامش الشامی ج ۲ ص ۳۷۴ وفی الشامی ۲/ ۳۷۸ تحت قولہ مالم یسکت حتی تلد۔

۳۔ درمختار علی الشامی ۲/ ۴۰۹۔

لڑکی نے غیر کفو میں نکاح کرلیا تو کیا حکم ہے؟

شرائط کفو	حمید	رضیہ بالغہ
نسب	غوری	سیدہ
اسلام	قدیم الاسلام	قدیم الاسلام
حریت	آزاد	آزادی
دیانت	پرہیزگار	پرہیزگار
پیشہ	معلمی	کلرکی
دینداری	زیادہ	کم
علم دین	علم دین سے واقف زیادہ	بہت کم واقف

ا۔کیا حمید اور رضیہ ہم کفو ہیں؟

بالغہ رضیہ کو حمید کے حسب نسب کے بارے میں علم ہونے کے باوجود رضیہ نے بلا رضامندی ولی حمید سے عقد کرلیا اورزن وشوئی کی زندگی بسر کی۔

(الف) کیا یہ نکاح واقع ہوگیا یا کہ نہیں؟

(ب) اگر نکاح نہیں ہوا ہے تو کیا زن وشوئی کے تعلقات حرام کاری کے مترادف ہوئے؟

۲۔امام محمدؒ نے اپنی کتابوں میں امام ابوحنیفہ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ (الف) ایسی حالت میں بالغہ عورت کا نکاح جائز ہے کو ولی کی اجازت اور رضامندی نہ ہو، ملاحظہ ہو حاشیہ علم الفقہ ص ۷۲ مصنفہ حضرت مولانا عبدالشکور صاحب لکھنویؒ باب النکاح۔

(الف) غیر عربی النسل عربی النسل کا کفو نہیں ہوسکتا ہے، اس سے ایک صورت مستثنیٰ ہے وہ یہ کہ اگر غیر عربی النسل علم دین کا عالم ہو تو وہ عربی النسل بلکہ خاص قریشی عورت کا جو علم سے بے بہرہ ہو کفو ہوجائے گا(منقول از علم الفقہ جلد ششم ص ۲۷)۔

(ب) دارالافتاء فرنگی محلی کا فتوی ہے کہ نکاح واقع ہوگیا۔

(ج) دارالافتاء دارالعلوم) دیوبند کی کیا رائے ہے۔

(۳) کیا آپ اپنے فتوی کے جواز میں ہیں، یعنی غیر کفو میں بلا رضامندی والدین نکاح منعقد ہی نہیں ہوتا ہے؟

(الف) کسی آیت قرآن مجید یا حدیث شریف کا حوالہ دیں گے۔

(ب) بالفرض امام حسن ابن زیاد اور امام محمدؒ میں اختلاف ہے اور بالفرض حسن بن زیاد کا قول مرجوح ہے تو کس بناء پر؟

(ج) براہ کرم کسی ایسے اسلام کے مسلک کی رہنمائی کردیجئے جو حنفی مسلک کے مقابلے میں زیادہ وسیع النظر ہو۔

۴۔ حمید کہتا ہے کہ حنفی فقہ میں ماوراءالنہر کے ذریعہ ہم تک پہونچنے میں کافی حد تک تحریف ہوگئی ہے ورنہ اسلام میں بہت وسعت ہے، بالفرض اسلام کی نام نہاد مساوات اتنی تنگ ہے تو نعوذ باللہ، میں پھر ابراہیمی مسلک سے وابستہ ہوجاؤنگا، اس سبب سے میں نے تشفی بخش جواب کے لئے درخواست کی ہے، کیونکہ ارتداد کا بھی اندیشہ ہے، اسوقت تک حمید بہت دیندار ہے اور دیندار خاندان سے تعلق ہے۔

سائل شوکت علی

الجواب وباللہ التوفیق:

پہلی بات تو یہ ہے کہ جدول کے اندر حمید کو پرہیز گار، زیادہ دیندار، علم دین سے زیادہ واقف دکھلایا گیا ہے اور پھر آخیر حصہ سوال میں اسکے عقیدے اور ایمان کا جو حال لکھا ہے اسکا حاصل یہ ہے کہ ایک عورت کی محبت وعشق میں اس کے مرتد تک ہوجانے کا اندیشہ ہے، نیز مسلک حنفی کو محرف اور غیر صحیح سمجھتا ہے جس کے حق ہونے پر اجماع امت ہے، نیز اس موجودہ اسلام کو ترک کرکے ایسے اسلام کی جانب رہنمائی کا خواہاں ہے جو مسلک حنفی کے مقابلہ میں زیادہ وسیع ہو، یہ سب چیزیں اس کی انتہائی بدعقیدگی، ضعف ایمانی بلکہ زندیقیت کی جانب مشعر ہیں، پھر اس کو دیندار و پرہیز گار کس طرح کہا جارہا ہے؟ صحیح حدیث میں وارد ہے کہ کمال ایمان کی دلیل یہ ہے کہ انسان دنیا کے آگ میں جل جانا اختیار کرے مگر آخرت کی آگ میں جانا گوارہ نہ کرے چہ جائے کہ محض حظ نفس کی خاطر قبول ارتداد پر تیار ہوجاوے اور قبول ارتداد کے بعد دخول نار جہنم میں کوئی شبہ نہیں العیاذ باللہ) اگر جدول کا مفہوم صحیح ہے تو اس متضاد تحریر کا کیا منشا ہے اور اس سے کیا مفہوم ہوتا ہے؟ ذرا غور سے سوچئے کیا جس طرح فقہ حنفی کو ماوراءالنہر کے ذریعہ سے ہم تک پہنچنے ہی کی وجہ سے محرف وغیر صحیح سمجھتا ہے، اسی طرح کیا وہ احادیث کو بھی محرف نا قابل قبول نہیں سمجھ سکتا؟ جبکہ اکثر ذخیرہ حدیث بھی ماوراءالنہر کے ہی ذرائع سے ہم تک پہنچا ہے اور جب اس کا یہی اصول ہے تو وہ کلام الٰہی کو بھی محرف وغیر معتبر (نعوذ باللہ) کہہ سکتا ہے، اس تحریر سے چند اور دعوی بھی ظاہر ہوتے ہیں مثلاً

یہ کہ وہ صرف قرآن کریم وحدیث ہی میں دلیل شرعی کو محصور سمجھتا ہے، اجماع وقیاس کا منکر ہے، پھر اپنے کو مجتہد بھی سمجھتا ہے جیسا کہ سوال ۳۔ کے الف وباء سے ظاہر ہوتا ہے، خود غور کیجئے ایسا آدمی دیندار ہوگا یا بددین ونفس پرست ومشغوف بحب النساء، برادرم نادان کی دوستی بسا اوقات بجائے نفع دینے کے مضر بھی ہوجاتی ہے، اگر کچھ لکھنا ہی تھا تو صرف اتنا لکھتے کہ دارالعلوم کے فتوی کے خلاف فرنگی محل لکھنوی کا یہ فتوی ہے اوران کے یہ دلائل ہیں، اب ہم کیا کریں؟ بہر حال آپ نے فرنگی محل لکھنو کے دلائل تو لکھے نہیں یہ تو وہ حضرات جانیں البتہ علم الفقہ سے جو استدلالات آپ نے لکھے ہیں وہ آپ کے لئے مفید مطلب نہیں، علم الفقہ باب النکاح ص ۲۶ سے جس عبارت کا حوالہ آپ دے رہے ہیں وہ بہت مبہم اور نا کافی بلکہ ناتمام ہے۔

امام محمد سے جو قول بھی منقول ہے اسکا پورا مفہوم یہ ہے کہ نکاح بغیر الکفوء ولی کی اجازت ورضامندی کے بغیر منعقد تو ہوتا ہے مگر موقوف رہتا ہے نافذ نہیں ہوتا ہے، ولی نافذ کرے گا تو نافذ ہوگا اور اگر فسخ کردے تو فسخ ہوجائے گا اور جب ولی فسخ کردے گا تو قاضی کے نافذ کرنے سے بھی نافذ نہ ہوگا حتی کہ بعد اجازت دوبارہ پھر سے تجدید نکاح نہ کرلیا جائے اور اگر ایسا نہ کیا گیا تو اس دوران میں جو اولادیں پیدا ہوں گی وہ اس شخص کی جائز وارث نہ ہوں گی "**كما صرح به في المبسوط** (ج ۵ ص ۱۳) **ومحمد يقول: لما توقف العقد على إجازة الولي لتمام الاحتياط فكما ينعقد بإجازته لينفسخ بفسخه و بعد ما يفسخ ليس للقاضي ان يجيزه ولكن يستقبل العقد إذا تحقق العزل (ثم بعد اسطر) وعلى قول محمد لا يتوارثان، لأن أصل العقد كان موقوفاً وفي العقد الموقوف لا يجري التوارث الخ**"

یہاں ولی کو اعتراض ہے اور اسپر یہ سب طوما رہے، لہذا یہ نکاح نافذ نہ ہوگا اور ایسی صورت میں تعلق زن وشوئی غلط اور حرام ہوگا، علم الفقہ کی عبارت میں یہ سب تفصیلات نہیں، لہذا اس سے استدلال صحیح نہیں ہے، یہی حال علم الفقہ ص ۲۷ کی عبارت کا بھی ہے جس کو شامی کے حوالے سے نقل کیا ہے، اس عبارت میں شامی کے استثناء پر قیاس کیا گیا ہے اور وہ قیاس مع الفارق ہوگیا ہے جس سے استدلال صحیح نہیں الخ علامہ شامی ہر عالم کو مستثنی نہیں فرمارہے ہیں بلکہ حضرت امام ابوحنیفہ اور حسن بصری رحمہا اللہ جیسے معظم ومسلم مقتداء عالم دین کو مستثنی فرمارہے ہیں: "**قال العلامة ابن عابدين الشامي :" وكيف يصح لأحد أن يقول: إن مثل أبي حنيفة والحسن البصري و غيرهما ممن ليس بعربي انه لا يكون كفوًا البنت قرشي جاهل أو لبنت عربي بوال على عقبيه الخ**"(۱)۔

۱- شامی ج۴ ص ۲۴۳ باب الکفائۃ۔

اور یہ کلیہ مسلم ہے کہ مثال ممثل لہ کی وضاحت وتبیین کے لئے ہوتی ہے، اس مثال سے ہی معلوم ہوتا ہے کہ علامہ شامی کی مراد ہر عالم نہیں ہے بلکہ وہ عالم دین مراد ہے جو ایسا برگزیدہ محترم اور مسلم مقتداء ہو کہ قریش وسادات کو بھی اس کے عقد میں لڑکی دینے سے عار نہ ہو، چہ جائیکہ ایسا عالم جس کا حال وہ ہے جو سوال میں مذکور ہے، نیز اس کے ولی کو ایسی عار لاحق ہو جس پر یہ شدید نزاع واقع ہو، غرض ان جزئیات سے آنجناب کی مقصد براری دشوار ہے، پہلے استفتاء میں حمید کے نسب کے بارے میں سکوت تھا، اس لئے اس کے جواب میں کچھ نہ لکھا گیا تھا کہ یہ نکاح ہوا یا نہیں، اب لکھا جاتا ہے کہ اگر حمید ورضیہ دونوں زن وشوئی رکھنا چاہتے ہیں تو بجز اس کے کوئی صورت نہیں ہے کہ رضیہ کے ولی اقرب کو راضی کر کے اس کی اجازت اور رضامندی سے پھر سے جدید نکاح کر دیا جائے اور جب تک نکاح جدید بعد اجازت ورضاء ولی اقرب نہ ہو جائے قطعاً دونوں الگ الگ رہیں، ہرگز یکجا نہ ہوں ورنہ جتنی اولادیں اس درمیان میں ہوں گی وہ سب غیر ثابت النسب ہوں گی اور دونوں ہمیشہ حرام کاری کے جرم میں وگناہ کے مرتکب رہیں گے اور اس کے وبال دنیوی اور اخروی میں مبتلا ہوں گے، یہ حکم شرعی تو خود ان دونوں زن وشوہر کے ہیں، رضیہ کے ولی کو جب شریعت مطہرہ نے حق اعتراض وحق فسخ دیدیا ہے اور وہ اسے ہی استعمال کر رہا ہے تو اس کو تو کوئی حکم دوسرا نہیں دیا جا سکتا ہے، البتہ مشورہ بھی خواہانہ دیا جا سکتا ہے اور وہ یہ کہ اس طرح کے تعلق سے جو رسوائی وبے عزتی ہونی تھی ہو چکی کسی قیمت وشکل سے واپس نہیں آسکتی ہے، بلکہ اس رشتہ کو منقطع کرنے اور مخالفت کرنے میں لڑکی کے اور آوارہ اور خراب ہو جانے کا اندیشہ قوی ہے اور ایسی صورت میں سارے خاندان کی بھی آئندہ رسوائی دررسوائی محتمل ہے اور بخلاف اس کے اس رشتہ کو قائم کر دیا جائے تو بہت ممکن ہے کہ دونوں ہی سدھر جائیں گے اور اپنے کئے پر نادم ہو کر اپنی اخروی زندگی بنانے کی فکر میں لگ جائیں جس سے یہ عار اور رسوائی بالکل ختم ہو جائے، یا کم از کم ہلکی وبے اثر سی ہو جائے اور اولادیں بھی صحیح النسب ہوں، انکی حفاظت پر بھی نظر شفقت ایک درجہ میں ضروری ہے۔

پس ایسی صورت میں ولی رضیہ کو بھی خیر خواہانہ مشورہ یہ ہے کہ اس کیلئے بہتر صورت یہ ہے کہ اس رشتہ کو اپنی اجازت ورضامندی سے نکاح جدید کے ذریعہ قائم کرا دے اور پھر خوش اخلاقی وحسن برتاؤ سے خود بھی اور کسی اللہ والے مصلح عالم دین کی مدد سے دونوں میں جذبۂ دینداری وصحیح تعلق مع اللہ پیدا کرنے کی سعی کرتا رہے اور معاملہ اللہ کے حوالہ اور سپرد کر دے۔

(نوٹ) اتنی تحریر سے جواب مسئلہ تو منقح ہو گیا ہے باقی جو مطالبات ہیں انکا مستفتی کو حق نہیں ہے تسکیناً للخاطر اور تبرعاً اتنا عرض ہے کہ کم از کم مبسوط للسرخسی، وفتح القدیر باب الاولیاء والاکفاء کا مطالعہ دیانت سے سمجھ کر کر لیں تو آیات واحادیث ووجہ استدلال وترجیح سب کا علم ہو جائے گا اور اگر اس کے بعد بھی کسی کو اطمینان اور تشفی نہ ہو اور خروج عن الاعتدال

یا طغیان عن الشرع کرے تو خود غور کر کے دیکھ لے کہ نقصان کس کا ہے خود اس کا ہے خسر الدنیا والآخرہ کا مصداق وہی ہوگا، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور
الجواب صحیح سید احمد علی سعید، محمود غفی عنہ نائب مفتی دارالعلوم دیوبند

لڑکی کا ولی کی اجازت کے بغیر غیر کفوء میں نکاح کرنا:

لڑکی اپنی اور اپنی ماں کی مرضی سے ولی کے ہوتے ہوئے غیر برادری میں نکاح کر لے تو کیا ایسا نکاح ہوگا یا نہیں، اور اگر لڑکی بالغ ہے اور نکاح ہو جائے تو ولی کو قاضی کے نکاح توڑ دینے کا حق ہے یا کہ نہیں؟

الجواب وباللہ التوفیق:

بغیر ولی کی اجازت کے اگر بالغہ لڑکی غیر کفو میں اپنا نکاح کر لے گی تو وہ نکاح صحیح نہیں ہوگا۔

"ویفتی فی غیر الکفو بعدم جوازہ اصلا وھو المختار للفتویٰ لفساد الزمان" (۱)۔

بالغہ لڑکی پر ولی کی ولایت مستحبہ ہے جبری نہیں ہے اس لئے وہ اپنے نفس کی مختار ہے جہاں چاہے نکاح کرے لیکن اس کو یہ اختیار نہیں ہے کہ ایسے شخص سے نکاح کرے جس سے لڑکی کے خاندان والوں کی بے عزتی اور تحقیر ہوتی ہو اسی کو غیر کفو کہا جاتا ہے، اگر ایسے شخص سے بغیر ولی کی اجازت کے نکاح کرے گی تو ولی کو اس کے فسخ کرانے کا اختیار رہتا ہے کہ حاکم وقت مسلم سے فسخ کرالے۔

نکاح پڑھانے والا قاضی فسخ نہیں کرسکتا ہے، متاخرین فقہاء کرام کا فتویٰ اس زمانہ فساد میں یہ ہے کہ غیر کفو میں نکاح کرنے سے نکاح ہوتا ہی نہیں جو جواب میں مذکور ہے کہ نکاح منعقد ہی نہیں ہوگا اور قطعاً جائز نہ ہوگا۔ مگر ہندوستان میں مغل اور پٹھان آپس میں کفو سمجھے جاتے ہیں بہت سے مقام میں دونوں میں رشتہ داریاں ہوتی ہیں، خلاصہ یہ ہے کہ اگر لڑکی کے خاندان کی اس نکاح سے بے عزتی ہے تو نکاح جائز نہ ہوگا۔ واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور
الجواب صحیح: سید مہدی حسن مفتی دارالعلوم دیوبند محمود غفی عنہ

۱- (درمختار علی ہامش ردالمحتار ج ۲ ص ۳۰۵) عبدالرحمٰن غفرلہ مدرسہ امینیہ دہلی الجواب صحیح الجواب صحیح ۵ / رجب ۸۵ھ۔

راجپوت، شیخ صدیقی کا کفو نہیں:

ہم حنفی ہیں، واقعہ اس طرح ہے کہ میری ایک عزیزہ نے جو کہ بالغ ہے اپنے والدین کی اجازت کے بغیر خاموشی سے اپنا نکاح کرلیا ہے، کچھ عرصہ کے بعد اصل نکاح کی اطلاع ملنے پر لڑکی کے والدین چونکہ اس رشتہ کو پسند نہیں کرتے تھے، لڑکی کو بہت زور دیکر طلاق کے لئے تیار کرلیا، لڑکے کے ماں باپ نے بھی اس نکاح کو پسند نہیں کیا ہے، انکے مجبور کرنے کے بعد طلاق دلوائی، اس واقعہ کا اثر لڑکے اور لڑکی پر بہت ہوا، لڑکی کی صحت روز بروز بگڑنے لگی اس واقعہ کو قریب چار سال ہوگئے ہیں اس دوران میں ہر طرح کا علاج کیا مگر لڑکی کی صحت بدستور رہی اور اب گمان غالب ہے کہ اگر یہی حالت رہی تو وہ سال ڈیڑھ سال میں اپنی زندگی کے اختتام کو پہنچ گی۔

دوسری جگہ رشتہ کی کوئی امید نہیں ہے تو اس صورت میں اس کا کامیاب رہنا محال نظر آتا ہے، دوسری بات یہ ہے کہ لڑکا راجپوت مگر حنفی عقیدہ کا ہے اور لڑکی شیخ صدیقی ہے، کفو کے بارے میں تحریر فرماویں، اب اس حالت میں معلوم کرنا ہے کہ لڑکی کا نکاح اس لڑکے سے پھر کیا جاسکتا ہے یا کہ نہیں؟

الجواب وبالله التوفيق:

راجپوت شیخ صدیقی النسل کا کفو نہیں ہوگا اور ایسی صورت میں لڑکی کا اپنے والدین کے خلاف مرضی نکاح منعقد وصحیح بھی نہیں تھا، اس لئے طلاق بھی واقع نہیں ہوئی تھی (۱) لیکن جب لڑکی اور لڑکے میں اس درجہ کی محبت ہوچکی تھی تو لڑکی کے والد کے لئے مناسب تھا کہ راضی ہوکر پھر سے نکاح پڑھوادیتا، بہر حال اب بھی جب صحت اور محبت کا یہ حال ہے تو طرفین کے والدین کے لئے مناسب ہے کہ آپس کی رضامندی کے ساتھ دونوں کا آپس میں نکاح پڑھواکر تعلق زن وشوئی قائم کرادیں۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

الجواب صحیح احمد علی سعید نائب مفتی دارالعلوم دیوبند

۱- ''وتعتبر الكفاءة للزوم النكاح (الدر المختار) وقال الشامي للزوم النكاح اي على ظاهر الرواية ولصحته على رواية الحسن المختار للفتوى ردالمحتار ۴/۲۰۹، مکتبہ زکریا)۔

باب المہر والجہاز

ادائیگی مہر میں کس وقت کے سکہ کا اعتبار ہوگا؟

دار القضاء امارت شرعیہ مدرسہ رحمانیہ سوپول دربھنگہ کی عدالت میں ایک ساٹھ سالہ بیوہ خاتون نے اپنے زرمہر کی وصولی کا مقدمہ دائر کیا ہے جو زوج کے مال متروکہ سے ادا ہوگا، مقدمہ کی نوعیت اور فقہاء کی تصریحات کی وجہ سے کچھ شبہات ہیں جن کا تعلق قصور فہم سے زیادہ ہے، امید ہے کہ مسئلہ مذکورۃ الذیل کے چند پہلوؤں پر مدلل جواب سے نوازا جائے گا۔

دعوی اس خاتون کا یہ ہے کہ میرا نکاح پچاس سال پہلے ہوا، مہر پانچ سو روپیہ مقرر ہوئے، شوہر کے انتقال کے بعد اب مجھکو ترکہ میں سے میرا مہر دین اس طرح ملنا چاہئے کہ پچاس سال پہلے چاندی کے سکے رائج تھے، لہذا اب مجھے اس وقت کے پانچ سو روپے کے سکے کی قیمت موجودہ زمانہ کے سکے کے حساب سے دس ہزار ملنا چاہئے۔ عدالت اسلامیہ مجھے اس وقت دس ہزار روپے دلوائے۔

اب قابل تحقیق امر یہ ہے کہ مہر کی رقم میں عقد نکاح کے وقت کا مروجہ سکہ پانچ سو روپے (جس کی قیمت دس ہزار روپے ہے) ادا کرنا ہوگا یا جس وقت مہر ادا کیا جارہا ہے اس وقت کا رائج سکہ پانچ سو روپے ادا کرنا ہوگا۔

یہ امر بھی واضح کردینا ضروری ہے کہ بوقت نکاح عموماً دو طرح کی تعبیر ہوتی ہے:

الف- تمہارا نکاح پانچ سو روپے سکہ رائج الوقت کے عوض کردیا۔

ب- کبھی بغیر قید سکۂ رائج الوقت کہا جاتا ہے کہ پانچ سو روپے پر تمہارا نکاح کردیا، کیا ہر دو تعبیر کا حکم ایک ہی ہوگا؟ جبکہ مہر عموماً اس دیار میں عرفاً موجل نہیں ہوتا ہے۔

ج- اگر کسی نے ساٹھ سال قبل کسی سے قرض سو روپے لئے اور اب اس کی ادائیگی کرنا چاہتا ہے تو وہ موجودہ سکہ میں سو روپے ادا کردینے سے بری الذمہ ہوجائے گا یا ساٹھ سال پہلے کے رائج اور دیئے ہوئے سکہ کی قیمت موجودہ سکہ کی شرح میں ادا کرنا ہوگا، بر تقدیر ثانی کیا موجب ربوا ہوگا یا نہیں، کیا مسئلہ مہر کو قرض پر قیاس کرکے حکماً متحد مانا جائے گا علامہ

شامی نے مطلب مہم فی احکام النقود اذا کسدت او انقطعت اوغلت اور خصت میں جو تفصیلات ذکر کی ہیں کہ باب قرض وبیع میں یوم القرض اور یوم البیع کی قیمت واجب نہ ہوگی اور یہی مفتی بہ ہے، اس تفصیل پر اگر یوم القرض کے سکہ اور مالیت کا اعتبار ہو تو پھر کیا یہ مفضی الی الربا ءاور سبب انفتاح ابواب ربا کا باعث ہوگا یا نہیں، بہر حال اب مہر کی ادائیگی کس شرح سے شرعاً واجب ہوگی بر اہ کرم اس کی وضاحت شرعی بنیادوں پر فرمائی جائے۔

محمد قاسم مظفر پوری (خادم التدریس والقضاء الشرعی، مدرسہ رحمانیہ سوپول دربھنگہ بہار)

الجواب وبالله التوفيق:

پہلی تنقیح تو اس مقدمہ میں یہ ہوگی کہ شوہر کے انتقال کو کتنا زمانہ گزرا، اگر ابھی حال میں انتقال ہوا ہے جب تو دعوی قابل سماعت ہونے میں شبہ نہیں، یا انتقال شوہر کو زمانہ دراز گذرا ہے لیکن مدعا علیہم کو مہر کا باقی رہنا تسلیم ہے یا زوجہ نے مہر کا مطالبہ کیا تھا اور ابھی تک کامیاب نہ ہوسکی، اس لئے کہ یہ دعوی جب ہی دعوی قابل سماعت ہوگا اور اگر انتقال زوج کے بعد زوج کی کوئی جائیداد فروخت ہوئی مگر زوجہ نے مہر کا مطالبہ نہیں کیا تو استصحاب حال کی بنیاد پر اور السکوت فی معرض البیان بیان کے اصول پر نیز علامہ شامی کی اس تصریح کی بناء پر کہ اذا ترک الدعوی ثلثة وثلاثين سنة لا تسمع(۱) دعوی قابل سماعت ہی نہ ہوگا غرض جب دعویٰ قابل سماعت ہوجائے تو پھر یہ تنقیح ہوگی کہ انعقاد عقد میں مہر صرف پانچ سو روپیہ مقرر ہوا یا پانچ سو روپیہ سکہ رائج الوقت مقرر ہوا، اگر سکۂ رائج الوقت کی قید کے ساتھ مقرر ہوا تو عرف میں رائج الوقت بوقت ادا مراد ہوتا ہے پس اس صورت میں اس وقت کا پانچ سو روپیہ واجب الاداہوگا۔

اور اگر سکۂ رائج الوقت کی قید نہیں تھی تو اس صورت میں وقت عقد کا پانچ سو روپیہ ادا ہوگا اور اس صورت میں یہ تنقیح ضروری ہوگی کہ پچاس سال پہلے (بوقت عقد) جو روپیہ تھا وہ غالب الغش تھا یا مغلوب الغش تھا اگر اس وقت سکہ غالب الغش تھا تو قیمت واجب الاداہوگی اور امام محمد کے نزدیک رفقًا بالناس یوم الکساد کی قیمت واجب الاداہوگی اور امام یوسفؒ کے نزدیک یوم العقد کی قیمت واجب الاداہوگی، اور فتوی بعض فقہاء کے نزدیک امام محمد کے قول پر ہے اور بعض فقہاء کے

۱- ''إذا ترک الدعوی ثلاثاً وثلاثین سنة ولم یکن مانع من الدعوی ثم ادعی لا تسمع دعواہ، لأن ترک الدعوی مع التمکن یدل علی عدم الحق ظاهراً، وفی جامع الفتوی عن فتاوی العتابی: قال المتأخرون من أهل الفتوی: لا تسمع الدعوی بعد ست وثلاثین سنة إلا أن یکون المدعی غائباً أو صبیاً أو مجنوناً ولیس لهما ولی أو المدعی علیه أمیراً جائراً اهـ'' (ردالمحتار علی الدرالمختار ۸/ ۱۱۷)۔

نزدیک فتوی امام ابو یوسف کےقول پر ہے، لہذا گنجائش دونوں پر عمل کی نکل آتی ہے، سہولت جس شق کو لینے میں ہو عمل کرسکتے ہیں اوراگر اس وقت سکہ مغلوب الغش تھا تو روپیہ چونکہ چاندی کے سکہ کا نام ہے اس لئے اس وقت سکہ میں جتنی مقدار چاندی کی متحقق ہواس مقدار سے کچھ زائد چاندی شبہ ربوا سے بچنے کی غرض سے واجب الاداہوگی، ہاں اگرعورت چاہےتو اتنی چاندی کی اس وقت کی قیمت یا کوئی جائداد یا عروض بھی لےسکتی ہے اور اگر اس وقت کے سکہ میں چاندی کی مقدار معین کی تحقیق نہ ہوسکےتو اس مقدار کا تخمینہ لگا کر جنس بدل سونے کے جنس سے ادائیگی واجب ہوگی، ہاں اگرعورت آج کے سکہ سے اس کی قیمت لینے پر یا کوئی جائداد یا عروض لینے پر راضی ہوتو یہ بھی لےسکتی ہے، احقر کےنزدیک حکم مسئلہ یہی نکلتا ہےاور ماخذ کے لئے شامی ۴۴۳-۴۴۵ اور شامی ج ۴،ص ۲۵،۲۴ کا دیکھنا بھی کافی ہوگا (۱)، اور اگرمزید تحقیق مطلوب ہےتو فتاوی خیریہ کا اور تنقیح فتاوی حامدیہ کا مطالعہ بھی کرلیا جائے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

مہر کی ادائیگی میں کس سکہ کا اعتبار ہوگا؟

۱- نکاح کے وقت مہر دین میں اگر مثلاً پانچ سو روپے مقرر کئے جائیں تو بوقت ادائیگی کتنے روپے ادا کرنے پڑیں گے؟

۲- نکاح کے وقت مہر دین میں اگر اشرفی مقرر کی جائے تو روپے کی شکل میں اشرفی کی کس وقت کی قیمت ادا کرنی پڑے گی؟ نکاح کے وقت کی یا ادائیگی کے وقت کی؟

۳-اشرفی کیا چیز ہےاور اس کا وزن کیا ہے۔ اسی طرح دینار اور درہم کیا چیز ہےاوران کا وزن کیا ہے؟

محمد علی (امام جامع مسجد ولاگرہر، ضلع بیگوسرائے بہار)

الجواب وباللہ التوفیق:

مرکزی دارالافتاء امارت شرعیہ بہار واڑیسہ خانقاہ رحمانی مونگیر سے نمبر ا کا جواب دیا گیا کہ بوقت نکاح پانچ سو

۱- سماع دعوی کے متعلق (رد المحتار علی الدر المختار ۸/ ۱۱۵-۱۱۷) اور غالب الغش یا مغلوب الغش روپیوں کے متعلق (رد المحتار علی الدر المختار ۷/ ۵۵، ۵۶) پر تفصیل موجود ہے۔

روئے کا جتنا سونا ملتا تھا۔ اب ادائیگی کے وقت اتنے سونا کے بدلے جتنے روپئے ملتے ہوں وہ روپئے ادا کرنے پڑیں گے چاہے وہ پانچ سو سے کم ہوں یا زیادہ اس جواب کا ماخذ امام ابو یوسفؒ کا قول ہے جو مفتی بہ ہے عبارت درج ذیل ہیں:

"وقال الثانی ثانیا علیه قیمتها من الدراهم یوم البیع والقبض وعلیه الفتوی"(۱)"ای یوم البیع فی البیع ویوم القبض ومثله فی النهر فهذا ترجیح لخلاف ما مشی علیه الشارح ورجحه المصنف ایضا کماقدمناه فی فصل القرض وعلیه فلافرق بین الکساد والغلاء فی لزوم القیمة"(۴/ ۵۳۳)۔

سوال نمبر ۲: کا جواب دیا گیا کہ اشرفی کی قیمت وہ ادا کرنی پڑے گی جو ادائیگی کے وقت ہے نہ کہ وہ قیمت جو بوقت نکاح تھی جیسا کہ شامی ۴/ ۳۳:

"اعلم ان الذی فهم من کلامهم ان الخلاف المذکور انما هو فی الفلوس والدراهم الغالبة الغش ویدل علیه انه فی بعض العبارة اقتصر علی ذکر الفلوس وفی بعضها ذکر العدالی معها وهی کما فی البحر عن البنایه بفتح العین المهملة والدال وکسر اللام دراهم فیها غش وفی بعضها تقیید الدراهم بغالبة الغش وکذا تعلیلهم قول الإمام ببطلان البیع بان الثمنیة بطلت بالکساد لان الدراهم التی غلب غشها انما جعلت ثمنا بالاصطلاح فإذا ترک الناس المعاملة بها بطل الاصطلاح فلم تبق ثمنا فبقی البیع بلا ثمن فبطل ولم ار من صرح بحکم الدراهم الخالصة او المغلوبة الغش سوی ما افاده الشارح هنا وینبغی انه لاخلاف فی انه لایبطل البیع بکسادها ویجب علی المشتری مثلها فی الکسا دوالانقطاع والرخص والغلاء اما عدم بطلان البیع فلا نها ثمن خلقة فترک المعاملة بها لا یبطل ثمنیتها فلا یتاتی تعلیل البطلان المذکور وهو بقاء البیع بلا ثمن واما وجوب مثلها وهو ما وقع علیه العقد کمائة ذهب مشخص او مائة ریال فرنجی فلبقاء ثمنیتها أیضا وعدم بطلان تقومها"(۲)۔

سوال نمبر ۳: کا جواب دیا گیا کہ اشرفی سونا کی ہوتی ہے جس کا وزن دس ماشہ ہوتا ہے جیسا کہ لغات کشوری میں ہے اور دینار سونے کا ایک سکہ ہے جس کا وزن ساڑھے چار ماشے ہوتا ہے اور درہم چاندی کا ایک سکہ ہے جس کا وزن ساڑھے تین ماشے ہوتا ہے جیسا کہ حاشیہ فتاویٰ دارالعلوم جدید مرتبہ مفتی ظفیر الدین میں ہے۔

محمد علی (امام جامع مسجد ولاگر ہر، ضلع بیگوسرائے بہار)

۱- ردالمحتار علی الدرالمختار ۷/ ۵۵۔

۲- ردالمحتار علی الدرالمختار ۷/ ۵۶، ۵۷۔

الجواب وبالله التوفیق:

سوال نمبر ۲و۳ کے جواب سے احقر کو اتفاق ہے۔

البتہ سوال نمبر ا کے جواب سے اتفاق نہیں ہے اس لئے کہ سوال میں صراحت ہے کہ نکاح کے وقت پانچ سو روپئے دین مہر مقرر ہوئے پانچ سو اشرفی مقرر نہیں ہوئی ہے اور روپیہ چاندی کے سکہ کا نام ہے پس اس کو سونے میں منتقل کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے بلکہ سیدھا سادہ حکم یہ ہے کہ وہ پانچ سو روپیہ کیا تھا نوٹ تھا یا سکہ۔

اگر نوٹ تھا تو اس نوٹ کی اس وقت جتنی چاندی ملتی تھی وہی چاندی مہر شمار ہوگی اور وہی چاندی یا اس کی جو قیمت اس وقت کے نوٹ سے ہوتی ہو اتنے نوٹ دلائے جائیں اور اگر وہ پانچ سو روپیہ نوٹ نہیں تھا بلکہ سکہ تھا تو سکہ دو حال سے خالی نہیں غالب الغش تھا تو اس وقت اس غالب الغش کی جتنی چاندی ملتی تھی اتنی چاندی مہر ہوگی اب اتنی چاندی آج کل کے جتنے روپئے میں ملے اتنے روپئے آج کل کے نوٹ سے دیئے جائیں

اور اگر وہ پانچ سو روپیہ مغلوب الغش سکہ تھا تو چونکہ روپیہ ہر زمانہ میں ایک تولہ کے برابر شمار ہوا ہے اس لئے اس پانچ سو روپیہ کے پانچ سو تولہ چاندی شمار ہوں گے اور وہ مہر پانچ سو تولہ چاندی شمار ہوگی اور پانچ سو تولہ چاندی آج کل جتنے نوٹوں سے ملے اتنے نوٹ دینے ہوں گے اور دلیل میں حضرت امام ابو یوسف کا ہی قول اختیار کریں گے کیونکہ وہی مفتی بہ ہو چکا ہے اور اشبہ بالفقہ ہے (۱)۔

باقی علماء کرام کی بحثیں بھی احقر کی سمجھ میں نہیں آئیں اسلئے ان سے بھی اتفاق نہیں ہے۔

هذا ما ظهر لي فان كان صوابا فمن عند الله وان كان خطأً فمن نفسي ومن الشيطان فنعوذ بالله من شرور انفسنا ومن خدع الشيطان، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی ،مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۵/۷/۱۴۰۱ھ

مہر میں اشرفی طے کرنا:

زید نے ۱۹۵۳ء میں ہندہ سے شادی کی اور مبلغ دس ہزار روپیہ سکہ رائج الوقت وگیارہ اشرفیاں مہر مقرر کیا، جبکہ اس سے برسوں قبل اشرفی کا رواج بند ہوگیا تھا۔ اب ۱۹۸۲ء میں ہندہ مہر کی طلبگار ہے اور زید بھی اس دین کو ادا کرنا چاہتا ہے،

۱- تفصیل کے لئے دیکھئے: ردالمحتار علی الدرالمختار ۷/۵۵، ۵۶۔

اشرفی کا وجود اس وقت بھی ہندوستان میں نا پید ہے، یعنی ملک میں اس کا رواج اس وقت بھی نہیں ہے تو زید اس مہر کو کس طرح ادا کرے گا۔ بعض لوگ ایک اشرفی کو ایک تولہ سونے کے برابر قرار دے کر ایک تولہ سونا کی قیمت دو ہزار روپیہ قرار دے کر گیارہ اشرفیوں کو بائیس ہزار کی مالیت کے برابر کا مطالبہ کرتے ہیں از روئے شرع زید پر کتنی رقم واجب الاداہوگی؟

محمد فروز عالم

الجواب وباللہ التوفیق:

بہار کے علاقہ میں عموماً شیر شاہ سوری کی اشرفیاں رائج تھیں اور وہ صرف اٹھنی کے برابر ہوتی تھیں پس اس کے مطابق صرف ۵ ۲؍۱ (ساڑھے پانچ) تولہ سونے کی موجودہ قیمت دینی ہوگی۔

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

زوجین کے درمیان مہر میں اختلاف ہوتو مہر کتنا واجب ہوگا؟ نیز مہر شرعی کی تحقیق:

میری لڑکی کو اس کے شوہر نے طلاق دیدی ہے اور مہر شرع محمدی بوقت نکاح طے ہوا تھا، لڑکی نے اپنے مہر وصول کرنے کیلئے عدالت میں چارہ جوئی کی ہے، آپ یہ بتائیں کہ مہر شرع محمدی کی کتنی تعداد ہے، لڑکی اپنا مہر ایک ہزار روپیہ طلب کر رہی ہے، کیونکہ بوقت نکاح اتنے ہی متعین ہوئے تھے اور اس کا خاوند ۴؍ ۲۷ ادا کرنا چاہتا ہے اس کا شرعی حکم اس معاملہ میں مطلع فرمادیں۔

الجواب وباللہ التوفیق:

حسب تحریر سوال جب بوقت نکاح مہر ایک ہزار روپیہ طے ہو گئے تھے، جیسا کہ عورت کا دعوی ہے تو اب مہر شرع محمدی کتنے بھی ہوں جتنے مہر بوقت نکاح طے ہوئے تھے اتنی دینا واجب ہوگا، اگر خاوند اس سے انکار کرتا ہے تو لڑکی پر بینہ و ثبوت پیش کرنا واجب ہوگا، اگر بینہ اور ثبوت پیش کردے تو فیصلہ اس کے مطابق ہوگا، اور اگر عاجز رہے تو خاوند سے حلف لیں گے جو حقدار کہے گا فیصلہ اس پر ہوگا۔ باقی مہر شرع محمدی کی محض تحقیق تو ہر جگہ کے عرف کے اعتبار سے مختلف ہوتی ہے اور مہر فاطمی کو بھی کہتے ہیں، اگر مہر فاطمی مراد ہے تو مہر فاطمی تقریباً ۱۳۲ تولہ بھر خالص چاندی کے برابر ہوتی ہے چاندی کا جو نرخ

جس زمانہ میں ہوگا اس وقت اس کے اعتبار سے قیمت لگا کر مقدار معلوم کرلیں گے،مثلاً آجکل چاندی اگر تین روپیہ بھر ہوتو ۱۳۲ تولہ چاندی کا دام تقریباً ۳۹۶ روپیہ ہوں گے،فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی،مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۴/ ۸/ ۱۳۸۵ھ

الجواب صحیح سید احمد علی سعید،محمود علی عنہ نائب مفتی دارالعلوم دیوبند

جنابت کا غسل نہ کرنے سے کیا عورت مرد پر حرام ہوجاتی ہے اور اس کا مہر مرد پر واجب ہوتا ہے؟

ایک آدمی کی شادی کسی غیر عورت سے ہوتی ہے،دونوں میاں بیوی ہمبستر بھی ہوئے ہیں اور صحبت بھی کرتے ہیں، لیکن عورت کبھی غسل نہیں کرتی ہے،اس کو کہا بھی جاتا ہے کہ غسل کیا کرو،لیکن کبھی غسل نہیں کرتی،تو کیا ایسی عورت ایک مسلمان مرد پر حلال ہے؟ اگر اس کا خاوند اس وجہ سے اس کو طلاق دیدے تو کیا اس پر مہر واجب ہوتا ہے یا کہ نہیں اور اگر واجب ہے تو کیوں؟ جبکہ عورت اسلامی اصولوں پر نہ چلے۔

الجواب وبا للہ التوفیق

اگر کوئی عورت مباشرت اور مجامعت کے بعد غسل نہیں کرتی تو اپنے شوہر پر حرام نہیں ہوجاتی ہے،البتہ ایسی عادت ڈالنا سخت گناہ ہے اور کبھی غسل نہیں کرتی تو نماز وغیرہ کیسے پڑھتی ہوگی،ایسی عورت کو طلاق دینا شوہر پر واجب نہیں ہے،"**لایجب علی الزوج تطلیق الفاجرة**"(۱)۔

جہاں تک ہوسکے سمجھا بجھا کر ڈانٹ پھٹکار کر اس کی اصلاح کرے ثواب ملے گا،اگر سمجھانے سے نہ مانے تو اس کے ساتھ سونا چھوڑ دے اگر پھر بھی نہ درست ہو تو ہلکی مار پیٹ بھی کرسکتے ہو"**والتی تخافون نشوزهن فعظوهن واهجروهن في المضاجع واضربوهن**"(۲)۔

اگر پھر بھی نہ مانے تو ہمیشہ یہی خیر خواہی سے سمجھاتے رہیں اور اس سے خوش نہ ہو،لیکن حقوق زوجیت نان نفقہ ادا کرتے رہیں تو خود گنہگار نہ ہوں گے،مہر پورا واجب ہوگا مہر تو استمتاع بالبضعہ کا عوض ہے اور اس کو یہ حاصل کرچکا ہے اور یہ

۱- الدر المختار فصل فی المحرمات ۴/ ۱۴۴۔

۲- سورۂ نساء ۳۴۔

سب خرابیاں معاشرہ اور رہائش کی ہیں، اور اس کا تعلق مہر سے نہیں ہے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۹/ ۸/ ۸۵ ۱۳ھ

الجواب صحیح محمود عفی عنہ

ناشزہ عورت اور اس کے مہر وغیرہ کا حکم:

ایک عورت اپنے شوہر کی نافرمان ہوئی اور بغیر اذن زوج خود بھاگ کر اپنے والدین کے گھر چلی گئی ہے، زوج کے خلوت صحیحہ سے انکار کرتی ہے، شوہر کے گھر کو آباد کرنے کی کوئی پرواہ نہیں کرتی ہے، اگر ایسی عورت کو شوہر طلاق دینا چاہے تو شوہر پر نان ونفقہ اور مہر دینا لازم ہوگا یا کہ نہیں، کیا ناشزہ کی تعریف میں اسکو شمار قرار دیا جائے گا اور عورت نافرمان کے لئے کیا حکم ہے؟

الجواب وبالله التوفيق:

زوج اپنی مدخولہ بیوی کو جب بھی خود طلاق دیگا تو نان ونفقہ عدت کا اور مہر دینا ہوگا، ہاں اگر عورت خود طلاق طلب کرے اور اپنا نان ونفقہ اور مہر معاف کردے یا اس کے بدلہ میں طلاق طلب کرے تو معاف ہوگا یہ حکم غیر ناشزہ کا ہے اور عورت کا بغیر اذن شوہر کے خود سے بھاگ کر چلا جانا اس کا یہ نشوز ہے اور جب تک واپس نہ آجائے، اس وقت تک کے نان نفقہ کی وہ مستحق نہیں رہتی ہے، لہذا صورت مسئولہ میں اگر واقعہ بالکل ایسا ہی ہے جیسا کہ سوال میں مذکور ہے اور اسی نشوز کیوجہ سے اور اسی حالت میں شوہر نے طلاق دیدی ہے تو عورت نفقہ کی مستحق نہ ہوگی(۱)،لیکن اگر ایک بار بھی دونوں میں خلوت صحیحہ ہوچکی ہے تو عدت تین حیض اور پورا مہر واجب ہوگا اور اگر ایک بار بھی خلوت صحیحہ نہیں ہوئی ہے تو عدت طلاق واجب نہ ہوگی، ''رجل تزوج امرأة نكاحا جائزا فطلقها بعد الدخول وبعد الخلوة الصحيحة كان عليها العدة'' (۲)،مگر مہر نصف واجب ہوگا، ''وإن طلقتموهن من قبل أن تمسوهن وقد فرضتم لهن فريضة فنصف مافرضتم'' (۳)۔فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

الجواب صحیح سید احمد علی سعید نائب مفتی دارالعلوم دیوبند

۱- ''فان نشزت فلا نفقة لها حتى تعود الى منزله'' (الہندیہ ۱/ ۵۴۵)۔

۲- الفتاوی الہندیہ ۱/ ۵۲۶۔ ۳- سورۂ بقرہ ۲۳۷۔

وسعت سے زائد مہر مقرر کرنا:

اگر کوئی معمولی آدمی خاندانی رواج کے مطابق یا برائے نام شادی کے موقع پر لاکھوں روپیہ مہر باندھے اور اس کو دینے کی طاقت نہ ہو تو یہ جائز ہے یا کہ حرام ہے؟ کسی مستند فقہ کا حوالہ دیجئے۔

الجواب وبا لله التوفيق:

نکاح تو منعقد ہو جائے گا، لیکن اتنے زیادہ مہر باندھنا جس کی ادیگی طاقت میں نہ ہو، بہت برا ہے۔

هكذا فی عامة كتب المعتبرة۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

جواب صحیح ہے۔

جس شخص کے دل میں یہ ہو کہ مہر ادا نہیں کرے گا، حدیث شریف میں اس کو زانی فرمایا ہے، یعنی قیامت میں اس کا حشر ایسا ہوگا جیسا زانی کا (۱)۔

احقر محمود غفی عنہ

الجواب صحیح سید احمد علی سعید نائب مفتی دارالعلوم دیوبند

شوہر کے مرنے کے بعد بیوی کے مہر کا حکم:

☆ بیوہ کا دین مہر موجل مرحوم نے اپنی زندگی میں ادا نہیں کیا تھا اور نہ زوجہ نے کبھی معاف کیا ہے، ایسی صورت میں کیا دین مہر کی رقم ترکہ سے منہا کی جاسکتی ہے؟

۶،۵- مرحوم عبدالعلیم کے مرنے کے وقت اگر مرحوم کے باپ وہاں زندہ نہیں تھے تو مرحوم عبدالعلیم کا کل ترکہ، خواہ بصورت مکان ہو یا بصورت سامان یا زیورات نقد ہو یا بینک وغیرہ کسی جگہ جمع شدہ ہو، ان سب کے مجموعہ میں سے پہلے بیوہ کا مہر جو باقی ہے وہ ادا کیا جائے، اسی طرح اگر اور کوئی قرض باقی ہے تو اسے ادا کیا جائے، پھر اس کے بعد باقی ترکہ صرف ایک تہائی کے اندر مرحوم کی وصیت صحیحہ نافذ کی جائے، پھر اس کے بعد جو کچھ ترکہ بچے اس کو چالیس سہام پر تقسیم کر دیں۔ چالیس سہام میں پانچ سہام بیوہ کا حق ہوگا۔ اور چودہ سہام فرزند کا حق ہوگا۔ اور سات سات سہام تینوں لڑکیوں کا حق ہوگا، جو

۱- کذا فی معجم الطبرانی ص ۵۴۱۔

لڑکی کسی غیر ملک کی شہری ہوگئی ہے محض اس سے اس کا حق وراثت سوخت نہ ہوگا، بلکہ اس کا حصہ محفوظ رکھ کر اس کو مطلع کیا جائے، اور اس کی ہدایت کے مطابق عمل کیا جائے، یا اس سے بیع وشراء وغیرہ کا کوئی شرعی معاملہ بذریعہ مراسلت وغیرہ کرلیا جائے، اور اس کے مطابق عمل کیا جائے۔ اگر مرحوم کے انتقال کے وقت ماں یا باپ کوئی زندہ تھے تو ان کو واضح کر کے پھر تخریج شرعی معلوم کی جائے۔

نوٹ: یاد رہے کہ فنڈ میں جو رقم حکومت اپنی طرف سے ملاتی ہے وہ صورت مسئولہ میں مرحوم کا ترکہ نہیں ہے، بلکہ وہ رقم تنہا بیوہ کا حق ہے۔ جیسا کہ نمبر ۲ کے جواب میں درج ہے۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۳۰/۳/۹۶/۱۳ھ

مہر سے متعلق مختلف قسم کے سوالات:

ہم ایک بڑی تعداد میں انگلینڈ میں مقیم ہیں اور ہماری جماعت کا نام ''نصرت پارچورا خلیفہ سنت والجماعت (یوکے)'' ہے، اس جماعت کی ماتحتی میں ہم خوشی غمی وغیرہ کے طور طریق شریعت کے موافق انجام دیتے ہیں، ہمیں یہاں انگلینڈ کی اقتصادی حالت کے پیش نظر مہر کے سلسلہ میں چند مسائل درکار ہیں۔ یہاں کا معاشرتی انتظام مختصر طور پر یہ ہے:

لوگوں کی اقتصادی حالت بہت اونچی ہے۔ متوسط شخص کی ایک ہفتہ کی آمدنی اندازاً چالیس سے پچاس پونڈ ہے، دولہا جس وقت مجلس نکاح میں آتا ہے تو کم ازکم ایک سو پونڈ کا لباس زیب تن کیے ہوتا ہے، نیز نکاح پڑھانے والے اور مسجد ومدرسہ کو بطور ہدیہ اندازاً ۲۰ پونڈ دیئے جاتے ہیں اور اس کے علاوہ دوسرا خرچہ الگ ہوتا ہے، اب دریافت طلب امر یہ ہے:

(۱) جس عورت سے نکاح ہوتا ہے، اس کا مہر فقط ۷ ۱۲ ۱/۲ روپیہ ہوتا ہے، پونڈ کے حساب سے مقرر نہیں کی جاتی، اب بہت سے لوگوں کا یہ کہنا ہے کہ مہر کی یہ موجودہ رقم حالت کے اعتبار سے بہت ہی کم ہے تو اس کا شرعی حکم کیا ہے؟

(۲) مہر فاطمی کتنی ہے اور کیا ہے؟ ۷ ۱۲ ۱/۲ روپیہ یہ مہر فاطمی شمار ہوتی ہے یا نہیں؟

(۳) شریعت میں مہر کی زیادہ سے زیادہ اور کم سے کم مقدار کیا ہے؟

(۴) شریعت کی نظر میں کتنا مقرر شدہ مہر عمدہ مہر ہے؟

مندرجہ بالا سوالات کے جوابات حدیث کی روشنی میں اور کتابوں کے حوالہ کے ساتھ عنایت فرمائیں۔

الجواب وباللہ التوفیق:

آج سےتقریبا ۵۰-۶۰ سال قبل ۱۲۷ ۱/۲ تولہ خالص چاندی کے برابرشمار ہوتا تھا۔اب تو ایسانہیں ہے اب تو پیسے کاغذ کے ہونے لگے ہیں اور ۱۲۷ ۱/۲ روپیہ صرف ۸-۹ تولہ خالص چاندی کے برابر بھی بمشکل ہوں گے اورمہر فاطمی کے برابر تو کسی بھی طرح نہیں ہوسکتے،مہر فاطمی کی مقدار بعض محققین کےنزدیک ایک سو چالیس (۱۴۰) تولہ چاندی کے برابر ہے،اتنی چاندی ایک سو چالیس (۱۴۰) تولہ جس زمانہ میں جتنے کاغذی روپیوں میں ملیگی اتنے روپیہ مہر فاطمی میں دینے ہوں گے اور بعض محققین کے نزدیک مہر فاطمی کی مقدار تقریباً ۱۳۲ تولہ چاندی کے برابر ہے ۔ اتنی چاندی (۱۳۲ تولہ)جس زمانہ میں جتنے کاغذی روپیوں سے ملے گی اتنے روپے مہر فاطمی میں دینے ہوں گے ۔یہی دوسرا قول (تقریبا ۱۳۲ تولہ چاندی)حضرت مفتی عزیز الرحمٰن رحمۃ اللہ علیہ مفتی اعظم دارالعلوم دیوبند صاحب فتاویٰ دارالعلوم دیوبند کا ہےاوریہی ہمارےنزدیک ماخوذ بہ ہے۔

وہاں کے جومعاشرہ وتمدن کا حال سوال میں درج ہے اور جوحقیقت مذکور ہے اس کے اعتبار سے واقعی یہ مقدار (۱۲۷ ۱/۲ روپیہ ان کاغذی روپیوں سے)بہت کم ہے،اس لئے کہ مہر کی اقل مقدار اگر چہ صرف دس درہم ہے جوتقریبا تین یا ساڑھے تین تولہ چاندی کےوزن کے برابر ہوتا ہے،لیکن مہر کی مقدار کیا ہے؟ اس کے بارے میں اپنے اکابر علماء کی دورائے ہیں:

۱——اول تو یہ ہے کہ شوہر کی حیثیت کے اعتبار سے اتنی مقدار ہو کہ اس کا ادا کرنا توشوہر کے استطاعت میں ہومگر ادا کرنے میں شوہر کچھ دشواری اور بار محسوس کرے۔ یہ رائے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی ہے اور اشبہ بالفقہ مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کی ہے ۔ اور ایسر للعمل ہے ——اور جماعتی طور پر یکساں عمل کے لئے یہی مقدار زیادہ مناسب ہوتی ہے۔خواہ ایک سو چالیس تولہ چاندی رکھ لی جائے چاہے ۱۳۲ تولہ چاندی دونوں کی گنجائش ہے۔

۲——اس نمبر کا جواب ۱ کے جواب میں آچکا بلکہ ۳ و ۴ کے جوابات بھی ۱ کے ہی جواب میں آچکے۔فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی،مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۸/۸/ ۹۶ ۱۳ھ

۱-جہیز کا شرعی حکم:

زید کہتا ہے کہ جہیز لینا و دینا درست نہیں اور دلیل یہ ہے کہ حضور پاک ﷺ نے حضرت علی کو جہیز اس لئے دیا تھا کہ حضور اکرم ﷺ کے چچازاد بھائی تھے۔حضور ﷺ نے ان کی پرورش کی تھی تو اپنا سمجھ کر جہیز دیا تھا تو کیا یہ قول صحیح ہے۔اور جو آج کل لین دین ہوتا ہے اس کا کیا حکم ہے؟

۲-شریعت یا جہالت میں بیان کردہ احادیث سے استدلال:

مولانا پالن حقانی کی کتاب "شریعت یا جہالت" کا کیا درجہ ہے اور اس کے اندر جو احادیث ہیں ان سے کسی مسئلہ پر استدلال کرنا بغیر دوسری کتب کی مدد کے درست ہے یا نہیں؟ جواب سے نوازیں۔

۳-لڑکی والوں سے شادی کے لئے کچھ لینا جائز نہیں:

مولانا مشتاق صاحب جامع مسجد بھنڈار یڈی گریڈ یہہ کے امام ہیں اور گزشتہ چند سالوں سے امامت کرتے آرہے ہیں، امام صاحب کے بھتیجہ محمد ریاض الدین ولد مراد علی کی شادی مورخہ ۱۱ رمئی ۱۹۹۰ء بروز جمعہ ہوئی،لڑکی والے سے آٹھ ہزار روپے سامان کے علاوہ لیے،۲۸ راپریل ۱۹۹۰ء بروز سنیچر لڑکی والے لڑکے یعنی ریاض الدین کے یہاں پہنچے اور بہت سے لوگوں کی موجودگی میں پانچ ہزار روپے دیے، اس میں مولانا مشتاق موجود تھے۔پھر مولانا مشتاق کے سالے محمد طیب ولد شیخ پوات علی کی شادی ۱۷ رمئی ۱۹۹۰ء بروز جمعرات ہوئی تو لڑکی والے سے چھ ہزار روپے سامان کے علاوہ لئے لڑکے والے نے جمعرات کو شادی کے موقع پر کھانے کی دعوت دی اس دعوت میں مولانا مشتاق شریک ہوئے اور کھانا بھی کھایا، اب دریافت طلب بات یہ ہے کہ تلک لینا کیسا ہے؟ اور مشتاق کو امام رکھنا کیسا ہے؟ اور مولانا مشتاق کو امام رکھنا درست ہے یا نہیں اور ایسے امام کے پیچھے نماز جائز ہے یا نہیں؟

الجواب وباللہ التوفیق:

لڑکی والوں سے شادی کے لئے یا شادی کے موقع پر لڑکے کے والوں کا لینا تلک کہلاتا ہے اور یہ عمل ورواج کافروں غیر مسلموں کا ہے اور شریعت کی نگاہ میں ناجائز اور گناہ ہے قرآن پاک میں اس کی ممانعت موجود ہے: قال اللہ تعالیٰ: "یا أیھا الذین آمنوا لاتکونوا کالذین کفروا"(۱)، اور اس طرح لینا نکاح کی شرط کے درجہ کی چیز ہو کر حرام ورشوت کے

۱- سورۂ آل عمران:۱۵۶۔

درجہ کی چیز ہو جاتی ہے جس کا واپس کردینا لڑکے پر اور لڑکے والوں پر ضروری ہو جاتا ہے اور اگر لڑکی والے لڑکے سے یا لڑکے والوں سے نکاح سے قبل نکاح کی شرط کے طور پر کچھ لیں تو شرعاً یہ چیز ممنوع اور رشوت کے درجہ میں ہو کر واجب الاعادہ ہو جاتی ہے۔ کما صرح بہ فی الشامی (۲/۳۶۵ نعمانی)۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۹/۱۱/۱۴۱۰ھ

سامان جہیز کے ضیاع کے بعد مطالبہ:

ہندہ جو کہ بکر کے نکاح میں تھی، ہندہ ایک شخص کے ساتھ شوہر کے یہاں سے فرار ہو گئی، کچھ دنوں کے بعد وہ لڑکی پکڑی گئی، لڑکی جو ساز و سامان ساتھ لے گئی تھی، اس میں سے اکثر ان دونوں نے بیچ کھایا، لڑکی کے باپ کا بیان ہے کہ لڑکی کے پاس بہتر ۷۲ تولہ چاندی تھی، پنچایت میں معاملہ رکھا گیا، پنچایت والوں نے اتنی چاندی اس لڑکے کے باپ سے دلوادی اور سامان مذکور کو برادری کے ایک معزز آدمی کے پاس امانت رکھ دیا گیا، اس واقعہ کو آٹھ سال کا عرصہ گزر چکا ہے، اب اس لڑکی کے باپ نے اس کی شادی دوسری جگہ کر دی اب اس سامان کے تین دعویدار ہیں۔

۱- لڑکی کا باپ، ۲- اس لڑکی کا اصل شوہر، ۳- وہ شخص جس کے ساتھ یہ بھاگی تھی، دعویٰ تو سب کرتے ہیں مگر اس آٹھ سال کے عرصہ میں کوئی ایک بھی ثبوت فراہم نہ کر سکا۔ سوال یہ ہے کہ یہ سامان کسی کو دیا جائے یا نہیں؟ اور دیا جائے تو کس کو اور اگر کوئی بھی ان تینوں میں سے اس کا مستحق نہیں ہے، تو کیا اس چیز کو فروخت کر کے کسی مسجد وغیرہ میں لگایا جا سکتا ہے؟

مولانا قمر صاحب دیوبندی

الجواب وباللہ التوفیق:

بہتر ۷۲ تولہ چاندی اگر لڑکی کو اس کے باپ نے دیا تھا تو وہ چاندی اور سامان جہیز خود لڑکی کی ملک شرعاً ہو گیا، اب اس کے ضیاع کے بعد مطالبہ کا حق کسی کو نہیں رہا(۱)۔ اور اگر یہ چیزیں جہیز میں دی ہوئی نہیں تھیں تو باپ مدعی ہوا اور البینۃ علی المدعی (۲) کے ضابطۂ شرعی کے مطابق بینہ و ثبوت پیش کرنے کے بعد اثبات دعویٰ اور واپسی کا حق دار لڑکی کا باپ ہوتا، پس

۱- "جهز ابنته بجهاز وسلمها ذلك ليس له الاسترداد منها" (الدر المختار) علامہ شامی اس کے تحت لکھتے ہیں: "هذا إذا كان العرف مستمراً أن الأب يدفع مثله جهازاً لا عارية" (رد المحتار علی الدر المختار ۴/۳۰۶)۔

۲- دیکھئے شرح المجلہ ۱/۵۱ مادہ ۷۶، "وعن الأشعث بن قيس قال: كان بيني وبين رجل من اليهود أرض فجحدني فقدمته

جب ثبوت شرعی اور بینہ باپ پیش نہ کر سکا تو اب اس کے واپسی کے مطالبہ کا حق باپ کو بھی نہیں رہا اور لڑکی کے اصلی شوہر کو بھی اس کے مطالبہ کا حق نہیں رہا، البتہ جس سے وہ چیزیں وصول کی گئیں ہیں، اس کو واپس کر دینا ضروری ہے، اس کے علاوہ پنچایت کا خود کہیں خرچ کر دینا جائز نہ ہوگا (۱)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۱/۱۰/۱۴۰۱ھ

إلى النبي ﷺ، فقال لي رسول الله ﷺ: هل لك بينة قلت: لا، قال لليهودي: إحلف، قلت: إذاً يحلف فيه، فيذهب بمالي، فأنزل الله سبحانه: إن الذين يشترون بعهد الله وأيمانهم ثمناً قليلاً" الخ (سنن ابن ماجه ۲/ ۷۷۸ کتاب الاحکام باب البینة علی المدعی والیمین علی المدعی علیہ حدیث ۲۳۲۲)۔

۱- "والحاصل أنه إن علم أرباب الأموال وجب رده عليهم" (رد المحتار علی الدر المختار ۷/ ۳۰۱)۔

باب المعاشرہ بالمعروف

پاکی وناپاکی کاخیال نہ رکھنے والی بیوی کے ساتھ برتاؤ:

ایک لڑکی سے میری شادی ہوئی تھی اسے بچہ بھی ہے، جب اس سے شادی ہوئی میں راضی نہیں تھا، یہ لڑکی رہن سہن میں پاکی ناپاکی کا کوئی خیال نہیں کرتی ہے، لوگ کہتے ہیں کہ خوبصورت ہے، لیکن میری اپنی نظر میں خوبصورتی دکھائی نہیں دیتی، جب نگاہ اٹھاتا ہوں دیکھ کر ایک قسم کی کوفت ہوتی ہے، اس کو چھوڑ کر دوسری شادی کروں تو کیسے، مہر اداکرنے کی کوئی صورت نہیں ہے، دوسری عورت پہلی ہوتے ہوئے کوئی دینے کو تیار نہیں ہے، بہرحال کوئی ایسی صورت بتلائیے کہ اس انسان نماحیوان سے چھٹکارا ہوجائے، میرے کہنے میں بھی نہیں ہے۔

الجواب وبالله التوفيق:

صورت مسئولہ کاحل یہ ہے کہ آپ صبر کریں اور اس کے حقوق اداکرتے رہیں، اس سے آپ کے درجات بلند اور آخرت درست ہوگی، اور اس عورت کو نرمی سے سمجھاتے رہیں، انشاء اللہ ایک دن حسب منشاء بھی ہوجائے گی (۱) فقط واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲/ ۸/ ۱۳۸۵ھ

۱- تنفر دور کرنے کے لئے مشکوۃ شریف ۲۸۰، درج ذیل حدیث کو بھی سامنے رکھیں: "قال رسول الله ﷺ لا يفرق المومن مومنه ان كره منها خلقا رضي منها آخر" (رواہ مسلم)۔

نافرمان بیوی کی اصلاح کا طریقہ:

زید کی بیوی نہایت بدمزاج اور زبان دراز ہے، زیادہ تر کام زید کی مرضی کے خلاف کرنے والی ہے، وہ شریعت نبوی کی مکمل طریقہ سے پابند نہیں ہوتی ہے، مثال کے طور پر اگر اس کو غسل کرنے کی پاکی کی غرض سے ضرورت ہے اور اس کو معمولی زکام بھی ہے تو وہ کئی کئی روز تک غسل نہیں کرتی ہے اور نمازیں ترک کرتی رہتی ہے، جن کی قضا بھی بعد کو نہیں پڑھتی ہے، ناخنوں پر سرخی لگانا بھی نہیں چھوڑتی، جبکہ اس کو یہ بتلا دیا ہے کہ ایسا کرنے سے وضو مکمل نہیں ہوتا ہے اور جب وضو نہیں ہوتا تو نماز بھی نہیں ہوتی ہے، وہ تعلیم یافتہ بھی ہے، زید چاہتا ہے کہ وہ خوشگوار اور شرعی زندگی مع اپنے گھر کے ماحول کے گذارے، وہ خود سنیما نہیں دیکھتا ہے، لیکن بیوی زید کی عدم موجودگی میں بلا شوہر کی اجازت اور اس کے علم میں لائے ہوئے سینما دیکھنے گئی، زید اس کو بارہا سمجھایا، مارا، غصہ ہوئے، غرضیکہ اس کو سمجھانے اور انسانیت اور شرافت سے زندگی گذارنے کی نصیحت میں زید نے کوئی دقیقہ نہیں چھوڑا، لیکن وہ اپنی جگہ پر قائم ہے، اب زید کو اپنی بیوی کے ساتھ کیا کرنا چاہئے؟

الجواب وباللہ التوفیق:

جب آپ اس ماحول میں ہر طرح نصیحت کر کے تھک چکے ہیں، تو اب آپ دونوں میاں بیوی اس ماحول کو چھوڑ کر کسی ایسے دوسرے دینداری کے ماحول میں قیام پذیر ہو جائیں جہاں عام طور سے عورتوں میں بھی دینداری ہو اور پردہ پوشی کا پورا پورا لحاظ ہو، اور وہاں بیوی کے سابق حالات کے دوست واحباب وتعلق والے نہ ہوں یا نہ ملیں تو امید ہے کہ حالات استوار و درست ہو جائیں گے، یا پھر آپ صبر کے ساتھ نصیحت وکوشش کرتے رہیں بڑے ثواب کے مستحق ہوں گے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند، سہارنپور

كتاب الطلاق

کتاب الطلاق

طلاق دینے کا حق صرف مرد کو ہے عورت کو نہیں:

الف کی بیگم بذات خود اپنے شوہر کو طلاق دے سکتی ہے؟ اور دونوں کا نکاح خارج مانا جائے گا؟ اگر ایسا کرنے سے الف کی بیگم آزاد نہیں ہوسکتی تو کونسا ایسا عمل ہے جس سے وہ آزاد ہوگی، اگر الف کی بیگم اپنے شوہر سے آزاد ہوتی ہے تو بچے کس کے رہیں گے۔ جب کہ بچوں کی عمریں بالترتیب ۹ رسال ۷ رسال ۴ رسال ہیں۔

الجواب وباللہ التوفیق:

طلاق دینے کا حق اللہ نے، اللہ کے رسول نے وشریعت نے صرف مرد کو دیا ہے، اگر عورت طلاق دیدے تو وہ طلاق واقع ہی نہ ہوگی (۱)، بلکہ اگر شوہر حقوق زوجیت ادا کرتا رہے اور پھر عورت طلاق کا مطالبہ کرے تو اس پر اللہ کی اور اس کے رسول کی اور ملائکہ کی سب کی لعنت پڑتی ہے اور عورت سخت گنہگار ہوتی ہے اور اگر شوہر سے طلاق کے بغیر کسی سے نکاح کرے تو ہمیشہ زنا کاری کے گناہ اور وبال میں مبتلا رہے گی۔

اور اگر شوہر سے طلاق حاصل ہوجائے تو اس کے نطفہ سے جو بچے پیدا ہوئے ہیں، وہ سب اسی طلاق دینے والے شوہر کے شمار ہوں گے اور جب یہ مطلقہ کسی دوسرے سے شادی کرے گی تو وہ شوہر ان بچوں کو اس مطلقہ سے الگ کردینے کا شرعاً حقدار ہوجائے گا۔

لہٰذا اس قسم کا خیال بھی ترک کردینا اس عورت پر لازم ہے، ورنہ آخرت کے عذاب کے علاوہ دنیا کے اندر بھی سخت

۱- "عن ابن عباس قال: أتی النبی ﷺ رجل فقال: یارسول اللہ! سیدی زوجنی أمته وھو یرید أن یفرق بینی وبینھا قال: فصعد رسول اللہ ﷺ المنبر فقال: یاأیھا الناس: ما بال أحدکم یزوج عبدہ أمته ثم یرید أن یفرق بینھما إنما الطلاق لمن أخذ بالساق" (ابن ماجہ باب طلاق العبد ر ۱۵۲)۔

وبال میں مبتلا ہوجانے کا شدید خطرہ ہے۔فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

محض دل میں طلاق دینے سے طلاق واقع نہیں ہوتی:

زید کی شادی کو ۲۷ دن ہوئے ،زید کو اپنی بیوی سے محبت ہے، مگر ملازمت کے سلسلہ میں اپنی بیوی کو چھوڑ کر دوسرے صوبہ میں جارہا ہے، دوران سفر بیوی کی جدائی سے بہت مغموم تھا، اچانک ذہن میں برے برے خیالات اور وسوسے آنے لگے، اسی جنونی کیفیت میں زید نے سوچا کہ میں نے اپنی بیوی کو چھوڑ دیا، فوراہی پھر خیال آیا کہ یہ کیا کیا، اس صورت میں جب کہ زبان سے کچھ نہیں کہا کیا طلاق ہوجائے گی ،اوراگر خدا نخواستہ طلاق ہوجائے تو رجوع کی کیا صورت ہوگی؟

سید خلیل احمد

الجواب وباللہ التوفیق:

طلاق دینا زبان کا فعل ہے، زبان سے دینے سے واقع ہوتی ہے اور محض دل میں دینے سے اور سوچنے سے کوئی طلاق نہیں پڑتی (۱)، پس جب آپ نے زبان سے کچھ نہیں کہا ہے تو اس سوچنے سے اور وسوسہ آنے سے کوئی طلاق نہیں پڑی بالکل مطمئن رہیں ۔فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۰ / ۱۲ / ۱۴۱۱ھ

بیوی کے سامنے طلاق لکھ کر دینے سے طلاق نہیں پڑتی:

اگر کوئی شخص بیوی کے سامنے زبان سے طلاق دیئے بغیر محض طلاق لکھ کر بیوی کو دیدے تو کوئی طلاق واقع ہوگی یا نہیں؟

۱- "إن الله تجاوز عن امتي ما وسوست به صدورها مالم تعمل بها أو تتكلم بها رواه الشيخان" (مشکوۃ المصابیح / ۱۸)۔

الجواب وبالله التوفيق:

اس (اشکال) کا جواب سمجھنے کے لئے پہلے ان باتوں کا ذکر کر دینا ضروری ہے، وقوع طلاق کی حقیقت شرعیہ تلفظ الطلاق بلفظ الایقاع ہے (۱) یعنی ایقاعی لفظ کے ساتھ طلاق کا تلفظ کیا جائے اور تلفظ زبان کا فعل ہے۔

جس طرح تکبیر تحریمہ میں تکبیر کہنا زبان کا فعل ہے (۲) اور تسمیہ عند الذبح میں تسمیہ کرنا زبان کا فعل ہے۔

اگر کوئی شخص تحریمہ کی تکبیر زبان سے ادا نہ کرے، صرف دل ہی دل میں تکبیر کہکر یا بغیر زبان سے کہے ہوئے کاغذ پر محض لکھ کر تحریمہ باندھ لے تو انعقاد صلوۃ متحقق نہ ہوگا اور نماز نہ ہوگی۔

اسی طرح اگر کوئی ذبح کے وقت زبان سے تسمیہ نہ پڑھے، بلکہ صرف دل ہی دل میں کہہ کر یا صرف کاغذ پر لکھ کر ذبح کردے تو ذبیحہ حلال وجائز نہ ہوگا۔

بالکل اسی طرح کا معاملہ طلاق میں بھی ہے، اگر کوئی شخص محض دل ہی دل میں طلاق کہہ لے، یا بغیر زبان سے ایقاع طلاق کا لفظ بولے ہوئے اور بغیر کسی مجبوری کے محض کاغذ پر لکھ ڈالے تو اس سے کوئی طلاق واقع نہیں ہوگی البتہ ''الدین یسر'' (۳) کے قاعدہ سے شریعت مطہرہ نے ضرورت کے موقع میں بقدر ضرورت کتابت کو بھی قائم مقام تلفظ قرار دے دیا ہے۔

مثلاً ایک شادی شدہ شخص اخرس گونگا ہے، اشارہ سے بھی اظہار طلاق پر قادر نہیں اور طلاق دینے کی اسکو ضرورت ہے، یا مثلاً معتقل اللسان ہے اور یہ اعتقال دائمی ہوگیا ہے اور زبان سے تلفظ طلاق پر قادر نہیں ہے اور ضرورت طلاق دینے کی ہے یا مثلاً ایک شخص جو دور ہے یا سامنے نہیں ہے اور وہ طلاق کی اطلاع عورت کو دینا چاہتا ہے، اس کی اس کو ضرورت ہے تو ان سب صورتوں میں کتابت طلاق بمنزلہ تلفظ طلاق کے قرار پا جاتی ہے اور اسی کو فقہاء نے بایں عبارت نقل فرمایا ہے:

۱- البحر الرائق مطبوعہ مکتبہ زکریا ۳/ ۴۱۰ میں طلاق کی تعریف میں مذکور ہے: ''رفع قيد النكاح حالاً أو مآلاً بلفظ مخصوص''، اور شامی ۴/ ۴۵۷ میں ہے: ''لأن ركن الطلاق اللفظ أو ما يقوم مقامه''، نیز درمختار مع شرح ردالمحتار للشامی (۲/ ۲۵۲-۲۵۳) میں مذکور ہے: ''(و) أدنى (المخافتة اسماع نفسه) ومن يقربه.......... (ويجري ذلك) المذكور (في كل ما يتعلق بنطق كتسمية على ذبيحة ووجوب سجدة تلاوة وعتاق وطلاق واستثناء''، علامہ شامیؒ نے اس کے تحت تحریر فرمایا ہے:'' قال في النهر: أقول: ينبغي أن يكون الحكم كذلك في كل ما يتوقف تمامه على القبول ولو غير مبادلة كالنكاح'' (۲/ ۲۵۴)۔

۲- تحریمہ کی شروط میں سے نطق کے تحت مذکور ہے: ''فمن همس بها أو اجراها على قلبه لا تجزيه'' (ردالمحتار ۲/ ۱۴۱)۔

۳- عن أبي هريرةؓ عن النبي ﷺ قال: ''إن الدين يسر، ولن يشاد الدين أحد إلا غلبه، فسددوا وقاربوا، وأبشروا استعينوا بالغدوة والروحة وشيء من الدلجة'' (صحیح بخاری مع فتح الباری ۱/ ۹۳ کتاب الایمان باب الدین یسر حدیث: ۳۹)۔

"ان الکتابه اقیمت مقام العبارة عند الحاجة"(۱) اور یہ علت مطردہ ہے ہر جگہ جاری و نافذ ہوگی اور اسی بناء پر چونکہ اقامۃ کتابت مقام العبارۃ محض بوجہ ضرورت اور بقدر ضرورت پر دائر ہے، اس لئے مکرہ کی طلاق بالکتابۃ واقع نہیں ہوتی، اس لئے کہ یہاں کتابت کی حاجت نہیں بغیر کتابت کے بھی زبان سے طلاق دلوائی جاسکتی ہے اور بالکل اسی طرح اگر کوئی شخص بیوی کے سامنے موجود ہوتے ہوئے زبان سے کوئی طلاق دینے کے بجائے محض لکھ کر دیدے تو کوئی طلاق واقع نہ ہوگی، کیونکہ بجائے لکھنے کے زبان سے طلاق دے سکتا تھا، اگر اس وقت زبان سے کہنے سے کوئی شخص کسی مانع کی وجہ سے زبان سے ادا نہ کرسکتا ہوتو بعد میں یا اسی وقت وہاں سے ہٹ کر بذریعہ کتابت طلاق نامہ بھیج سکتا تھا مگر جب اس نے ایسا نہیں کیا تو یہ حاضرانہ کتابت لغو و بیکار غیر مفید ہے، اسی کو علامہ ابن عابدین نے (شامی ج ۵ ص ۴۷۰) میں بایں الفاظ ادا کیا ہے:

"وظاهره أن المعنون من الحاضر الناطق غير معتبر"(۲)۔

علاوہ ازیں فقہاء نے جہاں جہاں بھی طلاق بالکتابۃ کو مفید سمجھا ہے وہاں وہاں جو مثالیں لائے ہیں ان سب میں کہیں کہیں ارسل وغیرہ ایسے الفاظ لائے ہیں جن سے واضح ہوتا ہے کہ یہ طلاق بالکتابۃ غائبانہ ہوئی ہے، سامنے اور روبرو کی نہیں ہے اور مثال چونکہ ممثل لہ کی وضاحت کے لئے ہوتی ہے، اس لئے بطریق دلالۃ النص یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ غائبانہ کتابت طلاق مفید ہوتی ہے، پھر چونکہ تصانیف کا مفہوم مخالف حجۃ ہوتا ہے، اس لئے بطریق اشارہ نص یہ حقیقت بھی کھل جاتی ہے کہ بالمشافہ کی کتابت بغیر کسی شدید ضرورت کے معتبر نہ ہوگی جیسا کہ شامی (ج ۵ ص ۴۷۰) کی عبارت سے اوپر واضح ہوچکا ہے، فقط واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۴/ ۷/ ۱۴۸۰ھ

طلاق دے دوں کہنے سے طلاق نہیں پڑتی:

صورت مسئلہ یہ ہے کہ مسمّی محمد ناصر علی ابن اللہ رکھا کا عقد نکاح مسماۃ پروین بنت شبیر احمد سے ہوا میری بیوی پروین میرے مکان پر تھی کہ میں اس کو اپنی خالہ کے یہاں شرکت شادی میں لیجانا چاہتا تھا، کیونکہ میری خالہ کے دھیر ا ضلع سہارنپور تحصیل رڑکی نے اس کے لانے کا اصرار فرمایا تھا مجھے گھر کے کچھ افراد منع کرنے لگے، میرے تقاضے میں شدت ہوگئی،

۱- البحر الرائق ۳/ ۲۴۹۔

۲- رد المحتار علی الدر المختار ۱۰/ ۳۶۱۔

گھر والوں نے مزید رکاوٹ پیدا کرنی چاہی، تو میں نے ازروئے حق زوجیت بغرض سرپرستی اپنا حق ظاہر کرتے ہوئے کہا کہ طلاق دے دوں یعنی کیا آپ لوگ میری مفارقت پسند کرتے ہو تو میں ایسا کردوں محلّہ کی کچھ موافق مخالف عورتیں بھی موجود تھیں جنہوں نے میرے اس لفظ کو دوسرے حضرات سے طلاق دیدینا ثابت کیا اور میرے اور میری زوجہ کے سرپرستوں (والد وغیرہ) کو باور کرانا چاہا کہ اس نے تو تمہاری لڑکی کو طلاق دیدی ہے، میرے خسر صاحب ابھی آئے تھے انھوں نے یقین سے کہدیا کہ تم نے تو میری لڑکی کو طلاق دیدی ہے، پھر اب میں کیسے بھیج دوں تو حضرت مفتی صاحب جناب سے استدعا ہے کہ بصورت مذکورہ بالا کیا میرے اس بیان سے طلاق واقع ہوگئی ہے؟

محمد ناصر علی بن اللہ رکھا چرتھاول، مظفرنگر

الجواب وباللہ التوفیق:

اگر ناصر علی نے واقعی صرف یہی جملہ (کہ طلاق دیدوں) کہا ہے تو ان الفاظ سے طلاق واقع نہیں ہوئی۔ یہ الفاظ ایقاع طلاق کے نہیں ہیں بلکہ محض استفہام یا تہدید کے ہیں (۱)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۵/۲/۱۴۰۲ھ

ایک مجلس کی تین طلاق کے سلسلہ میں احمد آباد اسلامک ریسرچ سینٹر کی جانب سے منعقد سیمینار کے فیصلہ پر محاکمہ:

احمد آباد ۴ نومبر ۱۹۷۳ھ یہاں اسلامک ریسرچ سینٹر کے زیر اہتمام ۴/۵/۶ نومبر ۷۳ء کو تین طلاقوں پر ایک کل ہند سیمنار رہوا جس کی صدارت مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی نے کی جس میں حسب ذیل نکات پر اتفاق رائے کیا:

(۱) ایک مجلس میں تین طلاق کے طلاقِ مغلظہ ہونے کا مسئلہ اجماعی وقطعی نہیں ہے، اس میں سلف ہی کے زمانے سے اختلاف موجود ہے۔

(۲) فقہی جزئیات وتفصیلات سے قطع نظر مندرجہ ذیل دوصورتوں کے بارے میں مجلس مذاکرہ کی رائے یہ ہے:

۱- ''أما تفسيره شرعا فهو رفع قيد النكاح حالا أو مآلا بلفظ مخصوص'' (فتاوی عالمگیریہ ۱/ ۳۴۸) اور استفہام وتہدید اور وعد ووعید پر مشتمل تعبیرات سے رفع قید نکاح کا تحقق نہیں ہوتا، قوله طلقي نفسک فقالت أنا طالق أو أنا أطلق نفسي لم يقع لأنه وعده (درمختار مع ردالمحتار ۴/ ۵۵۸)۔

الف: اگر کوئی شخص اپنی بیوی سے طلاق، طلاق، طلاق کہتا ہے اور کہتا ہے کہ میری نیت صرف ایک طلاق دینے کی تھی، میں نے طلاق کا لفظ تاکید کے لئے دہرایا تھا تو اس کی اس بات کو باور کیا جائے گا، اور یہ طلاق طلاقِ مغلظہ شمار نہ ہوگی۔

ب: اگر کوئی شخص اپنی بیوی سے کہتا ہے: تجھے تین طلاق مگر وہ حلفیہ بیان دیتا ہے کہ میری نیت تین طلاق دینے کی نہیں تھی، میں تو یہ سمجھتا تھا کہ تین طلاق کا لفظ کہے بغیر طلاق واقع نہیں ہوتی، اس لئے میں نے تین طلاق کے لفظ استعمال کئے تھے۔ اس کی بات باور کی جائے گی اور یہ طلاق طلاقِ مغلظہ بائنہ شمار نہ ہوگی۔

(۴) اس بات کی شدید ضرورت ہے کہ مسلمانوں کو طلاق کا صحیح طریقہ بتایا جائے، ان کو یہ واضح کیا جائے کہ ایک مجلس میں تین طلاق کا طریقہ بدعت، معصیت اور عورت کے حق میں ظلم وزیادتی ہے، طلاق کے اس غلط طریقہ سے مسلمانوں کو اجتناب کرنا چاہئے اور طلاق دینا ضروری ہے، تو بس ایک طلاق پر بس کرنا چاہئے۔

الجواب وبالله التوفيق:

امابعد ۴/۵/۶ /نومبر ۱۹۷۳ء کے اسلامک ریسرچ سینٹر احمد آباد کے زیر اہتمام تین طلاقوں کے بارے میں کل ہند سیمنار کے نام سے جو سیمنار ہوا ہے، اس کا فیصلہ قومی آواز لکھنو میں شائع ہوا ہے، اس کا تراشہ سامنے ہے اس پر کچھ عرض کرنا ہے:

پہلی بات تو یہ ہے کہ سیمناروں کی حیثیت عموماً محض ایک علمی مذاکرہ وتبادلہ خیالات کی ہوتی ہے، اس کو شرعی حکم یا فتویٰ قرار دینا صحیح نہیں، اگر کوئی شخص اس کو شرعی حکم قرار دے تو یہ اس کی غلطی اور فریب خوردگی ہوگی، پھر اس سیمنار کو کل ہند سیمنار کہنا بھی تسلیم نہیں، کل ہند سیمنار اس وقت کہا جا سکتا تھا جب پورے ہندوستان کے تمام مکاتب فکر اور ہر طبقہ خیال کے معتمد علماء کرام کا کم از کم معتدبہ طبقہ اس میں شریک ہوتا اور ہر ایک کے مقالے وبیانات پر مکمل بحث وتمحیص کے بعد کوئی متفقہ رائے سے فیصلہ کیا جاتا، یہاں ایسا نہیں ہوا، لہٰذا اس کو کل ہند سیمنار کہنا کیونکر درست ہوگا؟ بلکہ محض ایک حاضر جماعت یا ٹولی کا سیمنار ہوا جو قطعاً کسی دوسرے طبقہ خیال کے افراد پر حجت نہیں بن سکتا اور بالکل لایعباء بہ کے درجہ کی چیز ہے، اس لئے اس پر کچھ کہنا یا اس کی تردید کی بھی چنداں ضرورت نہ تھی، لیکن چونکہ آج کل بے راہ روی کا دور دورہ ہے، مبادا کوئی شخص اس کو شرعی حکم یا شرعی فتویٰ قرار نہ دے دے، اس لیے اس کی حقیقت واضح کر دینے کی ضرورت ہے، اور اسی مقصد کے پیش نظر ذیل

کی چند سطور عرض ہیں۔ مقالے سامنے موجود نہیں کہ ان پر کچھ تفصیلی گفتگو کی جاسکے، اس لئے صرف تراشہ اخبار میں جو چار نکات پر اتفاق ظاہر کیا گیا محض اسی پر عرض کیا جاتا ہے۔

چوتھا نکتہ: جس کو نمبر ۳ کے ضمن میں بیان کیا گیا ہے صحیح ہے اور تسلیم ہے کہ اس بات کی شدید ضرورت ہے کہ مسلمان کو طلاق دینے کا صحیح طریقہ بتایا جائے اور ان پر واضح کیا جائے کہ ایک مجلس میں تین طلاق دینے کا طریقہ بدعت ومعصیت وعنداللہ انتہائی مبغوض ومذموم ہے اور عورت کے حق میں اور خود اپنے حق میں ظلم وزیادتی ہے، طلاق کے اس طریقہ سے مسلمانوں کو اجتناب کرنا چاہئے اور اگر طلاق دینا ضروری ہو تو صرف ایک طلاق پر بس کرنا چاہئے اور وہ بھی خوب سوچ سمجھ کر اور اس کے نتائج وعواقب پر نظر رکھ کر اور غور وفکر کرنے کے بعد طلاق کا اقدام کرنا چاہئے اور وہ بھی اس وقت جب عورت حیض سے پاک ہو کر غسل وغیرہ کر چکی ہو اور اس سے مباشرت نہ ہوئی ہو، جیسا کہ فقہاء نے بیان فرمایا ہے اور اس مسئلہ کی تشہیر وترویج اور تعلیم کے لئے جتنی بھی سعی کی جائے محمود وپسندیدہ خدمت ہوگی۔

دوسرا نکتہ: (۱) و (۲) کے ضمن میں الف کے تحت بیان کیا گیا ہے کہ اگر کوئی شخص بیوی سے طلاق، طلاق، طلاق کہتا ہے الخ، وہ صحیح اور قابل اعتماد نہیں ہے، اس لئے کہ بیوی سے اس طرح براہ راست کہنا اس بات پر قرینہ ہے کہ شوہر نے بیوی کے سامنے اس کو مخاطب کر کے (طلاق، طلاق، طلاق) کہا ہے، لہذا جب بیوی نے خود سن لیا ہو تو لفظ تجھے کہا ہو، یا نہ کہا ہو نسبت بیوی کی طرف مراد ہوگی اور بیوی کے لئے جائز نہیں رہے گا کہ کسی طرح بھی شوہر کو اپنے اوپر قابو پالینے دے، اگر شوہر بحلف بھی بیان کرے کہ میری نیت محض تاکید کی تھی اور صرف ایک طلاق دینے کی تھی یا دومرتبہ کا لفظ بھی تاکید کے طور پر کہا تھا، شوہر کے اس حلفی بیان کی بھی تصدیق شریعت نہ کرے گی، تصدیق کرنا اس کے لئے جائز نہ رہے گا، اس لئے کہ عورت اس معاملہ میں مثل قاضی کے ہے۔

اسی طرح اگر یہ معاملہ قاضی (یا قائم مقام قاضی جیسے جماعت مسلمین وشرعی کمیٹی) کے سامنے پہنچ جائے گا تو وہ بھی بحلف بیان کرنے کی تصدیق نہ کرے گا، بلکہ تین طلاق کا ہی حکم ہوگا۔ ہاں اگر عورت کو شوہر کے جملہ کے کہنے کا علم نہ ہوا اور معاملہ قاضی یا قائم مقام قاضی تک نہ پہنچے، مثلاً شوہر نے غائبانہ کہا ہو کہ اس کو طلاق، طلاق، طلاق پھر بحلف کہے کہ میری نیت صرف ایک طلاق دینے کی تھی، دومرتبہ طلاق کا لفظ محض تاکید کے طور پر کہہ دیا تھا تو اس صورت میں فیما بینہ، وبین اللہ تصدیق کرلی جائے گی اور اس کی رجعت صحیح قرار دیدی جائیگی، اسی طرح اگر شوہر کے سوا کسی کو بھی شوہر کے اس جملہ کے کہنے کی خبر نہ ہو، مثلاً بالکل تنہائی میں عورت سے بھی غائبانہ کہہ دیا ہو اور واقعی شوہر نے تاکید کی نیت سے اور تاکید کے لئے ہی

دہرایا ہے تو معاملہ اس کے اور اللہ کے درمیان رہے گا۔ اور اس کا رجعت کرلینا صحیح رہے گا، جیسا کہ مندرجہ ذیل عبارت سے معلوم ہوتا ہے:

الف: "لو كرر لفظ الطلاق وقع الكل وإن نوى التاكيد دين" (۱)۔

ب: "قوله إن نوى التاكيد الخ أي وقع الكل في القضاء" (۲)۔

ج: تنقیح فتاویٰ حامدیہ، ص ۳۷ میں اسی قسم کے سوال کا جواب دیتے ہوئے فرماتے ہیں: "لا يصدق في ذالك قضاءً، لأنه مأمور باتباع الظاهر، والله يعلم بسرائره، ولا يصدق أنه قصد التاكيد إلا بيمينه، لأن كل موضع يكون القول منه قوله: إنما يصدق مع اليمين (ثم الىٰ قوله) أن المرأة كا لقاضي فلا تحل لها أن تمكنه إذا سمعت منه ذالك وعلمت؛ لأنها لا تعلم إلا الظاهر" (۳)۔ لہٰذا شوہر کا یہ جملہ اگر عورت نے خود سن لیا ہے یا معاملہ عدالت میں پہنچ گیا ہے تو خاوند کا یہ دعویٰ کہ اس جملہ سے میری نیت صرف ایک طلاق دینے کی تھی اور باقی دومرتبہ محض تاکید کے طور پر دہرایا ہے، قابل اعتبار اور مفید مطلب نہ ہوگا اور محض اس دعویٰ سے فقط ایک طلاق کا حکم نہ ہوگا اور عورت کے واسطے شوہر کو اپنے اوپر قابو دینا جائز نہ ہوگا، بلکہ اس سے خلاصی کی ہر مناسب تدبیر اختیار کرنا لازم ہوگا۔ جیسا کہ شامی، (ص ۵۹۴ ج ۲) میں اس کی تصریح موجود ہے، البتہ اگر عورت شوہر کو اپنے سے روک کر یا بھاگ کر یا فدیہ دیکر وغیرہ کسی طرح بھی خلاصی حاصل نہ کر سکے تو معاملہ قاضی تک پہنچائے، اب اگر قاضی کے سامنے بھی شوہر تین مرتبہ لفظ طلاق کہنے سے بحلف انکار کرے اور عورت کے پاس خلاف کا بینہ نہ ہو اور قاضی عورت کے خلاف فیصلہ کردے تو اب گناہ عورت پر نہ رہے گا، بلکہ صرف مرد پر رہے گا۔

وفی البحر از یعنی لا وزجندی: "إنها ترفع الأمر للقاضي فإن حلف ولا بينة لها، فالإثم عليه أي إذا لم تقدر على الفداء أو الهرب ولا على منعه عنها" (۴)۔

ہاں اگر شوہر نے محض ایک طلاق کی نیت کرنے پر اور دوبار محض تاکید کے لئے بولنے پر یہ جملہ بولنے سے قبل ہی ثقہ کو اہ بنالیا تھا اور ان کی گواہی سے عدالت میں ثابت کردیا کہ واقعی محض ایک طلاق کی نیت سے یہ جملہ کہا ہے اور محض تاکیداً

۱- شامی ۳/۲۹۳ کتاب الطلاق، باب طلاق غیر المدخول بہا۔

۲- حوالہ سابق۔

۳- تنقیح الفتاویٰ حامدیہ ۳۷۔

۴- شامی، شامی کتاب الطلاق باب مطلب الصریح ۳/۲۵۱۔

دوہرایا ہے تو اس صورت میں شوہر بھی گنہگار نہ ہوگا، اور محض ایک طلاق رجعی کا حکم ہوگا جیسا کہ اس عبارت سے معلوم ہوتا ہے:
"ویقع بها أی بهذه الألفاظ وما بمعناها من الصریح (إلی قوله) بلافرق بین جاهل وعالم، وإن قال تعمدته تخویفا لم یصدق قضاء، إلا إذا أشهد علیه قبله" (۱)۔ وهكذا فی البحر وغیره۔

اور ابن دقیق العید نے "احکام الاحکام" (ص ۱۲۷ ج ۲) میں اسی عذر جہل پر بہت مدلل ومفصل کلام کیا ہے ——— جس کا حاصل یہ ہے کہ منصوصات ومامورات میں جہالت کا عذر معتبر نہیں ہے اور تین طلاق کے بعد حرمت منصوص ہے اور بغرض نکاح جدید "حتی تنکح زوجا غیره" (۲) حکم بھی منصوص ہے پھر اس کا جہل کس طرح معتبر ہوگا۔

تیسرا نکتہ: جو ۲ کے ضمن (ب) کے تحت بیان کیا گیا ہے قطعا غلط اور نا قابل تسلیم ہے، اس لئے کہ شوہر نے اپنی بیوی سے یہ جملہ (تجھے تین طلاق) کہا تو اب اگر شوہر بحلف بھی بیان دے کہ اس جملہ سے میری نیت تین طلاق دینے کی نہ تھی، بلکہ میری نیت صرف ایک طلاق کی تھی میں تو یہ سمجھتا تھا کہ تین کا لفظ استعمال کیے بغیر طلاق واقع ہی نہیں ہوتی تو شوہر کا یہ بیان کسی صورت میں معتبر نہ ہوگا، بلکہ تین طلاق ہی کا حکم ہوگا اور حرمت مغلظہ ہوگی اور شوہر کے قول کی تصدیق کر کے محض ایک طلاق شمار نہ ہوگی۔

کما فی الرد: "والطلاق یقع بعدد قرن به أی متی قرن الطلاق بالعدد کان الواقع بالعدد بدلیل ما أجمعوا علیه من أنه لو قال لغیر المدخول بها أنت طالق ثلاثا طلّقت ثلاثا...... وقوله عند ذکر العدد الخ أی عند التصریح بالعدد فلا یکفی قصده" (۳) اور لاعلمی کے عذر کا اعتبار نہ ہوگا، ابھی اوپر نکتہ ۲ ضمن الف کے تحت کی اخیر عبارت: "بلا فرق بین عالم و جاهل" سے اور بھی واضح ہوتا ہے، اسی طرح عقل کے بھی مطابق ہے ،اس طرح کہ نقل وعقل وشرع سب کے نزدیک مسلمہ ہے کہ جس زبان کا جو لفظ ہوتا ہے اس زبان میں اس لفظ کے لئے جو معنی موضوع ہوتے ہیں وہی معنی مراد ہوتے ہیں۔

اس معنی کے خلاف معنی کا مراد لینا غلط کہا جاتا ہے، اور معتبر نہیں ہوتا ہے جیسے آم (ایک خاص پھل کا نام ہے جس معنی کے لئے وضع ہوا ہے وہی معنی اس سے مراد لئے جائیں گے۔ اور اگر کوئی شخص لفظ آم بول کر املی یا انار وغیرہ (دوسری نوع کا پھل) مراد لے تو ہرگز اعتبار نہ کیا جائے گا اور اگر وہ کہے کہ میری مراد اس لفظ آم، سے آم نہیں تھی، بلکہ املی تھی تسلیم نہیں کیا

۱- شامی ۳/ ۲۴۸-۲۴۹ باب الصریح۔
۲- سورۂ بقرہ ۲۳۰۔
۳- رد المحتار ۵۱۳-۵۱۴۔

جائے گا، تغلیط وتکذیب کی جائے گی ۔ بالخصوص جب کہ آم بول کر املی وغیرہ مراد لینے میں اس کا کوئی نفع بھی متصور ہو)۔

مثلاً یہی تین کا لفظ ہے، اس لفظ کے معنی ہر ہندوستانی کے ذہن وعلم میں متعین ہیں کہ دو اور چار کے درمیان کا عدد مراد ہے، جو دو سے زائد اور چار سے کم ہوتا ہے اور یہی معنی اس لفظ (تین) کا حقیقی معنی اور معنیٰ موضوع لہ ہے جس میں نیت بلانیت ہر حال میں یہی عدد دو درجہ مراد ہوتا ہے۔

اگر کوئی کہے کہ میں اس کے معنی نہیں جانتا تھا یا اس کا موقع استعمال نہیں جانتا تھا، یا میری مراد تو صرف دو تھی تکذیب کی جائے گی، قسم بھی اس پر کھائے گا تو اعتبار نہ کیا جائے گا، بالخصوص ایسے موقع پر جب کہ اس مراد لینے میں اس کا ذاتی نفع ہو اور جھوٹ بولنے کا احتمال بھی ہو رہا ہو، بالکل یہی حال یہاں بھی ہے کہ ہرگز اس کے قول کا جو طلاق کے ساتھ تین کا لفظ بولنے کے باوجود کہے کہ میں نہیں جانتا تھا کہ تین طلاق کہنے سے تین طلاق واقع ہو جائیں گی، یا یہ کہے کہ مراد تین سے تین نہیں تھی، بلکہ صرف ایک تھی، یا یہ کہے کہ میں تو سمجھتا تھا کہ بغیر تین کے لفظ بولے ہوئے طلاق ہی واقع نہیں ہوتی تو اعتبار نہ کیا جائے گا، بلکہ تغلیط وتکذیب کی جائے گی، بلکہ اگر قسم کھا کر بھی یہ توجیہات وتاویلات کرے گا تو بھی تسلیم نہ کیا جائے گا اور بہت سے بہت یہ کہا جائے گا کہ تین طلاق تو واقع ہو گئیں، اب آئندہ سے احتیاط کرو، قوم کی زبان اور اس کی لغت ومحاورہ کو سیکھو اور معلوم کرو، اگرچہ ہمارا استدلال محض ان روایات اور ان پر قیاسات پر نہیں ہے، بلکہ نص قرآنی: "فان طلقها فلا الخ" (۱) جو تیسری طلاق کے بارے میں عام اور مطلق ہو کر وارد ہوئی ہے، اسی سے ہے جیسا کہ ہم عنقریب واضح طور سے بیان کریں گے، مگر یہ روایت مذکورہ بھی محض عقلی تک بندی تک نہیں ہے، بلکہ ماخوذ من الکتاب والسنۃ ہے جب منطوق قرآنی: "وما ارسلناک إلا کافة للناس بشیرا ونذیرا" (۲) اور حسب ارشاد نبوی: "انما بعثت إلى الأسود والأحمر" الحدیث حضرت سرکار دو عالم نبی آخر الزماں تمام عالم کے لئے بشیر ونذیر بنا کر بھیجے گئے ہیں، تمام عالم کو خواہ وہ کوئی زبان ولغت رکھتا ہو سب کے لئے احکام خداوندی پہونچانے سے خواہ بلا واسطہ اور براہ راست زبان مشکوۃ سے اور یہ احکام پہنچانا خواہ بلا واسطہ اور براہ راست زبان مشکوۃ نہ ہونے میں ہو یا بواسطہ ہو اور منطوق قرآنی: "وما ارسلنا من رسول الا بلسان قومه" (۳) کے اشارۃ النص نے بتایا کہ ہر قوم میں احکام خداوندی کی تعلیم اس قوم کی زبان ولغت میں ہوگی، چنانچہ قوم عرب میں سرکار دو عالم ﷺ نے براہ راست خود لغت عرب میں تعلیم احکام فرمائی اور اقوام عجم میں آپ کے صحابہ وتابعین

۱- سورۂ بقرہ: ۲۳۰۔
۲- سورۂ سبا: ۲۸۔
۳- سورۂ ابراہیم: ۴۔

نے اور علماء ومشائخ نے ان عجمیوں کی زبان میں، ابلاغ احکام فرمایا، پس جس طریقہ سے لغت عرب میں لفظ ثلاثہ کے معنی و مصداق میں گفتگو ہوگی، ان نصوص کے تابع ہونے کی وجہ سے محض عقلی قیاسات یا تکبندی نہیں کہلائے گی، بلکہ درایت شرعی وقیاس شرعی ہی کے دائرہ کی چیز ہوگی، اور مستنبط من القرآن والحدیث ہوگی، لیکن یہاں پر چند مغالطات پیش کئے جاتے ہیں، ان کا دفع کرنا بھی ضروری ہے، کہا جاتا ہے کہ تم اپنی عقل وقیاس کے گھوڑے دوڑاتے پھرتے ہو اور احادیث میں صراحۃ تمہارے قیاس کے خلاف مذکور ہے کہ جب خیر القرون میں کوئی تین طلاق دیتا تھا تو وہ ایک شمار ہوتی تھی تو ہم تمہارے قیاس کو اختیار کریں یا حدیث کو، اس سلسلہ میں پہلی چیز دھوم دھام سے پیش کی جاتی ہے وہ حضرت ابو الصہبا کی روایت ہے کہ جب کوئی شخص طلاق دیتا تھا تو وہ ایک شمار ہوتی تھی، اس کا جواب یہ ہے کہ یہ حکم غیر مدخول بہا عورت کا ہے، جب کوئی شخص اپنی غیر مدخول بہا کو تین مرتبہ طلاق دیتا تھا تو بے شک اس کو ایک طلاق بائن سے مطلقہ شمار کرتے تھے اور یہ صحیح ہے کہ یہ روایت مبہم اور مجمل ہے اور ابو داؤد شریف میں تصریح ہے کہ یہ حکم غیر مدخول بہا عورت کے لئے ہے۔

"أما علمت أن الرجل كان إذا طلق امرأته ثلاثا قبل أن يدخل بها جعلوها واحدة" (۱) اور امام ابو داؤد بڑے درجہ کے محدث اور متفق ثقہ ہیں، وہ اس حدیث پر کوئی جرح نہیں فرماتے ہیں، اس لئے یہ زیادتی ثقہ کی ہوگی، اور معتبر ومقبول اور صحیح ہوگی، نیز مدخول بہا عورت کے لئے چونکہ نص قرآنی: "إذا نكحتم المؤمنات ثم طلقتموهن من قبل أن تمسوهن فما لكم عليهن من عدة تعتدونها" (۲) اس پر عدت نہیں ہوتی، وہ طلاق دے گا تو پہلے ہی طلاق پڑنے پر وہ نکاح وعدت سب سے خارج ہوکر شوہر سے بالکل غیر متعلق وآزاد، بلکہ شوہر کے لئے بالکل اجنبی وحرام ہوجائیگی اور دوسری وتیسری بار کی طلاق لغو وبے کار ہوجائے گی اور یہ بالکل ایسا ہے، جیسے کوئی اپنی مدخول بہا عورت کو طلاق رجعی دے تو عدت کے اندر اندر رجعت کرسکتا ہے اور مزید طلاق دینا چاہے تو مزید طلاق بھی دے کر اس کو بائنہ یا مغلظہ جو چاہے کرسکتا ہے، لیکن جب عدت ختم ہوجائے تو پھر کوئی طلاق واقع نہیں ہوتی، اگر دے تو لغو وبیکار ہوجائے گی یہ کیوں؟ محض اس لئے کہ عدت باقی نہ رہنے کی وجہ سے کسی قسم کا تعلق ولگاؤ باقی نہ رہا، وہ ہر طرح آزاد واجنبی ہوگئی جس طرح کسی اجنبی عورت کو طلاق دینے سے طلاق واقع نہیں ہوتی، اسی طرح اس کو طلاق دینے سے کوئی طلاق واقع نہ ہوگی، بالکل اسی طرح غیر مدخول بہا کا بھی حکم ہے، لہذا اس حدیث سے تین طلاق کے ایک طلاق ہونے پر استدلال کرنا درست نہ ہوگا۔

۱- ابوداؤد ۲/۲۶۱، حدیث: ۲۱۹۹، مکتبہ عصریہ بیروت۔

۲- سورۂ احزاب: ۴۹۔

دوسری چیز ابن عمرؓ کی روایت پیش کی جاتی ہے کہ انہوں نے حالتِ حیض میں تین طلاق دی تھیں، ان کو سرکارِ دوجہاں ﷺ نے ایک طلاق قرار دیا تھا، حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ حضرت ابن عمر نے صرف ایک طلاق بحالت حیض دی تھی، اور حضور ﷺ نے ان کو رجوع کر لینے کا حکم دیا تھا تین طلاق دینے کی روایت کی تغلیط خود راوی نے بھی کی ہے۔

تیسری چیز محمود ابن لبید کی روایت پیش کی جاتی ہے جس کی تخریج نسائی نے کی ہے کہ ایک شخص کے بارے میں حضور ﷺ کو خبر دی گئی کہ اس نے اپنی بیوی کو یکدم تین طلاق دی ہیں، تو حضور ﷺ غضبناک ہو گئے کہ کیا کتاب اللہ سے کھیل کیا جائے گا درانحالیکہ میں تمہارے اندر موجود ہوں؟ اس سے استدلال کیا جاتا ہے کہ دیکھئے حضور ﷺ نے یکدم تین طلاق دینے پر ڈانٹا ہے، اس لئے تین طلاق بیک دم واقع نہ ہونی چاہئیں، یہ استدلال یوں غلط ہے کہ روایت میں کہیں مذکور نہیں کہ حضور ﷺ نے اس تین طلاق کو ایک طلاق قرار دیدیا تھا، بلکہ چونکہ تین طلاق بیک دم دینا عند اللہ بیحد مبغوض ہے، اس لئے آپ نے نکیر فرمائی اور جو تین طلاق اس نے بیکدم دیدی تھیں آپ کا اس کو رد نہ فرمانا اس کے نفاذ پر تقریر ہو گئی کہ باوجود مبغوض ہونے کے کوئی شخص اس کا ارتکاب کرے گا تو وہ واقع اور نافذ ہو جائیں گی۔

علاوہ ازیں اس روایت کے بارے میں امام نسائی خود تصریح کرتے ہیں کہ یہ روایت مخرمہ ابن بکیر عن ابیہ کے علاوہ کسی اور نے روایت نہیں کی ہے اور مخرمہ ابن بکیر کا اپنے والد بکیر سے سماع متکلم فیہ ہے، لہذا یہ روایت غریب اور متکلم فیہ ہو کر اس قابل نہ رہی کہ اس کو دوسری صحیح حدیث اور مستند روایات کے مقابلہ میں ترجیح ہو سکے۔

چوتھی چیز حضرت ابو رکانہ کی روایت پیش کی جاتی ہے کہ انہوں نے اپنی بیوی کو تین طلاق دیدی تھیں اور حضور ﷺ نے اس تین طلاق کو ایک قرار دیا تھا، لہذا ایک دم تین طلاق ایک طلاق ہونا چاہئے۔ یہ استدلال بھی صحیح نہیں، اس لئے کہ مسلم شریف میں تصریح ہے کہ ابو رکانہ نے طلاق البتہ (جس کو طلاق بتی بھی کہتے ہیں) دیا تھا، لفظ البتہ کے معنی قطع کامل اور کلی انقطاع کے آتے ہیں اور قطع کامل اور انقطاع کلی جس طرح تین طلاق میں ہوتا ہے، اسی طرح ایک طلاق بائن میں بھی ہوتا ہے، لہذا اسی لفظ "البتہ" سے دونوں مراد لے سکتے ہیں اور ایک طلاق بائن باعتبار تین طلاق کے کم مبغوض ہوتا ہے اور صحابہ کے شایان شان یہی ہے کہ ابغضیت کی طرف میلان نہ ہو، اور ایک ہی طلاق بائن مراد لیا ہو، لیکن اس کے باوجود حضور ﷺ نے ان سے پوچھا ہے اور انہوں نے بحلف بیان فرمایا کہ محض ایک طلاق مراد لی تھی، اس لئے حضور ﷺ نے محض ایک طلاق بائن کا حکم دیا نہ یہ کہ تین طلاق کو ایک طلاق قرار دیا یہ کس قدر مغالطہ ہے، مسند احمد ابن حنبل کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ ابو رکانہ نے تین طلاق دے دی تھیں اور حضور ﷺ نے اس کو ایک طلاق قرار دے دیا، دھوکہ نہ کھانا چاہئے، اس

لئے کہ یہ واقعہ ابو رکانہ کا نہیں ہے، جیسا کہ محدثین نے اس کی تصریح کی ہے (کمافی البذل)۔

بلکہ رکانہ کا ہے اور حضور ﷺ نے رکانہ کی تین طلاق کو ایک طلاق قرار نہیں دیا ہے، راوی کو وہم اور خلط ہو گیا ہے اور اس خلط کو اس طرح نقل کر دیا، جیسا کہ متقدمین محدثین نے اس کی تصریح کی ہے اور توضیح کی ہے (کمافی البذل)، اور اگر تسلیم بھی کر لیا جائے تو بھی اس لئے کہ مسند احمد کی اس سند سے مسلم کی یہ سند زیادہ قوی ہے، اور مضبوط ہے اس کے مقابلہ میں، لہذا اس سند اور اس سند کی روایت کو ترجیح نہ ہوگی اور مسلم کی روایت میں امام نووی کا فیصلہ ہے کہ ابو رکانہ نے تین طلاق صریح نہیں دی تھیں، بلکہ طلاق البتہ دی تھیں اور اس پر ساری گفتگو پہلے گزر چکی ہے، اگر کوئی یہ کہے کہ اسی طرح کا واقعہ حضرت رکانہ کا بھی ہے کہ انہوں نے بھی تین طلاق دی تھیں اور حضور ﷺ نے اس کو ایک قرار دیا تھا تو یہ بھی قابل تسلیم اور صحیح نہیں ہے، اس لئے کہ اولاً تو یہ روایت مجاہیل کی ہے جو ہرگز صحاح کے مقابلہ میں قابل استناد نہیں ہے، ثانیاً اگر تعدد کی بنیاد پر تسلیم بھی کر لیا جائے تو کسی راوی نے یہ نہیں بیان کیا ہے کہ حضور ﷺ نے ان کی تین طلاق کو ایک طلاق قرار دیا ہو، اس لئے یہ بات کہ تین طلاق ان روایات سے ایک شمار ہوں کسی طرح صحیح نہیں۔

پانچویں چیز یہ کہی جاتی ہے کہ قرآن پاک کے "**الطلاق مرتان فامساک بمعروف أوتسریح باحسان**" (۱) کے سیاق وسباق سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جب تین طلاقیں تین وقت میں اور تین مجلس میں دے تو تین طلاق کا حکم ہوگا اور حرمت مغلظہ ہوگی، ورنہ نہیں، یہ کہنا بھی صحیح نہیں ہے، اس لئے کہ "الطلاق مرتان" کا مطلب یہ نہیں ہے کہ دو طلاق دو مرتبہ دو وقت میں دے، پھر جب اس کے بعد فان طلقہا وارد ہے تو اس سے معلوم ہوا کہ تیسری طلاق تیسرے وقت اور تیسری مجلس میں ہونا چاہئے، یعنی آگے پیچھے ہونا چاہئے بیک وقت بیک مجلس وبیک زبان نہ ہونا چاہئے، پس اگر کوئی شخص ایک ہی وقت میں، ایک مجلس میں یا ایک ہی مرتبہ میں تینوں طلاق دیدے تو تین طلاق واقع نہ ہوں گی، بلکہ اس کا حکم اس آیت میں داخل ہی نہ ہوگا۔

یہ دلیل محض بے بنیاد اور انوکھی ہے، اس دلیل کا تقاضا تو یہ ہے کہ دو طلاق رجعی بھی اس وقت واقع ہونا چاہئے، جب کہ وہ دو وقت اور دو مجلس میں دے اور اگر ایک ہی مرتبہ میں دو طلاق دے دے تو رجعی نہ ہونا چاہئے، بلکہ محض ایک ہی طلاق رجعی ہونی چاہئے، یا بالکل نہ ہونی چاہئے، حالانکہ اس کا کوئی قائل نہیں، پھر اس کے علاوہ یہ جدید ترجمانی جمہور صحابہ وتابعین جمہور ائمہ اربعہ میں سے کسی کے ذہن میں نہیں آئی جو زمانہ خیر القرون میں ہونے کے ساتھ جس طرح کتاب وسنت

۱- سورۂ بقرہ:۲۲۹۔

کے معاملہ میں محقق وامام تھے، اسی طرح لغت عرب ومحاورات عرب کے جاننے میں بھی امام مسلم تھے اور آج تو اس زمانہ میں جس کو شر القرون بھی کہنا بے محل نہ ہوگا اور کہنے والا ان حضرات مذکور میں کسی درجہ کا محقق یا امام تو ہرگز نہیں ہے۔

چھٹی چیز: جو بڑے زور وشور سے بیان کی جاتی ہے وہ حضرت ابن عباسؓ کا اثر ہے جس میں مذکور ہے کہ حضور علیہ السلام کے زمانہ میں اور حضرت صدیق کے زمانہ اور حضرت عمرؓ کے ابتدائی زمانہ میں تین طلاق ایک طلاق شمار ہوتی تھی، مگر لوگ کچھ جلدی اور بے احتیاطی کرنے لگے، تو حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ اب لوگ کچھ جلدی اور بے احتیاطی کرنے لگے، اس لئے ضرورت ہے ہم لوگ (مجتہدین صحابہؓ) تین طلاق کو تین ہی مانیں اور تین ہی نافذ کریں (یہ مشورہ فرمایا اور مشورہ کے بعد) تین نافذ کردیا۔

اس اثر سے استنباط کرتے ہیں کہ تین طلاق دینے میں ایک طلاق ماننا اصلی مشکوٰۃ نبوت سے متفق علیہ طریقہ پر برابر چلا آرہا تھا، اور ایک طلاق کے وقوع کا حکم برابر دیا جاتا تھا، مگر حضرت عمرؓ نے کسی عارض کی وجہ سے تین طلاق مان لیا اور تین نافذ کردیا۔

یہ استدلال صحیح نہیں اس میں پوری بات مذکور نہیں، اس لئے کہ اس اثر میں خود اشارہ موجود ہے کہ لوگ کچھ جلدی کرنے لگے اور بے احتیاطی کرنے لگے، لہذا جب تک وہ جلدی اور بے احتیاطی واضح نہ ہوجاوے کہ کیا تھی اور پوری بات سامنے نہ آئے، محض اس اثر سے جس میں محض جزوی بات مذکور ہو استنباط یقیناً نامکمل وادھورا رہے گا۔

پوری بات یہ ہے کہ زمانہ جاہلیت اور ابتدائے اسلام میں جب کوئی اپنی بیوی کو طلاق دیتا تھا تو رجعت کرنے میں دوسروں کے اعتبار سے زیادہ مستحق سمجھا جاتا تھا، اگرچہ تین سے زیادہ طلاق بھی کیوں نہ دیا ہو، بلکہ بہت سے لوگ عورتوں کو پریشان کرنے اور انہیں معلق رکھنے کے لئے مسلسل طلاقیں دیتے اور رجوع کرلیتے تھے، اور اس کے حقوق ادا نہ کرتے تھے تو اللہ تبارک وتعالی نے "الطلاق مرتان" کی آیت کریمہ "فلاتحل له من بعد حتى تنكح زوجا غيره" (۱) تک نازل فرماکر تین طلاقیں دینے کے بعد رجعت کردینے سے قطعاروک دیا، بلکہ یہ حکم دیدیا کہ اس معاملہ میں عورت کی مرضی کو بھی دخل رہے گا اور وہ بھی اس قید کے ساتھ کہ عورت کا نکاح کسی دوسرے شخص سے ہو اس سے مباشرت اور وطی کے بعد تفریق یا طلاق ہوچکی ہو اور پھر عورت قاعدہ شرعی کے مطابق اس کی زوجہ بنے، جیسا کہ حضرت عکرمہ خود حضرت ابن عباس سے نقل فرماتے ہیں:

۱- سورۂ بقرہ ۲۲۹-۲۳۰۔

"عن عکرمة عن ابن عباس قال: والمطلقات یتربصن بأنفسهن ثلاثة قروء، ولا یحل لهن أن یکتمن ماخلق الله في أرحامهن-الایة، وذالک أی نزول هذه الایة أن الرجل کان في الجاهلیة وبدء الإسلام إذا طلق امرأته فهو أحق برجعها وإن طلقها ثلاثا ذالک فقال: "الطلاق مرتان" (الایة)"(۱)۔

اس آیت کریمہ: "فلا تحل له من بعد الخ" میں ایک سرزنش کا پہلو بھی معلوم ہوتا ہے اور صحابہ کرام کل کے کل عدول تھے ان کی شان میں "أصحابی کالنجوم بأیهم اقتدیتم اهدیتم" وارد ہے، ان کے بارے میں یہ شبہ بھی نہیں کیا جا سکتا کہ وہ بغیر کسی شرعی وجہ یا داعیہ کے اس آیت کریمہ کے نزول کے بعد تین طلاق کے قریب بھی جاتے رہے ہوں، تین طلاق کے بعد پھر رجعت کر لینا اور پریشان کرنا یا معلق چھوڑے رکھنا تو بڑی بات ہے، بالخصوص جب کہ لفظ طلاق ہی کو "ابغض المباحات" فرمایا گیا اور اگر کبھی احیانا کسی صاحب سے تین طلاق صادر ہوگئی تھیں تو دربار نبوت سے سخت قسم کی سرزنش اور سخت غضب ناکی کا اظہار بھی فرمایا گیا ہے، جیسا کہ محمود ابن لبید کی روایت وارد ہے:

"قال أخبر رسول الله ﷺ عن رجل طلق امرأته ثلاث تطلیقات جمیعا فقام غضبان، ثم قال: أیلعب بکتاب الله و أنا بین أظهرکم" (۲)،حتی قام رجل وقال: یا رسول الله! ألا أقتله(بذل المجہود)——

ان تو بیخوں اور تہدیدوں کے سننے کے بعد صحابہؓ کے بارے میں تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ وہ عام طور سے تین طلاقوں کے دینے میں عجلت یا بے احتیاطی کرتے ہوں گے۔

ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ صحابہ کی مراد و نیت محض ایک طلاق دینے کی رہی ہو، مگر کسی مصلحت کے پیش نظر بہ نیت تاکید تین بار لفظ طلاق بول دیں اور کہیں کہ میری نیت محض ایک طلاق کی تھی اور تین بار لفظ طلاق کو محض تاکید کی نیت کے لیے کہہ دیا ہے، تو ان کی عدالت و دیانت و تقویٰ و امانت کے پیش نظر تصدیق کر لی جاتی ہے، جیسا کہ حدیث رکانہ میں جنہوں نے طلاق البتہ دے دی تھی جس سے تین طلاق اور ایک طلاق دونوں کا احتمال تھا یا دونوں مراد لیا جاتا تھا تو سرکار دو جہاں نے ان سے حلف لے کر کہ تمہاری مراد کیا تھی ایک کی تھی یا تین کی۔ حضرت رکانہ نے جواب میں بحلف بیان فرمایا کہ میری مراد صرف ایک طلاق کی تھی تو حضور ﷺ نے ایک ہی طلاق قرار دی اور یہی طلاق رکانہ قرظی نے دی اور ایک طلاق کی نیت نہیں کی تو اس کو ایک طلاق نہیں قرار دیا گیا، بلکہ تین طلاق اور حرمت مغلظہ اور موجب حلالہ قرار دیا گیا، اسی طرح عویمر عجلانی نے لعان والے واقعہ میں سرکار دو جہاں کے سامنے تین طلاق دیدیں اور حضور ﷺ نے اس کو نافذ فرما دیا۔

۱- ابوداؤد ۲/۲۵۹، حدیث: ۲۱۹۵، مکتبہ عصریہ بیروت۔

۲- الدر المنثور ۱/۵۰۴، دار الکتب العلمیہ بیروت۔

اورحضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی اس روایت کوتین طلاق کوایک طلاق ماننے والے بڑے زوردار طریقے سے پیش فرماتے ہیں ہرگز اس مقصد کے لئے پیش کرنا صحیح نہیں ہوسکتا، اس لئے کہ "الطلاق مرتان" کی آیت کریمہ کے شانِ نزول کو بتلاتے ہوئے اس بات کو فرما چکے ہیں کہ تین طلاق دینے کے باوجود جو حق رجعت طلاق دینے والا اپنے لئے سمجھتا تھا وہ اس آیت کریمہ: "الطلاق مرتان" کے نزول سے منسوخ کردیا گیا اور تین طلاق کوایک ثابت کرنیوالوں کا مقصد اور مدعا یہی ہے کہ تین طلاق دینے والوں کوبھی حق رجعت ملنا چاہئے، کس قدر متضاد بات ہے، ایسی متضاد بات وہ لوگ ہرگز نہیں فرما سکتے، بلکہ ان کا مقصد یہ ہے کہ "الطلاق مرتان" کے نزول کے بعد لوگ محض ایک طلاق کی نیت سے طلاق دیتے تھے اور محض تاکید کے لئے لفظ طلاق تین بار بول دیتے تھے اور چونکہ اس وقت دیانت کا غلبہ تھا، بہت کم ارتکاب بھی کرتے تھے، اس لئے لفظ طلاق تین بار بولنے کے باجود ان کے بیان کی تصدیق کر کے دیانۃً ایک طلاق کا حکم دے دیا جاتا تھا، لیکن جب تغیر احوال رونما ہونے لگا اور لوگ اس میں کثرت سے مبتلا ہونے لگے تو حضرت عمر فاروقؓ کو یہ اندیشہ ہونے لگا کہ مبادا کوئی شخص محض ایک طلاق کی نیت کئے بغیر یا تین ہی طلاق کی نیت سے تین بار طلاق دے کر محض ایک طلاق کی نیت کا اظہار کردے اور ہم ایک طلاق تسلیم کرلیں، تو کتنے بڑے حرام کام میں مبتلا ہوجائے گا اور اس اندیشہ کو صحابہ کرامؓ سے ظاہر فرما کر مشورہ لیا اور فرمایا کہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ دریافت کا معاملہ تو الگ ہے، صاحب معاملہ خود اس کا ذمہ دار ہوگا، لیکن جب یہ معاملہ ہمارے پاس (یعنی عندالقضاء) آجائے تو ہم تین طلاق کوایک طلاق تسلیم نہ کریں، بلکہ تین ہی کا حکم دیں اور جب یہ حکم سب پر ظاہر ہوجائے گا تو لوگ پھر طلاق دینے کا ارتکاب بھی کم کریں گے، اور احتیاط بھی کریں گے، اس مشورہ کے بعد جب لوگوں نے موافقت ظاہر کردی تو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے تین بار لفظِ طلاق بولنے پر قضاءً تین ہی طلاق کا حکم دینا شروع فرمادیا اور دیگر صحابہ نے بھی اس فیصلہ کو مان لیا۔

خود حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے بھی اس کے بعد تین بار لفظ طلاق بولنے کے بعد بھی تین طلاق کے واقع ہونے کا حکم دینا شروع فرمادیا، جیسا کہ ابوداؤد شریف میں صحیح سند کے ساتھ حضرت مجاہد کے طریق سے مروی ہے کہ حضرت مجاہد نے فرمایا، میں حضرت ابن عباس کے پاس موجود تھا:

"(مجاهد) قال: كنت عند ابن عباسؓ فجاء رجل فقال: إنه طلق امرأته ثلاثا فسكت حتى ظننت أنه سيردها إليه فقال: ينطلق أحدهم فيركب الحموقة ثم يقول: ياابن عباس: يا ابن عباس: إن الله قال: الطلاق مرتان إلى قوله فلا تحل له من بعد حتى تنكح زوجا غيره۔ الاية۔ عصيت ربک بانت

منک امرأتک'' (۱)۔

(ایک آدمی آیا اور اس نے کہا کہ میں نے اپنی بیوی کو تین طلاق دیدی ہیں، یہ سن کر ابن عباسؓ کچھ دیر خاموش رہے، یہاں تک کہ مجھکو خدشہ ہوا کہ وہ اس کی بیوی کو ایک طلاق قرار دے کر اس کے پاس ہی لوٹا دیں گے، لیکن کچھ دیر سکوت کے بعد فرمایا، خود حماقت پر سوار ہوتا ہے، پھر یا ابن عباس یا ابن عباس کرنے لگتا ہے (سن لو) اللہ کا ارشاد ناطق ہے "الطلاق مرتان...... فلا تحل له من بعد حتى تنكح زوجا غيره" پڑھ کر فرمایا کہ اب تیری بیوی تجھ سے جدا ہوگئی، تیرے نکاح سے نکل گئی) ظاہر ہے کہ یہ حکم صرف ایک طلاق کے وقوع میں نہیں ہوتا معلوم ہوا کہ تین طلاق ہی نافذ فرمائیں، چنانچہ حضرت ابن عباس کے تقریباً تمام ارشد تلامذہ ان کا یہی فتویٰ نقل فرماتے ہیں کہ وہ تین طلاق کو تین ہی قرار دیتے تھے، اور تین ہی طلاق واقع ہونے کا حکم فرماتے تھے، بلکہ صاحب ''استذکار'' نے تو بہت صاف لفظوں میں اس کی تصریح کردی ہے کہ تین طلاق کے ایک طلاق ہونے کی روایت جیسا کہ ابن عباس کی طرف منسوب ہے وہ بالکل غلط اور وہم ہے، کسی عالم محقق نے اس کا اعتبار نہیں کیا ہے (۲)۔

اسی طرح امام مالک نے بھی مؤطا میں فرمایا ہے: ''بلغه (أي مالک) أن رجلا قال لعبدالله ابن عباس إني طلقت امرأتي مأة تطليقة فماذا ترىٰ! فقال ابن عباس: طلقت منک ثلاثا وسبع وتسعون اتخذت بها آيات الله هزوا'' (۳)۔

(ایک شخص نے حضرت عبد اللہ ابن عباسؓ سے کہا کہ میں نے اپنی بیوی کو سومرتبہ طلاق دیدی ہیں آپ میرے بارے میں کیا حکم دیتے ہیں؟ فرمایا کہ تیری بیوی تین طلاق سے مطلقہ ہوگئی اور ۹۷ بار مزید لفظ طلاق بول کر تو نے اللہ کی آیات کا مذاق اڑایا، اور اس کا کھیل بنایا) یہ سب کو معلوم ہے کہ امام مالک کے بلاغات بھی، خواہ ان کی وہ سند ذکر نہ فرماویں، مگر وہ متصل السند اور صحیح ہوتے ہیں، اس لئے اب ان تصریحات کے بعد کیسے کہا جاسکتا ہے کہ اس اجماع کے منعقد ہوجانے کے بعد بھی حضرت ابن عباس بیک مجلس تین طلاق کو ایک ہی طلاق فرماتے تھے، یہ بات متضاد ومتعارض ہوجائے گی، بلکہ اگر اس پر ضد کی جائے تو حضرت ابن عباس پر صریح اتہام کے مرادف بھی ہوسکتی ہے۔

اس کے علاوہ اگر زمانہ مشکوٰۃ نبوت سے لے کر ابتدائے زمانہ عمرؓ تک کتاب وسنت کا عام حکم یہی مان لیا جائے کہ

۱- ابوداؤد ۲/ ۲۶۰-۲۶۱، حدیث: ۲۱۹۷، مکتبہ عصریہ بیروت۔

۲- الجوہر النقی ۲/ ۱۱۳۔

۳- أوجز على الموطأ ۱۰/ ۵۔

تین طلاق بیک مجلس ایک ہی طلاق شمار ہوتی تھی، لیکن حضرت عمر نے اسی ایک طلاق کو تین قرار دیدیا تو غور کیجئے کہ کس قدر خطرناک بات ہوگی؟ حضرت عمر کے دبدبہ ورعب کے باوجود ایک معمولی درجہ کے صحابی بھی اگر کتاب وسنت کے خلاف کوئی بات دیکھتے تھے برملا لومۃ لائم کے خوف کے بغیر حضرت عمرؓ کے منہ پر ظاہر فرمادیتے تھے، اس کی بہت سی مثالیں کتابوں میں مذکور ہیں، پھر یہ کیسے عقل باور کرسکتی ہے کہ اتنا بڑا اور حرمت وحلت کا حامل مسئلہ کتاب وسنت کے خلاف اس طرح برملا تمام اجل صحابہ کے سامنے طے ہوجائے اور کوئی خلاف نہ کرے، بلکہ ائمہ اربعہ کا مسلک وہی ہوجائے جس پر حضرت عمر نے اجماع منعقد کیا، بلکہ جمہور صحابہ اور جمہور تابعین وجمہور ائمہ کا یہی مذہب ہوجائے کہ ایک مجلس میں تین طلاق بھی تین ہی شمار ہوں گی، ایک طلاق شمار نہ ہوگی، جیسا کہ امام ابن ہمام نے فتح القدیر میں نقل فرمایا ہے:

"ذهب جمهور الصحابة والتابعين ومن بعدهم من ائمة المسلمين إلى أنه يقع ثلاثا" (۱)۔

اسی طرح طبقۂ صحابہ کے بعد طبقہ تابعین میں حضرت طاؤسؒ کا نام لیا جاتا ہے کہ وہ بیک مجلس تین طلاق کو ایک طلاق قرار دیتے تھے، یہ بھی صحیح نہیں ہے، اس لئے کہ علی ابن مدینی کے ارشد تلمیذ حسین ابن علی کرابیتی کی جانب سے اس کی تردید نقل کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"روىٰ حسين ابن علي ابن الكرابيتي في كتاب أدب القضاء قال: اخبرناعلي ابن عبد الله وهو ابن المليني عن عبد الرزاق عن معمر عن طاؤس أنه قال: من حدثك عن طاؤس أنه كان يرىٰ طلاق الثلاث واحدة كذبه"۔

(ہم کو ابن مدینی نے خبر دی اور ان کو عبدالرزاق نے خبر دی اور ان کو معمر نے اور ان کو ابن طاؤس نے اور ان کو خود طاؤس نے خبر دی اور متنبہ کیا کہ جو تم سے میرے بارے میں یہ کہے کہ وہ تین طلاق ایک طلاق سمجھتے تھے اس کی تکذیب کرنا تسلیم مت کرنا، جھٹلا دینا)۔

ابھی ہم جوہر نقی سے صاف استذکار کا فیصلہ نقل کرچکے ہیں کہ بیک مجلس تین طلاق کو ایک طلاق ماننے کی روایت کسی محقق کے نزدیک قابل اعتبار نہیں ہے، بالکل اسی طرح دارقطنی کا بھی یہی فیصلہ ہے کہ جو شخص بھی اپنی عورت کو تین طلاق مبہم طور پر (خواہ بیک لفظ یا بالفاظ متعددہ) دے گا یا تین طلاق کا اقرار، خواہ بیک لفظ یا بالفاظ متعددہ کرے گا اس کی عورت اس کے لئے حلال نہ رہے گی، یہاں تک کہ وہ حسب قاعدہ شرعیہ کسی دوسرے شخص سے حلالہ نہ کرا چکی ہو۔

۱- فتح القدیر ۳/۳۲۵، لا أجد هذه العبارة رغم أنى تصفحت تصفحا كثيرا۔

"أیما رجل طلق امرأته ثلا ثا مبھمة أو ثلا ثا عند الإقرار فلاتحل له حتی تنکح زوجا غیره" (۱)۔

ان ہی باتوں سے بخوبی اندازہ ہوجاتا ہے کہ طبقۂ تابعین کے بعد بھی بعض علماء کی طرف بیک مجلس تین طلاق کے ایک طلاق ہونے کا جوانتساب ہے وہ واقعیت یا حقانیت یا صداقت سے بہت دور ہے، ممکن ہے کہ یہی سب وجوہ واسباب ہوں کہ جب علامہ ابن قیم نے اپنے استاد ابن تیمیہ کی اتباع میں تین طلاق کو ایک قرار دے کر اس پر دلائل فراہم کئے تو ان کے تلامذہ میں سے ارشد تلامذہ ابن رجب نے اپنے استاذ کے اس دعوے کی نہایت شدومد کے ساتھ اور بہت زوردار طریقہ پرتردید کی اور ایک مجلس کی تین طلاق کو تین قرار دیا، اس لئے کہناپڑے گا کہ یا تو کتاب وسنت کا یہ مسئلہ ہی نہیں کہ بیک مجلس تین طلاق ایک طلاق ہو یا اگر تھا تو اس کے نسخ کی کوئی قوی دلیل ان سب کے پاس خودموجودتھی چنانچہ حضرت عبادہ ابن صامت کی روایت بھی اس پرکھلی دلیل ہے کہ سرکار دوجہاں نے خود ایک مجلس کی تین طلاق اور تین طلاق سے زائد طلاق کو تین ہی طلاق قرار دیا ہے، حضرت عبادہ ابن صامت کی روایت کو حضرت امام ابن ہمام فتح القدیر میں اس طرح فرماتے ہیں:

"و أسند عبد الرزاق عن عبادة ابن صامت أن أباه طلق امرأته ألف تطلیقة فانطلق عبادة إلی رسول الله فقال رسول الله ﷺ: بانت بثلث في معصیة الله تعالیٰ، وبقیت تسعمائة وسبع وتسعون عدوانا وظلما إن شاء عذبه و إن شاء غفرله (۲)۔

(عبدالرزاق نے اپنی باقاعدہ سند کے ساتھ عبادہ ابن صامت سے روایت کیا ہے کہ حضرت عبادہ کے والد نے اپنی بیوی کو ہزار طلاق دے دیں تو حضرت عبادہ نے حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوکر واقعہ نقل کر کے حکم معلوم فرمایا، تو حضور ﷺ نے فرمایا کہ ان کی بیوی ان کے نکاح سے تین طلاق کے ساتھ خارج ہوگئی اور وہ معصیت خداوندی میں مبتلا ہو گئے اور نوسوستانوے طلاقیں ظلم اور زیادتی ہوکر صادر ہوئیں، اب اللہ کی مرضی ہے کہ چاہے تو وہ ان کو عذاب دے، چاہے معاف کردے)۔

صاحب بحر نے بھی اس روایت کی توثیق کی اور قابل استناد قرار دیکر ایک مجلس کی تین طلاق کو تین طلاق شمار کرنے کے موقع میں پیش کیا ہے فرماتے ہیں: "روی عبد الرزاق عن عبادة ابن صامت مرفوعا انه علیه السلام قال: بانت بثلاث في معصیة الله" (۳)۔

۱- دارقطنی۔
۲- فتح القدیر، کتاب الطلاق ۳/ ۴۵۲۔
۳- البحرالرائق ۳/ ۲۳۴۔

(عبدالرزاق نے حضرت عبادہ ابن صامت سے مرفوعاً نقل فرمایا کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی معصیت میں تین طلاق سے جدا ہوگئی)۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اس واقعہ کے شیوع کا عموم نہ ہوا ہو۔ عام طور سے لوگوں کو اس کا علم نہ ہوا ہو اور یہ بھی وجہ اشتباہ بنا ہو اور انہی وجوہ سے حضرت عمرؓ کو مذکورہ بالا اندیشے پیدا ہوئے ہوں اور انہوں نے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سے اس کا تذکرہ فرمایا ہو اور سب نے ان کی رائے سے اتفاق کرلیا ہو اور پھر اس حکم کی اشاعت ہوگئی ہو۔

اس تقریر کے مطابق نہ نسخ ماننے کی حاجت ہوتی ہے اور نہ اجماع پر مدار ہوتا ہے، بلکہ محض حکم نبوی ﷺ کے اشاعت کا اہتمام نمایاں ہوتا ہے، ساتھ ہی محض ایک مجلس کی تین ہی طلاق نہیں، بلکہ فم واحد تین طلاق یا تین طلاق سے زائد طلاق کا بھی تین طلاق ہونا واضح ہوگیا اور عبادہ ابن صامت کا لفظ: "ان اباه طلق امرأته الف تطليقات" صریح دال ہوگیا کہ فم واحد بھی متعدد طلاقیں متعدد ہوں گی، نہ کہ محض ایک۔

غرض اگر ان باتوں کو تسلیم نہ کیا جائے تو چھوٹے بڑے تمام صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی شخصیت و دیانت مجروح ہوتی ہے جس سے ان تمام سے یکسر اعتماد غائب ہوجائے گا۔ اور پھر اس کا اثر کتاب وسنت یا پورے دین پر جہاں تک غلط طریقہ سے پہونچے ظاہر ہے۔ اس لئے دفع تضاد کی وہی صورت متعین ہوتی ہے جو احقر نے اوپر تفصیل سے لکھی ہے اور اسی وجہ سے محققین علماء ومشائخ نے لکھا ہے کہ اجماع صحابہ خود حجت قطعیہ کا درجہ رکھتا ہے، اس لئے متعدد ہوجانے اور ثابت ہو جانے کے بعد ایک مجلس کی تین طلاق کے منکر پر رد کرنے میں مشغول ہونے کی حاجت نہیں ہے، اس لئے یہ قول اجماع اور حجۂ شرعی کے مخالف ہے، اور اسی وجہ سے اگر کوئی حاکم (یا قاضی یا مفتی) فم واحد کی تین طلاق کو ایک طلاق قرار دے تو اس کا حکم نافذ ہی نہ ہوگا، اس لئے کہ حجت شرعی (اجماع) کی مخالفت ہے، محض اختلاف نہیں ہے، اس کو اختلاف سے تعبیر کرنا صحیح نہیں ہے، اس میں اجتہاد کرنے کی گنجائش نہیں ہے۔

"ولا حاجة أى الاشتغال بالأدلة على رد قول من أنكر وقوع الثلاث جملة، لأنه مخالف للإجماع كما حكاه في المعراج ولنا قالوا: لوحكم حاكم بأن الثلث بفم واحد واحدة لم ينفذ حكمه؛ لأنه لا يسوغ فيه الاجتهاد، لأنه خلاف لا اختلاف"(۱)۔

یہاں یہ بات بھی واضح کردینی ضروری ہے کہ فقہی جزئیات اور تفصیلات کو اور ائمہ اربعہ کے اصول استنباط کو جو مجمع علیہ ہیں، پس پشت ڈالنے ہی کا نتیجہ ہے کہ ان کوتاہیوں میں ابتلاء ہوگیا، اگر فقہاء کی تفصیلات وبیان کردہ جزئیات اور

۱- البحر الرائق ۳/۲۴۰۔

اصول استنباط کی اتباع سے قطع نظر کرلیا جائے تو ہم میں سے کوئی اس درجہ پر نہیں ہے کہ کتاب وسنت کو بغیر واسطۂ ائمہ کے کما حقہ سمجھ کر اس سے صحیح استنباط کرے، اگر ہم نے ان کے جزئیات کے اصول وضوابط اور تفصیلات سے قطع نظر کر کے سوچنا اور سمجھنا شروع کردیا تو بدراہی کے شکار ہوجائیں گے اور دین کو ایک کھلونا بنا کر رکھ دیں گے، جس طرح امم سابقہ اور دیگر مذاہب سماوی کے ماننے والے اور مدعیان مبتلا ہوگئے اور یہی وہ مرض مہلک ہے جس کی طرف بہت سی صحیح احادیث اور مسلم ارشاداتِ نبوی میں ارشارے ہی نہیں، بلکہ مستقل اور زبردست وعیدیں اور نکیریں مذکور ہیں۔

پہلا نکتہ: جو ایک ا کے تحت درج ہے:

ایک مجلس کی تین طلاق کے مغلظہ ہونے کا مسئلہ اجماعی اور قطعی نہیں ہے، بلکہ اس کی حقیقت بھی ان سابق بیانات سے خود بخود واضح ہوگئی کہ اس کے بارے میں یہ کہنا کہ ایک مجلس میں تین طلاق کے طلاق مغلظہ ہونے میں سلف ہی کے زمانہ سے اختلاف موجود ہے، یا یہ مسئلہ اجماعی اور قطعی نہیں بالکل نا قابل تسلیم وغیر صحیح ہے اور زائد تفصیل آگے آتی ہے کہ اس اختلاف کا نام اختلاف نہیں ہے، بلکہ خلاف اجماع اور خلاف حجت شرعیہ اور خلاف حق ہے اور خلاف حق کا جو درجہ ہوتا ہے وہ ظاہر ہے، اسی اجماع کے منکر کے بارے میں علامہ بدرالدین عینی شارح بخاری، ائمہ کی طرف منسوب کرتے ہوئے ذیل کے الفاظ نقل فرماتے ہیں: ''وقال من خالف فيه فهو شاذ مخالف لأهل السنة وإنما تعلق به أهل البدع ومن لايلتفت إليه لشذوذه من الجماعة التي يجوز عليهم التواطوء على تحريف الكتاب والسنة'' (۱) اور پھر اسی جلد اور صفحہ میں اس طرح رقم طراز ہیں:

''وذهب جماهير العلماء من التابعين ومن بعدهم منهم: الأوزاعي، والنخعي، والثوري، وابوحنيفة، واصحابه، والشافعي، وأصحابه، وأحمد، وأصحابه، واسحاق، وأبوثور، وأبو عبيدة وآخرون كثيرون على أن من طلق امرأته ثلاثا وقعن ولكنه يا ثم'' (۲) اور اسی مسئلہ کو علامہ ابن عابدین نے اپنے ان الفاظ میں نقل کیا ہے اور بعض حنابلہ کی اس توجیہ وقول کو جس کو انہوں نے اس اجماع کے خلاف میں نقل کیا ہے باطل وغلط قرار دیا ہے چنانچہ فرماتے ہیں: ''وأما إمضاء عمر الثلاث عليهم مع عدم مخالفة الصحابة وله وعلمه بأنها كانت واحدة فلا يمكن إلا وقد اطلعوا في الزمان المتأخر على وجود ناسخ أو لعلمهم بانتهاء الحكم

۱- عینی شرح بخاری ۹/۷/ ۵۴۲۔
۲- عینی شرح بخاری ۹/۷/ ۵۴۳۔

لذالک لعلمهم باناطته بمعان علموا انتفاء ها في الزمن المتأخر وقول بعض الحنابلة: توفي رسول الله صلى الله عليه وسلم عن مأة الف عين رأته فهل صح لكم عنهم أو عن عشر عشر عشرهم القول بوقوع الثلث باطل، أما أولا فإجماعهم ظاهر، لأنه لم ينقل عن أحد منهم أنه خالف عمر حين أمضى الثلاث ولا يلزم في نقل الحكم الإجماعي عن مأة الف تسمية كل في مجلد كبير لحكم واحد على أنه إجماع سكوتي، وأما ثانيا فالعبرة في نقل الإجماع نقل ما عن المجتهدين و المائة ـ الف لايبلغ عدة المجتهدين الفقهاء منهم أكثر من عشرين كالخلفاء والعبادلة وزيد ابن ثابت و معاذ ابن جبل وأنس وأبي هريرة والباقون يرجعون اليهم ويستفتون منهم وقد ثبت النقل عن أكثرهم صريحا بإيقاع الثلاث ولم يظهر لهم مخالف، فما ذا بعد الحق إلا الضلال، وعن هذا قلنا: لو حكم حاكم بأنها واحدة لم ينفذ حكمه؛ لأنه لايسوغ الاجتهاد فيه فهو خلاف لا اختلاف، وغاية الأمر فيه أن يصير كبيع أمهات الأولاد أجمع على نفيه، وكن في الزمن الاول يبعن(۱)۔

انہی وجوہ کی بناء پر احقر نے شروع میں کہا تھا کہ اس سمینار کو کل ہند سمینار کہنا غلط ہے اور نا قابل تسلیم ہے، لہذا مسلمانوں کو اس سے ہرگز دھوکہ میں نہ آنا چاہیے، ہاں صحیح مسائل کی ترویج اور تین طلاق دینے کی مبغوضیت اور بوقت ضرورت طلاق کے مسنون اور بہتر طریقہ کی تشہیر اور ترویج و تعلیم جس قدر زیادہ اور مؤثر انداز میں ہو پوری قوت سے کرنی ضروری ہے، بلکہ وقت ایسا ہے کہ یہی نہیں اور دیگر عقائد اور اعمال و معاملات کی شرعی تعلیم و ترویج و ترغیب میں بھی انتھک سعی و کوشش کرنی اور انتظام بنانا اور چلانا ضروری ہے۔فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دار العلوم دیو بند سہارنپور ۱۹/ ۱۱/ ۹۳ ۱۳ ھ

ایک مجلس کی تین طلاق:

ایک شخص نے اپنی عورت کو ایک مجلس میں تین طلاقیں دیدی، آیا طلاق حکم اللہ اور حکم رسول سے ہوگئی یا کہ نہیں؟

۱- شامی ۳/ ۲۳۳، کتاب الطلاق۔

الجواب وبالله التوفیق:

مدخول بہا کو جب شوہر نے تین طلاقیں دیدیں تو تینوں واقع ہو کر طلاق مغلظہ ہوگئی، خواہ ایک ہی مجلس میں دی ہوں، اس میں کوئی شک وشبہ کی گنجائش نہیں ہے۔

کما فی العالمگیریۃ ۲/۳۷۰ "وإذا قال لامرأته أنت طالق وطالق وطالق ولم يعلقه بالشرط إن كانت مدخولة طلقت ثلاثا وإن كانت غير مدخولة طلقت واحدة"(۱)۔

ہاں اگر عورت غیر مدخول بہا ہے یعنی ان میاں بیوی میں یکجائی نہیں ہوئی ہے تو اس میں یہ تفصیل ہے کہ اگر مثلاً با یں الفاظ طلاق دیا ہے (میں نے تجھ کو تینوں طلاقیں دیں) جب تو تین واقع ہوں گی، ورنہ محض ایک طلاق بائن واقع ہوگی کما ھو ظاہر(۲)۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور
الجواب صحیح سید احمد علی سعید محمود غفی عنہ

گواہوں کے سامنے تین طلاق دی تو کیا حکم ہے؟

مسمی کریم اللہ نے اپنی منکوحہ کو اپنی حقیقی بھاوج اور اجیر خان کے سامنے تین طلاق دیا جسکی وجہ دو مقامی خانگی جھگڑا بی بی اور مرد کا ہے اسکی شہرت منکوحہ نے اپنی زبان سے چند آدمیوں سے اپنے موضع میں کیا اس واقعہ کے بعد منکوحہ مرد کے گھر میں ایک ماہ تک ٹھہری رہی مگر مرد یعنی کریم اللہ بی بی سے قطعی طور پر قطع تعلق کر کے الگ رہتا تھا، ایک ماہ بعد کریم اللہ کی بی بی اپنے بچوں کو لے کر اپنے میکہ حبیب پور چلی گئی اور چھ ماہ سے اوپر ہو رہا ہے کہ میکہ میں قیام پذیر ہے، لڑکی یعنی کریم اللہ کی بی بی کے وارثان کی جانب سے پیشتر مہر مانگا گیا اور کہا گیا کہ اپنے بچے کو لیجاؤ، اس کو طے کرنے جب کریم اللہ جاتا ہے تو اب یہ کہا جاتا ہے کہ طلاق نہیں ہوا ہے، بی بی کو مع بچوں کے لیجاؤ، اس لئے عرض ہے کہ بروئے شرع محمدی جو مسئلہ صادق آتا ہو تحریر فرماویں کہ کیا وہ طلاق جائز کہ ناجائز ہے بینوا توجروا۔

۱- الفتاوی الہندیہ ۱/۳۵۵، مکتبہ رشیدیہ پاکستان۔

۲- "اذا طلق الرجل امرأته ثلاثا قبل الدخول بها وقعن عليها فإن فرق الطلاق بانت بالأولى ولم تقع الثانية والثالثة" (الفتاوی الہندیہ ۱/۳۷۳، مکتبہ رشیدیہ پاکستان)۔

الجواب وباللہ التوفیق:

کریم اللہ نے جب تین طلاقیں دیدیں اور اسکے گواہ بھی موجود ہیں اور خود عورت کو بھی اقرار ہے تو اب بعد میں انکار کسی طرح جائز نہیں، اب تین طلاقیں واقع ہوکر حرمت مغلظہ ہوگئی، اب بغیر حلالہ کے کریم اللہ کے لئے کسی طرح جائز نہیں ہوسکتی اور نہ کریم اللہ اپنے ساتھ لے جاسکتے ہیں، حلالہ یہ ہے کہ کریم اللہ کے طلاق کے بعد عدت (تین حیض) گذرنے پر عورت کا کسی دوسرے مرد سے نکاح ہواور وہ اس سے ہم صحبت ہونے کے بعد فوت کر جائے یا کسی وجہ سے طلاق دیدے اور وہ عورت اپنی یہ عدت بھی گذارے تو اب کریم اللہ سے جدید نکاح کرنے کے بعد حلال ہوسکتی ہے بغیر اس کے نہیں ہوسکتی (۱)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند، سہارنپور

الجواب صحیح محمود غفی عنہ

تین طلاق دینے والے پر مالی جرمانہ اور اس کی تعزیر کا حکم:

موجودہ کورٹ نے مسلم پرسنل لا کے خلاف جو قانون بنایا ہے کہ مطلقہ پوری زندگی یا دوسرے نکاح تک نفقہ کی حقدار ہے، اس قانون سے بہت سی مسلمان خواتین بھی غلط فائدہ اٹھارہی ہیں چنانچہ ہماری طرف سورت اور احمد آباد کی کورٹ میں اس قسم کے سیکڑوں مقدمے (کیس) داخل کئے گئے ہیں اور کتنی عورتوں کے لئے فیصلہ بھی کردیا گیا ہے، جب عوام کو مقدمہ اور مسلم وکلاء کو تعاون سے روکا جاتا ہے تو اعتراض کرتے ہیں کہ ان مظلومات کے نفقہ کا کیا ہوگا؟ کیا ان کو بھکارن بنا دی جائے گی؟ جبکہ بعض عورتیں بچوں یا کسی دوسری وجہ سے دوسرے نکاح کے قابل بھی نہیں ہے، اور ان کے اقرباء اس حالت میں نہیں ہوتے کہ ان کا نفقہ برداشت کرسکیں اب ایسی تنگ دستی میں وہ مطلقہ کورٹ سے اپنی داد نہ حاصل کرے گی تو کیا کرے گی اگر عدت سے زائد نفقہ حاصل نہیں ہوسکتا تو ایسی مطلقہ کا کیا حل ہے؟ اور نفقہ حاصل کرنے سے وہ مجرم شوہر جو ایک ساتھ بلاوجہ تین طلاق دیتا ہے ان کے لئے سزا بھی ہے اور دوسروں کے لئے عبرت ہے۔

چنانچہ مسلم پرسنل لا بورڈ کی کمزوری اور عورتوں کے لئے کوئی قابل اطمینان حل پیش نہ ہونے کی وجہ سے حکومت نے

۱- ''وان كان الطلاق ثلاثا في الحرة او اثنين في الأمة لم تحل له حتى تنكح زوجا غيره نكاحا صحيحا ويدخل بها ثم يطلقها أو يموت عنها'' (قدوری مع اللباب کتاب الرجعۃ ۲/ ۱۸۳، مطبعہ دارالایمان سہارنپور)۔

اب تک اس قانون کو بدلا نہیں ہے اور بہت سے ناواقف یہ سمجھ کر کہ اب ہمارے لئے دین پر چلنا مشکل ہے اور ہمارے لئے سوائے مقدمہ کے کوئی حل نہیں ہے، اپنے ایمان کو خراب کر رہے ہیں اب ان حالات کے پیش نظر چند امور دریافت ہیں:

(۱) ایسی مطلقہ کے لئے جو بچوں یا کسی دوسری وجہ سے دوسرا نکاح نہیں کر سکتی اور اقرباء کی مالی حالت بھی کمزور ہے، نفقہ اور دیگر دشواریوں کا حل شریعت کے مطابق کیا ہوگا۔

(۲) حضرت عمرؓ نے ایک ساتھ تین طلاق دینے والوں کو سزا فرمائی ہے (طحاوی شریف جلد ۲) اور جواہر الفقہ (۲/ ۵۳۴) پر مذکور ہے کہ جو شخص ایک ساتھ تین طلاق دے گا اس پر عدالت کو حسب صواب دید تعزیری سزا جاری کرنے کا اختیار ہوگا۔

تو کیا شرعی قاضی نہ ہونے کی صورت میں ان تعزیرات پر قیاس کرتے ہوئے ایسے مجرم سے بطور سزا و تنبیہ جماعت یا پنچایت قطع تعلق اور بائیکاٹ کر سکتی ہے۔

(۳) ظاہری روایت کے مطابق مالی جرمانہ جائز نہیں ہے۔

لیکن امام ابو یوسف کی ایک روایت کے مطابق جائز ہے، جیسا کہ شامی جلد ثالث باب التعزیر میں منقول ہے: "وعن أبی یوسفؒ یجوز التعزیر للسلطان بأخذ المال"۔

اب سوال یہ ہے کہ رسم المفتی میں قول مرجوح کی بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ان مواقع الضرورۃ مستثناۃ اور آگے قول مرجوح پر ضرورت کے وقت گنجائش کی کچھ مثالیں بھی دی ہیں اور انگریز کے دور میں مظلومہ عورتوں کے چھٹکارے کا بظاہر کوئی حل نہیں تھا تو حضرت تھانویؒ نے مذہب مالکیہ پر عمل کرتے ہوئے شرعی پنچایت کا حل نکالا تھا اور علماء نے اس کو قبول بھی کیا تھا تو آج بھی مطلقہ عورتوں کی مشکلات اور مجرم کو سزا اور بلاوجہ غلط طلاق کے رواج کا سدّ باب ان مصالح کے پیش نظر کیا قول مرجوح پر عمل کرتے ہوئے جماعت یا پنچایت بلاوجہ ایک ساتھ تین طلاق دینے والے سے مالی جرمانہ لے سکتی ہے؟ تاکہ اس سے مطلقہ کے نفقہ کا حل ہو سکے اور غلط طلاق کا رواج اور معاشرہ کے بگاڑ کے سدباب کا ذریعہ بھی ہو جائے۔

(۴) دوسری طرف وہ مظلوم مرد جو طلاق دینے پر مجبور ہے، اس قانون سے بچنے کے لئے مطلقہ کے ولی کو عورت کے نفقہ سے زائد روپیہ بطور صلح دے سکتا ہے؟ جیسا کہ آج کل گجرات میں بہت سے بے گناہ مردوں کو بھی مجبوراً طلاق دینے پر پانچ پانچ دس دس ہزار روپئے دینے پڑ رہے ہیں، امید ہے کہ موجودہ حالات کے پیش نظر قابل اطمینان تفصیلی جواب

مرحمت فرما کر ممنون فرمائیں گے۔

مولس ہدات، گجرات

الجواب وباللہ التوفیق:

نوٹ: اصل جواب معلوم کرنے سے پہلے چند باتوں کا معلوم کرلینا ضروری ہے:

(۱) یہ جتنی خرابیاں نظر آرہی ہیں سب معاشرے کے خرابی کی وجہ سے ہیں، اگر معاشرہ مسلمانوں کا شرعی اور صحیح ہوجائے تو ان خرابیوں میں سے ایک خرابی بھی پیدا نہ ہو۔

(۲) مسلمانوں کی دین و دنیا دونوں کی فلاح وکامیابی کے لئے معیار قرون ثلثہ مشہود لہا بالخیر (۱) (قرن نبوت، قرن صحابہ، قرن تابعین) ہیں ان کی مطابقت وموافقت ومتابعت فلاح وکامیابی کی ضامن ہیں اور اس کی متابعت وموافقت چھوڑنے میں ہی سب پریشانیاں ودشواریاں لاحق ہوتی ہیں، بلکہ اس سے کہیں زیادہ الجھنوں اور پریشانیوں کا سامنا کرنا ہوگا۔

(۳) ان قرون ثلثہ میں نکاح ثانی کوئی عیب نہیں قرار دیا گیا تھا بلکہ ازروئے احادیث وآثار فلاح وکامیابی کا ذریعہ تھا اور آج اس کے برعکس اعتقاد بن گیا ہے اور نکاح ثانی کو عیب و بے عزتی قرار دیا گیا ہے، چاہے دنیوی اعتبار سے بھی اس سے بڑے بڑے معائب کا اور خرابیوں کا ارتکاب ہو مگر پھر بھی وہ عیب شمار نہیں ہوتا شریعت مطہرہ کا منشاء تو یہ ہے کہ کوئی مرد بغیر جائز عورت کے ساتھ کے مجرد زندگی نہ گزارے، اسی طرح کوئی عورت بغیر جائز مرد کے مجرد زندگی نہ گزارے، دونوں کی عصمت وآبرو کی حفاظت اس نکاح میں مضمر ہو اور اسی کو آج عیب و بے عزتی قرار دیا گیا ہے، سب خرابیوں کی جڑ یہی ہے (۲)۔

خیال فرمایئے ازواج مطہرات میں سوائے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے کوئی کنواری نہیں تھیں، سب بیوہ یا شادی شدہ تھیں، اسی طرح صحابہ وصحابیات کا عام حال دیکھا جائے، اکثر کئی کئی شوہروں سے بیوہ یا جدا شدہ تھیں، اسی طرح

۱- عن عبداللہ قال :سئل رسول اللہ ﷺ: أی الناس خیر؟ قال: "قرنی، ثم الذین یلونهم ثم الذین یلونهم ثم یجیئ قوم تبدر شهادة أحدهم یمینه وتبدر یمینه شهادته" (صحیح مسلم ۴/ ۱۹۶۳ کتاب فضائل الصحابۃ حدیث ۲۱۱/ ۲۵۳۳)۔

۲- عن سعد بن أبی وقاص ؓ قال: "رد رسول اللہ ﷺ علی عثمان بن مظعون التبتل ولو أذن له لاختصینا" (صحیح مسلم ۲/ ۱۰۲۰ کتاب النکاح حدیث ۶/ ۱۴۰۲)۔

تابعیات کا بھی حال ہے کہ قطعی نکاح ثانی یا نکاح ثالث وغیرہ کو معیوب نہیں جانتی تھیں۔

(۴) دور صحابہ سے آگے بڑھ کر بھی دیکھئے یہی معمول وعام رواج ملتا ہے، سیر و تاریخ میں جانا نہیں ہے، آپ حضرات خود دیکھ سکتے ہیں صرف دو ایک مثال نقل کر دیتا ہوں حضرت امام شافعی بالکل بچے تھے والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا تو ان کی والدہ محترمہ نے حضرت امام محمد رحمۃ اللہ سے عقد نکاح کرلیا (۱)، چنانچہ حضرت امام شافعی رحمہ اللہ کی بچپن کی کل تعلیم وتربیت حضرت امام محمد رحمۃ اللہ کے پاس ہوئی ممکن ہے اس بنا پر بھی حضرت امام شافعی رحمہ اللہ کا یہ مقولہ مشہور ہو گیا ہو کہ **الناس عيال في الفقه لأبي حنيفة** اس وجہ سے ان کے علمی درجہ میں عیال کا ہونا تو ظاہر ہی ہے اسی طرح حضرت اسماعیل دہلوی شہید وحضرت مولانا قاسم رحمہما اللہ کو جب نکاح ثانی کی مردہ سنت کو زندہ کرنے کا خیال پیدا ہوا تو پہلے اپنی انتہائی بوڑھی بہن سے اس نکاح ثانی کی مردہ سنت کے احیاء وزندہ کرنے کی ابتدا فرمائی پھر بے شمار عورتوں کے نکاح ثانی ہوئے اور اس کا تقریباً رواج پڑ گیا تھا اور یہ مردہ سنت زندہ ہوگئی تھی یہ تو غیر مسلموں کا مذہبی طریقہ ورواج تھا کہ عورت بیوہ ہونے کے بعد ستی ہو جائے یا اسی شوہر کے نام پر بیٹھی رہے دوسری شادی کرنے کو مذہبی طور پر نہایت معیوب و بے عزتی قرار دیا جاتا اور سمجھا جاتا تھا اور یہی رواج بڑھ کر بیوہ ہونے کے علاوہ مطلقہ ہونے تک میں چل پڑا اور جب سے مسلمانوں میں اس رواج بد کا رواج ہوا مسلمانوں میں بھی یہی بات چل پڑی اس لئے یہ ساری خوفناک وافسوس ناک حالات اور صورتیں جو پیش آرہی ہیں وہ سب صرف غیر مسلمانہ روش کے اختیار کرنے اور اپنانے سے آرہی ہیں اور اب یہ ایک عام قومی مرض بن کر پورے معاشرہ کو خراب کر رہا ہے۔

(۵) ظاہر ہے کہ مرض کا ازالہ اسی وقت اچھی طرح ہوتا ہے جب سبب مرض کا ازالہ اچھی طرح ہو جائے، لہٰذا اس ضابطہ عقلیہ کی بنا پر تمام پریشانیوں کا واحد علاج یہی ہے کہ اس کافرانہ رسم کا علاج کرلیا جائے اور ایسی کوشش کی جائے کہ تمام ماؤں وبہنوں کے دماغ سے کم از کم نکاح ثانی کی نفرت ختم ہو جائے اور نکاح ثانی کا رواج عام ہو جائے تو معاشرہ خود صحیح ہو کر شریعت مطہرہ کے عین مطابق ہو کر صلاح وفلاح دارین کا ذریعہ بن سکتا ہے، آج نکاح ثانی کی سنت مردہ ہوگئی ہے جو شخص اس مردہ سنت کو زندہ کرے گا یا اس کا بیڑہ اٹھائے گا وہ صحیح حدیث شریف "**من أحيا سنتي عند فساد أمتي فله أجر مائة شهيد**" (۲) کے مطابق مجاہد عند اللہ شمار ہوگا اور شہیدوں کے برابر ثواب پائے گا، اسی طرح ایک اور صحیح حدیث شریف ہے:

۱- رد المحتار علی الدر المختار ج ۱ مقدمہ/ ۱۴۳، وتزوج بأم الشافعي وفوض إليه كتبه وماله...الخ۔

۲- عن أبي هريرة ؓ قال قال رسول الله ﷺ: "من تمسك بسنتي عند فساد أمتي فله أجر مائة شهيد" (مشکاۃ المصابیح ۱/ ۳۰ باب الاعتصام بالکتاب والسنۃ، الفصل الثانی)۔

"من أحيا سنة من سنتي قد أميتت بعدي فإن له من الأجر مثل أجر من عمل بها من الناس لا ينقص من أجور الناس شيئا" (۱)۔

تمام گفتگوں کا خلاصہ یہ نکلا کہ اس پریشانی کا اصلی علاج شریعت کے قوانین میں ردوبدل کرنا نہیں ہے، بلکہ اصلی علاج معاشرہ کا سدھارنا اور سیدھا کرلینا ہے۔

اب اس تمہید کے بعد ہر سوال کا جواب نمبروار دیا جاتا ہے۔

(۱) اس نمبر کا حکم یہی ہے کہ اس کو اپنا دوسرا نکاح کسی مناسب جگہ کرلینا چاہیے اور اگر بالفرض کسی شرعی معذوری یا کسی وجہ سے نکاح ثانی نہیں کرسکتی تو اس کا نفقہ مطلقہ کے عصبات کے ذمہ ہوگا، طلاق دینے والا شوہر بھی اگر ازخود کچھ تبرع کر دے تو اس میں بھی مضائقہ نہیں، لیکن شوہر کو اس پر مجبور نہیں کیا جاسکتا اور نہ اس پر شرعا لازم کیا جاسکتا ہے (۲)۔

(۲) حضرت عمرؓ نے تین طلاق دینے والے کو سزا نہیں دی ہے بلکہ اس کے "أبغض المباحات عند الله الطلاق" (۳) کے ارتکاب پر تنبیہ فرمائی اس کا قرینہ خود اس کے تین طلاق کو ختم نہ کرنا بلکہ باقی رکھنا ہے، تنبیہ اور سزا میں بون بعید ہے، نیز سزائے جسمانی کا حکم بھی سزائے مالی سے مختلف ہے۔ کما ورد في الحديث: " لا يحل مال امرئ مسلم إلا بطيب نفسه" او كما قال ﷺ (۴) اور جواہر الفقہ کا محمل صرف یہ ہے کہ شوہر نے ظلما تین طلاقیں دی ہوں ورنہ اس کا بھی کوئی محل نہیں ہے، پس اگر کوئی شخص واقعی محض ظلما تین طلاق دیدے اور عورت کا کوئی قصور نہ ہو تو شرعی پنچایت اس کی اصلاح تک قطع تعلق کا فیصلہ کرسکتی ہے۔

۱- "إن النبي ﷺ قال لبلال بن الحارث: اعلم، قال ما أعلم يا رسول الله، قال: اعلم يا بلال، قال: ما أعلم يا رسول الله؟ قال: أنه من أحيا سنة من سنتي قد أميتت بعدي فإن له من الأجر مثل من عمل بها من غير أن ينقص من أجورهم شيئا، ومن ابتدع بدعة ضلالة لا ترضي الله ورسوله كان عليه مثل آثام من عمل بها، لا ينقص ذلك من أوزار الناس شيئاً" (سنن الترمذی ۵/۴۵، کتاب العلم باب ماجاء فی الاخذ بالسنۃ واجتناب البدع حدیث: ۲۶۷۷)۔

۲- "فالإناث عليه (يعني على الأب) نفقتهن إلى أن يتزوجن إذا لم يكن لهن مال، وليس له أن يؤاجرهن في عمل ولا خدمة وإن كان لهن قدرة، وإذا طلقت وانقضت عدتها عادت نفقتها على الأب" (فتح القدیر ۴/۴۱۷، باب النفقۃ، نیز دیکھئے: رد المحتار ۵/۳۴۱)۔

۳- عن ابن عمر عن النبي ﷺ قال: "أبغض الحلال إلى الله تعالى الطلاق" (سنن ابوداؤد ۲/۲۵۵، کتاب الطلاق، باب فی کراہیۃ الطلاق حدیث: ۲۱۷۸، نیز سنن ابن ماجہ ۱/۶۵۰، حدیث: ۲۰۱۸)۔

۴- عن أنس بن مالكؓ أن رسول الله ﷺ قال: ...الحدیث (سنن الدارقطنی ۳/۲۶ حدیث ۹۱)۔

(۳) حضرت امام ابو یوسف رحمۃ اللہ جو بوقت ضرورت تعزیر مالی کی اجازت دیتے ہیں تو پھر بعد اصلاح اس کے واپس کر دینے کا حکم بھی دیتے ہیں اور یہ اباحت نفع بخش نہیں اور اگر تعزیر مالی ناگزیر ہو اور واپسی میں اصلاح بھی متوقع نہ ہو تو پھر اس کی اجازت و مرضی سے کسی کار خیر میں صرف کر دینے کی بھی گنجائش ہوگی ورنہ اباحت مطلقہ کا قول معتمد نہیں (۱)۔

(۴) الضرورات تبیح المحظورات الا فی مواقع الضرورہ مستثناۃ کا بھی یہ محل نہیں ہے، اس کا محل اس وقت ہو سکے گا جب بچاؤ و بدل کی کوئی صورت نہ ہو اور یہاں موجود ہے، اسی وجہ سے مسئلہ مفقود الخبر یا مسئلہ حیلہ ناجزہ پر بھی قیاس کرنا صحیح نہیں (۲)۔

(۵) مظلوم مرد کی بھی تکالیف کا لحاظ کرنا اور اس سے چھٹکارا لینے کی راہ کا ہموار کرنا مقصود شرعی ہے اور شریعت مطہرہ نے اس کا بھی لحاظ فرمایا ہے، چنانچہ خلع میں مہر کی رقم سے زیادہ رقم کے وصول کرنے کی کراہیت جب مرد کے لئے ہے تو اس سے عورت کے لئے نفقہ عدت سے زیادہ کی رقم لینا مکروہ نکلے گا اور واجب العمل نہ ہوگا (۳)۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دار العلوم دیوبند سہارنپور ۲۰/۸/۱۴۰۲ھ

طلاق دینے پر مالی جرمانہ لینا:

ہماری قوم لوہار نے نکاح اور طلاق کے معاملہ کو اپنے ہاتھ میں لیکر سو روپیہ سے لیکر پانچ سو روپیہ تک جرمانہ کر دیئے ہیں اور جرمانہ پنچایت میں وصول کر کے کسی کے پاس امانت رکھ دیتے ہیں، کیا طلاق دینا پنچوں کے امکان میں ہے یا کہ شوہر کے امکان میں، ایک لڑکے نے اپنی بیوی کو ناراض ہو کر طلاق دیدی ہے تو اس کے شوہر سے طلاق دینے کے جرم میں جرمانہ لینا جائز ہے یا کہ نہیں اور حرام ہے یا کہ حلال ہے اور جو رقم جرمانہ کی لی ہے اس کو واپس دیجائے یا کسی کام میں لایا جائے؟

۱- ''وأفاد في البزازية أن التعزير بأخذ المال على القول به إمساك شيء من ماله عنه مدة لينزجر ثم يعيده الحاكم إليه... وفي المجتبى لم يذكر كيفية الأخذ وأرى أن يأخذها فيمسكها فإن أيس من توبته يصرفها إلى ما يرى'' (رد المحتار على الدر المختار ۶/۱۰۶)۔

۲- کیونکہ انتہاء عدت کے بعد اس کا نفقہ اس کے فقیر ہونے کی صورت میں اس کے باپ یا اولاد پر لوٹ آتا ہے اور اگر وہ خود مالدار ہے تو اس کا نفقہ خود اپنے اوپر واجب ہے ''لو استغنت الأنثى بنحو خياطة وغزل يجب أن تكون نفقتها في كسبها كما هو ظاهر ولا نقول تجب على الأب مع ذلك إلا إذا كان لا يكفيها فتجب على الأب كفايتها بدفع القدر المعجوز عنه'' (رد المحتار على الدر المختار ۶/۳۳۷)۔

۳- ''وكره تحريماً أخذ شيء أي قليلاً أو كثيراً، والحق أن الأخذ إذا كان النشوز منه حرام قطعاً لقوله تعالى: "فلا تأخذوا منه شيئاً" (النساء: ۲۰)'' إلا أنه إن أخذ ملكه بسبب خبيث'' (رد المحتار على الدر المختار ۵/۹۳)۔

الجواب وبالله التوفيق:

طلاق کا حق صرف شوہر کو ہے، شوہر کے طلاق دینے سے پورے خاندان یا کسی اور پر جرمانہ عائد کرنا ظلم اور حرام ہے، اسکالینا حلال نہیں ہے، جرمانہ مال کا صرف حکومت کو حق ہے اور کو نہیں جو رقم جرمانہ وصول ہوئی ہے اس کو واپس کر دیں(۱)، ہاں اگر مالک خود کہیں، یا کسی مصرف میں خرچ کرنے کی اجازت دیدیں تو خرچ کر سکتے ہیں بلا انکی مرضی کے نہیں ۔فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

طلاق کے بعد دوسری شادی:

زید میں اور زید کی منکوحہ میں بزمان منکوحہ جسمانی نقصانات کی بنا پر اختلافات پیدا ہوئے اور جب زید کو اس کی منکوحہ نے باہمی نقصانات کی جانب زیادہ تو جہ دلائی تو اس نے غصہ میں آکر منکوحہ کی والدہ اور اپنے بھائی اور والدہ کے روبرو طلاق دیدی ور اپنی والدہ سے کہا کہ آپ لیجائیے، اس وقت اس کو غصہ آرہا ہے میں اس کو سمجھا دوں گا اور گھر پر ذکر نہ کرنا، منکوحہ کی والدہ اسکولیکر آگئی یہ واقعہ شادی کے اکیس دن بعد ہی پیش آگیا تھا اس کے بعد سے وہ دوبارہ نہیں گئی اور نہ ہی وہ لڑکا آیا، مگر زید کے دوسرے لواحقین کئی بار آئے مگر منکوحہ گئی نہیں، اس صورت میں قریب ڈھائی سال گذر گئے اور ڈھائی سال بعد زید منکوحہ کے ماموں زاد بھائی کو ملا تو انہوں نے زید سے کہا کہ اگر تم نے طلاق دیدی ہے تو تم دستخط کر دو اس پر زید کافی برہم ہوا ہے اور کہا کہ میں دستخط نہیں کروں گا مگر لفظ طلاق سے منکر نہیں ہوا ہے، اب قریب ساڑھے تین سال بعد جبکہ کوئی خرچ وغیرہ نہیں بھیجا اور نہ ہی کوئی واسطے مطلب رکھا ہے تو منکوحہ کی والدہ اور اس کے لواحقین نے عدالت میں درخواست دیدی، اس پر عدالت نے منکوحہ کے بیان پر دوسری شادی کا حکم دے دیا ہے۔

اس بارے میں علماء کرام فرمائیں کہ آیا منکوحہ زید دوسرا نکاح کر سکتی ہے یا کہ نہیں اور اس کے لئے عدت کا کیا حکم ہے اور وہ کس وقت سے ضروری ہے، آیا پہلی طلاق سے یا عدالتی طلاق سے، کیونکہ منکوحہ نے وہاں سے آنے کے بعد باقاعدہ عدت بھی پوری نہیں کی ہے، ایک بات یہ ضروری تحریر کرنی ہے کہ بزمان منکوحہ زید نے رجوع نہیں کیا ہے، آیا اس حالت میں

۱- ”لایاخذ مال فی المذهب، بحر وفیه عن البزازیه وقیل: یجوز، ومعناه ان یمسکه مدة لینزجر ثم یعیده له فان أیس من توبته صرفه إلى مایری التعزیر فی المجتبی انه کان فی ابتداء الاسلام ثم نسخ الدر المختار مع الرد ۶/ ۱۰۵-۱۰۶، مکتبہ زکریا دیوبند، والحاصل ان المذهب عدم التعزیر باخذ المال، رد المختار علی الدر ۶/ ۱۰۵-۱۰۶، مکتبہ زکریا دیوبند)۔

عدت ہوتی ہے یا کہ نہیں اور جن لوگوں کے سامنے طلاق دی ہے وہ موجود ہیں، ان میں تین مرد مسلم اور ایک ہندو ہے، ضرورت پڑنے پر وہ گواہی دے سکتے ہیں شرعی حکم کیا ہے؟

الجواب وباللہ التوفیق:

(سوال میں چند امور قابل لحاظ ہیں):

۱۔زید سے نکاح کے بعد خلوۃ صحیحہ ضرور ہوئی ہے جیسا کہ سوال کی شروع عبارت سے ظاہر ہے اور خلوۃ صحیحہ کے بعد وقوع طلاق میں عدت واجب ہوتی ہے۔

۲۔زید نے غصہ میں آکر اپنی منکوحہ کی والدہ (الی قولہ) روبرو طلاق دیدی، اس عبارت سے اگرچہ یہ پتہ نہیں چلتا کہ کن لفظوں میں ایقاع طلاق کیا ہے لیکن اس سے متصل زید کا جملہ (اسکا سامان دیدو الخ) جو سابق ایقاع کی تفسیر اور ترجمان ہوسکتا ہے جس کا ظاہر ومتبادر طلاق مبتی ہے مگر لفظ سامان دیدو دھمکی بھی ہوسکتی ہے، اس لئے واقل متیقن محض ایک طلاق رجعی ہوگا۔

۳۔ڈھائی سال کے بعد جب منکوحہ کا ماموں زاد بھائی زید سے ملا ہے تو زید دستخط (تحریر طلاق) کرنے پر تو برہم ہوا ہے مگر لفظ طلاق سے منکر نہیں ہوا ہے۔ یہ قرینہ ہے کہ زید نے رجوع نہیں کیا ہے۔

۴۔زید کے اس طلاق دینے پر تین مرد مسلم گواہ بھی ہیں جیسا کہ سوال کی آخیر میں عبارت سے ظاہر ہے۔

۵۔سوال کا یہ جملہ کہ وہاں سے آنے کے بعد منکوحہ نے باقاعدہ عدت پوری نہیں کی ہے اسکا ظاہر مفہوم یہ ہے کہ کسی متعین مکان میں بیتوتت نہیں کی، اگر یہی مفہوم ہے تو اس کا کچھ اثر اتمام عدت پر نہ پڑے گا، کیونکہ عدت حائضہ محض حیض آجانے کا نام ہے اور متبادر ہے کہ بعد طلاق کے زمانہ طویل (تقریباً چار سال) گذر چکا ہے جس میں عموماً اور عادۃً تین حیض آچکے ہیں اور منکوحہ اس تین حیض آنے پر منکر نہیں ہے۔

۶۔عدالت کی تفریق شرعی تفریق نہیں ہے کہ کچھ اثر انداز ہوسکے بجز اسکے کہ قانون کی زد سے محفوظ رہے یا تفریق شرعی کی تحصیل آسان ہوجاتی ہے، لہٰذا صورت مسئولہ میں احقر کے نزدیک فقہ حنفی کی رو سے اسی ایقاع طلاق کیوقت سے طلاق واقع ہوگئی نہ کہ عدالتی طلاق سے (۱) اور پھر اسکے بعد جب تین حیض گذر چکے ہیں تو اس وقت عدت بھی ختم ہوگئی پس

۱۔　"فالعدة من وقت الطلاق لا من وقت القضاء" (الدر مع الرد ۵/ ۲۰۲)۔

جب سے عدت ختم ہوچکی ہے، اسی وقت سے وہ دوسرا نکاح کرنے کی مجاز ہے، لہذا اگر واقعہ ایسا ہی ہے تو وہ دوسرا نکاح بعد ختم عدت کرسکتی ہے۔

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند ۹/ ۷/ ۵۸ ۱۳ھ

الجواب صحیح محمود علی عنہ

طلاق مکرہ کا حکم:

ریڈیو کویت نے بتلایا کہ اگر کسی شخص سے لڑکی والے یا دیگر اشخاص جان سے مارڈالنے کی دھمکی دے کر طلاق لیتے ہیں تو وہ طلاق واقع نہیں ہوتی۔

حافظ مہدی حسن، پوسٹ بکس ۲۴۴۳، ریاض، سعودی عرب

الجواب وباللہ التوفیق:

یہ بات ادھوری ہے، پوری بات اس طرح ہے کہ اگر جبر واکراہ کرکے مثلاً جان سے مارڈالنے کا خوف دلا کر لفظ طلاق کی تحریر لے لی اور زبان سے طلاق نہ دلوائی تو کوئی طلاق واقع نہ ہوگی (۱)۔

اوراگر زبان سے طلاق دلوائی تو اگر جبر واکراہ دے کر زبان سے کہلوایا ہے، چاہے مارڈالنے کی دھمکی دے کر کہلوایا ہو بہر حال واقع ہوگی (۲)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲/ ۴/ ۹۹ ۱۳ھ

بیوی سے صرف ایک، دو، تین کہنا:

زید اور ہندہ میں جھگڑا ہوا، زید بحالت غصہ اپنے بستر پر جاکر سوگیا، کچھ رات گذرنے کے بعد ہندہ نے زید کو کسی

۱- ''فلو أکرہ علی أن یکتب طلاق إمرأتہ فکتب لاتطلق، لأن الکتابۃ أقیمت مقام العبارۃ باعتبار الحاجۃ ولا حاجۃ ھنا، کذافی الخانیۃ'' (فتاویٰ شامی ۴۴۱/ ۲ کتاب الطلاق)۔

۲- ''ویقع طلاق کل زوج بالغ، عاقل ولو عبداً أو مکرھا فإن طلاقہ صحیح، أي طلاق المکرہ'' (الدر المختار علی ھامش الشامی ۴۲۱، کتاب الطلاق) (مرتب)۔

ضرورت سے بیدار کیا، زید نے غصہ میں اپنی بیوی سے کہا کہ ایک دو تین اور پھر سو گیا بندہ نے پھر جگایا کہ تم کل صبح دس آدمیوں کے روبرو مجھکو جواب دو، اس پر زید نے اپنی بیوی بندہ سے کہا میں چار آدمیوں کے بیچ میں کہوں گا کہ جواب دیدیا بندہ نے اپنے پڑوس میں اس کا ذکر کیا کہ زید نے مجھے اس طرح کے الفاظ کہا ہے۔

صبح کو ایک شخص نے زید سے پوچھا کہ تم نے اپنی بیوی سے کیا کہا، اس نے کہا کہ صرف ایک دو تین، پھر محلّہ کے اکابر نے جمع ہوکر زید سے دریافت کیا کہ تم نے اپنی بیوی کو کیا کہا، اس پر بھی زید نے کہا کہ صرف ایک دو تین کہا ہے، اب زید کا کہنا ہے کہ میں نے یہ لفظ بیوی کو صرف ڈرانے کے لئے کہا ہے، طلاق کی نیت سے نہیں کہا ہے، کیا صورت ھذا میں بندہ کو طلاق واقع ہوگئی؟

الجواب وبالله التوفيق:

حسب تحریر سوال بندہ کا اپنے شوہر کا یہ قول نقل کرنا کہ میں چار آدمیوں کے بیچ میں کہوں گا کہ جواب دیا اول تو شوہر اسکا منکر ہے اور بندہ کے پاس شاہد نہیں، دوم یہ الفاظ ایقاع طلاق کے نہیں بلکہ کنایہ طلاق کے ہیں اور وہ بھی ایقاع کا نہیں بہت سے بہت یہ سب دھمکی یا وعدہ کے ہوسکتے ہیں جو مفید نہیں، اس لئے صورت مسئولہ میں بندہ پر کوئی طلاق واقع نہیں ہوئی ہے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۱/ ۷/ ۱۳۸۵ھ

الجواب صحیح محمود عفی عنہ

میری طرف سے طلاق ہے اور تا زندگی حرام ہے، سے کتنی طلاق پڑی؟

میاں بیوی کے درمیان ابتدائی ملاقات میں نا اتفاقی ہوگئی ہے، عورت نے شوہر سے کہا کہ تم پڑھنا چھوڑ دو اور جو میں کہوں وہ کام کرو، ورنہ میرا اور تمہارا کوئی تعلق نہیں ہے، شوہر نے کہا کہ میں پڑھنا کیوں چھوڑوں یہ مجھ سے نہیں ہوگا اور کہا کہ تمہاری بات غلط ہے مجھ سے کام لے، لیکن عورت اپنی ضد پر قائم رہی اور کئی مرتبہ یہی کہا کہ میرا اور تمہارا تا زندگی کوئی تعلق نہیں رہے گا، شوہر نے جواب میں کہہ دیا ہے کہ میری طرف سے بھی طلاق ہے اور تو میرے لئے تا زندگی حرام ہے، اس بات کو تقریباً تین سال کا عرصہ ہوگیا ہے، شوہر نے رجوع نہیں کیا اور نفاق بدستور ہے اور شوہر کی شرائط پر زوجہ رہنے کو تیار نہیں

ہے اور عورت شوہر کے مکان پر موجود ہے شرعی جواب سے مسرور فرمائیں۔

الجواب وباللہ التوفیق:

حسب تحریر سوال طلاق کے دو جملے ۱۔میری طرف سے بھی طلاق ۲۔اور تو میرے لئے تازندگی حرام ہے مذکور ہیں پہلا جملہ طلاق صریح رجعی کا ہے اور دوسرا جملہ طلاق صریح بائن کا اور دوسرا جملہ اول جملہ کی تفسیر ہے، علیحدہ کوئی ایقاع جدید نہیں ہے، اس لئے مسئولہ میں صرف طلاق بائن واقع ہوئی اور تعلق زوجیت بالکلیہ منقطع ہوگیا ہے۔

اب دونوں میں تعلق زن وشوئی بغیر نکاح جدید کئے کسی طرح قائم نہیں ہوسکتا اور نہ بغیر نکاح جدید کے ایک دوسرے کے سامنے آسکتے ہیں۔

نیز سوال کا ابتدائی جملہ (ابتدائی ملاقات الخ) سے معلوم ہوتا ہے کہ دونوں میں یکجائی وتنہائی (خلوت صحیحہ ہوچکی ہے)، اس لئے بصورت مذکورہ زرمہر پورا دینا واجب ہے۔ھذا ما عندی من الفقہ الحنفی فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند ۱۲/۷/۸۵ ۱۳ھ

الجواب صحیح: محمود غنی عنہ، سید احمد علی سعید نائب مفتی دارالعلوم دیوبند

شوہر طلاق کا منکر ہو اور گواہ طلاق کی گواہی دیں:

ایک کمیٹی چند آدمیوں پر مشتمل لوگوں کے مذھبی معاملات کے فیصلہ کے لئے بنائی گئی ہے، لیکن اس نے اس کے بجائے دین اسلام میں خلل اندازی شروع کردی ہے اور طریق کار یہ اختیار کیا ہے کہ اگر کسی کے ساتھ مخالفت ہوجائے تو اس کو نقصان دینا اور اس کی عورت کو بہکا کر یہ دعویٰ کرادینا کہ میرے خاوند نے مجھے طلاق دیدی ہے، اور جو لوگ اس شرارت میں ملوث ہوں انکو گواہ بنا کر طلاق نامہ ثابت کرانا انکا کام ہے، اب انکے سیکریڑی نے ایک عورت کو بہکا کر اور جھوٹے دو گواہ طلاقنامہ کے انکو گواہ مقرر کر کے اس عورت سے شادی کرلی ہے اور خاوند اس عورت کے طلاق دینے سے منکر ہے اور عورت سے جھوٹ کہلوا کر اور دو جھوٹے گواہ بنا کر طلاقنامہ اس عورت کا ثابت کرتے ہیں کہ اس کے خاوند نے اس کو طلاق دیدی ہے، کیا ایسی کمیٹی کا فیصلہ قابل قبول ہے، جو یہ خلاف شرع فساد کرتے ہیں اس کا کیا جرم ہے، آیا یہ مذکورہ عورت اس شخص کے لئے نکاح میں رکھنا کیسا ہے جبکہ اس کی شرارت ظاہر ہے اور خاوند منکر طلاق ہے، کیا ایسے لوگ جو اس کمیٹی کے ہر مشورہ میں شریک

ہوتے ہیں اور کمیٹی کو کہتے ہیں کہ ہمیں بھی کوئی عورت اس طرح دیجانی چاہئے انکی گواہی معتبر ہوگی یا کہ نہیں؟

الجواب وبا لله التوفيق:

حسب تحریر سوال جب تک گواہ خود رجوع یا اپنے کذب کا اقرار نہ کریں یا دلیل شرعی سے انکا کذب اس معاملہ میں ثابت ومتعین نہ ہوجاوے اس وقت تک عدم طلاق کا حکم قضاءً نہیں ہوسکتا ہے (۱)، البتہ وہ ایسا کرنے کی وجہ سے آخرت میں سخت مجرم اور معذب ہوں گے اور دنیا میں بھی بدترین وبال میں مبتلا ہوں گے، ایسے لوگوں کے دل میں خوف خدا ڈالنا سب سے بڑی تدبیر ہے اور کمیٹی کے لوگ اگر غیر متدین ہوں تو انکو کمیٹی سے نکال دینا چاہئے اور کمیٹی کا کوئی فیصلہ جو اصول وضوابط شرعیہ کے خلاف ہوگا وہ شرعاً ہرگز معتبر ونافذ نہ ہوگا، آبادی کے بڑے لوگوں اور ذمہ دار لوگوں پر ضروری ہے کہ وہ لوگ اس قسم کے جرائم وفسادات کے انسداد کی تدبیریں سوچیں اور حتی المقدور روکیں، ورنہ سب حسب قدرت عند الله ماخوذ اور مبتلا ءوبال دنیا وآخرت ہوں گے۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۰/۷/ ۱۳۸۵ھ

الجواب صحیح: سید احمد علی سعید نائب مفتی دارالعلوم دیوبند، محمود غفی عنہ

شادی نامنظور ہے، طلاق دے دیا کہنے سے طلاق:

زوج کے ایک خط کی نقل منسلک ہے جو اس نے اپنے والدین کو لکھا ہے، جسکو پانے کے بعد فوراً اس کے والدین نے اس کو ایک خط دریافت طلب لکھا ہے کہ فوراً جواب دے اور اسپر عمل درآمد کیا جاوے اور یہ بتائے کہ اس نے یہ حرکت کیوں کی جس پر اس نے اپنی غلطی کی معافی مانگی اور پشیمان ہوا چنانچہ وہ خط نہ تو لڑکے کے والدین کو دیا گیا ہے نہ لڑکی کو نہ زوج کے والدین نے کوئی خط لڑکی کے والدین کو لکھا، اس لئے کہ اس کے خیال سے ضرورت نہیں باقی تھی اس کے بعد زوج رخصت کے وقت مکان آیا تو لڑکی بھی رخصت ہوکر آئی، اس وقت اس کی گود میں ایک سال کا بچہ بھی ہے اتفاق سے وہ خط زوج کی والدہ کے پاس پڑا رہ گیا تھا، جس کو لڑکی نے ایک مدت کے بعد کہیں بکس میں پالیا اور میکے جانے کے بعد اپنے والدین کو

۱- "وما سوى ذالک من الحقوق يقبل فيها شهادة رجلين او رجل و امرءتين سواء كان الحق مالا او غير مال مثل النكاح، الطلاق، والوكالة، والوصية ونحو ذالک" (ہدایہ ۳/ ۱۵۴-۱۵۵، مکتبہ اشرفیہ دیوبند)۔

دکھلایا، اب لڑکی والے کہتے ہیں کہ طلاق ہوگئی اور خط میں یہ لفظ لکھا ہے (مضمون خط) آپ صاف صاف لکھ دیں میں آپ لوگوں سے بہت شرمندہ ہوں اور میرے معظم والد جہاں آپ نے میرے بڑے بڑے قصور معاف فرمائے ہیں ایک یہ بھی معاف فرماویں اور صاف صاف میری طرف سے لکھدیں کہ انور نے شادی نامنظور کردی اور اپنی طرف سے طلاق دے دیا اور اب مجھے ان لوگوں سے کوئی واسطے نہیں ہیں، والدہ کی خدمت میں سلام عرض ہے جمشید کو دعاء، آیا اس تحریر خط سے طلاق پڑی یا کہ نہیں؟

(محمد انور)

الجواب وبالله التوفيق:

انور شوہر کی تحریر دیکھی گئی اس میں انور کے اپنے الفاظ بغرض صرف اتنے ہیں کہ شادی نامنظور کردی اور اپنی طرف سے طلاق دے دیا اور اگلا جملہ (اب مجھ سے ان لوگوں کا واسطہ نہیں) اس میں یہ بھی احتمال ہے کہ اپنے والد کو لکھنے کے لئے کہہ رہا ہے کہ وہ لوگ (اہل زوجہ) اسکے والد سے کچھ تعلق وواسطہ نہ رکھیں، اس کا حکم یہ ہے کہ اگر وہ تحریر واقعی انور ہی کی ہے تو حسب تحریر ایک طلاق رجعی واقع ہوگئی، پس اگر وہ لڑکی جب رخصت ہوکر اپنے زوج کے وہاں آئی اور زوج سے ملاقات ہوئی ہے اسوقت تک اس کو تین حیض نہیں آچکے تھے بایں صورت حسب سابق انور کی زوجہ باقی ہے اور اگر تین حیض آچکے تھے اور عدت ختم ہوچکی تھی تو زوجہ انور کے نکاح سے نکل چکی تھی رخصتی صحیح نہیں ہوئی، لہذا ایسی صورت میں دونوں آپس میں فوراً جدید نکاح کرلیں، "وينكح مبانة بما دون الثلاث في العدة وبعدها بالإجماع"(۱)، اور تجدید نکاح سے قبل قبل ہر گز آپس میں تعلق زن وشوئی قائم نہ رکھیں، ورنہ سخت گناہ گار ہوں گے اور ارتکاب زنا میں مبتلا ہوں گے، فقط واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۱/ ۷/ ۱۳۸۵ھ
الجواب صحیح: محمود غفی عنہ

۱- الدر المختار ۵/ ۴۰۔

مطالبہ طلاق پر دیدی، دیدی، دیدی، کہنا:

دونوں میاں بیوی میں کسی وقت جھگڑا ہورہا تھا، بیوی نے کہا کہ مجھکو تو طلاق دیدے تو شوہر نے بحالت غصہ کہا کہ میں نے دیدی، دیدی تین بار کہہ دیا، لیکن زبان سے یہ الفاظ نہیں نکالا کہ طلاق دیدی عورت کے کہنے پر یوں ہی کہدیا کہ دیدی کیا تین بار اس کی طلاق پڑی یا کہ نہیں؟ عورت اور مرد دونوں جاہل ہیں عورت حاملہ بھی ہے۔

الجواب وبالله التوفيق:

عبارت سوال سے معلوم ہوتا ہے کہ یوں ہی بلا نیت طلاق یہ الفاظ کہے ہیں، ایسی صورت میں حکم یہ ہے کہ نیت کے بغیر کہنے سے بھی طلاق واقع ہوجاتی ہے جیسا کہ اس عبارت سے معلوم ہوتا ہے: "إمرائة قالت لزوجها طلاق مراده فقال الزوج داده گير (الى قوله) ولو قال: داده است أو كرده است يقع نوى أو لم ينو ولا يصدق في ترک النية قضاء " (۱)۔

لہذا صورت مسئولہ میں تین طلاقیں مغلظہ واقع ہوگئیں ھذا ما عندی جواب لکھنے کے بعد قاضیخان کا جزئیہ ملا جو اسپر مثل نص ہے قال لأمرته: هشته هشته حرامي حرامي فقال ما اردت به الطلاق لايصدق قضاء (الى قوله) قالوا تطلق ثلاثا (۲)، وايضا في مختصر الخزانة ولو قالت: مرا طلاق كن فقال الزوج: كردم كردم كردم، طلقت ثلاثاً (۳) فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند، سہارنپور ۲۲/ ۷/ ۸۵ ۱۳ھ

الجواب صحیح محمود عفی عنہ، سید احمد علی سعید

پنچایت کا فسخ نکاح معتبر ہے یا نہیں؟

زید اور ہندہ میاں بی بی ہیں اور ہندہ کے زید سے بچے بھی ہیں اور زید نہ ہندہ کو اپنے یہاں لیجاتا ہے اور نہ طلاق

۱- فتاوی ہندیہ ۱/ ۳۸۰، مکتبہ رشیدیہ پاکستان۔

۲- "سئل المبوسي عمن قال لأمرته: هشته هشته حرامي حرامي قال: لايصدق في انه لم يرد به الطلاق وطلقت ثلاثا كذا في الحاوي" (الفتاوی الہندیہ ۱/ ۳۸۶، مکتبہ رشیدیہ پاکستان)۔

۳- فتاوی مجموع النوازل و نصف دوم قلمی ورق ص ۷۰ ۴۔

ہی دیتا ہے اور نہ نان ونفقہ کا کفیل ہوتا ہے اور نہ پنچائت کچھ فیصلہ کرتی ہے اور اگر کرتی ہے تو زید پنچائت کے فیصلہ پر راضی نہیں ہوتا ہے، مثلاً پنچائت نے فیصلہ کیا ہے کہ نکاح فسخ کردیا جاتا ہے، تو کیا پنچایت کے فسخ کرنے سے نکاح فسخ ہوجائے گا یا کوئی اور صورت ہے۔

الجواب وباللہ التوفیق:

زید کو اولا پنچایت کی جانب سے جس میں کم ازکم ایک عالم بھی ہو مجبور کیا جاوے کہ ہندہ کا کفیل ہو، نان نفقہ وغیرہ دے، اگر نہیں دیتا ہے تو طلاق دینے کے لئے کہا جائے کہ زید پر واجب ہے، اگر دونوں میں سے کسی کو نہیں منظور کرتا ہے تو پنچایت جس میں عالم جید کو بھی شامل کیا جاوے تفریق کردے یہ فیصلہ صحیح ہوجائے گا، لیکن زید سے قبل تفریق بتلا دیا جائے کہ اگر دونوں مذکورہ باتوں میں سے کسی کو نہیں مانیں گے تو ہم تفریق کردیں گے جو شرعاً معتبر ہے (حیلہ ناجزہ)۔

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۲/ ۷/ ۱۹۸۵ء
الجواب صحیح محمود عفی عنہ

عدالت کی تفریق کا حکم:

ایک لڑکی کی شادی نابالغیت میں لڑکی کے والدین نے ایک مرد جس کی عمر ۴۰ سال ہوچکی تھی کے ساتھ شادی کر دی، لڑکی کی بالغ ہوکر اپنے شوہر کے پاس گئی جبکہ شوہر کی عمر ۴۵ سال ہوچکی تھی قریب ۵-۶ سال لڑکی اپنے شوہر کے ساتھ رہی، اس درمیان میں روحانی جسمانی تکالیف ہوئی جس سے وہ تنگ آگئی، چنانچہ اس نے اس معاملہ کو برادری میں پیش کیا مگر برادری نے کوئی پنچایت نہیں کی ہے اور نہ سماعت معاملہ کیا، لڑکی کے شوہر کو مکرر سہ کرر بذریعہ سمن طلب کیا مگر باوجود تعمیل سمن پر بھی حاضر عدالت نہیں ہوا ہے، چنانچہ پنچایت نے بھی تنگ آکر شوہر کے خلاف عدالت میں دعوی کردیا، عدالت نے لڑکی کے شوہر کو طلب کیا وہ حاضر عدالت نہیں ہوا عدالت نے تنگ آکر ایک طرفہ فیصلہ لڑکی کے موافق دیدیا ہے، لڑکی نے فیصلہ کے ۳ماہ ۱۳ دن بعد اپنا عقد ایک ہم عمر جوان کے ساتھ کرلیا ہے، کیا یہ فیصلہ عدالت جائز ہے یا کہ ناجائز ہے۔

الجواب وباللہ التوفیق

حسب تحریر سوال صورت مسئولہ عدالت کی یہ تفریق اگر مسلمان حاکم نے تمام کاروائی مقدمہ حسب قانون شرعی

مرتب کر کے کیا ہے تو یہ فیصلہ شرعی ہوا اور یہ عقد جو ہم عمر جوان سے ہوا ہے اگر تین حیض (عدت) گذار کر ہوا ہے تو صحیح ہوا ورنہ نہیں، اس صورت میں کہ فیصلہ شرعی نہ ہوا ہو زوجین پر واجب ہے کہ فوراً دونوں علیحدہ علیحدہ ہو جائیں اور منجانب لڑکی جماعت مسلمین یعنی کم از کم تین دیندار باوقار، معاملہ شناس مسلمانوں کی جماعت بنا کر اس کے سامنے لڑکی اپنا واقعہ رکھ کر تفریق کی درخواست کرے اور وہ جماعت حسب قاعدہ شرعیہ بیان وشہادت وثبوت وغیرہ جملہ کاروائی مقدمہ مرتب کر کے اپنی صواب دید کے مطابق تفریق کر دے تو اب یہ تفریق شرعی ہو جائے گی اور پھر عدت تین حیض گذار کر لڑکی اس ہم عمر جوان سے دوبارہ اپنا نکاح پڑھا کر اس کے ساتھ رہے۔

(تنبیہ) اس جماعت مسلمین میں ایک معتبر ومتدین عالم بھی شامل کرلیں جو مسائل فقہ سے واقف ہو تو اچھا ہے، ورنہ وہ جماعت ہر موڑ پر کسی معتبر واقف مسائل عالم سے پوچھ کر عمل کر کے اور حیلہ ناجزہ مصنفہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ خود بھی مطالعہ میں رکھے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۱/۷/۱۹۸۵ء
الجواب صحیح محمود غفی عنہ

طلاق نامہ پر صرف دستخط کرنے سے طلاق پڑی یا نہیں؟

محترمی جناب مفتی صاحب مندرجہ ذیل ایک طلاق نامہ نقل پیش کیا جارہا ہے عبدالحفیظ نے اپنی زبان سے طلاق نہیں دیا ہے لیکن انہوں نے اسی طلاق نامہ پر دستخط کیا ہے بتلایا جاوے کہ یہ طلاق واقع ہوئی ہے یا نہیں بینوا توجروا۔

نقل طلاقنامہ یکم نومبر ۶۵ میں بشرن بی بی مقام شولا تالاب تھانہ بردوان ضلع بردوان کی رہنے والی ہوں، آج میں اپنے شوہر سے طلاق لے رہی ہوں، پنچ کے سامنے آئندہ ہم سے اور ان سے کوئی واسطہ نہیں اور لڑکے سے بھی کوئی واسطہ نہیں ہے اگر لڑکا ہمارے پاس جائے تو اس کا باپ عبدالحفیظ لا سکتا ہے، اگر ہم روکیں تو کہیں قانونی کاروائی کرسکتا ہے اور ہم نے دین مہر معاف بھی کر دیا ہے، ساتھ گواہ کے اور خوشی سے طلاق لیا شوہر کا نام عبدالحفیظ ہے اور راستہ گھاٹ میں ملاقات ہونے پر گالی گلوچ نہیں کرسکتا ہے ایک بچہ بھی اگر گواہ دے تو انجام برا ہوگا۔ دستخط گواہ۔ ۱ عبدالرحمٰن ۲۔ محمد ادریس ۳۔ محمد مقصود عالم ۴۔ شفیق احمد ۵۔ فضل کریم (عبدالحفیظ شوہر بشرن بی بی)۔

الجواب وبا للہ التوفیق:

عبدالحفیظ نے اس طلاقنامہ کی عبارت سن کر زبانی قبول کرلیا ہے اور تصدیق کردی ہے جب بھی طلاق واقع ہوگئی اور دین مہر معاف ہوگیا ہے، خواہ لفظ طلاق زبان سے بولا ہو یا نہ بولا ہو(۱)، فقط واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۴/۷/۱۹۸۵ء

الجواب صحیح: محمود غنی عنہ، سید احمد علی سعید نائب مفتی دارالعلوم دیوبند

نان ونفقہ اور حق زوجیت ادا نہ کرنے کی وجہ سے نکاح فسخ کرانا:

زید نے عرصہ بارہ سال سے اپنی بیوی ہندہ کی کوئی خبر نہیں لیا ہے، ہندہ اپنے میکے میں ہے اور ہندہ کے زید کے نطفے سے دولڑکیاں ہیں وہ بھی ہندہ کے ساتھ ہیں، ایک لڑکی کی عمر ۱۶ سال اور دوسری کی عمر ۱۳ سال ہے، آٹھ سال پہلے یہ بات معلوم ہوئی تھی کہ وہ کلکتہ میں رہتا ہے اور شادی کرلیا ہے، دو بچے بھی ہیں لڑکی کی عمر ۲۰ سال ہے، لڑکی کا بھائی اسکولا نے کلکتہ گیا لیکن وہ نہیں ملا زید کے والدین اس کے بچپن ہی میں انتقال کرگئے یہاں پر ایک مسلمان کے یہاں پرورش پائی ہے اسنے ہی شادی کردیا تھا جوان ہونے پر سسرال میں دولڑکیاں پیدا ہونے تک رہا اور اس کے بعد گیا تو آج تک خبر نہیں لیا ہے اور نہ کوئی پتہ دیا ہے کہ میں کہاں ہوں، ایک لڑکی کی شادی ننہال میں والدہ نے کردیا ہے، دوسری کی شادی بھی طے پاچکی ہے، ابھی ہوئی نہیں ہے، ہندہ کے والدین بہت کمزور ہوچکے ہیں، اس لئے ہندہ چاہتی ہے کہ میں بھی کہیں دوسری شادی کر کے اپنا گذر اوقات کرے عندالشرع کیا حکم ہے فرمایا جاوے۔

الجواب وبا للہ التوفیق:

حسب تحریر سوال صورت مسئولہ کا حکم یہ ہے کہ اگر ہندہ کو اپنی آئندہ زندگی بلا دوسری شادی کئے ہوئے باعصمت طور پر گذارنی دشوار اور متعذر معلوم ہوتی ہے تو اولاً پہلے شوہر کی تلاش کی جاوے اور اس سے کہا جائے کہ یا تو اس کو لیجائے یا طلاق دیدے، اگر شوہر نہ ملے یا طلاق نہ دے اور ہر طرح مجبوری ہوجائے تو جماعت مسلمین بناکر (یعنی شرعی پنچائت بناکر) جو کم از کم تین دیندار باوقار معاملہ شناس مسلمانوں کی جماعت ہو عورت اس کے سامنے اپنا معاملہ اور مجبوری رکھ کر درخواست کرے کہ تفریق شرعی واقع کر کے مجھے دوسرا نکاح کرنیکی اجازت دیجائے اور وہ جماعت حیلہ ناجزہ مصنفہ حضرت تھانوی

۱- "کل کتاب لم یکتبہ بخطہ ولم یملہ بنفسہ لایقع الطلاق مالم یقر انہ کتابہ" (شامی ۲/۵۸۹، عثمانیہ)۔

سامنے رکھکر قواعد شرعیہ فقہیہ کے مطابق بیان وشہادت وثبوت جملہ کارروائی مرتب کرے اورتفریق واقع کردے تو عدت گذار کرعورت کو اپنا دوسرا نکاح کرنا جائز ہوگا ورنہ نہیں۔

(تنبیہ) جماعت مسلمین میں ایک متدین عالم کو جو مسائل متعلقہ سے واقفیت رکھتا ہو شریک کرلیں تو زیادہ اچھا ہے، واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور
الجواب صحیح محمود غفی عنہ

والد کے اصرار پر طلاق نامہ پر دستخط کرنے سے طلاق کا حکم:

جواد حسن نامی ایک شخص ہے جس کی ہمشیرہ خلیق النساء سے میرا عقد ہوا تھا، اس کے بعد کچھ ایسی نا اتفاقی ہوئی جس کی بناء پر تحریری طلاقنامہ دوسرے شخص نے لکھا ہے اور مجھ پر میرے والد اور لوگوں کا زور پڑا اور میرے والد نے کہا کہ اگر طلاقنامہ پر دستخط نہ کروگے تو میں تمہارا حق ختم کردوں گا، میں نے طلاقنامہ پڑھ کر دستخط کردیا، ایسی صورت میں طلاق واقع ہوئی یا کہ نہیں اور میرا اول ارادہ طلاق کا قطعی نہ تھا، لڑکی نے قریب ایک سال تک نکاح نہیں کیا ہے، اس کے بعد ماہ شوال ۷۴ھ کو نکاح ہوگیا ہے، ایسی صورت میں شریعت کا کیا حکم ہے:

الجواب وبا لله التوفيق:

سعید الدین نے جب طلاقنامہ پڑھا اور اس کا مفہوم بھی یہ سمجھتے ہوئے کہ اس کی تصدیق سے طلاق واقع ہوجائے گی (جیسا کہ سیاق وسباق سوال سے معلوم ہوتا ہے) دستخط کردیا اور انکار نہیں کیا گو اپنے والد محترم کے دباؤ سے ہی ایسا کیا یہ اکراہ نہیں ہے، لہذا تصدیق طلاقنامہ ہوکر طلاق واقع ہوگئی، چاہے سعید الدین کا دلی ارادہ طلاق دینے کا رہا ہو یا نہ رہا ہو، "السكوت في معرض البيان بيان "(۱)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور
الجواب صحیح سید احمد علی سعید، محمود غفی عنہ

---

۱ - "ولو استكتب من آخر كتابا بطلاقها وقرأه على الزوج فاخذه الزوج وختمه وعنونه وبعث به إليها فاتاها وقع ان اقر الزوج انه كتابه" (ردالمحتار علی الدر ۴/۵۶ ۴، مکتبہ زکریا)۔

بیوی کا میکہ میں رہنا طلاق کی دلیل نہیں:

ایک مرد نے چار شادی کی پہلی بیوی اسکی زندگی میں مرگئی اور اس کے کوئی بچے نہیں ہیں اور دوسری بیوی بھی انکی زندگی میں مرگئی اور ان کے دولڑکے اور تین لڑکیاں اور تیسری بیوی سے ایک لڑکا ہے اس کے بعد تیسری بیوی کی موجودگی میں چوتھی شادی کرلی تیسری چوتھی بیوی کے اختلاف کی وجہ سے تیسری بیوی اپنے والد کی موجودگی میں بغیر رضامندی اپنے میکہ چلی گئی اورتقریباً ۲۹ سال سے اب تک میکہ ہی میں رہ رہی ہے، مرد کا انتقال دسمبر ۶۵ ء میں ہوگیا ان ایام میں مرد نے کوئی خرچ بیوی کونہیں دیا اور نہ کبھی ملاقات ہوئی باوجودیکہ میکہ صرف قریب ۴ میل دوری پر ہے، پتہ چلا کہ مرد کو اس طرح میکہ جانے پر سخت خفگی ہوئی اورانہوں نے اپنے بڑے بھائی کے ذریعہ ایک طلاق نامہ تیسری بیوی کے نام روانہ کیا جو گاؤں کے ایک معتبر دیندار آدمی کودیا گیا جس کوانہوں نے ان تک پہنچادیا وہ شخص موجود ہیں اوریادو ہانی کے مطابق اس عذر کا اعتراف کرتے ہیں ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ اس خط کے اندر کیا لکھا تھا مجھے علم نہیں، مرد کے بڑے بھائی کی بیوی موجود ہیں اور کہتی ہیں کہ ان کے شوہر طلاق نامہ لے کر گئے تھے اس کے برعکس تیسری بیوی یہ کہتی ہے کہ میرا طلاق نہیں ہوااورموجودہ چوتھی بیوی بھی کہتی ہے کہ طلاق ہو چکا ہے، مرد کی کچھ جائیداد کے سلسلے میں بات کرتے ہوئے تیسری بیوی کے لڑکے نے دوسری بیوی کے لڑکوں سے اظہار کیا کہ ہاں طلاق تو ہو چکا ہے اس وجہ سے ماں کا کوئی حصہ نہیں ہوتا ہے لیکن اب طلاق سے انکار کرتا ہے، دوسری بیوی کے بالغ بچوں کے سامنے بھی والد کی موجودگی میں طلاق کی بات ہوئی تھی کہ میری بیوی کوطلاق ہو چکا ہے اس کے بعد مرد نے تقریباً ۴ یا پانچ سال بعد جب تیسری بیوی کا بچہ کچھ بڑا ہوگیا جو اپنی ماں کے ساتھ میکہ میں رہ رہا تھا اس بات کی کوشش کی کہ وہ لڑکا بھی والد اور بڑے بھائیوں اور بہنوں کے ساتھ رہے، لیکن اس کی ماں نے بچہ کواپنے گھر آنے سے روک دیا جس کی وجہ سے ابتک وہ اپنی ماں کے ساتھ اپنے نانی ہال میں ہی ہے، تیسری بیوی کبھی بھی کسی خوشی ورنج کے موقعہ پر شریک نہ رہی اورمرد کی آخری دوسال کی سخت علالت وانتقال میں بھی شریک نہ رہی اب آیا طلاق واقع ہوا یانہیں؟

شمیم احمد ۱۹۰،اے پہاڑ پور، اعظم گڑھ

الجواب وبالله التوفيق:

صورت مسئولہ کا شرعی حکم یہ ہے کہ نکاح ہونا یقینی اور منکوحہ ہونا بھی یقینی اور منکوحہ کا وارث شرعی از نص قرآنی یقینی،

اس لئے جب تک اسی درجہ میں طلاق دینا بھی یقینی نہ ہو شرعا وراثت منصوصہ سے محروم نہیں کی جاسکتی (۱)، اور صورت مسئولہ میں طلاق نامہ کا خط کون لے گیا یا کس طرح بھیجا گیا معلوم نہیں، گاؤں کے جس معتبر آدمی کو دینا بیان کیا ہے اس کو معلوم نہیں کہ اس خط میں کیا لکھا تھا۔ بڑے بھائی کی بیوی کا یہ کہنا کہ شوہر طلاق نامہ لے کر گئے تھے اور یہ جملہ سوال کے سابق جملہ (کہ طلاق نامہ روانہ کیا تھا کے متخالف ہے، دوسرے برسبیل تسلیم مفید شہادت نہیں بالخصوص جب تیسری بیوی اپنے طلاق سے منکر ہے، اسی طرح چوتھی موجودہ بیوی کا یہ کہنا ہے کہ طلاق ہو چکا ہے، اسی طرح تیسری بیوی کے لڑکے کا دوسری بیوی کے لڑکوں سے اظہار کرنا کہ طلاق ہو چکا ہے، اسی طرح دوسری بیوی کے بالغ بچوں کے سامنے والد کی موجودگی میں طلاق کی جو بات ہوئی یہ سب ان میں سے کوئی بھی ایقاع طلاق کی شہادت نہیں ہے بلکہ محض خبر ہے نہ معلوم اس خبر کی بنیاد کیا ہے، اس لئے یہ جملے بھی مفید اثبات طلاق نہیں ہو سکتے ہیں، اسی طرح تیسری بیوی کا رنج وخوشی میں شریک نہ ہونا یا تیمارداری یا انتقال کے موقعہ پر شریک نہ ہونا یہ سب کوئی بھی ایقاع طلاق یا وقوع طلاق کا ثابت کرنے والا نہیں، نیز بغیر مرضی واجازت شوہر چلے جانے سے محض نفقہ ساقط ہوتا ہے حق وراثت یا مہر ساقط نہیں ہوتی، پس خلاصہ کلام یہ نکلا کہ شوہر کے انتقال کے پندرہ سال بعد یہ نزاع اٹھی اور اسمیں ثبوت طلاق کے معتبر اور عینی دوشاہد پیش نہ ہو سکے جو مثبت طلاق ہوتے اور عورت خود طلاق سے منکر ہے پس اس صورت میں عورت کے حلف پر شر عامدار ہوگا، اگر عورت قاضی کے سامنے بحلف کہہ دے کہ مجھے طلاق نہیں ہوئی تھی تو وہ وراثت شرعی اور حق شوہری کی مستحق ہوگی ورنہ مستحق نہ ہوگی، یہی حکم مہر کے بارے میں بھی ہوگا کہ اگر ثبوت شرعی سے ادائیگی یا معافی ثابت نہ ہو تو تقسیم ترکہ سے قبل مہر کی بھی مستحق ہوگی (۲)۔

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۴/۲/۱۴۰۱ھ

بحالت حمل تین طلاق کا حکم:

شوہر نے بحالت بیماری جب کہ بیوی حمل سے تھی تین طلاق دیدیا ہے عرصہ آٹھ ماہ کا ہو گیا ہے، پھر اس بیوی کو دوبارہ نکاح میں لانا چاہتا ہے۔ یہ جائز ہے یا کہ نہیں؟

۱- "ما ثبت باليقين لا يرتفع إلا بيقين، والمراد به غالب الظن" (الاشباہ والنظائر طبع کراچی ص/ ۹۰)۔

۲- عن عمرو بن شعيب عن أبيه عن جده أن النبي ﷺ قال في خطبته: "البينة على المدعي واليمين على المدعى عليه" (سنن الترمذی کتاب الاحکام ۳/ ۶۱۷ حدیث ۱۳۴۱)۔

الجواب وباللہ التوفیق:

جب تین طلاق دیدیا تو اب بغیر حلالہ کے شوہر اول کے لئے کسی طرح حلال نہیں ہوسکتی۔ طلاق حمل میں بھی واقع ہوجاتی ہے، حلالہ یہ ہے کہ عورت اس طلاق کی عدت (وضع حمل) گزار کر دوسرے شخص سے نکاح کر کے اس کے ساتھ زن وشوہر بستر ہو اور پھر وہ شوہر ثانی مرجاوے یا طلاق دیدے تو اس کی عدت گزارنے پر شوہر اول کے لئے حلال ہوگی (۱)، بغیر اس کے نہیں، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۸/۸/۱۴۱۰ھ

طلاق کے بعد عدت واجب ہے:

زید کے گھر میں ایک عورت عرصہ ڈیڑھ سال سے بلا طلاق آ گئی تھی کیوں کہ اس کا شوہر کسی وجہ سے اس کو نہیں رکھتا تھا اور نہ طلاق ہی دیتا تھا، اس لئے عورت کو والدین نے زید کے یہاں بلا طلاق بھیج دی تھی، زید سے اس عورت کی ایک لڑکی بھی پیدا ہوگئی ہے جو کہ انتقال کرگئی ہے، اب ۱۷ نومبر کو مذکورہ عورت کے شوہر نے کچھ روپیہ لے کر طلاق دیدی ہے عورت کو تین ماہ سے زید کا حمل بھی ہے جو زید ہی کے نطفہ سے ہے، دریافت طلب یہ امر ہے کہ عورت مذکورہ کے لئے ابھی عدت بھی ضروری ہے یا کہ نہیں یا فوری اس حالت میں زید سے نکاح پڑھا دینا ضروری ہے یا کہ نہیں جبکہ نطفہ زید سے ہی ہے۔

الجواب وباللہ التوفیق:

عورت مذکورہ کے لئے اب بھی عدت گذارنی ضروری ہے اور صورت مذکورہ کا حکم یہ ہے کہ وہ اور عورت دونوں فوراً الگ الگ ہوجاویں ہرگز ایک دوسرے کے سامنے نہ آئیں اور اگر آپس میں نکاح کرنا یا تعلق زن وشوئی قائم کرنا چاہتے ہیں تو چونکہ عورت حاملہ ہے اس لئے اس کی عدت وضع حمل ہے (۲) اس لئے بچہ پیدا ہونے کے بعد دونوں آپس میں نکاح پڑھا کر تعلقات زن وشوئی قائم کریں، اس کے خلاف ہرگز نہ کریں ورنہ سخت عذاب اور گناہ میں مبتلا ہوں گے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور
الجواب صحیح: محمود غفی عنہ نائب مفتی دارالعلوم دیوبند

۱- ''فان طلقها فلا تحل له من بعد حتى تنكح زوجا غيره'' (سورۃ البقرہ ۲ رکوع ۱۳)، ''وأولات الاحمال اجلهن ان يضعن حملهن'' (سورۃ الطلاق ۲۸/۴)۔

۲- ''واولات الاحمال اجلهن ان يضعن حملهن'' (سورۃ الطلاق آیت ۴/۲۸)۔

والدین کا طلاق دینے پر اصرار:

زید کے چھ بچے ہیں لڑکے اورلڑکیاں ان میں سے ایک لڑکے نے خلاف شرع ایک لڑکی سے تعلقات کرر کھے تھے جس وقت اس کے والدین کوعلم ہوالڑ کےکو سمجھایا اور روکا گیا، جب اس بات کالڑکی اور اس کی ماں کوعلم ہواتو زید کے لڑکے کوانہوں نے بہکا سکھا کر باپ کا روپیہ مال چوری کرا کر اس کوگھر سے فرار کرنے پر آمادہ کیااور یہ حرکت لڑکے سے کرا کرلڑکی ماں اور بھائی نے مل کر زید کےلڑکے سے نکاح کرادیا اوراس نکاح میں لڑکی کا باپ بھی ناراضگی کی وجہ سے شریک نہیں ہوا اور لڑکے کے والدین بھی دونوں باتوں کی وجہ سے ناراض ہیں، ایک تو باپ کا مال چوری کر کے یہ کام کیا لڑکی کا والد کافی عرصہ سے بدنام ہے،خلاف شرع اورخلاف قانون باتوں کی وجہ سے، اس لئےلڑکے کے والدین کا اصرار ہے کہ یہ رشتہ ختم کر کے اگرلڑکا معافی مانگ کرگھر آنا چاہےتو اس کواجازت ہے، ایسی حالت میں زید کوسمجھایا گیا ہے کہ اب نکاح ہو چکا ہے کسی کے گھر کوتوڑنا اچھانہیں ہے اورخلاف شرع ہےلڑکے کا باپ ابراہیم علیہ السلام اور اسمٰعیل کی مثال پیش کرتا ہے اور کہتا ہے اگر لڑکے نے ایسا نہ کیا تومیں اس کوتمام قسم کی اپنی املاک سے محروم کردوں، ایسی حالت میں شریعت کیا کہتی ہے۔ بینوا وتوجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

جب دونوں میں نکاح اور مناسبت دونوں باتیں ہو چکیں اورلڑکی کا باپ بدنام بھی ہو چکا ہے جس کا اعتراف زید کو بھی ہے اور اس پر ترس بھی کھارہا ہے اور رشتہ منقطع کرانے میں نہ تو چوری کا مال واپس آسکتا ہے اور نہ لڑکی کے والدین کی بے آبروئی دور ہوسکتی ہے، بلکہ رشتہ منقطع کرانے میں لڑکے کے اورخراب اورآوارہ ہونے کا بھی خطرہ قوی ہے جس کی حفاظت بھی باپ پر ہے اور برعکس اس کے رشتہ منقطع نہ کرنے میں باامید خدا ظن غالب یہ ہے کہ انشاء اللہ لڑکے کی اصلاح ہوجائے گی اورراہ راست پر آجائے گا اوراپنے کئے پر نادم ہوکر بدرگاہ رب العزت توبہ واستغفار بھی کرے گا اورایسی صورت میں زید کا سیدنا ابراہیم علیہ السلام اورسیدنا اسماعیل علیہ السلام کی مثال پیش کرنا بے موقع ہے، اس لئے زید کے لئے بہتر یہ ہے کہ اب دونوں کا نکاح باقی رکھتے ہوئے لڑکے کوآنے کی اجازت دے دے اورکسی اللہ والے عالم دین سے تعلق اصلاح قائم کرادے کہ وہ اس کوعلم دین اور دینداری سکھاتا رہے اوراصلاح کرتا رہے۔فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

الجواب صحیح سید احمد علی سعید، محمود غنی عنہ

بیوی کے لئے شوہر سے طلاق کا مطالبہ کرنا:

میری (محمد مسلم) شادی عرصہ پچاس سال ہوتا ہے ہوئی اور آج سے دو برس قبل تک میری ازدواجی زندگی نہایت ہی اطمینان بخش رہی، میں صاحب جائداد ہوں، اپنی بیوی (عشرت النساء) کے اصرار پر اور چند مصلحتوں کی بناء پر اپنی کل جائداد اپنی بیوی کے نام منتقل کردیا، چونکہ میں نوکری پیشہ تھا اور کوئی اولاد زینہ بھی نہیں تھی، اب جائداد حاصل کرنے کے بعد میری گرہستی سے ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش کررہی ہے اور میرے ساتھ رہنا سہنا چھوڑ کر اس گاؤں میں دوسری جگہ دوکان کرکے اپنی زندگی بسر کررہی ہے اور میں جسمانی طور سے مجبور ہونے کی وجہ سے ان دنوں دربدر کی ٹھوکر کھا رہا ہوں۔

میری بیوی کی طرف سے طلاق کی مانگ ہے، مگر میں اس وقت تک طلاق نہ دینے کے حق میں ہوں جب تک وہ میری جائداد میرے حوالہ نہ کردے اور وہ چونکہ جائداد کا بیعنامہ کرچکی ہے، اس لئے وہ مجھ کو واپس نہیں مل سکتی ہے عندالشرع میرے لئے کیا حکم ہے؟

الجواب وباللہ التوفیق:

اگر واقعہ ایسا ہی ہے جیسا کہ سوال میں مذکور ہے تو عشرت النساء سخت غلطی کررہی ہے، اپنے لئے غضب خداوندی کا سامان کررہی ہے، ایسی عورت جو اپنے شوہر کو بلاوجہ شرعی ناراض رکھے اس پر اللہ رب العزت کا غضب ہوتا ہے، صحیح حدیث میں وارد ہے کہ ملائکہ اس پر لعنت بھیجتے ہیں، عن ابی هريرة قال قال رسول الله ﷺ: " إذا دعى الرجل امرأته إلى فراشه فأبت فبات غضبان لعنتها الملائكة حتى تصبح" متفق عليه(۱)، اس عورت کی دنیا کیساتھ آخرت بھی خراب ہوجاتی ہے خسر الدنیا والآخرہ اللہ ہر مسلمان کو اس سے بچائے عشرت النساء پر لازم ہے کہ وہ اپنے شوہر کے ساتھ رہے اور اس کو راضی اور خوش رکھنے کی انتہائی سعی وکوشش کرے اور شیطانی نرغہ میں نہ پڑے، عورت کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ حد شرع میں رہتے ہوئے اپنے شوہر کو خوش رکھے، شوہر کو خوش رکھنے سے جنت ملتی ہے اور محمد مسلم پر لازم ہے کہ اگر اس کی عورت اپنے افعال اور برتاؤ سے تائب ہوجائے اور اطاعت کرنے اور خوش رکھنے لگے تو اس کے قصور کو معاف کرے اور ادائیگی حقوق میں انتہائی سعی کرے اور اگر عشرت النساء اس کے باوجود سرکشی ونافرمانی سے باز نہ آئے تو مسلم کو جائز ہے کہ وہ

۱- مشکوۃ المصابیح باب عشرۃ النساء وما لکل واحد من الحقوق ر ۲۸۰۔

طلاق دیدے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱/ ۸/ ۱۳۸۵ھ

الجواب صحیح: سید احمد علی سعید محمود غنی عنہ

زبردستی طلاق نامہ پر دستخط کرانے سے طلاق پڑتی ہے یا نہیں؟

محمد شریف ولد محمد مصطفیٰ عرف مرتضی ساکن شیوپور بنارس اپنی بیوی سرمن بی بی ولد بنی ساکن رسید ین پور تھانہ جلال پور ضلع جونپور کو ویدائی کی غرض سے اپنے سسرال گیا اور اپنے سسر نبی مذکور سے اپنی بیوی سرمن مذکورہ کی ویدائی کو کہا تو نبی نے صاف انکار کردیا اور گالیاں دیں اور لکھے ہوئے کاغذ پر دستخط کردو اور مار کر ہڈیاں توڑنے کی دھمکیاں دیں، پھر اس کاغذ پر محمد شریف سے زبردستی دستخط بھی کرالیا اس کاغذ کا مضمون یہ ہے کہ محمد شریف مقر لہٗ ہے اور سرمن بی بی مقرہ باہمی تنازع و جھگڑے کی وجہ سے نکاح کو ختم کرکے ایک دوسرے کو طلاق دے دیا ہے اور اب کسی فریق کا کوئی مطالبہ کسی دوسرے کے ذمہ باقی نہیں رہا، اس کاغذ پر محمد شریف اور سرمن بی بی کے دستخط کے ساتھ کاتب ہندو اور گواہوں کے دستخط ہیں، محمد شریف نے دستخط کے وقت بھی یہی کہا کہ میں طلاق نہیں دیتا ہوں، زبردستی دستخط کرا رہے ہو یہ ٹھیک نہیں ہے، اس کاغذ پر محمد شریف اور سرمن بی بی کے بھی دستخط ہیں، سوال یہ ہے کہ ایسی صورت میں جبکہ محمد شریف سے زبردستی دستخط لیا گیا ہے، شرعاً سرمن بی بی پر طلاق پڑی یا نہیں اور اگر پڑی تو کس قسم کی رجعی یا بائن۔

(نوٹ) ایک مولوی صاحب کہتے ہیں کہ طلاق نہیں ہوئی ہے، ایک دوسرے مولوی صاحب کہتے ہیں کہ مکمل ایک طلاق رجعی ہوئی، ایک تیسرے مولوی صاحب فرماتے ہیں کہ طلاق بائن پڑ گئی مکمل۔

الجواب وباللہ التوفیق:

اگر واقعہ بالکل ایسا ہی ہے جیسا کہ سوال میں مذکور ہے اور محمد شریف نے دستخط کرتے وقت بھی یہی کہا ہے کہ میں طلاق نہیں دیتا ہوں زبردستی دستخط کرا رہے ہو یہ ٹھیک نہیں ہے تو چونکہ محمد شریف نے نہ زبان سے طلاق دی اور نہ طلاق نامہ ہی کی تصدیق کی بلکہ اس نے طلاق نامہ کی تردید کی اور بلا تصدیق ایک لکھے ہوئے کاغذ پر محض دستخط کرنا کوئی شئی نہیں ہے۔ کما ھو الظاہر علی من لہ ادنیٰ فہم، اس لئے صورت مسئولہ میں زوجہ محمد شریف پہ کوئی طلاق واقع نہیں ہوئی ہے جن لوگوں نے وقوع

طلاق کا حکم دیا ہے وہ صحیح نہیں ہے (۱)۔فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند، سہارنپور

الجواب صحیح: سید احمد علی سعید، محمود عفی عنہ مفتی دارالعلوم دیوبند

کیا حالت حیض میں وطی کرنے سے عورت پر طلاق واقع ہو جاتی ہے؟

مسماۃ عائشہ خاتون بنت احمد حسن کا نکاح محمد عبدالقدوس سے تقریباً تین سال قبل ہوا ہے فی الحال وہ بیان کرتی ہے کہ میری شادی ہونے کے بعد ہی سے میرا شوہر مذکور حالت حیض میں بھی مجھ سے جماع کرتا رہا میں نے منع کیا اور کہا کہ عالم سے سنا ہے کہ حیض کی حالت میں وطی کرنا حرام ہے وہ نہیں مانتا ہے بلکہ غصہ ہو کر کہا کہ میرے لئے یہ سب کچھ نہیں ہے، ایسی باتیں مت بولو، آخر مجبور ہو کر اپنے سسر اور ساس سے بیان کیا، اس سے بھی کچھ فائدہ نہ ہونے کی غرض سے پڑوس کی عورتوں سے بھی بیان کیا، لیکن کسی طرح سے وہ رکتا نہیں ہے اور میرا شوہر نماز بھی نہیں پڑھتا ہے، ایسے شوہر کے یہاں میں نہیں رہوں گی خودکشی کرلوں گی وہ عورت میکہ چلی گئی ہے اور واضح ہو کہ علماء اور پبلک میں دو فریق ہو گئے ہیں، ایک فریق کہتا ہے کہ اس کا شوہر جبکہ قصداً حیض کی حالت میں باوجود بار ہا منع کرنے کے بھی بے پردہ حرمت قطعیہ پر اصرار کرتا رہا تو گویا وہ حلال سمجھ کر ہی حالت حیض میں وطی کرتا رہا ہے بایں وجہ وہ شخص کافر ہو گیا ہے اور اس کی بیوی مذکورہ پر طلاق بائن واقع ہو چکی ہے، اب عورت کو اختیار ہے کہ دوسرے شخص سے نکاح کر سکتی چنانچہ شرح فقہ اکبر (ص ۱۸۵) میں ہے: ''الاستهانة بها كفر بان يعدها هنيئة سهلة و يرتكبها من غير مبالاة بها ويجريها مجرى المباحات في ارتكابها'' اور صاحب البحر الرائق نے الفاظ کفریہ میں تحقیر الذنب لفظ کو شامل کر کے آخیر میں ''يكون كفرا'' کہا ہے اور شرح عقائد نسفی میں ''الاستهانه بها كفر'' ہے، اور ''مالا بدمنه'' اور خلاصۃ الفتاویٰ اور فتاویٰ رشیدیہ وغیرہ میں بھی اس کی تائید کی ہے اور چونکہ اس واقع میں عورت کا قول شرعاً مقبول ہے، اس وجہ سے کہ یہ جملہ ''مالا يطلع عليه الرجال'' کے ہے وغیرہ۔

اور دوسرا فریق کہتا ہے کہ اس کے شوہر کو صرف استغفار اور کچھ صدقہ لازم ہے اور کچھ نہیں ہے فقط اب علماء کرام سے دریافت طلب یہ امر ہے کہ صورت مذکورۃ الصدر میں کس فریق کا قول شرعاً مقبول ہے اور کس کا نہیں ہے اور عورت کا قول شرعاً

۱- ''وفي البحر أن المراد الإكراه على التلفظ بالطلاق فلو أكره على أن يكتب طلاق امرء ته فكتب لا تطلق لأن الكتابة أقيمت مقام العبارة باعتبار الحاجة ولا حاجة هنا كذا في الخانية'' (ردالمحتار علی الدر ۴/ ۴۴۰، مکتبہ زکریا)۔

مقبول ہوگا یا کہ نہیں؟

الجواب وباللہ التوفیق:

کسی مسلمان کو کافر قرار دینا امر عظیم ہے، کسی کے قول میں جب تک سو میں ایک احتمال بھی مومن رہنے کا ہوگا اس کو کافر کہنا جائز نہ ہوگا احتیاط کرنا واجب ہے، اگر کسی نے احتیاط نہ کی اور کافر کہنے میں عجلت کر دیا اور حقیقۃً وہ عنداللہ مومن تھا تو وہ کفر لوٹ کر اسی کافر کہنے والے پر آجاتا ہے (والعیاذ باللہ منہ) (۱) صورت مسئولہ میں حسب تحریر سوال عبد القدوس جذبات کا شکار ہے اور اس کا یہ قول کہ میرے لئے یہ سب کچھ نہیں ایسی باتیں مت بولو، اول تو اس کی کہنے والی محض عورت ہے اور کوئی گواہ اس پر نہیں ہے، دوسرے اگر صحیح بھی تسلیم کرلیں تو یہ جملہ مستلزم کفر کو نہیں ہے جیسا کہ اس عبارت سے معلوم ہوتا ہے: ''وقیل لا یکفر فی المسئلتین وھو الصحیح خلاصۃ وعلیہ المعول لانہ حرام لغیرہ لما فی المرتدانہ لا یفتی بتکفیر مسلم کان فی کفرہ خلاف ولو روایۃ ضعیفۃ'' (درمختار علی ہامش الشامی ج۱/ ۲۴۷ وکذا تحفہ فی الشامی فی باب الحیض)(۲)۔''وفی الطحطاوی علی المراقی ۷۴بعد بحث طویل: فعلی ھذا لایفتی بکفر مستحلہ (ای الوطی فی الحیض ناقل) لانہ حرام لغیرہ وھو الاذی''(۳)۔

لہٰذا صورت مسئولہ میں عبد القدوس کو کافر نہ کہیں گے اور نہ اس کی بیوی پر طلاق واقع ہوگی، البتہ اگر اسکی بیوی کو تجربہ اور حالات سے ظن غالب ہے کہ وہ پھر اس حرام میں مبتلا کرے گا تو اس کے پاس نہ جائے تا آنکہ اس کو اپنی حفاظت کا اطمینان شوہر کے حالات سے نہ ہو جائے اور اس درمیان کے نان ونفقہ وجملہ حقوق واجبہ کی وہ مستحق رہے گی، ہاں اگر شوہر کے سدھار سے بالکل مایوس ہو جائے یا الگ اپنی زندگی باعصمت گذارنی دشوار دیکھتی ہو تو اس کو یہ بھی حق ہے اور اختیار ہے کہ اس سے طلاق حاصل کرلے یا خلع کرالے اگر شوہر اس پر بھی تیار نہ ہو تو جماعت مسلمین شرعی پنچائت کے یعنی کم از کم دیندار با وقار معاملہ شناس مسلمانوں کی جماعت بنا کر جو شرعاً قاضی شرعی کے قائم مقام ہوتی ہے اور اس قسم کے معاملات میں فیصلہ کا حق رکھتی ہے، معاملہ اس کے سامنے رکھدے تاکہ معاملہ اسکے سامنے طے ہو جائے اور درخواست تفریق کرے وہ

۱- قال رسول اللہ ﷺ: ''ایما امری قال لاخیہ کافر فقد باء بھا احدھما ان کان کما قالت والا رجعت علیہ'' (مسلم شریف ۱/ ۵۷، مطبع رحیمیہ دیوبند)۔

۲- ردالمحتار علی الدر ۱/ ۴۹۴، باب الحیض مکتبہ زکریا۔

۳- ''ویسئلونک عن المحیض قل ھو اذی فاعتزلوا النساء فی المحیض'' (سورۃ البقرۃ آیت ۲۲۲)۔

جماعت مسلمین حسب قواعد شرعیہ جملہ کاروائی بیان وثبوت وشہادت وغیرہ مرتب کر کے تفریق واقع کر دے یہ تفریق بھی درست ہوگی اور اس کے بعد عورت تین حیض گذار کر اپنا دوسرا نکاح کر سکتی ہے۔

(تنبیہ) عبدالقدوس پر اس فعل سے باز آجانا اور خدا کے دربار میں توبہ اور استغفار کرنا اور آئندہ ایسا نہ کرنا بہر حال واجب ہے خواہ اس عورت سے پھر تعلق ہو یا نہ ہو۔

(تنبیہ) اس جماعت مسلمین کو چاہئے کہ الحیلۃ الناجزۃ بھی سامنے رکھکر تمام کارروائیاں اور فیصلہ مرتب کرے اور اس میں کوئی متدین واقف بالمسائل عالم بھی شریک ہو۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۴/ ۸/ ۱۳۸۵ھ

الجواب صحیح سید احمد علی سعید، محمود عفی عنہ دارالعلوم دیوبند

نابالغ کی طلاق کا حکم:

میرے لڑکے کا نکاح ہوا تھا مگر لڑکا اور لڑکی دونوں نابالغ تھے، دونوں کے والدین میں نااتفاقی پیدا ہوگئی اور تحریری طلاق آئی اور طلاق پر لڑکے کا انگوٹھا لگا ہے اور اس کے بعد جس لڑکی سے نکاح ہوا تھا اسکے والدین نے دوسری جگہ نکاح کر دیا ہے مگر وہاں لڑکی جانا نہیں چاہتی ہے، اس وقت لڑکی بالغ ہے اور وہ لڑکی وہیں آگئی ہے جہاں سے طلاق آئی تھی جہاں لڑکی کا نکاح ہوا وہ قطعی رضامند نہیں ہے، اس لئے عریضہ ھذا آپکی خدمت میں تحریر ہے کہ دوبارہ نکاح کیا جاوے یا کہ نہیں چونکہ پہلی طلاق نابالغیت میں آئی تھی۔

الجواب وباللہ التوفیق:

نابالغ لڑکے کا نکاح پڑھانے کا حق تو والد کو ہے مگر اس کے طلاق دینے کا حق کسی کو نہیں ہے نہ والد کو نہ خود نابالغ لڑکے کو جب تک بالغ ہو کر لڑکا خود طلاق نہ دے، لہٰذا نابالغی میں جو تحریری طلاق نامہ نابالغ لڑکے کے انگوٹھے کا نشان لگا کر آیا ہے وہ صحیح نہیں ہے، اس سے کوئی طلاق نہیں پڑی ہے (۱)، اور لڑکی کا نکاح جو اس کے باپ نے دوسری جگہ کیا ہے وہ بھی صحیح

۱- کما فی شرح التنویر: "واھلہ زوج عاقل بالغ مستیقظ وفی الشامیہ، وقولہ واھلہ زوج عاقل الخ) احترز بالزوج عن سید العبد ووالد الصغیر ...... وبالبالغ عن الصبی" (رد المحتار علی الدر ۴/ ۴۳۱، مکتبہ زکریا دیوبند) "یقع طلاق کل زوج اذا کان بالغا عاقلا سواء کان حرا او عبدا طائعا أو مکرھا" (کذا فی الجوھرۃ النیرۃ، الفتاوی الہندیہ ۱/ ۳۵۳، مکتبہ دار الکتاب دیوبند) "ولا یقع طلاق

نہیں ہوا ہے بلکہ لڑکی علی حالہ اپنے شوہر کی بیوی باقی رہی اور ہے،لہذا لڑکی کا بالغ ہونے کے بعد اپنے پہلے شوہر ہی کے پاس آجانا صحیح ودرست رہا دوبارہ نکاح کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی،مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۶/ ۸/ ۱۳۸۵ھ

الجواب صحیح محمود غفی عنہ

تم کو طلاق دیئے چھوڑ دیئے،چھوڑ دیئے کہنے سے کتنی طلاق پڑی؟

میاں اور بیوی آپس میں جھگڑا اور تکرار کرتے ہوئے میاں نے بیوی سے غصہ میں کہا تمکو طلاق دیدیئے ایک مرتبہ طلاق کا نام لیا ہے اور دومرتبہ کہا تمکو چھوڑ دیئے تمکو چھوڑ دیئے، بیوی حاملہ ہے اور اسی تاریخ سے بیوی میاں سے الگ رہتی ہے۔

لہذا دریافت طلب یہ ہے کہ مندرجہ بالا الفاظ سے کونسی طلاق واقع ہوئی ہے،اب شوہر کی خواہش ہے کہ بیوی عقد میں رہے لہذا اب عقد میں لانے کے لئے شوہر کو کیا کرنا پڑے گا،کیا بیوی سے عقد ثانی پڑھانا پڑے گا یا اور کوئی صورت ہے؟

الجواب وباللہ التوفیق:

تم کو چھوڑ دیئے کا لفظ بھی طلاق صریح ہے،لہذا صورت مسئولہ میں تینوں طلاق پڑ کر حرمت مغلظہ ہوگئی، اب بغیر حلالہ کے کوئی صورت عقد میں لانے کی نہیں اور حلالہ یہ ہے کہ اس طلاق مغلظہ کی عدت (وضع حمل ہے) گذر کر یعنی جب عورت کے بچے پیدا ہو چکے اس کے بعد عورت کسی دوسرے مرد سے نکاح کر کے اس سے ہم صحبت ہو اور پھر وہ فوت ہو جائے یا طلاق دیدے اور اس کے بعد اس کی عدت (تین حیض) اور اگر حاملہ ہو تو وضع حمل ہو جائے جب اس شوہر اول کے عقد میں آسکتی ہے بغیر اس کے نہیں آسکتی (۱)۔فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی،مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۸/ ۸/ ۱۳۸۵ھ

الجواب صحیح: محمود غفی عنہ

الصبی وان کان یعقل" (ہندیہ ۱/ ۳۵۳، دارالکتاب دیوبند)۔

۱- "واولات الاحمال اجلهن ان يضعن حملهن" (سورۃ الطلاق: ۴)،" فان طلقها فلا تحل له من بعد حتى تنكح زوجا غيره " (سورۃ البقرہ آیت ۲۳۰)۔

بذریعہ تحریر وقوع طلاق کے لئے کیا گواہ کا ہونا ضروری ہے؟

طلاق نامہ کی تحریر سے طلاق کا ثبوت ملتا ہے لیکن اس پر گواہ نہیں ہے، ایسی صورت میں جبکہ طلاق نامہ غیر ملک سے یہاں آیا ہو بغیر گواہ کے طلاق قطعی ہوگئی ہے؟

الجواب وبالله التوفيق:

اس سے طلاق واقع ہوجاتی ہے جبکہ یہ معلوم ہوجائے کہ اس کو زوج نے خود لکھا ہے، یا اس کے حکم سے لکھا گیا ہے:
"إن أرسل الطلاق بأن كتب أما بعد فأنت طالق فكما كتب هذا يقع الطلاق "(۱) فقط واللہ اعلم بالصواب۔

بندہ محمد سکندر علی ۲۴ پرگنوی متعلم دارالعلوم دیوبند ۱۳۸۵ھ

اگر شان تحریر سے نیز گزشتہ حالات وواقعات سے یہ یقین ہوجائے کہ یہ خط اسی کا ہے یا اسی کے حکم سے لکھا گیا ہے جب تو یہ حکم مذکور ہوگا۔ اور قرائن سے شبہ ہوجائے کہ شاید خط جعلی ہوتو اس کے پاس پھر خط لکھ کر تحقیق کر کے حکم لگایا جائے جلدی نہ کی جائے، فقط واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۸/ ۸۰ ۱۳ھ

ناجائز تعلق کے شبہ کی وجہ سے طلاق دینے اور بچہ کے نسب وپرورش سے متعلق:

زید کی بیوی جس کا فرضی نام مریم ہے، کچھ عرصہ قبل اپنے خاندان والوں سے مریم کا جھگڑا ہوا، مریم نے زید کی بیوی پر الزام لگایا کہ وہ کسی غیر مذہب کے آدمی سے ناجائز تعلق رکھتی ہے اور اس کا حمل بھی قرار پا گیا ہے زید کو اس کا علم نہیں تھا۔ کیونکہ وہ بمبئی میں ملازم تھا چھ ماہ کے بعد زید بمبئی سے گھر واپس آیا، ماہ اپریل میں دو ہفتہ اپنی بیوی کے پاس رہا جب زید کو اپنے رشتہ داروں سے یہ بات معلوم ہوئی کہ مریم جو زید کی بیوی ہے اس کو کسی غیر مذہب والے شخص سے ناجائز تعلق ہوگیا ہے اور حمل سے بھی ہے، زید نے اپنی بیوی سے اسی وقت علیحدگی اختیار کر لی، چنانچہ زید اپنی بیوی پر الزام لگاتا ہے اور زید اس کو قطعی طلاق دینا چاہتا ہے، لیکن پنچوں نے فیصلہ وضع حمل تک روک رکھا تھا ۱۷/ اکتوبر ۱۹۶۰ء کو بچہ پیدا ہوگیا ہے اور زید بمبئی

۱- فتاوی عالمگیری علی الخانیہ ۱/ ۳۷۸، مطبع رشیدیہ پاکستان۔

سے ۷/اپریل ۱۹۶۱ء اپنے مکان آیا ہے، اس لحاظ سے حمل اور پیدائش کے درمیان ۶ ماہ اور ۹ دن ہوتے ہیں عام طور پر بچہ نو ماہ میں پیدا ہوتا ہے زید ان حالات کیوجہ سے طلاق دینا چاہتا ہے۔

(۱) ان وجوہات وواقعات کی بناپر زید کا الزام زنا لگانا درست ہے یا کہ نہیں؟

(۲) اگر جرم عائد ہوجائے تو موجودہ زمانہ میں جب کہ ہمارے لئے شرعی عدالت میں کسی قسم کی سزا نہیں دی جاتی ہے۔اب کیا سزا دی جائے۔

(۳) مریم کی موجود اولاد کی پرورش کی ذمہ داری کس پر عائد ہوتی ہے؟

(۴) اب مریم کو مہر مل سکتا ہے یا نہیں؟

(۵) اگر اسی طرح کا جرم ثابت ہوجائے تو کیا شوہر کے ذمہ مہر واجب الاداء ہوسکتا ہے؟

الجواب وبالله التوفيق:

(۱) جب زید کے آنے کے بعد ۶ ماہ سے زائد پر بچہ پیدا ہوا تو زنا کی تہمت بلا دلیل شرعی لگانا جائز نہیں ہے، بچہ حلالی کہلائے گا اور زید ہی کی طرف منسوب ہوگا اور زید کے مال سے وراثت پائے گا (۱)، رہا طلاق تو مریم کے چال چلن کا اندازہ لگائے اگر وہ محتاط طریقہ سے رہتی ہے اور الزام بلا کسی حجت شرعی کے لگے ہیں تو الزام کی پرواہ نہ کرنا چاہئے اور طلاق نہ دینا چاہئے، کیونکہ طلاق بلا وجہ شرعی کے شریعت میں بڑی سخت چیز ہے خداوند قدوس کے غضب کا سبب ہے۔

(۲) سیاق وسباق سول سے ظاہر تو یہی ہے کہ یہ الزام بلا حجت شرعی محض جھگڑے کی بناء پر ہے، لیکن اگر شرعاً ثابت بھی ہوجائے تو کسی جسمانی یا مالی سزا کا اختیار صرف حکومت کو ہوتا ہے کسی اور کو نہیں ہوتا۔ایسی صورت میں مریم پر خود واجب ہے کہ وہ نہایت عاجزی اور ندامت کے ساتھ اللہ رب العزت کے دربار میں رو رو کر اپنے گناہوں کی معافی مانگے، توبہ واستغفار کرے اور کہے کہ اے اللہ اب ایسا نہیں ہوگا معاف کردیجئے اور واقعی آئندہ نہ کرنے کا دل سے عہد بھی کرلے۔

(۳و۴و۵) اگر مریم کو طلاق نہ دیا جب تو حکم ظاہر ہی ہے کہ جیسے اور ماں باپ کا حکم ہے ویسے ہی اس کا بھی۔اور اگر طلاق دیدے تو مدت حضانت کم وبیش ۷ برس تک یعنی جب تک بچہ خود تقاضائے حاجت اپنی طہارت ولباس پوشی نہ کرنے

۱- ''والقلها ستة أشهر إجماعا (فيثبت نسب) ولده'' (الدر المختار علی الرد ۵/۲۳۰، مکتبہ زکریا، جامع صغیر ۶۰، مطبع یوسفی لکھنؤ، ہدایہ ۲/۴۰۸، کتاب الطلاق مطبع یوسفیہ لکھنؤ، بدائع الصنائع ۳/۳۸۰، مکتبہ زکریا، فتاوی خانیہ علی الہندیہ ۱/۵۵۸، فتاوی ہندیہ ۱/۵۳۶، دار الکتاب دیوبند)۔

لگے تربیت وپرورش کا حق ماں کو ہے (۱) ، اور اس کا خرچہ باپ کے ذمہ ہے جب تک کہ ماں اپنی شادی بچے کے کسی غیر ذی رحم سے نہ کرے (۲)، اور مہر بھی زید کے ذمہ ہر حال میں واجب الاداء ہے جب تک مریم خود معاف نہ کردے (۳)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

بحالت غصہ طلاق چند بار کہنے کا حکم:

ایک شخص نے بحالت غصہ اپنی بیوی کو طلاق دے دی، اور دوسرے لواحقین اس بات کے گواہ بھی ہیں۔ طلاق میں تکرار بھی ہوئی ہے یعنی تین مرتبہ اس شخص نے طلاق کے الفاظ دُہرائے ہیں مگر اب غصہ اترنے پر وہ نہایت شرمندہ اور پریشان ہے، قریب کے مدرسہ جامعہ حسینیہ سے فتوی منگایا تو اس میں لکھا تھا کہ طلاق مغلظہ واقع ہوچکی ہے اب دوبارہ نکاح بغیر حلالہ کے جائز نہیں ہے۔ دوسرے ایک مولوی جو اہل حدیث میں سے ہے ان کا فتوی یہ ہے کہ غصہ کی حالت میں طلاق واقع نہیں ہوتی ہے، چاہے کوئی انسان سو مرتبہ یہ کہہ دے کہ طلاق دیدی۔ اب حکم شرع کیا ہے؟

الجواب وباللہ التوفیق:

صورت مسئولہ میں حسب تحریر سوال تین طلاق واقع ہوکر حرمت مغلظہ ہوگئی، اب دوبارہ نکاح بغیر حلالہ کئے ہوئے جائز نہیں ہے، حلالہ یہ ہے کہ وہ عورت بالکل اجنبی ہوگئی اس شوہر سے امید ختم کردے اور اس طلاق کی عدت (اگر حاملہ ہو تو وضع حمل ورنہ تین حیض) گزار کر کسی دوسرے شخص سے اپنا نکاح کرلے اور اس کے ساتھ رہے اس سے ہم صحبت ہو پھر وہ دوسرا شخص اگر بتقاضہ الٰہی فوت ہوجاوے یا کبھی طلاق دیدے اور یہ عورت اس طلاق کی عدت بھی (حسب طریق

۱- ''وإذا وقعت الفرقة بين الزوجين فالأم أحق بالولد لما روى ان امرءة الخ'' (ہدایہ ۲/ ۴۱۳ کتاب الطلاق، مطبع یوسفیہ لکھنؤ)، ''والام والجدة احق بالغلام حتى ياكل وحده ويشرب وحده ويلبس وحده لان تمام الاستغناء بالقدرة على الاستنجاء'' (ہدایہ ۲/ ۴۱۴، مطبع یوسفی لکھنؤ، وعلی ہامشہ ۴۱۴ اعتبار الغالب یعنی ان الصبي في الغالب اذا بلغ سبع سنين يستغني عن الحضانة..... عنایہ)۔

۲- ''والنفقة على الأب على ما المذكر، ولا تجبر الام عليه لانها عست تعجز عن الحضانة''؛ (ونفقۃ اولاد لصغار علی الاب لایشارکہ فیہا احد، (ہدایہ ۲/ ۴۱۳، ۴۲۳، ۴۲۴)،''وتجب النفقة بانواعها على الحر (لطفله) يعم الانثى والجمع'' (رد المحتار علی الدر ۵/ ۳۳۶، مکتبہ زکریا)۔

۳- ''المهر يتأكد باحد معان ثلاثة: الدخول والخلوة الصحيحة وموت احد الزوجين'' (ہندیہ ۱/ ۳۰۳، دار الکتاب)۔

مذکورہ سابق) گز ارلے اس کے بعد جا کرشوہر اول کے نکاح میں آسکتی ہے بغیر اس کے نہیں آسکتی، جس اہل حدیث مولوی نے فتوی دیا ہے کہ غصہ کی حالت میں طلاق واقع نہیں ہوتی ہے غلط ہے، صحیح نہیں ہے طلاق تو عموماً غصہ ہی کی حالت میں انسان دیتا ہے اور رضا وخوشی میں تو بہت ہی کم اس کا صدور ہوتا ہے۔ مدہوش کی طلاق البتہ واقع نہیں ہوتی ہے، اور صورت مسئولہ میں یہ شخص مدہوش نہیں ہے نیز بہت سے نصوص میں بحالت غصہ طلاق واقع ہونے کی تصریح ہے۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

غصہ میں اگر کوئی طلاق دے تو بلاشبہ واقع ہوجاتی ہے علامہ شامی نے ابن قیم کے رسالہ کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ طلاق غضبان کی تین صورتیں ہیں ایک یہ کہ غصہ ایسا ہو کہ عقل متغیر نہ ہو اپنے ارادے اور قول کا علم ہو ایسے غصہ میں اگر طلاق دیدے تو تفریق واقع ہوجائے گی اور عورت اس کے نکاح سے آزاد ہوجائے گی۔ دوسرے یہ کہ غصہ کا اس قدر غلبہ ہو کہ عقل مغلوب ہوجائے اپنے اقوال وافعال کی خبر نہ ہو تو یہ طلاق واقع نہ ہوگی (۱)۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

شوہر کا ''تجھ کو طلاق دے دیا'' تین بار کہنا:

صابرہ کا نکاح توحید خان کے ساتھ عرصہ پانچ سال کا ہوتا ہے ہوا تھا، اس درمیان میں کئی بار لڑکی اپنی سسرال گئی، لیکن اس کا شوہر اس کے ساتھ بہت سخت برتاؤ مارپیٹ کرتا ہے۔ ایک بار یہ کہہ کر کہ جا میں نے تجھ کو طلاق دیدیا ہے یہ الفاظ اس نے تین بار کہے اور مار کر گھر سے نکال دیا ہے، اس وقت سے صابرہ ماں باپ کے یہاں ہے اور اس عرصہ میں اس کا شوہر نہ تو لینے آیا ہے اور نہ تو صابرہ کے پاس اس کے شوہر کا کوئی اثاثہ ہے جس سے وہ اپنی زندگی بسر کرے، عورت جوان عمر ہے اندیشہ رسوائی کا ہے اگرچہ وہ طلاق بھی دے چکا ہے لیکن صابرہ کے پاس کوئی ثبوت نہیں ہے، شوہر سے کہا جاتا ہے کہ تم طلاق دیدو چار آدمیوں کے سامنے تو وہ اس سے بھی انکار کرتا ہے لہذا ایسے شوہر سے نجات کی کیا شکل ہے؟

۱- ''قلت وللحافظ ابن القیم الحنبلی رسالة فی طلاق الغضبان قال فیها: انه علی ثلاثة اقسام: احدها ان یحصل له مبادی الغضب بحیث لایتغیر عقله ویعلم مایقول ویقصده وهذا لا اشکال فیه، الثانی ان یبلغ النهایة فلا یعلم مایقول ولایریده فهذا لاریب انه لاینفذ شیء من اقواله الخ '' (ردالمحتار علی الدر ۴/ ۴۵۲، مکتبہ زکریا)۔

الجواب وباللہ التوفیق:

صورت مسئولہ میں اگر صابرہ نے خود اپنے کان سے تین بار شوہر کا یہ جملہ سنا ہے کہ (میں نے تجھ کو طلاق دیا) تو اب صابرہ کے لئے جائز نہیں ہے کہ تو حید خان کو کسی طرح بھی اپنے اوپر قابو پانے دے، بلکہ صابرہ پر واجب ولازم ہے کہ وہ شوہر سے الگ ہی رہے اور جس طرح بھی ممکن ہو اس سے چھٹکارا کرائے اور عیاناً بھی طلاق حاصل کرے، اگر ایسے طلاق نہ دے تو اپنا مہر وغیرہ معاف کر کے خلع کرائے یا بالاکراہ طلاق حاصل کرے۔ اگر تو حید خان سے کسی طرح بھی طلاق حاصل نہ کر سکے تو بلا تعلق ازدواجی قائم کئے اسی طرح پڑی رہے اور صبر کرے لیکن اگر بلا تعلق ازدواجی قائم کئے باعصمت زندگی گزارنی دشوار ہو تو صابرہ کو اختیار ہے کہ اپنا دوسرا نکاح کسی دوسرے شخص سے کرلے(۱)۔

”وكذلك إن سمعت أنه طلقها ثلاثا وجحد الزوج ذلك وحلف فردها عليه القاضي لم يسعها المقام معه“ (۲)۔

اور اگر تو حید خان کی جانب سے قانون حکومت کے گزند و پریشانی کا خطرہ ہو تو پہلے عدالت مجاز سے اپنا دوسرا نکاح کر لینے کی اجازت حاصل کرلے پھر دوسرا نکاح کرے۔ اور ظاہر ہے کہ چار سال سے اپنے باپ کے پاس میکہ میں بیٹھی ہوئی ہے اور اتنی طویل مدت میں تین حیض آ چکے ہوں گے، اس لئے اب مزید عدت گزارنے کی حاجت نہیں۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۸/۸/۱۴۰۹ھ

دومرتبہ طلاق دینے کے بعد منہ بند کردینے سے کتنی طلاق پڑی؟

حبیب نے اپنی عورت سے لڑائی کیا اور غصہ میں آ کر انہوں نے اپنی عورت کو دوبار طلاق دیدیا تیسری بار زبان سے کچھ نکلنے نہیں پایا تھا کہ ایک آدمی نے اس کا منہ بند کردیا ہے، پھر اس کی زبان سے صرف یہ لفظ نکلا کہ جاؤ میں تم کو ہر عدت

۱- کما فی العالمگیری ص ۳۱۳ ج ۵ کتاب الکراہیۃ۔

۲- ”إذا سمعت المرأة الطلاق ولم تسمع الاستثناء لا يسعها ان تمكنه من الوطي ...... والزوج يدعي الاستثناء ...... وفي فوائد شمس الاسلام لا يقبل قوله وفي الفصول وهو الصحيح“ (الی قولہ) قال شمس الائمة السرخسي: ما ذكرنا إذا هربت ليس لها ان تعتد وتتزوج بزوج آخر جواب القضاء اما فيما بينه وبين الله تعالىٰ فلها ان تتزوج بزوج آخر بعد ما اعتدت كذا في المحيط (شامی قدیم ۲/ ۷۰۳، مطبع عثمانیہ)۔

میں تینوں لڑکیوں کو دیدیا ہے، پھر تین آدمی اس وقت موجود تھے ایک مولوی عثمان نے بتلایا کہ جا کر اپنی عورت کو رجوع کرلو۔ تو آیا عند الشرع اس عورت پہ کیسی طلاق واقع ہوئی۔

اور یہاں کے مولوی یہ بھی کہتے کہ طلاق واقع ہوگئی ہے دریافت ہے کہ طلاق واقع ہوئی یا نہیں؟

الجواب وبالله التوفيق:

صورت مسئولہ میں حسب تحریر سوال محض دو طلاق رجعی واقع ہوئی تھیں جس سے رجوع کرنے کا حق شوہر کو رہتا ہے(۱)، چنانچہ جناب مولانا عثمان صاحب نے فوراً رجعت کرادی صحیح کیا اس رجعت سے پھر نکاح قائم ہوگیا۔ حلالہ وغیرہ کی ضرورت نہیں ہے، ہاں اب اگر آئندہ خدانخواستہ ایک بار بھی طلاق دے گا تو حرمت مغلظہ ہوجائے گی اور بغیر حلالہ کے میاں بیوی نہیں ہوسکیں گے(۲)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دار العلوم دیوبند سہارنپور

بیوی نے طلاق نامہ نہیں لیا جب بھی طلاق پڑ گئی:

میاں بیوی کا آپس میں کسی بات پر جھگڑا ہوگیا ہے وہ ناراض ہوکر اپنے میکہ چلی گئی، اس کے شوہر نے بذریعہ ڈاک طلاقنامہ کا کاغذ بھیج دیا ہے اور وہ کاغذ اس کی بیوی نے لیا نہیں ہے۔ اس صورت میں طلاق ہوگئی ہے یا کہ نہیں؟

الجواب وبالله التوفيق:

صورت مسئولہ میں بیوی نے اگرچہ طلاق نامہ کا وہ کاغذ نہیں لیا ہے لیکن حسب تحریر طلاق نامہ طلاق واقع ہوگئی (۳)،

۱- ’’فإذا طلق الزوج زوجته رجعيا حل له العود إليها في العدة بالرجعة دون عقد جديد فإذا مضت العدة عاد إليها بعقد جديد فقط‘‘ (الموسوعة الفقهية ۲۹/۲۹ وزارة الاوقاف والشئون الإسلامیہ)۔

۲- ’’الطلاق مرتان فإمساك بمعروف أو تسريح بإحسان‘‘ (سورۃ البقرۃ آیت: ۲۲۹)، ’’فإن طلقها فلا تحل له من بعد حتى تنكح زوجا غيره‘‘ (سورۃ البقرۃ ۲۳۰)۔

۳- ’’ثم المرسومة لاتخلو أما إن أرسل الطلاق بأن كتب أما بعد فأنت طالق فكما كتب هذا يقع الطلاق وتلزمها العدة من وقت الكتابة‘‘ (شامی ۴/۵۸۹، مطبع عثمانیہ)۔

پس طلاق نامہ دیکھنا چاہئے اس میں جیسی طلاق اور جتنی طلاق لکھی ہوں اتنی ہی اور ویسی ہی طلاق واقع ہوگئی۔فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

طلاق نامہ وصول نہ کرنے یا واپس آ جانے کے باوجود طلاق پڑ جاتی ہے:

پندرہ سالہ شادی شدہ بالغ زید نے کچھ گھریلو جھگڑے کی بناء پر اپنی منکوحہ بیوی کو جس کے بطن سے چار اولادیں ہیں کسی کے دباؤ میں آ کر بغیر کسی گواہ کے جو کہ دل سے نہیں چاہتا تھا بذریعہ رجسٹری طلاقنامہ روانہ کردیا ہے اور وہ طلاقنامہ دس پیسہ والے لفافہ پر تھا اب وہ گھر پر موجود نہیں ہے۔اس پر ڈاکیہ کے ہاتھ کا لکھا ہوا تھا واپس آ گیا ہے لفافہ بعینہ ویسے ہی بند تھا جیسے کہ اس نے روانہ کیا تھا کہیں کھولنے کا شبہ بھی ظاہر نہیں ہوا ہے، زید نے اس کے پیشتر رخصتی کے لئے دو نوٹس بھی روانہ کئے تھے جو کہ وصول ہو گئے تھے زید کو طلاقنامہ روانہ کرنے کا بے حد افسوس ہے کیا یہ طلاق واقع ہوئی یا نہیں؟

عبارت طلاقنامہ یہ ہے:

بذریعہ نوٹس ہذا آپ کو اطلاع دیجاتی ہے کہ ہم نوٹس دہندہ نے آپ کو طلاق دیدیا، طلاق دیدیا، طلاق دیدیا اور آپ کو اپنی زوجیت سے خارج کردیا ہے۔ان کے لئے عندالشرع کیا حکم ہے؟

الجواب وبا لله التوفيق:

طلاقنامہ کی عبارت دیکھی، اس عبارت کے مطابق تین طلاقیں واقع ہو کر حرمت مغلظہ ہوگئی، خواہ عورت کو اس کی اطلاع ہوئی ہو یا نہ ہوئی ہو، ڈاک وصول کی یا واپس کی، ان باتوں کا کوئی اثر اس طلاق پر نہیں پڑے گا (۱)۔

”ثم المرسومة لا تخلوا إما إن أرسل الطلاق بأن كتب أما بعد فأنت طالق فكما كتب هذا يقع الطلاق وتلزمها العدة من وقت الكتابة الخ“ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

۱- ”وإن كانت مرسومة يقع الطلاق نوىٰ أو لم ينو“ (شامی ۲/ ۵۸۹، مطبوعہ عثمانیہ)۔

شوہر کا طلاق دے چکا ہوں لکھنا:

بندہ گڑھی پختہ میں عرصہ پندرہ روز سے اجازت شوہر کے دہلی سے آگئی ہے، اس کے بعد دہلی سے بذریعہ ڈاک ایک خط ملا جس میں لکھا تھا کہ میں طلاق دے چکا ہوں۔ دونوں فریق سامنے ہونے پر کہتے ہیں کہ میں نے طلاق نہیں دی ہے، اس کے بارے میں علماء دین شرع کا کیا حکم ہے؟

الجواب وبالله التوفيق:

حسب تحریر سوال اگر واقعی شوہر نے یہ خط لکھا ہے تو طلاق واقع ہوگئی (۱) ، اگر تین طلاق اس میں نہیں لکھا ہے جیسا کہ خط سے ظاہر ہے بلکہ محض یہ لکھا ہے کہ میں طلاق دے چکا ہوں تو ایک طلاق رجعی واقع ہوگئی اور دونوں نے جب یکجائی کر لی تو رجعت بھی ہوگئی ہے اور حسب سابق دونوں میاں بیوی باقی رہ گئے ہیں۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۹/۸/۱۴۱۰ھ

دوسرے سے طلاق لکھوانے سے بھی طلاق پڑ جاتی ہے:

میرے داماد نے مجھے طلاقنامہ دیا ہے، میں ان کا خسر ہوں طلاقنامہ میں تحریر کیا ہے کہ میں اپنی رقیہ بی بی کو تین طلاق دیتا ہوں" فاروق علی علوی" دستخط انگریزی میں اس طلاقنامہ کے پیچھے مولوی حافظ ابراہیم سورت تحریر کیا ہے۔

جب طلاقنامہ میرے ہاتھ میں دیا تب میں نے چند سوالات کئے کہ معاملہ کیا ہے، بات کیا ہوئی ، طلاق دینے کا سبب کیا ہے، خلاصہ پوچھا کہ طلاقنامہ جب ہوا تو کون کون شاہد تھے، انہوں نے زبانی جواب دیا کہ دو تین آدمی تھے، مگر طلاق نامہ پر کسی شاہد کا دستخط نہیں ہے، یہ طلاقنامہ مجھے دیا اس وقت اس کی عورت بھی حاضر تھی، اس کو بھی یہ کہا نہیں کہ میں تجھے تین طلاق دیتا ہوں۔ آیا اس مسئلہ میں واقعی یہ طلاقنامہ صحیح اور شرعاً ہے یا کہ نہیں۔

(نوٹ) طلاقنامہ اگلے دن دیا گیا اس کے دوسرے روز اس کی نانی لڑکی کو لینے آئی ہے تب ہم نے اوپر کا خلاصہ کیا

۱- "ثم المرسومة لا تخلوا اما ان ارسل الطلاق فان كتب اما بعد فانت طالق فكما كتب هذا يقع الطلاق" (ہندیہ ۱/۳۷۸، الفصل السادس فی الطلاق بالکتابة، مطلب رشیدیہ پاکستان)، " وهو كانت طالق ومطلقة وطلقتك تقع واحدة رجعية" (ہندیہ ۱/۳۵۴، رشیدیہ پاکستان)۔

تھا کہ طلاقنامہ تحریر کرتے وقت وہاں دوتین شاہد موجود تھے اور اس نے نائی کو کہا تھا کہ وہاں کوئی موجود نہ تھا اور میں نے تین طلاق نہیں دی تھی، لڑکے کی عادت ہے کہ وہ پہلے دستخط کرتا ہے، اسی طرح اس نے پہلے دستخط کئے اس کے بعد طلاقنامہ جناب مولوی صاحب نے تحریر کیا لڑکا قسم کھا کر کہتا ہے کہ مجھے کسی قسم کا علم نہیں۔ اردو لکھنا پڑھنا بھی جانتا نہیں، عند الشرع کیا حکم ہے؟

الجواب وبالله التوفيق

تحریر سوال سے اتنی بات تو یقینی ہے کہ لڑکا اردو لکھنا پڑھنا نہیں جانتا ہے، اس لئے **مولوی** صاحب سے لکھوایا ہے۔

(۱) اور لڑکے نے خود تحریر اپنے خسر کو دیا یہ قرینہ ہے کہ اس لڑکے کو اس تحریر کے طلاقنامہ ہونے کا علم تھا۔

(۲) یہ بھی ظاہر اور متبادر ہے کہ لڑکے نے جو کہا ہے وہی **مولوی** صاحب **موصوف** نے لکھا ہے ورنہ لڑکا وہ تحریر **لا** کر اپنے خسر کو نہ دیتا، ہاں یہ محتمل ہے کہ لڑکے نے صرف طلاقنامہ لکھنے کے لئے کہا ہو اور **مولوی** صاحب **موصوف** نے تین طلاقیں لکھدی ہوں اور لڑکے کو اس تین طلاق کا علم نہ ہو۔

تحریر سوال سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ خسر کو دیتے وقت بیوی اگرچہ موجود تھی مگر طلاقنامہ لکھتے لکھاتے وقت بیوی وہاں موجود نہ تھی، یا تو دوسرے دوتین آدمی تھے یا کوئی دوسرا شخص سوائے **مولوی** صاحب (کاتب) کے موجود نہ تھا اور ایسی صورت میں لڑکے پر حلف دے کر پوچھا جائے کہ تین طلاق لکھے جانے کا علم لڑکے کو تھا یا نہیں، اگر نہیں تھا تو فقط ایک طلاق رجعی واقع ہوئی اور عورت سے عدت تین حیض کے اندر رجعت بھی کرسکتا ہے اور بعد عدت محض تجدید نکاح سے بلاحلالہ کے بھی تعلق زن وشوئی قائم کرسکتا ہے اور اگر تینوں طلاقوں کے علم نہ ہونے پر قسم نہ کھائے تو تینوں طلاقیں ہوکر حرمت مغلظہ ہوگئی، اب بغیر حلالہ کوئی صورت دونوں میں زن وشوئی کے تعلقات کے جواز کی نہیں ہے۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۸/۸/۱۴۱۰ھ

طلاق نامہ پر جبراً انگوٹھا نشان لینے سے طلاق نہیں پڑی:

ایک شخص نے اپنی لڑکی کی شادی کر کے ایک دومرتبہ روانہ کر کے پھر اس نے روک لیا اور کہا کہ طلاق دیدے، لڑکے کے دل میں اس کا خیال نہیں تھا لیکن لڑکی کے والد نے گھر بند کر کے طلاقنامہ پر انگوٹھہ لگوالیا ہے اور اس کو یہ معلوم نہ تھا

کہ کس چیز پر انگوٹھہ لگوا رہے ہیں، اس وقت اس کی نیت طلاق دینے کی نہیں تھی، کیا عندالشرع طلاق واقع ہوگئی ہے؟

الجواب وباللہ التوفیق:

اگر زبان سے الفاظ طلاق نہیں کہلوایا ہے، محض انگوٹھے کا نشان زبردستی لگوالیا ہے تو کوئی طلاق واقع نہیں ہوئی ہے (۱)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہٗ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبندسہارنپور ۲۲/۸/۱۴۱۰ھ

ختم کیا چند بار کہنے سے طلاق پڑی یا نہیں؟

کسی منکوحہ کا شوہر جو عرصہ آٹھ سال سے اپنی بیوی بچی کے نان ونفقہ سے بے نیاز ہو، اور اسے اپنے یہاں آباد نہ کرتا ہو۔

اس کی بیوی بچی کے ساتھ اپنے والدین کے یہاں رہتی ہو۔ نانا، نانی اپنی لڑکی اور نواسی کے نان ونفقہ میں کفیل ہوں تو ایسے شوہر کے لئے شرعی حکم کیا ہے؟ نیز منکوحہ کے شوہر سے آٹھ سال کے نان ونفقہ کا تقاضا برابر جاری ہے، مگر شوہر کو مطلق احساس نہیں ہے۔ مزید برآں شوہر اپنی سسرال میں آکر اپنی منکوحہ بیوی سے بآواز بلند مخاطب ہوکر یوں کہے کہ میں نے ختم کیا، ختم کیا۔ تین بار مسلسل یہی الفاظ کہے، جبکہ شوہر کا نظریہ بھی یہ ہو کہ اب اس کو آباد نہ کرے گا۔

تو کیا شوہر کی زبان سے بیوی کے سنے ہوئے الفاظ طلاق کے مترادف ہوگئے، شوہر سے پردہ لازم ہوگیا، اور یہ الفاظ سننے والوں میں سسرال میں سے گھر کا دوسرا آدمی بھی ہو، براہ کرم اس کے متعلق آپ فرمائیں کہ شرعی احکام کیا ہیں؟

الجواب وباللہ التوفیق:

شوہر کا یہ جملہ ''میں نے ختم کیا، ختم کیا'' اس بات کا قرینہ ہے کہ اس سے قبل خواہ عورت سے یا سسرال والوں سے کوئی سلسلہ کلام ضرور تھا، لہذا جب تک وہ بھی سامنے نہ ہو، محض اس لفظ ''میں نے ختم کیا'' پر اور محض شوہر کے نظریہ کی بنیاد پر

۱- ''رجل أکرہ بالضرب علی أن یکتب طلاق امرأتہ فلانۃ بنت فلان بن فلان فکتب امرأتہ فلانۃ بنت فلان وفلان طالق لاتطلق امرءتہ کذا فی فتاوی قاضی خان'' (ہندیہ ۱/۳۷۹، رشیدیہ پاکستان)۔

کوئی حکم نہیں لکھا جا سکتا، البتہ آٹھ سال سے حقوق زوجیت ادا نہ کرنا، نان ونفقہ نہ دینا، لاپرواہی برتنا یا ایسی حالت میں عورت کا بغیر شوہر رہنا اور باعصمت رہنا، اس کے لئے زندگی گذارنا دشوار ہو، تو عورت کو اختیار ہے کہ اگر مسلمان حاکم موجود ہو تو اس کی عدالت میں درخواست دے کر شوہر کی لاپرواہی اور حقوق زوجیت کی اور نان ونفقہ کی عدم ادائے گی یا اپنا بغیر شوہر باعصمت زندگی گذارنا دشوار ہونا بتلا کر فسخ نکاح کی درخواست کرے، پھر وہ حاکم شوہر کو مطلع کر کے اس کو طلب کرے اور دعویٰ عورت کا صحیح ثابت ہو جائے تو شرعی اصول وضوابط کے مطابق پوری تفتیش وتحقیق واقعہ کر کے فسخ نکاح کا فیصلہ دے دے۔ پھر عدت گذار کر دوسرا نکاح کر لینا عورت کو جائز رہے گا۔ اور اگر ایسا مسلمان حاکم موجود نہ ہو تو یہ کام شرعی کمیٹی (جماعت مسلمین جو شرعا قاضی کے قائم مقام ہوتی ہے) اس سے رجوع کرے اور سارے حالات اس کے سامنے رکھے، شرعی کمیٹی شوہر کو طلب کر کے اس سے یہ کہے کہ یا تو تم قاعدہ سے اسے آباد کر دیا طلاق دے کر آزاد کرو۔ اگر تم نے ان دونوں باتوں میں سے کوئی بات نہیں کی تو کمیٹی تمہاری طرف سے طلاق قرار دے گی، اور ان دونوں باتوں پر عمل کے لئے ایک مناسب مدت مذکور گزر جائے اور عورت اس مقررہ مدت کے گزر جانے کے بعد شرعی کمیٹی سے پھر تفریق واقع کرنے اور طلاق قرار دینے کی درخواست کرے اور شرعی کمیٹی تفریق واقع کر دے اور طلاق قرار دیدے تو شرعا طلاق واقع ہو جائے گی۔ اور عدت گزار کر دوسرا نکاح کر لینا عورت کو جائز ہو جائیگا۔ مگر ایسی صورت میں وقتی قانونِ حکومت کی زد سے بچنے کے لئے عورت کو عدالت مجاز سے حق خودمختاری حاصل بھی کر لینا چاہئے۔ عدالت مجاز سے اور شرعی کمیٹی سے تفریق شرعی اور فسخ نکاح حاصل کرنے کے اصول وضوابط مفصل طور پر رسالہ ''حیلۂ ناجزہ'' میں مذکور ہیں، اس کو سامنے رکھ کر عمل کیا جاوے، بوقت عمل دارالافتاء سے معلوم کیا جاوے۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

تو آزاد ہے، آزاد ہے، تجھے طلاق ہے، تجھے طلاق کہنے کا حکم:

ایک عورت نے اپنے شوہر سے کہا کہ مجھ کو ایک مکان الگ دیدیجئے۔ شوہر نے کہا کہ میرے پاس الگ مکان کی گنجائش نہیں ہے اور نہ ابھی میں کما کر کھلا سکتا ہوں، اس پر عورت نے کہا کہ میں خود کما کر کھا لوں گی، پھر اس عورت نے یہ لفظ کہا کہ میں تمہاری جھوٹی کی تچی کر دوں گی (یعنی کہ تم اپنے لڑکے کی بیوی سے غلط کام کرتے ہو) پھر شوہر نے اس عورت کو ماں کی گالی دی، اس پر عورت نے بھی شوہر کو گالی دی، پھر شوہر نے اس کے حقے کی نے اس پر دے ماری، اس نے شوہر کو دھکا

دے دیا۔پھرشوہر نے کہا کہ میرے سے تو آزاد ہے۔آزاد ہے تین مرتبہ کہہ دیا،لیکن دل میں طلاق کا ارادہ بالکل نہیں تھا،پھر اس کے بعد دومرتبہ کہا کہ تجھے طلاق ہے، تجھے طلاق ہے اور کہتے ہیں کہ مجھے دوہی مرتبہ یاد ہے، واللہ اعلم

الجواب وباللہ التوفیق :

طلاق دینے کے موقع میں بیوی کو یہ جملہ (تو آزاد ہے) کہنا عرف عام میں طلاق صریح دینے کے معنی میں مستعمل ہوتا ہے اور طلاق صریح بلانیت سے بھی واقع ہوجاتی ہے،لہذا صورت مسئولہ میں تین طلاق واقع ہو کر حرمت مغلظہ ہوگئی اور عورت نکاح سے بالکل نکل گئی۔ اور عورت کو حق ہوگیا کہ وہ عدت (تین ماہواری) گزار کر جس دوسرے مرد سے چاہے اپنا نکاح کرسکتی ہے۔پھر یہ دوسرا مرد اس عورت سے ہمبستری کرلینے کے بعد طلاق دیدے یا مرجائے اور اس عورت کی عدت جو اس دوسرے مرد سے لازم ہوئی تھی ختم ہوجائے، اس کے بعد پھر یہ عورت اگر چاہے تو اس سابق مرد سے جس نے تین طلاق دیدی ہیں اپنا نکاح کرکے رہے،بغیر اس حلالہ کے اور کوئی صورت ان دونوں میں ازدواجی زندگی کی گنجائش نہیں رہی (۱)۔فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی،مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۷/ ۱۲/ ۱۴۱۰ھ

شوہر کا کہنا فارغخطی لے جاؤ سے طلاق کا حکم:

میں اپنی لڑکی کو اس کی سسرال سے رضامندی کے ساتھ لے آیا، جس کو عرصہ ڈیڑھ سال ہوگیا ہے اور انہوں نے جہیز کے بارے میں مجبوری دکھلائی کہ جہیز یعنی زیور زمین کے اندر دفن کردیا ہے کہ ہم آٹھ روز میں وہیں جہیز پہنچادیں گے، میں نے کہا کہ کوئی بات نہیں لڑکی کو میرے ساتھ رضامندی سے بھیج دیا، میں لے کر گھر کو چلا آیا ہوں، اس کے آٹھ روز بعد لڑکے نے اپنی والدہ سے یہ خبر بھیج دی کہ ہم لینے نہیں آئیں گے، ایک مہینے تک انتظار کیا اسکے بعد خبر دی کہ اپنی بیوی کو لے جائے تو انہوں نے صاف انکار کردیا کہ ہم دوسری شادی کریں گے اس کو نہیں لائیں گے، پھر ہم نے دوسرا آدمی بھیجا تو اس کو کہا کہ ہم سے فارغخطی لیجاؤ ہم نہیں لائیں گے اور دوسری شادی کریں گے جس کو عرصہ چھ مہینے کا ہوگیا ہے، دوسری شادی بھی کرلی۔

۱- "وإن كان الطلاق ثلاثا في الحرة.....لم تحل له من بعد حتى تنكح زوجاً غيره نكاحا صحيحا ويدخل بها ثم يطلقها أو يموت عنها كذا في الهداية" (الفتاوی الہندیہ ۱/ ۴۷۳)۔

ہم نے اس سے کہا کہ تم لڑکی آزاد کردو اس کے جواب میں انہوں نے کہا کہ ہم تو آزاد کر چکے ہیں، لاؤ ہم اس کا کاغذ لکھدیں اور فارغخطی لے لو، ہم لے جانا نہیں چاہتے ہیں، ایسی حالت میں طلاق ہوئی یا کہ نہیں۔

الجواب وباللہ التوفیق:

آپکی تحریر سے صاف طور سے یہ نہیں معلوم ہوتا ہے کہ یہ جملہ (ہم آزاد کر چکے ہیں الخ) کس نے کہا ہے، شوہر نے خود کہے ہیں، یا اس کے گھر والوں نے کہے ہیں، اگر یہ جملہ خود شوہر نے کہا ہے تو لڑکی پر طلاق واقع ہوگئی اور لڑکی آزاد ہوگئی اور اگر یہ جملہ خود شوہر نے نہیں کہا ہے تو عورت پر کوئی طلاق نہیں پڑی۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۴/۷/۸۵ ۱۳ھ

میں تم کو رکھوں تو ماں کو رکھوں یا بیٹی کو رکھوں کہنے سے طلاق نہیں پڑی:

زید نے اپنی بیوی ہندہ کو اپنے گھر دو تین آدمیوں کے سامنے یہ کہا کہ اگر میں تمکو رکھوں تو اپنی ماں کو رکھوں صرف دو مرتبہ یہ لفظ کہکر بیوی سے جدا ہوکر دوسری جگہ رہنے لگا ہے، لیکن ایک ہفتہ کے بعد جب ہندہ زید کو بلانے آئی تو پھر زید نے کہا کہ جا اگر تمکو رکھوں تو اپنی بیٹی کو رکھوں اگر تمکو میں رکھوں تو اپنی بیٹی کو رکھوں، اس کا اقرار زید اور ہندہ دونوں کو ہے اس موقع پر کوئی گواہ نہیں تھا۔ بینوا وتوجروا۔

الجواب وباللہ التوفیق:

زید کا یہ جملہ (اگر تمکو رکھوں تو اپنی ماں کو رکھوں) نیز یہ جملہ (اگر تمکو رکھوں تو اپنی بیٹی کو رکھوں) یہ دونوں جملہ لغو اور بیہودہ کلام ہے، ایسا کہنا جائز نہیں باعث گناہ ہے، اس لفظ سے نہ تو ظہار ہوتا ہے، کیونکہ ظہار کے لئے تشبیہ شرط ہے(۱) کما صرح بہ فی رد المحتار ج ۲ باب الظہار، اور نہ یہ لفظ طلاق صریح یا کنایہ کے الفاظ میں سے شمار کیا ہے کما ھو ظاہر، اس لئے ان جملوں سے نہ طلاق واقع ہوئی اور نہ ظہار ہوا، عالمگیری میں ہے: ''لو قال ان وطئتک وطئت امی لا شئی علیه

۱- ''وشرعا (تشبیه المسلم) فلا ظهار للمعي عندنا (زوجته) ولو كتابية أو صغيرة أو مجنونة (أو) تشبيه مايعبر به عنها من أعضائها، أو تشبيه (جزء شائع منها بمحرم عليه تابيدا)'' (الدر المختار علی الرد المحتار ۳/ ۴۶۷)۔

كذا فی غاية السروجی" (۱)۔

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

الجواب صحیح: محمود غفی عنہ، سید احمد علی سعید

صحت حلالہ کے لئے شوہر ثانی کا وطی کرنا ضروری ہے؟

حامد علی نے اپنی بیوی حمیدہ کو ۳ طلاق دیا، عدت کے بعد اسی حمیدہ سے حامد علی کے چچیرے بھائی جابر علی نے بغرض حلالہ نکاح کیا لیکن حمیدہ اور جابر علی کے مابین اس نکاح کے بعد کبھی خلوت نہیں ہوئی ہے، اس کے چند ماہ بعد جابر علی نے پھر حمیدہ کو ۳ طلاق دیا ہے، عدت کے گذرنے کے بعد حمیدہ نے اپنے زوج اول حامد علی سے دوبارہ نکاح کرلیا، واضح رہے کہ یہ صورت حلالہ کی حامد علی کے ایماء پر تھی، طلاق دینے کے بعد ایک دوسرے سے پھر سے دل خوش کرلیا تھا اور پھر سے وابستگی چاہتے تھے، اس لئے یہ حیلہ بنایا تھا، اب دریافت طلب یہ امور ہیں کہ یہ صورت حلالہ کی صحیح ہوئی یا کہ نہیں ہوئی ہے جبکہ جابر علی نے حمیدہ سے وطی نہیں کیا ہے اور نہ ہی خلوت ہوئی ہے، اب اگر وہ حمیدہ کسی اور سے نکاح کرنا چاہے تو کیا اس کو بھی طلاق کی ضرورت اور احتیاج ہے، فی الحال حمیدہ کے لئے احکام شرع کیا ہیں اور اس کی اس اولاد کے لئے جو اس حلالہ کے بعد پیدا ہوئی ہے کیا حکم ہے؟

الجواب وبالله التوفيق:

حلالہ میں شوہر ثانی کا صحبت کرنا شرط ہے، لہذا یہ حلالہ جو جابر علی نے کیا ہے حسب تحریر سوال صحیح نہیں ہوا ہے، حمیدہ پر واجب ہے کہ وہ حامد علی سے فوراً علیحدہ ہوجاوے اور عدت طلاق گذار کر کسی دوسرے شخص سے اپنا نکاح کر کے اس کے پاس رہے اور اس سے ہم صحبت ہو پھر اگر وہ دوسرا شخص فوت ہوجاتا ہے یا طلاق دیدے تو اب اس کے بعد عدت گذار کر حامد علی سے نکاح کرنا درست ہوگا۔

حامد علی سے اس دوران میں جو اولاد ہوئی ہے وہ ثابت النسب قرار پائے گی، اس لئے کہ ممکن ہے کہ حامد علی کو اس مسئلہ کا علم نہ ہو کہ حلالہ میں وطی شرط ہے، اس لئے یہ نکاح فاسد اور وطی بالشبہ ہوئی ہے اور وطی بالشبہ میں نسب ثابت ہوتا

۱- الفتاوی الہندیہ ۱/ ۷۵۰، مکتبہ رشیدیہ

ہے(۱)، نیز حامد علی پر واجب ہے کہ وہ فوراً حمیدہ سے متارکت کر کے الگ ہوجاوے اور زبان سے کہدے کہ میں نے تم سے متارکت کرلی یا کہدے کہ میں نے تمکو چھوڑ دیا، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۵/۷/۸۵ ۱۳ھ

الجواب صحیح محمود دعفی عنہ، سید احمد علی سعید

شوہر کا جہاں تمہاری مرضی ہو اپنی لڑکی کا نکاح کردو کہنا:

ایک لڑکی کی شادی ہوئی تھی یعنی انکی لڑکی ہمارے یہاں آئی اور ہماری لڑکی انکے یہاں گئی، غرض ایک لڑکی کے تبادلہ میں روپیہ بھی دیا، زیور اور کپڑا بھی دیا اور لڑکی دی بعد شادی کے وہ اپنی لڑکی کو لے گئے اور ہماری لڑکی بھیجنے کو انکار کردیا ہے، معلوم ہونے پر ہم وہاں گئے اور ان سے کہا تو یہ جواب دیا کہ تم بھی جہاں تمہاری مرضی ہو اپنی لڑکی کا نکاح کردو نہ ہم لائیں گے اور نہ ہمکو لڑکی کی ضرورت ہے، جس کو عرصہ کافی ہوگیا ہے، اب ہماری لڑکی پر طلاق ہوئی یا کہ نہیں؟

الجواب وباللہ التوفیق:

سوال میں تحریر کردہ جملہ کہ تم بھی جہاں تمہاری مرضی ہو اپنی لڑکی کا نکاح کردو نہ ہم لائیں گے اور نہ ہمکو تمہاری لڑکی کی ضرورت ہے اگر خود لڑکی کے شوہر نے کہے ہیں تو لڑکی پر طلاق واقع ہوگئی (بشرطیکہ اس جملہ سے شوہر کی نیت طلاق کی ہو) ”ومالینبغی الازواج تقع واحدة بائنة إن نواها“ (۲)، عدت تین حیض گذار کر جہاں چاہے اپنا نکاح کرسکتی ہے اور اگر شوہر نے خود یہ جملہ نہیں کہیں ہیں محض اس کے گھر والوں نے کہا ہے تو لڑکی پر کوئی طلاق واقع نہیں ہوئی، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۳/۷/۸۵ ۱۳ھ

۱- ”بخلاف الفاسد فانه وطئ بشبهة فيثبت به النسب“ (شامی ۴/۶۸۷، مکتبہ فیض القرآن)۔

۲- الفتاوی الہندیہ ۱/۳۷۵۔

حلالہ کا طریقہ:

زید اپنی بیوی کو طلاق (تین طلاق) دے دیتا ہے اور اسی عورت کو ایک سال کے بعد اپنے نکاح میں لاتا ہے وہ پھر طلاق دے دیتا ہے اور یہ فعل بار بار دہراتا رہتا ہے، ایسی حالت میں نکاح مع حلالہ کے جائز ہے یا نہیں؟ نکاح اور حلالہ کے بارے میں تفصیل سے تحریر فرمائیں، اور حلالہ رشتہ دار یا غیر رشتہ دار سے جائز ہے یا نہیں؟ اور حلالہ کیسا ہے؟

عبدالحق (مینٹرل ملنگ آدم بلڈنگ، پیلان بھوپال)

الجواب وبالله التوفيق:

تین طلاق کے بعد اگر عورت عدت طلاق گذار کر دوسرے مرد سے نکاح ذہمبستری کراکے پھر اس سے طلاق واقع ہونے کے بعد عدت طلاق گذار کر یا اس دوسرے شوہر سے بیوہ ہو کر عدت وفات گذار کر اس پہلے تین طلاق دینے والے شخص سے حسب قاعدہ وشرع گواہوں کے سامنے نکاح کرے تو اس کے لئے شرعاً حلال وجائز ہوگی، ورنہ اگر اس میں ذرا بھی فرق ہوا تو حلال نہ ہوگی حرام ہی رہے گی۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

ایک دو تین کہتے ہیں، جواب دے دیا سے کون سی طلاق پڑی؟

زید کی بیوی ہندہ کسی رنجش کی وجہ سے زید کے گھر سے چلی گئی ہے، ہندہ کے ماموں کا گھر وہیں ہے جہاں زید کا گھر ہے۔ زید کو شک ہوا تو زید اپنی والدہ کو لے کر ہندہ کے ماموں کے گھر گیا، دریافت کرنے پر ہندہ کے ماموں نے لاعلمی ظاہر کیا، زید کو غصہ آیا زید نے بحالت غصہ اپنی والدہ سے کہا گھر چلو ہم ایک دو تین کہتے ہیں، جواب دیدیا ہے، کون ہم سے دین مہر لیتا ہے یہ کہتا ہوا گھر آیا، پھر بھی زید ہندہ کی تلاش میں رہا قریب چار ماہ بعد ہندہ اپنے ماموں کے یہاں آئی ہے، زید کو معلوم ہوا زید ہندہ کے ماموں کے یہاں گیا کہ ہندہ کو رخصت کردو، ہندہ کے ماموں نے کہا کہ تم نے طلاق دیدیا ہے، زید نے کہا کہ ہم نے لفظ طلاق استعمال نہیں کیا تھا، بلکہ لفظ جواب کہا تھا ہندہ کے ماموں نے کہا ہاں لفظ جواب کہنے سے بھی طلاق ہوگیا، عندالشرع طلاق ہوئی یا کہ نہیں ہندہ کا ماموں کہتا ہے کہ طلاق ہوگئی ہم دوسری جگہ نکاح کردیں گے۔

الجواب وباللہ التوفیق:

سوال کی اس عبارت میں ہم ایک دو تین کہتے ہیں جواب دیدیا کون ہم سے دین مہر لیتا ہے۔لفظ جواب دیدیا طلاق کنائی کے الفاظ میں سے ہے، بحالت غضب بلا نیت کے بھی طلاق واقع ہوجاتی ہے (کما فی الدر المختار ص ۲۷۸)(۱) اور یہاں تو قرائن موجود ہیں

لہٰذا صورت مسئولہ میں ایک طلاق بائن واقع ہوگئی ،جس کا حکم یہ ہے کہ عورت نکاح سے بالکل نکل گئی، اگر عورت پھر اپنی مرضی اور خوشی سے اسی شوہر کے ساتھ تعلق ازدواجی قائم کرنا چاہے تو صرف نکاح جدید کے ساتھ کرسکتی ہے۔اور اگر عورت اس شوہر کے ساتھ نہ رہنا چاہے تو جب سے لفظ جواب دیدیا کہا ہے اس وقت سے عدت تین حیض اور اگر حاملہ ہو تو وضع حمل گزارنے کے بعد اپنا دوسری جگہ جہاں چاہے نکاح کرسکتی ہے۔سابق شوہر کا اب اس سے کوئی تعلق نہیں ہے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

شوہر کا کہنا ہے آزاد کردوں گا کہا، گواہان آزاد کردیا بیان کرتے ہیں تو کیا حکم ہے؟

زید اپنی سسرال میں گیا وہاں جاکر زید اور زید کے سالے میں کچھ گفتگو ہوئی جس کی وجہ سے زید کو کافی تکلیف پہنچی، زید نے وہاں سے آکر کسی اور آدمی کے سامنے کہہ دیا کہ اگر میرے سالے کی یہی حرکت رہی اور وہ میرے ساتھ اس طرح سے لڑتا رہا تو میں اس کی بہن کو آزاد کردوں گا وہاں پر دو آدمی تھے، زید حلفیہ بیان دے رہا ہے کہ میں نے فقط ایک دفعہ یہ جملہ کہا ہے کہ آزاد کردوں گا اور کچھ نہیں کہا ہے وہ دو آدمی جن کے سامنے یہ بات ہوئی وہ کہہ رہے ہیں کہ زید نے یہ کہا ہے کہ میں نے اپنے سالے کی بہن کو آزاد کردیا۔آزاد کردیا (وہ شاہد یہ کہتے ہیں)اور زید اوپر والا جملہ کہہ رہا ہے تو اس صورت میں شاہدوں کے کہنے سے طلاق واقع ہوگئی یا کہ نہیں؟

۱- ’’الکنایات لا تطلق بها قضاء إلا بنیة أو دلالة الحال) وهي حالة مذاکرة الطلاق أو الغضب‘‘(شامی ۲/۵۹۳، ج ۳، مطبع عثمانیہ)۔

الجواب وباللہ التوفیق:

صورت مسئولہ میں حسب تحریر سوال جب دو شاہد یہ کہہ رہے ہیں کہ زید نے آزاد کردیا کا جملہ دوبار کہا ہے تو اگر چہ زید اس کا انکار کرتا ہے مگر دو طلاق رجعی واقع ہوگئی، جس کا حکم یہ ہے کہ زید عدت (تین حیض) کے اندر اندر رجعت کرے، یعنی اپنی طلاقیں واپس لے لے تو زید کی بیوی حسب سابق زید کی بیوی رہ جائے گی، البتہ آئندہ اب زید محض ایک ہی طلاق کا مالک رہ جائے گا، جس کا اثر یہ ہوگا کہ اگر خدانخواستہ پھر کبھی زید ایک دفعہ بھی طلاق دیدے گا تو تینوں طلاقیں پڑ کر حرمت مغلظہ ہوجائے گی، ابھی تک حرمت مغلظہ نہیں ہوئی ہے، رجعت سے بیوی رہ جائے گی(۱) فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

شوہر کا زن وشوئی کے تعلقات نہ رکھنا کہنا:

زید کے تعلقات اپنی بیوی سے ٹھیک نہیں رہتے تھے۔ جس کی بناء پر اس نے اپنے دل میں طے کرلیا تھا کہ وہ اب اپنے تعلقات اس عورت سے زن وشوئی نہیں رکھے گا۔ اس نیت کا اظہار زید نے اپنے احباب سے وقتاً فوقتاً کیا، ایسی نیت کئے اس کو آٹھ ماہ ہوگئے ہیں اور زید نے اپنی نیت کی پابندی بھی کی ہے اور بیوی سے نہیں ملا ہے اور بود و باش بھی علیحدہ اختیار کرلیا ہے، اب اس کے احباب اس کو مجبور کررہے ہیں کہ زید اپنی بیوی سے مل کرلے اور زن وشوہر کے تعلقات قائم کرے۔ اس نیت کا اظہار زید نے اپنی بیوی سے نہیں کیا ہے، بلکہ اس کا پختہ ارادہ دل میں قائم کرلیا ہے، اس صورت میں شرعی کیا حکم ہے؟

الجواب وباللہ التوفیق:

زید نے اگر اپنی زبان سے بھی قطعیت کے ساتھ کہہ دیا ہے کہ اپنی زوجہ کے پاس نہیں جائے گا یا اس مضمون پر قسم کھا لیا ہے تو اگر چہ بیوی کو اس کا علم نہ ہوا ایلاء ہوگیا ہے، اس کی وجہ سے چار ماہ سے زائد گزرنے پر ایک طلاق بائن واقع ہوجائے گی اور تعلق زن قائم کرنے کے لئے بغیر حلالہ کے محض پھر سے نکاح پڑھا کر تعلق زن قائم کرنا جائز ہوگا۔

۱- ''الطلاق مرتان فإمساک بمعروف أو تسریح باحسان''(سورہ بقرہ/۲۲۹)،'' فإن طلقها فلا تحل له من بعد حتی تنكح زوجا غيره''(سورہ بقرہ/۲۳۰)۔

اور اگر یہ جملہ کہ تعلق زن قائم نہیں کرے گا، اس پر قسم نہیں کھائی تھی اور یمین نہیں بنایا تھا بلکہ محض دل ہی دل میں تہیہ اور ارادہ کیا تھا تو ابھی اس کی بیوی پر کوئی طلاق واقع نہیں ہوئی ہے، بلا کسی جدید نکاح کے بھی اس کو اپنے ساتھ لا سکتا ہے اور تعلق زن وشوئی بھی قائم کرسکتا ہے (۱)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۷/۸/۱۴۱۰ھ

الجواب صحیح سید احمد علی سعید نائب مفتی دارالعلوم دیوبند

زوجین میں نا اتفاقی کی وجہ سے طلاق نہیں پڑی:

زید کی بیوی زینب اپنے گھر میں تھی، زید پردیس سے آکر اپنی بیوی کو لانے گیا، اہلیہ نے آنے سے انکار کیا کہ میں تمہارے باپ کے گھر نہیں جا سکتی ہوں، مجھکو وہاں تکلیف ہوتی ہے، زید نے بہت سمجھایا مگر وہ اپنی ضد پر رہی، زید خود اپنی اہلیہ کو پکڑ لایا چونکہ زید اور اس کی زوجہ کی والدہ کا گھر متصل ہے، زینب گھر بھاگ گئی اب وہاں رہتی ہے، زید کی والدہ اور زید کی بیوی میں اتفاق نہیں ہے۔ اب اس حالت میں زید کا نکاح زینب کے ساتھ رہا یا کہ نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب وباللہ التوفیق:

صورت مسئولہ میں زید کی بیوی زینب پر کوئی طلاق نہیں واقع ہوئی، نکاح میں باقی ہے، البتہ چونکہ بھاگ کر بلا اجازت گئی ہے اس لئے نان نفقہ کی مستحق نہیں ہے (۲)، لیکن زید پر بھی واجب ہے کہ اپنی بیوی کو الگ کمرہ دے، چاہے بقیہ گھر مشترک رکھے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۴/۸/۱۴۱۰ھ

۱- ’’قوله هو لغة اليمين، قوله: وشرعا الحلف ..... ولهذا قال في الفتح: وفي الشرع هو اليمين على ترك قربان الزوجة أربعة اشهر فصاعدا بالله تعالى‘‘ (شامی ۲/۲۴۹، مطبوعہ عثمانیہ)۔

۲- ’’قال الشامي تحت قوله (وركنه لفظ مخصوص) هو ماجعل دلالة على معنى الطلاق من صريح أو كناية (لاخارجة من بيته بغير حق) وهي الناشزة حتى تعود‘‘ (شامی ۲/۸۹۰ مکتبہ عثمانیہ) ’’النفقة واجبة للزوجة على زوجها مسلمة كانت او كافرة إذا سلمت نفسها إلى منزله فعليه نفقتها وكسوتها وسكناها‘‘ (ہدایہ ۲/۴۳۷)۔

عدالت سے خودمختاری حاصل کرنا:

ایک عورت نے بہت ہی مجبوری اور تکلیف سے مجبور ہوکر اپنے شوہر سے جس نے کئی مرتبہ طلاق دی تھی، وہ عورت کے قائل نہ تھا، علیحدہ ہوکر درخواست خودمختاری عدالت سے دے کر خودمختاری حاصل کرلی ہے کہ جس سے چاہے نکاح کرے۔

(۱) کیا اس عورت سے بغیر عدت نکاح درست ہے؟

(۲) اگر عدت ہے تو اخراجات کس کے ذمہ ہیں؟

(۳) طلاق اس کے شوہر نے ایک سال دو مہینے قبل دیدی تھی۔ بینوا توجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

اگر حاکم عدالت غیر مسلم ہو یا مسلم ہی ہو لیکن شرعی قاعدہ کے مطابق فسخ نکاح نہ کرے تو یہ اجازت خودمختاری شرعی نہیں ہوگی اور نہ معتبر ہوگی، بلکہ ایسی صورت میں قاضی شرعی کے قائم مقام جماعت مسلمین سے بھی تفریق شرعی حاصل کرنی ضروری ہے البتہ سوال کا یہ جملہ (اپنے شوہر جس نے کئی مرتبہ طلاق دی تھی) اگر شوہر نے تین بار طلاق دیدی تھی تو اس طلاق کی عدت (تین حیض) گزارنے پر جہاں چاہے دوسرا نکاح کرسکتی ہے اور اگر تین طلاق سے کم دی تھی تو سوال نمبر ۳ کے مطابق جب طلاق دینے کے بعد جس کو ایک سال دو ماہ ہوا اور بعد طلاق ۶ ماہ وہیں رہی، میاں بیوی کی طرح رہی تو رجعت بھی ہوگئی، اب آٹھ ماہ سے علیحدہ ہے مگر نکاح قائم ہے اور عدالت سے خودمختاری شرعی نہیں ہے بلکہ جماعت مسلمین کے ذریعہ تفریق کرالے اور پھر حکم تفریق کے بعد سے عدت گزار کر دوسرا نکاح کرسکتی ہے اور اس عدت کا خرچہ شوہر پر عائد ہوگا۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۹/۸/۱۴۱۰ھ

میرا تم سے کوئی واسطہ نہیں ہے کہنے سے طلاق:

زید نومسلم ہے اور اس کی بیوی بھی نومسلمہ ہے، ۱۹۵۵ء میں شادی ماں باپ کے رسم ورواج سے بلا مہر کے ہوئی تھی، بالغ ہونے پر دونوں مشرف باسلام ہوئے، زید ایک لڑکی کے باپ ہونے کے بعد زید کی بیوی کی نافرمانیوں سے تنگ

آ کر اور سخت پریشان کرنے پر چھوڑنے کی نیت سے یہ الفاظ کہا کہ میں تجھے رکھنا نہیں چاہتا ہوں، میرا تم سے کوئی واسطہ نہیں ہے، پنچایت میں فیصلہ ہوا کہ دوسو روپیہ مہر دے کر علیحدہ کردو، زید اس فیصلہ پر راضی ہوگیا ہے، لیکن زید کی بیوی علیحدہ ہونے سے ناراض ہے، وہ ہرگز زید اور بیٹی سے جدا ہونا نہیں چاہتی اور وہ علیحدہ ہوگی تو مرتد ہونے کا امکان اور علیحدہ ہونے پر بہت بڑا فتنہ پہنچنے کا اندیشہ ہے، زید کی بیوی معافی چاہتی ہے کہ آئندہ نافرمانی نہیں کروں گی، زید پریشان ہے کہ اگر وہ مرتد ہو جائے تو زید بھی گنہگار ہوگا اگر رجوع نہ کرنا چاہے، اگر طلاق ہوئی تو کونسی طلاق ہوئی، آیا شرعی احکام سے جائز ہے یا کہ نہیں؟

الجواب وبالله التوفيق:

صورت مسئولہ میں حسب تحریر سوال فقط ایک طلاق بائن واقع ہوئی (۱)، اگر دونوں پھر زن وشوئی کے تعلق قائم کرنا چاہتے ہیں تو دونوں میں پھر سے جدید نکاح پڑھا دیا جائے۔ ان دونوں کے درمیان نکاح پڑھانے کے لئے عدت گزارنی بھی شرط نہیں ہے جب چاہے آپس میں نکاح کر سکتے ہیں(۲)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی مفتی دارالعلوم دیوبند ۲۴/ ۱۰/ ۱۳۸۵ھ

بیوی کو میں نے تم کو چھوڑ دی تو میرے کام کی نہیں کہنا:

اگر زید نے اپنی عورت محبوبہ کو تنازع اور جھگڑا ہونے کے وقت مار پیٹ کر کے بولا ہوگا جاؤ تو مجھے بکار نہیں ہے یا کہ فارسی میں کہا ہے تو بکار من نیستی یا بکار نی تو نیستی یا میں نے تجھکو چھوڑ دی یا میں تجھکو چھوڑ بولتا ہوں اور کشمیری میں کہتے ہیں میہ ترا وک ژء (لفظ غیر واضح تھا اس کی تعیین مفتی نذیر احمد کشمیری سے مراجعہ کے بعد کی گئی جس کا ترجمہ انہوں نے یہ کیا: میں نے چھوڑ دیا تجھکو) یعنی مرے گھر سے نکل جاؤ کیا ان الفاظ سے طلاق واقع ہوتی ہے، مولانا مرحوم مولوی عبدالکبیر صاحب دیوبندی نے اپنے ایک فتوی میں لکھا ہے کہ ان الفاظ سے طلاق واقع ہوتی ہے اور دو کتاب کا حوالہ لکھا عالمگیری اور بزازیہ، لیکن ایک مولوی صاحب

۱- ''الكنايات لايقع بها الطلاق إلا بالنية أو بدلالة الحال، لأنها غير موضوعة للطلاق بل تحتمله وغيره فلا بد من التعيين'' (ہدایہ ۲/ ۳۵۳، مطبع یوسفی لکھنؤ) "لايقع الطلاق بشيء من الكنايات إلا بالنية'' (قاضی خاں علی الہندیہ ۱/ ۴۶۷، دارالکتاب دیوبند)۔

۲- ''إذا كان الطلاق بائنا دون الثالث فله أن يتزوجها في العدة وبعد انقضائها'' (عالمگیری مع خانیہ ۱/ ۴۷۲-۴۷۳، دارالکتاب دیوبند)۔

نے فرمایا ہے کہ عالمگیری میں یہ الفاظ بولنے سے طلاق نہیں ہوتی ہے (۱)، پھر رہا بزازیہ وہ کتاب میرے پاس نہیں لیکن عبدالکبیر صاحب نے کوئی مسئلہ نہیں لکھا ہے لیکن اپنے جواب میں دونوں کتابوں کا حوالہ دیا ہے۔

نذیر احمد (متصل زیارت حضرت شاہ ہمدان مقام تر الی ضلع بولہ والہ، کشمیر)

الجواب وباللہ التوفیق:

ان الفاظ میں سے بعض لفظ جیسے میں نے تجھکو چھوڑ دی یا چھوڑ دیتا ہوں طلاق صریح کے حکم میں ہے اور انکو بغیر نیت طلاق کہنے سے بھی طلاق واقع ہو جائے گی، اور بعض الفاظ طلاق کنائی کے ہیں، جیسے تو میرے کام کی نہیں ہے، یا تو میرے گھر سے نکل جا، ان الفاظ سے بغیر نیت طلاق کہنے سے طلاق واقع نہیں ہوتی یہ جزئیات عالمگیری (۲)، بزازیہ، خانیہ ہر کتاب میں مذکور ہیں، یہ طریقہ استفتاء کا نہیں ہے بلکہ جو لفظ جس موقع میں بولا ہو اس کو بعینہ مع موقع کلام کے لکھ کر استفتاء کرنا چاہئے، لہذا لفظ جس موقع میں بولا ہو حکم اس کے مطابق ہوگا، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۶/۶/۱۴۰۰ھ

کیا جذام کی وجہ سے حق حضانت ساقط ہونا چاہئے؟

میری ایک لڑکی ہے جس کی ماں کو جذام ہوگیا ہے، میں نے اس کو طلاق بائن دیدیا ہے، پنچایت نے اس طلاق سے یہ فیصلہ کیا ہے کہ چونکہ مدت رضاعت تک بچی کو ماں کے پاس رہنا چاہیے اور بچی کی ماں مرض جذام میں مبتلا ہے، اس لئے حق حضانت ماں کے بعد نانی کو ہوتا ہے، اس لئے بچی نانی کے پاس رہے گی اور منیر الدین بچی کو بیس روپیہ ماہانہ ادا کریں، بچی اپنی ماں اور بھائیوں کے شریک ہے، مجھے شبہ ہے کہ اس ماں کا اثر بچی پہ ہوگا، اس لئے بچی کو میں اپنی پرورش میں رکھنا چاہتا ہوں کیا رہ سکتی ہے؟

۱- "رجل قال لامرأته: مرا بکار نیستی ولوی به الطلاق لایقع" (فتاوی عالمگیری ۱/ ۳۸۰)۔

۲- "والأصل الذی علیه الفتوی فی زماننا هذا فی الطلاق بالفارسیة إنه إذا کان فیها لفظ لا یستعمل إلا فی الطلاق فذلک اللفظ صریح یقع به الطلاق من غیر نیة إذا أضیف إلی المرأة، وما کان بالفارسیة من الألفاظ ما یستعمل فی الطلاق وفی غیره فهو من کنایات الفارسیة فیکون حکمه حکم کنایات العربیة فی جمیع الأحکام، کذا فی البدائع" (فتاوی عالمگیریہ ۱/ ۳۷۹)۔

الجواب وباللہ التوفیق:

حسب تحریر سوال محض آپ کے بیان کردہ شبہ کے بناء پر حق حضانت سوخت نہیں ہوگا (۱)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

۱- ’’وإذا وقعت الفرقة بين الزوجين فالأم احق بالولد إلى قوله: فان لم تكن له ام فأم الأم اولىٰ من ام الاب وان بعدت‘‘ (ہدایہ ۲/۴۳۷)۔

باب تعلیق الطلاق

شوہر کا ایک نہیں تین طلاق، طلاق، طلاق لکھنا:

زید حنفی المذہب بالغ اور خواندہ ہے، لیکن مسائل دینی سے بہت کم واقف ہے، غلط فہمی سے اس کی اہلیہ جو حنفی المذہب خواندہ ہے، کسی رشتہ دار میکہ والوں کے پاس بلا اجازت ورضامندی مہمان گئی ہے، غصہ سے پدر ہندہ اور اس کے متعلقین کو ڈرانے کے لئے بنام خسر خط لکھا کہ آپ لوگوں کی مہربانی ہو تو آپ کی لڑکی کو طلاق دیدیا ہوں۔ ایک نہیں تین، طلاق، طلاق، طلاق تو اب غصہ کی حالت طلاق واقع ہو جاتی ہے یا کہ نہیں اگر زید رکھنا چاہے تو اس کا کیا حکم ہے؟

الجواب وباللہ التوفیق:

حسب تحریر سوال جب زید نے اپنے خسر کو یہ الفاظ لکھ کر بھیج دیئے کہ میں آپ کی بیٹی کو طلاق دے رہا ہوں ایک نہیں تین، طلاق طلاق طلاق تو بلاشبہ زید کی بیوی پر حنفی مذہب کے مطابق تین طلاق پڑ کر حرمت مغلظہ ہوگئی، اب بغیر حلالہ کے کسی طرح وہ عورت زید کے لئے جائز وحلال نہیں ہوسکتی چاہے، کسی نیت اور دھمکی کی غرض سے لکھا ہو ہر حال میں یہی حکم ہے۔ اور حلالہ یہ ہے کہ اس طلاق کے بعد ہندہ کو تین حیض آکر اور اگر حاملہ ہو تو وضع حمل ہو کر عدت ختم ہو لے اور اس کے بعد ہندہ کسی دوسرے مرد سے نکاح کر کے اس کے ساتھ ہم صحبت ہو لے پھر وہ دوسرا شوہر مر جائے یا طلاق دیدے۔ اور پھر اس موت یا طلاق کی عدت گزر جائے۔ اب اس کے بعد ہندہ زید سے دوبارہ نکاح کر کے اس کے پاس آسکتی ہے بغیر اس کے نہیں، ''وإن كان الطلاق ثلاثا في الحرة......لم تحل له حتى تنكح زوجا غيره نكاحا صحيحا ويدخل بها ثم يطلقها أو يموت عنها كذا في الهنديه'' (۱)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دار العلوم دیوبند بہار نپور ۲۳/۹/۸۵ ۱۳ھ

۱- الفتاویٰ الہندیہ ۱/ ۴۷۳۔

شوہر کا ایک دو تین طلاق ہو مجھ پر اگر بیوی میرے گھر آئے کہنا:

زید نے یہ الفاظ کہے ایک، دو، تین طلاق ہو مجھ پر اپنی بیوی منکوحہ زینب سے، اگر وہ میرے گھر واپس آ گئی، لیکن آدھ گھنٹے کے بعد زینب گھر آ گئی آیا یہ طلاق مغلظہ ہوئی؟

الجواب وبالله التوفيق:

اس میں حرمتِ مغلظہ ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے،" **لانه عد الطلاق أولا وعد الطلاق ليس بطلاق فبقي لفظ الصريح وهو يوجب الرجعة** "کما فی الشامی، فقط واللہ اعلم بالصواب

مفتی محمد فرید عفی عنہ

اس جواب پر سوال:

۱۔ اس میں مدخول بہا اور غیر مدخول بہا کیا برابر ہے؟ نیز یہ عبارت شامی صفحہ مذکورہ میں نہیں ہے، شرط مقدم اور مؤخر ہونے میں مسئلہ یہی ہے۔

الجواب:

جناب ایک دو تین نہ صریح ہے نہ کنایہ ہے، صرف عد طلاق ہے۔ نیز اس میں حکم بھی نہیں ہے اور خبر یہ محولہ کی بناء پر ایسے عدد سے طلاق واقع نہیں ہوتی۔ اس میں عدد کا مجھ پر طلاق ہونے سے کوئی تعلق ظرفیت یا مصدریت کا نہیں ہے، پس صرف ایک طلاق مجھ پر طلاق ہونے کی بناء پر واقع ہوگا۔ اس میں مدخول بہا غیر مدخول بہا کا یکساں حکم ہے۔

الجواب:

یہ جملہ (ایک دو تین) مختلف محاوروں کے مطابق بولا جاتا ہے، لہٰذا اس خط میں اس خط کے محاورہ کے مطابق حکم ہوگا۔ بتقاضائے آیت کریمہ: "**وما ارسلنا من رسول الا بلسان قومه**" (۱)۔

پس جس خطہ و دیار میں عرف عام و مشہور ہو کہ مذکورہ جملہ محض اپنی مستعدی ظاہر کرنے کے لئے اور مخاطب کو اپنے ارادہ سے آگاہ کرنے کے لئے بولتے ہیں اور اس کا تعلق اس کے بعد کے لفظ سے نہیں ہوتا تو اس خطہ میں اس سوال میں اس

۱- سورۂ ابراہیم: ۴۔

ذکر کردہ جملہ سے فقط ایک طلاق واقع ہونے کا حکم ہوگا۔

اور جس خطہ ودیار میں یہ عرف عام ومشہور ہو کہ یہ مذکورہ جملہ معدود ہوگا، اور مفہوم یہ ہوگا (ایک طلاق دوطلاق تین طلاق) پس اس خطہ ودیار میں اس سوال میں مذکورہ جملہ سے تین طلاق واقع ہوکر حرمت مغلظہ ہوجائے گی۔ اور جس خطہ ودیار میں ان دونوں عرف میں سے کوئی عرف نہ ہو وہاں شوہر کے قول کا اعتبار ہوگا۔ جس کو وہ بحلف بیان کرے گا، لہٰذا یہ دونوں مذکورہ جواب ادھورے ہیں۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۹/۲/۹۹/۵/۱۴ھ

تعلیق طلاق سے رجوع صحیح نہیں ہے:

زید نے اپنی منکوحہ ہندہ کو دوطلاق دیدی اور ساتھ میں یہ بھی کہہ دیا کہ اگر بکر کے گھر گئی تو تیسری بھی، (۲) بکر خاص رشتہ دار ہے بعض مرتبہ جانا بھی ضروری ہوجاتا ہے، جواب طلب امر یہ ہے اس کے بعد دونوں میں مصالحت ہوگئی ہے اور پھر زید نے اپنی شرط بکر کے گھر جانے کی واپس لے لی ہے کہ اب میں بکر کے گھر جانے سے منع نہیں کروں گا تو ہندہ بکر کے گھر پر جاسکتی ہے یانہیں اگر گئی تو کیا تیسری طلاق واقع ہوجائے گی؟

ایک صاحب نے یہ بتلایا ہے کہ زندگی بھر بکر کے گھر نہیں جاسکتی ہاں اگر وہ گھر بدلے تو پھر جاسکتی ہے کیا یہ صحیح ہے؟

محمد صالح عبدالصمد ساماتی (بمبئی)

الجواب وباللہ التوفیق:

شوہر کا یہ جملہ (اگر بکر کے گھر پر گئی تو تیسری بھی) مطلق ہے، شوہر نے اس تعلیق کو اپنی اجازت سے مقید نہیں کیا ہے، اس لئے اب اجازت دینے سے وہ شرط اور اس شرط کا حکم ختم نہ ہوگا بلکہ جب بھی بکر کے گھر جائے گی تو تیسری طلاق بھی واقع ہوکر حرمت مغلظہ ہوجائے گی اور پھر بغیر حلالہ کے کوئی شکل جائز ہونے کی باقی نہ رہے گی، اور چونکہ اس لفظ (بکر کے گھر) سے عرف میں دار بکر کا دار سکونت ہے یعنی جس گھر میں بکر سکونت پذیر ہو وہ مراد ہے خواہ وہ گھر آبائی ہو یا بکر کا خرید کردہ ہو یا کرایہ پر لیا ہوا ہو، پس گھر بدل کردینے میں یہ تفصیل ہوگی کہ جس گھر کو بدل کر اس میں جائے گا، اگر وہ سکونت کے لئے اختیار کیا ہوگا، خواہ کرایہ پر لے کر ہو تو اس میں بھی جانے سے قسم ٹوٹے گی اور تیسری طلاق پڑ جائے گی، ہاں اگر کہیں

مہمانی میں بکر گیا یا کوئی گھر محض چند دن قیام کے لئے لیا، خواہ عاریت پر یا کرایہ پر مگر اس گھر میں سکونت کرنے کا ارادہ نہیں ہے بلکہ محض عارضی طور پر چند دن کے لئے چلا گیا ہے اور وہاں زید کی منکوحہ ہندہ چلی جائے تو کوئی طلاق نہ پڑے گی، اسی طرح اگر ہندہ کے جانے کے بجائے خود بکر ہندہ کے گھر ملاقات کے لئے آجایا کرے تو اس سے کوئی طلاق نہیں پڑے گی (۱)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۰/۱/۱۴۰۱ھ

مارنے پر طلاق کو معلق کرنا:

زید اور عمر دونوں ایک ساتھ رہتے ہیں، کئی بار زید نے عمر کو مارا (بہت زیادہ پٹائی کی) ایک بار پٹائی میں زید نے جوش میں آکر پیٹنے کے بعد کہا کہ اگر میں آئندہ ماروں تو میری بیوی کو طلاق اور مارنے سے مطلب پٹائی کرنا تھا جیسا کہ پچھلے کئی واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ زید نے غصہ میں آکر عمر کو چھوٹے چھوٹے واقعات پر خوب مارا، طلاق معلق کرنے کے بعد ایک دن عمر لیٹا ہوا تھا لحاف اوڑھ کر اور اس نے ریح خارج کردیا زید نے بلاکسی ارادہ اور غصہ کے مذاق میں پیر ماردیا اتنی زور سے کہ جیسے عام طور سے ہاتھ پیر ٹکرا جاتے ہیں۔ ایک دوسرے کے اس وقت نہ تو غصہ تھا اور نہ ہی مارنے کا ارادہ تھا، اس کے بعد زید کو شک ہوگیا کہ یہ مارنا اس مارنے کے اندر تو شامل نہیں ہے جس پر طلاق معلق ہے تو اس کی کیا صورت ہوگی؟

عبدالحمید (ساکن کشرہ، مظفرنگر)

۱- "رجل قال لامرأته: إن دخلت دار أخي فأنت طالق، فسكن أخو الحالف داراً أخرى،ودخلت المرأة الدار الحديثة،قال بعضهم: إن كانت يمينه بغيظ الحقد من تلك الدار الأولى لا يحنث في يمينه، وإن كانت يمينه لأجل الأخ حنث في يمينه وإن لم تكن له نية حنث في قول أبي حنيفة ومحمد رحمهما الله تعالى، وإن دخلت المرأة الدار التي كانت لأخيه وقت اليمين، إن كانت الدار في ملك الأخ إلا أنه لا يسكن فيها حنث في يمينه، وإن خرجت تلك الدار عن ملك الأخ بعد اليمين ببيع أو هبة أو غير ذلك لا يحنث كذا في فتاوى قاضيخان" (فتاوی عالمگیریہ ۱/ ۴۴۴، فتاوی قاضیخان علی ہامش العالمگیریہ ۱/ ۴۸۳)۔

الجواب وباللہ التوفیق:

اگر واقعہ ایسا ہی ہے اور اسی طرح ہے تو اس سے قسم نہیں ٹوٹی اور طلاق نہیں پڑی، باقی آئندہ احتیاط رکھنا چاہئے(۱)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۰/۳/۲ ۱۴۰ھ

اقرارنامہ کی خلاف ورزی سے کون سی طلاق پڑے گی؟

چاند بیگ نے اپنی زوجہ رابعہ کو کافی ناجائز تکلیف پہنچائی ہے گالی گلوج مار پیٹ ناک کاٹنے کے لئے چھورے نکال کر حملہ آور ہوا ہے، آخر حد تک نااتفاقی دونوں میاں بیوی میں ہوگئی ہے، دارالافتاء میں اس پر فیصلہ ہوا کہ چاند بیگ نے اقرار نامہ تحریر کیا اور یہ لکھدیا کہ آئندہ کسی قسم کی تکلیف دوں یا رابعہ کے ماں باپ کے یہاں ان کے لئے آنے پر روکوں تو قاضی صاحب جو فیصلہ کریں گے منظور کروں گا اور رابعہ کو اختیار ہوگا کہ بذریعہ دارالقضاء تفریق کرویں اور اقرارنامہ کے خلاف کروں تو بھی طلاق سمجھی جائے۔ اپنے اقرار کرنے کے بعد دو آدمیوں کے سامنے جو قریب کے رشتہ دار ہوتے ہیں یہ الفاظ چاند بیگ نے کہے کہ رابعہ بی کو میکہ لے جاؤ میں اس کو نہیں رکھتا میں نے اس کو طلاق دیدی ہے تین بار اسی طرح کہا، رابعہ بی نے دارالافتاء میں فیصلہ چاہا تو چاند بیگ نے بذریعہ رجسٹری یہ تحریر کیا کہ میں (دارالافتاء) دارالقضاء میں کوئی جواب ہی نہیں کرنا چاہتا ہوں عدالتی کارروائی کرڈالو۔

اب رابعہ بی یہ چاہتی ہیں کہ از روئے شرع جواب تحریر کریں کہ آیا میرا مہر بذمہ شوہر واجب ہے یا کہ نہیں، اور تین بچے بھی اس کے ہوئے جن سے ایک لڑکی حیات ہے۔ رابعہ کے والد لینے آئے انہوں نے نہیں پہنچایا جو اقرارنامہ کی خلاف ورزی ہوتی ہے اب حکم شرع سے مطلع فرمایا جائے؟

۱- اس لئے کہ ضرب ان امور ثلاثہ میں سے نہیں ہے جن کا ہزل بھی جد شمار ہو، اور اس لئے کہ عرفا اس پر مارکا اطلاق نہیں ہوتا، ''والأصل أن الأیمان مبنیة .... و عندنا علی العرف''، اس کے تحت شامی میں ہے: ''لأن المتکلم إنما یتکلم بالکلام العرفي، أعني الألفاظ التي یراد بها معانیها التي وضعت لها في العرف'' (ردالمحتار علی الدرالمختار ۵/ ۵۴۷)۔

الجواب وباللہ التوفیق:

حسب تحریر سوال جب اقرار نامہ طلاق کے بعد کئی مرتبہ اقرار نامہ کی خلاف ورزی کی ہے اگر تین بار طلاق دینے کے پہلے یہ خلاف ورزی کی ہے تو ایسی خلاف ورزی سے جو پہلی بار کی ہے رابعہ پر ایک طلاق بائن پڑ گئی اور رابعہ بی چاند بیگ کے نکاح سے نکل گئی۔ اور بعد میں تین طلاق لغو اور بے اثر رہیں اور طلاق بائن کا یہ اثر ہے کہ رابعہ بی اگر اپنی مرضی وخوشی سے پھر چاند بیگ کی زوجیت میں جانا چاہے تو پھر سے جدید نکاح کر کے جاسکتی ہے، (۱)۔ چاند بیگ زبردستی یا رجعت نہیں کرسکتا ہے اور اگر اقرار نامہ کی خلاف ورزی سے پہلے تین بار یہ کہہ دیا ہے کہ میں نے اس کو (رابعہ کو) طلاق دی تو اب تین طلاقیں واقع ہو کر حرمت مغلظہ ہوگئی، اب رابعہ بی اس شوہر کے لئے بجز حلالہ کے کسی طرح حلال اور جائز نہیں ہوسکتی ہے اور حلالہ یہ ہے کہ اس مغلظہ طلاق کی عدت تین حیض گزرنے پر رابعہ دوسرے مرد سے نکاح کرے اور وہ اس کے ساتھ رہ کے ہم بستر ہو پھر اگر وہ فوت ہو جائے یا طلاق دیدے اور رابعہ کی یہ عدت وفات اور طلاق بھی گزر جائے، اس کے بعد شوہر اول چاند بیگ کا دار القضاء میں نہ جانا یا قانون جوئی کرنا سب غلط ہے، اب اس کو اگر یہ واقعات مذکورہ فی السوال صحیح ہیں ان باتوں کا کوئی حق نہیں ہے۔ رابعہ بی چاند بیگ کی زوجیت سے بالکل نکل گئی اور رابعہ بی کا مہر بذمہ چاند بیگ واجب الاداء ہے، چاند بیگ کو چاہیے کہ رابعہ کا مہر دے کر خاموش ہو جاوے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دار العلوم دیوبند سہارنپور ۱۷/ ۸/ ۸۵ ۱۳ھ

۱- زمانہ حال میں لگائی ہوئی شرط کو ماضی پر محمول کرنے کا حکم:

باب الطلاق میں زمانہ حال میں لگائی ہوئی شرط کا زمانہ ماضی پر محمول کرنا جائز ہے یا کہ نہیں۔ مثلاً یوں کہے کہ اگر تو پانی پیتی ہے تو تجھکو طلاق اور عورت نے پانی پیا زمانہ ماضی میں یہ الفاظ کہنے سے ۱۰ یا پانچ منٹ پہلے پانی پیتی ہے، یہ جملہ حالیہ ہے اور اس نے پانی پیا زمانہ ماضی میں۔ تو جملہ حالیہ میں لگائی ہوئی شرط کا زمانہ ماضی میں اعتبار ہوگا یا کہ نہیں ہوگا؟

۲- شوہر کا ''اگر تو میرے اور اللہ کے درمیان حجاب بنتی ہے تو تجھ کو طلاق'' کہنا:

زید نماز پڑھ رہا ہے۔ درمیان نماز اس کو اپنی بیوی مریم کا خیال آیا ہے، زید نے اپنا خیال فوراً اللہ عز وجل کی طرف

۱- "فاذا طلق زوجة طلقه بائنة واحدة او اثنين جاز له العود إليها في العدة وبعدها ولكن ليس بالرجعة وإنما بعقد جديد" (الموسوعة الفقهية ۲۹/۲۹)، "وينكح مبانة بمادون الثلاث في العدة وبعدها (بالاجماع)" (الدر المختار على الرد ۵/ ۴۰، مکتبہ زکریا)۔

متوجہ کیا اور اپنے نفس کو اس پر ملامت کی اور نماز پوری کی، اس کے بعد زید نے یوں کہا کہ اگر تو میرے اور اللہ کے درمیان حجاب بنتی ہے تو تجھکو طلاق ہے، اور مریم زید کے پاس موجود نہیں ہے۔ بلکہ وہ تو اپنے والدین کے یہاں زید سے چالیس میل کے فاصلہ دوری پر ہے اور ابھی مریم کی رخصتی بھی نہیں ہوئی ہے، تو طلاق واقع ہوئی یا کہ نہیں؟

الجواب وباللہ التوفیق:

۱- شرط لگانے سے پہلے خواہ ۱۰-۵ ہی منٹ پہلے پانی پیا ہو۔ اس بعد کی شرط سے کوئی طلاق واقع نہ ہوگی (۱)۔

۲- یہ خطاب تو دلی اور مجازی خطاب ہے جو عرفاً رائج ہے، اس لئے لغو نہ ہوگا، لیکن یہ جملہ (کہ اگر تو میرے اور اللہ کے درمیان حجاب بنتی ہے تو تجھ کو طلاق) تعلیق کا ہے۔ جس کا حکم یہ ہے کہ اگر آئندہ مریم اپنے ظاہری عمل اور قول سے روکاوٹ ڈالے گی تو ایک طلاق پڑ جائے گی۔ ابھی کوئی طلاق نہیں واقع ہوئی اور یہ حکم اس صورت کا ہے کہ یہ جملہ اپنی زبان سے زید نے کہا ہو۔ اور جیسا کہ سیاق وسباق سوال سے معلوم ہوتا ہے۔ اور اگر زبان سے نہ کہا ہو بلکہ محض دل ہی دل میں سوچا ہو تو اس کا کوئی اثر نہ ہوگا نہ اب نہ آئندہ (۲)۔

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

اگر عیدین میں مصافحہ ومعانقہ بدعت ہو تو بیوی پر تین طلاق:

۱- زید قسم کھا کر کہتا ہے کہ عیدین میں مصافحہ اور معانقہ کرنا اگر بدعت ہو تو ہماری بیوی پر تین طلاق، لہذا دریافت ہے کہ زید کی قسم باقی ہے یا کہ نہیں ایسا ہی ان کی بیوی مطلقہ ہے یا کہ نہیں؟

۲- بعض لوگ قسم کھا کر کہتے ہیں کہ فتاویٰ رشیدیہ کے اندر ص ۱۰۲ اور ص ۱۴۰ اور امداد الفتاویٰ کے جلد چہارم میں ص ۹۷ پر عیدین کا معانقہ اور مصافحہ بدعت فرمایا یہ بالکل غلط بلکہ بدعت حسنہ اور ثواب ہے اور بالکل جائز ہے حدیث شریف میں منع نہیں ہے، لہذا یہ بھی کہنا صحیح ہے اور قسم باقی ہے۔ بینوا توجروا۔

۱- ''التعلیق اصطلاحا (ربط حصول مضمون جملۃ بحصول مضمون جملۃ اخری) فہو خاص بالمعنوی والمراد بالجملۃ الاولیٰ فی کلامہ جملۃ الجزاء وبالثانیۃ جملۃ الشرط وبالمضمون ما تضمنۃ الجملۃ من المعنی فہو فی مثل ان دخلت الدار فانت طالق ربط حصول طلاقہا بحصول دخولہا الدار'' (شامی ۴/ ۶۷۷، مطبع عثمانیہ)۔

۲- ''فی القہستانی من انہ ازالۃ النکاح او نقصان حلہ بلفظ مخصوص'' (شامی ۴/ ۵۷۱، مطبع عثمانیہ)۔

الجواب وباللہ التوفیق:

محض عیدین کے نماز کیوجہ سے عیدگاہ میں جو مصافحہ کا رواج لازمی ہوگیا ہے یہ قطعاً بدعت (۱) ہے، اور امداد الفتاویٰ اور فتاویٰ رشیدیہ کا فتوی بالکل صحیح ہے، لہذا اگر ایسے مصافحہ پر طلاق کی قسم کھائی ہے جو سوال میں درج ہے تو بلاشبہ اس کی بیوی پر طلاق پڑگئی (۲)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

۱- ''ونقل في تبيين المحارم عن الملتقط انه تكره المصافحه بعد اداء الصلاة لكل حال لان الصحابة رضي اللہ عنهما صافحوا بعد اداء الصلوٰة ولانها من سنن الروافض اه ثم نقل عن ابن حجر من الشافعيه انها بدعة مكروهة لا اصل لها في الشرع وانه ينبه فاعلها اولا ويعزر ثانيا ثم قال وقال ابن الحجاج من المالكية في المدخل انها من البدع وموضع المصافحه في الشرع انما هو عند لقاء المسلم لاخيه لا في ادبار الصلوات فحيث وضعها الشرع يضعها فينهیٰ عن ذالك ويزجر فاعله لما اتى به من خلاف السنة'' (شامی ۵/۳۳۶، مطبوعہ عثمانیہ)۔

۲- ''اذا اضافه الي شرط وقع عقيب الشرط مثل ان يقول لامرء ته ان دخلت الدار فانت طالق'' (ہدایہ ۲/۳۸۵، باب الایمان فی الطلاق، مکتبہ تھانوی دیوبند)۔

باب الخلع

خلع میں زوجین کی رضامندی ضروری ہے:

زید کی شادی ہندہ سے ۱۰ نومبر ۶۳ء کو ہوئی قریب چھ ماہ تعلقات تو کچھ بہتر تھے، مگر اس کے بعد زید کی طرف سے ہندہ کو برابر خورد ونوش، لباس و پوشاک تک کی تکلیف دینی شروع ہوگئی ہے، جس کی وجہ سے ہندہ اپنے والد کے سمجھانے سے نباہتی رہی مگر زید کی یہ حرکت دائمی ہوگئی، اب ہندہ کے والدین نے اپنی لڑکی کا بوجھ اپنے سر دیکھ کر پنچائت بلایا ہے اور کل احوال سنایا ہے جس کا اثر یہ ہوا کہ زید نے ایک شرائط نامہ لکھ کر پنچائت کے روبرو یہ یقین دلایا کہ اب میں ہر طرح کی شکایت دور کرنے کی حتی المقدور کوشش کروں گا، تمام معززین حضرات زید کی بات پر یقین کر کے ہندہ کو پھر زید کے ساتھ پنچائت کے روبرو روانہ کر دیا ہے مگر ابھی چند گز وہ پنچایت نہیں گئے ہوں گے کہ ہندہ کے رونے کی آواز آئی تمام حضرات وہاں پہنچ کر ہندہ کو بیہوش دیکھا، اب جب ہوش میں آئی تو زید کے ساتھ زندگی گذارنے سے ناراض ہے اور کہا اگر ہمارے والد ہمکو وہاں روانہ کریں گے تو خودکشی کرلوں گی۔ اس پر پنچائت نے اس کے والد کے حوالے کر دیا جس کو دو سال ہوگئے ہیں کہ زید نے پھر لیجانے کی کوشش کی نہ لیجانے آیا ہے نہ نان ونفقہ کا انتظام کیا ہے، اب ہندہ اپنے ظالم شوہر سے خلع چاہتی ہے اور دین مہر اور سامان جہیز اور زیور کو چھوڑنے پر تیار ہے، ہندہ کے باپ نے زید کی ۶ کٹھہ زمین خرید لیا ہے جو کہ ہندہ کے نام ہے چھوڑنا نہیں چاہتی، اب زید کہتا ہے کہ جو زمین تم نے ہم سے رجسٹری کرائی ہے اس کو بھی واپس کر دو تو طلاق دوں گا، اب شرعی جواب سے مطلع کریں۔

الجواب وباللہ التوفیق:

اگر سوال میں مذکورہ واقعات صحیح ہیں تو ہندہ کو خلع کرانا درست ہے، مگر خلع شوہر کی رضامندی سے ہوتا ہے، زبردستی نہیں ہوتا ہے، لہذا جب شوہر بغیر اس آراضی کو حاصل کئے خلع پر تیار نہیں ہے اور ہندہ کو خلع کی ضرورت ہے تو جس طرح اور

سب چیزیں مہر وغیرہ چھوڑی ہیں اس آراضی کو بھی واپس کرادے، ہندہ کو اختیار ہے اور اپنی مصلحت دیکھ لے یہ حکم اس صورت کا ہے جب ہندہ خود خلع کرالینا ہی چاہتی ہے ورنہ تحریر سوال سے معلوم ہوتا ہے کہ زیادتی شوہر کی جانب سے ہے اور وہ ظالم ہے، اسکو اس خلع میں کچھ بھی لینا جائز نہیں ہے حرام ہے (۱) ، اس کو چاہئے کہ کچھ نہ لے اور طلاق دیدے ورنہ عند اللہ سخت عذاب میں مبتلا ہوگا، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

الجواب صحیح سید احمد علی محمود عفی عنہ

بیوی کا خلع نامہ تحریر کرنا:

خلع نامہ اہلیہ تحریر کر کے روانہ کردے تو خلع ہوگیا یا کہ نہیں؟

الجواب وباللہ التوفیق:

اگر زوج اس خلع کو منظور کرے گا تو درست ہوجائے گا (۲)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

خون میں عارضہ کی وجہ سے خلع لینا:

زید کو فساد خون کے عارضہ کی شروعات دس ۱۰ سال قبل ہوئی، پانچ سال قبل شادی ہوئی، شادی کے وقت خون میں حدت کم تھی شادی کے دو ۲ سال بعد ایک لڑکی پیدا ہوئی جو کہ اب تین سال کی ہے، زید کی بیوی بظاہر زید سے خوش ہے اور آپسی تعلقات اچھے ہیں خون کی حدت روز بروز بڑھتی جا رہی ہے، علاج و پرہیز میں زید لاپرواہی برتتا ہے، کیا ایسی حالت

۱- ''ان کان النشوز من قبل الزوج فلا یحل له اخذ شئ من العوض علی الخلع وهذا فی حکم الدیانة'' (الفتاوی الہندیہ ۱/۴۸۸، دار الکتاب دیوبند) ''فجملة الکلام فیه ان النشوز ...... فان کان من قبل الزوج فلا یحل له اخذ شئ من العوض علی الخلع لقوله تعالی: وان اردتم استبدال زوج مکان زوج وآتیتم احداهن قنطارا فلا تأخذ وامنه شیئا'' (سورۃ النساء آیت ۲۰، بدائع الصنائع ۳/۲۳۵، مکتبہ زکریا دیوبند)۔

۲- ''لحدیث ابن ماجه قوله :الطلاق لمن اخذ بالساق، کنایة عن ملک المتعة'' (شامی ۲/۵۸۵، مطبوعہ عثمانیہ)۔

میں زید کی بیوی زید سے خلع لینے کی حق دار ہے؟

جمیل احمد (ریٹائر پولس سی، آئی، ڈی، محلہ گوپٹلاغ لکھیم پوریوپی)

الجواب وباللہ التوفیق:

اگر فساد خون کی وجہ سے جسم کی شکل وصورت اس طرح نہیں بگڑ گئی ہے، جس سے وحشت ونفرت ہوتی ہو یا اس کو ازدواجی زندگی حاصل نہ ہوتی ہو تو عورت کو خلع لینے کا اختیار نہ ہوگا وہ اس کی حق دار نہ ہوگی، ہاں اگر جسم کی شکل وصورت اس طرح بگڑ گئی ہو کہ وحشت ونفرت ہوتی ہو یا وہ ازدواجی زندگی کے لائق نہ رہ گیا ہو تو اس وقت شرعی کمیٹی میں سب حال رکھے تب جا کر تفریق شرعی حاصل کرنے کی درخواست کرنے کا حق ہوجائے گا اور پھر شرعی کمیٹی اپنی تحقیق وتفتیش کے بعد شرعی ضابطہ کے مطابق جو حکم دے گی اس پر عمل کرنا ضروری ہوگا (۱)۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

۱- "في الكنز: (ولم يخير أحدهما بعيب) قال شارحه: أطلق العيب فشمل الجذام والبرص والجنون والرتق والقرن وخالف الشافعي ومالك وأحمدٌ في هذه الخمسة، وخالف محمدٌ في الثلاثة الأول إذا كانت بالزوج فتخير المرأة بخلاف ما إذا كانت بها فلا يخير لقدرته على دفع الضرر عن نفسه بالطلاق دونها، ......وقد كتبنا في القواعد الفقهية في مذهب الحنفية أن القاضي لو قضى برد أحد الزوجين بعيب نفذ قضائه" (البحر الرائق شرح کنز الدقائق کتاب الطلاق باب العنین وغیرہ ۴/ ۱۳-۲۱۲، مکتبہ زکریا، وقال في منحۃ الخالق علی البحر الرائق "أي القاضي المجتهد أو المقلد لمن يقول بذلك كما لا يخفى" ۴/ ۲۱۳)۔

باب اللعان

لعان کے لئے دارالاسلام شرط ہے:

شمس الدین تحصیل راجوری نے اپنے ماموں کی لڑکی کے ساتھ شادی کی اور وہ بطور متبنہ کے ماموں کے ساتھ رہنا شروع کیا، شادی کو پانچ سال ہو گئے ہیں دو تین سال کے بعد جب لڑکی بیگمات زوجہ کو مدت حمل ظاہر ہوئی تو اس کے خاوند نے شکایت کی کہ یہ حمل جو کہ مساۃ کو ہے اس کے خاوند کا نہیں ہے، بلکہ اس کے راجوری گوجر کے ساتھ ناجائز تعلق ہے اور یہ حمل بھی اسی کا ہے جب لڑکی کو حمل وضع ہوا تو لڑکی پیدا ہوتی ہے جس کی عمر دو سال کی ہو چکی ہے، اب دوسرے شخص کے ساتھ تہمت لگاتا ہے اگر ثبوت کے لئے کہا گیا ہے تو ثبوت پیش نہیں کرتا ہے بلا ثبوت ہے۔ دریافت ہے کہ اس صورت سے دونوں میاں بیوی کے تعلقات میں کوئی خلل تو نہیں آیا ہے۔

الجواب وبالله التوفيق:

ایسی صورت میں شوہر اپنی بیوی سے پیدا شدہ بچہ کا اپنی اولاد کہنے سے انکار کرے یا اپنی بیوی کو زناء کی تہمت لگائے اور شرعی گواہ زنا کا پیش نہ کر سکے تو شرعاً لعان واجب ہوتا ہے مگر بھارت میں شرعی حکومت نہیں ہے کہ لعان جاری کیا جا سکے۔ لعان جاری کرنے کا حق محض حکومت اسلامی کو ہوتا ہے اور کسی کو نہیں ہوتا ہے، "و أهله من هو أهل للشهادة على المسلم فمن قذف بصريح الزنا في دار الإسلام"(۱)، "قوله في دار الإسلام أخرج دار الحرب لانقطاع الولاية"(۲)۔

پس ایسی صورت میں اگر شوہر کے نزدیک زنا کا واقعہ صحیح ہے اور عورت اس کے قابو کی نہیں ہے تو شوہر اس کو طلاق دے کر آزاد کر سکتا ہے اور اگر واقعہ صحیح نہیں ہے تو عورت کی برائت کرے اور اس کا حق ادا کرے اور آئندہ ایسی کوئی بات نہ

۱- الدر المختار۔

۲- رد المحتار ۵/۱۵۱۔

کرے جس سے عورت کی آبرو پر دھبہ آئے۔ اور عورت پر بھی واجب ہے کہ وہ اپنے شوہر کی مرضی کے مطابق رہے، خالہ زاد، ماموں زاد بھائیوں سے اور ہر اجنبی مرد سے پردہ شرعاً واجب ہے یہ سب خرابی پردہ شرعی نہ کرنے کی وجہ سے ہے عزت بھی جارہی ہے آبرو بھی رخصت ہورہی ہے، خلاصہ یہ نکلا کہ شوہر یا تو تہمت بازی ختم کرکے انسانیت کے ساتھ بیوی کے ساتھ رہے یا طلاق دے کر علیحدگی اختیار کرے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

باب ثبوت النسب والنفقہ

زنا سے پیدا شدہ بچی کا نسب:

مسماۃ شہر بانو سے محمد سلیمان نے زنا کیا اور اس زنا سے شہر بانو کے حمل رہ گیا ہے، جب چند مہینے کے بعد یہ بات پنچایت کے لوگوں نے جمع ہو کر سلیمان اور شہر بانو کو بلا کر دریافت کیا تو دونوں نے زنا اور حمل کا اقرار کیا تب پنچایت نے سلیمان پر حد شرعی جاری کیا اور وضع حمل بعد شہر بانو پر بھی حد شرعی جاری کیا اور اس سلیمان کے ساتھ شہر بانو کا نکاح کرا دیا ہے، اب اس متولدہ بچی جو سلیمان کے زنا کے نطفہ سے پیدا ہوئی ہے اس کو حرامی کہنا درست ہے یا کہ نہیں اور بچی کا نسب ٹھیک ہے یا کہ نہیں؟

الجواب وباللہ التوفیق:

بچہ کا نسب تو ٹھیک نہیں ہے البتہ قصور زانی اور زانیہ کا ہے بچے کو کوئی ایسا لفظ نہیں کہنا چاہیے جس سے اس کو تکلیف یا اس کی توہین ہو اور اس کہنے سے اس کو تکلیف ہوگی نہیں کہنا چاہیے(۱)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دار العلوم دیوبند سہارنپور ۲۴/۸/۱۰ ۱۴ھ

الجواب صحیح محمود عفا اللہ عنہ

نفقہ مطلقہ کے بارے میں حکم شرعی:

آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کی مجلس عاملہ اجلاس منعقدہ ایسٹرن کورٹ نئی دہلی مؤرخہ ۶/دسمبر ۱۹۸۱ء میں یہ طے

۱- ”عن المعرور قال لقيت اباذر بالربذة وعليه حلة وعلى غلامه حلة فسئلته عن ذالك فقال إني سابيت رجلا فعيرته بامه فقال لي النبي ﷺ يا أبا ذر أعيرته بامه انك امرؤ فيك جاهلية الخ“ (بخاری شریف ۹/۱)۔

کیا گیا ہے کہ سپریم کورٹ میں نفقہ مطلقہ (متعلق دفعہ ۱۲۵ ۱۲۷ سی، آر، پی، سی) کے متعلق جو اپیل زیر سماعت ہے، اس میں بورڈ بھی فریق کی حیثیت سے مداخلت کرے اور اپنے وکلاء کے ذریعہ سپریم کورٹ کے سامنے معاملہ کی قانونی اور فقہی حیثیت کی وضاحت کرے۔

نفقہ مطلقہ کا پس منظر یہ ہے کہ چند سال قبل پارلیامنٹ میں ایک بل پیش ہوا تھا۔ جس کا مفاد یہ تھا کہ اگر کسی شوہر نے بیوی کو طلاق دے دی تو بیوی کو اس وقت تک نفقہ دینا ہوگا جب تک کہ اس کا دوسرا نکاح نہ ہوجائے، یا پھر اس کا انتقال نہ ہوجائے، مسلم پرسنل لا بورڈ نے اس سلسلہ میں حکومت کے ذمہ داران سے گفت وشنید کی اور قانون میں بڑی حد تک ترمیم کرائی گئی، اس ترمیم کے بعد قانون کا یہ مفاد رہا کہ اگر شوہر دین مہر، واجبات عدت ادا کرے تو پھر بیوی کو کچھ اور دینا نہیں ہوگا۔

لیکن مختلف کورٹس کے فیصلوں نے پارلیامنٹ کے طے کئے ہوئے قانونی منشاء کو متاثر کردیا اور خاص طور پر مسٹر جسٹس کرشنا ایر کے فیصلے نے قانون کی شکل ہی بدل دی، ان کے فیصلہ کا خلاصہ یہ ہے کہ شوہر اگر طلاق دے دے تو بیوی کو تا حیات نفقہ دینا ہوگا۔ ہاں اگر بیوی دوسرا نکاح کرلے تو نکاح ثانی کے بعد طلاق دینے والے کو نفقہ نہیں دینا پڑے گا۔

یہ فیصلہ فقہ اسلامی کی تصریحات کے بالکل خلاف ہے۔ اور آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کی میٹنگوں میں علماء کرام نے اسے واضح طور پر شریعت مطہرہ کے خلاف قرار دیا ہے، لیکن سپریم کورٹ کے فیصلے نے پورے ملک کی فضا کو متاثر کردیا ہے اور زیریں عدالتیں سپریم کورٹ کے اس فیصلہ کی پابند ہوچکی ہیں، اب سپریم کورٹ کی فل بنچ کے سامنے ایک مقدمہ درپیش ہے جس میں مسلم پرسنل لاء بورڈ نے بھی فریق کی حیثیت سے مداخلت کرنے کا فیصلہ کیا ہے، اس اہم کام کی دو جہتیں ہیں: ایک قانونی چارہ جوئی، دوسرے فقہی مواد فراہم کرنا، دونوں کاموں کے لئے علیحدہ علیحدہ کمیٹی بنائی گئی ہیں، فقہی مواد فراہم کرنے والی کمیٹی کا رکن بورڈ نے آپ کو بنایا ہے، مجھے امید ہے کہ آپ اس کمیٹی کا رکن بننا اور اس کے ساتھ تعاون کرنا پسند کریں گے اور اپنی منظوری سے مجھے مطلع فرمائیں گے۔

براہ کرم آپ پہلی فرصت میں مسئلہ کے پہلوؤں کا جائزہ لیں اور قرآن وحدیث کے حوالوں سے ایسا مواد فراہم کریں جس سے یہ بات ثابت ہو کہ مطلقہ کے نفقہ کی ذمہ داری طلاق دینے والے پر ہے یا نہیں؟ اگر ہے تو اس کی مدت کیا ہے اور اس مخصوص مدت کے خاتمہ کے بعد نفقہ کی ذمہ داری شوہر سے کیوں ختم کردی گئی ہے، مجھے امید ہے کہ جلدی ایک **مدلل** تحریر مرتب کر کے آپ مذکورہ فقہی کمیٹی کے کنوینر، جناب مولانا مجاہد الاسلام صاحب قاسمی، قاضی امارت شرعیہ پھلواری

شریف پٹنہ کے پتہ پر ارسال فرمائیں گے۔ والسلام

منت اللہ (جنرل سکریٹری آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ ۸/۸/دسمبر ۱۹۸۱ء)

الجواب وباللہ التوفیق:

پیش نظر مسئلہ کی وضاحت کے لئے پہلے چند باتوں کا ذہن نشیں کرلینا ضروری ہے: پہلی بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو تمام انسانوں کی عزت وآبرو اور نفس وعظمت کی حفاظت بے حد پسند ومطلوب ہے، اس بناپر شرع وشارع علیہ السلام کا منشاء یہ ہے کہ کوئی عاقل بالغ مرد وعورت بغیر شرعی وجہ کے بغیر نکاح کے نہ رہے، یا اخراجات بہت بڑھ جانے کے خطرے کے سبب عموماً انسان غربت وتنگدستی کی وجہ سے نکاح سے گریز کرتا ہے، حالانکہ نکاح صحیح سے رزق بڑھتا ہے۔ رزق میں برکت ہوتی ہے، چنانچہ حدیث پاک میں نکاح کی ترغیب کے سلسلے میں فرمایا گیا ہے: "اطلبو االرزق من الباع" (۱) اور اسی غلط خیال کو رد کرنے کے لئے نکاح سے رزق میں تنگی ہوگی۔ قرآن پاک میں ارشاد خداوندی ہے: "وانکحوا الایامی منکم والصالحین من عبادکم وامائکم إن یکونوا فقراء یغنهم الله من فضله" (۲) اور اسی سے بہت سے مسائل متفرع ہیں۔ مثلاً:

- اولاد (لڑکا ولڑکی) جب بالغ ہوجائیں تو جلد سے جلد کسی مناسب جگہ ان کا نکاح کردینا چاہئے، تاکہ بے نکاح کے نہ رہیں۔
- جب تفریق یا طلاق واقع ہوجائے یا عورت بیوہ ہوجائے تو بغیر وجہ شرعی کے دوسرے نکاح میں تاخیر نہیں کرنی چاہئے۔
- جب بغیر نکاح مجرد زندگی گزارنے سے مرد کو زنا کا خطرہ ہو یا عورت کو اپنی عصمت دری کا اندیشہ ہو تو ایسی حالت میں نکاح کرلینا شرعاً واجب ہوجاتا ہے۔
- نکاح کی وجہ سے چونکہ عورت اپنے نفس وعزت کو شوہر کے حوالہ کردیتی ہے، اس کے شوہر پر عورت کا نان ونفقہ وسکنیٰ سب حسب حیثیت واجب وضروری ہوجاتا ہے، چنانچہ ارشاد خداوندی ہے: "لینفق ذو سعة من سعته" (۳) اور

۱- کنز العمال۔
۲- سورۂ نور: ۳۲۔
۳- سورۂ طلاق: ۷۔

ایک مقام پر ارشاد ہے: "وعلی الموسع قدرہ وعلی المقتر قدرہ" (۱)، اسی طرح کی اور بہت سی احادیث بھی ہیں جن میں صراحت ہے کہ نکاح کی وجہ سے عورت کا نفقہ مرد پر شرعا واجب ہوجاتا ہے اور وجہ اس کی یہ ہے کہ عورت اپنے شوہر کے امر مقصود میں محبوس ہوجاتی ہے اور عقلی قاعدہ بھی یہی ہے کہ جو شخص اپنے غیر کے حق مقصود میں محبوس ہو تو اس کا نفقہ اسی شخص کے ذمہ ہوجاتا ہے، چنانچہ ہدایہ میں ہے: "لأن النفقة جزاء الاحتباس، وكل من كان محبوسا بحق مقصود لغيره كانت نفقته عليه" (۲)۔

لیکن بطریق امر تعبدی وعبادات کے کمافی الہدایہ فی باب النفقہ مطلقہ جب نابالغہ مشتہاۃ ہو، یا آئسہ ہو یا حاملہ ہو، یا غیر حاملہ ہو عدت گزارنا واجب ہوتا ہے: لقوله تعالىٰ: "والمطلقات يتربصن بانفسهن ثلاثة قروء" (۳) ولقوله تعالىٰ: "والئی یئسن من المحیض من نسائکم ان ارتبتم فعدتهن ثلاثة أشهر والئي لم يحضن، وأولات الأحمال أجلهن أن يضعن حملهن" (۴) ولقوله تعالىٰ: "وان كن اولات حمل فأنفقوا عليهن حتى يضعن حملهن" (۵) اور چونکہ زمانہ عدت میں ممکن ہے کہ رحم مطلقہ شوہر کے حمل سے مشغول ہو اور اس صورت میں صیانۃ نسب اور اختلاط ماء سے حفاظت کی خاطر مطلقہ کا احتباس ملحق الزوج ہونا ظاہر ہے، اس لئے احتباس کی وجہ سے ان مطلقات کا نفقہ بھی زمانہ عدت کا شوہر پر واجب رہتا ہے۔ اور بعد ختم عدت یہ تعلق احتباس بھی بالکلیہ ختم ہوجاتا ہے، اس لئے وجوب نفقہ بھی بالکلیہ ختم ہوکر اصلی حکم کہ بس بالغ مرد یا عورت کو بغیر عذر شرعی کے بلاتعلق نکاح نہ رہنا چاہئے، نہ کہ نفقہ کا وجوب بذمہ شوہر تا نکاح ثانی مطلقہ یا تا حیات مطلقہ باقی رہے گا۔

یہ حکم سراسر منشاء شرع وشارع علیہ السلام کے خلاف اور متضاد ہوگا۔ جو شرعا کسی طرح جائز ودرست نہ ہوگا۔ اور آیت کریمہ: "وللمطلقات متاع بالمعروف حقا على المتقين" (۶) سے مدعا مذکور کہ مطلقہ کو تا حیات یا تا نکاح ثانی نفقہ کا وجوب ہو ثابت نہیں کرسکتے، اس لئے کہ "متاع بالمعروف" قرآن پاک میں متعدد جگہ وارد ہوا ہے۔ ان سب

۱- سورۂ بقرۃ: ۲۳۶۔
۲- ہدایہ ۲/۳۷۵ کتاب الطلاق۔
۳- سورۂ بقرۃ: ۲۲۸۔
۴- سورۂ طلاق: ۴۔
۵- سورۂ طلاق: ۶۔
۶- سورۂ بقرۃ: ۲۴۱۔

پر اور ان کے متعلق روایت مرویہ پر غور کرنے سے واضح ہوتا ہے کہ متاع بالمعروف سے مراد ضابطہ شرعیہ کے مطابق ایک متعین ومعلوم المقدار مال کا دیدینا ہے۔

جو کبھی متعہ کے نام سے موسوم ہوتا ہے اور کبھی مہر مسمّیٰ سے اور کبھی نصف مہر مسمّیٰ سے اور کبھی مہر مثل سے اور کبھی عدت کے اندر نفقہ متوسطہ سے مراد ہوتا ہے اور بس، ان مرادوں سے تجاوز کرنا یا ان کے علاوہ مراد لینا تفسیر بالرائے کے حکم میں ہوکر ممنوع وناجائز ہوگا، اس لئے کہ تفسیر بالرائے ناجائز ہے اور گمراہی کا دروازہ کھولنا ہے اور اس پر مفسرین اور محققین سلف وخلف کا اجماع ہے۔

چنانچہ احکام القرآن للجصاص میں آیت کریمہ: "والذین یتوفون منکم ویذرون ازواجا" کے تحت مذکور ہے:" ومما یدل علی أن المتعة غیر واجبة مع المھر اتفاق الجمیع علی أنه لیس لھا المطالبة بھا قبل الطلاق، فلو کانت المتعة تجب مع المھر بعد الطلاق لوجبت قبل الطلاق وفی ذالک دلیل علی امتناع وجوب المتعة والمھر (ای معا)" (۱)۔

اور اس کی تائید فتح القدیر شرح ہدایہ کی اس عبارت: "المتعة أربعة اقسام (الی قوله) لیست بواجب ولاسنة ولا مستحب وھی التی طلقھا قبل الدخول بھاوقد سمی لھا مھرا، لأن نصف المھر ثابت لھا فیقوم مقام المتعة" (۲) سے بھی ہوتی ہے۔

غرض نفقہ مطلقہ کو تاحیات یا تا نکاح ثانی واجب قرار دے دینا قطعا جائز نہ ہوگا بلکہ صریح مداخلت فی الدین ہوگی اور کھلا ہوا ظلم ہوگا، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۷/۳/۱۴۰۲ھ

مطلقہ کو نفقہ کب تک ملے گا:

سوال: وھذا معلوم لکل واحد من أبناء الھند ان الحکومة الھندیة قد جاء ت بقرار یلزم فیه رجال المسلمین الذین طلقوا نساء ھم علی نفقتھن حتی تزوجھن رجال آخرون أوتو فھن الله تعالیٰ، فإن

۱- احکام القرآن للجصاص ۱/۴۳۲۔
۲- فتح القدیر ۱/۴۴۸۔

من القضاة فی أنحاء البلادقد حكموا على الرجال الذين طلقوهن على نفقتهن حتى تزوجهن الآخرون، وإن أصواتكم ايها الاستاذ الفاضل واستنكاراتكم قد سمعنا ها بآذاننا العارية، ولكن اذان الحكومة مازالت مما حتى هذه اللحظة الاخيرة، وبعض الرجال الذين حكم عليهم بنفقة المطلقات قد رفعوا الاستينان الى المحكمة العالية مدعين ان هذا الحكم مخالف لأحكام شريعة الاسلام وحتى لدستورالهند، وهم يجتهدون كل الاجتهاد على حصول من المحكمة العالية ضد هندهم القراء ويعتنون غاية الاعتناء بجمع الفتاوىٰ من مختلف أنحاء العالم الاسلام فنرجوا فضيلتكم ان ترسلون فتوىٰ على هذه الأقضية (فی اللغة الانكليزية) نرفعها أمام محكمة العالية۔ ومن الأسف أن بعض محامين المسلمين بالهندى يدعون أن القرآن الكريم لايخالف هذا القرار مستندين إلى الأية الواردة فی سورة البقرة: ”وعلى المطلقات متاع بالمعروف حقا على المتقين“ وهذه فرصة ذهبية لرفع اصواتنا واستنكار اتنا ضد هذا القرار الضال، فإن الا نتخاب إلى مجالس النواب والبرلمان قد قرب، فإنا نرفع أصواتنا من كل أنحاء البلد فی هذه الفرصة، فتفوضوء بلا إقرار۔ والسلام

الجواب وباللہ التوفیق:

یہ مسلمہ قاعدہ ہے کہ جس فن سے اور جس فن کی اصطلاحات سے جس شخص کو پوری واقفیت نہ ہو اور اس نے اس فن کو اور اس کی اصطلاحات کو اس فن کے جاننے والوں سے اور اساتذہ سے باقاعدہ حاصل نہ کیا ہو، اس کو اس فن میں بحث کرنے کا حق نہیں ہوتا۔ اگر بحث کرے گا تو فقط یہی نہیں کہ وہ بحث غیر مفید و غیر معتبر ہوگی، بلکہ بسا اوقات اس فن پر افترا اور اس کی تخریب میں سعی کے مترادف ہوگا اور طرح طرح کے فساد کا سبب بن جائے گا۔

مثلاً لاء (قانون) اور اس کی اصطلاحات کو جس شخص نے قانون (لاء) کے ماہرین اساتذہ سے باقاعدہ سمجھ کر پوری مناسبت و استعداد حاصل نہ کی ہو اس کو قانون کی کسی دفعہ پر نقد و تبصرہ کرنے کا اور قانونی بحث کرنے کا حق و اختیار نہ ہوگا، ورنہ مقصد قانون ہی فوت ہو جائے گا، بلکہ بسا اوقات نہایت خراب اور مہلک نتائج نکل آئیں گے۔ بالکل اسی طرح شریعت ایک مکمل قانون ہے اور اس کی بہت سی اصطلاحات ہیں اور اس کے خاص اصطلاحی معنی ومفہوم ہیں جس شخص نے ان قوانین و اصطلاحات اور اصطلاحی معانی ومفاہیم کو ان قوانین کے اور اصطلاحات کے جاننے والے اساتذہ وماہرین وعالمین سے

با قاعدہ حاصل نہ کیا ہو، ان سے پوری مناسبت واستعداد نہ پیدا کرلی ہو، اس کو قوانین شریعت اور اس کی اصطلاحات میں بحث کرنے کا حق نہ ہوگا، اگر کرے گا تو وہ بسا اوقات شریعت مقدسہ پر افترا کرنے کے مترادف ہوگا اور طرح طرح کے فساد رونما کرنے کا سبب بن کر پوری امت کی ہلاکت وتباہی کا بھی سبب ہو سکے گا، مسئلہ زیر بحث بھی اسی نوع کا ہے، آیت کریمہ "**وللمطلقات متاع بالمعروف حقا على المتقين**" (۱) کا تعلق اس حکم سے بالکل نہیں ہے کہ مطلقہ کو اس کی تا حیات یا تا نکاح ثانی منجانب طلاق دہندہ نفقہ دیا جائے، اگر ایسا کیا گیا تو دین الٰہی پر افترا ہوگا اور نہایت مہذب طریقہ سے اور نہایت ہوشیاری سے دین حنیف میں اور دین الٰہی میں تخریب کاری کی سعی کے مترادف ہوگا۔

اس لئے کہ نصوص کی روشنی میں اور نصوص کی مدد سے "**المطلقات**" میں الف لام عہد کا ہے اور اس سے وہ مطلقہ عورتیں مراد ہیں جن کے مہر مقرر نہ ہوئے ہوں اور ان کے شوہروں نے تعلق زن وشوئی سے قبل ہی طلاق دیدی ہو، نہ کہ ساری مطلقہ عورتیں مراد ہوں۔ اور "متاع" سے ایسی ہی عورتوں کے مہر مثل سے نصف کے اندر کی مقدار مراد ہے۔ یہ عورت کے حسب حال بشکل نقد یا بشکل سامان ہو، نہ کہ ان کی تا حیات یا تا نکاح ثانی کا پورا خرچ مراد ہو اور اگر "**المطلقات**" میں "الف لام" عام رکھا جائے، عہد کا نہ لیا جائے تو "متاع" سے مراد محض عدت مقررہ متعینہ کا نفقہ ہے، نہ کہ ان کی تا حیات یا تا نکاح ثانی کا نفقہ۔ **هكذا يؤخذ من الروح** (۴/۴۴) اور قرآن پاک میں ہے: "**أسكنوهن من حيث سكنتم من وجدكم ولا تضاروهن لتضيقوا عليهن، وإن كن أولات حمل فأنفقوا عليهن حتى يضعن حملهن**" (۲) حاملہ عورت کی عدت، خواہ وہ مطلقہ کیوں نہ ہو وضع حمل منصوص ہے۔ اور جنین کا جزء شوہر ہونا ظاہر ہے اور اسی وجہ سے پیدا ہونے کے بعد اس کا نفقہ حضانت بھی بذمہ مولود لہٗ ہوتا ہے، مگر اس کے باوجود آیت نے اس مطلقہ کو محض زمانہ مدتِ حمل تک کا ہی نفقہ دیا ہے، یہ اس بات کی جانب اشارہ ہے کہ جب حاملہ کو بھی زمانہ عدت ہی تک کے نفقہ کا استحقاق ہے تو غیر حاملہ کو بدرجہ اولیٰ زمانہ عدت کے بعد کے نفقہ کا استحقاق نہ ہوگا۔ پھر ان تمام تصریحات وتعینات شرعیہ کے خلاف متاع مطلقہ کے دوسرے معنی ومصداق کو ظاہر کر کے محض اس کو حکم شرعی قرار دینا ظاہر ہے کہ ناجائز رہے گا۔ اور دیدہ ودانستہ ایسا کرنا یا تو تخریب فی الدین کی سعی کے مترادف ہوگا یا افترا علی الشرع ہوگا۔

اس لئے صورت مسئولہ کے مطابق فیصلہ کرنا عورت کے نکاح ثانی یا تا حیات نفقہ کے لازم کرنے کا قانون بنانا

۱- سورۂ بقرہ: ۲۴۱۔

۲- سورۂ طلاق: ۶۔

بلاشبہا جائز اورمداخلت فی الدین ہوگا، اورکسی طرح جائز نہ ہوگا، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۳/۳/ ۱۳۹۵ھ

منکوحہ کا بچہ اس کے شوہر کا ہوگا:

کوثر کو جب کہ بانو بہت چھوٹی تھی طلاق ہوگئی تھی اور بتایا تو یہ جاتا ہے کہ کوثر کے خاوند کے کسی طوائف سے نکاح کر لینے کے باعث کوثر کی پھوپی فاطمہ نے کوثر کو طلاق دلوا کر اپنے پاس رکھ کر پالا اور سہارا دیا ہے، مگر زید کو شک ہے کہ معاملہ اس طرح نہیں، بلکہ دوسرا ہے وہ یہ کہ زید کے ماموں راشد نے اپنے کسی ہندو دوست کے لڑکے موہن کی بچپن سے پرورش کی ہے اور موہن وکوثر ہم عمر ہونے کے ناطے ہمیشہ ایک دوسرے کے ساتھ رہے اور موہن نے ۳۸ سال کی عمر ہوجانے کے باوجود نہ تو ابھی تک شادی کی ہے، نہ وہ اپنے ماں باپ بھائی بہن سے ملنے جاتا ہے اور اپنی تمام کمائی کوثر اور اس کی لڑکی بانو اور راشد کے اوپر خرچ کرتا ہے۔ آج اس دور میں بنا کسی لالچ یہ سب کرنا ناممکن ہے۔ لہذا زید کو شک ہے کہ موہن کے کوثر سے ناجائز تعلقات ہیں اور بانو ان کی ناجائز اولاد ہے، اس کی دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ زید نے موہن اور کوثر کی باہمی گفتگو کے دوران ایک دوسرے کو بہن یا بھائی کے القاب سے مخاطب ہوتے سنا ہے۔

اگر زید کا شک واقعی درست ہے اور بانو حقیقت میں کوثر اور موہن کی ناجائز اولاد ہے تو ایسی صورت میں زید کا بانو سے نکاح درست ہے کہ نہیں؟ کوثر ایک مسلمان کے موہن ایک ہندو سے ناجائز تعلقات کی بناء پر حرام اولاد سے نکاح کرنے کی صورت میں اس بانو کے بطن سے پیدا ہونے والی اولاد پر شریعت کا کیا حکم ہوتا ہے؟ کیا آگے چل کر بانو کے بطن سے پیدا ہونے والی اولاد بھی ناجائز ہوگی، مفصل حوالہ کے ساتھ جواب عنایت ہو۔

الجواب وباللہ التوفیق:

اگر ان مذکورہ باتوں اور الزامات کو تسلیم بھی کرلیا جائے، بلکہ اگر واقعی ایسا ہو بھی گیا ہو تو جب بھی یہ نکاح ناجائز یا مکروہ نہ کہا جائے گا اور جب کوثر کو طلاق ہونے سے قبل ہی بانو پیدا ہوچکی تھی تو بانو کو کسی حال میں حرامی وغیرہ کہنا یا سمجھنا بھی ناجائز اور حرام اور سخت گناہ ہوگا۔ البتہ کوثر کا موہن کے سامنے بے پردہ ہونا اور اسی طرح بے تکلف رہنا شرعاً حرام اور ناجائز ہے، کوثر کی ماں اور کنبہ وخاندان کے سارے ہی افراد حسب استطاعت اس عمل سے نہ روکنے پر عند اللہ ماخوذ ہوں گے، اور

ان سب پر شرعاً حسب استطاعت لازم ہے کہ پردہ کرائیں یا پھر شرعی جواز کی صورت سوچیں، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۹/ ۸/ ۹۸ ۱۳ھ

جنات کا سلسلہ نسب:

انسانوں کا سلسلہ آدمؑ وحواؑ سے شروع ہوا، جنات کا شجرہ کہاں سے شروع ہوتا ہے؟ جنات کس قسم کے گناہ کرتے ہیں؟ ہمارے رسول ﷺ کے علاوہ جنوں کے اور کتنے رسول ہوئے ہیں۔

الجواب وباللہ التوفیق:

جنات کا شجرہ ابوالجن سے شروع ہے، اس میں اگرچہ اختلاف ہے کہ وہ ابوالجن کون ہے؟ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ابلیس ہی ہے اور مسئلہ چونکہ موقوف علیہ نجات نہیں ہے اور نہ عقیدہ ضروریہ سے متعلق ہے، اس لئے یہ اختلاف مضر نہیں۔ گناہ نام ہے حکم خداوندی کی نافرمانی کا، اور یہ مفہوم حکم کے خلاف کرنے سے آجائے گا، لہذا یہ سوال بے محل ہے، ہمارے رسول ﷺ کے علاوہ کتنے رسول ان میں اور ہوئے اس کی تحدید منقول ومصرح نہیں۔ اور موقوف علیہ نجات نہ ہونے کی وجہ سے ان کا بتلانا اور جاننا بھی ضروری نہیں، بلکہ اتنا کافی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جتنے رسول ان کی ہدایت کے لئے مناسب قرار دیئے بھیجے، ان میں ہمارے رسول ﷺ ضرور شامل ہیں اور سب سے افضل ہیں، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

كتاب الوقف

کتاب الوقف

موقوفہ جائداد علی الاولاد کے وقف کو ختم کر کے تقسیم کرنا درست نہیں ہے:

ہندہ مرحومہ نے ایک جائداد وقف علی الاولاد مندرجہ ذیل شجرہ اولاد پر وقف کی، اس کی تقسیم ازروئے شرع کس طرح ہونی چاہئے؟ وقف کردہ جائداد کا وقف ختم کر کے تقسیم ہوسکتی ہے یا نہیں؟ اگر تقسیم ہوسکتی ہے تو مندرجہ ذیل شجرہ پر تقسیم سے ازروئے شرع مطلع فرمائیں!

ہندہ خاتون

میتہ

ابن	ابن	بنت	بنت
محمد جان	محمد ادریس	محمد نساء	رحمت بی

۱-محمد نساء کا انتقال ہوجاتا ہے اور وہ لاولد انتقال کرگئی۔

۲-محمد ادریس کا بھی انتقال ہوجاتا ہے اور وہ بھی لاولد انتقال کرگئے، ان دونوں بھائی بہن کا حصہ بروئے شرع کس کو پہنچتا ہے؟

۳-رحمت بی کو وقف کردہ جائداد سے بروئے شرع کس قدر حصہ پہنچتا ہے؟

مجیب الرحمٰن منصور پوری (فراشخانہ دہلی)

الجواب وباللہ التوفیق:

جائداد وقف کرنے کے بعد اس کو تقسیم کرنا درست نہیں (۱)، البتہ وقف کردہ جائداد کی آمدنی موقوف علیہم پر واقف

۱- ''وعندهما هو حبسها على حكم ملك الله تعالىٰ، وصرف منفعتها علىٰ من أحب ولو غنيا فيلزم، فلا يجوز له

کے تر کے کے مطابق تقسیم ہوگی۔

مذکورہ موقوفہ جائداد کی آمدنی کی تقسیم میں یہ تفصیل ہے کہ اگر واقفہ نے اولاد پر بغیر ان کے نام ذکر کیے ہوئے وقف کی ہو تو اس کی پوری آمدنی واقفہ کی شرط کے مطابق محمد جان اور رحمت بی کے درمیان تقسیم ہوگی۔

یعنی اگر برابر برابر پانے کی شرط ہو تو برابر برابر حصہ ملے گا اور اگر حصوں میں تفاوت رکھا تھا تو اس کے اعتبار سے ان دونوں میں سے ہر ایک کو حصہ ملے گا (۱)۔

اور اگر چاروں میں سے ہر ایک کا نام لے کر وقف کیا ہو تو انتقال کر جانے والے موقوف علیہم کا حصہ فقراء کو ملے گا اور باقی آمدنی واقفہ کی شرط کے مطابق محمد جان اور مسماۃ رحمت بی کے درمیان تقسیم ہوگی (۲)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۲/ ۴/ ۱۴۰۱ھ

۱ -واقف کے شرط کی رعایت ضروری ہے:

اگر واقف نے یہ متعین کر دیا ہو کہ میرے روپے سے فلاں آدمی اس مدرسہ کو چلائے گا، اب اگر کسی دوسرے آدمی نے اس کو چلایا واقف کے روپے سے تو یہ جائز ہے یا نہیں؟

۲ -وقف علی الاولاد کی کیا نوعیت ہے:

وقف علی الاولاد کی کیا نوعیت ہے؟ کیا اس میں سے لڑکے اور لڑکی کو یکساں حصہ ملے گا یا کچھ فرق ہے؟

محمد ابراہیم بن محمد صالح افریقی

إبطاله ولا يورث عنه وعليه الفتوى. قال الشامي تحت قوله على حكم ملك الله: فعبر بلفظ حكم ليفيد أن المراد أنه لم يبق على ملك الواقف ولا انتقل إلى ملك غيره، بل صار على حكم ملك الله تعالى الذي لا ملك فيه لأحد سواه، وإلا فالكل ملك الله تعالى" (ردالمحتار ۳/ ۳۵۸ کتاب الوقف) (مرتب)۔

۱- "وتقسم بينهم بالسوية إن لم يرتب البطون وإن قال للذكر كالأنثيين فكما قال" (الدر المختار علی هامش ۳/ ۴۳۸ کتاب الوقف)۔

۲- "ولو قال: على أولادي ولكن سماهم فمات أحدهم صرف نصيبه للفقراء" (الدر المختار علی ردالمحتار ۶/ ۶۹۸، بیروت)۔

الجواب وبالله التوفيق:

اگر واقف نے معین کردیا ہو کہ میرے روپے سے فلاں ہی شخص اس مدرسہ کو چلائے گا تو جب تک وہ فلاں شخص زندہ رہے گا اور اس سے مالی خیانت نہ ہوگی، اس وقت تک وہی شخص اس روپے سے مدرسہ چلانے کا حقدار رہے گا۔

البتہ جب وہ شخص انتقال کرجائے گا یا اس سے مالی خیانت ثابت ہوگی تو واقف کی اجازت سے دوسرے شخص کو مدرسہ چلانے کا حق ہوجائے گا۔ اور اگر واقف مرچکا ہو تو وقف کی حفاظت اور اس کو باقی رکھنے کی غرض سے شرائط کے مطابق دوسرے دین دار اور مناسب شخص کو یہ حق ہوجائے گا(۱)۔

اس سوال کا کہ وقف علی الاولاد کی کیا نوعیت ہے؟ کیا اس میں سے لڑکا اور لڑکی کو یکساں حصہ ملے گا یا کچھ فرق ہوگا؟ جواب یہ ہے کہ اس مسئلہ میں فقہاء میں اختلاف ہے، بعض فقہاء مثل ہبہ کے مساوات کے قائل ہیں اور بعض فقہاء بخلاف ہبہ کے وقف میں للذکر مثل حظ الانثیین کے قائل ہیں۔

علامہ شامیؒ نے "**مطلب مراعاة غرض الواقفين واجبة، والعرف يصلح مخصصاً**" کے تحت ایک طویل ونفیس بحث کی ہے۔

جس کا حاصل یہ ہے کہ اگر واقف خود زندہ ہو تو اسی سے دریافت کرلیا جائے اور جیسا وہ کہے اسی کے مطابق عمل کیا جائے (۲)۔

اور اگر اس کا کوئی معمول بھی متعین اور واضح نہ ملے تو للذکر مثل حظ الانثیین کے قاعدے کے مطابق ہر لڑکے کو دو لڑکیوں کے برابر دیا جائے گا اور اسی قول کو راجح قرار دیا ہے۔

چنانچہ فرماتے ہیں: "**فإذا أطلقها الواقف انصرفت إليها، إلى قوله، وفي جامع الفصولين: مطلق الكلام فيما بين الناس ينصرف إلى المتعارف**" (۳)۔

۱- "لأن شرط الواقف كنص الشارع" (الدرالمختار علی الشامی، ص ۴۱۶ کتاب الوقف)، "ولأن شرط الواقف معتبرة إذ الم يخالف الشرع" (الدرالمختار علی الشامی، ص ۴۱۶ ج ۴ کتاب الوقف)، "ولأن مراعاة غرض الواقفين واجبة والعرف يصلح مخصصاً" (علی حاشیہ الشامی، ص ۴۳۳ ج ۴ کتاب الوقف)۔

۲- ونقسم بينهم بالسوية إن لم يرتب البطون وإن قال: للذكر مثل حظ الأنثيين فكما قال (الدرالمختار مع الشامی ۴۳۸/۳ کتاب الوقف)۔

۳- فتاویٰ شامی ۴۳۳/۳ کتاب الوقف۔

اس مبحث کوشامی میں اور تنقیح فتاویٰ حامدیہ میں اورفتاویٰ خیریہ میں،ص ۱۵۰ جلد اول پر بہت تفصیل سے نقل کیا ہے،فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہٗ محمد نظام الدین اعظمی،مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۴۰۱/۶/۲۸ھ

بھوپال کے بعض اوقاف کا شرعی حکم:

سابقہ ریاست بھوپال میں جو بیگمات کے زیر حکومت تھی فرماں روائے وقت سرکار شاہجہاں بیگم صاحبہ نے ایک پروانہ بتاریخ ۱۱/ربیع الثانی ۱۳۰۲ھ جاری فرمایا،جس کی رو سے کچھ باغات ریاست کو وقف فرمائے تھے،پروانہ کی نقل شامل ہذا ہے، اس وقت ریاست کی جو رپورٹ سالانہ شائع ہوتی تھی اس کی دفعہ ۳۵ میں بھی اس کارروائی کی تصدیق کی گئی تھی، رپورٹ مذکور کا اقتباس متعلقہ بھی شامل ہے، اس سلسلے میں یہ امر بھی قابلِ لحاظ ہے کہ اس وقت کے نظامِ حکومت کے اعتبار سے۔

۱-فرماں روائے وقت مختار کل اور ریاست کی جملہ املاک کا مالک کامل ہوتا ہے!

۲-ریاست کے اندر جو اوقاف واقع تھے، ان کے متعلق قوانین واحکام وقف میں مرقوم تھا کہ تمام اوقاف شاہی (فرد خاندان شاہی کے قائم کردہ اوقاف) کی اور اوقافِ عامہ دیگر اشخاص کے قائم کردہ اوقاف میں سے ان اوقاف کی جن کا کوئی متولی نہ ہو ریاست متولی ہوگی۔

۳-سرکار شاہجہاں بیگم صاحبہ کے انتقال کے بعد ان کی جانشیں سرکار سلطان جہاں بیگم صاحبہ ہوئیں اور انہوں نے ان میں سے ایک باغ موسومہ عیش باغ کو اپنے صاحب زادے نواب نصر اللہ خاں صاحب کو معافی دے دیا، اور ان کے بعد دوسرے صاحب زادے نواب حمید اللہ خاں صاحب کو دے دیا، نواب صاحب موصوف نے جو بعد میں خود فرماں روا ہوگئے تھے اپنے حکم سے اپنے نام کرالیا، چنانچہ بعد میں کاغذات وہی میں یہ باغ نواب حمید اللہ خاں صاحب کے نام درج ہوا اور ابھی ان کی صاحب زادی کے نام درج ہے۔

ازراہ کرام مندرجہ ذیل امور کے متعلق روشنی ڈالی جائے کہ:

۱-کیا ان دستاویزات کی رو سے جن کی نقول شامل ہذا ہیں، باغات مذکورہ بشمول عیش باغ دواماً وقف ہوگئے تھے؟

۲-اس پروانہ (مورخہ ۱۱/ربیع الثانی ۱۳۰۲ھ) میں جس کی نقل شامل ہے نیابۃً وقف کیا جانا مذکور ہے کیا اس

عبارت سے دائمی وقف میں کوئی نقص واقع ہوگیا ہے؟

۳-کیا فرماں روایانِ مابعد کے عمل سے جس کی تفصیل پیراگراف ۲ مندرجہ بالا میں دی گئی ہے، وقف متاثر اور زائل ہوگیا ہے۔

الجواب وبالله التوفيق:

جب فرماں روایانِ حکومت بھوپال جملہ املاک ریاست کے مالک تھے، تو ان کے کسی وقف نامہ میں محض لفظ نیابۃً واقع ہوجانے سے کسی وقف میں کوئی نقص واقع نہ ہوگا، بلکہ نیابتاً لکھنے کا مطلب یہ ہوگا کہ جس طرح نواب سکندر جہاں بیگم صاحبہ مرحومہ نے ۱۲۸۰ھ کو فرحت باغ کو وقف کیا ہے، اسی طرح ان ہی کے نقش قدم نیابۃً میں سرکار شاہ جہاں بیگم صاحبہ نے بھی ۱۳۰۲ھ میں نور باغ کو نواب جہانگیر محمد خاں صاحب مرحوم کے ایصالِ ثواب کے لیے وقف کیا، اور عیش باغ کو نواب قدسیہ بیگم صاحبہ مرحومہ کے ایصالِ ثواب کے لیے وقف کیا۔

صرف فرق اتنا ہے کہ نواب سکندر جہاں بیگم صاحبہ نے بذریعہ وصیت ۱۲۸۰ھ میں اس وقف کا اظہار کیا ہے اور سرکار شاہجہاں مرحومہ نے بذریعہ پروانہ سرکاری حکم نامہ بابت ۱۳۰۲ھ میں وقف کیا ہے۔

لہٰذا سب صحیح ونافذ ہیں اور اس لفظ نیابۃً سے کوئی وقف زائل نہ ہوگا اور پھر سرکار سلطان جہاں بیگم صاحبہ نے جو عیش باغ کو اپنے صاحبزادے نواب نصر اللہ خاں صاحب کو یا ان کے بھائی نواب حمید اللہ خاں صاحب کو دے دیا یا جناب نواب حمید اللہ خان صاحب نے اپنے دورِ فرماں روائی میں اپنی صاحبزادی کو دے دیا اگرچہ بنام معافی دیا ہے، مگر چونکہ حسب تصریح پروانہ ۱۱/ربیع الثانی ۱۳۰۲ھ شمولہ مثل ۱۵ مد مال دفتر ۔ با قاعدہ وقف مکمل ونافذ ہو چکا ہے، اس لیے اس لفظ معافی سے مراد تملیک یا ہبہ نہ ہوگا، بلکہ حسب ضابطہ شرعیہ کلیہ کسی عاقل بالغ کا قول مہما امکن محل احسن پر محمول کرنا ضروری ہوتا ہے، شرح سیر کبیر للسرخسی۔

لہٰذا اس کی یہ توجیہ ہوگی کہ ان فرماں روایانِ وقف جناب سرکار سلطانِ جہاں بیگم وجناب نواب حمید اللہ خاں صاحب نے محض اپنا حق تولیت ان کے سپرد کیا ہے اور اپنا حق تولیت ان کے حق میں معاف کیا ہے اور اس کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ نواب سلطان جہاں بیگم نے پہلے یہ حق جناب نصر اللہ خاں صاحب کو دیا، پھر ان سے لے کر یا ان کے بعد اسی حق

کو جناب حمید اللہ خاں صاحب کو دیا ہے، پس اگر اسی طرح دینے کو تملیک سمجھا یا اپنے کو عیش باغ کا مالک سمجھا یا اپنی صاحبزادی کو بطور تملیک وہبہ دیا تو یہ ان کی سمجھ کی غلطی تھی، مگر اس غلطی سے عیش باغ کا وقف ختم نہ ہوگا اور نہ اس میں فتور واقع ہوگا اور اگر ایسا نہیں ہے تو یہ ان کی غلطی بھی نہیں ہے۔

بہر حال اس صورت میں یہ وقف عیش باغ کا وقف قائم وصحیح رہے گا، صاحبزادی صاحبہ بھی متولیہ ہی شمار ہوں گی اور حقوق فرائض تولیت ان پر بھی حسب شرائط وقف متوجہ ہوں گی اور بس!

اور ان فرمارویانِ وقف کا یہ دینا قریب ایسا ہی ہوا کہ جیسا باغ فدک جو پہلے سے وقف تھا اور حضرت عمرؓ نے اس کو حضرت علیؓ کو دیا اور پھر حضرت علیؓ نے حضرت حسنؓ کو دیا اور یہ دینا تملیک وہبہ شمار نہ ہوا بلکہ بطریق تفویض وتولیت تھا۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۷/۵/۹۳ ۱۳ھ

ٹونک کے ایک وقف کا شرعی حکم:

ایک مسلمان نے اپنی غیر منقولہ جائداد وقف کر کے واضح طور پر اپنی نیت ظاہر کر دی اور بتلا دیا کہ اس موقوفہ جائداد کی آمدنی سے میری تعمیر کردہ مساجد کے مصارف چلائے جائیں، کچھ حصہ دینی تعلیم پر صرف کیا جائے وغیرہ وغیرہ اور شروع سے اب تک اسی طرح صرف بھی ہو رہے ہیں!

۱-تو کیا کبھی اس جائداد کی آمدنی کو کسی اور کام پر بھی صرف کیا جا سکتا ہے، جو واقف کی نیت کے خلاف ہو؟

۲-جائداد موقوفہ جس کا حوالہ سوال ۱ میں دیا گیا ہے، وقف ہونے کے بعد اعلیٰ چیز میں تبدیل کر دی گئی ہے، یا اس وقف کی پس انداز رقم سے نئی جائداد خرید لی گئی ہے، تو اس زائد آمدنی سے کوئی ایسا صرفہ کیا جا سکتا ہے جس کا وقف معلق سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

۳-ایک غیر منقولہ جائداد وقف ہے، لیکن وقف نامہ نہیں ہے اور شروع سے اس جائداد کی آمدنی سے اس مسجد کے مصارف پورے کیے جا رہے ہیں جو واقف جائیداد کے نام سے مشہور ہے۔

لیکن کیا ایسی جائداد کی آمدنی اس کام پر صرف ہو سکتی ہے جس پر اب تک کبھی کوئی صرفہ نہ کیا گیا ہو؟

۴-شہر ٹونک کی آبادی سے ملحقہ کھیت اور گورستان ہے، کسی گورستان کے قریب زرعی آراضی ہے، تو مالکِ کھیت

کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ دھیرے دھیرے کورستان کا تھوڑا تھوڑا حصہ اپنے کھیت میں شامل کر لے، اور اگر کورستان کے قریب مکانات تعمیر ہو گئے ہیں تو مالکانِ مکانات کورستان کو اپنے استعمال میں لا رہے ہیں اور ایک شر پسند طبقہ ایسا ہی ہے جو کورستان کو دیکھنا ہی نہیں چاہتا اور مٹانے کی فکر میں ہے۔

اس لیے سوال یہ ہے کہ کورستان کی حفاظت کس طرح ہو، قوم کی اس طرف توجہ نہیں ہے اور مقدمہ بازی کرنے کے لیے روپے نہیں ہیں، اگر کسی مسلمان وکیل کے پاس جائیں تو وہ پوری اجرت لیتا ہے اور اگر کسی امور کو ناپ کرائیں بھی تو پوری فیس دینی پڑتی ہے۔

غرضیکہ بغیر معاوضہ کوئی مسلمان کوئی کام نہیں کرتا تو شرعاً کورستان کی حفاظت کی ذمہ داری کس کی ہو سکتی ہے؟

مرزا مصطفیٰ بیگ (ریٹائرڈ ناظم مال ٹونک اسٹیٹ محلہ قافلہ راجستھان)

الجواب وباللہ التوفیق:

۱-واقف نے جن جن مصارف کے لیے وقف کیا ہے جب تک ان مصارف کے لیے ضرورت باقی ہے یا آئندہ ضرورت متوقع ہے کسی دوسرے مصرف میں صرف کرنا درست نہیں۔

ہاں جو آمدنی اس سے بھی زائد ہو اور رکھی رہنے میں ضائع ہونے کا قوی اندیشہ ہونے لگے تو مسلم ذمہ داروں کے مشورہ سے دوسرے اہم کار خیر میں صرف کر سکتے ہیں۔

۲-اگر وہ اعلیٰ چیز و اعلیٰ مصرف واقف کے منشاء کے خلاف نہیں ہے تو یہ تبدیلی درست ہے ورنہ درست نہیں، اس وقف کی پس انداز رقم اگر ایسی زاید رقم ہے کہ جس کی ضرورت نہ تو اس وقت وقفِ مذکور میں ہے اور نہ آئندہ اس کی ضرورت متوقع ہے، تو اس زائد رقم سے کوئی جائداد خرید کر کسی دوسرے کار خیر میں وقف کی جا سکتی ہے، یا جواب ۱ کے مانند صرف کیا جا سکتا ہے جو عمل بھی مسلم ذمہ داروں کے مشورہ سے ہو۔

۳-وقف کے تحقق کے لیے وقف نامہ بھی تحریر کرنا ضروری نہیں ہے، وقف زبانی بھی متحقق و صحیح ہو جاتا ہے، پس واقف نے مسجد کے لیے وقف کر دیا اور اس موقوفہ پر خرچ بھی کرنے لگا تو وقف متحقق ہو گیا اور اب اس کے خلاف دوسری جگہ پر خرچ کرنا درست نہیں ہو سکتا، منشاء واقف کی رعایت واجب ہوتی ہے۔

۴-جواب ۱ و ۲ میں ذکر کردہ ضابطہ کے مطابق اوقاف کی فاضل آمدنی سے کورستان کی حفاظت و مرمت کی

جاسکتی ہے، نیز جو قبرستان تدفین سے متروک ہو چکے ہوں یا قانوناً دفن سے روک دیے گیے ہوں اور ان کے ضائع ہونے کا اندیشہ ہو تو اس میں دینی ضرورت کے مطابق مسجد یا دینی مدرسہ قائم کر کے یا اس کو کسی ایسے کارِ خیر میں استعمال کر کے جس سے مسلم عوام اور بچوں کی مذہبی واقتصادی تربیت وترقی کا ایسا کام کیا جائے کہ اصل واقفین کو ثواب پہنچتا رہے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

مالِ حرام سے خریدی ہوئی اشیاء کا وقف کرنا:

مالیر کوٹلہ میں حسینہ نام کی ایک عورت کا مورخہ ۹ جون کو انتقال ہوگیا، یہ پہلے طوائف تھی پھر بتوفیق الٰہی تائب ہوگئی اور محمد شریف نامی ایک شخص سے نکاح کر کے باقی زندگی پاکیزگی کے ساتھ گذاری، محمد شریف کا چند دن پہلے انتقال ہو چکا تھا۔

مسماۃ حسینہ نے اس زمانے میں جب وہ طائفہ تھی ایک مکان خرید اتھا اور اسی میں اس کی رہائش تھی، انتقال سے قبل اس نے اپنی اس خواہش کا اظہار کیا تھا کہ وہ اپنا مکان وغیرہ کارِ خیر یا مسجد کے لیے وقف کرنا چاہتی ہے۔

مسماۃ حسینہ کا وارث پہلے خاوند سے اس کا ایک لڑکا شبیر عرف بیر و میرٹھ میں موجود ہے وہ اپنی خالہ کے پاس رہتا ہے، اس کی خالہ اور شبیر کی مرضی بھی یہی ہے کہ مسماۃ حسینہ مرحومہ کی خواہش کے مطابق کیا جائے، امام ابوحنیفہؒ کا مشہور مسلک ہے کہ جو مال زانیہ اپنے کسب سے معاملہ طے کر کے حاصل کرے وہ حلال ہے اگر چہ عقد حرام تھا اور صاحبینؒ کے نزدیک حاصل کردہ مال بھی حرام ہے، اب سوال یہ ہے کہ اس سلسلے میں مفتیٰ بہٖ قول کیا ہے؟

۲-مسماۃ مذکورہ کا وارث اس کا لڑکا اگر وقف کرے تو کیا یہ وقف صحیح ہو جائے گا؟ درمختار کی روایت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مورث کا مال وارث کے لیے بھی حرام رہے گا: ”لکن في المجتبیٰ: مات و کسبه حرام فالمیراث حلال، ثم قال: لا نأخذ بهذه الروایة، وهو حرام مطلقا علی الورثة فتنبه“ رہنمائی فرما کر عنداللہ ماجور ہوں۔

مفتی فضیل الرحمٰن ہلال عثمانی (دارالافتاء مالیر کوٹلہ پنجاب)

الجواب وباللہ التوفیق:

صورتِ مسئولہ میں اصل جواب سمجھنے کے لیے ان باتوں کا سمجھ لینا ضروری ہے:

۱-یہ کہ مکان مذکورہ اس کو کسی زانی نے بسلسلہ زنا نہیں دیا ہے، بلکہ مزنیہ نے زنا کے پیسہ سے یا کسی اور طرح سے اس کوخریدا ہے۔

اگر مال حرام یا کسب زنا سے خریدا ہو تو یہ مال حرام ہے، اور اگر خریدنے کی تیسری یا چوتھی صورت ہے تو اس کا حکم خود مزنیہ کے حق میں یہ ہے کہ مفتی بہ قول میں واجب التصدق نہیں ہے کما دل علیہ ھذہ العبارۃ:

۱-''أما إن دفع تلک الدراهم إلى البائع أو لا ثم اشترى منه بها''۔

۲-''أو اشترى قبل الدفع بها و دفعها''۔

۳-''أو اشترىٰ قبل الدفع بها ودفع غيرها''۔

۴-''أو اشترىٰ مطلقا و دفع تلک الدراهم''۔

۵-''أو اشترى بدراهم آخر ودفع تلک الدراهم ثم قال بعد بحثٍ طويل: وقال الكرخي في الوجه الأول والثاني: لايطيب، وفي الثلاث الأخيرة: يطيب إلىٰ قوله والفتوىٰ على قول الكرخي'' (۱)۔

بلکہ مفتیٰ بہ قول کے اس جملہ ''وفی الثلاث الاخیرہ یطیب الخ'' سے مملوک حلال اور جائز الاستعمال معلوم ہوتا ہے اور جب مورث کے لیے مملوک حلال اور جائز الاستعمال ہوگا تو وارثین کے لیے بدرجہ اولیٰ مملوک حلال اور جائز الاستعمال رہے گا۔

۲-یہ مکان خود وارثین کا مکسوب حرام نہیں ہے بلکہ وراثت میں ملا ہے اور مورث کا بھی بعینہٖ مکسوب حرام نہیں ہے، بلکہ بیش از بیش مکسوب حرام کے ذریعہ سے خریدا ہوا ہے اور بعینہٖ مکسوب حرام وہ قیمتیں ہیں جو اس کی خرید میں دی گئیں اور ان قیمتوں کے مالک کا علم نہیں اور ایسی صورت کا حکم شامی (۴/ ۱۳۰) میں یہ لکھا ہوا ہے:

'' قوله: إلا في حق الوارث الخ فانه إذا علم أن كسب مورثه حرام يحل له، لكن إذا علم المالک بعينهٖ فلا شک في حرمته و وجوب ردهٖ عليه''۔

پس جب یہ صورت ہے تو مملوک بالوراثت ہونے میں اور اس کے وقف کردینے کی صورت میں کوئی کلام نہیں ہوگا۔

۱- شامی ۴/ ۲۱۹۔

اور یہ بات الگ ہوگی کہ وارث اگر تقوی برتے اور تنزہ کی خاطر صدقہ کردے تو یہ انتہائی تقوی اور تنزہ ہوگا۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دار العلوم دیوبند سہارنپور ۱۸/ ۷/ ۹۸ ۱۳ ھ
الجواب صحیح: سید احمد علی سعید مفتی دار العلوم دیوبند

وقف کے لیے تحریر ضروری نہیں، وقف زبانی بھی ہو جاتا ہے:

زید نے اپنی صحرائی زمین اور باغات اور مکان اور نقد روپیہ چار معتبر دین دار آدمیوں کے سامنے وقف کیا اور کہا کہ چونکہ وقف نامہ رجسٹرڈ کرانے میں ڈیڑھ دولا کھ کا خرچہ ہے، اس لیے یہ جائداد مذکورہ ہے تو وقف ہی، لیکن خرچ سے بچنے کے لیے میں وصیت نامہ لکھوا کر اس طرح رجسٹرڈ کرادوں گا کہ وقف نامہ ہی سمجھا جائیگا۔

چنانچہ زید نے وصیت نامہ لکھوا کر رجسٹرڈ کرادیا۔ پھر اچانک زید کا انتقال ہوگیا، یہ وقف صحت اور ہوش وحواس کی حالت میں کیا تھا اور انتقال وقف کے تقریباً دس گیارہ ماہ بعد کیا، دل کا دورہ پڑنے سے اچانک انتقال ہوا۔ چند امور دریافت طلب ہیں:

● کیا زبانی وقف چار معتبر دیندار آدمیوں کے سامنے شرعاً صحیح ہوگیا یا نہیں؟

مشترکہ جائداد کا وقف:

● اگر اس موقوفہ جائداد میں کوئی دوسرا شخص بھی شریک ہو اور تقسیم کیے بغیر زید نے اپنا مبہم حصہ وقف کردیا ہو تو یہ وقف صحیح ہوگا یا نہیں؟

● روپیہ کا وقف کرنا صحیح ہے یا نہیں؟

زبانی وقف کے بعد خرچ سے بچنے کے لئے وصیت نامہ لکھنا:

● اگر زبانی وقف چار گواہوں کے سامنے کرے، پھر وصیت نامہ خرچ سے بچنے کے لئے لکھا، تو کیا متولی وقف کو یہ حق ہے کہ وہ وقف سے نظر انداز کرکے وصیت نامہ کی رو سے دوثلث ورثاء کو دے دے۔

الجواب وباللہ التوفیق:

● وقف صحیح ہونے کے لیے تحریر کرنا یا رجسٹرڈ کرانا لازم نہیں ہے، بلکہ وقف زبانی کرنے سے بھی ہوجاتا ہے،

کیونکہ زبانی ہی اصل ہے، جیسا کہ اس عبارت سے معلوم ہوتا ہے: "ومحله المال المتقوم وركنه الألفاظ الخاصة" (۱)، البتہ سوال سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ کس چیز پر وقف کیا ہے اور صرف منفعت کی جہت مؤبدہ ہے یا نہیں۔ جب تک صرف منفعت کی جہت بھی واضح نہ ہو جائے۔ حضرت امام ابو یوسفؒ کے قول مفتی بہ کے مطابق کوئی بھی منقح حکم نہیں لگ سکتا، لہٰذا یہ تشنگی دور ہونے کے بعد ہی کوئی حکم لگ سکے گا۔

● اگر اس جائداد موقوفہ میں صرف منفعت کی جہت مؤبدہ ہے تو دوسرے شخص کے شریک ہونے کے باوجود، جب کہ وہ جائداد قابل تقسیم ہو حضرت امام ابو یوسفؒ کے قول کے مطابق جو کہ مفتی بہ ہے، یہ وقف جائداد صحیح شمار ہوگا کما دلت علیہ هذه العبارة: "فلا يجوز وقف مشاع يقسم خلافا للثاني (الى أن قال) واختلف الترجيح والأخذ بقول الثاني أحوط وأسهل. بحر. وفي الدرر: وقال صدر الشهيد: وبه يفتي وأقر المصنف، وفي الشامي النعماني: ان قول أبي يوسف أوجه عند المحققين(۲)، خلاصہ یہ ہے کہ جب تک اس جائداد کا قابل تقسیم ہونا، نیز اس پر جہت مؤبدہ میں صرف منفعت کا علم نہ ہو جائے، کوئی قطعی حکم نہیں لگایا جا سکتا۔

● جائز ہے۔ اول تو اس لیے کہ اشیاء منقولہ کے تابع ہو کر ہے اور ضمن میں ہے، دوسرے یہ کہ اس کے رواج پر تعامل جاری ہے کما صرح بہ فی الشامی النعمانیۃ (۳/ ۳۷۴)۔

● اگر اس جائداد موقوفہ میں صرف منفعت جہت غیر مؤبدہ میں ہے اور یہ عقد وقف مرض الموت سے قبل حالت صحت میں ہوا ہے تو یہ وقف مکمل و تام ہو چکا ہے اور وقف مکمل ہو چکنے کے بعد واقف کو بھی کسی تغیر و تبدل کا حق نہیں رہتا، لہٰذا اس وصیت نامہ کے رجسٹرڈ کرا دینے سے بھی اس وقف کے لازم و صحیح ہونے میں کوئی شبہ نہیں رہے گا۔ کما دلت علیہ هذه العبارة "فاذا تم ولزم فلا يملك ولا يملك ولا يعار ولا يرهن" (۳)۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دار العلوم دیو بند سہارنپور ۱۴۱۱/۵/۸ھ

موقوفہ زمین کی خرید فروخت جائز نہیں:

عرض ہے کہ ایک زمین موقوفہ علی المسجد، بٹائی پر ایک کاشت کار کے قبضہ میں تھی، آزادی کے بعد جب ٹیننسی

۱- درمختار کتاب الوقف۔
۲- درمختار مع رد المحتار کتاب الوقف ۶/ ۵۳۴ دار الکتب العلمیہ بیروت۔
۳- درمختار علی الشامی ۳/ ۳۶۷۔

(Tenancy) ایکٹ نافذ ہوا، جس کی رو سے کاشتکار کو یہ حق حاصل ہوا کہ کاشت کار زمین پر اپنے قبضہ کو نیز زمین کے اندر اپنے کاشت کرنے کو ثابت کر کے گورنمنٹ کے ذریعہ اس زمین کا مالک بن جائے، اور گورنمنٹ، مالک زمین کی رضامندی کے بغیر، مارکیٹ ویلو سے بہت ہی کم نفع پر وہ زمین کاشتکار کے ہاتھ فروخت کر کے اپنی مقررہ قیمت مالک زمین کو دلاتی ہے۔

چنانچہ اسی قانون کے تحت کاشت کار نے مذکورہ زمین موقوفہ علی المسجد پر قبضہ کر کے لے لینا چاہا، لہذا قیم ومتولی مسجد نے یہ زمین موقوفہ علی المسجد، زید (مشتری اول) کے ہاتھ فروخت کر دی، زید نے یہ کھیتی کی زمین خرید کر اس پر ہاؤسنگ سوسائٹی بنانے کی غرض سے اس زمین کے مختلف پلاٹ بنا دیئے اور اس میں سے ایک پلاٹ (قطعہ ارض) پر کچھ نقد رقم وغیرہ اس کاشت کار کو (جس کے قبضہ اور کاشت میں اب تک یہ زمین تھی بطور رشوت) دے کر اس کو قبضہ چھوڑنے اور ٹیننسی ایکٹ کا فائدہ اٹھانے کے حق سے دستبردار ہونے پر رضامند کر لیا اور وہ دست بردار بھی ہو گیا۔

اس کے بعد زید (مشتری اول) نے مذکورہ زمین کے مختلف پلاٹ ایک ایک کر کے مختلف لوگوں کے ہاتھ فروخت کرنا شروع کئے، چنانچہ زید سے بکر، (مشتری ثانی) نے بھی ایک پلاٹ، مارکیٹ کے دام سے خریدا، بکر (مشتری ثانی) کو خریداری کے وقت یہ علم نہ تھا کہ اصل میں یہ زمین موقوفہ علی المسجد تھی، بکر مشتری ثانی نے اپنی رہائش کے لئے مکان تعمیر کرنے کی غرض سے یہ زمین (پلاٹ) خریدی تھی، چنانچہ خریدنے کے بعد اس نے مذکورہ زمین پر مکان کی تعمیر شروع کر دی، اب تک کچھ تعمیر ہوئی ہے، اور کام جاری ہے، اسی دوران تعمیر اس کے علم میں یہ بات آئی کہ دراصل یہ زمین موقوفہ علی المسجد تھی، زید (مشتری اول) کو خریدتے وقت نیز بکر (مشتری ثانی) کے ہاتھ یہ زمین (پلاٹ) فروخت کرنے سے پہلے پہلے درحقیقت اس زمین کا موقوف علی المسجد ہونا بتایا یا نہیں، بکر کو اس کی خبر نہیں ہے۔

اب دریافت یہ ہے کہ مذکورہ بالا حالات میں قیم ومتولی مسجد کی زید (مشتری اول) کے ہاتھ زمین موقوفہ علی المسجد کی یہ بیع شرعاً صحیح ہے یا باطل؟

۱- اگر صحیح ہے تو وقف غیر منقول کی بیع کن اعذار و اسباب کی بناء پر صحیح ہوتی ہے، اور اس سلسلہ میں کلی طور پر فقہی ضابطہ کیا ہے؟

۲- اگر فقہی نقطۂ نظر سے یہ بیع، باطل اور کالعدم ہے، تو اب بکر (مشتری ثانی) کیا کرے؟ ایسی کوئی گنجائش اور اجازت ہے کہ اس زمین پر مکان تعمیر کر کے بکر، اس میں قیام کر سکتا ہے، اور یہ تعمیر جائز ہو؟

۳- شرعی حیثیت سے اس زمین پر تعمیر شدہ مکان میں رہائش شرعاً جائز نہ ہو تو بکر، زمین کی قیمت اور تعمیر مکان میں

اب تک جتنا خرچ ہو چکا ہے، اس کا حرجانہ اور نقصان زید (مشتری اول) سے وصول کرسکتا ہے یا نہیں؟ اس کے علاوہ آپ کے ذہن میں اس زمین پر تعمیر مکان کی کوئی جائز صورت ہو تو ضرور تحریر فرمائیں۔

محمد حنیف (بڑودہ، گجرات)

الجواب وبالله التوفيق:

(۱) "فإذا تم (أي الوقف) ولزم لا يملك ولا يملك ولا يعار ولا يرهن"(۱)۔

(۲) "تحت قوله: وجاز شرط الاستبدال الخ، إعلم أن الاستبدال على ثلاثة وجوه .... والثاني: أن لا يشترطه سواء شرط عدمه أو سكت لكن صار بحيث لا ينتفع به بالكلية (إلى قوله) جائز الخ"(۲)۔

(۳) "وصرف نقضه إلى عمارته إن احتاج، وإلا حفظه ليحتاج إلا إذا خاف ضياعه فيبيعه"(۳)۔

(۴) "ولا سيما في زماننا (إلى قوله) قال: نعم، لأن الواقف غرضه انتفاع المارة ويحصل ذالک بالثاني"(۴)۔

(۵)"وهكذا في البحر (۵) وغير ذلک في كتب الفتاوی أيضا"۔

ان عبارتوں سے معلوم ہوا کہ وقف تام اور مکمل ہوجانے کے بعد اس کا بیچنا، خریدنا، ہبہ کرنا، رھن رکھنا وغیرہ کچھ

۱- الدر المختار علی ہامش رد المحتار مطبوعہ مکتبہ نعمانیہ ۳/ ۳۶۷ میں اسی طرح ہے: "لا يملك ولا يملك" جبکہ مکتبہ زکریا کے مطبوعہ نسخہ (۵۳۹/۶) میں صرف "لا يملك" ہے مگر علامہ شامی کی تشریح: "لا يملك أي لا يكون مملوكاً لصاحبه ولا يملك أي لا يملك التمليك لغيره بالبيع ونحوه" سے واضح ہوجاتا ہے کہ مکتبہ زکریا کے نسخہ میں طباعت کی غلطی ہے (متن الدر علی ہامش الشامی ۳/ ۵۰۷)۔

۲- رد المحتار علی الدر المختار ۶/ ۵۸۳۔

۳- الدر المختار مع رد المحتار ۶/ ۵۷۳، پوری عبارت اس طرح ہے: "(وصرف) الحاكم أو المتولي، حاوي (نقضه) أو ثمنه إن تعذر إعادة عينه (إلى عمارته إن احتاج وإلا حفظه ليحتاج) إلا إذا خاف ضياعه، فيبيعه ويمسك ثمنه ليحتاج" (فی متن الدر علی حاشی الشامی ۳/ ۳۸۴)۔

۴- رد المحتار علی الدر المختار ۶/ ۵۵۰، ۵۵۱۔

۵- البحر الرائق ۵/ ۴۲۱، ۴۲۲۔

بھی جائز نہیں ہوتا، ہاں اگر ضائع ہوجانے کاظن غالب ہوجائے، یابالکل ہی ناقابل انتفاع ہوجائے تو اس کوفروخت کر کے اس کے بدلے میں اسی موقوفہ کے متوازی ومماثل دوسری چیزیں خرید کر وقف کردی جائیں۔

پس صورت مسئولہ میں جب خریدار اول کو اس زمین کے قبضہ قابض سے تخلیہ کرانے میں بطور رشوت کے اس زمین کا ایک پلاٹ اور ایک رقم دینی پڑی۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس قابض کا قبضہ اگرچہ غیر شرعی تھا مگر اتنا مستحکم اور مضبوط تھا کہ بغیر ان ایثارات کے تخلیہ دشوار تھا، لہذا اس سے یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ اس موقوفہ کے ضیاع کا قوی خطرہ ہو چکا تھا، ایسی حالت میں اس زمین کا وقف کی حفاظت کی خاطر فروخت کردینا درست تھا اور جب خریدار اول کے لئے اس کا خریدنا ان مذکورہ بالا عبارتوں کے ذریعہ درست تھا تو خریدار اول کو بطور خود مالک ہوجانے کے بعد خریدار ثانی کے ہاتھ فروخت کرنا بھی درست وجائز ہوگیا اور خریدار ثانی کو بھی جائز ہوگیا کہ وہ اب جس طرح جائز کاموں میں چاہے استعمال کرلے۔

البتہ ٹرسٹ وارا کین وقف کے ذمہ لازم ہے کہ اس زمین کی رقم سے اس زمین کے متوازی ومتبادل کوئی جائداد حاصل کر کے جلد از جلد منشاء واقف کے مطابق وقف کردیں، ورنہ یہ لوگ سخت گنہگار اور عند اللہ مجرم ہوں گے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۹/ ۷/ ۱۴۰۰ھ

مرض الموت کاوقف وصیت کے حکم میں ہے:

اپنی وفات سے چار پانچ گھنٹے قبل زید نے اپنی کل مقبوضہ جائداد (رہائشی مکان وکھلی خشک زمین) اس پوری جائداد کی تخمینی مالیت ۱۲ہزار روپے ہوتے ہیں، جس میں زید کی اپنی کسبی جائداد چار ہزار روپے اور موروثی منقسمہ غیر نزاعی ۸ہزار مالیتی دونوں شامل ہیں ان میں سے ایک ملکیت جس کی تخمینی قیمت دوہزار ہوتی ہے مسجد کو وقف کرنے کے لئے وقف نامہ لکھا تھا، جس پر خود زید اور عادل گواہوں کے علاوہ ان کے حقیقی ورثاء (ایک بیٹا دو بیٹیاں شادی شدہ) کی دستخطیں موجود ہیں، اب جب کہ وقف نامہ پر عمل آوری کے لئے مسجد کمیٹی کی جانب سے اقدام کیا جانے لگا تو درج ذیل اختلاف مانع اقدام بن رہا ہے۔

۱- زید کا بیٹا وارث حقیقی معذور، اپاہج اور ناقابل کسب معاش ہے جس کی گزر بسر بود وباش کا کوئی انتظام نہیں۔

۲-گواہوں نے شہادت دی ہے کہ زید کے بیٹے نے وقف نامہ پر برضا ورغبت ہوش وحواس میں دستخط کئے تھے

مگر اس وقت وہ مذکورہ شہادت سے منحرف ہے۔

۳- وقف نامہ مرض الموت میں لکھا گیا ہے جو نا قابل قبول سمجھا جاتا ہے، دوسرے یہ کہ زید اپنی جائداد کا کچھ حصہ وقف کر کے صدقہ جاریہ کا ثواب حاصل کرنا چاہتا تھا جبکہ خود ان کا بیٹا ایسی کسمپرسی کی حالت میں ہے کہ بیٹے کو اس حال میں چھوڑ کر وقف کے ذریعہ ثواب حاصل کرنا گویا فرض کو چھوڑ کر مستحب کے اہتمام کرنے کے مترادف ہے۔

مگر گواہوں (عادل) کا کہنا یہ ہے کہ زید کا بیٹا لاچار ضرور ہے، مگر وقف شدہ جائیداد کے بغیر گزر بسر ممکن ہے۔

نیز زید کا بیٹا وقف نامہ کے مضمون سے پوری طرح آگاہی کے بعد ہی پوری رضا کے ساتھ اس پر دستخط ثبت کیا تھا جس میں کوئی جبر واکراہ نہیں۔

وقف نامہ اگر چہ مرض الموت میں لکھا گیا لیکن مرحوم نے مرض الموت سے قبل بثبات ہوش وحواس کئی بار (عادل) گواہوں کے سامنے مذکورہ جائداد (وقف) کرنے کا ارادہ اور اس کا اظہار کیا تھا اور مستند بات یہ بھی ہے کہ تحریری شکل میں لینے کے بعد دستخط کرتے وقت مرحوم مکمل ہوش وحواس میں تھے، یہ غلط ہے کہ وہ اپنا ہوش وحواس کھو چکے تھے، آپ براہ کرم اس نزاع کا تحقیقی مطالعہ کے بعد فیصلہ شرعی قلمبند فرما کر مشکور فرمائیں۔

۱- آیا یہ وقف نامہ من وعن درست ہے یا سرے سے درست ہی نہیں۔

۲- کیا کسی قسم کی ترمیم کے ساتھ اس کو برقرار رکھا جا سکتا ہے، مثلاً زید کے بیٹے کو اس کی لاچاری کی بناء پر اس وقف شدہ ملکیت سے صرف تاحیات استفادہ کا حق دیا جائے۔ جواب باصواب اور قول فیصل عنایت فرمائیں تاکہ ارتفاع نزاع باہمی آسانی سے ممکن ہو سکے۔

عبدالحفیظ (جانگاؤں، ورنگل، اے پی)

الجواب وباللہ التوفیق:

مرض الموت کا وقف اگر چہ وصیت کے حکم میں ہوتا ہے اور ورثاء کو محتاج چھوڑ کر کل وقف کر دینا اگر چہ مذموم فعل ہے، ان تمام باتوں کے باوجود کل ترکہ میں سے تجہیز وتکفین کا خرچ اور میت پر جو قرضہ ہو اس کو ادا کرنے کے بعد باقی ترکہ کے ایک تہائی حصہ میں وصیت جاری ہوتی ہے اور اس ایک تہائی حصہ میں نافذ ہونے کے لئے ورثاء کی رضامندی بھی شرط نہیں ہوتی، ہاں ایک تہائی حصہ سے زائد میں ورثاء کی رضامندی کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ ہے مسئلہ۔ ''کما فی عامة

الکتب المعتبرة للفتاویٰ"(۱)۔

پس جب حسب تحریر سوال واقف کا کل ترکہ ۱۲ہزار کی مالیت کا ہے اور اس میں سے صرف دوہزار مالیت کی ایک دوکان مسجد کے لئے وقف کیا ہے، تو ظاہر ہے کہ میت کی تجہیز وتکفین وقرض کی ادائیگی کے بعد بھی دوہزار کی مالیت تہائی ترکہ کے اندر ہی رہے گی۔

پس اگر یہ مالیت (۲ہزار مالیت کی) بعد خرچ تجہیز وتکفین وبعد ادائے قرض اگر قرض ہو تہائی ترکہ کے اندر ہے تو بلاشبہ یہ وقف صحیح ودرست ہے۔ بیٹا راضی ہو یا راضی نہ ہو۔

اگر تجہیز وتکفین اور بذمہ میت قرض میں چھ ہزار بھی خرچ ہوجاتے ہوں جب بھی ۲ہزار ۶ہزار کا تہائی رہے گا اور وقف صحیح رہے گا۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۴۰۱/۶/۳۰ھ

موقوفہ زمین بیچ کر اس کی قیمت سے دوسری زمین خریدنا:

۱-کسی آدمی نے کچھ زمین مسجد کے لئے وقف کیا اور پھر کسی وجہ سے اس وقف شدہ زمین کو فروخت کر کے دوسری جگہ زمین خرید کر کے اسی مسجد کے نام پر دیدیا کیا یہ جائز ہے؟

۲-کسی آدمی نے اپنی خاص زمینوں میں سے ایک پاؤ زمین کسی مسجد کے لئے زبانی طور پر بغیر رجسٹر ڈ کئے وقف کر دی اس کے بعد اس وقف شدہ زمین کو دوسرے آدمی کو فروخت کر کے اپنی دوسری جگہ سے ایک پاؤ زمین اسی مسجد کے نام پر دیدینا ازروئے شرع کیا حکم رکھتا ہے؟

مشترکہ زمین سے بلا اجازت شریک زمین وقف کرنا:

۳-ایک آدمی دس لڑکے ولڑکی کو چھوڑ کر انتقال کر گیا ان میں سے کچھ بالغ اور کچھ نابالغ ہیں، اس میں سے بڑے لڑکے نے کہا کہ میں نے ایک بیگھہ زمین مسجد کے لئے وقف کردیا اور کہا کہ چھوٹے بھائیوں کو میں اپنے حصے سے ان کا حصہ دے دوں گا، تو یہ مشترکہ زمین سے وقف کرنا جائز ہے یا نہیں؟ جب کہ ورثاء میں بالغ ونابالغ دونوں موجود ہے اور اس جگہ کو مسجد میں تبدیل کرنا اور اس میں نماز پڑھنا جائز ہے یا نہیں؟ محمد رفیق احمد

۱- "أو بالموت إذا علق به أي بموته كإذا مت فقد وقفت داري على كذا فالصحيح أنه كوصية تلزم من الثلث بالموت لا قبله" (الدرالمختار مع ردالمحتار ۶/۵۲۹، ۵۳۰)۔

الجواب وبالله التوفيق:

۱- اگر واقف نے وقف کرتے وقت استبدال کی شرط نہیں لگائی تھی تو وقف تام ہوجانے کے بعد اس عبارت "وأما الاستبدال ولو للمساكين آل بدون الشرط فلا يملكه إلا القاضي "(۱) کی رو سے یہ استبدال جائز نہیں ہوگا، لہذا اگر بغیر شرط استبدال کے یہ استبدال ہوگیا ہے تو واقف اس بدلنے میں گنہگار ہوا جس پر توبہ کرنا ضروری ہے، باقی دوسری زمین جو خرید کر وقف کی ہے وہ زمین بھی وقف ہوگئی اور اب اس میں بھی کوئی تبدیلی جائز نہیں ہے۔

۲- اس نمبر کا جواب بھی بالکل وہی ہے جو نمبر ایک کا ہے، رجسٹر ڈ کرنے یا نہ کرنے سے اس حکم میں کوئی فرق نہ پڑے گا۔

۳- جب ورثاء میں نابالغ بھی ہوں جن کی اجازت بھی شرعاً معتبر نہیں تو امام ابو یوسفؒ کے نزدیک وقف مشاع کے جائز ہونے کے باوجود اس طرح وقف کرنا جائز نہیں تھا، وہ شخص اس میں گنہگار ہوا جس پر اس کو توبہ کرنا چاہیے(۲)۔

اور اس وقف کا حکم شرعی یہ ہوا کہ اگر ابھی تک اس زمین پر مسجد تعمیر نہیں ہوئی ہے تو اس کو تقسیم کر کے نابالغوں کا حصہ الگ کر کے محفوظ کرایا جائے اور وقف کردہ رقبہ کی کمی کو وقف کرنے والے کے حصے سے پورا کرایا جائے، پھر اس کو مسجد کے لئے وقف تسلیم کیا جائے اور اگر اس پر مسجد تعمیر ہوچکی ہو تو مسجد کو مسمار نہ کریں گے، بلکہ ان نابالغین کے حصے کے بقدر واقف کے حصے میں سے لے کر نابالغین کے لئے محفوظ کرلیں گے اور اس وقف کرنے والے سے اس کی اجازت لینی چاہیے اور وقف کرنے والے پر لازم ہے کہ وہ نابالغین کا حصہ دے کر اس مسجد میں نماز پڑھنے کی اجازت دیدے، اگر اجازت نہ دے گا تو مزید گنہگار ہوگا اور اس میں نماز پڑھنا درست رہے گا (۳)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲/۶/۹ ۱۴۰۲ھ

موقوفہ اراضی کو ہبہ کرنا جائز نہیں ہے:

عرض خدمت یہ ہے کہ موضع بابا پور تعلقہ بھکل ضلع نظام آباد (آندھرا پردیش) میں ایک درگاہ شریف موسومہ

۱- الدرالمختار مع ردالمحتار ۶/ ۵۸۵۔

۲- و "یعزر" فلا یجوز وقف مشاع یقسم خلافاً للثانی (الدرالمختار مع ردالمحتار ۶/ ۵۳۴)۔

۳- "ویزول ملکه عن المسجد والمصلی بالفعل وبقوله جعلته مسجداً عند الثانی وشرط محمد والإمام الصلوة فيه" (الدرالمختار مع ردالمحتار ۶/ ۵۴۴)۔

حضرت بابا مظہر شاہ ابدالؒ موجود ہے۔اس درگاہ شریف کے حسب ذیل مختلف خدمت گزار ہیں:

۱۔متولی-ان کے ذمہ درگاہ کی مسجد کی امامت کے علاوہ تمام خدمت گزاروں پر نگرانی کرنا ہے۔

۲۔آبدار-ان کا کام پانی مہیا کرنا ہے۔

۳۔مورچھل-ان بردار ان کا کام عرس شریف میں پنکھا جھلنا ہے۔

۴۔فتحی-ان کا کام فاتحہ خوانی ہے۔

۵۔چراغدار-ان کا کام درگاہ شریف میں روشنی کا انتظام کرنا ہے۔

مذکورہ بالا تمام خدمت گزار نسل درنسل اپنی خدمات انجام دے رہے ہیں، ان تمام خدمت گزاروں کے لئے سابق دور میں ہر ایک کے لئے علیحدہ علیحدہ اراضیات بطور انعام شروط خدمت حکومت کی طرف سے دیئے گئے۔

ایک ہی خاندان کے چراغ دار ابتداءہی سے اپنے اپنے دور میں خدمت چراغداری انجام دیتے ہوئے اراضیات شروط الخدمت سے مستفید ہوتے رہے۔چنانچہ اسی سلسلہ خاندان چراغداری کے مسمی عبدالحق اپنی زندگی میں چراغ داری کی خدمت انجام دیتے ہوئے اراضیات شروط الخدمت سے مستفید ہوتے رہے۔ان کو صرف ایک لڑکا شیخ محی الدین اور تین لڑکیاں مسماۃ مریم بی صاحب، حلیمہ بی صاحب، آمنہ بی صاحب تھیں۔عبدالحق صاحب کے انتقال کے بعد ان کے اکلوتے لڑکے شیخ محی الدین صاحب خدمت چراغداری انجام دیتے ہوئے مشروط الخدمت سے مستفید ہوتے رہے، ان کی خدمت کے مدنظر جائداد مشروط الخدمت موصوف کے نام حکومت کی جانب سے منتقل ہوئی۔شیخ محی الدین صاحب کا اپنی زندگی میں اپنی تینوں بہنوں (مریم بی صاحب، فاطمہ بی صاحب، آمنہ صاحب) کے ساتھ بہت بہتر سلوک رہا۔اس وقت اراضیات کی کوئی قدر و قیمت نہ تھی، چنانچہ اپنے بھائی کے حسن سلوک سے متاثر ہوکر ان تینوں بہنوں نے اپنے بھائی شیخ محی الدین صاحب کے حق میں جائداد مشروط الخدمت سے دستبرداری کی تحریر کر چکی ہیں جو محفوظ ہے۔

شیخ محی الدین صاحب کو نرینہ اولاد نہیں ہے، صرف ایک لڑکی طاہرہ بیگم ہے، موصوف نے اپنی زندگی میں اپنی بیٹی طاہرہ بیگم کے نام اپنی کل جائداد بشمول اراضیات مشروطۃ الخدمت ہبہ کر دیا جو محفوظ ہے۔شیخ محی الدین صاحب کو انتقال کئے ۱۲رسال کا عرصہ ہورہا ہے، حسب ہبہ نامہ ان کی لڑکی طاہرہ بیگم اور ان کی زوجہ علیم النساء بیگم صاحب دونوں ماں اور بیٹی بلاشکایت درگاہ شریف کی خدمت چراغ داری انجام دیتے ہوئے تمام جائداد سے مستفید ہورہی ہیں، ان کی بلاشکایت کے خدمت گزاری کی تصدیق متولی صاحب وگرام پنچایت محفوظہ ہے، حکومت نے ان دونوں کی خدمات کے مدنظر کچھ شروط

الخدمت اراضیات کو ان دونوں کے نام پٹہ کردیا ہے جس کو دس سال کا عرصہ ہورہا ہے۔ چنانچہ ہر سال یہ دونوں اپنے پٹہ کی اراضیات کی مالگزاری ادا کرتے آرہے ہیں۔ رسائل محفوظ ہیں۔

اب چالیس سال کے بعد جب کہ عبدالحق صاحب کا انتقال ہوگیا اور ان کے لڑکے شیخ محی الدین صاحب کا انتقال ہوگیا اور عبدالحق صاحب مرحوم کی مذکورہ تینوں لڑکیوں میں مسماۃ مریم بی صاحبہ اور حلیمہ بی صاحبہ کا انتقال ہوگیا جس کو ۲۰ سال کا عرصہ ہورہا ہے، زمینات کی قیمت بڑھ جانے سے مندرجہ ذیل ورثاء کا ادعا یہ ہے کہ شروط الخدمت اراضیات کو متروک دے کر اس کی تقسیم عمل میں لائی جائے۔

دعویدار:۔ ۱۔مریم بی۔عبدالحق صاحب۔مرحوم کی بیٹی اور شیخ محی الدین صاحب کی بہن، لیکن انہوں نے اپنے بھائی شیخ محی الدین صاحب کے حق میں جائداد سے دستبرداری کی تحریر کرچکی ہیں، ان کو انتقال ہوئے ۲۰/سال ہورہے ہیں۔

۲۔حلیمہ بی صاحبہ۔عبدالحق مرحوم کی بیٹی اور شیخ محی الدین صاحب مرحوم کی بہن لیکن ان کو انتقال کئے ۱۲/سال ہورہے ہیں۔

۳۔آمنہ صاحبہ۔عبدالحق صاحب مرحوم کی بیٹی اور شیخ محی الدین صاحب مرحوم کی بہن موصوفہ زندہ ہیں، لیکن اپنی دونوں بہنوں کی طرح اپنے بھائی شیخ محی الدین صاحب کے حق میں جائداد مشروط الخدمت وغیرہ سے دستبرداری کی تحریر کرچکی ہیں جو محفوظ ہے۔

۴۔محمودہ بی یہ دعویدار نمبر ۲ حلیمہ بی کی لڑکی ہے شادی شدہ ہے عمر ۵۰ سال ہے۔

۵۔گوری بی ان کی عمر ۴۵ سال ہے

۶۔صغریٰ بیگم ان کی عمر ۴۲ سال ہے

۷۔کبریٰ بیگم ان کی عمر ۴۰ سال ہے

۸۔عبدالغفار:۔ یہ دعویدار (۱) مریم بی صاحبہ کا بیٹا ہے، اپنی ماں مرحومہ کی جائداد مشروط الخدمت کا دعویدار ہے۔

۹۔سکندر:۔ یہ دعویدار (۸) عبدالغفار کا بیٹا ہے دادی مرحومہ کی مشروط الخدمت اراضیات کا دعویدار ہے۔

۱۰۔صبیحہ بیگم:۔ یہ دعویدار (۶) صغریٰ بیگم کی بیٹی ہے، اپنی نانی حلیمہ بی صاحبہ مرحومہ کی جائداد مشروط الخدمت

اراضیات کی دعویدار ہے۔

۱۱۔مختارن۔ یہ دعویدار (۱۰) صبیحہ بیگم کا شوہر ہے، اپنی بیوی کی نانی حلیمہ بی صاحب مرحومہ کی جائداد مشروط الخدمت اراضیات درگاہ شریف جو شیخ محی الدین صاحب مرحوم کو وراثتاً سرکاری حیثیت سے ۱۹۵۴ء میں باضابطہ منظور ہوئی ہیں تقریباً ۳۰ سال کا عرصہ گذر رہا ہے، اب مندرجہ بالا اشخاص جائداد مشروط الخدمت اراضیات درگاہ شریف کے دعویدار ہیں جب کہ اب تک انھوں نے کسی قسم کی خدمت انجام نہیں دی۔ اس صورتحال میں علمائے کرام ومفتیان عظام سے استدعا ہے کہ براہ کرم شرع شریف کی روشنی میں ان دعویداروں کا دعویٰ کس حد تک حق بجانب ہے؟

محمد ابراہیم (مکان نمبر ۸-۳-۱۰۱ محلہ پھولانگ نظام آباد)

الجواب وبالله التوفيق:

چہ اغدار کی آراضیات بھی مشروط الخدمت وقف ہیں موقوفہ کا ہبہ وغیرہ کرنا درست نہیں ہے (۱)، بلکہ جب خاندان چہ اغدار پر وقف ہے تو جب تک چہ اغدار اولاد میں کوئی شخص رہے اور خدمات مشروطہ ادا کرتا رہے وہ اس وقف کا حقدار ہوگا اور جب اولاد کا سلسلہ منقطع ہوجائے تو اولاد اناث میں زیادہ قریبی ہوگا وہ اسی شرط خدمت کے ساتھ حقدار ہوگا۔ اس قاعدہ کے مطابق صورت مسئولہ میں موقوف علیہ کا قریبی رشتہ دار جو زندہ ہو وہ حقدار متصور ہوگا اور صورت مسئولہ میں زیادہ قریبی رشتہ دار صرف آمنہ بی زندہ ہیں، لہذا صرف وہی اس مشروطہ خدمت کے ساتھ حقدار متصور ہوں گی بشرطیکہ خدمت مشروطہ خود یا اپنے کسی وکیل کے ذریعہ کرائیں۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

شرائط واقف کے خلاف عمل:

۱۔کسی موقوفہ یتیم خانے یا علمی ادارے کا شرائط واقف کے خلاف اس کے موجود کارکنان کی کاروائی درست ہے یا نہیں؟

۱- ’’وعندهما حبس العين على حكم ملك الله تعالى فيزول ملك الواقف عنه الى الله تعالى على وجه تعود منفعته الى العباد فيلزم ولا يباع ولا يوهب ولا يورث‘‘ (ہدایہ ۲/ ۶۱۲، کتاب الوقف، مطبع یوسفی لکھنؤ، بدائع الصنائع ۵/ ۳۲۶، مکتبہ زکریا دیوبند)۔

الجواب وباللہ التوفیق:

۱-شرائط واقف مثل نص شارع کے واجب العمل ہوتے ہیں، اس کے خلاف کرنا جائز اور درست نہیں ہوتا (۱)،فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی،مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

خائن کی تعریف اور اس کا حکم:

خائن کس کو کہا جاتا ہے اور اس کے لئے کیا حکم ہے؟

الجواب وباللہ التوفیق:

خیانت کا ثبوت جبتک شرعی دلائل سے نہ ہوجائے اس وقت تک کسی کو خائن کہنا جائز نہیں (۲) اور دلیل شرعی سے ثبوت خیانت کے بعد خائن کو معزول کردینا ضروری ہے (۳)اعانت جائز نہیں،فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی،مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۲/۹/۱۳۸۵ھ

الجواب صحیح محمود غفی عنہ

شب قدر میں شیرینی کی تقسیم اور اس پر اوقاف کی آمدنی صرف کرنا:

یہاں دہرہ دون میں ایک انجمن ہے جس کے سپرد مختلف اوقاف کا انتظام ہے، اس انجمن کا ہر تیسرے سال انتخاب عمل میں آتا ہے جس میں ہر بالغ سنی حنفی المذہب ووٹر ہوتا ہے جس کے لئے باقاعدہ ممبر سازی ہوتی ہے۔

ہر سال شب قدر پر شیرینی تقسیم ہوتی ہے۔مگر سال گذشتہ انجمن نے اپنی میٹنگ میں پاس کرکے کہ مٹھائی تقسیم نہ ہو مٹھائی بند کردی ہے، اب نمازیوں نے اپنے طریقہ سے چندہ کرکے مٹھائی کا انتظام کیا تھا، اب شب قدر قریب ہے سو مٹھائی کا

۱- ’’شرائط الواقف کنص الشارع إلی قولہ: في المفهوم والدلالة ووجوب العمل به‘‘(الدرالمختار علی الرد ۳/۵۷۵،مطبعہ عثمانیہ)۔

۲- ’’لایعزله القاضي بمجرد الطعن في امانته بل بخيانة ظاهرة قرينة‘‘(شامی ۳/۵۳۲،عثمانیہ)۔

۳- ’’وإن عزله واجب علی کل مسلم يستطيعه فانه من قبيل انكار المنكر‘‘(تقریرات الرافعی علی حاشیہ ابن عابدین ۶/۸۴، مکتبہ زکریا)۔

سوال پھر ہورہا ہے، انجمن کی اکثریت تو یہی کہتی ہے کہ مٹھائی انجمن نہیں دے گی، مگر چند ممبران انجمن اس پر بضد ہیں کہ حسب دستور سابق انجمن کو مٹھائی کا انتظام کرنا چاہئے، اوقاف کی پانچسو کی آمدنی ہے، آپ شرع کی روشنی میں بتلاویں کہ شب قدر میں شیرینی کی تقسیم کی مذہبی نوعیت ہے یا صرف رواج ہوگیا ہے، اب انجمن کو مٹھائی تقسیم کرنا چاہئے یا نہیں؟

الجواب وبالله التوفيق:

شب قدر میں شیرینی کی تقسیم شرعی نقطہ نظر سے بالکل بے اصل اور خلاف شرع ہے محض بے بنیاد رسم پڑ گئی ہے، اوقاف کی آمدنی سے یہ شیرینی تقسیم کرنا جائز نہیں ہے، اگر وقف کی آمدنی سے کوئی شیرنی تقسیم کرے گا تو اس پر شرعاً ضمان عائد ہوگا(۱)، پہلے جو شیرنیاں وقف کے مال سے تقسیم کی گئی ہوں گی انکا بھی یہی حکم ہے، ہاں اگر لوگوں نے اپنے ذاتی مال سے تقسیم کیا ہو تو کوئی ضمان نہیں، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۰/۹/۸۵ ۱۳ھ
الجواب صحیح سید احمد علی صاحب نائب مفتی دارالعلوم دیوبند

مسلم اوقاف بورڈ کی آمدنی عیدگاہ پر خرچ کرنا:

اگر مسلم اوقاف بورڈ سے روپیہ حاصل کر کے عیدگاہ کی تعمیر اور اسکے مصرف میں لگایا جائے تو جائز ہے یا ناجائز؟

الجواب وبالله التوفيق:

اگر مسلم اوقاف بورڈ میں اس مد کا روپیہ ہوتا ہے اور پھر دیتے ہیں تو جائز ہے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور
الجواب صحیح محمود غفی عنہ نائب مفتی دارالعلوم دیوبند

۱- "والواجب ان يبدأ بصرف الفرع الى مصالح الوقف من عمارته وإصلاح ماوهى من بنائه وسائر مؤناته التي لابد منها" (بدائع الصنائع ۵/ ۳۳۰، مکتبہ زکریا)۔

معذور کامتولی رہنا:

ایک ہمسایہ مسجد کا متولی ہے، دوڈھائی سال سے اپاہج ہے، کرسی پر بیٹھے پڑے رہتے ہیں، نقل وحرکت بالکل نہیں کرسکتا، دوسرے آدمیوں کی امداد کے بغیر پیشاب پاخانہ مشکل، لحاف وغیرہ خود بخود استعمال نہیں کرسکتا، نماز وغیرہ اسی وجہ سے خانگی رہتی ہے۔ مسجد جانے کی ضرورت ہوتو تین چار آدمی کرسی پر اٹھا کرلاتے ہیں۔ ایسی حالت پر ہمسایہ کے لوگ متولی رہنے پر ناراض ہیں، کیونکہ اس سے کماحقہ ہر کام چلتا نہیں، بلکہ وہ زبردستی متولی رہنا چاہتا ہے، کچھ تعصبا اس کی طرفداری کرتے ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ ایسی حالت میں ایسے شخص کو مسجد کا متولی باقی رکھنے میں شرعاً کوئی قباحت ہے یا نہیں؟ اطمینان بخش جواب مطلوب ہے۔

الجواب وباللہ التوفیق:

انتظام مسجد درست رکھنے کے لیے متولی کا مسجد میں آنا ہر وقت ضروری نہیں ہے، اگر یہ متولی پہلے سے مقرر ہے اور صحیح کام انجام دیتا تھا اور اب بھی غبن وغیرہ خرد برد وقف میں نہیں کرتا تو محض اس کی معذوریوں کی وجہ سے اس کو معزول نہ کیا جائے گا، ایسا کرنا درست نہ ہوگا، "**لایجوز للقاضی عزل الناظر لمشروط له النظر بلا خیانة**"(۱)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۴/ ۷/ ۹۱ ۱۳ھ

۱- شامی ۶/ ۵۸۰ کتاب الوقف مکتبہ زکریا۔

باب ما يتعلق بأحكام المساجد

مسجد کے لاؤڈ اسپیکر سے گم شدہ چیزوں کا اعلان کیسا ہے؟

مسجد کے مینارہ پر لاؤڈ اسپیکر کا ہارن رکھا ہوا ہے، باقی سامان یعنی ایمپلیفائر اور مائک وغیرہ مسجد کے اندر رکھے ہوئے ہیں، جس میں اذان کے علاوہ خرید وفروخت اور گم شدہ چیزوں کا اعلان پیسے لے کر کیا جاتا ہے، از روئے شرع یہ اعلان کرنا چاہیے یا نہیں؟

شفیق احمد (مسجد انصاریان اسوڑہ غازی آباد)

الجواب وباللہ التوفیق:

اگر یہ لاؤڈ اسپیکر مسجد کے پیسے سے خریدا گیا ہے جب تو اس کا مینارہ پر رہنا درست رہے گا، باقی خرید وفروخت یا گم شدہ کا اعلان وغیرہ کوئی دنیوی کام کرایہ لے کر بھی کرنا درست نہ ہوگا (۱)۔

اور اگر چندہ کے پیسے سے خریدا گیا ہے اور چندہ دینے والوں نے ان سب کاموں میں استعمال کی نیت سے چندہ دیا ہے تو ان مذکورہ سب کاموں میں کرایہ لے کر بھی استعمال کرنا درست رہے گا، باقی اس صورت میں جس طرح مشین وغیرہ متصل اور الگ رکھی ہے، اسی طرح ہارن بھی مینارہ سے الگ رکھنا ضروری ہے، ہاں مینارہ سے الگ اور متصل رکھ سکتے ہیں، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۲/۶/۱۴۰۱ھ

۱- ”ویحرم فیہ السوال ویکرہ الإعطاء مطلقاً وقیل، ان تخطی وإنشاد ضالة“ (الدر المختار علی هامش الشامی ۴۴۳ ج ۱)۔

”عن أبی هريرة قال قال رسول الله ﷺ: من سمع رجلاً ينشد ضالة في المسجد فليقل لا ردها الله عليک فإن المساجد لم تبن لهذا“ (رواہ مسلم، مشکوۃ شریف ۶۸ مرتب)۔

امام کومسجد کی آمدنی سے ایام رخصت کی تنخواہ دینا کیسا ہے؟

کیا جائداداورمسجد کی آمدنی سے امام کوایام رخصت کی تنخواہ دینا جائز ہے؟

شفیق احمد (مسجد انصاری اسوڑہ غازی آباد)

الجواب وباللہ التوفیق:

اگرشروع ملازمت میں امام نے یہ طےکررکھا ہے کہ ایام رخصت کی تنخواہ بھی لوں گا، یا کمیٹی مسجد نے طےکررکھا ہےتو بلاتکلف وبلاخدشہ ایام رخصت کی تنخواہ لینا دینا جائز رہے گا (۱)، اور اگر یہ سب باتیں نہ ہوں تو عرف عام میں جتنے دنوں کی رخصت میں تنخواہ دینے کا دستور ہوتو صرف اتنے ایام کی تنخواہ دینا درست رہے گا اور اس سے زیادہ اراکین مسجد کی صواب دید پرموقوف رہےگا (۲) فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبندسہارنپور ۱۲/۱۱/ ۱۴۰۹ھ

صدقہ، زکوۃ، چڑھاوے، چراغاں وغیرہ کی رقم مسجد میں لگانا اورلگ جائےتو کیا حکم ہے؟

۱-زید کا صدقہ، خیرات، زکوۃ، چڑھاوے اور چراغاں کا پیسہ بینک میں جمع تھا اور وہ کسی مسجد میں مؤذن تھا، پھر اچانک اس کا انتقال ہوگیا، درانحالیکہ اس کا کوئی وارث بھی نہیں اور نہ ہی اس نے کوئی پیسہ کے بارے میں وصیت فرمائی تو کیا ایک شخص یا مسجد کےممبران اس کو بینک سے کسی طرح نکال کرمسجد میں لگاسکتے ہیں اور انہوں نے اس رقم سے مسجد کے اندراگر پنکھا وغیرہ لگاہی دیا تو کیا حکم ہے؟

۲-محکمہ اوقاف سارے ہندوستان میں جاری ہے، یہ مساجد ومقابر اوران سے متعلق جائداد کی حفاظت کرتا ہے،

۱- "فإن كانت مشروطة لم يسقط من المعلوم شيء" (الاشباہ والنظائر مع شرح الحموی، ۱۱۸)۔

۲- "القاضي يستحق الكفاية من بيت المال في يوم البطالة في الأصح فينبغي أن يكون في المدارس، لأن يوم البطالة للاستراحة، وفي الحقيقة تكون للمطالعة والتحرير عند ذوي الهمة، الاشباه والنظائر مع شرح الحموى ۱۱۸ فحيث كانت البطالة معروفة في يوم الثلثاء والجمعة وفي رمضان والعيدين يحل الأخذ وكذا لو بطل في يوم غير معتاد لتحرير درس إلا إذا نص الواقف على تقييد الدفع باليوم الذي يدرس فيه كما قلنا وفي الفصل الثامن عشر من التتارخانية قال الفقيه أبو الليث: ومن يأخذ الأجر من طلبة العلم في يوم لا درس فيه أرجو أن يكون جائزا" (فتاوی شامی، ۳/۳۸۰ کتاب الوقف مرتب)۔

اس کے لیے انتظامیہ سے چھ ہزار ایک سو پچاس فیصد کے حساب سے چندہ نگراں وصول کرتا ہے۔

اس بارے میں سوال یہ ہے کہ کسی مسجد کی دکانوں اور مکانوں کی آمدنی مناسب ہے اور اخراجات پورے ہوجاتے ہیں اور کمیٹی کل آمدنی اوقاف کو نہیں بتلاتی، بعض بتلاتی ہے بعض چھپاتی ہے، تا کہ چندہ نگراں کو زیادہ نہ دینا پڑے، یہ چوری ہے یا خیانت ہے؟ اس طرح عمل کرنا جائز ہے یا نا جائز؟ اس طرح کا بچا ہوا روپیہ مسجد کی تعمیر اور دیگر مسجد کے کاموں میں خرچ کر سکتے ہیں؟ نیز ان مذکورہ بالا افعال کی مرتکب انتظامیہ کا کیا حکم ہے؟

عبدالمجید (محلہ شیخ مسجد، اجین، ایم، پی)

الجواب وباللہ التوفیق:

۱-جو پیسہ اس کے مرنے کے بعد برآمد ہوا ہے، اس کا حکم شرعی یہ ہے کہ پہلے اس کے نزدیک کے پھر دور کے خاندان کے لوگوں کو تلاش کر کے ان کو معلوم کیا جائے اور حسب قاعدہ وراثت ان کو دیا جائے، جب کوئی نہ ملے تو اس وقت مستحقین صدقہ پر صدقہ کر دیا جائے، دینی تعلیم کے نادار طلبہ اور دینی علم کی خدمت کرنیوالے ناداروں کو دینا مقدم کیا جائے اور پھر دوسرے غرباء و مساکین کو دیا جائے۔

اس رقم کو مسجد میں نہیں لگا سکتے، اگر غلطی سے کچھ پیسہ مسجد میں لگ گیا ہو تو جتنا پیسہ لگ گیا ہے اتنا پیسہ خرچ کرنے والے لوگ اپنے پاس سے صدقہ کر دیں۔

۲-ایسا پیسہ مسجد کی تعمیر میں اور دیگر کاموں میں صرف کر دینا شرعاً مباح ہے، باقی چونکہ یہ قانوناً چوری ہے جس سے بچنا واجب ہے، اس لیے مباح کی وجہ سے واجب کو تو نہیں چھوڑا جائے گا اور ایسا کرنے کی اجازت نہ دی جائے گی، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۰/۴/۷ ۱۴۰ھ

الجواب صحیح حبیب الرحمٰن خیرآبادی

جگہ کی قلت کی بنا پر خارج از مسجد اقتداء کرنے کا حکم شرعی:

دہلی کے ایک مخصوص علاقہ میں ایک شاہی مسجد واقع ہے، جو کہ کافی وسیع اور کھلی ہوئی ہے اور گنجان آبادی کے علاقہ

میں آباد ہے، جس کی حدودِ اربعہ اور شان وشوکت جامع مسجد سے کافی حد تک مشابہ ہے، مذکورہ مسجد کا صحن بھی اچھا خاصا وسیع ہے، جس کے تینوں جانب وضو خانہ واقع ہے، مذکورہ مسجد میں صدر دروازہ کی جانب مشرق میں سیڑھیاں ہیں اور سیڑھیوں کے دونوں جانب وسیع وضو خانے تعمیر شدہ ہیں، وضو خانہ اور سیڑھیوں کے قریب پندرہ بیس فٹ چوڑا راستہ اور دونوں جانب سبزہ زار واقع ہیں، جن کے بعد ایک سبز خطہ ہے جس میں گھاس لگی ہوئی ہے اور جس کے چاروں جانب خاردار جھاڑیوں کی باڑھ ہے، اس خطہ میں اکثر نماز جنازہ ہی ہوتی ہے، ساتھ ہی جمعہ کے دن عوام کی زیادتی کے سبب اس مذکورہ خطہ میں جہاں نمازِ جنازہ ہوجاتی ہے، جمعہ کے دن نمازی اپنی نماز اس جگہ بھی ادا کرلیتے ہیں، جیسا کہ نقشہ سے ظاہر ہے۔

تاہم چند افراد کا خیال ہے کہ اس خطہ میں نمازِ جمعہ ادا نہیں کی جاسکتی اور اس کو شرعی اعتبار سے غلط بھی قرار دیتے ہیں، ان کا کہنا ہے کہ تسلسل نماز با جماعت برقرار نہیں رہتا، اس لیے یہاں شرعی اعتبار سے نماز جائز نہیں ہے۔

اسلم قادر (کوچہ پنڈت لال کنواں دہلی)

الجواب وباللہ التوفیق:

مسجد کے اندرونی صحن بھر جانے کے بعد جہاں سیڑھیوں کے دونوں طرف وضو خانے ہیں، اگر وہاں بھی دو، دو، تین، تین نمازیوں کی صف بنا کر نماز ادا کی جاسکتی ہو، اسی طرح سیڑھیوں کے دونوں طرف جو سبزہ زار ہیں، اگر وہاں بھی دو تین کی صف بنا کر نماز ادا کی جاسکتی ہو، تو وہاں بھی زائد نمازی کھڑے ہوجائیں۔

اسی طرح سیڑھیوں کے نیچے جو راستہ ہے وہاں بھی زائد نمازی صف باندھ کر نماز ادا کرتے ہوں تو صفوں کا تسلسل ختم نہ ہوگا اور اس صورت میں نچلے سبزہ زار میں جہاں نماز ادا کی جاتی ہے وہاں بھی زائد نمازی نماز ادا کرلیں تو بلاشبہ سب کی اقتداء اور نماز درست ہوجائے گی، اسی طرح وضو خانوں اور راستے میں یا سیڑھیوں کے دونوں طرف سبزہ زاروں میں صف بنا کر نماز ادا کرنے کی جگہ نہ رہنے کی وجہ سے نماز نہ پڑھی جاسکے جب بھی اس مجبوری کی وجہ سے انقطاع صفوف کا حکم نہ ہوگا اور سبزہ زار جنازہ گاہ میں زائد مقتدیوں کا یعنی ایسے مقتدیوں کا اقتدا کرنا جو اندرونِ مسجد کے بھر جانے کی وجہ سے وہاں اقتدا کر کے نماز ادا کریں تو اقتدا صحیح اور نماز درست ہوجائے گی۔

ہاں آگے کے حصہ میں صف قائم ہوسکے اور پھر اس کو اتنا خالی چھوڑ کر جس میں ۲/۳ صفیں ہوسکتی ہوں وہاں صف قائم نہ کی جائے اور صرف سیڑھی کی جگہوں میں نماز ادا کی جائے تو انقطاع صفوف ہونے کی وجہ سے وہاں اقتدا صحیح نہ ہوگی اور نماز

ادانہ ہوگی (۱)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۱/ ۴/ ۱۴۰۶ھ

الجواب صحیح حبیب الرحمٰن خیرآبادی

سود لینے، جاندار کی تصویر بنانے اور بلیک مارکیٹنگ کرنیوالوں کا روپیہ مسجد کی تعمیر میں لگانا کیسا ہے؟

۱- زید سودی لین دین کرتا ہے جس کو عام طور پر لوگ جانتے ہیں اور اکبر ایسی ساڑیاں تیار کراتا تھا جن پر جانداروں کی تصویریں بنائی جاتی ہیں، کیا ایسے لوگوں کا روپیہ مسجد کی تعمیر میں لگایا جا سکتا ہے؟

۲- ایک شخص نے اپنی زمین پڑوسی کے ہاتھ فروخت کردی اور چند روپے بیعانہ کے طور پر لے لیے اور کہدیا کہ جیسے جیسے مجھ کو ضرورت ہوگی روپے لیتا رہوں گا، اس درمیان مسجد کے ذمہ داروں نے اس شخص پر زبردستی دباؤ ڈال کر مسجد کے لیے وہ زمین حاصل کرلی، زمین خریدنے والے سے اس معاملہ پر کوئی گفتگو نہیں کی اور نہ اس کو راضی کیا اور نہ آج تک وہ راضی ہے۔

اس طرح سے حاصل کی ہوئی زمین پر مسجد کی تعمیر ہوسکتی ہے؟

۳- چند لوگوں نے گاؤں کے عوام سے دستخط کرا کے گورنمنٹ سے راشن دکان کا لائسنس حاصل کیا کہ اس کے ذریعے سے مٹی کا تیل، شکر اور سیمنٹ وغیرہ حاصل کر کے راشن کارڈ پر عوام میں تقسیم کی جائیں گی، جو لوگ راشن کارڈ حاصل کرتے ہیں ان کے کارڈ پر جتنا لکھا جاتا ہے اس کا نصف ان کو دیا جاتا ہے، ان کا بقیہ نصف اور اس کے علاوہ تمام کا تمام بلیک کردیا جاتا ہے۔

کیا بلیک مارکیٹنگ کرنے والوں کا روپیہ مسجد کی تعمیر میں لگایا جا سکتا ہے؟

نوٹ: اگر مسجد کے ذمہ داروں نے جان بوجھ کر ایسا کردیا ہے اور شریعت کی نگاہ میں یہ صحیح نہیں ہے تو اس کی تلافی کی کیا صورت ہوگی؟ بینوا توجروا۔　　　　ابو اسلم (ضلع اعظم گڑھ)

۱- "ويمنع من الاقتداء تجري فيه السفن أو خلاء في الصحراء أو في مسجد كبير جداً، كمسجد القدس يسع صفين فأكثر إلا إذا اتصلت الصفوف فيصح مطلقاً، كأن قام في الطريق ثلاثة، وكذا اثنان عند الثاني لا واحد اتفاقا قال الشامي تحت قوله يسع صفين: نعت لقوله خلاء والتقييد بالصفين صرح به في الخلاصة، والفيض والمبتغى وفي الواقعات الحسامية، وخزانة الفتاوى: وبه يفتى به "(فتاویٰ شامی ۱/ ۵۹۴، باب الامامۃ)۔

الجواب وبالله التوفيق:

۱-سود کا روپیہ اور جانور کی تصویر بنانے کی مزدوری کا روپیہ حرام ہوتا ہے، حدیث میں سود خور وغیرہ پر لعنت کی گئی ہے، لہٰذا سود کے روپیہ کا حرام ہونا ظاہر وبیّن ہے(۱)، اس کا مسجد میں لگانا جائز نہیں، اگر ایسی ساڑیاں وغیرہ غیر مسلموں سے تیار کرائیں تو تیار کرنے والا گنہگار ہوگا جس سے اس کو باز آنا اور توبہ کرنا ضروری ہے، باقی وہ ساڑیاں یا ان کی قیمت حرام شمار نہیں ہوگی۔

غرض حرام پیشہ کرنے والا جب مسجد کے لیے روپیہ دے تو اس سے کہا جائے کہ حلال پیسہ مسجد کے لیے دو، حرام در حرام مشتبہ مت دو، پھر وہ شخص کہے کہ میں حلال ہی پیسہ دے رہا ہوں تو چوں کہ وہ مسلمان ہے، آخرت سے ڈرتا ہے، قرض لے کر بھی دے سکتا ہے، اس لیے اس کی بات تسلیم کرلیں گے اور جب تک دلیل شرعی سے یہ بات ثابت نہ ہوجائے کہ واقعی حرام ہی پیسہ دیا ہے، اس کا پیسہ لے سکتے ہیں اور مسجد میں لگا بھی سکتے ہیں۔

۲-جب بیعانہ کے طور پر صرف چند روپے لیے تو بیع تمام نہیں ہوئی اور نہ واقع ہوئی بلکہ صرف وعدہ بیع ہوا نہ کہ ایقاع، ایسی حالت میں اس وعدہ شدہ زمین کو اگر دوسرے کے ہاتھ فروخت کردے تو یہ بیع منعقد ونافذ ہوگی اور اس پر مسجد تعمیر کرنا بھی درست ہوجائے گا، البتہ اس وعدہ خلافی کا گناہ بیعانہ لینے والوں کو ہوگا اور بیعانہ کا پیسہ واپس کردینا لازم ہوگا۔

۳-بلیک کرنا قانونی چوری ہے جس کی بغیر وجہ شرعی اجازت نہیں اور اس رقم کو مسجد میں لگانا درست نہیں ہے۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دار العلوم دیوبند سہارنپور ۱۰/۴/۱۴۰۷ھ

مسجد کا مکان ایسے قصاب کو کرایہ پر دینا جو خنزیر وغیرہ کاٹے:

۱-مسجد کے پاس ایک مکان ہے، اس مکان کو قصاب کو کرایہ دینا جبکہ وہ اس میں خنزیر اور گائے وغیرہ ہر قسم کا حرام

۱- "عن جابر بن عبد الله رضي الله عنه قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: لعن الله آكل الربوا وموكله وكاتبه وشاهديه" (رواہ مسلم وغیرہ)، "وفي التوضيح قال أصحابنا وغيرهم تصوير صورة الحيوان حرام أشد التحريم، وهو من الكبائر وسواء صنعه لما يمتهن أو لغيره فحرام بكل حال، لأن فيه مضاهات بخلق الله إلى قوله وبمعناه قال جماعة العلماء مالك وسفيان وأبو حنيفة وغيرهم انتهى" (عمدۃ القاری۱۰/۷، ۲۲)۔

گوشت کاٹ کر فروخت کرتا ہے جائز ہے یا نہیں؟

عبدالصمد گجراتی (گلوسٹر لندن)

الجواب وبالله التوفيق:

في متن الدر على هامش الشامي: "وجاز إجارة بيت بسواد الكوفة لا بغير ها على الأصح، ليتخذ بيت نار، أو كنيسة أو بيعة، أو يباع فيه الخمر، وقالا: لاينبغي ذالک، لأنه إعانة على المعصية، وبه قالت الثلاثة" "وقال الشامي: هذا عنده أيضاً، لأن الإجارة على منفعة البيت، ولهذا يجب الأجر بمجرد التسليم ولا معصية فيه وإنما المعصية بفعل المستاجر وهو مختار فينقطع نسبته عنه، فصار كبيع الجارية ممن لايستبرئها أو يأتيها من دبر، وبيع الغلام من لوطي، والدليل عليه أنه لو آجره للسكنى جاز وهو لابد له من عبادته فيه"(۱)۔

"وفي الدر على هامش الشامي (۵/۲۵۰): وجاز بيع عصير عنب ممن يعلم أنه يتخذ خمراً إلى قوله أن قوله ممن أي من كافر، أمابيعه من المسلم فيكره، ومثله في الجوهرة"۔

ان عبارتوں سے معلوم ہوا کہ کرایہ پر لینے والا قصاب اگر مسلمان ہو تو جانتے ہوئے کہ وہ اس میں حرام گوشت وغیرہ فروخت کرنے کا کام کرے گا تو اس کو نہ دینا چاہیے، بلکہ اس کی اصلاح کی کوشش کرنی چاہیے کہ وہ ایسا پیشہ ہی نہ کرے، بلکہ جائز کام کرے اور اگر وہ غیر مسلم ہو تو اس صورت میں حکم یہ ہے کہ اگر وہ مکان مسجد سے بالکل متصل ہو کہ خنازیر کا شور وشغب وغیرہ مسجد میں آئے گا یا اس کا دروازہ بالکل مسجد کے سامنے ہو کہ تمام مصلی اسی راستے سے نماز کے لیے آتے ہوں اور آتے ہوئے یا نماز پڑھتے ہوئے اس کے اس فعل سے ان کو کراہت واذیت ہوتی ہے، یا ایسا ہو کہ جس سے مسجد کی تلویث کا خطرہ ہو تو چوں کہ مسجد شعائر اللہ میں سے ہے اور اس کی صفائی، ستھرائی اور تعظیم وتکریم واجبات شرعیہ میں سے اور مقاصد شرعیہ میں سے ہے: كما قال تعالىٰ: "ومن يعظم شعائر الله فإنها من تقوى القلوب"(۲) وفي الخبر: "تحريم الحرمات واجب" ہر وہ چیز جس سے مصلیوں کی نماز میں خلل واقع ہو احتیاط واجب ہے(۳)۔

۱- فتاوی شامی ۵/۲۵۱، فصل فی البیع۔

۲- سورۂ حج: ۳۲۔

۳- "وكذا يكره تطوع عند إقامة صلوٰة مكتوبة إلى قوله وكذا كل ما يشغل باله عن أفعالها ويخل بخشوعها كائناً

اوراگر وہ مکان مسجد سے متصل نہ ہواور نہ اس کا دروازہ مسجد کے سامنے ہوتو لندن جیسے ملک وشہر میں حضرت امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک کرایہ پر دینا جانتے بوجھتے بھی جائز ہے، مگر چونکہ صاحبین رحمہما اللہ کے یہاں جانتے بوجھتے دینے میں اعانت علی المعصیۃ کے ایہام کی وجہ سے دینا اچھانہیں، اس لیے اگر چہ مفتی بہ قول ابوحنیفہ کا ہوگا مگر احتیاط نہ دینے میں ہوگی، اوراگر علم نہ ہوکہ وہ ایسا کام کرے گا تو باتفاق دینا جائز ہے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبندسہارنپور ۱۵/۶/ ۹۸ ۱۳ھ

اگر مسجد کی زمین پر کسی نے غلطی سے گھر تعمیر کرلیا تو کیا حکم ہے؟

گاؤں کے پردھان نے غلطی سے صرف گاؤں سماج کی سمجھ کر وہ زمین ایک غریب مسلمان کو دے دی بعد میں معلوم ہوا کہ زمین تکیہ کی ہے، اس سے پہلے اس مسلمان نے اس پر تعمیر کرلی ،معلوم ہونے پر اس سے کہا گیا جبکہ اس نے اس پر تعمیر کرلی ۔کیا وہ تکیہ کی اس زمین کا حق دار ہوسکتا ہے یا وہ اس کا کچھ معاوضہ دے کر اس کو رکھ سکتا ہے، جب کہ اس نے اس کا معاوضہ پردھان کو دے دیا تھا، اس کے بارے میں شریعت کی رو سے کیا حکم ہے؟

سعید احمد (مقام کھیڑا افغان سہارنپور)

الجواب وباللہ التوفیق:

حسب تحریر سوال وہ زمین مسجد ہی کی شمار ہوگی، اگر پردھان کی غلطی سے اس زمین پر کسی مسلمان کا گھر بن گیا ہے تو اب اس گھر کو گرانے کا حکم نہیں دیا جائے گا، بلکہ شرعاً پردھان کے ذمہ ہے کہ ایسی ہی کوئی زمین جو سماج کی ہو مسجد کے لیے دیدے اور جب اس زمین کے عوض دوسری زمین مسجد کو مل جائے گی تو اب وہ زمین مسجد کی شمار ہوگی ،فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبندسہارنپور ۱۸/ ۱۳/ ۸۷ ۱۳ھ

مسجد میں داخل ہوتے وقت سلام کرنا کیسا ہے؟

میں شیر کوٹ کسی کام سے گیا، سوچا کہ نماز ادا کرلوں وضوء کر کے سنتیں ادا کیں، کچھ وقت جماعت میں باقی تھا، باہر سے ایک شخص آیا اور آکر سلام کیا، مولوی صاحب نے جو کہ امام صاحب تھے، ایک دم اس شخص سے کہا کہ مسجد میں سلام کرنا منع

ہے، کیونکہ میں بھی مسجد میں جاتا ہوں تو سلام کرتا ہوں، کیا واقعتاً مسجد میں سلام کرنا منع ہے؟

شمشاد حسین (بیڑی، سگریٹ مرچنٹ بجنور)

الجواب وبالله التوفيق:

مسجد میں سلام کرنا مطلقاً منع نہیں ہے، بلکہ اس صورت میں منع ہے جب ان لوگوں کو مخاطب بنا کر سلام کیا جائے جو کہ قرآن کی تلاوت اور تسبیح میں مشغول ہیں یا نماز کے انتظار میں بیٹھے ہوئے ہیں: ''والذين جلسوا في المسجد للقراءة والتسبيح أو لانتظار الصلوٰة ما جلسوا فيه لدخول الزائرين عليهم، فليس هذا أوان السلام فلا يسلم عليهم'' (۱)، ہاں البتہ داخلہ کے لیے جو سلام ہوتا ہے اس کے مندرجہ ذیل الفاظ ہیں: ''السلام علينا وعلىٰ عباد الله الصالحين، وإذا دخل الرجل في بيته يسلم عليهم علىٰ أهل بيته، وإن لم يكن في البيت أحد، يقول: السلام علينا وعلىٰ عباد الله الصالحين'' (۲)، جب اپنے گھر میں سلام کرنے کا حکم ہے تو مسجد میں بطریق اولیٰ ہوگا، کیونکہ مسجد میں فرشتوں کا ہونا ظاہر وغالب ہے۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۵/۳/۱۴۰۱ھ

کسی کا مکان وغیرہ توڑ کر جبراً مسجد تعمیر کرنا:

میرے پاس ایک مکان تھا جس کا مالک میں تھا اور دو یتیم بچوں کے نام کر دیا تھا، مگر محلّہ کے چند لوگوں نے اس مکان کو توڑ کر مسجد بنا ڈالی ہے، کیا اس صورت میں مسجد بنانا جائز ہے یا نہیں؟

نذیر احمد (جبو اتھ مظفر نگر)

الجواب وبالله التوفيق:

کسی کا مکان اس کی مرضی اور اجازت کے بغیر توڑ کر مسجد بنالیا جائز نہیں ہے اور اگر واقعہ صحیح ہے تو جن لوگوں نے

ما كان'' (الدر المختار على الشامى، ۱/ ۲۵۴، كتاب الصلوة)۔

۱- فتاویٰ عالمگیری ۵/ ۳۲۵۔

۲- فتاویٰ عالمگیری ۵/ ۳۲۵۔

ایسا کیا ہے ان پر لازم ہے کہ مالکِ مکان کو راضی کر کے اس سے اجازت لے لیں اور راضی کرنا اگر چہ قیمت دے کر ہو جب بھی قیمت دے کر راضی کرنا لازم رہے گا، ورنہ سب لوگ عاصی و گنہگار ہوں گے اور نماز بکراہت ادا ہوگی۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دار العلوم دیو بند سہارنپور ۳۱/۱/۰۰ ۱۴ھ

غیر مسلم کی رقم مسجد میں لگانا:

اگر کوئی غیر مسلم بطور امداد کے مسجد میں کچھ دے تو مسجد میں استعمال کرنا جائز ہے؟

الجواب وباللہ التوفیق:

اگر غیر مسلم مسجد کی امداد کو اپنے عقیدے میں اچھا اور نیک کام قرار دیکر کرتا ہے اور اس سے لینے کی وجہ سے خطرہ نہیں ہے کہ یہ آئندہ مسلمانوں سے پوجا پاٹ وغیرہ کے لئے یا کسی دنیوی غلط کام میں مسلمانوں کو استعمال کرے گا تو اس کی امداد لے لینا بلا شبہ جائز و درست ہوگی، ورنہ کسی لطیف حیلہ سے بتلا دیا جائے کہ بد اخلاقی اور بدنمائی بھی نہ ہو اور کام بن جائے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دار العلوم دیو بند سہارنپور ۱/ ۸/ ۰۴ ۱۴ھ

کافر کا روپیہ مسجد میں لگانا اور اس کو ایصالِ ثواب کرنا:

اگر کوئی غیر مسلم کسی مسجد میں پنکھا یا کوئی اور چیز اس طرح کی ایصال ثواب کے لیے دے دے اور اس پر اپنا نام بھی درج کرا دے، تو کیا یہ جائز ہے، نیز مسجد میں بھی ایصالِ ثواب کے لیے دیا جا سکتا ہے یا نہیں؟

حافظ عبد الغفار (سورج کنڈ سردھنہ میرٹھ)

الجواب وباللہ التوفیق:

یہ مسئلہ اس طرح ہے کہ اگر کوئی غیر مسلم مسجد کی تعمیر کے لیے یا اس کے کسی کام کے لیے کوئی چیز دینے کو اپنے عقیدہ

میں نیک کام سمجھ کر دے اور اس سے یہ خطرہ نہ ہو کہ وہ اس کی وجہ سے مسلمانوں کو غلط استعمال کرے گا یا ان پر احسان جتائے گا تو اس کا مسجد کے لیے دینا جائز رہے گا اور مسجد کے کام میں استعمال کرنا بھی صحیح رہے گا (۱)، باقی غیر مسلم کو مرنے کے بعد ایصال ثواب کرنا درست نہیں ہے (۲)، اس لیے ایصالِ ثواب کرنے کے لیے درست نہ ہوگا، اسی طرح اپنے نام کا کتبہ وغیرہ لگانے کی شرط لگاتا ہے تو اس صورت میں بھی لینا درست نہ ہوگا۔

مسجد میں جو چیز دی جاتی ہے اس کا ثواب ملتا ہے، اب ایصالِ ثواب پر دینے کا کیا مفہوم ہے، واضح ہونے کے بعد جواب ہو سکے گا۔فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۲/۱/۱۴۰۸ھ
الجواب صحیح: محمد ظفیر الدین مفتاحی

مسجد کی چھت پر امام کے لیے کمرہ بنانا جائز نہیں:

ایک مسجد ہے، اس کے دائیں اور بائیں دونوں جانب سڑکیں ہیں اور جدار قبلہ کے آگے مسجد کی کوئی زمین نہیں ہے، ایک صاحب اس میں امامت کرتے ہیں، دریافت طلب امر یہ ہے کہ مسجد کی چھت پر امام صاحب کے لیے کمرہ تعمیر کرایا جا سکتا ہے یا نہیں؟　　　　محمد نجم الدین (علی گڑھ)

۱- حنفیہ کے نزدیک کافر کے وقف کے صحیح ہونے کے لئے شرط یہ ہے کہ وہ ان کے نزدیک قربت ہو، ظاہر ہے کہ مسجد میں خرچ کرنا جیسے مسلمانوں کے نزدیک قربت ہے کفار و ہنود جو کچھ مسجدوں میں دیتے ہیں وہ بھی اعتقاداً اس کو قربت سمجھتے ہیں اور ہندوستان کے کفار و ہنود بھی مسجدوں میں خرچ کرنے کو قربت اور قابل ثواب جانتے ہیں۔

"قوله: وأن يكون قربة في ذاته الخ قال الشامي: فتعين أن هذا شرط في وقف المسلم فقط، بخلاف الذمي لما في البحر وغيره: أن شرط وقف الذمي أن يكون قربة عندنا وعندهم كالوقف على الفقراء أو على مسجد القدس، بخلاف الوقف على بيعة فإنه قربة عندهم فقط، أو على حج أو عمرة فإنه قربة عندنا فقط، فأفاد أن هذا شرط لوقف الذمي فقط، لأن وقف المسلم لايشترط كونه قربة عندهم بل عندنا كوقفنا على حج وعمرة، بخلافه على بيعة فإنه غير قربة عندنا بل عندهم" (فتاوی شامی ۳/ ۳۶۰ کتاب الوقف)، عبارت مذکورہ سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے نیز معلوم ہوا کہ جس طرح اہل کتاب کے نزدیک بیت المقدس میں صرف کرنا کار ثواب ہے اسی طرح ہندوستان کے کفار کے نزدیک بھی مساجد میں خرچ کرنا قربت ہے اسی وجہ سے سید الطائفہ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی قدس سرہٗ نے کفار ہنود کے روپیہ کو مسجد میں صرف کرنا جائز لکھا ہے کما فی فتاوہ رشیدیہ قدوۃ (مرتب)۔

۲- مشکوۃ شریف میں وارد ہوا ہے کہ ایک شخص کافر نے سو غلام آزاد کرنے کی وصیت کی تھی، اس کے بیٹے نے حضورؐ سے پوچھا: "فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم: إنه لو كان مسلماً فأعتقتم عنه أو تصدقتم أو حججتم عنه بلغه ذلك"، (رواہ ابو داؤد) یعنی آپ نے فرمایا کہ اگر وہ مسلمان ہوتا تو اس کو اعتاق وصدقہ وحج کا ثواب ملتا اور جب کافر کو ثواب نہیں ملے گا تو ایصال ثواب کرنا بھی درست نہ ہوگا۔

الجواب وباللہ التوفیق:

مسجد کی چھت پر امام صاحب کے لیے کمرہ بنانا جائز نہیں ہے (۱)، درمختار وغیرہ میں اس کی تصریح موجود ہے، ہاں غسل خانہ، وضوخانہ، استنجا خانہ وغیرہ جو فناءِ مسجد کے درجہ کی عمارت ہو، اس کی چھت پر امام صاحب کے لیے کمرہ بنایا جا سکتا ہے، اس لیے کہ جو جگہ ایک مرتبہ عین مسجد ہو جاتی ہے، یعنی محض نماز و ذکر وغیرہ عباداتِ خالصہ محضہ کے لیے وہ قیامت تک کے لیے تحت الثریٰ سے لے کر عنانِ سماء تک مسجد ہو جاتی ہے، کمافی کتب الفقہ، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۲/ ۴/ ۱۴۰۶ھ

مسجد یا مدرسہ کی رقم شیئرز میں لگانا از روئے شرع درست ہے یا نہیں؟

کیا کسی مدرسہ یا مسجد کی رقم اس بازارڈاک کے شیر ''حصص'' میں لگا کر اس میں سے مدارس اور مسجد کے لیے نفع حاصل کرنا جائز ہوگا؟

محمد خیر الاسلام (دارالافتاء دارالحدیث نوگاؤں آسام)

الجواب وباللہ التوفیق:

کسی مسجد یا مدرسہ کے پیسہ سے بازارڈاک ''حصص'' خریدنا چند وجوہ درست نہیں، ایک وجہ تو یہ ہے کہ دینے والے کی منشا عموماً یہ ہوتی ہے کہ اس کا پیسہ بعینہٖ اس کارِ خیر میں صرف ہو اور یہ چیز اس کی منشا کے خلاف ہوگی۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ اگر کبھی نقصان ہوگا تو ان لگانے والوں پر ضمان واجب الادا ہوگا جو جھگڑے اور نزاع کا سبب ہوگا۔

تیسری وجہ یہ ہے کہ یہاں پر ڈاک میں جو چیز ''سودا'' مبیع مثمن ہے وہ نہ تو موجود ہوتی ہے نہ مملوک و مقبوض یا معلوم

۱- ''لو بنیٰ فوقہ بیتاً للإمام لایضر، لأنہ من المصالح، أما لو تمت المسجدیۃ ثم أراد البناء منع، ولو قال: عنیت ذالک لم یصدق تاتار خانیۃ'' (الدرالمختار ۳/ ۳۷۱) ''وکرہ تحریما الوطء فوقہ والبول، والتغوط، لأنہ مسجد إلیٰ عنان السماء، قال الشامي تحت قولہ إلی عنان السماء: بفتح العین وکذا إلیٰ تحت الثریٰ کما في البیری عن الاسبیجابي'' (فتاویٰ شامی، ۱/ ۴۴۱، مطلب في أحکام المساجد)۔

کچھ بھی نہیں ہوتی اور بیع مالم یملک ، وبیع مالم یوجد ، وبیع مالم یقبض ، بیع مجہول نا جائز ہیں(۱)۔فقط واللہ اعلم بالصواب

مساجد میں قمقمے وغیرہ لگانا شرعی نقطۂ نظر سے درست ہے یا نہیں؟

آج کل مساجد میں قمقموں اور دیگر آرائش کی چیزوں کا لگایا جانا بکثرت جاری ہے، شرعی نقطۂ نظر سے ان چیزوں کا مساجد میں لگانا کیسا ہے؟

الجواب وباللہ التوفیق:

مسجدوں میں ضرورت سے زیادہ قمقمے لگانا اسراف کے حکم میں ہے اور ضرورت کے مطابق لگانا جائز رہے گا(۲)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

زیادہ مستحکم بنانے کے لئے مسجد کو شہید کرنا:

بینوا القول المفتیٰ به في مذهب الاحناف لاثنتان أسئلة آتية:

(۱) ''هل يجوز هدم المسجد الذي لم يبل للإعادة ثانياً''۔

مسجد کو دوسری جگہ منتقل کرنا:

(۲) ''هل يجوز نقل المسجد من موضع الىٰ موضع آخر''۔

عبدالغفور مولوی (گوپال گھاٹ، کیرالہ)

۱- ''ويؤيده ما في الهداية: ولا يجوز بيع السمك قبل أن يصطاد، لأنه باع مالا يملكه ولا في حظيرة إذا كان لا يؤخذ إلا بصيد، لأنه غير مقدور التسليم، ولا بيع الطير في الهواء، لأنه غير مملوك قبل الأخذ'' (الهدایہ مع الدرایہ، ۳/۴۲ باب البیع الفاسد)۔

۲- ''ويكره التكلف بدقائق النقوش ونحوها'' (فتاوی شامی ۱/۴۴۲، مطلب فی احکام المساجد)۔

الجواب وبالله التوفیق:

۱-لایجوز هذا الغیر الباني کما في الدر المختار: أراد أهل المحلة نقض المسجد وبنائه أحکم من الأول أن الباني من أهل المحلة لهم ذالک وإلا لا، وفي رد المحتار عن الهندیة:" مسجد مبنی أراد رجل أن ینقضه ویبنیه أحکم، لیس له ذالک، لأنه لاولایة له، إلا أن یخاف أن ینهدم إن لم یهدم"(۱)۔

۲-"لایجوز هذا، لأن المسجد یبقی مسجدا عند الإمام والثاني:(أبی یوسف)أبداً إلی قیام الساعة وبه یفتیٰ هذا فی الدر من کتاب الوقف"(۲)،فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

شہید شدہ مسجد کے ملبوں کو فروخت کرنا؟

۱-انهدم المسجد أو هدم ولم یکن بناء المسجد الجدید في طراز جدید، هل یجوز في هذه الحالة بیع أشیاء المسجد المنهدم من اللبن والحجر والباب وغیر ها؟

عبدالغفور مولوی (پال گھاٹ، کیرالہ)

الجواب وبالله التوفیق:

لایباع في هذہ الحالة أشیاء المسجد المنهدم من اللبن والحجر والباب وغیرها بل ینقل إلی مسجد آخر یحتاج إلیها بعد المشورة من أهل المحلة وأراکین المسجد۔

نعم إن لم یکن هناک مسجدمحتاج ویضیع تلک الأشیاء إن لم یبع، فیباع بعد مشورة الأراکین وأهل المحلة بقیمة مناسبة، وتحفظ تلک القیمة إن أمکن بناء المسجد الجدید وإلایرسل إلیٰ مسجد اٰخر یحتاج إلی ذالک، وهذا یؤخذ من الدرو الرد وغیر ها من کتب الفتاویٰ المعتبرة

۱- شامی ۳/ ۳۷۰ کتاب الوقف۔

۲- "ولو خرب ماحوله واستغنی عنه یبقیٰ مسجد أ عند الأمام والثاني أبداً إلی قیام الساعة وبه یفتیٰ "حاوی القدسي"(الدرالمختار علی الشامي ۳/ ۳۷۰ کتاب الوقف)(مرتب)۔

عند الأحناف (۱)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۹/ ۴/ ۱۴۰۱ھ

احکام المساجد سے متعلق اہم مفصل فتویٰ:

ہمارے بڑودہ شہر کے بالکل وسط میں ایسا علاقہ ہے جس کے چاروں طرف بازار ہے، سامنے عمارات بنائے معدوم کی شاندار پرشکوہ عمارت ہے اور اطراف سے شہر میں آنے والی بسوں کا اسٹینڈ بھی اس کے قریب ہے، بس اور ٹرافک سے ایسے بھرپور علاقہ میں کھجوری نامی مسجد تاریخی واقع ہے، مذکورہ مسجد کے چاروں طرف مسجد کی مملوکہ زمین پر دکانیں ہیں جو سالہا سال سے کرایہ پر دی ہوئی ہیں، حکومت کے ضابطہ قانون کی رو سے مسجد کی توسیع کے لیے ان دکانوں کا قبالہ مسجد کو حاصل ہونا دشوار بلکہ ناممکن ہے، جائے وقوع کی درج بالا خصوصیات کی وجہ سے نمازیوں کی کثرتِ تعداد کی بنا پر موجودہ مسجد بالکل ناکافی ہونے اور آج سے بیس سال قبل کے فرقہ وارانہ فساد میں اس کو کافی نقصان پہونچنے نیز اس کی عمارت نہایت بوسیدہ ہونے کی وجہ سے مسجد عرصہ دراز سے ازسرنو تعمیر طلب تھی، قانونی رکاوٹوں کی وجہ سے اس کی تعمیر نو مؤخر ہوتی رہی اور اب اس کی تعمیر کا کام شروع ہو چکا ہے، موجودہ مسجد نمازیوں کی تعداد کی بنسبت نہایت تنگ ہے اور اس میں ہوا، روشنی وغیرہ کا راستہ نہ ہونے کی وجہ سے کافی حبس رہتا ہے اور تاریکی بھی رہتی ہے، دکانوں سمیت مسجد کی مملوکہ زمین کا مجموعی ایریا (علاقہ) پانچ

۱ـ "ومثله حشيش المسجد وحصره مع الاستغناء عنهما، وكذا الرباط والبئر إذا لم ينتفع بهما فيصرف وقف المسجد، والرباط والبئر والحوض إلى أقرب مسجد أو رباط أو بئر أو حوض" (الدر المختار علی ہامش الشامی، ۳۷۱ ج ۳ کتاب الوقف) (مرتب)۔

"قال الشامي تحت قوله ومثله حشيش المسجد: أي الحشيش الذي يفرش بدل الحصر كما يفعل في بعض البلاد، قال الزيلعي :وعلى هذاحصير المسجد وحشيشه إذا استغنى عنها يرجع إلى مالكه عند محمد وعند ابي يوسف ينقل إلى مسجد آخر وعلى هذا الخلاف الرباط والبئر إذالم ينتفع بهما وصرح في الخانية بأن الفتوى على قول محمدؒ، قال في البحر: وبه علم أن الفتوى على قول محمدؒ في الآت المسجد وعلى قول أبي يوسف في تأبيد المسجد۔ والمراد بالآت المسجد نحو القنديل والحصير، بخلاف أنقاضه لما قدمنا عنه قريباً من ان الفتوى على ان المسجد لايعود ميراثاً، ولا يجوز نقله ونقل ماله إلى مسجد آخر" (فتاویٰ شامی ۳/ ۳۷۱ کتاب الوقف)۔

"والذي ينبغي متابعة المشائخ المذكورين في جواز النقل بلافرق بين مسجد أوحوض، كما أفتىٰ به الإمام أبو شجاع ولا سيما في زماننا فإن المسجد أوغيره من رباط أو حوض إذا لم ينقل يأخذ انقاضه اللصوص والمتغلبون كما هو مشاهد، وكذالك أوقافه ياكلها النظار أوغيرهم" (فتاویٰ شامی ۳/ ۳۷۲ کتاب الوقف) (مرتب)۔

ہزار اسکوائر فٹ ہے، جس میں سے بارہ سو اسکوائر فٹ علاقہ پر مسجد واقع ہے اور باقی اڑتیس سو اسکوائر فٹ علاقہ پر دکانیں ہیں جن پر کرایہ دار قابض ہیں، نمازیوں کی تعداد کے اعتبار سے موجودہ مسجد کی چارگنی توسیع اشد ضروری ہے۔

مسجد کی دکانیں مسجد کی ملکیت ہونے کے باوجود ناممکن الحصول ہونے کی وجہ سے تحتانی مسجد کی توسیع بالکل ناممکن ہے، اب توسیع کی صرف ایک صورت یہ ہے کہ مذکورہ مسجد کے اوپر ایک منزل تعمیر کر لی جائے اور مسجد سے ملحقہ دکانوں کی چھت والا حصہ فوقانی مسجد میں شامل اور داخل مسجد کرلیا جائے۔

بایں طور کہ تحتانی مسجد کے بجائے فوقانی مسجد کی توسیع بقدر کفایت وضرورت ممکن ہے، پھر فوقانی مسجد کی یہ توسیع صرف جانب مشرق میں ممکن نہیں بلکہ جانب غرب ''سمت قبلہ'' ہی میں ممکن ہے، نیز کماحقہ دائیں بائیں جانب بھی ممکن نہیں، اب مسجد کی انتظامیہ کمیٹی نے جانب غرب ہی میں فوقانی مسجد کی تعمیر کا نقشہ تیار کیا ہے، تعمیر مکمل ہونے کے بعد مسجد کی تحتانی اور فوقانی دونوں منزلیں پنج گانہ نماز با جماعت میں امام کے تحتانی مسجد میں امامت کے لیے کھڑے رہنے کی صورت میں فوقانی مسجد کی جانب غرب توسیع شدہ حصہ میں واقع صفوف کا تقدم علی الامام لازم آتا ہے جو کہ جائز نہیں، علاوہ ازیں توسیع کا اصل مقصد ہی فوت ہوجاتا ہے۔ لہذا درج ذیل امور دریافت طلب ہیں:

۱-جانب غرب دکانوں کی چھت پر واقع فوقانی مسجد کا توسیع شدہ حصہ صحتِ اعتکاف وغیرہ دیگر احکام مسجد کے اعتبار سے مسجد شرعی ہے یا نہیں؟ کیوں کہ بعض حضرات کو درج ذیل عبارت: '' وحاصله أن شرط كونه مسجداً أن يكون سفله وعلوه مسجد لينقطع حق العبد منه لقوله تعالىٰ: وأن المساجد لله، بخلاف ما إذا كان السرداب أو العلو موقوفاً لمصالح المسجد، فهو كسرداب بيت المقدس هذا هو ظاهر الرواية وهناك روايات ضعيفة مذكورة في الهداية والبحر الرائق (ج ۵ کتاب الوقف باب احکام المساجد ۱۷، رد المحتار ج ۳ مطبوعہ نعمانیہ دیوبند احکام المساجد ۳۷۰) کی وجہ سے مذکورہ فوقانی مسجد کی دکانوں پر توسیع شدہ حصہ کو عدم انقطاع حق عبد کی وجہ سے مسجد شرعی قرار دینے میں تامل ہے۔

۲-اگر مسجد فوقانی کا مذکورہ توسیع شدہ حصہ مسجدِ شرعی نہ ہو تو اشکال یہ ہے کہ بناء ابتدائی اولین تعمیر کے وقت شروط مذکور فی کتب الفقہ کی رعایت کے ساتھ تحتانی حصہ مسجد میں کرایہ کی دکانیں وغیرہ بنانا جائز ہے اور فوقانی حصہ مسجدِ شرعی ہوگا، حالانکہ یہاں بھی تو دکانوں والے تحتانی حصہ کے ساتھ بالکلیہ انقطاع حق عبد نہیں ہے، لہذا بناء ابتدائی اور بناء ثانی کی توسیع مسجدِ فوقانی میں وجہ فرق کیا ہے؟

۳-اگر مسجد فوقانی کا مذکورتوسیع شدہ حصہ مسجد شرعی ہوتو مذکورہ بالا حالت میں مفتی اعظم ہند حضرت العلامہ مفتی کفایت اللہ صاحبؒ کے درج ذیل فتویٰ کی بنیاد پر امام کوتحتانی مسجد کے بجائے فوقانی مسجد کی جانب غرب توسیع شدہ حصہ کے اندرفرض نمازباجماعت میں کھڑاہونا جائز ہے یانہیں؟

نقل فتویٰ حضرت مفتی کفایت اللہ صاحبؒ:

سوال: مسجد کی چھت پرنمازباجماعت جائز ہے یانہیں؟

جواب: مسجد کی چھت پرنماز کی جماعت جائز ہے اوراگرگرمی وغیرہ کےعذر کی وجہ سے ہوتو کسی قسم کی کراہت بھی نہیں ہے، البتہ بلاعذر ہوتو اس بناپر کہ جماعت کی اصلی جگہ نیچےکادرجہ اورمحراب ہے اوپر جماعت کرنا خلاف اولیٰ ہے۔

محمد کفایت اللہ کان اللہ لہ

جواب: ازحبیب المرسلین نائب مفتی:

تشریح اس کی یہ ہے کہ گرمی کی ایسی شدت ہوکہ خشوع وخضوع قائم نہ رہے تو مسجد کی چھت پرنمازباجماعت وسنن ونوافل پڑھے تو مکروہ نہ ہوں گے اوراگر اس قسم کی شدت نہ ہوتو مسجد کی چھت پرنمازباجماعت وغیرہ مکروہ ہوگی ،فتاویٰ عالمگیری میں ہے:"**الصعود على كل سطح مسجد مكروه، وهذا إذا اشتدت الحريكره أن يصلوا بالجماعة فوقه إلا إذا ضاق المسجد فحينئذٍ لايكره الصعود على سطحهٖ للضرورة**" (كذا في الغرائب ۵/۳۵۶)۔فقط واللہ اعلم

حبیب المرسلین (نائب مفتی مدرسہ امینیہ دہلی، کفایت المفتی،۳/۵۵)

المستفتی: سکریٹری (مسجد سجا شہر بڑودہ انڈوی جامع مسجد بلڈنگ بڑودہ)

الجواب وبالله التوفيق:

تحریر سوال سے معلوم ہوتا ہے کہ دکانوں کی عمارت وزمین سب موقوف علی المسجد ہیں اورمسجد سے بالکل متصل ہیں اورمسجد کی توسیع کی اشد ضرورت ہے اورمع ان مکانوں کے توسیع مسجد ناگزیر ہے،مگر دکان داردکان خالی نہیں کررہے ہیں اور قدیم مسجد اتنی چھوٹی ہے کہ اس پر دومنزلہ عمارت بناکربھی ضرورت توسیع پوری نہ ہوگی۔

ایسی صورت میں دکان خالی نہ کرنے والے شرعاً غاصب اورگنہگار رہیں گے،پھر اس میں محض اوپر مسجد بنائی جائے

تو یہ حصہ مسجد شرعی نہ ہوگا کیونکہ مسجد شرعی ہونے کے واسطے شرط ہے کہ مسجد کے نیچے اور اوپر سب کا سب مسجد ہو کما فی البحر (۵/۲۷۱): ''وحاصله أن شرط کونه مسجداً أن یکون سفله وعلوه مسجداً لینقطع حق العبد'' اور یہاں ایسا نہ ہوگا، کیونکہ ان دکانوں میں بیع وشرا بھی ہوگا اور ان میں حائضہ، نفساء اور جنبی کا آنا جانا بھی ہوگا اور ان میں بول وبراز وغیرہ سارے ہی اعمال جو مسجد میں ممنوع ہیں، ہوسکیں گے، لہذا استخلاص نہ ہوگا اور ذمہ داران مسجد کے تخلیہ سے عاجز ہونے کی وجہ سے ان تمام معاصی کا بدترین وبال آخرت میں عذاب ہونے کے علاوہ دنیا میں بھی دکان نہ خالی کرنے والوں پر عذاب میں پڑ جانے کا قوی اندیشہ ہے اور عجب نہیں کہ آیت کریمہ: '' إنما یعمر مساجد الله من آمن بالله والیوم الآخر ''(۱) کے خلاف کرنے پر علاوہ عذاب آخرت کے دنیا میں کسی شدید ترین وبال میں ابتلاء نہ ہوجائے۔

نیز چوں کہ ذمہ داران مسجد تخلیہ سے عاجز ہوں گے، اس عجز کی وجہ سے اور توسیع شرعاً ہونے کی وجہ سے ان دکانوں پر مسجد بنالینے کی بنا پر یہ ذمہ داران عند اللہ '' لایکلف الله نفساً الا وسعها '' (۲)، ''ولا تزر وازرة وزر اخریٰ (۳)'' کے مطابق ماخوذ وگنہگار نہ ہوں گے۔

البتہ یہ مسجد تحت الثریٰ تک شرعی مسجد شمار ہوگی اور اس پر نماز باجماعت ادا کرنا درست رہے گا اور انشاء اللہ سب کو شرعی مسجد میں نماز ادا کرنے کا ثواب ملے گا اور جو کچھ وبال ہوگا وہ سب دکان خالی نہ کرنے والوں پر شرعاً ہوگا۔

اتنی تمہید کے بعد استفتاء میں مذکورہ تینوں نمبروں کا حکم خود بخود نکل آیا، کیوں کہ اس تمہید سے اس نوتعمیر مسجد کا مسجد شرعی ہونا واضح ہوگیا اور تینوں نمبروں کا اشکال اس نوتعمیر مسجد کے مسجد شرعی نہ ہونے کا یقین یا اس میں شک واقع ہونے پر تھا اور وجہ اشکال تو خود بخود ختم ہوگئی، پس امام اگر جانب غرب میں دکان کے اوپر کھڑا ہوا اور مقتدی خواہ نوتعمیر حصہ پر رہیں یا قدیم مسجد کے حصہ پر سب کی نمازیں بلا کراہت ادا ہوں گی، اسی طرح نوتعمیر حصہ میں اعتکاف وغیرہ جملہ امور صحیح ہوں گے۔

هذا ما عندی من الشرع الشریف فإن کان صوابا فمن الله وإن کان خطأً فمن نفسی فنتبرأمنه فحینئذ یرجعون الیٰ غیری، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۴۰۹/۹/۱۲ھ

۱- سورۂ توبہ: ۱۸۔

۲- سورۂ بقرۃ: ۲۸۶۔

۳- سورۂ اسراء: ۱۵۔

مسجد میں پینٹ کا استعمال کرنا شرعاً کیسا ہے؟

آج کل مساجد میں پینٹ کا استعمال بکثرت جاری ہے، شرعی نقطۂ نظر سے اس کی کیا حیثیت ہے؟

الجواب وبالله التوفيق:

مسجد میں ایسا پینٹ استعمال کرنا جس میں بدبو ہوتی ہو ممنوع ہے، اگر بدبو زیادہ دیر پا ہو تو ناجائز اور استعمال مکروہ تحریمی ہوگا جس سے اجتناب لازم ہے(۱)، فقط واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

محراب سے مراد کیا ہے؟

محراب سے مراد کیا ہے؟ مسجد کے ہر در میں جو محراب خانہ کنارہ بنا رہتا ہے جس میں لوگ آتے جاتے ہیں، محراب کی تعریف میں آتا ہے، یا پچھلی دیوار کے درمیان ممبر کے قریب جو محراب بنی رہتی ہے صرف وہی محراب ہے، وضاحت فرمائیں! اور یہ بھی واضح کریں کہ ممبر کے قریب کی محراب کے علاوہ مسجد کے دوسرے در میں اگر امام کھڑے ہو کر نماز پڑھا رہا ہو اور اس کے صحن میں مقتدی کھڑے ہوں تو اس میں شرعاً کوئی ممانعت تو نہیں ہے؟

خادم مشتاق احمد (محمد پور، صدر، اعظم گڑھ)

الجواب وبالله التوفيق:

قبلہ کی دیوار میں بالکل درمیان میں جو محراب نما بنایا جاتا ہے وہ مراد ہے، تاکہ امام کے درمیان دونوں طرف صفوں کی مقدار برابر رہے۔ پس اس محراب کو چھوڑ کر اور جگہ یا کسی اور در میں کھڑے ہونے سے اگر امام کے دونوں جانب کی صفیں

۱- "وأكل نحو ثوم، ويمنع منه، وكذا كل موذ ولو بلسانه، قال الشامي تحت قوله "وأكل نحو ثوم": أي كبصل ونحوه مما له رائحة كريهة للحديث الصحيح في النهي عن قربان أكل الثوم والبصل المسجد إلى قوله: ويلحق بما نص عليه في الحديث كل ماله رائحة كريهة ماكولا أو غيره، وإنما خص الثوم هنا بالذكر" (فتاویٰ شامی، ۱/ ۴۴۴)، مذکورہ عبارات سے معلوم ہوا کہ ہر بدبودار چیز کھا کر بدبو جانے سے قبل مسجد میں جانا مکروہ ہے اور علت بدبو ہے لہٰذا بدبودار پینٹ کا استعمال مکروہ ہے چونکہ عبارات میں ماکولاً کے ساتھ أو غیرہ کی بھی قید ہے (مرتب)۔

برابر نہ رہیں، کم وبیش ہوجائیں، تو کراہتِ تحریمی کا ارتکاب لازم آئے گا۔

اسی طرح اگر کسی درمحراب نما کے اندر امام کھڑا ہو اور سب مقتدی باہر صحن میں کھڑے ہوں تو اگرچہ تعادلِ طرفین حاصل ہو مگر اسائت ہوگی اور کراہت ہوگی ورنہ کوئی حرج نہ ہوگا(۱)۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دار العلوم دیوبند سہارنپور ۵/۳/۱۴۰۱ھ

غیر مسلم کا چندہ مسجد میں لگانے کا حکم:

کافر غیر مسلم کا روپیہ چندہ لے کر مسجد میں خرچ کرنا جائز ہے یا کہ نہیں۔

الجواب وبالله التوفيق:

کافر اگر اپنے عقیدہ کے مطابق ثواب سمجھتا ہے اور بدلہ لینے یا احسان وغیرہ رکھنے کا احتمال نہ ہو تو جائز ہے ورنہ نہیں ہے(۲)۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دار العلوم دیوبند سہارنپور ۲/۱۰/۱۳۸۵ھ

الجواب صحیح محمود عفی عنہ

بحالت کفر کمایا ہوا پیسہ اور اس کو مسجد ومدرسہ میں صرف کرنا کیسا ہے؟

ایک نومسلم کفر وشرک کی حالت میں تھے دائرۂ اسلام میں داخل ہوئے تو اپنی دولت بھی ساتھ لیتے آئے، ان کے اس مال ودولت کے متعلق شرعی حکم کیا ہے؟ اگر وہ اس دولت کو اسلامی نیک کاموں مثلاً مسجد یا مدرسہ میں خیرات کریں تو کیا حکم ہے؟ اور مدرسہ ومسجد والوں کو ایسی رقم لینی چاہیے کہ نہیں، اگر لے لیا ہو تو کیا کریں؟

محمد ابراہیم باوا (لندن)

۱- ''السنة أن يقوم في المحراب ليعتدل الطرفان، ولو قام في إحدى جانبي المسجد يكره (فتاوی شامی، ۱/۳۸۲، باب الإمامة)۔

۲- ''وأن يكون قربة في ذاته ..... إن شرط وقف الذمي أن يكون قربة عندنا وعندهم'' (شامی ۳/۴۹۷، مکتبہ عثمانیہ)۔

الجواب وبالله التوفيق:

بعض پیسے ایسے ہوتے ہیں کہ جو کسی مذہب میں حلال و جائز نہیں ہوتے اور ان پر کسی مذہب میں ملکیت صحیحہ قائم نہیں ہوتی، جیسے چوری کا پیسہ، ڈاکہ اور غصب کا پیسہ۔

ایسا پیسہ بحالت کفر بھی کمایا ہو اگر کوئی نومسلم اپنے ساتھ لائے تو اس کا حکم شرعی یہ ہے کہ اس کو اصل مالک کی ملک میں کسی مناسب انداز سے پہنچا دیں(۱)۔ اگر یہ ممکن نہ ہو اور مالک ثواب پانے کا اہل ہو مثلاً ''مسلمان ہو'' تو اس کو ثواب پہونچانے کی نیت سے صدقہ کردے اور اگر اس کا علم نہ ہو سکے کہ مالک مسلم ہے یا کافر تو ایسی صورت میں اس کے وبال سے بچنے کی نیت سے صدقہ کر کے جلد از جلد اپنی ملک سے نکال دے(۲)۔

بعض پیسے ایسے ہوتے ہیں کہ مسلمان کے لیے شرعاً حلال و جائز نہیں ہوتے اور غیر مسلم کے لیے حلال و جائز ہوتے ہیں اور غیر مسلم اس کا مالک بملک صحیح ہو جاتا ہے، جیسے شراب کے کاروبار کا پیسہ، خنزیر کے کاروبار کا پیسہ، ایسا پیسہ ان کے لیے حلال و جائز ہوتا ہے(۳)، اور اس پر مالک بملک صحیح ہو جاتے ہیں۔

اگر کفر کی حالت کا پیسہ لے کر مسلمان ہو جاویں تو اس کے صحیح مالک ہو گئے ہیں اور جس نیک کام میں چاہیں صرف کر سکتے ہیں، مسجد میں، مدرسہ میں ہر جگہ خرچ کر سکتے ہیں، یہی حکم ان کے گانے بجانے کے پیسہ کا بھی ہے، اس لیے کہ وہ اس کے صحیح مالک ہو گئے تھے اور وہ ان کے لیے حلال و جائز تھا اور مسلمان ہونے کے بعد قدیم مسلمان بھی وہ پیسہ ان سے لے سکتا ہے اور نہیں نیک کاموں میں خرچ کر سکتا ہے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۶/ ۱۲/ ۱۴۰۰ھ

۱- ''ويردونها أي: الأموال الخبيثة إلى أربابها إن عرفوهم وإلا تصدقوا بها، لأن سبيل الكسب الخبيث التصدق إذا تعذر الرد على صاحبه'' (فتاویٰ شامی، ۵/ ۲۴۷)۔

۲- ''وأما إذا كان عند رجل مال خبيث فإما إن ملكه بعقد فاسد أو حصل له بغير عقد ولا يمكنه أن يرده إلى مالكه ويريد أن يدفع مظلمته عن نفسه فليس له حيلة إلا أن يدفعه إلى الفقراء ''إلى قوله'' ولكن لا يريد بذالك الأجر والثواب، ولكن يريد دفع المعصية عن نفسه ويدل عليه مسائل اللقطة'' (بذل المجہود فی حل ابی داؤد ۱/ ۳۷ کتاب الطہارۃ)۔

۳- ''لأنا أمرنا بتركهم وما يعتقدون'' (الدر المختار مع الشامی ۲/ ۳۸۷ باب نکاح الکافر)۔

غیر مسلم کا روپیہ مسجد میں لگانا:

کافر کا روپیہ مسجد کی تعمیرات میں لگنے کی کیا صورتیں ہیں جائز ہے یا کہ نہیں؟

مفتی حسن انصاری (مقام گڈھی سیلم پور، مرادآباد)

الجواب وباللہ التوفیق:

غیر مسلم اگر مسجد میں روپیہ وغیرہ دینا اپنے عقیدہ میں نیک کام سمجھتا ہے اور لے لینے میں یہ خطرہ نہ ہو کہ آئندہ وہ اپنے پوجا پاٹ کے لئے امداد طلب کرے گا یا اس کے دباؤ سے مسلمانوں کو غلط استعمال کرے گا تو اس کا روپیہ لینا اور مسجد کے کام میں استعمال کرنا جائز ہے ورنہ احتیاط و اجتناب لازمی ہے(۱)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۹/ ۸/ ۱۴۰۰ھ

خادم مسجد کے لئے موقوفہ زمین کی آمدنی امام و معلم پر صرف کرنا:

۱- پیر مرحوم جناب خورشید صاحب نے بوقت تعمیر چودہ بنگلہ میں دھلائی بازار مسجد بنوانے کے لئے اطراف کے لوگوں سے روپیہ و زمین چندہ میں جمع کیا، مسجد اور اس کے متعلقات کاموں سے فارغ ہو کر سات کدار چار جسٹی زمین چندہ جمع کیا مسجد اور اس کے متعلقات کے لئے خرید کیا اور وقف کیا اور یہ شرط لگائی کہ مذکورہ زمین کی آمدنی مسجد کا خادم استعمال کرے، اس وقت اس مسجد کے اطراف میں کوئی مسلم مقیم نہیں تھا صرف غیر مسلم کا ہجوم تھا اب کچھ مسلمان مقیم ہو گئے ہیں، ان کے لئے امام اور بچوں کی تعلیم کی ضرورت ہے، نیز ان کے لئے مستقل تعلیم کا انتظام کرنا ناممکن ہے، لہٰذا اس علاقہ کے اصحاب کی صلاح و مشورہ سے ان کی آمدنی کو امام اور معلم دونوں پر تقسیم کرنا جائز ہے یا کہ نہیں یا ایسے امام متعین کر لے کہ دونوں کام انجام دے سکے اور بچوں کی تعلیم بھی انجام دے سکے۔

مسجد کی زمین غیر مسلم کے ہاتھ فروخت کرنا:

۲- مذکورہ مسجد صرف بازاری لوگوں کے لئے بنوائی گئی تھی، اس وقت بازار دوسری جگہ ہونے کا اندیشہ ہو رہا ہے اگر

۱- ''وأما الإسلام فليس من شرطه فصح وقف الذمي بشرط كونه قربة عندنا وعندهم'' (البحر الرائق ۵/ ۳۱۶ مطبوعہ مکتبہ زکریا، نیز دیکھئے: فتاوی عالمگیریہ ۲/ ۳۵۲، شامی ۶/ ۵۲۲)۔

دوسری جگہ ہو جاوے تو کوئی مسلم یہاں نہیں رہیں گے، اس وقت مسجد کی جگہ کی حفاظت کرنا جو ضروری ہے مشکل ہو گئی ہے، لہذا مذکورہ جگہ غیر مسلم سے فروخت کرنے کے لئے کوئی صورت جواز کی ہے یا نہیں، واضح ہو کہ مذکورہ نصف کدار زمین مالک نے مسجد کے لئے وقف کیا تھا، اس سے کچھ زمین غیر مسلم کے قبضہ میں نیز بوقت تبدیل مقبوضہ زمین غصب ہو سکتی ہے۔

۳۔ دریافت ہے کہ مذکورہ موقوفہ زمین کی آمدنی مسجد کے کاموں میں لگائی جاسکتی ہے یا کہ نہیں؟

الجواب وبالله التوفيق:

سوال کی عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ مسجد کے لئے چندہ ہوا ہے اور وقف نامہ میں شرط لگائی گئی ہے کہ مذکورہ زمین کی آمدنی مسجد کے خادم استعمال کرے۔

مسجد کے خادم امام ،موذن ،فراش وغیرہ تو ہو سکتے ہیں لیکن بچوں کے معلمین نہیں ہو سکتے ہیں، لہذا اس آمدنی سے معلمین کی تنخواہیں نہیں دے سکتے۔ اس کے لئے اگر انتظام کرنا ہے تو دوسرا انتظام کرنا ضروری ہوگا، شرائط واقف کا لحاظ جب تک نص شرعی کے خلاف نہ ہو واجب ہے کما ہو مصرح فی الفقہ (۱)۔

۲۔ کوئی زمین جب مسجد ہو جاتی ہے تو قیامت تک کے لئے مسجد ہو جاتی ہے، اس کو فروخت کرنا یا کسی دوسری جگہ منتقل کرنا جائز نہیں ہوتا، بلکہ جس طرح ممکن ہو حفاظت ہی کرنا واجب رہے گا علی القول المفتی بہ (۲)، جب خدانخواستہ وہاں مسلم آبادی بالکل نہ رہے، اس وقت اس جز کا سوال کر کے جواب معلوم کر لیں۔

۳۔ مذکورہ موقوفہ زمین کی آمدنی مسجد کے کاموں میں لگائی جاسکتی ہے۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۱/۷/۸۵ ۱۳ھ

الجواب صحیح محمود عفی عنہ، محمد جمیل الرحمن، سید احمد علی سعید

۱- ''شرائط الواقف معتبرة إذا لم تخالف الشرع'' (شامی ۴/۳۹۹، مطبعہ عثمانیہ)۔

۲- ''المسجد لايخرج عن المسجدية ابداً، (شامي قديم ۳/ ۵۳۱، مطبعه عثمانيه)، ''قال أبو يوسف: ان المسجد اذا خرب واستغنى الناس عنه يبقى مسجدا إلى يوم القيمة كذا في البدائع، وقول ابي يوسف يبقى المسجد بعد خرابه والمفتى به كما صرح به في الحاوي القدسي'' (البحر الرائق ۴/ ۵۰۴)، لاخلاف فی بطلان بیع الوقف لانہ لایقبل التملیک والتملک (شامی ۴/ ۴۲۴، مطبعہ عثمانیہ)۔

۱-مسجد کی موقوفہ زمین کا تبادلہ:

اسکول یا مدرسہ کے متصل مسجد کی کچھ زمین ہے ان زمینوں کو اسکول کی ضرورت ہونے کی بناء پر اس کے بدلہ میں مسجد کو دوسری جگہ دوسری زمین دی جاسکتی ہے یا کہ نہیں، یہ بھی خیال رہے کہ وہ زمین اسکول کے متصل ہونے کی وجہ سے پیداواری میں بہت زیادہ نقصان کا اندیشہ ہے۔

۲-مسجد کے لئے زمین وقف کرنے کی وصیت کی تو کیا اس سے رجوع صحیح ہے:

کسی شخص نے ایک بیگھہ زمین اس طریقہ سے وقف کی کہ میں اس کی آمدنی زندگی بھر کھاتا رہوں گا اور میرے مرنے کے بعد وہ زمین مسجد کی ہوجائے گی، اب سوال یہ ہے کہ وہ شخص اپنی زمین ہی میں اپنی زندگی ہی میں وقف مسجد کو باطل کر کے کسی دوسری جگہ وقف کرسکتا ہے یا نہیں؟

الجواب وباللہ التوفیق:

۱- جو زمین مسجد کی ہوجاتی ہے اس کو دوسری زمین سے تبدیل کرنا یا کسی دوسرے مصرف میں خرچ کرنا خواہ کوئی دینی ہی مدرسہ کیوں نہ ہو جائز نہیں ہے، ہاں اگر نقصان کا قوی اندیشہ ہو اور مسجد کو خود اس زمین کی نہ اس وقت کوئی ضرورت ہو اور نہ آئندہ ضرورت ہونے کی توقع، پھر اور تبدیل کرنے میں مسجد کا زیادہ نفع ہو پھر تو وہاں کے ذمہ دار و دیندار مسلمانوں کے مشورہ سے تبدیل کرسکتے ہیں (۱)، بلا مشورہ تنہا متولی یا کوئی دوسرا نہیں کرسکتا ہے یا اسی طرح بعد مشورہ مذکورہ یہ بھی کرسکتے ہیں کہ اس زمین میں دینی مدرسہ کھول دیا جائے اور مدرسہ پر مناسب کرایہ رکھ کر مسجد کو دیا جائے، لیکن یہ یاد رہے کہ اس صورت میں وہ زمین مدرسہ کی نہ ہوجائے گی مسجد ہی کی رہے گی، مسجد کو جب ضرورت ہوگی خالی کر کے اپنا قبضہ وتصرف سب اس پر کرسکتی ہے۔

۲- ان الفاظ سے وقف کرنے میں (کہ میں اس کی آمدنی زندگی بھر کھاتا رہوں گا اور میرے مرنے کے بعد وہ زمین مسجد کی ہوجائے گی) وقف تام نہیں ہوتا ہے، بلکہ اس کی حقیقت ایک وصیت کی ہوجاتی ہے اور موصی کو اپنی زندگی میں اپنی وصیت ختم کر کے دوسرے مصرف میں صرف کرنا جائز رہتا ہے (۲)۔

۱- "صار بحیث لاینتفع بہ بالکلیۃ بان لایحصل منہ شئ اصلا اولا یفی بمؤنتہ فھو ایضا جائز علی الاصح اذا کان باذن القاضی ورأیہ المصلحۃ فیہ" (شامی ۳/ ۵۴۳، مطبعہ عثمانیہ)۔

۲- "یصح للموصی الرجوع عن الوصیۃ" (ہندیہ ۶/ ۹۲، رشیدیہ پاکستان)۔

اس لئے صورت مسئولہ میں یہ وقف تام نہ ہوا بلکہ وصیت کی حقیقت ہوگی جس کا حاصل یہ ہوگا کہ اس کو ختم کر کے دوسری جگہ صرف کرسکتا ہے۔

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

مسجد موقوفہ ہوتی ہے یا مملوکہ؟

ا- ایک صاحب نے ۱۹۷۵ء میں ایک مسجد شمشاد بلڈنگ میں اپنی زمین اور اپنے پیسے سے بنوادی، محلّہ کے مسلمانوں اور بازار کے دوکاندار مسلمانوں کے لئے اب یہاں کی ملکیت ہے یا وقف ہے۔

احاطہ مسجد میں امام کے لئے حجرہ بنانا جائز نہیں ہے:

۲-عرصہ بیس ۲۰ سال سے ان کے ورثہ نے انتظام کرنا چھوڑ دیا ہے، اس عرصہ میں آبادی بڑھی، مسجد کی ضروریات کے لئے مسلمانوں نے زمین خرید لی تھی اور انتظام بھی کرتے رہے امام بھی رکھا اور پنجوقتہ اور جمعہ کی نماز بھی ہوتی رہی ہے، نمازی بھی بڑھے اور امام کے لئے حجرہ کی ضرورت پڑی مسجد میں کوئی حجرہ نہیں ہے، اس سے امام کو بھی تکلیف ہوتی ہے، لہذا کمیٹی نے اندرون مسجد میں برانڈا اور حجرہ ہونے کی بناء ڈالی ہے اس کے اوپر ایک شخص نے اعتراض کیا ہے عرض ہے کہ کمیٹی کو اس کے بنوانے کا حق ہے یا کہ نہیں۔

الجواب وبالله التوفيق:

ا-مسجد قرار دیئے جانے کے بعد کسی کی ملک نہیں رہتی ہے، بنوانے والے کی بھی ملک نہیں رہتی بلکہ وقف علی اللہ اور خاص اللہ کی ملک ہوجاتی ہے (ا)۔

۲-مسجد کے صحن میں امام کے لئے یا کسی اور کام کے لئے حجرہ بنانا جائز نہیں ہے، واقف اور بانی مسجد کو بھی جائز نہیں ہے پھر دوسرے کا کیا شمار (۲)، ہاں نمازیوں کو دھوپ، برسات، سردی، گرمی سے بچنے کے لئے سائبان بناسکتے ہیں اور صرف

ا- ''وأما حكمه (الوقف) فعندهما زوال العين عن ملكه إلى الله تعالى'' (ہندیہ ۲/ ۳۵۲، رشیدیہ)۔

۲- ''لو تمت المسجدية ثم أراد البناء منع: ولو قال: عنيت ذالك لم يصدق (تاتارخانيه) فاذا كان هذا في الواقف فكيف بغيره فيجب هدمه'' (الدرالمختار ۱/ ۳۷۹، مکتبہ زکریا دیوبند)۔

نماز پڑھنے کے کام میں لا سکتے ہیں، اگر امام کے لئے حجرہ کی ضرورت ہوتو انہی بزرگ سے جنہوں نے پہلے مسجد کے لئے زمین دی ہے پھر مانگ لی جائے۔

مفت نہ دیں تو قیمت دیکر لی جائے، غرض مسجد کے حدود کے اندر حجرہ امام بنانا جائز نہیں ہے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۶/ ۸/ ۸۵ ۱۳ھ

الجواب صحیح سید احمد علی سعید نائب مفتی دارالعلوم دیوبند

مسجد کی پرانی لکڑی کو فروخت کرنا:

ایک بہت پرانی مسجد ہے، اس کا کچھ حصہ شہید ہوگیا ہے منہدم ہوگیا ہے، اب ہمارا ارادہ ہے کہ ہم پوری مسجد شہید کر کے دوبارہ بناویں، اس میں جو قدیم لکڑی لگی ہے اس کو فروخت کردیں یا کہ نہیں؟

الجواب وباللہ التوفیق:

اگر لکڑی فروخت نہ کرنے سے خراب ہوجائے اور مسجد کو آئندہ کوئی ضرورت نہیں ہوگی تو اس کو فروخت کرسکتے ہیں، لیکن اس لکڑی کی قیمت کو اس مسجد میں خرچ کرنا ضروری ہوگا۔ مہذب (ص ۴۵۱) میں ہے: "والثانی یجوز بیعه لانه لا یرجی منفعة فکان بیعه أولیٰ من ترکه الخ" (۱)، واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۲/ ۹/ ۸۵ ۱۳ھ

الجواب صحیح محمود عفی عنہ

مسجد کا متولی کون ہوگا؟

۱- زید اپنی قیمتی خاص زمین اس شرط پر حوالہ کیا کہ اس زمین پر مسجد تعمیر کی جاوے، ایک مدت کے بعد ایک مالدار آدمی نے کافی رقم صرف کر کے مسجد کی بناء ڈالی، بعد ازاں دوسرے اشخاص نے بھی اپنی خاص رقموں سے مسجد کی تعمیر کی اور اسے تکمیل کو پہنچایا اور بیرون مقامات سے اس کے لئے چندہ وصول کئے گئے، اب مسجد آباد ہے، اول واقف جس نے زمین

۱- "وما انهدم من بناء الوقف وآلته صرفه الحاکم فی عمارة الوقف ان احتاج الیه وان استغنی عنه امسکه حتی یحتاج الی عمارته فیصرفه فیها" (عالمگیری ۲/ ۴۶۹، رشیدیہ پاکستان)۔

وقف کی مرحوم ہوگیا ہے، اس کی نسل سے چند زینہ اولا دبھی ہیں، اب انکا دعویٰ ہے کہ مسجد بھی ہماری تولیت میں ہونی چاہئے، کیونکہ یہ زمین ہمارے والد کی ہے۔

اور مسجد کے لئے جس نے کافی رقم خرچ کی وہ کہتا ہے کہ میں نے مسجد بناڈالنے میں ۲۰۰۰ہزار روپیہ خرچ کردیا لہٰذا میں مقدم ہوں۔

۲- ہمارے شہر میں ایک مکتب ہے، یہ زید کے صرف خاص سے بنا ہوا ہے، اس مکتب کو چلانے کے لئے چند مکانات اور دوکانیں وقف کئے گئے ہیں۔اور تعلیم دین کی شرط بھی لگادی گئی ہے زید کی موجودگی میں آپ خود متولی بنا رہا ہے زید کے بعد یکے بعد دیگرے متولی بنتے رہے ہیں اور اس مکتب کی نگرانی اور دیگر مکانات کی نگرانی ہوتی رہی، اب موجودہ متولی جو زید کے وارث سے نہیں ہے کرایہ اور مصارف میں چشم پوشی کرتا ہے اور اپنے متعلق واحباب کے لئے واقف اصل زید کے وارثین میں کسی کے لئے ۳۰روپیہ کرایہ کے مکان کے ۲۰ روپیہ وغیرہ رعایت کرتا ہے اور جو منشی مقرر ہے وہ بھی رشوت لیکر چھوڑ دیتا ہے آیا از روئے شریعت یہ حرکات جائز ہے یا کہ نہیں۔

الجواب وباللہ التوفیق:

۱- اس صورت میں خاص کر جب نزاع بھی ہے تو بہتر یہ ہے کہ اہل محلّہ کی ایک ایسی کمیٹی بنالیجائے جس میں اول واقف کی اولاد میں سے بھی ایک دیانتدار امانتدار صالح آدمی ممبر ہو اور جس نے تعمیر میں کافی رقم خرچ کی ہے وہ بھی اس کا ممبر ہو اور ایک ایسا عالم دین جو مسجد و اوقاف کے احکام ومسائل سے واقف ہو اس کو بھی شریک کرلیا جائے اور شریعت کی روشنی اور حدود کے اندر تمام معاملات آپس کے مشورے سے طے کرلیا کریں اور اسی کے مطابق عمل کیا کریں۔

ذاتی ونفسیاتی بات کو دخل نہ دیا کریں، ہر شخص یہ خوب سمجھ لے اور ہر وقت متحضر رکھے کہ نیک کام بھی اخلاص سے قبول ہوتا ہے، نام آوری، حکومت اور بڑائی کا تخیل نیکی کو برباد اور گناہ لازم کردیتا ہے اور خسر الدنیا والآخرۃ کا مصداق بنادیتا ہے۔

۲- اس میں بھی ۲ کی طرح ایک ایک کمیٹی بناکر عملدرآمد کیا کریں، خیانت کے شرعی ثبوت کے بعد بھی ڈھیل دینا گناہ اور اعانت معصیت بھی معصیت ہے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۲/۹/۱۳۸۵ھ

الجواب صحیح محمود عفی عنہ

مسجد کی آمدنی مدرسہ یا دوسرے گاؤں کی مسجد پر صرف کرنا:

ہمارے دادا نے کچھ زمین صحن مسجد میں وقف کیا تھا تا حیات وہ خود متولی رہے، ان کے بعد ہمارے والد ذاکر محمد احسن متولی ہوئے اور اس وقت متولی ہم ہیں، مسجد کی زمین کی آمدنی مسجد کے سالانہ خرچ سے زائد ہے اور مسجد کی عمارت مکمل ہے آمدنی کا روپیہ ۲۲۰۰ ہے۔

۱- مسجد کے پاس ایک مدرسہ ہے جو کہ مسجد کی آمدنی سے والد صاحب نے بنایا تھا، اب اس کی عمارت کو مرمت کی ضرورت ہے اس روپیہ سے مرمت ہوسکتا یا کہ نہیں۔

۲- قریب کے دوسرے گاؤں میں ایک مسجد تعمیر ہورہی ہے، وہاں کے لوگوں کی مالی حالت خراب ہے، کیا اس مسجد کے کچھ روپیہ اس مسجد کی تعمیر میں دے سکتے ہیں یا کہ نہیں؟

الجواب وبالله التوفيق:

خدا کا شکر ہے اور آپ لوگوں کی مساعی نیک کا ثمرہ ہے کہ مسجد مالدار ہے، لیکن مسجد کے روپیہ سے مدرسہ کی تعمیر جو ہوئی وہ غلط اور ناجائز ہوئی، اس لئے آئندہ بھی مرمت مدرسہ مسجد کے روپیہ سے جائز نہیں ہے(۱)۔

یہ قریب کے گاؤں میں جو مسجد تعمیر ہورہی ہے اگر وہاں ضرورت ہو اور اس مسجد کو جس کا روپیہ ہے مستقبل میں ضرورت متوقع نہیں ہے اور نہ اس وقت کچھ وقت پیش آنے کا احتمال ہے تو اس مسجد پر خرچ کرسکتے ہیں (۲)۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

الجواب صحیح محمود عفی عنہ نائب مفتی دارالعلوم دیوبند

۱- ''الواجب أن يبدأ بصرف الفرع الى مصالح الوقف من عمارته واصلاح ماوهي من بنائه وسائر مؤوناته التي لابد منها'' (بدائع الصنائع ۵/ ۳۳۰)۔

۲- ''الفتوى على أن المسجد لايعود ميراثا ولايجوز نقله ونقل ماله الى مسجد آخر'' (شامی ۳/ ۵۱۳)، اس کے اگلے صفحہ پر ہے: "والذي ينبغي متابعة المشائخ المذكورين في جواز النقل بلا فرق بين مسجد أوحوض كما أفتى به الإمام أبو شجاع والإمام الحلواني وكفى بهما قدوة لاسيما في زماننا'' (شامی ۳/ ۵۱۴)۔

متولی کا مسجد میں چندہ کرنے سے روکنا:

یہاں ایک انجمن اوقاف ہے جس کے زیر انتظام جامع مسجد، مدرسہ، عیدگاہ اور قبرستان وغیرہ ہیں۔

کیا اس انجمن کے ممبران یا متولی اور صدر کو شرعاً یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ کسی انتظامی یا دینی مصلحت سے کسی خاص شخص یا اشخاص کو کوئی خاص مدرسہ کا چندہ کرنے کی جامع مسجد میں اجازت نہ دیں اور اجازت نہ دینے کی صورت میں اگر وہ شخص یا اشخاص انجمن کے ممبران یا متولی وصدر کے حکم کو ماننے سے انکار کریں اور علی الرغم چندہ کرنے کی کوشش کر کے انتظامی نظام کو درہم برہم کرنے کی کوشش کریں تو شرعاً انکا یہ فعل کیسا ہے؟

الجواب وباللہ التوفیق:

متولی یا صدر یا جو انتظام کا ذمہ دار بنایا گیا ہو اس کو یہ حق پہنچتا ہے کہ دینی وانتظامی مصالح کے تحت جامع مسجد میں چندہ اور سوال کرنے والے کو روک دیں یا اجازت نہ دیں، لیکن ضرورت مندمدارس عربیہ ودینیہ یا اہم دینی امور کے لئے بوقت ضرورت اس شرط کے ساتھ دے دینا کہ لوگوں کو تکلیف نہ ہو، گردنوں پر سے پھلانگا نہ جائے، نمازیوں کے سامنے سے گذرا نہ جائے موجودہ وقت میں نہ یہ کہ مباح ہے بلکہ مندوب ومناسب ہے کما یستفاد من کتب الفتاویٰ (۱)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۹/ ۹/ ۸۵ ۱۳ھ

الجواب صحیح فخر الحسن غفر لہ دارالعلوم دیوبند

محکمہ کی اجازت کے بغیر مسجد میں بجلی کا استعمال:

زیر تعمیر جامع مسجد موضع املو کے کارکنوں نے جامع مسجد مذکورہ بالا کی تعمیر کے لئے پانی کی ضرورت اور اسکی کمی کے پیش نظر مسجد کے پرانے کنویں میں جس کا پانی گرمی کے دنوں میں بہت کم ہو جاتا تھا اور جمعہ کے دن خاص طور سے وضو وغیرہ کے لئے سخت پریشانی ہوتی تھی، ٹیوب ویل کی بورنگ کرائی اور اسے چالو کرنے کے لئے محکمہ بجلی میں کنکشن کی درخواست دی اور اس کے لئے ضروری رقم بھی ساتھ ہی جمع کر دی، چونکہ مسجد کی تعمیر کا کام شروع ہو چکا تھا اور کنویں کے ہینڈ پانپ سے تعمیر

۱- "والمختار أن السائل إن کان لا یمر بین یدی المصلی ولا یتخطی الرقاب ولا یسأل إلحافا بل لأمر لابد منہ فلا بأس بالسوال والإعطاء" (رد المحتار ۱/ ۵۵۴)۔

کے لئے مطلوب پانی کی مقدار فراہم نہیں ہورہی تھی اور کام میں حرج ہوتا تھا، اس لئے محکمہ بجلی کے مقامی افسران جوکہ مبارکپور بجلی کالونی میں رہتے ہیں، سے جلد از جلد کنکشن جوڑنے کی درخواست کی گئی تا کہ پانی کی کمی دور ہوجائے اور تعمیر میں آسانی ہو، چونکہ دفتری کارروائی میں بہت دیر ہوتی ہے، اس لئے مسجد کی فوری ضرورت کا احساس اور لحاظ کرکے ان مقامی افسران نے یہ کہ کر کہ یہ دھرم کا کام ہے جب تک باقاعدہ کنکشن نہیں مل جاتا آپ لوگ مین لائن سے ڈائرکٹ تار لگا کر مسجد کا کام نکالئے۔ بجلی کے ذریعہ ٹیوب ویل چلانے کی اجازت دیدی۔ اس سلسلہ میں محکمہ بجلی کے کسی ملازم یا افسر کو کوئی نذرانہ یا بخشش یا رشوت کبھی نہیں دی گئی۔ اور نہ انھوں نے کبھی بھی اس طرح کا کوئی مطالبہ یا اس کی خواہش کا ہی اظہار کیا، محکمہ بجلی کے ان مقامی افسران کی اجازت کے بعد تقریباً ۹ ماہ تک باقاعدہ کنکشن نہیں ملا، اور مسجد کی تعمیر کے سلسلہ میں بوقت ضرورت مذکورہ بالا طریقہ سے ٹیوب ویل چلا کر پانی حاصل کیا گیا، مصلیان مسجد اس سے غسل اور وضو بھی کرتے رہے۔

اب سوال یہ ہے کہ اس طرح بلا باقاعدہ کنکشن ملے ہوئے ڈائرکٹ کنکشن جوڑ کر ٹیوب ویل چلانا اور اس سے حاصل شدہ پانی سے مسجد تعمیر کرنا کیسا ہے؟ اور اس تعمیر شدہ مسجد کا کیا حکم ہے؟ اور اگر خدانخواستہ شریعت کے نزدیک یہ کام غلط تھا تو اب اس کی تلافی کی کیا صورت ہوسکتی ہے۔

(نوٹ) سوال میں مذکورہ ۹ ماہ تک مقامی افسران اور ملازمین کی اجازت سے جو بجلی استعمال کی گئی اس کا کوئی معاوضہ گورنمنٹ کے خزانہ میں آج تک جمع نہیں کیا گیا اور جن افسران اور ملازمین نے بجلی استعمال کرنے کی اجازت دی تھی ان کو گورنمنٹ نے یہ اختیار نہیں دیا ہے کہ وہ کسی کو بھی اس طرح بجلی استعمال کرنے کی اجازت دے۔

ابوالقاسم (مبارک پور، اعلیٰ، ضلع اعظم گڑھ)

الجواب وباللہ التوفیق:

مذکورہ صورت کا ازروئے فتوی شرعی حکم یہ ہے کہ اس طرح عمل کرنا غلط ہوا، ایسا کرنے والے گنہگار ہوئے اور ان پر اس عمل پر تائب ہونا ضروری ہے اور توبہ یہ ہے کہ استغفار کے ساتھ یہ بھی کریں کہ ۹ ماہ تک بجلی کا جتنا قانونی چارج ہوتا ہے اتنا کسی نہ کسی حیلہ وذریعہ سے محکمہ کی ملک میں داخل کردیں۔ باقی یہ مسجد شرعی مسجد قرار پائے گی اور جن لوگوں نے اس پانی سے غسل، وضوء وغیرہ کیا ہے ان سب کی نمازیں ادا ہوگئیں۔ اگر ایسا غلط عمل کرنے والے (ذمہ داران) غریب ہوں، ۹ ماہ تک

کا بجلی کا اصلی چارج دینے کی طاقت نہ ہوتو ان کے ساتھ تبرع کرکے بذریعہ عام چندہ اس رقم کی ادائیگی کرادینا بہتر ہوگا(۱)،
فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۷/۳/۲/۱۴۰ھ

اختلاف کی بناپر جدید مسجد کی تعمیر:

ایک مسجد باہمی جھگڑے اور خاص طور پر امام کے ساتھ ذاتی اختلافات کی بناپر بنائی گئی جب کہ پہلے سے یہاں مسجد موجود تھی اور سارے گاؤں کے لوگ اس میں نماز پڑھتے چلے آرہے تھے۔ جہاں دوسری مسجد بنائی گئی ہے اس آدھی زمین ایک دوسرے شخص کی ہے جو مسجد بنانے کے صرف اس لئے حق میں نہیں تھا کہ یہ تفریق بین المؤمنین کا سبب بنے گی مگر بنانے والوں نے کوئی پرواہ نہیں کی اور یہ کہا کہ ہمیں مسئلہ کی کوئی ضرورت نہیں ہے ہم مسجد بنا کر چھوڑیں گے، چنانچہ مسجد بن گئی اور جسکی زمین دبائی گئی تھی وہ اب بھی ناراض ہی ہے، ایسی صورت میں اس نوتعمیر مسجد میں نماز پڑھنا کیسا ہے، جبکہ اس کے بننے سے گروہ بندی ہوئی ہے، اگر کبھی پورا گاؤں آپس میں میل جول کرلے، باہمی جھگڑے ختم ہوجائیں تب اس مسجد میں نماز پڑھنا درست ہوگا یا نہیں، یا پھر بھی زمین والے کی رضامندی ضروری ہوگی؟

عبدالسلام (نندیراء، راجستھان)

الجواب وباللہ التوفیق:

مسجد جھگڑے اور ذاتی اختلاف کی بناپر بنانا ناجائز فعل ہوگا اور سخت گناہ کا کام ہوگا، اسی طرح دوسرے کی زمین پر اس کی اجازت ومرضی سے بنالینا بھی ناجائز اور حرام فعل کا ارتکاب ہوگا۔

البتہ جب مسجد بن گئی اور اپنے اور غیروں نے سب نے اس کو مسجد سمجھ لیا اور مسجد کہدیا تو اس میں شعائر اللہ ہونے کی شان پیدا ہوگئی، اس کو اب گرانا اور مسمار ومنہدم کرنا جائز نہ ہوگا، بلکہ اب ضروری ہے کہ جھگڑا ختم کرکے دونوں مسجدوں کو

۱- ''لا یجوز لأحد أن یتصرف في ملک غیرہ بلا إذنہ أو وکالۃ منہ أو ولایۃ علیہ وإن فعل کان ضامنا'' (شرح المجلۃ لسلیم رستم باز اللبنانی ۶۱/۱ مادہ رقم: ۹۶) ''عن أبي حرۃ الرقاشي عن عمہ قال قال رسول اللہ ﷺ: ألا لا تظلموا، ألا لا یحل مال امرئ إلا بطیب نفسہ منہ'' (مشکوۃ ص ۲۵۵)۔

آباد کرنے کی کوشش کی جائے (۱)، اور جس کی زمین پر بغیر اس کی اجازت ومرضی کے مسجد بنالیا ہے اس سے اجازت حاصل کیا جائے اور اجازت چاہے مفت دے یا قیمت لے کر دے، جس طرح دے اجازت لے لینا ضروری ہے اور اس شخص پر بھی ضروری ہے کہ اجازت دیدے خواہ معاوضہ لے کر ہو یا بلا معاوضہ لئے ہو (۲)۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دار العلوم دیوبند سہارنپور ۴/۹/۱۴۰۲ھ

بچے اور پاگلوں کا مسجد میں داخل ہونا:

بچوں اور پاگلوں کو مسجد میں داخل کرنا کیسا ہے؟ یہاں یہ دیکھا جا رہا ہے کہ نابالغ بچے اور پاگل جماعت میں بے دھڑک شامل ہوتے ہیں۔

الجواب وباللہ التوفیق:

ناسمجھ بچوں اور پاگلوں کا مسجد میں لے جانا حرام ہے، اس سے خدا کے گھر کی بے حرمتی ہوتی ہے، سختی سے روکنا چاہئے، کیونکہ خدا کے گھر کی بے حرمتی خدا کے غضب کے نزول کا سبب ہے، "و یحرم ادخال صبیان و مجانین حیث غلب تنجسهم وإلا فیکره"، حضور ﷺ نے فرمایا ہے کہ بچاؤ اپنی مسجدوں کو بچوں سے اور پاگلوں سے اور بیع و شراء سے اور شور غل وغیرہ سے اور مسجدوں میں خوشبوں کی دھونی دیا کرو اور ان میں آفتابے رکھا کرو (۳)۔

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دار العلوم دیوبند سہارنپور ۱۸/۷/۱۳۸۵ھ

الجواب صحیح محمود عفی عنہ

۱- ''وفی شرح المنیة للحلبی: بنی مسجدا فی أرض غصب لا بأس بالصلاة فیه'' (رد المحتار علی الدر المختار ۴۴/۲)۔

۲- ''ولو ضاق المسجد علی الناس وبجنبه أرض لرجل توخذ أرضه بالقیمة کرها کذا فی فتاوی قاضی خان'' (فتاوی عالمگیریہ ۴۵۶/۲)۔

۳- "قوله ویحرم لما أخرجه المنذری مرفوعاً" "جنبوا مساجدکم صبیانکم ومجانینکم وبیعکم و شراء کم و رفع أصواتکم و سلّ سیوفکم وإقامة حدودکم، و جمروها فی الجمع واجعلوا علی أبوابها المطاهر بحر" (شامی ج۱ ص۴۸۲، رد المحتار علی الدر ۴۲۹/۲، باب ما یفسد وما یکره فیہا، مکتبہ زکریا دیوبند)۔

شرابی کومسجد سے نکالنا جائز ہے یا نہیں؟

ایک شخص نے اپنے ساتھی کونماز کے لئے بلایا ہے اور اسکے ساتھ مسجد نماز کے لئے گیا ہے، مسجد میں داخل ہونے تک یہ معلوم نہ ہوا کہ یہ شراب پیئے ہوئے ہے، اندر داخل ہونے کے بعد معلوم ہوا تو اس نے نادم ہوکر اتنا کہا کہ اللہ معاف کرنے والا ہے۔

اب اس ساتھ لانے والے کومسجد سے چلے جانے کے لئے کہنا درست ہوگا یا کہ نہیں؟

الجواب وباللہ التوفیق:

ہاں شرابی کومسجد سے چلے جانے کے لئے کہنادرست ہے، اب وہ شرابی واپس نہ جائے اور ویسے ہی نماز پڑھ لے تو اس لانے والے پر کوئی گناہ نہیں ہے۔فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۹/۲۴/ ۱۳۸۵ھ

اس لئے درست ہے کہ اس کے منھ سے شراب کی بو جو نکلے گی وہ باعث ایذاء ہوگی اور نشہ میں ایسی حرکات کرسکتا ہے جس سے مسجد کی بے حرمتی ہو۔

الجواب صحیح سید احمد علی سعید نائب مفتی دارالعلوم دیوبند

مسجد کے لئے وقف شدہ ڈول اور رسی کا حکم:

مسجد کے اندر پانی کا کنواں ہے اور اس پر ایک ڈول ہے جس سے پنجوقتہ نماز وجمعہ کی نماز کے لئے وضو کا پانی کھینچا جاتا ہے، اس ڈول سے پڑوسی لوگ اپنے گھروں پر پانی لے جاتے ہیں اور بے نمازی لوگ غسل کرنے والے کپڑے بھی دھوتے ہیں یہ عمل جائز ہے یا ناجائز ہے۔

الجواب وباللہ التوفیق:

وہ ڈول رسی اگر وقف کے مال سے خرید اگیا ہے جب تو محض نماز اور طہارت کی ضرورت میں استعمال کرسکتے ہیں،

نہ اس کو گھر پر پانی لیجانے کے لئے استعمال کر سکتے ہیں اور نہ بے نمازی لوگ اپنی کسی ضرورت میں استعمال کر سکتے ہیں، اور اگر وہ رسی ڈول وقف کے مال سے نہیں خریدا گیا ہے بلکہ کسی نے اپنی ملک سے رکھے ہیں اور وہاں کا عرف یہی ہے کہ محض مصلیان ہی ضرورت نماز کے لئے استعمال کریں جب بھی یہی حکم سابق ہے کہ محض مصلیان ہی ضرورت نماز کے لئے استعمال کریں، ہاں اگر دینے والا تصریح کردے کہ جو شخص چاہے استعمال کرے تو ہر شخص استعمال کرسکتا ہے (۱)۔فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

امام کے ساتھ سخت کلامی:

امام صاحب کے ساتھ سختی سے بات چیت کرنا یا انکی بے ادبی یا بدتمیزی کرنی کیسی ہے اور توہین کرنی وغیرہ۔

الجواب وباللہ التوفیق:

امام کے ساتھ سخت کلامی یا بے ادبی و گستاخی یا توہین کرنا یا ان پر حکومت کرنا اور عتراض گانٹھنا بالخصوص غلط طریقہ سے بہت ہی برا اور عند اللہ مبغوض ہے، امام کے پاس وادب کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۶/ ۷/ ۱۳۸۵ھ

الجواب صحیح محمود غفی عنہ

ایسی جگہ جہاں سو سال کے بعد مکانات منہدم کردیئے جاتے ہوں وہاں مسجد کا حکم:

۱-ہمارے شہر میں دس بارہ سال سے ایک گرجا خریدا ہے اور اس کو عبادت خانہ کے طور پر استعمال فرما رہے ہیں، ایک مہینہ پہلے حضرت مولانا ابرار الحق صاحب تشریف لائے ہوئے تھے، حضرت والا نے اپنے معمول کے مطابق فرمایا کہ کیا شرعی مسجد نہیں بنائی گئی کہ ابھی تک اس کو عبادت خانہ کے طور پر استعمال کررہے ہیں، لوگوں کو حضرت والا نے توجہ دلائی اور لوگوں کے ذہن کو صاف کیا، یہاں کے لوگوں کے ذھن میں یہ بات ہے کہ حکومت کا قانون ہے کہ جب مکانات سو ۱۰۰ سال

۱- دیکھئے: مطلب مراعاۃ غرض الواقفین واجب والعرف یصلح مخصصا، (رد المحتار علی الدر ۶/ ۶۶۵، مکتبہ زکریا)۔

کے ہوجاتے ہیں اس کوحکومت گرادیتی ہے اور وہاں کے رہنے والے اس شہر میں دوسری جگہ منتقل ہوجاتے ہیں اس وقت اس مسجد کوکون آباد کرے گا، اس وجہ سے یہاں اکثر شہروں میں لوگوں نے مکانات کوعبادت خانہ بنارکھا ہے، خدمت اقدس میں عرض ہے کہ اس عبادت خانہ کے اوپری حصہ میں پانچ وقت کی نماز جمعہ وعیدین پڑھتے ہیں، تقریباً ۳۰۰ افراد اس پرنماز پڑھ سکتے ہیں اور نیچے تہہ خانہ ہے تو اس میں جگہ کی تنگی کی وجہ سے بچے پڑھ رہے ہیں مگر اوپر کے حصہ کی چار صف تک مسجد کی نیت کرلی جائے، اور تہ خانہ کومصالح مسجد مثلاً مکتب مسجد کا سامان، میت رکھنے کے لئے چارپائی وغیرہ ضروریات کے لئے استعمال کریں تو شرعی طور پر اس طریقہ سے مسجد کی نیت کرنا جائز ہے یا نہیں؟

۲- اور اس طریقہ سے مسجد کی نیت کرنے کے بعد خدانخواستہ اس جگہ کوحکومت نے آبادی کو وہاں سے منتقل کردیا تو شوری کے آدمی عنداللہ مجرم ہوں گے یا نہیں؟ اور لوگوں کا اس بات کا سوچنا کہ اس کے بعد کون آباد رہے گا شرعی نقطۂ نظر سے درست ہے یا نہیں؟

ایس بوٹیات (۴۰-مارتھ کنگ اسٹریٹ باٹلے انگلینڈ)

الجواب وباللہ التوفیق:

(۱و۲) حضرت مولانا ابرارالحق صاحب مدظلہ کا توجیہ دلانا صحیح وبرمحل ہے، عبادت خانہ میں جتنا ثواب ملتا ہے مسجد شرعی میں کم ازکم اس سے پچیس ۲۵ گنا زیادہ ثواب ضرور ملتا ہے (۱)۔ ورنہ روایات اس سے زائد کی بھی ہیں اور مسجد شرعی وہ جگہ ہوتی ہے جس کونماز پڑھنے کے واسطے قیامت تک کیلئے وقف کردیا گیا ہو، اس جگہ اور عمارت کو مالک نے برائے مسجد وقف کردیا ہو، وقف کرنے سے وہ جگہ ومکان واقف کی ملک سے نکل کر اللہ کی ملک میں مفتی بقول میں داخل ہوجاتی ہے اور تا قیام قیامت وہ جگہ ومکان مسجد ہی قرار پاتا ہے، مسجد کے اوپر عنان سماء تک اور نیچے تحت الثری تک سب بحق مسجد خالص ہوکر محفوظ ہوجاتا ہے، اس لئے اس کے اوپر و نیچے کسی طرف نماز وذکر وتلاوت یعنی عبادات خالصہ کے علاوہ کے لئے استعمال کرنا جائز نہیں رہتا حتی کہ امام وموذن کے لئے اس کے اوپر نیچے کوئی کمرہ تعمیر نہیں کرسکتے حالانکہ امام وموذن عین ضروریات مسجد میں سے ہوتے ہیں اور ان ہی وجوہ سے غسل خانہ ووضوخانہ وغیرہ بھی مثل کمرہ موذن وامام کے ہیں مسجد کے اوپر یا نیچے بنانا

۱- ''صلوة الرجل في جماعة تضعف على صلواته في بيته وفي سوقه خمسا وعشرين ضعفا'' الحدیث (رواہ البخاری واللفظ لہ ومسلم وابوداؤد والترمذی وابن ماجہ، الترغیب والترہیب للمنذری ۱/۲۵۹)۔

درست نہیں ہے، اس طرح مکتب ومدرسہ خواہ دینی تعلیم کا ہو یا میت کے غسل ولانے وغیرہ کی جگہ بھی یا مردہ رکھنے کے لئے فیریز وغیرہ رکھنے کی جگہ کو بھی عین مسجد کے اوپر نیچے قائم کرنا جائز ودرست نہیں ہے، اگر ضرورت ہو تو امام وموذن کے کمرہ کی طرح حاشیہ ومسجد میں خواہ متصل عین مسجد کے ہو رکھنا چاہئے، ہاں عین مسجد کے اوپر و نیچے خاص مسجد کا سامان جیسے مسجد کے لوٹے جاءنماز وغیرہ رکھنے کے لئے کوئی جگہ نہیں متعین کر کے کمرہ کی شکل بھی دے سکتے ہیں، اس لئے مالکان عبادت خانہ کو مسئلہ خوب سمجھا کر اور شرعی مسجد کی فضیلت سمجھا کر ترغیب دینا چاہئے کہ وہ عبادت خانہ برائے مسجد وقف کر کے مسجد شرعی قرار دے دیں، بے انتہاء ثواب اور حصول خیر وبرکت کا کام ہوگا، رہا یہ اشکال کہ یہاں کے قانون حکومت کے ماتحت سو ۱۰۰ ر برس کے بعد گرانے والے پلان میں آ کر وہ جگہ یعنی مسجد بھی گرادی جائیگی تو ایسی صورت میں اس نیت کرنے والے پر تو کچھ وبال نہ آئے گا، اگر اس جگہ دوبارہ تعمیر کرنے کی اجازت بھی مل جائے تو چونکہ اس جگہ کے مسلمان متفرق ہو چکے ہوں گے آباد کون کرے گا یہ اشکال شرعاً معتبر وصحیح نہیں ہے، اولاً تو اس لئے کہ بعض لوگوں سے کچھ اس طرح سننے میں آیا ہے اگر گرجا گھر اور شرعی مساجد جو حکومت کے نزدیک بھی شرعی مسجد تسلیم ہو چکی ہو وہ اس کو گرانے والے پلان سے مستثنیٰ ہوتی ہے اگر ایسا ہو تو یہ خلجان رہ جاتا ہے وہاں کے مسلمانوں کے منتشر ہو جانے کے بعد کون آباد کرے گا تو ظاہر ہے کہ اس گرادینے کے بعد پھر چند مہینوں میں وہ جگہ لوگوں سے آباد بھی ہوتی ہوگی، اس وقت اس جگہ کو بکثرت مسلمان لے لیں یا لینے کی سعی کریں کامیاب ہو گئے تو اس سعی کو ثواب کے ساتھ ساتھ احیاء دین واحیاء مشاعر کا بھی ثواب ملے گا ورنہ اس سعی کا ثواب تو ضرور ملے گا اور یہ بھی نفع سے خالی نہیں اور ثانیاً اس کے لئے یہ گرجا گھر اور مساجد شرعی بھی اس گرانے کے پلان میں آتے ہوں جب بھی اس مذکورہ بالا سعی وغیرہ کا ثواب کہیں جاتا نہیں اور چونکہ یہ گرانا اور آبادی کو ایک جگہ سے دوسری جگہ وغیرہ منتقل کرنا خود اپنے اختیار وخوشی سے نہیں ہوگا اور وہ خود اپنا فعل نہیں ہوگا۔

بلکہ حکومت قہری طور پر ایسا کرے گی اور مسلمان معذور ہوگا ارشاد باری تعالیٰ ہے: "**ولاتزر وازرة وزر اخریٰ**" (۱)، ایک شخص کی غلطی کی سزا دوسرے کو نہیں دی جاتی اور احادیث صحیحہ میں آتا ہے: "**رفع عن امتی الخطاء والنسیان وما استکرهوا علیه أو کما قال علیه الصلوٰة والسلام**" (۲)۔

یعنی سرکار دوعالم ﷺ نے فرمایا ہے کہ میری امت سے خطاء اور نسیان اور اس چیز کا گناہ ووبال مرتفع کردیا گیا ہے

۱- سورۂ فاطر: ۱۸۔

۲- "تکرر هذا الحدیث فی کتب الفقهاء والأصولیین بلفظ: رفع عن امتی ولم نره فی الاحادیث المتقدمة عند جمیع من اخرجه" (التلخیص الحبیر ۱/ ۵۱۱، مؤسسة القرطبة، جامع صغیر للسیوطیؒ)۔

جس میں وہ مکرہ (معذور) ہو، اس آیت کریمہ وروایت کی بنیاد پر اس تغیر کا وبال مسجد کی نیت کرنے والوں اور وقف کرنے والوں پر بالکل نہ پڑے گا، بلکہ کیا عجب کہ مخلص کی سعی اللہ تبارک وتعالیٰ کو اتنی پسند آجائے کہ اس کی برکت سے اس کے گرانے کا پلان یا معابد ومساجد گرانے کا پلان منسوخ ہوجائے اور اگر منسوخ نہ ہو تو بھی "انما الاعمال بالنیات" (۱) کے تحت اور "نیة المومن خیر من عمله" (۲)، کے تحت ثواب تو کہیں جاتا نہیں، اس لئے قول کی توجہ اس طرف منعطف کر کے ان عبادت خانوں کو شرعی مساجد بنانے میں پوری سعی کرنا چاہئے اور الدال علی الخیر کفاعله کے مطابق سعی سے بھی پورا عمل کرنے والے کے ثواب کی نیت رکھنا چاہئے اور خلاصہ جواب یہ نکلا کہ اس نیت کرنے کے بعد اگر خدانخواستہ اس جگہ کو حکومت نے لے لیا اس جگہ کی بستی کو دوسری جگہ منتقل کردیا جب بھی یہ نیت کرنے والے اور شرعی مسجد قرار دینے والے مجرم وماخوذ نہ ہوں گے بلکہ یہ نیت وسعی باعث اجر وثواب وباعث خیر وبرکت بنے گی، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۴۰۲/۱/۱۳ھ

۱- مسجد کی آمدنی سے امام کی آمد ورفت کا کرایہ دینا:

مسجد میں جو امام ہے اس کے گھر آنے جانے کا کرایہ دینا طے ہے، اگر کسی وقت روپے لوگ اپنے پاس سے نہ دے سکیں پورا یا کچھ کمی رہ جائے اور مسجد کی آمدنی میں سے دیدیں تو کچھ حرج ہے یا نہیں؟

۲- امام کے ناشتہ وغیرہ کا نظم مسجد کی آمدنی سے:

امام صاحب کے ناشتہ کا انتظام مسجد کی آمد سے کردیں اور مسجد میں جلانے کے لئے مٹی کا تیل، آٹا اور ماچس اگر بخوشی لوگ اجازت دیدیں، اسٹوپ اور حجرہ میں روشنی کے لئے جلانا جائز ہے یا نہیں؟

۳- مسجد کی آمدنی سے انعام دینا:

جیسا کہ اب دستور ہوگیا ہے کہ کوئی شخص مسجد کی امداد کرتا ہے تو اس کو مائک پر بولا جاتا ہے اس کو سن کر لوگ اور دیتے ہیں اور بعض جگہ امام کو کبھی کبھی پڑھنا پڑجاتا ہے یعنی نظم وغیرہ تو اس سلسلہ سے اچھی آمدنی مسجد کو ہوجاتی ہے تو اس میں سے یعنی مسجد کی آمدنی سے کچھ بطور انعام امام صاحب کو دیدیں تو جائز ہے یا نہیں؟

۱- متفق علیہ، مشکوٰۃ ۱۱۔

۲- ضعیف کما قالہ العراقی، اسنی المطالب ۱/۳۰۸، دار الکتب العلمیۃ، بیروت۔

الجواب وبا اللہ التوفیق:

۱-اگر گھر آنے جانے والے کا کرایہ لینے دینے کا معاملہ مسجد کے ذمہ داروں اور اراکین مسجد سے طے ہے کہ مسجد کے پیسے سے دیدیا جایا کرے جب تو ایسے وقت میں مسجد کے پیسہ لیکر خرچ کرلیں اور بعد میں مسجد کے ذمہ داروں کو بتلا دیں اور اگر اس طرح معاملہ طے نہیں تو مسجد کے پیسے سے لینے کے بجائے کسی سے قرض لیکر کام چلائیں اور بعد میں طےشدہ معاملہ کے مطابق وصول کرلیا کریں۔

۲-امام کے ناشتہ کا انتظام مشورے سے طے ہے تو کرسکتے ہیں ورنہ نہیں اور مسجد کے صحن میں بھی جو عین مسجد قرار پا چکا ہو اس میں مٹی کا تیل اور کوئی بدبو دار چیز کا استعمال جائز نہیں(۱)، ہاں اگر وہ حصہ صحن میں مسجد نہ ہو بلکہ وضو خانہ و غسل خانہ وغیرہ کا جزء ہو تو وہاں جلا سکتے ہیں۔

۳-مسجد کی آمدنی بڑھانے کے لئے سادہ اور خموش طریقہ افضل ہے یہ مذکورہ طریقہ اچھا نہیں، باقی اگر اس طرح وصول کرلی گئی ہو اور اس میں سے بطور انعام کے امام صاحب کو بھی کچھ دیدیا تو اس کا لے لینا امام صاحب کو جائز رہے گا۔فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دار العلوم دیوبند سہارنپور ۱/ ۸/ ۱۴۰۳ھ

مساجد میں اناج کا دسواں حصہ لگانا:

مساجد میں اناج کا دسواں حصہ لگ سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب وباللہ التوفیق:

مساجد میں اناج کا دسواں حصہ (عشرہ) نہیں لگ سکتا ہے، جائز نہیں ہے۔فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دار العلوم دیوبند سہارنپور ۶/ ۱۲/ ۱۴۰۳ھ

۱- ''من أکل ثوما أو بصلا فلیعتزلنا او یعتزل مسجدنا'' (بخاری ۲/ ۸۲۰، باب ما یکرہ من الثوم والبقول)۔

عیدگاہ کے لئے وقف شدہ زمین کا مصرف:

ایک آراضی جوکہ ۱۶ ڈسمل کی تھی جس میں ہم ½ کے حصہ دار تھے وہ ہم دونوں حقداروں نے عیدگاہ کے لئے قریب پانچ سال ہوئے بخوشی دیدی تھی اور نماز عید الفطر اور عید الاضحیٰ چار سال سے وہاں متواتر ہوتی رہی، عمارت کسی طرح کی نہیں بنی اور نہ کسی طرح کی بنیاد پڑی، اب پبلک میں دو پارٹیاں ہونے پر اعتراض ہوا ہے کہ ہم لوگ قریب کے گاؤں میں نماز پڑھیں گے، ہم لوگ تھوڑے ہونے پر مجبوراً خاموش رہے ہیں، اب اس میں عیدگاہ بننے کی کوئی امید نہیں ہے اب اس آراضی کا کیا ہونا چاہئے وہ بیکار پڑی ہے پہلے اس میں کاشت ہوتی تھی۔

الجواب وبا اللہ التوفیق:

اس جگہ مسجد بنادیجائے، بہر حال یہ جگہ وقف ہوچکی اور کسی ذاتی خرچ میں بھی نہیں آسکتی ہے (۱)۔

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

مسجد بنانے کے لئے بینک سے سودی قرض لینا:

اگر کسی مسجد کے منتظمین مسجد بنانے میں بینک سے سودی قرضہ لے اور ادارہ کے حساب سے سود ادا کرے تو شرعی حکم کیا ہوگا؟ اور یہ کہ ایسے منتظمین کے بارے میں شرعی حکم کیا ہے؟

ابراہیم باوا

الجواب وباللہ التوفیق:

بینک سے بھی سودی قرض لینے کی بغیر سخت مجبوری اور ضرورت کے گنجائش نہیں ہوتی اور مسجد کا پختہ کرنا ضروری نہیں، اس لئے ایسا پیسہ لے کر مسجد میں لگانا ہی جائز نہیں، پھر اس کا سود مسجد کے پیسہ سے دینا کب جائز ہوگا؟

کسی مسجد کے منتظمین اگر سودی قرض لے کر تعمیر مسجد میں لگائیں گے تو گنہگار ہوں گے اور اس کا سود اگر مسجد کے پیسے سے دیں گے تو گنہگار بھی ہوں گے اور ان پر ضمان بھی عائد ہوگا، البتہ چونکہ مسجد اسلام کے اعلی شعائر میں سے ہے، اس

۱- ''لانہ لایقبل التملیک والتملک'' (شامی ۴/ ۴۴۲، مطبعہ عثمانیہ)۔

لئے اس کی عظمت واظہار کے پیش نظر مساجد کا عام مکانوں سے اعلیٰ وارفع بنانا افضل واحسن ہے، اس لئے اہل ثروت اور اہل خیر حضرات کو دل کھول کر پاک کمائی سے تعمیر مسجد میں حصہ لینا چاہئے (۱)۔

"انما یعمر مساجد اللّٰہ من آمن باللّٰہ والیوم الآخر و اقام الصلوۃ" (۲) کی فضیلت حاصل کرنے پر بھی نظر رکھنی چاہئے۔فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۲/۶/ ۱۴۰۰ھ

مسجد کی تعمیر کے لیے سودی قرض لینا کیسا ہے؟

اگر کسی مسجد کے منتظمین مسجد تعمیر کرنے میں بینک سے سودی قرض لیں اور ادارہ کے حساب سے سود ادا کریں تو شرعی حکم کیا ہوگا؟ اور یہ کہ ایسے منتظمین کے بارے میں شرعی حکم کیا ہے؟ فقط والسلام

الجواب وباللہ التوفیق:

بینک سے سودی قرض لینے کی بغیر سخت مجبوری اور ضرورت کے گنجائش نہیں ہوتی اور مسجد کا پختہ کرنا ضروری نہیں ہے، اس لیے ایسا پیسہ لے کر تعمیر مسجد میں لگانا ہی جائز نہیں، پھر اس کا سود مسجد کے پیسہ سے دینا جائز ہوگا۔

کسی مسجد کے منتظمین اگر سودی قرض لے کر تعمیر مسجد میں لگائیں تو گنہگار ہوں گے اور اس کا سود اگر مسجد کے پیسہ سے دیں گے تو گنہگار بھی ہوں گے اور ان پر ضمان بھی عائد ہوگا۔

البتہ چوں کہ مسجد اسلام کے اعلیٰ شعائر میں سے ہے، اس لیے اس کی عظمت اور اظہار کے پیش نظر مساجد کا مکانوں سے اعلیٰ وارفع بنانا افضل واحسن ہے، اس لیے اہل ثروت اور اہل خیر حضرات کو دل کھول کر پاک کمائی سے تعمیر مسجد میں حصہ لینا چاہیے: "إنما یعمر مساجد اللّٰہ من اٰمن باللّٰہ والیوم الاٰخر و اقام الصلوٰۃ" الخ (۳) کی فضیلت حاصل کرنے

۱- "أما لو أنفق في ذلک مالاً خبیثاً ومالاً سببه الخبیث والطیب فیکره، لأن اللّٰه تعالیٰ لا یقبل إلا الطیب، فیکره تلویث بیته بما لا یقبله" اھ (شرح ہدایہ۔ رد المحتار علی الدر المختار ۲/ ۳۱، قبیل مطلب فی أفضل المساجد)۔

۲- "إنما یعمر مساجد اللّٰه من آمن باللّٰه والیوم الآخر وأقام الصلاة وآتی الزکوة ولم یخش إلا اللّٰه فعسی أولٰئک أن یکونوا من المهتدین" (سورۂ توبہ: ۱۸)۔

۳- سورۂ توبہ: ۱۸۔

پر بھی نظر رکھنی چاہیے۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۶/۱۲/۱۴۰۰ھ

مسجد سے متصل صحن کا حکم:

محلّہ میں ایک چھوٹی سی مسجد ہے، مسجد مذکور سے متصل ایک حجرہ بھی بنا ہے جس میں مؤذن وغیرہ رہتے ہیں، حجرہ مذکور کے سامنے جو صحن فرش ہے وہ مسجد کے صحن اور فرش کے ساتھ ملا ہوا ہے، بعض مرتبہ جب زیادہ لوگ آجاتے ہیں تو جب مسجد کے صحن میں لوگ صف بناتے ہیں تو اس کا سلسلہ حجرہ والے صحن تک چلا جاتا ہے، اب اس میں دریافت یہ کرنا ہے؟

۱۔ حجرہ والے صحن کا کیا حکم ہے، وہ مسجد میں داخل مانا جائے گا یا مسجد سے خارج مانا جائے گا؟

۲۔ جو لوگ حجرے والے صحن میں نماز پڑھیں گے ان کو بھی مسجد میں پڑھنے والوں کے برابر ثواب ملے گا یا کچھ کم ملے گا۔

۳۔ حجرے والے صحن میں مؤذن وغیرہ گرمیوں میں چارپائی بچھا کر سو سکتے ہیں کہ نہیں؟

الجواب وباللہ التوفیق:

۱۔ محض مصلیوں کی زیادتی سے وہاں سلسلہ پہنچ جانے سے اس صحن کو مسجد کا حکم نہ دیدیں گے جب تک کہ اس کو مستقلاً اور بالاصل مسجد قرار نہ دے لیا جائے۔

۲۔ کچھ کم ثواب ملے گا جس طرح دیر سے آنے والے کو پہلے آنے والے کے اعتبار سے کچھ کم ثواب ملتا ہے۔

۳۔ جب تک اس صحن کو مستقلاً مسجد قرار نہ دے لیا جائے اس وقت تک کوئی سوء ادبی نہیں ہے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۴/۷/۱۳۸۵ھ
الجواب صحیح سید احمد سعید جمیل الرحمٰن محمود عفی عنہ نائب مفتی دارالعلوم

مسجد کی آمدنی سے مسجد کے حمام کی لکڑی جلانا کیسا ہے؟

۱۔ مسجد کی دوکانوں یا مکانوں کی آمدنی سے مسجد کے حمام کی لکڑی جلائی جاسکتی ہے؟

۲-جبکہ کچھ دوکانیں مسجد کی جائداد میں بنی ہوئی ہیں جو کہ چندہ سے اور مسجد کی دیگر آمدنی سے تعمیر ہوئی ہیں۔

۳-کچھ دوکان اور مکان کچھ مرحومین نے مسجد کے نام وقف کردئے تھے، ان کی بھی آمدنی آتی ہے۔

۴- محلے والے بہت غریب ہیں اور تھوڑے کچھ مالدار بھی ہیں۔

۵-مگر مالدار اتنے چندہ نہیں دیتے جس سے مسجد کے حمام کی لکڑی پوری ہوجاویں عند الشرع کیا حکم ہے؟

الجواب وبالله التوفيق:

لکھی ہوئی پانچوں صورتوں پر نظر کرلی گئی ، ان تمام آمدنیوں سے مصلیوں کے لئے پانی گرم کرسکتے ہیں جائز ہے(۱)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی ، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۱/ ۷/ ۸۵ ۱۳ھ

الجواب صحیح سید احمد علی ، سید محمود عفی عنہ مفتی دارالعلوم دیوبند

مسجد کی آمدنی دوسرے کاموں میں خرچ کرنا کیسا ہے؟

یہاں کے پنچایتی لوگ شادی گھر کا لڑکا اور لڑکی سے مسجد کے نام سے لڑکے والے سے ایک سو روپیہ اور لڑکی والے سے مسجد کے لئے پندرہ روپیہ لیتے ہیں اور روپیہ مسجد کے فنڈ میں رہتا ہے، اس روپیہ سے مسجد کے لئے کچھ زمین بھی خریدی گئی ہے اس زمین سے جو آمدنی ہوتی ہے وہ مسجد کے فنڈ میں جمع رہتی ہے اور اسی روپیہ سے مسجد کا تمام کام ہوتا ہے اور پیش امام کو تنخواہ دیجاتی ہے اور گاؤں والے پیش امام کو باری کرکے چار مہینہ میں ایک آدمی ایک دن کھانا کھلاتا ہے جس میں غریب اور بیوہ بھی شامل ہیں، اس لئے سال میں ایک مرتبہ مسجد کے دھان اور روپیہ سے کھانا پکا کر تمام پنچایت کے لوگ بلا فروخت کئے بانٹ کر کھانا لیکر کھاتے ہیں۔

۱-کیا مسجد کے روپیہ کو گاؤں والے یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ روپیہ ہمارا ہے ہم دیتے ہیں اس لئے ہمارا حق ہے، ہم مسجد میں خرچ کریں یا جس راستہ میں چاہیں خرچ کرسکتے ہیں، کیا جائز ہے؟

۱- ”مسجدله مستغلات وأوقاف، أراد المتولي ان يشتري من غلة الوقف للمسجد دهنا أو حصيرا أو حشيشا او اجرا وجصا لفرش المسجد أو حصى قالوا ان وسع الواقف ذالک للقيم وقال: تفعل ماترى لمصلحة المسجد كان له ان يشتري للمسجد ماشاء“ (فتاوی ہندیہ ۲/ ۴۶۱، رشیدیہ پاکستان)۔

۲۔ کیا مسجد کے نام کا روپیہ مسجد کو چھوڑ کر دوسرے کسی کام میں لگانا جائز ہے۔

۳۔ کیا یہ کہہ کر کہ بیوہ اور غریب لوگ پیش امام کو کھانے کو دیتے ہیں وہ پنچائیت کی طرف سے کچھ پاتے نہیں ہیں، اس لئے انکو خوش رکھنے کے لئے تاکہ وہ پیش امام کو کھانا دیں، اس وجہ سے سال میں ایک دفعہ مسجد کے روپئے سے کھانہ پکا کر اس کو فاتحہ دلا کر تمام پنچایت کے لئے کھانا جائز ہے یا کہ نہیں؟

۴۔ مسجد کے روپیہ سے چار مچھلی خرید کر مسجد کے تالاب میں ڈال دیا جائے اور جب مچھلی بڑی ہو جائے تمام پنچایت اس کو پکا کر کھانا کیسا ہے؟ جو مسجد کے روپئے سے مسجد کے تالاب میں ڈالا گیا تھا، یہ فعل کیا جائز ہوسکتا ہے یا کہ نہیں؟

۵۔ کیا مسجد کے روپئے سے بارہ وفات اور گیارہویں شریف میں مٹھائی منگا کر فاتحہ کرنا اور تمام پنچایت کا اس مٹھائی کو بلا اجازت کے بانٹ کر کھانا کیسا ہے، کیا جائز یا کہ نہیں؟

٦۔ مسجد کے روپیہ سے کسی انجمن یا لائبریری کو یا کسی غریب کو دیا مسافر کو یا کسی مدرسہ کو دینا یا کہ مولوی صاحب کا وعظ سنکر اس کو دینا، یا وعظ کے واسطے کسی مولوی صاحب کو اس روپیہ سے دینا یا کہ گاؤں کا راستہ کی مرمت کرانا یا کسی سرکاری پیر کا مزار بنانا یا کہ عیدگاہ بنانا یا کہ گاؤں کے پانی کے لئے کنواں کھودوانا وغیرہ یہ تمام کام مسجد کے روپیہ سے کرنا کیسا ہے؟

۷۔ مسجد کے روپئے سے پیش امام کو تنخواہ دینا کیسا ہے؟

الجواب وبالله التوفيق:

اپنی جو رقم یا جو چیز مسجد کو دیدی جاتی ہے وہ مسجد کی ہوجاتی ہے، اب اس کا استعمال کسی اور جگہ میں جائز نہیں رہتا ہے، خود دینے والے کو بھی دینے کے بعد یہ اختیار نہیں رہتا ہے تو دوسروں کا کیا شمار، اب وہ چیزیں مسجد پر وقف اور اللہ تعالیٰ کی ملکیت خاصہ ہوجاتی ہیں (۱) اب اپنی مملوک چیز جیسا معاملہ اسکے ساتھ کرنا سخت گناہ اور اللہ تعالیٰ کے غضب کا باعث ہوتا ہے اس لئے ان تمام سوالات کا جواب یہ ہے کہ یہ سب چیزیں غلط اور ناجائز ہورہی ہیں، بجائے ثواب الٹا گناہ ہوگا، دنیا میں بھی اس کا وبال پڑنے کا ڈر ہے۔

۱- ’’أما تعريفه إلى قوله: وعندهما حبس العين على حكم ملك الله تعالىٰ على وجه تعود منفعته الى العباد فيلزم ولايباع ولايوهب ولايورث كذا في الهداية، وفي العيون واليتيمة: ان الفتوى على قولهما كذا في شرح الشيخ ابي المكارم للنقاية‘‘ (عالمگیری ۲/ ۳۵۰، رشیدیہ پاکستان)۔

۷۔ امام مسجد کو تنخواہ دینا یہ مسجد ہی کا کام ہے جائز ہے(۱)۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور
الجواب صحیح سید احمد علی نائب مفتی دارالعلوم دیوبند

توسیع کی غرض سے مسجد کے متصل قبرستان اور حجرہ کو مسجد میں شامل کیا جا سکتا ہے یا نہیں؟

مسجد کے دائیں جانب ایک حجرہ ہے اور بائیں جانب کچھ جگہ پڑی ہوئی ہے، جس میں دو قبریں ہیں، ایک تو بوسیدہ ہو رہی ہے اور دوسری صحیح ہے اور مسجد کے اندر کی جانب دو صف ہو جاتی ہے، لیکن سردی کی وجہ سے نمازی رمضان شریف میں کافی ہو جاتے ہیں، جو لوگ باہر رہ جاتے ہیں وہ بہت کم ہیں، جو قرآن سنتے ہیں ان کا کہنا ہے کہ اور دن میں تو ہم فرض وسنت پڑھ کر چلے جاتے ہیں تھوڑا ٹائم لگتا ہے مگر رمضان شریف میں اتنی دیر سردی میں کھڑا نہیں ہوا جاتا ہے، خیال یہ ہے کہ اگر آپ صاحب اس بات کی اجازت دیں کہ دائیں جانب کا حجرہ جو مسجد سے ملا ہوا ہے اس کو مسجد میں ملا لیا جاوے اور بائیں جانب جو جگہ ہے اس کو بھی ملا لیا جاوے مسجد قبرستان میں ہے، لیکن آبادی زیادہ ہونے کے بعد شہر میں ہو گئی ہے، اس قبرستان میں دفن اموات بھی اب بند ہو گئیں ہیں، پچاس ساٹھ سال قبل دفن ہوتے تھے۔

الجواب وباللہ التوفیق:

مسئلہ یہ ہے کہ جب قبریں بہت پرانی اور بوسیدہ ہو جائیں اگر چہ بالکل بے نشان نہ ہوئی ہوں جب بھی اس کو برابر کے نشان مٹا کر مسجد بنا سکتے ہیں اور جب پچاس سال سے زائد سے وہاں مردے دفن نہیں ہوتے بلکہ آبادی بڑھنے سے وہ قبرستان آبادی میں آگیا ہے تو اگر اس قبرستان کی زمین موقوف بھی ہو جب بھی اس پر مسجد بنا لینا منشا واقف کے خلاف ظاہر و متبادر نہ ہوگا، اور حجرہ تو بظاہر متعلق مسجد ہی ہے، لہذا ایسی صورت میں جب مسجد میں تنگی ہے اور توسیع کی ضرورت ہے تو نشانات قبر مٹا کر مسجد کے دونوں جانب توسیع کر سکتے ہیں(۲)۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۱/شعبان ۱۳۸۵ھ
الجواب صحیح محمود عفی عنہ

۱- ''لاتصح الإجارة الی قوله: ولا لأجل الطاعات مثل الأذان، والحج، والإمامة وتعليم القرآن، والفقه، ويفتى اليوم بصحتها لتعليم القرآن والفقه والإمامة والأذان'' (الدرالمختار علی الرد ۵/۳۶، عثمانیہ)۔

۲- ''ويتخذ مسجدا، لما روي ان مسجد النبيؐ كان قبل مقبرة للمشركين فنبشت كذا في الواقعات'' (ردالمحتار ۱/۸۳۵، مطلب فی دفن المیت)۔

مال حرام سے بنی ہوئی مسجد کا حکم:

مسجد کی تعمیر مال طیب اور حلال سے ہونی چاہئے مال خبیث اور حرام سے نہیں سوال یہ ہے کہ ایک مسجد مال خبیث اور طیب دونوں سے ملا کر بنی، ایسی مسجد میں نماز مقبول ہے یا نہیں؟ حضرت مولانا رشید صاحب گنگوہی مکروہ تحریمی کہتے ہیں اور اعادہ ایسی نماز کا واجب ہے یا نہیں اور ایسی مسجد کا شہید کردینا شعار اسلام کی وجہ سے باطل ہوگا اور دوسری نئی مسجد کی تعمیر لوگوں کے لئے شاق اور تکلیف مالا یطاق سے کم نہیں، اب نماز کی اصلاح کے لئے ایسا کیا جائے کہ جو لاگت یا خرچ مال خبیث اس مسجد میں لگا ہے صحیح حساب کر کے اپنی پاک اور حلال کمائی کے اتنی رقم یا تو مالک تک اور عدم رسائی میں کل رقم غرباء ومساکین ہی میں تقسیم کردیا جائے کہ مجبوری کے وقت یہی حکم ہے کیا ایسا کرنا درست ہوگا اور اس تبدل اموال الخبیثة باموال الطیبة کے بعد مسجد میں نماز بلا کراہیت درست ہونے لگے گی یا نہیں، اور اب یہ اور مسجدوں کی طرح اسس علی التقوی کی مصداق ہوگی یا کہ نہیں جو مسجد مال خبیث سے بنائی گئی ہے اس میں نماز مکروہ تحریمی ہے، جیسا کہ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمہ اللہ تعالیٰ علیہ نے اپنے فتاوی میں لکھا ہے، اب اگر ایسی مسجد میں نماز پڑھنے کا سابقہ پڑ جائے یا جماعت ہی کے ساتھ نماز پڑھنے کا اتفاق ہوجائے تو ایسی مسجد سے گھر کی نماز با جماعت اول ہوگی یا نہیں؟ مسئلوں کا جواب محققانہ ہو۔

الجواب وباللہ التوفیق:

کوئی مسجد اگر محض خبیث مال سے بنی ہو تو اس کا حکم اور ہے اور اگر خبیث اور طیب دونوں سے ملکر بنی ہو تو اس کا حکم اور ہے اور پھر ہر حکم میں تفصیل ہے جو صورت واقع ہوئی ہو اسی کو دریافت فرمائیے، ہاں اتنا سن لیجئے کہ اگر طیب وپاکیزہ مال بھی اس میں لگا ہو اور نصف سے زائد لگا ہے تو اس میں نماز جائز ہوگی، اس طرح خبیث مال سے مراد اگر یہ ہے کہ خباثت محض معاملہ میں ہے حاصل شدہ مال میں نہیں ہے تو اس صورت میں بھی نماز جائز ہے گو بطریق خبیث حاصل ہونے کی وجہ سے اس کو بھی خبیث کہیں کما صرح بہ الفقہاء، باقی تطہیر واصلاح کا طریقہ جو آپ نے لکھا ہے وہ صحیح نہیں، اس لئے کہ اگر وہ باقی ہیں تو نہ اس کا عوض دے اور نہ اس کو بعینہ تصدق کرے بلکہ اس میں خرچ شدہ حرام رقم کی مقدار اپنا دوسرا پاک وطیب مال اس کے عوض میں تصدق کرے جب بھی مفید مطلب نہیں اور تطہیر اس مسجد کی نہ ہوگی کیونکہ خبیث وحرام شئی بعینہ ابتک موجود ہے اور خبیث وحرام شئی جب تک بعینہ موجود ہو اس کا حکم فقط یہ ہے کہ یا تو اس شئی کو اس کے جائز مالک کے پاس واپس کردیا جائے اور یہ نا ممکن ہو تو خود اس شئی کو اپنی ملک سے نکال کر فقراء کو دیدے اور تصدق کردے اور یہاں یہ دونوں نہیں ہوا اور نہ ممکن ہی

ہے جیسا کہ آپ خود اس کو تسلیم کر رہے ہیں، اس طرح دوسرے لوگ جو اپنے طور پر کریں گے اس سے بھی اس خبیث وحرام شئی کا تصدق نہ ہوگا بلکہ وہ بعینہ وبلی حالہ موجود رہے گی پس اگر تطہیر واصلاح واجب ہی ہو تو اس طرح کرلیں کہ اس مسجد کو ہٹا کر پھر سے جدید تعمیر جائز وحلال مال سے کر کے اس میں نماز پڑھیں (۱)، یہ صورت بالخصوص ہمارے دیار میں فی زماننا بالکل جائز ہوگی اور اس کے علاوہ بھی حدود وضوابط میں داخل ہو کر اباحت صلاۃ کے لئے کافی ہو جائے گی وھو المراد اور نماز پڑھنے کے لئے پختہ وریختہ ہی عمارت ہونا ضروری نہیں، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

الجواب صحیح سید احمد سعید، محمود غفی عنہ مفتی دارالعلوم دیوبند

اور جواز نماز بلا کراہیت کے لئے یہ صورت بھی ہوسکتی ہے کہ صرف فرش اکھڑوا دیا جائے اور جائز وحلال آمدنی سے دوسرا فرش بنوایا جائے، فقط واللہ اعلم بالصواب

سید احمد علی سعید نائب مفتی دارالعلوم دیوبند ۱۱/ ۸/ ۸۵ ۱۳ھ

مسجد کی آمدنی کو دوسرے کار خیر میں خرچ کرنا درست ہے یا نہیں؟

۱- مسجد کی آمدنی سے مصلیوں کی دینی کتابیں مثلاً قرآن، حدیث، رسالہ دینیات یا وہ کتابیں جو دین کا علم سکھانے میں ممد ومعاون ہوں خریدنا درست ہے یا نہیں، جبکہ مسجد کی آمدنی کے سارے اخراجات کو بدرجہ اتم پورا کر کے کافی مقدار میں بچی رہتی ہے، اسی طرح اگر مسجد کی آمدنی میں کشائش گنجائش ہو تو اس سے ایک چھوٹے مکتب کی بنا ڈالنا جو مصلیوں کو علم سکھانے کے مقصد سے کھولا جائے گا یا اس آمدنی سے ایسے معلمین کی تنخواہ دینا جو مصلیوں کو ضروری مسائل سے واقف کراتے ہیں یا وعظ ونصیحت سے لوگوں کے دلوں کو گرماتے رہتے ہیں جائز ہوگا یا کہ نہیں، مسجد میں آمدنی کا ذریعہ ایک تو آراضی موقوفہ مسجد سے ہے، دوسری وقتاً فوقتاً عوام الناس کی اعانت ہے، دونوں کا حکم یکساں ہے یا کچھ فرق ہے؟

۲- ایک مسجد کی تعمیر آراضی موقوفہ للمسجد اور عام لوگوں کی اعانت سے ہوئی، مسجد مکمل ہو جانے کے بعد مسجد کی

۱- "عن أبی هریرة قال قال رسول الله ﷺ: من تصدق بعدل تمرة من کسب طیب ولا یقبل الله الا الطیب" (مشکوۃ ص ۱۶۷ باب فضل الصدقۃ)۔

آراضی موقوفہ سے بڑھتی ہوئی آمدنی دیکھ کر لوگوں کا خیال ہوتا ہے کہ اپنے موقوفہ روپیوں کو جو مسجد میں لگایا ہے مسجد کی آمدنی سے وضع کرلیں اور ان روپیوں سے دوسرے کار خیر مدرسہ وغیرہ کی اعانت کریں، ظاہر ہے کہ موقوف جائداد میں تصرف بالکل روا نہیں لیکن یہاں جبکہ مسجد کی زمین کی آمدنی وسیع پیمانہ پر مسجد کے جملہ مصارف پورا کر کے بچی رہتی ہے، اس سے لوگ اپنے موقوفہ روپیوں کی تبدیل چاہتے ہیں اور مقصد خدمت خلق ورعایہ پروری ہے اس کی پوری تحقیق فرماویں۔

الجواب وبالله التوفيق:

۱-اس میں سب ناجائز ہے جب کوئی چیز مسجد کی ہوجاتی ہے خواہ وقف سے یا عطاء سے از قبیل عروض ومال ہو یا نقد کسی حال میں بھی اس کو مسجد کی ملک سے نکالنا یا کسی دوسرے مصرف میں پیش کرنا خود واقف کو بھی جائز نہیں پھر دوسرں کا کیا شمار ہوگا؟

۲-بالکل جائز نہیں کما مر آنفاً اگر لوگوں کو زیادہ شوق ہو یا زیادہ ضرورت ہو تو اپنے مملوکہ اموال سے کریں مسجد کی آمدنی یا مال سے ہرگز نہ کرے، مدرسہ خواہ دینی ہو یا دنیوی کسی حال میں بھی جائز نہیں ہے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دار العلوم دیوبند سہارنپور ۱۲/ ۸/ ۱۳۸۵ھ
الجواب صحیح سید احمد علی سعید، محمود غفی عنہ

غصب شدہ زمین میں مسجد بنانے اور نماز پڑھنے کا حکم:

ایک مسجد میں اس کے حقیقی وواقعی رقبہ سے جو سرکاری کاغذات میں درج ہے زیادہ زمین بجبر بحیثیت غصب شامل کرلی جائے اور اس غصب شدہ اراضی میں مسجد کی آمدنی بذریعہ دوکانات بڑھائی جاوے یا غلہ خانہ اور حمام یا دار الوضوء بنایا جائے، آراضی غصب شدہ خواہ کسی کی ملک ہو یا کسی کے حق آسائش یا راستے کی ہو ایسا کرنے والے حضرات کا کیا حشر ہے اور اس مسجد میں نماز پڑھنے کا کیا نتیجہ ہے؟

الجواب وبالله التوفيق:

کسی مسجد میں کسی دوسرے شخص کی زمین غصب کے طور پر لیکر شامل کرنا جائز نہیں، اگر غصب کے ذریعہ کوئی زمین حاصل کی جائے اور مالک زمین رضامند نہ ہو تو اس کا استعمال کرنا اور اسپر نماز پڑھنا کچھ بھی جائز نہ ہوگا نوٹ: لیکن اگر کسی

کے ارض مغصوبہ میں نماز پڑھ لی تو درست ہوجائے گی)(۱) ایسا شخص عند اللہ سخت مجرم اور باعث غضب خداوندی ہے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۶/ ۸/ ۸۵ ۱۳ھ

مسجد میں نکاح کا سہرا پڑھنا:

مسجد میں سہرا نکاح کے موقع پر پڑھنا جائز ہے یا کہ نہیں جواب مکمل تحریر فرماویں۔

الجواب وبالله التوفيق:

مسجد کی بناء جماعت کے لئے ہوئی ہے اور معصیت کا مسجد میں کرنا مطلقاً ممنوع ہے، اب اگر کوئی ایسے امر کے لئے مسجد میں جائے جو نہ طاعت ہے نہ معصیت بلکہ مباح ہے تو اس لئے خاص مسجد میں جانا مکروہ ہے، لیکن پہلے سے وہ شخص مسجد میں حاضر ہے اور اتفاقاً اس مباح کی حاجت پیش آگئی ہے اور اس کی نیت سے مسجد میں نہیں گیا تھا، بلکہ کسی طاعت کے لئے آگیا تھا اور وہاں اس مباح میں بھی اشتغال ہوگیا، تو بشرط عدم اکثار جائز ہے۔

لہٰذا صورت مسئولہ میں اگر سہرا حدود شرعیہ کے اندر اور بغرض سہرا مسجد میں نہیں گیا ہے اور سادگی کے ساتھ اسکو پڑھتا بھی ہے، اس کے اندر ایسا ترنم نہ ہو جو گانے کے قریب ہوجاوے کہ حاضرین اس سے لذت محسوس کرنے لگیں، ان قیود کے بعد پڑھنے کی اجازت ہوگی، لیکن نہ پڑھنا اولیٰ ہے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۲/ ۸/ ۸۵ ۱۳ھ

چھوٹے سے محلّہ میں دو مسجد کی بنیاد ڈالی تو کیا حکم ہے؟

تیرہ گھر کا ایک چھوٹا سا موضع ہے جس میں ایک مسجد بھی تھی، عوام کی بے توجہی سے وہ مسجد منہدم ہوگئی، بعد میں رائے عامہ سے ایک کشادہ جگہ میں نیو ڈالی گئی جب مسجد کی دیوار کچھ اونچی ہوئی تو پھر لوگوں کی اڈّے میں تبدیل پیدا ہوگئی اور تیسری جگہ مسجد کا بنانا طے ہوا اور اس تیسری جگہ بھی نیو کھودی گئی اور کچھ رقم بھی بطور چندہ اکٹھا کی گئی اور دوسری مسجد جس کی

۱- ''وفی شرح المنیة للحلبی: بنیٰ مسجدا فی ارض غصب لاباس بالصلوٰۃ فیہ'' (ردالمحتار ۱/ ۳۵۴، عثمانیہ)۔

دیوار کچھ بلند ہوچکی ہے اس میں قدرے سامان موجود ہے اب محلّہ مذکورہ کے لوگ متفق ہوکر یہ چاہتے ہیں کہ صرف ایک مسجد کا بنانا ازروئے شریعت جائز ہوتا اور ایک مسجد کا سامان دوسری مسجد پر لگانا ہوتا تو بہتر تھا۔ جواب میں سارے مقامی علماء نے انکار کردیا یہ جواب پاکر محلّہ والوں نے ہر ایک مسجد کا بنانا بند کردیا ہے بس ایک مسجد بنانا چاہتے ہیں تو ایسی صورت میں صرف ایک مسجد بنانا جائز ہوسکتا ہے اور نمازی مشکل سے محلّہ مذکورہ میں پانچ چھ ۶ ہوں گے، نیز ایک مسجد کی اذان کافی ہوسکتی ہے یا کہ نہیں، یا ہر ایک میں اذان دینا ضروری ہے، یوں ہی نماز صرف ایک مسجد میں جماعت سے ادا کی جاتی ہے، باقی دو جگہیں ترک کردی جائیں کیا قباحت لازم آئے گی اگر ان تین سے ایک کو جامع مسجد قرار دیا جائے درست ہے یا کہ نہیں؟

الجواب وباللہ التوفیق:

مقامی علماء کا انکار کرنا درست اور صحیح ہے ایک مسجد کا سامان وغیرہ دوسری مسجد میں لگانا جائز نہیں ہے ''وفی ردالمحتار(ج ۳/ ۵۷۴) قول أبی یوسف إنه لا یجوز نقله ونقل ماله إلیٰ مسجد آخر''، اور جو جگہ ایک مرتبہ مسجد کے لئے متعین کردی جائے وہ الی یوم القیامۃ مسجد ہی رہتی ہے لہٰذا بہتر طریقہ یہ ہے کہ پہلی مسجد جو لوگوں کی بے توجہی کی وجہ سے مسمار ہوچکی ہے اسے الاول فالاول کے اصول کے تحت تعمیر کرلی جائے اور باقی دونوں کی پوری حفاظت کی جائے اب اگر کوئی مسجد اس مسجد کے سامان وغیرہ سے مستغنی ہوتو اس سامان وغیرہ کو دوسری مسجد میں لگانا جائز اور درست ہے۔ ''وفی ردالمحتار(۳/ ۵۷۴) قال الزیلعی وعلی هذا حصیر المسجد وحشیشه إذا استغنی عنهما- إلی قوله - ینقل الی مسجد آخر''(۱)، لہٰذا صورت مسئولہ میں ان دونوں نامکمل مسجدوں کا چندہ وغیرہ اول مسجد میں لگانا درست و صحیح ہے۔

اور اگر پہلی مسجد آبادی سے دور یا کنارے واقع ہوتو جو مسجد بھی قریب ہو اس کی تعمیر کی جاوے اور بقیہ کی حفاظت کی جاوے۔

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

۱- ردالمحتار ۳/ ۵۱۳، مطبع عثمانیہ۔

صحن مسجد میں وضو خانہ کا حکم:

مسجد کے آداب کے مطابق مسجد میں کلی کرنا، وضو کرنا درست نہیں ہے، ہمارے یہاں کی مسجد میں صحن ہے جو مسجد میں ہی شمار ہوتا ہے اس صحن میں جنوب کی دیوار میں ایک موری بنا رکھا ہے اور اسی موری کے سہارے صحن میں ایک پتھر مشرق سے مغرب کی لمبائی میں بچھا ہوا ہے، برائے مہربانی اس پتھر کا بچھانا مسجد کے صحن میں درست ہے یا کہ نہیں اور اس پر نماز پڑھنا، وضو کرنا یا وہاں کلی کرنا درست ہے یا کہ نہیں؟

الجواب وبالله التوفيق:

وضو خانہ کا نقشہ منسلکہ دیکھا اسکا حکم شرعی یہ ہے کہ مسجد تعمیر ہوتے وقت میں اس جگہ کو وضو خانہ کی نیت سے تعمیر کیا ہے جب تو بلا تکلف وہاں وضو جائز ہے، اور مسجد کی تعمیر میں وہاں وضو کی نیت نہیں تھی بلکہ مسجد کی تعمیر مکمل ہونے کے بعد مسجد سے خارج کر کے وہاں وضو کرنا شروع کیا گیا تو یہ درست نہیں ہے (۱) موری کا وہاں بنا ہوا ہونا پھر وہاں ایک لمبا پتھر بچھا ہوا ہونا جو خاص وضو کے لئے ہے یہ سب اس بات کا قرینہ ہے کہ بانی مسجد کے ذہن میں وہ جگہ وضو خانہ ہی کے لئے ہے، البتہ اہل مسجد کے متصل ہے اور اس میں کوئی حرج نہیں ہے کیونکہ یہ سب عمل بوقت تعمیر کے ہیں غرض بانی مسجد سے تحقیق واقع کر کے پھر حکم مذکورہ دونوں شقوں میں سے جو ہو منطبق کر لیا جاوے علی الاطلاق کوئی بات یا نکیر نہ کی جاوے۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دار العلوم دیو بند سہارنپور ۱۳/۹/۸۵ ۱۳ھ

الجواب صحیح: سید احمد علی سعید نائب مفتی دار العلوم دیو بند

مسجد کا سامان منتقل کرنا کیسا ہے؟

جھگڑے کے سبب بستی کے مسلمان دو فریق ہو گئے ہیں، ایک فریق کو ہندوؤں نے مشورہ دیا کہ ہم چندہ دیں گے تو دوسری مسجد بناؤ اور پہلی مسجد میں نماز پڑھنا چھوڑ دو، چنانچہ ایسا ہی ہوا دوسری مسجد تیار ہو گئی اور چند مہینے اس میں نماز بھی پڑھی گئی ہے اس کے بعد اختلاف دور ہوا تو پہلی ہی مسجد میں نماز پڑھنے لگے اور دوسری مسجد میں تالا ڈالا کہ دوسری مسجد جو ہندو مسلم کے چندہ سے تیار ہوئی ہے اس کا سامان منتقل کرنا کیسا ہے۔

۱- ''لأن المسجد لايخرج عن المسجد أبدا'' (شامی جدید علی الدرر ۶/ ۵۴۷، مکتبہ زکریا دیو بند)۔

الجواب وبا للہ التوفیق:

جب مسجد بن گئی تو اب وہ مسجد ہی ہے اور رہے گی اس میں تالا لگانا جائز نہیں ہے (۱)، اس کو آباد رکھنا چاہئے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۹/۹/ ۱۳۸۵ھ

الجواب صحیح سید احمد علی سعید

مسجد میں استنجا خانہ بنانا:

قریب تین ہفتہ ہوا ہے کہ سلسلہ روزگار میرا سفر دہلی کا ہوا اور صدر بازار میں مال خریدنے کی غرض سے ٹھہرا، صدر بازار میں ایک مسجد ہے جو بڑی ہے، ہزاروں آدمیوں کی نماز پڑھنے کی جگہ ہے، نمازی زیادہ بیوپاری ہوتے ہیں، قریب قریب دوسو آدمی ہوجایا کرتے ہیں، میرا قیام دوروز تک ہر نماز کی جماعت میں شرکت کا ہوا، اسی مسجد میں لیکن اتنی بڑی مسجد میں استنجا خانہ کے لئے باہر جانا پڑتا ہے سرکاری پاخانہ ہے جو مسجد سے کچھ دور ہے قریب قریب ایک سوقدم پر ہے، وہاں ڈھیلے رکھے ہوئے ہیں ان سے صاف کر لیجئے پھر طہارت آکر غسل خانہ میں کر لیجئے، میں نے کہا کہ اس کو کسی عالم یا مولوی سے معلوم کرو۔ دریافت ہے کہ کیا مسجد میں استنجا خانہ بنانا ضروری نہیں ہے جبکہ جگہ موجود ہے۔

الجواب وبا للہ التوفیق:

مسجد کے قریب مصلیوں کے لئے استنجاء خانہ بنانا شرعاً جائز ہی نہیں بلکہ بہتر ہے، دہلی میں اس کا رواج اس لئے متروک ہے کہ استنجاء خانہ کو پاخانہ بناڈالتے ہیں اور گندہ رکھتے ہیں اور منتظمین مسجد قابو پانے سے عاجز رہتے ہیں، اس لئے منتظم لوگوں نے یہ سلسلہ ہی ختم کردیا۔ خود وہاں کے لوگوں سے ایسا ہی سننے میں آیا ہے ورنہ شرعاً کوئی حرج نہیں ہے۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۴/۹/ ۱۳۸۵ھ

الجواب صحیح سید احمد علی احمد نائب مفتی دارالعلوم دیوبند

۱- ''لأن المسجد لایخرج عن المسجدیة أبدا'' (رد المحتار علی الدر ۶/ ۵۴۷، مکتبہ زکریا دیوبند)، ''اما لو تمت المسجدیة ثم أراد البناء منع'' (رد المحتار علی الدرر ۶/ ۵۴۸، مکتبہ زکریا)۔

جہاں استنجاخانہ بنانے سے مسجد کی بے حرمتی ہو، وہیں استنجاخانہ بنانے کا حکم:

ایک مسجد ہے جو پہلے ایک درجہ تھی اب قریب دو سال کے ہوتا ہے کہ دو درجہ ہوگئی ہے، اس مسجد میں استنجاخانہ پہلے سے موجود تھا، اس کا راستہ پہلے مسجد کے باہر سے عام راستہ پر تھا کہ عرصہ سات سال کا ہوا اس کا راستہ باہر سے بند کر کے مسجد کے اندر سے بنادیا گیا ہے، کیونکہ باہر سے استنجاخانہ کا راستہ رہنے سے مسجد کی بے حرمتی ہوتی تھی اور گناہ ہوتا تھا، اس کی وجہ یہ ہے کہ مسجد کے سامنے ایک اسکول ہے اس کے عام راستہ پر رہنے سے ہر مذہب کے لوگ استنجا کرتے تھے اور مثلاً کھڑے ہو کر پیشاب کرنا، قبلہ رو ہوکر پیشاب کرنا، اب لوگوں کو تکلیف ہوتی ہے، لہٰذا ایک استنجاخانہ اور بنایا گیا جو پہلا استنجاخانہ تھا اس کی چھت پر بنایا گیا ہے، اس کا راستہ باہر سے آسکتا ہے تو ایسا کرنا جائز ہے یا کہ نہیں؟

الجواب وباللہ التوفیق:

وہی پہلے والا استنجاخانہ پھر باہر سے کھولنے میں مسجد کی بے حرمتی حسب سابق لوٹنے کا خطرہ نہ ہو تو کھولا جاوے ورنہ نہیں، بے حرمتی سے حفاظت واجب ہے (۱)۔

البتہ استنجاخانہ کی چھت پر جہاں غسل خانہ بنا ہوا تھا اگر وہاں استنجاخانہ بنانے پر مسجد کی بے حرمتی نہ ہوتی ہو تو وہاں بھی بناسکتے ہیں، اسی طرح مسجد سے باہر قریب تر جگہ میں جہاں بھی استنجاخانہ بنانے سے کام چل جاوے اور مسجد کی بے حرمتی سے محفوظ رہے، بناسکتے ہیں، الغرض استنجاخانہ بنانا محض اپنی اور مصلیوں کی سہولت کے لئے ہے بذات خود واجب نہیں ہے اور نہ مقصود اصلی ہے اور مسجد کی حفاظت اور مسجد کا بے حرمتی سے بچانا واجب اور مقصود اصلی میں ہے، لہٰذا یہ مقدم رکھا جاوے۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۹/۲۵/ ۸۵ ۱۳ھ

الجواب صحیح سید احمد علی سعید نائب مفتی دارالعلوم دیوبند

مسجد کی اینٹ مدرسہ میں یا مدرسہ کی مسجد میں لگی تو کیا حکم ہے؟

ہمارے یہاں پر ایک ہی ساتھ مسجد اور مدرسہ اور حجرہ یہ تینوں عمارتیں شہید کی گئیں اور اس کے بعد تعمیر کی گئی، اب

۱- ''فکان فی جعله مسجدا ضرورة بخلاف جعل المسجد طریقا'' (ردالمحتار علی الدر ۶/ ۵۷۲، مکتبہ زکریا)۔

چونکہ یہ قریب قریب ہیں ان کے شہید کرنے کے وقت کا صحیح اندازہ کسی صاحب کو نہیں ہے کہ مسجد کی اینٹ یا سامان مدرسہ میں لگایا مدرسہ کا مسجد میں لگا اور ایک آدمی کہتا ہے کہ لگا نہیں ہے جو یہ کہتا ہے کہ مدرسہ کی اینٹ لگی ہے لیکن کتنی مقدار میں لگی ہے ہم کو یہ دھیان نہیں ہے، اب اس کا کیا ہونا چاہئے؟

الجواب وبا لله التوفيق:

جولوگ اس تعمیر کے کارکنان تھے وہ لوگ ذمہ دار ہیں آپ لوگوں پر کوئی گناہ نہیں ہے، بے فکر مسجد میں نماز پڑھیں، کارکنان کو چاہئے کہ اندازہ کرکے جتنا سامان ادھر کا ادھر لگا ہو اس کا تاوان وہ خود دیں اگر نہ دیں گے تو خدا کے یہاں پکڑے جائیں گے(۱) آپ لوگوں سے مطلب نہیں ہے۔

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۴/ ۱۰/ ۱۳۸۵ھ

الجواب صحیح محمود عفی عنہ سید احمد علی سعید

مسجد میں دی ہوئی چیزیں واپس لینا:

زید کی بستی جس کی آبادی بہت مختصر ہے تقریباً ۲۵ گھر مسلمان رہتے ہیں، یہاں ایک ہی مسجد ہے، نمازیوں کی تعداد بہت مختصر ہے کبھی نماز کی جماعت ہوتی ہے اور کبھی نہیں ہوتی ہے، ایسی صورت میں بکر اور زید میں نزاع ہوگیا ہے، لہذا بکر نے عید کی نماز مسجد کے تین گز کے فاصلہ پر علیحدہ پڑھی اور بکر نے کچھ مصلی اور دری مسجد میں دیا تھا اور کچھ اینٹ بھی، اب وہ اپنی چیزیں واپس کرنا چاہتا ہے اور دوسری مسجد بنانے کو تیار ہے اس کے لئے عند الشرع کیا حکم ہے؟

الجواب وبا لله التوفيق:

مسجد میں دی ہوئی اینٹ وغیرہ اگر چہ جب تک خرچ نہ ہوچکی ہوں دینے والا واپس لے سکتا ہے، لیکن صورت مسئولہ میں بکر کے یہ افعال کسی طرح صحیح نہیں، اگر واقعات ایسے ہی ہیں جیسا کہ سوال میں مذکور ہے تو بکر کو فوراً باز آنا چاہئے

۱- ''ولایجوز نقله ونقل ماله إلى مسجد آخر سواء كانوا يصلون فيه اولا وهو الفتوى'' (ردالمحتار علی الدر ۶/ ۵۴۸، مکتبہ زکریا، مطلب فیما لو خرب المسجد أو غیرہ)۔

اورہر گز اختلاف نہیں کرنا چاہئے مل جل کر رہنا اور کام کرنا ضروری ہے، ورنہ ساری خرابیوں کا وبال اس پر پڑے گا۔فقط واللہ اعلم بالصواب

جواب صحیح ہے: ایسے چھوٹے گاؤں میں نماز عید درست نہیں ہے۔محمود عفی عنہ۔

دوسری مسجد کی تعمیر کے بعد پرانی مسجد کا حکم:

ایک گاؤں میں پہلے ایک ہی مسجد تھی ،بعد میں نمازی زیادہ ہونے کیوجہ سے گاؤں والوں نے مشورہ کر کے دوسرے محلّہ میں اس مسجد کو منتقل کردیا، واضح رہے کہ کو پرانی مسجد باقی نہیں ہے لیکن جگہ سجدہ باقی ہے اور اس جگہ ہر سال نماز عیدین پڑھی جاتی ہے ایسے گاؤں کے آدمیوں میں کسی بات پر نزاع ہوگیا ہے، نتیجہ یہ ہوا کہ پرانی مسجد کے محلّہ والے اس کو آباد کرنا چاہتے ہیں، دریافت ہیکہ کیا اس پرانی مسجد کی جگہ پر پھر مسجد قائم ہوسکتی ہے یا نہیں؟

الجواب وبالله التوفيق:

مسجد جب ایک مرتبہ مسجد ہوجاتی ہے قیامت تک مسجد ہی رہتی ہے(۱)، اس کو ویران یا ترک نہیں کرنا چاہئے دونوں مسجدوں کو نماز پنجگانہ سے آباد کرنا چاہئے۔تنازع البتہ نہایت بری چیز ہے (۲)، اس کو جہاں تک جلد ہو سکے ختم کر دینا چاہئے،فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی ،مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

الجواب صحیح محمود عفی عنہ

مسجد کے صحن کے کچھ حصہ پر مسجد کی آمدنی کی خاطر دوکان کی تعمیر:

مسجد کے لیے پورب کی طرف لب روڈ کچھ دوکانیں تعمیر کرانے کا پروگرام ہے، دوکانوں کے لیے اندر کی موجودہ

۱- "ولوخرب ماحوله واستغني عنه يبقى مسجدا عند الامام والثاني أبداً إلى قيام الساعة وبه يفتى"(الدرالمختار ۳/ ۳۷۱)۔

۲- "والفتنة اشد من القتل"(سورۂ بقرہ۱۹۱)۔

زمین حساب سے کچھ کم پڑ رہی ہے، مسجد کا موجودہ فرش جو بعد میں بڑھایا گیا ہے، اگر اس فرش کی تین فٹ زمین دوکانوں میں شامل کرلی جائے تو دوکانیں اچھی اور زیادہ کارآمد ہوں گی، مسجد کے مفاد کی خاطر کیا اس طرح کرنا جائز ہے؟

الجواب وباللہ التوفیق:

فرش کا جو حصہ اگر چہ ضرورتاً مسجد میں داخل کرلیا گیا اور مسجد قرار دیدیا گیا، تو وہ مسجد ہی کے حکم میں ہوگیا، اب اس میں سے ایک آدھ فٹ بھی دوکانوں کے لیے نہ لیا جائے، چاہے یہ لینا مسجد کے مفاد میں ہی کیوں نہ ہو، جائز نہ ہوگا، ہکذا فی الردوفی الدر وغیرہ (۱)، دوکانیں کشادہ نہ ہونے سے یا کہ آمدنی نہ ہونے سے یا بالکل دوکانوں کی تعمیر نہ کرنے میں بھی کوئی گناہ نہ ہوگا، اور اجزاء مسجد لے لینے میں سخت گناہ ہوگا۔

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

مسجد کے چندہ سے دوکان و استنجا خانہ کی تعمیر:

مسجد کے چندہ سے مسجد کے لیے دوکان، پیشاب خانہ اور غسل خانہ وغیرہ ضروریات کی تعمیر درست ہے یا نہیں؟ جواب کا شدید انتظار ہے۔

الطاف الرحمٰن (اعظم گڈھ)

الجواب وباللہ التوفیق:

مسجد کے چندہ سے ان مذکورہ تمام ضروریات کی تعمیر درست ہے۔

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۸/۲/۱۴۰۱ھ

ایک سنوی موقوفہ زمین کے متعلق استفتاء:

ملک آسام میں جو لوگ بود وباش کرتے ہیں، وہاں تین قسم کی زمینیں ہیں:

۱-ایک سنوی یا یکسنیہ، ۲-میعادی، ۳-توضیح۔ تینوں کی تفصیل منسلکہ مسودات میں دی گئی ہے۔ مجوث عنہا پہلی قسم

۱- ''کما جاز جعل الإمام الطریق مسجداً لا عکسہ''(الدر المختار علی ھامش الشامی ۳/۳۸۳ کتاب الوقف (مرتب))۔

کی زمین ہے۔

چونکہ مسجد، قبرستان، عیدگاہ، درسگاہ ایسی زمینوں میں ہیں اور کروڑوں بیگھے زمین ایسے اداروں کے لیے وقف ہیں، سرکار کی طرف سے وقف نامہ کی رجسٹری بھی ہوتی ہے، سلفاً خلفاً وقف قائم پر عمل استمراری بھی ہے، اس کے خلاف آج تک کوئی فتویٰ نہیں ہے کہ ایسی زمینوں میں وقف صحیح نہیں۔

ایک شخص نے ایک زمین مسجد کی خاطر وقف کی تھی، پھر کسی وجہ سے اس کی وفات کے بعد اس کے وارث نے یہ زمین واپس لینی چاہی، حالانکہ حکومت کی طرف سے یہ زمین ''امباڑی لا جیت تیار پورب مسجد'' کے لیے وقف نامہ کی رجسٹریشن حاصل کرچکی تھی، اس کی آمدنی پندرہ سال تک اس مسجد میں لگ چکی تھی، اب مسئلہ کھڑا ہوا کہ یہ زمین واپس لے سکتا ہے یا وقف ثابت ہوتو واپس نہیں لے سکتا، ورنہ لے سکتا ہے۔

بعض فقہاء کرام نے فتویٰ صادر فرمایا کہ وقف ثابت ہونے کے لیے ملک بات واقف کی ہونا ضروری ہے اور ایکسنوی زمین میں ملک بات حاصل نہیں۔

دوسرے گروہ نے وقف ثابت ہونے کا حکم دیدیا اور کہا کہ ملک بات ایک سنوی زمین پر بھی حاصل ہے اور استدلال میں شامی کی یہ عبارت پیش کرتے ہیں: "إن الواقف لأرض من الأراضي لايخلو إما يكون مالكاً لها من الأصل بأن كان من أهلها حين يمن الإما م على أهلها، فإن كان الأول فلا في صحة وقفه لوجود ملكه الخ وإن وصلت إلى يده بإقطا ع السلطان إياها له، أو بشراء من بيت المال، فإن كان الأول فإن كانت مواتا أو ملكا للسلطان صح وقفها الخ" (۱)۔

ایک سنوی زمین ان دونوں قسم کے اندر داخل ہے بنابریں وقف صحیح ہے، انتہی

امید ہے کہ تمام دستاویزات پر بنظر غائر توجہ مبذول فرما کر ایک محقق اور مدلل جواب عنایت فرمائیں گے۔

عبدالرحمٰن (قاضی شریعت ہوجائی ضلع ججیت، آسام)

الجواب وبالله التوفيق:

حسب تحریر سوال جب ایک سنوی زمین میں کروڑوں بیگھے زمین دینی اداروں کے لیے وقف ہیں تو ظاہر ہے کہ

۱- شامی ۴۸۲/۳ کتاب الوقف۔

ان اداروں کے اعتبار سے سیکڑوں مسجدیں بھی بنی ہوں گی اور سب کا وقف ہونا شرعاً مسلم ہے، اسی طرح بیسیوں سے زائد قبرستان بھی موقوفہ ہوں گے اور ان کا بھی وقف ہونا ظاہر ہے اور شروع سے یہ معمول چلا آرہا ہے اور حکومت نے کبھی کوئی ایکشن نہیں لیا تو حکومت کی جانب سے ان امور کا یہ اذن حالی ہوا جو شروع ہی سے وجود تملیک کا قرینہ بنا۔

پھر جب ان اوقاف کا اور ایسی زمینوں کے بیع وشراء کا رجسٹریشن بھی برابر ہوتا چلا آرہا ہے، حالانکہ رجسٹریشن کا محکمہ حکومت کا نہایت اہم محکمہ ہے، کوئی رجسٹرار حکومت کی بغیر اذن واجازت کے رجسٹریشن کرنے کی جرأت نہیں کرسکتا تو یہ چیز بھی شروع ہی سے وجود تملیک بلکہ ظہور تملیک پر دلیل بنی، اور پھر جب اکیس سال گذر جانے پر بھی حکومت ان مذکورہ بالا امور پر اعتراض کرنے کے بجائے کچھ معمولی رقم لے کر ہمیشہ کے لئے ملکیت نامہ لکھ دیتی ہے تو یہ چیز قانوناً بھی ظہور ملک کی دلیل بنی۔

اور جب یہ معمول شروع ہی سے چلا آرہا ہے تو اس معمول کا جاری وساری اور دائم رہنا استصحاب حال بھی ہوا، اور ایسے امور میں "بقاء ما كان علی ما كان" (۱) کے ضابطہ شرعیہ کے مطابق یہ استصحاب حال بھی دلیل بنتا ہے۔

اس لیے بلاشبہ یہ تمام اوقاف شرعاً صحیح ونافذ قرار پائیں گے، اور اس کے خلاف فتویٰ دینا یا ان اوقاف کو وقف غلط یا وقف غیر صحیح کہنا کسی طرح درست وصحیح نہ ہوگا، اور انہی سب قرائن ووجوہ سے کبھی کسی عالم وفقیہ نے ان اوقاف کو ناجائز یا غیر شرعی وغیرہ نہیں فرمایا۔

اور یہ کہنا کہ صحت وقف کے لئے موقوفہ پر واقف کی ملکیت ثابت ہونا شرط یا لازم ہے صحیح نہیں جیسا کہ ردالمحتار کی ص ۳۹۲ والی عبارت جس کو فریق ثانی نے اپنے استدلال میں پیش کیا ہے، اس کے بعد والی عبارت ص ۳۹۳ سے بھی یہی مستفہم ہوتا ہے، نیز درمختار کتاب الوقف کے شروع میں ہی اس متن (ویزول ملکہ) کے تحت شراح نے جو لکھا ہے اس سے بھی یہی مستفہم ہوتا ہے، اور "ولا يقسم إلا عندهما فيقسم المشاع وبه أفتیٰ قارى الهداية وغيره الخ" (۲) اس عبارت سے تو یہ بات خوب واضح ہوجاتی ہے کہ شئے موقوفہ پر واقف کی ملکیت تامہ بوقت وقف ملکیت تامہ شرط یا لازم ہی نہیں، کیونکہ شئے مشاع ومشترک میں اس کے ہر جزء پر شریک کی ملک بالیقین ہوتی ہے، اس کے باوجود جب کوئی شریک اس مشترک کا ایک متعین حصہ (مثلاً نصف یا جو حصہ مراد ہو) مشاعاً وقف کردیتا ہے تو مفتیٰ بہ قول کے مطابق یہ وقف درست ہو

۱- الاشباہ والنظائر مع شرح حموی، ص ۷۷، الفن الاول۔

۲- درمختار علی هامش الشامی ۳۶۸/۳-۳۔

جاتا ہے، حالانکہ اس پورے موقوفہ حصہ پر بوقتِ وقف واقف کی ملکیت باتہیں ہوتی، بلکہ اس موقوفہ کے تقسیم کرالینے اور قبضہ کرالینے کے بعد ملک باتہ اس پر ثابت وقائم ہوتی ہے، اور بوقتِ وقف تمام اجزاءموقوفہ پر ملکیت یا تو فی الجملہ تھی یا محض مآلؤں کے اعتبار سے تھی پھر بھی اس وقف کو مفتیٰ بہ قول میں صحیح قرار دیا گیا ہے۔

اور صورتِ مبحوث عنہا میں جب اس شخص نے اپنی زمین برائے مسجد وقف کی تھی اور وقف کا رجسٹریشن بھی کرادیا تھا اور اس زمین موقوفہ پر مسجد دس پندرہ سال سے برابر قابض ودخیل چلی آرہی ہے اور ہمیشہ اس کی آمدنی اپنے تصرف میں لارہی ہے تو یہ کہنا کہ اس پر واقف کی ملک بات نہ تھی، اس لیے یہ وقف صحیح نہیں ہے، یہ غلط ہے، بلاشبہ یہ وقف صحیح ہے، اوراب اتنے دنوں کے بعد اس وقف کو صحیح نہ ماننا اس ضابطہ شرعیہ " **تاخیر البیان عن وقت الحاجة لایجوز** " (۱) کے بھی خلاف ہونے کی وجہ سے غیر معتبر وغیرہ مفید ہے۔

پھر اس اعتراض کا اگر وقت تھا تو وقف کرنے کے وقت تھا، اب اتنے دنوں کے بعد اور واقف کے مرجانے کے بعد اس بات کو اٹھانے والوں کو متہم کرتا ہے، اور متہم کا قول شرعاً حجت نہیں بنتا (۲)۔

اور اگر بوقت وقف کسی وجہ سے ملک بات نہ بھی رہی ہو جب بھی وقف کے صحیح ہونے میں کوئی شبہ نہیں رہا، جیسا کہ ابھی وقف مشاع کے جواز کی تقریر سے ثابت ہو چکا۔

لہٰذا اب وقف کے صحیح ہونے میں کسی کو کوئی تردد نہ ہونا چاہیے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۵/ ۴/ ۱۴۰۹ھ

مسجد کی سابق عمارت گرا کر دوسری جدید تعمیر کا حکم:

التمس منک أن تجیب جوابا واضحا بشریعة الاسلامیه لسوال الذی تحت هذه الرسالة، فان بلدی ادرا مفتنم بضلعة تنجاور من ریاسة تاملناد، ففی بلدنا مسجد الجامع القدیم بنی المسجد الجامع المذکور قبل ثلاث مائة وخمسون سنة وکل جدارها ومبنیها بحجر السوداء یصلون الجمعة المسلمون فیه بغیر راحة ولا واسعة وقد یمکن ان یصلون فیه مائة وخمسون نفرا ومجموع نفر من

۱- قواعد الفقہ ۶۷، ما نقلا عن شرح السیر الکبیر ۵۷/ ۳۔

۲- المتهم لیس بحجة نا قلاعن شرح السیر الکبیر ۱۹۸، ۲۰۹/۱۔

بلدنا کانوا مسلمین قریبا خمسة عشراً آلافاعدداً ولذ عزمنا آن نبنی مسجداً جدیدا فی هذا المکان الذی کان مسجداً قدیماً مع الراحة الواسعة

فحینئذ ینکر بعض العلماء من بلدنا ویقولون من سبب انکارهم هدم مسجد القدیم وبنی مسجد جدید اختلاف الشریعة وحرامها، وقد وقع الفساد عندنا بآقوالهم، فالتمس عندک العظام ان تفتی فتوی واضحا لبنی المسجد الجدید۔

ای: هل بنی مسجدا جدیدا بعداهدام المسجدالقدیم للراحة والواسعة من المسلمین المصلین؟ام لا؟

فاکتب فتویک بسرعة، إنی آتوجه إلیها والصلوة والسلام علی محمد واله وصحبه آجمیعین والحمدلله رب العالمین۔

الجواب وبالله التوفیق:

حامداً ومصلیا ومسلماً فاعلموا آن تآسیس هذ االمسجد ولو کان من آزید ثلثه مائة وخمسین سنة، ولکن کان تعمیره مستحکماً من الأحجار السودا، ولم یتزلزل إلی الآن بل بقی قابلا؛ لأن یصلی فیه من غیر خوف الهدم والخطر علیه، فلا یجوز إهدامه بوجوه سنذکرهاانشاء الله بل إن ضاق علی المصلین فیلزم علیهم آن یبنوا مسجداً آخر فی مقام آخر بحیث یرفع الضیق والاحتیاج، وإن لم تتیسر الأرض الواسعة حسب الضرورة فلهم آن یبنوا مسجداً علی منازل منزلا علی منزل حسب الضرورة وحسب استطاعتهم۔

وآما حکم عدم الاهدام فبوجوه: الأول آن المسجد وقف ومراعات غرض الواقفین واجبة ففی الإهدام من غیر داعیة الاهدام ارتکاب خلاف الواجب فیخشی آن یکون مواخذاً عند الله من هذاالارتکاب۔

وآما ثانیا فإن المساجد من شعائر الله وقال تعالیٰ: ”ومن یعظم شعائر الله فإنها من تقوی القلوب“، فیه إشارة إلی تحفیظ شعائرها فلایجوز استنماسها من غیر آن یکون علی شرف الهدم یبقی

استعمالها يبقى استعمالها من خوف الهدم والخطر عليه۔

وأما ثالثا۔ إن المساجد انموذجة من السلف وتذكار للخلف، فيكون للعبر والتحريض لا للاستئناس۔

وأما رابعاً۔ إنه في ملك غير اسلامي فبإهدامه من غير وجه شرعي داع إلى خوف الهدم والخطر ينفتح باب الإهدام عن أعداء الدين من غير وجه شرعي، هذا ماعندى من الله حكم الشرع الشريف، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۵/ ۱۱/ ۱۴۱۰ھ

نابینا کو مسجد کا سفیر بنانا:

موضع تیتر واڑہ کی جامع مسجد اس وقت نہایت بوسیدہ خطرناک صورت میں ہے، اس کی جدید تعمیر کے لئے چندہ کی ضرورت ہے، اس میں ایک سفیر کی ضرورت ہے وہ ایک نابینا آدمی جنکا نام ملا شجاعت ہے سفیر رکھ دیا ہے اور ان کے ہمراہ محمد علی پسر نصیر الدین برائے خدمت بھیجا جاتا ہے اور ان نابینا کو سفیر مقرر کیا جاتا ہے، ان کی سفارت میں کوئی شرعی خرابی تو نہیں ہے تحریر فرمائیں۔

الجواب وبالله التوفيق:

صورت مسئولہ میں اگر مفاد مسجد ہے تو شرعی کوئی نقص نہیں ہے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

مسجد میں تدفین درست نہیں ہے:

متولی مسجد صاحب اپنی قبر مسجد ہی کے اندر ایک گوشہ میں بنوانا چاہتے ہیں، شرعی اعتبار سے کیا حکم ہے؟ یہ مسجد ۶۵/ سال سے آباد ہے، پنجوقتہ نماز باجماعت ہوتی ہے۔

مظہر پاشا حیدرآباد دکن

الجواب وباللہ التوفیق:

مسجد جس جگہ قرار پا جاتی ہے اس کے بعد اس میں کسی قسم کا تصرف شرعاً درست نہیں ہوتا ہے اور جب نمازِ جنازہ کا حکم بھی یہ ہے کہ وہ خارجِ مسجد ادا کی جاتی ہے تو پھر مسجد میں تدفین شرعاً کس طرح درست ہو سکتی ہے؟(۱)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲/۷/۱۴۰۱ھ

۱- "فإذا تم ولزم لایملک ولایملک ولایعار ولا یرهن، قال الشامي: أي لایکون مملوکاً لصاحبه ولا یملک أي لایقبل التملیک لغیره بالبیع ونحوه لاستحالة تملیک الخارج عن ملکه" (شامی ۳/۳۷۶ کتاب الوقف)۔

باب ما یتعلق بأحکام المدارس

زکوٰۃ وصدقۃ الفطر کی رقم بغیر حیلۂ تملیک کے مدرسین کی تنخواہ یا تعمیر وغیرہ میں صرف کرنا جائز نہیں:

ان مدارس کے بارے میں جن میں بیرونی طلبہ زیر تعلیم ہیں اور قیام وطعام بذمہ مدرسہ ہے، معطی کی رقم زکوٰۃ دیتے وقت یہ نیت ہوتی ہے کہ جو اپنے ذمہ زکوٰۃ ہے وہ ادا ہوجائے، یہ تو ہوتا نہیں کہ اس طرح کہتے ہیں کہ فلاں مقام پر خرچ کرو بلکہ سفیر یا مدرسہ کے مہتمم کے کہنے پر مدرسہ زکوٰۃ لیتا ہے تو زکوٰۃ دیتے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ مصارفِ زکوٰۃ کے مدرسہ میں کیا کیا مقام ہیں۔ تنخواہ معلمین، طلبہ کے قیام وطعام ولباس، مدرسہ کی توسیع، مدرسہ کے دیگر اخراجات وغیرہ مہتمم مدرسہ رقم زکوٰۃ کی حیلہ تملیک نہ کرتا ہو تو اس زکوٰۃ کی رقم کو کہاں کہاں خرچ کیا جائے؟

احمد علی صدیقی (کھرگون، ایم پی)

الجواب وباللہ التوفیق:

زکوٰۃ، صدقۂ فطر اور دوسری واجب التملیک رقوم کو صرف نادار وغیر مستطیع طلبہ کے کھانے اور کپڑے پر خرچ کرنا لازم ہے، اگر تنخواہ مدرسین یا تعمیر وغیرہ یا کسی کام کی اجرت میں خرچ کرتا ہو، یا کسی بھی ایسے کام میں خرچ کرنا جس میں تملیکِ مستحق نہیں ہوتی، بغیر تملیک مستحق کے خرچ کرنا جائز نہیں ہے۔

اس لیے احتیاطی پہلو یہی ہے کہ ان رقوم واجب التملیک کے وصول ہونے کے ساتھ ہی مستحقین زکوٰۃ سے تملیک کرا کے پھر خرچ کے لیے استعمال کریں (۱)، اور تملیک کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ جتنے روپے کی تملیک کرنا ہو اتنے روپے

۱- "والحیلۃ أن یتصدق علی الفقیر ثم یامرہ بفعل ھذہ الأشیاء" (الدرالمختار علی ھامش ردالمحتار، ج ۲، ۲۳، کتاب الزکوٰۃ) (مرتب)۔

کے بارے میں کسی غریب مستحق زکوٰۃ سے کہیں کہ تم اتنے روپے کہیں سے قرض لا کر مدرسہ میں بطور چندہ وعطیہ دے دو، تمہارا قرض ادا کردیا جائے گا، پھر جب وہ غریب اتنا روپے کہیں سے قرض لا کر بطور چندہ مدرسہ میں دے دے تو اس کے بعد زکوۃ وغیرہ واجب التملیک والی رقم اس غریب کو دیدیں اور غریب اس رقم سے اپنا قرض ادا کردے۔

اس کو قرض دینے میں ایسا بھی کرسکتے ہیں کہ خود اپنے پاس سے اس کو قرض دے دیں پھر جب وہ قرض لی ہوئی رقم چندہ میں دے تو اس کے بعد اپنی زکوۃ والی رقم اس کو دیدیں پھر جب وہ اس رقم پر مالک ہوجائے تو اس سے اپنا قرض وصول کرلیں، یہی طریقہ کسی دوسرے مالدار سے دلا کر اختیار کرسکتے ہیں۔فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۵/۱/۱۴۰۱ھ

فراہمی مالیات کے لئے اجرت کی ایک جدید شکل اور اس کا حکم شرعی:

میں ایک مدرسہ میں پڑھاتا ہوں جس میں مستطیع وغیر مستطیع ہر قسم کے طلبہ پڑھتے ہیں اور رہتے ہیں، میں وہاں سے چندہ کرنے کے لیے بمبئی، گجرات کے علاقہ میں جاتا ہوں، اس سال مدرسہ میں سفارتی اجرت اور انعام کی جدید شکل طے ہوئی ہے جس کو عرض کرتا ہوں۔

۱-تنخواہ یومیہ پچاس روپے ہوگی جس میں سفرخرچ بذمہ سفیر ہوگا۔

۲-پورے حلقہ کا ایک کوٹہ مقرر ہوا اس طرح پر کہ پچھلے سال کی آمدنی کا ۲/۳ حصہ اس سال کے لیے کوٹا ہے، اسی طرح ہر سال کی آمدنی کا ۲/۳ حصہ اپنے آئندہ کے لیے کوٹا ہوگا، مثلاً میرے حلقہ کی پچھلے سال کی آمدنی بارہ ہزار تھی اب آٹھ ہزار کوٹا ہوا۔

بہر کیف جو کوٹا متعین ہے جو کہ اوپر مذکور ہے کہ اتنی رقم وصول ہونے پر کوئی انعام نہیں ہے، صرف تنخواہ ہے اور اگر چندہ کی رقم کوٹا سے متجاوز ہوگئی تو تنخواہ تو جاری ہی رہے گی جب تک وصولی جاری رہے گی مزید مندرجہ ذیل شرح کے ساتھ متصل کو انعام بھی ملے گا۔کوٹا سے متجاوز رقم سے ایک سے لے کر دو ہزار تک پندرہ فیصد، دو ہزار ایک سے لے کر چار ہزار تک بیس فیصد، چار ہزار ایک سے لے کر چھ ہزار تک پچیس فیصد، چھ ہزار ایک سے لے کر دس ہزار تک تیس فیصد اور دس ہزار ایک سے لے کر اوپر جتنا بھی ہو ساڑھے بتیس فیصد۔ اس میں ایک چیز یہ ہے کہ مندرجہ ذیل شرحوں کے ساتھ انعام جس منزل پر بھی ہوگا وہ کوٹوں کے بعد والی رقم کو محیط ہوگا مثلاً کوٹا کے بعد چھ ہزار ایک روپیہ ہم نے وصول کرلیا تو اب ہمیں انعام پورے

چھ ہزار میں ۳۰ رفیصد کے حساب سے ملے گا اسی طرح دیگر شرحیں بھی۔

۳-وصولی کے ایام میں ہماری پرانی تنخواہ جو اور ایام میں ہوتی ہے جاری رہے گی، یہ تنخواہ پچاس روپیہ یومیہ وصولی والی الگ ہے، تو مندرجہ بالا شکل میں یہ تنخواہ اور اس طرح انعام مقرر شدہ لینا جائز ہے یا نہیں؟ اور ناظم صاحب کی اجازت کے بغیر ہم سفراء اگر مفادِ مدرسہ کو سامنے رکھ کر مزید کسی حلقہ میں کام کریں جو نیا ہے تو جائز ہے کہ نہیں جبکہ نیا حلقہ بنانے میں وقت زیادہ لگے گا تو تنخواہ زیادہ ہوگی؟ مہربانی فرما کر شرعی حکم سے نوازیں۔

محمد غفران (اعظم گڑھ)

الجواب وباللہ التوفیق:

مدارس میں کمیشن پر سفراء سے جو معاملہ رائج ہے وہ جائز نہیں ہوتا بعض صورتوں میں یہ اجارہ باطل ہوتا ہے اور بعض صورتوں میں فاسد ہوتا ہے۔ اس کا جائز اور سفیر و مدرسہ دونوں کے لیے سودمند یہ طریقہ ہوتا ہے کہ اس کام کے لیے سفیر کی ایک تنخواہ مقرر کردی جائے خواہ خشک یا خوراکی کے ساتھ اور جس علاقہ میں بھیجنا ہو اس علاقہ کے سابق وصولی کی مقدار کے مطابق یہ کہہ دیا جائے کہ اگر آپ کی وصولی اس مقدار سے نہیں بڑھے گی تو آپ کو انعام نہیں ملے گا، ہاں اگر مقررہ مقدار سے زیادہ وصولی ہو تو انعام اس طرح ملے گا کہ آپ اپنی کل وصولی مدرسہ پر بھیجتے جائیں اور مدرسہ اس کو اپنے خزانۂ مدرسہ میں رکھتا جائے گا، پھر جب آپ کام ختم کر کے آجائیں گے اور حساب وصولی کریں گے تو اس وقت مقررہ مقدار سے زائد میں اتنا فیصد (جو مناسب و موزوں ہو) آپ کو انعام دیا جائے گا۔ اس طریقہ کار سے سفراء کی ہمت بھی بڑھتی رہے گی اور مدرسہ کو بھی فائدہ پہنچے گا اور کوئی شرعی قباحت بھی نہ ہوگی۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۷/۷/۱۴۰۱ھ

مدرسہ کے نام موقوفہ زمین پر عیدگاہ، مسجد اور مطبخ بنانا:

ہمارے جوار میں ایک صدی پہلے ایک مدرسہ کے لیے چند اشخاص نے زمین وقف کی اور ان کی اولین نیت صرف مدرسہ کی تھی، پھر اس موقوفہ زمین میں مدرسہ بنا پھر مطبخ اور دار الطلبہ بنا پھر اس زمین میں ایک مسجد بھی بنی اور اس زمین میں درخت بھی لگوائے گئے اور پھر عیدگاہ بھی بنی، اس وقف میں کوئی تحریر شرائطِ وقف کے لیے نہیں تھی، صرف زبانی وقف ہوا اور

جوں جوں مدرسہ ترقی کرتا گیا کمرے بنتے گئے اور اس کے بعد دیگر مدارس بنے اور وقف کنندگان کی اولین نیت صرف مدرسہ کی تھی، عیدگاہ کا احاطہ بھی بنا، لیکن وقف کنندگان کے تصور میں مدرسہ کی متعلقہ عمارات، مطبخ، دارالطلبہ، مسجد اور عیدگاہ بھی رہی جیسا کہ ماقبل کے مدرسہ میں ہوا تو اب مسجد اور عیدگاہ کی تعمیر جائز ہوئی یا نہیں اور عیدگاہ کا احاطہ طلبہ کی تعلیم کے حسب موسم استعمال ہوتا ہے، اس طرح ایک مدرسہ کے لیے ماضی قریب میں زمین وقف کی گئی اور اس میں عیدگاہ کا احاطہ بھی بنا اور وقف کنندگان کے کچھ افراد نے عیدگاہ میں اینٹ، گارے وغیرہ میں امداد دی، حالانکہ عیدگاہ کی چہاردیواری ایک ہی شخص نے اپنے خرچ سے بنائی تو اس میں عید کی نماز پڑھنا جائز ہے یا نہیں:

نوٹ (۱) زمانہ ماضی میں عوام کے ذہنوں میں اگرچہ صرف مدرسہ ہوتا تھا، لیکن مدرسہ کے متعلقات یعنی مطبخ، دارالطلبہ، مسجد، عیدگاہ کی عمارات ان کے تصور میں ہوتی تھیں، اس طرح آج کل بھی مدرسہ کی تحریک سے متاثر ہوتے ہیں اور ان کی اولین نیت مدرسہ ہوتی ہے اور ان کے آبا واجداد کی طرح ان کے تصورات بھی ہوتے ہیں، زمانہ گذشتہ میں مدرسہ کے نام وکام سے جو زبانی وقف ہوتا تھا کچھ دنوں کے بعد جب کہ وقف کنندگان میں کچھ لوگ فوت ہوجاتے تھے، باقی وقف کنندگان کی تحریک سے موقوفہ زمین میں مسجد عیدگاہ بنتی تھی، یعنی مسجد، عیدگاہ اور خالی زمین میں زراعت برائے مدرسہ اور درخت برائے مدرسہ کو لوازمات مدرسہ تصور کرتے تھے۔

نوٹ (۲) اگر تحریری وقف نامہ لکھا جائے اور صرف مدرسہ کا ذکر ہو پھر اس موقوفہ زمین میں مسجد یا عیدگاہ بنائی جائے تو کیا جائز ہے؟

ماسٹر راغب علی (مقام و پوسٹ دودھارا ضلع بستی، یوپی)

الجواب وباللہ التوفیق:

مدرسہ پر وقف کرنے کا مفہوم یہی ہے کہ مدرسہ اور مدرسہ کی ضروریات پر وقف ہے اور مدرسہ کی ضروریات جس طرح درسگاہیں ہوتی ہیں، اسی طرح مطبخ، دارالاقامہ اور مسجد مدرسہ میں شمار ہوکر ان سب چیزوں کا بنانا اور تعمیر بھی واقف کے منشا کے خلاف نہ ہوگا، اسی طرح مدرسہ کی آمدنی بڑھانے کے لیے فاضل زمین پر زراعت یا باغ لگانے سے ہونے والے نفع کا طلبہ اور مدرسہ پر خرچ کرنا یا اس فاضل زمین پر نماز عیدین وغیرہ ادا کرلینا سب درست رہے گا، ان میں سے کوئی چیز واقف کے منشا کے خلاف ہوکر ناجائز نہ ہوگی۔

البتہ نمازعید اگر باغ یا مغازہ کی شکل میں ہوتے ہوئے ادا کریں تو ٹھیک ہے، باقی اس پر عیدگاہ کی عمارت تعمیر کرلینا صحیح نہ ہوگا، اس لیے کہ عیدگاہ کی عمارت بھی وقف ہوتی ہے، لیکن یہ عمارت ضروریات مدرسہ میں سے نہیں ہے اور جو چیز موقوفہ ہوتی ہے اس کو پھر وقف کرنا درست نہیں ہوتا ہے۔

ہاں اگر واقف نے شروع وقف میں ہی اس کی اجازت دے دی ہو، یا وقف نامہ کی عبارت سے اجازت نکلتی ہو تو دوسری بات ہوگی اور یہ حکم ہر دوصورت کا ہے کہ یہ عیدگاہ کی عمارت موقوفہ مدرسہ پر بنانا ناجائز نہیں ہوگا، خواہ کوئی اپنے ذاتی روپے سے بنائے یا مدرسہ کے پیسے سے، البتہ ایسی عیدگاہ میں جو نمازیں ادا کی جائیں گی وہ ادا ہو جائیں گی۔

نوٹ: واقف نے زبانی یا تحریری کوئی شرط لگادی ہو تو "**شرط الواقف کنص الشارع فی المفہوم والدلالۃ فی وجوب العمل بہ**"(۱) کے مطابق اس کی اتباع اور رعایت ضروری ہوتی ہے اور اگر واقف نے کوئی شرط نہیں لگائی ہے، نہ زبانی نہ تحریری لیکن اس کے زمانہ میں جو عمل ہوا ہے اس کے منشا اور رضا کا استنباط جہاں تک ہو سکے وہیں تک وسعت دی جائے گی، یا پھر اس کے منشأ وقف سے زیادہ مستحقین منشا وقف ہوا ورعند الشرع احسن منہ ہو تو اس کا اعتبار کیا جائے گا ورنہ نہیں۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۸/۲/۱۴۰۲ھ

سفر کے لئے مہتمم کی اجازت کے بغیر وصول شدہ رقم میں تصرف کرنے کا حکم؟

مدرسہ اسلامیہ رحمانیہ ناڈہ وبا دلی والوں نے اپنے مدرسہ کے ایک مدرس کو پاکستان چندہ وصولیابی کے لیے بھیجا، ان کے پاسپورٹ بنوانے، ویزہ حاصل کرنے اور اس سلسلے میں ہونے والے دیگر مصارف سفرخرچ کرایہ وغیرہ مدرسہ نے برداشت کیے، مدرسے سے روانگی تا واپسی مکمل تنخواہ مدرسہ نے دی اور ان کو یہ تاکید کی گئی کہ جو بھی رقم حاصل ہو اس کا آپ سامان بالکل نہ خریدیں بلکہ جملہ رقم پاکستان میں مقیم زید، عمرو، بکر وغیرہ کے حوالے کرتے آئیں وہ اپنے طور پر یہاں روانہ کردیں گے۔ لیکن مدرس موصوف نے اس کی خلاف ورزی کرکے اس رقم کا سامان خریدا اور کسٹم آفس پر اس کو روک لیا گیا، تقریباً ایک تہائی سامان ساتھ میں لے آئے بقیہ دوتہائی پاکستان کسٹم پر روک لیا گیا اور پاکستان میں ان کے مقیم متعلقین کو واپس کر دیا گیا جو رفتہ رفتہ آنے والے لوگوں کے ذریعہ بھیجا جا رہا ہے، مدرس موصوف اس سامان کو تاجرانہ طریقے پر اچھے

۱- الدر المختار علی ہامش الشامی، ۳/۴۱۶ کتاب الوقف (مرتب)۔

خاصے نفع سے اس کو فروخت کررہے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس طرح رقم جمع کرکے مدرسہ کی وصول شدہ رقم جمع کردوں گا۔ اس مدرس موصوف کے متعلق دریافت طلب امور یہ ہیں کہ:

۱-جب موصوف کا پاسپورٹ، ویزہ، تنخواہ، سفرخرچ ودیگر جملہ مصارف مدرسہ نے دے کر ان کو چندہ کی وصولیابی کے لیے بھیجا، کسٹم کے خطرات کو سامنے رکھ کر سامان کی خریداری سے منع کیا گیا، تو ان کو سامان خریدنا اور اس کی تجارت کرنا جائز ہوگا یا نہیں؟

۲-اس سامان سے حاصل ہونے والے نفع کے مستحق مدرس موصوف ہوں گے یا مدرسہ، یعنی مدرسہ کی رقم مثلاً گیارہ ہزار ہی مدرسہ میں جمع کرنی ہوگی جو کہ رسیدات کے مطابق ہے، یا اس پیسے سے جو رقم مع منافع مثلاً پندرہ ہزار حاصل ہوئی تھی وہ جملہ رقوم مدرسہ میں جمع کرنی ہوگی۔

۳-مدرس موصوف چندہ کے لیے گیے تھے انہوں نے اس سے تجارت نامی اس رقم کا سامان خرید لیا تو اس صورت میں جن لوگوں نے ان کو زکوۃ کی رقم دی تھی ان کی زکوۃ ادا ہوگئی یا نہیں؟ ان کو دوبارہ دینی ہوگی یا نہیں؟

فرمائشی سامان لانے پر نفع لینا:

۴-مدرس موصوف کی پاکستان روانگی کے وقت بعض حضرات نے فرمائشی طور پر انہیں کچھ سامان لانے کے لیے کہا وہ سامان مثلاً سو روپے کا آیا وہ اس سامان کو ان لوگوں کو دو سو روپے کا دے رہے ہیں تو سوال یہ ہے کہ اس سامان پر ان کو نفع لینا جائز ہے یا نہیں، کیونکہ یہ تجارت نہیں ہے بلکہ فرمائش ہے، جیسے کوئی بازار جائے اور اس سے کہہ دیں کہ فلاں سامان لے آویں تو لانے والے کو اس طرح منگوائے ہوئے سامان پر نفع لینا جائز ہے یا نہیں؟

حافظ محمود علی (ٹانڈہ بادلی ضلع رام پور یوپی)

الجواب وباللہ التوفیق:

۱، ۲-اگر تحریر کردہ واقعات اسی طرح ہیں جس طرح سوال میں تحریر ہیں تو مدرس مذکور گنہگار ہوا اور وصول شدہ مال ونفع سب کا مستحق مدرسہ ہے یہ مدرس نہیں ہے، بلکہ وصول شدہ رقم میں اگر کچھ نقصان ہوجائے گا تو اس کا ضمان بھی مدرس مذکور پر لازم ہوگا۔ نیز اس مدرس پر لازم ہے کہ تمام مال مع نفع کے مدرسہ کے سپرد کردے۔

۳-اس صورت میں زکوۃ ادا نہیں ہوگی (۱)۔

۱- ''هي تمليك جزء مال عينه الشارع'' (تنویر الابصار علی رد المحتار ۲/۴ کتاب الزکوۃ) (مرتب)۔

۴- اس مال پر بھی اس صورت میں نفع لینا جائز نہیں ہے، ہاں اگر شروع معاملہ میں ہی اپنے اس عمل کی اجرت طے کر لی ہوتو صرف اس اجرت کو لے سکتے ہیں، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۴۰۱/۵/۸ھ

مکاتب اسلامیہ میں زکوٰۃ، صدقۃ الفطر اور چرم قربانی کی رقم صرف کرنا، نیز حیلہ تملیک کی بہتر شکل؟

ایک بستی مسلمانوں کی ہے۔تقریباً چھ سو کی مردم شماری ہے جو مسلم کاشتکاروں پر مشتمل ہے۔تقریباً سات یا آٹھ افراد بڑی کاشت والے ہیں، باقی چھوٹے چھوٹے رقبہ والے، غریب کاشت کار کافی روز سے یہاں کے مکتب اسلامیہ میں کلام پاک اور اردو دینیات کی تعلیم ہوتی ہے، ایک معلم بیس روپے ماہانہ اور خوراک پر تعلیم دیتے تھے، قلیل تنخواہ ہونے کی وجہ سے انہوں نے مدرسہ چھوڑ دیا تو دوسرا معلم بہت ہی تلاش کے بعد اسی روپے ماہانہ اور خوراک پر رکھا گیا، بچوں اور بچیوں کی تعداد کافی ہے جس کی بنا پر ایک معلم کے لیے تمام کام کرنا مشکل ہو گیا ہے، ایک مدرس ناکافی ہے، کاشت کاروں میں جو چھوٹے درجہ کے ہیں وہ اپنے غلہ کی پیداوار سے چالیسواں حصہ نکالتے ہیں، بڑے کاشت کار اپنا چالیسواں حصہ دیگر مدارس میں دیتے تھے، اور مقامی مکتب کو بھی دیتے تھے، اب ایک معلم کے بجائے دو کی اشد حاجت ہے، مہنگائی وگرانی کو دیکھتے ہوئے اسی روپے اور ایک سو پچاس روپے بھی کم ہیں، اس آبادی میں گورنمنٹ کا پرائمری اسکول بھی قائم ہے چونکہ آبادی مسلمانوں کی ہے، اس لیے مکتب اسلامیہ کو جاری رکھنا اشد ضروری ہے، اس لیے کہ اس دور میں کلام پاک، اردو اور دینیات کی تعلیم دلانا بچوں کو بہت ضروری ہے، مندرجہ ذیل امور اس سلسلہ میں قابل غور ہیں:

۱- اس مکتب میں فطرہ کی امداد کرنا جائز ہے یا نہیں؟

۲- اس مکتب میں چرم قربانی کی رقم یا کھال دینا کیسا ہے؟

۳- نیز اس میں زکوٰۃ دینا کیسا ہے؟

۴- ان تینوں مدوں کی رقمیں تملیک کر کے دینا جائز ہے یا نہیں؟

۵- ناظم یا مہتمم مکتب تملیک کر سکتا ہے یا نہیں؟

اس انداز سے جواب شرعیہ مع دلائل ہوں کہ عوام الناس بغیر تکلف کے سمجھ لیں۔

مولانا احمد علی

الجواب وباللہ التوفیق:

۱تا۴: صدقۂ فطر، زکوۃ اور چرمِ قربانی کی قیمت تملیک مستحق کے بغیر تنخواہ وغیرہ کسی مد میں خرچ کرنا درست نہیں، ہاں قربانی کی کھال بجائے فروخت کرنے کے اگر بطور ہدیہ وتحفہ ناظم یا مہتمم مکتب کو دے دی جائیں، پھر ناظم اس کھال کو اپنی ملک میں لینے کے بعد جس مصرف میں چاہے خرچ کرسکتا ہے حتیٰ کہ پھر اس سے مدرسین وملازمین کی تنخواہ بھی دینا جائز ہو جائے گا(۱)۔

حیلۂ تملیک کا بہتر طریقہ:

یہ ہے کہ صدقات واجبہ کی جتنی رقم تنخواہ وغیرہ میں دینی ہو اتنی رقم کے لیے کسی غریب سے کہا جائے کہ تم اتنی رقم قرض لاکر بطور عطیہ و چندہ مدرسہ میں دے دو تمہارا قرض ادا کیا جائیگا، پھر جب وہ غریب اتنی رقم کہیں سے قرض لاکر مدرسہ میں داخل کردے تو صدقات والی رقم میں سے اتنی رقم اس غریب کو دے کر اس کو مالک بنا دیا جائے، پھر وہ غریب اس رقم سے اپنا قرضہ ادا کردے، اگر کسی دوسری جگہ سے اس کو قرض نہ ملے تو اپنے پاس سے صدقاتِ واجبہ کے علاوہ جو روپے ہوں ان میں سے قرض دے دے تو ایسا بھی کرسکتا ہے، اسی طرح اگر غریب سے خطرہ ہو کہ وہ یہ رقم لے کر قرضہ ادا نہیں کرے گا تو جس سے قرض لایا ہو اور داخل مدرسہ کیا ہو اس کو بلا کر اس کے سامنے صدقاتِ واجبہ والی رقم قرض ادا کرنے کے لیے اس کو دی جائے اور پھر اسی غریب کے اس رقم کے قبضہ کرنے کے بعد اگر چاہے تو زبردستی بھی اپنا قرضہ وصول کرسکتا ہے۔

اور سب سے اہم اور پہلی بات یہ ہے کہ حیلہ تملیک سخت مجبوری کی صورت میں کرنا چاہیے، اس لیے پہلے جو لوگ متمول اور بڑے کاشت کار ہیں ان کو لازم ہے کہ صدقات نافلہ وعطیہ سے ایسی امداد کریں جس سے حیلہ کے بغیر ہی مدرسہ کا کام چلنے لگے، اس لیے کہ دینی تعلیم کا جاری کرنا اور رکھنا بہت ہی بڑا کارِ ثواب ہے۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۸/۴/۱۴۰۲ھ

الاؤنس مدرسین کے بارے میں حکم شرعی:

ایک مدرسہ میں ناخوشگوار حالات کی بنا پر چند مدرسین نے یکجا درمیانی سال میں استعفیٰ دیا، مدتِ استعفیٰ سے قبل مدرسہ کی مجلس شوریٰ بیٹھی جس میں استعفیٰ کی واپسی پر پورا زور دیا گیا، لیکن مدرسین واپسی پر راضی نہ ہوئے۔

۱- ملاحظہ ہو: الدر المختار علی ہامش الشامی، ۲۳ ج ۲ کتاب الزکوۃ (مرتب)۔

بالآخر یہ معاہدہ ہوا کہ ۳۰/رمضان تک استعفی موخر کیا جائے، درمیانی سال کے سبب اس معاہدہ میں مدرسہ کی مصلحت تھی، چنانچہ شوریٰ کی کارروائی میں یہ معاہدہ طے ہوا اور اسی کو بنیاد قرار دے کر جملہ مدرسین کے الاؤنس ۳۰/روپے ماہانہ جو مدرسہ دیتا تھا بجائے ۳۰/روپے کے پندرہ روپے کم کر کے شامل تنخواہ ۳۰/رمضان تک کیا گیا اور گورنمنٹ سے ملنے والے الاؤنس پر وعدہ کیا گیا کہ وصول ہونے کے بعد ادا کیا جائے گا، اس معاہدہ کے بعد مستعفی مدرسین بھی اخیر سال تک برابر کام کرتے رہے۔

۱۹/شعبان ۹۰ھ کو مدرسہ میں تعطیل ہوگئی مدرسین کو شعبان کی تنخواہ نہیں دی گئی وہ اپنے اپنے مکان واپس ہو گئے، وسط رمضان میں صرف ۱۸/دن کی تنخواہ شعبان بذریعہ منی آرڈر روانہ کی گئی جس کو مدرسین نے واپس کر دیا، مدرسین کا کہنا ہے کہ چونکہ مدرسین کی حیثیت اجیر شہر یہ کی ہے بغیر معاہدہ کے بھی پورے شعبان کی تنخواہ کے ہم شرعاً مستحق تھے، اب چونکہ معاہدہ میں مدتِ اجارہ ۳۰/رمضان تک بڑھا دی گئی ہے، اس لیے اس معاہدہ کی رو سے پورے شعبان ورمضان دونوں مہینوں کی تنخواہ کے ہم شرعاً مستحق ہو چکے ہیں۔

دریافت طلب امر یہ ہے کہ مدرسین اس مطالبہ میں حق بجانب ہیں یا نہیں؟ اگر حق بجانب ہیں تو شرعاً مہتمم کو ان دونوں ماہ کی تنخواہ روکنے کا حق نہیں ہونا چاہیے، ایسا کرنے پر مہتمم صاحب عند اللہ ماخوذ ہوں گے یا نہیں؟

الجواب وباللہ التوفیق:

صورت مسئولہ میں معاہدہ مذکورہ کی وجہ سے مدرسین کا مطالبہ صحیح ہے اور مطالبہ پورا نہ کرنے پر مہتمم کے سر مواخذہ ہوگا، قال اللہ تعالیٰ و أوفوا بالعهد إن العهد كان مسئولاً " (سورۂ اسرائیل: ۳۴) مرقات شرح مشکوۃ میں ہے: ''ان الوعد للحق بالدین کما ورد عنه صلی الله علیه وسلم: العدة دین" علی ماروا ه الطبراني في الأوسط عن علي وابن مسعود" ۴/۶۴۶ "الاشباہ" میں ہے الخلف في الوعد حرام، صفحہ: ۴۵۲۔ فقط واللہ اعلم بالصواب۔

محمد یسین المبارکپوری خادم التدریس والافتاء فی الجامعۃ العربیۃ احیاء العلوم المبارکفور ۱۱/ذی الحجہ

الجواب وباللہ التوفیق:

یہ صحیح ہے کہ رمضان کی تعطیل استراحت کے لیے ہوتی ہے کہ بعد استراحت پھر مستعدی سے کام ہو سکے، جیسا کہ

عام مدارس میں متعارف ہے اور اس بناپر آئندہ سال نہ آنے والے مدرسین وملازمین کو رمضان کی تنخواہ کا استحقاق نہیں ہوتا مگر صورتِ مسئولہ کا معاملہ اس عرف سے الگ اور ایک جدید معاہدہ کے تحت ہے، اس معاہدہ میں جب حسب تحریر سوال رمضان تک کی تصریح ہے تو یہ مستعفی مدرسین ۳۰/رمضان تک کے اجیر قرار پا گئے اور تعطیل کلاں عرف عام کے تحت مدرسہ نے خود کی ہے، اس لیے اس تعطیل کا تعلق اس معاہدہ خصوصی سے نہ ہوگا، ہاں اگر ۳۰/رمضان سے قبل ۱۹/شعبان کو مدرسہ بند کرتے وقت ان مستعفی مدرسین کے ساتھ پھر کوئی معاہدہ جدید کرنے کے بعد ان کو وطن واپس کیا گیا ہوتا تو بے شک سابق معاہدہ ختم ہوکر اس جدید معاہدہ کے ماتحت حکم ہوتا، لیکن جب ایسا نہیں کیا گیا تو حسب معاہدہ ۳۰/رمضان تک کے اجورہ کے مستحق شرعاً یہ مستعفی مدرسین ہوں گے، لہٰذا ان مدرسین کا یہ مطالبہ صحیح ہے اور وہ اجورہ بذمہ مدرسہ واجب اداد ہے۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۸/ ۱۲/ ۹۰ ۱۳ھ

الجواب صحیح: سید احمد سعید مفتی دارالعلوم دیوبند

احکام المدارس سے متعلق ایک فتویٰ:

کیا حکم ہے شریعتِ مطہرہ کا ان دونوں صورتوں میں:

۱- جن مدارس کا الحاق گورنمنٹ سے ہے، وہاں کے شیخ الحدیث حضرات بکثرت ایسے طلبہ کو جو دوسرے مدارس میں تعلیم پاتے ہیں، ان کا فارم امتحان سرکاری ان طلبہ کی منظوری پر خود بھر بھرا کر یا ان طلبہ کے والد یا سرپرست کے ذریعہ بھر بھرا کر اپنے یہاں سے واقعہ کے خلاف اس فارم کی تصدیق کر کے گورنمنٹ میں امتحانات کے لیے بھیج دیتے ہیں۔ تو کیا ان حضرات کے لیے ایسے فارموں کی تصدیق درست ہے؟ جب کہ ایسا کرنے پر طلبہ کی عمر کے لحاظ سے کافی نقصان ہوجائے گا۔

۲- مدرسین کی تنخواہیں مدارس میں طے رہتی ہیں، اس کے باوجود گورنمنٹ سے بھی کچھ امدادی رقوم ان مدرسین کو مدرسہ کے ذریعہ ملا کرتی ہیں، تو کیا ایسے مدرسین کو زکوۃ کی رقم سے حیلۂ شرعی کر کے تنخواہ لینا درست ہے، جبکہ وہ گورنمنٹ سے بھی ان کی ضرورت پوری ہوجایا کرتی ہے؟

الجواب وباللہ التوفیق:

۱-امتحان تو پرائیوٹ بھی ہوتا ہے، پس اگر محض پرائیوٹ امتحان کے فارم کی تصدیق کرتا ہے تو یہ صحیح ہے، البتہ اگر یہ لکھتا ہو کہ یہ لڑکا ہمارے یہاں داخل ہو کر باقاعدہ پڑھتا ہے، حالانکہ داخل نہ ہو تو کذب صریح ہوگا اور ناجائز ہوگا۔

۲-تنخواہ کا معاملہ اجرت کا ہے جو اہل مدرسہ کے ذمہ واجب الاداہے، قطع نظر اس سے کہ اس کی ضروریات اس میں پوری ہوتی ہیں یا نہیں؟ اور حکومت یہ سمجھتے ہوئے امداد دیتی ہو کہ اس کو مستقل تنخواہ ملتی ہے اور دونوں دو الگ الگ چیزیں ہیں۔

لہٰذا حکومت کے دینے سے اہلِ مدرسہ کے ذمہ جو وجوب ہے وہ ساقط نہ ہوگا، جب تک کہ اہل مدرسہ اس سے یہ معاملہ نہ کرلیں کہ جس کو حکومت کی یہ امداد ملے گی اس کو ہم یہ سابق تنخواہ نہ دیں گے بلکہ کم کر کے محض اتنی دیں گے اور مدرس اس کو قبول بھی کرلے، کیونکہ صحت اجارہ میں رضاء طرفین ضروری ہے اور علم دین کا باقی رکھنا اور اس کا انتظام واجب ہے اور اس وجوب کی بنیاد پر اجرت وتنخواہ کے معاملہ کا جواز اور اجرت کی ادائیگی وجوب متفرع ہے، پس اگر اہل مدرسہ کے پاس ایسی رقوم نہ ہوں جن سے اجرت وتنخواہ دی جاسکتی ہو اور بغیر اس کے تعلیم دین متعذر رہو، قطع نظر اس سے کہ حکومت کچھ امداد دیتی ہے یا نہیں، حیلہ تملیک کر کے بھی ادائیگی تنخواہ درست رہے گی۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

مدرسہ یا مسجد کا مکان بینک یا کسی سودی ادارہ کو کرایہ پر دینا :

مدرسہ یا مسجد کا مکان بینک یا مسلم فنڈ والوں کو کرایہ پر دینا اور ان سے دکان یا مکان کا کرایہ وصول کرنا جائز ہے یا نہیں؟ کیونکہ بینک میں سودی کاروبار بھی ہوتا ہے، تو کیا اس سے حاصل شدہ کرایہ کی آمدنی مدرسہ یا مسجد میں لگانا درست ہوگا؟

الجواب وباللہ التوفیق:

مدرسہ یا مسجد کا مکان بینک کو یا کسی ایسے ادارہ کو کرایہ پر دینا جس میں سودی کاروبار ہوتا ہو یا ایسے شخص کو دینا جو اس میں بت یا سنکھ رکھے یا بجائے، یا بت وغیرہ کو پوجے اس کا کرایہ پر دینا امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک جائز ہے اور صاحبین نے بوجہ

اعانت علی المعصیۃ مکروہ فرمایا ہے اور منع فرمایا ہے، اس لیے گنجائش جواز نکلے گی مگر اچھا نہ ہوگا اور حتی الوسع اجتناب کرنا لازم رہے گا(۱)، فقط واللہ اعلم بالصواب، ہذہ کلہا فی کتاب الإجارۃ من الکتب الفقہ

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۶/۳/۱۴۱۰ھ

الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن خیرآبادی

مدرسہ کے مفاد کے پیش نظر مدرسہ کے خزانے سے خواص وعوام پر اوسط درجہ کا خرچ کرنا درست ہے؟

۱-ہم دارالعلوم میں کسی بزرگ یا عالم کو مدعو کریں ان کے ساتھ خدام اور ان سے مستفیض ہونے کی غرض سے عوام بھی دارالعلوم میں آئیں تو ان مہمانان کرام پر دارالعلوم کے خزانے سے خرچ کرنا جائز ہے کہ نہیں؟

۲-دارالعلوم میں عوام کی آمد پر دارالعلوم کے خزانے میں سے خرچ کرنے میں کوئی حرج آئے گا، نیز دارالعلوم کے معاون ومددگار لوگوں کو دارالعلوم ہی کے مفاد کے پیش نظر مدعو کیا جائے اور ان پر خرچ کیا جائے تو کوئی حرج ہے؟

نوٹ: دارالعلوم کی اوقاف کی جائداد نہیں ہے، دارالعلوم کے اخراجات کا مدار صرف چندہ پر ہے۔

محمد اسماعیل (کیرآف دارالعلوم بھروچ کنتھاریہ ضلع گجرات)

الجواب وباللہ التوفیق:

۱، ۲-مدرسہ کے مفاد ومصلحت کے پیش نظر مدرسہ کے خزانے سے اوسط درجہ کا خرچ ان جملہ مذکورین پر جائز ہے، اگر اوسط درجہ کی مقدار متعین کرنے میں اختلاف ہوجائے تو اراکین شوریٰ آپس کے مشورہ سے کوئی مناسب مقدار طے کرکے اس کا اختیار مہتمم کو دے دیں۔

یہ حکم چندہ ہی کی رقم ہونے کی صورت میں ہے، اگر وقف کی آمدنی ہو تو منشأ واقف کا لحاظ کرنا بھی ضروری

۱- (وجاز إجارۃ بیت إلی قوله لیتخذ بیت نار أو کنیسۃ أو بیعۃ أو یباع فیه الخمر، وقالا: لاینبغی ذالک، لأنه إعانۃ علی المعصیۃ وبه قالت الثلاثۃ) قال الشامی تحت قوله "وجاز إجارۃ بیت" هذا عنده أیضاً: لأن الإجارۃ علی منفعۃ البیت ولهذا یجب الأجر بمجرد التسلیم ولا معصیۃ فیه، وإنما المعصیۃ بفعل المستاجر وهو مختار، فینقطع نسبته عنه الخ" فتاویٰ شامی ۵/۲۵۱ فصل فی البیع (مرتب)۔

ہوجائے گا اورخلافِ منشاواقف کرنے کا ارا کین یا مہتمم کواختیار نہ ہوگا (۱)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبندسہارنپور ۱۴۰۱/۷/۶ھ

سنیماہال وغیرہ کی کمائی مدرسہ یا مسجد میں لگانے کا حیلۂ شرعی:

زید ایک سنیما ہال کا مالک ہے اور وہ فلم کی ریل منگوا کر فلم بھی چلاتا ہے، اس طرح کی کمائی ہوئی دولت، مکانات، کھیتیاں اور نقدروپیہ کی شکل میں رکھتا ہے، آٹھ دس سال سے باقاعدہ پنج گانہ نماز ادا کرتا رہتا ہے، حاجی ہے، مگر ذریعہ معاش سنیما ہال اور کھیتوں کی آمدنی ہے، کھیتیاں وغیرہ بھی سنیما ہال کی آمدنی سے ہی خریدی گئی ہیں، نیز وہ سنیما ہال کا دھندا چھوڑ کر کوئی اور تجارت کرنے کی جدوجہد بھی کررہا ہے، مگر لاکھوں روپیہ مذکورہ تجارت میں پھنسا ہوا ہونے کی وجہ سے جلد علیحدہ نہیں ہوسکتا ہے، اب وہ چاہتا ہے کہ ایک مدرسہ کھولے جہاں دینیات، حدیث وتفسیر اور ابتدائی علوم دینیہ پڑھائے جائیں، بچوں کے لیے ایک قیام گاہ اور ایک مسجد بھی تعمیر کی جائے، اب سوال یہ ہے کہ آیا زید کی اس آمدنی سے زید کا مدرسہ کھولنا، مسجد تعمیر کرنا جائز ہے اور جائز نہ ہونے کی صورت میں اس کی لاکھوں روپیہ کی دولت کی تطہیر کی شریعتِ مطہرہ میں کونسی صورت ہے؟

الجواب وباللہ التوفیق:

ان روپیوں سے براہِ راست مدرسہ وغیرہ کی تعمیر نہ کریں بلکہ کسی سے قرض لے کر تعمیر کرلیں اور وہ قرض ان روپیوں سے ادا کردیں۔

اگر کسی غریب سے جو مصرف صدقہ ہے کہیں کہ تم اتنے روپے کسی سے قرض لے کر مجھے بطورِ اعانت مدرسہ میں چندہ دے دو، میں تمہارا قرض ادا کردوں گا اور اس کو اطمینان دلادیں، وہ غریب شخص کسی سے قرض لے کر دیدے اور پھر یہ شخص اسی پہلے روپے سے اتنا روپیہ بطور صدقہ اس غریب کو دے دے جس سے وہ اپنا قرض ادا کردے تو اس طرح تطہیر بھی اتنے صدقہ کردہ روپیہ کی ہوجائے گی (۲)، اس روپیہ سے جو کھیت خریدا ہے، اگر اس کو اجارہ یا لگان پر دے گا تو اس کا نفع بھی صدقہ کرنا ہوگا، ہاں اگر اس کھیت میں خود کاشت کرے اور کھیتی کرے اور اپنی محنت سے جو غلہ کی پیداوار ہوگی وہ حلال ہوگی،

۱- "لأن مراعاة غرض الواقفين واجبة" (ردالمحتار ۳/۴۲۳)۔

۲- "والحيلة أن يتصدق على الفقير ثم يأمره بفعل هذه الأشياء" (الدرالمختار ۲/۲۳ کتاب الزکوۃ)۔

اس کا کھانا درست رہے گا، پس اس سابق حاصل کردہ روپیہ سے ہزار ڈیڑھ ہزار ایکٹر یا جتنا ہوسکے اراضی خرید کر اس میں اپنا فارم بنا کر کھیتی کرے اور پیداوار حاصل کرے اور اس کو اپنا ذریعہ معاش بنالے اور تھوڑا تھوڑا حسب موقع بغیر نیت ثواب محض وبال سے بچنے کے لیے صدقہ بھی کرتا رہے، تو انشاء اللہ ذریعہ بھی پاک رہے گا اور تطہیر بھی ہوجائے گی، جب کہ اس طرح کمائے ہوئے روپے کی مقدار صدقہ ہوجائے گا، صدقہ کرنے میں جو مدرسہ کھولے گا اس کے اندر غریب و مسکین طلبہ کے کھانے، کپڑے پر بھی خرچ کرنا درست ہوگا (۱)۔

سنیما ہال اگر حرام روپے سے نہیں بنوایا ہے بلکہ پاک روپے سے بنا ہوا ہے تو اس میں صرف سنیما خود چلانا بند کر کے اس کو کرایہ پر دے دینا کافی ہوگا جو کرایہ ملے گا وہ طیب ہوگا اور اگر سنیما ہال بھی حرام ہی روپیہ سے خریدا ہے تو اس کی خرید کی قیمت کے برابر اسی طرح اور جو مکانات ہیں ان کی قیمت کے برابر بھی جب تصدق کردے گا تھوڑا تھوڑا کر کے تو وہ بھی طیب ہوگا اور اس کے کرایہ وغیرہ کی آمدنی بھی حلال ہوجائے گی، البتہ ریل کو فروخت کردے اور اس ناجائز کاروبار کو ختم کردے۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۸/ ۱۲/ ۹۰ ۱۳ھ

موقوفہ مدرسہ کا کچھ حصہ یتیم خانہ کو دینے کا حکم:

مدرسہ قریشیہ مظفرنگر ایک عرصہ سے بنا پڑا تھا، حاجی عبدالغنی نے اس کو بنام مدرسہ اسلامیہ عربیہ مرادیہ وقف کردیا، چنانچہ مدرسین مدرسہ اسلامیہ عربیہ مرادیہ مظفرنگر میں درس و تدریس کا کام کررہے ہیں اور بیرونی طلباء بھی اس میں رہتے ہیں واقف نے وقف نامہ میں تحریر فرمایا ہے کہ مکان مدرسہ کا کوئی جز کرایہ پر نہیں دیا جاسکتا، سوائے تعلیم دین کے اس میں کوئی مشغلہ نہیں ہوسکتا، اب حال میں یتیم خانہ مظفرنگر کے مہتمم نے واقف سے یہ کوشش کی کہ مدرسہ موقوفہ کا اوپر کا حصہ یتیم خانہ کو دیدیا جائے، اس یتیم خانہ میں زیادہ تر انگریزی کی تعلیم ہوتی ہے، واقف مذکور اب کہتا ہے کہ اوپر کا حصہ یتیم خانہ کو دیا جائے، اس صورت میں مدرسہ موقوفہ کا کوئی حصہ یتیم خانہ کو دیدینا جائز ہے یا نہیں؟ درآں حالیکہ وہ مدرسہ اسلامیہ عربیہ مرادیہ مظفرنگر

۱- "وأما إذا كان عند رجل مال خبيث فإما ان ملكه بعقد فاسد أو حصل له بغير عقد ولا يمكنه أن يرده إلى مالكه ويريد أن يدفع مظلمته عن نفسه فليس له حيلة إلا أن ان يدفعه الى الفقراء" (بذل المجہود ۱/ ۳۷ کتاب الطہارت)۔ "ويردونها على أربابها إن عرفوهم وإلا تصدقوا بها لأن سبيل الكسب الخبيث التصدق إذا تعذر الرد على صاحبه (فتاوی شامی ۵/ ۲۴۷ فصل فی البیع)" "أي يتصدق بها بلا نية الثواب إنما ينوي به براءة الذمة" (مرتب)۔

کے نام کل کا کل وقف ہو چکا ہے۔

الجواب وبا الله التوفيق:

واقف نے جب مدرسہ مرادیہ مظفر نگر پر وقف کردیا اور وقف مکمل ہوگیا تو اب واقف کو اختیار نہیں کہ اس وقف کو سوخت کرے یا اس کا کوئی حصہ مدرسہ مذکور کے علاوہ کسی اور مصرف میں استعمال کرے (۱)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۶/ ۱۰/ ۱۳۸۵ھ

الجواب صحیح سید احمد علی سعید نائب مفتی دارالعلوم دیوبند

مدرسہ کے لئے وقف زمین پر مسجد وعیدگاہ کی تعمیر:

ہمارے جوار میں ایک صدی پہلے ایک مدرسہ کے لئے کچھ اشخاص نے زمین وقف کی اور ان کی اولین نیت صرف مدرسہ کی تھی پھر اس موقوفہ زمین پر مدرسہ بنا اور پھر مطبخ اور دار الطلباء بنا پھر اس زمین میں مسجد بھی بنی اور اس زمین میں درخت بھی لگوائے گئے اور پھر عیدگاہ بھی بنی، اس وقف میں کوئی تحریر شرائط وقف کے لئے نہیں تھی صرف زبانی وقف ہوا اور جوں جوں مدرسہ ترقی کرتا گیا کمرے بنتے گئے، اسکے بعد دیگر مدارس بنے اور وقف کنندگان کی اولین نیت صرف مدرسہ تھی، لیکن اس میں بھی جوں جوں ترقی ہوئی مطبخ دار الطلباء مسجد اور عیدگاہ کا احاطہ بھی بنا لیکن وقف کنندگان کے تصور میں مدرسہ سے متعلقہ عمارات مطبخ، دار الطلباء، مسجد اور عیدگاہ بھی رہی جیسا کہ ماقبل کے مدرسہ میں ہوا۔

تو اب مسجد اور عیدگاہ کی تعمیر جائز ہوئی یا نہیں اور عیدگاہ کا احاطہ طلباء کی تعلیم کے لئے حسب موسم استعمال ہوتا رہا، اس طرح ایک مدرسہ کے لئے ماضی قریب میں زمین وقف کی گئی اور اس میں عیدگاہ کا احاطہ بھی بنا اور وقف کنندگان کے کچھ افراد نے عیدگاہ میں اینٹ گارے وغیرہ میں امداد دی حالانکہ عیدگاہ کی چہار دیواری ایک ہی شخص نے اپنے خرچ سے بنایا تو اس میں عید کی نماز پڑھنا جائز ہے یا نہیں؟

نوٹ: (۱) زمانہ ماضی میں عوام کے ذہنوں میں اگر چہ صرف مدرسہ ہوتا تھا لیکن مدرسہ کے متعلقات یعنی مطبخ، دار الطلباء، مسجد، عیدگاہ وغیرہ عمارتیں ان کے تصور میں ہوتی تھیں، اس طرح آج کل بھی مدرسہ کی تحریک سے متاثر ہوتے ہیں

۱- کما فی الدرمع الشامی ۳/ ۳۶، "وعندهما هو حبسها على حكم ملك الله تعالىٰ وصرف منفعتها على من احب ولو غنيا فيلزم فلا يجوز له ابطاله" (الدرالمختار علی الرد ۳/ ۳۹۵، مطبوعہ عثمانیہ)۔

اور ان کی اولین نیت مدرسہ ہوتی ہے اور اپنے آباء واجداد کی طرح ان کے تصورات بھی رہتے ہیں، زمانہ گزشتہ میں مدرسہ کے نام وکام سے جو زبانی وقف ہوتا تھا کچھ دنوں کے بعد بلکہ وقف کنندگان میں کچھ لوگ فوت ہوجاتے تھے، باقی وقف کنندگان کی تحریک سے موقوفہ زمین میں مسجد عیدگاہ بنتی تھی۔ یعنی مسجد عیدگاہ اور خالی زمین میں زراعت برائے مدرسہ اور درخت برائے مدرسہ کولوازمات مدرسہ سے تصور کرتے تھے اور آج کل بھی وہی حالت ہے۔

نوٹ: اگر تحریری وقف نامہ لکھا جائے اور صرف مدرسہ کا ذکر ہو تو پھر اس موقوفہ زمین میں مسجد یا عیدگاہ بنائی جائے تو کیا جائز ہے بنابر تصور بالا جواب دے کر ممنون فرمائیے۔

ماسٹر رجب علی (رودھارا، ضلع بستی)

الجواب وبالله التوفيق:

مدرسہ پر وقف کرنے کا مفہوم ہی یہ ہے کہ مدرسہ اور مدرسہ کی ضروریات پر وقف ہے اور مدرسہ کی ضروریات میں جس طرح درسگاہیں ہوتی ہیں، اسی طرح مطبخ ودار الطلباء، دار الاقامہ اور مسجد مدرسہ سب ضروریات ومتعلقات مدرسہ میں شمار ہوکر ان سب چیزوں کا بنانا وتعمیر کرنا کوئی بھی واقف کی منشاء کے خلاف نہ ہوگا(۱)۔

اسی طرح مدرسہ کی آمدنی بڑھانے کے لئے فاضل زمین پر کھیتی کرلینا یا باغ لگا کر اس کا نفع طلباء ومدرسہ پر خرچ کرنا یا اس فاضل زمین پر نماز عیدین وغیرہ ادا کرلینا سب درست رہے گا۔ ان میں سے کوئی چیز منشاء واقف کے خلاف ہوکر ناجائز نہ ہوگی، البتہ نماز عید اگر باغ یا مغازہ کی شکل ہوتے ہوئے ادا کرلیا تو ٹھیک ہے باقی اس پر عیدگاہ کی عمارت تعمیر کردینا یہ صحیح نہ ہوگا، اس لئے کہ عیدگاہ کی عمارت بھی وقف ہوتی ہے اور یہ عمارت ضروریات مدرسہ میں سے نہیں ہے اور جو چیز موقوفہ ہوتی ہے، اس کو پھر وقف کرنا درست نہیں ہوتا جب یہ زمین ایک دفعہ مدرسہ کے لئے وقف ہوچکی تو اب اس کو عیدگاہ کی عمارت کے لئے وقف کرنا صحیح نہ ہوگا(۲)۔

ہاں اگر واقف نے شروع وقف میں ہی اس کی اجازت دیدی ہو یا وقف نامہ کی عبارت سے اجازت نکلتی ہو تو

۱- ''وإذا جعله تحته سردابا لمصالحه أي المسجد جاز'' (الدرالمختار مع ردالمحتار ۶/ ۵۴۷)، ''لو بنى فوقه بيتاً للإمام لا يضر لأنه من المصالح'' (الدرالمختار مع ردالمحتار ۶/ ۵۴۸)۔

۲- ''فإذا تم ولزم لا يملك ولا يملك ولا يعار ولا يرهن'' (الدرالمختار) ''لا يملك أي لا يكون مملوكاً لصاحبه ولا يملك أي لا يقبل التمليك لغيره بالبيع ونحوه'' (ردالمحتار على الدرالمختار ۶/ ۵۳۹)۔

دوسری بات ہوگی اور یہ حکم ہر دوصورت کا ہے کہ یہ عیدگاہ کی عمارت موقوفہ مدرسہ پر بنانا جائز نہیں ہوگا خواہ کوئی اپنے ذاتی روپے سے بنائے یا مدرسہ کے پیسے سے بنائے البتہ ایسی عیدگاہ میں جونمازیں ادا کی جائیں گی ادا ہوجائیں گی۔

نوٹ: واقف نے زبانی یا تحریری کوئی شرط لگادی ہوتو ''شرط الواقف کنص الشارع فی المفهوم والدلالة ووجوب العمل به'' (۱) کے مطابق اس کی اتباع ورعایت ضروری ہوتی ہے، اور اگر واقف نے کوئی شرط نہیں لگائی ہے نہ زبانی نہ تحریری، لیکن اس کے زمانہ میں جوعمل ہوا ہے اس سے اس کے منشاء مرضی کا استنباط جہاں تک ہوسکے وہیں تک وسعت کی جائے گی یا پھر اس کے منشاء وقف سے زیادہ مستحسن منشاء وقف ہواور عندالشرع احسن منہ ہوتو اس کا اعتبار کیا جائے گا ورنہ نہیں، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۸/۸/۱۴۰۲ھ

سفرائے مدارس کا حکم:

ہمارے مدرسہ کے بعض علماء کو رمضان میں وصولی چندہ کے سلسلے میں مختلف علاقوں میں بھیجا جاتا ہے جن کی تنخواہ کی یہ صورت ہوتی ہے کہ اس مخصوص مبلغ تک اگر چندہ وصول کیا تو ماہواری جوتنخواہ رہتی ہے اس کا ڈبل دیا جاتا ہے۔ اس کے بعد ہر مخصوص مبلغ میں مخصوص انعام دیا جاتا ہے۔ مثلاً ہر ہزار میں سوروپیہ انعام تو اس طریقہ سے تنخواہ متعین کرنا درست ہے یا نہیں؟ اگر درست نہ ہوتو صحیح جواز کی کیا صورت ہے؟

الجواب وبالله التوفيق:

مدارس میں موجود سفارت کا معاملہ جو فیصد پر طے ہوتا ہے، کئی وجہ سے ناجائز ونادرست ہے۔ شروع معاملہ میں جس وقت کوئی مقدار موجود ہی نہیں تو اس کا فیصد مقرر کرنا باطل اور یہ معاملہ شرعا باطل منعقد ہوگا۔

اور اگر معاملہ اس طرح کیا جائے کہ جب وصولی ہوجائے گی تو وصولی کا یہ فیصد لیا جائیگا تو اس صورت میں حدیث قفیز طحان کی مخالفت کی وجہ سے یہ معاملہ شرعا فاسد ہوگا۔

اور اہل مدارس کا یہ کہنا کہ اگر اس طرح معاملہ نہ کیا جائے تو مدرسہ کو کوئی فائدہ نہیں پہنچتا، بلکہ اکثر وصولی سفراء ہی

۱- الدرالمختار مع ردالمحتار ۶/۶۴۹۔

کی نظر ہوجاتی ہے، قابل لحاظ ضرورت ہے اور اس کا تدارک اس طرح ہوسکتا ہے کہ معاملہ اس طرح کیا جائے کہ سفراء کی سابق کارکردگی کے اعتبار سے ان کی تنخواہ خشک بھتہ وسفرخرچ وغیرہ کے ساتھ مناسب ہو، مقرر کردی جائے اور ان سے کہا جائے کہ آپ جملہ وصولی مدرسہ میں بھیجتے جائیں اور مدرسہ کی تحویل میں ڈالتے جائیں اور ساتھ یہ بھی کہہ دیا جائے کہ جب معاملہ ختم کرکے آپ مدرسہ میں آئیں گے تو آپ کی کل وصولی تحویل مدرسہ میں منتقل ہوجائے گی ومع الخلط استہلاک وہ ضابطہ کے مطابق مدرسہ کی ہوچکی، اب آپ کے حلقۂ وصولی کے اعتبار سے جب تک اس مقدار کے اندر رہے گی آپ کو صرف تنخواہ ملے گی، ہاں جب اس مقدار سے زیادہ ہوگی تو آپ کو اتنا فیصد انعام بھی ملے گا۔ اس طرح سفراء کی ہمت افزائی ہوکر زیادہ سے زیادہ وصولی بھی ہوگی اور مدرسہ مذکورہ بالا خطرہ کے احتمال سے محفوظ رہے گا اور معاملہ بھی شرعاً بالکل درست وصحیح ہوگا۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

بلا تعدی مدرسہ کی رقم سفراء سے گم ہوجائے تو کیا حکم ہے؟

۱-ساجد نے مدرسہ کی طرف سے برائے فراہمی مالیہ سفر کیا اور مدرسہ سے تاکید کردی گئی تھی کہ جس شہر کا کام مکمل ہوجائے اس کی رقم دوسرے شہر کے سفر سے پہلے بھیج دیں اس کے باوجود ساجد نے دوسرے شہر کا رخ کرلیا اور دوسرے شہر کی مسجد میں کرتہ نکال کرسوگیا ابھی بیدار ہی تھا کہ کسی ہنگامہ کی صورت میں مسجد کے کسی دوسرے گوشہ کی طرف بھاگا۔ اور کرتہ سابق جگہ ہی بھول گیا۔ جب ہنگامہ فروہوا اور اپنی جگہ واپس آیا تو اس کی جیب خالی ہوچکی تھی روپیوں کی اور یہ نفس واقعہ کی صداقت کی تصدیق وہاں کے مقامی ذمہ داروں نے بھی کی ہے۔ اور ساجد کے حالت کو پیش نظر رکھتے ہوئے غالب گمان یہی ہے کہ اس نے کذب بیانی سے کام نہیں لیا ہے اور واقعہ صحیح معلوم ہوتا ہے۔ واللہ اعلم

کیا صورت بالا میں ساجد کو وہ رقم مدرسہ کو ادا کرنا چاہئے یا نہیں، کیا مہتمم مدرسہ یا ذمہ داران مدرسہ کو معاف کرنے کا حق ہے؟

۲-راشد نے اسی طرح سفر کیا اور تمام رقوم اپنے ہمراہ لے کر واپس آرہا تھا۔ ریل میں کسی نے اس کو مٹھائی کھلادی اس کے بعد اس کو بیہوشی ہوگئی اور سارا روپیہ اس کی جیب سے نکال لیا گیا، کافی دیر کی بیہوشی اور بگڑی حالت میں جی۔ آر۔ پی۔ والوں نے ٹرین سے اتار کر علاج ومعالجہ کرایا۔ اور تصدیق نامہ بھی دیا۔ اور بعض ذرائع سے نفس واقعہ کے پیش نظر

ان کی تصدیق ہوتی ہے اور کبھی راشد مذکور سے خیانت کا کوئی واقعہ پیش نہیں آیا ہے اور وہ مدرسہ کا ملازم بھی نہیں ہے اور کوئی صاحب جائیداد یا با ضابطہ ملازمت پیشہ بھی نہیں ہے، بلکہ وہ اس پوزیشن میں ہے کہ فی الوقت وہ رقم ادا نہیں کر سکے گا، آئندہ بھی مستقبل قریب میں ادائیگی کی توقع مشکل معلوم ہوتی ہے۔

اس صورت میں از روئے شرع انتظام کیا طریقہ کار اختیار کیا جائے۔

۳- ہر دو صورت بالا میں مزکی کی زکوٰۃ کا کیا حکم ہوگا، کیا اس کو دوبارہ زکوٰۃ ادا کرنا ہوگا؟

یہ بات پیش نظر رہے کہ سیکڑوں چندہ دہندگان کو مطلع کرنا ایک امر مشکل اور مزید مشقت کا باعث ہے، علاوہ اس کے علماء اور مدارس کے ساتھ عوام واہل خیر کو جو سوء ظن پایا جاتا ہے اس کی وجہ سے بہت سے اس پر اعتماد نہ کر سکیں گے، اگر کر بھی لیں تو اندیشہ ہے کہ آئندہ مدرسہ ہذا کو چندہ ہی دینا بند کر دیں اور بے اعتمادی ہو جاوے، ایسے میں ناظم مدرسہ کو کیا طریقہ کار اختیار کرنا چاہئے۔

الجواب وباللہ التوفیق:

جب ذمہ داران مدرسہ نے طریق کار کی تاکیدی ہدایت کر دی تھی اور ان سفراء نے اس کے خلاف کیا تو ان سفراء پر شرعاً ضمان واجب الاداء ہو گیا۔ اور ذمہ داران کا مدرسہ کی رقم سے ضمان ادا کرنا یا اس کو معاف کرنا کچھ بھی درست نہیں۔ جب ان سفراء کا دیانتدار ہونا اور ان کا خیانت نہ کرنا اور معذور ہونا عوام کے نزدیک بھی ثابت ہے تو عوام کو ان کی طرف سے چندہ کر کے وہ رقم مدرسہ میں دیدینا چاہئے۔

اب رہ گیا یہ اشکال کہ اس تدبیر سے بھی زکوٰۃ دہندگان کی زکوٰۃ کیسے ادا ہوگی تو ایسی صورت کا اصلی حکم تو یہی ہے کہ زکوٰۃ وصدقات واجبۃ التملیک رقم دینے والوں کو مطلع کر دیا جائے، تاکہ وہ لوگ معاف کر دیں ضمان نہ لیں اور صحت ادا کے لئے دوبارہ رقم دے دیں، لیکن اس صورت میں وہ اشکال بھی ہے جو استفتاء میں درج ہے اور ان سب اشکالات اور بدنامیوں سے مدارس دینیہ کے بقاء وابقاء کے لئے تحفظ بھی واجب ہے اور خاص کر ہندوستان جیسے فساد والے ملک میں، اس لئے ضابطۂ شرعیہ (یختار أهون البلیتین) کے مطابق عوام کے چندہ سے اس رقم کو پورا کر لینے کی شرعاً گنجائش نکلے گی۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

نوٹ: اگر اراکین مدرسہ غیر مناسب نہ سمجھیں تو روئیداد میں بطور نوٹ یہ جملہ بھی درج کر دیا جائے کہ آج کل فسادات کی کثرت سے راستہ میں رقوم کی بلکہ بعض اوقات سفراء کے ضیاع کا بھی خطرہ زیادہ رہتا ہے، اس لئے ایسے ضیاع کے وقت میں مقامی مخیّر حضرات سے اسی ضائع شدہ رقم کی ادائیگی صحیح ہو جانے کے لئے چندہ کر کے معطی حضرات کی جانب سے دے دیا جائے گا تا کہ ادائیگی سب کی صحیح ہو جائے۔

ہاں اگر کسی صاحب کو اس سے اتفاق نہ رہے تو مطلع کر دیا جائے، تا کہ وہ دوبارہ ادا کر کے اس کو صحیح کر لیں ایسا کرنے سے سب دشواریوں اور بدنامیوں سے حفاظت ہو جائے گی۔فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

سفیر سے مدرسہ کی رقم گم ہو جانے کا کیا حکم ہے؟

مجھے مدرسہ کے فراہمی چندہ کے لئے قصبہ گلاوٹھی اور شہر میرٹھ سے فراغت کے بعد قصبہ سکندر آباد (بلندشہر) جانا تھا، شام کا وقت اور کچھ بارش کا موسم تھا اور مزید برآں یہ کہ مذکورہ سکندر آباد قصبہ اپنے لئے بالکل نیا اور اجنبی تھا، وہاں رات میں کسی وقت پہنچا جاتا پہنچنے کے بعد نہ معلوم کہاں قیام ہوتا، اس لئے بہتر سمجھا کہ گلاوٹھی میں اپنے جانے پہچانے سابق امین جناب حافظ عبدالجبار صاحب امام مسجد مقبرہ والی کے پاس دو تین روز کے لئے موجودہ وصولیابی مبلغ چھ سو(=/600) امانت رکھ دیئے جائیں، چنانچہ اس خیال سے شام قریب ٦ بجے متوکل علی اللہ ہو کر وہ رقم موصوف کو سپرد کر دی اور یہ رقم ایسی تنہائی میں سپرد کی تھی کہ انسان تو علیحدہ کوئی پرند بھی پر نہیں مار رہا تھا مراد ہے بالکل تنہائی تا کہ کوئی تاک نہ لے نیز یہ معاملہ کوئی پہلا نہیں تھا بلکہ اس سے قبل ان کے پاس کئی کئی ہزار کی رقم رکھتا رہا ہوں اور الحمد للہ محفوظ ملی آجتک کوئی کھٹکہ نہیں ہوا مگر تقدیر کہ محنت و مشقت کی وہ رقم مدرسہ کے نصیب سے اترنے والی تھی، افسوس کہ وہ رقم حافظ صاحب کے کچھ پیسوں کے ساتھ کمرہ کے اندر کسی خاص ڈبہ سے چوری ہو گئی، یہ خبر احقر کو سکندر آباد کے قریب واپس آتے ہوئے ملی، سنتے ہی اس خون پسینہ کی وصولیابی کے ضائع ہو جانے پر طبیعت اتنی متاثر ہوئی کہ ہاتھ پاؤں تک کی روح جاتی رہی، ہوش وحواس نے ساتھ چھوڑ دیا اللہ اللہ کر کے ان حافظ صاحب کے پاس پہنچا وہاں اس کا ایک شور تھا کہ مقبرہ والی مسجد میں اس طرح چوری ہو گئی انا للہ وانا الیہ راجعون اسی پریشانی میں وہاں کئی روز تحقیق وتجسس میں ناکامی کے بعد حافظ صاحب کو بڑی خوش آمد درآمد کر کے یہاں (دفتر مدرسہ میں) لایا، مہتمم صاحب اور بھائی محمد ہاشم صاحب اور بھائی عبدالمالک صاحب اور مولانا محمد سعید صاحب صدر مدرس وغیرہ

ذمہ داران مدرسہ سے بالمشافہ بات چیت کرا کرتحریراً ان کی تائید بھی پیش خدمت ہے۔

العبد محمد سہیل قاسمی

سلام مسنون! بندہ کی اسی سلسلہ میں حاضری ہوئی مذکورہ بالاتحریر واقعہ کے عین مطابق ہے۔

عبدالجبار (امام مسجد مقبرہ والی گلاؤٹھی)

الجواب وبالله التوفيق:

نوٹ: نفس جواب سے قبل تسہیل فہم کے لئے چند فقہی عبارتیں نقل کی جاتی ہیں:

۱-وعن محمد إن حفظها بمن يحفظ ماله كوكيله وما ذونه وشريكه مفاوضة وعنانا جاز وعليه الفتوى(۱)۔

۲- قوله لأن الظاهر أنه يلتزم حفظ مال غيره على الوجه الذى يحفظ مال نفسه وهو إنما يحفظ ماله بمن فى عياله فيجوز أن يدفع إليهم الوديعة وعن هذا قيل: العيال ليس بشرط فإنه روى عن محمد أن المودع إذا دفع الوديعة إلى وكيله وهو ليس فى عياله أو دفع إلى أمين من امنائه ممن يثق به فى ماله وليس فى عياله أنه لا يضمن(۲)۔

۳- فكان المالك ..الخ .. أقول فيه شئى (الى قوله) فالظاهر أن مدار ذلک هو الضرورة كما هو المفهوم من قوله ولأ نه لا يجد بداً من الدفع إلى عياله، فالأولىٰ أن يترک فكان المالک راضياً به (۳)۔

اب اس کے بعد اصل جواب معروض ہے:

سوال میں ہے کہ گلاؤٹھی میں شام کا وقت ہو چکا تھا، اگر وہاں بینک بھی ہوتو بھی شام کو بینک بند ہو چکے ہوتے ہیں، اس میں محفوظ کرنے کا کوئی سوال نہیں ہے اور سکندرآباد قصبہ بالکل نیا اور اجنبی تھا اور حافظ عبدالجبار صاحب جانے پہچانے

۱- درمختار علی الشامی ۸/ ۷/ ۶۸ ۔

۲- عنایہ علی ہامش فتح القدیر ۷/ ۵۳ ۔

۳- فتح القدیر ۷/ ۹۰ ۔

معتمد شخص تھے اور معاملہ بھی پہلی بار کا نہیں تھا جیسا کہ اس خط کشیدہ الفاظ (یہ معاملہ کوئی پہلا معاملہ نہیں تھا بلکہ الخ) سے معلوم ہوتا ہے اس لئے عبارت ۱ و ۲ و ۳ سے بالخصوص عبارت نمبر ۲ کے خط کشیدہ حصہ سے ظاہر ہے کہ سفیر موصوف پر کوئی ضمان نہیں۔

علاوہ ازیں جب سفیر مذکور کا بار بار کا یہ طریقہ تھا تو یہ طریقہ قرینہ ہے کہ معطیان چندہ اور اہل مدرسہ دونوں کو یا اس میں سے کسی ایک کو اس طریقہ کا علم تھا پھر کوئی اعتراض یا نکیر نہ کرنا ان کے اذن حال پر دلیل وسقوط ضمان کا موید ہے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۹/ ۱۰/ ۱۴۰۰ھ

مدارس ومکاتب میں چرم قربانی خرچ کرنے کا حکم:

ہمارے علاقہ میں قریب قریب اکثر دیہات میں مکاتب قائم ہیں جن میں کچھ سرکار سے منظور شدہ ہیں کچھ غیر منظور شدہ ہیں، نصاب تعلیم ہندی، انگلش، حساب تو سرکاری نصاب کے مطابق ہے، البتہ اس کے ساتھ ناظرہ قرآن وتعلیم الاسلام وغیرہ بھی داخل نصاب ہے۔ ان مکاتب کے لئے عید الاضحیٰ کے موقع پر ایک عام فضاء قائم ہوگئی ہے کہ ہر گاؤں والے اپنے یہاں کی چرم قربانی کو فروخت کر کے اس کی قیمت اپنے اپنے مکتب کے مدرسین کی تنخواہ میں اور تعمیرات فرش وغیرہ میں خرچ کرتے ہیں، انہیں مدرسین میں سے بعض نے عوام کو مسئلہ بتلا رکھا ہے کہ مدرسہ کو کھال بیچ کر پیسہ نہ دیں، بلکہ کھال ہی دیں، کھال اور قیمت دونوں میں فرق ہوجاتا ہے، کھال دینا درست ہے، قیمت درست نہیں، عوام مسئلہ کو سن کر مدرسہ کو کھال ہی دیدیتے ہیں، مہتمم مدرسہ کی ذاتی ملکیت میں دینے کو کوئی شخص بھی تیار نہیں، اگر مہتمم کو دیتے ہیں تو وہ بھی برائے مدرسہ ہی دیتے ہیں، کمیٹی مدرسہ ان کھالوں کو فروخت کر کے مدرسہ پر خرچ کر دیتی ہیں، نیز ان میں پڑھنے والے بچوں کے طعام کا انتظام اس طرح کیا جاتا ہے کہ ایک ایک بچہ کوئی گھر دے دیا جاتا ہے، چنانچہ ان بچوں پر وہ پیسہ صرف نہیں کیا جاتا۔

ازروئے شرع شریف فرمائیں کہ ہمارا ایسے مکاتب کو قربانی کی کھال دینا اور کمیٹی وذمہ داران کو ان کو فروخت کر کے مدرسین کی تنخواہوں میں وتعمیرات میں خرچ کرنا جائز ہے کہ نہیں؟

الجواب وبالله التوفیق:

یہ مکاتب سرکار سے منظور شدہ ہوں یا غیر منظور شدہ ہوں اگر علوم دینیہ کی تعلیم اصل مقصود بالذات ہے اور حساب وکتاب اور علوم دنیوی کی تعلیم محض بقدر ضرورت اور تبعاً ہوتی ہے تو سب کو مکاتب دینیہ شمار کریں گے اور سب کو قائم کرنا اور ان کو ترقی دینا باشارہ آیت کریمہ:"یایھا الذین امنوا قوا أنفسکم و أھلیکم نارا"(۱)،واجبات اصلیہ میں سے ہے اور قوم پر ضروری ہے کہ اپنے عطیات وصدقات نافلہ سے اس کی بھر پور خدمت کریں، البتہ صدقات واجبۃ التملیک میں جیسے زکوٰۃ وغیرہ اور قیمت چرم قربانی اور ان کی رقوم کو ایسے مکتب میں دینا جن میں اس کا مصرف مسلمان غریب بچے جو مستحق صدقہ اور زکوٰۃ نہ ہوں دینا درست نہ ہوگا، ان رقوم کو صرف ان مکاتب میں دینا درست رہے گا جن میں ان مستحق طلبہ کو کھانا کپڑا یا اور رقوم تملیکا دیجاتی ہوں کہ اس کے ذمہ داران تملیک مستحق کرسکیں اور تملیک مستحق کے بعد پھر جس مصرف میں خرچ کرنا ہو خرچ کریں۔

پس اگر کوئی مہتمم مدرسہ اس درجہ معتمد نہ ہو کہ چرم قربانی کی قیمت اس کو تحفہ یا ہدیۃ وغیرہ دیا جائے تو وہ مقاصد مکاتب دینیہ کے مطابق صحیح صحیح خرچ کر سکے تو دینا درست نہ ہوگا، بلکہ اراکین کے ذمہ لازم رہے گا کہ وہ ان کھالوں کو فروخت کر کے حیلۂ تملیک کے بعد جس کام میں چاہیں خرچ کریں، کیونکہ یہ رقم واجب التصدق ہے، بطور ہدیہ مدارس میں دینا کافی نہ ہوگا اور نہ ذمہ سے عہدہ برآ ہونے کے لئے کافی ہوگا۔

یہیں سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ جن مدارس ومکاتب میں غریب نادار طلباء ہوں، مگر ان کو کھانا کپڑا وغیرہ تملیکا نہ دیا جاتا ہو، بلکہ کھانے پینے وغیرہ کا انتظام اہل محلہ پر ہو۔ ان میں بھی ان طلباء کے بہانے سے یہ رقوم دینے سے دینے والوں کا ذمہ بری نہ ہوگا۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۵/۱/۱۴۱۱ھ

جس مدرسہ میں اسلامی کام نہ ہو اس میں چندہ دینا:

کسی گاؤں میں اسلامی طور پر ایک مدرسہ قائم کیا گیا ہو اور وہ اسلامی کام نہ کررہا ہو اور ہندی کی ترقی کررہا ہے اور سرکار کیطرف سے ڈپٹی صاحب جانچ کے لئے آئے ہوں اور جے جے کے نعرہ لگاتے ہوں اور مدرسہ والا مہتمم صاحب یا صدر

۱- سورۂ تحریم:۶۔

صاحب اسلامی نام لے لے کر چندہ کرتے ہوں، دریافت ہے کہ ایسی شکل میں جہاں گاؤں والوں سے اسلامی مدرسہ بتلا کر چندہ کرتے ہوں کیا ایسے مکتب میں چندہ دینا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب وباللہ التوفیق:

محض اسلامی مدرسہ نام رکھنے سے کوئی مدرسہ اسلامی نہیں ہوتا ہے جب تک اس میں اسلامی طور پر کام بھی نہ ہو غرض ایسے مدرسہ میں زکوۃ، صدقۂ فطر، چرم قربانی کی قیمت اور جتنے صدقات واجبہ جنکا مسلمان غرباء ومساکین کو مالک بنانا واجب ہے (۱)، اور بغیر ان غرباء ومساکین کے مالک بنائے ادا نہ ہوتے ہوں اور وہ اس مدرسہ میں نہ ہو تو نہ دے، اگر کوئی کچھ دینا ہی چاہے تو نفلی چندہ دے یہ سب نہ دے (۲)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۸/ ۸/ ۸۵ ۱۳ھ

الجواب صحیح محمود عفی عنہ

جماعت اسلامی کے مدرسہ میں چندہ دینا:

ایک قریہ میں ایک مدرسہ عربی جو عرصہ سے دین محمدی عربی کی تعلیم سے بچوں کو سیراب کر رہا تھا اور یہ ادارہ جماعت اہل سنت کے ماتحت تھا، اب کسی وجہ سے اس پر جماعت اسلامی کے کارکنان کا تسلط ہے اس میں انہی کا نصاب چل رہا ہے، قرآن شریف کے کچھ بچے ہیں، اب سوال یہ ہے کہ جو حضرات خیرات چندہ دیں وہ اس مدرسہ میں دیں یا اور کسی ادارہ میں اپنا روپیہ لگا کر ثواب دارین حاصل کریں آیا اس میں دینے سے ان کو ثواب ملتا ہے یا کہ نہیں ان کی نیت خدمت دین اور ثواب مدنظر ہے اگر اہل قریہ ایسے مدرسہ میں اپنا چندہ دیں تو ان پر کوئی تو حرج نہیں ہے۔

الجواب وباللہ التوفیق:

جماعت اسلامی کے تسلط سے بچانے کی تدبیر کرتے رہیں اور اس سے بے تعلق نہ ہوں اور جب تک دینی تعلیم

۱- ''تو خذ من أغنیائهم فترد إلى فقرائهم'' (رواہ الجماعۃ نیل الاوطار ۴/ ۱۱۴)۔

۲- دیکھئے البدائع ۲/ ۱۶۱ مکتبہ زکریا دیوبند۔

ہوتی ہے اس میں چندہ دینے سے ثواب ملے گا، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور
الجواب صحیح محمود عفی عنہ

مدرسہ کی موقوفہ زمین پر اسکول بنانا:

مدرسہ دینیہ کے لئے زمین لی گئی اس میں لڑکیوں کا انگریزی تعلیم کے لئے اسکول بنانا کیسا ہے؟

الجواب وباللہ التوفیق:

مدرسہ دینیہ کے لئے تعلیم دینے کی تصریح کیساتھ جو چندہ لیا گیا کہ اس سے مدرسہ دینیہ کے لئے زمین خریدی جائے گی اور اس سے جو زمین خریدی گئی اس پر محض دینی تعلیم کے لئے اسکول بنانا خواہ اسکول انگریزی ہو یا غیر انگریزی ہو درست نہیں "شرط الواقف کنص الشارع" (۱)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۴/ ۴/ ۱۴۰۲ھ

۱- ردالمحتار علی الدر ۶/ ۶۴۹، مکتبہ زکریا۔

باب ما یتعلق بأحکام المقابر

متروکہ قبرستان میں مسجد کی توسیع کرنا:

ایک قدیم مسجد ہے اس کے اردگرد قبریں ہیں، مسجد کے سامنے بھی قبرستان ہے اور دونوں طرف چند قبریں ہیں، مسجد کی طرح قبرستان بھی بہت قدیم ہے، ساٹھ، ستر سال سے اس میں تدفین نہیں ہوتی، لیکن قبریں بالکل صاف معلوم ہوتی ہیں، اس مسجد میں جمعہ ہوتا ہے اور یہی جامع مسجد بھی ہے، کبھی کبھی اتفاق سے مسجد میں تنگی محسوس ہوتی ہے، اس وجہ سے مسجد کی توسیع کی گئی، مسجد سے متصل ایک حوض ہے اور حوض قبر کے اوپر ہے، یعنی قبر کو بالکل منہدم کر کے اس کے اوپر عمارت بنائی گئی ہے، کیا یہ عمارت بنانا جائز ہے؟

بی، ایس موسیٰ (مقام و پوسٹ نالیسری ولا کالیکٹ ٹینکوآدینیہ)

الجواب وباللہ التوفیق:

مسئلہ یہ ہے کہ جب قبریں اتنی پرانی ہو جائیں کہ میت کے جسم کا مٹی بن جانا غالب ہوگیا ہو تو فقہ کی کتابوں میں لکھا ہوا ہے کہ اس کے اوپر تعمیر کرنا جائز ہے (۱)، یہاں تو مسجد کی توسیع کی ضرورت ہے جس کا ثواب تدفین سے کم نہیں۔

اس لیے ایسے قبرستان میں جس میں تدفین متروک ہو چکی ہو گر چہ موقوفہ ہو اس میں مسجد کی توسیع کرنا بلاشبہ جائز ہے اور یہ فعل حقیقتاً منشاء واقف کے بھی خلاف نہ ہوگا۔

خلاصہ یہ ہے کہ صورتِ مسئولہ میں حسب تحریر سوال یہ مسجد کی توسیع کر لینا یا قبرستان کو ضروریات مسجد میں لے لینا بلاشبہ جائز ہے (۲)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۹/۷/۱۴۰۰ھ

۱- ''إذا بلي الميت وصار تراباً يجوز زرعه والبناء عليه'' (شامی ۱/۶۰۶ کتاب الجنائز)۔

۲- ''لأن غرضه إحياء حقه وذلک يحصل بما قلنا'' (شامی ۳/۳، کتاب الوقف) (مرتب)۔

قدیم متروکہ قبر کے نشانات ختم کرکے مسجد بنانا؟

ایک جامع مسجد کی بابت مندرجہ ذیل سوالات پیش خدمت ہیں، مدلل جواب سے جلد نوازیں:

ا-ایک قدیم اور بڑی جامع مسجد جو ہمارے قصبہ گھوسی میں تھانہ سے متصل واقع ہے، اس کے جنوب میں افتادہ زمین ہے، اس زمین میں ایک قدیم مزار سید بابا کے نام سے مشہور ہے مزار کی چوحدی پختہ لمبائی چوڑائی 4*6 ہاتھ ہوگی، مسجد بھی ایک صدی سے زیادہ قدیم ہے، اور مزار بھی کافی قدیم ہے، بہت پہلے سے صاحب مزار کا حسب ونسب اور تاریخ معلوم کرنے کی کوشش کی گئی لیکن کچھ معلوم نہ ہوسکا، اور نہ کوئی آدمی صاحب مزار کی تدفین ہی بتاتا ہے، البتہ اسی زمین سے متصل جنوب میں تحصیل ہے، تحصیل کے پرانے لوگوں سے اتنا معلوم ہوتا رہا ہے کہ آج سے تقریباً چالیس سال قبل فلاں تحصیلدار نے خواب میں سید بابا کو دیکھا تھا، تحصیلدار کی قیام گاہ اس زمین سے متصل تھی، تحصیلدار نے مقامی طور پر بعض مسلمانوں کو شامل کرکے ایک کار مستحسن سمجھ کر مزار کی جگہ متعین کردی، اور معمولی طور پر اس کی کرسی بھی پختہ اینٹ سے تیار کرادی، آج بھی وہ مزار اسی صورت میں ہے، مسلمانوں سے زیادہ اہل ہنود پھول بتاشے چڑھاتے ہیں اور بتدریج اس عمل میں اضافہ ہی ہے، بعض مسلمان بھی اس سے اعتقاد رکھتے ہیں، اب اس وقت مسجد کی توسیع ناگزیر ہے، کیونکہ درمیان کے پانچ سالوں کا وقت اس زمین کے سلسلے میں تھانہ والوں سے مقدمہ بازی میں گذرا، اللہ تعالیٰ کا فضل ہے کہ مقدمہ کا فیصلہ عدالت دیوانی سے مع مسجد وزمین عام مسلمانوں کے حق میں ہوگیا۔

کثرت اژدہام کی وجہ سے مسجد کے علاوہ اس زمین پر بھی نمازی جمعہ کے دن بھرے رہتے ہیں بلکہ کچھ تاخیر سے آنے والوں کو جگہ نہیں ملتی، مزار مذکور مسجد کی مغربی دیوار میں پڑتا ہے، تقریباً آدھی مسجد کی تعمیر اگر صرف مزار تک رکھی جائے تو نمازی کی ضرورت پوری نہیں ہوتی، اور نہ توسیع کا مقصد ہی حاصل ہوگا، اور اگر مزار ختم کردیا جائے تو اس میں فتنہ کا امکان ہے، مذکورہ حالات میں کیا صورت اختیار کی جائے؟

الجواب وباللہ التوفیق:

البحر الرائق میں ہے: "ولو بلی المیت وصار ترابا جاز دفن غیره فی قبره وزرعه والبناء علیه" (۱)۔

۱- ۲/۲۱۰ کتاب الجنائز

وهكذا في الرد (۱) والهندية المعروفة بفتاویٰ عالمگیریة وغیرها۔

اس عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ جب قبر اتنی پرانی ہوجائے کہ جسد میت کے مٹی ہوچکنے کا ظن غالب ہوجائے تو اس قبر میں دوسرے مردہ کا دفن کرنا اور اس پر کھیتی کرنا اور مکان بنالینا سب درست ہے اور جائز رہتا ہے، اور جب کھیتی کرنا اور مکان بنانا جائز ہے تو مسجد کی توسیع وتعمیر بلاشبہ جائز ودرست ہوگی، چنانچہ تاریخ الکعبۃ المعظمۃ ص ۱۶۷ میں ہے: مابين المقام والركن وزمزم قبر تسعة وتسعين نبياً یعنی مقام ابراہیم اور رکن اور چاہ زمزم کے درمیان میں ننانوے نبیوں کی قبریں ہیں، اور اسی کتاب میں ہے کہ جب کسی نبی کی امت ہلاک کردی جاتی تھی تو وہ نبی بیت اللہ شریف کے پاس آکر پناہ لیتے اور وہیں تا زندگی متعبد ہوجاتے تھے، اور ظاہر ہے کہ نبی کی جس جگہ وفات واقع ہوتی ہے وہ اسی جگہ مدفون ہوتا ہے اور اب جب کہ ان قبروں کے نشانات صدیوں سے کسی کو معلوم نہیں تو کہنا پڑے گا کہ مسجد حرام کی توسیع میں زمانہ قدیم سے ہی وہ قبریں حدود حرم میں آگئیں، اسی طرح حضرت اسمٰعیل علیہ السلام اور ان کی والدہ ماجدہ حضرت ہاجرہ کی قبریں دار حطیم میں ہیں، جو حدود مطاف میں ہے اور قبروں کا کوئی نشان نہیں ہے۔

یہ باتیں اس بات کی دلیل ہیں کہ پرانی قبروں کے نشانات مٹا کر بھی توسیع مسجد وتعمیر جائز ہے، اسی قسم کے مضامین طبری اور البدایہ والنہایہ، جلد ۹ ص ۱۲۰، ۱۳۸، ۱۹۱، ۱۹۲ میں بھی ہیں۔

اس لیے صورت مسئولہ میں بلاشبہ جائز ہے کہ نشان قبر مٹا کر توسیع مسجد کرلی جائے، بالخصوص جبکہ اس قبر کا واقعی قبر ہونا بھی مشتبہ ہے، لیکن اگر اس میں فتنہ وفساد کا اندیشہ ہو تو یہ کرلیا جائے کہ قبر کو بغیر توڑے اور منہدم کیے ہوئے مٹی اتنی اونچی پاٹ دی جائے کہ قبر زمین میں چھپ جائے اور نشان قبر تک نمایاں نہ رہے اور اس پر توسیع مسجد کردی جائے، اگر اس صورت میں بھی کسی فتنہ وغیرہ کا اندیشہ ہو تو یہ بھی کرسکتے ہیں کہ قبر کی اونچائی کے برابر ہر طرف دیوار اٹھا کر اس پر ایک ڈاٹ لگائیں کہ پوری قبر ڈاٹ کے اندر آجائے پھر اس کے اوپر مٹی ڈال کر کرسی اونچی کرائیں اور مسجد کی توسیع کرائیں، اس صورت میں اگرچہ مسجد کی کرسی بھی کچھ اونچی کرنا پڑے تو اس میں بھی کوئی مضائقہ نہیں ہے، اگر اس صورت میں بھی فتنہ کا خطرہ ہو تو عجلت نہ کی جائے بلکہ عوام کو مسئلہ کی نوعیت وحقیقت بتلا کر خوب مطمئن کرلینے کے بعد کوئی اقدام کیا جائے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند، سہارنپور

۱- ای فی رد المحتار ۱/۶۰۱ کتاب الجنائز۔

قبرستان کے پیڑ یا اس کی قیمت کو مسجد میں لگانا:

ہمیں اس امر کے لیے فتویٰ درکار ہے کہ قبرستان کے پیڑ یا ان کی قیمت مسجد کے احاطہ کے اندر یا مسجد کے احاطہ سے باہر واقع مسجد کے کمروں کی تعمیر میں استعمال ہوسکتی ہے یا نہیں، دیگر یہ کہ پیڑ کی لکڑی یا ان کی قیمت کس طور پر استعمال کرنا جائز ہے؟

نسیم اقبال (صدر منتظمہ کمیٹی دوگڈہ ضلع پوڑی گڑھوال)

الجواب وباللہ التوفیق:

قبرستان کے پیڑوں کی قیمت یا ان کی لکڑی مسجد کے کسی کام میں اس وقت لگانا جائز ہے جب کہ وہ قبرستان کے کام وضرورت سے بالکل فاضل ہو اور یوں ہی پڑے ضائع یا خراب ہوجانے کا غالب گمان ہوجائے، بغیر اس کے ان چیزوں کا قبرستان کے علاوہ کہیں اور استعمال درست نہ ہوگا۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۶/۹/۱۴۰۹ھ

قبرستان کی زمین پر دوکان کی تعمیر اور اس کی آمدنی کا حکم:

ایک قبرستان جو کہ اب سڑک ہے اس کے پاس والے خالی قبرستان کی زمین میں اگر دوکانیں بنالی جائیں اور ان کی آمدنی مدرسہ عربیہ گلزار محمدی یتیموں، بیواؤں، غربا نیشنری اسکول جس کا بنانے کا ارادہ ہے اس میں خرچ کی جائے تو کیسا ہے؟

محمد علی (مقام شاہ پور ضلع مظفر نگر یوپی)

الجواب وباللہ التوفیق:

وہ خالی زمین اگر اس درجہ میں ہو کہ نہ تو اس وقت تدفین کی ضرورت ہے اور نہ آئندہ ضرورت متوقع ہے، تو اس صورت میں حواشی پر دوکانیں بنا کر چوحدی قبرستان بھی محفوظ کرسکتے ہیں اور اس کی آمدنی جو قبرستان کی ضرورت سے فاضل ہو اس کو مذکورہ دینی کاموں میں بھی بہ سبیل مناسب اور بقاعدہ دیانت خرچ کرسکتے ہیں ورنہ کوئی صورت جواز کی نہ ہوگی۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

قبرستان یا مسجد کے روپیہ کو تجارت میں لگانا؟

قبرستان یا مسجد کے مثلاً پانچ سو روپے ہیں، اس رقم سے قبرستان یا مسجد کے مفاد کی خاطر کوئی تجارت کرنا جائز ہے یا نہیں؟

عبدالقیوم القاسمی (خادم جامعہ عربیہ قاسم العلوم قصبہ نہٹور بجنور)

الجواب وبالله التوفيق:

قبرستان یا مسجد کے روپیہ سے تجارت کرنا ہرگز جائز نہیں ہے، یہ حرکت منشاء واقف کے صریح خلاف ہوگی، چاہے مفاد قبرستان ومسجد ہی کے لیے کیوں نہ ہو۔

اس لیے کہ دینے والے اور وقف کرنے والے نے ثواب حاصل کرنے کے لیے دیا ہے، تجارت کے لیے نہیں دیا ہے اور تجارت کرنے میں وہ رقم واقف کے مصرف میں خرچ ہونے کے بجائے تجارت میں مستہلک ہوجائے گی، "لأن مراعاة غرض الواقفين واجبة" (۱)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۶/۳/۱۴۰۱ھ

الجواب صحیح حبیب الرحمٰن خیرآبادی، محمد ظہیر الدین مفتاحی

ا۔قبرستان کو آمدنی کے لیے استعمال کرنا:

مرکزی انجمن تحفظ مساجد وقبور آندھراپردیش آپ کو واقف کراتی ہے کہ صوبہ آندھراپردیش بالخصوص حیدرآباد میں آئے دن قبرستانوں پر ناجائز قبضوں کا سلسلہ ہنوز جاری ہے، بعض قبرستانوں کو آندھراپردیش وقف بورڈ نے جس پر صیانت کی براہِ راست ذمہ داری قانونِ اوقاف دفعہ ۱۵ / ۱۹۵۴ء کے تحت عائد ہوتی ہے۔ خود آندھراپردیش وقف بورڈ کئی قبرستانوں کے بعض حصوں کو کرایہ وغیرہ سے آمدنی وقف بورڈ کے عنوان سے دیا ہے اور بعض قبرستانوں کو بلڈنگیں وغیرہ بنانے کے لیے کئی سال اجارہ پر دے چکا ہے۔

مرکزی انجمن نے جب بھی ارباب وقف بورڈ سے کہا کہ اراضی قبرستان کو آمدنی وقف بورڈ کے لیے استعمال نہیں کیا

۱- ردالمحتار ۳/۴۲۳۔

جا سکتا تو ارباب بورڈ نے کہا کہ ہمارے پاس فتویٰ موجود ہے کہ فارغ اراضی قبرستان کو آمدنی کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے، مرکزی انجمن عالی جناب سے یہ سوال کرتی ہے کہ واقف جس غرض وغایت کے لیے اراضی کو وقف کرتا ہے واقف کے منشاء کے خلاف جانے کا کسی فرد یا حکومت کو بھی حق نہیں پہونچتا۔ جب کہ شہر وصوبوں میں بڑھتی ہوئی آبادی کے پیش نظر قبرستانوں کی صیانت ایک مسئلہ بن چکی ہے۔

۲-میت کی تدفین کے لئے قدیم قبروں کو منہدم کرنا:

شریعت میں پکی قبر بنانا جائز ہے یا نہیں؟ قبرستان محدود ہونے کی بنیاد پر کیا قدیم قبروں کو منہدم کر کے مزید میتوں کو دفن کیا جا سکتا ہے؟ یہاں بعض افراد یہ کہہ رہے ہیں کہ ساٹھ سال کے بعد قبر کو مسمار کرنے کا حکم حدیث شریف میں موجود ہے، اس تاویل کی بنا پر کئی قبرستانوں میں علانیہ عمارتیں وغیرہ تعمیر ہو رہی ہیں اور مرکزی انجمن آخر میں مسلمانوں کی آخری آرام گاہ کی صیانت وحفاظت کے لیے علماء کرام سے فتویٰ حاصل کرنا چاہتی ہے، تاکہ بعض غرض مند افراد کے غلط پروپیگنڈے ختم ہو جائیں۔

الجواب وباللہ التوفیق:

مسئلہ یہ ہے کہ جو قبرستان موقوفہ نہیں ہیں مملوکہ ہیں، ان میں اصل مالکوں کو تصرف کا حق حاصل ہے، لیکن جو قبرستان موقوفہ ہیں ان کا حکم یہ ہے کہ جب تک ان میں مردے ہی دفن کرنا متعین ہے، اس کے علاوہ کسی اور کام میں اس طرح لانا جس سے منشاء واقف فوت ہو درست وجائز نہیں!

ہاں جو موقوفہ قبرستان اس حالت میں پہونچ گیا ہو کہ اس میں تدفین موقوف ہوگئی اور آئندہ اس کی توقع بھی نہ ہو کہ تدفین ہوگی، بلکہ اس کے ضائع ہونے کا قوی خطرہ ہو گیا ہو تو اس کے اور اس کے واقف کے منشاء کے تحفظ وبقاء کے لیے جو مناسب صورت ہو اختیار کرنا ضروری ہے۔

مثلاً یہ کہ اس کو چہار دیواری سے محفوظ کر کے اس میں کل کے اندر باغ لگا کر یا مثلاً اس کے حواشی پر بیرون رخی دکانیں اور اندر باغ لگا کر اس کی آمدنی دوسرے محتاج اعانت قبرستان پر خرچ کی جائے۔

اور اگر دوسرا قبرستان محتاجِ اعانت نہ ہو تو اس کی آمدنی دینی مدارس پر خرچ کی جائے، یا اس میں مسجد تعمیر کر دی جائے یا دینی مدرسہ قائم کر دیا جائے۔

اور جب بڑھتی ہوئی آبادی کے پیش نظر قبرستانوں کی زیادہ ضرورت ہوتو اس صورت میں اس کی آمدنی سے دوسرے محتاج اعانت قبرستان پر خرچ کرنا یا مستقل دوسرا قبرستان قائم کرنا زیادہ قابلِ ترجیح ہوگا، ذاتی وشخصی رہائش گاہ وغیرہ بنالینا یا کوئی عمل ایسا کرنا جس سے وقف ہی بالکلیہ فوت ہوجاتا ہو ہرگز جائز نہ ہوگا۔

معلوم نہیں کہ وقف بورڈ والوں کے پاس کیا فتویٰ ہے اور کہاں سے گیا ہے، جب تک وہ فتاویٰ سامنے نہ ہوں ہم ان کے بارے میں کچھ کہہ نہیں سکتے۔

۲-قانونِ شرع میں پکی قبریں بنانا جائز نہیں ہے(۱)۔

اور مسئلہ یہ ہے کہ جب قبر اتنی پرانی ہوجائے کہ جسدِ میت مٹی ہوچکنے کا ظن غالب ہوجائے تو اس میں دوسرا مردہ دفن کرسکتے ہیں۔

جسدِ میت کا مٹی ہوجانا یہ ملک وموسم کے اختلاف سے اور خود میت کے احوال کے اختلاف سے مختلف ہوتا ہے۔

اسی طرح اس کے پرانا ہونے کی تحدید وتعیین ساٹھ سال کے ساتھ کسی حدیث میں نہیں ہے،فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی،مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۰/۲/۹۲ ۱۳ھ

پرانی قبروں کے نشان مٹ جانے پر کیا حکم ہے؟

یہاں ایک مسجد کے صحن کے جنوبی حصے کے ایک کونے میں تقریباً ۱۵ رفٹ کے احاطہ میں چند پرانی قبریں ہیں اور بالکل ویران جگہ ہے جہاں بچھو وغیرہ نکلتے رہتے ہیں، ایک مرتبہ مدرسہ کی ایک بچی کو مسجد میں بچھو نے کاٹ لیا، ان وجوہات کے مدنظر منتظم مدرسہ نے ارادہ کیا ہے کہ قبروں کو ہٹا کر اس ویران جگہ سیمنٹ لگا کر صحن بنالیا جائے اور اونا بنالیا جائے، کیا شریعت کی رو سے مسجد کے احاطہ والی قبروں کی جگہ سیمنٹ سے پکا کرنا جائز ہے؟

الجواب وبالله التوفيق:

اگر قبر اتنی پرانی ہوچکی ہو کہ مردہ مٹی بن چکا ہوگا تو قبروں کا نشان باقی رکھنا ضروری نہیں ہے،نشان مٹا کر زمین

۱- "عن جابر نهى رسول الله ﷺ أن يجصص القبور وأن يكتب عليها وأن توطأ رواه الترمذي"(مشکوۃ المصابیح/ص۱۴۸-۱۴۹)۔

ہموار کر کے پختہ صحن بھی بنا سکتے ہیں، بلکہ مذکورہ خطرہ کی صورت میں ایسا کر لینا بہتر ہے(۱)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دار العلوم دیوبند سہارنپور

متولی کی اجازت کے بغیر موقوفہ قبرستان میں تدفین:

بغیر متولی کی اجازت کے کسی کو قبرستان میں دفنا دیا جائے اس سلسلہ میں شرعی مسئلہ کیا ہے؟

الجواب وباللہ التوفیق:

سوال کے خط کشیدہ جملہ سے معلوم ہوتا ہے یہ معاملہ موقوفہ قبرستان کا ہے اور موقوفہ قبرستان کا حکم شرعی یہ ہے کہ جو متولی غیر واقف ہو اس کا واقف کے درجہ میں ہونا ضروری نہیں، بلکہ وہ واقف کی شرائط کے تابع ہوتا ہے۔ "لأن شرط الواقف کنص الشارع" (۲)۔

نیز شامی (۳/ ۴۲۴) میں ہے: "مراعاة غرض الواقفین واجبة" ان دونوں عبارتوں سے معلوم ہوا کہ متولی جو غیر واقف ہو وہ اوقاف کا محض نگراں و منتظم و قیم ہوتا ہے اور اس کو واقف کی منشاء و غرض کے خلاف کے دفن کر دینے سے حاصل ہوتا ہے، پس "المعروف عرفا کا لمشروط شرطا" (۳) ضابطہ شرعیہ کے تحت کسی مسلمان کو اس قبرستان میں دفن کرنے سے روکنا شرعا جائز نہ ہوگا۔

ہاں اگر واقف نے اصل وقف نامہ میں صراحت کر دی ہو کہ اس موقوفہ میں فلاں کو دفن نہ کیا جائے تو صرف اس صورت میں متولی کی بغیر اجازت دفن کرنا جائز نہ ہوگا۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دار العلوم دیوبند سہارنپور ۱۶/ ۳/ ۱۴۱۱ھ

۱۔ قبرستان کے اردگرد کی زمین مدرسہ میں دینا:

کسی آبادی کے قریب ایک جنگل میں کسی بزرگ کا پرانا مزار ہے جس سے قدیم لوگوں کو عقیدت تھی جس کی بناء پر

۱- "ولو بلی المیت وصار ترابا جاز دفن غیرہ فی قبرہ وزرعہ والبناء علیہ" (رد المحتار ۱/ ۹۹)۔

۲- الدر المختار علی ہامش الشامی نعمانی ۱/ ۳۱۶۔

۳- قواعد الفقہ قاعدہ ۳۳۴ ص۔

مزار کے گرد کچھ اراضی چھوڑ دی گئی تھی بعض خودرو درخت اور اکثر کانٹے دار جھاڑیاں پیدا ہوگئی ہیں اور اس کے قریب کی آبادی کے لوگوں نے جنگلی کاشت اس مزار کے قریب ہوتی تھی ایک فقیر کو مزار کی حفاظت کے لئے مقرر تھا دیدی تھی جو عرصہ دراز تک اس اراضی کے خودرو درختوں کی آمدنی سے فائدہ اٹھاتا رہا ہے اور آخرکار اس کو چھوڑ کر کہیں باہر چلا گیا، اس کے بعد اس کی اولاد میں کوئی دوسرا شخص اس پر قابض ہوگیا اور درخت کی لکڑیاں کاٹ کر اپنے کام میں لاتا رہا ہے اور غیر مزروعہ زمین کے کچھ حصہ قابل کاشت کر کے کاشت میں نام لکھا لیا ہے اس کو فروخت کردیا باقی غیر مزروع حصہ میں اس کی کاشت نہیں ہے اور نہ مالک کی حیثیت سے اسکا نام ہے، اب آبادی کے لوگوں نے جنگلی کاشت اسکے قریب ہے فیصلہ کیا ہے کہ مزار کی حفاظت کے لئے ایک چہار دیواری بنا کر دروازہ لگا دیا جائے اور مزار کے گرد ونواح کی غیر مزروعہ زمین ایک اسلامی مدرسہ میں دیدی جائے، مدرسہ خود اس جنگل کو صاف کرا کر لکڑی مدرسہ کے صرف میں لے آوے اور زمین کو قابل کاشت بنا کر مدرسہ ہی کاشت کرائے اور اپنے مصرف میں لاتا رہے۔خصوصاً ایسی صورت میں جبکہ چک بندی میں اس حصہ کا نکل جانا یقینی ہے آیا مدرسہ کے حق میں یہ فیصلہ ازروئے شرع درست ہے یا کہ نہیں؟

۲-قبرستان کے درخت کی آمدنی مسجد ومدرسہ میں صرف کرنا:

کسی آبادی کے جنگل میں قبرستان ہے جہاں مسلمانوں کے مردے دفن ہوتے ہیں، اس زمین میں بعض درخت ہیں جن لوگوں کے مردے قبرستان میں دفن ہوتے ہیں انہوں نے قبرستان کے درخت کٹوا کر مسجد یا مدرسہ میں صرف کرنیکی اجازت دیدی ہے آیا ان درختوں کو کٹوا کر مسجد یا مدرسہ کے صرف میں لانا درست ہے یا کہ نہیں؟ نیز قبرستان کے حلقہ کی بقیہ زمین جس میں قبریں نہیں ہیں یا پرانی قبروں کے آثار بھی باقی نہیں رہے ہیں مدرسہ کو دیدی جائے تو اس میں مدرسہ کاشت کرا سکتا ہے یا کہ نہیں۔

الجواب وبالله التوفيق:

۱-عبارت سوال سے یہ نہیں معلوم ہوتا ہے کہ وہ زمین جو مزار کے اردگرد ابتک باقی ہے موقوفہ ہے یا کسی کی ملک ہے، اگر موقوفہ ہے تو وقف واقف کے شرائط کے مطابق اسکی حفاظت وترقی ودیکھ بھال کرنی واجب ہے اس کے خلاف مدرسہ کو دینا جائز نہ ہوگا(۱)، اور اگر وقف نہیں ہے تو جس کی ملکیت ہو اس کی اجازت سے جس جائز مصرف میں چاہے صرف کر سکتے

۱- "وسئل هو (القاضي الامام شمس الائمه محمود الاوزجندي) ايضا عن المقبرة في القرى اذا اندرست ولم يبق فيها

ہیں اور مدرسہ اسلامی اسکا بہترین مصرف ہے اور مالکوں کا پتہ عرف عام سے بھی چل سکتا ہے، ورنہ قدیم سرکاری کاغذات بندوبست سے ضرور چل سکتا ہے، بہرحال جب کسی طرح کوئی پتہ نہ چلے اور چک بندی میں نکل جانے کا ظن غالب ہوتو ایسی صورت میں آبادی کے لوگوں کا یہ خیال صحیح ہے۔

۲۔ یہاں بھی یہ حکم ہے کہ اگر قبرستان وقف ہے تو اس وقف میں واقف کے شرائط ومنشاء کے مطابق عمل کرنا واجب ہے اور اگر وقف نہیں ہے تو مالکوں کی اجازت لے کر درخت کٹوانے درست ہیں اور یہی حکم حلقہ کی بقیہ زمین میں کاشت کرنے کا ہے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۸/ ۷/ ۱۳۸۵ھ
الجواب صحیح محمود عفی عنہ، سید احمد علی سعید دارالافتاء دارالعلوم دیوبند

مزار وغیرہ کے نام وقف شدہ زمین اور اس کی آمدنی کو مسجد میں لگانا جائز ہے یا نہیں؟

کسی شخص نے کچھ زمین پہلے مزار پیر کے نام پر اور کچھ زمین محرم وغیرہ کرنے کے لئے وقف کی تھی، یعنی پیر کے عرس تعزیہ لاٹھی وغیرہ کے لئے یہ سارے کام خلاف شرع ہونے کی وجہ سے متولی مسجد زمینوں کی دیکھ بھال کرتے رہے پھر انکو مسجد کی زمین میں شامل کرلی، اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ کیا یہ وقف صحیح ہے، فی الحال اس کی آمدنی مسجد کے کام میں لگایا جارہا ہے، یا یہ لگانا درست ہے اگر عدم صحت کا فتوی ہوتو پھر جو روپیہ لگایا جاچکا ہے انکا کیا حکم ہوگا، نیز ان زمینوں کی آمدنی کو ہائی اسکول یا مدرسہ میں یا کسی اسکول کی تیاری میں لگایا جاسکتا ہے یا کہ نہیں؟ یہ بھی معلوم ہونا چاہئے کہ واقفوں نے نہ تو مسجد کے نام وقف کیا ہے نہ مسجد کے نام پر رجسٹری کی ہے۔ موقوفہ زمین کی تبدیلی جائز ہے یا نہیں؟

الجواب وباللہ التوفیق:

جس شخص نے مزار پیر یا محرم وتعزیہ کے لئے یہ زمین وقف کی تھی اگر وہ یا اس کے ورثہ مذکورہ موجود معلوم ہوں تو ان سے اجازت لے لی جائے ورنہ اس زمین کا مسجد میں شامل کرنا یا اس کی آمدنی مسجد پر صرف کرنا صحیح نہ ہوگا (۱)۔ اسی طرح اسی

اثر الموتی لاالعظم ولاغیرہ هل یجوز زرعها واستغلالها قال: لا "(ہندیہ ۲/ ۴۷۰، مکتبہ رشیدیہ پاکستان)۔

۱- ''فی الواقعات بنی مسجدا علی سور المدینة لاینبغی أن یصلی فیه لانه حق العامة فلم یخلص للّٰه تعالیٰ کالمبنی فی ارض مغصوبة'' (شامی ۱/ ۳۵۴، عثمانیہ)۔

زمین کا یا اس کی آمدنی کا ہائی اسکول کی یا کسی اسکول کی تیاری وتعمیر میں خرچ کرنا بھی جائز نہ ہوگا اور صحت وقف میں یہ تفصیل ہے کہ محرم وتعزیہ والا تو شرعاً صحیح نہیں (۱)، اور مزار پیر کے وقفنامہ میں اگر تصریح نہ ہو تو اس کا بھی وہی حکم ہے جو محرم کے وقف کا ہے اور وہ یہ ہے کہ جو آمدنی متولی نے بلا اس شخص کی یا اس کے وارثوں کی اجازت کے مسجد میں لگائی ہوگی اگر وہ شخص یا اس کے ورثہ چاہیں تو متولی کی ذاتی جائداد سے بطور ضمان کے وصول کر سکتے ہیں اور چاہیں تو معاف بھی کر دیں اور یہی ان کے لئے بہتر ہے تو انکو ثواب ملے گا لیکن خوب یاد رہے کہ یہ تاوان وضمان وغیرہ مسجد کے وقف یا مال سے وصول نہیں کر سکتے ہیں۔

اور اگر مزار پیر یا محرم وتعزیہ کے لئے دینے کی بابت بہت قدیم اور پرانی ہو اب اس دینے والے یا اس کے ورثہ کا بھی پتہ نہ ہو تو متولی پر کچھ ضمان نہیں، مسلمانوں کے مشورہ سے مسجد پر یا جس کار خیر میں ہو خرچ کرے اور ان سب کے مشورہ سے ایک ضابطہ وقاعدہ مطابق شرع شریف بنا کر اس کے مطابق عمل کرے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

متروکہ قبرستان کی زمین میں غرباء کے لئے مکان بنانا:

تقریباً دوسو سال پہلے بھنور شاہ تکیا می ایک جگہ میں کچھ قبریں تھیں مگر اسکا نام ونشان نہیں ہے، البتہ چند قبروں کے نشانات موجود ہیں، دیگر اراضی میں نام ونشان کسی قبر کا نہیں ہے، نہ ایک سو سال سے آج تک وہاں کسی قبر کا وجود ہے، اب دریافت طلب یہ امر ہے کہ اس وقت اس تکیہ میں جو خالی جگہ پڑی ہوئی ہے وہاں غرباء کے مکانات تعمیر ہو سکتے ہیں یا نہیں؟

الجواب وباللہ التوفیق:

قرائن تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ جگہ قدیم قبرستان اور موقوفہ ہے اگر ایسا ہے تو اس سے کسی قسم کا انتفاع جائز نہیں جیسا کہ عالمگیری جلد ۲ کتاب الوقف کی عبارت سے معلوم ہوتا ہے: ”وسئل هو أيضاً عن المقبرة في القرىٰ إذا اندرست ولم يبق فيها أثر الموتى لا العظم ولا غيره هل يجوز زرعها واستغلالها قال: لا ولها حكم المقبرة كذا في المحيط وهكذا في قاضي خان من كتاب الوقف(۲)۔

۱- ”ومنها (اي من شرائط) ان يكون قربة في ذاته وعند التصرف فلايصح وقف المسلم او الذمي على البيعة والكنيسة أو على فقراء اهل الحرب كذا في النهر الفائق“ (ہندیہ ۲/ ۳۵۳، مکتبہ رشیدیہ پاکستان)۔

۲- فتاوی ہندیہ ۲/ ۴۷۰، مکتبہ رشیدیہ پاکستان۔

بلکہ اس کا حکم یہ ہے کہ صرف منشا وقف وواقف کے مطابق اس کا استعمال وحفاظت وآبادی کی جائے، لہٰذا وہ قبرستان متروک ہوگیا ہو یا اس میں دفن ممکن نہ ہوگیا ہو تو مجبوراً اس کو محفوظ کر کے اس میں باغات لگادیئے جائیں یا جہاں خالی جگہیں ہوں وہاں پر کرایہ کی دوکانات تعمیر کرا کر کرایہ پر دیدیا جائے اور اس کا نفع جو اس کی حرمت وحفاظت سے بچے اہل محلّہ کے دوسرے قبرستان پر صرف کیا جائے اور اگر دوسرا قبرستان بھی اس آمدنی کا محتاج نہ ہو تو غرباء ومساکین پر وہ نفع تقسیم کردیا جائے ہاں اگر وہ جگہ کسی کی ملک ہو تو مالک کی اجازت سے اس پر مکان بھی تعمیر کر سکتے ہیں، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

الجواب صحیح سید احمد علی سعید، محمود غنی عنہ نائب مفتی دارالعلوم دیوبند

قبرستان کی موقوفہ زمین پر مدرسہ یا امداد یتامیٰ کے لئے مکان کی تعمیر:

قلب آبادی بجواڑے میں ایک قدیم قبرستان ہے جس میں تقریباً ایک سو سال سے تدفین بند ہے، کچھ حصے پر بعض قبور کے کے نشان پائے جاتے ہیں۔

حالات حاضرہ کے تحت اراضی قبرستان کا تحفظ مشکل نظر آتا ہے اس کا امکان ہے کہ اراضی دستبرد زمانہ کی نظر ہو جائے، کیا یہ بہتر ہوگا کہ اس کو لب سڑک حصہ پر مدرسہ، حفاظ وامداد یتامیٰ کیلئے عمارت بنا کر وقف کیا جاوے تاکہ جس طرح مسلمان اپنی زندگی اللہ تعالیٰ کے لئے وقف کرتے ہیں بعد الموت اس کی خاک بھی تملیک الی اللہ کی حیثیت بنکر اس سے خدمت دین میں صرف ہوتی رہے۔ مسلم عوام یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ عند الشرع اس میں کوئی ممانعت تو نہیں؟

الجواب وبالله التوفیق:

قدیم مسلم قبرستان عموماً وقف ہی ہوتی تھیں لہٰذا اگر یہ قبرستان وقف ہے جیسا کہ ظاہر اور متبادر بھی ہے تو اس کو غیر قبرستان کے لئے استعمال کرنا شرعاً کسی طرح بھی ہونا جائز ہے، تحفظ دینا ضروری ہے اور اس کی ایک صورت یہ بھی ہوسکتی ہے کہ اس قبرستان کی احاطہ بندی کرادیا جائے اور سب سٹرک جہاں قبریں نہ ہوں جگہ خالی ہو برائے نفع ومرمت وحفاظت قبرستان دوکانیں بنادی جائیں اور رخ سڑک پر کردیا جائے اور اندرون قبرستان جہاں جگہیں خالی ہوں کچھ درخت از قسم باغ لگادیئے جاویں اور اس کی آمدنی قبرستان پر اور اس کے علاوہ جو دوسرا قبرستان مسلمان کا ہو اس پر خرچ کیا جاوے اور اگر صحیح

ثبوت ودلیل سے یہ معلوم ہو کہ یہ قبرستان وقف کی نہیں ہے بلکہ کسی خاص شخص کی مملوک ہے تو اس مالک کی مرضی سے جہاں جگہیں خالی ہیں قبروں کے نشانات نہیں ہیں مکانات بھی بنوائے جاسکتے ہیں۔فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

الجواب صحیح محمود عفی عنہ نائب مفتی دارالعلوم دیوبند

عورتوں کے قبرستان جانے کا حکم:

۱-عورتوں کو مطلقاً قبرستان میں جانا کیسا ہے؟

۲-عورتوں کو کسی مزار پر زیارت کی غرض سے جانا کیسا ہے؟

۳-فرض نماز کے بعد سر یا پیشانی پر ہاتھ رکھ کر جو دعا پڑھتے ہیں وہ کیا ہے۔مسنون ہے یا نہیں؟

۴-مسجد کے ممبر کے سامنے مطلقاً روپیہ گننا کیسا ہے؟

۵-مسجد کے ممبر کے سامنے اسی مسجد کے چندہ کا پیسہ کسی ذمہ دار کو دیا جائے تو جائز ہے یا نا جائز؟

الجواب وباللہ التوفیق:

(۱، ۲) عورتوں کا مطلقاً قبرستان میں جانا یا مزار پر جانا فی نفسہ جائز ہے، لیکن چونکہ کمزوردل کی ہوتی ہیں، اس لیے متاثر ہوکر بعض ناجائز فعل (شرک وبدعت وغیرہ) کر دیتی ہیں، اس لئے روکا جاتا ہے، پس اگر پردہ کے ساتھ جائیں اور سنت کے مطابق کچھ پڑھ کر ایصال ثواب اور دعائے مغفرت کر کے واپس آجائیں تو اس میں کوئی ممانعت نہ ہوگی۔

۳-یہ عمل نہ تو سنت ہے نہ تو واجب صرف بطور مباح ایک فعل ضعف دماغ سے حفاظت کی نیت سے یہ علاج کے درجہ کی چیز ہے۔

۴-جائز ہے۔

۵-جائز ہے۔فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۷/۵/۱۴۱۱ھ

چرم قربانی کی رقم سے قبرستان کی چہار دیواری بنانا کیسا ہے؟

چرم قربانی کے مستحق کون ہیں اور کیا چرم قربانی کی آمدنی سے قبرستان کی دیوار بنائی جاسکتی ہے؟

الجواب وباللہ التوفیق:

قربانی کرنے والا جب تک چرم کوفروخت نہ کردے اس کوسب اختیار ہے۔ چاہے تو خود اس کا مصلّی، ڈول وغیرہ کچھ بنا کر استعمال کرے یا غریب یا امیر یا اور جس کو چاہے بطور تحفہ وہدیہ کے دے دے پھر وہ پانے والا اس چمڑے کو جس طرح چاہے استعمال کرے حتیٰ کہ فروخت کر کے قبرستان کی چہار دیواری بنوادے یا اس کے بنوانے کے لئے بطور عطیہ دیدے سب جائز رہتا ہے، "ويتصدق بجلدها أو يعمل منه نحو غربال وجراب وقربة وسفرة ودلو" (۱)۔

البتہ جب قربانی کرنے والا خود چمڑا فروخت کردے یا کسی کے ذریعہ فروخت کرادے تو اس قیمت کا غرباء یا مساکین پر صدقہ کردینا واجب ہوجاتا ہے اور کسی بھی دوسرے کام میں صرف کرنا جائز نہیں رہتا ہے، "فإن بيع اللحم أو الجلد به......أو بدراهم تصدق بثمنه" (۲)، ہاں وہ غریب ومسکین اپنا قبضہ قیمت پر کر کے اور مالک ہوکر پھر جہاں چاہے خرچ کرسکتا ہے قبرستان کے لئے بھی دے سکتا ہے۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۲/۸/ ۱۴۱۰ھ

قبرستان میں آبادی بسانا:

قبرستان میں آبادی کرنا جائز ہے یا کہ نہیں؟

الجواب وباللہ التوفیق:

موقوفہ قبرستان میں رہائش کے لئے مکان بنانا جائز نہیں ہے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۴/۹/ ۱۳۸۵ھ

۱- الدرالمختار ۹/ ۴۷۵۔

۲- تنویر الابصار علی ہامش ردالمحتار ۹/ ۴۷۵۔

۱- پرانی قبروں پر دوکان لگانا:

عیدگاہ کے متصل قبرستان کے نشانات جہاں پرختم ہیں وہاں عید وبقر عید کے موقع پر مٹھائی وغیرہ کی دوکانوں کی بھیڑ ہوجاتی ہے اس کا کیا حکم ہے اورگاؤں کے ذمہ دارلوگوں پر کیا حکم ہے؟

۲-قبرستان میں فقیروں کو چاول دال دینا:

مردہ کو دفنانے کے لئے جب قبرستان لے جاتے ہیں توفقیر وہاں جمع ہوتے ہیں اورقبرستان ہی میں مردہ کو دفن کے بعد دال چاول اورنمک فقیروں کو بانٹا جاتا ہے اوروہیں سے کچھ مدرسہ کوبھی دیا جاتا ہے یہ رقم کیسی ہے؟

الجواب وبالله التوفيق:

۱- یہ سب غلط طریقہ ہے اورمنشاءشرع کے خلاف ہے، گاؤں کے تمام ذمہ دارلوگوں پر لازم ہے کہ جہاں تک ہوسکے اس کی اصلاح کی کوشش کریں۔

۲-یہ طریقہ خلاف شرع ہے،صدقہ کے آداب میں سے ہے کہ جہاں تک ہومخفی اورخفیہ طور پر دیں اوراس کے صحیح مصرف میں دیں، ان فقیروں میں اکثر صدقہ کے مصرف نہیں ہوتے جن کو دینے سے صدقہ ادابھی نہیں ہوتا اس طریقہ کی اصلاح ضروری ہے،فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی،مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۹/ ۸/ ۱۳۸۵ھ

الجواب صحیح سید احمد علی سعید نائب مفتی دارالعلوم دیوبند

امیر جماعت کے لئے درگاہ کمیٹی کی ممبری قبول کرنا:

ا-تبلیغی جماعت کے امیر کوایسی درگاہ کمیٹی کی ممبری قبول کرنا اوراس کے لئے جد وجہد کرنا چاہئے یا کہ نہیں جس درگاہ کا عرس ہوتا ہے قوالی زوروشور سے ہوتی ہے جہاں پر پھول چادر غلاف سے نذرانہ صندل وغیرہ چڑھایا جاتا ہے یہ کہنا کہ ان معاملات میں کچھ دخل نہیں دوں گا، یعنی میں قوالی کرنے ،صندل پھول چادر غلاف وغیرہ چڑھانا سے نہیں روکوں گا یہ کہہ کرممبری کے لئے کوشش کرنا چاہئے یا کہ نہیں۔جبکہ یہ تمام چیزیں شرک وبدعت ہیں ایسی جگہ خصوصاامیر جماعت تبلیغ کوممبر بننا چاہئے یا کہ نہیں۔

۲۔ اگر صرف عوام سے کہنے کے لئے کہ مقصد یہ ہے کہ ممبر بنتے ہی رفتہ رفتہ یہ تمام کام بند کر دوں گا تو ایسا کرنا عوام کو دھوکہ دینا ہوگا یا نہیں اور منافقت ہوگی یا کہ نہیں اگر ممبر بنا ہی ہے تو عوام سے صاف صاف یہ کہہ کر ممبری کے لئے کوشش کرنا چاہئے یا کہ نہیں جبکہ یہ تمام چیزیں شرک وبدعت ہیں ایسی جگہ خصوصا امیر جماعت تبلیغ کو ممبر بنا چاہئے یا کہ نہیں؟

الجواب وبا الله التوفيق:

یہ طریقہ تبلیغ طریق سنت کے خلاف ہے، اپنی حفاظت مقدم ہے، ایسے مزاروں پر جہاں عرس قوالی پھول چادریں وغیرہ تمام بدعتیں ہوتی ہیں اس کے ممبر بننے کا مطلب یہ ہے کہ ان امور میں اور انکے نظم ونسق میں برضا ورغبت شریک ہوں اور ان عہود وقواعد وضوابط کی پابندی پہلے کرلیں جو شرعاً نا جائز ہیں اور نفع کا بھی پتہ تک نہیں ہے اور شرعی قاعدہ مسلم ہے: جلب منفعت سے دفع مضرت مقدم ہے، اس لئے شرعاً اس امر کی اجازت نہ ہوگی، نیز یہی کام اصلاح والا وہ ممبر صاحب باہر سے بلاممبر بنے بھی کر سکتے ہیں، اگر باطن وقلب میں کچھ رکھتے ہوں تو بلاممبر بنے اس کے متولی پر اثر انداز ہوں جب بھی کام بن سکتا ہے، لہذا ان کو حسب تحریر سوال یہ شرکت وغیرہ کرنا ہرگز جائز نہیں ہے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۷/ ۸/ ۱۳۸۵ھ

قبرستان کی زمین فروخت کرنا:

ایک قطعہ آراضی کے دو حقیقی بھائی مالک تھے، جن کا نام محمد حسن اور خدا بخش تھا۔ محمد حسن کی اولاد میں شریفا، نذیراً، فہم النساء، غفوری، امین الدین تھے، ان سب کا انتقال ہوگیا، ان کی اولاد میں سے بھی کوئی زندہ نہیں رہا، دوسرے بھائی خدا بخش تھے خدا بخش کی اولاد میں صرف کلوا تھے ان کا بھی انتقال ہوگیا، کلوا کی اولاد میں ننھے اور تین لڑکیاں ننھی چھوٹی منکو ہوئیں ننھے چھوٹی منکو کا بھی انتقال ہوگیا اس وقت صرف کلوا کی لڑکی ننھی زندہ ہے۔

کلوا کے لڑکے جو ننھے تھے ان کی اولاد میں عبد العزیز، عبد الصمد، شاہد حسین اور حامد حسین اور ننھے کی بیوی بسم اللہ اس وقت موجود ہیں ان کے علاوہ اور کوئی وارث نہیں ہے، ان سب کے نام پٹواری کے کاغذوں میں موجود ہیں، یہ قطعہ آراضی ان کی ذاتی ملکیت ہے، یہ قطعہ آراضی پٹواری کاغذوں میں قبرستان درج ہے، اس قطعہ آراضی کو ان وارثوں نے فروخت کیا، اسوقت اس آراضی میں کوئی قبر نہیں ہے وقف بورڈ سے بھی اس قبرستان کا کوئی تعلق نہیں ہے، نہ وقف بورڈ سے یہ

رجسٹرڈ ہے۔

نوٹ: ان مالکوں نے قبرستان کا وہ حصہ جس میں اسوقت قبریں نہیں رہیں فروخت کیا ہے قبرستان کا وہ حصہ جس میں قبریں ہیں اسے فروخت نہیں کیا ہے تو آیا ان مالکوں کو اس قبرستان کے فروخت کرنے کا کوئی حق ہے یا نہیں ہے جبکہ یہ ان کی ملکیت ہے، **مدلل** ومفصل تحریر فرمائیں۔

خلیل احمد (محلہ پہاڑی سرائے نگینہ ضلع بجنور (یوپی)

الجواب وباللہ التوفیق:

پٹواری کے کاغذ میں قبرستان درج ہونے سے شبہ ہوتا ہے کہ کہیں یہ آراضی قدیم سے قبرستان نہ ہوگا، اگر ایسا ہے تو قدیم قبرستان موقوفہ ہوتی ہے اور موقوفہ قبرستان کا بغیر وجہ شرعی کے فروخت کرنا درست نہیں (۱)، پوری تحقیق کرلی جائے، اگر موقوفہ ہوتو فروخت کرنے کی وجہ شرعی واضح کر کے سوال کیا جائے۔

اور اگر واقعۃً مملوک ہو موقوفہ نہ ہوتو مالکوں کو فروخت کرنے کا حق ہوگا حقیقت حال جو ہو اس کے مطابق عمل کیا جائے۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

نوٹ: یہ بقیہ سوال واضح نہیں ہے مرنے والوں کی ترتیب، انہوں نے مرتے وقت زندہ کس کس کو چھوڑا واضح کریں۔

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

مزار کی آمدنی:

قصبہ اُڑکی ضلع سہارنپور میں حدود ملٹری چھاونی کے اندر انگریز کے دور حکومت سے ایک شاندار مسجد ہے، انگریز کے دور میں یہاں ملٹری مسلم رہا کرتی تھی اور باقاعدہ سرکاری تنخواہ پر امام بھی رہا کرتے تھے، ۱۹۴۷ء میں وہ ملٹری یہاں سے ٹرانسفر ہوگئی، ملٹری کا اصول ہے کہ ایک جگہ چھاونی میں ایک مذہب کے اگر ۱۲۰ ماننے والے ہوتے تو ان کو ان کے مذہب کا رہبر سرکاری تنخواہ پر امام انکو مل جاتا ہے، ۱۹۴۷ء سے لیکر آج تک مسلمان یہاں پر رہتے نہیں جس سے سرکاری طور پر امام رکھ

۱- "وإذا صح الوقف لم یجز بیعه ولا تملیکه" (ہدایہ ۲/ ۶۴۰)۔

کر مسجد کو آباد کیا جا سکے، چھاونی کے اندر ہی مسجد سے تقریباً ۲ کلومیٹر کے فاصلہ پر ایک بزرگ کا مزار ہے جس پر جمعرات کو عقیدت مند لوگوں کا ایک خاص ہجوم ہوجاتا ہے جس میں ۹۵ پرسینٹ غیر مذہب کے لوگ اور ۵ فیصد مسلمان جمع ہوتے ہیں اور اس مزار کی آمد کو افسران لوگ کھا جاتے ہیں، اس وقت ایک افسر اچھے خیال کا ہے وہ مسلمانوں سے کہتے ہیں کہ اس مزار کو مسجد سے منسلک کرلو تاکہ اس کی آمدنی سے مسجد بھی آباد ہوجاوے اور یہ پیسے ادھر ادھر بھی نہ جائے، اگر اس پیسے سے امام کی تنخواہ مقرر کرکے امام رکھ دیا جائے اور مسجد آباد ہوجاوے تو شرعی رو سے جائز ہے، اخراجات مسجد تو حکومت کی طرف سے پورے ہوتے ہیں جیسا کہ چھاونی کے اندر مندر ہے اور گوردوارہ ہے انکا خرچ حکومت کے ذمہ ہے اور پنڈت کو اور گیتانی جو گرودوارہ کے اندر ہے حکومت تنخواہ دیتی ہے کیونکہ جوانوں کی تعداد پوری رہتی ہے اس مسئلہ کا جواب عنایت فرمائیں۔

الجواب وبالله التوفيق:

مزار کی آمدنی کی بہت سی صورتیں ہوتی ہیں مثلاً:

۱-حیوان، بکرا، مرغا، بھینس وغیرہ کو مزار پر ذبح کرنے کے لئے لاتے ہیں اور وہ وہیں ذبح کردیئے جاتے ہیں، انکے حلال وجائز استعمال ہونے کی کوئی صورت نہیں ہوتی وہ مردار اور میتہ کے حکم میں ہوجاتے ہیں، ان کا اصلی مالک یا کوئی بھی مفت دے یا بیچ کردے ان کا خریدنا کھانا جائز نہیں (۱)۔

۲-حیوان کو مزار پر ذبح کرنے کے لئے لاتے ہیں مگر مجاور وخادمین ذبح نہیں کرتے بلکہ کسی حیلہ بہانے سے نظر بچا کر فروخت کردیتے ہیں، انکا حکم یہ ہے کہ ان کے اول واجبی مالک اگر تائب ہوکر اپنے عقیدہ کی اصلاح کرلیں اور اس جانور کو واپس لے لیں تو ان کا کھانا وغیرہ سب جائز ہوجاتا ہے اور اگر تائب نہ ہوں تو ان سے یا مجاورین وغیرہ کسی سے اس کو خریدنا اور کھانا ہرگز جائز نہ ہوگا۔

۳-وہ حیوان جن کو مزار پر ذبح کرنے کے لئے نہیں لاتے بلکہ بہ نیت تقرب لصاحب المزار لاکر مجاور وغیرہ کو بطریق ھبہ وتملیک دیدیتے ہیں اور اس سے ان لانے والوں کا مقصود صاحب مزار کے لئے ذبح کرنا کرانا نہیں ہوتا بلکہ صرف وہاں کے مجاورین میں غریبوں کو نفع پہنچانا ہوتا ہے، اس کا حکم یہ ہے کہ اگرچہ ایسا فعل کرنا ناجائز کہا جائے مگر جس کو ھبہ وتملیک کرکے دیدیا جاتا ہے اس سے خریدنا لینا اور استعمال کرنا سب جائز رہے گا۔

۱- "إنما حرم عليكم الميتة والدم ولحم الخنزير وما أهل به لغير الله" (سورۃ البقرۃ ۱۷۳)۔

۴- وہ مٹھائیاں و چادر وزیورات وغیرہ جس کو مزار پر چڑھا دیتے ہیں اس کا حکم یہ ہے جب تک لانے والا تائب ہوکر اپنے عقیدہ کی اصلاح کر لے اور اس نذر کو باطل کر کے ان چیزوں کو واپس نہ لے لیں ان کا خریدنا لینا کھانا وغیرہ سب حرام وناجائز رہے گا، ہاں اگر تائب وغیرہ ہوکر واپس لے لیں تو ان کو لینا کھانا وغیرہ سب درست ہوجاوے گا غرض اس نمبر کا حکم بالکل ۲- کا ہوگا۔

۵- وہ مٹھائیاں چادریں وزیور ونقد وغیرہ لاکر مزار پر چڑھاتے ہیں بلکہ بہ نیت تقرب لصاحب مزار وہاں کے غریبوں یا مجاوروں وغیرہ کو بطور ھبہ وتملیک دیدیتے ہیں اس کا حکم ۲- کا ہے جن کو بطریق ھبہ تملیک دے دیا ہے، ان سے لیکر یا خرید کر استعمال کر سکتے ہیں اور اگر چہ ان کا یہ فعل شرعاً صحیح نہ ہو یہ الگ بات ہوگی، ان تمام مذکورہ صورتوں میں کسی شرط کے ساتھ انتفاع ممکن بھی ہے، ان میں مذکورہ بالا طریق پر صاحب حق کی اجازت ومرضی سے یا ان کی بلا اجازت ومرضی لینا اور استعمال کرنا ہرگز درست نہیں اور صورت مسئولہ میں صاحب حق کی اجازت مرضی کے بغیر محض حکام کے دباؤ وجبر سے لے کر استعمال کرنا ہے اس کا جواز شرع میں نہیں ہے خاص کر مساجد کے لئے مساجد پر تو نہایت صحیح پاکیزہ پیسہ لگانا ضروری ہے۔ اس لئے مذکورہ مسئولہ صورت کا جواز شرعاً بالکل نہیں نکلتا ہے، ہاں اگر اس مزار سے متعلق کچھ دکانیں ہوں جنکا کرایہ آتا ہو یا کچھ کمرے ہوں اور ان سے کرایہ آتا ہو یا کرایہ آنے کی کوئی صورت نہ نکل سکے اور نکال لیجائے تو ان رقوم کو لیکر مسجد کے امام کی تنخواہ میں بھی لا سکتے ہیں اگر مزار سے متعلق کچھ دوکانیں یا کمرے وغیرہ ایسے نہ ہوں جن سے کرایہ آسکتا ہو تو چونکہ سوال میں مذکور ہے کہ مسجد کے اخراجات حکومت پورے کرتی ہے اس لئے لے دے کر صرف امام کی تنخواہ کا معاملہ رہ جاتا ہے اس کو چندہ وغیرہ دوسری جائز صورتوں سے پورا کر کے مسلمان خود امام وموذن مقرر کر کے نماز جماعت کا انتظام کرلیں اور یہ امر مسلمانوں پر بیشک حسب استطاعت لازم وضروری رہے گا، اس معاملہ کے بعض مسائل وبعض نمبروں سے متعلق پوری تحقیق وتفصیل فتاوی دارالعلوم دیوبند جلد ہفتم وہشتم کے جز امداد المفتیین میں بھی مذکور ہے، اس میں حضرت مولانا تھانوی، حضرت مفتی کفایت اللہ صاحب اور حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب قدس سرہ کے مستقل فتاوے درج ہیں اور سب مضامین بھی نہایت مکمل ومدلل ہیں جناب بھی عالم ہیں مراجعت کرلیں بڑی بصیرت پیدا ہوگی، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۹/ ۳/ ۱۴۰۴ھ

الجواب صحیح عبدالحق قاسمی دارالعلوم دیوبند

كتاب الأيمان والنذور

کتاب الأیمان والنذور

شراب نہ پینے کی قسم کھانے کے بعد شراب پی لینے کا حکم:

ایک شخص شراب پیتا تھا، اس نے بعد میں قرآن شریف کی قسم کھائی کہ میں قرآن شریف کی قسم کھاتا ہوں کہ میں شراب نہیں پیئوں گا۔ قسم کے بعد وہ شخص پھر شراب پینے لگا اب وہ اپنے گناہ کا کفارہ ادا کرنا چاہتا ہے تو کفارہ ادا ہوسکتا ہے یا نہیں اور ہوسکتا ہے تو کس طرح؟

الجواب وباللہ التوفیق:

جب شراب نہ پینے کے لئے قسم کھائی تھی اور پھر شراب پی لیا تو قسم ٹوٹ گئی اور قسم توڑنے کا کفارہ دینا واجب ہوگیا اور قسم توڑنے کا کفارہ یہ ہے کہ دس مسکین کو بھر پیٹ دونوں وقت کھانا کھلائے، یا دس مسکین کو ایسا کپڑا پہنا دے جس میں نماز پڑھی جا سکے اور اگر غربت وناداری کی وجہ سے ان دونوں باتوں پر قدرت نہ رہے تو مسلسل تین دن روزر کھے یہ حکم تو قسم توڑنے پر کفارہ کا (۱) ہے اور جب پھر شراب پینے لگا ہے تو اس پر شراب پینا چھوڑ دینا واجب ہے اور جو پی چکا ہے اس پر توبہ واستغفار کرنا واجب ہے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۴۰۳/۶/۲ھ

منت کے روزوں کا حکم شرعی؟

میری صاحبزادی مسماۃ صبیحہ خاتون جب ہائی اسکول کا امتحان دے رہی تھی تو اس نے منت مانی تھی کہ امتحان میں

۱- "فکفارته إطعام عشرة مساكين من أوسط ما تطعمون أهليكم أو كسوتهم أو تحرير رقبة فمن لم يجد فصيام ثلاثة ايام، ذالک كفارة ايمانكم إذا حلفتم واحفظوا أيمانكم كذالک يبين الله لكم آياته لعلكم تشكرون" (سورۂ مائدہ ۸۹)۔

کامیاب ہونے پر (۵۵) روزے رکھوں گی، چنانچہ وہ پاس ہوگئی مگر اس نے اب تک صرف آٹھ روزے رکھے ہیں، باقی روزے ابھی پورے نہیں کر پائی تھی کہ وہ اتنے میں اونچے درجہ ۱۱ ر میں پہونچ گئی اور دو سال انٹر میں پڑھتی رہی، اس مدت میں بھی وہ منت کے روزے پورے نہ کر سکی، انٹر کا آخری امتحان دیا مگر اس میں فیل ہوگئی، اب تکمیل کے روزے ہائی اسکول کے باقی ہیں، اس میں اس نے منت روزوں کی تکمیل شروع کی ہے مگر شاید پورے نہ کر سکے، کیونکہ پوزے مین کا امتحان ۱۶ اپریل ۱۹۷۱ء سے شروع ہو رہا ہے۔

اس صورت میں ان باقی ماندہ روزوں کی تلافی صدقہ اور خیرات سے ہو سکتی ہے؟ خیرات دینے کے بعد بھی اس کی پکی نیت روزے رکھنے کی ہے، اگر تلافی ہو جائے تو کس قدر اور کس طرح ہو؟ نیز تحریر فرمائیں کہ فی روزے کتنی خیرات کرنے سے تلافی ہو جائے گی، آیا نقد صدقہ وخیرات سے مساکین کو کھلانا بہتر ہے اور فی مسکین کس قدر صدقہ وخیرات دے، نیز ہر مسکین کو دونوں وقت کھلانا ضروری ہے یا صرف ایک وقت؟

الجواب وبالله التوفيق:

منت کے روزوں کا بدل فدیہ نہیں ہوتا وہ تو رکھنے ہی ہوں گے، چونکہ کسی زمانہ یا مدت کے ساتھ محدود نہیں، اس لیے موت سے پہلے جب بھی روزے رکھ لیں گی ادا قرار دیئے جائیں گے، بے وجہ شرعی تاخیر سے برائی اور اسائت طاری ہوگی، فدیہ تو صرف فرض رمضان کے روزوں کے بدلے میں شیخ فانی کے لیے ہے اور ان لوگوں کے لیے ہے جو حکم میں شیخ فانی کے ہوں، اس پر دوسرے روزوں کو قیاس نہیں کر سکتے ہیں، لہذا منت کے ان روزوں کے بدل میں قیمت وغیرہ کوئی چیز کافی نہ ہوگی، خیرات وغیرہ کرنے کے بعد بھی اس منت کو پورا کرنا اور روزے ہی رکھ کر پورا کرنا واجب ہے، ہاں اب سے ہی حسب موقع واستطاعت روزے رکھنا شروع کر دیں اور آئندہ حسب موقع واستطاعت روزے رکھنے کا عزم وتہیہ کر لیں، کبھی بیماری وغیرہ عوارض کی وجہ سے جو تاخیر ہوگی وہ قابل معافی اب بھی ہو سکے گی۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دار العلوم دیوبند سہارنپور
الجواب صحیح سید احمد علی سعید مفتی دار العلوم دیوبند

نذر کے روزہ کو پورا کرنے کی صورت:

ایک شخص نے منت مانی کہ میرا فلاں کام ہو جائے تو میں ایک سال تک روزے رکھوں گا جب کام ہو گیا تو وہ صرف

دوماہ کے روزے رکھ سکا اب کاروبار کی وجہ سے ہمت نہیں تو اس منت کا پورا کرنا واجب ہے یا نہیں، اگر واجب ہے تو ۱۰ ماہ کے روزے کا فدیہ کس حساب سے رہے گا؟

الجواب وباللہ التوفیق:

منت کرنے والے کا یہ قول کہ (میرا فلاں کام ہوجائے گا تو میں ایک سال روزے رکھوں گا) اس قول کے مطابق جب اس کا وہ کام ہوگیا تو فوراً روزے شروع کردینا واجب تھا، اگر اس نے منت ماننے میں یہ نیت کی کہ مسلسل رکھوں گا تو ایک سال تک کا مسلسل روزہ واجب بالنذر ہوگیا اور ظاہر ومتبادر بھی اس قول کا یہی ہے، اس صورت میں اگر اس نے دوماہ روزہ رکھ کر ہمت چھوڑ دیا اور روزہ ختم کردیا تو حانث ہوگیا۔ اب اس کی قضاء ایک سال روزے کی مسلسل رکھنا واجب ہے زندگی میں جب بھی قضاء کرے لیکن جہاں تک جلدی ہوسکے رکھ ڈالے اگر نہ رکھے گا اور فوت ہوجائے گا تو گنہگار رہوگا محض کاروبار کی وجہ سے ہمت نہ ہونا یہ کوئی عذر نہیں ہے اس میں کچھ شرطیں ہیں جو آگے آتی ہیں، ہاں اگر بیمار ہوجاوے اور قوت روزہ رکھنے کی نہ رہ جائے اور موت کا ظن غالب اس حالت میں ہوجائے یا اتنا بوڑھا ہوجائے کہ بتقاضہ عمر طبعی قوت سلب ہوجائے تو فدیہ کی وصیت کرنا واجب ہوگا، ابھی فدیہ کا کوئی محل نہیں اور نہ گنجائش ہے اور اگر منت مانتے وقت ایک سال تک مسلسل روزے کی نیت نہیں کی تھی بلکہ یہ نیت کی تھی کہ ایک سال تک جتنا ہوسکے گا رکھوں گا تو ایک سال کے اندر جتنے روزے کی طاقت ہو رکھ لے ایک سال کے بعد قسم پوری ہوجائیگی اور کفارہ وغیرہ کچھ لازم نہ آئے گا، لیکن معاملہ اللہ تعالیٰ سے ہے خوب سوچ لے کہ اس کی کیا نیت تھی، کیونکہ یہ ظاہر کے خلاف ہے، کاروبار میں یہ شرط وتفصیل ہے کہ اگر کاروبار کرنے پر مضطر ہو مزدوروں نوکروں سے بھی کام نہ چلے اور نہ سرمایہ ہی ہو کہ بیٹھ کر اتنے دن گذارے غرض ہر طرح کوئی صورت نہ ہو تو روزے موخر کرے اور جب قدرت ہو قضاء کرے اور فدیہ کا وہی حکم ہے جو اوپر گذرا۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۲/ ۸/ ۱۳۸۵ھ

عہد توڑنے کا کفارہ:

محلّہ کی مسجد کے متولیین سابقین کے احوال کو دیکھ کر محلے والوں نے ایک ایسے آدمی کو متولی بنادیا جو نیک طبیعت دیانتدار ہے جس نے مسجد کی آمدنی بڑھائی اور دکانیں بنوائی بڑی دلچسپی سے کام کیا مگر کچھ لوگوں نے اعتراض اٹھایا جس سے

موصوف کی طبیعت اس کام کرنے سے کٹ گئی ہے اور انہوں نے بالکل ارادہ کرلیا ہے کہ وہ اس کام سے سبکدوش ہوجائے گا، چنانچہ انہوں نے اعلان بھی کردیا ہے کہ میں اس کام سے علیحدہ ہورہا ہوں، اس اعلان سے لوگوں کو ازحد رنج ہوا اور بضد رہے کہ یہ کام آپ ہی کو کرنا ہے، انہوں نے کہا کہ میں نے پختہ عہد کرلیا ہے میں اپنا عہد کیسے توڑ سکتا ہوں، ایسی صورت میں جب لوگوں کی نظر ان کی طرف ہے اور اعتراض کرنے والا سامنے نہیں آتا ہے اور دوسرے کے متولی بنجانے میں مستقبل اچھا نظر نہیں آتا ہے، ان تمام حالات کے پیش نظر موصوف کے اپنے عہد کے توڑ دینے میں کوئی جرم کی بات تو نہیں ہے؟

الجواب وبالله التوفيق:

موجودہ صورت میں متولی کے لئے حکم شرعی یہ ہے کہ اگر قسم کھا چکے ہوں تو قسم توڑ کر قسم کا کفارہ ادا کریں(۱) اور کام سنبھالیں ان پر کوئی گناہ نہ ہوگا بلکہ ثواب ملے گا، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند، سہارنپور ۲۹/۹/۸۵ ۱۳ھ

الجواب صحیح سید احمد علی سعید نائب مفتی دارالعلوم دیوبند

۱- "والقسم ایضا بقوله: أقسم أو أحلف أو أعزم" (ردالمحتار ۵/۴۸۹، مکتبہ زکریا)۔

باب الحدود

محصن کی کیا سزا ہے؟

شادی شدہ ہونے کے باوجود ایک شخص کی بیوی سے صحبت کر بیٹھا، اب اس کی سزا یا توبہ کا طریقہ بتلائیں اور اس مرد کی بھی اور اس عورت کی بھی دونوں کی کیا سزا ہے؟

الجواب وبالله التوفيق:

ایسے جرم کی سزا بھی آپ خوب جانتے ہوں گے کہ رجم اور توبہ ہے، لیکن رجم کا حق محض حکومت اسلامیہ کو ہے اور کسی دوسرے کو نہیں ہے(۱)، اب آپ آئندہ نہ کرنے کا عزم بالجزم کرتے ہوئے جہاں تک ہو سکے اللہ تبارک وتعالیٰ شانہ کے روبرو انتہائی ندامت وعجز ونیاز کے ساتھ توبہ واستغفار کریں اور دونوں آپس میں قوی پردہ کریں کہ کسی وقت بھی ایک دوسرے کے سامنے نہ آئیں اور نہ کسی قسم کا اختلاط رکھیں، یہی حکم دونوں کے لئے ہے اور احتیاط تو اس میں ہے کہ اگر دونوں ایک مکان میں رہتے ہوں یا ایسے دو کمرے یا مکان میں رہتے ہوں کہ اختلاط یا تنہائی کا موقع آجاتا ہو تو بھی دونوں جدا جدا دور دور مکان میں رہائش اختیار کرلیں، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۹/۷/۱۳۸۵ھ
الجواب صحیح محمود عفی عنہ، سید احمد علی سعید مفتی دارالعلوم دیوبند

۱- "(والزنا) الموجب للحد (وطئ) مكلف ناطق طائع في قبل مشتهاة......في دار الإسلام" (تنویر الابصار علی ہامش ردالمحتار ۶/۵)۔

زنا کی سزا محض مزنیہ کے والد سے معافی مانگنے سے معاف نہیں ہوگی:

زید نے زنا کیا عمر کی لڑکی سے، جب لوگوں نے بلاکر اس سے پوچھا تو اس نے انکار کردیا، لیکن یہ حقیقت ہے کہ اس نے یعنی زید نے عمر کی لڑکی سے زنا کیا، اور پھر اس نے خفیہ طریقہ سے لڑکی کے باپ سے معافی مانگا۔ اگر لڑکی کا باپ اسے معاف کردے تو کیا معاف ہوجائے گا؟

الجواب وبالله التوفيق:

زنا کا گناہ محض مزنیہ کے باپ سے معافی مانگ لینے سے یا محض اس کے معاف کردینے سے معاف نہ ہوگا، بارگاہ رب العزت میں انتہائی عجز و نیاز وندامت کے ساتھ اقرار جرم کرتے ہوئے اور آئندہ نہ کرنے کا عزم کرتے ہوئے توبہ و استغفار کرنے اور اللہ رب العزت سے معافی مانگنے سے ہوگا ''الحد شرعا عقوبة مقدرة وجبت حقا لله تعالى زجرا فلا تجوز الشفاعة فيه''(۱)۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۴/ ۸/ ۸۵ ۱۳ھ

غیر شرعی طریقہ پر اپنی خواہش کی تکمیل:

زید کی عمر ۲۰ سال کی ہے، پانچوں وقت کی نماز جماعت کے ساتھ پڑھتا ہے، رمضان کے پورے روزے بھی کئی سال سے رکھ رہا ہے، بچوں کو مدرسہ میں قرآن کریم کی تعلیم بھی دیتا ہے، کسی حد تک بدعت سے بھی بچتا ہے، حلال وحرام کی بھی تمیز ہے، غلط رسموں کی وجہ سے اس کے ماں باپ اس کی شادی نہیں کرتے ہیں، کیونکہ اس کے بڑے بھائی اور بہن کی بھی شادی نہیں ہوئی ہے، زید اپنی شہوت اپنے شاگردوں سے پوری کرتا ہے جس میں لڑکے اور لڑکیاں دونوں شامل ہیں اور فوراً ہی شہوت کو پورا کرنے کے لئے کبھی کبھی مشت زنی بھی کرتا ہے، کبھی کبھی جانوروں سے بھی اپنی خواہش پوری کرلیتا ہے، ان تمام باتوں کا علم یا تو وہ خود جانتا ہے یا اس کا خدا، زید اسلامی سزا لینے کے لئے تیار ہے، اب اس نے سچے دل سے ان تمام باتوں سے توبہ کرلی ہے، لیکن اکثر یہی ہوتا ہے کہ وہ صدق دل سے توبہ کرتا ہے لیکن موقع آنے پر وہ اپنے اقرار پر قائم نہیں رہتا ہے، لوگ نماز پڑھانے کے لئے اکثر کھڑا کردیتے ہیں، کیونکہ کسی حد تک وہ صحیح کلام پاک پڑھتا ہے، آپ فرمائیے کہ اس کو نماز

۱- الدر مع الرد ۶/ ۳

پڑھانا چاہئے یا کہ نہیں، نفسانی خواہش ابھرے تو زید کو کیا کرنا چاہئے، نفلی روزے رکھنے کے لئے اس کے والدین اس کو منع کرتے ہیں۔

الجواب وبالله التوفيق:

آپ تو ماشاء اللہ پڑھے لکھے بھی ہیں اور آخرت کی سزاؤں کا تصور بھی رکھتے ہیں پھر گناہ میں مبتلا ہو جاتے ہیں، زنا کی شرعی سزا سو کوڑے ہیں، "الزانية والزاني فاجلدوا كل واحد منهما مائة جلدة" (۱) ان کے علاوہ ذرا سوچئے کہ یہ لڑکے اور لڑکیاں جب بڑی ہو جائیں گی اور آپ سے ملاقات بھی ہوگی اور آپ بوڑھے ہو چکے ہوں گے، اس وقت آپ پر کیا گذرے گی، کس قدر ندامت ہوگی جن سے آپ یہ باتیں کرتے ہیں سب اس فعل کے بعد مر تو نہ جاتے ہوں گے اور نہ مرنا ضروری ہی ہے، علاوہ ازیں جہنم کی آگ منتظر کھڑی ہے، نیز قیامت کے میدان میں یہ سارے جرم کرتے ہوئے دیکھائے جائیں گے اور سارا عالم برملا دیکھے گا اس وقت آپ کا کیا حال ہوگا؟ جناب رسول اللہ ﷺ اور تمام صحابہ کرام اور تمام مومنین مومنات اور خود آپ کی ماں بہن باپ بھائی سب اس طرح کرتے ہوئے اس فعل کو وہاں دیکھیں گے جس طرح یہاں دیکھ سکتے ہیں پھر اس چھپانے سے کیا فائدہ اور ایسی حالت میں آپ پر واجب بلکہ فرض ہے کہ اپنی شادی آپ خود کہیں کرلیں، ماں باپ کی اطاعت اس معاملہ میں اور اس حال میں آپ پر لازم نہیں ہے، بلکہ اس جرم کے ساتھ اطاعت میں آپ گنہگار ہورہے ہیں، "لاطاعة لمخلوق في معصية الخالق" رواہ شرح السنن (۲)۔

آپ قطعاً ماں باپ کی نافرمانی کا لحاظ اس حالت میں نہ کیجئے اور نکاح فوراً کرلیجئے اور تمام جرموں سے باری تعالیٰ عزاسمہ کی دربار میں صدق دل سے توبہ کرلیجئے اور ماں باپ کو اولاً نکاح کے لئے راضی کرلینے کی کوشش کریں تو بہتر ہے ورنہ خود کرلیجئے، البتہ ماں باپ کا احترام برابر قائم رکھئے اور جب تک آپ نکاح نہ کریں نماز پڑھانے سے پرہیز کریں، سکون شہوت کے لئے نکاح جلد سے جلد کرلینا آپ پر فرض ہے (۳)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۲/۱۰/۱۳۸۵ھ

الجواب صحیح محمود غفی عنہ مفتی دارالعلوم دیوبند

۱- سورۂ نور ۲۔

۲- مشکوٰۃ/۳۲۱۔

۳- "ویکون واجبا عند التوقان فان تیقن الزنا الا به فرض" (الدرالمختار علی ردالمحتار ۴/۶۳)۔

كتاب المعاملات

کتاب المعاملات

پرچوں کے معمے حل کرکے انعام لینا کیسا ہے؟

آج کل بعض پرچوں میں معمے آتے ہیں، جن کو بھر کر بھیجنے کے بعد صحیح نکلنے پر انعامات دیئے جاتے ہیں، اور ان کو بھرنے کے لئے صرف فیس بھیجنا ہوتی ہے، اس طرح معمہ کا حل کرنا اور اس کا انعام لینا شرعا درست ہے یا نہیں؟

الجواب وباللہ التوفیق:

یہ معمہ بلاشبہ قمار پر مشتمل ہوتا ہے، جتنے لوگ فیس بھرتے ہیں ان سب کو انعام نہیں ملتا، بلکہ صرف بعض کو ملتا ہے اور بقیہ پیسہ بھرنے والوں کا پیسہ ڈوب جاتا ہے واپس نہیں ملتا، یہی قمار ہے قرآن پاک میں قمار کی ممانعت موجود ہے، کما قال اللہ تعالیٰ: "إنما الخمر والمیسر والأنصاب والأزلام رجس من عمل الشیطان" (۱) قمار شیطانی ناپاکی ہے اس سے ہر مسلمان کو بچنا واجب ہے (۲)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۱/۶/۱۴۱۱ھ
الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ، محمد ظفیر الدین غفرلہ

۱- سورۂ مائدہ: ۹۰۔

۲- قمار کے علاوہ کئی مفاسد اور پائے جاتے ہیں: (۱) انعام کا ملنا یقینی امر نہیں ہے لہٰذا یہ ناجائز ہے "تعلیق الاملاک بالاخطار باطل" (قواعد الفقہ ص ۷۱)، (۲) انعام ملنے کی صورت میں ایک روپیہ کے بدلے بہت سے روپے ملتے ہیں اس لئے ربا ہے (۳) درحقیقت یہ انعام معمہ حل کرنے کی اجرت ہے مگر مطلقاً نہیں بلکہ حسب منشا مستاجر ہو جس کا اجیر کو علم نہیں اور ایسا اجارہ جس میں اجیر کو عمل معلوم نہ ہو، نہ ہی اس کے قابو میں ہو شرعاً فاسد ہے: "قال في المبسوط لا بد من أعلام مايرد عليه عقد الإجارة على وجه ينقطع به المنازعة ببيان المدة والمسافة والعمل ولابد من أعلام البدل" (فتاویٰ شامی ۵/۴) (۴) ظاہر ہے کہ انعام دینے والوں کا مقصود محض خانہ پری نہیں، نہ ہی اس سے کوئی خاص غرض وابستہ ہے بلکہ مقصود یہ ہے کہ ایک ایک روپیہ کرکے بہت سے روپے جمع ہو جاتے ہیں اس لئے یہ بھی اجارۂ فاسدہ ہے: "هي تمليك نفع مقصود من العين بعوض حتى لو استاجر ثيابا أو اواني يستعمل بها (إلى قوله) فالإجارة فاسدة في الكل ولا أجر له لأنها منفعة غير مقصودة من العين" (الدر المختار مع الشامی ۵/۳) (مرتب)۔

شیئر زسے متعلق چند اشکالات :

نظام الفتاویٰ میں کمپنی کے شیر ز کے متعلق آں جناب کا تحریر فرمودہ فتویٰ نظر سے گذرا، اس جواب میں آنجناب نے جوحوالہ قرطاس فرمایا تھا اس سے مندرجہ ذیل امور ناظرین کو بادی النظر میں متصور ہوتے ہیں:

اول یہ کہ شیئر ز دراصل حصوں کا نام ہے اور جب حصے بولے جاتے ہیں تو تبادرفہمی سے شرعی شرکت کے حصے سمجھ میں آتے ہیں۔

دوسرے یہ کہ مالک شیئر ز اپنے شیئر ز کے مطابق کمپنی کا حصہ دار اور مالک ہوتا ہے اور کمپنی کے راس المال وسامان، اثاثہ وغیرہ سب چیزوں کا حسب شیئر ز مالک ہوتا ہے۔

تیسرے یہ کہ شیئر ز کا خریدنا بیچنا ان حصوں اور ان میں داخل شدہ چیزوں کا خریدنا و بیچنا شمار ہوتا ہے۔

چوتھے یہ کہ شیئر ز کی قیمت میں کمی بیشی تو کمپنی کے سرمایہ وسامان وغیرہ کی قیمت کی کمی بیشی کے اعتبار سے ہوتی ہے۔

اگر واقعتاً کمپنی کے شیئر ز کے سلسلہ میں امور بالا متحقق تھے تو پھر اشکال کی گنجائش نہ تھی، لیکن مقننین اور ان کی کتابوں سے تحقیق کرنے پر، نیز تعامل ناس اور عرف عام کو ملاحظہ کرنے سے شیئر ز کی حقیقت کچھ اور نکل آئی جو حضرت مفتی صاحب کی پیش کردہ تفصیل سے کافی متغایر ہے، لہذا آں حضرت کی خدمت میں مؤدبانہ گذارش ہے کہ آنے والی تفصیل پر پھر معاملہ شیئر ز کو ملاحظہ فرمائیں، یہ تفصیل ہماری معلومات کا خلاصہ ہے جو ہم نے شیئر ز کے متعلق کی ہے۔

جن جن فقہاء کرام نے جواز کا فتویٰ دیا ہے ان میں مستند صرف یہی تھا کہ شیئر ز کمپنی کے حصص کا نام ہے اور یہ شرعی شرکت کی طرح ہے، پس شیئر ز کا معاملہ جائز ہوگا'' **لکن التالی باطل فالمقدم مثلهٗ، و أیضا بناء الفاسد علی الفاسد**" چنانچہ کتب اقتصادیات قوانین کمپنی کے مطابق شیئر ز ایک اصطلاحی لفظ ہے۔ لغۃ (انگریزی زبان میں) اس کے معنی حصص کے ہیں، لیکن اصطلاحاً کمپنی وقانون کفار میں شیئر ز نام ہے حقوق مجردہ کے مجموعہ کا۔ ان حقوق میں سے دو سب سے اہم ہیں، ایک کمپنی کے جلسوں وشوریٰ کی میٹنگ میں ووٹ کرنے کا حق، دوم منافع ——— مستقبل میں حصہ کا حق، یہ در اصل ایک بیع ہے جس میں یہ حقوق مبیع کے طور پر بیچے جاتے ہیں خریدنے والے کو شیر ز ہولڈر (انگریزی میں) یعنی شیر دار یا حصہ دار کہتے ہیں۔ سمجھانے کے لیے آں حضور کی خدمت میں یہ احقر اس معاملہ کے آغاز وابتداء کی تفصیل پیش کرتا ہے، یہ بھی کمپنی کی اقتصادی کتب سے متخرج ہے:

شروع میں ایک کمپنی قائم کرنے کے ارادے سے چندلوگ جمع ہوئے اور اس کمپنی کے ذریعہ سے مثال کےطور پر کپڑے کی تجارت کرنا چاہتے ہیں، لیکن ان کے پاس پیسہ ایک بھی نہیں، اور کمپنی قائم کرنے کے لیے پھر اس کمپنی کے واسطے سے کاروبار جاری کرنے کے لیے پیسے کی ضرورت ہے کما ہوظاہر، پس تحصیل فلوس کے لیے یہ چندلوگ اعلان کرتے ہیں کہ ہم کپڑے کا کارخانہ کھولنا چاہتے ہیں کمپنی کی شکل میں، اور اس کمپنی کے مثلاً ایک لاکھ شیئرز بیچتے ہیں، دس روپیہ فی شیر، اعلان کے بعدلوگ شیئرز خرید نے لگتے ہیں، یہاں تک کہ وہ لاکھ شیئرز بک گئے جس نے بھی رقم دے کر ایک یا زیادہ شیئرز خریدا ہے اس کی ملک سے رقم نکل کر کمپنی کی ملکیت بن جاتی ہے، اب واپسی کا سوال ہی نہیں، لیکن رقم دے کرعوض میں حقوق مل گئے، وہی حقوق جن کو اصطلاح میں شیئرز کہا جاتا ہے اورمن جملہ ان حقوق کے ایک مستقل نفع بھی ہے، اس عقد میں مبیع وہی نفع تھا جو فقط زمانہ مستقبل میں وصول ہوگا، کیونکہ یہ لوگ شیئرز کے بیچنے میں ملی ہوئی رقم سے اب کارخانہ کھول کرتجارت کریں گے، تجارت کر کے جونفع حاصل ہوگا وہ شیئرز دار کو ملے گا، اور ظاہر ہے کہ یہ زمانہ مستقبل میں ہی ہوگا، یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ روپیہ دے کرعوض میں بصورت بیع روپیہ لیتے ہیں، لیکن علی طریق النسئیہ، بہرحال ہر مشتری شیئرز کو ایک رسید ملتی ہے جن کو ان کی اصطلاح میں سند کہتے ہیں، اس رسید پر شیئرز دار کا نام وعدد شیئرز مرقوم ہوتی ہے اور یہ شہادت ہے اس بات پر کہ مالک شیئرز مستقل منافع کا مستحق ہے، اب وہ کمپنی جدید قائم شدہ قانون حکومت کی نظر میں ایک قانونی شخص کی حیثیت رکھتی ہے، اب وہ مستقل ذات ہے، مالک اس کا کوئی نہیں بلکہ وہ خود اپنا مالک ہے اور جن لوگوں نے اس کمپنی کو قائم کیا ہے وہ تو محض متولین اور منتظمین ہیں، انہیں کو ارا کین کمپنی سے تعبیر کرتے ہیں، وہ کمپنی کے مالک نہیں ہیں، نہ کمپنی کے کوئی جزء ان کی ملک میں داخل ہیں، تنخواہ کمپنی کے سرمایہ سے لے کر یہ لوگ کمپنی کے انتظام وکاروبار جاری کرتے ہیں، ان ارا کین میں سے بعض خود شیئرز دار بھی ہوتے ہیں، ان لاکھ شیئرز کو بیچ کر جو دس لاکھ (مثلاً) روپیہ جمع ہوئے وہ سب کمپنی کے ذاتی سرمایہ بن گئے شیئرز داران اور ارا کین کو (بجز اپنی تنخواہ کے) کوئی حق اس میں نہیں ہے، لہٰذا کمپنی کے مختار خود ہونے پر یہ ثمرے ظاہر ہوتے ہیں کہ کاروبار کے سلسلے میں جو دین لازم ہوتے ہیں، ان کے لیے ذمہ دار خود کمپنی ہے نہ کہ شیرز داران یا منتظمین، ان سے کمپنی کے دین کا مطالبہ نہیں کیا جا سکتا، پس اگر کمپنی ٹوٹ جائے (اور یہ کثیر الوقوع ہے) تو قرض خواہوں کو اپنے دین کے نقصان اٹھانے پڑیں گے، اگر کمپنی کے سرمایہ میں ادائیگی دین کی استطاعت ہو تو اسی سے ادا کیا جائے گا ورنہ نہیں، منتظمین، ارا کین، شیئرز دار وغیرہ سے طلب نہیں کیا جائے گا، اس لیے کہ کمپنی ایک مستقل انسان کے مانند ہے جو بذات خود اپنے حقوق کی ذمہ دار ہے، کسی قسم کا خسارہ یا ٹوٹ کمپنی کے مال پر عائد ہوگا نہ کہ اہل شیئرز یا ارا کین کے مال پر، بعض صورتوں میں عدم استطاعت

دین کے وقت وہ قرض ودین بالکل ساقط ہوجاتے ہیں، نیز شیئر زدار وارا کین کو اپنے ذاتی معاملات میں جو دین یا قرض دینے پر لاحق ہوجاتے ہیں، کمپنی اس کی ذمہ دار نہیں، کمپنی کے سرمایہ سے نہیں لیا جائے گا، اہل شیئر زیا ارا کین خود ذمہ دار ہیں، اسی طرح اگر ارا کین میں سے کسی ایک نے کمپنی کے سرمایہ میں سے کچھ رقم نکال لی بلا اجازت کے تو عند الحکومت وہ سرقہ (چوری) کا مرتکب قرار دیا جائے گا، اور سزا کا مستحق۔ یہ سب اسی لیے ہیں کہ کمپنی ذاتی استقلال کی حیثیت رکھتی ہے، مالک اس کا کوئی نہیں۔

غرض جو رقم شیئر زیعنی مجموعہ حقوق کے بیچنے میں حاصل ہوئی اس کو منتظمین کمپنی کے کاروبار میں لگا دیتے ہیں، اب وہ رقم کمپنی کی ذاتی ملک بن گئی، وہ کمپنی کے پاس شیئر زداروں کی امانت نہیں ہے کہ جب چاہے واپس لے سکتے ہیں جیسا کہ شرکت میں ہوتا ہے، نہیں بلکہ کمپنی نے حقوق بیچ کر بذریعہ اپنے وکلاء یعنی منتظمین اس رقم کو حاصل کیا جیسا کہ مطلق بیع میں ثمن ملک بائع بن جاتا ہے۔

وقتاً فوقتاً کمپنی کے جلسے منعقد ہوتے ہیں، آج کل کی اصطلاح میں اس کو میٹنگ کہتے ہیں تو اپنے شیئر ز کی بدولت شیئر زدار بھی شریک ہوسکتے ہیں اور وہاں ووٹ کے ذریعہ کمپنی کے انتظام میں کسی قدر دخل دے سکتے ہیں، یہ تو ایک حق تھا جس کو میں نے شروع میں ذکر کیا، ان جلسوں میں تو بڑے بڑے شیئر زدار شریک ہوتے ہیں، عموماً اکثر شیئر زداران جو کم درجہ کے ہیں شریک نہیں ہوتے اور نہ ان کو ضروری سمجھتے ہیں، وہ تو فقط نفع کے درپے ہیں، تجارت کرتے کرتے ایک سال کے بعد (مثلاً) جب نفع کا جائزہ لیا جائے تو منتظمین نے دیکھا کہ پچاس ہزار کا نفع ہوا بمطابق قانون اس وقت ان کو اس نفع کا اعلان کرنے کا حکم ہے، لیکن ساتھ ساتھ یہ بھی حق رکھتے ہیں کہ اگر کمپنی کے سامان سرمایہ وغیرہ میں اضافہ کی ضرورت ہو تو ان منافع میں سے یا کل منافع کے ساتھ اضافہ کر سکتے ہیں، اگر کل منافع کا اعلان کریں تو کل میں شیئر زداران کا حق ہے، اگر بعض کا اعلان کریں تو اسی بعض معلن میں ان کا حق ہے، اور اگر کچھ بھی اعلان نہ کریں تو کسی چیز میں بھی ان کا حق نہیں، ایسی صورت میں آئندہ وقت کے منافع کے وہ مستحق ہوں گے، مثال کے طور پر پچاس ہزار میں سے دس ہزار اضافہ کمپنی کے لیے روک رکھا اور باقی چالیس ہزار کا اعلان کریں تو اس باقی کو منافع معلن کہتے ہیں، اس میں اب شیئر ز صاحبان کا حق ہے، اور اگر یوں اعلان کریں کہ پورے پچاس ہزار کو ہم نے کمپنی کے سرمایہ میں اضافہ کرنے کے لیے رکھا اور یہ برائے تقسیم نہیں ہے تو یہ منافع معلن شمار نہیں ہوتا، معلوم ہوا کہ جن منافع کا تقسیم کے لیے اعلان کریں وہ معلن شمار کیا جاتا ہے اور اس میں شیئر زدار مستحق ہیں، غیر معلن میں نہیں، یہ بھی یاد رہے کہ ایسی صورتوں میں ارا کین غداری بھی کرتے ہیں، چونکہ سب کے سب غیر مسلمان

ہیں جن منافع کا برائے تقسیم اعلان نہیں کیا گیا وہ بھی کمپنی کے ملک میں داخل ہوتے ہیں اور کسی کا حق ان پر نہیں نہ وہ کسی کی ملک رہتے ہیں (علاوہ کمپنی کے) جب بھی منافع ہوتے ہیں یہی رویہ اختیار کیا جاتا ہے، قانون کے تحت بعض دفعہ کمپنی کے قائم ہونے کے بعد منتظمین مزید شیئرز بیچنا چاہتے ہیں تو بذریعہ دلال اسٹاک ایکس چینج یعنی شیرز کے بازاروں میں ایسا ہی کردیتے ہیں، اب جو دلال سے شیئرز خریدنے والے ہیں ان کا کمپنی سے واسطہ ہی نہیں اور کمپنی کو دیکھتے تک نہیں، یہاں بھی حقوق بیچے جاتے ہیں اور ہر ایک کو رسید (سند) دی جاتی ہے۔

پھر جس نے ابتداءً براہ راست یا بالواسطہ دلال کمپنی سے شیئرز خرید لیا ہے اگر وہ چاہے تو کسی غیر سے اپنے شیئرز کو بیچ سکتا ہے، یہ بھی دلال کے واسطے سے ہوگا، اور اب مشتری ثانی کے نام رسید کٹے گی اور اسی کا نام کمپنی کے رجسٹر میں درج ہوگا، اور اب سے مشتری ثانی ہی مستقبل میں منافع معلّٰس کا حق دار ہوگا، تو یہاں بھی حقوق کی بیع ہوئی، مشتری اول کے نام کو خارج کرنے کے بعد یہ طریقہ شیئرز کی بیع وشراء عام شائع وذائع ہے اور اقتصادیات کے میدان میں یہ مسلم ومعروف ہے، ماہرین اس بات کی شہادت دے سکتے ہیں جو ان معاملات میں روز مرہ مستغرق وڈوبے ہوئے ہوتے ہیں (عرصہ دراز سے یہ معاملہ بایں طور چالو ہے جہاں میں)، اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا شیئرز دار کمپنی کے سرمایہ واثاثہ میں حصہ رکھتے ہیں یا نہیں، سو ہم اوپر بیان کر چکے ہیں کہ کمپنی کی حیثیت ایک قانونی شخص کی ہے جس کا کوئی مالک نہیں بلکہ وہ خود کا مالک ہے، یہ تمام اقتصادی اور قانونی کتابوں میں مذکور ہے صراحۃً، بلکہ یہاں تک لکھا ہے کہ یہ سمجھنا کہ شیر دار کمپنی کے راس المال وسامان میں حصہ دار ہے، محض لوگوں کی غلط فہمی ہے، ان چیزوں میں شیئرز دار بالکل شریک نہیں، شریک تو منافع مستقبل معلّٰس میں ہے (اس اعتبار سے کہ اس کو حصہ دار کہا جاتا ہے نہ اس واسطے کہ کمپنی کے راس المال یا اثاثہ میں اس کا حصہ ہے) مذکورہ بالا عبارت اقتصادیات کی ایک کتاب سے لی گئی ہیں جس کو انگریزی میں مرکنٹائل لاء کہتے ہیں، اس سے صاف ظاہر ہے کہ شیئرز والے حقیقۃً کمپنی کے حصہ دار نہیں ہیں، کمپنی کے سرمایہ واثاثہ میں کسی قسم کی ملکیت اس کو حاصل نہیں، یہی وجہ ہے کہ کمپنی کا قرض و دین شیئرز داران یا اراکین سے طلب نہیں کیا جائے گا یہ دونوں قسم کے لوگ کروڑ پتی ہی کیوں نہ ہوں، پس معلوم ہوا کہ شیئرز کا خریدنا اور بیچنا دراصل وفی الحقیقۃ کمپنی کے کسی حصہ (سرمایہ ہو یا سامان) کے خرید وبیچنے میں شمار نہیں ہے، چونکہ یہ اہل شیرز کی ملک ہی نہیں ہے۔

رہی شیئرز کی قیمت میں کمی بیشی کی وجہ سو اس میں کمپنی کے سرمایہ وسامان کو کوئی دخل نہیں، حسب ذیل متعدد وجوہ ہیں قلت وکثرت قیمت شیئرز کی۔

(۱) کمپنی کی ایسی اقتصادی حیثیت کی قوت وضعف۔

(۲) ملک یا دیگر ممالک کی سیاسی حالت۔

(۳) ملک یا دیگر ممالک کی اقتصادی ومالی حالت۔

(۴) مشتریان شیئرز کا تجربہ وعلم۔

(۵) دوملکوں کے درمیان وقوع جنگ۔

(۶) سونے کی قیمت میں تقلیل وتکثیر۔

(۷) ملک کے بڑے بڑے بازاروں میں گرانی ومہنگائی کا ظہور۔

(۸) شیرز کی بکری میں کمی زیادتی (یا مشتری کی چاہت سے زیادہ بکری یا اس سے کم)۔

یہ وجوہات خود احقر کی رائے نہیں ہیں، بلکہ معاملہ شیئرز کی قانونی کتابوں سے مستفاد ہیں، خلاصہ یہ نکلا کہ ابتداءً بائع شیئرز تو کمپنی تھی اور اراکین کمپنی کے وکلاء، شیئرز داران مشتری تھے اور مبیع تھا حقوق مجردہ کا مجموعہ، پھر جب اول مشتری شیئرز اپنے شیئرز کو فروخت کرتا ہے تو وہ بائع اور غیر جو بواسطۂ دلال خریدتا ہے وہ مشتری ثانی ہوا اور مبیع وہی حقوق مجردہ بنا، اور بدلیل "وبیع الحقوق بالانفراد لایجوز" (اشباہ تحت القاعدۃ "التابع تابع") فکذا بیع المعدوم (شامی) یہ حقوق کی بیع باطل ہوتی ہے، پس اسی بناپر معاملہ شیئرز سرے سے باطل وناجائز ہونا چاہیے۔

جواز کے لیے تاویل شرکت کی گنجائش نہیں ہے کہ اس میں شرائط عقد شرکت (ملک ہو یا عقد) سب مفقود ہیں، کما لایخفیٰ علی مثلکم العلام.

مجھے پوری امید ہے کہ بندہ کی اس تفصیل کی تصدیق وتوثیق ہندوستان میں کسی بھی قانون داں سے حاصل ہوسکتی ہے، اس لیے کہ پورے عالم میں عقود شیئرز اسی منہج پر رائج ہیں۔ جواب میں اس عریضہ کو لوٹانے کی ضرورت نہیں نقل ہمارے پاس ہے۔

سراج احمد غفرلہ (افریقی بروز چہارشنبہ ۲۱/۲/۱۴۰۳ھ جنوبی افریقہ)

الجواب وباللہ التوفیق:

پہلے چند چیزیں بطور مقدمہ پیش کی جاتی ہیں، اس کے بعد اصل مسئلہ کے متعلق عرض کیا جائے گا:

(۱)''وجاز أخذ دين على كافر من ثمن خمر بخلاف دين على المسلم لبطلانه، إلا إذا وكل ذميا ببيعه فيجوز عنده خلافا لهما''(۱)۔

(۲)''صح توكيل مسلم ذمياً ببيع خمر وخنزير وشرائهما''(۲)۔

(۳)''يكره للمسلم أن يدفع إلى النصراني مالا مضاربة وهو جائز في القضاء''(۳)۔

(۴)شرکت مفاوضہ کے علاوہ اور عقود شرکت کا معاملہ، نیز کفالت وحوالہ وغیرہ کا معاملہ یہ سب غیر مسلم کے ساتھ صحیح ومباح ہیں، ان سب کے ماخذ کتب فقہ میں مذکور ہیں۔

(۵)''وإذا خلط الوكيل دراهم الربوا بعضها ببعض الدراهم التي أخذها من حلال يجوز أخذ الربح منها لكون الخلط مستهلكاً عند الإمام لاسيما إذا كان الوكيل كافراً، لا سيما والتقسيم مطهر عندنا، كما إذا بال البقر في الحنطة وقت الدياسة فاقتسمها الملاک حل لكل واحد أكلها مع التيقن بكون الحنطة مختلطة بالطاهر والنجس، ولكن القسمة أحدثت احتمالا في حصة كل واحد من الشركاء فحكمنا بطهارة نصيب كل واحد منهم فكذا ههنا، إذا أربى الوكيل بالتجارة وخلط الدراهم بعضها ببعض ثم قسمها على الشركا يحكم بحل نصيب كل واحد منهم''(۴)۔

(۶)''غاصب اخذ ثوبان من دار رجل فذهب وعجز صاحب الثوب عن الاسترد اد فقال له رجل يفي حتى استرده منه فباعه بثمن معلوم فجاء المشترى الى الغاصب واراد ان ياخذ الثوب وقال هو لى وكذبه الغاصب فحلف المشترى بطلاق امرأ ته ثلاثا انه قالوا لايكون حانثا لان شراء المغصوب صحيح''(۵)۔

(۷)''أى عن سمرة عن النبى صلى الله عليه وسلم، قال: من وجد عين ماله عند رجل فهو أحق به ويتبع البيع من باعه''(۶)۔

۱- درمختار علی ہامش الشامی ۵/۳۷۹۔
۲- درمختار کتاب الوکالۃ۔
۳- المبسوط ۱۲۵/۲۵۔
۴- نا قلاً عن امداد الفتاویٰ ۳/۴۹۸۔
۵- قاضی خاں علی الہندیہ ۳/ ۲۹۰۔
۶- رواہ احمد وابوداؤد والنسائی، مشکوٰۃ ۲۵۵۔

(۸) یہ سب احکام دار الاسلام کے اندر ہوتے ہیں، دار غیر اسلام میں تو بہت سے عقود فاسدہ میں فقہاء متاخرین نے توسع کیا ہے اور گنجائش دی ہے اور اس کے نظائر اکابر کے فتاویٰ میں بے شمار ہیں، اس کا اندازہ امداد الفتاویٰ، کفایت المفتی وفتاویٰ رحیمیہ وغیرہ سے بھی ہوسکتا ہے۔

(۹) دار الحرب میں مقیم مسلمانوں کو حربیوں سے ایسا مال لینا (خواہ نقد ہو یا غیر نقد) حضرت امام ابوحنیفہؒ وحضرت امام محمدؒ کے نزدیک جائز ہے، جس کو حربی اپنی رضامندی واجازت سے دیں اور چاہے وہ مال ان کو شرعی طریقہ وحکم کے مطابق حاصل ہوا ہو، یا غیر شرعی طریقہ وحکم سے حاصل ہوا ہو ہر حال میں اس کو وہ مسلمان لے سکتا ہے اور وہ لینا اس کے لیے مباح ہوتا ہے، جیسا کہ مبسوط سرخسی کی اس عبارت سے معلوم ہوتا ہے: ''وإذا دخل المسلم دار الحرب فلابأس بأن يأخذ منهم أموالهم بطيب انفسهم بأى وجه كان، لأنه إنما أخذ المباح على وجه عري عن الغدر فيكون ذالک طيبا له'' (۱)۔

(۱۰) ''ولا ربوا بين حربي ومسلم مستامن ثمه، لأن ماله ثمه مباح فيحل برضاه مطلقاً بلاعذر خلافا للثاني والثلاثة'' (۲)۔

ان مقدمات عشرہ کے بعد اب اصل مسئلہ کی حقیقت شرعیہ بیان کی جاتی ہے، پورا سوال بار بار اور بغور پڑھا، سوال کی اس عبارت (شروع میں ایک کمپنی قائم کرنے کے ارادے سے چند لوگ جمع ہوتے ہیں اور کمپنی کے ذریعہ سے کپڑے یا کسی اور چیز کی تجارت کرنا چاہتے ہیں، لیکن ان کے پاس کمپنی قائم کرنے کے لیے پیسہ نہیں ہوتا، تو شیئر یعنی حصے بیچتے ہیں اور لوگ اعلان کے بعد خریدنے لگتے ہیں الخ) سے معلوم ہوتا ہے کہ حصے (شیئر) خریدنے والے کمپنی ہی کا حصہ خریدتے ہیں اور بیچنے والے کمپنی ہی کا حصہ بیچتے ہیں اور اسی حصہ کے خریدنے سے خریدنے والے شرعاً اس کمپنی میں حصہ دار ہوجاتے ہیں اور اسی کا نام شرکت ہے، لہٰذا شرعاً بلاشبہ ابتداءً شرکت متحقق ہوجاتی ہے، پھر بعد میں جب ان حصوں کو بیچنے والوں کے پاس سرمایہ اکٹھا ہوجاتا ہے تو تغلب کرکے خود مالک بن بیٹھتے ہیں اور کمپنی کو بمنزل انسان قرار دے کر مالک قرار دے لیتے ہیں، یہ سب فعل شرعاً ظلم وغصب ہے، اس سے حصہ خریدنے والوں کی ملکیت ختم نہیں ہوتی، بلکہ ان کو شرعاً حق رہتا ہے کہ وہ اپنے حصہ کے بقدر جس طرح ہو حدود شرع میں رہ کر وصول کرسکتے ہیں۔

باقی یہ الگ بات ہے کہ چونکہ سب کے سب غیر مسلم ہوتے ہیں جیسا کہ خود سوال میں اس کی تصریح موجود ہے اور

۱- سرخسی ۶۰/۴ تحت کتاب الحقوق۔
۲- درمختار باب الربوا۔

ملک و دار کا غیر اسلام ہونا ظاہر ہی ہے، اس لیے ملکی اور غیر شرعی قانون کی مجبوری سے کچھ چارہ جوئی وغیرہ بھی نہیں کر سکتے ہیں، مگر ان کے حقوق حصہ داری شرعاً اس سے سوخت نہ ہوں گے، بلکہ جس حصہ دار کو جس طرح بلا عذر و فریب وخداع کے اپنے حصہ کے بقدر ملے وصول کر سکتے ہیں۔

جیسا کہ مقدمات عشرہ مذکورہ بالا سے ظاہر ہوتا ہے اور یہ الگ بات ہے کہ یہ محض فتویٰ ہوگا گو از روئے تقویٰ احتیاط اعلیٰ بات ہوگی اور اس سے اس فتویٰ میں کوئی فرق نہ پڑے گا اور حقوق مجردہ کے منتقلی و بیع و شراء کی جتنی بحث جناب نے کی ہے اس کا یہ موقع نہیں ہے، یہ چیز عمل غصب کے بعد مرتب ہوئی ہے جو ظلم ہونے کی وجہ سے معتبر نہیں، بلکہ مقدمہ ۶ و ۷ کے مطابق جہاں اور جس طرح ہو سکے اپنے حصہ کے بقدر لے سکتے ہیں، صرف یہ خیال رکھنا ضروری ہوگا کہ اس کے لینے میں فریب وخداع وظلم نہ ہو جیسا کہ مقدمہ ۸ تا ۱۰ سے ظاہر ہوتا ہے۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۴/۴/۱۴۰۳ھ

ہندوستان میں عقود فاسدہ کا حکم، نیز ہندوستان دار الحرب ہے یا دار الامن؟

کیا ہندوستان دار الحرب ہے؟ اگر نہیں ہے تو شرعی طور پر کس قسم کے دار میں آتا ہے؟ سنا ہے بعض علماء آزاد ہندوستان کو دار الامن کہتے ہیں، کیا دار الامن کے نام سے موسوم دار کا ثبوت کتب حدیث وفقہ میں ہے؟ اگر آزاد ہندوستان کو دار الامن ہی کہا جائے تو کیا دار الامن میں دار الحرب جیسے معاملات جائز ہیں؟

الجواب وباللہ التوفیق ☆:

مندرجہ ذیل نمبر ملاحظہ فرمائیے:

(۱) دار الحرب لفظی معنی کے لحاظ سے تو ایسے ملک کو کہنا چاہیے جو برسر جنگ ہو، جس سے کوئی معاہدہ نہ ہو، جہاں مسلمان کے لیے امن اور تحفظ نہ ہو۔

لیکن حضرات فقہاء جن کے پیش نظر احکام اسلام کا اجراء اور نفاذ ہوتا ہے، وہ اسی نقطہ نظر سے دار (ملک) کی تقسیم

☆ نوٹ: یہ فتویٰ حضرت مولانا سید محمد میاں صاحب علیہ الرحمہ، صدر مدرس مدرسہ امینیہ، دہلی کا مطبوعہ فتویٰ تھا، جس کو حضرت موصوف نے استصواب رائے کے لئے حضرت مفتی صاحب کو بھیجا تھا، اس فتویٰ کے بعد حضرت مفتی صاحب کا مستقل جواب مذکور ہے۔

کرتے ہیں اور صرف دو دار (دو قسم کے ممالک) تسلیم کرتے ہیں، دار الاسلام، دار الحرب۔

(۲) دار الاسلام: وہ ملک جہاں حکومت کا مذہب اسلام ہو اور مسلمانوں کو کلی طور پر اقتدار اعلیٰ حاصل ہو۔ وہ اپنی آزادانہ رائے سے جو قانون چاہیں بنائیں اور جس قانون کو چاہیں منسوخ کردیں وہ دار الاسلام ہے۔

الف: اس دار کے مسلمانوں پر فرض ہوتا ہے کہ وہ احکام اسلام جاری کریں اور شریعت غراء کے مطابق قانون بنائیں، اس کے خلاف قانون بنائیں گے تو گنہگار ہوں گے: ''ومن لم یحکم بما أنزل الله فأولئک هم الظالمون، ومن لم یحکم بما أنزل الله فاولئک هم الفاسقون'' (۱)۔

ب: وہ ایسی طاقت فراہم کریں جو حریف طاقتوں کو اسی طرح متاثر اور مرعوب رکھے جیسے سرد جنگ میں ایک حریف دوسرے کو خوف زدہ رکھتا ہے: ''وأعدوا لهم ما استطعتم من قوة ومن رباط الخیل ترهبون به عدوالله وعدوکم وآخرین من دونهم لاتعلمونهم الله یعلمهم''(۲)۔

ج: وہ دفاعی حیثیت میں نہ آئیں، بلکہ ان کی اقدامی صلاحیت ایسی ہو کہ ہمسایہ ممالک اس کو محسوس کرتے رہیں اور اس کا لوہا مانتے رہیں: ''یا أیها الذین آمنوا قاتلوا الذین یلونکم من الکفار ولیجدوا فیکم غلظة''(۳)۔

د: وہ ان کمزور مسلمانوں کی بھی امداد کریں، جو کسی دوسرے ملک میں محض مسلمان ہونے کی بنا پر ظلم و ستم کا تختۂ مشق بنے ہوئے ہوں اور ضرورت ہو تو ان کو نجات دلانے کے لیے فوجی طاقت بھی استعمال کرسکیں۔ ''وما لکم لاتقاتلون فی سبیل الله۔تا۔نصیرا'' (۴)۔

(۳) ایسا ملک جہاں مسلمانوں کو کلی اقتدار حاصل نہ ہو، مثلاً امور خارجہ اور بین الاقوامی تعلقات میں وہ خود مختار نہ ہوں، فوجی اختیارات ان کو حاصل نہ ہوں، جرم وسزا کے قانون بنانے میں بھی وہ آزاد نہ ہوں، البتہ سماجی اور عائلی معاملات میں وہ خود مختار ہوں، ان کا پرسنل لاء محفوظ اور کارفرما ہو۔ فقہائے اسلام اس کو بھی دار الاسلام کہتے ہیں، وہاں اقتدار اور اختیار کی حد تک احکام اسلام جاری کرنے لازم ہوں گے۔

''کل مصرفیه وال مسلم من جهة الکفار یجوز منه إقامة الجمع والأعیاد وأخذ الخراج

۱- سورۂ مائدہ: ۴۵،۴۴،۴۷۔

۲- سورۂ انفال: ۶۰۔

۳- سورۂ توبہ: ۱۲۳۔

۴- سورۂ نساء: ۷۵۔

وتقليد القضاة وتزويج الأيامى" (۱)۔

یعنی جمعہ اور عیدین کا نظام قائم کرنے، خراج وصول کرنے، قاضیوں کے مقرر کرنے اور لاوارث غیر منکوحہ عورتوں کے نکاح کرنے کا اصل حق تو امام عامہ کو ہے، لیکن اگر کوئی شہر (علاقہ) امام عامہ کے بجائے غیر مسلم اقتدار اعلیٰ کے تحت ہے اور اس اقتدار اعلیٰ کی طرف سے اس کا مسلمان سربراہ (والی) مقرر ہے، اس کے لیے بھی جائز ہے کہ وہ ان فرائض کو انجام دے، ایسا ملک بھی حکماً دار الاسلام ہے۔ تقسیم ہند سے پہلے انگریزی دور حکومت میں حیدرآباد، بھوپال جیسی ریاستیں جو اپنے داخلی معاملات میں خود مختار تھیں؛ یہی حیثیت رکھتی تھیں۔

(۴) وہ مملکت جہاں مسلمانوں کو یہ اقتدار حاصل نہ ہو، خواہ مسلمان وہاں ہر طرح امن و اطمینان سے رہتے ہوں، وہاں کے سیاسی اور غیر سیاسی کاموں میں حصہ لیتے ہوں، اس کو اپنا وطن سمجھتے ہوں اور باشندۂ ملک کی حیثیت سے اس کی حفاظت اور ترقی کو بھی اپنا فرض سمجھتے ہوں، اس کے لیے ایثار اور قربانی بھی کر دیتے ہوں۔ مسلمان کی حیثیت سے یا مسلمانوں کی اجتماعی طاقت کی بناپر نہیں بلکہ ایک شہری کی حیثیت سے وہ اقتدار اعلیٰ میں حصہ لے سکتے ہوں، مثلاً وہ رئیس جمہوریہ اور وزیر اعظم بن سکتے ہوں، مگر احکام اسلام جاری نہ کر سکتے ہوں، جرم وسزا اور اقتصادی مسائل، کرنسی اور شرح تبادلہ وغیرہ کے سلسلہ میں احکام اسلام کو قانون نہ بنا سکتے ہوں، بلکہ ان میں اس ملک کے قوانین کے پابند ہوں تو وہ دار الاسلام نہیں ہے۔

حضرات فقہائے کرام کی تقسیم کے مطابق (کہ یہاں احکام اسلام جاری نہیں ہیں، یعنی قانون اسلامی قانون نہیں ہے) یہ ملک دار الحرب ہوگا، لیکن ایک پر امن اور باحفاظت ملک کے لیے اس لفظ کو غیر مانوس سمجھا جاتا ہے تو اس کو دار الامن کہہ دیا جاتا ہے۔

(۵) دار الامن ہوگا تو یہاں مسلمانوں کی حیثیت مستامن کی ہوگی، یعنی ان کو خود اپنی اجتماعی قوت کی بناء پر امن حاصل نہیں ہے، بلکہ حکومت کے قانون کی بناپر وہ حقوق حاصل ہیں جو باشندہ ملک کو حاصل ہو سکتے ہیں، ایسے ملک میں اگر چہ قانونی طور پر مسلمانوں کو بحیثیت مسلمان کوئی اقتدار یا قانون سازی کا کوئی اختیار حاصل نہیں ہوتا، مگر مسلمانوں پر فرض ہوتا ہے کہ وہ ایک نظام بنائیں اور اس کے تحت جمعہ اور عیدین کا انتظام کریں۔

"وأما بلاد عليها ولاة كفار فيجوز للمسلمين إقامة الجمع والأعياد ويصير القاضي قاضياً

۱- رد المحتار ۲/۲۷۵-۳۔

بتراضی المسلمین ویجب علیهم طلب وال مسلم"(۱)۔

ایسے شہروں میں جہاں غیر مسلم حکام ہوں مسلمانوں کے لیے جمعہ اور عیدین کا قائم کرنا جائز ہے اور جس کو وہ اپنی مرضی سے قاضی بنادیں وہ قاضی ہوجائے گا اور مسلمان والی کے لیے جد وجہد کرنا ان پر لازم ہوگا۔

(٦) اگر مسلمانوں کا ایسا نظام بھی نہ ہوتو نماز جمعہ وقتِ انتشار نہیں ہوگی بلکہ یہ فریضہ تمام مسلمانوں پر عائد ہوگا کہ وہ جمعہ کا امام بنائیں اور جمعہ وعیدین کی نمازیں شہروں میں حسبِ شرائط ادا کریں: ''یقیمها أمیر البلد ثم الشرطي ثم من ولاة قاضی القضاة ونصب العامة الخطیب غیر معتبر مع وجود من ذکر، أمامع عدمهم فیجوز للضرورة''(۲)۔

نماز جمعہ امیر البلد (والی یا گورنر) قائم کرائے گا، وہ نہ ہوتو شرطی یعنی وہ افسر جس کو سلطان نے اسی قسم کے تقررات کے لیے مقرر کیا ہے، مثلاً صدر الصدور یا امیر الامراء وغیرہ عام مسلمان اگر خطیب اور امام جمعہ مقرر کرلیں تو وہ قابل اعتبار نہیں ہے، جب کہ ان عہدہ داران میں سے کوئی عہدہ دار موجود ہو اور اگر کوئی عہدہ دار بھی نہ ہوتو ضرورتاً تمام مسلمانوں کے انتخاب کو منظور کرلیا جائے گا اور اس کو امام قرار دیا جائے گا جس کو مسلمان امام قرار دے لیں۔

(۷) جہاں تک میری واقفیت ہے دار الامن جدید اصطلاح ہے۔ قرآن اور حدیث تو کیا فقہائے متقدمین کی تصانیف میں بھی یہ اصطلاح رائج نہیں ہے، لیکن اس کا تصور ضرور موجود ہے، کیونکہ غیر اسلامی مملکت میں جہاں اقتدار اعلیٰ مسلمانوں کو حاصل نہ ہو، مسلمانوں کے لیے بود وباش اور کاروبار کو حرام نہیں قرار دیا گیا بلکہ وہ مسلمان جو دشمنوں میں رہتا تھا اور کسی مسلمان کے ہاتھ سے خطاءً قتل ہوگیا، اس کے متعلق قرآن پاک (۳) میں احکام مذکور ہیں۔

اسی طرح سورہ انفال کے آخری رکوع میں ان نومسلموں کے متعلق احکام ہیں جو اپنے وطن میں مسلمان ہوگئے اور

۱- رد المحتار قبیل باب العشر والخراج ۳/ ۲۵۳۔

۲- رد المحتار ۱/ ۷۵۴۔

۳- "ستجدون اخرین یریدون أن یأمنوکم ویأمنوا قومهم کلما ردوا إلی الفتنة أرکسوا فیها فإن لم یعتزلوکم ویلقوا إلیکم السلم ویکفوا أیدیهم فخذوهم واقتلوهم حیث ثقفتموهم وأولئکم جعلنا لکم علیهم سلطانا مبینا، وما کان لمؤمن أن یقتل مؤمنا إلا خطئا ومن قتل مؤمنا خطئا فتحریر رقبة مؤمنة ودیة مسلمة إلی أهله إلا أن یصدقوا فإن کان من قوم عدو لکم وهو مؤمن فتحریر رقبة مؤمنة وإن کان من قوم بینکم وبینهم میثاق فدیة مسلمة إلی أهله و تحریر رقبة مؤمنة فمن لم یجد فصیام شهرین متتابعین توبة من الله وکان الله علیما حکیما" (سورۂ نساء: ۹۱ - ۹۲)۔

ہجرت کر کے دار الاسلام میں نہ آئے (۱)، اسی طرح کے اور احکام جو دوسری آیتوں سے مترشح ہوتے ہیں ان سے ان کا جواز ثابت ہوتا ہے اور یہی جواز تھا جس کی بنا پر حضرات صحابہؓ اپنے دور میں اور ان کے بعد حضرات تابعین اور ان کے اتباع غیر اسلامی ممالک میں پہنچے، وہاں قیام کیا، ان کی زندگیاں اسلامی تھیں، ان کے قول و اعمال میں صداقت تھی، وہ کاروبار میں نہایت دیانتدار، خلق خدا کے بھی خواہ، اور جو ان سے خرید فروخت کرتا، اس کے بھی خیر خواہ اور صحیح معنی میں الصدوق اور الامین ہوتے تھے، ان کی اس شان نے ان ممالک کے عوام کے دلوں کو اسلام کا گرویدہ بنایا۔ ایشیا اور افریقہ کے بہت سے ممالک جن میں مسلمانوں کی غیر معمولی اکثریت ہے، بلکہ وہ مسلمانوں کے ملک کہلاتے ہیں، ان میں اسلام ان ہی حضرات کے قیام کی بدولت پھیلا۔ علاوہ ازیں جس طرح ان غیر مسلم مستامنین کے احکام موجود ہیں جو دار الحرب سے دار الاسلام میں آئیں، ایسے ہی ان مسلمانوں کے متعلق بھی احکام موجود ہیں جو دار الاسلام سے دار الحرب میں مستامن کی حیثیت سے جائیں۔

البتہ زمانہ جنگ میں جائز نہیں ہے کہ دار الاسلام کا کوئی مسلمان دار الحرب میں قیام کرے جس سے دشمنان اسلام کو قوت پہنچے اور خود اس کے لیے بھی خطرہ رہے، کما قال رسول اللہ ﷺ: "لاترائ نار اهما" (۲)۔

(۸) رہا یہ کہ دار الامن میں دار الحرب جیسے معاملات جائز ہیں؟ اس کا جواب اثبات میں دیا جا سکتا ہے۔ مگر بنیادی طور پر فقہاء کا یہ مسلمہ اصول یاد رکھنا ضروری ہے: " المسلم ملتزم بحكم الإسلام حيث مايكون " (۳) (مسلمان احکام اسلام کا پابند ہے جہاں کہیں بھی وہ ہو)۔

چنانچہ خیانت، دھوکہ، رشوت، احتکار، (ذخیرہ اندوزی) استحصال بالجبر، ٹیکس کی چوری وغیرہ جس طرح دار الاسلام میں حرام ہیں دار الحرب میں بھی حرام ہیں، ہر مسلمان کو چاہیے کہ وہ ان سب برائیوں سے بالا رہے اور خصوصاً ایسے موقعہ پر کہ یہ امراض وباء کی طرح پھیل رہے ہوں، مسلمان پر لازم ہو جاتا ہے کہ وہ احکام اسلام پر عمل کرتے ہوئے خیر امت ہونے کا مظاہرہ کرے، یہی موقعہ ہے کہ عملاً اسلام کی برتری ثابت کی جاتی ہے اور دوسرے کو متاثر کیا جاتا ہے۔

باقی بہت سے معاملات ایسے ہیں جو دار الاسلام میں اسلامی قانون کے مطابق ناجائز ہوتے ہیں، اگر ان کے

۱- "والذين آمنوا ولم يهاجروا مالكم من ولايتهم من شيء حتى يهاجروا وإن استنصروكم في الدين فعليكم النصر إلا على قوم بينكم وبينهم ميثاق والله بما تعملون بصير" (سورۂ انفال: ۷۲)۔

۲- ترمذی شریف ۱/ ۱۹۳۔

۳- شرح کبیر جلد ۴۔

سلسلہ میں کوئی مقدمہ اسلامی عدالت میں پیش ہوتو عدالت اس کے نا جائز ہونے کا فیصلہ کرے گی۔ اور اس خرید وفروخت کو نا جائز قرار دے گی، لیکن یہی معاملات اگر دار الحرب میں کیے جائیں تو وہاں کے قانون کے مطابق وہ غلط نہیں ہوتے بلکہ ان کو جائز قرار دیا جاتا ہے، مثلاً ایک من گیہوں کے معاوضہ میں ڈیڑھ من یا دو من گیہوں خرید نا ''ربوا'' کہلاتا ہے جو اسلامی قانون کے مطابق جائز نہیں ہے۔ اس طرح کی بیع اگر دار الاسلام میں ہو اور مقدمہ عدالت میں پہنچے تو اس بیع کو نا جائز قرار دیا جائے گا، لیکن اگر یہ دار الحرب میں ہو اور وہاں کا قانون اجازت دے دے تو اسے مسلمان کی ملک تصور کیا جائے گا۔

اب اگر کوئی فریق دار الاسلام میں اس مقدمہ کو چلانا چاہے تو قاضی اسلام اس کو خارج کر دے گا، کیونکہ یہ معاملہ دار الاسلام کا نہیں ہے۔

اسی طرح کے احکام ہیں جن کے متعلق مشہور ہو گیا ہے کہ دار الحرب میں بیوع فاسدہ جائز ہوتی ہیں، بشرطیکہ فریقین راضی ہوں اور معاملہ خوش دلی سے ہو۔

سیر کبیر میں ہے: ''**إذا دخل المسلم دار الحرب بأمان فلا باس بأن ياخذ منهم أموالهم بطيب أنفسهم بأي وجه كان، لأنه إنما أخذ المباح على وجه عري عن الغدر فيكون ذالك طيباً له، والأسير والمستامن سواء حتىٰ لو باعهم درهماً بدرهمين أوباعهم ميتة بدراهم أو أخذ مالاً منهم بطريق القمار ذالك كله طيب لهم**''(۱)۔

(کوئی مسلمان دار الحرب میں پروانہ امن (ویزا) لے کر جائے تو کوئی مضائقہ نہیں ہے کہ وہاں دار الحرب والوں کے مال کسی بھی صورت سے حاصل کرے جو طیب خاطر اور خوش دلی سے ہو، کیونکہ یہ ایسا مال لے رہا ہے جو مباح ہے، ایسی صورت سے لے رہا ہے جو دھوکہ فریب سے پاک ہے، پس یہ مال اس کے لیے حلال وطیب ہوگا، کوئی مسلمان دار الحرب میں اسیر کی حیثیت سے ہو یا پروانہ امن حاصل کر کے (ویزا لے کر) گیا ہو۔ دونوں کے لیے یہی حکم ہے، چنانچہ اگر وہاں ایک درہم دو درہم میں فروخت کردے یا مردار جانور کو درہموں کے بدلے فروخت کردے (بقیمت فروخت کردے) یا قمار کی صورت میں مال حاصل کرے تو یہ سب صورتیں اس کے لیے جائز ہوں گی)(۲)۔

(۹) سیر کبیر کی مذکورہ بالا عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ دار الحرب میں جو معاملہ اہل حرب سے ہو اس کے حلال

۱- سیر کبیر بحوالہ کشف الاستار۔

۲- سیر کبیر بحوالہ کشف الاستار۔

وطیب ہونے کے لیے طیب نفس یعنی خوش دلی اور رضامندی کافی ہے، وہ رضامندی شرعاً معتبر ہویا نہ ہو، چنانچہ سود اور قمار میں جو رضامندی ہوتی ہے، اگر چہ وہ شرعاً معتبر نہیں ہے، لیکن دار الحرب میں یہ غیر معتبر بھی معتبر ہوگی۔ اور اس رضامندی سے حاصل شدہ مال طیب قرار دیا جائے گا۔

تو سوال یہ ہے کہ شریعت نے جس کو خبیث فرمایا ہے، کیا اس کی خباثت صرف دار الاسلام تک ہے یا وہ خباثت اس معاملہ کی فطرت ہے جہاں بھی اس معاملہ کا وجود ہوگا۔ خباثت موجود رہے گی۔

مثلاً قمار بقول حضرت شاہ ولی اللہ اس لیے حرام ہے کہ کسب و استحصال کے جو ضابطے شریعت نے مقرر کیے ہیں یہ ان کے برعکس اور ان کے مناقض ومخالف ہے۔ مثلاً یہ کہ ان میں ایسی محنت نہیں ہوتی جس سے قوم اور ملک کو فائدہ پہنچے۔

حضرت شاہ صاحبؒ محنت کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

چور، ڈاکو، گرہ کٹ اور بھیک مانگنے والے سب ہی محنت کرتے ہیں، مگر ان کی محنت سے نہ ملک کی دولت میں اضافہ ہوتا ہے، نہ اس کی صنعت وحرفت میں، نہ تمدن ترقی کرتا ہے، نہ تعمیر ملک میں فروغ ہے، بلکہ یہ جرائم ان مقاصد کے لیے تباہ کن ہوتے ہیں، اسی طرح قمار باز اور سود خوار محنت ضرور کرتے ہیں مگر ان کی محنت سے ملک کی دولت میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا، بلکہ ان کی محنت ایک طرح کا ہیر پھیر ہوتی ہے جس سے دوسرے کی رقم جھپٹ لی جاتی ہے اور اس کی تہہ میں طمع وحرص کار فرما ہوتی ہے جو قانون کی حد سے آگے بڑھ کر اخلاق اور روحانیت کے نقطۂ نظر سے نہایت خطرناک مرض ہیں، سود کی بھی اصل علت حرص وطمع ہوتی ہے جس میں جارحیت بھی پیدا ہوجاتی ہے کہ سود خوار کمزور کی کمزوری سے فائدہ اٹھاتا ہے اور اس کی کمزوری میں اور اضافہ کردیتا ہے، کیونکہ ضرورت مند ہی قرض لینے پر مجبور ہے، ظاہر ہے اس میں ادائے قرض کی وسعت مشکل ہی سے پیدا ہوگی، لیکن سود خوار اس مشکل کی بناء پر رحم کرنے کے بجائے اس کی مشکل میں اضافہ کردیتا ہے کہ سود کے مطالبہ کو دو چند اور سہ چند کردیتا ہے (۱)۔

ان افعال کی یہ قباحتیں جس طرح دار الاسلام میں ہوتی ہیں، دار الحرب میں بھی قائم رہتی ہیں۔ تو جن معاملات کی تہ میں یہ قباحتیں موجود ہوں ان کی آمدنی کو حلال وطیب کیسے کہا جاسکتا ہے۔ قانونی نقطۂ نظر سے اگر جواز پیدا ہوتا ہے تو اس کو اسی حد تک محدود رہنا چاہیے، اس کو حلال وطیب نہیں کہنا چاہیے۔ قمار سے حاصل کردہ رقم دار الحرب میں جائز ہوگی، کیونکہ اس کو اسلامی قانون کا تحفظ حاصل نہیں اور ملکی قانون اس کو جائز قرار دیتا تھا، لیکن اس جائز کو طیب نہیں کہا جاسکتا، کیونکہ اخلاقی

۱- حجۃ اللہ البالغۃ، باب البیوع المنہی عنہا۔

قباحتیں اس کی شکلوں میں بدستور پیوست ہیں۔

کہا جا سکتا ہے کہ حسن وقبح کا مدار شریعت کے فیصلہ پر ہے، شریعت جس کو جائز قرار دے وہ حسن ہے اور جس کو ناجائز قرار دے وہ قبیح ہے۔

سیدنا ابو بکر رضی اللہ عنہ نے غلبہ روم کی قرآنی پیشین گوئی کے سلسلہ میں بازی لگا دینے پر جو مال حاصل کیا تھا حضور ﷺ نے اس کو جائز قرار دیا، اس جائز کو حسن اور اس ملک کو طیب ہی کہا جائے، لیکن بحر العلوم حضرت مولانا فتح محمد صاحبؒ نے اس جواز کے متعلق بیان کی ہے وہ بھی نظر انداز کرنے کے قابل نہیں ہے آپ فرماتے ہیں:

جو مال ایسے ملک سے لیا جائے جہاں صلح وعہد ہے اگر قہر وجبر لیا ہے تو غیر مملوک وحرام ہے اور اگر ایسی رضا سے لیا جائے جو شرعاً ممنوع ہے جیسے حر کی بیع یا سود یا قمار وغیرہ تو ملک آجائے گی برعایت صورتِ رضا اور حلت نہ آئے گی بوجہ مخالفت شرعی اور اگر وہ رضا شرعاً معتبر یا مسکوت ہو تو ملک بھی آجائے گی اور حلت بھی (۱)۔

(۱۰) دار الامن کے غیر مسلم کو حربی کی حیثیت نہیں دی جا سکتی، مثلاً ہندوستان کا کوئی مسلمان باشندہ لندن یا پیرس چلا جائے تو وہاں کے باشندوں سے اس کا کوئی رابطہ یا معاہدہ نہیں ہوگا، لیکن ہم وطن غیر مسلموں سے اس کے بہت سے رابطے ہیں وہ برابر کے شہری ہیں، ملکی قانون کے پابند اور اقتصادی کاروباری معاملات اور قومی اداروں میں شریک اور ایک دوسرے کے مددگار وغیرہ وغیرہ۔

(۱۱)　تنویر الابصار میں ایک جزئیہ ہے:

"دار الحرب تصير دار الاسلام بإجراء أحكام أهل الإسلام فيها" (۲)۔ صاحب الدر المختار نے اس کی مثال دی ہے کہ کجمعة و عيد۔

درمختار کی اس مثال کی بناء پر کچھ علماء کی رائے ہے کہ ہندوستان دار الاسلام ہے کہ یہاں جمعہ اور عیدین کی نمازیں پڑھی جاتی ہیں، لیکن ہر ایک صاحب بصیرت فیصلہ کر سکتا ہے کہ جمعہ وعیدین کی مثال صحیح نہیں ہے، کیونکہ جمعہ اور عیدین کی نماز کے پڑھ لینے کو "اجراء احکام الاسلام" نہیں کہا جا سکتا، ایک معمولی مجسٹریٹ بھی کسی مقام پر جمعہ یا عید کی نماز سے روک دے تو مسلمانوں میں یہ طاقت نہیں ہے کہ اس کے حکم کو منسوخ کر کے اپنے فیصلہ کے بموجب وہاں عید کی نماز یا جمعہ کی نماز پڑھ سکیں۔

۱-　عطر ہدایہ ۱۸۰۔

۲-　تنویر الابصار ۳/ ۳۵۲ قبل باب العشر والخراج۔

حکم اسلام کا اجراء یہ ہے کہ اہل اسلام اپنا فیصلہ نافذ کرسکیں، ادا فرض کی اجازت ہونا اور چیز ہے اور حکم اسلام کے اجراء کا اختیار واقتدار اور چیز ہے۔ یہ مثال اس لیے بھی بے محل ہے کہ خود رد المختار کی تحریر سابق کے مخالف ہے، جو فقرہ ''ب'' میں پیش کی گئی جس میں دارالاسلام اس علاقہ کو کہا گیا ہے، جہاں با اختیار والی مسلم ہو اگر محض نماز جمعہ پڑھ لینے سے کوئی علاقہ دارالاسلام ہو جاتا ہے تو والی مسلم کا تذکرہ غیر ضروری اور بے کار ہے۔

(۱۲) بہر حال ہندوستان کو آپ دار الحرب قرار دیں یا دار الاسلام، مگر یہ ظاہر ہے کہ یہاں عقود اور معاملات کے متعلق وہی احکام ہیں جو دار الاسلام میں ہوتے ہیں۔ پھلوں اور باغات کی بیع کی مختلف صورتوں میں وہی فتاوی صادر کیے جاتے ہیں جو دارالاسلام میں صادر کیے جاتے ہیں۔ گویا عقود اور معاملات کے سلسلہ میں عملاً دار الاسلام ہی مانا جاتا ہے۔

حضرت مولانا فتح محمد میاں صاحب رحمہ اللہ اس سلسلہ میں ایک ضابطہ تحریر فرماتے ہیں:

فقرہ (۹) میں جو عطر ہدایہ کی عبارت گزری ہے، اس کو ملاحظہ فرمائیے، اس کے بعد تحریر فرماتے ہیں: اس سے ظاہر ہے کہ جو لوگ دار الکفر میں بامان رہتے ہیں یا داخل ہوں یا باہم صلح وعہد رکھتے ہوں، انہیں کوئی ایسا معاملہ کرنا جو شرعاً ناجائز ہو، جیسے بیع یا اجارہ فاسد وباطل، یا شرعی ربو یا رشوت وغیرہ ہرگز جائز نہیں۔

اور حدیث: ''لا ربو ابین المسلم والحربی'' کے یہ معنی ہیں کہ مسلمان دار الکفر میں کافر سے سود لے تو وہ سود خوار اور موجب وعید ربوا نہ ہوگا، اگر چہ ملک حرام کا مواخذہ باقی ہے مگر سود دینا کسی طور پر جائز نہ ہوگا، مگر جب کہ اس سود کے لینے سے وہاں کے لوگوں کا عہد وصلح ہو، یا یہ وہیں کی رعیت ہو تو لینا بھی جائز نہیں (۱)۔

(۱۳) دار کے سلسلہ میں ملک العلماء علاء الدین کاسانی رحمہ اللہ نے مسلک امام ابوحنیفہؒ کا خلاصہ ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے:

"إن الأمان إن كان للمسلمين فيها على الإطلاق والخوف للكفرة على الإطلاق فهي دارالإسلام، وإن كان الأمان فيها للكفر ة على الإطلاق والخوف للمسلمين على الإطلاق فهي دار الكفرة" (۲)۔

سوال یہ ہے کہ اگر امن اور خوف کا مدار کسی مذہب پر نہ ہو، حکومت کا دستور اساسی یہ ہو کہ حکومت کا تعلق کسی مذہب

۱- عطر ہدایہ، ص ۱۸۱۔

۲- بدائع الصنائع ۱۳۱/۷۔

سے نہیں ہے، نہ کسی مذہب کی بناپر کسی کو ترجیح دی جائے گی، بلکہ امن اور خوف کا مدار وطنیت اور شہریت پر ہو، مثلاً دہلی کا رہنے والا مسلمان ہندوستان کے کسی صوبہ یا کسی شہر میں بھی جائے وہ ہندوستانی ہونے کی بناپر محفوظ اور مامون ہے اور اس کو تمام شہری حقوق حاصل ہیں، لیکن نیپال کا رہنے والا برہمن ویزا کے بغیر حدود ہندوستان میں قدم بھی نہیں رکھ سکتا، تو اس صورت میں اس دار کو کیا کہا جائے گا؟ کیا کسی مذہب کی طرف منسوب کرنا التزام مالایلتزم نہیں ہوگا(۱)؟

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند، سہارنپور

دارالاسلام ودارالکفر کی تحقیق:

الجواب وباللہ التوفیق:

(۱، و، ۲) حضرت مجیب نے بالکل صحیح فرمایا، (۲) دار حقیقت میں دو ہی ہوتے ہیں: ایک دار الاسلام جس کی توضیح وتشریح حضرت مجیب نے بہت مفصل ومدلل فرمادی ہے کہ اقتدار اعلیٰ (۳) جس ملک میں مسلمانوں کو مکمل طور پر حاصل ہو اور اس کو اسلامی احکام کے مطابق ہر قانون بنانے اور اس کو جاری کرنے کی پوری قدرت حاصل ہو۔ دوسرا دار، دار الاسلام کا مقابل ہوگا۔ اور اسلام کا مقابل کفر ہے، لہٰذا دوسرا دار حقیقت میں دار الکفر ہوگا اور یہی دو دار حقیقۃً وواقعۃً ہیں۔

پھر دار الکفر کی بنیادی واصولی طور پر چار قسمیں ہیں: (۱) دار المحاربہ (۴) (۲) دار المعاہدہ والمسالمہ (۵)

۱- حضرت مولانا سید محمد میاں رحمہ اللہ کا جواب مکمل ہوگیا، اس کے بعد اس کی مزید توضیح بعنوان دار الکفر ودار اسلام کی تحقیق حضرت مفتی صاحب کی تحریر فرمودہ ہے۔

۲- ’’قیل: الدار عندنا دار الإسلام ودار الحرب‘‘ (عینی شرح الہدایہ کتاب السیر ۲/ ۸۶۲)۔

۳- ’’وهذا لأن دار الحرب تصير دار الإسلام بإجراء الأحكام وثبوت الأمن للمقيم من المسلمين فيها‘‘ (فتح القدیر ۴/ ۳۱۱) ف: دار الکفر کی یہ اقسام اربعہ باہم قسیم ومتضاد نہیں، جیسا کہ حضرت مفتی صاحب نے آگے اس کی وضاحت فرمائی ہے بلکہ اول الذکر دو قسمیں باہم قسیم ومتضاد ہیں اور ثانی الذکر دو قسمیں باہم قسیم ہیں، فرق صرف مقسم کے اعتبار کا ہے اگر دار الاسلام کے تقابل کا اعتبار کیا جائے تو دار الکفر کی دو اول الذکر قسمیں ہوں گی اور اگر دار الکفر کے اندرونی معاملات کا اعتبار کیا جائے تو اس کی متاخر الذکر دو قسمیں ہوں گی۔

۴- ’’إن كان الأمان فيها للكفرة على الإطلاق والخوف للمسلمين على الإطلاق فهي دار الكفر‘‘ (بدائع الصنائع ۷/ ۱۳۱)۔

۵- ’’إذا رأى الإمام أن يصالح أهل الحرب أو فريقا منهم، وكان في ذالك مصلحة المسلمين فلا بأس به‘‘ (ہدایہ علی ہامش العینی ۲/ ۷۹۹) ’’إذا كانت دار من ديار الحرب لا د وادع المسلمون أهلها على أن يؤدوا إلى المسلمين شيئاً معلوماً في

(۳) دار الامن (۱) (۴) دار الشر والفساد (۲)، اس لیے کہ دار الاسلام کا محاربہ دار الکفر سے ہوگا یا نہیں، اگر ہوگا تو اس کا نام دار المحاربہ ہوگا اور اگر محاربہ نہ ہوگا تو دو حال سے خالی نہیں۔ آپس میں ان دونوں داروں (دار الاسلام اور دار الکفر) اور ان کی حکومتوں میں معاہدہ ومسالمہ ہوگا یا نہیں، اگر معاہد یا مسالمہ ہوگا تو اس کو دار المعاہد یا دار المسالمہ کہیں گے اور اگر معاہدہ ومسالمہ نہ ہوگا تو پھر دو حال سے خالی نہیں یا تو اس ملک کے مسلم باشندے اور اس ملک میں داخل ہونے والے مسلمان مامون ومحفوظ رہتے ہوں گے یا مامون ومحفوظ نہ رہتے ہوں گے، اگر مامون ومحفوظ رہتے ہوں، جیسے سرکار دوجہاں صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ملک حبشہ تو اس ملک کو دار الامن کہا جائے گا اور اگر اس ملک کے مسلم باشندے یا اس ملک میں داخل ہونے والے مسلمان مامون ومحفوظ نہ رہتے ہوں تو اس ملک کو دار الشر والفساد کہا جائے گا۔ جیسے فتح مکہ سے قبل مکہ مکرمہ ان چاروں قسموں میں سے پہلی دو قسموں میں دار الاسلام کے تقابل کے اعتبار سے مطلق دار الکفر مقسم ہے، اور بعد کی دو قسموں میں دار الکفر کے اندرونی معاملات کے اعتبار سے مطلق دار الکفر مقسم ہے، اس لیے پہلی دونوں قسمیں دار المحاربہ ودار المعاہدہ تو آپس میں قسیم ومتضاد ہوں گی اور بعد کی دونوں قسمیں محض آپس میں قسیم ومتضاد ہوں گی اور بیک وقت جمع نہ ہوسکیں گی، لیکن پہلی دونوں قسموں میں سے ہر ایک کے ساتھ جمع ہوسکیں گی۔ یعنی ایک دار، دار الاسلام کے تقابل کے اعتبار سے دار الحرب یا دار المعاہدہ ہو اور اپنے اندرونی قوانین ومعاملات کے اعتبار سے دار الامن یا دار الشر والفساد ہو، تو یہ بھی ہوسکتا ہے۔ پس ایک ملک ودار بیک

کل مدة علی أن لایجری علیهم المسلمون احکامهم فهذه دار الحرب، لأن الدار إنما تصیر دار الإسلام بإجراء حکم المسلمین فیها وحکم المسلمین غیر جار فکانت هذه دار حرب" (شرح السیر الکبیر ۳/۳۰۲)" الموادعة وهي المعاهدة والصلح علی ترک القتال" (بدائع الصنائع ۷/۱۰۸)۔

"ان النبی ﷺ صالح أهل مکة عام الحدیبیة علی ان وضع الحرب بینه وبینهم عشر سنین" (مبسوط ۲/۳۷)" ولما انتهی رسول الله ﷺ إلی تبوک أتاه یحنه بن رؤبة صاحب إیلة فصالح رسول الله ﷺ وأعطاه الجزیة وکتب لهم رسول الله ﷺ کتابا فهو عندهم" (البدایة والنهایة ۵/۱۶)۔

۱- دار الامن کا لفظ اگرچہ بعد میں وضع کیا گیا ہے لیکن عہد نبوی میں اس کی مثال موجود تھی۔ حبشہ کا ملک اسی قسم میں داخل تھا۔ "فلما رأی رسول الله ﷺ ما یصیب أصحابه من البلاء الخ قال لهم: لوخرجتم إلی الحبشة فإن بها ملکا لایظلم عنده أحد، وهي "أرض صدق" حتیٰ یجعل الله لکم فرجا مما أنتم فیه، فخرج عند ذالک المسلمون من أصحاب رسول الله ﷺ إلی أرض الحبشة" البدایة والنهایة ۳/۶۶)" قال النجاشي للمسلمین: اذهبوا فأنتم سیوم في الأرض، السیوم الآمنون في الأرض ما أحب أن لي دبراً وإني رجل منکم والدبر بلسانهم الذهب" (البدایة والنهایة ۳/۷۴)۔

۲- فتح مکہ سے پہلے دار الشر والفساد تھا۔ "انما جزاء الذین یحاربون الله ورسوله ویسعون في الأرض فساداً أن یقتلوا أو یصلبوا أو تقطع ایدیهم وأرجلهم من خلاف أو ینفوا من الأرض" (سورۂ مائدہ ۶ رکوع ۹)۔

وقت دونوں قسموں کے اعتبار سے دار المعاہدہ والمسالمہ اور دار الشر والفساد بھی کہا جا سکتا ہے۔ اور اسی طرح پر مطلق دار کی پانچ قسمیں نکل آئیں گی: (۱) دار الاسلام (۲) دار الحاربہ (۳) دار المعاہدہ والمسالمہ (۴) دار الامن (۵) دار الشر والفساد۔ لیکن دار الکفر کی ان چاروں قسموں میں سے پہلی قسم نہایت اہم اور شدید ہے، نیز کفر اپنی حقیقت ومفہوم واثر کے اعتبار سے "ودوا لو تکفرون الخ'' کی خاصیت رکھتا ہے اور اسلام اپنی حقیقت ومفہوم واثر کے اعتبار سے "بلغوا عني ولو آية" (الحدیث) اور آیت کریمہ: "وجادلهم بالتي هي أحسن'' (۱) اور آیت کریمہ: ''وقاتلوا في سبيل الله الذين يقاتلونكم ولاتعتدوا إن الله لايحب المعتدين'' (۲) اور آیت کریمہ: "وقاتلوهم حتى لاتكون فتنة ويكون الدين لله فإن انتهوا فلاعدوان إلا على الظالمين '' (۳) کی خاصیت رکھتا ہے اور اس کے مطابق عمل کا مخاطب ہے، اس لیے ہر وقت تصادم وٹکراؤ کا مظنہ وخطرہ موجود رہتا ہے اور بہت ممکن ہے کہ اسی وجہ سے فقہاء کرام کے یہاں ''تسمية الكل باسم الجز یا تسمية كل أفراد المقسم باسم بعض أفراد المقسم '' کے مطابق دار الکفر کے سب سے اہم وشدید فرد کا ترغیباً وتحریضاً علی الجہاد دار الحرب کا نام اس کے سارے وتمام افراد پر جاری ہو گیا پھر وہی شائع وذائع بھی ہو گیا ہو، ورنہ تمام اقسام کے احکام الگ الگ فقہاء متقدمین کی کتابوں میں بھی ملیں گے۔ پھر اسلام (۴) کے ابتدائی دور میں اگر چہ دار الکفر متعدد ومختلف تھے، مگر تمام عالم اسلام کی حکومت ایک ہی تھی اور دار الاسلام بھی ایک ہی تھا، اس لیے ان تمام اقسام پنجگانہ سے بات آگے نظر نہیں آتی، البتہ جب (۵) بنو امیہ وبنو عباسیہ کی دو الگ الگ اور مستقل حکومتیں بن گئیں اور ہر ایک اپنی حکومت کو مستقل

۱- سورۂ نحل: ۱۲۵۔　　۲- سورۂ بقرۃ: ۱۹۰۔　　۳- سورۂ بقرۃ: ۱۹۳۔

۴- ''عن أنس بن مالک أن رسول الله ﷺ کتب قبل مؤته إلیٰ کسریٰ وقیصر وإلیٰ النجاشي وإلیٰ کل جبار یدعوهم إلی الله عزوجل'' (البدایۃ والنہایۃ ۴/ ۲۶۲) ''عن عبد الله بن عبد القاري ان رسول الله ﷺ بعث حاطب بن أبي بلتعة إلی المقوقس صاحب الإسکندریة فمضیٰ بکتاب رسول الله ﷺ'' (البدایہ ۴/ ۲۷۲)۔

۵- اندلس کا پہلا فرماں روا عبدالرحمن الداخل ۱۳۸ھ سے ۱۷۲ھ تک اندلس کی حکومت کا مالک رہا، اس کے بعد بالترتیب ہشام اول از ۱۷۲ھ تا ۱۸۰ھ، حاکم اول از ۱۸۰ھ تا ۲۰۶ھ، عبدالرحمن ثانی از ۲۰۶ھ تا ۲۳۸ھ، محمد اول از ۲۳۸ھ تا ۲۷۳ھ، منذر از ۲۷۳ھ تا ۲۷۵ھ، عبداللہ از ۲۷۵ھ تا ۳۰۰ھ حکومت کے مالک ہوتے رہے لیکن ان میں سے کسی نے خلافت کا دعویٰ نہیں کیا اور نہ خلیفہ کا لقب اختیار کیا۔ ۳۰۰ھ میں عبدالرحمن ثالث بادشاہ ہوا، سب سے پہلے اسی نے خلیفہ کا لقب اختیار کیا اور اندلس میں اس سے خلافت کا آغاز ہو گیا۔ "في هذه السنة (سنة خمسين وثلاث مائة) توفي عبد الرحمن بن محمد بن عبد الله صاحب الأندلس الملقب بالناصر لدين الله فكانت إمارته خمسين سنة وستة أشهر وكان عمره ثلاثا وسبعين سنة ...... وهو أول من تلقب من الأمويين بألقاب الخلفاء وتسمیٰ بأمير المؤمنين '' (تاریخ الکامل ۸/ ۱۷۶) دوسری طرف بغداد کے اندر عباسی خلفاء یکے بعد دیگرے خلیفہ ہوتے رہے۔ عبدالرحمن ثالث کے پچاس سالہ دور خلافت کے اندر مندرجہ ذیل عباسی خلفاء تخت خلافت پر آئے۔ المقتدر باللہ از ۲۹۵ھ تا ۳۲۰ھ، القاہر باللہ از ۳۲۰ھ تا ۳۲۲ھ، الراضی باللہ از ۳۲۲ھ تا ۳۲۹ھ، المتقی للہ از ۳۲۹ھ تا ۳۳۳ھ،

دار الاسلام قرار دینے لگا تو اگر دار الکفر کا ایک ہی ملک ایک حکومت اسلامیہ کے اعتبار سے دار الحرب اور دوسری حکومت اسلامیہ کے اعتبار سے دار الامن یا دار المعاہد یا دار الشر والفساد قرار پانے لگے یا پا جائے تو یہ کسی تعجب یا کسی اختلاف کی بات نہ ہوگی بلکہ دار الاسلام کے ان حصوں کے اختلاف کی وجہ سے یہ اختلاف ہوگا، پھر جب مسلم حکومتیں ٹولیوں (۱) میں منقسم ہوکر اور زائد و متعدد ہوگئیں تو دار الکفر کی ایک قسم مختلف مسلم حکومتوں کے اعتبار سے الگ الگ ناموں سے بھی موسوم ہوسکتی ہیں، مثلاً اگر مسلم حکومت کے اعتبار سے دار الکفر کا ایک ملک دار المعاہد و المسالمہ ہوتو دوسری حکومت کے اعتبار سے وہی ملک دار الحرب اور تیسری کے اعتبار سے دار الشر والفساد ہو اور چوتھی کے اعتبار سے دار الامن ہو اور ہر ایک مسلم حکومت اپنے اپنے

المستکفی باللہ از ۳۳۳ھ تا ۳۳۴ھ، المطیع للہ از ۳۳۴ھ تا ۳۶۳ھ۔

عبد الرحمن ثالث کے بعد دوسرے اموی خلفاء اندلس میں خلیفہ ہوتے رہے اور عباسی خلفاء بغداد میں اندلس کے علاوہ باقی اسلامی ممالک کے خلیفہ ہوتے رہے اس طرح بیک وقت اسلامی ممالک میں دو خلیفہ کا وجود مدتوں تک رہا۔ ۸۹۲ھ تک اندلس سے مسلمانوں کا خاتمہ ہوگیا اور عباسی حکومت بھی روبہ زوال ہونے لگی یہاں تک کہ فتنۂ تاتار اٹھا اور آخری عباسی خلیفہ المستعصم بن المستنصر کو ۶۵۶ھ میں قتل کردیا گیا۔ کانت مدة خلافة المستعصم ۱۶ سنة تقريباً وعمره ۵۰ سنة الخ وانقضت الدولة العباسية من بغداد بعد ان دامت ۵۲۴ سنة اى من سنة ۱۳۲ وهي السنة التي استولىٰ فيها النور على بغداد وعدد خلفائهم ۳۷ خليفة الخ (دروس التاریخ ۴/۲۴۳)۔

اس زمانہ میں پوری اسلامی خلافت ٹکڑیوں میں بٹ گئی تھی۔ کچھ مدت کے بعد پھر دوسری خلافت کا آغاز ہوجاتا ہے کیونکہ عباسیوں کے بعض فرد فتنۂ تاتار سے بچ کر مصر چلے گئے تھے وہاں جاکر انہوں نے خلافت کی بیعت لی۔ سب سے پہلا خلیفہ المستنصر باللہ ابو القاسم از ۶۵۶ھ تا ۶۶۰ھ ہوا۔ اس کے بعد الحاکم بامر اللہ ابو العباس از ۶۶۰ھ تا ۷۰۱ھ خلیفہ رہا، ادھر عالم اسلام کے اکثر حصوں پر عثمانیوں کی حکومت وخلافت قائم ہوچکی تھی، آل عثمان کی خلافت کا آغاز عثمان اول سے ہوتا ہے جو ۶۹۹ھ سے ۷۲۶ھ تک خلیفہ رہا۔ یہیں سے دوسری خلافت کی ابتداء دوبارہ ہوجاتی ہے اور اس وقت تک یہ سلسلہ جاری رہا، جب تک کہ ۹۲۶ھ میں مصر سے بھی عباسی خلافت کا خاتمہ ہوکر عثمانیوں کا قبضہ نہ ہوگیا۔ اوپر کی مختصر تاریخی تفصیلات سے یہ معلوم ہوگیا کہ بیک وقت متعدد خلفاء کا وجود رہا ہے۔ اس کی سب سے پہلی مثال حضرت معاذؓ اور حضرت حسنؓ کی خلافت کے وقت ملتی ہے ایک طرف معاویہؓ خلیفہ تھے اور دوسری طرف حضرت حسنؓ خلیفہ تھے، یہ ۴۰ھ کا واقعہ ہے لیکن چھ ماہ کے بعد حضرت حسنؓ نے خلافت سے دستبردار ہوکر حضرت معاویہؓ کو مستقل خلیفہ مان لیا: ”ثم دخلت سنة اربعين وفي هذه السنة بويع لمعاوية بالخلافة بايلياء الخ فلما قتل عليؓ دعي لمعاوية أمير المؤمنين“ (تاریخ طبری ۶/۹ سو ۴۰)۔

۱- مثلاً پانچویں صدی کے اوائل میں کئی دار الاسلام بن گئے تھے۔ بغداد میں قادر باللہ ۳۸۱ھ سے ۴۲۲ھ تک خلیفہ رہا۔ اسی زمانہ میں قاسم ابن حمود اشبیلیہ پر قبضہ کرکے وہاں حکومت کرنے لگا اور اسی وقت اس کا بھتیجا یحییٰ ابن علی مالقہ سے قرطبہ پہونچا اور لوگوں سے بیعت لی۔ یہ واقعہ شروع جمادی الاولیٰ ۴۱۲ھ کا ہے ”لما سار القاسم ابن حمود من قرطبة إلى إشبيلية سار ابن أخيه يحيى ابن علي من مالقه إلىٰ قرطبه فدخلها بغير مانع فلما تمكن بقرطبه دعا الناس إلى بيعته فاجابوه فكانت البيعة مستهل جمادى الاولىٰ من سنة إثني عشرة وأربع مأة ولقب بالمعتلي وبقي بقرطبه يدعىٰ له بالخلافة وعمه القاسم باشبيليه ويدعىٰ له بالخلافة إلى ذي القعدة سنة ثلاث عشرة وأربع مائة“ (تاریخ الکامل، ۹/۹۴)۔

اعتبار سے وہاں کے بارے میں احکام مرتب وجاری کرے، یہ سب ہوسکتا ہے اور بظاہر اگرچہ ایک ہی ملک کے بارے میں متضاد قسم کے احکام وہاں نظر آئیں، مگر یہ سب اصل میں احکام کا تضاد نہ ہوگا بلکہ ان مسلم حکومتوں کے اختلاف کی وجہ سے نظر آئے گا۔

پھر دار کی یہ سب قسمیں اس وقت کے اعتبار سے ہیں جب شخصی حکومتیں عام طور سے رائج تھیں اور ایک ہی قسم کے احکام وقوانین پورے ملک میں یکساں طور پر جاری ورائج ہوتے تھے۔ اب جب کہ جمہوری حکومتوں کا عام رواج ہوگیا ہے اور جمہوری حکومتوں میں خاص کر بڑے ملکوں میں ایک مرکزی حکومت ہوتی ہے اور اس کے تحت متعدد صوبائی حکومتیں ہوتی ہیں اور صوبائی حکومتیں اپنے اندرونی معاملات وقوانین میں خود مختار وآزاد بھی ہوتی ہیں۔ اس لیے ان کے احکام وقوانین میں کچھ تغایر بھی ہوسکتا ہے، پس اگر مرکزی حکومت اور صوبائی حکومت کے دونوں احکام وقوانین بالکل متحد ویکساں ہوں گے۔ جب تو یہی اقسام پنج گانہ قائم رہیں گے اور اگر ایسا نہ ہوا بلکہ دونوں کے احکام وقوانین میں کچھ تغایر ہوتو دونوں کے اعتبار سے نام واقسام بھی الگ الگ ہوسکیں گے اور ان اقسام کے اعتبار سے احکام بھی الگ الگ ہوسکیں گے۔ یہ سب تقسیمیں اور قسمیں قوانین کے حدود میں اور حکومتی سطح پر ہیں، اور اس تقدیر پر ہیں کہ وہ احکام وقوانین سارے ملک میں یکساں رائج ونافذ بھی ہوں اور اندرون ملک کے حالات ومعاملات بھی انہیں احکام وقوانین کے مطابق ہوں اور اگر ایسا نہ ہو بلکہ حکومتی سطح کے اور قوانینی حدود کے احکام کچھ اور ہو اور عوامی سطح کے معاملات وحالات کچھ اور رہوں اور حکومت اس پر قابو نہ پائے یا بے اعتنائی برتے یا نظر انداز کرے تو حکومتی سطح اور قوانینی حدود کے احکام کچھ ہی ہوں مگر چونکہ شرعی احکام ظاہر معاملات وحالات پر دائر ہوتے ہیں اور عوامی معاملات وحالات ہی ایسی صورت میں ظاہر وباہر ہوں گے۔ اس لیے شرعی احکام انہیں عوامی حالات و معاملات پر جو ظاہر وباہر ہوں گے، دائر ہوں گے، اور انہیں کا اعتبار عند الشرع ہوگا۔ اسی طرح اگر کسی ملک میں مسلمانوں کو اقتدار اعلیٰ مکمل طور پر حاصل ہو اور مسلمانوں کے قبضہ واقتدار میں مکمل طور پر ہونے کی وجہ سے اگر چہ اس ملک پر دار الاسلام کی تعریف صادق آئے، لیکن وہاں اسلامی احکام کے خلاف احکام وقوانین نافذ وجاری ہوں، یا اس ملک کے رہنے والے مامون ومحفوظ نہ ہوں تو اس ملک میں باوجود ملک مسلم اور فی نفسہ دار الاسلام ہونے کے وہاں کے مروجہ احکام وقوانین اور ظاہر معاملات وحالات کے اعتبار سے جو احکام ان پر عند الشرع عائد ہوں گے وہ لاگو ہوں گے اور فی نفسہ دار الاسلام ہوتے ہوئے غیر شرعی قوانین جو نافذ کریں گے اس پر وہ عند اللہ ماخوذ ہوں گے اور ان کے عمل کی غلطی یا کوتاہی پر عند اللہ ان سے باز پرس ہوگی۔ پس اس حیثیت سے سارے عالم کا دار الاسلام ایک ہوتے ہوئے بھی ان کی صورت کے اعتبار سے احکام بالیقین

الگ الگ اورجدا جدا ہوسکیں گے۔لہٰذا اس مطبوعہ استفتاء میں درج شدہ مسائل کے احکام مستنبط کرنے میں بھی ان تمام امور پرنظر رکھنا اور سب کوملحوظ رکھنا لازمی وضروری رہے گا، چنانچہ حضرت مجیب نے ان امور کوحتی المقدورملحوظ رکھا ہے لیکن اگرایسے علماء کا اجتماع ہوجائے جن کواس قسم کے مسائل پر بصیرت کی نگاہ حاصل ہوتو نفع سے خالی نہ ہوگا، البتہ طریقہ کار پر پہلے غور کرلینا ضروری رہے گا۔

(۳)اس نمبر میں اس لفظ (اور بین الاقوامی تعلقات میں خودمختار نہ ہوں) کے بعد یہ جملہ (لیکن اپنے داخلی معاملات میں خودمختار ہوں) کا اضافہ ضروری ہے ورنہ پھر اس جملہ (فقہائے اسلام اس کوبھی دار الاسلام کہتے ہیں) کے لیے سند کی ضرورت ہوگی، اور اس پر تفریع کردہ مثال حیدرآباد، بھوپال، چسپاں ہونے کے بجائے دیگر چھوٹی چھوٹی غیر خودمختار ریاستوں کی مثال بھی چسپاں ہوجائے گی، جیسے ریاست مالیر کوٹلہ اور ریاست باغپت وغیرہ۔

(۴) یہ تشریح بھی احقر کے نزدیک بالکل صحیح اور درست ہے، لیکن اخیر کی یہ چند سطریں (یہ ملک دار الحرب الخ) اس طرح کردینا انسب معلوم ہوتا ہے (ایسا ملک دار الحرب کہا جاسکتا ہے)(۱) لیکن اصل میں ایک پر امن اور باحفاظت ملک ہونے کی وجہ سے دار الکفر کی تیسری قسم دار الامن اس کا نام ہوگا۔

(۵) مستامن (۲) تو اس شخص کو کہتے ہیں جو دوسرے ملک میں عارضی قیام کی نیت سے کچھ دنوں کے لیے امن حاصل کرکے قیام پذیر ہو جیسے کوئی مسلمان لندن وامریکہ وغیرہ ملکوں میں بذریعہ ملازمت یاتجارت وغیرہ کے لئے عارضی طور پر قیام پذیر ہوجائے اور وہاں کا شہری نہ بنے اور جوشخص (۳) اس ملک کا مستقل باشندہ ہواس کومستامن نہیں کہتے، بلکہ اس کے لیے مستقل دوسرا نام ہوگا، مثلاً امریکی مسلمان، افریقی مسلمان، روسی مسلمان وغیرہ، البتہ بعض اعتبار سے اس کومستامن کی حیثیت میں کہا جاسکتا ہے اور غالباً حضرت مجیب کی بھی یہی مراد ہوگی۔

۱- ”قال النجاشي :اذهبوا فأنتم سيوم في الأرض، السيوم الأمنون في الأرض ما أحب ان لي دبرا وإني اذيت رجلاً منكم والدبر بلسانهم اللهب“(ہدایہ ۴/ ۳۷)۔

۲- ”وهو المسلم الذي يدخل دار الحرب بالأمان وكذالك يطلق على الحرب الذي يطلب الأمان من المسلمين“ (عینی شرح ہدایہ ۴/ ۸۵۳)”هويشمل مسلما دخل دارهم بأمان وكافرادخل دارنا بأمان“(شرح الوقایہ ۱/ ۳۶۱)۔

۳- ”إذا دخل الحربي دار الإسلام بأمان لايمكن أن يقيم فيها سنة الخ فإن مكث سنة فهو ذمي الخ وللإمام أن يقدر له أقل من ذالك إذا رأى كالشهر والشهرين“(عالمگیری ۲/ ۲۳۴)”الذي ملتزم أحكام الإسلام فيما يرجع إلى المعاملات والمستامن غير ملتزم لذالك “(المبسوط ۱۰/ ۸۹) ”لأنه بقبول عقد الذمة يصير من اهل دارنا حتى لايمكن من الرجوع إلى دار الحرب بحال “(المبسوط ۱۰/ ۸۷و ۹۷)۔

(۶) یہ تشریح بھی درست ہے۔

(۷) یہ تشریح بھی بہت اچھی ہے، البتہ دار الامن جدید اصطلاح نہیں ہے، بلکہ قدیم چیز ہے(۱)، لیکن اس کا ظہور وشیوع بعد میں ہوا جیسا کہ خود حضرت مجیب کے اس جملہ (اس کا تصور ضرور موجود ہے) سے معلوم ہوتا ہے۔

(۸) یہ تشریح بھی درست ہے۔ البتہ بعض جملوں کی تعبیری عبارت میں کچھ تغیر کی ضرورت ہے جس کو اس موقع پر ظاہر کردیا گیا ہے۔

(۹) یہ تشریح بھی بہت عمدہ ہے، صرف ایک قید کی ضرورت تھی جس کو بڑھا دیا گیا ہے۔

(۱۰) جی ہاں صحیح ہے، دار الامن کے غیر مسلم کو ہر حیثیت سے حربی (بمعنی حربی محارب) کی حیثیت نہیں دی جاسکتی بلکہ عموماً معاہدہ ومسالم کی حیثیت یا مامون کی حیثیت رہتی ہے۔

(۱۱) یہ تفریع بہت مناسب ہے۔

(۱۲) ان احکام کے دار الامن (دار الحرب) میں نافذ ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ ان احکام میں اس دار کو عملاً دار الاسلام ہی مانا جاتا ہے، بلکہ یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ چونکہ یہ احکام دار الاسلام ودار الامن (دار الحرب) دونوں کے لیے یکساں وعام ہیں، اس لیے نافذ کیے جاتے ہیں، جیسا کہ خود یہی بات صاحب عطر ہدایہ کی محولہ عبارت سے معلوم ہوتی ہے۔

(۱۳) ملک العلماء کی دار کے بارے میں جو عبارت نقل فرمائی گئی ہے وہ امان وخوف کی ہر صورت کو حاوی نہیں ہے، اس لیے کہ امن وخوف کے اعتبار سے چھ صورتیں اور بھی ہیں اور کل آٹھ صورتیں ہو جاتی ہیں:
۱-"أمان للمسلمین علی الإطلاق وخوف للکفرة علی الإطلاق"، ۲-"أمان للکفرة علی الإطلاق" (۲) "وخوف للمسلمین علی الإطلاق"، ۳-"أمان للمسلمین علی الإطلاق وخوف للکفرة مقیدبقیود" (۳)،

۱- "فلما رأی رسول اللہ ﷺ مایصیب أصحابه من البلاء الخ قال لھم: لو خرجتم إلی الحبشة فإن بھا ملکا لایظلم عندہ أحد،وھی أرض صدق حتی یجعل اللہ لکم فرجاً مما انتم فیه فخرج عند ذالک المسلمون من أصحاب رسول اللہ ﷺ" (البدایة والنھایة ۳/۶۶) "قال النجاشي للمسلمین: اذھبوا فأنتم سیوم في الأرض الیوم الأمنون في الأرض" (البدایة ۳/ ۷۴)۔

۲- "وإن کان الإمام للکفر والخوف للمسلمین علی الإطلاق فھي دار الحرب" (بدائع الصنائع ۷/۱۳۱)۔

۳- مثلاً دار الاسلام مسلمانوں کے لیے مطلقاً امان کی جگہ ہے اور کافر ذمیوں کو خوف لاحق ہے نقض عہد ذمہ کی قید کے ساتھ، یا مثلاً کافر مستامن کو خوف لاحق ہے دار الاسلام میں اسلام لاکر مرتد ہوجانے کی قید کے ساتھ۔ "إذا نقض الذمي العھد فھو بمنزلة المرتد معناہ في الحکم بموته باللحاق لأنه التحق بالأموات" (ہدایہ ۱/ ۵۷۸)، "من ارتد والعیاذ باللہ عرض علیه الإسلام وکشفت شبھته فإن استمھل حبس ثلاثة أیام فإن تاب فیھا وإلا قتل" (شرح الوقایہ ۲/ ۳۷۵)۔

(۴)"أمان للكفرة" (۱)"على الإطلاق وخوف للمسلمين مقيد بقيود"(۵)"أمان للمسلمين"(۲) "مقيد بقيود والخوف للكفرة مقيد بقيود"(۲)"أمان للمسلمين مقيد" (۳)"بقيود والخوف للكفرة على الاطلاق" (۷)"أمان للكفرة" (۴)"مقيد بقيود وخوف للمسلمين على الاطلاق" (۸)"أمان للكفرة"(۵)"مقيد بقيود وخوف للمسلمين مقيد بقيود"۔

اس لیے معلوم ہوا کہ ملک العلماء نے یہ کوئی جامع و مانع تعریف نہیں فرمائی ہے کہ اس پر ہی مدار رکھ دیا جائے، بلکہ یہ بطور تمثیل کے بیان فرما دیا ہے، اسی طرح اس عبارت سے امن وخوف کا مدار بھی کسی مذہب پر نہیں معلوم ہوتا، بلکہ اختلاف دار کا مدار مذہب پر ضرور معلوم ہوتا ہے، اس لیے علامہ کاسانی کی اس عبارت کے تحت امن وخوف پر اختلاف دار کا مدار رکھ کر سوال میں درج شدہ تفریع مشکل ہے، صحیح نہیں معلوم ہوتی، نیز التزام مالا یلزم کا لزوم بھی نظر نہیں آتا، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

ترقیاتی منصوبوں میں شرکت کا حکم:

ہندوستان اور جنوبی افریقہ میں رہنے والے مسلمانوں کے حالات میں یہ فرق ضرور ہے کہ ہندوستان کے مسلمان یہاں کے مستقل باشندے ہیں سیکڑوں سال تک یہاں حکمراں رہے۔ اب اگرچہ حکمراں نہیں ہیں، مگر قانون اور دستور ہند

۱- (مثلاً دارالکفر کافروں کے لیے مطلقاً امان کی جگہ ہے اور مسلم مستامن کے لیے نقض عہد امان اور غدر وخیانت کی قید کے ساتھ خوف کی جگہ ہے۔"إذا دخل دار الحرب بامان مسلم تاجر يحرم عليه أن يتعرض بشئي من أموالهم و دمائهم إلا إذا غدر به ملكهم الخ"(فتاوی عالمگیری ۲/ ۲۳۲)۔

۲- (مثلاً دارالاسلام میں مسلمانوں کو قید اسلام کے ساتھ امان حاصل ہے اور ذمیوں کو نقض عہد ذمہ کی قید کے ساتھ خوف لاحق ہے) "من ارتد والعياذ بالله عرض عليه الاسلام الخ فان تاب فيها وإلا قتل"(شرح الوقایہ ۲/ ۳۷۵)۔

۳- مثلاً دارالاسلام میں مسلمانوں کو قید اسلام کے ساتھ امان حاصل ہے اور ایسے کافر کو جو نہ معاہد ہو نہ ذمی نہ مستامن مطلقاً خوف لاحق ہے)"من ارتد والعياذ بالله عرض عليه الإسلام الخ فإن تاب فيها وإلا قتل"(شرح الوقایہ ۳/ ۳۷۵) "إن كان الأمان للمسلمين فيها على الإطلاق والحزن للكفرة على الإطلاق فهي دار الاسلام"(بدائع الصنائع ۷/ ۱۳۱)۔

۴- (مثلاً دارالحرب میں ذمی کافر بقید امان داخل ہو اور مسلمان بغیر امان کے تو ذمی کافروں کو ایک قید کے ساتھ امان حاصل ہے اور مسلمان کو علی الاطلاق خوف لاحق ہے) "دخل المسلم أو الذمي دار الحرب بأمان الخ" (فتح القدیر ۴/ ۳۱۶)"وإن كان فيها الخوف للمسلمين على الإطلاق فهي دار الكفر"(بدائع الصنائع ۷/ ۱۳۱)۔

۵- (مثلاً دارالحرب میں ذمی کافر اور مسلمان بقید امان داخل ہو)"دخل المسلم أو الذمي دار الحرب بأمان)۔

نیز حقیقت واقعہ کے لحاظ سے وہ ملک کے حصہ دار ہیں اور ان کو وہی شہری حقوق حاصل ہیں جو دوسرے فرقوں کو حاصل ہیں، یہاں ان کے اوقاف ہیں، ان کے مدرسے ہیں، عبادت گاہیں ہیں وغیرہ وغیرہ!

لیکن اس بارے میں ہندوستان اور جنوبی افریقہ دونوں مشترک ہیں کہ ایسا اقتدار جس کے ذریعے مسلمان کوئی قانون تنہا اپنی رائے اور صوابدید اور اپنے مذہبی رجحانات کے بموجب بنا سکیں اور اس کو نافذ کر سکیں نہ افریقہ کے مسلمانوں کو حاصل ہے اور نہ ہندوستان کے مسلمانوں کو، مالی اور اقتصادی لحاظ سے وہ ایسے نظام میں جکڑ بند ہیں جس کی بنیاد اگر چہ سود پر نہیں ہے مگر اس کا پھیلاؤ اور اس کی تمام ترقی سود پر موقوف ہے، ممکن ہے مسلمان سود لینے سے احتیاط کرنے میں کامیاب ہو جائیں مگر وہ سود ادا کرنے سے محفوظ نہیں رہ سکتے، کیونکہ جو مختلف ٹیکس ادا کرنے پڑتے ہیں وہ اس لئے مقرر کیے گئے ہیں کہ ان قرضوں کا سود ادا کیا جا سکے جو ترقیاتی منصوبوں وغیرہ کے سلسلے میں لیے گئے ہیں۔

جن مسلمانوں پر کوئی ٹیکس لازم نہیں ہوتا ان کو بھی سود کی ادائیگی میں شرکت کرنی پڑتی ہے، کیونکہ وہ گرانی ان کو لامحالہ برداشت کرنی پڑتی ہے جو ٹیکسوں کے اضافہ کے باعث کردی جاتی ہے۔

فقہی نقطۂ نظر سے ایک ضرر اس کو لامحالہ برداشت کرنا پڑتا ہے، انفرادی کاروبار کی اگر چہ ممانعت نہیں لیکن حالات ایسے ہیں کہ ترقی کے امکانات انفرادی کاروبار میں ختم ہوتے جارہے ہیں۔ ترقیات کے منصوبے جو ہر طرح کے کاروبار حتیٰ کہ زراعت پر بھی حاوی کیے جارہے ہیں۔ ان کا تقاضا ہے کہ تمام کاروبار اجتماعی نوعیت اختیار کریں، یعنی سوسائٹیاں قائم کی جائیں اور ان کے ذریعے کام کیا جائے جن کا نمونہ افریقہ اور یورپ کے ممالک میں اس وقت پایا جارہا ہے، حکومت اس طریقہ کار کی حوصلہ افزائی کرتی ہے، چنانچہ ان سوسائٹیوں کو قرض دیا جاتا ہے جس کا سود ان کو ادا کرنا پڑتا ہے۔

اضافہ آبادی، بود و باش کے سلسلے میں بھی مشکلات پیدا کررہا ہے، اپنے ذاتی مکانات تنگ ہوتے جارہے ہیں، دوسری جانب نہ صرف یہ کہ کرایہ بڑھ رہا ہے بلکہ ''پگڑی'' کی وبا نے غیر معمولی مشکلات پیدا کردی ہیں، اس طرح رہائش کا مسئلہ بھی بہت پیچیدہ ہو گیا ہے، حکومت اس پیچیدگی کو اس طرح ختم کررہی ہے کہ تعمیر مکان کے سلسلہ میں قرض دیتی ہے مگر سود اس کو ادا کرنا پڑتا ہے، ان تمام حالات کو سامنے رکھتے ہوئے مندرجہ ذیل سوالات کے جوابات مطلوب ہیں:

(۱) ترقیاتی منصوبوں کے سلسلے میں اگر مسلمان سوسائٹی قائم کریں یا کسی قائم شدہ سوسائٹی میں شرکت کریں، تو کیا ان کے لیے جائز ہوگا کہ برادران وطن کی طرح وہ بھی حکومت سے سود کی شرط پر قرض لیں۔

الجواب وباللہ التوفیق:

(۱) ترقیاتی منصوبوں میں مسلمانوں کو بھی شریک ہونا چاہیے اور اپنی سوسائٹیاں اس طرح پر قائم کرنی چاہیے کہ ان میں سود اور سودی لین دین سے حفاظت رہے۔ مثلاً شرکت اور مضاربت کے اصول پر قائم کریں اور قوانین اس طرح وضع کریں جو حدود شرع میں رہیں۔ قانون کے جس موڑ پر شرعی حیثیت سے شبہ ہو معاملہ فہم مفتیوں اور علماء سے رجوع کر کے اصلاح کرلیا کریں۔

اسی طرح قائم شدہ سوسائٹیوں میں بھی شرکت کر سکتے ہیں، بڑی بڑی کمپنیوں اور فیکٹریوں میں جس طرح شیئرز (حصہ) خرید کر شرکت درست ہوتی ہے، اسی طرح یہاں بھی درست ہو سکتی ہے۔ ہر عقد شرکت کی صحت کے لیے تمام شرکاء کا مسلمان ہونا شرط نہیں ہے، بلکہ بعض عقد شرکت میں صرف معاملہ صاف و جائز ہونا شرط ہے، جیسے شرکت عنان اور شرکتیں عموماً اسی قبیل کی ہوتی ہیں۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند، سہارنپور

محکمہ اقتصادیات سے مدد لینے کی بعض صورتوں کا شرعی حکم:

حکومت ہذا نے عوام کی بے روزگاری دور کرنے، ان کی بحالی اور ترقی کے لیے ایک محکمہ قائم کیا ہے، جس کے ذریعہ سے صنعتی کارخانہ قائم کرنے والوں کو، صنعت وحرفت اختیار کرنے والوں کو یا جو سرمایہ نہ ہونے کی وجہ سے اپنی صنعت وحرفت کو فروغ دینے اور چلانے سے عاجز رہتے ہیں اور ان لوگوں کو جن کے پاس مکان نہیں، مکان بنانے کے لیے، اور کھیتی کرنے والوں کو کھیتی میں ترقی کے لیے نقد روپیہ دیتی ہے اور بہت کم شرح کے ساتھ کچھ زیادہ کر کے واپس لیتی ہے اور واپسی کی مدت بھی بہت لمبی دیتی ہے اور زائد رقم سے اس محکمہ کا نظم درست رکھتی ہے اور جو رقم اس محکمہ کے خرچے سے بچ جاتی ہے اس کو پھر اس قسم کے کاموں میں خرچ کرتی ہے، حکومت کا مقصد اس سے اپنی تجارت یا سرمایہ داری نہیں ہوتا ہے، محض قوم کی بھلائی اور ترقی مقصود ہوتی ہے، کبھی نقد روپیہ کے ساتھ یا بغیر نقد روپیہ کے محض سامان تجارت وحرفت اور آلات زراعت بھی سرکاری نرخ پر بازاری نرخ سے بہت ارزاں ادھار دیتی ہے، جیسے فیکٹریوں کے لئے مشین یا دیگر سامان یا انجن یا ٹریکٹر، کھاد، بیج اور آب پاشی کے لیے ٹیوب ویل اور دیگر سامان تجارت وصنعت اور اس کی قیمت مختلف قسطوں پر وصول کرتی ہے، بلکہ بعض بعض لوگوں کو کچھ روپیہ یا سامان مشینری وغیرہ مفت دیتی ہے اور کچھ مذکورہ رعایت وتفصیل کے ساتھ دیتی ہے، اس

مفت لینے اور دینے کے لیے کچھ قاعدے اور ضابطے مقرر ہیں، اسی قاعدہ میں جولوگ مستحق ہوتے ہیں صرف ان کو دیتی ہے۔ اور اس سلسلے میں حکومت کی طرف سے کچھ انسپکٹران (اور ماہرین فن) ماہرین صنعت وحرفت بھی مقرر ہوتے ہیں، جولوگوں کو طریقۂ استعمال بتاتے ہیں، مفید مشوروں کے ذریعہ ہدایت ورہبری بھی وقتاً فوقتاً کرتے رہتے ہیں اور بسا اوقات اپنی نگرانی میں ان سامانوں کا استعمال بھی کراتے ہیں تاکہ سامان ضائع نہ ہو اور لوگوں کو اس کا ہنر بھی اچھی طرح آجائے۔ اور مقررہ قسطوں کی وصولی میں آسانی بھی ہو۔ اور قسطوں کی وصولی کے لیے بھی ضابطے مقرر کیے ہیں مثلاً روپیہ یا سامان دیتے وقت کچھ ضمانت لیتی ہے اور وقت پر قسط ادا نہ ہو تو مہلت بھی دیتی ہے، لیکن کچھ زائد رقم بڑھا کر وصول کرتی ہے، اس کی ایک حد مقرر ہوتی ہے، اس حد کے گذرنے پر حکومت سختی بھی کرتی ہے، بسا اوقات عدم ادائیگی کی صورت میں ضمانتیں ضبط ہوجاتی ہیں، سب کارخانے وغیرہ بلکہ اس کے ذاتی مکان وغیرہ ساری ملکیت بھی ضبط ونیلام ہوجاتی ہے، اور بعض مرتبہ جیل خانہ بھی جانا ہوتا ہے۔

(۱) اب دریافت طلب امور یہ ہیں کہ مسلمانوں کو ایسی امداد لینا اور ایسا سامان ادھار خریدنا جس میں یہ سب خطرات بھی ہیں اور جس میں اپنے لیے ہوئے روپیہ سے زائد روپیہ واپس کرنا ہوتا ہے یا مقررہ قسط سے زیادہ دینے کا بھی ہر وقت احتمال رہتا ہے، جائز ہے یا نہیں؟

زائد دینا سود تو نہیں ہوگا؟ بعض علماء اس کو سود اور ناجائز کہتے ہیں اور بعض علما ٹیکس میں داخل کرکے جائز کہتے ہیں، بعض اس کو امداد باہمی کا ایک طریقہ کہہ کر جائز کہتے ہیں اور بعض اس کو تجارت کا ایک طریقہ کہتے ہیں اور اس کو تجارت کا نفع قرار دے کر جائز کہتے ہیں۔ امید کہ مفصل جواب دے کر مطمئن کریں گے۔

واضح رہے کہ اگر مسلمان اس قسم کی امداد نہ لے تو بسا اوقات اپنی کھیتی باڑی اور صنعت وحرفت وتجارت کو باقی نہیں رکھ سکتا، اور بہت سے غریب جو بے گھر اور بے روزگار ہیں اپنا روزگار قائم نہیں کرسکتے، اپنا گھر نہیں بنا سکتے، بے روزگار، بے گھر ہی رہ جائیں گے، اپنے معاش بھی نہ چلا سکیں گے تو کیا ناجائز ہونے کی شکل میں ان کے لیے کوئی گنجائش نکل سکتی ہے یا نہیں؟

(۲) اگر یہ طریقہ ناجائز ہو اور یہ دینا سود ہو تو ہندوستان جیسے ملک میں اس میں کچھ فرق ہوگا یا نہیں، اگر ہوگا تو کیا ہوگا؟

(۳) اگر یہی معاملات کسی ایسے ملک میں ہوں جن میں مسلم اکثریت ہو اور اقتدار اہلِ مسلم کے ہاتھ میں ہو تو کیا حکم ہوگا؟

الجواب وباللہ التوفیق:

اس وقت سود یا سودی کاروبار سے متعلق کوئی اور تفصیلی کلام کرنا مقصود نہیں ہے، اس لیے کہ سود اور سودی کاروبار کی حرمت میں آیات قرآنیہ، احادیث صحیحہ وصریحہ اس قدر کثرت سے اور اس طرح تربیتی انداز میں موجود ہیں کہ سود کا شرعی مفہوم صادق آجانے کے بعد اس کے جواز و اباحت کی طرف جانے کی جرأت ذرا بھی نہیں ہوسکتی۔

حضرت امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک آیت ربوا پورے قرآن میں زیادہ خوفناک آیت ہے: ''كان أبوحنيفة رضي الله عنه يقول: هي (يأيها الذين آمنوا لاتأكلوا الربا أضعافا مضاعفة) الخ الأية، أخوف آية القرآن، أو عد الله المؤمنين بالنار المعدة للكافرين إن لم يتقوه في اجتناب محارمه الخ'' (۱)۔

نیز جس وقت سود (ربوا) کی حرمت نازل ہوئی اس وقت مسلمانوں کے حالات آج سے بہت زیادہ سقیم وخطرناک وقابل رحم تھے، پھر بھی کسی قسم کی گنجائش یا کسی قسم کا اشارہ اباحت وجواز کی طرف نہیں دیا گیا، اس لئے جتنی صورتیں لوگ سود کی وجہ جواز کے سلسلے میں لکھتے ہیں۔ ان میں سے کوئی ایک بھی کافی نہیں، اور نہ مبیح ربوا ہوسکتی ہے، لہذا اس رخ کی طرف کلام کی کوئی حاجت نہیں اور اضطرار ومجبوری میں فقہاء رحمہم اللہ کے کلام سے جو کچھ تغیر احکام کا شبہ ہوتا ہے، اس کا حاصل ومقصود سود و ربوا کو مباح وحلال قرار دینا نہیں ہے، بیش از بیش مواخذہ آخرت سے برأت وسبکدوشی وحفاظت ہے، جیسا کہ عنقریب احقر کے کلام سے بھی معلوم ہوگا۔

البتہ چونکہ ربوا (سود) کا ایک مفہوم شرعی متعین ومنضبط ہے، کسی فرد یا جماعت کے کسی غیر سودی معاملہ کو سود کا نام دیدینے سے اس کو سود کہنا اور اس پر سود کا حکم لگا دینا ضروری نہیں ہے، جیسے پراویڈنٹ فنڈ وغیرہ کہ رقم میں سود کے نام سے کچھ رقم دینے سے اس کا سود ہونا ضروری نہیں ہے، اسی طرح کسی سودی معاملہ کو کسی فرد یا جماعت کے غیر سودی قرار دیدینے سے وہ سود کے حکم سے خارج نہیں ہوجائے گا، اس لیے یہ شق کلام کی باقی رہ گئی کہ آیا یہ نوپیدا معاملات جس میں حکومت وقت قرض کے طور پر عوام کو ان کی ترقی وبہبود کے لیے کچھ سامان یا آلات واسباب کھیتی کرنے کے یا آبپاشی کرنے کے، یا کسی اور صنعت وحرفت یا کارخانہ چلانے یا بڑھانے کے لیے (جیسے مشین، انجن، ٹریکٹر یا اس کے اور آلات واسباب بیج، کھاد وغیرہ) ادھار سستے سے سستے داموں پر دیکر کے اس کی قیمت وصول کرنے کے لیے مختلف قسطیں مقرر کردیتی ہے اور قسطوں کے معینہ مدت پر وصول نہ ہونے سے اس قسط کو کچھ بڑھا کر وصول کرتی ہے اور کبھی ان سامانوں کے ساتھ ان سے کام لینے

۱- مدارک ۱/۱۴۱ب

کے لیے کچھ نقد روپیہ بھی دیتی ہے اور کبھی ان ہی عوام کی ترقی و بہبود کے لیے محض نقد روپیہ دے کر پھر اس پر کچھ زیادتی کے ساتھ وصول کرتی ہے تو آیا اس پر سود کی شرعی تعریف صادق آتی ہے یا نہیں، اور سمجھنا ضروری ہے کہ یہ معاملہ شرعاً ربوا ہے یا اس کی حقیقت شرعیہ کچھ اور بھی ہو سکتی ہے یا ہے۔ اس وقت یہی پیش نظر ہے اور اس کے متعلق حکم شرعی مختصر لفظوں میں واضح کرنا مقصود ہے۔

سوالنامہ میں تصریح ہے کہ اس قسم کے اعانت کے طریقوں سے افراد اور ملک کی ترقی اور انہیں زوال سے محفوظ رکھنا اور ان کی بعض پریشانی دور کرنا حکومت کا مقصود ہوتا ہے، جیسا کہ بعض مرتبہ بعض حصہ قرض یا بعض حصہ سامان کے مفت چھوڑ دینے سے بھی ظاہر ہوجاتا ہے، جس کا شرعی مفہوم یہ ہے کہ ان طریقوں سے نفع خیزی یا زر اندوزی یا کوئی سودی کاروبار کرنا حکومتوں کا مقصود نہیں ہوتا ہے۔ اسی بنا پر سود کے نام سے لی ہوئی جزوی رقم اول تو عام رقم سود سے بہت تھوڑی ہوتی ہے، پھر اس سلسلہ کے اخراجات کے پورے کرنے کے بعد جو رقم بچ جاتی ہے تو اس کو اسی قسم کے اعانتی کاموں میں خرچ کردیا جاتا ہے، **كما هو مصرح في السوال**، تو مطابق قاعدہ مسلمہ فقہیہ: **"الأمور بمقاصدها وفيها بيان ان الشئی الواحد يتصف بالحل والحرمة باعتبار ما قصد له"**(۱)۔

سوالنامہ کی تصریحات کے بموجب اس زائد رقم کو جو قرضہ کے سلسلے میں وصول کی جاتی ہے، ٹیکس قرار دینا جیسا کہ بعض لوگوں کی تحریر سے اخذ کیا گیا ہے صحیح نہ ہوگا، کیونکہ ٹیکس محض قرضہ دینے پر نہیں لیا جاتا بلکہ انسان کی آمدنی اور کاروبار میں اس وقت لاگو اور عائد ہوتا ہے جب کہ اس کی معتدبہ مقدار جو حکومت کے قانون میں مصرح ہوتی ہے، موجود ہو کر ایک سال بھی گذر چکا ہوتا ہے، یہاں پر ایسا نہیں ہے اور یہ فرق بدیہی ہے، البتہ اس قسم کے معاملات کی احتیاج اور اس کی ضرورتیں چونکہ عام ہوتی جارہی ہیں، بلکہ عموم کا ایک درجہ اختیار کرچکی ہیں جیسا کہ سوالنامہ میں پیش کردہ حالات نیز روزمرہ پیش آمدہ واقعات جو بشکل استفتا تحریری و زبانی ہمارے سامنے آتے رہتے ہیں، اس لیے ضرورت داعی ہے کہ اگر کوئی توجیہ وتاویل معاملہ کے حدود شرع میں لانے کی ہوسکتی ہو تو حفظاً للعوام تلاش کرنی چاہیے۔ **كما سيجي، استحسانه**۔

پس اس معاملہ کی توجیہ یہ کی جاسکتی ہے کہ اس جزوی رقم کو جو سود کے نام سے لی جاتی ہے، حقیقت میں وہ سود نہیں ہے، بلکہ اس طریقہ کا انتظام ٹھیک رکھنے والوں کی اجرت میں اور جو سامان وغیرہ اس پر خرچ ہوتے ہیں یا درکار ہوتے ہیں، ان کی قیمت میں لی جاتی ہے جس سے انتظام میں سہولت رہتی ہے اور اعانت لینے والوں اور دینے والوں دونوں کا معاملہ

۱- قاعدہ ثانیہ فی الاشباہ والنظائر۔

صاف رہتا ہے اور یہ محض ایک قومی ومشترک نظام کی صورت ونوعیت ہے، کوئی سودی کاروبار نہیں ہے بلکہ قوم کا سرمایہ ہے اور قوم ہی کے کام میں صرف کیا جاتا ہے اس کے منتظمین وکارکنان قوم کے اجیر ووکیل ہوسکتے ہیں اور غریبوں کی اعانت اور پس ماندوں کو آگے بڑھانے اور ان کے لیے اسباب معیشت فراہم کرنے کی راہیں کھولنے کا انتظام کہا جاسکتا ہے، نیز اس طریقہ کار ومحکمہ میں نفع وسہولت بھی دونوں جانب کو قریب قریب یکساں حاصل ہوتی ہے۔ سود تو نام ہے اس نفع اور زیادتی کا جو محض ایک جانب کو حاصل ہو، اور عوض سے خالی ہو۔ کما صرح به الفقهاء: ''الربوا هو فضل خال عن عوض لأحد المتعاقدين في المعاوضة'' هذا التعريف يستفاد من الشامي من باب الربوا (۴۰۰/۷)۔

غرض یہ مفہوم سود کے مفہوم سے جدا کہا جاسکتا ہے، اور یہ توجیہ قریب قریب ایسی ہی ہوگی جو اس رقم میں کی جاتی ہے جس کو حکومت اپنے ملازمین کو ختم ملازمت کے وقت اگر چہ سود کے نام پر دیتی ہے، مگر ہمارے فقہاء محققین اس کو سود نہیں کہتے بلکہ انعام کہتے ہیں اور اس کو جائز فرماتے ہیں(۱)۔

نیز یہ توجیہ ایسی ہوگی جیسی منی آرڈر کی فیس میں کی جاتی ہے، فیس کو اجرت کتابت اور اجرت روانگی فارم کہا جاتا ہے، جیسا کہ علامہ تھانوی امداد الفتاوی میں ایک طویل سلسلہ کلام میں فرماتے ہیں: البتہ بہت عرق ریزی سے اس قدر تاویل کی گنجائش ہوسکتی ہے کہ فیس منی آرڈر کو اجرت کتابت اور روانگی فارم کہا جاوے، اس سے اس کی حرمت تفاضل تو رفع ہوجائے گی مگر کراہت سفتجہ باقی رہے گی۔

أيضاً ثم قال في مقام اخر: اور معاملہ پیش نظر میں جب اشکال حرمت تفاضل کا ختم ہوگیا تو اباحت اصلیہ لوٹ آئے گی وھو المراد، پھر اسی امداد الفتاوی، (۱۰۸/۳) میں فرماتے ہیں: البتہ فیس منی آرڈر کو اجرت کتابت وروانگی فارم کی کہہ کر حرمت تفاضل کو رفع کیا جاسکتا ہے، لیکن کراہت سفتجہ کے رفع کی کوئی وجہ خیال میں نہیں آتی، کو ابتلاء عام کی وجہ سے دل ضرور چاہتا ہے کہ اس کی بھی کوئی وجہ نکل آئے (الی قولہ) حتیٰ کہ اگر یہ بھی نقل صحیح سے مل جائے کہ سفتجہ کے جواز کی طرف ائمہ اربعہ میں سے کوئی امام گئے ہیں، تب بھی بضرورت اس پر عمل کرنے کو کہا جائے گا (ثم قال فیہ ۱۰۸/۳): منی آرڈر مرکب ہے دو معاملوں سے: ایک قرض سے جو اصل رقم سے متعلق ہے، دوسرے اجارہ سے جو فارم لکھنے اور روانہ کرنے پر بنام فیس کے دیجاتی ہے اور دونوں معاملے جائز ہیں، پس دونوں کا مجموعہ بھی جائز ہے اور چونکہ اس میں ابتلاء عام ہے، اس لیے یہ تاویل کر کے جواز کا فتوی دینا مناسب ہے (انتہی بلفظہ) امداد الفتاوی کی ان مجموعی عبارتوں سے معلوم ہوا کہ اس قسم کے

۱- کما فی امداد الفتاوی ۱۴۳تا ۱۴۵/ ۳جدید ایڈیشن مطبوعہ پاکستان۔

معاملات میں جب ابتلاء عام ہوجائے یا ضرورت صحیحہ داعی ہوجائے تو حدودشرعیہ میں رہتے ہوئے مھما امکن توجیہہ جواز تلاش کرنا امر مستحسن ہے، نیز عالمگیری کتاب الحیل کی عبارت سے ایسا ہی مفہوم ہوتا ہے:

"وكل حيلة يحتال بها الرجل ليتخلص بها عن حرام أو ليتوصل بها إلى حلال فهي حسنة، والأصل في جواز هذا النوع من الحيل قول الله عزوجل:" وخذ بيدك ضغثا فاضرب به ولا تحنث" وهذا تعليم المخرج لأيوب النبى عليه وعلى نبينا الصلاة و السلام (الى قوله) وعامة المشائخ على أن حكمها ليس بمنسوخ وهو الصحيح من المذهب كذا في الذخيرة" (۱)۔

حاصل یہ ہے کہ اس قسم کے حل وتوجیہات کا مدار ابتلاء عام اور ضرورت صحیحہ معتبرہ پر ہے اور سوالنامہ سے بھی ان دونوں چیزوں کا وجود مترشح ضرور ہوتا ہے، اس لیے یہ توضیح مستحسن بھی ہوسکتی ہے، خاص کر ایسے ملکوں میں جہاں اقتدار اعلیٰ غیر مسلموں کے ہاتھ میں ہو، وہاں یہ توجیہہ اور بھی آسان ہوگی ۔ على ما فصل المحققون من الفقهاء بالتفصيل التام۔

چند شبہات اور ان کا ازالہ:

اول یہ کہ ان تاویلات کا معاملات متعلقہ سے کیا تعلق ہے؟ اگر یہ تاویلیں کی گئیں تو منی آرڈر وغیرہ معاملات میں کی گئی ہیں اس معاملہ سے اس کا کوئی تعلق نہیں ۔

جواب: یہ بات محض درجہ نظیر میں یہاں پیش ہے کہ بحوائے آیات:" يريد الله بكم اليسر ولايريد بكم العسر" الأية "لايكلف الله نفسا إلا وسعها" اور "الدين يسر" کے ہمارے فقہاء کرام ومشائخ عظام نے اس قسم کے نوپید مسائل میں جن میں عام ابتلاء ہوا ہے، حدود شرع میں رہتے ہوئے توسع سے کام لیا ہے اور قوم کو تنگی میں پڑنے سے بچایا ہے، اس ذوق کے ماتحت مسئلہ مجوث عنہا میں بھی حدود شرع میں رہتے ہوئے توسع تلاش کرنا منشاء شرع وشارع کے خلاف نہ ہوگا، فقط اسی استدلال کے پیش نظر بطور نظیر یہ تفصیلی گفتگو کی گئی ہے، ورنہ یہ تمثیل نہیں کہ باعث اشکال یا اعتراض ہو۔

دوسرا شبہ یہ ہوتا ہے کہ یہ تاویلات وتوجیہات ارباب حکومت یا اس شعبہ کے اصحاب حل وعقد کے پیش نظر نہیں اور نہ وہ اس کے مطابق معاملہ کرتے ہیں تو پھر یہ توجیہات وتاویلات کس طرح مؤثر اور مفید ہوسکتی ہیں؟

تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہی اشکالات پراویڈنٹ فنڈ اور منی آرڈر کی تاویلات میں بھی وارد ہوتے ہیں اور باوجود اس کے علماء ان کو صحیح اور معتبر تسلیم کرتے ہیں، کما أشرت اليه سابقاپس اسی طرح یہاں بھی معتبر ومفید کہا جاسکتا ہے، چونکہ

۱- الفتاوى العالمگیریہ کتاب الحیل ۶/ ۹۰ س۔

معاملہ اموال ربویہ کا اور حرمت واباحت کے مقابل کا ہے، اس لئے اکابر امت وعلماء فحول بطور خود بھی غور فرمالیں۔

اگر ابتلاء عام یا ضرورت صحیحہ معتبرہ واقع میں متحقق ہے جب تو اس توجیہ میں کوئی کلام ہی نہیں وھوالمراد۔

اور اگر ایسا نہ ہو جب بھی اگر چہ اس قسم کے نفس معاملہ کو ناجائز کہا جائے اور نفس معاملہ کرنا کو گناہ ہو مگر مجبوری اور حاجت شدیدہ کے وقت جب کوئی دوسرا ذریعہ معاش معیشت سنبھالنے کا اور ضرورت رفع کرنے کا نہ رہے، یا متعذر ہو جائے تو اس وقت اس قسم کا معاملہ کرنے کی گنجائش ہوگی۔ الاشباہ والنظائر اور حموی کی اس تشریح کے مطابق رہے گی: کما قال: القاعدة الرابعة: المشقة تجلب التيسير، وفي القاعدة السادسة من الحاشية ١١٥: يجوز للمحتاج الاستقراض بالربح انتهىٰ و أيضاً يعلم مما تحته في الحموي وكذالك نحوه أن يقرض عشرة دنانير مثلاً ويجعل يربيها شيئا معلوما في كل يوم ربحاً اھ۔

اس صورت میں اقتدار اعلیٰ مسلم کے ہاتھ میں ہو یا غیر مسلم کے ہاتھ ہی ہو، کوئی فرق نہیں ہوگا۔ اس تمہید کے بعد اب تحریر کردہ ہر سہ سوالات کے جوابات نمبر وار درج ہیں:

(۱۔۲) اس زائد رقم پر جس کو حکومت قرض لینے والوں سے وصول کرتی ہے، ٹیکس کی تعریف صادق نہیں آتی، لیکن اس کو علی الاطلاق سود کہنا بھی ضروری نہیں، بلکہ اس میں تفصیل ہوگی وہ یہ کہ اگر محض نقد روپیہ بطور قرض لیا جائے اور اس پر نفع دینے کا معاملہ کیا جائے، یا سامان وغیرہ کے ساتھ ہی لیا جائے، مگر نقد کی وہ مقدار سامانوں سے کام چلانے کی مقدار سے زائد ہو اور اس پر نفع دینے کا معاملہ کیا جائے اور واپسی کی کل رقم یافتنی سے زیادہ ہو جائے تو سود کی تعریف: هو فضل خال عن عوض لأحد المتعاقدين في عقود المعاوضة (۱) صادق آجائے گی، مقدار نفع کم ہو یا زیادہ اور چونکہ معاملہ نقدین میں اور خالص مبادلہ اور عوض کا ہوگا، اس لئے وہ نفع سود ہی ہوگا اور حتی المقدور اس کے قریب بھی جانا جائز نہ ہوگا، اور مجبوری کا حکم دوسرا ہے جو اس جزئیہ: ''يجوز للمحتاج الاستقراض بالربح''(۲) سے معلوم ہوتا ہے کہ احتیاج شدیدہ کی حالت میں فقہاء امت سودی قرض بقدر ضرورت لینے کی اجازت دیتے ہیں۔

البتہ جو رقم سامان وغیرہ کے ساتھ محض کام چلانے کی مقدار میں لی جائے، اس میں تاویل چل سکے گی اور اس کو کام چلانے کے لیے اعانت میں داخل کر کے اس پر سودی معاملہ کا حکم نہ لگائیں گے، بلکہ انتظامات کی درستگی کے لیے ایک قسم کی

۱- الدرالمختار ۷/۴۰۰۔

۲- الاشباہ ۱۱۵۔

فیس میں داخل کیا جا سکتا ہے اور اس صورت میں یہ معاملہ جائز رہے گا۔

اسی طرح مثلاً کسی نے پروجیکٹ (محکمہ ترقیات کا ایک شعبہ) سے چار ہزار روپے کنویں بنوانے کے لئے نقد لئے، محکمہ پروجیکٹ نے اپنے قاعدہ کے ماتحت ایک ہزار نقد بالکل معاف کر دیا اور فقط تین ہزار قائم رکھ کر دو سال کا موقعہ دیا، پھر دو سال کے بعد چھوٹی اور لمبی قسطیں ادائیگی کے لیے متعین کیں اور اس میں ان قسطوں پر کچھ اضافہ کر کے وصول کیا، مگر کل وصولی چار ہزار سے زائد نہ ہوئی، تو اب قسطوں کے ساتھ جو زیادتی تھی وہ سود نہ ہوگی، اور معاملہ بھی جائز رہے گا، کیونکہ مجموعہ قرض چار ہزار تھا، چار ہزار پر زائد وصول نہیں کیا گیا کہ، فضل خال عن العوض الخ یا ''کل قرض جر نفعاً'' وغیرہ ربٰو کی تعریف صادق آسکے۔

اسی طرح محکمہ اعانت وترقی میں مشین لگانے کے لیے، فیکٹری قائم کرنے کے لئے یا کوئی صنعت وحرفت یا کارخانہ چلانے کے لئے سامان لینے کی درخواست کی، محکمہ نے اپنے ایک شعبہ سے اس کا رمقصود کے مناسب حال نقد روپے دیئے اور سامان خریدنے کے لیے اپنے دوسرے شعبہ کا تعین کر کے حکم کیا کہ اس شعبہ سے جو سامان درکار ہو خرید لو، اس دوسرے محکمہ نے ارزاں قیمتوں پر باقساط وصولی کے ساتھ سامان دیدیا یا حسب ضرورت دیتا رہا، اور پہلا محکمہ ان قسطوں کی ادائیگی کے مطابق نقد روپیہ قرض کے نام پر دیتا رہا اور اس لینے دینے میں دیئے ہوئے روپیہ سے کچھ زائد وصول کیا تو یہ زیادتی بھی سود نہ کہلائے گی، بلکہ انتظام کے درست وصحیح رکھنے کی فیس کہی جا سکے گی اور یہ معاملہ بھی جائز رہے گا۔

اسی طرح ہر معاملہ جو اس قسم کے لین دین کا حکومت کے اعانتی محکموں سے ہو، اس میں غرض ومقصود سامنے رکھتے ہوئے اس زیادتی کی حیثیت پر غور کریں گے جب تک کوئی صحیح تاویل ملتی رہے گی، ربوا، سود کہنے سے اجتناب کریں گے اور خاص کر جب بجائے نقد کے محض سامان وآلات ادھار دے کر اس کی قیمت مقررہ قسطوں کے مطابق وصول ہو جائے تو اس میں کوئی شبہ کسی کو نہیں۔

اسی طرح وقت پر کسی ایک قسط کے یا تمام قسطوں کے وصول نہ ہونے پر جو رقم زائد وصول ہوتی ہو، اس کو بھی قاعدہ کے مطابق انتظامات کی درستگی باقی رکھنے کے لیے ایک قسم کی فیس میں داخل کر کے جائز کہا جا سکتا ہے، بالخصوص ہندوستان جیسے ملکوں میں۔

فقہاء محققین کا رجحان اس طرف ہے کہ بہت سے عقود فاسدہ میں بوجہ ابتلاء کے کوئی توجیہ وتاویل کر کے حد جواز میں داخل کرنے کا توسع کیا جائے، جیسا کہ اوپر کی پیش کردہ عبارتوں سے بھی واضح ہو جاتا ہے اور اس کے علاوہ بھی متعدد جزئیات امداد الفتاویٰ کی اس پر شاہد ہیں، لیکن چونکہ بسا اوقات جب ادائے گی پر قدرت نہیں ہوتی، بڑی خطرناک اور

مضرت خیز شکلیں بھی سامنے آجاتی ہیں، جیسا کہ بعض شکلیں بسلسلہ بیان نقصانات مذکور بھی ہیں اور بہت سے لوگوں کے تجربہ میں بھی ہیں، اس لیے جہاں تک ہو سکے اس قسم کے معاملات سے پرہیز رکھنا ہی ضروری ہے، بغیر کسی شدید معذوری کے اس کے قریب بھی نہ جانا چاہیے اور اگر اس کو سود ہی قرار دیا جائے جب تو اس سے اجتناب اور پرہیز کا حتی المقدور ضروری ہونا ظاہر ہی ہے۔

(۳) اگر یہ تحقیق وتفصیل صحیح ہے جب تو کوئی اشکال ہی نہیں ہے اور یہ تحقیق وتفصیل صحیح ومعتبر نہ ہوئی تو بھی اقتدار اعلیٰ مسلم کے ہاتھ میں ہو یا غیر مسلم کے ہاتھ میں ہو، اصل جواب میں جو (۱، و ۲) میں مذکور ہے کوئی فرق واقع نہ ہوگا، اگر واقع ہو گا تو صرف اس قدر کہ جب اقتدار اعلیٰ مسلم کے ہاتھ میں ہو تو اس مسلم صاحب اقتدار پر ایسی صورتیں صاف واضح طور پر رائج کرنا ضروری ہوگا کہ جن میں عدم ربوا کا یقین ہو، اور کہیں سے ربوا کا نام بھی نہ آئے اور اگر وہ اعلیٰ صاحب اقتدار اس طرف متوجہ نہ ہو تو اس کے بعد والے صاحب اقتدار افراد حکومت پر درجہ بدرجہ حتیٰ کہ عوام میں بھی جو صاحب اقتدار ہوں، ان سب پر حسب حیثیت وقدرت اس اعلیٰ صاحب اقتدار کو اس طرف متوجہ کرنا اور اس پر عمل کے لیے آمادہ کرنا اور اسکے رواج دینے میں کوشش کرتے رہنا ضروری ہوگا۔ هذا ماظهر لي الآن في هذا المقام مرتجلاً بتوفيق الله تعالىٰ وعليه التكلان۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند، سہارنپور ۲۴/ ۱۱/ ۱۳۸۸ھ

محکمہ اقتصادیات سے مدد لینا (۱):

کیا حکومت سے ایسے بڑے اخراجات کو جو معاشی ترقی کے لیے ناگزیر ہیں، حاصل کرنے کے لیے مندرجہ ذیل طریقوں سے سرمایہ حاصل کیا جا سکتا ہے:

(۱) قرض، اس میں چھوٹی بچتوں کی اسکیم، بینکوں سے قرض، لمبی مدت کے داخلی قرض، ملازمین کے پراویڈنٹ فنڈ وغیرہ شامل ہوتے ہیں۔

(۲) غیر ممالک سے قرض۔

(۳) خسارے کی مالیات۔

۱- گذشتہ سوال کا ضمیمہ۔

عنوانات سوالات مندرجہ ذیل ہیں:

قرض لینے میں نفع اندوزی کا عنصر۔

خسارے کی مالیات۔

افراد کو حکومت کی جانب سے دیئے جانے والے قرض۔

افراد کو دیئے جانے والے قرضوں کی قسمیں۔

حکومت کے ملازمین کو قرض۔

امدادباہمی سوسائٹیوں کے ذریعہ قرض۔

مالیاتی ادارے۔

الجواب وباللہ التوفیق:

سوالنامہ مع ضمیمہ بغور پڑھا، سوالنامہ کا حاصل یہ ہے کہ حکومت وقت ترقیاتی اسکیم کے تحت جو رقم قرض کے نام پر اپنی رعایا کو دیتی ہے، اس پر زائد رقم یا نفع اتنا کم لیتی ہے جو نفی کے برابر ہوتا ہے، بسا اوقات حکومت کو اس میں خسارہ ہی برداشت کرنا ہوتا ہے، اس میں کسی قسم کی زرکشی یا زراندوزی یا ذخیرہ خیزی وغیرہ جو عام طور سے مہاجنوں کے یا سودی کاروبار کرنے والوں کے پیش نظر ہوتی ہے نہیں ہوتی، اس لیے یہ قرض سودی نہ ہوگا، اور مسلمانوں کو بھی اس کا لینا درست ہونا چاہیے۔

اور اگر سود کا احتمال ہو تو ٹیکس شمار کر کے یا حکومت کے حقوق عام جو رعیت پر ہوتے ہیں، ان کے تحت لا کر یا کسی اور فقہی تاویل سے یہ قرض لینا اور ان اسکیموں میں مسلمانوں کا شریک ہونا جائز و درست ہو سکتا ہے؟ تاکہ مسلمان بھی ان سے مستفید ہو کر اقتصادیات میں پیچھے نہ رہیں۔

سوالنامہ سے ان ہی امور کی شرعی تحقیق مقصود ہے کہ آیا واقعی ان امور کی گنجائش شرعاً ہے یا نہیں؟

اصل سوالنامہ کے اندر جواب طلب امور کا جہاں تک خاص تعلق ہے ان سب کا تقریباً مفصل جواب احقر کے ایک فتوئی مکتوبہ ۲۴/۱۱/۸۸ میں آچکا ہے، جس کا حاصل بحذف تمہید و دلائل فقہیہ یہ ہے کہ سود (ربوا) کا ایک مفہوم شرعی ہے، جس کو حقیقت شرعیہ کہہ سکتے ہیں، اور اس کی حرمت متعدد آیات واحادیث میں نہایت شدومد سے مصرح ومنصوص ہے، اور

اس کے ارتکاب کرنے والوں پر بڑی سخت وعیدیں وارد ہیں، اور یہ حرمت ایک ضابطہ وقانون کی شکل میں نازل ہوچکی ہے، اور یہ قانون (حرمت ربوا) اس بادشاہ کا قانون ہے جو تمام بادشاہوں کا بادشاہ ہے اور تمام قانون بنانے والے دماغوں کا بنانے والا ہے، تمام کائنات عالم کا تخلیق کرنے والا اور مالک ہے۔ اور تمام گذشتہ، موجودہ اور آئندہ کے بھی تمام منافع ومضار ہر پہلو وہر حیثیت سے اس کے سامنے ہمہ وقت مستحضر ہیں۔

دنیا کی کوئی حکومت یا قانون بنانے والی کوئی جماعت بڑے سے بڑا دماغ خواہ کتنا ہی مکمل ومنضبط اور اپنے خیال میں کتنا ہی جامع اور مانع قانون بنائے وہ اس احکم الحاکمین اور وحدہٗ لاشریک لہ کے بنائے ہوئے قانون جیسا مکمل ومدلل وجامع ومانع ونافع نہیں ہوسکتا۔

جب اس نے یہ مکمل قانون (ربوا کی حرمت مطلقہ کا) بناکر دنیا کو اس کے خلاف نہ کرنے کا حکم قطعی دیدیا، اور ایسے وقت میں اس کو نافذ بھی کردیا کہ وہ وقت آج کے وقت سے کہیں زیادہ سخت اور قابل لحاظ ورعایت تھا، اور اس کی حرمت بھی ساتھ ساتھ اور کھلے لفظوں میں بیان کردی، بلکہ جہالت (زمانہ پیشین) کے جتنے ربوا تھے سب کو یک لخت ختم ونسیا منسیا کردیا، اور دنیا نے اس قانون کا امتثال کرکے اور بار بار اس کا تجربہ کرکے منافع بھی دیکھ لیا تو اب اس قانون کے مطابق سود (ربوا) کا مفہوم جب کسی معاملہ پر صادق آجائے گا تو اس کو کسی طرح بھی جائز یا مباح نہیں کہا جائے گا اور بالکل اسی طرح جب تک کسی معاملہ پر ربوا (سود) کی شرعی تعریف صادق نہ آجائے گی محض لوگوں کے ربوا کا نام اس پر رکھ دینے سے کبھی اس کو حرام وناجائز یا ربوا نہ کہا جائے گا۔

بس اس قاعدہ کے مطابق اس زائد رقم یا نفع کی تقریباً ہر شق کا جواب تفصیل کے ساتھ احقر کے سابق جواب (مکتوبہ ۲۴/۱۱/۸۸ھ) میں آچکا ہے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس کے تمہید ودلائل فقہیہ کو حذف کرکے صرف اس زائد رقم کا تفصیلی حکم یہاں لاحق کردیا جائے۔ پھر ضمیمہ کا جواب لکھا جائے۔ البتہ اصل سوالنامہ میں جو بعض زائد باتیں ہیں، ان کے جواب کا یہاں اضافہ بھی کردیا جائے، تاکہ بات ہر پہلو سے مکمل ہوکر سامنے آجائے اور جن صاحب کو مزید دلائل وغیرہ دیکھنا ہوں وہ اس اصل جواب کو بھی دیکھ لیں۔ اس تمہید کے بعد اس زائد رقم کا تفصیلی حکم پیش ہے:

اس زائد رقم پر جس کو حکومت قرض لینے والوں سے وصول کرتی ہے، ٹیکس کی تعریف صادق نہیں آتی۔ لیکن اس کو علی الاطلاق سود کہنا بھی ضروری نہیں، بلکہ اس میں تفصیل ہوگی اور وہ یہ ہے:

الف: اگر محض نقد روپیہ بطور قرض کے لیا جائے اور اس پر نفع دینے کا معاملہ کیا جائے یا سامان وغیرہ کے ساتھ نقد

بھی لیا جائے مگر نقد کی وہ مقدار سامانوں سے کام چلانے کی مقدار سے بہت زیادہ ہو، اور اس پر نفع دینے کا معاملہ کیا اور واپسی کی کل رقم یا فنتی رقم سے زیادہ ہو جائے تو سود کی تعریف ''ھو فضل خال عن العوض لأحد المتعاقدین'' صادق آ جائے گی اور چونکہ معاملہ نقدین میں اور خالص مبادلہ اور عوض معاوضہ کا ہے، اس کے لیے وہ نفع کم ہو یا زیادہ وہ سود ہی ہوگا ''کل قرض جرنفعاً فھو ربوا'' بھی صادق آ جائے گا، اس لیے حتی المقدور اس کے قریب بھی جانا جائز نہ ہوگا، اور مجبوری کا حکم دوسرا ہوگا جو اس جزئیہ سے معلوم ہوتا ہے: ''یجوز للمحتاج الاستقراض بالربح''(۱) اسی قاعدہ کے تحت احتیاج شدیدہ کی حالت میں فقہاء امت سودی قرض کو بھی بقدر ضرورت لے لینے کی اجازت دیدیتے ہیں۔

ب: جو نقد رقم سامان وغیرہ کے ساتھ محض کام چلانے کی مقدار میں لی جائے، اس میں تاویل چل سکے گی، اور اس کو کام چلانے کے لیے اعانت میں داخل کر کے اس معاملہ پر سودی معاملہ کا حکم نہ لگائیں گے اور اس زائد رقم کو سود نہ کہیں گے، بلکہ انتظامات کی درستگی کے لیے ایک قسم کی فیس میں داخل کیا جا سکے گا، اور اس پہ معاملہ جائز رہے گا۔

ج: مثلاً کسی نے محکمہ ترقیات کے شعبہ سے چار ہزار روپے کنواں کھدوانے یا مکان بنوانے کے لیے یا کسی اور صنعت وحرفت کے لیے نقد لیے اور محکمہ ترقیات نے اس میں سے اپنے قاعدہ کے تحت ایک ہزار بالکل معاف کر دیئے اور فقط تین ہزار قائم رکھ کر دو سال کا موقع دیا۔ پھر دو سال کی تاخیر کے بعد چھوٹی چھوٹی اور لمبی قسطیں ادائیگی کے لیے متعین کیں اور اس میں ان قسطوں پر کچھ اضافہ کر کے وصول کیا، مگر کل رقم وصولی کی چار ہزار (کل قرضہ) سے زائد نہ ہوئی تو اب ان قسطوں کے ساتھ جو زیادتی محکمہ نے وصول کی وہ سود نہ ہوگی اور یہ معاملہ جائز رہے گا، چونکہ مجموعہ قرض چار ہزار تھا اور چار ہزار پر زائد وصول نہیں کیا گیا کہ سود کی تعریف ''ھو فضل خال عن العوض الخ نیز کل قرض جرنفعاً الخ'' صادق آ سکے۔

د: مثلاً محکمہ اعانت وترقی میں مشین (ٹیوب ویل) لگانے کے لیے یا فیکٹری قائم کرنے کے لیے یا کوئی اور صنعت وحرفت یا کارخانہ چلانے کے لیے سامان لینے کی درخواست دی، محکمہ نے ایک شعبہ سے اس کار مقصود کے لیے اس کے مناسب حال نقد روپیہ اور سامان لینے یا خریدنے کے لیے اپنے دوسرے شعبہ کا تعین کر کے حکم کیا کہ اس فلاں (دفتر یا شعبہ) سے جو سامان درکار ہو خرید لو، یا لیتے رہو، اور اس دوسرے شعبہ یا دفتر نے ارزاں قیمت پر باقساط وصول کیے اور شرط کے ساتھ ساتھ سامان دیدیا، یا حسب ضرورت دیتا رہا، اور پہلا شعبہ (محکمہ کا) ان قسطوں کی ادائیگی کے مطابق نقد روپے

۱- الاشباہ والنظائر/ص ۱۱۵۔

قرض کے نام پر دیتا رہا، اور اس لینے دینے میں محکمہ نے اپنا دیا ہوا روپیہ وصول کرتے ہوئے اپنے دیئے ہوئے روپئے سے کچھ زائد وصول کرلیا ہے تو اس زیادتی کا سود ہونا بھی ضروری نہیں، بلکہ انتظام درست رکھنے کی فیس بھی کہا جا سکے گا، اور یہ معاملہ بھی جائز رہ سکے گا۔

ھ: اسی طرح حکومت کے کسی اعانتی محکمہ سے کھاد یا بیج وغیرہ ادھار لیا، محکمہ نے ۶/ماہ میں ہر ماہ دس روپیہ کے حساب سے کل ۶۰/روپیہ وصول کیے اور اپنے رجسٹر میں از خود اصل قیمت کے خانہ میں پچاس روپئے درج کیے اور دس روپے خانہ سود یا نفع میں درج کیے تو اس دس روپے کا سود ہونا ضروری نہیں ہے، بلکہ جز ثمن قرار پا سکتا ہے، اس لیے کہ سود نام ہے فضل خال عن العوض کا جو اموال ربویہ کے اندر عقد معاوضہ کا معاملہ کرنے میں مشروط طریقہ پر طرفین متعین کریں، اور یہاں ایسا نہیں ہوا ہے، خواہ مشتری کو اس اندراج کا علم ہوجائے یا نہ ہو، بالخصوص ایسے ملک میں جہاں اقتدار اعلیٰ غیر مسلمین کے ہاتھ میں ہو، مسلمانوں کو قانوناً ایسا معاملہ کرنے سے روکنے کا یا اس کے اصلاح کرنے کا اختیار نہ ہو، اور خاص کر جب مجموعہ وصولی کی مقدار عام بازار کے نرخ کے اعتبار سے غبن فاحش کی مقدار سے زائد نہ ہو۔

و: اسی طرح ہر معاملہ جو اس قسم کے لین دین کا حکومت کے ان اعانتی محکموں سے ہو، اس میں غرض ومقصود کو سامنے رکھتے ہوئے اس زیادتی کی حیثیت پر غور کریں گے جب تک کہ کوئی صحیح فقہی تاویل ملتی رہے گی، اس کو سود کہنے سے اجتناب کریں گے اور خاص کر جب بجائے نقد کے محض سامان یا آلات وغیرہ ادھار دیکر اس کی قیمت مقرر متعدد قسطوں کے ذریعہ وصول ہو تو اس میں امید ہے کہ کسی کو کوئی شبہہ نہیں ہوگا۔

ز: اسی طرح وقت پر کسی ایک قسط یا متعدد یا تمام اقساط کے وصول نہ ہونے پر جو رقم زائد وصول ہوتی ہو، اس کو بھی قاعدہ کے مطابق انتظامات کی درستگی باقی رکھنے کے لیے ایک قسم کی فیس میں داخل کرکے جائز کہا جا سکے گا۔

بالخصوص جب ہندوستان جیسے ملکوں میں فقہائے محققین کا رجحان اس طرف ہے کہ بہت سے عقود فاسدہ میں بوجہ ابتلائے عام کے کوئی صورت توجیہ وتاویل کرکے حد جواز میں داخل کرلینے کی ہو تو داخل کرلینے کا توسع کیا جائے جیسا کہ تمہید میں پیش کردہ عبارتوں سے بھی واضح ہوتا ہے اور اس کے علاوہ بھی متعدد جزئیات امداد الفتاویٰ وغیرہ کی اس کی شاہد ہیں۔ جیسے گائے بھینس وغیرہ کو چرائی پر دینے کا جزئیہ۔

لیکن چونکہ بسا اوقات جب ادائیگی ثمن قسط پر قدرت نہیں ہوتی تو بڑی خطرناک مضرت خیز شکلیں بھی سامنے آجاتی ہیں، جن سے عزت وآبرو جان ومال سب خطرے میں پڑ جاتے ہیں، جیسا کہ بعض شکلیں بسلسلہ بیان نقصانات خود

سوال میں بھی مذکور ہیں اور بہت سے لوگوں کے تجربہ ومشاہدہ میں بھی ہیں جس کا علم عام ہے، اور بعض مرتبہ محررین وکارکنان محکمہ کی بے اعتنائیوں وشرارتوں کی وجہ سے برآمدگی رقوم میں بے حد تعویقیں ودشواریاں پیش آجاتی ہیں، یا رشوت خوروں کی وجہ سے حاصل شدہ رقم کا ایک معتد بہ حصہ انہی کی نذر ہوجاتا ہے، اس لیے جہاں تک ہوسکے اس قسم کے معاملات میں پڑنے سے پرہیز ہی رکھنا ضروری ہے، بغیر شدید معذوری کے اس کے قریب بھی نہ جانا چاہیے۔

اور اگر اس کو سود ہی قرار دیا جائے تب تو اس سے اجتناب وپرہیز کا حتی المقدور ہونا ظاہر ہی ہے، یہ تحقیق وتفصیل صحیح ہے یا غیر صحیح اس کا فیصلہ تو علمائے محققین اور مفتیانِ مدققین کریں گے، ان سب حضرات سے درخواست ہے کہ بہ رنگ اصلاح یا بصورت تائید وتصویب مطلع فرمائیں، باقی اگر اقتدار اعلیٰ مسلم کے ہاتھ میں ہو، اس سے اس مسئلہ میں کچھ فرق واقع نہ ہوگا، اگر واقع ہوگا تو صرف اس قدر کہ جب اقتدار اعلیٰ مسلم کے ہاتھ میں ہوگا، تو اس مسلم صاحب اقتدار پر ایسی صورتیں صاف اور واضح طور پر رائج کرنا ضروری ہوگا، جن میں عدم ربوا کا یقین ہو، اور کہیں سے اس میں ربوا کا نام بھی نہ آنے پائے اور ''دعوا الربا والريبة'' کا پورا پورا مصداق ہو، اور اگر وہ صاحب اقتدار اس طرف متوجہ نہ ہوتو اس کے بعد والے صاحب اقتدار افراد حکومت پر درجہ بدرجہ حتی کہ عوام میں بھی جو صاحب اقتدار ہوں گے ان سب پر حسب حیثیت وقدرت اس اعلیٰ صاحب اقتدار کو اس طرف متوجہ کرنا اور اس پر عمل کے لیے آمادہ کرنا اور اس کے رواج دینے میں کوشش کرنا واجب رہے گا۔

نوٹ: سابق جواب یہاں تک ختم ہوگیا، اس کے بعد کا اس وقت کا اضافہ ہے جو سوالنامہ کے پیش نظر لکھا گیا۔

(۲) جس جس چیز پر سود کا مفہوم شرعی صادق آجائے گا، اس کو والی یا حاکم کے حقوق خصوصی کی بنیاد پر مباح وجائز نہیں کہا جاسکتا، خاص کر جن جن چیزوں کا حکم نص میں جس طرح آجائے، اسی طرح اس کو رکھنا ضروری ہوجاتا ہے کہ یہی اصل دین ہے اور دین کے خلاف کسی کا بھی حکم ہو معتبر نہیں، **لقوله تعالىٰ: ''ومن يبتغ غير الإسلام دينا فلن يقبل منه'' (۱)**۔

اور اسی وجہ سے ایسی تمام چیزیں حکام وشاہان دنیا کی دسترس سے بلند وبالاتر ہوتی ہیں حتی کہ اگر کوئی امیر یا والی یا امام ان نصوص کے خلاف کوئی حکم کر بھی دے تو وہ مداخلت بے جا اور مداخلت فی الدین ہوگی اور کسی بھی مسلمان کو اس کی موافقت یا اتباع درست ومباح نہ ہوگی۔ اس لیے کہ اس کی موافقت واتباع میں خالق کائنات ورب الارباب کی نافرمانی اور اس کی معصیت کا ارتکاب ہوگا اور یہ جائز نہیں، **لقوله عليه السلام: ''لاطاعة لمخلوق في معصية**

۱- سورۂ آل عمران:۸۵۔

الخالق" (۱) اور "الضرورات تبیح المحظورات(۲) میں الف لام عہد کا ہے اور اس سے صرف وہ ضرورتیں مراد ہیں جو ملجی ہوں، کیفیت واضطرار اور مخمصہ کی جانب جیسا کہ اس جملہ سے بالکل متصل اگلی عبارت: "ومن ثم جاز اکل المیتة عند المخمصة" (۳) اس پر قرینہ ہے جس کو اسی قاعدہ کی وضاحت کے لیے مثال کے موقع پر خود مصنف (صاحب اشباہ ۱۱۵) نے ذکر فرمایا ہے اور "یجوز للمحتاج الاستقراض بالربح" الخ(۴) جو فرمایا گیا ہے اس کا مقصود سود کا جائز کہنا نہیں ہے بلکہ صرف گنجائش دینا ہے بایں معنیٰ کہ اس معذوری میں اس طرح قرض لے لینا جائز ہو جائے گا اور مواخذہ آخرت سے بری رہ سکے گا اور بس۔

(۳و۴) ان دونوں نمبروں کا جواب ابھی ابھی میں بتفصیل گذر چکا ہے، اس کے بعد ضمیمہ کا اصل جواب عرض ہے، ضمیمہ میں دو قسم کے قرضوں کا ذکر ہے:

پہلی قسم، حکومت کا خود دوسروں سے قرض لینا:

اندرون ملک کے باشندوں سے خواہ بیرون ملک سے پھر خواہ دوسری حکومتوں سے یا وہاں کے سرمایہ داروں سے اور پھر خواہ نفس حکومت کے استحکام وترقی پر خرچ کرنے کے لیے لیا جائے، خواہ اپنی رعیت کی فلاح وبہبود پر براہ راست خرچ کرنے کے لیے لیا جائے۔

دوسری قسم، حکومت کا اپنی رعایا کو قرض دینا:

قسم اول پر کلام کرنے سے زیادہ مقدم واہم قسم ثانی پر کلام کرنا ہے، اس لیے کہ اسی کا تعلق مسلم عوام سے براہ راست ہے اور انہی کے لیے شرعی راہ تلاش کرنا مقصود سوال ہے، علاوہ ازیں قسم ثانی پر کلام کرنے سے قسم اول کی بہت سی صورتوں کا حکم شرعی خود بخود بھی نکل آئے گا، قسم ثانی کی موٹی موٹی اور اصولی چھ صورتیں ضمیمہ میں ظاہر کی گئی ہیں۔ ہر ایک پر بقدر ضرورت کلام کر کے اس کا حکم شرعی منقح کرنا مقصود ہے۔

۱-بچوں، بوڑھوں، معذوروں کو وظیفہ دینا، یہ صورت اگر چہ اب تک ہمارے ملک میں ظاہر نہیں ہے، لیکن اگر عام ہو جائے تو اس کے جواز میں کوئی خفا یا شبہ نہیں ہوگا، اس لیے کہ یہ خالص وظیفہ یا اعانت یا انعام ہوگا بخلاف اور صورتوں کے،

۱- مشکوۃ المصابیح کتاب الامارۃ والقضاء، ۳۲۱۔

۲- الاشباہ والنظائر، ۱۴۰۔

۳- الاشباہ والنظائر، ۱۴۰۔

۴- الاشباہ والنظائر، ۱۳۹۔

ان میں بسا اوقات تفتیش وتحقیق کا اور حکم شرع مستنبط کرنے کا احتیاج ہوگا، پس یہ صورتیں نیز (۲ و ۳ و ۵) کے اندر قرض کی قریب قریب تمام صورتوں کا حکم احقر کے سابق جواب میں آچکا ہے، اور بعض صورتیں جو رہ گئی ہیں ان کا حکم اس وقت ہر نمبر کے تحت بیان کر دیا جائے گا۔

۲-اس تحریر کا مقصد اگر یہ ہے کہ فنڈ سے لیا ہوا قرض در اصل اسی ملازم کا روپیہ ہے اور اس کی واپسی میں جو رقم زائد سود کے نام پر دی جاتی ہے وہ بھی اصل اسی ملازم کو ختم ملازمت پر واپس دے دی جاتی ہے، اس لیے یہ قرض درحقیقت قرض اور یہ سود درحقیقت سود نہ ہوا، کیونکہ قرض تو وہ چیز ہوتی ہے جو دوسروں سے لی جائے۔ اور سود اس زیادتی کا نام ہے جو دوسروں کو دی جائے۔تو یہ توجیہ وتاویل اور یہ مقصد صحیح نہیں ہے، اس لیے کہ فنڈ کی اس رقم پر ابھی ملازم کی ملکیت ہی متحقق وثابت نہیں ہوئی ہے۔

اس لیے کہ ملازم کی حیثیت اجیر کی ہوتی ہے، اور فنڈ کی رقم کا وہ حصہ جو تنخواہ سے وضع نہیں ہوتا بلکہ محکمہ اپنی طرف سے ملاتا ہے، اس وصول کے ہونے سے قبل ملک ملازم نہ ہونا تو ظاہر ہی ہے اور فنڈ کا وہ حصہ جو تنخواہ سے وضع ہوتا ہے وہ بھی جزء اجرت ہوتا ہے، اور اجرت پر جب تک اجیر کا قبضہ وتصرف نہ ہو جائے اس وقت تک اجیر کی اس پر ملکیت ثابت ومتحقق نہیں ہوتی، صرف استحقاق ملکیت فی الجملہ ہوتا ہے، اور یہ ثبوت ملک کے لیے کافی نہیں ہے۔

اسی وجہ سے جب تک فنڈ کی رقم وصول نہیں ہو جاتی اس پر زکوٰۃ وغیرہ واجب نہیں ہوتی، اور اسی وجہ سے محکمہ جو جزو اضافہ کر کے اور زائد کر کے دیتا ہے، اگرچہ سود کے نام پر دیتا ہے، اور اپنے فہم وخیال میں اس پر سود کا اطلاق کرتا ہے اس کو سود نہیں کہا جاتا بلکہ سب کو انعام شمار کیا جاتا ہے اور جائز کہا جاتا ہے۔غرض وہ رقم ابھی در اصل محکمہ ہی کی ملکیت ہوتی ہے اور محکمہ کی ملک میں واپس جاتی ہے، اور جب قرض کے نام پر دی جاتی ہے تو قرض ہی شمار ہوگا اور جو نفع اس پر لیا دیا جائیگا وہ قرض پر ہی نفع لینا دینا شمار ہوگا جس کا سود ہونا ظاہر ہے، اور یہ نسبت کہ یہ فنڈ ملازم کا ہے یہ نسبت مجازی ہے، مایؤل کے اعتبار سے ہے، اور اگر تسلیم بھی کر لیں کہ وہ زائد رقم (نفع) پھر اسی ملازم کو واپس مل جاتی ہے جب بھی کچھ مفید نہیں، اولاً تو اس لیے کہ وہ رقم بہ شکل نقد ہوتی ہے، اور نقود میں قاعدہ شرعیہ مسلمہ عند الکل ہے کہ تبدل ملک سے تبدل عین ہو جاتا ہے، اور تبدل میں واپسی کہاں:۔ واپسی تو بعینہ اسی سابق شئے کی واپسی کا نام ہے اور پھر اگر اس واپسی کو بھی تسلیم کر لیں جب بھی مفید مدعا (عدم ربوا) نہیں ہو سکتی، اس لیے جب محکمہ اس کو سود قرار دیکر لیتا ہے اور سود ہی کے درجہ میں رکھ کر ملازم کو ختم ملازمت پر دیتا ہے، جیسا کہ سوال سے واضح ہے تو اس واپسی کو استرداد نہیں کہہ سکتے، کیونکہ استرداد میں سابق معاملہ کو فسخ کرنا اور اس کی حیثیت کو

مٹانا اور ختم کرنا منوی اور ملحوظ ہوتا ہے اور یہاں ایسا نہیں ہے اور جب یہ واپسی استرداد نہیں ہوئی تو سود کی حقیقت وشناعت بھی ختم نہ ہوئی بلکہ قائم ومتحقق رہی، لہٰذا یہ زائد رقم قرض کا نفع اور سود ہی کے حکم میں ہوگی اور بغیر حاجت واقعی ایسا قرض بھی لینا درست نہ ہوگا، ہاں اگر بغیر سودی قرض کے چارہ نہ ہو، اور محکمہ کے علاوہ کسی دوسرے سے قرض لینے میں سود زیادہ دینا پڑے گا تو اس صورت میں اشد المفسدین سے بچنے کی نیت سے اس اخف المفسدین کو ہی گوارہ کیا جائے گا اور اس قرض کو دوسرے قرضوں پر ترجیح ہوگی، اور بقدر ضرورت وحاجت لے لینے کی گنجائش ہوگی۔

(۳) امداد باہمی سوسائٹیوں کے ذریعہ قرض:

ان سوسائٹیوں کو بھی حکومت ہی قائم کرتی ہے اور اپنی ہی دی ہوئی یا دلائی ہوئی رقم اشیاء سے امداد دلاتی ہے، اس لیے ان سوسائٹیوں سے ملی ہوئی امداد (نقد یا بشکل سامان یا دونوں جو بھی ہو) سب کا حکم اور اس پر وصول کردہ رقم بنام سود کا سود ہونا یا سود نہ ہونا ان سب کی تفصیل ہوگی جو اصل استفتاء مکتوبہ ۲۴/۱۱/۸۸ھ کے جواب میں گذر چکی ہے، بلکہ اگر ان سوسائٹیوں میں شرکت یا مضاربت کے اصول پر کاروبار کیا جائے تو اس کے نفع کا سود نہ ہونا اور زیادہ آسان اور نمایاں ہو جائے گا بلکہ اس میں شرکت کرنا اور حصہ لینا بھی درست ہو سکے گا۔

(۴) بالاقساط ادائیگی ثمن کے وعدہ پر خرید وفروخت کا طریقہ:

اس بیع کا حکم عام طور سے فقہاء متاخرین کے فتاویٰ میں بہ تفصیل موجود ہے، جیسے امداد الفتاویٰ اور اس کا حاصل یہ ہے کہ اگر وصول اقساط کے سلسلہ میں کوئی قید عقد بیع کے منافی نہ ہو تو بے تکلف یہ بیع جائز رہے گی، اور اگر کوئی قید عقد بیع کے منافی بھی لگ جائے، لیکن ارکان بیع متحقق ہیں تو نفس معاملہ کرنے میں اگرچہ فساد آجائے اور بیع فاسد کہی جائے، لیکن یہ بیع بالکل کالعدم اور باطل نہ کہی جائے گی بلکہ مشتری کے حق میں مفید ملک رہے گی اور اس خرید کردہ شئ سے جو انتفاع ہو جائے گا وہ حرام نہ رہے گا اور جو تصرف اس میں کیا جائے گا وہ نافذ وصحیح رہے گا اور ہندوستان جیسے ممالک میں ایسے توسعات کی گنجائش ملتی ہے، جیسا کہ ہم اپنے سابق اصل جواب میں مدلل طور پر بیان کر آئے ہیں۔

(۵) مالیاتی ادارے:

پہلے عموماً بینکوں میں محض نقد کا لین دین ہوتا تھا، اس لیے اس کے منافع کو علی الاطلاق ناجائز اور سود کہا جاتا تھا، لیکن اب بہت سے بینک شرکت اور مضاربت کے اصول پر قائم ہوتے اور چلائے جاتے ہیں، اس لیے ان بینکوں میں شرکت کرنا یا ان سے لین دین کرنا جو شرکت یا مضاربت کے اصول کے مطابق ہو، ناجائز نہ ہوگا، اسی طرح ان کے منافع کا ہر حال میں سود

ہوا ضروری نہ ہوگا، بلکہ ان بینکوں کے اصول وضوابط اور ان کے حالات کے اعتبار سے الگ الگ حکم ہوگا اور جائز بھی ہو سکے گا۔

اسی طرح "انشورنس" کی حقیقت ابتداءً سود وقمار میں منحصر تھی، لیکن اگر اس کے اصول وضوابط میں کچھ تبدیلی ہوئی ہے (جیسا کہ بعض لوگ کہتے ہیں) تو اس کی تفصیل سامنے آنے کے بعد اس کے مطابق بھی حکم شرعی منقح ہو سکے گا، بہر حال یہ مالیاتی ادارے بینک کی امداد سے قائم ہوئے ہوں یا "انشورنس" کی مدد سے یا کسی اور طرح سے قائم ہوئے ہوں ہمیں اس وقت اس سے بحث نہیں ہے۔ اس وقت پیش نظر صرف یہ ہے کہ کسانوں کی زمینیں رہن رکھ کر ان کو جو امداد دی جاتی ہے، خواہ نقد سے بصورت قرض یا بصورت سامان یا آلات زراعت بیج، کھاد و اشیاء سے ادھار فروخت کر کے، غرض ان سب صورتوں میں کون کون سی صورتیں اور کون کون سے معاملے شرعی اصول پر جائز و درست ہیں، اور کون کون سے ناجائز اور نادرست ہیں۔ ان سب کی تفصیل بھی اصل سوال کے جواب میں گذر چکی ہے، وہاں مکمل دیکھ لیا جائے۔

(۶) بواسطہ بینک خرید وفروخت وکاروبار:

۱- اس طریقہ سے کاروبار کرنے کی مختلف صورتیں ہوتی ہیں:

مالک از خود بینک کا واسطہ اختیار کرتا ہے، خریدار اس کو پسند نہیں کرتا، مگر وہ مالک بینک کے واسطہ سے مال خریدار کے پاس بھیجتا ہے، اس میں مالک مال کو کئی فائدے ہوتے ہیں، ایک تو یہ ہے کہ بینک سے قیمت فوراً نقد یا کم سے کم مدت میں اور بہت آسانی سے وصول ہوجاتی ہے، دوسرے مال کے ضائع ہونے یا فریب ودھوکہ کھانے یا ادھار معاملہ میں پڑ کر قیمت کے ڈوب جانے وغیرہ کے احتمالات بہت کم ہوجاتے ہیں۔

۲- کبھی مالک مال از خود نہیں بلکہ قانون وقت کے تقاضے سے مجبور ہو کر بینک کا واسطہ اختیار کرتا ہے، اور پھر بقیہ عمل وہی کرتا ہے جو نمبر ایک میں گذر چکا ہے، اور خریدار اگر چہ اس کو پسند نہیں کرتا مگر انکار بھی نہیں کرتا۔

۳- کبھی خود حکومت دخیل ہو کر بائع ومشتری کے درمیان میں بینک کو قانوناً واسطہ بنادیتی ہے اور بینک کے ذریعے سے خرید وفروخت کراتی ہے، یہ دونوں صورتیں پہلی صورت کے اعتبار سے کم ہوتی ہیں۔

۴- کبھی بینک خود پیش کش کر کے یہ طریقہ کار جو نمبر ایک میں گذرا مالک مال سے اختیار کرالیتا ہے، کیونکہ اس طریقہ کار میں بینک کو بھی فائدہ پہنچتا ہے، بینک کی آمدنی بڑھتی ہے، یہ صورت پہلی تینوں صورتوں سے کم ہوتی ہے۔

۵- کبھی یہ طریقہ کار (بذریعہ بینک کاروبار) خود خریدار بھی اختیار کرتا ہے مگر کم، صرف ان صورتوں میں جب خریدار کے پاس اتنا سرمایہ نہیں رہتا کہ ہمیشہ نقد ہی قیمت ادا کر سکے، یا کوئی اور قانونی مجبوری ہوتی ہے یا راستہ وغیرہ کے خطرہ

سے حفاظت مقصود ہوتی ہے۔

۶-انہیں مواقع میں کبھی بینک خود بھی پیش کش کر کے خریدار سے براہ راست یہ طریقہ کار اختیار کر لیتا ہے۔ یہ اخیر کی دونوں صورتیں بہ نسبت پہلی چار صورتوں کے بھی بہت کم ہوتی ہیں، اس لیے کہ اس میں خریدار کو اگر چہ کچھ فوائد بھی ہوتے ہیں، مگر اس پر خرچ کا بار زائد ہو جاتا ہے نیز کچھ ذمہ داریاں و پریشانیاں بھی سوار ہو جاتی ہیں۔

ان چھ صورتوں میں سے پہلی چار صورتوں میں بینک سے خریدار کے قرض لینے یا بینک کو قرض پر نفع دینے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، کیونکہ ان صورتوں میں خریدار بینک سے قرض کا کوئی معاملہ ہی نہیں کرتا، بلکہ مالک خود یا دونوں براہ راست بینک سے اپنا معاملہ کر کے اس کو اپنا وکیل یا اجیر بناتے ہیں، یا بینک خود دخیل ہو کر بجائے خریدار کے مالک مال سے اپنا معاملہ کر لیتا ہے، اور ان کی ہدایات کے مطابق جو معاملہ چاہتا ہے اس میں خریدار بینک سے کہنے نہیں جاتا کہ میری طرف سے اتنا قرض دیدو بلکہ یہ صورت قریب ویسی ہی ہو جاتی ہے، جیسی صورت اصل پر اویڈنٹ فنڈ میں ہوتی ہے کہ محکمہ خود جو معاملہ چاہتا ہے اپنے ملازم کے ساتھ کرتا ہے، مثلاً یہ ہے کہ ملازم کی تنخواہ سے وضع کردہ روپیہ کے مثل خود اضافہ کرتا ہے، یا مثلاً خود ہی نام نہاد جمع شدہ فنڈ پر سود یا سود در سود وغیرہ کے نام سے کچھ رقم بڑھاتا رہتا ہے، لیکن کوئی اس کو سود نہیں کہتا، پس جس طرح وہاں سود کا تحقق نہیں ہوتا یہاں بھی نہ ہوگا، کیونکہ سود کا تحقق عقود معاوضہ میں ہوتا ہے، اور یہاں سرے سے خریدار کا بینک سے کوئی عقد ہی نہیں ہوتا اور یہ ظاہر ہے۔ اور پانچویں و چھٹی صورت میں بھی جب خریدار خود بینک کا واسطہ اختیار کرے یا بینک خود براہ راست خریدار سے معاملہ کرے چھ مختلف صورتیں ہوتی ہیں۔

یہاں الف، ب، ج، د، ہ، و کے عنوان سے چھ صورتیں لکھی جاتی ہیں:

الف: خریدار کا نقد سرمایہ بینک میں داخل وموجود ہے اور از خود مالک مال کی قیمت جمع کرا دیتا ہے تو اس کو بھی خریدار کا قرض لینا نہ کہیں گے، بلکہ اس جمع شدہ سرمایہ کو ادا کرنا محسوب کریں گے اور بینک کو اس کا اجیر یا وکیل کہیں گے، اور جو پیسے بینک خریدار سے مزید وصول کرے گا اس کو عمل کی اجرت قرار دیں گے۔

ب: خریدار کا کچھ سرمایہ تو بینک میں جمع نہیں ہے، لیکن بینک از خود ادائیگی ثمن کی مقررہ مدت سے قبل ہی مالک مال کو قیمت ادا کر دے، تو بھی خریدار کا قرض لینا نہ کہیں گے اور پھر بینک خریدار سے جو رقم اصل قیمت سے زائد لے گا اس کو سود کہنا ضروری نہ ہوگا، اور یہ ظاہر ہے۔

ج: ادائیگی ثمن کی مقررہ تاریخ ختم ہونے کے بعد بھی اگر بینک از خود قیمت جمع کر دے، لیکن خریدار سے کوئی

معاملہ نہ کرے، جب بھی قرض لینا صادق نہ آئے گا، اور پھر اس پر بینک اصل ثمن سے زائد لے گا اس کو سود کہنا ضروری نہ ہوگا۔

د- اسی طرح اگر خریدار کا کچھ سرمایہ بینک میں جمع نہ ہو، لیکن بینک مال کو اپنی قید اور نگرانی میں لے کر قیمت مالک مال کو جمع کردے، پھر جب خریدار قیمت ادا کرے اس کے بعد مال پر قبضہ ہونے دے تو اس صورت میں بھی قرض لینے کا معاملہ خریدار سے نہ ہوگا اور جو پیسے بینک سے لے گا وہ بجائے سود کے اجرت عمل شمار ہوگی۔

ھ- ان تمام صورتوں میں خواہ پہلی نمبر وار چھ صورتیں ہوں (یا، الف، ب، ج، د، وغیرہ کی پانچ صورتیں ہوں) سب میں اگر بینک اپنے پاس سے قیمت مال ادا نہ کرے بلکہ خریدار جس جس طرح قیمت ادا کرتا جائے باقساط یا بہ قسط واحد بینک وصول کر کے محض وہ قیمت مالک مال کو دیتا جائے تو اس صورت میں بھی جو پیسہ خریدار سے یا مالک مال سے بینک طے کر کے خود لے گا وہ سود نہ ہوگا، بلکہ وہ اس کی اجرت اور حق المؤنت ہوگی، اور یہ دینا لینا جائز رہے گا۔

و- البتہ اگر خریدار بینک سے واقعی قرض لے کر خود مالک مال کو قیمت ادا کرے یا بینک سے قرض لینے کا معاملہ کرے، مثلاً اس طرح معاملہ کرے کہ تم مالک مال (بائع) کو میری طرف سے قیمت ادا کردیا کرو، میں بعد میں تم کو ادا کردیا کروں گا تو بیشک یہ دونوں معاملے قرض کے ہوں گے۔ پہلا خالص قرض کا اور دوسرا قرض اور وکالت دونوں کا ہوگا اور ان دونوں صورتوں میں بینک اپنے دیئے ہوئے روپے سے زائد رقم جو خریدار سے وصول کرے گا، وہ بلاشبہ سود ہوگی، اور اس صورت میں بیشک سود دینے کا ارتکاب خریدار سے ہوگا جس کی اجازت بغیر شدید حاجت کے نہ ہوگی، مثلاً بغیر قرض لیے ہوئے کام نہ چلتا ہو، اور بینک کے علاوہ کہیں سے قرض نہ ملتا ہو یا ملتا ہو مگر باعتبار بینک کے سود زیادہ دینا پڑتا ہو، الغرض اس جواب ضمیمہ میں جن جن صورتوں میں نفع کو سود کہا گیا ہے وہ شرعی مفہوم ومصداق کے اعتبار سے کہا گیا ہے، اس کی حرمت ہر ملک اور ہر زمانہ کے اعتبار سے علی الاطلاق ہے، اخیر ضمیمہ میں ان سرکاری قرضوں کو جن جن صورتوں میں بانٹا گیا ہے، ان میں سے کوئی صورت بھی ہو، جب اس پر سود کا شرعی مفہوم صادق آجائے گا اس کو ربوئے محرم سے مستثنیٰ نہیں کرسکتے، اسی طرح حضرت مولانا جعفر شاہ صاحب نے اس ربو کو جس کی حرمت قرآن پاک میں منصوص ہے، یوزری کے ساتھ خاص فرمایا ہے، اگرچہ سوالنامہ پورا حاصل نہ ہونے کی وجہ سے نیز آکسفورڈ ڈکشنری بھی سامنے نہ ہونے کی وجہ سے حضرت موصوف کی مراد متعین نہیں ہوئی، لیکن دوسری اس فن کی معتبر کتاب (آؤٹ لائن آف اکنامکس) مصنفہ من موہن سنگھ ودیا ساگر کالج کلکتہ، مطبوعہ ۱۹۲۷ء میں یوزری USURY کے یہ تین معنی لکھے ہیں۔

(۱) سودخوری (۲) مروجہ قانونی شرح سے زیادہ سود لینا (۳) بہت بھاری سود لینا (عموماً)۔

یوزری کے انہی تین معنی میں سے کوئی معنی مراد لینا یا اس کے علاوہ کوئی بھی معنی لینا آیات حرمت ربوا میں ربوا کو اس کے ساتھ مخصوص کر لینا اس وجہ سے صحیح نہ ہوگا کہ جب شارع علیہ السلام نے خود ربوا کے معنی کی تشریح یا نشاندہی اس انداز سے فرما دی جس میں ہر طرح کا اطلاق ہے تو اب کسی دوسرے شخص کو اس کے تقیید یا تخصیص کا حق نہیں پہنچتا، چنانچہ مشہور حدیث کے جس کو مسلم شریف و ابوداؤد و نسائی و ترمذی و ابن ماجہ سبھی نے نقل کیا ہے، الفاظ یہ ہیں: **عن عبادة بن الصامت قال: قال رسول الله** ﷺ: **"الذهب بالذهب والفضة بالفضة والبر بالبر والشعير بالشعير والتمر بالتمر والملح بالملح مثلا بمثل يدا بيد فمن زاد أو استزاد فقد أربى"** (۱)۔

علت حکم جو چیز بھی ہو، اتنی بات تو ظاہر ہے کہ ان چھ چیزوں میں سے جب کوئی چیز اپنی جنس کے عوض میں بیچی جائے یا بطور قرض لی جائے یا دی جائے تو کسی قسم کی زیادتی بھی ہو وہ مطلقاً ربوائے محرم ہوگی، خواہ وہ مبادلہ (قرض) پیداوار کی صلاحیت بڑھانے کی نیت سے ہو، کسی انسانی بنیادی ضرورت کی تکمیل کے لیے ہو، خواہ مضطر کی مجبوری سے فائدہ اٹھانا مقصود نہ ہو بلکہ نفع پہنچانا مقصود ہو، خواہ بھاری سود یا سودخوری وغیرہ سے بالکل خالی وصاف ہو، غرض ہر حال میں وہ زیادتی ربوٰ ہی شمار ہوگی اور دائرہ حرمت سے باہر نہ ہوگی۔ ہاں اگر دربار رسالت علی صاحبہا الصلوٰۃ والتسلیم کی اتنی صاف تصریح اور وضاحت نہ ہوتی، اور پھر کوئی مناسب تاویل قائم ہو جاتی تو گنجائش بھی ہوتی۔

خلاصہ یہ ہے کہ جب کسی چیز کا حکم شارع علیہ السلام اطلاق وعموم کے ساتھ صاف وواضح لفظوں میں بیان فرما دیں تو کسی بشر کو یہ حق نہیں رہتا کہ وہ اس میں بغیر کسی نص کی مدد کے کوئی تقیید یا تخصیص یا کسی قسم کا تغیر وغیرہ کر سکے۔

ایک اشکال اور اس کا جواب:

اشکال یہ ہے کہ جب شارع علیہ السلام نے ربوا کا مفہوم اس طرح اطلاق اور عموم کے ساتھ صاف اور واضح بیان فرما دیا تو پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس فرمانے کا کیا مقصد ہے؟

"إن آخر ما نزلت آية الربو وأن رسول الله صلى الله عليه وسلم قبض ولم يفسرها لنا فدعوا الربوا والريبه" (۲)۔

۱- مسلم باب الربا ۲/ ۲۵۔

۲- ابن ماجہ والدارمی، مشکوٰۃ /ص ۲۴۶۔

اس کا جواب یہ ہے:

حضرت عمرؓ کے ارشاد کا یہ مطلب نہیں ہے کہ آیت ربو امجمل ہے یا اپنے مفہوم ومصداق میں گنجلک ہے، جس کی وجہ سے تقاضائے آیت پر عمل کرنے میں دشواری ہے، یہ مفہوم تو ایک معمولی انسان بھی نہیں لے سکتا چہ جائیکہ حضرت عمر فاروقؓ جیسا جلیل القدر اور قوی الایمان صحابی، اس لیے کہ اس میں کھلا اعتراض اسلام وتعلیمات اسلام پر ہوتا ہے اور اس کی زد ذات باری عز اسمہ پر پہنچتی ہے۔

بلکہ اس عبارت کا مطلب یہ ہے کہ آیت ربو ا آیت محکم ہے، اس میں نسخ وتغیر وغیرہ کسی چیز کا احتمال نہیں ہے اور نہایت واضح اور مفسر ہے، اسی لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی تفسیر نہیں فرمائی، اور اتنی اہم ہے اور خوفناک ہے کہ جو چیزیں صریح ربوا ہیں ان کو تو چھوڑنا ہی ہے، جن چیزوں میں شبہ ربو اہو ان کو بھی چھوڑ دینا ہے۔

چنانچہ علامہ طیبیؒ اسی مفہوم کو ان لفظوں میں ادا فرماتے ہیں: " **ان هذه الآية ثابتة غير منسوخة غير مشتبهة ولذالک لم يفسر ها النبی ﷺ فأجروها على ما هي عليه ولا ترتابوا فيها واتركوا الحيلة في حل الربوا** "۔

اور خود حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے اس جملہ "فدعوا الربوا والريبة" سے بھی اسی مفہوم کا پتہ لگتا ہے۔ اسی طرح "الأمور بمقاصدها" میں امور سے وہ امور مراد ہیں جن کا حسن وقبح یا جن کا حکم حلت وحرمت منصوص نہ ہو تو اس کا حسن وقبح یا حکم ان کے مقاصد سے نکل سکتا ہے نہ یہ کہ سارے ہی امور واحکام کا مدار ان ہی مقاصد پر ہو، اگر ایسا ہو تو دین کی اور حدود اللہ کی ساری ہی عمارت منہدم ہو کر رہ جائے گی۔

اسی طرح " **الضرورات تبيح المحظورات**(۱)" میں بھی الف ولام عہد کا ہے اور وہ ضرورتیں مراد ہیں جو ملجی اور منجر ہو جاتی ہیں، اضطرار اور مخمصہ تک، نہ کہ تمام ہی ضرورتوں کا یہی حکم ہو، ایسا ہرگز نہیں ہے چنانچہ اس سے اگلا جملہ " **ومن ثم جاز أكل الميتة عند المخمصة** "(۲) جو بالکل اس قاعدہ سے متصل اور اسی کی تمثیل ہے، اس کی وضاحت کر رہا ہے، جیسا کہ سابق جواب میں بھی ہم اس کی وضاحت کر آئے ہیں۔

الغرض جس معاملہ پر سود کا مفہوم شرعی صادق آجائے جس طرح اس کو غیر سود یا مباح وجائز کہنا درست وجائز نہیں ہوگا، اسی طرح جس معاملہ پر سود کا مفہوم شرعی صادق نہ آوے اس کو سود یا حرام کہنا درست ومباح نہ ہوگا، بلکہ ان فرق کا واضح

۱- الاشباہ والنظائر/۱۴۰۔
۲- الاشباہ والنظائر/۱۴۰۔

کرنا ہمیشہ اور ہر زمانہ کے علماء ومشائخ پر ضروری رہے گا تا کہ دین متین کی جامعیت اور جاذبیت وہمہ گیری وہر دلعزیزی نیز "الحلال بين والحرام بين" اور "الدين يسر" نمایاں وغالب رہے، اس تمام تر گفتگو سے قرض کی قسم اول (حکومتوں کا خود قرض لینا) کا حکم بھی خود بخود نکل آیا، اور اسی تفصیل پر جو گذری اس کو منطبق کر لینا کافی ہوسکتا ہے، اس لیے فقط ایک بات اس کے متعلق عرض کر کے جواب ختم کرتا ہوں۔

اور وہ یہ ہے کہ اگر حکومت کو اندرون ملک کے باشندوں سے قرض لینا ہو تو سود پر نہ لینا چاہئے، بلکہ جہاں تک ہو سکے باشندگان ملک کے سامنے مکمل ضروریات رکھ کر ہمدردی کی ترغیب وتحریض دلا کر بطور قرض حسنہ (غیر سودی قرض) لینا چاہیے۔ افراد ملک پر بھی اخلاقاً ضروری ہے خاص کر صاحب سرمایہ وصاحب حیثیت اصحاب پر کہ وہ ملک کی مضبوطی وترقی کے لیے حکومت کو قرض حسنہ (قرضہ غیر سودی) دیں کہ ملک کی اور اہل ملک کی ہمدردی وبہی خواہی کا تقاضا بھی یہی ہے۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند، سہارنپور ۷ /۲/ ۷ /۹۱ ۱۳ھ

ملکی ترقی کی سرکاری اسکیموں میں مسلمانوں کی شرکت:

عرض یہ ہے کہ چند امور قابل استفسار ہیں، اس کا جواب جس قدر بہ سہولت تمام ممکن ہو عنایت فرمادیں!

۱- سرکار ہند نے ملک کی ترقی کے لیے اسکیمیں کھولی ہیں، اور ان کے واسطے روپیہ کی فراہمی کے لیے سرٹیفکٹ جاری کرتے ہیں، جو لوگ سرٹیفکٹ خریدتے ہیں، ان کو سود ہر سال مل سکتا ہے، ان کا راس المال تین یا سات سال پر واپس مل سکتا ہے، یہ روپیہ سرکار اسکیم میں لگاتی ہے، لوگ روپیہ کی حفاظت کی نیت سے اور اس نیت سے بھی کہ کچھ اضافہ بطور سود ہو جاوے گا، روپیہ دے کر سرٹیفکٹ خریدتے ہیں، روپیہ فوراً نہیں مل سکتا، البتہ تین سال کے پہلے مل سکتا ہے، آیا ایسے روپیہ پر زکوۃ فوراً ہر سال ادا کرنے کا حکم ہے یا کس طرح اس کی زکوۃ کی ادائے گی کا حکم ہے؟

۲- آیا غیر مسلم حکومت سے سود لیا جاسکتا ہے اور وہ سود ہر کام میں لگا سکتے ہیں، سرکار ججوں سے، وکیلوں سے اور زمینداروں سے آدمی پر اور زمینداری ومکان پر ٹیکس لیتی ہے۔

۳و۴- کئی کمپنی چٹھی ڈالنے کی کھلی ہیں، جو غیر مسلم کی نہیں، آیا چٹھی ڈالنا ایسی کمپنی میں شرعاً جائز ہے؟ چونکہ کچھ لوگ اس ملک کو دار الحرب کہتے ہیں، آیا چٹھی ڈالنا یا عشر بند کرنا شرعاً جائز ہے۔

الجواب وباللہ التوفیق:

۱-سرکار ہند نے ملک کی ترقی کے لیے جو اسکیمیں کھولی ہیں، ان میں مختلف کاروبار اور بزنس کیا اور کرایا جاتا ہے اورعوام سے بذریعہ سرٹیفکٹ جو رقمیں لی جاتی ہیں، ان ہی کاروباروں میں اور بزنسوں میں خرچ کیا جاتا ہے، اس طرح یہ روپے بمنزلہ شیئر (حصوں) کے ہوسکتے ہیں اور دینے والے شیئر ہولڈر کہلائے جاسکتے ہیں، جس طرح دیگر کمپنیوں میں شیئر اور شیئر ہولڈر (حصہ دار) ہوتے ہیں، پھر ان کاروباروں اور بزنسوں سے جو نفع ہوتا ہے، نفع ان شیئر داروں کو دیتی ہے، یہ تاویل کی جاسکتی ہے، لہٰذا سود کا نام رکھنے سے اس کا سود ہونا ضروری نہیں، جس طرح پراویڈنٹ فنڈ وغیرہ میں سود کا نام رکھنے سے سود نہیں ہوتا۔

امدادالفتاوی میں حضرت تھانویؒ بھی اس حق میں ہیں کہ سود کا نام رکھنے سے سود ہونا ضروری نہیں اور یہ صحیح بھی ہے، اس لیے کہ سود (ربوا) شرعی لفظ اور شرعی اصطلاح ہے، شرعی مفہوم رکھتا ہے، جب تک وہ مفہوم شرعاً صادق نہ آئے گا کسی کے سود کہنے سے سود نہ ہوگا، پس جن علماء کے نزدیک یہ تاویلات وتوجیہات صحیح ہیں، وہ ان اسکیموں میں حصہ لینے اور اس کے نفع کو جائز کہتے ہیں، اور جن علماء کے نزدیک تاویلیں صحیح نہیں وہ ناجائز فرماتے ہیں، اور احقر کا رجحان بھی بحالت موجودہ جواز کی طرف ہے، اور جب وہ شخص وہ روپیہ حقیقت میں کاروبار و بزنس میں لگاتا ہے یا لگانے کے لیے دے سکتے ہیں، اس لیے اس کو زکوۃ بھی اپنے اور سرمایہ کے اندر لگے ہوئے روپیوں کی طرح دینی ہوگی۔

۲-جو نفع شرعی مفہوم کے اعتبار سے سود (ربوا) ہے، اس کا لینا دارالحرب میں اور غیر مسلم سے ہر ایک سے لینا ناجائز ہے اور حرام ہے، سود لینے پر بڑی سخت وعیدیں احادیث پاک قرآن پاک میں وارد ہیں، امام صاحب فرماتے ہیں کہ پورے قرآن پاک میں مجھے اس سے زیادہ اور کوئی آیت معاصی کے سلسلے میں خوفناک نظر نہیں آتی۔

اور اسی وجہ سے ان محکموں میں جو علماء شرکت جائز فرماتے ہیں، غایت احتیاط کا حکم دیتے ہیں کہ جہاں تک ہوسکے بچا جائے، ایسے کاموں میں بدرجہ مجبوری ہی شرکت کی جائے۔

۳-چٹھی ڈالنے کی کمپنیوں کی ذرا وضاحت فرمائیے، بہر حال اگر ان کمپنیوں میں بزنس اور کاروبار ہوتا ہے تو اس کی نوعیت اور حکم دوسرا ہوسکتا ہے، اور بالکل لاٹری والا معاملہ ہو تو دوسرا ہوسکتا ہے۔

۴-رہ گیا عشر کا مسئلہ تو ختم زمینداری کے بعد سے جہاں کا زمیندارہ حکومت نے ختم کردیا، وہاں حکومت ارضیات کاشت کی مالک ہوگئی، مسئلہ استیلاء کے ماتحت وہ زمین مثل اراضی محرزہ سلطانی ملک سرکار ہوگئیں اور عشر ختم ہوگیا، باقی جس

قدر بھی کوئی شخص بطور خیرات نکالدے گاباعث خیر وبرکت ہی ہوگا اورنکالنا بھی چاہیے،مگر وجوب عشر نہ ہونے کی وجہ سے عدم ادائیگی میں گناہ نہ ہوگا اورادائیگی میں ثواب ہوگا،فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی،مفتی دارالعلوم دیوبند،سہارنپور ۱۳/ ۱۲/ ۹۰ ۱۳ھ

الجواب صحیح سید احمد علی سعید

انعام کاغلط طریقہ:

چندلڑکوں نے مل کر ایک کمپنی شروع کی ہے اس کا نام ''سونا ٹریڈرس'' ہے، کمپنی کا اصول یہ ہے کہ دس ہزار ممبر بنائے جائیں اور ہر ممبر سے دس روپے فیس لی جائے۔کل رقم ایک لاکھ روپے ہوئے،اس رقم کو لےکرتجارت کرنے کا ارادہ ہے، اور ممبران کو ان کی اصلی رقم واپس کرنے کی صورت یہ ہے کہ ہر ماہ پانچ سو روپے کے انعامات کھولے جائیں، ۸/ انعامات ۲۵،۲۵ روپے کے اور ایک انعام تین سو روپے کا،ان انعامات کی ترتیب قرعہ اندازی جیسی ہوگی کہ دس ہزار ناموں کو ایک ڈبہ میں ڈال کر ۹ پرچے ہر ماہ نکالے جائیں،اسی طرح ۵ سال تک ہر ماہ کیا جائے اور ۵ سال بعد بقیہ ممبران کو کمپنی جو بونس (نفع) مقرر کرے وہ مع اصل رقم کے واپس کر دیا جائے گا،آیا اس کمپنی میں ممبر بنا جائز ہے یا نہیں؟ اور اس کی تقسیم شرع کے خلاف تو نہیں ہے مفصل تحریر فرماویں۔

(نوٹ) جن ممبران کا نام انعامات میں آجائے گا ان کو پھر کمپنی سے کوئی جوڑ یا تعلق باعتبار پیسے کے نہیں ہوگا۔

الجواب وباللہ التوفیق:

اس کمپنی کا یہ طریقہ انعام ونفع تقسیم کرنے کا غلط ہے۔قمار اور سود کو شامل ہے جائز نہیں۔اس لیے اس میں شریک ہونا اس کا ممبر بنا جائز نہیں ہے،فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی،مفتی دارالعلوم دیوبند،سہارنپور

الجواب صحیح محمود غفرلہ،سید احمد سعید مفتی دارالعلوم دیوبند ۲۲/ ۷/ ۹۱ ۱۳ھ

حق تصنیف سے متعلق سوال و جواب:

زید بہت بڑا عالم ہے اس نے ایک ابتدائی مذہبی کتاب لکھی جس میں بچوں کو سوال و جواب کے طور پر عقائد واعمال کے ضروری مسائل سکھائے ہیں۔ پھر وہ کتاب اس قدر مقبول ہوئی کہ بہت سے دینی مدارس میں داخل نصاب کر لی گئی۔ اور بہت سے لوگوں (اہل علم وتجارت) نے اسکو چھپوا کر شائع کیا۔ مگر زید نے کبھی کسی پر اعتراض نہیں کیا۔ زید کے انتقال کے بعد کچھ مدت گزرنے پر عمر نے اس کتاب کو بغرض اشاعت علم وتجارت چھپوایا۔ اس پر زید کے ورثاء مطالبہ کرتے ہیں کہ تمہارے اس کتاب کو چھپوانے سے ہماری تجارت کو نقصان پہنچا تم نے بلا اجازت اس کو چھپوایا ہے، لہذا ہمارے نقصان کا ہرجانہ اتنے ہزار روپیہ ادا کرو۔ ورنہ ہم عدالت میں مقدمہ دائر کرتے ہیں کہ تم نے ہماری کتاب کو بلا اجازت چھپوایا ہے۔

اب سوال یہ ہے (۱) کیا زید کے لیے خود یہ بات جائز تھی کہ وہ اپنی لکھی ہوئی دینی ضروری کتاب کی طباعت کے حقوق قانوناً محفوظ کرائے کہ کوئی دوسرا شخص نہ چھاپ سکے۔

(۲) کیا زید کے ورثا کے لیے خود یہ بات جائز ہے کہ انتقال زید کے بعد دوسرے لوگوں کو اس کے چھاپنے سے منع کریں۔

(۳) کیا زید یا زید کے ورثا کے لیے یہ بات درست ہے کہ وہ حقوق طبع کسی پریس یا تاجر کے ہاتھ فروخت کردیں۔ اور کیا شرعاً ایسی بیع درست ہوگی؟ اور اس بیع سے حاصل شدہ روپیہ جائز ہوگا؟ حق طبع مال متقوم ہے یا غیر متقوم؟

الجواب وباللہ التوفیق:

یہ اجتہادی اور قیاسی مسئلہ ہے، قرون اولیٰ میں فن طباعت کا نہ وجود تھا، اور نہ طباعت کیساتھ مالی منفعت کے متعلق ہونے کا تصور تھا، لہذا اس کے بارے میں صراحۃً کوئی حکم مذکور نہیں ہے، لیکن اگر طباعت کو غیر متقوم اور مباح الاصل مان لیا جائے، تب بھی ایسی کتاب جس کے ساتھ مصنف کی مالی منفعت یا تجارتی مفاد وابستہ ہو تو اس کو ہر کس وناکس کا بلا اجازت مصنف طبع کرنا جائز نہیں، کیونکہ بعض افعال ایسے ہیں کہ اصل کے لحاظ سے مباح ہوتے ہیں، لیکن اگر ان کے کرنے میں دوسرے شخص کی حق تلفی اور ضرر کا امکان ہو تو ان کی اباحت ساقط ہوجاتی ہے اور ممنوع شرعی بن جاتے ہیں، مثلاً ایک مسلمان عورت کو نکاح کا پیغام دینے کی ہر مسلمان مرد ہم کفو کو اجازت ہے، لیکن پیغام پر پیغام دینا ممنوع ہے، یعنی اگر ایک مسلمان مرد نے ایک ہم کفو مسلمان عورت کو اپنے نکاح کا پیغام دے دیا ہو، اور اولیاء کا نکاح کا کچھ رجحان بھی پایا جائے، تو جب تک

وہ عورت انکار نہ کردے، دوسرے کسی مسلمان کے لیے یہ مباح فعل جائز نہ ہوگا(۱)۔

ایک شخص کسی سے بھاؤ طے کرے تو تیسرے شخص کو دام لگانے کا حق نہیں رہا، اپنے مکان کی چھت پر چڑھنے اور ہوا کھانے کا ہر شخص کو حق حاصل ہے، مگر جب دوسرے لوگوں کے گھروں کی بے پردگی ہوتی ہو تو اس مباح کی اباحت نہیں رہے گی (کفایت المفتی کتاب المضاربہ والشرکت)۔

مسجد میں ہر جگہ بیٹھنا ہر نمازی کے لیے مباح ہے۔کوئی مقام کسی شخص واحد کے لیے مخصوص نہیں،لیکن اگر کوئی شخص کسی جگہ پر آ کر بیٹھ جائے اور اپنا کپڑا وغیرہ رکھ کر کسی ضرورت کے لیے اٹھے تو اس جگہ بیٹھنا دوسروں کے لیے ممنوع ہے،یعنی اس جگہ کو جب شخص واحد نے اپنے لیے مخصوص کر لیا تو دوسروں کے لیے اس کی اباحت نہ رہی، علامہ شامی نے "باب ما يفسد" میں "مطلب فيمن سبقت يده إلى مباح" کے تحت مفصل طور پر بیان کیا ہے کہ کسی مباح کے ساتھ جب کسی شخص کا حق متعلق ہو جائے تو وہ دوسروں کے لیے مباح نہیں رہتا۔

کسی مصنف کی کتاب جو شب و روز کی شدید محنت کے بعد معرض وجود میں آتی ہے۔اس کو طبع کرنے کا سب سے پہلا حق خود مصنف کو حاصل ہے اور اس کا مقصد علم کی تبلیغ و اشاعت کے ساتھ ہی مصنف کے لیے مالی منفعت کا حصول بھی ہے۔تو جب تک مصنف کا حق اس کے ساتھ وابستہ ہے دوسروں کا حق اس کے ساتھ متعلق نہ ہوگا۔ ایسے تاجران کتب جو مصنف کی طرف سے کتاب کی معتد بہ تعداد کی اشاعت کے باوجود اس کی کتاب کو بلا اجازت چھاپ لیتے ہیں، وہ اس کتاب کی مقبولیت سے مالی اور تجارتی فائدے حاصل کرنے کے لیے ایسا کرتے ہیں اور ان کا یہ عذر غیر مسموع ہے کہ انہوں نے علم کی اشاعت کے لیے ایسا کیا ہے، کیونکہ اگر ان کے دل میں علم کی وقعت اور اشاعت علم کا جذبہ ہوتا تو وہ بڑی تعداد میں مصنف سے کتاب خرید کر غریبوں میں مفت تقسیم کرتے اور ثواب حاصل کرتے۔

اب رہا یہ سوال کہ حق طباعت کا معاوضہ لینا مصنف کے لیے جائز ہے یا نہیں؟

حقوق مجردہ میں سے وہ حق جن میں مالی منفعت نہیں پائی جاتی یا وہ تحصیل مال کا ذریعہ نہیں بن سکتے، بلکہ محض دفع ضرر کے لیے اثبات حق ہوتا ہے، مثلاً حق شفعہ، سوء جوار سے مامون رہنے کے لیے یہ حق دیا گیا ہے، بیشک ایسے حقوق کا مالی معاوضہ لینا جائز نہیں، لیکن بعض حقوق ایسے ہوتے ہیں جن کے ساتھ صاحب حق کی مالی منفعت حال یا مستقبل میں متعلق

۱- "إن رسول الله ﷺ قال: المؤمن أخو المؤمن فلا يحل للمؤمن أن يبتاع على بيع أخيه ولا يخطب على خطبة أخيه حتى يذر" (مسلم کتاب النکاح ۱/ ۴۵۳ باب تحریم الخطبة على خطبة أخيه)۔

ہوتی ہے، مثلاً حق وظائف، یعنی شاہی مناصب تو ان کا معاوضہ مال کی صورت میں لینا یا مال کے معاوضہ میں حق سے دست بردار ہونا جائز ہے۔حضرت حسنؓ نے اپنے حق خلافت سے حضرت معاویہؓ کے حق میں دست برداری دے کر معاوضہ قبول فرمایا تھا (۱)۔

اپنے کاروبار کا کوئی نام رکھنے کا ہر شخص کو حق حاصل ہے۔جس کو آج کل کی اصطلاح میں گڈ ول(Goodwill) کہتے ہیں،لیکن اگر ایک شخص نے اپنے کاروبار کا نام ''عطرستان یا گلشن ادب'' رکھ لیا، اور اس سے اسکا تجارتی مفاد وابستہ ہوگیا تو دوسرے شخص کو وہ نام رکھنے کا حق نہیں رہا۔اور جب کہ ایک خاص نام کے ساتھ مستقبل میں تحصیل مال اور تجارتی منفعت مقصود ہے تو گڈ ول کا معاوضہ لینا جائز ہے(۲)۔

اسی طرح کتاب کا حق طباعت، جبکہ اس کے ساتھ مصنف کی مالی منفعت حال یا مستقبل میں متعلق ہے۔وہ حق بالاصالۃ ہے اور مصنف اس حق کو معاوضہ لیکر منتقل بھی کرسکتا ہے، اور عہد حاضر میں ذرائع نقل وحمل اور وسائل نشر واشاعت کی بے پناہ وسعت کے ہوتے ہوئے اور مصنفین کے لیے اسباب قدردانی وہمت افزائی، نیز وجہ کفاف کے فقدان کی وجہ سے حق طباعت کا مصنف کے لیے محفوظ رہنا علمی بخل نہیں ہے، بلکہ اسی میں صالح لٹریچر کی بقاء وترقی مضمر ہے،مگر صورت مسئلہ میں نقصان چونکہ نقصان منفعت ہے اور وہ بھی غیر متعین اور مجہول ہے، اس لیے موجب ضمان نہیں (۳)،فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

شرکت کی مختلف صورتیں اوران کے احکام:

۱- ''**ولا یجوز الشرکۃ إذا شرط لأحدھما دراھم مسماۃ من الربح**'' (۴) مذکورہ بالا عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ شرکت میں شریک کو متعین نفع یعنی تنخواہ لینا ناجائز ہے، مگر کیا دوسرے شرکاء کے لئے یہ تنخواہ دینے اور شریک کو تنخواہ لینے سے بقیہ مال جو شرکاء کے درمیان تقسیم ہوگا وہ حلال ہوگا یا حرام؟

۱- الاشباہ والنظائر للحموی وشامی فی غایۃ الاوطار۔
۲- حوادث الفتاوی حصہ چہارم۔
۳- شامی کتاب الغصب۔
۴- ہدایہ اولین ۲/۶۳۴ کتاب الشرکۃ زکریا کتب خانہ۔

۲-اگر کاروبار چلانے والے شریک کے لئے شرکت صحیح کرنے کے لئے غیر متعین حصہ طے کیا جاتا ہے تو رفتہ رفتہ اس کا کاروبار میں حصہ زیادہ ہوجانے کی وجہ سے پورے کاروبار پر خود قابض ہو کر بیٹھ جاتا ہے، اور دیگر شرکاء کے حصے کو جبرا وقہرا نکال دیتا ہے، اس لے متعین نفع دیناضروری ہے یہ رواج ہوٹل وغیرہ کے کاروبار میں عام ہو گیا ہے اور ابتلاء عام ہے، تو کیا اس صورت میں شرعاً متعین نفع کے لئے جواز کی کوئی سبیل نکل سکتی ہے تا کہ کسب حرام سے احتراز ہو سکے۔

۳- کچھ لوگوں نے ملکر ایک شخص کی دوکان چلانے کے لئے لی اور بات یہ طے ہوئی کہ ماہوار ہم لوگ دس ہزار روپئے (کنٹراکٹ) یعنی دکان کی اجرت دیتے رہیں گے اور پانچ سال کی مدت طے ہوئی، لیکن دکان پرانی ہوجانے کی وجہ سے اس میں کچھ مرمت واصلاح کی ضرورت ہے، اس لئے مالک دوکان نے چلانے والے لوگوں سے کہا کہ اگر تم کو دکان چلانی ہے تو جو کچھ بھی مرمت کی ضرورت ہے اپنی ذاتی رقم سے کرلو اور مرمت کا جتنا خرچ ہو وہ میرے ذمہ قرض رہے گا اور تمہارے ذمہ مجھے کنٹراکٹ دینے کی جو رقم طے ہوئی ہے اس میں سے ہر ماہ نصف نصف یعنی پانچ پانچ ہزار وصول کرتے رہیں، مابقیہ کنٹراکٹ کی نصف رقم مجھے دیتے رہیں اور مرمت کے قرض میں سے جب مبلغ دس ہزار روپئے باقی رہ جائے تو کنٹراکٹ میں سے وصول کرنا ترک کردیں وہ دس ہزار روپئے اجرت کی مدت مکمل ہوجانے کے بعد میں اس کو ادا کروں گا اور تم لوگ مجھے پوری اجرت دس ہزار روپئے دیتے رہو، دکان چلانے والوں نے اس بات کو منظور کرلیا اور یہ صورت اس لئے اختیار کی جاتی ہے تا کہ دکان چلانے والوں پر مالک دکان کی طرف سے ایک قسم کا دباؤ رہتا ہے جس کی بنا پر وہ لوگ دکان میں کسی قسم کا نقصان نہیں کرتے، کیونکہ ان لوگوں کو یہ اندیشہ رہتا ہے کہ اگر دکان میں کسی قسم کا نقصان کیا گیا تو مالک دکان ہمیں اپنے دس ہزار کا قرض واپس نہیں دے گا تو کیا اس طرح کا معاملہ کرنا شرعاً جائز ہے، اگر اس میں کوئی مضائقہ ہو تو شرعی حیثیت سے اگر کوئی جواز کی صورت نکلتی ہو تو تحریر فرمائیں۔

۴- اگر زید نے بکر سے یوں کہا کہ خالد جو کاروبار کر رہا ہے اس میں میری جانب سے بطور قرض دو ہزار روپئے دے دینا اور بکر نے زید کے حکم کے مطابق خالد کو دو ہزار روپئے دے بھی دیئے تو ظاہر ہے کہ ان دو ہزار روپئے پر زید کا قبضہ نہیں ہوا تو اب خالد کے کاروبار میں جو منافعہ ہوا وہ زید کی ملک ہو گا یا بکر کی اور یہ ملحوظ رہے کہ زید نے اپنا قرضہ بکر کو کچھ ادا کردیا ہے اور کچھ بعد میں ادا کردے گا۔

۵- ایک دوکان میں دو آدمی حصہ دار ہیں جملہ منقولی وغیر منقولی اشیاء میں، اس میں سے ایک آدمی کو دکان چلانے کے لئے متعین کیا اور دوسرا حصہ داران سے الگ رہا اور یہ دوکان چلانے میں شرکت نہ کرنے والا چلانے والے حصہ دار سے

یوں کہے کہ تم دکان چلاتے رہو اور مثلاً دو ہزار روپے مجھے میری نصف دکان کی اجرت کے طور پر دیتے رہنا، بقیہ بچا ہوا سب تمہارا ہے اور یہ صورت اس لئے اختیار کی جاتی ہے کہ متعین نفع کسی شریک کے لئے نہیں ہوا بلکہ وہ اپنے حصہ کی اجرت لے رہا ہے تو کیا یہ صورت شرعاً جائز ہے تحریر فرمائیں۔

٦- بعض مالک دکان، دکان چلانے والوں سے بطور ڈپوزٹ (قرض) لے لیتے ہیں اور یہ رقم اجارہ کی مدت ختم ہوجانے کے بعد واپس دے دیجاتی ہے اور یہ صورت اختیار کئے بغیر دکان ملنا مشکل ہے تو اس طرح ڈپوزٹ دے کر دکان چلانے کے لئے لینا جائز ہوگا اگر یہ صورت جائز نہیں ہے تو اگر یوں کیا جائے کہ مالک دکان سے کہا جائے کہ یہ ڈپوزٹ نہیں ہے بلکہ یہ وہ پیشگی اجرت ہے جو مدت اجارہ کے آخری دو مہینے ہیں اس کی اجرت ہے ان دو ماہ کے قبل کی اجرت نہیں ہے تو یہ صورت جواز کی ہے یا نہیں؟

محمد سلیمان (مہتمم مدرسہ جامعہ نذیریہ کاکوسی ضلع مہسانہ شمالی گجرات)

الجواب وبالله التوفيق:

١- ''ولا يجوز الشركة إذا شرط لأحدهما دراهم مسماة من الربح'' (١)۔

عبارت بالا سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جب کسی شریک کے لئے نفع میں سے متعین روپیوں کی شرط کردی جاتی ہے تو شرکت درست نہیں ہوتی ہے اور یہ ایک اتفاقی مسئلہ ہے، قال ابن المنذر: لاخلاف في هذا لأحد من أهل العلم(٢)۔

اور اس صورت میں نفع کی تقسیم مال کی مقدار کے اعتبار سے ہوگی اگرچہ نفع میں تفاضل کی شرط کی گئی ہو ويكون الربح على قدر المال، (الدر المختار) (٣)۔

رہ گیا یہ حکم کہ کسی شریک کو مشترکہ شئی میں کام کرنے کی تنخواہ اور اجرت لینا جائز نہیں سو یہ اس عبارت مذکورہ فی السوال سے معلوم ہی نہیں ہوتا بلکہ یہ حکم مندرجہ ذیل عبارات سے معلوم ہوتا ہے: ''ولو إستأجره لحمل طعام

١- (ہدایہ اولین رص ٦٣٢ کتاب الشرکۃ زکریا کتب خانہ)، اس کے آگے کی عبارت یہ ہے: ''لأنه شرط يوجب انقطاع الشركة فعساه لايخرج إلا قدر المسمى لأحدهما ونظيره في المزارعة'' (ہدایہ رص ٦٣٢ کتاب الشرکۃ زکریا کتب خانہ) (مرتب)۔

٢- فتح القدیر ٥/ ٢٥۔

٣- ''قوله ويكون الربح على قدر المال أى وإن اشترط فيه التفاضل لأن الشركة لما فسدت صار المال مشتركا شركة ملك والربح في شركة الملك على قدر المال'' (ردالمحتار علی الدرالمختار ٦/ ٤٩٠)۔

مشترک بینهما فلا أجر له لأنه لا یعمل شیئاً لشریکه إلا و یقع بعضه لنفسه فلا یستحق الأجر"(الدر المختار)، (قوله فلا أجر له) أی لا المسمی و لا أجر المثل زیلعی(۱) والأصل أن کل ما لا یستحق الأجر إلا بإیقا ع عمل فی العین المشترکة لا یجوز و کل ما یستحق بدونه یجوز (۲)۔

اب رہ گئی یہ بات کہ نفع میں سے تنخواہ دینے اور شریک کے تنخواہ لینے سے یا متعین ومعدود روپے دینے اور شریک کے لینے سے بقیہ مال جو شرکاء کے درمیان تقسیم ہوگا وہ حلال ہوگا یا حرام؟ سو اس میں حرمت کی کوئی وجہ نہیں اس لئے وہ مال حلال ہوگا لان الأصل فی الأشیاء إلا باحة (الاشباہ ص ۱۳۲)(۳)۔

۲-سوال اول سے ظاہر ہوتا ہے کہ غیر متعین نفع سے آپ کی مراد تنخواہ اور اجرت ہے سو اس کا حکم سوال اول کے جواب میں معلوم ہو چکا ہے کہ مشترک چیز میں کام کرنے کی اجرت وتنخواہ لینا درست نہیں لیکن امام شافعیؒ کے نزدیک درست معلوم ہوتا ہے جیسا کہ صاحب ہدایہ کی مندرجہ ذیل عبارت سے مستفاد ہوتا ہے: "وإذا کان الطعام بین رجلین فاستاجر أحدهما صاحبه أوحمار صاحبه علی أن یحمل نصیبه فحمل الطعام کله فلا أجرله وقال الشافعی رحمه الله: له المسمی لأن المنفعة عین عنده و بیع العین شائعا جائز"(ہدایہ ۳/ ۳۰۷)۔

اور ضرورت شدیدہ اور ابتلاء شدید کی صورت میں دیگر ائمہ کے مذہب کو اختیار کر لینے کی گنجائش ہے، لہذا اگر ضرورت شدیدہ یا ابتلاء شدید ثابت ہو جائے تو توسع کیا جا سکتا ہے، جیسا کہ مفقود کے بارے میں ضرورت شدیدہ کی بناء پر امام مالکؒ کے مذہب کو اختیار کر لیا گیا ہے اور قاعدہ ہے کہ ما عمت بلیته خفت قضیته(۴) اور درمختار میں ہے کہ و أطلق الشافعیؒ أخذ خلاف الجنس للمجانسة فی المالیة قال فی المجتبی: وهو أوسع فیعمل به عند الضرورة (الدرالمختار ۲۷۷)۔

جہاں تک ضرورت شدیدہ کا تعلق ہے تو ہمارے خیال میں اس کا تحقق نہیں، کیونکہ جو وجہ تنخواہ اجرت دینے کی ذکر

۱- ردالمحتار علی الدرالمختار طبعہ مکتبہ زکریا ۹/ ۸۲۔

۲- ردالمحتار علی الدرالمختار طبعہ مکتبہ زکریا ۹/ ۸۳۔

۳- الاشباہ والنظائر طبعہ دیوبند ۱۴۰۶ ص ۱۱۵ وطبعہ ادارۃ القرآن کراچی ص/ ۹۷، عبارت اس طرح ہے: "وفی شرح المنار للمصنف الأصل فی الأشیاء الإباحة عند بعض الحنفیة و منهم الکرخی"، اس کے تحت شرح حموی میں مذکور ہے: "ذکر العلامة قاسم بن قطلوبغا فی بعض تعالیقه إن المختار أن الأصل الإباحة عند جمهور أصحابنا"(الاشباہ والنظائر مطبوعہ دیوبند/ ص ۱۱۵)۔

۴- الاشباہ والنظائر طبعہ دیوبند ص ۱۳۸ وطبعہ کراچی ص ۱۰۷۔

کی گئی ہے، اس سے استیجار شریک و اعطاء اجرت کی ضرورت شدیدہ کا ثبوت نہیں ہوتا، اس لئے کہ اگر استیجار شریک و اعطاء اجرت نہ کیا جائے اور متعین ومعدود روپے کسی شریک کے لئے مشروط نہ کئے جائیں بلکہ نفع کا جز وشائع متعین (مثلاً نصف نفع، ثلث، یا ربع نفع) ہی طے کیا جائے اور مثلاً ہر پانچ سال پر حساب کر کے کاروبار چلانے والے شریک کا زائد حصہ شرکت کے مال سے علیحدہ کر کے اس کے حوالے کر دیا جائے (جیسا کہ تنخواہ دینے کی صورت میں تھوڑا تھوڑا اس کے حوالہ ہوتا رہتا ہے) تو اس شریک کا کاروبار میں حصہ زیادہ نہیں ہوسکتا اور نہ ہی پورے کاروبار پر خود قابض ہوکر بیٹھ سکتا ہے اور نہ ہی دیگر شرکاء کے حصوں کو جبراً وقہراً نکال سکتا ہے۔

نیز اس خرابی سے بچنے کے لئے وہ صورت بھی اختیار کی جاسکتی ہے جسکو۔۵ کے جواب میں بعض تاویلات اور تفصیلات کے ساتھ ذکر کیا جائے گا کما ستعرف انشاء اللہ تعالیٰ۔

رہ گیا ابتلاء شدید سو اگر واقعی اس علاقہ میں متحقق ہے تو وہاں توسع کیا جاسکتا ہے، حضرت مولینا تھانویؒ نے امام احمدؒ کی ایک روایت کی بناء پر ''دفع بقرہ بر نصف نماء'' کے بارے میں فرمایا ہے کہ ''تحرز احوط ہے اور جہاں ابتلاء شدید ہو توسع کیا جاسکتا ہے'' (امداد الفتاوی ۳/ ۲۸۵) (۱)۔

اگر استیجار شریک و اعطاء اجرت کو مطابق مذہب امام شافعیؒ اختیار کیا جائے تو مناسب ہے کہ شرکت میں بھی حتی الوسع ان کے مذہب کی رعایت کی جائے، شرکت میں ان کے نزدیک ضروری ہے کہ نفع ونقصان مال کی مقدار کے اعتبار سے ہو اس کے خلاف کی شرط موجب فساد عقد ہے: '' والربح والخسران علی قدر المالين تساويا في العمل أو تفاوتا فإن شرطا خلافه فسد العقد فيرجع كل أحدٍ على الآخر بأجرة عمله في ماله '' (۲)۔

۳- اس طرح کا معاملہ کرنا شرعاً جائز ہے جیسا کہ مندرجہ ذیل عبارت سے مستفاد ہوتا ہے: ''وإذا استأجر الرجل من آخر عرصة دار ببدلٍ معلومٍ مدةً معلومة وأذن له رب الدار أن يبني فيها كذا وكذا و يحسب له ما أنفق في البناء من الأجر فهذا جائز، ألاترى إلى ما ذكر محمد رحمه الله تعالىٰ فيمن استاجر حماماً و وكله رب الحمام أن يرم ما استرم من الحمام ويحسب له ذلک من الأجر يجوز وإذا جاز ذلک وأنفق في البناء إستوجب على الآجرِ قدر ما أنفق لأنه فعل بأمره والأجر على

۱- امداد الفتاوی طبع زکریا بکڈپو دیوبند ۳/ ۳۴۳، امام احمدؒ کی روایت جس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اس کی عبارت یہ ہے: ''لو دفع دابة أو نخلة إلى من يقوم له وله جزء من نمائه صح''۔

۲- منہاج الطالبین للنووی ص ۵۶۔

المستاجر دين فيلتقيان قصاصا إن لم يكن بينهما فضل و يترادان الفضل إن كان بينهما فضل ويكون البناء لصاحب العرصة " (۱) ۔

اس صورت کے اختیار کرنے کی جو وجہ سوال میں مذکور ہے وہ موجب بطلان یا فساد عقد نہیں ہے۔

۴- "أما دين الحيّ الفقير فيجوز لو بأمره" (الدر المختار) (قوله فيجوز لو بأمره) أى يجوز عن الزكاة على أنه تمليک منه و الدائن يقبضه بحكم النيابة عنه ثم يصير قابضاً لنفسه فتح (۲)۔

اس عبارت سے معلوم ہوا کہ اس کاروبار میں جو منافع ہوا ہے وہ زید کی ملک ہوگا، کیونکہ وہ قرض کے دوہزار روپئے اگر چہ زید کے قبضہ میں نہیں آئے ہیں لیکن زید کے نائب خالد کے قبضہ میں بحکم النیابت آ چکے ہیں وہ پھر ان دوہزار روپیوں پر شرکت کے واسطے قابض ہوا ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ خالد کے ساتھ شرکت کا معاملہ تو زید کا ہوا ہے نہ کہ بکر کا جیسا کہ سوال سے ظاہر ہو تا ہے، پس شریک کاروبار زید ہی ہے، لہذا وہی منافع کا مالک ہوگا ورنہ غیر شریک کو منافع کا مالک قرار دینا لازم آئے گا "وهو باطل كما لا يخفى من له أدنى مناسبة بالفقه"

پھر زید کا کچھ قرض ادا کر دینا اور کچھ بعد میں ادا کرنے کا ارادہ رکھنا اور بکر کا زید سے کچھ قرض وصول کر لینا بھی اس بات کی دلیل ہے کہ شریک کاروبار زید ہی ہے لہذا منافع اس کی ملک ہوگا۔

۵- اگر وہ دکان مع عمارت وفرنیچر وسامان عمارت دونوں کی ملکیت میں ہوتو یہ صورت اس تاویل سے جائز ہوسکے گی کہ ایک شریک اپنے حصہ عمارت وفرنیچر وسامان عمارت کا کرایہ لے رہا ہے، باقی کل کاروبار ونفع سب کا تبرع کر رہا ہے (ورنہ جواز کی کوئی شکل نہیں)" و أجمعوا أن لو آجر من شريكه يجوز سواء كان مشاعا يحتمل القسمة أو لا يحتمل و سواء آجر كل نصيبه أو بعضه كذا في الخلاصة" (۳)۔

لیکن یہ اجرت اس کے حصہ کی واقعی آمدنی سے زائد نہ ہو اور متعین ومعدود روپئے ہی ہوں نہ کہ جز وشائع (۴)۔

اور اپنے حصہ کا منافع کلی طور پر مستاجر کے سپرد کردے اور اس کے نفع سے بالکل دست بردار ہو جائے۔

۱- الفتاوی الہندیہ ۶/ ۴۱۴۔

۲- رد المحتار علی الدر المختار ۳/ ۲۹۱، ۲۹۲۔

۳- الفتاوی الہندیہ ۴/ ۴۴۸۔

۴- مستفاد من امداد الفتاوی ۳/ ۴۳۱۔

۲- ڈپوزٹ دیکر دکان کرایہ پر لینے کی گنجائش تو نکل سکتی ہے لیکن دوسری صورت (یعنی جو رقم مالک دوکان شروع میں لیتا ہے اس کو آخری دو مہینوں کی پیشگی اجرت قرار دیکر اس کے سپرد کیا جائے) چونکہ بے غبار ہے، اس لئے اسی صورت کو اختیار کرنا بہتر ہے، اس صورت کو چھوڑ کر سوال کی پہلی صورت کو اختیار نہ کرنا چاہئے اور اگر ڈپوزٹ کی رقم کو ضمانت قرار دیا جائے تو دونوں صورتیں بلا تکلف درست رہیں گی، رہ گیا تعجیل اجرت کا جواز سو وہ واضح ہے اور محتاج دلیل نہیں نیز مندرجہ ذیل عبارات سے اس کا جواز مستفاد بھی ہوتا ہے۔" إذا استأجر الرجل من آخر دارا بدين كان للمستاجر على الآجر يجوز" (۱) "ثم الأجرة تستحق بأحد معان ثلاثة إما بشرط التعجيل أو بالتعجيل أو بإستيفاء المعقود عليه فإذا وجد أحد هذه الأشياء الثلاثة فانه يملكها كذا في شرح الطحاوی" (۲)۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۵/۳/۱۴۰۱ھ

الجواب صحیح: محمود غفرلہ مفتی دارالعلوم دیوبند

شرکت عنان کے فساد کے وجوہات:

۱- شرکت عنان کن وجوہات کی وجہ سے فاسد ہو سکتی ہے یا کر سکتے ہیں اس کو مفصل تحریر فرمائیں۔

بعض شرکاء کا ایک شریک کو نکال دینا:

۲- بعض شرکاء دوسرے کم حصہ والے شرکاء کو بلا وجہ اپنے ذاتی مفاد کی خاطر شرکت سے خارج کر دیتے ہیں تو کیا یہ حرکت شرعاً جائز ہے؟

۳- شرکت عنان میں جملہ شرکاء کو مساوی درجہ کا حق ہوتا ہے یا حصہ کے تفاوت کی وجہ سے حقوق میں بھی تفاوت ہو سکتا ہے، مثلاً عام طور پر ہوٹلوں وغیرہ کے کاروبار میں جو شرکاء زیادہ حصہ والے ہوتے ہیں وہ کم حصہ والوں کو کسی شمار میں نہیں لاتے، یعنی ہوٹل میں کسی قسم کا کام کرنا ہو نوکر وغیرہ رکھنا ہو یا کسی بھی قسم کا ردوبدل کرنا ہو تو اپنے اختیار سے کر لیتے ہیں، کم حصہ والوں سے مشورہ لینے اور پوچھنے تک کے بھی روادار نہیں ہوتے اور ان کے اس برتاؤ پر کم حصہ والے رضامند بھی نہیں ہوتے مگر حصہ کم ہونے کی وجہ سے مجبوراً کچھ دم نہیں مار سکتے کہ کہیں ہمارا حصہ ہی نہ نکال دیں تو اس طرح زیادہ حصہ والوں کا کم حصہ والوں کے ساتھ اس طرح رویہ اختیار کرنا شرعاً کیا حیثیت رکھتا ہے؟

۱- الفتاویٰ الہندیہ ۴/ ۴۱۵۔
۲- الفتاویٰ الہندیہ ۴/ ۴۱۲۔

مال شرکت میں شرکاء کی اجازت کے بغیر تصرف:

۴-شرکت میں جمع شدہ پیسوں کو دوسرے شرکاء کی اجازت کے بغیر اپنے ذاتی مصرف میں لانا یا کسی دوسرے ذاتی کاروبار میں لگانا شرعا کیسا ہے اگر نفع تقسیم کرنے کی مدت کے قبل اپنے حصہ کے مطابق اندازاً کچھ رقم اٹھالے تو کیا اس طرح کرنے میں گنجائش نکل سکتی ہے؟

مولوی عبدالرحیم گجراتی (مدرس مدرسہ جامعہ عزیزیہ کاکوسی ضلع مہسانہ گجرات)

الجواب وباللہ التوفیق:

۱ و ۲-شرکت عنان مندرجہ ذیل وجوہ سے فاسد و باطل ہوتی ہے:

(۱) احد الشریکین کی موت اگرچہ حکماً ہی ہو خواہ دوسرے شریک کو اس کا علم ہوا ہو یا نہ ہوا ہو، (۲) شرکت کا انکار، (۳) احد الشریکین کا دوسرے سے یہ کہہ دینا کہ اب میں تیرے ساتھ شرکت میں کام نہیں کروں گا، (۴) احد الشریکین کا فسخ کر دینا بشرطیکہ دوسرے شریک کو فسخ کا علم ہو جائے خواہ مال نقود اور روپیوں کی شکل میں ہو یا سامان کی شکل میں ہو، (۵) احد الشریکین کا جنون مطبق، (۶) خریدنے سے قبل دونوں مالوں کا یا ایک مال کا ہلاک ہو جانا، (۷) کسی شریک کے لئے نفع میں سے متعین ومعدود روپیوں کی شرط کرنا یہ آخری صورت فساد کی ہے اور بقیہ صورتیں بطلان کی ہیں" وتبطل الشركة اى شركة العقد بموت أحدهما علم الآخر أولا، لأنه عزل حكمي ولو حكما بأن قضى بلحاقه مرتدا و تبطل أيضاً بإنكارها وبقوله: لا أعمل معک فتح و بفسخ أحدهما ولو المال عروضا بخلاف المضاربة هو المختار بزازيه خلافاً للزيلعي ويتوقف على علم الآخر، لأنه عزل قصدى وبجنونه مطبقا"(۱)۔

"وظاهر أنه لا يحكم بالفسخ إلا بإطباق الجنون وهو مقدر بشهر أو بنصف حول على الخلاف"(۲)۔

"وتبطل الشركة بهلاک المالين أو أحدهما قبل الشراء"(۳)۔

۱- الدر المختار علی ہامش رد المحتار ج ۳/ ۳۸۴،۸۵۔
۲- رد المحتار علی الدر المختار ۶/ ۵۰۵۔
۳- الدر المختار علی ہامش رد المحتار ۳/ ۳۷۔

"وتفسد باشتراط دراهم مسماة من الربح لأحدهما لقطع الشركة كما مر"(۱)۔

اگر شرکاء دو سے زیادہ ہوں اور ایک کے حق میں شرکت فسخ یا باطل ہوجائے تو باقی شرکاء کے حق میں اس کا فسخ یا بطلان لازم نہیں آئے گا، بلکہ ان کے حق میں شرکت قائم رہے گی، "ولو كان الشركاء ثلاثة فمات واحد منهم حتى انفسخت الشركة في حقه لا تنفسخ في حق الباقين كذا في المحيط(۲)۔

"فلو كانو ثلاثة فمات أحدهم حتى انفسخت في حقه لا تنفسخ في حق الباقين بحر عن الظهيريه"(۳)۔

شرکت عنان کو جو شریک جب چاہے فسخ کرسکتا ہے جائز ہے، لیکن اس بات کا خیال رکھنا ضروری ہے کہ کسی شریک کی حق تلفی اور اضرار کا قصد نہ ہو کیونکہ یہ معصیت ہے، اپنے مفاد کی خاطر دوسرے شریک کے نفع ونقصان کا خیال نہ کرتے ہوئے فسخ کرنا بہت ہی غلط ہے، کسی شریک کو شرکت سے خارج کرکے اس کو اپنے حصہ کی قیمت ہی لینے پر مجبور کرنا درست نہیں اور بڑی بے مروتی ہے۔

"وأحدهما يملك الفسخ وإن كان المال عروضا بخلاف المضاربة وهو المختار"(۴)۔

"القاعدة الخامسة، الضرر يزال، أصلها قوله عليه الصلاة والسلام:"لا ضرر ولا ضرار"(۵)، "وفسره في المغرب بأنه لا يضر الرجل أخاه ابتداءً ولا جزاء انتہی"(۶)۔

۳- شرکت عنان میں حصص کے تفاوت کی وجہ سے حق تصرف میں تفاوت نہیں ہوتا، بلکہ ہر شریک کو مساوی درجہ کا حق تصرف حاصل ہوتا ہے، ہوٹل میں جو بھی کام کرتا ہے، اس کا ہر شریک مجاز ہے، زیادہ حصہ والے شرکاء کا تمام تصرفات کا خود مالک بننا، اور کم حصہ والے شرکاء کو تصرف کا حق نہ دینا، اور مشورہ تک نہ لینا (جبکہ وہ اس پر راضی بھی نہیں ہوتے) ناجائز ہے،

۱- الدرالمختار مع ردالمحتار ۶/ ۴۸۹۔

۲- الفتاوی الہندیہ ۲/ ۳۳۵-۳۳۶۔

۳- ردالمحتار ۳/ ۳۸۴۔

۴- البحرالرائق ۵/ ۱۹۹۔

۵- "عن عبادة بن الصامت رضي الله عنه أن رسول الله ﷺ قضى أن لا ضرر ولا ضرار" (سنن ابن ماجہ ۲/ ۷۸۴ حدیث نمبر ۲۳۴۰، وفی سندہ انقطاع اور حدیث نمبر ۲۳۴۱، عن ابن عباس رضي الله عنهما قال قال رسول الله ﷺ: "لا ضرر ولا ضرار" وفي إسناده جابر الجعفي)۔

۶- الاشباہ والنظائر طبع کراچی ص/ ۱۱۸، وطبع دیوبند/ ۱۳۹۔

"ولكل من شريكي العنان والمفاوضة أن يبضع ويستأجر ويودع ويضارب ويوكل ويده في المال أمانة" (۱)، "ودليل عدم الجواز ما مر عن الأشباه من القاعدة والحديث الشريف"۔

۴- شرکت میں جمع شدہ پیسوں کو دوسرے شرکاء کی اجازت کے بغیر اپنے ذاتی مصرف میں لانا یا کسی دوسرے ذاتی کاروبار میں لگانا شرعاً درست نہیں۔ جب تک خرید وفروخت جاری ہے اس وقت تک نفع میں سے اپنے حصہ کے مطابق اندازاً کچھ رقم اٹھالینا درست نہیں، لیکن جب خرید وفروخت دونوں موقوف ہوچکی ہوں یا صرف خریدنا موقوف ہوا ہو اور اب صرف تقسیم کا مسئلہ رہ گیا ہو یا بقیہ مال بیچ کر تقسیم ہی کرنا ہو اور نفع کا مال نقود کی شکل میں ہو یا ایسی چیز ہو کہ تقسیم نہ کرنے سے خراب ہو جائے گی جیسے کھانا یا بعض مکیل اور موزون چیزیں اور ضرورت بھی متحقق ہو تو گنجائش ہے، لما مر عن الكنز من قوله: "ويده في المال أمانة" ولما مر عن الأشباه من القاعدة والحديث الشريف ولما في الهندية من قوله في الفتاوى: طعام أو دراهم بين اثنين غاب أحدهما واحتاج الآخر الحاضر وأخذ منه نصيبه قال محمد رحمه الله تعالىٰ: أرجو أن لا بأس به قال الفقيه ابو الليث وبه ناخذ كذا في الغياثية" (۲)۔

"وفي المكيل والموزون له أن يعزل حصته بغيبة شريكه ولا شئى عليه إن سلم الباقي وإن هلك كان عليهما كذا في النهر الفائق" (۳)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۴۰۱/۴/۸ھ

الجواب صحیح: محمود غفرلہ مفتی دارالعلوم دیوبند

ایک شریک کو اس کی محنت کے صلہ میں طے شدہ حصہ سے زیادہ دینا:

سوال نمبر (۱) سلیمان نے ایک ہوٹل کا ۷ لاکھ میں سودا کیا، ۵۰ ہزار بیعانے کے طور پر اپنے پاس سے دیئے اور بقیہ رقم ۲ ماہ کے بعد ادا کرنے کا وعدہ کیا، سلیمان سے کچھ احباب نے کہہ رکھا تھا کہ کہیں دکان ہوٹل وغیرہ خریدو تو ہمارا حصہ رکھنا، ہمارے پاس کچھ رقم موجود ہے، سلیمان نے ان لوگوں سے ایک پیسہ حصہ پر ۱۲ ہزار وصول کئے، ۶۰ پیسوں کا حصہ ۷ لاکھ ۲۰ ہزار میں فروخت کیا، اس میں لینے دینے والوں کی یہ نیت تھی کہ دوکان میں جو نفع ہوگا وہ پہلے ۶۰ پیسے والوں میں تقسیم ہوگا اور

۱- کنز الدقائق مع شرحہ البحر الرائق ۵/ ۲۹۶-۲۹۷۔

۲- الفتاوی الہندیہ ۲/ ۳۴۲۔

۳- حوالہ بالا ۲/ ۳۴۲۔

جب ۶۰ پیسے والے کو ان کی رقم جو ایک پیسے پر ۱۲ ہزار دیئے تھے وصول ہوجائیں گے تو سلیمان نفع کو ۱۰۰ پیسوں پر تقسیم کرے گا، اس میں سے ۴۰ پیسے سلیمان کو اور بقیہ دوسرے ۶۰ پیسے والوں کے ہوں گے، سلیمان کے دکان کا قبضہ لینے سے پہلے ایک ساتھی ابراہیم کو اپنے چالیس پیسے حصہ میں ۲۵ پیسے حصہ دکان ذمہ داری پر چلانے کے بدلے دینا طے کیا اور یہ طے کیا کہ اصل رقم جو ۶۰ پیسے والوں کے پاس سے وصول کی ہے وہ نفع میں سے وصول ہوجانے کے بعد تمہیں ۲۵ پیسہ نفع ملنا شروع ہوجائے گا تو اب شریعت مطہرہ کے اعتبار سے یہ معاملہ صحیح ہوا یا نہیں اگر صحیح نہیں ہے تو جواز کی کیا شکل ہے؟۔

(۲) ایک ہوٹل میں ۳۔۴ حصہ دار ہیں جس میں ایک آدمی دکان میں محنت کرتا ہے، دوسرے محنت نہیں کرتے، جو شخص محنت کرتا ہے وہ چونکہ حصہ دار ہے اس لئے تنخواہ نہیں لے سکتا، اگر دوسرے حصہ داروں نے ملکر یہ کہا ہے کہ آپ محنت کرتے رہئے ہم سب ملکر آپکو ہر سال ۱۲ ہزار ہمارے حساب میں سے ہدیہ بخشش دیں گے تو کیا اس طرح کرنا جائز ہے یا نہیں؟ اگر محنت کرنے والے کا دکان میں کچھ حصہ بڑھادیا تو یہ خطرہ ہوتا ہے کہ کبھی وہ شخص محنت کرنا چھوڑ دے یا بیمار ہوگیا یا غیر حاضر رہنے لگا تو جو حصہ بڑھادیا وہ کیسے کم کرسکتے ہیں، آیا وقتی طور پر جب تک وہ شخص محنت کرتا رہے گا اس کو اتنا حصہ نفع میں زیادہ ملے گا اور محنت چھوڑ دے گا یا انتقال ہوگیا تو وہ حصہ نہیں ملے گا، اس طرح شرط رکھ سکتے ہیں یا نہیں؟۔

شریک کا مال مشترک سے چندہ دینا و دیگر تصرفات کا حکم:

(۳) بمبئی میں ہوٹل کے کاروبار میں ۵-۶ اور زیادہ شریک ہوتے ہیں، ایک ایک پیسے کا حصہ دار ہوتا ہے اور ۲-۴ آنوں کا حصہ دار بھی اس میں ہوتا ہے، لیکن ایک آدمی ذمہ دار ہوتا ہے جس کے پاس حساب رہتا ہے اور وہ تمام حصہ داروں کو انکا نفع وقت پر تقسیم کرتا ہے، دکان میں کوئی مرمت کا کام آتا ہے یا سرکاری دفتر وں کی لائن کے کام بھی وہی کرتا ہے، ماہ رمضان میں مسجد مدرسوں کے چندہ کرنے والے ہندوستان کی مختلف جگہوں سے آتے ہیں ان کو بھی دکان میں سے دیتا ہے، یہ چیزیں پہلے سے چلی آرہی ہیں، اس میں کسی حصہ دار کا کوئی اختلاف نہیں ہے، لیکن ذمہ دار شخص کبھی بھی ایک ایک پیسے اور کم زیادہ کے حصہ داروں کو جمع کرکے نہیں پوچھتا کہ اس طرح کے کام مجھے کرنے ہوتے ہیں، آپ سب ملکر مجھے اجازت دے دیں اس لئے کہ عام طور پر سب حصہ داروں کو یہ ساری باتیں معلوم ہوتی ہیں کہ اس طرح ذمہ دار شخص تصرف کرتا رہے گا جس پر کوئی مخالفت نہیں کرتا، آیا اس قسم کا کام صریح اجازت کے بغیر اور چندہ وغیرہ دکان میں سے دینا جائز ہے یا نہیں اور اس کے جواز کی کیا صورت ہے؟۔

شریک کے انتقال کے بعد اس کے حصہ کا مالک کون ہوگا؟

(۴) اگر ایک ہوٹل کے ۵، ۷ حصہ دار میں سے ایک کی وفات ہوگئی، مرحوم کے وارث موجود بھی ہیں، اب یہ وارث اس دکان میں مرحوم کے حصے کے پورے پورے نفع اور ملک میں حصہ دار ہوں گے یا نہیں؟ مرحوم کے انتقال کے بعد حصہ داروں نے اور ورثہ نے کوئی خلاصہ نہیں کیا اور ایک سال گذر گیا، تو جو نفع مرحوم کے حصہ کا ہوگا اس کے حق دار کون ہوں گے، وارث اس حصہ کو باقی رکھنا چاہتا ہے تو شرعاً کیا حکم ہے اور دوسرے شرکاء اس کو باقی نہیں رکھنا چاہتے تو اس کا کیا حکم ہے واضح فرمادیں۔

غیر شریک کا شرکاء کے لئے تنخواہ پر کام کرنا:

(۵) ایک ہوٹل کو اس کے مالکان یا کرائے دار کئی سال سے چلاتے ہیں، اب وہ ضعیف اور کمزور ہوگئے، یا کسی وجہ سے چلانے کو تیار نہیں ہے، تو یہ سب ملکر کسی ایک باہر کے شخص کو جو حصہ دار نہیں ہے، ۱۵ پیسے نفع میں حصہ دیکر رکھ سکتے ہیں یا نہیں؟ یعنی وہ آدمی اپنی ذمہ داری سے دکان سنبھالے گا اور جو نفع ہوگا اس میں ۱۵ فی صد وصول کرلے گا باقی مالکوں کو دے دے گا تو اس طرح کرنا جائز ہے یا نہیں؟ نفع کیساتھ روزانہ ۱۵ روپیہ تنخواہ بھی لیتا ہے یہ جائز ہے یا نہیں؟

ہوٹل کی ذمہ داری ایسے شریک کو دینا جو نفع زیادہ دے:

(۶) ایک ہوٹل کے پانچ سات حصے دار ہیں ہر ایک حصہ دار یہ چاہتا ہے کہ دوکان کو میں سنبھالوں اور چلاؤں سب ملکر نہیں چلاتے، ایک شخص جو ذمہ دار ہوتا ہے وہی چلاتا ہے، جب آپس میں معاملہ طے نہیں ہوتا تو یہ شرکاء یہ شرط رکھتے ہیں کہ جو نفع زیادہ دینے کو تیار ہو اس کو دینا چاہئے، اب آپس میں بیٹھ کر طے کرتے ہیں اور جو زیادہ رقم دینے کو تیار ہوتا ہے، اس کو دوکان ایک متعین وقت کے لئے سپرد کرتے ہیں، آیا اس طرح کرنا جائز ہے یا نہیں، اگر جائز نہیں ہے تو اس ہوٹل میں جو چیزیں موجود ہیں، مثلاً کرسی، میز، پنکھے جو چھت میں لٹک رہے ہیں اور الماری جو دیوار میں لگی ہے وغیرہ چیزوں کا جو زیادہ کرایہ دے اس کو ہوٹل چلانے کے لئے دیدیتے ہیں تو کیا یہ صحیح ہے یا نہیں؟

مال اور عمل کے بغیر نفع میں شرکت:

(۷) زید کے پاس دوکان خریدنے کے لئے اتنی رقم تو نہیں ہے مگر اپنی وجاہت سے ادھار خریدتا ہے، پھر خریدنے کے بعد شرکاء تلاش کرتا ہے، اس میں سے دس فی صد پیسے اپنے لئے رکھتا ہے کہ تم لوگوں کو دوکان خرید کر تو میں نے دی ہے، لہذا بغیر راس المال کے دس پیسہ حصہ تم لوگ مجھے دیتے رہو اور تمام شرکاء اس کو خوشی سے قبول کر لیتے ہیں، تو اس طرح

سے معاملہ کرنا شرعاً کیسا ہے، اسی طرح اگر شرط اجارہ کی دکان میں کی جائے تو شرعاً کیا حکم ہے؟

کھیت کو پیداوار کے ایک تہائی حصہ کی شرط پر سیراب کرنا:

(۸) میرا ایک ذاتی کنواں ہے اس میں کافی پانی ہے، دوسرے لوگ مجھ سے اپنے کھیت کو سیراب کرنے کے لئے پانی طلب کرتے ہیں تو میں پانی اس شرط پر دیتا ہوں کہ تمہارے کھیت میں جو اس پانی سے پیداوار ہوگی اس میں سے تیسرا حصہ مجھے پانی کے عوض میں دینا اور کھیت والا اسے خوشی سے منظور کر لیتا ہے تو شرعاً یہ معاملہ کرنا کیسا ہے؟

اور اگر ایک گھنٹہ کے دس روپئے کے حساب سے پانی دیا جاتا ہے تو اس سے کنویں والے کا نقصان ہوتا ہے بلکہ کھیت والے بھی اس پر خوش نہیں ہوتے اور اگر پانی نہ دیوے تو دوسرے لوگوں کے پاس چونکہ کنواں نہیں ہے یا اس میں پانی نہیں ہے، اس لئے پریشان ہوتے ہیں اور ان کے کھیت بے کار پڑے رہتے ہیں تو کیا ایسی مجبوری کی صورت میں شرعاً اوپر والا معاملہ کرنا درست ہے؟

مضاربت کے بعد ارباب مال، مضاربین اور راس المال میں اضافہ کا حکم:

(۹) عقد مضاربت تام ہوجانے کے بعد ارباب مال میں نیز مضاربین میں اضافہ ہوسکتا ہے یا نہیں؟

(۱۰) نیز عقد مضاربت تام ہوجانے کے بعد رأس المال میں اضافہ کرنا کیسا ہے بحوالہ کتاب جواب عنایت فرمائیں۔

محمد سلیمان بھاگلپوری

الجواب وباللہ التوفیق:

۱-اس سوال کے جواب سے پہلے چند باتوں کا معلوم ہونا ضروری ہے:

(۱) سلیمان نے ہوٹل پر قبضہ کرنے کے بعد اس کے ساٹھ پیسے حصہ کو فروخت کیا ہے یا قبضہ سے پہلے؟

(۲) ابراہیم سے دکان چلانے کا معاملہ کب ہوا ہے اور یہ معاملہ سب شرکاء کے مشورہ اور رضامندی سے ہوا ہے یا صرف سلیمان کے ساتھ ہوا ہے۔

(۳) ابراہیم بھی ہوٹل کے شرکاء مالکین میں سے ہے یا نہیں؟

۲- یہ بارہ ہزار (۱۲۰۰۰) روپئے سالانہ دینے کے لئے کہنا اگر شرط کے درجہ میں ہو، یعنی اگر نہ پاوے تو مطالبہ

کر سکے تو جائز نہیں، خواہ تنخواہ کے نام سے دیئے جائیں یا ہدیہ یا بخشش کے نام سے (۱) اور اگر محض وعدہ کے درجہ میں ہے اور محض تبرع ہے تو ہدیہ یا اور بخشش کے نام سے دینا جائز ہے اور اگر بغیر شرط اور وعدہ کے دیا جاتا رہے تو اور اچھا ہے، سوال کے آخر میں جو شرط ذکر کی گئی ہے وہ درست نہیں۔

اچھی صورت یہ ہے کہ محنت کرنے والے کا کچھ حصہ بڑھا دیا جائے اور ہر سال جدید معاملہ کیا جائے اور کام کرنے والے شریک کا کام دیکھ کر حصہ میں کمی وبیشی کردی جایا کرے (۲)۔

۳- ذمہ دار شریک جس کے پاس حساب رہتا ہے اور شرکاء کے درمیان نفع تقسیم کرتا ہے، اس کے لئے دکان کی مرمت کرنا اور کروانا اور سرکاری دفاتر سے متعلق کام کرنا اور کروانا درست ہے، ان چیزوں کے لئے صریح اجازت کی ضرورت نہیں، رہ گیا چندہ وغیرہ سو قیاس تو یہ ہے کہ اس مشترک ہوٹل میں سے دینا بغیر اذن صریح کے درست نہ ہو، مگر چونکہ تعارف ہے اور تعارف اذن صریح کے قائم مقام ہوا کرتا ہے، اس لئے استحسانا درست ہے، ”ولکل من شریکی العنان والمفاوضة أن یستأجر ویبضع “ الخ (۳)۔

”وکل ما کان لأحد أن یعمله إذا نهاه شریکه عنه لم یکن له عمله“ (۴)۔

”ولا یجوز لهمافی عنان ومفاوضة تزویج العبد........ ولا الأمة ای لثوب ونحوه ولا القرض إلا باذن شریکه إذنا صریحاً (سراج) وفیه إذا قال له: إعمل برأیک فله کل التجارة إلا القرض والهبة وکذا کل ما کان إتلافاً للمال أو تملیکاً للمال بغیر عوض، لأن الشرکة وُضعت للإسترباح وتوابعه وما لیس کذلک لا ینتظمه عقدها“ (۵)۔

”قال في البحر: ولو قال کل منهما للآخر: إعمل برایک فلکل منهما أن یعمل ما یقع في التجارة کالرهن والإرتهان والسفر والخلط بما له والشرکة بالغیر لا الهبة والقرض وما کان إتلافا

۱- ”وشرطها (الشرکة) ..... وعدم مایقطعها کشرط دراهم مسماة من الربح لأحدهما لأنه قد لا یربح غیر المسمی، وحکمها الشرکة في الربح“ (الدرالمختار مع ردالمحتار ۶/۴۷۵)۔

۱- ”ومع التفاضل في المال دون الربح وعکسه“ (الدرالمختار)، ”لکن هذا مقید بأن یشترط الأکثر للعامل منهما أو لأکثر هما عملاً“ (ردالمحتار علی الدرالمختار ۶/۴۸۴ مکتبہ زکریا دیوبند)۔

۳- تنویر الابصار مع الدرالمختار ۳/۳۴۴۔

۴- فتاوی عالمگیریہ ۲/۳۲۳، وتمام العبارة: فإن عمله ضمن نصیب شریکه۔

۵- الدرالمختار علی ہامش الطحطاوی ۲/۵۲۰۔

للمال أو تمليكا من غير عوض فإنه لا يجوز مالم يصرح به نصا" (۱)۔

"قوله: وكذا كل ما كان إتلافا للمال ولو في وجوه الخير كوقف وبناء مسجد" (۲)۔

"ومنها لو باع التاجر في السوق شيئاً بثمن ولم يصرحا بحلول ولا تأجيل وكان المتعارف فيما بينهم أن البائع يأخذ كل جمعة قدراً معلوماً إنصرف إليه بلا بيان، قالوا لأن المعروف كالمشروط" (۳)۔

۴- شرکاء میں سے کسی شریک کے انتقال کر جانے سے اس کے حق میں شرکت فسخ ہوجاتی ہے اور دوسروں کے حق میں فسخ وباطل نہیں ہوتی ہے وہ اگر اس کو باقی رکھنا چاہیں تو بلاتکلف باقی رکھ سکتے ہیں، پس اس شریک کے وفات پا جانے کی وجہ سے شرکت فسخ ہوگئی، مرحوم کی وفات کے وقت جس قدر ان کا حصہ تھا صرف اسی مقدار کے ورثہ حقدار ہیں، جب ورثہ نے دوسرے شرکاء کیساتھ از سر نو مستقل عقد شرکت نہیں کیا ہے، تو مرحوم کے انتقال کے وقت سے ابتک جو ان کے چھوڑے ہوئے حصہ پر نفع ہوا ہے، اس کے حقدار ورثہ نہ ہوں گے، لیکن اس کو لیکر صدقہ کر دینا ضروری ہوگا ان کے لئے (یعنی شرکاء کے لئے) مرحوم کے حصہ کا نفع حلال نہیں رہے گا، "وتبطل الشركة بموت أحدهما وبجنونه مطبقا فالربح بعد ذلك للعامل لكنه يتصدق بربح مال المجنون(۴)(قوله لكنه يتصدق الخ) "والظاهر أنه يقال مثل ذلك فيما إذا تصرف أحدهما بالمال في صور بطلان الشركة المارة فإن الربح يكون للعامل ويتصدق بما ربح من مال الآخر"(۵)۔

"(قوله وبجنونه) قال في البحر: سئل أبو بكر عن شريكين جن أحدهما وعمل الآخر بالمال حتى ربح أو وضع قال: الشركة بينهما قائمة إلى أن يتم إطباق الجنون فإذا مضى ذلك الوقت عليه قال: تنفسخ الشركة بينهما فإذا عمل بالمال بعد ذالك فالربح كله للعامل والوضيعة عليه وهو كالغصب لمال المجنون فيطيب له ربح ماله ولا يطيب ما ربح من مال المجنون فيتصدق(۶)۔

۱- حاشیۃ الطحطاوی علی الدر مطبوعہ کوئٹہ ۲/ ۵۲۰، البحر الرائق ۵/۲۹۹۔

۲- حاشیۃ الطحطاوی علی الدر مطبوعہ المکتبۃ العربیہ کوئٹہ ۲/ ۵۲۰، نیز الدر المختار مع رد المحتار ۶/ ۳۹۳" وفیہ: وكذا كل ما كان إتلافاً للمال أو كان تمليكاً للمال بغير عوض لأن الشركة وضعت للاسترباح وتوابعه وما ليس كذلك لا ينتظمه عقدها"۔

۳- الاشباہ والنظائر طبع ادارۃ القرآن کراچی/ ۱۲۸، وطبع دیوبند/ ۱۵۲۔

۴- الدر المختار ۳/ ۸۵-۳۸۴۔

۵- رد المحتار ۳/ ۳۸۵۔

۶- حاشیۃ الطحطاوی علی الدر المختار ۲/ ۵۲۴۔

رہ گئی یہ بات کہ ورثہ شرکت کو باقی رکھنا چاہتے ہیں اور دوسرے شرکاء ورثہ کے ساتھ شرکت کو باقی رکھنا نہیں چاہتے، سو اس کا حکم یہ ہے کہ شرکت تو مرحوم کے وفات کے وقت فسخ وباطل اور معدوم ہوچکی ہے، اس باطل اور معدوم کو کس طرح باقی رکھیں گے، ہاں اگر ورثہ ازسر نو دوسرے شرکاء کی رضامندی سے شرکت کا معاملہ کریں اور صحت شرکت کی جملہ شرائط پائی جائیں تو وہ اور بات ہے ورثہ کو اس بات کا حق نہیں کہ شرکاء کے ساتھ بغیر انکی رضامندی کے شریک ہوجائیں اور نہ ہی دوسرے شرکاء پر انکو شریک کرنا لازم ہے:" لأن كل واحدمختار في المعاملات مع الآخرين"، البتہ مرحوم کا حصہ جو انکے انتقال کے وقت تھا، ورثہ ان کے حقدار ہیں وہ ان کو مل جائے گا، البتہ شرکاء کے لئے بہتر ہے کہ مرحوم کے ورثہ کو اگر کوئی مانع نہ ہوتو شریک کرلیں۔

۵- وہ شرکاء اس غیر شریک سے جو معاملہ کرنا چاہتے ہیں وہ مضاربت ہے، پس اگر صحت مضاربت کی ساری شرطیں پائی جائیں تو درست ہے ورنہ نہیں، مضاربت کی ایک شرط یہ ہے کہ رأس المال اثمان میں سے ہو، اگر عروض میں سے ہے تو حیلہ کرلیا جائے، یعنی ارباب مال مضارب سے یوں کہیں کہ یہ سامان بیچ کر اس کے ثمن سے مضاربت کرو۔

دوسری شرط یہ ہے کہ نفع میں سے مضارب اور رب المال کے لئے جزء شائع ہی ہو، متعین مقدار نفع کی کسی کے لئے طے نہ کی جائے، پس اگر رأس المال اثمان میں سے ہے، یا عروض میں سے ہے، لیکن حیلہ کرلیا گیا ہے اور نفع میں سے ارباب مال کی طرح مضارب کا بھی جزء شائع ہی ہو، ۱۰، ۱۵ پیسے یا ۳۰ پیسے وغیرہ تو درست ہے۔

اس مضاربت کی بنیاد پر نفع میں ۱۵ روپے روزانہ مضارب کے لئے طے کرنا درست نہیں، اس سے مضاربت فاسد ہوجائے گی، البتہ مضارب کو ۱۵ پیسے حصے کے بجائے تیس پیسے حصے یا چالیس پیسے حصے وغیرہ متعین کرسکتے ہیں، اگر اس کو نفع کی تقسیم سے پہلے ہی پیسوں کی ضرورت ہوتو ارباب مال کی اجازت سے اپنے حصے میں سے کچھ لیتا رہے، پھر نفع کی تقسیم کے وقت اس کے حصے میں سے اتنا کم کردیا جائے گا اور اس صورت میں نقصان مضارب پر نہیں ہوگا بلکہ ارباب مال پر بعد وضع نفع ہوگا "وشرطها أمور سبعة: كون رأس المال من الأثمان...... و كون الربح شائعاً فلو عين قدراً فسدت " (۱)۔

"(قوله اشترلي عبداً) هذا يفهم أنه لو دفع عرضا وقال له: بعه واعمل بثمنه مضاربة أنه يجوز بالأولى، وقد أوضحه الشارح وهذه حيلة لجواز المضاربة في العروض "(۲)، وهكذا في البدائع عن

۱- الدر المختار علی ہامش رد المحتار ۴/ ۴۸۵-۴۸۴۔

۲- رد المحتار ۴/ ۴۸۴ نقلا عن الطحطاوی۔

كتاب المضاربة مفصلاً ومدللاً(۱)۔

اس معاملہ کواجارہ بھی قرار دیا جاسکتا ہے،لیکن اس صورت میں نفع میں سے پندرہ پیسے حصہ اجرت کے لئے طے کرنا درست نہ ہوگا، بلکہ اجرت کا متعین اور معلوم کرنا ضروری ہے، اسی طرح مدت عمل کا بیان کرنا بھی ضروری ہے، مثلا یہ کہ پچیس روپے اور یا مثلاً ۵۰۰ سو روپے مہینے میں اس کو اجرت پر رکھا جائے اور اس سے بیع وشراء کا کام لیا جائے ،"من دفع إلى حائك غزلا لينسجه بالنصف فله أجر مثله وكذا إذا استاجر حمارا يحمل عليه طعاما بقفيز منه فالإجارة فاسدة، لأنه جعل الاجر بعض ما يخرج من عمله فيصير في معنى قفيز الطحان، وقد نهى عليه السلام عنه .... والمعنى فيه أن المستاجر عاجز عن تسليم الأجر وهو بعض المنسوج أو المحمول وحصوله بفعل الأجير فلا يعد هو قادراً بقدرة غيره''(۲) ۔

"ولا يصح حتى تكون المنافع معلومة والأجرة معلومة ....والمنافع تارة تكون معلومة بالمدة'' الخ (۳)۔

"(فرع) استوجر على أن يبيع ويشترى لم يجز لعدم قدرته عليه، والحيلة أن يستاجره مدة للخدمة ويستعمله فى البيع زيلعى" (۴)۔

مذکورہ صورت میں مضاربت بھی ہے اور اجارہ بھی ہے جو تداخل صفقتین ہے، یہ وجہ بھی اس معاملہ کے نا درست ہونے کی ہے،پس یا تو اجارہ ہی رکھا جائے یا مضاربت ہی۔

٦- سوال سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک شریک کو دوسرے شرکاء جو ہوٹل چلانے کے لئے دے رہے ہیں، وہ اپنے حصوں کو کرایہ پر دے رہے ہیں، اگر ایسا ہی ہے تو حکم یہ ہے کہ اگر وہ ہوٹل مع اپنے الماریوں فرنیچر وغیرہ کے ان شرکاء کی ملکیت میں ہے تو دونوں صورتیں اپنی شرط (جس کا ذکر آگے آئے گا) کے ساتھ درست ہیں اور اگر وہ ہوٹل کرایہ کا ہے تو اس میں یہ تفصیل ہے کہ اگر انہوں نے ہوٹل میں کچھ اصلاح کی ہے یا الماریاں وغیرہ خود لگوائی ہیں اور اب شریک کے ساتھ زیادتی اجرت کے ساتھ معاملہ کر رہے ہیں تو درست ہے اور اجرت زائدہ حلال وطیب ہے اجرت زائدہ کا الماریوں وغیرہ

۱- دیکھئے: بدائع الصنائع ۵/ ۱۱۳۔
۲- ہدایہ مع الفتح کتاب الاجارۃ ۸/ ۱۸۸۔
۳- ہدایہ ۳/ ۲۷۰۔
۴- الدر المختار ۴/ ۳۶۰۔

کے مقابلہ میں مقرر کرنا ضروری نہیں البتہ ایسا کرلینا بہتر ضرور ہے اور اگر نہ کچھ اصلاح کی ہے اور نہ ہی الماریاں وغیرہ خود لگوائی ہیں تو اجرت زائدہ دوسرے شرکاء کے لئے حلال نہیں ہوگی، اس کا صدقہ کردینا واجب ہوگا، اس معاملہ کی جو صورتیں درست ہیں، ان میں بھی شرط یہ ہے کہ اجرت نفع میں سے متعین نہ کی جائے بلکہ مطلقاً روپے متعین کر لئے جائیں، اگر یہ شرط نہ پائی گئی تو اجارہ فاسد ہوجائے گا کمافی الهندیه قوله:" و أجمعوا أنه لو آجر من شريكه يجوز سواء كان مشاعاً يحتمل القسمة أو لا يحتمل وسواء آجر كل نصيبه أو بعضه كذا في الخلاصة" (۱) ولما مرفي الجواب:عن السوال الرابع من الدر المختار ورد المحتار وأصول الكرخي، ولما في الدر المختار من قوله :"ولو دفع غزلاً لآخر لينسجه له بنصفه أى بنصف الغزل أو إستأجر بغلا ليحمل طعامه ببعضه أو ثوراً ليطحنَ بُرّه ببعض دقيقه فسدت في الكل، لأنه إستأجر بجزء من عمله والأصل في ذلک نهيه ﷺ عن قفيز الطحان وقدمناه في بيع الوفاء والحيلة ان يفرز الأجر أولا أويسّمى قفيزاً بلا تعيين ثم يعطيه قفيزاً منه فيجوز" (۲)۔

اور اگر سوال کا مقصد کچھ اور ہوتو واضح کیا جائے تا کہ حکم معلوم کیا جا سکے۔

۷-نفع میں شرکت کے لئے ضروری ہے کہ تین چیزوں میں سے ایک چیز پائی جائے: مال ہو یا عمل ہو، تقبل وضمان ہو اور زید کا ان تینوں چیزوں میں سے کچھ بھی نہیں ہے، لہذا یہ شرکت فی النفع درست نہ ہوگی اور زید کسی مقدار نفع کا مستحق نہ ہوگا اور نہ زبردستی ان سے لے سکتا ہے،" وفي الدر: لا يستحق الربح إلا بإحدى ثلاث: بمال أو عمل أو تقبل" (۳)۔

"وقال في الدر: ولذا لو قال لغيره: تصرف في مالک على أن لي بعض ربحه لا يستحق شيئاً لعدم هذه المعاني" (۴)۔

البتہ زید نے شرکاء پر شراء یا اجارۂ دکان کا انتظام کر کے تبرع اور احسان کیا ہے، اگر اس کے عوض میں بطیب خاطر اتنا حصہ یا جس قدر چاہیں اور جب تک چاہیں دیا کریں تو کوئی مضائقہ نہیں، یہ حکم مندرجہ ذیل عبارت سے مستفاد ہوتا ہے:

۱- الفتاوی الہندیہ ۴/ ۴۴۸۔
۲- الدر المختار ۶/ ۳۶ نعمانیہ۔
۳- الدر المختار ۳/ ۳۴۹۔
۴- رد المحتار ۳/ ۳۴۹۔

”ولو عمل من غير شرط وأعطاه شيئاً لا بأس به لأنه عمل معه حسنة فجازاه خيراً“(۱)، دونوں صورتوں کا یہی حکم ہے۔

۸- کنویں کا مالک اس کے پانی کا مالک نہیں ہوتا کہ اس کی بیع صحیح ہو، ہاں اگر اس کو کسی آلے سے نکال لے تو مالک ہوجائے گا، پس اگر اپنی مشین یا رہٹ وغیرہ سے نکال دیتا ہے اور اجرت بھی مطلقاً متعین کرتا ہے نہ کہ پیداوار کا جزو شائع مثلاً دس روپیہ گھنٹہ یا پچاس روپیہ بیگھا متعین کرتا ہے تو درست ہے ورنہ درست نہیں، پس یہ معاملہ مذکورہ درست نہیں، ہے سوال میں جو مجبوری ذکر کی گئی ہے وہ کوئی ایسی مجبوری نہیں ہے جس سے جواز کا حکم نکال لیا جائے، ”وقال الرملي: صاحب البئر لا يملک الماء“(۲)۔

”ولا يصح حتى تكون المنافع معلومة والأجرة معلومة“ (۳) ”فيصير بمعنى قفيز الطحان وقد نهى عليه السلام عنه، والمعنى فيه أن المستاجر عاجز عن تسليم الأجر“(۴)۔

جواب نمبر ۱۰ و ۱۱- الدر المختار ورد المحتار کے کتاب المضاربۃ و الفتاوی الہندیۃ ۴/ ۵۲۲ اور قواعد سے معلوم ہوتا ہے کہ ارباب مال اور مضاربین کے مشورہ سے یہ اضافے ہوسکتے ہیں(۵)۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دار العلوم دیوبند سہارنپور ۱۴۰۱/۵/۲۱ھ

شرکاء میں سے کسی شریک کا مال شرکت میں سے کچھ اپنے مصرف میں لانا:

۱- ایک کمپنی جو کہ بہت سے افراد کے حصص سے بنی ہے کی رقم میں سے جانے انجانے کچھ رقم ذمہ داران کے ذاتی مصرف میں بھی آجاتی ہے جس کا حساب میں آنا ممکن نہیں ہوتا (ذمہ داران کچھ رقم بنا حساب بھی خرچ کرتے ہیں) کیا یہ کوئی

۱- رد المحتار ۴/ ۴۸۔

۲- رد المحتار على الدر المختار ۷/ ۲۵۸ نیز علامہ شامی آگے لکھتے ہیں: ”وهذا ما دام في البئر، أما إذا أخرجه منها بالإحتيال كما في السواني فلا شک في ملكه له لحيازته له في الكيزان ثم صبه في البرک بعد حيازته“(۷/ ۲۵۸ مکتبہ زکریا)۔

۳- ہدایہ ۳/ ۲۹۳ کتاب الاجارات یاسر ندیم اینڈ کمپنی دیوبند۔

۴- ہدایہ ۳/ ۲۷۷۔

۵- تفصیل کے لئے دیکھئے: رد المحتار ۸/ ۴۳۵،........”ولا يملک المضاربة والشركة والخلط بمال نفسه إلا بإذن أو إعمل برأيک“۔

گناہ تو نہیں؟

۲-مزید جو حصص حصہ داران لیتے ہیں ان پر کچھ فائدہ ایسا بھی ہوتا ہے جو کہ حسابات سے پرے ہوتا ہے اور ان کے اندراجات نہیں ہوتے ان کے سلسلہ میں کیا حکم ہے؟ (یہ بات ظاہر ہے کہ جو بھی حصص حصہ داران خریدتے ہیں وہ ان کے بدلے صرف اندراجی حسابات کے فائدہ میں حصہ دار ہوتے ہیں اور حصص خریدتے وقت یہ ان کے علم میں ہوتا ہے کہ وہ صرف اندراجی فائدہ میں حصہ دار رہوں گے)۔

الجواب وبالله التوفيق:

۱-جو رقم انجانے میں اپنے ذاتی مصرف میں خرچ ہوجاتی ہو اس پر تو عنداللہ مواخذہ نہیں، البتہ اس کے بارے میں کوشش یہ رہنا چاہئے کہ اس طرح بھی کوئی رقم اپنے اوپر خرچ نہ ہو، نیز اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے رہنا چاہیے کہ اے اللہ اس کے وبال سے ہمیں بچائیے اور اس طرح بھی کوئی رقم خرچ نہ ہو تو پھر معاملہ آخرت کا بالکل صاف رہے گا (۱) اور جو رقم جانتے بوجھتے اپنے ذاتی مصرف میں خرچ ہوجاتی ہو اس کا حکم یہ ہے کہ ایک اندازکر کے جتنی رقم جس کے حصے کی خرچ ہوجاتی ہو اور وہ اندراج میں نہ آسکتی ہو اندراج میں لانے میں کوئی قانونی گرفت یا اور کوئی پریشانی آسکتی ہو تو اندراج میں لائے بغیر اتنی رقم خواہ ہدیہ و تحفہ ہی کے نام پر ہو اصل مالک کی ملک میں پہنچا دینا آخرت کے حساب سے برأت کے لئے کافی ہوگی۔ اور ایسا کر لینے سے حقوق العباد کے تلف کا ان شاء اللہ کوئی گزند نہ ہوگا (۲)۔

۲-جو فائدہ حسابات سے پرے ہو کسی مصلحت یا مجبوری سے اندراج میں نہ آتا ہو تو اس کا حکم شرعی یہ ہے کہ اندازہ کر کے جس حصہ دار کی جتنی رقم اس فائدہ کی رقم میں آتی ہو اتنی رقم تحفہ ہدیہ کے نام پر ان کی ملک میں پہنچا دے، پھر اگر ذمہ داران کو یہ معلوم ہو کہ ہم کو صرف اندراجی حساب کا فائدہ ملے گا زائد نہیں ملے گا اور اس علم کے باوجود حصہ خریدتے ہوں تو یہ سکوت اذن حالی کے درجہ کی چیز ہوگی اور اس صورت میں حسابات سے پرے والی رقم حسب طریق بالا ان تک پہنچانا

۱- حدثنا عبد الله بن السائب بن يزيد عن أبيه عن جده قال قال رسول الله ﷺ: "لا يأخذ أحدكم عصا أخيه لاعباً أو جاداً فمن أخذ عصا أخيه فليردها إليه" (سنن الترمذی ۴/۴۶۲ کتاب الفتن باب ماجاء لا یحل لمسلم أن یروع مسلما حدیث: ۲۱۶۰)۔

۲- ويجب رد عين المغصوب ما لم يتغير تغيراً فاحشاً، مجتبى، في مكان غصبه لتفاوت القيم باختلاف الأماكن، ويبرأ بردها ولو بغير علم المالك (الدر المختار مع رد المحتار ۹/۲۶۶)۔

تقویٰ ہوگا ورنہ ازروئے فتویٰ کسی حیلہ سے اس کی ملک میں پہنچانا واجب رہے گا۔ ورنہ عند اللہ مواخذہ ہوگا(۱)۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

کمیشن کی شرط پر کمپنی میں شرکت:

ایک کمپنی جو کہ مثال کے طور پر ۵۰۰ افراد کے اشتراک سے بنی ہے اور ہر فرد کچھ مخصوص رقم لگاتا ہے، اس مخصوص رقم پر یہ طے پایا جاتا ہے کہ اگر:

۱۔ تجارت ۱۰ لاکھ روپیہ تک ہوئی تو ۱۰% کمیشن ملے گا۔

۲۔ ۱۱ سے ۲۰ 〃 〃 〃 〃 ۱۱% 〃 〃

۳۔ ۲۰ سے ۳۰ 〃 〃 〃 〃 ۱۲% 〃 〃

۴۔ ۳۰ سے ۴۰ 〃 〃 〃 〃 ۱۳% 〃 〃

اور حد سے حد کمیشن ۱۵% تک ہوگا۔ کیا یہ کمیشن کی ادائیگی Interest تو نہیں مانی جائے گی (یہ بات مسلمہ ہے کہ کمپنی کی تجارت اس حد سے کم نہ ہوگی

الجواب وباللہ التوفیق:

یہ دس فیصد یا گیارہ فیصد یا جتنا فیصد بھی ہو اگر یہ فیصد محض نفع کا فیصد ہوتا ہے تو یہ نفع ہرگز سود میں نہیں آتا ہاں اگر بجائے نفع کے فیصد کے کل رقم کا فیصد مانا جائے تو ربوا شرعی کا شبہ ہو جاتا ہے جس سے بھی بچنا ضروری ہے(۲)۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۳۰/۶/۱۴۰۲ھ

۱- حوالہ بالا، نیز ''وکذا لو سلمه إليه بجهة أخرى كهبة أو إيداع أو شراء وكذا لو أطعمه فأكله خلافاً للشافعي'' (الدر المختار مع رد المحتار ۹/۲۶۷)۔

۲- کیونکہ یہ مخصوص رقم پر مشروط نفع ہو کر ''کل قرض جر نفعاً حرام أي إذا كان مشروطاً'' (رد المحتار علی الدر المختار ۷/۳۹۵) کے دائرہ میں آجاتا ہے۔

شرکت کی ایک خاص اسکیم:

دوسوافراد نے بیس ماہ کی ایک اسکیم بنا رکھی ہے اس طریقہ پر دوسوافراد میں سے ہر ایک فرد نے بیس بیس روپیہ جمع کیا، یہ تمام رقم ایک شخص کے پاس ہی ان دوسوافراد میں سے رکھدی گئی اور ہر ماہ وہ ہر شخص سے بیس بیس روپیہ جمع کرائے یہ طے ہوگیا اور ہر مہینہ قرعہ اندازی ہوگی جس میں دوسوافراد کے ناموں کی پرچی ہوگی جسکا نام نکلے گا اس کو ایک ہیرو سائیکل دی جائے گی، اب یہ انعام پانے والا سائیکل حاصل کرنے کے بعد چاہے اس اسکیم میں شامل رہے اور چاہے شامل نہ رہے اگر شامل رہنا چاہتا ہے تو پھر سے اس کو ہر ماہ کے حساب سے بیس روپیہ جمع کرنے پڑیں گے، اس طرح اگر اس کا نام ابھی اسکیم شروع ہونے کے دوماہ بعد نکلا تو اس نے سائیکل حاصل کرلی گویا کہ اس ۴۰ روپیہ میں چارسو کا مال حاصل کرلیا اب پھر وہ اسکیم میں رہنا چاہتا ہے تو اس کو ان دوماہ کے پیسے جو کہ وہ جمع کرچکا تھا، ازسرنو جمع کرنے ہوں گے اور اگر پھر انعام نہیں نکلا تو آخر میں بیس ماہ پورے ہونے کے بعد ایک سائیکل ملے گی، خلاصہ اسکیم دوسوافراد کی ہر ماہ بیس روپیہ جمع ہر ماہ قرعہ اندازی انعام اور جس کا انعام میں نام نہ آئے تو بیس ماہ پورے ہونے کے بعد سبکو سائیکل مل جائے گی ہیرو، اب جس کے پاس پیسے رہیں گے وہی سائیکل کا ذمہ دار ہے اور انعام تو وہ بیس ماہ تک اس رقم سے کاروبار بھی کرتا ہے معلوم کرنا ہے کہ یہ طریقہ اسکیم کا کیا صحیح ہے یا نہیں؟ اور اس کا اس رقم سے کاروبار کرنا کیسا ہے۔

مولانا خلیل الرحمٰن (مہتمم مدرسہ مرادیہ مظفرنگر یوپی)

الجواب وباللہ التوفیق:

اگر دوسوافراد نے بیس بیس روپیہ جمع کئے تو ایک ہی مرتبہ میں چارہزار روپے ہوگئے اگر بیس ماہ تک یہ طریقہ رہا تو اسی ۸۰ ہزار روپے ہوگئے، پہلا سوال یہ ہے کہ یہ روپے خواہ چارہزار ہوں یا اسی (۸۰۰۰۰) ہزار کس کے شمار ہوں گے، اگر سب کے شمار ہوں گے اور اس سے مشترک کاروبار ہوگا (۱) پھر اس قرعہ اندازی میں جسکا قرعہ نکلے اس کو انعام میں سائیکل دینے کے کیا معنی؟ اگر کوئی فرد چند ماہ بعد قرعہ میں نام آئے ہوئے نکلے تو اس کے لئے کیا قاعدہ رکھا ہے پھر کوئی شخص درمیان میں آجائے تو اس کے لئے کیا قاعدہ ہے وغیرہ وغیرہ بہت سے سوالات پیدا ہوتے ہیں اور ان سب کے لئے ضابطہ مقرر کئے بغیر

۱- ’’وحکمھا الشرکۃ فی الربح‘‘ (الدرالمختار مع ردالمحتار ۶/۴۷۵)۔

یہ معاملہ خالص قمار اور ربو احرم کی ایک شکل ہوگی اور قطعاً حرام و نا جائز ہوگی (۱)۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دار العلوم دیوبند سہارنپور ۲۱/۱۲/۱۴۰۰ھ

چوری کے مال سے قرض کی ادائیگی:

سلیمان زید کا مقروض تھا، اپنی قرض کی ادائیگی کے لئے سلیمان نے زید کو مال (متاع) تجارت دیا، زید نے اس مال میں سے بعض اپنی دوسری دکان میں بھیج دیا اب چند ماہ کے بعد زید کو علم ہوتا ہے کہ وہ مال جو سلیمان نے ان کو دیا تھا وہ مال سرقہ ہے، زید کو کیا کرنا چاہیے کہ اگر مذکورہ صورت میں زید نے پورے مال کو فروخت کرلیا تو اس صورت میں کیا کرنا چاہیے؟

محمد ابراہیم افریقی (متعلم دار الافتاء، دار العلوم دیوبند)

الجواب وباللہ التوفیق:

(۱) سلیمان نے جو مال تجارت زید کو اپنے قرضہ کی ادائیگی میں دیا تھا، اس مال کے بارے میں اگر سلیمان نے منع کر دیا تھا کہ اس کو کسی دوسرے کے ذریعہ مت فروخت کرانا جب تو اس سرقہ شدہ مال کا ضمان زید پر واجب ہوگا۔ اور اگر سلیمان نے زید کو منع نہیں کیا تھا تو اس سرقہ شدہ مال کا ضمان زید پر شرعاً واجب الاداء نہیں ہے۔ باقی اگر زید خود نقصان کی تلافی کردے تو یہ اس کا تبرع واحسان ہوگا (۲)۔

(۲) اگر زید نے اس پورے مال کو فروخت کرلیا تو اپنے قرض کی مقدار خود رکھ کر بقیہ سلیمان کو واپس کردے اور اگر کل مال فروخت کرنے پر بھی سب قرض وصول نہیں ہوا اور فروخت کیا مناسب قیمت پر تو باقی ماندہ کا مطالبہ سلیمان سے کرسکتا ہے بشرطیکہ کل قرض کے عوض میں یہ لیا ہوا مال محسوب کر کے نہ لیا ہو ورنہ اگر کل قرض میں محسوب کر کے وہ مال لیا تھا تو

۱- عن أبي هريرةؓ قال: "نهى رسول اللہ ﷺ عن بيع الغرر وبيع الحصاة" (سنن الترمذي ۵۲۳/۳ كتاب البيوع باب ما جاء في كراهية بيع الغرر حدیث ۱۲۳۰)، ''يا أيها الذين آمنوا إنما الخمر والميسر والأنصاب والأزلام رجس من عمل الشيطان فاجتنبوه لعلكم تفلحون'' (سورہ مائدہ ۹۰)۔

۲- ''ويجب على المرتهن أن يحفظه بنفسه وعياله كما في الوديعة وضمن إن حفظ بغيرهم كما مر فيها وضمن بإيداعه وإعارته وإجارته واستخدامه وتعديه كل قيمته فيسقط الدين بقدره (الدر المختار) وفي الشامي: "وتعديه" عطف عام على خاص أي كالقراءة والبيع.... الخ'' (رد المحتار على الدر المختار ۱۰/۹۱)۔

اب زید باقی کا مطالبہ نہیں کرسکتا(۱)۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۰/۱۲/۱۴۰۱ھ

غیر مسلم کمپنی سے شیئرز لینا:

ایک غیر مسلم کمپنی غیر مسلم ممالک میں سودی کاروبار کرتی ہے اور مسلمان اس کمپنی کو روپے دے کر شیئرز لیتا ہے، تو یہ شیئرز لینا مسلمان شخص کے لئے جائز ہوگا یا نہیں؟ نیز کمپنی کو نفع زیادہ ہونیکی صورت میں شیئرز دار کو نفع زیادہ ملتا ہے اور کمپنی کو نفع کم ہونے کی صورت میں شیئرز دار کو بھی نفع کم ملتا ہے اور کمپنی کو نقصان ہونے میں نفع نہیں ملتا، نیز ایک مسلمان دوسرے مسلمان کمپنی سے شیئرز لے تو جائز ہے یا نہیں؟ مدلل ومکمل جواب عنایت فرمائیں، نیز اگر شیئرز لینا جائز ہے تو اس پر زکوۃ ہے یا نہیں؟

رشید احمد موسیٰ فریقی (متعلم دارالافتاء دارالعلوم دیوبند)

الجواب وباللہ التوفیق:

غیر مسلم کمپنی سے شیئرز لینا جائز ہے اگر چہ یہ کمپنی دوسری کمپنی یا کسی بینک وغیرہ سے سودی معاملہ کرتے ہوں، لہٰذا ہمارا کاروبار اس کمپنی سے جائز ہے، کیونکہ ہمارے اور کمپنی کے مابین سودی معاملہ نہیں ہے، باقی رہا مسلمان سے مسلمان کا شیئرز لینا اگر دونوں کے مابین سودی کاروبار نہیں ہے اور کسی غیر شخص وغیرہ کا کاروبار بھی سودی نہیں جس سے اس کا تعلق کاروبار میں ہے تو جائز ہے ورنہ نہیں، لہذا اس شیئرز کے مال تجارت میں زکوۃ ہے اور ادا کرنا ضروری ہے۔

”وفي المبسوط(۲۲/۱۲۵) يكره للمسلم أن يدفع إلى النصراني مالا مضاربة وهو جائز في القضاء“۔

”وإن كان غالب مال المهدى من الحلال لا باس بأن يقبل الهديه، وبأكل مالم يتبين عنده أنه حرام لأن أموال الناس لا تخلوا عن قليل حرام فيعتبر الغالب“(۲)۔

۱- ”فيسقط الدين بقدره أي يسقط الدين جميعه بقدر ما ضمن وإلا رجع كل منهما على صاحبه بما فضل“(رد المحتار على الدر المختار ۱۰/۹۱)۔

۲- کتاب الحظر والإباحة ما يكره أكله وما لا يكره وكذا في مجمع الأنهر ۴/۲۹ ۵ کتاب الکراہیۃ فصل في الأكل وكذا في الفتاوی العالمگیریۃ ۵/۳۴۳

"اذا خلط الوكيل دراهم الربوا بعضها ببعض الدراهم اللتى أخذ ها من حلال يجوز اخذ الربح منها لكون الخلط مستهلكا عند الإمام لاسيما إذا كان الوكيل كافراً، لا سيما والتقسيم مطهر عندنا، كما إذا بال البقر فى الحنطة وقت الدياسة فاقتسمها الملاک حل لكل واحدا كلها مع التيقن بكون الحنطة مختلطة بالطاهر والنجس، ولكن القسمة أورثت احتمالا فى حصة كل واحد من الشركاء فحكمنا بطهارة نصيب كل واحد منهم فكذا ههنا إذا اربى الوكيل بالتجارة وخلط الدراهم بعضها ببعض ثم قسمها على الشركاء يحكم بحل نصيب كل واحد منهم "والله اعلم(۱)۔

مال تجارت پر زکوۃ ہے جب کہ بقدرنصاب ہواور جونقد پس انداز ہواس میں بھی زکوۃ ہے جب کہ بقدرنصاب ہو اورحولان حول ہوگیا ہواور جورقم منافعہ میں آئی ہے اس پر بھی زکوۃ ہے جب کہ مال تجارت اورمنافع مجموعہ بقدرنصاب ہویا خریدار کے پاس پہلے سونا یا چاندی یا نقد بقدرنصاب موجود ہواوراثناء حول میں یہ بھی اس کے ساتھ مل جائے تو مجموعہ ہرسال تمام پرزکوۃ واجب ہوگی'' ولعل هذا الظاهر ''والله تعالىٰ اعلم (۲)مال تجارت سے مرادمشنری وعمارت نہیں ہے بلکہ مال تجارت سے مرادمیٹریل اورسامان تجارت ہے۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمدنظام الدین اعظمی،مفتی دارالعلوم دیوبندسہارنپور

مضاربت کی مختلف صورتیں اوران کے احکام:

زید نے ایک کمپنی حکومت کی اجازت سے بنائی جوکہ عمانی ہے،اس کمپنی کو چلانے کے لئے اس نے ایک آدمی ہندوستان سے ویزہ پر بلایا تاکہ وہ کمپنی اس کی نگرانی میں چلائی جاسکے،لیکن بعدکوزید اس کے نگراں سے یہ کہتا ہے کہ تم مکمل ہماری کمپنی کو چلاؤ،میں تم کوتنخواہ نہ دے کر پوری کمپنی سپردکرتا ہوں،صرف تم مجھ کومنافع کا دس فیصد یا جوبھی مقررکردے دیدیا کرو،ایسا کرنا زید کادرست ہےاورمنافع کی وہ رقم جائز ہوگی یاناجائز؟

۲۔دوسری صورت یہ ہے کہ کام کاٹھیکہ زید کو اس کی کمپنی کی معرفت ملتا ہے جس میں کچھ رقم زید اپنی دے کرنگراں سے کہتا ہے کہ تم اس رقم کی مقدار سے مجھ کونفع دےدوتو کیا یہ جائز ہے؟

کتاب الکراہیۃ الباب الثانی عشر۔
۱- امدادالفتاوی ۳/ ۹۲ م۔
۲- امدادالفتاویٰ ۳/ ۹۸ م۔

۳۔ تیسری شکل یہ ہے کہ زید اپنے نام پر ٹھیکہ لے کر اپنے نگراں کو دے دیتا ہے اور اس میں اپنی کوئی رقم نہیں لگاتا اور کام کی تکمیل سے پہلے ہی اس سے اصل ٹھیکہ کی رقم کا بیس فیصد یا دس فیصد لے لیتا ہے اور نگراں کے نقصان کا وہ شریک نہیں ہوتا تو کیا یہ رقم زید کے لئے جائز ہوگی؟

۴۔ زید نے حکومت سے تجارت کی اجازت حاصل کی جو عمانی ہے، دوسرے کسی آدمی سے زید نے کہا کہ تجارت کے لائسنس پر جو بھی تجارت کروگے بغیر کسی رقم کے ذمے میں اس میں بیس ۲۰ فیصد یا دس فیصد منافع لونگا، تو کیا یہ رقم زید کے لئے جائز ہوگی جو صرف لائسنس کی وجہ سے مل جاتی ہے۔

۵۔ زید اپنے کام کے نام پر ایک آدمی کو ہندوستان سے بلاتا ہے، اس آدمی کے آجانے کے بعد زید اس سے کہتا ہے کہ تم کو اختیار ہے کہ تم جہاں چاہو ملازمت کرو تو کیا یہ کمیشن زید کے لئے جائز ہے یا ناجائز؟

۶۔ زید اپنی تجارت کے لائسنس پر ایک ٹھیکہ لیکر بکر کو دے دیتا ہے اور یہ کہتا ہے کہ میرے پاس چونکہ رقم نہیں ہے تم اپنی رقم اس پر خرچ کرو بعد کو جو اس ٹھیکہ سے نفع حاصل ہوگا اس نفع میں ہم دونوں برابر کے شریک ہیں یا دونوں فیصد مقرر کر لیتے ہیں اور اگر خدانخواستہ اس میں نقصان ہو تو ہم دونوں اس کنٹریکٹ (معاہدہ) کے اعتبار سے نقصان میں بھی برابر کے شریک ہیں، تو کیا زید کا اس طرح سے نفع کمانا جائز ہے؟ جبکہ نفع اور نقصان میں دونوں برابر کے شریک ہوں۔

واضح ہو کہ یہاں حکومت عمان میں قانوناً اس طرح کی کوئی مشارکت خارجیوں کے ساتھ کرنا حکومت کے قانون کی خلاف ورزی کرنا ہے اور اگر کوئی قانون یا معاملہ شرعی طور پر جائز ہے اور حکومت اس کے خلاف اپنا الگ الگ ملکی قانون بناتی ہے تو کیا اس کی پابندی وہاں کے رہنے والوں پر شرعاً عائد ہوتی ہے یا نہیں؟۔

مولانا محمد حسین اشرف صاحب (جلالہ عمان)

الجواب وباللہ التوفیق:

۱۔ اس معاملہ کا حاصل یہ نکلے گا کہ سرمایہ ٹھیکہ دار کا ہوگا اور عمل نگران کا ہوگا اور نفع میں دونوں مثل عقد مضاربت کے شریک ہوں گے، اس لئے یہ معاملہ اس تاویل سے جائز رہے گا اور منافع کی رقم کو حسب معاہدہ وشرائط لینا دونوں کے لئے جائز رہے گا (۱)۔

۱- ''ولو قال: خذ هذا المال واعمل به على ان مارزق الله عزوجل من شئ فهو بيننا على كذا ولم يزد على هذا فهو جائز'' (بدائع الصنائع ۵/ ۱۰۹، مکتبہ زکریا دیوبند)۔

۲۔ یہ معاملہ بھی بہ تاویل جائز ہوسکے گا اور تاویل یہ ہوئی کہ ٹھیکیدار کو تو حق واختیار ہونا ظاہر ہے کہ وہ اپنا سرمایہ لگائے اور اپنا ہی عمل کرے اور نفع خود لے، اسی طرح ہر انسان کو اختیار ہے کہ اپنا حق بالکل سوخت کردے یا دوسرے شخص کو محض عمل کا اختیار بطریق مضاربت دیدے جیسا کہ مسئلہ ا۔ میں مذکور ہے یا اپنا حق بالکل سوخت کرکے اپنا حق واختیار اور عمل سب دوسرے کو تفویض کردے پس جب ٹھیکیدار یہ کل حق واختیار نگراں کو تفویض کردے، تو شرعاً یہ بھی جائز رہے گا اور یہ فعل ٹھیکیدار کا بحق نگراں تبرع ہوگا اور وہ جائز رہے گا۔

پھر ٹھیکیدار نے جو چیز سرمایہ کی مقدار نگراں کو دیا ہے، اگر بطور قرض دے جب تو اس پر نفع لینا ''کل قرض جر نفعاً فھو ربوا'' کے مطابق ربا ہوگا اور ناجائز ہوگا اور اگر بطریق مضاربت دے تو یہ دینا درست رہے گا اور بحکم مضاربت اس مقدار کے نفع میں دونوں حسب معاہدہ شریک ہوں گے، لیکن جب مضارب اپنا حصہ نفع بھی ٹھیکیدار کو دے دیگا تو یہ مضاربت کا تبرع اور اپنا حق سوخت کردینا ہوگا اور چونکہ بطیب خاطر ہوگا، اس لئے یہ تبرع اس کے تبرع کا بدل ہوکر دائرہ شرع میں داخل ہوکر جائز ہوسکے گا۔

اگر ٹھیکہ کی نوعیت معلوم ہوجائے کہ کس کام کا ٹھیکہ ہے اور کیا کرنا ہوگا اور کل سرمایہ کتنا لگے گا تو تھوڑے تغیر کے ساتھ عقد وشرکت کا معاملہ بھی ہوسکے گا۔

۳۔ یہ صورت شرعاً ناجائز ہوگی۔

۴۔ یہ بھی اس مذکور طریقے سے ناجائز ہے، البتہ یہ ہوسکتا ہے کہ دو یا تین یا چند آدمی ملکر عقد شرکت کے ضابطہ کے مطابق تجارت کرنا چاہیں اور قانونی مجبوری سے لائسنس صرف ایک آدمی کے نام لے لیا جائے، پھر عقد شرکت کے ضابطہ کے مطابق وہ سب مشترک تجارت کریں۔

۵۔ یہ صورت بھی ناجائز ہے۔

۶۔ یہ بھی شرعاً درست نہ ہوگا۔

نوٹ:۔ کوئی معاملہ شرعاً جائز ہو مگر خارجی ہونے ونہ ہونے کی قید خلاف شرع یا کوئی معاملہ شرعاً جائز ہو اور خارجی وغیر خارجی ہونے کی قید کے بغیر خلاف قانون حکومت ہو تو فی نفسہ اگرچہ مباح ہو لیکن قانون حکومت کے خلاف ہونے کی وجہ سے عزت آبرو یا مال خطرہ میں پڑنے کا اندیشہ ہو تو چونکہ مال وعزت وآبرو کی حفاظت واجب ہے اور کسی خلاف قانون معاملہ کا کرنا واجب نہ ہو بلکہ صرف اباحت کی حد تک ہو تو اس مباح کے لئے واجب کو نہیں چھوڑا جاتا ہے اور اجازت نہیں دی

جاسکتی۔

اور اس کا حاصل یہ ہوگا کہ اگر کوئی شخص اپنی عزت وآبرو وغیرہ بچاتا ہے تو عند اللہ مواخذہ نہ ہوگا۔فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۲/۹/ ۱۴۰۴ھ

مقروض کا ادائیگی قرض کے وقت اپنی خوشی سے کچھ رقم زائد دینا:

ا-بینک اور ڈاکخانہ میں جمع کردہ رقم پر ملنے والے سود کے بارے میں یہ مسئلہ معلوم ہوا تھا کہ وہاں سے لے لینا چاہئے اور بلانیت ثواب غریب مسلمانوں پر تقسیم کردینا چاہئے، اب دریافت طلب یہ امر ہے کہ زید کی رقم کسی کافر پر باقی تھی عرصہ کے بعد وہ ادا کرتا ہے اور اپنے دستور کے مطابق اپنی خوشی سے سود بھی دیتا ہے تو آیا اس سے بھی سود کی رقم لے کر غریب مسلمانوں پر صرف کردینا چاہئے، اسی طرح مالدار مسلمان یا کافر پر زید کی رقم باقی تھی جس کو وہ نہیں دیتا تھا، چنانچہ زید نے بذریعہ عدالت اس پر ڈگری حاصل کی اور عدالت نے تجویز کیا کہ زید کو فلاں کافر کا فلاں مالدار مسلمان اتنی رقم اور اتنا سود ادا کرے تو زید سود کی رقم اس کافر یا اس مالدار مسلمان سے لے کر غریبوں پر تقسیم کرسکتا ہے یا کہ نہیں یا صرف اصل رقم لے اور سود چھوڑ دے؟

الجواب وباللہ التوفیق:

بینک وغیرہ کے سود پر جو مسئلہ آپ نے لکھا ہے صحیح ہے اور اگر کوئی غیر مسلم بلاکسی دباؤ یا مقدمہ وغیرہ کے محض اپنی خوشی اور رضامندی سے کچھ زائد رقم دیتا ہے تو موجودہ بھارت میں اس پر سود کا حکم ہے ہی نہیں وہ بالکل حلال وطیب ہے، البتہ کسی مسلمان سے اس طرح بھی لینا جائز نہیں۔اگر کوئی مسلمان نا دھند ہو اور بلاعدالت ومقدمہ کے وصول نہ ہو اور عدالت میں سود سے مفر نہ ہو تو پہلے اس کو اطلاع دے کر متنبہ کردے کہ ہماری اصل رقم اگر تم نے اتنی مدت میں ادا نہیں کی تو غیر مسلم کے حوالہ تمہارا معاملہ کردوں گا پھر وہ تم سے مع سود در سود کے بھی وصول کرسکتا ہے اور تم خود اس سود دینے دلانے کے ذمہ دار ہوگے مجھ سے مطلب نہ ہوگا، اب اگر وہ اس تنبیہ کے بعد بھی مدت مقررہ کے اندر نہ دے تو اسکے ساتھ بھی وہی صورت اختیار

کر لے جائے جو اوپر گذرا۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۳۸۵/۹/۱ ھ

الجواب صحیح سید احمد علی سعید نائب مفتی دارالعلوم دیوبند

مشترکہ کاروبار سے متعلق ایک اہم فتوی:

۱-عمر اور بکر نے پچیس پچیس ہزار روپے جمع کر کے کپڑے کی تھوک تجارت کرنا طے کیا، جس میں عمر کے صرف پچیس ہزار روپے لگیں گے، اور عمل ومحنت، خرید فروخت وغیرہ کچھ نہیں لگیں گے، اور بکر کے پچیس ہزار اور خرید فروخت وغیرہ میں ہر قسم کی محنت اور عمل لگے گا، عمر کا چونکہ صرف روپیہ ہے اور بکر کا روپیہ اور عمل دونوں ہیں، نفع کی تقسیم اس طرح پائی کہ عمر کو نفع کا ۳۰ رفیصد اور بکر کو ۷۰ رفیصد ملے گا۔

دریافت طلب امر یہ ہے کہ اس طرح دونوں کو از روئے شرع معاملہ کرنا جائز ہے یا نہیں، اور بصورت نقصان کس نسبت اور حساب سے دونوں کے حصہ میں نقصان آئے گا؟

۲-یہ امر بھی دریافت طلب ہے کہ بکر اس مشترک مال کو دوسرے گاہکوں کو بیچے گا، تو کیا وہ خود اپنی خوردہ فروش دکان کے لیے بھی اسی قیمت پر جس میں دوسرے گاہکوں کو بیچ رہا ہے، اس مال میں سے لے سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب وباللہ التوفیق:

۱-صورت مسئولہ میں "الربح علی ما اشترطا" کے حکم سے ایک کا نفع ستر فیصد اور دوسرے کا یعنی جس کی محنت نہ ہوگی، صرف بضاعۃ وپونجی میں شرکت ہوگی اس کا محض تیس فیصد نفع لینا صحیح رہے گا۔ باقی نقصان میں حکم یہ ہے کہ ہر ایک کا نقصان اس کے راس المال (پونجی) کے مطابق ہوگا، پس جب دونوں کے ۲۵/ ۲۵ رہزار (برابر، برابر) لگے ہوئے ہیں تو نقصان دونوں پر برابر رہے گا(۱)۔

۲-یہ معاملہ اپنے شریک کے اذن حال یا مقال کے ذریعہ طے ہوسکتا ہے اور بغیر اذن حالی یا مقالی کے نہیں

۱- "ولا خلاف أن اشتراط الوضیعة بخلاف قدر رأس المال باطل، واشتراط الربح متفاوتاً عندنا صحیح "(فتاویٰ شامی ۳/۳۳۷ بحث شرکۃ العقد) وهکذا الیضاً فی صفحہ ۳۰۴ مطلب شرکۃ العنان، (مرتب)۔

لے سکتا، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی ،مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور، ۹/۹/۸ ۱۴۰۹ھ
الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن خیرآبادی، محمد ظفیر الدین مفتاحی، کفیل الرحمٰن

تقسیم شئی مشترک کا ایک خاص فیصلہ:

دو بھائیوں کے درمیان ایک مکان ارث میں آیا۔ مکان کی پوزیشن اس طرح واقع ہوئی ہے کہ مکان کے دو حصے ہیں، ایک حصہ دوسرے حصہ سے عمدہ اور اچھا ہے اور اس کی قیمت بھی دوسرے سے زیادہ ہے، چنانچہ عمدہ حصہ لینے والے کو یہ کہا گیا کہ وہ دوسرے حصہ والے کو بارہ ہزار زائد دے گا اور اچھے حصے کے ایک کمرہ میں دونوں بھائیوں کا زمانہ سے آفس ہے، آفس بدستور رہے گا، بلکہ کرایہ اس کو دیا جائے گا جس نے اس اچھے حصہ کو خریدا ہے وہ اس کو کبھی اس کمرہ سے نکلنے کے لئے نہیں کہے گا، اس شرط پر دونوں بھائی راضی ہو گئے اور معاملہ طے ہوگیا۔ اس طرح مکان تقسیم ہوگیا۔ اب جس نے اچھا حصہ لیا تھا دوسرے بھائی کو آفس سے نکلنے کے لئے کہہ رہے ہیں، حالانکہ وہ کرایہ برابر دیتا ہے۔ لہذا صورت مسئولہ میں اس طرح نکالنا جائز ہوگا یا نہیں، اور جو معاملہ طے کیا گیا تھا وہ صحیح تھا یا نہیں؟

الجواب وباللہ التوفیق:

اس معاملہ کا تعلق دو جزء سے ہے، ایک جزو کا تعلق تقسیم سے ہے، خواہ تقسیم وراثت ہو یا تقسیم شئی مشترک ہو اور دوسرے جزو کا تعلق عقد اجارہ سے ہے اور عبارت استفتاء سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ فیصلہ مسلم عند الفریقین ہے اور نافذ بھی ہو چکا ہے۔ خواہ ثالث کے فیصلہ کے ذریعہ سے ہو یا آپس کے مصالحتی معاہدہ کے ذریعہ سے ہو، اور یہ نزاع نفاذ فیصلہ کے بعد پیدا ہوا ہے۔

نیز فیصلہ کے اس جملہ (اچھے حصہ کے کمرہ میں دونوں بھائیوں کا زمانہ سے آفس ہے) سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ بوقت فیصلہ وتقسیم دونوں بھائیوں کا کاروبار مشترک تھا۔ پس اگر اس وقت دونوں بھائیوں کا کاروبار مشترک تھا اور اب بھی مشترک ہے تو اس صورت میں اس کمرے سے نکالنا درست نہیں ہے، ہاں اگر حالات ووقت کی تبدیلی کی وجہ سے سابق کرایہ (تیس روپیہ) موجودہ عام کرایوں کے اعتبار سے بہت کم رہ گیا، تو اس میں مناسب اضافہ ہوسکتا ہے اور اگر اب دونوں

بھائیوں کا کاروبار جدا جدا ہوگیا ہو یا کمرہ ہی اس قدر خراب اور بوسیدہ ہو چکا ہو کہ قابل رہائش باقی نہ ہو تو نکال بھی سکتے ہیں۔ اور یہ الگ بات ہوگی۔

اور بوقت فیصلہ وتقسیم دونوں بھائیوں کے کاروبار الگ الگ اور جدا تھے تو پھر اس کمرہ (آفس) میں دونوں کے مشترک رہنے اور کرایہ داری کا فیصلہ دینے کا کیا منشاء وسبب تھا، جواب کے لئے اس کا واضح ہونا بھی ضروری ہے۔فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

بیٹے کی ملازمت کی رقم کا مالک بیٹا ہے یا باپ؟

باپ اور بیٹا، دونوں ایک مکان میں رہتے ہیں، کھانا پینا ساتھ ہے، بیٹے کو کسی اسکول یا اسپتال میں بیرون ملک یا ملک میں ملازمت دلوادی، سوال یہ ہے کہ بیٹے کو جو کچھ آمدنی اس ملازمت سے ہوگی اس کا مالک بیٹا ہے یا باپ ہے، اگر مالک باپ ہے تو کب، تنخواہ بیٹے کے ہاتھ میں آتے ہی یا باپ کو دینے کے بعد، اس پر یہ مسئلہ بھی متفرع ہوگا کہ بیٹے کے پاس دوسری جائیداد ہے وہ صاحب نصاب ہے بیٹے کی جو سابق ملکیت ہے بیٹا اس کی زکوۃ تو نکالے گا ہی تنخواہ کی رقم جو کئی ہزار ہے ابھی بیٹے کے ہی ہاتھ میں ہے، باپ کو دیا نہیں ہے، کیا اس کی بھی زکوۃ نکالے گا اس سلسلے میں فتاوی شامی کی باب الشرکۃ الفاسدۃ اور فتاوی دارالعلوم مبوب قدیم ۲۲۶/۵، ۶۱/۷، ۳۶۱/۷، ۶۹ کو سامنے رکھ کر جواب عنایت فرمایا جائے۔

محمد ادریس چورو راجستھان

الجواب وباللہ التوفیق:

۱۔ اس صورت میں بیٹے کی جو آمدنی ہوگی یا بیٹے کو جو تنخواہ ملے گی اس کا مالک بیٹا ہی ہوگا باپ نہیں ہوگا (۱)، ہاں باپ کو جو رقم بیٹا بطور تملیک دے دے گا، اس رقم کا باپ البتہ مالک ہوجائے گا، ملازمت وتنخواہ کی آمدنی کا یہی حکم ہے، باپ کی تجارت میں بیٹا مل کر کے جو بڑھاؤ وترقی دیتا ہے اسکا حکم دوسرا ہے (۲)، اس مسئلہ سے اس میں مغالطہ ودھوکہ نہ ہونا

۱- یہ اجارہ کا معاملہ ہے جو بیٹے کے ساتھ طے ہوا ہے، باپ کا اس میں کوئی عمل نہیں ہے اس لئے اجرت کا مالک بیٹا ہوگا (اجارہ کی بحث کے لئے دیکھئے ردالمحتار ۹/۳، فتاوی عالمگیریہ ۴۰۹/۴)۔

۲- ’’أب وابن یکتسبان فی صنعة واحدة ولم یکن لهما مال فالکسب کله للأب إذا کان الابن فی عیال الأب لکونه

چاہئے، اور جب بیٹا ہی مالک رہے گا تو بیٹے ہی پر اس کی زکوۃ بھی دینی واجب رہے گی اور یہ ظاہر ہے،"وسببه أي سبب افتراضها ملک نصاب حولي.....قام"(۱)،فقط واللہ اعلم بالصواب ۔

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۶/۹/۱۴۰۰ھ

سودی کاروبار کرنے والی فیکٹری کا شیئر ہولڈر بننا:

مقام واپی میں ایک فیکٹری قائم ہونے کا پلان کیا جارہا ہے۔اس میں ایک شیئر ہولڈر کا پانچ سوروپیہ ہے، اب ایسی صورت میں جب ایک بڑی رقم ہوجائے گی تو اس رقم کو بینک میں جمع کر کے لون لیا جائے گا تا کہ ایک بڑی رقم ہوجائے پھر اس کے بعد فیکٹری چالو ہوگی جو بھی شیئر ہولڈر رہوں گے اس کو نفع اور نقصان میں بھاگیدار کیا جائے گا، اس فیکٹری کے چالو کرنے میں لون کا روپیہ بیاج کے ساتھ شامل ہورہا ہے اور جو شیئر ہولڈر والے ہیں ان کو کوئی مجبوری بھی نہیں ہے۔اور اس کے بغیر بھی روزی چلتی ہے تو ایسی حالت میں جو نفع ہوگا وہ ہمارے لئے جائز ہوگا یا نہیں اس صورت میں اس طرح کا معاملہ کرنا کیسا ہے؟

افتخاراحمد(مکی منزل ضلع بلساڑ، گجرات)

الجواب وباللہ التوفیق:

اس فیکٹری کے نفع کے جواز میں تو کوئی کراہت نہیں ہے اور اس کا نفع لینا تو جائز رہے گا(۲)، البتہ یہ بات توضیح طلب ہے کہ جب بڑی رقم ہوجائے گی تو اس کو بینک کو دیکھا کر بینک سے لون کون لے گا آیا یہی شیر خرید نے والے خود لیں گے یا یہ شیر ہولڈر شیر خرید کر اپنا روپیہ فیکٹری میں دیدیں گے اور پھر فیکٹری والے خود بینک سے لون لیں گے۔ اگر شیر ہولڈر خرید نے والوں کو خود اپنا روپیہ بینک کو دکھا کر اس پر سودی قرض لینا پڑتا ہے جب تو ان لوگوں کو ایسا کرنا جائز نہ ہوگا، جن

معبدا له"(فتاوی عالمگیریہ ۲/ ۲۹۰،۳، رد المحتار علی الدر المختار ۹/ ۵۰۲ عن الهندیہ)۔

۱- الدر المختار ۲/ ۱۷۴،۵ ۱۷ا۔

۲- "لو دفع ألفاً إلى رجل وقال: أخرج مثلها واشتر و ما كان من ربح فهو بيننا وقبل الآخر وأخلطها وفعل انعقدت الشركة"(البحر الرائق ۵/ ۲۸۲)۔

کے پاس اپنا دوسرا جائز کاروبار ہے اور وہ مجبور نہیں ہیں (۱)، اور اگر شیئر ہولڈر خریدار خود بینک کو دیکھا کر لون نہیں لیں گے بلکہ فیکٹری کا عملہ یہ سب کام خود انجام دیتا ہے اور وہ اکثر غیر مسلم ہے یا کل غیر مسلم ہے تو ایسی صورت میں یہ شیئر خریدنا بھی جائز رہے گا منع نہ ہوگا (۲)۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دار العلوم دیوبند سہارنپور ۱۲/۱۱/۱۴۰۱ھ

فیکٹری ملازم کی بیوہ کے لئے فیکٹری سے ملنے والی رقم کا حکم:

بی۔ ایچ ای۔ ایل کا ملازم ہے اور انتقال ہوجاتا ہے فیکٹری کی طرف سے اس کی بیوہ کو رقم دے دی جاتی ہے اور اس رقم کے لئے فیکٹری کی طرف سے جو اسکیم بنائی ہے بیوہ اس اسکیم میں حصہ لے سکتی ہے یا نہیں؟ رقم اس طرح اسکیم میں محفوظ رہتی ہے، اسکیم تیس ۳۰/ سال یا اس سے زائد ہوتی ہے اور اس کی ادائیگی کے بعد کچھ فی صد بڑھا کر سود کے ساتھ فیکٹری دیتی ہے، اس رقم کو حاصل کرنے کے بعد وہ کسی دھندہ تجارت میں لگاتی ہے یا کسی کو دیتی ہے اس رقم کی سودی نوعیت کے بارے میں تفصیل سے فرمائیں اور اس کو استعمال میں لانا بیوہ کیلئے جائز ہے یا نہیں؟

عبدالحق (صاحب ہیٹرل ملنگ آدم بلڈنگ پیلان بھوپال)

الجواب وباللہ التوفیق:

اگر وہ رقم بیوہ کو دیکر اس کے قبضہ دخل میں فیکٹری دیدیتی ہے تو وہ رقم بالکل حلال وجائز ہے، البتہ پھر اس رقم کو جمع اسکیم میں داخل کرنے کے لئے یا اس اسکیم میں حصہ لینے کے لئے کسی قسم کی قانونی ہدایت یا پابندی نہیں ہے، بلکہ بیوہ اس معاملہ میں بالکلیہ خودمختار اور آزاد رہتی ہے، پھر اس کے باوجود بیوہ اس جمع اسکیم میں حصہ لے اور یہ رقم اس میں داخل کردے تو

۱- ''الضرورات تبیح المحظورات'' (الاشباہ والنظائر طبعہ کراچی/ ۱۱۸)، ''عن ابن مسعودؓ قال: لعن رسول اللہ ﷺ آکل الربا وموکلہ وشاھدیہ وکاتبہ'' (سنن الترمذی ۳/ ۵۰۳ کتاب البیوع باب ما جاء فی آکل الربا حدیث ۱۲۰۶)۔

۲- مفتی محمد تقی عثمانی صاحب نے ایسی کمپنیاں جو اگرچہ سودی کاروبار میں ملوث ہیں مگر ان کا مجموعی کاروبار حلال ہے ان کے شیئرز کی خرید کو دو شرطوں کے ساتھ جائز لکھا ہے اول یہ کہ شیئرز ہولڈر کمپنی کے اندر سودی کاروبار کے خلاف آواز اٹھائے، دوم یہ کہ آمدنی کا جتنا فیصد حصہ سود ہے اپنے منافع سے اتنا فیصد صدقہ کردے (تفصیل کے لئے دیکھئے: فقہی مقالات ۱/ ۱۵۰، ۱۴۹)۔

درست نہ ہوگا اور جو رقم اس جمع کردہ رقم سے زائد ملے گی وہ سود شرعی ہوگی، اس کا حکم وہی ہوگا جو کہ بینک کے دوسرے سود کا ہے، اسے لیکر غرباء ومساکین کو اس کے وبال سے بچنے کے لئے دے دینا ضرور رہے گا اور اگر صورت واقعہ اس طرح نہ ہو تو حکم بھی دوسرا ہوگا۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی مفتی دارالعلوم دیوبند، سہارنپور

سدا پھولی اسکیم میں شرکت:

صوبہ مہاراشٹر میں ایک بینک ہے جس کا نام بینک آف مہاراشٹر ہے، اس بینک نے عوام کی سہولت کے لئے اسکیم نکالی، جس کی مرضی آئے جاری کرے کوئی سختی نہیں، اس میں ایک اسکیم ہے اور اس اسکیم کا نام صدا پھولی SADA FULI رکھا گیا ہے، اس میں اگر آپ پانچ سو روپیہ جمع کرنا چاہیں تو ہر مہینہ بینک میں جمع کرنا پڑے گا۔ اسی طرح اگر دس سال تک جاری رکھیں گے تو دس سال کا عرصہ ختم ہونے کے بعد ہر ماہ ایک ہزار روپیہ مع پنشن کے طور پر حیات تک میاں بیوی اور بچوں کو ہمیشہ کے لئے ملتا رہے گا تحریری طور پر ایسی اسکیم ہے مثال اس اسکیم کی ایک پھل لگنے والے درخت سے دی ہے کہ کسی درخت کو لگانے کے وقت پانی دیتے رہو تو بعد میں وہ درخت ہمیشہ پھل دیتا رہے گا۔ اور سبکو اس کا فائدہ حاصل ہوگا، اس بناء پر انہوں نے یہ اسکیم بنائی ہے تو کیا ہم ایسی اسکیم میں شریک ہو سکتے ہیں یا نہیں؟ بیان فرمائیں۔

کمپنی کا شیئر ہولڈر بن کر نفع حاصل کرنا:

اگر کسی کمپنی میں شیئر ہولڈر بن کر اس کا نفع حاصل کرنا چاہیں تو کر سکتے ہیں یا نہیں؟ ڈیونٹ DEVINT کی رقم لے سکتے ہیں یا نہیں؟ واضح فرمائیں۔

الجواب وباللہ التوفیق:

ابھی یہ سوال نامکمل اور ادھورا ہے اس لئے ان باتوں کے بارے میں اگر قانون معلوم ہو جائے تو کوئی حتمی وقطعی جواب دیا جائے، وہ یہ کہ اگر کوئی شخص دس ۱۰ رسال پورا ہونے سے پہلے اپنا جمع کیا ہوا روپیہ واپس لینا چاہے یا دس سال مسلسل جمع نہ کرے یا جمع نہ کر سکے یا مرجائے تو اس کے بارے میں کیا قانون ہے، اس کا جمع کیا ہوا روپیہ کیا ہوگا، واپس ملے گا ان دونوں باتوں کا جواب آنے پر اس نمبر کا جواب دیا جا سکے گا۔

تجارتی کمپنی میں شیر ہولڈر بننا اور اس کا نفع لینا جائز ہے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دار العلوم دیوبند، سہارنپور ۴/۲/۱۴۰۳ھ

موجودہ ہندوستان کی شرعی حیثیت:

موجودہ ہندوستان کی شرعی حیثیت کیا ہے ۱۹۴۷ء سے پہلے کیا تھی اور اب کیا ہے، دار الحرب کی کتنی قسمیں ہیں؟

محمد ادریس (راجستھان)

الجواب وباللہ التوفیق:

۴۷ء کے پہلے بھی دار الحرب تھا اور بعد میں بھی دار الحرب ہے، اور دار الحرب کی کئی قسمیں ہیں ان سب صورتوں میں حکم علیحدہ علیحدہ ہے (۱)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دار العلوم دیوبند سہارنپور

امداد باہمی کی ایک صورت کا شرعی حکم:

فرض کرو کہ میونسپل کمیٹی مالیر کوٹلہ کے بیس ملازمین اپنی تنخواہ میں سے ہر ماہ ایک صد روپیہ کٹوا کر مبلغ دو ہزار روپے جمع کرتے ہیں، اور روپیہ اکٹھا ہونے پر اس روپے کو انہیں ممبران میں کم قیمت پر فروخت کر دیتے ہیں، یعنی جس ملازم ممبر کو ضرورت ہوتی ہے دوسرے ضرورت مند ملازم کے مقابلہ میں دو ہزار کی لاٹری ہزار یا بارہ صد میں لے لیتا ہے اور جو فالتو رقم ہوتی ہے باقی ممبران حصہ کے مطابق منافع سمجھ کر بانٹ لیتے ہیں، یہ سلسلہ اسی طرح ہر ماہ چلتا رہتا ہے جب تک کہ تمام ممبران پورے نہ ہو جائیں۔

کیا یہ فالتو فروخت کی گئی رقم جو کہ بانٹی جاتی ہے کسی غریب ملازم سے ضرورت کے پیش نظر فائدہ اٹھا کر بانٹنا کسی بیاج کی زد میں آتی ہے یا کہ نہیں، شرعی طور پر یہ سسٹم جائز ہے یا کہ نہیں؟

۱- اس مسئلہ کے لئے محدث فقیہ مولانا حبیب الرحمن الاعظمی کے مقالہ ''دار الاسلام اور دار الحرب'' کا مطالعہ کیا جائے، انہوں نے ایک مقام پر تحریر فرمایا ہے: جہاں تک ہماری نظر وفہم کا تعلق ہے ہندوستان اسی آخری قسم میں شامل ہے ''الوطن القوی'' کے باوجود دار الاسلام کے حکم میں ہے (دار الاسلام اور دار الحرب مطبوعہ مرکز تحقیقات وخدمات علمیہ مئو ص/۲۸)۔

الجواب وباللہ التوفیق:

یہ سسٹم شرعی طور پر کئی وجوہ سے ناجائز وغلط ہے، مثلا:

الف- تنخواہ کا یہ جز ونقدین ہوتا ہے، نقدین کا تبادلہ (بیع) زیادتی کمی کے ساتھ ناجائز ہے، حدیث شریف میں: "مثلا بمثل یدا بید" ہونا ضروری ہے، اس کو شرعی اصطلاح میں بیع صرف کہیں گے، اس میں جو نفع ہوگا یا زیادتی ہوگی وہ سود ہوگی۔ "والفضل ربوا"۔

ب- اس معاملہ میں (ربوا) سود کے ساتھ قمار (جوا) بھی ہے، مثلا ربوا تو یہی کہ دوہزار کو بارہ سو یا تیرہ سو میں فروخت کرکے آٹھ سو یا سات سو نفع کے نام پر وصول کیے۔ یہ سات سو یا آٹھ سو بھی "الفضل ربوا" کا مصداق ہے اور سود ہے اور بیاج ہے، اور قمار مثلا یہ ہے کہ جو لوگ ۲۰ قسطیں دینے سے پہلے نمبر آجانے کی وجہ سے دوہزار وصول کرکے ۲۰ قسطیں پوری کرنے سے پہلے ہی مر جائیں تو حسب حصہ بقیہ تمام ممبروں کا حصہ ضائع ہوا۔ اور مثلا کوئی آدمی چند قسطیں دینے کے بعد وصولی کا نمبر آنے سے پہلے مر جائے تو اس کی داخل کی ہوئی رقم ضائع ہوئی اور بیس قسطوں کی ادائیگی میں ہر شخص کا زندہ رہنا ضروری نہیں، بلکہ ضیاع کے ایسے واقعات بعید از وقوع بھی نہیں۔ لہذا اس طرح سے مال کا دینا موضع خطر میں مال کا ڈال دینا ہوا، اور یہ بھی قمار کی ایک شکل ہے۔

ج- یہ معاملہ مفضی الی النزاع بھی ہوگا، اس لئے کہ جو رکن چند قسطیں دینے کے بعد اور دوہزار وصول کرکے درمیان سے نکل جانا چاہے گا تو بقیہ ارکان ان کو نکلنے نہ دیں گے، جبر ہوگا یا دی ہوئی رقم کی واپسی کرنے کے لائق نہ ہوگا، اور وہ مطالبہ جاری رکھیں گے تو نزاع کا ظن غالب ہوگا۔

اسی طرح چند قسطیں دینے کے بعد دوہزار کی رقم وصول کرنے سے قبل الگ ہوگا تو اپنے دیئے ہوئے روپیوں کی واپسی کا مطالبہ کرے گا اور یہ صورت بھی مفضی الی النزاع ہوگی اور جو معاملہ اپنے نوعیت کے اعتبار سے مفضی الی النزاع ہو، فاسد وممنوع ہوگا۔

ہاں اگر ایثار وہمدردی اور نفع رسانی کا جذبہ ہے تو صحیح ہے اور بطور امداد باہمی جائز طریقہ سے کرنا چاہتے ہیں تو اس طرح کر سکتے ہیں، دوہزار کی رقم جس کو دی جائے بذریعہ قرعہ اندازی کے جس کا نام نکلے اس کو پوری رقم بطور ہبہ کے دیدی جائے، ہر رکن بطور ہبہ اس کو دے دینے کی تصریح کردے اور جس کا نام ایک مرتبہ قرعہ میں نکلے رقم اس کو مل جائے دوبارہ قرعہ اندازی میں اس کا نام نہ رکھا جائے۔

اور جو رکن قرعہ میں نام نکلنے اور روپیہ پانے کے بعد الگ ہو جائے اس سے واپسی کا مطالبہ بقیہ ارکان نہ کریں اور نہ اس پر کوئی گرفت کریں۔

اسی طرح جو رکن کچھ قسطیں دینے کے باوجود قرعہ میں آنے کے قبل نکل جاویں وہ اپنے دیئے ہوئے روپیہ کا مطالبہ نہ کریں اور نہ کوئی گرفت کریں۔ اور ان سب باتوں کا ضابطہ وقاعدہ پہلے تسلیم کر لے تو اس طرح یہ معاملہ درست رہے گا، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دار العلوم دیوبند سہارنپور

منتخبات نظام الفتاوی

حضرت مفتی محمد نظام الدین اعظمیؒ

(جلد سوم)

ایفا پبلیکیشنز، نئی دہلی

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ

نام کتاب : منتخبات نظام الفتاوی (جلد سوم)

صفحات : ۵۹۵

قیمت : ۵۳۰/روپے

طبع اول : مارچ ۲۰۱۳ء

ناشر

ایفا پبلیکیشنز، نئی دھلی

۱۶۱ - ایف بیسمنٹ، جوگابائی، پوسٹ باکس نمبر:۹۷۰۸

جامعہ نگر، نئی دہلی-۱۱۰۰۲۵

ای میل:ifapublication@gmail.com

فون:011 - 26981327

اجمالی فہرست

۱	**كتاب البيوع**	۲۷
۲	باب الربوا	۹۷
۳	باب الرشوة	۲۰۵
۴	باب الرہن	۲۰۹
۵	باب الہبۃ	۲۱۵
۶	باب الاجارة	۲۳۱
۷	**كتاب الذبائح**	۲۵۷
۸	باب الاضحیۃ	۲۸۷
۹	**كتاب الحظر والإباحة**	۳۰۹
۱۰	باب الاكل والشرب	۳۸۷
۱۱	**كتاب الوصية**	۵۰۳
۱۲	**كتاب الفرائض**	۵۱۵

فہرست

	کتاب البیوع	۲۷
۱	بغیر تحریر خریدی ہوئی زمین مسجد و مدرسہ میں دینا	۲۷
۲	کوٹے سے بچے ہوئے مال کو فروخت کرنا	۲۷
۳	اسمگلنگ کا شرعی حکم	۲۸
۴	غیر مسلموں نے جو کپڑے اتاری اور برہمن کو دیے ان کی خرید فروخت	۲۸
۵	کسٹوڈین سے مکان خریدنا	۲۹
۶	چوری کا مال خریدنا کیسا ہے؟	۲۹
۷	پرمٹ سے زائد راشن لینا	۳۰
۸	ٹھیکیدار کے ذریعہ سیمنٹ بلیک سے خریدنا	۳۰
۹	چوڑیوں کی تجارت جائز ہے یا نہیں؟	۳۱
۱۰	سامان کم اور زیادہ قیمت پر فروخت کرنا	۳۲
۱۱	باپ کی فروخت کردہ زمین کو بیٹے کے لئے دوسرے کے ہاتھوں فروخت کرنا	۳۲
۱۲	بیوپاری کا مال پہنچانے پر نفع لینا کیسا ہے؟	۳۳
۱۳	آرڈر دینے والے سے پیشگی رقم لینا	۳۳
۱۴	پیمانہ کی تعیین کے بغیر بیع سلم کا معاملہ	۳۵
۱۵	شرکت میں بچے ہوئے مال کو ایک شریک کے لئے خریدنے کی شرط لگانا	۳۶
۱۶	قرض کے عوض بازار کے عام نرخ سے کم میں گندم لینا	۳۶
۱۷	فصل آنے سے پہلے اناج کا بھاؤ طے کرنا	۳۷
۱۸	حق تصنیف کو خاص کرنا اور اس کی بیع وشرا کا حکم	۳۷
۱۹	ادھار کی صورت میں گراں فروخت کرنا	۳۸
۲۰	ایک متعینہ مدت کے لئے باغ ٹھیکہ پر دینا	۳۹

۲۱	دوسرے کی زمین کو فروخت کرنا	۴۰
۲۲	متعینہ مدت میں سامان کی قیمت نہ دینے پر زیادہ قیمت لینا	۴۱
۲۳	شیئرز خریدنا کیسا ہے؟	۴۲
۲۴	غیر مقبوضہ مچھلیوں کی بیع	۴۳
۲۵	مرغیوں کو تول کر فروخت کرنا	۴۴
۲۶	فارم کے کھاد کو کچھ ملائے بغیر فروخت کرنا	۴۴
۲۷	اخبار و رسائل کی خریداری کے لئے پیشگی قیمت پورے سال کی ادا کرنا	۴۵
۲۸	وی پی (ریلوے) کے ذریعہ بیع وشراء	۴۵
۲۰	اندرو کاس ٹکٹ خریدنا کیسا ہے؟	۴۶
۳۰	بیرونی وانعون کی بیع وشراء	۴۷
۳۱	کمپنیوں کے حصوں کی خریداری کا حکم	۴۷
۳۲	کمپنی کا شیئر خریدنا اور ساجھے دار ہونا کیسا ہے؟	۴۹
۳۳	مردار کی کھال خرید وفروخت کرنے کا حکم	۵۳
۳۴	کمپنیوں کے شیئرز و بونڈ کی بیع وشرا کا حکم	۵۵
۳۵	بینک کے ذریعہ تجارت	۵۶
۳۶	گنے کی پرچی خریدنا	۶۰
۳۷	تجارت کے فروغ کی ایک اسکیم کا حکم	۶۱
۳۸	خاندان کا مشترک کاروبار اور تقسیم متروکات	۶۳
۳۹	کمبر بیع میں مکان خریدنے کی ایک صورت کا حکم	۶۴
۴۰	واپسی کی شرط کے ساتھ دوکان کی بیع	۶۶
۴۱	تجارتی حصص کی خریداری اور اس پر منافع کا حکم	۶۷
۴۲	درخت پر آم کی بیع کی مختلف صورتیں	۶۸
۴۳	قربانی کے چمڑے کی بیع قربانی سے قبل	۷۰
۴۴	تالاب یا حوض کی مچھلی کی خرید وفروخت	۷۱
۴۵	خون واعضا کی خرید وفروخت	۷۶
۴۶	جس کی آمدنی حرام ہو اس سے اپنا سامان فروخت کرنا	۸۵
۴۷	ڈاک ٹکٹ یا اسٹامپ کی تحریر شدہ قیمت سے زائد لینا	۸۶
۴۸	سامان کو متعینہ قیمت سے زیادہ پر فروخت کرنا	۸۶

۴۹	سامان کو متعینہ قیمت سے زیادہ میں فروخت کرنا	۸۶
۵۰	لون لے کر مکان بنوانا یا سواری خریدنا	۸۷
۵۱	ٹھیکیداری کا شرعی حکم	۸۷
۵۲	پانچ گنا منافع پر بیچنا	۸۹
۵۳	قرض لینے کے لئے فارم کی خریداری	۹۰
۵۴	ضفدع اور سرطان کی بیع اور اس کا کھانا	۹۱
۵۵	ایگریمنٹ کی رقم کا حکم	۹۱
۵۶	لیڈ واپس دے کر مکان پر قبضہ کر لینا اور مدت کے اندر رجسٹری نہ کرا سکنا	۹۲
۵۷	خنزیر کی چربی سے بنے صابن اور اس کی تجارت کا حکم	۹۳
۵۸	ریڈیو کی مرمت وتجارت	۹۵
۵۹	بائع مبیع بیچ کر بقیہ ثمن وصول کر سکتا ہے یا نہیں؟	۹۶
	باب الربوا	۹۷
۱	لائف انشورنس کمپنی سے ملی ہوئی سودی رقم انکم ٹیکس سیل ٹیکس میں دے سکتے ہیں	۹۷
۲	بحالت مجبوری بینک سے سودی قرض لینا کیسا ہے	۱۰۰
۳	جمع شدہ زکوۃ کی رقم پر بینک سے ملنے والے سود کا مصرف	۱۰۱
۴	بلا ضرورت شدیدہ سودی قرض لینا ناجائز ہے فکس ڈپازٹ کا حکم	۱۰۲
۵	بینک سے ملے ہوئے سود کا مصرف	۱۰۴
۶	سود کی رقم سود میں خرچ کرنا	۱۰۵
۷	بینک کے سود کے بعض جدید احکام	۱۰۶
۸	سود کی تعریف اور بینک کے سود کا حکم	۱۰۸
۹	مسلم بینک کے سود کا حکم	۱۰۸
۱۰	سود کے پیسہ کا حکم	۱۰۹
۱۱	سود کی رقم سے قرض کی ادائیگی	۱۱۰
۱۲	بینک کے سود کا حکم	۱۱۱
۱۳	لائف انشورنس یا بیمہ پالیسی کا شرعی حکم	۱۱۳
۱۴	بیمہ کا شرعی حکم	۱۱۴
۱۵	لائف انشورنس کا شرعی حکم	۱۱۵

۱۶	ایک خاص قسم کے بیمہ زندگی کا شرعی حکم	۱۱۷
۱۷	پراویڈنٹ فنڈ کی رقم اور اس پر زکوٰۃ کا حکم	۱۱۸
۱۸	پراویڈنٹ فنڈ کی شرعی حیثیت	۱۱۹
۱۹	پی ایف کا شرعی حکم	۱۲۳
۲۰	پی ایف کی رقم کا شرعی حکم	۱۲۴
۲۱	پراویڈنٹ فنڈ کی رقم سود نہیں ہے	۱۲۵
۲۲	ٹیکس میں سودی رقم دینا	۱۲۶
۲۳	بینک کی ملازمت اور شیئرز کی خریداری	۱۲۸
۲۴	ڈاکخانہ کی ایک اسکیم اور اس کا حکم	۱۲۹
۲۵	سودی رقم مسجد کے بیت الخلاء، صفائی وغیرہ میں لگانا کیسا ہے؟	۱۳۱
۲۶	انشورنس کا شرعی حکم	۱۳۲
۲۷	سودی رقم سے پنچایت کا سامان خریدنا	۱۳۳
۲۸	بینک سے سود نکالنے پر اشکال اور اس کا جواب	۱۳۴
۲۹	دارالحرب میں حربی سے سود لینا	۱۳۴
۳۰	بیمہ کے روپیوں کا شرعی حکم	۱۳۵
۳۱	حکومت کے یونٹ ٹرسٹ آف انڈیا میں شرکت کا حکم	۱۳۶
۳۲	کپاس کی خریداری میں حکومت جو رقم سود کے نام سے دیتی ہے اس کا حکم	۱۳۷
۳۳	لون لے کر کام کرنے کی صورت میں سود سے بچنے کی کیا شکل ہے؟	۱۳۸
۳۴	سود کے وبال سے بچنے کا طریقہ	۱۴۰
۳۵	ایک خاص قسم کی سوسائٹی کی ملازمت اور اس کی تنخواہ کا شرعی حکم	۱۴۲
۳۶	مسلم فنڈ کے سلسلہ میں استفتا	۱۴۳
۳۷	فیکٹری کی ملازمت کا حکم	۱۴۴
۳۸	غیر سودی رفاہی ادارہ سے متعلق استفتا	۱۴۴
۳۹	مکان و کارخانہ کے لئے حکومت یا غیر مسلم و مسلم سے سودی قرض لینا	۱۶۳
۴۰	جس سے زمین لگان پر لی پھر اسی کو کاشت کے لئے دینا جائز ہے یا نہیں؟	۱۶۵
۴۱	لاٹری کا حکم	۱۶۷
۴۲	لاٹری کی خریداری اور اس سے حاصل ہونے والے انعام کا حکم	۱۶۷
۴۳	بینک سے سودی قرض لینا	۱۶۹

۴۴	انشورنس اور اس سے حاصل کردہ کمیشن کا حکم	۱۶۹
۴۵	بینک یا سوسائٹی سے سودی قرض لینا	۱۷۲
۴۶	کیا بنکر کو دی جانے والی اضافی رقم سود ہے؟	۱۷۳
۴۷	کاشت کے لئے بینک سے سودی قرض لینا	۱۷۵
۴۸	بلاک سے ضرورۃً سودی قرض لینا	۱۷۶
۴۹	ہندوستان میں کافروں سے سود لینے کا حکم	۱۷۷
۵۰	تعمیر اسکول میں سودی رقم لگانا	۱۷۷
۵۱	امدادی فنڈ سے نفع لے کر مدد کرنا	۱۷۸
۵۲	لگان دینے کی وجہ سے مرہونہ زمین سے انتفاع کا حکم	۱۷۹
۵۳	ملکی فسادات کی حالت میں بیمہ کرانے کا حکم	۱۷۹
۵۴	عطیات کی جمع شدہ رقم سے حاصل شدہ سود کو وکیل کی فیس اور مسجد کی احاطہ بندی میں خرچ کرنا	۱۸۱
۵۵	بینک کی سودی رقم سے بینک کا سود ادا کرنا	۱۸۳
۵۶	بینک سے ملنے والے قرض میں چھوٹ اور سود کا حکم	۱۸۳
۵۷	لائف انشورنس کا شرعی حکم	۱۸۴
۵۸	لازمی بیمہ کا حکم	۱۸۴
۵۹	ڈاکخانہ اور بینک میں روپیہ جمع کرنا اور اس کے سود کا حکم	۱۸۵
۶۰	سودی رقم سے بیت الخلا بنوانا اور وکلاء کی فیس دینا	۱۸۵
۶۱	بینک میں رقم جمع کرنا اور اس کے سود کا مصرف	۱۸۶
۶۲	سود لکھنا، لینا دینا کیسا ہے؟	۱۸۶
۶۳	سیونگ اکاؤنٹ کھولنا اور سود کا مصرف	۱۸۷
۶۴	پمپنگ سیٹ یا ٹریکٹر کے لئے لون لینا	۱۸۷
۶۵	سودی کاروبار کرنے والے سے قطع تعلق	۱۸۹
۶۶	ٹھیکہ پر لی گئی زمین کو خود مالک زمین کا بٹائی پر لینا	۱۹۰
۶۷	شئی مرہون سے فائدہ اٹھانا	۱۹۰
۶۸	سود کا مصرف	۱۹۱
۶۹	سودی رقم کا مصرف	۱۹۲
۷۰	بینک کے منافع سے اپنی ضروریات کو پورا کرنا	۱۹۳
۷۱	بجلی اور پانی کے بل میں سودی رقم دینا	۱۹۵

۷۲	بینک کی سودی رقم اپنے مصرف میں استعمال کرنا	۱۹۶
۷۳	بینک کے سود سے متعلق چند استفسارات	۱۹۷
	باب الرشوۃ	۲۰۵
۱	بحالت مجبوری رشوت دینا کیسا ہے؟	۲۰۵
۲	ظلم وضرر سے بچنے کے لئے رشوت دینا	۲۰۶
۳	حج کے لئے رشوت دینا	۲۰۷
۴	اپنا حق وصول کرنے کے لئے رشوت دینا کیسا ہے؟	۲۰۷
	باب الرھن	۲۰۹
۱	مرتہن کے لئے شئ مرہون سے فائدہ اٹھانا	۲۰۹
۲	مدت متعینہ کے بعد شئ مرہون، مرتہن کی ہو جائے گی یہ شرط عقد رہن کے خلاف ہے	۲۰۹
	باب الھبۃ	۲۱۵
۱	شوہر کا کہنا مکان اور سب مال میری بیوی کا ہے کیا یہ ہبہ ہے؟	۲۱۵
۲	کیا اقرار نامہ یا حلف نامہ باعث ملک ہے؟	۲۱۶
۳	ہبہ میں ملکیت کے لئے قبضہ شرط ہے	۲۱۷
۴	زندگی میں اپنی تمام جائداد اپنے لڑکوں کو لکھ دینا	۲۱۹
۵	موہوبہ جائداد میں سے حصہ کا مطالبہ	۲۲۲
۶	بغیر تصدیق منتظم مدرسہ کے لئے زمین ہبہ کرنا	۲۲۳
۷	مکان مشترک غیر منقسم کا ہبہ جائز ہے یا نہیں؟	۲۲۴
۸	مکان کی تقسیم سے قبل اپنا حصہ ہبہ کرنا	۲۲۵
۹	مال کے ضیاع کے خوف سے ہبہ	۲۲۶
۱۰	کیا مکان کی کنجی حوالہ کر دینا قبضہ کے قائم مقام ہے؟	۲۲۶
۱۱	زندگی میں جائداد کی تقسیم	۲۲۷
۱۲	دو لڑکوں کے نام مکان لکھنا اور باقی کے نام نہ لکھنا کیسا ہے؟	۲۲۸
۱۳	کیا ہبہ درست ہونے کے لئے شئ موہوب کا قبضہ میں ہونا ضروری ہے	۲۳۰

	باب الاجارۃ	۴۳۱
۱	پگڑی کا حکم	۴۳۱
۲	پگڑی سے متعلق نظام الفتاویٰ پر ایک اشکال کا جواب	۴۳۱
۳	دوکان ومکان کی پگڑی	۴۳۴
۴	چکی والوں کا گردہ (جلن) کے نام سے آٹا کاٹنا	۴۳۵
۵	دلالی کی اجرت کا حکم شرعی	۴۳۶
۶	بٹے پر نوٹ تبدیل کرنا	۴۳۷
۷	ہنڈی کے ذریعہ رقم بھیجنا کیسا ہے	۴۳۷
۸	ہنڈی کے مروجہ کاروبار کے سلسلہ میں حکم شرعی	۴۳۸
۹	پگڑی اور بعض دوسرے کرایہ داریوں کا شرعی حکم	۴۴۰
۱۰	کرایہ دار کا مکان دوسرے کو زائد کرایہ پر دینا	۴۴۲
۱۱	طوائف کو مکان کرایہ پر دینا	۴۴۳
۱۲	کسی مسلمان کا ناچ گانے کی تقریب میں اپنا شامیانہ لگانا اور اس کا کرایہ وصول کرنا کیسا ہے	۴۴۴
۱۳	سفر حج کے زمانہ کی تنخواہ کا حکم کیا ہے؟	۴۴۵
۱۴	امامت پر تنخواہ لینا	۴۴۶
۱۵	قرآن خوانی پر اجرت لینا	۴۴۶
۱۶	دو ماہ کی تنخواہ کی شرط پر چندہ کرنا	۴۴۶
۱۷	جانور بٹائی پر دینا	۴۴۷
۱۸	جانوروں کو ادھیا پر دینا	۴۴۸
۱۹	اجرت لے کر جنات کا علاج	۴۴۸
۲۰	کمیشن پر سفیر مقرر کرنا جائز ہے یا نہیں؟	۴۴۹
۲۱	امامت کی تنخواہ لینا جائز ہے یا نہیں؟	۴۴۹
۲۲	تعویذ پر اجرت لینا	۴۵۰
۲۳	قرآن خوانی پر اجرت لینا	۴۵۰
۲۴	بلا ٹکٹ یا کم ٹکٹ پر سفر کرنا	۴۵۰
۲۵	سوسائٹی کے تحت کام کرنے والے ملازم کی تنخواہ	۴۵۱
۲۶	جس فیکٹری میں خنزیر کا چمڑا استعمال ہوتا ہو اس میں ملازمت کا حکم	۴۵۲
۲۷	مؤذن کی تنخواہ سے متعلق	۴۵۳

	کتاب الذبائح	۲۵۷
۱	بجلی کے جھٹکے یا گولی مارکر جانور کے ذبح کا حکم	۲۵۷
۲	گائے وغیرہ کو ذبح کرنے سے قبل بندوق کی گولی سے گرانا کیسا ہے؟	۲۵۷
۳	گولی سے بیہوش کرنے کے بعد ذبح کرنا	۲۵۸
۴	مشینی ذبیحہ کا شرعی حکم	۲۶۱
۵	پوشیدہ طور پر گائے ذبح کرنا	۲۶۳
۶	مرغی ذبح کرنے کا شرعی طریقہ	۲۶۳
۷	ذبیحہ کے متعلق ایک مضمون کے بارے میں ایک اشکال	۲۶۴
۸	عمداً تارک التسمیہ کے ذبیحہ کا حکم شرعی	۲۷۰
۹	اہل کتاب کے ذبیحہ کا حکم	۲۷۱
۱۰	ڈبہ میں پیک شدہ گوشت اور اہل کتاب کے ذبیحہ کا حکم	۲۷۱
۱۱	آگ سے ذبح کا شرعی حکم	۲۸۱
۱۲	کیا مشینی ذبیحہ حلال ہے اور کیا بوقت ذبح ٹیپ ریکارڈ کے ذریعہ اللہ اکبر کی آواز آنا کافی ہے؟	۲۸۳
۱۳	جانور کے ذبح کے لئے وضو	۲۸۵
	باب الاضحیۃ	۲۸۷
۱	قربانی کس پر واجب ہے؟	۲۸۷
۲	بیٹے کے نام سے قربانی کی جبکہ نیت باپ کی تھی	۲۸۷
۳	ایک جانور میں بالغ اور نابالغ کی طرف سے قربانی	۲۸۸
۴	مردہ اور زندہ دونوں کی طرف سے ایک جانور میں قربانی	۲۸۸
۵	جانور خریدنے کے بعد شرکت	۲۸۸
۶	قربانی کے جانور میں شرکت کے سلسلہ میں ایک استفتاء مع فتویٰ اور اس کا جواب	۲۸۹
۷	چند اشخاص کا مل کر حضور ﷺ کے نام سے قربانی کرنا	۲۹۵
۸	قتل خطا میں قربانی کی ادائیگی	۲۹۷
۹	ایک سال سے کم عمر کی بکری و بھیڑ کی قربانی درست نہیں، البتہ فربہ دنبہ چھ ماہ کا جو ایک سال کے برابر ہو اس کی درست ہے	۲۹۷
۱۰	نیل گائے اور ہرن کی قربانی	۳۰۲
۱۱	قربانی کے لئے آئے ہوئے مختلف جانوروں کا خرچہ	۳۰۲

	كتاب الحظر والاباحة	۳۰۹
۱	مرد کا مادہ منویہ لے کر بیوی کے رحم میں بذریعہ انجکشن پہنچانا	۳۰۹
۲	کسی مرد کا مادہ منویہ اجنبی عورت کو بطور چندہ حاصل کر کے اس کے رحم میں انجکشن سے پہنچانا، ایسی صورت میں بچہ کس کی طرف منسوب ہوگا؟	۳۰۹
۳	کلوننگ یعنی ہم شکلی کا حکم شرعی	۳۰۹
۴	کاغذی نوٹوں کی شرعی حیثیت	۳۱۰
۵	مختلف ملکوں کی کرنسیوں کا حکم	۳۱۹
۶	ڈاکٹروں کے مشورہ سے مرد کی منی لے کر عورت کے رحم میں پہنچانا کیسا ہے	۳۲۰
۷	خنزیر کے کسی عضو کو بحالت اضطرار انسان کے جسم میں پیوند کر کے لگایا جاسکتا ہے یا نہیں؟	۳۲۰
۸	استرہ کا کام کرنے والے صابن کا استعمال کرنا	۳۲۲
۹	انگریزی دواؤں کے استعمال کا حکم جس میں شراب، اسپرٹ، افیون وغیرہ کا استعمال ہو	۳۲۳
۱۰	کالے رنگ کے خضاب کا حکم شرعی	۳۲۳
۱۱	بال کٹانے کا مسنون طریقہ، نیز قصر افضل ہے یا حلق؟	۳۲۴
۱۲	امریکن گائے کا گوشت کھانا، دودھ پینا اور قربانی کرنا کیسا ہے؟	۳۲۵
۱۳	خون اور انسانی اعضا کو طبی اغراض کے لئے استعمال کرنے کا حکم	۳۲۶
۱۴	خون اور مختلف اعضاء کے بینک کے قیام کا حکم	۳۲۶
۱۵	شبہ کے موقع پر از روئے تقویٰ احتیاط اولیٰ ہے	۳۲۶
۱۶	پاسپورٹ کے لئے تصویر کھنچوانے کا شرعی حکم	۳۲۷
۱۷	ذی روح کی تصاویر چھاپنے کا حکم	۳۲۸
۱۸	تصویر بنانا یا بنوانا	۳۳۱
۱۹	مرے ہوئے جانور میں بھوسی وغیرہ بھر کر اس کو کھڑا کرنا شرعاً کیسا ہے؟	۳۳۱
۲۰	سونے چاندی کا بٹن یا قلم استعمال کرنا کیسا ہے؟	۳۳۲
۲۱	پیتل تانبے یا لوہے کی انگوٹھی پہننا شرعاً درست ہے یا نہیں؟	۳۳۳
۲۲	ٹیلی ویژن، ریڈیو، وی سی آر وغیرہ کی مرمت تجارت اور ان کی آمدنی کا حکم	۳۳۳
۲۳	ریڈیو اور ٹیلی ویژن کا استعمال	۳۳۴
۲۴	یورپ میں عیسائیوں اور یہودیوں کے برتنوں کے استعمال کا حکم	۳۳۵
۲۵	سرکاری بس سے ایکسیڈینٹ کی صورت میں گورنمنٹ سے معاوضہ لینا شرعاً کیسا ہے؟	۳۳۶
۲۶	ریڈ کی عورت سے مباشرت کا حکم	۳۳۶

۲۷	بعض گیسٹ ہاؤس کا حکم	۳۳۹
۲۸	مصنوعی حمل وتولید کے طریقوں کا حکم شرعی	۳۴۱
۲۹	پوسٹ مارٹم کا حکم	۳۴۲
۳۰	جاندار کی تصویر بنانے اور بعض سرکاری قرضے لینے کا حکم	۳۴۳
۳۱	حق تالیف محفوظ کرنا	۳۴۴
۳۲	گروپ ہاؤسنگ کا حکم	۳۴۷
۳۳	ٹی وی پر خبریں سننا	۳۴۸
۳۴	قرض کا مسئلہ اور ایک اشکال کا جواب	۳۵۰
۳۵	فلاحی وخیراتی ادارہ کا حکم	۳۵۱
۳۶	آسٹریلیا کے بعض نئے حالات کا حکم	۳۵۵
۳۷	اسلامک سینٹر میں کون کون سے کام کر سکتے ہیں	۳۵۷
۳۸	سماجی ہال کا استعمال ڈنر،کھیلوں کے مقابلے،مینا رمیلاد النبی وغیرہ مختلف کاموں کے لئے درست ہے یا نہیں ؟	۳۵۹
۳۹	کسی کی آمد پر شیرینی ڈالنا	۳۶۳
۴۰	مال لقطہ کے مالک کا پتہ نہ چلے تو کیا حکم ہے؟	۳۶۴
۴۱	نومسلم کے مال ودولت کا شرعی حکم	۳۶۵
۴۲	ماں کا بحالت جنابت دودھ پلانا	۳۶۶
۴۳	حاملہ عورت سے مباشرت	۳۶۶
۴۴	حصول اولاد کے لئے جدید طریقے اوران کا شرعی حکم	۳۶۷
۴۵	محکمہ آبکاری سے تالاب مچھلی پالنے کے لئے لینا	۳۶۸
۴۶	غیر مسلم سے چندہ لینا	۳۶۹
۴۷	بناسپتی کا شرعی حکم	۳۷۰
۴۸	خون کا ٹھیکہ اوراس کی رقم کا مصرف	۳۷۱
۴۹	یہودی کی قبر میں مسلمان کی نعش کی تحقیق	۳۷۳
۵۰	کرسمس کے تہوار میں مسلمانوں کی شرکت	۳۷۴
۵۱	یکم جنوری کو نیا سال منانا	۳۷۴
۵۲	گڈفرائیڈے منانا	۳۷۴
۵۳	مالی جرمانہ	۳۷۵
۵۴	دعا برائے علم وذہن	۳۷۷

۵۵	مینڈوں پر لگے درخت کا حکم	۳۷۷
۵۶	جماعت میں جانا اور تبلیغ کی اہمیت وضرورت	۳۷۸
۵۷	طریقۂ تبلیغ	۳۸۰
۵۸	چھٹی میں تبلیغ میں جانا	۳۸۲
۵۹	عورت کی صحت وقوت کی بحالی کے لئے نزودھ اور مانع حمل دواؤں کے استعمال کا حکم شرعی	۳۸۳
۶۰	گھڑی میں اسٹیل کا چین لگانا	۳۸۴
۶۱	اسٹیل کی چین والی گھڑی کا استعمال	۳۸۴
۶۲	سینوں کا استعمال درست ہے یا نہیں؟	۳۸۵
۶۳	میوزک والی گھڑی کے استعمال کا شرعی حکم	۳۸۵
۶۴	کیا سرخ روشنائی کا استعمال درست ہے؟	۳۸۶
۶۵	بحالت اضطرار انسان کا خون چڑھانا درست ہے	۳۸۶
۶۶	مرنے کے بعد اعضائے انسانی کے ہبہ کرنے کا حکم	۳۸۷
۶۷	اعضاء انسانی سے پیوند کاری	۳۸۸
۶۸	خون چڑھانے کا شرعی حکم	۳۸۸
۶۹	پاس شدہ اسقاط حمل بل کا نچوڑ مع شرائط	۳۸۹
۷۰	اسقاط حمل بل کے مطابق	۳۸۹
۷۱	یوتھیزیا کا شرعی حکم	۳۹۲
۷۲	افریقہ میں پھیلے ہوئے بعض نئے مسائل کے احکام	۳۹۸
۷۳	اعضاء کی پیوند کاری	۴۰۱
۷۴	دودھ کے بینک کا حکم	۴۰۲
۷۵	مصنوعی جوڑے کے بارے میں پیشین گوئی	۴۰۳
۷۶	الکحل	۴۰۳
۷۷	جانوروں کے اجزاء سے حاصل شدہ دوا کا حکم	۴۰۵
۷۸	دماغی امراض میں مبتلا عورت کا مانع حمل آپریشن یا اسقاط حمل کرانا	۴۰۶
۷۹	مختلف مقاصد کے لئے جانوروں کا استعمال	۴۰۷
۸۰	جنات کا وجود	۴۰۸
۸۱	جادو کالا جادو	۴۰۹
۸۲	تعویذ	۴۰۹

۸۳	طلاق سے متعلق چند اہم سوالات	۴۱۰
۸۴	مصنوعی دانتوں کا استعمال اور سونے و چاندی کا تار باندھنا شرعاً درست ہے یا نہیں	۴۱۱
۸۵	الکحل اور افیون ملی ہوئی دواؤں کا استعمال	۴۱۲
۸۶	ظالم سے ظلم کا بدلہ لینا	۴۱۲
۸۷	عورتوں کا بے پردہ نکلنا	۴۱۳
۸۸	تصویر سازی اور اس کا حکم	۴۱۴
۸۹	مالدار وفقیروں کو صدقہ دینا	۴۱۵
۹۰	غیر شرعی عدالتوں میں مقدمہ لے جانا کیسا ہے؟	۴۱۶
۹۱	عمارت وغیرہ پر اﷲ کا کتبہ لگانا جائز ہے یا نہیں؟	۴۱۷
۹۲	حضور ﷺ کی ولادت سے قبل مکہ ومدینہ میں کس کی حکومت تھی	۴۱۷
۹۳	دعا کے بعد مرحوم وپیغمبر کے نام کا فاتحہ دینا	۴۱۸
۹۴	نماز میں بیوی کا خیال آنا اور قرض کی ادائیگی میں مسجد کا سامان دینا	۴۱۸
۹۵	ایسے مذہبی جلسوں میں شرکت جہاں میلہ جیسا ماحول ہو	۴۱۹
۹۶	دوسرے کے شعر کو اپنی طرف منسوب کرنا	۴۱۹
۹۷	اپنے نسب کو بدلنا کیسا ہے	۴۱۹
۹۸	مقروض کے صدقہ کا حکم	۴۲۰
۹۹	منی آرڈر کا حکم	۴۲۰
۱۰۰	جانور کا پیشاب دواءً پینا	۴۲۱
۱۰۱	بذریعہ انجکشن اولاد اور اس کے نسب ومیراث کا حکم	۴۲۱
۱۰۲	حدیث لطیف کا مطلب - حدیث کی سند واجازت	۴۲۲
۱۰۳	بزرگ کا بد دعا کرنا	۴۲۳
۱۰۴	شب قدر میں ذکر ووعظ کے محفل کا انعقاد	۴۲۳
۱۰۵	غیر مسلم کو آداب کہنا	۴۲۳
۱۰۶	گاندھی جی کی ٹوپی پہننا	۴۲۴
۱۰۷	کوئڑا کی شرعی حیثیت	۴۲۴
۱۰۸	بلاوجہ شرعی قاضی کو معزول کرنا	۴۲۵
۱۰۹	ہندی رسم الخط میں قرآن کی اشاعت	۴۲۵
۱۱۰	ڈھول بجا کر لاٹھی کھیلنا	۴۲۹

۱۱۱	غیر مسلم کی شیرینی کا حکم	۴۳۰
۱۱۲	غیر مسلم کے تہوار میں شرکت	۴۳۰
۱۱۳	ڈرامہ اور تھیٹر کا شرعی حکم	۴۳۰
۱۱۴	حرام کو حلال سمجھنا	۴۳۰
۱۱۵	الیکٹرانک انجینئر کا کام سیکھنا کیسا ہے	۴۳۱
۱۱۶	مروجہ قرآن خوانی کا شرعی حکم	۴۳۲
۱۱۷	مروجہ قرآن خوانی کا حکم	۴۳۳
۱۱۸	آیت قرآنی لکھے ہوئے لباس پہن کر ناپاک جگہ جانا	۴۳۳
۱۱۹	کیا حضور ﷺ مختون پیدا ہوئے؟	۴۳۳
۱۲۰	غیر عالم کا قرآن وحدیث کی تشریح کرنا	۴۳۴
۱۲۱	بسم اللہ کی جگہ ۷۸۶ لکھنا	۴۳۵
۱۲۲	ذکر لسانی افضل ہے یا ذکر قلبی؟	۴۳۶
۱۲۳	ذکر کا ایک خاص طریقہ اور اس کا حکم	۴۳۷
۱۲۴	مجدد کی تعریف اور اس کی آمد کی مدت	۴۳۹
۱۲۵	کیا پنچایت کا فیصلہ قضاء قاضی کے قائم مقام ہے؟	۴۴۰
۱۲۶	مسنون ٹوپی، مسنون کرتا و مسنون بنیان کا حکم	۴۴۲
۱۲۷	مرد کو کیسا پائجامہ پہننا چاہئے؟	۴۴۳
۱۲۸	پینٹ اور بیل باٹم کا حکم	۴۴۳
۱۲۹	نیکر پہننا کیسا ہے؟	۴۴۳
۱۳۰	عورتوں کے لئے مسنون لباس	۴۴۳
۱۳۱	رولڈ گولڈ، لوہا اور چاندی کا بٹن	۴۴۳
۱۳۲	مرد و عورت کا لباس	۴۴۵
۱۳۳	کن رنگوں کے کپڑے مردوں کو پہننا ممنوع ہے؟	۴۴۶
۱۳۴	جبہ کا ٹخنہ سے نیچے ہونا کیسا ہے؟	۴۴۷
۱۳۵	کرتا کا نصف ساق ہونا	۴۴۷
۱۳۶	عمامہ سنت ہے یا مندوب؟	۴۴۸
۱۳۷	کیا سر منڈانا سنت ہے؟	۴۴۸
۱۳۸	مشین سے ٹپک ٹپک کر جمع ہونے والے تیل کا حکم	۴۴۹

۱۳۹	سلام میں پاؤں چومنا	۴۵۰
۱۴۰	الحق مر عند الجاہلین کیا یہ حدیث ہے؟	۴۵۰
۱۴۱	صحیح اور ضعیف حدیث کی تعریف	۴۵۰
۱۴۲	کسی کے گھر جاکر قرآن خوانی کرنا	۴۵۰
۱۴۳	کیا لڑکا پیدا ہونا خوش نصیبی ہے؟	۴۵۱
۱۴۴	کیرم بورڈ کھیلنا	۴۵۳
۱۴۵	بغرض تعظیم پاؤں چھونا	۴۵۳
۱۴۶	لوہار کے یہاں کام سے بچے ہوا بکا رلوہے کا حکم	۴۵۴
۱۴۷	قرآن شریف پر ماتھا ٹیکنا	۴۵۵
۱۴۸	معانقہ کی شرعی حیثیت	۴۵۵
۱۴۹	بیوی بچوں کو دیکھنے کے لئے تصویر کھنچوانا	۴۵۶
۱۵۰	آسیبی حرکات کا علاج غیر مسلم سے کرانا	۴۵۶
۱۵۱	غیر مسلم سے گھر کا کام کرانا	۴۵۶
۱۵۲	سحر سے محفوظ رہنے کی تدبیر	۴۵۷
۱۵۳	گھر میں لوبان وغیرہ جلانا	۴۵۷
۱۵۴	حمد و شکر کے وقت ہاتھ اٹھا کر دعا مانگنا	۴۵۸
۱۵۵	کھانا کھلا کر ایصال ثواب کرنا	۴۵۸
۱۵۶	ستائیسویں شب کو مٹھائیاں کھلانا	۴۵۸
۱۵۷	ایصال ثواب کے لئے سورۂ یٰسین پڑھ کر دعا کرنا	۴۵۹
۱۵۸	تعلیم کے لئے عورتوں کا بے پردہ نکلنا	۴۶۰
۱۵۹	لڑکیوں کی تعلیم کا مسئلہ	۴۶۰
۱۶۰	افریقہ کے موجودہ صورت حال میں مسلمان کیا کریں؟	۴۶۱
۱۶۱	افریقہ میں مسلمانوں کی شرعی حیثیت کیا ہے	۴۶۶
۱۶۲	افریقہ میں مسلمانوں کی حکومت میں شرکت اور ووٹ کا حکم	۴۶۶
۱۶۳	جنات کا ذریعہ معاش	۴۶۷
۱۶۴	حضرت جبرئیل علیہ السلام کے سلام کا حضور ﷺ کیا جواب دیتے تھے؟	۴۶۷
۱۶۵	ہر وقت قرآن ساتھ رکھنا	۴۶۸
۱۶۶	واقعہ معراج سے قبل قرآن کتنا نازل ہوا تھا؟	۴۶۸

۱۶۷ کیا علماء کے لئے شریعت کے بنیادی احکام میں قانون سازی درست ہے؟ (عربی) ۴۶۹

۱۶۸ پڑوسی کے بعض حقوق کا بیان، چوربازاری اور سودی کاروبار کا حکم ۴۷۱

۱۶۹ چوربازاری اور سودی کاروبار کا حکم ۴۷۱

۱۷۰ حکومت کی ایک اسکیم کا حکم ۴۷۲

۱۷۱ امداد باہمی کے مقصد سے انجمن میں جمع شدہ رقم کو بینک میں رکھا جا سکتا ہے؟ ۴۷۳

۱۷۲ مختلف فیہ و مجمع علیہ کے مفہوم میں فرق ۴۷۵

۱۷۳ یوم عرفہ کا صحیح مصداق کون سا دن ہے؟ ۴۷۶

۱۷۴ امراض شکم میں مبتلا کا حکم ۴۷۷

۱۷۵ پہلے نور محمدی کی تخلیق ہوئی یا قلم کی؟ ۴۷۷

۱۷۶ ایک فلاحی تنظیم کے بارے میں فیصلہ شرعی ۴۷۹

۱۷۷ ڈیل آڑھت اجرت لینے کا حکم ۴۸۲

۱۷۸ لپ اسٹک لگانے اور فلم بنانے کا حکم ۴۸۳

۱۷۹ قرض کے ایک حیلہ کا بیان ۴۸۴

۱۸۰ چوری کے مال کی تحقیق کے لئے لوگوں سے پوچھنا ۴۸۵

کتاب الأکل والشرب ۴۸۷

۱ کوکاکولا اور فینٹا کا شرعی حکم ۴۸۷

۲ جھینگا کھانا ۴۸۹

۳ مغربی ممالک سے ڈبوں میں جو پکے ہوئے گوشت آتے ہیں ان کا حکم ۴۸۹

۴ خون سے بنے نمک کا استعمال ۴۹۰

۵ جانوروں کی ہڈی سے بنی ہوئی چیز کھانا ۴۹۰

۶ ذبح شدہ گوشت جو پیکٹ میں آتے ہیں ان کا حکم، کیا ہر مرحلہ میں مسلمان کی نگرانی ضروری ہے ۴۹۰

۷ کیا ہر مرحلہ میں مسلمان کی نگرانی ضروری ہے؟ ۴۹۰

۸ آسٹریلیا وغیرہ سے جو گوشت آتے ہیں ان کا استعمال شرعاً کیسا ہے؟ ۴۹۲

۹ بیرونی ممالک سے آئی ہوئی مذبوحہ مرغیوں کا شرعی حکم ۴۹۳

۱۰ دھوبی کے یہاں کھانا ۴۹۴

۱۱ کافر کے یہاں کھانا ۴۹۴

۱۲ شرادھ کے کھانے کا حکم ۴۹۴

۱۳	نہر فرات کا پانی پینا	۴۹۵
۱۴	کیا بعد عصر کھانا کھانا ممنوع ہے؟	۴۹۵
۱۵	حیض والی عورت کے ہاتھ کا پکا ہوا کھانا جائز ہے یا نہیں؟	۴۹۶
۱۶	جرسی گائے کے دودھ کا حکم	۴۹۶
۱۷	تصویر والی مٹھائی کا حکم	۴۹۷
۱۸	الگ الگ پلیٹ میں کھانا	۴۹۸
۱۹	مسلم لڑکے لئے اپنے غیر مسلم والدین کا کھانا کھانا	۴۹۸
۲۰	جلاٹین ملی ہوئی مٹھائی کھانا	۴۹۹
	کتاب الوصیۃ	۵۰۳
۱	بیوی کو قرض کی ادائیگی اور اولاد کی شادی کے انتظام کے لئے منتظم و وصی بنانا	۵۰۳
۲	پوتے کو لڑکے کے برابر حصہ دینے کی وصیت	۵۰۴
۳	مدرسہ یا مسجد بنانے کی وصیت	۵۰۶
۴	وصیت سے رجوع کا حکم اور پھر وصیت کرنا	۵۰۶
۵	داشتہ سے پیدا ہونے والی لڑکیوں کے لئے وصیت کا حکم	۵۰۷
۶	میرے روپیہ کو کار خیر میں لگا دینا	۵۰۹
۷	وصیت کی گئی زمین سے حقوق اللہ کی ادائیگی	۵۱۰
	کتاب الفرائض	۵۱۵
۱	بعض وارث کی غیر موجودگی میں ثالث کے فیصلہ کی حیثیت	۵۱۵
۲	والد کی خدمت نہ کرنے کی وجہ سے وراثت سے محروم نہ ہوگا	۵۱۶
۳	مورث کا تمام مال اس کا ترکہ قرار پائے گا	۵۱۶
۴	پگڑی دے کر کرایہ پر لئے گئے مکان میں وراثت	۵۱۸
۵	بھائی کے نام بینک میں جمع شدہ رقم کا مالک کون ہوگا؟	۵۲۰
۶	بہن، ماموں و چچا کی اولاد اور چچی میں ترکہ کس کو ملیگا؟	۵۲۱
۷	کیا ہندوستان اور بنگلہ دیش دونوں مختلف دار ہیں؟	۵۲۲
۸	تمام متروکہ جائداد میں سارے ورثہ کا حق ہے	۵۲۳
۹	مختلف فنڈ سے ملنے والی رقم کی تفصیل و تقسیم	۵۲۶

۱۰	کیا حق وراثت معاف کردینے سے حصہ ختم ہوجاتا ہے؟	۵۲۹
۱۱	لڑکوں کے لئے زمین ومکان لینا اور لڑکیوں کو روپے دینا کیسا ہے؟	۵۳۱
۱۲	مکان کی تقسیم کس طرح ہوگی؟	۵۳۱
۱۳	متوفی کے ایام رخصت کی تنخواہ اور جی پی فنڈ کا وارث کون ہوگا؟	۵۳۳
۱۴	مشترک مکان کی تقسیم کس طرح ہوگی؟	۵۳۳
۱۵	قرض دیتے وقت یہ کہنا کہ یہ رقم فلاں کی ہے تو کیا یہ رقم اس کی ہوجائے گی؟	۵۳۳
۱۶	شادی کے موقع پر دیئے گئے زیورات کا مالک کون ہوگا؟	۵۳۳
۱۷	کیا قرض میں دی گئی رقم بھی ترکہ شمار ہوگی؟	۵۳۳
۱۸	بعض اراضیات کاشت کا حکم	۵۳۴
۱۹	وراثت ووصیت کا مسئلہ اور اس کا حکم	۵۳۶
۲۰	گمشدہ لڑکے کا حصہ	۵۳۷
۲۱	ترکہ سے حقوق اللہ کی ادائیگی	۵۳۷
۲۲	کسی ایک لڑکے کو الگ کردینے یا اس کے الگ ہوجانے سے اس کا حق وراثت ختم نہیں ہوتا	۵۳۹
۲۳	مرتد مسلمانوں کے ترکہ کا وارث نہیں	۵۴۰
۲۴	مکان کی تقسیم ورثہ کے درمیان کس قیمت کے اعتبار سے ہوگی؟	۵۴۱
۲۵	پوتوں کی وراثت کا مسئلہ	۵۴۳
۲۶	بیٹے کی موجودگی میں پوتے محروم رہتے ہیں	۵۴۳
۲۷	مشترکہ خاندان کی مشترکہ جائداد کی تقسیم	۵۴۶
۲۸	ملازم کے مرنے کے بعد فنڈ کا حکم	۵۴۹
۲۹	پاکستان چلے جانے والے وارث کا حصہ	۵۴۹
۳۰	فنڈ گروپ، انشورنس، ڈیتھ ریلیف اور گریجویٹی کی رقم کی تقسیم کس طرح ہوگی	۵۵۱
۳۱	کسی کو وارث قرار دینے یا مرتد کرنے سے قانوناً و شرعاً کا استحقاق وراثت ساقط نہ ہوگا	۵۵۴
۳۲	دو لڑکے اور چار لڑکیوں کے درمیان ترکہ کی تقسیم	۵۵۷
۳۳	دادا کا اپنے پوتے کو ہبہ یا وصیت کرنا	۵۵۸
۳۴	ترکہ کی تقسیم کتنے دنوں میں ہونی چاہئے	۵۵۸
۳۵	دو بیویاں ہوں اور دونوں سے اولاد ہو تو ترکہ کی تقسیم کس طرح ہوگی؟	۵۵۹
۳۶	ایک بھائی کے ورثہ کے درمیان مشترک کاروبار کی تقسیم	۵۶۴
۳۷	مناسخہ	۵۶۴

۳۸	ایک لڑکی، ایک بہن اور بھانجے و بھانجی کے درمیان ترکہ کی تقسیم	۵۶۷
۳۹	بھانجا، دادا کے بھائی کا پوتا و نواسہ کے درمیان ترکہ کی تقسیم	۵۶۸
۴۰	مناسخہ	۵۶۹
۴۱	رہن چھڑانے والا وارث تنہا اس کا مالک نہیں ہوگا	۵۷۱
۴۲	ایک بھائی، دو بھتیجے اور تین بھتیجوں کے درمیان ترکہ کی تقسیم	۵۷۲
۴۳	بھائیوں کا چوتھائی ترکہ بھتیجے کے نام رجسٹری کردینا	۵۷۳
۴۴	مہر میں دیا گیا مکان ورثہ کے لئے واپس کردینے کا حکم	۵۷۵
۴۵	باپ کے ترکہ کو لڑکوں نے بڑھایا تو اس کی تقسیم کس طرح ہوگی؟	۵۷۶
۴۶	شادی کے موقع پر جو زیورات دیئے گئے ان کی تقسیم	۵۷۶
۴۷	مشترک خاندان میں لڑکے کی بیوی کو جو جنس دی گئی اس کی تقسیم	۵۷۶
۴۸	باپ کا اپنے بیٹے کو اولاد تصور نہ کرنے سے اولاد وراثت سے محروم ہو جائیں گی یا نہیں؟	۵۷۷
۴۹	پوتے کی وراثت	۵۷۸
۵۰	وارث کے لئے وصیت کب نافذ ہوگی، نیز مورث کا وارث سے ناراضگی وراثت سے محرومی کا سبب ہے یا نہیں؟	۵۷۸
۵۱	حق وراثت مورث کے مرنے کے بعد ہے مورث اپنے حین حیات میں اپنے املاک میں خود مختار و شرعی تصرف کا مالک ہے وارث کو تعرض کا حق نہیں	۵۸۰
۵۲	دادا کے سامنے باپ کا انتقال ہوگیا، چچا نے نصف جائداد بھتیجے کے نام کردی اب پوری جائداد کی تقسیم کس طرح ہوگی؟	۵۸۲
۵۳	والد کے انتقال کے بعد والدہ ترکہ تقسیم کرنے سے انکار کرے تو اولاد کو بذریعہ عدالت ترکہ تقسیم کرانے کا حق ہے یا نہیں؟	۵۸۷
۵۴	برضا و رغبت ترکہ تقسیم کرنے کے بعد انکار کا حکم	۵۸۹
۵۵	مشترکہ دوکان کی تقسیم	۵۹۰
۵۶	کسی کے نام محض پٹہ و اندراج کردینا موجب ملک نہیں ہے	۵۹۰
۵۷	گود لینے کا شرعی حکم	۵۹۱
۵۸	شوہر کے ترکہ سے مہر و حصہ کا مطالبہ	۵۹۲
۵۹	کیا شوہر کے ترکہ میں زینب کا بھی حصہ ہوگا؟	۵۹۳
۶۰	پوتا وراثت سے محروم کیوں؟	۵۹۴

☆☆☆

كتاب البيوع

کتاب البیوع

بغیر تحریر خریدی ہوئی زمین مسجد و مدرسہ میں دینا:

ایک آراضی سبرداری ایک مسلمان نے غیر مسلم سے خریدی جس کا بیع نامہ وغیرہ کوئی تحریر نہیں ہوا، چونکہ دس گنا دیا ہوا نہیں تھا، اس مجبوری سے وہ آراضی اب تک اس غیر مسلم کے نام چلی آتی ہے وہی اس کا لگان ادا کرتا چلا آتا ہے، اصل خانہ کاشت پٹواری میں اس کا نام ہے۔

اس آراضی میں مسجد بنانا اور نماز پڑھنا درست ہے یا کہ نہیں، مدرسہ اسلامیہ بنانا درست ہے یا کہ نہیں؟

الجواب وباللہ التوفیق:

حسب تحریر سوال صورت مسئولہ میں اگر اس آراضی کو جب قیمت طے کر کے خرید لیا ہے اور قیمت وزمین میں کوئی نزاع نہیں ہے تو بیع مکمل ہوگئی ہے (۱)، گو کسی مصلحت سے کاغذی اندراجات نہ ہوا اور اس صورت میں اس آراضی پر مسجد بنانا یا مدرسہ اسلامیہ قائم کرنا وغیرہ سب تصرف مالکانہ جائز اور درست ہوں گے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دار العلوم دیوبند سہارنپور ۱۹/ ۷/ ۸۵ ۱۳ھ
الجواب صحیح محمود غفی عنہ، سعید احمد علی سعید مفتی دار العلوم دیوبند

۱- کوٹے سے بچے ہوئے مال کو فروخت کرنا:

۱۔ اشیاء خوردنی تیار کرنے کے واسطے کوٹہ کے حساب سے یعنی محدود مقدار میں آتا ہے اور شکر یا گھی وغیرہ جو ملتا ہے اپنے مصرف سے زائد بچے رہنے پر یا بچانے پر اس مال کو اگر فروخت کیا جاوے جس سے منافع کثیر ہو اور جسے عرف عام میں

۱- ''(البیع ینعقد بالایجاب والقبول إذا کانا بلفظی الماضی) مثل أن یقول أحدھما بعت والآخر اشتریت''(ہدایہ ۳/ ۱۸، اشرفیہ دیوبند)۔

بلیک کہتے ہیں اور موجودہ قانونی بندشوں کی بناء پر عام طور سے لوگ ایسی خرید وفروخت پر مجبور رہوں، تو مطلع فرمائیے کہ اس طرح پر مذکورہ بالا مال کی خرید وفروخت از روئے شرع جائز ہے یا ناجائز ہے اور بلیک کی آمدنی حلال ہے یا کہ حرام ہے؟

۲-اسمگلنگ کا شرعی حکم:

بیرون ملک سے سونا وغیرہ خرید کر لوگ یہاں لاکر فروخت کرتے ہیں جبکہ بیرون ممالک میں یہ اشیاء سستی ملتی ہیں اور اپنی ملکی قانون یا گرانی کے باعث لوگ ایسے مال کو خریدنے پر مجبور رہوں، اس طرح پر لایا گیا مال اسمگلنگ کہلاتا ہے، مطلع فرمائیں کہ ملک میں لائی گئی اس قسم کی اشیاء کی خرید وفروخت از روئے شریعت جائز ہے یا کہ ناجائز ہے؟

الجواب وباللہ التوفیق:

ا۔اس کی دو صورتیں ہیں: ایک تو یہ ہے کہ حکومت کی جانب سے دوکاندار کو کچھ کوٹہ فروخت کرنے کے لئے ملتا ہے، اسکو بچا کر یا خود بچے ہوئے کو بلیک کرنا جائز نہیں ہے، دوسرے یہ کہ لوگوں کو جوراشن اپنے استعمال کے لئے ملتا ہے اور لوگ اس کو قیمتاً خریدتے ہیں اور وہ اپنے استعمال سے بچ رہتا ہے اس کو جس قیمت پر چاہیں شرعاً فروخت کرنا جائز ہوگا، لیکن اگر قانوناً جرم ہو تو چونکہ عزت کا بچانا واجب ہے اپنی عزت بچانے کے لئے قانون کی خلاف ورزی کی بھی اجازت نہ ہوگی۔

۲۔جائز ہے مگر عزت بچانے کے لئے اس کا بھی وہی حکم ہے جو جواب ا۔کا ہے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۵/۷/۸۵ ۱۳ھ

الجواب صحیح: محمد ظلیل الرحمٰن، محمود غنی عنہ، سید احمد علی سعید

غیر مسلموں نے جو کپڑے نائی اور برہمن کو دیئے ان کی خرید وفروخت:

شہروں میں پرانے کپڑے اور جوتے استعمال شدہ فروخت ہوتے ہیں اور کہا جاتا ہے کہ یہ کپڑے وہ ہوتے ہیں جو غیر مسلموں کے یہاں مرنیوالے کے نائی اور برہمن کو دیدیئے جاتے ہیں، دریافت ہے کہ ان کو خرید کر استعمال کرنا درست ہے یا کہ نہیں۔

الجواب وباللہ التوفیق:

برہمن کو دیدینے سے وہ برہمن کی ملک ہو جاتا ہے اور اس کا خریدنا اور استعمال کرنا سب جائز ہے، ہاں اگر اس کے

ناپاک ہونے کا ظن غالب ہو تو دھوکر استعمال کرے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۸/ ۷/ ۱۳۸۵ھ

الجواب صحیح محمود غفی عنہ

کسٹوڈین سے مکان خریدنا:

میں ایک شریف خاندان پردہ نشین عورت اور بال بچے دار ہوں، میں نے بخیال رہائش اہل وعیال ایک مکان واقع محلہ شیخان گدری بازار شہر میر کسٹوڈین سے آٹھ ہزار روپیہ میں خرید کیا، اس میں بطور کرایہ دار منشی غلام مجتبی رہتے ہیں اور چار خاندان جنکا راشن کارڈ بنا ہوا ہے اس میں آباد کر رکھے ہیں، زبانی وتحریری بذریعہ اقرارنامہ مہلت انخلاء ۱½ ڈیڑھ سال چند اشخاص کے روبرو چاہی جو انکی منشاء ومرضی پر دیدی گئی کوئی میعاد نہ گھٹائی گئی نہ بڑھائی گئی، اس پر میرے شوہر نے ان پر ظلم کر رکھا ہے، اب آپ سے صرف یہ مسئلہ درکار ہے کہ میں حق پر ہوں یا وہ منشی غلام مجتبی اب انکی نسبت یہ بات پائی جارہی ہے کہ وہ اپنی تحریر اقرارنامہ میں جو اسٹام پر تحریر کیا ہے اس سے وہ انکاری ہیں، مسماۃ نسیم بانو۔

الجواب وباللہ التوفیق:

اگر وہ مکان واقعہ اور صحیح طور پر کسٹوڈین کا ہوگیا تھا اور اسکے بعد مسماۃ نسیم بانو نے کسٹوڈین سے قیمت دیکر خریدا ہے تو مسماۃ نسیم بانو شرعی طور پر اس کی جائز اور صحیح مالک ہوگئی ہے، منشی غلام مجتبی کو محض کرایہ داری کی بناء پر یہ حق شرعاً نہیں پہنچتا کہ وہ اس مکان کو نہ چھوڑیں یا شہرت عام دیں کہ ان پر ظلم ہو رہا ہے، ہاں اگر واقعہ کچھ دوسرا ہو تو حکم بھی دوسرا ہوسکتا ہے۔

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۷/ ۸/ ۱۳۸۵ھ

الجواب صحیح محمود غفی عنہ

چوری کا مال خریدنا کیسا ہے؟

میری دوکان پرانے سامان کی ہے اور اس کے لئے جو سامان خریدتا ہوں وہ سامان چوری کا ہوتا ہے، لیکن میں خود اس کو چور سے نہیں خریدتا ہوں بلکہ دوسرے بیوپاران سے خریدتا ہوں اور وہ بیوپاری چوروں سے خریدتے ہیں، لیکن میں تو

بیوپاریوں کو پوری قیمت ادا کرتا ہوں، لہذا استدعا ہے کہ اس سامان کا منافع مجھ کو جائز ہے یا کہ نا جائز؟

الجواب وباللہ التوفیق:

جب آپ کو علم اور یقین ہے کہ یہ سامان چوری کے ہیں تو آپکو اسکا خریدنا، فروخت کرنا، تجارت کرنا کچھ بھی جائز نہیں اور جو نفع اس سے ہوگا وہ بھی جائز اور صحیح نہ ہوگا، خواہ آپ چوروں سے نہ خریدتے ہوں چوروں سے خریدنے والوں سے خریدتے ہوں یا ان سے خریدنے والوں سے خریدتے ہوں کسی حال میں جائز نہیں ہے یہ تو کوئی عقل کی بات بھی نہیں کہ محنت اور مشقت اٹھائیں آپ اور مصیبت جھیل کر سرمایہ جمع کریں اور اس سے منتفع ہوں اعزہ اقرباء اور دوسرے لوگ، آخرت میں گردن نپے آپ کی، اس کو چھوڑ کر کوئی دوسرا کاروبار کیجئے، جب تک دوسرا کوئی جائز کاروبار نہ ملے اس وقت تک اس کو گناہ سمجھ کر اور نا جائز سمجھ کر کرتے رہئے اور استغفار کرتے رہئے اور دوسرے جائز کام کی تلاش جاری رکھئے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دار العلوم دیوبند سہارنپور ۱۱/ ۸/ ۱۳۸۵ھ

الجواب صحیح: سید احمد علی سعید، محمود غنی عنہ

۱-پرمٹ سے زائد راشن لینا:

اس وقت اشیاء کی کم مائیگی ناپیدی کی وجہ سے غلہ کپڑا تیل سب پر کنٹرول کیا جارہا ہے اور یہ چیزیں اکثر جگہ پرمٹ ہی کے ذریعہ ملتی ہیں، پرمٹ کے ذریعہ ایک شخص کو جو گیہوں یا چینی یا تیل ملتا ہے وہ اس کے گھر والوں کے لئے ناکافی ہے بلکہ اسپر اہل وعیال کا گذر مشکل ہے خاص کر شادی بیاہ پر اور سب تہواروں میں اور زیادہ دقت کا سامنا کرنا پڑتا ہے، اپنے وقار کو باقی رکھنا دشوار ہوجاتا ہے، ایسے پریشان کن حالات میں بلیک کے ذریعہ ان اشیاء کو خریدا جائے تو از روئے شرع کیسا ہوگا کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ حاکم سے بربنائے تعلق اپنی مقررہ یونٹ میں یعنی افراد کی تعداد بڑھا کر زیادہ کا مطالبہ کیا جاتا ہے، یا ایسے شخص کے نام لے لیا جاتا ہے جو مفقود یا غائب ہے اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ خود حاکم آفس میں مال گدام میں مال کی فراوانی دیکھ کر از راہ شفقت مقررہ یونٹ سے بڑھا کر تقسیم کر دیتا ہے، ان صورتوں میں درست ہے یا کہ نہیں؟

۲-ٹھیکہ دار کے ذریعہ سیمنٹ بلیک سے خریدنا:

سیمنٹ یا چینی جو ٹھیکیدار نے پبلک غلہ ورشی سے بلیک لیا ہے، اس میں شرعی پہلو خیانت ہے آج جبکہ ان شیاء کی دستیابی مشکل سے مشکل تر ہوتی جاتی ہے اور اگر مل بھی جاتی ہے تو حسب ضرورت نہیں اور اگر پرمٹ پر حاصل بھی کیا جاتا ہے

تو بہت قلیل مقدار کہ شاید مسجد یا مکان صدیوں میں تیار ہواور پرمٹ کے ذریعہ بھی خوشامد درآمد رشوت ستانی کی سنت سے نجات نہیں، لیکن مجبوری کی صورت میں کوئی شرعی حیلہ جواز کی ہوسکتی ہے کہ بدون اس چارہ جوئی آج اس مسجد اور مکان کی تعمیر عمل میں نہیں آسکتی ہے واضح رہے کہ بلیک سے آٹا یا چینی برآمد کرنے میں جو چوری ہے وہی چور بازاری ٹھیکیدار سے سمنٹ یا دوسری اشیاء حاصل کرنے میں ہے۔

الجواب وبا لله التوفيق:

ا-تسعیر للحاکم کو امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ تعالی علیہ تو ہر حال میں مکروہ فرماتے ہیں مگر امام ابو یوسف رحمۃ اللہ تعالی علیہ کے نزدیک اس صورت میں جب عوام کو پریشانی لاحق ہو یا پریشانی کا خطرہ قوی ہو تسعیر جائز ہے واجب انکے نزدیک بھی نہیں اور قانون وقت بھی اس پر دائر ہوتا ہے، لہذا اگر انتظاماً ایسا ہو ظلماً ایسا نہ ہو تو اس کا احترام اور لحاظ بھی حتی المقدور لازم ہے اور عندابی یوسف واجب نہ ہوگا ثمرہ یہ نکلے گا کہ اگر کسی نے تسعیر کے خلاف کوئی تصرف کر دیا اور اس میں اور کوئی شرعی قباحت مثل خداع وخلابہ فریب وغیرہ کے نہ ہو تو نافذ ہو کر مملوک بملک صحیح ہو جائیں گی، پس حاصل کلام یہ نکل آیا کہ بوقت مجبوری قانون کا احترام اور اس سے حفاظت رہتے ہوئے گنجائش ہے۔

۲-ٹھیکیدار (سرکاری دوکانداروں) کو حکومت جو چیزیں فروخت کے لئے دیتی ہے اس کی مالک حقیقۃً حکومت ہی رہتی ہے ٹھیکیدار محض اس کے پیچھے کا وکیل ہوتا ہے خود مالک نہیں ہوتا ہے، اس کے لئے قانون حکومت کے خلاف کرنا جائز نہیں ہے، اگر خلاف قانون کرے تو خیانت ہوگی اور یہ جائز نہیں بقیہ اجزاء کا جواب ا- میں گذر چکا ہے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۲/ ۸/ ۸۵ ۱۳ھ

الجواب صحیح محمود غفی عنہ

چوڑیوں کی تجارت جائز ہے یا نہیں؟

ایک شخص شریعت کا پابند ہے، لیکن کانچ کی چوڑی کا وہ تاجر ہے اور چوڑیاں ہاتھ میں عورتوں کو پہنانا پڑتا ہے، اب عندالشرع اس کا یہ پیشہ غلط ہے یا صحیح ہے، کیونکہ وہ اس پیشہ سے حج کرنا بھی چاہتا ہے اور زکوۃ دینا بھی چاہتا ہے اور دینی

کاموں کی خدمت کرنا چاہتا ہے، لہٰذا دریافت ہے کہ کیا اس پیسہ سے موجودہ کام کرنا ٹھیک ہیں؟

الجواب وباللہ التوفیق:

چوڑیوں کی تجارت جائز ہے، البتہ نامحرم عورتوں کو اپنے ہاتھ سے پہنانا ناجائز ہے، چاہے نگاہیں اپنی نیچی رکھتا ہویا اور کچھ ہو، کیونکہ نامحرم کا بدن بھی چھونا ناجائز ہے یہ گناہ کا فعل ہے اس سے اس کو گناہ ہوتا ہے، اس کو چاہئے کہ خود نہ عورتوں کو پہنائے بلکہ اپنی عورتوں سے یا نابالغ چھوٹے بچوں کے ذریعہ پہنوائے باقی یہ گناہ الگ ہے، اس سے اس کو توبہ کرنا چاہئے، اس گناہ سے اس کے حاصل شدہ نفع یا مال میں حرمت نہیں آئی وہ سب اس کی ملک صحیح ہیں، اس سے حج، زکوۃ، صدقہ خیرات سب جائز ہے، بس تجارت کرے اور خود نامحرم عورتوں کو نہ پہنائے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۴/ ۸/ ۸۵ ۱۳ھ

الجواب صحیح سید احمد علی سعید

سامان کم اور زیادہ قیمت پر فروخت کرنا:

تجارت میں (مثلاً کپڑے کی تجارت) دام زیادہ اور بعد میں کم داموں میں مال فروخت کرنا کیا حکم شرعی رکھتا ہے؟

الجواب وباللہ التوفیق:

اپنا مال انسان جس قیمت پر چاہے اس کو اختیار ہے اسی طرح یہ بھی اختیار ہے کہ پہلے دام زیادہ رکھا پھر بعد میں کم پر فروخت کردیا، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲/ ۹/ ۸۵ ۱۳ھ

الجواب صحیح محمود غفی عنہ

باپ کی فروخت کردہ زمین کو بیٹے کے لئے دوسرے کے ہاتھوں فروخت کرنا:

ایک خطہ زمین آٹھ فٹ ملا سردار نے شفیع اللہ پہلوان سے تبادلہ کیا جسکے لئے کئی آدمی گواہ ہیں شفیع نے ملا سردار کو

آٹھ فٹ زمین دے دی، لیکن جب ملاسردار کو تنگ دستی پیش آئی تو انہوں نے اپنی زمین شفیع پہلوان کے ہاتھ فروخت کردی، شفیع اللہ نے اس زمین کی لکھا پڑھی نہیں کرائی زبانی بات ہوگئی محض ایمان داری پر، بعد میں ملاسردار نے دوسرے آدمی سے کہا کہ تم اپنی زمین آٹھ فٹ کو ہمارے ہاتھ فروخت کردو تو انہوں نے کہا کہ زمین تو میں نے دوسرے کو فروخت کردیا، پھر سردار کا انتقال ہوگیا، بعد ملاسردار کے لڑکے نے وہ آٹھ فٹ زمین دوسرے آدمی کے ہاتھ فروخت کردیا ہے اور کہا کہ ہمارے والد نے ہم سے کبھی نہیں کہا ہے کہ ہم نے زمین شفیع اللہ کو فروخت کردیا ہے اس لئے ہم نے فروخت کردیا تیسرے آدمی کو، شفیع اللہ اس زمین پر مکان بنا چکا ہے اب ملاسردار کے لڑکے اور بیوی نے اس کو تیسرے کے ہاتھ فروخت کردیا ہے، اب مجھ سے بعض آدمی یہ کہتے ہیں کہ آپ نے جتنا روپیہ اس زمین پر ملاسردار کو دیا تھا اتنا روپیہ لیجئے، اب میں آپ حضرات سے دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ آیا کہ میں نے جتنا روپیہ ملاسردار کو دیا تھا اتنا لوں یا جتنے میں اس کے لڑکے نے فروخت کی ہے اتنا لوں یا کچھ نہ لیں کون سی صورت اچھی ہے؟۔

الجواب وبالله التوفيق:

بیع کا ثبوت اور تحقق لکھنے پڑھنے یا نام زدگی پر موقوف نہیں بیع زبانی بھی ہوجاتی ہے اور فرضی نام پر لکھنے سے بھی ہو جاتی ہے، بیع کا ثبوت وتحقق ایجاب وقبول اور اس کی حقیقت پر موقوف ہے، پس صورت مسئولہ میں اللہ ورسول اللہ ﷺ کے نزدیک حکم یہ ہے کہ ملاسردار اور شفیع اللہ پہلوان کے درمیان تبادلہ زمین پر جس طرح عینی شاہد ۵-۷ آدمی موجود ہیں اسی طرح ملاسردار نے تنگی آجانے کی وجہ سے جو زمین شفیع اللہ پہلوان کے نام فروخت کیا ہے اس پر بھی کم ازکم دو عینی شاہد موجود ہوں اور بیچنے کی شہادت دے رہے ہوں تو ملاسردار کے لڑکوں نے جتنے میں وہ زمین بیچی ہے وہ سب روپیہ شفیع اللہ پہلوان لے سکتے ہیں اور اگر اس بیع پر جس کو ملاسردار نے بوجہ تنگدستی شفیع اللہ پہلوان کے نام کی ہے کہ کم ازکم دو عینی شاہد بھی موجود نہیں تو شفیع اللہ پہلوان صرف اتنا ہی روپیہ لے سکتے ہیں جتنے انہوں نے ملاسردار کو واقعی دیا تھا زائد نہیں لے سکتے ہیں۔

(تنبیہ) یہ حکم اس صورت کا ہے کہ ملاسردار نے اپنے نابالغ لڑکوں کے نام محض قانونی زد سے بچنے کے لئے خریدی ہو اور اگر باقی قانونی خطرہ نہیں تھا تو ظاہر یہی ہے کہ حقیقۃً انہی نابالغوں کو مشتری قرار دیا ہے اور اس صورت میں ملاسردار کا اس زمین کو فروخت کرنا سب غلط اور غیر صحیح ہوا خواہ کتنے بھی شاہد عینی اس پر موجود ہوں اور اس صورت میں شفیع اللہ پہلوان کو اپنا

واقعی دیا ہوا روپیہ وصول کرنیکا حق ہوگا زیادہ کا بالکل نہیں، خواہ عینی شاہد موجود ہوں یا نہ ہوں، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱/۹/ ۱۳۸۵ھ

الجواب صحیح محمود عفی عنہ دارالعلوم دیوبند

بیوپاری کا مال پہنچانے پر نفع لینا کیسا ہے؟

تھوک کپڑا، دری، ساڑی، چادر وغیرہ بکری کرتا ہوں اور کچھ بیوپاری اس طرح کے ہیں کہ فلاں فلاں مال یعنی دری چادر وغیرہ ہم نے بکری کیا ہے جو چیزیں ہم کہیں وہ چیزیں ہم کو فلاں جگہ سے لا دو اور کل خرچہ آمد و رفت مال کا ہم دیں گے اور آپ نفع بھی طے کرلو کہ کیا نفع لوگے، نفع ہوجاتا ہے مثلاً ایک سو روپیہ کے مال پر خرچ روپیہ ۳ آنہ نفع ہوگا، اور روپیہ کی یہ قید نہیں ہے کہ کب ملے گا مال بکری ہوجائیگا روپیہ ملتا جاوے گا جب مال ختم ہوجاتا ہے تو پھر مال لاکر دیدیتے ہیں جو نفع طے ہے وہی لیتے رہتے ہیں، اور کبھی مالک وطن جاتا ہے تو اپنے بیوپاریوں میں سے ایک کو یا دو کو روپیہ لینے کا اور مال لاکر دینے کا اختیار دے جاتا ہے کہ جس مال کی ضرورت ہو میرے نام سے لانا سب لوگ بکری اور نفع اسی حساب سے لگاتے ہیں اور مال میں جو بھی نقصان ہوگا وہ مالک کا ہوگا بیوپاری کو جو مال دیا جاوے گا اتنا روپیہ لیا جاوے گا۔ کیا یہ نفع لینا جائز ہے؟

الجواب وبا اللہ التوفیق:

یہ نفع درست اور جائز ہے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

آرڈر دینے والے سے پیشگی رقم لینا:

آجکل عام دستور ہے کہ فیکٹریوں میں آڈر لیکر سامان تیار کیا جاتا ہے اور آڈر دینے والے سے کچھ رقم مثلاً ۱/۲، ۱/۳ پیشگی لے لیا جاتا ہے پھر سامان تیار کیا جاتا ہے آیا یہ لینا دینا جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب وباللہ التوفیق:

بیع وشراء کا یہ طریقہ جائز ہے توثیق معاملہ کے لئے بطور پیشگی کچھ ثمن لینا اس کو کہیں گے اور یہ جائز ہے (۱)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دار العلوم دیوبند سہارنپور ۱۳/ ۹/ ۸۵ ۱۳ھ
الجواب صحیح محمود علی عنہ نائب مفتی دار العلوم دیوبند

پیمانہ کی تعیین کے بغیر بیع سلم کا معاملہ:

۱- زید نے عمرو سے کچھ رقم لیا اس شرط پر کہ فصل آنے پر اتنا پیمانہ دھان دونگا اور کوئی شرط اس میں نہیں لگایا ہے اور جو پیمانہ کہا ہے، یہ پیمانہ اس گاؤں میں بہت ہیں اور ایک دوسرے سے متفاوت ہیں لیکن ان میں سے کسی ایک کو متعین نہیں کیا ہے اس طرح بیع کر کے مبیع کو وصول کرنا جائز ہے یا کہ نہیں، کسی فتوی کی کتاب کا حوالہ دیں۔

۲- بیع سلم کی کیا صورت ہے اور کیا شرائط ہیں اور اگر کوئی شخص باشرط کے بیع سلم کر کے مسلم فیہ کو وصول کرے تو یہ جائز ہے یا کہ نہیں۔

الجواب وباللہ التوفیق:

۱- جب اس گاؤں میں کئی قسم کے مختلف پیمانے رائج ہیں اور کسی ایک کو متعین نہیں کیا تو یہ بیع فاسد ہوگی، بیع سلم کے صحیح ہونے کے لئے جس طرح جنس مبیع ونوع وصفت کا معلوم ہونا ضروری ہے، اسی طرح مقدار مبیع کا معلوم ہونا بھی ضروری ہے (۲)، كما هو في عامة الكتب الفقه

۲- بیع سلم کی صورتیں اور اس کی شرائط کی تفصیل بہت طویل ہے، اس طرح سوال سے آپکو بصیرت نہیں ہوگی، اگر آپ بصیرت چاہتے ہیں تو اردو کی معتبر کتابوں جیسے صفائی معاملات مصنفہ حضرت مولانا تھانویؒ یا بہشتی زیور میں دیکھیں

۱- ''قال وان استصنع شيئا من ذالك بغير أجل جاز وقال في هامشه صورة الاستصناع ان يجيئ انسان الى صانع فيقول اصنع لي شيئا كذا وكذا قدره كذا بكذا درهما ويسلمه اليه جميع الدراهم او بعضها أولا يسلم'' (حاشیہ ہدایہ ۳/ ۱۰۰، اشرفیہ دیوبند)۔

۲- ''ولايصح السلم عند ابي حنيفةؒ الا بسبع شرائط جنس معلوم الى قوله ومقدار معلوم كقولنا كذا كيلا بمكيال معروف أو كذا وزنا'' (ہدایہ ۳/ ۹۵، اشرفیہ دیوبند)۔

اور پھر جو بات اس میں سمجھ میں نہ آئے پوچھ لیں، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۱/ ۹/ ۸۵ ۱۳ھ
الجواب صحیح: محمد جمیل الرحمن، محمود عفی عنہ مفتی دارالعلوم دیوبند

شرکت میں بچے ہوئے مال کو ایک شریک کے لئے خرید نے کی شرط لگانا:

زید اور عمر ایک میلہ میں فروختگی کے لئے ۵۰۰-۵۰۰ روپیہ ملا کر ایک ہزار روپیہ کے بکس لائے اور معاملہ یہ طے ہوئے کہ میلے میں فروخت ہونے کے بعد جو کچھ مال بچے گا خواہ کسی مقدار سے بھی بچے چاہے کم چاہے زیادہ زید کو اپنے ہی ذمہ لگانا ہوگا، یعنی اصل قیمت خرید زید سے عمر وصول کرے گا کیونکہ باقی ماندہ مال میں نصف پر زید کی ملکیت بر بناء شرکت ہے اور زید کے اس طرح معاملات کے گویا صلے میں زید کو عمر و کی طرف سے یہ رعایت مل گئی کہ بک جانے والے بکسوں کے نفع میں زید کو ۱۰/ اور عمر کو ۶/ حصہ لینا ہوگا، تو کیا اس طرح کی شرکت داری جائز ہے؟

الجواب وباللہ التوفیق:

صورت مذکورہ میں ۱۰/ ۶/ نفع کو اس بنیاد پر نہ رکھا جائے کہ زید بعد میں باقی ماندہ کے نصف کو خرید یگا بلکہ اصل معاملہ شرکت میں ہی نفع کی یہ تفصیل مذکور رکھی جائے اگر چہ سرمایہ دونوں کا برابر ہے جائز ہے کما فی الھدایۃ (۱) رہ گیا یہ شرط لگانا کہ بعد میں جس قدر مال بچے گا اس کو زید تنہا اصل خرید پر خریدے گا اس کا حاصل یہ ہے کہ شرکت زمانہ محدود تک کے لئے کی اور بعد میں اس مذکورہ صورت پر ختم کر دیں گے اس سے بھی معاملہ میں کوئی سقم پیدا نہیں ہوتا ہے، لہذا صورت مسئولہ میں اس طرح ساجھے داری درست ہے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۳/ ۹/ ۸۵ ۱۳ھ
الجواب صحیح: سید احمد علی سعید نائب مفتی دارالعلوم دیوبند

قرض کے عوض بازار کے عام نرخ سے کم میں گندم لینا:

اگر کسی حاجتمند نے ہم سے سوال کیا کہ ہم کو سو روپیہ دو ہم نے اس کو روپیہ دیدیئے اور اس وقت گیہوں کا بھاؤ بتیس

۱- ''واما شركة العنان الى قوله ويصح التفاضل في المال لحاجة الى قوله ويصح ان يتساويا في المال ويتفاضلا في الربح'' (ہدایہ ۲/ ۶۲۹، اشرفیہ دیوبند)۔

روپیہ فی من ہے اور چار مہینے بعد بیس روپے فی من لونگا اور وہ رضامند ہوکر لے گیا ہے، یہ معاملہ کرنا میرے لئے کیسا ہے؟

الجواب وباللہ التوفیق:

یہ صورت بیع سلم کی نہیں ہوئی، بلکہ قرض کی ہوئی اس صورت میں عام بھاؤ بازار سے دبا کر زیادہ لینا سود ہوگا اور ناجائز ہوگا (۱)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۸/ ۱۰/ ۸۵ ۱۳ھ

الجواب صحیح سید احمد علی سعید نائب مفتی دارالعلوم دیوبند

فصل آنے سے پہلے اناج کا بھاؤ طے کرنا:

جو شخص فصل آنے سے پہلے کاشتکاروں کو روپیہ دیتے ہیں اور اناج کا بھاؤ بڑھا کر طے کرتے ہیں یہ جائز ہے یا کہ نہیں؟

الجواب وباللہ التوفیق:

نہیں جائز ہے۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۸/ ۱۰/ ۸۵ ۱۳ھ

(جواب صحیح ہے۔ اس کی توضیح یہ ہے کہ اگر روپیہ قرض دیا ہے یہ کہہ کر کہ فصل کے وقت اس کا غلہ بھاؤ بڑھا کر وصول کیا جائے گا تو یہ جائز نہیں)، فقط واللہ اعلم بالصواب

سید احمد علی سعید نائب مفتی، احقر محمود احمد

حق تصنیف کو خاص کرنا اور اس کی بیع وشراء کا حکم:

۱- آج کل کتابوں کے ناشرین اپنی کتابوں کو رجسٹرڈ کراتے ہیں، جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ہمارے علاوہ دوسرے

۱- ''عن عطاء قال کانوا یکرھون کل قرض جر منفعۃ'' (مصنف ابن ابی شیبہ ۱۰/ ۶۴۷، حدیث ۲۱۰۷۷، المجلس العلمی دار قرطبہ بیروت)۔

کتب خانہ والے اس کو نہ چھپوائیں، ہم ہی طبع کر کے اس کی سیل کریں، اس طرح حق تصنیف کو اپنے لیے خاص کر لینا کہاں تک درست ہے؟

۲۔بعض مصنفین کتب خانہ والوں کو اپنی کتاب کا حق تصنیف فروخت کر دیتے ہیں، اس طرح حق تصنیف بیچ دینا اور اس کے عوض پیسے لینا شرعاً درست ہے یا نہیں؟

عبدالقیوم القاسمی (شہر میرٹھ)

الجواب وباللہ التوفیق:

(۱و۲) بعض کتابیں محض دنیوی علوم اور کاروباری معاملات کی اور اس سے متعلق ہوتی ہیں اور ان کتابوں سے مقصد محض دنیا کمانا یا دنیوی کاروبار کرنا ہوتا ہے اور اسی لیے یہ کتابیں لکھی اور بیچی جاتی ہیں، ایسی کتابوں کا حق تصنیف محفوظ رکھنا اور دوسروں سے روپیہ لے کر دوسروں کو چھاپنے کی اجازت دینا کاروباری طریقہ میں شمار ہو کر درست رہے گا اور بعض کتابیں محض دینی علوم کی اور محض اشاعت دین کی ہوتی ہیں اور علوم دین اور اس کی اشاعت شرعاً مطلوب اولی واصل ہے اور اس کا روکنا یا اس کو دنیوی کاروبار بنانا شرعاً درست نہیں ہوتا، کما اشار الیہ النصوص مثلاً: ''بلغوا عنی ولو اٰیة'' اور مثلاً: ''لیبلغ الشاهد الغائب'' وغیرهما۔

لہٰذا علوم دینیہ کی کتابوں کا حق تصنیف محفوظ کر لینا، اس کی اشاعت سے روکنا درست نہیں ہوگا اور اگر کوئی کتاب دونوں قسم (دنیوی و دینی) پر مشتمل ہو تو اکثر کا حکم جاری ہوگا (۱)۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور، ۲/ ۸/ ۱۴۱۱ھ

الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن خیرآبادی، محمد ظفیر الدین مفتاحی، کفیل الرحمٰن

ادھار کی صورت میں گراں فروخت کرنا:

ایک سامان جس کا نقد کہہ کر دس روپیہ اور ادھار اگر فروخت کرے تو بارہ روپیہ ہے، تو کیا ایسا کرنے سے سود تو نہیں ہوگا۔

۱- اس سلسلہ میں حضرت مفتی محمد شفیع صاحبؒ کا مختصر فتویٰ الاجتہ التقطیف من ثمرات التالیف، ملاحظہ کیا جا سکتا ہے (مرتب)۔

الجواب وباللہ التوفیق:

ایک چیز کی قیمت نقد فروخت کرنے میں کم اور ادھار فروخت کرنے میں زیادہ لے جاسکتی ہے (۱)، زیادتی قیمت کو کسی مدت پر محمول نہ کریں کہ جیسے جیسے مدت بڑھتی جائے قیمت بھی بڑھتی جائے اس لئے کہ یہ جائز نہیں ہے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۳/ ۱۰/ ۱۳۸۵ھ

الجواب صحیح محمود غفی عنہ

ایک متعینہ مدت کے لئے باغ ٹھیکہ پر دینا:

میرا باغ آم کا بستی کے قریب ہے، باغ میں ایک حویلی کا دروازہ بھی ہے اور بستی کا عام راستہ بھی ہے، باغ میں بینڈ پولہ اور گھاس کافی ہے اور ایک طرف کاشت بھی ہوتی ہے چھ بیگہ میں، میں بہت پریشان ہوں اس بات سے کہ فصل آم آنے پر ہی کافی اجاڑ ہوجاتی ہے، پھر قیمت پوری نہیں ہوتی ہے، اس میں آپ ہم کو تحریر کریں کہ ہم اس آم کے باغ کا پھل آنے سے پہلے ایک یا دو سال کا ٹھیکہ فصل کا دے سکتے ہیں یا کہ نہیں؟ کیونکہ باغ کی حفاظت بھی خریدار کے ذمہ ہوجاتی ہے، میری پریشانی دور کرنے کے لئے کوئی صورت آسانی کی بتلاویں۔

الجواب وباللہ التوفیق:

سال دو سال کے لئے محض پھل کا ٹھیکہ دینا تو جائز نہیں (۲)، مگر یہ جائز ہے کہ آپ باغ کی زمین ہی کو مدت مقرر کر کے مثلاً دو سال تین سال کے لئے کرایہ پر دیدیں کہ اس سے جو نفع ہو تم حاصل کرو اور ہم کو اتنے روپیہ سال اس کا کرایہ

۱- ''وقالت الشافعیہ والحنفیۃ وزید بن علي والمؤید باللہ والجمہور أنه یجوز لعموم الأدلة القاضیة بجوازه وهو الظاهر لأن ذالک المتمسک هو الروایة الأولیٰ'' (نیل الاوطار للشوکانی ۵/ ۱۴۹، مصطفی البابی الحلبی واولادہ بمصر باب تفسیر بیعتین فی بیعۃ)۔ ''لو اشتری شیئا نسیئة لم یبعه مرابحة حتی یبین لأن للأجل شبهة المبیع وإن لم یکن جمیعا حقیقة لأنه مرغوب فیه الا تری إن الثمن قد یزاد لمکان الأجل'' (بدائع الصنائع ۴/ ۲۶۶، باب ما یجب بیانہ فی المرابحہ، مکتبہ زکریا دیوبند)۔

۲- ''ومن باع ثمرة بارزة إما قبل الظهور فلا یصح إتفاقا'' (درمختار ۴/ ۹، مکتبہ زکریا)، ''قال في الفتح: لاخلاف في عدم جواز بیع الثمار قبل أن تظهر'' (شامی قدیم ۴/ ۵۲، عثمانیہ)۔

دے دیا کرو (۱)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۳/ ۱۰/ ۱۳۸۵ھ
الجواب صحیح: مفتی محمود غفی عنہ

دوسرے کی زمین کو فروخت کرنا:

ہمارے داداصاحب کی جائداد موجود ہے اور ہمارے والد بھی موجود ہیں ہم سب معصوم تھے ہمیں معلوم نہیں تھا، اس وقت ہمارے والد صاحب نے اپنے ایک دوست کو یہ جائداد فروخت کرنے کے لئے کہا، وہ دوست بغیر معلوم کئے دوسروں کے پاس فروخت کر دیئے اس وقت جب ہم سمجھدار ہوئے تو ہم کو ملنا چاہئے!

الجواب وبالله التوفيق:

آپ کی تحریر سے کوئی صاف بات معلوم نہیں ہوئی ہے اگر یہ مطلب ہے کہ آپ کے والد کے کسی دوست نے آپ کے داداصاحب کی جائداد ان سے پوچھے بغیر کسی سے آپ لوگوں کے بچپن میں ہی بیچ دیا اور جب آپ بڑے ہوئے تو اس شخص کو اس کی قیمت جو پائی تھی دیکر اپنی جائداد واپس لینا چاہا تو اس نے انکار کر دیا، واقعی اگر یہی مطلب ہے تو اس کا حکم یہ ہے کہ اس شخص کا یہ فروخت کرنا صحیح نہیں ہے، آپ لوگ اس کے مستحق ہیں، شریعت کے قانون سے اس کی دی ہوئی قیمت لوٹا کر واپس لے سکتے ہیں وہ شخص اگر نہیں دے گا تو خدا کے یہاں پکڑا جائے گا۔ اور اگر اس تحریر کا یہ مطلب نہیں ہے تو پھر کسی اور جاننے والے سے اپنا مطلب اور واقعہ صاف لکھوا کر بھیجئے اور اس کا جواب معلوم کیجئے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۳/ ۱۰/ ۱۳۸۵ھ
الجواب صحیح: محمود غفی عنہ

۱- ''الإجارة إلى قوله: ولايصح حتى تكون المنافع معلومة إلى قوله والمنافع تارة تصير معلومة بالمدة كاستيجار الدور للسكنى والأرضين للزراعة'' (ہدایہ ۳/ ۲۹۳، اشرفیہ)۔

متعینہ مدت میں سامان کی قیمت نہ دینے پر زیادہ قیمت لینا:

۱-مارکیٹ میں یہ رواج ہوگیا ہے کہ تھوک فروش بیوپاری چھٹکر بیوپاریوں کو ادھار مال دیتے ہیں اور ان سے یہ معاملہ طے ہوتا ہے کہ اگر ایک ماہ میں پیسہ ادا کردو گے تو بالکل سود نہ لیں گے اور ایک ماہ کے بعد ادائیگی میں سود لیں گے اور جتنی تاخیر ہوگی سود بڑھتا جائے گا چنانچہ سود کے ڈر سے چھٹکر بیوپاری ایک ماہ کے اندر ہی قیمت ادا کرانے کی کوشش کرتے ہیں، زید بھی تھوک فروش تاجر ہے مگر حرام ہونیکی وجہ سے وہ سود نہیں لیتا ہے چنانچہ بیوپاری اس کے یہاں سے لئے ہوئے مال کی قیمت چھ چھ مہینے تک بھی ادا نہیں کرتے ہیں، کیونکہ جانتے ہیں کہ یہ سود نہیں لے گا، ویسے زید تاکید کرتا رہتا ہے مگر کچھ اثر نہیں پڑتا ہے، ایسی صورت میں زید کو تجارت میں بڑی تنگی پیش آتی ہے۔ کیا شریعت زید کی اس پریشانی کا کوئی حل کرتی ہے یا کہ نہیں؟

۲-بینک اور ڈاکخانہ میں جمع کردہ رقم پر ملنے والے سود کے بارے میں یہ مسئلہ معلوم ہوا تھا کہ وہاں سے لے لینا چاہئے اور بلانیت ثواب غریب مسلمانوں پر تقسیم کردینا چاہئے، اب دریافت طلب یہ امر ہے کہ زید کی رقم کسی کافر پر باقی تھی، عرصہ کے بعد وہ ادا کرتا ہے اور اپنے دستور کے مطابق اپنی خوشی سے سود بھی دیتا ہے تو کیا اس سے بھی سود لے کر غریب مسلمانوں پر صرف کردینا چاہئے، اسی طرح مالدار مسلمان یا کافر پر زید کی رقم باقی تھی جس کو وہ نہیں دیتا تھا، چنانچہ بذریعہ عدالت اس پر ڈگری حاصل کی گئی اور عدالت نے یہ تجویز کیا کہ زید کو ملی ہوئی رقم مع سعد کے واپس کی جائے، تو کیا یہ سود کی رقم لے کر غربا پر تقسیم کردیا جائے؟

الجواب وبالله التوفيق:

۱-زید کی تجارت میں اگر چہ کچھ پریشانی ہے لیکن وہ سود کی لعنت سے محفوظ ہے، اللہ پاک اس کے مال کا محافظ ہے، دنیا وآخرت میں وہ خدا تعالیٰ کی رحمتوں سے مالامال ہے، اس کا حشر انبیاء علیہم السلام کے ساتھ ہوگا۔

۲-اس کافر کے پاس چھوڑ دے، اس سے وصول نہ کرے یہی بہتر ہے، مسلم سے تو لینے کا سوال ہی نہیں اگر چہ عدالت نے فیصلہ کردیا ہو۔ حررہ العبد محمود عفی عنہ مدرسہ دارالعلوم دیوبند

(الف) اگر زید کو بہت زیادہ تنگی و دقت پیش آرہی ہے تو زید ایسا بھی کرسکتا ہے کہ عام بازار کے بھاؤ سے بہت سستا کر کے کم از کم نفع پر فروخت کردے ارزاں فروخت کرنے سے نکاسی مال کی زیادہ ہوگی اور نفع کا اوسط برابر آجائے گا،

اور اگر کوئی ادھار ہی لینا چاہے تو اس کی مدت عام تاجروں کی مدت سے کچھ لمبی مقرر کر کے عام نرخ سے کچھ زیادہ قیمت رکھ کر فروخت کرے اور معاملہ کرتے وقت صاف صاف یہ کہدے کہ اگر تم اس مدت کے اندر اندر بے باق نہ کرو گے تو مجھے اختیار ہوگا کہ میں مقدمہ کے ذریعہ جس طرح چاہوں وصول کروں اور جملہ خرچ وہرج کے ذمہ دار تم ہوگے اور تم کو دینا ہوگا۔

اب اس کے باوجود بھی مدت کے اندر اندر ادا نہ کرے تو اس کے وصول کرنے میں جو خرچ پڑے آپ اس سے پورا پورا لے سکتے ہیں، بلالحاظ اس کے کہ حکومت اس رقم کو سود کے نام سے دیتی دلاتی ہے یا کسی اور نام سے، نیز یہ کہ سود کی رقم سے وہ رقم خرچ کی کم ہے یا زیادہ اگر کم ہو اور معاملہ مسلم سے ہے تو زائد آپ واپس کردیں اور یہ کہہ دیں کہ عام طریقہ سے لوگ کاروبار کرتے ہیں سود کے ساتھ وہ بھی ویسے ہی کرے بلا سود کے، لیکن کسی غیر مسلم کو اپنا اجیر بنالے اور اس سے یہ کہے کہ فلاں فلاں کے پاس ہماری یہ اصل رقم سود وضع کرنے کے بعد باقی ہے ہم کو سود سے مطلب نہیں ہے ہم کو محض اصل رقم چاہئے ہم تم کو اختیار دیتے ہیں جس طرح چاہو اصل رقم وصول کرو اس وصول کے صلہ میں ہم تم کو یہ اجرت دیں گے اور اجرت بالمقطع متعین کردے۔ اب وہ غیر مسلم جس طرح چاہے وصول کرے، مقدمہ کر کے مع سود کے یا جیسے بھی ہو آپ سے کچھ مطلب نہیں اور نہ آپ زید سے وہ رقم زائد لیں اس طرح آپ سود سے بچ جائیں گے۔

اور جب بیوپاریوں کو عام طور سے معلوم ہو جائے گا کہ باوجود سود نہ لینے کے بھی وصول کا طریقہ نکل آیا تو آپ کے ساتھ بھی ادائیگی وقت سے کرنے لگیں گے اور یہی آپ کی مراد ہے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱/۹/ ۱۳۸۵ھ

الجواب صحیح سید احمد علی سعید نائب مفتی دارالعلوم دیوبند

شیئرز خریدنا کیسا ہے؟

مقام والی میں ایک شوگر فیکٹری قائم کرنے کا پروگرام بنایا جارہا ہے، اس میں ایک شیئرز ہولڈر کا پانچسو روپیہ ہے، اب ایسی صورت میں جب کہ ایک بڑی رقم ہو جائے گی، پھر اس کے بعد فیکٹری چالو ہوگی یعنی جو شیئرز ہولڈر رہوں گے ان کو نفع اور نقصان میں بھی برابر رکھا جائے گا۔

اس فیکٹری کے چالو کرنے میں لون کا روپیہ بیاج کے ساتھ حاصل ہو رہا ہے، تو ایسی صورت میں جو شیئرز ہولڈر رہیں ان کو کوئی مجبوری بھی نہیں ہے، اور اس کے بغیر بھی روزی ملتی ہے، تو ایسی حالت میں جو نفع ہوگا وہ ہمارے لیے جائز ہوگا یا

نہیں؟ اس صورتِ حال میں یہ معاملہ کرنا کیسا ہے؟

افتخار احمد (گجرات)

الجواب وباللہ التوفیق:

اس فیکٹری کے نفع کے جواز میں تو کوئی شبہ نہیں ہے، اس کا نفع لینا تو جائز رہے گا، البتہ یہ بات توضیح طلب ہے کہ جب بڑی رقم ہوجائیگی تو اس کو دکھا کر بینک سے لون کون لے گا، آیا یہی شیئر ہولڈر خود لیں گے یا یہ شیئر ہولڈر ر یدکر اپنا روپیہ فیکٹری میں دیدیں گے اور پھر فیکٹری والے خود بینک سے لون لیں گے، اگر شیئر ہولڈر کو خود اپنا روپیہ دکھا کر بینک سے سودی قرض لینا پڑتا ہے، جب تو ان لوگوں کو ایسا کرنا جائز نہ ہوگا، جن کے پاس اپنا دوسرا جائز کاروبار ہے اور وہ مجبور نہیں ہیں۔

اور اگر شیئر ہولڈر خود بینک سے لون نہیں لیتا ہے، بلکہ فیکٹری کا عملہ یہ سب کام خود انجام دیتا ہے، اور وہ اکثر غیر مسلم ہے یا کل غیر مسلم ہے تو ایسی صورت میں یہ شیئر زبھی جائز رہے گا، منع نہ ہوگا، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دار العلوم دیوبند سہارنپور ۱۲/۱۱/۱۴۰۱ھ

غیر مقبوضہ مچھلیوں کی بیع:

آج کل لوگ تالاب کا ٹھیکہ مچھلی پالنے کی خاطر لیتے ہیں، پھر ان مچھلیوں کو انداز ہ کر کے جال وغیرہ سے تالاب کے اندر ہی پکڑنے سے قبل فروخت کرتے ہیں، کیا اس طرح مچھلیوں کی بیع جائز ہے؟

محمد صدیق (جبار بلڈنگ شہر میرٹھ)

الجواب وباللہ التوفیق:

اگر تالاب اس قسم کا ہے کہ اس میں مچھلیاں محفوظ ہیں از خود باہر نہیں نکلیں گی تو مچھلی پالنے کے لیے اس کا ٹھیکہ پر لینا درست رہے گا، اور جو مچھلیاں اس میں پالی جائیں گی وہ مملوک ہوجائیں گی، البتہ بغیر پکڑے ہوئے مقبوضہ نہ ہوں گی، اس لیے خود پکڑ کر یا اپنے کسی ملازم یا اجیر (مزدور) سے پکڑ وا کر فروخت کرنا بھی جائز ہوجائے گا، البتہ بغیر پکڑے اور قبضہ میں لائے فروخت کرنا بیع مالم یقبض ہوکر بیع فاسد ہوگی، اور مملوک رہنے کی وجہ سے بیع باطل نہیں ہوگی اور بیع فاسد ہونے کا ثمرہ یہ

ہوگا کہ اگر مالک کے قبضہ میں آئے بغیر فروخت ہو جائے اور مشتری پھر اس کو فروخت کرے اور مالک کو اعتراض نہیں تھا بلکہ اجازت تھی تو یہ دوسری بیع جو ہوگی وہ صحیح اور "سمک مبیع لهذا البیع" کا استعمال کرنا درست رہے گا(۱)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۴۱۱/۶/۱۲ھ
الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ، کفیل الرحمٰن، محمد ظفیر الدین مفتاحی غفرلہ

مرغیوں کو تول کر فروخت کرنا:

پولٹری فارموں میں مرغیوں کو تول کر فروخت کیا جاتا ہے، کلوگرام کے حساب سے اس کے دام گھٹا بڑھا کر لگانا جائز ہے یا نہیں؟

محمد صدیق (جبار بلڈنگ شہر میرٹھ)

الجواب وباللہ التوفیق:

اگر مرغیوں کو اس طرح بیچنے میں بیچنا، خریدنا، مرغیوں کا مقصود ہو یعنی مبیع مرغیاں قرار دی جائیں محض ان کا گوشت ہی مبیع قرار نہ ہو تو چونکہ اصل مبیع (مرغیاں) معلوم، متعین اور مشاہد ہوں گی اس لیے یہ بیع جائز رہے گی، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۴۱۱/۶/۲ھ

فارم کے کھاد کو کچھ ملائے بغیر فروخت کرنا:

فارم کے کھاد کو اس میں کچھ ملائے بغیر بوریوں میں بھر کر فروخت کرنا شرعاً درست ہے یا نہیں جب کہ اس میں مرغیوں کی بیٹ کے علاوہ اور کوئی دوسری چیز نہیں ہوتی؟

۱- "ولا يجوز بيع السمك قبل أن يصطاد، لأنه باع مالا يملكه ولا في حظيرة إذا كان لا يؤخذ إلا بصيد الخ" (الهداية مع الدراية، ص ۴۳ ج ۳، باب البیع الفاسد)۔

الجواب وباللہ التوفیق:

اس لفظ (فارم کے کھاد) بالخصوص لفظ کھاد یہ ظاہر کرتا ہے کہ یہ کھاد جس میں محض مرغیوں کی بیٹ ہی نہیں ہوتی بلکہ اس میں اور چیزوں کی ملاوٹ بھی لازمی ہوتی ہے، مٹی وغبار اور جو غذائیں دی جاتی ہیں اس کا خوردہ وغیرہ کی آمیزش اس میں ضرور ہوتی ہے۔

اس طرح مخلوط ہونے سے محض بیٹ کا فروخت کرنا نہ کہا جائے گا اور اس کا بیچنا جائز رہے گا، سرقین وقذرہ وغیرہ کی بیع اس کی نظیر بن سکتی ہے (۱)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۲/۶/۱۴۱۱ھ

اخبار و رسائل کی خریداری کے لیے پیشگی قیمت پورے سال کی ادا کرنا:

اخبار و رسائل کی خریداری کا یہ طریقہ رائج ہے کہ پیشگی پورے سال کی قیمت منی آرڈر کردی جاتی ہے اور ہر روز اخبار کے نئے پرچے آجایا کرتے ہیں، اس طرح سے بیع وشراء کرنا (جب کہ اخبار یا پرچوں کا بلکہ اس کے کاغذ کا بھی وجود نہیں ہوتا) کیا یہ بیع شرعاً درست ہے، اور کیا یہ بیع معدوم میں داخل نہیں ہے؟

الجواب وباللہ التوفیق:

اس معاملہ میں اصل چیز کاغذ ہے اور وہ موجود رہتا ہے، پس یہ معاملہ بیع سلم کا ہے اور شرعاً جائز ہے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۱/۶/۱۴۱۱ھ

وی، پی (ریلوے) کے ذریعہ بیع وشراء:

وی، پی (ریلوے) سے مال منگوانے والے ایسا کرتے ہیں کہ مال کی بلٹی ڈاک خانہ کے ذریعہ منگوالیتے ہیں اور اسی کے ساتھ رقم بذریعہ وی پی بائع تک آجاتی ہے اور مال ریلوے سے کبھی پندرہ دن کبھی مہینہ دو مہینہ بعد پہنچتا ہے، کیا اس

۱- جائز تو ہے مگر خلاف اولیٰ ہے: "کما قال وکرہ بیع العذرة (الی قولہ ماسوی الإنسان" (الدرالمختار مع الشامی ۶/۲۴۳، فصل فی البیع) (مرتب)۔

طرح سے بیع وشراء کا معاملہ کرنا شرعاً درست ہے؟

الجواب وباللہ التوفیق:

یہ طریقہ عمل جائز ہے، جب یہ سب چیزیں نہیں تھیں تو یہ کام برید وجمال اور اجیر وغیرہ کے ذریعہ ہوتا تھا، اب بواسطہ ڈاکخانہ وریلوے ہوتا ہے اور اس میں مال محفوظ طریقہ سے پہنچ جاتا ہے جو بلاشبہ جائز ہے(۱)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دار العلوم دیوبند سہارنپور ۱۶/۶/۱۴۱۱ھ

الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ، کفیل الرحمٰن، محمد ظفیر الدین مفتاحی غفرلہ

اندراوکاس ٹکٹ خریدنا کیسا ہے؟

ایک شخص بینک سے پانچ ہزار روپے دے کر اندراوکاس ٹکٹ خریدتا ہے، اور پانچ سال کے بعد اسی ٹکٹ کو بینک دوگنی قیمت یعنی دس ہزار پر لیتا ہے، کیا اس طرح ٹکٹ خریدنا اور بیچ کر دوگنے پیسے لینا جائز ہے؟

الجواب وباللہ التوفیق:

اس معاملہ کی حقیقت شرعیہ یہ ہے کہ ایک شخص سے حکومت نے (مثلاً) پانچ ہزار روپیہ قرض لیا، اور پھر پانچ سال کے بعد قرض دینے والے کو اسی قرض کے عوض میں دس ہزار دیتی ہے۔

لہٰذا یہ صورت بلاشبہ "کل قرض جر نفعاً" میں داخل ہو کر ممنوع وناجائز رہے گی، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دار العلوم دیوبند سہارنپور ۲/ ۸/ ۱۴۱۱ھ

الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن غفرلہ، محمد ظفیر الدین مفتاحی غفرلہ، وکفیل الرحمان عثمانی

۱- "ولو أعطاه الدراهم وجعل يأخذ منه كل يوم خمسة أمناء ولم يقل في الابتداء: اشتريت منك يجوز، وهذا حلال وإن كان نيته وقت الدفع الشراء، لأنه بمجرد النية لاينعقد البيع، وإنما ينعقد البيع الآن بالتعاطي والآن المبيع معلوم فينعقد البيع صحيحاً" (فتاویٰ شامی ۴/۱۳)(مرتب)۔

ہیروئن وافیون کی بیع وشراء:

آج کل بلیک کرنے والوں نے کثرت سے اپنا یہ طریقہ بنا رکھا ہے کہ وہ ایک مقام سے افیون یا ہیروئن لا کر دوسرے مقامات پر چوری چھپکے سے فروخت کرتے ہیں، یہ دونوں نشہ آور چیزیں ہیں اور گورنمنٹ کی طرف سے ان دونوں کے بیچنے پر سخت پابندی ہے، بغیر لائسنس کے نہ کوئی رکھ سکتا ہے، نہ بیچ سکتا ہے، ایسے کاروبار کرنے والوں کا یہ کاروبار جائز ہے یا ناجائز اور ان کی کمائی ہوئی آمدنی حلال ہے یا حرام؟ وضاحت فرمائیں:

الجواب وبالله التوفيق:

ہیروئن بڑی نشہ آور چیز ہے اور نشہ ہی لانے کے لیے استعمال بھی ہوتی ہے اور اس کا خریدنا بیچنا اپنے ملک کے اندر بھی ناجائز ہے چہ جائے کہ دوسرے ملک سے لا کر بلیک کیا جائے، اور افیون بھی گھول کر پیا نشہ آور ہے، اس لیے اس کا بھی یہی حکم ہوگا۔ ہاں خشک بہت تھوڑی مقدار میں محض مخدر ہوتی، اس لیے جتنی خشک مقدار نشہ آور نہ ہو دواءً اس کا خریدنا بیچنا وغیرہ درست رہے گا، اور غیر ملک سے لا کر بلیک کرنے کا وہی حکم ہے جو اس سے پہلے سوال کے جواب میں گذرا ہے اور نشہ آور نہ ہونے میں بھی یہی حکم ہے (۱)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دار العلوم دیوبند سہارنپور ۲/ ۸/ ۱۴۱۱ھ

الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن غفرلہ، محمد ظہیر الدین مفتاحی غفرلہ

کمپنیوں کے حصوں کی خریداری کا حکم:

دنیا کے بیشتر ممالک میں جن میں ہندوستان وپاکستان بھی شامل ہیں بڑی بڑی کمپنی شیئرز (حصہ) نکالتی ہیں، انہیں پبلک میں ایک طے شدہ قیمت پر فروخت کیا جاتا ہے، پھر کمپنی کے شیئر (حصہ) خریدنیوالا کمپنی کا ساجھے دار بھی ہوجاتا ہے جسے کمپنی سالانہ منافع بھی دیتی ہے اور ان حصوں کی کمپنی کی ترقی کارگزاری اور منافع گیری سے یہ شیئر بازار میں خرید فروخت ہوتے ہیں جس میں نفع بھی ہوتا ہے اور نقصان بھی ہوتا ہے، یعنی دونوں ہی باتیں ہیں، اس میں کسی طرح کا بیاج کا

۱- "قال في الدر المختار: وبطل بيع مال غير متقوم، أي غير الانتفاع به كخمر (قال الشامي) قيد به لأن بيع ما سواه من الأشربة المحرمة جائز عنده خلافا لهما كما في البدائع والشامي، ۱۰۳ ج ۴) (مرتب)۔

کوئی لین دین نہیں ہوتا ہے، کمپنی/۱۰ روپے کا ایک شیئر دیتی ہے تو اس کی ترقی کے حساب سے وہ ۲۰ روپے کا بھی ہو جاتا ہے تو اس کی خراب کارگزاری سے پانچ روپے کا بھی رہ سکتا ہے، ایسی حالت میں کمپنی کا نقصان ساجھے داری کی وجہ سے خریدار کو بھی ہوتا ہے، آپ ساری باتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے اس کا جواب ہمیں دیں یہ دھندا جو آج کل مسلمان بہت کرتے ہیں جائز ہے یا نہیں؟

شیخ عبدالسمیع

الجواب وباللہ التوفیق:

بڑی کمپنی کا عرف عام میں مفہوم یہ ہے کہ جب کوئی بڑا کاروبار بڑے سرمایہ سے کرنا ہوتا ہے تو انتظام درست رکھنے کے لیے کچھ ممبران کی ایک کمیٹی بنالیتے ہیں، پھر وہ کمیٹی کچھ لوگوں کو اس میں بطور حصہ دار (شیئر دار) بنا کر اور شریک کر کے کاروبار کرتی ہے اور اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ اگر دو لاکھ روپے سے کاروبار شروع کرنا ہے تو دو لاکھ کے اندر ۲۰، ۳۰، روپے کا حصہ مقرر کرتی ہے جو ایک ہزار حصے (شیئر) ہوتے ہیں اور لوگوں کو اختیار رہتا ہے کہ ایک حصہ سے شریک ہوں یا دس حصے سے یا سو حصے سے، غرض جو شخص جتنے حصہ سے شریک ہوتا ہے اس سے اتنے حصہ کی رقم لیکر شریک کر لیتے ہیں اور شریک داری اور رقم کی وصولیابی کی رسید دیتے ہیں، جس کو وہ باؤنڈ کے نام سے موسوم کرتے ہیں، پھر جمع شدہ رقم سے پہلے اس کمپنی کی ضرورت کے مطابق مشین وغیرہ دیگر سامان واثاثہ خریدتے ہیں، پھر سال بہ سال ہر سال پورا ہونے پر اپنے نفع نقصان کا حساب کر کے نفع کا بضاعۃ (پونجی وڈپازٹ) بنالیتے ہیں اور بقیہ نفع تمام شیئر داروں (حصہ داروں) کو ان کے شیئر کے مطابق تقسیم کر دیتے ہیں اور اگر کم نفع ہوا تو کم نفع دیتے ہیں اور اگر زیادہ نفع ہوا تو زیادہ نفع دیتے ہیں اور اگر نقصان ہوا تو اطلاع بھی دیتے ہیں۔

پس اس طرح کاروبار کی شرعی حیثیت شرکت عنان کی ہوگی اور تمام شیئر دار شریک کمپنی شمار ہو گئے جس کا مفہوم یہ ہے کہ تمام شرکاء کمپنی کی تمام چیزوں کے خواہ مشین ہو یا اثاثہ ہو یا اور کوئی سامان ہو (کاروباری یا غیر کاروباری) سب کے سب اپنے شیئر کے مطابق شرعاً مالک ہو جاتے ہیں اور کام کرنے والا سب عملہ ان شیئر داروں (حصہ داروں) کا شرعاً اجیر یا وکیل ہو جاتا ہے، اس طریقہ کار میں بیع مالم یوجد یا حقوق مجردہ کے بیع کی کوئی شکل نہیں ہوتی ہے کہ شرعاً اس کو ناجائز کہا جائے اور شرکت عنان کا جواز بین المسلم تسلیم شدہ ہے۔

رہ گیا شرکت عنان کی بعض جزئیات کے مطابق عمل نہ ہونا یہ ہندوستان جیسے غیر اسلامی ملک میں قادح نہ ہوگا، جیسا کہ اپنے ممالک میں بہت سے عقود فاسدہ میں توسع سے ظاہر ہے۔

اس حکم کی تائید ''امداد الفتاوی'' کے (التحقیق السنی فی حکم حصص کمپنی) سے بھی ہوتی ہے، اسی طرح شرکت کا یہ معاملہ جاری و نافذ ہونے کے بعد کسی کمپنی کے ارکین کا اس کمپنی کو اپنی کمیٹی کے نام رجسٹرڈ کرالینا یا کمپنی کو لمیٹڈ کرالینے کے بعد خود کمپنی کا قانونا مالک بن بیٹھنا اور شیئر داروں کو ان کی رقم واپس نہ کرنا حتی کہ اگر کوئی شیئر دار اس شرکت سے نکلنا چاہے اور اپنی رقم واپس لینا چاہے تو واپس نہ کریں، بلکہ یہ قانون بنادیں اور کہیں کہ اگر کوئی شخص شرکت سے نکلنا چاہے تو اپنا حصہ فروخت کر دے یہ ہوسکتا ہے اور یہ اور یہ بیع شرعا بچند وجوہ صحیح اور درست ہوگی: اولاً اس لیے کہ اس صورت میں کمپنی والے شرعا غاصب ہو گئے اور یہ شیئر دار مغصوب منہٗ ہو گئے اور مغصوب منہ کا اپنے مال مغصوب کو جس طرح مناسب ہو وصول کر لینا درست وصحیح رہتا ہے۔ اور یہاں ایسا ہی ہے۔ ثانیا اس لئے کہ اس حصہ کی بیع کا مفہوم یہ ہے کہ کمپنی میں جتنا مال ومتاع واثاثہ کا جتنا حصہ اس کا ہے اس کی وہ بیع کر رہا ہے اور ایسی بیع شرعا درست رہتی ہے، شرعا اس میں کوئی قباحت ہندوستان جیسے غیر اسلامی ملک میں نہ ہوگی۔

اور خلاصۂ جواب یہ ہے کہ یہ معاملہ شرعا جائز ہے، ہاں اگر کوئی تقوی برتے اور ایسا معاملہ نہ کرے تو یہ تقوی ہوگا۔ فتوی نہ ہوگا اور تقوی کے فعل کا مستحسن ہونا ظاہر ہے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

کمپنی کے شیئرز خریدنا اور ساجھے دار ہونا کیسا ہے؟

ہماری کمپنی انویسٹمینٹ لمیٹیڈ ایک سرمایہ کار کمپنی ہے جو کہ مختلف کمپنیوں کے حصص مساوی کی خرید فروخت کے کاروبار میں ملوث ہیں، ان کمپنیوں کے حصص مساوی ہیں جو کہ ملک کے اسٹاک ایکسچینج کی فہرست میں شامل ہیں، یہ کاروبار اسلامی شریعت میں کہاں تک جائز ہے، اس حقیقت پر روشنی ڈالنے کی ہماری آپ سے گذارش ہے، ذیل کے نکات کے ذریعہ ہم نے اپنے کاروبار کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کرنے کی سعی کی ہے جن کا خیال رکھنا ضروری ہے۔

۱-حصص مساوی وہ حصص ہیں جن پر آمدنی بصورت ڈیوڈنٹ دی جاتی ہے، یہ ڈیوڈنٹ کمپنی کے منافع کے اعتبار سے ہر برس کم یا زیادہ ہوتا رہتا ہے۔

۲-ان حصص کی قیمت بھی ایک نہیں رہتی ہے، بلکہ یہ اس کمپنی کے حصص کی بازار (شیئر بازار) میں مانگ، اس کمپنی کی کارکردگی اور اس کے روشن مستقبل کے اعتبار سے کم یا زیادہ ہوتی رہتی ہے۔

۳-ہماری کمپنی ان کمپنیوں کے حصص میں سرمایہ نہیں لگاتی جو اسلامی قوانین کے مطابق ممنوع کاروبار میں ملوث ہیں، مثلاً شراب ساز کمپنیاں یا وہ کمپنیاں جن کا مقصد سود پر سرمایہ لگانا ہوتا ہے، یا ہوٹل جہاں شراب فروخت ہوتی ہے وغیرہ وغیرہ۔

۴-موجودہ حالات کے پیش نظر ممکن ہے، کسی کمپنی نے جس کے حصص ہم نے خریدے ہوں کسی بینک سے سود پر قرض لیا ہو یا اپنے سرمایہ کا ایک قلیل حصہ کسی بینک میں بطور ڈپازٹ رکھا ہو۔

۵-ہر صورت میں ہمارا سرمایہ کسی بھی کمپنی میں اتنا زیادہ نہیں کہ ہم انہیں اس قسم کے قرضہ جات لینے یا بینک میں سرمایہ رکھنے سے روک سکیں۔

۶-ہندوستان کے موجودہ قوانین اور کاروباری فضا کی وجہ سے بڑی رقوم کے قرضہ جات سود پر حاصل کرنے کے علاوہ اور کوئی چارہ کار نہیں ہے، سوائے چند گنے چنے اداروں کے جن کے ذریعہ صرف چھوٹی رقمیں ہی برائے قرض دستیاب ہوسکتی ہیں۔

۷-جب بھی ہم کسی کمپنی کے حصص خریدتے ہیں ہمارا مقصد اس میں سرمایہ کاری کرنا ہوتا ہے، نہ کہ جوا کرنا، عام طور پر ہم حصص کو اپنی ملکیت میں لے کر اس کی پوری قیمت ادا کردیتے ہیں، تاکہ بعد میں کچھ عرصہ بعد فروخت کرسکیں۔

۸-خریدنے اور فروخت کرنے کی تواریخ میں اوسطاً ایک سال کا وقفہ ہوتا ہے، ہماری آپ سے درخواست ہے کہ اس کا جواب ہمیں جلد از جلد روانہ کریں، اپنے جواب میں ذیل کی چیزوں کا ضرور خیال رکھیں:

(الف) آپ کے جواب میں اصل ماخذ قرآن شریف یا حضور ﷺ کی احادیث سے حوالہ دیا گیا ہو، اس کے علاوہ فقہ کی ان مستند کتابوں کا ذکر ہو جن سے کہ آپ نے استفادہ کیا ہو۔

(ب) آپ کے جواب میں آپ ان قیاسات اور دلائل کی کڑی پر روشنی ڈالیں جن کے ذریعہ آپ اصل ماخذ سے لے کر نتیجہ تک پہنچے ہیں۔

الجواب وبالله التوفيق:

۱-۲-ڈیوڈنٹ نفع کے حصہ کا نام ہوتا ہے، کل نفع کے کم وزیادہ ہونے کے اعتبار سے کم وزیادہ ہوتا رہتا ہے، اس

لیے یہ ربوا (سود) نہیں ہے، نیز ربوا تو سرمایہ کا متعین فیصدی ہوتا ہے، نفع کے کم وزیادہ ہونے یا نفع کے بالکل نہ ہونے سے وہ متعین فیصد کم یا زیادہ نہیں ہوتا، بلکہ حدیث پاک: "کل قرض جر نفعاً فهو ربوا" میں داخل ہو کر سود کا شرعی مفہوم اس پر صادق آجاتا ہے، اور وہ فیصد نفع حرام ہو جاتا ہے۔

۳-۴-۵۔ جب آپ کا سرمایہ لگانا یا آپ کا حصص خریدنا ان جائز کاروبار کرنے والی کمپنیوں سے درست وصحیح رہے گا اور یہ بات الگ ہوگی کہ وہ کمپنی خود قانونی مجبوری وغیرہ کی وجہ سے کسی بینک سے قرض لیتی ہو یا اپنا کچھ ڈپازٹ اس میں جمع کرتی ہو، اس کا اثر اس سے حصہ خریدنے والوں پر نہیں پڑے گا، اسی طرح جب آپ کا سرمایہ کسی کمپنی میں اتنا زیادہ نہیں ہوتا کہ آپ اس کے دباؤ سے اس کمپنی کو ایسے قرضہ جات لینے یا اس میں سرمایہ رکھنے سے روک سکیں تو اس سے بھی آپ کے جائز کاروبار پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔

۶۔ جب قانون حکومت کی وجہ سے ایسی مجبوری ہو کہ بینک حکومت سے قرض لیے بغیر اپنا جائز کاروبار بھی چلانا دشوار ہو اور اپنے جائز وحلال مال کی حفاظت بھی مشکل ہو تو ایسی سخت مجبوری میں بینک حکومت سے صرف اتنا قرض لینا اور اپنا مال صرف اتنا بغرض تحفظ وحفاظت بینک میں رکھنا جس سے اپنے جائز کاروبار اور جائز مال کا تحفظ ہو سکے بقدر مجبوری اور بوجہ مجبوری کے گنجائش ہو جائے گی۔

البتہ چونکہ یہ سب پریشانیاں اور مجبوریاں اپنے ہی اعمال بد کی پاداش ہیں، جیسا کہ آیات وروایات سے معلوم ہوتا ہے مثلاً: "بان الله لم يک مغيراً نعمة أنعمها علي قوم حتى يغيروا ما بأنفسهم" (۱) حاصل آیت کریمہ، یعنی اللہ تعالیٰ جب کسی قوم کو کوئی نعمت عنایت فرماتے ہیں تو جب تک وہ قوم خود اس نعمت کی ناقدری نہیں کرتی اس وقت تک اللہ تعالیٰ خود اس نعمت کو نہیں چھینتے۔

اللہ تعالیٰ نے سات سو برس مسلمانوں کو یہاں حکومت دے کر ہمارے اصلاح حال کا موقع عنایت فرمایا، مگر ہم نے اپنی حالت کی اصلاح کے بجائے اوراس میں خرابی پیدا کرلی تو اس کے پاداش میں سنت خداوندی نے ہم پہ جیسے ہم تھے ویسے ہی عمال حکومت مقرر فرما دیئے، جیسا کہ حدیث پاک میں ہے: "كما تكونوا يولى عليكم أو كما قالؐ" (۲) (یعنی جیسے تم نیک یا بد رہو گے ویسے ہی نیک وبد عمال تم پر مسلط کیے جائیں گے)، اور ایک صحیح حدیث میں ہے: "اعمالكم

۱- سورۂ انفال: ۵۳۔

۲- رواه الديلمي في مسند الفردوس عن أبي بكرة "كما تكونوا يول عليكم"۔

عمالکم"(۱)(یعنی تمہارے ہی بداعمال تم پر حکومت کرتے ہیں)۔

اس لیے ان مجبوریوں میں اگر چہ مذکورہ باتوں کی (قرض وغیرہ لے لینے کی) فقہی گنجائش ہوجائے، مگر اصلی علاج اور دین ودنیا کے فلاح کا راستہ یہی رہے گا کہ اپنے گناہوں پر توبہ واستغفار کرتے رہیں، خاص کر ان اعمال سے نجات پر جن میں مبتلا ہوکر ان محرمات کے ارتکاب کرنے پر مجبور ہوگئے ہیں، نیز یہ پکی نیت رکھیں کہ جب ہمارے حالات بدل جائیں گے تو ایسے کام نہیں کریں گے۔

۷۔ یہ صورت جائز ہے اور یہ مقصد صحیح ہے۔

۸۔ جی ہاں خریدنے اور فروخت کرنے کے درمیان تقریباً ایک سال کا وقفہ رکھنا صحیح ہے۔

(الف) جواب کے ماخذ میں ایک آیت شریفہ اور دو حدیثیں پیش کردی گئی ہیں اور صحت دعویٰ کے لیے یہ بھی کافی ہیں، مگر مزید تشفی کے لیے ایک اور حدیث قدسی کا اخیر جملہ نقل کردیا جاتا ہے اور وہ یہ ہے: "**إن العباد إذا عصوني حولت قلوبهم أی قلوب ملوکهم بالسخطة والنقمة فساموهم سوء العذاب فلا تشغلوا انفسکم بالدعاء علی الملوک ولکن اشغلوا انفسکم بالذکر والتضرع کی اکفیکم**"(۲)۔

یعنی اس حدیث قدسی میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: "بندے جب میری نافرمانی کرتے ہیں تو میں ان کے بادشاہوں کے قلوب کو سخت گرفت کرنے والا اور سخت تکلیف دینے والا بنا دیتا ہوں، پھر وہ بادشاہ لوگوں کو سخت سے سخت اور بدترین عذاب وتکالیف طرح طرح کی چکھاتا ہے، لہٰذا ایسے وقت میں تم لوگ بادشاہوں پر بددعا کرنے میں مشغول ہونے کے بجائے میری جانب تضرع وزاری اور میری جانب دعا میں مشغول ہوجاؤ" (یعنی اپنی اصلاح میں لگ کر صحیح توبہ میں مشغول ہوجاؤ) تاکہ میں خود تمہارے لیے کافی ہوجاؤں (اور چھٹکارے کا راستہ نکال دوں)۔

یہ طویل حدیث مشکوٰۃ شریف (ص ۳۲۳) میں منقول ہے، جس کا جی چاہے "مشکوٰۃ شریف" کی شرح "مرقات" میں تفصیل ملاحظہ فرمالیں۔

اور فقہ کی کتابوں میں ہمارا ماخذ: (المبسوط للسرخسی، احکام القرآن للجصاص، قواعد الفقہ، قاضی خاں، درمختار مع شرح ردالمحتار، بدائع الصنائع، وفتح القدیر وغیرہا ہیں، کالتحقق الحسنی فی حصص کمپنی من امداد الفتاویٰ۔

۱- مشکاۃ المصابیح کتاب الامارۃ حدیث: ۳۷۲۱۔

۲- رواہ ابونعیم فی الحلیۃ (مشکوٰۃ ۳۲۳)۔

ان معروضات میں احقر کے دلائل پر خود بخود روشنی پڑ جاتی ہے، خدا کرے کہ سب صحیح ہوں اگر صحیح ہوں تو من الله و إلا فمن نفسي، و ما ابرئ نفسي وحینئذٍ نظهر الرجوع من الجواب الغیر الصحیح، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

نوٹ: حصص مساوی کی خرید وفروخت اس کا مفہوم واضح نہیں ہوسکا اگر اس کا مفہوم یہ ہے کہ دوسری کمپنیوں کے حصص جس قیمت پر خریدتے ہیں اسی قیمت پر فروخت بھی کردیتے ہیں، نیز اس کا ڈیوڈنٹ ملتا ہے وہ بھی سب کا سب بعینہ اپنے خریداروں کو دیدیتے ہیں تو یہ اشکال ہے کہ پھر آپ کے دفتری اخراجات اس سلسلہ کے کس طرح پورے ہوتے ہیں اور اگر یہ مراد ہے کہ ان حصص مساوی کو جس قیمت پر خریدتے ہیں اسی قیمت پر فروخت کردیتے ہیں، مگر اس کو ڈیوڈنٹ میں سے کچھ کم کرکے اس کا ڈیوڈنٹ دیتے ہیں تو خریداروں کو اعتراض پیدا ہوگا اور پھر آپ سے ایسے حصص کیوں خریدے گا، نیز یہ اشکال بھی ہوگا کہ ان حصص کا ڈیوڈنٹ اگرچہ کم کردیں، مگر اپنی کمپنی کے حصص براہ راست فروخت کریں اس کا پورا ڈیوڈنٹ عام کمپنیوں کے اصول کے مطابق ڈیوڈنٹ کی یہ دورنگی بھی باعث اعتراض ہوگی اور اس کمپنی (فلاح انسٹی ٹیوٹ) کے ٹوٹ جانے کا سبب ہوگی۔

اور اگر اس لفظ (حصص مساوی کی خرید وفروخت) کا مفہوم کچھ اور ہے تو اس کو واضح فرمائیے، اس لیے کہ سوال کے اور جتنے نمبر ۲ سے لیکر ۸ تک لکھے گئے ہیں ان سے اس کے مفہوم کی وضاحت نہیں ہوتی اور حکم شرع کا علم اس کی وضاحت پر موقوف ہے، باقی ان نمبرات کے جواب مفہوم حصص مساوی سے قطع نظر کرتے ہوئے وہ لکھے جاچکے ہیں، واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

مردار کی کھال کی خرید وفروخت کا حکم:

۱- اہاب میتہ کی بیع ازروئے شرع کیسی ہے؟ اگر بالغ کافر اور بلا دباغت اہاب میتہ کو فروخت کرتا ہے اور مشتری مسلمان ہے تو مسلمان کے لیے شراء درست ہے یا نہیں، اگر درست نہیں ہے اور کوئی مسلمان تاجر ایسا کرتا آرہا ہے تو اب کیا کرنا چاہیے؟ اور اس تجارت کے ذریعہ حاصل شدہ منافع کا کیا حکم ہے؟

اگر کسی مسلمان نے کافر سے اہاب میتہ کی خرید کی اور پھر مسلمان مشتری نے بھی کسی دوسرے مسلمان کے ہاتھ بلا

دباغت ہی فروخت کردی تو ہر دو مسلمان کی یہ بیع وشراء اور اس سے حاصل شدہ منافع کا حکم شرعی کیا ہوگا؟

اگر غیر مسلم جس نے کھال اتاری ہو یا کسی غیر مسلم ہی سے خرید کی ہو اور اس کو کسی مسلمان کے کارخانہ میں اپنے طور پر دباغت دے دے اور پھر صاحب کارخانہ مسلمان تاجر یا کوئی دوسرا مسلمان تاجر خرید لے تو اس کا کیا حکم ہوگا؟ اور صاحب کارخانہ اور دوسرے مسلمان تاجر کی شراء میں کچھ فرق ہوگا یا نہیں؟

۲-غیر اللہ کے نام پر ذبح کیے گئے یا بلا تسمیہ ذبح کیے گئے جانوروں کی کھال اور میتہ کی کھال کا ایک ہی حکم ہے یا دونوں کے اندر امور مذکورہ بالا میں کوئی فرق ہے۔

۳-اگر کوئی مسلم تاجر کسی غیر مسلم نوکر کو روپے دیدے کہ تم اہاب میتہ کی خرید فروخت کرو تو اس سے حاصل شدہ نفع مسلم تاجر کے لیے درست ہوگا یا نہیں؟

۴-یا اپنے کارندہ (نوکر) غیر مسلم کو قرض دیدے، تاکہ وہ خرید لاوے اور پھر دباغت کے بعد میں مسلمان تاجر کے ہاتھ نفع کے ساتھ یا دام کے دام فروخت کیا کرے تو کیا حکم ہوگا؟

۵-مسلمان تاجر نے کسی کافر سے اہاب میتہ کی خرید کی اور اب مسلم تاجر نے اس کو دباغت کے بعد کسی مسلم کے ہاتھ فروخت کیا تو ایسی صورت میں دونوں مسلم تاجروں کے لیے خرید فروخت درست ہوگی یا نہیں؟ اور نفع کا کیا حکم ہوگا؟

الجواب وباللہ التوفیق:

۱-مردار کی کھال دباغت سے پہلے کسی مسلمان کو خریدنا بیچنا کچھ بھی جائز نہیں یہ بیع باطل ہوتی ہے منعقد ہی نہیں ہوتی، ہاں دباغت کے بعد خواہ کچھ ہی دباغت سے پہلے آپ کی ملک میں رہے، یا آجائے مثلاً گھر کا جانور مر گیا یا کسی غیر مسلم کے ذریعہ اپنے پاس آگئی اور اس مسلمان نے خود یا اپنے مزدور سے دباغت کرالی تو اب بعد دباغت اس کا بیچنا خریدنا نفع لینا سب جائز رہے گا، اسی طرح اگر کسی غیر مسلم نے کسی مسلمان کی فیکٹری میں یا جس کا وہ ملازم ہے اس کی ہی فیکٹری میں خود دباغت دیدی تو اس کا بھی بعد دباغت کے خریدنا بیچنا سب مسلمانوں کو جائز ہوجائے گا، خواہ اسی فیکٹری کا مالک خریدے یا کوئی دوسرا خریدے، اسی طرح جو کھال دباغت شدہ کسی مسلمان کے پاس ہو تو اس کا اس سے خرید لینا اور پھر بیچنا سب جائز رہے گا، اور تجسس کی حاجت نہیں کہ کس نے دباغت دی ہے اگر کوئی غیر مدبوغ کھال کوئی مسلمان خریدے خواہ کسی غیر مسلم سے خرید لے یا مسلم سے خریدنے کے بعد اپنے کسی غیر مسلم ملازم سے یا اپنے غیر مسلم مزدوروں سے دباغت کرائے تو یہ فعل

ناجائز ہوگا، اب دباغت کے بعد جب وہ دباغت کرنے والے اس مسلمان کووہ کھال دے دیں تو پھر اس کا خریدنا بیچنا بھی جائز ہوجائے گا۔

۲-دونوں کا ایک ہی حکم ہے اور وہی حکم ہے جو نمبر ا کے جواب میں گزرا۔

۳-اس صورت میں مسلمان تاجر کے لئے اسی مسلمان تاجر کی جانب سے بیع بالوکالۃ ہوجائیگی اور اس طرح بھی یہ معاملہ جائز نہ رہے گا۔

۴-اگر یہ روپیہ دینے والا یہ شرط نہ لگائے کہ بعد دباغت میرے ہی پاس فروخت کرو تو اس طرح اس کا بعد دباغت کے خریدنا پھر فروخت کرنا جائز ہوجائے گا، ورنہ "کل قرض جر نفعا" کے تحت آکر ناجائز ہوجائے گا۔

۵-پہلے مسلمان تاجر کے خریدنے کا عدم جواز تو اوپر کی تحریر میں آچکا اور دوسرے مسلمان تاجر کو جب تک یقین سے یہ نہ معلوم ہو کہ یہ بیع غلط طریقہ سے ہوکر میرے پاس آرہی ہے، اس وقت تک خریدنا بیچنا سب جائز رہے گا، ہاں علم یقینی کے بعد ایسا کرنا جائز نہ رہے گا، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

کمپنیوں کے شیئرز و بونڈ کی بیع وشراء کا حکم:

یہاں برطانیہ میں لوگ شیرز اور بونڈ (Shares &Bond) دلال کمپنیوں سے خریدتے ہیں، جس کی قیمت کم وبیش ہوتی رہتی ہے اور لوگ اپنا نفع ونقصان سوچ کر جب چاہیں فروخت کر کے اپنی لاگت نفع ونقصان کے تحت حاصل کرتے ہیں۔

ایسے بونڈ شیر وغیرہ خریدنا کیسا ہے؟ جب کہ یہ معلوم ہوجائے کہ دلال کمپنیاں ان رقوم سے بڑی بڑی کمپنیوں اور فیکٹریوں میں حصہ لینے کے علاوہ کچھ رقوم سود حاصل ہونے والی جگہوں پر بھی لگاتی ہیں، حالانکہ شیئر ربونڈ خریدنے والے کو براہ راست اس سے کوئی واسطہ نہیں، ان شیئر ربونڈ کی قیمت اخباروں میں بھی ہفتہ واری اشاعت ہوتی ہے۔شیئر ربونڈ خریدنے والا تو رقم لگا کر شیئر رخریدتا ہے، لیکن فروخت کرنے والی دلال کمپنیاں اس رقم سے سود ملنے والی جگہوں پر بھی حصہ لیتی ہیں۔

الجواب وباللہ التوفیق:

شیئرز حصوں کا نام ہے، شیئر کا مالک شیئر کے مطابق کمپنی کا حصہ دار اور مالک ہوتا ہے اور کمپنی کے سرمایہ وسامان واثاثہ وغیرہ سب چیزوں کا حسب شیئر زمالک ہوتا ہے، اور سرمایہ وسامان وغیرہ کی حیثیت وقیمت کی کمی وبیشی کے اعتبار سے شیئر کی حیثیت وقیمت بھی کم وبیش ہوتی رہتی ہے۔ اور شیئر کا خریدنا وبیچنا ان حصوں کا اور ان حصوں میں داخل شدہ چیزوں کا خریدنا وبیچنا شمار ہوتا ہے اور اس کا جائز ہونا ظاہر ہے۔

بونڈ بھی ان ہی حصوں اور شیئرز کی سند کے درجہ کی چیز ہوتی ہے اور ان کے عرف میں ان کی خرید فروخت سے ان ہی حصوں کی بیع وشراء مراد ہوتی ہے اور بونڈ سند وحوالہ کے درجہ میں لئے دیئے جاتے ہیں، اس تاویل سے اس بیع وشراء کا حکم مثل شیئر بیع وشراء کے حکم ہوگا، اور جائز رہے گا۔

دلال کمپنیوں کے دلال اور ان کے نائبین ووکلاء دلال یا دلال کے حکم میں ہوں گے اور بائع ومشتری کے درمیان محض واسطہ کے درجہ میں ہوں گے۔ خود اصل ہونے والے مالک شیئر یا اس کے اصل بائع ومشتری نہ ہوں گے اور جب ان سے اصل مالکان شیئرز نے سود حاصل ہونے والے معاملہ میں لگانے کے لیے نہ کہا ہو اور نہ خود ایسا کرلیا ہو تو وہ دلال خود اس معاملہ کے ذمہ دار ہوں گے اور اس کا مواخذہ اصل مالکان شیئرز سے نہ ہوگا اور نہ ان کے مال میں اس معاملہ کی خباثت ہی آوے گی جب کہ سود کا پیسہ ان کے پاس نہ آیا ہو۔

البتہ علم ہوجانے کے بعد کہ وہ دلال ایسا بھی کردیتے ہیں، ان کو منع کردیا جائے کہ وہ لوگ اس کے شیئرز وبونڈ کی رقم سود حاصل ہونے والی جگہوں میں نہ لگائیں، پھر اس کے بعد بھی اگر وہ لوگ ایسا کردیں گے تو عنداللہ وہ خود گنہگار ہوں گے اور مالکان شیئرز وبونڈ محفوظ وبری رہیں گے۔ وھکذا یستفاد من تحقیق صاحب الفتاوی الامدادیۃ نور اللہ مرقدہ۔ ایضاً، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

بینک کے ذریعہ تجارت:

کچھ زمانہ پہلے معدودے چند ہی تاجر جو برطانیہ وغیرہ بیرون ہند سے بڑے بڑے کاروبار کرتے تھے بینک کے واسطہ سے لین دین کرتے تھے۔ پھر یہ طریقہ بڑھ کر اندرون ملک بھی بڑے بڑے کاروبار بینک کے واسطہ سے ہونے لگے،

لیکن اب تو یہ حال ہے کہ چھوٹی چھوٹی تجارت میں بھی مال و قیمت دونوں کی آمد برآمد خواہ اندرون ملک ہی کیوں نہ ہو جہاں ڈاکخانہ کا واسطہ بلٹی قیمت بھیجنے میں ہوا، محض بینک کے ذریعہ وواسطہ سے ہونے لگی، اور بینک اکثر اصل قیمت سے زیادہ کچھ رقم مختلف طور سے سود کے نام سے وصول کرتا ہے، اگر کوئی شخص نقد کاروبار کرنا چاہے اور مال کی بلٹی و قیمت محض ڈاکخانہ کے ذریعہ سے بغیر توسط بینک کے درآمد برآمد کرنا چاہے تو سخت دشواریوں میں مبتلا ہوجاتا ہے، گویا آزاد کاروبار کرنا ناممکن سا ہو رہا ہے۔

لہٰذا دریافت طلب امر یہ ہے کہ جو رقم بینک سود کے نام سے لیتا ہے وہ شرعا سود ہے یا نہیں؟ اگر ہے تو اس سے بچنے کی کیا صورت ہوسکتی ہے؟

الجواب وباللہ التوفیق:

بینک کے ذریعہ کاروبار کی مختلف ومتعدد صورتیں ہوتی ہیں اور اس کے احکام بھی مختلف ہیں:

۱- مالک مال ازخود بنک کا واسطہ اختیار کرتا ہے، خریدار اس کو پسند نہیں کرتا، مگر وہ بلٹی بینک کے واسطہ سے خریدار کے پاس بھیجتا ہے، اس میں مالک مال کو کئی فائدے ہوتے ہیں، ایک تو یہ کہ بینک سے قیمت فوراً نقد یا کم از کم مدت میں اور بہت آسانی سے وصول ہوجاتی ہے، دوسرے مال کے ضائع ہونے یا فریب ودھوکہ کھانے یا اور معاملہ میں پڑ کر ڈوب جانے وغیرہ کے احتمالات بہت کم ہوجاتے ہیں۔

۲- کبھی مالک مال ازخود نہیں بلکہ قانون وقت کے تقاضے سے مجبور ہوکر بینک کا واسطہ اختیار کرتا ہے اور پھر بقیہ عمل وہی کرتا ہے جو نمبر ۱ میں گزرا، اور خریدار اگرچہ اس کو پسند نہیں کرتا، مگر انکار بھی نہیں کرتا۔

۳- کبھی حکومت خود دخیل ہوکر بائع ومشتری کے درمیان بینک کو قانونا واسطہ بنادیتی ہے، اور بنک کے ذریعہ سے خرید فروخت کراتی ہے، یہ دونوں صورتیں پہلی صورت کے اعتبار سے کم ہوتی ہیں۔

۴- کبھی بینک خود پیش کش کر کے یہ طریقہ کار جو نمبر ایک میں گزرا مالک مال سے اختیار کرالیتا ہے، کیونکہ اس طریقہ کار میں بینک کو بھی فائدہ پہنچتا ہے، بینک کی آمدنی بڑھتی ہے، یہ صورت پہلی تینوں صورتوں سے کم ہوتی ہے۔

۵- کبھی یہ طریقہ کار (بذریعہ بینک کاروبار) خود خریدار بھی اختیار کرتا ہے، مگر صرف ان صورتوں میں جب خریدار کے پاس اتنا سرمایہ نہیں رہتا کہ ہمیشہ نقد ہی قیمت ادا کرسکے، یا کوئی مجبوری قانونی ہوتی ہے یا راستہ وغیرہ کے خطرہ سے

حفاظت مقصود ہوتی ہے۔

۶- انہی مواقع میں کبھی بینک خود بھی پیش کش کر کے خریدار سے براہ راست یہ طریقہ کار اختیار کرالیتا ہے، یہ اخیر کی دونوں صورتیں بہ نسبت پہلی چار صورتوں کے اور بھی بہت کم ہوتی ہیں، اس لیے کہ اس میں خریدار کو اگر چہ فائدے بھی ہوتے ہیں، مگر اس پر کچھ خرچ کا بار زائد ہوتا ہے، نیز کچھ ذمہ داریاں اور پریشانیاں بھی سوار ہوجاتی ہیں، ان چھ صورتوں میں سے پہلی چار صورتوں میں بنک سے خریدار کے قرض لینے یا بنک کو قرض پر نفع دینے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، کیونکہ ان صورتوں میں خریدار بینک سے قرض کا کوئی معاملہ ہی نہیں کرتا، بلکہ مالک خود یا حکومت یا خود دونوں براہ راست بینک سے اپنا معاملہ کر کے اس کو اپنا وکیل یا اجیر بناتے ہیں یا بینک خود دخیل ہوکر بجائے خریدار کے مالک مال سے اپنا معاملہ کرلیتا ہے اور اس کی ہدایت کے مطابق خود جو معاملہ چاہتا ہے کرتا ہے، اس میں خریدار بینک سے کہنے نہیں جاتا کہ میری طرف سے اتنا قرضہ دے دو، بلکہ یہ صورت قریب قریب ویسی ہی ہوتی ہے جیسی صورت اصل پرائیویٹ فنڈ میں ہوتی ہے کہ محکمہ خود معاملہ چاہتا ہے اپنے ملازم کے ساتھ کرتا ہے۔ مثلاً یہ کہ ملازم کی تنخواہ سے وضع کردہ روپیوں کے مثل خود اضافہ کرتا ہے یا مثلاً خود ہی نام نہاد جمع شدہ فنڈ پر سود یا سود در سود وغیرہ کے نام سے کچھ رقم بڑھاتا رہتا ہے، لیکن کوئی اس کو سود نہیں کہتا، پس جس طرح وہاں سود کا تحقق نہیں ہوتا یہاں بھی نہ ہوگا، کیونکہ سود کا تحقق عقود معاوضہ میں ہوتا ہے اور یہاں سرے سے خریدار کا بینک سے کوئی عقد ہی نہیں ہوتا اور یہ ظاہر ہے۔

اور پانچویں وچھٹی صورت میں (جب خریدار خود بینک کا واسطہ اختیار کرے یا بینک خود براہ راست خریدار سے معاملہ کرے) بھی صورتیں مختلف ہوتی رہتی ہیں۔ (یہاں الف، ب، ج، د) کے عنوان سے چھ صورتیں لکھی جاتی ہیں:

الف- خریدار کا نقد سرمایہ بنک میں داخل وموجود ہے اور بنک خود مالک مال کو قیمت جمع کردیتا ہے تو اس کو بھی خریدار کا قرض لینا نہیں کہیں گے، بلکہ اسی جمع شدہ سرمایہ سے ادا کرنا یا جمع کرنا محسوس کریںگے، اور بینک کو اس کا اجیر یا وکیل کہیں گے اور جو پیسے بینک خریدار سے مزید وصول کرے گا اس کو اس کے عمل کی اجرت قرار دیں۔

ب- خریدار کا کچھ سرمایہ بینک میں جمع نہیں ہے، لیکن بینک از خود ادائیگی ثمن کی مقررہ مدت سے قبل ہی مالک مال کو قیمت ادا کردے تو بھی خریدار کا قرض لینا نہ کہیں گے، اور پھر بینک خریدار سے جو رقم اصل قیمت ادا کردے تو بھی خریدار کا قرض لینا نہ کہیں گے، اور پھر بینک خریدار سے جو رقم اصل قیمت سے زائد لے گا، اس کو سود کہنا ضروری نہ ہوگا اور یہ ظاہر ہے۔

ج- ادائیگی ثمن کی مقررہ تاریخ ختم ہونے کے بعد اگر بینک از خود قیمت جمع کردے، لیکن خریدار سے کوئی معاملہ نہ

کرے، جب بھی قرض لینا صادق نہ آئے گا اور اس پر بینک جو رقم اصل ثمن سے زائد لے گا، اس کو سود کہنا ضروری نہ ہوگا۔

د- اسی طرح اگر خریدار کا کچھ سرمایہ بینک میں جمع نہ ہو، لیکن بینک مال کو اپنے قبضہ ونگرانی میں لیکر قیمت مال کی جمع کردے، پھر جب خریدار قیمت ادا کرے اس کے بعد مال پر قبضہ کرنے دے تو اس صورت میں بھی قرض لینے کا معاملہ خریدار سے نہ ہوگا اور جو پیسے بینک لے گا وہ بجائے سود کے اجرت عمل شمار ہوگی۔

ھ- ان تمام صورتوں میں خواہ پہلی نمبر وار چھ صورتیں ہوں یا یہ الف، با وغیرہ پانچ صورتیں ہوں، سب میں اگر بینک اپنے پاس سے قیمت مال ادا نہ کرے، بلکہ خریدار جس جس طرح قیمت ادا کرتا جائے بااقساط یا قسط واحد بینک وصول کر کے محض وہ قیمت مالک مال کو دیتا جائے تو اس صورت میں بھی جو پیسہ خریدار سے یا مالک مال سے بینک طے کر کے خود لے گا، وہ سود نہ ہوگا، بلکہ وہ اس کی اجرت وحق المحنت ہوگی، اور یہ دینا لینا جائز رہے گا۔

و- البتہ اگر خریدار بینک سے واقعی قرض لے کر خود مالک کو قیمت ادا کردے یا بینک سے قرض لینے کا معاملہ کرے، مثلاً اس طرح معاملہ کرے کہ تم مالک مال (بائع) کو میری طرف سے قیمت ادا کردیا کرو، میں بعد میں تم کو ادا کردیا کروں گا، تو بیشک یہ دونوں معاملے قرض کے ہوں گے، پہلا خالص قرض کا اور دوسرا قرض اور وکالت دونوں کا ہوگا اور ان دونوں صورتوں میں بینک اپنے دیئے ہوئے روپیہ سے زائد رقم جو خریدار سے وصول کرے گا وہ بلاشبہ سود ہوگی، اور اس صورت میں بیشک سود دینے کا ارتکاب خریدار سے ہوگا، جسکی اجازت بغیر شدید حاجت کے نہ ہوگی، مثلاً بغیر قرض لئے کام نہ چلتا ہو اور بنک کے علاوہ کہیں اور سے قرض نہ ملتا ہو، یا ملتا ہو، مگر باعتبار بینک کے سود زیادہ دینا پڑتا ہو، یا مثلاً کوئی قانونی مجبوری ایسی ہوجائے کہ بغیر توسط بینک کاروبار نہ ہوسکے، ''الاشباہ والنظائر'' میں ہے: "ویجوز للمحتاج الاستقراض بالربح"(۱) اور اسی طرح اس کی شرح حموی میں ہے۔

تنبیہ: یہ حوادث الفتاوی کے قسم کی چیز ہے، اس لئے اور علماء فحول بھی اس پر غور فرما کر اس کے صحت وسقم پر اپنی رائے ظاہر فرما کر مستفید فرمائیں۔

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

۱- الاشباہ والنظائر/ص ۱۴۹ فی آخر القاعدۃ الخامسۃ۔

گنے کی پرچی خریدنا:

ہمارے علاقے میں ایک طرح کا کاروبار ہوتا ہے، وہ یہ کہ کاشت کار چینی ملوں کو اپنا گنا دیتے ہیں، اور چینی مل کی طرف سے کاشت کاروں کو ایک رسید کا پرزہ ملتا ہے جس پر گنے کا وزن وغیرہ تحریر ہوتا ہے، دو ہفتہ یا ایک مہینہ یا اس سے بھی زیادہ مدت بعد اس رسید کے پرزے کو پیش کرنے پر مل کی طرف سے گنے کا حساب ملتا ہے۔ بعض کاشت کار جو اتنے دنوں تک انتظار نہیں کر سکتے وہ پرزہ کی اصلی قیمت سے تین چار روپیہ کم پر اس پرزہ کو خرید لیتے ہیں اور جب مل کی طرف سے حساب ملنے لگتا ہے تو اس پرزہ کو پیش کر کے مل سے اس کا حساب لے لیتے ہیں۔ ایک صورت یہ بھی ہوتی ہے کہ رسید کا پرزہ خریدنے کا کام کرنے والے لوگ کاشت کار کو اپنے پاس سے چالان دیتے ہیں جس کی قیمت چار پانچ روپے ہوتی ہے۔ یہ چالان مل میں گنا لے جانے کا اجازت نامہ ہوتا ہے۔ کاشت کار مل میں گنا گرا کر اور رسید کا پرزہ لے کر آتا ہے تو پرزہ کا خریدار اکٹھے چالان کا دام اور تین چار روپے اور کاٹ کر باقی حساب کاشت کار کو دے دیتا ہے اور جب مل سے حساب ملنے لگتا ہے تو اس پرزہ کو پیش کر کے اس کا حساب لے لیتا ہے، سوال یہ ہے کہ شرعی نقطۂ نظر سے پرزہ خریدنے کا کاروبار جائز ہے یا نہیں؟ براہ کرم مدلل جواب دیں، عین نوازش ہوگی۔

الجواب وباللہ التوفیق:

رسید کا پرزہ قیمت ملنے کا ذریعہ ہے، خود کوئی مال نہیں ہے۔ اس کی بیع وشراء درست نہیں ہے، ہاں اگر پرچی (رسید کا پرزہ) بیچنے والے اور خریدنے والے بجائے خریدنے بیچنے کے اس طرح معاملہ کرلیں کہ پرچی کا مالک (گنا بیچنے والا) پرچی خریدنے والے سے یہ کہے کہ یہ گنے کی پرچیاں ہیں اس کو تم لے جاؤ مل سے اس کی رقم وصول کرلاؤ ہم تم کو اجرت میں فی پرچی اتنا (تین روپیہ یا دو روپیہ) دیں گے، یا یہ کہے کہ ہم تم کو لائی ہوئی رقم میں دو روپیہ سیکڑہ یا جتنا طے ہوجائے دیں گے تو یہ معاملہ اجارہ کا ہوکر جائز رہے گا، اور نتیجہ میں کوئی فرق نہ پڑے گا، نہ صرف قاعدہ شرع اور حکم شرع کے مطابق ہوجانے کی وجہ سے جائز ہوگا، بلکہ باعث ثواب بھی ہوگا۔

یہ تاویل جواز اس صورت کی ہے جب پرچی بیچنے والا فوراً روپیہ خریدنے والے سے نہ لے، لیکن اگر پرچی بیچنے والا خریدنے والے سے فوراً اس کی قیمت لینا چاہے، جیسا کہ سوال میں مذکور ہے تو اس کے لئے یہ حیلہ کرلینے کے بعد پھر دوسرا معاملہ اس طرح کرے کہ جتنے روپئے خریدنے والے سے لینا چاہتا ہے، اتنا روپیہ بطور قرض فی الوقت لے لے اور اس سے

کہے کہ پرچی کا روپیہ وصول ہونے کی تاریخ میں جب اس کا روپیہ وصول کرکے لاؤ گے اس وقت یہ قرض وصول کرلینا۔

دوسری صورت میں پرچی خریدنے والے جو کاشت کاروں کو چالان دے کر چالان کی قیمت وصول کرتے ہیں، اگر اس چالان کو دینے اور اس کی قیمت لینے کا مل مالکوں نے قانون بنایا ہے اور گورنمنٹ کی اجازت سے بنایا ہے تو جب تو یہ تاویل ہوگی کہ یہ وہ چالان کی قیمت نہیں ہے، بلکہ اجازت نامہ ملنے کی فیس ہے اور یہ دینا لینا درست ہوگا، ورنہ یہ رشوت ہوگی۔جس کے دفعیہ کے لیے مناسب کارروائی کرنی چاہئے اور مجبوری میں دینے کی گنجائش رہے گی،فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی،مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۶/۱۲/ ۹۲ ۱۳ھ

تجارت کے فروغ کی ایک اسکیم کا حکم:

ایک شخص اپنی تجارت کو فروغ دینے کے لیے یہ صورت اختیار کرتا ہے کہ ایک گھڑی کی قیمت سو روپے ۱۰۰/ ہے اور بازار میں بھی اسی قیمت پر ملتی ہے اسکے واسطے پچاس ممبر بنائے گئے دس دس روپے کے، یہ اسکیم دس مہینہ چلائی جائے گی۔ پہلے مہینہ جس شخص کا نام قرعہ اندازی میں نکل آیا اس کو دس روپئے میں گھڑی دے کر اس کا نام ممبری سے خارج کردیا جائے گا، اسی طرح سے نو ماہ تک جس کا نام آتا جائے گا۔ اس کو گھڑی دے کر ممبری سے اس کا نام خارج کردیا جائے گا، اور ان سے پیسے نہیں لیے جائیں گے۔

دسویں مہینہ اکتالیس اشخاص جو بچے ان کو ایک ایک گھڑی دے کر اسکیم ختم کردی جائے گی، اس صورت میں کسی کو دس روپئے میں کسی کو بیس روپئے میں کسی کو چالیس روپئے میں، یہاں تک کہ کسی کو سو ۱۰۰/ میں گھڑی ملے گی، لیکن قرعہ اندازی ضرور ہوگی۔

اب آپ حضرات سے دریافت طلب ہے کہ آیا شرعاً یہ صورت تجارت کے فروغ کی جائز ہے یا نہیں؟ **مدلل ومفصل** جواب سے نوازیں کرم ہوگا۔

الجواب وباللہ التوفیق:

اس طریق کار کا حاصل یہ ہے کہ یہ گھڑی بازار میں سو ۱۰۰/ روپئے کی ملتی ہے اور اس دوکاندار نے کسی گاہک سے زائد نہیں لئے، بلکہ اپنی طرف سے پچاس گھڑیوں کا دام جو پچاس سو روپیہ ہوتا تھا بجائے پچاس سو روپیہ کی چھوٹ دیدی۔ اور

کسی گاہک سے سو روپیہ سے زائد (جو اصلی قیمت تھی) نہیں لیا، لیکن سوال یہ ہے کہ کوئی گاہک کچھ قسطیں دیکر مر جائے اور گھڑی ملنے سے پہلے مرجائے تو اس کو اس کی دی ہوئی قسط واپس ہوتی ہے یا نہیں؟ اگر دی ہوئی قسط واپس دے دی جاتی ہے تو یہ محض چھوٹ ہوئی، جوا نہیں ہوا، اور معاملہ بالکل جائز رہا، اور محض تجارت کو فروغ دینے کا طریقہ ہوگیا، اور اگر دی ہوئی قسط (رقم) واپس نہیں کی جاتی تو جوا ہوگیا اور یہ معاملہ ناجائز ہوگیا، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

خاندان کا مشترک کاروبار اور تقسیم متروکات:

دو بھائی تھے بڑا مسمی عبدالرؤف اور چھوٹا محمد شریف، بڑا بھائی سرکاری ملازم تھا، اور چھوٹا بھائی کاروبار میں لگا ہوا تھا، اور دونوں ساتھ کھاتے پیتے اور گھریلو سارے کام مشترک طور پر کرتے تھے۔ چھوٹے بھائی نے ایک ہوٹل کیا اور خود چلانے لگے، پھر کچھ دنوں بعد چھوٹے بھائی کے لڑکے اسفندیار بھی ان کے ساتھ ہوٹل میں لگ گئے، پھر کچھ عرصہ بعد اسفندیار بھی سرکاری ملازم ہوگیا اور کچھ دنوں بعد چھوٹے بھائی محمد شریف گھر پر رہنے لگے، چونکہ اسفندیار سرکاری ملازم ہوگئے تھے اور ان کے باپ گھر رہنے لگے، اس لئے ہوٹل کا حال خراب ہوگیا، اس لئے ایک صاحب مسمی الیاس کو ہوٹل اس شرط پر دے دیا گیا کہ نصف آمدنی اسفندیار پسر مسمی محمد شریف کو ملے گی اور نصف الیاس صاحب لیں گے، محمد شریف کے بڑے بھائی عبدالرؤف نے اپنی ذاتی کمائی سے دو رکشے بنوائے تھے جو چل رہے تھے، کچھ عرصہ بعد عبدالروف کا جو بڑا بھائی تھا اس کا انتقال ہوگیا، تو ان کے چھوٹے بھائی محمد شریف نے گھر کا انتظام مشترک طور پر سنبھال لیا، اور عبدالرؤف صاحب مرحوم کے جے۔ پی فنڈ سے جو پانچ سو روپیہ ملا وہ بھی شریف نے لے کر گھر کے مصرف میں اور دوکان مذکور کے قرض ادا کرنے میں یہ کہہ کر لگا دیا کہ خاندان کا سب کام مشترک ہے، لہذا یہ روپیہ سب کے کام میں لگا دیا جائے گا۔ پھر کچھ دنوں بعد شریف صاحب نے اپنے مرحوم بڑے بھائی کے اکیلے لڑکے مسمی عبدالرزاق صاحب کو الگ کردیا، اور بڑے بھائی کی ذاتی کمائی سے جو دو رکشے چل رہے تھے ایک بڑے بھائی عبدالرؤف کے اکیلے لڑکے عبدالرزاق کو دیدیا، اور ایک خود یہ کہہ کر لے لیا کہ سب چیز مشترک ہے تو آدھا میرا ہے اور آدھا تمہارا ہے۔ اب صورت حال یہ ہے کہ عبدالرؤف کی کمائی کے پانچ سو روپے بھی شریف نے لے کر گھر میں لگا دیئے اور رکشہ میں سے بھی بٹوارہ کرلیا، لیکن شریف نے جو ہوٹل کیا تھا جس کو شریف نے عبدالرؤف کے لڑکے عبدالرزاق کو کچھ نہیں دیا، لہذا عبدالرزاق کا کہنا یہ ہے کہ جب میرے باپ کی کمائی میں آدھا آدھا

بٹوارہ ہوگیا ہے تو چچا کی کمائی ہوٹل میں سے مجھے بھی حصہ مل جانا چاہئے اور اگر چچا کی کمائی سے حصہ نہیں ملتا ہے تو پھر چچا نے ایک رکشہ اور مبلغ پانچ سو (۵۰۰) روپے جو میرے والد کی کمائی کے تھے کس طرح کے لئے ہیں وہ مجھے واپس ملنی چاہئے۔

۱- کیا عبد الروف اور شریف کی مشترکہ کمائی جو ہوٹل اور رکشہ نقد پانچ سو روپے کی شکل میں تھے اس میں دونوں کے لڑکوں کو آدھا آدھا ملے گا یا کس حساب سے ملے گا؟

۲- اگر دونوں کی کمائی الگ سمجھی جاتی ہے تو پھر عبد الروف کے لڑکے عبد الرزاق کو پانچ سو روپے اور ایک رکشہ جو چچا نے لے لیا ہے ملے گا یا نہیں؟ اور شریف کی کمائی ہوٹل ان کے سب لڑکوں کو ملے گا یا صرف اسفندیار کو ملے گا جن کا نام شرائط نامہ مذکورہ بالا میں ہے؟

۳- جب محمد شریف نے اپنے بڑے بھائی کی کمائی سے مشترکہ ہونے کے ناطے آدھا بٹالیا تو پھر محمد شریف کی کمائی ہوٹل سے بڑے بھائی کے لڑکے عبد الرزاق کو حصہ ملے گا یا نہیں؟

۴- اس وقت دونوں بھائی عبد الروف اور محمد شریف انتقال کر چکے، دونوں کے لڑکے اس طرح ہیں کہ عبد الروف کے صرف ایک لڑکا عبد الرزاق ہے اور محمد شریف کے تین لڑکے اسفندیار، محمد عیسی اور محمد قمر ہیں۔ مفصل اور واضح طور پر تحریر فرمائیے کہ کس کس کو شرعا کتنا حصہ ملے گا، تاکہ جھگڑا ختم ہوجائے۔

الجواب وباللہ التوفیق:

عبد الروف کی زندگی تک سب معاملات کھانا پینا رہنا سہنا مشترک تھا۔ عبد الروف کے انتقال کے کچھ دنوں بعد عبد الروف کے لڑکے عبد الرزاق الگ کردیئے گئے شرکت ختم ہوگئی۔ اس وقت ہر چیز نصف نصف تقسیم کردینی چاہئے تھی اور سارے معاملات صاف کر لینے چاہئے تھے، ایسا نہیں ہوا، اب شرعی حکم یہ ہے کہ مبلغ پانچ سو روپے چونکہ مشترک رہنے کے زمانے میں خرچ ہوگئے ہیں، اس لئے مطالبہ کرنے کا حق نہیں، البتہ رکشہ جس کو عبد الروف نے اپنی ملازمت کے زمانے کے الگ اور ذاتی روپیہ سے خریدا ہے، اگر حقیقتا واقعہ ایسا ہی ہے تو وہ دونوں رکشے تنہا عبد الروف کے ورثاء کو ملنے چاہئیں۔ عبد الروف کے ورثاء میں اگر تنہا ان کا لڑکا ہی ہے تو وہی اس کا مستحق ہوگا اور ہوٹل چونکہ مشترک رہنے کے دور میں شروع کیا گیا، اور محمد شریف (ہوٹل شروع کرنیوالا) کی الگ کمائی نہیں ملازمت وغیرہ نہیں تھی، اس لئے ظاہر ومتبادر یہی ہے کہ مشترک سرمایہ سے شروع ہوا، اس لئے اس میں محمد شریف اور عبد الروف دونوں کی شرکت ہوگی، اور اس میں نصف عبد الروف کے

ورثا ءکا حق ہوگا، عبدالروٴف کے ورثا ء میں جب صرف وہ ایک ہی لڑکا عبدالرزاق ہے تو ہوٹل میں نصف عبدالروٴف کا ہوگا اور نصف میں محمد شریف کے سب لڑکے شریک متصور ہوں گے۔

اسفندیار کا باپ کے ساتھ ہوٹل کے کام میں لگنے سے وہ ہوٹل اسفندیار کا شمار نہ ہوگا اور محض اسفندیار تنہا اس کے مالک شمار نہ ہوں گے، بلکہ وہ محمد شریف کے معین ومددگار شمار ہوں گے اور ہوٹل محمد شریف وعبدالروٴف کا مشترک ہی شمار ہوگا، اسی طرح محمد الیاس کے ساتھ معاملہ کرتے وقت شرائط نامہ میں (اس اندراج سے کہ نصف آمدنی اسفندیار کی اور نصف محمد الیاس کی لکھدینے سے) وہ ہوٹل تنہا اسفندیار کا شمار نہ ہوگا، بلکہ محض نصف محمد شریف کا رہےگا اور ان کے انتقال کے بعد ان کے تینوں لڑکوں کا ہوگا، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۹/ ۱۲/ ۹۲ ۱۳ھ

کیمبریج میں مکان خریدنے کی ایک صورت کا حکم:

ہم نے کیمبرج میں مسلمانوں کی ایک جماعت بنائی ہے جس میں پچیس افراد ہیں۔ یہاں شہر میں کوئی بھی مسجد نہیں ہے جس کی وجہ سے فی الحال کرایہ پر مکان لیکر سب مل کر پانچوں وقت کی نماز اور جمعہ کی نماز پڑھتے ہیں۔ اور اسی مکان میں مدرسہ بھی چلتا ہے۔ عیدالفطر اور عیدالاضحیٰ کی نماز کے لئے کوئی دوسرا بڑا ہال کرایہ پر لے کر نماز ادا کرتے ہیں، ہم لوگ مسجد اور مدرسہ کی ملکیت خریدنے کی کوشش میں ہیں فی الحال ہماری سوسائٹی کے پاس اندازاً تین ہزار ڈالر جمع ہوئے ہیں اور اندازاً آٹھ سے نو ہزار ڈالر جمع ہونے کی امید ہے، اتنا مال سوسائٹی کے ۲۵ ممبروں پر ہوگا، اور مسجد، مدرسہ کی ملکیت کو خریدنے کے لئے پچاس سے ساٹھ ہزار چاہئے، لیکن اتنی رقم کس وقت تک جمع ہوسکتی ہے وہ خدا کے علاوہ کوئی جان نہیں سکتا۔

یہاں کے تمام لوگ ملکیت خرید بھی لیں، لیکن یہاں پر رواج یہ ہے کہ تمہاری پوری رقم نہ ہو تو جتنی بھی رقم ہو، تمہارے پاس جمع ہوتی ہے، جس کو (DOWNPAYMENT) کے نام سے تعبیر کرتے ہیں اور بقیہ رقم ہر مہینے یا ہفتہ واری جمع کریں، جہاں تک پوری رقم جمع نہیں ہوجائے گی وہاں تک بائع تقریباً تیرہ فیصد روپیہ سود مانگتا ہے۔ اگر پچاس سے ساٹھ ہزار کی قیمت کے مکان ہوں تو ہر مہینہ تقریباً چھ سو سے سات سو ڈالر ادائیگی کی رقم ہوتی ہے۔ جس وقت تک پورے مکان کی قیمت کی ادائیگی نہ ہوگی اس وقت تک مکان کی قیمت کا سود اصل قیمت سے دو تین گنا زائد ہوگا۔ ایک صورت یہ ہوسکتی ہے کہ اگر (DOWNPAYMENT) زیادہ دیں تو ماہانہ ہفتہ وار کرایہ کی رقم تقریباً برابر ہوتی ہے، لیکن اگر

(DOWNPAYMENT) ادا کریں تو ماہانہ ہفتے کی رقم کرایہ کی رقم سے دوگنی ہوتی ہے۔ تو کیا سود کے روپے سے مکان خرید لیں یا کرایہ سے اسی مکان کو چلاتے رہیں۔ فی الحال جو مکان لے رکھا ہے وہ بہت ہی چھوٹا ہے جس کا ماہانہ کرایہ ایک سوڈالر ہوتا ہے، اور اس مکان میں ۲۵ آدمی نماز پڑھ سکیں ایسا انتظام ہے، بعدۂ اس مکان کے دائیں بائیں جانب مسلمانوں کی آبادی ہے، نتیجتاً نمازی کو طلبہ کے پڑھنے کی آواز سے تکلیف نہیں ہے، لیکن مستقبل میں یہ مکان خالی کرنا پڑے تو بعد میں پھر سے ایک مکان کرایہ پر رکھنا پڑے گا جس کا کرایہ ماہانہ دوسوڈالر سے تین سوڈالر تک ہوگا۔ پھر یہاں ایک ساتھ میں سب لوگوں کا جمع ہونا اسے غیر مسلم پسند نہیں کرتے، اس لیے کرایہ کے مکان میں کبھی بھی تکلیف کا ہونا لازم ہے، اس لئے کہ مالک مکان مہینہ کی نوٹس دے کر خالی کرادیں تب پھر سے مکان کی ضرورت آئے گی، ابھی قریب میں پوری رقم دے کر بھی مکان خرید سکیں، ایسی توقع نہیں ہے، پھر مکان کی قیمت اور کرایہ بھی ہر سال بڑھتا جارہا ہے، نتیجتاً مکان بورڈ گیج سے خریدنا مناسب معلوم ہوتا ہے، بہت سے مسلمان بھائیوں نے اپنے رہنے کے لئے اس طرح سے مکان خرید لیے ہیں، لہٰذا مذکورہ حقیقت کو دھیان دے کر شریعت کی رو سے لکھ کر مہربانی فرمادیں۔

☆ مطلب یہ ہے کہ جو رقم جمع ہو اس رقم کو (DOWNPAYMENT) طریقے سے دیکر بقیہ رقم کو ہر مہینہ یا ہفتہ بھر کر مسجد یا مدرسہ کا مکان خرید سکتے ہیں یا نہیں؟

☆ ہم اس طریقہ سے نہ کریں تو مسلمانوں کے لیے ہم کو کیا کرنا چاہئے؟

☆ ہر مسلمان اس طرح سے (بورڈ گیج طریقہ سے) مکان استعمال کے لیے خرید سکتا ہے یا نہیں؟

نوٹ: یہاں دنیا کے گوشہ گوشہ سے مسلمان آکر بسے ہوئے ہیں، لہٰذا ان سوالوں کا جواب قرآن شریف اور حدیث شریف کی روشنی میں دیں اور بعد میں حنفی مذہب کا حوالہ دے کر مہربانی فرمائیں۔

الجواب وباللہ التوفیق:

حسب تحریر ترجمہ سوال تعمیر عمارت کی بیشک اشد ضرورت ہے اور جلد پورا ہو جانا بھی بے حد ضروری ہے۔ پس اگر خرید عمارت کے لئے نقد قیمت کا فراہم ہونا دشوار ہے تو بہتر صورت یہ ہے کہ جن لوگوں کو بینک میں جمع کئے ہوئے سرمایہ پر سود کے نام سے کچھ رقم مل رہی ہو، وہ لوگ اس کو بینک سے نکال کر ضرورت کے مقدار اکٹھا کرلیں، پھر کسی غریب مستحق زکوٰۃ شخص کو اس خرید میں چندہ کے ذریعہ شریک ہونے کی ترغیب دے کر اور اس کے فوائد وثواب بتلا کر اس سے کہا جائے کہ تم

اتنے روپئے کسی سے قرض لاکر بطور چندہ کے اس کے لیے دے دو، تمہارا قرض ادا کردیا جائے گا، تم کو بھی اس چندہ دینے کا پورا پورا ثواب ملے گا۔

پھر موقعہ ہو تو قرض بھی اپنے پاس سے دے دیا جائے، یا کسی سے دلا دیا جائے پھر جب وہ شخص قرض لاکر بطور چندہ کے یا عطیہ کے دے دے تو وہ سود والا روپیہ اس کو دے کر مالک بنادیا جائے، پھر قرض خواہ اسی وقت یا جب مناسب ہو اپنا قرض اس سے وصول کرے۔ اور یہ بھی کرسکتے ہیں کہ سود والی کل رقم اس مستحق کو اس کام میں شریک ہونے اور عطیہ دینے کا ثواب بتلا کردے دیں اور دیکر اس کو اس رقم کا مالک مختار بنادیں، پھر وہ شخص اپنی طرف سے بطور عطیہ کے اس خرید کے لیے دیدے اور اس روپئے سے بجائے ادھار خرید نے کے نقد خرید لیا جائے۔

اور اگر اس طرح نقد خرید لینے میں کالا روپیہ وغیرہ ہونے کا خطرہ ہو تو اس سے قانونی حفاظت کرلی جائے۔ مثلاً یہ کہ فلاں فلاں سے قرض لے کر خریدا ہے، یا چندہ سے خریدا ہے وغیرہ ذلک۔ یہ صورت حنفیہ کے نزدیک بھی بے ضرر و بے خطر جائز ہوگی، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۹۶/۱/۲۲ ۱۳ھ

الجواب صحیح: محمد غفرلہ

واپسی کی شرط کے ساتھ دوکان کی بیع:

بندہ نے اپنی ایک دوکان زید کے ہاتھ فروخت کی اس شرط کے ساتھ کہ دس سال تک اگر میرا لڑکا اس رقم کو واپس کر کے یہ جائیداد واپس لینا چاہے تو اسے دیدیا جائے اور اسی دوکان میں بندہ کا لڑکا دوکان کرتا ہے، اور اس کا کرایہ Rs300/- ماہانہ زید کو ادا کرنا طے پایا ہے، آیا اس سے کرایہ لینا جائز ہے یا نہیں؟ چونکہ جائیداد کی قیمت بندہ کو زید دے چکا ہے اور وہ رقم فی الحال واپس نہیں مل سکتی، اس لئے جو مسئلہ حد جواز میں ہو بیان فرما کر مشکور فرمائیں۔

حاجی بشیر احمد (محلہ کوجرواڑہ دیوبند)

الجواب وباللہ التوفیق:

عبارت سوال سے معلوم ہوتا ہے کہ بندہ (بائع نے) دوکان کو محض کسی مدت معینہ کے لئے بیع نہیں کیا ہے بیع کے

حلب عقد میں کسی معینہ مدت تک کے لئے بیع کی کوئی قید نہیں ہے، بلکہ عقد بیع مطلق ہے، البتہ عقد بیع کے منافی ایک شرط بصورت درخواست لگایا ہے کہ دس سال تک اگر میرا لڑکا اس رقم کو واپس کر کے جائیداد واپس لینا چاہے تو اسے واپس دیدیا جائے۔

پس اگر واقعہ یہی ہے اور دستاویز بیع نامہ کا بھی یہی مضمون ہے تو یہ بیع بیع میعادی یا بیع بالوفاء نہیں ہے (۱)، بلکہ یہ بیع قطعی دائمی ہے، البتہ عقد بیع کے منافی ایک شرط لگا دینے کی وجہ سے یہ بیع فاسد ہوگی، لأن النبي ﷺ **نهى عن بيع وشرط** او کما قال (۲)، اور بیع فاسد کا حکم یا تو فسخ بیع ہے یا سبب فساد کو ختم کر کے بیع کو صحیح بنالینا ہے پس حکم شرعی یہ نکلا کہ یا تو دونوں (بائع و مشتری) اس بیع کو توڑ دیں اور فسخ کر دیں، یعنی مشتری کو ثمن واپس کر دے اور مشتری بائع کو مبیع واپس کر دے یا بائع واپسی کی اس شرط کو ختم کر کے پہلے بالقطع و قطعی قرار دے اور اگر ایسا نہ ہو سکے تو مشتری چند گواہوں کے سامنے بائع سے کہہ دے کہ اگر تم اس بیع کو فسخ نہیں کرتے ہو تو میں واپسی کی اس شرط فاسد کو ختم کرتا ہوں اب میں واپس کرنے کا شرعاً پابند نہیں ہوں گا، اب اگر بائع اس بات کو تسلیم کرے اور موافقت کرے تو ٹھیک ہے ورنہ بیع کا فساد ختم ہو کر بیع صحیح ہو جائے گی (۳)، واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

تجارتی حصص کی خریداری اور اس پر منافع کا حکم:

ہندوستان میں بڑی بڑی تجارتی کمپنیوں کے تجارتی حصص Shares لینا جائز ہے یا نہیں، ان تجارتی حصص پر منافع لینا جائز ہے یا نہیں؟ اگر یہ ملحوظ خاطر رکھا جائے کہ وہ کمپنیاں حلال اور جائز چیزیں بناتی اور خرید فروخت کرتی ہیں سنتے ہیں کہ وہ روپیہ Current اکاؤنٹ میں رکھتی ہیں جسمیں سود نہیں ملتا ہے بچت کھاتہ میں رکھنے سے وہ ایک بار سے زیادہ ایک دن میں نہیں نکال سکتی ہیں جبکہ تجارت میں دن میں کتنی ہی بار روپیہ نکالنے کی ضرورت پڑتی ہے۔

۱- ''صورته أن يبيعه العين بألف على أنه إذا رد عليه الثمن رد عليه العين'' (الدر المختار مع رد المحتار ۷/ ۵۴۵)۔

۲- صاحب نصب الرایہ نے اس کی نسبت طبرانی کی طرف کیا ہے قلت: رواه الطبراني في معجمه الأوسط (نصب الرایہ ۴/ ۱۷)۔

۳- ''ثم جملة المذهب فيه أن يقال كل شرط يقتضيه العقد كشرط الملك للمشتري لا يفسد العقد لثبوته بدون الشرط، وكل شرط لا يقتضيه العقد وفيه منفعة لأحد المتعاقدين أو للمعقود عليه وهو من أهل الاستحقاق يفسده'' (الہدایہ ۳/ ۵۹ باب البیع الفاسد)۔

الجواب وباللہ التوفیق:

تجارتی کمپنیوں کے تجارتی حصص لینا اور ان حصص پر جو منافع ہو اس کا لینا دونوں درست ہے، البتہ جو کمپنی تجارتی نہ ہو بلکہ صرف سودی کاروبار کرتی ہو جانتے بوجھتے اس کے حصص خریدنا یا اس کا نفع لینا ممنوع ہے (۱)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۹/۱۰/۱۴۰۱ھ

درخت پر آم کی بیع کی مختلف صورتیں:

۱- ہم لوگوں کے یہاں آم کا باغ مختلف طور پر فروخت کرتے ہیں وہ یہ کہ ۱- باغ میں مول (پھول) نہ آئے اور سال دو سال کے لئے فروخت ہو جاتا ہے۔

۲- دوسری شکل یہ کہ مول آیا اور فروخت کیا۔

۳- تیسری بات یہ کہ ٹیکورا آنے کے بعد فروخت کیا جائے۔

۴- اور چوتھی شکل یہ کہ جب آم قابل صلاحیت ہو جائے اس وقت فروخت ہوتا ہے۔

۵- آخری شکل یہ کہ آم توڑ کر فروخت کرے اس شکل میں ناجائز ہونے کا کوئی سوال نہیں، کیا شرعاً کسی طرح جائز یہ ہے کہ آم درخت میں لگا ہوا فروخت کیا جائے۔ ۱- عوام تو عوام اس زمانہ میں ۹۹ فیصد علماء وصلحاء وغیرہ سب ہی درخت میں آم لگا ہوا فروخت کرتے ہیں، ایک دشواری ہے وہ یہ کہ مجبوراً فروخت کرتے ہیں، کیونکہ اس کا انتظام مالک باغ کر نہیں پاتے اور نقصان کا خطرہ بہت زیادہ رہتا ہے، فتوی تو زمانہ کے لحاظ سے ہوتا ہے کیا اس وقت کوئی گنجائش ہے۔

۶- ایک شکل اور یہ ہے کہ باغ مع زمین کے چند سال کے لئے متعینہ رقم میں اس طرح طے کرے کہ متعینہ رقم متعینہ سال میں سوخت ہو جائے اور باغ واپس کردے، شرعاً مع حوالہ قابل اطمینان بخش جواب عنایت فرمایا جائے۔

حکیم فداء حسین (تاتارپور بھاگل پور)

۱- ''الذین یأکلون الربوا لا یقومون إلا کما یقوم الذی یتخبطہ الشیطان من المس ذلک بأنہم قالوا إنما البیع مثل الربوا وأحل اللہ البیع وحرم الربوا فمن جاءہ موعظۃ من ربہ فانتہی فلہ ما سلف وأمرہ إلی اللہ ومن عاد فأولئک أصحاب النار ہم فیہا خالدون''(سورہ بقرۃ ۲۷۵)۔

الجواب وبا للہ التوفیق:

تمہید: جواب میں پہلی بات تو یہ سمجھنی چاہئے کہ اگر مسلمان نے کافر مالک باغ سے خریدا تو اس کے احکام دوسرے ہیں اور اگر کافر نے مسلمان مالک باغ سے خریدا تو اس کے احکام اور۔

شق اول: یعنی مسلمان خریدے غیر مسلم مالک باغ بیچے تو مندرجہ پانچ صورتیں ۱ تا ۵ سب درست وجائز رہے گی جبکہ تراضی طرفین کے ساتھ ہو ''لعدم الخداع والغصب والمظالم ، لأن الكافر غير مكلّف لهذه الجزئيات عند بعض المحققين وهو موسع عندالفتوى في هذا الزمان عند ارباب التحقيق''البتہ چھٹی صورت میں بیع کا یہ معاملہ صحیح نہ ہوگا ''لأن هذه المعاملة منافية لمفهوم عقد البيع بالكلية''، ہاں اگر اجارہ کا معاملہ کیا جائے بجائے معاملہ بیع کے وہ کچھ شرطوں کے ساتھ گنجائش رکھے گا جیسا کہ شق ثانی کے ضمن میں اس کا تفصیلی ذکر کیا جائے گا۔

شق ثانی: یعنی غیر مسلم خریدے اور مسلمان مالک باغ بیچے تو اس صورت میں صورت ۱۔تو بالکل باطل ہے کسی کے نزدیک جائز نہیں اور صورت ۲۔ میں اگر مول آ کر زیرہ پڑنے سے قبل بیچا تو یہ بھی سب کے نزدیک باطل و ناجائز ہے اور اگر مول آ کر زیرہ اس طرح پڑ گیا کہ فی الجملہ بھی قابل انتفاع ہو تو امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک منعقد ہوکر فاسد ہوگی اور صاحبین کے نزدیک غیر منعقد ہوکر کالعدم ہوگی اور صورت ۳ میں امام صاحبؒ کے نزدیک منعقد ہوگی پھر اگر بائع خود درخت پر چھوڑے رکھنے کی اجازت دے دے تو یہ بیع صحیح ہوکر نافذ ہی ہوگی بوجہ عرف عام کے اور صاحبین کے نزدیک یہ بیع فاسد و غیر صحیح ہوگی ، اور فتوی امام صاحب کے قول پر ہوگا، اور صورت ۴ میں ائمہ ثلاثہ کے نزدیک بیع صحیح و نافذ ہوگی بشرطیکہ بائع درخت پر باقی رکھنے کی اجازت ورضامندی دیدے بوجہ عرف عام کے اور صورت ۵ میں تو جواز کے اندر کسی کے نزدیک کوئی کلام ہی نہیں، جیسا کہ اس کو سوال میں بھی لکھا ہے،لہذا احتیاط اور تقوی کی صورت یہی ہوئی اور صورت ۶ میں بیع کا معاملہ تو قطعاً نا درست و غیر صحیح ہوگا، ہاں اگر بجائے معاملہ بیع کے اجارہ کا معاملہ کیا جائے کہ زمین اجارہ پر سال دو سال وغیرہ کے لئے دے دی جائے اور مالک زمین اس طرح معاملہ اجارہ کرے کہ یہ زمین اتنی مدت کے لئے اتنے اجارہ (سالانہ یا بالمقطع) پر دے رہا ہوں اس زمین سے جو پیداوار ہو اس سے تم منتفع ہو اور اجرت جو طے ہے وہ مجھے دے دیا کرو اور اگر وہ زمین باغ کی ہے اور زمین بعض جگہ اس طرح موجود ہو کہ اس میں سبزی ترکاری وغیرہ کاشت بھی ہو سکتی ہو یہ اجارہ صحیح ہوگا، اور پھر اس زمین سے درختوں کے پھل وغیرہ اور سبزی وغیرہ کی جو پیداوار ہوگی اس کا اجیر کو لینا اور اس سے منتفع ہونا درست رہے گا اور یہ صورت جواز مالک زمین وباغ کسی سے کرے خواہ مسلم سے یا غیر مسلم سے ہر صورت میں

یہ معاملہ جائز رہے گا(۱)۔

نوٹ:۔ یہ سارے احکام ردالمحتار و بحرالرائق وغیرہ کتب کے باب بیع العاشر سے ماخوذ ہیں اور امداد الفتاویٰ جلد ثالث کے پھلوں اور پھولوں کے بیع کے احکام سے بھی اس مسئلہ پر کافی روشنی ملے گی، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

قربانی کے چمڑے کی بیع قربانی سے قبل:

مدارس عربیہ میں عیدالاضحیٰ کے موقعہ پر جو چمڑے اور کھالیں وغیرہ آتی ہیں، ان کھالوں اور چمڑوں کو عیدالاضحیٰ سے پہلے کسی خریدار سے فی چمڑا اور فی کھال کے حساب سے قیمت متعین کر کے معاملہ طے کر لینا اور پھر اسی طے شدہ معاملہ پر عیدالاضحیٰ کے بعد عمل کرنا درست ہے یا نہیں؟ تفصیل اور دلائل کے ساتھ بیان فرمایا جائے آجکل یہ مسئلہ علمی طبقہ میں اختلاف پیدا کئے ہوئے ہے۔

محمد فضل حق (مبارک پور اعظم گڑھ)

الجواب وبالله التوفيق:

ظاہر ہے کہ یہ معاملہ بیع کی قسموں میں سے کسی قسم میں داخل نہیں ہوگا، اس لئے کہ بیع کی ہر قسم میں مبیع کا موجود ہونا وقت عقد بیع سے وقت تسلیم مبیع تک شرط وضروری ہے اور یہاں مبیع قربانی کا چمڑا و کھال موجود نہ ہو جانے سے مبیع موجود نہ ہوگی، رہ گیا اس کو وعدہ یا معاہدہ قرار دینا یہ بھی اس وقت مفید ومثمر ہوگا، جب مالک مبیع سے وعدہ یا معاہدہ ہو اور مالک مبیع قربانی کرنے والا ہوگا اور جب تک یہ مالک مبیع قربانی کر لینے کے بعد اہل مدارس کو وہ چمڑا بطور ہبہ یا ہدیہ دیکر مالک نہ بنا دیں یا اہل مدارس مبیع کو مبیع مطلق کا وکیل نہ بنا دیں اس وقت تک یہ وعدہ یا معاہدہ اہل مدارس پر لاگو نہ ہوگا، اور نہ اس کا ایفاء متوجہ ہوگا، اس لئے یہ وعدہ اہل مدارس کے ساتھ بیکار وغیر مثمر ہوگا، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

۱- ردالمحتار کتاب البیوع مطلب فی بیع الثمر والزرع والشجر مقصوداً ۷/۸۴-۸۵، البحرالرائق شرح کنز الدقائق کتاب البیع تحت قول الکنز "ومن باع ثمرة بعد اصلاحها اولا صح (۵/۵۰۲)۔

تالاب یا حوض کی مچھلی کی خرید وفروخت:

مچھلیوں کی بیع وشراء جائز ہے یا نہیں؟ اگر جائز ہے تو اس کے اصول وضوابط کیا ہیں؟

الجواب وباللہ التوفیق:

مچھلیوں کی بیع وشراء کے سلسلہ میں دو باتوں کا لحاظ بنیادی طور پر ضروری اور لازمی ہے۔

ا-مچھلیوں کا مالک ہونا، ۲- بائع کا اس کو مشتری کے تسلیم کرنے پر قادر ہونا۔

مالک ہونے کی مختلف شکلیں ہیں: (ا) مچھلی کی پرورش اور نشو ونما کے لئے ہی اس کو تالاب میں رکھا گیا ہو (۲) کسی آدمی نے تالاب میں مچھلیاں تو نہیں ڈالی ہیں لیکن ندی یا تالاب سے آجانے والی مچھلیوں کو روکنے اور واپس نہ جانے دینے کے لئے کوئی تدبیر کیا ہو، (۳) مچھلی کا شکار کر کے اس کو اپنے برتن میں حفاظت سے رکھ لیا ہو۔

اس کے علاوہ اور بھی ایک شکل فقہاء کرام نے تحریر فرمایا ہے اور وہ یہ کہ کسی کے تالاب یا حوض میں مچھلیاں بغیر کسی محنت ومشقت کے خود بخود آجائیں، لیکن صرف آجانے کی وجہ سے وہ اس کا مالک نہیں ہوگا، کیونکہ یہ ایسا ہے جیسے کہ کسی کے کھیت میں کوئی پرندہ آجائے یا کوئی پرندہ انڈا دے تو محض زمین میں پرندہ کے آنے یا انڈا دینے سے زمین والا اس کا مالک نہیں ہوجاتا ہے، بلکہ اس جانور اور انڈے پر جو بھی قبضہ کرے گا وہ اس کا مالک ہوجائے گا، خواہ زمین والا ہو یا کوئی دوسرا ہو، جیسا کہ ''عنایہ'' میں ہے:

''کما لو باض الطیر فی أرض إنسان أو فرخت فإنه لا یملک لعدم الإحراز''(۱)۔

(۲) مقدور التسلیم ہونا اس کی ایک شکل تو یہ ہے کہ شکار کر کے برتن میں یا تھیلی وغیرہ میں رکھ لے اور دوسری شکل یہ ہے کہ کسی ایسے چھوٹے گڑھے یا حوض میں رکھی جائے کہ جس سے اس کو نکالنا آسان ہو۔

جواب نمبر ا:۔بس جس شکل میں آدمی مچھلی کا مالک ہی نہ ہو تو اس کو فروخت کرنا کیسے درست ہوسکتا ہے، حدیث میں ''بیع ما لیس للانسان ''کی ممانعت وارد ہے، ''قال رسول اللہ ﷺ: لاتبع مالیس عندک''(۲)۔

''عن حکیم ابن حزام قال یا رسول اللہ! یا تینی الرجل فیرید منی البیع ما لیس عندی، فأبتاعه

۱- عنایہ شرح ہدایہ ۶/ ۴۱۰۔

۲- رواہ ابوداؤد والنسائی، مشکوۃ ۱/ ۲۴۸ باب المنہی عنہا من البیوع۔

له من السوق؟ فقال: لا تبع مالیس عندک، اخرجه ابوداؤد وسکت عنه"(۱)۔

(۲) اسی طرح اگر مالک تو ہو لیکن تسلیم پر قادر نہ ہو تو بھی اس کی بیع جائز نہیں ہے، حدیث میں اس سے منع وارد ہے، امام ابو یوسف نے کتاب الخراج میں ایک روایت درج کی ہے:

"حدثنا یزید بن ابی زیاد عن المسیب بن رافع عن عبد اللہ بن مسعود انه قال: لا تبیعوا السمک فی الماء فانه غرر۔ وقال ابو یوسف ایضا: حدثنا بن ابی لیلی عن عامر الشعبی قال: نهی النبی ﷺ عن بیع الغرر" (۲)۔

علامہ ابن ہمام صاحب ہدایہ کے قول: "ولا یجوز بیع السمک قبل أن یصطاد، لانه با ع مالا یملکه (ولا فی حظیرة اذا کان لا یوخذإلا بصید) لانه غیر مقدور التسلیم" یہاں ابن ہمام نے اس پر گفتگو کرتے ہوئے اس کے جواز اور عدم جواز کی مختلف شکلوں کا ذکر فرمایا ہے: "بیع السمک فی البحر أو النهر لا یجوز فإن کانت له حظیرة فدخلها السمک فإما أن یکون أعدها لذلک أو لا فإن کان أعدها للملک فما دخلها ملکه ولیس لأحد أن یاخذه ثم إن کان یوخذ بغیر حیلة إصطیاد جازبیعه، لانه مقدور التسلیم مثل السمکة فی جب وإن لم یکن یؤخذ إلآبحیلة لا یجوز بیعه لعدم القدرة علی التسلیم عقیب البیع، وإن لم یکن أعدها لذلک لا یملک ما یدخل فیها فلا یجوز بیعه لعدم الملک إلا أن یسد الحظیره إذا دخل فحینئذ یملکه ثم ینظر إن کان یؤخذ بلا حیلة جاز بیعه وإلا لا یجوز، ولو لم یعدها لذلک ولکنه أخذه ثم أرسله فی الحظیرة ملکه، فان کان یؤخذ بلا حیلة جاز بیعه، لأنه مملوک مقدورالتسلیم، أوبحیلة لم یجز لانه وإن کان مملوکاً فلیس مقدورالتسلیم۔ وقال ابو یوسف فی کتاب الخراج: رخّص فی بیع السمک فی الآجام أقوام فکان الصواب عندنا فی قول من کرهه۔

حدثنا العلاء بن المسیب بن رافع عن الحارث العکلی عن عمر بن الخطابؓ قال: لاتبایعوا السمک فی الماء فإنه غرر، وأخرج مثله عن ابن مسعود، ومعلوم أن الأجمة قد یوخذ منها السمک بالید و الغرر الخطر وغیر المملوک علی خطر ثبوت الملک وعدمه فلذا جعل من بیع الخطر" (۳)۔

۱- اعلاء السنن ۱۴/۱۵۱۔
۲- کتاب الخراج/ص ۹۴و ۹۵۔
۳- فتح القدیر ۶/۴۰۹،۴۱۰۔

علامہ شامی نے بھی اسی طرح کی تفصیلات کا ذکر فرمایا ہے کہ مچھلی جب گڑھے میں داخل ہوتو یا تو اس کو اسی مقصد کے لئے تیار کیا ہوگا یا نہیں، اول صورت میں وہ اس کا مالک ہوجائے گا اور کسی کو بھی اس کے لینے کا حق نہ ہوگا، پھر اگر کسی حیلہ کے بغیر اسی کا لینا ممکن ہوتو اس کو فروخت کرنا بھی درست ہوگا، کیونکہ وہ مملوک بھی ہے اور مقدور التسلیم بھی اور اگر کسی حیلہ کے بغیر اسی کا لینا ممکن نہ ہوتو اس کی بیع درست نہیں ہوگی، کیونکہ اس کو حوالہ کرنا ممکن نہیں ہے۔

اور دوسری صورت میں بھی اس کا مالک ہی نہیں ہوگا تو بیع بھی جائز نہ ہوگی، مگر یہ کہ گڑھے میں مچھلی کے داخل ہونے کے بعد وہ اس کا راستہ بند کردے تو اب وہ اس کا مالک ہوجائے گا، پھر اگر کسی دشواری کے بغیر اس کا لینا ممکن ہوتو اس کی بیع درست ہوگی ورنہ درست نہیں ہوگی، اور اگر اس نے گڑھا خود نہیں بنایا۔ لیکن مچھلی حاصل کر کے اس میں چھوڑ دیا تو اب بھی وہ اس کا مالک قرار پائے گا اور اب اگر کسی دشواری اور حیلہ کے بغیر اسی کا لینا ممکن ہوتو اس کی بیع جائز ہوگی، اس لئے کہ اس کو مشتری کے حوالہ کرنا ممکن ہے اور اگر حوالگی میں دشواری ہوتو اب اس کی بیع جائز نہ ہوگی، کیونکہ وہ اگر چہ اس کے ملک میں ہے مگر اس کو حوالہ کرنا ممکن نہیں ہے (۱)۔

مذکورہ بالا عبارات اور قواعد فقہیہ کے پیش نظر سوال میں مذکور خرید فروخت کو مجہول اور غیر مقدور التسلیم ہونے کی وجہ سے ناجائز قرار دیا جائے گا۔

البتہ بعض فقہاء کرام فساد بیع کی تقسیم کرتے ہیں کہ کبھی فساد حق شرعی کی وجہ سے ہوتا ہے اور یہ کہ وہ معاملہ کسی گناہ پر مشتمل ہوتا ہے اور کبھی فساد حق شرع کی وجہ سے نہیں بلکہ مفضی الی المنازعت ہونے کی وجہ سے ہوتا ہے، ایسی صورت میں جبکہ باہم منازعت نہ ہوتو اس کو جائز ہونا چاہیے۔

چنانچہ علامہ کشمیری علیہ الرحمہ فرماتے ہیں: "ان من البیوع الفاسدة مالوآتی بھا أحدجازت دیانة و إن کانت فاسدة قضاء وذلک لأن الفساد قد یکون لحق الشرع بان اشتمل العقد علی مأثم فلا یجوز بحال، وقد یکون الفساد لمخافة التنازع ولا یکون فیه شئی آخر یوجب الإثم إن لم یقع فیه التنازع جاز عندی دیانة، و إن بقی فساد القضاء لا رتفاع علة القادحة وھی المنازعة" (۲)۔

بیع سمک کے سلسلہ میں بھی علت حرمت دھوکا اور غرر ہی ہے جیسے کہ حضرت عبد اللہ ابن مسعود اور حضرت عمر

۱- ردالمحتار ۳؍۱۰۴۔

۲- فیض الباری ۳؍۲۵۸۔

ابن الخطاب کی روایات میں صراحۃ اس کا ذکر موجود ہے یعنی ان کا یہ قول "لا تبيعوا السمک فی الماء فانه غرر"۔

جواب نمبر ۲: ٹھیکیدار کا فاسد طریقہ سے حاصل کردہ مچھلیوں کی بیع یہ بیع فاسد ہے اور اس کا حکم یہ ہے کہ وہ معقود علیہ میں ملکیت کا فائدہ صاحب ملک کی رضامندی کے بغیر نہیں دیا کرتا ہے اور مبیع مشتری کے قبضہ میں قبضہ ضمان کے ساتھ ہوتا ہے اگر اس کے قبضے میں ہلاک ہو جائے تو مثل یا اس کی قیمت کا وہ ضامن ہوتا ہے(۱)۔

علامہ ابن ہمام فرماتے ہیں: "ثم إنه و إن افادالملک وهو مقصود فی الجمله لکن لا ینعقد عامةاذ لم ینقطع به حق البائع من المبیع ولا المشتری من الثمن اذ لکل منهما الفسخ بل یجب علیه" (۲)۔

اور ہدایہ میں ہے: "واذاقبض المشتری المبیع فی البیع الفاسد بأ مرالبائع وفی العقد عوضان کل واحد منهما مال ملک المبیع ولزمته قیمته" (۳)۔

حضرت مفتی نظام الدین صاحب اسی طرح کے مسئلہ میں ارشاد فرماتے ہیں، البتہ بغیر پکڑے اور قبضہ میں لائے فروخت کرنا بیع مالم یقبض ہوکر بیع فاسد ہوگی اور مملوک رہنے کی وجہ سے بیع باطل نہیں ہوگی اور بیع فاسد ہونے کا ثمرہ یہ ہوگا کہ اگر مالک کے قبضہ میں آئے بغیر فروخت ہو جائے اور مشتری پھر اس کو فروخت کردے اور مالک کو اعتراض نہیں تھا بلکہ اجازت تھی تو یہ دوسری بیع جو ہوگی وہ صحیح ہوگی اور سمک مبیع لہذا المبیع کا استعمال کرنا درست رہے گا (۴)۔

حاصل یہ کہ بیع فاسد کے سلسلہ میں اصول احناف کے پیش نظر بائع کی اجازت سے ٹھیکیدار مالک ہو جائے گا اور اس کا دوسرے کے ہاتھ بیچنا اور دوسرے کا خریدنا جائز ہوگا۔

جواب نمبر ۳: حوض یا تالاب چاہے سرکاری ہوں چاہے کسی شخص کی ذاتی ملکیت کے ہوں ان کی مچھلیاں شکار کرنے سے پہلے کسی کے ہاتھ فروخت کرنا جائز نہیں ہے اور اس حکم کی علت غرر اور اس کا غیر مقدور التسلیم ہونا ہے، لہذا سوال نمبر ا کی طرح اس میں بھی وہی فساد کا حکم لگے گا۔

جواب نمبر ۴: نجی ملکیت کے حوض یا تالاب میں جو مچھلیاں پالے بغیر بارش وغیرہ کی وجہ سے ازخود اگتی ہوں تو دیکھا جائے گا کہ اگر وہ حوض یا تالاب اس نے اسی غرض سے بنایا تھا تو وہ اس کا مالک ہو جائے گا اور کوئی ان مچھلیوں کو لے

۱- الالتزامات/ص ۱۸۴۔

۲- فتح القدیر ۶/ ۴۰۱۔

۳- ہدایہ ۳/ ۴۷۔

۴- نظام الفتاویٰ ۱/ ۲۴۴۔

نہیں سکتا ہے، پھر اگر اس کے اندر کی مچھلیاں شکار کئے بغیر پکڑی جا سکے تو اس کی بیع جائز ہوگی اور اگر بغیر شکار کئے پکڑی نہ جا سکے تو اس کی بیع جائز نہیں ہوگی (۱)۔

علامہ ابن ہمام نے ایک جزئیہ اسی طرح کا تحریر فرمایا ہے : ''**من حظر حظيرة فوقع فيها صيد فإن كان إتخذها للصيد ملكه و ليس لأحد أخذه و إن لم يتخذ ها له فهو لمن أخذه**'' (۲)۔

اسی طرح کا ایک مسئلہ اور ہے کہ اگر حظیرہ وغیرہ شکار کے لئے نہ بنایا ہو تو صرف مچھلی کے داخل ہونے سے وہ مالک نہیں ہوگا، البتہ اگر اس حظیرہ کو بند کردے تو اب وہ مچھلیوں کا مالک ہو جائے گا (۳)۔

اور عنایہ میں ہے: ''**وفيه إشارة إلى أنه لو سدّ صاحب الحظيرة عليها ملكها أما بمجرد الاجتماع في ملكه فلا كما لو باض الطير في أرض إنسان أو فرخت فانه لا يملك لعدم الإحراز**'' اسی سے آگے شہد اور مچھلی کا فرق واضح کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''**لا يشكل بما اذا عسل النحل في أرضه فإنه يملكه بمجرد إتصاله بملكه من غير أن يحرزه او يهيئ له موضعا، لأن العسل اذا ذالك قائم بارضه على وجه القرار فصار كالشجر الثابت فيها بخلاف بيض الطير و فرخها والسمك المجتمع بنفسه فانها ليست فيها على وجه القرار**'' (۴)۔

لہٰذا صورت مسئولہ میں مچھلیاں اگر از خود آ گئی ہوں تو احتراز کی وجہ سے اور اسی نیت سے حوض کو بنانے کی وجہ سے وہ مالک ہو جائے گا اور اس کے لئے اس کو فروخت کرنا جائز ہوگا، البتہ ٹھیکہ پر دوسرے کو دینے کے سلسلہ میں ائمہ کا اختلاف ہے۔

امام ابو یوسفؒ نے فرمایا: ''**حدثنا عبدالله بن علي عن إسحاق عن ابي الزناد، وقال: كتبت الى عمر بن عبد العزيز في بحيرة يجتمع فيها السمك بأرض العراق، نواجرها فكتب أن إفعلوا وقال: حدثنا أبو حنيفة عن حماد قال: طلبت إلى عبدالحميد بن عبدالرحمن فكتب إلى عمر بن عبدالعزيز يسأله عن بيع صيدالأجام فكتب إليه عمراً نه لابأس به وسماه الحبس**''۔''**لكن بعد مدة رأيت في**

۱- عالمگیری ۳/۱۱۳۔
۲- فتح القدیر ۶/۴۱۰۔
۳- فتح القدیر ۶/۴۱۵۔
۴- عنایہ مع فتح القدیر ۶/۴۱۰۔

الایضاح عدم جواز اجارته"۔

علامہ شامی منحۃ الخالق میں النہر الفائق کے حوالے سے فرماتے ہیں کہ ایضاح کی عبارت قواعد فقہیہ سے زیادہ قریب ہے (جس میں عدم جواز کا قول ہے) اور علامہ رملی نے دونوں کی عبارت کے تضاد کو دور کرتے ہوئے فرمایا کہ عدم مطلق ہے چاہے کسی شخص کی زمین میں ہو یا وقف کی ہو اور امام ابو یوسف کا جواز کا قول بھی قواعد کے خلاف نہیں ہے، لیکن وہ مخصوص جگہ اور معلوم منفعت کے لئے (یعنی شکار کے لئے) تھا، البتہ امام صاحب کی حضرت سماک سے جواز کی روایت کی تطبیق مشکل ہے، کیونکہ وہ شکار سے پہلے مچھلی کی بیع کرنا ہے مگر اس کا بھی یہ جواب دیا گیا کہ وہ ایسی جھاڑی اور گنجان درختوں کے بارے میں ہے جو اسی مقصد کے لئے تیار کئے گئے تھے اور اسی میں مچھلی کی سپردگی مقدور التسلیم تھی(۱)۔

خلاصہ یہ ہے کہ تالاب والا مالک ہو جائے گا، البتہ شکار کئے بغیر ٹھیکہ پر دینے میں وہی غیر مقدور التسلیم اور غیر مقبوض کی بیع لازم ہوگی جو صحیح نہیں ہے۔

امداد الفتاوی میں اسی طرح کا ایک سوال اور اس کا جواب ہے:

سوال ہے صفائی معاملات (یہ ایک کتاب ہے) میں ایک مسئلہ مرقوم ہے اور وہ یہ کہ تالاب یا دریا ماہی گیروں کو دیدیا جاتا ہے اور دوسروں کو اس تالاب سے مچھلی پکڑنے نہیں دیا جاتا ہے تو یہ بیع باطل ہے۔ وفیہ بعد سطرین بلکہ سب کو مچھلیاں پکڑنے کا شرعا حق حاصل ہے ازیں مسئلہ زید می گوید کہ بدون اطلاع مالک تالاب خفیہ اگر تالاب سے مچھلیاں پکڑ لاوے تو گناہ نہیں ہوگا کیونکہ شرعا اس میں سبھی کا حق ہے تو حضرت یہ قول زید کا صحیح ہے یا نہیں؟

الجواب: زید کا قول صحیح ہے اور خفیہ طور سے مچھلی پکڑنا تالاب سے درست ہے لیکن اگر مالک تالاب نے مچھلیاں کہیں سے لاکر اپنے ہاتھ سے تالاب میں چھوڑی ہوں تو پھر وہ مچھلیوں کا مالک ہوجائے گا اور خفیہ طور سے پکڑنا بھی درست نہیں ہے۔

لیکن بیع کرنا بدون پکڑے ہوئے پھر بھی درست نہیں - واللہ اعلم، امداد الفتاوی ۳/ ۵۰۔

خون و اعضاء کی خرید وفروخت:

خون وغیرہ کو خریدا اور بیچا بھی جاتا ہے، یہ صورتِ حال آج پوری دنیا میں پائی جاتی ہے، سوال یہ ہے کہ کیا مذہبی نقطۂ نظر سے یہ جائز ہیں؟

۱- منحۃ الخالق علی البحر، ص ۹،۷۰۵ ۔

۱-اشکال یہ ہے کہ فقہاء نے اضطرار کے تعین کا حق طبیب مسلم کو دیا ہے،لیکن ایلو پیتھک اور سرجری علاج میں عموماً غیر مسلم ڈاکٹر ہی میسر آتے ہیں،لہذا ایسی صورت میں غیر مسلم ڈاکٹر کی رائے اور تحقیق پر اعتماد کیا جاسکتا ہے یا نہیں؟ اصولاً تو اعتماد کرنا چاہیے کیونکہ یہ مسئلہ شہادت کا نہیں ہے، اس میں صرف حذاقت وعدالت ہی کافی ہوتی ہے، نیز اضطرار کے موقع پر یہ شرط عجیب ہی معلوم ہوتی ہے، اس وقت تو طبیب کی شرط بھی ختم کردی جاتی ہے،حضرت مولانا تھانویؒ فرماتے ہیں کہ ضرورت میں متاخرین نے تداوی بغیر الطبیب کی اجازت دی ہے(۱)۔

لہذا خلاصہ دریافت طلب امر یہ ہے کہ اضطرار اور ضرورت شدید کی حالت میں محض ماہر ڈاکٹر کی تجویز پر خواہ وہ مسلم ہو یا غیر مسلم، کیا خون یا دیگر ممنوعات شرعیہ کو استعمال کیا جاسکتا ہے؟

۲-اس لیے ضروری یہ ہے کہ اضطرار کا ایسا شرعی معیار مقرر کیا جائے جس سے یہ فیصلہ کرنا آسان ہوجائے کہ جس اضطرار کے نتیجہ میں اعضاء کی تبدیلی جائز ہوسکتی ہے وہ یہاں پایا جاتا ہے یا نہیں؟ اصولاً ہر مضرت اور حرج کے خوف کا نام اضطرار ہی ہے جیسا کہ آیت کریمہ:"مایرید الله لیجعل علیکم فی الدین من حرج" (۲)کے عموم سے متبادر ہوتا ہے، اسی لیے فقہ حنفی ہر مضرت کو اضطرار تسلیم کرتا ہے، چنانچہ تیمم کے باب میں جہاں ''ازدیاد مرض'' کے خوف کو اضطرار و حرج مانا گیا ہے کہ ''إن المریض اذا خاف زیادة المرض أوخاف إبطاء البرء جاز لهٗ التیمم'' ان الفاظ میں مطلق خوف مرض کو بھی اضطرار و مضرت تسلیم کیا گیا ہے الجنب الصحیح فی المصر إذا خاف بغلبة ظنه عن التجربة الصحیحة إن اغتسل یقتله البرد أو یمرضه یتیمم عند ابی حنیفة'' (۳)۔

کیا ان مثالوں پر قیاس کرتے ہوئے حسب ذیل ضرورت کو اضطرار والی ضرورت مانا جاسکتا ہے،ضرورت یہ ہے کہ عمر کی آنکھوں کی اوپر کا پردہ خراب ہونے کی وجہ سے بینائی کا راستہ مسدود ہو چکا ہے،لیکن اگر کسی کی آنکھ اس کے لگادی جائے تو ڈاکٹروں کی تحقیق یہ ہے کہ وہ بینا ہوجائے گا۔

۱-کسی متوفی کی آنکھیں لے کر آنکھوں کی تبدیلی کرائے۔

۲-اور کیا متوفی کے لیے جائز ہے کہ اپنی آنکھوں کے متعلق یہ وصیت کرے کہ مرنے کے بعد ان کو نکالا جائے تاکہ وہ کسی کے کام آسکیں۔

۱-	امداد الفتاوی ۱۹۹/۔

۲-	سورۂ مائدہ ۶۔

۳-	کبیری الشیخ ابراہیم الحلبی، ۶۴۔

۳-اور چونکہ ایسی ضرورت پیش آنے کا کوئی وقت متعین نہیں ہوتا، اس لیے کیا یہ جائز ہے کہ بطور پیش بندی آنکھوں وغیرہ کو جمع کرنے کے لیے آنکھوں کا بینک قائم کیا جائے، جس طرح "أعدوا لهم ما استطعتم" سے اسلحہ وغیرہ کا جنگ اور نا جنگ دونوں حالتوں میں موجود رہنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔

۴-اگر آنکھوں کی تبدیلی جائز ہے تو ان کی خرید فروخت یقیناً جائز ہونی چاہیے، کیونکہ فقہ کا مشہور اصول ہے کہ "جواز البيع يدور مع الانتفاع" (۱) لیکن اس صورت میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس بیع سے حاصل شدہ رقم کی حیثیت کیا ہوگی، اصولاً تو اس رقم کو حرام ہی ہونا چاہیے، کیونکہ یہ رقم ایسے مال کی بیع سے حاصل ہوئی جو خریدار کے لئے تو بوجہ اضطرار جائز ہے، لیکن بائع کے لئے بعدم الاضطرار حرام ہے، حضرات علماء کرام اپنی قیمتی آراء وتحقیقات سے ادارہ کو مطلع فرمائیں، ادارہ آپ کی علمی کاوشوں کے لیے چشم براہ ہے۔

(۳و۴) جب خون کے استعمال کی گو بدرجۂ مجبوری ہی ہو گنجائش ہوگی تو چونکہ ایسی مجبوریاں اچانک بھی پیدا ہوجاتی ہیں، اور خون کی بہت زیادہ مقدار کی متقاضی ہوجاتی ہیں جیسے ریل کے ایکسیڈنٹ کے موقع میں، یا جنگ ومحاربہ کے اندر بسا اوقات بیک وقت بہت زیادہ افراد زخمی ہوجاتے ہیں اور ان کی جان بچانے کے لیے ان سب کو خون کا انجکشن دینا ضروری ہوتا ہے، اور پھر اس میں بھی مریض کے خون کا نمبر اور جو خون چڑھایا جاتا ہے اس خون کا نمبر یکساں ہونا ضروری ہوتا ہے ورنہ بجائے نفع کے نقصان کا اندیشہ ہوجاتا ہے، اس لیے ان اچانک پیش آمدہ ضروریات کے لیے ہر نمبر کے خون کا فراہم رکھنا بھی ضروری ہوجاتا ہے اور مقدار کی تعیین وتحدید معلوم نہ ہونے کی وجہ سے کافی مقدار میں محفوظ رکھنا ضروری ہوگا، اور اس کا ایک خزانہ بنانا بھی لازم ہوگا جس کو آج کل کی اصطلاح میں بینک کا نام دیا جاسکتا ہے، لأن الشئي اذاثبت ثبت بجميع لوازمه، لہٰذا اس فراہمی کے اور محفوظ رکھنے کے جو مناسب طریقے ہوں گے، اور ان میں جو اخراجات درکار ہوں گے، ان سب کو بھی حدود شرع میں رہتے ہوئے برداشت کرنا ہوگا۔

(۲) کوئی شخص اپنے کسی عضو کا مالک نہیں ہوتا، بلکہ صرف نگراں اور محافظ ہوتا ہے، اور حکم شرعی کے خلاف اس میں کسی تصرف کا بھی حق کسی کو نہیں ہوتا ہے، لہٰذا کسی عضو کا زندگی میں فروخت کرنا یا کسی کو دینا یا مرنے کے بعد کے لیے دینے کی وصیت کرنا کچھ بھی جائز نہ ہوگا۔ یہی حکم شریعت مطہرہ کا اصل حکم خون اور تمام اعضاء انسانی کا ہے۔

اور سوال نمبر (۱) میں خون کے استعمال کی جو گنجائش ہے وہ صرف وقتی اور عارضی ہے اور حالت اضطرار ومجبوری

۱- شامی ۴/ ۱۴۰۔

خون کے علاوہ اور عضو میں متحقق نہیں ہوتی جیسا کہ بعد کے جوابات سے واضح ہوجائے گا، اس لیے کسی عضو کو خون پر قیاس کرنا بھی صحیح نہ ہوگا۔

لہٰذا سوال نمبر (۲) میں درج شدہ صورت کے جواز کی شرعاً کوئی گنجائش نہ ہوگی، اور ساری دنیا میں اس کا رائج ہوجانا بھی اس کے جواز کی دلیل نہیں بن سکتا، کسی غلط یا حرام شئے کا دنیا میں رائج و عام ہوجانا کوئی شرعی حجت نہیں ہے۔

حضور علیہ السلام کے زمانہ بعثت میں سارا عالم کفر وضلالت میں مبتلا تھا، اور طرح طرح کے محرمات ومناہی (ربوا وغیرہ) میں ابتلاء عام تھا، مگر یہ عموم وشیوع وجہ جواز نہ بنا بلکہ آئندہ کے بارے میں بھی مروی ہے کہ ایک وقت ایسا آئے گا کہ دین پر عمل کرنا اتنا دشوار ہوگا جیسے ہاتھ پر انگارہ لینا (۱)، نیز مسلم شریف میں ہے: "العبادة في الهرج كهجرة إليّ" (۲) یہ سب خود اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اس وقت ارتکاب محرمات ومناہی عام وشائع ہو چکے ہوں گے اور عمل دشوار ہوجائے گا، مگر اس کے باوجود ان محرمات ومناہی کے جواز واباحت کی جانب کوئی اشارہ نہیں دیا گیا۔ اور بات بھی یہی ہے کہ یہ شیوع مناہی ومعاصی اور یہ پریشانیاں اور یہ احوال ہمارے ہی اعمال بد کا رد عمل ہیں: "كما روي أعمالكم عما لكم" یا "كما تكونوا يولى عليكم" (الحدیث)، بلکہ نص قرآنی ہے: "ذلك بأن الله لم يك مغيرا نعمة أنعمها على قوم حتىٰ يغيروا ما بأنفسهم" (۳)، لہٰذا اصل علاج یہ نہ ہوگا کہ ہر چیز جو دائر وسائر اور عام ہوجائے اس کے جواز کی راہیں تلاش کی جانے لگیں، بلکہ اصل علاج انابت الی اللہ ہے اور اس بات کی سعی ہے کہ قوم من حیث القوم میں مزاج عمل ظاہراً وباطناً انابت الی اللہ ہوجائے۔

"كما روى في الحديث القدسي عن أبي الدرداء قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: "إن الله يقول: أنا الله لا إله إلا أنا مالك الملوك، وملك الملوك، قلوب الملوك في يدي وإن العباد إذا أطاعوني حولت قلوب ملوكهم عليهم بالرحمة والرأفة وإن العباد إذا عصوني حولت قلوبهم بالسخطة والنقمة فساموهم (أي اذا قهم) سوء العذاب، فلا تشغلوا أنفسكم بالدعاء على الملوك، ولكن إشغلوا أنفسكم بالذكر والتضرع، كي أكفيكم" (۴)۔

۱- مشکوۃ ۲/۴۵۹۔
۲- کتاب الفتن ۲/۴۰۶۔
۳- سورۂ انفال: ۵۳۔
۴- رواہ ابونعیم فی الحلیۃ مشکوۃ، ۳۲۳، کتاب الامارہ۔

اب اس کے بعد جناب کے پیش کردہ سوالات کے جواب معروض ہیں:

۱- یہ مسئلہ گرچہ باب شہادت کا نہیں ہے مگر چونکہ اس میں ایک حرام قطعی کے استعمال کی گنجائش دینی ہوتی ہے جس کی حرمت منصوص بنص قطعی ہوتی ہے، اس کا تقاضا یہ ہے کہ اس اجازت کی علت یا بنیاد جو بحوائے آیت کریمہ: ’’ **ومن اضطر غیر باغ ولا عاد فلا إثم علیه**‘‘ (۱) اور بحوائے منطوق کلام الٰہی: ’’ **فمن اضطر فی مخمصة غیر متجانف لإثم فإن الله غفور رحیم**‘‘ (۲)، اضطرار ومجبوری جو بھی ہو وہ قطعی الثبوت ہونا چاہیے اور یہ قطعیت معالج کی حذاقت فن ومہارت کے ساتھ اس بات کی متقاضی ہے کہ اس میں دیانت صحیحہ بھی ہو، اور یہ وصف (دیانت صحیحہ) صرف دیندار مسلم معالج میں ہی متحقق ہوگا اور ہوسکتا ہے، اس لیے کہ اس کے نزدیک حلت وحرمت کی اہمیت دنیا وآخرت دونوں اعتبار سے ہوگی، اور وہ اس کے خلاف کے ارتکاب کی جرأت عموماً نہ کر سکے گا، دنیوی واخروی دونوں کے وبال سے ڈرے گا او روافعی اضطرار ومجبوری کے مواقع کو تلاش کرے گا اور احتیاط برتے گا۔

غیر مسلم سے یہ توقع نہیں، کیونکہ اس کو تو اس حلت وحرمت کا عقیدہ نہ ہوگا، تو اس سے اس قسم کی اہمیت کا کیا سوال، لہٰذا اس کا قول یا تشخیص کرنا حجت نہ ہوگا، بلکہ اگر طبیب مسلم بھی بادیانت نہ ہو تو اس کا قول بھی شرعاً معتبر نہ ہوگا، ان ہی اسباب ووجوہ کی بنا پر فقہاء نے یہ قیود لگائی ہیں اور یہی اصل حکم ہوگا۔

نصوص قرآنیہ مذکورہ بالا سے بھی ان قیود کی طرف اشارہ ملتا ہے، البتہ جس وقت اضطرار ومجبوری کا تحقق جو گنجائش دینے کی بنیاد ہے، ظاہر اور نمایاں ہوجائے اس وقت ان قیود کی حاجت نہ ہوگی جیسا کہ ایکسیڈنٹ وغیرہ میں اس تحقق کا ظہور نمایاں ہوتا ہے، یا مثلاً کسی تندرست قوی عورت کو دم استحاضہ میں خون اتنا نکل جائے کہ جاں بلب ہوجائے، یا تندرست قوی آدمی کو نکسیر پھوٹ کر اتنا خون نکل جائے کہ جاں بہ لب ہوجائے، ظاہر ہے کہ یہ حالت خون کی کمی کی وجہ سے ہی ہے اور اس کا بدل کوئی اور چیز ہو ہی نہیں سکتی، اگر خون نہ چڑھایا جائے تو موت اغلبی درجہ میں یقینی ہے، لہٰذا ایسی حالت میں اضطرار ومجبوری کے تحقق میں کیا شبہ ہوگا اور خون چڑھانے کے جواز میں اس حالت میں کیا کلام ہوگا۔

فقہاء متاخرین سے جو چھوٹ بعض صورتوں میں منقول ہے وہ اسی قسم کے مواقع کی ہے نہ کہ کلیہ قاعدہ اور عام ضابطہ کہ اشکال والجھن کا سبب ہو، اور حضرت تھانویؒ کی جو عبارت جناب نے پیش فرمائی ہے وہ تو تداوی بغیر الطبیب کا مسئلہ ہے،

۱- سورۂ بقرہ: ۱۷۳۔

۲- سورۂ مائدہ: ۳۔

وہ تداوی بالمحرم کا مسئلہ نہیں ہے، یہ دونوں دو مسئلے ہیں، اس سے نہ معلوم جناب نے استشہاد کس بنا پر فرمایا ہے۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ جب تک اس اضطرار و مجبوری کے تحقق کا ظہور نمایاں نہ ہو جیسا کہ عام حالات میں ہوتا ہے، اس وقت تک بغیر باشرع طبیب حاذق کی تشخیص و مشورہ کے ممنوعاتِ شرعیہ کو استعمال نہیں کیا جا سکتا اور اس کا استعمال کرنا جائز نہ ہوگا، ہاں اگر کوئی خطہ یا ملک ایسا ہو جہاں ایسے طبیب میسر ہی نہ آتے ہوں تو وہاں بوجہ مجبوری مطلق طبیب حاذق کی جو مسلمانوں کے مذہب کا احترام اور اس کی رعایت کرتا ہو، اور تجربہ اس پر شاہد ہو خواہ غیر مسلم ہی ہو، معتمد و معتبر ہو، اس کی تشخیص پر بھی استعمال کی گنجائش ہو جائے گی۔

اس سلسلہ میں حضرت مفتی محمد شفیع صاحبؒ کا اخیر رسالہ ''انسانی اعضاء کی پیوند کاری'' بھی دیکھنے کے لائق ہے، بڑی سیر حاصل و بے نظیر بحثیں کی ہیں۔

۲-جناب نے ہر مضرت و حرج کے خوف کو اضطرار قرار دیا ہے اور استدلال میں فقہ کی تین عبارتیں پیش کی ہیں:

الف-منیہ کی عبارت (إن المريض إذا خاف) حالانکہ اسی عبارت سے متصل یہ عبارت کبیری ص ۶۳ میں موجود ہے: ''ويعرف ذالک إما بغلبة الظن عن أمارة أو تجربة او باخبار طبيب حاذق مسلم غير ظاهر الفسق وقيل عد الته شرط''، اور اس عبارت سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہر مضرت و حرج کا خوف اضطرار نہیں ہے، بلکہ خوف سے وہ خوف مراد ہے جو ان مذکورہ شرائط کے ساتھ متحقق ہو۔

ب-کبیری ص ۶۴ کی عبارت ''الجنب الصحيح في المصر إذا خاف بغلبة ظنه عن التجربة الصحيحة إن اغتسل يقتله البرد أو يمرضه'' اس عبارت میں خود ''بغلبة الظن'' اور تجربہ صحیحہ کی قید موجود ہے، یہ بھی ہر مضرت و حرج کے خوف کے معتبر ہونے کی نفی کرتا ہے۔

ج-امداد الفتاویٰ ۱۹۸، کی عبارت، اس عبارت میں تو حکومت وقت کے جبریہ حکم کے بارے میں کہا گیا ہے جس کا تعلق مسئلۃ الاکراہ سے ہے نہ کہ ہر خوف سے، لہٰذا یہ عبارت ہر مضرت و حرج کے اضطرار ہونے پر دلالت نہیں کرتی۔

اصل وجہ یہ ہے کہ جناب کو اضطرار و اکراہ و ضرورت و حرج وغیرہ کے مفاہیم شرعیہ میں خلط ہو گیا، حالانکہ ہر ایک الگ الگ مفاہیم رکھتے ہیں اور ہر ایک کے الگ الگ حدود و احکام ہیں، احقر ہر ایک کے مفاہیم شرعیہ اور اس کے حدود و احکام کو اجمالاً عرض کرتا ہے، اس سے امید ہے کہ یہ خلط مرتفع ہو کر بصیرت سے رائے قائم ہو سکے گی۔

اللہ تبارک وتعالیٰ نے محرمات منصوصہ بہ نص قطعی میں گنجائش کے لیے ایک ضابطہ بیان فرمایا ہے، ارشاد ہے: ''وقد

فصل لکم ما حرم علیکم إلا ما اضطررتم إلیه، وإن کثیرالیضلون بأهوائهم بغیر علم ان ربک هو أعلم بالمعتدین'' (۱)۔

اس ضابطہ میں محض اضطرار کو مستثنیٰ فرمایا ہے، پھر ساتھ ہی تنبیہ بھی فرمادی ہے جس سے واضح ہوتا ہے کہ اضطرار کے مستثنیٰ ہونے کی کچھ قیود وشرائط بھی ہیں، اگر ان کالحاظ نہ کیا گیا تو گمراہی میں مبتلا ہوجائے گا، پھر ان قیود کو دوسری آیت کریمہ میں واضح فرمایا ہے، منجملہ ان کے سوال نمبر (۱) کے جواب میں درج شدہ دو آیت بھی ہیں ان میں سے ایک کے اندر'' غیر متجانف لإثم'' (أي غیر متجاوز عن الحدود الشرعیة) کی قید ہے، اور دوسری آیت کریمہ:'' غیر باغ ولا عاد'' (أی غیر قاصدللخروج عن الحدود الشرعیة والأمر للخروج عن الحدود الشرعیة) کی قید ہے۔

پھر اس ضابطہ کی تفصیل وتشریح کتب احادیث وفقہ واصول فقہ میں ہے جس کے تحت استثناء کی مندرجہ ذیل صورتیں نکلتی ہیں:

۱-مخمصہ، بھوک اور پیاس کی پریشانی سے جاں بہ لب ہوجائے، جان بچانے کی کوئی صورت ظاہر نہ رہے، اسی کو ''فمن اضطر في مخمصة غیر متجانف لإثم'' (۲) میں فرمایا گیا، یہ اضطرار کی انتہائی شدید صورت ہے۔

۲-جان کے یا کسی عضو کے تلف ہونے کا یا ناقابل تحمل جسمانی تکلیف (مثلاً بصورت زدوکوب) یا حبس مدید (طویل قید) کا یا شدید مالی نقصان کا جو ناقابل تلافی ہو، ایسا خطرہ ہوجائے کہ اسباب کے تحت اس سے بچنے کی کوئی تدبیر نظر نہ آئے۔

اگر یہ صورت کسی دشمن یا ظالم کے جبر واکراہ کرنے سے ہو تو اس کو اکراہ ملجی اور جبر تام کہتے ہیں، اس کے بارے میں حدیث شریف میں ہے:'' إن الله تجاوز عن أمتی الخطاء والنسیان وما استکرهوا علیه'' (۳)'' وفي شرحه: أي ماطلب منهم من المعاصي علیٰ وجه الإکراه'' اور اسی کے بارے میں'' درالمختار'' میں ہے :'' وإن أکرهه بقتل ملجئٍ أوقطع عضو أو ضرب حل الفعل'' ۔

اسی طرح کی اور بھی تفصیلات فقہ کی کتاب الاکراہ میں مذکور ہیں، بسبب خوف طوالت ذکر نہیں کرتا، جناب خود مراجعت فرمالیں۔

۱- سورۂ انعام ۱۱۹۔
۲- سورۂ مائدہ ۳۔
۳- مشکوٰۃ ۵۸۴۔

۳- یہی صورتیں اگر کسی مکرہ یا جابر کے جبر واکراہ کرنے کے بغیر خود بخود پیدا ہوجائیں، اوران کے زائل کرنے اور مرتفع کرنے کے اسباب اختیار میں نہ رہیں تو اس کو ضرورت کہتے ہیں اور اسی کے بارے میں فقہاء کرام ''الضرورات تبیح المحظورات''(۱) فرماتے ہیں۔

۴- جان کے یا کسی عضو کے تلف ہونے کا خطرہ تو نہ ہو، لیکن نا قابلِ تحمل جسمانی تکلیف یا نا قابل تلافی مالی نقصان کا ایسا خطرہ ہو جس کا ازالہ اسباب کے تحت قدرت میں نہ ہو۔

یہ صورت اگر کسی ظالم وجابر یا دشمن کے جبر واکراہ سے پیدا ہوگئی ہو تو اس کو اکراہ غیر ملجی کہتے ہیں، ایسے مواقع کے لیے فقہاء نے ''الضرر یزال'' فرمایا ہے۔

۵- اگر یہی چار نمبر کی صورتیں خود بخود اپنے حالات کے تحت پیش آجائیں تو اس کو حاجت یا احتیاج کہتے ہیں اور ایسے مواقع کے بارے میں فقہاء کرام "ویجوز للمحتاج الاستقراض بالربح" فرماتے ہیں۔

یہ پانچوں صورتیں درجہ بدرجہ اضطرار کی ہیں، ان میں مخمصہ واکراہ کی صورتوں کے علاوہ اور صورتوں میں حکم شرعی یہ ہے کہ وہ صورت زندگی کے جس شعبہ ونوع سے متعلق ہو مثلاً معاشیات، اقتصادیات، معاشرہ، تمدن، صحت، مرض، معالجہ وغیرہ، غرض جس شعبہ ونوع سے تعلق ہو، جب تک اس شعبہ کا ماہر وحاذق واقف کار مسلمان جو بادیانت وباشرع بھی ہو یہ حکم نہ لگادے کہ واقعی اضطرار متحقق ہوگیا ہے، یا مبتلی بہ کا بار بار کا خود تجربہ صحیحہ اس پر شاہد نہ بن جائے، اس وقت تک اس میں محرمات منصوصہ کے خلاف کرنے یا اس کے استعمال کرنے کی شرعاً گنجائش نہ ہوگی اور ہر شخص کی رائے کا اعتبار نہ ہوگا، ہاں اگر اضطرار ومجبوری کا تحقق ظاہر ونمایاں ہوجائے تو اس خاص صورت میں بغیر ان شرائط وقیود کے بھی وسعت وگنجائش ہوجائے گی، لقوله تعالى: "لايكلف الله نفساً إلا وسعها" (۲) ولقوله تعالىٰ: "ولا تلقوا بأيدكم إلى التهلكة" (۳) وغيرهما

ان اضطرار خمسہ کے علاوہ کچھ اور بھی توسعات وگنجائشیں اللہ تبارک وتعالیٰ نے عنایت فرمائی ہیں، ان کی بنا بھی آیات ربانی ہی پر ہے مثلاً: "يريد الله بكم اليسر ولا يريد بكم العسر" (۴)، اور قوله تعالىٰ: "وما جعل

۱- الاشباہ والنظائر/ ۱۴۰۔

۲- سورۂ بقرۃ ۲۸۶۔

۳- سورۂ بقرۃ ۱۹۵۔

۴- سورۂ بقرۃ ۱۷۵۔

عليكم في الدين من حرج" (۱)، اور **قوله تعالیٰ: "وما يريد الله ليجعل عليكم من حرج"**(۲) **وغيرها من الأيات۔**

ان آیات کریمہ سے بھی چندضابطے نکلتے ہیں، جوکتب احادیث وفقہ میں مذکور ہیں:

۱-جان یا عضو کے تلف ہونے کا اندیشہ تو نہ ہو، بلکہ صرف جسمانی یا مالی نا قابل تحمل یا نا قابل تلافی نقصان کا شدید خطرہ ہو،لیکن اس کا دفعیہ وازالہ بھی اسباب کے تحت قدرت واختیار میں ہو، اس کو مشقت کہتے ہیں، اور فقہاء کرام اسی کے بارے میں "**المشقة تجلب التيسير**"(۳) فرماتے ہیں۔

۲-ان ہی صورتوں میں جب نا قابل تحمل ونا قابل تلافی نقصان کا شدید خطرہ تو نہ ہو مگر اس کا تحمل یا تلافی کرنا بیحد دشوار ہو جس سے بے حد تنگی رہتی ہو، معاش ومعاشرہ دشوار وتنگ تر بنا ہوا ہو تو اس کو حرج کہتے ہیں، اس کے بارے میں فقہاء کرام: "**الحرج مدفوع**" فرماتے ہیں۔

ان دونوں (مشقت وحرج) میں محرمات منصوصہ کی مخالفت یا ترک کی گنجائش نہ ہوگی، مشقت وحرج کے ازالہ کا دائرہ اثر وہیں تک ہوتا ہے جہاں تک کوئی نص خلاف میں موجود نہ ہو، چنانچہ الاشباہ والنظائر مع الحموی میں تصریح ہے فرماتے ہیں: "**المشقة والحرج انما يعتبر في موضع لانص فيه، وأما مع النص بخلافه فلا**"۔

ہاں یہ ہوسکتا ہے کہ نص عسر سے نص یسر کی طرف منتقل ہوجائیں، جیسے نص غسل ووضو سے نص تیمم کی طرف منتقل ہونا اور جیسے اتمام صلوٰۃ کی نص سے قصر صلوٰۃ کی نص کی طرف منتقل ہونا۔

اسی طرح اگر کوئی دوسرا نص جو متقاضی یسر ووسعت کا ہو نہ ملے مگر مشقت یا حرج کا باعث ایسا حکم ہو جس کی بناپر محض کسی مجتہد کا قیاس واستنباط ہو تو اس میں بھی حدود شرع میں رہتے ہوئے یسر ووسعت کی جانب منتقل ہونے کی گنجائش ہوتی ہے،لیکن انتقال کی ان دونوں صورتوں میں جواز انتقال من العسر الی الیسر یا انتقال من الضیق إلی الوسعۃ میں شرائط وقیود وہی ہوں گی جو پہلے گذر چکی ہیں، یعنی اپنا بار بار کا تجربہ صحیحہ شاہد ہو یا اس شعبہ کے ماہر وحاذق باشرع بادیانت مسلمان کی تشخیص حاکم ہو خود رائی یا ہر کسی کی رائے معتبر نہ ہوگی۔

خون کے علاوہ کسی اور عضو کی پیوندکاری میں ایک انسان کے کسی عضو کو دوسرے انسان کے عضو کے ساتھ جوڑنے

۱- سورۂ حج: ۷۸۔

۲- سورۂ مائدہ: ۶۔

۳- قواعد الفقہ، قاعدہ/۳۲۱۔

میں یا استعمال کرنے میں ان ساتوں صورتوں میں سے کوئی صورت عموماً متحقق نہیں ہوتی، اگر کچھ تحقق ہوتا ہے تو صرف عدم النفع کا یا عدم استراحت کا یا بیش از بیش کلفت کا جو حسب منشاء راحت وآرام نہ پہونچنے سے پیش آجاتی ہے، اور ان سب صورتوں میں محرماتِ شرعیہ کے ارتکاب کی گنجائش نہیں ہوتی۔

لہٰذا اس پیوند کاری یا ایک شخص کے کسی عضو کو دوسرے شخص کے کسی عضو میں جوڑنے یا استعمال کرنے کی قطعاً گنجائش نہ ہوگی۔

ایک شبہ اور اس کا ازالہ:

اس تقسیم وانقسام کا تقاضا تو یہ ہے کہ ان ساتوں الفاظ (مخمصہ، اکراہ ملجی، اکراہ غیر ملجی، ضرورت واحتیاج، مشقت وحرج) میں سے کسی ایک کا اطلاق دوسرے پر نہ ہو، حالانکہ ہم ہر ایک لفظ کا اطلاق دوسرے لفظ پر عموماً دیکھتے ہیں جو اس تقسیم انقسام کے منافی ہے۔

جواب یہ ہے کہ یہ اطلاق عام بول چال کا ہے یا بہت سے بہت مجازی ہے جو تنقیح مسائل وتنفیذ احکام وتحدید احکام میں قطعاً معتبر نہ ہوگا، ان مواقع میں فقہی اصطلاح وفروق کا اور ان کی حدود احکام کا لحاظ ضروری ہوگا ورنہ خبط عشوا ہوگا اور دین حنیف ایک کھلونا بن کر رہ جائے گا۔

اس سمع خراشی کی معافی کی درخواست کرتے ہوئے امید ہے کہ ان گذارشات پر نظر ضرور رکھی جائے گی، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۷/۲/۱۴۰۷ھ

جس کی آمدنی حرام ہو اس سے اپنا سامان فروخت کرنا:

کسی آدمی کی آمدنی بالکل یقینی طور پر ناجائز ہے، مثلاً چوری، شراب، جوا وغیرہ تو اس سے بیع وشراء کر سکتے ہیں، یا نہیں؟ اور جو نفع بیع سے حاصل ہو وہ ہمارے لیے جائز ہے یا نہیں؟ ان مسائل کا جواب کتب عربیہ سے عنایت فرمائیں۔

الجواب وباللہ التوفیق:

آدمی کی آمدنی اگر چہ سب ناجائز ہو، لیکن جب تک متعین طور پر معلوم نہ ہو جائے کہ جو چیز یہ فروخت کر رہا ہے یہ

حرام وناجائز کی ہے، یا جو قیمت یہ دے رہا ہے وہ حرام وناجائز پیسہ کی ہے، اس کے ساتھ خرید فروخت کا ناجائز ہونا ضروری نہیں اور نہ اس سے حاصل شدہ رقم کا حرام وناجائز ہونا ضروری ہے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۲/ ۷/ ۹۱ ۱۳ھ

الجواب صحیح: محمود غفرلہ

ڈاک ٹکٹ یا اسٹامپ کی تحریر شدہ قیمت سے زائد لینا:

ڈاک ٹکٹ یا سرکاری اسٹیمپ پر تحریر شدہ رقم سے زائد کچھ پیسہ لینا جیسا کہ اسٹیمپ فروش کرتے ہیں شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

خادم مشتاق احمد محمد پور صدر اعظم گڑھ

الجواب وباللہ التوفیق:

جو لوگ گورنمنٹ کی طرف سے ان چیزوں کے فروخت کرنے پر مامور ہوتے ہیں اور گورنمنٹ انکو اس کام پر کمیشن واجرت دیتی ہے انکو زیادہ پیسے لیکر بیچنا جائز نہیں ہے۔

البتہ جو لوگ گورنمنٹ کی طرف سے اس کام پر مامور نہیں ہیں اور نہ ان کو اس پر اجرت ملتی ہے اگر وہ لوگ خود اپنے پیسے سے خرید کر کے نفع لیکر بیچیں تو اس میں شرعاً کوئی قباحت نہ ہوگی، البتہ اگر ایسا کرنا قانون وقت کے خلاف ہوگا تو اجازت نہ دیجائے گی بلکہ ممنوع کہا جائے گا (۱)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۵/ ۳/ ۱۴۰۱ھ

سامان کو متعینہ قیمت سے زیادہ پر فروخت کرنا:

ایک شئی کا بازار میں ایک مول مقرر ہے مگر مشتری کو اس کی قیمت کا علم نہیں، بائع مشتری کے عدم علم یا کسی اور مجبوری کا فائدہ حاصل کرتے ہوئے مشتری سے اس چیز کی زیادہ قیمت لے لیتا ہے، پھر جب مشتری کو اس کا علم ہوتا ہے تو وہ

۱- "لأن طاعة الإمام فيما ليس بمعصية فرض" (الدرالمختار مع ردالمحتار ۸/ ۴۱۶)۔

بائع سے باقی رقم کا مطالبہ کرتا ہے لیکن بائع وہ زیادتی اس کو نہیں دیتا، اندریں صورت کیا مشتری ہر جائز وناجائز (چوری وغیرہ) طریقہ سے اپنی رقم وصول کرسکتا ہے؟

الجواب وباللہ التوفیق:

بازار کے بھاؤ سے گراں بیچنا مستحسن نہیں ہے، بائع اگر زیادہ قیمت پر بیچے اور مشتری اس کو منظور کرے اور غبن فاحش نہ ہو تو بیع صحیح ہوجاتی ہے، اور بعد تکمیل بیع مشتری کو بیع کے توڑنے کا اختیار نہیں رہتا، ہاں اگر غبن فاحش ہوجائے مثلاً عام بھاؤ سے یہ بڑھاؤ دوگنا ہوجائے تو واپس کرسکتا ہے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

۱-لون لے کر مکان بنوانا یا سواری خریدنا:

اس مہنگائی کے دور میں اپنی تنخواہ سے مکان بنوانا ناممکن ہے، شاید اسی لئے حکومت نے اپنے ملازمین کو مکان بنوانے کے لئے یا سواری وغیرہ خریدنے کے لئے قرضہ دینے کی اسکیم شروع کی ہے جوکہ ماہانہ قسطوں میں سود کے ساتھ تنخواہ سے واپس کرنا ہوتا ہے تو کیا اس طرح قرضہ لے کر مکان بنوایا جاسکتا ہے؟ سواری خریدی جاسکتی ہے، یا پھر کوئی کاروبار کیا جاسکتا ہے؟

۲-ٹھیکیداری کا شرعی حکم:

میں ایک سرکاری انجینئر ہوں، ٹھیکیداروں کے ذریعہ سرکاری کام کرواتا ہوں، ٹھیکیدار کام کرنے کے جو ریٹ دیتے ہیں اس میں جو کمیشن نیچے سے اوپر تک دینا ہوتا ہے شامل کرلیتے ہیں، مثلاً کسی چیز کا ریٹ سو روپے ہے اور ۲۵ فیصد کمیشن دینا ہے تو ٹھیکیدار اسی چیز کا ۱۲۵ روپیہ ریٹ دیں گے اور پھر یہ ۲۵ فیصد پورے اسٹاف میں بٹ جاتا ہے کسی کو دو فیصد کسی کو ۵ فیصد کسی کو ۱۰ فیصد وغیرہ وغیرہ، میں یہ کمیشن نہیں لیتا ہوں، میرا یہ کمیشن یا تو دوسرے مجھ سے اوپر کے لوگ لے لیتے ہیں یا پھر ٹھیکیدار کو فائدہ ہوتا ہے، کچھ لوگ کہتے ہیں کہ یہ جائز ہے لینا چاہئے اور یہ تو حق ہے بغیر مانگے ہوئے ملتا ہے اور کچھ کہتے ہیں کہ ان غیروں پر تو ہرگز نہیں چھوڑنا چاہئے اور لے کر کسی غریب محتاج یا ضرورت مند یا کسی کی مدد کردینا چاہئے، اور یہ کمیشن نیچے سے اوپر تک سارے لوگ لیتے ہیں ان حالات میں مجھے کیا کرنا چاہئے؟

دوسری طرف بہت سارے غیر سرکاری خرچے اپنی طرف سے ایسے کرنے ہوتے ہیں کہ جن کے نہ کرنے سے رپورٹ خراب ہونے کے چانس ہوجاتے ہیں، مثلاً آڈٹ ہوا ہے اس میں اچھی خاصی رقم دینا ہوتی ہے یا کسی بڑے آفیسر کا دورہ ہے، اب اس کے رہنے، کھانے، اور کبھی کبھی ان کی فرمائش کو بھی پورا کرنا ہوتا ہے، نہ کرنے پر کام میں بہت ساری کمی نکالی جاتی ہیں۔ سالانہ رپورٹ بھی خراب ہوسکتی ہے وغیرہ، ان سب حالات کا بغور جائزہ لے کر مجھے کیا کرنا چاہئے؟

الجواب وباللہ التوفیق:

۱-حکومت اپنے ملازمین کو جو رقم بطور قرض دیتی ہے عموماً یہ دینا ان ملازمین کے جی پی فنڈ کے لحاظ سے اس اندازہ پر ہوتا ہے کہ ختم ملازمت کے اندر مع زیادتی کے واپس ہوجائے اور اکثر اسی کے جمع شدہ فنڈ سے دیتی ہے، لہٰذا اگر ایسا معاملہ ہو جب تو یہ واپس شدہ رقم مع اس زیادتی کے جو سود کے نام سے ملتی ہے اسی ملازم کے فنڈ میں جمع ہوجاتی ہے، پس اگر یہ صورت ہو تو اس زائد رقم پر سود کا نام رکھنے سے سود شمار نہ ہوگی اور اس قرض کا لینا دینا سب بلاشبہ جائز رہے گا اور اگر اس ملازم کے فنڈ کے علاوہ سے دیتی ہے تو چونکہ مکان کا ضروریاتِ اصلیہ میں سے ہونا بغیر مکان والے شخص کے لئے ظاہر ہے، اسی طرح جس سواری کے لئے قرض لیا جارہا ہے، اس کا رکھنا بھی ضروری ولابدی ہو تو وہ ضروریات اصلیہ میں شمار ہوکر یہ قرض لینا جائز رہے گا۔ کما یؤخذ من هذه العبارة: ''ویجوز للمحتاج الاستقراض بالربح''(۱)۔

۲-دونوں قسم (۲۵ ر فیصد اور آپ پر زیادتی اور دورہ میں حکام وغیرہ کو کھلانا پلانا وغیرہ) کے خرچے میں شرعاً ناجائز اور ظلم ہیں اور رشوت دہی اور رشوت ستانی کے قبیل کی چیزیں ہیں، اکثر یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ جو ملازم رشوت نہیں لیتا تو حکام بالا کو خوش بھی نہیں رکھ پاتا اور اس حالت میں بلاوجہ شرعی معطل بھی ہوجاتا ہے اور حکومت شرعیہ نہیں کہ اس کا دفعیہ اور مداوا شرعی ضابطہ کے تحت کیا جاسکے، تو اس کے لئے شرعی حکم یہ ہے کہ جب تک اس ملازمت کے علاوہ کوئی دوسرا ذریعۂ معاش ایسا نہ ملے جس میں ان ناجائز امور سے حفاظت مل سکے اس وقت تک یہ ملازمت نہ چھوڑے اور اوپر لکھنے کے مطابق کوئی جائز ذریعہ معاش تلاش کرتا رہے اور اللہ تعالیٰ سے دعاء بھی کرتا رہے کہ اے اللہ! کوئی جائز ذریعہ معاش عنایت فرما اور دل میں یہ پکی نیت رکھے کہ جب جائز ذریعہ معاش مل جائے گا تو اس کو چھوڑ دوں گا تو انشاء اللہ اخروی نجات اور دنیوی ذریعۂ فلاح سے

۱- الاشباہ والنظائر رص ۹۳ ا لمفتی الثقلین۔

محروم نہ ہوگا اور جب تک یہ ملازمت نہ چھوڑے اس وقت تک خاص طور سے جب مذکورہ بالا ناجائز امور کا ارتکاب ہو تو اس پر استغفار کرتا رہے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۹/۱۱/۱۴۱۰ھ

پانچ گنا منافع پر بیچنا:

شرعاً بائع بیع پر اپنے اختیار سے نفع لے سکتا ہے، یہ مسئلہ تو روز روشن کی طرح ظاہر ہے، مگر موجودہ زمانے اور آج کے اس نازک حالات میں بائع تاجر حضرات ایک روپیہ کی چیز پانچ روپیہ کے عوض میں بیچتے ہیں جس سے عوام پریشان ہوجاتے ہیں اور سرکاری ملازمین سرکار کے خلاف زیادتی تنخواہ کا احتجاج اور مطالبہ کرتے ہیں اور مجبور کرتے ہیں تو ایسی مجبوری کے وقت سرکار و تاجر حضرات ملکر اشیاء کی قیمت مقرر کریں یا تو صرف سرکاری اشیاء پر ۲۰ فیصد نفع کو مقرر کرے تو اس صورت میں تاجر حضرات کو ان اشیاء پر ۵۰-۶۰ فیصد نفع لینا جائز ہے؟

اور ایک روپیہ کی چیز کو ان حالات میں ۴، ۵ روپے کے عوض بیچنا جائز ہے؟

کتبہ العبد محمد بن اسماعیل العمرواری بجکم خادم دارالافتاء مفتی احمد بیات ۱۶ محرم الحرام ۱۴۰۱ھ

الجواب وباللہ التوفیق:

ہر آدمی کو اپنی مملوکہ چیز کی قیمت کے بارے میں اختیار ہے کہ جتنی زیادہ قیمت چاہے لے، مثلاً ایک پیسہ کی چیز کا ایک سو روپیہ لے یا ایک ہزار روپیہ کی چیز کا محض سو روپے لے یا اس سے بھی کم یا بالکل نہ لے سب جائز ہے، باقی اس میں کمی یا زیادتی اور ایسا تفاوت جو تجار کے یہاں عام طور پر رائج نہ ہو خلاف رواج کہا جاتا ہے اور زیادتی فاحش خلاف مروّت کہی جاتی ہے اور بعض صورتوں میں خلابہ یا خداع تک پہنچ کر ناجائز اور ممنوع بھی ہوجاتی ہے، اسی ضابطہ کے مطابق آج بھی مندرجہ ذیل حالات کا حکم متفرع ہوگا۔

درج قیمت سے پانچ گونہ زیادہ قیمت لے لینا تجار کے یہاں عام رواج نہیں ہے، اس لئے یہ صورت خلاف مروت بلکہ بعض مواقع میں خداع یا خلابہ ہو کر ممنوع ہوگی، اور غبن فاحش کے ارتکاب کے مثل سے ہوگا، لہٰذا عام قیمت ایک روپیہ ہو تو بجائے ایک روپیہ کے پانچ روپیہ لینا، یا ۲۰ فیصد عام طور پر نفع مقرر رائج ہو تو بجائے ۲۰ فیصد ۵۰ یا ۶۰ روپیہ فیصد

زیادہ لینا اس حکم مذموم میں داخل ہوجائے گا (۱)،فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی،مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۳/۱/ ۱۴۰۱ھ

قرض لینے کے لئے فارم کی خریداری:

مسلم فنڈ محمدی جو قرض مسلمانوں کو بلاسود دیتا ہے، اس کی شکل یہ ہے کہ مقروض اور کارکن مسلم فنڈ کے درمیان فارم کی قیمت کا خریدنا ہوتا ہے اگر کسی کو دوسو روپیہ کا قرض لینا ہے تو اس کو ہرے رنگ کا فارم خریدنا پڑے گا اور اگر ایک ہزار روپیہ لینا ہے تو اس کو نیلے رنگ کا فارم خریدنا ہوگا،غرض کہ مختلف رنگ مختلف قیمت کے ہوتے ہیں مقروض اور کارکن مسلم فنڈ کے درمیان قرض کی مدت مقرر ہوتی ہے کسی کو دوماہ کسی کو تین اور کسی کو ایک ماہ، مسلم فنڈوں کے قیام کا مقصد مسلمانوں کو سود جیسے گناہ سے بچانا ہے اور مسلمانوں کو روزگار فراہم کرنا ہے، بہر حال آپ حضرات کے نزدیک اگر کوئی جائز شکل نکلے تحریر فرمائیں، اگر ناجائز ہے تو ہم لوگ مسلم فنڈ کو بند کردیں گے ہم لوگوں نے مسلم فنڈ کے قیام کا مقصد اللہ کی رضا سمجھا ہے برائے مہربانی درج شدہ مسئلہ کا جواب مع الدلائل من القرآن وحدیث دیں۔

محمد حسین قاسمی (سکریٹری مسلم فنڈ محمدی ضلع لکھیم پور کھیری یوپی)

الجواب وباللہ التوفیق:

اگر قرض لی ہوئی رقم کا فیصدیا فی ہزار یا فی دس ہزار مثلاً ماہانہ یا سالانہ یا ششماہی کا حساب نہ آتا ہو اور نہ زرکشی یا سرمایہ اندوزی کی صورت ہو بلکہ محض کام کرنے والوں کی اجرت ان کے کام کی حیثیت میں ہو یہاں تک کہ اگر ضرورت سے زائد پسماندہ لوگوں کے لئے مقدار اجرت کم کردی جائے تو یہ معاملہ شرعا درست ہوگا ورنہ نہیں (۲)،فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی،مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۹/۶/ ۱۴۰۱ھ

۱- ”ولا يسعر حاكم لقوله عليه الصلاة والسلام: لا تسعروا فإن الله هو المسعر القابض الباسط الرازق إلا إذا تعدى الأرباب عن القيمة تعدياً فاحشاً فيسعر بمشورة أهل الرأي“ (درمختار ۹/ ۵۷۳)، اور حاشیہ شامی میں ولا یسعر حاکم کے تحت لکھا ہے: ”أي يكره ذلك كما في الملتقى وغيره، اور تعدیا فاحشا کے تحت مذکور ہے: ”بينه الزيلعي وغيره بالبيع بضعف القيمة“۔

۲- ”القرض بالشرط حرام والشرط لغو (الدر المختار مع رد المحتار ۷/ ۳۹۴)، كل قرض جر نفعاً حرام أي إذا كان مشروطاً..... وفي الذخيرة وإن لم يكن النفع مشروطاً في القرض فعلى قول الكرخي لا بأس به“ (رد المحتار على الدر المختار ۷/ ۳۹۵)، ”وفي القنية من باب القروض: شراء الشيئ اليسير بثمن غال إذا كان له حاجة إلى القرض يجوز ويكره“ (البحر الرائق ۶/ ۲۰۶)۔

ضفدع اور سرطان کی بیع اور اس کا کھانا:

ضفدع و سرطان کی بیع (فروخت) کرنا کیسا ہے اور اس کا کھانا ائمہ اربعہ کے نزدیک کیسا ہے اور امام اعظم کا مفتی بہ قول کیا ہے؟

الجواب وباللہ التوفیق:

زندہ ضفدع اور سرطان کی خرید فروخت کرنا سب اماموں کے نزدیک جائز ہے، البتہ مرجانے کے بعد دباغت سے قبل اس کی خرید فروخت حنفیہ کے نزدیک درست نہیں، اسی طرح ان کا کھانا حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ کے نزدیک جائز نہیں، باقی دیگر ائمہ کا مسلک وفتوی ان ہی کے مفتیان کرام سے معلوم کرنا چاہئے (۱)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۳/۸/۱۴۰۱ھ

اگریمنٹ کی رقم کا حکم:

زید سے دو شخصوں نے اگریمنٹ پر جس کی مدت ایک سال ہوا کرتی ہے زمین لی جس میں سے ایک نے اندر میعاد بیعنامہ کرالیا دوسرے سے کہا گیا اور تقاضہ کیا گیا مگر وہ ٹال مٹول کرتا رہا اور اسی طرح چھ سال کا عرصہ گزر گیا اور بعد میں قطعی انکار کردیا کچھ دن ہوئے زید کا انتقال ہوگیا اور اس شخص کی اگریمنٹ کی رقم زید کے پاس رہی، کیا اس رقم کا زید مالک ہو چکا تھا یا وہ اس شخص مذکورہ کو واپس کی جائیگی پھر جبکہ زید کا انتقال بھی ہو چکا رقم کی ادائیگی کی صورت کیا ہوگی؟

قمر (دیوبند)

الجواب وباللہ التوفیق:

اگریمنٹ کی رقم کے بارے میں مشتری نے یہ معاہدہ کیا ہو کہ اگر اتنے دنوں کے اندر میں بیعنامہ نہ کراؤں تو یہ رقم

۱- ’’ولا یجوز بیع ما یکون فی البحر کالضفدع والسرطان وغیرہ إلا السمک ولا یجوز الإنتفاع بجلدہ أو عظمہ، کذا فی المحیط، وفی النوازل: ویجوز بیع الحیات إذا کان ینتفع بها فی الأدویة وإن کان لا ینتفع بها لا یجوز، والصحیح أنه یجوز بیع کل شئ ینتفع به کذا فی التتارخانیہ‘‘ (فتاوی عالمگیریہ ۳/ ۱۱۴، نیز تفصیل کے لئے دیکھئے: عالمگیریہ ۵/ ۲۸۹)۔

سوخت ہوجائیگی، یا جب خرید نے سے قطعی انکار کیا تھا اس وقت بائع نے اس سے یہ معاہدہ کرلیا ہو کہ اب اس رقم کی واپسی نہ ہوگی اور مشتری نے اس معاہدہ کو تسلیم کرلیا ہو تو اس رقم کی واپسی زید پر اور زید کے ورثہ پر ضروری نہیں ورنہ زید کے ورثہ پر دیانتاً یہ ضروری ہے کہ اس رقم کو واپس کردیں تاکہ اس کے آخرت کا معاملہ صاف ہوجائے، اس لئے کہ یہ رقم محض توثیق وعدۂ بیع کے لئے بائع کے حوالہ کی جاتی ہے اور اس سے بائع اس کا مالک نہیں ہوجاتا (۱)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۱/۱۰/۱۴۰۱ھ

ایڈوانس دے کر مکان پر قبضہ کرلینا اور مدت کے اندر رجسٹری نہ کراسکنا:

میری والدہ صاحبہ نے ۲۵/ اپریل ۱۹۵۷ء کو ایک مکان خرید نے کا چوالیس ہزار روپیہ میں سودا کیا، ۱۸۰۰۰ روپیہ ایڈوانس دے کر مکان کا قبضہ لے لیا، ایگری مینٹ میں رجسٹری کرانے کی مدت چھ ماہ مقرر ہوئی اور تقریباً والدہ صاحبہ کی زندگی میں پانچ سال گزرنے کے بعد میں رجسٹری نہ ہوئی، اکتوبر ۱۹۷۹ء میں والدہ صاحبہ کا وصال ہوگیا اور مکان کا مسئلہ یونہی رہ گیا، قانونی طور پر والدہ صاحبہ مرحومہ اس مکان کی مالک نہیں ہوئی اور نہ مکان ان کی ملکیت ہوا۔ اب شرعی طور پر قرآن وحدیث کی روشنی میں بتلائیں کہ کیا والدہ صاحبہ مرحومہ اس مکان کی مالک بنی یا نہیں اور یہ کہ مکان ان کی ملکیت ہوئی یا نہیں؟ کیا بقایا رقم والدہ صاحبہ مرحومہ کے ذمہ قرض ہے یا نہیں؟ اس مکان میں ورثہ کا کوئی حق شرعی طور پر بنتا ہے یا نہیں؟ جبکہ قانونی طور پر ملکیت نہیں ہے شرعی حکم کیا ہے؟

الجواب وباللہ التوفیق

اٹھارہ ۱۸۰۰۰ روپیہ ایڈوانس دے کر جب مکان پر قبضہ بھی لے لیا تو یہ بیع تام ومکمل ہوکر مشتریہ کی ملک ہوگیا اور مبلغ ۲۶ ہزار روپیہ بذمہ مشتریہ دین ہوگیا اور مدت رجسٹری چھ ماہ گذرنے کے بعد پانچ سال تک بائع کا مشتریہ سے واپسی

۱- جیسا کہ مہر کے باب میں مذکور ہے: "خطب بنت رجل وبعث إليها أشياء ولم يزوجها أبوها فما بعث للمهر يسترد عينه قائماً فقط وإن تغير بالاستعمال أو قيمته هالكاً لأنه معاوضة ولم تتم فجاز الاسترداد" (الدر المختار مع رد المحتار ۴/ ۳۰۴)، "عن عمرو بن شعيب عن أبيه عن جده أنه قال: نهى رسول الله ﷺ عن بيع العربان قال مالك: وذلك فيما نرى والله أعلم، أن يشتري الرجل العبد أو يتكارى الدابة ثم يقول: أعطيك ديناراً على أني تركت السلعة أو الكراء فما أعطيك لك" (سنن ابوداؤد ۳/ ۲۸۳ کتاب البیوع باب فی العربان حدیث ۳۵۰۲)۔

مکان کا دعویٰ نہ کرنا اس بات کا قرینہ ہے کہ اس کے نزدیک یہ بیع تمام و مکمل ہو چکی تھی۔ اب اس کا حکم یہ ہے کہ یہ مکان مبیعہ مشتریہ کے مرنے کے بعد مشتریہ کا ترکہ شمار ہوگا اور مبلغ ۲۶ ہزار جو بذمہ مشتریہ دین واجب الاداء تھا اس کو پہلے ادا کیا جائے گا چاہے ورثہ اپنے پاس سے ادا کریں یا وہ مکان فروخت کر کے ادا کریں، دین ادا کرنے کے بعد جس طرح اور تمام مملوکات تمام ورثہ شرعی پر حسب تخریج شرعی تقسیم ہوں گے، اسی طرح یہ مکان بھی حسب تخریج شرعی تقسیم ہوگا، اس لئے کہ ادائیگی دین و وصیت صحیحہ حقوق متقدمہ علی المیراث میں سے ہے، ان حقوق متقدمہ کی ادائیگی کے بعد تقسیم وراثت کا حکم متوجہ ہوتا ہے، ہاں دین جس کا حق ہو وہ معاف کر دیں تو یہ بات دوسری ہوگی اور دین معاف ہو جائے گا، قانون اور کاغذی کارروائی کی تکمیل پر شرعاً تکمیل بیع معلق ہونا ضروری نہیں۔ شرعاً یہ بیع مکمل و تمام ہو چکی ہے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

خنزیر کی چربی سے بنے صابن اور اس کی تجارت کا حکم:

۱۔ زید کا صابون بنانے کا کارخانہ ہے اور اس میں امریکن چربی استعمال کرتا ہے جس میں ساٹھ ۶۰ فیصدی خنزیر کی چربی ہے اور چالیس فیصدی بیل کی چربی ہوتی ہے، تو سوال یہ ہے کہ اس چربی سے تیار ہوئے صابون کی تجارت جائز ہے یا کہ نہیں اور اس صابون کا استعمال جائز ہے یا کہ نہیں؟

۲۔ اگر یہ تجارت جائز نہیں ہے تو ابتک جو آمدنی حاصل ہو چکی ہے جس سے حج بھی کیا گیا ہے، زکوۃ بھی ادا کی گئی اور اس کی آمدنی کی رقم موجود بھی ہے، ان سب کا کیا حکم ہے خود استعمال کر سکتا ہے یا کہ نہیں۔

۳۔ زید مذکور صابون بنانے والوں کی انجمن کا ممبر ہے جس میں تقریباً ۵۰۰ مسلم ممبر ہیں اور گورنمنٹ کچھ چربی کا کوٹہ (یعنی مقدار) انجمن کو دیتی ہے اور پھر وہ ان ممبروں کو تقسیم کرتی ہے جو پہلے سے اس کو استعمال کرتے رہے ہیں جن میں زید بھی شامل ہے اور کوٹہ اس شرط پر تقسیم کرتی ہے کہ اس سے صرف صابون بنا کر پبلک کو سپلائی کیا جاوے جو ۲۸ روپیہ میں دس کیلو ملتی ہے اور یہی مال بازاری بھاؤ سے ۳۲ روپیہ سے دس کیلو ملتا ہے، اس اعتبار سے اگر دس ہزار روپیہ کی چربی سے صابون بنا کر فروخت کیا جاوے تو آٹھ نو ہزار کا نفع حاصل ہو سکتا ہے تو اگر اس کی تجارت ناجائز ہو اور اس کی وجہ سے زید مذکور اپنے حصے کا کوٹہ نہ لے تو اس کوٹہ کو دوسرے ممبر آپس میں تقسیم کر لیں گے پھر اس کا نفع غیر مسلموں کو ہوگا اور زید کو نقصان رہے گا، ایسی صورت میں گنجائش نکل سکتی ہے یا کہ نہیں؟

۴۔ اگر اس چربی کا استعمال صابون میں نا جائز ہے تو زید اپنے حصے کی کسی سے بھاؤ طے کر کے اس کے بدلہ میں تیل لیکر اس سے صابون بنائے تو کیا حکم ہے؟

(نوٹ) اس امر کا بھی لحاظ رکھا جاوے کہ گورنمنٹ لا مذہب ہے جسکو دار الحرب سے تعبیر کیا جا سکتا ہے، اس سے کوئی گنجائش نکل سکتی ہو تو اسکی طرف بھی توجہ فرماویں۔

الجواب وبالله التوفيق:

(۱ و ۲) خنزیر کی چربی یا کسی ناپاک چربی سے بنائے ہوئے صابون کی تجارت تو بلا کراہیت و بلا اختلاف جائز اور استعمال بھی مفتی بہ قول میں جائز ہے، لیکن اس قول جواز کا مدار انقلاب ماہیت پر ہے اور اس میں امام ابو یوسف کا اختلاف ہے، اس لئے جب یقین ہو جائے کہ اس صابون میں خنزیر کی چربی یا ناپاک چربی پڑی ہے تو اس کے استعمال سے احتراز کرنا اولیٰ اور تقویٰ ہوگا۔ مکروہ یا ناجائز نہ ہوگا۔

كما في الدر المختار على هامش الشامي ج ۲ ص ۲۹۱ (۱)، ويطهر زيت تنجس بجعله صابونا به يفتي للبلوىٰ و تحته في الشامي ثم هذه المسئله قد فرعوها على قول محمد بالطهارة بانقلاب العين الذي عليه الفتوىٰ واختاره اكثر المشائخ خلافاً لأبي يوسف الخ (وايضاً في الدرر في مقام آخر) ولا ملح كان حمارا أو خنزيرولا قذر وقع في بير فصار حمأة لا نقلاب العين به يفتي (۲)۔

اس صابون کی تجارت وغیرہ جب جائز ہوگئی تو اس سے حاصل شدہ آمدنی حلال و پاکیزہ ہوگی اور حج، زکوۃ خیرات جب جائز ہوگی تو اس سے حاصل شدہ آمدنی حلال و پاکیزہ اور حج زکوۃ خیرات وغیرہ سب درست ہوگا۔

(۳ و ۴) خنزیر کی چربی کی ماہیت جب تک منقلب نہ ہوگی نجس العین ہے، اس کی خرید فروخت مسلمان کے لئے ناجائز ہے اس لئے آپ اس کی تدبیر یہ کرلیا کریں کہ اس کا جب آپ کے لئے نامزد ہو جائے تو آپ کسی غیر مسلم سے بقدر ضرورت بھاؤ طے کر کے تیل خرید لیں اور اس غیر مسلم سے یہ کہیں کہ میرے نام کو یہ آگیا ہے میں اس کو نہیں لوں گا میں تمکو اختیار دیتا ہوں کہ تم لے لو یا جو چاہو کر لو پھر وہ غیر مسلم لے کر جو چاہے کرے آپ نہ لیں اور وہ غیر مسلم آپکو اس اختیار دینے پر صلے میں اس خرید کردہ تیل کی قیمت چھوڑ دے اس طرح آپ کا نقصان بھی نہ ہوگا اور کسی حرام میں مبتلا بھی نہ ہوں گے۔

۱- شامی ۱/ ۲۹۱، مطبع عثمانیہ۔

۲- شامی ۱/ ۳۰۱، مطبع عثمانیہ۔

نوٹ! جوگنجائش تھی کہہ دی گئی۔فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور
الجواب صحیح محمود عفی عنہ، سید احمد سعید عفی عنہ

ریڈیو کی مرمت وتجارت:

ہم لوگوں نے ریڈیو کی مرمت اور تجارت کے بارے میں مظاہر علوم سہارنپور اور دارالعلوم دیوبند سے معلوم کیا کہ آیا ریڈیو کی بیع ومرمت درست ہے یا کہ نہیں؟ آپ کے یہاں سے تو صاف طور پر اجازت مل گئی مگر مظاہر العلوم والوں نے مع عبارت کے علماء کا اختلاف ظاہر کیا ہے اور لکھا ہے کہ جہاں تک ہوسکے اس سے اجتناب کرنا بہتر ہے اب یہ دونوں فتوے آپ کے سامنے ہیں ان دونوں میں کس کو ترجیح ہے مطلع فرمائیں۔

الجواب وباللہ التوفیق:

دونوں جوابوں میں کوئی خاص تعارض نہیں ہے، سہارنپور کے جواب میں احتیاط کا پہلو ہے اور دیوبند کے جواب میں اطلاق کا، اگر جوابوں میں تفصیل اور تشریح کچھ کردی گئی ہوتی تو مستفتی کو الجھن نہ ہوتی، بہر حال سنئے ریڈیو اپنی اصل ذات کے اعتبار سے صحیح مقصد کے لئے وضع کیا گیا ہے یعنی بآسانی خبر رسانی کے لئے جو مقصد صحیح ہے، البتہ اس کا استعمال گانے بجانے اور لہو ولعب میں بکثرت ہوگیا ہے، ریڈیو اپنی ذات کے اعتبار سے کوئی قباحت نہیں رکھتا ہے اور ایسی چیز جسکی ذات میں کوئی قباحت نہ ہو اس کی خرید وفروخت، تجارت وصنعت بے شبہ درست ہوتی ہے، استعمال میں چونکہ خلط ہے اور غلط طریقہ سے بھی ہوتا ہے جیسے خبر سننا، وعظ وخطبہ سننا وغیرہ تمام جائز کام میں اس کا استعمال جائز اور گانا بجانا وغیرہ جملہ لہو ولعب اور ناجائز چیزوں میں اس کا استعمال ناجائز ہے۔ اس کے پیش نظر مرمت کرنے میں چونکہ ٹسٹ کرنے کے لئے استعمال بھی کرنا پڑتا ہے، اس میں احتیاط کرنا واجب ہے کہ گانے وغیرہ لگاکر ٹیسٹ نہ کیا جاوے بلکہ محض خبریں مباح استعمال میں لگا کر جانچ لیا جائے تو مرمت کرنے میں بھی کوئی قباحت شرعی نہ ہوگی (۱)، اور ایک مسلمان کی شان سے بھی یہی ہے اور اس کے پیش نظر دیوبند کے فتوی میں جائز ودرست لکھا ہے اور سہانپور کے جواب فتوی میں غالب استعمال پیش نظر ہے، اس لئے کہ عموماً درست کرنے والے احتیاط نہیں کرتے ہیں اور بلاوجہ معصیت میں مبتلا ہوجاتے ہیں اس لئے احتیاط کرائی گئی ہے۔

۱- ''لأنه لا معصية في عين العمل'' (دیکھئے ردالمحتار ۹/ ۵۶۱، مکتبہ زکریا دیوبند)۔

اب امید ہے کہ آنجناب کے ذہن میں سے دونوں جوابوں کا تعارض بھی مرتفع ہوگیا ہوگا اور تسلی بھی ہوگئی ہوگی۔

وهكذا افاد العلامة المفتي محمد شفيع الديوبندي ثم الباكستاني ، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دار العلوم دیوبند سہارنپور ۸/ ۸/ ۱۳۸۵ھ

الجواب صحیح محمود غفی عنہ

بائع مبیع بیچ کر بقیہ ثمن وصول کرسکتا ہے یا نہیں؟

زید نے عمر کے ہاتھ اپنا پاورلوم فروخت کیا اور عمر نے اس کا نصف روپیہ فوراً ادا کردیا اور کہا کہ پندرہ بیس دن کے بعد بقیہ روپیہ دے کر پاورلوم لے جاؤں گا، مگر اس کے بعد ہی پاورلوم کی قیمت کم ہوگئی اور اب قیمت کم ہوتے ہوتے اتنا گھٹ گئی کہ اسی نصف روپیہ میں پاورلوم خریدی جاسکتی ہے، اب وہ بقیہ نصف روپیہ یعنی پاورلوم کی بقیہ قیمت مانگ رہا ہے، بلکہ وہ یہ کہتا ہے کہ میں نے تین برس تک تمہارے پاورلوم کی جو نگرانی کی ہے مجھے اس کا معاوضہ اور مکان کا کرایہ ملنا چاہئے۔

سوال یہ ہے کہ عمر کے پاورلوم کی نگرانی کے اخراجات زید لینے کا حق دار ہے یا کہ نہیں؟

عمر نے پاورلوم کی بقیہ نصف قیمت تین سال تک ادا نہیں کی ہے تو اس کو بیچ کر زید اپنی رقم، نیز اخراجات وصول کرسکتا ہے، یا کہ نہیں؟

الجواب وباللہ التوفیق:

حسب تحریر سوال صورت مسئولہ میں بیع تمام ہوکر لازم ہوچکی ہے اور بائع کو اختیار ہے کہ وہ مشتری کو اس مضمون کا نوٹس دے کہ تم فلاں تاریخ کے اندر اندر مبیع لے جاؤ، ورنہ تاریخ مقررہ گزر جانے پر میں اس کو فروخت کر کے اپنی بقیہ ثمن وصول کرلوں گا۔ اس نوٹس کے بعد بھی اگر وہ تاریخ مقررہ کے اندر اندر پاورلوم نہ لیجاوے تو بائع اس کو فروخت کر کے اپنا بقیہ ثمن وصول کرسکتا ہے۔ باقی نگرانی کا معاوضہ یا اس مکان کا کرایہ جس کو پاورلوم محبوس کررکھا ہے وصول کرنے کا حق نہیں رکھتا ہے۔ بچند وجوہ: اول تو اس لیے کہ یہ نگرانی چونکہ کسی معاہدہ کے تحت نہیں تھا، اس لیے تبرع میں معاوضہ کے مطالبہ کا حق نہیں۔ دوئم اس لیے کہ یہ معاوضہ نگرانی یا کرایہ مکان نفع واجرت ہے اور "المنافع لا ثمن لها" مسلمہ قاعدہ فقہیہ، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دار العلوم دیوبند سہارنپور

باب ربوا

لائف انشورنس کمپنی سے ملی ہوئی سود کی رقم انکم ٹیکس، سیل ٹیکس وغیرہ میں دے سکتے ہیں:

زید نے اپنی حیات میں لائف انشورنس (زندگی کا بیمہ) کرا لیا تھا، اور ابھی تقریباً ایک ماہ ہوا زید کی وفات ہوگئی، زید اپنی وفات تک لائف انشورنس کمپنی میں بائیس ہزار روپیہ جمع کر چکا تھا، زید کے انتقال کے بعد لائف انشورنس کمپنی کے اصول کے مطابق زید کے ورثاء کو بیمہ کمپنی کی جانب سے متوفی زید کا اصل جمع شدہ سرمایہ بائس ہزار روپیہ پر کمپنی کی جانب سے آٹھ ہزار روپیے کا اضافہ کردہ کل مجموعی رقم تیس ہزار روپے ملنے والی ہے، مذکورہ زید نے اپنی حیات میں الآئسی (ہاؤسنگ بورڈ) سے ۱۹۷۵ء میں مکانات کی تعمیر وغیرہ کے سلسلے میں بتیس ہزار روپے سودی قرض لون لیا تھا، ۱۹۷۵ء سے ۱۹۸۰ء تک مذکورہ قرض کے سود کی رقم تقریباً چھ ہزار ہوتی ہے جو زید کے ذمہ قرض کی اصل رقم بتیس ہزار کے علاوہ ہاؤسنگ بورڈ کو واجب الادا ہے، اب لائف انشورنس کمپنی میں جمع شدہ اصل رقم پر مزید حاصل ہونے والی آٹھ ہزار روپے کی رقم کے بارے میں درج ذیل امور دریافت طلب ہیں:

۱- ہاؤسنگ بورڈ سے لی جانیوالی رقم بتیس ہزار روپے کے قرض کے سلسلے میں چھ ہزار روپے سود کی جو رقم واجب الاداء ہے، لائف انشورنس کمپنی سے حاصل ہونے والی مزید آٹھ ہزار روپے کی رقم میں سے زید کے ورثاء یہ سود کی رقم سے ادا کر سکتے ہیں یا نہیں؟

۲- حکومت ہند کے قانون کے مطابق جس شخص کی ملکیت پچاس ہزار روپے سے زیادہ ہو، تو اس کے مرنے کے بعد اس کے مال میں موت ٹیکس کے نام سے کچھ رقم گورنمنٹ وصول کرتی ہے، اسی قانون کے تحت زید کی وفات کے بعد اس کے مال میں بھی یہ موت ٹیکس آٹھ سے دس ہزار روپے کی رقم واجب الادا ہے، لہذا لائف انشورنس کے سلسلے میں جمع شدہ رقم حاصل ہونے والی مزید آٹھ ہزار روپے کی رقم سے یہ موت ٹیکس ادا کیا جا سکتا ہے یا نہیں؟

۳- اسی طرح لائف انشورنس سے حاصل ہونے والی مزید رقم انکم ٹیکس، سیل ٹیکس، میونسپل کارپوریشن، اور میونسپلٹی

کے دوسرے ٹیکسوں (ہاؤسنگ ٹیکس وغیرہ) کے اندر ادا کی جاسکتی ہے یا نہیں؟

۴-بغرض حفاظت بینک کے سیونگ اکاؤنٹ میں جمع شدہ اصلی سرمایہ پر سیونگ بینک سے حاصل شدہ سودی رقم، موت ٹیکس، سیل ٹیکس کے اندر اسی طرح مکانات کے سلسلے میں میونسپلٹی کی جانب سے عائد شدہ ٹیکسوں (ہاؤس ٹیکس وغیرہ) میں دی جاسکتی ہے یا نہیں؟ مفتی عبد الرحیم صاحب لاجپوری راندیر سورت نے "فتاویٰ رحیمیہ" (۱۷۵/۳) میں ڈاکخانہ اور بینک سے حاصل شدہ سودی رقم کو میونسپلٹی کے ہاؤس ٹیکس اور موٹر کے لاری انشورنس میں ادا کرنے کی گنجائش دی ہے۔

۵-اس سلسلے میں مزید توضیح و تصریح بحوالہ کتب فقہ مطلوب ہے، اس سلسلے میں ضابطہ کلیہ ہے کہ دس ہزار روپے یا اس سے زیادہ کی سالانہ آمدنی پر حکومت ہند کی جانب سے انکم ٹیکس عائد ہوتا ہے، لائف انشورنس (زندگی کا بیمہ) کے علاوہ بھی اس وقت بیموں کی بہت سی قسمیں رائج ہیں، دس ہزار روپے یا اس سے زیادہ سالانہ آمدنی والا بیمہ کی دیگر رائج الوقت اقسام میں سے کسی قسم کا بیمہ کرائے تو اس پر سے انکم ٹیکس معاف ہوجاتا ہے یا انکم ٹیکس کی رقم میں کمی ہوجاتی ہے، زیادہ نہیں دینا پڑتا، تو کیا انکم ٹیکس کی معافی یا تقلیل کے لیے اس قسم کا کوئی بیمہ کرانے کی شرعاً اجازت وگنجائش ہے؟

۶-قومی فسادات میں یک طرفہ نقصان سے بچنے کی خاطر مکان، دوکان (املاک وجائداد) وغیرہ کے بیمہ کی شرعاً اجازت ہے، لیکن دوکان، مکان وغیرہ کا قومی فسادات یا کسی ناگہانی حادثہ میں نقصان اور تباہ ہوجانے کی صورت میں جتنی مالیت کا نقصان ہوا ہے، اس سے زیادہ رقم کا بیمہ ہے، مثلاً دوکان یا مکان میں پچاس ہزار روپے کا نقصان ہوا ہے، بیمہ پچھتر ہزار روپے کا ہے تو نقصان سے زیادہ کی رقم بیمہ کمپنی سے وصول کرنا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟ مثال کے طور پر مذکورہ بالا صورت میں پچاس ہزار روپے کے بجائے پچھتر ہزار روپے وصول کرنے کی گنجائش ہے یا نہیں؟

(نوٹ) قومی فسادات کی طرح دیگر ناگہانی آفات وحوادثات مثلاً سیلاب، زلزلہ، آگ لگ جانا، چوری، ڈاکہ وغیرہ وغیرہ سے حفاظت کی خاطر دوکان، مکان وغیرہ املاک وجائیداد کا بیمہ کرانا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

المستفتی: عبد المنعم داروحال، بڑودہ، گجرات

الجواب وباللہ التوفیق:

۱-لائف انشورنس کمپنی اگر مرکزی حکومت کی ہے اور ہاؤسنگ بورڈ بھی مرکزی بورڈ ہے تو ہاؤسنگ بورڈ کی سود میں

لائف انشورنس سے ملی ہوئی سود کی رقم دے سکتا ہے: **"ما حصل بسبب خبيث فالسبيل رده إلى رب المال"**(۱)۔

۲-لائف انشورنس کمپنی اگر مرکزی حکومت کی ہے تو موت ٹیکس میں بھی لائف انشورنس سے ملی ہوئی سود والی رقم دے سکتے ہیں۔

۳-لائف انشورنس کمپنی جب مرکزی حکومت کی ہو تو اس سے ملی ہوئی سود کی رقم انکم ٹیکس اور سیل ٹیکس میں جبکہ مرکزی حکومت کی ہے، دے سکتے ہیں، باقی میونسپل کارپوریشن بورڈ، میونسپلٹی ٹیکس اور اس کے علاوہ دیگر ٹیکسوں میں نہیں دے سکتے۔

۴-گورنمنٹ بینک سے ملی ہوئی سود کی رقم انکم ٹیکس اور ہر ایسے غیر شرعی ٹیکس میں دے سکتے ہیں جو مرکزی حکومت کے ہیں اور ایسے ٹیکس میں دینا درست نہ ہوگا جو مرکزی حکومت کے نہیں ہیں، پس میونسپلٹی وغیرہ کے ٹیکس میں دیدینے سے برائت ذمہ نہ ہوگی۔

اصل ضابطہ یہ ہے کہ جو بھی حرام مال ہو، اس کے بارے میں اصل حکم یہی ہے کہ جس کا وہ مال ہے اس کی ملک میں کسی تدبیر سے لوٹا دینا(۲)، اور جب اصل مالک کی ملک میں نہ پہنچا سکے تو اس کے وبال سے بچنے کی نیت سے بطور صدقہ کسی مستحق صدقہ کو دے کر جلد از جلد اپنی ملک سے خارج کردے اور خود کسی کام میں استعمال نہ کرے اور نہ اس کو صدقہ میں دینے کے بعد ثواب کی نیت کرے(۳)۔

۵، ۶-قانونی مجبوری یا ملکی فساد وغیرہ کے خطرہ سے بچنے کی نیت سے انشورنس کرانے کی گنجائش ہے، باقی اپنے جمع کیے ہوئے روپے سے زائد جو روپیہ ملے اس کا حکم یہ ہے کہ اگر گورنمنٹ انشورنس کمپنی سے زائد رقم ملے تو اس کو ایسے ٹیکس میں دینا درست ہے جو براہ راست گورنمنٹ خزانے میں پہنچتا ہو، جیسا کہ ۴ کے تحت لکھے ہوئے ضابطہ میں بتلا دیا گیا ہے، اگر اس طرح کے ٹیکس میں نہ دینا ہو یا دینے سے بچ جائے تو پھر ایسی صورت میں اس کے وبال سے بچنے کی نیت سے ثواب کی نیت کیے بغیر غرباء و مساکین کو جلد سے جلد دیکر یا ایسے مدارس دینیہ میں دے کر جس میں غیر مستطیع طلبہ کو کھانا کپڑا دیا جاتا ہو، اپنی ملک سے نکال دیں، اور ان مدارس میں دیتے وقت ان کے مصارف میں صرف کرنے کی تاکید کردیں، بلکہ اگر اپنے یہاں ایسے دینی مدارس موجود نہ ہوں اور ان مدارس کی ضرورت ہو تو ایسے مدارس قائم کر کے غریب بچوں کو اس میں کھانا کپڑا

۱- قواعد الفقہ ۱۱۵۔

۲- "إذا علم المالك بعينه فلا شك في حرمته ووجوب رده عليه" (شامی ۵/۱۳۰، باب البیع فاسد)۔

۳- "وأما إذا كان عند رجل مال خبيث فإما إن ملكه بعقد فاسد أو حصل له بغير عقد ولا يمكنه أن يرده إلى مالكه ويريد أن يدفع مظلمته عن نفسه فليس له حيلة إلا أن يدفعه إلى الفقراء" (بذل المجہود ۱/۳۷، کتاب الطہارت)۔

وغیرہ دینے کا نظم کر کے اس میں بغیر نیت ثواب دیدینا چاہیے کہ اس سے دین اور علم دین کو فروغ اور ترقی ہوگی، اور اس فروغ وترقی کا ثواب خود بخود ملے گا، علیٰ ہذا دین اور علم دین کی ترقی اور فروغ کے لیے ایسے مدارس کے قائم کرنے کا منجانب شرع حکم بھی ہے۔

(نوٹ) یہ بھی خوب سمجھ لیجئے کہ آج کل کے جاری شدہ نصاب جو سرکاری اسکولوں میں رائج ہیں اور ان میں قوم کے امیر وغریب ہر ایک کے بچے لازمی طور پر پڑھتے ہیں اور پڑھاتے ہیں۔ اور اردو زبان جس میں مسلمانوں کا دینی سرمایہ اگرچہ منتقل ہو چکا ہے مگر اردو زبان نہ پڑھنے اور نہ جاننے کی وجہ سے مسائل دین اور علم دین سے بیگانگت بڑھتی جارہی ہے اور ایسی صورت میں ان بچوں کو بلکہ اپنی نئی پود کے سب لوگوں کو اپنی زبان اردو ہو تو اردو زبان میں ورنہ جو اپنی مقامی زبان ہو اس میں اپنے دینی مسائل کو جلدی سے منتقل کر دینا ہر ذی حیثیت مسلمان پر واجب ہے، اور جہاں تک جلد ہو اپنا تمام دینی علمی سرمایہ مقامی زبان میں منتقل کر دینا لازم ہے، اور یہ عام لوگوں کے دین ومذہب کے بچاؤ کے لیے فرض ہورہا ہے، اس طرف قوم کے ہر فرد پر اس کی مالی اور علمی استطاعت کے مطابق حکم خداوندی متوجہ ہے، جیسا کہ جب ایران میں مذہب اسلام پہونچا اور وہاں عربی زبان پوری طرح رائج نہیں تھی تو اس وقت کے علماء ومشائخ نے فوراً اور جلد سے جلد تمام مذہبی سرمایہ فارسی زبان میں اس طرح منتقل کر دیا کہ وہاں کا ہر فرد بشر جلد سے جلد دین سے اور دینی مسائل سے واقف ہو گیا اور کایا پلٹ گئی .... بالکل یہی حالت اس وقت ہندوستان میں ہندوستان کی قومی زبان رائج ہونے کی وجہ سے ہو گیا ہے، اور یہ کام اس وقت کا بہت بڑا دینی کارنامہ، دینی خدمت اور بہت بڑا اجہاد ہے، اہل فہم غور کریں اور جلد متوجہ ہوں، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۳۰/۷/۱۴۰۰ھ

بحالت مجبوری بینک سے سودی قرض لینا کیسا ہے؟

ہم لوگ بہت جلد دوسری جگہ منتقل ہونے پر مجبور ہوں گے، اس ملک کی سرکار کے قانون کے بموجب، سرکار ہم لوگوں کو نئی اراضی متعلقہ دکان میں ٹھہرائے گی جس کو ہم لوگوں کے واسطے بنایا گیا ہے، جیسے ہی اس دکان سے واسطہ ہوگا ہم لوگوں کو اپنا مکان بنانا ہوگا، مان لیجئے کہ ایک شخص کے پاس مکان بنانے کے لیے پیسہ نہیں ہے تو کیا وہ لون حاصل کرسکتا ہے جس میں سود لگتا ہے، اگر شریعت اسلام میں ایسا نہیں ہے تو یہاں کی سرکار یا بلڈنگ سوسائٹی بغیر سود کے منظور نہیں کرتی، کیا امارت شرعیہ ایسی حالت میں ایک شخص کو سود دینے کے لیے حکم دے سکتی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اس ملک کا قانون یہی ہے، زبردستی ہمیں اپنے گھروں اور دکانوں سے نکالا جارہا ہے، ہم لوگ ہر طرح سے مجبور ہیں، ہر کام ہماری مرضی کے خلاف ہوتا ہے، اگر امارت شرعیہ ایسی حالت میں بھی سود دینے سے منع کرتی ہے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ سرکار ہم لوگوں کو وہاں پہنچائے گی جہاں ہمیں بہت تکلیف ہوگی اور ہم ہر طرح لاچار ومجبور ہوجائیں گے۔

براہ کرم ہمارے ان مسائل کے سلسلے میں ایسی وضاحت سے جواب مرحمت فرمائیں کہ ہم سب آسانی سے اس کو سمجھ سکیں اللہ تعالیٰ آپ کو دارین میں اجرِ عظیم عطا فرمائیں گے۔

المستفتی حاجی محمد سلیم سلیمان افریقہ

الجواب وباللہ التوفیق:

اگر حالات تحریر کیے ہوئے صحیح ہیں تو واقعی یہ حاجت صحیح اور احتیاج صحیح ہے، اور ایسی حالت میں اگر بغیر سود کا قرضہ نہ ملے تو شریعت مطہرہ نے بوجہ ضرورت اور حسب ضرورت بینک سے سودی قرض بھی لے لینے کی اجازت دی ہے(۱)۔

البتہ جہاں تک جلد ہوسکے ایسے قرض سے سبکدوشی حاصل کرنے کی کوشش کرے اور جب تک سبکدوشی حاصل نہ ہوجائے کچھ استغفار کرنے کا بھی معمول بنائے اور اللہ تعالیٰ سے دعائیں بھی کرتا رہے کہ اے اللہ! اس مال سے جلد نجات دے کر بہتر مال عطا فرما، اس لیے کہ ایسی صورتیں ہمارے ہی اعمال بد کی پاداش ہوتے ہیں، **کما ورد فی الخبر: "اعمالکم عمالکم"** اور کسی شاعر نے کہا ہے:

یہ اعمال بد کی ہے پاداش ورنہ
کہیں شیر بھی جوتے جاتے ہیں ہل میں

فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۳/۲/۱۴۰۱ھ

جمع شدہ زکوۃ کی رقم پر بینک سے ملنے والے سود کا مصرف؟

بحیثیت زکوۃ فنڈ کے خزانچی کے جو زکوۃ کی رقم بغرض حفاظت بینک میں جمع کرتا ہوں وہ بڑی رقم ہوتی ہے، ایک سال میں آہستہ آہستہ زکوۃ کی رقم خرچ ہوجاتی ہے اور مستحقین پر صرف ہوجاتی ہے، لیکن بینک زکوۃ فنڈ کی رقم پر سود

۱- "ویجوز للمحتاج الاستقراض بالربح" (الاشباہ والنظائر ۱۱۵)۔

دیتا ہے۔

میری مشکل یہ ہے کہ میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ بینک سے جو رقم زائد ملتی ہے، میں اسے کس طرح اور کہاں خرچ کروں؟

براہ کرم اس بارے میں قانون اسلامی کی رہنمائی کریں۔

المستفتی محمد باندوپ، ملں موانش

الجواب وبالله التوفيق:

اصل بات تو یہی ہے کہ زکوۃ کی رقم جلد سے جلد مصرف میں پہنچا کر یا ادائیگی کر کے سبکدوش ہو جانا چاہیے (۱)۔

لیکن اگر بروقت مصرف نہ ملنے کی وجہ سے ذخیرہ کرنا پڑ جائے تو یہ بھی درست ہے اور ایسی صورت میں حفاظت کی غرض سے بینک میں جمع کرنا بھی درست ہے، پھر جو رقم سود کے نام سے بینک سے ملے اس کو بھی مستحقین زکوۃ پر اور قرضہ میں دبے ہوئے اور پریشان حال مسلمانوں پر بطور صدقہ کے خرچ کر دے اور اگر اس کے مصرف کے علاوہ کسی اور کام میں خرچ کرنا ہو، جیسے مسافر خانہ کی تعمیر یا دینی مدرسہ کی تعمیر وغیرہ میں تو شرعی حیلہ کے ذریعہ تملیک مستحق کر لینے کے بعد صرف کرے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۳۰/۷/۱۴۰۰ھ

بلاضرورتِ شدیدہ سودی قرض لینا ناجائز ہے، نیز فکس ڈپازٹ کا حکم:

میں سعودی عرب سے مستقل طور پر اپنے وطن واپس ہونا چاہتا ہوں، لیکن یہاں سے جانے کے بعد گذارے کے لیے ذریعہ آمدنی کیا ہوگا، ہمیشہ سوال رہا ہے، میرے پاس کچھ سرمایہ بھی جمع ہے، لیکن کاروبار میں آج کل اس قدر بے ایمانی ہے کہ ایسا شخص جو زندگی میں پہلی بار تجارت میں داخل ہونا چاہتا ہے ہمیشہ نقصان ہی سے دوچار ہوتا ہے، یہ صرف مفروضہ نہیں بلکہ میں اپنے ایسے متعدد ساتھیوں کو شخصی طور پر جانتا ہوں۔

اولاً تاجر برادری کی بھی کوشش ہوتی ہے کہ کسی طرح اس کا روپیہ ڈوب جائے اور وہ اپنے ہتھکنڈوں میں کامیاب

۱- الفتاوی الہندیہ ۱/۱۹۱ باب المصارف۔

بھی ہوجاتے ہیں۔

ثانیاً جولوگ نفع بخش تجارت کرتے ہیں ان میں بھی اندر سے دیکھا جائے تو وہ اپنی تجارت کومنافع بخش بنانے کے لیے مختلف غیر اسلامی ذرائع مثلاً رشوت دینا، جھوٹ بولنا، ذخیرہ اندوزی کرنا، من مانی قیمتیں بڑھانا اپنائے ہوئے ہیں اول صورت میں ضیاع سرمایہ کا خوف ہے تو دوسری صورت میں حلال تجارت کو برقرار رکھنے کے لیے غیر حلال یا غیر اسلامی TACTIES ضروری ہیں اور دونوں ہی برے ہیں۔ واپس ہونے پر اپنی فیملی کے اخراجات چلانے کے لیے اپنا جمع شدہ سرمایہ میں FIXED DEPOSIT رکھ کر جو بھی منافع بینک سے ملے اس میں اپنی فیملی کی زندگی کے اخراجات پورا کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں، براہ کرم مذکورہ بالا دونوں صورتوں کی جو تشریح میں نے لکھی ہے، اس کو خیال میں رکھتے ہوئے بتلایے کہ مذکورہ بالا منافع بینک کے ذریعہ اپنے اور اپنی فیملی کے اخراجات پورا کرنا حلال ہے یا حرام؟

سید عبداللہ (سعودی عربیہ)

الجواب وباللہ التوفیق:

یہ صحیح ہے، بداخلاقیوں کا دور ہے، چھوٹی تجارت کی پہلی شکل حسد و دشمنی کی زد میں آکر اکثر فیل ہوجاتی ہے، باقی اس میں جو نفع و بچت ہوتی ہے وہ جائز طریقہ سے حاصل ہوکر حلال و جائز رہتی ہے، اور جو ذرا اونچے پیمانہ پر اور نفع بخش تجارت کرتے ہیں، اس میں بھی ایمانداری و دیانت سے کام کرنے کی تمنا و خواہش کے باوجود غیر اسلامی قانون ہونے کی وجہ سے وہ باتیں مجبوراً کرنی پڑتی ہیں جس کا ذکر آپ نے خود بھی کیا ہے، مگر ان تمام غیر شرعی معاملات میں حرام روپیہ اپنی ملکیت سے نکل جاتا ہے بلکہ غیر شرعی طریقہ سے کچھ اپنا جائز اور حلال روپیہ بھی اپنی ملکیت سے نکل جاتا ہے اور چونکہ مجبوری کی وجہ سے نکلتا ہے، اس لیے اس پر استغفار کرنے سے خدا کی طرف سے معافی کی امید ہے، چنانچہ فقہاء کرام تشریح کرتے ہیں کہ رشوت جس کا لینا اور دینا مثل سود کے دونوں حرام ہیں، مگر مجبوری کی صورت میں اپنا حق بغیر رشوت کے نہ ملتا ہو تو رشوت دینے میں صرف رشوت لینے والے کو گناہ ہوگا دینے والا معذور قرار دے کر انشاء اللہ گناہ سے محفوظ رہے گا، ''**دفع المال للسلطان الجائر لدفع الظلم عن نفسه وماله، ولاستخراج حق له ليس برشوة يعني في حق الدافع**''(۱)، اسی طرح جب بغیر قرض لیے کام نہ چلتا ہو یا ناقابل عمل تکلیف کا سامنا ہو اور قرض غیر سودی نہ ملتا ہو تو بینک سے بقدر حاجت وضرورت

۱- ردالمحتار ۱۰/ ۶۰۷۔

لینے کی گنجائش ہوجاتی ہے، کمافی الاشباہ والنظائر/ ۱۱۵ مع الحموی: "**ویجوز للمحتاج الاستقراض بالربح**"۔

مثلاً اپنے جائز روپے سے بھی بڑا کاروبار کرنے میں قانون حکومت کی وجہ سے قانونی گرفت ہوکر اپنا جائز روپیہ کالا روپیہ شمار ہوکر قابل ضبطی وغیرہ ہورہا ہوتو قانونی رو سے اور اپنے حلال روپے کو بچانے کے بقدر مجبوری میں بقدر ضرورت حکومت وقت سے قرض لے لینے کی گنجائش ہوجاتی ہے، البتہ استغفار برابر کرتے رہنا اور خدا سے دعاء کرتے رہنا کہ اے اللہ! یہ ہمارے اعمال بد کے نتائج ہیں، لقولہ علیہ السلام: "**کما تکونوا یولیٰ علیکم**" أو کما قال اولقولہ علیہ السلام: "**اعمالکم عمالکم**" اس لیے ہمارے اعمال ایسے بنادیجئے اور ہمیں ایسی توفیق دیجئے کہ ہم اس قسم کے حالات سے محفوظ رہیں، غرض اس طرح تجارت کرنے میں اگر چہ غیر اسلامی حکومت ہونے کی وجہ سے مجبوراً کچھ غیر شرعی کام کرنے پڑیں جس کے لیے توبہ واستغفار کرنا بھی بسا اوقات کافی ہوسکتا ہے، لیکن جو پیسہ اور مال اپنے پاس آتا ہے اور جو نفع وبچت ہوتی ہے وہ جائز اور حلال مال ہوتا ہے، اس کے کھانے اور استعمال کرنے میں حرام مال اور خبیث مال کھانے کا گناہ ووبال نہیں ہوگا، اور بینک میں سرمایہ اسی نیت سے جمع کرنا کہ اس کے ذریعہ سے جو سود ملے گا اس سے اپنی اور اپنے بال بچوں کی کفالت کروں گا، اس صورت میں سود کھانا لازم آئے گا جس کی حرمت پر نصوص قطعیہ شاہد ہیں، اور جس کے بارے میں قرآن پاک میں یہ تصریح بھی ہے کہ: "**یمحق اللہ الربا ویربی الصدقات**" (۱) پھر صحیح حدیث شریف میں وارد ہے کہ ایک سودی معاملہ میں آٹھ آدمی لعنت اور پھٹکار کے مستحق ہوجاتے ہیں، بلکہ سودخوار پر کھلم کھلا سرکار دوجہاں ﷺ کے دربار سے لعنت آتی ہے اور پھر امام ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں کہ تمام قرآن میں آیت ربوا ہمارے درمیان جتنی خوفناک ہے دوسری کوئی آیت نہیں، غرض اس صورت میں بینک میں سرمایہ جمع کر کے کھلم کھلا سود کی رقم کھانے کا اور بغیر کسی مجبوری کے کھانے کا گناہ اور وبال لازم آئے گا اور ایسا گناہ اور وبال کہ اس کے تصور سے دل کانپ جاتا ہے، کیسے گنجائش ہوسکتی ہے، اس لیے اس کی اجازت شرعاً نہیں دی جاسکتی اور قانونی بات تو آپ ہم سے زیادہ جانتے ہوں گے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۳۰/ ۷/ ۱۴۰۰ھ

بینک سے ملے ہوئے سود کا مصرف:

مروجہ بینکوں میں سیونگ اکاؤنٹ کھولنا جائز ہے یا نہیں؟ اور اگر اکاؤنٹ کھولا گیا ہے تو اس کے سود کا کیا مصرف

۱- سورۂ بقرہ ۲۷۶۔

ہے، کیا سودی روپیہ کو گاؤں کی سڑک کی تعمیر میں صرف کیا جاسکتا، یا کسی غریب مسلم یا غیر مسلم کی اعانت ثواب سمجھتے ہوئے کی جاسکتی ہے؟

مشتاق احمد اعظم گڈھ

الجواب وباللہ التوفیق:

پہلی بات تو یہ ہے کہ حفاظت کی غرض سے یا کسی قانونی مجبوری کی وجہ سے اگر بینک میں روپیہ جمع کرنا پڑے تو ایسے شعبہ یا کھاتہ میں جمع کرنے کی کوشش کرے جس میں سود کا حساب ہی نہ لگایا جاتا ہو، پھر اگر ایسا نہ ہوسکے تو جو رقم سود کے نام سے ملے اس کو بینک میں ہرگز نہ چھوڑے، بلکہ وہاں سے نکال لے، پھر اگر خود اس کے اوپر کوئی غیر شرعی ٹیکس مرکزی حکومت کا عائد ہو جیسے انکم ٹیکس وغیرہ تو اس میں دے، پھر جو رقم بچے اس کو غریبوں، محتاجوں، پریشان حال لوگوں قرضداروں بیواؤں، یتیموں کو بغیر نیت ثواب کے بلکہ اس رقم کے وبال سے بچنے کی نیت سے بطور صدقہ دیدے، اور خود کسی کام میں خرچ نہ کرے، نہ گاؤں کی سڑک میں نہ کسی اور کام میں۔

اگر خرچ کرنے کی ضرورت آجائے تو حیلہ تملیک کے بعد خرچ کرے، یعنی مستحق صدقہ کو بطور صدقہ دے کر مالک بنادے، پھر وہ غریب اپنی طرف سے اور اپنی خوشی سے جس کام کے لیے دے اس میں صرف کرے(۱)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

سود کی رقم سود میں خرچ کرنا:

انڈیا گورنمنٹ کے قاعدہ کے مطابق ہر کاروباری کو اپنی آمدنی کی چوتھائی رقم لازماً حکومت کے بینک میں جمع کرنی پڑتی ہے جو پانچ سال سے پہلے واپس نہیں مل سکتی، البتہ اس کا سود جب چاہے نکال سکتے ہیں اور دوسری طرف اس تاجر کو اپنے کاروبار کے لیے سودی قرض لینا پڑتا ہے، کیونکہ رقم بینک میں اٹکی ہوتی ہے جس کے لیے وہ تیار نہیں ہے مگر مجبوراً قرض لے کر سود ادا کرنا پڑتا ہے۔

۱- ''والحیلۃ أن یتصدق علی الفقیر ثم یأمرہ بفعل ھذہ الأشیاء'' (الدرالمختار مع الشامی، ج۲ ص ۲۳ کتاب الزکوۃ) (مرتب)۔

تو اگر مذکورہ تاجر اپنی جمع شدہ رقم کا سود نکال کر لون والے کو سود ادا کرے تاکہ سود کا مال سود ہی میں جائے، تو ایسا کرنا جائز ہے یا نہیں؟ مدلل تحریر فرمائیں۔

حاجی صدیق بھائی روابری روڈ بون مرچنٹ بھاؤنگر

الجواب وبالله التوفيق:

سود کا مال سود میں جائے یہ تو کوئی وجہ نہیں ہے، البتہ چونکہ خود گورنمنٹ لازماً ایک رقم کاٹ کر اپنے پاس جمع کر لیتی ہے اور اس کا سود بھی خود دیتی ہے، اور دس یا پانچ سال تک وہ شخص اپنا روپیہ بھی نہیں نکال سکتا ہے، اول تو اس نفع کو شرعی سود کہنا جب کہ روپیہ جمع کرنے پر مجبور ہے مشکل ہے۔

دوسرے یہ کہ یہ سود مرکزی حکومت (سینٹرل گورنمنٹ) سے ملتا ہے اور یہ بینک سے قرض لے کر جو سود دینا ہوتا ہے وہ بینک کو دینا ہوتا ہے اور بینک بھی مرکزی حکومت کا ہوتا ہے، اور ہر حرام مال کا شرعی حکم یہ ہے کہ جہاں سے ملا ہو وہاں واپس کر سکے تو واپس کر دے(۱)۔

پس اس قاعدۂ شرعی کے تحت جو رقم سود کے نام پر سینٹرل گورنمنٹ سے ملی تھی، اس کو بینک کے سود کے نام سے اگر چہ دیا مگر اصل میں جہاں کی وہ رقم تھی وہاں ہی پہونچا دی، اس لیے یہ صورت شرعاً گنجائش رکھے گی، اور اگر ایسا نہ ہو سکے تو سود کی رقم کا حکم شرعی یہ ہے کہ اس کے وبال سے بچنے کی نیت سے غرباء و مساکین کو بطور صدقہ دیدے، ''ما أبيح للضرورة يتقدر بقدرها'' (۲)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دار العلوم دیوبند سہارنپور ۱۵/۳/۲۰۰۲ھ

بینک کے سود کے بعض جدید احکام:

اگر بینک سے سود کی رقم اس مقصد سے حاصل کی جائے کہ اس کو شرعی حیلہ اختیار کرنے کے بعد جس کی فقہاء کرام

۱- ''وما حصل بسبب خبيث فالسبيل رده إلى رب المال'' (قواعد الفقہ ۱۱۵) ''وفي رد المحتار إذا عرفوهم وإلا تصدقوا بها، لأن سبيل الكسب الخبيث التصدق إذا تعذر الرد على صاحبها'' (شامی ۵/۳۵۵) ''ويتصدق بها بلا نية الثواب إنما ينوي به براءة الذمة''۔

۲- الاشباہ والنظائر مع شرح الحموی ۱۰۸۔

نے اجازت دی ہو مفادِ عامہ کے امور جو حسب ذیل ہیں:

جیسے تعلیمی وظائف کا دینا، آنکھوں کا کیمپ لگانا، خیراتی ہسپتال چلانا، سیلاب زدگان کی امداد کرنا، سڑک یا پل تعمیر کرانا، دنیاوی تعلیم کے اسکول چلانا، ایسی عمارت بنانا جس میں مفادِ عامہ کے کام انجام دیے جائیں۔

تو کیا کسی شخص سے بطور قرض لے کر مذکورہ بالا امور میں صرف کر دیا جائے اور قرض دہندہ کو بینک سے حاصل شدہ سود کی رقم سے قرض ادا کر دیا جائے تو اس صورت میں مسئلہ کی نوعیت کیا رہے گی؟ آیا یہ مصرف اور ان پر خرچ کرنا جائز ہوگا یا نہیں؟

مسلم فنڈ دیوبند

الجواب وباللہ التوفیق:

جو شخص محتاج غریب ان رقوم کا مستحق ہو یعنی کم سے کم مستحق زکوٰۃ ہو وہ اگر اپنی خوشی اور صوابدید سے قرض لے کر مندرجہ بالا کاموں کے لیے کچھ دیدے تو اس کو وہ پیسہ دے کر مالک بنا دینا کہ وہ خود اپنا قرض ادا کر دے تو درست ہوسکتا ہے اور اس کی گنجائش نکل سکتی ہے (۱)۔

باقی جو شخص ان پیسوں کا مستحق نہیں ہے، محتاج و پریشان نہیں ہے اس کا قرض لے کر ان کاموں کے لیے دیدینے کے بعد اس کو یہ پیسہ دیدینا خواہ قرض کی ادائیگی کے لئے ہی ہو درست نہ ہوگا۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ ان مذکورہ کاموں کے مقصد سے سود حاصل کرنے کے لیے بینک کے سودی شعبہ میں جمع کرنا خود مہمل کلام ہے، اس مقصد کی تحصیل کے لیے بھی ایسا کرنا جائز نہ ہوگا۔

یہ مذکورہ بالا حیلہ بھی محض اس صورت کا ہے کہ کسی تجارتی یا قانونی مجبوری سے یا حفاظت کی مجبوری سے بینک میں کھاتہ کھولنا ناگزیر ہوگیا اور پھر غلطی سے یا کسی مجبوری سے ایسے شعبہ میں جمع کر دیا جس میں سود کا حساب لگایا جاتا ہے اور سود کی رقم ملتی ہے تو اس رقم کو وہاں نہ چھوڑے، وہاں سے نکال کر ان حیلوں کے ذریعہ سے جلد سے جلد اپنی ملک سے بغیر نیت ثواب کے نکال دے (۲)۔

۱- "والحیلة أن یتصدق علی الفقیر ثم یأمره بفعل هذه الأشیاء" (الدر المختار علی الشامی، ص ۲۳، ج ۲ کتاب الزکوۃ)۔

۲- رد المحتار، ص ۱۳۰ ج ۲ باب البیع الفاسد، بذل المجہود ۳۷/۱، کتاب الطہارۃ۔

یہاں اگر بینک میں جمع کرنے والا یہ شخص حکومت کو انکم ٹیکس یا سیل ٹیکس وغیرہ ایسا ٹیکس بھی دیتا ہے جس میں ٹیکس کی رقم براہِ راست سرکاری خزانہ میں پہنچتی ہے تو اسٹیٹ بینک سے ملی ہوئی سود کی رقم پہلے ان ٹیکسوں میں دیدینا چاہیے تا کہ یہ رقم جہاں سے آئی تھی وہاں پہنچ جائے (۱)، اور جو رقم ان ٹیکسوں میں دینے سے بچے اس کو مذکورہ حیلہ کر کے خارج از ملک کردے پھر وہ مستحق رقم کا مالک ہونے کے بعد جس مصرف میں چاہے دے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۳۹۹/۲/۹

سود کی تعریف اور بینک کے سود کا حکم:

اس سوال کا جواب قرآن وحدیث کی روشنی میں دلائل کے ساتھ مرحمت فرما کر ممنون ومشکور فرماتے ہوئے ثواب دارین حاصل کریں۔

سود کی تعریف کیا ہے؟ بینک میں جمع شدہ رقم پر جو سود بینک کی جانب سے ملتا ہے، اس کا حاصل کرنا جائز ہے یا نہیں؟ اگر جائز ہو تو کیا اس کو حاصل کر کے غرباء اور محتاجوں کو تقسیم نہیں کر سکتے؟ جب کہ اس کے حاصل نہ کرنے سے بینک میں ضائع ہوگا۔

مسلم بینک کے سود کا حکم؟

سعودی عرب جہاں سے تمام اسلامی قوانین کا نفاذ عمل میں آیا ہے کیا وہاں کے بینکوں میں سود ادا نہیں کیا جاتا اگر ادا ہوتا ہے تو وہاں کے علماء کیوں خاموش ہیں، یا وہاں کے بینک سے سود لیا جا سکتا ہے۔

محمد عبدالمقتدر (پوسٹ بکس ۳۱۷۳ ابوظہبی متحدہ عرب امارات)

الجواب وباللہ التوفیق:

ربوا سود مطلقاً حرام ہے (۲)، بینک سے جو رقم سود کی ملے اس کا لینا اور حاصل کرنا بھی جائز نہیں ہے، اگر کسی مجبوری

۱- ''ماحصل بسبب خبيث فالسبيل ردهٗ إلى رب المال'' (قواعد الفقہ، ۱۱۵، رد المحتار ۲۲۳/۵، فصل فی البیع) (مرتب)۔

۲- ''فبظلم من الذين هادوا حرمنا عليهم طيبات أحلت لهم وبصدهم عن سبيل الله كثيراً وأخذهم الربوا وقد نهوا عنه وأكلهم أموال الناس بالباطل وأعتدنا للكافرين منهم عذاباً أليماً'' (سورۂ نساء ۲)، ''وعن ابن مسعودؓ عن النبي ﷺ قال: "الربوا ثلاث وسبعون باباً أيسرها ان ينكح الرجل أمه " رواه الحاكم وقال: صحيح على شرط البخاري ومسلم، وعنه أن النبي صلى الله

سے بینک میں جمع کرنی پڑ جائے تو ایسے صیغہ وشعبہ میں جمع کرے جس میں سود نہ لگایا جاتا ہو اور اگر کسی وجہ سے ایسے شعبہ میں جمع کردیا ہو جس میں سود لگایا جاتا ہو تو اس کو ایسے صیغے وشعبے میں منتقل کرالے جس میں سود نہ لگایا جاتا ہو۔

یہی حکم تمام بینکوں اور ان کے سود کا ہے۔

سعودی عربیہ میں سود لیا جاتا ہے یا نہیں؟ اور اگر لیا جاتا ہے تو وہاں کے علماء کیوں خاموش ہیں ان سب باتوں کی وجہ وہیں کے علماء ومشائخ بتا سکتے ہیں۔

البتہ حکم شرعی یہ ہے کہ سعودی عربیہ بلکہ مسلم حکومتوں کے بینکوں سے اگر سودی رقم مل رہی ہو تو اس کو ان بینکوں سے نکالنا جائز نہیں ہے، بلکہ بینک میں ہی چھوڑ دینا لازم ہے اور غیر مسلم حکومتوں کے بینکوں کو قیاس کرنا بھی صحیح نہیں ہے، غیر مسلم حکومتوں کے بینکوں سے جو رقم سود کی مل رہی ہو اس کا حکم یہ ہے کہ اگر اس شخص کو انکم ٹیکس وغیرہ کوئی شرعی ٹیکس اس طرح کا دینا ہو جس میں سود کی رقم اس کے خزانہ میں براہ راست پہونچ جاتی ہو تو ان ٹیکسوں میں اس سود کی رقم کو دے دینا چاہیے(۱)، اور پھر جو رقم اس ٹیکس سے فاضل پڑے اس کو خود کسی کام میں استعمال نہ کرے بلکہ بغیر نیت ثواب کے اس کے وبال سے بچنے کی نیت سے مستحقین صدقہ کو دے کر اپنی ملک سے خارج کردے(۲)۔

اور اگر اس رقم کا ٹیکس جو اوپر مذکور ہوا نہ دینا ہو، پبلک بینک سے وہ رقم مل رہی ہو تو کل کی کل رقم مستحقین صدقہ کو بطور صدقہ دے کر اپنی ملک سے نکال دینا چاہئے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۳۹۹/۲/۳۰

سود کے پیسہ کا حکم:

زید آٹھویں درجہ تک تعلیم یافتہ ہے، زید کو سرکار کی جانب سے آٹھ ہزار (۸۰۰۰) روپے اور ایک سلائی مشین ملی، تین سال کے بعد فقط رقم واپس کرنی ہے، نیز زید کے نام اتنی رقم بینک میں ہے۔ اس کو آٹھ ہزار روپے سود کا دستیاب ہوا تو اب زید کے لئے یہ سود کی آٹھ ہزار رقم سرکار کو دینا جائز ہوگا یا نہیں؟ بالتفصیل مع حوالہ تحریر فرمائیں عین نوازش ہوگی۔

نوٹ: اگر زید کے والد کی یہ رقم ہو (سود کی حاصل کردہ) تو کیا صورت ہوگی سرکار کو دی جاسکتی ہے یا نہیں؟

علیہ وسلم قال: الربوا بضع وسبعون بابا مثل ذلک" (رواہ البزار)۔

۱- دیکھئے قواعد الفقہ، ۱۱۵۔

۲- فتاویٰ شامی ۱۲۰/۴، باب البیع الفاسد۔

الجواب وباللہ التوفیق:

آٹھ ہزار روپے جو حکومت سے بطور قرض لیا ہے وہ حکومت کا جائز مطالبہ ہے، اس میں بینک سے ملا ہوا سودی روپیہ دینا جائز نہیں ہے چاہے یہ سود کا پیسہ باپ کو ملا ہو یا خود اپنے کو دونوں کا یہی حکم ہے۔فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۱/۱۱/ ۱۴۱۰ھ

سود کی رقم سے قرض کی ادائیگی:

حقیر نے ایک سماجی تنظیم انجمن اصلاح ملت کے نام سے تشکیل کرنے کا پروگرام بنایا ہے جس کے اغراض ومقاصد میں سے ایک اہم مقصد سود کے استعمال کا بھی ہے جس کے تحت انجمن مسلم افراد کے شخصی بینک کے کھاتوں، مدارس کے بینک اکاؤنٹوں، خانقاہ ودیگر مسلم ٹرسٹوں کے بینک اکاؤنٹوں سے حاصل شدہ سود کو اپنی تحویل میں لے لیگی اور اس رقم سے ان مقروض لوگوں کو جو کہ مہاجنوں سے قرض لئے ہوئے ہیں اور اصل رقم وسود ادا نہیں کر پا رہے ہیں، ایسی صورت میں انجمن مقروض کی جملہ رقم اصل بمعہ سود مہاجن کو ادا کر کے اور مقروض کی زرِ ضمانت (مثلاً زیورات، مکانات ودیگر جائیداد کے کاغذاتوں) کو اپنی تحویل میں لے لیگی اور بعدہ مقروض کے اصل رقم ادا کر دینے پر ان کی زرضمانت واپس کر دے گی، اگر انجمن کے سود کی آمد زیادہ ہوئی تو وہ مسلم کاروباری طبقہ کو بینک سے قرض دلا دے گی اور اس قرض کا سود انجمن خود ادا کرے گی تو آنجناب سے درخواست ہے کہ ان معاملات کو مذہب کی روشنی میں جانچ کر شرعی فتوی سے آگاہ فرمادیں۔

محمد انور خاں، کانپور

الجواب وباللہ التوفیق:

مذکورہ معاملہ شرعی حدود میں نہیں آتا اور نہ شرعی ضابطہ کے مطابق جائز ہی ہوتا ہے، ہاں اگر ایسا ہوجائے کہ جو لوگ مقروض ہیں یا قرض میں ڈوبے ہوئے ہیں ان کو یہ رقم دیدی جائے کہ وہ لوگ اس سے خود اپنا قرض وسود ادا کردیں تو یہ درست وجائز ہوسکتا ہے اور اگر یہ خطرہ ہو کہ اس رقم کو دوسرے کاموں میں خرچ کر ڈالیں گے اور اپنا قرض وغیرہ ادا نہیں کریں گے تو یہ بھی کر سکتے ہیں کہ ان لوگوں کو ساتھ لے کر جائیں اور اپنے سامنے ان کو یہ رقم دے کر یہ قرض وغیرہ ادا کرادیں تاکہ وہ قرض سے سبکدوش بھی ہوجائیں اور دوسرے بیکار مصارف میں خرچ بھی نہ کرسکیں، باقی یہ کہ زرضمانت (مثلاً زیورات وجائیداد

وغیرہ) کو اپنی تحویل میں کرلیں اور جب وہ مقروض اصل رقم ادا کردے تو اس وقت ان کو یہ زرضمانت واپس کیا جائے صحیح نہیں ہوگا بینک وغیرہ سے سود کی حاصل شدہ رقم کا یہ مصرف صحیح نہ ہوگا، ہاں اگر اپنے ذاتی پیسے سے ایسا کرنا ہو تو کرسکتے ہیں اور سود کی رقم کا تو وہی حکم ہے جو اوپر مذکور ہوا(۱)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۶/۱/۰۲ ۱۴ھ

بینک کے سود کا حکم:

دوسرا مسئلہ میرے پاس یہ ہے کہ میں نے اب تک جتنا کمایا اور اس میں سے جو بھی بچایا وہ سب کا سب بینک میں ہے، اللہ تعالی کے حکم کے مطابق ہر سال ۲½ فیصد زکوۃ بھی جاتی ہے، اب تک اس سود کے پیسے کو میں انتہائی غریب لاچار مجبور یا ایسے شخص کو دیدیتا تھا جو اپنے بیوی بچوں کی کفالت نہ کرسکتا ہو، اس میں لڑکیوں کی شادی بھی شامل ہے، غریبوں کا علاج بھی سب سے پہلے میں نے اپنے گاؤں کی گلی اور نالیاں پکی بنوادیں ایک ہسپتال کی عمارت بنوائی اور لاکھوں روپیہ غریبوں کو بانٹا، لیکن یہ پیسہ یعنی سود کا روپیہ کم نہ ہوا اس وقت میرے پاس تقریبا دس لاکھ روپیہ سود کا ہے، میں نے روپیہ بانٹنے کے لئے ایک ایماندار آدمی رکھا ہے ہر طرح سے چھان بین کر غریبوں کو روپیہ دیتا ہے میرے پاس تین قسم کے حساب ہیں:

(۱) سود کے روپیہ کا حساب انتہائی غریب، غریب طلباء انگریزی والے پیشاب پاخانہ وغیرہ۔

(۲) زکوۃ کا روپیہ دینی مدارس، دیندار غربا غریب عزیز واقارب غیرہ۔

(۳) کمیشن سے کمایا ہوا روپیہ۔ مساجد مدارس بنوانے کے لئے۔

اب آپ برائے مہربانی یہ بتائیں کہ کیا میرا یہ قدم اسلامی قاعدے کے مطابق صحیح ہے اور اگر نہیں صحیح ہے تو اس سود کی لعنت سے کیسے نجات ملے اور جو روپیہ صرف ہو چکا ہے۔ تقریباً آٹھ لاکھ کیا اس کو اچھے مال سے بدلنا پڑے گا، آپ تفصیل سے تحریر کریں کہ میرا اقدام کہاں تک صحیح ہے، کہیں میں کسی گرفت میں تو نہیں آجاؤں گا جس سے میری عاقبت خراب ہو، یا اللہ کی ناراضگی مول لے رہا ہوں، اگر میرا اقدام غلط ہے تو اس سود کے روپئے کا استعمال کیا ہے تفصیل سے تحریر کریں۔

۱- ''لأن سبیل الکسب الخبیث التصدق إذا تعذر الرد'' (البحر الرائق ۸/۳۶۹)۔

الجواب وباللہ التوفیق:

بینک میں سود لینے کی نیت سے تو روپیہ جمع کرنا درست نہیں، البتہ چونکہ روپیہ اپنے گھر پر رکھ کر حفاظت مشکل ہو جاتی ہے خاص کر فی زمانہ، اس لئے بغرض حفاظت بینک میں جمع کرنا درست ہے، اس لئے آپ کا یہ فعل غلط نہیں بلکہ جائز وصحیح ہے، اور خاص کر سنگاپور کے بینک میں جمع کرنا مبنی بر احتیاط ہونے کی وجہ سے مستحسن ہے، نام کے لئے کرنٹ اکاؤنٹ میں سود نہ دینا ہوتا ہے باقی بینک کے عملہ ہر رقم کو سودی کاروبار میں چلا کر سود حاصل کرتے ہیں، اسلئے اس اعتبار سے کرنٹ اکاؤنٹ وفیکس ڈپازٹ میں کوئی خاص فرق نہیں نکلے گا اور سود کا پیسہ بینک میں چھوڑ دینے سے خطرہ ظن غالب ہے کہ وہ لوگ اپنے مذہبی کاموں کے فروغ میں خرچ کریں یا ایسے کاموں میں خرچ کریں جس سے مسلم قوم کو من حیث مسلم قوم نقصان پہونچے، اس لئے بہ نیت حفاظت قوم مسلم یہ حکم دیا جاتا ہے کہ سود کے نام سے جو روپیہ ہے اس کو بینک میں نہ چھوڑا جائے بلکہ وہاں سے نکال کر شرعی ضابطہ کے مطابق اپنی ملک سے نکال دیا جائے اور چونکہ بینک سے ملی ہوئی سود کی رقم کا اصل مالک معلوم نہیں اور نہ ان کا مسلمان ہونا معلوم ہوتا ہے، اس لئے ضابطہ نمبر ۴ کے مطابق اس کے وبال سے بچنے کی نیت سے غرباء ومساکین کو دے کر ان کو اس کا مالک بنا دینا چاہیے۔ ہاں جس ملک کے اسٹیٹ بنک سے یہ سود کی رقم ملی ہے اگر اسی ملک کے اسٹیٹ کا کوئی غیر شرعی ٹیکس اپنے اوپر عائد ہو اس ٹیکس میں دیدیا جائے تو جتنی رقم اس ٹیکس میں دے گا اتنی رقم کا استرداد الی المالک مستحق ہو کر اتنی رقم سے حسب ضابطہ نمبر ا ذمہ سے بری ہو جائے گا اور باقی رقم کا حکم وہی رہے گا جو ابھی ضابطہ نمبر ۴ سے بیان کیا گیا۔

لہذا اس رقم کے بارے میں بھی آپ کا طریقہ انتہائی غریب ولا چار وغیرہ کو دینے میں بالکل صحیح ہے، البتہ لڑکیوں کی شادی کیلئے دینے میں اس کا لحاظ رکھیں کہ اگر اس کے والد یا والدہ غریب ومجبور ہوں تو ان کو بھی دے سکتے ہیں کہ وہ اس سے اپنی لڑکی کی شادی کر ڈالیں اور اگر وہ غریب ولا چار نہ ہوں تو ان کو دے کر ان سے یہ بھی کہہ دیا جائے کہ رقم لڑکی کی ہے اس کو دیدیجئے پھر لڑکی جس طرح چاہے خرچ کرے یا کرائے یا اگر کوئی سامان شادی کا خرید کر لڑکی کو دیدیا جائے تو یہ بھی درست رہے گا۔

اسی طرح غریبوں کے علاج میں دینے میں ڈاکٹروں کی فیس وغیرہ خود نہ دیا جائے بلکہ بالمقطع ایک رقم ان کو دیدیا جائے کہ وہ خود ڈاکٹروں کی فیس وغیرہ دیں یا جس طرح چاہیں علاج کرائیں، ہاں ان کو دوا یا کھانے پینے کی چیز ہو تو خرید کر دے سکتے ہیں۔ یہی طریقہ زکوۃ کے روپیہ کے ادائیگی کا بھی ہے، اسی طرح آپ کا یہ طریقہ بھی صحیح ہے کہ ان کاموں کے لئے

ایماندار آدمی رکھا ہے، البتہ اس میں اتنا لحاظ کرنا چاہیے کہ وہ ایماندار آدمی ادائیگی کا طریقہ اور تملیک مستحق کا طریقہ بھی اچھی طرح جانتا ہوتا کہ ادائیگی صحیح ہوکر ذمہ بری ہوجائے ورنہ اس میں اگر گڑبڑی ہوگی تو ادائیگی صحیح نہ ہوکر ذمہ بری نہ ہوگا۔

تینوں قسم کے حساب میں ادائیگی صحیح ہونے کے لئے ان اصول مذکورہ کا لحاظ رکھنا ضروری ہے اور مستحقین کی ملک میں پہنچادینا ضروری ہے، اب وہ مستحق مالک ہوکر پھر از خود کسی کام کے لئے دیدے یا اس کام میں خود صرف کردے تو یہ درست ہے اور سود کے پیسہ سے جو پیشاب خانہ وغیرہ بنوادیا ہے یا گاؤں کی گلی و نالی وغیرہ پکی بنوادیا ہے اس میں چونکہ بعض علماء نے غرباء و مساکین کی ملک میں جائے بغیر اس تصرف کی اجازت دیدی ہے، اس لئے اس میں جو روپیہ صرف ہو چکا ہے اس کو اچھے مال سے بدلنا یا اس کا ضمان وغیرہ کچھ عائد نہ ہوگا، البتہ آئندہ محتاط رہنا بہتر ہے کہ جب تک تملیک مستحق نہ ہو جائے اس وقت تک ان کاموں میں بھی خود صرف نہ کیا جائے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

لائف انشورنس یا بیمہ پالیسی کا شرعی حکم:

کیا بیمہ پالیسی جائز ہے یا نہیں، اگر جائز نہیں ہے تو پھر کیا کیا جائے؟ بینوا توجروا۔

محمد اسماعیل (ضلع اورنگ آباد)

الجواب وباللہ التوفیق:

بیمہ میں چونکہ عموماً قمار، جوا، اور ربوا ہوتا ہے، اس لیے ناجائز ہے، البتہ اگر کسی ملک یا خطہ کی بدحالی ایسی ہوجائے کہ بغیر اس بیمہ کے جان و مال کا تحفظ متعذر رہوجائے، یا قانونی مجبوری ہوجائے تو اس اضطراری کیفیت کی وجہ سے اپنے تحفظ کے لیے بقدر ضرورت استعمال کی گنجائش ہوجائے گی۔

پھر اس کا لحاظ بھی ضروری رہے گا کہ اگر اپنی جمع کی ہوئی رقم سے زائد رقم ملے تو اسکو خود کسی کام میں نہ لائے بلکہ اس کے وبال سے بچنے کی نیت سے غرباء و مساکین کو دیدے، ہاں اگر اپنے اوپر مرکزی حکومت کا کوئی غیر شرعی ٹیکس لاگو ہو تو اس ٹیکس میں دیدینے کے بعد جو رقم بچے اس کو بطریق مذکورہ غرباء و مساکین کو دیدے۔

نیز چونکہ ایسے حالات اپنی ہی بداعمالیوں کا ثمرہ عموماً ہوتے ہیں، اس لیے جب تک ان حالات سے نجات نہ مل

جائے، ہمیشہ توبہ واستغفار بھی کرتے رہنا اور اپنے حالات کے درست اور مطابق شرع کرنے کی کوشش کرتے رہنا اور اس کے لیے دعائیں کرتے رہنا بھی نجات آخرت کے لیے ضروری رہے گا، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۵/۳/۱۴۰۱ھ

بیمہ کا شرعی حکم:

بیمہ کرانے کا رواج بھی عام ہوگیا ہے، اپنی مملوکہ چیز کا بھی بیمہ کرایا جاتا ہے، چنانچہ موٹر گاڑی بلا بیمہ کرائے نہیں رکھ سکتے ہیں۔ بیمہ کرائی ہوئی چیز اگر کسی حادثہ میں تباہ اور ہلاک ہو جائے تو بیمہ کمپنی ذمہ دار ہوتی ہے کہ اس کی قیمت ادا کرے، موجودہ حالات میں جب کہ املاک کے لیے ہر وقت خطرہ رہتا ہے، کیا مسلمان اپنی دکان کارخانہ یا کسی اور چیز کا بیمہ کرا سکتے ہیں، کیا ان خطرات کی بنا پر مسلمانوں کے لیے جائز ہے کہ وہ اپنی زندگی کا بیمہ کرائیں کہ رقم بیمہ ان کے وارثوں کے کام آئے؟

الجواب وباللہ التوفیق:

بیمہ کے اندر قمار اور ربوا ہونے کی وجہ سے تو نفس بیمہ ناجائز و حرام رہے، مگر سرکاری قانون کی مجبوری کی وجہ سے یا کاروبار کے یا ملازمت کے بقاء یا معاش ومعیشت کی مجبوری سے یا سوال میں ذکر کردہ خطرہ کے پیش نظر فقہاء محققین بیمہ کرا لینے کی اجازت دیدیتے ہیں، خواہ جان کا بیمہ ہو یا جائداد واملاک کا یا ورثاء کا، البتہ بیمہ میں اپنی جمع کردہ رقم سے جو زائد رقم حاصل ہو، اس کو مسلم غرباء ومساکین کو دیدینا ضروری ہے، خود استعمال کرنا جائز نہیں ہے، ہاں اگر اس رقم کے تصدق کرنے سے قبل ہی وہ شخص انتقال کر جائے تو ورثاء میں جو لوگ غریب ومصرف زکوۃ ہوں گے وہ اس زائد رقم کو بھی استعمال کرسکیں گے اور جو زائد رقم بیمہ کرانے والے کو اس کی زندگی میں حاصل نہ ہو بلکہ اس کے انتقال کے بعد حکومت اپنے قانون کے تحت ازخود دے رہی ہو تو اس کو جمع کردہ اصل کی طرح تمام ورثاء بلا لحاظ غریب وغیر غریب سب استعمال کرسکتے ہیں، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

لائف انشورنس کا شرعی حکم:

پہلے یہ واضح ہو کہ پہلے پہل انشورنس کا شعبہ الگ تھا۔اس کے قوانین وضوابط جدا تھے،اب محکمہ وشعبہ کو حکومت نے اپنے تحت لے کر اس کے قواعد کو بدل دیا اور اب حکومت جو رقم اس سے وصول کرتی ہے اس کے مصارف مندرجہ ذیل ہیں:

۱-ملک کی ترقی کے لئے پانی کا نظم،دواخانہ،تعلیم وتربیت کے لیے مدرسے،سڑکوں کی سہولت وغیرہ۔

۲-بڑی بڑی تجارتوں صنعت وحرفت میں خرچ کرنا۔

۳-عمارتیں تعمیر کر کے ان سے کرایہ وصول کرنا۔

۴-حکومت اپنی خاص خاص ضرورتوں پر بطور قرض لیتی ہے۔

غرض ان سارے مصارف کے لیے حکومت رقم دے کر ان سے سود وصول کرتی ہے اور سود کی اس رقم سے کارپوریشن اپنے سارے اخراجات خود برداشت کرتی ہے،جن لوگوں کی انشورنس پالیسیاں ہیں ان کو بطور وظیفہ کچھ دیدیتی ہے مگر سود کی غرض سے یہ رقم نہیں دی جاتی،اب انشورنس دو قسم کی ہوتی ہے:(۱) انڈرمیٹ پالیسی انشور ہے جس کی حکومت خود پوری طرح ذمہ دار ہے،اگر کوئی چند ہزار روپے اور چند سال کے لیے انشورنس کرتا ہے،اگر وہ بقید حیات ہے تو پوری رقم اور بونس دیدیتی ہے،دونوں قسم کے فائدے ہیں۔اگر وہ مرجائے تو جتنی رقم کے لیے انشورنس کیا ہے،اتنی اس کے وارث کو لوٹا دیتی ہے،اس کے علاوہ کوئی فائدہ نہیں،مگر اس طرح کے انشورنس کے لیے ان لوگوں کی پالیسی محکمۂ لائف انشورنس حق شرکت عطا نہیں کرتی جو لوگ معذور ومجبور ہوں،جیسے اندھے لنگڑے بوڑھے اور ذیابطیس کے مریض،بلڈ پریشر کے مریض وغیرہ ساٹھ سال والوں کے لیے بھی اس میں کوئی حصہ نہیں۔

دوسری قسم پیورانڈ ومیٹ پالیسی کا کہلاتا ہے اس میں عمر کی کوئی قید نہیں اور نہ صحت ہی کی شرط ہے،مگر اس انشورنس میں حکومت کسی کی موت وحیات کی ذمہ دار نہیں ہوتی،اگر وہ باحیات ہے تو جو رقم جتنی مدت کے لیے جمع کی ہے وہ اور تھوڑا سا بونس دے کر اسکی پالیسی ختم کر دی جاتی ہے اور اگر مرجائے تو اس کے مرنے تک جتنا پیسہ جمع کیا ہے اتنا اسکے وارث کو لوٹا دیا جاتا ہے۔غرض اس انشورنس میں کسی قسم کا کوئی فائدہ نہیں ہے،موجودہ حکومت نے چونکہ اپنی رعایا پر جہاں ٹیکس لگایا ہے وہاں ایک رعایت یہ رکھی ہے کہ اگر کوئی بیوپاری اس انشورنس کی پالیسی لے تو ان کا انکم ٹیکس کم کر دیا جاتا ہے،اب جبکہ مذکورہ بالا قانون حکومت پیش کرتی ہے تو از روئے شرع ایک مسلمان کے لیے چند سوالات پیدا ہوتے ہیں جو درج ذیل ہیں:

۱-اگر کوئی بیوپاری یا اور کوئی شخص لائف انشورنس کی پالیسی محض اس غرض سے لیتا ہے کہ اس کے ٹیکس میں کمی ہو تو

آیا جائز ہے یا نہیں؟

۲-اوپر جو دوقسم کی پالیسیوں کا ذکر کیا گیا ہے، اس میں دوسری قسم کی پالیسی انشورنس میں جو بونس دیا جاتا ہے وہ چھوڑ دی جائے یا نہیں۔یا اس کو لے کر ثواب کی نیت اور عام لوگوں کی سہولت کے لیے خرچ کیا جا سکتا ہے؟

۳-پہلی انشورنس میں، جبکہ دونوں طرح کے فائدوں سے ملنے والی رقم کے لیے کسی وارث کو وصیت کی جا سکتی ہے یا نہیں؟

۴-اگر انشورنس کی پالیسی لینے کی اجازت ہو تو پہلی قسم کی انشورنس کی جا سکتی ہے۔یا دوسری قسم؟

۵-حکومت کی عطا کردہ سہولت سے فائدہ اٹھانے میں کیا حرج ہے؟

۶-اگر دونوں انشورنس کی پالیسی والا حیات ہو اور اس کو اصل رقم اور بونس ملے تو کیا نیک کاموں میں خرچ کر سکتا ہے؟ ہماری غرض صرف یہ ہے حکومت ٹیکس زیادہ لیتی ہے اس سے بچنے کے لیے حکومت کی سہولت سے فائدہ اٹھایا جائے، علاوہ بریں کوئی نیت اور غرض نہیں ہے۔

الجواب وبالله التوفيق:

مرسلہ استفتاء کا ہر جز بغور پڑھ کر حکم شرعی لکھا جاتا ہے: **لائف انشورنس خواہ کسی قسم کا ہو اس میں سود (ربوا) تو ضروری ہوگا اور اکثر میں قمار (جوا) بھی ہوگا اور سود قمار دونوں شریعت مطہرہ میں حرام و ناجائز ہیں، اس لئے لائف انشورنس کو جائز نہیں کہا جا سکتا**، البتہ شدید مجبوری کی بات دوسری ہے، مثلاً کسی مقام کے حالات ایسے خراب ہو جائیں کہ بغیر انشورنس کے جان و مال کی حفاظت مشکل ہو جائے، یا مثلاً ملازمت نہ ملے یا ملازمت برقرار و بحال نہ رہے اور بغیر ملازمت کے گزارہ مشکل ہو یا معاشرہ قائم نہ رہے تو بوجہ مجبوری کے محض بقدر گنجائش نکل سکتی ہے، مگر شرط یہ ہوگی کہ جمع کی ہوئی رقم سے زائد رقم سود کے نام سے جو ملے اس کو ثواب کی نیت کے بغیر، بلکہ اسکے وبال سے بچنے کی نیت سے محتاج غرباء و مساکین کو دے دیا جائے اور استغفار و دعاء کا معمول رکھا جائے کہ اللہ ہمارے گناہوں کو معاف کیجئے اور ہمارے حالات ایسے کیجئے کہ ان حرام و ناجائز چیزوں سے ہم محفوظ رہتے ہوئے اطمینان سے کمائی کر سکیں۔ اس تمہید کے بعد اب ہر سوال کا جواب نمبر وار درج کیا جاتا ہے بغور مطالعہ فرمائیں!

۱-بیجا اور غلط قسم کے دباؤ سے بچنے کی غرض سے مجبور ہو کر ضرورت کے بقدر گنجائش ہے۔

۲-وہ بونس وہاں نہ چھوڑا جائے، وصول کر کے بغیر نیت ثواب محض اس کے وبال سے بچنے کی نیت سے محتاج غرباء ومساکین کو دے دیا جائے۔

۳-اگر بوجہ مجبوری ایسا انشورنس کرائے تو یہ وصیت کرنی ضروری ہوگی کہ میری جمع کی ہوئی رقم سے جو زائد رقم ملے اس کو محتاج غرباء ومساکین کو دے دیا جائے۔

۴-مجبوری کے تحت پہلی قسم کے انشورنس بھی کرا سکتے ہیں۔

۵-حدود شرع میں رہتے ہوئے کوئی حرج نہیں ہے۔

۶-دونوں پالیسیوں میں اپنی اصل رقم تو اپنے جس مصرف میں چاہے خرچ کر سکتا ہے، البتہ اصل رقم سے زائد جو رقم یا بونس ملے اس کا حکم وہی ہے جو نمبر ۲، ۳ میں گزرا، یعنی صرف محتاج غرباء ومساکین کو اس کے وبال سے بچنے کی نیت سے دیدے اور کہیں خود خرچ نہ کرے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

ایک خاص قسم کے بیمۂ زندگی کا شرعی حکم:

ہندوستان میں گورنمنٹ کی طرف سے ایک کمپنی قائم ہے جو انسان کی زندگی کا بیمہ کرتی ہے۔ اس کی صورت یہ ہے کہ مثلاً زید کی زندگی کا بیمہ مبلغ پچیس ہزار کا کیا اور مدت بیمہ پندرہ سال ہے۔ پندرہ سال میں زید کو پچیس ہزار روپیہ کی رقم اس کمپنی کو دینا ہے، لیکن قسط وار جب پندرہ سال پورے ہو جائیں تو پچیس ہزار روپیہ زید کو پورا کرنا ہوگا۔ پندرہ سال کے بعد پوری رقم مع اس کے نفع کے کمپنی زید کو واپس کرے گی۔

لیکن اس شرط کے ساتھ کہ نفع میں پانچ فیصدی کمپنی نفع سے لے گی بقیہ زید کو واپس کرے گی اور دو سال ابتدائی میں زید کو قسط برابر دینا ہوگی، اگر اس نے ناغہ کر دیا تو جو رقم زید نے دی ہے وہ ختم ہو جائے گی۔ دو سال کے بعد اگر قسط وار نہیں دیا تو ساری نہیں جائے گی۔ اور خدانخواستہ ایک قسط ادا کرنے کے بعد زید کا انتقال ہو جائے تو زید کے وارث کو پورا پچیس ہزار روپے مع نفع کے ملے گا۔ تو آیا اس صورت میں زید کو زندگی کا بیمہ کرانا جائز ہے یا نہیں؟ پانچ فیصدی رقم نفع کی جو کمپنی کاٹ لیتی ہے وہ نفع خود نہیں، بلکہ بیواؤں کو جو لوگ مر جاتے ہیں ان کی رقم عوض کر کے دے دیتی ہے۔

الجواب وباللہ التوفیق:

اس شرط سے (کہ کمپنی نفع میں سے پانچ فیصد کاٹ کر بقیہ نفع دے گی) تو خرابی واقع نہ ہوگی، البتہ اس معاملہ میں دوسری اور خرابیاں ہیں، مثلاً پندرہ سال بعد پوری رقم مع اس کے نفع کے کمپنی جو واپس دے گی، اس میں وہ پورے سرمایہ کے فیصد کے حساب سے دے گی۔ جیسے پورے سرمایہ (پندرہ ہزار کا) پانچ فیصد یا سات فیصد نفع تخصیص کرے گی یا کیا صورت ہوگی؟ اگر سرمایہ کے فیصد کے تعین کے ساتھ نفع متعین ہے، تو یہ نفع تجارت کے اصول پر نہیں ہوگا، کیونکہ تجارت میں کبھی نفع کم کبھی زیادہ ہوتا ہے، اسی طرح پورے سرمایہ پر پندرہ سال میں بھی سرمایہ کا فیصد متعین نہیں ہوسکتا۔ فیصد سرمایہ کا متعین کر کے نفع مشخص کرنا یہ سود ہو جائے گا، دوسری خرابی یہ ہے کہ ابتدائی دو سال میں اگر کوئی ایک قسط بھی ناغہ ہوگئی تو کل دی ہوئی رقم ضبط ہو جائے گی یہ شرط غلط اور ناجائز ہے، معاملہ کو قمار بنا دیتی ہے۔ اسی طرح اگر رقم جمع کرنے والا ایک قسط بھی ادا کر کے مر جائے تو کمپنی کو پورے پچیس ہزار روپے ادا کرنے ہوں گے یہ شرط کھلی ہوئی قمار کی ہے، اور ان خرابیوں کی وجہ سے یہ معاملہ (زندگی بیمہ کا) ناجائز و نادرست ہے، البتہ اگر بقائے ملازمت کی خاطر قانون حکومت سے مجبور ہو کر بیمہ زندگی کرانا پڑ جائے یا کسی خطہ کے ملکی حالات ایسے خراب ہو جائیں کہ بغیر بیمہ کے جان و مال وغیرہ کا تحفظ مشکل ہو جائے تو بات دوسری ہوگی اور ان مجبوریوں میں بوجہ مجبوری اس بیمہ کی اجازت ہوگی، البتہ اس بیمہ میں جمع کی ہوئی اپنی رقم سے زائد جو رقم ہے اس کو مسلم غرباء و مساکین کو دیدینا ضروری رہے گا، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین، مفتی دار العلوم دیوبند سہارنپور

پراویڈنٹ فنڈ کی رقم اور اس پر زکوۃ کا حکم:

الف- ایک شخص سرکاری ملازمت کرتا ہے، سرکاری ملازمین کے مطابق ہر ماہ اس کی تنخواہ میں سے، ۱۰/روپے لازمی طور پر کٹ جاتے ہیں اور سالانہ ۱۲ روپے پر کم از کم چار روپے یا اس سے زیادہ سود ملتا ہے، اور اسی رقم کے مجموعہ پر ہر سال اسی کے مطابق سود جمع ہوتا رہتا ہے، اور نوکری چھوڑتے وقت اس کو وہ تمام رقم مجموعہ مع سود در سود کے ملتے ہیں، سوال یہ ہے کہ یہ سود لینا رقم پر قبضہ کے وقت جائز ہے یا نہیں؟

ب- اگر ناجائز ہو اور سود لینے سے بچنے کے لیے وہ ہر سال اپنی مجموعہ رقم پر جو سود ملتا ہے، اس کے قبضہ سے پہلے اپنی جیب سے اتنی خیرات کر دے اور قبضہ کے وقت تمام رقم اپنے پاس رکھ لے تو جائز ہے یا نہیں؟ یہ اس لیے کہ آخر وہی رقم

سود کی نکلتی ہوئی نظر آئے اور اس سے دل میں تذبذب پیدا نہ ہوجائے، اس لیے کرنے کا ارادہ ہے۔

ج - اس رقم کی زکوٰۃ ہر سال نکالنی ہوگی، یا اس پر قبضہ کے بعد تمام سالوں کی نکالنی ہوگی، یا صرف ایک سال کی؟

الجواب وباللہ التوفیق:

الف، ب: سرکاری ملازمین یا کسی بھی ملازمین کی تنخواہ سے ہر ماہ جو رقم محکمہ کاٹ کر جمع کرتا رہتا ہے اور اس پر سود کے نام سے یا جس نام سے بھی اضافہ کرتا ہے اور بعد ختم ملازمت ملازم کو دیتا ہے وہ سود نہیں ہے، وہ منجانب محکمہ انعام کے قبیل سے ہے، اس کا لینا اور اپنے استعمال میں لانا سب بے تکلف جائز ہے، کسی قسم کا کوئی خیال یا شبہ نہ کریں، البتہ فنڈ سے جو قرض لیتے ہیں اور اس میں جو سود دیتے ہیں وہ شرعاً سود دینا ہے، اس سے بچنے کے لیے جہاں تک ہوسکے ایسا قرض نہ لیں۔

ج: اس رقم کی زکوٰۃ وصول ہونے کے بعد جب اس پر ایک سال گذر جائے گا اس وقت ادا کرنی ہوگی ابھی نہیں (۱)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین، مفتی دار العلوم دیوبند سہارنپور ۲۲/ ۷/ ۹۱ ۱۳ھ

الجواب صحیح محمود غفرلہ

پراویڈنٹ فنڈ کی شرعی حیثیت:

پرائیویٹ فنڈ کا طریقہ یہ ہے کہ کچھ فیصد ملازمین کی تنخواہ سے لے کر جمع کیا جاتا ہے اور اس کے بقدر ادارہ کی طرف سے رقم جمع کی جاتی ہے، یہ رقم بینک میں جمع ہوتی رہتی ہے اور جب ملازم سبکدوش ہوجاتا ہے تو اس کی رقم اور ادارہ کی مجموعی رقم کے ساتھ وہ سود بھی شامل کیا جاتا ہے جو اس اثنا میں بینک کی طرف سے دیا گیا تھا اور یہ ساری رقم ملازم کو دیدی جاتی ہے، بہت سے محتاط لوگ سود کی رقم نہیں لیتے ہیں، آپ نے فرمایا تھا کہ یہ سود سود نہیں ہوتا، اس درمیان ایک صاحب پاکستان سے آئے انہوں نے فرمایا کہ جناب مفتی محمد شفیع صاحب مرحوم کا بھی یہی فتویٰ ہے، لیکن وہ فتویٰ میری نظر سے نہیں گذرا، اور نہیں معلوم کہ کس بنا پر وہ اس قسم کے سود کو سود نہیں قرار دیتے، براہ کرم آپ اپنی رائے مطلع فرمائیں۔

۱- ’’وشرطه أي شرط افتراض أدائها حولان الحول وهو في ملكه‘‘ (فتاویٰ شامی ۲/ ۱۰ کتاب الزکوٰۃ)۔

بینکوں میں رقم اشخاص جمع کرتے ہیں اور اس پر سود لگتا ہے اس سود کے بارے میں غالباً ۱۹۲۸ء میں یہ فتویٰ شائع ہوا تھا کہ سود کی رقم بینک میں نہ چھوڑی جائے بلکہ لے کر کسی کو بلا امید ثواب دیدی جائے، کسی مدرسہ اور یتیم خانہ وغیرہ کو یہ رقم دی جاسکتی ہے، لیکن اگر اداروں کی رقم پر سود ملے تو کیا ادارے، مدرسے وغیرہ اپنے مصارف میں اس سودی رقم کو صرف کر سکتے ہیں یا انہیں بھی کسی اور کو دینی پڑے گی، اس سلسلہ میں آج کل یہ مسئلہ اٹھا ہوا ہے کہ امن و انتظام کی جو حالت ہے اس کی بناپر مدرسوں اور دوسرے اداروں کو اپنے یہاں بھاری رقم نہ رکھنی چاہیے بلکہ کسی معتبر بینک میں جمع کر دینا چاہیے تاکہ محفوظ رہے اور جو رقم انٹرسٹ کے طور پر ملے اسے یہ مدرسے اور ادارے اپنی مدات میں خرچ کریں، کیا کسی معین مدت کے لیے مثلاً پانچ سال کے لیے فوری ضرورت کے علاوہ کی رقم بینک میں جمع کی جاسکتی ہے، جو اس مدرسہ یا ادارہ کا سرمایہ محفوظ ہو، ان طویل المدت جمع شدہ رقوم پر جو انٹرسٹ ملے اس کو بھی ادارہ اور مدرسہ کے کاموں میں صرف کیا جاسکتا ہے، کیا اس بارے میں حکومتی اور غیر حکومتی بینکوں میں کوئی فرق کیا جائے گا بعض لوگوں کا خیال ہے کہ حکومت چونکہ رعایا کے اموال پر تصرف کرتی رہتی ہے، آمدنی پر جتنی مقدار میں چاہتی ہے ٹیکس لگا دیتی ہے، جائیدادوں کے متعلق مالکوں کی مرضی کے خلاف قوانین بناتی ہے، جب مناسب سمجھتی ہے جائیداد کو ضبط کر لیتی ہے جیسا کہ خاتمہ زمینداری کے وقت کیا گیا کہ زمین کے جائز مالکوں کو ان آراضی سے محروم کر دیا گیا، مکانوں کے بارے میں ایسے قوانین بنائے ہیں کہ مالکان تقریباً بے اختیار ہو گئے ہیں اور اس میں بھی امکان ہے کہ حکومت زمینوں کی طرح مکانوں اور جن املاک کو چاہتی ہے مالکوں سے چھین لیتی ہے، ایسی صورت میں بعض لوگوں کا خیال ہے کہ حکومت سے جو بھی مل جائے روا ہے، جیسا کہ خاتمہ زمینداری کے موقع پر جو بانڈ دیئے گئے تھے ان پر جو سود لگتا تھا اسے جائز قرار دیا گیا تھا، خیال ہوتا ہے کہ مولانا حفظ الرحمٰن صاحب مرحوم اور دوسرے اصحاب نے کہا تھا کہ جو جائیداد حکومت لے رہی ہے اس کا جو معاوضہ دے رہی ہے اس کو جائیداد کی اصل قیمت سے کوئی نسبت نہیں ہے، اس حالت میں جو بھی وہ دیتی ہے وہ بے حد کم ہے اور چاہے جس طرح پروے اسے لے لیا جائے۔

عبدالسلام

الجواب وباللہ التوفیق:

پراویڈنٹ فنڈ کے سلسلہ میں جو زائد رقم محکمہ دیتا ہے اس پر سود کی تعریف صادق نہ آنا تو ظاہر ہے، اس لیے کہ ملازم کی تنخواہ سے وضع کی ہوئی رقم کے برابر محکمہ جو رقم ملاتا ہے وہ رقم تو شروع ملازمت ہی میں طے شدہ ضابطہ کے مطابق ایک گونہ جزء اجرت قرار دی جاتی ہے اور اس کے علاوہ اور جو زائد رقم محکمہ خود ملاتا ہے خواہ بینک میں جمع رکھنے کی وجہ سے جو نفع اس کو

ملے اس کا اضافہ کر کے دیدیا خواہ کسی اور ذریعہ سے وہ حاصل کر کے دیدے یہ سب محکمہ کا اپنا ذاتی فعل ہے، ملازم اس کا مطالبہ نہیں کرتا اور نہ ملازم کا اس میں کوئی دخل ہوتا ہے بلکہ محکمہ خود کرتا ہے، اس پر بھی سود کی تعریف صادق نہیں آتی، سود کا شرعی مفہوم یہ ہے کہ اموال ربویہ (اموال قدری متحد الجنس) میں تبادلہ کا معاملہ (عقد معاوضہ) کیا جائے، اور پھر کسی جانب کوئی زیادتی بلاعوض ہو، یہاں ایسا نہیں ہے، اس لئے اس رقم میں سود کی حرمت نہیں آتی، نیز اہل بینک یا اسٹیٹ غیر مسلم میں یا اگر مشترک ہو تو چونکہ اقتدار اعلیٰ غیر مسلم کا ہے، اس لئے اس کے احوال و احکام وہی ہوں گے جو عام غیر مسلموں کے ساتھ معاملات کے احوال و احکام ہوتے ہیں، غیر مسلم آپس میں سودی کاروبار اور سودی لین دین بھی کرتے ہیں، بہت سی بیع باطل و فاسد بھی کرتے ہیں، شراب بھی بناتے ہیں اور بیچتے ہیں اور اس کی قیمت لیتے ہیں، خنزیر بھی بیچ کر اس کی قیمت لیتے ہیں۔ پھر مسلمانوں کو یہ پیسے مزدوری میں انعام وغیرہ میں دیتے ہیں، اور ان سب پیسوں کا حرام ہونا معلوم ہونے کے باوجود ان پیسوں کا لینا اس وقت تک شرعاً جائز وغیر مکروہ شمار ہوتا ہے جب تک کہ یہ یقین نہیں ہوتا کہ یہ چیز جس کو فروخت کر رہا ہے یہ بعینہ وہی چیز ہے جس کو چرا کر یا ڈاکہ ڈال کر لایا ہے، جو قیمت دے رہا ہے یہ بعینہ وہی روپیہ ہے جس کو چرا کر یا ڈاکہ ڈال کر لایا ہے، غرض ان سب کا لے لینا اور استعمال کر لینا سب درست رہتا ہے، اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ حکم جواز کیوں ہے؟ اس کی وجوہ متعدد ہیں۔ متعدد شرعی ضوابط اس کی بنیاد ہیں مثلاً:

الف: تبدیل ملک سے حکماً تبدیل عین ہوجاتا ہے۔

ب: الخلط استہلاک کا ضابطہ جو مسلم ہے۔

ج: مثلاً یہ کہ کفار ابتداءً صرف ایمان کے اور حدود وعقوبت مشروعہ کے مخاطب ہوتے ہیں، باقی معاملات وجزئی احکامات کے مخاطب بعد میں ہوتے ہیں، اس لیے ان کے آپس کے معاملات برقرار اور نافذ رکھے جاتے ہیں، جب تک کہ وہ حرام لعینہ وقبیح خداع، چوری، ڈاکہ وغیرہ کا ارتکاب نہ کریں حتیٰ کہ زوجین کے ایک ساتھ اسلام لانے میں ان کے زمانہ کفر کے نکاح کو بھی جو شرعی ضابطہ کے مطابق اکثر نہیں ہوتا، بلکہ بسا اوقات شرعی احکام کے خلاف ہوتا ہے برقرار و باقی رکھا جاتا ہے، ہاں اگر حقیقی بہن یا ماں بیٹی کسی کے نکاح میں ہو تو اس صورت میں تفریق کرادیتے ہیں، اس لیے کہ حرام بعینہ وقبیح بعینہ ہونے کے ساتھ ساتھ ان کی حرمت قبیح عقلی بھی ہے، پس یہی حکم وحال یہاں بھی ہوگا کہ محکمہ جن کے اصحاب حل وعقد خالص غیر مسلم ہوں یا مشترک ہوتے ہوں مگر اقتدار اعلیٰ غیر مسلم کے ہاتھ میں ہو اور وہ اپنے طور پر سودی کاروبار نفع حاصل کر کے کوئی رقم جمع کرے اور بطور تبرع کسی مسلمان ملازم کو دے تو اس کا لینا جائز رہے گا اور بعد انعام داخل ہو کر طیب وحلال شمار ہوگا، اس

کے علاوہ پہلی دونوں وجوہ (تبدل ملک سے حکماً تبدل عین ہوجاتا ہے) اور (اختلاط استہلاک کا ضابطہ) بھی صادق آکر حکم حرمت ختم ہوجاتا ہے، حضرت مفتی محمد شفیع صاحبؒ کا فتویٰ احقر کی نظر سے بھی نہیں گذرا ہے، بہت ممکن ہے کہ یہی مذکورہ وجوہ حضرت مفتی صاحب موصوف کے فتوے کی بنیاد بھی ہوں۔ جو حضرات احتیاط برتتے ہیں اور یہ رقم نہیں لیتے، یہ احتیاط شرعاً اس وقت تک معتبر ہوگی جب تک کہ یہ ظن غالب ہو کہ نہ لینے کی صورت میں محکمہ اس رقم کو کسی غیر مسلم مذہبی ادارہ میں نہیں دیگا اور اگر اس کا ظن غالب ہوجائے کہ ملازم اس رقم کو نہیں لیگا تو محکمہ اس رقم کو کسی غیر مسلم مذہبی ادارہ میں ''دان کھاتہ'' میں دیدے گا تو پھر یہ نہ لینا شرعاً صحیح ومعتبر نہ ہوگا، بلکہ اس صورت میں کوئی شخص تقویٰ پر عمل کرنا چاہے تو اس کی یہ صورت ہوگی کہ محکمہ سے وصول کر کے خود غریب وپریشان حال مسلمانوں پر بلانیت ثواب صدقہ کردے یا کسی دینی ادارہ میں دیدے، جس میں غیر مستطیع یا غریب ویتیم بچوں کو کھانا کپڑا دیا جاتا ہوتا کہ وہ ان کے کھانے کپڑے میں خرچ کردیں یا کسی قرضدار کو دیدے کہ وہ اپنا قرض ادا کردے۔

۲- ہاں جب اداروں کی رقم پر اسی قسم کی رقم سود کی ہے تو اداروں کو بھی چاہیے کہ اگر اپنے یہاں غریب وغیر مستطیع (مستحقین زکوٰۃ) موجود ہوں تو ان کو بلانیت ثواب اور بغیر جز واجرت وبغیر جز وتنخواہ وغیرہ بتائے ہوئے بطور صدقہ کے دیدے، یا ان کے کھانے کپڑے پر خرچ کردے جیسا کہ دینی مدارس میں ہوتا ہے، اور اگر اپنے یہاں غریب ومستحق زکوٰۃ نہ ہوں تو پھر جس غریب ومستحق زکوٰۃ پر چاہے بلانیت ثواب بطور تصدق دیدے، غرض تملیک مستحق بطور تصدق ضروری ہے بغیر اس کے کسی اور مصرف میں صرف کرنا درست نہ ہوگا، اور اگر کسی اور مصرف میں صرف کرنا کسی شرعی مقصد کے تحت ضروری ہی ہوجائے تو اس کے وبال سے بچنے کی نیت سے حیلۂ تملیک کے بعد صرف کرے۔ یہ حکم غیر حکومتی بینکوں سے سودی رقم لینے کا ہے، حکومتی بینکوں سے اس قسم کی رقم ملنے کا حکم اگلے جواب میں آتا ہے۔

۳- جی ہاں ان تشویشناک ملکی حالات میں بغرض حفاظت مدرسوں اور دوسرے اداروں کو بھی اپنی رقوم کسی بھی معتبر بینک میں جمع کردینا جائز ہے، اور اگر اپنی ساری رقم کرنٹ اکاؤنٹ میں جمع کرنے میں دشواری یا قانونی مشکلات ہوں تو فکسڈ یا سیونگ جس اکاؤنٹ میں محفوظ سمجھیں جمع کرسکتے ہیں اور پھر اس پر سود کے نام سے ملی ہوئی جو رقم ہو اگر غیر حکومتی بینک سے مل رہی ہو تو اس کا بعینہٖ وہی حکم اور مصرف ہے جو ۲ کے جواب میں ابھی تفصیل سے مذکور ہوا، اور اگر حکومتی بینک سے مل رہی ہو تو مذکورہ ۲ کی صورتوں کے علاوہ یہ بھی کرسکتے ہیں کہ ان رقوم کو انکم ٹیکس میں یا کسی بھی ایسے ٹیکس میں جس میں ٹیکس کی

رقم اسٹیٹ کے خزانہ میں براہ راست پہنچتی ہوے سکتے ہیں، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۴/۱۲/ ۹۸ ۱۳ھ

پی ایف کا شرعی حکم:

۱- سرکاری نوکری کی تنخواہ سے کچھ روپیہ بطور فنڈ کاٹا جاتا ہے اور جتنا یہ فنڈ کٹتا ہے اس میں اس فنڈ کی آدھی رقم گورنمنٹ اس میں شامل کردیتی ہے۔ مثال کے طور پر اگر ہمارے ۲۰ روپے فنڈ کٹا تو سرکار اس میں ۱۰ روپے اور اپنی طرف سے ملادیتی ہے، اور پھر ان ۳۰ روپیوں پر سود لگادیتی ہے، کیا یہ دونوں حالت جائز ہیں، یا صرف ہمارے لیے ہماری اصل رقم جو کہ کٹتی ہے وہ ہی جائز ہے؟

۲- ہماری تنخواہ سے سرکاری طور پر جبراً ۵ روپیہ کٹتے ہیں، ہمارے ریٹائر ہونے تک یہ اصل رقم دو ہزار روپے بنتے ہیں، لیکن ریٹائر ہونے پر ہمیں سرکار دو ہزار روپیوں کے بدلے ۵ ہزار روپے دیگی یا اچانک ہم کسی حادثہ کا شکار ہوجاتے ہیں، یعنی مرجاتے ہیں تو یہ پیسہ، یعنی مبلغ ۵ ہزار روپے ہمارے لواحقین کو ملتا ہے، چاہے ہماری کل رقم یعنی دو ہزار روپے بھی جمع نہ کئے گئے ہوں، کیا یہ دونوں صورتیں جائز ہیں؟

۳- بینک یا ڈاک خانہ میں ہم بذات خود کچھ روپیہ جمع کریں اور اس پر سرکار بطور سود کچھ رقم دے یا سرکاری طور پر کوئی رقم جمع ہو، اور اس پر کچھ روپے بطور سود ملتے ہیں، تو کیا یہ دونوں صورتیں جائز ہیں؟

۴- جو روپیہ ہمیں سود کا ملتا ہے اس کو ہم کسی آدمی کو بتا کردیں کہ یہ سود ہے تو یہ ڈر ہے کہ وہ یہ نہ سمجھ لے کہ ہم سود خور ہیں، کیونکہ پوری بات وہ نہیں سمجھ پاتا تو ایسی صورت میں کیا:

الف- سود کی رقم بغیر بتائے کہ یہ سود کا پیسہ ہے، کسی مستحق کو دے دیا جائے؟

ب- یا اس رقم کو جلا کر یا پھاڑ کر ختم کردیا جائے۔ ان دونوں صورتوں میں کونسی بہتر ہے؟

الجواب وباللہ التوفیق:

۱- فنڈ کاٹ کر حکومت اس میں جتنا ملا کردیتی ہے، خواہ سود کے نام سے دے وہ سب لے لینا اور اپنے استعمال میں لانا سب جائز ہے، سود نہیں ہے، بلکہ وہ سب انعام ہے۔

۲-سرکاری طور پر جبراً جو روپیہ حکومت بیمہ کے نام پر کاٹ لیتی ہے وہ روپیہ اور اس میں جتنا ملا کر دے وہ سب بھی ناجائز نہیں ہے لے سکتے ہیں اور اپنے کام میں خرچ کر سکتے ہیں، اسی طرح مرجانے پر لواحقین کو جو روپیہ دیتی ہے اس میں جو روپیہ ملازم کا اپنا جمع ہو وہ تو ترکہ بنتا ہے اس میں وراثت کے قاعدہ سے ہر وارث کا حصہ ہوگا اور جو روپیہ اس سے زائد حکومت دیتی ہے وہ اپنے قانون کے ماتحت جس کو دیتی ہے اس کا ہوتا ہے اور اس کا لینا جائز ہے۔

البتہ جو روپیہ انسان بیمہ میں خود کٹوائے اور حکومت کی طرف سے مجبوری نہ ہو اور نہ جبراً کاٹتی ہو تو وہ واقعی بیمہ ہے اور ایسا کرنا ناجائز ہے اور اس میں اپنے جمع کیے ہوئے روپے سے زائد جو ملے گا وہ سود اور ناجائز ہوگا، اس کو لے کر کسی غریب مستحق زکوٰۃ کو اس کے وبال سے بچنے کی نیت سے بطور صدقہ کے دیدینا ضروری رہے گا اور اس محتاج مستحق زکوٰۃ کو دیتے وقت یا کسی وقت بتانا ضروری نہیں ہے کہ یہ سود کا روپیہ ہے، بلکہ اپنے دل میں چھپائے رکھنا بھی درست ہے، اور اس روپیہ کو جس طرح خود خرچ کرنا جائز نہیں ہے، اسی طرح جلا ڈالنا یا پھاڑ ڈالنا یا پھینک دینا بھی جائز نہیں ہے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۹۶/۲/۶ ۱۳ھ

پی ایف کی رقم کا شرعی حکم:

میونسپلٹی میں کسی بھی ملازم کو ریٹائر ہونے کے بعد پنشن نہیں ہوتی ہے، اس کی تنخواہ سے پی فنڈ ماہواری کٹتا رہتا ہے اور بورڈ بھی اپنی طرف سے فنڈ سے آدھا روپیہ خود بھی ملازم کے فنڈ میں جمع کرتا رہتا ہے اور ہر پانچ سال ہونے کے بعد میونسپل بورڈ بونس بھی دیکر اسی کے فنڈ میں جمع کر دیتا ہے یہ سب روپیہ بینک میں جمع ہوتا رہتا ہے، اس پر ہر سال بینک اپنے قاعدے کے مطابق اس فنڈ کی رقم کا انٹرسٹ یعنی سود ہر سال جمع کرتا رہتا ہے تو آپ اسکے لئے بھی مطلع فرمائیں کہ وہ لینا جائز ہے یا نہیں؟ ایک صاحب نے یہ بھی بتایا ہے کہ دو اماموں نے اس کو جائز قرار دیا ہے، کیا مسلم ملازم اس بینک کے سود سے یعنی اپنے خرچ اخراجات میں لاسکتا ہے یا نہیں؟

نسیم اختر محلہ ساہوان (دھام پور، ضلع بجنور)

الجواب وباللہ التوفیق:

جو ہر ملازم کی تنخواہ سے ہر ماہ فنڈ کٹتا ہے اور محکمہ خود جمع کرتا رہتا ہے اور پھر اپنی خوشی سے اور اپنی طرف سے اس میں

بڑھاتا رہتا ہے خواہ بونس کے نام سے یا کسی اور طرح سے اور جہاں چاہتا ہے خود اس رقم کو رکھتا ہے، اس میں ملازم کا کوئی عمل دخل نہیں ہوتا ہے اور پھر اصل فنڈ جو تنخواہ سے کٹا تھا اس پر زیادہ کر کے دیتا ہے یہ سب محکمہ کا انعام ہے اس پر شرعی تعریف سود کی صادق نہیں آتی، اس لئے یہ سود اور حرام نہیں ہے، ان سب رقوم کا لینا اور اپنے کام میں لانا شرعا جائز ہے(۱)۔

بخلاف اس رقم کے جس کو انسان خود بینک میں جمع کرتا ہے اور اس پر زائد رقم ملتی ہے یہ البتہ سود اور حرام ہوتا ہے، اور اس کا اپنے کام میں لانا جائز نہیں رہتا ہے اور نہ اس رقم کو بینک میں چھوڑ دینا ہی جائز ہے بلکہ وہاں سے نکال کر خود غریبوں محتاجوں کو اس رقم کے وبال سے بچنے کی نیت سے بطور صدقہ دیدینا واجب ہے (۲)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین، مفتی دار العلوم دیوبند سہارنپور ۱۴۰۱/۱/۴ھ

پراویڈنٹ فنڈ کی رقم سود نہیں ہے:

زید نے بوجہ علالت سات آٹھ ماہ علاج کے باوجود افاقہ نہ ہونے کی صورت میں ملازمت سے استعفی دے دیا، زید نے ۷، ۸، ماہ کی مسلسل رخصت بھی لی تھی، زید کے بچے چھوٹے ہیں کوئی بھی بچہ برسر روزگار نہیں، زید کافی مقروض بھی ہوگیا ہے زید کا ایک ذاتی مکان ہے جس میں وہ بیوی بچوں کے ساتھ مقیم ہے کرایہ نہیں آتا ہے زید کپڑا بننے کی ملز (Millz) میں کام کرتا تھا مستعفی ہونے کے بعد زید کو پراویڈنٹ فنڈ کی رقم ملی اس رقم میں سود کی بھی رقم شامل ہے لیکن جتنی رقم سو کی ہے وہ الگ بتائی گئی ہے۔

دریافت طلب امر یہ ہے کہ کیا زید اپنے ان ناگفتہ بہ حالات کے تحت سود کی رقم استعمال کرسکتا ہے؟

پراویڈنٹ کو سرکاری یا کمپنی کی مدد بھی کہا جاسکتا ہے جسے ریٹائرڈ ہونے یا مستعفی ہونے کے بعد ملازم کو دی جاتی ہے۔

زید کی لڑکی اور بیوی دونوں مل کر ماہانہ چالیس پچاس روپیوں کا کام کرلیتے ہیں، لیکن اس کام کی صورت مستقل نہیں ہے ہوا تو کیا ورنہ کچھ نہیں، علاوہ ازیں لڑکی کی شادی ایک دو ماہ کے بعد ہونا قرار پائی ہے لڑکی کی شادی کے بعد یہ معمولی سی

۱- ''ولا يجوز قرض جر نفعاً ..... فإن قضاه أجود بلا شرط جاز ويجبر الدائن على قبول الأجود'' (البحر الرائق ۶/ ۲۰۴)، ''كل قرض جر نفعاً حرام أي إذا كان مشروطاً'' (الردالمختار ۷/ ۳۹۵)۔

۲- ''أن سبيل الكسب الخبيث التصدق إذا تعذر الرد على صاحبه'' (ردالمحتار على الدرالمختار ۹/ ۵۵۳)۔

غیر مستقل آمدنی بھی ختم ہوجائے گی، کیونکہ زید کی بیوی شاید اکیلے کام نہ کرسکے، بچوں کو برسرروزگار ہوتے ہوئے کم ازکم دو تین سال درکار ہیں ممکن ہے بڑا لڑکا ایک ہی سال کے اندر کوئی ملازت کرلے زید کے ان تمام حالات کو پیش نظر رکھتے ہوئے قرآن وحدیث کی روشنی میں تحریرفرمائیں کہ کیا زید سود کی رقم استعمال کرسکتا ہے؟

الجواب وباللہ التوفیق:

جواب صورت مسئولہ میں زید کو ملز کی طرف سے جو پرووڈینٹ فنڈ کی رقم ملی ہے وہ حلال طیب ہے، اس میں اس کی جانب سے کوئی تصرف نہیں پایا گیا، اور اب اسے یہ رقم عطیۂ مل رہی ہے وہ اپنے کام میں لاسکتا ہے شرعاً جائز ہے اور یہ سود نہیں ہے، اگرچہ کمپنی اس کو سود کا نام لیکر دیتی ہے اور زید تو اس رقم پر ابھی قبضہ کررہا ہے، اس لئے پرووڈینٹ فنڈ سے سود کے نام کی جو رقم ملے اس کا استعمال جائز ہے(۱)۔

ٹیکس میں سودی رقم دینا:

اگر زید سود کی رقم استعمال نہیں کرسکتا تو اس رقم کو کیا کرے، کیا اس رقم یعنی سود کی رقم سے وہ ٹیکس جو میونسپل یا کارپوریشن کی طرف سے مکان کا لیا جاتا ہے ادا کیا جاسکتا ہے۔

الجواب وباللہ التوفیق:

اگر زید غنی مالدار ہے تو سود کی رقم فقیر فقراء کو بلانیت ثواب مالک بنادینا چاہئے تحریر کردہ ٹیکس میں استعمال جائز نہیں، ’’لأن سبیل الکسب الخبیث التصدق إذا تعذر الرد علی صاحبہ‘‘(۲)۔

نوٹ: یہ حکم اس سود کا ہے جو پرووڈینٹ فنڈ کے علاوہ بینک وغیرہ سے ملے۔

دستخط احمد بیات

آپ کی رائے بطور فتوی مع دستخط ومہر وتاریخ

۱- ’’ویجوز للمشتری أن یزید للبائع في الثمن، ویجوز للبائع أن یزید للمشتری في المبیع ویجوز أن یحط عن الثمن ویتعلق الاستحقاق بجمیع ذلک فالزیادۃ والحط یلتحقان بأصل العقد عندنا‘‘(ہدایہ ۳/۵۹)۔

۲- رد المحتار علی الدر المختار ۹/ ۵۵۳۔

الجواب وبالله التوفيق:

مفتی احمد بیات صاحب کے یہ دونوں جواب بہت صحیح ہیں اور بہت عمدہ ہیں اس جواب کے بعد مزید کسی جواب کی ضرورت نہیں وہی جواب احقر کا جواب بھی سمجھا جائے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین، مفتی دار العلوم دیو بند سہارنپور ۲۹/۱/۱۴۰۰ھ

جواب پر اشکال وجواب:

ازراہ کرم اس سوال کا جواب بھی مرحمت فرمائیں:

سوال: حضرت مفتی احمد بیات صاب میونسپل یا کارپوریشن کے اس ٹیکس کو سود کی رقم سے ادا کرنے کو منع فرمارہے ہیں جو مکان کا لیا جاتا ہے اور میں نے حضرت مفتی عبد الرحیم صاحب لاجپوری کی تصنیف میں پڑھا ہے کہ سود کی رقم سے موٹر کا انشورنس، حکومت کے باقی ٹیکس اور مکان کا وہ ٹیکس جو میونسپل یا کاپوریشن لیتی ہے ادا کیا جاسکتا ہے، ازراہ کرم آپ اپنی رائے سے (فتوی) سے مطلع فرمائیں۔

طالب عفو آمر سورتی، ۵/۱۸۳۵ سیدہ پورہ نکی سورت

الجواب وبالله التوفيق:

نوٹ: پہلے چند فقہی ضابطے نقل کردیے جاتے ہیں انہی سے جواب خود بخود متفرع ہوجائے گا۔

(۱) (بعد بحث طویل) والحاصل أنه إن علم أرباب الأموال وجب رده عليهم وإلا فإن علم عين الحرام لا يحل له ويتصدق به بنية صاحبه(۱)۔

(۲) وشمل الرد حكما لما في جامع الفصولين: وضع المغصوب بين يدي مالكه برئ وإن لم يوجد حقيقة القبض (۲)۔

(۳) غصب دراهم إنسان من كيسه ثم ردها فيه بلا علم برئ وكذا لو سلمه إليه بجهة أخرى

۱- شامی ۴/۱۳۰۔

۲- شامی ۵/۱۱۶

كهبة أو إيداع أو شراء وكذا لو أطعمه فأكله(۱)۔

(۴) ويردونها (ای الأموال الخبيثه) على أربابها إن عرفوهم وإلا تصدقوا بها لأن سبيل الكسب الخبيث التصدق إذا تعذر الرد على صاحبه(۲)۔

ان عبارتوں سے معلوم ہوا کہ اسٹیٹ بینک یا مرکزی حکومت کے اور جتنے بینک ہیں ان سے سود کی جو رقم ملے اس کو اگر مرکزی حکومت کے کسی غیر شرعی ٹیکس میں دیدے تو ذمہ بری ہو جائے گا، جیسے انکم ٹیکس وغیرہ اور اگر مرکزی حکومت کے ٹیکس کے علاوہ صوبائی یا میونسپل بورڈ وغیرہ کے کسی مقامی یا نجی غیر شرعی ٹیکس وغیرہ میں دے دیا جائے تو ذمہ بری نہ ہوگا، بلکہ ایسی صورت میں اس کے وبال سے بچنے کی نیت سے غرباء ومساکین پر تصدق کر دینا لازم ہوگا، تصدق بغیر نیت ثواب کے علاوہ کہیں اور کام میں خرچ کر دینا درست نہ ہوگا، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۴/۲/۱۴۰۱ھ

بینک کی ملازمت اور شیئرز کی خریداری:

بینک کی ملازمت کرنا، نیز بینک میں پیسے جمع کروانا، یا بینک سے شیئرز خریدنا، اور ان شیئرز کا مع نفع کے بیچنا مثلاً دس روپے کا شیئرز ۲۵ روپے میں بیچنا، نیز بینک کے علاوہ بڑی بڑی کمپنیوں کے شیئرز کو اصل رقم سے زائد میں خریدنا، مثلاً کسی میل کا شیئرز ۱۰ روپے کا ہو تو اس کو دوسو پچاس روپے میں خریدنا و بیچنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب وباللہ التوفیق:

بینک میں ایسے کام کی ملازمت کرنا جو جائز ہو جائز ہے، اس کی ہر ملازمت ناجائز نہیں، حفاظت کی ضرورت سے جمع کرنا درست ہے، جس بینک میں شرکت یا مضاربت کے اصول پر کاروبار رہوتا ہو اس کے شیرز اور اسی طرح تجارتی کمپنیوں اور فیکٹریوں کا شیرز خریدنا جائز ہے، یہ شیرز خریدنے والے ملکیت میں شریک اور مالکان فیکٹری وغیرہ کے افراد میں سے ایک فرد ہو جاتے ہیں، پھر جب شیرز کی حیثیت نقد سے بڑھ کر کمپنیوں میں اور فیکٹریوں میں سامان وآلات واثاثہ میں بھی منتقل ہو

۱- درمختار علی ہامش الشامی ۱۱۶/۵ وہکذا فی البزازیۃ "غصب دراهم انسان من كيسه ثم ردها في كيسه وهو لا يعلم يبرأ" (البزازیۃ علی ہامش العالمگیریہ ۱۷۹/۶)۔

۲- شامی ۲۴۷/۵۔

جائے تو خریدے ہوئے روپیوں سے زائد میں بھی فروخت کر سکتے ہیں، البتہ شیرز کے محض متعین روپوں کو محض روپیوں کے بدلے میں فروخت کرنا ہوتو زائد پر فروخت کرنا درست نہ ہوگا، پس ۲۵ روپیہ کو ۲۵۰ روپے میں بیچنا تو جائز نہ ہوگا البتہ جب یہی ۲۵ روپیہ کے شیرز کا مالک دس سال بعد جب کہ اسی نسبت سے پوری فیکٹری دولاکھ روپیہ کی ہو چکی ہو، ۲۵ روپیہ والا شریک بھی مالک وشریک ہوا، اور وہ اپنے اس حصہ کو ۲۵ روپیہ کے بجائے ہزار روپیہ میں بیچے تو یہ شریک بھی مالک وشریک ہوا، اور وہ اپنے اس حصہ کو ۲۵ روپیہ کے بجائے ہزار روپیہ میں بیچے تو یہ درست ہوگا، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۲/ ۷/ ۹۱ ۱۳ھ

الجواب صحیح محمود غفرلہ

ڈاک خانہ کی ایک اسکیم اور اس کا حکم:

یہاں پر ڈاک خانہ میں ایک اسکیم جاری ہے کہ وہاں ایک پونڈ دو پونڈ پانچ پونڈ جمع کرتے ہیں اور وہ جمع کیے جانے کی رسید دیتے ہیں اور رسید کے اوپر نمبر ہوتے ہیں، جس وقت وہ روپیہ نکالنا ہو تو وہ رسید دے کر نکال سکتے ہیں اس کے اوپر کوئی سود نہیں ملتا ہے، لیکن ہر ماہ اخبارات میں کچھ نمبرات نکلتے ہیں، ایک پونڈ کا سو پونڈ ملتا ہے، لہذا اگر زید نے ایک پونڈ جمع کیا تھا اور اس کا نمبر نکلا تو کیا وہ سو پونڈ لے سکتا ہے؟ نمبرات نہیں نکلنے پر بھی جتنی رقم جمع کیا تھا وہ پوری پوری ملتی ہے، کوئی کمی نہیں ہوتی، دریافت طلب امر یہ ہے کہ اس طریقہ سے روپیہ رکھ کر جو زیادہ رقم ملے اس کا لینا جائز ہے یا نہیں؟

عبدالصمد احمد پٹیل (۱۳ لے نیر اسٹریٹ، گلاسٹر، لندن)

الجواب وباللہ التوفیق:

جب یہ حقیقت ہے کہ چاہے اس کے نمبرات نکلیں یا نہ نکلیں اس کا جمع کیا ہوا روپیہ پورا کا پورا ملے گا، اور جب چاہے واپس لے سکتے ہیں، اور اس روپیہ کے ضائع ہونے کا ڈر نہیں ہے تو اس معاملہ میں قمار تو نہ ہوا، رہ گیا نمبرات نکل آنے پر جو زائد رقم ملے گی اس کا شرعی حکم کہ وہ رقم سود میں شمار ہوگی یا نہیں؟

اس کا شرعی حکم معلوم کرنے کے لیے پہلے اس بات کا بطور تحقیق مناط کے سمجھ لینا ضروری ہے کہ ربوا (سود) ایک شرعی لفظ ہے اور اس کا ایک شرعی مفہوم بھی ہے۔

اگر وہ شرعی مفہوم اس زیادتی پر صادق آجائے گا تو وہ زیادتی بالیقین (ربٰو) سود ہوگی، کسی کے اس کو غیر سود

(غیر ربوا) کہنے سے یا غیر سود سمجھنے سے غیر سود نہ ہوجائے گی، اور نہ حکم سود اور نہ حکم حرمت سے نکل جائے گی۔

اور اگر اس زیادتی پر سود (ربوا) کا شرعی مفہوم صادق نہ آئے گا تو کسی کے اس کو سود (ربوا) کہنے سے سود نہ ہوجائے گی اور اس کا حرام ہونا ضروری بھی نہ رہے گا۔

اس بات کو سمجھنے کے بعد اب یہ سمجھیے کہ جب روپیہ جمع کرتے وقت یہ معاملہ ہوتا ہے کہ اس پر واپسی کے وقت کچھ زائد رقم نہیں ملے گی اور معاملہ غیر سودی ہوگا، اور یہ معاملہ سودی نہ ہوگا، پھر جب اس زیادتی کے ملنے کا یقین بھی نہیں ہوتا اور نہ اس کا مطالبہ ہی ہوتا ہے اور نہ سب کو وہ زیادتی مل ہی جاتی ہے، بلکہ محکمہ محض اپنی صوابدید اور محض اپنے ضابطہ کے مطابق کچھ نمبرات کے لئے زائد رقم دینے کا اعلان کرتا ہے اور جن کا نام نکلتا ہے صرف ان کو دیدیتا ہے اور کسی شخص کو اس زائد رقم کے لئے مطالبہ کرنے کا حق بھی نہیں ہوتا ہے، کیونکہ اصل عقد میں غیر سودی اور زائد نہ لینے کا معاملہ کر چکا ہے۔

اس لیے اب اگر کسی کے نمبرات نکل آنے پر کچھ زائد رقم مل جانے سے چاہے ایک پونڈ پر سو پونڈ زیادتی کا حساب کیوں نہ آجائے، اس زیادتی کو (ربوا) شرعاً نہیں گے، کیونکہ ربوا (سود) کا شرعی مفہوم اس پر صادق نہیں آتا، اس لیے کہ شرعاً ربوا (سود) کے معنی میں جتنی عبارتیں فقہاء رحمہم اللہ نے نقل فرمایا ہے ان سب کا حاصل یہ ہے کہ اموال ربویہ میں عقد معاوضہ کا معاملہ ہو اور اسی عقد میں کسی جانب کو زیادتی بلاعوض ہو (۱)، اور یہاں ایسا نہیں ہے، کیونکہ یہاں عقد میں زیادتی نہ ہونے کا معاملہ ہے۔

ایک شبہ اور اس کا ازالہ:

اگر کوئی شخص یہ کہے کہ یہ زائد رقم تو صرف اسی کو ملتی ہے جو قرض دیتا ہے، لہٰذا اس زیادتی کو اس قرض نے ہی کھینچا ہے اور ''کل قرض جر نفعا فهو ربوا'' کے تحت داخل ہوکر یہ زیادتی ربوا (سود) ہوگئی۔

اس کا جواب یہ ہے کہ جب ہر قرض دینے والے کو یہ زائد رقم نہیں ملتی بلکہ محکمہ جس کو چاہتا ہے صرف اسی کو ملتی ہے حتی کہ اگر کوئی شخص قرض دینے والوں میں سے جس کا نام نہ نکلا ہو اس زیادتی کا مطالبہ کرے تو اس کو سابق عقد معاملہ کی بنیاد پر حق مطالبہ نہیں ہوگا، تو یہ زیادتی "جر نفعاً" کا مصداق نہیں ہوئی، کیونکہ "کل قرض جر نفعاً" کے تحت شامی ۴/ ۱۷۴ میں ہے کہ: ''إذا كان مشروطا كما علم ممانقله عن البحر وعن الخلاصة، وفي الذخيرة وإن لم يكن النفع مشروطا في القرض فعلى قول الكرخي لاباس به''۔

۱- ''الربوا فضل مال بلا عوض في معاوضة مال بمال'' (فتاویٰ شامی ۴/۱۷۶)، ''الربوا في اللغة: الزيادة، وفي الشرع هو: فضل خال عن عوض بمعيار شرعي مشروط لأحد المتعاقدين في المعاوضة'' (قواعد الفقہ ۳۰۲)۔

اس عبارت سے یہ معلوم ہوا کہ "جر نفعاً" کا مصداق وہ "جر" ہوگا جس میں نفع عقد معاملہ میں مشروط ہو اور یہاں ایسا نہیں ہے، بلکہ یہاں تو نفع نہ ہونا مشروط ہے، اور اگر کچھ زیادہ زور لگایا جائے تو بہت سے بہت، "انجرار" ثابت کیا جا سکے گا، تو جراً اور انجرار دونوں میں فرق ہے، دونوں الگ الگ چیزیں ہیں، دونوں کا حکم ایک ہونا ضروری نہیں اور ممنوع جر ہے نہ کہ "انجرار" پس اگر یہاں ہوگا تو "انجرار" ہوگا اور وہ ممنوع نہیں ہے۔

ان تمام بحثوں کے بعد یہ بات منقح ہو کر سامنے آ گئی کہ یہ زیادتی منجاب محکمہ تبرع ہے اور تبرع جائز ہوتا ہے ممنوع نہیں، لہذا ایسی زیادتی لینا جائز رہے گا۔

ہاں اگر کوئی تقویٰ اختیار کرے تو یہ الگ اور اولیٰ بات ہوگی، اور تقویٰ یہ ہوگا کہ اس رقم کو اس محکمہ میں نہ چھوڑے بلکہ وہاں سے نکال کر غرباء و مساکین پر، یا کسی کار خیر یا رفاہ عام کے کاموں میں خرچ کردے (۱)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دار العلوم دیوبند سہارنپور ۱۴/ ۵/ ۹۸ ۱۳ ھ

اصاب المجیب العلام: سید احمد علی سعید عفی عنہ، مفتی دار العلوم دیوبند

سود کی رقم مسجد کے بیت الخلا کی صفائی وغیرہ میں لگانا کیسا ہے؟

۱- زید کا مختلف بینکوں سے کاروبار ہے، اور بعض بینکوں میں رقم جمع بھی ہوتی ہے، مثلاً زید کا بینک ابیض میں پیسہ جمع ہے، جس کے سود کی ایک خاص رقم ہو چکی ہے، تو کیا جو رقم بینک ابیض سے سود میں ملی ہوئی ہے وہی رقم بینک سود میں دے سکتا ہے؟

۲- کیا بعینہ وہی رقم دینا شرط ہوگا، یا صرف حساب کر کے نیت کر لینا کافی ہے؟

۳- مسجد کا پیسہ بینک میں جمع ہے، اس کا سود کس طرح اور کہاں خرچ کیا جائے اور کون کرے؟

۴- کیا مسجد کے پیسے کی سود کی رقم مسجد کے پاخانہ کی صفائی میں خرچ کی جا سکتی ہے؟

۵- عام لوگوں کے پیسے کی سود کی رقم جو بینک سے ملتی ہے، مسجد کے پاخانہ کی صفائی میں خرچ کرنا کیسا ہے؟

محمد رئیس (رقو تگ، ساؤتھ تھائی لینڈ)

۱- ملاحظہ ہو: فتاویٰ شامی ۴/ ۱۳۰ باب البیع الفاسد۔

الجواب وباللہ التوفیق:

۱، ۲-اگر بینک ایجنٹ اور بینک اسود دونوں ایک ہی حکومت کے ہیں تو مذکورہ معاملہ کرلینا بلاشبہ درست رہے گا، اور زبانی حساب وکتاب کرلینا بھی کافی رہے گا اور اگر دونوں بینک دومختلف حکومتوں کے ہیں تو مذکورہ معاملہ کرنا درست نہ ہوگا، بلکہ اس صورت میں اس کی تفصیل لکھ کر حکم شرعی معلوم کریں۔

۳، ۴-تملیک مستحق کے حیلہ کے بعد مسجد کے پاخانہ کی صفائی وغیرہ میں بھی استعمال کرنا درست ہوگا، اور حیلہ تملیک یہ ہے کہ جتنی رقم سود کی ہے وہ غرباء ومساکین کو جو مستحق صدقہ ہوں دے کر اس کا مالک بنادیا جائے، پھر وہ مستحق صدقہ اپنی طرف سے بطور چندہ مسجد میں دیدے (۱)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

انشورنس کا شرعی حکم:

۱- "ما هو حكم التأمين (Insurance) في الإسلام؟ هل يجوز تأمين النفوس والبيوت والسيارات وغيرها أم لا، خصوصاً في ديار الكفر إذ لا يجد واحد مخلصاً منها"۔

دارالحرب میں بینک سے سود لینا:

۲- "هل يجوز استلام الربوا من البنوك في ديار الكفر وصرفها إلى الفقراء أم لا؟ بينوا بالأدلة الشرعية، توجروا والله الموفق"۔

الجواب وباللہ التوفیق:

۱- التامين في الاسلام حرام لا جتماع المنهيات خاصة الربوا والقمار كما قال الله تعالى: "أحل الله البيع وحرم الربوا" (۲)، وقوله تعالىٰ: "يا أيها الذين آمنوا إنما الخمر والميسر والأنصاب

۱- "ولاشك أن الحيلة أن يتصدق على الفقير ، ثم يأمره بفعل هذه الأشياء" (الدرالمختار علی هامش الشامی، ص ۲۳ ج ۲ کتاب الزکوۃ) (مرتب)۔

۲- سورۃ البقرۃ ۲۷۵۔

والأزلام رجس من عمل الشيطان فاجتنبوه لعلكم تفلحون" (۱)،وغيرهما كثير من الآيات التي تدل على حرمتها فالواجب الاحتراز عنها على كل مسلم مهما أمكن وإذا لم يجدوا مخلصا منها لديار الكفر (يجوز)(۲)للمضطر شرعيا بالشرائط۔

۲-"إن حكم مال الغير إذا أخذ بغير إجازة شرعية غصبا كان أو رباً أو نهبة أو غيرها يجب على الآخذ الرد على صاحبه كما قال النبي ﷺ: لا يحل لأحد أن يأخذ متاع أحد لاعبا ولا جاداً فإن أخذه فليرده" (۳)۔

وفي تحت قوله :على الغاصب رد العين المغصوبة"

"الحاصل أنه إن علم أرباب الأموال وجب رده عليهم وإلا فإن علم عين الحرام لا يحل له ويتصدق به بنية صاحبه، ومفاد الحرمة وإن لم يعلم أربابه لا يحل له فيه ما لم يؤدبدله فاذا أخذ الزائد من التامين أو الربوا يجب رده على أصحابه وإن كان على الآخذ من الضريبة ما لا يجوز في ديار الكفر رخص له دفع الضريبة إلى الدولة وإلا صرفها إلى الفقراء بنية دفع الوبال من الحرام إن أردتم المزيد أن تطلعوا عليه فعليكم أن تراجعوا إلى الكتب الآتية مثلاً نظام الفتاوى المجلد الأول للعبد وإمداد الفتاوى لسماحة الشيخ التهانوى، وجواهر الفقه لسماحة الشيخ مفتي محمد شفيع وفتاوى عزيزية للشيخ عبدالعزيز المحدث الدهلوى رحمهم الله أجمعين كاملة(۴)،فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی،مفتی دارالعلوم دیوبند،سہارنپور

سودی رقم سے پنچایت کا سامان خریدنا:

زید بینک کے سودکی رقم کوبستی کی پنچایت میں ایسے سامان کی خریداروں میں صرف کرسکتا ہے جس سے بوقت

۱- سورۂ مائدہ:۹۰۔

۲- مابین القوسین بتقاضائے سیاق مرتب کی طرف سے اضافہ ہے۔

۳- سنن الترمذی ۴/۶۲ ۴ کتاب الفتن باب ماجاء لایحل لمسلم أن یروع،مسلم شریف میں یہ حدیث ان الفاظ میں وارد ہے:"لا یأخذ أحدکم عصا أخیه لاعباً أو جاداً فمن أخذ عصا أخیه فلیردها إلیه"(حدیث:۲۱۶)۔

۴- دیکھئے ردالمحتار علی الدرالمختار ۹/۳۶۶۔

ضرورت امیر وغریب زید وعمر سبھی استفادہ کرسکتے ہیں۔

محمد فروزعالم

الجواب وباللہ التوفیق:

سود کی رقم کے مستحق صرف وہ لوگ ہیں جو زکوٰۃ کے مستحق ہیں اور بطور تملیک کے اوپر لکھی ہوئی نیت سے بطور صدقہ ان کو دے دینا ضروری ہے، بغیر مستحقین کی تملیک کے کسی کام میں خودخرچ کردینا درست نہیں ہے، لہٰذا سود کی رقم کو بستی کی پنچایت میں تملیک مستحق کے قبل دینا درست نہ ہوگا، پنچایت کو تملیک مستحق سے قبل لینا درست نہ ہوگا۔

کتبہ محمد نظام الدین، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

بینک سے سودنکالنے پر اشکال اور اس کا جواب:

ضروری امر یہ ہے کہ سارے علماء ومفتیانِ کرام بینک سے سود کے لینے کو جائز کہتے ہیں چاہے مجبوری کی وجہ کچھ بھی ہو۔

اس پر ایک زبردست اشکال یہ ہے کہ یہ تو قرآن پاک کی نصِ صریح پر قیاس سے زیادتی لازم آتی ہے کہ صرف اس وجہ سے کہ پیسے عیسائیت کی تبلیغ پر خرچ ہوں گے، اس کو بنیاد بنا کر قرآنِ پاک کی نصِ صریح پر زیادتی کیسے جائز ہے؟

جب کہ قرآن پاک کی نصِ صریح ربوا کی حرمت پر دال ہے تو محض اس بنیاد پر کہ اسلام کو ان پیسوں سے نقصان پہنچے گا، اسلام کے صریح حکم میں تبدیلی کیسے جائز ہے؟

اس لیے کہ سود لیکر اس کو چاہے صدقہ کردیا جائے، مگر لینا گویا کہ قرآنی حکم صریح کی مخالفت ہے، اس کے جواز کی کیا دلیل ہے؟

دارالحرب میں حربی سے سود لینا:

اسی طرح دارالحرب میں حربی سے سود لینے کا جواز بھی اس نصِ صریح پر زیادتی ہے؟ جب کہ قاعدہ ہے کہ قرآنی نصِ صریح کے مقابلہ میں اگر چہ حدیث صریح ہوتو وہ رد ہوگی۔

لہٰذا ہمارے علماء زمانہ نے موجودہ حالات سے متاثر ہوکر قرآنی نص کے مقابلہ میں بینک سے سود لینے کو فرمایا اس

کے اصولی دلائل کیا ہیں؟ مفصل ومدلل تحریر فرمائیے۔

الجواب وباللہ التوفیق:

سود لینا قطعاً حرام ہے(۱)، بینک سے بھی لینا حرام ہے یہ جو کہا گیا ہے کہ سود کے نام پر جو رقم بینک سے ملے اس کو بینک میں نہ چھوڑے، وہاں سے نکال کر مسلم غرباء ومساکین کو اس کے وبال سے بچنے کی نیت سے دیدے تو یہ سود لینا نہیں ہے بلکہ وہاں چھوڑ دینے پر چونکہ وہ لوگ سود کی رقم رکھنے والے ہی کے نام سے الگ کر کے ایسے کاموں میں خرچ کر سکتے ہیں جس سے اسلام اور مسلمانوں کو ضرر اور ظلم ہوتا ہے اور ضرر وظلم سے بچنا اور بچانا بھی منصوص حکم ہے، جیسا کہ "**لاضرر ولا ضرار فی الاسلام**" سے اور آیت کریمہ "**ومار بک بظلام للعبید**"(۲) سے بھی اشارہ ملتا ہے۔

ان کے علاوہ اور بھی متعدد آیات ہیں جن سے یہ اشارہ ملتا ہے، اسی طرح احادیث بھی ہیں جن سے بھی اشارہ ملتا ہے، اس لیے اس ظلم وضرر سے بچانے کے لیے ان ہی آیات ونصوص کی مدد سے اس حیلہ کی جرأت ہے، یہ سود کے جواز کا فتویٰ یا قول ہرگز نہیں کہ اشکال وارد ہو، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲/۲/۹۵ ۱۳ھ

بیمہ کے روپوں کا شرعی حکم:

۱- ہماری تنخواہ سے سرکاری طور پر جبراً پانچ روپے بیمہ کے کٹتے ہیں، ہمارے ریٹائر ہونے تک یہ اصل رقم دو ہزار روپے بنتی ہے، لیکن ریٹائر ہونے پر ہمیں سرکار دو ہزار روپے کے پانچ ہزار روپے دے گی یا اچانک ہم کسی حادثہ کا شکار ہو جاتے ہیں، یعنی مر جاتے ہیں تو یہ پیسہ یعنی مبلغ پانچ ہزار روپے ہمارے لواحقین کو ملتے ہیں، چاہے ہماری کل رقم، یعنی دو ہزار روپے بھی جمع نہ کیے گیے ہوں، کیا یہ دونوں صورتیں جائز ہیں؟

۱- "أحل اللہ البیع وحرم الربوا"(بقرۃ:۲۷۵)، "یا أیہا الذین آمنوا اتقوا اللہ وذروا مابقی من الربوا إن کنتم مؤمنین" (بقرۃ:۲۷۸)۔

عن جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ قال: "لعن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آکل الربوا وموکلہ وکاتبہ وشاہدیہ وقال: ہم سواء"۔ رواہ مسلم وغیرہ (مرتب)۔

۲- سورۂ حم سجدۃ:۴۶۔

۲-بینک یا ڈاک خانہ میں ہم بذات خود کچھ روپے جمع کریں اور اس پر سرکار بطور سود کچھ رقم دے، یا سرکاری طور پر کوئی رقم جمع ہو اور اس پر کچھ روپے بطور سود ملتے ہیں، تو کیا یہ دونوں صورتیں جائز ہیں؟

۳-جو روپیہ ہم کو سود کا ملتا ہے اس کو ہم کسی آدمی کو بتا کر دیں کہ یہ سود ہے تو یہ ڈر ہے کہ وہ یہ سمجھ لے کہ ہم سود خور ہیں، کیونکہ پوری بات وہ نہیں سمجھ پاتا، تو کیا ایسی صورت میں سود کی رقم بغیر بتائے کہ یہ سود کا پیسہ ہے کسی مستحق کو دے دیا جائے، یا اس رقم کو جلا کر یا پھاڑ کر ختم کر دیا جائے ان دونوں صورتوں میں کونسی صورت بہتر ہے؟ فقط واللہ اعلم بالصواب

الجواب وباللہ التوفیق:

سرکاری طور پر جبراً جو روپیہ حکومت بیمہ کے نام پر کاٹتی ہے وہ روپیہ اور اس میں جتنا ملا کر دے وہ سب بھی ناجائز نہیں ہے، لے سکتے ہیں اور اپنے کام میں خرچ کر سکتے ہیں، اسی طرح مر جانے پر لواحقین کو جو روپیہ دیتی ہے اس میں جو روپیہ ملازم کا اپنا جمع ہو وہ تو ترکہ بنتا ہے، اس میں وراثت کے قاعدہ سے ہر وارث کو حصہ ملے گا اور جو روپیہ اس سے زائد حکومت دیتی ہے، وہ اپنے قانون کے ماتحت جس کو دیتی ہے اس کا ہوتا ہے اور اس کا لینا جائز ہے، البتہ جو روپیہ انسان بیمہ میں خود کٹوائے اور حکومت کی طرف سے مجبوری نہ ہو اور نہ جبراً کاٹتی ہو تو وہ واقعی بیمہ ہے اور ایسا کرنا ناجائز ہے اور اس میں اپنے جمع کیے ہوئے روپے سے زیادہ جو ملے گا وہ سود اور ناجائز ہوگا، اس کو لے کر کسی غریب مستحق زکوٰۃ کو اس کے وبال سے بچنے کی نیت سے بطور صدقہ کے دے دینا ضروری رہے گا (۱)۔

اور اس محتاج مستحق زکوٰۃ کو دیتے وقت یا کسی وقت بتانا ضروری نہیں ہے کہ یہ سود کا روپیہ ہے بلکہ اپنے دل میں چھپائے رکھنا بھی درست ہے اور اس روپیہ کو جس طرح خود خرچ کرنا جائز نہیں ہے اسی طرح جلا ڈالنا یا پھاڑ ڈالنا یا پھینک دینا بھی جائز نہیں ہے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۳۹۶/۲/۶ھ

حکومت کے یونٹ ٹرسٹ آف انڈیا میں شرکت کا حکم:

حکومت ہند کی طرف سے ایک ادارہ بنام "یونٹ ٹرسٹ آف انڈیا" ۳،۴/ سال سے قائم ہے جو عوام سے سرمایہ

۱- ملاحظہ ہو بذل المجہود ۱/۳۷ کتاب الطہارۃ، فتاوی شامی ۴/۱۳۰ باب البیع الفاسد۔

حاصل کر کے اس کو کاروبار میں لگاتا ہے، اس کے ایک حصہ کی قیمت دس روپے ہے اور بازار میں ۱۰/روپے ۲۰/ پیسے ہے۔

اسی طرح کی بیشی کے ساتھ ملتے ہیں، اس میں لگائے ہوئے سرمایہ کے تحفظ کی ضامن حکومت ہے اور ہم جب چاہیں اس کو بازار میں فروخت کر سکتے ہیں، یا حکومت کو واپس کر سکتے ہیں اس کے منافع کا اعلان منجانب حکومت بذریعہ اخبارات کیا جاتا ہے جو کم وبیش ہوتا ہے۔

۱-اس سلسلہ میں عرض ہے کہ اس ادارہ میں مسلمانوں کے لیے سرمایہ لگانا جائز ہے یا نہیں؟

۲-اس کی ایجنسی باقاعدہ قانونی طور پر لے کر کمیشن کی بنیاد پر مسلمانوں سے یا دیگر اقوام سے سرمایہ حاصل کر کے کیا اس ادارہ کو دینا جائز ہے؟

الجواب وبالله التوفيق:

(۱،۲) اس ادارہ میں مسلمانوں کے لیے سرمایہ لگانا بھی جائز ہے اور اس کی ایجنسی باقاعدہ اور قانونی طور پر لینا بھی جائز ہے۔

اسی طرح کمیشن سے اگر وہی صورت مراد ہے جو اوپر سوال میں ہے کہ مثلاً ۱۰/روپے کا حصہ ۱۰/روپے ۲۰/ یا ۲۵/ پیسے میں فروخت کرنا ہوتا ہے تو اس کی بھی شرعاً اجازت ہے اور اگر کمیشن کی کوئی اور صورت ہے تو اس کو لکھ کر حکم شرعی معلوم فرمائیں، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۸/۱۰/۱۳۹۵ھ

کپاس کی خریداری میں حکومت جو رقم سود کے نام سے دیتی ہے اس کا حکم؟

ہمارے یہاں کپاس کی کاشت عموماً ہوتی ہے، اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کی فروخت نہایت آسان ہے، کسان کو بیک وقت تمام روپیہ مل جاتا ہے۔

لیکن سال گذشتہ حکومت مہاراشٹر نے قانون ادھیکار کے ذریعہ ہر کسان پر لازم کر دیا کہ وہ سرکاری کارندوں کے ہاتھ سرکاری ریٹ پر مرکز سے فروخت کریں، جس کا بھاؤ بھی مقرر کر چکی ہوتی ہے اب مجبوراً کسان ایسا کرتے ہیں جس کی وجہ سے پوری قیمت کا صرف ۳۰/ فیصد دیا جاتا ہے اور وہ بھی ہفتہ عشرہ کے بعد بذریعہ بینک، باقی ستر فیصد دو قسطوں میں غیر

معینہ مدت پر ملتی ہے جس میں آٹھ ماہ تک لگ جاتے ہیں پھر نرخ بھی اور صوبوں کے مقابلہ میں کم رکھا ہے۔

پھر دو قسطوں والی رقم واجب الاداء میں سے ایک قسط اور کرلی تو اعلان کیا کہ اس کا دس فیصد کے حساب سے سود ادا کیا جائے گا، جس کی وجہ سے وہ رقم ایک سال کے بعد کسانوں کو ملتی ہے!

لہٰذا سوال یہ ہے کہ اس دس فیصد پر حکومت جو سود دیتی ہے، کیا وہ شرعاً سود کے حکم میں داخل ہوکر ہمارے لیے ناجائز ہے؟ امید ہے کہ جواب سے جلد نوازیں گے!

الجواب وباللہ التوفیق:

اگر حکومت کسانوں کی مرضی کے خلاف ایسا کرتی ہے اور کسانوں کو مجبوراً ایسا کرنا پڑتا ہے تو دس فیصد رقم جو سود کے نام سے حکومت خود کسانوں کو دیتی ہے، وہ شرعی سود کی تولیت میں نہیں آتی اور وہ رقم دس فیصد شرعاً سود نہ ہوگی، بلکہ شرعاً جزءِ ثمن ہوگی اور اس کا لینا اور استعمال کرنا جائز اور درست رہے گا، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۹/۲/۹۶/۸/۱۳ھ

لون لے کر کام کرنے کی صورت میں سود سے بچنے کی کیا شکل ہے؟

آج کل ہر قسم کا سامان پرمٹ سے ملتا ہے اور پرمٹ وغیرہ کے حصول میں بہت دقتیں ہوتی ہیں، ضرورت اور وقت پر سامان مہیا نہیں ہو پاتا اور بعض موقعوں پر پرمٹ اور لائسنس بھی نہیں ملتا، نیز جو روپیہ کاروبار میں لگایا جاتا ہے وہ نہ صرف بتانا پڑتا ہے کہ کہاں سے حاصل کیا ہے، بلکہ اس کے لیے قابل قبول ثبوت بھی پیش کرنا ہوتا ہے خواہ وہ غلط ہی ہو، اپنے پاس سے لگائے ہوئے سرمایہ پر ٹیکس بھی ادا کرنا پڑتا ہے اور اس ٹیکس کے سلسلہ میں حکام متعلقہ ناجائز طور پر بہت تنگ کرتے ہیں۔

اس لیے بعض لوگ سرمایہ کی کمی کی وجہ سے اور بعض لوگ مندرجہ بالا پریشانیوں سے بچنے کی غرض سے لون لیتے ہیں، چونکہ سرمایہ گورنمنٹ کا ہوتا ہے، اس لیے گورنمنٹ کو اس میں کافی دلچسپی ہوتی ہے اور ضرورت کا ہر سامان نیز لائسنس پرمٹ وغیرہ سہولت سے مل جاتا ہے!

اس کی شکل یہ ہوتی ہے کہ جیسا کام ہو اس کے کل لاگت کی ۵۰/ ۶۰/ فیصدی رقم بصورت آلات و مشین اور ۱۰/

۱۵ فیصدی رقم بصورتِ نقد گورنمنٹ دیتی ہے اور اپنی کل لگائی رقم حسبِ قاعدہ مع سود کے کئی سالوں بعد مختلف قسطوں میں وصول کرتی ہے۔

لہذا اگر کوئی شخص گورنمنٹ کی ایسی رقم سے (جس کا لینا بحالتِ موجودہ ضروری ہے) کوئی کام کرنا چاہے تو کیا طریقہ اختیار کرے کہ ربوٰ اور حرام سے بچ سکے۔

عبدالعزیز سعدی (گورکھپور، یوپی)

الجواب وبالله التوفيق:

آج کل حکومت نے اقتصادی ترقیات کے لیے جو مختلف محکمے کھول رکھے ہیں، ان میں عموماً حکومت کا مقصد سودی کاروبار کرنا یا زراندوزی وغیرہ کا مقصد نہیں ہوتا بلکہ محض عوام کا اقتصادی ومعاشی سدھار اور عوامی بے روزگاری اور پریشان حالی دور کرنے میں سعی کے درجہ کی ایک چیز ہے، جیسے پروجیکٹ وغیرہ کے محکمے اور اسی وجہ سے جب کوئی شخص محکمہ سے محض قرض طلب کرتا ہے جب بھی بسا اوقات محکمہ نقد قرض نہیں دیتا بلکہ اس کے کاروبار اور روزگار کی تحقیق وتفتیش کے بعد اس کے مناسب حال مشین ودیگر سامان وغیرہ بہت سستے داموں پر چھوٹی قسطوں پر ادھار دیتا ہے اور نقد بہت تھوڑی مقدار کام چلانے کے لیے دیتا ہے جیسا کہ آپ کی تحریر سے بھی معلوم ہوتا ہے، پھر اس شخص کے کاروبار کی نگرانی بھی خود محکمہ کرتا ہے اور اس کاروباری کو رہنمائی اور مفید مشورے بھی کاروبار کے سلسلے میں دیتا رہتا ہے، پھر ان کاموں کے لیے اور اپنی دی ہوئی رقم ٹھکانے لگتی ہے کہ نہیں اس کا انتظام درست رکھنے کے لیے بہت سے ملازمین کلرک، انسپکٹر وغیرہ بھی رکھنے پڑتے ہیں، دفاتر بھی قائم کرنے پڑتے ہیں، پھر ان اخراجات کو پورا کرنے اور درست رکھنے کے لیے دیئے ہوئے ادھار سامان کی قسطوں کے ساتھ کچھ رقم سود کے نام سے وصول کرتی ہے۔

پس اگر یہ بات صحیح ہے تو اس زائد رقم کو سود کا نام دینا شرعاً ضروری نہ ہوگا بلکہ انتظامی اخراجات کی فیس بھی قرار دیا جا سکتا ہے کہ محکمہ چونکہ مسلم نہیں ہے، اس لیے وہ شرعی اصطلاحی الفاظ بولنے کا نہ تو پابند ہے اور نہ وہ اس کا پابند کیا جا سکتا ہے، پھر بسا اوقات محکمہ اپنے دیئے ہوئے سرمایہ پر کچھ چھوٹ بھی دیتا ہے۔

مثلاً مجموعی دین کی محکمہ کی ۵۰ ہزار ہے مگر وہ ۵ ہزار کی چھوٹ اور معافی دے کر صرف ۴۵ ہزار قرار دے کر اس

میں قسطیں اورسودسب متعین کرتی ہے۔

اس صورت میں اگر کل ادائیگی مع سود کے محکمہ کی کل دینگی مجموعہ کے اندر ہےتو سود کا نہ ہونا بالکل ظاہر اوریقینی ہوگا۔

غرض ہر حال میں اس معاملہ کوربوی معاملہ اورسودی لین دین نہیں کہہ سکتے ، کیونکہ سود، ربوٰ ایک شرعی لفظ ہے اور اس کا ایک شرعی مفہوم ہے(۱) ۔ جب تک وہ مفہوم صادق نہ آئے اس وقت تک کسی کے سود کہہ دینے سے وہ سود نہ ہوگا جس طرح جب وہ مفہوم صادق آئے گا تو کسی کے غیر سود کہہ دینے سے وہ سود ہونے سے نکل نہ جائے گا اور غیر سود نہ ہوجائے گا، علاوہ ازیں مذکورہ پریشانیوں کودور کرنے کے لیے اور اقتصادی ضرورتوں کے ماتحت بوجہ مجبوری کے بقدرِمجبوری وضرورت یہ قرض لے لینا بھی گنجائش رکھتا ہے۔

جیسا کہ ’’الاشباہ والنظائر مع الحموی‘‘ (ص۱۴۵ مطبوعہ ہند) کے اس جزئیہ:’’**ویجوز للمحتاج الاستقراض بالربح**‘‘معلوم ہوتا ہے۔

پس سوال میں لکھی ہوئی پریشانیوں اورمجبوریوں کے ماتحت بقدرضرورت و بقدردفعِ مضرت لے لینے اور لے کر کام کرنے کی شرعاً گنجائش رہے گی۔

البتہ چونکہ بحوائے نصوص ’’**أعمالکم عمالکم**‘‘ اور’’**کما تکونوا یولی علیکم**‘‘ یہ سب ہماری ہی نحوستِ اعمال کاثمرہ ہے، اس لیے ایسا معاملہ کم سے کم کرنا چاہیے اورکرکے برابر استغفاربھی کرتے رہنا چاہیے اوردعا بھی کرتے رہنا چاہیے کہ اے اللہ! اس قسم کے معاملات سے بخیر وعافیت نجات دیجئے اور محفوظ فرمائیے ، اورہماراحال ایسا بنادیجیے کہ ان باتوں سے حفاظت کے ساتھ فلاح دارین نصیب ہو، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہٗ محمد نظام الدین اعظمی ، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

سود کے وبال سے بچنے کا طریقہ:

کناڈا میں مقیم مسلمانوں کا وہ پیسہ جس کولوگ وہاں کے بینکوں میں رکھتے ہیں اس پر جو منافع ان کو ملتا ہے اس کو یہ سمجھ کر لینے سے احتراز کرتے ہیں کے یہ سود ہے جس کا لینا حرام ہے۔

غورطلب امر یہ ہے کہ مندرجہ بالا منافع کی رقم حاصل کرکے ہندوستان وپاکستان اور دیگر ممالک کے مسلمان

۱- ’’الربوٰ في اللغة الزيادة، والمراد في الآية كل زيادة لايقابلها عوض‘‘(أحکام القرآن ابن العربی قواعد الفقہ ۱۱۵)۔

غریب اور نادار لڑکوں اور لڑکیوں کی بنیادی تعلیم وتربیت مثلاً ڈاکٹری، انجینئرنگ، ٹکنالوجی وغیرہ میں لگایا جاسکتا ہے یا نہیں؟

اس بات کی وضاحت بے جا نہ ہوگی کہ اگر اس پیسہ کو مسلمان حاصل نہ کریں تو انگریز مشنری کے لوگ اس کو حاصل کر کے مسیحی تبلیغی کاموں میں صرف کرتے ہیں اور اس تبلیغ کی زد میں تمام ادیان بشمول اسلام کے لوگ بھی آسکتے ہیں۔

جب کہ ایک موقع ایسا بھی گذرا ہے کہ جب محمد علی جناح بمبئی میں وکالت کرتے تھے، اس وقت بمبئی کے بینکوں میں مسلمانوں کی جو رقم تھی اس کا سود مسلمانوں کے انکار پر انگریزوں نے حاصل کرلیا اور مسیحی تبلیغ کے کاموں میں لگایا گیا۔

سید حکیم الدین (سکندرآباد، اے پی)

الجواب وباللہ التوفیق:

یہ صحیح ہے کہ سود کا لینا حرام ہے (۱)، اس وجہ سے یہ حکم ہے کہ حفاظت وغیرہ کی غرض سے بینک ہی میں روپے جمع کرنا پڑے تو ایسے شعبہ وکھاتہ میں جمع کرے جس میں سود کا حساب نہ لگایا جاتا ہو، اگر کسی وجہ سے ایسے شعبہ میں جمع کردیا ہو جس میں سود ملتا ہو تو ایسے خطرہ کی وجہ سے جو اخیر سوال میں مذکور ہے۔ سود کی رقم بینک میں نہ چھوڑے بلکہ وہاں سے نکال کر اس کے وبال سے بچنے کی نیت سے بطور صدقہ کے مستحقین صدقہ کو دے کر جلد از جلد اپنی ملک سے نکال دے اور خود کسی کام میں صرف نہ کرے۔

پس ہندوستان وپاکستان اور دیگر ممالک کے مسلم غرباء ومساکین اور نادار لڑکیوں اور لڑکوں کو دینی تعلیم حاصل کر لینے کے لیے ہی نہیں بلکہ دنیاوی جائز تعلیم حاصل کرنے کے لیے بھی (جیسے ڈاکٹری اور ٹکنالوجی وغیرہ) بطور تملیک دے سکتے ہیں۔

اسی طرح لاوارث وغریب بیواؤں، یتیموں اور نادار لڑکوں اور لڑکیوں کی شادی کے لیے بطور امداد بھی دے سکتے ہیں۔

اسی طرح نادار لڑکیوں کی شادی میں اس رقم سے زیور یا سامان جہیز وغیرہ خرید کر ان لڑکیوں کو یا ان لڑکیوں کے غریب اولیاء کو بھی دے سکتے ہیں۔

۱- "أحل الله البيع وحرم الربوا" (بقرة: ۲۷۵)، "يا أيها الذين آمنوا اتقوا الله وذروا مابقي من الربوا إن كنتم مؤمنين" (سورۂ بقرۃ: ۲۷۸)۔

غرض جتنے مستحقین صدقہ وزکوۃ ہیں سب کوحسب درجہ وضرورت دے کر اپنی ملک سے نکال سکتے ہیں، فقط واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند، سہارنپور ۲۶/ ۴/ ۹۹ ۱۳ھ

ایک خاص قسم کی سوسائٹی کی ملازمت اوراس کی تنخواہ کا شرعی حکم:

میں یہاں ایک فروٹ گرورس کوآپریٹو سوسائٹی میں عرصہ تین سال سے بحیثیت منیجر کام کررہا ہوں، یہ سوسائٹی زیرکنٹرول گورنمنٹ ہے اوراس کو چلانے والے یا اس کے ذمہ دار آٹھ افراد ہیں، اس سوسائٹی کا دائرہ کاروبار چھ حلقوں پر پھیلا ہوا ہے، ان ذمہ دار افراد کا کام بینک سے منافع پر روپے فراہم کرکے کسانوں کو ایڈوانس کے طور پر دینا اور وصول کرکے فروخت کرنے کے بعد روپے مع منافع داخل بینک کرنا ہے۔

اس درمیانہ داری پر بینک سوسائٹی کو ۲% دیتا ہے، جو اس کے دفتری اخراجات ہوتے ہیں۔

دیگر سوسائٹی کے طور پر آرٹ کی طرح کمیشن حاصل کرتی ہے جو اس کا کاروباری ہوتا ہے، اب اس تمام کاروبار کو چلانے کے لیے سوسائٹی نے بعوض تنخواہ چار ملازم رکھے ہیں، جو تنخواہ پر یہ کام چلا رہے ہیں یہاں ایک مقامی قاری صاحب ہیں جو یہ فرماتے ہیں کہ ہماری تنخواہ حرام ہے، کیونکہ یہ سودی کاروبار ہے، اور ایک مولوی صاحب ہیں وہ فرماتے ہیں کہ آپ کی تنخواہ حلال ہے، کیونکہ آپ جسمانی یا دماغی محنت صرف کرکے اپنا معاوضہ حاصل کررہے ہیں۔

سود لینے یا دینے کا سوال لینے والا کسان اور دینے والا بینک ہے، ایک اور مولوی صاحب فرماتے ہیں کہ بہت سے صحابہ کرامؓ یہودیوں کے یہاں ملازمت کرتے تھے، حالانکہ یہودیوں کا تمام کام سود ہی پر چلتا ہے، ایک اور پیر طریقت فرماتے ہیں کہ آپ کی تنخواہ حلال ہے، کیونکہ منافع دینے والے لوگ ہیں اور لینے والا بینک ہے، ہندوستان میں دیگر جس قدر سرکاری ملازم ہیں ان کی اکثر تنخواہ سود کے روپے سے آتی ہے، آیا مجھے یہ نوکری کرنی چاہیے یا نہیں؟ فقط۔

شبیر احمد بیگ (کوآپریٹو مارکنگ چندن واڑی)

الجواب وباللہ التوفیق:

ذمہ دار افراد جو بینک میں سودی قرض لینے اور سود دینے کا کام کرتے ہیں ان کا تو یہ کام ناجائز ہوگا، باقی چونکہ سود کا

پیسہ اپنے پاس آتا نہیں بلکہ سود کا پیسہ دینا پڑتا ہے، اس لیے اس طرح قرض لینے میں جو پیسہ آئے گا وہ خود خبیث نہ ہوگا، البتہ خبیث طریقے سے آنے کی وجہ سے اس قرض لینے دینے میں قدرے خباثت آئے گی، باقی وہ لیا ہوا روپیہ اور اس سے کمائی ہوئی آمدنی حرام نہ ہوگی سب جائز وحلال رہے گی۔

جب یہ حکم ان ذمہ داروں کی آمدنی ونفع کا نکلا جو بینک سے سودی قرض لیتے اور دیتے ہیں تو جو لوگ اس ذمہ داری کے علاوہ ہیں اور بینک سے خود سودی قرض نہیں لیتے تو ان کا حکم بدرجۂ اولیٰ نکل آیا کہ ان کی آمدنی اور نفع وغیرہ اس وجہ سے حرام وناجائز نہ ہوگا بلکہ حلال وجائز رہے گا، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۵/۱۱/۱۴۰۱ھ

مسلم فنڈ کے سلسلے میں استفتا:

مسلم فنڈ محمدی جو قرض مسلمانوں کو بلا سود دیتا ہے، اس کی شکل یہ ہے کہ پہلے مقروض کو کارکن مسلم فنڈ سے قیمتاً فارم خریدنا ہوتا ہے، اگر کسی کو دو سو روپے کا قرض لینا ہوتا ہے تو اس کو ہرے رنگ کا فارم خریدنا ہوگا غرض کہ مختلف رنگ مختلف قیمت کے ہوتے ہیں، مقروض اور کارکن مسلم فنڈ کے درمیان قرض کی مدت مقرر ہوتی ہے، کسی کی دو ماہ کی کسی کی تین ماہ اور کسی کی ایک ماہ۔

مسلم فنڈوں کے قیام کا مقصد مسلمانوں کو سود جیسے عظیم گناہ سے بچانا اور مسلمانوں کے لیے روزگار فراہم کرنا ہے۔

بہر حال آپ حضرات کے نزدیک اگر کوئی شکل نکلے تو تحریر فرمائیں، اگر ناجائز ہے تو ہم لوگ مسلم فنڈ کو بند کردیں گے، ہم لوگوں نے مسلم فنڈ کے قیام کا مقصد اللہ کی رضا سمجھا ہے۔

محمد حسین قاسمی (سکریٹری مسلم فنڈ محمدی ضلع لکھیم پور کھیری یوپی)

الجواب وباللہ التوفیق:

اگر قرض لی ہوئی رقم کا فیصد یا فی ہزار یا فی دس ہزار مثلاً ماہانہ یا سالانہ یا ششماہی کا حساب نہ آتا ہو اور نہ زرکشی یا سرمایہ اندوزی کی صورت ہو بلکہ محض کام کرنے والوں کی اجرت اور ان کے کام کی حیثیت میں ہو، یہاں تک کہ اگر ضرورت سے زائد پسماندہ ہونے لگے تو مقدارِ اجرت کم کردی جائے تو یہ معاملہ شرعاً درست ہوگا ورنہ نہیں، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۹/۶/۱۴۰۱ھ

فیکٹری کی ملازمت کا حکم؟

اگر کوئی شخص کسی فیکٹری کا ملازم ہو اور اس کا کام فیکٹری کا حساب کتاب کرنا ہو، یعنی یہ لکھنا کہ اتنا فیکٹری کا نفع ہوا، اتنا نقصان ہوا اتنا ویز الیا، بینک سے اتنا پیسہ سود پر لیا، تو کیا یہ اور دیگر امور انجام دینا جائز ہیں؟ مہربانی فرما کر ایسا نکتہ تحریر فرمائیں کہ جس سے اور کاموں کے حلال وحرام ہونے کا حکم استنباط کرسکیں۔

الجواب وباللہ التوفیق:

سود لینے اور دینے کا حساب لکھنا بھی ناجائز ہے(۱)، اور باقی مذکورہ کام اور ان کی ملازمت جائز ہے، اگر سود لینے دینے کا حساب لکھنا کسی دوسرے غیر مسلم کلرک کے حوالہ کر کے خود لکھنے سے بچ سکیں تو بچ جائیں اور اگر مجبوری ہو تو دوسری جائز ملازمت تلاش کرتے رہیں اور جب تک نہ ملے اس ملازمت کو نہ چھوڑیں، البتہ استغفار کرتے رہیں اور یہ نیت رکھیں کہ جب دوسری جائز ملازمت مل جائے گی تو اس کو چھوڑ دوں گا، مجبوری کے درجہ تک گنجائش رہے گی، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۹۶/۱/۲۵ ۱۳ھ

غیر سودی رفاہی اداروں سے متعلق استفتا:

آج پوری دنیا خاص کر ہندوستان اور اس جیسے غیر اسلامی ممالک میں مسلمان جن معاشی اور اقتصادی دشواریوں سے دوچار ہیں اور مسلم سرمایہ کاروں کا سرمایہ مروجہ بینکوں میں پہنچ کر جس طرح غیر مسلم بلکہ اسلام دشمن مفادات میں صرف ہو رہا ہے وہ ارباب فکر ونظر سے مخفی نہیں، یہ دشواریاں دنیوی اور مادی نہیں بلکہ شرعی اور معنوی ہیں، کیونکہ تجارت سرمایہ کاری قرض واستقراض کے جو بھی طریقے اور سسٹم موجودہ دور میں رائج ہیں وہ سب بینکنگ نظام سے مربوط ہیں جن کی بنیاد ہی سود پر ہے، انہیں کسی بھی حالت میں سود سے الگ کرنا ممکن نظر نہیں آتا، ان حالات میں مسلمانوں کو سودی کاروبار اور لین دین سے بچانے، اقتصادی مشکلات کو دور کرنے کے لیے ہندوستان جیسے ملک میں اسلامی اصولوں اور شرعی بنیادوں پر بینکنگ نظام رائج کرنا دشوار تر بلکہ ناممکن سا نظر آتا ہے، کیونکہ بینکنگ نظام پر جو قانونی پابندیاں عائد ہیں ان کی رو سے بینک تجارت

۱- عن جابر بن عبد الله رضي الله عنه قال: " لعن رسول الله صلى الله عليه وسلم آكل الربوا وموكله وكاتبه وشاهديه وقال: هم سواء"۔ رواہ مسلم وغیرہ (مرتب)۔

نہیں کرسکتا جب کہ اسلامی بینکاری نظام، انواع تجارت، شرکت، مضاربت، مرابحہ اور اجارہ وغیرہ پر ہی قائم کیا جاسکے گا۔

ان مشکلات پر نظر کرتے ہوئے اسلامیان ہند کو سود کی لعنت سے بچانے، مسلم سرمایہ مسلم مفادات میں استعمال کرنے اور مسلم معاشرہ سے معاشی بدحالی کو دور کرنے کے لیے نصف صدی پیشتر اس وقت کے اساطین امت، ارباب بصیرت فقہاء ومفتیانِ کرام (مفتی اعظم حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحبؒ، شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ اور حضرت مولانا مفتی محمد سہول عثمانیؒ وغیرہم) نے نہایت حزم واحتیاط کے ساتھ غیر سودی رفاہی بنکاری کا ایک جامع لائحہ عمل پیش فرمایا تھا، جو ہندوستان کے طول وعرض میں عملی جامہ پہن کر اپنی افادیت ثابت کر چکا ہے، اس طرح کے غیر سودی رفاہی اداروں اور سوسائٹی کے قیام کے مفید اور ضروری ہونے میں دو رائے نہیں، اگر چہ اس طریقہ کار کے عملی صورت میں آنے اور نظام میں وسعت وہمہ گیری کے بعد بہت سے اشکالات، شبہات، اعتراضات بالخصوص ادارہ کے اخراجات پورا کرنے کے لیے آمدنی کے ذرائع پر ہوتے رہے، جس کے نتیجے میں ارباب حل وعقد اور اصحاب فقہ وفتاویٰ کے ایک طبقہ نے اس طریق کار کو مختصر شرائط کے ساتھ جائز قرار دیا، جبکہ ایک طبقہ کو اس پر شرح صدر پوری طرح نہیں ہوا۔

جمیعۃ علماء ہند کے ادارہ مباحث فقہیہ نے ضروری سمجھا کہ اس طریقہ کار اور نظام کے مالہ وماعلیہ محاسن ومفاسد اور شرعی عوائق پر وسعت نظر کے ساتھ بحث کا موقعہ فراہم کیا جائے، تاکہ پوری گہرائی اور تدبر اور غور وفکر کے ذریعہ اس کے علمی وعملی نقائص کو منقح کر کے دور کرنے کی سعی کی جائے اور پیش آمدہ مشکلات کا شرعی حل تلاش کیا جائے، اس لیے آنجناب کی خدمت میں چند سوالات جواب وتحقیق کے لیے پیش کئے جارہے ہیں، اگر کوئی اہم سوال اور اشکال مزید آپ کے ذہن میں ہو تو اس کو بھی شامل فرما کر مدلل ومفصل مقالہ سپرد قلم فرمائیں، ان حالات میں امت اسلامیہ، آپ جیسے ارباب فکر ونظر اور صاحب بصیرت کی رہنمائی کی شدید محتاج ہے، سوالات کا مقصد تحدید وپابندی نہیں بلکہ صورتِ واقعہ سامنے لانا ہے۔

سوالات سے پہلے ان رفاہی اداروں میں رائج طریقہ کار اور ان کے اغراض ومقاصد کو پیش کر دینا مناسب ہوگا۔

الف:　ادارہ کا قیام اس طرح ہو کہ بستی کے مخلص، دیانت دار، قابل اعتماد اور فعال اشخاص کو جمع کر کے ان میں سے چند افراد پر مشتمل کمیٹی تشکیل دی جائے۔

ب:　اغراض ومقاصد حسب ذیل ہوں:

(۱) مسلمانوں کو سودی لین دین کی لعنت سے بچانا۔

(۲) غریب، نادار اور حاجتمند لوگوں کی فلاح وبہبود کے لیے اقتصادی خوشحالی کے ذرائع مہیا کرنا۔

(۳) مسلمان بہی خواہوں سے بطور امانت رقوم جمع کرنا۔

(۴) طلائی اور نقرئی اشیاء کی کفالت پر حاجتمندوں کو قرض بلاسود دینا۔

(۵) جائز اور منافع بخش ذرائع سے حاصل ہونے والی رقومات (مثلاً) عطیات، فیس ممبر شپ، فروختگی لٹریچر، معاہدہ نامہ قرض بلاسود، پاس بک برائے کھاتہ دار وغیرہ درج ذیل امور میں صرف کرنا:

الف: دفتری امور میں لگانا۔

ب: نادار، مستحق طلبہ کی امداد کرنا۔

ج: مسلم قوم کے لیے رفاہی، فلاحی امور میں صرف کرنا۔

ج: ادارہ کے بنیادی کام حسب ذیل ہوں گے:

(۱) مسلم بہی خواہوں اور سرمایہ کاروں سے زیادہ سے زیادہ رقم بطور امانت جمع کرنا۔

(۲) جمع شدہ رقوم امانت میں سے نصف حصہ محتاجوں اور ضرورت مندوں کو زیورات مکفول کر کے موقت قرض تقسیم کرنا۔

(۳) مسلم معاشرہ سے اقتصادی بد حالی دور کرنے، اسراف وفضول خرچی کی بری عادتیں مٹانے اور پس اندازی کا عادی بنانے کے لئے غریب، مزدور، معمولی صنعت کار وتاجر نیز معاشرہ کے ہر طبقہ میں بچت کا جذبہ فروغ دینے کے لیے تدابیر اختیار کرنا مثلاً:

الف: ایسے شخص کا انتظام جو معمولی اور روزمرہ کی آمدنی والوں کے پاس جا کر جستہ جستہ حسب استطاعت رقم امانت حاصل کرے۔

ب: ہوم سیونگ بینک، گھریلو بچت، اسکیم کھولنا، یعنی ادارہ کی طرف سے گولکیں یا صندوق بنا کر مناسب قیمتوں پر گھروں کو دی جائیں، جس میں موقع بموقع گھر والے تھوڑی تھوڑی رقم پس انداز کرتے رہیں۔ متعین مدت کے بعد وہ رقم نکال کر ادارہ میں امانۃً جمع کر دی جایا کرے

ج: ایسے مزدور، صنعت کار، رکشا پلر وغیرہ جو معمولی رقم مہیا نہ ہونے کے سبب اپنی آمدنی کا بیشتر حصہ کرایہ وغیرہ کے نام پر دوسرے کی جیب میں منتقل کرنے پر مجبور رہتے ہیں، ان کا تعاون اس طرح کرنا کہ وہ قسطوں پر رکشا وغیرہ خرید لیں اور اپنی آمدنی سے یومیہ کرایہ کے بقدر رقم پاس بک کے ذریعہ ادارہ میں

جمع کرتے رہیں اور ہر ماہ جمع شدہ رقم سے قسط کی ادائیگی کرتے ہیں، اس طرح جلد ان کو رکشا وغیرہ کا مالک بنایا جا سکتا ہے۔

د: اخراجات ادارہ کی کفالت حسب ذیل طریقہ سے کی جائے:

(۱) ابتدائی مرحلہ میں ادارہ کے خرچ کے لیے تھوڑا بہت عوامی چندہ کیا جائے، کم ازکم ایک سال کا خرچ چندہ سے جمع کرلیا جائے۔

(۲) رقم امانت جمع کرنے والے کھاتہ داروں کو، پاس بک فروخت کی جائے۔

(۳) قرض لینے والوں کو معاہدہ نامہ فارم سے فروخت کیا جائے جو مختلف نوعیت، مختلف حیثیت اور مختلف رنگ کے ہوں جو تناسب قرض کی مقدار سے مختلف قیمت کے ہوں، مثلاً ۵ تا ۱۰۰/ایک روپیہ کا۔۱۰۱ تا ۲۰۰/تین روپے کا اور ۲۰۱ تا ۳۰۰/چار روپے کا وغیرہ۔

(۴) مدت قرض ختم ہونے کے بعد تجدید قرض کے لیے مستقرض سے نیا معاہدہ نامہ فارم پر کرایا جائے اور سابقہ تناسب سے فارم کی قیمت لی جائے۔

(۵) اشیاء مرہونہ کے علاوہ بغرض حفاظت بطور امانت زیورات یا قیمتی اشیاء رکھنے پر مدت کے اعتبار سے حفاظت کا کرایہ لیا جائے۔

ھ: ادارہ میں رقوم امانت کے جمع و واپسی کا طریقہ یہ ہوگا کہ:

منیجر ادارہ کے نام درخواست برائے اجرائے کھاتہ (جو دفتر میں مطبوعہ موجود ہو) پر کر کے پاس بک قیمتاً حاصل کرے، جس پر اندراج کر کے ہی رقم امانت جمع کرے، واپسی امانت کے وقت فارم واپسی امانت (جو دفتر میں مطبوعہ ہو) بھر کے جمع کرے جس کی بنیاد پر حسب طلب رقم امانت پاس بک میں اندراج کر کے واپس کرے۔

و: ادارہ سے حسب ذیل طریقہ سے ضرورت مندوں کو قرض تقسیم کیا جائے:

(۱) سونے، چاندی کے زیورات کی کفالت پر ہی قرض دیا جائے، شخصی ضمانت نیز مکان، زمین کاغذات پر قرض ہرگز نہ دیا جائے۔

(۲) زیورات مکفولہ کی موجودہ قیمت کا ۶۰/یا ۷۰/فیصد حصہ ہی بطور قرض دیا جائے۔

(۳) مقدار قرض کے مطابق متعینہ معاہدہ نامہ فارم خرید کر پر کرنے پر ہی قرض دیا جائے۔

ز: مدت قرض کی توسیع کے لیے یہ طریقہ اختیار کیا جائے کہ اگر مقروض وقت معینہ پر ادائیگی قرض سے قاصر ہے تو مہلت کے طور پر مزید دو تین مہینے دیئے جائیں، اس کے لیے از سر نو معاہدہ ہو اور فارم قرض دوبارہ سابقہ طریقہ پر دے کر پر کرایا جائے۔ اور سابقہ فارم واپس لے کر جمع کرلیا جائے۔

نوٹ: دفتری نظم ونسق سے متعلق طریق کار کو ذکر نہیں کیا گیا۔

مذکورہ تفصیل کے مدنظر درج ذیل سوالات کے جوابات مطلوب ہیں:

(۱) ذکر کردہ طریقہ کار کے مطابق غیر سودی رفاہی اداروں اور سوسائٹیوں کا چلانا اور رائج کرنا شرعاً صحیح ہے یا نہیں؟ اگر نہیں! تو پھر کیا طریقہ کار ہو؟

(۲) اس طرح کے ادارے قائم کرنے اور چلانے والے مسلمانوں کو صرف سودی لین دین کی لعنت سے بچانے کی نیت رکھیں یا جائز طریقہ سے حاصل شدہ آمدنی سے رفاہی امور کے فروغ دینے اور اقتصادی حالت کو بہتر بنانے کی بھی، یا دونوں کی؟

(۳) رقم امانت جمع کرنے والوں سے اجرائے کھاتہ کے لیے پاس بک (جس پر امانت کے جمع و واپسی کا اندراج ہوگا) کی قیمت لینا جائز ہے یا نہیں؟

(۴) ادارہ کے مصارف اور اخراجات کی کفالت کے لیے عطایا اور دیگر صدقات کی رقومات حاصل کی جاسکتی ہیں یا نہیں؟ بصورت اثبات (الف) کس مد کی رقم اس مقصد پر صرف کی جاسکتی ہے، صدقات واجبہ یا صدقات غیر واجبہ بھی، اگر صدقات غیر واجبہ تک محدود کیا جائے تو اتنی رقم کا مہیا ہوسکنا مشکل ہے جو اخراجات کو پورا کرسکے، اور اگر صدقات واجبہ کو بھی اس مقصد پر صرف کیا جائے تو یہ ایسا مقصد ہے جس میں حیلہ تملیک کی اجازت ہوگی یا بلا حیلہ تملیک صرف کیا جائے گا؟

ب: عطایا وصدقات قابل اعتماد اور مستقل ذریعہ آمدنی بھی قرار نہیں دیے جاسکتے جن پر اس نظام کے بقاوتحفظ کی ضمانت دی جاسکے، چہ جائیکہ نظام کو وسیع اور ہمہ گیر بنایا جاسکے جب کہ مقصد زیادہ سے زیادہ لوگوں کو سودی لعنت سے بچانا اور ان کی معاشیات کو سدھارنا ہے۔

ج: اس صورت میں چندہ دہندگان ادارہ کے انتظام وانصرام میں دخیل ہوکر اس کی بقاوتحفظ کو خطرہ میں ڈال سکتے ہیں۔

د: فراہمی چندہ کے سلسلہ میں جو عملی دشواریاں پیش آتی ہیں جو ارباب بصیرت سے مخفی نہیں، ان کے ہوتے ہوئے ان اداروں کے بقا کی کیا صورت ہوگی؟

(۵) ادارہ کے انتظامی مصارف اور اخراجات کے لیے قرض لینے والوں سے اجرۃ الخدمت وصول کرنا صحیح ہے یا نہیں؟ اگر صحیح ہے تو:

الف: کیا یہ اجرۃ الخدمت "کل قرض جر نفعاً فھو ربوا" میں داخل نہ ہوگا؟

ب: کیا اسے واقعی شرعی عقد اجارہ میں داخل کر کے اجرۃ الخدمت قرار دیا جا سکتا ہے؟

ج: اگر یہ عقد اجارہ ہے تو کیا مستقرض کو اس اجرۃ الخدمت کی ادائیگی پر جبر کیا جا سکتا ہے؟

د: اس اجرۃ الخدمت کا تعین کس تناسب سے ہوگا، مقدار قرض کا اعتبار ہوگا یا ہر مقروض سے برابر۔

ھ: مدت قرض کی توسیع وتجدید کے وقت کیا دوبارہ مستقرض سے اجرۃ الخدمت لیا جائے گا؟

و: اس اجرۃ الخدمت کو کیا ایسے ملازمین وادارہ پر صرف کیا جا سکتا ہے جو معاملہ قرض کے ساتھ دیگر امور ادارہ بھی انجام دیتے ہیں، اور کیا ادارہ میں تنخواہوں کے علاوہ دیگر اخراجات میں بھی اسے لگایا جا سکتا ہے؟

(۶) سرمایہ کو تجارت میں لگا کر اس کے منافع سے ادارہ کے اخراجات اور ضروریات پورا کرنا درست ہے یا نہیں؟ اس صورت کے اختیار کرنے میں درج ذیل امور قابل توجہ ہیں:

الف: تجارت کس سرمایہ سے ہوگی، رقوم امانت سے یا ادارہ کی آمدنی سے؟

ب: رقوم امانت سے تجارت ہو تو نفع کی صورت میں وہ نفع صرف ادارہ کا حق ہوگا یا مستودعین بھی حقدار ہوں گے؟ اگر مستودعین بھی حقدار ہوں گے تو کس تناسب سے؟

ج: خسارہ کی امکانی صورت میں اسے کون برداشت کرے گا ادارہ یا مستودعین؟ اگر ادارہ تو کہاں سے؟ اگر مستودعین تو کیوں؟

د: اگر ادارہ کی آمدنی سے تجارت کی جائے تو یہ آمدنی کہاں سے اور کیسے حاصل ہوگی؟

ھ: یہ تجارت کاری ادارہ کی جانب سے ہوگی یا کسی فرد کی جانب سے اور وہ فرد کون ہوگا؟ واضح رہے کہ ادارہ بحیثیت ادارہ ملکی قانون کے اعتبار سے تجارت نہیں کر سکتا۔

(۷) ادارہ کے مصارف اور واقعی اخراجات کی کفالت کے لیے قرض لینے والوں سے قرض لینے کے وقت معاہدہ نامہ اور فارم حصول قرض کی قیمت لینا شرعاً صحیح ہے یا نہیں؟ اگر صحیح ہے تو:

الف: کل قرض جر نفعاً فهو ربوٰ سے کیونکر خارج ہوگا؟ کیا اس میں انتفاع بالقرض نہیں؟

ب: اس صورت میں شبہ ربوٰ نہ پایا جائے گا، یا اس مقصد کے لیے شبہ ربوٰ جائز قرار دیا جائے گا؟

ج: اگر یہ حیلہ ہے تو عقود مالیہ میں مفید حل واقعی ہو سکے گا یا نہیں؟

د: فارموں کی قیمت مقدار قرض کے تناسب سے ہوگی یا ہر مقروض سے یکساں؟

ھ: اگر مقدار قرض کے تناسب سے فارموں کی قیمت رکھی جائے تو ان فارموں کا ہر حال میں یکساں ہونا ضروری ہے یا مختلف نوعیتوں حیثیتوں اور رنگوں کا؟

و: اگر ہر مقروض سے برابر لیا جائے تو معمولی قرض لینے والوں اور زیادہ لینے والوں میں عدل کیونکر ہوگا؟

(۸) قرض کی مدت متعینہ ختم ہونے کے بعد توسیع مدت اور تجدید قرض کے لیے ازسر نو دوسرے معاہدہ نامہ کی قیمت مستقرض سے وصول کرنا درست ہے یا نہیں؟ اگر درست ہے تو صرف پہلا معاہدہ نامہ باطل کر کے یا پہلا معاملۂ قرض بالکل ختم کرنے کے بعد؟ اگر پہلا معاملہ قرض بالکل ختم کرنے کے بعد تو اس کی کیا صورت ہوگی جب کہ وہ قرض کی ادائیگی سے بالکل عاجز ہے اور کہیں اور سے قرض بھی دستیاب نہیں۔

اور اگر تجدید قرض کے وقت ازسر نو معاہدہ نامہ کی قیمت لینا درست نہیں تو زرقرض جلد وصول کرنے کی کیا صورت اختیار کی جائے، جب کہ زیورات مکفولہ کو فروخت کر کے زرقرض کو وصول کرنا ان اداروں کے لیے قانونی سرپرستی نہ ہونے کے سبب تقریباً ناممکن ہے، نیز اس طرزِ عمل سے ادارہ کا اعتماد بھی مجروح ہوتا ہے اور اس صورت میں لوگوں کو معاشی مشکلات سے نکالنے کے بجائے مزید اس میں ڈالنا بھی ہے، اس کے علاوہ منتظمین ادارہ اور مستقرض کے مابین زیورات مکفولہ کی قیمتوں وغیرہ کا نزاع اور اختلاف پیدا ہوکر معاملہ عدالت تک پہنچ جاتا ہے، جہاں ان اداروں کو کوئی مدد نہیں مل پاتی، اس صورت حال میں زرقرض کی واپسی کی کیا صورت ہوگی؟ جب کہ مستقرض نوٹس کے باوجود آتا بھی نہیں، کیا یہ صورت اختیار کی جاسکتی ہے کہ مستقرض سے قرض لینے کے وقت معاہدہ نامہ میں یہ شرط منظور کرائی جائے کہ اگر وہ متعینہ مدت کے بعد قرض نہیں لوٹاتا ہے اور نوٹس کے باوجود آتا نہیں، تو اس کی جانب سے معاہدہ نامہ پر کر کے رکھ دیا جایا کرے گا، اور آخر میں جب زرقرض واپس کرے گا تو

ان کی قیمت کو بھی ادا کرنا ہوگا، اسی صورت میں شئے مرہون لوٹائی جائے گی جس طرح معاہدہ نامہ میں یہ شرط منظور کرائی جاتی ہے کہ وقت متعینہ پر زر قرض نہ لوٹانے کی صورت میں زیورات مکفولہ کو فروخت کر کے زر قرض وصول کرلیا جائے۔

(۹) مستقرض سے اشیاء مرہونہ کی حفاظت کا کرایہ لینا درست ہے یا نہیں؟ اگر درست نہیں تو اشیاء مرہونہ کی حفاظت کے مصارف کون برداشت کرے گا مستقرض یا ادارہ؟ اگر ادارہ تو کہاں سے؟ خاص کر جب ان کی حفاظت کے لیے بینکوں کے لاکرس کرایہ پر لینے کی ضرورت پڑے۔

(۱۰) اشیاء مرہونہ ومکفولہ میں مضمون بالقرض سے زائد مقدار کی حفاظت پر کرایہ لینا نیز اس کے حسابات رکھنے، رجسٹر وغیرہ میں درج کرنے، دیگر امانتوں میں اختلاط سے بچانے پر ادارہ کا جو خرچ آتا ہے اس کا راہن اور مستقرض سے لینا صحیح ہے یا نہیں؟ اور اس کو ادارہ کے مصارف میں لگایا جاسکتا ہے یا نہیں؟

(۱۱) اشیاء مرہونہ کے علاوہ اگر لوگ اپنے زیورات یا قیمتی اشیاء ان اداروں میں بغرض حفاظت رکھیں تو کیا ان کی حفاظت پر مدت کے اعتبار سے کرایہ لینا صحیح ہوگا؟ کرایہ لینے کی صورت میں اگر وہ چیز بلا تعدی ضائع ہوجائے تو ادارہ پر ضمان وتاوان واجب ہوگا یا نہیں؟

(۱۲) ان اداروں کے لیے مروجہ بینکوں کے میعادی چیک کو ضرورت مندوں سے کم قیمت پر خریدنے کی کیا صورت نکل سکتی ہے؟ جو جائز اور شرعاً درست ہو (یعنی وہ چیک جن کی ادائیگی بینک ایک مدت کے بعد ہی کرے گا، مثلاً وہ ایک ہزار کا ہے اور چھ ماہ بعد ملے گا، کیا ایسے چیک کو کسی ضرورت مند سے نوسو پچاس میں لینا اور وقت مقررہ پر بینک سے پورے ایک ہزار وصول کرنا جائز ہوسکتا ہے؟

اور کیا اس طریقہ سے حاصل ہونے والی رقم مصارف ادارہ میں لگائی جاسکتی ہے؟

(۱۳) جائز صورت سے حاصل شدہ رقم اگر مصارف ادارہ سے بڑھ جائے تو اسے کیا کیا جائے؟ ادارہ کی ترقی میں لگایا جائے یا رفاہی امور پر صرف کیا جائے، یا غرباء پر صدقہ کرنا ضروری ہے؟

(۱۴) یہ ادارے جمع شدہ رقم امانت بغرض حفاظت مروجہ بینکوں کے کرنٹ اکاؤنٹ، سیونگ اکاؤنٹ اور فکسڈ ڈپازٹ میں رکھ سکتے ہیں یا نہیں؟ اگر نہیں رکھ سکتے تو ان امانتوں کی حفاظت کی کیا صورت ہو؟ جب کہ اس کے علاوہ کوئی قابل اعتماد ذریعہ حفاظت بھی نہیں، نیز ملکی قانون کی رو سے زیادہ رقم خود اپنے پاس بھی نہیں رکھ سکتے اور بغرض

حفاظت بینکوں میں رکھنا درست ہے تو اس پر مل سکنے والی سود کی رقم کو کیا کیا جائے؟

معز الدین احمد غفرلہٗ (ادارہ المباحث الفقہیہ جمعیۃ علماء ہند)

الجواب وباللہ التوفیق:

غیر سودی رفاہی ادارہ میں کئی طرح کے اور کئی قسم کے کام اور معاملات ہوتے ہیں اور ہر قسم کا حکم بھی الگ الگ ہوتا ہے، اس لیے ہر قسم کے کام اور اس کے احکام الگ الگ بیان کیے جاتے ہیں، تا کہ احکام میں خلط واختلاط ہو کر باعث الجھن نہ ہو مثلاً:

(۱) یہ کہ کوئی شخص اپنا زیور وغیرہ کوئی چیز گروی رکھ کر بطور قرض روپے لیتا ہے تو یہ معاملہ رہن کا ہوگا اور اس پر رہن کے احکام جاری ہوں گے۔

(۲) یہ کہ کوئی شخص اپنا زیور یا کوئی سامان گروی رکھے بغیر محض قرض لیتا ہے تو یہ معاملہ محض قرض کا ہوگا، رہن کا نہ ہوگا، اور اس پر قرض کے احکام جاری ہوں گے، رہن کے احکام جاری نہ ہوں گے۔

(۳) یہ کہ کوئی شخص اپنا زیور یا سامان قرض لئے بغیر محض حفاظت کے لیے رکھتا ہے تو یہ معاملہ محض امانت و ودیعت کا ہوگا اور اس کے احکام الگ جاری ہوں گے۔

(۴) یہ کہ کوئی شخص اپنا نقد روپیہ محض بغرض حفاظت رکھے تو یہ معاملہ بھی محض امانت و ودیعت کا ہوگا اور اس کا حکم بھی الگ ہوگا۔

(۵) یہ کہ کوئی شخص اپنا نقد روپیہ ادارہ میں کوئی کاروبار کرنے کے لیے دے تو یہ معاملہ مضاربت کا ہوگا اور اس کا حکم الگ ہوگا۔

اس تشریح کے بعد ہر ایک نمبر کا الگ الگ تفصیلی حکم لکھا جاتا ہے:

(۱) یہ کہ کوئی شخص اپنا زیور وغیرہ کوئی چیز گروی (بندھک) رکھ کر کچھ روپے لینا چاہے تو یہ معاملہ خالص عقد رہن کا ہوگا اور اس معاملے پر اس کے احکام جاری ہوں گے۔

روپے لینے والا راہن کہلاتا ہے اور بندھک رکھ کر روپے دینے والا مرتہن کہلاتا ہے اور جو شئے راہن رہن پر رکھتا ہے وہ مرہون کہلاتی ہے اور مرتہن نے جو رقم (روپیہ) دی ہے وہ بذمہ راہن قرض ہو جاتی ہے، اور اس طرح یہ معاملہ قرض

کے معاملہ پر بھی مشتمل ہوجاتا ہے: ''الرهن في اللغة مطلق الحبس، وفي الشرع حبس شئي مالي بحق كالدين يمكن استيفاء ه منه ويسمىٰ مرهونا ورهنا'' (۱)، اور مرتہن شئے مرہون کو معاملہ رہن کی توثیق اور اپنے دیئے ہوئے قرض کی حفاظت کی غرض سے اپنے قبضہ میں لیتا ہے، لہٰذا اس شئے مرہون کی حفاظت مرتہن ہی کے ذمہ واجب رہتی ہے: قال في الدر المختار مع رد المحتار (۵/۳۱۳): ''ويجب على المرتهن أن يحفظه بنفسه وعياله وضمن إن حفظ بغيرهم، وضمن بإيداعه وإعارته وإجارته واستخدامه وتعديه كل قيمته (إلى أن قال) وأجرة بيت حفظه ومأوى الغنم على المرتهن'' اھ اور اگر اس حفاظت کی وجہ سے یا جس وجہ سے بھی مرتہن کچھ رقم راہن سے وصول کرے گا، وہ حدیث پاک: ''كل قرض جر نفعاً فهو ربا'' میں داخل ہوجائے گی اور اس کا لینا ناجائز وممنوع رہے گا، ہاں مرتہن یہ کرسکتا ہے کہ توثیق رہن وتحفظ قرض کے خاطر راہن سے یہ کہے کہ اس رہن کے لیے ایک وثیقہ یا سرخط وغیرہ لکھ کرلاؤ تو ہم بندھک رکھ کر یہ قرض دیں گے، اور اس وثیقہ یا سرخط وغیرہ کی قیمت واجرت تحریر وغیرہ سب بذمہ راہن رہے گی، اسی طرح مرتہن فارم کی وہ قید بھی لگا سکتا ہے جو معاملہ ۲ میں تفصیل سے آئے گی: كما يستفاد هذا الأمر من قوله تعالىٰ: يا أيها الذين آمنوا إذا تداينتم (تعاملتم بدين كسلم وقرض) إلى أجل مسلمى (معلوم) فاكتبوه (استيثاقا ورفعا للنزاع) وليكتب (كتاب الدين بينكم) كتاب بالعدل (بالحق في كتابته، لايزيد في المال والأجل ولاينقص) ولا ياب كاتب أن يكتب كما علمه الله (أي فضله بالكتابة فلا يبخل بها) فليكتب وليملل (على الكاتب) الذى عليه الحق (الدين لأنه المشهود عليه فيقر ليعلم ما عليه (۲) وأيضا لقوله تعالىٰ: وإن كنتم على سفر ولم تجدوا كاتباً فرهان مقبوضة (۳) بالخصوص آیت ثانیہ کا کلمہ (فرهان مقبوضه) راہن کے مدعی ہونے کی جانب صریح اشارہ ہے، لہٰذا کتابت کی اجرت اسی کے ذمہ ہوگی۔

(۲) یہ کہ کوئی شخص اپنا زیور یا کوئی سامان رکھے بغیر محض نقد روپیہ لے تو یہ معاملہ خالص قرض لینے دینے کا معاملہ ہوگا ''القرض هو عقد مخصوص، أي بلفظ القرض ونحوه يرد على دفع مال مثلي لآخر ليرد مثله'' (۴)۔

۱- قواعد الفقہ رص ۳۱۱۔

۲- جلالین شریف ۱/۴۴۔

۳- سورۂ بقرۃ ۲۸۳۔

۴- درمختار مع الرد ۴/۱۷۱۔

اوراس کا حکم یہ ہے کہ اس قرض دینے کے عوض میں کوئی چیز لینا یا اس سے کسی قسم کا نفع اٹھانا درست نہ رہے گا، ورنہ ”کل قرض جر نفعافھو ربا“ کے تحت داخل ہوکر سود لینے کے حکم اور وزر میں ابتلاء ہوگا، ہاں یہ کرسکتے ہیں کہ قرض دینے اور قرض کا معاملہ کرنے سے پہلے یہ کہے کہ مثلاً اس مقدار کا معاملہ کرنے کے لیے فلاں قیمت کا فارم کہیں سے خرید کرلاؤ اور ان فارموں کی قیمت قرض کے فیصد کے اعتبار سے نہ ہو، بلکہ اس سے مختلف اور محض توثیق معاملہ کی حد تک رہے، اس طرح اس معاملہ کے مکمل ہوجانے کے بعد یہ قرض دینا جائز رہے گا، کما سیجي انفاً پس اگر یہ شخص کہیں سے یہ فارم خرید کر دیدے اور اس کے بعد قرض کا معاملہ کرے تو یہ قرض دینا ”کل قرض جر نفعا فھو ربا“ کا نہ ہوگا بلکہ ”کل بیع جر نفعا“ کا ہوگا، بلکہ یہ فارم اگر خود وہ شخص جو اس کے بعد قرض دے گا وہ فارم خود بیچ کردے یا اس کا کوئی نائب یا وکیل بیچ کردے اور بیچ کا معاملہ مکمل اور تمام ہونے کے بعد قرض دینے کا معاملہ کرے تو اس طرح بھی معاملہ کرنا ”کل قرض جرنفعاً“ میں شمار نہ ہوگا، اور اس طرح معاملہ جائز رہے گا جیسا کہ اس عبارت سے معلوم ہوتا ہے: ”شراء الشئي اليسير بثمن غال لحاجة القرض يجوز ويكره وتحته في رد المحتار بعد نقل صور الاختلاف مذکور ہے وكان شمس الأئمة الحلواني يفتي بقول خصاف وابن سلمة ويقول: هذا ليس بقرض جرمنفعة بل هذا بيع جر منفعة وهي القرض“ (۱)، اس عبارت سے معلوم ہوا کہ قرض دینے والا قرض دینے سے پہلے مستقرض سے یہ کہے کہ تم فلاں فارم مجھ سے یا کسی سے خرید کرلاؤ تو میں تمکو یہ قرض دے دوں گا تو اس کی بھی گنجائش رہے گی اور درمختار کے اس قول ”ویکرہ“ کی تشریح کرتے ہوئے شامی نے خود جو عبارت نقل کی ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کراہت کا یہ حکم قرض کا معاملہ کرلینے کے بعد اس طرح عمل کرنے پر ہے اور قبل القرض والی شرط کو محفوظ رکھا ہے جو اس کے جواز بلا کراہت کی طرف اشارہ کرتی ہے، لہٰذا فارموں کی اس رقم سے ادارہ کی کفالت کرنا جائز رہے گا، تنخواہ دینا بھی جائز رہے گا، لیکن چونکہ اس بیع وشراء (خرید وفروخت) کا انسلاک قرض سے یا شئی مرہون سے ہوگا اور فقہاء کے درمیان اس کے اندر اختلاف بھی ہے، خاص طور پر علامہ حلوانی جیسے جلیل القدر فقیہ کا اختلاف، نیز حرمت ربوا کی شدت کے خطرے سے بھی کچھ خلش معلوم ہوتی ہے اور ایسے معاملہ سے احتیاط ہی اولیٰ معلوم ہوتی ہے، اور اس سے احتراز کرنا اشبہ بالفقہ معلوم ہوتا ہے، ہاں کوئی تیسرا آدمی جو مسلم فنڈ کا ملازم یا نائب نہ ہو بلکہ آزاد ہو تو یہ خلش واقع نہ ہوگی اور معاملہ بے داغ رہے گا اور جب ہمدردان قوم اپنی بڑی بڑی رقمیں ادارہ کو غیر سودی قرض دینے کے لیے دیتے ہیں تو مستبعد نہیں ہے کہ کوئی صاحب خیر اپنی دکان یا فیکٹری میں ان

۱- درمختار علی الشامی نعمانی ۴؍۱۷۵

فارموں کے بیچنے کا نظم کرلے اور ماہ بہ ماہ اس کی رقم ادارہ کو ہدیہ کے طور پر دے دیا کرے کہ یہ بھی ایک کار ثواب ہوگا، کار خیر ہوگا، نیز جن صورتوں میں ادارہ خواہ مستقرض ہو کر یا کسی بھی اور صورت میں ادارہ میں آمدہ رقم کا خود مالک ہوجاتا ہے تو اس رقم سے بھی بغیر ان فارموں کے خرید فروخت کے بھی غیر سودی قرض دے سکتا ہے۔

ایک شبہ کا ازالہ:

شبہ یہ ہے کہ ادارہ جن صورتوں میں ملی ہوئی رقوم کا شرعاً مالک ہو کر ان مواقع میں خرچ کرنے کا شرعاً اگرچہ مجاز ہوجائے گا، لیکن جب یہ رقوم دفتری اخراجات میں خرچ کردے گا تو مقرض کے طلب پر کہاں سے ادا کرے گا، ازالہ شبہ اس طرح ہے کہ ان اخراجات کے پورا کرنے کی جائز صورتیں نکل سکتی ہوں تو ان کے ذریعہ سے اس کمی کو پورا کرے، ورنہ فارم کے سلسلے میں اوپر لکھی ہوئی شکلوں میں جو جائز شکل ہے اس کے مطابق عمل کرکے اس کمی کو پورا کردے۔

اب رہ گئی یہ بات کہ رہن اور قرض کا معاملہ کم سے کم کتنے دنوں کا ہونا چاہیے، تو چونکہ یہ رفاہی ادارہ کے اس سب عمل سے غریب عوام کو سود کی لعنت اور زیر باری سے بچانا مقصود ہوتا ہے، اس لیے یہ معاملہ کم سے کم پورے ایک سال کے لیے ہونا چاہیے، تاکہ قرضدار سال بھر کے اندر محنت و مزدوری کرکے ادائیگی قرض کے قابل ہوسکے، کیونکہ سال بھر میں فصلوں کے تغیر اور کاروبار کے اتار چڑھاؤ سے نفع حاصل کرنے کا موقع ملتا ہے اور اس سے کم مدت میں عموماً اس کا موقع نہیں ملتا اور مروجہ طریقہ کہ ہر تین مہینہ میں واپسی قرض لازم کردے کہ اگر واپس نہ کرسکا تو تبدیل فارم پر قیمت فارم لازم کردیا جائے یہ ٹھیک نہیں رہے گا" وإن كان ذو عسرة فنظرة إلى ميسرة" پ ۳ر کے خلاف رہے گا اور اس طرح سے تو راہن کو اس عقد رہن اور اس قرض میں اتنی رقم دینی پڑ جائے گی جتنی رقم بینک سے قرض لینے میں شاید نہ دینی پڑے، لہٰذا عوام کیونکر بینک سے ہٹ کر اس رفاہی ادارہ میں آئیں گے، بالخصوص جب بینک میں جمع کرنے میں دوسرے جائز فوائد بھی متوقع ہوں گے جب کہ رفاہی ادارہ کا یہ طریقہ اپنی وضع ادارہ کی غرض کے بھی منافی اور غلط ہوگا، رہ گیا یہ اشکال کہ پھر دفتری اخرجات کس طرح اور کہاں سے پورے کیے جاسکیں گے؟ تو اس کا ایک حل پہلے بھی لکھا جاچکا ہے اور آئندہ نمبروں میں بھی آئے گا قوم کے ہمدرد اور مخیر حضرات جس طرح اس رفاہی کام کو کار ثواب سمجھ کر ادارہ میں ایسی بڑی بڑی رقمیں دیتے ہیں کہ ان رقوم سے ضرورت مندوں کو غیر سودی قرض وغیرہ دیا جاتا ہے، اسی طرح مخیرین وہمدردان قوم کو اس کام کی اہمیت، افضلیت اور قیامت تک کے لیے صدقۂ جاریہ ہوجانا واضح کرکے بڑے بڑے چندے وصول کرکے پراپرٹی وجائدادیں حاصل کرکے ادارہ پر وقف کردی جائیں، تاکہ اس کے نفع سے دفتری اخراجات بھی پورے ہوتے رہیں، اور غریب ومسکین سود کی لعنت اور مالی زیر باری سے

بھی بچ سکیں اور ان وقف کرنے والوں کو قیامت تک صدقہ جاریہ کا ثواب بھی ملتا رہے، اسی طرح جن معاملات کے اندر ادارہ مستقرض ہوکر جمع شدہ روپے کا شرعاً مالک ہوجاتا ہے اس رقم کو افراد اور ادارہ اپنے ذاتی مصرف میں صرف کرنے کے مجاز ہوکر اس سے بھی تھوڑی تھوڑی رقم جمع کرکے بحق ادارہ معقول پراپرٹی اتنی بنا سکتے ہیں کہ کچھ ہی زمانہ میں ادارہ بالکل مفت اور بغیر کسی قسم کی شرطیں لگائے ہوئے غیر سودی طریقے سے بھی عوام کی امداد کرسکتا ہے۔

۳-کوئی شخص اپنا زیور یا کوئی سامان محض حفاظت کے لیے ادارہ میں رکھے اور کوئی قرض نہ لے تو یہ معاملہ بھی محض امانت و ودیعت کا ہوگا" الإيداع تسليط الغير على حفظ ماله" (۱) اور اس کا حکم یہ ہوگا کہ وہ چیز یا سامان بعینہ محفوظ رکھا جائے اور اس کو کسی اور کام میں استعمال نہ کرے اور نہ اس کو کسی عاریت وغیرہ پر دے في الهندية (۳۳۸/۴) :والوديعة لا تودع ولا تعار ولا تواجر ولاترهن وإن فعل شيئا منها ضمن "البتہ حفاظت کی اجرت متعارفہ امانت رکھنے والے سے لے سکتا ہے اور یہ اجرت ادارہ کی ملک ہوگی، پس اس سے بھی شئے مرہون کی حفاظت کرسکتا ہے ''المودع إذا شرط الأجرة للمودع على حفظ الوديعة صح ولزم عليه'' (۲) اور ایسی صورت میں حفاظت میں رکھنے والا حفاظت کی اجرت طے کرکے یا حسب ضابطہ حفاظت کوئی عمل کرکے اجرت لے تو جائز رہے گا، البتہ اس کے علاوہ کوئی اور عمل یا تصرف کرے گا تو خیانت کا گناہ ہوگا كما قدمنا آنفا من الهندية اور جس شخص نے حفاظت کے لیے رکھا تھا وہ فوراً اپنی چیز کی واپسی کا مطالبہ بھی کر سکے گا اگر وہ چیز واپس مل گئی تو خیر ورنہ اس کی واپسی کے وقت پوری قیمت پانے کا مستحق ہوجائے گا'' وأما حكمها فوجوب الحفظ على المودع وصيرورة المال أمانة في يده ووجوب ادائه عند طلب مالكه'' (۳) اور اگر خدانخواستہ ادارہ کی تعدی وغلطی کے بغیر ضائع ہوجائے تو ادارہ پر شرعاً ضمان یا تاوان واجب نہ ہوگا، البتہ اگر ادارہ نے اس امانت کی حفاظت پر اجرت لینا بھی طے کیا ہے تو پھر ادارہ کی تعدی کے بغیر ضائع ہوجانے کی صورت میں بھی ادارہ پر اس کا تاوان ادا کرنا ضروری رہے گا،'' هي أمانة فلاتضمن بالهلاك إلا إذا كانت الوديعة بأجر" (۴) بلکہ باب ودیعت کے سارے احکام جاری ہوں گے۔

۴-یعنی یہ کہ کوئی شخص اپنا نقد روپیہ محض بغرض حفاظت رکھے تو یہ معاملہ بھی خالص امانت و ودیعت کا ہوگا،

۱- بحر ۷/ ۲۷۳۔

۲- ہندیہ ۴/ ۳۴۲۔

۳- عالمگیری ۴/ ۳۳۸۔

۴- اشباہ معزیا للزیلعی، درمختار مع الرد ۴/ ۴۹۴۔

"الوديعة المال المتروک عند الإنسان يحفظه، وهي شرعاً: عقد أمانة ترکت عند الغير للحفظ قصداً" (۱) اور اس کا حکم شرعی یہ ہے کہ رقم بالکل بعینہٖ الگ تھلگ محفوظ رکھی جائے، حتی کہ اگر اس قسم کی امانت کی رقمیں کئی آدمیوں کی ہوں تو ان سب کو بھی الگ الگ رکھا جائے گی؛ کما في الشامي النعماني ۴/۴۹۷: وکذا لو خلطها المودع بجنسها أو بغيره بماله أو مال اٰخر بحيث لاتتميز ضمنها لاستهلاکه بالخلط"(۲) اور یہ معاملہ ابتداءً اگر چہ امانت کا ہوگا مگر انتہا ءً قرض کا ہوجائے گا اور اگر ادارہ کی زیادتی وتعدی کے بغیر ہلاک ہوجائے جب بھی اس کا عوض دینا لازم رہے گا، باقی اس رقم کے دینے والے کی اجازت سے یہ خلط ہوا ہے تو ادارہ کو کچھ گناہ بھی نہ ہوگا بلکہ ادارہ شریک ہوجائے گا، اور اپنے حصہ کا مالک ہوجائے گا "وإن خلط بإذنه کان شريکا له" (۳) اور اگر بعینہٖ الگ الگ محفوظ رکھی جائے اور بغیر کسی زیادتی کے ہلاک ہوجائے تو ادارہ پر کوئی عوض ادا کرنا واجب نہ رہے گا، بلکہ اس مدت حفاظت کی متعارف اجرت یا طے شدہ اجرت بھی لے سکتا ہے: "هي أمانة فلاتضمن بالهلاک" (۴) ہاں اگر شئے مودع کی حفاظت پر اجرت لینے کا معاملہ بھی ہوا ہے تو پھر ہلاکت کی صورت میں بہر حال ضمان ادا کرنا لازم رہے گا (کما مر في جواب ۳) امانت کی یہ رقم کسی دوسری رقم سے خلط ملط ہوجانے سے جس طرح قرض بن جائے گی، اسی طرح ادارہ اس کا شرعاً خود مالک متصور ہو جائے گا: "قوله ضمنها أي إذا ضمنها ملکها" (۵) پھر اپنی صوابدید سے جو معاملہ چاہے گا کرے گا تو شرعاً جائز یہ بھی رہے گا، پس اس رقم سے ادارہ کے تمام اخراجات کی کفالت بھی کر سکے گا، تنخواہ ملازمین وغیرہ بھی دے سکے گا، اور شئے مرہون کی حفاظت میں بھی اس رقم کو خرچ کر سکے گا۔

اور اگر کوئی چیز بندھک رکھ کر قرض دے گا تو یہ معاملہ عقد رہن کا ہوجائے گا اور معاملہ ۱ کی طرح معاملہ ہوا کرے گا اس کی تفصیل ۱ میں دیکھئے، اسی طرح اگر بغیر کوئی چیز بندھک لیے ہوئے محض قرض دے گا تو اس پر قرض کے احکام جاری ہوں گے اور اس کے لیے معاملہ ۲ کا حکم دیکھئے۔

۵- یہ کہ کوئی شخص اپنا نقد روپیہ لوگوں کو غیر سودی قرض دینے کے لیے دے یا ادارہ میں رکھے تو یہ معاملہ تو وکیل کا

۱- قواعد الفقہ ۵۴۳۔
۲- درمختار مع الرد ۴۹۷، وکذا في البحر ۲۷۷/۷۔
۳- بحر ۲۷۶/۷۔
۴- بحر ۲۷۶/۷۔
۵- شامی ۴۹۷/۴۔

ہوگا، اور اس کے احکام یہ ہیں: یہ رقم دینے والا شرعاً موکل اور اصل مالک کہلائے گا، اور ادارہ محض وکیل کہلائے گا، وکیل (ادارہ) اس رقم کا مالک شمار نہ ہوگا بلکہ حسب اجازت غیر سودی قرض حدود شرع میں رہتے ہوئے لوگوں کو دینے کا مجاز ہوگا، ''التوكيل هو إقامة الغير مقام نفسه في التصرف ممن يملكه'' (۱) وفی قواعد الفقہ ۵۴۶: ''وهي شرعاً تفويض أحد أمره لآخر وإقامته مقامه، ويقال لذالک الشخص، موكل ومن أقامه وكيل والأمر موكل به'' (۲) ''صح التوكيل بالإقراض لا بالاستقراض'' پس اگر کوئی چیز گروی رکھ کر غیر سودی قرض دے گا تو یہ معاملہ عقد رہن کا ہوگا اور اس کا حکم معاملہ ا میں دیکھئے، اور اگر کوئی چیز بغیر گروی رکھے محض قرض دیا ہے تو اس کا حکم معاملہ ۲ میں دیکھئے، بقیہ پوری تفصیل کتب فقہ کے باب القرض اور کتاب الرہن میں دیکھی جاسکتی ہے اور ان سب کے احکام کا خلاصہ یہ ہے کہ وکیل (ادارہ) جتنا معاملہ کرے گا، وکیل ان سب معاملات کا خود ذمہ دار ہوگا، حتیٰ کہ نفع ونقصان وغیرہ کے سب احکام لاگو ہوں گے، وہ سب محض ادارہ (وکیل) ہی تک محدود رہیں گے، کیونکہ وکیل اصل مباشر اور شرعاً ذمہ دار شمار ہوتا ہے: ''والحقوق في مايضيفه الوكيل في نفسه كالبيع والإجارة والصلح عن إقرار تتعلق بالوكيل إن لم يكن محجوراً كتسليم المبيع وقبضه وقبض الثمن والرجوع عند الاستحقاق والخصومة في العيب'' (۳)۔

اور اس معاملہ کے حکم میں ۲ کے معاملہ سے یہ فرق رہے گا کہ معاملہ ۲ میں ادارہ خود مالک ہوجائے گا اور معاملہ ۵ میں رقم دینے والا ہی مالک رہے گا اور ادارہ محض وکیل رہے گا۔

۶ - یہ کہ کوئی شخص اپنا نقد روپیہ ادارہ میں کوئی کاروبار کرنے کے لیے دے، تو یہ معاملہ مضاربت کا ہوگا اور اس کا حکم دینے والا شرعاً رب المال کہلائے گا، اور ادارہ مضارب کہلائے گا اور یہ رقم بضاعۃ وپونجی کہلائے گی: ''المضارب هو العامل في المضاربة ويقابله رب المال'' (۴)۔

''المضاربة هي عقد شركة في الربح بمال من جانب رب المال وعمل من جانب المضارب'' (۵) ''وشرطها كون رأس المال من الأثمان، في رد المحتار: الدراهم والدنانير (۶) اس کے

۱- بحر ۷/۱۴۱۔
۲- البحر ۷/۱۴۳۔
۳- کنز مع البحر ۷/۱۵۱۔
۴- قواعد الفقہ ۴۹۴۔
۵- درمختار مع الرد ۴/۴۸۳۔   ۶- شامی ۴/۴۸۴۔

سارے احکام کتاب المضاربۃ میں ہیں، یہاں صرف اتنا سمجھئے کہ رب المال (رقم دینے والا) ادارہ (مضارب) کوکسی خاص چیز کی تجارت کرنے کے لیے دے یا عام تجارت کرنے کے لیے مضارب (ادارہ) کو دے، سب جائز رہے گا، یہ دونوں صورتیں درست رہیں گی، "في الدر المختار مع رد المحتار۴؍۴۸۵": "ويملك المضارب في المطلقة التي لم تقيد بمكان أو زمان أو نوع البيع بنقد و نسيئة متعارفة و الشراء و التوكيل بهما"۔

البتہ مجموعی نفع میں سے مضارب (ادارہ) کے لیے نفع کا ایک متعین مثلاً آدھایا جوحصہ ہوطے ہوجانا ضروری رہے گا کہ سال بہ سال حساب کے وقت جونفع برآمد ہو اس کا مالک حسب معاہدہ (ادارہ) شمار ہوگا "وشرطها كون الربح بينهما شائع فلو عين قدراً فسدت" (۱) اور ادارہ (مضارب) کو اختیار رہے گا کہ اپنے جس کام میں چاہے خرچ کرے اور اس نفع کی رقم کو مرہون کی حفاظت میں بھی خرچ کرسکتا ہے، پس اگر کسی کو محض قرض دے یا کوئی چیز گروی رکھ کر قرض دے اس کا حکم ۳، ۲ میں دیکھئے۔

یہاں تک ان تمام کاموں کا اصولی حکم الگ الگ تسہیلاً للفہم بیان کردیا گیا، اب آگے باقی ضمنی نمبروں کا جواب ملاحظہ فرمائیں:

۱-صحیح ہے اور اس کا طریقہ بھی اوپر مذکور ہو چکا ہے۔

۲-دونوں کی نیت کریں۔

۳-پاس بک کی قیمت لینا اور ادارہ کے مصارف میں صرف کرنا جائز رہے گا "المودع إذا شرط الأجرة للمودع على حفظ الوديعة صح ولزم عليه" (۲)۔

۴-عطایا اور محض صدقات غیر واجبہ حاصل کیے جا سکتے ہیں "لأن الحيلة للتمليك إنما جوزوها للضرورة ولا ضرورة ههنا" (من العبد الضعيف)۔

ب، ج، د: ان سب نمبروں کا بہتر حل یہ ہے کہ جس طرح ہمدردان ملت مخیّر حضرات نے بڑی بڑی رقمیں جمع کر کے غیر سودی قرض دینے کا تعاون کیا ہے، اسی طرح صدقہ جاریہ کی اہمیت وفضیلت بتا کر بڑی بڑی رقمیں حاصل کر کے کوئی جائداد و پراپرٹی خرید کر ادارہ پر وقف کیا جائے اور اس کے نفع سے ادارہ چلایا جائے اور جب تک اتنی پراپرٹی

۱- درمختار مع الرد ۴؍۴۸۵۔

۲- عالمگیری ۴؍۳۴۲۔

وجائداد یں وقف نہ ہوجائیں اس وقت تک فارموں کی قیمت کے ذریعہ ادا کرنے سے بہتر یہ ہوگا کہ ۲، ۴ کے ذریعہ حاصل شدہ رقوم سے ادارہ کے تمام اخراجات پورے کریں تو یہ جائز رہے گا۔

۵-قرض دینے سے قبل قبل وہ دونوں فارموں کی قیمت جن کا ذکر معاملہ ۲، ۴، ۶ میں گذر چکا ہے، احقر کے تحریر کردہ ضابطے کے مطابق لے سکتے ہیں ورنہ نہیں۔

الف تا د: کے مناسب قیمت واخراجات کے ساتھ حسب قید مذکور جائز رہے گا اور اس کا نام اجرۃ الخدمت رکھا جائے یا کچھ بھی رکھا جائے درست رہے گا، باقی قرض دیدینے کے بعد کوئی رقم مستقرض سے لینا درست نہ رہے گا، بلکہ ''کل قرض جر نفعاً'' میں داخل ہوکر شرعاً ممنوع رہے گا، ضمنی نمبرات (الف تا د) سب میں یہی حکم رہے گا، اور ان سب کے دلائل شرعیہ ۲، ۴، ۵ میں دیکھے جاسکتے ہیں۔

۶- یہ سرمایہ اگر ادارہ کو مضاربت کا معاملہ کرنے کے لیے دیا گیا ہے تو اس میں عقد مضاربت کے احکام جاری ہوں گے اور اس کی ضروری تفصیل معاملہ ۶ میں مذکور ہے۔

الف تا د: اور اگر یہ سرمایہ دینے والوں نے لوگوں کو قرض بلاسودی دینے کے لئے ادارہ کو دیا ہے تو یہ معاملہ عقد توکیل کا ہوگا اور اس کا حکم معاملہ ۵ میں تفصیل سے مذکور ہے دیکھا جاسکتا ہے۔

ھ: اگر ملکی قانون کی رو سے ادارہ خود تجارت نہیں کرسکتا تو قانونی زد سے بچتے ہوئے ایسی کوئی شکل اختیار کرسکتے ہیں جو شرعی حدود کے خلاف نہ ہو، قانون دانوں (وکیلوں) سے اس کا طریقہ معلوم کر کے شرعی حدود کی مطابقت وعدم مطابقت بھی معلوم کر کے جب شرعی حدود کے مطابق نظر آئے تو اس پر عمل کریں۔

۷-معاملات کے اندر لکھے ہوئے ضابطہ کے مطابق بھی صحیح رہے گا اور ضمنی نمبروں۔ الف تا د: کا حکم بھی اس میں دیکھا جاسکتا ہے۔

۸-قرض کی مدت متعینہ ختم ہونے کے بعد توسیع مدت اور تجدید قرض کے لیے مذکورہ دونوں صورتوں میں سے صرف یہ صورت کہ پہلا معاملہ قرض بالکل ختم کر کے ازسرنو معاملہ کیا جائے تو درست رہے گی، اور قانونی پریشانی ہر صورت میں ہوسکتی ہے اور اس کا مخلص وہی ہے جو پہلے لکھا جاچکا کہ وکلاء سے مشورہ کے بعد کیا جائے۔

۹- اشیاء مرہونہ کی حفاظت خود مرتہن کے ذمہ واجب ہے، خود حفاظت کرے یا کسی سے کرائے، لہٰذا احفاظت کا کرایہ خود ادارہ پر لازم رہے گا، لہٰذا بینکوں کے لاکرس کرایہ پر لینے کی اجرت بھی ادارہ ہی کو برداشت کرنا ہوگی، اور اخراجات

کی فراہمی انہیں صورتوں سے کی جائے جو ۲، ۳، ۴ میں گذر چکیں، یعنی جن صورتوں میں ادارہ مالک ہوجاتا ہے۔'' و أجرة بیت حفظه و حافظه و مأوی الغنم علی المرتهن'' (۱)۔

۱۰- اس جملہ (اشیاء مرہونہ ومکفولہ) میں غالباً اشیاء مرہونہ ہی مراد ہیں کوئی جائداد غیر منقولہ یا دستاویزات وغیرہ کا مکفول کرنا مراد نہیں ہے، جیسا کہ سوال نامہ کے اغراض ومقاصد کے غرض ۲ کے تحت ضمنی نمبر (و) میں تصریح ہے کہ سونا چاندی کے زیورات کی کفالت پر ہی قرض دیا جائے، شخصی ضمانت پر یا مکان وزمین کے کاغذات پر قرض ہرگز نہ دیا جائے، سے واضح ہے۔

پس اس صورت میں مضمون بالقرض سے زائد مقدار سے مراد متعین ہے کہ جو زیور قرض میں بندھک لیا ہے، اس زیور کی قیمت مقدار قرض سے زائد ہے اور ظاہر ہے کہ ان زیورات کی زائد مقدار زیور مرہونہ سے الگ وجود نہیں رکھتی، بلکہ اس طرح سے ہوگی کہ اس کا مقدار مرہون سے الگ وممیز کرنا دشوار ہوگا، لہذا اس کی حفاظت بھی شئی مرہونہ ہی کی حفاظت کے ساتھ رہے گی، لہذا اس کا کوئی حکم الگ نہ ہوگا بلکہ وہی حکم ہوگا جو زیور مرہون کی حفاظت کا ہوگا، اور اگر وہ زائد مقدار مضمون بالقرض کی مقدار سے الگ تھلگ بھی ہو اور الگ وجود بھی رکھتی ہو تب بھی حسب تصریح فتاوی ہندیہ سب کی حفاظت مرتہن کے ذمہ ہی رہے گی: ''الأصل فيه إنما يحتاج إليه لمصلحة الرهن بنفسه وتبقيته فعلى الراهن سواء كان في الرهن فضل أو لم يكن (إلى قوله) وكل ما كان لحفظه كرده إلى يدالراهن أو كرد جزءٍ منه كمدا واة الجرح فهو على المرتهن مثل أجرة الحافظ (۲) الأصل فيه أن كل مايحتاج إليه لمصلة الرهن بنفسه وتبقيته فعلى الراهن لأنه ملكه وكل ما كان لحفظه فعلى المرتهن إن حبسه له (۳) وبهذا يندفع ما قيل بانقسام أجرة الحفظ على المضمون والأمانة، لأن المقسوم على المضمون والأمانة ليس من قبيل الحفظ كما قال في الدر المختار وما مؤنة رده (إلى قوله) مضمونة على الراهن'' (من العبد الضعيف)۔

۱۱- جو لوگ اپنے زیورات یا قیمتی اشیاء ادارہ میں محض بغرض حفاظت رکھتے ہیں اور قرض نہیں لیتے، ان اشیاء کی حفاظت کرنے کا متعارف کرایہ ادارہ لے سکتا ہے جائز رہے گا، البتہ حفاظت پر اجرت کا معاملہ طے ہوجانے کی صورت میں اگر شئے مودع ادارہ کی تعدی وغلطی کے بغیر بھی ضائع ہوجائے تب بھی ادارہ پر اس کا تاوان ادا کرنا لازم رہے گا، کما مر دلیلہ فی

۱- درمع الرد ۵/ ۳۱۳۔
۲- فتاوی ہندیہ ۵/ ۴۵۴۔
۳- درمختار مع الرد ۵/ ۳۱۴۔

جواب ۳۔

۱۲-میعادی چیک سندووثیقہ ہے مال نہیں ہے، اس لیے اس کی بیع وشراء (خرید وفروخت) جائز نہیں، البتہ اس طرح کرنا جائز رہے گا کہ جس محکمہ کا چیک ہے اس محکمہ سے خود چیک کا مالک یہ اجازت لے لے کہ اس چیک کی رقم کو فلاں شخص وصول کرے گا، پس جب متعلقہ محکمہ اجازت دیدے (اپنے اصول سے جن لفظوں میں اجازت دیدے) تو میعادی چیک والا شخص یہ چیک کسی کے حوالہ کردے کہ اس کو تم بھنانے کی اجرت میں اتنا وضع کرکے باقی رقم مجھے نقد دیدو، پھر یہ شخص جس کے حوالہ کررہا ہے وہ چیک کے اندراج شدہ مقدار اور اس کی مدت ادائیگی کے اعتبار سے قیمت چیک کا نصف یا ثلث یا جس قدر مناسب ہو اجرت میں لینا طے کرکے بقیہ رقم نقد صاحب چیک کو دیدے اور بقیہ رقم باقساط خود وصول کرتا رہے تو اس طرح اس چیک کا اور اس طے شدہ رقم کا خود کو لینا درست رہے گا، جیسا کہ اس عبارت سے معلوم ہوتا ہے: ”**تمليك الدين ممن ليس عليه الدين باطل إلا في ثلاث: حوالة، وصية، وإذا سلطه أي سلط المملک غير المديون على قبضه أي الدين فيصح حينئذ**“(۱)**هكذا يفهم من امداد الفتاوىٰ مبوب في بحث الحوالة ايضاً** ۳۲۱/۴۔

۱۳-جائز صورت جس کا تفصیلی حکم اصول شش گانہ میں مذکور ہے، اس کے مطابق جو جائز رقم اگر ادارہ کے مصارف سے بڑھ جائے تو پہلے ادارہ کی جائز ترقی میں لگائے پھر جو رقم بچے اس کو مذہبی رفاہی امور پر صرف کرے، جیسے مدارس علوم دینیہ جس میں علوم دینیہ کی ترویج واشاعت صحیح طریقہ پر ہوتی ہو اور عوامی چندے سے چلتا ہو پھر پریشان حال مسلم غرباء ومساکین کو بطور صدقہ دیدے، یا اسی طور سے اور جو دینی امور ہوں ان پر خرچ کرے۔

۱۴-بغرض حفاظت مروجہ سرکاری بینکوں کے کرنٹ اکاؤنٹ وسیونگ اکاؤنٹ میں رکھ سکتے ہیں اور بغیر کسی قانونی سخت مجبوری کے فکسڈ ڈپازٹ میں نہ رکھے، کیونکہ یہ حسب ضابطہ شرع اپنی جانب سے ربوائے شرعی کے معاملہ کرنے پر مشتمل ہوتا ہے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۴۱۱/۶/۱۵ھ

۱- درمختار فی فصل مسائل متفرقۃ مع الشامی النعمانی ۳۲۱/۴۔

مکان وکارخانہ کے لئے حکومت یا غیر مسلم ومسلم سے سودی قرض لینا:

ا-کیا یہ جائز ہوگا کہ اپنے انفرادی کام مثلاً کارخانہ یا باغ یا کاشت کوترقی دینے کے لیے یا مکان کی تعمیر کے لیے حکومت سے سود کی شرط پر قرض لیں؟

۲-کیا حکومت کے علاوہ غیر مسلم افراد سے بھی مسلمان سود پر قرض لے سکتے ہیں یا سود پر قرض دے سکتے ہیں؟

۳-کیا ہندوستان میں یہ سودی معاملہ خود مسلمانوں کا آپس میں بھی ہوسکتا ہے کہ مسلمان مسلمان کو سود پر قرض دے یا قرض لے؟

۴-بینک کا پورا نظام سود کی بنیاد پر ہوتا ہے، بینک میں اپنا حساب رکھنا سودی کاروبار میں شرکت ورنہ تعاون ضرور ہے، لیکن کاروبار میں عام طور پر بینک واسطہ بنتا ہے، مثلاً مطالبات کی ادائیگی بینک کے چیک کے ذریعہ ہوتی ہے اور بہت سے سرکاری غیر سرکاری اداروں میں ملازمین کی تنخواہ چیک کے ذریعہ ادا کی جاتی ہیں، کیا ان ضرورتوں کے پیش نظر مسلمانوں کے لیے جائز ہوگا کہ وہ بینک میں اپنا حساب رکھیں؟

چالو (کرنٹ) حساب کے علاوہ ایک شکل ڈیپازٹ کی ہوتی ہے، کہ ایک خاص مدت کے لئے اپنی رقم بینک میں جمع کرادیتے ہیں، اس رقم پر سود بھی ملتا ہے، اگر ایک ہزار روپیہ جمع ہے تو سال بھر میں پچاس روپے ہوجائے گی، اس کا سود لیں، اگر اجازت دیجاتی ہے تو کیا یہ پچاس روپیہ جو سود کے لئے ہیں وہ مسلمانوں کے لیے حلال وطیب ہیں، ان کو وہ اپنے خرچ میں لاسکتے ہیں۔

الجواب وباللہ التوفیق:

ا-کارخانہ قائم کرنے یا باغ لگانے یا کاشت وغیرہ کرنے یا درست رکھنے کے لیے حکومت سے جو اعانتیں لی جاتی ہیں یا جو قرض لئے جاتے ہیں۔ان کی کچھ نوعیت اس طرح ہوتی ہے کہ ان سب کا سود یا سودی لین دین ہونا لازم نہیں بلکہ بعض صورتیں غیر سودی اور بعض معاملے امدادی اور محض از قبیل اعانت بھی شمار ہوسکتے ہیں، اس کے ہر لین دین کو سودی یا سود کے شرط پر قرض لینا یا سودی معاملہ ہونا نہیں کہہ سکتے بلکہ بعض صورتیں بالکل جائز ہوں گی اور بعض ناجائز اور سودی بھی ہوں گی، توضیح کے لیے بعض صورتیں ذرا تفصیل سے بیان کردی جاتی ہیں مثلاً:

الف: اگر محض نقد روپیہ بطور قرض کے لیا جائے اور اس پر نفع دینے کا معاملہ کیا جائے، یا سامان وغیرہ کے ساتھ ہی

نقد بھی لیا جائے، مگر نقد کی یہ مقدار سامانوں سے بہت زیادہ اور فاضل ہو اور اس پر نفع دینے کا معاملہ کیا جائے اور واپسی کی کل رقم یا قیمت سے زائد ہو جائے تو سود کی تعریف ''**هو فضل خال عن العوض لأحد المتعاقدين في عقود المعاوضة**'' (۱) صادق آجائے گی اور چونکہ معاملہ نقدین میں اور خالص مبادلہ اور عوض معاوضہ کا ہوگا، اس لیے وہ نفع کم ہو یا زیادہ سود ہی کا ہوگا اور ''**كل قرض جر نفعاً فهو ربوا**'' بھی صادق آجائے گا اور حتی المقدور اس کے قریب بھی جانا جائز نہ ہوگا، اور مجبوری کا حکم دوسرا ہوگا جو اس جزئیہ ''**ويجوز للمحتاج الاستقراض بالربح**''(۲) سے معلوم ہوتا ہے، اس قاعدہ کے تحت احتیاج شدیدہ کی حالت میں فقہائے امت سودی قرض کو بھی بقدر ضرورت لینے کی اجازت دیدیتے ہیں۔

ب: جو نقد رقم سامان وغیرہ کے ساتھ محض کام چلانے کی مقدار میں لی جاتی ہے، اس میں تاویل چل سکے گی اور اس کو کام چلانے کے لئے اعانت میں داخل کر کے اس معاملہ کو غیر سودی ہونے کا حکم لگائیں گے اور اس زائد رقم کو سود نہ کہیں گے، بلکہ انتظامات کی درستگی کے لیے ایک قسم کی فیس میں داخل کیا جا سکے گا اور اس صورت میں یہ معاملہ جائز رہے گا۔

ج: کسی نے پروجیکٹ (محکمہ ترقیات کا ایک شعبہ) سے مثلاً چار ہزار روپے کنواں کھدوانے یا مکان بنانے یا کسی اور صنعت و حرفت کے لیے نقد لیے اور محکمہ پروجیکٹ نے اس میں سے اپنے قاعدہ کے تحت مثلاً ایک ہزار روپے **بالکل معاف** کر دیے اور فقط تین ہزار قائم رکھ کر دو سال کا موقع دیا اور پھر دو سال بعد سے چھوٹی چھوٹی اور لمبی قسطوں میں ادائیگی کے لیے متعین کیا اور اس میں ان قسطوں پر کچھ اضافہ کر کے وصول کیا مگر کل رقم وصول کی چار ہزار کل رقم قرضہ سے زائد نہ ہوئی تو ان قسطوں میں اصل پر جو زیادتی محکمہ نے وصول کی وہ سود نہ ہوگی اور یہ معاملہ بھی جائز رہے گا، چونکہ مجموعہ قرض چار ہزار پر زائد وصول نہیں کیا گیا، اس لیے سود کی تعریف: ''**فضل خال عن العوض**'' الخ ''**يا كل قرض جر نفعاً فهو ربوا**'' صادق آئے گی۔

۲و۳- سود کا ایک شرعی مفہوم ہے اور اسی مفہوم کے اعتبار سے سود کی حرمت منصوص ہے، ''**أحل الله البيع وحرم الربو**'' (۳) اور بغیر قید کسی ملک و مذہب و بغیر قید کسی زمانہ یا افراد زمانے کے مطلقاً منصوص ہے، اور اس کے مرتکب پر درکنار اس میں کسی حیثیت سے شرکت کرنے والے اور معاونین پر بھی طرح طرح کی وعیدیں و لعنتیں وارد ہوئی ہیں، اس لیے وہ مفہوم شرعی ربوا (سود) کا جس رقم پر صادق آجائے گا اور جس معاملہ پر سودی معاملہ ہونا صادق آجائے گا، وہ چیز یا

۱- الدر المختار ۴/۱۷۷۔
۲- الاشباہ والنظائر ۱۱۵۔
۳- سورۂ بقرہ ۲۷۵۔

معاملہ خواہ ہندوستان میں ہو یا کسی اور ملک میں ہو، مسلمانوں کے ساتھ ہو یا غیر مسلموں کے ساتھ ہو سب حرام وناجائز رہے گا اور اس کالینا دینا کچھ بھی درست نہیں رہیگا۔

۴- بینک کا ابتدائی دور ایسا ضرور تھا کہ اس کا پورا کاروبار محض سودی پر ہوتا تھا مگر اب ایسا نہیں ہے، اس کے اصول ومقاصد میں اور طریقہ کار میں بہت سی تبدیلیاں واقع ہوگئی ہیں۔ اب تو بہت سے بینکوں میں مختلف نوع کے مستقل کاروبار تجارتی اصول پر ہونے لگے ہیں، بہت سے بینک شرکت اور مضاربت کے اصول پر چلنے لگے ہیں جیسا کہ خود سوال کے بعض جملوں سے (مگر کاروبار میں عام طور سے) بھی اس طرف اشارہ ملتا ہے، پس جن کاروباروں میں مطالبات کی ادائیگی بینک کے چیک کے ذریعہ ہوتی ہے یا جن ملازموں کی تنخواہیں بینک کے چیک کے ذریعہ برآمد ہوتی ہیں، ان میں اگر بینک اپنے لیے بھی کوئی رقم وصول کرے تو اس کا سود ہونا ہی ضروری نہ ہوگا بلکہ وہ بینک کا محنتانہ بھی کہا جا سکتا ہے، بینک اجیر یا وکیل یا درمیانی واسطہ قرار دیکر اس رقم کو بینک کی اجرت یا عوض کارکردگی بھی کہا جاسکتا ہے، اس لیے اب ہر بینک کا ایک ہی حکم باقی نہیں رہے گا بلکہ ہر بینک کے اصول وضوابط وطریقہ کا ومعاملات کے اعتبار ولحاظ سے الگ الگ حکم رہے گا اور پھر جب بینک کے علاوہ دیگر ذرائع سے سرمایہ کی حفاظت دشوار یا پریشان کن ہو تو بوجہ احتیاج مجبوری تو اس مسلمہ ضابطہ کی بناء پر سودی بینک میں جو ابتدائی دور میں تھے رقوم کے محفوظ رکھنے کا جواز علماء وفقہاء آج سے بہت پہلے بتلا چکے ہیں، تو اب ان بینکوں میں جن میں محض سودی کاروبار ہونا متیقن نہیں ہے محفوظ رکھنے کی غرض سے بدرجہ اولی اجازت ہوگی۔

چالو (کرنٹ حساب) یا ڈیپازٹ اس فرق سے تو حکم میں کوئی فرق نہ ہوگا اور اگر ہوگا تو یہ ہوگا کہ جو بینک غیر سودی بینک کاری کے اصول پر کام کرتے ہوں یا شرکت ومضاربت کے اصول پر کاروبار کرتے ہوں؛ ان میں اکاؤنٹ یا سرمایہ رکھنے کو ترجیح ہوگی اور پھر جب تک اس زائد رقم کے بارے میں جو بینک سے سود کے نام پر ملتی ہو، غیر سودی ہونے کا ظن غالب نہ ہو جائے اس کا تصدق کر دینا مسلم غرباء ومساکین پر واجب رہے گا اور خود ستعمال کرنا جائز نہ رہے گا، جیسا کہ اب تک محققین علماء کا یہی فتویٰ تھا اور ہے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

جس سے زمین لگان پر لی پھر اسی کو کاشت کے لئے دینا جائز ہے یا نہیں؟

۱- زید نے پانچ بیگھہ زمین سو روپیہ لگان پر ایک فصل کے لئے عمر کو دی اور فصل کٹنے پر روپیہ ادا کرنا طے ہوگیا، عمر

نے زید سے کہا اس میں گنا لگا دو اور یہ لو پیسے بیج کے لئے اور پانی دوائی وغیرہ کے لئے اور گنے سے جو منافع ہوگا وہ دونوں میں نصف نصف اس لئے کہ تمہاری محنت دیکھ بھال ہوگی اور میرا پیسہ خرچ ہوگا تو کیا یہ شکل جائز ہے؟

۲- اگر مذکورہ شکل جائز نہ ہو تو کیا زید آدھی رقم اپنی طرف سے عمر کو ہدیہ میں دے سکتا ہے اور اس کا لینا عمر کو جائز ہے یا نہیں؟

۳- جس کے پاس زمین نہ ہو صرف پیسہ ہو اور نہ ہی کھیتی کے تجربے سے واقف ہو تو ایسا شخص کھیتی میں اگر شرکت کرے تو شرعاً اس کے لئے کیا حکم ہے اور منافع سے کتنا اس کے نام کا لگایا جائے؟

عبد اللہ معرفت عبد الکریم (نیابازار، سہارنپور، یوپی)

الجواب وباللہ التوفیق:

۱و۲- عمر نے جب پانچ بیگھہ زمین لگان پر لیا تو اس کو ضروری تھا کہ خود کاشت کرتا یا اپنے مزدوروں سے کاشت خود کراتا یا کسی تیسرے کو کاشت پر دیتا لیکن جب عمر نے ایسا نہیں کیا بلکہ زید ہی کو کاشت کرنے کے لئے دیکر بیج و کھاد وغیرہ وغیرہ کی رقم دیا تو لگان والا معاملہ شرعاً ختم ہو گیا (۱) اور یہ سب روپے دینا قرض ہو گیا، اب اس سلسلہ میں پیداوار میں سے کوئی نفع لینا عمر کو جائز نہیں رہا۔ بلکہ "کل قرض جرّ نفعا فھو ربوا" (۲) میں داخل ہو کر وہ نفع لینا سود میں داخل ہو جائے گا اور نا جائز رہے گا یہی حکم سوال نمبر ۲ کا بھی ہے۔

۳- اس کے لئے یہ صورت جائز ہے کہ لگان پر اگر خود کاشت کرنا نہیں آتا یا خود کاشت کرنا نہیں چاہتا ہے تو لگان پر زمین لیکر مالک زمین کی اجازت سے کسی تیسرے کو کاشت کرنے کے لئے دیدے اور پیداوار میں نصف نصف یا جتنا چاہے شریک کرے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دار العلوم دیوبند سہارنپور ۲۶/۴/۱۴۰۲ھ

۱- "ولو آجرھا من المؤجر لا تصح وتنفسخ الإجارۃ فی الأصح" (الدر المختار مع رد المحتار ۹/۳۹)۔

۲- "أی إذا کان مشروطا" (رد المحتار علی الدر المختار ۷/۳۹۵)۔

لاٹری کا حکم:

ایک شخص کے پاس لاٹری ٹکٹ میں ایک لاکھ روپیہ انعام نکلا ہے اگر وہ شخص انعام کے روپیہ سے دین کے کام میں روپیہ صرف کرنا چاہتا ہے تو کیا کرسکے گا یا نہیں اور کرسکتا ہے تو کس معاملہ میں کس جگہ استعمال ہوگا؟

الجواب وباللہ التوفیق:

ایک لاکھ روپیہ جو لاٹری سے مل گیا ہے اس کا حکم یہ ہے کہ اگر خود غریب ونادار اور مستحق زکوۃ ہے جب تو بقدر ضرورت خود رکھ کر بقیہ کو مستحقین زکوۃ کو بغیر نیت ثواب صدقہ کردے اور خود ایسا غریب ونادار مستحق زکوۃ نہ ہو تو سب رقم کو خواہ تھوڑا تھوڑا کرکے یا یک وقت تصدق کردے اور جس صورت میں وہ خود اپنے خرچ میں بھی لاسکتا ہے، اس صورت میں بھی اگر وہ کسی دینی کام میں خرچ کرنا چاہے تو اس طرح جتنی رقم کسی دین کے کام میں دینا ہو اتنی رقم کسی سے قرض لے کر دین کے کام میں دیدے پھر وہ قرضہ اس ملی ہوئی رقم سے ادا کردے پھر بھی اعلیٰ بات یہی رہے گی کہ اس رقم کو اپنے کسی کام میں لانے سے اجتناب واحتیاط رکھ کر اس کے وبال سے بچنے کی نیت سے اپنی ملک سے بطور تصدق کے نکال دے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۲/۶/ ۱۴۰۳ھ

لاٹری کی خریداری اور اس سے حاصل ہونے والے انعام کا حکم:

یہاں حکومت لاٹری کے ٹکٹ دو روپے کے حساب سے فروخت کرتی ہے، ایک شخص جتنا ٹکٹ چاہے خرید سکتا ہے، دو مہینہ میں ایک بار قرعہ اندازی سے جس کا نمبر نکلتا ہے اس کو زیادہ ایک لاکھ کم از کم سات سو روپیہ انعام ملتا ہے، اس کے متعلق شریعت کا کیا حکم ہے۔

یہاں مسلمان بڑی تنگی میں بسر کررہے ہیں، ملازمت تجارت ہر ایک کا یہی حال ہے تنگدستی اور غربت عام ہے، اس لئے مسلمان زیادہ تر اس انعام کو لیتے ہیں اور اپنے کام میں لاتے ہیں چاہے جائز ہو یا ناجائز (اللہ تعالیٰ معاف فرمائے) اب دریافت طلب مسئلہ یہ ہے کہ گنجائش کی کوئی صورت ہو تو مطلع فرمائیں تاکہ حرام سے بچیں خدانخواستہ حرام وحلال جاننا یا سمجھنا نہیں ہے بلکہ فقہاء کرام نے گنجائش کی کوئی صورت نکال رکھی ہو تو اس سے فائدہ اٹھانا مقصد ہے، اگر مقروض جو کسی طرح قرض کی ادائیگی پر قادر نہیں ہے وہ اس رقم سے قرض ادا کرسکتا ہے اور اپنی ضرورت پر خرچ کرسکتا ہے یا نہیں؟ اگر بیوی اپنی

خوشی سے اس روپے کو بالکلیہ اپنے شوہر کو مالک بنادے اور شوہر اس روپے سے قرض ادا کرے اور دیگر ضروریات پر خرچ کرے یا اپنی بیوی کو دے تو کیا حکم ہے، اس سے حرام کو حلال جاننا نہیں ہے بلکہ اگر گنجائش ہے تو اس سے فائدہ حاصل کرنا ہے کیونکہ (اللہ معاف فرمائے) مسلمان تو یہ روپے لے رہے ہیں اور کام میں لا رہے ہیں یہاں سے ٹکٹ بھیجنا مشکل ہے معاف فرمائیں۔

ابوطلحہ

الجواب وباللہ التوفیق:

لاٹری کا ٹکٹ خریدنے میں شرعاً چونکہ قمار (۱) کا مفہوم صادق آجاتا ہے، اس لئے اس ٹکٹ کا خریدنا اور اس کا کام کرنا درست نہیں ہے، باقی اگر کسی نے غلطی سے ٹکٹ خرید لیا اور اس کو انعام ملا تو اس کا حکم یہ ہے کہ اپنی جمع کی ہوئی رقم تو اپنے پاس رکھ سکتا ہے اور اپنے کام میں بھی لا سکتا ہے اور اپنی جمع کی ہوئی رقم سے زائد رقم کا یہ حکم ہے کہ اگر حکومت کا کوئی غیر شرعی ٹیکس اس ٹکٹ خریدنے والے پر لاگو ہو تو پہلے اس ٹیکس میں دے، پھر جو رقم بچے اس رقم کو اس کے وبال سے بچنے کی نیت سے غریب کو دے کر اپنی ملک سے خارج کردے (۲) اگر کسی عورت کا شوہر غریب ہے تو شوہر کو بھی وہ دے سکتی ہے، اسی طرح اگر ٹکٹ خریدنے والا خود غریب ہے اور اس نے کسی دوسرے کو بطور صدقہ دینے کے بجائے خود ہی استعمال کرلیا تو اگر وہ واقعی غریب و مستحق زکوٰۃ تھا تو امید ہے کہ عند اللہ مواخذہ سے محفوظ رہے، باقی اس عمل کی عادت کرنا اور بار بار خریدنا وغیرہ کسی طرح جائز نہ ہوگا، اسی طرح ٹکٹ میں دی ہوئی اپنی رقم سے زائد رقم کو اگر کسی قرضدار یا پریشان حال کو دے کر اپنی ملک سے نکال دیا جائے تو یہ بھی درست رہے گا، باقی ایسا کرنے کے لئے ٹکٹ خریدنا درست نہ ہوگا (۳)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دار العلوم دیوبند سہارنپور ۲۵/ ۴/ ۱۴۰۲ھ

۱- ''القمار: ثم عرفوه بأنه تعليق الملك على الخطر والمال في الجانبين'' (قواعد الفقہ/ ۴۳۴)۔

۲- ''لأن سبيل الكسب الخبيث التصدق إذا تعذر الرد على صاحبه'' (رد المحتار علی الدر المختار ۹/ ۵۵۳)۔

۳- ''يأيها الذين آمنوا إنما الخمر والميسر والأنصاب والأزلام رجس من عمل الشيطان فاجتنبوه لعلكم تفلحون'' (سورہ مائدہ ۹۰)۔

بینک سے سودی قرض لینا:

ہندوستان کے موجودہ معاشی نظام کے پیش نظر یہ حقیقت ہے کہ گورنمنٹ سے حاصل ہونی والی مراعات کی ادائیگی کے وقت سود دینا ہوتا ہے۔ اس ضمن میں یہ امر بھی قابل توجہ ہے کہ اگر گورنمنٹ کے بینکوں سے پیسہ نہ لیں تو کوئی بھی تجارت قابل قدر ترقی نہیں کرسکتی اور اس طرح مسلم افراد ترقی کی دوڑ میں پیچھے رہ جاتے ہیں۔

ان امور کے پیش نظر علماء کرام بینک کی فراہم کردہ رقوم پر سود کی ادائیگی پر کیا نظریہ رکھتے ہیں۔

سید احمد (جی-۸۴(اے) کالکاجی، نئی دہلی)

الجواب وباللہ التوفیق:

اگر قانونی مجبوری کی وجہ سے بینک سے قرض لینا پڑے یا بغیر بینک سے قرض لیے ہوئے کاروبار چلانا دشوار ہو اور ضرورت اس کی متقاضی ہو کہ بینک سے قرض لیا جائے اور اس کی سخت مجبوری ہو تو الاشباہ والنظائر ص ۱۴۵ مع الحموی کے اس جزئیہ "ویجوز للمحتاج الاستقراض بالربح" کے تحت حسب مجبوری وضرورت بینک سے سودی قرض لے لینے کی گنجائش ہوگی (۱)، البتہ چونکہ یہ سب حالات وپریشانیاں اپنی ہی بداعمالی کا خمیازہ ہیں، کما قال: أعمالکم عمالکم''(۲) اس لئے ہمیشہ ان حالات ومعاملات پر استغفار کرتے رہنا اور اللہ تعالی سے دعا کرتے رہنا کہ ہمارے اعمال وحالات ایسے بنادیجئے کہ اس قسم کے معاملات سے نجات ملے ضروری رہے گا، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۴۰۲/۶/۳۰ھ

انشورنس اور اس سے حاصل کردہ کمیشن کا حکم:

کیا انشورنس جائز ہے؟ اور اگر جائز ہے تو یقیناً اس سے حاصل کردہ کمیشن (عمولہ) بھی جائز ہونا چاہیے۔ مسئلہ کی نوعیت یہ ہے کہ سعودی عرب جہاں تقریباہر چیز باہر سے منگائی جاتی ہے، سعودی حکومت جو اسلامی حکومت ہے تمام تاجروں سے کہتی ہے کہ جو بھی مال آئے اس کی تامین وانشورنس ضروری ہے، زیادہ تر انشورنس کمپنی لندن میں ہوتی ہے، البتہ ان کے

۱- الاشباہ والنظائر طبعۃ کراچی ۲۶/۱ وطبعۃ دیوبند ۱۴۹/۔

۲- فیض القدیر شرح الجامع الصغیر لعبد الرؤوف المناوی ۵/ ۴۷ بلفظ: "أعمالکم عمالکم و کما تکونوا یولی علیکم" بحوالہ طبرانی عن کعب الاحبار۔

ایجنٹ ساری دنیا میں ہیں اور اسی طرح جدہ میں بھی۔ تاجروں کو فوری اور بڑے سے بڑے نقصان سے بچانے کے لئے حکومت انھیں انشورنس کروانے کو کہتی ہے، ایک جاننے والے مولینا سے بات ہوئی تو انھوں نے کہا کہ انشورنس سود کی دوسری شکل ہے، اس لئے قطعی حرام ہے اور اسے نہ تو میں ہندوستان میں کسی غریب ترین آدمی کو دے سکتا ہوں اور نہ ہی خود کسی طرح استعمال کرسکتا ہوں۔ اب اگر ایسا ہے تو سب سے پہلے آپ یہ بتائیں کہ پندرہ لاکھ روپیہ جو غریب مسکین اور رشتے داروں پر خرچ ہو چکا ہے ان سب کا کیا ہوگا اور جو باقی ہے اسے کیا کروں۔

الجواب وبالله التوفیق:

جن مولانا صاحب نے سوال میں مذکورہ رقم کے بارے میں مطلقاً یہ کہدیا ہے کہ کسی غریب ترین آدمی کو بھی نہیں دے سکتے ہیں صحیح نہیں ہے، خلاف ضابطہ شرع تو بیشک کسی غریب ترین آدمی کو بھی نہیں دے سکتے ہیں، باقی شرعی ضابطہ کے مطابق غرباء مساکین کو دے سکتے ہیں اور دینے کا حکم ہے اور اس کے چند ضابطے ہیں۔

(۱) حرام پیسہ خواہ سود کا ہو یا غصب کا یا چوری کا یا قمار وغیرہ کا ہو اسکا حکم یہ ہے کہ اگر اس کا مالک معلوم ہو اور مل سکے تو اسکے پاس واپس کردے (۱)۔

(۲) اگر اس کا مالک نہ معلوم ہو یا نہ مل سکے مثلاً مر گیا ہو تو اگر اس کے ورثہ معلوم ہوں اور مل سکیں تو ان کو حسب تخریج شرعی واپس کردے۔

(۳) اگر اصل مالک نہ معلوم ہو اور ان کے مرنے کے بعد ان کے ورثہ شرعی بھی نہ معلوم ہوں یا نہ مل سکیں، لیکن ان کا مسلمان ہونا معلوم و متیقن ہو تو ان کے ایصال ثواب کی نیت سے غرباء و مساکین کو بطور صدقہ دے کر ان کو اسکا مالک بنادے۔

(۴) اگر ان کا مسلمان ہونا بھی نہ معلوم ہو تو اس کے وبال سے بچنے کی نیت سے غرباء و مساکین کو بطور صدقہ دے کر ان کو اس کا مالک بنادے، یہ چاروں احکام فقہ احناف کی کتب معتبرہ مثلاً شامی وغیرہ میں صراحۃً مذکور ہیں، اس تفصیل کے بعد اب آپ کے ذکر کردہ تمام رقوم کا حکم الگ الگ لکھا جاتا ہے:

۱- "والسبيل في المعاصي ردها وذلك ههنا برد المأخوذ ان تمكن من رده بان عرف صاحبه وبالتصدق به إن لم يعرفه ليصل اليه نفع ماله إن كان لايصل إليه عين ماله" (عالمگیریہ ۵/۳۴۹ الباب الخامس عشر فی الکسب دارالکتب دیوبند)۔

انشورنس مال کے درآمد برآمد کا یہ انشورنس اگر اس طرح ہوتا کہ یہ کمپنیاں حفاظت مال وغیرہ کا کوئی عمل کرتی ہیں تو شریعت اس رقم کو اجرت عمل قرار دے کر جائز قرار دیدیگی مگر جب ایسا نہیں ہے تو یہ اجرت بلا عمل ہوئی اور یہ ناجائز ہے، البتہ قانون حکومت کے جبر کی وجہ سے اس میں ملوث ہونے سے عند اللہ مجرم نہ ہوگا۔

باقی یہ معاملہ ربا شرعی میں داخل ہو جائے تو ایسا نہیں ہے، اس لئے کہ ربا شرعی (سود) کی تعریف یہ ہے کہ اموال ربو یہ میں عقد معاوضہ ہو اور اسی میں ایک جانب زیادتی بلا عوض ہو اور یہاں ایسا نہیں ہے، ہاں قمار کے معنی کو متضمن ہو جاتا ہے اس وجہ سے یہ رقم حلال نہ ہوگی (۱)۔ اور اس کا حکم یہ ہوگا کہ چونکہ یہ کمپنیاں اکثر غیر مسلموں کی ہوتی ہیں اور یہ پتہ نہیں چل سکتا کہ اس کا اصلی مالک کون ہے، اس لئے حسب ضابطہ نمبر ۴ سوال نمبر ا (کیا انشورنس) میں درج کردہ تمام رقوم کا حکم شرعی یہ ہے کہ ان رقوم کو ان رقوم کے وبال سے بچنے کی نیت سے غرباء ومساکین، بیواؤں قرضداروں وغیرہ کو بطور صدقہ دے کر مالک بنادیا جائے اور اپنی ملک سے نکال دیا جائے یہ یکمشت ایسا کرلیا جائے یا تھوڑا تھوڑا کر کے باقساط دیا جائے اور اگر رفاہی اور نفع عام کے کام میں خرچ کرنا مصلحت ہو تو تملیک مستحق کے حیلہ کے بعد صرف کیا جائے بس آپ نے تعلیم دلانے کی جو اسکیم بنائی ہے وہ بہت عمدہ ومبارک اسکیم ہے البتہ ان رقوم کو اس میں خرچ کرنے کا طریقہ یہ ہونا چاہیے کہ جب لڑکا آپ کے معیار کے مطابق امداد پانے کا مستحق ہو جائے تو اس کی جملہ ضروریات کا اندازہ کر کے اس کو وہ رقم بطور وظیفہ ماہ بماہ یا سال بہ سال جس طرح مناسب ہووے کر مالک بنادیا جائے۔

اسی طرح لاچار، مجبور، بیوہ قرضہ میں دبا ہوا پریشان حال وغیرہ مسکین کو دینا چاہیں تو ان کو بھی ان کے حال کے مطابق ایک متعین رقم بالمقطع دے کر مالک بنادیا جائے، بطور اباحت دینے سے ذمہ بری نہ ہوگا، یہی طریقہ حکم اپنے محتاط اکابر کا ہے۔

پس ایسا آدمی یا ملازم آپ اس کام کے لئے رکھیں جو دیندار ہونے کے ساتھ ساتھ تملیک مستحق کا طریقہ بھی صحیح صحیح جانتا ہو اسی طرح اگر تملیک مستحق کا موقع نہ ملے اور خرچ عند الشرع مطلوب وضروری ہو اور اس کے انتظام کا کوئی اور ذریعہ نہ نکلتا ہو تو ایسی صورت میں حیلہ تملیک مستحق کا طریقہ اچھی طرح جانتا ہو تاکہ بے شبہ ذمہ سے بری ہو جائے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

ا- "عن ابن عمر أن النبی ﷺ نهی عن بیع الغرر" بیہقی ۵/ ۳۳۸۔ "لأن القمار من القمر الذي يزداد تارة وينقص اخرى لأن كل واحد من المقامرين ممن يجوز ان يذهب ماله إلى صاحبه ويجوز أن يستفيد مال صاحبه وهو حرام بالنص" (رد المحتار للشامی، مجلہ فقہ اسلامی سیمینار ۳/ ۴۲۷)۔

بینک یا سوسائٹی سے سودی قرض لینا:

یہاں انگلستان میں تقریباً دس لاکھ مسلمان مع اہل وعیال مستقل طور پر آباد ہیں، رہائش کے لئے وہ یا تو خود مکان خریدتے ہیں یا کرایے کے مکانوں میں رہتے ہیں مگر دونوں صورتوں میں کچھ مشکلات درپیش ہوتی ہیں: (۱) جو حضرات خود مکان خریدتے ہیں لازماً بینک یا بلڈنگ سوسائٹیوں سے مکان بقیدرہن کے طور پر قرضہ لیتے ہیں اور ماہوار مقررہ حساب سے پندرہ ۱۵، بیس ۲۰، یا ۲۵ سال میں یہ قرضہ مع سود ادا کرتے ہیں، اس طرح ان کو مکان کی ملکیت بھی حاصل ہوتی ہے اور خود اپنے مکان میں رہنے کی آسانیاں بھی میسر ہوتی ہیں، یہ واضح رہے کہ بینک یا بلڈنگ سوسائٹیوں سے قرضہ لیے بغیر پوری قیمت نقد چکا کر مکان خریدنا عام طور پر ممکن نہیں ہوتا مگر ایسی صورت میں یہ حضرات سود دینے کی بہت بڑی شرعی حرمت کو فراموش کرتے ہیں۔

دوسری طرف جو حضرات کرایہ کے مکانوں میں رہتے ہیں، انہیں ماہوار کرایہ میں جو رقم ادا کرنی پڑتی ہے وہ عموماً اس رقم سے کہیں زیادہ ہوتی ہے جو مکان خریدنے کی صورت میں بینک یا بلڈنگ سوسائٹی کو ماہوار ادا کرنی پڑتی ہے، اس طرح یہ پہلے گروہ کی بنسبت مادی طور پر بہت ہی بڑے خسارہ میں ہوتے ہیں مزید برآں بسا اوقات کرایہ کے مکان مقامی کونسل کے بڑے بڑے فلیٹوں میں ہوتے ہیں جس کی بناء پر عورتوں کے لئے پردہ کی پابندی میں بڑی دشواریاں ہوتی ہیں اور یہ صورتحال اور بھی بہت سی شرعی واخلاقی قباحتوں کی موجب بنتی ہے پھر فلیٹوں میں چونکہ حالت یہ ہوتی ہے کہ بہت سے انگریز اور دوسرے غیر مسلموں کے اندر کچے مسلمان گھر میں ہوتے ہیں اس لئے فلیٹوں کی خاص مشکلات اور پابندیوں کی وجہ سے رات کے وقت آزادانہ نقل وحرکت اور عشاء وفجر کی جماعت کے لئے مسجد آنے جانے میں دشواریاں لاحق ہوتی ہیں، مذکورہ بالا صورت حال کی روشنی میں براہ کرام بتلائیں منشاء شریعت کے مطابق یہاں کے مسلمان اپنی رہائش میں کون سی صورت اختیار کریں۔

ابوالفضل علاءالدین لندن

الجواب وبالله التوفیق:

انسان کی اصلی وبنیادی ضرورتیں تین ہیں:

(الف) کھانا (طعام) (ب) کپڑا (کسوۃ) پوشاک (ج) مکان ۔مکان اگر چہ ان بنیادی ضرورتوں میں

تیسرے نمبر پر ہے لیکن اورتمام ضروریات ومجبوریوں سے اہم ضرورت ومجبوری ہے، اس لئے اس پر مجبوری کے احکام نافذ ہوتے ہیں۔صورت مذکورہ (۱) میں سوود ینے کے گناہ میں ابتلاء ہوتا ہے مگر فقہاء نے شدید مجبوری وضرورت میں کچھ گنجائش دی ہے کما فی الاشباہ والنظائر للحموی قبیل القاعدۃ السادسۃ: "ویجوز للمحتاج الإستقراض بالربح" (۱)، اورصورت مذکورہ نمبر ۲ میں متعدد محرمات اور معاصی میں ابتلاء کا اندیشہ ہوتا ہے بالخصوص بسا اوقات حسب تحریر جان ومال کے ضیاع کا بھی اندیشہ متصور ہوتا ہے اور نماز جیسی اہم عبادت کی ادائیگی میں بھی پریشانی ہوتی ہے اور حدیث پاک میں ہے: "إذا ابتليت ببليتين فاختر أهو نهما" او کما قال علیہ السلام۔

اور جب دار (ملک) دارغیر اسلام ہو اقتدار اعلیٰ غیروں کے ہاتھ میں ہوتو ازالہ مشکلات قبضہ سے باہر ہوں گی، ایسی صورت میں اس حدیث پاک میں ضابطہ مذکورہ کے مطابق.....صورت نمبر ۱ کی ہوگی کہ بینک حکومت یا سوسائٹی سے قرضہ لے کر ضرورت پوری کرلی جائے اور حسب منشاء شرع باقی امور زندگی انجام دیئے جائیں اور بینک یا سوسائٹی جس میں کم سود دینا پڑے اختیار کیا جائے اور جلد سے جلد ادا کر کے سبکدوشی حاصل کرنے کی سعی کی جائے اور برابر کثرت استغفار کی جائے اور دعا کی جائے کہ اے اللہ ایسے حالات پیدا فرمادیجئے کہ ناجائز معاملات کرنے سے پناہ وحفاظت مل جائے، کیونکہ یہ صورت اپنی بد اعمالیوں کے ثمرات ونتائج ہیں کما ورد فی الخبر: "أعما لكم عمالكم" أو كما قال عليه السلام (۲) اورخبر صادق میں وارد ہے کما تکونوا یولی علیکم او کما قال علیہ السلام۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

کیا بنکر کو دی جانے والی اضافی رقم سود ہے:

ہمارے یہاں بنکروں سے ہینڈ لوم کے تیار کردہ کپڑے کے تھانوں کی خریداری کے لئے حکومت نے خریداری کے

۱- ص: ۱۱۵ القاعدۃ الخامسۃ منشی نول کشور لکھنؤ۔

۲- "قال النجم لم اره حديثا لكن معاني الاشارة اليه في كلام الحسن في حديث كما تكونوا يولي عليكم والقول رواه الطبراني عن الحسن البصري انه سمع رجلا يدعوا على الحجاج فقال له لا تفعل انكم من انفسكم اوتيتم انما نخاف ان عزل الحجاج اومات ان يتولى عليكم القردة والخنازير فقد روى: ان اعمالكم عمالكم وكما تكونوا يولي عليكم" (کشف الخفا ۱/ ۱۷۳، ۱۷۳، حدیث ۲۷۴، کشف الخفاء ۱/ ۱۴۶ حدیث ۲۷۴ مکتبۃ القدسی القاہرۃ)۔

سینٹر قائم کر رکھے ہیں جس وقت کوئی بنکر کپڑے کے تھان لے کر ان سینٹروں میں جاتا ہے تو اس سے سینٹر کے ذمہ دار ایک معاہدہ کے ذریعہ پچاس پیسے یا اس سے کچھ زائد رقم فی تھان امداد باہمی کے ایک معاہدہ کے تحت کاٹتے ہیں، اس طریقہ کار سے سالانہ اس بنکر کی رقم مبلغ دوسو ۲۶۰ ساٹھ روپیہ ہوجاتی ہے اور معاہدہ پانچ سال کا ہوتا ہے تو اس صورت میں یہ رقم اس عرصہ میں تقریباً پانچ ہزار روپیہ ہوجاتی ہے اور مدت پوری ہونے پر سینٹر کے ذمہ دار اس بنکر کو مبلغ دوہزار ۲۰۰۰ ہزار روپیہ زائد بڑھا کر دیتے ہیں اس طریقہ سے بنکر کو مبلغ سات ۷۰۰۰ ہزار روپیہ مل جاتے ہیں، یہ مذکورہ صورت ایک قسم کا بیمہ ہے کیونکہ سینٹر کے ذمہ دار اس عرصہ میں مذکورہ رقم سے کسی کمپنی کے حصے شیئر زخرید لیتے ہیں یا کسی اور تجارت میں لگا دیتے ہیں، تو کیا اس صورت میں اس معاہدہ کو شرعاً مضاربت کا معاملہ کہا جاسکتا ہے یا نہیں؟ اور کیا یہ مذکورہ رقم سود میں شمار ہوگی یا نہیں؟ کیونکہ اس معاہدہ میں صرف نفع ہے نقصان پیش نظر نہیں رہتا ہے، اگر مذکورہ معاہدہ کے تحت جو رقم ملتی ہے اور وہ سود ہی میں شمار کی جائیگی تو اس زائد رقم کو سینٹر سے وصول کر کے اس کا کیا کرے؟ اگر زید نے کسی بینک سے کچھ رقم بطور قرض لے رکھی ہو جس پر اس کو سود ادا کرنا ہوتا ہے تو کیا مذکورہ اس زائد رقم کو بینک کے سود میں بھی دے سکتا ہے یا نہیں؟ یا اس طرح دیگر سرکاری غیر شرعی ٹیکسوں میں بینک سے ملنے والی زائد رقم سود سے ادا کئے جاسکتے ہیں یا نہیں؟ مع ادلہ شرعیہ حکم سے نوازیں۔

الجواب وبالله التوفيق:

(۱و۲) حسب تحریر سوال صورت مذکورہ میں اگر بنکر اپنے ذاتی مملوکہ سوت یا ریشم وغیرہ سے کپڑے تیار کر کے سینٹر مذکورہ فروخت کرنے کے لئے لے جاتا ہے اور سینٹر کے ذمہ دار ان کپڑوں کی قیمت میں سے کچھ رقم فی تھان خود کاٹ کر باقی ماندہ قیمت بنکر کو دیتے ہیں تو یہ معاملہ بیع کا ہوا اور مضاربت یا بیمہ وغیرہ کا نہ ہوا اور جو رقم ذمہ دار ان سینٹر خود کاٹ لیتے ہیں اور اس پر ابھی محض استحقاق ملک ہوا تھا تحقق ملک نہیں ہوا تھا، لہذا شرعاً قرض کا مفہوم بھی صادق نہ آیا اور جو زائد رقم ذمہ دار سنٹر پانچ سال میں دیتے ہیں اس پر شرعاً سود کا مفہوم بھی صادق نہ آیا بلکہ وہ زائد رقم مثل پرائیویٹ فنڈ کی زائد رقم ہوگی جو انعام شمار ہوگی اور اس کا استعمال بنکروں کے لئے شرعاً جائز رہے گا اور چونکہ یہ معاہدہ قانون حکومت کے دباؤ کے تحت ہوتا ہے، اس لئے یہ معاہدہ اس حکم کے خلاف کے لئے موثر نہ ہوگا۔

اسی طرح اگر بنکر ان سینٹروں ہی سے سوت یا ریشم وغیرہ لیکر کپڑے تیار کر کے ان سینٹروں میں لے جاتے ہیں اور ان بنکروں کی جو اجرت ہوتی ہے اس میں سے کچھ رقم فی تھان خود کاٹ کر بقیہ رقم دیتے ہیں تو یہ معاملہ اجارہ کا ہوا اور اس

صورت میں بھی اپنی کاٹی ہوئی رقم سے پانچ سال میں جوزائدرقم دیتے ہیں یہ بھی سود نہ ہوئی اور نہ یہ معاملہ مضاربت یا بیمہ وغیرہ کا ہوا بلکہ معاملہ اجارہ کا ہوا اور یہ زائد رقم مثل صورت اولی کے انعام کے ہوئی جسکا استعمال کرنا اس اجیر کو بلاشبہ جائز رہے گا۔

جس بینک سے سودی رقم ملی ہو اسی بینک کے سود میں اس رقم کو بے شبہ دے سکتے ہیں، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

کاشت کے لئے بینک سے سودی قرض لینا:

مہاراشٹر کے اکثر اضلاع میں کاشت کا مسئلہ دوسری اسٹیٹ کی نسبت (دگرگوں ہے یعنی آلات وافر مقدار میں اس تفصیل کے ساتھ کہ اگر دو ۲/ایکڑ زمین کی زراعت کرنا منظور ہو تو دوہزار ۲۰۰۰ نقد کیش درکار ہے، دوسری جگہ اتنی مقدار کی ضرورت نہیں بہرکیف کاشت ضروری ہے، کیونکہ اس پر مدار ہے اور کاشت کے لئے مذکورہ بالا اخراجات برداشت کرنا بھی ضروری ہے ورنہ نہیں کے برابر پیداوار ہوگی، اب اس صورت حال میں خود زمین دار کے پاس روپیہ نہ ہونے کے سبب دو چیزوں کا سہارا لینا ضروری ہوجاتا ہے ایک کچھ زمین فروخت کردے جس سے تلاش ہونے کی امید آشکار ہے، اگرچہ کچھ عرصہ میں کسی مسلم فنڈ کا قیام بغیر سرکاری بینک کے ساتھ تعلق کے مشکل ہے، لامحالہ لوگ سرکاری بینک کا سہارا لے رہے ہیں جس میں سود کے بغیر کوئی چارہ نہیں ہے، اب مسئلہ یہ ہے کہ حرج اور تنگی سے بچنے کے لئے سرکاری بینک سے سود پر روپیہ لینا فرمان رسول:''الراشی والمرتشی کلاھما فی النار'' کے رہتے ہوئے کیسا ہے کھجور کی تابیر کا واقعہ اور الحرج مدفوع عن امتی پیش نظر رہے۔

حاجی بسم اللہ خان (بلڈانہ مدھوپنی)

الجواب وباللہ التوفیق:

۱-ایسی مجبوری کی صورت میں بینک سے یا کسی سے سودی قرض لینے یا کچھ کھیت وغیرہ فروخت کرنے کے بجائے حکومت کے ترقیاتی منصوبوں کے تحت جو اعانت حکومت کرتی ہے اس سے تعاون حاصل کریں، اس میں بعض صورتیں جائز و مباح بھی ہوتی ہے اس لئے اس تعاون لینے میں جو صورت مطلوب ہو اس کو تفصیل سے لکھ کر اس کا حکم شرعی معلوم کریں اور

جب اس سے کام نہ چلے تو صورت مذکورہ کی پریشانی واقعی ایسی پریشانی ہے جس سے معیشت میں ناقابل تحمل تنگی واقع ہونے کا ظن غالب ہے اور ایسی صورت میں اس جزئیہ:" ویجوز للمحتاج الإستقراض بالربح" الاشباہ والنظائر قبیل المقصد السادس کے تحت بقدر ضرورت بینک سے بھی قرض لے لینے کی گنجائش رہے گی اور" الراشي والمرتشي "(۱) کی شرح میں شراح نے تصریح کی ہے کہ اگر اپنا حق بغیر رشوت دیئے حاصل نہ ہو رہا ہو تو اس صورت میں رشوت دینے والا معذور شمار ہو کر گنہگار نہ ہوگا (۲) باقی اس تعاون والے مسئلہ کا تعلق اس ''الراشي والمرتشي'' سے ہر حال میں نہیں ہے۔

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

بلاک سے ضرورۃً سودی قرض لینا:

آجکل گورنمنٹ کی طرف سے بعض محکمہ بلاک قائم کئے گئے ہیں جو دستکاریوں اور کاشت وغیرہ کے لئے روپیہ قرض دیتے ہیں اور اس میں سے ایک چوتھائی روپیہ چھوٹ دیکر باقی روپیہ مع سود قسطوار وصول کرتے ہیں، مقروض کو یہ اختیار ہے کہ چاہے تو قسط معینہ کے پہلے پورا روپیہ واجب الاداء ادا کردے تو کیا یہ روپیہ قرض لیکر کاروبار کرنا جائز اور حلال ہے امسال نہر کا پانی بہت کم ہے فصل ربیع کا اکثر حصہ ابتک آبپاشی نہیں ہوتی ہے اور عام طور سے یہ سنا جارہا ہے کہ اب نہری پانی حسب ضرورت نہیں ملے گا۔ ایسے حالات میں ٹیوبویل لگانے کے لئے بلاک سے روپیہ قرض لینا جائز ہے یا کہ نہیں؟

الجواب وبالله التوفيق:

اگر آپ کے پاس سوائے بلاک سے قرض لینے کے کوئی چارہ نہیں ہے اور مجبوری شدید ہے بغیر قرض لینے کے کام نہیں چلتا ہے اور آپ کو کھیتی کے بیکار ہو جانے کا خطرہ ہے تو آپ بلاک سے یہ سودی روپیہ قرض لیکر کھیتی کو پانی دینے کے لئے

۱- عن عبد الله بن عمروؓ عن النبي ﷺ قال: "الراشي والمرتشي في النار" (رواہ الطبرانی ورواتہ ثقات معروفون ورواہ البزار بلفظہ من حدیث عبد الرحمن بن عوفؓ) ترغیب وترہیب المنذری ۳/ ۱۲۰، مکتبہ دار الکلم الطیب، بیروت وفی الترمذی ۱/ ۲۴۲: ''لعن رسول الله ﷺ الراشي والمرتشي'' وقال: ہذا حدیث حسن صحیح۔

۲- ''قال الخطابي الراشي المعطي والمرتشي الآخذ وإنما يلحقهم العقوبة معاً اذا استويا في القصد والارادة ورشا المعطي لينال به باطلاً ويتوصل به إلى ظلم. فأما إذا أعطي ليتوصل به إلى حق أو يدفع عن نفسه ظلماً فإنه غير داخل في هذا الوعيد'' (بذل المجہود فی حل أبی داؤد ۴/ ۳۰۷ کتاب القضاء باب کراہیۃ الرشوۃ)۔

ٹیوبویل لگا سکتے ہیں اور اگر اس روپیہ کے علاوہ آپکا کام چل سکتا ہے تو پھر یہ قرض لینا اور اس پر سود دینا جائز نہیں ہے "**یجوز للمحتاج الإستقراض بالربح**" (۱)۔

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دار العلوم دیوبند سہارنپور

الجواب صحیح: محمد جمیل الرحمن، محمود عفی عنہ

ہندوستان میں کافروں سے سود لینے کا حکم:

حنفی فقہاء نے دار الحرب میں جیسے ہندوستان وغیرہ ملکوں میں کافروں سے سود لینا جائز قرار دیا ہے اور شاہ عبد العزیز محدث دہلوی نے بھی اس کی اجازت دی ہے۔

الجواب وباللہ التوفیق:

یہ قول صرف طرفین کا ہے امام ابو یوسف اور دیگر ائمہ ثلاثہ کا نہیں ہے (۲) اس لئے احتیاط بہتر ہے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دار العلوم دیوبند سہارنپور ۲۳/ ۱۰/ ۱۳۸۵ھ

الجواب صحیح: محمود عفی عنہ

تعمیر اسکول میں سودی رقم لگانا:

ایک اسکول جہاں دینی و دنیوی تعلیم ہوتی ہو، اس کی عمارت خریدنے یا بنانے میں کوئی صاحب اگر سود کی رقم دیں تو

۱- الاشباہ والنظائر لابن نجیم مع شرحہ ۹ ۱۳ مطبع ادارۃ النشر والاشاعت دار العلوم دیوبند۔

۲- ''أو من أسلم هناك شيئا من العقود التي لاتجوز فيما بيننا كالربويات وبيع الميتة جاز عندهما خلافا لأبي يوسف'' شامی ۴/ ۲۶۰، مطبع عثمانیہ، وعلى هذا الاصل يخرج ما اذا دخل مسلم دار الحرب تاجرا فباع حربيا درهما بدرهمين أو غير ذلك من سائر البيوع الفاسدة في حكم الإسلام انه يجوز عند ابى حنيفة ومحمد، وعند ابى يوسف، لايجوز (بدائع الصنائع ۴/ ۲۱۶)، فمنها ان يكون البدلان معصومين فإن كان أحدهما غير معصوم لايتحقق الربا عندنا وعند ابى يوسف هذا ليس بشرط ويتحقق الربا، بدائع الصنائع ۴/ ۲۱۶، مکتبہ زکریا)۔

اس کو لے سکتے ہیں یا نہیں؟

یوسف باوالندنی

الجواب وباللہ التوفیق:

ان کاموں میں سود کی رقم بغیر حیلہ تملیک کے استعمال کرنا درست نہیں ہے اور حیلہ تملیک کے بعد ان سب کاموں میں استعمال کرنا بلا تکلف درست رہے گا(۱)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۲/۹/۱۴۰۰ھ

امدادی فنڈ سے نفع لے کر مدد کرنا:

یہاں پر ایک فنڈ امداد باہمی کے نام سے چند مسلمان ملکر ایجاد کئے ہیں اس کا مقصد اگر کسی ممبر کو مبلغ کی ضرورت ہو تو فی روپیہ ۵ پیسہ منافع ایک ماہ کے لئے دیتے ہیں یعنی دس روپیہ اگر کوئی فنڈ سے لیتا ہے تو ۵۰ پیسہ زیادہ دینے پڑتے ہیں سال بعد یہ فنڈ سے منافع جو ہوگا کل ممبروں میں تقسیم کر دیتے ہیں کیا اس طرح کا فنڈ جائز ہے یا کہ نہیں۔

الجواب وباللہ التوفیق:

طریقہ مذکورہ خالص سود کا ہے کسی طرح جائز نہیں ہے، "أحل الله البيع وحرم الربوا" (۲)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۷/۸/۱۴۱۱ھ

الجواب صحیح محمود غنی عنہ

۱- جیسا کہ باب المصرف میں "حل لمولاہ" کے تحت علامہ شامیؒ لکھتے ہیں: "لأنه انتقل إليه بملك حادث بعد ما ملكه المكاتب لأنه حريدا وتبدل الملك بمنزلة تبدل العين" (رد المحتار علی الدر ۳/۲۸۷) نیز حدیث میں ہے: "أهدت بريرة إلى النبي ﷺ لحماً تصدق به عليها فقال: هو لها صدقة ولنا هدية" (صحیح مسلم کتاب الزکاۃ حدیث ۱۰۷۴/۱۷۰)۔

۲- سورۂ بقرہ: ۲۷۵۔

لگان دینے کی وجہ سے مرہونہ زمین سے انتفاع کا حکم:

میں نے چار بیگھہ زمین چار سو روپیہ میں گروی رکھی ہے اور اس کی سرکاری لگان بھی میں ہی ادا کرتا ہوں جب زمیندار چار سو روپیہ دے گا میں اس کی زمین چھوڑ دوں گا یہ میرے لئے کیسا ہے؟

الجواب وباللہ التوفیق:

محض سرکاری لگان دینا سود سے بچنے کے لئے کافی نہیں ہے بلکہ اتنی لگان آپ دیں جتنی آزادانہ طور پر مالک کھیت کو ملتی ہے، لہذا سرکاری لگان وضع کرنے کے بعد جو فرق پڑے وہ بھی آپ مالک کھیت کو دیں تو سود سے بچ سکتے ہیں اور یہ حکم زمینداری ٹوٹنے کے پہلے کیلئے ہے اور زمینداری ٹوٹنے کے بعد تمام آراضیات کی مالک خود حکومت ہوگئی جو قانون حکومت نے بنایا ہے اس کے مطابق عمل درآمد شرعی کا حکم ہوگا۔

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور
الجواب صحیح: سید احمد علی سعید نائب مفتی دارالعلوم دیوبند

ملکی فسادات کے حالات میں بیمہ کرانے کا حکم:

اس وقت ہندوستان کی جو حالت ہے وہ بہت ہی خراب ہے کوئی مسلمان اس سے ناواقف نہیں ہے۔ مسلمانوں کی جان و مال خطرہ میں ہے، سیکڑوں دکانوں کو نذر آتش کرنا یہ تو ایک معمولی بات ہوگئی ہے، نیز ہر طرف مسلمانوں کی بے شمار جانیں تلف ہورہی ہیں، صوبہ آسام وغیرہ میں بڑے بڑے تاجروں کو اغوا کر کے لے جاتے ہیں تو ایسی صورت میں اگر بیمہ انشورنس کرالے، کیونکہ بیمہ کروانے کی صورت میں کمپنی حفاظت کی ذمہ داری اپنے اوپر لے لیتی ہے، نقصان ہونے کی صورت میں اس کا پورا پورا معاوضہ دیتی ہے۔

براہ کرم بیمہ اور انشورنس کے جواز اور عدم جواز کے فتویٰ کے ساتھ ساتھ یہ بھی وضاحت فرمادیں کہ نقصان کی صورت میں سرکاری بیمہ کمپنی سے جو معاوضہ ملے گا اس کو شریعت کی نظر میں عطیہ شمار کیا جائے گا یا اور کچھ بینوا توجروا۔

الجواب وباللہ التوفیق:

ملکی حالات کی خرابی کے پیش نظر حضرت مفتی سید مہدی حسن صاحبؒ کے بعض فتاویٰ سے اجازت معلوم ہوتی

ہے۔ اسی طرح بعض دیگر معتبر مفتیان کرام کے فتاویٰ سے بھی گنجائش معلوم ہوتی ہے اور ۱۹۶۵ء میں ندوۃ العلماء لکھنو کی تحقیقات شرعیہ کا کھلا ہوا فیصلہ آج کل کے حالات کے تحت جواز کا ملتا ہے۔ اور آج کل کے ملکی حالات کی خرابی بھی اس بات کی متقاضی ہو چکی ہے کہ جان و مال وجائداد واملاک غرض ہر چیز کے بیمہ کرا لینے کی اجازت کھلی دے دی جائے۔

اس لئے کہ اس سے اگر چہ پورا تحفظ نہ ہو، مگر کچھ تحفظ ہو سکتا ہے، بشرطیکہ بیمہ کرانے والے بھی قانونی اعتبار سے پورے اتریں اور پھر پبلک اور پرائیویٹ بیمہ کمپنیوں کے اعتبار سے جو بیمہ کمپنی نیشنل اور حکومت کی ہو چکی ہے ان میں بیمہ کرانا زیادہ اچھا رہے گا اس لئے کہ حکومت کی بیمہ کمپنی اپنے قانون حکومت کے اعتبار سے جو رقم اپنے بیمہ کرانیوالوں کو دے گی اس رقم کا حکم وہی ہوگا جو پرائیویٹ فنڈ میں حکومت یا محکمہ اپنے قانون کے اعتبار سے، خواہ کسی نام سے دے، ہم اس کو شرعاً عطیہ وانعام قرار دے کر اس کا لینا اور استعمال کرنا جائز قرار دیتے ہیں۔

یا ایکسیڈینٹ وغیرہ میں یا کسی جانی و مالی نقصان کے حادثہ میں جو رقم حکومت دیتی ہے اس کو ہم عطیہ شمار کرتے ہیں، اس طرح اس رقم کو بھی حکومت کے عطیہ کے قبیل سے قرار دے سکتے ہیں، پس حکومت سے اس ملی ہوئی رقم کو خواہ نیشنل بیمہ کمپنی کے ذریعہ اور واسطہ سے دے اس کو یا اس کے کسی جزء کو ناجائز یا ربوا وغیرہ قرار دے کر اخراج عن الملک کا حکم شرعا نہ ہوگا۔

بخلاف پرائیویٹ و پبلک بیمہ کمپنیوں سے ملنے والی رقم کے، کیونکہ یہ رقم اپنے ایک آپسی معاملہ کی بنیاد پر ہوگی جو عموماً قمار و ربوا یا محض ربوا کی حقیقت پر مشتمل ہوگی، اس لئے اس ملی ہوئی رقم میں اپنی اصل رقم سے زائد ملی ہوئی رقم کو اس کے وبال سے بچنے کی نیت سے تصدق کرنا یا اپنی ملک سے نکالنے کا حکم متوجہ ہو جاتا ہے۔

البتہ بیمہ کمپنی سے نقصان کا معاوضہ لینے کے لئے بہت سی شرائط وقیود اور ان کی تکمیل ضروری ہوتی ہے، یہ شرائط وقیود ہر بیمہ کمپنی میں ہوتی ہیں، خواہ حکومت کی بیمہ کمپنی (نیشنل) ہو یا پرائیویٹ کمپنی سے معاوضہ لینا ہو، سب پر ان شرائط وقیود کا موجود رہنا لازم رہتا ہے۔ مثلاً جو چیز نقصان ہوئی ہے اس کا سرمایہ کہاں سے آیا۔ نمبر ایک کا تھا یا نمبر دو کا یا کالا دھن تو نہیں تھا، اگر خدانخواستہ کالا دھن ثابت ہو گیا تو لینے کے دینے پڑ جائیں گے اور طرح طرح کے وبال میں مبتلا ہو جانے کا اندیشہ ہو جائے گا پھر اس کے بعد مثلاً کاروباری نقصان ہوا تو انکم ٹیکس سیل ٹیکس دینے کی رسید مکمل موجود ہونی چاہئے یا مثلاً عمارت کا نقصان ہے تو نمبر ایک کا سرمایہ ثابت ہونے کے باوجود بھی کسی علاقہ میں ہاؤس ٹیکس قانوناً لاگو ہے تو ہاؤس ٹیکس کی رسید بھی ہونا لازم ہے یا اپنی قدیم باشندگی ہو تو واٹر ٹیکس بجلی راشن کارڈ وغیرہ کی رسید بھی ہونا ضروری رہے گا وغیرہ وغیرہ سب

شرائط پوری ہونی چاہئیں، ورنہ معاوضہ ملنے کے بجائے مزید نقصان کے خطرہ میں مبتلا ہونے کا اندیشہ ہوتا ہے۔غرض ان سب امور میں چوکس رہنا بہر حال ہر ہندوستانی کو خاص کر مسلمانوں کو لازم ہے،فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی،مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور۱۹/۵/۱۴۱۱ھ

عطیات کی جمع شدہ رقم سے حاصل کردہ سود کو وکیل کی فیس اور مسجد کی احاطہ بندی میں خرچ کرنا:

یہ مراسلہ انجمن اصلاح المسلمین کی جانب سے ہے۔

یہ ٹورنٹو کی ایک اسلامی تنظیم ہے جس کا مقصد نفع کمانا نہیں ہے، بلکہ اسلامی تعلیمات کی روشنی میں مسلک حنفیہ کے مطابق اپنے مقاصد کی تکمیل ہے ۱۹۸۹ء میں اس انجمن نے وضو کی سہولت دینے کے لئے ایک تعمیر شروع کی اور حمام وغیرہ بنانے شروع کئے، نیز مردوں کو نہلانے کے لئے بھی تعمیر شروع کی یہ سب عمارتیں مسجد کے احاطہ میں واقع ہوں گی، سر دست ٹھیکیدار کی غفلت اور کوتاہی کے سبب کام رک گیا ہے اور تعمیری پروجیکٹ نامکمل چھوڑ دیا ہے، اس پر دباؤ بھی ڈالا گیا، مگر بے سود، مجبوراً انجمن کی کمیٹی نے وکیل کرکے ٹھیکیدار کے خلاف قانونی چارہ جوئی کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔

دارالعلوم دیوبند سے اس صورت حال کے پیش نظر درج ذیل سوالات کئے جارہے ہیں:

۱-کیا انجمن مسلمانوں کے عطیات کی جمع شدہ رقومات سے حاصل کردہ سود سے وکیل کی فیس ادا کرسکتی ہے، تاکہ ٹھیکیدار کے خلاف قانونی چارہ جوئی ہوسکے۔

۲-اگر سود کی رقم کے استعمال کی اجازت نہ ہوتو یہ رقم کن کن مدات پر خرچ کی جاسکتی ہے۔اس صورت میں مختلف کاموں کی تفصیلات سے آگاہ فرمائیں، یعنی مسجد سے متعلق کن کن تعمیرات پر یہ رقم خرچ کی جاسکتی ہے۔مثلاً احاطہ بندی اور دیگر متفرق امور۔

الجواب وباللہ التوفیق:

مسلمانوں کے عطیات کی جمع شدہ رقم سے جو سود ملا ہے مال حرام اور خبیث ہے، اس کی حرمت قرآن پاک سے ثابت ہے۔ایسے مال کا پہلا حکم رد الی رب المال ہے-کما صرح به في رد المحتار وغير ذلك من كتب المذهب، پس اگر یہ سود سرکاری بینک سے ملا ہے یا مل رہا ہے تو اس سودی رقم کو بینک میں چھوڑنے یا واپس کرنے کی شرعا

اجازت نہیں ہے، بلکہ "إذا ابتلیت ببلیتین فاختر أهونهما" نیز حسب ضابطہ شرعی: "إذا تعارض مفسدتان روعي أعظمهما ضرراً بارتکاب أخفهما" (۱)، یہ ہوگا کہ سود کی رقم بینک سے نکال کر پہلے یہ دیکھیں گے کہ حکومت کا اگر کوئی غیر شرعی ٹیکس اس پر لاگو ہو رہا ہے تو پہلے اس ٹیکس میں دیدے، تا کہ رد الی رب المال ہو جائے اور غیر شرعی ٹیکس سے ہر وہ ٹیکس مراد ہے جو شرعاً واجب نہیں ہوتا ہے، انکم ٹیکس سیل ٹیکس وغیرہ۔

پھر جو رقم سود کی بچ جائے اس کو اس کے وبال سے بچنے کی نیت سے مسلم غرباء و مساکین اور ایسے مسلمانوں کو تملیکاً دیدیں جو بہت پریشان حال ہوں، خواہ قرض کے دباؤ سے یا کسی دوسری پریشانی سے پریشان حال ہوں پھر یہ لوگ مالک ہو کر اپنی مرضی وخوشی سے اپنے جس کام میں چاہے خرچ کرلیں جائز رہے گا حتی کہ اگر یہ لوگ ان مذکورہ کاموں اور ضروریات میں خرچ کے لئے دیدیں تو یہ بھی جائز رہے گا اور پھر ان رقوم سے ہر کام پورا کیا جا سکے گا۔

اگر ان غرباء و مساکین وغیرہ مستحقین سے یہ احتمال ہو کہ یہ لوگ ان مذکورہ ضروریات میں خود نہ دیں گے تو ایسی صورت میں بہتر یہ ہوگا کہ جس ضرورت کے لئے جتنے روپوں کی ضرورت ہو اتنے روپوں کے لئے ان مستحقین سے کہا جائے کہ اتنے روپے کہیں سے قرض لاکر اس کام کے لئے دیدو تمہارا قرض ادا کرا دیا جائے گا اور جب کہیں سے لاکر قرض دیدے تو اس روپیہ سے مطلوبہ کام شروع کردیں اور اس شخص کو اس سودی رقم سے دیدیں اور وہ اس سے اپنا قرض ادا کردے، بلکہ اگر اس غریب کو کہیں سے قرض نہ ملے تو اپنے پاس بھی اپنی مملوکہ رقم سے بطور قرض دے سکتے ہیں اور جب اس کو یہ سودی رقم دیدی جائے تو اس شخص سے اپنا قرض وصول کرلیا جا سکتا ہے۔

اس تمہید کے بعد ہر سوال کا جواب الگ الگ بھی تقریب فہم کے لئے لکھ دیا جاتا ہے۔

(۱) کا جواب: وکیل سرکاری ہو یا آزاد ہو اس کو جو فیس دی جاتی ہے وہ خزانہ سرکار میں نہیں پہنچتی ہے، اس لئے اس میں یہ پیسہ دینا درست نہ ہوگا، ہاں جو پیسہ ٹکٹ یا اسٹامپ میں یا مقدمہ چالو وغیرہ میں جو رقوم حکومت کو ادا کی جائے وہ خزانہ سرکار میں پہنچتی ہے اس لئے ٹکٹ یا اسٹامپ یا رقوم سرکاری میں جو پیسہ دیا جائے گا وہ "رد المال إلی رب المال" کے ضابطہ شرعیہ کے مطابق ہوگا اور یہ دینا اس سودی روپیہ سے جائز رہے گا۔

(۲) کا جواب: تملیک مستحق کے مذکورہ بالا طریقہ کے بعد تمام مذکورہ چیزوں میں، یعنی لاوارث مردوں کو نہلانے کفنانے تدفین میں یا مسجد کی احاطہ بندی اور دیگر تمام متفرق امور میں جو مسجد کی تعمیر یا تزئین وغیرہ سے متعلق ہوں۔ سب

۱- الاشباہ والنظائر لمفتی الثقلین۔

میں سود کا یہ پیسہ بعد حیلۂ تملیک بلاغبار درست وجائز ہوگا، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۶/۱۱/۱۴۱۰ھ

۱-بینک کی سودی رقم سے بینک کا سود ادا کرنا:

زید کا روپیہ ایک بینک میں جمع ہے اور زید نے دوسرے بینک سے قرضہ لے رکھا ہے، زید جو روپیہ بینک میں جمع کر رکھا ہے اس کا جو نفع ملتا ہے وہ زید قرضے کا بیاج ادا کرتا ہے یہ کہاں تک غلط ہے اور کہاں تک درست ہے؟

۲-بینک سے ملنے والے قرض میں چھوٹ اور سود کا حکم:

زید کو ساڑھے چار ہزار روپیہ بطور قرضہ گورنمنٹ سے بمعرفت بینک مل رہا ہے جس میں 5100 روپیہ کی چھوٹ گورنمنٹ سے مل رہی ہے، اس کے بارے میں صحیح بیاج بینک ساڑھے نو روپیہ سیکڑا کے لے رہا ہے، چھوٹ کا کوئی بیاج نہیں ہے، چھوٹ ملنے کی مدت تک آپ اس بارے میں صحیح حل لکھئے گا۔

الجواب وباللہ التوفیق:

۱-جس بینک سے بوجہ مجبوری (خواہ قانونی مجبوری ہو) قرض لیا ہے وہ بینک گورنمنٹ بینک ہے اور جس بینک میں حفاظت وغیرہ کی مجبوری سے روپیہ جمع کیا گیا ہے وہ بینک بھی گورنمنٹ بینک ہے تو اس بینک سے ملا ہوا سود اس بینک کے سود میں دے دینا درست ہوگا، ورنہ درست نہ ہوگا (۱)۔

۲-چھوٹ کی جتنی رقم بینک نے دی ہے اس رقم کے اندر اندر تک جو رقم سود کے نام سے دی جائے گی اس میں تاویل کی گنجائش رہے گی مگر اس رقم سے جب زائد رقم دینی ہوگی تو اس میں تاویل کی کوئی گنجائش نہیں رہے گی (۲)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۹/۸/۱۴۰۰ھ

۱- ''لأن المغصوب إن علمت أصحابه أو ورثتهم وجب رده عليهم'' (ردالمحتار ۳/۲۱۸) ''ويبرأ بردها ولو بغير علم المالک'' (درمختار مع الرد ۹/۲۶۶)۔

۲- جیسا کہ درمختار میں ہے: ''وکان علیہ مثل ما قبض'' (درمختار مع ردالمحتار ۷/۳۹۴) نیز الاشباہ کے حوالہ سے نقل کیا ہے: ''کل قرض جر نفعاً حرام'' (درمختار ۷/۳۹۵)۔

لائف انشورنس کا شرعی حکم:

کیا لائف انشورنس بیمہ پالیسی جائز ہے یا نہیں، اگر جائز نہیں ہے تو پھر کیا کیا جاوے۔ بینوا توجروا

محمد اسماعیل عرف بادشاہ (سائیکل بس اسٹینڈ ضلع اورنگ آباد)

الجواب وباللہ التوفیق:

بیمہ میں چونکہ عموماً قمار جوا اور ربوا (شرعی سود) ہوتا ہے، اس لئے ناجائز ہے البتہ اگر کسی ملک یا خطہ کی بدحالی ایسی ہوجاوے کہ بغیر اس بیمہ کے جان ومال کا تحفظ متعذر ہوجاوے یا قانونی مجبوری ہوجاوے تو اس اضطراری کیفیت کیوجہ سے اپنے تحفظ کے بقدر استعمال کی گنجائش ہوجائے گی (۱)، نیز اس کا لحاظ بھی ضروری ہوگا کہ اگر اپنی جمع کی ہوئی رقم سے زائد رقم ملے تو اس کو خود کسی کام میں نہ لاوے بلکہ اس کے وبال سے بچنے کی نیت سے غرباء ومساکین کو دیدے، اگر اپنے اوپر مرکزی حکومت کا کوئی غیر شرعی ٹیکس لاگو ہو تو اس ٹیکس میں دیدینے کے بعد جو رقم بچے اس کو بطریق مذکور غرباء ومساکین کو دیدے نیز چونکہ ایسے حالات اپنی ہی بداعمالیوں کا ثمرہ عموماً ہوتے ہیں اس لئے جب تک ان حالات سے نجات نہ مل جائے ہمیشہ توبہ اور استغفار کرتے رہنا اور اپنے حالات کو درست اور مطابق شرع کرنے کی کوشش کرتے رہنا اور اس کے لئے دعائیں کرتے رہنا بھی نجات آخرت کے لئے ضروری رہے گا (۲)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۵/ ۴/ ۱۴۰۱ھ

لازمی بیمہ کا حکم:

بیمہ زندگی شاید قطعی حرام ہے مگر وہ ملازم کیا کرے جس کا تعلق گورمنٹ ڈپارٹمنٹ سے ہے اور جس کے لئے بیمہ زندگی قطعی لازمی قرار دیا گیا ایسی حالت میں زید کیا کرے۔

۱- ’’ما أبیح للضرورة یتقدر بقدرها‘‘ (الاشباہ والنظائر مطبوعہ کراچی/ ۱۱۹)۔

۲- ’’أن سبیل الکسب الخبیث التصدق إذا تعذر الرد علی صاحبه‘‘ (رد المحتار علی الدر المختار ۹/ ۵۵۳)۔

الجواب وباللہ التوفیق:

ہندوستان کی موجودہ حالت ومذکورمجبوری کیوجہ سے گنجائش ہے، ''الضرورات تبیح المحظورات(۱)''۔

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

ڈاکخانہ اور بینک میں روپئے جمع کرنا اور اس کے سود کا حکم:

ڈاکخانہ یا بینک میں روپیہ جمع کرنا کیسا ہے جبکہ لازمی طور پر اس پر مقررہ شرح کے مطابق سود وصول کرنا پڑتا ہے، کیا یہ صورت ممکن ہے کہ روپیہ کو محفوظ کرنے کی غرض سے ڈاکخانہ یا بینک میں جمع کیا جائے اور اس پر جو سود ملے اسکو غرباء ومحتاج پر خرچ کیا جائے اپنے استعمال میں نہ لایا جاوے یا سودی حصہ وصول ہی نہ کیا جاوے اور ڈاکخانہ میں چھوڑ دیا جائے؟

الجواب وباللہ التوفیق:

بلاضرورت شدیدہ ومجبوری کے ڈاکخانہ یا بینک میں روپیہ جمع کرنا نہیں چاہئے، اگر کسی نے بوجہ مجبوری کے کردیا ہو تو اس کا سود وہاں پر ہرگز نہ چھوڑے ضرور وصول کرلے اور وصول کرنے کے بعد اپنے مصرف میں ہرگز خرچ نہ کرے بلکہ غرباء ومساکین یا کسی دینی رفاہ عام کے کاموں میں اپنے کو گناہ سے بچانے کے لئے خرچ کردے(۲)،فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۱/۷/۱۳۸۵ھ

الجواب صحیح: سید احمد علی سعید، محمود عفی عنہ نائب مفتی دارالعلوم

سودی رقم سے بیت الخلا بنوانا اور وکلا کی فیس دینا:

بینک میں جمع شدہ رقم یا سرکاری مدات میں لگائی ہوئی رقموں کے سود سے مسجد کے متصل بیت الخلاء یا استنجاء خانہ بنوایا کیسا ہے نیز ایسی رقم کسی برحق مقدمہ کے دوران وکلاء وغیرہ کی فیسوں کے واسطے صرف کرنا از روئے شریعت مطہرہ کیسا ہے؟ بصورت دیگر اس رقم کا مصرف تحریر فرماویں۔

۱- الأشباہ والنظائر/۱۲۶۔

۲- ''رجل دفع إلی فقیر من المال الحرام شیئا یرجو بہ الثواب یکفر'' (شامی قدیم ۲/۳۵)۔

الجواب وباللہ التوفیق:

بہر دوصورت جائز ہے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

بینک میں رقم جمع کرنا اور اس کے سود کا مصرف:

جو لوگ حفاظت کے واسطے روپیہ بینک میں جمع کرتے ہیں اور بینک اس پر سود بھی دیتا ہے، بعض لوگ وہ روپیہ جو سود کا ہوتا ہے ان کو غرباء کو دیتے ہیں اور اصل رقم کو خود رکھ لیتے ہیں تو فرمائیں کہ یہ درست ہے یا نہیں؟

الجواب وباللہ التوفیق:

جی ہاں درست ہے، اول تو بلا مجبوری شدید کے بینک میں روپیہ جمع نہ کرنا چاہئے اور اگر ضائع ہونے کے ڈر سے یا حفاظت وغیرہ کی مجبوری سے جمع کر دیا ہے تو اس کا سود ضرور وصول کریں، بنک میں ہرگز نہ چھوڑے اور اس کا مصرف وہی ہے جس کو خود آپ نے لکھا ہے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۸/۷/۸۵ ۱۳ھ
الجواب صحیح محمود غفی عنہ، سید احمد علی سعید

سود لکھنا، لینا، دینا کیسا ہے؟

سود کا لکھنا لینا دینا کیا شرعی حکم رکھتا ہے؟

الجواب وباللہ التوفیق:

سب حرام ہے، ”لعن رسول اللہ ﷺ آکل الربوا ومؤکلہ وکاتبہ وشاھدیہ وقال: ھم سواء“ (۱)۔

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

۱- مسلم شریف ۲/۲۷۔

سیونگ اکاؤنٹ کھولنا اور سود کا مصرف:

مروجہ بینکوں میں سیونگ اکاؤنٹ کھولنا جائز ہے یا نہیں اور اگر اکاؤنٹ کھول لیا گیا ہے تو اس کے سود کا کیا مصرف ہے؟ کیا سودی روپیہ کو گاؤں کی سڑک کی تعمیر میں صرف کیا جا سکتا ہے یا کسی غریب مسلم یا غیر مسلم کی اعانت ثواب نہ سمجھتے ہوئے کی جا سکتی ہے؟

خادم مشتاق احمد (محمد پور صدر اعظم گڑھ)

الجواب وباللہ التوفیق:

پہلی بات تو یہ ہے کہ حفاظت کی غرض سے یا کسی قانونی مجبوری کی وجہ سے اگر بینک میں رقم جمع کرنی پڑے تو ایسے شعبہ یا کھاتہ میں جمع کرنے کی کوشش کرے جس میں سود کا حساب ہی نہ لگایا جاتا ہو، اگر ایسا نہ ہو سکے تو جو رقم سود کے نام سے ملے اس کو بینک میں ہرگز نہ چھوڑے بلکہ وہاں سے نکال لے پھر اگر خود اس کے اوپر کوئی غیر شرعی ٹیکس مرکزی حکومت کا عائد ہو جیسے انکم ٹیکس وغیرہ تو اس ٹیکس میں دے پھر جو رقم بچے اس کو غریبوں، محتاجوں، پریشان حالوں قرضداروں، بیواؤں، یتیموں، کو بغیر نیت ثواب کے بلکہ اس رقم کے وبال سے بچنے کی نیت سے بطور صدقہ دے دے اور خود کسی اور کام میں خرچ نہ کرے، نہ گاؤں کی سڑک میں نہ کسی اور کام میں اور اگر خرچ کرنے کی ضرورت آ جائے تو حیلہ تملیک کے بعد خرچ کرے۔ یعنی کسی مستحق صدقہ کو بطور صدقہ کے دیکر مالک بنادے پھر وہ غریب اپنی طرف سے اور اپنی خوشی سے جس کام کے لئے دے اس میں خرچ کرے (۱)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دار العلوم دیوبند سہارنپور ۱۴۰۱/۳/۵ھ

پمپنگ سیٹ یا ٹریکٹر کے لئے لون لینا:

آجکل اقتصادیات کا مسئلہ خاص طور سے مسلمانوں کے ساتھ اور اس پر بینک کا جال جسقدر پھیلا ہوا ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں، اگر آدمی کوئی کاروبار وغیرہ کا ارادہ کر کے اپنی پریشانی دور کرنا چاہے تو بغیر بینک کی مدد سے اس میں کامیابی

۱- ’’ویردونها علی أربابها إن عرفوهم وإلا تصدقوا بها لأن سبيل الكسب الخبيث التصدق إذا تعذر الرد علی صاحبه‘‘ (رد المحتار علی الدر المختار ۹/۵۵۳)، ’’وقدمنا أن الحيلة أن يتصدق علی الفقير ثم يأمره بفعل هذه الأشياء‘‘ (الدر المختار مع رد المحتار ۳/۲۹۳)۔

بہت مشکل ہے۔

مثال کے طور پر اپنے کھیت کی زرخیزی اور صحیح غلہ کی پیداوار کے لئے آدمی اگر پمپنگ سیٹ لگوانا چاہے یا جوتائی کے لئے ٹریکٹر لینا چاہے تو اس کے لئے بینک سے قرض لینا جس پر لامحالہ سود دینا پڑے گا لازمی ہے تو اگر اس طرح کی کوئی صورت پیدا ہو جائے کہ بینک سے قرض لینے کی شکل میں پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑے تو کیا شریعت اس کی اجازت دیدے گی، اگر کوئی صاحب پمپنگ سیٹ کے لئے بینک سے سود پر قرضہ لے لے تو اس سے حاصل شدہ آمدنی کے بارے میں شریعت کا کیا حکم ہے؟

الجواب وباللہ التوفیق:

محکمہ اقتصادیات میں یا منصوبہ ترقیات میں حکومت جو قرضہ قوم کو دیتی ہے اس کی تین صورتیں ہوتی ہیں:

الف:۔ ایک صورت تو یہ ہوتی ہے کہ جتنی رقم حکومت براہ راست یا بذریعہ بینک بطور قرض دیتی ہے اس میں ۲۵ فیصد یا کم وبیش چھوٹ بھی دیتی ہے اور چھوٹ دینے کے بعد جو رقم بچتی ہے اس پر سود رکھ کر باحتیاط وصول کرتی ہے، پس اس صورت میں سود کی کل رقم ملانے کے بعد بھی واپسی رقم کی مقدار کل لئے ہوئے قرض سے نہ بڑھے جب تو شرعی سود کی تعریف اس پر صادق نہیں آتی اور بلاشبہ یہ صورت جائز رہے گی۔

ب:۔ اور اگر واپسی رقم کی مقدار کل لئے ہوئے قرض سے بڑھ جائے تو یہ بڑھی ہوئی رقم شرعاً سود ہو جائے گی اور اس کا حکم شرعی یہ ہے کہ اگر بغیر اس قرض کے لئے ہوئے کاروبار نہ کرسکیں یا کاروبار قائم نہ رکھ سکیں یا اور کوئی قانونی مجبوری ہو تو اس مجبوری کو احتیاج کہا جائے گا اور اس مجبوری واحتیاج کے تحت بقدر ضرورت یہ قرض لے کر کام چلا لینا اس فقہی ضابطہ "ویجوز للمحتاج الاستقراض بالربح"(۱)۔ الاشباہ والنظائر القاعدۃ الخامسۃ:" الضرر یزال"(۲) کے تحت شرعاً گنجائش رہے گی اور اس کی اجازت احتیاج وضرورت کی حد تک رہے گی۔

ج:۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ حکومت کسی کام کے لئے سامان دینا منظور کرتی ہے اور سامان خریدنے کے لئے کنٹرول نرخ سے خریدنے کے لئے بینک سے روپیہ دلا کر خود اس کی نگرانی میں یا بغیر نگرانی سامان خرید لینے کی اجازت دے

۱- الأشباہ والنظائر/ ۱۳۹ مطبوعہ دارالعلوم دیوبند۔

۲- الاشباہ والنظائر/ ۱۳۹۔

دیتی ہے مگر اس کام اور سامان کی نگرانی خود رکھتی ہے اور اس کے لئے کچھ انسپکٹر سپر وائزر وغیرہ ملازم رکھتی ہے، اس کا ایک مستقل محکمہ ہوتا ہے، یہ ملازمین اس کے سامان کی نگرانی اور اس کے ترقی دینے کے راستے بھی بتلاتی ہے اور موقعہ بموقعہ مشورہ بھی دیتی ہے اور اس معاملہ میں دی ہوئی رقم پر کچھ زائد رقم سود کے نام سے وصول کرتی ہے تو اس زائد رقم کو ان کام کرنے والوں کی اجرت قرار دینے کے حیلہ سے شرعی سود کے حکم سے بچانے کی ایک تاویل کی جاتی ہے اور بقدر حاجت وضرورت گنجائش دے دی جاتی ہے، لہذا ان صورتوں میں سے جو صورت ہوگی اس کے مطابق حکم شرعی ہوگا، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

سودی کاروبار والے سے قطع تعلق:

گاؤں کے چند لوگ کسانوں کو ڈیڑھی بوائی پر فروخت کردینے کا کاروبار کرتے ہیں جس کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ تخم ریزی کے زمانہ میں کسان کو بیج فراہم کیا جاتا ہے اور فصل تیار ہونے پر ڈیڑھ گنا یا سوا گنا مقررہ شرح کے مطابق وصول کیا جاتا ہے چونکہ بظاہر یہ سود کی کھولی ہوئی شکل ہے اس وجہ سے گاؤں کے چند دیندار لوگوں نے فہمائش کے ذریعہ اس کاروبار کو بند کرنے کی کوشش کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دو ایک افراد اس فہمائش سے متاثر ہوئے اور اس سودی کاروبار کو بند کردیا لیکن اکثر لوگ اپنے اس پچھلے طریقہ پر آرہے ہیں اور اس پر اڑے ہوئے ہیں اور فہمائش سے بھی باز نہیں آتے ہیں تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایسی صورت میں گاؤں کے دیندار طبقہ کو شریعت حقہ کی روشنی میں ان لوگوں کے ساتھ کیا معاملہ کرنا چاہئے آیا ان سے برادرانہ دوستانہ تعلقات قائم رکھے یا نہیں ان کے ساتھ کھانا پینا حقہ پانی بند کردیا جائے۔

الجواب وبالله التوفیق:

ان لوگوں کو بہی خواہانہ دوستانہ وعظ ونصیحت اور عذاب آخرت وغضب خداوندی سے ڈرتے رہیں اور مسلسل کرتے رہیں اور اس کی تدبیر بھی کرتے رہیں کہ ان کے قلوب میں خوف خدا آجائے اور وہ خود بھی چھوڑ دیں اور اس کی سہل صورت اور آسان ترکیب یہ ہے کہ ان کا تعلق اللہ والے مصلح سے کرا دیا جاوے وہ مصلح خود سب کرلے گا، ہاں اگر ان سے برادرانہ و دوستانہ تعلقات ختم کردینے یا ان کے ساتھ حقہ پانی اور کھانا وغیرہ بند کردینے سے انکی اصلاح کا ظن غالب ہو اور یہ بند کرنے اور ختم کرنے والے ایسے معتبر وبا اثر ہوں کہ ان کے اس فعل سے ان پر اچھا ہی اثر ہوگا اور کسی اور فساد وعناد وغیرہ شر وفتنہ کا اندیشہ

نہ ہوتو گنجائش ہو سکے گی ورنہ نہیں، اس لئے کہ زمانہ فساد کا ہے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

الجواب صحیح سید احمد علی سعید نائب مفتی دارالعلوم دیوبند

۱- ٹھیکہ پر لی گئی زمین کو خود مالک زمین کا بٹائی پر لینا:

ہم نے ایک زمین ۱۰۰۰ روپے میں چار سال کے لئے لی ہے ٹھیکہ پر، مالک زمین چاہتا ہے کہ ہم بٹائی پر شرکت میں خود اس کو ملا لیں اس کے پاس ہل جوتنے کو نہ تو بیل ہیں اور نہ سامان شرکت، بٹائی کس طریقہ پر رکھا جائے، غریب آدمی ہے دیگر کوئی سبیل نظر نہیں آتی معاش کی تمام پہلو پر روشنی ڈالیں۔

۲- شی مرہون سے فائدہ اٹھانا:

ایک زمین رہن ہے مالک زمین جب تک روپیہ نہ لوٹائے کاشت کر کے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے یا نہیں اگر مالک زمین بھی خود شرکت بٹائی کا خواہشمند ہے تو طریقہ کیا ہونا چاہئے، شرکت کے مالک زمین کا کہنا ہے کہ رہن کا روپیہ لوٹا دوں گا تب قبضہ بعد کاشت کروں گا اس وقت تک بٹائی یا شرکت ہی کرنا چاہتا ہے، اور مالک زمین بھی بغیر سامان کاشت ہے نہ ہل ہے نہ بیل اور نہ دیگر سامان، تو کیا شرعی طریقہ ہے؟

احمد علی و محمد علی (پرفیومری سنیما روڈ پوسٹ کھرگون-ایم، پی)

الجواب وباللہ التوفیق:

جب چار سال کے لئے ۱۰۰۰ کے ٹھیکہ پر لے چکے تو اب ٹھیکہ لینے والے کو اختیار ہے کہ یا تو اسی ٹھیکہ پر چار سال تک باقی رہے اور چاہے تو ٹھیکہ کا معاملہ ختم کر کے بٹائی کا معاملہ کرے اور ٹھیکہ والی رقم اگر دے چکا ہے تو جتنی رقم دے چکا ہے اتنی رقم واپس لے لے، اگر مالک زمین کے پاس ہل بیل نہ ہو جب بھی بٹائی پر لے سکتے ہیں، اور جو معاملہ طے ہو کر سکتے ہیں بشرطیکہ کوئی ایسی جہالت نہ ہو جو مفضی الی النزاع (جھگڑے تک پہنچانیوالی ہو) ہو(۱)۔

۱- ''عن حنظلة بن قيس الأنصاري قال: سألت رافع بن خديج عن كراء الأرض بالذهب والورق، فقال: لا بأس به، إنما كان الناس يؤاجرون على عهد النبي ﷺ على الماذيانات وإقبال الجداول، وأشياء من الزرع فيهلك هذا ويسلم هذا، ويسلم هذا ويهلك هذا، فلم يكن للناس كراء إلا هذا فلذلك زجر عنه، فأما شئ معلوم مضمون فلا بأس به'' (صحیح مسلم کتاب البیوع حدیث ۱۱۶/ ۱۵۴۷)۔

رہن شدہ زمین سے رہن پر لینے والے کو رہن کی بنیاد اور رہن کی وجہ سے نفع اٹھانا جائز نہیں ہے، البتہ اگر رہن کے بعد یہ معاملہ کرلیا گیا کہ مرہون اراضی کو مرتہن اجارہ (کرایہ ولگان) پر لے لے اور لگان وہ دے جو ایک تیسرا آدمی دیتا ہے اور قرض (زردین) کے دباؤ سے اس میں کمی نہ کی جائے اور راہن خوشی سے یہ معاملہ کرلے تو شرعاً رہن کا معاملہ ختم ہوکر لگان و اجارہ کا معاملہ قائم ہوکر جواز کی صورت بن جائے گی، اسی طرح یہ بھی جائز ہوسکتا ہے کہ مرتہن اس کو بٹائی پر کاشت کرے اور آزادیعنی قرض نہ دینے والے کی طرح معاملہ کرکے آدھی پیداوار راہن کو دیا کرے، باقی یہ صورت جائز نہ ہوگی کہ راہن (مالک زمین) خود کاشت کر کے پیداوار کا آدھا حصہ یا کچھ حصہ مرتہن کو دے، راہن کی اجازت ومرضی سے بھی یہ صورت جائز نہ ہوگی(۱)، فقط واللہ علم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۹/۱/۱۴۰۱ھ

سود کا مصرف:

بحیثیت زکوۃ فنڈ کے خزانچی کے جو زکوۃ کی رقم میں حفاظت کی غرض سے بنک میں جمع کرتا ہوں وہ بڑی رقم ہوتی ہے، ایک سال میں آہستہ آہستہ زکوۃ کی رقم خرچ ہوجاتی ہے اور مستحقین پر صرف ہوجاتی ہے لیکن بینک زکوۃ فنڈ کی رقم پر سود دیتا ہے، میری مشکل یہ ہے کہ میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ بینک کی رقم زائد ملی ہوئی میں کس طرح اور کہاں خرچ کروں؟ براہ کرم اس بارے میں قانون اسلامی سے رہنمائی فرمائیں۔

محمد باندوپ (۴۶ ہکس روڈ، روزہل ماریشش)

الجواب وباللہ التوفیق:

اصل بات تو یہی ہے کہ زکوۃ کی رقم جلد سے جلد مصرف میں پہنچا کریا ادائیگی کر کے سبکدوش ہوجانا چاہئے۔

لیکن اگر بروقت مصرف نہ ملنے کی وجہ سے ذخیرہ کرنا پڑ جائے تو یہ بھی درست ہے (۲) اور ایسی صورت میں حفاظت کی غرض سے بنک میں جمع کرنا بھی درست ہے پھر جو رقم سود کے نام سے بینک سے ملے اس کو بھی مستحقین زکوۃ پر

۱- ''ولا ینتفع المرتهن بالرهن استخداماً وسکنی ولبسا واجارة واعارة، لأن الرهن یقتضی الحبس إلی أن یستوفی دینه دون الانتفاع'' (البحر الرائق ۸/۲۳۸)۔

۲- ''فتکون الزکاة فریضة وفوریتها واجبة فیلزم بتأخیره من غیر ضرورة الإثم'' (فتح القدیر ۲/۱۱۴)۔

اورقرضہ میں دیدے اور پریشان حال مسلمانوں پر بطور صدقہ کے خرچ کردے اور اگر اس کے مصرف کے علاوہ کسی اور کام میں خرچ کرنا ہو جیسے مسافر خانہ یا دینی مدرسہ کی تعمیر وغیرہ میں تو شرعی حیلہ کے ذریعہ تملیک مستحق کرلینے کے بعد صرف کریں(۱)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۲/۲/۱۴۰۱ھ

سودی رقم کا مصرف:

جن لوگوں کا روپیہ ہندوستان کے بینکوں میں جمع ہے اور اس روپیہ پر سود یا نفع ملتا ہے، اس روپیہ کا استعمال کہاں کہاں کیا جاسکتا ہے، غریبوں کی پرورش پر خرچ کیا جاسکتا ہے یا نہیں؟ اور ان پر خرچ کرتے وقت ان کو بتلانا ضروری ہے یا نہیں؟

حافظ مہدی حسن (پوسٹ بکس ۲۲۴۴، ریاض، سعودی عرب)

الجواب وباللہ التوفیق:

اس کا حکم صرف یہ ہے کہ سود کے وبال سے بچنے کی نیت سے بغیر نیت ثواب کے جلد سے جلد اپنی ملک سے خارج کردینا چاہیے(۲)، اور بصورت صدقہ مستحق زکوۃ کو دے کر الگ ہونا چاہیے، وہ مستحق زکوۃ مالک ہونے کے بعد اپنی جس ضرورت میں چاہے خرچ کردے اور دینے میں ان کو یہ بتانا ضروری نہیں کہ یہ رقم ایسی ہے بلکہ بتلانا نہیں چاہیے، اس لیے کہ شاید ان کو رنج وقلق ہو اور خود ان کی ضروریات پر ان کو مالک بنائے بغیر خرچ کردینا درست نہیں ہے۔

اسی طرح یہ بھی کرسکتے ہیں کہ اگر ایسی رقم سودی اسٹیٹ بینک سے ملے تو اس کو انکم ٹیکس میں اور غیر شرعی ٹیکس میں دے سکتے ہیں جس میں یہ رقم براہ راست حکومت کے خزانے میں پہنچتی ہو(۳)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲/۲/۱۳۹۹ھ

۱- "والمعنا أن الحيلة أن يتصدق على الفقير ثم يأمره بفعل هذه الأشياء" (درمختار مع ردالمحتار ۳/۲۹۳)۔

۲- ''وأما اذا كان عند رجل مال خبيث فاما ان ملكه بعقد فاسد او حصل له بغير عقد ولا يمكنه ان يرد الى مالكه ويريد ان يدفع مظلمة فليس له حيلة الا ان يدفع الى الفقراء'' (بذل المجہود ۱/۳۷)۔

۳- ''ما حصل بسبب خبيث فالسبيل رده أي إلى أرباب الأموال'' (قواعد الفقہ، ص ۱۱۵)۔

بینک کے منافع سے اپنی ضروریات کو پورا کرنا:

میں سعودی عرب سے مستقل طور پر اپنے وطن واپس ہونا چاہتا ہوں، لیکن یہاں سے جانے کے بعد گذارے کے لئے ذریعہ آمدنی کیا ہوگا، ہمیشہ سوال رہا ہے میرے پاس کچھ سرمایہ بھی جمع ہے، لیکن کاروبار میں آجکل اسقدر بے ایمانی ہے کہ ایسا شخص جو زندگی میں پہلی بار تجارت میں داخل ہونا چاہتا ہے، ہمیشہ نقصان ہی سے دو چار ہوتا ہے، یہ صرف مفروضہ نہیں ہے، بلکہ میں اپنے ایسے کئی ساتھیوں کو خود شخصی طور پر جانتا ہوں، اولا تاجر برداری کی بھی کوشش ہوتی ہے کہ کسی طرح اس کا روپیہ ڈوب جائے اور وہ اپنے ہتھکنڈوں میں کامیاب ہوجاتے ہیں۔

ثانیاً جو لوگ نفع بخش تجارت کررہے ہیں انہیں بھی اندر سے دیکھا جائے تو وہ اپنی تجارت کو منافع بخش بنانے کے لئے مختلف غیر اسلامی ذرائع مثلاً رشوت دینا، جھوٹ بولنا، ذخیرہ اندوزی کرنا، من مانی قیمتیں بڑھانا اپنائے ہوئے ہیں، اول صورت میں ORIGINAL CAPITAL LOSS کا خوف تو دوسری صورت میں حلال تجارت کو برقرار رکھنے کے لئے غیر حلال یا غیر اسلامی TACTIES ضروری ہے اور دونوں ہی برے ہیں، اس لئے میں RETIRE ہونے پر اپنی فیملی کے اخراجات چلانے کے لئے اپنا جمع شدہ سرمایہ BANK میں FIXED DEPOSIT رکھ کر جو بھی منافع بینک سے ملے اس میں اپنی فیملی کی زندگی کے اخراجات پورے کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔

براہ کرم مذکورہ بالا دونوں صورتوں کی جو تشریح میں نے لکھی ہے، اس کو خیال میں رکھتے ہوئے بتلائیے کہ مذکورہ منافع بینک SCHEMES CERTIFICATES PROFIT ON GOVT SAVING سے اپنے اور اپنی فیملی کے اخراجات پورے کرنا حلال ہے یا حرام؟ جائز ہے کہ نہیں؟

سید عبداللہ صاحب معرفت الفوثیہ (ٹریڈنگ کمپنی پوسٹ بکس ۳۲۶، الخبر - سعودیہ عربیہ)

الجواب وباللہ التوفیق:

یہ صحیح ہے، بداخلاقیوں کا دور ہے، جھوٹی تجارت کی پہلی شکل حسد و دشمنی کے زد میں آکر اکثر فیل ہوجاتی ہے، باقی اس میں جو نفع و بچت ہوتی ہے وہ جائز طریقہ سے حاصل ہوکر حلال و جائز رہتی ہے...... اور جو تجارت ذرا اونچے پیمانہ پر اور نفع بخش تجارت کرتے ہیں اس میں بھی ایمانداری و دیانت سے کام کرنے کی تمنا و خواہش کے باوجود غیر اسلامی قانون ہونے کی وجہ سے وہ باتیں مجبوراً کرنی پڑجاتی ہیں جس کا ذکر آپ نے خود بھی کیا ہے مگر ان تمام غیر شرعی معاملات میں حرام روپیہ اپنے

پاس نہیں آتا بلکہ غیر شرعی طریقہ سے کچھ اپنا جائز اور حلال روپیہ اپنے ملک سے نکل جاتا ہے اور چونکہ مجبوری کی وجہ سے نکلتا ہے، اس لئے اس پر استغفار کر لینے سے خدا کی طرف سے معافی کی امید ہے۔ چنانچہ فقہاء کرام تصریح کرتے ہیں کہ رشوت جس کا لینا اور دینا مثل سود کے دونوں حرام ہیں مگر مجبوری کی صورت میں اپنا جائز حق بغیر رشوت کے نہ ملتا ہو تو رشوت دینے میں صرف رشوت لینے والے کو گناہ ہوگا، دینے والا معذور قرار دیکر انشاء اللہ گناہ سے محفوظ رہے گا(۱)، اسی طرح جب بغیر قرض لئے کام نہ چلتا ہو یا ناقابل برداشت تکلیف کا سامنا ہو اور قرض غیر سودی نہ ملتا ہو تو بینک سے بقدر حاجت وضرورت لے لینے کی گنجائش ہو جاتی ہے، کمافی الاشباہ والنظائر ص ۱۱۵ مع الحموی: ''ویجوز للمحتاج الاستقراض بالربح''(۲) مثلاً اپنے جائز روپیہ سے بھی بڑا کاروبار کرنے میں قانون حکومت کیوجہ سے قانونی گرفت ہوکر اپنا جائز روپیہ بھی کالا روپیہ شمار ہوکر قابل ضبطی وغیرہ ہو رہا ہو تو قانونی رو سے اور اپنے حلال روپیہ کو بچانے کے بقدر مجبوری میں اور بقدر ضرورت حکومت وقت سے قرض لے لینے کی گنجائش ہو جاتی ہے، البتہ استغفار برابر کرتے رہنا اور خدا سے دعاء کرتے رہنا کہ اے اللہ یہ ہمارے اعمال بد کے نتائج ہیں، لقوله عليه السلام: ''كما تكونوا يولى عليكم''(۳) أو كما قال عليه السلام، اور لقوله عليه السلام: ''أعمالكم عمالكم''(۴) اس لئے ہمارے اعمال ایسے بنادیجئے اور ہمیں ایسی توفیق دے دیجئے کہ ہم اس قسم کے حالات سے محفوظ رہیں، غرض اس طرح تجارت کرنے میں اگر چہ غیر اسلامی حکومت ہونے کی وجہ سے مجبوراً کچھ غیر شرعی کام کرنے پڑیں جس کے لئے توبہ واستغفار کرنا بھی بسا اوقات کافی ہو سکتا ہے، لیکن جو پیسہ ومال اپنے پاس آتا ہے اور جو نفع وبچت ہوتی ہے وہ جائز اور حلال مال ہوتا ہے، اس کے کھانے اور استعمال کرنے میں حرام مال اور خبیث مال کھانے کا گناہ ووبال نہیں ہوگا۔ اور بینک میں سرمایہ اس نیت سے جمع کرنا کہ اس کے ذریعے سے جو سود ملے گا اس سے اپنی اور اپنے بال بچوں کی کفالت کروں گا، اس صورت میں سود کھانا لازم آئے گا جس کی حرمت پر نصوص قطعیہ شاہد ہیں اور جسکے بارہ میں قرآن پاک میں یہ تصریح بھی ہے، ''ويمحق الله الربوا ويربى الصدقات''(۵)، پھر صحیح حدیث شریف

۱- ''ثم الرشوة أربعة أقسام .... الرابع ما يدفع لدفع الخوف من المدفوع إليه على نفسه وماله حلال للدافع حرام على الآخذ'' (فتح القدیر ۶/۳۵۹ وعند الشامی ۸/۳۵)۔

۲- الاشباہ والنظائر مطبوعہ ادارۃ القرآن ودار العلوم الاسلامیہ پاکستان/۱۲۶۔

۳- الجامع الصغیر مع شرحہ فیض القدیر ۵/۴۷ حدیث ۶۴۰۶ بحوالہ مسند فردوس وشعب الایمان للبیہقی۔

۴- فیض القدیر شرح جامع الصغیر لعبد الرؤوف المناوی ۵/۴۷ بلفظ: ''أعمالكم عمالكم وكما تكونوا يولى عليكم''۔

۵- سورۂ بقرہ ۲۷۶۔

میں وارد ہے کہ ایک سودی معاملہ میں آٹھ آدمی لعنت اور پھٹکار کے مستحق ہوجاتے ہیں بلکہ سودخوار پر کھلم کھلا سرکار دوجہاں ﷺ کے دربار سے لعنت آئی ہے(۱) اور پھر حضرت امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ تمام قرآن میں آیات ربوا ہمارے نزدیک جتنی خوفناک ہیں دوسری کوئی آیت نہیں، غرض اس صورت میں بینک میں سرمایہ جمع کرکے کھلم کھلا سودی رقم کھانے کا اور بغیر کسی مجبوری کے کھانے کا گناہ اور وبال لازم آئے گا۔ اور ایسا گناہ اور وبال کہ اس کے تصور سے دل کانپ جاتا ہے کیسے گنجائش ہوسکتی ہے، اس لئے اس کی اجازت شرعاً نہیں دی جاسکتی اور قانونی بات تو آپ ہم سے زیادہ جانتے ہوں گے،، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۳۰/ ۷/ ۱۴۰۰ھ

بجلی اور پانی کے بل میں سودی رقم دینا:

بجلی اور پانی کے بل میں بینک کے سودی رقم جمع کرانا جائز ہے یا ناجائز؟

محمد ادریس (چورو راجستھان)

الجواب وباللہ التوفیق:

ناجائز ہے، اس لئے کہ سود حرام ہے اور حرام رقم کا حکم یہ ہے کہ اس کو یا تو اصل مالک کے پاس رد (واپس) کردو اور اگر یہ نہ ہوسکے تو اس کے وبال سے بچنے کے لئے یا اگر اصل مالک مستحق ثواب ہو مثلاً مسلمان ہو تو اس کو ثواب پہنچانے کی نیت سے صدقہ کردے(۲)، اور بجلی اور پانی کے نل کے بل میں دینے میں ان دوصورتوں میں سے کوئی صورت نہیں ہے، بلکہ یہاں بجلی اور پانی جو خرچ کیا ہے اس کا عوض دیتے ہیں جس کو شرع میں اجرت کہا جاتا ہے اور اجرت میں طیب وپاکیزہ مال دینا

۱- غالباً خمر کے ملعونین سے اشتباہ ہوگیا، سود کے بارے میں حضرت ابن مسعودؓ سے مروی ہے ''قال: لعن رسول اللہ ﷺ آکل الربا، وموکلہ، وشاھدیہ، وکاتبہ'' (سنن الترمذی ۳/ ۵۰۳ کتاب البیوع باب ماجاء فی آکل الربا حدیث ۱۲۰۶، وسنن ابی داؤد ۳/ ۲۴۴ کتاب البیوع باب فی آکل الربوا وموکلہ حدیث ۳۳۳۳ بلفظ "شاھدہ بدل "شاھدیہ"، اس طرح یہ کل چار یا پانچ ہوئے اور خمر کے متعلق مروی ہے: قال رسول اللہ ﷺ:" لعن اللہ الخمر وشاربھا وساقیھا وبائعھا ومبتاعھا وعاصرھا ومعتصرھا وحاملھا والمحمولۃ إلیہ"(سنن ابوداؤد ۳/ ۳۲۶ کتاب الاشربہ حدیث ۳۶۷۴) جس میں خمر سے ملعونین کی تعداد آٹھ مذکور ہے۔

۲- علامہ شامی مال حرام کے بارے میں لکھتے ہیں: ''والحاصل أنہ إن علم أرباب الأموال وجب ردہ علیھم وإلا فإن علم عین الحرام لا یحل لہ ویتصدق بہ بنیۃ صاحبہ'' (ردالمحتار علی الدرالمختار ۷/ ۳۰۱)۔

چاہئے اور سود حرام اور خبیث مال ہے (۱)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دار العلوم دیوبند سہارنپور ۱۶/۹/۱۴۰۰ھ

بینک کی سودی رقم اپنے مصرف میں استعمال کرنا:

نواز میاں کی عمر اس وقت ۷۶ سال کی ہے دو بیویاں باحیات ہیں جن کی عمریں بالترتیب ۷۰ اور ۴۵ سال ہیں جو اولاد سے محروم ہیں، حال ہی میں انہوں نے جائداد (زراعت) فروخت کر کے چالیس ۴۰ ہزار روپے بینک میں جمع کر رکھے ہیں، عمر کے لحاظ سے اور وہ کوئی کام یا تجارت نہیں کر سکتے ہیں نہ اولاد کا کوئی سہارا ہے، انہیں فکر ہے کہ ایسی صورت میں انکا اور دونوں بیویوں کا گزر کس طرح ہو، ان کا خیال ہے کہ بینک میں جو رقم جمع کی گئی ہے اس پر جو ماہوار زیادہ رقم بینک کی طرف سے ملے گی، اس رقم سے تینوں کی زندگی بسر کرنا یعنی گھر کا خرچ چلایا جائے کیوں کہ مہنگائی کا دور ہے تینوں کو کم سے کم گھر خرچ کے لئے ۴۰۰ روپے درکار ہوں گے تو سرمایہ پر جو زائد رقم ملے گی وہ گھر خرچ کے لئے استعمال کر سکتے ہیں یا نہیں اور وہ اور اپنی دونوں بیویوں کا گزر بسر ضروریات زندگی کس طرح کریں جب کہ بڑھاپے کی وجہ سے ہاتھ پاؤں جواب دے چکے ہیں برائے کرم شرعی حکم سے مطلع فرمائیں۔

نواز میاں پٹیل (مقام پوسٹ لوہارہ، تعلقہ پاجورہ ضلع جلگاؤں، مہاراشٹر)

الجواب وباللہ التوفیق:

قرض کے بدلے میں جو زائد رقم ملتی ہے وہ سود ہوتی ہے، اس کو اپنے گھر کے خرچ میں استعمال کرنا درست نہیں ہے، "أحل الله البيع وحرم الربوا" (۲) ہاں تجارتی بینک ہو اور اس میں مضاربت کے لئے دیدیں اور عقد مضاربت کے اصول پر نفع کا جو حصہ ملے اس کا اپنی ضروریات میں خرچ کرنا درست ہوگا (۳)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دار العلوم دیوبند سہارنپور ۳۰/۶/۱۴۰۱ھ

۱- "عن عبد الله بن مسعودؓ قال: لعن رسول الله ﷺ آكل الربا وموكله وشاهديه وكاتبه" (سنن ابوداؤد ۳/۴۴۴ کتاب البیوع باب فی آکل الربا وموکلہ حدیث ۳۳۳۳)۔

۲- سورۂ بقرۃ ۲۷۵۔

۳- "کل قرض جر نفعاً حرام أي إذا كان مشروطاً" (رد المحتار علی الدر المختار ۷/۳۹۵)، "المضاربة عقد يقع على الشركة

بینک کے سود سے متعلق چند استفسارات:

مسائل حاضرہ کے متعلق چند صورتوں کے جواب تشفی بخش مطلوب ہیں، دوران جواب اصول قواعد کی طرف بھی اشارہ ہوجائے تو انشاء اللہ تعالیٰ مفید رہے گا۔

بینک میں جمع شدہ سود کی رقم کو بلانیت ثواب تملیکاً مستحقین زکوٰۃ تک پہنچا دینا اولین ذمہ داری ہے، لیکن روپیہ میں عینیت نہیں ہوا کرتی، اس لیے بنام سود حاصل شدہ رقم کھاتے میں جمع رہنے دینا اور اس کی جگہ دوسرے روپے اپنے پاس سے خرچ کردینا اور نیت یہ کرنا کہ میرے حساب میں سود کے نام سے جو رقم شامل ہے وہ دے رہا ہوں، کیا یہ صحیح ہے؟

اگر صحیح نہیں ہے تو کن کن مواقع میں سود کی رقم دی جائے اور کس نیت سے دی جائے، اصولی وبنیادی فرق کی جانب رہنمائی فرماتے جائیں تو زہے نصیب۔

مثلاً دکان بنوانے، چلانے کالائسنس، یا ڈرائیوری کرنے کالائسنس وغیرہ وغیرہ کی رقم یا مثلاً انکم ٹیکس، ہاؤس ٹیکس، واٹر ٹیکس، روڈ ٹیکس وغیرہ وغیرہ کی رقم یا اسی قسم کی اور رقوم، ان رقوم میں بینک سے ملنے والی سود کی رقم کا دیدینا صحیح ہے یا نہیں؟

اسی طرح گاڑی انشورنس یا کسی بھی انشورنس میں دی جانے والی رقم میں اس سود کی رقم دی جاسکتی ہے یا نہیں؟ مفصل ومدلل بیان فرمائیں!

زین الاسلام قاسمی (امام وخطیب جامع مسجد گورکھپور، یوپی ۷/۴/۷/۷۰ ۱۴ھ)

الجواب وباللہ التوفیق:

یہ خلجان اس لیے پیدا ہوگیا کہ روپیہ میں عینیت کی نفی ہر حال میں سمجھ لی گئی، حالانکہ ایسا نہیں ہے، مثلاً نقود کو کسی کے یہاں بطور امانت ودیعت رکھدیا تو امین (مودع) پر لازم ہے کہ ان نقود کو بعینہ الگ رکھے، اور اس میں کسی قسم کا تصرف نہ کرے، حتیٰ کہ اس حالت میں اگر وہ گم وغیرہ ہوجائے تو بھی امین پر کوئی ضمان وغیرہ نہیں آتا، یہ اسی عینیت ذاتیہ کی وجہ سے ہے، اور اگر امین نے ان رقوم کو دوسری رقم میں از خود ملادیا تو محض اس ملانے ہی سے عینیت ختم ہوگئی، اور وہ خائن کے حکم میں شمار ہوگیا، اور گنہ گار بھی ہوگیا، اور بغیر تعدی کے بھی گم ہوجانے پر ضمان واجب الاداہوگیا، اسی وجہ سے ہوشیاری یہ ہے کہ

بمال من أحد الجانبين ومراده الشركة في الربح وهو يستحق بالمال من أحد الجانبين والعمل من الجانب الآخر" (ہدایہ ۳/۲۴۱)۔

جب خلط ملط ہوجانے کا خطرہ ہوتو مودع سے بجائے امانت کے قرض کا معاملہ کرکے یا جس طرح مناسب ہومعاملہ صاف کرلے تاکہ گناہ نہ ہو۔

اسی طرح اپنی زکوٰۃ ادا کرنے کی نیت سے کچھ رقم الگ رکھدی (عزل کرلیا) تو اس الگ کی ہوئی رقم سے بغیر نیت ادائے زکوٰۃ بھی مستحق زکوٰۃ کو دینے سے ادائیگی زکوٰۃ صحیح ہوتی رہے گی، یہ حکم اسی عینیت ذاتیہ کے بقاء کی وجہ سے ہوتا ہے، لیکن اس الگ کردہ رقم کو اگر اپنی کسی رقم میں ملا دیا تو عینیت ختم ہوگئی پھر بوقت اداجب تک ادائیگی زکوٰۃ کی نیت نہ ہوتو زکوٰۃ ادانہیں ہوتی۔

یہ دومثالیں سمجھنے کے لیے کافی ہیں اور انہیں وجوہ سے اعلیٰ بات وطریقہ تو یہ ہے کہ بینک سے اپنی ذاتی مقدار کی رقم الگ نکالے اور سود کی مقدار کی رقم الگ نکالے، اور اس کو الگ ہی رکھے اور اس کو بینک میں نہ چھوڑے اور نکال لینے کی وجہ شرعی تو معلوم ہی ہے کہ "إذا ابتليت ببليتين فاختر أهونهما" "من ابتلي ببليتين وهما متساويتان يأخذ بأيتهما شاء وان اختلفا يختار أهونهما" (۱) ہے، بہر حال اس کو نکال لینے کے بعد پہلا حکم شرعی حسب ضابطہ شرعیہ: "الرد الى رب المال حسب الامكان" متوجہ ہوجاتا ہے، اور اس وجہ سے کہ اب چونکہ بینک عموماً حکومت کی ملک قرار پاچکے ہیں، اس لیے حکومت کے جو غیر شرعی ٹیکس اس شخص پر خود لاگو ہوں جیسے انکم ٹیکس، ہاؤس ٹیکس، سیل ٹیکس، موت ٹیکس، پیدائش ٹیکس وغیرہ پہلے اس ٹیکس میں دیدے تاکہ اتنی رقم رد الی رب المال ہوکر خود اس سے بری الذمہ ہوجائے، اور باقی ماندہ کو اس کے وبال سے بچنے کی نیت سے جہاں تک ہوسکے غرباء ومساکین کو دے کر اپنی ملک سے نکال دے اور اس کے علاوہ کسی اور کام میں خرچ نہ کرے، کما یستفاد من هذہ العبارات:

۱-"إذا كان عند رجل مال خبيث فإما إن ملكه بعقد فاسد أو حصل له بغير عقد ولا يمكنه أن يرده إلى مالكه ويريد أن يدفع مظلمته عن نفسه فليس له حيلة إلا ان يدفعه إلى الفقراء" (۲)۔

۲-إن علم أرباب الأموال (المحرمة) وجب الرد عليهم، وإلا فإن علم عين الحرام لايحل له ويتصدق بنية صاحبه(۳)۔

اور اگر دونوں رقموں کو الگ الگ نہیں نکالا بلکہ ایک ساتھ ہی نکال لیا، یا بینک نے خود ایک ہی ساتھ دونوں رقمیں

۱- الاشباہ والنظائر/۱۴۵۔
۲- بذل المجہود ۱/۳۷۔
۳- شامی ۴/۱۳۰۔

دیدیں تو خلط ملط ہوجانے سے وہ عینیت تو باقی نہیں رہی جو پہلے تھی مگر احکام سب وہی متوجہ ہوجائیں گے جو اوپر بیان ہوئے کہ جہاں تک جلد ہوسکے سودی رقم کی مقدار اپنی پاک ذاتی رقم سے سے نکال کر الگ کردے، اور پھر وہی معاملہ کرے جو ابھی اوپر بذل المجہود اور رد المحتار سے گذرا(۱)، لہٰذا ایسا کرنا کہ بنام سود حاصل شدہ رقم کھاتے میں جمع رہنے دیں اور اس کی جگہ دوسری رقم جو اپنی غیر سودی اور جائز رقم ہو دیدیں، صحیح نہ ہوگا، ایسا کرنے سے نہ تو اپنا ذمہ بری ہوگا اور نہ ہی گناہ سے بچ سکیں گے، رہ گیا معاملہ عینیت، تو عینیت نہ ہونے کا مفہوم یہ ہے کہ عینیت وصفیہ اصطلاحیہ باقی نہیں رہتی، اسی طرح ''الخلط استہلاک'' کا مفہوم بھی استہلاک وصفی واصطلاحی ہوتا ہے نہ کہ استہلاک حقیقی، کیونکہ حقیقت میں شئے مختلط کی ذات تو موجود ہی رہتی ہے، محض متمیز وعلیحدہ علیحدہ نہیں رہتی۔

بینک میں کس نیت سے روپیہ رکھنا چاہیے؟

تو جواب یہ ہے کہ بینک میں محض حفاظت کی غرض سے اور اضاعت وضیاع کے خطرہ سے بچنے کی نیت سے رکھنے کی اجازت ہے، اور کسی غرض سے سودی بینکوں میں رکھنے کی شرعاً اجازت نہیں، اور ممنوع وناجائز ہی نہیں بلکہ بسا اوقات نہایت خطرناک معصیت ہوگی، مثلاً اگر اس نیت سے رکھا کہ اس کے سود سے غرباء ومساکین کی یا پریشان حال وغیرہ لوگوں کی اعانت کروں گا تو بظاہر یہ عنوان بڑا سنہرا ہے بلکہ ایسے کام تو بڑے ثواب کے ہوتے ہیں، اس میں تو ہم لقمہ وہم ثواب کا مصداق ہوگا، لہٰذا ایسا کرنے میں کیا خرابی ہوگی؟......تو یہ خیالات احکام شرع سے لاعلمی کے باعث پیدا ہوجاتے ہیں، کیونکہ اس طریقہ کار میں سود کا پیسہ جو حرام ہوتا ہے اس کو ثواب کی نیت سے یا ثواب حاصل کرنے کی غرض سے بغیر حکم شرع کے دینا لازم آتا ہے اور اس کا کفر ہونا شرعاً واضح ہے(۲)، بلکہ اس کا حکم شرعی اوپر کی لکھی ہوئی دونوں عبارتوں سے یہ متعین ہو چکا ہے کہ ایسے پیسے کا پہلا حکم یہ ہے کہ اس کے شرعی مالک کو واپس کردینا ضروری رہتا ہے، اور جب ایسا نہ ہوسکے تو اس کے وبال سے بچنے کی نیت سے جہاں تک جلد ہوسکے غرباء ومساکین کو دے کر اپنی ملک سے نکال دینا واجب رہتا ہے۔

لہٰذا ایسے حرام پیسوں کا حکم شرعی سوائے اس مذکورہ صورت وحیلہ کے اور کوئی شکل اس کے وبال سے بچنے کی نہیں ہے، یہیں سے یہ بات بھی معلوم ہوگئی کہ بعض لوگ فکسڈ ڈپوزٹ میں رقم جمع کرتے ہیں اور نیت اس قسم کی بھی رکھتے ہیں کہ بڑھاپے یا مجبوری میں اس کے نفع سے اپنا کام چلے گا یا بچوں کی تعلیم وتربیت اس سے ہوگی یا مرنے کے بعد اولاد کا گذر

۱- ''وإن لم یعلم صاحبه یعلم لکن لایصلح أن یکون محلا لإیصال الثواب یکفره حتی یتصدق بنیة فیدفع إلی الفقیر بنیة حصول الحفظ عن وباله ومظلمته کما علم من البذل''۔

۲- ''رجل دفع إلی الفقیر من المال الحرام شیئا یرجو الثواب یکفر''(شامی ۲۶/۴)۔

اوقات اس سے ہوگا اور رقم بھی بچی رہے گی، وغیر ذلک اور یہ معاملہ خالص سودی معاملہ ہوگا اور اس کا حاصل شدہ نفع خالص شرعی سود ہوگا جو کسی طرح جائز نہ ہوگا۔

اور یہ تعریف فکسڈ ڈپازٹ کے معاملہ پر بلاشبہ صادق آتی ہے، کیونکہ فکسڈ ڈپازٹ میں جمع کرتے وقت طرفین کی رضامندی سے یہ معاہدہ اور عقد ہوتا ہے کہ یہ روپیہ اتنی مدت کے بعد لوگے تو اس روپیہ پر اتنا فیصد انٹرسٹ (سود) ملے گا اور اضافہ کے ساتھ یہ روپیہ واپس ملے گا، وعلی ہذا القیاس اتنی مدت میں واپس لینے پر اتنا فیصد انٹرسٹ اور اتنی مدت میں اتنا فیصد کے ساتھ واپس ملے گا وغیرہ وغیرہ، اور نقود کا اموال ربویہ میں ہونا "الحنطة بالحنطة" والی حدیث سے ظاہر ہے، علاوہ ازیں سودی معاملہ کرنے والے مسلمانوں کے حق میں بڑی سخت سے سخت وعیدیں مروی ہیں، مثلاً جو لوگ سودی معاملہ کرنے سے باز نہیں آتے ان کے لیے "فاذنوا بحرب من الله" (۱) یعنی اللہ تعالیٰ سے اعلان جنگ کی دھمکی وارد ہے، نیز قرآن میں "ویمحق الله الربو ویربی الصدقات" (۲) وارد ہے، اور حضرت امام ابوحنیفہ نے فرمایا: "أخوف الآیات في القرآن عندي آیة الربا" وغیرہ وغیرہ اور فاسقوں فاجروں کے حالات پر اپنے کو قیاس نہ کرنا چاہیے۔

یہیں سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ اگر بینک میں کوئی کھاتہ یا شعبہ ایسا ہو جس میں نفع یا انٹرسٹ لینے دینے کا کوئی حساب نہ لکھا جاتا ہو یا لکھا جاتا ہو مگر وہ رقم حکومت خود اپنے اختیار وصوابدید سے محض روپیہ جمع کرنے والوں کو ہی دیتی ہو کسی اور جگہ نہ دیتی ہو، جیسے پرائیوٹ فنڈ میں اپنی جمع شدہ رقم سے زائد رقم میں ہوتا ہے تو اس شبہ میں بغرض حفاظت جمع کرنا پھر جو زائد رقم حکومت بغیر واپسی کے معاملہ کے دے، اس کا لینا اور استعمال کرنا سود نہ ہونے کی بنا پر مثل پرائیویٹ فنڈ والی رقم کے حکم میں ہوگا، ہاں اگر اس کے خلاف کوئی شکل ہوگی تو اس کا حکم بھی دوسرا ہوگا۔

ایک شبہ کا ازالہ:

شبہ یہ ہے کہ بینک میں ساری ہی رقوم ایک ہی کھاتہ میں خلط ملط رہتی ہیں، محض سود کا اور غیر سود کا حساب صاف صحیح رکھنے کی غرض سے صرف کاغذات میں الگ الگ اندراج رہتا ہے اور بینک ہی میں الخلط استہلاک صادق آچکا ہوتا ہے تو اب بینک سے نکالنے کے بعد یہ امتیاز وغیرہ سب فرضی ہی رہ جاتا ہے، اس لیے یہ سب احکام بے کار و بے محل ہیں، تو جواب یہ ہے کہ بینک حکومت غیر مسلمہ کے ہیں، اور وہ ان احکام کے مخاطب نہیں ہیں کہ یہ سب احکام ان پر ہوں اور ہماری اس میں

۱- سورۂ بقرہ ۲۷۹۔

۲- سورۂ بقرہ ۲۷۶۔

ذمہ داری بھی نہیں ہے اور نہ ہمارا اس میں کچھ دخل ہی ہے کہ بینک میں رہنے کی حالت میں ہم پر یہ احکام متوجہ ہوں، البتہ بینک سے نکل کر ہمارے پاس پہنچنے پر چونکہ ہم بفضلہ تعالیٰ مسلمان ہیں اور ان سب احکام کے مخاطب ومکلف ہیں، اس لیے یہ سارے احکام ہم پر متوجہ ہوجاتے ہیں جو ابھی مذکور ہوئے کما اشار الیہ قولہ تعالیٰ: "انی جاعل فی الأرض خلیفة" (۱) جس کی طرف سے منصب خلافت ملتا ہے اس کی پوری پوری اتباع وتابعداری حتی الوسع تمام امور میں خلیفہ پر لازم وواجب عقلاً ونقلاً ہر طرح ہوجاتی ہے، ورنہ منصب خلافت سے لائق معزولی قرار پاجاتا ہے، نیز اشار الیہ قولہ تعالیٰ: "إنا عرضنا الأمانة علی السموات (الی قولہ تعالیٰ) فأبین أن یحملنها و أشفقن منها وحملها الانسان" (۲)، اس لیے کہ امانت سے مراد یہی امانت دین متین ہے اور اس پر صاحب امانت کی پوری اتباع حتی الوسع لازم رہتی ہے، ورنہ مجرم وخائن قابل مواخذہ قرار دیا جاتا ہے، اور بینک کے اندر رہتے ہوئے دخل دینا اپنی قدرت واستطاعت سے باہر ہوتا ہے، اس لیے اس کے مکلف نہیں کما أشار إلیه قولہ تعالیٰ: "لایکلف الله نفسا إلا وسعها" (۳)۔

جواب سوال ۲:

مندرجہ بالا گفتگو اور ضابطۂ شرعیہ سے درج ذیل تمام سوالوں کا حکم شرعی خود بخود واضح ہوجاتا ہے، مثلاً بنام سود حاصل شدہ رقم کو مندرجہ بالا مصارف میں دینے کے علاوہ کسی اور کام میں خرچ کرنا درست نہ ہوگا، اسی طرح سود میں دینے کی نیت سے سود کی رقم کے بدلے میں دوسری رقم دینے سے بری نہ ہوگا، اور اس تمہیدی گفتگو کے بقیہ ضمنی نمبرات کا جواب ایک تا چار نیز اور ضمنی سوالات وجوابات مع شئے زائد درج ذیل (الف، ب وغیرہ) نمبروں کے جواب میں ملاحظہ کیجئے۔

الف وب: دکان بنوانے یا چلانے کا لائسنس ہو یا ڈرائیوری کرنے یا کوئی گاڑی چلانے کا یا بندوق وغیرہ کا لائسنس ہو، اور یہ لائسنس لینا قانوناً لازم ہو کہ بغیر لائسنس کے بنوائے ہوئے کچھ نہیں کرسکتے، اور لائسنس کی رقم خزانہ حکومت میں پہنچتی ہو یعنی یہ لائسنس بھی مرکزی حکومت کا ہو تو ہندوستان جیسے ملک میں حکم شرعی یہ ہے کہ جس کو بینک سے سود مل رہا ہے اگر اسی شخص پر قانوناً ان لائسنسوں میں سے کوئی لائسنس لاگو ہو یعنی لینا ضروری ہو تو اس کو اپنے اس لائسنس میں سے دیدینا مثل انکم ٹیکس کی رقم کے دینے کے ضروری رہے گا اور ان کے بنوانے اور حاصل کرنے میں جو رقم بطور رشوت دی جاتی ہے اس میں سود والی رقم دینا درست نہیں رہے گا، اس لیے کہ اس میں ردالی رب المال کا تحقق نہ ہوسکے گا اور قانونایا واجبی اخراجات کا

۱- سورۂ بقرہ: ۳۰۔

۲- سورۂ احزاب: ۷۲۔

۳- سورۂ بقرہ: ۲۸۶۔

جملہ بہت مبہم ومجمل ہے۔ اس سے کیا مراد ہے، اور اس کی کیا حقیقت وتفصیل ہے واضح ہونے کے بعد جواب واضح ہوگا۔

ج - اس ٹیکس میں بھی مثل انکم ٹیکس کے پہلے دیدینا چاہیے۔

د- روڈ ٹیکس ومکان ٹیکس میں بھی دینے کا حکم انکم ٹیکس میں دیدینے کی طرح ہے، البتہ روڈ پر چلنے والوں کی حفاظت ومعاونت کا معقول انتظام منجانب حکومت ہو اور اس کے عوض میں یہ ٹیکس لیا جاتا ہو تو اس ٹیکس میں بینک کا سود دیدینے سے ذمہ سے بری نہ ہوگا، بلکہ اس ٹیکس میں اپنا ذاتی اور جائز پیسہ دینا ضروری رہے گا، اسی طرح جن شہروں میں مکانوں کی حفاظت کا پورا پورا انتظام منجانب حکومت ہوتا ہے جیسے آگ وغیرہ لگ جانے میں فائر بریگیڈ والے فوراً موقع پر پہونچ کر پوری محنت وجانفشانی سے تحفظ کا انتظام کرتے ہیں ان شہروں میں ہاؤس ٹیکس کو غیر شرعی نہ کہہ سکیں گے اور اس ٹیکس میں سود والی رقم دینے سے ذمہ بری نہ ہوگا۔

ھ- واٹر ٹیکس سے اگر مراد یہ ہے کہ حکومت کی طرف سے جو پانی گھروں میں یا سرکاری نہر سے کھیتوں میں لیا جاتا ہے اور اس کا چارج بل کی صورت میں دیا جاتا ہے تو یہ معاملہ عوض ومعاوضہ کا ہے، اس میں سود کا پیسہ دینا درست نہیں رہے گا بلکہ جائز اور صحیح پیسہ سے دینا ضروری رہے گا، اور اگر اور کچھ مراد ہو تو واضح کر کے لکھئے۔

و- سیل ٹیکس، ہاؤس ٹیکس، انکم ٹیکس جو ٹیکس بھی غیر شرعی منجانب حکومت ہو اس میں پہلے دیدینا چاہیے پھر ما بقیہ کو اس کے وبال سے بچنے کی نیت سے جلد از جلد فقراء ومساکین کو دے کر اپنی ملک سے نکال دینا چاہیے۔

ز- دکان بندی کے دن پولیس والوں کو بطور رشوت جو رقم دی جاتی ہے یا انسپکٹر کے چیک کر لینے پر جو جرمانہ دیا جاتا ہے اس میں بینک سے حاصل شدہ سود دینے سے ذمہ بری نہ ہوگا، کیونکہ ان صورتوں میں مال حرام کا ردالی رب المال نہ ہوگا۔

ح - گاڑی انشورنس ہو یا لائف انشورنس ہو یا کسی اور جائداد واملاک کا انشورنس، اس میں تو حسب ضابطۂ قانونِ وقت کچھ رقم جمع کرنی پڑتی ہے اور اس میں قمار وربوا دونوں ہوتا ہے اور ان دونوں کی حرمت بہ نص قرآنی منصوص ہے، اس لیے ان دونوں کا کرانا شرعاً حرام وناجائز ہے، البتہ ملکی حالات کی خرابی سے ایسی شدید مجبوری لاحق ہو جائے کہ بغیر اس کے حفاظت جان ومال متعذر وناممکن سا معلوم ہونے لگتے یا قانونی ایسی شدید معذوری لاحق ہو جائے کہ بغیر اس کے معیشت برقرار نہ رہ سکے تو ان شدید مجبوریوں میں حسب مجبوری وضرورت گنجائش ہو جاتی ہے (۱)۔

اور گنجائش ہو جانے کا مفہوم یہ ہے کہ آخرت میں محاسبہ تو اس عمل پر بھی ہوگا، اور حسب مجبوری واضطرار معاقبہ

۱- ''الضرورات تبیح المحضورات'' (الاشباہ والنظائر مع شرح الحموی ۱۰۸)۔

ومواخذہ بھی ہو مگر حسب مراحم خسروانہ، معافی تلافی کی امید بھی ہے کہ معافی ہو کر عذاب نہ ہو، اور حسب ضابطہ شرع ظاہر بھی یہی ہے، مگر بتقاضائے اعمالنا عمالنا اور بتقاضائے "کما تکونوا یولی علیکم" أو کماقال علیه الصلاة والسلام، نیز فرمان باری تعالیٰ ہے: "ان الله لم یک مغیر انعمة أنعمها علی قوم حتی یغیر وا ما بأنفسهم" (۱)، لازم ہے کہ ان توسعات پر عمل کرنے پر بھی استغفار کرتا رہے اور اللہ تعالیٰ سے دل سے یہ بھی دعا کرتا رہے، اللہ تعالیٰ سے کہتا رہے کہ اے اللہ! آپ جانتے ہیں کہ ہم اس فعل سے راضی نہیں ہیں صرف بوجہ مجبوری ومعذوری ایسا کرتے ہیں، آپ قادر ہیں، آپ ہمارے یہ حالات بدل دیجئے اور دل میں یہ نیت بھی برابر رکھے کہ واقعی جب یہ حالات بدل جائیں گے تو میں اس کے قریب بھی نہ جاؤں گا۔

اور ان حالات میں بوقت واپسی اپنی جمع کردہ جتنی رقم ہو اس کو بلاریب وصول کر لینا درست رہے گا اور اس سے زائد رقم میں اعلیٰ بات تو یہی ہوگی کہ خود استعمال نہ کرے بلکہ غرباء ومساکین کو اس کے وبال سے بچنے کی نیت سے دیدے لیکن چونکہ یہ معاملہ اپنی خوشی اور رضا سے نہیں کیا ہے اور یہ رقم کمپنی خود اپنے ضابطہ وقانون کے ماتحت خود اپنی خوشی سے اور اپنی مرضی سے دے رہی ہے تو ہندوستان جیسے ملک میں اس کا لے لینا مباح رہے گا بالخصوص جبکہ وہ شخص خود مصرف صدقہ ہو۔

اور اگر بغیر ان گنجائش صورتوں کے کوئی انشورنس کرالے گا تو سخت گنہ گار رہوگا، اور یہ روپے دینا بھی باعث وبال بنے گا اور اس دی ہوئی رقم سے زائد جو رقم ملے گی اس کے وبال سے بچنے کی نیت سے غرباء ومساکین کو دیدینا واجب رہے گا اور فقط اپنی اس دی ہوئی رقم کو واپس لے لینا بھی ازروئے فتویٰ درست رہے گا۔

البتہ اگر بغیر انشورنس وغیرہ کے کسی وقت اچانک ایکسیڈنٹ میں تلف جان یا مال ہو جانے پر یا چوری وغیرہ پیش آجانے پر کمپنی یا حکومت غرض جو کوئی بھی ازخود رقم دے وہ دینا دینے والے کا ازخود دینا ہوگا جو تبرع ہوگا اور اس کا لے لینا اور اپنے استعمال میں لانا مباح رہے گا اور تلف جان کی شکل میں اور منجانب حکومت ملنے میں دیت یا خون بہا کی شکل قرار دینے میں بھی اباحت کا یہی حکم باقی رہے گا جو ابھی مذکور ہوا، "هذاماعندي من الشرع الشريف فإن كان حقا وصحيحاً فمن الله والحمد لله عليه وإن كان غير حق أوغير صحيح فمني ومن نفسي وما أبرئ نفسي فعلى الله التكلان وهو الملهم للصواب"، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۶/۸/۱۴۰۷ھ

۱- سورۂ انفال: ۵۳۔

باب الرشوۃ

بحالت مجبوری رشوت دینا کیسا ہے؟

ایک شخص مسلم پی، ڈبلو، ڈی انجینیر، اس کا ایک کلرک بھی مسلمان ہے، وہ دوتین اہل ہنود کو اور اپنے کو رشوت دلانے کے لئے دوتین مسلم ٹھیکیداروں سے جو نماز پنجگانہ ادا کرتے ہیں اور اپنے کو شریف مسلمان بھی سمجھتے ہیں اور ان کے علاوہ دوتین ہندو ٹھیکیدار بھی ہیں، ان سبھی اشخاص ٹھیکیداروں سے مسلم انجینئر اور اس کا کارکن ٹھیکہ دیتے وقت ایسا اسٹیمیٹ بناتے ہیں کہ محکمہ کا آدھا روپیہ ٹھیکیدار اور یہ کارکنان مل کر کھا جاتے ہیں، جب کہ محکمہ اچھی خاصی تنخواہ دیتا ہے کہ سادگی کے ساتھ رہ کر سادہ کھانا کھا کر بسر اوقات کر سکتا ہے، لیکن یہ سب فضول خرچی اور عیاشی میں مبتلا ہیں اور یہ سب افعال رشوت کی بنا پر ہیں، اگر کوئی شخص ان لوگوں کو رشوت لینے سے منع بھی کرے تو اس کا جواب یہ دیتے ہیں کہ ہم وقت کے ساتھ چل رہے ہیں، ایسا نہ کریں تو ہمارا گذارہ نہ ہوگا۔

نسیم احمد (قصبہ دھام پور بجنور)

الجواب وباللہ التوفیق:

راشی، مرتشی یعنی رشوت دینے والا اور رشوت لینے والا دونوں جہنم کی آگ میں جلیں گے، اور ساتھ ساتھ جس کا حق اس سلسلے میں تلف ہوگا اس کا وبال بھی ان پر پڑے گا، دنیا میں بھی بے برکتی، ذلت ورسوائی اٹھانی پڑے گی، ایسے لوگ خسر الدنیا والآخرۃ کا مصداق ہو جاتے ہیں، اب انسان خود دیکھ لے، ایک پلہ میں آخرت کا نقصان رکھے، اور ایک پلہ میں دنیا کی چند روزہ پریشانیاں رکھ لے، پھر خود موازنہ کرے، دیکھ لے کہ کس کو اختیار کرنا چاہیے، دنیا کی پریشانی یا آخرت کی پریشانی، ظاہر ہے کہ آخرت کی تھوڑی پریشانی بھی دنیا کی ساری پریشانیوں سے بڑھ کر اور سخت ہے۔ باقی اگر اپنا جائز حق لینا

بغیر رشوت دیئے حاصل نہ ہو سکے تو رشوت دیدے، اور رشوت دینے والا گنہگار نہ ہوگا (۱)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دار العلوم دیوبند سہارنپور ۱۴/۱/۱۴۰۱ھ

ظلم وضرر سے بچنے کے لئے رشوت دینا:

آجکل عام طور پر شہروں اور قصبات وغیرہ میں جائز اور حلال طریقہ پر کسی بھی کاروبار کرنے کے راستہ میں مقامی یا دیگر سرکاری محکمہ کے ارکان نت نئی بندشیں اور رکاوٹیں عائد کرنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں جبکہ ان کے اس اقدام کی حمایت میں قوانین بھی کچھ اس قسم کے رائج ہیں جو حقیقۃً ظلم اور زیادتی پر مبنی ہیں، اب ایسی صورت میں اپنے کاروبار یا تجارت کو باقی رکھنے کی خاطر اگر انکو کچھ رقم یا بطور تحائف کچھ اشیاء وغیرہ دی جایا کریں جبکہ بغیر اس کے چارۂ کار نہ ہو اور نقصان کا احتمال ہو تو کیا یہ رشوت ہے اور شریعت میں رشوت کے کیا معنی ہیں۔

الجواب وباللہ التوفیق:

ظلم اور ضرر دفع کرنے کی مجبوری میں رشوت دینا جائز ہے، "الثالث: أخذ المال لیسوی أمرہ عند السلطان دفعا للضرر أو جلبا للنفع وھو حرام علی الآخذ" (۲)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دار العلوم دیوبند سہارنپور ۲۵/۷/۱۳۸۵ھ

الجواب صحیح محمود غفی عنہ

۱- "الضرورات تبیح المحظورات" (الاشباہ والنظائر مع شرح الحموی، ص ۱۰۸) "الرابع ما یدفع لدفع الخوف من المدفوع إلیہ علی نفسہ أو مالہ حلال للدافع حرام علی الآخذ، لأن دفع الضرر عن المسلم واجب، ولا یجوز أخذ المال لیفعل الواجب انتھی" (فتاوی شامی ۲/۲۱۶)۔ "الراشی والمرتشی فی النار" ان الفاظ کے ساتھ سیوطی نے جامع صغیر میں ذکر کیا ہے اور اس کی نسبت طبرانی فی الصغیر کی طرف کیا ہے، (الجامع الصغیر مع شرحہ فیض القدیر ۴/۴۳) اس کے علاوہ سنن ابوداؤد ۳/۳۰۰ کتاب الاقضیہ باب فی کراہیۃ الرشوۃ حدیث ۳۵۸۰ میں ان الفاظ میں مذکور ہے "عن عبد اللہ بن عمرو قال: لعن رسول اللہ ﷺ الراشی والمرتشی"۔ "عن ابی حرۃ الرقاشی عن عمہ قال قال رسول اللہ ﷺ: ألا لا تظلموا، ألا لا یحل مال امرئ إلا بطیب نفس منہ" رواہ البیہقی فی شعب الایمان والدارقطنی فی المجتبی (مشکوۃ المصابیح/۲۵۵)۔

۲- شامی ۸/۳۵ کتاب القضاء۔

حج کے لئے رشوت دینا:

موجودہ دور میں حج پر جانے اور واپس آنے پر خواہ سامان ہو یا نہ ہو بغیر رشوت کے بہت مشکل ہوتا ہے اگر رشوت دیدی تو چھوڑ دیا جاتا ہے ورنہ پریشان کرتے ہیں اور شریعت رشوت دینے کو ناجائز کہتی ہے، لہٰذا ایسی صورت میں کیا صورت اختیار ہو؟

الجواب وباللہ التوفیق:

حتی الوسع رشوت دینے سے بچنا چاہئے اور مجبوری میں دفع ظلم کے لئے اس کی گنجائش ہے، ''وإعطاء شئ لمن يخاف هجوه ولو خاف الوصی ان يستولی غاصب علی المال فله أداء شئ ليخلصه كما فی الخلاصه'' (۱)۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دار العلوم دیوبند سہارنپور ۲/۱۱/ ۱۳۸۵ھ
الجواب صحیح محمود عفی عنہ

اپنا حق وصول کرنے کے لیے رشوت دینا کیسا ہے؟

مسئلہ ذیل کی وضاحت مطلوب ہے! ابوبکر کی زمین زید ہڑپنا چاہتا ہے، تو کیا ابوبکر کچھ رشوت دے کر اپنی زمین کو نہ ہڑپنے دے، جائز ہے؟

الجواب وباللہ التوفیق:

اپنا جائز حق اگر بغیر رشوت دیئے نہ حاصل ہو تو رشوت دے کر اپنا حق حاصل کر لینے کی گنجائش رہتی ہے، البتہ رشوت لینے والا ہر حال میں گنہگار رہے گا، ''دفع المال للسلطان الجائر لدفع الظلم عن نفسه وماله ولاستخراج حق له ليس برشوة يعنی فی حق الدافع'' (۲)۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دار العلوم دیوبند سہارنپور ۲/ ۸/ ۱۴۱۱
الجواب صحیح: حبیب الرحمن خیرآبادی، محمد ظفیر الدین مفتاحی، کفیل الرحمن

۱- الاشباہ والنظائر القاعدۃ الرابعۃ/ ص ۲۴۹، مطبوعہ دار العلوم دیوبند۔
۲- رد المحتار ۵/ ۲۷۲۔

باب الرہن

مرتہن کے لئے شئ مرہون سے فائدہ اٹھانا:

زید نے اپنا کھیت بکر کے پاس رہن رکھا، بکر اس میں کاشت کر کے فائدہ اٹھاتا ہے جس کی وجہ سے زید کو لگان، یعنی مالگذاری دیتا ہے، اور رہن شدہ مکان میں رہتا ہے اور اس کا کرایہ دیتا ہے، تو کیا بکر کا مکان میں رہنا اور کاشت کرنا جائز ہے؟

الجواب وباللہ التوفیق:

اگر رہن شدہ کھیت کا لگان اتنا دیتا ہو، جتنا کہ ایک تیسرا آدمی (جس نے روپیہ نہ دیا ہو) دیتا ہے، اور پھر راہن کو اختیار بھی دیدیا ہو کہ تم جب چاہو گے ہم کاشت کرنا روک دیں گے، اسی طرح مکان کا کرایہ بھی اتنا دیتا ہو جس میں رہن کے دباؤ کا شبہ نہ ہو، اور راہن کو تخلیہ کا اختیار بھی دے رکھا ہو تو کاغذی اندراج کے ماتحت اگر چہ یہ معاملہ رہن کا ہے مگر شرعاً رہن کا معاملہ ہو کر اجارہ کا ہو جائے گا اور جائز رہے گا، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دار العلوم دیوبند سہارنپور ۱۹/۹/۱۸ ۱۴ھ

مدت متعینہ کے بعد شئ مرہون، مرتہن کی ہو جائے گی یہ شرط عقد رہن کے خلاف ہے:

کچھ اشخاص نے دوسرے اشخاص کے پاس چار ہزار روپیہ میں ساٹھ سال یا کچھ سال کی مدت کے لئے اپنی زمین گروی رکھی اور یہ شرط طے پائی کہ جتنے سال کی مدت مقرر ہوئی ہے اس مدت کے اندر رہن گروی زمین کو واپس چھوڑانی ہوگی، اگر مدت گزر گئی تو مرتہن (گروی لینے والا) زمین کا مالک بن جائے گا اور راہن (گروی دینے والے) کا کوئی حق نہیں رہے گا۔

(الف) کیا اس شرط کے مطابق مدت گزرنے پر مرتھن (گروی لینے والے) کے ورثہ جو اس وقت بقید حیات ہیں، رہن کے خریدار سمجھے جائیں گے یا مرتھن (گروی لینے والے) کے روپیہ کی سلامتی کے لئے زمین کو رہن (گروی) رکھنا درست سمجھا جائے گا۔

(ب) رہن گروی رکھی ہوئی زمین کو دنیوی شرط وقانون کے مطابق راہن گروی دینے والے کو نہ واپس کرنا اور احکام خداوندی وقانون قدرت کے مقابلہ میں دنیا کے قانون کو ترجیح دینا اور خدا کے احکام کا انکار کرنا، جھٹلانا اس پر کیا وعید ہے، کیا ایسی زمین مغصوب (لوٹی ہوئی) حرام ہوگی؟

(ج) اپنی دنیاوی اغراض کے لئے شرعی احکام کے خلاف کرنا، راہن (گروی دینے والے) کو زمین واپس لوٹانے سے روکنا یا جان بوجھ کر جھوٹا بہانے بنانا اور شرعی احکام کے ساتھ چالاکی کرنا اس پر کیا وعید ہے۔

(د) مرتہن (گروی لینے والے) کے ورثہ یا خریدار نے یہ بوئی ہوئی زمین دوسرے اشخاص کو فروخت کردی تو ان خریدواروں کے لئے یہ زمین حلال ہوگی نیز ایسی زمین میں نماز صحیح ہوگی کب تک اس زمین میں نماز درست نہ ہوگی اس کا گناہ کن کن لوگوں پر کس حد تک رہے گا۔

(ھ) شرعی احکام کے مطابق رہن (گروی) رکھی ہوئی زمین راہن (گروی دینے والے) کو واپس لوٹائے بغیر مرتہن گروی لینے والے کے ورثہ کی توبہ قبول ہوگی ایسے اشخاص کی توبہ قبول ہونے کے لئے کیا شرائط ہیں مرتہن (گروی لینے والے) کے کہاں تک کے ورثہ گناہ میں شریک شمار ہوں گے۔

حسین ابراہیم

الجواب وبالله التوفيق:

جو چار ہزار روپیہ میں زمین رہن رکھا ہے یہ جائز اور درست ہے لیکن اس نے جو شرط لگائی کہ اگر مدت گزر گئی تو مرتھن زمین کا مالک بن جائے گا، یہ شرط غلط ہے، عقد رہن کے تقاضہ کے خلاف ہے، لیکن اسکے باوجود عقد رہن درست وباقی رہے گا، کیونکہ عقد رہن اس قسم کے شرط لگانے سے بیع کی طرح فاسد نہیں ہوتا ہے یعنی بیع جس طرح شرط فاسد سے فاسد ہوجاتی ہے رہن اس طرح شرط فاسد سے فاسد نہیں ہوتا ہے، ''ہدایہ'' کے حاشیہ میں ہے:

''ولو تفرق الرهن بتفرق التسمية لا يتضرر بالراهن (الى قوله وهو شرط فاسد والبيع يفسد

به أما الرهن فلا يفسد بالشرط الفاسد لانه تبرع كالهبة"(۱)، لہذا یہ عقدرہن اسی قاعدہ کے تحت ''كل شرط لايقتضيه العقد وفيه منفعة لأحد المتعاقدين أو للمعقود عليه وهو من أهل الإستحقاق يفسده" (۲) داخل ہوکر فاسدنہیں ہوگا جب یہ عقد صحیح ہوگیا تو جب تک دین کی پوری ادائیگی نہ ہوگی مرتہن کے ہاتھ میں یہ زمین بطور مرہون ہی رہے گی، ''عنایہ''میں ہے:

"الرهن يبقىٰ مضمونا ما دام القبض والدين باقيا" (۳)۔

اورعقدرہن کسی کےنزدیک چاہے راہن ہو یا مرتہن باطل نہیں ہوتا ہے، شامی میں ہے: "الرهن لايبطل بموته (الراهن) ولا بموت المرتهن"(۴)۔

لہذا مرتہن کے انتقال کرجانے سے ان کے ورثاء کے ہاتھ یہ زمین بطوررہن ہی رہے گی اور اس کو بیچنایا اورکوئی تصرف کرنے کایا اس سے انتفاع حاصل کرنے کا کچھ بھی مرتہن کے ورثہ کوحق نہیں اگر کرے گا تو وہ گنہگار ہوگا، ''شامی''میں ہے:

"لا يحل له (للمرتهن) ان ينتفع بشي منه بوجه من الوجوه وإن أذن له الراهن لأنه أذن في الربوا لأنه يستوفي دينه كاملا فتبقى له المنفعة فضلا فيكون ربا وهذا أمر عظيم "(۵)اورفتح القدیر (۶) میں ہے: "وليس للمرتهن أن ينفع بالرهن وليس له أن ينتفع لانه ليس له ولا ية الانتفاع بنفسه فلا يملك تسليط غيره عليه فان فعل كان متعديا ولا يبطل عقد الرهن بالتعدى"۔

اس سےنمبر الف کا جواب آ گیا کہ شرط کےمطابق مدت گزرنے سے مرتہن کے ورثاء کو جو بقید حیات ہیں زمین کا خریدار سمجھانہیں جائے گا بلکہ زمین کوشرعاً رہن ہی سمجھا جائے گا مثلاً نیز اس سے نمبر (د) کا بھی جواب معلوم ہوگیا کہ مرتہن کے ورثاءکو وہ زمین دوسرے اشخاص کے ہاتھ فروخت کرنے کا حق نہیں اور نہ یہ درست ہے، اگر فروخت کردیا ہے تو یہ راہن

۱- حاشیہ ہدایہ ۴/ ۵۳۵، مکتبہ اشرفیہ دیوبند۔

۲- ہدایہ ۳/ ۱۳۴۔

۳- عنایہ علی ہامش فتح القدیر ۸/ ۲۰۱ مطبعۃ الکبریٰ، الامیریہ بمصر، اور الدرالمختار میں ہے: "حكم الرهن الحبس الدائم حتى يقبض دينه"(الدرالمختار ۲/ ۲۶۶-۲۶۷۔ الردالمحتار مع الدر ۱۰/ ۹۱، مکتبہ زکریا دیوبند)۔

۴- شامی ۵/ ۳۴۶۔

۵- شامی ۵/ ۳۴۷۔

۶- ہدایہ ۴/ ۵۲۲، مکتبہ اشرفیہ دیوبند یہ عبارت علامہ ابن الہمام کی نہیں ہے فتح القدیر کا حوالہ دینے میں تسامح ہے۔

کے اختیار پر موقوف رہے گا اگر راہن اجازت دیدے تو بیع فاسد ہوگی اور اگر راہن چاہے تو اس بیع کو ختم کر کے زمین کو واپس لے لے تو اس کا بھی اس کو حق ہے، ''شامی'' میں ہے:

''**و کذا توقف علی اجازة الراهن بیع المرتهن فإن اجازه جاز وإلا فلا وله أن یبطله ویعیده رهنا**'' (۱)، یعنی اگر راہن نے اجازت دیدی تو یہ بیع صحیح ہونے کی وجہ سے خریدار کے لئے وہ زمین حلال ہوگی اور اگر راہن کی اجازت کے بغیر جبراً قبضہ کر رکھا ہے راہن کو دیتا نہیں تو اس زمین میں نماز مکروہ ہوگی، ''الدر المختار'' میں ہے:

''**تکره الصلوة فی الکنیسة (الی قوله) فی الصلواة فی الأرض المغصوبة**'' (۲) ''**وقال الشامی: فالصلوة فیها مکروه تحریماً فی قول**'' (۳)۔

لہٰذا یہ زمین جب تک ایسے حالات میں رہے گی اس میں نماز مکروہ ہوگی اور مرتہن کے ورثہ جو اس زمین کو بیچنے والے ہیں اگر وہ معاملہ کی صفائی نہ کریں تو وہ گنہگار ہوں گے اور اگر زمین کے خریدنے والے ہی معاملہ کی صفائی کرنے نہ دیں جس پر اس زمین کو واپس کرنا لازم تھا، جیسے ''شامی'' میں ہے:

''**الحاصل أنه إن علم ارباب الأموال وجب رده علیهم وإلا فإن علم عین الحرام لایحل له**'' (۴) تو وہ بھی گناہ میں شامل ہوں گے۔

جواب: (ب، د، ج) شئی مرھون کی قیمت عموماً دین سے زائد ہوتی ہے اور جو زائد ہوتی ہے وہ مرتہن کے ہاتھ امانت ہوتی ہے، ''ہدایہ'' میں ہے: ''**لأن الزیادة علی مقدار الدین أمانة**'' (۵)، ص ۵۰۶ ج ۴ فتح القدیر میں ہے:

''**وإن کانت قیمة الرهن أکثر فالفضل أمانة فی یده**'' (۶)۔

۱- شامی ۵/ ۵۰۴۔

۲- الدر المختار علی حاشیہ رد المحتار ۱/ ۳۵۳۔

۳- شامی ۱/ ۳۵۴۔

۴- شامی ۴/ ۱۸۰۔

۵- ہدایہ ۴/ ۵۲۲ مکتبہ اشرفیہ۔

۶- (قدوری ص ۸۸ مکتبہ امدادیہ دیوبند۔ ہدایہ ۴/ ۵۱۹، فتح القدیر کا حوالہ دینے میں تسامح ہے)۔ فی یدہ (ای فی ید المرتہن) ص ۱۹۸ ج ۸ جس کو بحکم عند و عند قدوس لوٹانا فرض ہے قرآن کریم میں ہے: ''ان اللہ یامرکم ان تودوا الامٰنٰت الی اھلھا'' (سورۂ نساء: ۵۸) اور چونکہ اس میں تجزی نہیں ہوتی ''کما فی الهدایة: الرهن اضیف الی جمیع العین وهذا مما لا یقبل الوصف بالتجزی فصار محبوسا لکل واحد'' (ص ۵۱۹ ج ۴)، اسلئے پوری زمین کو واپس کرنا جب راہن قرضہ (دین) ادا کرے تو ضروری ہے ورنہ وہ زمین مغصوبہ حرام ہوگی، حدیث شریف میں ان لوگوں

اور دنیوی قانون کو احکام شرع پر ترجیح دینا اگر اھانۃً ہے تو فقہاء نے اس کے بارے میں من اھان الدین فقد کفر جیسی وعید کا حکم بیان فرمایا ہے اور قرآن کریم میں بھی مختلف وعیدیں آئی ہیں فرمایا ہے: "ومن لم یحکم بما انزل الله فاولئک هم الکافرون"(۱)، دوسری آیت میں ہے: "ومن لم یحکم بما أنزل الله فأولئک هم الظالمون"(۲)، اور ایک دوسری آیت میں ہے: "ومن لم یحکم بما انزل الله فاولئک هم الفاسقون"(۳)، اسی طرح دینوی اغراض کے لئے شرعی احکام میں جھوٹے بہانے بنانا گناہ ہے۔

جواب: (ھ) جن لوگوں نے شئی مرھون میں بیع وغیرہ خلاف شرع کام کر لئے ان کی توبہ قبول ہونے کے لئے شرط یہ ہے کہ وہ اس معاملہ کو شریعت کے مطابق صاف کر لیں، یعنی راھن کو ان کا حق ادا کر کے راضی کر لیں یا معافی تلافی کر لیں شرح فقہ اکبر میں ارکان توبہ بیان کرتے ہوئے لکھا ہے: "إن أرکان التوبة ثلاثة"(۴)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دار العلوم دیوبند سہارنپور ۹/ ۲/ ۱۴۰۲ھ

کے لئے جو اس طرح ظلماً قبضہ کئے ہوئے ہوتے ہیں سخت وعید ہے مشکوۃ شریف میں ہے: "عن سعید ابن زید قال قال رسول الله ﷺ: من أخذ شبراً من الأرض ظلماً فإنه یطوقه یوم القیامة من سبع أرضین" (متفق علیہ ص ۲۵۴)۔

۱- سورۂ مائدۃ ۴۴۔

۲- سورۂ مائدۃ ۴۵۔

۳- سورۂ مائدۃ ۴۷۔

۴- (۱) "الندامة علی الماضي (۲) والاقلاع في الحال (الی قوله) وان کانت عما یتعلق بالعباد، فإن کانت من مظالم الأموال فتتوقف صحة التوبة منها مع ما ذکرناه في حقوق الله تعالیٰ علی الخروج عن عهدة الأموال وإرضاء الخصم في الحال والاستقبال بان یتحلل منهم او یردها الیهم" (شرح فقہ الاکبر ۱۴۴ ص ۱۴۴، دار الکتب العربیۃ الکبریٰ بمصر)۔

باب الهبہ

شوہر کا کہنا مکان اورسب مال میری بیوی کا ہے کیا یہ ہبہ ہے؟

زید نے اپنی بیوی خالدہ بیگم کے متعلق اپنی زندگی میں چندمرتبہ لوگوں کے سامنے بار ہا یہ کہا کہ یہ گھر بھی تمہارا ہے اور سب کچھ تمہارا ہے اور یہ کہا کہ یہ مکان بھی میری بیوی کا ہے اورسب مال میری بیوی کا ہے، ایک عرصہ کے بعد زید کا انتقال ہوگیا، انتقال کے وقت زید کے ہوش وحواس بالکل درست تھے، لیکن بیماری کی وجہ سے رجسٹری بند ہونے کی بناپر بیوی کے نام ایک اقرارنامہ بشکل بیع نامہ لکھ دیا، بیماری کی وجہ سے دستخط نہ کرسکا انگوٹھا لگادیا، سوال یہ ہے کہ مذکورہ بالاصورت میں مکان اور متروکہ مال کی وارث صرف بیوی ہوگی یا شوہر کے دوسرے بھائی بھی وارث ہوں گے کیونکہ بیوی نے زید کی حیات ہی میں کافی مال چند اشخاص کے پاس بطور امانت رکھ دیا تھا۔

حافظ نوراحمد عرف مکن (کیرانہ ضلع مظفرنگر، یوپی)

الجواب وبالله التوفيق:

بیوی کے بارے میں شوہر کا محض یہ کہنا (یہ گھر بھی تمہارا ہے اورسب کچھ تمہارا ہے یا یہ کہنا کہ یہ مکان بھی میری بیوی کا ہے اورسب مال میری بیوی کا ہے) اثبات ہبہ کے لئے کافی نہ ہوگا، ہاں اگر اس کہنے کے وقت عقدھبہ کے الفاظ بھی بول دیا ہو، یا پہلے اس کے ھبہ کرچکا ہواور اس کی اس وقت وہ خبر دے رہا ہو اور بعد اس ہبہ کے مکان اور سامان کو اپنے قبضہ دخل سے نکال کر بالکل بیوی کے قبضہ دخل میں دے چکا ہوتو اس صورت میں یہ مکان اور سب سامان تنہا بیوی کا ہوگا، اورشوہر کا متروکہ شمار نہ ہوگا اور اگر ایسا نہیں ہوا ہے تو یہ ہبہ غیر مقبوض اور غیر تسلیم شدہ ہوکر غیر مفید اور بیکار ہوگا اور زید ہی کا ترکہ شمار ہوکر حسب تخریج شرعی سب ورثہ شرعی پر تقسیم ہوگا کما یوخذ من هذه العبارة أيضاً "ولو وهب داراً دون ما فيها من

متاعہ لم یجز" (۱)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہٗ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند، سہارنپور ۱۳/۲/۱۴۰۱ھ

کیا اقرارنامہ یا حلف نامہ باعث ملک ہے:

تقریباً پندرہ سولہ سال کا عرصہ ہوا کہ زید کے والد نے ایک حلف نامہ کا اقرارنامہ نوٹری ٹکٹ لگا کر اور ایک پنچ نامہ بھی لکھدیا جس کا مضمون یہ تھا کہ ہم نے اپنے آٹھ لڑکوں کو مکان، کاروبار گرہستی کا مالک بنایا، آج سے برابر کے حق دار ہیں، ایک لڑکا آٹھوں میں سے ۱۹۷۰ء میں علیحدہ ہونے لگا اس وقت تقریباً دوسو کرگھا تھے۔ علیحدہ ہونے والے سے والد اور بڑے بھائی نے کہا آپ صرف دو کرگھا لیں اس لئے کہ آپکو کوئی تجربہ نہیں اور جو کچھ تمہارا شرعی حصہ ہے دیدیا جائے تو تم محفوظ نہیں رکھ سکتے لیکن تمہارا حصہ کچھ مہینے بعد ہم دیں گے، علیحدہ ہونے والے کے اصرار پر بڑے بھائی نے چند پنچان کو جمع کیا جن کی موجودگی میں والد صاحب اور بڑے بھائی نے کہا کہ یہ دو کرگھا لیکر علیحدہ ہوجائیں، چار پانچ ماہ بعد انکا شرعی حق اور حصہ دے دیں گے، دو کرگھا کے سامان کی قیمت اور عیدالفطر کے مصارف اور کھانے پکانے کے سامان کی قیمت مجموعی دو ہزار چھ سو پچیس روپے علیحدہ ہونے والے کو ملے، دریافت طلب یہ ہے کہ علیحدگی کے وقت ۱۹۷۰ء میں جو اثاثہ جائیداد منقولہ اور غیر منقولہ تھی اس حساب سے شرعی حصہ ملے گا یا ۱۹۸۰ء میں جو پوزیشن ہے اس اعتبار سے؟ بینوا توجروا

نوٹ: اگر زید کے اقرارنامہ کے بعد والد نے دوبارہ زید کی عدم موجودگی میں دوسرا اقرارنامہ صرف سات لڑکوں کو لکھ دیا تو کیا اقرارنامہ صحیح ہے؟ اور زید اپنے حق وحصہ سے محروم ہوجائے گا۔

شمس الدین

الجواب وباللہ التوفیق:

پندرہ سولہ سال قبل والد نے جو اقرارنامہ یا حلف نامہ لکھا کہ (ہم نے اپنے آٹھ لڑکوں کو مکان کاروبار الخ) تو اس تحریر کو اگر ہبہ کہا جائے تو چونکہ تخلیہ وتفویض وافراز یعنی بعد ہبہ ہر لڑکے کا حصہ تقسیم کرکے اپنے قبضہ اور دخل سے نکال کر الگ الگ ان لڑکوں کے قبضہ ودخل میں نہیں دیا، اس لئے یہ ہبہ شرعاً غیر مفید وغیر نفع بخش رہا (۲)، اور اگر اس تحریر کو وصیت نامہ کہا

۱- ردالمحتار علی الدرالمختار ۸/ ۴۹۳۔

۲- "وتتم الھبة بالقبض الکامل" (درمختار مع ردالمحتار ۸/ ۴۹۳)۔

جائے تو حدیث پاک ''لا وصیة لوارث'' (۱)، اَوکما قال کے تحت یہ وصیت بھی صحیح نہیں، اسی طرح بعد میں جو دوسری تحریر زید کی عدم موجودگی میں لکھا ہے اگر وہ بھی اسی قسم کی ہے جو اوپر والی ہے تو وہ بھی شرعاً غیر نافع اور بیکار ہے بلکہ شرعاً والد تمام املاک وکاروبار کا مالک ہے اور سب املاک وکاروبار والد کے انتقال کے بعد حسب تخریج شرعی تقسیم ہوگا اور تمام لڑکے بشمولیت زید برابر کے حق دار رہیں گے۔

اور حق وارث بعد موت مورث متحقق ہوتا ہے پہلے نہیں، البتہ دوکرگھا کے سامان وغیرہ کی قیمت جس کا مجموعہ دوہزار چھ سو پچیس روپے ہوئے ہیں اس کا مالک تنہا زید ہوگیا اور اس دوکرگھا پر جتنی ترقی ہوگی اور اس کے ذریعہ جتنا اضافہ ہوگا اس کا تنہا زید مالک ہوگا (۲)، لہذا ایسی صورت میں ۷۰ء اور ۸۰ء کی قیمت وحیثیت کے فرق کی کوئی بحث ہی نہ پیدا ہوگی، فقط واللہ تعالی اعلم

نوٹ: زید کے الگ ہوجانے سے زید اپنے باپ کے ترکہ کی وراثت سے محروم نہ ہوگا (۳)۔

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند، سہارنپور ۱۹/۳/۱۴۰۱ھ

ہبہ میں ملکیت کے لئے قبضہ شرط ہے:

مرحوم نے مندرجہ ذیل اولاد چھوڑی تو جائیداد منقولہ اور غیر منقولہ جائیداد کس طرح تقسیم ہونی چاہئے۔

محمد جان مرحوم

۱۔ لڑکی	۲۔ لڑکی	۳۔ لڑکی
آمنہ بی	مغلانی بی	نورجہاں عرف مکو بی
محمد دین لڑکا	مغیث الرحمٰن	بہن بھائی

محمد جان کی لڑکی۔ ۲ کا انتقال انکی حیات میں ہوا اور اپنا لڑکا مرحومہ نے خدا کو درمیانی رکھکر والد کے سپرد کیا، اس

۱- ''عن أبي أمامة الباهلي رضي الله عنه قال سمعت رسول الله ﷺ يقول في خطبته عام حجة الوداع: إن الله قد أعطى لكل ذي حق حقه فلا وصية لوارث..... الحديث'' (سنن الترمذی ۴/۳۳۳ باب ماجاء لاوصیۃ لوارث حدیث نمبر ۲۱۲۰، ۲۱۲۱)۔

۲- کیونکہ اس علیحدہ کردہ حصہ پر اس کا قبضہ پایا گیا، ''وتتم الهبة بالقبض الكامل'' (درمختار مع ردالمحتار ۸/۴۹۳)۔

۳- ''ما يستحق به الإرث شيئان: النسب والسبب، فالنسب على ثلاثة أنواع المنسوبون إليه وهو الأولاد'' (البحر الرائق ۹/۳۶۵)۔

کی پرورش کی پوری پوری ذمہ داری کا عہد لیا، چنانچہ انہوں نے بحیثیت والد کے اس بچے کی پرورش کی اور تاحیات اپنے سے جدا نہ کیا حتی کہ اپنی حیات میں اپنی جائیداد غیر منقولہ تقسیم کی جس میں اس لڑکے کو بھی پورا پورا حصہ دیا اور اپنے عہد کو فرض اولین ہمیشہ سمجھا بعد ازاں محمد جان کے انتقال کے وقت لڑکا موجود نہ تھا اور لوگوں نے دو روز بعد اطلاع دی چنانچہ جب تک پہنچتا، تمام تر فیصلہ مکمل کر کے لڑکے کو جائیداد غیر منقولہ سے محروم کر دیا جاتا ہے جب کہ مرحوم نے اپنی حیات میں اس کو جائیداد غیر منقولہ پر قابض کر دیا تھا اور ہمیشہ ساتھ رکھا کرتے تھے، کیا بروئے شرع کوئی حق پہنچتا ہے یا پھر ان دونوں بہنوں پر تقسیم مساوی ہوگی تفصیل سے آگاہ فرمائیں۔

مجیب الرحمٰن منصوری و محمد دین (۱۰۴۳ گلی راجان فراش خانہ دہلی)

الجواب وباللہ التوفیق:

جتنی جتنی جائیداد منقولہ اور غیر منقولہ محمد جان نے تقسیم کر کے اپنے عیال میں سے جس جس کو بالغ ہونے کے بعد دی ہے اور قبضہ کرا دیا ہے یا بالغ ہونے سے پہلے دی ہے اگرچہ قبضہ نہ کرایا ہو اتنی اتنی جائداد ان افراد میں سے ہر ایک کی ملک ہے، ان میں سے کسی فرد کو اس کے حق وملک سے محروم کرنا ناجائز ہے، پس مغیث الرحمٰن کو اس کی نابالغی کے زمانہ میں جتنی چیزیں ہبہ کر کے دیدی گئیں اگرچہ اس پر مغیث الرحمٰن کا قبضہ نہیں کرایا تھا اور اپنے قبضے سے نہیں نکالا تھا جب بھی وہ مغیث الرحمٰن ہی کی قرار پائیں گی اور جو چیزیں بالغ ہونے کے بعد مغیث الرحمٰن کو دے کر قبضہ بھی کرا دیا ہے وہ بھی مغیث الرحمٰن کی ہوگئیں ان چیزوں سے اس کو محروم کرنا جائز نہیں ظلم ہے۔

بقیہ جائداد منقولہ اور غیر منقولہ محمد جان کا ترکہ ہے جو اس کے ورثاء کے درمیان حسب قاعدہ شرعیہ تقسیم کیا جائے گا، لہذا اگر محمد جان کے پس ماندگان یہی مذکورہ افراد ہیں تو یہ ترکہ آمنہ بی اور نور جہاں عرف مکو بی کے درمیان برابر برابر تقسیم ہوگا یعنی حقوق مقدمہ علی الارث (جیسے قرضہ اور وصیت وغیرہ) کی ادائیگی کے بعد ترکہ دو سہام پر منقسم ہو کر ایک سہام آمنہ بی کو اور ایک سہام نور جہاں عرف مکو بی کو ملے گا اور اس ترکہ میں سے مغیث الرحمٰن کو کچھ نہیں ملے گا۔

"وهبة من له ولاية على الطفل وهو كل من يعوله فدخل الأخ والعم عند عدم الاب لو في عيالهم تتم بالعقد الخ" (الدر المختار علی ہامش الطحطاوی ۴/ ۳۹۸)(۱)۔

۱- الدر المختار مع رد المحتار ۸/ ۳۹۸، ۳۹۹، "وفيه: وهبة من له ولاية على الطفل في الجملة وهو كل من يعوله .... الخ وفي

"وقوله على الطفل اخرج به الولد الكبير فان الهبة لا تتم الا بقبضه ولو كان في عياله" (حاشیۃ الطحطاوی علی الدر ۳/ ۳۹۸)(۱)۔

"والظاهر أن القول في أنه لا يشترط عدم الأب في الهبة الصادرة من الأجنبي يأتي هنا والمراد بالأب من له ولاية التصرف في ماله" (حوالہ بالا ۳/ ۳۹۸)(۲)۔

"ولو قبض له من هو في عياله مع حضور الأب قيل: لا يجوز وقيل: يجوز والصحيح الجواز الخ" (۴/ ۵۱۳)(۳)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند، سہارنپور ۳/ ۴/ ۱۴۰۱ھ

زندگی میں اپنی تمام جائداد اپنے لڑکوں کو لکھ دینا:

مسمی برساتی میاں کے تین لڑکے مسمیان ڈومن، علی حسین اور محمد حسین تھے تینوں شادی شدہ تھے۔ برساتی میاں نے اپنی زندگی میں اپنی ساری جائداد منقولہ وغیر منقولہ انہی تینوں لڑکوں کو بذریعہ دستاویز رجسٹری ہبہ کر کے مالکانہ حیثیت کردی تھی، برساتی میاں کی موجودگی میں پہلے ڈومن بعد ازاں علی حسین دولڑکے قضا کر گئے، اس دوران تیسرے لڑکے محمد حسین جو بقید حیات تھے کی بیوی کا انتقال بھی ہوگیا، مسمی ڈومن مرحوم کی بیوی مسماۃ صبیحن کے بطن سے دولڑکیاں اور ایک لڑکا مسمی دوست محمد نابالغ تھا اور مسمی علی حسین کی بیوہ معصومہ کے بطن سے ایک لڑکا محمد شفیع کمسن تھا۔

چوں کہ برساتی میاں کی مذکورہ بالا دونوں بہویں مسماۃ صبیحن ومسماۃ معصومہ بیوہ ہوچکی تھیں اور دونوں ابھی نوجوان عقد ثانی کے قابل تھیں اور دونوں کے بچے پرورش کے محتاج تھے اور برساتی میاں ایک بڑے دولت مند کاروباری آدمی تھے

ردالمحتار تحت قوله "في الجملة": أي ولو لم يكن له تصرف في ماله۔ الدر المختار علی ہامش حاشیۃ الطحطاوی علی الدر ۳/ ۳۹۸ میں بھی اسی طرح ہے۔

۱- حاشیۃ الطحطاوی علی الدر المختار مطبوعہ المکتبۃ العربیہ کانسی روڈ کوئٹہ ۳/ ۳۹۸، وفی ردالمحتار تحت قولہ "على الطفل" فلو بالغا يشترط قبضه ولو في عياله" (۸/ ۴۹۹)۔

۲- حاشیۃ الطحطاوی علی الدر المختار ۳/ ۳۹۸، "وفيه: والظاهر أن القول الصحيح الآتي في أنه ...... الخ"۔

۳- وفی ردالمحتار علی الدر المختار ۸/ ۵۰۰، "قلت: لكن في البرجندي: اختلف فيما لو قبض من يعوله والأب حاضر فقيل لا يجوز والصحيح هو الجواز"۔

اور گھر میں ہر طرح کی خوشحالی تھی انہوں نے دونوں بہو کا نکاح (عقد ثانی) اپنے تیسرے لڑکے محمد حسین کے ساتھ کر دیا تا کہ دونوں بہویں بچوں کو چھوڑ کر کہیں اور جگہ عقد کر کے نہ جانے پائیں۔ بچوں کو لے کر رہ جاویں سب کی پرورش ایک ساتھ ہو دونوں بھائیوں کے مرنے کے بعد بر ساتی میاں بھی قضاء کر گئے اس کے بعد مسماۃ صحکن کے بطن سے محمد حسین کے نطفے سے نبوت نذیر بعد از ان نبین اور آمنہ پیدا ہوئیں نبوت اور نبین بچپنے میں ہی گذر گئی نذیر اور آمنہ بقید حیات ہیں ان کے ماں باپ صحکن و محمد حسین بھی چند سال ہوئے مر چکے ہیں۔

مسماۃ معصومہ جو محمد حسین کی بیوہ بھاوج بعد از ان منکوحہ دوسری بیوی تھی ان کے بطن سے محمد حسین کے نطفے سے صرف ایک لڑکا مسمی دین محمد پیدا ہوا چونکہ مسماۃ معصومہ کے میکے میں بجز ان کے بوڑھے سن رسیدہ باپ مسمی گوبر میاں کے اور کوئی نہ تھا۔ بوڑھی ماں بھی مر چکی تھی اس لئے باپ کی خدمت گذاری اور دیکھ بھال نیز باپ کی جائداد منقولہ وغیرہ منقولہ کے حصول کے پیش نظر (جو گوبر میاں کو اپنے دونوں بھائیوں جھبو اور پیر بخش سے خانگی بٹوارہ کے بعد ملی تھی) اپنے دونوں لڑکے محمد شفیع ابن علی حسین مرحوم و دین محمد ابن محمد حسین کو لے کر کوپا گنج اپنے میکہ میں اپنے شوہر محمد حسین کے نان ونفقہ سے بے نیاز ہو کر رہنے سہنے لگی، دین محمد سات آٹھ سال کا تھا وہ بھی اپنی ماں معصومہ کے ساتھ ہے، اب لے دے کے گوبر میاں کے دونوں بھائیوں جھبو و پیر بخش سے جائداد بچانے کے لئے گوبر میاں نے اپنی ساری جائداد حسب تفصیل ذیل دو قطعہ مکان خام سفالہ پوش اور ایک قطعہ آراضی بشکل احاطہ دونوں نواسوں مسمیان محمد شفیع و دین محمد برادران اخیافی بذریعہ رجسٹری دستاویز ہبہ کر کے بخش دیا مگر جائداد موہوبہ مشترک مابین ہر دو برادران اخیافی تھی گوبر نے اپنی زندگی میں بٹوارہ نہیں کیا اور اسی دوران میں دین محمد (بن محمد حسین) کا جو محمد شفیع (بن علی حسین) کا اخیافی تھا انتقال بھی ہو گیا بعد از اں گوبر میاں و معصومہ و محمد شفیع اور ان کے چچا محمد حسین والد دین محمد یکے بعد دیگرے انتقال کر گئے۔ اور جو جائداد غیر منقولہ محمد شفیع و دین محمد کو مشترک گوبر میاں نے ہبہ کیا تھا اس پر محمد شفیع کی اولاد قابض اور دخیل ہے اور اپنے کو بلاشرکت غیرے اس جائداد کی مالک تصور کرتی ہے۔

اب محمد نذیر اور آمنہ جو صحکن کے بطن سے محمد حسین کی اولاد ہیں اور دین محمد کے علاتی بھائی بہن، دین محمد کی من جانب گوبر میاں کی موہوبہ جائداد پر دعویدار ہیں اور اپنا حق جتلاتے ہیں کہ دین محمد کی موہوبہ نصف جائداد موہوبہ منجانب گوبر میاں ہم کو ملنی چاہیے۔

اب علماء کرام و مفتیان عظام صورت مذکورہ بالا میں کیا حکم دیتے ہیں، کیا محمد نذیر اور آمنہ دین محمد کی جائیداد موہوبہ کے حقدار ہیں یا نہیں، ایک بات اور واضح کر دینا ضروری ہے کہ محمد شفیع ہی نے اپنے بھائی، گوبر اور ماں معصومہ اور برادر اخیافی

دین محمد کی تازیست پرورش کی اور مرجانے پر ان کی تجہیز وتکفین پر مصارف بھی برداشت کئے۔ بینوا توجروا

حاجی حبیب اللہ، محبوب عالم، عبدالغنی (سبزی منڈی، مئو)

الجواب وباللہ توفیق:

اگر تحریر کردہ واقعات اس طرح ہیں جس طرح تحریر ہیں تو صورت مسئولہ کا شرعی حکم یہ ہے کہ گوبر میاں کے ہبہ کرنے کے وقت اگر محمد شفیع ودین محمد دونوں نابالغ تھے اور اگر گوبر میاں ہی کے زیر کفالت وزیر تربیت تھے تو جتنی جائداد وچیزیں گوبر میاں نے ان دونوں کو ہبہ کیا ہے سب کے نصف نصف کے حقدار ومالک دین محمد ومحمد شفیع ہوگئے (۱)، اور یہ الگ بات ہوگی کہ گوبر میاں نے اپنے بھائیوں کو محروم کرنے کی وجہ سے اگر ایسا کیا ہے تو وہ گنہگار رہوں باقی ہبہ میں اس سے فتور نہ پڑے گا، پھر دین محمد کے انتقال کے وقت چونکہ اس کے باپ محمد حسین زندہ تھے، اس لئے دین محمد کا سب ترکہ وحق تنہا محمد حسین کو از روئے تخریج پہنچ گیا، پھر سوال سے معلوم ہوتا ہے کہ دین محمد کا انتقال محمد شفیع کے مرنے سے پہلے ہوا ہے پس یہ بات بھی صحیح ہے تو محمد حسین کا جتنا ترکہ وملکیت تھی سب تین برابر حصے ہوکر دو حصہ نذیر احمد کا حق ہوگیا اور ایک حصہ آمنہ کا حق ہوگیا، دین محمد کو جو کچھ گوبر میاں سے ملا تھا اس کا بھی یہی حکم ہوگا اور اس صورت میں محمد شفیع کا حق صرف گوبر میاں کی نصف جائداد کا ہوگا اور یہی نصف جائداد محمد شفیع کے لڑکوں کا حق ہوگا زائد کا حق نہ ہوگا اور محمد شفیع کا انتقال محمد حسین کے انتقال کے بعد ہوا ہے تو محمد حسین کا کل ترکہ پانچ برابر حصہ کرکے دو حصہ محمد شفیع کا حق ہوگا (۲) اور دو حصہ نذیر احمد اور ایک حصہ آمنہ کا ہوگا اور یہی حکم اس نصف جائداد ومال کا بھی ہوگا جو دین محمد کو گوبر میاں سے بذریعہ ملا تھا۔ غرض محمد شفیع کا جو کچھ حق ہوگا صرف وہی محمد شفیع کی اولاد کی طرف منتقل ہوگا نہ کہ گوبر میاں کا کل موہوب۔

(نوٹ) تازیست بلا معاہدہ پرورش کرنے سے اور تجہیز وتکفین کے مصارف بلا کسی معاہدہ کرنے سے اس حکم میں کوئی فرق نہیں پڑے گا بلکہ یہ سب تصرف تبرع اور احسان شمار ہوگا جس کا بدلہ اور ثواب آخرت میں ملے گا دنیا میں اس کے

۱- ''وھبة من له ولاية على الطفل في الجملة وهو كل من يعوله فدخل الأخ والعم عند عدم الأب لو في عيالهم تم بالعقد لو الموهوب معلوماً وكان في يده أو يد مودعه، لأن قبض الولي ينوب عنه'' (الدرالمختار مع ردالمحتار ۸/ ۴۹۸)۔

۲- سوال نامہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ محمد شفیع معصومہ کے بطن سے اس کے شوہر اول علی حسین کے نطفہ سے ہے اور معصومہ کے بطن سے محمد حسین کے نطفہ سے صرف ایک لڑکا دین محمد ہے لہذا محمد حسین کے ترکہ سے محمد شفیع کیونکر وارث ہوگا البتہ سیاق سوال سے پتہ لگتا ہے کہ محمد شفیع کا انتقال اس کی ماں معصومہ کے بعد ہوا ہے لہذا اس کی ماں کے ترکہ سے اس کو حصہ ملنا چاہئے جس کا جواب میں ذکر نہیں ہے

عوض کا مطالبہ نہیں کر سکتے (۱)۔

۲۔ اگر بوقت ہبہ دین محمد محمد شفیع (دونوں نا بالغ نہ تھے تو حکم دوسرا ہوگا اس کو بھی لکھ کر پھر حکم شرعی معلوم کیا جائے۔فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیو بند، سہارنپور ۲۱/۴/۱۴۰۲ھ

موہوبہ جائداد میں سے حصہ کا مطالبہ:

زید مورث اعلی نے اپنی جدی جائداد کی ایک تہائی اپنی حقیقی بہن کو منتقل کر دیا اور مابا قی ۲/۳ حصہ کو خالدہ لڑکی کے انکار کرنے پر دونوں لڑکوں کو دے دیا، کچھ دن بعد اپنی ۱/۳ حصہ پھوپھی نے بھی بڑے لڑکے عمر کو داماد ہوتے ہوتے ہبہ کر دیا، اس صورت میں بڑے لڑکے (عمر کے پاس) کل جائداد کا ۲/۳ حصہ ہوگیا مابقیہ ۱/۳ حصہ چھوٹے بھائی بکر کو ملا تھا پاکستان جانے پر چھوٹے بھائی کے حصہ کو کسٹوڈین نے قبضہ کر لیا اور دو سال تک کل جائداد بچانے کی غرض سے مقدمہ چلا، اس میں تین سو پچاس روپیہ خرچ ہوئے آخر کار چھوٹے بھائی کا ۱/۳ حصہ میں نیلام ہوگیا جو بڑے بھائی عمر نے خرید لیا، عمر تینوں حصہ کا مالک ہوگیا، بڑے بھائی عمر کے لاولد ہونے پر خالدہ اپنا حصہ لینا چاہتی ہے اس صورت میں خالدہ کو زرخرید جائداد میں سے بھی حصہ مل سکتا ہے یا کل میں سے اور خرچہ جو مقدمات وحصہ لینے میں صرف ہوئے وہ اس کے ادا کرنے کے بھی حقدار ہیں یا نہیں اور کس قدر اسوقت عمر کے لاولد ہونے کے وقت دو وارث ہوئے ایک بیوی دوسرے بہن خالدہ۔

الجواب وباللہ التوفیق:

حسب تحریر سوال صورت مسئولہ میں جب زید مورث علی نے اپنی زندگی ہی میں ایک تہائی بہن کو اور باقی ۲/۳ حصہ اپنے دونوں لڑکوں کو منتقل کر دیا ہے، اس طرح زید کی بہن نے جو منتقل اپنی زندگی میں اپنے داماد عمر کو کی ہے اگر بذریعہ بیع کے ہے یا بذریعہ ہبہ کے ہے موہوب لہم کے قبضہ دخل کے ساتھ تو یہ سب منتقلیاں صحیح ونافذ ہوگئیں اور زید کی لڑکی کا حق ختم ہوگیا اب اس کا مطالبہ صحیح نہیں ہے نہ زرخرید میں سے نہ کل میں سے۔فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیو بند، سہارنپور ۳/۱۱/۱۳۸۵ھ

الجواب صحیح محمود عفی عنہ

۱- ''المنفق بلا إذن الآخر ولا بأمر قاض فهو متبرع'' (ردالمحتار علی الدرالمختار ۹/۳۱۱)۔

بغیر تصدیق منتظم مدرسہ کے لئے زمین ہبہ کرانا:

عرصہ پندرہ سال کا ہوا چند مسلمان کاشتکاروں نے بسلسلہ گذراوقات کچھ آراضی اپنے قریب کے دوسرے موضع میں ایک مسلمان زمیندار سے بطریق نذرانہ مبلغ پچاس روپیہ بیگہہ سے لی تھی، یہ آراضی کچھ بھومی دھری اور کچھ سرداری ہے، ایک سال تک لگان زمیندار نے وصول کیا، اس کے بعد نو سال تک سرکاری لگان ادا کر کے رسید حاصل کرتے چلے آرہے ہیں اور آراضی مذکورہ کو متواتر پندرہ سال سے وہ کاشتکار بوتے چلے آئے ہیں، نہیں معلوم کہ کس بنا پر زمیندار لالچ میں کاشتکاروں کے نام خارج کرا کر عرصہ چار سال سے اپنا نام درج کرالیا ہے، لگان بھی اس کا چار سال سے کاشتکاروں کے نام نہیں آیا ہے، بلکہ زمین دار کے نام سے ہی کاشتکاران لگان ادا کرتے رہے لیکن جوتنا بونا متواتر کرتے رہے ہیں عدالت میں چارہ جوئی بھی کی گئی ہے اب بذریعہ نوٹس معلوم ہوا کہ زمیندار صاحب نے بغیر بے دخل قانوناً کرائے اس آراضی کو ایک مدرسہ اسلامیہ کے نام سے منتظم مدرسہ کے نام ھبہ کر دیا ہے، منتظم مدرسہ ان کاشتکاروں کو بالکل علیحدہ کر کے آراضی کو اپنے قبضہ میں لینا جاتا ہے۔ یہ آراضی ۸۰ بیگھہ ہے، ایسی صورت میں ان کاشتکاروں کو بڑی پریشانی ہوتی ہے، سرکاری قانون کے اعتبار سے ان کاشتکاروں کو کیا حق گنجائش ہے ایسی حالت میں شرعاً:

(الف) منتظم مدرسہ کا بغیر تصدیق کئے ہوئے اس آراضی کا ہبہ نامہ کرانا درست ہے یا کہ نہیں؟

(ب) ان کاشتکاروں کو یہ آراضی چھوڑنی مناسب ہے یا کہ نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب وباللہ التوفیق:

پہلی بات یہ سمجھ لینی چاہئے کہ زمینداری ٹوٹنے کے بعد آراضیات پر حکومت کا استیلاء ہو گیا ہے اور تمام آراضیات زمیندار کی ملک سے نکل کر حکومت کی ملک قرار پا گئی، اب قانون حکومت کے مطابق جو شخص جس آراضی کا بھومی دھر یا سردار ہے وہ قانون حکومت کے مطابق اس پر قابض اور متصرف قرار پائے گا (کما ھو مبرہن فی مقامہ) پس اگر یہ کاشتکار ان مذکورین قانون حکومت کے مطابق ان آراضیات کے بھومی دھر یا سردار بن چکے ہیں اور زمیندار نے خداع اور دھوکہ دیکر یہ حرکتیں کی ہیں تو زمیندار کا ھبہ بالکل غیر درست ہے اور نا جائز ہے اور اس صورت میں منتظم مدرسہ کا ان آراضیات کو ان کاشتکاروں سے بے دخل کرانا بھی ناجائز اور غیر صحیح ہوگا۔ اور اگر یہ کاشتکاران اب تک من جانب حکومت بھومی دھر یا سردار نہیں بن سکے ہیں بلکہ زمیندار ہی منجانب حکومت بھومی دھر یا سردار ہے تو مطابق قانون حکومت اور اس کا ھبہ کرنا صحیح و درست

ہوسکے گا، عبارت سوال سے یہ چیز منقح نہیں ہوتی ہے، اس لئے پہلے اس کی تحقیق کرلی جائے کہ بھومی دھر یا سرداری کس کو حاصل ہے زمین دارکو یا کاشتکارکو پھر اسکے مطابق عمل درآمد کیا جائے ،فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی ،مفتی دارالعلوم دیوبند، سہارنپور

الجواب صحیح :سید احمد علی سعید،محمود غنی عنہ دارالعلوم دیوبند

مکان مشترک غیر منقسم کا ہبہ جائز ہے یا نہیں؟

۱-آج سے ۲۶ برس پہلے کا واقعہ ہے کہ محمد علی و محمد اسحٰق دونوں حقیقی بھائی اپنے موروثی مکان میں برابر کے حصہ دار تھے جو غیر منقسم تھا ،محمد علی کے ذمہ ان کے چچازاد بھائی حاجی عبدالرحیم صاحب کا تقریباً ۵۷۱ روپیہ باقی تھا ،محمد علی نے بقیہ میں اپنے (غیر منقسم مشترک) مکان کے حصے کو مذکورہ حاجی صاحب کے نام بیع اور باقاعدہ رجسٹری کرنے کے لئے تحصیل محمد آباد، ضلع اعظم گڑھ بیعنامہ کرانے کے بجائے محمد علی کے حقیقی بھتیجے اور اپنے چچازاد بھتیجے محمد یعقوب و محمد زکریا پسران محمد اسحٰق کے نام ہبہ نامہ لکھوا کر باقاعدہ رجسٹری کرادیا جس کی خبر عرصہ تک ان لوگوں کو نہیں ہوئی اب سوال طلب امر یہ ہے کہ مکان مشترک غیر منقسم کا ھبہ جائز ہوا یا ناجائز ہوا۔

۲-اگر ہبہ ناجائز ہے تو شرعاً و دیانۃً مکان مذکورہ حاجی عبدالرحیم صاحب کا خرید کردہ سمجھا جائے یا محمد علی کی جائداد اور ملکیت جنکا انتقال ہبہ کرنے کے کچھ سال بعد ہوگیا ہے۔

۳-اگر محمد علی مرحوم کی جائداد وملکیت سمجھا جائے تو انکے قرض کا دیندار کون ہوگا؟

الجواب وبا للہ التوفیق:

رجسٹرار کے وہاں لکھوادینے پر مدار معاملہ نہیں ہوتا ہے بلکہ اصل ایجاب وقبول اور اسکی نوعیت پر معاملہ کا مدار ہوتا ہے، پس جب حاجی عبدالرحیم نے اپنی بقایا رقم ۵۷۱ روپیہ کے عوض میں لیا ہے، تو خواہ رجسٹری میں کچھ بھی لکھایا ھبہ یا کچھ اور ہر حالت میں یہ معاملہ بیع ہی قرار پائے گا اور بیع شئی مشترک میں بقدر حصہ کے جائز ہوتی ہے، لہٰذا یہ بیع جائز ہوئی اور حاجی عبدالرحیم صاحب مشتری اور مالک اس شئی مبیع کے شرعاً ہوگئے اور ہیں اور اگر معاملہ اس طرح ہوا کہ بیع کا معاملہ تو زبانی طے ہوا اور پھر حاجی عبدالرحیم صاحب نے واقعۃً اپنی طرف سے محمد یعقوب و محمد زکریا کو ہبہ کرکے ان دونوں کے نام ہبہ نامہ لکھوا

دیا ہے تو اس صورت میں بیع تو صحیح ہوگئی، البتہ شئی مبیع پر اپنا قبضہ دخل کر کے اور تقسیم کر کے ہبہ نہیں کیا ہے بلکہ مشاعاً کر دیا حالانکہ شئی موہوب (وہی شئی مبیع) قابل تقسیم تھی، اس لئے اس ہبہ کی صحت ونفاذ ابھی معلق ہے اور نا تمام ہے، حاجی عبدالرحیم صاحب کو اختیار ہے کہ چاہیں تو شئی موھوب (وہی شئی مبیع) قابل تقسیم تھی تقسیم کرا کے اسپر اپنا قبضہ دخل کرنے کے بعد موہوب لہم (یعقوب، زکریا یا ان کی اولاد) کو قبضہ دخل دلا کر ہبہ نافذ اور تمام کر دیں، یا اگر چاہیں تو استرداد ہبہ کرلیں یعنی اپنا ہبہ واپس لے لیں اور شئی موھوب کو واپس لیکر اپنی ملک قرار دے لیں، یہ سب اختیار حاجی عبدالرحیم صاحب کو ہے، تنقیح الفتاوی الحامدیۃ فی کتاب الہبہ والعالمگیری۔

اتنے جواب کے بعد اگلے نمبروں کے نہ سوال کی ضرورت ہے نہ جواب کی حاجت، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند، سہارنپور ۲۳/ ۸/ ۸۵ ۱۳ ھ

الجواب صحیح: سید احمد علی سعید نائب مفتی دارالعلوم دیوبند

مکان کی تقسیم سے قبل اپنا حصہ ہبہ کرنا:

متوفی کی زوجہ نے دو سال کے بعد شادی کی ہے اور شادی کرتے وقت اپنے شرعی حصے کو جو متوفی کے مکان سے ملا تھا لڑکی کو دی اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اور لڑکے کو کچھ بھی نہ دیا تو اب اس میں شرع کا کیا حکم ہے۔

الجواب وبالله التوفيق:

متوفی کی زوجہ نے اگر اپنا ($\frac{1}{8}$) تقسیم کرا کے اپنا قبضہ پہلے اس پر کر کے پھر لڑکی کو دیا ہے اور لڑکی کا قبضہ دخل کرا دیا ہے جب تو ہبہ صحیح و نافذ ہوگیا اور وہ حصہ ($\frac{1}{8}$) تنہا لڑکی کا ہوگیا ہے اور اگر زوجہ نے اپنے حصہ ($\frac{1}{8}$) تقسیم کرا کے اپنے اس پر پہلے قبضہ دخل کئے بغیر محض یوں ہی دیدیا ہے تو یہ ہبہ صحیح نہیں ہوا چاہے اس حصہ $\frac{1}{8}$ پر لڑکی کا قبضہ کرا دیا ہے جب بھی ہبہ صحیح نہیں ہوا بلکہ زوجہ ہی کا ہے زوجہ کو اختیار ہے جو چاہے سو کرے کما فی تنقیح الفتاوی الحامدیہ۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند، سہارنپور

مال کے ضیاع کے خوف سے ہبہ:

میرا برادرزادہ عرصہ سے یارباشی میں فضول اخراجات کرتا رہتا ہے، فضول خرچی کے باعث اپنی بیوی کے حقوق نان نفقہ سے بھی غافل رہتا ہے، میں لا ولد ہوں میرے پاس ایک قطعہ باغ امرود کا ہے کہ برادرزادہ باغ بھی خرد برد کر ڈالے گا، میں چاہتا ہوں کہ باغ امرود برادرزادے کی بیوی جو کہ میری بھانجی بھی ہوتی ہے، اس کے نام ہبہ نامہ رجسٹری کردوں، اگر ایسا کردوں تو شرعاً مجھ سے مواخذہ حق تلفی برادرزادہ ہوگا یا کہ نہیں؟

الجواب وباللہ التوفیق:

اگر برادرزادہ کی چال چلن واقعی ٹھیک نہیں ہے اور مال کے خرد برد اور ناجائز امور میں خرچ کرنے کا ظن غالب ہے تو آپ کو باغ امرود برادرزادے کی بیوی کے نام ھبہ کر کے اس پر اسکا قبضہ دخل سب کرادینا شرعاً جائز ہے، ایسی صورت میں آپ پر کوئی مواخذہ نہ ہوگا بلکہ امید ہے کہ ثواب زیادہ ملے گا، واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند، سہارنپور ۱۷/۹/۱۳۸۵ھ

الجواب صحیح محمود غفی عنہ

کیا مکان کی کنجی حوالہ کردینا قبضہ کے قائم مقام ہے؟

۱-عمر نے زید کو اپنی تقسیم شدہ جائداد اپنے حقیقی بھائی کی موجودگی میں اسکے حسن خدمت و پرورش حقیقی کے صلہ میں ھبہ و بخشش دو گواہوں کے سامنے کردیا ہے اور کنجی بھی دے دیا اور کچہری جاکر انہی گواہوں کے سامنے ھبہ و بخشش کی رجسٹری بھی کردیا، یہ ہبہ درست ہوا یا کہ نہیں؟

۲-قبضہ کن کن صورتوں میں ثابت ہوتا ہے؟

الجواب وباللہ التوفیق:

(۱و۲) اگر اس موہوب میں سے اپنا سامان نکال کر بالکل خالی کر کے کنجی حوالہ کی ہے تو قبضہ صحیح ہوکر ہبہ درست

اور نافذ ہوگیا ہے اور اگر اپنے سامان سے مشغول رکھتے ہوئے محض رسمی طور پر کنجی حوالہ کیا ہے تو ہبہ نا تمام رہا، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند، سہارنپور ۲۳/ ۱۰/ ۸۵ ۱۳ھ

الجواب صحیح محمود علی عنہ

زندگی میں جائداد کی تقسیم:

میری ایک بیٹی ہے جو شادی شدہ ہے اور ایک بچہ کی ماں ہے، اس کے علاوہ ایک بیٹا ہے عمر تقریباً ۲۰ سال زیر تعلیم ہے اور غیر شادی شدہ ہے، میں چاہتا ہوں کہ اپنی زندگی ہی میں شریعت کے مطابق دونوں کے حصے ابھی سے دونوں کو بتلا دوں براہ کرم بتلائیے کہ شریعت اسلامی فقہ حنفی کے مطابق دونوں کتنے کتنے فیصد کے حقدار CASHANIMMOVE-ABLE PROPERTY ہیں؟

سید عبداللہ صاحب معرفت الخوثیہ (ٹریڈنگ کمپنی پوسٹ بکس ۳۲۶، الخبر ۔ سعودیہ عربیہ)

الجواب وباللہ التوفیق:

اگر آپ ان دونوں کو اپنی زندگی میں دیدینا چاہتے ہیں تو یہ دے دینا بطور ھبہ کے ہوگا اور اس کا حکم یہ ہے کہ دونوں کو یعنی لڑکی و لڑکے کو برابر برابر دیں کمی بیشی باعث گناہ ہوگی (۱)، نیز دونوں کا حصہ تقسیم کر کے الگ الگ دیکر اپنے قبضہ دخل سے نکال کر ان کے قبضہ دخل میں دے دینا ہوگا (۲)۔

اور اگر ابھی انکو کچھ دینا نہیں چاہتے ہیں بلکہ صرف یہ بتلا دینا چاہتے ہیں کہ میرے مرنے کے بعد تم لوگوں کا اتنا حق

۱- ’’ولو وهب رجل شيئاً لأولاده في الصحة وأراد تفضيل البعض على البعض في ذلك لا رواية بهذا في الأصل عن أصحابنا وروي عن أبي حنيفة رحمه الله أنه لا بأس به إذا كان التفضيل لزيادة فضل له في الدين وإن كانا سواء يكره، وروى المعلى عن أبي يوسف رحمه الله تعالى أنه لا بأس به إذا لم يقصد به الإضرار وإن قصد به الإضرار سوى بينهم يعطي الابنة مثل ما يعطي للابن وعليه الفتوى وهكذا في فتاوى قاضي خان وهو المختار كذا في الظهيرية‘‘ (فتاوی عالمگیریہ ۴/ ۳۹۱، نیز فتاوی قاضی خان علی ہامش فتاوی عالمگیریہ ۳/ ۲۷۹)۔

۲- ’’وتتم الهبة بالقبض الكامل‘‘ (الدرالمختار مع ردالمحتار ۸/ ۴۹۳)۔

ہوگا تو چوں کہ قرآن پاک میں منصوص ہے: "یوصیکم اللہ فی أولادکم للذکر مثل حظ الأنثیین" (۱) اس لئے آپ یہ بتلا سکتے ہیں کہ یہ میرا ترکہ ہے یہی ترکہ رہے یا جتنا ترکہ میرا رہے اس میں سے دو حصہ لڑکے (ابن) کا حق ہوگا اور ایک حصہ لڑکی (بنت) کا حق ہوگا اسی قاعدہ سے تم لوگ تقسیم کر لینا اور اگر بطور وصیت کے کچھ دینا چاہتے ہیں تو حدیث شریف میں ہے: "لا وصیّة لوارث" او کما قال علیہ السلام (۲) اور اولاد تو شرعاً وارث ہوتی ہی ہے، اس لئے یہ وصیت ان کے حق میں درست نہ ہوگی۔

نیز اپنی زندگی میں کسی اولاد وغیرہ کسی کا حق وراثت قائم نہیں ہوتا سب کا مالک ومختار خود مورث ہوتا ہے، اس لئے یہ سوال کہ اپنی زندگی میں کس کا کتنا حق ہے۔ معلوم نہیں مورث کے مرنے تک کون کون زندہ رہے گا اور کون مر چکا ہوگا، اس لئے قبل از وقت حق وراثت کی تعیین نہیں کر سکتے ہیں، البتہ جو لڑکا زیر تعلیم ہے اس کی تعلیم پر او ین مناسب جو چاہیں خرچ کر سکتے ہیں وہ نفقہ میں شمار ہو جائے گا، خلاصہ جواب یہ ہے کہ جب تک آپ زندہ ہیں یہ دونوں آپ کے مملوکہ واثاثہ میں سے کسی فی صد کا حقدار ابھی سے نہیں ہیں بلکہ مرنے کے بعد حسب تخریج شرعی حقدار ہوں گے جس کو اوپر بیان کر دیا گیا ہے، اور اگر آپ خود کچھ دینا چاہیں تو بطور ھبہ کے دونوں کو برابر برابر دیں اور کل اثاثہ مملوکہ نہ دے دیں، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دار العلوم دیوبند، سہارنپور ۳۰/۷/۱۴۰۰ھ

دو لڑکوں کے نام مکان لکھنا اور بقیہ کے نام نہ لکھنا کیسا ہے؟

ایک باپ ہے اس نے اپنے مکان کو پانچ بیٹوں میں سے صرف دو بیٹوں کے نام کیا (تملیک کیا)، کیونکہ تین بیٹے ان کی خدمت نہیں کرتے تھے اس لئے باپ ناخوش تھے پھر ایک بیٹے کا انکی حیات میں ہی انتقال ہو گیا اس کے باوجود باپ نے اپنی بیوہ بہو تک کو مکان میں بالکل بھی حصہ نہیں دیا، وہ صرف ایک بیٹے کو یہ کہہ کر انتقال کر گئے کہ یہ اور اس کے بچے اگر تیرے ساتھ اچھا سلوک رکھیں تو مکان میں رہنے دینا ورنہ باہر نکال کھڑا کرنا پھر اس بیٹے نے اپنی بیوہ بھاوج کو (چھوٹے بھائی کی بیوی) تقریباً ۲۵ سال تک اپنے مکان میں رکھا اور برابر دکھ سکھ میں ساتھ دیا، لیکن اس بیوہ بھاوج اور بچوں کا سلوک اپنے جیٹھ کے ساتھ اچھا نہیں رہا، اور آئے دن گالی گلوج ہوتی رہی، اس عرصے میں بیوہ بھاوج کا ایک لڑکا دادا قسم کا ہو گیا

۱- سورۂ نساء: ۱۱۔

۲- سنن الترمذی ۴/۴۳۳، کتاب الوصایا باب ماجاء لا وصیۃ لوارث حدیث ۲۱۲۰، ۲۱۲۱، سنن ابوداؤد ۳/۱۱۴، کتاب الوصایا باب ماجاء فی الوصیۃ للوارث حدیث ۲۸۷۰۔

اورگھر میں طوائف لے آیا، اور اپنے بڑے باپ یعنی تایا کودھوکہ دی کہ دیکھیں کون مکان سے ہمیں نکالتا ہے یہ مکان ہمارا ہے۔

تو کیا شرعاً وہ اپنے حصہ لینے کا حقدار ہے؟ جبکہ سسر نے اپنے سامنے بیوہ ہونے کے باوجود اسے مکان کی تملیک نہیں کی اور کیا وہ دو بیٹے بھی مکان میں سے حصہ لینے کے حقدار ہیں، جنہیں باپ نے کچھ بھی تملیک نہیں کیا اور اپنی حیات میں ہی گھر سے باہر نکال دیا تھا، معاف فرمائیں سوال ذرا لمبا ہوگیا ہے کیونکہ بات پوری سمجھانی تھی میں نے یہاں عالموں سے اس سوال کو پوچھا تو انہوں نے مشورہ دیا کہ آپ مفتی صاحب کو دیو بند لکھئے اور فتوی منگائیے اور سوال پر غور سے توجہ فرمائیں کہ وہ ''بیوہ'' مکان میں حصہ دار ہونے کا حق رکھتی ہے یا نہیں؟ فقط والسلام

حافظ نفیس احمد قریشی اجین، ایم - پی

الجواب وبالله التوفيق:

اگر باپ نے صرف اپنے دو بیٹوں کو مکان دیکر اور تقسیم کرکے الگ الگ قبضہ دخل دلا دیا ہے جب تو اس مکان موہوب کے صرف دولڑکے جن کے قبضہ دخل میں دیا ہے شرعاً مالک ہو گئے اور اب اس میں کسی کا کچھ نہیں رہا(۱) اور یہ بات الگ ہوگی کہ باپ اس زیادتی کی وجہ سے عند اللہ عاصی ہوگا، باقی ہبہ کے نفاذ و تکمیل میں کوئی فرق نہیں ہوگا(۲)۔

اور اگر مکان تقسیم کرکے دولڑکوں کو الگ الگ قبضہ دخل نہیں کرایا تھا یا اپنا تخلیہ نہیں کیا تھا یعنی خود بھی ہمیشہ اس میں رہا اور کبھی اپنے قبضہ دخل سے خالی کرکے ان دولڑکوں کا قبضہ دخل نہیں کرایا تو یہ ہبہ شرعاً فاسد ہوکر ختم ہوگیا (۳)، اور باپ کے مرنے پر باپ کا ترکہ قرار پاکر حسب تخریج شرعی تقسیم ہوگا۔

اور اس صورت کا حکم شرعی یہ ہوگا کہ جو لڑکا باپ کی زندگی میں انتقال کرگیا اس کی اولاد حق وراثت سے محروم ہوگئی اور شرعاً حق دار نہ رہی (۴)، باقی اور سب صلبی اولاد حقدار ہوگئیں، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دار العلوم دیو بند، سہارنپور ۱۵/ ۴/ ۱۴۰۱ھ

۱- ''تتم الهبة بالقبض الكامل'' (درمختار مع رد المحتار ۸/ ۴۹۳)۔

۲- ''ولو نحل بعضاً وحرم بعضا جاز من طريق الحكم، لأنه تصرف في خالص ملكه لاحق لأحد فيه إلا أنه لا يكون عدلاً، سواء كان المحروم فقيهاً تقياً أو جاهلاً فاسقاً على قول المتقدمين من مشائخنا، وأما على قول المتأخرين منهم لا بأس أن يعطي المتأدبين والمتفقهين دون الفسقة الفجرة'' (بدائع الصنائع ۵/ ۱۸۴)۔

۳- ''والهبة لا صحة لها بدون القبض'' (بدائع الصنائع ۸/ ۱۶۷)۔

۴- ''وهو مبني على أصلين أحدهما أنه يحجب الأقرب ممن سواهم الأبعد لما مر أنه يقدم الأقرب فالأقرب الحد في

کیا ہبہ درست ہونے کے لئے شئی موہوب کا قبضہ میں ہونا ضروری ہے؟

اگر زید یوں کہے کہ عمر وجو کہ زید کا وارث ہے میں اس کو مبلغ تین سو روپیہ ہبہ کرتا ہوں لیکن حال یہ ہے کہ زید کے پاس فقط پچاس ۵۰ روپیہ ہے اور زید چاہتا بھی ہے کہ کسی بھی صورت سے عمر وکو تین سو روپیہ مل ہی جائے اور زید کے پاس جائداد وغیرہ ہے جس سے کرایہ بھی آتا ہے اب زید کہتا ہے کہ اگر میں زندہ رہوں تو میں وہ رقم دوں گا اور اگر مر جاؤں تو یہ رقم دین ہے میرے ذمہ جس کو تم وارثین سے لے سکتے ہو کیا یہ درست ہے اور اگر دین سے لیں تو زید کا جو ارادہ ہے وہ کسی دوسرے طریقہ سے پورا ہوسکتا ہے یا نہیں؟

الجواب وبا اللہ التوفیق:

یہ تو سب ہی جانتے ہیں ہبہ صحیح و نافذ ہونے کے لئے شئی موہوب پر موہوب لہ کا پورا پورا قبضہ دخل ہو جانا شرط اور لازم ہے(۱)، اور صورت مسئولہ میں ایسا نہیں ہے اس لئے ہبہ کا بھی انعقاد نہیں ہوا۔

اور زید کا یہ چاہنا کہ عمر کو کسی بھی طرح تین سو روپیہ مل ہی جائے ای ارادہ ہبہ کی تکمیل کا بے حد اشتیاق ہے اس طرح یہ جملہ کہ اگر میں مر جاؤں تو رقم دین میرے ذمہ تم دوسرے وارثوں سے لے سکتے ہو)، یہ جملہ بھی محض اس اشتیاق ہبہ کے مکمل کرنے کا ارادہ ہے اور عزیزم ان جملوں سے بھی نہ تو ہبہ ہی متحقق ہوا اور نہ تو وصیت ہی متحقق ہوئی، البتہ واہب کی بے پناہ خواہش کا اظہار ہے، اسکا حکم شرعی یہ ہے کہ جب واہب کے پاس جائداد وغیرہ سے واہب مفلس نہیں ہے اور نہ ورثہ ہی مفلس ونادار ہوں تو واہب کی خواہش کو پورا کر دینا عند اللہ بہت محبوب وپسندیدہ ہوگا۔ اگر یہ تکمیل واہب کی زندگی ہی میں ہو جائے جب تو بہتر ہے ہی، ورنہ مرنے کے بعد بھی پورا کر دینا عند اللہ بہت ہی پسندیدہ مرغوب چیز ہوگی، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند، سہارنپور

السبب أم لا، والثاني أن من أدلى بشخص لا يرث معه كابن الابن لا يرث مع الابن" (الدر المختار مع رد المحتار ۱۰/ ۵۲۹)، "فالأقرب يحجب الأبعد كالابن يحجب أولاد الابن" (فتاوی عالمگیریہ ۶/ ۴۵۲)۔

۱- "وشرائط صحتها في الموهوب أن يكون مقبوضاً غير مشاع مميزا غير مشغول وركنها الايجاب والقبول" درمختار مع تنوير الابصار (کتاب ہبہ شامی ۸/ ۴۸۹، مکتبہ زکریا دیوبند)۔

باب الاجارہ

پگڑی کا حکم:

۱-مالک مکان یا کرایہ دار پگڑی کے نام سے (مکان یا دوکان کرایہ پر لیتے ہیں) روپیہ لیتے ہیں جو کرایہ میں وضع نہیں ہوتا اور اس کالینا دینا جب کہ باہمی رضامندی یا مجبوری سے درست ہے یا کہ نہیں؟

۲-کرایہ دار وہ پگڑی کے روپے مالک مکان کو نہیں دیتا بلکہ خود رکھ لیتا ہے اور اس مکان پر قبضہ دیدیتا ہے اس کو لینا جائز ہے یا کہ نہیں؟۔

الجواب وباللہ التوفیق:

۱-مالک مکان کرایہ پر دیتے وقت جو رقم پگڑی کے نام پر لیگا اس کی تو گنجائش ہے، توجیہ ہوسکتی ہے، باقی جو کرایہ دار لیتا ہے یہ صحیح نہیں ہے خواہ کرایہ داروں کی باہمی رضامندی سے کیوں نہ ہو، ہاں اگر کرایہ دار پگڑی کی یہ رقم مالک مکان کو دیدے یا اس کی صریح اجازت سے خود لے تو گنجائش نکل سکتی ہے اور لینا جائز ہوسکتا ہے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

پگڑی سے متعلق نظام الفتاویٰ پر ایک اشکال کا جواب:

آپ کی کتاب "نظام الفتاویٰ" دیکھنے کا موقع ملا۔ نظام الفتاویٰ (۱/۱۵۰، و۲/۲۶۶) میں پگڑی کی ایک یہ صورت مذکور ہے کہ ایک کرایہ دار دوسرے کرایہ دار سے معاملہ کرکے مکان یا دکان خالی کرکے اس کے حوالے کردیتا ہے اور کچھ روپیہ خالی کرنے کا لیتا ہے، گویا کرایہ داری جو کہ حق منفعت ہے کی بیع کرتا ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ کرایہ دار مکان یا دکان خالی کرکے اصل مالک کے حوالہ کرتے وقت پگڑی کے نام سے کچھ رقم لیتا ہے ان دونوں صورتوں کا حکم یہ ہے کہ اس رقم

کا لینا شرعاً جائز نہیں ہے۔

لیکن پگڑی کی صورت جو آج کل عموماً رائج ہے، پگڑی کی مذکورہ بالا صورت سے مختلف ہے وہ کیا ہے؟ وہ یہ ہے کہ آج کل عموماً مالک مکان کرایہ دار سے ایک خاص رقم پگڑی کے نام سے وصول کرتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ دکاندار (مالک) یہ پیسے لیکر اس کی ضمانت دے رہا ہے کہ مجھے اس دکان کے خالی کرانے کا حق نہیں، شرعی اعتبار سے یہ رقم نمبر الیما اور دینا کیا حکم رکھتا ہے، نمبر ۲: بعض لوگ کرایہ دار سے رقم تو لیتے ہیں، لیکن اس کو پگڑی کا نام نہ دے کر صرف پیشگی کا نام دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ کرایہ دار جب دکان خالی کرے گا یہ رقم اس کو واپس دیدیں گے، کیونکہ عموماً آج کل کرایہ دار خالی نہیں کرتے۔ اب اگر ان سے پیشگی رقم لے لی جاتی ہے تو وہ خالی کردیتے ہیں اور خالی نہیں کرتے تو یہ رقم مالک ہی کے پاس جمع رہتی ہے، اس طرح کی رقم لینا جائز ہے یا نہیں اور مالک دکان کیا اس رقم کا مالک ہوجائے گا اگر نہیں ہوگا اور وہ دکان بھی خالی نہیں کررہا ہے تو اس رقم کو کیا کرے؟

نوٹ: کرایہ سے اس رقم کا کوئی تعلق نہیں۔ تفصیلی جواب مرحمت فرمائیں۔

الجواب وباللہ التوفیق:

برادرم آپ نے غالباً غور نہیں فرمایا یا سمجھا نہیں، یا تو اجارہ پیشگی کے لفظ سے متوحش ہوگئے احقر بھی جانتا ہے کہ لاپرواہی یا ناواقفیت کی وجہ سے مسلمان بھی اکثر معاملات خلاف حکم شرع کرکے گرفتار معصیت ہوجاتے ہیں، جیسا کہ احقر نے خود بھی جواب میں ایک دو ناجائز معاملہ صورت مسئولہ کا شروع جواب میں عرض کردیا ہے۔ باقی اگر مسلمان ذرا سی توجہ کرے اور تھوڑی سی تاویل سے کام لے لے تو عدم جواز کے ارتکاب سے نکل کر حد جواز میں آکر مستحق اجر وثواب ہوجائے یا کم ازکم ارتکاب معصیت سے محفوظ ہوجائے۔ اور حکم شرع بھی یہی ہے کہ عاقل بالغ مسلمان کے معاملہ کو جہاں تک ہوسکے محمل حسن پر لانے کی سعی کرنی چاہئے، کما صرح به في كتب المذهب۔ مثلاً یہ اصل: ''إن أمور المسلمين محمولة على السداد والصلاح حتى يظهر غيره'' (وتحته في حاشية) من باع درهما ودينارا بدرهمين ودينارين جاز البيع وصرف الجنس إلى خلاف جنسه تحريا للجواز حملا لحال المسلم على الصلاح'' (۱)، انہی وجوہ سے احقر جائز معاملات واعمال کی تشریح وتبیین میں نہیں جاتا، بلکہ مسلمان کو اس جائز طریقے سے

۱- قواعد الفقہ / ۱۲ اشرفی بکڈپو۔

کر لینے کا راستہ بتاتا ہے تاکہ اس راستہ کی اتباع کر کے مستحق اجر وثواب ہوجائے یا کم ازکم محفوظ عن المعصیۃ ہوجائے۔ اسی اصل شرعی کی بنیاد پر احقر نے اس معاملہ کرایہ داری میں ناجائز معاملات کی تفصیل وتشریح کرنے کے بجائے اس معاملہ کرایہ داری کو حد شرع میں لانے کی تدبیر بتادی، اور اس جواز میں لانے کا ثبوت اس عبارت سے ہے:

"واعلم أن الأجر لا يلزم بالعقد فلا يجب تسليمه به بل (يجب تسليمه) بتعجيله أو شرطه في الإجارة المنجزة (إلى قوله)فيفتي برواية تملكها بشرط التعجيل للحاجة" (۱) "إذا عجل الأجرة لا يملك الاسترداد إلى اخره" (۲) اور جب فی زمانہ کرایہ دار اجارہ پر لی ہوئی چیز عموماً خالی نہیں کرتے اور ہمیشہ غاصبانہ قبضہ کی وجہ سے گنہگار ہوتے رہتے ہیں اور مواجر قانوناً خالی بھی نہیں کراپاتا اور نقصان میں مبتلا رہتا ہے اور اگر اس مذکورہ طریقہ کے مطابق ذرا سمجھ سے کام لے لے تو مستاجر معصیت سے اور مواجر ضرر سے محفوظ رہ سکتے ہیں اور اس صورت میں پیشگی لی ہوئی رقم کی واپسی کا مطالبہ کرایہ دار نہیں کرسکتا کما دل علیہ عبارۃ الشامی النعمانی، بلکہ بعض محققین نے جیسے محقق (زرقاء) نے اس اجارہ شدہ کرایہ داری کو اس ضابطہ: "وقيل تجعل عقود في الأحكام" کے تحت دو الگ الگ صفقہ قرار دیکر جواز کا فتویٰ دے دیا ہے اور وہ یہ ہے: بڑی رقم جو ایک مشت شروع عقد میں لی جائے اس کو صرف ایک ماہ کی اجرت قرار دی جائے اور اس کا حق شرعاً مواجر کو مستاجر کے راضی ہونے کے ساتھ ہوتا ہے، اس لئے پیشگی رقم شروع ہی میں لے لینا جائز ہے اور بعد میں بھی ہر ماہ کے لئے برضا جو مقدار طے ہوا گلے مہینوں کے لئے طے کردی جائے، یہ بھی ایک تاویل حد جواز میں لانے کی رہے گی۔

اب رہ گیا آپ کا ذکر کردہ دونوں صورتوں کا شرعی حکم تو صورت نمبر ۱، کا حکم شرعی یہ ہے کہ جب کرایہ داری کا معاملہ ہر ماہ متعین کرایہ طے کر کے دیا گیا ہے تو اب یہ بڑی رقم محض خالی نہ کرانے کا عوض یا حق قرار پائے گا اور یہ صورت محض حق کا عوض شمار ہو کر ممنوع ہوگی، اس لئے اس صورت میں اوپر لکھے ہوئے دونوں معاملوں میں سے کوئی معاملہ بنالیا جائے تو شرعاً وزر ونقص سے حفاظت ہوجائے گی ورنہ نہیں۔

اور صورت نمبر ۲ میں تو یہ بڑی رقم شرعاً امانت ہوگئی اور امانت کی رقم بعینہ محفوظ رکھنا واجب رہتا ہے۔ ورنہ خیانت وتعدی شمار ہو کر خیانت کا گناہ ہوتا ہے اور تصرف کر لینے کے بعد وہ رقم قرض بن کر حق واجب الرد ہوجاتی ہے، اور معلوم نہیں

۱- درمختار علی الشامی ۵/۶، ۷، وتحقیق فی الشامی النعمانی۔

۲- شامی ۵/۶، ۷۔

کرایہ دار کب دوکان واپس کرے گا، یہ ایک پریشانی کی ذمہ داری الگ ہوگی، اس لئے اس طرح یہ معاملہ کرنا شرعاً صحیح نہیں ہوگا، اگر اس طرح معاملہ کرلیا جائے کہ یہ بڑی رقم جو میں لے رہا ہوں اس میں سے ماہ بہ ماہ کرایہ کی مقدار وضع کرتا جاؤں گا، تو اس طرح یہ معاملہ شرعاً صحیح ہوجائے گا، یا پھر اسی طریقہ پر معاملہ کرلیا جائے جس طریقہ پر اوپر جواب میں لکھا ہوا ہے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

دوکان ومکان کی پگڑی:

ہر شہر روز بروز ترقی کی طرف تیزی سے گامزن ہے اور اس کے پیش نظر ہر شہر میں تجارت کے مواقع زیادہ سے زیادہ فراہم ہونے لگے ہیں جس کے لئے مالک مکان اور دوکان دار کو "پگڑی" لینا دینا پڑتی ہے، کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ سامنے والا جب خوشی سے پیسے دے رہا ہے یا لے رہا ہے تو اس کے لینے دینے میں کیا حرج ہے میں ایک مالک مکان ہوں اور مجھے آئے دن اس مسئلہ سے دوچار ہونا پڑ رہا ہے۔

دریافت طلب امر یہ ہے کہ کیا موجودہ حالات کو دیکھتے ہوئے "پگڑی" لینا دینا جائز ہے؟

حافظ نفیس احمد قریشی (اجین، ایم-پی)

الجواب وباللہ التوفیق:

۱- پگڑی کے معاملہ میں اصل مالک مکان اور اصل مالک دوکان کا حکم دوسرا ہے اور کرایہ والوں کا حکم دوسرا ہے، کرایہ دار کے لئے تو شرعی حکم یہ ہے کہ اگر کرایہ دار نے اصل مالک کی اجازت سے اس مکان یا دوکان میں ایسی چیز کچھ بنوایا ہے جو برابر قائم رہتی ہے جیسے فرش یا سائبان وغیرہ تو اس کے عوض کے طور پر جو مناسب ہو کرایہ داری چھوڑتے وقت لے سکتا ہے اور اگر کچھ نہیں بنوایا ہے تو محض حق کرایہ داری میں کچھ عوض لینا درست نہیں (۱)۔

۱- "إذا قال القيم أو المالك أذنت له في عمارتها فعمر بإذنه يرجع عليه وعلى الوقف، هذا إذا كان يرجع نفعه إلى الوقف والمالك وإن كان يرجع إلى المستأجر وفيه ضرر كالبالوعة والتنور فإنه لا يرجع إلا إذا شرط الرجوع" (البحر الرائق ۱۹/۸)، نیز "لا يجوز الاعتياض عن الحقوق المجردة" (الدر المختار مع رد المحتار ۳۳/۷)۔

اور اصل مالک مکان اور مالک دوکان جو کچھ زر پیشگی لیتا ہے خواہ پگڑی کے نام پر لیتا ہے اس کو زر اجارہ پیشگی کی تاویل سے جائز کہا جا سکتا ہے (۱)۔

یہ تفصیل تو لینے کے اندر ہے اور دینے میں تو اگر دینے والا مجبور ہے کہ بغیر دیئے مکان یا دوکان کچھ نہیں ملے گی اور بغیر مکان یا دوکان لئے گذارہ ہی ناممکن یا مشکل ہے اور لینے والا غلط طریقے سے لیتا ہے جب بھی یہ دینے والا مجبور ہے، امید ہے کہ اس دینے والے سے مواخذہ نہ ہوگا (۲)۔فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۵/ ۴/ ۱۴۰۱ھ

چکی والوں کا گردہ (جلن) کے نام سے آٹا کاٹنا:

آٹے کی چکی والے گیہوں پینے پر دو آنہ فی کلو کے حساب سے اجرت لیتے ہیں اور ایک من میں سے ایک کلو آٹا جلن (گردہ) کے نام سے کاٹتے ہیں او یہ کہتے ہیں کہ پسائی کے وقت چکی چلنے کی گرمی سے اتنا آٹا اندازاً جل جاتا ہے، اس طرح چکی والوں کا گردہ کے نام سے آٹا لینا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

جب کہ عموماً چکی والے آٹا نہیں خریدتے، اسی گردہ کی مد میں اتنی بچت ہوجاتی ہے کہ جس سے گھر کا خرچ چلتا رہتا ہے۔

الجواب وباللہ التوفیق:

اس مذکورہ طریقہ سے گردہ یا جلن کاٹنا قفیز طحان کی خرابی پر مشتمل ہے جس کی ممانعت حدیث پاک میں ہے، اس لیے شرعاً اس طرح سے معاملہ کرنا جائز نہ ہوگا۔

بلکہ اس کا آسان اور بہتر طریقہ جو شرعاً عام طرح سے جائز بھی ہے اور اس میں جتنا کام پہلے کرنا پڑتا تھا تقریباً اتنا ہی کرنا پڑے گا، صرف تھوڑی توجہ کرنی پڑے گی۔

۱- ''واعلم أن الأجر لا يلزم بالعقد فلا يجب تسليمه به بل بتعجيله أو شرطه في الإجارة المنجزة''(درمختار مع ردالمحتار ۹/ ۱۳)،''يعتبر ويراعى كل ما اشترط العاقدان في تعجيل الأجرة وتأجيلها''(شرح المجلہ ۱/ ۲۶۴ مادہ رقم ۴۷۳)۔

۲- ''ما يدفع لدفع الخوف من المدفوع إليه على نفسه أو ماله حلال للدافع حرام على الآخذ لأن دفع الضرر عن المسلم واجب ولا يجوز أخذ المال ليفعل الواجب''(ردالمحتار علی الدرالمختار ۸/ ۳۵)۔

اس لیے کہ جب غلہ پینے کے لیے آتا ہے تو چکی والا وزن کر کے سب غلہ پیس لیتا ہے اور بعد میں اسی پسے ہوئے میں سے گردہ کے نام پر جتنا لینا ہوتا ہے، لے لیتا ہے، یہی قفیز طحان ہے جو منع ہے۔

پس اگر وہ پسنے کے بعد بجائے کاٹنے کے یہ کرے کہ جب شروع میں غلہ وزن کرلے اسی وقت جتنا آٹا گردہ وغیرہ کے نام سے بعد میں نکالتا ہے پینے سے پہلے ہی نکال لے، اور جتنا غلہ بچے اس کو پیس کر پورا کا پورا دیدے، اگر دوبارہ وزن کرنے میں کچھ کم وبیش ہو تو اپنے پاس سے ملا دے جیسے اس وقت کرتا تھا، جب پینے کے بعد کم وبیش آتا ہونے پر اپنے پاس سے ملانے یا نکالنے کا عمل کرتا تھا، مزید کوئی کام نہیں کرنا پڑے گا اور معاملہ جائز ہوجائے گا، ورنہ اگر گردہ نہ کاٹے اور پسائی کی اجرت بڑھادے تو پسانے والا اس کو بار اور غلط سمجھے گا اور آئندہ غلہ پسائی کے لیے نہیں لائے گا، اور بدنام الگ کرے گا، اور مذکورہ بالا تدبیر سے گاہک بھی مطمئن رہے گا اور پریشانی کی کوئی بات بھی نہ آئے گی۔ اور قفیز طحان کی شرعی خرابی سے بھی حفاظت ہوجائے گی، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۱/۶/۱۴۱۱ھ
الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ، محمد ظفیر الدین غفرلہ

دلالی کی اجرت کا حکم شرعی:

کچھ لوگ دلالی (ایجنٹ) کا کام کرتے ہیں، دیکھا جاتا ہے کہ وہ بائع اور مشتری دونوں سے کمیشن لیتے ہیں، کیا دلال کے لیے دونوں سے کمیشن لینا جائز ہے؟

الجواب وباللہ التوفیق:

دلال شرع میں اجیر کا نام ہے، اور دلالی اور کمیشن اجرت کا نام ہے، اور اجیر جس کا کام کرتا ہے اسی سے اجرت پانے کا مستحق ہوتا ہے، یہ دلال اگر بائع کا کام کرتا ہے تو بائع کا اجیر ہے اور بائع سے اجرت پانے کا مستحق ہوگا اور اگر مشتری کا کام کرتا ہے تو مشتری سے اجرت پانے کا مستحق ہوگا، اور یہ جائز نہ ہوگا کہ عمل تو صرف ایک کا کرے اور اجرت دونوں سے لے، اسی کا نام ڈبل اجرت ہے جس کو ناجائز کہا جاتا ہے۔

ہاں اگر کوئی شخص دونوں کا کام الگ الگ کرے تو الگ الگ کام ہونے کی بنا پر دونوں سے اس کے متمیز عمل کی

اجرت متعارفہ لے سکتا ہے(۱)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دار العلوم دیو بند سہارنپور ۲/ ۸/ ۱۴۱۱ھ
الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن غفرلہ، محمد ظفیر الدین مفتاحی غفرلہ، کفیل الرحمٰن غفرلہ

بٹے پر نوٹ تبدیل کرنا:

پھٹے پرانے نوٹوں کا استعمال شہروں میں ہوتا ہے، ہم کوئی پھٹا ہوا نوٹ بدلنا چاہیں تو وہ لوگ بٹے پر یعنی ہمارے نوٹ میں کچھ کٹوتی کر کے بدل دیتے ہیں، اس طرح سو روپے کا نوٹ دے کر ۹۵ اور پچاس کا نوٹ دے کر ۴۸ روپے لینا شرعاً کیسا ہے؟

الجواب وباللہ التوفیق:

نوٹ: (کاغذی نوٹ) نہ کیلی ہے اور نہ وزنی بلکہ عددی ہے، اس لیے کمی بیشی کے ساتھ بدلنا جائز ہے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دار العلوم دیو بند سہارنپور، ۲/ ۸/ ۱۴۱۱ھ
الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن، محمد ظفیر الدین مفتاحی، و کفیل الرحمان عثمانی مفتی دار العلوم دیو بند

ہنڈی کے ذریعہ رقم بھیجنا شرعاً کیسا ہے؟

باہر ملک میں رہنے والے جب اس ملک میں پیسے بھیجتے ہیں تو اس کی دو صورتیں ہوتی ہیں: کبھی تو بینک کے ذریعہ بھیجتے ہیں، کبھی ہنڈی کے ذریعہ، بینک کے ذریعہ معینہ مقدار ملتی ہے اور ہنڈی کے ذریعہ کرنسی سے کچھ زیادہ رقم ملتی ہے، ہنڈی رقم کا یہ طریقہ کار حکومت سے چھپا کر کیا جاتا ہے۔

دریافت طلب امر یہ ہے کہ ہنڈی کے ذریعہ کرنسی کے مقابلہ مقررہ رقم سے زیادہ جو پیسے ملتے ہیں ان کا لینا جائز

۱- "وأما الدلال فإن باع العين بنفسه باذن ربها فأجرته على البائع (قال الشامي) وليس له أخذ شئ من المشتري (إلى قوله) فظاهره أنه يعتبر العرف هنا لأنه لا وجه له، وإن سعىٰ بينهما وباع المالك بنفسه يعتبر العرف (قال الشامي) فتجب الدلالة على البائع أو المشتري أو عليهما بحسب العرف" (فتاویٰ شامی ۴/ ۴۲)(مرتب)۔

ہے یا نہیں؟

الجواب وباللہ التوفیق:

جب ہنڈی کا یہ طریقہ قانون حکومت کے خلاف ہے تو یہ قانونی چوری ہوگی، اگر اس میں پکڑا جائے تو عزت وآبرو، مال سب کی بربادی ہوگی اور ان سب چیزوں کا بچانا شرعاً واجب ہے اور ہنڈی کے ذریعہ بھیجنے میں اولاً ہنڈی بھنانے میں بھی دینا پڑتا ہے اور اگر کسی حیلہ سے سود دینے سے بچ جائیں تو بھی بیش از بیش ہنڈی سے بھیجنا شرعاً محض مباح وجائز رہے مگر مباح حکم کے مقابلہ میں واجب حکم کو چھوڑنا درست نہیں رہتا، اس لیے اس کی اجازت نہ ہوگی، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۴/ ۸/ ۱۴۱۱ھ

الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن، محمد ظفیر الدین مفتاحی، مفتی دارالعلوم دیوبند

ہنڈی کے مروجہ کاروبار کے سلسلے میں حکم شرعی:

آج کل جو ایک ملک سے دوسرے ملک میں ہنڈی کا کاروبار کیا جاتا ہے شرعاً اس کا کیا حکم ہے کہ اس دور میں اس کی شدید ضرورت ہے، اور ابتلاء عام ہے مثلاً سفراء حضرات مدارس اسلامیہ کے چندے کے لئے دوسرے ممالک کا سفر کرتے ہیں اور چندہ اکٹھا کر کے اس ملک کے کسی تاجر کے پاس جمع کر دیتے ہیں اور وہ تاجر اس کو ایک رسید یا وثیقہ دیتا ہے وہ سفراء اپنے ملک میں آکر اس رسید یا وثیقہ کو دیکر اسی جمع کردہ رقوم کی تعداد اپنے ملک میں اس سے لے لیتے ہیں جس کے نام اس تاجر نے رسید دی الغرض اس طرح کی اور بھی ضرورتیں ہیں۔

عبدالحق (خادم جامعہ عربیہ نصیر العلوم ماظر ہاٹ، چاٹگام)

الجواب وباللہ التوفیق:

شرعاً ہر شخص کو اختیار رہے کہ وہ اپنا نقد یا غیر نقد اپنے ملک میں یا باہر جہاں چاہے جس طرح چاہے حدود شرع میں رہتے ہوئے، یعنی خداع وغدر نہ ہو بھیج سکتا ہے، پس جس ملک سے بھیجنا چاہتا ہے اس ملک میں یہ بھیجنا خلاف قانون نہ ہو، آزادی ہو، اسی طرح جس ملک میں بھیجتا ہو وہاں بھی کوئی چیز خلاف قانون نہ ہو آزادی رہے تو پھر منی آرڈر، بیمہ، ڈرافٹ،

چیک وغیرہ ہر طرح سے یہ رقم بھیجی جا سکتی ہے اور اگر بینک کے ذریعہ سے بھیجنے میں خرچ زیادہ پڑتا ہو اور کفالت مقصود ہو تو اگر کوئی ایسا آدمی مل جائے جو معتبر بھی ہو اور جس ملک میں بھیجنا چاہتا ہے وہاں کوئی شخص اس کا معتبر ہو اس کے ذریعہ بھیج دے اس طرح پر کہ یہ آدمی ایک تحریر (رسید یا وثیقہ) کے طور پر رقم والے کو دیدے، پھر یہ آدمی اس ملک میں جا کر یہ رسید دکھلا کر اس سے اپنی رقم لے لے پھر مدرسہ میں داخل کر دے، پس اس صورت میں اگر ان دونوں نے کوئی پیسہ نہیں لیا جب تو ان کا یہ تبرع ہو گیا اور اس طرح یہ معاملہ شرعاً بلا ریب درست ہو گیا۔

اور اگر رسید یا وثیقہ دینے والے نے کچھ پیسے اپنے لئے بھی لے لئے تو اس کو اس تحریر کرنے کی اجرت قرار دے کر جائز کہا جائے گا اور جس کے پاس یہ رسید اور وثیقہ رقم دینے کے لئے بھیجا گیا ہے، اگر وہ شخص اس پہلے شخص کا نائب یا وکیل ہے جب تو اس کے لئے حکم شرعی یہ ہوگا کہ وہ بغیر کچھ پیسہ لئے ہوئے بعینہ وہ رقم ادا کر دے، اگر کچھ پیسہ لئے بغیر نہیں دیتا ہے تو یہ پیسہ لینا رشوت ہوگا۔ اور رشوت کا حکم یہ ہے کہ مجبوری کی وجہ سے دینے والا گنہگار نہ ہوگا، صرف لینے والا گنہگار ہوگا اور رقم کے مالک کا پیسہ وصول کر لینے سے گنہگار نہ ہوگا، بلکہ جائز رہے گا۔

اور اگر یہ شخص رسید بھیجنے والے کا نائب یا وکیل نہیں ہے تو پھر حکم شرعی یہ ہوگا کہ اگر اس کو یہ رقم دینے میں کچھ عمل کرنا پڑتا ہے تو وہ اجرت قرار دے کر لے سکتا ہے۔ یہاں تک کے اس معاملہ کا تعلق ہنڈی سے نہیں ہوگا۔

البتہ چونکہ یہ طریقہ خطرہ سے بچنے کے لئے کیا جاتا ہے، اس لئے جب اجرت وغیرہ لے دیکر کیا جائیگا تو سفتجہ کا معاملہ ہو کر کراہت سفتجہ آجائے گی اور اس کے جواز کا حیلہ یا بوجہ مجبوری اس کے ارتکاب کی جو گنجائش فقہاء کرام فرماتے ہیں اس کے مطابق عمل کیا جائے گا۔

ہنڈی سے اس معاملہ کا تعلق اسلئے نہیں ہوگا کہ ہنڈی عموماً مہاجنوں کے درمیان چلتی ہے، تقریباً ہر مہاجن کا تعلق لین دین کا دور تک کے مہاجنوں سے ہوتا ہے اور ان کو جب کسی گاہک کو رقم دینی ہوتی ہے تو وہ اس گاہک کے کسی قریبی مہاجن کے لئے ایک تحریر بطور سند لکھ کر دیدیتے ہیں یا بھیج دیتے ہیں کہ یہ رقم فلاں مہاجن سے وصول کر لو، جب وہ تحریر اس مہاجن کو پہنچتی ہے تو وہ اول مہاجن سے اس کی تحقیق کرتا ہے اگر سابق مہاجن قرار کر لیتا ہے (جن کو مہاجن کی اصطلاح میں سکارنا بولتے ہیں) تو وہ ثانی مہاجن رقم کا فیصد کاٹ کر وہ رقم مستحق کے حوالہ کر دیتا ہے، اور مہاجنوں کا طریقہ ان کے اپنے مقصد سے اور سہولت کی غرض سے ہوتا ہے جس کا تعلق اسی مستحق رقم سے ہوتا ہے، اس لئے یہ فیصد کاٹی ہوئی رقم بلاشبہ سود (ربوا) بن جاتی ہے اور اس طرح یہ معاملہ ناجائز ہو جاتا ہے۔

پس اگر کوئی شخص مہاجنوں کی طرح رقم کا فیصد لے کر کاروبار کرنے لگے تو اس کا یہ معاملہ بھی بیشک ہنڈی کے معاملہ کی طرح ناجائز شمار ہوجائے گا۔

یہیں سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ جس شخص کی یا جس دوکاندار کی معرفت دوسرے ملک میں اپنی رقم بھیجنا چاہتا ہے اگر اس دوسرے ملک میں اس شخص کی دوکان ہے، پس اگر بھیجنے والا کتابت تحریر وسند کی اجرت کے طور پر کچھ لے کر تحریر دیتا یا بھیجتا ہے تو اجرت کتابت کی تاویل سے یہ امر جائز کہا جائے گا، باقی دوسرے دوکاندار پر لازم ہے کہ اپنے ملک کی کرنسی کے مطابق جتنی رقم (زیادہ یا کم) تجویز ہوئی ہو پوری دیدے، اگر کچھ رقم خود لئے بغیر نہیں دے گا تو یہ لینا سود ہوگا، اور اس صورت کا حکم مہاجنوں کی ہنڈی کے احکام کے ضمن میں تفصیل سے گزر چکا ہے، پھر ایسا کاروبار بالکل ہنڈی کے کاروبار کی طرح شرعاً ناجائز شمار ہوگا۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

پگڑی اور بعض دوسرے کرایہ داریوں کا شرعی حکم:

آج کل عام رواج ہے کہ کرایہ دار کسی مکان یا دوکان کو خالی کرتے ہیں تو لینے والے سے کچھ روپیہ لیکر مکان یا دوکان خالی کرتے ہیں اس میں اکثر مالک جائداد سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا، بلکہ ایک کرایہ دار دوسرے کرایہ دار سے معاملہ کر کے مکان یا دوکان دوسرے کے حوالہ کر دیتا ہے اور کچھ روپیہ خالی کرنے کا لے لیتا ہے۔ براہ کرم یہ فرمائیں کہ یہ لینا جائز ہے یا ناجائز۔ اسی طرح اگر ایک دوکان یا مکان کے دو کرایہ دار مشترک طور پر ہوں اور ان میں ایک کرایہ دار اپنا حق کرایہ داری دوسرے کو دینا چاہتا ہے، مگر اس کے معاوضہ میں وہ پانچ ہزار روپیہ مانگ رہا ہے، روپیہ اس کے لیے لینا جائز ہے یا ناجائز؟

کرایہ داری حق ملکیت نہیں ہے بلکہ حق منفعت ہے، کیا حق منفعت کے انتقال یا اس کو فروخت کرنے کی شریعت میں کوئی مثال موجود ہے، فقہ حنفی میں بظاہر اس کی کوئی گنجائش معلوم نہیں ہوتی کیا دوسرے ائمہ سے کسی کے یہاں حق منفعت ناقابل انتقال یا ناقابل فروخت ہے، یہ بات بھی ملحوظ رہے کہ اس حق منفعت میں جس میں صاحب منفعت نے کوئی محنت صرف کی ہے، مثلاً کتاب کا حق اشاعت مصنف کی طرف سے، دوسرے صاحب منفعت نے کوئی محنت صرف نہیں کی، جیسے مذکورہ بالا صورت ہے۔ براہ کرم ان تمام صورتوں کو واضح فرمائیں۔

مجیب اللہ ندوی (مہتمم جامعۃ الرشاد، اعظم گڑھ)

الجواب وباللہ التوفیق:

کرایہ دار کسی مکان یا دوکان کو محض خالی کرنے کے عوض میں جو رقم لیتے ہیں جس کو پگڑی کہتے ہیں، اس رقم کو لینا جائز نہیں، ہاں اگر کرایہ دار نے اصل مالک کی اجازت سے دوکان یا مکان میں کوئی تعمیر کی ہو یا اس کی عمارت میں کوئی ایسا اضافہ کیا ہو یا اس کی مرمت وغیرہ اس طرح کی ہو جس سے اس مکان یا دوکان کی مالیت وحیثیت بڑھ گئی ہو تو اس اضافہ کے اعتبار سے مناسب معاوضہ لے سکتا ہے، کرایہ داری حق ملکیت نہیں ہے وہ حق منفعت ہے، اس کی خرید وفروخت درست نہیں ہے۔ البتہ بعض فقہاء متاخرین نے بعض کرایہ داروں کو حق قرار دیا ہے، جس کا مفہوم یہ ہے کہ جو کرایہ دار تقاضائے وقت کے مناسب معقول کرایہ دیتا ہے اور اس کی کرایہ داری سے مکان یا دوکان کا کوئی ضرر نہ ہو تو بغیر وجہ شرعی کے اس کرایہ دار سے تخلیہ نہیں کرا سکتے، ہاں اگر مالک مکان یا مالک دوکان کو اور اگر موقوفہ ہو تو وقف کو خود اپنے لیے ضرورت ہو تو ان لوگوں کو ہر صورت میں تخلیہ کرالینے کا پورا حق رہے گا۔

اسی طرح کرایہ دار اگر اپنا حق قرار (حق سکونت) کسی دوسرے شخص کو دینا چاہے تو انہی مذکورہ بالا شرائط وقیود کے ساتھ بطور ہبہ کے دے سکتا ہے اور اگر بطور کرایہ داری کے دینا چاہے تو جو کرایہ خود اصل مالک کو دیتا تھا تو صرف اسی کرایہ میں دے سکتا ہے، اس سے زائد کوئی مقدار اپنے لئے نہیں لے سکتا۔

غرض یہ پگڑی کی مروجہ صورت جو ایک کرایہ دار دوسرے کرایہ دار سے لیتا ہے تو یہ شریعت مطہرہ کے خلاف ہے، البتہ اصل مالک مکان، یا مالک دوکان اگر کسی کو کرایہ پر دے اور ماہانہ کرایہ کے علاوہ کوئی رقم ایک مشت بھی وصول کرے تو اسے اگر چہ پگڑی کا نام دے کر لیا جائے اس میں کچھ زر کرایہ پیشگی وغیرہ کی توجیہ کر کے جواز کی گنجائش ہو سکتی ہے، بشرطیکہ اور تمام شرائط اجارہ اجرت متعین ومعلوم ہوں۔

رہ گئی یہ بات کہ دوسرے ائمہ میں سے کسی کے نزدیک اس کا جواز ہے یا نہیں تو اس کا تحقیقی جواب دیگر ائمہ کے محققین سے ہی لینا مناسب ہے، البتہ علامہ شامی نے جلد رابع میں مذکورہ صورتوں کی اباحت کا قول مالکی مشائخ سے نقل کیا ہے۔

رہ گیا حق تصنیف کے محبوس کرنے کا مسئلہ اس میں یہ تفصیل ہے کہ جب تک کہ وہ تصنیف مسودوں کی شکل میں ہے اس وقت تک وہ محض مصنف کی ملک ہے اور اس کو اختیار ہے کہ چاہے خود شائع کرے یا کسی کے ہاتھ جس قیمت پر چاہے فروخت کر دے یا مفت دیدے، پھر اس لینے والے کو یہی سب اختیارات حاصل ہو جائیں گے، لیکن جب طبع ہو کر اس کی اشاعت عام ہو جائے تو اب اس میں علماء کی دو رائیں ہیں: ایک جماعت یہ فرماتی ہے کہ عام طباعت واشاعت کے بعد جو نسخہ

کوئی شخص خریدے گا وہ اس کا مالک ہوجائے گا اور مالک ہونے کا تقاضا یہ ہے کہ وہ اس پر ہر مالکانہ تصرف (پھاڑ کے پھینک دے، جلادے، یا طبع کرادے وغیرہم)، سب حاصل ہوجائے، لہٰذا خریدنے والے کو پابند کرنا کہ وہ طبع نہ کرائے اصول شرع کے خلاف ہوگا، نیز اس طرح پابندی کرنے میں اچھی چیزیں اور علوم کی ترویج واشاعت کو بھی مسدود کرنا لازم آئے گا، اس کا عدم جواز بھی ظاہر ہے۔

دوسری جماعت مثلاً صاحب "عطر ہدایہ" اور ان کے موافقین ہیں وہ اس پابندی کے جواز کے قائل ہیں، ان کی دلیل یہ ہے کہ یہ چیزیں حقوق مجردہ کی بیع نہیں ہے اور نہ اصول شرع کے خلاف ہے، بلکہ یہ اپنے سرمایہ ومحنت کا تحفظ ہے اور تحفظ کا ایک طریقہ ہے، نیز یہ ترویج کو مسدود کرنا نہیں ہے، بلکہ اشاعت کو منتظم و درست رکھنے کا، نیز تصنیف وتالیف میں ترقی کا ذریعہ ہے۔ احقر کا بھی میلان پہلے اسی طرف تھا، مگر غور کرنے سے یہ بات محقق ہوگئی کہ کتب دینیہ وعلوم دینیہ کی تصانیف ومضامین کو اس پابندی سے مستثنیٰ رکھا جائے، اس لئے کہ اس پابندی سے اگرچہ ترویج اشاعت من کل الوجوہ مسدود نہ ہوتی ہو، لیکن اس میں تقلیل صواب لازم آئے گا اور یہ تقلیل بھی مزاج شرعی کے اور ارشادات نبوی ﷺ مثلاً "ولیبلغ الشاهد الغائب" (۱) اور "بلغوا عني ولو اٰية" (۲) وغیرہا کے خلاف ہونا لازم آتا ہے، نیز جو حضرات یہ پابندی لگاتے ہیں وہ عموماً دنیوی مفاد واغراض اور دنیوی کاروبار کے طریقہ پر لگاتے ہیں جس سے ایہام وشبہ "ولا تشتروا باٰیاتي ثمنا قليلا" (۳) کی مخالفت کا بھی مترشح ہوتا ہے، اس لئے بھی کتب دینیہ کی تصانیف کو یا اس کے حق اشاعت کو محبوس نہ کیا جائے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۳۰/۵/۹۷ ۱۳ھ

کرایہ دار کا مکان دوسرے کو زائد کرایہ پر دینا:

اگر کسی شخص کے اجارہ کا مکان ہے اور وہ اس اپنے مکان میں الماری جو دیوار میں لگی ہوئی ہے اور چارپائی اور کچھ دوسرا فرنیچر جو دیوار میں لگا ہوا ہے وغیرہ چھوڑ کر زیادہ اجرت سے دوسروں کو مکان دیتا ہے آیا یہ جائز ہے یا نہیں جائز کرنے کے لئے وہ زبان سے یوں کہتا ہے کہ میں ان ساری استعمالی چیزوں کا جو مکان میں چھوڑی ہے اس کے بدل اجرت وصول کرتا

۱- صحیح البخاری ۱/۲۳۵ باب الخطبۃ ایام منیٰ۔
۲- مشکوٰۃ کتاب العلم للخطیب التبریزی ۱/۳۲۔
۳- سورۂ مائدۃ ۴۴۔

ہوں تو شرعاً یہ معاملہ کرنا کیسا ہے؟

محمد سلیمان بھاگلپوری (مہتمم جامعہ نذیریہ کاکوسی، ضلع مہسانہ، گجرات)

الجواب وباللہ التوفیق:

جائز ہے اور اجرت زائدہ اس کے لئے حلال طیب ہے جواز اور حلت زیادت کے لئے یہ کہنا ضروری نہیں کہ میں اجرت زائدہ الماری و چارپائی وغیرہ کی اجرت میں دے رہا ہوں (۱)، "وله السکنی بنفسه و إسکان غیره بإجارة وغیرها وکذا کل مالا یختلف بالمستعمل یبطل التقیید لأنه غیر مفید بخلاف ما یختلف به کما سیجئی ولو آجر بأکثر تصدق بالفضل الا فی مسئلتین اذا آجرها بخلاف الجنس أو أصلح فیها شیئاً" (۲)۔

"قوله بخلاف الجنس أی جنس ما استأجر به وکذا اذا آجر مع ما استأجر شیئاً من ماله یجوز أن تعقد علیه الإجارة فإنه تطیب له الزیادة" (۳)۔

"قوله أو أصلح فیها شیئاً بأن جصصها او فعل فیها مسنّاة وکذا کل عمل قائم لأن الزیادة بمقابله مازاد من عنده حملاً لأمره علی الصلاح کما فی المبسوط" (۴)۔

"الأصل ان أمور المسلمین محمولة علی السداد والصلاح حتی یظهر غیره" (۵)۔

طوائف کو مکان کرایہ پر دینا:

زید نے اپنا مکان عرصہ ایک سال ہوا کرایہ میں دیدیا تھا اس کے کچھ عرصہ بعد عمرو نے وہی مکان ایک طوائف کے نام کچھ روپیہ لے کر اسی طوائف کے نام الاٹ کرادیا، لہذا اب وہ عورت زید کو پیشے کے پیسے کما کر کرایہ ادا کرتی ہے، لہذا اب زید اس کے لئے کیا صورت اختیار کرے جو کہ جائز ہو اور کرایہ اس کے لئے حلال ہو سکے، بینوا توجروا

مفتی محمد فاروق قاسمی مدرسہ دارالعلوم گذری بازار، میرٹھ

۱- اس سے آگے بھی مفتی صاحب کی عبارت سمجھ میں نہیں آسکی (مرتب)۔
۲- الدر المختار علی ہامش رد المحتار ۵/۱۸۔
۳- رد المحتار ۵/۱۸۔
۴- حوالہ بالا ۵/۱۸ نعمانیہ۔
۵- اصول الکرخی مع قواعد الفقہ / ۱۲۔

الجواب وباللہ التوفیق:

حرام کاری کرانے کے لئے تو مکان کا دینا جائز نہیں نہ کرایہ لے کر نہ بغیر کرایہ لئے ہوئے، البتہ رہائش یا تجارت وغیرہ کے لئے مطلقاً کرایہ پر دیا اور اس میں کرایہ پر لینے والی حرامکاری کرانے لگے یہ خود اس کا فعل ہوگا اور اس کا اثر کرایہ پر نہ آئے گا، یہ ایسا ہی ہوجائے گا کہ کسی غیر مسلم کو مکان رہائش یا تجارت کے لئے دیا اور وہ اس میں غیر اللہ کی پوجا پاٹ کرنے لگے پس جس طرح اس غیر مسلم سے کرایہ کی رقم لینا جائز ہے اسی طرح اس سے بھی لینا جائز ہوگا(۱)، البتہ جب یقین ہو کہ یہ اسی حرامکاری کا پیسہ دیتی ہے تو اس سے کہا جائے کہ تو یہ پیسہ کرایہ میں نہ دے بلکہ جائز دے اور اس سے مکان خالی کرانے کی کوشش کی جائے۔ اگر مکان خالی کردے تو فہوالمراد اور اگر مکان خالی نہ کرے لیکن اس کے پاس حلال کمائی ہو اور اس کا پیسہ دے یا قرض لے کر دیدیا کرے اور پھر بعد میں اپنا قرض ادا کرے جب بھی لے لینے کی گنجائش رہے گی اور اگر وہ یہ نہ کہے کہ جائز و حلال پیسہ سے دیتی ہوں اس کے پاس حلال کمائی نہ ہو اور مکان بھی خالی نہ کرایا جاسکے تو پھر یہ حیلہ کرلے کہ ادھار قرض کسی غیر مسلم سے لے کر کام چلائے اور جب وہ رقم کرایہ کی دے تو اس سے غیر مسلم کا وہ قرض اتار دیا جائے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دار العلوم دیوبند سہارنپور ۱۴۰۱/۱۲/۶ھ

کسی مسلمان کا ناچ گانے کی تقریب میں اپنا شامیانہ لگانا اور اس کا کرایہ وصول کرنا کیسا ہے؟

کسی مسلمان ٹینٹ ہاؤس والے کو ناچ گانے کی تقریب میں اپنا شامیانہ لگانا اور اس کا کرایہ وصول کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب وباللہ التوفیق:

گانے بجانے کے لیے کرایہ پر دینا جائز نہ رہے گا اور نہ اس کی آمدنی حلال رہے گی، البتہ ان نامشروع چیزوں کے لیے کرایہ پر دے اور کرایہ پر لے جانے والا ان نامشروع چیزوں میں خود استعمال کرلے تو چونکہ یہ فعل مالک شامیانہ کا نہ

۱- ''ولا (تصح الإجارة) لأجل المعاصي مثل الغناء والنوح والملاهي ولو أخذ بلا شرط يباح'' (الدرالمختار مع ردالمحتار ۹/۷۵)۔

ہوگا اس لیے اس کی گنجائش امام صاحب علیہ الرحمۃ کے اصول پر رہے گی، صاحبینؒ کی تصریح کے مطابق اعانت علی المعصیت ہوکر ممنوع رہے گا(۱)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۶/۴/۱۴۱۱ھ

الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ، کفیل الرحمان نائب مفتی

سفر حج کے زمانہ کی تنخواہ کا حکم کیا ہے؟

ایک مولانا صاحب ایک مدرسہ میں مدرس ہیں وہ فریضۂ حج ادا کرنے کے واسطے تین ماہ کی چھٹی لے کر حج کرنے گئے حج سے واپس آکر ان تین ماہ کی تنخواہ لینا چاہتے ہیں آیا ان تین ماہ کی تنخواہ کے وہ مستحق ہیں یا نہیں؟ اوران کے واسطے لینا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب وباللہ التوفیق:

اگر سابق میں اس طرح کی تنخواہ دینے کی نظیر اس مدرسہ میں موجود ہو جب تو اس تنخواہ کے دینے میں کوئی کلام ہی نہیں، اوراگر اس مدرسہ میں اس کی نظیر موجود نہیں، لیکن اگر قرب وجوار کے مدارس دینیہ میں اس طرح دینے کا رواج موجود ہے تب بھی اس تنخواہ کے دینے میں کوئی شبہ نہیں اور اگر ایسا بھی نہیں ہے تو پھر چونکہ اراکین وذمہ داران انتظامیہ قوم کے وکیل ہوتے ہیں اگر وہ عوام کی زبوں حالی کی بنیاد پر دینا چاہیں تو دے سکتے ہیں، اس طریقہ کار کی نظیر اپنے اکابر کے مدارس میں مل سکتی ہے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۷/۱۲/۱۴۱۰ھ

۱- "(وجاز إجارة بيت بسواد الكوفة لا بغيرها على الأصح ليتخذ بيت نار أو كنيسة أو بيعة أو يباع فيه الخمر وقالا لا ينبغي ذالک لأنه إعانة على المعصية وبه قالت الثلاثة) قوله (وجاز إجارة بيت الخ) هذا عنده أيضا، لأن الإجارة على منفعة البيت ولهذا يجب الأجر بمجرد التسليم ولا معصية فيه وإنما المعصية بفعل المستاجر وهو مختار فينقطع نسبته عنه (إلى قوله) والدليل عليه أنه لو آجره للسكنىٰ جاز وهو لا بد له من عبادته فيه" (فتاویٰ شامی ۵/۲۵۵)۔

۱-امامت پر تنخواہ لینا:

امامت کی تنخواہ لینا یا بذات خود طے کرنا درست ہے یا نہیں؟

۲-قرآن خوانی پر اجرت لینا:

اکثر بمبئی اور دیگر مقامات پر کلام پاک پڑھنے جاتے ہیں یہ درست ہے کہ نہیں۔

مفتی حسن انصاری (مقام گڈھی سلیم پور، مرادآباد)

الجواب وباللہ التوفیق:

۱-کسی مقام پر قرآن پڑھ کر یا سن کر خواہ تراویح میں ہو جیسے بھی ہو اجرت لینا جائز نہیں خواہ طے کر کے لے یا بغیر طے کئے ہوئے سب ناجائز ہے(۱)۔

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۹/ ۸/ ۱۴۰۰ھ

دو ماہ کی تنخواہ کی شرط پر چندہ کرنا:

مدرسین مدرسہ کو چندہ کے لئے نکلے ہوئے ماہ میں دوگنا تنخواہ لینا یعنی یہ شرط لگانا کہ ہم جس مہینے میں چندہ کے لئے نکلیں گے اس ماہ ایک ماہ کے ساتھ دو ماہ کی تنخواہ لیں گے جائز ہے یا نہیں، دلیل میں والعاملین علیہا پیش کرتے ہیں، اگر ہے تو کیا مدرسہ کے روپئے سے یہ تنخواہ دینا جائز ہے بینوا توجروا۔ وباللہ التوفیق

الجواب وباللہ التوفیق:

مدرسین یا ملازمین مدرسہ جو چندہ کے لئے جاتے ہیں اگر زمانہ تعطیل میں بھیجے جائیں تو علاوہ تنخواہ کے مزید جس معاوضہ کا معاملہ طے ہوا اس کے وہ مستحق ہوں گے اگر کوئی معاملہ مزید طے نہیں ہوا ہے تو خرچ کے علاوہ ڈبل تنخواہ کے مستحق نہ

۱- ایک مقررہ مدت کے لئے قراءۃ قرآن کے متعلق "جوہرہ" میں جو منقول ہے: "قال بعضهم لا يجوز وقال بعضهم يجوز، وهو المختار" اھ اس پر علامہ شامی لکھتے ہیں: "والصواب أن يقال على تعليم القرآن، فإن الخلاف فيه كما علمت لا في القراءة المجردة فإنه لا ضرورة فيها .... فالحاصل أن ما شاع في زماننا من قراءة الأجزاء بالأجرة لا يجوز" (تفصیل کے لئے دیکھئے: ردالمحتار علی الدرالمختار ۹/ ۷۶، ۷۷، ۷۸)۔

ہوں گے اور زمانہ تعلیم میں بھیجے جائیں اور کوئی مزید معاملہ طے نہ ہوا اور نہ کوئی اس سلسلہ کا دستور ہو تو صرف تنخواہ اور سفر خرچ کے مستحق ہوں گے ورنہ جو مزید معاملہ اس کام کے لئے طے یا دستور مدرسہ ہوا سکے مستحق ہوں گے (۱)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۰/۸/۱۴۰۰ھ

جانور بٹائی پر دینا:

جانور خرید کر تہائی یا چوتھائی حصہ پر دینا تو ناجائز ہے لیکن اس میں کوئی جواز کی صورت ہے یا کہ نہیں مثلاً یہ صورت ہو کہ جانور والے سے کہا جائے کہ تم اس جانور کی پرورش کرو اس جانور کی فروخت پر تم کو تیس فیصدی یا چالیس فی صدی مزدوری دیں گے کیا یہ شکل جواز کی ہوگی؟

الجواب وبا للہ التوفیق:

جیسے جانور تہائی یا چوتھائی پر پرورش کرنے کے لئے دینا جائز نہیں ہے اسی طرح یہ صورت مذکورہ بھی جائز نہیں ہے، اس کے جواز کی یہ صورت ہے کہ آپ جس کو جانور پرورش کے لئے دیں اس کو اس پرورش کی مزدوری مقرر کر کے دیں پھر اس کو وہ مزدوری دیجاوے جو ایسے جانور کی اس طور پر پرورش کرنے پر عام طور سے دیجاتی ہے جس کو اجر مثل کہتے ہیں (۲)، ایک جواز کی صورت یہ بھی ہے کہ جو جانور پرورش کے لئے دیا جائے تو پرورش کرنے والے کو وہ نصف جانور قیمت متعینہ پر فروخت کر دیا جاوے اور وہ قیمت اس کو معاف کر دی جاوے تو اب یہ دونوں اس جانور کے اور جو اس سے فائدہ ہوگا اسکے شریک ہوں گے ”والحیلة فی جوازہ أن یبیع نصف البقرة منه بثمن ویبرئه عنه“(۳)۔

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند، سہارنپور

الجواب صحیح: محمد جمیل الرحمٰن، مفتی محمود غفی عنہ

۱- اجارہ کی بحث میں مذکور ہے ”وشرطها کون الأجرة والمنفعة معلومتین لأن جهالتهما تفضی إلی المنازعة“ (درمختار مع ردالمحتار ۹/۷)۔

۲- ”وعلی هذا إذا أعطی البقرة بالعلف لیکون الحادث بینهما نصفین فما حدث فهو لصاحب البقرة وللآخر أجر مثل علفه وأجر مثله“ (ردالمحتار ۳/۸۴۴)۔

۳- عالمگیری ۴/۳۳۰۔

جانوروں کو ادھیا پر دینا:

مرغی، بکری، گائے، بھینس وغیرہ ادھیا پر دینا کیسا ہے؟ جواز وعدم جواز بدلائل بیان کریں۔

خادم مشتاق احمد محمد پور صدر اعظم گڑھ

الجواب وباللہ التوفیق:

ان چیزوں کو ادھیا پر دینے میں اجرت ومدت عمل دونوں مجہول ہوتی ہے اس لئے یہ اجارہ فاسدہ کے حکم میں ہوتا ہے اور اس کے جواز کا ایک حیلہ محققین علماء نے یہ بھی لکھا ہے کہ اس جانور ہی میں سے آدھا جانور اس ادھیا پر لینے والے کے ہاتھ کم سے کم قیمت پر جتنی قیمت پر مناسب ہو فروخت کردے اس طرح وہ لینے والا خود آدھے جانور کا مالک ہوجائے گا اور آدھے دودھ و بچے کا بھی مالک بوجہ شرکت کے ہوجائے گا اور اس کا کھلانا پلانا سب تبرع ہوکر جائز رہے گا(۱)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند، سہارنپور ۵/۳/۱۴۰۱ھ

اجرت لے کر جنات کا علاج:

اگر غیر اسلامی مذہب جیسے ہندو یا عیسائی وغیرہ ہیں ان کے جنات وغیرہ کا علاج کرنا اور علاج پر اجرت لینا درست ہے یا کہ نہیں غیر مذہب کے لوگوں سے۔

الجواب وباللہ التوفیق:

کافروں کو بھی تعویذ دے سکتے ہیں مگر آیات قرآنی یا اسماء حسنی وغیرہ لکھ کر نہ دینا چاہئے کہ ان سے ان چیزوں کے واقعی اور صحیح احترام متصور نہیں اگر ہو جب بھی خلاف احتیاط ہے تعویذ گنڈے وغیرہ پر جو اس فن کو جانتا ہو اجرت لے سکتا ہے

۱- ''وشرطها (الإجارة) كون الأجرة والمنفعة معلومتين لأن جهالتهما تفضي إلى المنازعة'' (درمختار ۹/۷) اور اس کے تحت شامی میں مذکور ہے ''ولو كانت حيوانا فلا يجوز إلا أن يكون معينا'' (ردالمحتار علی الدرالمختار ۹/۷)، ''المنفق بلا اذن الآخر ولا أمر قاض فهو متبرع'' (ردالمحتار علی الدرالمختار ۹/۲۱۱)۔

ہر آدمی کو جائز نہیں ہے۔

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

کمیشن پر سفیر مقرر کرنا جائز ہے یا نہیں؟

کمیشن پر سفیر مقرر کرنا جائز ہے یا کہ نہیں دارالعلوم میں سفارت کے لئے کیا قواعد ہیں مختصر طور پر ان کو بھی تحریر کریں۔

الجواب وباللہ التوفیق:

کمیشن پر سفیر مقرر کرنا شرعاً جائز نہیں ہے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند، سہارنپور ۱۹/ ۸/ ۱۳۸۵ھ

الجواب صحیح سید احمد علی سعید نائب دارالعلوم دیوبند

امامت کی تنخواہ لینا جائز ہے یا نہیں؟

کیا امام مسجد کو نماز پڑھانے کی تنخواہ لینی جائز ہے اور کیا علاوہ نماز پڑھانے کے کوئی دوسرا کام کرنا یا تلاش کرنا جائز نہیں ہے۔

الجواب وباللہ التوفیق:

امامت کی تنخواہ لینا جائز ہے (۱)، اور امامت کے کام میں فرق نہ پڑے تو دوسرے کام کی تلاش بھی درست ہے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند، سہارنپور

الجواب صحیح: محمود علی عنہ دارالعلوم دیوبند

۱- ''ویفتی الیوم بصحتها لتعلیم القرآن والفقه والامامة والاذان'' (ردالمحتار ۹/ ۷۶ مکتبہ زکریا)۔

تعویذ پر اجرت لینا:

تعویذ گنڈے کے عوض میں رقم لینا کن صورتوں میں جائز ہے اور کن صورتوں میں نا جائز ہے۔ کیا جھوٹ بولکر کہ تمہارے مریض کی اتنے روپیہ کی دوائیاں ہیں لینے اور اتنے روپیہ خرچ ہوں گے کچھ روپیہ تو تبدیل وغیرہ میں صرف کر کے باقی ماندہ کو بغیر اس کے اطلاع دیئے خرچہ میں لانا کیسا ہے مقصد یہ ہے وضاحت تحریر کریں۔

الجواب وباللہ التوفیق:

تعویذ گنڈہ ایک علم ہے اگر جانتا ہے تو اس پر اجرت لینا جائز ہے جھوٹ بولکر معمولی مرض کو شدید بتا کر پیسہ وصول کرنا فریب وخداع ہے جو جائز نہیں ہے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند، سہارنپور ۲۷/۲/۹/ ۱۳۸۵ھ

قرآن خوانی پر اجرت لینا:

کیا میت کی مغفرت کے لئے جو ختم کلام اللہ شریف پڑھا جاتا ہے اس ختم میں کھانا پینا درست ہے ختم کی اجرت لینا ٹھیک ہے۔

الجواب وباللہ التوفیق:

اجرت ختم قرآن خوانی لینا جائز نہیں ہے (۱)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند، سہارنپور

بلاٹکٹ یا کم ٹکٹ پر سفر کرنا:

ریل، بس میں کنڈیکٹر سے ملکر بلاٹکٹ یا کم ٹکٹ پر سفر کرنا آج کے ہندوستان میں کیسا ہے کیا شرعی طور پر جائز ہے؟

محمد ادریس چورو راجستھان

۱- ''فالحاصل أن ماشاع في زماننا من قرأة الأجزاء بالأجرة لايجوز'' (ردالمحتار ۹/ ۷۷ مکتبہ زکریا)۔

الجواب وبالله التوفيق:

کنڈ یکٹر اگر بس کا مالک ہے جب تو گنجائش جواز ہے(۱) ورنہ جائز نہیں، اور ریل میں تو عدم جواز ظاہر ہے اس لئے کہ بعض صورتوں میں خداع ہوگا اور بعض صورتوں میں چوری اور بعض صورتوں میں غصب ہوگا اور بدمعاملگی اور قانونی چوری بھی ہونے کی وجہ سے عزت وآبرو کا ہر وقت خطرہ بھی ہوگا جس سے حفاظت بھی واجب ہے پس اس ترک واجب کا بھی گناہ مزید برآں ہوگا (۲)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند، سہارنپور ۱۶/۹/۱۴۰۰ھ

سوسائٹی کے تحت کام کرنے والے ملازم کی تنخواہ:

میں یہاں ایک فروٹ گرورس کوآپریٹیو سوسائٹی میں عرصہ تین سال سے بحیثیت منیجر کام کرتا ہوں، یہ سوسائٹی زیر کنٹرول گورنمنٹ ہے اور اس کو چلانے والے یا اس کے ذمہ دار آٹھ افراد ہیں۔ اس سوسائٹی کا دائرہ کاروبار چھ حلقہ پر پھیلا ہوا ہے، ان ذمہ دار افراد کا کام ہے بینک سے منافعہ پر روپیہ فراہم کرکے کسانوں کو ایڈوانس میوہ پر دینا، میوہ وصول کرکے فروخت کرنے کے بعد روپیہ معہ منافعہ داخل بینک کرنا۔ اس درمیانہ داری پر بینک سوسائٹی کو 2% منافع دیتا ہے جو اس کے دفتری اخراجات ہوتے ہیں۔ دیگر سوسائٹی میوہ پر آرتی کی طرح کمیشن حاصل کرتی ہے جو اس کا کاروباری نفع ہوتا ہے۔ اب اس تمام کاروبار کو چلانے کے لئے سوسائٹی نے بعوض تنخواہ چار ملازم رکھے ہیں جو تنخواہ پر یہ کام چلا رہے ہیں۔ یہاں اک مقامی قاری صاحب ہیں جو فرماتے ہیں کہ ہماری تنخواہ حرام ہے چونکہ یہ سودی کاروبار ہے اور اک جامع کے مولوی صاحب ہیں وہ فرماتے ہیں کہ آپ کی تنخواہ حلال ہے چونکہ آپ جسمانی یا دماغی محنت صرف کرکے اپنا معاوضہ حاصل کررہے ہیں سود لینے یا دینے کا مسئول دینے والا کسان اور لینے والا بینک ہے ایک اور مثال مولوی صاحب فرماتے ہیں بہت سارے صحابہ کرام تھے جو یہودیوں کے یہاں ملازمت کرتے تھے، حالانکہ یہودیوں کا تمام کام سودی سود پر چلتا تھا۔ ایک اور پیر طریقت فرماتے ہیں آپ کی تنخواہ حلال ہے چونکہ منافع دینے والے لوگ اور لینے والا بینک دیگر ہندوستان میں جس قدر سرکاری ملازم ہیں ان کی اکثر تنخواہ سود کے روپیہ سے آتی ہے آیا مجھے یہ نوکری کرنی چاہیے یا نہیں؟

۱- "ولو قال: حملتك عليها في سبيل الله فهو إعارة هكذا في فتاوى قاضي خان" (فتاوی عالمگیریہ ۴/ ۳۶۳)۔

۲- "يا أيها الذين آمنوا لا تأكلوا أموالكم بينكم بالباطل إلا أن تكون تجارة عن تراض منكم ولا تقتلوا أنفسكم إن الله كان بكم رحيما" (سورہ نساء ۲۹) "درء المفاسد أولى من جلب المصالح" (الاشباہ والنظائر طبعہ کراچی/ ۱۲۵)۔

الجواب وباللہ التوفیق:

ذمہ دار افراد جو بینک سے سودی قرض لینے اور سود دینے کا کام کرتے ہیں ان کا یہ کام تو ناجائز ہوگا باقی چونکہ سود کا پیسہ اپنے پاس آتا نہیں بلکہ سود کا پیسہ دینا پڑتا ہے اس لئے اس طرح قرض لینے میں جو پیسہ آئے گا وہ خود خبیث نہ ہوگا، البتہ خبیث طریقہ سے آنے کی وجہ سے اس قرض لینے دینے میں قدرے قباحت آئیگی (۱)، باقی وہ لیا ہوا روپیہ اور اس سے کمائی ہوئی آمدنی حرام نہیں بلکہ سب جائز وحلال رہے گی (۲)، جب یہ حکم ان ذمہ داروں کی آمدنی ونفع کا نکلا جو بینک سے سودی قرض لیتے اور سود دیتے ہیں تو جو لوگ ان ذمہ داروں کے علاوہ ہیں اور بینک سے خود سودی قرض نہیں لیتے بلکہ ان کا حکم بدرجہ اولیٰ نکل آیا کہ ان کی آمدنی اور نفع وغیرہ اس وجہ سے حرام وناجائز نہ ہوگا۔ بلکہ جائز وحلال ہوگا (۳)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند، سہارنپور ۱۴۰۱/۱۱/۱۵ھ

جس فیکٹری میں خنزیر کا چمڑا استعمال ہوتا ہو اس میں ملازمت کا حکم:

برطانیہ کی بعض فیکٹریوں میں جن کے مالک نصرانی ہیں اور ان میں خنزیر کا چمڑا دباغت شدہ استعمال ہوتا ہے، جس سے مختلف چیزیں تیار ہوتی ہیں، کیا ایسی فیکٹری میں ایک مسلم ورکر (عامل) کا ملازمت کرنا یا مزدوری کرنا جائز ہے یا نہیں؟

مقبول احمد خادم جامع مسجد گلاسگو

الجواب وباللہ التوفیق:

خنزیر کا چمڑا گوشت سب نجس العین ہے (۴)، مثل انسانی پاخانہ کے ناپاک ہے یہ دباغت کے بعد بھی ناپاک ہی

۱- ''عن ابن مسعودؓ قال: لعن رسول اللہ ﷺ آكل الربا وموكله وشاهديه وكاتبه'' (سنن الترمذی ۳/۵۰۳ کتاب البیوع باب ماجاء فی آکل الربا حدیث ۱۲۰۶)۔

۲- ''واعلم أن المقبوض بقرض فاسد كمقبوض ببيع فاسد أي فيفيد الملك بالقبض كما علمت'' (رد المحتار علی الدر المختار ۷/۳۸۹)۔

۳- تنخواہ اجرت ہے اور غیر مسلم سے اجرت لینا جائز ہے جبکہ ان کے کاروبار سودی بھی ہوتے ہیں، ''ولو استأجر المشركون مسلما ليحمل ميتا منهم إلى موضع يدفن فيه إن استأجروه لينقله إلى مقبرة البلدة جاز عند الكل'' (فتاویٰ عالمگیریہ ۴/۴۴۹)۔

۴- ''أما الخنزير فجميع أجزائه نجسة'' (فتاویٰ عالمگیریہ ۱/۴۴)۔

رہتا ہے (۱) جس طرح پاخانہ خشک ہونے کے بعد بھی ناپاک ہی رہتا ہے، اور خنزیر کا چمڑا مسلم کو خریدنا اور فروخت کرنا بھی درست نہیں ہے (۲)، پس اس چمڑے کو خریدنے بیچنے کی ملازمت تو جائز نہیں۔ اور اس کام کی اجرت وتنخواہ بھی نا درست وغیر حلال ہوگی (۳)، ہاں اگر وہ چمڑا خریدنے اور فروخت کرنے کا کام کرنے کے بجائے اس سے چیزیں بنانے کا مثلاً موزہ، جوتا، وغیرہ بنانے کا کام سپرد ہو تو اس کی اجرت وتنخواہ، حلال وجائز رہے گی (۴)، البتہ یہ کام بہت خراب ہوگا اس لئے کہ اگر خشک چمڑے کاٹنے پٹنے سلنے وغیرہ کا کام ہو تو اگرچہ جب تک اس چمڑے کا اثر (رنگ، بو، مزہ) اپنے ہاتھ وغیرہ پر نہ آوے ناپاک نہ کہا جاوے کہ اس کی مثال ایسی ہی ہوگی جیسے انسانی پاخانہ کو خشک ہونے کے بعد اس کو کاٹنے پٹنے اور ہاتھوں سے اٹھائے رکھے۔

اور اگر وہ چمڑا پانی وغیرہ سے تر کر کے استعمال کرتا ہو یا چھونا وغیرہ پڑے تو ہاتھ بھی نجس ہوجائے گا اور جہاں جہاں اسکی چھینٹ بدن وکپڑے وغیرہ پر پڑے گی نجس ہوجائے گا۔ اور اس کی مثال ایسی ہوگی جیسے انسانی پاخانہ پانی سے تر کر کے چھوئے اور کسی کام میں استعمال کرے (۵)۔

اس لئے ان دونوں قسم کے کاموں کی ملازمت بغیر سخت مجبوری کے اس فیکٹری میں نہ کرنا چاہئے اور اگر پہلے سے ان کاموں پر ملازم ہو تو دوسرے جائز کام کی ملازمت تلاش کرنا ضروری ہے البتہ جب تک دوسرا جائز کام نہ ملے اس وقت تک استعفیٰ دے کر الگ نہ ہوجائے بلکہ توبہ واستغفار کرتا رہے اور دعا کرتا رہے کہ یا اللہ کوئی جائز وحلال کام عنایت فرما اور جب مل جائے تو فوراً اس کام کو چھوڑ دے (۶)۔

۱- ''وكل إهاب دبغ فقد طهر وجازت الصلاة فيه والوضوء منه إلا جلد الخنزير والآدمي'' (ہدایہ ۱/ ۲۴)۔

۲- درمختار میں ہے: ''وبعده أي المبيع يباع إلا جلد إنسان وخنزير وحية''، علامہ شامیؒ ان کے قول ''إلا جلد إنسان'' کے تحت لکھتے ہیں: ''فلا يباع وإن دبغ لكرامته وفي الباقي لإهانته ولعدم عمل الدباغة فيه'' (ردالمحتار علی الدرالمختار ۷/ ۲۶۶)۔

۳- ''ولو استاجر مسلماً ليرعى له الخنازير يجب أن يكون على الخلاف ولو استاجره ليبيع له ميتة لم يجز هكذا في الذخيرة'' (فتاوی عالمگیریہ ۴/ ۴۵۰ نیز دیکھئے ص ۴۴۹)۔

۴- جیسے نوحہ کرنے اور گانے پر اجرت لینا جائز نہیں مگر ان کی کتابت پر اجرت لینا جائز ہے'' بخلاف الاستجار لكتابة الغناء والنوح إنه جائز لأن الممنوع عنه نفس الغناء والنوح لا كتابتهما'' (بدائع الصنائع ۴/ ۳۹)۔

۵- ''السرقين الجاف أو التراب النجس إذا هبت به الريح فأصاب ثوباً لا ينجس ما لم ير فيه أثر النجاسة ولو مر الريح على النجاسة وثمت ثوب مبلول معلق تصيبه الريح قيل بأنه ينجس'' (فتاوی قاضیخان علی ہامش العالمگیریہ ۱/ ۲۵)۔

۶- ''الحاجة تنزل منزلة الضرورة'' (الاشباہ والنظائر/ ۱۲۶، ادارۃ القرآن کراچی)۔

ہاں اگر ان دونوں کاموں (چمڑے ہی کی خرید فروخت کا کام یا ان چمڑوں سے چیزیں بنانے کا کام) کے علاوہ کلرکی وغیرہ کا کام ہوتو اس کی ملازمت کرنا اور اس کی تنخواہ لینا سب جائز ودرست رہے گا(۱)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۴/۸/۱۴۰۰ھ

موذن کی تنخواہ سے متعلق:

ہمارے انجمن میں موذن ملازم ہیں، جن کو تنخواہ پچاس روپیہ ماہانہ دیا جاتا ہے کیا یہ جائز ہے؟

جمیل احمد (ریٹائر پولس سی، آئی، ڈی، محلہ گوپٹلا غ لکھیم پوری پی)

الجواب وباللہ التوفیق:

جس طرح موذن کی تنخواہ ماہانہ مقرر ہے اس طرح چندہ وصول کرنے کی تنخواہ بھی ماہانہ متعین کردیجئے اس سے کہے کہ ہر ماہ اتنی رقم (مثلاً ہزار دو ہزار جومناسب ہولانا ضروری ہے اور اگر تم اس سے زیادہ لائے تو ہم تم کو اس زائد کے اعتبار سے انعام بھی دیں گے اور انعام واضح کردیجئے جب زائد رقم لائے تو پہلے سے جو پیسہ آیا ہوا موجود ہے اس میں سے انعام دے دیجئے اس طرح کام اچھا اور جائز رہے گا۔

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

۱- ''وأما في حق الأجير الخاص فلا يشترط بيان جنس المعمول فيه ونوعه وقدره وصفته، إنما يشترط بيان المدة فقط'' (فتاوی عالمگیریہ ۴/۴۱۱)۔

كتاب الذبائح والأضحية

کتاب الذبائح

بجلی کے جھٹکے یا گولی مار کر جانور کے ذبح کا حکم:

ہمارے شہر میں ذبح کے دوطریقے رائج ہیں:

١-جانور کو بجلی کے جھٹکے سے بے ہوش کرتے ہیں، رگیں کاٹ کر خون بہادیا جاتا ہے۔

٢-دماغ میں کارتوس کی گولی مارتے ہیں، رگیں کاٹی جاتی ہیں، ممکن ہے پوراخون بہہ جاتا ہو، لیکن یقین نہیں ہے۔

الجواب وباللہ التوفیق:

١، ٢-اگر بجلی کا جھٹکا لگنے سے یا کارتوس کی گولی لگنے سے روح فنا نہیں ہوتی اور نہ دم گھٹ کر خون محتبس ومنجمد ہوجاتا ہو بلکہ گردن کی رگوں کے کٹنے سے روح پرواز کرتی ہو اور خون سارا کا سارا نکل جاتا ہو اور گردن کی اکثر رگیں کٹ جاتی ہوں اور اس طرح گردن کی رگیں کاٹنے والے مسلمان یا ایسے اہل کتاب ہوں جو رگ کاٹتے وقت (بوقت ذبح) صرف اللہ کا ہی نام لیتے ہوں تو اگرچہ یہ طریقہ مکروہ اور خلاف سنت اور خلاف طریق انبیاء ہوگا مگر وہ جانور اگر ماکول اللحم ہے تو اس کا گوشت پاک وحلال رہے گا اور اس کا کھانا درست رہے گا، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ١٤٠١/٣/٥ھ
الجواب صحیح: محمود غفرلہ

گائے وغیرہ کو ذبح کرنے سے قبل بندوق کی گولی سے گرانا کیسا ہے؟

ہم اپنے مسلمان بھائیوں کے لئے کنیڈا میں گائے ذبح کرتے ہیں، ایک آدمی کا گائے ذبح کرنا بہت مشکل ہے

چنانچہ ایک چھوٹی سی بندوق کے ذریعے گائے کے سر میں چھوٹی سی گولی ماری جاتی ہے جس سے گائے فوری گر جاتی ہے پھر فوری ان کو ذبح کر دیا جاتا ہے، کیا یہ طریقہ درست ہے؟

اسلامک سینٹر آف عربک، کناڈا

الجواب وباللہ التوفیق:

ذبح کا یہ طریقہ سنت کے خلاف ہے، اور بے وجہ اذیت پہنچانا ہے جو حقوق بہائم کے خلاف اور ان پر ظلم ہے اور باعث گناہ ہے(۱)، باقی اگر جانور اس طرح بیہوش ہو کہ ذبح سے قبل مر نہیں جاتا ہے زندہ رہتا ہے اور گردن کی چار رگوں (ودجین حلقوم، مری) میں سے ودجین اور بقیہ دو میں سے ایک رگ کٹ کر خون پورا پورا نکل جاتا ہے تو ذبیحہ حلال کہا جائے گا اور اس کا کھانا جائز رہے گا(۲)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دار العلوم دیوبند سہارنپور ۲۹/۱۲/۱۴۰۰ھ

گولی سے بیہوش کرنے کے بعد ذبح کرنا:

الیٰ حضرة المفتی بدار العلوم دیوبند الاستفتاء ما قولکم رحمکم الله فی المسئلة التالیة:

اللحوم التی تصدر من دانمرک إلی البلاد العربیة الإسلامیة تذبح کالتالی:

۱۔ یأتی بالحیوان حیاً الی المجزرة المعدة له میکانیکیا۔

۲۔ یضرب الحیوان بنوع من المسدس یکون فیه الرصاص علی مقدم رأسه (ارسل صورة المسدس وطرق عملیته الی فضیلتکم مع هذه الاستفتاء) الرصاص لا یدخل فی رأسه حتی لا یمس الجلد والعظم واللحم منه۔

۱- ”عن شداد بن أوس قال: ثنتان حفظتهما عن رسول الله ﷺ قال: إن الله کتب الإحسان علی کل شیٔ، فإذا قتلتم فأحسنوا القتلة، وإذا ذبحتم فأحسنوا الذبح، ولیحد أحدکم شفرته، فلیرح ذبیحته“(صحیح مسلم کتاب الصید والذبائح حدیث ۵۷/۱۹۵۵)۔

۲- ”وذکاة الاختیار ذبح بین الحلق واللبة بالفتح المنحر من الصدر وعروقه الحلقوم کله وسطه، أو أعلاه أو أسفله وهو مجری النفس علی الصحیح والمری هو مجری الطعام والشراب والودجان مجری الدم وحل المذبوح بقطع أی ثلاث منها“(الدر المختار مع رد المحتار ۹/ ۴۲۴)۔

٣۔ يصرع الحيوان مغشياً عليه بعد الطرق مباشرة ولكنه يبقى حياً، يحرک الرجلين والذنب والعينين واعضاء بدنه يدق قلبه وعروقه الى وقت طويل ....بعد أن يصرع الحيوان مغشيا يأتى المسلم المراقب من طرف المركز الثقافى يأخذ السكين ويذبح الحيوان بالطريقة الشرعية الإسلامية يقطع الأوداج والمرئ قائلا بسم الله الله أكبر۔

٥۔ الحيوان يترک بعد الذبح بالقوة والشدة ويخرج منه الدم بالفوران۔

٦۔ كل المراحل بعد ذلک حتى التطحين والتلفيف تكون تحت اشراف مسلم صحيح العقيدة لا يكون قاديانياً ولا بهائياً هل الذبح بهذه الطريقة حلال ام حرام؟ بعض المنظمات الإسلامية عللوا بأنه يدخل فى استثناء قوله تعالىٰ إلا ما ذكيتم۔

وان دخل فى تعريف الموقوذة ما رأيكم؟ بينوا بالأدلة الشرعية توجروا۔

محمد ادریس (امام المرکز الثقافی، کوپن ہیگن، ڈنمارک)

الجواب وبالله التوفيق:

من المعلوم ان ذكوة الشرعى نوعان اختيارى واضطرارى وذكاة الاضطرار انما يصار إليها عند العجز عن ذكاة الاختيار كما فى الشامى(٥/ ٢٦٤) (١) وفتح القدير (٨/ ٥٢)(٢) وكلاهما سواء فى إنهار الدم المسفوح والتسمية على المذبوح وكون الذابح مسلما او كتابيا صحيح العقيدة وغير ذلک مما ذكره الفقهاء وما ثبت بالآية كما قال الله تعالى: حرمت عليكم الميتة والدم(٣) وفى آية اُخرى أو دما مسفوحا(٤)وقوله تعالى: فكلوا مما ذكر اسم الله عليه(٥) وقوله تعالى: إلا ما

١- "لأن ذكاة الإضطرار إنما يصار إليها عند العجز عن ذكاة الاختيار "(الدر المختار مع رد المحتار ٩/ ٤٤٠)۔

٢- دیکھئے: ہدایہ مع فتح القدیر ٨/ ٤٠٦، "وفيه: والثاني كالبدل لأنه لا يصار إليه إلا عند العجز عن الأول"، نیز دیکھئے: ٨/ ٤١٦۔

٣- "حرمت عليكم الميتة والدم ولحم الخنزير وما أهل لغير الله به والمنخنقة والموقوذة والمتردية والنطيحة وما أكل السبع إلا ما ذكيتم وما ذبح على النصب وأن تستقسموا بالأزلام ذلكم فسق..."(سورہ مائدہ: ٣)۔

٤- "قل لا أجد فيما أوحي إلي محرما على طاعم يطعمه إلا أن يكون ميتة أو دماً مسفوحاً أو لحم خنزير فإنه رجس أو فسقاً أهل لغير الله به فمن اضطر غير باغ ولا عاد فإن ربک غفور رحيم "(سورہ انعام: ١٤٥)۔

٥- "فكلوا مما ذكر اسم الله عليه إن كنتم بآياته مؤمنين "(سورہ انعام: ١١٨)۔

ذكيتم (١) في حق المسلم وقوله تعالى: وطعام الذين أوتوا الكتاب حل لكم (٢) في حق الكتابي مع أن طريق الذكوة مختلف فذكوة الإختيار موقوف على أشياء مثلاً إنهار الدم المسفوح والتسمية على المذبوح عند الذبح كما قال النبي ﷺ عن رافع بن خديج عن النبي ﷺ أنه قال ما أنهر الدم وذكر اسم الله عليه فكلوا إلا ما كان السن أو الظفر (٣)، وهكذا في الترمذي ايضا بتغيير يسير (٤) وقطع الحلقوم المرى والودجين اللذين بينهما الحلقوم والمرئى وكون الذبح بين الحلق واللبة وغير ذلک وهذا كله موجود في السوال وإن كان غير واضح كما كتبت يأتي المسلم من طرف المركز الثقافي الإسلامي يأخذ السكين ويذبح الحيوان بالطريقة الإسلامية ويقطع الأوداج والمرى قائلاً بسم الله الله أكبر إلى آخره۔

فلما يبقى الحيوان حياً بعد صدمة المسدس أيضا ويكون الذابح مسلما صحيحا لا قاديانياً ولا بهائياً ويذبح بالسكين قائلاً بسم الله الله أكبر و يفرى الأوداج وينهر الدم فالذبح بهذه الطريقة المذكورة وإن كان مكروهاً ومخالفاً للسنة ولكن ذبيحته لا يكون حراما بل يكون حلالا يحل أكله بلا شک وريب لدخول هذا الذبح تحت قوله تعالى: إلا ما ذكيتم الآية۔

فاللحوم التي تصدر من دنمارک إن كانت بعد الذبح المذكور يكون حلالا بلا ريب ولكن العمل بهذا الطريق مكروه لمخالفة الطريق المسنون ولتعذيب الحيوان بالرصاص أو ضرب الحيوان بنوع من المسدس بلا فائدة ولترک الحيوان الذي أمر النبي ﷺ إن الله كتب الإحسان على كل شئي إلى قوله وإذا ذبحتم فأحسنوا الذبح وليحد أحدكم شفرته وليرح ذبيحته (ابوداؤد ٢/٣٣) (٥)

١- سورہ مائدہ:٣۔

٢- سورہ مائدہ:٥۔

٣- احکام القرآن للجصاص ٣٠٨۔

٤- "عن رافع بن خديج قال: قلت يارسول الله إنا نلقى العدو غدا وليست معنا مدىً، فقال النبي ﷺ: ما أنهر الدم وذكر اسم الله عليه فكلوا ما لم يكن سنّ أو ظفر وسأحدثكم عن ذلک: أما السن فعظم وأما الظفر فمدى الحبشة" (سنن الترمذی ١/ ١٨٠ کتاب الاحکام باب ماجاء فی الذکاۃ بالقصب وغیرہ حدیث: ١٤٩١)۔

٥- "عن شداد بن أوس قال: خصلتان سمعتهما من رسول الله ﷺ: إن الله كتب الإحسان على كل شئ فإذا قتلتم فأحسنوا القتلة وإذا ذبحتم فأحسنوا الذبح وليحد أحدكم شفرته وليرح ذبيحته" (سنن ابوداؤد ٣/ ١٠٠ کتاب الاضاحی، باب فی الرفق بالذبیحۃ حدیث ٢٨١٥)۔

فالمناسب ترکه أی طریق الذبح المذکور وأخذ السنة بالنواجذ یجب علی کل مسلم للنجاة والفوز ومع هذا غیر داخل فی الموقوذة بل ما قال بعض المنظمات الإسلامیة معللاً بأنه یدخل فی استثناء قوله تعالی: إلا ما ذکیتم صحیح۔

ولیس من الموقوذة لأن تعریف الموقوذة غیر صادق علیه قال صاحب احکام القرآن الموقوذة فإنه یروی عن ابن عباسؓ والحسن وقتادة وغیرهم: إنها المضروب بالخشب ونحوه حتی تموت (۱)، وفی عمدة القاری الشرح للبخاری: الموقوذة: هی التی تضرب بشئی ثقیل غیر مُحددٍ حتی تموت وقال قتادة: کان أهل الجاهلیة یضربونها بالعصاء حتی إذا مات أکلوها (۲) وکتبت أن المسلم المراقب یذبح الحیوان بالطریقة الاسلامیة فکیف یدخل فی تعریف الموقوذة، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۹/۹/۱۴۰۲ھ

مشینی ذبیحہ کا شرعی حکم:

الاستفتاء ما قولکم رحمکم الله فی المسألة التالیة حول قضیة ذبح الدواجن فی المجازر الدانمرکیة التی تصدرُها إلی البلاد العربیة الإسلامیة تأتی الدواجن (الدجاج والبط) معلقة من الرجلین فی الصف)۔

۲۔ تمر الدواجن من ماء یمر فیه تیار الکهربائی یصیر الدجاج مسکرا مغشیا علیه ولکنه یبقی حیا إذا کان تیار الکهربائی أقل من ثلاثین درجة۔

۳۔ المشرف المراقب المسلم یؤکد مسبقا ان التیار الکهربائی أقل من ثلاثین درجة۔

۱- احکام القرآن للجصاص تحقیق محمد صادق قمحاوی دار احیاء التراث العربی بیروت ط ۱۴۱۲ھ، ۱۹۹۲ء ج ۱۰۱/۳ وفیه "وقتادة والضحاک والسدی" بدل "وغیرهم"۔

۲- عمدة القاری شرح صحیح البخاری ۹۱/۲۱ مکتبة مدینة لاہور ۱۴/ ۷۳ مکتبة زکریا دیوبند ۲۱/ ۱۳۵ دار الکتب العلمیة بیروت)، مذکورہ تمام نسخوں میں "غیر محدد" بدون الواو کے بجائے "غیر محدود" بالواو مذکور ہے البتہ تفسیر ابن کثیر ۲/ ۸ دار المعرفة بیروت، میں "غیر محدد" ہے جیسا کہ فتوی کی عبارت میں ہے اور یہی صحیح ہے۔

۵۔ یأتی المراقب المسلم وینوی انه سیذبح الیوم عشرة الاف دجاج مثلاً۔
بعد ذلک یقول بسم الله اکبر یفتح الآلة المیکانیکة وبعد ذلک یکرر التکبیر حسب استطاعته۔

٦۔ یأتی الدجاج ویذبح بالآلة من الإمام من الحلق ویجری منه الدم۔

۷۔ ان بقی دجاج من الذبح المیکانیکی یذبحه المراقب المسلم بیده قائلا بسم الله الله اکبر والتلفف والتلفیف یکون تحت إشراف المراقب المسلم أرجو من سماحتکم أن تکتبوا لی الجواب مدللاً بالأدلة الشرعیة إن هذا حلال أو حرام، والمسئولیة علی البلاد المستوردة أکثر منها علی البلاد المصدرة والأکل الحلال من الشروط الإسلامیة لقبول جمیع العبادات وفقنا الله وإیاکم لما یحب ویرضی، والسلام علیکم ورحمة الله وبرکاته۔

اخوکم محمد ادریس امام المرکز الثقافی - ڈنمارک

الجواب وبالله التوفیق:

لما یبقی الدواجن بعد المرور فی التیار الکهربائی حیاً ویأتی المراقب المسلم صحیح العقیدة یفتح الآلة المیکانیکة قائلا بسم الله الله اکبر ثم یکرر التکبیر حسب استطاعته مسلسلاً (۱) حتی ینتهی عمل الذبح ویفری الاوداج وینهر الدم فالعمل بهذه الطریقة المذکورة وإن کان مکروها ومخالفا للسنة کما أوضحنا فی جواب الاول ۱۰ الف ۸۲۴ آنفا لکن ذبیحته لا یکون حراما بل یکون حلالا ویحل أکله بلا شک وریب لدخوله تحت قوله إلا ما ذکیتم فإن قیل بحسب تعدد الذبح یلزم أن یتعدد التسمیة؟ قلت فی هذه المطابقة حرج عظیم والحرج مدفوع فی مثل هذه الأحکام کما أفاده فی التنویر مع الدر بقوله وتشترط التسمیة من الذابح حال الذبح ۔۔۔۔والمعتبر الذبح عقب التسمیة قبل تبدل المجلس وتحته فی الشامیة(۱۹۳) قوله قبل تبدل المجلس الخ أی حقیقة أو حکما (إلی قوله) لأن إیقاع الذبح متصلا بالتسمیة بحیث لا یتخلل بینهما شئی لا یمکن إلا

۱- "لأن الفعل یتعدد فتعدد التسمیة" (الدر المختار مع رد المحتار ۹/۳۳۹)۔

بحرج عظیم فأقیم المجلس مقام الإتصال(۱)۔

وفی فتاوی الهندیة النعمانیة (۵/۲۸۵)۔

ومنها التسمیة حالة الذکاة عندنا ای اسم کان سواء قرن بالاسم الصفة(۲)إلی قوله أو لم یقرن بأن قال الله أو الرحمن أو الرحیم أو غیر ذلک تفید هذه العبارة ان من یفتح الآلة قائلاً بسم الله أکبر ویشرع فعل الذبح یلزم علیه أن یکرر التکبیر أو یکرر اسم الذات حسب استطاعته مسلسلاً إلی أن ینتهی عمل الذبح (۳) وهذا موافق لعمل المذکور للمراقب فلا یشک فی جواز الذبیحة وحلة لحمه، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

پوشیدہ طور پر گائے ذبح کرنا:

زمانہ موجودہ میں ذبیحہ گاؤ حکومت نے بند کردیا ہے پوشیدہ ذبیحہ کاٹ کر کے گوشت کھانا جائز ہے یا کہ نہیں؟

الجواب وبالله التوفیق:

گوشت کھانا جائز ہے، قانون حکومت کا لحاظ بھی ضروری ہے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۴/۹/ ۱۳۸۵ھ

مرغی ذبح کرنے کا شرعی طریقہ:

مرغی یا مرغا ذبح کرنے کے لئے اکثر لوگ ایسا کرتے ہیں کہ ایک آدمی مرغی یا مرغا کو کھڑی حالت میں پکڑتا ہے

۱- ردالمحتار علی الدر المختار ۹/۴۳۹۔

۲- "بأن قال الله اکبر، الله أعظم، الله أجل، الله الرحمن، الله الرحیم ونحو ذلک أو لم یقرن.... الخ "(فتاوی عالمگیریہ ۵/۲۸۵)۔

۳- "حتی لو أضجع شاتین إحداهما فوق الأخری فذبحها ذبحة واحدة بتسمیة واحدة حلاً، بخلاف ما لو ذبحهما علی التعاقب لأن الفعل یتعدد فتعدد التسمیة "(الدر المختار مع رد المحتار ۹/۴۳۹)۔

اور دوسرا آدمی اس کو ذبح کرتا ہے۔تحریر فرمائیں یہ فعل درست ہے؟ یا یہ کہ ایک آدمی مرغی یا مرغا کو نیچے لٹائے اور اپنے پیروں اور ہاتھوں کی مدد سے اس کو ذبح کرڈالے دونوں طریقوں میں کون سا قرآن وسنت کی روشنی میں افضل ہے؟

الجواب وباللہ التوفیق:

مرغا یا مرغی کو بھی زمین پر لٹا کر ذبح کرنا سنت طریقہ ہے۔اگر کوئی دوسرا آدمی مرغ یا مرغی کو پکڑنیوالا بوقت ذبح نہ ہوتو اپنے ہاتھوں اور پیروں کی مدد سے ذبح کرلے،فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی،مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

ذبیحہ کے متعلق ایک مضمون کے بارے میں ایک اشکال:

ذبیحہ کے متعلق ایک مضمون (دی اسلامک ریویوز) جوانگریزی زبان میں شائع ہوتا ہے، کے شمارہ مئی ۱۹۶۶ء میں پڑھا۔اس کے مصنف رشید احمد جالندھری تمام حدود کو پار کر گئے ہیں مختصر ان کے لئے ہرقسم کا گوشت جائز ہے چاہے وہ چھپکلی کا ہو چاہے ہندو یا سکھ کا حلال کیا ہوا ہو، اس سلسلہ میں انہوں نے قرآن مجید کی آیات شریفہ نمبر ۱۹۱ و ۱۲۲ سورۃ نمبر ۶ اور آیت نمبر ۴ سورہ نمبر ۵ کے حوالے دیئے ہیں۔

اس مسئلہ میں دو چیزیں ہیں ایک تو تسمیہ یعنی خدا کا نام لینا، دوسرے طریقۂ ذبح،تسمیہ میں تو گنجائش تھی وہ اباجی مرحوم کے فتویٰ سے ظاہر ہے کہ عیسائی اور یہودیوں کے ذبح کو قابل قبول مانا جاسکتا ہے،طریقۂ ذبح کے سلسلہ میں قرآن مجید کی کوئی آیت کوئی روشنی نہیں ڈالتی۔ یہ میرا ذاتی خیال ہے جس کی بنیاد وہی مضمون ہے۔اور اس سلسلہ میں احادیث میں ایک خاص طریقہ کا حکم ہے جو مصنف مذکور کے حساب سے اس بنیاد پر قائم ہے کہ جانور کو کم سے کم تکلیف ہو، چونکہ موجودہ طریقہ جسے (ہومن کلر)(HUMAN KILLER) کہتے ہیں بظاہر جانور کے لیے تکلیف دہ ہے، اگر ہمارے طریقۂ ذبح سے اس کا موازنہ کیا جائے۔اس لئے مصنف کہتا ہے کہ موجودہ طریقہ ہومن کلر ہی عین اسلامی طریقہ ہے اس کو مفتی اردن وغیرہ نے بھی (ENDORSE) کیا ہے، حتیٰ کہ مصنف کے بیان کے مطابق اس کی حمایت سعید احمد اکبرآبادی نے بھی ۶۴ء کے برہان میں کی ہے، اسی طرح کا یہاں پر عام طور پر گوشت ملتا ہے وہ بھی جائز ہوجاتا ہے؟

الجواب وبالله التوفيق:

سب سے پہلے یہ بات سمجھ لینی ضروری ہے کہ قرآن کریم انسانی مقالہ، یا انسانی تصنیف یا اس کے مثل نہیں ہے، بلکہ یہ کلام ہے اور کلام الٰہی ہے، انسانی کلام میں بھی بہت سے ایسے اشارے اور گوشے ہوتے ہیں جسکو کما حقہ مخاطب ہی سمجھتا ہے، کوئی دوسرا نہیں سمجھ پاتا۔ صرف دوسطر کا لکھا ہوا ایک پوسٹ کارڈ بسا اوقات بہت سے اشارات وگوشے اپنے اندر رکھتا ہے جن کو صرف مخاطب ہی سمجھتا ہے۔ دوسرا کوئی خواہ کتنا ہی بڑا زبان داں، فصیح وبلیغ محاورات ولغات پر حاوی ہی کیوں نہ ہو، اچھی طرح نہیں سمجھ پاتا اور یہ چیز روزمرہ کے تجربہ میں ہے، پھر کلام الٰہی کو جو "تبیانا لکل شیئی یحتاج إلیه الإنسان في معاده" (یعنی یہ قرآن ہر اس چیز کا پورا بیان ہے جس کی جانب انسان کسی وقت بھی اپنے معاد کے معاملہ میں محتاج ہو) کے درجہ میں ایجاز کے اعلیٰ اسلوب پر قیامت تک کے لیے ایک مکمل ضابطہ وقانون ہے، بغیر اس کے مخاطب اول کی اعانت کے کیونکر اچھی طرح سمجھا جاسکتا ہے۔

قرآن کریم کے مخاطب اول چونکہ نبی کریم ﷺ ہیں، اس لیے جناب نبی کریم ﷺ سے مستغنی وبے نیاز ہوکر سمجھنا معتبر وقابل اعتماد نہیں ہوسکتا، جناب نبی کریم ﷺ محض مخاطب اول ہی نہیں، بلکہ آپ قرآن حکیم کے معلم بنا کر بھیجے گئے اور آپ کی تعلیم کی اتباع کا حکم بھی دیا گیا اور آپ کی تعلیمات کو امت پر اللہ نے خود اپنا احسان بتلایا اور موقع امتنان واحسان میں ارشاد فرمایا: "لقد من الله علی المؤمنین إذ بعث فیهم رسولا من أنفسهم یتلو علیهم آیٰته ویزکیهم ویعلمهم الکتب والحکمة" (۱)، پھر آپ سے یا آپ کی تعلیمات سے بے نیازی کس طرح روا ہوسکتی ہے۔

اسی طرح رسول اللہ ﷺ کا کلام بھی کلام ہے اور مثل قرآن کریم وحی ہے۔ صرف فرق اتنا ہے کہ قرآن کریم وحی متلو ہے اور احادیث رسول اللہ (علیہ الصلوٰۃ والسلام) وحی غیر متلو ہے، مگر نفس وحی ومصدق من اللہ ہونے میں دونوں یکساں ہیں، اسی بارے میں ارشاد خداوندی ہے: "وما ینطق عن الهویٰ إن هو إلا وحي یوحیٰ" (۲)، اور اس کلام رسول اللہ ﷺ کے مخاطب اول صحابۂ کرام ہیں۔ صحابۂ کرامؓ کی سلامتی فہم اور بصیرت کی تائید قرآن پاک میں متعدد جگہ فرمائی گئی ہے، بلکہ بعض مقام پر تو جناب نبی کریم ﷺ کو حکم دیا گیا ہے کہ آپ بالا علان امت کو اس سے آگاہ فرمادیجئے کہ یہ (دین) میرا راستہ ہے، میں اس کے ذریعہ تمام لوگوں کو اللہ کی طرف بلاتا ہوں، میں خود اور میرے تمام صحابی بصیرت پر ہیں، چنانچہ

۱- سورۂ آل عمران: ۱۶۴۔

۲- سورۂ نجم: ۳۔

ارشاد الٰہی ہے:"قل هذه سبيلي أدعو إلى الله على بصيرة أنا و من اتبعني"(۱)۔

اور ان ہی اصحاب رسول ﷺ کے بارے میں ارشاد رسول علیہ السلام اس طرح ہے:"أصحابي كالنجوم بأيهم اقتديتم اهتديتم" (۲)، اس سے معلوم ہوا کہ ان کے ارشادات وتشریحات کا حکم بھی وہی ہوگا جو ابھی اوپر مذکور ہوا۔

پھر اسی طرح کلام صحابہ بھی کلام ہے اور اس کے مخاطب اول حضرات تابعین ہیں بالخصوص وہ حضرات جنھوں نے صحابہؓ سے براہ راست اخذ علم رسول کیا ہے اور صحابہ کرام نے ان پر اعتماد کیا ہے، اور کلام صحابہؓ اگر چہ وحی نہیں ہے، مگر صاحب وحی سے براہ راست اخذ کیا ہوا ہے، اور صاحب وحی نے ان پر اعتماد کیا ہے، اور یہ حضرات تابعین ان کے معتمدین کے معتمد ہیں، لہٰذا ان کی فہم وبصیرت بھی واجب اللحاظ اور دوسروں کی فہم وبصیرت پر فائق ہوگی۔

ہماری اس بات پر بہت سی آیات وروایات شاہد ہیں۔ ان سب کے پیش کرنے کا یہ موقع نہیں ہے، صرف ایک مشہور حدیث پیش کر دی جاتی ہے، اس میں بھی اس طرف کافی اشارہ موجود ہے، ارشاد رسول علیہ الصلوٰۃ والتسلیم ہے:"خير القرون قرني ثم الذين يلونهم ثم الذين يلونهم" (۳)۔

اتنی گفتگو سے معلوم ہوا کہ ان تینوں سے بے نیاز و مستغنی ہو کر محض زبان دانی کے بھروسہ پر آیات قرآنی کا کوئی مفہوم متعین کر لینا حجت شرعی نہیں ہوسکتا، بلکہ ایک خطرناک قسم کی جرأت اور ناقابل تلافی غلطی ہوگی، اور اسی قسم کی غلطیوں سے تمام فرق ضالہ وباطلہ پیدا ہوئے۔

غرض یہ ہے کہ اگر چہ تسمیہ وطریق ذبح کی ساری قیود وشرائط اور سارے احکام ہم کو براہ راست قرآن پاک میں نہ ملیں، مگر جب احادیث رسول وآثار صحابہؓ میں یہ تفصیل موجود ہے، تو ان کا اتباع ولحاظ ضروری ہوگا، یہ بات بطور اصول موضوعہ ہر وقت پیش نظر رہنی ضروری ہے، انہیں اصول کے پیش نظر نہ رہنے کی وجہ سے جالندھری صاحب نے وہ مضمون لکھ مارا ہے، ورنہ ہرگز ایسی جرأت نہ فرماتے اور ہرگز ایسی باتیں نہ فرماتے جو انہیں کبھی نہ کہنی چاہئے تھیں۔

بہر حال تسمیہ کے بارے میں جب آپ کو تشفی حاصل ہے تو اس پر کلام کی حاجت نہیں، البتہ طریق ذبح کے بارے میں آنجناب کی بصیرت وتشفی کے لیے تھوڑا سا عرض ہے کہ ذبح کا جو طریقہ کتاب وسنت سے ثابت ومتعین ہے، یعنی یہ کہ جانور

۱- سورۂ یوسف:۱۰۸۔

۲- مشکوۃ المصابیح باب مناقب الصحابۃ الفصل الثالث/۵۵۴۔

۳- ابن ماجہ میں ہے:"أي الناس خير قال: قرني، ثم الذين يلونهم، ثم الذين يلونهم" (ابن ماجہ ۲/۴۸، ابواب الاحکام حدیث نمبر:۲۳۸۴)۔

کو بائیں پہلو پر قبلہ رخ لٹا کر کوئی مسلمان یا اہل کتاب (یہودی یا نصرانی) ذبح کرتے وقت کسی غیر اللہ کا نام لیے بغیر محض اللہ کا نام لے کر حلقوم کی جانب سے کسی دھار دار چیز سے ذبیحہ کا حلقوم (غذا کی نلکی) اور قصبۃ الریہ (سانس کی رگ) اور ودجین (قصبۃ الریہ کے دونوں جانب کی خون کی دو رگیں) کاٹ کر ناپاک خون (دم مسفوح) خارج کر دے، یہی طریقہ ذبح کا مسنون ہوگا اور شریعت مطہرہ کے عین منشاء کے موافق کہلائے گا۔

خط میں موجودہ طریقہ ذبح کی تفصیل مذکور نہیں ہے کہ اس پر کلام کیا جائے، بہر حال اس جدید طریقہ ذبح میں یہ مذکورہ بالا باتیں اگر چہ موجود نہ ہوں جن سے ذبیحہ سنت کے مطابق ہوتا ہے، لیکن گوشت کے حلال وطاہر ہونے کی صرف دو شرطیں منصوص ہیں۔ اگر پائی جائیں گی تو ذبیحہ حلال وطاہر کہا جائے گا۔

☆ پہلی شرط بحکم آیت کریمہ: "یسئلونک ماذا أحل لهم قل أحل لكم الطيبات" (۱)، (قوله تعالیٰ): "واذكروا اسم الله عليه واتقوا الله إن الله سريع الحساب" (۲)، یہ ہے کہ ذبح کرنے والا مسلمان ہو یا بحکم آیت کریمہ: "وطعام الذين أوتوا الكتاب حل لكم وطعامكم حل لهم" (۳)، کوئی اہل کتاب (یہودی یا نصرانی) ہو بوقت ذبح بلا شرکت غیرے محض اللہ کا نام لے کر ذبح کرے۔

☆ دوسری شرط بحکم آیت کریمہ: "حرمت عليكم الميتة والدم .... إلا ما ذكيتم" (۴)، یہ ہے کہ کوئی مسلمان یا بحکم آیت متلوہ کوئی اہل کتاب گردن کی مذکورہ چاروں رگوں میں سے کم سے کم تین رگیں تسمیہ کے ساتھ کاٹ کر ناپاک خون (دم مسفوح) نکالدے۔

اب اگر ان رگوں کے کاٹنے میں گردن کا زائد حصہ کٹ جائے یا بالکل سر قلم ہو جائے یا پچھلے حصہ سے کاٹ دیا جائے یا بغل سے کاٹ دیا جائے یا جانور پر کھڑے کھڑے یہ دونوں عمل (تسمیہ مذکیہ) کر دیا جائے، اگر چہ ان افعال کو غیر مشروع یا خلاف سنت ہونے کی وجہ سے مکروہ کہا جائے، مگر چونکہ دونوں شرطیں پوری ہو گئیں اور تسمیہ معہودہ کے ساتھ دم مسفوح نکل کر طہارت وحلت آ گئی ہے، اس لیے ان افعال غیر مسنونہ کا اثر گوشت کی حلت وطہارت پر نہ پڑے گا اور کھانا جائز رہے گا۔

۱- سورۂ مائدہ: ۴۔
۲- سورۂ مائدہ: ۴۔
۳- سورۂ مائدہ: ۵۔
۴- سورۂ مائدہ: ۳۔

اور اگر چہ بحیثیت مسلمان ہونے کے اس بات کی سعی بھی حتی المقدور کرتے رہنا ضروری رہے گا کہ یہ عمل ذبح مطابق سنت کیا جائے، تا کہ ہر طرح عند الشرع والشارع محمود و پسندیدہ رہے۔ اور یہ کہنا کہ احادیث میں ذبح کا ایک خاص طریقہ محض اس بنیاد پر ذکر کیا گیا ہے کہ جانور کو کم سے کم تکلیف ہو، اور پھر اسی کو علت اصلی قرار دے کر اس پر یہ حکم متفرع کر دینا کہ یہ مشینی طریقہ بھی عین اسلامی طریقہ ہے صحیح نہ ہوگا، یہ حصر درست نہیں، بلکہ احراق دم مسفوح میں نجس خون کا اچھی طرح اخراج بھی ضروری ہے اور شرط کے درجہ میں لازم ہے، پس اگر ذبیحہ کے جسم پر بجلی کا کرنٹ دوڑانے سے یا کسی اور طریقہ سے مثلاً انجکشن وغیرہ دے کر جانور کو بے حس وحرکت یا بیہوش کرنے سے رگیں سکڑ کر دوران خون بند ہوجاتا ہو یا کمزور ہوجاتا ہو، یا طبیعت کمزور ہوجاتی ہو جس سے اخراج خون میں کمی ہوجاتی ہو، اور دم نجس سے اچھی طرح صفائی نہ ہوتی ہو تو یہ طریقہ عند الشرع پسندیدہ و محمود نہ ہوگا۔ چہ جائیکہ اس کو عین طریقہ اسلامی کہا جائے، بلکہ اگر غور کیا جائے تو نفس ذبح میں ایک جاندار کی جان ضائع کرنا ہوتا ہے جو بظاہر قتل کے مشابہ ہے اور عقل کے نزدیک بظاہر یہ فعل قساوت قلبی سے ناشی معلوم ہوتا ہے، عقل کے نزدیک تو یہ فعل سرے سے ہی جائز نہ ہونا چاہئے، لہذا یہ مسئلہ عقلی نہ رہا، بلکہ بایں طور تعبدی ہوگیا کہ اللہ رب العزت نے اپنے قول برحق: ''ولقد کرمنا بنی آدم''(۱)، اور ''ھو الذی خلق لکم ما فی الأرض جمیعا''(۲) کے پیش نظر تکریم بنی آدم اور بنی نوع انسان کا اعزاز واکرام ظاہر کرنے کے لیے اس فعل کا حق واختیار بنی نوع انسان کو عطا فرمایا ہے کہ انسان اس سے یہ سمجھے کہ ہم ان مذبوحات کے خالق و مالک نہیں تھے، مگر اللہ نے ہماری حیثیت ومرتبہ سے بڑھ کر ہم کو یہ انعام واکرام فرمایا ہے، اعزاز بخشا ہے، لہذا اس کی طرف رجوع کریں اور ممکن ہے کہ بوقت ذبح اللہ کا نام لے کر ذبح کرنے میں یہ بھی نکتہ ہو۔

نیز ممکن ہے کہ اس فعل کو اللہ نے اپنی عبادت کے ساتھ ملا کر عبادت بنادیا، جیسا کہ ''فصل لربک وانحر'' (سورہ کوثر: ۳) میں بیان فرمایا اور یہ حق واختیار دیا ہے، لہذا یہ فعل امر تعبدی کے قبیل سے ہوگیا، اور امر تعبدی کی علتیں محض شارع حقیقی کے علم وحکمت میں مخفی رہتی ہیں اور بظاہر جو وجوہ اسباب نظر آتے ہیں وہ محض حکمت کے درجہ میں ہوتے ہیں، علت نہیں ہوتے، مدار حکم اگر ہوسکتا ہے تو محض علت نہ کہ حکمت، حکمت کبھی مدار حکم نہیں ہوتی۔

یہی فرق پیش نظر نہ ہونے سے یہ کہلایا گیا ہے کہ یہی عین اسلامی طریقہ ہے، یا یہ خاص طریقہ ذبح کا احادیث میں

۱- سورۂ اسراء: ۷۰۔

۲- سورۂ بقرہ: ۲۹۔

محض اس بنیاد پر ہے کہ جانور کو کم سے کم تکلیف ہو۔ مفتی اردن یا اور تائید کرنے والوں کے ذہن سے یہی فرق ذہول کر گیا ہے، ورنہ وہ لوگ بھی کبھی اس کی تصویب یا تائید نہ کرتے۔

یہیں سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ یہ کہنا کہ قرآن کریم کی کوئی آیت کوئی روشنی نہیں ڈالتی یہ بھی صحیح نہیں ہے۔ اگر واقعی اس کا کوئی حکم قرآن کریم میں ہم کو نہ ملتا جب بھی یہ تعبیر (کہ قرآن کریم کی کوئی آیت اس پر کوئی روشنی ـــــ الخ) قرآن کریم کی شان میں گستاخی و بے ادبی ہے، اللہ رب العالمین نے قرآن کریم کو "تبیانا لکل شئی" (۱)، اور "ھدی للناس وبینات من الھدیٰ و الفرقان" (۲) فرمایا ہے، پھر ایسے اہم اور خالص مذہبی معاملہ میں اس کی کوئی ہدایت یا رہبری کیوں نہ ہوگی۔ یہ تعبیر اسی قسم کے ذہنوں کی پیداوار ہے جس نے نبی کریم ﷺ کا درپردہ انکار کر کے آپ کی تنقیص واستہزاء کے لیے لفظ "راعنا" استعمال کیا تھا اور اس پر خدائے ذوالجلال نے نکیر وتنبیہ فرمائی، چنانچہ: "لا تقولوا راعنا وقولوا انظرنا" (۳) نازل فرمایا اور اس موقعہ کے تعبیری عنوان کی تعلیم ہم کو دربار نبوت علی صاحبہا الصلوۃ والتسلیم سے حدیث معاذ بن جبل میں اس طرح ملی ہے کہ بجائے مذکورہ تعبیر کے یوں کہنا چاہئے کہ قرآن پاک میں اس کے بارے میں ہم کو کوئی حکم نہیں ملتا، چنانچہ "مشکوۃ" میں ہے: "عن معاذ بن جبل أن رسول الله ﷺ لما بعثه إلى اليمن قال كيف تقضي إذا عرض لک قضاء قال: أقضي بكتاب الله قال: فإن لم تجده في كتاب الله قال فبسنة رسول الله، قال: فإن لم تجده في سنة رسول الله، قال: أجتهد برأيي فضرب رسول الله على صدره، وقال: الحمد لله الذي وفق رسول رسول الله لما يرضى به رسول الله" (۴)۔

اس تعبیر میں لاعلمی وجہل یا نقص کی نسبت محض اپنی طرف ہوگی، اس لیے قرآن کریم کی تنقیص یا بے ادبی وغیرہ کا ایہام بھی نہ ہوگا۔ پھر قرآن کریم اللہ کا کلام ہے۔ ہر کلام متکلم کی صفت ہوتا ہے اور خود متکلم موصوف شمار ہوتا ہے۔ اور متکلم ہی کی حیثیت ومرتبہ سے اس کے کلام کا مرتبہ ومقام متعین ہوتا ہے، کلام الملوک ملوک الکلام۔

نیز متکلم کے کسی وصف کی تنقیص خود متکلم کی تنقیص بسا اوقات شمار ہوتی ہے، بلکہ اکثر کسی موصوف کی تنقیص واستہزاء اس کے وصف ہی کے استہزاء سے کرتے ہیں، بالخصوص جب موصوف کی براہ راست ذات کی تنقیص سے خطرات

۱- سورۂ نحل: ۸۹۔

۲- سورۂ بقرۃ: ۱۸۵۔

۳- سورۂ بقرۃ: ۱۰۴۔

۴- ابوداؤد کتاب الاقضیہ باب اجتہاد الرأی فی القضا ۳/ ۳۰۳، حدیث نمبر: ۳۵۹۲۔

ومصائب میں ابتلاء کا اندیشہ ہوتا ہے۔ اس لیے قرآن کریم کی اس بے ادبی وگستاخی کی سرحد براہ راست اللہ تعالیٰ کی بے ادبی وگستاخی تک پہنچتی ہے۔ اس لیے یہ گستاخی وبے ادبی انتہائی خطرناک بھی ہوتی ہے مسلمانوں کو اس سے احتیاط لازم ہے۔

امید کہ اتنی گفتگو سے آپ کو جس مسئلہ کی تحقیق مطلوب تھی اس کی توضیح بقدر ضرورت ہوگئی ہوگی، البتہ آپ کا غیر مسنون طریقہ سے ذبح کئے ہوئے گوشت کو نہ کھانا یا اس سے طبیعت کا رکنا یہ جذبۂ محمود اور سلامتی طبع کی دلیل اور تقوی کی علامت ہے۔ اب اس مذکورہ بالا ضابطہ کے مطابق دیکھ لیا کریں، اگر حلت واباحت کی شرطیں پائی جائیں تو مباح سمجھیں ورنہ ناپاک وحرام سمجھیں، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

عمداً تارک التسمیۃ کے ذبیحہ کا حکم شرعی:

کوئی حنفی المذہب مرغ یا بکرا ذبح کرتے وقت جان بوجھ کر بسم اللہ چھوڑ دے تو وہ ذبیحہ حلال ہے یا حرام؟ اسی طرح ہر حنفی کے لیے یہ ذبیحہ کسی حنفی کو فروخت کرنا اور ہر حنفی کو اس کا خریدنا اور کھانا جائز ہے کہ نہیں؟

الجواب وباللہ التوفیق:

کوئی حنفی المذہب شخص اگر ذبیحہ پر ذبح کرتے وقت جان بوجھ کر بسم اللہ کہنا چھوڑ دے اور اللہ کا نام لیے بغیر قصداً ذبح کردے اور گو اتفاقاً ہی ایسا کرے جب بھی ذبیحہ حرام ہوجاتا ہے اور اس کا خود کھانا یا کسی کو کھلانا خواہ وہ مسلم ہو یا غیر مسلم ناجائز اور حرام ہوتا ہے، اس لیے کہ قرآن پاک میں نصوص مثلاً: ''لاتاکلوا مما لم یذکر اسم اللہ علیہ'' (۱) اور مثلاً ارشادِ باری: ''کلوا مما ذکر اسم اللہ علیہ'' (۲)، ان تمام شقوں کو شامل اور حاوی ہے، اس لیے کہ اس کے الفاظ عام ہیں اور اعتبار عموم الفاظ ہی کا ہوتا ہے نہ کہ محض خصوصِ مورد کا۔ اسی طرح اس کا خریدنا فروخت کرنا وغیرہ سب ناجائز اور حرام ہوجاتا ہے، کیونکہ مطہر ومذکی حقیقت میں اللہ کا نام بوقتِ ذبح لینا ہی ہوتا ہے اور جب چھوڑ دیا تو وہ جیفہ ومردار کے حکم میں ہو گیا اور مردار کا حکم یہی ہے اور ان ہی وجوہ سے فقہاء ومشائخ نے فرمایا ہے: ''ان ترک التسمیۃ عامداً لا یسع

۱- سورۂ انعام ۱۲۲۔

۲- سورۂ انعام ۱۱۹۔

الاجتهاد ولو قضی القاضی بجواز بیعه لاینفذ"(۱)۔فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۸/ ۶/ ۹۸ ۱۳ ھ

اہل کتاب کے ذبیحہ کا حکم:

اہل کتاب یہود وعیسائی کا خدا کا نام لے کر ذبح کیا ہوا گوشت جائز ہے یا نہیں؟

شیخ محی الدین (میٹریل ڈیپارٹمنٹ شیڈکم ۔سعودی عربیہ)

الجواب وبالله التوفيق:

عیسائی عموماً ذبح کے وقت اللہ کے نام کے ساتھ مسیح ابن اللہ بھی کہتے ہیں، اس لئے جب تک ایسا نہ ہو کہ عیسائی کسی مسلمان کے سامنے محض اللہ کا نام لے کر ذبح کردے یا جب تک ایسا نہ ہو کہ یہ عیسائی اپنے مذہب کے اعتبار سے ایسا ہو کہ محض اللہ کا نام بوقت ذبح لیتا ہو اس کا ذبیحہ کھانا درست نہ ہوگا۔ ہاں یہودی اپنے مذہب ومسلک کی بنیاد پر بوقت ذبح محض اللہ کا نام لے کر ذبح کرتے ہیں، اس لئے ان کا ذبیحہ کھانا درست وجائز ہوگا (۲)۔فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۷/ ۲/ ۹۹ ۱۳ ھ

ڈبہ میں پیک شدہ گوشت اور اہل کتاب کے ذبیحہ کا حکم:

ہماری کمیونٹی براعظم افریقہ کے جنوبی سرے پر آباد ہے اور دو مسلمانی مذاہب کے مسلمانوں پر مشتمل ہے۔

(۱) پہلے مسلم جو افریقہ میں ۳۰۰ سال قبل آئے اور جو خصوصی طور پر شافعی المذہب سے تعلق رکھتے ہیں دوسرا طبقہ جو ہندوستانی اور پاکستانی نسل کے مسلمانوں پر مشتمل ہے وہ زیادہ تر حنفی المذہب ہیں، ۵۰ سال قبل ہم بالکل الگ تھلگ تھے اور باقی دنیا سے ہمارا بہت کم تعلق تھا، اب موجودہ ذرائع آمد ورفت اور ذرائع اظہار خیال کے بہت زیادہ تبدیلی رونما ہوگئی ہے، آج زیادہ سے زیادہ ہمارے افراد دنیا کے چاروں طرف سفر کررہے ہیں حج کے لئے مکہ معظمہ جاتے ہیں اور یورپ کا

۱- ہدایہ علی فتح القدیر ۷/ ۵۷، ہوکذا فی البحر والرد وغیرہا۔

۲- ھکذا فی الدر مع الرد ۲/ ۲۵۹۔

دورہ کرتے ہیں جب ہم ان ممالک میں ہوتے ہیں تو ہمیں معلم کے ذریعے ہوٹلوں میں گوشت اور چکن (چوزہ، کے گوشت) فراہم کیا جاتا ہے، جب ہم ہوٹلوں میں گوشت اور چکن کے پیکنگ کو دیکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ گوشت اور چکن آسٹریلیا، نیوزی لینڈ، کناڈا، جنوبی امریکہ، چائنا، ہالینڈ، بلغاریہ، ڈنمارک اور دیگر ممالک سے آتا ہے یہ سب مسلم ریاستیں نہیں ہیں ان کے ذبح کرنے کا طریقہ اس سے مختلف ہے جو ہمیں سکھایا جاتا ہے۔

۱۔ جو شخص ذبح کرتا ہے وہ لازما مسلمان ہونا چاہئے۔

۲۔ ذبح کرنے سے قبل بسم اللہ ضرور پڑھنی چاہئے۔

۳۔ ذبح کرنے میں چار باتوں کا خیال رکھنا ضروری ہے۔

۱۔ لازمی طور پر چاک کرنا چاہئے　۲۔ دو گردن کی رگیں ضرور کاٹ دینی چاہئے　۳۔ نرخرہ ضرور کاٹ دینا چاہئے　۴۔ سر کو جسم سے الگ نہیں کرنا چاہئے۔

متذکرہ بالا ممالک میں ذبح کرنے کا یہ طریقہ نہیں ہے وہاں جو شخص ذبح کرتا ہے مسلمان نہیں ہے بلکہ اہل کتاب کا ایک فرد ہے، بڑے جانوروں کے معاملہ میں یہ ہوتا ہے کہ پہلے جانوروں کے سر (دماغ) پر گولی مار کر بے ہوش کر دیا جاتا ہے اور پھر خون بہانے کے لئے گلا کاٹ دیا جاتا ہے ذبح کرتے وقت اللہ کا نام نہیں لیا جاتا چوزہ کی صورت میں بغیر اللہ کا نام لئے گردن کاٹ دی جاتی ہے۔

سوال یہ ہے کہ کیا اہل کتاب فرقہ کے کسی فرد کے ذریعہ ذبح شدہ جانور کا گوشت یا یا چکن (چوزہ گوشت) میرے لئے کھانا جائز ہے۔

معلمین یہ بتاتے ہیں کہ گوشت اور چکن ہمارے کھانے کے لئے مکمل طور پر حلال ہیں، حال ہی میں ایک مشہور مصنف ایک کتاب الموسوم میں غیر مسلم اشخاص کے ذریعہ ذبح شدہ جانور کے گوشت کا جواز اس کتاب میں مصنف اپنے خیالات کی تائید میں قرآن اور احادیث سے اقتباسات پیش کرتا ہے ان کی بنیاد پر عربی بولنے والی دنیا کے مسلمان بغیر ضمیر کی علامت یا دل کی خلش کے اس گوشت کا استعمال کر رہے ہیں، آج کے علماء ہمیں یہ بتاتے ہیں کہ اہل کتاب اب ایسے نہیں ہیں جیسے کہ وہ پہلے تھے، میں اس میں یہ اضافہ کرنا چاہوں گا کہ آج کے مسلمان ایسے نہیں ہیں جیسے کہ وہ پیغمبر محمد ﷺ کے زمانہ میں تھے قرآن نے سورہ (۵) آیت چھ میں اہل کتاب کا کھانا ہمارے لئے اور ہمارا کھانا اہل کتاب کے لئے جائز قرار دیا ہے، ہمارے پیغمبر کے زمانہ میں عیسائیوں کے اور یہودیوں کے ۷۲ فرقے تھے یہ فرقے پیغمبر کے زمانے میں پہلے ہی سے موجود

تھے اورقرآن پاک ان ہی اختلاف کے وجود کے دور میں نازل ہواایسی صورت میں ہمیں یہ کیسے بتایا جاتا ہے، کہ آج کے اہل کتاب ایسے نہیں ہیں جیسے کہ وہ پیغمبر کے زمانہ میں تھے اور اس بناپر ان کے ذریعہ ذبح شدہ جانور کا گوشت استعمال نہیں کیا جاسکتا، اگر یہ اہل کتاب مختلف خیال کئے جاتے ہیں تو مہربانی فرماکر بتایئے موجودہ اہل کتاب کن بین وجوہات کی بناء پر پیغمبر علیہ السلام کے زمانہ کے اہل کتاب سے مختلف ہیں۔

الجواب وباللہ التوفیق:

جواب لکھنے سے قبل چند باتیں عرض ہیں، پھر اس کے بعد نمبر وار جواب معروض ہوگا۔

(الف) حنفی، شافعی، مالکی، اصحاب ظواہر (اصحاب حدیث) سب اصولاً متفق ہیں ان کے درمیان آپس میں اصولی اختلاف نہیں سب کے اصول، کتاب وسنت رسول اللہ، اجماع اور قیاس شرعی ہیں آپس کا اختلاف فروعی اور محض اجتہادی اور استنباطی ہے، اورسب اہل حق ہیں کسی کی تغلیط اور کسی کو ناحق یا باطل پر کہنا یا سمجھنا جائز نہیں ہے اور سب کا بتلایا ہوا قرآن وحدیث کا مفہوم ومطلب صحیح وحق ہے اوران میں سے ہر ایک کو اپنے اجتہاد واستنباط پر عمل کرنا صحیح ہے۔

البتہ بعد کے لوگ جو مجتہد نہیں ہیں ان پر لازم ہے کہ عمل کرنے میں ان مذکورین میں سے جس مجتہد کی پیروی کر رہے ہوں صرف اسی سے ہر معاملہ ومسئلہ میں خدا ورسول کا حکم معلوم کریں اور کتاب وسنت سے جو حکم انکا بتلایا ہوا ہو صرف اس پر عمل کریں خود اپنی رائے وفہم سے کوئی عمل نہ کریں ورنہ بسا اوقات ایسا عمل کر بیٹھیں گے جو قرآن وسنت کے صریح خلاف اور سب مجتہدین کے نزدیک غلط وباطل ہوگا اور اس طرح بد دینی کا دروازہ کھل جائے گا اور پھر مکمل گمراہی پھیل جائے گی اوراسی کا نام تلفیق بالمُحرم ہے جونا جائز بلکہ حرام ہے اور تلعب بالدین ہے اوریہی خود رائی امم سابقہ میں گمراہی کا پہلا قدم تھا اور نوبت یہاں تک پہونچی کہ کتاب الٰہی اور سارا دین سب مسخ ومحرف ہوگیا پس اس طریق سے اجتناب کلی لازم ہے۔

ہاں اگر کسی معاملہ یا مسئلہ میں ان مجتہدین ومحققین کے اقوال مختلف ہوں تو غور کر کے ان اقوال میں اگر کوئی قول ایسا مل جائے جس پر عمل کرنے سے کسی مجتہد کے بتلائے ہوئے مفہوم ومعنی کا خلاف کرنا لازم آتا ہو تو اس پر عمل کرلیں تاکہ سب کے نزدیک متفق علیہ عمل ہوجائے اور یہ صورت بہتر ہوگی۔

اوراگر ان اقوال میں سے کوئی قول ایسا نہ ملے تو صرف اسی امام ومجتہد کے بتلائے ہوئے مفہوم وحکم پر عمل کریں جسکی پیروی اپنے اوپر لازم کر چکا ہے کبھی اس کے خلاف نہ کرے، ورنہ کتاب وسنت کی اتباع کے بجائے اپنی کم علمی کیوجہ سے بسا

اوقات اپنے ہوی وہوس کی اتباع میں مبتلا ہوکر دین کی ہلاکت کا باعث بن جائے گا اور اس پر بے شمار وعیدیں قرآن وسنت میں وارد ہیں۔

نیز اس چھوٹ دینے سے بہت سے بالقصد دین میں گمراہی پیدا کرنے والے گمراہی پیدا کرنے کا راستہ پا جائیں گے جس سے خود بچنا اور قوم کو بچانا لازم ہے اور عین دین کی حفاظت میں شمار ہے۔

اسی ضابطہ وقاعدہ پر عمل کرنا ملک کے باشندوں پر لازم وضروری ہے، جہاں پر وہ رہیں اور جس ملک میں وہ جائیں ہر جگہ اور ہر ملک میں اسی ضابطہ کے مطابق عمل کرنا لازم رہے گا۔ اگر کوئی شخص دیدہ ودانستہ اس احتیاطی ضابطہ کو چھوڑے گا یا اپنی طبیعت یا خواہش کے مطابق آزادی برتے گا تو قوی اندیشہ ہے کہ وہ قرآن پاک کی اس وعید کا مصداق ہوجائے یا اس وعید کے وبال میں مبتلا ہوجائے، **كما قال تعالى: "هل أنبئكم بالأخسرين اعمالا الذين ضل سعيهم في الحيوة الدنيا وهم يحسبون انهم يحسنون صنعا"** (۱)۔

تقریباً چوتھی صدی ہجری یا اس کے آس پاس منجانب اللہ تمام امت مسلمہ کا اسی احتیاطی طریقہ کار پر اجماع ہوگیا ہے اور یہ اختلاف مجتہدین، اختلاف امتی رحمۃ، اور الدین یسر کا مظہر بشکل اجماع قرار پا گیا ہے اور یہ اجماع اللہ تعالیٰ کی رحمت خاصہ سے دینی حقیقت کی حفاظت کا سامان وذریعہ بن گیا ہے، ورنہ دین میں خرابی کہاں سے کہاں پہونچ گئی ہوتی۔

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے بھی اس مضمون کو نہایت تحقیق وتفصیل سے اپنے رسالہ جات انصاف وغیرہ میں بیان فرمایا ہے۔

(ب) اہل کتاب ان لوگوں کو کہتے ہیں جو اللہ پر ایمان رکھتے ہوں اور اللہ کو معبود برحق مانتے اور سمجھتے ہوں اور انجیل توریت زبور میں سے کسی کتاب کے قائل ہوں اور اس کو آسمانی کتاب مانتے اور سمجھتے ہوں اور اس پر اعتقاد رکھتے ہوں اور اس پر اپنا مذہب رکھتے ہوں خواہ ان کتابوں کے محرف ہونے کے بعد ہی یہ اعتقاد ومذہب رکھتے ہوں اور جس نبی پر یہ کتاب نازل ہوئی ہے اس کو نبی بھی مانتے وسمجھتے ہوں خواہ اسکو ابن اللہ یا ثالث ثلاثہ وغیرہ بھی کہتے ہوں وہ سب اہل کتاب ہیں خواہ کسی ملک یا خطہ میں رہتے ہوں یا کسی خطہ وملک کے باشندے ہوں وہ سب اہل کتاب ہی شمار ہوں گے۔

اور یہ سب اعتقاد ومذھب رکھتے ہوئے محض عمل کی خرابی وبدعملی سے وہ اہل کتاب سے خارج شمار نہ ہوں گے اس لئے کہ قرآن کریم نے ان حالات میں بھی انکو اہل کتاب فرمایا ہے اور انہی لوگوں کے بارے میں یہ آیت کریمہ نازل ہوئی

۱- سورۂ کہف: ۱۰۴۔

ہے :"وطعام الذین اوتوا الکتاب حل لکم و طعامکم حل لھم" (۱) ، اور انہی لوگوں کا ذبیحہ جو قرآن کریم میں بیان کردہ قیود وشرائط کے ساتھ ہو وہ مسلمانوں کے لئے حلال قرار دیا گیا ہے نہ کہ مطلقاً اہل کتاب کا ذبیحہ جس کی تفصیل ابھی عنقریب آتی ہے۔

اور وہ لوگ جنکے یہ عقیدے باقی نہ رہ گئے ہوں یعنی اللہ تعالی کے وجود کا انکار کر دیا ہو، اللہ کو معبود برحق نہ مانتے ہوں یا آسمانی کتاب پر یا جس نبی پر وہ کتاب نازل ہوئی ہے ایمان ختم کر دیا ہو یا انکا انکار کر دیا ہو وہ لوگ چاہے اپنے کو اہل کتاب کہیں مگر وہ عندالشرع اہل کتاب باقی نہیں رہے، اب یا تو وہ عندالشرع دہریہ شمار ہوں گے یا زندیق ولامذہب وغیرہ شمار ہوں گے اور انکا اپنے کو اہل کتاب کہنا معتبر نہ ہوگا اور انکا ذبیحہ بھی حلال نہ ہوگا۔

پس جن علماء نے یہ کہا ہے کہ اہل کتاب اب ایسے نہیں رہے جیسے پہلے تھے اگر انکا مقصود یہی ہے تو صحیح ہے ورنہ وہ لوگ اپنے قول کے خود ذمہ دار ہوں گے۔

یہ تشریح بالکل ایسی ہی ہے جیسے وہ شخص جو اللہ تعالی پر ایمان رکھتا ہو اور اس کو وحدہ لاشریک مانتا وسمجھتا ہو اور حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کو نبی آخر الزماں اور خاتم النبیین اور آپ پر نبوت کو ختم مانتا سمجھتا ہو اور قرآن کریم کو آسمانی کتاب وآخری کتاب اور برحق سمجھتا وجانتا ہو اور ان تمام چیزوں کا بھی اعتقاد رکھتا ہو جو ایمان صحیح کیلئے زمانہ خیرالقرون میں ضروری وشرط کے درجہ میں سمجھی گئی ہوں تو وہ شخص مومن ومسلم ہے۔

اور ان عقائد کو رکھتے ہوئے اس کے عمل میں خواہ کتنی ہی خرابی آجائے وہ مومن ہی قرار پائے گا گو وہ مومن عاصی اور فاسق ہو مگر ایمان سے خارج وغیر مسلم شمار نہ ہوگا۔

اور جن لوگوں کے یہ عقائد ہی بدل جائیں اور جن چیزوں پر مومن ہونے کے لئے اعتقاد رکھنا لازم وضروری ہے اس پر انکا عقیدہ نہ رہے تو وہ اگرچہ مومن کہیں مگر وہ مومن شمار نہ ہوں گے مثلاً جو شخص باری تعالی کے وجود ہی کا منکر خدانخواستہ ہو جائے تو وہ اپنے مومن کہنے یا کہلانے کے باوجود عنداللہ مومن نہ ہوگا، بلکہ دلائل شرعیہ سے یہ...... ثابت ہو جانے کے بعد اس پر دہریہ وغیرہ ہونے کا شرعاً حکم ہو جائیگا۔

اسی طرح کوئی خدا کے وجود کا تو قائل ہو مگر جناب نبی کریم ﷺ کے لئے ختم نبوت نہ مانتا ہو یا کسی ایسی ہی اور ضروریات دین کا منکر ہو جس پر اعتقاد رکھنا ایمان کے لئے شرط ہو یا ایمان معتبر اس پر موقوف ہو تو بھی عنداللہ مومن نہ ہوگا اور

۱- سورۃ المائدۃ ۵۔

دلائل شرعیہ سے ثابت ہو جانے کے بعد اس پر شرعاً مرتد یا غیر مسلم ہونے کا حکم ہو جائے گا اور اس کا ان حالات میں اپنے کو مؤمن کہنا یا سمجھنا یا کہلانا کچھ مفید و معتبر نہ ہوگا۔

امید کہ اتنی گفتگو سے سب اشکالات رفع ہو جائیں گے۔

اب اس کے بعد ہر سوال کا نمبر وار جواب معروض ہے:

۱۔ ذبح کی کئی صورتیں ہوتی ہیں بعض صورتوں میں ذبیحہ حرام ہو جاتا ہے، بعض صورتوں میں حرام نہیں ہوتا، ابھی تفصیل میں یہ چیز واضح ہو جائے گی انشاء اللہ!

ذبح کی جو صورت آپ نے لکھی ہے اور ہمیں جو یہ صورت ضابطہ کے مطابق سکھلائی جاتی ہے یہ ذبح ہی سب سے اعلیٰ و برتر صورت ہوتی ہے، اس صورت سے ذبح کرنے میں گوشت حلال ہونے کے ساتھ ساتھ انہیں اتباع سنت کا بھی ثواب ملتا ہے۔ خواہ نصرانی ہو یا یہودی یا حربی ہو، یا عربی یا کہیں کا ہو کما فی الشامی (۵/۱۸۵) "لان الشرط قیام الملة هدایه و کذا الصائبه لانهم یقرون بعیسیٰ علیه السلام قهستانی"(۱)۔

دوسری صورت یہ ہے کہ ذبح کرنے والا مسلمان ہونے کے بجائے کوئی اہل کتاب ہو اور وہ ذبح کرتے وقت بسم اللہ اللہ اکبر کہنے کے بجائے کسی اور کا نام لئے بغیر محض اللہ کا نام لیکر سوال میں ذکر کردہ طریقہ کے ساتھ ذبح کردے، یعنی گردن کی طرف سے دھاردار چیز سے حلقوم کاٹتا ہوا شروع کرے اور حلقوم کے ساتھ حلقوم کے دونوں طرف کی دو رگوں (خون بہنے کی ......) اور حلقوم کے پیچھے کی رگ (سانس لینے کی) سے کم ازکم دو رگ حلقوم کے ساتھ کاٹ کر خون اور بہادے اور ذبح کرتے وقت سر کو کاٹ کر قصداً الگ نہ کرے تو یہ ذبیحہ بھی بلاشبہ حلال و جائز رہے گا۔

تیسری صورت یہ ہے کہ مسلمان ذبح کرے یا اہل کتاب (کتابی) بطریق بالا ذبح کرے اور اس صورت میں بھی ذبیحہ بلاشبہ حلال و جائز رہے گا(۲)۔

ان تینوں صورتوں کو بلاریب اسلامی طریقہ کا ذبیحہ کہیں گے۔

چوتھی صورت یہ ہے کہ مسلمان یا کتابی مذکورہ بالا طریقہ سے ذبح کرے گا سر کو بھی قصداً کاٹ کر الگ کردے باقی

۱- رد المحتار علی الدر ۹/ ۴۲۸، مکتبہ زکریا دیوبند۔

۲- "وشرط کون الذابح مسلما حلالا خارج الحرم إن کان صیدا أو کتابیا ذمیا أو حربیا" (الدر المختار علی الرد ۹/ ۴۲۸-۴۲۷)۔

خون پورا رگوں کے کٹنے سے بہہ جائے تو اگر چہ سر قصداً کاٹ کر الگ کر دینا مکروہ(۱)، اور قبیح فعل کا ارتکاب ہوگا مگر ذبیحہ حلال وجائز رہے گا لقوله وحل بقطع ای ثلاث منها۔

پانچویں صورت:

مسلمان ذبح کرے یا کتابی ذبح کرے ذبح کرتے وقت قصداً اور عمداً اللہ کا نام لینا ترک کر دے خواہ مذکورہ بالا طریقہ ہی سے ذبح کرے یہ ذبیحہ حنفیہ کے نزدیک حرام ہو جائے گا اور اسکا کھانا حلال نہ رہے گا لقوله تعالى: ''ولا تاكلوا مما لم يذكر اسم الله عليه وانه لفسق'' (۲)۔

اور حضرت امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک متروک التسمیہ عامداً کی نفس حلت اگر چہ ہے لیکن فقہ ائمہ اربعہ ج ۳ ص ۲۳ و ۲۴ میں حضرت امام موصوف کا مذہب یہ لکھا ہے کہ ان کے نزدیک بھی تسمیہ مستحب ہے وإنما تستحب التسمية عند ذالك استحباباً مؤكداً (۳)۔

اور اگر بوقت ذبح اللہ کا نام لینے کا ارادہ تھا مگر بھول گیا اور نسیاناً نام نہ لیا تو امام مالک رحمہ اللہ کے نزدیک حرام قرار پائے گا، ان سب اقوال کا حاصل یہ نکلا کہ ذبیحہ متروک التسمیہ خواہ عامداً ہو یا نسیاناً اس کی حلت مختلف فیہ بین الائمہ ہوگی۔

ذبح کرنے والا اگر چہ مسلمان یا کتابی ہی کیوں نہ ہو مگر وہ گوشت مسلمان یا کتابی کے وہاں سے مہر بند ڈبہ میں نہ ہو بلکہ کھلا ہوا ہو تو اس کا غیر مسلم وغیر کتابی سے خریدنا یا غیر مسلم غیر کتابی کے ذریعہ اس طرح سے اس کا حاصل کرنا ممنوع ہے اور ایسے گوشت کا کھانا مکروہ تحریمی ہے، اس لئے کہ اس گوشت کے حلال ہونے کا مدار غیر مسلم غیر کتابی کی خبر پر ہوگا اور غیر مسلم غیر کتابی کی خبر اس باب میں معتبر ومفید نہیں، اس لئے کہ حلت وحرمت باب دیانات کے قبیل سے ہے اور باب دیانات میں ان کی خبر غیر مقبول ہوتی ہے، ''لأن جعل الشي حلالا حق الله تعالىٰ لا للغير'' كما في رد المحتار ''وأصله أن خبر الكافر مقبول بالإجماع في المعاملات لا في الديانات'' اور رد المختار ۵ (۲۱۵/) پر ہے: ''لابی يوسف- مجوسى الى قوله كره اكله الخ''، اور تنویر الابصار میں ہے: ''أو قال إشتريته من مجوسى فيحرم'' اس تفصیل سے مشہور مصنف کی کتاب (غیر مسلم اشخاص کے ذریعہ ذبح شدہ جانور کے گوشت کا جواز) کا بھی اندازہ ہو گیا۔

۱- ''وكره كل تعذيب بلا فائدة مثل قطع الرأس والسلخ قبل ان يبرد'' (الدر المختار على الرد ۹/ ۴۲۷، مکتبہ زکریا دیوبند)۔

۲- سورۃ الانعام ۱۲۱۔

۳- کتاب الفقہ علی المذاہب الاربعہ ۲/ ۲۳، مطبعۃ التجاریۃ الکبری مصر۔

اس لئے کہ غیر مسلم کا لفظ شامل ہے غیر مسلم اہل کتاب کو بھی پس اگر معنوں (مضامین کتاب) میں بھی یہی عموم ہو تو یہ کتاب واجب الرد ہے اس کی تردید و اصلاح واجب ہے اور جو شخص اس کی تردید و اصلاح پر قادر نہیں ہے اس کا دیکھنا بھی جائز نہ ہوگا، بلکہ ایسی کتاب بد دینی کا دروازہ کھولنے کا ہم معنی و مترادف ہے۔

یہ طول طویل تفصیل اسی لئے عرض کی ہے تاکہ جناب کو اس کتاب کا جائزہ لینا آسان ہو جائے اور معلمین کا یہ بتانا اگر اس سے مراد انکی یہ ہے کہ گوشت اور چکن غیر مسلم غیر اہل کتاب یا مسلم کا ذبح کیا ہوا ہو ہر حال میں اس کا کھانا جائز ہے اس کی غلطی بھی علی وجہ البصیرۃ معلوم ہو جائے۔

اب ہم آگے مزید بصیرت کے لئے اور مزید وضاحت و تکمیل فائدہ کے طور پر ذکر کرتے ہیں جس سے سوال میں تحریر کردہ امور کا صراحۃً حکم شرعی نکل آئے گا۔

تصریح ا۔ جس گوشت یا چکن کے بارے میں یقین ہو جائے کہ یہ غیر مسلم و غیر اہل کتاب کا ذبیحہ ہے یا اس پر بوقت ذبح اللہ کا نام نہیں لیا گیا ہے، اس کا لینا کھانا سب حرام و ناجائز ہے، خواہ آسٹریلیا یا کناڈا وغیرہ کہیں سے آیا ہو خواہ مقامی ہو سب کا یہی حکم شرعی ہوگا حسب صورت ۵ و ۱۰۔

۲۔ اگر بوقت ذبح اللہ کا نام نہ لینے کا یقین نہ ہو تو اس میں یہ تفصیل ہے:

الف۔ اگر ایسے خطہ و ملک سے آیا ہو (خواہ آسٹریلیا یا کناڈا وغیرہ سے آیا ہو) جہاں مذہبی اہل کتاب رہتے ہیں اور بستے ہوں اور ان کے بارے میں عام طور سے سنایا جاتا ہو کہ یہاں مذہبی ہی کتابی ذبح کرتے ہیں اور بوقت ذبح اللہ کا نام لیتے ہیں تو وہاں سے آیا ہوا ذبیحہ کھا سکتے ہیں کما فی الشامی ج ۵ ص ۱۸۸ فی کتاب الذبائح فلو سمع منه الخ و افادانه یو کل اذا جاء به مذبوحا (۱)، عنایہ بشرطیکہ مسلم فیکٹری یا اہل کتاب فیکٹری سے مہر پیکنگ میں ہے ورنہ اس کا کھانا مکروہ تحریمی ہوگا کما مر فی صورۃ ۱۱ جیسا کہ گیارہویں صورت میں گزر چکا ہے۔

(ب) اگر ان کے بارے میں عام طور سے مذکورہ بالا بات سنی یا کہی نہیں جاتی مگر وہاں عام طور سے مذہبی کتابی اور مسلمان رہتے اور بستے ہوں اور پیکنگ پہ لکھا ہوا ہو کہ یہ ذبیحہ اسلامی طریقہ پر ذبح کیا ہوا ہے تو چونکہ تجارت کے اصول میں سے بھی ہے کہ خداع نہ کیا جائے، اور جھوٹ نہ بولا جائے اس لئے انکا یہ ذبیحہ حلال کہا جائے گا جس کے پیکنگ پر مذکورہ

۱- "فلو سمع منه ذکر الله تعالیٰ لکنه عنه به المسیح قالوا یؤکل الا اذا نص فقال بسم الله الذی هو ثالث ثلاثة هدمیه و افاد انه یؤکل اذا جاء به مذبوحا عنایة" (الردالمختار علی الدر ۹/ ۴۳۰، مکتبہ زکریا)۔

عبارت لکھی ہوئی ہوکمافی الشامی ج ۵ ص ۳۰۷ ''فالأولی ان یقال ان کان الموضع مما یسکنه او یسلک فیه مجوسی لا یوکل وإلا أکل...... فإن الظاهر من حال المسلم والکتابی التسمیة لأنه یعتقدها دینا وخلاف هذا موهوم لا یعارض الراجح''۔

اسی شرط کے ساتھ کہ مسلم فیکٹری یا اہل کتاب فیکٹری سے مہر بند پیکنگ نہیں ہے تو وہ مکروہ تحریمی ہوگا جیسا کہ گیارہویں قسم میں گزر چکا ہے۔

۳۔ الف و ب یہ دونوں شقوں میں محض فتوی کہا جا سکتا ہے اور تفریع یہی ہے کہ جب تک اسلامی طریقہ پر اور بوقت ذبح محض اللہ کا نام لیکر ذبح کیا جانا نہ معلوم ہو نہ کھایا جائے، اس لئے جس جانور پر بوقت ذبح اللہ کا نام نہ لیا گیا ہو یا اللہ کے نام کے ساتھ کسی غیر اللہ کا نام بھی لے لیا گیا ہو اور اس کی حرمت نص قرآن پاک میں منصوص ہے مثلاً ''ولا تاکلوا '' (۱)، ''مما لم یذکر اسم الله علیه'' اور ''حرمت (۲)، علیکم المیتة والدم (الی قوله ..) وما اهل لغیر الله به '' اور ایسے موقعہ پر خود اسلامی طریقہ پہ ذبح کرانے یا مرغی وغیرہ خود ذبح کر کے یا کرا کے استعمال کرے۔

تصریح۔ ۴ یہ تحقیق وحکم نفس ذبیحہ کے اور کچے گوشت کے حرام وحلال ہونے میں ہے اور پکے ہوئے گوشت کا حکم دوسرا ہے اور وہ یہ ہے کہ غیر مسلم خواہ کوئی بھی ہو اس کے گھر کا یا اس کے ہوٹل کا پکا ہوا گوشت کھانا کسی طرح حلال وجائز نہیں، اس لئے کہ یہ لوگ اگرچہ اس گوشت کو اسلامی طریقہ پر ذبح کیا ہوا بتائیں مگر اس کے حلال ہونے کا مدار ان کی بتائی ہوئی خبر پر ہوگا اور اس کی غیر مقبولیت وخرابی ذبح کی گیارہویں صورت میں بیان ہوں گی۔ دوسری بات یہ ہے کہ یہ لوگ عموماً جھٹکا ومردار وغیرہ غیر اسلامی ذبیحہ بکثرت کھاتے ہیں، اس لئے ان کا ظاہر حال کلی خبر اس معاملہ میں ان کی مکذب ہے، اس لئے عدم اعتبار میں اور شدت بڑھ جائے گی، خاص کر عیسائی یہ لوگ خنزیر کے دلدادہ ہو چکے ہیں خنزیر کا گوشت عموماً بڑی رغبت اور شوق سے بکثرت پکاتے اور کھاتے ہیں اور اس کو پاک وحلال وطیب سمجھتے ہیں اور شرعی تطہیر اور اس کے طریقہ کی اہمیت بھی نہیں رکھتے اور چونکہ خنزیر کا گوشت عندالشرع نجس العین ہے لحم خنزیر فانہ رجس انسانی پیشاب پاخانہ کی نجاست کے مانند نجس ہے، اس لئے اگر حلال ذبیحہ کی ہانڈی لحم خنزیر کی ہانڈی کے ساتھ الگ پکائیں غالب حال یہ ہے کہ اس کا چمچہ ڈبو وغیرہ اس میں

۱- سورۃ الانعام:۱۲۱۔
۲- سورۃ المائدۃ:۳۔

بھی ڈالتے رہیں گے جس سے وہ گوشت ناپاک ہوجائے گا اگر یہ فعل یقینی نہ ہو جب بھی اس کا احتمال قوی ہونے کی وجہ سے یہ مشکوک ضرور ہوجائے گا اور شک کی حالت میں بھی اس کا کھانا ہرگز جائز نہیں رہے گا، اس لئے کہ (ردالمحتار ۵/۳۰۶) میں ہے: ''لایحل لوقوع الشک'' اور قرآن پاک میں: "یا ایھا الذین آمنوا کلوا من طیبات مارزقناکم" (۱)۔

ہاں اگر اپنے پاس اور اپنی یا کسی بھی مسلمان کی نگرانی میں حلال گوشت پکوائے تو کسی بھی غیر مسلم یا مشرک یا کافر کو کچھ دے اور وہ اپنا ہاتھ دھو کر پکائے تو اس کا کھانا جائز رہے گا۔

تفریع۔۵ اسی طرح اکثر لوگ مرغ وغیرہ چڑیوں کو اسلامی طریقہ سے ذبح کرنے کے باوجود اس کا شکم چاک کر کے آلائش نکالے اور صاف کئے بغیر ہی اس کے بال وپر وغیرہ اکھیڑنے اور صاف کرنے کے بعد کھولتے پانی میں ڈال دیتے ہیں اس طرح کچھ دیر بھی چھوڑے رکھنے سے اس کے منہ وپاخانہ کے مقام کے راستے سے ناپاکی وغلاظت نکل کر پانی میں مل کر سارے گوشت کو ناپاک بنادیتی ہے بلکہ ناپاکی تھوڑی دیر میں اس طرح رہنے سے گوشت میں اس طرح سرایت کر جاتی ہے کہ دھونے سے بھی وہ ناپاکی زائل نہیں ہوتی اور اس گوشت کا کھانا جائز نہیں رہتا۔

پس اگر کھولتے پانی میں ڈالنا ہو تو لازم ہے کہ پیٹ چاک کر کے آلائش صاف کر کے ڈالنا چاہئے الغرض حلال و طیب رزق کے تلاش کرنے اور کھانے کی بڑی تاکید اسلام میں آئی ہے اللہ تعالیٰ نے بہت سے مقام میں اس کی ترغیب وتاکید فرمائی ہے ایک آیت تو وہی ہے جو ابھی اوپر گزری ہے اور اس کے علاوہ اور بہت سی آیت میں اس کی ترغیب وتصریح منصوص ہے اس لئے اس معاملہ میں بڑی احتیاط لازم ہے، رزق حلال وطیب سے قلب میں نور اور ایمان میں پختگی پیدا ہوتی ہے اور صفت ملوکیت حاصل ہوتی ہے اور آخرت میں درجات عالیہ حاصل کرنے کی صلاحیت واستعداد پیدا ہوتی ہے۔

پس اگر کہیں پر پاکیزہ وطیب گوشت میسر نہ ہو تو انڈا مچھلی، سبزی وغیرہ پر قناعت کرے مگر یہ مشتبہ گوشت نہ کھائے امید کہ اتنی تفصیل سے بصیرت کے ساتھ پوری تشفی حاصل ہوجائے گی، اس لئے اب مزید کچھ کہنے کی حاجت نہیں، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند، سہارنپور

۱- سورۃ البقرۃ ۱۷۲

آگ سے ذبح کا شرعی حکم:

بعد سلام مسنون عرض ایں کہ مسئلہ ذیل کے متعلق حضرات مفتیان کرام کی آرائے گرامی مطلوب ہیں، مسئلہ یہ ہے کہ درمختار کتاب الذبائح میں مندرجہ ذیل عبارت موجود ہے:

"وحل الذبح بكل ما أفرى الأوداج وأنهر الدم أي أساله ولو بنار" اس پر علامہ شامیؒ رقم طراز ہیں:

قوله ولو بنار الخ قال في الدر المنتقىٰ: وهل تحل بالنار علىٰ المذبح، قولان، الأشبه لا كما في القهستاني عن الزاهدي، قلت: لكن صرحوا في الجنايات بأن النار عمد بها تحل والذبيحة، لكن في المنح عن الكفاية: إن سال بها الدم تحل وإن تجمد لا اه فليحفظ وليكن التوفيق" (۱)۔

اس عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ آگ سے ذبح شرعاً درست ہے اور جانور حلال ہوگا جب کہ پوری طرح رگیں کٹ جائیں اور خون بہے، البتہ شبہ یہ ہے کہ اولاً اس طریق میں (یعنی ذبح بالنار) میں شرعاً ذبح متحقق نہیں ہوتا۔ اس معنی کر کے کہ امرار السکین نہیں پایا جاتا، یہاں تو ذبح قوت ناریہ سے ہورہا ہے نہ کہ انسان کے ہاتھ کی مباشرت سے اور بندہ یہ سمجھا ہوا ہے کہ انسان کا ید سے ہی آلہ ذبح متحرک ہوجائے، یعنی امرار یہ فعل ید انسان ہے، حضرت امام شافعی نورہ اللہ مرقدہ نے کتاب الام میں ذبح کی بابت یہ فرمایا: "فهي عمل يده" یعنی ذکوۃ تو ید انسانی کا عمل ہے، اگر یہی حکم احناف کے نزدیک ہے اور غالب یہی ہے، گو صراحۃً کتب احناف میں نہیں دیکھا تو پھر نار سے ذبح نہ ہونا چاہیے، چونکہ ید انسان کا کوئی عمل براہ راست ومباشرۃً نہیں پایا جاتا، اس پر آنحضور کچھ افادہ فرمادیجئے۔ غالباً اگر ذبح کا یہ طریقہ درست ہو تو پھر آج کل جو رائج ہے کہ مشین کے ذریعہ ذبح ہوتا ہے، وہ بھی جائز ہونا چاہیے کیونکہ مشینی ذبح میں اتنا ہوتا ہے کہ انسان بٹن دباتا ہے اور مشین پر جو چھری لگی ہوتی ہے وہ چالو ہوجاتی ہے، اس کے بعد تمام جانور اسی چھری سے ذبح ہوتے ہیں، بٹن دبانے سے قوت برقیہ کرنٹ مشین میں بھر جاتی ہے اور اسی قوت سے چھری چل جاتی ہے، جیسا کہ آگ لگانے سے قوت ناریہ کے ذریعہ سے کٹ جاتی ہیں، انسان اتنا کردیتا ہے کہ آگ کو مذبح پر لگادے، اس کے بعد اصل ذبح نار سے ہوتا ہے نہ کہ براہ راست انسان کے کسی فعل سے، یہی ہوتا ہے مشینی ذبح میں کہ اصل فعل ذکوۃ براہ راست انسانی فعل سے نہیں ہورہا ہے، بلکہ چھری سے جو برقی قوت سے متحرک ہے، تو بظاہر مذکورہ بالا جزئیہ مشینی ذبح کے لیے فقہی نظیر بن سکتا ہے بعنوان دیگر اگر ناری قوت سے ذبح جائز ہے تو قیاساً علیہ برقی طاقت سے بھی ذبح جائز ہونا چاہیے۔ جہاں تک بندہ کی معلومات ہے جمہور فقہاء زمانا نے مشینی ذبح کو

۱- شامی کتاب الذبائح ۱۸۷/۵۔

ناجائز وحرام قرار دیا ہے۔

سراج احمد افریقی (جنوبی افریقہ شہر پورٹ آلزابتھ، ایلزبتھ)

الجواب وبالله التوفيق:

درمختار میں حل الذبح سے قبل متصلا وحل بقطع موجود ہے، اور اس کی یہ عبارت وحل الذبح تفسیر ہے اور مراد یہ ہے کہ اپنے شرائط وقیود کے ساتھ جب قطع وانشقاق متحقق ہوکر انہار دم ہوجائے گا، تو ذبیحہ حلال متصور ہوگا خواہ یہ بات امرار سکین سے حاصل ہو یا نار سے حاصل ہو یا لیطہ (بانس کے سخت چھلکے وغیرہ) سے یا مروہ (تیز دھار پتھر) سے یا منزوع دانت یا ناخن سے اور دانت وناخن کے تیز نہ ہونے سے یہ عمل مکروہ ہے، مگر حلت ذبیحہ کا شبہ یا کلام نہیں، درمختار "ولو بنار" کے متصلا بعد جملوں سے واضح ہے اور اس کی صحت کی تاکید اس حدیث پاک سے بھی ہوتی ہے:

"أفر الأوداج بماشئت" (الحديث) شامي تحت هذا المتن"(۱)۔

نار جس جگہ پر قوت سے پہنچ ہوتی ہے اور ٹکر کھاتی ہے اس جگہ سے آگے قطع وانشقاق عموماً پیدا ہوجاتا ہے، پس اگر یہ ٹکر اوداج پر ہوکر انہار دم بھی ہوجائے تو حسب تصریح متن شرعی ذبح متحقق ہوکر حلت ذبح میں کلام نہ رہے گا۔ اور صاحب رد المحتار نے اسی مضمون کو "ولیکن التوفیق" سے بیان کیا ہے اور یہ صحیح ہے۔ اس تفصیل سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ امرار السکین اپنے حقیقی معنی اور موضوع لہ معنی میں مقصود ومحدود نہیں ہے، بلکہ بطور عموم مجاز اس کا اثر ونتیجہ مراد ہے، ورنہ لیطہ وغیرہ میں سکین کا امرار کہاں ہے؟

انسان کے ہاتھ کی مباشرت کا جو مفہوم آنجناب نے سمجھا ہے، یعنی یہ کہ انسان کے ید سے آلۂ ذبح متحرک ہوجائے بالکل صحیح ودرست ہے اور اس کی متعدد نظیریں شرع میں موجود ہیں، ایسا ہی تو خود ذبح بالنار ہے کہ اس کے ذریعہ سے انہار دم کرنے میں ہاتھ کی مباشرت نار سے قطعاً نہیں ہوتی اور اس کے علاوہ مثلاً بسم اللہ اللہ اکبر کہہ کر مسلمان تیر کو کمان سے پھینکے اور وہ شکار پر پہونچ کر اس کے اوداج وغیرہ کو کاٹ کر انہار دم کردے اور شکار کی جان نکل جائے تو بھی وہ شکار حلال ہے۔ ان سب صورتوں میں انسان سے براہ راست اور بلا واسطہ مباشرت بالذبح نہیں ہوتا بلکہ ید انسان سے محض آلۂ ذبح متحرک ہوتا ہے۔ بالکل یہی صورت مشین کے ذریعہ ذبح میں ہوتی ہے کہ اس میں اگر چہ ید انسان براہ راست اور بلاواسطہ مباشر بالذبح نہیں ہوتا، لیکن اس کے ید سے آلہ ذبح متحرک ضرور ہوتا ہے کہ جہاں اس نے بٹن دبایا اور آلہ ذبح (چھری) چل جاتی ہے،

۱- ۴۲۵/۹ كتاب الذبائح مكتبہ زکریا۔

پس اگر کوئی مسلمان بسم اللہ اللہ اکبر کہہ کر بٹن دبائے اور فوراً چھری گلے کے اگلے حصہ سے چل کر ذبیحہ کے اوداج وغیرہ کاٹ کر انہارِ دم کردے تو ذبح بالنار کے ذریعہ ذبیحہ حلال ہونے کی طرح یہ ذبیحہ بھی حلال ہوگا، پس جناب کا یہ سمجھنا کہ مشین کے ذریعہ سے ذبح کیا ہوا ذبیحہ بھی جائز ہونا چاہیے، بالکل صحیح و درست ہے، جب کہ اوپر لکھی ہوئی شرائط وقیود کے مطابق ہو جیسا کہ ابھی اوپر مذکور ہوا اور جناب نے خود بھی اپنے قول (کیونکہ مشینی ذبح میں) سے بیان فرمایا ہے۔ اور اس مسئلہ کی نظیر وہ مثالیں بھی بن سکتی ہیں جو کلب معلم وغیرہ کے بارے میں یہ تفصیل گذری ہیں اور کتاب الام کی عبارت "**ففی عمل یدہ**" میں **عمل** ید بالواسطہ کا بھی احتمال ہے اور کیوں نہ ہو جب کہ کلب معلم سے بہ شرائط وقیود کیے ہوئے شکار کی حلت نص قرآنی میں منصوص ہے، لہذا کتاب **الام** کا یہ جملہ ہمارے خلاف نہیں اور اگر کوئی شخص **عمل** ید بلاواسطہ اور مباشرت ید بالذبیحہ براہِ راست کہے تو مذکورہ بالا فقہی جزئیات کے ہوتے ہوئے ہم پر حجت نہیں بن سکتا، البتہ جناب کا یہ فرمانا کہ جمہور فقہاء زمانا نے مشینی ذبح کو ناجائز وحرام قرار دیا ہے یہ **محل کلام** ہے اور اس کو مختلف فیہ کوئی کہہ دے تو کہہ سکتا ہے۔ باقی عدم جواز کو متفق علیہ یا قول جمہور نہیں کہہ سکتا! اس لیے کہ آج سے بہت پہلے حضرت تھانوی نور اللہ مرقدہٗ نے امداد الفتاویٰ میں مفصل اور اصولی گفتگو فرمائی ہے اور غیر مسنون طریقہ ذبح پر نکیر فرمائی ہے، بعض صورتوں میں اس طریقہ کو مکروہ، بعض صورتوں میں ممنوع اور بعض صورتوں میں اس طریقہ ذبح کو ناجائز وحرام قرار دیا ہے، باقی اس غلط طریقہ سے ذبح کیے ہوئے ذبیحہ کو جب اوداج کے آگے کا حصہ کٹ کر اہراقِ دم سائل ہو جائے اور بشرائط وقیود ہو تو اس کو حرام وغیر حلال نہیں قرار دیا ہے، بلکہ فقہی جزئیات لاکر حلال بتایا ہے، پھر مشینی ذبح پاکستان میں جب رائج ہونے والا تھا اس وقت وہاں کے علماء کے درمیان اس ذبیحہ کے حلال وحرام ہونے میں اختلاف ہوا، اس وقت حکومتِ پاکستان کے محکمہ ذبح کے ایک ذمہ دار جناب ڈاکٹر اشفاق صاحب کا اور حضرت مولانا سید میر شاہ صاحب کشمیری (شیخ الحدیث) کا مشترکہ عربی زبان میں لکھا ہوا ایک ضخیم کتابچہ شائع ہوا، اس میں اس ذبیحہ کے اور اس طریقہ ذبح کی حلت وجواز پر زور دیا گیا تھا، احقر کے پاس بھی رائے دینے کے لیے آیا تھا احقر نے اس پر طرداً وعکساً بحث کی، اس کا حاصل یہ تھا کہ طریقہ ذبح ایک مستقل چیز ہے اور اس سے ذبح ہو کر جو ذبیحہ نکلے اس کی حلت وحرمت ایک الگ اور مستقل چیز ہے۔ طریقہ ذبح خلاف سنت ہونے کی وجہ سے یا ایذائے مذبوح کی وجہ سے یہ طریقہ مکروہ یا ممنوع یا ناجائز وحرام ہو اور اس طریقہ کے رائج کرنے کی اجازت نہ دی جائے اور نہ دینا چاہیے، باقی جو ذبیحہ اس سے ذبح ہو کر نکلے اگر اس کے اوداج حسبِ ضابطہ شرع گردن کے اگلے حصہ سے کٹ کر دم سائل کا انہار و اہراق ہو جائے اور تسمیہ وغیرہ کی قیود بھی ہو جائیں تو اس ذبیحہ کو حرام وناجائز نہیں قرار دیا جائے گا۔

یہ جواب لکھ کر احقر نے دارالعلوم کے اکابر کے سامنے رکھا، سب نے تصویب فرمائی۔ پھر احقر کے منتخبات نظام الفتاوی میں اس سلسلے میں دوفتوے شائع ہو چکے ہیں، پھر حضرت مفتی محمود صاحب کے بھی تصدیقی دستخط ہیں، البتہ چونکہ ذبح کرنے والوں کو ان تمام قیود وشرائط مذکورہ کا عام طور سے لحاظ کرنا دشوار ہے اور معاملہ حرام وحلال کا ہے، اس لیے احتیاطاً اس طریق عمل کی اجازت نہ دینا چاہیے۔ ''هذا ماعندی من الشرع الشريف إن كان صواباً فمن عند الله وإن كان خطاءً فمن نفسي وما أبرئُ نفسي''، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۹/ ۲/ ۱۴۰۲ھ

کیا مشینی ذبیحہ حلال ہے؟ اور کیا بوقت ذبح ٹیپ ریکارڈ کے ذریعہ اللہ اکبر کی آواز آنا کافی ہے؟

مونٹریال کنیڈا میں سعودی عرب اور کویت کو حلال مرغیاں بھیجنے کے لئے کچھ مشین لگائی جارہی ہے جس میں مرغیاں سر کے بل کٹتی رہتی ہیں اور بلٹ کے ذریعے چلتی رہتی ہیں اور ایک مقام پر ایک تیز دھار رکھی ہے جو مرغی آتے ہی اس کے گردن پر چل جاتی ہے پھر یہ مرغی بلٹ ہی کے ذریعے آگے چلتی ہے جہاں اس کو گرم پانی میں (خون کے نکلنے کے بعد) غوطہ دیا جاتا ہے پھر اس کے پر مشین کے ذریعے سے نکالے جاتے ہیں اور مشین ہی کے ذریعے سے تمام پیکنگ ہوتی ہے، یہ لوگ ہم سے ایک سرٹیفکٹ مانگ رہے ہیں کہ یہ مرغیاں کس طرح اس مشین کے ذریعے حلال کر کے بھیجی جاسکتی ہیں تاکہ سعودی عرب میں فروخت کی جاسکے، امریکہ میں اسی طرح کی مشین دوجگہ لگی ہوئی ہے جہاں انہوں نے ایک مسلمان کو نوکر رکھا ہے کہ جب مرغی اس تیز دھار سے کٹے وہ بسم اللہ اللہ اکبر پڑھتے ہیں اور دوسری جگہ ایک ٹیپ ریکارڈ لگا ہوا ہے جس میں بسم اللہ اللہ اکبر کا ٹیپ بجتا رہتا ہے اور مرغیاں کٹتی رہتی ہیں، فی الحال ہم نے ان لوگوں کو سرٹیفکیٹ دینے سے منع کر رکھا ہے آپ اس بابت تفصیل سے ارشاد فرماویں نوازش ہوگی۔

اسلامک سینٹر آف عربک (مرنیٹ کناڈا)

الجواب وباللہ التوفیق:

تیز دھاردار چیز جو مرغیوں کی گردن کاٹتی ہے وہ جس بٹن یا پرزہ کے دبانے سے یا چلانے سے چلتی ہے اگر کوئی مسلمان ذبح کرنے کی نیت سے ذبح کرنے کے وقت بسم اللہ اللہ اکبر کہتا ہوا وہ بٹن دبائے یا وہ پرزہ چلائے اور اس دبانے

چلانے سے وہ دھاردار چیز گردن کاٹے اور کٹنے میں ودجین (سانس کی دورگ) اور حلقوم (غذا کی نلکی) اور وصبۃ الریہ (سانس کی نلکی) یہ سب کٹ کر پورا خون نکل جائے تو اگر چہ یہ طریقہ خلاف سنت ہونے سے مکروہ وغلط ہو مگر ذبیحہ حلال ہو جائے گا اور اسکا کھانا جائز رہے گا اگر ان سب قیود میں سے کسی ایک قید کا بھی لحاظ کئے بغیر ذبح کر دیا جائے تو وہ ذبیحہ شرعیہ نہیں ہوگا، اور حلال نہ ہوگا، ان سب قیود کا لحاظ کئے بغیر محض کسی مسلمان کا گردن کٹنے کے وقت بسم اللہ اللہ اکبر کہتے رہنا یا ٹیپ ریکارڈ سے بسم اللہ اللہ اکبر کی آواز آتی رہنا کافی نہ ہوگا خوب غور سے سمجھ لیا جائے (۱)۔

اسی طرح اگر ذبح کرنے اور خون نکلنے کے بعد شکم سے آلائش وغلاظت دور کئے اور نکالے بغیر کھولتے پانی میں ڈال دیا جائے گا تو غلاظت تمام گوشت و پوست میں سرایت کر کے سب کو ناپاک بنادے گی، اور پھر کھانا ممنوع ہو جائے گا، اس لئے کھولتے ہوئے پانی میں ڈالنے سے قبل شکم چاک کر کے غلاظت سب نکال دی جائے، پھر اس کے بعد کھولتے پانی میں ڈالی جائے خواہ مشین ہی کے ذریعے سے شکم چاک ہوتا رہے اور آنتیں سب باہر نکل کر الگ ہوتی رہیں اور اسکے بعد کھولتے پانی میں پڑتی رہیں جب بھی صحیح رہے گا (۲)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۹/۱۲/۱۴۰۰ھ

جانور کے ذبح کے لئے وضو:

مرغ یا بکرا ذبح کرتے وقت وضو کرنا ضروری ہے یا نہیں؟

الجواب وباللہ التوفیق:

ذبح کرتے وقت بھی وضو کرنا ضروری نہیں ہر طرح یکساں درست ہے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۴/۲/۱۴۰۳ھ

۱- ذبیحہ حلال ہونے کے شرائط میں سے ذبح کرنے والے کا مسلمان یا کتابی ہونا، اور ذبح کے وقت اللہ کا نام لینا ہے'' ومنها أن يكون مسلماً أو كتابياً..... ومنها التسمية حالة الذكاة '' (دیکھئے: فتاوی عالمگیریہ ۵/۲۸۵، ۲۸۶، نیز البحر الرائق ۸/۳۰۵)، '' ومن شرائط التسمية أن تكون التسمية من الذابح ''(فتاوی عالمگیریہ ۵/۲۸۶) ''والمذبح قطع الأوداج لقوله عليه الصلاة والسلام: أفر الأوداج بما شئت والمراد الحلقوم والمرئ والودجان '' (البحر الرائق ۸/۳۰۶، نیز دیکھئے: ردالمحتار علی الدر المختار ۹/۴۲۴، ۴۲۵)۔

۲- '' وكذا دجاجة ملقاة حالة غلي الماء للنتف قبل شقها فتح (الدر المختار، وفي الشامي: قال في الفتح: انها لا تطهر أبداً لكن على قول أبي يوسف تطهر والعلة والله أعلم تشربها النجاسة بواسطة الغليان...... ولا يترك فيها إلا مقدار ما تصل الحرارة إلى ظاهر الجلد لتنحل مسام الصوف '' (ردالمحتار علی الدر المختار ۱/۵۴۴)۔

باب الأضحية

قربانی کس پرواجب ہے؟

زید کے پاس جائداد بھی ہے اور مکان بھی ہے اور خانگی سامان بھی ہے مگر یہ بہت کچھ ہونے کے باوجود اس کے پاس نقد روپیہ جمع نہیں ہوتا اور ضروری امور میں خرچ ہوجاتا ہے، اس طرح اس کے پاس جو خانگی سامان ہے وہ بھی بقدر ضرورت ہی ہے، ایسی صورت میں اس پر صدقۂ فطر اور قربانی واجب ہوتی ہے یا کہ نہیں؟

الجواب وبالله التوفيق:

زکوۃ وصدقۂ فطر اس وقت واجب الاداء ہوتا ہے جب حاجت اصلیہ ضروریات روزانہ کی استعمال کی چیزوں سے فاضل مال نامی نصاب (۵۲ ½) تولہ چاندی یا اسی قدر روپیہ یا اس مقدار کی قیمت کا روپیہ یا تجارت کا سامان موجود ہو ورنہ نہیں، خانگی سامان جو کبھی کبھی استعمال میں آیا ہو یا اسی طرح مکان جو چاہے کبھی کبھی استعمال میں آتا ہو اسی طرح جائداد سے مراد اگر کھیتی باڑی ہے جس کی آمدنی سے آپ کا گذر اوقات ہوتا ہو یہ سب حوائج اصلیہ میں شمار ہیں ان کی مالیت پر زکوۃ یا صدقۃ الفطر واجب نہیں (۱)، اب آپ خود غور کر کے سمجھ لیجئے ،فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

بیٹے کے نام سے قربانی کی جبکہ نیت باپ کی تھی:

ایک شخص نے ایک جانور میں ایک حصہ لیا اور نیت اپنے باپ کی قربانی کرنے کی تھی مگر اس نے اس بات کی تصریح نہیں کی اور قربانی کے وقت موجود بھی نہیں تھا لوگوں نے اس شخص کے نام سے قربانی کر دیا بعد میں اس آدمی نے اپنی نیت

۱- ''فتجب التضحية على حر مسلم مقيم موسر يسار الفطرة'' (ردالمحتار ۹/۴۵۷)۔

ظاہر کی کہ میری نیت باپ کی طرف سے تھی قربانی کرنے کی۔

دریافت طلب امر ہے کہ یہ قربانی صحیح ہے کہ نہیں اور بقیہ شرکاء کی قربانی صحیح یا کہ نہیں۔ اور شخص مذکور صاحب نصاب بھی ہے یا کہ نہیں۔

الجواب وباالله التوفیق:

اس شریک ہونے والے کی قربانی صورت مسئولہ میں ہوگئی، البتہ باپ کی طرف سے نہیں ہوئی، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

۱- ایک جانور میں بالغ اور نابالغ کی طرف سے قربانی:

بالغ اور نابالغ کا ایک ساتھ اور ایک ہی جانور میں قربانی کرنا جائز ہے یا کہ نہیں؟

۲- مردہ اور زندہ دونوں کی طرف سے ایک جانور میں قربانی:

زندہ اور مردہ دونوں کی طرف سے ایک ہی جانور میں قربانی دینا جائز ہے یا کہ نہیں اگر جائز ہے تو مردہ کے حصے میں جو گوشت ملے گا اسکی کیا صورت ہوگی؟

۳- جانور خریدنے کے بعد شرکت:

مالک نصاب جس پر قربانی واجب ہے اس نے قربانی کا جانور خرید اخرید نے کے بعد پھر گھر کے پانچ آدمی کو شامل کرلیا تو یہ شامل کرنا جائز ہے یا کہ نہیں نیز مالک نصاب پر پورا جانور شرط ہے یا اس میں شرکت جائز ہے۔

الجواب وباالله التوفیق:

۱- جائز ہے مگر نابالغ پر واجب نہیں ہے (۱)۔

۲- جائز ہے اور اس کے گوشت کا بھی وہی حکم ہے جو زندہ کی قربانی کا ہے البتہ اگر وصیت کی ہو تو اس کے حصہ کا

۱- دیکھئے ردالمحتار ۹/۵۹ ۳۔

تمام گوشت صدقہ کرنا ضروری ہے (۱)۔

۳-جائز ہے مالک نصاب پر محض خریدنے سے پورے جانور کی قربانی واجب نہیں ہوگی جب تک پورے جانور کی تنہا اپنے نام کرنے کی نذر نہ مان لے۔ دوسروں کو شریک کرلینا بھی درست ہے (۲)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۸/۱۱/ ۱۳۸۵ھ

الجواب صحیح محمود عفی عنہ

قربانی کے جانور میں شرکت کے سلسلے میں ایک استفتاء مع فتوی اور اس کا جواب:

سوال: ایک شخص کی ایک گائے میں ایک ہی قربانی ہوسکتی ہے؟ آپ نے تحریر فرمایا کہ قربانی میں ایک پوری گائے ایک ہی شخص ذبح کرے تو اس کی ایک قربانی ہوگی، اس لئے ایک گائے میں ایک ہی شخص واجب قربانی کے ساتھ عقیقہ اور اموات کو ایصال ثواب کے لئے نفل قربانی کی نیت نہیں کرسکتا، اس پر یہ اشکال ہے کہ شامیہ میں اسی صورت میں سات قربانی ہونے کا بھی قول ہے: "واختلفوا فی البقرة قال بعض العلماء یقع سبعا فرضاً والباقی تطوع" (۳)، نیز شامی وغیرہ میں یہ تصریح موجود ہے کہ ایک گائے میں مختلف جہات قربت مثلاً اضحیہ، عقیقہ، دم شکر، اور جنایت وغیرہ جمع ہوسکتے ہیں، لہذا اس مسئلہ کی مزید وضاحت تحریر فرمائیں۔

الجواب وباللہ التوفیق:

تعدد قول بعض ہے جو مرجوح ہے۔ بلکہ خلاف عامة المشائخ کی وجہ سے مرجوح ہے، عامة المشائخ توحد کے قائل ہیں اور یہی مفتیٰ بہ ہے: "قال فی العلائیة ولو ضحی بالکل فالکل فرض کأرکان الصلوٰة، وفی الشامیة: الظاهر أن المراد لو ضحی ببدنة یکون الواجب کلها لا سبعها بدلیل قوله فی الخانیة: ولو أن رجلا موسرا ضحی ببدنة عن نفسه خاصة کان الکل أضحیة واجبة عند عامة العلماء وعلیه الفتویٰ، مع أن

۱- دیکھئے رد المحتار ۹/ ۴۷۰ مکتبہ زکریا۔

۲- "(وصح اشتراک ستة فی بدنة شریت لأضحیة) أی إن نوی وقت الشراء الإشتراک صح استحسانا وإلا لا (استحسانا وذا) أی الإشتراک قبل الشراء أحب" (دیکھئے: رد المحتار ۹/ ۴۵۹ مکتبہ زکریا)۔

۳- رد المحتار ۵/ ۲۲۶۔

ذکر قبله باسطر لو ضحی الغنی بشاتین، فالزیادة تطوع عند عامة العلماء، فلا ینافی قوله کان الکل أضحیة واجبة ولا یحصل تکرار بین المسألتین فافهم. دلیل وجه الفرق أن التضحیة بشاتین تحصل بفعلین منفصلین وإراقة دمین، فیقع الواجب أحد لهما فقط والزائدة تطوع بخلاف البدنة، فإنها بفعل واحد وإراقة واحدة فیقع کلها واجبا، هذا ما ظهر لی"(۱)۔

حدیث میں یوں بھی ارشاد ہے کہ ایک گائے میں سات آدمی شریک ہوسکتے ہیں اس کا کسی حدیث میں ثبوت نہیں ملتا کہ ایک ہی آدمی ایک گائے ذبح کرے تو اس کی سات قربانیاں ہوں گی یا ایک ہی شخص ایک ہی گائے میں اضحیہ ودم شکر وغیرہ جمع کرسکتا ہے، مختلف جہات قربت کو مختلف افراد پر قیاس بھی نہیں کیا جاسکتا، اس لئے کہ ایک جانور کا سات کے قائم مقام ہونا خلاف قیاس ہے(۲)، اس لیے حدیث اپنے مورد پر منحصر رہے گی، فقہ میں مختلف جہات قربت کا جواز مذکور ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک گائے میں ایک کی قربانی کے ساتھ دوسرا شخص دم شکر یا عقیقہ وغیرہ کا حصہ رکھ سکتا ہے۔ یہ مطلب نہیں کہ ایک ہی شخص ایک ہی گائے میں مختلف قربات ادا کرسکتا ہے۔ اس لئے کہ یہ حدیث اور فقہ کی نص مذکور کے خلاف ہے، شخص واحد کی نیت مختلف جہات پر عدم جواز اور عبارات فقہ غیر مراد ہونے پر مندرجہ ذیل شواہد ہیں:

۱- علائیہ اور شامیہ کی عبارت مذکورہ:''**ولو ضحی بالکل فالکل فرض کارکان الصلوة الخ**"۔

۲- حدیث اور فقہ میں اس کی کوئی تصریح نہیں اور اجزاء من السبعہ پر قیاس اسلئے صحیح نہیں کہ یہ حدیث خلاف قیاس ہونے کی وجہ سے اپنے مورد پر منحصر ہے۔

۳- کتب فقہ میں جہات مختلفہ کا ذکر اجزاء عن السبعہ کے تحت کیا گیا ہے۔

۴- شامیہ وغیرہ میں "**وکذا لو أراد بعضهم العقیقة**" سے اگر شخص واحد کی نیت اضحیہ وعقیقہ کا بیان مقصود ہوتا تو اس کے ساتھ لفظ "ایضا" کا اضافہ لازم تھا۔

۵- کئی کتب میں جہات مختلفہ اشخاص مختلفہ کی طرف سے ہونے کی تصریح ہے: "**أراد بعضهم الأضحیة وبعضهم جزاء الصید الخ**"(۳)۔

۱- ردالمحتار ۵/ ۲۳۵۔

۲- عنایہ علی ہامش الفتح ۸/ ۷۶۔

۳- عالمگیری ۵/ ۳۰۴، خانیہ علی ہامش العالمگیریہ ۳/ ۳۵۰، بدائع ۵/ ۷۱، شلبی علی تبیین الحقائق ۶/ ۸، الجوہرۃ النیرۃ علی ہامش مختصر القدوری ۲/ ۳۰۳۔

۶-فقہ کی تمام کتابوں میں موقع بیان با وجود اس کے مکمل سکوت مستقل دلیل عدم صحت ہے اور اس کا ثبوت ہے کہ یہ کلیہ "ولو ضحی بالکل الخ" سے مستثنیٰ نہیں۔

۷- "ولو اشتری بقرة للأضحية ونوى السبع منها لعامه هذا وبسنة أسباعها عن السنين الماضية يجوز عن العام ولا يجوز عن الأعوام الماضية كذا في خزانة المفتيين، وإن نوى بعض الشركاء التطوع وبعضهم يريد الأضحية للعام الذى صار دينا عليه وبعضهم الأضحية الواجبة عن عامه ذلك جاز الكل وتكون عن الواجب عمن نوىٰ الواجب عن عامه ذالك وتكون تطوعا عمن نوىٰ القضاء عن العام الماضى ولا تكون عن قضائه بل يتصدق بقيمة شاة وسط لما معنى كذا فى فتاوى قاضيخان" (۱)۔

اس عبارت میں بصورت تعدد اشخاص بنیۃ اضحیہ ماضیہ وقوع تطوع مذکور ہے، مگر بصورت توحد شخص وقوع کا ذکر نہیں، اس سے ثابت ہوا کہ صورت توحد میں اضحیہ واجبہ کے ساتھ اور کسی نیت کا کوئی اعتبار نہیں، اور یہ پوری گائے اضحیہ واجبہ شمار ہوگی۔

التماس:

۱- یہ تحریر مختلف اہل فتویٰ حضرات کی خدمت میں بغرض اظہار رائے ارسال کی جارہی ہے، براہ کرم اپنی رائے **مدلل** تحریر فرمادیں۔

۲-اگر یہ تحقیق صحیح ہو تو یہ سوال پیدا ہوگا کہ کسی نے ایک گائے میں اضحیہ ودم شکر وغیرہ متعدد واجبات کی نیت کی تو ان میں سے کون سا واجب ادا ہوگا؟ یا کہ کوئی واجب بھی ادا نہیں ہوگا۔ اس سے متعلق بھی رائے حق تحریر فرمائیں۔

رشید احمد (اشرف المدارس ناظم آباد، کراچی)

الجواب وباللہ التوفیق:

احقر کے ذہن میں تو یہ مسئلہ اس طرح قائم ہے کہ اگر کوئی شخص بڑے جانور کو جس میں سات حصے قربانی کے ہوتے ہیں خریدنے سے قبل یہ نیت کر کے خریدے کہ اس میں ایک حصہ سے اپنے کسی غلام یا ام ولد کی جانب سے قربانی کرے گا۔ اور باقی تین حصوں سے اپنی نابالغ اولاد کی جانب سے قربانی کرے گا- تو اس طرح سے بھی قربانی وعقیقہ سب بالکل درست

۱- عالمگیری ۵/ ۳۰۵۔

ہوجائے گا، جس طرح خریدنے سے قبل دوسروں کو شریک کرنے کی نیت سے خریدے اور شریک کرکے قربانی کرنا جائز ودرست رہتا ہے، جیسا کہ ان مندرجہ ذیل عبارتوں سے بھی بخوبی معلوم ہوتا ہے:

۱- "على هذا (أى يجوز) إذا كان أحد الشركاء أم ولد ضحى عنها مولاها أو صغير أضحى عنه أبوه ولاخلاف أنه ليس على المولى ولا على الأب أن يضحى عن أحد من مماليكه أو عن أولاده الصغار، فإن تبرع بذلك جاز، وإذا جعله شريكا في البدنة ففيه قياس واستحسان لما بينا" (۱)۔

۲- "ولو ضحى غنى بدنة عن نفسه وعن ستة أولاده ليس هذا في ظاهر الرواية، وقال الحسن بن زياد في كتاب الأضحية له إن كان أولاده صغارا جاز عنه وعنهم جميعا في قول أبي حنيفة وأبي يوسف (إلىٰ قوله) وإن كانوا كبارا إن فعل بأمرهم جاز عن الكل۔۔وإن فعل بغير أمرهم أو لغير أمر بعضهم لا تجوز عنه ولا عنهم في قولهم جميعا، لأن نصيب من لم يأمر صار لحما فكان الكل لحما" (۲)۔

۳- "وكذا صح لو ذبح بدنة عن أضحية ومتعة وقران مع اختلاف جهات قربتهم عنه لاتحاد المقصود هو القربة" (۳)۔

۴- "ولنا أن الجهات وان اختلفت صورة فهي في المعنى واحد، لأن المقصود من الكل التقرب إلى الله عز شأنه وكذلك إن أراد بعضهم العقيقة عن ولد ولد له من قبل لأن ذلك جهة التقرب إلى الله عز شأنه بالشكر الخ" (۴)۔

ان سب عبارتوں کا خلاصہ یہی ہے کہ سات حصے والے قربانی کے جانور میں ساتوں حصوں میں تقرب الی اللہ کی جہت موجود رہنا چاہئے۔ عام اس سے کہ سات آدمی شریک ہوکر جہت قربت قائم کریں یا ایک ہی آدمی اپنی مختلف جہت کی قربت سے تقرب الی اللہ قائم کرے۔ اگر سات حصوں میں سے ایک حصہ میں یا ایک حصہ سے بھی کم میں جہت کی قربت متحقق نہ ہوگی تو کسی حصہ کی قربانی صحیح نہ ہوگی، بلکہ پوری قربانی اکارت ہوجائے گی، رہ گئی یہ بات کہ یہ مسئلہ خلاف قیاس ہے تو یہ بات

۱- المبسوط للسرخسی ۱۲/۴۔
۲- فتاویٰ خانیہ علی الہندیہ ۳/۳۵۰، وکذا فی الفتاویٰ الہندیہ ۵/۳۰۳۔
۳- مجمع الانہر ۴/۵۰۲۔
۴- بدائع الصنائع ۵/۷۲۔

یہاں تک تو صحیح ہے کہ نفس اراقۂ دم اور حکم ذبح کا ورود غیر مدرک بالقیاس ہے۔اسی طرح شرکت کو بھی قیاس جلی کے خلاف کہہ سکتے ہیں۔باقی اس کے بعد کی تمام تفصیلات وجزئیات کو خلاف قیاس یا غیر مدرک بالقیاس کہنا سمجھ میں نہیں آتا، چنانچہ جناب نے خود بھی اثبات مدعا کے موقعہ میں کئی جگہ قیاس کو بطور استشہاد واستدلال پیش فرمایا ہے، مثلاً اس عبارت: "ولو ضحی بالكل فالكل فرض كأركان الصلوٰة" میں حصص اضحیہ کو ارکان پر قیاس فرمانا بیان فرمایا ہے۔اسی طرح اس عبارت "لو ضحى الغني بشاتين" میں بدنہ اور شاتین کے حکم کا فرق قیاس ہی سے ثابت کیا ہے۔اسی طرح شاید نمبر ۸ کی عبارت "ولو اشترى بقرة" میں قیاس ہی کے ذریعہ حکم لگانا بیان فرمایا ہے۔اسی طرح بدائع الصنائع (۵/ ۶۷) کی عبارت: "ومنها أنه تجزئ فيها النيابة، لأنها قربة تتعلق بالمال فتجزئ فيها النيابة كأداء الزكوٰة وصدقة الفطر ولأن كل أحد لا يقدر على مباشرة الذبح بنفسه خصوصاً النساء فلو لم تجز الإستنابة لأدىٰ إلى الحرج وسواء كان المأذون مسلما أو كتابيا حتى لو أمر مسلم كتابيا أن يذبح أضحية يجزيه" (۱)، اس عبارت میں بیک وقت کئی قیاس ہیں اور ان سے متعدد جزئیات کا حکم مستنبط کیا گیا ہے، اسی طرح اور بھی بہت سے فقہی احکام ہیں جو محض علت مطردہ کے ذریعے مستنبط ہوتے ہیں، مثلاً یہ حکم: "ولا شك في جواز بدنة أو بقرة عن أقل من سبعة بأن اشترك إثنان أو ثلثة أو أربعة أو خمسة أو ستة في بدنة أو بقرة لأنه لما جاز السبع فالزيادة أولىٰ (إلىٰ قوله) بعد أن لا ينقص عن السبع" (۲)۔

اس جزئیہ میں "لأنه لما جاز السبع الخ" کی علت کے ذریعہ سے حکم فقہی مستنبط کیا ہے اور مثلاً: "ولو إشترك سبعة في خمس بقرات أو في أكثر فذبحوها أجزاهم لأن لكل واحد منحصر في كل بقرة سبعها" (۳)۔

اس میں بھی قیاس سے حکم جواز متعدی ہوا ہے اور جناب نے خلاف قیاس کے اثبات کے سلسلہ میں عنایۃ عن الفتح (۸/ ۹۶) کی عبارت بطور استدلال پیش فرمائی ہے اس سے متصل خود اسی جگہ "ولكنا نقول" سے استدراک کرتے ہوئے اور اس قیاس جلی کو رد کرتے ہوئے شارح علیہ الرحمہ نے استحسان وقیاس خفی کے ذریعہ حکم اشتراک کو معلل بالعلۃ المطردہ کرکے خود جواز اشتراک کو ثابت کیا ہے، اور علت جواز صرف تقرب الی اللہ کی نیت کو قرار دیا ہے اور یہ تقرب عام ہے اس

۱- بدائع الصنائع ۵/ ۷۱۔
۲- بدائع الصنائع ۵/ ۷۱۔
۳- بدائع الصنائع ۵/ ۷۲

سے کہ چند شرکا تقرب کی نیت سے شریک ہوں یا ایک ہی شخص اپنے حصص میں مختلف جہات قربت کی نیت کرے، یہ علت سب صورت میں یکساں مطرد ہوکر حکم جواز کا ذریعہ بنے گی، جیسا کہ سابق عبارتوں سے بھی واضح ہورہا ہے، اسی طرح اس عبارت سے بھی واضح ہوتا ہے: "ولكنا نقول إذا كانت الجهات قربا اتحد معناها من حيث كونها قربة فجاز الإلحاق بخلاف ما إذا كان بعضها غير قربة فإنه ليس في معناها"(۱)، اس عبارت سے یہ معلوم ہوا کہ غیر قربت کو تو جمع نہیں کر سکتے باقی قربتیں خواہ کسی جہت کی ہوں جمع ہوسکتی ہیں اور ان کو مجتمع کر سکتے ہیں، اس جگہ یہ ذکر کردینا بھی ضروری ہے کہ یہ سب تفصیل اس وقت ہے جب غنی شخص نے شرکت کی نیت کرنے کے بعد خریدا ہو، ایسا نہیں ہوا، بلکہ خرید چکنے کے بعد شرکت کی نیت کررہا ہے تو اس کا جواز علماء کے درمیان مختلف فیہ ہوجاتا ہے اور بعض صورتوں میں مرجوح بھی ہوجاتا ہے، نہ کہ پہلی صورت میں، اس لئے تعدد کے قول کو مطلقاً اور ہر حال میں مرجوح کہنا صحیح نہ ہوگا۔ ہاں اگر ذبح کرلینے کے بعد کوئی شخص دوسروں کو شریک کرنا چاہے، اس کا بعض ساتو اں حصہ قربانی واجب میں اور بعض قربانی غیر واجب یا عقیقہ وغیرہ میں شمار کرنا چاہیں یا غیر غنی شخص قربانی کے لیے نامزد کر کے خریدے، پھر دوسروں کو شریک کرے یا مختلف جہات تقرب پر مشتمل کرنا چاہے تو یہ صورتیں کسی کے نزدیک جائز نہ ہوں گی: "لأنه لما أوجبها صار الكل واجبا كما بينه في البدائع" وغیرہ، یعنی عدم جواز اس لئے ہوگا کہ بطریق ایجاب فعلی کے یا بطریق فعلی کے یا بطریق ایجاب قولی کے کل کو اپنے اوپر جب واجب کر چکا تو اب اس کے خلاف کرنا جائز نہ ہوگا، اور یہی محل مصداق ان عبارتوں کا ہے جن کو جناب نے "ولو ضحى بالكل فرض" سے اور "ولو أن رجلا موسرا ضحى ببدنة عن نفسه خاصة"(۲)، وغیرہ سے بیان فرمایا ہے، اور اس قسم کی جزئیات میں خلط واقع ہونے سے اس قسم کا خیال پیدا ہوجاتا ہے، ان تمام تفصیلات کے بعد مسئلہ کی پوری نوعیت نکھر جائے گی اور جناب کا سوال جو عنوان التماس کے تحت ہے پیدا ہی نہ ہوگا، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

الجواب صحیح محمود غفر لہ، سید احمد سعید مفتی دارالعلوم دیوبند

۱- عنایہ علی الفتح ۸/۷۶۔

۲- حوالہ سابق۔

چند اشخاص کامل کر حضور ﷺ کے نام سے قربانی کرنا:

غیر واجب قربانی میں حضور ﷺ کے ایصال ثواب کے لیے دو چار آدمی مل کر مشترک قربانی کرنے کو دارالعلوم کی جانب سے درست ہونے کا فتوی ۱۳۸۸ھ میں موصول ہوا تھا، تو اس فتوی کو پمفلٹ کی شکل میں شائع کر کے پورے برطانیہ میں تقسیم کیا تھا، جس سے الحمدللہ کم وبیش آج تک سیکروں قربانی ہوچکیں۔ لیکن امسال ۱۳۹۱ھ میں ماہ فروری ۱۹۷۱ء میں گجراتی ماہنامہ التبلیغ میں جامعہ ڈابھیل سے اسی قسم کے فتوی کا جواب اس کے برعکس شائع ہوا ہے۔ جس کے سوال وجواب حسب ذیل ہیں:

ہمارے یہاں برطانیہ میں دو تین آدمی مل کر (مشترک) حضور کے نام پر ایک بکرے کی قربانی کرتے ہیں۔ یہ صحیح ودرست ہے یا نہیں؟

الجواب وبالله التوفيق:

ایک بکرے کی قربانی ایک ہی آدمی کرسکتا ہے۔ اس میں دو یا تین حصہ دار بن کر بکرے کی قربانی کریں گے تو قربانی صحیح ادا کی ہوئی نہیں سمجھی جائے گی۔ جس کی وجہ سے قربانی کا ثواب بھی نہیں ملے گا۔ حضور ﷺ کے لئے قربانی یا ایصال ثواب کرنا بہت ہی بہتر اور کار ثواب ہے۔ ہاں اگر استطاعت اور گنجائش ہو تو ضرور کرنا چاہئے، جانور جس میں سات حصے ہوسکتے ہیں، ایسے جانور میں سے ایک ایک حصہ کی قربانی کرسکتے ہیں، فقط (عالمگیری، شامی)۔

جامعہ ڈابھیل سورت گجرات

دارالعلوم دیوبند اور جامعہ ڈابھیل کے جوابات میں صحیح اور غیر صحیح جیسے بڑے فرق ہونے کی وجہ سے لوگوں میں ایک قسم کی پریشانی اور بے چینی پھیلی ہوئی ہے۔

دارالعلوم کے ایک فتوی کی ایک فوٹو کاپی اس خط کے ہمراہ روانہ کی ہے اور حضرت تھانویؒ نے بھی ''امداد الفتاوی'' میں دارالعلوم میں کے مانند جواز کا فتوی دیا ہے حوالہ حسب ذیل ہے:

مبوب امداد الفتاوی جلد سوم۔ ادارہ اشرف العلوم کراچی۔ طبع اول شوال ۱۳۷۳ھ (کتاب الذبائح والاضحیہ صفحہ ۴۹۵)۔

دارالعلوم اور حضرت تھانویؒ کے حوالے کے بعد مزید تحقیقات کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ مگر جامعہ ڈابھیل کا فتوی

گجراتی ماہنامہ رسائل میں شائع ہوکر ملک اور بیرون ملک میں پھیل گیا ہے۔اس وجہ سے مزید استصواب اور تسکین کے لیے دوبارہ وہی سوال حاضر خدمت ہے۔

الجواب وباللہ التوفیق:

۱۳۸۸ھ میں دارالعلوم دیوبند سے حضرت مفتی محمود صاحب کا لکھا ہوا جو فتوی گیا ہے وہ صحیح ہے۔اسی طرح حضرت تھانوی نور اللہ مرقدہٗ نے رجوع کے بعد جو تحریر فرمایا ہے وہ بھی صحیح ہے۔

اور مفتی ڈابھیل نے جو بات لکھی ہے (کہ ایک بکرے کی قربانی یا سبع بقرہ (ساتواں حصہ بقرہ کا) کی قربانی چند آدمیوں کے نام سے نہیں ہوسکتی) وہ اپنی جگہ پر تو صحیح ہے، لیکن یہ بات اس سوال مذکورہ کا جواب نہیں ہوسکتی، اس لئے کہ یہاں تو اس بکرے کی قربانی اور صرف جناب رسول اللہ ﷺ کے نام سے ہوگی، آپ ﷺ کا تنہا وہ حصہ ہوگا۔اس میں چند آدمی حصہ دار نہیں ہوں گے۔

وہ چند آدمی جنہوں نے بکرا خرید کر فقط آپ کے نام قربانی کی ہے وہ خود حصہ دار نہیں ہوئے، بلکہ حصہ دار ہونے کے بجائے دوسرے کو حصہ دار بنانے والے ہوئے اور ان دونوں صورتوں میں بڑا فرق ہے۔یہی فرق نہ سمجھنے سے مغالطہ ہوگیا ہے۔

چند آدمیوں کا ایک بکرا یا ساتواں حصہ بقرہ (سبع بقرہ) خرید کر، مالک بن کر پھر کسی ایک کے نام قربانی کرادینا یا بذریعہ وراثت اس کا مالک ہوکر کسی ایک کے نام اس کی قربانی کرادینا ایک ہی چیز ہے۔اور اس کے جواز کی تصریح موجود ہے۔کما فی الدر علیٰ حامش الشامی (۵/ ۲۸۴)، ''وإن مات أحد السبعة المشتركين في البدنة وقال الورثة: اذبحوا عنه وعنكم صح عن الكل استحسانا لقصد القربة من الكل'' (۱) وھکذا فی العالمگیریہ (نولکشوری)، ''وإذا اشترى سبعة بقرة ليضحوا بها فمات أحد السبعة وقالت الورثة: وهم كبار اذبحوا عنه وعنكم جاز استحساناً الخ''۔

لہذا آپ حضرات کے یہاں (برطانیہ میں) جو طریقہ رائج ہے وہ بلاشبہ جائز و درست ہے، آپ حضرات کسی شک وشبہ میں نہ پڑیں۔اور یہ بات الگ ہوگی اور بہت اعلیٰ وارفع ہوگی کہ ایک شخص تنہا ایک بکرا خرید کر سرکار دوعالم ﷺ کے نام

۱- شامی ۵/ ۲۸۴۔

پر تنہا قربانی کردے۔فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دار العلوم دیوبند سہارنپور ۲/ ۲/ ۹۵ ۱۳ ھ

قتل خطا میں قربانی کی ادائیگی:

ایک شخص اپنی چراگاہ میں شکار کھیل رہا تھا کہ غلطی سے بندوق کی گولی چرتے ہوئے ایک بھیڑ کو لگ گئی اور گولی اس کے سر میں لگی اور وہ قریب تھا کہ دم توڑ دے کہ اس نے اس کو پکڑ کر ذبح کیا اور قربانی کے ایام تھے تو ذبح کرتے وقت اس نے اس میں قربانی کی نیت کرلی تو آیا اس شدید زخمی جانور کی قربانی جائز ہے؟ جس کے سر میں گولی لگی ہے؟

الجواب وباللہ التوفیق:

اگر اس کی عمر پوری تھی قربانی کے لائق تھی اور ذبح کرنے سے خون نکلا تھا تو قربانی کی نیت کرلینے سے قربانی ادا ہوجائے گی۔فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دار العلوم دیوبند سہارنپور ۲/ ۲/ ۹۵ ۱۳ ھ

ایک سال سے کم کی بکری و بھیڑ کی قربانی درست نہیں، البتہ فربہ دنبہ چھ ماہ کا جو ایک سال کے برابر ہو اس کی درست ہے:

ہمارے یہاں ایک سال کی بکری کی قربانی کردیتے تھے، چاہے ایک سال کی بکری دانتی ہو یا نہ ہو، لیکن امسال ایک صاحب آئے انہوں نے کہا کہ ایک سال کی بکری کی قربانی درست نہیں ہے اگر دانتی نہ ہو، مسلم شریف کی حدیث ہے: "لا تذبحوا إلا مسنة إلا أن يعسر عليكم فتذبحوا جذعة من الضان"(۱) قربانی میں صرف مسنہ ذبح کرو اگر یہ میسر نہ ہو تو بھیڑ کا جذعہ ذبح کرو چونکہ حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ بھیڑ کا جذعہ ذبح کرو اس سے معلوم ہوا کہ اور جانوروں کا مثلا اونٹ، بکری، گائے کا جذعہ جائز نہیں ہے۔

جذعہ، ضان اور معز کی تعریف جمہور اہل علم اور ائمہ لغت کی تحقیق میں جانور کا ایک پورا سال کر کے دوسرے میں لگنا

۱- مسلم کتاب الاضحیہ ۲/ ۱۵۵۔

ضروری ہے (فتح الباری پ ۲۳ صفحہ ۳۲۹) میں ہے: ''الجذع من الضان ما أكمل سنة دخل في ثانية وهو الأصح عند الشافعية وهو الأشهر عند أهل اللغة" (۱)، شرح مسلم شریف میں ہے: "الجذع من الضان ما له سنة تامة هذا هو الأصح عند أصحابنا وهو الأشهر عند أهل اللغة وغيرهم" (۲)، نیل الاوطار میں ہے: "الجذع من الضان ما له سنة تامة هذا هو الأشهر عند أهل اللغة وجمهور أهل العلم من غيرهم"، مجمع البحار میں ہے: "الجذع من الضان ما تمت له سنة" (۳)، بذل المجہود میں ہے: "في ما تمت له سنة" (۴)۔

ان سب حوالجات سے معلوم ہوا کہ بھیڑ کا جذعہ بھیڑ کا وہ بچہ ہے جو پورے ایک سال کا ہو اور یہ مسلک جمہور اہل علم اور امامان لغت کا ہے، خود حافظ ابن حجر نے اس کو جمہور اہل علم کی طرف منسوب فرمایا ہے ملاحظہ ہو: ''فمن الضان ما أكمل السنة وهو قول الجمهور" (۵)، لیکن اور مسائل اختلافیہ کی طرح اس میں بھی حنفیہ نے اختلاف کیا ہے جس کا ذکر خود ائمہ حدیث اور فقہ کے مصنفین نے کیا ہے، ہدایہ میں ہے: "والجذع من الضان ما تمت له ستة أشهر في مذهب الفقهاء" (۶)۔

اس تصریح سے معلوم ہوا کہ احناف کے نزدیک جذعہ ضان بھیڑ کا وہ بچہ ہے جو پورے چھ ماہ کا یا اس سے کچھ زیادہ عمر کا ہو، لیکن یہ قول چونکہ لغت کے خلاف تھا، اس لئے ہدایہ میں جذعہ ضان کی تشریح کرتے ہوئے "في مذهب الفقهاء" کی قید لگا دی گئی، تاکہ یہ ظاہر ہو کہ ائمہ لغت کی یہ تشریح نہیں ہے (کفایہ ۴/ ۳۴) میں قید: "بمذهب الفقهاء احتراز عن قول اللغة" اسی طرح ''بذل المجہود'' میں ہے: ''قيد بقوله شرعا لأنه في اللغة ما تمت له سنة'' (۷)، معلوم ہوا کہ ائمہ لغت کی تشریح احناف کے خلاف ہے اور صحیح مسلک جذع ضان ایک سالہ بچہ ہے جذعہ معز جس کی ممانعت کا حکم بخاری شریف کی روایت میں آچکا ہے اس کی عمر کی نسبت شراح حدیث اور ائمہ لغت کی تصریحات ملاحظہ ہوں۔

جذع معز کی عمر: فتح الباری میں ہے: ''فهو ما دخل في السنة الثانية'' تحفۃ الأحوذی میں نہایہ ابن اثیر کے

۱- فتح الباری ۲۳/ ۳۲۹۔
۲- نووی ۲/ ۱۵۵۔
۳- مجمع البحار ۱/ ۱۸۱۔
۴- بذل المجہود ۳/ ۱۷۔
۵- فتح الباری ۳/ ۲۴۴۔
۶- ہدایہ مع کفایۃ ۴/ ۳۴۔
۷- بذل المجہود ۴/ ۱۷۔

حوالہ سے یہ عبارت ہے: "الجذع من البقر والمعز ما دخل فی السنة الثانیة" (۱) میں جذع آنچہ پیش از ثنی باشد یعنی گوسپندو گاؤ بسالہ دوم درآمد، فقہ اللغۃ میں ہے:"وکل من أولاد المعز والضنان فی السنة الثانیة جذع" (۲) میں "الجذع من البقر والمعز ما تم له سنة وطعنت فی الثانیة"۔

"بذل المجہود" میں ہے:"وأما الجذع من المعز فهو ما دخل فی السنة الثانیة" ان تصریحات بالا سے معلوم ہوا کہ بکری کا وہ بچہ جو ایک سال پورا کر کے دوسرے سال میں داخل ہو وہ جذعہ معز کہلاتا ہے! ظاہر باہر ہے کہ حضور ﷺ نے جذع معز کی قربانی سے منع فرمایا ہے، پس کسی حالت میں بکری، بکرا، خصی جو پورے ایک سال کے نہ ہوں قربانی درست نہیں ہے۔

مسنہ جو اہل بقر معز سے قربانی کے لئے ضروری ہے، اب مسنۃ کی عمر کی تعیین شارحین حدیث وامامان لغت کی زبانی ملاحظہ ہو، امام نووی شرح مسلم (۲/ ۱۵۵) میں لکھتے ہیں: "قال العلماء المسنة هی الثنیة من کل شئی من الابل والبقر والثنیة أکبر من الجذعة بسنة"، امام شوکانی نے لکھا ہے: "المسنة هی الثنیة من کل شئی من الإبل الذی یلقی سنة ویکون فی ذات الخف فی السنة السادسة وفی ذات الظلف والحافر فی السنة الثالثه وقال ابن فارس إذا دخل ولا الشاة فی الثالثة فهو شئی ومسن" (۳)، علامہ امیر یمانی نے لکھا: "المسنة من کل شئی ومن البقر" صاحب فتح العلام نے لکھا ہے:"الثنیة من الغنم ما دخل فی السنة الثالثة" شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ لکھتے ہیں:"الثنی من البقر والمعز ما استکمل سنتین وطعن فی الثالثة" (۴)، علامہ شیخ محمد طاہر نے لکھا ہے:"الثنیة من المعز ما دخل فی السنة الثالثة" (۵)۔

ان حوالجات سے معلوم ہوا مسنہ معز بکری وغیرہ کا وہ راس ہے جو دو سال پورا کر کے تیسرے میں قدم رکھے، اس لئے ایک سال کی بکری کی قربانی درست نہیں ہے، مسنہ کی تعریف دانت ہونے کے اعتبار سے محدثین کرام شکر اللہ مساعیہم کی راس مسنہ کی تشریح میں مختلف رہی ہے بعضوں نے مسنہ کی تشریح میں جانور کے ساتھ اس کی عمر کی قید لگا دی ہے جس عمر میں وہ

۱- منتہی الارب ۱/ ۱۸۱۔
۲- مجمع البحار ۱/ ۱۸۱۔
۳- فتح ۲۳/ ۳۲۸۔
۴- مسوی ۱/ ۱۸۔
۵- مجمع البحار ۱/ ۱۶۶۔

جانور مسنہ ہوتا اور بعضوں نے دانت نکلنے کو اصل سمجھ کر عمر کا ذکر تبعاً کیا ہے، چنانچہ اب ہم اسی کا ذکر کرتے ہیں، فتح الباری میں ہے: "وحكى ابن السني عن الداؤدي أن المسنة التي سقطت أسنانها وقال أهل اللغة: المسن الذي يلقي سنة ويكون في ذات الخف في سنة السادسة في ذات الظلف والحافر في السنة الثالثة" اور عون المعبود میں بحوالہ محکم ہے: "الثني من الإبل الذي يلقي ثنية وذلك في السادسة ومن الغنم الداخل في السنة الثالثة" اور بحوالہ صحاح یہ عبارت ہے: "الثني الذي يلقي ثنية ويكون ذلك في الظلف والحافر في السنة الثالثة وفي السنة السادسة"، حاشیہ سندھی نسائی شریف میں ہے: "والمسنة اسم فاعل من السنت إذا طلع سنها وذلك بعد السنتين"، حاشیہ نسائی (۲/ ۲۵۳) تیسیر الوصول میں ہے: "المسنة التي لها سنون"، مجمع البحار میں ہے: "والمسنة تقع على البقرة والشاة إذا اثنيا ويثنيان في السنة الثالثة" (۱)، منتہی الارب میں ہے مسنہ کہ دندان پیش برآمدہ اینا قہ درسال ششم درآمد وگوسپند وگاؤ درسوم درآمدہ منجد میں ہے: "الأثني الذي يلقي ثنة وهي اسنان مقدم الفم"، بذل المجہود میں ہے: "وهي التي طعنت في الثالثة سميت بذلك لأنها طلعت سنها" (۲)، ہدایہ کفایہ میں ہے: "وهي التي طعنت في الثالثة" مصفی میں ہے: "سنة النصف" کہ گذشت باشد بروے دو سال وداخل شد در سال سوم۔

ان سب حوالہ جات سے معلوم ہوا کہ ایک سال کی بکری قربانی کے لئے جائز نہیں ہے، قربانی کے لیے مسنہ ہونا ضروری ہے اور مسنہ کے لیے دانت ہونا ضروری ہے، اب مفتی دارالعلوم دیوبند سے سوال ہے کہ کیا حنفیہ کے مسلک کی تائید شراح حدیث وامامان لغت نہیں کرتے ہیں اور اس مسئلہ میں حنفیوں کے دلائل کیا ہیں اور پیش کردہ دلیلوں کا کیا جواب ہے، جبکہ پیش کردہ دلیلوں میں بذل المجہود ہدایہ مع کفایہ اور علامہ سندھی اور شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی کتابوں کا حوالہ بھی ہے؟ جواب باصواب دیکر ممنون ومشکور فرمائیں۔

عبدالرحمن عابدی (مقام پکولیا مسلم پوسٹ پکولیا ضلع بستی، یوپی)

۱- مجمع البحار ۲/ ۱۴۸۔

۲- بذل المجہود ۳/ ۱۷۔

الجواب وبالله التوفيق:

فاضل مضمون نگار نے عبارتوں کے نقل کرنے میں بڑی ہوشیاری سے کتر بیونت کیا ہے، بلکہ اس سے بھی دو چار ہاتھ آگے بڑھ گئے ہیں۔ اگر پوری عبارت نقل فرما دیتے تو سارا تاروپود بکھر جاتا۔ اور اشکال کی ساری عمارت خود بخود منہدم ہوجاتی۔

احقر صرف ایک عبارت نقل کر دیتا ہے اسی سے اندازہ ہوجائے گا، فتح الباری (۱/ ۱۱۳) کی پوری عبارت اس طرح ہے: "واختلف القائلون بأجزاء الجزعة من الضأن وهم الجمهور في مسنة على آراء أحدها أنه ما أكمل سنة ودخل في الثانية وهو الأصح عند الشافعية وهو الأشهر عند أهل اللغة، ثانيها نصف سنة وهو قول الحنفية والحنابلة، ثالثها سبعة أشهر وحكاه صاحب الهداية من الحنفية عن الزعفراني، رابعها ستة أو سبعة حكاه الترمذي عن وكيع، خامسها التفرقة بين فيكون نصف سنة وبين، فيكون ابن ثمانية، سادسها ابن عشر، سابعها لا يجزى حتى يكون عظيما حكاه ابن المعزى، وقال: إنه مذهب باطل، وقال الأبعادى من الشافعية لو أجذع قبل السنة أى سقطت أسنانه أجزأ كما لو تمت السنة قبل أن يجذع ويكون ذلک قبل البلوغ، قال البغوى: ما استكمل السنة أو أجذع قبلها"۔

اس عبارت کا ظاہر ومتبادر مفہوم صرف اتنا ہے کہ جمہور علماء لغت کے اقوال جذع من الضان کی عمر کے بارے میں مختلف ہیں۔ اختلاف تو اں کی تعداد نوتک پہنچی ہے، مگر کوئی دوسرے قول کو غلط یا صحیح نہیں کہتا بجز قول نمبر ۷ کے کہ اس کو صرف ابن المعزی نے باطل فرمایا ہے اور یہ باطل فرمانا بھی صرف ان کا قول ہے کسی اور نے اس کو بھی باطل نہیں قرار دیا ہے، لہٰذا وہ بھی عند اہل اللغہ صحیح ہی شمار ہوگا، لہٰذا سب اقوال صحیح ہی شمار ہوں گے اور صاحب فتح الباری چونکہ شافعی المسلک ہیں اس لیے انہوں نے قول نمبر ۱ کو اپنے فہم ومسلک کے اعتبار سے بسلسلہ وجوہ ترجیح "وهو الأصح عند الشافعية وهو الأشهر" کہہ کر نقل فرمایا ہے اور اس کے خلاف کو غیر صحیح یا شاذ انہوں نے بھی نہیں فرمایا ہے، کیسے کہہ سکتے ہیں، اس لئے کہ اصح کا مقابل صرف غیر اصح ہوتا ہے اور غیر اصح کا غیر صحیح ہونا ضروری نہیں ہوتا، بلکہ اصطلاح علماء میں اصح کا مطلب صرف یہ ہوتا ہے کہ اس کا جانب مخالف بھی صحیح ہے، مگر میرے نزدیک اس صحیح میں صحت کے وجوہ اس صحیح کے اعتبار سے زیادہ قابل لحاظ ہیں۔ اسی طرح اشہر کا مفہوم بھی اصطلاح علماء میں صرف یہ ہوتا ہے کہ اس کا مقابل مردود یا نا قابل عمل نہیں ہوتا، بلکہ مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس مشہور سے زیادہ وجہ شہرت میرے نزدیک ہے، اس لئے اصح یا اشہر کو ترجیح دیتے ہیں اور بس اور اس کا خلاصہ

علی وجہ التسلیم صرف افضلیت کے درجہ کی ترجیح ہوسکتی ہے، نہ کہ ضروری العمل پس فاضل مضمون نگار کاضروری العمل کہنا یا ضروری سمجھنا بالکل غلط اور جاہلانہ تعبیر ہے۔

پھر فاضل مضمون نگار نے کتر وبیونت کرنے میں عبارت مذکور کے مضمون کو خبط کر کے اپنے غلط مدعیٰ کو ثابت کرنے میں یہ بھی تلبیس کی ہے کہ پوری عبارت میں سے شروع عبارت کی پہلی سطر کے اندر سے صرف یہ لفظ (الجذع) لے کر اس کے بعد کے کسی جملہ (خط کشیدہ جملے) حذف کر کے اس کے بعد کے اس لفظ (ما استکمل) سے اس لفظ (الجذع) کو جوڑ کر اپنی خودساختہ عبارت بنا کر غلط مفہوم پیدا کر دینے کی سعی نا کام کی ہے، مزید برآں اس کے بعد فتح الباری کی پوری عبارت بھی نقل نہیں کی ہے۔ کیونکہ اس سے بھی اس تلبیس کا پردہ چاک ہوجاتا تھا اور صریح بددیانتی مذاہب کے نقل کرنے میں واضح ہوجاتی تھی کیونکہ حنفیہ بھی اہل لغت کے اقوال میں سے جس قول کے قائل ہیں۔ وہ امام محمدؒ کا قول ہے اور امام محمدؒ جس طرح فقہ میں امام ہیں اور حضرت امام شافعی کے استاذ ہیں، اسی طرح فن لغت میں بھی مسلمہ امام ہیں، ان کے قول وتحقیق کو غلط یا غیر راجح کہنے کے لئے دل وگردہ اور ہمت چاہئے۔

پھر فاضل مضمون نگار کو تو یہ بھی پتہ نہیں کہ جذع من الضان کی عمر میں چھ ماہ اور چھ ماہ سے کچھ زائد اور سال بھر سے کم عمر ہونے میں محض حنفیہ ہی کا قول نہیں ہے، بلکہ حنفیہ کے ساتھ حنابلہ بھی ہیں۔ حنابلہ کا قول بھی چھ ماہ ہی کا ہے بلکہ یہ قول محض بعض شوافع کا ہے، محققین شوافع کا قول نہیں ہے۔ محققین شوافع کا قول صاحب فتح الباری نے خود بھی نقل فرمایا ہے، محدثین صحاح میں سے امام کبیر حضرت امام ترمذیؒ کا قول اور حضرت امام شافعی کے استاذ مسلمہ (حضرت وکیع رحمۃ اللہ علیہ) کا قول ان سب میں بھی یہی نقل فرمایا ہے کہ چھ ماہ سے زائد اور ایک سال سے کم اور اس کے علاوہ محققین شوافع عبادی کا قول اور امام بغوی کا بھی یہی قول نقل فرمایا ہے جس کے قائل احناف وحنابلہ ہیں۔

ان سب باتوں کے ہوتے ہوئے فاضل مضمون نگار کا یہ مضمون مبنی برعناد کہا جائے یا فریب دہی کہا جائے یا فریب خوردگی یا مبنی برلاعلمی وجہالت کہا جائے۔

قیاس کن زگلستان من بہار مرا

احقر کے نزدیک یہ مضمون مبنی برعناد یا فریب دہی نہیں معلوم ہوتا بلکہ مبنی برفریب خوردگی وکم علمی یا مبنی برلاعلمی معلوم ہوتا ہے، بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سنی سنائی باتوں پر ساری تعمیر کھڑی کر دی ہے، کیونکہ فاضل مضمون نگار کو یہی نہیں معلوم ہے کہ جذعہ من الضان کس کو کہتے ہیں اور ضان ومعز وشاۃ میں کیا فرق ہے، بیچارے کو یہ بھی نہیں معلوم کہ فتح الباری میں

پارے ہوتے ہیں کہ نہیں اسی بنا پر فتح الباری کے لیے پ ۲۳ لکھ جاتے ہیں، اس فریب خوردگی اور اس لاعلمی کا پردہ چاک ہوجانے کے بعد اب مزید کچھ لکھنے کی حاجت نہیں تھی، لیکن اس میں کچھ بددیانتی کو بھی دخل ضرور معلوم ہوتا ہے، اس لئے اتنا لکھ دیا گیا ہے، تاکہ سادہ لوح مسلمان اور دیانتدار طبقہ آگاہ ہوکر اس فریب میں نہ آجائے۔

پھر مزید بصیرت واطمینان کے لیے حنفیہ کا مذہب مع دلیل نقل کردیا جاتا ہے، کیونکہ مسلم شریف، ابو داؤد شریف، اور ترمذی شریف کے مطابق اصل مذہب احناف یہی ہے کہ بکری، بھیڑ دنبہ سب پورے ایک سال کا ہی قربانی کرنا چاہئے، لیکن اگر ایک سال کی بکری بھیڑ نہ ملے تو دنبہ کا جذعہ (چھ ماہ) اگر اتنا لمبا چوڑا موٹا تازہ ملے جو ایک سال کے دنبہ کے برابر معلوم ہوتا ہو تو اس کی قربانی بھی درست ہوجائے گی اور چھ ماہ کے دنبہ کے علاوہ چھ ماہ کی بھیڑ یا بکری کافی نہ ہوگی، خواہ کتنا ہی توانا یا موٹا تازہ ہو، جیسا کہ مسلم شریف کی ان روایات سے معلوم ہوتا ہے۔

☆ عن جابر قال قال رسول الله ﷺ: لا تذبحوا إلا مسنة" یعنی ایک سال کا پورا، "ألا يعسر عليكم فتذبحوا جذعة من الضان"(۱)(یعنی ضان کا جذعہ)۔

☆ غزت الغنم فأمر (المجاشع بن مسعود) مناديا فنادى أن رسول الله ﷺ كان يقول:" إن جذع يوفى منه الثنى"(۲)۔

☆ عن كباش قال: جلبت غنما جذعاً إلى المدينة فكسرت على فلقيت أباهريرة فسألته فقال: سمعت رسول الله ﷺ يقول: نعم أو نعمت الأضحية من الضان قال: فانتهبه الناس (إلى قوله) والعمل على هذا عند أهل العلم من أصحاب النبي ﷺ وغيرهم أن جذع من الضان يجزى فى الأضحية (إلى قوله) قال وكيع: الجذع يكون ابن سبعة أو ستة أشهر هذا حديث حسن"(۳)۔

ظاہر کہ فرمان رسالت علی صاحبہا الصلوۃ والسلام کی تصریح پھر اس کی شرح میں اصحاب رسول اللہ ﷺ کی تشریح جو اسی تصریح رسالت کے مطابق ہو تو پھر ان قوال اہل لغت کی اس مقابلے میں کیا حیثیت ہوگی اور کیا ضرورت باقی رہ جائے گی؟

پھر آگے چل کر فاضل مضمون نگار نے جو جذع معز کی تحقیق عمر کے سلسلے میں قلم فرسائی فرمائی ہے اول تو ان سب

۱- مسلم وابوداؤد ۲/ ۳۰۔

۲- ابوداؤد ۲/ ۱۲۔

۳- ترمذی ۱/ ۱۸۱۔

کا جواب احقر کی اسی معروض میں آ گیا ہے، علاوہ ازیں فاضل مضمون نگار کی بات اگر ان کی جماعت کا یا ان کا کوئی حمایتی تسلیم کرے اور مانے تو اس کو چاہئے کہ بکری، بھیڑ، دنبہ جب تک دوسال کا پورا نہ ہوجائے تو اسکی قربانی جائز نہ ہوگا۔ جولوگ دو سال سے کم بکری، بھیڑ دنبہ کی قربانی کریں گے ان کی قربانی ادا نہ ہوگی، لہذا ایسے لوگ اپنے اس فاضل مضمون نگار سے دریافت کریں کہ اب تک جو قربانیاں ان کی ذکرکردہ شرائط کے خلاف کی گئی ہیں ان کے بارے میں کیا حکم ہے؟ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی ، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۳/ ۴/ ۹۸ ۱۳ھ

نیل گائے اور ہرن کی قربانی:

پالتو نیل گائے، یا ہرن کی قربانی عیدالاضحیٰ میں ہوسکتی ہے یا کہ نہیں اگر ہوسکتی ہے تو ہرن پر کتنے آدمی کی اور نیل گائے میں کتنے آدمی کی؟

الجواب وبالله التوفيق:

نہیں ہوسکتی ہے قربانی صرف بکری بھیڑ دنبہ نر یا مادہ یا خصی کی اور گائے بیل بھینس بھینسا اونٹ اونٹنی کی جائز ہے اور اس کے علاوہ کسی اور جاندار کی قربانی جائز نہیں ہے چاہے یوں بلا قربانی کر کے انکا کھانا جائز ہو یہ الگ بات ہے قربانی کو اس پر قیاس نہ کیا جاوے (۱)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی ، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۶/ ۸/ ۸۵ ۱۳ھ

الجواب صحیح محمود غفی عنہ دارالعلوم دیوبند

قربانی کے لئے آئے ہوئے مختلف جانوروں کا خرچہ:

عیدالاضحیٰ کے موقع پر مدرسہ کے اندر مختلف جگہوں سے قربانی کے واسطے جانور آتے ہیں اور بعض جگہ سے تو کئی کئی روز پہلے بھیج دئے جاتے ہیں تو اس دوران میں جانور جو چارہ وگھاس کھاتے ہیں اس کا خرچ کس شخص کے ذمہ ہوگا آیا مدرسہ

۱- دیکھئے: ردالمحتار ۹/ ۴۶۶ مکتبہ زکریا۔

ذمہ دار ہوگا یا اور کوئی ذمہ دار ہوگا؟

الجواب وباللہ التوفیق:

یہ تو ظاہر و مسلم ہے کہ اہل مدارس جانور بھیجنے والوں کے محض وکیل ہیں اور اضحیہ کرانے کے لئے منتظم و ذمہ دار ہوتے ہیں خود ان جانوروں کے مالک نہیں ہوتے، لہذا شرعاً ان کے گھاس پھوس وغیرہ جملہ اخراجات جانور بھیجنے والے کے ذمہ ہوں گے، پس اگر مشترک کھانے یا کھلانے کی صورت میں کس جانور نے کتنا کھایا یا کس پر کتنا خرچہ پڑا؟ متعین و معلوم کرنا دشوار ہو تو چونکہ لقمہ نہیں گنا جاتا اس لئے سب جانوروں پر یکساں تقسیم کرکے اس کے بھیجنے والوں کی رقم سے وضع کرلیا جائے گا اور مدرسہ پر یہ خرچہ نہ ڈالا جائے گا، البتہ جس جانور کو الگ کھلایا پلایا تو ان کا حساب کتاب الگ ہوسکتا ہے صرف اس کے اخراجات کو اس کے بھیجنے والے کے ذمہ ڈال دیا جائے گا، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۵/۳/۱۴۱۱ھ

كتاب الحظر والإباحة

کتاب الحظر والاباحۃ

مرد کا مادہ منویہ لے کر بیوی کے رحم میں بذریعہ انجکشن پہنچانا:

درج ذیل امور میں شرعی رہنمائی مطلوب ہے:

(۱) Test Tube Baby ''ٹسٹ ٹیوب بے بی'' جس کی صورت یہ ہے کہ جن عورتوں کے بچے نہیں ہیں ان کے شوہروں کا مادہ منویہ لے کر ان کے رحموں میں بذریعہ انجکشن پہنچایا جاتا ہے جس سے وہ عورتیں حاملہ ہوجاتی ہیں، کیا اس سلسلہ میں سائنٹفک طریقہ اختیار کرنا درست ہوگا؟

کسی مرد کا مادۂ منویہ اجنبیہ عورت کو بطور اجیر حاصل کر کے اس کے رحم میں انجکشن سے پہنچانا، ایسی صورت میں بچہ کس کی طرف منسوب ہوگا؟

(۲) Surregate, ''قائم مقام ماں'' جس کی صورت یہ ہے کہ مرد کا مادہ لے کر بجائے بیوی کے کسی اجنبی عورت کو بطور اجیر حاصل کر کے رحم میں انجکشن سے پہونچایا جاتا ہے، وہ عورت حاملہ ہوجاتی ہے، اس صورت کا کیا حکم ہے؟

(۳) Surreganton سے جو بچہ حاصل ہو وہ کس کا کہلائے گا، ان زوجین کا جن کا مادہ اور بیضہ لیا گیا ہے یا اس عورت کا جس کا رحم استعمال کیا گیا ہے؟

کلوننگ یعنی ہم شکلی کا حکم شرعی:

(۴) Cloning. کلوننگ یعنی ہم شکلی جس کا تجربہ درختوں اور پودوں میں تو ہوتا رہتا ہے، اس کے بعد شاید جانوروں میں بھی کیا گیا، بہر حال انسانوں میں اس کی کامیابی کے امکان کا دعویٰ ہے، بعض بتاتے ہیں کہ دعویٰ کامیاب بھی ہوا ہے، لیکن بعض مصلحتوں سے اس کو روک دیا گیا، اس کی صورت یہ ہے کہ بدن انسانی کے کسی بھی حصہ کا تھوڑا سا بھی جزو لے کر سائنٹفک طریقہ پر اس کو اس طرح بڑھایا اور پھیلایا جائے کہ آخر کار ٹھیک اسی شکل وصورت اور رنگ وروغن اور مزاج وخیال کا دوسرا انسان بن کر تیار ہوجائے، شریعت مطہرہ اس عمل پر کیا حکم عائد کرتی ہے؟

کاغذی نوٹوں کی شرعی حیثیت:

(۵)　ایک مسئلہ افراطِ زر Inflation کا ہے۔

اگر کوئی شخص ہزار روپے کسی کو قرض دے اور دس سال کے بعد واپسی طے پائے تو عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ ہزار روپے کے نوٹ ہی واپس کرنے ہوں گے اور زیادتی سود کہلائے گی، لیکن سوال یہ ہے کہ کاغذ کا نوٹ تو محض حوالہ اور رسید کے درجہ میں ہے، اصل مال وہی ہے جو اس کے پیچھے ہے اور اس کی قیمت گھٹتی رہتی ہے قرض دیتے وقت اگر اس مال کے لیے بطور حوالہ ہزار روپے کے نوٹ ہوتے ہیں تو ہوسکتا ہے کہ ادائیگی کے وقت اس مال اور اس کی قدر کے حوالہ کے طور پر ہزار روپے کے نوٹ سے کم ہوتے ہیں یا زیادہ، تو کیوں نہ اس معاملہ نوٹ کی تعداد کے بجائے اس کی قدر VALUE کو بنیاد بنایا جائے، جن احادیث میں سود کی تفصیل آئی ہے ان میں قدر والی چیزوں کو ہی شمار کرایا گیا ہے، جیسے "الحنطة بالحنطة والشعير بالشعير والملح بالملح والذهب بالذهب والفضة بالفضة" الخ، "وكل قرض جر نفعاً فهو ربا" میں بھی ضروری نہیں ہے کہ بنیاد نوٹ ہو بلکہ اصل مال اور نوٹ کی قدر VALUE ہوسکتی ہے، پھر ایک ملک کے سکے اور نوٹ دوسرے ملک کے سکوں اور نوٹوں سے فرق کے ساتھ ہی متبادل ہوتے ہیں، دس ڈالر کے بدلے دس پونڈ یا دس ریال یا دس روپے کوئی نہیں لیتا تو پھر کیوں نہ قرض کی ادائیگی میں اس کی رعایت ہو؟

محمد عبداللہ سلیم (مقیم امریکہ ۱۳/۱۲/۱۴۰۸ھ)

الجواب وبالله التوفيق:

۱- یہ طریقہ طبائع سلیمہ کے خلاف، مزاج شرع وشارع علیہ السلام کے خلاف انتہائی بے شرمی پر مشتمل ہے اور "الحياء شعبة من الإيمان"(۱) کے بھی خلاف ہے، اس لیے اس کو اپنانا انتہائی بے حمیتی اور حدود شرع سے تجاوز اور بے شرمی ہوگی اور شرعاً اضطرار ہے نہیں، اس لیے اجازت نہ ہوگی!

۲- وہ اجنبیہ عورت جس کے رحم میں انجکشن سے شوہر کے علاوہ کسی مرد کا مادہ منویہ پہنچایا گیا ہو وہ عورت عقل سلیم کے نزدیک مزنیہ اور طوائف سے بھی زیادہ فاحشہ قرار پائے گی اور اس کی شناعت عقل سلیم کے نزدیک زنا ولواطت سے بھی زیادہ قبیح ومذموم ہوگی اور صورت تو اضطرار کی ہے نہیں، اس لیے اس کی بھی اجازت ہرگز نہ ہوگی۔

۱-　مشکوۃ المصابیح/۱۲۔

۳-اس عمل سے جو بچہ پیدا ہوا ہوگا وہ کس کا کہلائے گا؟ تو اس کا حکم یہ ہے کہ وہ عورت اگر بے شوہر والی ہے تو جو بچہ پیدا ہوگا وہ اسی عورت کا کہلائے گا جس کے شکم سے وہ بچہ پیدا ہوا۔ بالکل اسی طرح جس طرح طوائف جس کے پاس متعدد مرد آکر زنا کر جاتے ہیں اور اس سے جو بچہ پیدا ہوتا ہے وہ بچہ ان زنا کرنے والے مردوں میں سے کسی کا شمار نہیں ہوتا، بلکہ اسی رنڈی کا شمار ہوتا ہے جس کے پیٹ سے بچہ پیدا ہوا ہے، جس کو شریعت کی اصطلاح میں ''منسوب إلى أمه'' کہا جاتا ہے اور صحیح النسب نہیں کہا جاتا۔ رہا جاہلیت کے زمانہ کا کوئی طریقہ اپنانا، مثلاً یہ کہ جب کوئی عورت مختلف مردوں سے زنا کراتی پھر جب بچہ پیدا ہوتا تو وہ عورت ان زنا کرنے والوں میں سے جس کا ہاتھ پکڑ لیتی کہ یہ اس کا بچہ ہے تو وہ اسی مرد کا شمار ہوتا، یہ طریقہ عقل سلیم کے خلاف ہونے کے علاوہ دقیانوسی اور بالکلیہ متروک ہو چکا ہے اور جدت پسندی کے بھی خلاف ہے اور یہ سب معاملات جدت پسندی کے تحت کیے جا رہے ہیں، اس لیے اس کی بحث نہیں اور اگر وہ عورت شوہر والی ہے تو وہ بچہ اگرچہ نامشروع طریقہ سے آیا، لیکن اس کے شوہر کا شمار ہوگا اور اس کی صورت ایسی ہی ہوں گی جیسی یہ صورت کہ کوئی عورت اپنے شوہر کی مرضی سے اس کے سامنے بھی زنا کرائے اور علوق ٹھہر جائے اور بچہ پیدا ہو تو وہ بچہ اسی شخص کا شمار ہوگا جس کی وہ بیوی ہے، لقوله عليه السلام: ''الولد للفراش وللعاهر حجر'' أو كما قال (۱) اور یہ حکم اس صورت کا بھی ہے جب کہ شوہر نے اس سے کبھی بھی وطی نہ کی ہو لأن الفراش له، لہٰذا ہر حال میں یہی حکم ہوگا اور وہ بچہ اسی شخص کا شمار ہوگا جس کی بیوی نے ایسی حرکت کرائی ہے۔

خلاصہ یہ کہ یہ بچہ اسی عورت کا کہلائے گا جس کا رحم استعمال کیا گیا ہے فرق صرف اتنا ہوگا کہ اگر وہ عورت شوہر والی ہے تو وہ بچہ منسوب الی ابیہ بھی ہوگا اور صحیح النسب بھی شمار ہوگا، ورنہ محض منسوب الی امہ ہوگا اور جس اجنبی کا مادۂ منویہ استعمال کیا جائے گا اس بچہ کا نسب اس اجنبی کے ساتھ شمار نہ ہوگا اور نہ بچہ صحیح النسب کہلائے گا۔

۴-کلوننگ کا معاملہ حسب تحریر سوال کہ بدنِ انسانی کے کسی بھی حصہ کا تھوڑا سا جزو بھی لے کر سائنٹفک طریقہ سے اس طرح بڑھانا الخ۔

اس معاملہ میں ایسے شخص کے لیے جو اللہ تعالیٰ کو رب العالمین مانتا ہے اور ہر نماز میں نماز شروع کرتے ہی الحمد للہ رب العالمین کہتا ہے اور اس کی حقانیت کا عقیدہ پہلے ہی سے رکھتا ہے، اس کے نزدیک یہ معاملہ نہ تو محالات عقلیہ میں سے ہوگا اور نہ ممنوعات واقعیہ میں سے ہوگا اور نہ عجائباتِ دہر میں سے ہوگا اور نہ باعث استعجاب ہی ہوگا، بلکہ رب العالمین کے

۱- مشکوٰۃ المصابیح/ ۲۸۸۔

مفہوم کے پیشِ نظر دین وشرع پر ازدیادِ ایمان کا مزید باعث بنے گا، اس لیے کہ عقیدہ میں ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ تمام عالم اور عالم کی تمام چیزوں کے پالنے والے اور تربیت دینے والے ہیں اور تربیت کے معنیٰ ہیں: کسی چیز کو آہستہ آہستہ سنوارتے اور ترقی دیتے ہوئے مرتبہ کمال تک پہنچانا اور یہ وصف باری تعالیٰ میں: "إن الله علی کل شئی قدیر" (۱) کے مطابق علی وجہ الکمال ہے اس کی مثال یہ سمجھو کہ یہ مشینیں جو کام کر رہی ہیں اگر چہ آٹو میٹک ہی کام کرتی ہوں جب بھی ان مشینوں کی حقیقت میں کمال نہیں سمجھا جاتا بلکہ یہ کمال اس مشین کے بنانے والوں اور چلانے والوں کا سمجھا جاتا ہے۔

پس اسی طرح ان ہاتھ پیر مارنے والوں کا کمال نہیں سمجھا جائے گا، بلکہ ان ہاتھ پیر مارنے والوں کے دماغ میں جو آٹو میٹک مشین کام کر رہی ہے، اس کے بنانے والے اور چلانے والے کا کمال سمجھا جائے گا اور وہ آٹو میٹک مشین بنانے والا، چلانے والا بجز اللہ کے کوئی اور نہیں ہوسکتا، چنانچہ برابر مشاہدہ کیا جاتا ہے کہ کبھی کبھی جب مشین کا پرزہ بگڑ جاتا ہے اکثر بڑے بڑے ماہرین عاجز ودرماندہ رہ جاتے ہیں اور بالآخر وہ موت کے گھاٹ اتر جاتا ہے اور کبھی ایسا بھی مشاہدہ ہوتا ہے کہ سب ماہرین وہاتھ پیر مارنے والے عاجز ودرماندہ ہو چکے ہوتے ہیں اور قادر مطلق ومختار خود اپنی مشیت وقدرت سے بالکل توانا وصحت مند کردیتا ہے اور یہ سب امور "ماتشاؤن إلا أن یشاء الله" (۲) کا مظہر بن جاتے ہیں اور فرق یہ نکلتا ہے کہ مومن تو چونکہ پہلے ہی سے ایسی چیزوں کو خالق کائنات کی صناعی اور مظہر قدرت قرار دیتا اور اس پر ایمان رکھتا ہے اس لیے مومن کہلاتا ہے۔

اور دوسرے لوگ اولاً اپنی ایجاد کا کمال سمجھتے ہیں اور اسی پر نظر رکھتے ہیں اور خالقِ کائنات کا کمال اور اس کا احسان نہیں قرار دیتے، اس لیے مومن نہیں کہلاتے۔ ہاں جب عاجز ودرماندہ ہوجاتے ہیں تو اس وقت بھی بعض ہی حضرات خدا کی طرف رجوع کرتے ہیں، اس لیے ایسے لوگ ایمان سے محروم ہی رہ جاتے ہیں۔

رہ گئی یہ بات کہ آخر کار ٹھیک اسی شکل وصورت، رنگ وروغن اور مزاج وخیال کا دوسرا انسان بن کر تیار ہوجائے، یہ بات بھی کچھ باعثِ استعجاب نہیں، اس لیے کہ اس کا مشاہدہ ہم دن رات کرتے ہیں جو بچہ پیدا ہوتا ہے وہ ماں باپ کا جزء لیے ہوئے پیدا ہوتا ہے اور جس کا جزء اس میں غالب ہوتا ہے، اس کی شکل وشباہت مزاج وخیال وغیرہ غالب ہوتی ہے، اسی طرح جس کا کوئی حصہ جزو ہو اس کی شکل وشباہت وغیرہ ہوجائے، تو کیا استبعاد ہے، پھر اللہ تبارک وتعالیٰ نے ابتداء آفرینش

۱- سورۃ بقرۃ: ۱۴۸۔
۲- سورۃ دہر: ۳۰۔

انسانی میں ہی حضرت آدم علیہ السلام کے صرف ایک حصۂ بدن سے حضرت حوا علیہا السلام کو پیدا فرمایا جو حضرت آدمؑ کے خیال ومزاج وغیرہ کے مطابق مونث ہونے کے باوجود رہیں، اس نظیر سے استبعاد اور بھی دور ہوگیا اور یہ سب اشکالات ان لوگوں کے ذہن میں آتے ہیں جن کی نظیر اللہ تعالیٰ کی قدرتِ تامہ کاملہ پر نہیں آتی، ورنہ یہ چیزیں ایک مومن کے لیے باعث استبعاد ہونے کے بجائے ازدیادِ ایمان کا باعث بنتی ہیں۔

۵- اس نمبر میں حکم واضح ومنقح ہونے کے لیے ایک تفصیل کا ہونا ضروری ہے اور وہ تفصیل یہ ہے:

اللہ تبارک وتعالیٰ نے ثمنیت کے لیے صرف سونا چاندی پیدا فرمایا ہے، اس لیے ثمن خلقی محض سونا وچاندی ہوتے ہیں اور تمام عالم نے اسی ذہب وفضہ ہی کو ثمنِ خلقی واصلی کے لیے تسلیم کرلیا ہے، کما لا یخفی اور اسی وجہ سے سونا وچاندی کا سکہ نافقہ خلقی واصلی قرار دے دیا گیا۔ وھذا ایضاً غیر مخفی بل عند الکل مقبول ومسلم۔

پھر لین دین کی سہولت، نیز لے جانے لے آنے اور منگانے بھیجنے میں سہولت وحفاظت کے پیش نظر اور دیگر بہت سے مقاصد ومصالح کی خاطر حکومتوں نے کاغذ کے نوٹ اصلی سکہ کے بجائے نافذ وجاری کردیے اور اسی قبیل سے ہندوستان میں انگریزوں نے بھی کاغذ کے نوٹ جاری کردیئے اور نوٹوں پر لکھ دیا کہ یہ اسی مقدار کی چاندی کی رسید وسند ہے جو مقدار نوٹ پر درج ہے اور اس نوٹ پر لکھے ہوئے چاندی کے سکے رزرو بینک سے لے سکتا ہے، اس لیے علماء نے نوٹوں کو رسید وسند وحوالہ وغیرہ قرار دیا اور اسی وجہ سے ان نوٹوں کو ان پر لکھی ہوئی مقدار سے کم وبیش کے ساتھ تبدیل کرنا جائز نہیں ہوتا تھا اور نہ تبادلہ بالنسیئہ حلال ہوتا تھا اور جب تک ان نوٹوں کا نقد حاصل نہ کرے یا مالِ متقوم سے بدل نہ لے زکوٰۃ وغیرہ واجب التملیک کوئی تصرف بھی صحیح نہیں ہوتا تھا اور زکوٰۃ وغیرہ کسی چیز کی ادائیگی متحقق نہ ہوتی تھی ان وجوہ سے بہت سے شرعی معاملات میں بے حد تنگی ودشواری پیش آتی اور بسا اوقات ادائیگی وصحت میں تعذر واقع ہونے لگا تھا تو علماء کا ذہن ان نوٹوں کو سکہ نافقہ غیر خلقی قرار دینے کی جانب متوجہ ہوا۔

چنانچہ مولانا عبد الحی فرنگی محلی نے پہلے اس توسع کی جانب اشارہ فرمایا پھر اس کے بعد ان کے تلمیذ رشید صاحب ''عطر ہدایہ'' نے ادھر اشارہ فرمایا، پھر اس کے بعد حضرت مفتی جمیل احمد صاحب تھانوی اور حضرت مفتی سعید احمد کانپوری کی مدلل ومبرہن مکاتبت سے مسئلہ واضح ہوگیا کہ نوٹوں کو بجائے سند حوالہ کے سکہ نافقہ غیر خلقی قرار دینے میں کوئی شرعی قباحت نہیں ہوگی، اس کی نظیر قدیم زمانہ کا سکہ غطارفہ وبطارقہ وغیرہ ہے کہ اس کو علماء متقدمین نے سکہ نافقہ غیر خلقی قرار دیا تھا اور حوالہ یا سند وغیرہ قرار نہیں دیا تھا۔

اسی طرح خود ہندوستان میں تانبے کے پیسے جس کو گورکھپوری پیسے بھی کہتے تھے بطور سکہ نافقہ غیر خلقی کے بغیر حوالہ وسند وغیرہ قرار دیتے ہوئے جاری تھا، پھر جب چاندی کے روپوں کی قلت کے ساتھ چاندی کی اٹھنی، چونی، دونی وغیرہ مفقود ہوکر گلٹ وغیرہ کی ریزگاریاں بمنزلہ سکہ نافقہ غیر خلقی کے درجہ میں بغیر حیثیت حوالہ وسند کے رائج وجاری ہوگئیں تو نقد سکوں کے بھنانے میں اور تبدیل کرنے میں کچھ توسع ہوگیا اور انہیں وجوہ سے حضرت تھانوی نور اللہ مرقدہٗ نے اپنی کتاب ''صفائی معاملات'' میں یہ فرمایا کہ نوٹوں کو بھنانے میں اگر کچھ ریزگاریاں بھی ملالی جائیں تو نسیہ وکمی بیشی سب جائز ہوجائے گی، کیونکہ اس صورت میں اتحاد قدر وجنس نہ رہے گا جو باعث تحقق ربوا ہے۔

غرض کہ اب اجماعی طور پر مفتیٰ بہ قول میں نوٹ سکہ نافقہ غیر خلقیہ قرار پا گیا، باقی چوں کہ نوٹ سکہ غیر خلقیہ وغیرہ اصلیہ ہے، اس لیے وہ اس کے اصلیہ وخلقیہ کے تابع رہے گا اور اس پر حکومت نے جو قیمت سکہ اصلیہ خلقیہ کے اعتبار سے لکھی ہے وہی قیمت اس نوٹ کی قرار پائے گی اور ہندوستان میں حکومت نے نوٹوں کی قیمت چاندی کے سکے اصلیہ وخلقیہ کے اعتبار سے چاندی کا نقد روپیہ رکھی ہے جس کا وزن ایک تولہ آتا ہے، اس لیے نوٹوں کے ذریعہ سے معاملہ کرنے میں یا لین دین وغیرہ کرنے میں کوئی نزاع واقع ہوگی تو اس وقت رفعِ نزاع کے لیے چاندی کے نقد سکہ اصلیہ خلقیہ کی جانب عقلاً وبداہۃً رجوع کرنا لازم ہوجائے گا۔ پس جب کسی شخص نے ہزار روپے کسی کو قرض دیئے اور دس سال کے بعد واپسی طے پائی تو چونکہ یہ معاملہ قرض کا ہے، اس لیے اس قرض کے دیتے وقت ان نوٹوں کے جتنے سکہ اصلیہ خلقیہ، یعنی چاندی کا ایک تولہ والے روپے ہوتے تھے اتنے نقد روپے یا اس کی موجودہ قیمت میں جتنے نوٹ آتے ہوں ان کی واپسی لازم ہوگی چاہے وہ واپسی دس بیس سال کے بعد کیوں نہ ہو، کیونکہ معاملہ قرض میں شرعاً واجب ادا وہ سکہ اصلیہ خلقیہ یا ان کا بدل ہوگا اور دیکھنے میں اگرچہ دیتے ہوئے نوٹ سے زاید نوٹ تعداد میں نظر آتے ہوں، مگر ان پر ربوا کا اطلاق نہ ہوگا، جیسا کہ عنقریب واضح ہوجائے گا۔

جس طرح ہندوستان کے نوٹوں کا حکم ہے بالکل اسی طرح ہر ملک وحکومت کے نوٹوں کا ہوگا، ان کا نام پونڈ ہو یا ڈالر یا ریال ہو، یعنی چاندی سونے میں سے جس کے اعتبار سے اس پر قیمت لکھی ہوگی اسی قیمت کے اعتبار سے اتنے نقد چاندی یا سونے کا سکہ قرار پائے گا اور ان کا سکہ مفقود ہوجائے تو شرعاً اتنے ہی وزن کا سونا، چاندی ان کی قیمت قرار پائے گی، اسی طرح یہ سمجھنے کی بھی ضرورت ہے کہ نوٹوں میں تحقق ربوٰ کب ہوگا، پس مسئلہ ربوا میں یہ تو ظاہر ومسلم ہے کہ تحقق ربوا کے لیے اتحاد قدر وجنس لازم ہے۔ اتحاد قدر وجنس دونوں ہوجائے تو تبادلہ میں ''یداً بید مثلاً بمثلٍ'' لازم ہوتا ہے،

یعنی فضل (زیادتی وکمی) بھی ناجائز اور نسیہ ادھار بھی ناجائز ہے اور جب محض ایک وصف میں، یعنی صرف قدر میں یا صرف جنس میں اتحاد ہو تو نسیہ تبادلہ ممنوع رہتا ہے، مگر نقداً تبادلہ میں کمی بیشی جائز رہتی ہے، اسی اعتبار سے ہم جب نوٹ کو دیکھتے ہیں تو نوٹ قدری نہیں ہیں کیوں کہ قدری چیز صرف کیلی اور وزنی ہوتی ہے اور نوٹ تبادلہ کرنے میں نہ تو کیل کئے جاتے ہیں اور نہ ہی وزن کئے جاتے ہیں، بلکہ گنے جاتے ہیں اور گن کر دیے جاتے ہیں، لہذا نوٹ عددی ہوئے اس لیے اتحادِ فی القدر کا احتمال ختم و منقطع ہوگیا۔

لہذا نقد نوٹوں میں تبادلہ کی بیشی کے ساتھ بالاتفاق سب کے نزدیک جائز رہے گا، رہ گئی اتحاد فی الجنس کی بات تو بعض علماء تمام کاغذوں کو علی الاطلاق ایک جنس فرماتے ہیں تو ان کے نزدیک نوٹوں کی تبدیلی ایک دوسرے سے نسیہ ناجائز رہے گی، ہاں اگر تبادلہ میں کسی جانب کچھ ریزگاریاں یا روپے غیر چاندی کے ملا لئے جائیں تو نسیۂ تبادلہ ان کے نزدیک بھی جائز ہوگا، باقی وہ حضرات جو تمام کاغذوں کو علی الاطلاق ایک جنس تسلیم نہیں کرتے، بلکہ مختلف قسم کے کاغذوں کو مختلف جنس تسلیم کرتے ہیں، جیسے ملاٹ کا کاغذ، بیز کاغذ، عمدہ کاغذ یہ سب کاغذ ایک دوسرے جنس سے مختلف ہوتے ہیں اور یہ قول اقرب الی التحقیق معلوم ہوتا ہے پس اس طرح مختلف قسم کے کاغذ مختلف جنس کے شمار ہوں گے اور نوٹوں کے کاغذ بھی اسی طرح چونکہ مختلف قسم وحیثیت ومختلف نوع کے ہوتے ہیں، لہذا یہ بھی مختلف جنس کے شمار ہوں گے اور ان دوسرے علماء کے نزدیک ہزار ہزار روپیہ کے نوٹ کے کاغذ ایک جنس کے اور سو روپیہ کے نوٹ کے کاغذ ایک جنس کے اور پچاس روپیہ کے نوٹ کے کاغذ ایک جنس کے شمار ہوں گے وعلیٰ ہذا القیاس، پس سو سو روپیہ کے نوٹوں کو اس سے کمی بیشی کے نوٹوں سے تبدیل کرنے میں جس طرح نقداً تبدیل کرنے میں کمی بیشی درست رہے گی، اسی طرح نسیۂ تبدیلی میں بھی کمی بیشی درست رہے گی۔

اسی بنیاد پر چونکہ ہر ملک وحکومت کی کرنسیوں کے کاغذ بھی الگ الگ جنس کے اور مختلف ہوتے ہیں، اس لیے ان حکومتوں کی کرنسیوں میں کمی بیشی کے ساتھ تبدیلی کو بھی علماء درست فرماتے ہیں۔ اور یہ قول اشبہ بالفقہ بھی معلوم ہوتا ہے (۱)۔

هذا ما عندي من الشرع الشريف فان كان صواباً فمن الله وإن كان خطاءً فمن نفسي وما

۱- اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا نے اپنے دوسرے فقہی سمینار منعقدہ ۸ تا ۱۱/دسمبر ۱۹۸۹ء میں "کرنسی نوٹ کی شرعی حیثیت کو موضوع بحث بنایا تھا، اکیڈمی نے اپنے اس سمینار میں کرنسی نوٹ سے متعلق جو تجاویز پاس کی تھی اس کی ایک شق ہے: عصر حاضر میں نوٹوں نے ذریعہ تبادلہ ہونے میں مکمل طور پر زر خلقی (سونا، چاندی) کی جگہ لے لی ہے اور اب بھی لین دین نوٹوں کے ذریعہ انجام پاتا ہے اس لئے کرنسی نوٹ کی بھی احکام میں ثمن حقیقی کے مشابہ ہے لہذا ایک ملک کی کرنسی کا تبادلہ اسی ملک کی کرنسی سے کمی وبیشی کے ساتھ نہ تو نقد جائز ہے نہ ادھار (جدید فقہی تحقیقات ۲/ ۵۱) (مرتب)۔

آبری نفسی من الزلل والخطاء فلیراجع الاٰن الی العلماء المحققینؒ واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۹/۳/۱۴۰۸ھ

الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن خیرآبادی

نوٹ: اس جواب پر اعتراض اور اس کا جواب آگے ملاحظہ کیا جائے ، (محمد نظام الدین اعظمی)۔

اعتراض بر جواب:

بخدمت گرامی حضرت مفتی صاحب　　　　　زید معالیکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

ہم رشتہ فتویٰ پڑھ لیا ہے (۵و۶) کا جواب الحمدللہ کافی وشافی ہے۔ فجزاکم اللہ خیر الجزاء۔

لیکن جیسا کہ میں نے عرض کیا تھا کہ (۱) میں شرعاً اضطرار ہے نہیں کا لفظ قابلِ وضاحت ہے، میں نے زبانی عرض کیا تھا کہ نکاح کے دو شرعی غرضوں اور نتائج ومقاصد میں سے ایک غرض حصولِ اولاد ہے اور دوسری باہم الفت ومحبت۔

اب اگر زن وشوہر میں سے کسی ایک کی عدم صلاحیت کی وجہ سے ایک غرض پوری نہیں ہورہی ہے تو یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ دوسری غرض بھی فوت کردی جائے ،یعنی طلاق دے دی جائے ،جبکہ دوسری شادی کی بعض ملکوں میں اجازت نہیں ، پھر شریعت نے عدل کے ساتھ ایک سے زائد ازدواج کو مقید کیا ہے ہم کیسے بلاتقیید کے ازدواج ثانی کا مشورہ دے سکتے ہیں۔

اب اگر اولاد کی طلب اور منکوحہ سے حصول اولاد ایک شرعی غرض ہے جو مجامعت سے پوری نہیں ہورہی ہے تو سائنٹفک طریقے پر کیے جانے میں کیا قباحت ہوگی؟ رہ گئی بے حیائی ڈاکٹروں کو معائنہ کرانے یا دایہ کو دکھانے کی تو زچگی وغیرہ کے موقع پر ہر مرد یا عورت ڈاکٹر کے ہاتھوں زچگی کرانے کی اجازت تو ہوگی اگر ضرور وہ مستثنیٰ ہے تو اس کو بھی اسی ضرورت کے تحت مستثنیٰ کیا جاسکتا ہے۔ بہرحال یہ مسئلہ مزید وضاحت طلب اور نظر ثانی کا محتاج ہے۔

۴- میں نے جس حد تک سوال کیا تھا اس حد تک جواب مرحمت فرمایا گیا، بلکہ کچھ ضرورت سے زائد تفصیل بھی ہے جو خود مفید ہے، لیکن مجھے احساس ہے کہ سوال ہی ناقص تھا در اصل عجلت میں سوال لکھ کر بھیجدیا تھا۔

بہرحال اس معاملہ کا اصل پہلو حل طلب یہ ہے کہ اصل کا جز و بڑھ کر چونکہ ہمہ وجوہ اصل کے مطابق ہوجائے گا، جیسے کسی پودے کی ایک شاخ کاٹ کر زمین میں لگادی جائے تو بعض پودوں میں اسی کا تجربہ رات دن ہر جگہ کیا جاتا ہے کہ اس

شاخ سے پہلے جیساپوداتیارہوجاتا ہے اورصفات وخصوصیات میں کوئی فرق نہیں ہوتا،ٹھیک اسی طرح انسانوں میں کلوننگ کا نظریہ کے مطابق جس صغیر کی سائنٹفک پرورش سے جسم کبیر اصل کے مطابق بناتا ہے،تو اس طرح ایک مرد کے دویا دو سے زیادہ مرد اور ایک عورت کی دویا دو سے زیادہ عورتیں بن گئیں،مگر تو الد وتناسل کے طریق کے بغیر تو اس صورت میں حقوق فرائض متعلقہ کا کیا ہوگا،مثلاً ازدواج ووراثت ، معاہدہ ومعاملات وغیرہ یعنی یہ دو الگ الگ شخصیتیں ہوں گی یا ایک ہی شخصیت کے دوروپ؟ یہی سوال کی اصل غرض ہے۔

امید کہ جناب والا پھر زحمت جواب فرما کر ممنون فرمائیں گے مگر ۳؍دن اور مقیم ہوں، اس لیے پہلی توجہ کا خواستگار ہوں۔فقط والسلام

جواب اعتراض بر جواب سابق:

محترم المقام واجب الاحترام　　زادت مکارمکم ومعالیکم علیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

خدا کا شکر ہے کہ دو جواب تو صحیح اتر گئے، اللہ تعالیٰ کے شکر کے ساتھ جناب کی پذیرائی کا بھی شکریہ۔

جواب (۱): کی وضاحت کے لیے چند مغالطات کا اظہار ضروری ہے، پہلی بات تو یہ ہے کہ اگر احقر نے طلاق دینے کے لیے کہا ہوگا تو اس کو لازم نہیں کیا ہوگا، دوسرے یہ کہ نکاح کے یہ مقاصد علت نہیں ہیں کہ ان کے انتفاء سے معلول (نکاح) ہی منتفی ہوجائے یہ منافع نکاح ہیں اور منافع کا انتفاء عدم النفع کہلاتا ہے اور عدم النفع کو ضرر کسی نے نہیں کہا، نہ اس کو ضرر لازم ہے کہ اضطرار کا شبہ ہو اور اگر کوئی ضرر سے تعبیر بھی کرے تو اضطرار ہرگز نہیں ہوسکتا، اس لیے کہ اضطرار کے معنی ہیں (ضرر نازل لامر دلہٗ) یعنی ایسا ضرر کہ اس سے مخلص نہ ہو اور یہاں مخلص ہے،مثلاً یہ کہ کسی چھوٹے بچے کو پال لیا جائے، اس کی تعلیم وتربیت کردی جائے تو وہ بڑا ہوکر مثل اپنی اولاد کے ہوگا، بلکہ بعض اوقات اولاد سے بڑھ کر نافع ہوگا۔

اب یہ شبہ کہ اس کو میراث کیسے ملے گی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ تہائی ترکہ کی وصیت تو ہر حال میں جائز ہوگی اور اس کے علاوہ ہبہ جتنا چاہے دے کر اس پر اس کا قبضہ دیدے اور اگر ہونے والا وارث غنی اور اس کے ترکہ سے مستغنی وبے نیاز ہوتو کل ترکہ بھی دیدینے میں کوئی شرعی قباحت نہ ہوگی، نیز یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اپنی کل متروکہ جائداد کو کار خیر میں وقف کرجائے اور اسی ربیب کو اس کا متولی بنادے، پھر اسی کی نسل میں نسلاً بعد نسلٍ ایسی چند قیود وشرائط کے ساتھ تولیت دیدے کہ اپنے خاندانی افراد کی حق تلفی بھی نہ ہو وغیرہ وغیرہ۔

اور اس طریقہ کار، یعنی مذکورہ سائنٹفک طریقہ پر مادہ منویہ منتقل کرنے میں جو نامحرم مردوں کے سامنے بے حجاب ہونا پڑے گا، اس کو زچگی کی حالت پر قیاس کرنا قیاس مع الفارق ہے، اس لیے کہ ڈلیوری (زچگی) میں جان کے لالے پڑے رہتے ہیں، یا ایسی مجبوریاں ہوتی ہیں کہ بغیر ایسی صورت کے کہ کسی معالج سے ایسا کرایا جائے کوئی مخلص نہیں رہتا ہے، یا بے انتہا و ناقابلِ تحمل ضرر کا ظن غالب رہتا ہے، پھر بھی ایسی حالت میں ترجیح اس کو ہوتی ہے کہ یہ عمل عورت ڈاکٹرنیاں کریں اور ایسا ہی عموماً کرتی بھی ہیں، سوائے معدودے چند ایمرجنسی پھر بھی اگر کوئی اس جدید بے حیائی کے طریق کو زچگی پر قیاس کرے تو یہ اس کی بڑی نادانی و نافہمی ہوگی، جس سے آثار میں پناہ مانگی گئی ہے۔

(۴) میں یہ پہلو کہ اصل کا جزء جب بڑھ کر مثل اصل ہوجائے گا، تو عرض ہے کہ ایسے مرد کے حصہ بدن سے جب دو چار مذکر بدن بن جائیں اور عورت کے حصہ بدن سے دو چار مونث بدن بن جائیں تو اگر چہ یہ عورت اس مرد کی بیوی ہی کیوں نہ ہو ان میں آپس میں مناکحت جائز رہے گی، جیسے کہ ایک عورت اپنے پہلے شوہر سے بچیاں لے کر دوسرے مرد سے شادی کرتی ہے اور اس دوسرے مرد کی پہلی بیوی سے بچوں کے ساتھ ان بچیوں کا نکاح جائز رہتا ہے، اس لیے کہ ان اولادوں میں ان دونوں کی مشترک جزئیت، یعنی ان دونوں کے مختلط مادہ منویہ سے نہیں ہیں، بلکہ ایک ایک کے الگ جزء ہیں اور حرمت نکاح کی علت یہی جزئیت ہے۔

یہاں سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ اگر ایک مرد یا ایک عورت کے حصہ بدن سے مذکر و مونث دونوں بن جائیں تو ان میں ایک ہی فرد کی جزئیت مشترک ہوجانے سے نکاح درست نہ ہوگا، کیونکہ شریعت مطہرہ نے سوائے آدم علیہ السلام کے اور کسی کے لیے اس کی اجازت نہیں دی، رہا وراثت کا معاملہ تو یہ وراثت ان بنے ہوئے اشخاص میں جاری نہ ہوگی، اس لیے کہ وراثت کا معاملہ بالکل غیر مدرک بالقیاس ہے، وارثوں کا تعیین اور ان کے حق وحصہ کا تعیین کرتے ہوئے باری تعالی عز اسمہ نے صاف صاف فرمادیا ہے: "وا ٰ بائکم وابنا ئکم لاتدرون أیھم أقرب لکم نفعاً فریضة من اللہ" الخ(۱)، پس جن چار مردوں اور بارہ عورتوں کو اور جس طرح اللہ عز وجل نے ذوی الفروض مقرر فرمادیا، صرف وہی ذوی الفروض ہوں گے اور جن کو جس طرح عصبہ یا ذوی الارحام مقرر فرمادیا وہی اسی طرح صرف عصبہ وذوی الارحام شمار ہوں گے، اور ان کے علاوہ اور کوئی حق دار وراثت شرعاً نہ ہوگا، ہاں بذریعہ وصیت یا بذریعہ مقرلہ بالنسب وغیرہ حسب قاعدہ شرع کے ذریعہ سے جس کو جتنا دینے کی شریعت نے اجازت دی ہے دے سکتے ہیں، جیسا کہ سوال نمبر ا کے جواب میں معروض ہوچکا ہے

۱- سورۂ نسا ء:۱۱

اور اس طریقہ سے اپنے دلی جذبات کو بذریعہ معاہدات ومعاملات وغیرہ حدود شرع میں رہتے ہوئے پورا کر سکے گا، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۳/۳/۱۴۰۸ھ

مختلف ملکوں کی کرنسیوں کا حکم:

مختلف ملکوں کی کرنسیوں کا تبادلہ آپس میں نقد وادھار ہر طرح اور کمی وبیشی کے ساتھ ہوتا ہے، حالانکہ ان کرنسیوں کو سب ہی سکہ قرار دیتے ہیں، لہذا بتایا جائے کہ شرعاً اس تبادلہ کا کیا حکم ہے؟

الجواب وباللہ التوفیق:

ان کرنسیوں کو اگرچہ سکہ نافقہ غیر خلقیہ، یعنی سکۂ عرفی تسلیم بھی کیا جائے جب بھی "مثلا بمثل" اور "یدابید" اور متبادلین کا حکم شرعی اس وقت ہوتا ہے جب بدلین کے درمیان اتحاد قدر وجنس دونوں ہو، اور صورت مذکورہ اتحاد قدر تو اس لئے نہیں ہے کہ قدر کے معنی شرع میں کیل ووزن کے ہوتے ہیں اور یہ کرنسیاں کیلی یا وزنی نہیں ہوتیں، بلکہ عددی ہوتی ہیں، اس لئے اتحاد فی القدر ختم ہوگیا، اسی طرح اتحاد فی الجنس بھی نہیں ہوتا، اس لئے کہ اتحاد فی الجنس شرع میں منطقی مراد نہیں ہوتی، بلکہ جنس نوعی وصفتی کے قبیل کی چیز عند الشرع مراد ہوتی ہے، جیسے سوتی کپڑا، اونی کپڑا، ریشمی کپڑا، جنس منطقی سب کی ایک ہے یعنی کپڑا مگر یہ سب الگ الگ جنس ہوتے ہیں۔ اسی شرعی اختلاف جنسی سے ان کا تبادلہ آپس میں بھی کمی بیشی وغیرہ سب طرح درست رہتا ہے۔ اور ان سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ شرعاً جنس متحد اس وجہ سے نہیں ہیں کہ لٹھا گاڑھا وغیرہ سب کی جنسیات ومالیات وشکل وصورت سب مختلف ہونے سے یہ اتحاد جنسی نہیں ہے، پس جب ان کرنسیوں میں بھی سب کی مالیت وجنسیت وشکل وصورت وغیرہ مختلف ہوتی ہیں تو ان میں اتحاد جنسی کا تحقق نہ ہوا، پس جب مختلف ملک کی یہ کرنسیاں (پونڈ، ڈالر، ریال، درہم) سب کاغذ کی ہونے کی وجہ سے منطقی جنس میں ایک شمار ہوں، لیکن شرعاً وعرفاً سب الگ الگ جنس کی شمار ہوتی ہیں۔ اسی طرح ان میں آپس میں اتحاد قدر (اتحاد کیل ووزن) بھی نہیں متحقق ہے، کیونکہ یہ سب عددی ہیں، لہذا جب اتحاد فی الجنس اور اتحاد فی القدر دونوں مفقود ہو گئے تو نقد وادھار ہر طرح کا تبادلہ، نیز نقد تبادلہ میں بھی کمی زیادتی سب تصرف شرعاً جائز ہوگا۔ اور یہی حکم شرعی جہاں بھی متحقق ہوگا یہ سب تبادلے آپس کے عرف کے مطابق شرعاً درست ہوتے رہیں گے

اور سکۂ عرفی ہونے سے اس کے جواز میں فرق نہ پڑے گا، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دار العلوم دیوبند سہارنپور ۱۳/ ۱۲/ ۱۴۱۳ھ

ڈاکٹروں کے مشورہ سے مرد کی منی لے کر عورت کے رحم میں پہنچانا کیسا ہے؟

ایک عورت کی اولاد نہیں ہوتی، ڈاکٹروں کی تحقیق کے بعد معلوم ہوا کہ عورت یا مرد میں کوئی خرابی نہیں ہے، بلکہ مباشرت میں مادۂ تولید رحم کے اندر اپنے مقام تک نہیں پہونچتا ہے، اس لیے استقرار نہیں ہوتا، اگر مرد سے مادۂ تولید لے کر عورت کے رحم کے اندر پہونچایا جائے تو استقرار ہوجائے گا اور بچہ پیدا ہوجائے گا۔

اب سوال یہ ہے کہ ایسا کرنا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟ اور اس ترکیب سے جو اولاد پیدا ہوگی وہ جائز اولاد اور صحیح النسب ہوگی یا نہیں، اگر نہیں تو پھر کیسی شمار ہوگی؟

محمد ابراہیم بن محمد حسین صالح افریقی (متعلم دار الافتاء دار العلوم دیوبند)

الجواب وباللہ التوفیق:

یہ طریقہ نہایت بے شرمی اور بے حیائی کا ہے جو شرعاً مذموم ہے، تقدیر اور قضاوقدر پر قانع رہنا امر مستحسن ہے، باقی نفس جواز میں کلام نہیں جب کہ شوہر خود ہی یہ عمل کرے، اس طریق عمل سے جو بھی اولاد پیدا ہوگی وہ جائز اولاد اور صحیح النسب شمار ہوگی بحکم حدیث پاک: ''الولد للفراش'' (۱)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دار العلوم دیوبند سہارنپور ۹/ ۴/ ۱۴۱۱ھ

خنزیر کے کسی عضو کو بحالتِ اضطرار انسان کے جسم میں پیوند کر کے لگایا جاسکتا ہے یا نہیں؟

خنزیر کے کسی عضو کو بحالت اضطرار انسان کے جسم میں پیوند کر کے لگایا جاسکتا ہے یا نہیں؟ یہ تو منصوص علیہ ہے کہ بوقت اضطرار خنزیر کا گوشت حلال الاکل ہے، مگر آج کل ڈاکٹر لوگ اعضاء خنزیر کو بدن انسانی میں استعمال کرتے ہیں، مثلاً دل، گردہ، جگر وغیرہ تو اگر یقین ہے کہ فلاں عضو کی پیوندکاری سے جان بچ جائے گی ورنہ تو موت ہے، ایسے موقعہ پر اعضائے

۱- مشکوۃ المصابیح/ ۲۸۸۔

خنزیر استعمال میں لائے جاسکتے ہیں یا نہیں؟

نیز بعض کیپسول جو مریضوں کو تجویز کیے جاتے ہیں، ان میں خنزیر کے اجزاء شامل ہیں، مختلف ترکیب سے یہ اجزاء بنائے جاتے ہیں اور دواؤں و کیپسول میں مخلوط کیے جاتے ہیں، تو ایسی دوا و کیپسول کا استعمال درست ہے یا نہیں، جبکہ ان کا بدل میسر نہیں؟

الجواب وبالله التوفيق:

اس معاملہ کو اضطرار کہنا یا اضطراری حالت کا معاملہ کہنا مغالطہ ہے، خاص کر خنزیر و شراب کے معاملہ میں، جبکہ یہ لوگ خنزیر و شراب کو بے محابا اور علانیہ جائز سمجھتے ہیں اور جائز سمجھ کر استعمال کرتے ہیں، بلکہ اضطرار یہ ہوگا کہ مسلم، دین دار، حاذق ڈاکٹر و طبیب مکمل تشخیص کر کے یہ کہ دے کہ اس مرض کا فقط یہی علاج ہے، اس کے علاوہ کوئی دوسرا علاج و تدبیر نہیں ہے، اور یہاں ایسا نہیں ہے اس لیے کہ مسلم دین دار، حاذق ڈاکٹر و طبیب کی اس متعین تشخیص کے بغیر یہ لوگ ایسا کرتے ہیں، اس کو اضطرار کہنا غلط ہوگا۔

اور پھر انسانی اعضاء کو باعتبار خنزیر کے بندر وغیرہ جانوروں کے اعضاء سے زیادہ مشابہت و مناسبت مسلم ہے جس کے ذریعہ سے بعد ذبح شرعی یہ علاج بدرجۂ اولی ہوسکتا ہے، نیز جمادات وحیوانات کے اجزاء سے یہ پیوند کاری بخوبی ہوسکتی ہے جو بلاشبہ جائز و درست ہے، بلکہ اب پلاسٹک اور سیکلون کے ہر قسم کے اعضاء و اجزاء اندرونی و بیرونی ایسے ایجاد ہو گئے ہیں جو ہر مزاج کے موافق اور دیرپا اور زیادہ مفید اور سہل الحصول بھی ہوتے ہیں اور شرعاً بھی جائز رہتے ہیں پھر وہ اضطرار کہاں رہا، بلکہ اگر غور کیا جائے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خنزیر کے اعضاء و اجزاء کا بے محابا استعمال کرنا دہریت ولا مذہبیت کے مزاج سے خوگر بنانے اور دہریت ولا مذہبیت کی اشاعت کی غرض سے بھی ہوتے ہیں، فافہم۔

اور بر تقدیر تسلیم اضطرار بھی خنزیر کے کسی عضو کی پیوند کاری کو ظاہری اعضاء جوارح میں جیسے ہاتھ پیر جلد وغیرہ اکل میتہ یا اکل لحم خنزیر بحالتِ اضطرار کھانے کے جواز پر قیاس کرنا جواز کی گنجائش نہ ہوگی، یہ قیاس قیاس مع الفارق ہوگا، اس لیے کہ اکل کی صورت میں وہ ماکول ہضم ہوکر ختم ومعدوم ہوجاتا ہے یا متبدل بدم ولحم وشحم ہوجاتا ہے قائم وباقی نہیں رہتا، جبکہ عضو خنزیر ہونے کی صورت میں عضو مردار ہونے کے ساتھ ساتھ نجس العین کا بقاو تلبس بھی لازم رہے گا، جس کی وجہ سے انسان کا جسم ہمیشہ گندہ وپلید رہے گا، کسی وقت بھی طہارت پذیر نہیں ہوسکے گا اور نماز جیسی اہم ومطلوب عبادت جو بین العابد والمعبود

رابطۂ مطلوبہ کے قیام وبقا کا اہم ذریعہ ہے فوت ہوجائے گی اور اس سے محرومی لازم آئے گی، پس ایسی حالت میں ایک مومن کا جذبۂ ایمانی کبھی اس کو گوارا نہ کرے گا، بلکہ اس کا جذبۂ ایمانی آخرت کی زندگی کو ترجیح دے کر اس گندی زندگی کو کبھی گوارا نہ کرے گا، بخلاف اکل کی صورت کے کہ کھالینے کے باوجود گندہ وپلید نہ ہوگا، اگر ہاتھ منہ گندہ بھی ہوگا تو دھوکر پاک وصاف کر لے گا اور کسی خاص اہمیت وضرورت کے پیش نظر اس خاص جزء کی گنجائش بھی نکل آئے تو بھی یہ حکم کلی وعمومی نہ ہوگا، اور عموم جواز کا مثمر نہ ہوگا ہاں دواؤں یا کیپسولوں میں مخلوط ہونے کی صورت میں مذکورہ بالا قیود کے ساتھ اضطراری حالت میں ان کا حکم مثل حلت اکل میتہ کے حکم کا ہوگا اور وقتی طور پر بقدر ضرورت ومجبوری استعمال کی گنجائش ہو سکے گی، مگر وہ بھی حکم کلی وعمومی جواز کے لیے نہ بن سکے گا او صحیح نہ ہوگا۔

اسی طرح اگر جسم کے اندرونی اعضاء دل، گردہ، جگر، آنت وغیرہ کی ضرورت ہوکر واقعی وہ اضطرار شرعی متحقق ہو جائے اور جمادات ونباتات یا پلاسٹک سیکلون سے کام نہ چلے تو بھی خنزیر کے دل گردہ وغیرہ کی پیوند کاری نہ کی جائے، حتی المقدور غیر خنزیر لے کر اس کو ذبح شرعی کے بعد اس کے ان اجزاء کی پیوند کاری کی جائے ورنہ ایسا مکروہ ہوگا اور خنزیر کے دل وگردہ کی پیوند کاری میں فقہ کے اعتبار سے کراہت شدیدہ بحکم حرام ہوگی اور اس صورت کو بھی مذکورہ دواؤں، کیپسولوں اور اکل میتہ وغیرہ پر قیاس کرنا صحیح نہ ہوگا کما ھو واضح من التقریر السابق، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

استرہ کا کام کرنے والے صابن کا استعمال کرنا:

ایک ایسا صابن نکلا ہے جو استرہ کا کام انجام دیتا ہے (بالوں کے کاٹنے میں)، نیز اس میں ناپاک اجزاء بھی استعمال نہیں کیے جاتے ہیں، اس طرح کے صابن کا استعمال کرنا درست ہے یا نہیں؟

الجواب وباللہ التوفیق:

ایسا صابن جس میں ناپاک اجزا نہیں ہیں، استرہ ہی کے کام میں استعمال کر سکتے ہیں، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۶/۷/۱۴۱۱ھ

انگریزی دواؤں کے استعمال کا حکم جن میں شراب، اسپرٹ، افیون وغیرہ کا استعمال ہو:

آج کل عوام وخواص بکثرت انگریزی دواؤں کا استعمال کرتے ہیں، جن میں شراب، اسپرٹ، افیون وغیرہ کا استعمال کیا جاتا ہے، کیا ایسی دوائیں استعمال کرنا درست ہے؟

الجواب وباللہ التوفیق:

آج کل جو انگریزی دواؤں میں اسپرٹ وغیرہ کا استعمال کیا جاتا ہے وہ عموماً شراب نہیں ہوتی، بلکہ ایسی اسپرٹ ہوتی ہے جو آلو، گیہوں وغیرہ سے بنائی جاتی ہے، اس کے استعمال کرنے کی گنجائش ہے، کیونکہ یہ اشربہ اربعہ محرمہ کی جنس سے نہیں ہوتی۔

اگر تحقیق سے یہ بات معلوم ہو جائے کہ اس دوا میں جو اسپرٹ وشراب استعمال کی گئی ہے وہ خمور اربعہ: کشمش، انگور، کھجور، منقہ سے بنائی گئی ہے تو اس کو استعمال نہ کرے، کیونکہ اس کا ایک قطرہ بھی متفق علیہ طور پر حرام اور نجس ہے، ہاں اگر دیانت دار ماہر اطباء سے یہ معلوم ہو کہ اس کا علاج اس کے علاوہ کسی دوسری چیز سے نہیں ہو سکتا اور موت کا قوی خوف ہو تو ایسی دواؤں کا استعمال کرنا بھی بقدر ضرورت جائز رہے گا۔ "وجوزه في النهاية بمحرم إذا أخبره طبيب مسلم ان فيه شفاء، ولم يجد مباحا يقوم مقامه" (۱)۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۶/۷/۱۴۱۱ھ

الجواب صحیح: کفیل الرحمٰن، محمد ظہیر الدین مفتاحی

کالے رنگ کے خضاب کا حکم شرعی:

آج کل عام طور پر زمانہ شباب ہی میں بال سفید ہو جاتے ہیں، ایسے لوگ جن کے عقد میں نوعمر اور جوان عورتیں ہیں محض بیوی کی رغبت کی بنا پر سیاہ خضاب کرتے ہیں، یہ فعل ان کے حق میں کیسا ہے؟ نیز عام حالات میں بھی سیاہ خضاب کا حکم تحریر فرمائیں۔

۱- الدر المختار ۵/۳۴۹۔

الجواب وبالله التوفيق:

قدرتی کالے رنگ کا خضاب حرام ہے، حدیث شریف میں اس پر وعید آئی ہے: قال رسول الله ﷺ: "يكون قوم يخضبون في آخر الزمان بالسواد كحواصل الحمام لايريحون رائحة الجنة"(۱) سیاہ خضاب کے علاوہ دوسرے رنگ کے خضاب جائز ہیں، البتہ مہندی یا کتم کا خضاب مستحسن ہے، حدیث شریف میں ہے:" إن أحسن ما غير به هذا الشيب الحناء و الكتم" (۲) فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۳/۳/۱۴۰۸ھ

الجواب صحیح: کفیل الرحمٰن، محمد ظفیر الدین مفتاحی

بال کٹانے کا سنت طریقہ، نیز قصر افضل ہے یا حلق؟

بعض لوگ سر کے بال اس طرح کٹاتے ہیں کہ صرف کانوں کے اوپر اور گدی پر سے کٹاتے ہیں، جن کو انگریزی بال کہا جاتا ہے، اس طرح کٹانا کیسا ہے؟ نیز بالوں میں قصر افضل ہے یا حلق؟ جب کہ اکابرین کا معمول حلق کا ہے۔

الجواب وبالله التوفيق:

حضور ﷺ اکثر بال رکھا کرتے تھے، موئے مبارک کبھی نصف کان تک، کبھی کانوں کی لو تک اور کبھی مونڈھے تک ہوتے تھے، یہ تینوں طریقے سنت ہیں (۳)، کانوں کے اوپر تک کٹانے کا ثبوت حدیث میں نہیں ملتا، اور اگر سر کے پورے بالوں کو یکساں طور پر کٹایا جائے کہ کہیں بڑے چھوٹے نہ ہوں، یہ بھی جائز ہے، لیکن سر کے اگلے حصہ کے بال بڑے رکھنا اور صرف پیچھے کے حصہ کے بالوں کو چھوٹا کرانا (جو آج کل کا فیشن ہے) جائز نہیں، حدیث شریف میں اس سے ممانعت آئی ہے:"نهى رسول الله ﷺ عن القزع أن يحلق رأس الصبي فيترک بعض شعره " (۴)، نیز سر کے بعض حصہ کے بال کٹوانا اور بعض حصہ کو چھوڑ دینا بھی جائز نہیں ہے، حضور ﷺ نے اس سے بھی منع فرمایا ہے:"عن ابن عمر أن

۱- ابوداؤد ۲۲۲/۲، باب في الخضاب۔
۲- ابوداؤد ۲۲۲/۲، باب في الخضاب۔
۳- شمائل الترمذی/۱۔
۴- ابوداؤد ۲۲۱/۲۔

النبی ﷺ رأی صبیا قدحلق بعض شعره وترک بعضه، فنهاهم عن ذالک، فقال: أحلقوا کله أو اترکوه کله"(۱)،حلق اور قصر دونوں مباح ہیں،حضور ﷺ کا جومعمول بال رکھنے کا تھا وہ حکم شرعی کی وجہ سے اور سنن ہدیٰ کے طور پر نہیں تھا، ورنہ صحابہ اس کے خلاف نہ کرتے اور یہاں اس کے خلاف ہے، اس لیے حضرت علیؓ اور بعض صحابہ کرامؓ سے حلق کرانے کا ثبوت ملتا ہے،معلوم ہوا کہ حلق اور قصر دونوں مباح ہیں،فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی،مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۶/۷/۱۴۱۱ھ

الجواب صحیح: کفیل الرحمان ،محمد ظفیر الدین مفتاحی

امریکن گائے کا گوشت کھانا، دودھ پینا اور قربانی کرنا کیسا ہے؟

امریکن گائے جس کو عوام جرمنی گائے بھی کہتے ہیں، اس کے بارے میں بتایا جاتا ہے کہ گائے کے ساتھ خنزیر کی جفتی کرائی جاتی ہے یا خنزیر کا مادۂ منویہ حاصل کر کے بذریعہ مشین گائے کی شرمگاہ میں ڈالا جاتا ہے، اس سے جو گائے پیدا ہوتی ہے اس کا شرعی حکم کیا ہوگا؟ اس کا گوشت کھانا، دودھ پینا اور اس کی قربانی کرنا درست ہے، یہ امریکن گائے بنسبت ہندوستانی گایوں کے دس گنا زیادہ دودھ دیتی ہے، اسی دودھ کے لالچ میں کچھ لوگ اس کو لا کر پالتے ہیں۔

الجواب وباللہ التوفیق:

حیوانات میں نسب مادہ سے چلتا ہے،جب یہ گائے (امریکن یا جرمنی) اور گایوں کی طرح سے کھاتی پیتی ہے اور گائے کی طرح بولتی ہے،تو یہ شرعاً گائے ہی شمار ہوگی،خواہ خنزیر سے جفتی کرائی گئی ہو، یا بذریعہ انجکشن یا کسی اور طرح حاملہ کرائی گئی ہو اور حاملہ کرانے کا یہ طریقہ غیر شرعی یا مذموم وغیرہ ہو، اس سے اس کے گائے ہونے میں کوئی شبہ نہ کیا جائے گا، گائے کا ہی حکم رہے گا اور اس کا گوشت کھانا، دودھ پینا اور اس کی قربانی کرنا، پالنا سب درست رہے گا(۲)،فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی،مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۳/۶/۱۴۱۱ھ

الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ،محمد ظفیر الدین مفتاحی غفرلہ،کفیل الرحمان

۱- ابوداؤد ۲/۲۲۱۔

۲- "فإن کان متولدًا من الوحشي والإنسي فالعبرة بالأم،فإن کانت أهلیة یجوز وإلا فلا، حتی أن البقرة الأهلیة إذا نزاعلیها ثور وحشي فولدت ولداً، فإنه یجوز أن یضحیٰ به، وإن کانت البقرة وحشیة والثور أهلیا لم یجز، لأن الأصل في الولد الأم، لأنه ینفصل عن الأم" (بدائع الصنائع،۶۹ ج۵، البحر الرائق،۳۰۷)(مرتب)۔

۱-خون اور انسانی اعضاء کوطبی اغراض کے لیے استعمال کرنے کاحکم:

موجودہ زمانہ میں انسانی خون اور اعضاء کوطبی اغراض کے لیے استعمال کرنا ایک عام بات ہوگئی ہے۔مثلاً:

۱-مریضوں اورزخمیوں کے جان بچانے کے لیے انسانی خون کے انجکشن دیے جاتے ہیں۔

۲-مرنے والوں کی آنکھیں متوفی کی وصیت یا ورثاء کی اجازت سے نکال کر نابینا لاعلاج اندھوں کولگائی جاتی ہیں۔

۲-خون اور مختلف اعضاء کے بینک کے قیام کاحکم:

اس مقصد کے لیے خون اور آنکھوں کے بینک قائم کیے جاتے ہیں۔

الجواب وباللہ التوفیق:

۱-جان بچانے کے لیے مجبوری واضطرار کی صورت میں انسانی خون کواستعمال کر لینے کی اور اس کاانجکشن لگادینے کی تداوی بالمحرم کے قاعدہ کے مطابق شرعاً گنجائش ہے،مگر اس گنجائش کا مطلب یہ نہیں کہ وہ خون مباح الاصل ہوگیا یا مطلقاً جائز الاستعمال ہوگیا ہے،اس کامطلب یہ ہے کہ ضعفِ بشری اور معذوری کالحاظ رکھتے ہوئے بطورمراحم خسروانہ اس استعمال پرآخرت میں مواخذہ یاگرفت نہ ہوگی اور ایسا کرنے والے عند اللہ گنہگار شمار نہ ہوں گے،بلکہ عفوودرگذر کامعاملہ ہوگا،فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی،مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۷/۱/۲ ۱۳۹۷ھ

شبہ کے موقع پر ازروئے تقویٰ احتیاط اولیٰ ہے:

یہاں سعودی عرب میں بیرونی ممالک سے بسکٹ اور ایسی نوع کی چیزیں آتی ہیں جوغیر مذبوحہ جانور کی چربی یا اسی قبیل کی حرام اشیاء ان بسکٹوں میں لازمی جزء ہوتی ہیں اور بسکٹ کے پیکٹ پربھی لکھا ہوا ہوتا ہے کہ فلاں چیز شامل ہے اور ایسے بسکٹ اور ایسی نوع کی چیزیں بھی آتی ہیں جن میں حرام چیزوں کی آمیزش نہیں ہوتی ہے اور اگر کہیں ملاقات کے لیے دینی یا دنیاوی غرض سے کسی ایسے شخص کے پاس جائیں جوحلال وحرام کی اتنی پرواہ نہیں کرتا (خواہ کسی وجہ سے مجملہ ایک وجہ یہ ہے کہ حکومت تاثر دیتی ہے کہ وہ حلال وحرام کے بارے میں سخت پابند ہے)اور یہ شخص پلیٹ میں بسکٹ اور چائے لاکر دیتا ہے مہمان نوازی کے خیال سے اور صرف بسکٹ کی شکل دیکھ کر پتہ چلانا مشکل ہے کہ یہ حلال ہے کہ حرام اور میزبان اصرار کرتا

ہے، کھانے پر، تعلقات کی نوعیت ایسی ہے کہ حلال وحرام کا مسئلہ بیان کیا جائے تو سننے کی استعداد نہیں۔

ایسی صورت میں کیا کیا جائے، ایک آدھ ٹکڑا کراہت کھا کر میزبان کو مطمئن کیا جائے اور اگر ایسے مشکوک کھا لیے جائیں تو دعا کتنے دنوں تک قبول نہ ہوگی۔

محمد ضیاء الرحمٰن (سعودی عربیہ)

الجواب وباللہ التوفیق:

اگر پیکٹ ہی سامنے آجائے اور اس پر حرام چیز کی آمیزش لکھی ہوئی ہو جب تو قطعاً نہ کھایا جائے، صاف انکار تہذیب ونرمی سے کردے، اس لیے کہ "لاطاعة لمخلوق في معصية الخالق"(۱) اگر پیکٹ سامنے نہ آئے اور کوئی علامت بسکٹوں پر حرام چیز کی آمیزش کی نہ ہوتو چونکہ حکومت میں حرام وحلال ہر چیزیں دستیاب بھی ہوتی ہیں، تو ظاہر حال واغلب حال یہی ہوگا کہ جب تک ان میں حرام یا ناپاک چیز کا ثبوت نہ ہو حرام وناپاک نہ کہیں گے (۲)، باقی اگر شبہ ہو تو کسی اچھے اور نرم انداز سے معلوم کر لے کہ ایسی ویسی چیز تو اس میں شامل نہیں ہے؟ اگر وہ آدمی خود محتاط وپرہیز گار ہو تو اس سے معلوم کرنے کی بھی ضرورت نہیں، ہاں اگر غیر محتاط وآزاد ہو اور شبہ ہو اور پھر معلوم بھی نہ کر سکتا ہو تو بطور توریہ کے "إنی سقیم" کہہ دے کہ میں نفس کا مریض ہوں یہ چیز میرے لیے مضر ہے، اس لیے میں اس کے کھانے سے معذور ہوں اور اپنے کو بچا لے۔

نیز شبہ کے موقع میں از روئے فتویٰ استعمال کی گنجائش ہوتی ہے، لیکن از روئے تقویٰ اس قسم کے توریہ وبہانہ سے نہ کھائے تو افضل اور احسن ہوگا، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دار العلوم دیوبند سہارنپور ۱۵/۱۲/۱۴۰۰ھ

پاسپورٹ کے لئے تصویر کھینچوانے کا شرعی حکم:

کوئی شخص نفلی حج کو جانا چاہتا ہے یا تفریحاً پردیس کو جانا چاہتا ہے یا کسی پر طلب علم دین تفصیل دلائل وغیرہ فرض

۱- مشکوۃ المصابیح کتاب الإمارۃ والقضاء، ۳۲۱۔

۲- "أما مسئلة ما إذا اختلط الحلال بالحرام في البلد، فإنه يجوز الشراء والأخذ إلا أن تقوم دلالة على أنه من الحرام" (الاشباہ مع شرح الحموی، ۶ ف ۱۷)۔

واجب نہیں، لیکن وہ اس کے لئے یا محض عربی سیکھنے کے لئے دیگر ممالک جانا چاہتا ہے یا صرف دنیوی فن یا پیشہ حاصل کرنے کے لئے پردیس جانا چاہتا ہے یا اور کسی غیر ضروری سفر کے لئے جارہا ہے اور چونکہ آج کے زمانہ میں پاسپورٹ لازم ہے تو وہ شخص ایسے اسفار کے لئے پاسپورٹ نکالتا ہے اور اس میں فوٹو بھی لازم ہے تو کیا یہ جائز ہوگا یا نہیں؟ تصویر کھینچنا تو حرام ہے اور ضرورت کے موقع پر تو جائز ہے، جیسے فرض حج یا طلب علم دین با لتفصیل اگر اپنے شہر میں کوئی عالم نہیں وغیرہ، لیکن ایسے غیر ضروری مواقع پر کیا حکم ہوگا؟ آیا یہاں بھی بر بناء حاجت تصویر نکال کر پاسپورٹ لینا جائز ہے یا نہیں۔

بندہ سراج احمد (فریقی غفرلہ)

الجواب وباللہ التوفیق:

یہ تو ظاہر ہے کہ بغیر کسی وجہ شرعی کے فوٹو نکلوانا ممنوع ہے اور وجہ شرعی کے ساتھ مباح ہے دینوی وتجارتی غرض بھی مقصد صحیح اور وجہ شرعی بن سکتی ہے، اسی طرح قانونی مجبوریاں اضطراری حالات بھی وجہ شرعی بن سکتی ہیں اور یہ وجوہ شاخ درشاخ بے حد وبے حساب منشعب ہیں اور جناب نے خود بھی لکھا ہے اور جزئی حکم مبتلی بہ کی رائے پر چھوڑ اجائے گا بشرطیکہ وہ بادیانت ہو یا پھر کسی خاص جزئی کی تعیین کے بعد لکھا جاسکتا ہے، جبکہ خود صاحب معاملہ صاف صاف لکھ کر پوچھے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

ذی روح کی تصاویر چھاپنے کا حکم:

میں منوہر لال منیجر کتب خانہ اشاعت الاسلام دہلی قرآن پاک اور بہت سی مذہب اسلام کی کتابوں کا ناشر ہوں، میرے مال کے خریدار تقریباً تمام ہی مسلمان ہیں، میرے کتب خانہ میں اکثر کارکن مسلمان ہیں، میں اور میرے ادارہ کے تمام کارکن قرآن پاک کی نشر واشاعت میں امکان بھر احترام واحتیاط سے کام لیتے ہیں۔

مجھے چند ماہ قبل کینیڈا، افریقہ کے ایک مسلمان تاجر کتب کا ایک آرڈر چند بزرگوں کی تصاویر چھاپ کر بھیجنے کا ملا اور جو تصاویر ہم کو نمونہ کے طور پر دی گئیں وہ بھی ایک اسلامی ملک مصر کی چھپی ہوئی تھیں، ہم نے وہ تصاویر آرڈر کے مطابق چھاپ کر کینیڈا روانہ کردیں، ان کی اشاعت سے مسلمانوں کی دل آزاری کا تصور بھی ہمارے گوشۂ خیال میں نہ تھا، دہلی کے

ہمارے ہم پیشہ بعض تاجر ان کتب نے صرف ہماری مخاصمت اور مخالفت میں یہاں سے وہ تصاویر حاصل کیں اور غلط انداز میں اخبارات میں اشاعت کے لیے بھیج دیں اور میرے ذریعہ مسلمانوں کی دل آزاری کرنے کی انتہائی مذموم کوشش کی، حالانکہ میں نے ان تصاویر کو ہندوستان بھر میں کسی جگہ سپلائی نہیں کی ہندوستان میں ان تصاویر کو پھیلانے اور مسلمانوں کی دل آزاری کا باعث وہی لوگ بنے جو میری مخالفت کرتے ہیں۔

مجھے جیسے ہی یہ علم ہوا کہ یہ تصاویر مسلمانوں کی دل آزاری کا باعث ہوسکتی ہیں، میں نے دہلی کے چند مسلم علماء سے رجوع کیا اور ان حضرات سے حکم معلوم کیا، ان کے حکم کے مطابق ان ہی کی موجودگی میں ان تصاویر کے نگیٹیو اور طباعت کے تمام ذرائع جلا کر ضائع کردیے اور آئندہ کے لیے ان لوگوں کو یقین دلایا کہ اس طرح کی کوئی تصویر شائع نہیں کرونگا۔

اگر کوئی آدمی لاعلمی میں غلطی کا ارتکاب کرے اور علم میں آتے ہی تمام مواد ضائع کردے اور آئندہ کے لیے تائب ہوجائے تو اس کے لیے کیا حکم ہے؟

نیازمند (منوہر لال کتب خانہ اشاعت الاسلام دہلی)

نقل فیصلہ: منوہر لال کے پاس چار تصویر افریقہ سے طبع ہونے کے لیے آئی تھیں، ان میں ایک تصویر حضرت آدم علیہ السلام کی اور دوسری حضرت ابراہیم علیہ السلام کی، تیسری حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمہ اللہ کی اور چوتھی براق کی تھیں یہ تصویریں قابلِ اعتراض تھیں، چنانچہ یہ طے ہوا کہ مولانا محمد یوسف مفسر قرآن سے اس معاملہ کا فیصلہ کرایا جائے، حضرت مولانا نے ان تصویروں کو قابلِ اعتراض قرار دیا ان کے سامنے منوہر صاحب نے یہ اعلان کیا کہ وہ تصویروں کے قابلِ اعتراض ہونے سے واقف نہیں تھے، چھپی ہوئی تصویریں ان کے پاس چھپنے کے لیے آئیں جو انہوں نے طبع کرادیں، مولانا محمد یوسف نے فیصلہ فرمایا کہ ان میں کوئی تصویر ہندوستان میں نہ طبع ہوگی نہ تقسیم۔ دوسرے اس کے نگیٹیو ضائع کردیے جائیں تیسرے اس قسم کی کوئی قابلِ اعتراض چیز آئندہ شائع اور طبع نہ ہوگی اس مطبوعہ مال کو فی الفور افریقہ بھیجدیا جائے، چنانچہ حسبِ ذیل حضرات کی موجودگی میں نگٹیو اور خاکے ضائع کردیے گئے مولانا یوسف، جناب محمد ادریس، حاجی عبدالملک، ڈاکٹر تنویر احمد صاحب علوی، مسلمانوں کے مذہبی جذبات کی رعایت کرنے کی بناپر منوہر لال صاحب مستحق شکریہ ہیں۔

توقیر محمد یوسف الدہلوی محلہ چوڑی والان دہلی، ۱۷/۹/۸۷ء

الجواب وباللہ التوفیق:

عام جانداروں کی تصویر بنانا، خواہ کسی کیڑے مکوڑے ہی کی کیوں نہ ہو، اسلام میں قطعاً حرام اور گناہ ہے اور آخرت میں اس پر بہت سخت عذاب کی وعیدیں آئی ہیں، پھر بزرگوں کی تصویر بنانا اور وہ بھی انبیاء کرام کی یہ تو اسلام میں بہت ہی بڑا جرم ہے خواہ مصر، قاہرہ اور عرب کے لوگ بنائیں۔ اس لیے کسی کو بھی غیر مسلم ہی کیوں نہ ہو اس کے بنانے کی یا نقل اتارنے کی قطعاً اجازت نہ ہوگی، ایسی تصاویر جن کا تعلق کسی کے مذہبی شعار سے ہو اس کے مذہب کے پیشواؤں، مقتداؤں کی توہین یا تنقیص کا پہلو نکلتا ہو یا کسی مذہب کے ماننے والوں کے نزدیک تنقیص یا توہین شمار ہوتی ہو تو اس کے بنانے اور شائع کرنے کی اجازت کسی قوم و مذہب کے کسی فرد کو سیکولر ملک اور اسٹیٹ میں قانوناً بھی نہیں ہوتی اور پیشِ نظر تصویروں میں یہ سب پہلو موجود ہیں، اس لیے غلطی تو بہت بڑی تھی جو ہوگئی، باقی جب صاحب معاملہ کو اپنی غلطی کا احساس ہوگیا اور انہوں نے محض معذرت ہی نہیں کی، بلکہ دہلی کے بہت سے علماء کرام کو حکم بنا کر ان کے فیصلہ کے مطابق عمل کر کے ان تمام تصاویر کے نگیٹیو اور خاکے ان سب حضرات کی موجودگی میں جلا کر ضائع بھی کر دیئے اور آئندہ کے لیے ان حضرات کو یقین بھی دلایا کہ اس طرح کی کوئی تصویر نہیں شائع کروں گا، جیسا کہ ان حضرات علماء کرام کی خود اپنی تحریروں سے (جو استفتا کے ساتھ منسلک ہیں) ظاہر ہے تو صاحب معاملہ کی یہ غلطی عند اللہ معاف ہوگی۔

نیز صاحب معاملہ کا اس انداز سے صفائی معاملہ کر لینا ان کی سلامت روی کی دلیل بھی ہے اور اس قسم کی صورتوں میں جذبات سے کام لینا مناسب نہیں، اس کی اسلام اجازت نہیں دیتا، بلکہ اس کو مذموم حرکت قرار دے کر درگذر کرنے کی تعلیم دیتا ہے۔ اس لیے اب مزید کسی مظاہرہ وغیرہ کی ضرورت باقی نہیں، البتہ چونکہ بلٹز وغیرہ اخبارات میں بھی یہ صورتِ حال شائع ہو کر عام مسلمانوں کی بے چینی کا سبب ہو چکی ہے، اس لیے تکمیلِ معذرت وصفائی معاملہ کے لیے صاحبِ معاملہ کو چاہیے کہ وہ بلٹز، وغیرہ اخبارات میں اپنی معذرت کے ساتھ ساری صورتِ واقعہ اور ثالثوں کی تحریرات اور ان کے فیصلوں کو اشاعت کے لیے بھیج دے، تاکہ ان اثرات کا ازالہ ہو سکے جو صاحب معاملہ کے متعلق ملک میں پیدا ہو چکے ہیں، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دار العلوم دیوبند سہارنپور ۱۵/۱۱/ ۱۳۹۸ھ
الجواب صحیح: سید احمد علی سعید

تصویر بنانا یا بنوانا:

مصلحۃً کسی کو اپنی تقریر کے وقت اور جلسہ گاہ، وعظ اور کسی نیک کام کی بنیاد رکھنے کے وقت بنیاد رکھنے والے کا فوٹو لینا جائز ہے یا نہیں، اور فوٹو لینے والا کیسا ہے، یعنی لینا اور لیوانا دونوں صورتوں کے متعلق لکھیں عند الشرع کیسی ہے اور تصویر بنانا کیسا ہے؟

الجواب وبالله التوفيق:

انسان حیوان اور ہر جاندار ذی روح کا فوٹو لینا یا اتنے حصے جسم کا فوٹو لینا جتنے میں زندہ باقی رہ سکتا ہے، ناجائز ہے اور حرام ہے سوائے چند مجبوری کی صورتوں کے اور آپ نے جو لکھا ہے اس میں کوئی مجبوری نہیں ہے۔

لہٰذا ایسا کرنا سخت گناہ اور حرام ہے آخرت میں تصویر بنانے والے اور بنوانے والے کھینچنے والے اور کھنچوانے والے سب کو کہا جائے گا کہ اس میں جان ڈالو اور وہ جان ڈال نہ سکیں گے تو انکو شدید عذاب ہوگا، اسی طرح یہ عذاب چلتا رہے گا، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دار العلوم دیوبند سہارنپور

الجواب صحیح سید احمد علی سعید

مرے ہوئے جانور میں بھوسی وغیرہ بھر کر اس کو کھڑا کرنا شرعاً کیسا ہے؟

مور وغیرہ جانور کو مار کر، اس کے اندر سے آلائش نکال دی جاتی ہے اور اس میں دوسری اشیاء بھر دی جاتی ہیں، جس سے وہ مور ہی معلوم ہوتا ہے، جس کو سجاوٹ کے لیے گھروں میں رکھا جاتا ہے۔ ایسے جانوروں کا کاروبار کرنا کیسا ہے؟ درست ہے یا نہیں؟

اقبال احمد ظفر (جامع نور رانتو دانت کناڈا افریقہ)

الجواب وبالله التوفيق:

بطور مذکور اس قسم کے جسم کو محفوظ کر لینے میں چنداں مضائقہ نہیں اور نفس اباحت میں کلام نہ ہوگا، اس لیے کہ یہ

صورت وعمل نہ تو تصویر شئی ہے اور نہ ہی کوئی ہیکل وقالب بنانا ہے، بلکہ ایک شئی کے قدرتی جسم کو برقرار رکھنا ہے۔ لیکن چونکہ یہ مور اور اسی طرح کی بعض چڑیاں بعض غیر مسلموں کے مذہب میں مذہبی طور پر معظم ومحترم، بلکہ شانِ عبودیت رکھتی ہیں اور بعض قومیں پوجتی بھی ہیں اور زینت وتزئین کے لیے رکھتی ہیں، ان کے اعزاز واکرام اور تعظیم وغیرہ کا ایہام بھی ہوتا ہے اور عبادتِ اصنام سے مشابہت اور عقیدہ باطلہ سے ہمرنگی بھی ہوتی ہے، اس لیے ایسے موروں یا جانوروں کو اس طرح رکھنے کی یا اس کے کاروبار کرنے کی شرعاً اجازت نہ ہوگی اور یہ شبہ نہ کیا جائے کہ گائے جس کو ایک قوم معبود سمجھتی ہے اور اس کی پرستش بھی کرتی ہے پھر بھی جب گائے کا بچہ مرجاتا ہے اور گائے دودھ نکالنے نہیں دیتی تو اس کے مرے ہوئے بچہ میں بھوسی وغیرہ بھر کر کھال کو باقی رکھ کر گائے کے سامنے کھڑا کر کے دودھ نکال لیتے ہیں اور اس کو علماء نے جائز قرار دیا ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اگرچہ گائے کو معبود سمجھتے ہیں، مگر اس بچہ کو زینت وتزئین کے لیے نہیں رکھتے اور نہ اس کے ساتھ اکرام وتعظیم کا معاملہ کرتے ہیں، بلکہ تحقیر وتوہین، جیسا معاملہ کرتے ہیں، اس لیے ایہام شرک یا عبدۃ اصنام کی مشابہت کا ایہام نہیں ہوتا ہے، اس لیے اس کی گنجائش میں کلام نہیں، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور، ۱۱/۱/۱۴۰۱ھ

سونے چاندی کا بٹن یا قلم استعمال کرنا کیسا ہے؟

سونے چاندی کے بٹن یا قلم استعمال کرنا درست ہے یا نہیں؟

عبدالقیوم القاسمی (موضع جلال پور میرٹھ یوپی)

الجواب وباللہ التوفیق:

سونے چاندی کا قلم اور وہ بٹن جو کپڑے سے الگ رہتا ہے، استعمال کرنا درست نہیں ہے (۱) کما في الدرمع الشامي ولا یتحلیٰ الرجل بذهب وفضة إلا بخاتم ولا یتختم بغیر ها لحجروذهب وحدید وصفر الخ۔ وفي الهندیه ۱/۱۰۱: ویکره أن یکتب بالقلم المتخذ من الذهب أو الفضة أو من دواة کذلک، ویستوی فیه

۱- ”قال في الدر المختار: وکذا یکره الأکل بملعقة الفضة والذهب (إلیٰ قوله) وقلم ودواة ونحوها“ (فتاویٰ شامی ۵/۲۱۷ کتاب الحظر والإباحۃ)۔

الذکر والأنثی، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۹/ ۲/ ۱۴۱۱ھ
الجواب صحیح: حبیب الرحمان خیرآبادی، کفیل الرحمٰن

پیتل، تانبے اور لوہے کی انگوٹھی پہننا شرعا درست ہے یا نہیں؟

مردوں یا عورتوں کے لیے پیتل، تانبے اور لوہے کی انگوٹھی پہننا شرعاً کیسا ہے؟

الجواب وباللہ التوفیق:

تانبے اور لوہے وغیرہ کسی بھی دھات کی انگوٹھی پہننا مردوں اور عورتوں دونوں کے لیے حرام ہے(۱)، بحوالہ بالا ، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۹/ ۲/ ۱۴۱۱ھ

الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن عفااللہ عنہ، کفیل الرحمٰن

ٹیلی ویژن، ریڈیو، وی سی آر وغیرہ کی مرمتِ تجارت اور ان کی آمدنی کا حکم:

ٹیلی ویژن، ریڈیو، وی سی آر، وغیرہ آلات لہو ولعب کی تجارت اور مرمت کرنا شرعاً کیسا ہے، اور اس سے حاصل شدہ آمدنی حلال ہے یا حرام؟

الجواب وباللہ التوفیق:

ٹیلی ویژن، وی سی آر میں نامشروع اور لہو ولعب سے بچتے ہوئے محض جائز چیزوں کا دیکھنا یا سننا سب متعذر رہوتا ہے، اس لیے اس کا لہو ولعب کا آلہ ہونا ظاہر ہے اور اس کی ممانعت حدیث پاک میں ہے: ''کل لهو المسلم حرام

۱- "قال الشامي "وفي الجوهرة: والتختم بالحديد والصفراء والنحاس والرصاص مكروه للرجال والنساء" (الدر مع الشامي ۲۲۹/ ۵ کتاب الحظر والإباحة) (مرتب)۔

الا ثلثة" أو كما قال (۱)، اور یہ دونوں چیزیں "ثلثة" میں داخل نہیں ہیں، لہذا ان کی تجارت، مرمت وغیرہ شرعاً کچھ بھی جائز نہ رہے گی اور اس کی آمدنی بھی حلال نہ رہے گی۔ ہاں ریڈیو میں جائز کلام کا سننا غلط خبر اور لعب ولہو میں مبتلا ہوئے بغیر ممکن ہے، اس لیے ریڈیو میں جائز باتیں اس طرح سننا کہ مشروع چیزوں کا ارتکاب لازم نہ آئے درست رہے گا، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۶/۲/۱۴۱۱ھ

ریڈیو اور ٹیلی ویژن کا استعمال:

ریڈیو اور ٹیلی ویژن کا استعمال شرعاً کیسا ہے اور اگر کوئی عالمی اخبار کے لئے یہ دونوں چیزیں استعمال کرنا چاہیں تو شرعاً کیا حکم ہے؟ مولوی شبیر احمد میرٹھی

الجواب وبالله التوفيق:

جن خبروں اور باتوں کا بغیر ریڈیو ٹیلیویژن کے سننا جائز ہے ان کا ریڈیو اور ٹیلویژن میں بھی سننا جائز ہے، اور جن خبروں اور باتوں کا بغیر ریڈیو اور ٹیلیویژن کے سننا نا جائز ہے ان کا ریڈیو اور ٹیلیویژن پر بھی سننا نا جائز ہے۔

اسی طرح جن چیزوں کا براہ راست بغیر ٹیلیویژن کے دیکھنا جائز ہے ان کا ٹیلیویژن پر بھی دیکھنا جائز ہے، جیسے کوئی مرد ٹیلیویژن پر کوئی جائز خبر دے کرے یا تلاوت وغیرہ کرے۔

اور جن چیزوں کا براہ راست بغیر ٹیلیویژن کے دیکھنا نا جائز ان کا ریڈیو ٹیلیویژن پر بھی دیکھنا نا جائز ہے، جیسے کسی اجنبی یا نامحرم عورت کا دیکھنا یا کسی لہو ولعب اور نا جائز امور کا بغیر ٹیلیویژن کے دیکھنا نا جائز ہے ان کا ٹیلیویژن میں بھی دیکھنا نا جائز ہے (۲)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۳/۸/۱۴۰۱ھ

۱- حافظ ابن حجر نے مستدرک حاکم کے حوالہ سے فتح الباری میں اس حدیث کو نقل کیا ہے، جس کے الفاظ یہ ہیں: "كل ما يلهو به المرأ المسلم باطل إلا رميه بقوسه وتأديبه فرسه وملاعبته أهله" (فتح الباری ۱۱/۹۱ کتاب الاستئذان، باب: ۵۲)۔

۲- درمختار میں ہے: "وكل عضو لا يجوز النظر إليه قبل الانفصال لا يجوز بعده"، اس کے تحت شامی میں لکھتے ہیں: "لم أر ما لو نظر إلى الأجنبية من المرآة أو الماء، وقد صرحوا في حرمة المصاهرة بأنها لا تثبت برؤية فرج من مرآة أو ماء...... إلا أن

یورپ میں عیسائیوں اور یہودیوں کے برتنوں کے استعمال کا حکم؟

یورپ میں عام طور پر یہودی، عیسائی لوگ بستے ہیں، جگہ جگہ ہوٹل، کافی ہاؤس، چائے خانے اور شراب خانے بنے ہوئے ہیں، ہندوپاک اور افریقہ وغیرہ سے کافی تعداد میں مسلمان گذشتہ دس برس میں یہاں آکر آباد ہوئے ہیں اور اسی قوم سے واسطہ رہتا ہے، خنزیر کے گوشت اور شراب کا عام رواج ہے اور اس سے مسلمان اپنی حفاظت کرتا ہے، مگر ہوٹلوں ریسٹورینٹ میں عیسائیوں، یہودیوں کے برتنوں وچمچوں وچھریوں، کانٹے پیالے، پلیٹ، گلاس وغیرہ برتنوں سے احتیاط کرنا اور بچنا عام طور پر مشکل ومحال نظر آتا ہے، کوئی ایک مسلمان پہونچا جہاں مسلمانوں کا ہوٹل نہیں ہے، بڑے بڑے راستوں پر ریلوں اور ہوائی جہازوں میں مسلمانوں کے لیے کوئی الگ نظام نہیں ہے، حرام کھانے سے پرہیز کرتا ہے، سبزی، پھل وغیرہ حلال چیزیں کھاتا ہے یا چائے، کافی وغیرہ پیتا ہے، مگر برتن ان لوگوں کے استعمال کیے ہوئے ہیں، اگرچہ دھلے ہوئے صاف ستھرے ہوتے ہیں۔ تو کیا مذکورہ صورتوں میں مسلمانوں کے لیے ان برتنوں کا استعمال جائز ہوگا یا نہیں؟ عموم بلوی ہے، ان کے برتنوں کے استعمال کا عام طور پر مسلمانوں کو اس سے بچنا بہت مشکل ہے۔

الجواب وباللہ التوفیق:

اگر حالات کے تحت یہ یقین ہو کہ یہ چمچہ، کانٹا و برتن وغیرہ خنزیر وشراب میں استعمال نہیں ہوئے ہیں یا ہوئے ہیں مگر بالجملہ دھوکر ان سبزیوں وغیرہ میں استعمال ہوئے ہیں اور دستر خوان پر لائے جاتے ہیں تو ان سے سبزیوں کا کھانا اور برتنوں وغیرہ کا استعمال کرنا درست ہے، بالخصوص مذکورہ مجبوریوں کی صورت میں (۱)، ورنہ بغیر اضطرار کے گنجائش نہیں ہوگی اور احتیاط بہر حال عمدہ چیز ہے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

الجواب صحیح: محمود غفرلہ، سید احمد علی

یفرق بأن حرمة المصاهرة بالنظر ونحوه شدد في شروطها لأنه الأصل فيها الحل بخلاف النظر؛ لأنه إنما منع منه خشية الفتنة والشهوة، وذلک موجود هنا" (رد المحتار علی الدر المختار ۹/ ۵۳۴) (مرتب)۔

۱- الضرورات تبیح المحظورات، الاشباہ مع شرح الحموی، ۱۰۸۔

سرکاری بس سے ایکسیڈنٹ ہونے کی صورت میں گورنمنٹ سے معاوضہ لینا شرعاً کیسا ہے؟

زید کا سرکاری بس سے ایکسیڈنٹ ہوگیا اور جائے حادثہ پر شہید ہوگیا اور ڈرائیور پولیس اسٹیشن میں حاضر ہوگیا، اب اگر ڈرائیور کے خلاف عدالتی کارروائی کی جائے (مقدمہ وغیرہ دائر کیا جائے) تو اس کو سزا بھی ہوگی اور اس کے بعد حکومت کچھ معاوضہ بھی دے گی، کیونکہ بس سرکاری تھی، دریافت طلب امر یہ ہے کہ ڈرائیور کے خلاف مقدمہ دائر کرنا اور حکومت سے معاوضہ وصول کرنا ازروئے شرع کیسا ہے۔

فیاض احمد رحیمی (بھیونڈی مہاراشٹر)

الجواب وباللہ التوفیق:

مقدمہ دائر کرنا اور حکومت سے معاوضہ لینا دونوں درست ہیں اور معاف کردینا بہتر ہے (۱) اس لیے کہ یہ حادثہ بہت سے بہت قتل خطا میں آسکتا ہے اور قتل خطا میں قصاص یا قتل نہیں ہوتا (۲)، صرف دیت لازم آسکتی ہے اور دیت میں ذمی، مستامن و مسلم سب برابر ہیں (۳)، اور دیت میں صرف مال عوض میں لے سکتے ہیں، سزاء جسمانی کرانا درست نہیں اور حق دار میت کو دیت کے معاف کرنے کا حق بھی ہوتا ہے اور معاف کردینا بلکہ اولیٰ ہے (۴)، پس اگر حق دار دیت لے کر معاملہ صاف کرلے یا صلح وغیرہ کے ذریعہ سے معاملہ صاف کرلے اور پھر مقدمہ دائر کرنے میں اس کی سزا کا ظن غالب ہو اور مقدمہ دائر نہ کرنے میں اپنے کسی ضرر کا اندیشہ نہ ہو (خواہ قانونی یا غیر قانونی) تو مقدمہ دائر نہ کرے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

ربڑ کی عورت سے مباشرت کا حکم:

ایک شخص نیم پاگل ہے جس کا علاج ایک حاذق حکیم مسلم نے مجامعت بتلایا ہے اور یہ شخص نکاح کی قدرت نہیں

۱- ''وجزاء سیئة سیئة مثلها فمن عفا وأصلح فأجره علی اللّٰه'' (سورہ شوریٰ: ۴۰)۔

۲- "والخطاء علی نوعین، خطاء في القصد وخطاء في الفعل إلی قوله وموجب ذالک الکفارة والدیة علی العاقلة" (الهدایة مع الدرایة، ۴/ ۵۴۵، کتاب الجنایات) (مرتب)۔

۳- "والذمي والمستامن والمسلم في الدیة سواء" (فتاویٰ شامی ۵/ ۳۶۹)۔

۴- ''ومن قتل مؤمنا خطاء فتحریر رقبة مؤمنة ودیة مسلمة إلی أهله إلا أن یصدقوا'' (سورۃ النساء) (مرتب)۔

رکھتا، یعنی کوئی اس سے نکاح کے لیے تیار نہیں ہے، مگر امریکہ نے ایک مصنوعی عورت، یعنی (بیلون) تیار کی ہے جس کی نوعیت یہ ہے کہ اس میں پھونک بھر دی جاتی ہے جس کی وجہ سے اس میں عورت کی صورت اور جنسی اعضاء ابھر جاتے ہیں، یعنی بعینہٖ عورت معلوم ہوتی ہے، نیز اس کے اندر ایسی صنعت کی ہے جس کی وجہ سے وہ متحرک بھی ہو جاتی ہے۔ تو کیا اس بیلون کا علاجاً استعمال کرنا اس کے لیے جائز ہوگا؟ نیز جو لوگ ملازمت پیشہ ہیں وہ اپنی بیویوں سے دور رہتے ہیں، کیا وہ بھی استعمال کر سکتے ہیں یا نہیں؟

محمد افضل فریقی (متعلم درالافتاء دارالعلوم دیو بند ۶/۲/۱۴۰۴ھ)

الجواب وبالله التوفيق:

مصنوعی عورت کے ساتھ جماع سے وہ فائدہ نہیں ہو سکتا ہے جس کا ڈاکٹر یا طبیب نے مشورہ دیا ہے، اس طبیب سے استصواب کرلیا جائے قرآن پاک میں ہے: ''والذين هم لفروجهم حفظون إلاعلى أزواجهم أو ماملكت أيمانهم فإنهم غير ملومين''(۱)۔

جنسی خواہش جائز طور پر دو طرح سے پوری کی جا سکتی ہے جس کی قرآن نے صراحت کی ہے، ایک بیوی دوسری لونڈی اور باندیاں'' إلا علىٰ ازواجهم'' أي من زوجاتهم ''أو ماملكت أيمانهم'' أي السراري ''جلالین'' آگے قرآن کہتا ہے: '' فمن ابتغىٰ وراء ذالک: أي من الزوجات والسراری کا لإستمتاع بيلم فأولئك هم العادون أي المتجاوزون إلى مالا يحل لهم'' (۲)، امام مالک اور امام شافعی نے اس آیت سے ثابت کیا ہے کہ استمناء بالید حرام ہے، فقہاء احناف لکھتے ہیں: وكذا الاستمناء بالكف وإن كره تحريماً الحديث''ناكح اليد ملعون'' (۳)، البتہ اگر کوئی دیانت داری سے سمجھتا ہے کہ اس نے ایسا نہ کیا تو زنا میں مبتلا ہو جائے گا تو اس کے لیے کراہت تنزیہی کے ساتھ اس کی گنجائش ہو سکتی ہے: '' ولو خاف الزنا يرجىٰ أن لا وبال عليه(۴) ،وعبارة الفتح: فإن غلبته الشهوة ففعل إرادة تسكينها به، فالرجاء أن لا يعاقب الخ''(۵)۔

۱- سورۂ مومنون: ۶۔
۲- جلالین للسیوطی تفسیر سورۂ مؤمنون۔
۳- الدر المختار ۳/۱۴۷۔
۴- درمختار۔　　۵- رد المحتار ۳/۱۴۷۔

حدیث نبوی میں ہے کہ اگر کوئی شادی پر قادر نہ ہوتو وہ روزہ رکھے کہ اس سے شہوت ٹوٹتی ہے: "ومن لم يستطع فعليه بالصوم فإن لهٗ وجاء"(۱)۔

ان تمام حوالوں سے معلوم ہوتا ہے کہ جنسی خواہشات کی تکمیل کے طریقے شریعت میں دو ہی ہیں: بیوی یا اپنی باندی سے ہمبستری، تیسری کسی صورت کی اجازت نہیں دی گئی ہے اس میں بیلون سے استمتاع بھی آتا ہے، از روئے شرع مصنوعی عورت سے شہوت رانی جائز نہیں ہے، اگر کوئی استعمال کرے گا تو وہ گنہگار ہوگا۔ ''ويدل أيضاً على ما قلنا ما في الزيلعي: حيث استدل علىٰ عدم حلهٖ بالكف، لقوله تعالىٰ: "والذين هم لفروجهم حافظون" الأية، وقال: فلم يبح الاستمتاع إلابهما أي بالزوجة والأمة، فأفاد عدم حل الاستمتاع أي قضاء الشهوة بغيرهما" (۲)، البتہ اگر اس پاگل کا وہی علاج ہو جو سوال میں درج ہے اور کوئی دوسرا علاج کارگر نہ ہو اور حاذق مسلمان طبیب ذمہ داری قبول کرتا ہو تو تداوی بالمحرم کے قاعدہ سے علاجاً تجویز کیا جاسکتا ہے۔

فقہاء لکھتے ہیں: ''اختلف في التداوي بالمحرم وظاهر المذهب المنع، كما في رضاع البحر، لكن نقل المصنف ثمه وهنا عن الحاوي، وقيل: يرخص إذا علم فيه الشفاء ولم يعلم دواء آخر كما رخص الخمر للعطشان وعليه الفتوىٰ" (۳) ''لأن حل الخمر والميتة حيث لم يوجد يقوم مقامهما" (۴)۔

اگر دوسرا علاج ہے اور اس کے ملنے کی توقع بھی ہے تو پھر اس نیم پاگل کے لیے مصنوعی عورت ''بیلون'' سے مجامعت کی اجازت نہ ہوتی اس لیے کہ استمناء بالید کرنے والوں کو ملعون قرار دیا گیا ''ناكح اليد ملعون" علامہ شامی نے بحث کی ہے کہ استمناء بالید (ہاتھ سے منی خارج کرنا) میں گناہ کی وجہ آدمی کے ایک جزء ہاتھ کا استعمال، پانی کا ضائع کرنا اور شہوت کا بھڑکانا ہے، انہوں نے دوسری شکل کو بنیاد قرار دیا ہے: ''لم أر من صرح بشئی من ذالک والظاهر الأخير" ردالمحتار میں اس کی مثال دی ہے: ''وعلىٰ هذا فلو أدخل ذكرهٗ في حائط أونحوهٖ حتىٰ أمنى أو استمنىٰ بكفه بحائل يمنع الحرارة يأثم أيضاً" (۵)، یعنی ہاتھ کے سوا دوسری چیز کے ذریعہ بھی منی خارج کرے گا تو

۱- متفق علیہ، مشکوۃ المصابیح/۲۶۷۔
۲- ردالمحتار ۳/ ۱۷۱۳، ۲۷۲۔
۳- درمختار۔
۴- ردالمحتار/ ۳۶۵، ۳۶۶ کتاب الطہارۃ قبیل فصل فی البئر۔
۵- ردالمحتار ۳/ ۱۷۱۳۔

بھی گنہگار ہوگا، تو اس سے معلوم ہوا کہ منی کو بے فائدہ قصداً ضائع کرنے کی شریعت میں اجازت نہیں ہے، اس سے بچنا ضروری ہے، باقی ملازمت پیشہ لوگ جو اپنی بیویوں سے دور رہتے ہیں یا نوجوان طالب علموں کے لیے اس کی اجازت قطعاً نہیں ہے اور ان کے لیے شرعاً جائز ہے یہ اپنی بیویوں کو لا سکتے ہیں، دوسری شادی کرسکتے ہیں، اسی طرح مجرد نوجوانوں کو بھی شادی کی اجازت ہے، یا پھر وہی جس کی طرف سرورکائنات ﷺ نے رہنمائی فرمائی ہے کہ تم میں جو شادی کی استطاعت نہ رکھتا ہو تو وہ اپنے اوپر روزہ رکھنا لازم کرلے، اس سے بھی شہوت ٹوٹتی ہے۔

قال رسول الله ﷺ: "یا معشر الشباب من استطاع منکم البائۃ فلیتزوج فإنه أغض البصر وأحصن للفرج، ومن لم یستطع فعلیه بالصوم فإنه له وجاء متفق علیه"(۱)، ملا علی قاری فرماتے ہیں: "فالمعنی أن الصوم یقطع الشهوۃ ویدفع شر المنی" (۲) یہی وجہ ہے کہ اسلام نے بلوغ کے بعد شادی کی تاکید کی ہے: قال رسول الله ﷺ من: "ولد له ولد فلیحسن إسمه وأدبه، فإذا بلغ فلیزوجه، فإن بلغ ولم یزوجه، فأصاب إثما فإنما إثمه علی أبیه" (۳) جہاں باپ کی ذمہ داری لڑکے کے لیے تعلیم وتربیت کا انتظام ہے، وہیں بالغ ہونے کے بعد شادی کا نظم کرنا بھی ہے، اگر مصنوعی مرد یا عورت کا لوگ استعمال کرنا شروع کردیں گے تو فتنہ وفساد زیادہ سے زیادہ پھیل پڑے گا، نہ مرد کو عورت کی ضرورت باقی رہے گی اور نہ عورت کو مرد کی، اس طرح انسانوں کی پیدائش کا سلسلہ بتدریج رک جائے گا اور نسل کشی کی ایک نئی قسم عام ہوجائے گی۔

دراصل یورپ سے مذہب بے زاری کا جو طوفان چلا ہے وہ بڑھتا اور پھیلتا جارہا ہے اور لوگ اس کی گرفت میں آتے جارہے ہیں، یہ بھی نسل بندی کی ایک قسم ہے جس کی علماء مخالفت کرتے آرہے ہیں، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۲/ ۲/ ۱۴۰۲ھ
الجواب صحیح: محمد ظفیر الدین، مفتی دارالعلوم دیوبند

بعض گیسٹ ہاؤس کا حکم:

کسی شخص نے گیسٹ ہاؤس کی تجارت کی اور اس کو معلوم ہے کہ اس گیسٹ ہاؤس میں دوسرے لوگ شب گذارنے

۱- مشکوۃ ۲/ ۲۶۷۔
۲- مرقاۃ ۳/ ۴۰۲۔
۳- مشکوۃ/ ۲۷۱۔

کے لیے اپنے ساتھ بغیر نکاح کی ہوئی عورتوں کو لے کر آئیں گے اور زنا کاری میں مشغول ہوں گے اور گیسٹ ہاؤس کا ایک خادم ہوتا ہے جو مالک کی جانب سے مقرر کیا ہوا ہوتا ہے، پھر وہ آنے والے حضرات خادم سے شراب منگواتے ہیں اور زنا کاری میں مشغول ہوتے ہیں اور شراب پیتے ہیں اور گیسٹ ہاؤس کا مالک صرف شب گذارنے کا کرایہ وصول کرتا ہے اور بعض حضرات اس میں ایسے آتے ہیں جو ہفتہ پندرہ روز مسلسل قیام کرتے ہیں اور دوسری عورتوں کے ساتھ رہتے ہیں اور مالک اپنے روم کا کرایہ وصول کرتا ہے، کیا یہ تجارت جائز ہوگی یا نہیں؟

الجواب وبالله التوفيق:

۱-''إشترى المسلم الفاسق عبدا أمر دوكان ممن يعتاد إتيان الأمرد يجبر على بيعه''(۱)۔

۲-''قوله (جاز) حمل خمر ذمي الخ قال الزيلعي: وهذا عنده، وقالا: هو مكروه، لأنه عليه السلام لعن في الخمر عشرة، وعد منها حاملها'' (۲)۔

۳-''قوله: وجاز إجارة بيت بسواد الكوفة، أي قرآها، الخ هذا عنده ايضاً، لأن الإجارة على منفعة البيت، ولهذا يجب الأجر بمجرد التسليم ولا معصية فيه، وإنما المعصية بفعل المستأجر وهو مختار فينقطع نسبته عنه، فصار كبيع الجارية ممن لايستبرئها أو يأتيها من دبر وبيع الغلام من لوطي۔ والدليل عليه أنه لو آجره للسكنىٰ جاز وهو لابد من عبادته فيه..... والمنقول في كثير من الفتاوىٰ أنه يكره، وهو الذي عولنا عليه في المختصر الخ'' (۳)۔

۴-''قوله: جاز تعمير كنيسة الخ قال في الخانية: و لو آجرنفسه ليعمل في الكنيسة ويعمرها لا بأس به، لأنه لا معصية في عين العمل''(۴)۔

ان عبارتوں سے چند باتیں معلوم ہوتی ہیں جو درج ہیں:

۱- گیسٹ ہاؤس کی تجارت جائز ہے بمقدمہ ۳ البتہ کسی شخص کے بارے میں علم ہو جائے کہ یہ شخص اجنبی عورت کو

۱- شامی ۵/ ۲۴۴۔
۲- فتاویٰ شامی ۵/ ۲۴۵۔
۳- شامی ۵/ ۲۵۱ مطبع بیروت۔
۴- شامی ۵/ ۲۴۵۔

بد اعمالی کے لیے لایا ہے یالائے گا، تو اس کو نہ دے کما ھو من مقدمتہ ا۔

۲-اگر جانتے بوجھتے دیا گیا تو گناہ ہوگا اور ان غلط کاموں کے لیے کمرہ کرایہ پر دینا ناجائز ہوگا اور ایسی صورت میں یہ کاروبار کرنا مکروہ تحریمی ہوگا بمقدمہ ۔

۳-گیسٹ ہاؤس کا ملازم شراب نہ لایا کرے، شراب لانے سے انکار کردیا کرے بمقدمہ ۲ اور بوجہ حدیث "لاطاعة لمخلوق فی معصیة الخالق "(۱) ملازم کو ہدایت کردی جائے کہ ان کے ایسے حکموں کو نہ مانا کرے۔

۴-گیسٹ ہاؤس کے دروازے پر یہ اعلان لگا رہنا چاہیے:

الف: اس گیسٹ ہاؤس کے اندر شراب لانا، منگانا، پینا اور نشہ کی حالت میں قیام کرنا منع ہے۔

ب: اس گیسٹ ہاؤس کے اندر کوئی ایسا کام کرنا یا کرانا جو شرعاً یا قانوناً ناجائز ہو منع ہے۔

۵-ان تمام باتوں کے باوجود جو کرایہ ملے گا وہ حرام وناجائز نہ ہوگا، اس لیے کہ ان ناجائز کاموں کے لیے کرایہ پر نہیں دیا ہے، البتہ جب ان مذکورہ باتوں پر پابندی نہ ہو سکے تو دوسرا جائز کاروبار تلاش کرنا لازم ہوگا اور مل جانے پر اس کا چھوڑ دینا ضروری رہے گا، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲/۲/۲۹ ۱۴۰۲ھ

مصنوعی حمل وتولید کے طریقوں کا حکم شرعی:

درج ذیل پیش آمدہ مسائل کے بارے میں کہ مصنوعی طریق حمل وتولید کے متعلق حکم شرعی سے آگاہ فرمائیں، جس کی مندرجہ ذیل صورتیں ہیں:

۱-ایک شخص کا مادۂ تولید لے کر بذریعۂ انجکشن عورت کے اندام نہانی کی اس مخصوص جگہ تک پہنچایا جاتا ہے جہاں مردوعورت کے مادۂ تولید کے اختلاط سے حمل کا استقرار ہوتا ہے، یہ سب اس لئے کیا جاتا ہے کہ کوئی مرد کمزوری یا کسی بیماری کے سبب اپنے مادۂ تولید کو اس خاص مقام تک نہیں پہنچا سکتا ہو۔

۲-دوسری صورت یہ ہے کہ کسی مرد اور اس کی بیوی کا مادۂ تولید لے کر رحم سے باہر ٹیوب میں حمل تیار کیا جاتا ہے اور پھر اس کو رحم میں منتقل کردیا جاتا ہے، اور بچہ کی تخلیق اس طرح عمل میں آجاتی ہے، یہ صورت ایسی عورت کے ساتھ اختیار کی

۱- مشکوۃ المصابیح/۳۲۱ کتاب الامارۃ والقضاء۔

جاتی ہے جس کی بچہ دانی تک جانے والی لائن بند ہو جانے کی وجہ سے استقرار حمل نہ ہوتا ہو۔

۳-تیسری صورت یہ ہے کہ کسی مرد کی ایک بیوی حمل اور زچگی کی سختیوں کے تحمل کی طاقت نہیں رکھتی، اس لیے ٹیوب میں تیار شدہ حمل کو اس کی دوسری بیوی کے رحم میں منتقل کر دیا جاتا ہے۔

۴-چوتھی صورت یہ ہوتی ہے کہ ٹیوب میں تیار شدہ حمل کی تکمیل کے لیے کسی غیر عورت کی بچہ دانی کو خرید اجاتا ہے، جو کہ معاوضہ وصول کر کے حمل اور زچگی کے فرائض انجام دیتی ہے اور اس کے بعد اس بچہ سے دست بردار ہو جاتی ہے۔

۵-پانچویں صورت یہ ہوتی ہے کہ ایسے لوگ جو علمی اور عقلی تجربات کے اعتبار سے امتیازی شان رکھتے ہیں، ان کے مادۂ تولید کو الگ الگ جمع کر لیا جاتا ہے، اس کے بالمقابل جن عورتوں کی نسل پسند ہوتی ہے ان کے مادۂ تولید سے استقرار حمل کا کام لیا جاتا ہے، تا کہ اچھے لوگوں کی نسل تیار کی جاسکے۔ اس صورت میں ایک شخص کے مرنے کے بعد بھی بچے پیدا کرنے کا سلسلہ اس کے مادۂ تولید سے چلتا رہتا ہے۔

۲-پوسٹ مارٹم کا حکم:

پوسٹ مارٹم کے متعلق حکم شرعی سے مطلع فرمائیں، جب کہ نعش کی حرمت اسی طرح برقرار رہتی ہے جس طرح زندہ انسان کی، اور زندہ اس طرح قطع و برید کو ناجائز قرار دیا گیا ہے، البتہ مندرجہ ذیل مصالح اس صورت میں پائے جاتے ہیں:

۱-اگر کسی شخص کی موت کا سبب معلوم نہ ہو تو تفتیش جرائم کا محکمہ یہ جاننے کی جد وجہد کرتا ہے کہ اس کی موت زہر کھانے سے ہوئی یا گلا گھونٹنے سے، یا ڈوب کریا اور کسی پوشیدہ سبب کے نتیجہ میں ہوئی، تا کہ ظالم کی شناخت کر کے اس کو سزا دی جائے، اس کی سرکوبی کی جائے، اور جرائم کی راہ مسدود ہو جائے۔

۲-دوسرا پہلو اس کا یہ بھی ہے کہ بسا اوقات کسی کا انتقال ہوا اور موت کا سبب معلوم نہ ہونے کی بنا پر ایک بے قصور شخص شبہ کی بنا پر گرفتار کر لیا جاتا ہے، لیکن نعش کے پوسٹ مارٹم کے بعد یقینی طور پر یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ مرنے والا طبعی موت مرا ہے یا اس نے خودکشی کی ہے، اس صورت میں وہ بے قصور شخص بچ جاتا ہے۔

۳-تیسری مصلحت یہ ہے کہ کوئی وبائی مرض پھیل جاتا ہے تو ڈاکٹر لوگ پوسٹ مارٹم کے ذریعہ اس بات کا پتہ لگاتے ہیں کہ اس کثرت اموات کے اسباب کیا ہیں، ان پر غور کر کے احتیاطی تدابیر اختیار کرتے ہیں۔

۴-چوتھی مصلحت یہ بھی ہوتی ہے کہ انسانی نعش کو کھول کر انسانی اعضاء کی ترکیب، ہڈیوں کے جوڑ، مختلف اعضاء کے درمیان تناسب وغیرہ کو اس مقصد اور غرض کے لیے دیکھتے ہیں، تا کہ بیماری اور اس کے اسباب اور طریق علاج پر عبور

حاصل کرسکیں وغیرہ وغیرہ۔

عبداللطیف قاسمی (سلطانپور شہر، یوپی)

الجواب وباللہ التوفیق:

۱-قرآن پاک میں ہے: ''إن الدین عند اللہ الإسلام'' (۱) یعنی دین صحیح صرف دین اسلام ہے، اسی طرح دین اسلام کو دین فطرت بھی فرمایا گیا ہے اور فطرت سے مراد فطرۃ سلیمہ ہے، کما أشار إلیہ قولہ علیہ السلام، ''کل مولود یولد علی الفطرۃ فأبواہ یھودانہ أو ینصرانہ أو یمجسانہ'' أو کما قالؐ (۲)، نیز حدیث پاک میں ہے ''الحیاء شعبۃ من الایمان'' او کما قالؐ (۳) اور ظاہر ہے کہ سوال ۱؎ کی پانچوں صورتیں انتہائی بے حیائی، بے شرمی، بے دینی اور فطرت سلیمہ کے خلاف اور گری ہوئی ہیں، علاوہ ازیں یہ طریقہ تخلیق بھی اختیاری نہیں، اور نہ کوئی اس کا دعویٰ ہی کرسکتا ہے کہ اس تدبیر سے یقیناً استقرار ہو ہی جائے گا، بلکہ ان سب کا نتیجہ خدا ہی کے حوالہ سب کرتے ہیں، پھر یہ فعل لغو لا طائل بھی ہوا، اور ''ألا لہ الخلق والأمر'' (۴) سے مزاحم بھی ہوا، اس لیے اس کی شرعاً ہرگز اجازت نہیں ہے، نیز اگر یہ طریقہ چلا تو انسانوں اور حیوانوں میں چند سے کچھ فرق نہ رہ جائے گا، اور ایک شیطانی طریقہ بن کر رہ جائے گا۔

۲-پوسٹ مارٹم آیت کریمہ: ''ولقد کرمنا بنی آدم'' (۵) کے صریح خلاف ہے، اور اس میں جو مصالح ومقاصد تحریر ہیں ان میں سے کوئی ایک بھی واجب التحصیل نہیں ہے، علاوہ ازیں اس میں انسان کو ننگا کرنا بھی لازم ہے جس کا حرام ہونا ظاہر ہے، علاوہ ازیں اور بہت سے دیگر شرعی مفاسد کا باب کھلتا ہے، اور بر سبیل تسلیم پتہ بھی لگ جائے کہ اس کی موت زہر وغیرہ سے ہوئی ہے، جب بھی ظالم یا مجرم کی تعیین نہیں ہوسکتی، اس لیے اس فعل کے ارتکاب کی شرعاً اجازت نہ ہوگی، اگر کوئی غیر مسلم کی نعش پر ایسا کرے یا کسی غیر اسلامی ملک میں ایسا کیا جائے تو یہ فعل حجت شرعی نہیں بن سکتا، اس لیے شرعاً اس

۱- سورۂ آل عمران: ۱۹۔
۲- صحیح البخاری ۱/ ۱۸۵ باب ما قیل فی اولاد المشرکین۔
۳- الصحیح للبخاری ۱/ ۶۔
۴- سورۂ اعراف: ۵۴۔
۵- سورۂ بنی اسرائیل: ۷۰۔

کی اجازت نہ ہوگی، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲/ ۸/ ۱۴۱۱ھ

الجواب صحیح حبیب الرحمٰن خیرآبادی، محمد ظفیر الدین مفتاحی، کفیل الرحمٰن

جاندار کی تصویر بنانے کا حکم اور بعض سرکاری قرض لینے کا حکم:

۱-کسی مسلمان کے پریس میں جاندار کی تصویر والے کاغذات چھاپنے کے لئے اگر ایسا طریقہ اختیار کیا جائے کہ اس پریس کے غیر مسلم ملازم کے ذمہ یہ کام سپرد کیا جائے اور یہ کہا جائے کہ تم اپنے خرچ سے اس کو چھپوا کر اس نفع کا خود لے لو اور وہ ملازم ایسا ہی کرے تو اپنے پریس میں ایسے کاغذات چھپوانے کی اجازت دینے کی وجہ سے پریس کا مالک گنہگار ہوگا یا نہیں؟ اس طریقے کے ایجاد کرنے واختیار کرنے کی وجہ یہ ہے کہ پانچ قسم کے کاغذات چھپوانے کے لیے ایک آدمی مثلاً آتا ہے۔ان میں سے صرف ایک کاغذ تصویر والا ہے اس کو چھاپنے سے انکار کردینے سے وہ آرڈر ہی یہاں سے نکل جائے گا، بلکہ کبھی اس کا کوئی آرڈر پھر یہاں نہیں آئے گا، اگر یہ طریقہ یا اس قسم کا کوئی صحیح طریقہ ہو تو بیان فرمائیں اس کے درست ہونے میں یہ بھی بتائیں کہ یہ طریقہ ہندوؤں کی مورتی والی رسید چھاپنے میں چلے گا یا نہیں؟

۲-موجودہ حکومت ہند مخصوص تعلیم یافتہ افراد کی سندیں لے کر ۵/ ۵/۳ ہزار روپے قرض کے طور پر دیتی ہے ان میں سے کچھ رقم دینے کے وقت ہی کاٹ کر رکھ لیتی ہے، تاکہ اگر یہ شخص قرض ادا نہ کر سکے تو خود بخود اس آٹھ ہزار روپے سے اور ان کے سود سے یہ قرض ادا ہو جائے گا، گویا سندوں کے بدلے یہ قرض حکومت دیا کرتی ہے، اگر یہ قرض ادا نہ کر سکے تو سند واپس نہیں ملے گی اور کوئی سرکاری ملازمت بھی نہیں ملے گی اسے سند بیچنا بھی کہا کرتے ہیں، مگر شرعاً یہ قرض مسلمان کے لیے لینا جائز ہوگا یا نہیں؟ کیونکہ سود کا حساب ادا کرنے کی صورت میں ہوتا یہی ہے اور اگر ادا کرنے کی نیت بالکل نہ کرے تب لے سکتا ہے یا نہیں؟

حق تالیف محفوظ کرنا:

۳-حق تالیف محفوظ کرنے کے جائز و درست ہونے میں حضرت مرحوم مفتی شفیع کا فتویٰ اور حضرت عبدالرحیم صاحب لاجپوری کا فتویٰ ہے اس میں مفتی بہ قول کیا ہے؟

الجواب وبالله التوفيق:

ا- اولاً یہ جاننا چاہئے کہ ذی روح چیز کی تصویر بنانا، خواہ قلم سے ہو یا دیگر آلات مثلاً فوٹو و پریس سے علی الاطلاق ناجائز نہیں، بلکہ اس میں تفصیل ہے۔

وہ یہ کہ ذی روح کی تصویر بنانا کبھی تو بالقصد والاختیار ہوتا ہے اور کبھی بلاقصد تبعاً بھی ان آلات میں ذی روح شے کی تصویر آجاتی ہے، مثلاً کسی مکان، باغ بازار یا محاذ جنگ کا فوٹو لینا ہے اور وہاں پر کثرت آمد و رفت کی وجہ سے سب انسانوں و جاندار چیزوں کو الگ کرنا اختیار میں نہیں ہوتا، تو ایسی صورت میں جو ذی روح کی تصویر کاغذ میں تبعا بلاقصد آجائے اس کا چھاپنا شرعاً جائز ہوتا ہے۔ کما یستفاد القاعدۃ الثانیۃ من الاشباہ والنظائر من قولہ: "الأمور بمقاصدها"۔

اسی طرح سر کٹی ہوئی ناقص وغیر مکمل تصویر بھی سر کٹنے کے بعد تصویر کے حکم میں نہیں رہتی، بلکہ نقوش اور بیل بوٹوں کے حکم میں ہوجاتی ہے، اس لئے اس کے استعمال کی اجازت کتب فقہ میں مصرح ہے: "فإن كانت مقطوعة الرأس فلا بأس بالصلوة فيه؛ لأنها بالقطع خرجت من أن تكون تماثيل و التحقت بالنقوش" (۱)، لہذا ایسی سر کٹی تصویر بنانا بھی شرعاً جائز رہے گا۔ نیز ذی روح کے وہ اعضاء جن پر مدار حیات نہیں ہوتا۔ مثلاً ہاتھ، پیر یا آنکھ، ناک وغیرہ کی تصویر بنانا بھی شرعاً جائز ہے، پس ذکر کردہ تینوں صورتیں شرعا جواز کی ہیں، لہذا مسلمان کا اپنے پریس میں اس طرح کی تصویریں چھاپنا شرعاً جائز ہوگا۔

البتہ ذی روح کی مکمل تصویر یا صرف نصف اعلی کی تصویر جس میں سر موجود ہو قصداً وبالاختیار خود چھاپنا مسلمان کے لئے جائز نہیں ہے اور اس عدم جواز اور شرعی قباحت سے بچنے کے لیے سوال میں ذکر کردہ طریقہ کہ ملازم غیر مسلم سے کہا جائے کہ وہ اپنے خرچ سے ذی روح تصاویر کاغذات چھاپ کر اس کا نفع خود رکھ لے اور مسلمان کے عمل کو اس میں کچھ دخل نہ ہو، چونکہ غیر مسلم قول محقق پر فروع کا مکلف نہیں ہوتا، اس لئے یہ طریقہ شرعاً جائز ہوگا۔

بلکہ اس سے اولی یہ ہے کہ مسلمان مالک پریس اندازہ کرلے کہ اس طرح کے کاغذات اس کی پریس میں کتنی دیر میں چھپ جائیں گے اور اندازہ کے مطابق اتنی دیر کے لئے اپنی پریس اس غیر مسلم ملازم کو اجارہ پر دے دے اور کرایہ کی ایک خاص مقدار اس غیر مسلم سے طے کرلے پھر وہ غیر مسلم اسی طرح اپنے خرچ سے چھاپ کر نفع خود لے کر مقررہ رقم اجارہ مالک پریس کو دیدے تو مسلمان مالک کو اس طرح معاملہ کرنا اور اتنی دیر کا اپنی پریس کا مقررہ کرایہ لینا بھی شرعاً جائز وحلال

۱- بدائع ۱/۱۱۶۔

رہے گا:

”كما يستفاد هذا الحكم من هذه العبارة ومن أجربيتا ليتخذ فيه نار أو كنيسة أو بيعة أو يباع فيه الخمر بالسواد فلا بأس (إلى قوله) وله أن الإجارة ترد على منفعة البيت، ولهذا تجب الأجرة بمجرد التسليم ولا معصية فيه، وإنما معصية بفعل المستأجر وهو مختار فيه فقطع نسبته عنه“(۱)، اور ظاہر ہے کہ یہاں حکومت اپنی نہیں، قانون بنانا اپنے اختیار میں نہیں اور اس ملک کے حالات سواد کوفہ سے بہتر نہیں، لہذا مذکورہ عبارت کے مطابق تحریر کردہ پریس کو کرایہ پر دینے کی صورت حضرت ابوحنیفہؒ کے نزدیک بلا تکلف جائز ہوگی، ہندوؤں کی مورتی اور ایسی چیزیں جن میں ان کے مذہب کی اشاعت وترویج ہو اگر ان سے بآسانی بچا جاسکے تو تحرز اولی ہے، ورنہ بصورت دیگر مذکورہ طریقہ کے مطابق اس کی بھی شرعاً گنجائش ہوگی۔

۲-صورت مسئولہ میں قرض لینے والا شخص اگر بہ نیت ادائیگی قرض لے اور قسط وار یا جیسے ادا کرنا طے ہوا ہو قرض ادا کرنے کی صورت میں قرض کی ادائیگی صرف اتنی رقم سے ہو جائے جتنی رقم اس نے قرض لی تھی اپنی طرف سے سود کے نام پر زائد رقم دینا نہ پڑے تو ادائیگی کی نیت سے اس طرح قرض لینا شرعاً جائز ہوگا اور اگر قرض کی ادائیگی میں کچھ زائد رقم اپنی طرف سے بھی دینی پڑے تو پھر بلا ضرورت شدیدہ قرض لینا جائز نہ ہوگا۔

اسی طرح عدم ادائیگی کی نیت سے بھی یہ قرض لینا جائز نہیں، اس لئے کہ اس کو سند بیچنا لوگ کہتے ہیں حقیقۃً یہ سند بیچنا نہیں، بلکہ قرض مع القید کی ایک صورت ہے اور عدم ادائیگی کی صورت میں خداع لازم ہے، لہذا عدم ادائیگی کی نیت سے لینا جائز نہ ہوگا۔

۳-حق تالیف محفوظ ورجسٹرڈ کرانے کا مسئلہ اجتہادی اور قیاسی ہے قرون اولیٰ میں نہ طباعت کا وجود تھا نہ طباعت کے ساتھ مالی منفعت متعلق ہونے کا تصور تھا، بلکہ یہ سب چیزیں بعد کو پیدا ہوئیں اور بعد کے علماء نے اجتہاد وقیاس سے اس کا حکم نکالا، اس لیے اس باب میں اکابر کی رائیں مختلف ہوگئیں، بعض نے حق تصنیف محفوظ کرنے کی مطلقاً اجازت دی، بعض نے علی الاطلاق اس کا انکار کیا، ہم نہ تو مطلقاً اس کو جائز سمجھتے ہیں، نہ ہی بالکلیہ ممانعت کے قائل ہیں، بلکہ ہمارے نزدیک اس میں تفصیل ہے۔

وہ یہ کہ وہ کتابیں جو علم دین سے متعلق نہیں، بلکہ علوم دینیہ کے سوا دیگر علوم وفنون ان میں مذکور ہوں، جبکہ ان کے

۱- ہدایہ مع الفتح ۸/ ۱۲۸۔

ساتھ مصنف کی مالی منفعت اور تجارتی مفاد وابستہ ہو تو ان کو ہر کس و نا کس کا بلا اذن مصنف طبع کرنا جائز نہیں، اس لئے کہ بعض افعال ایسے ہیں جو کہ اصل کے لحاظ سے مباح ہوتے ہیں، لیکن اگر ان کے کرنے میں کسی کی حق تلفی اور ضرر کا امکان ہو تو ان کی اباحت ساقط ہو جاتی ہے، مثلاً مسلمان عورت کو پیغام نکاح دینے کی ہر مسلمان مرد ہم کفو کو اجازت ہے، لیکن اگر کسی ہم کفو مسلمان نے پیغام دے دیا ہو اور اولیاء کا نکاح کے لیے رجحان ہو گیا ہو تو دوسرے مسلمان کے لیے یہ فعل مباح نہ ہوگا۔ کسی مصنف کی کتاب جو شب و روز کی عرق ریزی و محنت شدید کے بعد معرض وجود میں آتی ہے اس کے طبع کرنے کا پہلا حق خود مصنف کو ہے، اس لئے کہ اس کا مقصد مالی منفعت کا حصول ہے، اس لئے جب تک خود مصنف کا حق اس سے وابستہ ہے بغیر اس کی اجازت دوسرے کے لیے اس کا طبع کرنا جائز نہ ہوگا۔

البتہ کتب دینیہ جن سے دینی علوم وفنون کی اشاعت مقصود ہو اگر چہ مذکورہ علت کے اندر وہ بھی مشترک ہیں، لیکن دیگر نصوص کی بناء پر ان کا حکم دوسرا ہوگا اور ان کے چھاپنے پر پابندی عائد کرنا شرعاً روا نہ ہوگا۔ اس لیے کہ ان دینی کتب کے حقوق طبع محفوظ کر لینے اور ان کے چھاپنے پر پابندی لگانے سے حدیث "**فليبلغ الشاهد الغائب**" (۱)، اور دیگر وہ سب نصوص کی ایک طرح سے مخالفت لازم آئے گی اور شریعت کا منشاء فوت ہو جائے گا، اس لئے دینی کتب اس پابندی کی قید سے شرعاً مستثنیٰ رہیں گی۔ اور کوئی بھی شخص ان کو من وعن چھاپ لے تو گنہگار نہ ہوگا، البتہ خلاف کرنے پر حکم دوسرا ہوگا، ناجائز وحرام بھی ہو سکتا ہے۔

نوٹ: حقوق طباعت کے بارے میں احقر کی یہ آخری رائے ہے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دار العلوم دیوبند سہارنپور

گروپ ہاؤسنگ کا حکم:

آج کل عام طور پر شہروں میں گروپ ہاؤسنگ سوسائٹی قائم ہے۔ جس کی شکل یہ ہوتی ہے کہ چند افراد مل کر ایک سوسائٹی قائم کر لیتے ہیں اور اسے حکومت سے رجسٹرڈ کرا لیتے ہیں اس کے بعد دو چار سال یا کم وبیش مدت میں ڈی، ڈی، اے (D.D.A.) زمین کی قیمت لیکر سوسائٹی کو زمین الاٹ کر دیتا ہے، اس سلسلہ میں معلوم کرنا ہے کہ:

☆ سوسائٹی کے کچھ ممبر ابتدا ہی میں اپنی مرضی سے علیحدہ ہو گئے اور اپنی جمع شدہ رقم بھی واپس لے لی، لیکن بعض

۱- صحیح بخاری ۱/۵ ۲۳۔

ٹیکنیکل دشواریوں کی وجہ سے ان کا نام سوسائٹی سے خارج نہیں کیا جاسکا۔

☆ کچھ ایسے ممبر تھے جن کے نام ان کے دوستوں نے لکھوا دیئے تھے اور انہوں نے ہی ان کے حصے کی رقم بھی جمع کروادی اس توقع پر کہ ان سے رقم مل جائے گی، لیکن تقاضے کے باوجود انہوں نے نہ تو رقم دی اور نہ کبھی کسی میٹنگ میں شرکت کی اور نہ کوئی دلچسپی لی۔

سوسائٹی کے قیام کے تقریباً پانچ سال بعد زمین الاٹ ہونے سے قبل ہی سوسائٹی کے کچھ حصص منافع کے ساتھ فروخت کردیئے گئے، ان فروخت ہونے والے حصص میں مذکورہ بالا دونوں طرح کے ممبران کے حصے بھی شامل تھے، اس منافع کے مستحق مذکورہ بالا دونوں طرح کے ممبران ہوں گے یا سوسائٹی اور اس کے دوست؟ واضح رہے کہ اگر سوسائٹی کسی نقصان سے دوچار ہوجاتی تو مذکورہ بالا ممبران ہرگز کسی نقصان کو پورا کرنے کے ذمہ دار نہ ہوتے۔

الجواب وبالله التوفيق:

صورت مذکورہ میں جو ممبران اپنی مرضی سے علیحدہ ہوگئے اور اپنی جمع شدہ رقم بھی واپس لے لی، انہوں نے شرعاً اپنی شرکت ختم کردی، لہذا حصص کے منافع میں ان کا کوئی حصہ نہ ہوگا، اور جن ممبران نے اپنے کسی دوست کا نام شرکت میں لکھوایا تھا اور اپنی طرف سے پیسے بھی دیدیئے تھے، لیکن دوست نے نہ تو رقم دی نہ شرکت کی نہ کوئی دلچسپی لی تو وہ دوست بھی منافع کے حقدار نہ ہوں گے۔ جس ممبر نے پیسے لگائے ہیں وہی اس کے منافع کا بھی حق دار ہوگا۔ گویا اس کی ڈبل حصہ میں شرکت ہوئی ہے اور دوست کی شرکت سوسائٹی میں صحیح نہ ہوئی، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۳ محرم ۱۴۱۱ھ

الجواب صحیح: حبیب الرحمن خیرآبادی غفر اللہ عنہ، کفیل الرحمن غفر اللہ عنہ

ٹی وی پر خبریں سننا:

☆ مذکورہ حالات کے پیش نظر امام مسجد اور راقم اور دیگر حفاظ کرام ٹی۔وی۔ T.V. پر خبریں سن لیتے ہیں اس کے بارے میں مسائل سے نوازیں کہ شرعی خرابی تو سامعین پر عائد نہیں ہوتی، یعنی ٹی۔وی۔ پر خبریں سننا جائز ہے یا ناجائز؟

الجواب وبالله التوفيق:

☆ T.V. ٹی وی دیکھنے میں لامحالہ بہت سی ناجائز اور ممنوع چیزیں دیکھنی وسنی پڑتی ہیں، اس لئے کسی حال میں اس کی اجازت نہ ہوگی، بلکہ ان سب مصائب کا جو اصل علاج انابت الی اللہ ہے، اس کو اختیار کریں، کیونکہ یہ سب ہمارے ہی برے اعمال کا خمیازہ ہے، ورنہ قرآن پاک میں صریح نص ہے: "وأنتم الأعلون إن كنتم مؤمنين" (۱) (اگر تم کامل مومن ہو تو تم ہی سربلند رہو) جیسا کہ تجربہ بھی صدیوں ہو چکا ہے، پس ہر مسلمان کو اپنے اقوال وافعال کا جائزہ لینا چاہئے، اگر حق العباد تلف ہوا ہو اس کو ادا کریں، کچھ غصب یا چوری کیا ہو اس کو واپس کریں اور جو گناہ ہو گئے ہوں سب سے سچی پکی توبہ کریں تو حالت بدل جائے، صحیح حدیث قدسی ہے سرکار دو عالم ﷺ نے فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میں تمام بادشاہوں کا بادشاہ ہوں، تمام بادشاہوں کے قلوب میرے دست قدرت میں ہیں، جب میرے بندے میرے ساتھ اچھا معاملہ کرتے ہیں (یعنی ظاہر وباطن سے میرے حکم کے مطابق رہتے ہیں) تو میں بادشاہوں اور جو بادشاہوں کی جگہ میں ہوتے ہیں سب کے دل کو نرم کر دیتا ہوں اور پھر وہ میرے بندوں کے ساتھ خاص کر مسلمانوں کے ساتھ بہت اچھا اور نرم معاملہ کرتے ہیں، ورنہ ان کے دل کو سخت کر دیتا ہوں اور وہ بدترین عذاب ومزا چکھاتے ہیں۔ پوری حدیث مشکوۃ شریف میں بھی موجود ہے خود دیکھ لیجئے:

"عن أبي الدرداء قال قال رسول الله ﷺ: إن الله تعالىٰ يقول لا إله إلا أنا مالك الملوك وملك الملوك قلوب الملوك في يدى وأن العباد إذا أطاعونى حولت قلوب ملوكهم عليهم بالرحمة والرأفة، وأن العباد إذا عصونى حولت قلوبهم بالسخطة والنقمة فساموهم سوء العذاب فلا تشغلوا أنفسكم بالدعاء على الملوك لكن اشغلوا بالذكر والتضرع كئى أكفيكم" (۲)۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۷/۵/۱۴۱۱ھ

۱- سورۂ آل عمران: ۱۳۹۔

۲- مشکوۃ شریف ۲/۳۲۳ طبع سہارنپور۔

قرض کا مسئلہ اور ایک اشکال کا جواب :

مسئلہ قرض میں فتاویٰ شامی کی عبارت: ''وإن استقرض دانق فلوس أو نصف درهم فلوس ثم رخصت وغلت لم يكن عليه إلا مثل عدد الذي أخذه'' (۱)۔

نیز ''بدائع الصنائع'' کی عبارت: ''ولو استقرض فلوسا فكسدت فعليه مثلها عند أبي حنيفة'' (۲)،

نیز دوسری کتابوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ادائیگی قرض مثل ہی سے ہوگی، مثلاً سو روپیہ کسی نے قرض لیا تھا تو عند الاداء سو روپیہ ہی دینا پڑے گا، خواہ ادائیگی کے وقت سو روپیہ سے وہ چیز حاصل نہ ہو جو کہ قرض دیتے وقت حاصل ہوئی تھی، یعنی عند القبض سو روپیہ سے جو چیز ملتی تھی وہ عند الاداء دس لاکھ سے بھی ملنا مشکل کیوں نہ ہو، تب بھی سو ہی روپے ادا کرنا پڑے گا۔

لیکن نظام الفتاویٰ (ج ۱ صفحہ ۳۴۲ سوال نمبر ۸۵) کے جواب سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ قرض لینے کے زمانہ میں نوٹوں سے جتنی چاندی یا جتنا سونا ملتا ہے اتنی چاندی میں یا اتنے سونے میں جتنے نوٹ آج بوقت ادا ملیں اتنے ہی نوٹ دینے ہوں گے، اب ''فتاویٰ شامی'' اور دوسرے فتاویٰ کی کتابوں کی عبارت ''نظام الفتاویٰ'' کے جواب سے متضاد معلوم ہوتی ہے۔

نیز سرکاری طور پر روپیہ کی ویلیوکم وبیش ہو تو اس کا کیا حکم ہے؟ نیز ہندوستان میں اس مسئلہ، یعنی روپیہ کی ویلیوکم وبیش ہو تو کیا حکم ہے؟

الجواب وبالله التوفيق:

''نظام الفتاوی'' کی عبارت پر خلجان پیدا ہوا اور اس کو شامی و دیگر کتب وفقہ کی عبارت سے متضاد سمجھنے کا مبنی مسئلہ مبحوث عنہا کی پوری بحث نہ دیکھنے پر ہے، مسئلہ ہذا سے متعلق اگر ''ردالمحتار'' کے اس سارے صفحہ کو ہی دیکھ لیا جاتا تو یہ اشکال پیدا نہ ہوتا، نہ تضاد معلوم ہوتا۔ شامی کے اسی صفحہ کے آخر میں یہ عبارت بھی موجود ہے:

''ولم يذكر حكم الغلاء والرخص وقدمنا أول البيوع أنه عند أبي يوسف تجب قيمتها يوم القبض أيضا، وعليه الفتوى، كما في البزازية والذخيرة والخلاصة، وهذا يؤيد ترجيح قوله في الكساد أيضا'' (۳)۔

۱- ردالمحتار ۱/۴/۱۷۲۔
۲- بدائع ۷/۳۹۵۔
۳- شامی ۴/۱۷۳۔

جس کا حاصل یہ ہے کہ اگر دوشخصوں کے درمیان نقدین کے علاوہ سکہ نافقہ رائجہ پرقرض کا معاملہ ہو جس کو ثمن عرفی کی حیثیت حاصل ہے اور اس وقت اس کی ایک خاص قیمت ہے۔ اور بتراضی طرفین ادائیگی قرض کی ایک مدت متعین ہوئی۔ جب ادائیگی کا وقت آیا تو اس سکہ کی قیمت جو قرض کا معاملہ کرتے وقت تھی اس سے کم ہوگئی، مثلاً سو سکے قرض لئے جن کے بدلے بوقت قرض دو تولہ چاندی ملتی تھی بوقت ادائیگی ان کی قیمت گھٹ گئی اور اب اس جیسے سوسکوں کے بدلہ صرف ایک تولہ چاندی خریدی جاسکتی ہے تو اب مستقرض کے ذمہ دوسو سکے ادا کرنا لازم ہوں گے؟

سو حضرت امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک تو قیمت کا اعتبار نہ کرتے ہوئے مستقرض کے ذمہ صرف سو سکے واجب الاداء رہیں گے اور حضرت امام ابو یوسف یوم القبض کی قیمت کا اعتبار کرتے ہوئے اور دوسو سکے مقروض کو دینا ضروری قرار دیتے ہیں۔

حضرت امام ابو یوسف کا قول اس مسئلہ میں مفتی بہ ہے، جیسا کہ عبارت میں مذکور ہے اور فلوس نافقہ رائجہ کی طرح مروجہ نوٹ کی بھی ثمن عرفی کی حیثیت حاصل ہے، لہٰذا اس کا حکم بھی باب قرض میں مثل فلوس کے ہوگا اور یہاں بھی حضرت امام ابو یوسف کے قول پر فتوی دیا جائے گا۔

اسی کو بنیاد بنا کر ''نظام الفتاوی'' میں جواب تحریر کیا گیا ہے، امید ہے کہ اس بیان سے مسئلہ بخوبی ذہن نشین ہوجائے گا اور دونوں عبارتوں میں تضاد بھی معلوم نہ ہوگا، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۸/۱/۱۴۱۱ھ
الجواب صحیح: حبیب الرحمن عفا اللہ عنہ

فلاحی وخیراتی ادارہ کا حکم:

حیدرآباد (آندھرا پردیش) میں ایک فلاحی وخیراتی ادارہ ''طور بیت المال'' کے نام سے قائم ہے جو باضابطہ رجسٹرڈ ہے اور ادارہ کی کارکردگی اطمینان بخش ہے۔

بیت المال ضرورت مند مسلمانوں کی (بشرطیکہ بلحاظ قواعد قابل امداد ہوں) امداد کرتا ہے جس کی صورتیں مندرجۂ ذیل ہیں:

نادار طلبہ اور لڑکیوں کی شادیوں میں امداد، غیر مستطیع اموات کی تجہیز وتکفین، اتفاقی وقدرتی حادثوں کا شکار ہونے والے مجبور وحقدار افراد کی مدد، مساجد میں بغرض تعمیر وترمیم اعانت، مدارس دینیہ میں تعاون بغیر کسی رکنیت اور قدر کے عام مسلمانوں کو جاری کی جاتی ہیں، دفعتہً اشیاء کی کفالت پر قرضوں کا اجراء صرف مستقل ارکان کی حد تک محدود رکھا گیا ہے، جس

کا طریقہ کار حسب ذیل ہے:

۱- ماہانہ زراعانت جو چھ ماہ تک دیتے رہتے ہیں، ان کو مستقل رکنیت بعد تکمیل اقرارنامہ ادا کے زراعانت ماہانہ وپابندی دستور وقواعد دی جاتی ہے۔

۲- مستقل رکن کو ہی قرض حاصل کرنے کا حق دیا جاتا ہے تو اس سے سابقہ چھ ماہ کی زراعانت لیکر مستقل رکنیت دی جاتی ہے۔

۳- اگر کوئی شخص جو رکن نہ ہو اور مستقل رکنیت حاصل کرنا چاہتا ہو تو اس سے سابقہ چھ ماہ کی زراعانت لے کر مستقل رکنیت دی جاتی ہے۔

۴- رقمی گنجائش اور سہولیت کار کے لحاظ سے بیت المال ہر مستقل رکن کو ایک سو پچیس روپیہ کی حد تک قرض بکفالت اشیاء جاری کرتا ہے، لیکن کوئی زیادہ اشیاء سے ماہانہ بیت المال کو مستحکم کررہا ہو تو ایسے رکن کو مثلاً دو روپیہ ایثار کرنے والے رکن کو دوسو اور اسی طرح دس روپیہ یا اس سے زائد ایثار کرنیوالے ارکان کو ایک ہزار کی حد تک قرض دیا جاتا ہے۔

۵- ہر وہ شخص جو بیت المال کا رکن نہیں ہے لیکن وہ آج مستقل رکن بن کر قرض حاصل کرنا چاہتا ہے تو بیت المال اس سے سابقہ چھ ماہ کی اعانت حاصل کر کے مستقل رکنیت دے کر قرض جاری کرتا ہے۔

۶- اگر کوئی مستقل رکن دو روپیہ ماہانہ سے بیت المال کا تعاون کرتا ہے تو قواعد کے لحاظ سے اسے دوسو روپیہ کی حد تک قرضہ دیا جاسکتا ہے، لیکن اگر ایسے رکن کو پانچ سو روپیہ کی ضرورت پڑتی ہے تو بیت المال سابقہ چھ ماہ تین روپیہ کے حساب سے رقم حاصل کر کے اسے پانچ سو روپیہ قرض جاری کرتا ہے۔

۷- اگر قرض گیرندہ رکن نے ادائے اقساط یا ادائے کامل قرض کے وقت حسب معاہدہ ماہانہ زراعانت ادا نہیں کیا ہے، تو اس سے بقایا زراعانت وصول کر کے قرض کی اقساط وصول کی جاتی ہیں۔

۸- مرہونہ اشیاء کے گوداموں کا لوٹ وفسادات کے پیش نظر بیمہ کرادیا گیا ہے۔ قرض گیرندہ اگر اپنی اشیاء کو حفاظت مزید کے لئے داخل بیمہ رکھنا چاہتا ہو، وہ اپنی خوشی سے بحساب فی روپیہ قرض لیتے وقت بیمہ فیس بیت المال میں جمع کرتا ہے۔ قاعدہ لازم نہیں۔

مذکور طریقہ کار از روئے شرع جائز درست ہے یا نہیں۔ اور اگر کوئی چیز جائز نہ ہو تو اس کا متبادل حل تجویز فرما کر ممنون فرمائیں۔

قرض ۶۰ فیصد۔ مد محفوظ ۵ فیصد۔ اخراجات دفتر ۱۲ فیصد۔ امداد مستحقین ۵ فیصد۔ مساجد ۵ فیصد۔ مدارس ۲ فیصد۔ طلباء ۳فیصد۔ اموات ۲فیصد۔ معاشی فنڈ ۲فیصد۔ ملت فنڈ ۳فیصد۔

الجواب وبالله التوفيق:

۱ تا ۴ - ''طور بیت المال'' کا دستور اساسی اور سوال پیش نظر سب بغور پڑھا، جب ماہانہ زراعانت کی ممبری کا سلسلہ اور اعانتی قرض دینے کا سلسلہ دونوں الگ الگ ہیں۔ اور دونوں دو مستقل الگ الگ لائنیں ہیں، ایک دوسرے کے لئے شرط یا ایک دوسرے پر معلق نہیں ہیں تو دونوں کے نفس اباحت میں کوئی کلام نہیں۔

اور یہ ظاہر ہے کہ کوئی شخص یا کوئی ادارہ ہر انسان کو یا کسی ایک ہی شخص کو اسکی منہ مانگی ہر مقدار قرض نہیں دے سکتا، اس لئے اگر قرض دینے کے معاملہ میں حد شرع میں رہتے ہوئے کوئی ضابطہ مقرر کر لیا جائے یا کوئی تقیید وتحدید کر لی جائے تو اس کے مباح ودرست ہونے میں بھی کوئی کلام نہیں ہوسکتا۔

پس یہ قید لگانا کہ مثلاً ہم قرض صرف اسی شخص کو دیں گے جو ہمارا کم از کم چھ ماہ سے مستقل اعانتی ممبر ہوگا یا مثلاً یہ قید لگانا کہ صرف ۱۲۵ روپیہ تک قرض تو ہر مستقل ممبر کو علی الاطلاق دے سکتے ہیں۔ مگر جو شخص اس سے زائد مقدار میں قرض لینا چاہے اس کو ہم زیادہ سے زیادہ صرف ایک ہزار تک دے سکتے ہیں، اس سے زیادہ کسی کو نہیں دے سکتے، خواہ وہ دس روپیہ ماہانہ سے بھی زائد مقدار کا مستقل اعانتی ممبر کیوں نہ ہو، حتی کہ اگر سو روپیہ ماہانہ کا مستقل اعانتی ممبر ہوگا۔ جب بھی نہ دے سکیں گے تو اب چاہے دس روپے سے نیچے کے اعانتی ممبروں کے لئے یہ تفصیل ہو کہ دو روپے کو صرف دو سو تک اور تین سو تک اور تین روپے والے کو صرف تین سو تک دیں گے۔ وعلیٰ ہذا تو اس میں بھی کوئی شرعی قباحت نہ ہوگی، بلکہ محض انتظام کے طریقہ کے درجہ کی ایک چیز ہوگی، سود وربوا سے اس کا کوئی تعلق نہ ہوگا۔

۵و۶ - جو شخص اعانتی ممبر نہیں ہے اور وہ قرض لینا چاہتا ہے اس کے لئے یہ شرط لگانا کہ ۶ ماہ کا زراعانت پیشگی داخل کرو، تو قرض دیا جائے گا، یہ شرط اور یہ رقم (زراعانت کی) بیشک قرض کی وجہ سے بظاہر ہوگی اور ''كل قرض جر نفعاً فهو ربوا'' (۱) کے تحت داخل ہو کر یہ معاملہ ممنوع ہوگا اور یہ رقم حرام وناجائز ہوگی۔

اگر کوئی ایسا آدمی ہو جو قابل اعانت معلوم ہوتا ہو، اور بیت المال اس کو قرض دینا چاہتا ہو تو اس کی یہ صورت بھی

۱- قواعد الفقہ / ۱۰۳ اشرفی بکڈپو۔

ہوسکتی ہے کہ جتنے روپے اس کو دینے ہوں اتنے روپے کوئی قدیم مستقل اعانتی ممبر اپنے نام سے لیکر اس کو اپنی طرف سے دیدے، پھر باقساط یا یکمشت جس طرح بھی وہ مناسب سمجھے اس سے وصول کرتا رہے، البتہ اس شخص کو آئندہ ممبر بننے کی ترغیب دینے میں یا تحریض کرنے میں قباحت نہ ہوگی، بشرطیکہ اس پر کوئی دباؤ قرض کی وجہ سے نہ ہو، لہذا ان دونوں ممبروں میں اصلاح کی ضرورت ہے۔

۷- یہ صورت درست ہے۔

۸- اگرچہ شئے مرہون کی حفاظت بذمہ مرتہن ہوتی ہے، لیکن یہ خاص صورت حفاظت (بذریعہ بیمہ) لازم نہیں، بغیر بیمہ کے بھی یہ حفاظت کی ذمہ داری پوری ہوجاتی ہے، بلکہ خود بیمہ کی اجازت ہی انتہائی مجبوری (مثلاً فتنہ وفساد ملکی کی وجہ سے نقصان سے حفاظت کی کوئی صورت نہ ہو) کی وجہ سے ہوگی اور اس کا نفع خود بیت المال کو بھی ہوگا، اس لئے یہ اجرت راہن پہ لازم کی جاسکتی، ہاں راہن خود دینا چاہے تو مضائقہ نہیں گنجائش رہے گی، پس جب منجانب بیت المال لازم نہیں ہے تو اس اجرت میں اباحت کی گنجائش ہے۔

دستور بیت المال کے سلسلے میں ضروری ہدایات:

۱- صدقات واجبہ (جیسے زکوٰۃ فطرہ وغیرہ) واجب التملیک ہوتے ہیں، یعنی مستحق زکوٰۃ شخص کو بعینہ ان رقوم کا مالک بنادینا ضروری ہوتا ہے، بغیر اس کے ادائیگی صحیح نہیں ہوتی، اور نہ ذمہ ہی بری ہوتا ہے، لہذا ایسی رقوم کو تجہیز وتکفین یا تعمیر وغیرہ یا کسی بھی کام کے عوض میں دیدینا یا لڑکیوں کی شادی یا طلباء کی فیس وغیرہ میں اس طرح دے دینا کہ ان کی ملک وقبضہ میں یہ رقوم بعینہ نہ پہنچیں جائز نہ ہوگا، اگرچہ یہ لوگ نادار ہی کیوں نہ ہوں، جیسے ان کے شادیوں میں آنے والے مہمانوں کے کھانے وغیرہ میں خود خرچ کردینا ان طلباء کی فیس خود ادا کردینا۔

بلکہ اس طرح خرچ کرنا ضروری ہوگا کہ یہ رقم بعینہ ان کی ملک وقبضہ میں ان کے اولیاء جو مستحق زکوٰۃ ہوں ان کی ملک وقبضہ میں پہنچ جائیں، جیسے یہ رقوم خود نہ خرچ کریں، بلکہ ان ہی کو دیدیں یا حیلۂ تملیک کے بعد مذکورہ تمام مصارف (تعمیر وتکفین وغیرہ وغیرہ) میں صرف کردینا درست ہے، "**ویشترط أن یکون الصرف تملیکا لا إباحة، کما مر لا یصرف إلی بناء نحو سجد ولا إلی کفن میت وقضاء دنبه**" (۱)۔

۲- دستور صفحہ ۳۳ کے نمبر (۱۸) کی ترمیم ضروری ہے، راہن ومالک اشیاء کو بھی پہلے ادائیگی قرض یا انفکاک رہن

۱- درمختار ۲۹۱/۳ کتاب الزکاۃ باب المصرف۔

کے لئے ایک مناسب مدت متعین کردیں اور یہ اطلاع دینی ضروری ہوگی، مدت کے اندر ادائیگی نہ ہوگی تو ہم خود فروخت کر دیں گے، پھر جب اس متعینہ مدت میں علم واطلاع کے باوجود انفکاک یا ادائیگی قرض نہ کرے تو اب قرض میں کمیٹی کو فروخت کردینے کا حق ہوجائے گا، بغیر اس کے اس کا حق نہ ہوگا، اگر کردیں گے تو عند اللہ ماخوذ ہوں گے اور عند الناس سبب بدنامی اور باعث تہمت بھی ہوسکے گا۔

۳- صفحہ ۳۶ کے نمبر (۶) کی ترمیم مثل نمبر (۱۸) کے ضروری ہے۔

۴- صفحہ ۳۹ کے نمبرات (۷، ۸، ۹ و ۱۰) کی ترمیم بھی ضروری ہے۔

یہ اجرت رقم وصولی میں سے لینے کے بجائے بالمقطع متعین ومقرر ہونا ضروری ہے، البتہ بغرض ہمت افزائی وتحریض عاملین یہ کرسکتے ہیں کہ کم سے کم مقدار وصولی کی ایک حد (مثلاً تین ہزار سالانہ یا چار ہزار سالانہ) متعین کرکے اس سے زائد مقدار وصولی پر عامل کو اس کے کام ومحنت کارکردگی کے تناسب سے اس کی بالمقطع مقررہ اجرت کا دس فیصد یا بیس فی صد یا جو نسبت مناسب ہو بطریق انعام دینے کا قانون بنادیا جائے تو یہ درست رہے گا۔

۵- صفحہ ۳۹ کا نمبر (۱۱) درست ہے۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دار العلوم دیوبند سہارنپور ۱۹/۹/۱۴۰۳ھ

آسٹریلیا کے بعض نئے حالات کا حکم:

جیسا کہ آپ کو علم ہوگا کہ آسٹریلیا ایک مغربی تہذیب کا ملک ہے جہاں مسلمانوں کی تعداد بہت کم ہے، عیسائی زیادہ ہیں چند مسائل معلوم کرنے ہیں جو حسب ذیل ہیں۔

۱- یہاں عموماً مکانات کا کرایہ بہت زیادہ ہے اور مکانات کی قیمت بھی زیادہ ہے اکثر لوگ بینک سے سودی رقم لے کر مکانات خریدتے ہیں۔

۲- اگر کوئی شخص اس طرح مکان خریدے کہ اصل قیمت وہ شخص ادا کرے اور سود کا پیسہ وہ کمپنی جس میں وہ شخص کام کرتا ہے ادا کردے تو کیا یہ جائز ہے یا نہیں۔

۳- اگر کوئی شخص مکان اس طرح خریدے کہ بات کرلے کہ مثلاً قیمت دس سال کے اندر تھوڑا تھوڑا ادا کردے گا، اور آج کی قیمت کے مقابلہ میں دس سال بعد جو قیمت ہوگی، (اندازہ سے) اس پر معاملہ طے ہوجائے، اور ہر ماہ معینہ رقم ادا

کی جائے ،یا مکانات کی قیمت چاہے گھٹے یا بڑھے۔

۴- یہاں عموماہر طرح کا انشورنس کرایا جاتا ہے،مثلا کار، مکان، ڈاکٹر کا زندگی کا وغیرہ وغیرہ مثلا کار کا انشورنس اگر نہ کرایا اور خدانخواستہ ایکسیڈنٹ ہوگیا تو اس حال میں اپنی کار کی مرمت کے علاوہ دوسرے کی کار کی مرمت یا بعض مرتبہ پوری کار کی قیمت دینی پڑتی ہے کار کی قیمتیں یہاں کافی ہوتی ہیں، لاکھ سے دس لاکھ تک کی کاریں ہوتی ہیں اگر انشورنس ہوتو کمپنی ادا کرے گی، اسی طرح اگر انشورنس نہ کرائے تو ڈاکٹر کے یہاں جانے کی الگ فیس ہے اور اگر خدانخواستہ بیماری آئی اور آپریشن کرنا پڑا تو کافی خرچہ ہوتا ہے، بعض مرتبہ اچانک کوئی بات پیش آجاتی ہے، اگر انشورنس نہ ہوتو آدمی کو کہیں نہ کہیں سے پیسہ ادا کرنا ہی ہوگا چاہے کار یا گھر بیچ کر ادا کرے، اگر انشورنس ہے تو کمپنی ادا کرتی ہے۔

الف-کار انشورنس جائز ہے یا نہیں؟

ب- ہیلتھ کا انشورنس جائز ہے یا نہیں؟

ت-لائف انشورنس جائز ہے یا نہیں؟

ث- کمپنی میں کام کرنا اور اس کی آمدنی جائز ہے یا نہیں؟

۵- یہاں بعض کمپنیاں اپنے سامانوں کی فروخت بڑھانے کے لئے ایک طریقہ یہ اختیار کرتی ہیں کہ مثلا کسی شخص نے صابن خریدا، صابن کے خالی پیکٹ (جس میں صابن لپٹا ہوتا ہے) نکال کر اپنا نام و پتہ کاغذ پر لکھ کر کمپنی کو بھیج دیا جاتا ہے، ہزاروں لاکھوں لوگ بھیجتے ہیں، پھر قرعہ اندازی سے کمپنی انعام دیتی ہے، مثلا کار، گھڑی وغیرہ وغیرہ کہ جس کا پہلا نام نکل آیا اس کو کار دوسرے نام پر گھڑی وغیرہ اس طرح کا انعام لینا جائز ہے یا نہیں؟

۶- بعض مرتبہ حالات نمبر ۵ جیسے ہوتے ہیں، لیکن اس میں کمپنی کا سامان خریدنا ضروری نہیں ہوتا ہے، صرف فارم پر نام و پتہ لکھ کر بھیج دیں ایسی حالت میں اگر نام نکل آئے تو انعام لینا جائز ہے یا نہیں؟

۷- بڑی کمپنیاں ایسا کرتی ہیں کہ اگر آپ ان کے سامان خریدیں تو ایک ٹکٹ دیتی ہیں اس ٹکٹ کو کھولنے پر اندر چارخانوں میں نمبر ہوتے ہیں اگر تین نمبر ایک جیسے ہی ہوں تو اس نمبر کے برابر روپیہ انعام میں دیتی ہیں یہ جائز ہے یا نہیں؟

الجواب وبالله التوفيق:

۱- یہ سمجھئے کہ انسان کی بنیادی ضرورتیں تین (۳) ہیں: (۱) طعام (کھانا) (۲) کسوہ (کپڑا) (۳) سکنی (مکان)

باقی ضرورتیں اس کے بعد کی ہیں، لہذا اسکنی اہم بنیادی ضروریات (حاجات) میں سے ہے، پس اگر اس کے پاس مکان نہیں ہے تو وہ قرض لے کر بھی شرعاً بنوانے کا مجاز ہوگا، اور اگر احتیاج ہو اور غیر سودی قرض نہ ملے تو سودی قرض بھی لیکر بقدر ضرورت بنوا سکتا ہے۔ کما یؤخذ من هذه العبارة: ''ویجوز للمحتاج الاستقراض بالربح''(۱) قبیل مقصد: ''الضرورات تبیح المحظورات(۲)۔

۲- ایسی حاجت ضرور یہ کے وقت جائز ہے اور جواب نمبر ۱ اہون واسلم ہے۔

۳- یہ صورت پہلی دونوں سے اہون واسلم ہے اور بے داغ درست ہے۔

۴- قانونی مجبوری کے تحت اور اس نمبر میں لکھی ہوئی مجبوریوں ومعذوروں کے ماتحت الف تا ت، سب انشورنس کی گنجائش ہے، بلکہ حسب ضرورت بھی ہوسکتا ہے۔

ث- کے جواب میں یہ تفصیل ہوگی کہ حتی الوسع کمپنیوں میں اس کام کے لئے ملازمت نہ کی جائے اور ان کا کام بھی محض بوجہ ضرورت اور بقدر ضرورت ہی کیا جائے، پھر تقوی واحتیاط کی بات یہ ہوگی کہ قرض لے کر کام کیا جائے اور اس کی تنخواہ وآمدنی کو قرض میں دے دیا جائے، اب اگر انشورنس کے کام کے علاوہ اور کسی کام کی ملازمت کمپنی میں کرے تو یہ ملازمت اور اس کی تنخواہ سب بلاریب حلال ودرست رہے گی۔

۵- یہ جائز ہے اور انعام ہے اس کو اپنے مملوک کی طرح ہر کام میں خرچ کر سکتے ہیں۔

۶- یہ بھی انعام وجائز ہے۔

۷- یہ بھی انعام وجائز ہے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

اسلامک سنٹر میں کون کون سے کام کر سکتے ہیں؟

نوٹ سوال بہت طویل تھا اس کا خلاصہ درج ذیل ہے:

امریکہ کی دارالحکومت شہر نیویارک میں دنیا کے متعدد ملکوں کے مختلف الخیال ومختلف المذاہب مسلمانوں نے ایک

۱- الاشباہ والنظائر ر ۹ ۱۴۔

۲- الاشباہ والنظائر مع الحموی ر ۱۴۰ طبع دارالعلوم دیوبند۔

اسلامی مرکز (اسلامک سنٹر) کے نام تعمیر کرایا ہے، جو دو منزلہ عمارت پر مشتمل ہے بالائی منزلے پر نماز کے لئے ایک ہال اور لائبریری اور اسلامی تعلیم کے لئے دو کمرے ہیں، نچلی منزل میں ایک سماجی ہال، عورتوں مردوں کے لئے الگ الگ بیت الخلا وضوخانہ، باورچی خانہ اور اسٹور روم بنا ہوا ہے۔

نچلی منزل سماجی ہال کے استعمال کے سلسلہ میں اجلاس عام میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ اس مرکز اسلامی عمارت کا استعمال قرآن وسنت کے خلاف نہیں کیا جا سکتا ہے بعد میں اس میں اختلاف ہوگیا ایک فریق طے شدہ فیصلہ کی موافقت کرتا ہے اور دوسرے فریق کا خیال ہے کہ اس سینٹر میں ایسی کسی بھی تقریب کی اجازت نہیں ہونی چاہئے جس میں علاقہ کے سارے مسلمانوں کو دعوت نہ دیجائے۔

اسی طرح ایک باہمی نزاعی مسئلہ یہ بھی ہے کہ مختلف ملکوں کے رہنے والے ایک فریق کا یہ کہنا ہے کہ اس ہال کو قومی تقریبات کے لئے استعمال نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ اس سے عصبیت کے پھیلنے کا اندیشہ ہے اور فریق ثانی اس کے خلاف یہ کہتا ہے کہ وطن سے محبت ایک فطری امر ہے، لہذا اس پر کسی کو اعتراض کا حق نہیں ہوتا۔

غرض مختلف الخیال لوگوں کے ہونے کی وجہ سے چند جزیات میں باہمی اختلاف ہے جس کی تفصیل مندرجہ ذیل سوالات میں ہے۔

مسعود لودانی سکریٹری مرکز اسلامی علاقہ مرکزی نیویارک ریاست ہائے متحدہ (امریکہ)

الجواب وباللہ التوفیق:

سارا مضمون پڑھا جب ہر مکتب فکر کی اس سینٹر میں شمولیت ہے تو ہر مسلمان کے جذبات کی کتاب وسنت کی حدود میں رہتے ہوئے رعایت کرنا بھی ضروری ہوگیا اور ہر اس کام کی اجازت ہوگی جو کتاب وسنت کے منافی نہ ہو اور کسی فریق یا فرقہ کے جذبات کو اس سے ٹھیس نہ لگے اور آپس میں تشتت وافتراق یا اختلاف کے پیدا ہونے یا بڑھنے کا باعث نہ بنے، نیز جو کام بھی اس میں کیا جائے انتظامی مصلحت کے ماتحت اور سنٹر کی انتظامیہ کی نگرانی اور انتظام کے تحت ہونا چاہئے (۱)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۸/۸/۱۴۰۰ھ

۱- ''فی حدیث علیؓ مرفوعاً: وقال لا طاعة فی معصیة الله، إنما الطاعة فی المعروف'' (صحیح مسلم کتاب الامارہ حدیث ۱۸۴۰/۳۹) ''وعن أبی هریرةؓ أن رسول الله ﷺ قال: لا تحاسدوا، ولا تباغضوا، ولا تجسسوا، ولا تحسسوا، ولا تناجشوا،

سماجی ہال کا استعمال ڈنر، کھیلوں کے مقابلے، سمینار، میلاد النبی وغیرہ مختلف کاموں کے لئے درست ہے یانہیں؟

نوٹ: سول کے ہرنمبر کا جواب اسی سوال کے سامنے مختصر مختصر لکھ دیا گیا ہے۔

سوالنامہ حصہ اول:

کیا علاقہ کی مسلم آبادی اسلامی سنٹر کے سماجی ہال کو درج ذیل تقاریب کے لئے استعمال کرسکتی ہے؟

سوال: ۱۔ عیدڈنر (عیدملن پارٹی)؟

جواب: ہاں (۱)۔

۲۔ سالانہ ڈنر؟

جواب: ہاں (۲)۔

۳۔ اجتماعی طعام؟

جواب: ہاں

۴۔ اسلامی تحاریک کے لئے فنڈ جمع کرنے کی غرض سے منعقد کئے جانے والے ڈنر؟

جواب: ہاں

۵۔ علاقہ سے جانے والے مسلمانوں کے اعزاز میں الوداعی دعوتیں؟

جواب: ہاں

۶۔ کھیلوں کے مقابلے یا ٹورنامنٹ؟

جواب: ہاں بشرطیکہ نماز کی ادیگی میں اس سے سستی نہ ہو (۳)۔

وكونوا عباد الله إخوانا، وفي رواية قال لا تهجروا (أي لا تكلموا بالهجر وهو الكلام القبيح)" (صحیح مسلم کتاب البر والصلۃ حدیث ۲۹/ ۲۵۶۳)۔

۱- کراہت سے خالی نہیں، غیروں کی نقل ہے مثلاً ہولی ملن پارٹی وغیرہ، حدیث میں ہے: "من تشبه بقوم فهو منهم" (سنن ابوداؤد ۴/ ۴۴ حدیث: ۴۰۳۱)۔

۲- کراہت سے خالی نہیں، غیروں کی نقل ہے حوالہ بالا۔

۳- "وكره كل لهو أي كل لعب وعبث..... والإطلاق شامل الفعل واستماعه كالرقص، والسخرية والتصفيق..... فإنها كلها مكروهة لأنها زي الكفار" (الردالمحتار علی الدرالمختار ۹/ ۵۶۶)، وفي الحديث: كل ما يلهو به الرجل المسلم باطل إلا رميه

۷۔ اسلامی کتب کی نمائش؟

جواب: ہاں

۸۔ اسلامک سنٹر کا جنرل باڈی اجلاس جس میں تمام مسلمانوں کے بجائے صرف ارکان کو ووٹ دینے کا حق ہے۔

جواب: ہاں

۹۔ سیمنار اور تقاریر؟

جواب: نہیں اس لئے کہ اس میں تخریبی پہلو غالب ہے نیز زہر پر شہد لپٹی ہوئی گولی کی طرح ہے (۱)۔

۱۰۔ میلادالنبی۔عاشورا،معراج وغیرہ کی تقریبات وشب بیداری؟

جواب: ہاں بشرطیکہ حقیقت وحیثیت مسئلہ واضح کردیا جائے اور غلط وموضوع روایات نہ بیان کی جائیں، بلکہ صرف صحیح روایات بیان کی جائیں (۲)۔

(۱۱) کیا غیر مسلموں کو ان تقریبات میں شرکت کی دعوت دی جاسکتی ہے۔

جواب: ہاں

سوالنامہ حصہ دوم

کیا کوئی مسلمان سنٹر کے سماجی ہال کو مندرجہ ذیل مقاصد کے لئے استعمال کرسکتا ہے

سوال -۱

۱۔ نکاح؟ جواب ہاں

۲۔ ولیمہ جواب ہاں

۳۔ عقیقہ؟ جواب ہاں

سوال نمبر ۲ کیا قرآن وسنت کی روشنی میں میزبان پر یہ لازم ہے کہ وہ علاقہ کے تمام مسلمانوں کو مدعو کرے، (اس

بقوسه وتاديبه فرسه وملاعبته أهله فإنهن من الحق" (سنن الترمذی ۴/ ۱۷۴ کتاب فضائل الجہاد باب ماجاء فی فضل الرمی حدیث ۱۶۳۷)۔

۱- علی الاطلاق ممنوع نہیں کہا جاسکتا، جیسا کہ اگلے سوال کے جواب سے یا قومی دلچسپی کے موضوعات پر تقاریر وسیمنار کے جواب سے ظاہر ہے۔

۲- حدیث میں ہے: "من كذب علىّ متعمداً فليتبوأ مقعده من النار" (مقدمہ صحیح مسلم حدیث ۳/ ۳) امام نووی لکھتے ہیں: "يحرم رواية الحديث الموضوع على من عرف كونه موضوعاً أو غلب على ظنه وضعه، فمن روى حديثاً علم أو ظن وضعه ولم يبين حال روايته فهو داخل في هذا الوعيد مندرج في جملة الكاذبين على رسول الله ﷺ" (شرح النووی لصحیح مسلم ۱/ ۷۱)۔

علاقہ میں مسلمانوں کی مجموعی تعداد چار سو سے زائد ہے)

جواب: اگر سب کو بیک وقت نہیں مدعو کر سکتے تو باری باری مدعو کیا جائے کبھی کسی خطہ کے لوگوں کو اور کبھی کسی خطہ کے لوگوں کو (۱)۔

سوال نمبر ۳: کیا کوئی مسلمان ساجی ہال کو مندرجہ ذیل مقاصد وتقریبات کے لئے استعمال کر سکتا ہے۔

(۱) بچوں کی رسم بسم اللہ؟ (قرآن پڑھنے کا آغاز)

الجواب: ہاں

(۲) بچوں کا ختم قرآن

الجواب: ہاں

(۳) ایصال ثواب کی غرض سے قرآن خوانی؟

جواب: ہاں بشرطیکہ بطور اجرت کچھ دینے لینے یا کھلانے پلانے کا دستور نہ ہو (۲)۔

(۴) بچوں کی سالگرہ؟

جواب: نہیں یہ طریقہ شریعت مطہرہ میں غیروں کا ہونے کی وجہ سے ناپسندیدہ ہے (۳)۔

(۵) BABUSHOWER یہ ایک امریکی رسم ہے جس کے مطابق حاملہ عورت کو بچے کی پیدائش سے پہلے تحائف دیئے جاتے ہیں اسے نومولود کے لئے تحائف کی بارش بھی قرار دیا جا سکتا ہے؟

جواب: نہیں۔ یہ بھی شرعی چیز نہیں، بلکہ غیروں کی رسم کی اتباع ہے اسلئے شریعت کے نزدیک غیر مستحسن ہے، نیز ھدیہ وتحفہ وصدقہ سب کی شرائط کے خلاف ہے نام ونمود غالب ہے (۴)۔

۱- تاکہ کسی کی دل شکنی نہ ہو اور انتشار واختلاف سے محفوظ رہیں۔

۲- ''فالحاصل أن ما شاع في زماننا من قراءۃ الأجزاء بالأجرۃ لا يجوز، لأن فيه الأمر بالقراءۃ وإعطاء الثواب للآمر والقراءۃ لأجل المال، فإذا لم يكن للقاري ثواب لعدم النية الصحيحة، فأين يصل الثواب إلى المستأجر''(رد المحتار علی الدر المختار ۹/ ۷۷)۔

۳- "عن ابن عمرؓ قال: قال رسول اللہ ﷺ: من تشبه بقوم فهو منهم"(سنن ابوداؤد ۴/ ۴۴، کتاب اللباس باب فی لبس الشہرۃ حدیث ۴۰۳۱)۔

۴- جیسا کہ حوالہ گزر چکا "من تشبه بقوم فهو منهم" نیز حدیث میں یہ بھی وارد ہے" من أحدث في أمرنا هذا ما ليس منه فهو رد"، اس کی تخریج بھی گزر چکی۔

سوال ۔۴ کیا کوئی مسلمان ساجی ہال کو علاقہ سے جانے والے کسی مسلمان کے اعزاز میں الوداعی دعوت کے لئے استعمال کرسکتا ہے؟

جواب: ہاں

(حصہ سوم) تنظیموں کی جانب سے منعقد کئے جانے والے پروگرامات:

کیا مسلمانوں کے مختلف گروپ مثلاً عرب مسلم ایسوسی ایشن ترکی اسلامی گروپ پاکستان ایسوی ایشن ۔وغیرہ سنٹر کے ساجی ہال میں مندرجہ ذیل پروگرام منعقد کرسکتے ہیں

(۱) قومی دلچسپی کے موضوعات پر تقاریر وسیمینار

الجواب: ہاں بشرطیکہ کوئی ایسی بات نہ بیان کی جائے جس سے دوسری قوم کے جذبات کو ٹھیس لگے یا اختلاف بڑھنے کا سبب بنے، اور اگر مذہبی سیمینار ہوں تو اس کو ہم پہلے منع کر چکے ہیں۔

(۲) اجتماعات جن میں عام طور سے ملک کی مشہور شخصیتوں کو مہمان مقرر کر کے مدعو کیا جاتا ہے۔

الجواب: ہاں بشرطیکہ اس کے اعزاز میں کھانے پینے میں یا اور کسی متعلقہ کام میں کسی حرام وناجائز چیز کا استعمال یا ارتکاب نہ ہو(۱)۔

(۳) یوم اقبال، یوم انقلاب یوم جہاد رمضان یوم جمہوریہ وغیرہ کا انعقاد

الجواب: ہاں انہیں شرطوں کے ساتھ جو ابھی اوپر کے دونمبروں میں بیان کی گئیں۔

(۴) مشاعرہ (فحش اور بیہودہ شاعری سے اجتناب)

الجواب: ہاں بشرطیکہ صرف علمی واخلاقی وسنجیدہ مضامین پر مشتمل اشعار ہوں (۲)۔

(۵) قومی زبانوں میں درس قرآن درس حدیث اور تفاسیر کا مطالعہ

۱- ''ولا يسقي أباه الكافر خمراً ولا يناوله القدح ويأخذ منه ولا يذهب به إلى البيعة ويرده عنها ويوقد تحت قدره إذا لم يكن فيها ميتة أو لحم خنزير ولايحضر المسلم مائدة يشرب فيها خمر أو تؤكل ميتة، كذا في الفتاوى العتابية" (فتاوی عالمگیریہ ۳۴۱/۵)۔

۲- ''عن عمرو بن الشريد عن أبيه قال: ردفت رسول الله ﷺ يوما، فقال: هل معك من شعر أمية بن أبي الصلت شيئاً قلت: نعم، قال: هيه، فأنشدته بيتا، فقال: هيه، ثم أنشدته بيتا، فقال: هيه حتى أنشدته مائة بيت " (صحیح مسلم کتاب الشعر حدیث ۲۲۵۵/۱) ''وفي رواية قال: لقد كاد يسلم في شعره''، نیز ایک حدیث میں مروی ہے: ''لأن يمتلئ جوف الرجل قيحا يريه خير من أن يمتلئ شعراً'' (صحیح مسلم کتاب الشعر حدیث ۲۲۵۷/۷)۔

الجواب: ہاں بشرطیکہ اصحاب خیر القرون کے ذوق مزاج کے مطابق اور اس کی اتباع کے ساتھ ہو اور کہیں سے بھی خود رائی نہ ٹپکتی ہو۔

(۶) قومی زبانوں میں اسلامی لٹریچر کی تقسیم

الجواب: ہاں اسی قید کے ساتھ جو ابھی اوپر ذکر کی گئیں۔

نوٹ یہ ساری چیزیں جنکی اجازت دی گئی ہے وہ بھی سنٹر کی انتظامیہ کی نگرانی اور انتظام کے تحت ہونا ضروری ہے کوئی شخص از خود نہ کرے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۲/۱۲/۱۴۰۰ھ

کسی کی آمد پر شیرنی ڈالنا:

۱-فاطمہ کا بھائی یا بیٹا یا باپ دور کے سفر سے آتا ہے یا سفر میں جاتا ہے تو فاطمہ اس اپنے بھائی یا بیٹے یا باپ پر شیرینی ڈالتی ہے اگر شیرینی زمین پر گرتی ہے اسے بچے اٹھاتے ہیں فاطمہ کا یہ عمل شریعت کی رو سے کیا حیثیت رکھتا ہے حرام ہے؟ مکروہ تنزیہی ہے؟ مکروہ تحریمی ہے؟ یا کیا

اور فاطمہ اس عمل کی وجہ سے گنہگار ہوگی یا نہیں اور اس کا باپ یا بھائی بھی گنہگار ہوگا کہ نہیں یاد رہے کہ فاطمہ یہ عمل اظہار خوشی کے لئے کرتی ہے۔

۲-یہی صورت شادی بیاہ کے موقعہ پر کرتی ہے تو کیا حکم ہے؟

۳-یہی عمل غیر محرم عورت کرے تو کیا حکم ہے براہ کرم جواب عام فہم اور بالتفصیل ہو۔

محمد حسین

الجواب وباللہ التوفیق:

۱- اس کو شرعی حکم سمجھ کر کرتے ہیں یا ضروری سمجھتے ہیں تو ناجائز ہے اور اگر اس عمل کو موثر سمجھتے ہیں تو شرکیہ عمل کو بھی متضمن ہوجائے گا اور قطعاً حرام ہوجائے گا ورنہ اسراف ہوکر ناجائز رہے گا(۱)۔

۱- ''یا بنی آدم خذوا زینتکم عند کل مسجد وکلوا واشربوا ولا تسرفوا إنه لا یحب المسرفین'' (سورہ اعراف:۳۱)۔

۲-اس کا یہی حکم ہے جو جواب نمبر ا کا ہے۔

۳-اوپر لکھے ہوئے کے علاوہ اس میں حرمت اور شدت اور بڑھ جائے گی اور اگر سب باتیں ان باتوں کے خیال کے بغیر محض قدیم رسم جاری کی بناء پر کرتے ہیں تو یہ رسوم جاہلیت کی بقایا ہیں جو عندالشرع نامقبول ہیں ان کی اصلاح اور ان کا ترک ضروری ہے (۱)۔فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۲/۱۲/۱۴۰۰ھ

مال لقطہ کے مالک کا پتہ نہ چلے تو کیا حکم ہے؟

مسجد میں کسی نامعلوم شخص کو پڑی ہوئی رقم ملنے کا کیا مصرف ہے، جبکہ مسلسل کچھ دنوں تک اعلان کے باوجود اس کے مالک کا پتہ نہ چل رہا ہو۔

خادم مشتاق احمد (محمد پور صدر اعظم گڑھ)

الجواب وباللہ التوفیق:

اس رقم کا حکم یہ ہے کہ جب مالک کے آنے اور تلاش کرنے سے مایوسی ہوجائے تو غریبوں کو صدقہ کردے اور ثواب میں اس شخص کے ثواب کی نیت کرے جو اس کا اصلی مالک ہے، بشرطیکہ یہ گمان ہو کہ وہ اصلی مالک مسلمان ہے، ورنہ اس کے وبال سے بچنے کی نیت سے صدقہ کرے (۲)۔فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۵/۳/۱۴۰۱ھ

''عن عائشۃؓ قالت: قال رسول اللہ ﷺ: من أحدث في أمرنا هذا ما ليس منه فهو رد'' (صحیح مسلم کتاب الاقضیۃ حدیث ۱۷۱۸/۱۷)۔

۱- ''عن ابن عباس أن النبي ﷺ قال: أبغض الناس إلى الله ثلاثة: ملحد في الحرم، ومبتغ في الإسلام سنة الجاهلية ومطلب دم امرئ بغير حق ليهريق دمه'' (صحیح بخاری مع فتح الباری ۱۲/۲۱۰ حدیث ۶۸۸۲)۔

۲- ''وقيل: الصحيح أن شيئا من هذه المقادير ليس بلازم ويفوض إلى رأى الملتقط يعرفها إلى أن يغلب على ظنه أن صاحبها لا يطلبها بعد ذلك ثم يتصدق به'' (ہدایہ ۲/ ۵۹۴)۔

نومسلم کے مال و دولت کا شرعی حکم:

۱-ایک نومسلم جو کفر وشرک میں مبتلا تھا دائرہ اسلام میں داخل ہوا تو اپنی دولت بھی ساتھ لیتے آیا۔اس کے اس مال و دولت کے متعلق شرعی حکم کیا ہے؟

اگر وہ اس دولت کو اسلامی نیک کاموں میں مثلاً مسجد مدرسہ میں خیرات کرے تو کیا حکم ہے؟

اور مدرسہ مسجد والوں کو ایسی رقم لینی چاہئے کہ نہیں؟ اور اگر لینی ہو تو کیا کرے؟

ابراہیم باوا غفرلہ

الجواب وباللہ التوفیق:

۱-بعض پیسے ایسے ہوتے ہیں جو کسی مذہب میں حلال وجائز نہیں ہوتے اور ان پر کسی مذہب میں ملکیت صحیح قائم نہیں ہوتی، جیسے چوری کا پیسہ، ڈاک اور غصب کا پیسہ ایسا پیسہ بحالت کفر بھی کمایا ہوا اگر کوئی نومسلم اپنے ساتھ لائے تو اس کا حکم شرعی یہ ہے کہ اس کو اصل مالک کی ملک میں کسی مناسب انداز سے پہنچا دے اگر یہ ممکن نہ ہو اور مالک ثواب پانے کا اہل ہو مثلاً مسلمان ہو تو اس کو ثواب پہنچنے کی نیت سے صدقہ کردے اگر اس کا علم نہ ہو سکے کہ مالک مسلم ہے یا غیر مسلم تو ایسی صورت میں اس کے وبال سے بچنے کی نیت سے صدقہ کر کے اپنی ملکیت سے جلد از جلد نکال دے(۱)۔

بعض پیسے ایسے ہوتے ہیں کہ مسلمان کے لئے شرعاً جائز وحلال نہیں ہوتے اور غیر مسلم کے لئے حلال وجائز ہوتے ہیں اور غیر مسلم اس کا مالک بملک صحیح ہوجاتا ہے، جیسے شراب کے کاروبار کا پیسہ خنزیر کے کاروبار کا پیسہ ایسا پیسہ ان کے لئے حلال وجائز ہوتا ہے اور وہ اس پر مالک بملک صحیح ہوجاتے ہیں اگر کفر کی حالت کا حاصل کردہ ایسا پیسہ لیکر مسلمان ہوجاویں تو وہ اس کے صحیح مالک ہوگئے ہیں اور جس نیک کام میں چاہیں خرچ بھی کر سکتے ہیں مسجد میں مدرسہ میں ہر جگہ کر سکتے ہیں۔یہی حکم ان کے گانے بجانے کے پیسہ کا بھی ہے، اس لئے وہ اس کے صحیح مالک ہوگئے تھے اور وہ ان کے لئے حلال وجائز تھا مسلمان ہونے کے بعد بھی مسجد ومدرسہ جس نیک کام میں چاہیں خرچ کر سکتے ہیں قدیم مسلمان بھی وہ پیسہ ان سے لے سکتا

۱- "ویجب رد عین المغصوب ما لم یتغیر فاحشاً، ...... ویبرأ بردھا ولو بغیر علم المالک "(درمختار مع ردالمحتار ۹/۲۶۶)، نیز شامی میں ہے: "ویردونھا علی أربابھا إن عرفوھم وإلا تصدقوا بھا، لأن سبیل الکسب الخبیث التصدق إذا تعذر الرد علی صاحبہ" (ردالمحتار علی الدرالمختار ۹/۵۵۳)۔

ہے اوران نیک کاموں میں خرچ کرسکتا ہے(۱)،فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی،مفتی دارالعلوم دیوبندسہارنپور ۱۴۰۰/۱۲/۶ھ

۱-ماں کا بحالت جنابت دودھ پلانا:

جنابت کی حالت میں ماں بچے کو دودھ پلاسکتی ہے یا نہیں؟

۲-حاملہ عورت سے مباشرت:

حاملہ عورت کے ساتھ مباشرت کرسکتے ہیں یانہیں اوراگرنہیں کرسکتے توکتنی مدت کے بعد سے نہیں کرسکتے ہیں؟

فتح محمد کشمیری (بمقام شاہ پورہ ضلع بارہ مولہ کشمیر)

الجواب وباللہ التوفیق:

(۱) ہاں پلاسکتی ہے(۲)۔

(۲) اگر حاملہ کے نقصان کا خطرہ نہ ہو تو کرسکتے ہیں اوراگر خطرہ ہو تو نہ کریں اوراس کے لئے کسی مدت کی تعیین منجانب شرع نہیں ہے(۳)،فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی،مفتی دارالعلوم دیوبندسہارنپور ۱۴۰۱/۱۰/۵ھ

۱- ''وجاز أخذ دين على كافر من ثمن خمر لصحة بيعه" (الدرالمختار)،''ردالمحتار" میں اس کے تحت لکھتے ہیں: ''أي بيع الكافر الخمر :لأنها مال متقوم في حقه فملك الثمن فيحل الأخذ منه"(ردالمحتار مع الدرالمختار ۹/ ۵۵۳)۔

۲- ''عن أبي هريرةؓ أن النبي ﷺ لقيه في بعض طريق المدينة وهو جنب فانخنست منه فذهب فاغتسل ثم جاء، فقال: أين كنت يا أباهريرة؟قال: كنت جنباً فكرهت أن أجالسك وأنا على غير طهارة فقال: سبحان الله إن المسلم لا ينجس"، انتہی،حافظ ابن حجرؒ اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں: ''فدل على أن الآدمي الحي ليس بنجس العين إذ لا فرق بين النساء والرجال"، نیز لکھتے ہیں: "واستدل به البخاري على طهارة عرق الجنب؛ لأن بدنه لا ينجس بالجنابة، فكذلك ما تحلب منه"(دیکھئے صحیح بخاری مع فتح الباری ۱/ ۳۹۰،۳۹۱ کتاب الغسل باب عرق الجنب حدیث ۲۸۳،۲۸۵)۔

۳- ''إن رجلاً جاء إلى رسول الله ﷺ فقال :إني أعزل عن امرأتي، فقال له رسول الله ﷺ: لم تفعل ذلك؟ فقال الرجل: أشفق على ولدها أو على أولادها، فقال رسول الله ﷺ لو كان ذلك ضاراً ضرّ فارس والروم"(صحیح مسلم ۲/ ۱۰۶۷ کتاب النکاح حدیث ۱۴۳(۱۴۴۳)۔

حصول اولاد کے لئے جدید طریقے اور ان کا شرعی حکم:

چند دن قبل یہاں کے اخبار میں ایک خبر شائع ہوئی ہے کہ ایک خاتون کو سائنسی طریقہ کار سے اولاد ہوئی غیر فطری طریقہ سے افزائش نسل انسانی کے دو طریقہ کار ہیں:

اول:۔ اگر کسی عورت کے شوہر میں کوئی کمزوری واقع ہوجائے اور وہ اپنی بیوی سے جماع کرنے سے قاصر ہوتو اس شخص کا مادّہ تولید ایک انجکشن کے ذریعہ سے عورت کے رحم میں داخل کردیا جاتا ہے جس سے استقرار حمل عمل میں آتا ہے۔

دوم:۔ اگر کسی عورت میں کوئی نقص پیدا ہوجائے، جیسا کہ بیضوں کا اپنی جائے پیدائش سے ایک مخصوص جگہ تک کا سفر نہ کرنا۔ جہاں اسے مرد کے جسموں میں ملنا ہوتا ہے۔ تو ایسی شکل میں سائنسی طریقہ کار سے وہ بیضہ اس کے جسم سے نکال لیا جاتا ہے اور مرد کے مادّہ تولید سے ملانے کے بعد اسے چند دنوں کے لئے ٹیسٹ ٹیوب میں رکھ دیا جاتا ہے، گویا استقرار حمل ٹسٹ ٹیوب میں ہوتا ہے، پھر اسے عورت کے رحم میں منتقل کردیا جاتا ہے، جہاں وہ مزید نشو ونما پاکر اپنی فطری مدت گذارنے کے بعد وضع حمل کی شکل میں ظہور پذیر ہوتا ہے۔

اولاً: کیا ان دو طریقوں سے افزائش نسلِ انسانی اسلامی اصول وطرق کے مغائر تو نہیں؟

ثانیاً: کیا ان اولادوں کی شرعی حیثیت مسائل وراثت ورضاعت میں وہی ہوگی جو فطری اولاد کی ہوتی ہے؟

ثالثاً: کیا فطری ذرائع سے اولاد ہونے کے مواقع کے باوجود ان مصنوعی ذرائع سے اولاد پیدا کرنا جائز ہے؟

رابعاً: شکل اول کے طریقے سے اگر کسی عورت کے رحم میں اس کے شوہر کے بجائے کسی اور مرد کا مادہ تولید منتقل کرکے اولاد پیدا کی جائے تو کیا عورت پر تہمت زنا عائد کی جائے گی؟ اور ایسی اولاد کی شرعی حیثیت کیا ہوگی؟

خامساً: اگر کوئی کنواری لڑکی یا بیوہ عورت بلا اختلاط مرد کے ماں بننا چاہے اور ان ذرائع کے استعمال سے حصول اولاد کی متمنی ہوتو کیا علماء کرام اس کی اجازت مرحمت فرمائیں گے؟

سید محمد مصطفےٰ

الجواب وبالله التوفيق:

(۱) افزائش نسل کے یہ دونوں طریقے اسلامی اصول وضوابط کے خلاف وناجائز ہیں (۱)۔

۱- کیوں کہ اس میں جلق اور عورت کی بے پردگی لازم آئے گی، ''ولا يباح النظر والمس إلى ما بين السرة والسرة والركبة إلا في حالة

(۲) اگر عورت شوہر والی ہے تو ان اولادوں کی شرعی حیثیت وراثت ورضاعت وغیرہ مسائل میں صحیح النسب اولاد کی طرح ہوگی، البتہ چونکہ اس فعل میں بہت سے محرمات شرعیہ کا ارتکاب کرنا بھی ہوگا، اس لئے اس کے کرنے کرانے والے عند اللہ مجرم اور مبغوض ہوں گے۔

(۳) ناجائز ہے (۱)۔

(۴) ایسی عورت پر زنا کاری کی تہمت جس پر حد زنا جاری کی جاتی ہے نہیں لگائی جائیگی، البتہ بدکاری اور حرامکاری کی تہمت لگائی جائیگی اور سخت گنہگار ہوگی اور باعث عذاب خداوندی ہوگی، بلکہ ایسا کرنے اور کرانے والے سب کے سب سخت گنہگار اور باعث غضب خداوندی ہوں گے (۲)۔

اور اگر شوہر کے منع کرنے کے باوجود نہ مانے اور شوہر طلاق دیدے تو شوہر گنہگار نہ ہوگا۔ اور اگر شوہر طلاق نہ دے یا طلاق دے، مگر بچہ طلاق سے دو سال کے اندر پیدا ہو جائے تو وہ بچہ باشارہ الولد للفراش صحیح النسب قرار دیا جائے گا۔ اور باپ سے وراثت بھی پائے گا اور اگر شوہر طلاق دیدے اور طلاق سے دو سال کے بعد بچہ پیدا ہو تو وہ بچہ ثابت النسب قرار نہ دیا جائے گا اور اس شوہر سے وراثت نہ پائے گا، بلکہ صرف ماں سے وراثت کا مستحق ہوگا اور منسوب الی امہ ہوگا۔

(۵) شرعاً ہرگز اس کی اجازت نہ ہوگی، بلکہ سخت بے حیا اور بدکار شمار ہوگی۔ اور وہ بچہ جو اس شنیع حرکت سے پیدا ہوگا وہ صحیح النسب شمار نہ ہوگا۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دار العلوم دیوبند سہارنپور

۱- محکمہ آب کاری سے تالاب مچھلی پالنے کے لئے لینا:

محکمہ آب کاری نے قرب وجوار میں تالاب بنوار کھے ہیں بعد بارش تالاب نیلام کر دئے جاتے ہیں اور یہ تالاب

الضرورۃ، لأن کانت المرئۃ خائفۃ تخش الساء" تحفۃ الفقہاء ۳/ ۳۳۴ (بحوالہ جدید فقہی مسائل ۲/ ۳۸۲)، نیز اس سلسلہ میں معاصر فقہاء کی رائے میں تبدیلی ہوئی ہے اس مسئلہ کی جملہ تفصیلات کے لئے "مکہ فقہ اکیڈمی" کے آٹھویں فقہی سیمینار کے فیصلے کی طرف رجوع کیا جا سکتا ہے فیصلوں کا اردو ترجمہ "مکہ فقہ اکیڈمی کے شرعی فیصلے" کے نام سے ایفا پبلیکیشنز، نئی دہلی سے طبع شدہ ہے (مرتب)۔

۱- "لعن اللہ الواشمات والمستوشمات المتنمصات والمتفلجات للحسن المغیرات خلق اللہ" (بخاری ۲/ ۸۷۸، مکتبہ اشرفیہ دیوبند)۔

۲- "لایحل لامرئ یؤمن باللہ والیوم الآخر أن یسقی ماءہ زرع غیرہ" (ابوداؤد شریف حدیث ۲۱۶۰، باب فی وطی السبایا)۔

نہ تو مدخل ندی ہیں اور نہ تو متصل، لہذا خریدنے والا مچھلی کے بچے خرید کر تالاب میں چھوڑ دیتے ہیں اور ۴/ یا ۶/ ماہ بعد جب یہ بچے بڑے ہو جاتے ہیں فروختگی کے لائق موجودہ اور آئندہ نسل کو فروخت کرتے رہتے ہیں بعد میعاد مدت پھر از سر نو نیلامی اور وہی سلسلہ بچے خرید کر ڈال دیتے ہیں بعد پرورش فروخت ہوتے جاتے ہیں کیا یہ طریقہ جائز ہے اور یہ طعام سمک صحیح ہے اور یہ طریقہ نیلامی محکمہ آب کاری کا درست ہے کیا ان کا طول عرض بھی کافی ہوتا ہے۔

۲-غیر مسلم سے چندہ لینا:

اہل ہنود چونکہ خود تو چندہ اپنی مرضی اور بلا کر دیتے نہیں ہیں چونکہ لیا ہوتا ہے اور لینے والے سے کہہ دیتے ہیں کہ چندہ اس سے متعلق ہے تعمیر مدرسہ یا تعمیر مسجد یا اور مدرسہ وغیرہ وغیرہ اہل ہنود میں ایک صاحب ٹھیکیدار ہیں اور مسجد مدرسہ میں بوقت ضرورت ریت وغیرہ مانگنے سے چندہ دیدیتے ہیں، لہذا تعمیر مدرسہ کی غرض سے ٹرک ریت ڈلوادیں گے اور قیمت بھی نہیں لیں گے کیا اس طرح امور میں نقد یا دیگر مذکورہ صورت میں چندہ لینا اور کہنا مانگنا صحیح ہے؟

احمد علی محمد علی یوم الثانی

الجواب وبالله التوفيق:

صورت مذکورہ میں محکمہ آب کاری کے تالاب کا نیلام کرنا حقیقت میں تالاب بیچنا نہیں ہے، بلکہ تالاب کا محض نفع کچھ مہینوں کے لئے بیچنا و کرایہ پر دینا ہے عالمگیری میں لکھا ہے کہ ھی تملیک منافع بعوض (۱)، یعنی اجارہ کہتے ہیں منافع کا مالک بنا دینا عوض کے بدلے میں۔ پس جب عمل معلوم ہے اور مدت عمل معلوم ہے اور عوض بھی معلوم ہے تو اس کو ناجائز نہ کہیں گے۔ ایسی مچھلی کا لگانا بھی ناجائز نہ رہے گا۔

۳۔ تعمیر مدرسہ یا تعمیر مسجد وغیرہ کے لئے بلا وجہ ہندو سے چندہ مانگنا خلاف غیرت ہے، لیکن اگر کوئی ہندو اس کو کار ثواب سمجھ کر دیتا ہو اور اس کی وجہ سے آئندہ مسلمانوں کے استعمال میں آنے کا خطرہ نہ ہو تو لینا ناجائز نہیں (۲)، ''وشرط وقف الذمي أن يكون قربة عندنا وعندهم ''(۳)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دار العلوم دیوبند سہارنپور

۱- ''فهي عقد على المنافع بعوض'' (عالمگیری ۴/ ۴۰۹، مکتبہ رشیدیہ پاکستان)۔

۲- ''أما الوقف فليس بعبادة وضعا بدليل صحة من الكافر، فإن نوى القربة فله الثواب وإلا فلا'' (الاشباہ والنظائر ۲۱)۔

۳- شامی ۳/ ۷۹۴، مطبوعہ عثمانیہ۔

بناسپتی کا شرعی حکم:

بناسپتی کے متعلق بہت سوالات آرہے ہیں یہ ایک خاص نوعیت کا ہے آپ حضرات کیا تحریر فرمارہے ہیں نیز اس کا جواب عام سوالوں جیسا ہوگا یا کچھ فرق ہوگا؟

ڈالڈا میں گائے وسور کی چربی کی ملاوٹ کا ذکر مخالف پارٹیوں کی جانب سے پارلیمنٹ میں کیا گیا مخالفین نے برسر اقتدار حکومت پر الزام لگایا کہ ڈالڈا میں چربیوں کی ملاوٹ کا جرم سرکار کرا رہی ہے حکومت کی طرف سے جواب دیا گیا کہ یہ کام جنتا دل کے دور حکومت سے ہورہا ہے، حکومت نے اس ملاوٹ کو فوراً بند کرنے کا وعدہ بھی کیا دوسری طرف جنتا دل کے دور حکومت کے وزیر اعظم یا وزیر تجارت یا کسی دوسرے ذمہ دار نے حکومت کی جانب سے کہی گئی باتوں کی تردید میں اب تک کچھ نہیں کیا موجودہ حکومت نے جانچ کا سلسلہ شروع کیا چربیوں کی ملاوٹ ڈالڈا میں پائی گئی چربیوں کی درآمد صابون بنانے والی کمپنیوں کے لئے کی جاتی تھی جس کسی کو چربیوں کی درآمد کا لائسنس ملا ہوا تھا ڈالڈا میں ملاوٹ پائے جانے کے بعد حکومت نے اس کا لائسنس بھی رد کر دیا مذکورہ بالا حقائق کی روشنی میں ڈالڈا کھانے میں شرعاً کوئی قباحت تو نہیں ہے۔

رسائل ممتاز احمد جامعہ دربھنگہ

الجواب وباللہ التوفیق:

بناسپتی کے متعلق دارالعلوم میں ابتک اتنا تفصیلی سوال اس نوعیت کا نہیں آیا تھا۔

محض افواہوں کے قسم کے یا بہت سے بہت اخباروں کے کچھ بیانات پر مشتمل سوالات آجاتے تھے اور اس کا جواب یہاں سے دیدیا جاتا تھا کہ اصل اشیاء میں حلّت واباحت ہے، پس جب تک مردار کی یا خنزیر کی چربی کے ملاوٹ کا یقین یا ظن غالب نہ ہو جائے حرمت کا فتوی نہیں دیا جا سکتا۔

البتہ جس کو اس ملاوٹ کا دلیل شرعی سے یقین یا ظن غالب ہو جائے اس کے لئے اس کا استعمال درست نہ رہے گا، اسی طرح اگر کوئی شخص احتیاطاً استعمال نہ کرے تو یہ تقوی ہوگا اور مذموم نہ ہوگا، اور یہ دوسری بات ہوگی۔

مگر اس پیش نظر تحریر کی حیثیت دوسری ہے اس تحریر میں غیر ملکی چربیوں کی درآمد اور ڈالڈا میں اس کی ملاوٹ تسلیم ہے اور غیر ملکی چربیاں عموماً ذبیحہ کی نہیں ہوتیں اس لئے ظن غالب ہے کہ چربیاں عموماً ذبیحہ کی نہیں ہوتیں، اس لئے ظن غالب پیدا ہو جاتا ہے کہ وہ یا تو مردار کی ہوں گی یا خنزیر کی ہوں اور جس درجہ کا ظن غالب پہلے مردار اور خنزیر کی چربی نہ ہونے کا تھا

اب اسی درجہ کا ظن غالب مردار یا خنزیر کی چربی ملانے کا ہو رہا ہے، اس لئے اب ہمارے نزدیک حکم شرعی یہ ہونا چاہئے کہ جب تک ان چربیوں کے بارے میں دلیل شرعی سے معلوم نہ ہو جائے یا اس کا ظن غالب نہ ہو جائے کہ یہ چربیاں محض ذبیحہ کی ہوتی ہیں مردار کی یا خنزیر کی نہیں ہوتیں استعمال کرنے کی اجازت نہ دی جائے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱/۱/ ۱۴۰۴ھ

الجواب صحیح محمد ظفیر الدین مفتاحی، مفتی دارالعلوم دیوبند

نوٹ:- جناب کی فرستادہ تحریر کے مطابق اب یہ مذکورہ بالا جواب متعین ہو رہا ہے، لیکن چونکہ معاملہ بہت اہم اور اس کے نتائج بہت دور رس ہیں، اس لئے مناسب یہ معلوم ہوتا ہے کہ آنجناب بھی اپنے یہاں مجلس علماء میں رکھ کر گفتگو فرما کر کوئی بھی رائے متعین فرمائیں، احقر بھی اپنے افتاء کمیٹی میں رکھ کر اس پر گفتگو کے بعد کوئی حتمی رائے متعین کر سکے گا، کیونکہ اس فتوی کے نتیجہ میں ڈالڈا میں پڑی ہوئی مٹھائیاں بسکٹ وغیرہ تمام چیزوں میں پھر یہی بحث پیدا ہو جائیں گی۔

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

خون کا ٹھیکہ اور اس کی رقم کا مصرف:

زندہ جانوروں کے خون کا سالانہ ٹھیکہ چھوڑا جاتا ہے اور وہ جانور کا بھی سالانہ ٹھیکہ چھوڑا جاتا ہے اس کا روپیہ آتا ہے یعنی ٹھیکہ کا تو اس روپیہ کے بارے میں تحقیق سے بتائیں کہ اس روپیہ کا صحیح مصرف کیا ہے موجودہ دور میں یہ روپیہ کن کن مدوں اور کن کن جگہوں پر خرچ کیا جا سکتا ہے؟ یہ روپیہ مندرجہ بالا سوسائٹی وصول کرتی ہے اور ابھی تک غریبوں کو انفرادی طور پر دیتی رہی ہے مثلاً جاڑے کے موسم میں لحاف وغریبوں اور ضرورت مندوں میں تقسیم کرنا اور مختلف فلاح وبہبود کے کام دیتی ہے۔

۱۔ کچھ لوگ یہ جانتے ہوئے بھی کہ یہ روپیہ خون اور مرداری جانورں کا ہے وہ اس روپیہ کو سوسائٹی سے مسجد کی جگہ خریدنے کے لئے مانگتے ہیں تو کیا مسجد کی جگہ خریدنے کے لئے ان کو روپیہ دینا جائز ہے یا کہ نہیں اگر جائز ہے تو کس شکل میں؟۔

۲۔ کچھ لوگ دینی مدارس کے واسطے اس روپیہ کو جو کہ خون اور مرداری جانوروں کے ٹھیکہ کا روپیہ ہے امداد مانگتے

ہیں وہ اس روپیہ سے مدرسہ کے واسطے زمین بھی خریدنا چاہتے ہیں تو اس رقم سے ان لوگوں کو امداد دی جاسکتی ہے یا نہیں؟ اور ان لوگوں کو بھی یہ بات معلوم ہے کہ روپیہ خون کے ٹھیکہ کا اور مرداری جانورں کے ٹھیکہ کا ہے۔

۳۔ یہ سوسائٹی جو کہ مختلف فلاح و بہبود کے کام انجام دیتی ہے اور برادری کی ایک اہم سوسائٹی ہے وہ علاقہ میں چھٹی جماعت سے دنیاوی تعلیم کا ایک اسکول بنانا چاہتی ہے اسکول کی زمین خریدنا اور اس کا انتظام ملانا اور اساتذہ کی تنخواہ وغیرہ پر خرچ کرنا چاہتی ہے یہ روپیہ مرداری جانوروں کے خون اور ٹھیکہ کا ہے کیوں کہ اسکول چلانے کے واسطے اور کوئی ذریعہ نہیں ہے اور اس علاقہ میں برادری کا کوئی اسکول بھی نہیں ہے تو کیا اس روپیہ سے اسکول چلایا جاسکتا ہے؟

مسئلہ ۴۔ اس روپیہ سے سوسائٹی یہ بھی چاہتی ہے کہ علاقہ میں ڈسپنسری ہسپتال وغیرہ نہیں ہے اور ہسپتال وغیرہ بنایا جاسکتا ہے یا نہیں؟

عارفین جنرل سکریٹری (قرمتنگر دہلی صدر بازار)

الجواب وباللہ التوفیق:

۱۔ متن درمختار میں ہے: " بیع ما لیس بمال کالدم والمیتته الخ" وتحته فی الشامیه (ج ۴ ص ۱۵۰) (۱)، وأما فی حقنا فالکل سواء فی الهدایة فی باب البیع الفاسد فنقول: البیع (۲)، بالمیتة والدم باطل (۳)، وتحته فی فتح القدیر بإجماع علماء الأمصار وفی الهندیه (ج ۴ ص ۱۴۶) فی أحکام البیع الغیر الجائز: فالباطل مالم یکن محله مالا متقوما (الی قوله) **فهو لایفید الملک**".

ان عبارتوں سے معلوم ہوا کہ مسلمانوں کے لئے خون و مردار کی خرید فروخت قطعاً ناجائز و حرام ہے اور انکی بیع و شراء باطل ہے یعنی ان چیزوں کے خریدنے سے شرعاً مالک نہ ہوگا اور ان کو فروخت کرنے سے ان کی قیمت کا بھی مالک نہ ہوگا، بلکہ ان قیمتوں کا مالک معلوم ہو تو اس کو واپس دینا یا پھر انکا ان کے وبال سے بچنے کی نیت سے تصدق کر دینا لازم ہے کما فی الشامی (ص ۳۴۷) تحت "حکم البیع الباطل بتفصیل الملک الخبیث التصدق إذا تعذر الرد علی صاحبه" اور اس کا حاصل یہ ہے کہ اس خرید فروخت کے قریب بھی مسلمانوں کو نہ جانا چاہئے اور جو کچھ مال و دولت اس سے

۱- شامی ۴/۱۳۹، نعمانیہ۔
۲- ہندیہ ۳/۱۴۶، مکتبہ رشیدیہ، پاکستان۔
۳- ہدایہ ۳/۴۹، مکتبہ اشرفیہ دیوبند۔

حاصل ہوچکی ہے اس کا حکم شرعی صرف یہ ہے کہ اس کو اس کے وبال سے بچنے کی نیت سے جہاں تک ہوسکے بطور صدقہ دیکر اپنی ملک سے نکال دے اور اگر معاشی حالات اتنے خراب خدانخواستہ ہوجاویں کہ بغیر اس کاروبار کے چارہ نہ رہے حالات ناگزیر ہوجائیں تو مندرجہ ذیل طریقہ سے کرلینے کی اجازت ہے امام ابوحنیفہ کے قول پر شرعاً ہوجائے گی اور اس سے بچنا پھر بھی احوط رہے گا۔

الف کسی غیر مسلم سے عقد مضاربت کا معاملہ کر کے اس سے یہ کہدے کہ تم کو اختیار ہے جو کاروبار کرنا چاہو کر سکتے ہو نفع میں چوتھائی چونی یا اٹھنی وغیرہ مثلاً حصہ ہوگا اور وہ غیر مسلم اس روپیہ سے یہی کاروبار کرے اور مقررہ نفع دیا کرے۔

"**هكذا يؤخذ من المبسوط (ص ١٢٥) من باب المضاربة أهل الكفر لقوله: ولكن هذه الكراهة ليست لعين المضاربة والوكالة، فلا تمنع صحتها في القضاء، ولايكره للمسلم أن يدفع ماله إلى مسلم ونصراني مضاربة**"۔

(ب) کسی غریب مسلم کو اس کی اجرت خواہ یومیہ خواہ ماہانہ مقرر کر کے اس کام کے لئے وکیل بنادے کہ وہ یہ کام کرے کما فی الدر المختار علی حامش الشامی (ص ۵/ ۲۴۷) **إلا إذا وكل ذميا ببيعه، فيجوز عنده خلافاً لهما** (۱)۔ وھکذا فی المغنی (ص ۲۶۳، ۲۶۲)۔

جواب نمبر ۱ تا ۴۔ مذکورہ بالا جواب سے معلوم ہوا کہ ان مذکورہ کاموں میں ان حاصل شدہ رقوم کو تملیک مستحق کے حیلہ کے بغیر صرف نہیں کر سکتے ہاں آئندہ کے لئے بطریق مذکور (الف وب) حیلہ کر سکتے ہیں۔

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

۱-یہودی کی قبر میں مسلمان کی نعش کی تحقیق:

ایک نیک وپرہیزگار حاجی زکوۃ نکالتا ہے زکوۃ کا پیسہ ختم ہونے پر ایک مسلمان سائل کو دھتکار کر نکال دیتا ہے اور وہاں سے ایک یہودی کا گذر ہوتا ہے وہ یہودی اس مسلمان کی ضرورت پوری کر دیتا ہے پھر وہ مالدار اور یہودی دونوں مرجاتے ہیں تو یہودی کی قبر میں اس مسلمان کی نعش پہنچ جاتی ہے اور اللہ تعالی یہودی کی مغفرت فرمادیتے ہیں اور اس مسلمان کی مغفرت نہیں فرماتے کیا یہ واقعہ درست ہے؟

۱- فصل فی البیع کتاب الحظر والاباحۃ۔

۲-کرسمس کے تہوار میں مسلمانوں کی شرکت:

کرسمس کے تہوار میں مسلمان ناچ گانے کرتے ہیں۔ اوران کے تہوار میں شریک ہوتے ہیں یہ کیسا ہے؟

۳-یکم جنوری کو نیا سال منانا:

یکم جنوری کے دن بھی مسلمان Happy New years نیا سال مبارک ہو کہ کر مصافحہ کرتے ہیں یہ فعل مسلمان کے لئے جائز ہے یانہیں؟

۴-گڈ فرائیڈے منانا:

عیسائی لوگ ۲۵ر دسمبر کو کرسمس ڈے مناتے ہیں اور اپریل کے مہینے میں گڈ فرائی ڈے Good Friday مناتے ہیں، یہ کیوں مناتے ہیں اور مسلمان کو ایسا کرنا چاہئے یانہیں؟

عبدالستار اسماعیل (شری کوکن ایس، بی، ٹی جبیل انجیر سعودی عرب)

الجواب وبالله التوفيق:

۱-یہ بات بے اصل ہے اسکا کوئی ثبوت نہیں، اس کو حدیث بنا کر بیان کرنا بھی صحیح نہیں ہے۔

۲-کرسمس ڈے عیسائیوں کا مذہبی اور دنیوی تہوار ہے اس دن سے دن کا بڑا ہونا مان کر اور اس دن حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش کا دن ہے اس کو خوشی کا دن مان کر خوشیاں مناتے ہیں اگر اس میں ناچ گانا وغیرہ نہ ہوتا جب بھی چونکہ ان لوگوں نے دین کو لہو ولعب بنا رکھا ہے ان کے تہواروں میں شریک ہونا جائز نہیں ہوتا، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا ہے ارشاد ربانی ہے: ''وذر الذين اتخذوا دينهم لهوا ولعبا و غرتهم الحياة الدنيا'' (۱)۔

ترجمہ جن لوگوں نے اپنے دین کو لہو لعب بنالیا ہے ان کے قریب بھی نہ پھٹکو ان سے بالکل دور رہو اور جیسا وہ لوگ اس میں ناچ گانا بھی کرتے ہیں اس میں شریک ہونا اور بھی سخت گناہ ہوگا اور قرآن پاک کی اس آیت کریمہ: ''لا تعاونوا على الاثم والعدوان'' (۲) کے بھی خلاف ہوگیا۔ اس لئے اور بھی پرہیز کرنا ضروری ہے۔

آپ لوگ عرب لوگوں کو سمجھائیں ان سے کہئے کہ بھائی ہم بھی مسلمان تم بھی مسلمان ہمارا بھی ایمان قرآن و

۱- سورۂ انعام: ۷۰۔

۲- سورۂ مائدہ: ۲۔

حدیث پر تمہارا ابھی ایمان قرآن وحدیث پر قرآن پاک میں اس میں شرکت کی صریح ممانعت اور سخت گناہ اللہ پاک نے بتایا ہے پھر آپ لوگ اس میں کیوں شریک ہوتے ہیں انشاء اللہ نرمی وہمدردی سے سمجھانے سے وہ لوگ باز آجائیں گے۔

(۳، ۴) ان دونوں نمبروں کا بھی وہی حکم ہے جو۔۵ کے جواب میں لکھا گیا ہے ان کے اس کرنے کی کوئی بھی وجہ ہو مسلمان کو ان کی اتباع یا نقل کرنے کی ہرگز اجازت نہیں ہے مصافحہ وسلام اسلامی شعار بھی ہے اسلامی طریقہ سے ہی ہونا ضروری ہے قرآن پاک میں ہے: ''ومن یعظم شعائر اللہ فانہا من تقوی القلوب''(۱) اور یہ طریقہ خلاف شرع و شریعت ہے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

مالی جرمانہ:

ہمارے گاؤں کی حالت اتنی گندی ہورہی تھی جس میں گلیوں میں غنڈے آبروریزی کرتے ہیں۔

ایک روز ایک پاگل عورت آئی وہ قوم سے مسلمان تھی سنا گیا وہ عورت حاجی بھی تھی غنڈوں نے اس کو جبراً گلی میں سے پکڑ کر گاؤں سے باہر ان غنڈوں نے زنا کیا گاؤں کے اثر دار آدمیوں کو یہ بات بہت بری لگی اس سے اگلے روز پنچائیت کی جس میں کہ مسلمان سب ہی لوگ شامل تھے اس پنچائیت سے گیارہ آدمیوں کو چنا گیا ان غنڈوں کے اوپر پنچائیت بطور جرمانہ کے ان کوری میں جوڑ کر پانچ جوتے مارنے کا فیصلہ کیا۔

اور دو غنڈوں پر پانچ پانچ سو روپیہ جرمانہ کیا گیا اور دو پر تین تین سو روپیہ جرمانہ کیا گیا۔

دو کے اوپر دو دو سو روپیہ اس لئے کئے گئے کہ ایک ملزم نے پنچائیت کو گیدڑوں کی پنچائیت بتلائی ہے اور دوسرے نے اس پاگل عورت کے ساتھ زنا کرتے ہوئے دوسرے آدمی کی اور یہ فیصلہ پورے گاؤں والوں ملزم اور غیر ملزم سب نے یہ فیصلہ منظور کیا اس کے بعد سب غلط قسم کی باتیں جیسے گلیوں میں گھومنا وغیرہ سب بند ہوگیا، اگر یہ روپیہ کسی اور فنڈ میں دیا جائے یا واپس کیا جائے تو گاؤں کے حالات بہت زیادہ خراب ہونے کا اندیشہ ہیں اور پنچایت کی بات ٹوٹتی ہے آئندہ بھی یہ طے پایا ہے کہ اگر کوئی شخص غلط کام کرے گا تو اس کے لئے بھی یہی انجام ہوگا، آپ مفتیان کیا فرماتے ہیں کیا یہ جائز مانا جاتا ہے؟

محمد ادریس معرفت ساجد حسن (محلہ لال مسجد دیوبند)

۱- سورۂ حج: ۳۲۔

الجواب وبا الله التوفيق:

حسب تحریر سوال جب یہ فیصلہ ملزم وغیر ملزم سب نے منظور کرلیا، اور ملزمین نے جرمانہ کی رقم ادابھی کردی تو اتنا اور بھی کرلیا جائے کہ جس نیک اور رفاہی کاموں میں اس رقم (جرمانہ) کوخرچ کرنا چاہتے ہیں اس کام کی بھلائی اور اس کا رنیک اور کارثواب ہونا اور اس کی خوبی بتلا کر اس کے مکمل ہوجانے کی ترغیب سے اگر کھلے دل سے کرلینے کی اجازت ورضامندی دے دیں گے تو حدیث پاک: " لا يحل مال امرئ مسلم الا بطيب نفسه او كما قال عليه السلام "(۱)، کے بھی خلاف نہ ہوگا، اور ان سب چیزوں کاخریدنا اور استعمال کرنا سب درست ہوجائے گا اور چونکہ مسلم معاشرہ کی اصلاح و درستگی اور انکے مذہبی عقائد واخلاق وعادات اورطور طریقہ کی حفاظت کرنا اور اس کو باقی رکھنا اور اس میں ترقی دینا شریعت مطہرہ کے اہم ترین مقاصد میں سے ہے، جیسا کہ منطوق کلام الہی۔

"كنتم خير امة اخرجت للناس تامرون بالمعروف و تنهون عن المنكر "(۲)، کے اشارہ سے معلوم ہوتا ہے نیز بحکم" من راى منكم منكرا فليغيره بيده فإن لم يستطع فبلسانه الخ او كما قال" (مشكاة المصابيح، باب الأمر بالمعروف الفصل الأول ۴۳۶/۲)(۳) كلكم راع وكلكم مسئول عن رعيته أو كما قال عليه السلام (۴)۔

اور بتقاضائے عبارات فقہیہ مثلاً: "لأن التعزير شرع للتطهير تاترخانية و زاد بعض المتأخرين أن الحد مختص بالإمام والتعزير يفعله الزوج والمولى وكل من راى أحدا يباشر المعصية" (شامي ص

۱- "وعن ابی حرة الرقاشی عن عمه قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: ألا لاتظلموا ألا لايحل مال امرئ إلا بطيب نفس منه، وقال القاري في المرقاة تحت قوله: امرئ (اي مسلم او ذمي) رواه البيهقي في شعب الايمان والدار قطني في المجتبى، مشكاة المصابيح باب الغصب والعارية(مرقاۃ ۱۱۸/۶، مکتبہ اشاعت الاسلام)۔

۲- سورۂ آل عمران: ۱۱۰۔

۳- "من راى منكم منكراً فليغيره بيده، فإن لم يستطع فبلسانه، فإن لم يستطع فبقلبه، وذلك أضعف الإيمان"۔ مسلم شریف عن ابی سعیدؓ کتاب الایمان باب بیان کون النہی عن المنکر من الایمان ۵۱/۱ مطبع اصح المطابع ۔ وترمذی شریف ابواب الفتن باب ماجاء فی تغییر المنکر باللسان أو باليد أو با لقلب ۴۰/۲، مکتبہ اشرفیہ دیوبند) (مرتب)۔

۴- "كلكم راع وكلكم مسئول عن رعيته الإمام راع ومسئول عن رعيته والرجل راع في أهله وهومسئول عن رعيته والمرأة راعية في بيت زوجها ومسئولة عن رعيتها والخادم راع في مال سيده ومسئول عن رعيته، (بخاري شريف عن عبد الله بن عمرؓ باب الجمعة في القرى والمدن ۱۲۲/۱، مطبع اصح المطابع) (مرتب)۔

۱۷۷، باب التعزیر ج ۳)اورمثلاً "وذکر الإمام التمر تاشی أن التعزیر الذی یجب حقا للہ تعالی یلی إقامته کل أحد بعلة النیابة عن اللہ تعالی"۔

لازم ہے ناشزہ کے لئے اہل آبادی ایک جماعت مسلمین شرعی کمیٹی شرعی دارالقضاء قائم کریں جو دیانت دار سمجھ دار باا ثر معاملہ فہم مسلمانوں پر مشتمل ہو اور اس میں کم ازکم ایک ایسا عالم بھی شریک رکھیں جو اپنے تدین وتقوی کے ساتھ مسائل متعلقہ سے اچھی طرح واقف ہو، پھر اس شرعی کمیٹی یا شرعی دارالقضاء کے ذریعہ سے ایسی کوشش کی جائے کہ تعزیر باخذ المال کے بغیر ہی قوم کا معاشرہ وتمدن اصلاح پذیر ہوکر صالح معاشرہ بن سکے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

دعاء برائے علم وذہن:

مندرجہ ذیل دعا جو برائے ترقی علم وذہن ہے۔

کیا رسول اللہ ﷺ کی فرمودہ ہے (وہ دعا یہ ہے)"اللھم اخرجنا من ظلمات الوھم واکرمنا بنور الفھم وافتح علینا ابواب فضلک ویسر علینا خزائن علمک سبحانک لا علم لنا الا ما علمتنا انک انت العلیم الحکیم"۔

یہی درست کرنا مقصود ہے کہ کیا مندرجہ بالا دعاء نبی کریم ﷺ سے مروی ہے۔

الجواب وباللہ التوفیق:

حدیث کی کوئی معتبر کتاب میں تو یہ دعا جناب نبی کریم ﷺ سے ان لفظوں میں منقول نہیں، لیکن مضمون صحیح ہے، اس میں کوئی خرابی نہیں، اس لئے اس کے پڑھنے میں کوئی حرج نہیں، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۵/ ۷/ ۱۳۸۵ھ
الجواب صحیح محمود عفی عنہ نائب مفتی دارالعلوم دیوبند

مینڈوں پر لگے درخت کا حکم:

بعض درخت دو یا تین کھیتوں کے مالکوں کے درمیان مینڈوں پر کھڑے ہیں اگر ایک شخص کاٹنا چاہتا ہے تو دوسرا

شخص مزاحم ہوتا ہے تو ان درختوں کو کاٹکر مدرسہ کے مصرف میں لایا جاسکتا ہے یا کہ نہیں؟

الجواب وباللہ التوفیق:

جی ہاں اگر تمام حصہ دار اجازت دیدیں تو مدرسہ کے مصرف میں لایا جاسکتا ہے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۸/ ۷/ ۱۳۸۵ھ

الجواب صحیح محمود غفی عنہ

جماعت میں جانا اور تبلیغ کی اہمیت وضرورت:

۱۔ جو مسلمان دین سے واقف نہ ہو اور نماز روزہ کے فرائض وواجبات سے پوری طرح واقف نہ ہو وہ اگر تبلیغی جماعت کے ساتھ نکلے اور ان چیزوں کو سیکھے تو کیسا ہے۔

۲۔ اگر مسائل تجارت سے واقف نہ ہو اور مسائل تجارت معلوم کئے بغیر تجارت کرتا ہو اس کا کیا حکم ہے اور مسائل تجارت سیکھنا کیسا ہے۔

۳۔ دین کو سیکھنے کے لئے ایک شخص جماعتوں کے ساتھ جاتا ہے اور اہل وعیال کا پورا انتظام کر جاتا ہے تو اس کا کیا حکم ہے۔

۴۔ دکان کا کاروبار اچھے پیمانہ پر چل رہا ہے اور دکان پر چند آدمی رہتے ہیں ان میں سے اگر ایک آدمی دین سیکھنے کے لئے جاتا ہے تو کیسا ہے، دوسرے آدمی اچھی طرح چلا سکتے ہیں۔

۵۔ گھر اور دوکان کے ماحول میں رہ کر آجتک دین سیکھنے کی طرف سے نہ تو جہ ہوئی اور نہ ہی موقع ملا ہے اگر کچھ وقت فارغ کر کے دین سیکھنے کی غرض سے نکل جاتا ہے، جبکہ دنیوی کوئی نقصان بھی نہیں ہے اور اس زمانہ میں دوکان کا کام بھی مختصر ہے کیسا ہے۔

۶۔ ایسے کفر والحاد وبددینی کے دور میں جبکہ مسلمان نماز روزہ، جیسے اہم فرائض کو دلیری کے ساتھ علی الاعلان چھوڑ رہا ہے انکو رغبت دلا کر ان کو فرائض پر آمادہ کرنا کیسا ہے، جبکہ علماء کرام کا سب جگہ پہنچنا اس طرح مشکل ہے، بہت سی بستیاں ایسی ہیں جن میں مسجد ہے، مگر بالکل ویران پڑی ہیں اور بہت سی بستیاں ہیں اس میں مسلمان موجود ہیں، مگر مسجد نہیں ہے انکو

دین سے واقف کرنے والا کوئی نہیں ہے اور مسلمان مردے بغیر نماز جنازہ دفن ہوتے ہیں بعض جو نماز پڑھتے رہتے ہیں انکو بھی نماز یاد نہیں ہے، ایسی حالت میں اپنی بیوی بچوں میں مشغول رہنا اور صرف اپنے کاروبار کو بڑھانے کی اور اپنے آرام کی فکر میں رہنا کیسا ہے۔

۷۔ زید مسلمانوں میں دین کی طلب بیدار کرنے کے لئے اور نماز روزہ پر آمادہ کرنے کے لئے سفر کرتا ہے اس میں جو مال خرچ کرے اسکا کیا اجر ہے۔

۸۔ جو لوگ جماعت میں نکل کر نوافل جماعت کی پابندی، ذکر، تلاوت قرآن پاک کی پابندی اور شریعت پر عمل کرنے کا جذبہ رکھتے ہوں ان فوائد کے پیش نظر اگر خدانخواستہ دنیوی نقصان بھی ہوجاوے اس پر کیا اجر ہے۔

۹۔ ایسے بددینی کے ماحول میں دین کی ذمہ داری کیا صرف علماء کرام پر ہی ہے یا عام مسلمانوں پر بھی اس کی فکر اور کوشش ضروری ہے۔

الجواب وبالله التوفيق:

۱۔ اگر بال بچوں کے کھانے پینے وغیرہ کا انتظام کرکے جاتا ہے تو جائز ہے۔

۲۔ اس شخص کو مسائل تجارت اس حد تک سیکھنا واجب ہے کہ اپنے کاروبار میں جائز اور ناجائز کو سمجھ سکے۔

۳۔ جائز ہے۔ ۴ جائز ہے ۵۔ بہتر ہے۔

۶۔ ایسی حالت میں کہ جب دوسرے لوگ تبلیغ کا کام انجام نہ دے رہے ہوں تبلیغ کرنا اور اس کا انتظام کرنا ضروری ہے جو ایسا کرے گا وہ تو آیت کریمہ "ولتكن منكم أمة يدعون إلى الخير و يأمرون بالمعروف و ينهون عن المنكر" (۱) کے فضیلت کا مستحق ہوگا، نیز ایسی حالت میں مقدور بھر کوشش نہ کرنا اور قیود و شرائط تبلیغ جانتے ہوئے محض اپنی بیوی بچوں میں ہی لگا رہنا اور محض اپنے کاروبار کے ہی بڑھانے کی فکر میں لگا رہنا دین کے قطب اعظم (امر بالمعروف ونہی عن المنکر) کے ترک کے وبال ونحوست میں مبتلا ہونے کا قوی خطرہ ہے۔

۷۔ حقوق واجبہ علی الحین کی ادائیگی اور انتظام کے بعد اس میں اخلاص سے، یعنی محض بہ نیت حصول رضائے باری بلا خیال ریا ونمود کی آمیزش کے ثواب کا مستحق ہوگا۔ اور حدیث ''فله اجرها و اجر من عمل بها'' کا مصداق ہوگا (۲)۔

۱۔ سورہ آل عمران: ۱۰۴۔

۲۔ ''من سن في الإسلام سنة حسنة فله أجرها و أجر من عمل بها بعده من غير أن ينقص من أجورهم شيء، ومن سن في

۱۔ دنیوی نقصان سے اگر یہ مراد ہے کہ کچھ آمدنی کم ہوگئی یا کاروبار ڈھیلا پڑ گیا یا کچھ نقصان ہی ہوگیا وغیرہ وغیرہ اور اخلاص سے اس نے ایسا کیا ہے اور عبارت کے سیاق وسباق سے یہی مضمون متبادر ہے تو بڑا ہی اجر عظیم ہے "جاھدوا بأموالکم وأنفسکم" (۱) کا مصداق ہوگا اور اگر نقصان اس حد تک ہے کہ اہل وعیال کے حقوق جنکی ادائیگی اس پر واجب علی العین ہے تلف ہو رہے ہوں اور اس کا کوئی انتظام بھی نہیں کیا ہے اور نہ کرتا ہے تو بجائے اجر کے الٹا گناہ ہو جائے گا کیونکہ یہ کوشش فرض علی الکفایہ ہے اور دوسرے حضرات انجام دے رہے ہیں اور وہ فرض علی العین ہے۔

۹۔ حسب استطاعت وقدرت سب پر ہے اور جو قیود وشرائط تبلیغ بھی بقدر معتد بہ جانتے اور سمجھتے ہوں ان پر زیادہ ہے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۰/۷/۱۳۸۵ھ

الجواب صحیح: سید احمد علی سعید، محمود غنی عنہ نائب مفتی دارالعلوم دیوبند

طریقۂ تبلیغ:

جبکہ شرعی جرم میں گناہ کبیرہ کے مرتکب مولوی قطع تعلق کا حکم بطور تنبیہ دیتا ہے تو مرتکب گناہ مولوی پر مقدمہ ازالہ حیثیت کا چالو کر کے مولوی کا آبرو وعزت کا نقصان کرتا ہے جس کے سبب سے عالموں کو اسلامی تبلیغ میں مشکلات کا سامنا ہوتا ہے اور سب وتوہین کے مولوی شرعی تبلیغ سے خاموش ہو جاتے ہیں، نیز جب تو کوئی عالم کبیرہ اور صغیرہ گناہ کی بابت مرتکب کو منع کرتا ہے تو پھر معلم کو اپنی عزت کی خیر نظر نہیں آتی ہے اور مرتکب گناہ بطریق الزام تراشی معلم پر شروع کر دیتا ہے اور دروغ شہادتیں بنا کر بذریعہ پولس معلم کو زدوکوب کرانا چاہتا ہے اور اس کے دیکھا دیکھی سیکڑوں گناہ میں مبتلا ہو گئے ہیں چونکہ شرعی جرم کی تو کوئی پرواہ نہیں، لہذا موجودہ زمانہ کی صورت کو مدنظر رکھتے ہوئے:

(۱) آیا کوئی ہندوستان میں اسلامی کمیٹی یا کوئی تبلیغ کا سربراہ حکام موجود ہے یا کہ نہیں اور ہو تو اسکا پتہ بتلائیں۔

(۲) آیا مندرجہ بالا صورتوں میں معلم کی طرف سے کوئی درخواست بروقت ضرورت مشکلات میں کسی وزارت ہند

الإسلام سنة سيئة كان عليه وزرها ووزر من عمل بها بعدهٔ من غير أن ينقص من أوزارهم شيئ" (مسلم ۱/۳۲۷)، "رحیمیہ دیوبند، من سن في الإسلام سنة حسنة فله أجرها وأجر من عمل بها من غير أن ينقص من أجورهم شيئا، ومن سن في الإسلام سنة سيئة فعليه وزرها ووزر من عمل بها من غير ان ينقص من أوزارهم شيئا" (نسائی ۱/۲۷۳، مطبع فیصل پبلیکیشنز دیوبند)۔

۱- سورۂ توبہ: ۴۱۔

کوگذاری جاسکتی ہے یا کہ نہیں؟

(۳) آیا ہندوستان کے مسلمان شرعی عبادات اور اسلامی تبلیغ میں آزاد ہیں یا کہ نہیں اور اسلامی تبلیغ قانونی جرم تو نہیں ہے۔

(۴) کیا ہندوستان کے کس کس مدرسہ میں تبلیغ الجماعت کے سرکردہ علما یا حکام موجود ہیں، نیز تبلیغ کس حد تک کی جاسکتی ہے۔

الجواب وباللہ التوفیق:

ایک ہے تبلیغ اور ایک تذکیر و نصح مومن، دونوں کیلئے الگ الگ احکام اور آداب وضوابط و قواعد ہیں، معلم ناصح ومذکر اور مبلغ کو چاہئے کہ پہلے انکو کسی شیخ مصلح ومربی سے سیکھے اور پھر اس کی ہدایت کے مطابق نصح وتبلیغ وتذکیر کرے تو بہت سے یہ مفاسد جنکا آپ نے ذکر کیا ہے پیش ہی نہ آئیں گے۔ اکثر بے ڈھنگے پن سے اور خود رو پیہ درخت کی مانند کرنے اور پھل لانے اور پیش کرنے سے پیدا ہوتے ہیں اس کے احکام وآداب تو بہت ہیں بلا کسی مربی شیخ ومصلح کی جوتیاں سیدھی کئے کماحقہ نہیں حاصل ہوسکتے ہیں، ہم بطور نمونہ دو ایک بیان کردیتے ہیں جس سے آپکو روشنی ملے گی۔

حضرت موسیٰ وھارون علیہما السلام کو جب اللہ تعالیٰ فرعون جیسے ظالم کی نصیحت کے لئے بھیجتے ہیں تو پہلے بطور تعلیم کے ان دونوں نبیوں سے فرماتے ہیں: "**فقولا له قولا لينا لعله يتذكر أو يخشى**" (۱) اور حدیث شریف میں ہے: "**بشروا ولاتنفروا الخ**" (۲)۔

یہ حضور ﷺ نے اس وقت نصیحت فرمائی جب دو صحابیوں کو عامل بنا کر بغرض تبلیغ احکام بھیجا ہے ان دونوں کا حاصل یہ ہے کہ مخاطب کے حال کا لحاظ کرتے ہوئے اولا ہمدردی ونرمی وبہی خواہی کے انداز میں ڈر کے ساتھ احکام خداوندی پیش کرنا بہتر ہے اس طریق سے کسی میں عناد یا معاند میں ہیجان نہ پیدا ہوگا، بلکہ وہ نادم وشرمندہ ہوکر اور بہی خواہ سمجھ کر متوجہ اور متاثر ہوگا اور اگر ان تمام حدود وضوابط شرعی کے برتنے اور اہتمام کے بعد بھی کوئی ہیجان میں آئے اور سختی کا معاملہ

۱- سورۃ طٰہٰ: ۴۴۔

۲- "يسروا ولاتعسروا بشروا ولاتنفروا"، بخاری شریف ۱/۴۲۶ باب ما یکرہ من التنازع والاختلاف مکتبہ اشرفیہ دیوبند، "بشروا ولاتنفروا ويسروا ولاتعسروا"، مسلم شریف ۲/۸۲، مطبوعہ یاسر ندیم کمپنی دیوبند)۔

کرے تو ٹھنڈے دل سے صبر کرے اور رجوع الی اللہ کرے تو سنت انبیا علیہم السلام کی اتباع حاصل ہوگی۔ اور بڑے اجر و ثواب کا مستحق ہوگا یہ بڑا کام ہے اور اس پر بڑا اجر ہے، مگر شرط یہ ہے کہ قاعدے سے ہو اور خود بینی اور خویشتن بینی نہ ہو اکثر خود بینی سے اور خویشتن بینی سے ہی خسارت پیدا ہو جاتے ہیں اور لوگ دشمن بن جاتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ”و امر“ **”هلك بالصلوة و اصطبر عليها واصبر“**(۱)، **”علی ما اصابک“** (۲) یعنی اپنے لوگوں کو نماز، یعنی عبادت اور تصحیح معاملہ فیما بینہ وبین اللہ کا حکم کرو اور اگر اس پر لوگ کچھ بدکیں اور سختی کریں تو سختی پر صبر کرو، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۳/ ۹/ ۱۳۸۵ھ
الجواب صحیح محمود عفی عنہ

چھٹی میں تبلیغ میں جانا:

میں شادی شدہ ہوں ۲۵ سال کی عمر ہے، بحرین سے انڈیا جانے کے لئے دو سال میں چار مہینہ کی چھٹی ملے گی میں ارادہ کرلیا ہوں کہ گھر نہ جا کر چار مہینہ تبلیغ دین کے لئے نکل جاؤں جب چھٹی ختم ہو جائے گی تو باہر ہی باہر بحرین آجاؤں گا اس درمیان بیوی سے ملاقات ہونا ناممکن ہے، ایسا کرنا کیسا ہے؟

شفیع احمد الاعظمی

الجواب وباللہ التوفیق:

بغیر بیوی کی مرضی واجازت کے اتنے دنوں تک مسلسل بیوی سے الگ اور پردیس میں رہنا جائز نہیں ہے، اس کے حقوق کی ادائیگی مقدم اور محمود عندالشرع ہے (۳)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

۱- سورۂ طٰہٰ: ۱۳۲۔

۲- سورۂ لقمان: ۱۷۔

۳- ”واعلم أن ترک جماعها مطلقاً لا يحل له، صرح أصحابنا بأن جماعها أحيانا واجب ديانة لكنه لا يدخل تحت القضاء والإلزام إلا الوطأة الأولى، ولم يقدروا فيه مدة ويجب أن لا يبلغ به مدة الإيلاء إلا برضاها وطيب نفسها به“(فتح القدير ۳۰۲/۵)، ”وفي الشامي: وهو أربعة أشهر..... فأمر أمراء الأجناد أن لا يتخلف المتزوج عن أهله أكثر منها، ولو لم يكن

عورت کی صحت وقوت کی بحالی کے لیے نرودھ اور مانع حمل دواؤں کے استعمال کا حکم شرعی:

اگر عورت کی صحت وتندرستی نیز بچوں کی بہتر نگہداشت کے واسطے مندرجہ ذیل چیزوں کو استعمال کیا جائے تو کیسا ہے؟ (نرودھ، مانع حمل دوائیں، لوپ وغیرہ)، براہ کرم اس اختلافی مسئلہ پر مفید رہنمائی فرمائیں۔

شہاب الدین (۱۳۸ گھوگھاری محلہ بمبئی)

الجواب وباللہ التوفیق:

اگر صحت خراب ہو، تکالیف حمل برداشت کرنے کی طاقت نہ ہو یا استقرار حمل میں ایسی تکالیف کا اندیشہ ہو جو ناقابلِ تحمل وبرداشت ہوں، یا مسلمان دیندار طبیب حاذق نے اس کی تشخیص کی ہو تو ان صورتوں میں عارضی طور پر قوت وصحت کی بحالی کے لئے ان چیزوں کے استعمال کی اجازت ہوجائے گی۔ (عارضی منعِ حمل تدابیر مثلاً نرودھ، لوپ، دوایا مرہم کے استعمال کی درج ذیل صورتوں میں گنجائش ہے) اور اگر یہ عوارض نہ ہوں تو عارضی طور پر بھی ان چیزوں کا استعمال کرنا مقصد شرع وشارع کے خلاف اور ان کی ناخوشنودی کا سبب ہوگا، اس لئے کہ تکثیر امت اجابت حضور ﷺ کا منشا ہے۔ چنانچہ فرمایا گیا ہے: ''تزوجوا الودود الولود'' أو کما قال (۱)، اور فرمایا گیا ہے: ''تناکحوا وتناسلوا فإني مکاثر بکم الأمم'' أو کما قال (۲) اور یہ عمل خواہش نبوی اور مقصد نبوی کے خلاف ہوگا۔ اور غربت کے خطرہ سے ایسا کرنے کی ممانعت تو خود کلام پاک میں عقیدہ کے درجہ کی چیز قرار دے کر بتایا گیا ہے۔ فرمایا گیا ہے: ''وانکحوا الأیامیٰ منکم والصالحین من عبادکم وإمائکم إن یکونوا فقراء یغنہم اللہ من فضلہ واللہ واسع علیم'' (۳)۔

نیز حدیث پاک میں فرمایا گیا ہے: ''اطلبوا الرزق من الباءۃ أو کما قال''، اور ایک جگہ فرمایا گیا ہے: ''من النکاح'' (من الباءۃ کے بجائے)، اس لیے ان خطرات سے بھی ایسا عمل کرنے کی شرعاً اجازت نہ ہوگی، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دار العلوم دیوبند سہارنپور ۲۰/۱۰/۱۴۰۰ھ

في ھذہ المدۃ زیادۃ مضارۃ بہا لما شرع اللہ تعالی الفراق بالإیلاء'' (رد المحتار علی الدر المختار ۳/۳۸۰)۔

۱- مشکوۃ ۲/۲۶۷۔

۲- ابن ماجہ نے ان الفاظ میں اس حدیث کی روایت کی ہے "فإني مکاثر بکم الأمم" (ابن ماجہ ۱/۳۴۰، ابواب النکاح، ماجاء فضل النکاح)۔

۳- سورۂ نور ۳۲۔

گھڑی میں اسٹیل کی چین لگانا:

کلائی گھڑی میں اسٹیل کی چین باندھنا اور اس کو اپنے ہاتھ میں باندھ کر نماز پڑھنا جائز ہے یا نہیں؟ یہاں کے بعض علماء اسٹیل کی چین باندھنے کو یا اس کو باندھ کر نماز پڑھنے کو مکروہ بتلاتے ہیں۔

محمد شوکت علی انصاری (بڈھانہ گیٹ شہر میرٹھ، یوپی)

الجواب وباللہ التوفیق:

اسٹیل کی چین کا زیور میں شمار نہیں ہے کہ اس کا باندھنا حرام ہو، بلکہ ایک ضرورت کی حیثیت سے استعمال ہوتی ہے، ہاں جو گھڑی یا چین زنانی طرز وساخت کی ہو اس کو مردوں کا استعمال کرنا ''لعن النبی ﷺ المتشبهين من الرجال بالنساء والمتشبهات من النساء بالرجال'' (۱) کے مطابق درست نہ رہے گا، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور، ۶/ ۴/ ۱۴۱۱ھ

اسٹیل کے چین والی گھڑی کا استعمال:

دستی گھڑی کا اسٹیل پٹا نما چین کا کیا حکم ہے ہاتھ میں گھڑی کیساتھ باندھنا جائز ہے یا نا جائز ہے تو کپڑے نما نائلون کا پٹا اور دیگر کون سی چیز جائز ہیں؟

احمد علی محمد علی

الجواب وباللہ التوفیق:

زیور کے لئے دھات کی چیز کا استعمال درست نہیں۔ لیکن اسٹیل کا چین زیور نہیں ہے، بلکہ ضرورت کی بناء پر مستعمل ہوتا ہے۔ اس لئے اسٹیل کے چین کا استعمال نا جائز نہیں ہوگا، کپڑے نما نائلون کے پٹے کا استعمال بھی جائز ہے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

۱- صحیح البخاری ۲/ ۸۷۴ باب المتشبہین بالنساء والمتشبہات بالرجال۔

سینٹوں کا استعمال درست ہے یا نہیں؟

سینٹ لگانا اور اس کو لگا کر نماز پڑھنا کیسا ہے؟ بقول کسے اس میں الکحل ملایا جاتا ہے۔

الجواب وباللہ التوفیق:

اگر یقین ہو کہ الکحل سے مراد وہی الکحل ہے جو خمور اربعہ سے بنا ہے جو حرام قطعی اور نجس العین ہوتا ہے، تو اس کو استعمال کرنا درست نہ ہوگا، ورنہ گنجائش رہے گی، کیونکہ آج کل عموماً ایسا الکحل نہیں ڈالا جاتا ہے جس کا حرام بنفسہ اور نجس العین ہونا ضروری ہو، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دار العلوم دیوبند سہارنپور ۲/۶/ ۱۴۱۱ھ

الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ، کفیل الرحمٰن نشاط عثمانی

میوزک والی گھڑی کے استعمال کا شرعی حکم:

ایک دیوار گھڑی چل رہی ہے جس میں گھڑی بجتے وقت موسیقی کے طور پر بہت ہی سریلی آواز میں چند گھنٹیاں بجتی ہیں، اس کے بعد اصل گھنٹہ بجتا ہے، ایسی موسیقی والی گھڑی مسجد یا اپنے گھروں میں لگانا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب وباللہ التوفیق:

ایسی گھڑیوں کو رکھنا ممنوع ومکروہ ہوگا (۱)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دار العلوم دیوبند سہارنپور ۲/۶/ ۱۴۱۱ھ

الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ، کفیل الرحمٰن نشاط عثمانی

۱- اس لیے کہ یہ گھڑی اگر چہ مستقل آلہ لہو ولعب نہیں ہے لیکن اصل گھنٹہ سے پہلے موسیقی کی سریلی آواز زائد از ضرورت ہے جو جرس کے مشابہ ہے، اس لیے ایسی گھڑی کو گھر میں اور خصوصاً مسجد میں لگانا مکروہ وممنوع ہے "قال في الدر المختار: استماع صوت الملاهي كضرب قصب ونحوه حرام" (الدر المختار مع الشامی ۵/ ۲۲۳ کتاب الحظر والاباحۃ) (مرتب)۔

کیا سرخ روشنائی کا استعمال درست ہے:

سرخ روشنائی کا استعمال مکروہ ہے یا نہیں؟ اگر ہے تو تنزیہی یا تحریمی؟ ویسے آج کل سرخ روشنائی بکثرت استعمال کرتے ہیں خصوصاً قانونی کاغذات سجلات وغیرہ میں بعض جگہ استعمال کیا جاتا ہے، ایسی صورت میں بھی محظور ہے یا گنجائش ہے؟ یہ مسئلہ کہیں دیکھا تھا اب یاد نہیں کہاں دیکھا تھا تلاش بھی کیا پایا نہیں۔

محمد روح الحق (سلامت منزل عربک کالج اسٹریٹ تریچی)

الجواب وبالله التوفيق:

سرخ روشنائی کا استعمال ناجائز نہیں ہے، شروع میں چونکہ یہ بات مشہور بین العوام ہوگئی تھی کہ سرخ روشنائی خون سے مشتق ہے اور خون نجس العین ہوتا ہے، اس لیے اس کو استعمال نہ کرنا چاہیے، سرخ روشنائی کی طرح سرخ رنگ (پڑیہ کا رنگ) کے بارے میں ایسی ہی شہرت ہوگئی تھی حالانکہ وہ بات غلط ہے، خون سے نہیں بنتا ہے، بالکل اسی طرح نیلی یا سیاہ روشنائی جو فاؤنٹن پین میں پڑتی ہے، اس کے بارے میں مشہور ہوا تھا کہ اس کا استعمال ناجائز ومکروہ ہے، اس لیے کہ اس میں اسپرٹ جو شراب کا جوہر یا شراب کی تلچھٹ ہے پڑتی ہے اور یہ نجس العین ہے۔

یہ بات تو اس روشنائی کے سلسلے میں ایک حد تک صحیح بھی تھی، لیکن جب یہ سائنٹفک طریقہ سے بننے لگی اب اس میں شراب کی تلچھٹ نہیں ہوتی تو وہ حکم کراہت کا اس سے بھی ختم ہوگیا، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۵/۳/۱۴۰۱ھ

بحالت اضطرار انسان کا خون چڑھانا درست ہے:

ایک شخص بیمار ہے اور اس کا خون جسم میں کم ہے اور ڈاکٹر نے اس کے جسم میں خون کی قریب پانچ بوتلیں یا پچھو گرام کی دی ہیں، مگر یہ نہیں معلوم کہ وہ کس انسان کا خون تھا، عیسائی کا تھا یا یہودی کا یا کافر کا تھا، دریافت طلب امر یہ ہے کہ اس طریقہ سے دوسرے انسان کا خون لے سکتے ہیں یا نہیں؟، کیا اس میں شرط ہے کہ مسلمان کا ہی خون ہونا چاہئے یا کسی کا بھی ہو مسلمان میں چل سکتا ہے؟

عبدالصمد احمد پٹیل (گلاسٹر لندن)

الجواب وباللہ التوفیق:

نص قرآنی میں خون بھی مثل مردار اور شراب کے نجس وحرام ہے، خواہ مسلم کا ہو یا غیر مسلم کا (عیسائی، یہودی، مجوسی وغیرہ) ہو، خواہ مرد کا ہو، خواہ عورت کا سب نجس وحرام ہے (۱)۔ اور یہ الگ بات ہوگی کہ حرمت نجاست کی شدت وغلظت کفر واسلام، متقی وغیر متقی وغیرہ کیفیات کے اعتبار سے کچھ باطنی فرق تو ہے، مگر اس فرق کا کوئی اثر اس کے استعمال کا جو حکم شرعی ہے اس میں ظاہر نہ ہوگا، کیونکہ نفس حرمت ونجاست میں سب مشترک ہیں اور حکم شرعی اس پر متفرع ہے اور وہ یہ ہے کہ اس کا استعمال کرنا خواہ خارجی ہو یا داخلی بذریعہ انجکشن ہو یا کسی اور طریقہ سے بغیر اضطرار یا شدید مجبوری کے جائز نہیں ہوگا۔

لہٰذا اگر حاذق طبیب (ڈاکٹر) یہ تشخیص کردے اور یہ کہہ دے کہ اس مرض کا یہی علاج ہے کہ اس جسم میں خون چڑھا یا جائے، اس تشخیص کے مطابق خون چڑھانے کی گنجائش ہوجائے گی (۲) اور چونکہ مریض کے جسم میں جس نمبر اور جس درجہ کا خون ہوتا ہے اسی نمبر اور اسی درجہ کا خون چڑھانا ضروری ہوتا ہے، اس لیے اسی نمبر کا خون، خواہ مسلم کا ہو یا غیر مسلم کا، مرد کا ہو یا عورت کا جس کا بھی ہو وہی دینا ضروری ہوگا، محض مسلمان کا ہی خون دینا ضروری نہ ہوگا۔

البتہ اگر پہلے سے معلوم ہوجائے کہ مسلمان کا خون اس نمبر اور درجہ کا ہے اور اس کا لحاظ کرلیا جائے اور کسی مسلمان ہی کا خون چڑھادیا جائے تو یہ بہتر ہوگا۔

خلاصہ یہ ہے کہ حسب تشخیص وتجویز ماہر ڈاکٹر کسی کا بھی خون ہو، بحالتِ مجبوری مسلمان کو بھی چڑھایا جاسکتا ہے اور اس طرح خون چڑھانے سے حرمتِ مصاہرت یا رضاعت وغیرہ کا بھی خطرہ نہ ہوگا، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

۱۔مرنے کے بعد اعضائے انسانی کے ہبہ کرنے کا حکم:

کیا ایک مسلمان کو مسلم ہونے کی حیثیت سے آنکھ، ناک، کان یا جسم کے کسی عضو کے متعلق مرنے سے قبل یہ وصیت کرنا جائز ہے کہ میرے جسم کا فلاں عضو میرے مرنے کے بعد کسی ہسپتال کو بطور عطیہ دیدیا جائے۔

۱- "حرمت علیکم المیتة والدم ولحم الخنزیر" الخ (سورۂ مائدہ ۳)۔

۲- ''یجوز للعلیل شرب الدم والبول وأکل المیتة للتداوی إذا أخبر طبیب مسلم إن شفاءہ فیه ولم یجد من المباح مایقوم مقامه''(عالمگیری ۵/۳۵۵ کتاب الکراہیۃ) (مرتب)۔

۲-اعضاء انسانی سے پیوند کاری:

کیا کسی مسلم کے جسم میں کسی مسلم یا غیر مسلم کا کوئی عضو بوقت ضرورت منسلک کرنا جائز ہے؟

۳-خون چڑھانے کا شرعی حکم:

کیا کوئی مسلمان اپنا خون بطور عطیہ کسی مسلم یا غیر مسلم کو دے سکتا ہے، یا اپنے جس میں کسی مسلم یا غیر مسلم کا خون داخل کرا سکتا ہے؟

ایک مجتہد الحاج السید ابو القاسم الموسوی الخوئی نے ''المسائل'' نام کی ایک کتاب تصنیف کی ہے جو شائع ہو چکی ہے، اس میں ایک جگہ انہوں نے لکھا ہے: اگر کسی نے اپنے وصیت نامہ میں اپنے جسم کے کسی عضو کو بطور عطیہ دینے کے لیے لکھ دیا ہے، تو اس کی وصیت کے مطابق عمل کرنا جائز ہے۔ کیا مفتیان اہل سنت والجماعت اس فتوے سے متفق ہیں؟

محمد جاوید ہندی عفی عنہ (مرکز فیض قربانیہ سکندریہ ماہمی، بمبئی)

الجواب وباللہ التوفیق:

۱-کسی مسلمان کو جائز نہیں کہ وہ یہ وصیت کرے کہ میرے مرنے کے بعد میرا جسم یا جسم کا فلاں عضو آنکھ، کان وغیرہ کچھ بھی فلاں شخص کو یا کسی ہسپتال کو بطور عطیہ یا بعوض قیمت دیدیا جائے، اگر وصیت کردے گا تو یہ وصیت منعقد وصحیح بھی نہ ہوگی اور اس کے مرنے کے بعد اس وصیت پر عمل کرنا بھی جائز نہ ہوگا، جو لوگ عمل کریں گے سخت گنہگار ہوں گے اور یہ سب حکم ظاہر ہے، اس لیے کہ وصیت مملوکہ مال میں ہوتی ہے اور یہ جسم انسان کا مملوک نہیں ہے، بلکہ اللہ کی ملک ہے اور اس کے پاس محض بطور امانت کے ہے، بغیر حکم شرع وحکم خدا ایک انگلی بھی کاٹ ڈالنا جائز نہیں ہے بلکہ حرام وسخت گناہ ہے۔

۲-یہ چیز بھی قطعاً نا جائز وحرام ہے، کوئی عضو، خواہ مسلمان ہی کا ہو کٹ کر جسم سے الگ ہونے کے بعد جیفہ ومردار ہو کر نجس وناپاک ہو جاتا ہے اور پھر کسی جسم میں لگانے سے، خواہ مسلمان ہی کے جسم میں لگایا جائے مردار وجیفہ ہونے سے خارج نہیں ہوگا اور نہ پاک وطاہر ہی ہوگا، لہٰذا اتنا حصہ جسم مردار اور ناپاک ہی رہے گا اور وہ شخص کبھی نماز بھی نہ پڑھ سکے گا اور نہ کبھی طاہر ہی ہو سکے گا۔ ہاں اگر اضطراری صورت ایسی ہو جائے کہ احشاء جسم (اندرون جسم) میں مثلاً گردہ، پھیپھڑا، جگر، دل وغیرہ میں سے کوئی اس درجہ خراب ہو جائے کہ اس کو نکال کر اس کی جگہ دوسرا لگانا ضروری ہو جائے اور ماہر معالجوں کے نزدیک جانبری کے لیے اور زندگی بچانے کے لئے اس عمل کے بغیر چارہ نہ رہے، بلکہ یہی عمل متعین ہو جائے اور صحت و

بقاءِ زندگی کا گمان غالب حاصل رہے تو اس اضطراری حالت میں جان باقی رکھنے کے لیے اس عمل کے بقدر اضطرار گنجائش ہوسکے گی، پھر بھی یہ کوشش لازم وضروری رہے گی کہ بجائے انسانی عضو کے کسی جانور کا عضو اور وہ بھی ماکول اللحم جانور کے عضو سے کام چل سکے تو صرف اسی عضو سے کام لیا جائے۔

۳- اس نمبر کا یہ حکم ہے کہ اضطراری حالت میں جب کہ جان بچنے کی اس کے علاوہ کوئی اور صورت نظر نہ آوے تو محض قدرِ ضرورت کی مقدار دینے اور استعمال کر لینے کی گنجائش نکل سکے گی اور اس میں کوشش بھی لازم رہے گی کہ کسی مسلمان کا خون نصیب ہوجائے۔

۴- اس نمبر کا جواب (۱) کے جواب میں آچکا کہ یہ مسئلہ بالکل غلط اور ناقابلِ التفات ہے اور ناقابل عمل ہے، ہر گز اس وصیت پر عمل کرنا کسی کو جائز نہیں ہے، اضطراری صورت مستثنٰی ہے اور اس سے وصیت کا کوئی تعلق نہیں ہے، لہٰذا اس سے دھوکہ نہ کھایا جائے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دار العلوم دیو بند سہارنپور ۱۲/۸/ ۹۸ ۱۳ھ

پاس شدہ اسقاطِ حمل بل کا نچوڑ مع شرائط:

(جموں وکشمیر) رنبر سینل کوڈ میں اسقاطِ حمل سے متعلق تفصیلات اور سفارشات ایک سو سال پرانی ہیں، اس وقت اسقاطِ حمل ایک جرم تھا، اس سلسلہ میں حاملہ اور حمل گرانے والے معالج دونوں کو سزا دی جاسکتی تھی۔ البتہ اس میں استثناء اس وقت پیدا ہوتا جب عورت کی جان خطرے میں تصور کر کے حمل گرایا گیا ہوتا۔

اسقاطِ حمل بل کے مطابق:

کوئی بھی رجسٹرڈ معالج حمل گرانے کا مجاز ہوگا جب کہ:

۱-i　مدت حمل بارہ ہفتوں سے زیادہ نہ ہو۔

۲-ii　مدت حمل بارہ ہفتوں سے زیادہ اور ۲۰ ہفتوں سے کم نہ ہو، اول الذکر صورت میں ایک معالج اور مؤخر الذکر صورت میں دو معالج کی ایماندارانہ رائے ضروری ہوگی۔

۱- حمل کی موجودگی سے حاملہ عورت کی زندگی یا اس کی ذہنی یا جسمانی صحت کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو۔

۲- اس بات کا اندیشہ ہو کہ پیدا ہونے والا بچہ جسمانی یا دماغی بے اعتدالی کا شکار ہوگا۔

۳-کوئی شادی شدہ یا غیر شادی شدہ حاملہ عورت یہ شکایت کرے کہ اس کا حمل زنا بالجبر سے ٹھہرا ہے۔

الجواب وباللہ التوفیق:

عرض یہ کہ جب تک پورا اہل سامنے نہ ہو اس کے بارے میں کوئی حتمی ویقینی بات نہیں کہی جا سکتی، البتہ جن چیزوں کا ذکر آپ حضرات نے سوال میں کیا ہے، اس کا شرعی حکم نمبر وار لکھدیا جاتا ہے، لہذا اگر شائع کرانا ہو تو اس جواب کو اس بل کا جواب قرار دے کر شائع نہ کیا جائے، بلکہ اگر شائع کرنے کی ضرورت ہو تو پورا اہل یا دستوریا اس کی بعینہ نقل بھیجی جائے اس پر جواب میں جو کچھ لکھا جائے اس کو جواب میں شائع نہ کیا جائے، البتہ بطور مسئلہ اس کو شائع کر سکتے ہیں۔

ا-ہر رجسٹرڈ معالج کی رائے اسقاط حمل کے بارے میں علی الاطلاق معتبر نہ ہوگی، بلکہ ماہر وتجربہ کار طبیب یا ڈاکٹر جو اس معاملے میں اسپیشلسٹ ہو اور حدود شرع کے اندر رہ کر تشخیص وحکم کرے اس کا اعتبار ہوگا، اس لیے کہ حمل متیقن ہو جانے کے بعد اس کا بغیر شرعی عذر کے گرادینا مکروہ تحریمی وناجائز ہوتا ہے اور حرام وناجائز فعل کے ارتکاب کی اجازت یا حرام وناجائز وغیرہ چیز کے استعمال کی اجازت بغیر اضطراری اندازکی حاجت کے اور بغیر کسی شدید ضرورت کے نہیں ہوتی، تداوی بالحرام اور احکام المعذورین کے مسائل سے بھی اس مسئلہ پر کافی روشنی پڑ سکتی ہے اور کچھ تفصیل آئندہ نمبروں میں بھی آجائے گی۔

۲-وفي رد المحتار،۶(ے۲): قوله: ويكره أن تسقى لإسقاط حملها الخ أى مطلقا قبل التصوروبعدهٗ و أيضاً فيه: (ج ۵) ونقل عن الذخيرة، لو أرادت الإلقاء قبل مضى زمن ينفخ فيه الروح إلى قوله: يكره فإن الماء بعد ما وقع في الرحم مآله الحياة فيكون له حكم الحيوة۔

و أيضاً فيه قوله: جاز لعذر كا لمرضعة إذا ظهربها الحبل وانقطع لبنها وليس لأب الصبي مايستأجربه الظئر ويخاف هلاک الولد

وفي كراهية الخانية: ولا أقول به إذ المحرم إذا كسربيض الصيد يضمن؛ لأنه أصل الصيد، فلما كان يواخذ بالجزاء فلا أقل من أن يلحقها إثم هنا إذا اسقطت بغير عذرٍ

ان عبارتوں سے معلوم ہوا کہ حمل خواہ بارہ ہفتوں سے کم کا ہی کیوں نہ ہو اس میں کسی عضو کی تخلیق بھی اگر چہ نہ ہوئی ہو، لیکن حمل کے تیقن کے بعد اس کو بغیر کسی شرعی عذر کے گرادینا کسی طرح جائز نہیں!

۳-حمل پر جب بارہ ہفتے پورے ہوجاتے ہیں تو عموماً بعض اعضاء کی تخلیق ہوچکی ہوتی ہے کما فی البدائع وغیرھا، اور جب بعض اعضا کی تخلیق ہوچکی ہوتو بغیر شرعی وجہ کے ساقط کرادینے میں اگر چہ شوہر کی اجازت سے ساقط کرائے گناہ عظیم کے ساتھ تعزیر وضمان وعقر وغیرہ بھی واجب ہوجاتا ہے۔

في الدر: وما استبان بعض خلقه كظفر وشعر كتام فيما ذكر من الأحكام وتحته في الشامي (۵/۳۷۸) ولو ألقت مضغة ولم يتبين شئي من خلقه (إلىٰ قوله) تجب فيه عندنا حكومة عدل (۵/۳۷۹).

"قوله فإن أذن أولم يتعمد لاغرة لعدم التعدي الخ وقال في الشرنبلالية: أقول: هذا يتمشى على الرواية الضعيفة لا على الصحيح".

اور جب حمل پر سترہ ہفتے پورے ہوجاتے ہیں تو جنین میں عموماً روح وجان پڑجاتی ہے۔

كما في الرد: "وقدروا المدة بمائة وعشرين يوماً وهكذا في البحر وغيره".

اور جان پڑجانے کے بعد بغیر کسی شرعی وجہ کے ساقط کرادینے میں قتل کردینے کا گناہ ہوتا ہے اور مستوجب سزا وعقر ہوتا ہے۔

"كما في الرد، (۳۷۹ ج۵) ولا يخفىٰ أنها تأثم إثم القتل لو استبان خلقه ومات بفعلها" (۱).

۴-شرط اول معالجین میں اگر وہ شرائط وقیود موجود ہوں جو نمبر ایک میں لکھی گئی ہیں اور وہ معالج حدود شرع کے اندر رہتے ہوئے تشخیص کر کے حکم کرے کہ اگر اسقاط نہ کرایا گیا تو حاملہ کی زندگی خطرے میں ہے تو گرانا درست ہوگا ورنہ نہ ہوگا، جسمانی یا ذہنی صحت کے نقصان کے محض احتمال پر گرانا درست نہ ہوگا۔ کذا فی الرد، ۶/۱۴۸ **"يرخص إذا علم فيه شفاء ولم يعلم دواء اٰخر" (۲) "وكذا كل تداو لا يجوز إلابطاهر وجوزه في النهاية بمحرم، إذا أخبرهٗ طبيب حاذق مسلم أن فيه شفاء ولم يجد مباحاً يقوم مقامه" (هذه العبارة ايضاً تشير الىٰ ما قلنا).**

شرط دوم: یہ اندیشہ محض احتمال کا درجہ ہے، یہ اسقاط کے لیے وجہ جواز نہیں بن سکتا (کما قلنا اٰنفا)۔

شرط سوم: یہ شرط بھی شرعاً صحیح نہیں ہے، اس لیے کہ غیر شادی شدہ عورت کے حمل کو اگر چہ بالزنا کردیں اور زانی وزانیہ کو جتنا چاہیں قصوروار قرار دیں جو سزا مناسب ہو دے دیں، اس حمل کا خواہ زنا بالجبر سے یا زنا بالرضا سے ہو، کوئی قصور

۱- ردالمحتار ۳۷۹/۵۔

۲- وأیضاً فی الرد ۵/۲۴۹۔

نہیں اس کو ضائع کرنا ظلم ہوگا، اس کے ساقط کرنے میں بھی اور گرانے میں بھی وہی تفصیل وقیودات ہیں جو ابھی اوپر مذکور ہوئیں: ''فإن الماء بعد ما وقع في الرحم ماله الحيوة فيكون له حكم الحيوة'' (الہدایہ)، اس لیے جب تک وہ شرائط وقیود متحقق نہ ہوجائیں گرانے کی شرعاً گنجائش واجازت ہرگز نہ ہوگی اور شادی شدہ عورت سے اگر زنا کا صدور متحقق وثابت بھی ہوجائے خواہ زنا بالجبر کی صورت میں یا زنا بالرضا کی شکل میں ہو اور خواہ اس کی سزا غیر شادی شدہ عورت سے کتنی ہی زیادہ اور سخت ہو مگر اس کے حمل کو زنا سے کہنا یا اس کو حرام کہنا درست نہیں، حدیث شریف میں ہے: ''الولد للفراش وللعاهر الحجر'' (الحدیث)(۱) حتیٰ کہ اگر عورت اس حمل کے بطریق لعان بالزنا ہونے کا اقرار کرے جب بھی جب تک خود شوہر بھی اس کے بارے میں اپنا ہونے سے انکار نہ کرے اور حلف انکار نہ کرے حرامی نہ کہا جائے گا اور بغیر ان اعذار ومجبوریوں کے اور بغیر ان شرائط وقیود کے، جس کا ذکر تفصیل سے پہلے آچکا ہے، گرانا شرعاً کسی طرح جائز نہ ہوگا، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

یوتھینزیا کا شرعی حکم:

جب ڈاکٹر کسی مریض سے مایوس ہوجاتے ہیں کہ اب یہ شخص اپنے مرض سے نجات نہیں پائے گا، بیماری اتنی بڑھ گئی کہ صحت وتندرستی کی امید ہی نہیں، تجربہ سے ثابت ہے کہ عادتاً ایسا بیمار صحیح ہوکر جیا نہیں کرتا ہے اور اس مریض کو بسبب اپنی بیماری کے مزید تکلیف بھی ہورہی ہے تو اولیا سے یا خود علیل سے اجازت لیکر بذریعہ انجکشن اس مریض کی جان لے لیتے ہیں، یعنی خاص زہریلی دوا سے اس کو ختم کردیتے ہیں، تاکہ اپنی تکلیف سے راحت پائے اور بیماری ایسی ہے کہ مرنا تو ہے ہی، لہٰذا تکلیف شدید کو ختم کرنے کے لیے ڈاکٹر لوگ شفقۃً علی المریض اس کی جان کو تلف کردیتے ہیں اور اس جان تلفی میں مریض کو کسی قسم کی تکلیف نہیں ہوتی جہاں انجکشن دیا اور سانس بند ہوگئی موت آچکی اس عمل کو انگریزی اصطلاح میں یوتھینزیا کہتے ہیں۔

دراصل اس عمل کے مختلف طریقے ہیں ایک یہ کہ بذریعہ انجکشن زہریلی دوا بدن کے اندر پہونچائی جائے، دوسرے یہ کہ ہسپتالوں میں ایک مشین ہے جس کو آلۂ تنفس کہا جاتا ہے، جب مریض اتنا کمزور ہوجاتا ہے کہ خود بخود سانس نہیں لے سکتا ہے، تو اس آلہ کے ذریعہ سے مریض کے بدن میں سانس پہونچایا جاتا ہے جس سے وہ زندہ رہتا ہے، مشین کو بند کرنے سے وہ

۱- مشکوۃ المصابیح / ۲۸۸۔

متنفس نہیں رہتا، یعنی مر جاتا ہے، اس طریق سے وہ ختم کیا جاتا ہے یہ بھی بوجہ شدید تکلیف اور زندگی سے نا امیدی۔

تیسرے یہ کہ سلسلۂ علاج کو بند کر دیا جائے مریض کو ایسی بیماری ہے کہ اگر علاج نہ کیا جائے تو ہلاک ہو جائے گا اگر چہ اصل مرض سے نجات نہ ہوگی، لیکن علاج سے کم از کم زندہ تو رہے گا تو چونکہ مرض کی سختیاں نا قابلِ برداشت ہیں، اس لیے ڈاکٹر علاج کو منقطع کر دیتا ہے، تاکہ رفتہ رفتہ مریض اپنے مرض سے اپنی موت مر جائے (ڈاکٹروں کے یہاں بعض بیماریاں دائمی ہیں جن کا علاج نہیں اور وہ مفضی الی الموت ہوا کرتی ہیں)۔

طریقہ اول کے مطابق تو ظاہر ہے کہ یہ صریح قتل ہے، یعنی قتل نفسِ زکیہ بلا حق شرعی جس کی حرمت وقباحت مختلف ومتعدد آیات واحادیث سے مستفاد ہے اور مرض کی سختیاں اور اس کے دوام نیز تکلیف شدید کا تحمل سے باہر ہونا قتل کے لیے اباحت نہیں بن سکتے بوقت شدت وقلق نہ مبتلیٰ بہ کو جائز ہے کہ اپنی جان تلف کرے اور نہ غیر کو حتیٰ کہ تمنّیٔ موت سے بھی ممانعت وارد ہے، ایسے مواقع پر جیسا کہ بخاری شریف ودیگر احادیث کی کتابوں سے ثابت ہے۔

اگر بندہ کی اس تحریر وتقریر میں کچھ فتور ہو تو آں حضور اس کی اصلاح ضرور فرما دیں، البتہ ثانی وثالث طریقہ میں کسی قدر ردّ دو ہے، اس لیے کہ زید کہتا ہے کہ مذکورہ مشین کا استعمال بھی از قبیل تداوی ہے، اس لیے کہ اس آلہ کے ذریعہ سے حیات انسانی کو باقی رکھا جاتا ہے اور بیماری کا مقابلہ ہوتا ہے، بعینہٖ یہی حال معالجات وتداوی کا ہے، اس میں بھی یہ بات پائی جاتی ہے پس دونوں یکساں ہوئے، لہٰذا حکم بھی متحد ہوگا دونوں کے لیے اور فقہاء حضرات نے تصریح کی کہ تداوی وعلاج مباح ہے کوئی فرض وواجب نہیں، جب مباح ہے تو کرنے نہ کرنے میں اختیار ہے اور علاج نہ کرنے کی صورت میں اگر موت واقع ہو جائے تو کسی قسم کا گناہ لاحق نہیں ہوگا۔ کما فی الہندیہ فی کتاب الکراہیہ

"وأما الدرجة المتوسطة: وهي المظنونة كالمداواة بالأسباب الظاهرة عند الأطباء ففعله ليس مناقضاً للتوكل بخلاف الموهوم وتركه ليس محظوراً الخ، وفيها أيضاً عن السراجية:

الإشتغال بالتداوى لابأس به إذا اعتقد أن الشافي هو الله تعالىٰ الخ (باب التداوى والمعالجات) وفي الشامية من الحظر والإباحة: بخلاف التداوى ولو بغير محرم، فإنه لوتركه حتىٰ مات لايأثم كما نصوا عليه، لأنه مظنون"(۱)۔

ان عبارات سے ظاہر ہے کہ ترک تداوی کی صورت میں مر جانے پر کوئی معصیت لازم نہیں آتی، نیز عباراتِ ظاہرہ سے اباحت تداوی مترشح ہے، لہٰذا زید اس بات کا قائل ہے کہ مشین یعنی آلۂ تنفس کا بند کرنا یا موقوف کرنا تداوی کے ترک جیسا

۱- 　فتاوی ہندیہ ۵/ ۳۴۹۔

ہے اور اگر وہ مریض ہلاک ہوجائے تو کسی پر گناہ نہیں کوئی ذمہ دار نہیں، اور فقہاء نے یہ علت بیان فرمائی کہ "لانہ مظنون" یعنی معالجہ وتداوی ظنی شئی ہے، قطعی اور یقینی نہیں جس کا التزام واجب ہو، ایسا ہی یہ مشین اس بات پر قاطع نہیں کہ انقطاع پر آدمی مر ہی جاوے گا، بلکہ ایک دو ایسے واقعات ہوئے کہ ڈاکٹروں نے مشین کو بند کیا پھر بھی مریض کافی مدت تک زندہ رہا، معلوم ہوا کہ دوا کی طرح یہ بھی مظنون ہے،''ولا یاثم بترک المظنون ان مات منه کما مر آنفاً''۔

اس کے برخلاف بکر یہ کہتا ہے کہ طریق ثانی بھی فی الحقیقت مثل قتل نفس کے ہے، مشین بند کردینے سے بھی ڈاکٹر مریض کی جان کو ہلاکت میں ڈال رہا ہے اور وجہ اس کی یہ ہے اور غلبہ ظن بھی یہی ہے کہ انقطاع مشین سے مریض مرجائے گا، تجربہ ومشاہدات سے یہ بات ثابت ہے کہ عادۃً آدمی مشین کے موقوف ہوجانے پر مرجاتا ہے شاذ ونادر ایسا ہوا کہ مشین کے عدم جریان کے وقت بھی مریض حیات رہا لیکن اکثر وبیشتر موت کا وقوع لازمی ہے، پس اس تجربہ ومشاہدہ سے جو غلبہ ظن وغالب گمان حاصل ہوا ہے وہ کالیقین سمجھا جاسکتا ہے، لہٰذا زید کا یہ کہنا کہ مظنون ہے قابل تسلیم نہیں، بلکہ غلبۂ ظن تو مستقل دلیل بن سکتا ہے ''عند انعدام ما فوقها من الدليل''، پھر شامی نے تصریح کی ہے کہ''والظاهر أن التجربة يحل بها غلبة الظن دون اليقين'' (۱)۔

بایں معنی صورت مذکورہ میں آلہ تنفس کو روکے رہنے سے اگر مریض مرجائے تو قتل کا گناہ ہوا، یعنی قتل بالسبب کیونکہ مشین کا تھامنا سبب بنا قتل کے لئے جیسا کہ فقہی جزئیہ میں حضر بئر سبب موت بنا ''فيضاف الفعل إلى المتسبب''، پس ڈاکٹر پر قتل کا گناہ ہوجائے گا۔ رہا ترک تداوی سو یہ تو جب ہے جب کہ علاج ومداوات ابھی شروع ہی نہیں ہوا۔

ابتداءً بالتداوی سے قبل کسی نے ترک کو اختیار کیا تو کوئی مضائقہ نہیں اور مذکورہ عبارات میں جہاں ترک تداوی کو مباح وغیر موجب اثم قرار دیا تو اس کا محمل یہی ہے، یعنی سلسلۂ تداوی شروع کرنے سے پہلے، لیکن جس وقت دوا دارو شروع ہوچکی اور یہ غالب گمان ہے کہ اس دوا سے مریض کو فائدہ پہنچ رہا ہے اور یہ بھی غلبۂ ظن کے درجہ میں ہے کہ اگر سلسلہ دوا منقطع ہوجائے تو بیمار مرجائے گا اب جائز نہیں کہ دوا کو چھوڑے یا مشین کو بند کرے چونکہ اب ظن نہیں رہا، بلکہ قریب الیقین معاملہ ہے، یعنی ظن غالب جو موجب عمل ہے، اگر مشین کے روکنے پر مریض کا انتقال ہوگیا تو اثم قتل ثابت ہوگا، ایسا ہی دوا وعلاج کے چھوڑنے پر قتل کا گناہ ہوگا تو یہ ترک تداوی کے قبیل سے نہیں، بلکہ انقطاع تداوی کے قبیل سے ہے فرق بیّن ہے۔

اب آنحضور سے التماس ہے کہ اوپر کے دو اقوال میں سے کونسا قول حق وصواب ہے؟

۱- ۱۴۰/۱ شامی علی الدر

۲-اگر یہ ثابت ہوا کہ مشین کا روکنا صورتِ مذکورہ میں درست ہے، تو اگر کسی ڈاکٹر نے کسی بھی غرض سے اس کو قتل مریض ہی کے ارادے سے بند کیا، یعنی اس کا ارادہ یہی تھا کہ مشین کو روک کر اس مریض کی جان کو ہلاک کروں، تو کیا اثم قتل لاحق ہوا اور دیت بھی واجب ہوگی یا نہیں؟

۳-کتب فقہ میں لکھا ہے کہ اگر آدمی کا دانت گر جائے تو طرفین کے نزدیک شاۃ ذکیہ کا دانت لے کر اس کی جگہ پر رکھ دے یہ جائز نہیں ہے کہ اپنا ہی دانت یا کسی مردہ انسان کا دانت استعمال کرے اصل عبارت یہ ہے: ''**وكذا يكره أن يعيد تلك السن الساقطة مكانها عند الطرفين، ولكن يأخذ سن شاة ذكية فيشدها مكانها، كذا في البدائع وجواهر الفقه، رسالة تنشيط الأذهان في الترقيع بأعضاء الانسان**''۔

اب سوال یہ ہے کہ ذکیہ کی قید کیوں جب کہ میتہ (سوائے خنزیر کے) کی ہڈیوں کے دانت سب پاک ہیں، کما صرح به الفقهاء العامة اور جب دانت پاک ہے تو استعمال بھی درست ہونا چاہیے، نہ ہونے کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی، یہ بھی فقہاء کی تصریح ہے کہ دانت اور اس جیسے اعضاء واجزاء مثلاً ہڈی وکھر وغیرہ میں حیات حلول نہیں کرتی پس عمل موت نہیں رہا، لہٰذا ان اجزاء میں میتہ وذکیہ دونوں برابر ہیں، مگر طرفینؒ نے صراحتاً ذکیہ کی قید فرمائی تو مفہوم مخالف کے طور پر میتہ کا دانت غیر جائز الاستعمال ہوا، امید کہ آنحضور وضاحت بسلاست فرمائیں گے۔

العبد سراج احمد فریقی

الجواب وبالله التوفيق:

۱-طریقہ (۱) میں آپ کی تحریر صحیح ہے، ماشاء اللہ بہت عمدہ تحقیق ہے، بے ساختہ دل سے دعا نکلی، ''**بارک الله علمكم وسعيكم وفي إفادتكم وإفاضتكم**''۔

طریقہ (۲و۳) میں زید کے قول سے ایک حد تک اور فی الجملہ اتفاق ہے، بکر کے قول سے اتفاق نہیں ہے، اس لیے کہ مثل قتل نفس تو یقیناً نہیں ہے، اس لئے کہ مثلِ قتل نفس میں مماثلت ہونا ضروری ہے اور یہاں مماثلت کا نہ ہونا ظاہر ہے۔ **وأيضا سياتي توضيحهٗ**

البتہ چونکہ اقدام قتل میں قتل کا گناہ ہوتا ہے، اس سے التباس واشتباہ ہوکر یہ خلط فی الاحکام واقع ہوسکتا ہے، غور کرنے سے یہ مذکورہ دونوں صورت (۲و۳) اقدام علی القتل بھی نہیں ہیں، اس لیے کہ اقدام علی القتل میں اگر چہ صدور قتل نہ

ہو مگر اسبابِ قتل کا ارتکاب لازم ہے اور ضرور ہوتا ہے اور یہاں بجائے ارتکاب کے عدم ارتکاب ہے، عدم ارتکاب کو ارتکاب کہنا بداہۃً غلط ہے، بلکہ دونوں میں تضاد ہے تو ان کے حکم میں بھی تضاد ہوگا، لہٰذا جب ارتکاب معصیت ہے تو عدمِ ارتکاب میں عدم معصیت ہوگی۔

اسی طرح حفر بیر فی الطریق پر قیاس کرنا بھی درست نہیں اس لیے کہ اولاً تو بیر سے صرف وہ بیر مراد ہے جس میں منڈیر وسامانِ حفاظت نہ ہو اور طریق سے مراد طریق عام ہے جس میں رات میں اندھیرے میں بے آنکھ والے اور معذور وکمزور سب چلتے ہوں اور ظاہر ہے کہ ایسے راستہ میں ایسے بیر کا کھودنا جس میں منڈیر وسامانِ حفاظت نہ ہو سبب ہلاکت ہے، سببِ قریبی ہے جس سے ارتکاب اسباب ہلاکت کا تحقق بھی ظاہر ہے اور ایسی صورت میں قتل بالسبب کا گناہ ہونا بھی ظاہر ہے اور اگر ایسا نہ ہو بلکہ کنوئیں پر اونچی منڈیر ہو اور سامانِ حفاظت مکمل ہو تو عام راستہ پر بھی آنے جانے کی حسبِ ضرورت جگہ چھوڑ کر کنواں بنادینا منع نہ ہوگا اور ایسی صورت میں اس میں اگر گر کر ہلاک ہو جائے تو اس سے کنواں بنالینے والے پر کوئی مواخذہ یا گناہ وغیرہ بھی نہ ہوگا، اس لیے کہ اس صورت میں ارتکاب اسباب ہلاکت کا نہیں۔

اور حاصل یہ نکلا کہ مدار اسباب ہلاکت کے ارتکاب پر اگر ارتکاب اسباب ہے تو ارتکاب کے مطابق کہیں اقدام علی القتل کا گناہ ہوگا اور اس کا حکم جاری ہوگا اور کہیں قتل بالسبب کا گناہ اور اس کا حکم جاری ہوگا اور جہاں ارتکاب نہ ہوگا وہاں اس قسم کا کوئی حکم جاری نہ ہوگا اور نہ کوئی مواخذہ ہی ہوگا اور مسئلہ مجوث عنہا میں یہی حال ہے، اسباب ہلاکت کا ارتکاب نہیں ہے، لہٰذا اس میں کوئی گناہ یا مواخذہ نہ ہوگا۔

رہ گیا تداوی کا مسئلہ تو اس کے فی نفسہ مباح ہونے میں کلام نہیں، باقی ہر شخص پر ہر حال میں کلیۃً وجوب ہو یہ صحیح نہیں، بلکہ اس میں تفصیل ہے اور وہ یہ کہ اگر مرض شدید وخطرناک یا مہلک ہو اور تداوی پر استطاعت وقدرتِ میسرہ بھی موجود ہو تو حسبِ حیثیت واستطاعت وقدرتِ میسرہ عالَم اسباب ہونے کی وجہ سے شفا کے حصول کا اعتقاد فقط اللہ جل مجدہ پر رکھتے ہوئے حکم خدا وحکمِ شرع کے اندر اندر علاج کرنا واجب ہو جاتا ہے، لیکن اگر قدرتِ میسرہ موجود نہ ہو یا مرض شدید یا خطرناک ومہلک نہ ہو تو وجوبِ علاج کا حکم متوجہ نہیں ہوتا یا حکم موکد رہے یا مستحب وافضل رہے، حسبِ حال مبتلی بہ وقیود مذکورہ بالا کے مطابق جو حکم ہو تو ہوسکتا ہے مگر واجب نہ ہوگا۔

یہی تفصیل وحکم اس صورت کا ہے کہ ابھی علاج شروع نہیں کیا ہے اور اس صورت کا کہ علاج کر کے چھوڑ دیا ہے اور دونوں صورتوں کا حکم قریب قریب یکساں ہی ہوتا ہے۔

غرض جب علاج کرنا واجب ہو اور علاج ترک کردے تو یہ ترکِ واجب ہوا اسباب ہلاکت کا ارتکاب نہیں ہوا، ارتکاب ایجابی اور وجودی شئے ہے اور ترک عدمی وسلبی شئے ہے، دونوں میں بڑا فرق ہے، ایک کے حکم کو دوسرے پر جاری نہیں کرسکتے، قیاس مع الفارق ہوگا، پس جب اسباب ہلاکت کا ارتکاب نہ ہوگا تو اس پر اقدام علی القتل یا قتل بالسبب کا حکم یا گناہ بھی لازم نہ آئے گا، ہاں ترک واجب کا گناہ یا ترک حکم موکد کا گناہ یا ترکِ سنت کی معصیت ہو، تو یہ ہوسکتا ہے اور یہ الگ بات ہوگی۔

یہیں سے یہ بات بھی نکل آئی کہ جس وقت علاج کرنا واجب ہو اور علاج نہ کرے بلکہ علاج ترک کردے اور اس میں اگرچہ نیت ہو کہ اس سے یہ مریض ختم ہوجائے گا، اس نیت میں بھی چونکہ ارتکاب اسباب ہلاکت کا نہ ہوگا، اس لیے اس فاسد وغلط نیت پر گناہ یا مواخذہ الگ بات ہوگی اس سے اقدام علی القتل یا قتل بالسبب کا حکم وگناہ نہ ہوگا، اس لیے اس پر دیت بھی لازم نہ ہوگی، کیونکہ وجوب دیت کے لیے کم سے کم قتل بالسبب کا ہونا لازم ہے، کما ھو مبرھن فی مقامہ، یہ بات بھی ان بیانات سے معلوم ہوگئی کہ عدم تداوی یا مذکورہ بالا نیت یا انقطاع تداوی کو نہ حقیقۃً قتل کہہ سکتے ہیں نہ مثل قتل کہہ سکتے ہیں۔

۲-اس نمبر کا جواب بھی اس تقریر سے واضح ہوگیا اور مزید کچھ لکھنے کی حاجت نہیں رہی۔

۳-شاۃ کے دانت کی تخصیص کی وجہ تو ظاہر ہے کہ اس کے دانت کو وضع وحجم کے اعتبار سے انسانی دانت سے زیادہ مشابہت ومماثلت ہے، نیز یہ بات چونکہ بھیڑ ودنبہ کے دانت سے بھی حاصل ہوسکتی ہے، اس لیے یہ قید احترازی نہ ہوگی بلکہ اتفاقی ہوگی اور ذکیہ کی قید اس وجہ سے بھی ہوسکتی ہے کہ اگر غیر ذکیہ زندہ سے یہ دانت اس کی جڑ سے اکھاڑا جائے تو اس کو بے انتہا تکلیف ہوگی اور یہ حقوق بہائم کے خلاف ہے کہ ایذا پہنچانا بہائم کو بھی منع ہے اور اگر جڑ سے نہ اکھاڑا جائے اوپر سے توڑ لیا جائے تو فٹ نہ ہوگا، انسانی دانت کی وضع وحجم کے خلاف ہوگا اور اگر غیر ذکیہ سے اس کے مرنے کے بعد لیا جائے تو دانت کی جڑ میں کچھ اجزاء لحمیہ وشحمیہ اس طرح قائم رہیں گے کہ ان کو الگ الگ کردیا جائے تو انسانی دانت پر فٹ نہ ہوں گے اور ان اجزاء کو دانت سے الگ نہ کیا جائے تو وہ ناپاک ومردار اجزاء ہوں گے جن کا استعمال ناجائز رہے گا، اور ذکیہ کے قید کی ایک وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ حضرت امام شافعیؒ کے نزدیک میتہ ماکول اللحم کی ہڈی بھی ناپاک ہوتی ہے، کما فی کتاب الام ان کے اختلاف سے بچنے کے لیے یہ قید لگادی ہو اور ان سب صورتوں میں یہ قید احترازی ہوگی۔

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۵/۳/۱۴۰۱ھ

افریقہ میں پھیلے ہوئے بعض نئے مسائل کے احکام:

مرکز البحث العلمی :معرفت امارت شرعیہ بہار اڑیسہ پھلواری شریف پٹنہ، ۸۰۱۵۰۵

عرض یہ کرنا ہے کہ ساؤتھ افریقہ کے مسلم ڈاکٹروں کی ایک انجمن نے چند سوالات بھیجے ہیں، اس سلسلہ میں جلد ازجلد وہ دینی رہنمائی کے طالب ہیں۔ ان سوالات کا خلاصہ جناب کی خدمت میں ارسال کررہا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ جلد ازجلد ان سوالات کے تحقیقی جواب ارسال فرمائیں گے۔ فقط والسلام

مجاہدالاسلام القاسمی (امارت شرعیہ، پھلواری شریف، پٹنہ)

پہلا مسئلہ:

یوتھینیسیا EUTHANSIA یوتھینیزیا کا مطلب یہ ہے کہ مریض جو شدید تکلیف میں مبتلا ہو اور اس کے زندہ رہنے کی کوئی توقع نہ ہو یا وہ بچے جو غیر معمولی حد تک معذور ہوں اور ان کی زندگی محض ایک طرح کا بوجھ ہو، ایسے مریضوں اور بچوں کی زندگی کو ختم کردینا، تاکہ وہ تکلیف سے نجات پائیں اور آسانی سے ان پر موت طاری ہو۔

یوتھیزیا کی دوقسمیں ہیں: ایکٹیو ACTIVE اور پیسیو PASSIVE

۱-ایکٹیو یوتھیزیا کی صورت یہ ہے کہ ڈاکٹروں کو مریض موت تک پہنچانے کے لیے کوئی مثبت عمل کرنا پڑتا ہے، مثلاً کینسر کا مریض جو شدید تکلیف میں مبتلا ہو وہ مریض جو طویل بے ہوشی کا شکار ہو، نیز اس کے بارے میں ڈاکٹروں کا خیال ہے کہ اس کی زندگی کی اب کوئی توقع نہیں ہے، ایسے مریض کو دردکم کرنے والی تیز دوا زیادہ مقدار میں دے دی جاتی ہے، جس سے مریض کی سانس رک جاتی ہے، اسی طرح کبھی ایسا مریض جس کے سر میں شدید چوٹ لگی ہے یا منجائٹس جیسی بیماری کی وجہ سے بے ہوش ہو اور اس کی صحت یابی کا کوئی امکان ڈاکٹروں کے نزدیک نہ ہو، محض مصنوعی تدابیر سے اس کی سانس کو چلایا جارہا ہو، اگر یہ مصنوعی آلہ ہٹالیا جائے تو مریض کے سانس کا آنا جانا بند ہوجائے گا، ایسے حالات میں ان مصنوعی آلات کو ہٹا لینا تاکہ مریض مکمل طور پر مرجائے، بھی ایکٹیو یوتھیزیا کی ایک قسم ہے۔

۲-پیسیو یوتھیزیا:

اس کا مطلب یہ ہے کہ مریض کی جان لینے کے لیے کوئی عملی تدبیر نہیں کی جاتی، بلکہ اس کو زندہ رکھنے کے لیے جو

ضروری علاج کیا جانا چاہیے وہ نہیں کیا جاتا اور وہ مریض مرجاتا ہے، مثلاً کینسر یا بے ہوشی یا دماغی چوٹ یا منجائٹس کا مریض نمونیہ میں مبتلا ہوجائے جو قابل علاج ہے، لیکن ڈاکٹر اس نئے مریض کا علاج نہ کرے تا کہ اس کی موت جلد واقع ہوجائے، اسی طرح ایسے بچے جو شدید طور سے معذور ہوں، مثلاً ان کی ریڑھ کی ہڈی میں ایسی خرابی ہو جس کی وجہ سے ٹانگیں مفلوج یا پیشاب پاخانہ پر قابو باقی نہ رہا ہو، یا بچہ کا دماغ پیدائش کے وقت مجروح ہو چکا ہو، ایسی حالت میں زندگی بھر یہ مریض بار گراں بن کر زندہ رہے گا، اب اگر ایسے بچوں کو نمونیہ یا کوئی دوسرا قابل علاج مرض پیدا ہوجائے تو ان کا علاج نہ کرکے انہیں زندگی سے نجات دلانے کی صورت اختیار کرنا پسیو یوتھینز یا ہے۔

بہر حال یوتھینز یا کا مقصد مریض کو اور اس کے اعزا کو طویل تکالیف سے نجات دلانا ہے۔

۱-مذکورۃ الصدر صورتِ حال میں کیا اسلام عمداً کسی ایسے فعل کی اجازت دیتا ہے جس کے ذریعہ کسی مریض کو شدید تکالیف سے نجات دلانے کے لیے پہنچے دیا جائے۔

۲-کیا اسلام اس مقصد کے خاطر معالجہ کو چھوڑ دینے کی اجازت دے گا؟

الجواب وباللہ التوفیق:

پہلا مسئلہ:

یوتھینز یا کا (۱و۲) ان دونوں تدبیروں کی غرض مریض کو یا اس کے متعلقین کو تکالیف سے نجات دلانا یا ان کی تکلیفات کو کم کرنا مذکور ہے، اس لیے پہلی بات تو یہ ہے کہ اس کا تجربہ کسی کو نہیں ہے اور نہ ہوسکتا ہے کہ طبعی موت میں زیادہ تکلیف ہوتی ہے یا غیر طبعی موت میں زیادہ ہوتی ہے، اس لئے کہ تجربہ تو اس کو ہوگا جو مرنے کے بعد زندہ ہوکر بتائے اور ایسا نہ ہوا اور نہ ہوسکے گا۔ بلکہ مشاہدہ اس کے خلاف ہے، طبعی موت میں اکثر تکلیف کم دیکھی جاتی ہے اور غیر طبعی موت میں اکثر تکلیف زیادہ دیکھی جاتی ہے، اسی طرح متعین مریض و تیمارداری میں مشاہدہ اکثر اسی کا ہے کہ تیمارداروں کی دیکھ بھال میں بظاہر تکلیف نظر آتی ہے، مگر مرجانے کے بعد سکون و تسلی جلد ہی ہوجاتی ہے کہ جتنا اس کے بس میں تھا کرلیا، آگے قدرت کی بات تھی جو اختیار میں نہیں ہے، اس لیے جلد صبر و سکون ہوجاتا ہے بخلاف غیر طبعی موت کے کہ اس کا رنج و غم بسا اوقات دماغ خراب کردیتا ہے یا برسوں اور مدتوں کے بعد ختم ہوتا ہے۔ اور اگر یہ شبہ ہو کہ بسا اوقات مریض و تیماردار اس کو فت و گھٹن میں سالہا سال مبتلا رہتے ہیں اور ان تدبیروں سے جلد ان تکالیف سے چھٹکارا ہوجاتا ہے، تو اس کا جواب یہ ہے کہ دنیا کی

زندگی چندروزہ اور محض عارضی ہے اور آخرت دائمی ہے۔اور اصلی زندگی دائمی اور ابدی ہوتی ہے۔جو آخرت کی زندگی ہے، وہاں موت کبھی نہیں آتی، یہاں گھبرا کر اگر غیر طبعی موت طاری کردی جائے تو اس سے گھبرا کر ایسا کرنے والے کی آخرت کی زندگی ہمیشہ تباہ وبرباد رہے گی اور کبھی موت بھی نہ آئے گی کہ چھٹکارامل جائے، اس لیے عقلاً بھی یہ جانب مرجح نہیں ہوسکتی کہ اس کی وجہ سے مذکورہ تدابیر کی اجازت دی جاسکے،غرض تجربہ ومشاہدہ وغیرہ کی حیثیت سے اس کی اجازت کوئی مرجح نہیں ہے،دوسری بات یہ ہے کہ تجربہ یا مشاہدہ وغیرہ کے دلائل سے کوئی فیصلہ نہ ہوسکے جب بھی صادق ومصدوق کی خبر سے یہ بات متعین ہے کہ مؤمن کو طبعی موت وشہادت میں تکلیف بہت کم ہوتی ہے اور غیر مؤمن کو ہر حال میں تکلیف بہت زیادہ ہوتی ہے۔

ارشادربانی:والنّٰزعات غرقاً والنّٰشطات نشطاً (۱) میں بھی اس بات کو بتلایا گیا ہے کہ چاہے طبعی موت ہو یا غیر طبعی دونوں حال میں مؤمن کو موت کی تکلیف کم ہوتی ہے، پس اگر دواوغیرہ کسی ذریعہ سے غیر طبعی موت طاری کردی جائے تو مریض تو شہید ہوجائے گا اور یہ اگر چہ اس کے لیے بہتر ہوگا،مگر غیر طبعی موت طاری کرنے والا بسااوقات قتل کے گناہ ووبال میں مبتلا ہوجائے گا اور بسا اوقات شرعاً دیت یا ضمان وغیرہ واجب الاداہوجائے گا، اورتوبہ کرنا بھی لازم ہوجائے گا جس طرح اس حمل کے ساقط کرنے میں قتل کا گناہ ووبال پڑتا ہے اور بعض صورتوں میں دیت وضمان بھی شرعاً لازم آتا ہے اور جب جان پڑنے کے محض گمان واحتمال کی صورت میں یہ سزاووبال ہے تو جان کے یقیناً موجود ہونے کی حالت میں جو کچھ وبال ونکال ہوگا، ظاہر ہے ایسے موقعہ پر کم ازکم قتل کا گناہ تو ضرور ہی ہوگا، روایات جمع کرنے کا اس وقت محل نہیں، احادیث سے رجوع کرکے اس کی تفصیل معلوم کی جاسکتی ہے کہ مریض کو جو تکالیف غیر اختیاریہ پہونچتی ہیں اور وہ اس پر صبر کرتا ہے اور اپنے خدا کے سپرد کرتا ہے،تو اس کے لیے یہ تکالیف اس کے گناہوں کا کفارہ بنتی ہیں اور آخرت میں درجات بلند ہوتے ہیں اور اچھی زندگی نصیب ہوتی ہے۔حتیٰ کہ اگر مرنے والا معصوم یا نابالغ بچہ ہوتا ہے تو اس کی ان تکالیف سے اس کے والدین ومتعلقین تیمارداروں کو جب وہ اس پر صبر کرتے ہیں اور کلفت برداشت کرکے تفویض الی اللہ کرتے ہیں تو ان کے گناہ بھی جھڑتے ہیں اور آخرت سنورتی ہے، بالکل یہی حال بالغین وغیر معصومین کے متعلقین اور تیمارداروں کا بھی ہوتا ہے کہ انکی تکالیف پر صبر کرنے اور ان کی صحت وبھلائی کی تدبیر میں مشغول رہنے والے کے لیے یہ تکالیف کفارہ ذنوب اور آخرت میں درجات کا ذریعہ بنتی ہیں اور پھر ہمیشہ ہمیشہ ابدالآباد تک راحت وچین ملتا ہے، اس لیے مذکورہ دونوں تدبیروں میں سے کسی

۱-　　سورۂ نازعات:۱۔

تدبیر کا حکم یا اجازت شریعتِ مقدسہ میں ہرگز نہ ہوگی، البتہ دونوں تدبیروں کے حکم میں فرق یہ ہوگا کہ پہلے میں غیر طبعی موت دوا وغیرہ سے طاری کرنے میں تو ایسا کرنے والے پر قتل کا گناہ اور وبال پڑے گا، بسا اوقات شرعاً دیت ضمان وغیرہ بھی لازم آجائے گا۔ اور دوسرے میں یہ حکم (قتل کا گناہ وغیرہ) تو نہ ہوگا، لیکن ترک تدبیر اور صحت کے لیے ترک سعی فعلِ مذموم وقبیح اور منشأ شرع کے خلاف ضرور ہوگا اور سستی یا لاپرواہی سے ایسا کیا گیا تو اس پر مؤاخذہ بھی ضرور ہوگا، فقط والسلام

دوسرا مسئلہ! اعضاء کی پیوندکاری:

طبی سائنس نے جو بہت سی ترقیات کی ہیں ان میں سے ایک اعضاء کا تبادلہ بھی ہے، اس میں کسی جانور یا کسی انسان کے جسم سے پورے اعضا یا اعضاء کے جز و یا ریشے نکال کر مریض کے جسم میں لگادیے جاتے ہیں۔ بچھڑے یا خنزیر کے قلب کے VALVE یا خنزیر کا جگر یا اس کی کھال نکال لیے جاتے ہیں، جانوروں میں اور انسانوں میں زندہ انسانوں کے وہ اعضاء جن کے نکال لینے سے اس انسان پر کوئی اثر نہیں پڑتا مثلاً کھال ایک گردہ یا خون اور مردہ انسانوں کے اعضاء جیسے آنکھ کی پتلی، کھال، قلب، گردے، ہڈی اور قلب کے VALVE نکالے جاتے ہیں، اعضاء کا تبادلہ کسی کی جان بچانے، زندگی کی صلاحیتوں میں اضافہ کی غرض سے یا مریض کو دیکھنے کے قابل بناسکے۔ یا ہڈیوں کے مشکل ضرب شدید کے پر ہونے یا گردہ کے تبادلہ سے مریض کو آسانی سے کھانے پینے کے لائق بنانے اور اس کو بہتر محسوس کرنے کی غرض سے کیا جاتا ہے۔

سوالات:

۱- کیا جانوروں کے اعضاء کے جزء انسان کی زندگی بچانے یا اس کی صلاحیت کو بڑھانے کے لیے استعمال کیے جاسکتے ہیں۔ اور اگر وہ جانور خنزیر ہو (مثلاً خنزیر کی کھال، اس کا جگر یا اس کا قلب) VALVE تو کیا صورت ہوگی؟

۲- کیا ایک مسلمان جو زندہ ہو اپنے جسم کے اعضا نکال کر اپنے بچوں یا والدین کو فائدہ پہنچانے کی غرض سے ان کے جسم میں لگانے کی اجازت دے سکتا ہے؟

۳- کیا ایک مسلمان اس بات کی اجازت دے سکتا ہے کہ اس کے مرنے کے بعد اس کے جسم کے اعضا نکال کر کسی دوسرے انسان خواہ مسلم ہو یا غیر مسلم کو فائدہ پہونچانے کی غرض سے ان کے جسم میں لگادیے جائیں۔

۴- کسی انسان کو مردہ کب قرار دیا جاتا ہے؟

طب میں یہ اس وجہ سے اہم ہے کہ کچھ اعضا مثلاً قلب یا گردے اسی وقت مفید ہوسکتے ہیں جب کہ انکو نکالے جانے کے وقت ضروری مقدار میں خون دستیاب کیا جاتا رہا ہو۔ اسی وجہ سے دماغی موت کے اصول کو اپنایا گیا ہے، اس میں

ڈاکٹر اس بات کو طے کرتا ہے کہ کسی مریض کے دماغ کے اعضاء رئیسہ ایسے شدید طور پر مجروح ہوئے ہوں کہ وہ مشین جو اس کو زندہ رکھے ہوئے ہے، اگر بند کردی جائے تو مریض یقینی طور پر مرجائے گا۔ ایسے آدمی کے جسم سے اس کے اعضا اسی وقت نکالے جاتے ہیں جب تک وہ مشین کے ذریعہ زندہ رکھا جاتا ہو اور مشین اس کے بعد ہی بند کی جاتی ہو۔ ایسے اصول اور اس کے استعمال کے سلسلہ میں اسلام کا نقطہ نظر کیا ہے؟

۵- کیا کوئی مسلمان اس بات کی وصیت کرسکتا ہے کہ اس کے مرنے کے بعد اس کے جسم کو چیر پھاڑ کر انسان کی اندرونی ساخت کے بارے میں معلومات حاصل کی جاسکیں جس سے انسانیت کو فائدہ پہونچ سکے۔

۶- کیا غیر مسلم کے بدن کے اعضا کسی مسلمان کے جسم میں پیوندکاری کے لیے استعمال کیے جاسکتے ہیں؟ اسی طرح کیا غیر مسلم کے بدن کا خون کسی مسلمان کے جسم میں چڑھایا جاسکتا ہے؟

الجواب وباللہ التوفیق:

اس مسئلہ پر احقر کا سابق مضمون مدلل اور مفصل نظام الفتاوی جلد اول، ۴۳۲، تا ۴۴۱ پر طبع ہوکر شائع شدہ ہے اس میں ہر شق کا جواب آگیا ہے، اس لیے مزید لکھنے کی ضرورت نہ سمجھ کر وہی جواب نقل کرا کے کاغذات میں بھیج رہا ہوں وہی مطالعہ فرمالیا جاوے۔

تیسرا مسئلہ! دودھ کے بینک کا حکم:

طبی سائنس نے بالآخر یہ مان لیا ہے کہ بچوں کے لیے ماں کا دودھ ہی بہتر ہے، اس لیے ایسے بچوں کے لیے جو اپنی ماؤں سے دودھ نہیں حاصل کرسکتے، مصنوعی دودھ کا متبادل حاصل کرنے کے لیے مختلف ماؤں سے جن کا دودھ فاضل ہو حاصل کرنا اور پھر اس دودھ کو بچوں کو پلانا ایک فیشن بن گیا ہے، ایسا دودھ علیحدہ بھی رکھا جاسکتا ہے اور ملا کر اکٹھا بھی کیا جاسکتا ہے؟

سوالات:

۱- اس بات کو مدنظر رکھتے ہوئے کہ ہمارے پیغمبر ﷺ کی خود ایک دودھ پلانے والی دائی کے دودھ سے پرورش کی گئی تھی، ایسے بچوں کے واسطے جو کسی وجہ سے اپنی ماؤں کا دودھ نہیں حاصل کرپاتے، دوسری ماؤں کے دودھ کے استعمال کے بارے میں اسلامی نقطہ نظر کیا ہے؟

۲-کیا ماؤں کے دودھ کے بینک کی یعنی منظم طریقہ سے ماؤں کے دودھ حاصل کرنے اور استعمال کرنے کی اجازت ہے؟

۳-کیا ایسے بچوں کو جو اپنی ماؤں کا دودھ نہ حاصل کر پاتے ہوں دوسری ماؤں کا دودھ دیا جا سکتا ہے؟

۴-کیا ماؤں کے دودھ کو براہ راست پستان سے دینے یا اس کو بوتل کے ذریعہ دینے میں کوئی فرق ہے؟ یعنی اصلی دودھ کی اہمیت ہے یا اس کے استعمال کے طریقے کی؟

الجواب وباللہ التوفیق:

ڈھائی سال سے کم عمر بچہ کو کسی عورت کا بھی دودھ ہو پلانا جائز ہے اور یہ الگ بات ہے کہ مسلمان و دین دار عورت کا دودھ پلانا بہتر ہے، باقی جواز میں کوئی کلام نہیں، اس لیے بغیر ضرورت اور بقدر ضرورت اس کا مہیا رکھنے کی گنجائش ہے۔

چوتھا مسئلہ:

مصنوعی جوڑے کے بارے میں پیشن گوئی:

ڈاکٹر کسی مصنوعی جوڑے کے بارے میں پیشین گوئی کر سکتے ہیں کہ ان دونوں کے ملاپ سے جو اولاد پیدا ہوگی اس کے بارے میں ظن غالب ہے کہ وہ شدید دماغی امراض یا کسی نقص جسمانی کا شکار تو نہیں ہوگی اگر ایسی حالت میں کسی مسلمان ڈاکٹر سے مشورہ لیا جائے تو کیا وہ اس جوڑے کو مندرجہ ذیل صورتیں اختیار کرنے کا مشورہ دے سکتا ہے؟

۱-شادی ہی نہ کرے۔

۲-ایسی تدبیریں کریں کہ علوق ہی نہ ہو اور اولاد کی آرزو کسی تدبیر کے ذریعہ پورا کریں۔

۳-اگر حمل ۱۶؍ ہفتہ کے اندر کا ہو تو اس کے اسقاط کی اجازت دی جائے؟

۴-ابتدائی ایام حمل میں ڈاکٹر خصوصی جانچ کے ذریعہ معلوم کریں کہ کیا بچہ ان مخصوص امراض یا جسمانی نقص میں مبتلا ہے، اگر ایسا ہو تو عورت کو اسقاط حمل کی اجازت دیں، لیکن یہ خیال رہے کہ اس طرح کی جانچ بعض حالات میں خود حاملہ کے لیے خطرناک ہو سکتی ہے۔

الجواب وباللہ التوفیق:

پیشین گوئی طبی اصول کے ماتحت ایک احتمال کا بیان یا ایک خطرہ کا اظہار ہے، اس لیے نفس اس میں تو کوئی مضائقہ نہیں، البتہ اس پر جو ۴/سوال مرتب کیے گیے ہیں ان کے جواب شرعی یہ ہیں:

۱- اس کا حکم علی الاطلاق صحیح نہیں۔

۲- اس کی بھی علی الاطلاق اجازت نہیں۔ نیز یہ چیز منشأ شرع وشارع کے خلاف ہے اور مسئلہ تدبیر کا عدم جواز تو منصوص ہے۔

۳- جب تک حمل میں جان پڑنے کا زمانہ نہ آئے، یعنی حمل پر ۱۲۰/دن نہ گذرے ہوں تو بضرورت شرعی اسقاط کی اجازت ہوگی اور بغیر ضرورت شرعی ممنوع وقبیح فعل کا ارتکاب ہوگا اور ضرورتِ شرعی یہ ہے کہ مثلاً عورت یا رضیع کو جان یا خرابی صحت کا خطرہ ہو جائے۔

۴- ان مذکورہ حالات میں قطعاً اجازت اس لیے نہیں ہے کہ دفعِ مضرت جلبِ منفعت پر مقدم ہوتی ہے۔

پانچواں مسئلہ: الکحل:

۱- کیا الکحل پر مشتمل کوئی دوا چمڑے کے اندر داخل کی جاسکتی ہے؟ آپریشن سے پہلے چمڑے کو صاف کرنے کے لیے استعمال کی جاتی ہیں۔

۲- دواؤں میں الکحل کا استعمال بغرض حفاظت کیا جاتا ہے، آسانی سے نہ تحلیل ہونے والی اشیاء کو گھلانے اور تحلیل کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے، تو کیا ایسی دواؤں (مکسپر نا نگ بچوں کے غیر مپچر اینڈ پین لکچر) کا استعمال جائز ہے؟

۳- بہت سی مائع دوائیں کمزور مریضوں کو بذریعہ انٹراوینس انجکشن بطور غذا دی جاتی ہیں جن کا الکحل ہوتا ہے، کیا ایسی دواؤں کا اس طرح استعمال درست ہوگا؟

۴- اگر کسی ڈاکٹر نے کسی مریض کی جلد انجکشن سے الکحل کے ذریعہ صاف کی، تو کیا اس مریض کے لیے اس مقام کو دھوئے بغیر نماز ادا کرنا صحیح ہوگا؟

۵- افیون، ہیروئن، ڈگہ، نیز ان سفنیگ، آئی ایس ڈی وغیرہ نشہ آور دواؤں کا استعمال بھی کیا الکحل خمر کی طرح ممنوع ہے؟

الجواب وباللہ التوفیق:

ابتدائی دور میں الکحل جوہر شراب یا ردی شراب (شراب کی تلچھٹ) ہوتا تھا، اس لیے فقہاء نے اس کو شراب کا حکم دیا تھا اور اس کو ناپاک وحرام قرار دیا تھا اور اس کا استعمال اور دوا میں استعمال بھی ناجائز قرار دیا تھا، مگر اب الکحل سائنٹیفک طریقے سے بننے لگی ہے کہ وہ شراب نہیں رہتی، بلکہ سرکہ (خل) کے حکم میں ہوجاتی ہے، اس لیے جب تک دلائل شرعیہ سے یہ یقین نہ ہوجائے کہ الکحل وہی شراب کا جوہر یا تلچھٹ ہے، اس وقت تک اس کے ناپاک وحرام ہونے کا اور اس کے دوا وغیرہ میں استعمال کی ممانعت یا عدم جواز کا حکم نہیں دے سکتے۔ اور نہ استعمال کے بعد یا جسم پر لگنے کے بعد تطہیر کا حکم دینا ضروری کہہ سکتے، البتہ تقویٰ الگ بات ہوگی اور تقاضائے احتیاط کہا جائے گا نہ کہ فتویٰ۔

افیون کا منشیات میں شمار نہیں، بلکہ مخدرات میں شمار ہے اور جو چیز بھی منشی نہ ہو، بلکہ مخدر ہو اس کو دوا میں استعمال کرنے کی شرعاً ممانعت نہیں ہوتی، البتہ اس سے بچنا اور بچانا محمود و مستحسن ہوتا ہے۔ پس اگر یہ مذکورہ چیزیں منشی نہیں ہوتیں بلکہ مثل افیون کے محض مخدر رہوتی ہیں تو ان کا حکم یہی ہوگا اور جو چیزیں ان میں منشی ہوں گی ان کے استعمال کی شرعاً اجازت نہ ہوگی۔ لان کل مسکر حرام۔

چھٹا مسئلہ: جانوروں کے اجزاء سے حاصل شدہ دوا کا حکم:

بہت سی دوائیں جانوروں کے اجزاء سے حاصل کی جاتی ہیں، جیسے: HEPRIN, INSULIN FNZYMES, HORMONES, GFLATINE

۱- اگر یہ دوائیں بکری، بلی وغیرہ حلال جانوروں سے حاصل کی گئی ہوں (اگر وہ جانور بطریق شرع ذبح نہ کیے ہوں) تو کیا ان دواؤں کا استعمال جائز ہوگا؟

۲- اور اگر خنزیر کے اجزاء سے یہ دوائیں حاصل کی گئی ہوں تو کیا ان کا استعمال جائز ہوگا؟

الجواب وباللہ التوفیق:

۱- وہ جانور جس کے اعضاء یا اجزاء کا استعمال مقصود ہو اگر وہ ماکول اللحم ہو اور شرعی قاعدہ سے ذبح کیا ہوا ہو تو اس کے سات عضو کے علاوہ جن کا کھانا درست نہیں، تمام اعضاء اجزاء سے حاصل شدہ دواؤں کا استعمال خارجی وداخلی، یعنی کھانا

یا جسم پر لگانا ہر طرح جائز ہے۔

۲-جانور غیر ماکول اللحم ہو، مگر نجس العین نہ ہو، جیسے خنزیر تو اگر اس کو شرعی قاعدہ سے ذبح کرلیا جائے تو اس کے اعضاء واجزاء کا کھانا اور داخلی استعمال کرنا اگرچہ جائز نہ رہے گا، مگر خارجی استعمال، یعنی لگانا اور ملنا وغیرہ سب جائز رہے گا۔

۳-اور اگر وہ جانور شرعی قاعدہ سے ذبح کیا ہوا نہ ہو تو چاہے ماکول اللحم ہو یا غیر ماکول اللحم، کسی صورت میں کسی عضو یا کسی جزء کا استعمال کرنا درست نہ ہوگا شرعاً ممنوع ہوگا۔ اگر استعمال کرلیا جائے تو خواہ خارجی استعمال ہو تو بعد استعمال اس کو دھوکر اس کے اثر کا ازالہ کرنا ضروری رہے گا، بغیر ازالہ کیے ہوئے تطہیر جسم و کپڑا جس میں یہ لگ جائے نماز پڑھنا درست نہ رہے گا۔

۴-وہ جانور اگر نجس العین ہو، جیسے خنزیر تو اس کا استعمال خارجی و داخلی کسی صورت میں درست نہ ہوگا، سوائے اس صورت کے جس میں بوجہ اضطرار خون یا شراب کا کھانا یا پینا درست ہو جائے۔

ساتواں مسئلہ: PROMESCUTTY (دماغی امراض میں مبتلا عورت کا مانع حمل آپریشن یا اسقاط حمل کرانا:

دماغی امراض کی وجہ سے بعض اوقات جنسی خواہشات بہت بڑھ جاتی ہیں، جس کی وجہ سے خاتون زنا کار اور نتیجتاً حاملہ ہو جاتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ وہ اپنے مرض کی وجہ سے بچوں کی پرورش کی اہل نہیں ہیں، اس لیے کیا ایسی عورتوں کا مانع حمل آپریشن کرنا درست ہوگا، یا حمل ہو چکا ہو تو اس کا اسقاط درست ہوگا؟

الجواب وباللہ التوفیق:

اس میں حکم شرعی یہ ہے کہ ان حالات میں بھی کوئی ایسا عمل کرنا جس سے بچہ پیدا ہونے کی صلاحیت ختم ہو جائے درست نہیں، البتہ ایسی تدبیر کردینا جس سے بحالی صحت تک جماع کی خواہش ختم یا مضمحل ہو جائے گنجائش رہے گی، اسی طرح اگر حاملہ ہو جائے تو حمل میں جان پڑ جانے کے بعد اسقاط کرادینا درست نہ ہوگا۔ اور اس کا بھی بلاضرورت شرعی اسقاط کرانا ممنوع و مکروہ ہوگا۔

آٹھواں مسئلہ: مختلف مقاصد کے لیے جانوروں کا استعمال:

مختلف مقاصد کے لیے جانوروں کا استعمال علم طب میں کیا جاتا ہے۔

ا- نئی دواؤں کے جسم پر پڑنے والے اثرات کا پتہ چلانے کے لیے ان دواؤں کا استعمال کسی جانور کے جسم پر، انسانی جسم پر استعمال سے پہلے کیا جاتا ہے۔ جسم حیوانی پر ان نئی دواؤں کے تجربہ سے اس کے مفید و مضر اثرات کا پتہ چلایا جاتا ہے، مثلاً T.B کے جراثیم کسی جانور کے جسم میں داخل کرتے ہیں جب وہ جراثیم اندر جا کر T.B پیدا کر دیتے ہیں، تو پھر ایسی دوائیں دیجاتی ہیں جو T.B کو زائل کرنے والی ہوں اس کے بعد اس جانور کا CLINICALLY جائزہ لے کر پتہ چلایا جاتا ہے کہ دواؤں کا کیا اثر رہا، یہ بھی ممکن ہے کہ اس جانور کو مار دینا پڑے اور اس کے اعضاء کو مائکرواسکوپ سے جانچا جا سکے۔

۲- بعض چیزیں وائرس یا بیکٹریا یا بعض امراض کا سبب بنتے ہیں، مثلاً ایک کیمیائی عنصر CARCINOGEN جس سے کینسر پیدا ہوتا ہے، یا اس کے ہونے کا شبہ ہو تو کسی جانور کے جسم میں داخل کیا جاتا ہے، اس کے بعد اس کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔

۳- ایسا بیکٹریا جس سے منجائٹس پیدا ہونے کا شبہ ہو جانور کے جسم میں داخل کیا جاتا ہے، دونوں ہی صورتوں میں جانور کو مار کر اس کے ٹکڑے کیے جاتے ہیں تا کہ نتائج کا علم ہو سکے۔

۴- بعض اجزاء یا دواؤں کو جسم میں داخل کرنا تا کہ قلبی کیفیات پر پڑنے والے اثرات کا علم ہو سکے، ان اثرات کو جاننے کے لیے مشاہدہ یا مشینی تعاون سے کام لیا جاتا ہے۔

ب: جانوروں کو سخت سردی میں مبتلا کیا جاتا ہے اور پھر دواؤں کے اثر کا مشاہدہ کیا جاتا ہے۔ ان طریقوں کے استعمال سے ہم جان پاتے ہیں کہ ان دواؤں کا اثر انسان پر کیا پڑ سکتا ہے اور اس طرح ہم جسم انسانی کے بارے میں واقفیت کے ساتھ بہتر اور ترقی یافتہ معالجہ مریض کے لیے فراہم کر سکتے ہیں۔

ا- تو کیا اس طرح کا تجربہ اسلام میں درست ہے؟

۲- اکثر و بیشتر تجربہ جسم خنزیر پر کیا جاتا ہے، کیا یہ از روئے شرع جائز ہوگا؟

الجواب وباللہ التوفیق:

اس کی گنجائش ہے بشرطیکہ اس کے مر جانے کے بعد کیا جائے اور زندہ رہنے کی حالت میں اسی حد تک گنجائش جواز ہوگی جس حد تک اس جانور کو غیر معمولی تکلیف نہ پہنچے اور خنزیر چونکہ مثلِ پیشاب پخانہ اور شراب کے نجس ہے، اس لیے مسلمان کو اس پر مشق سے اجتناب لازم ہے، اگر ضرورت یا مجبوری آزمانا پڑے تو جسم و کپڑے کو اس کے ذرات سے بچانا اور اگر کہیں لگ جائے تو بعد میں فوراً پاک کر لینا لازم ہوگا۔

نواں مسئلہ: جنات کا وجود:

۱-مسلمان جنات کے وجود پر یقین رکھتے ہیں، اس سلسلہ میں شرعی حیثیت کیا ہے؟ جس سے یہ معلوم ہو سکے کہ جنات بیماریوں خصوصاً ذہنی بیماریوں کی وجہ ہوتے ہیں اور ان کا علاج صرف جنات کو اتار کر ہی ہو سکتا ہے۔

۲-پاک اور ناپاک جن سے ہماری کیا مراد ہے، وہ کس طرح کی بیماریوں کے سبب بنتے ہیں؟

۳-صرف اناث ہی جنوں کا عام طور پر نشانہ کیوں بنتی ہیں؟

۴-ہم کس طرح اس کا پتہ چلا سکتے ہیں کہ کوئی مریض جن کا شکار ہے؟

۵-کیا ہم جنات کو اتارنے کے بارے میں سوچ سکتے ہیں؟

الجواب وباللہ التوفیق:

جنات کے وجود کا ذکر قرآنِ پاک میں بھی ہے، اس لیے اس کے وجود سے انکار کرنا درست نہیں اور جنات کے اثر انداز ہونے کا تیقن تمیم داری کی حدیث سے بھی ہوتا ہے، اس لیے اس کا قائل ہونا بھی صحیح ہے، البتہ قوی الایمان مومن پر اس کا اثر نہیں ہوتا ہے اور جو لوگ وہم کے شکار نہیں ہوتے ان پر جنات کا اثر نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ عورتیں مردوں کے اعتبار سے زیادہ وہم کی شکار رہتی ہیں، اس لیے عورتوں پر اس کا اثر زیادہ ہوتا ہے، اس کے اثر کی مختلف وجوہ ہوتی ہیں، کبھی تو وہم کے شکار ہونے سے ابتدا ہی میں اس کا اثر نمایاں ہو جاتا ہے اور اس کے بعد مرض بھی لاحق ہو جاتا ہے، ایسی حالت میں اس کا اثر زائل کرنے کے لیے جس طرح دعا وغیرہ کی حاجت ہوتی ہے، اسی طرح ازالہ مرض کے لیے علاج کی بھی ضرورت ہوتی ہے اور اکثر تو ایسا ہوتا ہے کہ جب انسان زیادہ دن جسمانی مرض میں مبتلا رہتا ہے اور علاج سے حسب خواہ فائدہ نہیں ہوتا تو

جناتی اثر کا شبہ ہونے لگتا ہے، پھر یہی شبہ جنات کے واقعی اثر ڈالنے کا ذریعہ ہوتا ہے۔ اور پاک وناپاک جن میں کوئی شرعی اصطلاح نہیں ہے بلکہ عوامی چیز ہے، مسلمان جنات کو لوگ پاک جن اور کافر جن کو ناپاک جن کہہ دیتے ہیں۔ جنات کا اثر زائل کرنے کا سب سے بڑا ذریعہ مشائخ محققین کی توجہ ہے، بعض عاملین اپنی قوتِ عمل سے بھی اتارتے ہیں، مگر یہ قوت محدود ہوتی ہے اور کبھی جن کی قوت اس عامل کی قوت سے زیادہ ہوتی ہے، اس لیے نہیں جاتا ہے اور مع اللہ نسبت رکھنے والوں کی توجہ سے باذن اللہ کیسا بھی جن ہو دور ہو جاتا ہے۔

دسواں مسئلہ: جادو، کالا جادو:

۱- کیا مسلمانوں کو جادو پر یقین رکھنا چاہئے اور ہاں تو پھر شرعی سند اس بارے میں کیا ہے؟

۲- اسلامی اعتبار سے جادو کا توڑ کس طرح ہوسکتا ہے؟

۳- ہم جادو کی تشخیص کس طرح کرسکتے ہیں؟

۴- ہم طلسماتی اثرات کو کس طرح زائل کرسکتے ہیں؟

الجواب وبالله التوفيق:

جادو کا وجود بھی صحیح ہے، حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں اس کا شباب تھا، جیسا کہ نصوص قرآنیہ کے دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے اور اس کا بقیہ بقایا اب تک چلا آرہا ہے، اس کے توڑ کا بھی وہی طریقہ ہے جو جنات کے توڑ میں بیان ہو چکا ہے۔

جادو سحر کا ایک فن ہے، اس کے جاننے والے کرتے بھی ہیں اور اتارتے بھی ہیں اور یہ الگ بات ہے کہ ایسا کرنے والے عموماً سفلی عمل کرتے ہیں اور طلسماتی اثرات کو تو اپنی قوتِ خیالی سے بھی زائل کرسکتے ہیں، بشرطیکہ ایسے شخص میں نسبت مع اللہ قوی طور پر حاصل ہو۔

گیارہواں مسئلہ: تعویذ:

۱- اس لفظ تعویذ کے معنی کیا ہیں؟

۲-تعویذ کے استعمال کے معروف طریقے کون سے ہیں؟
۳-کس طرح کے تعویذ موجود ہیں؟
۴-شرعی حیثیت اس کی کیا ہے؟تعویذ کا استعمال کیا ہے؟

الجواب وباللہ التوفیق:
اس کا بھی ثبوت بعض روایات سے ہوتا ہے اور جائز کام کے لیے جائز طریقے سے ہوتو جائز بھی ہوگا ورنہ ممنوع ہوگا، اورتعویذ کومؤثر بالذات جاننا جیسا کہ اکثر عوام سمجھتے ہیں ناجائز اورشرک ہے، صرف برکت تک کوئی مضائقہ نہیں ،تعویذ جائز وناجائز دونوں طرح کے موجود ہیں، اصولِ شرع کے خلاف جوتعویذ ہوگا وہ ناجائز ہوگا۔

بارہواں مسئلہ: طلاق سے متعلق چند اہم سوالات:

۱-شوہر نے اپنی بیوی کو ساؤتھ افریقہ کے قانون کے مطابق طلاق کا نوٹس جاری کیا، بیوی نے اپنے وکیل کے مشورہ کے مطابق یہ جواب دیا کہ وہ طلاق دوشرطوں پر قبول کرنے کو تیار ہے:

الف: بچوں کے نفقہ کی ذمہ داری شوہر قبول کرے۔
ب: شوہر تاحیات بیوی کے نفقہ کی ذمہ داری قبول کرے۔

۲-خاوند نے بیوی کے خلاف ساؤتھ افریقن قانون کے مطابق سمن جاری کیا، بیوی نے اس کے جواب میں یہ کہا وہ طلاق کو اسی حال میں قبول کرنے کو تیار ہے جبکہ شوہر اسے اسلامی قانون کے مطابق طلاق دیدے، شوہر اسے اسلامی طلاق دینے کو تیار نہیں ہے، یہ کہتے ہوئے کہ وہ ساؤتھ افریقن قانون کا پابند ہے، اسلام کی رو سے اس دشواری کو دور کرنے کا کیا راستہ ہے؟

۳-خاوند نے طلاق کا فیصلہ حاصل کرنے کے لیے سمن کیا، درآنحالیکہ اس نے سمن جاری کرنے سے پہلے ازروئے اسلام اسے طلاق دی تھی، عورت نے اس دعوے کا یہ جواب دیا کہ ابھی مفاہمت کا امکان ہے، لہذا طلاق کا فیصلہ نہیں دیا جائے، خاوند اس قسم کے کسی امکان کا قائل نہیں ہے، ایسے مقدموں میں عورت کے وکیل کی شرعاً کیا ذمہ داری ہے؟

۴-ساؤتھ افریقن غیر مسلم عدالت (جہاں مسلم پرسنل لا نافذ نہیں ہے) سے شوہر نے طلاق حاصل کرلی، کیا یہ

فیصلہ اسلامی قانون طلاق پر کوئی اثر ڈالے گا اور عورت کو تفریق حاصل ہو جائے گی؟

الجواب وباللہ والتوفیق:

اس مسئلہ کا بھی مفصل و مدلل جواب آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ کے سوال کے جواب میں لکھ چکا ہوں (۱)، اسی جواب میں ان تمام سوالات کا جواب آ گیا ہے اس لیے اسی کو یہاں دوسرے کاغذ پر نقل کر دیا گیا ہے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

مصنوعی دانتوں کا استعمال اور سونے و چاندی کا تار باندھنا شرعاً درست ہے یا نہیں؟

۱- مصنوعی دانتوں کا استعمال کرنا کیسا ہے، اگر درست ہے تو ضرورت اور زینت دونوں کے لیے یا صرف ضرورت کے لیے؟

۲- نیز دانتوں میں سونے چاندی کا تار باندھنا کیسا ہے؟

الجواب وباللہ التوفیق:

۱- ضرورت کی خاطر مصنوعی دانتوں کا استعمال کرنا درست ہے۔

۲- حدیث وفقہ کی کتابوں میں شکستہ دانتوں کو سونے یا چاندی کے تاروں سے باندھنے کی اجازت منقول ہے (۲)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۶/۷/۱۴۱۱ھ

الجواب صحیح: کفیل الرحمن، محمد ظفیر الدین مفتاحی

۱- نفقہ مطلقہ سے متعلق سوال و جواب کتاب الطلاق میں دیکھیں۔

۲- ''(ولا يشد سنه) المتحرك (بذهب بل بفضة) وجوزهما محمد'' (مرتب) الدر المختار مع الشامی، ۵/۲۳۰ کتاب الحظر والاباحة۔

الکحل اور افیون ملی ہوئی دواؤں کا استعمال:

اکثر انگریزی دوائیں جن کے اندر الکحل ملا ہوتا ہے اور یونانی ادویہ جن کے اندر افیون ودھتورہ وغیرہ کی آمیزش ہوتی ہے اگر چہ یہ آمیزش تبدیل ہیئت کے بعد ہو ایسی دواؤں کا استعمال شدید مجبوری کے بغیر محض طاقت اور تندرستی حاصل کرنے نیز نظام جسمانی کے متوازن رکھنے کی غرض سے کرنا شریعت کے اعتبار سے کیسا ہے؟ نیز اس طرح کے انجکشن وغیرہ لگوانے کے بارے میں کیا حکم ہے؟

الجواب وباللہ التوفیق:

اگر دیندار مسلمان ماہر طبیب یا ڈاکٹر یہ کہہ دے کہ اس دوا سے بہتر اس مرض کے لئے کوئی دوسری دوا نہیں ہے تو اس کا استعمال جائز ہے(۱) اور یہ احتیاطی حکم ہے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲/۷/ ۱۳۸۵ھ

الجواب صحیح محمود غفی عنہ

ظالم سے ظلم کا بدلہ لینا:

چند آدمیوں نے گروہ بنا کر ایک شخص پر ظلم کیا مظلوم نے کمزوری جان کر صبر کیا پھر دوبارہ ظلم کیا مظلوم نے پھر صبر کیا، گروہ نے تیسری چوتھی بار پھر ظلم کیا مظلوم نے پھر صبر سے کام لیا اگر آئندہ اس گروہ سے پھر ظلم کی امید ہو تو اب مظلوم کیا کرے جبکہ صبر کی حد گذر چکی ہو اور بدلہ لینے کی طاقت رکھتا ہو بدلہ لینا کہاں تک درست ہے۔

الجواب وباللہ التوفیق:

تحریر سوال سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ اس گروہ نے کیا ظلم کیا اور آپ نے کیا صبر کیا اور درحقیقت وہ عند اللہ ظالم بھی

۱- "(وفی الهدیة وقالا: لا بأس بأبوال الإبل ولحم الفرس للتداوی كذا فی الجامع الصغیر قلت وفی الخانیة ادخل مرارة فی أصبعه للتداوی روی عن أبی حنیفة كراهته وعن ابی یوسف عدمها وهو علی الاختلاف فی شرب بول مایؤكل لحمه وبقول أبی یوسف أخذ أبو اللیث "(رد المحتار علی الدر ۹/ ۴۹۱، مکتبہ زکریا دیوبند) ایضاً۔ "مطلب فی التداوی بلبن البنت للرمد قولان"(الرد المحتار علی الدر ۷/ ۲۶۴، مکتبہ زکریا)۔

ہیں یا نہیں، لیکن بہر حال قاعدہ شرعیہ ہے کہ مظلوم ظالم سے بقدر اس کے ظلم کے طاقت رکھتے ہوئے بدلہ لے سکتا ہے لیکن زیادتی سرمو جائز نہیں، ''فاعتدوا علیه بمثل ما اعتدیٰ علیکم ''(۱)، لہٰذا اگر وہ واقعی عند اللہ ظالم اور آپ مظلوم ہیں اور بدلہ لینے کی طاقت رکھتے ہیں اس طرح پر کہ کوئی شر وفساد بپا نہ ہو تو قانون کے اندر رہتے ہوئے آپ بدلہ لے سکتے ہیں مگر وہیں تک جہاں تک ان کا ظلم ہو ذرا بھی زیادتی وتجاوز جائز نہ ہوگا ورنہ پھر آپ ہی عند اللہ ظالم قرار دیئے جائیں گے اور بحالت مظلومیت وصبر جو فضیلتیں اور آخرت کا ثواب اور نصرتیں منجانب خدا آپ کو ملتی ہوں گی یا موعود ہیں سب سے آپ محروم ہوجائیں گے۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

الجواب صحیح: سید احمد علی سعید، محمود غنی عنہ

عورتوں کا بے پردہ نکلنا:

وہ علاقہ جس میں پردہ کا رواج نہیں ہے، عورتیں اپنے محرم اور غیر محرم کے ساتھ اور تنہا بھی جنگل میں کاروبار کے لئے نکلتی ہیں اور یہ طریقہ اس علاقہ کی قوم کے آباء واجداد کے قدیم زمانہ سے چلا آرہا ہے، شریعت میں اس کی کہاں تک گنجائش ہے؟

الجواب وباللہ التوفیق:

پردہ کی دو قسمیں ہیں ایک حجاب اور دوسرا ستر، حجاب یہ ہے کہ عورت اپنے تشخص اور سراپے کو مردوں کے سامنے نہ آنے دے (۲)، اس طرح غیر محرم کے ساتھ تخلیہ میں رہنے کی حدیث میں ممانعت آئی ہے لیکن حوائج اور ضروریات کے پیش نظر باہر میلے کچیلے کپڑوں میں نکلنے کی اجازت ہے مگر ستر اور پردہ کی پوری رعایت رکھنا ضروری ہے یعنی باہر نکلتے وقت منھ اور سینہ کو دوپٹے سے اچھی طرح چھپالے جس کا حکم قرآن سے ثابت ہے:

۱- سورۂ بقرۃ ۱۹۴۔

۲- ''وقرن فی بیوتکن ولا تبرجن تبرج الجاهلیة الاولی''، اور ستر یہ ہے کہ جتنا بدن چھپانا فرض ہے اتنا چھپائے چنانچہ اجنبی مرد سے سوائے منھ (چہرہ) اور ہاتھوں کے چھپانا بھی ضروری ہے ''ولا یبدین زینتهن الا ما ظهر منها'' (سورۂ نور: ۳۱)۔

"یا أیها النبی قل لازواجک و بناتک و نساء المومنین یدنین علیهن من جلابیبهن" الایة ،
"وایضاً قال فی الهدایة: لا یجوز أن ینظر الرجل إلی الأجنبیة إلا إلیٰ وجهها وکفیها لقوله تعالیٰ: ولا یبدین زینتهن إلا ما ظهر منها، قال ابن عباس رضی الله عنه ما ظهر منها الکحل والخاتم والمراد موضعهما وهو الوجه والکف کما أن المراد من الزینة المذکورة لمواضعها ولأن فی إبداء الوجه والکف ضرورة لحاجتها إلی المعاملةمع الرجال أخذاً وإعطاءً وغیر ذلک وهذا تنصیص علی أنه لا یباح النظر الی قدمها قال: فإن کان لا یأمن الشهوة لا ینظر إلی وجهها إلا لحاجة لقوله علیه الصلوة والسلام: من نظر الی محاسن إمرائة أجنبیة من شهوة صبّ فی عینه الأنک یوم القیمة، هدایه اخیرین ۴۴۲ وفی الخلاصة لاتسافر العجوز بغیر محرم ولا تخلو برجل شابِ أو شیخ" (۱)،فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

تصویر سازی اور اس کا حکم:

لکڑی کے ڈبّوں پر پینٹل وغیرہ کی تصویر بنائی جاتی ہیں آیا ان کا بنانا اور بنانے والے پر اجرت لینا یہ جائز ہے یا نہیں؟

الجواب وباللہ التوفیق:

جو مٹھائیاں جاندار کے جسم کی طرح بنی ہوئی ہوں انکا خریدنا بیچنا جائز نہیں ہے(۲)، البتہ اگر بغیر خریدے ہوئے بطورہبۃ وغیرہ کے مل جائیں تو انکو توڑ پھوڑ کرکھانا جائز ہے (۳)،لکڑی کے ڈبّوں پر جوکسی جانور کی پوری تصویر خواہ پینٹل سے

۱- خلاصۃ الفتاویٰ/ص ۴۱۴۔

۲- "اشتری ثوراً او فرساً من خزف لأجل إستئناس الصبی لایصح ولا قیمة له فلایضمن متلفه، قال فی الشامیه کأنه لأنه آلة لهو" (ردالمحتار ۷/ ۴۷۸،کتاب البیوع،باب المتفرقات،مکتبہ زکریا)۔

۳- (لما فی صحیح ابن حبان إستاذن جبریل علیه السلام علی النبی صلی الله علیه وسلم فقال: أدخل فقال: کیف أدخل وفی بیتک ستر فیه تصاویر فإن کنت لابد فاعلاً فاقطع رؤسها أو اقطعها وسائد أو إجعلها بسطاً وفی البخاری فی کتاب المظالم عن عائشةؓ أنها إتخذت علی سهوة لها ستراً فیه تماثیل فهتکه النبی صلی الله علیه وسلم. قالت فاتخذت منه نمرقتین فکانتا فی البیت تجلس علیهما زاد احمدؒ فی مسنده: ولقد رایته متکئاً علی أحدهما وفیه صورة" (البحر الرائق کتاب الصلوۃ باب مایفسد الصلوۃ وما یکرہ فیہا ۲/ ۴۹،مکتبہ زکریا)۔

یا لکڑی وغیرہ سے اس طرح بنی ہوئی ہو جو اتنی بڑی ہو کہ اگر اس کو زمین پر رکھ کر خود کھڑے ہو کر دیکھا جائے تو نمایاں طور پر ظاہر ونمایاں ہوں تو ان کا بنانا اور اس پر اجرت لینا کچھ جائز نہیں ہوگا، اور اگر چھوٹی ہوں کہ کھڑے ہو کر دیکھنے میں نمایاں نہ ہوں یا اس طرح پر ہوں کہ ان کا سر نہ ہو تو اس کا بنانا اور اسکی اجرت سب جائز رہے گا۔ اس طرح اگر غیر جاندار کی تصویریں ہوں تو اسکو بھی بنانا اور اس پر اجرت لینا سب جائز رہے گا (۱)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دار العلوم دیوبند سہارنپور

مالدار وفقیروں کو صدقہ دینا:

۱- سال میں دو بار فصل کے موقع پر فقیروں کو گاؤں والے کھانا کھلاتے ہیں اور انکو ایک خوراک کھانا (چھانا) اور چراغی ایک آنہ فی فقیر کے حساب سے دیتے ہیں اور سب کام ختم ہونے کے بعد وہ لوگ یہ الفاظ زور سے کہتے ہیں اور اس کو (حق مارنا) کہتے ہیں، لطف انبیاء کرام، اولیاء یا فضل پنجتن یا علی الا اللہ اور چلے جاتے ہیں اور گاؤں والے یہ سمجھتے ہیں کہ انکو کھانے سے بلا ومصیبت دور ہو جاتی ہے۔

اب کچھ لوگ اعتراض کرتے ہیں۔ یہ لوگ ذات کے فقیر ہیں کچھ ان میں مالدار بھی ہیں انکو دعوت دیکر بلانا اور کھانا کھلانا اور خیرات سمجھ کر دینا درست نہیں ہے۔

۲- اور پھر ایک خوراک بطور چھانا الگ باندھ کر دینا بھی مناسب نہیں ہے۔ چراغی کے طور پر فی فقیر ایک آنہ دینا بھی پرانا رسم الفاتحہ مروجہ ہی کا ہے۔ پھر ایسا کلمہ کہنا جو کفر یا مشابہ کفر ہے اور خود بلوا کر کھلانا گویا اس میں شریک ہونا ہے اور گاؤں میں کچھ ایسے محتاج ہیں جو فاقہ کشی کرتے ہیں اگر یہی غلہ وصول کر کے انکو دے دیا جاوے تو ثواب بھی ہو اور صلہ رحمی بھی ہو اور مذکورہ بالا گناہوں سے بھی بچ جاویں۔ دریافت ہے کہ یہ لوگ صحیح کہتے ہیں یا اسی پرانے طریقہ پر رسم بجالانے والے ہی حق پر ہیں۔

۱- ’’وأما صورة غير ذي الروح فلا خلاف في عدم كراهة الصلاة عليها أو إليها ولا كراهة في عملها أيضاً لما روي عن ابن عباسؓ أنه قال للمصور حين نهاه عن التصوير وذكر له الوعيد وقال: إن كنت لابد فاعلا فاصنع الشجر ومالا نفس له. حلبي كبيري مع زيادة يسيرة باب كراهية الصلاة ۳۵۹ سہیل اکیڈمی لاہور‘‘ وقال في الدر (أو كانت (صغيرة) لا تتبين تفاصيل أعضاء ها للناظر قائماً وهي على الأرض، او مقطوعة الرأس او الوجه او ممحوة الوجه لاتعيش بدونه (او غير ذي روح لا) يكره لأنها لاتعبد، وخبر: جبريلُ مخصوص بغير المهانة، وقال في الشامية وقد صرح في الفتح وغيره بأن الصورة الصغيرة لاتكره في البيت قال: ونقل أنه كان على خاتم أبي هريرةؓ ذبابتان‘‘ (ردالمحتار على الدرالمختار کتاب الصلاۃ ۱۹/۲-۴۲۰)۔

الجواب وباللہ التوفیق:

اعتراض کرنے والوں کی بات صحیح ہے، صدقہ غریب مسکین محتاج کو دینا چاہئے، اگر اپنے گاؤں میں کوئی ایسا ہو اس کو زیادہ ترجیح ہوگی، ایسے فقیروں کو جو مالدار ہوں نہ دینا چاہئے صدقات واجبہ (زکوۃ فطرہ وغیرہ) تو مالدار فقیروں کو دینے سے ادا بھی نہ ہوں گے صدقات وخیرات بلاشبہ مصیبت وبلاؤں کو دفع کرتے ہیں لیکن شرط یہ ہے کہ اپنے صحیح محل اور مصرف میں ہوں اور حکم شرعی کے مطابق ہوں یہ فقیر جو کلمات بعد طعام کہتے ہیں ان میں بعض تو بالکل ناجائز اور عقیدہ روافض کو مشتمل ہیں اور بعض ایسے ہیں کہ انکو اگر کھینچ تان کر بنانے کی کوشش بھی کی جائے تو اسکا استعمال بے محل ہونے کی وجہ سے واجب الترک ہیں، لہذا ایسے کلمات کہنے یا کہلانے کو قطعاً بند کر دینا چاہئے یہ سب جاہلانہ باتیں اور رسمیں ہیں انکی اصلاح کی ضرورت ہے، صحیح حقی تو کلمہ طیبہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کی ہوتی ہے جو اپنے موقع پر اہل اللہ وذاکرین شاغلین کرتے ہیں نہ کہ یہ، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

غیر شرعی عدالتوں میں مقدمہ لے جانا کیسا ہے:

جن عدالتوں میں جھوٹے کاروبار چلتے ہوں وہاں پر مقدمہ داخل کرے یا کہ نہیں؟

الجواب وباللہ التوفیق:

مذکورہ قسم کی غیر شرعی عدالتوں میں ابتداءً اور بلا مجبوری مقدمہ نہیں لیجانا چاہئے جب مجبوری ہو، مثلاً اپنا حق سوخت ہو رہا ہے یا اپنے اوپر ظلم ہو رہا ہے اور بغیر اس عدالت میں گئے ہوئے چارہ نہ ہو تو گنجائش ہے، اب حالات کے اعتبار سے حکم الگ الگ ہوگا، البتہ یہ بات ہر حال میں قابل ترجیح اور واجب اللحاظ ہے کہ مسلمان کو حتی الوسع اپنے تمام معاملات جو مسلمانوں سے ہوں شرعی پنچایتوں کے ذریعہ طے کرا لینے چاہئیں جب بالکل مجبوری ہو جیسا کہ اوپر مذکور ہوئی جب عدالت غیر شرعی میں لیجائیں، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

الجواب صحیح سید احمد علی سعید نائب مفتی دارالعلوم دیوبند

عمارت وغیرہ پر نام کا کتبہ لگانا جائز ہے یا نہیں؟

زید اور عمر کو اللہ تعالیٰ نے توفیق دی اس نے تقریباً صد ہزار روپیہ خرچ کر کے مسجد از سرنو بنوادیا ہے، مسجد تعمیر کرنے والے کی نیت محض ثواب اور اخلاص کی ہے، لیکن چند دوسرے معزز بزرگ کا یہ خیال ہے کہ دونوں اشخاص کے نام کا کتبہ لگادیا جائے تاکہ جن حضرات کی نظر کتبہ پر پڑے دعاء خیر میں یاد کریں اور دوسرے لوگوں کو شوق ہو اور حضرات کا یہ بھی خیال ہے کہ نام کا کتبہ اس لئے لگادیا جائے کہ جب تک نام کا کتبہ لگا ہوا ہوگا مسجد کے نگراں اس نام سے ایصال ثواب کرتے رہیں گے اور دعا کرتے رہیں گے۔

لیکن زید اور عمر کا خرچ کرنا فی سبیل اللہ ہے۔ شرعاً کیا حکم ہے؟

الجواب وباللہ التوفیق:

جب ریاء ونمود کے لئے نہیں لگوایا جا رہا ہے تو بلا تکلف کتبہ لگانا جائز ہے سلف میں اس کی بیشمار نظیریں ہیں، محتاج دلیل نہیں، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۵/ ۸/ ۱۳۸۵ھ

الجواب صحیح سید احمد علی نائب مفتی دارالعلوم دیوبند

حضور ﷺ کی ولادت سے قبل مکہ اور مدینہ میں کس کی حکومت تھی:

پیدائش رسول اللہ ﷺ سے پہلے مکہ اور مدینہ میں کس بادشاہ کی حکومت تھی اور کس بادشاہ کے وقت میں آپ ﷺ پیدا ہوئے؟

الجواب وباللہ التوفیق:

حضور ﷺ کی پیدائش کسریٰ بادشاہ کے وقت یا زمانہ میں ہوئی ہے کسریٰ فارس کا بادشاہ تھا۔ عرب کے بعض حصہ پر بھی اس کی حکومت تھی مگر مکہ پر نہیں تھی مکہ میں خود قریش حکمران تھے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

الجواب صحیح محمود غفی عنہ

دعا کے بعد مرحوم وپیغمبر کے نام کا فاتحہ دینا:

پانچوں نماز کے بعد دعاء کیا جاتا ہے اور دعاء کے بعد کسی مرحوم یا پیغمبر علیہ السلام کے نام فاتحہ دیا جاتا ہے ایسا کرنا درست ہے یا کہ نہیں چند لوگ اس کو منع کرتے ہیں اور چند لوگ بتلاتے ہیں، شرعی کیا حکم ہے؟

الجواب وباللہ التوفیق:

کوئی آیت قرآن کو پڑھ کر اور کسی مرجانے والے کو ایصال ثواب کردیں یہ درست ہے، لیکن اگر فاتحہ کو آجکل کے طریقہ سے پڑھا جاوے جیسے عام طور پر جاہل شوافع کے یہاں ہوتا ہے وہ ٹھیک نہیں ہے۔

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

نماز میں بیوی کا خیال آنا اور قرض کی ادائیگی میں مسجد کا سامان دینا:

ا۔ کسی نمازی کا حالت نماز میں اپنی بیوی کی طرف ذرا سا خیال ہو جانا اس نمازی اور اللہ عزوجل کے درمیان حجاب ہے یا کہ نہیں؟

۲۔ زید ایک مسجد کی نظامت کرتا ہے چونکہ زید نے اپنی ماں سے مسجد کے پردہ بنانے کے واسطے چودہ ۱۴ روپیہ قرضہ مسجد کے نام سے لئے نمازیوں نے چندہ کر کے صرف زید کو سات روپیہ دیئے زید کی ماں نے روپیوں کا تقاضہ کیا تو زید روپیوں کے عوض ایک ڈبہ مسجد کا اپنی ماں کو دے دیا، دریافت ہے کہ زید نے اپنی ماں کو ڈبہ مسجد کا دیا کیا اس نے خیانت کی یا کہ نہیں؟

الجواب وباللہ التوفیق:

خیال کا خود ہو جانا اور خیال کو بالقصد اور خود لے آنا اور سوچنا دونوں چیزیں الگ الگ ہیں خیال لے آنا اور بالقصد سوچنا یہ تو برا ہے اور حجاب ہے باقی خود بخود خیال کا دل میں اپنے سے آجانا انسان کے اختیار میں نہیں ہے، اس لئے یہ از خود آجانا تو حجاب نہیں اور نہ اس پر کچھ مواخذہ ہے، البتہ از خود خیال آجانے کے بعد ادھر متوجہ ہونا یہ برا اور حجاب ہے۔

۲۔ خیانت ہے، درست نہیں ہے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور
الجواب صحیح سید احمد علی سعید

ایسے مذہبی جلسوں میں شرکت جہاں میلہ جیسا ماحول ہو:

ایسے مذہبی اور دینی جلسوں میں شرکت کرنا جہاں یہ وعظ وتقریر بھی ہوتی ہو اور رنگ برنگ طرح طرح کے فیشن کی دوکان بھی لگتی ہو اور اس مذہبی کام کے لئے عورتیں بھی شرکت کرتی ہوں، انکے اٹھنے بیٹھنے کا انتظام الگ ہو اور ان دوکانوں سے عورتیں بھی خرید وفروخت کرتی ہوں غرض میلا لگا رہتا ہے ایسے جلوس میں جانا جائز ہوگا یا کہ نہیں؟

الجواب وبالله التوفیق:

ایسے جلسے جن کی کیفیت وہ ہو جو آپ نے لکھی ہے مذہبی نہیں ہوسکتے ہیں ان سے اجتناب کرنا چاہئے اور عورتوں کو قطعاً ایسے جلسوں میں جانے سے روکنا چاہئے قطعاً جائز نہیں ہے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۳/۹/ ۱۳۸۵ھ

الجواب صحیح محمود غفی عنہ

۱- دوسرے کے شعر کو اپنی طرف منسوب کرنا:

کسی شاعر کے پاس فرمائش بھیج کر شعر بنوانا اور اس میں اپنا تخلص ڈلوا کر کے اپنی طرف سے منسوب کرنا یا کسی شاعر کے شعر میں اپنا نام ڈال کر کے پڑھوانا کیسا ہے؟

۲- اپنے نسب کو بدلنا کیسا ہے؟

اپنی عزت افزائی کے لئے اپنے نسب کو بدلنا کیسا ہے؟

الجواب وبالله التوفیق:

۱- یہ فریب اور جھوٹ ہے جائز نہیں ہے۔

۲- خاندان بدلنا اور اپنے نسب کو اپنے خاندان کے سوا دوسری طرف منسوب کرنا سخت گناہ ہے، حدیث میں اس کی بڑی مذمت وارد ہے،"من ادعى إلى غير أبيه أو انتمى إلى غير مواليه فعليه لعنة الله التابعة إلى يوم

القیامۃ'' (۱)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۹/۹/ ۸۵ ۱۳ھ

الجواب صحیح سید احمد علی سعید نائب مفتی دارالعلوم دیوبند

۱-مقروض کے صدقہ کا حکم:

گذارش ہے کہ ایک شخص کے پاس پانچ سو روپیہ قرض کا ہے اور وہ تجارت اور کل اخراجات بھی کرتا ہے اور اس کے دل میں بھی ہے کہ میں قرضہ ادا کرتا رہوں گا تو اس کے دل میں آتا ہے کہ میں دو چار روپیہ مدرسہ یا مسجد کو دوں زید کہتا ہے کہ اس روپیہ دینے کا ثواب نہیں ملے گا۔

کیونکہ قرض دینا واجب ہے اور اگر وہ روپیہ مسجد یا مدرسہ کو ملیگا تو قرض بڑھے گا، لہذا اس شخص کو اللہ تعالی کے واسطے روپیہ دینے کا ثواب ملے گا یا کہ نہیں؟

۲-منی آرڈر کا حکم:

منی آرڈر کرنا کیسا ہے اور اسکے بارے میں دیوبند کی کیا رائے ہے۔

الجواب وباللہ التوفیق:

۱-وہ مسجد یا مدرسہ کو دے سکتا ہے اگرچہ بہتر نہیں ہے کہ پہلے قرض ادا کرے بعد میں خیرات بہر حال ثواب اس کو بھی ملے گا۔

۲-منی آرڈر کرنا درست ہے۔

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۴/ ۱۰/ ۸۵ ۱۳ھ

محمد جمیل الرحمٰن نائب مفتی دارالعلوم دیوبند

۱- سنن ترمذی ۲/ ۳۳ باب ماجاء لاوصیۃ لوارث۔

جانور کا پیشاب دوائً پینا:

زید بیمار ہے اور اس کو ڈاکٹر نے کہا ہے کہ فلاں جانور کا پیشاب پینے سے یہ بیماری زائل ہوجاوے گی تو کیا اس صورت میں پیشاب کو پینا جائز ہے۔

الجواب وباللہ التوفیق:

امام اعظم ابوحنیفہؒ کے نزدیک تو حرام شیٔ میں شفاء ہے ہی نہیں، البتہ صاحبین کے نزدیک کچھ گنجائش ہے، اس لئے صورت مسئلہ کا حکم یہ ہے کہ اگر دیندار حاذق طبیب یہ فیصلہ و تشخیص قطعی کردے کہ اس مرض کی صرف یہی دوا ہے اس کے سوا اور کوئی دوا نہیں تو گنجائش بقدر ضرورت دیجائے گی ورنہ نہیں (۱)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

الجواب صحیح محمود عفی عنہ

بذریعہ انجکشن اولاد اور اس کے نسب ومیراث کے احکام:

آجکل انجکشن کے ذریعہ سے انسان اور جانداروں کے حمل قائم کئے جاتے ہیں اور بعض جگہ اس سے بچے پیدا ہوتے ہیں، اس میں دو باتیں مطلوب ہیں یہ طریقہ شرعاً جائز ہے یا نہیں، دوسرے یہ اولاد مستحق میراث ہوگی یا کہ نہیں؟

الجواب وباللہ التوفیق:

اس طریق کا خلاف فطرت ہونا تو ظاہر ہے جن روایات اور مجبوریوں میں دیگر خلاف فطرت اور مثلاً معالجات کو برداشت کیا جاتا ہے، اس طرح مجبوری کی حالت میں اس کو بھی برداشت کیا جاسکتا ہے، بشرطیکہ وہ مجبوری شرعاً بھی قابل لحاظ ہو، جب شوہر کی منی بیوی میں بذریعہ انجکشن کے داخل کی جائے اور حمل قائم ہوجائے گا تو بچہ ثابت النسب اور مستحق میراث ہوگا۔

”یفهم ما في رد المحتار: إذا عالج الرجل جاريته فيما دون الفرج فأنزل فأخذت الجارية ماء ه

۱- ”ونکره أبوال الإبل لحم الفرس وقالا لا بأس بأبوال الإبل ولحم الفرس للتداوي“(ہندیہ ۵/ ۳۵۵ دارالکتاب دیوبند)۔

فی شی فاستدخلته فرجها فی حدثان ذلک فعلقت الجاریة وولدت فالولود لمه والجاریة أم ولده" اھ (۱)۔

لیکن کسی غیر کی منی داخل کرنا جائز نہیں ہے، آجکل ڈاکٹروں نے جوطریقہ جاری کیا ہے کہ مادہ منویہ جمع کرتے ہیں اور پھر داخل کرتے ہیں اس میں منی کی بیع ہے، غیر کی منی کا استعمال وادخال ہے، غلط نسب ہے، بغیر عقد نکاح کے سلسلہ ولادت کا فتح باب ہے وغیرہ وغیرہ، یہ جملہ مفاسد بہت سے احکام شرعیہ کو منہدم کرنے والے ہیں، اس لئے اس کی ہرگز ہرگز اجازت نہیں ہے۔

جانوروں کے معاملہ میں تنگی نہیں ہے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲/۱۱/ ۱۳۸۵ھ

الجواب صحیح محمود غفی عنہ

حدیث لطیف کا مطلب-حدیث کی سند واجازت:

دیوبند کی بہت کتابوں میں لکھا ہوا پایا جاتا ہے کہ حدیث کا یہ حصہ لطیف ہے، اس کے کیا معنی ہیں اور آج جو رواج ہوا ہے کہ حدیث کی اجازت اور فقہ کی اجازت اور فلاں کتاب کی اجازت ہم نے فلاں سے حاصل کی ہے اور اس نے فلاں سے اور اس نے فلاں سے اس سے کیا فائدہ ہوتا ہے جبکہ بیشمار حدیث کی کتابیں موجود ہیں اور اس میں روایات موجود ہیں نیز اس اجازت کا ثبوت کہاں سے ہے اور کس طرح چلا ہے اور یہ بھی بتلایا جائے کہ ہم بعض حدیثوں کی کتابوں میں دیکھتے ہیں کہ حدثنا یا اخبرنا سے شروع کر کے عن پر ختم کرتے ہیں۔

حدثنا فلان اخبرنا فلان بظاہر یہ درست نہیں کیونکہ حدثنا اتصال واقع پر اور صحت پر دال ہے اور عن تدلیس اور ارسال پر جو دونوں متعارض ہیں۔

الجواب وباللہ التوفیق:

حدیث لطیف کہنے کی وجہ یہ بھی ہوتی ہے کہ اس کے معنی کی طرف ہر ایک کا ذہن نہیں جاتا، کبھی اس سے کوئی

۱- شامی ۴/۴۶ ۸۔

باریک مسئلہ یا نکتہ نکلتا ہے جس کو ہر ایک نہیں سمجھ پاتا ہے، حدیث کے لئے سند پیش کرنا اور سند سے حدیث حاصل کرنا محدثین کا قدیم طرز ہے اور حدیث شریف میں ہے: ''ان ھذا العلم دین فانظر وا عمن تأخذون دینکم'' (۱)۔

حدثنا اور اخبرنا کی انتہاء ہمیشہ عن پر نہیں ہوتی، محدثین نے چھان بین کر کے مدلسین کی فہرست مرتب کردی ہے، مدلس کے عنعنہ میں کلام کرتے ہیں غیر مدلس کے عنعنہ میں کلام نہیں کرتے، لہذا ہر عنعنہ محل تلبیس نہیں، جہاں تلبیس کا احتمال ہوتا ہے اس کی خبر موضع استدلال میں دیگر طرق سے کردی جاتی ہے کمالا تخفی علی من مارس الحدیث۔

علم امانت ہے جن طرق سے حاصل کیا جاتا ہے بتلا دیا جاتا ہے اس میں خیر و برکت ہے قابل اعتماد ہے، خود بخود کتابوں کو دیکھ کر حاصل کرنا قابل اعتماد نہیں، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲/۱۱/ ۱۳۸۵ھ

الجواب صحیح محمود عفی عنہ

بزرگ کا بد دعا کرنا:

ایک بزرگ صوفی صاحب کہتے ہیں کہ بد عا کرنا حضور ﷺ سے ثابت ہے وہ اکثر بد دعا کرتے رہتے ہیں جب اس بد دعا کا اثر ہوتا ہے تو خوش ہوتے ہیں اور بیان کرتے ہیں ٹھیک ہوا ایسی حالت میں شرعی حکم کیا ہے؟ یہ بزرگ پیری مریدی کرتے ہیں۔

الجواب وباللہ التوفیق:

بد دعا کرنا بعض موقعوں میں جناب نبی کریم ﷺ سے ثابت ضرور ہے مگر ہر جگہ اور ہر موقع پر بد دعا کرنا درست نہیں ہے، اس کے کچھ شرائط اور قیود ہیں، نہ معلوم یہ صوفی صاحب کس موقع میں بد دعا کرتے ہیں جب تک ان مواقع کی تفصیل و تعیین نہ معلوم ہو کوئی قطعی حکم جواز یا عدم جواز کا نہیں لکھا جاسکتا ہے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲/۱۱/ ۱۳۸۵ھ

الجواب صحیح محمود عفی عنہ

۱- رواہ مسلم، مشکوۃ المصابیح رص ۳۷ کتاب العلم۔

شب قدر میں ذکر ووعظ کی محفل کا انعقاد:

شب قدر میں ذکر اور وعظ کی محفل منعقد کرنا اور اس میں شب بیداری کرنا کیسا ہے، ہندوستان میں یہ رواج چلا آرہا ہے اور علماء اس میں شرکت کرتے ہیں زید، اس طرح کے اجتماعات کو بدعت کہتا ہے اس بارے میں شرعی قیود کیا ہے۔

الجواب وباللہ التوفیق:

نفس ذکر اور وعظ تو اس شب میں بدعت نہ ہوگا لیکن خاص اس شب کے لئے اجتماع کا اہتمام کرنا (۱)، اور بعد اس کو لازم اور ضروری قرار دینے سے اور اس کے نہ کرنے والے پر نکیر کرنے سے بدعت ہوجائے گا، شب بیداری شب قدر میں افضل ہے اور اس کے بہت سے طریقے ہیں، تلاوت کرنا نفلیں پڑھنا وغیرہ وغیرہ کوئی عبادت کرنا سب سے شب بیداری کی فضیلت حاصل ہوجائے گی (۲)۔

کسی ایک ہی طریقہ کو سب پر لازم کرنا صحیح نہیں ہے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۳۰/۱۰/۱۳۸۵ھ

الجواب صحیح محمود عفی عنہ، مفتی دارالعلوم دیوبند

۱-غیر مسلم کو آداب کہنا:

ہندوستان جیسے ملک میں ہندو کو ادب کے خیال سے کہنا جائز ہے یا نہیں؟

۲-گاندھی جی کی ٹوپی پہننا:

گاندھی ٹوپی پہننا جائز ہے یا نہیں؟

۳-کونڈا کی شرعی حیثیت:

غوث پاک کی نیاز جعفر صادق کے کونڈے کے بارے میں کیا حکم ہے؟

۱- "ویکرہ الاجتماع علی احیاء لیلۃ من ہذہ اللیالی فی المساجد" (ردالمحتار ۲/۴۶۹، مکتبہ زکریا)۔

۲- "واحیاء لیلۃ العیدین والنصف من شعبان ویکون بکل عبادۃ تعم اللیل او اکثرہ" (درمختار مع الرد ۲/۴۶۹ مکتبہ زکریا)۔

الجواب وباللہ التوفیق:

۱-شعار اسلامی کے خلاف ہے اس سے بچنا ضروری ہے۔

۲-جائز غیر افضل ہے۔

۳-یہ سب بدعت وناجائز ہے اس سے بچنا ضروری ہے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

بلاوجہ شرعی قاضی کو معزول کرنا:

۷۳ سال سے قاضی صاحب اپنی خدمت بہت خوبی کے ساتھ انجام دے رہے ہیں، یہ سلسلہ ان کے خاندان میں شاہی زمانہ سے چلا آرہا ہے اور قوم سے قریب اور دور سبھی کو قاضی صاحب سے کوئی شکایت نہیں ہے، قاضی صاحب تعلیم یافتہ ہیں، ایک صاحب کی کوشش ہے کہ قاضی صاحب کو قوم اس خدمت سے ہٹادے۔ قاضی صاحب سے ۴-۶ آدمی ناخوش ہیں اور حقیر سمجھتے ہیں تو کیا اس فتنہ کی بناء پر قاضی صاحب کو اپنی خدمت سے علیحدہ کیا جاسکتا ہے؟

الجواب وباللہ التوفیق:

اگر قاضی صاحب متبع شرع اور اس کام کو پورا کرتے ہیں تو انکے خلاف فتنہ پر داری جائز نہیں ہے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۴/۱۰/۱۳۸۵ھ

الجواب صحیح محمود غفی عنہ

ہندی رسم الخط میں قرآن کی اشاعت:

کسی شخص نے قرآن مجید کو ہندی رسم الخط میں اس طرح لکھا کہ لکھنے اور پڑھنے میں عربی الفاظ وکلمہ دونوں میں کمی اور اضافہ ہوکر پورا قرآن مجید عربی مسخ ہوجاتا ہے۔ اور غلط تلفظ کی وجہ سے عربی زبان تو الگ مسخ ہوتی ہے اور معنی کی غلطی سے کفر تک کا خطرہ ہوجاتا ہے۔ مثلاً قرآن عربی ہے، ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم'' ایک آیت ہے، اس آیت کو ہندی رسم الخط میں

یوں لکھا گیا ہے (۱)، اگر ہندی تحریر کو عربی میں لکھے تو یوں آیت ہوگی (بسم ل للہ ہ ررحمان ررحیم) جو تحریراً بھی غلط، قرأۃ بھی غلط ہے اور عربی بسم اللہ میں اللہ کا ''الف'' اور الرحمٰن کا ''ال'' اور الرحیم کا ''ال'' کم ہے، اس طرح ہندی بسم اللہ میں پانچ حرف کم کیے گیے اور الرحمٰن کی (ر) زیادہ اور دوبارہ لکھی گئی ہے، جس کے معنی یہ ہوئے کہ دو (ر) زیادہ اور اضافہ ہے، گویا ایک آیت مذکورہ میں سات غلطیاں ہیں، پورے قرآن شریف میں تو ہزاروں حروف کی کمی اور اضافہ ہے۔ اس طرح پورا قرآن مجید عربی میں ترمیم وتنسیخ کر کے مسلّم قرآن مسخ کیا گیا ہے۔ اور اس کو ہندی قرآن کا نام دیا گیا ہے۔ کیا ایسی صورت میں اس ہندی قرآن کا لکھنا اور پڑھنا جائز ہے یا نا جائز ہے، اور لکھنے والا ناسخ قرآن ہے یا نہیں، اور یہ حرکت تمسخر قرآن میں داخل ہے یا نہیں، اور لکھنے والے کو اور پڑھنے والے کو مومن اور مسلمان کہا جاسکتا ہے یا نہیں؟ **بینوا توجروا**

نوٹ: اس کی تحسین وتعریف کرنے والے کو شرعا کیا کہا جائے گا۔

الجواب وباللہ التوفیق:

قرآن کریم نام ہے اور علم ہے خاص اس کلام الٰہی کا جو عربی زبان میں بذریعہ جبرئیل علیہ الصلوٰۃ والسلام جناب محمد رسول اللہ ﷺ پر منجانب خدا نازل کیا گیا ہے اور تلاوت کیا گیا ہے، اور اس کے تمام کلمات وحروف، وزبر، زیر مدولین، جزم وتشدید وغیرہ سب ہی چیزیں متعین ومعلوم ہیں۔ اس کا رسم الخط بھی علیحدہ ومتعین ہے، ایک خاص انداز سے مکتوب ہے۔ اس کا نطق وتکلم بھی نرالی شان رکھتا ہے، اور ان تمام کیفیات وخصوصیات کے ساتھ لوح محفوظ میں موجود ومحفوظ ہے۔ اور اس کے تمام احکام الگ اور ممتاز ہیں۔ اس کو کسی شخص کا بغیر طہارت چھونا بھی جائز نہیں ہے۔ چنانچہ ایک مقام پر ارشاد ربانی ہے:

''الٓمّر تلک ایات الکتٰب المبین إنا أنزلنٰہ قرآنا عربیا لعلّکم تعقلون'' (۲)۔

(یہ آیتیں ہیں واضح کتاب کی، ہم نے اس کو اتارا ہے عربی زبان کا قرآن (بناکر) تاکہ تم لوگ اچھی طرح سمجھو) (بیان القرآن)۔

اور ایک مقام پر اس طرح مذکور ہے:

۱- ہندی خط میں تحریر تھی۔

۲- سورۂ یوسف:۱-۲۔

"إنه لقران كريم في كتاب مكنون لا يمسه إلا المطهرون، تنزيل من رب العالمين"(۱)۔

(یہ ایک مکرم قرآن ہے جو ایک محفوظ کتاب یعنی لوح محفوظ میں درج ہے کہ اس کو بجز پاک فرشتوں کے کوئی ہاتھ نہیں لگانے پاتا)(بیان القرآن)۔

اور ایک جگہ اس طرح ارشاد ہے:"بل هو قران مجيد في لوح محفوظ"(۲)۔

(بلکہ وہ ایک باعظمت قرآن ہے جولوح محفوظ میں لکھا ہوا ہے)(بیان القرآن)۔

اورتفسیر روح المعانی(۱/ ۱۰) میں قرآن کریم کے بارے میں اس طرح فرماتے ہیں:

"والقران كلام الله تعالىٰ ألمنزل بهذاالمعنى فهو كلمات غيبية مجردة عن المواد مترتبة في علم الله تعالىٰ أز لا غير متعاقبة تحقيقا بل تقديراً عند تلاوة الألسنة الكونية (إلى قوله) ومن هنا قال السنيون: القران كلام الله تعالىٰ غير مخلوق وهومكتوب في المصاحف محفوظ في الصدور مقرؤ بالألسن؟ مسموع بالأذن غير حال في شيء منها وهو في جميع هذه المراتب قران حقيقة شرعية معلوم من الدين بالضرورة وهكذا في عامة تفسير المحققين(۳)۔

(قرآن پاک (نام ہے) اللہ تعالیٰ کے اس کلام کا جو اپنے معنی کے ساتھ نازل کیا گیا ہے، پس وہ (مجموعہ ہے) ان کلمات غیبیہ کا جو مادہ سے مجرد ہیں (اور) اللہ تعالیٰ کے علم میں مترتب ہیں ازلی ہیں اور حقیقت کے اعتبار سے ترتیب وار ہیں، بلکہ زبانوں پر تلاوت کے وقت تقدیری ترتیب سے مترتب ہیں جوترتیب زمانی وجود کی متقاضی ہے، اور یہیں سے اہل السنّت والجماعت نے فرمایا ہے کہ قرآن پاک اللہ تعالیٰ کا کلام غیرمخلوق ہے۔مصاحف میں مکتوب ہے،لوگوں کے سینوں میں محفوظ ہے، زبانوں پر پڑھاجاتا ہے،کانوں سے سنا جاتا ہے، ان میں سے کسی میں حلول کردہ نہیں ہے۔اور یہ قرآن پاک ان تمام مراتب میں حقیقت شرعی کے اعتبار سے قرآن ہے،ضروریات دین میں شمار ہے اور اسی طرح عام محققین کی تفسیر میں مذکور ہے)۔

ان آیات کریمہ وعبارات سے، نیز دوسرے مفسرین محققین کے کلام وروایات اور احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب چیزیں (قرآن پاک کے کلمات وحروف زیروزبر وغیرہ) امور توقیفی ہیں، ان میں ایک زیر یا زبر، بلکہ نقطہ کی بھی کمی یا

۱- سورۂ واقعہ: ۷۷-۸۰۔

۲- سورۂ بروج: ۲۱-۲۲۔

۳- تفسیر روح المعانی ۱/ ۱۰، ۱/ ۲۳، ۲۴ خطبۃ المفسر مطبوعہ زکریا بکڈپو دیوبند۔

بیشی جائز نہیں ہے۔

اور ان قرأتوں کے علاوہ جو رسول علیہ الصلوٰۃ والتسلیم سے منقول ہیں کسی نوع کا تغیر وتبدل جائز نہیں ہے، اگر چہ عربی زبان اور عربی عبارت باقی رہے، پھر ایسی تبدیلی وتغیر جس میں عربی زبان یا عربی رسم الخط وغیرہ تک متغیر ومتبدل ہو جائے، کب اور کیونکر درست ومباح ہوسکتا ہے؟

وفي الاتقان للسيوطي: "لم يجوز أحد من الأئمة الأربعة كتابة القران بغير العربية"۔

(سیوطی نے اتقان میں لکھا ہے کہ ائمہ اربعہ میں سے کسی نے غیر عربی میں قرآن پاک کی کتابت کو جائز نہیں قرار دیا ہے)۔

پس سوال میں جو جو خرابیاں لکھی ہوئی ہیں ان کے ساتھ تو لکھنا پڑھنا یا اس کو قرآن کریم کہنا کسی طرح بھی درست نہیں ہے۔ سخت گناہ اور قطعی حرام ہے۔ اور بڑی خطرناک قسم کی جرأت ہے۔ اگر دیدہ ودانستہ کوئی شخص اس طرح لکھے یا پڑھے تو اس کے محرف قرآن وناسخ قرآن کریم ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہے۔ اسی طرح اس کو جائز سمجھنا یا اس کی اعانت کرنا بھی شدید جرم وحرام ہے۔

مذکورہ طریقہ پر ہندی رسم الخط یا انگریزی یا بنگلہ یا برمی یا چینی قرآن کہنا قرآن کریم وکلام الٰہی کی توہین وتحقیر ہے اور تحریف کا دروازہ کھولنے کے مترادف ہے۔

ہاں یہ ہوسکتا ہے کہ جو لوگ عربی رسم الخط سے ناواقف ہونے کی وجہ سے ناظرہ بھی نہ پڑھ سکتے ہوں اور تلاوت کلام الٰہی کرنا چاہتے ہوں، ان کی تعلیم وتلقین کے لیے مصحف پاک کی ترتیب کے مطابق داہنی طرف سے کتابت شروع کی جائے اور پہلے قرآن کریم سرخوش وسرصفحہ نمایاں کرکے اس طرح لکھا جائے کہ اس کا اصل ہونا اور اس کی متبوعات وعظمت اور اس کا پورا ادب واحترام محفوظ وملحوظ رہے اور اس کے نیچے تابع بنا کر کسی بھی زبان کے رسم الخط میں اتنی ہی عبارت قرآن کریم کی اس طرح پر لکھی جائے کہ قرآن مجید کے تمام خصوصی حروف مثلاً س۔ث۔ اورز۔ذ۔ظ۔ض اور ہمزہ ع وغیرہ اور اس کے تمام فروق وامتیازات، نیز تمام خصوصیات کتابت واداء وغیرہ مثلاً حروف زوائد (الف لام) اور مدوجزم، تشدید واسکان وغیرہ کی پوری پوری رعایت موجود وملحوظ رہے۔

اور یہ ظاہر ہے کہ یہ صورت اس وقت ممکن ہوگی جب پہلے ان تمام خصوصیات کے لیے جامع مانع اصطلاحات وضع کرکے اس زبان کو مکمل کرلیا جائے، پھر لکھا جائے، ورنہ بغیر اس کے کوئی صورت جواز واباحت کی نہ ہوگی۔

اوران باتوں کے باوجود ایک بات اور پھر بھی ضروری اور لازمی رہے گی کہ اس عبارت کو قرآن کریم کا نام یا ہندی رسم الخط میں قرآن کا نام یا انگریزی یا بنگلہ وغیرہ کسی بھی رسم الخط میں قرآن کا نام ہرگز نہ دیا جائے۔

بلکہ اصل قرآن کریم سے امتیاز اور تعارف کی غرض سے اور خلط وتلبیس وتحریف سے حفاظت کی غرض سے سرخی میں فقط یہ لکھا اور کہا جائے، مثلاً: ہندی رسم الخط میں یا انگریزی یا بنگلہ وغیرہ رسم الخط میں قرآن کریم کی تعلیم کا ذریعہ، یا مثلاً ہندی رسم الخط میں یا فلاں رسم الخط میں قرآن کریم کا تعارف۔

صرف قرآن کریم کا اس کو ہرگز نام نہ دیا جائے۔ اگر ذرا بھی کسی عمل میں یا فعل سے قرآن کریم سے التباس ہوگا تو پھر اباحت وجواز کی کوئی صورت نہ رہے گی۔ ان تمام بندشوں اور احتیاطوں کے ساتھ اس زیر متن عبارت کی حیثیت وہی ہو جائے گی جو قرآن کریم کے ترجمہ اور تفسیر کی ہوتی ہے، جو عربی زبان یا غیر عربی زبان میں متن قرآن کریم کے ساتھ تابع بن کر لکھ دی جاتی ہیں، اور اس کو قرآن کا نام نہ دیتے ہوئے صرف ترجمہ قرآن کریم یا تفسیر قرآن کریم کے نام سے موسوم کرتے ہیں، هذا ماعندی، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

الجواب صحیح محمود غفرلہ، سید احمد علی سعید

میں ہندوستانی ہوں اور یہاں سعودی عرب میں ملازمت کرتا ہوں، یہاں پر ریڈیو کویت سے اردو میں پروگرام سنتا ہوں، ان پروگراموں میں دینی معلومات اور مسائل بھی شامل ہیں، جن میں سے احقر نے ۳ مسئلے نوٹ کیے ہیں، جن کے بارے میں تفصیلی معلومات کے لیے آپ کی خدمت میں عرض ہے:

ڈھول بجا کر لاٹھی کھیلنا:

"لحاجتها إلى المعاملة مع الرجال اخذاً واعطاءً وغير ذلك. وهذا تنصيص على الله لايباح النظر إلى قدمها قال فان كان لايأمن الشهوة لاينظر إلى وجهها الا لحاجة لقوله عليه الصلوٰة والسلام: من نظر إلى محاسن امرأة اجنبية من شهوة صب في عينه الانك يوم القيامة (هدايه آخرين ۴۴۲) وفي الخلاصة لاتسافر العجوز بغير محرم ولاتخلو برجل شابٍ أو شيخ" (خلاصۃ الفتاوی ۴/۲۱۴)۔

۱-عید الاضحیٰ میں عیدگاہ سے گھر کو آتے وقت ڈھول بجا کر مسلمان کا لاٹھی کھیلنا اور اس کھیل کا کرانا عند الشرع

کیسا ہے؟

۲-ڈھول بجانے والا ہندو ہے اور لاٹھی تلوار کھیلنے والے سب مسلمان ہوتے ہیں، جب ان لوگوں سے کہا جائے کہ اس کا کرنا شریعت میں منع اور حرام ہے۔تو یہ لوگ کہتے ہیں کہ یہ غیر قوموں کے لئے ایک ڈر کی وجہ سے ہے۔کیا جائز ہے؟

۳-غیر مسلم کی شیرینی کا حکم:

کیا ہندو کے نام کا شیرینی کھانا جائز ہے؟

۴-غیر مسلم کے تہوار میں شرکت:

۱-ہندو کے تہوار کو مسلمانوں اور ان کے بچوں کا منانا کیسا ہے؟

۲-ہندو کے تہوار میں مسلمانوں کو چندہ دینا کیسا ہے اور مسلمانوں کے بچے اور بڑوں کو ملا کر ہندو کے مت کو سجانا کیسا ہے، پوجا کے لئے گیت گانا اور پھول چڑھانا کیسا ہے؟

۳-ایک مسلمان کو یہ بتلا دیا گیا ہے کہ مسلمان کو بت کے نام کی شیرینی کھانا منع ہے اور حرام ہے، اس نے اس بات کو سننے کے بعد بھی اس شیرینی کو خود مولوی صاحب کے سامنے کھایا ہے، عندالشرع یہ کیسا ہے اور کہتا ہے کہ یہ کوئی بات نہیں ہے اور اپنے گھر والوں کو بھی حلال سمجھ کر کھلاتا ہے۔یہ کیسا ہے؟

۴-ٹھاکر کو پانی میں ڈالنے کے لئے ہندو کے ساتھ مسلمان کا لاٹھی کھیل کر ٹھاکر کو ڈوبانے جانا یہ رسم بارش برسانے کے لئے کی جاتی ہے یہ کیسا ہے کیا جائز ہے یا ناجائز؟

۵-ڈرامہ اور تھیٹر کا شرعی حکم:

۱-مسلمان ہوتے ہوئے ڈرامہ اور تھیٹر کرنے کو فخر سمجھنا اور جائز وحلال سمجھنا کیسا ہے؟

۲-ڈرامہ اور تھیٹر میں مسلمانوں کا شوق اور ذوق سے چندہ دینا اور ڈرامہ تھیٹر دیکھنا کیسا ہے کیا یہ جائز ہے؟

۳-مسلمان بچوں کا ڈرامہ تھیٹر کرنا کیسا ہے۔اور ہندوؤں جیسے نام رکھنا ہندوانہ بات ادا کرنا کیسا ہے؟

۶-حرام کو حلال سمجھنا:

۱-کیا شریعت کے ہر حرام کیے ہوئے کو حلال سمجھنے والا مسلمان ہوسکتا ہے؟

الجواب وباللہ التوفیق:

۱-ڈھول باجہ وغیرہ نہ بجاویں اور کسی اور ناشرع اور ناجائز امر کا ارتکاب نہ ہو تو جائز ہوگا ورنہ نہیں۔

۲-ان کا یہ کہنا صحیح نہیں ہے اور ان کا یہ مقصد ڈھول بجانے پر موقوف نہیں ہے بلکہ بغیر ڈھول کے بھی ہوسکتا ہے۔

۳-سے لیکر ۵-تک یہ سب ناجائز اور بڑا خطرناک گناہ ہے۔

۶-مولوی صاحب کے سامنے اس شیرینی کو کھانے سے اور اس کے اس کہنے سے (کہ اس کو کھانے سے کوئی بات نہیں ہے) حرام کا حلال کرنا اس طرح ہے کہ اس سے اس کا ایمان ختم ہوجائے اور اس کی بیوی اس کے نکاح سے نکل جائے لازم نہیں آتا ہے، اس لئے کہ ہوسکتا ہے کہ ان مولوی صاحب پر اس کو اعتقاد نہ ہو اور جس مولوی پر اس کو اعتقاد ہو اس نے مسئلہ غلط بتلایا ہو، البتہ یہ سب امور سخت جرأت اور بڑے گناہ کی باتیں ہیں، اس شخص کو ڈرنا چاہئے اور فوراً توبہ کرنی چاہئے اور ایسی چیزیں کھانے اور ایسی باتیں کہنے سے اجتناب کرنا ضروری ہے۔

۷-سے ۱۰-سب قطعاً ناجائز ہے۔

۱۱-اس کا جواب گزرچکا ہے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۶/۷/۸۵ھ

الجواب صحیح: محمود عفی عنہ، سید احمد علی سعید نائب مفتی دارالعلوم دیوبند

الکٹرانک انجینئر کا کام سیکھنا کیسا ہے؟

کیا الیکٹرانک انجینیئر کا کام سیکھنا جائز ہے، ٹیلی ویژن، ٹیپ ریکارڈ اور دوسری میوزیکل چیزوں کی مرمت اور ان کا بیچنا بھی جائز ہے؟

الجواب وباللہ التوفیق:

الیکٹرانک انجینئر کا کام سیکھنا جائز ہے، ٹیلیویژن، ٹیپ ریکارڈ اور دوسری صنعتوں کا بنانا اور مرمت کرنا جائز ہے، بشرطیکہ اس پر حرام کام مثلاً گانے بجانے کا ارتکاب نہ کرنا پڑے ورنہ حرام ہوگا، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲/۸/۱۴۱۱

الجواب صحیح: حبیب الرحمن خیرآبادی، محمد ظفیر الدین مفتاحی، کفیل الرحمن

مروجہ قرآن خوانی کا شرعی حکم:

قرآن خوانی جس میں چند لوگ جمع ہو کر کسی کے انتقال کرنے یا کسی کام کے آغاز مثلاً مکان، دکان، فیکٹری وغیرہ کے موقع پر کرتے ہیں جبکہ اس میں مندرجہ ذیل مفاسد ہیں:

۱- طلبہ کا وقت ضائع ہوتا ہے۔

۲- بعض مقامات پر یہ بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ پڑھنے والے رسماً جلدی الٹا سیدھا پڑھ کر چلے آتے ہیں، جس سے بجائے ثواب ہونے کے عذاب ہوتا ہے۔

۳- قرآن خوانی کے بعد کھانا، ناشتہ اور بعض مقامات پر پیسے بھی دیئے جاتے ہیں جو کہ اجرت علی الطاعت کے قبیل سے ہے۔

۴- سب کے یکجا پڑھنے میں قرآن کریم کی آیت "و إذا قرئ القرآن فاستمعوا له و انصتوا" الخ کی خلاف ورزی ہوتی ہے۔

۵- جب طلبہ قرآن خوانی کے لیے جاتے ہیں تو ان پر جملے کسے جاتے ہیں کہ یہ جا رہے ہیں کھانا کھانے والے، وغیرہ وغیرہ۔

محمد اسلام (شہر میرٹھ)

الجواب وباللہ التوفیق:

قرآن خوانی اکٹھا ہو کر جہراً کرنا مکروہ ہے لترک الانصات والاستماع الواجب خواہ مذکورہ خرابیوں میں سے کوئی خرابی نہ ہو، جب بھی مکروہ ہے، تو جس وقت مذکورہ خرابیوں میں سے کوئی خرابی منضم ہو جائے تو کراہت میں شدت ہو جاتی ہے اور اگر اس کے عوض میں کچھ لینا دینا یا کھانا پینا ہو تو ناجائز فعل کا بھی ارتکاب ہو کر "الآخذ والمعطی کلاهما آثمان" (۱) کا بھی مصداق ہو جائے گا، اور ثواب کا استحقاق سمجھنا بھی بڑی گستاخی عند الشرع شمار ہوگی (۲)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دار العلوم دیوبند سہارنپور ۲/ ۸/ ۱۴۱۱ھ
الجواب صحیح: حبیب الرحمن خیرآبادی، محمد ظفیر الدین مفتاحی، کفیل الرحمن

۱- رد المحتار ۵/ ۳۵۔

۲- (قرآن کریم پڑھ کر یا نفلی عبادت کے ذریعہ ایصال ثواب کرنا امر مستحسن ہے، مردوں ہی کو نہیں بلکہ زندوں کو بھی پہنچایا جا سکتا ہے۔" کما

مروجہ قرآن خوانی کا حکم:

ہمارے یہاں کسی کے انتقال کے بعد یعنی ہفتہ یا دس دن کے کائم مقرر یعنی جس دن اس کی طاقت ہو اس دن قرآن پڑھا کر مرحوم کے روح پر ثواب بخشا جاتا ہے، اس کے بعد جتنا اس کے پاس ہو سکے کچھ کھانے کو کھلاتا پلاتا ہے، اس کے بعد مجموعی طور پر ہاتھ اٹھا کر دعا کرتے ہیں، ایسا کرنا کھانا اور دعا کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب وباللہ التوفیق:

کسی کے انتقال کے بعد ہفتہ کے دن یا دسویں دن وغیرہ جیسا کہ فاتحہ کا رواج ہے بدعت ہے اس کا ثبوت شرع سے نہیں اور قرآن اجرت دیکر پڑھنا یا اس کے پڑھنے پر اجرت لینا ناجائز ہے، شامی (ج ۵) میں "کتاب الاجارہ" میں بھی یہ مسئلہ لکھا ہے اجرت لیکر یا دیکر پڑھنے پڑھانے سے ثواب نہیں، جب ثواب ہی نہ ملا تو بخشے گا کس چیز کو؟ بلکہ اس طریقہ سے "ولاتشتروا بآیاتی ثمناً قلیلاً" (۱)، کا گناہ ہوگا اس لئے ان غلط طریقوں کی اصلاح ضروری ہے قرآن خوانی کے وقت

صرح علمائنا في باب الحج عن الغير بأن للانسان أن يجعل ثواب عمله لغيره صلوٰة أو صوماً أو صدقة أو غيرها وهو مذهب أهل السنة وأيضا قال: وفي البحر من صام أو صلى أو تصدق وجعل ثوابه لغيره من الأموات والأحياء جاز ويصل ثوابها إليهم عند أهل السنة والجماعة كذا في البدائع" (فتاویٰ شامی ۵۰۱/۱۰۵ باب صلوٰۃ الجنائز)۔ چونکہ آج کل قرآن خوانی رسماً اور رواجاً ہوتی ہے جس کا تذکرہ صاحب رد المحتار نے بھی کیا ہے: "وأطال ذالک في المعراج وقال: هذه الأفعال كلها للسمعة والريا فيحترز عنها لأنهم لايريدون بها وجه الله تعالى" (فتاویٰ شامی ۶۰۳/۱ باب صلوٰۃ الجنائز)، لہٰذا اس طرح قرآن خوانی سے احتراز لازم ہے نیز قرآن خوانی کرانے والے حضرات یہ سمجھتے ہیں کہ یہ ایک رسم ہے جس کا ادا کرنا ضروری ہے اور بعض لوگوں کا مقصد قوم کی طعنہ زنی سے بچنا ہوتا ہے اس سے بڑھ کر تعدی یہ ہے کہ عام طور پر قرآن خواں حضرات تجوید قرأت کی رعایت تو درکنار بلکہ اتنی تیز رفتاری سے پڑھتے ہیں کہ بجائے ثواب کے الٹا عذاب ہوگا۔ اس مروجہ قرآن خوانی میں ایک خرابی یہ ہے کہ قرآن کریم پڑھے جانے کے بعد کھانا یا ناشتہ اور مٹھائی وغیرہ کھلائی جاتی ہے۔ بعض مقامات پر پیسے بھی دیے جاتے ہیں، اگر خدانخواستہ قرآن کریم پڑھنے والوں کے دلوں میں دعوت یا مٹھائی وغیرہ کی حرص وطمع پیدا ہوگئی تو یہ صورت شرعاً مذموم اور مہلک ہے الغرض اس طرح اجتماعی قرآن خوانی کی کراہت کے سلسلہ میں ذرہ برابر شک نہیں، اسی وجہ سے فتاویٰ ہندیہ میں اجتماعی قرآن خوانی کی کراہت مصرح ہے: "كما قال: ويكره للقوم أن يقرؤا القرآن جملة لتضمنها ترك الاستماع والانصات المأمور بهما" ۵/۳۵۱/۵ طحطاوی علی مراقی الفلاح، ۱۷۴"، لہٰذا بہتر یہ ہے کہ ہر شخص اپنے طور پر اس طرح پڑھے کہ ایک دوسرے کی قرأت میں مزاحمت نہ ہو یا پھر خود ہی صدقہ وغیرہ کے ذریعہ ثواب پہنچائے اور اپنے عزیز واقارب یا اساتذہ ومشائخ عظام کی خدمت میں ایصال ثواب کی درخواست کرے البتہ آج کل کے رسم ورواج کی طرح اکٹھا نہ کرے ہاں اگر اتفاقی طور پر کہیں لوگ جمع ہوں اور رواج محسوس نہ کریں تو ان سے گذارش کرلی جائے تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے (مرتب)۔

۱- سورۃ البقرۃ:۴۱۔

یا قرآن خوانی کے بعد کھلانا پلانا سب عوض بن جاتا ہے، ایصال ثواب کا سنت طریقہ یہی ہے کہ کچھ تلاوت کر کے یا کوئی ثواب کا کام کر کے بلاعوض کے یا فقیروں کو کچھ صدقہ کر کے یا کھلا پلا کر اس کا ثواب میت کو پہنچا دینا چاہئے اور یہ سب کام خموشی سے بلا کسی شہرت وغیرہ کی نیت کے محض اللہ کی رضا کے لئے کرے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دار العلوم دیوبند سہارنپور ۱۴۰۳/۱۲/۲ھ

آیات قرآنی لکھے ہوئے لباس پہن کر ناپاک جگہ جانا:

ایسا لباس پہن کر ناپاک جگہ اور پاخانہ وغیرہ میں جانا کیسا ہے جس میں کلمہ شہادت یا آیت قرآنی مرقوم ہو۔

الجواب وباللہ التوفیق:

جس کپڑے ولباس پر کلمہ شہادت یا آیات قرآنی لکھی ہوئی ہوں اس کو پہن کر ناپاک جگہ اور پاخانہ پیشاب خانہ وغیرہ میں جانا جائز نہیں سخت گناہ و بے ادبی ہے ''ویکرہ أن یدخل الخلاء ومعہ خاتم مکتوب علیہ اسم اللہ تعالی أو شئ من القرآن''(۱)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دار العلوم دیوبند سہارنپور ۱۴۰۱/۸/۲۳ھ

۱- کیا حضور ﷺ مختون پیدا ہوئے؟

حضور ﷺ کے مختون اور غیر مختون پیدا ہونے میں علماء کی کیا رائے ہے۔

۲- غیر عالم کا قرآن وحدیث کی تشریح کرنا:

کوئی غیر عالم غیر سند یافتہ کا سنی سنائی باتوں سے خود تقریر کے وقت قرآن واحادیث کے معانی وتفاسیر بیان کرنا اس کا کیا حکم ہے جبکہ حدیث میں یوں آیا ہے:

من قال فی القرآن بغیر علم فلیتبوأ مقعدہ من النار بینوا وتوجروا۔

۱- البحر الرائق ۱/۲۴۲۔

الجواب وباللہ التوفیق:

۱- اس باب میں علماء کی دو رائیں ہیں: بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ مختون پیدا ہوئے تھے اور یہی راجح ہے (۱)۔

۲- کسی مستند تفسیر کا مستند ترجمہ یا کسی مستند کتاب حدیث کا مستند ترجمہ پڑھ کر سنا دینے میں جب کہ اپنی طرف سے کوئی تشریح وغیرہ نہ کرے تو مضائقہ نہیں۔ باقی اس کی تشریح وتفسیر خود اپنی طرف سے آدمی کو کرنا منع و نادرست ہے اور بڑی سخت سخت وعیدوں کا مستحق ہے (۲)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دار العلوم دیوبند سہارنپور ۲۳/۸/۱۴۰۱ھ

بسم اللہ کی جگہ ۷۸۶ لکھنا:

بہت سے لوگ خطوط وغیرہ میں ۷۸۶ لکھتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ یہ بسم اللہ کا عدد ہے کیا یہ صحیح ہے؟ اور یہ کس نے ایجاد کیا ہے اور کیوں اور کیا اس میں بسم اللہ کی برکت حاصل ہوتی ہے؟

قاری ولی اللہ (مسجد النور ۴۷، مٹان پاڑہ، روڈ، بمبئی -۹)

الجواب وباللہ التوفیق:

لفظ جلالہ (اللہ) کے لام کو مکرر شمار کرلیا جائے اور رحمٰن کے الف کو نہ شمار کیا جائے تو تعداد ۷۸۶ ہوجاتی ہے، پس اس عدد سے یقیناً ذہن بسم اللہ کی جانب منتقل ہوسکتا ہے بلکہ اس عدد کو دیکھ کر یا سن کر بسم اللہ مکمل ذہن میں آجاتا ہے اور ہوسکتا ہے کہ کوئی زبان سے بھی کہہ دے تو یہ عدد اس مقصد سے لکھنے کی غرض یہ بھی ہوسکتی ہے کہ ہر خط کی عبارت کی ابتداء میں انتقال ذہنی بسم اللہ کی طرف ہوجائے اور بسم اللہ کا ادب بھی باقی رہے اس لئے بہت ممکن ہے کہ اس طریقہ کار سے بسم اللہ کہنے یا مستحضر فی الذہن کرنے کی جانب تلقین کی غرض سے یہ طریقہ چل پڑا ہو اور گرچہ یہ معلوم نہ ہو کہ یہ طریقہ کب سے جاری ہوا

۱- ''وروی أن آدم وشیثا ونوحا وھودا وصالحا ولوطا وشعیبا ویوسف وموسی وسلیمان وزکریا وعیسی وحنظلة بن صفوان نبی أصحاب الرس ومحمداً صلوات اللہ وسلامه علیھم ولدوا مختونین'' (مرقاۃ المفاتیح شرح مشکاۃ المصابیح ۷/۴)۔

۲- ''عن ابن عباسؓ قال: قال رسول اللہ ﷺ: من قال فی القرآن بغیر علم فلیتبوأ مقعدہ من النار'' (سنن الترمذی ۱۹۹/۵ کتاب تفسیر القرآن حدیث ۲۹۵۰، نیز دیکھئے: حدیث ۲۹۵۲)۔

کچھ مضر نہ ہوگا بلکہ استحسان باقی رہے گا اور بعینہ بسم اللہ پڑھنے کی برکت اگر چہ حاصل نہ ہولیکن ذریعہ ضرور بن سکتا ہے اور چونکہ ادب کو زیادہ مشتمل ہے، اس لئے مذموم کہنا بھی محل تأمل ہوگا (۱)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

ذکر لسانی افضل ہے یا ذکر قلبی؟

سلسلہ نقشبندی کے بزرگ سانس سے ذکر کراتے ہیں یعنی اندر سانس جائے تو اللہ اور سانس باہر نکلے تو ''ھو'' اور ''ھو'' کی چوٹ دل پر لگے اس ذکر میں گردن کو بھی حرکت دینی پڑتی ہے، دوسرے لفظوں میں اس کو پاس انفاس بھی کہتے ہیں شریعت کی رو سے جواب دیں کیا لسانی ذکر افضل ہے یا ذکر قلبی۔

الجواب وباللہ التوفیق:

مقصود اور مطلوب ذکر قلبی ہے باقی سب اس کے اسباب اور ذرائع ہیں، ذکر لسانی بھی اس کا ذریعہ ہے اور پاس انفاس (ذکر خیالی) یہ بھی اس کا ذریعہ ہے جس طرح سے ایمان بالقلب مقصود ہے کہ ایمان کی جگہ قلب ہے کما أشار اللہ تعالی بقولہ ''**ومن أکرہ وقلبہ مطمئن بالإیمان**'' (۲) قلب سے تصدیق کرنا ضروری ہے پھر دنیاوی احکام کے مرتب ہونے کے لئے مؤمن زبان سے اس کا اظہار کرتا ہے۔ ارشاد باری: ''**إن من شيء إلا یسبح بحمدہ ولکن لا تفقھون تسبیحھم....**'' (۳) کہ ہر چیز اپنے رب کا ذکر اور تسبیح کرتی ہے لیکن تم سمجھتے نہیں ہو، حیوانات، نباتات، جمادات تمام ذکر اور تسبیح کرتے ہیں، کوئی زبان سے کرتا ہے، کوئی دل سے کرتا ہے، کوئی سانس سے کرتا ہے اور کوئی کسی اور طرح سے کرتا ہے کسی کا رکوع تسبیح اور ذکر ہے کسی کا قیام تسبیح اور ذکر ہے اور سانس کے ساتھ جو ذکر ہوگا اس کو پاس انفاس کہتے ہیں اس سے بھی

۱- اس کا احتمال اسی وقت ہوگا جبکہ مابعد کی تحریر میں اور کہیں اللہ کا ذکر یا کسی آیت وحدیث کا ذکر نہ ہو، ورنہ پھر اس احتمال کی کوئی گنجائش نہیں، اس کا رواج دینا کراہت سے خالی نہ ہونا چاہئے۔

۲- ''**من کفر باللہ من بعد إیمانہ إلا من أکرہ وقلبہ مطمئن بالإیمان ولکن من شرح بالکفر صدراً فعلیھم غضب من اللہ ولھم عذاب عظیم**'' (سورۂ نحل: ۱۰۶)۔

۳- ''**تسبح لہ السموات السبع والأرض ومن فیھن وإن من شيء إلا یسبح بحمدہ ولکن لا تفقھون تسبیحھم إنہ کان حلیماً غفوراً**'' (سورہ اسراء: ۴۴)۔

ذکر قلبی حاصل ہوتا ہے جومقصود ہےاور مقصود کا ذریعہ بھی فی الجملہ مقصود ہوتا ہے گو اولاو بالذات نہ سہی، اس لئے اس کو نا جائز ملغو وغیرہ نہیں کہہ سکتے ہیں،غرض اس طرح سے فضیلت ہر طرح کے ذکروں میں ذکر لسانی میں بھی اور ذکر قلبی میں بھی اور پاس انفاس میں بھی پھر کسی وجہ سے جہر افضل ہوتا ہے اور کسی وجہ سے خفی افضل ہوتا ہے اور دلیل قول باری تعالی ہے جو مطلق ہے ''اذکروا الله ذکرا کثیرا''(۱) تو مطلق کے اندر دونوں آ گئے دونوں مامور ہیں۔فضائل خارجی مختلف ہوتے ہیں باعتبار ذکر اوروقت اور کیفیت اور ثمرات کے فتاوی رشیدیہ ص ۲۱۴ (۲)،مثلا اگر کسی کے دل میں یہ داعیہ پیدا ہوجائے کہ میرے ذکر کرنے سے لوگ مجھے متقی اور عابد وزاہد کہیں گے اس کے لئے سرا ذکر افضل ہے اگر کسی کا دل سرا ذکر سے اتنا لطف اندوز نہیں ہوتا ہے جتنا کہ جہرا سے ہوتا ہے اور ریا کا شائبہ تک بھی نہیں تو ایسے شخص کے لئے جہرا ذکر افضل ہے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی،مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱/۲۰/ ۱۴۰۲ھ

ذکر کا ایک خاص طریقہ اور اس کا حکم:

بعض صوفیاء ومشائخ حلقہ کراتے ہیں جس کا طریقہ یہ ہے کہ ذاکرین شیخ کے قریب حلقہ بنا کر بیٹھ جاتے ہیں، پھر شیخ ذکر ''لا إله إلا الله'' اس کے ساتھ ساتھ سب ذاکرین ایک آواز سے ذکر کرتے ہیں، گاہ بگاہ وہ شیخ اس پر توجہ ڈالتا ہے جس کی وجہ سے ان کے اوپر ایک خاص حالت وکیفیت طاری ہوتی ہے، کیا اس طریقہ پر ذکر کرنا اور کرانا ثابت ہے، اگر سلف سے ثابت نہیں تو اس صورت میں ایسا کرنا مفید اور جائز ہے یا نہیں؟

الجواب وبالله التوفيق:

اور اشغال واذکار کی طرح یہ بھی ایک طریقہ ذکر وعلاج ہے، اس سے بھی ایسی کیفیت پیدا ہوسکتی ہے، جس کے ذریعہ سے باری تعالی عز اسمہ کی محبت مطلوبہ کی تحصیل آسان ہو، ذکر منفردا ومجتمعا خواہ سرا یا جہرا، اور توجہ کا القاء ثابت وجائز ہے، اس لئے اس کا مجموعہ بھی جائز ثابت ہونے میں کلام نہ ہوگا، البتہ اس کو واجب یا سنت کہنا یا قرار دینا یا اسی میں حصر کرنا درست نہ ہوگا۔

۱- ''یا أیها الذین آمنوا اذکروا الله ذکراً کثیراً'' (سورہ احزاب: ۴۱)۔

۲- جواب: سانس کی آمدورفت کا اور ذکر لسانی کا ثواب جودریافت کیا ہے تو بعض وجوہ سے تو ذکر لسانی افضل ہے اور بعض سے پاس انفاس (فتاوی رشیدیہ بضمن تالیفات رشیدیہ/ ۲۰۲)۔

پس اگر شیخ کامل جو مکائد نفس سے اور طریق اصلاح سے واقف ہو، اور اس کی محبت مطلوبہ کی تحصیل کے لئے یہ طریقہ استعمال کرے تو کوئی وجہ اعتراض نہیں۔ رہ گیا ذکر منفرداً ومجتمعاً والقاء توجہ کا ثبوت تو اس کے لئے مندرجہ ذیل روایات بھی کافی ہیں:

۱- ''عن أبی هريرة وأبی سعيد قالا: قال رسول الله ﷺ: لا يقعد قوم يذكرون الله إلا حفتهم الملٰئكة وغشيتهم الرحمة ونزلت عليهم السكينة، وذكرهم الله فيمن عنده'' رواہ مسلم (۱)۔

۲- ''وعنه في حديث طويل قالوا المفردون يا رسول الله؟ قال الذاكرون الله كثيرا والذاكرات'' (رواہ مسلم)(۲)۔

۳- ''عن أنس قال: قال رسول الله ﷺ: إذا مررتم برياض الجنة فارتعوا، قالوا: وما رياض الجنة؟ قال: حلق الذكر'' (رواہ الترمذی)(۳)۔

۴- ''عن جابر قال قال رسول الله ﷺ: أفضل الذكر لا إله إلا الله وأفضل الدعاء الحمد لله'' (رواہ الترمذی)(۴)۔

اسی کے ساتھ حضرت جریر بن عبداللہ (رضی اللہ عنہ) کی روایت بھی ملا لیجئے جس کو مشکوۃ صفحہ ۵۴۳ بروایت بخاری ومسلم کے نقل کیا ہے کہ یہ گھوڑے کی سواری پر قادر نہ تھے، اگر جاتے تھے حضور ﷺ ان کے سینہ پر اپنے دست مبارک سے مارا اور سوار کر لیا اس کے بعد سے کبھی گھوڑے سے نہ گرتے تھے، اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کا بھی واقعہ یاد کر لیجئے جس کو وہ خود نقل فرماتے ہیں: ''فبسطت نمرة ليس عليّ ثوب غيرها حتى قضى النبي ﷺ مقالته ثم جمعتها إلى صدري فو الذي بعثه بالحق ما نسيت من مقالته ذلك إلى يومي هذا'' (۵)، اور اس کے ساتھ حضرت عمرؓ کا واقعہ ملا لیجئے جس کو حدیث ''لا يؤمن أحدكم حتى أكون أحب إليه من نفسه وماله ووالده وولده، أو كمال قال'' کے تحت محدثین نقل فرماتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ! مال واولاد وغیرہ سے تو زیادہ محبت آپ

۱- مشکوۃ شریف ۱۹۲۶/۔
۲- مشکوۃ شریف۔
۳- مشکوۃ صفحہ ۱۹۔
۴- مشکوۃ صفحہ ۲۰۱۔
۵- بخاری ومسلم، مشکوۃ ۵۳۵/۔

کی دیکھتا ہوں لیکن اپنی جان سے زیادہ نہیں دیکھتا تو آپ نے حضرت عمرؓ کو سینہ پر دست مبارک سے ٹھونکا، اس کے بعد حضرت عمرؓ نے عرض کیا کہ "الآن یا رسول اللہ" یعنی ہاں اب یا رسول اللہ آپ کی محبت اپنی جان سے بھی زیادہ پانے لگا، اس روایت کو اشعۃ اللمعات نے بھی نقل کیا ہے، یہ سب توجہ نہیں تو اور کیا ہے، علماء نے توجہ باطنی کی بہت سے طرق تفصیل سے نقل فرمائے ہیں ان کو مطالعہ فرمایئے امید کہ خلجان رفع ہو جائے گا، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیو بند سہارنپور ۹/ ۲/ ۹۱ ۱۳ ھ

مجدد کی تعریف اور اس کی آمد کی مدت:

بکر کا کہنا ہے کہ مجدد الف ثانی شیخ احمد فاروقی نقشبندی سرہندی رحمۃ اللہ علیہ ایسے مجدد ہیں کہ ایسا مجدد ایک ہزار سال ہی میں ایک پیدا ہوتا ہے۔

عمر کہتا ہے کہ ایسا نہیں ہے بلکہ ہر سو سال بعد ایسا مجدد پیدا ہوتا ہے ایک ہزار کی کوئی قید نہیں بکر کا قول صحیح ہے یا عمر کا مفصل ثبوت کیساتھ تحریر فرمائیں۔

سعید احمد (بڑی مسجد، جالوپورہ جے پور راجستھان)

الجواب وبالله التوفيق:

"إن الله يبعث لهذه الأمة على رأس كل مائة سنة من يجدد لها أمر دينها أو كما قال عليه الصلاة والسلام"(۱) اور جلال الدین سیوطی مرقاۃ الصعود میں فرماتے ہیں:

"قال ابن الأثير إختلف العلماء في تاويل هذا الحديث كل واحد في زمانه وأشاروا إلى قائم الذى يجدد للناس دينهم على رأس كل مائة سنة كان كل قائم قد مال إلى مذهبه وذهب بعض العلماء إلى ان الأولى أن يحمل الحديث على وجه العموم فان قوله ﷺ من يجدد لها دينها لا يلزم منه أن يكون المبعوث على راس المائة أى واحد بل قد يكون واحد وقد يكون أكثر"(۲)۔

۱- سنن ابوداؤد ۴/ ۱۰۹ کتاب الملاحم باب ما یذکر فی قرن المائۃ حدیث ۴۲۹۱ عن ابی ہریرۃؓ۔
۲- فتاوی مولانا عبدالحی / ۱۰۶۔

ان اقوال پرغور کرنے سے پہلے مجدد کی تعریف معلوم ہونی چاہیے۔ جو شخص دین کے جن جن شعبوں کے اندر ضعف آرہا ہو اس کو دائمی طور پر دور کردے اور تقویت پہنچادے اور مردہ سنت کو زندہ کردے اور پامال شدہ احکام کی تجدید کرکے نئی روح پھونک دے مجدد کہلاتا ہے۔

کبھی ایک صدی میں ایک ہی مجدد ہوتا ہے، جیسے پہلی صدی میں عمر بن عبدالعزیز مجدد کہلائے انھوں نے تدوین حدیث کرکے دین کی حفاظت فرمائی اور کبھی ایک سے زیادہ بھی ہوتے ہیں جیسے امام ابوحنیفہؒ، امام مالک، امام شافعی، امام احمد بن حنبل، امام بخاری، امام مسلم، امام ترمذی وغیرہ وغیرہ سب اپنے زمانے کے مجدد کہلائے ان سب نے دین کا تحفظ کیا اور دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ الگ کردیا۔ کیونکہ اللہ تبارک وتعالی کو قیامت تک دین کو باقی اور قائم رکھنا ہے اس لئے جب احکام پامال ہونے لگتے ہیں اور بدعات کا اظہار ہونے لگتا ہے اور اس پر سو سال گزرنے نہیں پاتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ایک شخص کو پیدا کرتے ہیں جو تجدید دین وسنت کرتا ہے یہ ایک بھی ہوسکتا ہے اور کئی بھی ہوسکتے ہیں۔ بدعت کے مختلف شعبوں کو ختم کرنے کے لئے ہر ایک الگ بھی مامور کیا جاتا ہے جس طرح بنی اسرائیل میں کئی نبی ہوتے تھے اور ہر ایک الگ الگ خطے کے لئے مامور ہوتا تھا۔

مجدد الف ثانی اس الف ثانی سے جو مشہور ہوئے اس کی وجہ یہ ہے کہ ۱۰۰۰ ہجری کے اندر دین کے جن جن شعبوں میں ضعف دیکھا سب کی تجدید کی اور سنت مردہ کو زندہ کیا اور لوگوں میں مجدد الف ثانی کے نام سے مشہور ہوگئے۔ لیکن ایسا بالکل نہیں ہے کہ ایک ہزار سال کے اندر فقط یہی ایک مجدد آئے بلکہ ہر صدی میں اس صدی کی خرابی کو دور کرنے کے لئے مجدد آتا ہے چاہے ایک ہو یا کئی ایک ہوں۔

بکر اور عمر دونوں میں فقط نزاع لفظی ہے بعض مقدمات کے ذہول کر جانے سے یہ اختلاف رونما ہوا ہے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۰/۳/۲ ۱۴۰ھ

کیا پنچایت کا فیصلہ قضاء قاضی کے قائم مقام ہے؟

میرے سامنے علماء کرام کی یہ عبارتیں ہیں اور ان کے متعلق آپ کا جواب مطلوب ہے

الحيلة الناجزة مولانا اشرف علی تھانویؒ المطبوعة كتب خانه امداديه ديوبند صفحه

۲۲۸۔ ۲۲۹۔ ۲۳۶ الاستفتاء بالمرة الخامسة الخامس وإن كانت القوة والشوكة شرطا للقاضي فهل تشترط القوة والشوكة لتلك الجماعة التي رفع الأمر إليهم فإن قيل بصحة حكمها ونفاذه بدون القوة فما الفرق بين القاضي وتلك الجماعة بينوا بالدليل(۱)۔

الجواب من الشيخ عبد الله الفوتي المدرس بالحرم النبوي الخامس فإن كانت القوة والشوكة (إلى قوله) بينوا الدليل. فجوابه ما اطلعنا على نصوصهم في كتب المذهب التي بأيدينا أن القوة والشوكة من شروط الجماعة، وأما الفرق بين القاضي والجماعة فبين وذلک ان القاضي وعمله جزء من أجزاء عمل وظيفة الإمام وعدم الإمام شرط لوجود الجماعة لأنهم قالوا إذا فقد الحاکم أن جماعة العدول تقوم مقامه (۲)۔

حنفیہ کےنزدیک پنچایت کافیصلہ قضائے قاضی کے قائم مقام نہیں ہوسکتا،لیکن اگر یہ پنچائتیں اپنے فیصلے نافذ کرنے کا اقتدار رکھتی ہوں اور ان کے اختیارات سماعت محض ثالثانہ نہیں بلکہ حاکمانہ نوعیت کے ہوں تو مذہب حنفی کے مطابق بھی ان کے فیصلے قضائے شرعی کے حکم میں ہوں گے۔

معلوم یہ ہوا کہ مالکی اور حنفی دونوں کے نزدیک قوت وشوکت اور حاکمانہ نوعیت شرعی پنچایت کے قیام کے لئے ضروری ہے، ہندوستان کے موجودہ حالات میں اس کی عملی صورت کیا ہوگی؟

خادم فضیل الرحمٰن مفتی مالیرکوٹلہ مورخہ ۴؍جمادی الاول ۱۴۰۲ھ،مطابق یکم مارچ ۱۹۸۲ء

الجواب وبالله التوفيق:

خط کشیدہ عبارت تو واضح نہیں ہے اسلئے اس کے بارے میں تو کچھ نہیں کہا جا سکتا البتہ اتنا عرض ہے کہ شرعی پنچایت کے قیام کے لئے تو حاکمانہ نوعیت ضروری نہیں ہے۔البتہ اس کے فیصلہ کو قاضی کے فیصلہ کی حیثیت دینے کے لئے اور نفوذ فیصلہ کی قوت قہر یہ حاصل ہونے کے لئے یہ صورت ہوسکتی ہے کہ حکومت وقت اسے وہی حیثیت دیدے جو کبھی آنریری مجسٹریٹوں کو حاصل ہوتی تھی، اور اگر یہ نہ ہوسکے تو حکومت وقت سے اس کے فیصلہ کے نفاذ کے لئے وہی قوت حاصل ہو جو

۱- الحیلۃ الناجزۃ مطبوعہ مکتبہ رضی دیوبند، ۱۵۷۔
۲- الحیلۃ الناجزۃ مطبوعہ مکتبہ رضی دیوبند، ۱۶۲۔

حکومت کے عدالت مجاز کو حاصل ہوتی ہے۔

اور اگر یہ بھی نہ ہو سکے تو کم از کم اتنی قوت حاصل ہو کہ عدالت مجاز اس کے فیصلہ کو تسلیم کر لے اور اس کو خلاف قانون قرار نہ دے اور نہ اس کے کاروائی وفیصلہ میں مانع وحائل ہو بلکہ اس کے ساتھ تعاون کرے اور اس کے فیصلہ کے نفاذ میں مدد کرے تو چونکہ تقلد قضاء من الکفار بھی درست ہے جیسا کہ شامی ج ۴ کتاب القضاء میں مذکور ہے (۱)۔

اور اگر یہ قوت بھی حکومت وقت سے حاصل نہ ہو تو شرعی کمیٹی کے فیصلہ کو فیصلہ قضاء کی طرح ملزم نہیں کہہ سکیں گے، بلکہ اس کی حیثیت محض تحکیم وحکم کی ہو جس کا حکم یہ ہے کہ فیصلہ کرنے سے قبل اگر فریقین میں سے کوئی فریق اس تحکیم کو ختم کردے اور توڑ دے تو یہ تحکیم ختم ہو جائے گی اور اس کا یہ فیصلہ لازم ولا گو نہ ہوگا۔ ہاں اگر فیصلہ کرنے سے قبل کسی فریق نے تحکیم کو ختم نہیں کیا تو یہ فیصلہ ہو جانے کے بعد یہ فیصلہ بھی مثل فیصلہ قضاء کے ملزم ولا گو اور لازم العمل تضاء بھی ہو جائے گا۔ جیسا کہ شامی ج ۴ میں باب التحکیم کے اندر اس کی تصریح موجود ہے (۲)، خلاصہ یہ ہے کہ شرعی کمیٹی کو کوشش کر کے حکومت وقت سے اس کمیٹی کو تسلیم ومنظور کرا لینا چاہیے اور ان فیصلوں کی وہی حیثیت حاصل کرا لینا چاہیے جو عدالت مجاز کے فیصلوں کی ہوتی ہے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۴۰۲/۵/۱۸ھ

۱-مسنون ٹوپی؟

ٹوپی کیسی مسنون ہے دیوبندی مروج ٹوپی کا پہننا کیسا ہے۔

۲-مسنون کرتا:

مرد کے لئے کیسا کرتا پہننا مسنون ہے، لمبا کتنا ہونا چاہیے کس انداز کا سلا ہوا ہونا چاہیے۔

۳-بنیان کا حکم:

بنیان کا پہننا مسنون ہے یا نہیں؟

۱- ”ویجوز تقلد القضاء من السلطان العادل والجائر ولو کافراً“ (الدر المختار مع رد المحتار ۸/ ۴۳)۔

۲- ”وینفرد أحدهما بنقضه أی التحکیم بعد وقوعه ..... فإن حکم لزمهما ولا یبطل حکمه بعزلهما لصدوره عن ولایة شرعیة“ (الدر المختار مع رد المحتار ۸/ ۱۲۷)۔

۴-مرد کو کیسا پائجامہ پہننا چاہئے؟

مرد کو کیسا پائجامہ پہننا چاہیے آج کل تین چار قسم کے پائجامے رائج ہیں ا۔علیگڑھی ۲۔شلوار ۳۔پینٹ نما، ۴۔ چوڑی موہری والا۔

۵-پینٹ اور بیل باٹم کا حکم:

پینٹ اور بیل باٹم کا پہننا کیسا ہے؟

۶-نیکر پہننا کیسا ہے؟

پائجامہ یا تہبند کے نیچے نیکر کا پہننا کیسا ہے۔

۷-عورتوں کے لئے مسنون لباس:

عورتوں کے لئے سر سے لے کر پیر تک پورے مسنون لباس کی وضاحت فرما دیا جائے۔

۸-رولڈ گولڈ لوہا اور چاندی کا بٹن:

رولڈ گولڈ لوہا اور چاندی کے بٹن کا کیا حکم ہے؟

عبدالقدوس، جمشید پوری

الجواب وبالله التوفیق:

مسئلہ یہ ہے کہ ہر کپڑا جس کا پہننا جائز ہو جیسے عورتوں کے لئے ریشمی وغیر ریشمی ہر دو پہننا جائز ہے اور مردوں کے لئے محض غیر ریشمی پہننا جائز ہے اور ٹخنوں سے اوپر تک رکھنے کا حکم ہے، غرض جس کپڑے کا پہننا جائز ہو، اس کا ہر ایسا لباس جو پوری طرح ساتر ہو اور ذرا ڈھیلا ڈھالا ہو اور اس کو پہن کر نماز پڑھنے میں دشواری نہ ہوتی ہو اور وہ کسی غیر مسلم قوم کا مذہبی شعار نہ ہو تو ایسے لباس کے نفس اباحت میں کلام نہیں، البتہ جس ملک کے علماء اور مشائخ کا جو پسندیدہ لباس ہوگا اس کا اس ملک میں حد شرع کے اندر پہننا مستحسن ہوگا۔ اور جو لباس وغیرہ پہننا حضور ﷺ یا خیر القرون سے منقول ہے یا جس کی تعریف حسن منقول ہے، ان لباسوں کو اتباع کی نیت وجذبہ سے پہننا سب سے افضل ہوگا باقی چونکہ یہ چیزیں سنن ہدی کے طریق سے منقول نہیں ہیں اس لئے ان کے محض ترک سے معصیت یا کراہیت کا حکم نہ ہوگا اور ان منقول لباسوں کو مسنون بہ غیر ہدی کی فضیلت کا حکم ہوگا یہ مسئلہ فقہ کی کتابوں کا خلاصہ ہے۔ مثلاً بدائع الصنائع ورد المحتار وغیرہ (۱) اور تحقیقی مسئلہ ہے اس کے بعد

۱- تفصیل کے لئے دیکھئے: بدائع الصنائع ۳۱۲/۴ کتاب الاستحسان، ورد المحتار علی الدر المختار ۵۰۵/۹ کتاب الحظر والإباحۃ۔

ہر سوال کا نمبر وار جواب معروض ہے۔

۱-ٹوپی سلف سے گول منقول ہے بعض سر سے لگی ہوئی اور بعض سر سے کچھ اوپر نکلی ہوئی باقی ہر ٹوپی کا پہننا جائز ہے، اور انہی قیود سے جو اوپر منقول ہوئیں دیوبندی مروج ٹوپی سے اگر مراد وہ ٹوپی ہے جس میں کچھ دیواری ہوتی ہے تو یہ طرز خیر القرون سے منقول نہیں ملتا باقی نفس اباحت میں کلام نہیں۔

۲-نصف ساق تک پہننا مستحسن وافضل ہے خواہ کلی دار ہو یا بغیر کلی کا ہو اور نفس جواز ہر ایک میں ہے (۱)۔

۳- خیر القرون سے ایسی بنیان کا ثبوت منقول نہیں باقی نفس جواز واباحت میں کلام نہیں، کیونکہ یہ چیز کسی غیر مسلم قوم کا مذہبی شعار نہیں۔

۴-پائجامہ چاہے جس قسم کا پہنے صرف ٹخنوں سے نیچا نہ ہو تو جواز میں کلام نہیں استحسان شلوار میں ہے (۲)۔

۵- مذکورہ بالا تحقیق کے مطابق نفس جواز میں کلام نہیں باقی اس خطہ میں غیر مستحسن کہا جائے گا کیونکہ یہاں کے صلحاء واتقیاء ومشائخ میں رائج نہیں۔

۶-جائز ہے۔

۷-عورتوں کے لئے چہرہ اور دونوں ہاتھ کلائی کے بعد سے اور دونوں پیر ٹخنوں کے نیچے سے چھوڑ کر سب ستر ہے اور اجنبی ہر مرد سے اس کے چھپانے کا حکم ہے (۳) باقی محرم وغیر محرم سے چھپانے کی تفصیل اور نماز میں چھپانے اور نہ چھپانے کی تفصیل کی گنجائش استفتاء میں نہیں اس کے لئے فقہ کی کتابیں دیکھئے کم از کم بہشتی زیور کا غائر نظر سے مطالعہ کیجئے۔

۸-بٹن چاندی کے تار سے کپڑے میں بنا ہوا ہو اس کا استعمال تو بلا اختلاف جائز (۴)، اور اس کے علاوہ کا بٹن

۱- ’’عن عوف بن أبي جحيفة عن أبيه قال رأيت النبي ﷺ وعليه حلة حمراء كأني أنظر إلى بريق ساقيه قال سفيان أراها حبرة‘‘ (شمائل ترمذی مع شرح خصائل نبوی/۹۹)۔

۲- ’’عن الأشعث بن سليم قال سمعت عمتي تحدث عن عمها قال بينما أنا أمشي بالمدينة إذا إنسان خلفي يقول: ارفع إزارك فإنه أتقى وأبقى، فالتفت فإذا هو رسول الله ﷺ فقلت يا رسول الله إنما هي بردة ملحاء قال: أما لك في أسوة فنظرت فإذا إزاره إلى نصف ساقيه‘‘ (شمائل ترمذی مع شرح خصائل نبوی/ ۱۰۸، ناشر کتب خانہ نعیمیہ دیوبند ۲۰۰۳ء) ’’وعن حذيفة بن اليمان قال أخذ رسول الله ﷺ بعضلة ساقي أو ساقه في الكعبين فقال هذا موضع الإزار فإن أبيت فأسفل فإن أبيت فلا حق للإزار في الكعبين‘‘ (شمائل ترمذی مع خصائل نبوی ص ۱۰۷، کتب خانہ نعیمیہ دیوبند)۔

۳- ’’وللحرة ولو خنثى جميع بدنها حتى شعرها النازل في الأصح خلا الوجه والكفين، فظهر الكف عورة على المذهب والقدمين على المعتمد وصوتها على الراجح‘‘ (الدر المختار مع رد المحتار ۲/ ۷۷)۔

۴- ’’ولا بأس بعروة القميص وزره من الحرير، لأنه تبع، وفي التاتارخانيه عن السير الكبير لا بأس بأزرار الديباج

کپڑے سے الگ رہ کر بھی اپنا مستقل وجود رکھتے ہوں وہ حلیہ کے حکم میں ہے اور ممنوع ہے صرف بعض علماء نے گنجائش دی ہے، اسی طرح رولڈ گولڈ کے بٹن کے استعمال کا اکثر علماء جواز فرماتے ہیں اور بعض محققین منع فرماتے ہیں۔

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی مفتی دار العلوم دیوبند سہارنپور ۲/۶/۲۹ ۱۴۰۲ھ

مرد وعورت کا لباس:

۱-لڑکی اپنے شوہر کے ساتھ خلوت میں پینٹ پہنے تو کیا یہ جائز ہے؟ پینٹ کئی قسم کی ہو سکتی ہے جیسے کہ پینٹ میں بناوٹ زنانہ ہو یا مردانہ یا نہ زنانہ ہے اور نہ ہی مردانہ چینن ہزف بیل باٹم، نائٹ، بیرل، ایسا پینٹ جو کہ لڑکی کے نام کا ہو اور شوہر اسے نہیں پہنتا ہو ایسا پینٹ جسے اس لڑکی کا شوہر بھی پہنتا ہو۔

۲-آج کل مرد شلوار پہنتے ہیں اور عورتیں بھی اس طرح چوڑی دار پائجامہ پہنتی ہیں بظاہر مردانہ اور زنانہ طرز میں کوئی فرق نہیں ہوتا کیا چوڑی دار پائجامہ اور شلوار مرد پہن سکتے ہیں اور عورتیں بھی۔

۳-بہت سے بیرونی ممالک میں عورتیں پینٹ پہنتی ہیں یا پری اسکرٹ وہاں کوئی اور لباس کا رواج نہیں ہے کیا وہاں مسلم یا نو مسلم عورتیں پینٹ پہن سکتی ہیں۔

۴-ایک ہی لباس جیسے کرتا، پائجامہ شلوار وغیرہ اگر مردانہ اور زنانہ بھی ہوں تو دونوں میں کیا فرق ہونا چاہئے؟

ایم، ایم (مکان ۸-۲۱۳ ۱۲ حیدرآباد ایم، پی)

الجواب وبالله التوفيق:

پینٹ خواہ کسی قسم کا ہو اور زنانی بناوٹ کا ہو یا کسی اور بناوٹ کا ہو یہ اسلامی لباس یا اسلامی معاشرہ کا لباس نہیں ہے پس جس ملک میں جہاں کا قومی عام لباس بھی نہیں اس ملک میں زنانی بناوٹ کا یہ لباس پہننا مکروہ ہوگا باقی محض شوہر کے ساتھ خلوت میں تو عورت کا ننگا ہونا بھی درست ہے تو یہ لباس جبکہ شوہر کے سوا کوئی اور نہ دیکھے اور کوئی نہ ہو اس کے پہن لینے کی ممانعت کا حکم نہ ہوگا۔

البتہ اگر شوہر اس کے لئے اس لباس کو پسند نہ کرے تو ہرگز پہن لینے کی اجازت نہ ہوگی، اسی طرح ہر ملک میں جو

والملعب'' (الدر المختار مع رد المحتار ۹/۵۱۱، یعنی کپڑے سے منسلک اور اس کے تابع ہونے کی وجہ سے جائز ہے)۔

لباس عام طور سے شائع ضائع ہواور اس میں جو غیروں کا مذہبی شعار کے طور پر استعمال نہ ہوتا ہو، ان لباسوں میں جو مردانہ طرز کے شمار ہوں ان کا عورتوں کو پہننا مکروہ وممنوع اور جوزنانہ طرز کے شمار ہیں ان کا مردوں کو استعمال کرنا مکروہ اور ممنوع ہوگا۔

"لعن الله المتشبهين بالنساء و المتشبهات بالرجال "(۱)۔

اور ہدایت نبوی کے مطابق احتیاط کرنا لازم وضروری رہے گا۔

اسی ضابطہ کلیہ پر مردانہ وزنانہ شلوار اور چوڑی دار وغیر چوڑی دار پائجامہ وکرتہ وغیرہ تمام لباسوں کا ان کی کٹنگ وساخت کے فرق کو سمجھ کر استعمال کرنیکا حکم بآسانی معلوم ہوجائے گا۔ اسی طرح بیرونی ممالک کے لباسوں میں عورتوں اور مردوں کے لباس کا فرق معلوم کر کے حکم بآسانی معلوم ہوجائے گا ،معلوم کرلیا جائے ، البتہ یہ کلیہ بھی ہر وقت پیش نظر رہنا چاہئے کہ ہر ملک میں وہاں کے علماء وصلحاء ومشائخ کا جولباس ستر پوش ہواور ستر پوشی میں ایسا ہوجس سے پہننے میں جسم کی ہیئت وساخت نمایاں نہ ہوتی ہو بلکہ ڈھیلا ڈھالا ہو اس کا استعمال عند اللہ وعند الرسول وعند الشرع مستحسن ومحمود ہوگا اور جولباس شرعاً اور عند الرسول علیہ السلام محمود ومستحسن ہوگا اس میں شوہر کی مخالفت وممانعت موثر نہ ہوگی، البتہ عورت پر لازم رہے گا کہ وہ شوہر کو سمجھا بجھا کر مخالفت کرنے سے باز رکھے اور اگر لباس چست ہو کہ اعضاء مستورہ کی ہیئت وساخت نمایاں ہو یا ڈھیلا ہو مگر اتنا باریک ہو کہ مستور اعضاء جھلکیں یا نظر آئیں تو حدیث پاک (۲) کے حکم کے مطابق بالخصوص عورتوں کو بوڑھی ہوں یا جوان ہوں پہننا قطعاً ناجائز وحرام ہے خواہ کسی ملک میں ہو ہر جگہ کا یہی حکم ہے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دار العلوم دیوبند سہارنپور ۱۶/ ۷/ ۱۴۰۴ھ

کن رنگوں کے کپڑے مردوں کو پہننا ممنوع ہیں؟

وہ کون سے رنگین کپڑے ہیں کہ جو مردوں کو پہننا جائز ہیں؟

الجواب وباللہ التوفیق:

احمر قانی (گاڑھا سرخ) شوخ گلابی، کسم کا رنگ، زعفران اور جو رنگ زنانے شمار ہوتے ہیں، ان رنگوں کے

۱- بخاری ۲/ ۸۷۴، کتاب اللباس۔

۲- "فرب کاسیۃ فی الدنیا عاریۃ فی الآخرۃ" (بخاری ۱/ ۲۲، کتاب العلم)۔

کپڑے کا استعمال مردوں کو درست نہیں (۱)۔فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دار العلوم دیوبند سہارنپور ۲۲/ ۷/ ۹۱ ۱۳ھ

الجواب صحیح: محمود غفرلہ

جبہ کا ٹخنہ سے نیچے ہونا کیسا ہے؟

امام صاحب جمعہ کا خطبہ اتنا لمبا جبہ پہن کر دیتے ہیں کہ وہ ٹخنوں سے نیچا ہوتا ہے۔ نیز سر پر رومال رکھ کر ڈوری باندھ دیتے ہیں۔ بعض مقتدی کہتے ہیں کہ نماز مکروہ ہوتی ہے، کیونکہ ٹخنوں کے نیچے کپڑا پہننا حرام ہے اور ماتھے پر رومال رکھنا نماز کی حالت میں مکروہ ہے، امام صاحب کہتے ہیں کہ کوئی کراہت نہیں ہے۔

الجواب وباللہ التوفیق:

نماز جمعہ کے لئے جبہ پہن کر نماز پڑھانے میں کوئی حرج نہیں، البتہ جبہ ٹخنوں سے نیچا رکھنا جائز نہیں ہے، اس کا لحاظ رکھنا ضروری ہے، جب رومال سر پر ڈال کر اوپر سے ڈوری اس طرح باندھ لیتے ہیں تو ڈوری سے تو سدل کی کراہت سے نکل جاتے ہیں۔ وجہ کراہت یا ممانعت باقی نہیں رہتی۔فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دار العلوم دیوبند سہارنپور

کرتہ کا نصف ساق ہونا:

کرتہ میں نصف ساق کی شرعی حیثیت کیا ہے آیا سنت ہے یا مستحب یا مستحسن؟ جو بھی ہو واضح دلائل کے ساتھ تشفی بخش جواب سے نوازیں۔ عموماً قمیص دو طرح کی ہوتی ہیں، ایک شگاف بند (گول) دوسری شگاف والی بعض علماء کی رائے یہ

۱- "وكره لبس المعصفر والمزعفر والأحمر والأصفر للرجال مفاده أن لايكره للنساء ولا بأس بسائر الألوان، وفي المجتبى والقهستاني وشرح النقاية لأبي المكارم لابأس بلبس الثوب الأحمر "ومفاده أن الكراهة تنزيهية، لكن صرح في التحفة بالحرمة فأفاد أنها تحريمية، وهي المحمل عند الإطلاق قاله المصنف، قلت: وللشرنبلالي فيه رسالة نقل فيها ثمانية أقوال منها: أنه مستحب ولكن جل الكتب على الكراهة كالسراج المحيط والاختيار والمنتقى والذخيرة وغيرها۔ وبه أفتى العلامة القاسم" (فتاوی شامی، ۲۲۸ ج ۵ کتاب الحظر والاباحۃ)(مرتب)۔

ہے کہ قمیص میں سنت تب ہی ادا ہوگی جب وہ نصف ساق شگاف بند ہو، بعض لوگ شگاف بند اور بغیر شگاف قمیص کے مابین کافی فرق کرتے ہیں، یہ فرق کرنا اور کسی ایک پر اصرار کرنا کیسا ہے وعلیٰ ہذا القیاس گول ٹوپی لمبی ٹوپی اور دیوبندی ٹوپی میں فرق کرنے والا آدمی بھی مل رہا ہے، بعض آدمی گول ٹوپی ہی افضل کہتے ہیں اور بعض لوگ دیوبندی ٹوپی میں ہندوؤں کی مشابہت بتا کر اس پر اعتراض کرتے ہیں، یہ اعتراض کیسا ہے اور کون سی ٹوپی افضل ہے، نیز صلحاء کے لباس کا معیار متعین فرمادیجئے تاکہ ہمارے لئے عمل کرنا آسان ہو۔

عمامہ سنت ہے یا مندوب؟

عمامہ سنت ہے یا مندوب اور اس کا کوئی خاص وقت بھی ہے یا دائمی عمل ہے۔

کیا سر منڈانا سنت ہے؟

سر کا منڈانا سنت ہے یا نہیں، لمہ، جمہ، وفرہ تو سنت ہے ہی اس کے علاوہ قصر کا کیا حکم ہے۔ حضرت صدر مفتی صاحب دار العلوم دیوبند کی خدمت اقدس میں مؤدبانہ گذارش ہے کہ مذکورہ سوالات کے واضح جوابات سے نوازیں، تاکہ حق کی وضاحت ہوجائے۔

الجواب وبالله التوفيق:

نصف ساق تک کرتہ مسنون ہے: ''**اعلم أن الكسوة منها فرض وهو ما يستر العورة ويدفع الحر والبرد والأولىٰ كونه من القطن أو الكتان أو الصوف على وفاق السنة، بأن يكون ذيله نصف ساق**''(۱)، شگاف وغیر شگاف کی تفصیل ان سے پوچھی جائے جو دونوں میں فرق کے مدعی ہیں، گول ٹوپی جو سر سے چمٹی ہوئی ہو اونچی نہ ہو افضل ہے، حضرت ابی کبشہ کا قول اس پر دلالت کرتا ہے: ''**عن أبي كبشة قال كان أكمام أصحاب رسول الله ﷺ بطحا**'' (۲)، لیکن گول ٹوپی کی فضیلت دوسری ٹوپی کے جواز کے منافی نہیں ہے، لہذا لمبی ٹوپی پر اعتراض درست نہیں، اسی طرح دیوبندی ٹوپی کو ہندوؤں کے مشابہ قرار دیکر اعتراض کرنا بالکل غلط ہے، اس لئے کہ ٹوپی مسلمانوں کا شعار ہے، نہ کہ

۱- شامی ۵/ ۲۲۳۔

۲- رواہ الترمذی، مشکوۃ/ ۳۷۴۔

ہندوؤں کا اور غیرقوم سے کسی چیز میں مشابہت اس وقت قبیح ہے، جبکہ وہ اس قوم کے ساتھ خاص ہو، یا اس کا شعار ہو جو لباس مسنون اوپر ذکر کیا گیا وہی صلحاء کا لباس ہے، مثلاً نصف ساق کرتہ، ٹخنوں سے اوپر پائجامہ یا تہبند اور ٹوپی، نیز ہر ملک کے علماء صلحاء کا جو لباس ہو وہی لباس وہاں کے لوگوں کے لئے مسنون ومستحب ہے۔

عمامہ سنت ہے اور اس کے لئے کوئی خاص وقت نہیں ہے، "عن عبادة قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: عليكم بالعمائم، فإنها سيماء الملائكة وارخوها خلف ظهوركم" رواه البيهقي في شعب الإيمان(۱)۔

سرمنڈانا بھی سنت ہے اور قصر بھی جائز ہے، كما في قوله تعالى: "محلقين رؤسكم ومقصرين"(۲)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲/۱/۱۴۱۱ھ

مشین سے ٹپک ٹپک کر جمع ہونے والے تیل کا حکم:

تیل نکالنے والی مشین سے تیل نکالنے کے بعد کچھ دیر تک تیل کے قطرات نکلتے رہتے ہیں، ہفتہ عشرہ کے بعد تیل کی کچھ مقدار جمع ہو جاتی ہے، دریافت طلب امر یہ ہے کہ اس تیل کا استعمال مالک مشین کے لئے جائز ہے یا کوئی اور مصرف ہے۔

محمد معین الدین گونکاڑی

الجواب وباللہ التوفیق:

تیل نکالنے والی مشین سے کھلی وغیرہ نکال لینے کے بعد بھی جو قطرات کچھ دیر تک ٹپکتے رہتے ہیں اس کے اصل مالک تو وہی ہیں جن کے سرسوں وغیرہ سے یہ تیل نکلا ہے باقی ان کی اجازت حالی یا مقالی سے اس کے استعمال کی اجازت مالک مشین کو بھی ہو جائے گی، اور اصل مالک کا ان قطرات کو ٹپکتا ہوا چھوڑ کر چلا جانا ان کے اذن حالی دیدینے کا قرینہ ہے اور

۱- مشکوۃ ص ۳۷۷۔
۲- سورۂ فتح: ۲۷۔

جواز استعمال کے لئے کافی ہے، باقی اگرکسی موقعہ میں اس اجازت میں شبہ ہوتو صریح اجازت لے لینا بہتر ہوگا(۱)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۴۰۲/۸/۵ھ

سلام میں پاؤں چومنا:

عید کے دن میں لوگ نماز کے پڑھنے کے بعد والدین کا پاؤں پکڑ کر سلام کرتے ہیں، یعنی دو ہاتھ کو پاؤں پر رکھ کر پیشانی سے لگا لیتے ہوں کیا یہ شریعت کی بات ہے؟ سلام کر کے مصافحہ کر لینے سے بس نہیں ہوگا۔

الحق مرعند الجاہلین کیا یہ حدیث ہے؟

''الحق مر عند الجاهلين وحلو عند العارفين'' حدیث ہے یا کیا ہے؟

صحیح اور ضعیف حدیث کی تعریف:

بر ما ملک سے فارغ ہوا مولوی لوگ کہتے ہیں کہ احادیث سب صحیح ہے جھوٹا حدیث نہیں ہے۔ بعض راوی متقی نہیں ہے، اس لئے اس کو ضعیف یا جھوٹا حدیث بولنا صحیح ہے؟

تیرہ صدی (۱۳۰۰ ہجری) کے بعد کیا ہوگا رسول اللہ ﷺ نے کچھ نہیں فرمایا صرف اتنا فرمایا آپ لوگ ہوشیار رہو گھوٹالا (گڑبڑ) ہونے والا ہے یہ بات صحیح ہے یہ ایک مشہور بات ہے۔

کسی کے گھر جا کر قرآن خوانی کرنا:

اکثر اچھے لوگ مجھکو پیار کرتے عزت کرتے ہیں اگر کسی کے گھر میں آدمی کا انتقال ہوا اگر میں اس کے گھر میں جا کر قرآن پڑھ کر نہیں دیا لوگ مجھے کیا کیا بولتے ہیں اگر مجھکو بخار یا خفقان ہے پھر بھی جا کر پڑھ کر دینا ہوتا ہے لوجہ اللہ نہیں ہے مجبوری کی وجہ سے جانا ہوتا ہے ان کے گھر میں جا کر پڑھے گا یا میرے گھر میں؟ ان کے گھر میں جا کر پڑھنے سے میرے اندر اخلاص بہت کم ہے کہاں میں پڑھنے سے اچھا ہوگا؟ لوگ کہتے ہیں کہ قرآن پڑھنے والا بہت ہے مگر اسحاق جیسا کہاں ہے۔

۱- ''وإن كانت شيئاً يعلم أن صاحبها لا يطلبها كالنواة وقشور الرمان يكون إلقاؤه إباحة حتى جاز الانتفاع به من غير تعريف'' (الہدایہ ۲/۵۹۵)۔

کیا لڑکا پیدا ہونا خوش نصیبی ہے:

لوگ بولتے ہیں جس کے پاس لڑکا پیدا ہوتا ہے وہ اچھا نصیب (تقدیر) والا ہے، تمہارا نصیب بہت اچھا ہے۔ اللہ نے دو بچے دیئے ہیں دونوں لڑکے ہیں لی ابنین اسمیهما هارون وموسیٰ۔ فقط

محمد اسحاق (تھائی لینڈ)

الجواب وبالله التوفيق:

۱- یہ طریقہ شریعت میں منع ہے، شریعت کے سراسر خلاف اور کافروں کا طریقہ ہے، چرن پر ڈنڈوت کرنا ہے، یعنی چرن (قدم) پر تعظیماً پیشانی رکھنا ہے قرآن پاک میں ہے: ''ولا تركنوا إلى الذين ظلموا فتمسكم النار'' (۱) صرف سلام ومصافحہ پر بس کرنا چاہیے، ماں باپ کے قدم کو چومنے کی اس وقت اجازت ہے جب ماں باپ اتنی اونچائی پر ہوں کہ ان کا قدم چومنے میں سجدہ کی طرح جھکنا نہ پڑے اور اس مذکورہ طریقہ میں سجدہ کی طرح جھکنا پڑتا ہے اور کافروں کا شعار وطریقہ ہے ہرگز ایسا کرنا درست نہیں (۲)۔

۲- ان الفاظ میں کوئی صحیح حدیث مروی نہیں ہے البتہ مشائخ اس طرح فرمادیتے ہیں۔

۳- حدیث نام ہے کلام رسول اور فعل رسول اور تقریر رسول ﷺ کا اور جو ایسی ہیں وہ سب صحیح ہیں، باقی واضعین حدیث نے جو غیر حدیث کو حدیث کہہ کر بیان کیا ہے وہ صحیح نہیں یہ جملہ بدعتیوں کا ایک قسم کا مغالطہ ہے (۳)۔

۴- تیرہ صدی کے بعد کی بھی بہت سی چیزوں کی خبر آپ نے دی ہے مثلاً حضرت امام مہدی کا ظاہر ہونا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا امام مہدی کے زمانہ میں دجال کو قتل کرنے کے لئے آسمان سے اترنا۔ دابۃ الارض کا نکلنا۔ سورج کا پچھم سے طلوع ہونا، غرض بہت سی علامات قیامت اور اشراط ساعت حضور ﷺ سے ثابت ہیں جو ابھی ظاہر نہیں ہوئی ہیں اس لئے

۱- ''ولا تركنوا إلى الذين ظلموا فتمسكم النار ومالكم من دون الله من أولياء ثم لا تنصرون'' (سورہ ہود: ۱۱۳)۔

۲- ایک طویل حدیث میں وارد ہے: ''قال: فقبلوا يده ورجله'' (سنن الترمذی ۵/۷۷ کتاب الاستئذان حدیث ۲۷۳۳)، ''قال الإمام العيني بعد كلام: فعلم تقبيل اليد والرجل والرأس... الخ'' (رد المحتار علی الدر المختار ۹/۵۴۶ و ۵۴۹)، ''تجوز الخدمة لغير الله تعالى بالقيام وأخذ اليدين والانحناء ولا يجوز السجود إلا لله تعالى'' (فتاوی عالمگیریہ ۵/۳۶۹)۔

۳- ''وفيها أي في الآحاد المقبول وهو ما يجب العمل به عند الجمهور، وفيها المردود وهو الذي لم يرجح صدق المخبر به'' (نزہۃ النظر مع شرحہ لملا علی القاری/ ۲۱۰)۔

یہ کہنا کہ حضور ﷺ نے تیرہ صدی کے بعد کی کوئی خبر نہیں دی یا اس کے بارے میں کچھ نہیں فرمایا بالکل غلط اور گمراہی کی بات ہے(۱)۔

۵- کسی کے گھر جا کر قرآن خوانی کرنے سے بہت بہتر ہے کہ اپنے ہی گھر پڑھ کر بخش دے اور اگر کسی رعایت یا مروت سے جانا ہی پڑ جائے تو لوگ جس جگہ بیٹھ کر اکٹھا طور پر جہر سے تلاوت کر رہے ہوں وہاں سے الگ اتنی دور بیٹھ کر آہستہ تلاوت کرنا چاہیے جہاں سے جہر (بلند آواز) سے تلاوت کا استماع لازم نہ آتا ہو(۲)، اور بعد تلاوت کوئی چیز اجرت میں بغیر کھائے پئے واپس آجانا چاہیے(۳)۔

۶- یہ بات بھی غلط مشہور ہوگئی ہے حدیث شریف میں تو اس طرح آیا ہے:" أول البنت أول بركات البنات او كما قال ﷺ "(۴) یعنی پہلی اولاد لڑکی ہونا یہ عورت کی پہلی برکت ہے۔ بہر حال لڑکوں کا ہونا بھی برکت سے خالی نہیں، اس لئے کلیہ دونوں طرح نہ ہونا چاہیے۔ لڑکوں کا نام ہارون وموسی بہت اچھا نام ہے خدا مبارک کرے اور سبھوں کو دیندار اور عالم دین بنائے اور دنیا وآخرت دونوں اچھا گزارے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دار العلوم دیوبند سہارنپور ۱۱/۸/۱۴۰۲ھ

۱- ''عن حذيفة بن أسيد الغفاري قال اطلع النبي ﷺ علينا ونحن نتذاكر، فقال: ما تذاكرون، قالوا نذكر الساعة، قال: إنها لن تقوم حتى ترون قبلها عشر آيات، فذكر الدخان والدجال، والدابة وطلوع الشمس من مغربها ونزول عيسى بن مريم عليه السلام ويأجوج ومأجوج وثلاثة خسوف، خسف بالمشرق وخسف بالمغرب وخسف بجزيرة العرب، وآخر ذلك نار تخرج من اليمن تطرد الناس إلى محشرهم" (صحیح مسلم ۴/ ۲۲۲۵، کتاب الفتن واشراط الساعة، حدیث ۳۹/ ۲۹۰۱)۔

۲- ''وإذا قرئ القرآن فاستمعوا له وأنصتوا لعلكم ترحمون" (سورہ اعراف: ۲۰۴)۔

۳- ''فالحاصل أن ما شاع في زماننا من قراءة الأجزاء بالأجرة لا يجوز، لأن فيه الأمر بالقراءة وإعطاء الثواب للآمر، والقراءة لأجل المال، فإذا لم يكن للقاري ثواب لعدم النية الصحيحة فأين يصل الثواب إلى المستاجر، ولو لا الأجرة ما قرأ أحد لأحد في هذا الزمان، بل جعلوا القرآن العظيم مكسباً ووسيلة إلى جمع الدنيا إنا لله وإنا إليه راجعون" (رد المحتار علی الدر المختار ۹/ ۷۷)۔

۴- ان الفاظ میں کوئی حدیث نہیں ملی البتہ عقبہ بن عامرؓ سے مروی ہے: ''قال قال رسول الله ﷺ: لا تكرهوا البنات فإنهن المؤنسات الغاليات، رواه احمد والطبراني وفيه ابن لهيعة وحديثه حسن وبقية رجاله ثقات" (مجمع الزوائد ۸/ ۱۵۶)، اور حضرت عائشہؓ سے مروی ہے: ''قال رسول الله ﷺ: من ابتلي بشيء من البنات فصبر عليهن كن له حجاباً من النار، قال أبوعيسى هذا حديث حسن" (سنن الترمذی ۴/ ۳۱۹، کتاب البر والصلة، باب ما جاء فی النفقة علی البنات حدیث ۱۹۱۳)، اور حضرت واثلہ بن الاسقع سے مروی ہے: ''قال قال رسول الله ﷺ: إن من بركة المرأة تبكيرها بالأنثى، ألم تسمع الله يقول في كتابه يهب لمن يشاء إناثاً ويهب لمن يشاء الذكور، فبدأ بالإناث قبل الذكور، هذا حديث موضوع" (کتاب الموضوعات لابن الجوزی ۲/ ۲۷۶)۔

کیرم بورڈ کھیلنا:

کیرم بورڈ کھیلنا کیسا ہے؟

محمد علی (مظفر نگر)

الجواب وباللہ التوفیق:

کیرم بورڈ بھی مثل تاش کے ایک قسم کا کھیل ہے اس لئے مکروہ ہے اور حدیث شریف میں ہے: "کل لھو المسلم حرام إلا ثلثة أو کمال قال علیہ السلام" (۱)، اور اس تین میں جو مستثنیٰ ہیں یہ کھیل داخل نہیں، اس لئے اس کا تقاضا تو یہ تھا کہ بالکل حرام ہو مگر چونکہ بعض دماغی مشق بھی ہوتی ہے اس لئے مکروہ کہا گیا البتہ اس میں ایسا انہماک ہو جائے کہ نماز باجماعت کی پابندی میں فتور پڑنے کا اندیشہ ہو تو قطعاً ناجائز ہے اور حسب ارشاد نبوی حرام ہوگا (۲)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دار العلوم دیوبند سہارنپور ۱۷/۸/۱۴۰۲ھ

بغرض تعظیم پاؤں چھونا:

لوگ دوسرے مسلمان کی تعظیم کے لئے ان کے پاؤں چھوتے ہیں اور دونوں اس عمل سے خوش ہوتے ہیں کرنے اور کروانے والے اسکے متعلق بھی ادھر ادھر کے عذرات اور بعض پیر مرشد کے اعمال کا حوالہ دیا جاتا ہے، حالانکہ رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام اور بزرگان دین سے یہ بات قطعی ثابت نہیں، براہ کرم اس کی بھی قرآن وحدیث وفقہ کی روشنی میں وضاحت فرمائیے۔

۱- "وقال رسول اللہ ﷺ: ارموا وارکبوا وأن ترموا أحب إلیّ من أن ترکبوا، وکل ما یلھو بہ المرء المسلم باطل إلا رمیہ بقوسہ، وتأدیبہ فرسہ وملاعبتہ امرأتہ فإنھن من الحق" (سنن ابن ماجہ ۲/۹۴۰ کتاب الجہاد باب الرمی فی سبیل اللہ حدیث ۲۸۱۱، سنن الترمذی ۴/۱۷۴ کتاب فضائل الجہاد باب ما جاء فی فضل الرمی فی سبیل اللہ حدیث ۱۶۳۷، سنن ابوداؤد ۳/۱۳، کتاب الجہاد باب فی الرمی حدیث ۲۵۱۳، ان کے الفاظ مختلف ہیں)۔

۲- "وکرہ تحریماً اللعب بالنرد وکذا الشطرنج... وأباحہ الشافعي وأبو یوسف، في روایۃ ..... وھذا إذا لم یقامر ولم یداوم ولم یخل بواجب وإلا فحرام بالإجماع" (الدر المختار مع رد المحتار ۹/۵۶۶، ۵۶۷)۔

الجواب وباللہ التوفیق:

تعظیم کے لئے یا تحیۃ کے لئے پاؤں چھونے میں اکثر اور عموماً (جھکاؤ) لازم آتا ہے، اور یہ (جھکاؤ) مجوسیوں کا فعل ہے اور ان کی مشابہت ہے اور یہ مکروہ تحریمی وناجائز ہے جیسا کہ فتاویٰ عالمگیری (ص ۳۶۸ ج ۵) کی ان عبارتوں سے معلوم ہوتا ہے:

(الف) ''الإنحناء للسلطان أو لغيره مكروه لأنه يشبه فعل المجوس كذا في جواهر الاخلاطي''۔

(ب) ''ويكره الإ نحناء عند التحية به ورد النهي كذا في التمر تاشي''، نیز ہندوستان کے مشرکین اپنے بڑوں کا پیر چومتے اور چھوتے اور اس کو پاؤں لگی اور ڈنڈوت کا نام دیتے ہیں اور یہ ان کا مذہبی طریقہ عمل ہے، اور ان کا مذہبی شعار ہے، بعض تو عبادت کے طور پر کرتے ہیں جس کا تعبد لغیر اللہ ہونا ظاہر ہے، اس لئے یہ عمل وطریقہ قطعاً حرام و ناجائز ہوگا اور اس کی مشابہت سے بھی بچنا واجب ہوگا۔ اب جو بعض فقہاء نے اباحت بیان فرمادی ہے اس کا محل سوائے اس کے اور کچھ نہیں ہوسکتا جس میں انحناء (جھکاؤ) بالکل نہ ہو مثلاً وہ شخص چارپائی وغیرہ کسی اونچی جگہ پر ہو اور چومنے والا نیچے زمین پر ہو اور بغیر کسی انحناء (جھکاؤ) کے اس کا پیر چھوئے یا چومے اور اگر اباحت مطلقہ مراد بھی لے لیا جائے تو اباحت کے لئے واجب کے خلاف کرنا ہرگز ہرگز جائز نہ ہوگا، اس لئے بھی اس کے پاؤں چھونے کی اجازت نہ ہوگی، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

۱-لوہار کے یہاں کام سے بچا ہوا بیکار لوہے کا حکم:

دیکھا جاتا ہے کہ لوہاروں کے یہاں جو کاشتکار کام کرنے آتے ہیں ان کا جو کام کرانے کے بعد لوہا جو بچتا ہے جو بیکار ہوتا ہے ان کے کسی کام کا نہیں ہوتا اس میں رکھنے کے لئے اسے اجازت لینی پڑے گی یا بغیر اجازت کے اگر رکھ لے تو جائز ہے یا نہیں؟ اب اگر ان کی اجازت کے بغیر رکھ بھی لیا تو یہ مال حرام تو نہیں ہوگا اس میں نیز یہ ہوتا ہے کہ بعض تو خود ہی چھوڑ جاتے ہیں بعض کو یاد نہیں رہتا بعض کے بارے میں معلوم نہیں ہوتا کہ یہ کس غرض سے چھوڑ کر جارہا ہے تو اب اگر ان کو پہنچانا ضروری ہے تو کس طرح پہنچایا جاسکے گا جبکہ معلوم نہیں کہ کس کا کتنا ہے اور کیا ہے؟ اور کون تھا اور کون نہیں تھا۔

۲-قرآن شریف پر ماتھا ٹیکنا:

بعض لوگوں کو دیکھا جاتا ہے کہ جب قرآن شریف پڑھنا شروع کرتے ہیں تو پہلے چہار زانو بیٹھتے ہیں، پھر قرآن شریف کھول کر اس پر سجدہ کی طرح ماتھا رکھیں گے پھر پڑھنا شروع کریں گے آیا یہ جائز ہے یا نہیں؟

الجواب وباللہ التوفیق:

۱-اس بچے ہوئے لوہے کا حال اگر ایسا ہے کہ اس کو لوگ کسی کام میں نہیں لاتے تو اس شخص سے زبان سے اجازت لئے بغیر بھی اپنے مصرف میں لانا درست رہے گا، ورنہ اجازت لینا ضروری ہے، عام اس سے وہ شخص زبان سے اجازت دیدے یا اس کی حالت اجازت بتلائے یعنی اذن حالی ہو مثلاً پہلی بار اس سے کہہ دے کہ یہ بچا ہوا لوہا ہے اگر آپ لے جانا چاہیں تو لے جائیں ورنہ مجھے اس کے استعمال کی اجازت دے دے تو پھر آئندہ کے لئے اس سے یہ کہہ دیں کہ بھائی آئندہ کے لئے بھی میری یہی درخواست ہے اگر لے جانا چاہا کریں تو لے جایا کریں ورنہ اس کے استعمال کی مجھے اجازت دے دیں آپ کی خاموشی کو میں اجازت سمجھوں گا، پھر اس کہہ دینے کے بعد آئندہ بھی جب وہ اس کو آپ سے نہ مانگے گا تو آپ کے لئے اس کا استعمال جائز رہیگا۔

ہر شخص جو کہ پہلی بار آپ کے یہاں کام لائے اس سے یہی بات کرلیا کیجئے۔

۲-قرآن پاک پر سر جھکا کر سجدہ کی طرح ماتھا ٹیکنا جائز نہیں ہے بلکہ سیدھے بیٹھے رہتے ہوئے قرآن پاک اوپر اٹھا کر منھ کے پاس اس کا بوسہ دے سکتے ہیں اور آنکھوں سے لگا سکتے ہیں، کما ورد فی الدر (۱)۔

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

۱-معانقہ کی شرعی حیثیت:

مسلمان مسلمان بھائی سے ملاقات کے وقت ہاتھ ملانے کے بعد بغلگیر ہوتے ہیں دائیں بائیں سینہ کو ملاتے ہیں، یہ جائز ہے دریافت فرمادیں۔

۱- ''لکن روی عن عمر رضی اللہ عنہ أنہ کان یاخذ المصحف کل غداۃ ویقبلہٗ ویقول عھد ربی ومنشور ربی عز وجل، وکان عثمان رضی اللہ عنہ یقبل المصحف ویمسحہٗ علی وجھہ'' (درمختار کتاب الحظر والاباحۃ شامی ۹/ ۵۵۲، مکتبہ زکریا)۔

۲-بیوی بچوں کو دیکھنے کے لئے تصویر کھینچوانا:

اگر کوئی مسلمان غیر ممالک میں ہے اور اس کے بیوی بچے تمام اہل خانہ وطن (انڈیا) میں ہوں اور اس شخص کو ایک سال یا دو سال پر چھٹی ملا کرتی ہے، اگر کسی مسلمان بھائی نے اپنی تصویر نکال کر اپنے بچوں کو دیکھنے کے لئے بھیج دی تو شرعاً درست ہے یا نہیں، جبکہ وہ تصویر کوئی گھر میں نہیں لگاتے ہیں بلکہ دیکھ کر صندوق میں بند کر دیتے ہیں تو اپنی یادداشت کے لئے اپنے ماں باپ بیوی بچوں کو تصویر بھیج سکتے ہیں یا نہیں؟ جب کہ کوئی تصویر نہ گھر میں لٹکاتے ہیں اور نہ دوسرے کو بتاتے ہیں، صرف گھر کے آدمی دیکھ کر چپ چاپ رکھ دیتے ہیں، یہ جائز ہے یا نہیں؟ تفصیل سے دریافت فرمادیں، جبکہ معاش کے سلسلے کی وجہ سے کسی بھی حالت میں کسی وقت جا نہیں سکتے، اس بارے میں کیا حکم ہے؟ واضح فرمادیں۔

۳-آسیبی حرکات کا علاج غیر مسلم سے کرانا:

اپنے وطن گاؤں میں اور کسی مسلمان کے گھر بلا، بھوت اور شیطانی چکر ہوا کرتا ہے، حالانکہ بیوی بچے صوم وصلوۃ کے پابند ہیں اور تلاوت قرآن بھی کرتے ہیں، پھر بھی بہت سارے اہل علم حضرات سے تجربہ کر کے دیکھا گیا، لیکن کچھ اسے چکر چلتا ہے کہ بھوت پریت کا اثر ہوا کرتا ہے، اس سے بچنے کے لئے ایک ہندو عالم سے پوچھ کر کچھ صدقہ خیرات وغیرہ جیسے وہ کہے اس طرح کرائے تو کیا حرج ہے؟ حالانکہ وہ ہندو عالم اپنے مسلمان بھائی بہنوں کو صوم وصلوۃ کا پابند رہنے کو کہتا ہے اور کسی بھی طرح سے اور کوئی بات اسلام کے خلاف نہیں پائی جاتی، بلکہ وہ کتاب سے دیکھ کر ہی بتاتا ہے اور اپنا نام ماں کا نام پوچھ کر بتاتا ہے پھر کچھ صدقہ وغیرہ کرنے کو بولتا ہے، جبکہ صدقہ ایسے گھر کے بارے میں رکھنے کو اور جگہ وغیرہ کی تکلیف ہو تو کرنے کو کہتا ہے کہ فلاں چیز وہاں رکھ دو تو اس بارے میں کیا رائے ہے؟ اور اگر نہ کرے تو تکلیف کیسے ہٹائی جائے، اور اپنوں میں سے کوئی ایسا نہیں، اس لئے ایسی چیزوں کا علاج کیسے کیا جائے؟ تفصیل سے آگاہ فرمادیں، مثال کے طور پر میرے ہی گھر میں ایسا معاملہ ہو تو کیا کیا جائے؟ اس کے لئے ترکیب بیان فرمادیں، اور اگر وہ ہندو جس طرح کہتا ہے اس طرح کریں تو جائز ہے یا نہیں؟ واضح فرمائیں۔

۴-غیر مسلم سے گھر کا کام کرانا:

اگر کسی مسلمان کے گھر میں غریب غیر مسلم کام کریں (پانی بھریں) تو یہ جائز ہے یا نہیں؟ اور اسے الگ کھانا دیں یا جب گھر کے لوگ ساتھ بیٹھ کر کھائیں اسے بھی بٹھالیں واضح طور پر بیان فرمائیں۔

۵-سحر سے محفوظ رہنے کی تدبیر:

اگر کوئی مسلمان یا غیر مسلم کسی کے گھر میں آکر یا باہر ہی سے حسد کے لئے کوئی تکلیف والا عمل (مثلاً جادو) کر جائے اور اس سے بیوی بچوں کو تکلیف ہو جائے، تو اس کے لئے کیا کرنا چاہئے؟

۶-گھر میں لوبان وغیرہ جلانا:

گھر میں اگربتی لوبان وغیرہ جلاتے ہیں یہ جائز ہے یا نہیں، مذکورہ اشیاء اگر خوشبو کیلئے جلائی جائیں تو حرج ہے یا نہیں؟

الجواب وبالله التوفيق:

۱-ملاقات کے وقت سلام کے بعد مصافحہ کر کے یا بغیر مصافحہ کئے ہوئے اگر بغل گیر ہوا ہو تو صرف بائیں حصہ سے سینہ سے سینہ ملانا ثابت ہے بائیں جانب قلب ہوتا ہے اور قلب کی قلب سے محاذاۃ مطلوب ہوتی ہے اور بس۔

۲-صحیح حدیث میں ہے: "اشد الناس عذاباً عند الله المصورون" (۱)، أو کما قال علیه الصلاۃ والسلام اس سے معلوم ہوا کہ مذکورہ مقاصد کے لئے بھی تصویر کھنچوانا وغیرہ ٹھیک نہیں؟ ہاں! اگر وہ تصویر اتنی چھوٹی ہو اگر زمین پر رکھ دیا جائے تو کھڑے ہو کر دیکھنے پر اس کے سب اعضاء صاف معلوم نہ ہوں، اتنی چھوٹی تصویر کا بنانا اور رکھنا سب جائز رہے گا کما فی الدر والطحطاوی (۲)، وغیرہما۔

۳-حضرت حفصہؓ سے مسلم شریف میں روایت ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا: "من أتى عرافاً فسأله عن شئی لم يقبل له صلوة أربعين ليلة" (۳)، اور حضرت ابو ہریرہؓ سے مسند احمد و ابوداؤد میں ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا ہے: "من اتى كاهنا فصدقه بما يقول (الى قوله) فقد برئی مما أنزل على محمد ﷺ" (۴)، اس طرح اور بھی بہت سخت وعیدیں وارد ہوئی ہیں، اس لئے ہرگز ان باتوں کے قریب بھی جانا درست نہیں ہے اور ایسا کام کرنے والا عموماً

۱- مشکاۃ المصابیح، کتاب اللباس، باب التصاویر ۲/ ۳۸۵ قدیمی۔

۲- "قبيل مطلب الكلام على اتخاذ السبحة باب مايفسد الصلوة ويكره فيها" (۱/ ۴۳۶، دار احیاء التراث، بیروت)۔

۳- کتاب السلام باب تحریم الکہانۃ و اتیان الکہان ۲/ ۲۳۳ قدیمی۔

۴- رواہ ابوداؤد فی کتاب الکہانۃ والطیر باب فی الکہان: ۳۸۹۸، رواہ احمد فی مسندہ حدیث امراۃ من بنی سلیم ۵/ ۱۷، ۱۶۲۰۲، دار احیاء التراث، بیروت۔

عراف یا کاہن یا ساحر ہوتے ہیں بالخصوص غیر مسلم ہوں ان لوگوں کے پاس نہ جانا چاہئے اور نہ ان کی تصدیق کرنی چاہئے، انکی بات کی تصدیق کرنے سے آخرت بھی برباد ہوتی ہے اور دنیا بھی برباد ہوتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ روزہ نماز وتلاوت وغیرہ سب کی پابندی کے باوجود مسلمانوں کو کوئی فائدہ نہیں ہوتا جیسا کہ عراف والی روایت سے معلوم ہوا کہ اس کی وجہ سے چالیس ۴۰ نمازیں مردود ہو جاتی ہیں اور دوسری روایت تو بڑی ہی خطرناک ہے، ورنہ صحیح العقیدہ مسلمان کے لئے تو صحیح حدیث کے مطابق محض سورہ بقرہ کے اخیر رکوع کی تلاوت بلند آواز سے کر دینا بھی ان بلاؤں سے دفعیہ کے لئے کافی ہے اور صحیح حدیث میں ہے کہ جس گھر میں ایک ختم قران پاک کی تلاوت جہراً کر دی جائے اس گھر میں شیاطین نہیں رہ سکتے ہیں بشرطیکہ پڑھنے والا اور پڑھوانے والا دونوں اسی حدیث پر ایمان واعتماد رکھتے ہوں۔

۴- مسلمان کے گھر میں بھی غیر مسلم کا کام کرنا جائز ہے بشرطیکہ عورتوں سے پورا پورا پردہ ہو ورنہ منع رہے گا اور اگر اس کا ہاتھ ومنہ پاک وصاف ہے تو ساتھ میں کھلانا بھی درست رہے گا ورنہ الگ کھلانا چاہئے۔

۵- جب کوئی مسلمان یا غیر مسلم گھر میں آکر حسد سے جادو یا سحر وغیرہ کرے تو اس کو گھر سے نکال دینا چاہئے۔

۶- گھر میں خوشبو کی خاطر اگر بتی ولوبان جلانا سب جائز ہے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۴/۲/۴ ۱۴۰۳ھ

۱- حمد وشکر کے وقت ہاتھ اٹھا کر دعا مانگنا:

حمد وشکر کے وقت ہاتھ اٹھا کر دعا مانگنا جائز ہے یا نہیں، ہمارے یہاں کھانا کھانے کے بعد ہاتھ اٹھا کر شکر کرتے ہیں۔

۲- کھانا کھلا کر ایصال ثواب کرنا:

ہمارے یہاں جو آدمی مرجاتا ہے تو اس کے ورثہ ایک یا دو ۲ سال اس کی طاقت میں جب ہو ایک گائے ذبح کر کے لوگوں کو کھلا کر مرحوم کی روح کو ثواب بخشتے ہیں ایسا کرنا جائز ہے یا نہیں؟

۳- ستائیسویں شب کو مٹھائیاں کھلانا:

ہمارے یہاں ۲۷ ویں رات کو مٹھائی یا کھانا جتنا ہو سکے لا کر مسجد میں نمازیوں کو کھلاتے پلاتے ہیں ایسا کرنا جائز ہے یا نہیں۔

الجواب وباللہ التوفیق:

۱-حمد وشکر کے موقعہ پر ہاتھ اٹھا کر دعا مانگنے کا نفس جواز میں کلام نہیں ۔ باقی اس کو شرعی حکم سمجھنا یا جو ایسا نہ کرے اس کو برا سمجھنا ناجائز ہے اور ایسے طریقہ پر کرنے سے یہ فعل بدعت بھی ہوجائے گا۔

۲-ثواب پہنچانا تو بہت اچھی چیز ہے اگر پوری گائے یا پکا کر کے اس کا گوشت غریبوں محتاجوں کو دیدیا جائے یا پکا کر کھلا دیا جائے، اور کوئی نام ونمود نہ کیا جائے اور اس کے لئے کوئی خاص تاریخ کو شرعاً ضروری قرار نہ دیا جائے تو درست رہے گا ورنہ بدعت ہوگا جیسا کہ اہل بدعت کے یہاں یہ سب چیزیں چالیسویں ششماہی برسی کے نام سے موسوم ہوکر اور ضروری سمجھ کر کی جاتی ہیں یہ سب طریقہ ناجائز اور بدعت ہے۔

۳- اس کا بھی شرعاً کوئی حکم نہیں ہے، اگر کوئی شرعی حکم اس کا سمجھ کر کرے تو ممنوع ہوگا اور اگر ویسے ہی محض مسلمانوں کا دل خوش کرنے کے لئے کرے تو درست ہوگا، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی ،مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۴۰۳/۱۲/۲ھ

ایصال ثواب کے لئے سورہ یسین پڑھ کر دعا کرنا:

ہمارے یہاں یہ رواج ہے کہ بیرون ملک کسی رشتہ دار کا انتقال کی خبر پر جمعہ بعد ایصال ثواب کے لئے یاسین شریف کے ختم کا اعلان امام صاحب سے کرایا جاتا ہے، ایک طالب علم نے اس رواجی ایصال ثواب کے طریقہ سے نکیر کی ہے عرض یہ ہے کہ بستی نظام الدین میں بھی باقاعدہ کسی نماز کے بعد یاسین شریف کے ختم کا اعلان ہوتا ہے اور اس کے بعد اجتماعی دعا ہوتی ہے اور آج کل تو لوگ اکابر کے عمل کو صرف دیکھتے ہیں اکابر کا عمل فتوی یا کتاب سے تو ملاتے نہیں تو لوگ ان مراکز کے عمل کو دلیل میں پیش کرتے ہیں تو ان کو کیا جواب دیا جائے، ایسے موقع پر طالب علم کی رہبری فرمائیں تو عین نوازش ہوگی۔

الیس بوٹیات (۴۰-ا رچھ کنگ اسٹریٹ باٹلے انگلینڈ)

الجواب وباللہ التوفیق:

اس رواجی ایصال ثواب کو لازم وواجب قرار دے دیا گیا ہو یا اس کے لئے بعد نماز جمعہ کو لازم وواجب قرار دے دیا گیا ہو کہ اگر کوئی جمعہ کی نماز کے بجائے کسی اور وقت کرائے تو اس پر لوگ نکیر کرتے ہوں یا اگر کوئی شخص اس جگہ سے اٹھ کر

چلا جائے یا شریک نہ ہو اس کو مطعون کیا جاتا ہو اس پر لعن طعن کیا جاتا ہو یا شرعاً ضروری قرار دیا جاتا ہو تو اس کو ترک کرنا اور اس کی اصلاح کرنا ضروری ہوگا، ورنہ نفس جواز و اباحت میں بغیر کسی وقت و دن وغیرہ کی تعیین کے ہو تو کوئی کلام نہیں ہوگا، ان تمام حالات پر غور کر کے مناسب طریقہ سے اصلاح کرنی چاہئے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۴/۱/۱۴۱۱ھ

۱-تعلیم کے لئے عورتوں کا بے پردہ نکلنا:

انگریزی تعلیم حاصل کرنے کے لئے عورتوں کا غیر شرعی طور پر نکلنا کیسا ہے؟

۲-لڑکیوں کی تعلیم کا مسئلہ:

لڑکیوں کی تعلیم شرعی اعتبار سے کس حد تک درست ہے؟

زکوٰۃ کا پیسہ جو دینی مدارس کے لئے وصول کیا جاتا ہے، لڑکیوں کی انگریزی تعلیم پر خرچ کرنا کیسا ہے؟

الجواب وباللہ التوفیق:

۱-کوئی بھی تعلیم ہو انگریزی یا غیر انگریزی اس کے حاصل کرنے کیلئے غیر شرعی طور پر نکلنا درست نہیں ہے۔

۲-پردہ کے ساتھ شرعی حدود میں رہتے ہوئے عالمہ حافظہ مفسرہ محدثہ فقیہہ بننے کی حد تک فرض کفایہ کے درجہ میں تعلیم حاصل کر لینا شرعاً درست ہے، البتہ ضروری درجہ انکے لئے صرف اتنا ہے کہ جس سے اعتقادات و ایمانیات وعبادات (فرض و واجبات) کا علم حاصل ہونے کے ساتھ شرعی معاملات کی صحت و سقم کا بھی تصحیح معاملات کے لئے علم حاصل ہو جائے، نیز گھریلو و خانگی حساب کتاب لکھنے پڑھنے اور سمجھنے اور بچوں کی تربیت و پرورش کا بھی سلیقہ ہو جائے اور بس۔

زکوٰۃ کا پیسہ جو دینی مدارس کے لئے وصول کیا جاتا ہے، اس کو دینی تعلیم پر خرچ کرنا حسب قاعدہ وضابطہ شرع ضروری ہے اور بوجہ ضرورت شرعی اور بقدر ضرورت شرعی انگریزی تعلیم ہو یا غیر انگریزی اس پر بھی حسب قیود ضابطہ شرع ضمناً خرچ کرنا درست رہے گا، لڑکیوں کی تعلیم ہو یا لڑکوں کی ہو، البتہ لڑکیوں کی تعلیم میں مذکورہ بالا نمبروں کی قیودات کا لحاظ زیادہ اہم ہوگا، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۴/۴/۱۴۰۳ھ

افریقہ کی موجودہ صورتحال میں مسلمان کیا کریں؟

الجواب وباللہ التوفیق:

ہر دو مضمون پورا بار بار بغور پڑھا حسب تحریر یہ مسئلہ محض تعاون ظالم یا تعاون مظلوم کا نہیں ہے، بلکہ وہاں کے پورے قوم مسلم کا من حیث المسلم مسئلہ ہے اور ان کے من حیث القوم زیست وموت کا مسئلہ ہے اور ان کے دین واسلام کے تحفظ وبقاء کا مسئلہ ہے۔

سوال میں مسلمانوں پر سیاہ فام قوم کے مظالم کا تذکرہ ہے، گوروں کے مظالم کا تذکرہ ہے ساتھ ہی ساتھ ہندوستانی غیر مسلموں بلکہ بدعتیوں اور اہل زیغ کی ریشہ دوانیوں کا تذکرہ بھی ہے اگر پورے تدابیر اور ہوشیاری کے ساتھ اس وقت حفاظت وبقا کا سامان نہ کیا گیا تو پوری قوم مسلم اور ان کے دین وایمان کا اس ملک سے ختم ہوجانے کا شدید خطرہ واندیشہ ہے اور یہ صورت وہاں کے پورے مسلم قوم کے قومی ودینی واجتماعی اضطرار جس طرح انفرادی ہوتا ہے، اسی طرح اضطرار اجتماعی بھی ہوتا ہے۔

اللہ جل شانہ نے پورے قوم مسلم کو اپنے اجتماعیت کو اور اپنے دین ومذہب کے تحفظ وبقا کو اور بلکہ اس کے ترقی دینے کو مطلوب شرعی قرار دیا ہے اور اس کا صریح حکم فرمایا ہے چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: **''وأعدوا لهم مااستطعتم من قوة ومن رباط الخيل ترهبون به عدوالله وعدوكم''** (۱)۔

ان موجودہ حالات میں وہاں کے مسلمان اگر بالکل خوش ہوجائیں اور بالکل الگ تھلگ ہوجائیں، گوروں اور سیاہ فام کسی کے ساتھ کوئی ربط واشتراک وغیرہ نہ رکھیں تو دونوں کے بے انتہا مظالم کے شکار ونشانہ بنیں گے بلکہ ہندوستانی غیر مسلموں کے مظالم وخداع کا نشانہ بنیں گے، اور خدانخواستہ جوتباہی اور ہلاکت پچاس ۵۰ سال میں آتی ہیں دس پانچ سال میں اس طرح آجانے کا قوی خطرہ ہے کہ یا تو وہاں کی قوم مسلم اپنے دین ومذہب اور اپنی قومیت وغیرہ کے سب اعتبار سے فنا ہوجائیں جیسا کہ روس میں ہوا، یا وہاں کا وطن چھوڑ کر بھاگیں جیسا کہ برما میں ہوا اور اگر صرف سیاہ فاموں کی حمایت اور ان کے ساتھ اشتراک کریں تو سیاہ فاموں کی حیوانیت ودرندگی وبربریت سے کوئی توقع نہیں کہ اس صورت حال میں اپنی قومیت ومذہبیت محفوظ رکھ سکیں، مزید برآں گوروں کے اور ہندوستانی غیر مسلموں کے مظالم کا نشانہ اور زیادہ شدت سے بن جانے کا

۱- سورۃ الانفال ۶۰۔

غالب امکان ہے اور اسی نتیجہ کا اندیشہ ہے جو بالکل الگ تھلگ رہنے میں ہے۔

اور اگر گوروں میں رہ کر حمایت وموافقت کریں تو چونکہ ان کی بربریت عموماً درندگی وحیوانیت کے درجہ میں نہیں ہوتی بلکہ عموماً قانونی انداز میں ہوتی ہے، ساتھ ساتھ مذہبی وقومی آزادی بھی کچھ نہ کچھ رہتی ہے اس لئے توقع ہوتی ہے کہ ان کی حمایت وقانونی محافظت کے ذریعہ سیاہ فاموں کی درندگی وبربریت سے کچھ حفاظت ہو سکے، لیکن ہندوستانی غیر مسلموں کی دشمنی اور خصلت کینہ پروری اور انکے مظالم سے حفاظت رہنا ضروری نہیں بلکہ اس کا خطرہ غالب ہے جیسا کہ ابھی ذرا سی چوک یا غفلت سے نماز جمعہ کے سلسلے میں مسلم ٹیچران اور طلبہ وطالبات کے مبتلاء پریشانی سے ظاہر ہے، پس اگر مسلمانوں نے اپنی حمایت وموافقت کو صرف زبانی حد تک محدود رکھا اور عملی طور پر کسی درجہ میں دخیل نہ ہوئے تو ہندوستانی غیر مسلم، مسلم قوم کے تباہ وبرباد کرنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھیں گے، **كما صرح به في البحر بقوله لان الحمية الملينية تحتلهم عليه۔**

اس لئے یہ طریقہ منشاء شرع وشارع علیہ السلام کے مطابق نہ ہوگا اور یہ طریقہ بھی شرعی حکم ہرگز نہ بن سکے گا، البتہ جب گورے اپنی حماقت وموافقت میں قانوناً ملازمتیں بھی دیں گے اور پارلیمنٹ میں بھی کچھ نمائندگی دیں گے اور کچھ اندرونی حقوق حکومت بھی دیں گے تو ایسی حالت میں گر قوم مسلم محض زبانی حمایت وموافقت تک اپنے کو محدود نہ رکھے بلکہ جس طرح غیر مسلموں سے دلی وقلبی دوستی قائم کئے بغیر محض دنیوی امور تک تعلق ورابطہ رکھنا درست ہے جیسے تجارت میں شرکت ومضاربت یا ان کے ساتھ ایجار اور استیجار کا معاملہ کرنا یا ملازم رکھنے یا ملازمت کرنے کا معاملہ کرنا جائز درست ہے، اسی طرح ان کی حکومت سے دنیاوی معاملہ تک بغیر مداہنت وتلبیس کے رابطہ رکھا جائے اور سول ملازمتوں میں پولس ملازمتوں میں فوجی ملازمتوں میں اسمبلی ڈپارٹمنٹ میں آپس کے اتفاق واتحاد کے ساتھ گھسا جائے اور دانشمندی وہوش مندی کے ساتھ کلیدی عہدوں پر قابض ہوا جائے اور اپنے دین ومذہب کو اور معاشرہ کو سنوارا جائے اور اپنے خوبصورت شکل ووضع قطع امر اخلاق کو احکام خداوندی کے مطابق ڈھالا جائے تو بلاشبہ جائز رہے گا، اور اللہ کا شکر ہے اور ابھی اللہ کا دیا ہوا بہت کچھ موقع ہے، اس سے اپنی حفاظت ہی نہیں بلکہ حکم خداوندی "**وأعدوا لهم ما استطعتم**" کے تحت بہت کچھ حاصل بھی کیا جا سکتا ہے، اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ کثرت سے تبلیغی اجتماعات جگہ جگہ قائم کئے جائیں اور اہل دل مشائخ مصلحین اور علمائے ربانیین کو بکثرت بلایا جائے وعظ کہلوایا جائے اور عوام وخواص سب کا رابطہ قائم ومضبوط کرایا جائے، اور زیادہ سے زیادہ ان کی صحبتوں سے فائدہ اٹھائے جانے میں سعی کی جائے اور اپنے ظاہر وباطن سب کو اللہ جل جلالہ سے فقط انکی رضا جوئی کے لئے مرتبط کیا جائے،

اور اس میں رسوخ پیدا کیا جائے، اس لئے کہ بہ نصوص قطعیہ حقیقت یہی ہے کہ یہ سب رسوائیاں اور دنیا وآخرت کی ذلتیں ہماری ہی بداعمالیوں کے نتائج بد ہیں، جیسا کہ صحیح احادیث پاک سے معلوم ہوتا ہے کہ یہی ہمارے اعمال ہی دوسرے شکل میں ہم پر حاکم ہوتے ہیں۔مثلاً حدیث پاک میں ہے:

(الف)"أعمالنا عمّا لنا أو كما قال ﷺ "(۱)۔

ہمارے اعمال جیسے ہوتے ہیں ویسے ہی ہم پر حاکم من جانب اللہ مقرر ہوتے ہیں۔

(ب)''كما تكونوا يولىّ عليكم أو كما قال" اس کا بھی حاصل وہی ہے جو الف کا ہے اور مثلاً (ج)

"عن عبدالله بن عمروؓ قال سمعت رسول الله ﷺ يقول ستكون هجرة بعد هجرة فخيار أهل الأرض ألزمهم مهاجرابراهيم وَيَبقى في الأرض شرار أهلها تلفظهم أرضو هم وَتقذرهم نفس الله وتحشرهم النار مع القِردَةِ والخنازير" (۲)۔

حضرت عبداللہ بن عمرو سے مروی ہے کہ فرمایا، میں نے خود حضور اکرم ﷺ سے سنا ہے آپ ﷺ فرماتے تھے عنقریب یکے بعد دیگرے، ہجرتیں ہوں گی (یعنی لوگ اپنے وطنوں کو چھوڑ کر بار بار ادھر ادھر بھاگیں گے) بس اچھے لوگ عموماً وہ ہوں گے جو ہجرت گاہ ابراہیم علیہ السلام کو زیادہ لازم پکڑنے والے ہوں گے، اور اکثر بدترین لوگ وہاں باقی رہ جائیں گے، ان کو ان کی زمین یہاں سے وہاں، وہاں سے یہاں پھینکتی رہے گی، اور اللہ تعالی کی ذات انکو (غلاظت کی طرح) مکروہ ومذموم قرار دیگی، یہاں تک کہ فتنہ کی آگ ان کو مردہ (چھوٹے کافر اورخنازیر (بڑے کافر) کے ساتھ محشور نہ کردیگی،

"أللهم احفظنا من شرور أنفسنا وفي البذل (۳/ ۳۰۳) قوله تلفظهم أرضوهم الخ المعنى ترمى شرار الناس أراضيهم من ناحية الى ناحية أخرى، وفيه قال المظهر: النار ههنا الفتنة يعنى تحشرهم نارا لفتنة التى هي نتيجة أفعالهم القبيحة مع القردة والخنازير لكونهم متخلقين بأخلاقهم فيظنون أن الفتنة لا تكون إلا في بلدانهم فيختارون جلاد أوطانهم ويتركونها والفتنة تكون لازمة لهم ولا تنفك عنهم حيث

۱- "قال النجم لم أره حديثا لكن معنى الإشارة إليه في كلام الحسن في حديث كما تكونوا يولىٰ عليكم والأول رواه الطبراني عن الحسن البصري أنه سمع رجلا يدعوا على الحجاج فقال له: لاتفعل إنكم من أنفسكم او يتم إنما نخاف إن عزل الحجاج أو مات أن يولىٰ عليكم القردة والخنازير فقد روى أن أعمالكم عمالكم وكما تكونوا يولىٰ عليكم"(كشف الخفا ۱/ ۲ ۱۷ - ۱۷۳، حدیث ۴۲۷، مکتبۃ العلم الحدیث، وکشف الخفاء ۱/ ۱۶۴ حدیث ۴۲۷ مکتبۃ القدسی القاہرہ)۔

۲- ابوداؤدشریف کتاب الجہادباب فی سکنیٰ الشام حدیث ۲۴۷۹۔

یکونون "(۱)۔

اور بذل المجہود میں تلفظہم ارضوہم کے معنی یہ لکھے ہیں کہ شرارہاس ان کی زمین وملک اس ناحیہ سے اس ناحیہ کی طرف پھینکتی رہے گی مگر کہیں پناہ نہیں ملے گی۔

اور اسی بذل المجہود میں یہ بھی مذکور ہے کہ شارح حدیث (حضرت مظہر) نے فرمایا ہے کہ نار سے مراد اس جگہ اپنی بداعمالیوں کے سبب طرح طرح کے فتنے ہیں، یعنی انہی فتنوں کی آگ جو ان کے اعمال قبیحہ واخلاق کافرانہ اختیار کرنے کی وجہ سے ہوگی ان کو قردہ وخنازیر کے ساتھ ملحق ومحشور کردے گی اسوجہ سے کہ وہ لوگ کافرانہ وفاسقانہ عادات واخلاق وطور طریقہ میں غرق ہونے کی وجہ سے اپنی ذلت ورسوائی کا اصل سبب بھی نہ سمجھ سکیں گے، بلکہ یہ گمان کریں گے کہ ہماری ذلت و رسوائی اس ملک وخطہ کی خرابی کی وجہ سے ہے، اور اس ملک وخطہ میں ایسا نہیں ہے لہذا وہاں چلو اور اپنے وطنوں کو چھوڑ کر جلاوطن ہوکر دوسرے وطن میں جائیں گے حالانکہ یہ آگ ان کی بداعمالیوں کی ہوگی وہ ان بداعمالیوں کو نہ چھوڑنے کی وجہ سے ہر وقت اس کے وبال میں مبتلاء رہیں گے۔

اور اسی بناء پر یہ ان کے لازم حال رہے گی کبھی ان سے الگ نہ ہوگی یہاں تک کہ تائب ہوکر اپنا حال بدل کر اللہ کی مرضی وخوشنودی کے مطابق نہ کرلیں۔

اور حدیث قدسی میں ہے: راوی حضرت ابو الدرداءؓ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں ہی اللہ ہوں میرے سوا کوئی معبود نہیں، بادشاہوں کا بادشاہ ہوں اور بادشاہوں کا بادشاہ ہوں بادشاہوں کے قلوب میرے قبضہ میں ہیں، اور یہ فرمایا کہ بندے جب میری اطاعت کرتے ہیں تو ان کے بادشاہوں کے دلوں کو پھیر دیتا ہوں (تاکہ وہ انکو خوب راحت وآرام پہنچائے ظلم وتعدی نہ کریں)۔

اور بلاشبہ جب بندے میری (میرے حکم کی) نافرمانی کرتے ہیں تو میں ان کے بادشاہوں کے قلوب کو ان کے اوپر نحمت اور ناراضی وگرفت کے ساتھ پھیر دیتا ہوں جس سے وہ بادشاہ (خواہ کافر ہو یا مؤمن) ان کو طرح طرح کے بدترین عذاب چکھاتے ہیں (اور طرح طرح کے مصائب میں گرفتار کرتے ہیں)، پس ایسے وقت میں تم لوگ اپنے کو ان بادشاہوں پر بددعا کرنے میں مشغول مت کرو، (کیونکہ یہ چیزیں خود تمہارے ہی بداعمالیوں کا خمیازہ ہے) بلکہ تم لوگ ایسے وقت میں اللہ کی یاد اور اس کے احکام کی اتباع کی جانب متوجہ ہو جایا کرو، اور اسی سے زاری وتضرع کے ساتھ نجات مانگا کرو تاکہ میں

۱- کتاب الجہاد باب فی سکنی الشام ۳ر ۱۹۴۔

تمہاری کفایت کروں، اورتمکو (بعدتوبہ وانابت الی اللہ اس سے بلا بھی) نجات بخشوں پس اگران مذکورہ بالا اصول کے مطابق عمل کیا گیا تو یقین کامل ہے کہ افریقہ کی پوری مسلم قوم من حیث القوم) ومن حیث الدین والمذہب ہرطرح محفوظ ومامون رہے گی بلکہ اگر منطوق قرآنی ''واعتصموا بحبل الله جميعاً ولا تفرقوا''، اورآیت ''ولا تنازعوا افتفشلوا وتذهب ريحكم ''ترجمہ: (اللہ کی رسی (دین) کومجتمع ہوکرمضبوط پکڑلواورآپس میں اختلاف نہ کرو، اورآیت کریمہ کا ترجمہ، آپس میں منازعت مت کروورنہ تمہارا قدم پھسل جائے گا اورتمہاری ہوا (وہاک) اکھڑ جائے گی (اورتم ذلیل ورسوا ہوجاؤگے)۔

۱؎ مشکوۃ ص ۳۲۳ قبیل باب ماعلی الولاۃ من التیسیر الفاظ حدیث مندرجہ ذیل ہیں:

''عن ابی الدرداء او قال قال رسول الله ﷺ: ان الله تعالیٰ یقول: أنا الله لا إله الاّ أنا مالک الملوک و ملکُ الملوک قلوب الملوک فی یدی وإن العباد أذا أطاعونی حوّلتُ قلوبَ ملوکهم علیهم بالرحمة والرأفة وإن العباد إذا عصونی حولت قُلُوبهم بالسخطة النقمة فساموهم سوء العذاب فلا تشغلوا أنفسکم بالدعاء علی الملوک ولکن إشغلوا أنفسکم بالذکر والتضرع کی اکفیکم'' (۱)۔

ان باتوں کوپیش نظر رکھتے ہوئے ان اصول پرآئندہ بھی عمل جاری رکھا گیا تو یقین واثق ہے کہ انشاء اللہ ان نصوص وآثار کی برکت سے وہاں کی قوم مسلم موفق من اللہ ہوکرسب سے فائق ہوجائے گی قوم مسلم یا یہ لوگ من حیث القوم والمذہب ہرطرح مامون ومحفوظ رہیں گے انشاء اللہ اس لئے کہ یہ طاقتیں محض دنیوی تدابیر کی بنیاد پر ہوشمندی ودانشمندی سے عمل پیرا ہونے کی وجہ سے اتنی غالب وحکمراں ہیں یا ہوتی ہیں تو یہاں تو مسلمانوں کے پاس نصرت خداوندی بھی شامل رہے گی پھر کیوں نہ موفق وفائق یا کم ازکم ہرطرح مامون ومحفوظ رہے گی کما اشارت الیہ روایات کثیرۃ عدیدۃ فی الصحاح ایضاً۔

الحاصل افریقہ کے مذکورہ حالات وکوائف کے پیش نظر منشاء شرع وشارع علیہ السلام کے مطابق یہی طریقہ کارہوگا اوریہی شرعی حکم ہوگا اوراس حکم شرعی کے مطابق عمل نہ کیا گیا تو قوی خطرہ ہے کہ وہ ہلاکت وتباہی جسکے پچاس سال میں آنے کا اندیشہ تھا وہ کہیں دس یا پانچ سال میں نہ آجائے جس کی جانب پہلے اشارہ کرچکا ہوں۔

''اللهم احفظنا واحفظهم من جميع الآفات والبليات وهو آخر ما اوردنا ايراده من الشرع الشريف فاللهم وفقنا و وفقهم كما تحب و ترضى من القول والفعل والهدى انک علی کل شئی

۱- 　روا ہ ابونعیم فی الحلیۃ مشکوۃ ص ۳۲۳۔

قدیر، اللھم یا مقلب القلوب قلب قلوبنا و قلوبھم الی دینک وقلب قلوبنا وقلوبھم الی طاعتک وثبت اقدامنا واقدامھم وانصرنا وانصرھم بفضلک ومنک امین ، یا رب العالمین بحرمة سید الانبیاء وخاتم النبیین "، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

۱-افریقہ میں مسلمانوں کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

مسلمان کی حیثیت اس ملک (افریقہ) میں کیا ہوگی؟ مستامن یا کچھ اور؟

۲-افریقہ میں مسلمانوں کے لئے حکومت میں شرکت اور ووٹ کا حکم:

اگر مسلمان مستامن کی حیثیت رکھتا ہے اس ملک میں تو اس سے اشتراک عمل میں حکومت کا ساتھ دے سکتا ہے یا نہیں اگر شریک ہوسکتا ہے تو اس کی کیا صورت ہوگی؟

۳-اگر شریک ہوسکتا ہے تو ووٹ دینے کی کیا صورت ہونا چاہئے؟

۴-اگر شریک ہوسکتے ہیں تو فوج میں داخل ہوسکتے ہیں یا نہیں؟ اگر ہوسکتے ہیں اور مقابلہ پر فوج مسلمانوں کی ہو تو کیا کریں۔

مولوی محمد شبیر سالول (جمعیۃ العلما بکس ۱۰۔، جوہانسبرگ ٹرانسوال افریقہ)

الجواب وباللہ التوفیق:

۱ تا ۳-مستامن کی حیثیت صرف ان لوگوں کی ہوگی جو صرف چند متعینہ مدت کے لئے ویزا پر گئے ہوئے ہیں اور بعد ختم مدت ویزا انکو واپس آجانا ضروری ہے، اور جو لوگ وہاں کے مستقل قیام پزیر ہو چکے ہیں وہ شرعاً بجائے مستامن ہونے کے وہاں کے باشندے شمار ہونگے اور حدود شرع میں رہتے ہوئے، اور اپنے حقوق ملکی حاصل کرتے ہوئے جس طرح اور دنیوی کاروبار میں غیر مسلم سے شرکت کر سکتے ہیں اور اس کا ساتھ دے سکتے ہیں اسی طرح اس حکومت سے بھی شرکت کر سکتے ہیں اور شرکت کی اور ساتھ دینے وغیرہ کی صورت تفصیل کے ساتھ ہمرشتہ سوال کے مفصل جواب میں مدلل ومبرہن طریقہ سے عرض کیا جاچکا ہے اس کو ملاحظہ فرمالیں۔

۴- ملک کی حکومت وحفاظت کی نیت سے ہر ملازمت میں حدودشرع میں رہتے ہوئے جب تک کہ تلبیس ومداہنت کے بغیر شریک ہوکر ملک کی خدمت وحفاظت کرسکتے ہیں،فوج میں بھی اسی نیت وقید کے ساتھ داخل ہوسکتے ہیں، پھر اگر مقابلہ مسلم فوج سے ہوتو دوحال سے خالی نہیں یا تو وہ بالکل اسلامی ضابطہ کے مطابق بالکل شرعی جہاد کے تحت ہوگی تو اس کے مقابلہ کا دوسرا حکم ہوگا اور اگر محض دنیوی معاملات ومفادتک یہ تقابل محدود ہوگا تو اس کا حکم دوسرا ہوگا جو وقت پر دریافت و تحقیق سے واضح ہوسکے گا، پھر اس سے متعلق احقر کی ایک شرعی اور واقعی تدبیر بھی مفصل جواب میں مذکور ہے ملاحظہ فرمالیں، نیز یہ ضابطہ مسلم ہے کہ خطرہ موجودہ ومتحقق کے اسباب حفاظت کو خطرہ موہوم کی وجہ سے ترک نہ کریں گے، بلکہ اس کے اسباب حفاظت کو فوراً اختیار کریں گے، جب خدانخواستہ اس خطرہ موہوم کا سامنا ہوگا تو اس کے اسباب حفاظت بھی اختیار کئے جائیں گے اس لئے یہ خطرہ بھی موثر نہ ہوگا۔

پھر محض تقریب فہم کے لئے ایک صورت یہ بھی پیش خدمت ہے،مثلاً ایک جائداد جس کے مالک مسلم وغیر مسلم دونوں مشترک طورپر ہوں اور ایسا بکثرت ہوسکتا ہے، بلکہ ہوتا ہے جیسے عقد شرکت وعقد مضاربت کی شکل میں ہوتا ہے، اس صورت میں حقیقت کے بارے میں نزاع مسلم سے یا مسلم گروپ سے ہوجائے تو اس وقت شرعی کیا حکم ہوگا؟ اسی طرح کبھی آبادی میں مسلم وغیر مسلم کی مشترک رہائش کی شکل میں ہو اور اس آبادی پر قطاع الطریق جس میں مسلم وغیر مسلم دونوں شریک ہوکر حملہ آور ہوں تو شرعی حکم کیا ہوگا؟ اسی قسم کا قریب قریب حکم صورت مسئولہ میں بھی نکل سکتا ہے جو عین وقت پر منقح ہوسکتا ہے،فقط واللہ اعلم بالصواب

محمد نظام الدین اعظمی،مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

۱-جنات کا ذریعہ معاش:

جنات کا ذریعہ معاش کیا ہے؟

۲-حضرت جبرئیل علیہ السلام کے سلام کا حضور ﷺ کیا جواب دیتے تھے؟

جب حضور پاک ﷺ کی خدمت میں حضرت جبریلؑ اللہ کی جانب سے سلام لایا کرتے تھے تو کیا آپ ﷺ جواب دیتے تھے؟

۳-ہمہ وقت قرآن ساتھ رکھنا:

ایک شخص اپنے ہمراہ ہمہ وقت قرآن کا کوئی پارہ رکھ سکتا ہے یا نہیں؟

۴-واقعہ معراج سے قبل قرآن کتنا نازل ہوا تھا؟

الف-قرآن پاک حضور ﷺ پر معراج سے قبل کتنا نازل ہوا تھا؟

ب-دودھ دیتی بھینس کے آج کل سواں لگا کر دودھ نکالتے ہیں یہ جائز ہے یا نہیں؟

الجواب وباللہ التوفیق:

۱-احادیث میں آتا ہے کہ ہمارے کھائے ہوئے گوشت کی ہڈیاں اور کوئلہ ان کی خوراک ہے (۱)، باقی انکا ذریعہ معاش کیا تھا احقر کو معلوم نہیں۔

۲-آپ اسی طرح سے جواب باحسن منہا دیتے تھے جس طرح آپ نے یہاں جواب دینے کی تعلیم فرمایا ہے۔

۳-رکھ سکتا ہے باقی اس کی حفاظت کرنا بھی واجب ہوگا۔

۴ (الف)-اس تعداد کا معلوم کرنا موقوف علیہ نجات نہیں، اس لئے موضوع سے خارج ہے، یہ مسئلہ ان کتابوں میں تلاش فرمایئے جن میں نزول آیات کی تاریخ وترتیب سے بحث وریسرچ کی گئی ہے، ہاں آیت "واذ یمکر بک الذین کفروا"(۲) کے نزول کے بعد آپ ﷺ نے ہجرت فرمائی۔

۴ (ب)-جائز ہے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۶/۱۲/۱۴۰۳ھ

۱- "عن عبد اللہ بن مسعود قال: قدم وفد الجن علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم، فقالوا یا محمد انہ امتک أن لایستنجوا بعظم او روثۃ او حممۃ فإن اللہ عزوجل جعل لنا فیہا رزقا قال فنہی النبی ﷺ عن ذالک، ابو داؤد کتاب الطہارۃ باب ماینہی عنہ ان یستنجی بہ" (بذل المجہود ۱/۲۹، وقال فی المرقاۃ شرح مشکوۃ ان الحروث لمواہبہم ۱/۳۵۶، مکتبہ اشاعت الاسلام)۔

۲- "وإذ یمکر بک الذین کفروا لیثبتوک أو یقتلوک أو یخرجوک ویمکرون ویمکر اللہ واللہ خیر الماکرین" (سورۃ انفال:۳۰)۔

کیا علماء کے لئے شریعت کے بنیادی احکام میں قانون سازی درست ہے؟

لما كتب بصدر اصدار كتاب موضوعه دعوةأوسع الأمر في البلاد الإسلامية لتقنين أحكام الشريعة الإسلاميه وإصدارها في أنظمة أو قوانين شرعية بعد إختيار و ترجيح من قبل هيئة مختارة من كبار العلماء ثم إلزام القضاء بتطبيقها دون غير ها بدلا من ترك الإختيار والترجيح لكل قاضي منفردا مما يسبب تعارضا في الأحكام القضائية في القضايا المتشابهة في عناصرها ودقائقها نتيجة لتعدد الآراء الفقيه في المسئله الواحدة لذا ألتمس من فضيلتكم التكرم ببيان رأيكم في المسائل الآتية لاستئناس به.

١- هل مثل هذا التقنين المستعد من الأحكام الشرعية الإسلاميه متى أصدره ولي الأمر وألزم القضاء به بدعة في الدين محرمة أم يعد من قبيل الرد إلى الله والرسول؟

٢- هل يجوز للقاضي متى ألزمه ولي الامر بتطبيق نظام أو قانون معين مستعد من أحكام الفقه الإسلامي أن يحكم به قضاء ولو اعتقدأن رأياً آخر أصح منه وأقوى منه؟

٣- هل افضل وأجدى أن يتدخل ولي الأمر لتقنين احكام الشرعية الصلبة . وتجديد التعزيرات عن طريق مجموعة من الفقهاء الموثوق بهم أم يترك الاختيار و الترجيح لاجتهاد القاضي هذا والله اسأل لكم الاجر المثوبة ولكم خالص شكري و تقديري حفظكم الله.والسلام

مولانا ولی عیسیٰ (مدرسہ دارالعلوم جامع مسجد بڑودہ گجرات)

الجواب وبالله التوفيق:

بسم الله الرحمن الرحيم صاحب الفضيلة والكرامة السلام عليكم وعلىٰ من لديكم ورحمة الله وبركاته لقد شرفنا تصديركم الينا للمشورة فها انا حاضر للخدمة مع قلة البضاعة لدى فاعلموا أن الأحكام الشرعية العملية على ثلاثة أنواع:

١. العبادات (الصلوة والصوم والزكوة وغير ذالک)

٢.المعاملات (المناكحات والمخاصمات والمعارضات المالية وغيرها)

۳۔ العقوبات (الحدود والقصاص والكفارات وغيرها)

اما الثالث لااحتياج فيها إلى التقنين بل لا يجوز تقنينها لان الكل منها منصوص والنصوص هو القانون ۔ واما الاول۔

فالتقليد فيها واجب لامام معين من الأئمة المجتهدين الأربعة لايجوز الخروج عنه، ومسالكهم متنوعة ومنظورة بتنوعات كثيرة وتطورات شتى لا يمكن اجتماعها في قول واحد في كل حال فكيف يسوغ التقنين علىٰ أصولكم بل يورث التقنين مفسدة عظيمة في الدين۔

واما المعاملات فبعض منها منصوصة وبعض منها اجتهادات ائمة الهدى وداخلة في دائرة التقليد وحُكم كل منها حكم النوع الأول، أما الثالث لا يحتمل التقنين، وبعض منها مسائل سياسية لا تتعلق بالتقليد ولا بصراحة النصوص ولا باجتهادات الأئمة فيسوغ التقنين فيها تحت الحدود الشرعية بأصول شرعية صحيحة كما قننها العلماء الفحول السابقون في الزمن الماضي و صنفوا لها تصانيف نافعة كالمجلة وغير ذلك فيسوغ لكم التقنين ايضاً فيها على هذا الاسلوب المذكور مقتديا بالأ سلاف المعتمدين الصالحين، ولا تعد بدعة بل تكون من قبيل الدعوة لهم الى الله والرسول وردهم إليها وهكذا طالب من علماء ديوبند صاحب الدولة العثمانية (حيدر آباد دكن)۔

في زمنه ان يرتبوا الأحكام الشرعية على طور القانون نمرة بعد نمرة فرتبوها وجعلوها في مجلة بترتيب حسن واسلوب جيد وارسلوا إليه (صاحب الدولة والفضيلة) فاستحسنه واعجب به ۔

وأنا أرجو أن يكون ذالك كافيا وافيا في ذالك المدخل حاويا للمسائل والأحكام المعتبرة إلا جزئيات يسيرة حادثة بعمله في يومنا هذا فلتطالعوه ، وأرجو أيضا أن يورث لكم البصيرة ويرشد كم إلى القوة في هذا المجال وهذا ما عندي مرتجلا والتفصيل عند العمل ان شاء الله تعالىٰ وهو الموفق والمعين المرشد الى السداد والصواب وهو أعلم واليه المرجع المآب۔ فقط والسلام وايانا بمنه وكرمه ۔

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

پڑوسی کے بعض حقوق کا بیان، چور بازاری اور سودی کاروبار کا حکم:

ایک شخص کے گھر کا پانی باپ دادا کے زمانہ سے اپنے بغل والے پڑوسی کے گھر سے ہوکر نکلتا ہے، یعنی قدیم زمانہ سے اس کے گھر کی نالی پڑوسی کے گھر سے ہوکر سڑک پر نکلتی ہے۔ موجودہ صورت میں اب پڑوسی کو اس پر کچھ اعتراض ہے، وہ اصرار کرتا ہے کہ آپ نالی کا رخ پھیر لیجئے، نالی کے رخ کا مطلب یہ ہے کہ اپنے گھر سے ایک نئی نالی نکال لئے، اس صورت میں ظاہر ہے کافی خرچہ بیٹھے گا۔

الف-سوال طلب امر یہ ہے کہ نالی کا رخ پھیرنے میں جو خرچہ بیٹھے گا شرعاً پڑوسی پر کچھ واجب ہوتا ہے یا نہیں؟ یعنی اس خرچہ میں دونوں نصف نصف شریک ہوں گے یا نہیں؟

ب-عرف رواج عام تو یہ ہے کہ آدھے آدھے کا کچھ رقم کے دونوں ذمہ دار ٹھہرتے ہیں، یہ آدھا خرچے بر چے لینا کیسا ہے؟ آیا جائز ہے یا شرعاً کوئی قباحت ہے؟

۲- عام طور سے شہروں میں تمام بازاروں کے ساتھ ایک چور بازار بھی ہوتا ہے جہاں عموماً تمام چیزیں چوری ہی کی رہتی ہیں، یہ جانتے ہوئے وہاں کی چیزیں خریدنا کیسا ہے؟ اس میں کوئی شرعی قباحت ہے یا نہیں؟

ب- نٹ کی لکڑیاں خریدنا کیسا ہے جب کہ ان کا یہی پیشہ ہے کہ دوسروں کے باغات سے لکڑیاں کاٹ لاتے ہیں اور بیچتے ہیں۔

۳-کاروباری سلسلے میں کبھی کبھی مجبوراً بغیر قصد کے سود دینا ہی پڑ جاتا ہے مثلاً ایک گانٹھ مال خریدا اور ایک ہفتے یا ایک مہینے کا ڈیو(وقت) لیا مشتری کا خیال ہوتا ہے کہ میں رقم وقت پر چکادوں گا لیکن کبھی بعض مجبوریوں کی وجہ سے نہیں چکا پاتا، ادھر مہاجن کا اصول یہ ہے کہ ڈیو پورا ہونے کے بعد اگر رقم اس کے ہاتھ میں نہیں پڑتی تو فٹ سے سود کے دس بیس روپے بڑھا دیتا ہے جس کو مجبوراً دینا ہی پڑتا ہے، اس صورت میں کیا کرنا چاہئے، آیا سود دینے کی گنجائش اس کے لئے ہے یا نہیں، تفصیلی جواب سے آگاہ فرماویں۔

الجواب وباللہ التوفیق:

ا-جب قدیم زمانہ سے اسی طرح چلا آرہا ہے تو ظاہر یہی ہے کہ کسی صحیح معاہدہ یا بنیاد پر قائم ہے، ایسی صورت میں وہ پڑوسی مجبور نہیں کرسکتا ہے، "في الذخيرة عن أبي الليث سيل سطوحه إلى دار رجل وله فيها ميزاب قديم

فليس له منعه (إلى قوله) والفتوى على ما ذكره أبو الليث ثم...... (إلى قوله) أن القديم يترك على قدمه"(۱)۔

ہاں آپس کی مصالحت سے فریقین نصف نصف خرچے جس طرح کا معاملہ آپس میں کرلیں جائز اور بہتر ہے۔

۲-الف-جس چیز کے بارے میں ظن غالب یہ ہوجائے کہ یہ یقیناً چوری کی ہے اس کو نہ خریدنا چاہئے۔

ب-نٹ کے بارے میں یہ احتمال غالب ہے کہ مالکان باغ نے اس بات کی اس کو چھوٹ دے رکھی ہو، اس لئے ان سے خریدنے میں گنجائش ہے، ہاں یہ ہے کہ اگر دلیل شرعی سے چوری کی ہونا معلوم ہوجائے تو خریدنا جائز نہ ہوگا۔

۳- حتی المقدور وقت مقررہ (ڈیو) کے اندر ادا کرے اور مجبوری کی صورت دوسری ہے اس میں گنجائش ہوسکتی ہے۔فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

حکومت کی ایک اسکیم کا حکم:

یہاں پر یعنی سنگاپور گورنمنٹ مکانات بنا کر کرایہ پر دیتی اور بکری بھی کرتی ہے، جو مکان کرایہ پر دیتی ہے اس کو بھی کچھ مدت کے بعد اس آدمی کو بکری کردیتی ہے جو کہ گھر میں رہتا ہے، اگر وہ نہ خرید سکا تو اس کو نکال دیتی ہے۔اور یہ مکان جو بن چکے ہیں اور بن رہے ہیں سب فلیٹ میں کافی اونچے ہیں اور بہت تلے ہوتے ہیں تو جن مکانوں کی سرکاری بکری ہوتی ہے،خواہ نیا ہو،شروع میں بکری کرنے والا ہو، یا کہ جس میں کوئی کرایہ دار پہلے کرایہ پر رہ چکا ہے اور بعد میں بکری کررہی ہو تو اس کی بکری کی شکل یہ ہے کہ نقد اور ادھار کی قیمت ایک ہوتی ہے جس میں کہ سود شامل کرلیا جاتا ہے۔اور قسط ادا کرتے کرتے اصل رقم سے زیادہ ہوجاتی ہے۔فلیٹ میں مکانوں کی قیمت دس ہزار سے لے کر ۵۰ ہزار ڈالر تک ہوتی ہے، عام طور سے اسی شکل میں فلیٹ چھوٹے بیوپاری یا سرکاری ملازم کو بکری ہوتے ہیں۔اور یہاں سب مکان سرکار کے ہوتے جارہے ہیں اور اوپر کی تدبیر کے مطابق سرکار بکری کرتی ہے آیا یہ جائز ہے یا ناجائز۔اس طرح ایک سوال اور یہ ہے کہ اکثر یہاں عام طریقہ سے زیادہ گاڑی، یعنی موٹر خود کی رکھنے کی ضرورت پیش آتی ہے تو اس کی خرید کی شکل یہ ہے کہ نقد اور ادھار کی قیمت یکساں ہوتی ہے، مگر ادھار جو موٹر گاڑی لی جاتی ہے اس کی قیمت کا ایک چوتھائی پہلے جمع کرنا پڑتا ہے۔اور باقی رقم قسطوار ادا کرنی

۱- شامی ۵/ ۲۸۵ فصل فی الشرب۔

پڑتی ہے جو کہ اخیر میں اصل رقم سے زیادہ ہوجاتی ہے جب تک قسط ادا نہیں ہوجاتی اس وقت تک خریدنے والا کرایہ دار شمار ہوتا ہے اور کمپنی والا مالک شمار ہوتا ہے اور سارے کاغذات موٹر خریدنے کے کمپنی کے پاس رہتے ہیں جو پوری رقم ادا ہونے پر واپس کرتے ہیں تو آیا اس شکل میں ادھار موٹر گاڑی خریدنا جائز ہے یا کہ ناجائز ہے؟

الجواب وباللہ التوفیق:

ا-جب حکومت یہ کرتی ہے کہ جو نہ خرید سکے حکومت اس کو نکال دیتی ہے، تو یہ بڑی مجبوری ہے کہ اگر نکال دے تو کہاں رہے،نقد خریدنے کی طاقت نہیں، پردیس کا معاملہ ہے۔پس اس مجبوری کی وجہ سے تو اگر خریدنے والے پاس رہنے کے لائق اپنا ذاتی مکان نہ ہوتا ،سوال میں لکھے ہوئے ادھار خریدنے کے طریقہ کے مطابق ادھار بھی خرید سکتا ہے۔اسی طرح اگر نقد خریدنے میں کسی قانونی خطرہ کا اندیشہ ہو جب بھی بطریق مذکور ادھار خرید سکتے ہیں اور اگر بیچنے والے محکمہ کے کسی ذمہ دار سے اس طرح بات کرلیں کہ آپ جتنی قیمت ادھار کی قیمت رکھتے ہیں اتنی ہی نقد کی قیمت بھی رکھتے ہیں اور چوتھائی پہلے لے کر پھر قسط وار جو وصول کرتے ہیں اس میں نقد کی قیمت سے اتنا زیادہ وصول کرتے ہیں ،مثلاً نقد کی قیمت دس ہزار ہے اور ادھار میں کل وصولی ۱۲ ہزار ہوتی ہے تو اگر آپ ہم سے اس طرح معاملہ کرلیں کہ ادھار کی کل قیمت بارہ ہزار ہے اور ایک چوتھائی قیمت ڈھائی ہزار تو ابھی لیں گے اور باقی ساڑھے نو ہزار قسط وار لیں گے۔پس اگر وہ اس بات کو آپ کی مان جائے اور اسی طرح بات ومعاملہ کرلے تو اگرچہ زبانی ہی اس طرح معاملہ کرے اور کاغذ میں اپنے قانون کے مطابق نقد کے برابر ہی قیمت دکھلائے جب بھی نقد خریدنے کی قوت رہتے ہوئے بھی ادھار خریدنا درست ہوجائے اور نقد سے بڑھ کر زبانی بتائی ہوئی کل رقم بھی اصل قیمت ادھار کی ہوجائے گی اور سود کا شبہ ختم ہوجائے گا، کیونکہ نقد کی قیمت سے ادھار میں قیمت زیادہ لینا جائز ہے۔

۲-نقد خریدنے کی طاقت نہ ہونے کی صورت میں یا نقد خریدنے میں کسی قانونی پریشانی میں مبتلا ہوجانے کے اندیشہ کی صورت میں موٹر کو بھی ان کے ذکر کردہ قانون کے مطابق خریدنے کی بوجہ مجبوری گنجائش ہے،لیکن اگر سوال نمبر ا میں لکھے ہوئے طریقہ کے مطابق محکمہ کے کسی ذمہ دار سے معاملہ وبات کرلیں تو اگرچہ وہ معاملہ اور بات زبانی ہی ہوگی، مگر سود کی خرابی سے محفوظ رہیں گے، البتہ خریداری کے معاملہ اور کرایہ داری کے معاملہ کے تداخل کی خرابی میں میں بھی ابتلا رہے گا ،مگر

اس سے بچنے کی کوئی تدبیر اختیار میں نہیں ہے، اس لئے بوجہ مجبوری اس کی گنجائش رہے گی۔ اور برداشت کریں گے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور، ۲۳/۳/۹۵ ۱۳ھ

امداد باہمی کے مقصد سے انجمن میں جمع شدہ رقم کو بینک میں رکھا جا سکتا ہے؟

ایک کارخانے کے آٹھ سو مسلم ملازمین ایک انجمن قائم کرتے ہیں، اور ہر ماہ اپنی تنخواہ سے ایک روپیہ فی کس کے حساب سے رقم جمع کرتے ہیں، اور اس انجمن کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ رکن ملازم کے حسن خدمت سے سبکدوشی پر اس کی جمع شدہ رقم ۲۵ فی صد اضافہ کے ساتھ اس کو واپس دی جائے، یا ملازم کے دوران ملازمت فوت ہو جانے پر ہر رکن دو روپیہ فی کس کے حساب سے اسی ماہ کی حد تک رقم جمع کر کے یکمشت رکن متوفی کے پسماندگان کو مالی اعانت کریں۔ مسئلہ درپیش یہ ہے کہ جمع شدہ رقم جس میں ہر ماہ اضافہ ہوتا رہتا ہے کسی ایسے شعبہ یا ادارہ میں مستعمل ہو جس سے جائز منافع حاصل ہو۔ ملازمین ادارہ مذکورہ کے لئے اپنی مصروفیات اور دیگر حالات کی بناء پر آج خود تجارت یا صنعت و زراعت میں سرمایہ جمع شدہ کا استعمال کرنا مشکل ہے۔ دریں حالات ارکان مقتدر انجمن مذکور یہ چاہتے ہیں کہ ہندوستان کے کسی بینک میں اس رقم کو محفوظ کر دیا جائے یا بڑے بڑے صنعتی اداروں میں جہاں حصص فروخت ہوتے ہیں اس سرمایہ کو لگایا جائے، ایسی صورت میں بینک سے جو منافع بشکل سود ملتا ہے یا حصص کے سلسلہ میں جو معاوضہ ایک مقرر شرح فی صد سے طے شدہ ملتا ہے وہ ہمارے لئے جائز ہوگا کہ نہیں؟

علاوہ ازیں متعلقہ ارباب انجمن مذکور یہ چاہتے ہیں کہ موجودہ حالات میں وہ کون کونسی جائز صورتیں ہیں جن میں گھر بیٹھے سرمایہ لگانے پر منافع ملے تو جائز ہو سکتا ہے اور کونسی صورتوں میں ناجائز فقط۔

الجواب وباللہ التوفیق:

انجمن کے مقاصد و ارادے نیک ہیں، اللہ تعالیٰ صحیح طریق پر عمل کی، نیز مقاصد حسنہ میں کامیابی کی توفیق بھی عطا فرمائے۔ یہ رقم کسی بینک میں محفوظ کرنے کے بجائے مناسب یہ ہے کہ انجمن کے مقتدر اراکین ایک نگراں کمیٹی بنا کر اس کی نگرانی میں اس رقم سے اصول مضاربت پر کچھ کاروبار کرائیں اور حساب و کتاب و نفع و نقصان کی برابر جانچ کرتے رہیں اور

تمام ملازمین جن کی رقمیں اس میں شریک ہیں سب کو حسب حصہ رسدی نفع دیتے رہیں، کسی بڑے صنعتی ادارہ یا کمپنی کے حصص بھی خرید سکتے ہیں جہاں شرکت یا مضاربت کے اصول پر کام ہوتا ہو، لیکن ہر حال میں یہ ضروری ہے کہ کسی ملازم کے سبکدوش ہونے پر ہر حال میں محض ۲۵ فی صدی اضافہ کر کے نہ دیا جائے، ہاں یہ ہوسکتا ہے کہ کسی ملازم کے دوران ملازمت فوت ہوجانے پر باقی اراکین اپنی طرف سے دو روپیہ فی کس کی اعانت خود پسماندگان کو کردیں، لیکن یہ ان اراکین کا تبرع اور احسان ہوگا، اس اعانت سے اس ملازم کی جمع شدہ رقم سوخت کردینے کا حق نہ ہوگا اور نہ ایسا کرنا جائز ہی ہوگا، بلکہ اس فوت شدہ ملازم کی جمع شدہ رقم کے نفع ونقصان کا حساب کر کے اور اخراجات وضع کر کے جو رقم بچی ہوگی اس کو بھی ان پسماندگان کو دینا ضروری رہے گا، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۵/۵/۹۵ ۱۳ھ

مختلف فیہ ومجمع علیہ کے مفہوم میں فرق:

مختلف فیہ، متفق علیہ، مجمع علیہ اور مفتیٰ بہ کی ایسی تشریح کیجئے کہ عوام سمجھ جائیں۔

الجواب وباللہ التوفیق:

مفتیٰ بہ صرف اس قول کو کہنا جس پر اجماع ہو چکا ہو۔ صحیح نہیں ہے، مفتیٰ بہ کو مجمع علیہ میں محصور کرنا غلط ہے اور مجمع علیہ تو مفتی بہ ہوگا ہی، مختلف فیہ اقوال میں بھی مفتیٰ بہ اس قول کو کہتے ہیں جس کو محققین واصحاب ترجیح نے فتوی کے لئے اختیار ومنتخب کیا ہو۔ علامہ ابن عابدین کی ''عقود رسم المفتی'' میں نیز عموماً کتب فتاوی کے باب رسم المفتی میں اس پر مفصل کلام کیا ہے اور اس کی کچھ علامتیں بھی بیان کی ہیں۔ مثلاً یہ الفاظ: "به يفتي، عليه الفتوى، عليه المعمول. عليه الاعتماد، وهو المختار وغيره وغيره"، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

الجواب صحیح: محمود غفی عنہ، سید احمد علی سعید

یوم عرفہ کا صحیح مصداق کونسا دن ہے؟

حدیث شریف میں جو یوم عرفہ کی فضیلت وارد ہوئی ہے اس کا صحیح مصداق کون سا یوم ہے، جبکہ دیکھنے میں آتا ہے کہ مثلاً سعودی عرب میں جس دن یوم عرفہ ہوتا ہے اس کے تقریباً دو دن کے بعد ہمارے ملک میں یوم عرفہ ہوتا ہے (یعنی ذی الحجہ کی نویں تاریخ) ہم اپنے حساب سے یوم عرفہ شمار کرتے ہیں۔ اس تفاوت کی بناء پر یہ پوچھنے کی ضرورت پیش آئی کہ یوم عرفہ کا مصداق ثواب کے اعتبار سے کون سا دن ہے؟

الجواب وباللہ التوفیق:

اس کا صحیح مصداق سمجھنے کے لئے پہلے یہ سمجھئے کہ یہ حقیقت تسلیم شدہ عند الکل ہے کہ جناب باری تعالیٰ کے رحم وکرم وفضل خصوصی کی توجہ پورے بساط ارض پر گوشہ گوشہ میں ہمیشہ قائم ودائم رہتی ہے، جیسا کہ ان احادیث پاک سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر باری سبحانہ وتعالیٰ محض عدل کا معاملہ فرمائیں تو عالم بالکل ہی نہ رہے، بلکہ سارا عالم ختم وبھسم ہوجائے ان تمام ترحمات کے باوجود پھر انسانی وبشری ضعف پر نظر فرماتے ہوئے اس کے آخرت میں ترقی وفلاح حاصل کرنے کے لئے ایک ضابطہ مقرر فرما کر بعض مہینوں، بعض دنوں، بعض تاریخوں اور بعض اوقات کو متعین فرما دیا کہ جو پائے گا وہ اپنی آخرت بنالیگا اور سنوار لے گا، اور ان متعینہ اوقات کو بندہ کے پانے کے لئے ایک ضابطہ مقرر فرما دیا کہ اس کے مطابق پاسکتے ہو، مثلاً ماہ مبارک رمضان کہ اس کی فضیلت: ''**من صام رمضان إيماناً واحتساباً غفر له ما تقدم من ذنبه**''(۱)، پھر اس کی فضیلت پانے کے لئے یہ ضابطہ فرمایا ان آیات میں ''**شهر رمضان الذی أنزل فيه القرآن هدى للناس وبينات من الهدى والفرقان فمن شهد منكم الشهر فليصمه**'' (۲) متعین فرما دیا کہ پس جو شخص ماہ رمضان کا شہود کر لے دیکھ لے اس کو روزہ رکھ کر اس کی فضیلت حاصل کرنا چاہئے اور شہود ماہ رمضان کی شرح وتفسیر احادیث پاک میں یہ آئی ہے: ''**صوموا لرؤيته وأفطروا لرؤيته**'' (اس کی تخریج گذر چکی ہے) اور ''**ولا تصوموا حتى تروا الهلال ولا تفطروا حتى تروا الهلال**'' (۳) اور ہلال نام صرف اس چاند کا ہے جو ہر ماہ وشہر میں دو دن چاند کے غائب ہونے کے بعد نظر آتا ہے پس انہیں دنوں میں اس کے دیکھنے کا اعتبار ہے۔

۱- ترمذی عن ابی ہریرۃ، حدیث نمبر: ۶۷۸ ابواب الصوم ۳/ ۳۹۳۔

۲- سورۃ بقرۃ ۱۸۵۔

۳- اللؤلؤ والمرجان/ ۲۳۹۔

پھر حدیث میں آیا ہے: ''الشهر هكذا وهكذا (إلى قوله) يعني مرة تسعاً وعشرين ومرة ثلثين'' (۱)، پس مہینہ انہی دوطریقوں میں دائر رہتا ہے، پس جس طرح ۳۰ دن سے زیادہ نہیں ہوسکتا، اسی طرح ۲۹ دن سے کم نہیں ہوسکتا ، پس اگر ۲۹ ویں تاریخ سے قبل کسی بھی جگہ یا شہر میں رویت ہلال ہوجائے وہ اس حدیث پاک کے خلاف ہونے کی وجہ سے معتبر نہ ہوگی ، اور روزہ رکھنا صحیح نہ ہوگا، بلکہ اگر کوئی رکھے گا تو: ''لا تصوموا حتى تروا الهلال'' (۲) والی حدیث اور ''لا يتقدمن أحدكم رمضان بصوم يوم أو يومين'' کے خلاف کرنے کی وجہ سے گنہگار ہوگا، پس جس طرح ہمارے یہاں کی رویت کے اعتبار سے ماہ مبارک رمضان کی پہلی تاریخ متعین ہوکر رمضان کی فضیلتیں ہوتی ہیں، اسی طرح یوم عرفہ کی تاریخ بھی ہمارے یہاں کی رویت ہلال کے اعتبار سے متعین ومتحقق ہوکر اسی دن کے مرویہ اعمال کرکے اس کی فضیلت حاصل کی جائے گی، بلکہ یہی حکم صوم عاشورہ اور صوم نفل وغیرہ سب میں جاری ہوگا۔

خلاصہ یہ ہے کہ محض اپنے خطہ کی تاریخ ودن کا اعتبار مذکورہ بالا اصول کے مطابق جاری ہوگا، نہ کہ کسی اور خطہ کی تاریخ ودن کا، خواہ سعودی عربیہ ہی کے اعتبار سے کیوں نہ ہو، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۹/۱/۱۴۱۲ھ

امراض شکم میں مبتلا کا حکم:

۱-سائل امراض شکم کا دائمی مریض ہے، شدت قبض اور دائمی کثرت ریاح سے دس منٹ بھی باوضو نہیں رہ سکتا، نماز کو مختصر کرتا ہوں اگر ریاح کو روکتا ہوں تو تکلیف ہوتی ہے، درود شریف ابراہیمی اور سورہ یٰسین زبانی پڑھنے کا معمول چلا آرہا ہے جس میں ایک گھنٹہ کا وقت لگتا ہے، اگر ہر بار وضو کروں تو شاید دوپہر تک بھی پورا نہ کرسکوں، ایسی حالت میں کیا کیا جائے، معمول کو ترک کرنے کی بھی طبیعت نہیں چاہتی ہے؟

۲-جس مکان میں قرآن پاک اور دیگر کتابیں رکھی ہوں اس میں تعلقات زن وشوہر کے ساتھ جائز ہے یا نہیں؟

پہلے نور محمدی کی تخلیق ہوئی یا قلم کی:

۳-ایک جماعت کا عقیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے تو نور محمدی پیدا فرمایا، دوسری جماعت کا مولوی کہتا

۱- کتاب اللؤلؤ والمرجان ۲۴۰/۱ حدیث نمبر: ۶۵۵۔

۲- کتاب اللؤلؤ والمرجان ۲۴۰/۱ حدیث نمبر: ۶۵۷۔

ہے سب سے پہلے قلم کو پیدا کیا اور حدیث "أول ما خلق الله نوری" کو بلا سند کہتا ہے، اس لئے کہ حضور ابن آدم ہیں اور جن کی پیدائش مٹی سے ہوئی نور سے نہیں؟

علی احمد انصاری (موضع پنڈ وہیا، منصور رنگر، بہرائچ)

الجواب وبالله التوفيق:

۱-سورہ یٰسین لکھی ہوئی ہوتو اسکو بلا وضو چھونا جائز نہیں ہوتا، "لایمسه إلا المطهرون" (۱)، بغیر چھوئے ہوئے سورہ یٰسین کا پڑھنا بلاشبہ جائز رہتا ہے، اس لئے آپ زبانی اپنا معمول برابر پڑھتے رہیں اس میں کوئی خرابی یا حرج نہیں ہے، خاص کر اس معذوری کی صورت میں۔

۲-اگر قرآن پاک اور فرمان رسالت قد آدم سے نیچے ہوتو بے ادبی ہے وکراہت غلیظ ہے اور اگر قد آدم سے اونچی رکھا ہوا اور پائتی نہ ہوتو جائز بلا کراہت ہے اور بے ادبی بھی نہیں ہے، اور اگر قد سے اونچی ہو، مگر پائتی یعنی پیر کی جانب ہوتو کراہت خفیفہ ہے اور پردہ سے مستور رکھنا افضل ہے، "یجوز قربان المرأة فی بیت فیه مصحف مستور کذا فی القنیة" (۲)۔

۳-پہلی جماعت کا عقیدہ وقول صحیح ہے: "أول ما خلق الله القلم" (۳) اس کے منافی نہیں ہے، اس لئے کہ "أول ما خلق الله القلم" میں اولیت سے حقیقیہ مراد نہیں ہے، بلکہ محض اولیت اضافیہ، اولیت فی الجملہ، اولیت اعتباریہ مراد ہے، اس لئے کہ اسی درجہ کی اور بھی حدیثیں ہیں، مثلاً ایک حدیث میں ہے کہ وہ قلم جنت کی نہروں میں سے ایک نہر نور کی تھی اس سے بنی، یعنی وہ نہر جنت کی مراد ہے، اس قلم سے اول واقدم ہوئی اور جب وہ نہر اول واقدم ہوئی تو جنت بدرجہ اولی بدرجہ قلم سے اولی واقدم ہے، اسی طرح ایک حدیث میں ہے کہ وہ قلم نور سے بنی تو وہ نور یقیناً اس قلم سے اولی واقدم ہوا، اس لئے کہنا پڑے گا کہ "أول ما خلق الله القلم" میں اولیت سے اولیت حقیقیہ مراد نہیں ہے، بلکہ محض اولیت اضافیہ اور فی الجملہ اولیت اعتباریہ مراد ہے، یعنی محض بعض اعتبار سے اول ہے، نہ کہ تمام اعتبارات سے اور اس کی تفصیل خود ایک حدیث پاک میں موجود ہے، چنانچہ ایک حدیث میں ہے کہ جب مشیت الٰہی قضا وقدر لکھنے کی ہوئی تو اللہ تعالیٰ نے قلم کو پیدا فرما کر حکم

۱- سورۂ واقعہ: ۷۹۔

۲- الفتاوی الہندیہ ۵/۳۲۲۔

۳- فتح الباری عن ابن عباس کتاب بدء الخلق ۱۰/۲۸۹۔

دیا کہ اکتب (لکھو) تو قلم نے عرض کیا کہ بارالٰہی کیا لکھوں (ما اکتب) جواب ملا کہ اکتب ما ھو کائن، یعنی وہ تمام چیزیں لکھو جو قیامت تک یا ابد تک ہونے والی ہیں، اور ایک روایت میں ہے کہ اس قلم سے مراد ان ملائکہ کا قلم ہے جو قضا وقدر لکھنے کے لئے مامور تھے، یہ سب روایتیں تفسیر ابن کثیر وبغوی وغیرہ میں موجود ہیں، ان روایتوں سے جس طرح بہت سی چیزیں معلوم ہوئیں، مثلاً یہ کہ تمام کائنات عالم محض یوں ہی کیف ما اتفق (علی البھیت) نہیں پیدا ہو گئے ہیں، جیسا کہ ملحدین اور دہریوں کا خیال ہے، بلکہ سب ایک ایک نظم کے مطابق اور منظم ہیں، اسی طرح یہ بھی معلوم ہوا کہ یہ قلم اس موقع پر پیدا فرمایا گیا جب قضا وقدر کے لکھنے کا موقع آیا، اس موقع سے قبل یہ قلم پیدا نہیں ہوا تھا اور بہت سی چیزیں موجود تھیں، نور موجود تھا، ملائکہ موجود تھے، پس جب "أول ماخلق الله القلم" میں اولیت حقیقیہ نہیں، بلکہ محض اولیت اعتباریہ ہے تو "أول ما خلق الله نوری" سے کوئی منافات نہ رہی، بلکہ جس طرح اور نور موجود تھے اسی طرح نور محمدی بھی موجود تھا، بلکہ "أول ما خلق الله نوری" کی اولیت وقدمیت بھی قلم پر نکل آئی وھو المراد، پھر یہ کہنا کہ حضور ﷺ ابن آدمؑ ہیں، اس لئے آپ مٹی سے ہوئے نور سے نہیں نہایت تعجب ہے، اس لئے حضرت آدمؑ کا قالب اگر چہ مٹی سے تھا، مگر ذات وحقیقت تو مٹی سے نہیں تھی، ذات وحقیقت تو نئی نہیں، ذات وحقیقت تو اسی طرح اگر چہ سرکار دو عالم ﷺ کا قالب ناسوتی میں سے ہے، دراصل مٹی سے ہونا کب لازم آتا ہے، آپ کی ذات مبارکہ تو بہت اعلیٰ وارفع ہے، عام انسانوں کا بھی صرف قالب ناسوتی میں سے ہے اور اس کی حقیقت وذات ومجردات سے ہوتی ہے، پھر اول ماخلق الله نوری میں خلق (پیدائش) ناسوتی مراد نہیں ہے، بلکہ خلق نوری اور عالم مجردات کا مراد ہے، پس قالب ناسوتی پر قیاس کر کے یہ کہہ دینا کہ آپ کی پیدائش (خلق) نور سے نہیں ہوئی بالکل ناسمجھی کی بات ہوجائے گی۔ امید کہ اب خلجان رفع ہو کر اطمینان ہوجائے گا، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۶/۱۱/۹۹ ۱۳ھ

ایک فلاحی تنظیم کے بارے میں فیصلہ شرعی:

آج ہندوستان کے حالات ناگفتہ بہ موڑ پر پہنچ چکے ہیں۔ مسلمانوں کے جان ومال، عزت وآبرو کی حفاظت کی کوئی ضمانت نہیں، حکومت کی پالیسی بھی معاندانہ ہے۔ ان حالات میں مسلمان ہی اپنے بھائی کی امداد پر مجبور رہتا ہے۔ انہیں وجوہ کے پیش نظر یہاں امارات میں باشندگان اعظم گڑھ وجونپور نے فلاح المسلمین کے نام سے ایک تنظیم قائم کر رکھی ہے، اس کے ارکان منتخب ہو چکے ہیں۔ فی کس دس درہم ماہانہ چندہ معین کیا گیا ہے، تنظیم تین خاص امور کی پابند ہوگی۔

اول: فساد زدہ علاقوں کے مسلمانوں کی مالی امداد۔

دوم: کمیٹی نے ہر ممبر کو اس کا پابند کیا ہے کہ ہر ماہ چندے کی رقم ادا کریں۔ اگر کسی عذر سے دو ماہ نہ ادا کر سکا تو تیسرے مہینہ بکمل رقم تین درہم دینا ضروری ہے، ورنہ ممبری ختم کردی جائے گی اور سابق جمع شدہ رقم اس کو واپس نہیں ملے گی، کیا ایسا شرعاً جائز ہے، یہ زندگی بیمہ کی شکل تو نہیں، اگر خدا نخواستہ درست نہ ہو تو کیسی ترمیم کی جائے کہ مطابق شرع ہو جائے اور سب لوگ گناہ سے بچ سکیں۔

سوم: اگر کوئی ممبر دوران ممبری فوت ہو جاتا ہے تو اس کے ورثاء کو بیس ہزار درہم بطور امداد دیئے جائیں گے، ورثاء کی خواہش کے مطابق تدفین یہیں ہوگی۔ ورنہ میت ملک روانہ کردی جائے گی اس کا خرچ اسی بیس ہزار سے ادا کیا جائے گا، کیا محررہ رقم سے منتقلی کی اجرت دینا جائز ہے، نیز منتقلی کی بابت علماء کرام کیا فرماتے ہیں اگر معذور ہو جائے تو اس صورت میں بھی باہمی مشورے سے اس کی مالی اعانت کی جائے گی؟

محمد ارشد اعظمی

الجواب وبالله التوفيق:

تقریب فہم کے لئے ذخائر حدیث میں سے صرف چند حدیثیں نقل کی جاتی ہیں:

۱- ”عن نعمان بن بشيرؓ قال قال رسول الله ﷺ: ترى المؤمنين في تراحمهم وتوادهم وتعاطفهم كمثل الجسد إذا اشتكى عضو تداعىٰ له سائر الجسد بالسهر والحمى“ (متفق علیہ)(۱)۔

۲- ”عن ابن عمر أن رسول الله ﷺ قال: المسلم أخو المسلم لا يظلمه ولا يسلمه ومن كان في حاجته أخيه كان الله في حاجة ومن فرج عن مسلم كرية فرج الله عنه كربة من كربات يوم القيٰمة، ومن ستر مسلماً ستر الله يوم القيٰمة“ (متفق علیہ)(۲)۔

۳- ”عن النعمان بن بشيرؓ قال قال رسول الله ﷺ: المؤمنون كرجل واحد إن اشتكى عينه اشتكى كله، وإن اشتكى رأسه اشتكى كله“ (۳)۔

۱- صحیح مسلم للمنذری/ ۶۸، ۶۷، ۳، حدیث نمبر: ۱۷۷۳۔

۲- اللولو والمرجان/ ۱، ۰۱۷، حدیث نمبر: ۱۶۶۷، مسلم ۸/ ۷۷۳ باب تحریم الظلم۔

۳- مسلم ۸/ ۳۸۴ کتاب البر والصلۃ والآداب۔

ان روایات سے معلوم ہوا کہ مذکورہ بالا اقدام بہت بروقت اور بہت ضروری اور بڑا مستحسن ہے، بس شرط یہ ہے کہ بڑھو بڑھاؤ ترقی کرو، لیکن سر رہے قدموں تلے رسول کے۔ ذیل میں تنظیم کے تینوں امور کا شرعی حکم لکھا جاتا ہے۔

اول: فساد زدہ علاقوں کے مسلمانوں کی امداد ضروری و مستحسن ہونے میں کوئی کلام نہیں، صرف شرط یہ ہے کہ حدود شرع کے اندر رہے: "**کما دل قوله علیه السلام: إني ترکت فیکم أمرین لن تضلوا ما تمسکتم بهما کتاب الله و سنة رسوله**" (۱)۔

دوم: جو ممبر اس فیس کا بغیر کسی دباؤ وجبر کے محض اپنی خوشی ومرضی سے اور بطیب خاطر منظور کرلے گا تو یہ فیس دینا درست رہے گا، بلکہ شروع سوال میں لکھی ہوئی ضروریات وحالات کے پیش نظر بہتر ومناسب ہوگا کہ اس معاملہ میں ارکان کمیٹی کو اس دی ہوئی رقم کا کھلے دل سے مالک بنادیں، یعنی واپس لینے یا مانگنے کی نیت بالکل نہ رکھیں تو آئندہ بہت سی خرابیوں سے حفاظت اور بہت سے مقاصد صحیحہ کا حصول بآسانی ہوسکے گا، مثلاً ایک تو یہی کہ جب کسی میت کو ملک بھیجنا ہوگا تو اسی پسماندہ رقم سے بھیجنا آسان ہوگا یا کسی ہنگامی حالت پر بڑی رقم سے اعانت درکار ہوگی تو اس میں سہولت ہوگی، اس لئے مخیّر ومتمول حضرات کو اس تملیک کا لحاظ رکھنا خصوصی طور سے بہتر ہوگا، البتہ کمیٹی کے ارکان منتخب کرنے میں خوب چھان بین کر کے معتمد ودیانت دار حضرات کا انتخاب کیا جائے اور جب بطیب خاطر فیس دے دینے اور بطیب خاطر تملیکا دے دینے کا معاملہ کرے گا تو اس جملے (ورنہ ممبری ختم کردی جائے گی اور سابق جمع شدہ رقم اس کو نہیں ملے گی) کی گفتگو ہی ختم ہوجائے گی ہاں اگر بطیب خاطر فیس ممبری دے گا مگر دی ہوئی رقم کا کمیٹی کو مالک نہیں بنائے گا تو اس وقت اس معاہدہ (اگر ماہ فیس نہ دے گا تو تیسرے ماہ پورے تیس درہم دینا ہوگا) کا حکم شرعی یہ ہوگا کہ حسب ضابطہ شرع: "**إن المرء یعامل في حق نفسه کما أقر به**" (۲)، اس معاہدہ کا پابند رہنا ہوگا، البتہ اگر یہ شخص شرعاً معذور ہو اور شرعاً عذر کی وجہ سے نہ دے سکا ہو تو یہ چیز شرعاً قابل گرفت نہ ہوگی، بلکہ یہ اعذار صحیحہ عدم ادا کی جانب مشعر ہوجائیں گے اور ایسی صورت میں اس کی رقم اس کی مرضی کے بغیر ضبط کرنا لازم آئے گا جو ناجائز اور ظلم ہوگا اور اگرچہ بیمہ کی شکل نہ ہو، مگر حدیث پاک: "**لا یحل مال امرئ مسلم إلا بطیب نفس منه**" (۳) کے خلاف ہونے کی وجہ سے کسی دنیوی وبال میں بھی مبتلا ہوجانے کا شدید خطرہ ہوجائے گا، البتہ

۱- رواہ الشیخان۔

۲- قواعد الفقہ/ ۱۴۳۔

۳- "وفي غریب الحدیث لابن قتیبة: لا یحل لأحد منکم من مال أخیه شيء إلا بطیب نفسه" (۱/ ۱۸۱)۔

اس رقم کے واپس نہ کرنے کے جواز کی یہ صورت ہوسکتی ہے کہ اس رقم کے واپس نہ کرنے کے فوائد دنیوی واخروی بتلا کر اس کو اس پر راضی کرلیا جائے ایسا کرلینے سے سب گناہ سے بچ ہی نہیں جائیں گے، بلکہ حسب حالات ومجبوری اس تدبیر سے مستحق ثواب بھی ہوجائیں گے۔

سوم: میت کے ورثاء کو بیس ہزار درہم بطور امداد دینا بہت عمدہ اقدام ہے اور ان کی خواہش کے مطابق وہیں تدفین کردینا بلا ریب صحیح ومستحسن ہے، البتہ میت کو ملک روانہ کردینا یہ فعل اگرچہ شرعاً پسندیدہ ومستحسن نہیں، لیکن اگر روانہ کردیا جائے تو شرعاً جائز رہے گا، جبکہ روانگی ومنتقلی کا خرچ میت کے ترکہ سے نہ ہو، بلکہ لوگوں کی امداد باہمی سے یا فنڈ میں تملیکاً جمع شدہ رقم سے ہو، کیونکہ تملیکاً کمیٹی میں دے دینے کے بعد دینے والے کی ملک نہ رہے گی، یہ فائدہ اور اس قسم کے بہت سے فوائد اس رقم کو کمیٹی کی ملکیت میں دے دینے پر متفرع ہوں گے، جیسا کہ سوال نمبر ۱ کے جواب میں تفصیل گزرچکی ہے کہ میت کے ترکہ سے بھیجنے کا خرچ دینے میں یہ گفتگو ہوگی کہ مرنے کے بعد ترکہ وارثین میں نابالغ کی اجازت معتبر نہ ہوگی اور ان کے حصہ میں تصرف کرنا جائز نہ ہوگا۔ ترکہ کی رقم سے بھیجنا جائز ہوگا ورنہ ناجائز ہوگا، اس لئے وہی اوپر لکھی ہوئی صورت (کمیٹی کی تملیکاً حاصل کردہ رقم سے بیس ہزار جو ورثا کو بطور امداد ملتے ہیں اس میں سے یا اپنے طور پر چندہ جمع کرکے میت کو ملک بھیج سکتے ہیں، کیونکہ یہ رقمیں میت کا ترکہ نہیں ہیں)۔

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۱/ ۷/ ۱۴۰۹ھ

الجواب صحیح: حبیب الرحمن عفا اللہ عنہ، کفیل الرحمن

ڈبل آڑھت اجرت لینے کا حکم:

منڈی میں دکان کرنا چاہتا ہوں جس میں کمیشن لیا جاتا ہے، اس طرح سے کہ ایک شخص گاؤں سے کچھ سبزی لے کر آتا ہے فروخت کرنے کے لئے، اور دوسرا شخص خریدنے کے لئے، ہم نیلام کرتے ہیں جس کے نام بولی چھوٹ جاتی ہے اس کو دیدیتے ہیں، لینے والا ادھار لیتا ہے اور فروخت کرنے والا نقد پیسے سے لیتا ہے، ہم اپنی طرف سے فروخت کرنے والے کو پیسے دیتے ہیں اور خریدار ہم سے ادھار لے جاتا ہے اور ہم دس فی صد خریدار سے اور دس فی صد فروخت کرنے والے سے کمیشن لیتے ہیں۔ براہ کرم جواب سے نوازیں یہ کمیشن لینا شرعی رو سے کیسا ہے؟

الجواب وباللہ التوفیق:

دلالی وآڑھت داری میں بھی ڈبل اجرت لینا جائز نہیں ہوتا، بلکہ جس کا کام کرے صرف اسی سے اجرت لینا جائز ہوتا ہے، پس اس صورت میں یہ شخص صرف بیچنے والے کا کام کرتا ہے کہ اس کی جانب سے بولی بولتا ہے اور جس خریدار پر بولی ختم ہوجاتی ہے اس کو سودا دے دیتا ہے اور خریدار کے ادھار خریدنے پر یہ شخص جو نقد پیسہ بیچنے والے کو دیتا ہے یہ بھی بیچنے والے ہی پر تبرع ہوتا ہے اور خریدار خود آڑھت کے پاس آتا ہے اور آڑھت دار خریدار تلاش کرنے کے لئے نہیں جاتا ہے، اور نہ اس کا اور کوئی کام کرتا ہے کہ اس سے بھی اجرت لے، لہذا صورت مسئولہ حسب تحریر سوال صرف اس شخص سے اجرت دلالی لے سکتا ہے جس کی طرف سے بیچتا اور بولی وغیرہ بولتا ہے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۶/۱۱/۱۴۱۰ھ

لپ اسٹک لگانے اور فلم بنانے کا حکم:

میں نے برائے معلومات چند مسائل ایک لفافہ تقریبا ایک ماہ پہلے ارسال کیا تھا جس میں عورتوں کو لپسٹک کی حالت میں وضو کرنا اور شادیوں وغیرہ میں فلم بنانا اور فوٹو وغیرہ بنانے کے متعلق معلوم کیا گیا تھا؟

الجواب وباللہ التوفیق:

۱- لپسٹک میں عموما جلد پر ایک تہہ جم جاتی ہے جس سے وضو کرنے میں پانی جلد (چمڑے) تک نہیں پہنچتا اور وضو صحیح نہیں ہوتا، اس لئے لپسٹک سے بغیر اس کو صاف اور دور کئے ہوئے وضو کر کے نماز پڑھنے سے نماز نہیں ہوگی، اسی طرح اگر غسل ضروری ہو تو غسل کی طہارت بھی حاصل ہو کر نماز وغیرہ صحیح نہیں ہوگی، ہاں اگر لپسٹک رقیق پانی کی طرح ہو تو یہ حکم نہ ہوگا۔

۲- فلم بنانا جس میں جاندار کی بھی صورتیں آئیں یا جاندار کا فوٹو وغیرہ بنانا جس میں اس کے سر کا بھی فوٹو آجائے درست وجائز نہیں ہے، خواہ کسی بھی طریقہ کی بنا پر یہ خرابی آجائے تو حرمت وعدم جواز کا حکم ہوگا، اس لئے کہ اس پر حرمت ووعید کی جو روایتیں وارد ہیں وہ مطلق اور عام ہیں اور ہر شق کو شامل ہیں، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۳/۹/۱۴۱۰ھ

قرض کے ایک حیلہ کا بیان:

کسی شخص نے اس ارادہ سے حکومت سے بطور امداد قرض لے لیا ہے کہ اس میں سے بعض رقم کو بینک کے کسی ایسے کھاتہ میں جمع کردے جس میں جمع کی ہوئی رقم کا سالانہ سود بیاج قرض لی ہوئی رقم سے بڑھ جاتی ہو، مثلاً قرض رقم مبلغ چھ ہزار روپے کا سود وبیاج فی سیکڑہ دس روپے کے حساب سے ہوتا ہے تو کھاتہ میں جمع کی ہوئی رقم مثلاً تین ہزار روپے کا سود وبیاج فی سیکڑہ بیس روپے کے حساب سے سالانہ ہوتا ہے۔

لہٰذا دریافت طلب امر یہ ہے کہ تین ہزار روپے جمع شدہ رقم کے سود وبیاج سے چھ ہزار روپے کا سود وبیاج پورا ہوتا ہے اور صرف تین ہزار روپے سے اپنا کاروبار کرتا ہے جس میں سود وبیاج کا لینا دینا نہیں ہے تو ایسا حیلہ کرنا از روئے شرع کیسا ہے؟

الجواب وبالله التوفيق:

مجبور وغریب کا حکومت سے بطور امداد قرض لینا کہ اس میں سے کچھ رقم بینک کے کسی ایسے کھاتہ میں جمع کردی جائے جس سے ملنے پر سود پورے قرضہ کے سود کی ادائیگی کے لئے کافی ہو اور بقیہ رقم اپنے کاروبار میں لگادی جائے جس کو الگ سے ادا نہ کرنا پڑتا ہو تو شرعاً یہ حیلہ درست ہے: "من أراد بالحيلة الهرب من الحرام فلا بأس (۱)۔

"وأجمعوا على أن ما لا يبطل حق الغير لا يكره فيه استعمال الحيلة وتعلم الحيلة" (۲)۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

الجواب صحیح: محمد ظفیر الدین مفتاحی غفی عنہ

۱- سراجیہ علی الخانیہ ۳/۵۷۴۔

۲- خانیہ ۳/۴۱۷۔

چوری کے مال کی تحقیق کے لئے لوگوں سے پوچھنا:

چوری ہونے کے بعد لوگ باگ سے پوچھنا چھ کراتے ہیں یہ جائز ہے یا نہیں؟

الجواب وباللہ التوفیق:

یہ شرعی چیز نہیں ہے اور اس پر یقین رکھنا نا جائز ہے، اس طرح سے کسی کو بدنام یا متہم کرنا بھی صحیح نہیں ہے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۲/۶/۱۴۰۴ھ

باب الأکل والشرب

کوکاکولااورفنٹا کاشرعی حکم:

حسب ذیل مسئلہ کے متعلق فتویٰ مطلوب ہے، تفصیل اس کی یہ ہے کہ ہمارے ملک میں کوکا کولا فنٹا اوران کے مانند دیگر اشیاء مشروبہ شائع ذائع اور کثرت سے مستعمل ہیں جیسا کہ آنجناب کو بخوبی معلوم ہوگا، اب بنانے والے کارخانہ سے بالتحقیق معلوم ہوا کہ ان شربتوں میں یعنی کوکا کولا واخواتہا میں الکحل ڈالا جاتا ہے جس کو انگریزی میں ''ایتھنول'' کہتے ہیں، اس الکحل کے بعض اقسام عصیر العنب سے تیارشدہ ہیں اور بعض اقسام آلو، کوئلہ، گیہوں وغیرہ اشیاء سے بنتے ہیں ایک شیشی میں تقریباً ایک آدھ قطرہ الکوحل موجود ہیں اور ظاہر ہے کہ اس قسم کی شربتیں محض تنعم وتلذذ کے طور پر پی جاتی ہیں بہشتی زیور حصہ نہم کے ضمیمہ ثانیہ میں ایک حاشیہ کی حسب ذیل عبارت ہے:

"فالقسم الاول منه حرام ونجس غليظا والثلاثة الاخيرة حرام ونجس خفيفاً وفي رواية نجس غليظا كما في الهدايه وما عدا ذالک من الاشربة فهي في حكم الثلاثة الاخيرة عند محمدؒ في الحرمة والنجاسة وعند ابي حنيفةؒ وابي يوسف رحمهما الله تعالىٰ يحرم منها القدر المسكر واما القدر الغير المسكر فحلال الا اللهو"- اهـ

اس عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ عند الشیخین غیر خمر کی قلیل المقدار شراب حلال ہے، لہٰذا اگر غیر خمر کی کوئی شربت قلیل مقدار میں کسی کھانے یا پینے کی چیزیں مثلاً بسکٹ، کیک، مٹھائی کوکا کولا وغیرہ میں استعمال کی جائے تو ان چیزوں کا کھانا پیا حلال ہوگا۔

زید کہتا ہے کہ بر بناء مذہب شیخین علیہما الرحمۃ اگر کسی کھانے یا پینے کی چیز میں غیر خمر کا الکحل ڈالا جائے تو وہ طعام یا شراب جائز الاکل وحلال ہے، لیکن عمرو کہتا ہے کہ انھوں نے جو قول کیا ہے وہ عدم لہو کے ساتھ مقید ہے اور بسکٹ، کیک، مٹھائی کوکا کولا وغیرہ چیزیں تو غیر ضروریات میں سے ہیں وہ تو محض تنعم وتلذذ کیلئے کھائی جاتی ہیں، لہٰذا یہ لہو میں داخل ہوکر

حرام ہوجائیں گی، دونوں میں سے کس کا قول صحیح وبرحق ہے۔

زید یوں بھی کہتا ہے کہ کوکا کولا، فنٹا وغیرہ اتنی کثرت سے مستعمل ہیں کہ اب ابتلاء عام کا حکم لگایا جاسکتا ہے اور اس بناء پر حرمت ثابت ہے مگر مسکی ہوجائیگی عمرو یہ قول کرتا ہے کہ اس معاملہ میں ابتلاء عام کا حکم لگانا ناقابل قبول ہے کیونکہ کوکا کولا وغیرہ اشربہ کو تو فقط تنعم وتلذذ کے درجہ میں مستعمل ہیں ضروریات طعام میں سے نہیں ہیں نیز دوسری شربتیں مثلاً پھلوں کے رس وغیرہ اس کے قائم مقام مل سکتے ہیں، لہذا عدم ضرورت وحاجت کے سبب ابتلاء عام نہیں کہا جاسکتا، اب کون صواب پر ہے، زید یا عمرو، کتب فقہ میں غیر خمر کے متعلق کسی قدر اختلاف معلوم ہوتا ہے بعض کے نزدیک قلیل المقدار خارجاً وداخلاً حلال ہے اور بعض کے نزدیک دونوں طرح استعمال کرنا حرام ہے البتہ حاشیہ مذکورہ از بہشتی زیور میں فرمایا گیا: ''فالاولیٰ ان لا یتعرض للمبتلی به بشیء نعم من قدر علی الاحتراز منه فلیحترز ما شاء''۔ اس بناء پر زید کہتا ہے کہ قدر قلیل از غیر خمر شراب جائز الاستعمال ہے خارجاً ہو یا داخلاً البتہ اجتناب از روئے تقویٰ اولیٰ واحسن ہے، اس طرح کوکا کولا وغیرہ میں اگر یہ غیر خمر الکحل ڈالا جائے تو جائز الشرب ہوگا بوجہ اسکے قلیل المقدار ہونے کے عمرو اس کے خلاف کا قائل ہے یہ عبارت بہشتی زیور کے متن میں ہے اور حاشیہ پر جو لکھا ہے وہ صرف دواءً ہے، یعنی صرف تداوی کے لئے استعمال درست ہوگا نہ کہ تلذذ وتنعم کے لئے اور عمرو بہشتی زیور کی یہ عبارت سند میں پیش کرتا ہے۔

''دواءً بقدر غیر مسکی داخلاً بھی استعمال کی جاسکتی ہے مگر زید تو دواء کی قید کو غیر احترازی بتلاتا ہے اور اس رائے کے استناد میں اس کتاب کی دوسری عبارت پیش کرتا ہے بہر اسپرٹ خمر اربعہ میں سے نہیں ہے پس ایسی اسپرٹ کا شیخین کے نزدیک استعمال جائز ہے''

یہاں دواء کی قید مفقود ہے معلوم ہوا کہ اول عبارت میں قید اتفاقی تھی تو چاہے کھانے یا پینے کی اشیاء میں یہ غیر خمر الکحل قلیل المقدار موجود ہو تب بھی اکل وشرب جائز ودرست ہوگا لیکن عمرو کہتا ہے دونوں عبارتیں ایک دوسرے سے متعلق ہیں الگ الگ نہیں ہیں، آنجناب فرمائیں کہ دونوں میں سے کون صائب الرائے ہے۔ جن اشربہ میں یہ غیر خمر الکوحل پایا جائے قلت مقدار کے ساتھ اگر وہ حرام ہیں تو ان کی خرید وفروخت کا کیا حکم ہوگا؟

سراج احمد خان فریقی

الجواب وبالله التوفيق:

فقہاء کی یہ تحقیق اس وقت کی ہے جب الکحل شراب کا جوہر یا اس کی تلچھٹ ہی ہوا کرتا تھا، اب الکحل سائنٹیفک طریقہ سے اس طرح بنائی جاتی ہے جس کو شراب کا جوہر یا شراب کی تلچھٹ نہیں کہہ سکتے، لہذا جب تک یہ یقین نہ ہوجائے کہ یہ شراب کا جوہر ہی ہے یا اس کی تلچھٹ ہی ہے اس وقت تک حرمت کا حکم نہیں لگایا جائے گا البتہ کوئی احتیاط برتے تو یہ تقوی ہوگا فتوی نہ ہوگا فتوی کے اعتبار سے ان مذکورہ چیزوں کو ناجائز الاستعمال یا حرام نہیں کہہ سکتے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

جھینگا کھانا:

دریا کے جانوروں میں سے جھینگا کھانا جائز ہے یا کہ نہیں؟

الجواب وبا الله التوفيق:

جائز ہے، لیکن جھینگا بعض فقہاء کے نزدیک منع ہے، لہذا احتیاط یہ ہے کہ اس کو نہ کھایا جاوے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۳/ ۱۰/ ۱۹۸۵

الجواب صحیح احقر محمود غفی عنہ

۱- مغربی ممالک سے ڈبوں میں جو پکے ہوئے گوشت آتے ہیں ان کا حکم:

ہمارے یہاں ایک مسئلہ زیر بحث ہے فریقین کے دلائل درج ذیل ہیں براہ کرم رہنمائی فرمائیں!

بعض مقامی مسلمان پکے ہوئے گوشت کے ڈبے اپنی پرچون کی دکان پر فروخت کرتے ہیں، اس سے کسی کو اختلاف نہیں کہ ڈبوں میں خنزیر کا گوشت ہو، خنزیر کا گوشت تو قطعاً حرام ہے اس پر ایک دکاندار نے یہ حیلہ اختراع کیا کہ وہ اس مال کو کسب کے لیے نہیں بلکہ میل لگانے کے لئے رکھے گا، اور قیمت خرید پر ہی فروخت کرے گا یہ حیلہ جائز ہے یا ناجائز؟

اگر ڈبے میں بھیڑ یا گائے کا گوشت ہے تو بھی وہ مسلمان کا ذبیحہ نہیں ہے، عرب حضرات اس کو طعام اہل کتاب سمجھ کر

کھاتے ہیں، بعض حضرات اس کی خرید فروخت کو بھی حرام قرار دیتے ہیں، لیکن کچھ اور اہل علم اس کی حرمت کو غیر مؤثر قرار دے کر خرید فروخت کی حد تک اجازت دیتے ہیں۔

۳-خون سے بنے نمک کا استعمال:

یہاں خون کا نمک بھی فروخت ہوتا ہے جو شوربے میں کام آتا ہے، اگر خنزیر کا خون شامل ہونے کا شبہ نہ ہو تو کیا خون کی حرمت اس کی اس قسم کی مصنوعات کو بھی حرام کر دے گی؟

۴-جانوروں کی ہڈی سے بنی ہوئی چیز کھانا:

بعض کھانے کی چیزیں ان جانوروں کی ہڈی سے تیار کی جاتی ہیں، اگر یہ یقین ہو کہ اس میں خنزیر کی ہڈی شامل نہیں ہے تو کس دلیل کی بنا پر حرام ہوگی؟

۵-ذبح شدہ گوشت جو پیکٹ میں آتے ہیں ان کا حکم، کیا ہر مرحلہ میں مسلمان کی نگرانی ضروری ہے؟

ایک غیر مسلم کی کمپنی میں گائے کا گوشت ذبح ہو کر ڈبوں یا پیکٹ میں پیک کیا جاتا ہے، پھر مسلم یا غیر مسلم کی دکانوں میں فروخت کیا جاتا ہے، اس گوشت کے ذبح ہونے سے اور فروخت ہونے تک حسب ذیل مراحل ہوتے ہیں:

۱-جانوروں کو مسلمان ذبح کرتا ہے۔

۲-اس کے بعد مسلم یا غیر مسلم اس کو صاف کرتے ہیں۔

۳-اس کے بعد اس گوشت کو مسلم یا غیر مسلم کی نگرانی میں برف خانوں میں رکھا جاتا ہے۔

۴-اس کے بعد برف خانوں سے نکال کر ہڈیوں کو الگ کر کے گوشت کو مختلف طریقوں سے پکایا جاتا ہے، پکانے میں صرف حلال اجزاء استعمال کیے جاتے ہیں۔

۵-اس کے بعد تیار شدہ گوشت کو پیکٹ یا ڈبوں میں پیک کیا جاتا ہے، پھر اس پیک شدہ ڈبہ پر مسلمان نگراں اپنی جماعت (جمعیۃ العلماء) کی رجسٹرڈ شدہ مہر یا لیبل یا نشان لگاتا ہے (جو گوشت کے حلال ہونے کی نشانی ہوتی ہے)

۶-بعدہ اس پیک شدہ گوشت کو مسلم یا غیر مسلم ڈرائیور مسلم یا غیر مسلم تاجروں کو پہونچاتا ہے جو اس کو اپنی دکانوں میں فروخت کرتے ہیں۔

صورت مذکورہ میں حسب ذیل امور کی وضاحت مطلوب ہے:

۱-کیا ہر مرحلہ میں مسلمان کی نگرانی ضروری ہے یا نہیں؟

۲-ہر مرحلہ میں ضروری نہیں تو کن کن مراحل میں ضروری ہے؟

۳-اگر گوشت ذبح ہونے سے تاجر تک پہنچنے تک ہر مرحلہ میں مسلمان کی نگرانی رہے تو ایسے پیک شدہ اور مہر لگا ہوا گوشت غیر مسلم کی دکان سے خرید کر کھانا جائز ہے یا نہیں؟

۴-اگر ذبح کے بعد کے مراحل میں مسلمان کی نگرانی نہ رہے، صرف پیکنگ کے بعد مسلمان نگراں اپنی مہر ،نشان یا لیبل ہر ڈبہ یا پیکٹ پر لگائے تو آیا پیک شدہ اور مہر زدہ گوشت کا ان غیر مسلم کی دکان سے خرید کر کھانا جائز ہے یا ناجائز؟

۵- پیک ہونے کے بعد مسلم یا غیر مسلم تاجر کو پہونچنے تک مسلمان کی نگرانی شرط ہے یا نہیں؟

۶- یہ پیک شدہ گوشت یہاں سے مسلم ممالک کے لیے برآمد کیا جاتا ہے جو غیر مسلموں کے ہوائی یا بحری جہاز سے بھیجا جاتا ہے تو یہ غیر مسلموں کی نگرانی میں بھیجا ہوا گوشت مسلم ممالک کے مسلم یا غیر مسلم تاجر سے مسلمانوں کو خرید کر کھانا جائز ہے یا نہیں؟

۷-اگر فیکٹری کا مالک تمام شرائط قبول کر لے تو اس کو سرٹیفکٹ دینا پڑے گا، شرعاً سرٹیفکٹ شہادت کے قائم مقام ہوگی یا صرف سند ہوگی؟

الجواب وبالله التوفيق:

۱و۲-ذبح ہونے سے پیک ہو کر سیل اور مہر لگنے تک برابر ہر درجہ میں معتمد مسلمان کی موجودگی ونگرانی ضروری ہے، تاکہ وہ اپنے سامنے ان مراحل کی تکمیل کرائے، پھر ذبح شرعی کے بعد صاف کرنا یا برف خانوں میں رکھنا یا برف خانوں سے نکال کر ہڈیوں وغیرہ کو صاف کرنا، یا پیک کرنا یہ سب معتمد مسلمان کی موجودگی ونگرانی میں اور مسلمان کے سامنے غیر مسلم بھی کر سکتا ہے۔

۳-جب معتمد مسلمان کی نگرانی وموجودگی میں اس کے سامنے مذکورہ بالا تمام مراحل طے کر کے سیل ومہر ہو کر باقاعدہ پیک ہو جائے تو اب کسی مسلمان کی موجودگی ونگرانی باقی رہنا ضروری نہیں رہے گی، حتیٰ کہ صحیح سیل ومہر والا بند پیکٹ غیر مسلم بھی اپنی دکان میں رکھ کر فروخت کر سکتا ہے، البتہ غیر مسلم کی دکان سے محض سیل ومہر والا بند پیکٹ وبند ڈبہ جس کے اندر تلبیس وخداع وغیرہ کا بالکل شبہ نہ ہو خریدنا کھانا جائز رہے گا، کھلے ہوئے یا مشتبہ حال کا خریدنا اور کھانا جائز نہ رہے گا۔

۴- ایسا گوشت خریدنا اور کھانا جائز نہیں۔

۶و۵- اس کا جواب (۱) تا (۴) میں گذر چکا ہے کہ ان نمبروں میں مذکورہ قاعدہ کے مطابق پیک ہوکر سیل وہر ہوجانے کے بعد ہر وقت کسی مسلمان کی موجودگی شرط نہیں، لہٰذا غیر مسلم ہوائی یا بحری جہاز سے اور غیر مسلم کے واسطہ سے بھی بھیجا جاسکتا ہے اور غیر مسلم اور مسلم ممالک میں بھیجا جاسکتا ہے، اور محفوظ سیل وہر والا بند پیکٹ وڈبہ مسلم وغیر مسلم ہر دکان سے خرید ابھی جاسکتا ہے، اس میں شرط ہے کہ یہ اطمینان حاصل رہے کہ درمیان میں کوئی غداری یا خداع کاری وغیرہ نہیں ہوئی ہے، البتہ کھلا ہوا پیکٹ یا ڈبہ اس کا گوشت غیر مسلم کی دکان سے اطمینان حاصل ہونے کی حالت میں بھی خریدنا یا کھانا جائز نہ رہے گا۔

۷-صرف انہی گوشتوں کا سرٹیفکٹ دینا جائز ہوگا جن کے پانچوں مراحل معتمد مسلمان کے سامنے (۱) تا (۴) کے مطابق تکمیل پاکر سیل وہر ہونے کا مشاہدہ یا شرعی ثبوت موجود ہو، اس کے علاوہ اور گوشتوں کا سرٹیفکٹ دینا درست نہ ہوگا اور یہ سرٹیفکٹ دینا شہادت نہ ہوگی بلکہ صرف تصدیق اور سند کے درجہ کی چیز ہوگی ،فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۹/۶/۹۸ ۱۴ھ

آسٹریلیا وغیرہ سے جو گوشت آتے ہیں ان کا استعمال شرعاً کیسا ہے؟

☆ یہاں پر یعنی مسقط میں گوشت اور مرغی آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ سے آتا ہے اور مشکوک کے خیال سے ہم استعمال نہیں کرتے۔ بعض لوگ استعمال کرتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ گوشت اور مرغی کے پاکٹ پر لکھا ہوتا ہے حلال طریقہ سے ذبح کیا ہوا ہے، پھر اسلامی حکومت میں بغیر تحقیق کے سامان آتا نہیں، لہٰذا استعمال کریں کیا یہ درست ہے؟

☆ مسقط کے وطنی حضرات اور ائمہ مساجد کس مسلک سے تعلق رکھتے ہیں ہمیں علم نہیں لیکن یہ لوگ ہاتھ چھوڑ کر اور ایک سلام میں دونوں طرف رخ کرتے ہوئے سلام کرتے ہیں، کیا ان کے پیچھے، یعنی ان کی اقتداء درست ہے۔

الجواب وباللہ التوفیق:

☆ اگر یہ تحقیق ہوجائے کہ آسٹریلیا یا نیوزی لینڈ میں جو مسلمان رہتے ہیں انہیں کے ہاتھ کا اسلامی قاعدہ سے ذبح کیا ہوا یہ گوشت آتا ہے، یا وہاں کے اہل کتاب محض اللہ کا نام لے کر ذبح کرتے ہوں تو اس گوشت کا کھانا جائز رہے گا، پس اگر گمان غالب ہوجائے کہ واقعی یہ ذبیحہ اسی اسلامی قاعدہ کا ہے، جیسا کہ پیکٹ پر لکھا ہوا ہے تو فتویٰ کے اعتبار سے اس کا کھانا

جائز رہے گا، باقی تقویٰ میں پرہیز بہتر ہوگا، اس کے نہ کھانے میں احتیاط اور بہتری ہے۔

☆ اگر وہ حضرات مالکی مسلک کے ہوں خوارج ومعتزلہ وغیرہ نہ ہوں تو ان کے پیچھے حنفی کی نماز صحیح ادا ہو جائے گی بشرطیکہ نجاست وطہارت وتطہیر کے مسئلہ میں حنفی مسلک کی رعایت کرتے ہوں، ورنہ ان کے پیچھے نماز صحیح نہ ہوگی، اور پھر جب وہ ایک ہی سلام میں دونوں طرف رخ پھیریں تو حنفی مقتدی کو دونوں طرف سلام پھیرنے میں دو مرتبہ السلام علیکم ورحمۃ اللہ کہہ لینا چاہئے۔فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۹/۴/۱۴۰۲ھ

بیرونی ممالک سے آئی ہوئی مذبوحہ مرغیوں کا شرعی حکم:

یہاں سعودی عرب میں یورپ اور دیگر بیرونی ممالک سے کھال اتاری ہوئی آلائش سے پاک مرغیاں پولی تھین کے بیگ میں بھر کر آتی ہیں اور ان پر لکھا ہوا ہوتا ہے "مذبوحة عن طريق الشريعة" یہاں رہتے ہوئے کوئی ذریعہ نہیں ہے کہ پتہ چلایا جائے کہ واقعی یہ شریعت کے مطابق ذبح شدہ ہیں جبکہ یہاں مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ میں رہنے والے بعض دیندار لوگ ایسی مرغیوں کو مشکوک قرار دیتے ہیں اور بعض بالکل حرام کہتے ہیں کہ مشین سے گردن کاٹ دی جاتی ہے (واللہ اعلم) کیا ایسی مرغیوں کو کھانا جائز ہے؟

محمد ضیاء الرحمن، معرفت محمد افضال سعود ولد (ریاض سعودی عربیہ)

الجواب وباللہ التوفیق:

تجارت کا بھی یہ اصول مسلم ہے کہ تجارت دھوکہ دہی اور فریب دہی سے کامیاب نہیں ہوتی اور اس وجہ سے بڑے تاجر دھوکہ فریب دہی وغیرہ سے بچتے ہیں پھر جب حکومت بھی حرام وحلال کا معاملہ سخت پرکھ پر رکھتی ہو تو جن ڈبوں پر لکھا ہو کہ مذبوحہ عن طریق الشریعۃ تو جب تک اس کے خلاف کا ثبوت دلیل شرعی سے نہ ہو جائے از روئے فتوی استعمال کی گنجائش رہے گی باقی از روئے تقوی اجتناب افضل واولی ہے (۱)۔فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۹/۱۲/۱۴۰۰ھ

۱- "ويقبل قول كافر ولو مجوسياً قال: اشتريت اللحم من كتابي فيحل أو قال اشتريته من مجوسي فيحرم، ولا يرده

۱-دھوبی کے یہاں کھانا:

مسلمان دھوبی کے گھر کا کھانا کیسا ہے؟

۲-کافر کے یہاں کھانا:

کافر کے یہاں کا کھانا کیسا ہے؟

مفتی حسن انصاری مقام گڈھی سلیم پور، مراد آباد

الجواب وباللہ التوفیق:

۱مسلمان دھوبی کے گھر کا گوشت بھی کھانا جبکہ اس میں نجاست لگنے کا گمان نہ ہو جائز ہے(۱)۔

۲-غیر مسلم کے گھر کا گوشت کھانا بالکل حرام و ناجائز ہے البتہ گوشت کے علاوہ اور چیزوں کا کھانا جبکہ اس کے برتن وغیرہ اور ہاتھ وغیرہ سب چیزیں ناپاکی سے محفوظ ہوں تو کھا سکتے ہیں مگر غیرت کے خلاف ہے(۲)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۹/ ۸/ ۱۴۰۰ھ

شرادھ کے کھانے کا حکم:

ایک ہندو کے یہاں موتی کا کھانا جو انکے مذھبی طریقہ پر کھلا دیا جاتا ہے کیا مسلمان کو کھانا جائز ہے یا کہ نہیں اور کیا وہ کھانا مسلمان کے لئے حلال بھی ہے۔

الجواب وباللہ التوفیق:

سوال کی عبارت صاف نہیں پڑھی جاتی ہے غالباً موتی سے مراد میت اور مردار جانور ہے جس کو ہندو لوگ جھٹکے وغیرہ

بقول الواحد وأصله أن خبر الكافر مقبول بالإجماع في المعاملات لا في الديانات وعليه يحمل قول الكنز: ويقبل قول الكافر في الحل والحرمة" (الدر المختار مع رد المحتار ۹/ ۴۹۷ کتاب الحظر والاباحۃ)۔

۱- "اهدى إلى رجل شيئاً أو أضافه إن كان غالب ماله من الحلال فلا بأس" (فتاوی عالمگیریہ ۵/ ۳۴۲)۔

۲- "قال محمدؒ ويكره الأكل والشرب في أواني المشركين قبل الغسل ومع هذا لو أكل أو شرب فيها قبل الغسل جاز ولا يكون آكلاً ولا شارباً حراماً وهذا إذا لم يعلم بنجاسة الأواني..... الخ" (فتاوی عالمگیریہ ۵/ ۳۴۷)۔

اپنے مذہبی قاعدہ سے مارڈالتے ہیں اور کھاتے ہیں اگر یہی مراد ہے تو اس کا کھانا بالکل حرام ہے اور سخت گناہ قطعاً ناجائز ہے ہرگز نہ کھانا چاہئے (۱)، اور اگر مراد کچھ اور ہو تو اس کو صاف لکھ کر پھر پوچھیں، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۷/۷/۱۹۸۵ھ

الجواب صحیح محمود عفی عنہ

نہر فرات کا پانی پینا:

کربلا معلی میں خداوند عالم نے حضرت امام حسین علیہ السلام اور ان کی آل کو نہر فرات کا پانی پینے کے لئے نہیں نصیب کیا یعنی نہر فرات کا پانی پینا نصیب نہیں ہوا تو بعد انکے شہادت کے اور مسلمانوں کے لئے اس کا پانی پینا جائز ہے یا کہ ناجائز ہے۔

الجواب وباللہ التوفیق:

دونوں باتیں خدائے قدیر کے علم اور اختیار سے ہوئیں ہیں اور خدائے قدیر نے اباحت مطلقہ پانی پینے کے لئے دی ہے، اس لئے جائز ہے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۸/۸/۱۹۸۵ھ

الجواب صحیح محمود عفی عنہ

کیا بعد عصر کھانا کھانا ممنوع ہے؟

مجھے ایک صاحب نے بتایا کہ اس بارے میں حدیث ہے کہ عصر کے بعد کھانا کھانا ممنوع ہے، دریافت ہے کہ اس بارے میں حدیث ہے یا کہ نہیں۔

۱- ''وذبحها من قفاها ان بقيت حية حتى تقطع العروق والا لم تحل لموتها بلاذكاة'' (الدرمع الرد۹/۴۲۷ مکتبہ زکریا)۔

الجواب وباللہ التوفیق:

باتیں بے بنیاد اور من گڑھت ہیں عصر بعد کھانا شرعاً منع یا مکروہ نہیں ہے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

الجواب صحیح سید احمد علی سعید نائب مفتی دارالعلوم دیوبند

حیض والی عورت کے ہاتھ کا پکا ہوا کھانا جائز ہے یا نہیں؟

ایام حیض میں عورت کے ہاتھ کا پکا ہوا کھانا کیا جائز ہے یا کہ ناجائز ہے؟

الجواب وباللہ التوفیق:

ا۔ ایام حیض میں عورت کے ہاتھ کا کھانا کھانا پکانا سب جائز ہے (۱)۔

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

جرمنی گائے کے دودھ کا حکم:

کشمیر میں اکثر لوگ جرمنی گائیں پالنے لگے ہیں، کیونکہ ان سے دودھ زیادہ حاصل ہوتا ہے لاگت بھی بہت لگتی ہے، لیکن روزانہ دس کلو سے پندرہ کلو دودھ دیتی ہیں، اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ لوگ یہ دودھ کھانے پینے سے پرہیز کرتے ہیں، کیونکہ بعض کہتے ہیں کہ جنگلی کتے کا بیج گائے میں ڈالکر گائے پیدا ہوتی ہے، لہذا یہ گائے کتے کی نسل ہے، اس واسطے پرہیز کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ تیجی بھینس یعنی جاموس اور گائے سے یہ نسل پیدا ہوئی ہے ان تینوں سوالوں کے جواب دیں۔

نذیر احمد (متصل زیارت حضرت شاہ ہمدان مقام ترالی ضلع پلوامہ، کشمیر)

الجواب وباللہ التوفیق:

حیوانات میں نسب ونسل مادہ سے چلتی ہے اور مادہ ہی کا اعتبار ہوتا ہے (۲)، پس جس نطفہ سے بھی بچہ پیدا ہو پیدا

۱- ”ولایکرہ طبخها ولا استعمال ما مسته من عجين او ماء“ (رد المحتار ۱/ ۴۸۶ باب الحیض مکتبہ زکریا)۔

۲- بدائع الصنائع ۴/ ۲۰۵ میں ہے: ”فإن كان متولداً من الوحشي والإنسي فالعبرة بالأم..... لأن الأصل في الولد الأم لأنه

ہوا کرے بچہ گائے کا ہی کہا جائے گا اور یہ دودھ گائے کا ہی کہا جائے گا اور گائے کا دودھ علی الاطلاق مباح وحلال فرمایا گیا ہے، لہٰذا ان وجوہ کو صحیح تسلیم کر کے بھی اس دودھ کو حرام نہ کہیں گے اور یہ الگ بات ہوگی کہ چونکہ یہ طریقہ قبیح اور بعض وجوہ سے ممنوع ہیں، اس لئے اگر کوئی شخص ایسا باوجاہت ومقتدی ہو کہ وہ باب اصلاح وتبلیغ کے ضابطہ کے مطابق منع کرے یا خود استعمال نہ کرے تو باب تبلیغ واصلاح سے قرار دیکر اس کو یہ گنجائش ہوگی مگر یہ عام حکم نہیں بن سکے گا، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۶/۶/۱۴۰۰ھ

تصویر والی مٹھائی کا حکم:

بچوں کے کھانے کی مٹھائی تصویر کی بنی ہوئی آتی ہیں بعض مچھلی کی بعض ہاتھی کی ہوتی ہیں وغیرہ وغیرہ تو آیا انکا کھلانا بچوں کو بڑوں کا خود کھانا اور ان کا بیچنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب وبالله التوفيق:

جو مٹھائیاں جاندار کے جسم کی طرح بنی ہوئی ہوں انکا خریدنا بیچنا جائز نہیں (۱) ہے، البتہ اگر بغیر خریدے ہوئے بطور ہبہ وغیرہ کے مل جائیں تو انکو توڑ پھوڑ کر کھانا جائز (۲) ہے، لکڑی کے ڈبوں پر جو کسی جانور کی پوری تصویر خواہ پینٹ سے یا لکڑی وغیرہ سے اس طرح بنی ہوئی ہو جو اتنی بڑی ہو کہ اگر اس کو زمین پر رکھ کر خود کھڑے ہو کر دیکھا جائے تو نمایاں طور پر ظاہر ونمایاں ہوں تو ان کا بنانا اور اس پر اجرت لینا کچھ جائز نہیں ہوگا، اور اگر چھوٹی ہوں کہ کھڑے ہو کر دیکھنے میں نمایاں نہ ہوں یا اس طرح پر ہوں کہ ان کا سر نہ ہو تو اس کا بنانا اور اسکی اجرت سب جائز رہے گا۔ اس طرح اگر غیر جاندار کی تصویریں

ينفصل عن الأم"۔

۱- "اشترى ثوراً أو فرساً من خزف لأجل استئناس الصبي لايصح ولاقيمة له فلايضمن متلفه، قال في الشامية كأنه لأنه آلة لهو" (ردالمحتار ۷/ ۲۸۷، کتاب البیوع/ باب المتفرقات، مکتبہ زکریا)۔

۲- "لما في صحيح ابن حبان إستاذن جبريل عليه السلام على النبي صلى الله عليه وسلم فقال أدخل فقال: كيف أدخل وفي بيتك ستر فيه تصاوير فإن كنت لابد فاعلاً فاقطع رؤوسها أو اقطعها وسائد أو إجعلها بسطاً وفي البخاري في كتاب المظالم عن عائشةؓ أنها إتخذت على سهوة لها ستراً فيه تماثيل فهتكه النبي صلى الله عليه وسلم. قالت فاتخذت منه نمرقتين فكانا في البيت تجلس عليهما زاد احمدُ في مسنده: ولقد رايته متكئاً على أحدهما وفيه صورة" (البحرالرائق کتاب الصلاۃ باب مایفسد الصلاۃ ومایکرہ فیہا ۲/ ۴۹، مکتبہ زکریا)۔

ہوں تو اسکو بھی بنانا اور اس پر اجرت لینا سب جائز رہے گا (۱)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

الگ الگ پلیٹ میں کھانا:

گھر میں آجکل لوگ الگ الگ پلیٹ میں کھانا کھاتے ہیں لیکن ہر ایک کے ساتھ ایک پلیٹ رکھ کر کبھی اکٹھے ملکر کھاتے ہیں جبکہ ایک بڑے تھالے یا تھال میں لینے کے بجائے ہر ایک کو علیحدہ چاول، روٹی، سبزی وغیرہ ایک ہی پلیٹ میں لیکر کھاتے ہیں لیکن سب مل کر کھاتے ہیں بھارت میں اور آجکل یہ رواج دیہاتوں میں عام ہوگیا ہے، اس لئے اس طرح کھانے کا کیا حکم ہے؟ واضح فرمائیں۔

الجواب وباللہ التوفیق:

الگ الگ پلیٹ میں کھانا اور ایک بڑے تھال میں کھانا سب درست ہے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۴/۴/۱۴۰۳ھ

۱- مسلم لڑکے کے لئے اپنے غیر مسلم والدین کا کھانا کھانا:

ہم ساؤتھ افریقہ میں دعوت اسلام کی خدمات بھی انجام دیتے ہیں، بعض مرتبہ نوعمر لوگ جن کی عمر ۲۰ سے ۱۸ سال تک ہوتی ہے اسلام قبول کرتے ہیں جب کہ ان کے والدین اسلام قبول نہیں کرتے، کیا یہ نوعمر نومسلم اپنے والدین کا کھانا کھاسکتے ہیں جو برائے نام عیسائی ہیں اور عیسائیت پر صحیح طور پر عمل پیرا نہیں ہیں، ان کے والدین اپنے چوزے اور بکرے جو

۱- ’’وأما صورۃ غیر ذی الروح فلا خلاف فی عدم کراہۃ الصلاۃ علیہا أو إلیہا ولا کراہیۃ فی عملہا أیضاً لما روی عن ابن عباسؓ أنہ قال للمصور حین نہاہ عن التصویر وذکر لہ الوعید وقال إن کنت لابد فاعلا فاصنع الشجر ومالا نفس لہ‘‘۔ حلبی کبیری مع زیادۃ لیسیرۃ باب کراہیۃ الصلاۃ ۳۵۹ سہیل اکیڈمی لاہور، وقال فی الدر (أو کانت (صغیرۃ) لا تتبین تفاصیل أعضاءہا للناظر قائماً وہی علی الأرض، او مقطوعۃ الرأس او الوجہ او ممحوۃ الوجہ لاتعیش بدونہ (أو غیر ذی روح لا) یکرہ لأنہا لاتعبد، وخبر: جبریلُ مخصوص بغیر المہانۃ، وقال فی الشامیۃ وقد صرح فی الفتح وغیرہ بأن الصورۃ الصغیرۃ لاتکرہ فی البیت قال: ونقل أنہ کان علی خاتم أبی ہریرۃؓ ذبابتان‘‘ (ردالمحتار علی الدرالمختار کتاب الصلاۃ ۲/۱۹-۴۲۰)۔

ذبح کرتے ہیں یہ نوعمر نومسلم کھانے کے معاملہ میں بڑی مشکل میں ہیں اور کھانے کے معاملہ کی وجہ سے کچھ لوگ مسلمان ہونے سے احتراز کرتے ہیں کیاان نوعمر نومسلم لوگوں کے لئے عیسائی والدین کا کھانا کھانا جائز ہے؟

۲-جلاٹین ملی ہوئی مٹھائی کھانا:

بعض مٹھائیوں کی تیاری میں ایک چیز شامل کی جاتی ہے جوجلوٹین کہلاتی ہے (جلاٹین ایک چیپ دار مادہ ہے جو جانور کی کھال ہڈی وغیرہ سے نکلتا ہے) جلاٹین تیار کرنے والوں نے بتایا کہ یہ گائے کی کھال سے تیار کی جاتی ہے کوئی سور کی کھال استعمال نہیں کی جاتی کیا ہمیں اس مٹھائی کے کھانے کی اجازت ہے جو اس جلاٹین سے تیار کی جاتی ہے میں یہ گوش گذار کرنا چاہتاہوں کہ اس مقصد کے لئے کھالیں تازہ ذبح شدہ گائیوں کی استعمال کی جاتی ہیں جن کوسکھایایا انگار کیانہ گیا ہو ان جانوروں کواہل کتاب میں سے کوئی شخص اپنے طریقہ پر ذبح کرتا ہے اوربعض صورتوں میں اللہ کا نام بھی نہیں لیاجاتا۔

الجواب وبالله التوفيق:

یہ نوعمر لوگ جنکے والدین نے اسلام قبول نہیں کیا اپنے والدین کا کھانا گوشت کے علاوہ اورسب کھانا بے تکلف کھاسکتے ہیں، جبکہ ظاہر میں وہ لوگ ہاتھ دھوکر پکائیں اور کھانے میں کوئی نجاست کا ڈالنا معلوم نہ ہو اور گوشت کھانے میں خنزیر کے گوشت کے علاوہ حلال جانور جنکو فقط اللہ کا نام لیکر ذبح کرتے ہوں اور خون بہادیتے ہوں اس کوبھی کھاسکتے ہیں سامنے ذبح کرنا یا ذبح کرتے وقت اللہ کا نام سامنے لیناضروری نہیں ہے بلکہ انکی عام عادت سے اس کاعلم ہونا کافی ہوگا کہ یہ لوگ ذبح کرتے وقت محض اللہ کا نام لیتے ہیں تو اس مجبوری میں یہ گوشت بھی کھاسکتے ہیں باقی بہتر ہے کہ اگر خودذبح کرلینے کی گنجائش ہوتو خودذبح کرنے کا ڈھنگ سیکھ لیں اور خودسبقت کرکے ذبح کرلیا کریں **كما في الدر على الشامي ج ۵ ص ۱۸۹ فتحل ذبيحتهما (الى قوله) أو صبيا يعقل التسمية و الذبح (كتاب الذبائح)۔**

۲-جب محض بعض مٹھائیوں میں جلاٹین ملائی جاتی ہے تو جب تک یقین نہ ہوجائے کہ اس مٹھائی میں جلاٹین ملائی گئی ہے اسکا کھانا ازروئے فتوی جائز رہے گا، اس لئے کہ اصل اشیاء میں حلت واباحت ہے محض شبہ سے وہ حرام نہ ہوگی باقی تقوی یہ ضرور ہوگا کہ جب شبہ ہوجائے تونہ کھائے۔

اور جب یہ یقین ہوجائے کہ اس مٹھائی میں جلاٹین ملی ہوئی ہے تو اس میں یہ تفصیل ہے کہ جب قرائن کے ذریعہ سے ظن غالب ہوکہ اس میں مردار گائے کی کھال کی جلاٹین نہیں ملائی گئی ہے بلکہ حلال ذبیحہ کی کھال سے نکالی ہوئی جلاٹین

ملائی گئی ہے تو اس کو کھا سکتے ہیں اور جب یہ ظن غالب حاصل نہ ہو بلکہ شک یا ظن غالب مردار کی کھال سے نکالی ہوئی جلاٹین ملانے کا ہو تو اس کو نہ کھائے ، کما فی الدر علی الشامی (ص ۳۰٦) بقوله: ''لا یحل لوقوع الشک فی هذه المسائل من الشرع "(۱) ، اور حلال ذبیحہ کس کو کہتے ہیں اس کا علم سوال ا کے جواب میں مل جائے گا ، فقط واللہ اعلم بالصواب

مولانا محمد افضل فریقی متعلم دارالافتاء دارالعلوم

الجواب صحیح محمد نظام الدین اعظمی ، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

۱- آخر کتاب الصید قبیل کتاب الرہن ۔

كتاب الوصية

کتاب الوصیۃ

بیوی کو قرض کی ادائیگی اور اولاد کی شادی کے انتظام کے لئے منتظم و وصی بنانا:

۱-نواب سید جمال الدین کا انتقال ۱۴ ستمبر ۱۹۵۶ء کو ہوگیا، انہوں نے اپنے ورثہ میں زوجہ اول جنکا انتقال نواب صاحب کی حیات میں ہوگیا ہے، ان کے بطن سے ایک فرزند سید محمد دبیر حسین خان صاحب چھوڑا اور زوجہ ثانی حسین بیگم جو اس وقت حیات ہیں، انکے بطن سے تین فرزندان ۱-سید محمد کمال الدین ۲-سید محمد جمال الدین حسین ۳-سید محمد بلال الدین حسین اور چھ ۶ دختران ۱-کریم النساء بیگم ۲-سیف النساء، ۳-بیگم حرمۃ النساء، ۴-بیگم صالحہ، ۵-بیگم حافظ، ۶-بیگم مسرت النساء اور ایک زوجہ حسینی بیگم چھوڑی مرحوم اپنی وفات سے قبل کئی سال تک علیل رہے، انکی دولڑکیوں کی شادی ہوئی کریم النساء اور سیف النساء کی ان شادیوں اور مرحوم کی تیمارداری کے لئے قرض لیا گیا ہے، اس قرض کی ادائیگی اور حرمت النساء کی شادی کرنے کے لئے اور اپنے نابالغ فرزندان و دختران کے لئے اور انتظام نفقہ وغیرہ کے لئے اپنی زوجہ حسینی بیگم کو منتظم اور ولی وصیتی نامزد کیا اور وصیت کی کہ اگر ان کی حیات میں یہ قرض ادا نہ ہوا اور فریضہ شادی انجام نہ پائے تو زوجہ اپنی ولایت سے متروکہ زمین سے کوئی جائداد فروخت کر کے قرض کی ادائیگی اور شادی کا انتظام کرے اور دیگر متروکہ کی حفاظت بھی کرے، نیز بچوں کی تعلیم و تربیت اور نفقہ کا انتظام کرے، چنانچہ حسینی بیگم ولی وصی نے حسب ہدایت شوہر ایک آراضی سدوی ۷۷ موسومہ خاص باغ واقع سیرکلیاں ضلع بیدوشریف میسور اسٹیٹ مبلغ (۲۰۰۰۰) بیس ہزار روپیہ سکۂ ہند میں فروخت کر کے مشتریان عبدالسلام نابالغ پدر حقیقی محمد عبدالکریم صاحب وغیرہ کے حق میں ولایۃ بیع کرنے کا معاہدہ کر کے محکمہ اسٹیٹ کمشنری ضلع بیدر شریف سے اجازت نامہ انتقال آراضی حاصل کر کے بحیثیت ذات اور ولی نابالغ فرزندان و دختران شرکت دختران بالغ بتاریخ ۳۰ راگست ۱۹۵۷ء دستاویز بیعنامہ کی تکمیل و رجسٹری کرادی اور آراضی معینہ پر مشتریان قابض و متصرف ہیں، اب نابالغ فرزندان میں سے دو فرزندان سید محمد کمال الدین حسین خانصاحب اور سید محمد جمال الدین خانصاحب جنکی عمر دستاویز بیعنامہ میں (۱۱) سال درج ہے بالغ ہو کر فرزند سوم محمد بلال الدین نابالغ کا خود کو ولی ظاہر کر کے اور مسرت النساء دختر نواب

خانصاب مرحوم کا بھی ولی بتا کر بشرکت صالحہ بیگم وحافظ بیگم ایک دعویٰ دیوانی عدالت سیول جج بیدر کے پاس دستاویز بیعنامہ کو کالعدم قرار دینے اور قبضہ آراضی مبیعہ کے لئے دائر کیا، اس دعویٰ میں اپنی مادر حقیقی ولیہ کی ولایت کو شرعا کالعدم ہونا بیان کیا ہے، متوفی کے متروکہ میں آراضی مبیعہ کے علاوہ کثیر جائداد غیر منقولہ موجود ہے جو مرحوم کے ورثہ کے قبضہ میں ہے۔ یہ مسئلہ دریافت طلب ہے کہ مادر حقیقی کی ولایت جو پدر متوفی کی نامزد کردہ ہے شرعاً درست ہے یا کہ نہیں اور ایسی ولیہ کو نابالغ کی جائداد جو متروکہ میں انکو ملی ہو مذکورہ اعتراض کے لئے منتقل کرنے کا اختیار شرعاً حاصل ہے یا کہ نہیں اور ایسا انتقال شرعاً جائز ہے یا کہ نہیں، متوفی کے ایک بھائی سید مہدی حسین بوقت وفات نواب مرحوم موجود تھے جن سے متوفی کو سخت اختلاف تھا اور دونوں میں مقدمہ بازی جائداد کے لئے جاری تھی۔ صورت جواب مرقوم فرمائیں۔

الجواب وبالله التوفيق:

حسب تحریر سوال حسینی بیگم کو منتظم اور وصی مقرر کرنا شرعاً صحیح ہے اور وصایہ کے حق سے مسماۃ مذکورہ نے جو آراضی فروخت کی ہے اگر عام نرخ کے مطابق بھی قیمت لیکر فروخت کی ہے تو اس کی بیع صحیح اور نافذ ہے، سید محمد کمال الدین حسین خانصاحب اور سید جمال الدین حسین خانصاحب کا ان نابالغین پر خود اپنے کو متولی ظاہر کرنا اور دستاویز بیعنامہ کو کالعدم کہنا شرعاً صحیح نہیں ہے، مسماۃ حسینی بیگم سے جب تک خیانت صریح یا غبن فاحش کا صدور دلائل شرعیہ صحیحہ سے ثابت و متحقق نہ ہو جاوے یا تمام نابالغین بالغ ہو کر اپنے حقوق واپس وحاصل نہ کرلیں اس وقت تک حسینی بیگم کی یہ وصیت ختم نہیں ہوسکتی۔ ودلائله مذكورة مفصلة في الكتب الفقهية المعتبرة فمن شاء فليراجع اليها كتنقيح الفتاوىٰ الحامدية، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۴/ ۷/ ۸۵ ۱۳ھ

الجواب صحیح محمود علی عنہ نائب مفتی دارالعلوم دیوبند

پوتے کو لڑکے کے برابر حصہ دینے کی وصیت:

زید کے چار لڑکے اور ایک لڑکی ہے جن میں سے زید کے روبرو زید کی زندگی میں ایک لڑکے کا انتقال ہوجاتا ہے اور مرنے والے لڑکے نے اپنی نسل سے ایک لڑکا زندہ صحیح وسلامت چھوڑا ہے، زید اپنی اولاد لڑکوں اور لڑکی کے روبرو گھریلو

معاملات آمدنی وخرچہ میں برابر برابر اپنے مرنے والے لڑکے کے لڑکے کو یعنی پوتے کو لیتا دیتا رہا ہے اور اپنی زندگی میں یہ بھی اپنے لڑکوں سے کہتا رہا کہ میرے پوتے کو اپنے برابر میرے مال ومکان میں حصہ دینا۔

زید نے اپنے مرتے وقت بھی یہ وصیت کی کہ میرے مال ومکان میں سے میرے پوتے کو ضرور حصہ دینا، لہذا زید کے پوتے کو شرعاً کتنا حصہ ملنا چاہئے، اور زید فوت ہوگیا ہے۔

الجواب وبالله التوفيق:

صورت مسئلہ میں زید کے سامنے مرنے والے لڑکے کا لڑکا اگر چہ ازروئے وراثت محجوب ہوگا مگر ازروئے وصیت حصہ پائے گا یہ تو سوال سے معلوم ہوتا ہے کہ زید اپنی زندگی میں بھی اپنے لڑکوں کے برابر اس پوتے کو بھی دیتا لیتا تھا نیز یوں بھی زندگی میں کہتا رہا کہ میرے پوتے کو اپنے لڑکوں کے برابر دینا پھر مرتے وقت جو وصیت کی ہے اگر چہ اس میں برابر برابر دینے کی تصریح نہیں کی ہے لیکن قرائن سے مساوات اور برابری دینا معلوم ہوتا ہے۔

نیز وصیت کا یہ لفظ کہ میرے پوتے کو ضرور حصہ دینا بھی برابری دینے کا ہے بشرطیکہ ثلث متروکہ کے اندر اندر رہے جیسا کہ عبارت ذیل سے معلوم ہوتا ہے، "ومن أوصى لأحد بحظ من ماله أو اوصیٰ من ماله أو بنصيب من ماله فالبيان إلى الموصي الخ "(۱)۔

وفي الجامع الصغير (ص ۱۲۲): رجل أوصى لرجل بجزء من ماله فإن الورثة يعطونه ما شأوا وإن أوصى بسهم من ماله فله مثل نصيب أحدالورثة ولا يزاد على الثلث إلا ان يجيز الورثة"

اور صورت مسئولہ میں لڑکوں کے برابر کو دینے کی صورت میں متروکہ کے ایک تہائی کے اندر ہی اندر رہتا ہے، کیونکہ زید کے تین لڑکے اور ایک یہ پوتا اور زید کی ایک لڑکی کل وارث ہیں، زید کی اہلیہ بھی زید کی زندگی ہی میں انتقال کرچکی تھی جیسا کہ اس واقعہ سے متعلق اس کے قبل والے استفتاء سے معلوم ہوتا ہے اور اس صورت میں زید کا کل متروکہ بعد ادائیگی حقوق متقدمہ علی الارث کے ۹ سہام (حصہ) پر تقسیم ہوکر دو دو سہام زید کے تینوں لڑکوں کو اور دو سہام زید کے پوتے کو دیئے جائیں گے اور ایک سہام زید کی لڑکی کو ملے گا۔ اس طور پر زید کے پوتے کو کل متروکہ ۲-۹ ملا اور یہ ثلث ترکہ کے اندر

۱- عالمگیری ۱۰۲/۶۔

ہے، لہذا صورت مسئولہ میں زید کے پوتے کوحسب وصیت زید کے لڑکوں کے برابر ملے گا، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

الجواب صحیح سید احمد علی سعید نائب مفتی دارالعلوم دیوبند

مدرسہ یا مسجد بنانے کی وصیت:

ہمارے ایک رشتہ دار کا وصیت نامہ ہے کہ ہماری جائداد کے تین حصے کئے جائیں اور اس میں سے ایک حصہ مدرسہ یا شفاخانہ میں ایک کمرہ یا مسجد بنائی جائے مگر رقم اتنی نہیں ہے کہ ان میں ایک حصہ کی رقم میں ایک چیز بن جاوے، لہذا ٹرسٹیوں کا یہ خیال ہے کہ کسی مدرسہ میں استاد کی تنخواہ یا مسجد کے امام کی تنخواہ میں وہ رقم استعمال کریں کیا وہ ایسا کر سکتے ہیں۔

الجواب وباللہ التوفیق:

اس روپیہ کو کسی تنخواہ میں خرچ کرنا جائز نہیں ہے بلکہ جس طرح وصیت کرنے والے نے وصیت کی ہے اسی طرح خرچ کرنا ضروری ہے خام تعمیر کرکے یا پختہ ہاں اگر کسی طرح تعمیر میں کفایت نہ کریں تو اس کو بمد تعمیر محفوظ کرکے اگر کسی طرح تعمیر کے لئے اور رقم فراہم ہوجائے اس وقت یہ روپیہ بھی اس میں ملا کر تعمیر پر خرچ کیا جاوے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۵/ ۸/ ۸۵ ۱۳ھ

الجواب صحیح سید احمد علی سعید دارالعلوم دیوبند

وصیت سے رجوع کا حکم اور پھر وصیت کرنا:

ایک شخص سعید الدین شاہ نے کچھ رقم جمعہ کے روز جامع مسجد کے اندر مجمع عام میں حافظ صدیق احمد کے سپرد کرکے اعلان کیا کہ اس رقم میں سے جو کچھ میں اپنی زندگی میں اپنے تصرف میں لے آؤں اور جو کچھ رقم بچے گی اور کفن وغیرہ سے بھی بچے گی وہ اس مسجد میں دیدینا۔ اب سعید الدین کا پانچ چھ سال بعد انتقال ہوگیا ہے، حافظ صاحب نے اس کے باقی ماندہ رقم سو روپیہ بتائی جس میں سے ۲۱۔ روپیہ کفن وغیرہ میں خرچ آگئے ہیں ۷۹۔ روپیہ موجود ہیں، لیکن اب حافظ صاحب کا بیان ہے کہ میرے سے متوفی نے کئی مرتبہ یہ وصیت کی ہے کہ میری باقی ماندہ رقم گاؤں میں تین مسجدیں ہیں تینوں میں دینا حافظ جی کہتے ہیں کہ میں نے یہ بھی کہا کہ تو نے مجمع عام میں ایک مسجد میں دینے کا اعلان کر رکھا ہے۔ اب تو تینوں مسجدوں میں دینے کو

کہتا ہے تو اس نے باصرار پھر یہی کہا ہے کہ تینوں مسجدوں میں دینا ورنہ حشر میں دامن گیر ہوں گا، اب حافظ صاحب دریافت کرتے ہیں کہ پہلے قول کے بموجب ایک مسجد میں دوں یا دوسرے قول کے بموجب تینوں مسجدوں میں دوں جس طرح آپ فرمائیں گے میں ویسے کروں گا مجھکو کسی قول سے خصوصیت نہیں ہے نہ دلچسپی ہے۔

الجواب وبالله التوفيق:

صورت مسئولہ میں حسب تحریر سوال تینوں مسجدوں میں دینا چاہئے، نیز یہ معلوم کر لیجئے کہ وصیت محض ایک تہائی متروکہ میں جاری ہوتی ہے، لہذا اگر سعید الدین اس روپیہ کے علاوہ کچھ ترکہ نہیں چھوڑا ہے تو (۷۹) اسی روپیہ کی ایک تہائی محض چھبیس روپیہ پانچ آنہ چار پائی ہے کل اتنی مقدار مسجدوں پر دیں اور بقیہ دو تہائی سعید الدین شاہ کے وارثوں کا حق ہے بغیر ان وارثوں کی اجازت کے مسجد وغیرہ میں کل دینا جائز نہیں ہے، لہذا سعید الدین کے وارثوں سے اس دو تہائی کی اجازت صریح لے کر مسجد پر دیں بغیر اس کے نہیں، "ولاتجوز بمازاد على الثلث إلا أن يجيز الورثة بعد موته وهم كبار" (۱)، اگر ورثہ معلوم نہ ہو یا نابالغ ہوں تو معلوم ہونے تک اور بالغ ہونے تک اس دو تہائی کو محفوظ رکھیں، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۵/ ۹/ ۸۵ ۱۳ھ

الجواب صحیح محمود غفی عنہ

داشتہ سے پیدا ہونے والی لڑکیوں کے لئے وصیت کا حکم:

اعظم نے دو شادی کی پہلی بیوی سے زید اور بیگم دو بچے پیدا ہوئے اور دوسری بیوی سے بکر اور خاتون پیدا ہوئے، اعظم کے مرنے کے بعد چاروں اولادوں نے باپ کی جائداد تقسیم کر لی، زید نے بغیر نکاح کے اپنے گھر میں ایک عورت کو رکھ لی جس سے دو لڑکیاں پیدا ہوئیں جنکے نام نرگس اور ثریا ہیں جب یہ دونوں جوان ہوگئیں تو انکی والدہ جو بلا نکاح کے رہتی تھی گھر چھوڑ کر چلی گئی اور اپنے ہمراہ دونوں لڑکیوں کو بھی لے گئی اس کے بعد اس نے اپنا نکاح کسی دوسری جگہ کیا اور نرگس اور ثریا کی شادی کی، لڑکیوں کی شادی میں زید بھی شریک ہوا اس کے بعد زید بیمار ہوا اور ایک وصیت نامہ لکھا کہ میرے مرنے کے بعد

۱- الفتاوی الہندیہ ۶/ ۹۰۔

میری جائداد لڑکیوں کو دیجائے لیکن وصیت نامہ کی کوئی تصدیق نہیں ہے اور نہ گواہوں کے دستخط ہیں۔ اب معلوم یہ کرنا ہے کہ زید کی جائداد مذکورہ میں سے کس کس کا حصہ ہے۔

الجواب وبالله التوفيق:

صورت مسئولہ میں اگر واقعی نرگس کی ماں سے زید کا نکاح نہیں ہوا تھا تو نرگس وثریا زید کی شرعی وارث نہیں ہیں اور ایسی صورت میں زید کی یہ وصیت زید کے دیگر ورثاء شرعی کی اجازت ومرضی کے بغیر بھی درست ہے ونافذ ہے اور اس کا حکم یہ ہے کہ زید مرحوم کے ذمہ اگر کچھ قرض ہو تو پہلے ان کے ترکہ سے قرض ادا کیا جاوے پھر جو بچے اس میں سے فقط ایک تہائی کے اندر اندر اس وصیت کے مطابق نرگس اور ثریا کو دے دیا جاوے اور باقی دو تہائی (چونکہ زید کی والدہ ماں سوال کے قرائن سے فوت شدہ معلوم ہوتی ہے اس لئے) کا نصف یعنی ایک تہائی بیگم کو اور پھر باقی ماندہ یعنی ایک تہائی کا تین حصہ کر کے دو حصے بکر کو اور ایک حصہ خاتون کو دے جائیں۔

مسئلہ ۱۸/۳　　　　　　　　　　　　زید متوفی

مـــیـــت

موصی علیہا	اخت حقیقی	اخ علاتی بکر	اخت علاتی خاتون
نرگس-ثریا	بیگم		ا
۳-۳	۱/۹	۴	۲

حاصل تخریج یہ ہے کہ زید متوفی کے ذمہ اگر قرض ہو تو قرض ادا کرنے کے بعد کل ترکہ زید اٹھارہ سہام کر کے پہلے تین سہام نرگس اور ثریا کو بوجہ وصیت دیں اور پھر چھ سہام (یعنی باقیماندہ ۱۲ سہام کا نصف) بیگم کو اور چار سہام بکر کو اور دو سہام خاتون کو دیں، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۳۸۵/۹/۲۴ھ

الجواب صحیح سید احمد علی سعید نائب مفتی دارالعلوم دیوبند

میرے روپئے کارِ خیر میں لگا دینا:

میری بیوی کا بھائی محمد یوسف کا انتقال ہوا انکے کوئی اولاد نہیں ہے اور نہ بیوی ہے صرف بڑے بھائی کے دولڑکے اور ایک بڑے بھائی کی بیوہ ہے جو کہ یوسف سے پہلے مر چکے ہیں، مرحوم کو بڑی فکر تھی کہ حسب ضرورت رقم جمع ہوجاوے تو حج کو جاؤں۔ انکی خدمت میری بڑی لڑکی کرتی تھی۔

ایک دفعہ اس نے شدت مرض میں کہا تھا کہ میرے روپیہ کو کارِ خیر میں لگا دینا جس سے میری روح کو ثواب پہنچے اس کے علاوہ کوئی ذکر نہیں کیا ہے۔

۱۔ ڈاکخانہ میں سات سو روپیہ ہے جس کے متعلق مرحوم نے کہا تھا کہ یہ طاہر نہیں ہے وکالت کی کمائی ہے۔

۲۔ ایک بکس میں نوسو روپیہ کے نوٹ تھے اور نوٹوں کے نمبر کاغذ پر تھے اور لکھا تھا برائے حج۔

۳۔ اسکے علاوہ کوئی جگہوں سے ۱۸۲ روپیہ ملے۔

۴۔ کپڑوں میں چھ جوڑے بستر لحاف اور دیگر کپڑے بھی تھے دریافت ہے کہ رقومات مندرجہ صدر یعنی وہ رقم جو کہ پاس تھی اور جو ڈاکخانہ میں ہے اور جس رقم پر برائے حج لکھا ہے اور پارچہ کو کیا کیا جاوے بتلایا جاوے کچھ دودھ کا قرض تھا وہ بھی دے دیا۔

الجواب وباللہ التوفیق:

صورت مسئولہ میں حسب تحریر سوال تجہیز و تکفین میں جو آپنے خرچ کیا اسی طرح دودھ کی قیمت بقایا جو دیا وہ سب ٹھیک ہے اور مرحوم کا یہ جملہ کہ میرے روپیہ کو کارِ خیر میں لگا دینا جس سے میرے روح کو ثواب پہنچے یہ وصیت ہے جو تجہیز و تکفین قرض کی ادائیگی کے بعد باقی ماندہ کے محض ایک تہائی میں نافذ ہوگی، اور باقی دو تہائی ازروئے وراثت مرحوم کے دونوں بھتیجوں کا حق ہے اور آپ نے جو چیزیں اور نقد صدقہ کردیا ہے وہ بھی چونکہ تہائی کے اندر اندر ہے جائز تصرف ہوگیا ہے۔

مگر اب آئندہ یہ کیجئے کہ مرحوم کے بھتیجے کو بلا لیجئے اور انکے سامنے وصیت والی رقم الگ کر لیجئے اور انکے مشورہ سے جس نیک کام میں چاہتے ہوں خرچ کیجئے، اس میں سے ان دونوں جوان قابل عقد یتیم لڑکیوں کے نکاح و سامان جہیز کے لئے بھی کچھ رقم نکال سکتے ہیں اور باقی دو تہائی رقم چند معتبر مسلمانوں کے سامنے مرحوم کے ان دو بھتیجوں کے سپرد کردیجئے اور جائز کاموں میں صرف کرنے کی نصیحت کردیجئے آپ کا ذمہ بھی نہیں ہوگا بلکہ ثواب کے بھی مستحق ہوجائیں گے اب آپ ازخود

کچھ مت کیجئے ۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی ، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور
الجواب صحیح محمود غفی عنہ مفتی دارالعلوم دیوبند

وصیت کی گئی زمین سے حقوق اللہ کی ادائیگی :

شیخ سلطان احمد صاحب اپنی زندگی میں کثرت مشاغل اور بدقسمتی کی وجہ سے فریضہ حج ادا نہ کر سکے اور آخر عمر میں مرض فالج کے بھی شکار ہو گئے جس کا سلسلہ تقریباً آٹھ دس سال تک چلتا رہا ، معقول دوا علاج اور کافی صرفہ خرچہ کے باوجود بھی شفایاب نہ ہو سکے ، اس عرصہ میں روزہ نماز اور دوسرے فرائض کما حقہ ادا کرنے سے معذور و مجبور ہو گئے تو وصال سے پہلے تلافی مافات کے لئے دس کٹھہ زمین مخصوص کر دی جس کی مالیت اس وقت بھی آٹھ دس ہزار روپیہ تھی اور تنبیہ بھی کر دی کہ وارثوں میں یہ زمین تقسیم نہ کی جائے گی بلکہ حقوق اللہ کی ادائیگی کیجائے گی جو میرے ذمے نکلتے ہیں ۔

چنانچہ وصال کے بعد جناب قاری امیر حسن صاحب مدظلہ کو حج بدل کے لئے تیار کیا گیا ہے جنکو مرحوم نے اپنی حیات میں اس کے لئے منتخب فرمایا تھا ، جسے ایک شخص سے لیکر زمین مذکور رہن کے طور پر دے دیا جانا طے ہو گیا ہے ، اسی بیچ میں مرحوم کے تیسرے لڑکے نے کہا کہ روپیہ کا انتظام ہم کئے دیتے ہیں وہ زمین ہمکو دے دی جائے بعد میں لکھ پڑھ دیا جائے گا ، چنانچہ وہ زمین ان کو دے دی گئی اور کوئی تحریر عمل میں نہیں آئی ، لکھ پڑھ دینے والی بات صاف نہیں ہوئی یونہی رہ گئی وہ سمجھ بیٹھے کہ یہ زمین ہمکو بطور بیع مل جائے گی لیکن کوئی تحریر عمل میں نہیں آئی جسے لگ بھگ دس سال کا عرصہ ہو رہا ہے وہ زمین ابھی بھی مرحوم کے تیسرے لڑکے کے پاس دخل قبضہ میں ہے ، اب جبکہ بڑے لڑکے دس سال کے بعد پاکستان سے آئے ہیں جنکے غائبانہ میں یہ معاملہ ہوا ہے یہاں آنے پر علم ہوا ہے اب تیسرے لڑکے طالب ہیں کہ یہ لوگ بیع لکھ دیں جبکہ زمین مذکور دس سال پہلے بھی آٹھ دس ہزار کی تھی اب تو بارہ تیرہ ہزار کی ہے جس پر صرف تین ہزار حج بدل کے لئے لیا گیا ہے بقیہ حقوق کی ادائیگی باقی ہے ، اس لئے یہ امر دریافت ہے کہ تین ہی ہزار میں زمین دے دی جائے یا کل زمین موجودہ نرخ کے حساب سے فروخت کر کے تین ہزار دے دیا جائے ، بقیہ سب حقوق اللہ کی دائیگی میں صدقہ جاریہ میں دے دیا جائے ، آیا کون سی صورت اختیار کی جائی جو شرعاً حکم ہو صادر فرمایا جائے ۔

ڈاکٹر عالم (ساکن لالی ، پوسٹ چکرہ سیوان)

الجواب وبالله التوفيق:

جب مرحوم نے وصال سے پہلے تلافی مافات کے لئے دس کٹھہ زمین مخصوص کردی تھی اور تنبیہ کردی تھی کہ وارثوں میں یہ زمین تقسیم نہ کی جائے گی بلکہ حقوق اللہ کی ادائیگی کی جائے گی تو یہ وصیت ہوگئی تھی اور جہاں تک جلد ممکن تھا اسکی تعمیل ضروری ہوگئی تھی اور اسکا حکم شرعی یہ تھا کہ مرحوم کے ذمہ جو قرض تھا اسکے دینے کے بعد جتنا ترکہ بچتا ہے خواہ کسی قسم کا ترکہ ہو اگر یہ دس کٹھہ پورا اس ترکہ کے تہائی کے اندر آتا تھا تو پورا دس کٹھہ ورنہ جتنا کٹھہ تہائی ترکہ میں آیا اتنا وصیت میں شمار کرکے مرحوم کی نماز روزہ حج وعمرہ جتنے حقوق اللہ ہیں ادا کردیے جاتے اور اگر وہ ساری قیمت تمام حقوق اللہ کی ادائیگی کے لئے کافی نہ ہوسکے تو اس کے متعلق استفتاء کرکے حکم شرعی معلوم کرکے اس کے مطابق عمل کیا جاتا اور اگر کوئی وارث اس زمین کو خرید لینا چاہتا ہے تو اس کی پوری قیمت لیکر اس وارث کو دیدینا مقدم کردیا جاتا مگر ایسا نہیں کیا گیا، روزہ نماز وغیرہ کا پورا حساب لگا کر اس کے فدیہ کی رقم نہیں معلوم کی گئی بلکہ صرف حج کی ادائیگی سوچی گئی اور معاملہ رہن دخلی کا طے کرلیا گیا حالانکہ رہن دخل میں سود ہوتا ہے (۱)، اور یہ معاملہ شرعاً حرام وناجائز ہے یہ سب اسی کا وبال ہونا اغلب ہے، كما ورد في الحديث "ما لم تحكم ائمتهم بكتاب الله جعل الله بأسهم بينهم او كما قال عليه الصلوة والسلام" (۲)۔

یعنی جب قوم کے بڑے لوگ کتاب اللہ سے خلاف فیصلہ کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ (اس کے وبال میں) قوم کے اندر آپس میں خوب گتھم گتی کردیتے ہیں۔

یہاں بھی ایسا ہی ہوا کہ ساری زمین (دس کٹھ) صرف تین ہزار میں ایک لڑکے کو دے دی گئی ہے اب بھی اس وصیت کا شرعی حکم یہ ہے کہ مرحوم کے تمام قضا شدہ روزوں نمازوں وغیرہ کا حساب لگا کر اس کے فدیہ کی رقم معلوم کرکے دس کٹھہ سب زمین یا اس سے کم جتنی زمین تہائی ترکہ قرار دیکر وصیت میں آتی ہو اس وقت کی مناسب قیمت پر فروخت کرکے اس میں سے تمام وصیت پوری کیجائے اور اگر کوئی وارث خود لینا چاہتا ہو تو پوری قیمت لے کر اس کو دیدینا راجح ہوگا۔

ہاں اگر تمام ورثاء یا بعض وارث راضی ہوجائیں کہ وہ زمین فروخت کئے بغیر اپنی جانب سے ساری وصیت پوری

۱- "لا انتفاع به (يعني الرهن) مطلقاً لا باستخدام ولا سكنى ولا لبس ولا إجارة ولا إعارة سواء كان من مرتهن أو راهن إلا بإذن كل للآخر، وقيل لا يحل للمرتهن لأنه ربا" (الدر المختار مع رد المحتار ۱۰/ ۸۲، ۸۳)۔

۲- ایک لمبی حدیث ہے "عن عبد الله بن عمر قال: أقبل علينا رسول الله ﷺ فقال: يا معشر المهاجرين، خمس إذا ابتليتم بهن وأعوذ بالله أن تدركوهن..."، اس کے آخر میں ہے "وما لم تحكم أئمتهم بكتاب الله ويتخيروا مما أنزل الله إلا جعل الله بأسهم بينهم" (سنن ابن ماجہ ۲/ ۱۳۳۲، کتاب الفتن، باب العقوبات حدیث ۴۰۱۹)۔

کردیں تو یہ زیادہ لیاقت کی اور عند اللہ پسندیدہ بات ہوگی اور تمام وصیت پوری کردینے کے بعد جو رقم فاضل بچے اس کے ذریعہ سے مرحوم کے ثواب کے لئے کوئی صدقہ جاریہ مہیا کردیا جائے، غرض یہی مذکور سب وبال سے نکلنے اور فلاح دارین کا ذریعہ ہے (۱)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۱/۱۱/۱۴۰۰ھ

۱- ''وتجوز (الوصیة) بالثلث للأجنبی عند عدم المانع وإن لم یجز الوارث ذلک لا الزیادة علیه إلا أن تجیز ورثته بعد موته'' (الدرالمختار مع ردالمحتار ۱۰/۳۳۹)۔

كتاب الفرائض

کتاب الفرائض

بعض وارث کی غیر موجودگی میں ثالث کے فیصلہ کی حیثیت:

فریقین نے کسی معاملے میں چند لوگوں کو ثالث بنایا ایک فریق کے چھ وارث ہیں دوسرے فریق کے تین وارث ہیں، ثالثی فیصلے کے وقت چھ وارث والے فریق کے صرف دو وارث موجود تھے اور تین وارث والے فریق سب یعنی تینوں موجود تھے، ان تینوں اور دوسرے فریق والے دونوں نے ثالثی کا فیصلہ مان لیا اور چار غیر حاضر رہے، فیصلہ کرنے والوں نے چھ وارث والے فریق کو شرعی طور سے جو حصہ پہنچتا تھا اس سے بالکل محروم کردیا اور بیوی کا جو مہر پانچ ہزار روپیہ تھا اس سے محروم کردیا، اب سوال یہ ہے کہ چار وارث کی غیر موجودگی دو وارث کی موجودگی اور ان کا فیصلہ ماننا جب کہ شریعت کے خلاف فیصلہ ہے معتبر اور جائز ہوگا یا نہیں امید ہے کہ مفصل فتوی صادر فرمائیں گے۔

حافظ نور احمد عرف مکن (کیرانہ ضلع مظفر نگر، یوپی)

الجواب وبا لله التوفيق:

مذکورہ صورت میں جب ان بعض ورثہ کو بقیہ ورثہ نے اپنا وکیل نہیں بنایا ہے تو یہ فیصلے ان ورثہ کے حق میں معتبر اور لاگو نہ ہوگا جو موجود نہیں تھے اور مہر بھی ساقط نہ ہوگی اور بلکہ بعد ادئیگی حقوق متقدمہ وبعد ادائیگی مہر وہ ورثہ جو موجود نہیں تھے حسب تخریج شرعی مستحق ترکہ ہوں گے(۱)، واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۴۰۱/۲/۱۳ھ

۱- تحکیم اور ثالثی کے صحیح ہونے کے لئے ہر فریق کا ثالث اور حکم پر متفق ہونا ضروری ہے علامہ شامیؒ "کتاب القاضی إلی القاضی إلا فی مسائل" کے تحت لکھتے ہیں:" وأنه لا بد من تراضيهما عليه.... وأنه لا يتعدى حكمه إلى الغائب ...... وأنه لا يتعدى حكمه من وارث إلى الباقي والميت" (رد المحتار علی الدر المختار ۸/ ۱۳۰)۔

۱-والد کی خدمت نہ کرنے سے وراثت سے محروم نہ ہوگا؟

مرد اپنی چوتھی بیوی اور دوسری بیوی کے بچوں کے ساتھ رہتے رہے، تیسری بیوی کا لڑکا کبھی بھی کسی خوشی ورنج کے موقعہ پر والد کے ساتھ شریک نہ رہا اور والد کی آخری دو سال کی سخت علالت میں بھی باپ سے نہیں ملا، حتی کہ انتقال میں بھی شریک نہ ہوا اور دوسری بیوی کے دونوں لڑکے ان کی خدمت اور تیمارداری کرتے رہے، دوران علالت میں ان کی دلی خواہش ہوئی کہ میں کاغذی طور پر تیسری بیوی کے بچے کو اپنی جائیداد سے محروم کردوں تا کہ بعد انتقال کوئی فتنہ نہ پیدا ہو، چھوڑی ہوئی جائیداد پر اب بھی دوسری بیوی کے دونوں لڑکے قابض ہیں، اب آیا تیسری بیوی کے بچہ کا حصہ ہوایا نہیں؟

۲-مورث کا تمام مال اس کا ترکہ قرار پائے گا:

مذکورہ بالا مسئلہ میں دوسری بیوی کے دولڑکے اور تین لڑکیاں اور تیسری بیوی اور ایک بچہ اور چوتھی بیوی کو چھوڑ کر شوہر عرصہ ۱۵ سال ہوا مر گئے، اور رہائشی مکان کرایہ کی دوکان، کھیت، اور باغ اور اس کے علاوہ شہر میں ایک سائیکل کی کرایہ کی دوکان چھوڑی جو ایک تجارت کی شکل میں تھی جس کی دیکھ بھال دوسری بیوی کے دونوں لڑکے اپنے والد کے ساتھ کرتے تھے، مرنے انتقال سے تقریباً ۳ سال قبل سائیکل کی دوکان کے سامان کا حصہ اپنے بڑے لڑکے کے نام انکم ٹیکس کی بچت کے تحت تحریر کردیا، اب آیا صرف تجارتی کرایہ کی دوکان کے سامان میں کسی اور کا حصہ ہوگا یا نہیں؟ اس کے بعد بڑے لڑکے نے چھوٹے بھائی کے ساتھ کام کو آگے بڑھایا اور سال بہ سال سائیکل کی کمپنیوں سے ایجنسی لے لے کر اپنے کاروبار کو کافی محنت کر کے آگے بڑھایا، تیسری بیوی کا لڑکا بالغ ہونے کے بعد اپنے بڑے بھائیوں سے اپنا حق مانگ رہا ہے اور بڑے بھائی دینے کو بھی تیار ہیں اب سوال یہ ہے کہ چھوڑی ہوئی کرایہ کی تجارتی دوکان میں حصہ بھائیوں کے درمیان موجودہ حیثیت پر لگے گا یا اس حیثیت پر جو باپ کے مرنے کے وقت تھی؟

۳-اگر باپ کے مرنے کے وقت کرائے کی دوکان کی جو حیثیت تھی اس پر لگے گا تو تیسری بیوی کے بچہ کا وہ روپیہ جو اس کی آمدنی کا حصہ تھا اس کا کیا حساب ہوگا اور بھائی لوگ جب اس سے مستفید ہوتے رہے تو کس طرح ادا کریں گے؟ بینوا توجروا۔ سوال کے جواب شرع کی رو سے مرحمت فرمائیں۔

شمیم احمد (معرفت اعظم گڑھ سائیکل اسٹورس ۱۹۰، اے پہاڑ پور، اعظم گڑھ-۲۷۶۰۰۱)

الجواب وبالله التوفيق:

۱-تیسری بیوی کا لڑکا بھی باوجود کھ درد میں شریک نہ ہونے کے بلا شبہ نص قرآنی مثل اور بھائیوں (یعنی اولادوں) کے حقدار وراثت ہوگا اور جن بھائیوں نے باپ کی خدمت اور تیمارداری کی مگر باپ نے حیات میں ان کو اس خدمت کے عوض میں بطور ہبہ کچھ دیکر ان کے قبضہ دخل میں نہیں دیا تو ترکہ میں سے اس کا عوض لینے کے یہ لوگ مستحق نہ ہوں گے، بلکہ ان خدمت کرنیوالوں کو آخرت میں اس سے کہیں زیادہ ثواب ملے گا اور تیسری بیوی کے لڑکے نے جس نے خدمت وغیرہ نہیں کی اگر اس میں وہ معذور نہیں تھا تو اس کو آخرت میں سخت مواخذہ بھگتنا ہوگا لا یہ کہ باپ کے لئے دعائے خیر وصدقہ وخیرات کرے اور اس کی تلافی کی کوشش کرے۔

اگر باپ کاغذی طور پر بھی اس کو عاق اور محروم کردیتا جب بھی شرعاً وہ حقدار وراثت ہوتا محروم عن الوراثۃ شرعاً نہ ہوتا پھر جب عاق نہیں کیا تو بدرجہ اولیٰ محروم نہ ہوگا(۱)۔

۲-پرداز سوال سے معلوم ہوتا ہے کہ شوہر (مورث) کے مرنے کے وقت دونوں بیویاں (تیسری وچوتھی) زندہ تھیں اگر یہ صحیح ہے تو مرحوم کے رہائشی مکان اور اس کے جملہ سامان واثاث البیت اور کھیت وباغ جو بھی مرحوم کا مملوک رہا ہو سب میں سے حقوق متقدمہ علی المیراث (جیسے خرچ تجہیز وتکفین وبذمہ مورث قرض باقی رہا ہو اور مہر وغیرہ) دینے کے بعد جتنا ترکہ بچے وہ سب ایک سو چوالیس سہام پر تقسیم ہوکر اس میں سے ۹ نو ۹ نو سہام تیسری وچوتھی بیوی کا حق ہوگا۔ اور اٹھائیس اٹھائیس سہام تینوں لڑکوں کا حق ہوگا، اور چودہ چودہ سہام تینوں لڑکیوں کا حق ہوگا، اور صورت تخریج یہ ہوگی:

مسئلہ ۸ تص ۱۴۴

زید (میت)

زوجہ ثالثہ	زوجہ رابعہ	ابن ثانیہ	ابن ثانیہ	ابن ثالثہ	بنت	بنت	بنت
۹	۹	۲۸	۲۸	۲۸	۱۴	۱۴	۱۴

اور کرایہ کی دوکان کا اگر یہ مطلب ہے کہ وہ دوکان مرحوم کی ملکیت نہیں تھی بلکہ مرحوم نے کرایہ پر لی تھی تو اس کا حکم

۱- ''الإرث جبری لا يسقط بالإسقاط'' (تکملۃ رد المحتار ۱۱/۶۷۸)، ''والحقوق ههنا خمسة بالاستقراء، لأن الحق إما للميت أو عليه أولا ولا، الأول التجهيز والثاني إما أن يتعلق بالذمة وهو الدين المطلق أولا وهو المتعلق بالعين والثالث إما اختياري وهو الوصية أو اضطراري وهو الميراث'' (درمختار مع رد المحتار ۱۰/۴۸۹)۔

یہ ہے کہ مورث (مرحوم) کے مرنے پر وہ کرایہ داری ختم ہوگئی اور اب اس عمارت میں وراثت نہیں چلے گی، بلکہ مرحوم کے مرنے کے بعد جس نے کرایہ پر لیا صرف وہ شرعاً اس کا کرایہ دار قرار پا گیا یا قرار پا جائے گا، پھر کسی دوسرے کی طرف وہ کرایہ داری جو والد مرحوم کی تھی شرعاً منتقل نہ ہوگی۔

یہی حکم شہر والی کرایہ کی دوکان کا ہوگا، اگر اس کی عمارت کا مرحوم خود مالک نہیں تھا (۱)، اب رہا اس دوکان میں جو سائیکل کرایہ پر دینے وغیرہ کا کام جس کو صرف دوسری بیوی کے دولڑکے انجام دیتے تھے، اپنے والد کے ساتھ بھی اور والد کے مرنے کے بعد بھی اس کا حکم شرعی یہ ہے کہ جب مرحوم (والد) کے انتقال کے بعد تیسری بیوی کا لڑکا کام میں شریک نہیں ہوا اور نہ کہ اور وارث نے شرکت کیا اور نہ تقسیم اثاثہ واسباب کا مطالبہ کیا تو یہ سب ورثہ کی جانب سے ان دولڑکوں کے حق میں تبرع واحسان ہوا جس کا ثواب آخرت میں ملے گا، اور جو آمدنی اس کے ذریعہ ان دولڑکوں نے کمائی اس میں حصہ کا مطالبہ کرنے کا کسی کو حق نہیں رہا، بلکہ اس کی آمدنی جو والد مرحوم کے بعد کی ہے وہ سب تنہا صرف ان دولڑکوں کی شرعاً شمار ہوگی (۲)۔

ہاں والد (مرحوم) کے انتقال کے وقت کا جو سامان واثاثہ موجود ہو اس میں اوپر لکھی ہوئی تخریج کے مطابق سب حصہ دار شریک وحقدار ہوں گے، اور ان دولڑکوں کے علاوہ ورثہ کو حق ہوگا کہ وہ اس موجود اثاثہ وسامان کو تقسیم کرا کے بعینہ لے لیں یا ان کی موجود قیمت کے اعتبار سے قیمت لے لیں۔

۳- اس نمبر کا جواب ۳ کے جواب میں آگیا، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۴/۲/۱۴۰۱ھ

پگڑی دے کر کرایہ پر لئے گئے مکان میں وراثت:

ہمارے والد مرزا عثمان بیگ کا انتقال ہوا جائیداد کی صورت میں کوئی نقدی یا مال نہیں چھوڑا، البتہ دو روم پر مشتمل ایک کرایہ کا بمبئی میں گھر ہے جس کا کرایہ مبلغ =/۲۲ روپئے تھے، اب مبلغ =/۱۴ روپئے ادا کرنا ہوتا ہے، بمبئی میں کرایہ داروں کے کچھ ایسے حقوق ہیں جن کی وجہ سے گھر مالک اپنی مرضی سے مکان خالی نہیں کرا سکتے یا مرنیوالے کے رشتے دار ہوں یا رکھے ہوئے آدمی ہوں ان سے بھی وہ خالی نہیں کرا سکتے تا وقتیکہ انکو کرایہ ملتا رہے، البتہ اگر ۳ سے ۶ ماہ کا کرایہ نہ ادا ہو تو گھر

۱- ’’وإذا مات أحد المتعاقدين وقد عقد الإجارة لنفسه انفسخت الإجارة‘‘ (ہدایہ ۲۹۹/۳)۔

۲- ”لو تصرف أحد الورثة في التركة المشتركة وربح فالربح للمتصرف وحده كذا في الفتاوى الغياثية“ (فتاوی عالمگیریہ ۳۴۶/۲)۔

مالک مکان خالی کراسکتا ہے یہ قانونی پیچیدگیاں ہیں جن کی وجہ سے **لوگ** اپنے قبضہ اور حق کرایہ داری کے عوض ایک خطیر رقم **لو** گوں سے لیتے ہیں اس بنا پر سماجی اور عوامی ذہن میں **لوگ** اسے جائیداد سمجھنے لگے ہیں ایسے مکان میں وارثین کا حق ہوگا یا نہیں، شرعی نقطۂ نظر سے برائے مہربانی تفصیل سے اس پر روشنی ڈالدیں، آجکل یہ معاملہ عوام میں موجب نزاع بنا ہوا ہے، مرحوم مرزا عثمان بیگ کے تین لڑکے دولڑکیاں اور ایک بیوی تھی، بڑے لڑکے مرزا محمد بیگ صاحب نے والد کے بعد گھر کے افراد کی سرپرستی کی اور ان کی شادیاں والدہ کی تاحیات کفالت حتی کہ تجہیز وتکفین بھی کی، ان اخراجات کی شرعی حیثیت کیا ہے، اگر مرزا محمد بیگ ان اخراجات کا مطالبہ کریں تو شرعاً کیسا ہے؟

مرزا محمد بیگ

الجواب وبالله التوفيق:

بمبئی کی زمینوں ومکانوں کے احوال مختلف ہوتے ہیں اور ان احوال کے اعتبار سے احکام بھی مختلف ہوتے ہیں، مثلاً وہاں زمین ومکان کی مالک واقعی حکومت ہوتی ہے حکومت چونکہ غیر ہے اس لئے حکومت اپنے قانون کے مطابق جس کو جن قیود وشرائط کے ساتھ دیگی حکم اس کے مطابق ہوگا اور مثلاً جن دوکانوں یا مکانوں کے واقعی مالک مسلمان ہیں وہ اگر محض کرایہ پر دیں اور کچھ رقم پیشگی وصول کریں اور کچھ رقم ماہ بماہ وصول کریں تو وہ پیشگی رقم بھی زیر اجارہ پیشگی کی تاویل سے مالکوں کو لینا درست رہے گا(۱)، اور مثلاً جن دوکانوں یا مکانوں کے واقعی مالک مسلمان نہیں ہیں بلکہ واقعی مالک غیر مسلم ہیں تو وہ جن قیود وشرائط کے ساتھ دے رہے ہوں ان قیود وشرائط کے ساتھ لینا درست ہے بشرطیکہ خداع فریب نہ ہو کیونکہ حکومت غیر مسلمہ ہے اور حکومت غیر مسلمہ میں ایسے امور کا یہی حکم ہوتا ہے۔

اور مثلاً جو لوگ اصل مالک نہیں ہیں بلکہ محض کرایہ دار ہیں اور محض قبضہ وحق کرایہ داری کے عوض خطیر رقم لیتے ہیں تو چونکہ حق کرایہ داری حقوق مجردہ میں سے ہے اور حقوق مجردہ کا معاوضہ لینا شرعاً درست نہیں (۲)، البتہ اگر اصل مالک کی اجازت سے اس مکان یا دوکان میں کچھ اضافہ یا تعمیر وغیرہ اصلاحات وزیادتی کی ہے تو اس کا مناسب معاوضہ لے سکتا ہے اور غیر مسلموں سے ایسا معاملہ کرنا درست ہوگا جیسا کہ وہ مسلمانوں کے ساتھ کرتے ہیں تاوقتیکہ نصوص شرعیہ صریحہ کے خلاف

۱- ''الأجر لا يلزم بالعقد فلا يجب تسليمه بل بتعجيله أو شرطه في الإجارة'' (درمختار) اس کے تحت شامی میں ہے: "بل بتعجيله" في العناية: إذا عجل الأجرة لا يملك الاسترداد.... "أو شرطه" فله المطالبة بها'' (رد المحتار علی الدر المختار ۹/۱۳)۔

۲- ''وفي الأشباه: لا يجوز الاعتياض عن الحقوق المجردة'' (الدر المختار مع رد المحتار ۷/۳۳)۔

نہ ہو مثلاً ربوا وغیرہ کا ارتکاب، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۱۴۰۱/۵/۲۳ھ

بھائی کے نام بینک میں جمع شدہ رقم کا مالک کون ہوگا؟

زید نے اپنی تنخواہ میں سے فنڈ کی رقم NOMINATION.P.F اپنے پرورش کنندہ بڑے بھائی کے نام کر دیا ہے، کیونکہ زید کے والد صاحب زید کے بچپن میں ہی انتقال کر گئے تھے، انتقال کے بعد سے زید کے بڑے بھائی نے ہی زید کی پرورش کی اس کومزدوری میں ہی تعلیم دلائی اوردل اورجان کی بازی لگا کر اسے کوشش کر کے اسے ملازمت بھی دلوائی تھی، فنڈ کی رقم زید نے اپنے بھائی کے نام لکھی ہے اور بعد کی رقمیں خود اپنے نام لکھی ہے زید کی شادی وغیرہ کا بوجھ بھی بڑے بھائی کے ذمہ تھا، شادی کرنے کے پانچ سال کے بعد زید کا اچانک انتقال ہوگیا، زید کے انتقال کے وقت زید کی والدہ زید کی ایک بیوہ بہن جوکہ ۴۰ سال سے بیوہ ہے اور نہ ہی اسے کوئی اولاد ہے جوکہ بیوہ ہونے کے بعد ہی سے زید کے سر تھی اب بڑے بھائی کے سر ہے زید کا بڑا بھائی جس نے باپ کا پیار اورشفقت زید کو دی اپنا خون پلایا اور ایک زید کی بیوی اور ایک لڑکا اور دو لڑکیاں باقی ہیں، زید کی شادی سے پہلے بھی فنڈ کی رقم بھائی کے نام تھی اور اب انتقال کے بعد بھی فنڈ کی رقم بڑے بھائی کے نام ہی لکھی ہے۔

لیکن زید جس فیکٹری میں ملازمت کرتا تھا اس فیکٹری کا قانون یہ ہے کہ شادی کرنے کے بعد وہ فنڈ کی رقم بھی جوکہ پرورش کنندہ کے نام لکھی ہے وہ کٹ جاتی ہے اور یہ رقم بھی فیملی میں چلی جاتی ہے یہی ایسی ایک فیکٹری ہے جس میں وصیت کئے جانے والے کا نام کٹتا ہے کہ جب فنڈ میں نام بڑے بھائی کا موجود ہے اس رقم کی بعد کی رقمیں جوکہ خود زید کے نام پر تھی وہ تو شرع شریف کے مطابق تقسیم ہوچکی ہے لیکن یہ رقم کا مسئلہ رکا ہوا ہے، کیا یہ رقم بزرگ بڑے بھائی کو حاصل ہوسکتی ہے؟ کیونکہ عام سرکاری قانون ساری دنیا کا یہ ہے کہ مرنے سے پہلے جب کوئی انسان کوئی وصیت کرتا ہے تو وہ اس کا حقدار ہوتا ہے شادی کرنے اور نہ کرنے سے کوئی مطلب نہیں ہے، کیونکہ زید پانچ سالہ شادی کے درمیان میں خود نام لکھ سکتا تھا اور بڑے بھائی کا نام کاٹ سکتا تھا لیکن شادی کے بعد بھی نام موجود ہے کیا یہ رقم جوکہ فنڈ کی ہے بڑے بھائی کے نام وہ بھی وارثان میں شرع شریف کے مطابق تقسیم ہوگی یا پھر صرف زید کے نام کی رقمیں شرع شریف کے مطابق تقسیم ہوگی ازروئے شرع شریف بحوالہ کتاب جواب فرما کر اس مسئلہ کو جلد از جلد حل کرنے کی مہربانی فرمائیں۔

لال خاں (محلہ لوہا منڈی ہاپوڑ)

الجواب وبالله التوفيق:

فنڈ کی جو رقم بھائی کو دینے کے لئے زید نے لکھا ہے اس کی حقیقت وصیت کی ہے اور جب زید کے انتقال کے وقت زید کا لڑکا موجود ہے تو بھائی کو از روئے وصیت زید کے کل ترکہ سے تہائی حصہ میں جتنی رقم وصیت کی آوے گی اس کا مستحق شرعاً از روئے وصیت بھائی ہی ہوگا اور تہائی ترکہ سے زائد جو رقم وصیت کی پڑے گی اس میں تخریج شرعی چلے گی اور سب وارثوں کو حسب قاعدہ وراثت ملے گی (۱)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند، سہارنپور ۱۴۰۱/۵/۲۱ھ

بہن، ماموں و چچا کی اولاد اور چچی میں ترکہ کس کو ملے گا:

۱- زینب کا انتقال ہوگیا اس کے کوئی اولاد یا اور کوئی وارث نہیں قریبی رشتہ داری میں درج ذیل لوگ موجود ہیں:

۱- بہن کے بچے ۲- ماموں کے بچے ۳- چچا کے بچے

۴- چچی

اوپر لکھے لوگوں میں کون کون زینب کے وارث کہلائیں گے۔

۲- زینب کی تادم حیات خبر گیری زینب کی بہن کے بچوں نے کی ہے۔ اور اپنی حیات میں زینب کو یہ کہتے سنا گیا ہے کہ میرے بعد مال کے وارث میری بہن کے بچے ہیں۔ کیا اس صورت میں بہن کے بچے وارث کہلانے کے حقدار ہیں؟

الجواب وبالله التوفيق:

صورت مسئولہ میں چچی اجنبیہ ہے اور اسکو کسی حال میں استحقاق وراثت نہیں ہے اور بہن کے بچے (لڑکا ولڑکی) دونوں اور ماموں کے بچے (لڑکا ولڑکی دونوں) اور چچا کے بچے (صرف لڑکی) یہ سب ذوی الارحام میں سے ہیں اور چچا کا لڑکا تو عصبات میں سے ہے پس اگر چچا کا لڑکا زندہ ہوگا تو کل ترکہ کا استحقاق وصیت وغیرہ دینے کے بعد تنہا چچا کے لڑکے کو ہوجائے گا اور باقی سب محروم رہیں گے (۲)، اور اگر چچا کا کوئی لڑکا (مذکر) زندہ نہ ہوگا تو کل ترکہ بہن کے بچوں کو مل جائے گا

۱- ''وتجوز بالثلث للأجنبي عند عدم المانع وإن لم يجز الوارث ذلك لا الزيادة عليه إلا أن تجيز ورثته'' (الدرالمختار مع ردالمحتار ۱۰/۳۳۹)۔

۲- ''يحوز العصبة بنفسه وهو كل ذكر لم يدخل في نسبته إلى الميت أنثى ما أبقت الفرائض وعند الانفراد يحوز جميع

اور باقی لوگ بہر حال محروم رہیں گے۔ کیوں کہ ذوی الارحام میں بہن کے بچے اقرب الی المیت کے ہیں (۱)۔ خلاصہ جواب یہ نکلا کہ اگر چچا کے کوئی لڑکا موجود ہے اور بہن کی اولاد کے لئے وصیت بھی کیا ہے تو بہن کی اولاد کو تہائی ترکہ دے کر بقیہ سب چچا کے لڑکے (مذکر) کو مل جائے گا اور چچا کی لڑکی کچھ نہ پائے گی۔ اور اگر چچا کے کوئی لڑکا زندہ نہیں ہے تو اقرب الی المیت ہونے کی بنیاد پر کل ترکہ تنہا بہن کی اولاد مذکر کو دوہرا حصہ اور مونث کو اکہرا حصہ ملے گا، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دار العلوم دیوبند، سہارنپور ۲/ ۱۰/ ۱۴۰۱ھ

کیا ہندوستان اور بنگلہ دیش دونوں مختلف دار ہیں؟

موجودہ ہندوستان اور بنگلہ دیش ظاہر ہے کہ دونوں الگ الگ مستقل دو حکومتیں ہیں۔ اگرچہ بنگلہ دیش بھی کوئی اسلامی حکومت نہیں تاہم اختلاف دارین کا دارو مدار تو اختلاف قوۃ و منعۃ پر ہے۔ ہندوستان اور بنگلہ دیش کے درمیان آپس میں قوۃ اور منعۃ کا اختلاف تو کھلم کھلا ہے۔ اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ دونوں ملکوں کے باشندوں کے درمیان اختلاف دارین کا حکم (حرمان میراث وغیرہ) جاری ہوگا یا نہیں۔

سوال اس سے نہیں ہے کہ کوئی شخص کس طرح رابطہ قائم کرے اور اپنے بنگلہ دیشی کسی رشتہ دار کو اپنی راضی خوشی سے کچھ دلوا دے اس سے بحث نہیں بلکہ اصل سوال شرعی استحقاق کے بارے میں ہے۔ اگر شرعاً استحقاق نہ ہوگا تب تو بعض وارث کی طرف سے برضا و خوشی کچھ دینے دلوانے پر دوسرے ورثہ کو حق اعتراض پہنچے گا بلکہ حقوق العباد میں دخل اندازی بھی ہوگی یہاں کے علماء میں اس سوال پر اختلاف ہو رہا ہے یہ بات اگر کہی جائے کہ اختلاف دارین کا حکم بین المسلمین جاری نہیں ہوتا تو اس کا مصرح حوالہ کتب معتبرہ میں ملے گا تو کہاں؟ ورنہ مودودی صاحب نے جیسا کہ ہندوستان پاکستان کے باشندے کے زوجین کے درمیان آپس میں اختلاف دارین کے سبب سے انقطاع نکاح کا فتوی صادر کیا تھا، تو اہل سنت علماء کی طرف سے کس بنیاد پر مودودی کے فتوی کو مورد ہدف بنایا گیا تھا، یہاں ایک ایسا واقعہ پیش آ گیا ہے، لہذا سوال بھیج رہا ہوں۔

مفتی محمد خیر الاسلام (نوگاؤں، آسام)

المال" (تنویر الابصار مع شرح الدر المختار مع رد المحتار ۱۰/ ۵۱۶)، اور وصیت کی بناء پر صرف تہائی ترکہ بہن کی اولاد کو ملے گا، "ثم تقدم وصيته .... من ثلث ما بقي بعد تجهيزه و ديونه" (الدر المختار مع رد المحتار ۱۰/ ۴۹۶)۔

۱- "باب توريث ذوي الأرحام هو كل قريب ليس بذي سهم ولا عصبة ولا يرث مع ذي سهم ولا عصبة سوى الزوجين فيأخذ المنفرد جميع المال ويحجب أقربهم الأبعد" (تنویر الابصار مع شرح الدر المختار مع رد المحتار ۱۰/ ۵۴۵)۔

الجواب وبالله التوفيق:

اختلاف دار فیما بین المسلمین مانع عن الارث نہیں ہوتا۔

(مبسوط للسرخسی ۳۰ص ۲۳) میں بھی اس کی صراحت موجود ہے،فرماتے ہیں:''وأهل الحرب فيما بينهم لا يتوارثون إذا اختلفت منعتهم وملكهم بخلاف المسلمين فان أهل العدل مع أهل العدل يتوارثون فيما بينهم لأن دار الإسلام دار أحكام فباختلاف المنعة والملك لا تتباين الدار فيما بين المسلمين لأن حكم الإسلام يجمعهم''(۱)۔

اورحضرت مولانا سید اصغرحسین میاں صاحب بھی اپنے حاشیہ سراجی میں اس کی تصریح بایں الفاظ کی ہے:''بل بعضهم صرح بتخصيصه مع الكفار (فی فصل فی موانع الارث)''۔

انہی وجوہ کی بناپر ابوالاعلی مودودی کی اس مسئلہ میں تردید کی گئی تھی،فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی،مفتی دارالعلوم دیوبند،سہارنپور ۱۴۰۱/۹/۲۵ھ

تمام متروکہ جائداد میں سارے ورثہ کا حق ہے:

حاجی عبدالغنی کا انتقال ہوا،انہوں نے حسب ذیل ورثاء چھوڑا(۱) بیوی صُفدری خاتون (۲) ایک بیٹا عبدالعزیز (۳) ایک بیٹی ہاجرہ خاتون اور وراثت میں دودکانیں مع اسباب تجارت دوگودام اور ایک رہائش گاہ چھوڑی۔دکانیں گودام اور رہائش گاہ سب ہی کرایہ پر ہیں۔اب دریافت طلب مسئلہ یہ ہے کہ

(الف) عبدالعزیز کا کہنا ہے کہ دکانوں کے صرف مال واسباب میں مذکورہ تینوں افراد کی وراثت ہوسکتی ہے، لیکن دکانیں،گودام اور رہائش گاہ چونکہ کرایہ پر ہیں اس لئے ان سے صُفدری وہاجرہ کووراثت کا حق حاصل نہیں۔بلکہ اس کا سوفیصدی حق عبدالعزیز کوحاصل ہے اور اسی بناپر گودام اور دکانوں پر قابض رہ کرعبدالعزیز اسی سرمائے سے آج تک تجارت کرتا ہے اور مکان مذکورہ میں رہائش پذیر ہے،واضح ہو کہ کلکتہ کے مروجہ دستور کے مطابق رہائشی مکان میں رہائش یا دکانوں میں تجارت کو پوزیشن کا حصول خرید فروخت کے طور پر ہوتا ہے۔

۱- نیز دیکھئے: ردالمحتار علی الدرالمختار ۱۰/ ۵۱۰ قوله:"بخلاف المسلمين محترز قوله فيما بين الكفار أي اختلاف الدار لا يؤثر في حق المسلمين كما في عامة الشروح حتى أن المسلم التاجر أو الأسير لو مات في دار الحرب ورث منه ورثته اللذين في دار الإسلام كما في ملتقى الأبحر".

صفدری وہاجرہ خاتون شرعی اصول کے روشنی میں دکانوں، گودام اور رہائش گاہ میں اپنا حق وراثت چاہتی ہیں تا کہ وہ خود تجارت کر اسکیں۔شرعی اصول تحریر فرمائیں۔

(ب) عبدالعزیز مال کی تقسیم پر آمادہ ہے لیکن کیا (۱) صفدری وہاجرہ خاتون کی خواہش کے مطابق دکانیں، گودام اور رہائش گاہ میں جگہ یعنی پوزیشن کی تقسیم جس قدر کہ ان کا حق ہے ممکن ہے (۲) جگہ (پوزیشن) کوفروخت کردینے کے بعد حاصل شدہ رقم میں صفدری وہاجرہ کا کس قدر حصہ ہوگا؟ (۳) جگہ کی تقسیم نہ کئے جانے کی صورت میں کیا ہر ماہ (اسی مشترک سرمائے کی) آمدنی میں صفدری وہاجرہ جس قدر کہ ان کا حصہ ہے کی حقدار ہیں۔

(۴) دکانوں میں عبدالعزیز کی جو اپنی محنت شامل ہے اس کی محنتانہ بعد دے کر حساب ہوگا یا کیا؟

یا ہاجرہ خود بھی ایک دکان میں محنت کر کے یا کرا کے محنتانہ کا حساب برابر کرسکتی ہے یا نہیں؟

(ج) حاجی عبدالغنی کا انتقال پانچ برس ہوئے ہوا۔ اس وقت سے عبدالعزیز نے اپنی آل اولاد یا دوسری ضروریات کے تحت جو اخراجات کئے (۱) صفدری وہاجرہ خاتون اس تصرف شدہ رقم میں اپنا حصہ چاہنے کی مجاز ہیں اگر ہیں تو کس قدر؟

(۲) عبدالعزیز نے ۴۵ مہینوں کے لئے ایک دکان بعوض پانچ سو روپے ماہانہ ایک صاحب کو دی تھی جس سے ساڑھے بائیس ہزار روپے حاصل ہوئے اس رقم میں صفدری وہاجرہ کا کس قدر حصہ ہے؟ (د) حاجی عبدالغنی کی حیات ہی میں عبدالعزیز نے ایک دکان وغیرہ کی پوزیشن فروخت کر دی صفدری خاتون کی شہادت کے مطابق عبدالغنی کی خواہش کے باوجود اس کی حیات تک اس کو یا صفدری خاتون کو آج تک وہ رقم نہیں ملی۔واضح ہو کہ وہ دُکان بھی کرائے کی تھی اور رائج دستور کے تحت خاطر خواہ رقم طے کر کے اس کی پوزیشن فروخت کی گئی اس ضمن میں کیا حکم ہے۔لہذا مسئولہ بالاشق (الف، ب، ج اور د) کے سلسلہ میں شرعی فیصلہ کیا ہے؟

محمد عرفان

الجواب وباللہ التوفیق:

مسئلہ یہ ہے کہ عبدالغنی کے مرنے کے وقت جتنی چیزیں عبدالغنی کے ملکیت میں ہوں گی وہ سب حسب تخریج شرعی سب ورثہ پر خواہ بیوی ہو یا بیٹی یا بیٹا سب پر حسب تخریج شرعی تقسیم ہوں گی۔ وہ چیزیں جو ملک میں ہوں گی وہ دوکان ہو یا

مکان ہو یا اسباب تجارت ہو یا کچھ اور مملوکہ ہو سب ترکہ ہو کر حسب تفصیل تینوں (بیوی، بیٹا، بیٹی) پر تقسیم ہوں گے سب کا اس میں حق ہوگا نیز مملوکہ چیزیں کرایہ پر رہی ہوں یا خود ان کے قبضہ میں رہی ہوں سب کا یہی حکم ہے (۱)، اور تخریج شرعی یہ ہے۔

عبدالغنی　مسئلہ ۸　　۲۴

بیٹی	بیٹا	زوجہ
۷		۱
۷	۱۴	۳

بر تقدیر صحت سوال عبدالغنی مرحوم کا کل ترکہ حقوق متقدمہ (جیسے قرض اور باقی ماندہ مہر وغیرہ) ادا کرنے کے بعد چوبیس سہام پر تقسیم ہو کر شرعاً تین سہام زوجہ کا حق ہوگا اور سات سہام بیٹی کا حق ہوگا اور چودہ سہام بیٹا کا حق ہوگا۔

(الف) اگر وہ دوکان وگودام وغیرہ خرید کر عبدالغنی کے ملک میں آئی ہیں تو ان سب میں حسب تفصیل مذکورہ بالا تینوں کا حق ہوگا اور عبدالعزیز کا کہنا صحیح نہ ہوگا (ایضا)۔

(ب) (۱) اس شق کا بھی وہی حکم ہے جو الف کا حکم ہے۔

(۲) مملوکہ جگہ فروخت کر دینے کے بعد حاصل شدہ رقم میں بھی تینوں (بیوی، بیٹا، بیٹی) کا حق حسب تخریج مذکورہ بالا ہوگا (۲)۔

(۳) حسب تخریج وتقسیم مذکورہ بالا حقدار ہیں۔

(۴) اگر یہ محنت کسی معاہدہ کے تحت ہوئی ہے تو اس معاہدہ کے مطابق حکم ہوگا۔ ورنہ عبدالعزیز کا تبرع سمجھا جائیگا، اور آخرت میں عبدالعزیز کو اسکا ثواب ملے گا اور دنیا میں اسکے کسی معاوضہ کے مطالبہ کا حق نہ ہوگا۔ البتہ بقیہ حصہ داروں پر خود دیانۃً واجب ہوگا کہ ان کی محنت وخدمت کا صلہ کر دیں (۳)۔

۱- ''لأن التركة في الاصطلاح ما تركه الميت من الأموال صافياً عن تعلق حق الغير بعين من الأموال كما في شروح السراجية'' (رد المحتار علی الدر المختار ۱۰/ ۴۹۳)۔

۲- کیونکہ اس کے ترکہ کا بدل ہے غصب کے باب میں مذکور ہے "وحكمه وجوب رد المغصوب إن كان قائماً ومثله إن كان هالكاً، أو قيمته'' (البحر الرائق ۸/ ۱۹۶)۔

۳- ''المنفق بلا إذن الآخر ولا أمر قاض فهو متبرع كمرمة دار مشتركة'' (الدر المختار مع رد المحتار ۹/ ۲۱۱)۔

اسی طرح بیوی اور ہاجرہ جو جگہ یا چیزیں قابل تقسیم ہیں یعنی تقسیم کے بعد بھی قابل انتفاع ہیں ان کو تقسیم شرعی کے مطابق تقسیم کرا کے اپنے قبضہ وکام میں لاسکتی ہیں۔

(ج) عبدالعزیز اپنی یا اپنی اولاد وغیرہ کی ضروریات پر جو خرچ کر چکے ہیں اگر کسی معاہدہ یا قضاء قاضی کے تحت خرچ کیا ہے تو اس کا حکم اس معاہدہ وقضاء کے نظام کے مطابق ہوگا ورنہ عبدالعزیز کا تصرف ورثہ کے جانب سے تبرع قرار پائے گا اور اب ورثہ کو اس پر آخرت میں ثواب ملے گا اور دنیا میں اس کے عوض کے مطالبہ کا حق نہیں رہا، ہاں عبدالعزیز پر دیانۃً خود ضروری ہے وہ اس کا عوض دیدیں۔

۱۔ اس شق کا حکم یہی ہے جو ابھی لکھا گیا۔

۲۔ اس کرایہ کی آمدنی میں بھی مذکورہ بالا شرعی تخریج کے مطابق سب کا حق ہے

(د) اگر اس دوکان میں عبدالغنی کو ابھی حق قرار حاصل نہیں تھا تو اس کے پوزیشن کی بیع محض حقوق مجردہ کی بیع میں داخل ہو کر شرعاً نا جائز رہی اور اس میں کسی کا حق وراثت جاری نہ ہوگا(۱) اور اگر عبدالغنی کو حق قرار حاصل ہوگیا تھا تو اس میں حسب تخریج شرعی سب کا حق ہونے میں حسب تحریر سوال کلام ہوگا، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند، سہارنپور

مختلف فنڈ سے ملنے والی رقم کی تفصیل وتقسیم:

ایک مسلمان جو ہیوی الیکٹرک بھوپال میں ملازم تھا، اٹھارہ سال کی ملازمت کے بعد سال گزشتہ اچانک انتقال ہوگیا۔ مرحوم کی بیوہ اور بچوں کو تقریباً ستر ۷۰ہزار روپیہ ملنے والے ہیں جن کی تفصیل حسب ذیل ہیں۔

(۱) (Provident fund)(ملازمتی فنڈ) یہ فنڈ ملازم کی تنخواہ سے ہر ماہ کٹ کر جمع ہوتا ہے اور ۱۵ سال کے بعد جتنی رقم ملازم کی جمع ہوتی ہے اتنی ہی رقم ملازم کو سرکار دیتی ہے اس طرح سے یہ فنڈ ڈبل ہوجاتا ہے، یہ فنڈ مرحوم کا ذاتی حق اور مرحوم کی اصل میراث یا ترکہ ہے۔

(۲) (Gretinty) گریجویٹی، ملازم کو سال پورا ہونے پر ۱۴ دن کی تنخواہ ملتی ہے گویا کسی ملازم نے ۲۰ سال ملازمت کی تو اس کو ۹ ماہ کی تنخواہ کا حق حاصل ہے گریجویٹی بھی ملازمت پوری ہونے پر ملازم کو ملتی ہے، کیونکہ یہ اس کا ذاتی حق

۱- ''وفی الاشباہ لا یجوز الاعتیاض عن الحقوق المجردۃ کحق الشفعۃ(الدرالمختار مع ردالمحتار ۷/۳۳)۔

ہے، اس لئے یہ رقم بھی مرحوم کی میراث یا ترکہ ہے۔

(۳) (Death Reliving) (ڈی۔آر۔ایس) جو ہے وہ اس کارخانہ کے ملازمین کا چندہ ہے اس کی شکل یہ ہے کہ اگر اس کارخانہ کے کسی ملازم کی موت ہوجائے تو یہ چندہ مرنے والے کی بیوہ کو بطور امداد دیا جاتا ہے اس کارخانہ میں تقریباً بیس ہزار ہندو مسلمان ملازم ہیں جو فی کس ایک روپیہ چندہ دیتے ہیں اس طرح سے یہ رقم بیس ہزار روپیہ ہوتی ہے، یہ رقم مرحوم کی میراث اور ترکہ نہیں کہی جاسکتی کیونکہ اگر ملازم صحیح سلامت ملازمت پوری کرکے ریٹائرڈ ہوجاتا ہے تو اس کو یہ رقم نہیں دی جاتی لہٰذا یہ رقم خالص بیوہ کا حق ہے۔

(۴) (Group) اگر کسی ملازم کی موت واقع ہوجائے تو سرکار یہ امداد مرحوم کی بیوہ کو دیتی ہے تا کہ وہ اپنے بال بچوں کو پال سکے اور رشتہ داروں اور سوسائٹی پر بوجھ نہ بنے اس طرح یہ رقم بھی مرحوم کی ترکہ یا میراث میں شمار نہیں ہوسکتی بلکہ یہ بیوہ اور یتیموں کا حق ہے اگر یہ میراث اور ترکہ ہوتی تو ہر ملازم کو ملازمت پوری کرنے پر ملتی ہے۔

خلاصہ:

خالص میراث یا ترکہ کی رقمیں (۱) ملازمتی فنڈ تقریباً بیس ہزار روپیہ (۲) گریجویٹی دس ہزار روپیہ

(بیوہ یتیموں کے حق کی رقمیں) (۱) ڈی۔آر۔ایس تقریباً بیس ہزار روپیہ (۲) گروپ انشورنس تقریباً بیس ہزار روپیہ مجملہ کل رقم ستر ہزار روپیہ ہوئی مرحوم کی والدہ زندہ ہیں اور وہ بیوہ ہیں مرحوم نے اپنی والدہ کے حق میں ۳۰ فیصدی محض گریجویٹی کی رقم لکھی ہے قانوناً ان کو کل تین ہزار روپیہ ملیں گے۔

مرحوم کے تین بچے ہیں جن میں سب سے بڑی لڑکی پانچ سال کی اس سے چھوٹی تین سال کی لڑکی سب سے چھوٹا ایک سال کا لڑکا ہے۔

حبیب محمد خان ماسٹر (۸/ النعمت پورہ، برہان پور ایم پی)

الجواب وباللہ التوفیق:

ملازمتی فنڈ گریجویٹی فنڈ۔ اور بھوپال کے کوارٹر میں جو کچھ سامان مرحوم کی ملک تھا (چھوٹا بڑا) سب مرحوم کا ترکہ ہے وہ اس طرح تقسیم ہوگا:

مرحوم مسئلہ ۲۴ ۹۶

زوجہ	ماں	لڑکا	لڑکی	لڑکی	بھائی	بہن
۳	۴		۱۷		م	م
۱۲	۱۶	۳۴	۱۷	۱۷		

بہ تقدیر صحت سوال مرحوم کا کل ترکہ حقوق متقدمہ علی المیر اث (جیسے مرحوم کی بیوہ کا اگر مہر باقی ہو تو مہر اور دیگر قرض جو بذمہ مرحوم ہوں) کی ادائیگی کے بعد باقی کل ترکہ چھیانوے برابر حصوں پر تقسیم ہو کر اس میں سے بارہ حصے بیوہ کا حق ہوگا اور سولہ حصے ماں کا حق ہوگا اور چونتیس حصے لڑکے کا حق ہوگا اور سترہ سترہ سہام دونوں لڑکیوں کا حق ہوگا، اور جب تک یہ نابالغ بچے بالغ نہ ہو جائیں اس وقت تک اہل خاندان ان کے حصوں کو محفوظ رکھیں، اور تا بلوغ ان کی کفالت کا بار اہل خاندان پر حسب حصہ شرعی ہوگا (۱)، اور بھائی بہن ازروئے وراثت محروم رہیں گے، اس کے بعد سوال میں قائم شدہ پانچوں نمبر کا جواب الگ الگ بھی لکھا جاتا ہے۔

(۱) چار پاور لوم لگا دینا یہ مرحوم کا جب کسی معاہدہ کے تحت نہیں تھا تو تبرع تھا اور اس کا عوض کا مطالبہ کرنے کا حق کسی کو نہ ہونے کے باوجود مرحوم کے ترکہ میں سے حسب تفصیل مذکورہ بالا ورثاء کا حق ہوگا ()(سوال میں اس جزئیہ کا ذکر نہیں ہے)۔

(۲) ڈی۔آر۔ایس کی کل رقم۔اور گروپ انشورنس یہ مرحوم کا ترکہ نہیں اس میں کسی وارث کا حق نہیں ہے بلکہ حکومت اور قانون نے جب بیوی ہی کو دیا ہے تو صرف بیوہ کو ملے گا(۲)۔

(۳) مرحوم نے اگر واقعی بہنوں سے تین ہزار روپیہ قرض لیا تھا تو ترکہ کی تقسیم سے پہلے اس کو ادا کر کے ترکہ تقسیم ہوگا(۳)۔

(۴) (الف) مرحوم کی والدہ اور بڑے بھائی پر لازم ہے کہ بیوہ کو اس کے جہیز کا سب سامان واپس کردیں، جہیز

۱- ’’والنفقة لکل ذی رحم محرم إذا کان صغیراً أو کانت امرأة بالغة فقیرة أو کان ذکراً فقیراً زمناً أو أعمی ویجب ذلک علی قدر المیراث ویجبر علیه کذا فی الهدایة‘‘(فتاویٰ عالمگیریہ ۱/۵۶۶)۔

۲- ’’وحکمها (أی الهبة) ثبوت الملک للموهوب له‘‘(متن الدرالمختار مع ردالمحتار ۸/۴۹۰)۔

۳- ’’یبدأ من ترکة: المیت بتجهیزه ثم بدینه ثم وصیته ثم یقسم بین ورثته‘‘(کنز الدقائق مع شرحہ البحر الرائق ۹/۳۶۵)سوال میں اس جزئیہ کا ذکر بھی نہیں ہے۔

کے جملہ سامان کی جو بیوہ کو میکہ سے ملا ہو بلا شرکت غیرے تنہا بیوہ مالک ہے۔ اور نہ دینے کی صورت میں عند اللہ غصب کے گناہ میں اور ظالموں کی فہرست میں شمار ہوں گے (۱)۔

(ب) بڑے بھائی نے پاورلوم کی آمدنی سے دینے کا جو وعدہ کیا تھا اس کے پورا نہ کرنے سے وہ لوگ گنہگار ہیں۔ ان کو ایفائے وعدہ خود کر دینا چاہیے (۲)۔

(۵) یہ سب چیزیں جو مرحوم کی ملک ہوں سب مرحوم کا ترکہ ہیں حسب تفصیل مذکورہ بالا ۹۶ سہام پر تقسیم ہو کر اوپر لکھے ہوئے ورثہ کا اس میں حق ہوگا، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند، سہارنپور ۱۴۰۱/۱۱/۱۰ھ

کیا حق وراثت معاف کر دینے سے حصہ ختم ہو جاتا ہے؟

زید اور بکر نامی دو بھائیوں نے اپنے باپ کے مرنے اور کفنانے دفنانے کے بعد قبرستان سے واپس آتے ہی اسٹام لکھی ہوئی مندرجہ ذیل عبارت اپنی دو بہنوں کو سنا کر ان سے اسٹام پر انگوٹھے لگوا لئے عبارت مذکورہ: ہم دونوں بہنیں فلاں وفلاں اپنے فلاں وفلاں بھائیوں کو اپنا حق وراثت جو شرعاً ہمارا حق بنتا ہے معاف کرتی ہیں وغیرہ وغیرہ اب دونوں بہنیں اپنے بھائیوں سے اپنا حق واپس کرنے کا مطالبہ کر رہی ہیں کہ ہم کو والد کی وراثت سے حصہ دو، ان بہنوں کا کہنا ہے کہ ہم کو تو باپ کا غم تھا پریشان تھیں کہ ہائے ہمارا کیا حال ہوگا، مگر ہمارے بھائیوں کے پیٹ میں زمین اور مکانوں کا درد تھا کہ قبرستان سے آتے ہی ہم سے اسٹام پر انگوٹھے لگوا لئے، ان بہنوں کا یہ بھی کہنا ہے کہ ہم نے تو سمجھا تھا کہ باپ مر گیا ہے اب ہمارے بھائی دُکھ سُکھ میں ہمارا سہارا اور سایہ بنے رہیں گے اور ہماری اس فراخدلی پر ہمارا خیال رکھیں گے وقتاً فوقتاً ہمارے ساتھ تعاون کرتے رہیں گے۔ مگر انھوں نے تو بعد میں ہماری پرواہ تک نہ کی اب زید بکر دونوں بھائیوں کا کہنا ہے کہ آپ کا ہم سے بوجہ اسٹام پر غیر مشروط بخوشی انگوٹھے لگا دینے کے شرعاً وقانوناً کوئی حق نہیں رہتا، جبکہ دو بہنوں میں سے ایک بہن کے لڑکے عالم ہیں ان کا کہنا ہے کہ ہمارے خالاؤں (ماموؤں) نے ہماری ماں اور خالہ کی بے علمی پریشانی اور ناقص العقلی سے فائدہ اٹھا کر بغیر کسی عوض ومعاوضہ کے خود اپنے ہاتھ کی لکھی ہوئی تحریر پر زمین اپنے نام بخشش کرا لی یہ عمل غبن فاحش ہے، یاد رہے کہ اسٹام

۱- ''ولها (أي للمرأة) إذا كان العرف مستمراً أن الأب يدفع مثله جهازا لا عارية'' (متن الدر المختار مع رد المحتار ۳/ ۳۰۸، نیز جہیز کے سلسلہ میں مزید تفصیل کے لئے دیکھئے: فتاوی قاضیخان علی ہامش العالمگیریہ ۱/ ۳۹۱)۔

۲- ''ولا تقربوا مال اليتيم إلا بالتي هي أحسن حتى يبلغ أشده وأوفوا بالعهد إن العهد كان مسئولاً'' (سورہ اسراء: ۳۴)۔

پر انگوٹھے لگوانے سے قبل نہ تو ان بہنوں کے نام زمین انتقال ہوئی تھی اور نہ قبضہ تھا اور نہ کوئی حاصل کہ جس سے شرعی کوئی قبضہ ثابت ہونے کا شائبہ مل سکے، مزید یہ کہ زید اور بکر نے والد کے مرنے اور اسام مذکورہ کی تحریر کے بہت عرصہ بعد اپنے والد کا چھوڑا ہوا مکان اپنی ان دو بہنوں کو شرعی حق سمجھ کر دیدیا تھا جواب بھی ان بہنوں کے قبضہ میں ہے وغیرہ وغیرہ۔

نوٹ: زید بکر دو بھائیوں میں سے ایک بھائی مولوی ہیں وہ کہتے ہیں کہ کسی معتبر کتاب کا حوالہ یا کسی معتبر عالم کا فتوی ہمارے مخالف دعوی کے آجائے تو ہم والد کی وراثت سے بہنوں کو حق دیدیں گے، تو لہذا آپ سے مؤدبانہ گزارش ہے کہ برائے مہربانی قرآن وحدیث ومعتبر کتب فقہ کی روشنی میں جتنے حوالہ جات ممکن ہوسکیں دیں چاہے مسئلہ اس طرف ہو یا دوسری جانب تاکہ برادری کا یہ شر رفع ہو سکے۔

محمد یعقوب

الجواب وبالله التوفيق:

حق وراثت انسان کا اپنا دیا ہوا حق نہیں ہے کہ معاف کردینے سے یا ختم کرانے سے ختم یا معاف ہوجائے بلکہ یہ حق وراثت اللہ کا دیا ہوا حق ہے جس کے اندر کسی تبدیل وترمیم کا حق کسی کو نہیں بلکہ ہونے والے وارث کو بھی بغیر اصول تخارج مخارج کئے ہوئے معاف کرنے کا حق نہیں کما صرحت بہ الفقہاء (۱) بلکہ اشباہ والنظائر مع الحموی میں ہے: ''ولو قال تركت حقي لم يبطل حقه'' (۲) اور یہی مضمون امداد الفتاوی للعلامۃ التھانوی نور اللہ مرقدہ میں بھی باب وراثت میں تفصیل سے مذکور ہے، اس لئے بہنوں کے اوس لکھدینے سے کہ ہم نے اپنا حق وراثت چھوڑ دیا یا معاف کردیا تو معاف یا ختم نہیں ہوا بلکہ وہ ہر وقت لینے اور وصول کرنے کی حقدار ہیں۔ ہاں شرعی ضابطہ کے مطابق جیسا کہ سراجی میں لکھا ہوا ہے تخارج کرلیں تو بیشک ان کا حق ختم ہوسکتا ہے کما فی السراجیہ باب التخارج، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند، سہارنپور ۱۵/۲/۱۴۰۲ھ

۱- ''والثالث إما اختياري وهو الوصية أو اضطراري وهو الميراث'' (الدر المختار مع رد المحتار ۱۰/ ۴۹۲)۔

۲- ''لو قال الوارث تركت حقي لم يبطل حقه'' (الاشباہ والنظائر ۲/ ۳۵۷ مع حاشیہ نزہۃ النواظر علی الاشباہ والنظائر تحقیق وتقدیم محمد مطیع الحافظ مطبوعہ دار الفکر)۔

۱-لڑکوں کے لئے زمین ومکان لینا اورلڑکیوں کوروپئے دینا کیسا ہے؟

ایک شخص کا انتقال ہوگیا ہے اس نے ترکہ میں دس بارہ مکان چھوڑا اوران کی اولاد ان کے وارث ہیں جن میں سے بعض لڑکے اورلڑکیاں ہیں۔لڑکے یوں کہتے ہیں کہ ہم زمین اورمکان تمام کے تمام اپنے لئے لیں گے اورلڑکیوں کو ہم ان کے حصے روپے پیسے کی شکل میں دیں گے وہ بھی فی الفور نہیں بلکہ آہستہ آہستہ تو پوچھنے کا مطلب یہ ہے کہ:

(۱)لڑکوں کے لئے یہ جائز ہے کہ زمین مکان کواپنے لئے خاص کریں اورلڑکیوں کوزمین ومکان کی جگہ (ان کے شرعی حصے)روپے پیسے سے دیں۔

(۲)وہ بھی فوراً نہیں بلکہ یہ لوگ کام کریں گے اورجیسے جیسے ان کو پیسے ملیں گے ویسے ویسے یہ لوگ لڑکیوں کوان کے حصے دیتے رہیں گے۔

(۳)حالانکہ لڑکیاں زمین اورمکان اپنے اپنے حصے چاہتی ہیں یہ لوگ نقد پیسے بھی نہیں چاہتے۔

۲-مکان کی تقسیم کس طرح ہوگی؟

بعض مکان بڑے شہر میں اوربعض چھوٹے شہر میں ہیں تو اگر ان کو چند بھائی بہنوں کے درمیان تقسیم کرنا ہے تو کس طرح کریں؟

محمد احمد دیگانی (فرانس)

الجواب وبالله التوفيق:

۱۔ مسئلہ یہ ہے کہ مرنے والا جتنی چیزیں اپنی ملکیت میں چھوڑتا ہے وہ سب اس کا ترکہ شمار ہوتا ہے (۱)اور وہ مملوکہ چیزیں خواہ مکان ہو یا فرنیچر ہو یا کوئی اور سامان وچیز ہو خواہ نقد ہو سب ترکہ شمار ہوکر اس میں سے حقوق متقدمہ علی المیراث (جیسے قرضہ وباقی رہا ہو مہر اور وصیت صحیحہ وغیرہ) دینے کے بعد باقی سب ترکہ کو ورثہ شرعی پر تقسیم کردینا ضروری ہوتا ہے اور یہ سب چیزیں سب ورثہ میں شرکۃ املاک سے مشترک ہوتی ہیں اوراس کا حکم یہ ہے کہ کوئی وارث (شریک) دوسرے ورثہ (شرکاء) کی اجازت صحیحہ کے بغیر کوئی تصرف کسی چیز میں نہیں کرسکتا ورنہ اس کو غصب کا گناہ ہوگا اور وہ عنداللہ گنہگار ومجرم ہوگا اورعنداللہ ظالم شمار ہوگا(۲)۔

۱- ''المراد من التركة ما تركه الميت خالياً عن تعلق حق الغير بعينه" (البحرالرائق۹/۳۶۵)۔

۲- ''وهي (الشركة) ضربان: شركة ملك وهي أن يملك متعدد اثنان فأكثر عيناً.... أو ديناً .... بإرث أو بيع أو

ہاں اگر باقی شرکاء اپنا حصہ قیمت لے کر کسی شریک کے حق میں اپنی خوشی سے کر دیں یا بعد تقسیم و قبضہ کے ہبہ کر دیں تو اس وقت جو خریدے یا جس کو ہبہ کیا وہ تصرف کر سکتا ہے۔ یہ شرعی احکام فقہ کی تمام معتبر کتابوں میں لکھے ہوئے ہیں جیسے رد المحتار کی کتاب الشرکت اور کتاب القسمہ اور کتاب الفرائض وغیرہ میں ہیں سب احکام تفصیل سے مذکور ہیں۔ پس صورت مذکور میں لڑکیوں کی اجازت و مرضی کے بغیر تینوں مذکورہ صورتوں میں سے کوئی صورت جائز نہ ہوگی، بلکہ غصب کا گناہ ہوگا اور عند اللہ ظلم ہوگا۔ جس کے وبال پڑنے کا آخرت کے ساتھ دنیا میں بھی اندیشہ ہے، اس لئے دنیا و آخرت دونوں میں فائدہ لینے کے پیش نظر لڑکوں کو ایسا نہ کرنا چاہیے۔

۲۔ تقسیم کے طریقہ کے معاملہ میں حکم شرعی یہ ہے کہ جو چیز قابل تقسیم ہو یعنی تقسیم کے بعد بھی قابل انتفاع باقی رہے خراب نہ ہو جائے اس کو تقسیم کر کے تمام شرکاء کو ان کا حصہ دیدینا چاہیے(۱)، کسی شریک کی مرضی و اجازت کے بغیر اس کو اسکا حصہ نہ دینا محض قیمت دینا درست نہیں اور جو چیز قابل تقسیم نہ ہو یعنی تقسیم کے بعد قابل انتفاع باقی نہ رہے یا خراب ہو جائے اس کا حکم یہ ہے کہ آپس کی مصالحت کے ساتھ اس کو کرایہ وغیرہ پر دے کر اس کا کرایہ وغیرہ حسب حصہ تمام شرکاء کو دیدیا جائے، اور اگر مصالحت سے ایسا نہ ہو سکے تو اس کو کوئی شخص مناسب قیمت پر خرید لے اور قیمت تمام شرکاء پر حسب حصہ تقسیم کر دیا جائے، اگر شرکاء ہی میں سے کوئی ایک یا دو خرید لے تو یہ زیادہ بہتر ہے۔ اسی ضابطہ شرعی کے ماتحت بڑا امکان جو بعد تقسیم بھی قابل رہائش رہ سکتا ہو خراب نہ ہو جاتا ہو اس کو تقسیم کر لیا جائے خواہ کسی شہر میں ہو اور چھوٹا مکان جو بعد تقسیم کے قابل نہ رہے یا خراب ہو جائے اس کو آپس کی مصالحت سے مشترک رکھتے ہوئے کرایہ وغیرہ پر دے کر حسب حصہ کرایہ تقسیم کر لیا جائے اور اگر آپس داری اور مصالحت کے ساتھ ایسا نہ ہو سکے تو اس کو مناسب قیمت پر فروخت کر کے قیمت سب حصہ داروں پر حسب حصہ تقسیم کر دیا جائے خریدنے میں بعض شرکاء کا مناسب قیمت پر خرید لینا اور قیمت حسب حصہ تقسیم کر دینا بہتر ہوگا، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دار العلوم دیوبند، سہارنپور ۲۵/۷/۱۴۰۲ھ

غیرهما بأي سبب كان جبرياً أو اختيارياً ولو متعاقباً كما لو اشترى شيئاً ثم أشرك فيه آخر هبة وكل من شركاء الملك أجنبي في الامتناع عن تصرف مضر في مال صاحبه'' (الدر المختار مع رد المحتار ۶/ ۶۶۳، ۶۶۷)۔

۱- ''وشرطها (القسمة) عدم فوت المنفعة بالقسمة'' (الدر المختار مع رد المحتار ۹/ ۳۶۹)۔

۱-متوفی کے ایام رخصت کی تنخواہ اور جی پی فنڈ کا وارث کون ہوگا؟

متوفی ملازم سرکاری جن کے ورثاء (۱) ماں (۲) ایک بھائی (۳) بیوی——ملازم سرکاری ہونے کی وجہ سے ان کو DCRG

FBFG PF زندگی کے ایام کی رخصت کی تنخواہ اور دیگر بقایا جات ملتے ہیں؟

کیا اس رقم کی حقدار حسب شریعت صرف بیوہ ہی ہے یا دیگر ورثاء بھی ہیں اور اگر ہیں تو رقم کی مقدار کیا ہوتی ہے۔

یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ اگر زندگی ہی میں ع FBF مذکورہ بالا دیا جاتا تو اس کی رقم صرف بیس ہزار ہوتی، وفات کی صورت میں چالیس ہزار ملتی ہے۔ ترکہ کی تقسیم صرف بیس ہزار پر ہوگی یا چالیس ہزار پر، اگر ہے تو کیا مقدار ہے؟

۲-مشترک مکان کی تقسیم کس طرح ہوگی:

دونوں بھائی مشترک طور پر مکان خرید لیے تھے اس مکان کے اندر بیوہ کا کیا حق ہوسکتا ہے یہ مکان ماں کے نام پر رجسٹرڈ ہے اور خاندان مشترک ہے۔

۳-قرض دیتے وقت یہ کہنا کہ یہ رقم فلاں کی ہے تو کیا یہ رقم اس کی ہوجائے گی؟

وفات سے پہلے متوفی نے اپنے بھائی کو پانچ ہزار روپے دیئے تھے اور اپنی بیوی سے کہا تھا کہ رقم تمہاری ہے، بھائی سے رقم واپس ملنے پر تمہارے لئے سونا خریدوں گا کیا رقم واپسی پر مطلق بیوہ کی ہوگی یا تقسیم میں آئے گی؟

۴-شادی کے موقع پر دیئے گئے زیورات کا مالک کون ہوگا؟

جو سونا چاندی کا زیور شادی کے وقت بیوی کو دیا گیا تھا وہ بیوہ کا ہی ہے یا تقسیم شدنی ہے۔

۵-کیا قرض دی گئی رقم بھی ترکہ شمار ہوگی؟

زندگی میں متوفی نے بعض احباب کو قرض دیا تھا قرض واپس ہونے پر یہ رقم بھی تقسیم ہوگی یا نہیں؟

الجواب وباللہ التوفیق:

۱-مرحوم کی زندگی کے ایام کی تنخواہ اور جی، پی، فنڈ اور مرحوم کی زندگی کے دیگر بقایا جات سب مرحوم کا ترکہ شمار ہوکر حسب تخریج شرعی تمام ورثاء پر تقسیم ہوں گے۔ شرعاً صرف اور تنہا بیوی کا حق شمار نہ ہوں گے۔ جی، پی، فنڈ جو حیات میں ملتا

ہے وہ اور بعد مرنے کے جو اضافہ ہوکر ملے گا وہ سب مرحوم کا ترکہ شمار ہوکر حسب تخریج شرع تمام ورثاء میں شرعی طور پر تقسیم ہوگا، لہذا بجائے بیس ہزار کے چالیس ہزار حسب تخریج شرعی تقسیم ہوں گے۔

۲-جب وہ مکان دونوں بھائیوں نے مشترک طور سے خریدا ہے اور خاندان مشترک ہے تو محض ماں کے نام رجسٹرڈ کرانے سے تنہا ماں کا حصہ نہ ہوگا بلکہ دونوں بھائیوں کا نصف نصف شمار ہوگا، اور صرف دوسرے بھائی کی ملکیت شمار نہ ہوگا۔

۳-پانچ ہزار روپیہ جو بھائی کو دے کر بیوی سے کہا تھا کہ یہ رقم تمہاری ہے واپس ملنے پر اس سے تمہارے لیے سونا خریدوں گا۔ محض اس کہنے سے تکمیل ہبہ نہیں ہوئی، بلکہ صرف وعدۂ ہبہ ہوا اور وعدۂ ہبہ واہب کے مرجانے کے بعد ختم ہوکر واہب کا ترکہ شمار ہوکر حسب تخریج شرعی تقسیم ہوگا۔ لہذا یہ پانچ ہزار بھی ترکہ مرحوم شمار ہوکر حسب تخریج شرعی تقسیم ہوگا۔

۴-شادی کے وقت جو زیور بیوی کو دیا جاتا ہے اس میں جو زیور منہ دکھائی میں دیا گیا ہوتو وہ تنہا بیوی کی ملک شمار ہوتا ہے اور جو زیور اسکے علاوہ دیا جاتا ہے، اگر عرف میں ہبۃً دینا شمار ہوتا ہے تو وہ بھی تنہا عورت کا شمار ہوگا، ورنہ ترکہ مرحوم شمار ہوکر حسب تخریج شرعی تقسیم ہوگا، "**المختار للفتوى أن يحكم بكون الجهاز ملكا لا عارية، لأنه الظاهر الغالب، إلا في بلدة جرت العادة بدفع الكل عارية فالقول للأب، وأما اذا جرت في البعض يكون الجهاز تركة يتعلق بها حق الورثة وهو الصحيح**"(۱)۔

۵-مرحوم نے جو قرضہ لوگوں کو دیا ہے وہ مرحوم کا ترکہ شمار ہوکر حسب تخریج شرعی تقسیم ہوگا۔ غرض حسب تحریر سوال جو جو چیزیں مرحوم کا ترکہ شمار ہوں گی ان سب میں سے پہلے بیوہ کا باقی ماندہ مہر اور دیگر قرضے جو مرحوم کے ذمے باقی ہوں دینے کے بعد بارہ سہام (برابر حصوں) پر تقسیم ہوکر چار سہام ماں کا اور تین سہام بیوہ کا اور پانچ سہام بھائی کا حق ہوگا۔ بشرطیکہ ان کے سوا اور کوئی وارث شرعی نہ ہو اور صورت تخریج درج ذیل ہے:

مرحوم مورث مسئلہ ۱۲ بیوہ ۳/، ماں ۴/، بھائی ۵/، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند، سہارنپور ۲۲/۱/۱۴۱۱ھ

بعض اراضیات کاشت کا حکم:

میں کاشتکار ہوں اور کچھ اراضی والد صاحب سے میرے نام پر منتقل ہوئی ہیں اور کچھ خریدی ہے، میرے والد

۱- شامی ۴/۳۰۹ کتاب النکاح باب المهر مطلب فی دعوی الاب أن الجهاز عارية۔

صاحب کو زمین طواب رام پور کے ضلع دار صاحب نے دی تھی اور وہ لگانی ہے اور کچھ زمین معافی کی تھی، یعنی تعزیہ برداری کے صلہ میں ملی تھی، جب حضرت تھانویؒ سے بیعت ہو گئے تو زمین سے سبکدوش کر دیا گیا۔

چکبندی کے موقعہ پر جملہ کاشتکاران کو بے دخل کر دیا گیا اور ہم لوگوں سے دستخط بے دخلی کے لئے چکبندی ہوئی، سابقہ زمین چھ فی صد بیگھہ کم کر کے ہم کو سونپی گئی، کٹوتی کی آراضی مختلف لوگوں کو ان کی ضروریات کے مطابق دی گئی اب وہ لوگ قابض و متصرف ہیں، اب بھی اگر گورنمنٹ کو اپنی کوئی ضرورت محسوس ہوتی ہے تو معاوضہ جو کہ خود حکومت کا مقرر کردہ ہے محض اشک شوئی کی غرض سے وعدہ کر لیتی ہے، اس معاوضہ کو بھی ہزاروں کی رشوت دے کر وصول کیا جاتا ہے نقد ونقد نہیں ہوتا ہے، تو ہم مالکوں کے لئے استیلاء ثابت نہیں ہوتا؟ جب ہم پوری زمین کے مالک ہیں تو کٹوتی کیسے بغیر رضامندی کے ہوئی، لگان کے عوض حق کاشت حاصل ہے اگر کوئی چماری، بھنگی چھ سات سال بٹائی پر کاشت کر لے اور اپنا قبضہ درج کرائے تو حکومت کے قانون کے مطابق اسی کی ہو جاتی ہے، نہر اور سڑک بے دریغ نکال لیتے ہیں، ٹیوب ویل حکومت اپنا بغیر معاوضہ کے بنالیتی ہے، ٹیوب ویل کے پانی کو سپلائی کے لیے بلا رضامندیٔ کاشتکار کولیں اور نالیاں بنالیتی ہے بلا رضامندی کے کافی رقبہ قصبات اور شہروں میں منڈی سمتی کے نام پر معاوضہ کے وعدہ پر لے لیا ان تمام وجوہات کے پیش نظر مزروعہ اراضی میں وراثت سمجھ میں نہیں آتی، زمین کی خرید فروخت میں ہر دور میں الگ الگ قوانین سامنے آتے ہیں کبھی ایسا بھی ہوا کہ سیرداری کو فروخت کرنے کا حق نہیں تھا بھومی دھر بنائے گئے اب وہ قانون ختم ہوا، کل اور آئے گا۔ البتہ باغات مکانات کنویں وغیرہ پر مالکانہ حیثیت رہی ہے، ان میں حکومت شرع محمدی سے قبضہ کرا دیتی ہے، نہ کہ کاشت کی آراضی میں، سیردار اور کاشتکاری کی اراضی میں وراثت جاری ہوگی یا نہیں؟

الجواب وباللہ التوفیق:

خاتمہ زمینداری میں حکومت نے زمینداروں کی زمینداری کو جو شرعاً ان کی مملوک بملک صحیح تھیں کچھ معاوضہ از خود تجویز کر کے باقساط متعددہ ادا کرنے کے قانون کے بنا زمینداروں کے ملک وقبضہ سے نکال کر اپنے ملک و تصرف میں کر لیا، یہ معاملہ کھلی دلیل ہے کہ زمینداری پر حکومت مالک ہوگئی، پھر جو زمین کاشت کی مدت ہائے دراز سے زمینداروں کے ملک وقبضہ و تصرف میں تھیں ان میں بھی یہ قانون بن گیا کہ ان میں تھوڑی سی زمینداروں کے ملک وقبضہ میں چھوڑ کر زائد زمینوں کو دوسروں سے کچھ کو نہ معاوضہ لے کر دوسروں کو بھی بھومی دھر وغیرہ بنادیا اور جو تھوڑی سی زمینیں باقی رہ گئی تھیں ان پر بھی قبضہ

مالکانہ باقی نہیں رکھا، بلکہ مثل اجیر کے اس کے قبضہ میں باقی رکھا کہ اتنی اجرت سالانہ دیتے رہو اور تصرف میں رکھو کہ اب زمیندار خود اپنی مرضی واختیار سے نہ بیچ سکتا ہے، اور نہ خرید سکتا ہے بلکہ ہر موڑ پر حکومت وقانون سے اجازت لینی ضروری رہے گی، حتی کہ اگر اس نے تین سال تک پرتی رکھا تو حکومت اس کے قبضہ سے نکال لے گی، اور پھر اس کو جو تھوڑے حقوق منتقل کرنے کے نظر آتے ہیں وہ حقوق محض ان کے ساتھ مختص نہیں، بلکہ ہر قابض کو خواہ بھومی دھر ہو یا کچھ بھی حسب اجازت قانون حاصل رہتے ہیں وہ حکومت اور قانون کے عطا کردہ حقوق کو قانون وقت کے دائرے میں رہ کر استعمال کرسکتا ہے، یعنی اگر وہ شخص قانون وقت کے مطابق بیچ دے، یا خرید ے، یا ہبہ، وقف، خیرات جو تصرف بھی کرلے وہ حکومت وقت اور قانون کے عطا کردہ اور عارضی ہیں، ان تصرفات کو تصرفات مالکانہ کہنا ظاہر وعیاں ہے، ان وجوہ کی بنا پر حکومت کے خاتمہ زمینداره میں اس استیلاء کو استیلاء مالکانہ کہنا صحیح اور ظاہر معلوم ہوتا ہے۔

رہ گیا وراثت جاری ہونے کا مسئلہ تو اس میں یہ تفصیل ہوگی کہ کاشت کی وہ آراضیات جنکا زمیندار خود مالک نہیں تھا، بلکہ دوسرے سے لے کر کاشت کرتا ہے ان کا مالک نہ ہونے کی وجہ سے ان میں وراثت کا نہ جاری ہونا ظاہر ہے اور وہ چیزیں جو خاتمہ زمینداره کی زد میں آکر ان کی حیثیت مالکانہ ختم ہوکر محض قبضہ اجارہ دارانہ باقی رہ گیا ہے ان کے مملوک نہ رہنے کی وجہ سے تقسیم وراثت کس طرح جاری ہوگی، ہاں اگر جس طرح حکومت وقانون نے ہبہ ووقف وغیرہ کرنے کا حق دیا ہے اسی طرح تقسیم وراثت کا بھی دیا ہو، اس کے مطابق وراثت جاری ہوسکے گی، یا پھر اگر کوئی شخص دیانۃً اس بنیاد پر کہ حقیقۃً وشرعاً وہ ان آراضیات کا عند اللہ مالک چلا آرہا ہے، چاہے تغلب کسی اور طرح کا ہوگیا، مگر وہ خود حسب حقوق وراثت میں ملا ہے تو یہ اس کا تقوی ہوگا۔ اور استیلاء کے تسلیم کرلینے کی بنیاد پر یہ شئی مداخلت فی احکام الدین گرچہ متصور ہوجائے گی، فتوی تقسیم کا دینا مشکل نہ رہے گا، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند، سہارنپور ۳/۵/۱۴۱۱ھ

وراثت اور وصیت کا مسئلہ اور اس کا حکم:

میرے شوہر ہاشم ڈوچکی کا انتقال ہوئے آج تقریبا سات ماہ ہوگئے۔ انہوں نے اپنے پیچھے ایک بیوی (یعنی میں) اور تین لڑکے اور تین لڑکیاں چھوڑیں، مرحوم نے اپنے پیچھے ایک دوکان جس میں وہ خود اور ایک لڑکا محمد اشرف نام کا ان کے ساتھ کاروبار کررہا تھا، اس دوکان کو پہلے عارضی طور پر استعمال کے لئے لیا تھا لیکن بعد میں اس کے مالک سے بیس ہزار روپے میں خرید لی گئی تھی۔

مرحوم نے اپنے مرنے سے پہلے ۱۹۷۸ء میں ایک وصیت نامہ تحریر کیا تھا جس میں دوکان کا مالک محمد اشرف کو بتایا اور دوکان کے مال میں آدھا آدھا باپ بیٹے کا تحریر کیا تھا، اس کے بعد دوسرا وصیت نامہ ۱۹۸۴ء میں تحریر کیا۔ اس میں دوبارہ محمد اشرف کو دوکان اور جس گھر میں رہ رہے ہیں اس کو اور ساتھ ہی نقد تین لاکھ روپے محمد اشرف کو بخشا اور مجمہ (زینت بی بنت محمد) کو ایک لاکھ روپئے بخشا، تحریر کیا، محمد اشرف ہی اکیلا اپنے والد صاحب کے ساتھ دوکان میں اخیر تک کام کرتا رہا، اب سوال کرنے کا مقصد یہ ہے کہ چونکہ شریعت میں جس کو ہبہ کیا گیا ہے اس کو انتقال سے پہلے قبضہ بھی دلائے، ورنہ معتبر نہیں ہوتا ہے۔

اب جب کہ مرحوم نے انتقال سے پہلے ہی وصیت نامہ بھی لکھا تھا اور دوکان چلانے کا کام بھی اپنے لڑکے محمد اشرف کے حوالہ کر دیا اور جس گھر کا ہبہ محمد اشرف کے نام کیا تھا اسی میں مرحوم کی زندگی ہی میں محمد اشرف کے ساتھ میں خود اور مرحوم کے دوسرے افراد سکونت پذیر تھے اور ہیں۔ یہاں تک کہ مرحوم نے انتقال سے قبل کہہ دیا تھا کہ یہ مکان بھی اور اس مکان کے اندر موجود تمام فرنیچر سب کا سب محمد اشرف کا ہے۔ گو اس طرح بالکلیہ دوکان چلانے کا کام محمد اشرف سے ہی لیتے۔ گھر میں سکونت اختیار کرنے کے لیے موقعہ دینے سے ہبہ کیساتھ قبضہ دلانا سمجھا جائے گا یا نہیں۔ بعض علماء کا کہنا ہے کہ اس طرح دوکان حوالہ کر دینے اور گھر پر سکونت اختیار کرنے کے لئے ہی موقعہ دینے سے ہی ہبہ درست ہو جاتا ہے۔ گھر اور دوکان دونوں محمد اشرف کے ہیں، گو کہ انہوں نے دوکان اور مکان کو علی الاعلان محمد اشرف کے حوالہ نہیں کیا، کیونکہ مرحوم نے انتقال سے قبل گھر اور دوکان کا مالک محمد اشرف کے ہی ہونے کا تذکرہ مجھ سے بھی کیا تھا، اس لئے آپ سے دریافت ہے کہ دوکان اور مکان کا مالک موجودہ صورت حال میں صرف محمد اشرف کا ہے یا ہبہ درست نہ ہونے کے سبب تمام ورثاء بھی دوکان اور مکان کے حصہ دار ہیں؟

گمشدہ لڑکے کا حصہ:

تین لڑکوں میں ایک لڑکا فاروق آج تقریباً پندرہ سال ہوئے لاپتہ ہے۔ جب سے گھر سے گیا اس وقت سے آج تک اس کی کوئی خبر نہیں۔ یہ بھی پتہ نہیں کہ زندہ ہے یا نہیں، اس لڑکے کا دماغی توازن بھی خراب ہو گیا تھا، اس لئے اس لڑکے کے ورثہ کے بارے میں شرعاً کیا حکم ہے؟

ترکہ سے حقوق اللہ کی ادائیگی:

مرحوم شوہر سے اپنی زندگی میں نماز یا روزہ، زکوۃ میں بہت کوتاہی اور کمی رہ گئی اور حج بھی نہیں کیا تھا، اسلئے ان

فرائض کا فدیہ کس طرح ادا کیا جائے تقسیم سے پہلے ہی ان تمام کی ادائیگی کی جائے یا کس طرح کیا جائے؟

اس لئے شریعت محمدی ﷺ کے تحت وارثوں کو مرحوم کے ورثہ میں کتنا کتنا دیا جائے اور مرحوم کے فدیہ کا تدارک اور گم شدہ لڑکے کا حصہ اور محمد اشرف کے بارے میں جواب دے کر ممنون فرمائیں۔

الجواب وباللہ التوفیق:

تحریر استفتاء سے معلوم ہوتا ہے کہ موسیٰ ہاشم ڈوچکی نے پہلے ایک وصیت نامہ اپنے لڑکے محمد اشرف کے نام ۱۹۷۸ء میں لکھا ہے۔ اور دوسرا وصیت نامہ اپنے لڑکے محمد اشرف کے نام ۱۹۸۴ء میں لکھا ہے۔ اور وصیت کے بارے میں حدیث پاک میں ہے: "لا وصية لوارث إلا أن يشاء الورثة"(۱) یہاں موصی (موسی ہاشم ڈوچکی) کے انتقال کے بعد ورثہ کا اس وصیت کو نافذ نہ کرنا ظاہر ہے، لہذا یہ وصیت تو باطل غیر موثر غیر مفید ہوگی۔ اور ان وصیت ناموں کے اعتبار سے شرعاً نہ تو محمد اشرف تنہا دوکان کا مالک ہوا اور نہ دوکان کے مال میں آدھے کا شرعاً مالک ہوا اور نہ ہی تین لاکھ نقد کا تنہا مالک ہوا اور اسی طرح ایک لاکھ کی تنہا مالک بیوی (زینت بنت محمد) بھی نہ ہوگی، بلکہ سارا مملوکہ موسی ہاشم ڈوچکی کا شرعاً ترکہ باقی رہا۔

اسی طرح محمد اشرف کے تنہا والد کے ساتھ اخیر تک دوکان میں محض کام کرتے رہنے سے محمد اشرف کا دوکان میں سہیم وشریک ہونا لازم نہیں آتا، بلکہ اولاد ایسے وقت میں محض والد کی معین ومددگار شمار ہوتی ہے، کما صرح به الفقهاء: "فالكسب للأب إن كان الابن في عياله لكونه معيناً له" (۲)۔

ہاں اگر موسی ہاشم اپنی زندگی میں محمد اشرف کے ساتھ ضابطۂ شرعیہ واحکام عقد شرکت عنان کے تحت باقاعدہ شرکت کا معاملہ کر دیئے ہوتے اور اس کا ثبوت شرعی موجود ہوتا تو یہ بات دوسری ہوتی اور یہاں ایسا نہیں، لہذا عقد شرکت کا حکم نہ ہوگا۔

رہ گئی ہبہ کی بات تو حسب تحریر سوال جب وصیت نامہ لکھا اور دوکان چلانے کا کام اپنے لڑکے محمد اشرف کے حوالہ کیا تو اس کا ظاہر مفہوم یہی ہے کہ محض دوکان چلانے کا کام محمد اشرف کے حوالہ کیا ہے، خود دوکان کو اپنے قبضہ ودخل سے عملا نکال کر محمد اشرف کے حوالہ کر کے خود دوکان سے بے قبضہ نہیں ہوئے، لہذا محض اس طریقہ کار سے دوکان کا ہبہ شرعاً نہیں ہوا،

۱- مشکوۃ المصابیح/۲۶۵ باب الوصایا۔

۲- ردالمحتار/۳/۳۴۹۔

بلکہ وہ دوکان مرحوم ہی کا ترکہ رہی۔ اسی طرح جس گھر کا ہبہ محمد اشرف کے نام کیا اسی گھر میں محمد اشرف کے ساتھ خود اور مرحوم کے دوسرے افراد بھی سکونت پذیر رہے، لہذا یہ ہبہ بھی شرعاً صحیح ونافذ نہیں ہوا، لہذا یہ مکان بھی مع اس کے فرنیچر کے شرعاً ہبہ ہو کر مرحوم کی ملکیت سے نہ نکل کر سب دوکان اور یہ مکان اور فرنیچر سب مرحوم کا ترکہ باقی رہا اور حسب تخریج شرعی تمام ورثاء شرعی پر تقسیم ہوگا، کما ھو فی کتب الفقہ والفرائض مثلاً درمختار اور اس کی شرح میں صحت ہبہ کے لئے یہ سب شرائط مذکور ہیں۔

اس لئے بعض علماء کا یہ کہنا کہ اس طرح کا حوالہ کرنے سے اور موقعہ دینے سے ہبہ درست ہو جاتا ہے صحیح نہیں رہا، ہاں چونکہ محمد اشرف نے اپنے والد کیساتھ کام کرنے اور کاروبار کے ترقی دینے میں کافی محنت کی ہے، اس لئے دیانۃً تمام ورثاء پر ضروری ہے کہ وہ سب مل کر آپس کے مشورہ سے بطور حسن مکافات مناسب مقدار بطور ہدیہ دے کر ان کے قبضہ ودخل دینے کے بعد بقیہ کو حسب تخریج شرعی تقسیم کرلیں۔ اسی طرح تمام ورثا کی جانب سے محمد اشرف کو دینے میں ہبہ مشاعاً بھی نہ ہوگا کہ کوئی اشکال واقع ہو۔

۲-محمد فاروق جو تقریباً پندرہ برس سے مفقود ہے، اس کے حصہ کی ترکہ کا حکم یہ ہے کہ جتنا ترکہ اس کے حصہ میں آئے اس کو اس وقت تک محفوظ رکھا جائے جب تک اس کے ہم عمر زندہ رہیں، اگر وہ اس درمیان میں آجائے تو اس کو اس کا حصہ دے دیں اور جب اس کے سب ہم عمر مر جائیں اور وہ نہ آئے تو اس وقت اس کو تقسیم کر کے اس کا حصہ حسب تخریج شرعی ورثہ پر تقسیم کر دیا جائے، لہذا جب اس کا محفوظ حصہ تقسیم کرنے کا موقعہ آئے تو اس وقت طریقۂ تقسیم معلوم کرلیا جائے۔

۳-مرحوم نے اگر اپنی کوتاہیوں کے سلسلہ میں فدیہ وغیرہ دینے کی وصیت کی ہے، جب تو مرحوم کے تہائی ترکہ کے اندر اندر اس وصیت کو پورا کر کے باقی ماندہ ترکہ تقسیم کیا جائے اور اگر تہائی ترکہ سے کوتاہیوں کا فدیہ پورا نہ ہوسکے تو اس سے زائد سے فدیہ دینا ضروری نہیں یا فدیہ دینے کی وصیت نہیں کی تو کچھ بھی مقدار بطور فدیہ دینا ضروری نہیں رہے گا، البتہ اگر ورثاء اپنی طرف سے ادا کریں گے تو یہ عمل ان لوگوں کے لئے بڑے ثواب کا باعث ہوگا، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند، سہارنپور ۱۲/ ۱/ ۱۴۱۱ھ

کسی ایک لڑکے کو الگ کر دینے یا اس کے الگ ہو جانے سے اس کا حق وراثت ختم نہیں ہوتا:

چار بھائی اور والد صاحب ایک ساتھ رہتے تھے، مگر آپس کے خانگی جھگڑے کی وجہ سے ایک بھائی نے الگ ہونا چاہا، اس حالت میں کہ تمام جائداد، دوکان، الگ مگر والد محترم اور نہ ہی بھائیوں نے ایسا کرنے دیا، بلکہ اس طرح الگ کرنا

چاہا کہ جوکام تم کرو اس سے اپنے بال بچوں کا خرچہ چلاؤ۔

لیکن جو بھائی الگ ہو رہا تھا وہ یہ چاہتا تھا کہ اسی وقت ہر چیز بانٹ دی جائے، مگر ایسا نہیں کیا گیا، بلکہ اسکی اس بات پہ یہ کہا گیا کہ تم گاڑی کے آگے کاٹھ رکھتے ہو۔ بہر حال مجبور ہوکر اس بات پہ والد محترم نے اور بھائیوں سے ایک بھائی کو الگ کیا کہ تم کارخانہ پہ جتنا ہو گے اس سے اپنے بال بچوں کا خرچہ چلانا، باقی جو کاروبار ہو رہا ہے اسی طرح سے ہوتا رہے گا، وقتی طور پر تمہیں الگ کر رہا ہوں، پھر جب حالات سازگار ہوئے تو ایک ہی ساتھ کردوں گا، تم یہ نہ سمجھو کہ تمہیں الگ کر رہا ہوں، لہٰذا وہ بھائی الگ ہو گیا، اور اس کو ایک ہینڈلوم کارخانہ جس پر ۲۲ ساڑی تھیں جو دوسرے مکان میں تھا اور جس کی باقی دے کر الگ کر دیا وہ بھائی بن نہیں پار ہا تھا، اس لئے غیروں سے اور خود بھائیوں سے کچھ قرض لے کر کاروبار کر رہا ہے، اب جو بھائی الگ ہوا تھا۔ وہ ان تین بھائیوں کے کاروبار میں اپنے حصہ کا مطالبہ کر رہا ہے اور کہتا ہے کہ اس فرم میں بھی برابر کا شریک ہوں، جب کہ اسی فرم سے ایک مکان لیا گیا جس کی چار بھائیوں کے نام کی رجسٹری بھی ہوئی، مگر تین بھائی اسکے حصہ کو تسلیم نہیں کرتے جب کہ والد صاحب تسلیم کرتے ہیں، اب ایسی حالت میں شریعت کی رو سے جو ہو آپ فیصلہ فرمادیں۔

الجواب وباللہ التوفیق:

جب والد محترم زندہ تھے اور سب بھائی ان کے ساتھ ہی کام کرتے تھے تو والد صاحب تنہا سب کے مالک تھے۔ محض کسی ایک لڑکے کو الگ کر دینے سے یا الگ ہو جانے سے اس کا حق وراثت سوخت نہیں ہوگا۔ خاص کر اس تحریر سوال کے مطابق، بلکہ والد صاحب کے انتقال کے بعد ان کے تمام متروکات میں جس میں یہ خرید کردہ مکان بھی شامل تھے، چاروں لڑکوں کا یکساں اور برابر حق ہے، الگ ہونے والے بھائی کو اپنے حق کے مطالبہ کا استحقاق حاصل ہے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند، سہارنپور ۱۴/۷/۹۷ ۱۳ھ

الجواب صحیح محمود غفرلہ مفتی دارالعلوم دیوبند

مرتد مسلمانوں کے ترکہ کا وارث نہیں:

ایک لڑکی نہایت متقی حنفی المذہب مسلمان (مرحوم) کی بیٹی ہے۔ اسلامی قانون وراثت کے تحت مرحوم کی متروکہ

جائداد میں سے کچھ غیر منقولہ جائداد لڑکی کو حصہ میں مل سکتی ہے، اگر یہ خاتون اپنے خاوند کے مرزائی قادیانی ہونے کی وجہ سے خود بھی قادیانی ہوجائے یا قادیانی نہ ہو، مگر اپنے مرتد خاوند کا ساتھ نہ چھوڑے تو کیا بموجب شرع محمدی بدستور جائداد کی وارث بن سکتی ہے اور کیا ایک مسلمان کی متروکہ جائداد ایک مرتد کو منتقل ہوسکتی ہے؟ جب کہ مرحوم کی اور اولاد نرینہ اہل سنت والجماعت موجود ہو؟

الجواب وباللہ التوفیق:

جو شخص (مرد یا عورت) پہلے مسلمان تھا پھر قادیانی ہوگیا وہ مرتد ہے اور جو شخص (مرد یا عورت) پیدائشی طور پر قادیانی ہو وہ غیر مسلم (کافر) ہے اور جب وارث اور مورث میں دین کا اختلاف کفر واسلام سے ہو تو وراثت نہیں ملتی۔ پس کوئی وارث نہیں ہوسکتا، ''سراجی موانع الارث''میں مانع وراثت واختلاف الدین لکھا ہے، وهکذا في عامة کتب الفقه اور یہ اجماعی مسئلہ ہے، لقوله تعالیٰ: "ولن يجعل الله للكافرين على المومنين سبيلا" (۱) ولقوله علیه السلام: "لايتوارث أهل ملتين شتى" (۲)۔

پس یہ لڑکی جو قادیانی کے ساتھ رہنے کی وجہ سے خود بھی قادیانی ہوگئی اور تائب ہوکر اسلام میں لوٹ کر نہیں آئی وہ اپنے باپ کے ترکہ میں ہرگز وارث نہیں ہوسکتی، قطعاً محروم رہے گی، نیز مرتدہ تو شرع اسلامی میں کسی سے وراثت نہیں پاسکتی، هکذا في الشامي، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند، سہارنپور

مکان کی تقسیم ورثاء کے درمیان کس قیمت کے اعتبار سے ہوگی؟

میرے والد ایک مکان خستہ حالت میں چھوڑ کر انتقال فرما گئے۔ انہوں نے مندرجہ ذیل حصہ داران چھوڑے ہیں۔

(۱) احمد حسین (۲) مظہر حسن (۳) زاہد حسن (۴) لڑکی (۵) لڑکی۔ اس دوران میں

۱- سورۂ نساء: ۱۴۱۔

۲- ابوداؤد ۳/۱۲۶، مکتبہ عصریہ بیروت۔

میرے بھائی مظہر حسن نے اور دوسرے حصہ داروں نے اس مکان کی قیمت مبلغ تین سو روپیہ لگا کر اپنا حصہ میرے نام کر دیا تھا، ان میں سے میرے سب سے بڑے بھائی احمد حسن نے اپنے انتقال کے بعد اپنی پہلی بیوی سے ایک لڑکی چھوڑی اور ایک بیوہ چھوڑی، میں نے بیوہ سے بھی اس رقم یعنی تین سو روپئے کے حساب سے مکان کا حصہ لے لیا تھا، اور اسی طرح بہنوں کا حصہ بھی، اب اس مکان میں صرف احمد حسن کی پہلی بیوی کی لڑکی رہ جاتی ہے۔ اس کو مجھے حصہ دینا ہے، پھر میں نے اس مکان کو تعمیر کر لیا، کافی عرصہ گزرنے کے بعد لڑکی نے حصہ کا مطالبہ کیا ہے، اب میرا مطلب دریافت یہ ہے کہ اس لڑکی، یعنی میری بھتیجی کا شرعاً کیا حصہ بنتا ہے، اور کتنا اس کو مجھے دینا چاہئے، دوسرے موجودہ پوزیشن میں حصہ دینا واجب ہوگا یا اس حساب سے جس حساب سے میرے دوسرے حصہ داروں نے حصہ لیا تھا، کیونکہ میں نے اس مکان کو خود تعمیر کر دیا ہے اس میں کسی نے کوئی حصہ نہیں دیا ہے۔

احمد حسن　　　　مظہر حسن　　　　زاہد حسن

دوسری بیوی　　　　پہلی بیوی　　　　میں خرید چکا ہوں

لڑکی　　　　لڑکی

۵ لڑکے　　　　۲ لڑکی

بیوہ کو میں رقم دے چکا ہوں　　　　لڑکی والا انتقال فرما گیا

محمد حسن محلہ ابوالمعالی دیوبند

الجواب وباللہ التوفیق:

بھتیجی کا جتنا حصہ زمین میں بیٹھا ہو اس حصہ کی جو قیمت آج لگتی ہو وہ دینی پڑے گی اور جس وقت وہ مکان مشترک تنہا تعمیر کر لیا ہے اگر وہ قابل انتفاع رہائش تھا اور انہوں نے توڑ کر تعمیر کیا تو اس وقت جو حصہ مکان میں بھتیجی کا بیٹھتا تھا اس حصہ مکان کی اس وقت جو قیمت ہوگی وہ قیمت بھی پانے کی بھتیجی مستحق ہوگی، اور اگر وقت تعمیر جدید وہ قدیم مکان مسمار ہو چکا تھا قابل انتفاع نہ رہ گیا تھا تو اس مکان کی عمارت کے کسی حصہ کی قیمت عائد نہ ہوگی بلکہ صرف زمین کے حصہ کی موجودہ قیمت دینا کافی ہوگا۔ اور اس کے باپ کا جتنا حصہ ہوتا ہے اس کے نصف کی حقدار ہے اور باپ کے حصہ کی حقدار اس وقت متعین

ہوگی جب مرنیوالوں کی ترتیب معلوم ہوجائے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند، سہارنپور ۲۷-۷-۱۴۰۱ھ
الجواب صحیح: محمود غفرلہ، سید احمد سعید دارالعلوم دیوبند

پوتوں کی وراثت کا مسئلہ:

باپ کی حیات میں اگر بیٹے کا انتقال ہوگیا ہوتو پوتوں کو جائدادی (وراثتی) حق اسلام میں نہیں دیا جاتا، اس کی وجہ کیا ہے؟

محمد غیاث الدین بھیساورم

الجواب وباللہ التوفیق:

اول تو یہ الزام محض ہے کہ باپ کی زندگی میں بیٹا مرجائے تو پوتے کو کسی حال میں وراثت نہیں ملتی، یہ قول سراسر الزام اور اسلام سے دشمنی ہے۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ پوتے کی وراثت کی ۲۷ صورتیں نکلتی ہیں جن میں سے صرف ایک صورت میں، جبکہ دادا کے دوسرے بیٹے حیات ہوں تو مرجانے والے بیٹے کی اولاد کو ازروئے تخریج شرعی وراثت میں کچھ حق نہیں پہنچتا، اس کی وراثت کا مدار میت کے قریب تر ورثہ پر ہوتا ہے اور بیٹا پوتے سے زیادہ قریب ہوتا ہے۔ باقی دادا کے لئے ضروری ہے کہ وہ محروم الوراثت پوتے کو بذریعہ ہبہ یا وصیت اپنے ترکہ و مال میں سے دے۔ اس ایک صورت کے علاوہ ۲۶ صورتوں میں اس پوتے کو وراثت ہی ملے گا، جتنا کہ بیٹی اور بیٹا نہ چھوڑنے میں بیٹے کو ملتا۔ وغیر ذالک، تفصیل کا یہ موقعہ نہیں ہے اگر تفصیل دیکھنی ہے تو رسالہ (جواہر الفقہ اردو) میں ملاحظہ فرمائیں، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند، سہارنپور

بیٹے کی موجودگی میں پوتے محروم رہتے ہیں:

زید کا انتقال اپنے معمر باپ کی عین حیات ہی میں ہوا اور اس نے اپنی بیوی اور اپنی اولاد جو چار لڑکوں اور پانچ لڑکیوں پر مشتمل ہے اپنے پیچھے چھوڑی۔ زید کی اچانک موت کے کوئی ڈیڑھ سال بعد ان کے سن رسیدہ باپ کا انتقال ہوا جنہوں نے اپنے پیچھے دولڑکے اور چار لڑکیاں چھوڑیں۔ زید کے والد نے موت سے پہلے یا بوقت موت کوئی وصیت زبانی طور

یہ یا کسی بزرگ خاندان کے یا معتبر دوست یا رشتہ دار یا بیٹوں کے سامنے یا دستاویزی شکل میں نہیں کی۔ زید کے والد صاحب کے پاس جائداد تھی اور چونکہ انہوں نے کوئی وصیت نہیں کی تھی اس بات کا فائدہ اٹھاتے ہوئے زید کے چھوٹے بھائی نے زید کی بیوہ اور ان کی اولاد کو اپنے والد مرحوم کی ملکیت سے بے دخل کر کے اپنے والد مرحوم کے مکان سے جس میں وہ ایک مدت دراز سے سکونت پذیر تھے برطرف کر دیا اس طرح یہ غریب، یعنی زید کی اولاد دیکھتے ہی دیکھتے اپنے دادا کی ملکیت سے خارج الحق قرار دے دیئے گئے۔

حالانکہ یہ بات صحیح ہے کہ قرآنی احکام اور ارشادات نبوی علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی رو سے زید کی اولاد کو اپنے دادا کی ملکیت میں حق وراثت اس لئے حاصل نہیں کہ ان کے والد کا انتقال اسکے دادا کی حیات کے اندر رہوا تھا، لیکن کیا سورۃ البقرہ اور سورۃ النساء کی ان آیات (جن میں آدمی کو اپنے کل مال کے ۱/۳ حصے کی حد تک وصیت کرنے کا اختیار ہے اور وصیت کا یہ قاعدہ اسلئے مقرر کیا گیا کہ قانون وراثت کی رو سے جن عزیزوں کو میراث میں حصہ نہیں پہونچتا یا ان میں سے جس کو یا جس آدمی کو مدد کا مستحق پاتا ہے اس کے لئے اپنے اختیار تمیزی سے مقرر کر دے۔ مثلاً یتیم پوتا پوتی وغیرہ وغیرہ) سے یہ بات اچھی طرح سے ظاہر نہیں ہو جاتی کہ ان بے کسوں کو حق وراثت سے باہر ہی سہی دادا کی ملکیت میں کچھ حصہ ضرور ملنا چاہئے اور اگر کوئی ان کا یہ حق تلف کرنا چاہتا ہو تو اس کا یہ فعل رضاء خداوندی کے خلاف ہوگا۔

اگر چہ اس معاملہ کے متعلق زید کے باپ کی کوئی وصیت نہیں اس کے باوجود کیا یہ امر ضروری نہیں ہو جاتا کہ ان کے بقید حیات اولاد اپنے مرحوم بھائی، یعنی زید کی اولاد کے مندرجہ بالا حق کو تسلیم کر کے اپنے مرحوم باپ کی ملکیت کے ۱/۳ میں ہی سہی کچھ عنایت کر کے بچھڑے دلوں کو پھر سے جوڑ لیتے، لیکن وہ ایسا کرنے کے لئے تیار نہیں، بلکہ انہیں اس عمل سے گریز ہے، انکار ہے اور ان کی صرف ایک ہی دلیل ہے کہ زید کی موت اپنے باپ سے پہلے ہوئی اور بلحاظ شریعت زید کی اولاد کو دادا کی ملکیت کا ایک حبہ بھی نہیں مل سکتا۔

مزید برآں کیا سورۃ النساء کی اس آیت (۸): ''واذا حضر القسمة أولو القربىٰ واليتٰمى والمسٰكين فارزقوهم منه وقولوا لهم قولا معروفا''، یعنی تقسیم کے وقت کنبہ کے لوگ اور یتیم اور مسکین آئیں تو اس مال میں سے ان کو بھی کچھ دو اور ان کے ساتھ بھلے مانسوں کی سی بات کرے اس سے مرحوم زید کی بیکس اولاد کے حق کو تقویت نہیں ملتی کہ ان پسماندگوں کے ساتھ اللہ کے لیے نیک سلوک ہونا چاہئے اور دادا کی ملکیت سے انہیں کچھ نہ کچھ ملنا چاہیے۔

آپکی خدمت میں ان واقعات کی تفصیل بیان کرنے کے بعد آپ سے میری گزارش ہے کہ براہ کرم ونوازش یہ

بتائیں کہ شرع محمدی ﷺ کی روشنی میں اس مسئلہ کا کیا حل ہے جو مندرجہ بالا پیراگرافون میں بیان کیا گیا ہے۔مزید یہ بھی بتایئے کہ احکام خداوندی اور ارشادات ﷺ کے مطابق کیا زید کی اولاد اور ان جیسے دوسرے بچے اور بچیاں جن کے والدین کے انتقال ان کے والدین کی حیات کے اندر ہوجاتے ہیں انہیں دادا اور نانا یا دادی یا نانی کی ملکیت کی وراثت سے خارج سمجھنا چاہئے؟ اگر یہ صورت حال صحیح نہیں ہے اور مشیت ایزدی اس معاملہ میں کچھ اور ہی ہے تو اس کی سند اسلامی شرع میں کیا ہے؟

سراج الدین، مدراس

الجواب وبالله التوفیق:

یہ صحیح ہے کہ بیٹے کی موجودگی میں پوتوں کا ازروئے وراثت حق نہیں ہوتا، بلکہ دادا کے ذمہ خود ہوتا ہے کہ وہ ازروئے وصیت مناسب سمجھے تو تہائی کے اندر دے دے، بلکہ محروم ہونے والے محتاج ہیں تو اخلاقاً دے دینا ضروری ہے، بلکہ خود ان موجود بیٹوں کے ذمہ بھی اخلاقاً ضروری ہے کہ محروم بھتیجوں کے ساتھ حسن سلوک کریں، باقی اگر یہ لوگ کچھ نہ کریں تو ”انا ولی من لاولی له“ (۱) کے ضابطہ کے مطابق حکومت مسلمہ کو یہ حق ہوتا ہے کہ وہ ان محرومین کی تعلیم وتربیت وپرورش کا مناسب انتظام کرے۔ اگر دادا خود صاحب جائداد ہو تو اسی کے تہائی سے انتظام کردے یا جن چچاؤں کی وجہ سے یہ حرمان ہے اگر وہ صاحب ثروت ہیں تو ان کے ہی ذمہ ڈال کر یہ نظم کرائیں یا جن جن اعزاء پر شرعاً ان محرومین کا نان ونفقہ وغیرہ عائد ہوتا ہے ان کے ذریعہ سے معقول انتظام کرے، ورنہ پھر بیت المال سے ان کی تعلیم وتربیت وپرورش کا معقول انتظام کردے۔

اور جب حکومت مسلمہ بھی نہ ہو تو قوم خود اپنے اندر شرعی کمیٹی ان امور کے لیے قائم کرکے اس کے ذریعہ سے حدود شرع میں رہ کر ان محرومین کے لئے معقول انتظام مذکورہ بالا طریق پر کرے۔

یہ شرعی کمیٹی محض کنبہ اور خاندان کے افراد کی ہو یا محلّہ کے افراد کی ہو یا پوری آبادی کی یا پورے کسی ایک خطہ کی ہو مسلمانوں کی ایسی شرعی ضرورتوں کی انجام دہی کے لیے شرعی کمیٹی بنالینا شرعاً ضروری ہے، اگر بنالیں تو اس قسم کے اشکالات شریعت مطہرہ پر وارد ہی نہ ہوں، لہذا اس قسم کے اعتراض تو اپنی کوتاہی عمل کی وجہ سے ہوتے ہیں، نہ کہ قانون خداوندی کے نقص یا غیر معتدل ہونے کی وجہ سے۔

۱- مسند احمد کتاب مسند الشامیین باب حدیث مقدام بن معدیکرب الکندی ۱۶۵۶۸۔

پس صورت مسئولہ میں اسی مذکورہ ضابطہ کے مطابق اہل خاندان ایک شرعی کمیٹی (جماعت مسلمین) بنا کر اس کے ماتحت اسی واقعہ کا بھی نظم کرلیں، یہ نظم آئندہ بھی حسب مرضی شریعت کارآمد ہوگا۔

اور محروم پوتے کی وراثت کے مسئلہ کے سلسلہ میں اردو کے اندر بھی مفتی اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب ''جواہر الفقہ'' میں ایک مفصل رسالہ موجود ہے اسکو منگا کر مطالعہ فرمالیا جائے بصیرت کے ساتھ ہر اشکال کا جواب مل جائے گا۔ یہ کتاب (جواہر الفقہ) ہندوستان کے کتب خانوں میں بھی ملتی ہے اور زیادہ قیمتی بھی غالبانہ ہوگی، فتوی میں اتنی تفصیل کی گنجائش نہیں اور عمل کے لیے مذکورہ بالا جواب کافی ہے۔

نوٹ: شرعی کمیٹی (جماعت مسلمین) اور اس کے تفصیلی احکامات اردو رسالہ ''الحیلۃ الناجزۃ'' مصنفہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ میں ہیں اس کو بھی سامنے رکھنا ضروری ہے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور

مشترکہ خاندان کی مشترکہ جائداد کی تقسیم:

سعید اللہ صاحب مرحوم کا خاندان جس کا شجرہ درج ذیل ہے: ایک صاحب حیثیت اور صاحب جائداد مشترکہ خاندان رہا ہے اور تمام افراد خاندان مشترکہ طور پر تجارت کا پیشہ کرتے رہے ہیں، خدا کے فضل سے سعید اللہ مرحوم کے خاندان ڈیڑھ صدی سے زیادہ عرصہ تک، یعنی تیسری نسل تک مشترکہ طور پر تجارت کرتے ہوئے مزید کافی شہری املاک جائداد اور زمین داری وغیرہ بنائیں ۳۵-۳۰ سال پہلے تک فرم تمام افراد خاندان کی ساری ضروریات زندگی مثلاً علاج معالجہ بچیوں کے تعلیمی اخراجات افرادخاندان کے شادی بیاہ کے اخراجات، لباس و کپڑے اور عزیز و اقارب میں تقاریب کے موقع پر مروجہ رسوم کی ادائیگی کے مصارف کے علاوہ مشترکہ باورچی خانہ سے تمام افرادخاندان کو یکساں تیار کھانا بھی دیتا رہا۔ یعنی مشترکہ خاندان کی حیثیت سے کھانا پکتا رہا۔ لیکن گزشتہ ۳۵-۳۰ سال سے جب خاندان کے افراد کی تعداد زیادہ بڑھ گئی اور مختلف پسند و ذائقہ کے کھانا کھانے والے لوگ ہو گئے تو فرم نے مشترکہ باورچی خانہ کا طریقہ ختم کر کے فی نظر، یعنی فی یونٹ کے حساب سے خرچہ کا روپیہ مقرر کر کے تمام افرادخاندان میں خود پکانے اور کھانے کا نظم قائم کیا، یعنی اس مقررہ روپیہ سے جو کھانا یا جیسا کھانا لوگ کھانا چاہتے ہیں کھائیں اور کھلائیں۔

چونکہ محمود صاحب مرتبہ اور رشتہ میں سب لوگوں کے چچا ہوتے ہیں اور اسی لئے سب چھ بھتیجوں نے محمود صاحب

سے کہا کہ وہ خاندان کے بڑے ہیں اور ان کے صرف ایک ہی اولاد ہے، اس لیے ان پر فی یونٹ کی رقم کا نفاذ نہیں کیا جاسکتا، بلکہ وہ جس قدر رمناسب سمجھیں اپنے خرچ کے لیے کیا کریں، اسی پر محمود صاحب فی یونٹ کی مقررہ رقم سے تقریباً دوگنا روپیہ لیتے رہے جس پر کبھی کسی کو کوئی عذر اعتراض نہیں ہوا۔

محمود صاحب اول تین بھتیجوں (انصار احمد، اظہار احمد، مختار احمد) سے عمر میں چھوٹے ہیں اور دوسرے تین بھتیجوں (سرور احمد، منصور احمد، مسرور احمد) سے عمر میں بڑے ہیں، اس وقت سرور احمد کی عمر تقریباً ۵۰ سال ہے اور محمود صاحب جو چچا ہیں ان کے لڑکے محمود احسن کی عمر اس وقت تقریباً ۲۶ سال ہے۔

سعید اللہ مرحوم کی جائداد میں مذکورہ چھ ۶ بھتیجوں نے مزید اضافہ کیا اور تجارت کو بھی وسیع تر کیا ہے، جبکہ محمود صاحب ہمیشہ تجارت، زمین داری کے کاموں اور تجارت کے معاملہ سے بالکل علیحدہ رہے، ان کی حیثیت صرف گھر کے بڑے کی سی رہی، ان کو کاروبار اور زمین داری وغیرہ کے کاموں سے بھی کبھی کوئی واسطہ نہیں رہا۔ ان کا لڑکا محمود احسن اپنی کم عمری میں اور تعلیمی مشاغل کی بناء پر نہ تو تجارتی کاموں میں شریک رہا اور نہ زمین داری وغیرہ کے معاملات میں اس کو کوئی دخل رہا۔

۱۹۶۳ء میں چھ بھتیجوں اور چچا محمود صاحب کے درمیان صرف روپے کی تقسیم ہوئی۔ اس وقت سعید اللہ مرحوم کے مشترک خاندان کی کئی فرمیں تھیں، سب فرموں کا روپیہ یکجا کر کے آٹھ حصوں میں تقسیم کیا گیا۔ دو حصے چچا (محمود صاحب) نے یہ کہہ کر لیے کہ ایک حصہ میرا اپنا اور ایک میرے لڑکے محمود احسن کا ہے، باقی چھ ۶ کو ایک ایک ہر بھتیجے کو ملا۔ چچا کو دو حصے سب لوگوں نے بخوشی و بہ رضا دیتے تھے۔

چونکہ خاندان کے ساتوں افراد پر حج فرض تھا ان میں سے تین بھتیجے اور ایک چچا محمود صاحب نے حج نہیں کیا تھا۔ اس لئے ۱۹۶۳ء میں رقم کے بٹوارے کے وقت جو لوگ حج نہیں کیے ہوئے تھے مع ان کی بہوؤں کے سب لوگوں کو ایک مقرر اور مساوی رقم حج کرنے کے لیے دے دی گئی اور محمود صاحب نے اپنے لڑکے محمود احسن اور آئندہ ہونے والی بہو کے حج کے لئے بھی روپیہ لے لیا، یعنی چچا محمود صاحب کو دو حج کے لئے رقم ملی۔

اب جائداد شہری املاک، زمین داری باغ و باغیچہ وغیرہ کے بٹوارے کے موقع پر محمود چچا کا کہنا یہ ہے کہ وہ تمام جائداد کا ۱/۲ نصف لیں گے۔ اور باقی نصف میں دیگر چھ بھتیجوں کا حصہ ہے، حالانکہ اب تک زمین داری کے باغ، باغیچہ اور کھیت وغیرہ سے جو فصل گھر پر آتی رہی اس کی تقسیم میں اب تک کوئی تفریق نہیں برتی گئی، یعنی آئی ہوئی چیز کے سات برابر

حصے ہوتے رہے ہیں اور ایک حصہ ملتا رہا۔

مندرجہ بالا تفصیلات کی روشنی میں دریافت طلب شرعی امر یہ ہے:

☆ مذکورہ بالا سعید اللہ مرحوم کے مشترک خاندان کی مشترک جائداد کی شرعی تقسیم کس طرح کی جائے؟

☆ محمود صاحب جو چچا ہیں اور جن کے متعلق اوپر تفصیل دی جاچکی ہے ان کا نصف حصہ جائداد لینا درست ہے؟

شجرہ نسب یہ ہے:

کلیم الدین	[سعید اللہ مرحوم]	عظیم الدین
مسعود احمد		محمود اختر
زوجہ اول	زوجہ ثانی	محمود احسن

انصار احمد　اظہار احمد　مختار احمد　سرور احمد　منصور احمد　مسرور احمد

المستفتی ا۔م انصاری

الجواب وباللہ التوفیق:

صورت مسئولہ میں سعید اللہ مرحوم کے کل وارث صرف دولڑکے (کلیم الدین، عظیم الدین) ہیں، اس لیے سعید اللہ مرحوم کا کل ترکہ حقوق متقدمہ جیسے تجہیز وتکفین قرض وغیرہ ادا کرنے کے بعد دو برابر حصوں میں تقسیم ہوکر آدھا آدھا دونوں لڑکوں کا حق ہوا، پھر کلیم الدین کے بھی ایک ہی لڑکا مسعود احمد اور عظیم الدین کا بھی ایک ہی لڑکا محمود اختر ہے، اس لیے وہ پھر آدھا آدھا ان دونوں (مسعود احمد ومحمود اختر) کا حق قائم رہا، یہاں تک تو بات صاف ہے، پھر اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے مسعود احمد کو چھ ۶ لڑکے دیئے اور محمود اختر کو صرف ایک لڑکا دیا، یہاں سے توازن بدلا اور ترقی بھی اسی زمانہ میں ہوئی جس میں مسعود احمد کے لڑکوں کی محنت کا زیادہ دخل تھا۔ حسب تحریر سوال معلوم ہوتا ہے اور محمود اختر صاحب صرف گھر کے بڑے کی حیثیت میں رہے، گھر کے بڑے کی حیثیت کا مفہوم گھر کے سربراہ ونگراں۔

نیز سوال کی عبارت سے ظاہری متبادر یہی ہے کہ مسعود احمد کے لڑکوں کا یہ ترقی کرنا اپنے کسی ذاتی سرمایہ سے نہیں ہے بلکہ خاندانی مشترک سرمایہ سے ہے۔

اس کا شرعی حکم یہ ہے کہ اس زیادتی وترقی کے بارے میں آپس میں کوئی معاہدہ ہو تو حکم معاہدہ کے مطابق ہوگا، ورنہ ترقی دینے والے معاون ومتبرع کے حیثیت میں ہوں گے اور شرعی ضابطہ (لا اجر للعامل المتبرع) کسی اجرت یا حق المحنت کا مطالبہ کرنے کا حق نہیں رہتا، البتہ اگر کوئی خود عوض کا تبرع کردے تو دیانۃً ایسا ضروری یا بہتر رہتا ہے۔

پس اگر واقعہ اسی طرح ہو کہ اس ترقی شدہ (اور بڑھوتری) خاندان کے مشترکہ سرمایہ کے علاوہ مسعود احمد مرحوم کے لڑکوں نے اپنا ذاتی سرمایہ نہیں لگایا ہے اور نہ اس کے بارے میں کوئی معاہدہ ومعاملہ طے ہوا ہے تو ان ترقی شدہ چیزوں میں بھی آدھا آدھا ہی تقسیم ہونا چاہئے تھا کما یوخذ من البحر والرد والفتح للفتاوی الآمدیة وغیرھا۔ لیکن چونکہ نقد کے بٹوارے میں پھر اس طرح حج کی ادائیگی کے سلسلہ میں رقوم دینے کی صورت میں محمود احمد نے خود اپنا حصہ ہر شخص کے اعتبار سے الگ الگ اعتبار کرنے میں ہر شخص سے صرف دوگنا لیا ہے، یعنی آٹھ سہام میں صرف دو سہام لیا ہے جس کا حاصل یہ ہیکہ بجائے مجموعہ کے اعتبار سے نصف کے صرف چوتھائی حصہ لیا ہے، یعنی بجائے ۴ سہام کے صرف دو سہام لیا ہے، گویا دو سہام کی مقدار لے کر بقیہ دو سہام کا مسعود احمد مرحوم کے لڑکوں کے تبرع کے عوض میں تبرع کیا ہے جو محمود اختر کے لیے بہتر تھا۔ اور یہ عمل محمود کا دستور العمل بن گیا۔ جو معاہدہ قولی گرچہ نہیں ہے مگر اس کے ہم معنی ہوگیا ہے، لہذا اب محمود احمد کے لیے زیب یہی ہے کہ جائداد غیر منقولہ میں بھی یہی رویہ اختیار کریں اور آٹھ سہام سے صرف دو سہام لیں، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دار العلوم دیوبند

ملازم کے مرنے کے بعد فنڈ کا حکم:

عبد العلیم ملٹری ملازم ہے، انہوں نے سرکاری ملازمت میں لکھا تھا کہ دوران ملازمت وفات ہو جانے کی صورت میں ان کے پرائیویٹ فنڈ کی جمع شدہ رقم جو کچھ بھی ہو ان کی اہلیہ کو دے دی جائے۔ قضائے الٰہی سے ان کی وفات دوران ملازمت واقع ہوگئی، اور محکمہ نے کل رقم مرحوم کی منشاء اور تحریر کے مطابق بیوہ کو دے دی۔ مرحوم عبد العلیم کے ایک فرزند اور بیوہ وتین دختر ان ہیں، جو سب کے سب عاقل بالغ اور شادی شدہ ہیں۔ ان میں ایک لڑکی عرصہ سے پاکستان میں مقیم ہے اور اغلب ہے کہ وہاں کی شہریت حاصل ہو چکی ہے۔ اس کا شوہر پاکستانی شہری ہے۔ از راہ کرم شرعی حکم سے مطلع فرمائیں کہ:

پاکستان چلے جانیوالے وارث کا حصہ:

☆ کیا پاکستان میں جاکر بس جانے والی لڑکی ترکہ پدری کی حقدار ہے؟

☆ کیا وہ رقم جومرحوم نے پرائیویٹ فنڈ کی شکل میں بیوہ کے نام لکھا تھا اور جو بیوہ کومل چکی ہے، ورثاء میں قابل تقسیم ہے؟

☆ ترکہ کی تقسیم کا شرعی اصول مابین ورثاء کیا برتا جانا چاہئے؟

الجواب وبالله التوفيق:

۱- ہاں وہاں جاکر بس جانے والی لڑکی بھی حسب تخریج شرعی حقدار ہے، تخریج شرعی کی تفصیل نمبر ۵ کے جواب میں مذکور ہے۔

۲- فنڈ میں جمع شدہ رقم کے دو حصے ہیں۔ ایک حصہ رقم کا وہ ہے جومرحوم کی تنخواہ سے کٹی ہوئی رقم کے علاوہ ہے اور اس کوحکومت نے خود اس میں شامل کیا ہے۔ اس زائد رقم کی مالک و مستحق تنہا مرحوم کی بیوہ ہے۔ اس میں کسی اور وارث کا کوئی حق نہیں ہے، البتہ جو حصہ فنڈ کا مرحوم کی تنخواہ سے کٹ کر جمع ہوا ہے وہ حصہ شرعاً دین واجب الاداء بذمہ حکومت تھا، اس کے بارے میں مرحوم کی یہ وصیت شرعاً "تمليك الدين على من ليس عليه الدين" ہونے کی وجہ سے شرعاً درست نہیں ہے، بلکہ یہ حصۂ فنڈ مرحوم کا ترکہ شرعی ہے جومرحوم کے تمام ورثاء پر حسب تخریج شرعی تقسیم ہوگا، اور بیوہ کے تنہا، اس پر قبضہ کرلینے سے بقیہ ورثاء شرعی کا حصہ سوخت نہ ہوگا۔ تخریج شرعی کی تفصیل نمبر ۵ کے جواب میں ملاحظہ ہو۔

۳- ڈاکخانہ و بینک وغیرہ میں جمع کی ہوئی رقم میں بھی حق ورثاء کو پہنچتا ہے وہ رقم بھی حسب تخریج شرعی تقسیم ہوگی، تخریج شرعی کی تفصیل نمبر ۵ کے جواب میں درج ہے، البتہ اپنی جمع کی ہوئی رقم سے زائد جو رقم سود کی مد کی ہے اس کا حکم یہ ہے کہ اگر مرحوم کے ذمہ کچھ انکم ٹیکس وغیرہ منجانب حکومت عائد ہو اس میں وہ سود کے نام والی رقم دے دی جائے۔ اور اگر منجانب حکومت کوئی ایسا مطالبہ نہ ہو یا بعد ادائیگی مطالبہ بچ جائے اس کو ان ورثاء کو دے سکتے ہیں جو غریب محتاج ہوں، اور اگر ورثاء میں کوئی محتاج وغریب نہ ہو تو بلانیت ثواب بطور صدقہ کے غریبوں، محتاجوں کو دے دیا جائے۔

(۴) اگر مرحوم پر حج فرض نہیں تھا یا فرض تھا، مگر مرحوم نے اپنا حج کرانے کی وصیت نہیں کی ہے، بلکہ محض ارادہ ہی ارادہ ظاہر کیا تھا، تو وہ رقم بھی ترکہ شمار ہوگی۔ اور اس میں بھی حسب تخریج شرعی تقسیم جاری ہوگی، تفصیل تقسیم نمبر کے جواب میں مذکور ہے، اور اگر مرحوم پر حج فرض تھا اور مرحوم نے حج کے لیے وصیت بھی کی تھی اور وہ رقم تہائی ترکہ کے اندر ہے تو اس سے حسب وصیت حج بدل کرایا جائے۔ حج بدل کرانے کے بعد جو رقم بچے گی وہ ترکہ شمار ہو کر حسب تخریج شرعی ورثہ پر تقسیم ہوگی۔

۶،۵-مرحوم عبدالعلیم کے مرنے کے وقت اگر مرحوم کے باپ وماں زندہ نہیں تھے تو مرحوم عبدالعلیم کا کل ترکہ، خواہ بصورت مکان ہویا بصورت سامان یا زیورات ونقد ہو یا بینک وغیرہ کسی جگہ جمع شدہ ہو، ان سب کے مجموعہ میں سے پہلے بیوہ کا مہر جو باقی ہے وہ ادا کیا جائے۔ اسی طرح اگر اور کوئی قرض باقی ہے تو اسے ادا کیا جائے، پھر اس کے بعد باقی ترکہ صرف ایک تہائی کے اندر مرحوم کی وصیت صحیحہ نافذ کی جائے، پھر اس کے بعد جو کچھ ترکہ بچے اس کو چالیس سہام پر تقسیم کردیں۔ چالیس سہام میں پانچ سہام بیوہ کا حق ہوگا اور چودہ سہام فرزند کا حق ہوگا اور سات سات سہام تینوں لڑکیوں کا حق ہوگا، جو لڑکی کسی غیر ملک کی شہری ہوگئی ہے محض اس سے اس کا حق وراثت سوخت نہ ہوگا، بلکہ اس کا حصہ محفوظ رکھ کر اس کو مطلع کیا جائے، اور اس کی ہدایت کے مطابق عمل کیا جائے، یا اس سے بیع وشراء وغیرہ کا کوئی شرعی معاملہ بذریعہ مراسلت وغیرہ کرلیا جائے، اور اس کے مطابق عمل کیا جائے۔ اگر مرحوم کے انتقال کے وقت ماں یا باپ کوئی زندہ تھے تو ان کو واضح کرکے پھر تخریج شرعی معلوم کی جائے۔

نوٹ: یاد رہے کہ فنڈ میں جو رقم حکومت اپنی طرف سے ملاتی ہے وہ صورت مسئولہ میں مرحوم کا ترکہ نہیں ہے، بلکہ وہ رقم تنہا بیوہ کا حق ہے۔ جیسا کہ نمبر ۲ کے جواب میں درج ہے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند، سہارنپور ۳۰/۳/۹۶ ۱۴ھ

فنڈ، گروپ انشورنس، ڈیتھ ریلیف اور گریجویٹی کی رقم کی تقسیم کس طرح ہوگی:

میرے دوست فاضل خان مرحوم کا گذشتہ سال انتقال ہوگیا، ان کی عمر تقریباً ۳۸ سال تھی، مرحوم ایک سرکاری فیکٹری میں کام کرتے تھے، مرحوم کے انتقال کے بعد فیکٹری کے قانون کے مطابق مختلف وجہ سے مرحوم کے ورثاء کو روپے ملیں گے۔

مرحوم کے خاندان کے مندرجہ ذیل افراد موجود ہیں:

ایک بڑا بھائی، ماں، بیوہ، بہن، ایک لڑکا، دو لڑکیاں۔

مرحوم کے ورثا کو فنڈ، ڈیتھ ریلیف، اسکیم گروپ، انشورنس، گریجویٹی کی مد سے رقم ملے گی، ہر ایک مد سے ملنے والی رقم کی تفصیل اور مرحوم کا NOMINEE بنانا لکھا جارہا ہے، براہ کرم میراث کی تقسیم کا شرعی طریقہ تحریر فرمائیں۔

(ا) فنڈ۔ یہ وہ روپیہ ہے جو ہر ایک ملازم کے مشاہرے میں سے ماہانہ کاٹا جاتا ہے اور اخیر میں ریٹائر ہونے پر خود

ملازم کو اور مرنے کی صورت میں اس کے ورثاء کو دے دی جاتی ہے، اس کے لیے فیکٹری ہر ملازم سے فارم بھرواتی ہے اور NOMINATION مانگتی ہے۔ Nominee اس کو کہتے ہیں کہ خود فارم بھرنے والے کے مرنے کے بعد یہ روپیہ کن کو دیا جائے، مرحوم فاضل خاں نے ۱۹۶۵ء میں فارم بھر کر فیکٹری کو دیا تھا، اور Nomination اپنے بڑے بھائی کے نام کیا تھا، اس وقت مرحوم کی شادی نہیں ہوئی تھی، مرحوم کا نکاح ۱۹۷۰ء میں ہوا اور مرحوم کا انتقال ۱۹۷۹ء میں ہوا، اس درمیان میں مرحوم نے Nomination تبدیل نہیں کر یا خواہ اس کی اہمیت نہ جانتا ہو خواہ کوئی اور سبب ہو۔

فیکٹری کے قانون کے مطابق بڑا بھائی وراثت کا حق دار نہیں ہوتا ہے، لہذا فیکٹری نے مرحوم کے اس بھرے ہوئے Nomination کو باطل قرار دے دیا فیکٹری یہ روپے اس کی بیوی کو دے گی، لیکن عدالت سے ایک مخصوص سرٹیفکٹ لانے کے بعد جس کا نام سلیکشن سرٹیفکٹ ہے، فیکٹری نے مرحوم کے بڑے بھائی کو لکھ کر دیا ہے کہ فنڈ کے روپے آپ کو نہیں مل سکتے بلکہ یہ رقم بیوی کو دی جائے گی۔

براہ کرم اس رقم کا شرعی حصہ تحریر فرمائیں کہ کس وارث کو کتنا ملے گا، فنڈ کی ملنے والی رقم بیس ہزار ۲۰۰۰۰ ہزار روپے ہے۔

(۲) گروپ انشورنس یہ وہ روپے ہیں جو فیکٹری بطور امداد کے ملازم کی وفات پا جانے کی صورت میں اس کے گھر والوں کو دیتی ہے۔ حیات کی صورت میں بھی ملازم کو نہیں دیا جاتا، اس کے لیے مشاہرہ سے کچھ نہیں کاٹا جاتا ہے، اس میں مرحوم نے فارم اپنی بیوی کے نام بھرا ہے، کیوں کہ اس فارم کے بھرنے کے وقت ان کی شادی ہو چکی تھی، فیکٹری نے یہ رقم مرحوم کی بیوی کو ادا کر دی، مرحوم کے لکھنے کے مطابق براہ کرم اس رقم کی شرعی تقسیم تحریر فرمائیں۔

(۳) ڈیتھ ریلیف اسکیم: اس فیکٹری میں ۲۰ ہزار ملازم ہیں، ہر ملازم اپنے ساتھی ملازم کی موت پر ایک روپیہ اپنے مشاہرہ میں سے کٹواتا ہے، اس لیے ایک مشت ۲۰۰۰۰ کی رقم مرنے والے کے گھر والوں کو دی جاتی ہے، یہ رقم بھی مرنے ہی کی صورت میں ملتی ہے، حیات میں نہیں ملتی، مرحوم بھی اس اسکیم کے ممبر تھے اس میں کوئی فارم نہیں بھروایا گیا ہے اور نہ ہی فیکٹری کی طرف سے مانگا گیا ہے، لیکن فیکٹری کا قانون یہ ہے کہ یہ روپے مرنے والے کی بیوی ہی کو دیتے ہیں، کسی دوسرے کو نہیں، اس طرح یہ رقم فیکٹری نے مرحوم کی بیوی کو دے دی۔

براہ کرم اس صورت میں شرعی تقسیم تحریر فرمادیں۔

(۴) گریجویٹی: وہ رقم ہے جو فیکٹری ملازم کو اس کے ریٹائر ہونے پر یا خود مر جانے کی صورت میں اس کے

گھر والوں کو دیتی ہے، اس میں فیکٹری دس ماہ سے بیس ماہ تک ماہانہ مشاہرہ کا مجموعہ دیتی ہے، یہ رقم ملازم کو حیات اور موت دونوں میں ادا کی جاتی ہے، اس کے لیے بھی فارم مانگتی ہے، مرحوم نے اس مخصوص فارم پر ۳۰ فیصدی والدہ کے نام اور ۷۰ فیصدی بیوی کے نام بھرا ہے اور اس پر فیکٹری کو کوئی اعتراض بھی نہیں ہے، فیکٹری بحیثیت لکھنے کے ادا کرے گی۔

براہ کرم اس رقم کی تقسیم شرعی بھی تحریر فرمائیں کہ کس وارث کو کتنا ملے گا اس مد سے ملنے والی رقم آٹھ ہزار ۸۰۰۰ روپے ہوگی۔

(۵) مشاہرہ اور بونس: مرحوم کی کچھ رقم بونس اور مشاہرہ کی شکل میں ملنے والی ہے اس میں کسی کا نام نہیں ہے اور نہ ہی فیکٹری کی جانب سے مانگا جاتا ہے اس رقم کی بھی شرعی تقسیم کیسے ہوگی۔

نوٹ: اس طرح مرحوم کی کل ملنے والی رقم کا مجموعہ ۷۰۰۰۰ ہزار روپے ہیں، مرحوم نے شادی سے قبل بڑے بھائی کے نام فارم بھرا تھا، لیکن شادی کے بعد اور دوسرا فارم بھائی کے نام نہیں بھرا

المستفتی محمد اکرام الدین بی، ایچ، ای ایل بھوپال، اے پی

الجواب وباللہ التوفیق:

مسئلہ ۲۴ تص ۹۲

فاضل خان میت

ماں	بیوی	لڑکا	لڑکی	لڑکی	بڑا بھائی	بیوہ بہن
۴	۳	—	۱۷	—	محروم	محروم
۱۶	۱۲	۳۴	۱۷	۱۷		

پرائیویٹ فنڈ مرحوم فاضل خان کا ترکہ ہے اور شرعاً اس کا حکم یہ ہے کہ بیوہ کا مہر اگر باقی ہے تو مہر اور جو کوئی قرض مرحوم کے ذمہ ہو تو وہ قرض غرض حقوق متقدمہ علی المیراث دینے کے بعد باقی چھیانوے حصوں پر تقسیم کر کے سولہ حصے ماں کے ہوں گے اور بارہ حصے بیوی کے ہوں گے اور چونتیس سہام لڑکے کا ہوگا اور سترہ لڑکی کے ہوں گے اور فارم میں محض بڑے بھائی کا نام لکھنے سے وہ رقم شرعاً بڑے بھائی کی ملکیت میں نہیں ہوگی۔

(۲) یہ رقم جو مرنے والے کے مرجانے کے بعد فیکٹری کی جانب سے مرنے والے کے گھر والوں کو ملتی ہے وہ رقم مرنے والے کا ترکہ نہیں ہوتی کہ اس پر سب ورثاء کو حسبِ تخریج شرعی حصہ ملے بلکہ یہ رقم عطیہ ہوتی ہے۔

بس فیکٹری یا محکمہ جس کو اور جن شرائط کے ساتھ دے گا وہی ان شرائط کے ساتھ مستحق وحقدار ہوں گے، الہٰذا محکمہ نے جن کو دیا ہے وہی اس کے مستحق وحقدار ہیں۔

(۳) اس رقم کا حکم بھی یہی ہے کہ مرحوم کا ترکہ نہیں ہے بلکہ عطیہ ہوگی اور فیکٹری اپنے ضابطہ کے مطابق جس کو دے گی صرف وہی اس کے حق دار و مستحق ہوں گے اور جب ضابطہ یہ ہے کہ گھر والوں میں سے بیوی ہی کو دیجاتی ہے اور بیوی ہی کو حسب ضابطہ دیا ہے تو بیوی ہی حق دار ہوگی۔

البتہ بیوی پر دیانتاً یہ لازم ہوگا کہ وہ اس رقم سے مرحوم کے بچوں کی پرورش اور تعلیم وتربیت اچھی طرح کرے اور مرحوم کی والدہ، بیوہ بہن وغیرہ کے ساتھ حسنِ سلوک کا معاملہ کرے اور جہاں تک ہو سکے ان کی ضروریات کا لحاظ بھی رکھے۔

(۴) جب یہ قانون ہے کہ زندہ رہنے کی صورت میں ریٹائر ہونے پر یہ رقم خود اس کو اور اس کے مرجانے پر قانوناً اس کے ورثا کو دی جاتی ہے تو محض کسی ایک فرد کے دینے سے تنہا وہ شخص پوری رقم کا مستحق نہ ہوگا بلکہ حسبِ تخریج شرعی تمام ورثۂ شرعی پر تقسیم ہوگی، یعنی اس رقم کے چھیانوے سہام بنا کر سولہ سہام ماں کو اور بارہ سہام بیوی کو اور چونتیس سہام لڑکے کو اور سترہ سترہ دونوں لڑکیوں کو ملیں گے۔

(۵) یہ رقم بھی حقوق متقدمہ علی المیراث کی ادائیگی کے بعد حسبِ تخریج شرعی تمام ورثاء شرعی کو سوال ۱ کے جواب کے مطابق ملے گی، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند ۲۶/ ۴/ ۹۹ ۱۳ھ

کسی کو وارث قرار دینے یا نامزد کرنے سے قانوناً ورثاء کا استحقاق وراثت سوخت نہ ہوگا:

سوال: زید مرحوم نے اپنے پسماندگان میں دو حقیقی لڑکے تین لڑکیاں چھوڑیں، ان پانچوں اولاد کی تعلیم وتربیت، شادی بیاہ کے فرائض سے مرحوم عرصہ ہوا الحمدللہ سبکدوش ہو چکا تھا۔ زید نے ترکہ میں دو عدد بیمہ پالیسیاں چھوڑیں جن میں پہلی پالیسی کے لیے نامزد یا وراثت ابتداء ہی سے بیمہ کمپنی کے قانون کی رو سے اپنے بڑے صاحبزادے کو قرار دیا اور دوسری پالیسی کا وارث اپنے چھوٹے صاحبزادہ کو قرار دیا، لہٰذا اس بارے میں حکم شرعی کیا ہے؟

☆ زید اپنی کمپنی کے تنخواہ دار مینجنگ ڈائرکٹر تھے، جن کی تنخواہ میں سے با قاعدہ کمپنی کے قانون کے تحت ہر ماہ کچھ فنڈ کٹ کر جمع ہوتا تھا، اس جمع شدہ رقم کا بھی نامزد یا وارث بڑے لڑکے کو کیا یہ ازروئے شرع کیسا ہے؟

☆ زید اپنی قائم کردہ کمپنی ہی کے ساڑھے چار سو حصص کے مالک تھے جن کی تقسیم کے متعلق بالکل ابتداء ہی میں اپنے انتہائی رازدار شریک کار پر پورے طور پر واضح کر دیا کہ تمام حصص ان کے دونوں صاحبزادوں ہی میں تقسیم ہوں گے، لڑکیوں کا کوئی حصہ نہیں ہوگا۔ اس بات کا اعادہ انتقال سے کچھ عرصہ قبل بڑے صاحبزادے پر بھی کر چکے تھے اور دو ماہ قبل بشکل ہوش وحواس اپنی ایک صاحبزادی کی خواہش پر کہ ان میں لڑکیوں کا بھی حصہ ہونا چاہئے۔ مرحوم پھر ایک مرتبہ واضح طور پر اپنے بڑے لڑکے اور دوسرے دیرینہ ومخلص شریک کار کے سامنے اس خواہش کا اظہار فرمایا کہ حصص لڑکیوں ہی میں تقسیم کیے جائیں، لہٰذا مندرجہ ساڑھے چار سو حصص میں سے مرحوم ڈیڑھ سو حصص میں حیات میں ہی بڑے لڑکے خلف اکبر کے نام اور دوسرے ڈیڑھ سو چھوٹے لڑکے خلف اصغر کے نام قانونی طور پر منتقل فرما چکے تھے، اب باقی ماندہ ڈیڑھ سو میں مرحوم کی خواہش کے مطابق فیصلہ شرع کیا ہے؟

☆ زید نے ترکہ میں چار پانچ ہزار کی رقم نقد چھوڑی اور اس کے لئے اپنے بڑے صاحبزادے کے واسطے وصیت فرمائی کہ یہ کل رقم ایصال ثواب کے لیے کار خیر میں صرف کی جائے۔ کیا اس صرف کرنے کے لیے دوسرے ورثہ کی اجازت ضروری ہے۔

سید محمد جیلانی ممبئی نمبر ۲

الجواب وباللہ التوفیق:

نوٹ: اولاد کی تعلیم وتربیت وشادی بیاہ کے فرائض سے سبکدوش ہونے کے بعد بھی مورث مرحوم کی ملکیت میں ورثاء شرعی حسب تخریج شرعی اور حسب حکم شریعت حقدار ہوتے ہیں اور اس کے خلاف کسی کو اس میں کسی تغیر وتبدل کا اختیار نہیں ہوتا، اس تمہید کے بعد ہر نمبر کا جواب شرعی نمبر وار لکھا جاتا ہے۔

(۱) قانون کی رو سے کسی کو وارث قرار دینے سے یا نامزد کرنے سے دیگر ورثاء کا استحقاق وراثت سوخت یا ختم نہیں ہوتا، بلکہ شرعاً سب ورثہ حسب تخریج شرعی مستحق رہتے ہیں، لہٰذا محض دونوں نامزد شدہ ہی وارث نہ ہوں گے، بلکہ حکم شرعی یہ ہوگا کہ دونوں پالیسیوں میں زید مرحوم کا اپنا جمع کیا ہوا جتنا روپیہ ہے وہ تو سات حصوں پر تقسیم کر کے دو دو حصے زید

مرحوم کے دونوں لڑکوں کا حق ہوگا اور ایک ایک حصہ تینوں لڑکیوں کا حق ہوگا اور جو رقم اپنے جمع کیے ہوئے روپے سے زائد ملے اس کا حکم شرعی یہ ہے کہ اس کو بغیر نیت ثواب کے، بلکہ اس کے وبال سے بچنے کی غرض سے جتنا جلد ہو سکے غریبوں، محتاجوں کو دے کر اپنی ملک سے نکال دینا چاہئے، ہاں اگر ورثہ میں خود کوئی غریب، محتاج و مستحق زکوۃ ہو تو اس کو بھی دے سکتے ہیں۔

(۲) فنڈ کی رقم کا بھی یہی حکم ہے کہ قانون کی رو سے مورث نے جس کو وارث نامزد کیا ہے صرف وہی مستحق نہ ہوگا، بلکہ تمام ورثاء شرعی حسب تخریج شرعی مستحق ہوں گے، اس کی تقسیم بھی سات برابر حصہ کر کے دو دو حصے دونوں لڑکوں کا حق ہوگا، اور ایک ایک حصہ تینوں لڑکیوں کا حق ہوگا نیز فنڈ میں اپنی تنخواہ سے کٹی ہوئی رقم سے زائد رقم جس کو محکمہ اپنی طرف سے ملاتا ہے یا اضافہ کر کے خود دیتا ہے اس کا صدقہ کرنا واجب نہیں ہوتا، بلکہ یہ زائد رقم بھی ملازم کا ترکہ شمار ہو کر حسب تخریج شرعی مثل اصل رقم کے تمام ورثائے شرعی پر تقسیم ہوگی۔

(۳) زید مرحوم نے ساڑھے چار سو حصص کے تقسیم کرنے کے بارے میں جو بات کہی ہے چونکہ وہ مرنے کے بعد تقسیم کرنے کے بارے میں ہے اس لیے اس کا حاصل وصیت کے ہوا، جبکہ وصیت کے بارے میں حکم شرعی یہ ہے: "لا وصية لوارث إلا أن يشاء الورثة" (۱)، لہذا یہ وصیت تو محل کلام بن جائے گی، البتہ ڈیڑھ ڈیڑھ سو حصص جو خلف اکبر وخلف اصغر کے نام قانونی طور پر اپنی زندگی ہی میں منتقل کر چکے ہیں۔ پس اگر قانونی طور پر ان حصص کے اوپر ان لڑکوں کا قبضہ وتصرف بھی دے چکے تھے تو اس کی حقیقت ہبہ کی ہوئی اور وہ حصص (جن کا مجموعہ تین سو ہے) زید مرحوم کا ترکہ شمار نہ ہوگا، بلکہ ان لڑکوں کی ملکیت قرار پائیگی، البتہ ڈیڑھ سو حصص اگر زید مرحوم کے کل ترکہ کے تہائی کے اندر ہیں یا زائد ہیں ہر حال میں اس کا حکم یہ ہے کہ اگر لڑکیاں زید مرحوم کے انتقال کے بعد اس وصیت کو نافذ کر دیں اور اپنی طرف سے بھائیوں کے حق میں دے دیں تو صرف دونوں بھائی حقدار ہوں گے، ورنہ جواب نمبر ۲ اور ۳ کی طرح ڈیڑھ سو حصوں کے اندر بھی حسب تخریج شرع سات سہام میں سے ایک ایک سہم کی حقدار لڑکیاں ہوں گی، البتہ لڑکیاں اگر محتاج وضرورت مند نہ ہوں تو ان کے لیے اعلی بات یہی ہے کہ باپ کی وصیت کا احترام کریں اور حسب منشاء والد مرحوم اس وصیت کو نافذ کر دیں۔

(۴) یہ وصیت کہ کسی وارث کو ترکہ دینے کی وصیت نہیں ہے کہ حدیث پاک: "لا وصية لوارث الخ" کا مصداق بنے، بلکہ یہ وصیت کار خیر میں صرف کرنے کے لیے ہے، اس کا حکم شرعی یہ ہے کہ اگر یہ چار پانچ ہزار کی رقم

۱- مشکوۃ ۲۶۵/ باب الوصایا۔

مورث (موصی) کے کل ترکہ کے تہائی کے اندر ہے تو نافذ ہوگی، البتہ سب بھائیوں کے علم میں لانا اس لیے مناسب ہوگا کہ کسی کو اس تصرف سے انکار نہ ہو، لہذا یہ قید صحیح و درست ہوگی، یعنی سب لڑکوں سے اجازت لینے کے بجائے ان کے علم میں لاکر صرف کرنا ضروری رہے گا، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین مفتی دارالعلوم دیوبند، سہارنپور

دولڑکے اور چار لڑکیوں کے درمیان ترکہ کی تقسیم:

بابا میاں متوفی ہے اور ان کے دولڑکے تھے وہ بھی انتقال ہوگئے، چار لڑکیاں تھیں جس میں سے دو زندہ ہیں، دو انتقال کرگئیں متوفی نے چودہ گنٹھے زمین ترکہ میں چھوڑی ہے اب جبکہ لڑکے تو زندہ نہیں ہیں لیکن دونوں لڑکوں میں سے ایک کی اولاد میں ایک لڑکی ہے اور دوسرے لڑکے کی بیوی زندہ ہے اس طرح جو دولڑکیاں انتقال کرگئیں ان میں سے ایک لڑکی کو چار لڑکے ہیں دوسری لڑکی کی اولاد نہیں ہے نقشہ حسب ذیل ہے۔

بابا میاں

لڑکی حسین بی	لڑکی روشن بی	لڑکی بالو بی	لڑکی کلثوم بی	حسن مرحوم	ابراہیم مرحوم
دونوں زندہ ہیں اولاد نہیں ہے		دونوں وفات پاچکی ہیں ایک کی اولاد ہے چار لڑکے		اس کی ایک لڑکی ہے	بیوی زندہ ہے اولاد نہیں

الجواب وباللہ التوفیق

بابا میاں کے مرنے کے وقت جب ان کے دولڑکے اور چار لڑکیاں زندہ تھیں، بابا میاں کا کل ترکہ آٹھ برابر حصوں پر تقسیم ہوکر دو دو حصے لڑکوں کا حق ہوگا اور ایک ایک حصہ چاروں لڑکیوں کا حق ہوگا، پھر ابراہیم کے مرنے پر ان کے حق

وحصہ کا چوتھائی علاوہ دین مہر کے بیوہ کا حق ہوگا اور باقی تین چوتھائی کا حکم اس وقت معلوم ہوگا جب یہ معلوم ہوجائے کہ ابراہیم کے مرنے کے وقت بھائی بہنوں میں کون کون زندہ تھا، اسی طرح حسن کے مرنے پر حسن کے حق وحصہ کا آدھا ان کی لڑکی کا حق ہوگا اور باقی آدھے کا حکم اس وقت معلوم ہوگا جب یہ معلوم ہوجائے کہ حسن کے مرنے کے وقت کون کون زندہ تھا، اسی طرح دو فوت شدہ لڑکیوں کے حصوں کا حال ہے کہ جب تک یہ معلوم نہ ہوجائے کہ ان کے مرنے کے وقت کون کون زندہ تھا کوئی حکم واضح نہ ہوگا، سوال ادھورا ہے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند، سہارنپور

دادا کا اپنے پوتے کو ہبہ یا وصیت کرنا:

(۱) یتیم پوتے کا حق دادا کے ترکہ میں ختم نہیں ہوتا، البتہ اس کا کوئی مقررہ حصہ نہیں ہے اور یہ بات صاحب جائداد کی صواب دید پر ہے کہ وہ اس سے وصیت یا ہبہ کے ذریعہ ۱/۳ یا اس سے کم دے اور اگر صاحب جائیداد نے وصیت یا ہبہ نہ کیا ہو تو یہ بات تمام وارثین کے صوابدید پر ہے کہ اس یتیم رشتہ دار (بھتیجا) کو کتنا دینا ہے طے کریں بہر حال یتیم کو محروم نہیں کیا جاسکتا کیا یہ درست ہے؟

(۲) اگر دادا نے اس پوتے کے بارے میں جس کے والد کا انتقال ان کے سامنے ہوگیا ہو دو گواہوں کی موجودگی میں زبانی وصیت کیا ہو کہ ان سے ۲/۹ حصہ ترکہ میں دیا جائے یا دوسرے لڑکوں کے برابر ہی اس پوتے کو بھی دیا جائے تو کیا یہ وصیت جائز ہوگی؟

(۳) اگر دادا نے یتیم پوتے کو زبانی ہبہ کے ذریعہ ۲/۹ حصہ دیا ہو اور اپنی زندگی میں اسے قبضہ دے کر دوسرے وارثین سے یہ کہہ دیا ہو کہ فلاں (یتیم پوتا) کو بے دخل نہ کرنا تو کیا اسے بے دخل کرنا جائز ہوگا؟

ترکہ کی تقسیم کتنے دنوں میں ہونی چاہئے؟

(۴) صاحب جائیداد کی وفات کے بعد کتنے دنوں کے اندر تقسیم ہونا چاہیے؟

(۵) کیا ترکہ کو تقسیم نہ کرنا جائز ہے جب کہ کچھ وارثین ترکہ کے تقسیم کئے جانے کے خواہش مند ہوں؟

الجواب وباللہ التوفیق:

(۱) یتیم پوتے کا حق دادا کے ترکہ میں سے ہر حال میں ختم نہیں ہوتا بلکہ یتیم پوتے کی وراثت کی ۲۷-۲۸

صورتیں ہیں اوران میں سے صرف ایک صورت یا دوصورتوں میں محروم ہوتا ہے باقی تمام صورتوں میں حق دار ہوتا ہے اورتر کہ پا تا ہے (۱)، یہ تو مخالفین اسلام کا پروپیگنڈہ ہے تا کہ اس کے ذریعہ سے احکام اسلامیہ کی اتباع سے ورغلایا جائے، البتہ دادا کے لئے یہ بہتر ہے کہ اگر یتیم پوتے کے محروم ہونے کا اندیشہ ہو اور وہ غریب بھی ہو تو اپنی زندگی میں اس کو کچھ بذریعہ ہبہ دیدے یا محروم ہونے کی تقدیر پر ثلث کے اندر وصیت کردے۔ اسی طرح دادا کے مرنے پر محروم ہو رہا ہو اور غریب ہو تو بقیہ ورثہ کے لئے بہتر ہے کہ اس کو بھی کچھ مناسب حصہ تر کہ میں سے دیدیں بالکل محروم نہ کریں۔

(۲ و ۳) یہ دونوں صورتیں جائز ہیں بلکہ بعض صورتوں میں بہتر ہوگا جیسا کہ نمبر ا کے جواب میں گذرا۔

(۴) تر کہ مستحقین کے حصوں کے اعتبار سے تقسیم ہونا چاہیے اور جلد سے جلد تقسیم ہونا چاہیے، اس لئے کہ تر کہ میں ورثہ کی شرکتِ املاک قائم ہوجاتی ہے اور شرکت املاک سے جو چیز مشترک ہو اس میں بدون معاملہ شرعی کے ایک شریک کا کوئی تصرف جائز نہیں ہوتا (۲)، بلکہ غصب کے حکم میں ہو کر باعث گناہ ہوجاتا ہے۔

(۵) ضرور اور جلد قاعدہ شرع کے مطابق تقسیم کردینا چاہیے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند، سہارنپور

دو بیویاں ہوں اور دونوں سے اولاد ہو تو تر کہ کی تقسیم کس طرح ہوگی؟

ہمارے والد مرحوم کے انتقال کے بعد ہم بھائیوں اور بہنوں میں جائیداد کی تقسیم کا مسئلہ کھڑا ہے، کوئی کچھ کہتا ہے کوئی کچھ کہتا ہے، اس لئے آپ سے مشورہ طلب ہے، جائیداد، زیورات، مکانات اور والدین اور اولاد حسب ذیل ہیں:

والد صاحب مرحوم کی دو بیویاں ہیں اور دونوں ہی بقید حیات ہیں اور زندہ ہیں اور ان سے جو اولاد ہوئی اس کی تفصیل اس طرح ہے بڑی بیوی (والدہ صاحبہ) سے تین لڑکے اور چار لڑکیاں ہیں اور سب شادی شدہ ہیں اور لڑکے ملازم سرکار ہیں، چھوٹی بیوی (چھوٹی والدہ صاحبہ) کے دو بڑے لڑکے اور چار لڑکیاں ہیں، ان میں سے صرف ایک لڑکے اور لڑکی کی شادی ہوا ہے، انکی عمر ۱۵ رسال اور لڑکے کی عمر ۱۷ رسال ہے، لڑکا زیر تعلیم ہے (ITI) کررہا ہے جائیداد کی تفصیل پوری

۱- (۲۸ صورتیں ہیں جن میں سے ایک مہمل ہے جو تیرہویں صورت ہے ۵ اویں صورت پر محجوب ہے باقی تمام صورتوں میں حصہ پاتا ہے، دیکھئے پوتے کی وراثت از مولانا عبدالرزاق مظاہری قاضی شریعت کٹیہار، شائع کردہ آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ بمبئی) (ماخوذ از پوتے کی وراثت)۔

۲- ”فاما شركة الاملاك فحكمها في النوعين جميعا واحد وهو ان كل واحد من الشريكين كأنه اجنبي في نصيب صاحبه لا يجوز له التصرف فيه بغير اذنه“ (بدائع الصنائع ۵/ ۸۷، مکتبہ زکریا دیوبند)۔

جائیداد ½ ۱۳۰ ایکڑ ہے جس میں سے ½ ۵ ایکڑ تری اور ۲۵ ایکڑ خشکی ہے، تری جائیداد میں دو تالاب ہیں جسمیں کرنٹ موٹر مٹ ہے۔ مکانات پانچ ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ تھوڑی کھلی جگہ ہے۔ زیورات آٹھ تولہ سونا اور ۲۰۰ تولے چاندی ہے، آپ سے معلوم کرنا یہ ہے کہ پوری جائیداد کو مساوی حصوں میں لڑکوں میں تقسیم کریں تو لڑکیوں کو کتنا حصہ نکال کر کریں، ہر ایک کو کتنا اور کس حساب سے دیں یہاں اپنے رشتہ داروں میں یہ بحث بہت گرم ہے کہ جائیداد کو دو مساوی حصوں میں تقسیم کریں کیونکہ دو والدین ہیں دو حصے کر کے، ایک حصہ بڑی بیوی کے بچوں میں تقسیم اور دوسرا حصہ دوسری بیوی کے بچوں میں تقسیم کریں یہ کہاں تک صحیح ہے؟ میرے خیال میں پوری جائیداد دونوں والدین کی اولاد میں مساوی تقسیم ہونا چاہئے، پوری جائیداد کا لڑکیوں کو کتنا حصہ اور کس حساب سے ملنا چاہیے، اس کے علاوہ والد صاحب مرحوم نے اپنی زندگی میں کچھ جائیداد بڑے بیٹے یعنی ہمارے بڑے بھائی صاحب کے نام کیے تھے، جب ساری جائداد تقسیم ہوتی ہے تو پھر والدہ صاحب کا مکان اور بھائی صاحب کی زمین جو ان کے نام پر ہے وہ تقسیم میں لایا جائے یا وہ لوگوں کے نام سے جو جائداد ہے وہ اُن ہی لوگوں کو دے کر پھر بچی ہوئی جائداد میں بھی حصہ دیا جائے معلوم کریں، اس کے علاوہ دونوں والدین کو جائیداد میں کتنا حصہ نکالنا چاہیے اور ان کی زندگی کے بعد اس جائداد کو پھر تقسیم کرلیں یا کیا کریں معلوم کریں۔ اور ایک بات یہ دریافت کرنا ہے کہ جائداد تقسیم کرنا چاہیے یا نہیں جب کہ دونوں والدین زندہ ہیں جائداد میں دونوں والدین کا کہاں تک حق ہوتا ہے، اگر جائداد تقسیم کرلیں تو ان کی گذر بسر کے لئے کیا دیں اور جو لڑکا اور لڑکی غیر شادی شدہ ہیں ان کو جائیداد کا کتنا حصہ دینا چاہیے، لڑکیوں کو دو آنے حصہ میں برابر تقسیم کرنا چاہیے یا چار آنے حصہ میں تقسیم کرنا چاہیے معلوم کریں، یہاں کے لوگوں کا خیال ہے کہ جس وقت جائداد تقسیم ہوگی اس وقت بڑے بھائی کو اوپر کا حصہ یعنی مغرب کی طرف سے دینا چاہیے یہ کہاں تک صحیح ہے، دوسرا یہ کہ اگر دونوں والدین اپنی زندگی تک جائیداد تقسیم نہیں کرنا چاہیں تو وہ کہاں تک صحیح ہے، والد صاحب نے اپنی زندگی میں بڑے بیٹے کی تنخواہ سے پیسے جمع کر کے ان کی شادی میں دو تولے سونے کی چیز بنا کر ڈالے تھے اب وہ تقسیم میں نہیں لانا چاہتے ہیں وہ کہاں تک صحیح ہے جب کہ دوسرا لڑکا بھی تنخواہ دے دیا لیکن والد صاحب کوئی چیز بنا کر نہیں دیئے بلکہ دوسرے کاموں میں خرچ کر لئے، تمام تفصیلات شریعت کی روشنی میں اپنی فرصت کے اولین اوقات میں جواب دے کر مشکور فرمائیں۔

الجواب وبالله التوفيق:

بر تقدیر صورت سوال صورت مسئولہ کا حکم شرعی یہ ہے کہ مرحوم (والد) کے کل ترکہ میں سے پہلے حقوق متقدمہ علی

المیراث (جیسے قرض اور جن بیویوں کا مہر باقی ہوان کا مہر) دینے کے بعد باقی ترکہ ایک سو چوالیس برابر حصوں میں تقسیم کر کے نو نو حصہ دونوں بیویوں کا حق ہوگا اور چودہ چودہ حصے پانچوں لڑکوں کا حق ہوگا اور سات سات حصے آٹھوں لڑکیوں کا حق ہوگا۔ پہلی بیوی یا دوسری بیوی کی اولاد ہونے سے اس تقسیم میں کوئی فرق نہیں پڑے گا، اسی طرح بعض اولاد کے غیر شادی شدہ وغیرہ ہونے سے بھی کوئی اثر نہ پڑے گا۔ البتہ جو اولاد زیر تعلیم ہو یا جس کی شادی باقی ہو اس کے اخراجات میں سب ورثہ کو حسب استطاعت شرکت کرنا بہتر ہوگا۔

بڑے لڑکے یا دوسری بیوی کے نام کچھ جائداد محض لکھنے سے وہ جائداد ان کی ملک نہ شمار ہوگی بلکہ ترکہ شمار ہوگی اور اوپر لکھے ہوئے قاعدہ کے مطابق تقسیم ہوگی۔ البتہ جو زیور لڑکے کے پیسے سے بنوا کر اس کی شادی میں دیدیا وہ اس لڑکے یا اس کی بیوی جس کو دیا وہ اس کی مالک ہوگئی اور اس میں یہ تقسیم جاری نہ ہوگی۔

یہ کہنا کہ مغرب کی طرف یا اوپر کا بڑے لڑکے کا حق ہوگا یہ بھی غلط ہے۔ البتہ یہ بات الگ ہے کہ سب ورثہ اپنی خوشی و مرضی سے اس کو اس کی منشاء پر مطابق سمت کا دیدیں باقی وہ خود اس کا مطالبہ نہیں کر سکتا۔ اسی طرح جب ورثہ شرعاً بالغ ہیں تو سب کی اجازت و مرضی سے اگر جائداد ابھی تقسیم نہ کی جائے بلکہ سب کے مشورہ سے اس کا کوئی ایک فرد تقرار دے کر مشترک رکھی جائے جیسا کہ بیوگان کہتی ہیں تو یہ بھی درست رہے گا، لیکن جب اور جس وقت جو وارث تقسیم چاہے گا اس کا حصہ تقسیم کر کے دیدینا ہوگا۔

مورث متوفی مسئلہ تص ۱۴۴

زوجۂ اولی	زوجۂ ثانیہ	ابن از اولی	ابن از اولی	ابن از اولی	ابن از ثانیہ	ابن از ثانیہ
۹	۹	۱۴	۱۴	۱۴	۱۴	۱۴

بنت از اولی	بنت از اولی	بنت از اولی	بنت از اولی	بنت از ثانیہ	بنت از ثانیہ	بنت از ثانیہ	بنت از ثانیہ
۷	۷	۷	۷	۷	۷	۷	۷

فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند، سہارنپور

ایک بھائی کے ورثہ کے درمیان مشترک کاروبار کی تقسیم:

۱-دو بھائی کاروبار میں شرکت کرتے ہیں اور نفع کو برابر تقسیم کرتے ہیں، اس میں ایک بھائی کا انتقال ہوجاتا ہے تو کاروبار کا اثاثہ کس طرح تقسیم ہوگا جب کہ انتقال کرنے والے بھائی نے تقریباً ۲ لاکھ روپیہ مشترک کاروبار میں لگائے ہیں اور دوسرے بھائی نے تقریباً ۵ ہزار روپئے لگائے ہیں، موجودہ بھائی اب مرحوم کے ورثہ سے کہتے ہیں کہ موجودہ دوکان وگودام کا اسٹاک نصف ہم لیں گے اور نصف میں سے مرحوم کے ورثہ میں تقسیم کریں گے جو حصہ اس کا نکلے گا دیں گے اور جو تقسیم کروں گا وہ جب اسٹاک ہوا تھا اس وقت کے حساب سے کروں گا؟

۲-ایک بھائی کے انتقال ہونے کے باوجود جو چیزیں ترکہ میں چھوڑی ہیں اس میں سے ایک ایسی مارکیٹ بھی ہے جسکی دوکانیں کرایہ پر اٹھائی ہوئی ہیں اور جس میں معقول آمدنی ہے، مارکیٹ کے اوپر کا حصہ جو مکان کی شکل میں ہے وہ ایسے کرائے داروں کے ہاتھ میں ہے جو نہ تو کرایہ ہی دیتے اور نہ ہی دکان کو خالی کرتے ہیں تو ایسی شکل میں مارکیٹ کا کرایہ آتا ہے، وہ وارثوں میں کس طرح تقسیم ہوگا جب کہ مرحوم زوجہ اور بالغ لڑکے اور چار لڑکیاں چھوڑ گئے ہیں۔

۳-دوفریق آپس میں شراکت میں کام کرتے تھے جس میں سے ایک فریق کا انتقال ہوجاتا ہے جب کہ دوسرے فریق سے کہا جاتا ہے کہ دوکان گودام کا اسٹاک کرکے مرحوم کے ورثہ کو ان کا حق دو تو موجود فریق کہتے ہیں کہ ابھی ہم تقسیم نہیں کریں گے، جب مرحوم کی دوغیر شادی شدہ لڑکیوں کی شادی ہوجائے گی تو ان کے ایک سال بعد تقسیم کروں گا، شرعاً ان کا کہنا کہاں تک درست ہے؟

۴-موجودہ فریق جو اس وقت پورے مال کے مالک ہیں انھوں نے اسٹاک دوکان گودام کا بھی کرایہ لیا ہے اور ابھی تک مرحوم کے ورثہ کو یہ بھید نہیں بتانے کی زحمت گوارہ کیا ہے کہ مرحوم کیا مال چھوڑ گئے ہیں جس کے تم لوگ وارث ہو جب کہ انتقال ہوئے ۵ سال کا عرصہ گذر چکا ہے۔

الجواب وبالله التوفيق:

۱-حسب تحریر سوال نفع کی حصہ داری شرکت کی بنیاد پر تھی، ایک شریک کے فوت ہوجانے سے شرعاً شرکت ختم ہوگئی اور جب شرکت ختم ہوگئی تو سابق شرکت کی بنیاد پر نفع کا معاملہ بھی ختم ہوگیا، بس زندگی میں جو نفع ہوا اس میں تو حسب معاہدہ برابر کا حق موجود بھائی کو ہوگا، باقی کل سرمایہ واسٹاک سب ترکہ بن گیا اور اس میں دو لاکھ اور پانچ ہزار کی نسبت سے

حصہ داری ہوگی، یعنی دولاکھ سرمایہ لگانے والے شریک کا دولاکھ کی نسبت سے حق ہوگا اور پانچ ہزار سرمایہ لگانے والے کا پانچ ہزار کی نسبت سے حق ہوگا۔

موجودہ بھائی کا سب اسٹاک وسرمایہ پر نصف کا استحقاق غلط ہے شرعاً صحیح نہیں، پس محض نصف میں سے مرحوم کے ورثہ کو دینا شرعاً صحیح نہیں بلکہ مرحوم کا جو کچھ حق وحصہ تھا وہ سب مرحوم کا ترکہ شمار کر کے شرعاً مرحوم کے ورثہ شرعی پر حسب تخریج شرعی تقسیم ہوگا۔

۲-مذکورہ مارکیٹ کی عمارتوں کی مالیت وسرمایہ کی تقسیم بھی اسی دولاکھ اور پانچ ہزار کے حساب سے ہوگی، اگر اس سلسلہ میں بھائیوں کے درمیان کوئی معاہدہ نہ ہو ورنہ جو معاہدہ رہا ہوگا اس کے مطابق حکم شرعی ہوگا، البتہ مرحوم کی زندگی کا جو کرایہ ہوگا وہ حسب جواب نمبر ا نصف نصف تقسیم ہوگا اور مرحوم کے انتقال کے بعد کے کرایہ میں مرحوم کے ورثہ سے جیسا معاہدہ ومعاملہ ہوگا حکم اس کے مطابق ہوگا۔

۳-موجود شریک کا یہ کہنا شرعاً صحیح نہیں ہے، شرعاً مسئلہ یہ ہے کہ مورث کا جو کچھ ترکہ ہوتا ہے وہ تمام ورثہ میں املاک کے مطابق مشترک ہوجاتا ہے اور حکم شرعی یہ ہے کہ بغیر شرعی ضابطہ کے مطابق کوئی عمل کئے ہوئے کسی شریک کا اس میں تصرف کرنا صحیح وجائز نہیں ہوتا (۱)، پس حسب تخریج شرعی حصہ کشی کر کے نابالغین کا حصہ محفوظ کرلیا جائے اور اس کے بعد جتنے ورثہ شرعی نہیں وہ سب اپنے اپنے حصہ کے بارے میں کسی ایک شریک کو اگر اپنا وکیل یا وصی بنادیں تو وہ وکیل یا وصی اس کے مطابق عمل کرسکتا ہے اور غیر شادی شدہ لڑکیوں کے معاملہ میں یہ بھی کرسکتے ہیں کہ ان کا حصہ ان کو تملیکاً دیدیا جائے یا محفوظ رکھ کر سب بھائی چچا وغیرہ عصبات حسب حیثیت واستطاعت تبرعاً اس کی شادی شرع کے مطابق کردیں۔

۴- اس سوال کا جواب نمبر ۳ کے جواب سے معلوم ہوچکا کہ تقسیم شرعی ترکہ میں تصرف سے پہلے کردینا چاہیے تاخیر بھی صحیح نہیں ہاں اوپر لکھے قاعدہ کے مطابق کوئی معاملہ شرعی کر کے اس کے مطابق عمل کرنا صحیح رہے گا ورنہ غصب کے گناہ کا ارتکاب ہوگا، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند، سہارنپور

۱- ’’فاما شركة الاملاك فحكمها في النوعين جميعا واحد وهو ان كل واحد من الشريكين كانه اجنبي في نصيب صاحبه لايجوز له التصرف فيه بغير اذنه‘‘ (بدائع الصنائع ۵/ ۷۸، مکتبہ زکریا)۔

مناسخہ:

مرحوم عبدالرحیم کا انتقال ہوا اس نے دو لڑکے منظور احمد اور اللہ جلایا اور ایک لڑکی اللہ جلائی، چھوڑی اس کے بعد منظور احمد کا انتقال ہوا تو اس نے ایک زوجہ مسماۃ صغری ایک لڑکا مسمی مقبول احمد دو لڑکیاں مسماۃ زبیدہ اور بسم اللہ کو چھوڑا پھر اس کے بعد بسم اللہ کا انتقال ہو، اس نے ایک ماں صغری، ایک لڑکا مہدی حسن، ایک لڑکی امۃ المنان، ایک شوہر نبی حسن کو چھوڑا اس کے بعد مہدی حسن کا انتقال ہوا تو اس نے ایک بہن امۃ المنان، ایک باپ نبی حسن کو چھوڑا پھر نبی حسن کا انتقال ہوا تو اس نے ایک لڑکی امۃ المنان اور ایک بھائی امیر حسن اور ایک ماں عائشہ کو چھوڑا اس طرح عبدالرحیم کے متروکہ مکان میں امۃ المنان کو کتنا حصہ از روئے شرع ہے وضاحت فرماویں۔

نوٹ: صغری کے انتقال پر اس کا لڑکا مقبول احمد اور زبیدہ زندہ ہیں۔

بلال ۹مفر (محلہ ابوالبرکات سفید مسجد دیوبند)

الجواب وبا اللہ التوفیق:

نوٹ: اس واقعہ کے متعلق کے سوالات آئے بعض نامکمل تھا بعض امور آپس میں متخالف تھے، اس لئے جواب سے معذرت کی گئی، اب سوال یہ کہہ کر لایا گیا ہے کہ فریقین کے افراد سے سمجھ کر جو سوال بالکل صحیح امور واقعہ کے مطابق ہے لایا گیا ہے، پس وقعۃً واقعہ اسی طرح پر ہے تو حکم شرعی وہ ہوگا، واقعہ اس کے خلاف ہوگا تو جو حقیقت واقعہ ہوگی شرعی حکم اس کے مطابق ہوگا وانا بری ء منہ اور دوسرے کاغذ پر جو تفصیلی تحریر وجواب ہے تو اس کا حال یہ ہے کہ بر تقدیر صحت واقعہ وصحت سوال عبدالرحیم مرحوم کا ترکہ اور تقدیم ما تقدم ورفع موانع اکیاون ہزار آٹھ سو چالیس سہام پر تقسیم ہو کر اس میں سے ۲۰۷۳۶ سہام اللہ جلایا کا حق ہوگا اور ۱۰۳۶۸ سہام اللہ جلائی کا حق ہوگا اور ۹۰۷۲ سہام مقبول کا حق ہوگا اور ۴۵۳۶ سہام زبیدہ کا حق ہوگا اور ۲۳۳۱ سہام امۃ المنان کا حق ہوگا اور ۴۸۳ سہام عائشہ کا حق ہوگا اور ۶۴۴ سہام امیر حسن کا حق اور ۳۲۲ سہام ام خاتون کا حق ہوگا اور صغری کا ۳۳۴۸ سہام حق ہوگا اور سوال میں جو نوٹ ہے اس کا حکم یہ ہے کہ صغری کا جتنا حصہ ہوگا وہ تین برابر حصوں (سہام) پر تقسیم ہو کر دو حصہ مقبول کا حق ہوگا اور ایک حصہ زبیدہ کا حق ہوگا۔

مسئلہ ۵ تصـــ ۸۰ تصـــ ۲۸۸۰ تصـــ ۵۱۸۴۰

عبدالرحیم میـــت

لڑکا	لڑکا	لڑکی
منظور احمد	اللہ جلایا	اللہ جلائی
۲	۲	۱
	۳۲	۱۶
	۱۱۵۲	۵۷۶
	۲۰۷۳۶	۱۰۳۶۸

مسئلہ ۸ تصـــ ۱۶/۳۲ تداخل تصـــ ۱/۲

منظور احمد میـــت

بیوی	لڑکا	لڑکی	لڑکی
صغریٰ	مقبول احمد	بسم اللہ	زبیدہ
۱		۷	
۴	۱۴		۷
۱۴۴	۵۰۴		۲۵۲
۲۵۹۲	۹۰۷۲		۴۵۳۶

مسئلہ ۱۲　تصـ ۳۶　　تباین　　تصـ ۷

بسم اللہ　میت

شوہر	ماں	لڑکا	لڑکی
نبی حسن	صغریٰ	مہدی حسن	امۃ المنان
۳	۲		
۹	۶	۱۴	۷
۶۳	۴۲	۹۸	۴۹
	۷۵۶		۸۸۲

مسئلہ ۱　　تصـ ۹۸

مہدی حسن　میت

باپ	بہن
نبی حسن	امۃ المنان
۱	م
۹۸	

مسئلہ ٦ 　تصح ١٨ 　تباین 　تصح ١٦١

نبی حسن میت

بہن	بھائی	لڑکی	ماں
ام خاتون	امیر حسن	امۃ المنان	عائشہ
٢		٣	١
٢	٤	٩	٣
٣٢٢	٦٤٤	١٤٤٩	٤٨٣

المبلغ ٥١٨٤٠

الاحیاء

اللہ جلایا	اللہ جلائی	صغری	مقبول	زبید	امۃ المنان	عائشہ	امیر حسن	ام خاتون
٢٠٧٣٦	١٠٣٦٨	٣٣٤٨	٩٠٧٢	٤٥٣٦	٢٣٣١	٤٨٣	٦٤٤	٣٢٢

فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند، سہارنپور

ایک لڑکی، ایک بہن اور بھانجے و بھانجی کے درمیان ترکہ کی تقسیم:

عظیم اللہ کا انتقال ہوا اور اس کے مال اور مکان کے ورثا ء صرف ایک لڑکی ہے اور عظیم اللہ پر قرضہ ہے، ایک ہمشیرہ

کی اولاد چارلڑکے اور ایک لڑکی زندہ ہے اور انکے علاوہ اور کوئی حقدار وراثت کا نہیں ہے اب اس وراثت کی تقسیم اور قرضہ کی ادائیگی شرعی طور پر کس کس طرح سے حصہ دار ہونی چاہئے فقط۔

نوٹ مہر سوال کے جواب پر دارالافتاء کی مہر ہونی ضروری ہے

نوٹ: عظیم اللہ کی ایک اور ہمشیرہ موجود ہے اور دوسری ہمشیرہ مرگئی ہے، البتہ اس کے اولاد چارلڑکے اور ایک لڑکی ہے۔

الجواب وباللہ التوفیق:

ا۔حسب تحریر سوال عظیم اللہ پر جوقرضہ ہے اس کو ادا کیا جائے قرض ادا کرنے کے بعد جو ترکہ بچے دو برابر حصوں میں تقسیم کر کے ایک حصہ لڑکی اور ایک ہمشیرہ جوزندہ ہے اس کو دیدیا جائے اور جو اولادیں دوسری (مرحومہ) ہمشیرہ کی ہیں وہ محروم رہیں گی۔ تخریج ھذا

عظیم اللہ

مسئلہ ۲

میت

اولاد والاخت	اخت	بنت
م	ا	ا

ھذا ما عندی فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند، سہارنپور

الجواب صحیح سید احمد علی سعید، محمد جمیل الرحمن نائب مفتی دارالعلوم دیوبند

بھانجہ، داداکے بھائی کا پوتہ ونواسہ کے درمیان ترکہ کی تقسیم:

سید آفتاب علی پسر سید یعقوب علی نبیرہ سید منیر علی نے نہ کوئی پسر اولاد چھوڑی نہ دختری نہ بیوی بہن بھائی نہ والدہ نہ والد چھوڑا تو حق وراثت کس کو پہنچتا ہے۔

شجره

سیدامام علی سیدمنیرعلی　　　　سیدرستم علی　　　　سیدولائت علی

سیدصدیق علی نواسہ سیدامام علی وخالہ زاد بھائی یعقوب علی ہے سیدبشیرعلی بھانجا سیدآفتاب علی اورسیدخورشید ہے اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ سیدآفتاب علی متوفی کے ترکہ کا جبکہ وہ لا ولد گذرے اور بیوی بھائی بہن وغیرہ بھی زندہ نہ تھے صرف سیدصدیق علی تو اس امام علی وخالہ زاد بھائی سید یعقوب علی ہے اورسید خورشیدعلی پوتا امام علی اور بشری احمد بھانجی سید یعقوب علی باقی رہے، اس صورت میں از روئے شرع ترکہ کس طرح تقسیم ہوگا؟

الجواب وباللہ التوفیق:

سیدآفتاب علی

مسئلہ

میت

ابن ابن اخ الجد	ابن بنت اخ الجد	ابن الاخت
خورشیدعلی	صدیق علی	شبیرعلی
ا	م	م

صورت مسئولہ میں بر تقدیر صحت سوال سیدآفتاب علی کا کل متروکہ بعد تقدیم ما تقدم ورفع موانع صرف خورشیدکو ملے گا، اور بقیہ دونوں یعنی صدیق علی اوربشیرعلی محروم ہیں، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند، سہارنپور ۱۴/۷/۸۵ ۱۳ھ
الجواب صحیح: محموداحمد عفی عنہ

مناسخہ:

مسرورکا انتقال ہوا اس نے ایک لڑکا امیدعلی اور دولڑکیاں مسماۃ فیاض النساء اورسراج النساء چھوڑے، اسکے بعد

سراج کا انتقال ہوا، اس نے ایک لڑکا گھسیٹا اور ایک شوہر محمد خان اور ایک بہن فیاض النساء اور ایک بھائی امید علی کو چھوڑا، پھر انتقال ہوا امید علی کا اس نے ایک بہن فیاض النساء اور ایک بھانجا سراج النساء کا لڑکا اور ایک بہنوئی محمد خان مذکور سراج النساء کا شوہر وارث چھوڑے اب ترکہ مسرور مرحوم کا از روئے شرع کیسے تقسیم ہوگا؟

الجواب وباللہ التوفیق:

مسئلہ ۴　　　تصـــ ۱۶

مسرور

میـــــت

بنت	بنت	ابن
سراج النساء	فیاض النساء	امید علی
۱	۱/۴	۲/۸

مسئلہ ۴　　　مافی الید ۱

سراج النساء　میـــــت

ابن	زوج
گھسیٹا	محمد خاں
۳	۱

مسئلہ ۱　　　مافی البداء ۸

امید علی　میـــــت

ابن اخت (سراج النساء)	اخت فیاض النساء
م	۱/۸

الأحـــــــــــــيـــــــــــاء

فیاض النساء	محمد خاں	ابن گھسیٹا
۱۲	۱	۳

ترکہ مذکورہ بشرط صحت سوال مذکورہ صورت میں بعد تجہیز وتکفین واداء دین مہر وغیرہ مسمی مسرور کا ترکہ ۱۶ سہام ہوگا جس میں سے ۱۲ سہام فیاض النساء کو اور تین سہام گھسیٹا کو اور ایک سہام محمد خان کو ملے گا، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند، سہارنپور ۱۶/۷/۱۳۸۵ھ

الجواب صحیح: محمود علی عنہ نائب مفتی دارالعلوم

رہن کو چھڑانے والا وارث تنہا اس کا مالک نہیں ہوگا:

زید اپنی ملکیت کا ایک مکان جس کی زمین کا رقبہ ۲۰×۲۰ ہے، شکستہ حالت میں چھوڑ کر آج سے تقریباً ۲۵ سال قبل انتقال کر گیا ہے، زید کی بیوی زید کا لڑکا اور زید کی لڑکی پسماندگان میں رہ گئے تھے، زید کے انتقال کے ۱۰ برس بعد زید کی بیوی بھی انتقال کر گئی ہے، صرف لڑکا اور لڑکی رہ گئے ہیں، زید کی بیوی کے ۷ برس کے بعد زید کی لڑکی بھی سسرال میں رہنے لگی پیچھے تین بچے چھوڑ کر انتقال کر گئی ہے، اب زید کا لڑکا زندہ ہے خاص بات یہ ہے کہ زید نے اپنی زندگی میں مذکورہ مکان ایک ساہوکار کے پاس ۱۹۳۷ء میں ۲۰۰ روپے کے عوض گروی رکھ دیا تھا، لیکن مکان چھوڑانے سے قبل ہی زید کا انتقال ہو گیا ہے وہ گیروی شدہ مکان زید کے لڑکے نے ۲۰۰ روپیہ ادا کر کے چھوڑا لیا ہے اس مسئلہ پر فتویٰ صادر فرمائیے زید کی اس ملکیت میں زید کی لڑکی اور لڑکے کا حق از روئے شرع کتنا کتنا ہوتا ہے۔ بینوا توجروا

الجواب وباللہ التوفیق:

عبارت سوال سے یہ نہیں معلوم ہوتا ہے کہ زید کی بیوی کے انتقال کے وقت اس کے ماں باپ دونوں مر چکے تھے یا کوئی زندہ موجود تھا جواب دونوں مردہ تسلیم کر کے دیا گیا ہے اور ان میں سے کوئی بھی زندہ رہا ہو تو پھر سے سوال کر کے جواب لیا جاوے اس وقت کا جواب دوسرا ہوگا، اس صورت مسئولہ میں زید کی جائداد تین حصوں پر تقسیم کر کے دو حصے زید کے لڑکے کو اور ایک حصہ زید کی لڑکی کو ملے گا، زید کے لڑکے نے جو دوسو روپیہ زر رہن ادا کر کے مکان چھوڑ لیا ہے، اس کا حکم یہ ہے کہ اگر

زید کے لڑکے نے اپنی بہن سے کوئی معاہدہ کر کے روپیہ دیا ہے جب حکم اس معاہدہ کے مطابق ہوگا ورنہ زید کے لڑکے کا یہ تبرع اور احسان سمجھا جائے گا جس کا ثواب اسکو آخرت میں اس سے کہیں زیادہ ملے گا دنیا میں مطالبہ کا حق اس کو نہیں ہے۔

مسئلہ ۳

زید　　م ــــــــــ یــــــــــ ت

لڑکا	لڑکی
۲	۱

ھذا ما عندی واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند، سہارنپور ۲۰/۷/۸۵ ۱۳ھ

الجواب صحیح سید احمد علی سعید، محمود غفی عنہ

ایک بھائی، ۲/بھتیجے و ۳ بھتیجیوں کے درمیان ترکہ کی تقسیم:

شیخ منگرو مرحوم

عبدالمجید مرحوم　ولی محمد مرحوم　عبدالستار　نبی اللہ مرحوم　سعید احمد

شیخ منگرو مرحوم کے ۴ لڑکے تھے اور اس کی کمائی ہوئی اور ترکہ چار بیگھہ زمین ہے، عبدالمجید عرصہ ۲۱ سال ہوئے انتقال کر گئے اور ان کے دولڑکوں سعید احمد نذیر احمد کو جائداد مذکورہ سے انکے حصے کی پیداوار برابر دیجاتی ہے۔

ولی محمد بھی انتقال کر گئے، انکے اولاد ذکور سے کوئی نہیں اور انکی بیوہ بہن اور ایک لڑکی مومنہ بی بی شادی شدہ صاحب اولاد ہے۔

تیسرے لڑکے عبدالستار ہیں جو صاحب اولاد ہیں، عبدالستار ہی کا اپنی جدی دکان ہے جس میں لڑکا نبی اللہ مرحوم تھے جو ایک سال ہوئے انتقال ہوگیا ہے نہ ان کے بیوی ہے نہ ان کے بچے ہیں۔

نبی اللہ مرحوم کے حصے میں جو جائداد آراضی تھی اس میں عبدالستار کو حصہ ملے گا یا نہیں۔

سعید احمد وزیر احمد اور ولی محمد مرحوم کی جائداد سے مندرجہ بالا شجرہ میں جن جن لوگوں کے جتنے حقوق ہوں از روئے شریعت ان سے آگاہ کریں۔

الجواب وباللہ التوفیق:

آپ کے سوال سے معلوم ہوتا ہے کہ ولی محمد مرحوم نبی اللہ سے قبل انتقال کر چکے تھے اور عبدالستار اب تک زندہ ہیں اور جواب اسی تقدیر پر درج ہے اگر واقع اس کے برعکس ہوتو سوال پھر لکھئے۔

صورت مسئولہ میں حسب تحریر سوال وبر تقدیر صحت مسئلہ نبی اللہ مرحوم کا کل ترکہ منقولہ وغیر منقولہ بعد تقدیم ما تقدم ورفع موانع کے تنہا صرف عبدالستار کو ملے گا اور بقیہ ورثہ محروم رہیں گے، فقط واللہ اعلم بالصواب

مسئلہ ا

نبی اللہ

میت

اخ عینی	بنت الاخ	بنت الاخ	بنت الاخ	ابن الاخ	ابن الاخ
عبدالستار	مومنہ	عائشہ	زینب	سعید	نذیر احمد

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند، سہارنپور ۱۹/۷/۱۳۸۵ھ

الجواب صحیح محمود عفی عنہ، سید احمد علی سعید

بھائیوں کا چوتھائی ترکہ بھتیجے کے نام رجسٹری کرنا:

مورث اعلیٰ زید کے چار لڑکے ہیں جیسا کہ شجرہ مندرجہ کے مطابق ملاحظہ سے معلوم ہوتا ہے جس میں سے خالد اپنے باپ زید کی زندگی میں انتقال کر گئے ہیں، اس نے احمد علی ایک لڑکا چھوڑا ہے، اس کے بعد مورث اعلیٰ زید نے انتقال کیا اور عمر اور بکر اور سعید کو چھوڑا، لیکن عمر بکر اور سعید نے چوتھائی ترکہ احمد علی کے نام رجسٹری کرادیا اور پھر احمد علی کا انتقال ہوگیا ہے اس نے دو لڑکی ساجدہ اور کریمہ اور ایک بیوی شاہدہ کو چھوڑا، احمد علی کے انتقال پر یہ فیصلہ ہوا کہ پورا ترکہ اس کی بیوی شاہدہ بی کے نام کرادیا جاوے اور بعد فوت ہونے شاہدہ بی کے ۱۰ آنہ اس کے ورثہ کو ملے گا اور چھ آنے ہم لیں گے تو اس صورت میں اب شاہدہ کے انتقال کے بعد واپس لے سکتے ہیں یا کہ نہیں اور ایسے ہی سعید کی زوجہ کے ساتھ مذکورہ بالا صلح ہوا تھا تو کیا اس کو واپس لے سکتے ہیں اور بکر کے تین لڑکے موجود ہیں اور عمر خود ابھی موجود ہے ترکہ کیسے تقسیم ہوگا؟

الجواب وباللہ التوفیق:

زید کے ترکہ میں سے زید کے تینوں لڑکوں کو ایک ایک حصہ ملے گا اور خالد کا لڑکا محروم ہو جائے گا، کیونکہ اس کے والد زید کی وفات کے وقت تک موجود نہیں تھے۔

عمر اور بکر اور سعید نے احمد علی کے نام جو رجسٹری کرایا ہے یہ ہبہ ہے اگر احمد علی نے قبضہ کرلیا ہے اور اس میں کسی کی شرکت نہ رہی تو وہ احمد علی کا ہو گیا اور اگر قبضہ نہیں کیا تو ہبہ تمام نہیں ہوا ہے، اس لئے کہ ہبہ قبضہ کے بعد ہوتا ہے، ''لأن الهبة تتم بالقبض الكامل'' (۱)، اس کے مرنے کے بعد اس کے ورثہ پر تقسیم بھی نہیں ہوگا بلکہ اس کے تینوں چچا ہی مالک ہیں، پوری ملکیت احمد علی کے انتقال کے بعد اس کا ترکہ ورثہ پر اس طرح تقسیم ہوگا کہ زوجہ کو نو ۹ سہام ملیں گے اور تینوں چچاؤں میں سے ہر ایک کو پانچ پانچ سہام ملیں گے اور دونوں لڑکیوں ساجدہ، کریمہ کو چوبیس چوبیس سہام ملیں گے۔

مسئلہ ۳　　　　　　　　　　زید

میــــــــــــــــــــــــــــــــــتـ

عمر	بکر	سعید
۱	۱	۱

مسئلہ ۲۴　　تص ۷۲　　　　　احمد علی

میــــــــــــــــــــــــــــــــــتـ

بنت ساجدہ	بنت کریمہ	عم عمر	عم بکر	عم سعید	زوجہ
۸	۸				۳
		—	—		
۲۴	۲۴	۵	۵	۵	۹

اور سولہ آنہ حین حیاتی رجسٹر کرا دینے سے مرنے کے بعد اگر قبضہ ان کا مکمل ہو گیا ہے تو نہیں لے سکتے ہیں نہ شاہدہ زوجہ احمد علی سے اور نہ زوج سعید سے ہاں ان کے مرنے کے بعد شرعی طور پر ترکہ تقسیم ہوگا اس وقت جو ورثہ ہوں گے ان کو

۱- الدر المختار ۴/ ۵۰۷۔

بنا کر دریافت کیا جاوے۔

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۲/۷/۱۳۸۵ھ

الجواب صحیح: محمود غنی عنہ

مہر میں دیا گیا مکان ورثہ کے لئے واپس کردینے کا حکم:

ایک مکان جو کہ مرد نے اپنی عورت کے مرنے کے بعد اس کو دین مہر میں دیا مگر عورت کے جو وارث تھے انہوں نے اس کو لیکر کچھ عرصہ کے بعد واپس کردیا ہے اب مرنے والی عورت کے صرف دولڑکیاں ہیں اور ایک حقیقی بھائی کالڑکا بھتیجا ہے لڑکیوں کی شادی ہوگئی ہے جو کہ اپنے شوہر کے گھر ہیں اب اس کی تقسیم مرنے والی عورت کا خاوند کرنا چاہتا ہے تو کس طرح تقسیم ہوگی بھتیجہ کا کیا حق ہے اور دونوں لڑکیوں کا کیا حق ہے، مرنیوالی کا خاوند حیات ہے تو کس طرح تقسیم ہوگی؟

الجواب وباللہ التوفیق:

حسب تحریر سوال (عورت کے ورثہ نے اس مکان کو لیکر الخ) اگر عورت کی لڑکیاں اور تمام وارث بالغ تھے اور سب نے لیکر پھر کچھ عرصہ کے بعد اپنی مرضی سے واپس کیا ہے جب تو یہ مکان پھر مرد کی ملکیت ہوگا، اب اس میں عورت کی وراثت جاری نہ ہوگی، بلکہ مرد کو اختیار رہے جس کو چاہے دیدے یا نہ دے اگر نہ دے گا تو اس کے مرنے کے بعد اس کی وراثت جاری ہوگی اور اگر سب ورثہ بالغ نہیں ہیں یا سب نے ملکر اپنی مرضی سے واپس نہیں کیا تھا بلکہ صرف کسی ایک نے لیکر از خود واپس کردیا تھا تو اس صورت میں حکم یہ ہے کہ عورت کے مرنے کے وقت اس کے کل ورثہ بھی تھے جو سوال میں مذکور ہیں تو مندرجہ ذیل تخریج جاری ہوگی۔

بعد تقدیم ماتقدم ورفع موانع بارہ سہام پر تقسیم ہوکر چار چار سہام دونوں لڑکیوں کو اور تین سہام شوہر کو اور ایک سہام عورت کے بھتیجے کو ملے گا۔

مسئلہ ۱۲

زوجہ

میت

بنت	بنت	زوج	ابن الاخ
۴	۴	۳	۱

ھذا ما عندی فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند، سہارنپور ۲۶/ ۷/ ۱۳۸۵ھ

الجواب صحیح محمود غُفی عنہ، سید احمد علی سعید دارالعلوم دیوبند

۱- باپ کے ترکہ کو لڑکوں نے بڑھایا تو اس کی تقسیم کس طرح ہوگی؟

دونوں حقیقی بھائیوں کا پریوار شریک رہ کر ۵۔۲ ایکڑ گنا ۴ ایکڑ کو ۲۔۱۔۲ ایکڑ فصل ہوئے اور اس کی کمائی شامل شرکت میں کرتے رہے بعد علیحدہ ہونے پر دونوں نے مل کر بھائیوں کے ان فصلوں کی آخری کمائی میں ۵۵ روپیہ لگائے ان فصلوں کا بٹوارہ دونوں بھائیوں میں کیسے کیا جاوے۔

۲- شادی کے موقع پر جو زیورات دیئے گئے ان کی تقسیم:

والد کے فوت ہونے کے بعد ایک بھائی کے تین لڑکوں کی شادی اس طرح ہوئی کہ لڑکے والے مہمان یہاں آکر نکاح پڑھایا اور جو کچھ روپیہ دیئے اور اس روپیہ سے ایک ایک ہنسلی چاندی معمولی شادی کا کھانا وغیرہ سارا انتظام کرکے شادی ہوگئی۔ لڑکی کی شادی میں بھی اس طرح کم خرچ ہوا، کچھ خرچ گھر سے بھی لگا دوسرے بھائی کے لڑکے کی شادی میں برائت گئی اور زیادہ خرچ ہوا صورت بالا پر خیال کرتے ہوئے یہ فرماویں کہ ان کے زیوروں کا بٹوارہ دونوں بھائیوں میں ہوسکتا ہے یا کہ نہیں جبکہ دونوں بھائیوں کو ابھی برابر لڑکوں کی شادی کرنی ہے۔

۳- مشترک خاندان میں لڑکے کی بیوی کو جو بھینس دی گئی اس کی تقسیم:

ایک لڑکے کی بی بی کو شادی ہونے کے ۵ سال بعد رشتہ دار کے یہاں سے ایک بھینس بلا لاگت کے انعام میں ملی ہے اس کی پریوار بڑھی تو اس کے پریوار میں سے ۲ راس بھینس فروخت کرکے شامل شریک میں خرچ ہوا باقی بھینس کے

پر یوار میں دونوں بھائیوں کا کس طرح بٹوارہ کیا جاوے۔

الجواب وباللہ التوفیق:

۱-باپ کی کل املاک میں دونوں بھائی برابر کے حصہ دار ہیں جبتک شرکت میں کاروبار کرتے رہے ہیں خواہ کسی بھائی کا کتنا کنبہ اور کتنے ہی کمائی والے ہوں حصہ دونوں بھائیوں کا مساوی ہے (۱) یہ برضاء ورغبت مشارکت کارکردگی و اخراجات تبرع کے حکم میں ہے جب علیحدہ ہوگئے تو دونوں کا حصہ مساوی ہونے کی وجہ سے کھیتی پر جو کچھ خرچ ہوا وہ نصف تقسیم ہوگا۔

۲-باہم شرکت میں شادی پر جو کچھ خرچ ہوا وہ حصہ تقسیم ہوا، اس پر کسی کا واجب نہیں اور جس کے لئے جو زیور بنایا گیا اگر وہ اس کو بطور ہبہ کے دیا تھا تو وہ اس کا ہوگیا (۲) کیونکہ دونوں کی خوشی سے دیا گیا ہے، لہذا اس میں تقسیم نہیں ہوگی۔

۳-جس عورت کو اس کے رشتہ دار نے بھینس حصہ کی دی ہے وہ اس کی ملک ہے اور اس کی آمدنی سے اس کی رضا مندی سے جو سب نے نفع اٹھایا ہے وہ تبرع تھا بھینس اس عورت کی ملک رہے گی اس میں بٹوارہ نہیں ہوگا۔

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند، سہارنپور ۸ شعبان ۱۳۸۵ھ

الجواب صحیح محمود علی عنہ

باپ کا اپنے بیٹے کو اولاد تصور نہ کرنے سے اولاد وراثت سے محروم ہو جائیں گی یا نہیں؟

باپ کہتا ہے کہ میں اس بیٹے کو اپنی اولاد تصور نہیں کروں گا، میں اچھی طرح واقف ہوں کہ یہ اولاد میری نہیں ہے ایسی صورت میں وراثت سے ایسی اولاد محروم ہوگئی ہے یا نہیں؟

۱- ''لو اجتمع اخوة يعملون في تركة ابيهم ونما المال فهو بينهم سوية ولو اختلفوا في الرأى والعمل" (شامی ۴/ ۴۸۳، عثمانیہ)۔

۲- ''الهبة تمليك العين من غير عوض فكان حكمها ملك الموهوب من غير عوض" (بدائع الصنائع ۶/ ۱۲۷، رشیدیہ پاکستان)۔

الجواب وبالله التوفيق:

باپ کے محض اتنا کہنے سے لڑکا میراث سے محروم نہیں ہوگا(۱)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند، سہارنپور ۹/۸/ ۱۳۸۵ھ

الجواب صحیح محمود عفی عنہ

پوتے کی وراثت:

دادا کی موجودگی میں (زندگی میں) بیٹے کا انتقال ہوگیا ہے وراثت میں پوتے کا حصہ مل سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب وبالله التوفيق:

اگر کسی شخص کا ایک بیٹا اس کی موجودگی میں وفات پا گیا ہے اور دوسرا بیٹا موجود ہے تو فوت شدہ بیٹے کا لڑکا اس حالت میں دادا کا وارث نہ ہوگا، "الأقرب فالأقرب يرجحون بقرب الدرجة أعني أولهم بالميراث جزء الميت أي البنون ثم بنوهم" (۲)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۳/ ۷/ ۱۳۸۵

وارث کے لئے وصیت کب نافذ ہوگی نیز مورث کا وارث سے ناراضگی وراثت سے محرومی کا سبب ہے یا نہیں؟

۱- زید کا انتقال عرصہ سات سال کا ہوا ہے، زید کے صرف دو اولاد ہیں ایک لڑکا اور ایک لڑکی، لیکن اس وقت زید کے زر نقد جائداد منقولہ وغیر منقولہ و مکان وغیرہ لڑکے کے قبضہ واقتدار میں ہے وہ اپنی بود وباش اختیار کئے ہے، متوفی زید کے صرف دو اولاد ہیں (یعنی ایک لڑکا اور ایک لڑکی) جائداد واملاک وغیرہ کی تقسیم از روئے شرع کس طرح ہوگی؟ وضاحت فرماویں۔

۱- ''والنسب الثابت بالنكاح لاينقطع إلا باللعان ولم يوجد" (بدائع الصنائع ۲۴۶/۳، رشیدیہ پاکستان)۔

۲- سراجی ص ۲۲ کتب خانہ امدادیہ دیوبند۔

۲-لڑکی یعنی بہن ،لڑکے یعنی بھائی سے اپنا حصہ کا مطالبہ کرتی ہے تو اس کو اس کا حق دینے سے بھائی انکار کرتا ہے اور کہتا ہے کہ متوفی کی جائداد اور پوری املاک کا میں تنہا مالک ہوں اس میں تمہارا کوئی حق نہیں ہے اور میں اس کا قانوناً مستحق ہوں، کیا متوفی کی ایسی کوئی وصیت وارث کے خلاف ہوسکتی ہے؟۔

۳-سرکاری دفاتر میں غیر منقولہ جائداد کا داخلہ اب تک متوفی کے نام پر ہے، نیز متوفی کے حین وحیات میں کچھ زرنقد روپیہ خورد برد کردینے کے باعث اپنے لڑکے سے تا دم زیست بات چیت بند کردی تھی۔ اور آخری دم تک ناراض اور نالاں تھے۔

چنانچہ مذکورہ بالا صورت حال کی روشنی میں ایک جائز مقدار کی دانستہ حق تلفی کرنے والے کے لئے شرعی حکم ازروئے شرع کیا ہے؟

الجواب وبالله التوفيق:

مرنے والے کے شرعی وارث صرف ایک لڑکا اور ایک لڑکی ہو تو حکم یہ ہے کہ میت کے کل مال متروکہ میں سے تجہیز و تکفین اور اگر مقروض ہو تو ادائیگی قرض کے بعد جو بچے اس کے اندر وصیت صحیح نافذ کرے پھر جو بچے اس کے تین حصے کر کے ایک حصہ لڑکی کو اور دو حصے لڑکے کو دیا جائے۔ لڑکیوں کو وراثت ملتی ہے، یہ کہنا غلط ہے کہ بہن کو کوئی حق نہیں ہے قرآن پاک میں تصریح موجود ہے: **"يوصيكم الله في اولادكم للذكر مثل حظ الانثيين"**(۱)۔

اس کے خلاف کرنا سخت گناہ اور احکام خدا سے بغاوت ہے، بھائی کو چاہئے کہ بہن کا حصہ اسی مذکورہ قاعدہ کے مطابق دیدے اگر بالفرض متوفی نے ابن ہی کے لئے وصیت بھی کردی ہو تو یہ وصیت صحیح نہیں ہے مال کی وصیت غیر وارث کے لئے ہوتی ہے صحیح حدیث میں ہے: **"لا وصية لوارث إلا أن يجيزها الورثة"** (۲) وارث کے لئے بلا اذن بقیہ ورثہ نافذ نہیں ہوتی ہے، اسی طرح مورث کا کسی وارث سے خفا اور ناخوش رہنا حق وراثت کو سوخت نہیں کرتا ہے۔

پس صورت مسئولہ میں دونوں حسب تصریح مذکورہ بالا کل متروکہ متوفی آپس میں تقسیم کرلیں، اگر بھائی حق تلفی کرے گا تو آخرت میں جو عذاب شدید غصب وظلم کا ہوگا وہ تو ہوگا ہی دنیا کے اندر بھی وبال میں مبتلا ہونے کا قوی اندیشہ ہے،

۱- سورۃ النساء: ۱۱۔

۲- سنن ترمذی حدیث نمبر ۲۱۲۰ باب ماجاء لاوصیۃ لوارث، سنن کبری بیہقی حدیث ۱۲۹۱۷ جلد ۶/ ۲۶۴، مجلس دائرۃ المعارف العثمانیہ حیدرآباد دکن، سنن دارقطنی مع التعلیق المغنی حدیث ۴۱۵۱، جلد ۵/ ۱۷۱، مطبوعہ مؤسسۃ الرسالۃ۔

ھذا ماعندی فقط واللہ اعلم بالصواب

جواب صحیح ہے، فقط واللہ اعلم بالصواب

اگر لڑکا وصیت کا ثبوت بھی پیش کردے تو چونکہ لڑکی اپنا حق طلب کررہی ہے اس لئے وہ وصیت معتبر اور نافذ نہیں ہے کیونکہ وارث کے حق میں وصیت اسی وقت نافذ ہوتی ہے جبکہ دوسرا وارث بھی راضی ہو، اس لئے لڑکے پر واجب ہے کہ اپنی بہن کا حق وحصہ ادا کردے جو اس کو اپنے باپ کے ترکہ سے پہنچتا ہے اس کا روکنا کسی طرح جائز نہیں ہے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند، سہارنپور

الجواب صحیح: سید احمد علی سعید نائب مفتی دارالعلوم دیوبند

حق وراثت مورث کے مرنے کے بعد ہے مورث اپنے حین وحیات میں اپنے املاک میں خودمختار اور شرعی تصرف کا مالک ہے وارث کو تعرض کا حق نہیں:

والد صاحب موضع ہند کے ملازم جاگیری پیش امام تھے انہوں نے اس جاگیر میں پیش امام کی تنخواہ ۷ روپیہ اور ۷ بیگہ زیر زمین مسجد پر معمور تھے۔ علاوہ ازیں پٹہ جات آراضی بھی تھے یہ زمینات پیدا کئے والد بزرگوار اسی جاگیری موضع میں ۱۰ سال ہوئے انتقال کئے، والد کے ہم تین بیٹے ہیں میں بڑا ہوں اور دوسرے پہلے اور تیسرے چھوٹے ہیں، والد کی زندگی میں ملازم سرکار ہوگیا تھا، والد کے ایصال ثواب کے وقت سب عزیز جمع ہوئے انہوں نے باتفاق رائے یہ طے کیا کہ تم بڑے ہو بزرگوں کی جائداد سنبھال کر کام چلانا تمہارا کار ہے چونکہ جاگیری موضع ہے جاگیرداروں نے وراثت میں جھگڑے ڈالیں گے چونکہ عطاء جاگیری تھی میں نے سرکاری سروس چھوڑ دی اور والد کی ملازمت کو سنبھالا، برادران کے اصرار پر آراضی ومکان تین حصوں میں تقسیم کردیا جو آراضی والد کے زمانہ میں قول پر دئے ہوئے ۳۰۔۴۰ سال ہوئے گئے تھے ان سے جھگڑا کر کے چھوڑادیا دوسرے بھائی ملازم سرکار تھے والد کے انتقال کے بعد آگئے تیسرے بھائی ڈاکٹر ہیں والد کی زندگی میں بھی میرے دو عورت تھیں پہلی کا ایک لڑکا ہونے کے بعد انتقال ہوگیا دوسری اہلیہ کو مسلسل چھ لڑکیاں ہیں جن میں سے تین فوت ہوچکی ہیں دو شادی شدہ اور ایک غیر شادی شدہ ہے مجھلے بھائی لاولد ہیں والد کے کہنے پر مجھلے بھائی نے احقر کے لڑکے کو گود میں لے لیا تھا یہ خیال کرتے ہوئے کہ دوسری اہلیہ سے نرینہ اولاد ہوگی مگر نہیں ہوئی ہے کیونکہ بھائی کی خواہش تھی

کہ اس لڑکے کو ولی عہد جائداد بنا دیں گے اس وقت لڑکا ۲۲ سال کا ہے اور پوسٹ ماسٹر ہے بھائی کے زیر پرورش ہے یہ لڑکا نہ میری کوئی مدد کرتا ہے نہ اس سے کچھ امید ہے حتی کہ میرے سے بات تک نہیں تیسرے بھائی کے چھ ۶ لڑکے اور تین لڑکیاں ہیں۔

انہوں نے تقسیم جائداد کا مسئلہ پیش کرنے پر تقسیم جائداد و مکان کے لئے تقسیم شدہ جائداد آراضی میں کچھ زمین میرے حصہ میں سے فروخت کر کے لڑکوں کی شادی کر دیا اب تقریبا میرے حصہ کی آراضی پانچ چھ بیگھہ رہ گئی ہے، میرے ذمہ اس وقت گورنمنٹ کا ۱۹۰۰ روپیہ قرض ہے اور چھوٹی لڑکی کی شادی کرنا ہے برادران کا اور اس لڑکے کا عذر ہے کہ اب میں کوئی زمین فروخت نہیں کر سکتا ہوں اور میرا قصد ہے کہ میں اپنی آراضی سے کچھ زمین فروخت کر کے قرض ادا کردوں لڑکی کی شادی کردوں اور اہلیہ کا حق ادا کردوں، میری عمر ساٹھ سال ہے خدمت امامت انجام دے رہا ہوں، بھائی اور لڑکے کہتے ہیں کہ کوئی چیز آپ فروخت نہیں کر سکتے ہیں اگر میں مر گیا تو قرض اور دوسرے حقوق مجھ پر باقی رہیں گے؟

الجواب وبالله التوفيق:

حسب تحریر سوال اگر اپنے باپ کے فقط آپ ہی تین بھائی شرعی وارث تھے اور ان تینوں نے بحصہ مساوی اپنے والد کا متروکہ جائداد تقسیم کرلیا اور اس پر قبضہ دخل اپنا اپنا کرلیا تو تقسیم مکمل ہوگئی اب کسی بھائی کو آپ کے حصے میں بلا آپ کی مرضی کے دخل دینے اور بیع وشراء وغیرہ کرنے سے روکنے کا حق نہیں، آپکو اختیار ہے اپنی مصلحت دیکھ کر عمل کریں کر سکتے ہیں قرض کی ادائیگی حقوق وراثت پر مقدم ہے (۱)، اگر اس کی ادائیگی کے لئے بغیر کچھ جزوی یا کلی جائداد فروخت کئے کوئی صورت نہ ہو تو اس کا بھی آپ کو حق ہے البتہ شادی کم خرچ میں اور سادی طرح سے بھی ہو سکتی ہے اس میں ان باتوں سے احتیاط کرنا چاہئے، آپ کا وہ لڑکا جسکو منجھلے بھائی نے گود میں لے لیا ہے وہ بھی آپ کا شرعی وارث آپکے مرنے کے بعد ہوگا اس کو محروم کرنے یا ضرر پہنچانے کی نیت سے کچھ تصرف منتقل مثل بیع وہبہ وغیرہ کریں گے تو وہ دنیا میں تو نافذ ہو جائیں گے مگر آپ آخرت میں گنہگار ہوں گے (۲)، اگر اسوقت آپ صبر کریں گے ضرر نہ پہنچائیں گے تو ثواب ملے گا۔ اس وقت جو آپ کو وہ نہیں

۱- ’’ثم تقضى ديونه من جميع مابقي من ماله ثم تنفذ وصاياه من ثلث مابقي بعد الدين ثم يقسم الباقي بين ورثته‘‘ (سراجی ص ۳، مکتبہ امدادیہ دیوبند)۔

۲- ’’عن ابی هريرة عن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: إن الرجل ليعمل والمرأة بطاعة الله ستين سنة ثم

پوچھتا یہ اس کی سخت غلطی ہے گنہگار ہوگا آپ کی اطاعت اس پر واجب ہے اپنی استطاعت اور آپکی ضرورت کا اعتبار کرتے ہوئے اس کو آپکی مالی امداد بھی کرنا چاہئے اگر قدرت رہتے ہوئے اور آپکے مجبور ہوتے ہوئے بھی خیال نہ کرے تو موجب گناہ ہے اس کو ایسا نہ کرنا چاہئے، لیکن وہ وراثت سے محروم نہ ہوگا، باقی رازق و مالک اللہ تعالیٰ ہیں اور آپ کا اور آپ کے بچوں کا اگر آپ نے کسی عزیز کو ضرر پہنچانے کی نیت نہیں کی تو انشاء اللہ تعالیٰ ان لوگوں کی بدنیتی وبدعملی سے کوئی ضرر و تکلیف نہیں پہنچ سکتی آپ خاطر جمع رکھیں، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند، سہارنپور

دادا کے سامنے باپ کا انتقال ہوگیا، چچا نے نصف جائداد بھتیجے کے نام کردی اب پوری جائداد کی تقسیم کس طرح ہوگی؟

حاجی باسط علی خان دو بھائی تھے، ایک بھائی کا باپ کی موجودگی میں انتقال ہوگیا ہے ان کا لڑکا مشتاق احمد موجود ہے، حاجی باسط علی نے اپنے والد کے انتقال کے بعد نصف جائداد مزروعہ وغیرہ مشتاق احمد کے نام کردیا ہے اور نصف کا حقدار مثل بھائی کے بنالیا ہے، حاجی باسط علی صاحب کا بڑا لڑکا منظور احمد اور بھتیجا مشتاق احمد مزروعہ دونوں سنگاپور رہتے ہیں اور شرکت میں کوئی کام کرتے ہیں، یہاں گھر پر حاجی باسط علی خود اور مشتاق احمد نے روپیہ بھیجا جس سے ایک قطعہ عریض و طویل مکان بھی تیار ہوا ہے، ظاہر ہے کہ مکان صرف روپیہ سے نہیں بنا ہے بلکہ اس میں باسط علی خان اور ان کے دونوں لڑکوں مقبول احمد و مسعود احمد نے کافی محنت ومشقت کی ہے، اس طرح آبائی جائداد سے جو غلہ پیدا ہوا ہے اس میں بھی مقبول احمد و مسعود احمد ہی کی محنت وسعی کو دخل ہے، اب حاجی باسط علی اور ان کے بھتیجے مشتاق احمد اپنا کاروبار علیحدہ کرنا چاہتے ہیں تو کیا ازروئے شرع شریف جملہ جائداد آبائی اسطرح غلہ اور مکان جدید سب صرف دو حصوں میں تقسیم ہوجائے گا اور منظور و مسعود احمد و مقبول احمد دن رات محنت کرنے کے باوجود ان کے بچوں کو نہ ایک چھٹانک غلہ ملے گا اور نہ رہنے کیلئے کوئی مکان دیا جائے گا، یا آبائی جائداد حاجی باسط علی و مشتاق احمد نصف تقسیم کرلیویں گے یا مکان اور غلہ میں منظور احمد مسعود احمد اور مقبول احمد کو بھی حصہ ملے گا اور یہ بھی شریک سمجھے جاویں گے۔

یحضرهما الموت فیضاران فی الوصیة فتجد لهما النار ثم قرأ ابوهریرةؓ من بعد وصیة یوصی بها او دین غیر مضار الی قوله تعالیٰ وذلک الفوز العظیم "(رواہ احمد والترمذی وابوداؤد وابن ماجہ، مشکوۃ ۱/۲۶۵، کتاب الوصایا)۔

الجواب وبالله التوفيق:

صورت مسئولہ میں اگر امور مندرجہ ذیل کا حکم شرعی معلوم ہو جاوے تو تمام امور مستفسرہ کا شرعی تصفیہ بآسانی ہو جائے گا۔

۱-باسط علی خاں اپنے والد کے مرنے کے بعد جو نصف جائیداد مزروعہ وغیر مزروعہ ہبہ کیا ہے وہ صحیح ونافذ ہوا یا نہیں؟

۲-سنگھا پور میں مشتاق احمد و منظور احمد نے جو کاروبار کیا ہے اس کا حکم شرعی کیا ہے؟

۳-جو مکان جدید تعمیر ہوا ہے اس کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

۴-کھیتی باڑی جو گھر پر ہوتی ہے اس کا حکم شرعی کیا ہے؟

(تنبیہ) یہ ظاہر ہے کہ مشتاق احمد اپنے دادا اور چچا باسط علی کے موجود ہوتے ہوئے اپنے والد کے انتقال کی وجہ سے محجوب الارث ہو گئے تھے اور تنہا باسط علی وارث تھے اور باسط علی نے بطور خود ہبہ کیا ہے اس بنیاد پر سارے امور کے حکم شرعی الگ الگ لکھے جاتے ہیں:

۱۔ اگر مشتاق احمد بوقت ہبہ بالغ تھے یا اتنے بڑے ہو چکے تھے کہ قبضہ ولین دین اور اس کے نفع اور نقصان کے مفہوم و مقصد کو سمجھتے تھے اور باسط علی نے اشیاء موھوبہ پر واقعی قبضہ و دخل بھی کرا دیا تھا اور اپنا تخلیہ اس سے کر لیا ہے یا بعد ہبہ کے تقسیم و افراز اور انکا قبضہ دخل کرا دیا ہے جب تو یہ ہبہ صحیح و نافذ ہو کر مکمل ہو گیا ہے(۱)، اور اس نصف کے تنہا مالک مشتاق احمد ہو گئے اور اسی طرح اگر مشتاق احمد بوقت ہبہ بالکل بچے ایسے ناسمجھ تھے کہ ہبہ لین دین وقبضہ وغیرہ کا مفہوم ونفع ونقصان نہیں سمجھتے تھے مگر بوقت ہبہ یا بعد الھبہ باسط علی خان نے اشیاء موھوبہ کو باقاعدہ تقسیم وافراز کر کے محوز ومتمیز کر دیا ہے خواہ قبضہ بوجہ ولی ہونے کے خود اپنا ہی رکھا ہے جب بھی یہ ہبہ صحیح و نافذ ہو کر مکمل ہو گیا ہے(۲)، اور مشتاق احمد تنہا اس کے مالک قرار پا گئے ہیں اور اگر ایسا نہیں ہوا ہے بلکہ محض کاغذی اندراج یوں ہی کرا دیا ہے اور محض ذہنی تعین حصص پر قناعت کر کے کیا ہے تو یہ ہبہ فاسد قابل استرداد ہے خواہ مشتاق احمد بالغ رہے ہوں بوقت ہبہ یا بچہ ناسمجھ ہر صورت میں باسط علی کو اختیار ہے کہ اب وہ اس ہبہ کو اپنی حیات تک تقسیم وافراز کر کے قبضہ دخل مکمل کرا کے نافذ کر دیں یا اس ہبہ کو ختم کر کے خود تنہا سب کے مالک و

۱- ”ولا یتم حکم الهبة الا مقبوضة ویستوی فیه الاجنبي والولد اذا كان بالغا“(ہندیہ ۴/۳۷۷، مکتبہ رشیدیہ پاکستان)۔

۲- ”هبة من ابنه الصغير تتم بلفظ واحد ويكون الاب قابضا“(فتاویٰ بزازیہ علی ہامش الہندیہ ۶/۲۳۳، رشیدیہ پاکستان)۔

متصرف ہوجائیں اور اپنے ورثہ کے لئے میراث چھوڑ جائیں اور اگر چہ اشیاء موہوبہ میں بہت سارے تصرفات ہو چکے ہوں کیونکہ یہ سب تصرفات بلاامتیاز حصص مشترک وکیف ما اتفق ہی ہوئے ہیں یہ مصحح ہبہ نہیں ہوسکتے۔ والدلائل ھذہ۔

۱- هبة المشاع فيما يحتمل القسمة لا يجوز سواء كانت من شريكه (۱)، او من غير شريكه (ج ۴ ص ۳۷۸ هندية فصل فيما يجوز من الهبه و مالا يجوز)۔

۲- روى عن سيد نا عمر رضى الله عنه قال (بحذف سيد) و أيم الله لا ينحل احدكم ولده نحلى لايجوز ها ولا يقسمها فيموت الاجعلتها ميراثا لورثته (۲)، فيقوله فيموت الخ۔ افا داالحكم المذكور فى كون الموهوب له صبياً ذارحم محرم منه ايضا

۳- ومع افادتها للملک عند البعض أجمع الكل على أن للواهب إستردادها من الموهوب له ولو كان ذا رحم محرم من الواهب قال فى جامع الفصولين رامز الفتاوى الفضلى ثم اذا هلكت أفتيت باالرجوع للواهب هبة فاسدة لذى رحم محرم منه (الى قوله) كما يكون للواهب الرجوع فيها يكون لوارثه بعد موته (۳) الخ۔

۴- ''ولو وهب مشاعاً فيما يقسم ثم أفرزه وسلمه صح هكذا فى السراج الوهاج'' (۴)۔

یہ حکم تو اس وقت کا ہوا کہ اگر ہبہ صحیح اور نافذ ہوگیا ہے جب تو اشیاء موہوبہ نصف دونوں کی یعنی باسط علی خان اور مشتاق احمد کی ہوگئیں ورنہ تنہا باسط علی کی ملک ہے۔

(نوٹ) اب اسکے بعد غیروں کا حکم مذکور ہے، اس کے لئے پہلے یہ دیکھنا ہے کہ اس جگہ عرف عام کیا ہے، کیا اس طرح مشترک معاشرہ وکاروبار میں عرفاً شرکت متصور ہوتی ہے اور لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ چیزیں ہر کام کرنے والوں میں مشترک ہے اور ہر ایک اس کے مالک وسہیم قرار پائیں گے گو شرکت فاسدہ ہو بوجہ عدم شرائط صحت کے جیسا کہ امداد الفتاوی ج ۳ ص ۴۴۰ کتاب الشرکۃ کی سرخی (حکم مال اہل بیت کہ ایشاں کسب کنند و مال مکسوب را کسے علیحدہ نمی دارد) کی ماتحت کی عبارت سے مستنبط ومفہوم ہوتا ہے وھو ھذ القولہ (الجواب) میرے نزدیک ان دونوں روایتوں میں تضاد نہیں ہے وجہ جمع یہ

۱- فتاوی ہندیہ ۳۷۸/۴، مکتبہ رشیدیہ پاکستان۔

۲- بدائع الصنائع ۱۲۰/۶، مکتبہ رشیدیہ، پاکستان۔

۳- تنقیح الفتاوی الحامدیہ ۸۵/۲، طبعہ بولاق مصر۔

۴- فتاوی ہندیہ ۳۷۸/۴، مکتبہ رشیدیہ پاکستان۔

ہے کہ حالات مختلف ہوتے ہیں جنکی تعیین کبھی تصریح سے ہوتی ہے کبھی قرائن سے ہوتی ہے یعنی کبھی تو مرد اصل کاسب ہوتا ہے اورعورت کے متعلق عرفاً کسب ہوتا ہی نہیں ہے وہاں تو اس کو معین سمجھا جاویگا اور کہیں گھر کے سب آدمی اپنے اپنے لئے کسب کرتے ہیں جیسا کہ اکثر بڑے شہروں میں ہوتا ہے وہاں دونوں کو کاسب قرار دیکر عدم امتیاز مقدار کے وقت علی السویہ نصف نصف کا مالک سمجھا جاوے گا واللہ اعلم (۱)۔

"وأيضا يستنبط من تنقيح الفتاوىٰ الحامدية ج ٢ ص ١٨ وإن لم يكن بهذا الوصف بل كان كل مستقلا بنفسه واشتركوا في الاعمال فهو بين الاربعة سوية بلا إشكال وإن كان إبنه فقط هو المعين والإخوة الثلاثة بأنفسهم مستقلين فهو بينهم أثلاثا بلا إشكال والحكم دائر مع علته بإجماع أهل الدين حاملين لحكمة"۔

"وأيضاً يستنبط من هذه العبارة تنبيه يوخذ من هذا ما أفتى به في الخيرية في زوج إمرائة وابنها إجتمعا في دار واحدة كل منهما يكتسب علحدة ويجمعان كسبهما و لا يعلم التفاوت ولا التساوي والتميز فاجاب بانه سوية الخ شامي كتاب الشركة في فعل الشركة الفاسدة تحت قول الدر وما حصله أحدهما وما حصلاه معاً فلهما"

پس اس جگہ عرف عام شرکت کا ہے جب تو بعد کے تینوں نمبروں میں اسی طرف کے مطابق شرکت تسلیم کر کے حکم معلوم کرلیں اور اگر نفس شرکت کا تو عرف عام ہو مگر تعیین حصص میں عرف عام نہ ہو تو پانچوں کو علی السویۃ حصہ دیں گے کمافی تنقیح الفتاویٰ الحامدیۃ ج ا ص ۹۰۲ ایضا "هذا بناء على الاصل في الشركة انها بينهم سوية حيث لم يشترطوا شيئاً" اور اس جگہ شرکت کا عرف عام نہ ہو پھر بعد کے ہر ایک نمبر کے حکم الگ الگ ذیل میں لکھے جاتے ہیں:

۲-سنگاپور میں جو سرمایہ دوکان وغیرہ ہیں اس کو اگر مشتاق احمد و منظور احمد نے اپنی ذاتی کمائی اور روپیہ سے پیدا کیا ہے تو اس کے مالک محض مشتاق احمد و منظور احمد ہیں باسط علی اور انکے دیگر اولاد کا اس میں کوئی حق نہیں اور اگر باسط علی کے روپیہ سے کاروبار شروع کیا اور بڑھایا ہے تو باسط علی تنہا اس کے مالک ہیں اور اس صورت میں اگر مشتاق احمد و منظور احمد کے بال بچے باسط علی کے عیالداری میں نہیں رہتے ہیں بلکہ الگ الگ رہتے ہیں تو مشتاق اور منظور احمد کو اجرت مثل یعنی اس کاروبار میں کام کرنے والے کو جو عام اجرت دیجاتی ہے اس کے مستحق ہوں گے اور اگر دونوں کے بال بچے باسط علی ہی کی عیالداری

۱- ۱۵/رمضان ۱۳۳۱ھ تتمہ ثانیہ ص ۷۹۔

میں رہتے ہوں اور ہبہ نافذ وصحیح نہ ہوتو کسی کو اجرت مثل نہیں ملے گی اور اگر ہبہ صحیح ونافذ ہے تو مشتاق احمد کو اجرت مثل باوجود مشترک عیالداری کے ملے گی البتہ منظور احمد کو نہیں ملے گی ۔لکونہ معینالاب فی الشامی (ج ۳ ص ۳۴۹) فی فصل الشرکۃ الفاسدۃ کمافی القنیۃ ''الأب و ابنه يكتسبان في صنعة واحدة لم يكن لهما شئى فالكسب كله لأب إن كان الابن في عياله ۔ أفاد الحكم المذكور لأن مفهوم المخالف حجة عندنا أيضاً بخلاف النصوص كما هو مبرهن في الأصول (ثم بعد ورقة تحت قوله والربح الخ) حاصله إن الشركة الفاسدة إما بدون مال أو به من الجانبين أو من أحدهما (الیٰ قوله) والثالثة (ای حكم الثالثة) ان الربح لرب المال وللأخر اجر مثله''، ہاں اگر باسط علی سے روپیہ لینے کے وقت کوئی معاہدہ ہوا ہو پھر تو حکم اس معاہدہ کے مطابق ہوگا اور اگر قرض کر کے دیا ہے تو باسط علی قرض کی مقدار کے محض مستحق ہوں گے اور باقی سب سرمایہ وکاروبار کے مالک فقط مشتاق احمد ومنظور احمد ہوں گے کما ھو ظاہر ۔

۳- جو مکان نوتعمیر ہے اگر نئی زمین خرید کر اس میں تعمیر ہوا ہے اور سنگاپور کے کاروبار کے مالک محض مشتاق احمد و منظور احمد ثابت ہیں اور محض ان ہی دونوں کے روپے سے تعمیر ہوا ہے اور باسط علی یا انکے لڑکوں نے کوئی معاہدہ یا معاملہ کئے بغیر اس میں محنت ومشقت کی ہے تو اس مکان کے مالک محض مشتاق احمد ومنظور احمد ہوں گے اور عامل متبرع ہوں گے اور اگر کسی معاہدہ اور معاملہ کے تحت محنت ومشقت کی ہے تو اس معاہدہ کے مطابق حکم ہوگا ہاں اگر مشتاق احمد ومنظور احمد نے اس نیت سے روپیہ بھیجا ہے کہ مکان سب کا مشترک تعمیر ہوتو سب بھائی اور باسط علی علی السویہ حقدار و مالک ہوں گے اور اگر سنگاپور کی دوکان وسرمایہ کے مالک مشتاق احمد ومنظور احمد نہیں ہیں تو وہ مکان تنہا باسط علی کا ہے تو باسط تنہا اس کے مالک قرار پائیں گے اور اگر وہ مکان نوتعمیر آبائی زمین میں یا قدیم مکان منہدم کر کے اس کی جگہ میں تعمیر ہوا ہے اور ہبہ صحیح اور نافذ نہیں تو بھی اس مکان کا وہی حکم ہے جو ابھی تفصیل سے گذرا اور اگر ہبہ صحیح ونافذ ہے اور مکان نوتعمیر آبائی زمین یا قدیم مکان منہدم کر کے اس کی جگہ تعمیر ہوا ہے اور سنگاپور کے سرمایہ ودوکان کے مالک محض مشتاق احمد ومنظور احمد ہیں اور روپیہ کسی معاہدہ کے ماتحت بھیجا ہے تو حکم اس معاہدہ کے مطابق ہوگا اور اگر بلا کسی معاہدہ کے روپیہ بھیجا ہے تو وہ مکان باسط علی مشتاق احمد کے درمیان نصف نصف ہوگا اور منظور احمد کا کچھ نہ ہوگا لکونہ معینا للاب ۔

اور یہی حکم اس صورت کا بھی ہے کہ جب سنگاپور کے سرمایہ دوکان مالک مشتاق احمد ومنظور احمد نہ ہوں یعنی یہ کہ وہ مکان نصف نصف باسط علی ومشتاق احمد کا ہوگا۔

۴- اگر ہبہ صحیح و نافذ ہے تو کھیتی باڑی جملہ پیداوار میں نصف باسط علی کا اور نصف مشتاق احمد کا ہوگا اور کسی کا نہ ہوگا اور مقبول احمد و مسعود احمد کی یہ مشقت و محنت کسی معاہدہ کے ماتحت ہے تو حکم اس معاہدہ کے ماتحت ہوگا اور اگر بلا کسی معاہدہ و معاملہ کے مقبول احمد و مسعود احمد نے محنت مشقت کی ہے اور انکی رہائش مشترک باسط علی کے ساتھ انہی کی عیالداری میں ہے تو محض نصف اجرت مثل کے مستحق ہوں گے اور اگر ان دونوں کی رہائش الگ ہے باسط علی کی عیالداری میں نہیں ہے تو پھر یہ دونوں پوری پوری اجرت مثل کے مستحق ہوں گے، " کما مر من الشامی فی نمبر ۲ "، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند، سہارنپور ۱۷/ ۸/ ۸۵ ۱۳ھ

الجواب صحیح: محمد جمیل الرحمن، احمد علی سعید

والد کے انتقال کے بعد والدہ ترکہ تقسیم کرنے سے انکار کرے تو اولاد کو بذریعہ عدالت ترکہ تقسیم کرانے کا حق ہے یا نہیں؟

ایک صاحب جن کا انتقال تین سال قبل ہو چکا ہے، گیارہ بچے ہیں چھ ۶ لڑکیاں اور پانچ لڑکے ان کی بیوی بھی حیات ہیں اور گیارہ بچے بھی زندہ ہیں جن میں دو کی شادی موصوف کی زندگی میں بھی ہوگئی تھی، ان کی جائداد حسب ذیل ہے جو ابھی تقسیم نہیں ہوئی ہے حقدار میں گیارہ بچے اور بیوی ہے یہ جائداد آبائی نہیں بلکہ ذاتی کمائی ہے۔

۱- دھان کے کھیت پندرہ ایکڑ ان میں سے چار ایکڑ صاحب موصوف نے اپنی زندگی ہی میں اپنی بیوی کے نام کر دیا تھا۔ انکی زندگی ہی میں انکی بیوی نے اس کو گروی رکھ کر سودی قرض لیا ہے جو ابھی تک ادا نہیں ہوا ہے۔

۲- مکان کی جگہ تقریباً پونے ایکڑ ہے جس میں سے ½ حصہ انہوں نے اپنی بیوی کے نام لکھ دیا ہے۔

۳- ایک مٹی کا مکان جس کو نصف پکی عمارت کہہ سکتے ہیں اور جس کی چھت لکڑی اور کھپریل سے بنی ہوئی ہے جو موجود ہے۔

۴- کل جائداد میں بیوی کے نام لکھی ہوئی جائداد کو وضع کر دیں تو گیارہ ایکڑ دھان کے کھیت تقریباً نصف ایکڑ مکان کی زمین اور ایک مکان باقی رہتے ہیں اس میں بھی مورث کے انتقال کے بعد بالغ لڑکے دو اور ماں نے چار ایکڑ زمین دھان کے کھیت گروی رکھدی ہے، شادی شدہ دو لڑکیوں کے علاوہ باقی یعنی نو اولاد بالغ اسی گھر میں رہتے ہیں شادی شدہ لڑکیاں والد کے انتقال کے بعد متعدد بار اپنا حق دریافت کر چکی ہیں، لیکن ان کی والدہ کہتی ہیں کہ تمام بچوں کی شادی کے بعد جائداد تقسیم ہوگی۔

ہر سال کھیتوں سے کافی آمدنی ہوتی ہے لیکن اس میں سے کسی کی شادی نہیں ہوئی ہے اور نہ شادی شدہ لڑکیوں کو کچھ دیا جاتا ہے اور والدہ ہمیشہ ٹال مٹول کرتی رہتی ہے عرصہ ہوگیا ہے لڑکیوں کا ارادہ ہے کہ عدالتی چارہ جوئی کر کے عدالت کے ذریعہ ترکہ تقسیم کرائیں۔ کیا یہ لڑکیاں اس کارروائی کے بعد حق بجانب ہیں۔

الجواب وبالله التوفيق:

۱- چار ایکڑ زمین جو صاحب موصوف نے اپنی بیوی کے نام لکھ دیا ہے وہ بیوی کی ملک تنہا ہوگئی، اس میں ابھی کسی اولاد کا حق نہیں ہے اور بیوی نے جو اس کو رہن سودی رکھ دیا اس کا عذاب و وبال انہی بیوی کے ذمہ ہے، اولاد سے اس کا کوئی تعلق نہیں، البتہ اولاد کو چاہئے کہ جلد سے جلد اس گیروی کو چھوڑانے کی فکر کریں، اور اپنی ماں کی امداد کریں کہ وہ اس وبال و عذاب سے بچ جائیں، اگر وہ زمین بچی رہی تو بیوی کے مرنے کے بعد جو اولاد زندہ بچیں گی انکو ترکہ ملے گا ابھی نہیں ملے گا(۱)۔

۲- پونے ایکڑ کی $\frac{1}{3}$ کی زمین جو بیوی کے نام لکھ دیا ہے وہ بھی تنہا انہی کی ہوگئی اس میں کسی اولاد کو کوئی حق ابھی نہیں بقیہ $\frac{2}{3}$ حصہ تمام ورثہ یعنی خود بیوی اور انکی سب اولاد میں مشترک ہے۔

۳- یہ بھی تمام ورثہ میں حسب تخریج شرعی جو درج ذیل ہے تقسیم ہوگا۔

۴- مورث کے انتقال کے بعد ماں اور دو بالغ لڑکوں نے ملکر جو چار ایکڑ کھیت دھان کی زمین گروی رکھدی ہے اگر ماں نے ان بالغ بچوں کے نان ونفقہ میں خرچ کی مجبوری سے رکھی ہے کہ اس کے پاس بجز اس کے اور کوئی معاش نہ ہوتو اس کا ضمان ماں پر نہیں ہے، جب واگذار ہوگی تمام ورثہ میں حسب تخریج ذیل تقسیم ہوگی۔

اگر ماں نے بوجہ واقعی مجبوری گیروی رکھا ہے تو بالغ اولاد ذکور و اناث کو چاہئے کہ حتی المقدور جلد سے جلد اس گیروی کو چھوڑا کر ماں کو سود دینے کے وبال سے بچائیں اور ماں پر واجب ولازم ہے کہ مورث شوہر کی کل متروکہ جائداد جو ترکہ ہے یعنی ۱۱ ایکڑ زمین کھیت دھان اور نصف ایکڑ زمین مکان کی اور خود مکان سب کو حسب تصریح ذیل تمام اولاد میں تقسیم کردے اور نابالغین کا حصہ خود محفوظ رکھے یا کسی امین کے پاس محفوظ رکھے اور اسکی آمدنی سے ان نابالغین کا نان ونفقہ تعلیم وتربیت کافی نہ ہوتو جتنی بالغ اولاد ہیں ان سب کے ذمہ حسب استحقاق وراثت واستطاعت واجب ہے، اسی طرح ماں کے حصہ کی آمدنی اگر ماں کے نان ونفقہ کے لئے کافی نہ ہوتو جتنی اولاد بالغ ہیں سب پر حسب استحقاق وراثت واستطاعت واجب ہے۔ ہاں

۱- ’’کونهم ورثة لايتحقق إلا بعد موت المورث‘‘ (شامی ۵/ ۱۰۳، کتاب الفرائض، عثمانیہ)۔

اگر ماں نے اپنی دوسرے شادی کرلی ہواور شوہر زندہ موجود ہے تو ماں کا نان ونفقہ واجب نہیں۔ مورث کی ان تمام متروکات میں تمام ورثہ کے حصے اس طرح ہیں کہ تمام متروکات میں سے مورث کے ذمہ اگر کچھ قرض ہوتو پہلے اس کو اداکریں اور کچھ وصیت مال ہوتو قرض کی ادائیگی کے بعد ایک تہائی کے اندر اس کو اداکریں پھر جو کچھ بچے اس میں سے ایک یعنی اٹھویں $\frac{1}{8}$ مورث کی بیوی (یعنی اولاد کی ماں) کو دیں اور باقی کو یعنی $\frac{7}{8}$ کو سولہ حصے پر تقسیم کریں اور پانچوں لڑکوں کو دودوحصہ دیں اور لڑکیوں کو ایک ایک حصہ دیں، ماں کو سمجھا کر حکم خدا اور رسول بتا کر کہیں کہ وہ شرعی قاعدہ سے تقسیم کردیں تاکہ آخرت کے وبال سے بچ جائیں۔ اگر ماں تیار ہوجائے تو اس مذکورہ قاعدہ سے تقسیم کرلیں اگر ماں کسی طرح نہ مانیں تو ان بالغ اولاد پر مال کے تقسیم نہ کرنے سے کوئی گناہ نہ ہوگا یہ اپنے حق سے آزاد ہوگئے، البتہ ماں غاصب کے حکم میں ہوگی اور گنہگار ہوگی اگر ماں اولاد کو ضرر پہنچانے کی غرض سے تقسیم نہ کرتی ہوتو یہ اور بھی شنیع اور سخت گناہ کی چیز ہے۔

اور مجبور ہوکر عدالت سے چارہ جوئی کرنے میں اور اپنے حق کو بچانے کی خاطر دعوی کرنے میں اولاد پر کوئی ضرر نہ ہوگا حتی الوسع پنچایت سے صلح سے ماں کا ادب واحترام رکھتے ہوئے مطالبہ کرنا اور اپنا حق حاصل کرنا چاہئے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند، سہارنپور ۲۶/ ۸/ ۱۳۸۵ھ
الجواب صحیح: سید احمد علی سعید نائب مفتی دارالعلوم دیوبند

برضاء ورغبت ترکہ تقسیم کرلینے کے بعد انکار کا حکم:

عبدالرزاق وعبدالواحد دو حقیقی بھائی ہیں ان دونوں نے اپنی موروثی جائداد کو باہمی رضامندی سے دو حصوں پر اس طرح تقسیم کیا ہے کہ ایک لڑکا مکان کے ایک حصہ میں اور دو چھوٹے مکان اور دو احاطے اور ایک بیگھہ زمین نکلی اور عبدالرزاق کے نام پر ایک بڑا مکان نکلا اس باہمی رضا ورغبت سے تصفیہ قرعہ اندازی کے بعد عبدالواحد اس فیصلہ کے ماننے سے انکار کر گیا، لہذا آپ شریعت کے حکم سے مطلع فرماویں کہ باہمی رضا ورغبت کے فیصلہ سے انکار کرنے والا کیسا ہے؟ شریعت میں ایسے شخص کا کیا حکم ہے؟

الجواب وباللہ التوفیق:

جب دونوں بھائیوں میں اپنی رضا ورغبت سے بلاکسی جبر ودباؤ کے حسب حصہ اسلامی دونوں حصوں کی تعیین کی گئی

ہے اور پھر دونوں نے برضاورغبت قرعہ اندازی بھی کر لی تو اب جملہ کاروائی مکمل ہوگئی، اب کسی کا اس قرعہ سے انکار کرنا جائز نہیں ہے بالکل اپنے بھائی کی طرح برابر کا شریک وحقدار ہے، لہذا کوئی اور طریقہ شرعی تقسیم کا اختیار کر لیا جائے۔

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند، سہارنپور ۱/۹/ ۱۳۸۵ھ
الجواب صحیح: سید احمد علی سعید دارالعلوم دیوبند، محمود عفی عنہ دارالعلوم دیوبند

مشترکہ دوکان کی تقسیم:

ہم چار بھائی ہیں میرے بھائیوں میں شرکت داری میں ایک دوکان چل رہی ہے اور نا اتفاقی کی وجہ سے چار بھائیوں میں تین بھائی اس دکان سے بے سروکار ہیں، حالانکہ بھائیوں میں دوکان کا کوئی بٹوارہ نہیں ہے، عرصہ دراز سے میرے بھائی صاحب اس دوکان پر قبضہ کئے ہوئے ہیں، عرصہ آٹھ سال ہوا دکان کئے ہوئے یہ چار سال سے تین بھائی اس دکان سے علیحدہ ہیں، اس نا اتفاقی کی صورت میں ہم لوگوں کے لئے شرعی کیا مسئلہ ہے۔ اور ۴ چار سال کے منافع پر کیا ہم تینوں بھائیوں کا حق ہے، بڑے بھائی کا اس طرح اکیلے کھانا کیسا ہے؟

الجواب وباللہ التوفیق:

اگر واقعہ ایسا ہی ہے جیسا کہ سوال میں مذکور ہے تو اس بھائی پر جو تنہا دکان پر قابض اور دخیل ہے، تمام برسوں کا حساب دینا ضروری ہے اور اس تمام زمانہ میں جو نفع ہوا ہے ان سب میں سب بھائی حسب حصہ رسد حقدار (۱) ہیں، ان سب بھائیوں کو اختیار ہے کہ معاف کردیں اگر معاف نہ کریں تو قیامت میں دینا ہوگا، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند، سہارنپور ۱۶/۹/ ۱۳۸۵ھ
الجواب صحیح محمود عفی عنہ

کسی کے نام محض پٹہ اور اندراج کر دینا موجب ملک نہیں ہے:

سید ذو الفقار علی کے پانچ لڑکے اور دو لڑکیاں تھیں جنکے نام یہ ہیں دیدار علی، سکندر علی، انور علی، عباس علی، اور

۱- ''قوله وكل اجنبي في قسط صاحبه اى وكل واحد من الشريكين ممنوع من التصرف في نصيب صاحبه لغير الشريك الا باذنه'' (البحر الرائق ۵/ ۱۶۷، مکتبہ رشیدیہ پاکستان)۔

سردارعلی، آج چالیس سال کا عرصہ ہوا، جائداد کا پٹہ عباس علی اور سردارعلی کے نام چلا آرہا ہے اور یہ پٹہ پانچوں بھائیوں کی مرضی سے سردارعلی کے نام ہوا، اس جائداد پر سرکاری قرض بتایا بھی تھا جو سردارعلی نے ادا کیا دوسرے بھائیوں نے قرض کی ادائیگی میں کوئی حصہ نہیں لیا ہے، اگر قرض ادا نہ ہوتا تو جائداد ختم ہوجاتی اب چونکہ سردارعلی کا انتقال ہوگیا ہے، وہ جائداد اپنی بیوی کے مہر میں دے چکے ہیں ایسی صورت میں سیدسردارعلی کے بڑے بھائیوں کی اولادیں جائداد کی حقدار ہیں یا کہ نہیں؟

الجواب وبا للہ التوفیق:

کسی کے نام محض پٹہ اور اندراج کرادینے سے اس کا شرعاً مالک ہونا ضروری نہیں ہے، اندراج تو بوجہ مصلحت فرضی بھی کرلینا رائج ہے، البتہ دیکھنا یہ ہے کہ اگر یہ جائداد ملکیت سیدذوالفقارعلی کی تھی تو اس میں یہ پانچوں لڑکے اور لڑکیاں شرعی وارث وحقدار ہیں، تنہا سردارعلی یا عباس نہیں اور سردارعلی نے جو قرضہ ادا کیا ہے، اگر آپس کے کسی معاہدہ کے تحت داخل کیا ہے تو حکم اس معاہدہ کے تحت ہوگا ورنہ سردارعلی کا یہ تبرع واحسان ہوگا جس کے مطالبہ کا حق ان کے ورثہ کو نہیں، ہاں اگر تمام ورثاءخود اپنی مرضی سے حسب حصہ رقم قرضہ میں شرکت کرلیں تو یہ انکے لئے دیانۃً انسب اور بہتر ہے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند، سہارنپور ۲۴/۹/۱۳۸۵ھ

الجواب صحیح سید احمد علی سعید نائب مفتی دارالعلوم دیوبند

گود لینے کا شرعی حکم:

۱- کیا مذھب حنفی میں کسی کو گود لینا جائز ہے؟

۲-واقعہ یہ ہے کہ ایک شخص اور اس کی بیوی کچھ وقفہ کے بعد فوت ہوگئے، انہوں نے اپنی کوئی اولاد پسری یا دختری نہیں چھوڑی ہے، بلکہ متوفی نے اپنی زندگی میں ہی اپنے ایک بھتیجے کو اپنے پاس رکھ لیا ہے، وہی متوفی کے بعد تمام ترکہ پر قابض ہوگیا ہے، متوفی تین بھائی تھے، دو بھائیوں کی اولاد موجود ہے، متوفی نے جس بھتیجے کو پاس رکھا تھا اس کے نام زمین و سرمایہ وغیرہ کچھ نہیں کیا تھا، ایسی صورت میں کیا فتوی ہے، سرمایہ ومکان وبقایا وغیرہ دو بھائیوں نے اپنے پاس رکھا تھا، مفصل جواب تحریر فرمادیں۔

الجواب وباللہ التوفیق:

۱- گود لینے سے شرعاً وارث نہیں ہوگا جب تک اس کے نام ہبہ نہ کردے، اس لئے یہ کوئی موثر ومفید چیز نہ ہوئی اور شریعت میں اس کا کوئی درجہ نہیں ہے۔

۲- پہلی لکھی ہوئی عبارت سے اس کا جواب نکل سکتا ہے کہ اگر متوفی نے اس کے نام زبانی یا تحریری کوئی وصیت یا ہبہ کیا ہوتو اس کے مطابق مسئلہ دریافت کر کے عمل کریں اور اگر کوئی وصیت یا ہبہ وغیرہ نہیں کیا ہے تو گود والا شرعی وراثت کا حقدار نہ ہوگا بلکہ متوفی کی جائیداد میں شرعی تخریج کے مطابق جاری ہوگی جو ورثہ کی پوری تفصیل معلوم ہونے پر بتائی جا سکتی ہے، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند، سہارنپور

الجواب صحیح سید احمد علی سعید نائب مفتی دارالعلوم دیوبند ۲۳/۹/ ۱۳۸۵ھ

شوہر کے ترکہ سے مہر اور حصہ کا مطالبہ:

منشی رضا کا انتقال اسکے والد کی موجودگی میں ہوا جبکہ مرحوم کے نام کوئی جائداد نہ تھی، بیوہ نے عقد ثانی دوسرے موضع میں کرلیا جس کو عرصہ تقریباً ۳۵ سال کا ہو، اہیوہ کے خسر کے انتقال کے بعد جائداد بقیہ ۳ بیٹوں حبیب اللہ، کلیم اللہ، شفیع اللہ میں تقسیم ہوگئی، کلیم اللہ کا انتقال بھی تھوڑے ہی دنوں بعد ہوگیا، کلیم اللہ کی جائداد بقیہ دولڑکوں حبیب اللہ وشفیع اللہ نے تقسیم کرلیا، کلیم اللہ کی بیوی نے اپنے دیور شفیع اللہ سے عقد کرلیا۔ کلیم اللہ کی بیوہ اپنے مرحوم شوہر کا ترکہ مانگتی ہے، کہتی ہے کہ میرے مرحوم شوہر کی جائداد سے میرا مہر ادا کیا جاوے اور میرے حصے کا ترکہ بھی دیا جاوے اس کا مطالبہ جائز ہے کہ نہیں؟ منشی رضا کی بیوہ بھی اپنا مہر اور جائداد میں حصہ مانگتی ہے، واضح رہے کہ منشی رضا کا انتقال باپ محمد عمر کے زمانہ ہی میں ہوگیا تھا، منشی رضا کے نام کوئی جائداد دوسری تھی ہی نہیں اب منشی رضا کی بیوی اپنے دو دیوروں سے اپنے مہر اور جائداد میں حصہ پا سکتی ہے یا کہ نہیں؟

الجواب وباللہ التوفیق:

حسب تحریر سوال کلیم اللہ کی بیوی کا مطالبہ جائز اور صحیح ہے، کلیم اللہ مرحوم کے مرنے پر ان کے ترکہ سے جو قرضہ ان پر رہا ہو اور دین مہر دینے کے بعد جو بچے اس میں سے اگر وصیت مال کیا ہو تو ثلث مال سے وصیت ادا کرنے کے بعد جو بچے

اس میں سے اگر کلیم اللہ کی کوئی اولاد ہوں تو کلیم اللہ کی بیوی کو ایک آٹھویں حق شوہری دیں اور اگر کلیم اللہ نے کوئی اولاد نہ چھوڑی ہو، انکی بیوی کو کلیم اللہ کے ترکہ سے ایک چوتھائی دیں پھر جو بچے اس کو کلیم اللہ کے لڑکے اور لڑکی ہو تو وہ لے اور اگر اولاد نہ ہو تو دونوں بھائی برابر تقسیم کرلیں غرض دین کا مطالبہ اور حق شوہری ۱-۸ کی یا ۱-۴ جو بھی ہو اس کا مطالبہ صحیح ہے۔

منشی رضا مرحوم چونکہ اپنے والد محمد عمر کے زندگی میں فوت کر گئے تھے، اس لئے محمد عمر کی جائداد سے کوئی حق نہ منشی رضا کو ملے گا اور نہ اس میں سے منشی رضا کی بیوی کو، ہاں اگر محمد عمر کی جائداد کے علاوہ منشی رضا کی کوئی اپنی ذاتی جائداد ہوتی تو اس میں سے بے شک منشی رضا کی بیوہ مستحق ہوتی اور جب نہیں ہے تو نہیں ہوگی، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند، سہارنپور

کیا شوہر کے ترکہ میں زینب کا بھی حصہ ہوگا؟

مرزا نصیر بیگ کا نکاح بنام فیاض بیگم سے ہوا ہے جبکہ نکاح ہوا، اس وقت فیاض بیگم کے ایک لڑکا بنام صابر علی ولد مبارک علی کا تھا، اب اس وقت لڑکے کی عمر ۲۰ سال کی ہوگئی اور مرزا نصیر بیگ کا انتقال ہوگیا ہے، جائداد نصیر کے دادا کی ہے، تو مرزا نصیر بیگ کے فوت ہوجانے کے بعد بیوی فیاض بیگم کا کیا حق وحصہ ہے اور لڑکا صابر علی جو مبارک علی کا ہے اس کا انکے مکان حصہ میں سے کتنا حق ہے تحریر فرماویں۔

الجواب وباللہ التوفیق:

حسب تحریر سوال صورت مسئولہ میں صابر علی ولد مبارک علی جس کو فیاض بیگم لے کر آئی ہے اس کا کوئی حق وراثت مرزا نصیر علی کے ترکہ میں نہیں ہوگا، البتہ فیاض بیگم زوجہ نصیر بیگ کا حق ہوگا، اس تفصیل سے کہ اگر نصیر بیگ کے نطفہ سے کوئی اولاد فیاض بیگم کے یا کسی اور زوجہ سے مرزا نصیر بیگ کے مرنے کے وقت موجود ہو تو فیاض بیگم کو مرزا نصیر بیگ کے ترکہ سے آٹھواں حصہ ملے گا اور اگر نصیر بیگ کے نطفہ سے کوئی اولاد مرزا نصیر بیگ کے انتقال کے وقت زندہ موجود نہ رہی تو ایک چوتھائی ملے گا(۱) ھکذا فی (السراجیۃ)، فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند سہارنپور ۲۴/ ۱۰/ ۸۵ ۱۳ھ
الجواب صحیح محمود غفی عنہ

۱- ''ولھن الربع مما ترکتم ان لم یکن لکم ولد فان کان لکم ولد فلھن الثمن مما ترکتم، سورۃ النساء ۱۲، اما للزوجات

پوتا وراثت سے محروم کیوں؟

سوال: شریعت اسلامیہ کا یہ قانون ہے جس پر ایمان و اعتقاد بھی ہے کہ دادا کی صلبی اولاد کی موجودگی میں پوتا محجوب الارث، یعنی وراثت سے محروم رہتا ہے تو یہاں ذہنی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ شریعت اسلامیہ کہ اس سے بڑھ کر کسی دین میں دل جوئی وتلطف رافت وشفقت علی الخلق نہیں ہے۔ تو اس شریعت میں یہ قانون کہ دادا کی موجودگی میں پوتا وراثت سے محجوب ہوجاتا ہے سمجھ میں نہیں آتا، کیونکہ یہ پوتا سایۂ پدری سے محروم رہا۔ اب چاہئے تو یہ تھا کہ اس پر مزید انعامات واکرامات کیے جاتے، نہ یہ کہ وراثت ہی سے محروم ہوجائے، گزارش یہ ہے کہ اس کا جواب مختصراً عنایت فرمائیں جس سے ذہنی خلجان وپریشانی دور ہوجائے۔

الجواب وبالله التوفيق:

اس قانون (دادا کی میراث سے پوتا محروم ہوجاتا ہے) سے وحشت محض اس وجہ سے ہوگئی ہے کہ مسئلہ پورا ذہن میں نہیں رہا، پورا مسئلہ ذہن میں آجانے کے بعد یہ وحشت یا اعتراض نہ رہے گا، ہر حال میں پوتا وراثت سے محروم نہیں ہوتا، بلکہ مسئلہ یہ ہے کہ اگر زید (دادا) کے کوئی اولاد نہ ہو تو پوتا بالکل ہر حیثیت سے بیٹے کے برابر اور مستحق ترکہ ہوتا ہے، اسی طرح اگر زید کے اولاد تو ہے، مگر نرینہ نہیں، بلکہ صرف لڑکیاں ہیں جب بھی پوتا محروم نہیں ہوتا، اسی طرح جب اس کی بیویاں ہوں جب بھی محروم نہیں ہوتا، اسی طرح اس کے (زید کے) بھائی بہن، ماں، باپ ہوں جب بھی پوتا محروم نہیں ہوتا، بلکہ مثل لڑکے کے شمار ہوکر وراثت کا پورا پورا حقدار ہوتا ہے۔

محروم ہونے کی صرف ایک صورت ہے کہ زید (دادا) کے پوتے کے ساتھ بیٹا بھی موجود ہے تو چونکہ زید کا بیٹا زید کے پوتے کے اعتبار سے زیادہ قریب ہے اور وہ صلبی اولاد ہے اور پوتا ایک واسطے کے بعد اولاد میں داخل ہوتا ہے، اور ظاہر ہے کہ الاقرب فالاقرب کے قاعدے سے بیٹے کی موجودگی میں پوتے کو استحقاق نہیں ہوسکتا، لیکن اس صورت میں بھی زید (دادا) کے لیے مندوب ومستحب یہ ہے کہ وہ اس محروم پوتے کے لیے بطور ہبہ کچھ دیدے یا ثلث ترکہ کے اندر اندر کچھ وصیت کردے، تاکہ پوتا بے سہارا نہ رہے، حتی کہ اگر زید (دادا) کچھ ہبہ یا وصیت نہ کرسکا تو زید کے لڑکے کے لیے بہتر ہے

فحالتان: الربع للواحدة فصاعدة عند عدم الولد وولد الابن وان سفل والثمن مع الولد أو ولد الابن وإن سفل" (السراجی ۱۱-۱۲)۔

کہ وہ اپنے بھائی کی اولاد کو تبرعاً کچھ دے کر آباد کرے۔

اب غور کیجئے کہ اسلام کے قانون میں کہاں رافت ورحمت کے خلاف تعلیم کا شبہ یا شائبہ ہے؟ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ محمد نظام الدین اعظمی، مفتی دارالعلوم دیوبند، سہارنپور